کتاب نما

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

اُردو میں کلاسیکی تنقید — پروفیسر عنوان چشتی

پروفیسر عنوان چشتی کا ایک تنقیدی و تحقیقی کارنامہ، جس میں لسانی، فنی اور عروضی نکات کو دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور کلاسیکی تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کے مخفی اور نئے گوشوں کو پہلی بار روشنی میں لایا گیا ہے۔ اُردو کے اساتذہ، طلبہ اور فنکاروں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ۴۸/=

تفہیم و تنقید — حامدی کاشمیری

اس کتاب میں حامدی کاشمیری کے ایسے اہم مقالات شامل ہیں جو قدیم اور جدید ادوار کے بعض شعری رجحانات اور شخصیات کے متعلق ہیں۔ ۴۰/=

قدیم ہندستان کی سیکولر روایات — ڈاکٹر مجیب اشرف

اس مختصر مگر اہم کتاب میں عہدِ قدیم کی سماجی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی اور رجحانات کے مستند حوالوں کے ساتھ نہایت ذمے داری سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲/=

زندگی کی طرف — شمیم حنفی

شمیم حنفی کے ڈراموں کی نئی کتاب۔ عام انسانی تجربوں اور رویّوں کی تخلیقی تعبیر کا ایک منفرد زاویہ، اُردو ڈرامے کی روایت کا ایک اہم موڑ۔ ۳۶/=

گول مال — شفیقہ فرحت

"رانگ نمبر" کے بعد شفیقہ فرحت کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جو ایک بار نہیں بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ ۱/=

فی الفور — یوسف ناظم

طنز و مزاح میں یوسف ناظم کا شمار صفِ اوّل کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ "فی الفور" آپ کے مزاحیہ مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔ ۳۰/=

مَولانا آزاد کی کہانی — ڈاکٹر ظفر احمد نظامی

مولانا ابوالکلام آزاد کی مختصر مگر جامع سوانح جسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائق استاد اور اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر ظفر احمد نظامی نے بڑی محنت سے لکھی ہے۔ طلبہ کے لیے ایک اہم تاریخی دستاویز۔ ۱۸/=

دیگر اداروں کی کتابیں

مضامینِ سیّدین — مرتبہ: ڈاکٹر مظہر انشان صدیقی

ممتاز ماہرِ تعلیمات خواجہ غلام السیدین کے علمی ادبی مضامین کا اہم مجموعہ۔ ۴۰/=

توفیق الحکیم — ناول نگاری کا جائزہ — ڈاکٹر بدرالدین الحافظ

اس کتاب میں عالمی شہرت یافتہ ناول نگار توفیق الحکیم کی ناول نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ۷/-

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

کتاب نما

جنوری ۱۹۹۳ء جلد ۳۳ شمارہ ۱

فی پرچہ 6/=
سالانہ 55/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے 75/=
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک) 170/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک) 320/=

ایڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
TELEPHONE 630191

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

پرنٹر پبلشر سید دسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

مضامین:-

نظمیں / غزلیں:-

افسانہ:-

نئی مطبوعات

مسلمانوں کا تعلیمی نظام (علمی) پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۲۵/-
حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدن (تاریخ) مالک رام ۷۵/-
جام جہاں نما اردو صحافت کی ابتدا جی۔ ڈی چندن ۷۵/-
پروفیسر آل احمد سرور، شخصیت اور ادبی خدمات (خصوصی شمارہ کتاب نما) ۲۵/-
خوب سیرت (حصہ دوم) (مذہب) بچوں کے لیے حکیم محمد سعید ۴/-
امت کی مائیں (مذہب) بچوں کے لیے۔ حسین حسنی ۴/۵۰
اچھی باتیں " " سعید الدین انصاری ۴/۵۰
گندا پانی (سائنس) بچوں کے لیے ۴/۵۰
آپ کا جسم (سائنس) " " ۴/۵۰
یہ کیسا بخار ہے " " " ۶/-
ایک تھا مرغا ککڑوں کوں " " قمر علی عباسی ۶/-
پریوں کی کہانیاں (بچوں کے لیے) اشرف صبوحی ۶/-
پتھر کی گڑیا " ادارہ ۷/۵۰
سمندر کا بادشاہ ہار گیا " ڈاکٹر شریف الحسن ۴/-
ریل کے بچے (بچوں کے لیے) ترجمہ احمد خاں خلیل ۴/-
معلم اردو (قاضی نذر الاسلام نمبر) مدیر اظہار احمد ۱۰/-
اقبال: شاعر و مفکر (تحقیق) پروفیسر نور الحسن نقوی ۸۵/-
رباب صحرا (شعری مجموعہ) ڈاکٹر حنیف ترین سنبھلی ۵۰/-
سمت ساز (نظمیں) علیم صبا نویدی ۳۰/-
ایک لمحہ ایک خواب (شعری مجموعہ) سیفی سرونجی ۲۵/-
عالمی اردو ادب ۹۲ء مدیر: نند کشور وکرم ۱۵۰/-
سرہانے کا چراغ (شعری مجموعہ) عزیز تمنائی ۵۰/-
پرندے کیوں نہیں اڑتے (افسانے) دیویندر اسر ۷۰/-

سرورق:۔ رام پرکاش کپور

میرزا یگانہ، شخصیت اور فن (سوانح تنقید) مرتبین مشفق خواجہ و دیگر ۱۰۰/-
غالب کے خطوط حصہ چہارم (خطوط) مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم ۱۲۰/-
غالب کے خطوط حصہ اوّل (نیا ایڈیشن) خطوط مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم ۱۲۰/-
المامون (سوانح) علامہ شبلی نعمانی ۵۰/-
سفرنامہ افغانستان (سفرنامہ) مولانا سید سلیمان ندوی ۳۵/-
علاج نبوی اور جدید سائنس (طب) ڈاکٹر خالد غزنوی ۳۵/-
بھوکا ایتھوپیا (افسانے) شرف عالم ۱۱۰/-
گر تو برا نہ مانے (مزاحیہ) شاہد صدیقی ۵۰/-
اردو ادب اطفال کے معمار (بچوں کا ادب) ڈاکٹر خوشحال زیدی ۱۲۵/-
چیزیں اور لوگ (پاکستانی) افسانے آصف فرخی ۱۰۰/-
معالجات اطفال (طب) حکیم سید محمد شجاع الدین ۵۰/-
افسانے کے معمار (افسانوی ادب) مرتبہ: ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی ۴۰/-
قاری اساس تنقید۔ مظہریت اور قاری کی دلچسپی (تنقید) گوپی چند نارنگ ۱۵۰/-
دائروں کے قیدی (افسانوی مجموعہ) بانو سرتاج ۶۰/-
جمیل مظہری (سوانح اور تنقید) مظہر امام ۱۵۰/-
بند ہوتا ہوا بازار (نظمیں) " ۴۰/-
اسلام مسلمان اور غیر مسلم (مذہب) علامہ یوسف کرامی ۳۵/-
انتون چیخوف کے شاہکار ڈرامے (ترجمہ و تنقید) مترجم: ناہدہ زیدی ۱۵۰/-

مہمان مدیر
رام پرکاش کپور
۱۸/۱۷، ایم، آئی، جی پدم نابھ پور
درگ (ایم۔ پی)

اشاریہ

ہندستان میں اُردو کے مسائل

اتنے بڑے بڑے ادیب وقتاً فوقتاً کتاب نما کا اداریہ لکھتے رہے ہیں کہ میں یہ لکھتے ہوئے کچھ احساسِ کمتری محسوس کرتا ہوں۔ میں کوئی شاعر، ادیب یا نقاّد نہیں ہوں۔ میں ایک بے حد معمولی قاری ہوں۔ میری یہ اداریہ لکھنے کی کوالیفیکیشن یہی ہے کہ میں اُردو کو پیار کرتا ہوں اور بے حد پیار کرتا ہوں۔ اور اسے دنیا کی سب سے خوبصورت زبان سمجھتا ہوں۔ یہ اس لیے نہیں کہ یہ ہماری زبان ہے۔ یہ واقعی اگر دنیا کی سب سے خوبصورت نہیں تو کم سے کم خوبصورت ترین زبانوں میں سے ایک ہے۔ درحقیقت اُردو ایک زبان ہی نہیں یہ ہماری مشترکہ قومی تہذیب کی تصویر ہے۔ ہمارا مشترکہ قومی ورثہ ہے۔ اس خوبصورت تہذیبی زبان کو فروغ دینا ہمارا قومی فریضہ ہے۔ اس نے ہمیں ایک منفرد پہچان عطا کی ہے اور غیر منقسم ہونے کا تصور بخشا ہے۔ یہ ایک ایسی زبان ہے جس نے ہندستان کی اجتماعی تاریخ کے دورِ جدید میں غیر معمولی رول ادا کیا ہے۔ جس نے ہمیں انقلاب زندہ باد جیسے جوشیلے نعرے دیے ہیں۔ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی سے لے کر ۱۹۴۷ء کی آزادی تک اردو کے سیکڑوں ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے اپنی زندگی کی قربانیاں دی ہیں اور انقلابی ادب کی تخلیق کی ہے۔ رام پرشاد بسمل کی نظم کا یہ شعر "حسرت سے در و دیوار پہ نظر کرتے ہیں / خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں۔" گاتے ہوئے سیکڑوں نوجوان انڈمان نکوبار (کالا پانی) گئے۔ اور انھی کی مشہور نظم سے "سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے / دیکھنا ہے زور کتنا بازوے قاتل میں ہے" گاتے ہوئے سردار بھگت سنگھ اور اُن کے ساتھی اور دوسرے سیکڑوں نوجوان ہنستے ہنستے پھانسی پر جھول گئے۔ شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی کی نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے" گاتا ہوا طلبہ کا ایک جلوس الٰہ آباد میں انگریزی حکومت کی لاٹھی، گولی کا شکار ہوا۔ آزادی کی تحریک میں اردو کا رول نہایت اہم اور ناقابلِ فراموش رہا ہے۔ ہریانہ کے بزرگ مجاہدِ آزادی آنجہانی کامریڈ ہرچند آہوجہ نے اردو سے متعلق اپنے

ایک مضمون میں لکھا تھا۔" اردو والے ادبی سطح پر اُردو کو کچھ بھی سمجھیں لیکن یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ اُردو نے ہندستان کی تحریک آزادی میں بھرپور مجاہدانہ فرض انجام دیا ہے۔ یہ زبان ہم مجاہدوں کا اوڑھنا، بچھونا ہی نہیں بلکہ آزادی کے جہاد میں ہماری رہنما بھی رہی ہے۔ یہ وہ زبان ہے جس کی وسعتیں ہمالیہ کی بلندی سے گنگا اور جمنا کی لہروں تک دکھائی دیتی ہیں۔" جس طرح ہندستان نے اپنی سرزمین پر مختلف مذاہب اور مختلف نسل کے لوگوں کو جگہ دے کر اپنی کشادہ دلی کا ثبوت دیا ہے اسی طرح ہندستانی زبان اردو نے بھی مختلف مذاہب اور مختلف زبانوں کے خیالات و الفاظ کو اپنے دامن میں سمیٹ کر اپنی وسیع النظری اور وسیع القلبی کا ثبوت دیا ہے ؎

سرزمینِ ہند پہ اقوامِ عالم کے فراقؔ
قافلے آتے گئے ہندستاں بنتا گیا

جس طرح ہندستان بنا اسی طرح مختلف تہذیبوں کے امتزاج سے یہ زبان پیدا ہوئی اور پروان چڑھی۔ اس کی نشو و نما میں صوفی فقیروں اور بھگتی تحریک کے سنتوں کا بھی نمایاں رول رہا ہے اور چونکہ یہ ایک لشکری اور جمہوری زبان تھی، اس کا فروغ بھی شروع شروع میں بازاروں اور خانقاہوں میں ہوا۔ اسی طرح عوامی زندگی کے مظاہر سے اس کا ایک اٹوٹ رشتہ قائم ہوا۔ یہ ہماری مشترکہ وراثت ہے۔

تقسیم ہند نے اس زبان کو گہرا صدمہ پہنچایا۔ مگر اس سے پہلے بھی اُردو پر ایک حملہ ہوا تھا۔ جب کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا تو جہاں ایک طرف اُردو کو فائدہ پہنچا وہاں دوسری طرف نقصان بھی ہوا۔ یہاں اردو اور ہندی کو دو شاخوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہ انگریزوں کی ایک چال تھی۔ جس کے نتیجہ میں پہلی بار اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دینے کی کوشش ہوئی لیکن یہ چال کامیاب نہ ہو سکی۔ اردو مشترکہ زبان ہی رہی جس کا ثبوت وہ سیکڑوں ہزاروں غیر مسلم اردو کے شاعر، ادیب، نقاد، صحافی اور دانشور ہیں جنھوں نے اردو کو فروغ دیا اور نام پیدا کیا۔

اُردو کے بہترین ناول نگار منشی پریم چند تھے۔ جدید افسانہ نگاری کے چار ستونوں (کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی) میں سے دو غیر مسلم تھے۔ میں یہاں صرف چند مشہور نام ہی گنواؤں گا جنھوں نے اردو ادب کو بڑھاوا دیا، اور اپنی ہمیشہ رہنے والی چھاپ اردو لٹریچر پر چھوڑ گئے۔ شاعروں میں فراقؔ گورکھپوری، بابائے اُردو پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، چکبست، تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد، جوشؔ ملسیانی، عرشؔ ملسیانی، ساحرؔ ہوشیارپوری، میلہ رام وفاؔ، پرشوتم لال ضیاؔ، کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ، نریش کمار شادؔ، وید راہی، آنند نرائن مُلّا، ہری چند اختر، آزاد گلاٹی، کشن پرساد شادؔ، رام پرکاش راہیؔ، راج نرائن رازؔ، پریم وار برٹنی۔ گوپی ناتھ امن۔ موہن راہی، کرشن گوپال مغموم۔ اندر جیت لال، کمار پاشی وغیرہ۔

ناول نگاروں، افسانہ نگاروں اور ڈراما نویسوں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، منشی پریم چند،

کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اُپندر ناتھ اشک، رام لال، پرکاش پنڈت، دیوندر ستیارتھی، مہندر ناتھ، بلونت سنگھ، ہنس راج رہبر، سریندر پرکاش، ہربنس سنگھ دوست، جوگندر پال، جیلانی بانو، رتن سنگھ، نریندر سنگھ، رام لعل، ریوتی سرن شرما، کشمیری لال ذاکر، ہرچرن چاولہ، رتن سنگھ، نریندر سنگھ بھاٹیا، نورسین، راما نند ساگر، گلشن نندہ، ساگر سرحدی، دیوندر اسّر، جوگندر پال، اتل شکر، راجندر کار شرما، نقادوں میں مالک رام، کالی داس گپتا رضا، گوپی چند نارنگ، کے کے کھلر، ڈاکٹر تارا چند رستوگی، پروفیسر گیان چند، سرینواس لاہوٹی، رام بابو سکسینہ، نند کشور وکرم، حکم چند نیّر۔

طنز نگاروں میں فکر تونسوی، کنہیا لال کپور، بھارت چند کھنّہ، دلیپ سنگھ، نریندر لوتھر صحافیوں میں منشی دیا نارائن نگم، جمنا داس اختر، میلہ رام وفا، تانک چند ناز، رام رکھا مل خوشتر گرامی، دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی، دیش بندھو گپتا، مہاشہ کرشن، مہاتما خوشحال چند، رنبیر، کے نریندر، سادھو سنگھ ہمدرد، پریتم ضیائی، لال چند پرارتھی چاند، دیوان سنگھ مفتون، چندن کے نام اس وقت دماغ میں آتے ہیں۔ اور ان گنت غیر مسلم ادیب وشاعر ہوئے ہیں اور اب بھی ہیں۔ جن کے نام یہاں گنوائے نہیں جا سکتے۔ لیکن جن کا اُردو ادب میں اپنا مقام ہے اور جنھوں نے یہ ثابت کیا کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جو مسلمان باہر سے آئے تھے وہ عربی، فارسی، ترکی بولنے والے تھے۔ لیکن جس ڈھانچے سے اُردو بنی وہ زبان یہاں پہلے ہی بولی جاتی تھی۔ اُردو ہندستان کی مُول بھاشا ہے۔ یہ کسی خاص طبقے کی نہیں ہے یہ پورے ہندستان کی ہے۔ یہ ہندی کی سگی بہن ہے۔ اُردو آسمان سے نہیں ٹپکی ہندستانی سماج سے اوپجی ہے۔ ایک بار اس پر تو شک ہو سکتا ہے کہ اردو پاکستان کی قومی زبان ہے کیونکہ چند مہاجر بستیوں کو چھوڑ کر یہ پاکستان کے کسی حصہ کے لوگوں کی مادری زبان یا روزمرہ کی بولی نہیں ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ہندستان کی ہے۔ ہندستان کا کوئی ایسا کونا نہیں ہے جہاں اُردو نہ ہو۔ اُردو تو ہندی سے اتنی گھلی ملی ہے کہ اس کی الگ پہچان صرف لکھاوٹ اور بعض الفاظ سے ہی کی جا سکتی ہے۔ اردو ہندی کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور ناخن اور گوشت کا رشتہ ہے۔ دونوں ایک ہی ماں کی جائی ہوئی جڑواں بہنیں ہیں۔ ابتدا میں دونوں کا نام (ہندی — ہندوی) بھی ایک تھا۔ منشی پریم چند نے ۱۹۳۴ء میں مدراس میں ہوئی ہندی پرچار سبھا کی کانفرنس میں اپنے خطبہ صدارت میں کہا تھا "...... میری ساری زندگی اردو کی خدمت کرتے گزری ہے۔ آج بھی جتنا اُردو میں لکھتا ہوں اتنا ہندی میں نہیں لکھتا اور کائستھ ہونے اور بچپن سے فارسی کا ابھیاس کرنے کے باعث اردو میرے لیے جتنی سوبھاوک (فطری) ہے اُتنی ہندی نہیں۔" اسی خطبہ میں وہ آگے چل کر کہتے ہیں۔" راشٹر بھاشا سے ہمارا کیا مطلب ہے۔ اس کے بارے میں بھی آپ سے چند الفاظ کہوں گا۔ اسے ہندی کہیے، ہندستانی

کہیے یا اردو کہیے۔ چیز ایک ہی ہے۔ نام سے ہماری کوئی بحث نہیں۔ زندہ بھاشا تو زندہ جسم کی طرح برابر بنتی رہتی ہے۔ شدھ ہندی تو نرر تھک (بے معنی) لفظ ہے۔ جب بھارت شدھ ہندو ہوتا تو اس کی بھاشا ہندی ہوتی۔ جب تک یہاں مسلمان، عیسائی، افغانی سبھی جاتیاں موجود ہیں ہماری بھاشا بھی ویاپک (ترقی پذیر) رہے گی۔"

ملک کی آزادی کے وقت اردو شمالی ہندستان میں انگریزی کے بعد سب سے اہم اور زیادہ استعمال ہونے والی زبان تھی۔ نچلی کچہریوں، ضلع اور تحصیل دفتروں، تھانوں اور پٹواریوں کے دفتروں میں صرف اردو ہی رائج تھی۔ ٹکنیکل الفاظ جیسے ربیع، خریف، تھانہ تھانیدار، حوالدار، مدعی، مدعا علیہ وکیل، مقدمہ، درخواست، دیوانی، فوجداری وغیرہ اردو کے الفاظ ابھی تک استعمال ہوتے ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں انبالہ چھاونی سے شائع ہونے والے انگریزی اخبار "دی ٹریبیون" میں پنڈت جواہرلال نہرو کا ایک مضمون قومی زبان کے بارے میں چھپا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ "میں یہ مضمون ملک کے وزیراعظم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عام شہری کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں۔ اس مضمون میں انھوں نے مختلف دلیلیں دے کر قومی زبان کے طور پر اُردو (ہندستانی) کو رومن رسم الخط میں قبول کرنے کی وکالت کی تھی۔ وہ اردو کے لیے رومن سکرپٹ کے حامی تھے لیکن مضمون کے آخر میں انھوں نے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ اگر عوام کو رومن لپی منظور نہ ہو تو دونوں سکرپٹ سے اُردو اور دیوناگری میں لکھا جانا چاہیے۔ مہاتما گاندھی کا بھی قومی زبان کے بارے میں تقریباً یہی نظریہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ قومی زبان عام فہم ہندستانی ہو جو دیوناگری اور اردو دونوں لپیوں میں لکھی جائے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اتنا کچھ اُردو کے حق میں ہونے کے باوجود آزادی کے بعد اپنے ہی ملک میں کیوں اسے بدیشی زبان یا ایک مخصوص طبقے کی زبان بنادیا گیا۔ کیا وجہ ہے کہ مولانا آزاد اور جواہرلال نہرو جیسے لوگ اس کے 'زوال' کو نہ روک سکے (گو کہ اس 'زوال' کو پوری طرح زوال نہیں کہا جاسکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسے اسکولوں اور کالجوں سے نکال دیا گیا۔ عدالتوں اور سرکاری دفتروں سے بھی خارج کر دیا گیا۔ اس کے لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد نہایت ہی کم ہوگئی ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ زیادہ تر ہندی فلموں کی زبان اُردو/ہندستانی ہوتی ہے۔ فلمی گانے تو پورے طور پر اردو میں ہی ہوتے ہیں اور یہ فلمیں ہندستان کے کونے کونے میں مقبول ہیں اور دیکھی جاتی ہیں) اس زبان کے اس "زوال" کی کیا وجہ ہے کیوں اس زبان کو اپنے ہی وطن میں جہاں یہ پیدا ہوئی اور پروان چڑھی، دیش نکالا دے دیا گیا ہے۔

ملک کے بٹوارے کے بہت ہی دُوررس نتائج ہوئے ہیں۔ لیکن بٹوارے کا سب سے زیادہ نقصان اُردو کو ہی ہوا ہے۔ اُردو کو یہ نقصان زیادہ تر اس کے نام

ہادبھی خواہوں اور اہلِ زبان نے ہی پہنچایا ہے جس طرح کچھ لوگ قیامِ پاکستان کے
لیے مسلم لیگ کے ساتھ ساتھ کانگرس کی پالیسیوں کو بھی ذمّے دار ٹھہراتے ہیں کہ صرف
سلم لیگ اور مسلم فرقہ پرست ہی پورے طور پر ملک کی تقسیم کے ذمّے دار نہیں ہیں۔
س کے لیے کچھ حد تک وہ لوگ بھی ذمّے دار ہیں جو فرقہ پرستی، دو قوموں کی تھیوری
ور مذہب کے نام پر ملک کی تقسیم کے خلاف لڑنے کا دعوا کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح
ردو کو محدود کرنے اور اسے صرف مسلمانوں کی زبان بنانے کی ذمہ داری پوری طرح
ینٹی اردو لابی یا ہندو فرقہ پرستوں پر نہیں ڈالی جاسکتی، مسلم لیگ والوں نے بھی اس کے لیے
وزوں حالات پیدا کیے تھے۔

اصلیت یہ ہے کہ پاکستان کا خیال انگریزوں کے دماغ کی اُپج ہے۔ وہ ہندوؤں
اور مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے دو اپوزٹ کیمپوں میں بانٹ دینا چاہتے تھے تاکہ وہ
ہمیشہ لڑتے رہیں اور انگریز ان کا فیصلہ کرتا رہے۔ اسی پالیسی کو DIVIDE & RULE کہا
جاتا تھا۔ پہلے پہلے انگریزوں نے کچھ مسلمانوں کو اس تصور کے حق میں کرلیا۔ یہ کہہ کر
کہ ہندستان میں مسلم اقلیت ہمیشہ ہندو اکثریت کے رحم وکرم پر رہے گی۔ کیونکہ جمہوریت میں
صرف ووٹ گنے جاتے ہیں اور اکثریت ہی حکومت کرتی ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو ایک
الگ ہوم لینڈ کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ جہاں مسلمان اکثریت میں ہوں اور خود اپنے حکمراں
ہوں۔ پہلے پہلے صرف چند مسلمان لیڈر ہی اس جھانسے میں آسکے۔ اور انھوں نے ۱۹۳۰ء کے
مسلم لیگ کے اجلاس میں پہلی بار پاکستان کا مطالبہ رکھا لیکن جناح صاحب اور ان کے ساتھیوں
نے اس کی مخالفت کی اور اس کے حق میں کچھ سپورٹ نہ مل سکی۔ اس کے بعد
مسلم لیگ کے ہر اجلاس میں پاکستان لابی والے اپنا مطالبہ پیش کرتے رہے لیکن
ناکام رہے۔ ۱۹۳۷ء کے پشاور اجلاس میں تو باقاعدہ ریزولیوشن لایا گیا لیکن اکثریت
نے اسے نامنظور کردیا اور اس مخالفت میں جناح صاحب اور اُن کے ساتھی پیش پیش
تھے لیکن تین سال بعد ۱۹۴۰ء کے مسلم لیگ کے لاہور اجلاس میں قیامِ پاکستان کا ریزولیوشن
خود جناح صاحب اور ان کے حامیوں نے پاس کروادیا اور قیامِ پاکستان مسلم لیگ
کا نصب العین قرار دیا گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۰ء کے بیچ ایسا کیا ہوا جس
سے مسلمان ہندو اکثریت سے اتنے بدظن ہوگئے کہ انھوں نے تقسیم ملک کے سوال پر اپنا
نظریہ بدل دیا۔ اس کے لیے کون ذمّہ دار ہے؟ اس کے بارے میں مختلف رائیں ہیں
جن کی تفصیل میں اس وقت میں جانا نہیں چاہتا۔ بالکل اسی طرح اردو کو محدود کرنے اور صرف
مسلمانوں کی زبان بنانے کی ذمّے داری صرف اینٹی اُردو لابی اور ہندو فرقہ پرستوں پر نہیں
ڈالی جاسکتی۔ اس کے لیے کافی حد تک مسلم لیگ والے خود ذمّے دار ہیں۔ اس کی طرف
پہلا قدم ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے وقت اُٹھایا گیا جب جناح صاحب اور مسلم لیگ نے
مختلف بیانوں اور پوسٹروں کے ذریعے سارے ملک میں مسلمانوں سے یہ اپیل کی تھی کہ وہ

مردم شماری کے فارم اس طرح بھروائیں — قوم۔ مسلمان، مذہب۔ اسلام مادری زبان۔ اُردو حالانکہ یہ سب جانتے ہیں صرف یوپی، بہار، دہلی وگردونواح، ریاست بھوپال، ریاست حیدرآباد کے کچھ حصوں، مرکزی ہندستان کے کچھ ضلعوں اور مرکزی ہندستان کی کچھ چھوٹی ریاستوں ہی کے مسلمانوں کی مادری زبان اردو تھی اور یہ صرف مسلمانوں کی ہی نہیں تھی، ساتھ ساتھ یہ ان علاقوں کے غیر مسلموں کی بھی مادری زبان تھی۔ پنجاب، سندھ، صوبہ سرحد، بلوچستان، بنگال، آسام، اُڑیسہ، گجرات، مہاراشٹر اور تمام جنوبی ہندستان (ریاست حیدرآباد کے کچھ حصوں کو چھوڑ کر) کے مسلمانوں کی مادری زبان اردو نہیں تھی۔ بھلے ہی وہ اُردو جانتے ہوں اور بول سکتے ہوں۔ لیکن ان لوگوں میں یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ مسلمانوں کی یکجہتی اور سیاسی حالات کا تقاضا ہے کہ تمام مسلمان اپنی مادری زبان اُردو لکھوائیں۔ اس پروپیگنڈے میں ان کو انگریزی حکومت کی پوری حمایت حاصل تھی۔ اس اپیل نے غیر مسلم فرقہ پرست عناصر کو موقع دیا کہ وہ اُردو پر صرف مسلمانوں کی زبان ہونے کا ٹھپہ لگا دیں اور اس وقت سے اُردو کے خلاف ایک سوچی سمجھی چال کے تحت مہم چلائی گئی۔ اس مہم کو آزادی سے پہلے کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی لیکن تقسیم ملک کے بعد اسے کافی کامیابی ملی۔ اور اس غلط فہمی کو مزید ہوا تب ملی جب اُردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیا گیا لیکن جیسا کہ سب جانتے ہیں مشرقی پاکستان کے مسلمانوں نے اس فیصلے کو قبول نہیں کیا۔ اور بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کی جہاں کچھ اور وجوہات بھی تھیں وہاں ایک بڑی وجہ بنگالی مسلمانوں کی اُردو سے بیزاری تھی اور یہ کم اہم وجہ نہیں تھی۔ خود مغربی پاکستان میں بھی وہ مسلمان جن کی مادری زبانیں سندھی، بلوچی یا پشتو وغیرہ ہیں اُردو سے زیادہ مانوس نہیں ہیں اور کبھی کبھی اُردو کی بالادستی کے خلاف آواز بھی اُٹھاتے ہیں۔ گو مغربی پنجاب میں اُردو کی زیادہ مخالفت نہیں ہے لیکن مہاجر بستیوں کو چھوڑ کر پاکستان کے کسی حصے کی بول چال کی زبان اُردو نہیں ہے۔

آزادی کے بعد اور تقسیم ملک کے وقت ہوئے فسادات کی وجہ سے اس مہم کو تقویت پہنچی اور پہلا قدم اُردو کو اسکولوں اور کالجوں سے نکالنا تھا۔ ۱۹۵۱ء میں سرکاری زبان کے قانون کے نفاذ کے بعد اُسے عدالتوں اور دفتروں سے بھی نکال دیا گیا۔ لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ اُردو سے اس کا حق چھن جانے کے خلاف کوئی بڑے پیمانے پر پروٹسٹ نہیں ہوا اور نہ ہی کوئی تحریک چلائی گئی۔ وہ مجاہدین آزادی جو آزادی کی لڑائی میں جان پر کھیل جانے کے لیے تیار تھے اُردو پر ہوتی بے انصافی پر خاموش رہے مسلمان تو شاید تقسیم اور اس کے بعد کے حالات سے شش STUNNED اور demoralise ہو گئے تھے۔ یا شاید GUILTY CONCIENCE بھی محسوس کرتے تھے کہ انھوں نے علاحدہ ہوم لینڈ کا مطالبہ کیا تھا۔ اس لیے خاموش رہے لیکن اُردو کے دوسرے ادیب اور دانشور بھی چُپ رہے۔ کہیں کہیں سے کسی فراق گورکھپوری

یا اُسی کی طرح کے چند گنے چنے لوگوں نے آواز اُٹھائی مگر ملک کے اس سیاسی ماحول اور فرقہ پرستی کے شور میں آواز دب کر رہ گئی۔ اور ایک سوچی سمجھی چال کے تحت اُردو کا دیش نکالا شروع ہوگیا۔

ایک اور بات جس پر مجھے حیرانی ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ عثمانیہ اُردو یونی ورسٹی کو مرکزی حکومت نے اپنی تحویل میں لے کر انگلش میڈیم یونی ورسٹی بنادیا لیکن کوئی پروٹسٹ نہیں ہوا۔ کسی وائس چانسلر، پروفیسر یا فیکلٹی ممبر نے پروٹسٹ کے طور پر استعفا نہیں دیا۔ سچ پوچھیے تو اس سے بھی کم اہم مسئلوں پر کئی یونی ورسٹیوں میں طلبہ کے پروٹسٹ ہوئے ہیں لیکن ایک یونی ورسٹی کا کردار بدل دیا گیا اور اُردو کے ساتھ اتنی بڑی بے انصافی ہوگئی اور طلبہ خاموش رہے۔ اگر تھوڑا بہت پروٹسٹ اس وقت ہوا بھی ہوگا تو اس کا نیشنل پریس میں کوئی ذکر نہیں ہوا۔ اور نیشنل پریس نے خود بھی ایک بے انصافی کے خلاف آواز نہ اُٹھا کر اپنی ڈیوٹی پوری نہیں کی۔ میرے خیال میں اگر پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے لوگ یہ قدم اُٹھاتے کہ عثمانیہ یونی ورسٹی کو مرکز کے تحت لے کر اس کا اُردو کردار برقرار رکھا جائے تو یہ آزاد ہندستان کی تاریخ کا بڑا کارنامہ ہوتا جس طرح انھوں نے علی گڑھ یونی ورسٹی کو فرقہ پرست سیاست سے بچایا تھا وہ عثمانیہ یونی ورسٹی کو بھی بچا سکتے تھے۔ مرکزی حکومت حیدرآباد میں ایک سنٹرل یونی ورسٹی انگلش میڈیم کی کھول سکتی تھی۔ ایک ہی کیوں ایک ہندی اور ایک انگلش دو یونی ورسٹیاں قائم کی جا سکتی تھیں اس طرح عثمانیہ یونی ورسٹی اُردو کے لیے محفوظ رہ جاتی۔

ابھی تک جو میں نے لکھا ہے وہ سب ماضی سے متعلق ہے۔ لیکن حال اور مستقبل کے لئے اردو کے تحفظ کے بارے میں کوئی ایکشن پلان بنانے کے لیے ماضی کا صحیح تجزیہ ضروری تھا۔

حال میں اُردو داں طبقہ میں دو طرح کے نظریے پائے جاتے ہیں ایک نظریہ تو یہ ہے کہ اُردو بھی فارسی کی طرح ہندستان میں ختم ہو رہی ہے اور آیندہ پچاس سال میں یا اس سے بھی پہلے یہ زبان محدود ہو کر رہ جائے گی کیونکہ ہندستان میں اُردو کا مستقبل تاریک ہے۔ اس نظریے والے دو طرح کے لوگ ہیں ایک تو وہ جو حضرت جوش ملیح آبادی اور ایسے ہی دوسرے لوگوں کی طرح اُردو کے مستقبل سے بالکل مایوس ہو کر پاکستان چلے گئے یا جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ پاکستان میں بھی اردو کا کچھ سنوار نہ سکے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو اُردو کے حال اور مستقبل سے بالکل مایوس ہوگئے ہیں اور دُکھی ہیں لیکن اپنے آپ کو بے بس ولاچار محسوس کرتے ہیں کہ وہ اُردو کے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔ میں ایسے ہی لوگوں سے مخاطب ہوں۔ فرض کیجیے ان کا نظریہ ٹھیک بھی ہو تو کیا وہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے اور اس مشترکہ تہذیبی ورثے کو محدود ہوتے خاموشی سے دیکھتے رہیں گے۔ کیا

اس زبان کو زندہ رکھنے کے لیے جدوجہد کرنا اُن کا فرض نہیں ہے۔ آنے والی نسلیں ان کے بارے میں کیا سوچیں گی۔ کامیابی ملے یا نہ ملے کم سے کم اتنا کہنے کے قابل تو وہ ہوسکیں ؎

فتح و شکست تو قسمت میں تھی دلے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

مجھے پوری اُمید ہے کہ جدوجہد کرنے سے کامیابی ضرور ملے گی۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ ماضی قریب میں اُردو کے جو مسائل تھے یا دشواریاں تھیں وہ اب ختم ہوتی جارہی ہیں اب ماحول سازگار ہے۔ اب بیشتر صوبوں میں اردو اکاڈمیاں قائم ہوگئی ہیں۔ عام اُردو داں حلقوں میں یہ سمجھا جارہا ہے کہ حکومت اردو کے لیے سنجیدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جا بجا اُردو اکاڈمیاں قائم ہوئی ہیں۔ یہ نظریہ بھی ٹھیک نہیں ہے اور حقائق سے آنکھیں بند کرنے کے مترادف ہے۔ جناب شمس کنول صاحب نے ان اکاڈمیوں کو اُردو کی سمادھیاں کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں (اداریہ کتاب نما جولائی ۱۹۹۲ء)
"یہ اچھا کام بھی ہمارے سیاست دانوں کے ہاتھوں انجام پایا ہے کہ انھوں نے اُردو کی چتا سے پھول چُنے ہیں اور ملک کی تقریباً سبھی ریاستوں میں اُردو اکاڈمی کے نام سے اُردو کی ایک سمادھی بنادی ہے۔" اسی مضمون میں آگے چل کر انھوں نے لکھا ہے۔
"۱۹۴۷ء سے پہلے اُردو کی ترقی کے نام پر ایسی بدعتوں کا کوئی رواج نہیں تھا۔ مگر تب اُردو زندہ تھی اور ہر خاص و عام کسی نہ کسی شکل میں اُردو زبان کو اپنا میڈیم بنائے ہوئے تھا۔" اردو اکاڈمیوں پر ریاستی سرکاریں کروڑوں روپے خرچ کر رہی ہیں۔ اس خرچ سے اردو کی کیا پیش رفت ہوئی ہے۔ جب سے اردو اکاڈمیاں قائم ہوئی ہیں۔ کتنے ہزار غیر اُردو دانوں کو پڑھنا لکھنا سکھایا گیا ہے۔ سیمیناروں اور مشاعروں سے تو اُردو کی ترویج و ترقی ممکن نہیں ہے۔ اس وقت اُردو کی پوزیشن کیا ہے۔ مرکزی حکومت اور ریاستی سرکاروں نے اُردو کو مسلمانوں کی زبان بنا کر محدود کر دیا ہے۔ کسی بھی ریاست یا مرکز میں اُردو کی کوئی سرکاری حیثیت باقی نہیں رہی ہے اور اگر ہے بھی تو سرکاری فائلوں تک محدود ہے۔ اُردو کتابیں اور اخبارات خریدنے والوں کی تعداد میں ہر روز کمی ہوتی جارہی ہے۔ پنجاب کے زیادہ تر اخبار ہندی اور پنجابی میں تبدیل ہوگئے ہیں۔ اور جو اُردو اخبار بچے ہیں ان کی سرکولیشن دن بدن کم ہوتی جارہی ہے۔ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی اُردو اخباروں اور رسالوں کا یہی حشر ہونے والا ہے۔ اُردو کی جنم بھومی دِلّی سے اُردو کا ایک پاپولر رسالہ شائع ہوتا تھا۔ بعد میں اس کا ہندی اڈیشن بھی شروع کیا گیا۔ لیکن کچھ سال ہوئے اُردو اڈیشن کو بند کرنا پڑا کیونکہ سرکولیشن بہت کم رہ گئی تھی۔ ماہنامہ شاہراہ بھی اسی وجہ سے بند ہوگیا۔ ملک کی آزادی کے وقت سارے پنجابی (مغربی پاکستان سے آئے ہوئے بھی اور مشرقی پنجاب میں رہنے والے بھی) اُردو جانتے

تھے اور اُردو اخبار ہی پڑھتے تھے۔ ساری سیاسی پارٹیوں کے اخبار اُردو میں ہی نکلتے تھے۔ زیادہ تر پنجابی بیوپاری صرف اُردو ہی جانتے تھے اور اپنا سارا کاروبار اسی زبان میں کرتے تھے۔ بڑی بڑی بیوپاری فرموں کے منیم بھی اُردو میں ہی کام کرتے تھے۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے وقت ہندی، پنجابی کا جھگڑا شروع ہوا تھا تو اس وقت پنڈت نہرو نے کہا تھا کہ "ہندی اور پنجابی کے حمایتیوں کا جھگڑا اُردو اخباروں کے ذریعہ ہو رہا ہے" اس وقت پنجاب میں ہندی پنجابی کے اخبار بہت کم تعداد میں تھے۔ نیز ہندی پنجابی پڑھنے والوں کی تعداد بھی کم تھی لیکن آہستہ آہستہ اُردو اخبار بند ہوتے گئے اور ۱۹۴۷ء کے بعد اسکول جانے والی نسل اردو سے بے بہرہ ہے۔ باقی ملک میں بھی ۱۹۴۷ء کے بعد اسکول جانے والی نسل اردو سے بے بہرہ ہے کیونکہ چند گنے چنے اُردو اسکولوں کو چھوڑ کر اُردو پڑھانے کا انتظام ہی اسکولوں میں نہیں ہے۔ دیہی علاقوں میں تو اُردو خط یا کوئی قدیم دستاویز پڑھانے کے لیے کسی مسجد کے مولوی کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔ آج کی نسل اُردو سے بے بہرہ ہوتی جا رہی ہے۔ یہ حقیقت ہے اور اس تلخ حقیقت سے آنکھیں بند کرنا اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔

ان دو نظریوں سے الگ میں ایک اور نظریہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ان گنت اُردو کے چاہنے والے انھی لائنوں پر سوچتے ہیں اور وقتاً فوقتاً مختلف رسالوں میں اپنے ان خیالات کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں۔ ایسے مجاہدوں کی کمی نہیں ہے جو اس مشترکہ ورثے کی زبان کو محدود نہیں ہونے دیں گے اور اس کے فروغ و بحالی کے لیے ہر ممکن کوشش و قربانی کریں گے۔ ایسے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کی ضرورت ہے اس کے لیے جدوجہد کرنی ہوگی۔ ہمارے ملک میں ہزاروں کی تعداد میں انجمنیں، ادارے، سوسائٹیاں اور جماعتیں کام کر رہی ہیں۔ جو اپنے طریقے سے اُردو کے لیے کچھ نہ کچھ خدمت انجام دے رہی ہیں۔ لیکن اُردو کے نام پر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے یا ایک طاقتور آواز بننے کی کوشش آج تک نہیں ہو سکی ہے۔ کیوں نہ ملک گیر سطح پر ایک غیر سیاسی جماعت کی تشکیل کی جائے۔ جس میں انفرادی ممبرشپ کے ساتھ ساتھ یہ جماعتیں بھی شامل کر لی جائیں۔ اُردو سے پیار کرنے والے سب لوگوں کو اس میں شامل ہونے کی دعوت دی جائے۔ اس جماعت کا صرف ایک پوائنٹ پروگرام ہو۔ (ایک سُوتر یہ کاریہ کرم) ONE POINT PROGRAMME کہ اُردو کو ہندستان میں اس کا جائز حق دلانا ہے۔ اس کے لیے سب سے پہلا قدم اُردو کو یوپی، بہار، دہلی، ہریانہ، پنجاب، مدھیہ پردیش، راجستھان اور آندھرا پردیش میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانا ہوگا۔ صرف کاغذات میں نہیں بلکہ عملی طور پر تمام سیکولر پارٹیوں نے الیکشن کے وقت یہ وعدہ کیا تھا۔ اور یہ اُن کے الیکشن مینوفیسٹو میں بھی ہے۔ اس وعدہ کو پورا کرانے کے لیے جدوجہد کرنی ہوگی۔ اور سیاسی پارٹیوں کو مجبور کرنا ہوگا کہ وہ اپنا

وعدہ پورا کریں۔ لیکن اس سے بھی پہلے ایک اور کام کرنا نہایت ضروری ہے اس بات کا PUBLIC OPINION بنانا ہوگا اور عام لوگوں کو یقین دلانا ہوگا کہ اُردو والے ہندی اور علاقائی زبانوں کے خلاف نہیں ہیں۔ ہندی کو اُردو والوں نے کبھی حقارت سے نہیں دیکھا۔ اس کے حق میں ہمیشہ آوازیں اٹھائیں لیکن کچھ ہندی والے اُردو کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہندی کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے اور اُسے قومی زبان کی تمام مراعات دی ہوئی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ملک میں خاص کر جنوبی ہندستان میں ہندی مخالف رویہ نے شدت اختیار کر رکھی ہے (اس میں اردو والے شامل نہیں ہیں) علاقائی زبانوں کی اہمیت سے تو کسی کو بھی انکار نہیں۔ لیکن اس حقیقت سے کیوں انحراف کیا جاتا ہے کہ علاقائی زبانوں کے بولنے والوں کی بڑی تعداد کے بعد اُردو کا ہی نمبر آتا ہے۔ ہم کو ہندی والوں اور علاقائی زبان والوں کو یہ یقین دلانا ہے کہ اُردو والے علاقائی زبانوں یا ہندی کی جگہ اُردو کو نہیں دلوانا چاہتے۔ ہندی ہندستان کی قومی زبان مان لی گئی ہے اور علاقائی زبانوں کو بھی اپنے اپنے علاقوں میں سرکاری زبانوں کا درجہ حاصل ہے۔ ہمارا مطالبہ تو صرف اتنا ہے کہ اُردو کو "دوسری سرکاری زبان" کا درجہ دیا جائے۔ اس کے منظور ہونے سے اُردو کسی بھی طرح ہندی یا علاقائی زبانوں کے لیے خطرہ نہیں ثابت ہوسکتی۔ یہ صحیح ہے کہ اُردو زبان کا ادب اور شاعری دوسری زبانوں کے بولنے والوں کے لیے بے پناہ کشش رکھتے ہیں لیکن یہ دوسری زبانوں کی جگہ نہیں لے گی۔ ہاں یہ سارے ہندستان کی رابطے کی زبان بن سکتی ہے اور اس میں رابطے کی زبان بننے کا تاریخی و لسانی وصف بھی ہے لیکن یہ کسی زبان کے لیے خطرہ نہیں بن سکتی۔

اُردو والوں کو ایک اور بات کا بھی دھیان رکھنا ہوگا۔ سرکاری اداروں اور اُردو اکاڈمیوں سے مدد لینے میں کوئی ہرج نہیں۔ لیکن ان کے ساتھ جڑے ایسے اشخاص سے ہوشیار رہنا ہوگا جو اپنی زبان کے لیے بہت کچھ کر سکتے تھے لیکن خود غرضی موقع پرستی اور اپنے ذاتی مفاد کی خاطر انھوں نے اُردو کے لیے کچھ نہیں کیا۔ وہ اُردو کو محض اپنے سیاسی مفاد کے لیے استعمال کرتے رہے۔ یہ لوگ اپنی زبان کے خلاف ہو رہی زیادتیوں کے بارے میں کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ دھیان رکھنا پڑے گا کہ یہ لوگ پھر ہماری جماعت کی لیڈرشپ بھی نہ ہتھیالیں۔ دیانت دار اور مخلص لوگوں کو ہی آگے لانا ہوگا۔ ایک بار اُردو ریاستوں کی دوسری زبان بن جاتی ہے تو باقی مسئلے خود بخود حل ہوجائیں گے۔ جناب شمس کنول کے الفاظ میں: "اُردو جب روزی روٹی سے جُڑ جائے گی تو ہر رمضانی اور فقیر چند کسی کے کہے بغیر اور کسی اکاڈمی کی مدد کے بغیر خود ہی اُردو سیکھنے کی کوشش کرے گا۔"

جب سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر میں اُردو کا چلن شروع ہو جائے گا اور اُردو داں حضرات کو ان میں نوکری ملنی شروع ہو جائے گی تو یہ زبان معاشی تحفظ بھی دے سکے گی اور آپ کو عام آدمی کے اس سوال کا جواب نہیں دینا پڑے گا کہ اُردو پڑھیں گے تو

نوکری کہاں سے ملے گی۔ جب اُردو والوں کو نوکری کے لیے نظرانداز نہیں کیا جائے گا تب خود بخود اسکولوں کالجوں میں اُردو پڑھانے کا انتظام ہو جائے گا۔ تب آپ تحریک چلا سکتے ہیں کہ اپنے نام اور پتے خطوط پر اُردو میں لکھیں۔ بنکوں میں اُردو میں لکھے گئے چیک اور دستخط شدہ چیک اور اُردو میں درخواستیں قبول ہوں۔ انکم ٹیکس سیلز ٹیکس دفتروں وغیرہ میں بھی اُردو کا فروغ ہو۔ مگر اس کے لیے مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے PUBLIC OPINION بنانا پڑے گا۔ ایک بار ایک زبان ذریعہ معاش سے جڑتی ہے تو لوگ اسے خود بخود پڑھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اور مثال دینا چاہتا ہوں۔ ہندی ہماری راشٹریہ بھاشا ہے اور گورنمنٹ اس کے لیے بہت کچھ کر رہی ہے۔ پھر بھی لوگ اپنے بچوں کو ہندی میڈیم اسکولوں کے بجائے انگلش میڈیم اسکولوں میں بھیجنا پسند کرتے ہیں حالانکہ وہاں خرچ زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اعلا تعلیم اور نوکری کی مارکیٹ میں انگلش کا زیادہ سکوپ ہے۔ ہندی میڈیم اسکولوں میں وہی بچے پڑھتے ہیں جن کے والدین انگلش میڈیم اسکولوں کا خرچ نہیں برداشت کر سکتے۔ جو سیاسی لیڈر "انگریزی ہٹاؤ" مہم کے سلسلے میں بڑے بڑے بھاشن دیتے ہیں وہ بھی اپنے بچوں کو انگلش میڈیم اسکولوں ہی میں بھیجتے ہیں۔ چند سال پہلے ایک جرنلسٹ نے اس بارے میں تحقیقات کی تھی تو یہ پتا چلا تھا کہ دہلی میں رہنے والے سب بڑے بڑے نیتاؤں (ہندی چیمپئن بھارتیہ جن سنگھ کے لیڈروں سمیت) وزیروں، پارلیمنٹ، میٹرو پالیٹن کونسل اور کارپوریشن کے ممبروں اور سب بڑے بڑے افسروں کے بچے انگلش میڈیم اسکولوں میں ہی پڑھتے تھے۔ (صرف مادھو لیمائے ممبر پارلیمنٹ ہی ایک سیاسی لیڈر تھے جن کے لڑکے مراٹھی میڈیم اسکول میں پڑھتے تھے) ہندستان کے کسی بڑے شہر میں چلے جاؤ۔ آپ کو انگلش میڈیم اسکولوں کے اشتہار شہر کے کونے کونے میں نظر آئیں گے۔

اس لیے ہمارا ایک پوائنٹ فارمولا اُردو کے لیے یہی ہے کہ اسے دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانا ہے اور اس کے لیے ہر ممکن قربانی دینی پڑے گی اور ہم ایک بار پھر یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اُردو ہندی یا کسی دوسری علاقائی زبان کی جگہ نہیں لے گی اور کسی زبان کے لیے خطرہ ثابت نہیں ہوگی۔ ہم تو اُردو کے لیے اس کی اپنی مخصوص پوزیشن کا تحفظ چاہتے ہیں۔ اور ساری قومی زبانوں کی ترقی میں تعاون دینا چاہتے ہیں۔ اُردو کی ترقی باقی سب زبانوں کی ترقی میں معاون ثابت ہوگی۔ جیسا کہ مجاہد آزادی آنجہانی پنڈت سندر لال ہمیشہ کہا کرتے تھے "میرے ہاں زبانیں لڑتی نہیں ہیں۔"

اس ۱۸ر ستمبر کو کانپور میں اقلیتی کمیشن کی ایک میٹنگ میں شری ارجن سنگھ مرکزی وزیر ہیومن ریسورسز ڈیولپمنٹ HUMAN RESOURCE DEVELOPMENT نے اعلان

کیا ہے کہ مرکزی حکومت نے ایک اُردو یونی ورسٹی قائم کرنے کی منظوری دے دی ہے۔ گویہ اُردو کے مسئلہ کا حل نہیں ہے پھر بھی ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ اس فیصلے کا بھی وہی حشر نہیں ہوگا جو اُردو کو مراعات دینے والے پہلے فیصلوں کا ہوا ہے اور یہ صرف سرکاری فائلوں تک ہی محدود نہیں رہ جائے گا۔

احتساب

رفعت سروش
۲-بی۔ پاکٹ سی سدھارتھ
ایکسٹینشن نئی دہلی ۱۴

گنو وہ سر جو اُتارے ہیں تم نے جسموں سے
گنو وہ ہاتھ جو کاٹے ہیں تم نے شانوں سے
گنو وہ پاؤں جو چلنے سے ہو گئے مجبور
گنو وہ دل کہ اُتاری ہیں گولیاں جن میں
گنو وہ بچے یتیمی اڑھائی ہے جن کو
گنو وہ چوڑیاں جو بیوگی نے توڑی ہیں
گنو وہ حُرمتیں لوٹا ہے جن کی عصمت کو
گنو وہ گھر جو جلائے ہیں تم نے نفرت سے
گنو وہ گاؤں جہاں بھوک تم نے بوئی ہے
گنو وہ شہر بنائے گئے ہیں جو مقتل
گنو وہ لاشیں جو زندہ ہیں اب بھی سولی پر
گنو وہ مسجدیں مسمار کر دیا جن کو
گنو وہ مورتیاں جن کو توڑ ڈالا ہے
گنو۔ حساب رکھو اپنے سب گناہوں کا

نہ تم ہو سچے مسلماں، نہ سچے ہندو تم
تم ایک داغ ہو انسانیت کے ماتھے پر

یہ رات فرقہ پرستی کی رات ہے جس میں
تعصبات کا زہر اب پی رہے ہو تم
نشے میں رقص بہیمانہ کر رہے ہو تم

مگر یہ رات کٹے گی، وہ دن بھی آئے گا
کہ تم کو دینا پڑے گا ہر اک گناہ کا حساب
عذاب سہنا ہے تم کو اسی جہنم میں
ابھی مرا نہیں انسان، اس کی سچائی
خدا کی آنکھ میں انصاف کی ہے بینائی

بچوں کی مذہبی کتابیں

کتاب	قیمت
خوب سیرت (دوم) حکیم محمد سعید	۴/
امت کی مائیں	۴/۵۰
اچھی باتیں	۴/۵۰
بچوں کے سلطان جیؒ	۴/:
بزرگان دین	۴/:
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیاں	۴/۵۰
خوب سیرت ۱	۶/-
رحمان کا مہمان	۶/-
کمسن صحابی	۵/-
اسلام کے جاں نثار	۴/-
سیرت پاک مختصر مختصر	۳/-
نور کے پھول	۹/-
حضرت حمزہؓ	۳/:
سب سے بڑے انسانؐ	۳/۵۰
حضرت محبوب الٰہیؒ	۳/:
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ	۲/:
حضرت فریدالدین گنج شکرؒ	۲/:
حضرت معین الدین چشتیؒ	۲/:
حضرت ابوبکر صدیقؓ	۶/:
حضرت طلحہؓ	۳/:
حضرت سلمان فارسیؓ	۳/۵۰
حضرت ابوذر غفاریؓ	۳/:
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	۳/:
حضرت عبداللہ بن عباسؓ	۳/:
نیک بیٹیاں	۳/۵۰
امیر خسروؒ	۴/:
ہمارے نبیؐ	۳/۵۰
دس جنتی	۴/۵۰
منہاج القرآن	۴/۵۰
ارکانِ اسلام	۲/-
عقائدِ اسلام	۳/-
چار یار	۴/-
آں حضرتؐ	۳/:
خلفائے اربعہ	۹/-
نبیوں کے قصے	۶/۵
مسلمان بیبیاں	۴/:
اسلام کیسے پھیلا اوّل۔ دوم	۵۰/۴/ ۶/
پیارے رسولؐ	۴/۵۰
ہمارے رسولؐ	۶/-
حضرت ابوہریرہؓ	۴/-
سرکار دو عالمؐ	۹/-
اللہ کے صفی	۲/:
حضرت نظام الدینؒ	۳/:
سرکار کا دربار	۶/۵۰
ہمارا دین (اوّل، دوم، سوم) فی حصہ	۴/۵۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار (اوّل، دوم) مکمل	۸/-
اسلام کے مشہور امیر البحر	۴/۵۰
قرآن پاک کیا ہے؟	۳/:
اسلام کیسے شروع ہوا؟	۴/
رسول پاکؐ	۶/:
اللہ کا گھر	۳/۵۰
رسول پاک کے اخلاق	۳/:
اللہ کے خلیل	۳/:
تحسین القرآن	۳/۵۰
حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ	۳/:

سید حامد
چیرمین ہمدرد فاؤنڈیشن
ہمدرد نگر۔ نئی دہلی

ایودھیا کے بعد کیا؟

۶ دسمبر کو جو قیامت برپا ہوئی اس نے ہندستان کو ہلا ڈالا اور مسلمانوں کے سکون، ان کی سلامتی اور ان کے حقوق کو تہس نہس کر دیا۔ مسلمانوں کو اپنی اوقات معلوم ہوگئی، وہ سوچنے لگے کیا اپنے وطن میں ہم عزّت کے ساتھ رہ سکیں گے۔ کیا یہاں ہم آزادی کا سانس لے سکیں گے کیا ہمیں عبادت کی اجازت ہوگی، کیا ہمارے مذہب، ثقافت اور روایات بالآخر محفوظ رہ سکیں گی۔ یا جس طرح ان کی مسجد منہدم کی گئی ہے اسی طرح وہ سب کچھ جو انھیں عزیز ہے، جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں، مسمار کر دیا جائے گا۔ کیا تعداد کو قانون پر بالادستی حاصل ہوگئی ہے؟ کیا اکثریت کو یہ اختیار ہے کہ وہ اقلیت کو روندتی چلی جائے۔ آئین کو بالائے طاق رکھے، قانون کی دھجیاں بکھیر دے، عدالتوں کی حکم عدولی برملا اور علی الاعلان کرے۔ کیا ہندستان کے ہر باشندے کو ہندویت (ہندتو) کے آگے سر بہ سجود ہونا پڑے گا کیا اس ملک میں حکومت جمہور کی نہیں ہے، اکثریت کی ہے، اور اقلیتیں اکثریت کی رعایا ہیں اور ان کے رحم وکرم پر یہاں زندگی گزار رہی ہیں۔ کیا رواداری کی پرمپرا ایک سراب ہے، کیا سیکولرزم کا دعوا ایک فریب ہے۔ کیا ہندستان ایک دھارمک ریاست ہے جہاں ہندو دھرم کو فضیلت حاصل ہے اور باقی سب دھرم ریاست کے دھرم کے تابع فرمان ہیں؟ کیا مساوات کے یہ سارے دعوے باطل ہیں؟ کیا جمہوریت کا ایوان دھوکے کی ٹٹی ہے؟

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب   تو سمجھتا ہے کہ آزادی کی ہے نیلم پری

بابری مسجد کیا شہید ہوئی، مسلمانوں کے دل ٹوٹ گئے، پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ جگناتھ آزاد کہنے لگے ہم آپ کو مُنہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔ مسلمان سرنگوں ہیں ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اب سر اٹھا کر کیسے چلیں گے، وہ خدا کے گھر کی حفاظت نہ کر سکے، وہ نامراد اب کس لیے جئیں گے۔ ان کے سینے کھوکھلے ہوگئے ہیں۔ جن سے رہا نہیں گیا وہ کفن باندھ کر سڑکوں میں آگئے اور نہ معلوم کتنوں نے جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ جن میں نکلنے کا یارا نہ تھا وہ کڑھ رہے ہیں سُلگ رہے ہیں خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ مسجد کو روئیں کہ شہیدوں کو۔ (شہید دونوں ہی ہوئے)

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

لوگ کہیں گے کہ مسلمان تنہا نہیں ہیں، وہ بے یار و مددگار نہیں ہیں، ان کے ہم وطن ان کے ساتھ ہیں۔ یہ شکست مسلمانوں کی، ان کے مذہب کی شکست نہیں ہے۔ یہ شکست اعلا انسانی قدروں کی شکست ہے، جمہوریت اور سیکولرزم اور مساوات اور انصاف کی شکست ہے۔ بی جے پی، وشو ہندو پریشد اور آر ایس ایس کا ہندستان پر کوئی اجارہ نہیں۔ سیاسی پارٹیوں کو دیکھیے تو بھاجپا کے علاوہ ساری پارٹیاں کل کے اتیاچار سے تلملا اٹھی ہیں، وہ مظلوم اقلیت کا ساتھ دینے پر تلی ہوئی ہیں، انھیں فکر ہے کہیں ہندستان جمہوری اور سیکولر قدروں کو ترک نہ کر دے، یہاں دھرم ماندلا کا بول بالا نہ ہو جائے یہاں مذہبی ریاست وجود میں نہ آ جائے۔ زخم خوردہ مسلمان جو خاک چاٹ رہے ہیں یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بھاجپا کو چھوڑ کر سارا ہندستان ان کا ہمدرد اور غمگسار ہے، اور یہ کوئی چھوٹی بات نہیں۔ لیکن وہ ایک بات بھول رہے ہیں۔ بھاجپا کے پاس "کارڈ" ہے، منصوبہ ہے، پروگرام ہے، اور یہ جذبہ ہے کہ سارے ہندستان کو ہندو رنگ میں رنگ دیا جائے اور جو یہ رنگ قبول کرنے سے انکار کرے اُسے نکال باہر کیا جائے۔ اب یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ آر ایس ایس اور بی جے پی کا اثر شہروں تک محدود ہے اور دیہات انتہا پسندی کے زہر سے پاک ہیں۔ یہ زہر تو ہندستان بھر میں پھیل گیا ہے، ایک بڑی کثیر تعداد کی رگِ جاں میں پیوست ہو گیا ہے۔ اکثریت کے بیشتر افراد، چاہے وہ شہر میں رہتے ہوں چاہے دیہات میں، وہی سوچتے ہیں جو بھاجپا چاہتی ہے۔ یاتراؤں نے اور سادھوؤں نے پورے ملک کی فضا کو مسموم کر دیا ہے۔ راجستھان اور جنوبی ہند کی ریاستیں فرقہ پرستی سے پاک تھیں، آر ایس ایس کی کوششوں کی بدولت اکثریتی فرقہ پرستی کا چلن وہاں بھی ہو گیا ہے دوسری سیاسی پارٹیوں نے جہاں تک تنظیم، توسیع اور تبلیغ کا تعلق ہے بھاجپا کو ایک عرصہ واک اوور دے رکھا ہے۔ مسلمانوں کو دوسری پارٹیوں کے مثبت ردِ عمل کی پذیرائی ضرور کرنی چاہیے لیکن ایک پل کے لیے بھی یہ سوچنا مہلک ہوگا کہ یہ پارٹیاں مل کر بھی بی جے پی کا مقابلہ کر سکتی ہیں، یا یہ آڑے وقت میں مسلمانوں کا دفاع یا ان کی دستگیری کے لیے کمر کس پائیں گی۔ بی جے پی کو ہندوؤں کی اکثریت زبان سے یا دل سے اپنا ترجمان مانتی ہے۔ ساری پارٹیاں سالوں سے یہ دیکھ رہی تھیں کہ بھاجپا اور اس کی ہم رنگ جماعتیں روشنی کو پسپا اور ذہنوں کو مسموم کر رہی ہیں، شاکھاؤں، یاتراؤں، تحریروں، تقریروں اور کیسٹوں کے ذریعے مسلمان بھی یہ دیکھ رہے تھے لیکن نہ ان سیاسی پارٹیوں نے، نہ خود مسلمانوں نے ہندو انتہا پسندی کی روک تھام کا کوئی سر و سامان کیا۔ زہر بھرے پروپیگنڈے اور نفرت بھرے دروغ کا جواب دینے، اس کا ازالہ کرنے کی کوئی کوشش بھی کسی نے نہیں کی۔ جمہوریت آزادیِ رائے، سیکولرزم، رواداری اور احترامِ عقائد و مذاہب کے خلاف ہندو عوام کی عدالت میں فیصلہ یک طرفہ کر دیا گیا۔ بنی نوع انسان نے جب سے اینٹیں ایجاد کیں اور شہر بسائے اینٹیں

آبادی کے ہی کام آتی رہیں، بربادی کے کام کبھی نہیں آئیں، لیکن وشو ہندو پریشد اور بھاجپا نے اینٹوں کے طریق استعمال کو بالکل الٹ دیا۔ شلانیاس یعنی بظاہر رام مندر کے تعمیر کے لیے ہندستان بھر سے پوجی ہوئی اینٹوں کو ایودھیا میں جمع کیا گیا۔ یہ ساری تیاریاں بابری مسجد کی اینٹ سے اینٹ بجانے اور اسے منہدم کرنے کے لیے تھیں۔

صفائی کے طور پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ "یہ سب کچھ بی جے پی کے ارادوں اور منصوبہ کے خلاف اچانک عمل میں آ گیا، دیکھیے شری کلیان سنگھ نے فوراً استعفیٰ دے دیا۔ اور بی جے پی کے سب سے بڑے رہنما شری اڈوانی ایوان میں حزب مخالف کی لیڈری سے مستعفی ہو گئے۔" سوچیے ان دکھاوٹی استعفوں کی اہمیت ہی کیا ہے۔ یہ تو کام کو انجام دینے کے بعد کرکھول دینے کا سا انداز ہے۔ ابھی رات گئے دوردرشن میں اس مسئلے پر گفت گو کے دوران ڈاکٹر حبیب سنگھ نے جو ہندی کے ایک ممتاز مصنف اور ممبر ہیں پینل کے ایک دوسرے رکن سے کہا کہ "پچھتاوے اور پشیمانی کی حکایت کو زیادہ نہ بڑھائیے۔ اگر یہ صاحبان واقعی پشیماں ہیں تو انھیں اجتماعی طور پر اس کا اظہار کرنا چاہیے اور مسلمانوں سے معافی مانگنی چاہیے۔ آپریشن بلیو اسٹار کے بعد اگر سکھوں سے معافی مانگ لی جاتی تو پنجاب کی کیفیت آج بالکل مختلف ہوتی۔ بھاجپا کی منفعل قیادت مسجد کو اسی جگہ پر بنانے کی ذمّے داری کیوں نہیں لیتی؟" ڈاکٹر حبیب سنگھ کی بات سے یہ اندازہ لگائیے کہ ہندستان میں اقلیتیں خود کو غیر محفوظ سمجھ رہی ہیں، باوجود اس کے کہ یہ گوتم بُدھ اور گاندھی کا ملک ہے اور اہنسا یہاں کی پرمپرا ہے۔ ہندوؤں کو اور ارباب اقتدار کو ٹھنڈے دل کے ساتھ اس صورتِ حالات پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ اپنی پیٹھ ہم ہندستانی ایک عرصہ سے ٹھونکتے چلے آئے ہیں، اب وقت آ گیا ہے گریبان میں مُنہ ڈالنے اور دل کو ٹٹولنے کا۔ رواداری کی روایت کا ذکر کرکے (جو اب متروک ہو چکی ہے)، ہم خود کو دھوکا دے سکتے ہیں دوسروں کو مطمئن نہیں کر سکتے۔ ان کی نگاہ میں تو یہ زخموں پر نمک پاشی کا عمل ہے۔

ہندوؤں کی انتہا پسند جماعتوں کے بعد اس شرمناک حادثہ، اس راکشسی فعل کی ذمّے داری سرکار پر جاتی ہے۔ اپنے ارد گرد نظر ڈالیے جو شخص فیصلہ نہ کر سکے، جو وعدوں پر ٹالتا رہے، کیا سماج میں اس کی کوئی ساکھ بن پاتی ہے؟ لوگ اُسے ڈھلمل یقین، کمزور اور بے ریڑھیا سمجھتے ہیں۔ خواہ ایسا شخص کتنا ہی عالم فاضل و ودوان ہو کوئی اُسے گر دانتا ہی نہیں، نہ کسی اجتماعی کام میں اسے شریک کرتا ہے۔ جب افراد کا یہ حال ہو تو کیا ایسی حکومت کی ذرّہ برابر بھی ساکھ ہو گی جو ٹال مٹول کرتی رہے، فیصلہ سے جی چرائے اور یہ سوچا کرے کہ وقت خود مسائل کو حل کر دے گا۔ ایودھیا کے سلسلہ میں ہماری حکومت نے یہی کیا۔ شخصی اور اجتماعی مذاکرات کا جال بچھا دیا گیا۔ گویا مذاکرات سے لوگ تھک جائیں گے تو اپنے موقف میں نرمی لے آئیں گے یا اُسے سرے سے ترک ہی کر دیں گے، اس طرح یہ سمسیا حل ہو جائے گی۔ ہمارے اربابِ اختیار کو یہ چھوٹی سی بات بھی نہیں معلوم

کہ حکومتیں محکم فیصلوں اور جرأت مندانہ اقدامات اور دلیر قیادت سے چلا کرتی ہیں التوا اور معاملات کو کھٹائی میں ڈالنے سے نہیں چلتیں۔ ہندستان جیسا عظیم اور وسیع اور گوناگوں اور پیچیدہ ملک تقاضا کرتا ہے ایک براق ذہن اور ایک جرأت پیشہ دل اور ایک پیش رفت آمادہ نقطۂ نظر کا۔ گھوڑا سوار کو پہچانتا ہے۔ بھاجپا نے اندازہ لگا لیا تھا کہ سوار میں کتنا دم ہے۔ اس کے گھٹنوں میں کتنی گرفت ہے چنانچہ اوّلین فرصت میں اس نے اسے دے پٹکا اور اس کے ماتھے پر ناتوانی اور بے عملی کا کلنک لگا دیا۔ ہمارے اکابرین اور دانشور مشورہ دینے کے لیے جاتے تھے اور حکمتِ عملی کے قصیدے پڑھ کر چلے آتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ابھی تک ہم بادشاہوں اور مہاراجاؤں کے دور میں ہیں اور اس ملک کو جمہوریت کی ہوا بھی نہیں لگی۔ خود کابینہ کا بھی یہی حال ہے وہاں بھی لوگ صدر کا رُخ دیکھتے ہیں، برملا اختلاف رائے کی جہاں بغاوت سے کی جاتی ہو وہاں مسئلہ کے بیشتر رُخ ڈھکے چھپے رہتے ہیں، ان پر سے پردہ اُٹھانا جسارتِ بیجا ہے اور اس کا مرتکب گردن زنی۔ عافیت اسی میں ہے کہ اپنی رائے کو سربراہ کی رائے کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرو۔ وہ بھی خوش تم بھی خوش۔

ایودھیا کانڈ پر جو بیانات نکلے ان میں سب سے درد بھرا بیان صدر جمہوریہ کا تھا۔ سارے اختلاف اور سیاسی مصالح سے بالاتر۔ لگتا تھا کہ دل پر چوٹ لگی ہے۔ ہر لفظ میں درد کی کراہ تھی۔ اتفاق ہے کہ دوسرا قابلِ ذکر واحترام بیان نائب صدر کا تھا جو انھوں نے راجیہ سبھا میں دیا۔ انھوں نے کہا کہ "آزادی کے بعد ملک میں دو بڑے سانحے ہوئے، ایک گاندھی جی کی شہادت، دوسرا بابری مسجد کا شہید ہونا۔" گاندھی کی شہادت نے نفرت اور ظلمت کی اُمڈتی ہوئی فوجوں کو شکست دے کر پیچھے دھکیل دیا تھا، کیا بابری مسجد کی شہادت کا بھی کچھ ایسا ہی اثر ہوگا؟ رجائیت کہتی ہے، ہاں، قنوطیت کہتی ہے، نہیں۔ سوال یہ ہے کہ پشیمانی پوری قوم کو ہے یا چند لیڈروں اور دانشوروں کو۔ فتح اور خوشی کے جشن تو کئی جگہ منائے گئے۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ جن شہروں میں ردِّ عمل نے ہنسا کی شکل اختیار کی وہاں اس کا نقطۂ آغاز فاتحانہ طنز رہا ہوگا۔ لیکن قیاس بھی کیوں کیا جائے۔ یہ بات کم دُکھ کی نہیں کہ ایک دن کے اندر مختلف شہروں میں کم سے کم دو سو انسان خاک و خوں میں تڑپتے نظر آرہے ہیں۔ ان کے گھروں میں ماتم کی صفیں بچھی ہوئی ہیں یہ لوگ خاندانوں کے سربراہ تھے یا ان کے چشم و چراغ۔ ان کے گھر اُجڑ گئے، بے چراغ ہو گئے۔ نفرت اور عداوت کا جو بیج بھاجپا، وشوہندو پریشد اور آر ایس ایس نے بویا تھا اس کی فصل ہم سب کاٹ رہے ہیں اور نہ جانے کب تک کاٹتے رہیں گے۔

صبح کا بھولا اگر شام کو گھر واپس آجائے تو اُسے بھولا نہیں کہتے۔ ابھی دور درشن نے بتایا کہ حکومت نے جفا سے توبہ کر لی اور اہم فیصلے کر لیے۔ مسجد اُسی جگہ پر پھر بنائی جائے گی مجرموں کو سزا ملے گی۔ فرقہ پرست پارٹیوں پر قدغن لگے گی۔ مندر کی تعمیر کے بارے میں فیصلا جلد کیا جائے گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ نفاذ کتنی جلد اور کس طرح ہوتا ہے۔

یہ تو سب تمہید ہی تمہید تھی۔ بات جو کہنے کی تھی وہ یہ ہے کہ، مسلمانوں کو چاہیے کہ اس بڑے سانحہ سے عبرت کے تازیانے کا کام لیں۔ اس موقع پر بلکہ گذشتہ ڈیڑھ دو سال سے ان کی قیادت نے ہوش و گوش اور صبر و ضبط سے کام لیا ہے۔ لیکن کچھ کر کے اب بھی نہیں دکھایا۔ جب تک کہ وہ شہر شہر جاکر مسلمانوں کو نظم و نسق کا سبق نہیں دیتی، انھیں یہ نہیں سمجھاتی کہ اچانک مشتعل ہو جانے سے کام نہیں چلتا، نقصان ہی نقصان ہوتا ہے۔ ہمیں تعمیر اور تنظیم ہی کے لیے خود کو وقف کر دینا چاہیے۔ تعلیم کی طرف سے جو غفلت ہم نے برتی ہے وہ ہمیں بہت مہنگی پڑی ہے، جب تک کہ ہماری قیادت مسلمانوں کو یہ نہیں سمجھاتی کہ ان کی بقا بہ یک وقت مقابلہ اور تعاون، خود نگہداری اور خوش ہمسایگی میں ہے وہ اپنے فرض کو انجام نہیں دے گی۔ ہمیں ہندستان کی زندگی میں ایک نئے باب کا آغاز کرنا ہے۔ شکوے شکایت بہت ہو چکے۔ شکوہ کوئی سنتا نہیں۔ ہمیں بقائے باہم کے انداز سیکھنے چاہییں اور یہ بات منوا لینی چاہیے کہ "ملک کی پیش رفت اور فلاح میں ہم بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہے ہیں۔ ہندستان کی جیالی پر ہم بوجھ بن کر نہیں رہنا چاہتے، ہم اس کے دست و بازو ہیں۔ ہم سے ہندستان کی طاقت ہے ہندستان کے لیے ہم سرمایۂ بصیرت ہیں۔ ہندستان ہم سے وسعت نظر اخذ کرتا ہے۔ اس کی اقدار کو ہم نے استوار کیا ہے۔ ہماری نگاہ ملک کے ماضی پر نہیں، اس کے مستقبل پر ہے، ہم ترقی کی شاہراہ پر اہلِ وطن کے ساتھ شانہ بہ شانہ چل رہے ہیں، یہاں کی خوشحالی اور خوش اندیشی میں ہمارا حصّہ ہے۔" یہ ساری باتیں جب تک ہم عمل سے ثابت نہ کر دیں اور اہلِ وطن سے اپنے بارے میں منوا نہ لیں، چین سے نہ بیٹھیں۔

ہمیں اپنے اہلِ وطن کے ساتھ بیٹھ کر بہت سی باتوں کی وضاحت، بہت سے شبہات کا ازالہ کرنا چاہیے۔ ہم اکثریت سے کیا چاہتے ہیں، وہ ہم سے کیا توقع رکھتی ہے، ہماری خواہش اور اس کی توقع کس طرح پوری ہوگی۔ اس کی تکمیل کے لیے عملی اقدامات کیا ہوں گے۔ روزمرہ کے جھگڑوں کو چھوڑ کر اب ہمیں دوسروں کے ساتھ مل کر ایک روشن مستقبل کی تشکیل کرنی چاہیے خود ہمارے اندر کیا کمیاں، کیا کمزوریاں اور وطن اور اہلِ وطن کے تئیں کیا بے خبریاں ہیں، ہمیں ان کا احتساب کرنا ہوگا، انھیں تسلیم کرنا ہوگا، تاکہ ہم اپنے نقطۂ نظر اور رویّہ کو نئے خوابوں اور نئے مشترک عزائم کے سانچے میں ڈھال سکیں۔ ایودھیا کے بہت بڑے سانحہ نے ملک کو ہلا ڈالا ہے۔ یہ ہمارے ہوش و گوش پر منحصر ہے کہ ہم اس زبردست تخریب سے ایک بڑی تعمیر کا سروسامان کر سکیں۔ پہلا قدم تو یہی ہوگا، مل کر بیٹھنا، ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنا اس کی رعایت کرنا، باہمی داد و ستد سے ایک قابل عمل رابطہ، رشتہ اور ہمکاری کو وجود میں لانا۔ ہمیں اپنی سمتِ نظر میں انقلاب آفریں تبدیلی کرنی چاہیے۔ مسلمان بچّوں کو نئے ڈھنگ سے اٹھانا چاہیے، انھیں مذہب، انسانیت اور وطن دوستی اور مسؤلیت کے سبق پڑھانے چاہییں، ہزار جتن کر کے انھیں جہالت سے چھٹکارا دلانا سب سے زیادہ ضروری ہے۔

ہندستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے۔ جمہوریت کی بنیاد انصاف پر رکھی

جاتی ہے۔ ہم سب کو ساری لفظی اور قانونی موشگافیوں سے اوپر اٹھ کر اپنی صورت حالات، اپنی کیفیت پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ کیا ہم گزشتہ ۲۵ سال کی مدت میں ایک منصفانہ اور مساوات پر مبنی سماج کو وجود میں لا سکے؟ اگر نہیں تو کیوں؟ کیا ہمارے یہاں اونچی ذاتوں کا تسلط ہنوز قائم ہے؟ کیا آئین کا منشا اور حکومت کی بہت سی فلاحی اسکیمیں ملازمین حکومت کی بے بہری کا شکار ہو جاتی ہیں، کیا اس کا کوئی علاج نہیں؟ کیا وہ خلیج جو سرکار کے قول و فعل کے درمیان خندۂ دنداں نما بنی ہوئی ہے۔ اسی طرح چوڑی ہوتی چلی جائے گی۔ کیا یہ بات قرین انصاف ہے کہ ترقی یافتوں اور پسماندوں کو مقابلہ کے میدان میں ایک ساتھ کھڑا کر دیا جائے تاکہ اوّل الذکر کی حرکت تسلسل اور ان کی پیش آغازی انھیں پسماندوں سے اور زیادہ آگے کر دے۔
کیا یہ سب کچھ کر کے ملک کا ضمیر مطمئن ہو سکتا ہے کہ مقابلہ کی آزادی اور روزگار کے مواقع ہر ہندستانی شہری کی دسترس میں ہیں؟ ایسا مقابلہ انصاف پر نہیں، انصاف دشمنی پر مبنی ہے۔ نابرابروں کے درمیان مقابلہ کیسا؟ منڈل کمیشن کی سفارشات منظور کی گئیں تاکہ پسماندوں کے لیے کچھ تلافی مافات ہو سکے تو ایک ہنگامہ اور توڑ پھوڑ کا ایک جشن برپا ہو گیا۔ مسلمان پیچھے رہ گئے ہیں، اپنے ملک کے انتظام میں ان کا عمل دخل برائے نام ہے، پسپائی کی رفتار زور پکڑ رہی ہے انھیں میعاد بستہ ریزرویشن دینے ہوں گے تاکہ ترقی کی دوڑ میں وہ بھی حصہ لے سکیں۔ اس حادثہ کے بعد اگر عادلانہ سماج قائم نہ ہوا اور اقلیتوں اور کمزوروں کی دستگیری نہ کی گئی تو عداوت، نفرت اور نفاق اسی طرح بنے رہیں گے بلکہ زور پکڑتے رہیں گے۔ یاد رکھیے اگر قوم، نظام اور انتظامیہ کے انصاف پر کسی ایک فرقہ یا جماعت کو بھی اعتماد نہ ہوا تو فتنہ و فساد برابر سر اٹھاتے رہیں گے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انصاف کے بغیر کسی نظام کو ثبات نہیں ہوتی۔ انصاف کرنا اور اسے ثابت بھی کرنا حکومت اور معاشرہ دونوں کا فرض ہے۔ ساری جماعتوں کو مل بیٹھ کر طے کرنا چاہیے کہ انصاف کو صدر میں کس طرح بٹھایا جائے گا ہزار ہا سال اور آزادی کے بعد کی ناانصافیوں کو دور کیونکر کیا جائے گا۔ اکثریت اپنے ہیں جذب ہوئے، اپنے گرد طواف کرنے اور دوسروں کے جذبات اور ضروریات کو نظر انداز کرنے کے بجائے اقلیتوں کی تالیف قلب کس طرح کرے گی؟
تعلیم کا نصاب کسی قوم کی تشکیل اور اس کے نقطۂ نظر اور سمتِ سفر کے تعین میں کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اُسے نفرت اور تنگ نظری اور بے بصری سے پاک ہو جانا چاہیے اسے اس طرح ڈھالا جائے کہ اعلا اخلاقی اقدار بچپن سے طلبہ کے ذہن نشین ہو جائیں اور وہ عالمگیر انسانیت کے مفادات و مصالح، عزائم اور منصوبوں سے روشناس ہو جائیں۔
ان سب امور کو نئی روشنی میں دیکھنا ہوگا۔ ورنہ عداوت کا سارا کاروبار ہمارے پانو کی بیڑی بن جائے گا اور نصاب اور گھروں اور جلسوں اور اخباروں کے صفحوں میں بوئے ہوئے نفرت اور دشمنی کے بیج تباہی کے برگ و بار لائیں گے۔
یہ مضمون کل مکمل نہیں ہو پایا، آج یعنی ۸ دسمبر کی خبروں نے امید کی اس مشعل کو

بجھادیا جو تخریب کی راکھ سے تعبیر کو اٹھتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ پاکستان اور بنگلہ دیش میں مسلمانوں نے مندروں کو جلانا شروع کر دیا اور ہندوؤں پر حملے بھی ہونے لگے۔ لندن میں ایک مندر کو جلاکر خاکستر کر دیا۔ ایسا لگتا ہے کہ اب یہ آگ برصغیر کے تینوں ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ شری اڈوانی، شری جوشی اور شری سنگھل آج گرفتار کر لیے گئے، پوچھے گئے سوال کا جواب شری اڈوانی نے جس انداز سے دیا اس میں پشیمانی شمہ بھر بھی نہ تھی بلکہ سرکشی کے تیور نمایاں تھے۔ انھوں نے ساری خرابی کا ذمہ دار سرکار کو ٹھہرایا۔

سرکار نے کل جو فیصلے کیے تھے شاید وہ انھیں عمل میں نہ لا سکے۔ مسجد کی تعمیر نو اب دشوار نظر آتی ہے۔ آج کی خبر یہ ہے کہ کارسیوکوں نے میدان کارزار چھوڑنے سے پہلے مسجد کی جگہ چبوترہ بناکر اس پر مورتی استھاپت کر دی تھی۔ پیرا ملٹری فورسیز کے بعض جوانوں نے اس چبوترہ کو سمان دیا اور مورتی کی پوجا کی۔ اب مورتی کو وہاں سے کون ہٹائے گا؟ لوگ پوچھ رہے ہیں کہ کارسیوکوں کو اس کام کی مہلت دی ہی کیوں گئی، انھیں مرکزی حکومت کی نیت پر شبہہ ہے۔ انصاف کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ارباب اختیار کی کمزوری اور فیصلہ کرنے میں تاخیر اور کوتاہی ہے۔ ہماری تردّد پیشہ اور تاخیر پیکر مرکزی حکومت ابھی یہ سوچ رہی ہے کہ مسجد کس ادارہ کے ذریعے بنوائی جائے۔ جب تک وہ کسی فیصلہ کو پہنچے گی ملک میں ایک بڑی مہم بھاجپا اور وشو ہندو پریشد مسجد کی تعمیر کے خلاف شروع کر دیں گے۔ پاکستان اور بنگلہ دیش میں بابری مسجد کے شہید ہونے کا جو ردّعمل ہوا اور مندروں کی جس طرح بے حرمتی کی گئی یا بے حرمتی کی کوشش ہوئی اور کئی مندر نذر آتش کیے گئے اس نے معاملہ کو اور الجھا دیا ہے اور اس وقت عام بدگمانی اور باہمی عداوت کے ماحول میں اس گتھی کو سلجھانا ممکن نظر نہیں آتا۔

اس مضمون میں مسلم قیادت کے ہوش و گوش کی تعریف کی گئی تھی کہ اس نے عوام کو ضبط کی تلقین کی۔ اب ایسا لگتا ہے کہ عوام تک یا تو یہ پیغام پہنچا ہی نہیں، یا وہ تنگ آکر جنگ پر آمادہ ہو گئے ہیں، اور اب وہ اپنے رہنماؤں کی بات نہیں سنیں گے۔ یہ بات پُرخطر ہے۔ اچھا ہوتا اگر مسلم رہنما دور درشن اور آکاش وانی پر مسلم عوام سے مخاطب ہوئے ہوتے اور انھیں ضبط کی تاکید کرتے۔ یہ موقع بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ مسلم رہنما عوام سے کٹے ہوئے ہیں، ان کے اور عوام کے درمیان وہ زندہ رابطہ ہے ہی نہیں جو خدمت اور خیر اندیشی اور فلاحی اور ارتقائی کاموں کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ رابطہ قائم نہ ہوا تو پھر عوام انتشار سے دوچار رہیں گے۔ تنظیم کے کام میں تاخیر بہت مہنگی پڑ سکتی ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ حالات اب کیا کروٹ لیں گے۔ ایسے میں منظم، متحد اور باخبر لوگ منسلک رہنا بہت ضروری ہوتا ہے۔

آگ ٹھنڈی جب ہی ہو گی جب انتقام کے چکّر کو توڑا جائے۔ ہمارے مسلم رہنماؤں کو پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں سے ہاتھ جوڑ کر التجا کرنی چاہیے کہ خدارا، اس بنا پر کہ

ہندستان میں بابری مسجد شہید کر دی گئی ہے، اپنے یہاں نہ مندروں کو نقصان پہنچائیے نہ ایسے بے گناہ ہندو شہریوں پر حملہ کیجیے۔ ان معصوم انسانوں کا کیا قصور ہے۔ اس کے علاوہ اگر آپ اس طرح بدلہ لیں گے تو ہندستان میں اس وقت جو ہمدردی مظلوم مسلمانوں کے ساتھ عام طور پر پیدا ہوئی ہے اسے عداوت میں بدلتے دیر نہیں لگے گی۔ اپنے ملک کے ہندوؤں اور ہندستان کے مسلمانوں پر رحم کیجیے۔" اگر بی بی سی نیوز سروس سے درخواست کی جائے تو شاید وہ خوشی سے ہمارے دو ایک معروف مسلم رہنماؤں کو پاکستان اور بنگلہ دیش (اور انگلستان) کے مسلمانوں سے خطاب کرنے کا موقع دے دے۔

اس مضمون کے آخر میں راقم سطور اپنی ایک غلطی کا اعتراف کرے گا۔ اس نے آج سے تقریباً سال بھر پہلے تک مسلم قیادت کو یہ مشورہ دیا تھا کہ "بھاجپا کے رہنماؤں کے ساتھ بات کریں اور ان سے پوچھیں کہ وہ مسلمانوں سے چاہتے کیا ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اس طرح مفاہمت کے باب وا ہو جائیں۔" اسے اب پتا چلا ہے کہ اس کا مشورہ خوش فہمی پر مبنی تھا اور غلط تھا۔ وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے دور درشن پر اہل ہند کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ بی جے پی اور وشو ہندو پریشد نے ملک کو دھوکا دیا ہے۔ اس کے ساتھ عہد شکنی کی ہے۔ جو جماعت اپنے قول سے پھر جائے، جس کے نزدیک حصول مقصد کے لیے ہر طرح کے ذرائع کا استعمال کرنا جائز ہو، جو نہ اپنے پیمان کا پاس کرے نہ عدالت کے احکام کی تعمیل بظاہر اس سے بات کرکے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ فسطائی طریق کار کی ایک نشانی ہے۔ فسطائی طاقتیں جمہوری روایات اور اخلاقی اقدار کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ وہ انھیں اپنے مقصد کی راہ میں ایک پل کے لیے بھی حائل نہیں ہونے دیتیں۔ بھاجپا نے طے کرلیا ہے کہ وہ ہندستان میں ہندو راج استھاپت کرے گی۔ ایسا کرنے کے لیے وہ کہیں رکے گی نہیں۔ انصاف کے تقاضے اور جمہوریت کے آداب اس کے سدّ راہ نہیں بن پائیں گے۔ جس پارٹی کا سیاسی فلسفہ کدورت، عداوت اور تنگ نظری سے پھوٹتا ہو وہ رواداری اور انصاف کی بات سُنے گی ہی کیوں؟ لیکن راقم پھر بھی اتنا کہے گا کہ موقع پڑے تو اس سے گفتگو ضرور کی جاسکتی ہے، اس کے عہد و پیمان پر اعتبار کیے بغیر۔ ممکن ہے کہ خود اس کے مصالح اسے کسی وقت ہماری بات پر غور کرنے کے لیے مجبور کر دیں۔ حالات اس قدر تیزی سے بدل رہے ہیں کہ لائحہ عمل اور نقطۂ نظر ابھی مرتب نہیں کیا جاسکتا۔ اس وقت ضرورت ہے حزم و احتیاط، اور نظم و ضبط کی، عوام سے روابط استوار کرنے کی، انھیں اشتعال کے خلاف آگاہ کرنے کی، انھیں خاموشی، سنجیدگی اور صلح کوشی کے ساتھ اپنی اپنی بستیوں میں دفاع کے لیے تیار کرنے کی۔ اتنا ہی اہم ہے سیکولر اور انصاف پسند سیاسی پارٹیوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے قدرتی یاور اور ہمدرد ساری اقلیتیں، درج فہرست ذاتیں اور قبائل اور دوسرے پسماندہ اور کمزور طبقات ہیں۔ ان کے ساتھ عہد وفا باندھنا چاہیے۔ الغرض ہمارے رہنماؤں کو نئے پس منظر میں ان سارے مسائل پر غور کرنا اور مسلمانوں کی حفاظت

ان کے استحکام اور فلاح و ترقی کی کوشش کرتا ہوگا۔

بہرحال مسلمانوں کو ضعیفی کے جرم اور بد نظمی کے گناہ کی سزا مل گئی۔ وہ ملتا ہی تھی، خود غافل رہیں وہ اپنے مفادات اور مصالح سے اور جھگڑتے رہیں وہ اسی طرح بے مصرف اور ناہم باتوں پر، اور بے خبر رہیں وہ بدخواہوں کی چالوں اور ارادوں سے۔

مسلمانوں کے خیرخواہ ان کی تالیفِ قلب کے لیے اور ارباب اختیار کھسیانی پن مٹانے اور عالمی رسوائی کے داغ کو دھونے کے لیے اعلان کر رہے ہیں کہ بابری مسجد نئے سرے سے تعمیر کرائی جائے گی۔ یہ کوئی بھی نہیں بتاتا کہاں اور کب اور کس وضع پر تعمیر ہو گی؟ مفہوم تو یہ ہوا کہ جس جگہ اسے توڑا گیا ٹھیک وہیں بنائی جائے گی۔ کیا یہ ممکن ہے؟ کیا مرکزی حکومت کی ڈھیلی ڈھالی چال نے اس جگہ جو چبوترہ بنوا دیا اور جو مورتی وہاں رکھوا دی ہے کیا اس کا ارادہ ایک کو توڑوانے اور دوسری کو ہٹوانے کا ہے۔ کیا اس بے ریڑھ حکومت میں اتنا دم ہے کہ وہ ایسا کر سکے تھوڑی دیر کے لیے مان لیجیے۔ کہ سرکار کے پھیپھڑوں میں آکسیجن بھر دی گئی اور اس نے یہ فیصلہ کر بھی لیا تو بھی کیا اس طرح ملک گیر فتنہ و فساد کا ایک نیا دروازہ نہ کھل جائے گا؟ کچھ لوگ یہ کہتے ہوئے بھی سنائی دیے کہ انہدام کے اثرات کو مٹانے کے لیے اور سابقہ کیفیت کو بحال کرنے کے لیے مسجد اسی جگہ پر بنے گی اور جب وہ بن جائے گی تو اس میں مورتی اسی طرح سے رکھ دی جائے گی جیسے وہ انہدام سے پہلے رکھی ہوئی تھی۔ سبحان اللہ! قیامت رفتہ کو آواز دینے کی اس سے انوکھی مثال، عمل درکنار، تخیل کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ مسلمان ایک بل سے کتنی بار ڈسا جائے گا۔ اگر ایسا کیا گیا تو بھارت اس طویل اور المناک جھگڑے کا ری پلے دیکھے گا جس کی نمائش کی ذمے دار ایک بار پھر بھارت سرکار ہوگی۔ تکنیکی نقطۂ نظر سے دیکھیے تو ہماری پلے، میں کیا مضائقہ ہے۔ یہ ریہرسل تو پہلے ہی ۵ دسمبر کو قریب ہی ایک جگہ پر کارسیوکوں نے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ کیا تھا اور بھارت سرکار کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ لوگ اب بھی اس کی سلامتی ہوش و حواس کی بات کرتے ہیں۔ حکومت کی ایوان ایک ستون باخبری ہے اور یہاں یہ ستون سرے سے غائب ہے۔

ایک تجویز یہ بھی سننے میں آرہی ہے کہ مسجد قریب ہی کسی دوسری جگہ بنا دی جائے نمک پاشی کی یہ نئی ترکیب نکالی گئی۔ کیا اس پرانی تجویز کو مسلمان اب اس لیے قبول کرلیں گے کہ اس اثنا میں وہ خاک و خوں اور دخان و آتش سے گزر چکے ہیں:

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا — کریدتے ہو جب اب راکھ جستجو کیا ہے

ہمدردوں اور بے دردوں سے مسلمان یہی کہیں گے کہ خدارا اب ان کے زخموں کو نہ کریدیں مسجد بنانا چاہیں بنائیں، نہ بنانا چاہیں نہ بنائیں، بنانا چاہیں تو جس جگہ بنانا چاہیں بنا ڈالیں۔ مسلمان بھر پائے انھیں اب اس قضیہ میں نہ الجھائیں، ان کے زخموں کو نہ کریدیں۔ ہماری جمہوریت میں اقلیت ہونا سب سے بڑا پاپ ہے۔ اس پاپ کی سزا انھیں کب تک دی جائے گی، سزا کی بھی تو کوئی میعاد ہوتی ہے۔ جس عداوت اور نفرت کے چہرے سے نقاب

اس تزک و احتشام کے ساتھ اُٹھا دی گئی اب وہ سات پردوں کے پیچھے چلی جائے تو بھی نگاہوں کو دھوکا نہ دے سکے گی۔ وہ کروڑوں کدورت پیشہ دل جنھیں گھٹا ٹوپ اندھیروں نے گھیر لیا ہے روشنی کی کرنوں کو آیندہ برداشت کیسے کرسکیں گے۔ بابری مسجد کی شہادت سے مظلوموں کے دل ٹوٹ گئے، یہ بہت بڑا نقصان ہے کیونکہ دل زندہ رہے ہی حوصلہ اور اعتماد کا انحصار ہوتا ہے، ہمارے آنسو ربجھ جائے اگر جہاں دل ٹوٹے ہیں وہاں آنکھیں کھل جائیں، وہ دوست اور دشمن، عارضی اور دائمی، حقیقی اور سیاسی میں فرق کرنے لگتے۔

آپ نے دیکھا جہاں ایک کے علاوہ ساری سیاسی پارٹیاں مسجد کی حفاظت کے حق میں تھیں اور زیادہ تر اہل علم و دانش ان کے ہمنوا تھے، وہاں پھر بھی مسجد محفوظ نہ رہ سکی۔ اس سے نتیجہ کیا نکلا۔ یہ پارٹیاں اور یہ اہل دانش عوام کی اکثریت کے ترجمان نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تو یہ سانحہ نہ ہوتا۔ ہمیں ہندو عوام کے پاس جانا پڑے گا، ابھی نہیں کہ اس وقت اس کا غلط مفہوم لگایا جائے گا۔ جب نفرت کی آگ ٹھنڈی ہونے لگے تو ہمیں ان کے سامنے دودھ کا دودھ، پانی کا پانی الگ کرکے رکھنا ہوگا۔ فاصلہ سے بدگمانیاں دن دُونی رات چوگنی بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ کیوں نہ ہم عہد کرلیں کہ ہم فاصلہ کو حائل نہ ہونے دیں گے لیکن "ہم" سے مراد کیا ہے؟ ہماری نمایندگی کون انجام دے گا، ہماری طرف سے عہد کون کرے گا، جہاں تنظیم نہ ہو، اتحاد نہ ہو، اعتماد نہ ہو وہاں ترجمانی کون کرسکتا ہے، وہاں اہل وطن ہماری بات کیوں سننے لگے۔ جنھیں وہ حقارت سے دیکھتے ہیں ان کی بات کو وہ وزن کیوں دینے لگے۔

بہرحال اگر ہمیں زندہ رہنا ہے، عزت نفس کے ساتھ، سر اٹھا کر، سینہ تان کر، بالا قدمی کے ساتھ تو ہمیں اپنا گھر پہلے درست کرنا پڑے گا۔ جس گھر سے آئے دن جھگڑے، مارپیٹ، اور الزام و دشنام کی صدائیں آتی ہوں ہمسایے اس گھر کے مکینوں کو منہ نہیں لگاتے۔ اب ہم سے یہ اطمینان چھین لیا گیا ہے کہ سیکولر جمہوریت میں، وقتی حادثوں سے قطع نظر، ہم امن چین سے رہ پائیں گے۔ اب تو ہمیں نگرانی، چوکسی اور نگہبانی کا طریقہ اپنانا پڑے گا۔ غنیم گھات میں ہو تو ایک لمحہ کی غفلت گھاتک بن جاتی ہے۔ ہم کسی کو غنیم نہیں سمجھتے تا وقتیکہ وہ اپنے برتاو سے یہ ثابت نہ کردے۔ ہماری حالت ہے کیا۔ ایک ادارہ بھی ہم ڈھنگ سے نہیں چلا پاتے۔ ہمارے اداروں اور انجمنوں میں خانہ جنگی کا سکّہ چلتا ہے، ہم کو مسلمانوں کی خامیوں اور ان کے فرائض کا احساس ہے لیکن اسی وقت تک جب کہ ہم خود کو مستثنا کردیں۔ ہم اپنی ذات کو ملّت کے مفاد سے بالاتر، کہیں بالاتر سمجھتے ہیں۔ مسلکوں کی لڑائیاں ہم میں ہوتی ہیں۔ عیب اور بہتان کا کاروبار ہمارے ہاتھوں فروغ پاتا ہے۔ جہالت ہماری رفیق راہ بن گئی ہے۔ وقت ضائع کرنا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پھر ہم ترقی کریں تو کیوں کر۔

وقت آگیا ہے کہ ہمارے بڑے مل بیٹھیں اور باہمی مشورہ کے بعد سمت نظر اور سمت سفر دونوں متعین کردیں۔ اقلیت کی صورت حالات کی منطق یہ ہے کہ وہ اکثریت سے بہت زیادہ محنت کرکے مہارت، فضیلت اور امتیاز حاصل کرے۔ ہندستان میں جہاں اکثریت

اقلیتوں اور پسماندوں کے استحصال کو ایک فنِ لطیف کی طرح برتتی چلی آئی ہے۔ اس بات کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اکثریت کے ایک طبقہ نے اس وقت کھل کر جو حملہ ہم پر کیا ہے اس میں سے ہمارے لیے بھلائی کی راہ نکلتی ہو۔ ہمیں خطرہ کا پہلی بار سچا احساس ہو جائے اور ہم اس کے لیے ڈھال وضع کر لیں۔

اس اثنا میں ہمارے وزیر اعظم نے اپنے اعلان کے ایفا کی کوشش کی ہے۔ پارٹیوں پر جو قدغن لگائی ہے اس میں سے نکلنے کے لیے چور دروازے بہت ہیں، خصوصاً ایسی پارٹیوں کے لیے جو تنظیم کی لڑی میں پروئی ہوئی ہوں، اور ایسی حکومت کے زیر سایہ جو خوش خرام اور نرم لجام اور کمزور ہو۔ یہ بات البتہ انوکھی ہے کہ جب کوئی تادیبی کارروائی کی جاتی ہے تو مسلمانوں کو ان کا حق حصّہ امیدی سے کچھ زیادہ ہی ملتا ہے۔ چنانچہ ہندوؤں کی تین پارٹیوں کو ممنوع قرار دیا گیا تو مسلمانوں کی دو پارٹیوں کو بھی زیر قدغن لے آئی۔ اسلامک سیوک سنگھ کو بند کرنے کا تو جواز تھا، لیکن جماعت اسلامی نے کیا قصور کیا تھا۔ تعلیم، اخلاقی رہنمائی اور راحت رسانی کے علاوہ یہ بچارے کرتے ہی کیا ہیں۔ آندھرا پردیش میں سائیکلون آیا تو جماعت نے بغیر امتیاز مذہب راحت رسانی کا کام بڑی جانفشانی اور سلیقہ سے انجام دیا جس کا اعتراف متعلقہ حکام نے بھی کیا۔ ان کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ ایک پاکستانی اور ایک کشمیری انجمن کے ہمنام ہیں اور ان انجمنوں کا طرزِ عمل جارحانہ رہا ہے۔ یہ فیصلہ نظرِ ثانی کا مستحق ہے۔

جو کام فوراً انجام دینا ہے وہ ہے ریلیف یا راحت رسانی کا کام۔ یہ کام بھی تنظیم چاہتا ہے۔ پھر مظلوموں کی فریاد سننا ان کی بات اہلِ اقتدار تک پہنچانا، ان کی داد رسی کرنا۔ ان کے زخموں پر پھائے رکھنا۔ پولیس اور آرمڈ پولیس کی زیادتیوں کو دستاویزی روپ میں پیش کرنا۔ اب کے تو فسادات ملک گیر ہو گئے ورنہ کچھ شہر ایسے ہیں جو ہر وقت فساد آمادہ رہتے ہیں۔ وہاں بلوؤں سے نبرد آزما ہونے کے لیے منصوبے تیار رہنے چاہییں۔ اگر فسادات ہمارا مقدّر بن گئے ہیں تو ہمیں اپنے مقدّر کا پاس رکھنا چاہیے۔ ہمت اور تنظیم کے ساتھ مقسوم کی پذیرائی کرنی چاہیے۔ دوستی اور محبت کا ہاتھ ہم برابر بڑھائیں لیکن ہر بار احتیاط کے ساتھ، اعتماد کے ساتھ اور طاقت کے ساتھ۔ رفاقت، دوستی، تعاون، خیر اندیشی، بجا اور برحق، مسکینی، سپر اندازی، نیاز مندی، سرنگوئی، بے جا اور باطل مظلوموں کی مدد اس طرح کیجیے کہ جو لوگ آگے آ جائیں وہ زیادہ پا جائیں اور جن لوگوں کی غیرت اور تامل انھیں آگے نہ بڑھنے دے وہ محروم رہ جائیں۔ ریلیف یا راحت رسانی کے کام میں جو مجلس ماتم میں کیا جا رہا ہے بزم مے کا سا سماں نہ ہونا چاہیے "یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی۔ جو خود بڑھ کر اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے"۔ یہ بھی نہ ہو کہ بعض ظلم رسیدوں پر بہ یک وقت کئی امدادی انجمنوں کی نظرِ التفات پڑے، اور دوسروں تک کوئی پہنچنے نہ پائے۔ مناسب ڈھنگ تو یہ ہوگا کہ ہر آفت زدہ شہر میں تقسیم کا کام صرف ایک ایجنسی یا ادارہ کرے۔ یہ اعلان کرنا اس کی

اخلاقی اور ضابطہ کی ذمہ داری ہوگی کہ ان اداروں، انجمنوں یا ایجنسیوں کے ناموں کا شہر یا قصبہ یا گاؤں میں اعلان کر دے جنھوں نے وہاں کے لیے روپیا اور اشیاء فراہم کی ہیں اور فراہمی کی مقدار بھی کھول کر بیان کر دی جائے۔ مسلمان جن میں غیرتِ ملی اور انسانی ہمدردی زندہ ہے ایسے موقعوں پر دل کھول کر مدد کرتے ہیں۔ جب تک برباد شدہ لوگ نئے سرے سے آباد نہیں ہوتے ان کے لیے کھانے بھیجے جاتے ہیں! یہاں بھی تال میل اور احتیاط ضروری ہے تاکہ رزق ضائع نہ ہو۔

امداد کی رقوم کا ایک اچھا مصرف بازآبادکاری ہے۔ مکان پھر سے بنائے جائیں، مکانوں اور دکانوں میں سامانِ رہائش اور سامانِ تجارت پہنچایا جائے۔ زخمیوں کا علاج اور بیواؤں اور یتیموں کے لیے پرورش کا مستقل انتظام، یہ سب خصوصی توجہ چاہتے ہیں۔ ان کے لیے معقول اقدامات ضروری ہیں۔ یتیم بچوں کی تعلیم کو راحت رسانی کے کام میں ترجیح دینی چاہیے۔

اگر ایک محلہ میں ہندو اور مسلمان دونوں مجروح ہوئے ہیں تو ہماری ریلیف پارٹیوں کو امداد کرتے ہوئے مذہب کی بنا پر کوئی امتیاز نہ کرنا چاہیے۔ ہمارے دل انسانیت اور انصاف کا جو خون ہوا ہے اس پر دکھے ہیں۔ علاوہ بریں ہمیں جلے ہوئے مکانوں کی راکھ سے ایک ایسی عمارت کو تعمیر کرنا ہے جو بھید بھاؤ سے بالاتر ہو۔

تازہ ترین اطلاعات بتا رہی ہیں کہ شہید صرف بابری مسجد کو نہیں کیا گیا۔ دیپ انشٹن مکرجی نے ۶ دسمبر کو جو کچھ دیکھا اس کی رپورٹ انھوں نے ایودھیا سے روانہ کی۔ اس کا ترجمہ قومی آواز نے ۱۵ دسمبر کے شمارہ میں شائع کیا ہے۔ اس کو پڑھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ ایودھیا شہر کی دوسری مسجدیں بھی نذرِ آتش کر دی گئیں اور چن چن کر مسلمانوں کے مکان جن کی آبادی پانچ ہزار تھی جلا دیے گئے۔ شری مِتی بلکہ سادھوی اوما بھارتی نے اُس وقت جو تقریر کی اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آتش زنی اور قتل و غارت کی یہ ساری کارروائی سوچے سمجھے منصوبے کے تابع تھی۔ کیا ایودھیا کی دوسری مسجدیں بھی، جن کی تعداد تیس کے لگ بھگ ہے، رام جنم بھومی پر مندروں کو توڑ کر بنائی گئی تھیں؟ اسی رپورٹ میں ایک اور حادثہ کا ذکر بھی ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر بھاجپا اختیار میں آگئی، اگر اس نے زمامِ اقتدار ہاتھوں میں لے لی تو وہ مسلمانوں سے کیا مطالبہ کرے گی، کیا چاہے گی۔ بھاجپا کا رکن بن جانا یا اس کے سیاسی مسلک کا اتباع کرنا، یا اس کی قصیدہ سرائی کرنا کافی نہیں ہوگا۔ اس کی مانگ صرف یہ ہوگی کہ اپنی شناخت بھول جاؤ، اپنے مذہب کو ترک کر دو اور ہندوتے کے رنگ میں خود کو رنگ لو، ورنہ تم پر جو بیتے گی اس کے ذمہ دار تم ہی ہو گے۔ قارئین احسن حیدر پر جو بیتی اس سے اندازہ لگا لیں۔ دیپ انشٹن لکھتے ہیں "یہ (حسن حیدر) بھی ایودھیا میں بڑی آراضی کے مالکوں میں شامل ہیں، ہندوؤں سے ان کے بہت قریبی تعلقات رہے ہیں انھوں نے اپنی آراضیوں پر بہت سے بے گھر ہندوؤں کو آباد کیا ہے، ایک شخص نے یہ

، بتایا کہ مسٹر حسن حیدر بھارتیہ جنتا پارٹی ایودھیا کے صدر بھی تھے اور یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ ہر طرح
نفا ہیں کسی بھی طرح کا تحفظ حاصل کرنے سے (انھوں نے) انکار کر دیا تھا لیکن آج
کارسیوکوں کے ایک جتھے نے ان کے گھر میں گھس کر لاٹھیوں سے ان کی پٹائی کر کے اس
ال کو پہنچا دیا ..... حاجی محبوب نے اپنے ہی علاقے کے چھ افراد کے نام بتائے
میں ۶ دسمبر کی شام کو تباہ اور تاراج کرنے والے ہجوموں نے ہلاک کر دیا تھا۔ ایک سو آدمیوں
ے بھاگنے میں پناہ لی تھی ..... ہر چند کہ ایودھیا کے مسلمانوں کے تعلقات مقامی ہندوؤں سے
ہت اچھے تھے مسلمانوں کے مکانوں کی نشاندہی تو مقامی ہندوؤں نے ہی کی ہوگی۔

آج (۱۶ دسمبر) کی اطلاعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرکزی سرکار نے اب مضبوط قدم
ٹھانے کی ٹھان لی ہے۔ تینوں بی جے پی ریاستوں کی بھاجپائی حکومتوں کو برطرف کر دیا گیا
ہے۔ سیکولر پارٹیوں اور خود کانگریس کے سیکولر عناصر کا دباؤ اکارت نہیں ہوا۔ مسلمانوں کا فرض
ہے کہ وہ سیکولر عناصر کی مدد کریں اور سارے صحت مند اقدامات میں حکومت کا ساتھ دیں۔
ھوڑی دیر کے لیے ہم بھول جائیں کہ حکومت نے کیا نہیں کیا۔ اس وقت دھیان صرف
س طرف دیں کہ سرکار کیا کرنے جا رہی ہے۔ اس کا ہاتھ بٹائیں۔ اس نے جو غلطیاں کیں اس کی
رمت نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ ان سے کہیں زیادہ ہمارے روشن خیال ہندو بھائیوں نے
رلی۔ اب وہ بعد از خرابی بسیار راہ راست پر آئی ہے۔ ہمیں اس کی منزل کو آسان کرنا چاہیے
س گئی گزری حالت میں بھی ہندستان میں ایسے ہندو نظر آتے ہیں جو بھید بھاؤ سے بہت اوپر
ٹھ کر انسان دوستی، مسلمان پسندی اور وطن پرستی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ
نھیں جزائے خیر دے اور ان کے ہاتھوں اور ارادوں کو مضبوط کرے۔ اسٹیٹسمین میں
ال ہی میں دو لڑکیوں ورشا وینکٹیشن اور پونم کا ۱۲ دسمبر کا خط شری اڈوانی کے نام چھپا ہے
جسے اڈیٹر نے سرخی دی ہے کہ "ہندستان کے مستقبل کی آواز سنیے"۔ اس خط سے اندازہ
ہوتا ہے کہ ہماری نئی نسل کے بعض بچے اور بچیاں تعصب کے زہر سے بفضلہ تعالیٰ محفوظ ہیں
وہ ایک ایسے بھارت کے خواب دیکھ رہے ہیں جو نفرت اور عداوت سے پاک ہو۔ نئی نسل کے
ایسے نونہالوں سے ہماری امیدیں وابستہ ہیں۔ لیکن ہمیں بھول کر بھی مستقبل کی طرف
سے مطمئن نہ ہونا چاہیے۔ ہندستان اگر بے تعصب اور روشن خیال اور سلامت رو
اور انسان دوست رہتا ہے تو اس میں فائدہ سب سے زیادہ مسلمانوں کا ہے۔
اس لیے ایسے بھارت کی تعمیر میں ان کا یوگدان بھی سب سے زیادہ ہونا چاہیے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

کتاب	موضوع	مصنف	قیمت
تاثر نہ کہ تنقید	(تنقید)	صدیق الرحمٰن قدوائی	۵۱/
اپنے دل کی حفاظت کیجیے	(ایڈیشن)	ترجمہ نذیر الدین مینائی	۲۵/
بہ صورت گر کچھ خوابوں کے	انٹرویوز	طاہر مسعود	۶۶/
مرضیات	(طب)	حکیم نعیم الدین زبیری	۵۱/
بانگ درا	(شعری مجموعہ، طلبہ ایڈیشن)	اقبال	۹/
بالِ جبریل	(شعری مجموعہ)	″	۶/
ضربِ کلیم مع ارمغانِ حجاز (اردو نظمیں)	(شعری مجموعہ) ″	″	۶/
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی	(ناول)	کشمیری لال ذاکر	۴۰/
گوشے میں قفس کے	(طنزیہ مزاحیہ)	دلیپ سنگھ	۴۵/
سحر کے پہلے اور بعد	(جگ بیتی)	سعید الظفر چغتائی	۵۱/
افکارِ اقبال	(اقبالیات)	محمد عبدالسلام خاں	۱۷۵/
فرمان فتح پوری	(شخصیت اور ادبی خدمات)	مرتبہ خلیق انجم	۳۵/
تذکرہ ماہ وسال	(تذکرہ)	مالک رام	۱۲۵/
تحقیق نامہ	(تحقیق)	مشفق خواجہ	۱۲۵/
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان	(مذہب)	حکیم محمود احمد برکاتی	۴۵/
خواب اور خلش	(شعری مجموعہ)	آل احمد سرور	۶۶/
سفر	(ناول)	رابعہ تبسم	۲۷/
تحریریں	(تنقید)	ڈاکٹر اسلم پرویز	۵۱/
پہچان اور پرکھ	(تنقید)	پروفیسر آل احمد سرور	۵۱/
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	(تحقیق)	ڈاکٹر سلامت اللہ	۵۱/
پت جھڑ کی آواز (نیا ایڈیشن)	(افسانے)	قرۃ العین حیدر	۷۵/
اقبال کا نظریۂ خودی	(تحقیق)	عبدالمغنی	۱۵۰/
سمندری خزانہ	(ناول)	ماریہ رحمان	۲۷/
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	(تنقید)	وارث علوی	۳۶/
فی الحقیقت	(طنز ومزاح)	یوسف ناظم	۴۵/
مٹی سے ہیرا	(ناولٹ)	سید مقبول احمد	۱۰/
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	(ناولٹ)	صغرا مہدی	۲۴/
الجھاوے	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف	۵۱/
غبارِ منزل	(شعری مجموعہ)	غلام ربانی تاباں	۴۵/
قلندر بخش جرأت	(خطبہ)	جمیل جالبی	۱۰/
عجائب گھر	(بچوں کی سائنسی کتاب)	قاسم صدیقی	۱۰/
تاریخ اودھ	(تاریخ)	ترجمہ و ترتیب شاہ عبدالسلام	۲۷/
مولانا آزاد کا ذہنی سفر	(ادب)	ظ انصاری	۳۲/

ڈاکٹر عصمت جاوید
۲۷-۲۲-۱- بیجولین کیاڑسی پورا
اورنگ آباد ۴۳۱۰۰۱

رسالۂ نورالمعرفت اور ولی دکنی

رسالۂ 'نورالمعرفت' کے بارے میں ہمیں پہلی مرتبہ آب حیات میں یہ اطلاع ملتی ہے کہ یہ رسالہ ولی دکنی کی تصنیف ہے۔ محمد حسین آزاد ولی کے ترجمے میں لکھتے ہیں:

"رسالہ نورالمعرفت تصوف میں بھی لکھا ہے۔ اس میں کہتے ہیں کہ میں محمد نورالدین صدیقی سہروردی کے مریدوں کی خاک پا ہوں اور شاہ سعداللہ کا شاگرد۔ مگر یہ نہیں لکھا کہ کس امر میں۔"[1]

محمد حسین آزاد نے اس اطلاع کا ماخذ نہیں بتایا لیکن یہ بات صاف ہے کہ یہ رسالہ ان کی نظر سے نہیں گزرا تھا ورنہ وہ ہرگز یہ نہ لکھتے کہ یہ رسالہ تصوف میں لکھا ہے۔ کیوں کہ اس رسالے کا تصوف سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی نے یہ رسالہ ۱۹۵۰ء میں شائع کیا تھا جس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ تصوف میں نہیں ہے گو کہ اس کے نام سے یہی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے بلکہ احمد آباد کی ایک مشہور دینی درس گاہ "ہدایت بخش" کی مدح سرائی میں ہے اور اس میں اس درس گاہ کے مشہور عالم اور استاد مولانا شیخ نورالدین سہروردی ان کے بڑے صاحبزادے شیخ محمد صالح عرف پیر بابا اور اس کی عمارت کو زر کثیر سے تعمیر کرنے والے ایک عہدہ دار محمد اکرم الدین (شیخ نورالدین سہروردی کے شاگرد اور مرید) شیخ الاسلام کی شان میں قصیدہ خوانی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی مرتب رسالہ نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "شمس العلماء آزاد اور مولوی احسن مارہروی دونوں غالباً رسالے سے ناواقفیت کی بنا پر تصوف اور سلوک کی کتاب بتاتے ہیں"، انھوں نے جو رسالہ شائع کیا ہے وہ اصل پر مبنی نہیں ہے بلکہ دراصل اس مخطوطے کی نقل ہے جو جناب منظور حسین علوی عرف حسینی پیر کی ملکیت ہے اور یہ مخطوطہ ۱۲۷۰ء میں نقل کیا گیا ہے۔ مرتب رسالہ نے رسالے کا سال تصنیف ۱۱۱۱ھ اور ۱۱۱۹ھ کے درمیان متعین کیا ہے۔ یعنی

---

[1] آب حیات، ص ۱۱۴

جو رسالہ چھپ کر منظرِ عام پر آیا ہے اس کی بنیاد وہ متن ہے جو اصل قلمی نسخے کی کتابت کے ایک سو انسٹھ تا ایک سو ستر سٹھ سال کے بعد کا نقل کردہ ہے۔ اصل نسخے کے بارے میں خود مرتب کو اعتراف ہے کہ:

"نورالمعرفت کا کوئی بہت قدیم نسخہ موجود نہیں البتہ ۱۲۷۰ھ کا نقل کیا ہوا نسخہ موجود ہے جو کہ وہ نبت قاضی سید محمد نورالدین حسین فائق مصنف مخزن الشعرا ہیں"۔[1]

مزید لکھتے ہیں:

"آج کل نورالمعرفت کے جتنے قلمی نسخے ملتے ہیں سب کے سب ۱۲۷۰ھ والے نسخے کی نقلیں ہیں"۔

اگرچہ آزاد نے رسالۂ نورالمعرفت کے بارے میں دی ہوئی معلومات کا ماخذ آب حیات میں نہیں بتایا ہے لیکن رسالۂ نورالمعرفت کے ناقل محمد نورالدین فائق کی تصنیف مخزن الشعرا مولانا محمد حسین آزاد کی نظر سے ضرور گزری تھی۔ کیوں کہ ولی کے ترجمے میں انھوں نے دو مقامات پر اس تذکرے کا حوالہ دیا ہے اس لیے رسالۂ نورالمعرفت سے متعلق انھوں نے جو کچھ آب حیات میں تحریر کیا ہے اس کا ماخذ بھی تذکرۂ مخزن الشعرا ہی ہو گا۔ فائق نے رسالۂ نورالمعرفت کے ترقیمے میں یہ واضح طور پر لکھا ہے کہ یہ رسالہ مولانا نورالدین صدیقی سہروردی کی مدح میں ہے لیکن مخزن الشعرا میں اس رسالے کے موضوع کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ ولی کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے۔

"واز رسالۂ نورالمعرفت کہ از تصنیف اوست مستفاد می شود کہ از شاگردانِ شاہ گلشن و مرید جناب معارف آگاہ مخدوم العالم مولانا محمد نورالدین صدیقی السہروردی است"۔

آزاد کی نظر وہاں سے صرف یہی بیان گزرا ہو گا جس کی بنیاد پر انھوں نے آب حیات میں یہ تحریر فرمایا:

"کہتے ہیں کہ میں (ولی) محمد نورالدین صدیقی سہروردی کے مریدوں کی خاکِ پا ہوں اور شاہ سعداللہ کا شاگرد"۔

چوں کہ اس رسالے کا موضوع کا آزاد کو علم نہ تھا کہ یہ رسالہ ان کی نظر سے گزرا ہی نہ تھا اس لیے انھوں نے رسالے کے نام سے دھوکا کھا کر اٹکل سے لکھ دیا کہ یہ رسالہ تصوف میں ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسالہ نورالمعرفت کا ذکر صرف فائق نے کیا ہے۔ مولانا آزاد تو صرف ناقل ہیں۔ قاضی نورالدین فائق نے اپنے تذکرۂ مخزن الشعرا میں صرف گجراتی شعرا کا ذکر کیا ہے اور اس میں ولی دکنی کو بھی شامل کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ولی کی وطنیت خود قاضی صاحب کے زمانے میں نزاعی تھی۔ قاضی صاحب نے ولی کو "احمد آبادی" قرار دیتے ہوئے لکھا

---

[1] رسالۂ نورالمعرفت

"... ولی تخلص۔ محمد ولی نام۔ مولدش احمد آباد و مدفنش ہم ہماں بلدۂ خجستہ بنیاد۔ محققانِ این فن را در حال او اختلاف است کہ آیا ولی از گجرات است و یا از دکن ... بہ راقم آثم از زبانی ثقات بلدۂ احمدآباد بہ ثبوت چناں پیوستہ کہ شاعر مذکور از بلدۂ مسطور بودہ۔ سالہا بدکن ہم گذرانیدہ"

یہاں دو نکتے قابلِ غور ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ رسالۂ نورالمعرفت کا جو نسخہ شائع ہوا ہے اس کا متن اصل پر نہیں بلکہ اس نقل پر مبنی ہے جسے اصل سے ڈیڑھ صدی کے بعد قاضی نورالدین فائق نے تیار کیا اور ولی کے بارے میں ان کی معلومات کا ماخذ سنی سنائی باتیں ہیں اور وہی تنہا شخص ہیں جس نے دعوا کیا ہے کہ "یہ تصنیف محمد ولی شاعر ہندی" ہے۔ اس رسالے کا کسی اور قدیم کتاب میں تذکرہ نہیں۔ مرتب نورالمعرفت کو اس کا اعتراف ہے کہ قدیم کتابوں میں مخزن الشعرا اور آب حیات کے سوا نورالمعرفت کا کہیں ذکر پایا نہیں جاتا۔ آب حیات کے بارے میں ہم بتا چکے ہیں کہ آزاد نے اپنا بیان مخزن الشعرا سے نقل کیا ہے۔ اس طرح نورالمعرفت کا پہلا ناقل ہی اس کے بارے میں اطلاع دیتا ہے اور کوئی نہیں۔ دوسرا نکتہ یہ کہ قاضی نورالدین فائق ولی کو احمدآبادی سمجھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے رسالۂ نورالمعرفت کو بھی غلطی سے لکھا یا غیر شعوری طور پر "محمد ولی شاعر ہندی" سے جوڑ دیا۔ اس غلطی یا غلط فہمی کی وجہ اس رسالے کے یہ آخری جملے ہیں

"مصنفِ این عبارت کہ بیمنِ ثنا پردازی بزرگان بخطاب ولی سرفراز است و از شاگردی زبدۃ العارفین حضرت شاہ گلشن ممتاز امیدوار از فضل بے نیاز است (کہ ایں) ہرزہ گرد کوچۂ حق سبحانہٗ (را) ہوشیار دم و ثبات قدم دارد..."

[اس عبارت کا مصنف بزرگان (دین) کی مدح سرائی کی برکت سے خطابِ ولی سے سرفراز ہے اور زبدۃ العارفین حضرت شاہ گلشن کی شاگردی سے ممتاز خدائے بے نیاز کے فضل سے امید رکھتا ہے کہ وہ کوچۂ حق کے اس ہرزہ گرد مسافر کو ہوشیار دم اور ثبات قدم رکھے]

اس رسالے کا مصنف دو ٹوک انداز میں لکھ رہا ہے کہ وہ بزرگان دین کی مدح سرائی کی برکت سے "ولی" کے "خطاب" سے سرفراز ہے یعنی ولی اس کا نام یا تخلص نہیں ہے بلکہ خطاب ہے۔ بلکہ یہ بات اب پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ ہمارے

شاعرِ ہندی کا نام "ولی محمد" تھا (محمد ولی نہیں جیسا کہ نورالدین فائق صاحب نے لکھا ہے) اور "ولی" ان کا تخلص تھا جو ان کے نام سے استخراج کیا گیا تھا۔ اس بات سے صرف ایک ہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ نورالمعرفت کا مصنف ہمارا شاعرِ ہندی نہیں بلکہ کوئی اور مجہول الاسم شخص تھا جس کا خطاب "ولی" تھا تخلص نہیں لیکن بُرا ہو تحقیق کا کہ "کاتا اور لے دوڑی" کے اصول پر عمل کرتے ہوئے زیرِ تحقیق مسئلے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیے بغیر ہی اسے ولی دکنی سے منسوب کر دیا گیا اور ولی کی جھولی میں وہ ٹکڑا بھی ڈال دیا گیا جو اس کے لیے باعثِ افتخار بھی نہیں اور نہ ان کے فرشتوں کو بھی اس کی خبر رہی ہو گی۔ "نورالمعرفت" وقتی ضرورت کے تحت لکھا ہوا ایک رسالہ تھا۔ رہا اس کا مصنف تو اس کے بارے میں ایک قیاس یہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ یہ ممکن ہے "محمد ولی اللہ" کی تصنیف ہو۔ بدقسمتی سے ولی دکنی کی شناخت کا مسئلہ بھی ایک عرصے تک تخمین و ظن کا باب رہا۔ ایک عرصے تک ولی دکنی کو احمد آباد کی ایک اور شخصیت "محمد ولی اللہ" سے گڈمڈ کیا گیا ہے اور آج بھی بعض وقیع حلقوں میں یہ خطرناک غلط فہمی قائم ہے۔ اس غلط فہمی کا شکار میرے محترم بزرگ اور استاد ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی بھی ہیں جو "ولی گجراتی" کے مصنف بھی ہیں اور رسالۂ نورالمعرفت کے مرتب بھی۔ ولی دکنی / اورنگ آبادی اور "محمد ولی اللہ" ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں یا یہ دونوں جداگانہ ہستیاں ہیں۔ اس پر بحث کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھیے۔ یہاں میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ نورالمعرفت کے مصنف ولی دکنی / اورنگ آبادی تو کجا وہ "محمد ولی اللہ" بھی نہیں ہو سکتے جنھیں ولی گجراتی بنا کر پیش کیا گیا ہے اس طرح کا قیاس ولی کو دکنی سمجھنے اور ثابت کرنے کی کوشش کرنے والے ایک بلند پایہ محقق ڈاکٹر محی الدین زور نے پیش کیا ہے۔ ان کا قیاس ہے کہ نورالمعرفت کے مصنف محمد ولی اللہ تھے۔ یہ بات بھی ان اطلاعات کی روشنی میں جنھیں ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی نے اپنی کتاب ولی گجراتی میں فراہم کیا ہے درست نہیں معلوم ہوتی۔ یہ فرض کرنے سے پہلے کہ محمد ولی اللہ رسالۂ نورالمعرفت کے مصنف تھے ہمیں یہ متعین کرنا ہو گا کہ رسالہ نورالمعرفت رقم کرتے وقت ان کی عمر کیا تھی، چوں کہ ولی دکنی / اورنگ آبادی کا سال وفات ۱۱۱۹ھ ہے[1] اس لیے وہ حضرات جو ولی دکنی اور "محمد ولی اللہ" کو ایک ہی شخصیت سمجھتے ہیں۔ یہ سمجھنے پر بھی مجبور ہیں کہ "محمد ولی اللہ" کا بھی انتقال ۱۱۱۹ھ میں ہوا تھا۔ بدقسمتی سے ہمیں ولی دکنی / اورنگ آبادی کا سن پیدائش اب تک معلوم نہیں ہو سکا ہے لیکن

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے راقم کا مضمون "ولی کا سال وفات۔ ایک شبہ اور اس کا ازالہ" جس میں ڈاکٹر جمیل جال[بی] کے ان دلائل سے بحث کی گئی ہے جن کی مدد سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ولی کا انتقال ۱۱۱۹ھ کے ایک ع[رصے] کے بعد ہوا۔

محمد ولی اللہ" کا سن پیدائش متعین کر سکتے ہیں۔ مصنف "ولی گجراتی" لکھتے ہیں کہ حضرت عبدالملک نے ملفوظ کبیری (مولفہ ۱۰۴۵ھ تا ۱۰۶۰ھ) میں محمد ولی اللہ کے والد شریف محمد کے چار بیٹوں کا ذکر کیا ہے اور جس ترتیب سے ذکر کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ محمد شریف کا سال وفات ۱۰ھ ہے۔ ملفوظ کبیری ۱۰۴۵ھ اور ۱۰۶۰ھ کے درمیان لکھی گئی ہے۔ محمد شریف کے سب سے چھوٹے اور لائق ذکر بیٹے ہونے کی حیثیت سے محمد ولی اللہ کی عمر ۱۰۴۵ھ میں کم سے کم اٹھارہ سال تو فرض کی جاسکتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کا سال پیدائش قریب ۱۰۲۷ھ رہا ہوگا اور اگر ملفوظ کبیری ۱۰۶۰ھ میں لکھی گئی تو ان کی سن پیدائش ۱۰۴۲ھ متعین کی جاسکتی ہے۔ محمد ولی اللہ ۱۱۰۷ھ میں زندہ تھے کیوں کہ ایک مسک نامے پر جو استاذی نجیب اشرف ندوی مرحوم کی ملکیت تھا ان کے بطور گواہ دستخط ثبت ہیں۔ رسالہ نورالمعرفت کا سال تصنیف ۱۱۱۱ھ اور ۱۱۱۹ھ کے درمیان متعین کیا گیا ہے۔ کیوں کہ بقول ڈاکٹر ظہیرالدین یہ رسالہ جس درگاہ کی تعریف میں رقم کیا گیا ہے۔ اس کا سال بنیاد ۱۱۱۱ھ ہے اور محمد ولی اللہ کا انتقال بھی ولی دکنی اورنگ آبادی کی طرح ۱۱۱۹ھ میں فرض کیا جائے تو رسالہ نورالمعرفت کا سال اختتام ۱۱۱۱ھ اور ۱۱۱۹ھ کے درمیان ہی رہا ہوگا۔ اگر ہم محمد ولی اللہ کا سال پیدائش ۱۰۲۷ھ مان لیں تو ۱۱۱۱ھ میں ان کی عمر چوراسی (۸۴) سال کی فرض کرنی ہوگی۔ اور اگر ان کا سال پیدائش (۱۰۴۲ھ) مان لیں تو ان کی عمر ۱۱۱۱ھ میں انہتر برس کی مان لینی ہوگی یا پھر اس وقت ان کی عمر انہتر اور چوراسی کے درمیان فرض کرنی ہوگی۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ مصنف نورالمعرفت کے ممدوح شاہ نورالدین صدیقی سہروردی کی ۱۱۱۱ھ میں کیا عمر تھی۔ ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی رقمطراز ہیں:

"مولانا شیخ نورالدین ۱۰ر جمادی الاول ۱۰۶۴ھ بمقام احمد آباد پیدا ہوئے (اور) ۹۰ اکانوے سال کی عمر میں ۹ر شعبان ۱۱۵۵ھ میں وصال ہوا"[1]

اس حساب سے ۱۱۱۱ھ میں مولانا کی عمر ۴۷ (سینتالیس) سال کی تھی۔ سوال یہ ہے کہ ایک ستر یا اسی سال کا بوڑھا اپنے سے اس قدر کم عمر شخص کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے کس طرح ملا سکتا ہے۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ بزرگی بعلم است نہ بسال پھر بھی جس انداز میں مصنف نورالمعرفت نے شاہ نورالدین کی تعریف کی ہے اس سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک نوجوان کسی بزرگ کی تعریف میں رطب اللسان ہے ملاحظہ ہو۔

"شکرش بشکر آل داؤد مساز و صبرش بصبر ایوب ہمراز۔ کلامش باکلام

---

[1] رسالہ نورالمعرفت دیباچہ ص ۴ اور ص ۵

کلیم اللہ ہم کلام و مہمان داریش بہ مہمان داری ابراہیم ہم طعام۔ عصا کفش
ہم دست عصائے موسوی و نقرش ہم کاسۂ نقر عیسٰی ... پیراہنش
بہ پاکی دامن یوسف مشہور .... اگر ارسطو ہوش مہداشت کہ (بطاگردیش)
می نسبت و اگر بو علی زندہ بود از شاگر۔ دانش تکراری می گرفت"

(اس کا شکر شکر آلِ داؤد کی برابری کرتا ہے۔ اس کا صبر صبر ایوب کا
ہمراز ہے۔ اس کا کلام کلیم اللہ کے ہم کلام ہے اور اس کی میزبانی
میزبانیِ ابراہیم کی ہم طعام ہے۔ اس کا عصا عصائے موسوی اور فقر
فقر عیسیٰ کی برابری کرتا ہے اور اس کا پیرہن پاکدامنی یوسف کی
طرح مشہور ہے۔ اگر ارسطو ہوش و خرد رکھتا تو اس کا شاگرد بن جاتا
اور اگر بو علی زندہ ہوتا تو اس کے شاگردوں کے اقوال دہراتا)

لطف کی بات یہ ہے کہ نورالمعرفت کا مصنف جو کوئی بھی رہا ہو وہ شاہ نورالدین سہروردی کی مدح سرائی میں غلو اور اغراق کی تمام سرحدیں پار کر جاتا تو ہے لیکن کہیں یہ دعوا نہیں کرتا کہ وہ شاہ نورالدین سہروردی کا شاگرد ہے۔ وہ یہ لکھتا ہے کہ وہ مولانا نورالدین کا مرید ہے لیکن نورالمعرفت کے ناقل قاضی خالق اس رسالے کی ترقیم کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد اپنے تذکرۂ مخزن الشعرا میں "ولی احمد آبادی" کے ترجمے میں یہ دعوا کرتے ہیں کہ اس رسالے کا مصنف (جو ان کے خیال کے مطابق ولی دکنی تھا) "جناب معارف آگاہ مخدوم العالم مولانا محمد نورالدین صدیقی السہروردی" کا مرید تھا۔ پھر یہ بات چل پڑی کہ ہمارا محمد ولی دکنی مولانا نورالدین سہروردی کی مریدی کا دم بھرتا تھا اور اس ثبوت طلب بات کو سند کا درجہ دینے کے مرتکبین میں آزاد جیسے کمزور محقق سے لے کر دور حاضر کے ماہرین ولی بھی نظر آتے ہیں اور یہ بات اتنی بار دہرائی جا چکی ہے کہ اب وہ ان لوگوں کے لیے بھی حقیقت بن گئی ہے جو تحقیقی نظر رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر زور بھی رو میں لکھ گئے کہ ولی دکنی نے گجرات کے مدرسۂ ہدایت بخش سے فیض حاصل کیا۔[۵] یہ وہی مدرسہ ہدایت بخش ہے جس کی تعریف میں رسالہ نورالمعرفت لکھا گیا ہے اور جس کا سال بنیاد ۱۱۱۱ھ یعنی ولی کی وفات سے آٹھ سال قبل کا ہے۔ ولی دکنی اور شاہ نورالدین سہروردی کی ملاقات تک ثابت نہیں ہے اور نہ اول اللہ کرنے کسی شعر میں ان کی مدح کی ہے اور نہ کہیں ہلکا سا اشارہ بھی کیا ہے۔ بہرحال یہ طے ہے کہ رسالہ نورالمعرفت کے مصنف "محمد ولی اللہ" کبھی نہیں تھے اور اگر تھے تو پیرانہ سالی میں مدرسہ ہدایت بخش کی مدح سرائی کی کوئی معقول اور قابلِ قبول توجیہہ ہمارے پاس نہیں ہے

---

[۵] ملاحظہ ہو، دکنی ادب کی تاریخ۔ ص ۱۱۵

ں رسالے کا مصنف وہ مجہول الاسم شخص تھا جس کا تخلص نہیں بلکہ خطاب ولی تھا
رر رسالہ تحریر کرنے وقت اغلب ہے کہ وہ جوان تھا۔

نورالمعرفت الف سے ی تک پڑھ جائیے مصنف نے اس رسالے میں اپنی ذات
ے متعلق یا اپنی دکنی شاعری سے متعلق ہلکا سا اشارہ بھی نہیں کیا ہے۔ اگر یہ رسالہ
لی کی تصنیف ہوتا تو چونکہ یہ رسالہ ۱۱۱۱ھ یا اس کے بعد کا لکھا ہوا ہے یعنی ولی
، وفات سے آٹھ سال یا اس سے کم عرصے میں ضبط تحریر میں آیا تھا اس لیے ولی اس
یں اپنے شاعر ہندی ہونے کا ذکر ضرور فخر سے کرتے۔ کیوں کہ یہ وہ زمانہ ہے جب
ولی کی دکنی شاعری کی دکن میں دھوم مچی تھی۔ رسالۂ نورالمعرفت کے مصنف
لے اپنے بارے میں اگر کوئی معلومات دی ہے تو صرف اتنی کہ ولی اس کا خطاب ہے
اور وہ شاہ گلشن کا شاگرد ہے۔ مصنف رسالۂ نورالمعرفت کا خود کو شاہ گلشن کا
شاگرد کہنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مصنف ولی دکنی ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن
ستم ظریفی یہ ہے کہ محض اس بیان کی بنیاد پر مصنف نورالمعرفت اور ولی دکنی میں
خلط مبحث کر کے یعنی ولی دکنی کو نورالمعرفت کا مصنف قرار دے کر یہ بات بھی
چل نکلی کہ ولی شاہ گلشن کے شاگرد تھے کہ آزاد نے آب حیات میں یہ لکھ کر کہ "یں
(ولی) محمد نورالدین صدیقی سہروردی کے مریدوں کی خاک پا ہوں اور شاہ سعداللہ
کا شاگرد" اس جملے کا بھی اضافہ کیا ہے مگر یہ نہیں لکھا کہ کس امر میں۔ آزاد نے یہ
جملہ اس لیے لکھا ہوگا کہ ولی دکنی شاہ گلشن کے اگر شاگرد ہو سکتے تھے تو فارسی
یں۔ کیوں کہ شاہ گلشن دکنی سے نابلد تھے اور ولی دکنی صرف دکنی میں طبع آزمائی
کرتے تھے۔ شاہ گلشن سے دلی میں ولی کی ملاقات کا ذکر ضرور آیا ہے اور ان کے
مشورے کا بھی لیکن شاگردی کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ شاہ سعداللہ گلشن
فارسی کے شاعر تھے اور ولی کی فارسی گوئی کا ہمیں قطعی علم نہیں۔ ان سے صرف
ایک فارسی خمسہ بے نقط منسوب ہے جو ان کے دیوان کے متعدد قلمی نسخوں میں صرف
ایک نسخے میں ملا ہے جسے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے کلیات ولی کے دیباچے میں نقل کیا
ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ الحاقی کلام ہوگا۔ اس خمسے میں ولی کا تخلص بھی نہیں ہے۔ اگر یہ
فارسی خمسہ ولی کا ہوتا تو ان کے دیوان کے کسی اور نسخے میں بھی ضرور ملتا۔ قدیم
مخطوطوں میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں جن میں کسی مخطوطے کے کاتب نے دوسروں
کا کلام بھی اس میں شامل کر لیا ہے۔ جب تک ہمارے پاس کوئی ایسی تحریری شہادت
نہیں ملتی کہ ولی فارسی میں بھی لکھتے تھے تو ہم کس بنیاد پر کہہ سکتے ہیں کہ وہ
شاہ سعداللہ گلشن کے شاگرد تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنا دکنی کلام شاہ گلشن کو اصلاح
کی غرض سے نہیں دکھاتے تھے۔ صاحب نورالمعرفت کے اس بیان سے کہ وہ شاہ گلشن
کے شاگرد تھے۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اس رسالے کے مصنف ولی دکنی

ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ کوئی اور صاحب ہی ہو سکتے ہیں جو شاہ سعد اللہ گلشن کے فارسی زبان میں شاگرد تھے اور جن کا خطاب ولی تھا۔

ایسی صورت میں جب کسی دعوے کی تائید یا تردید میں کوئی خارجی شہادت دستیاب نہ ہو تو داخلی شہادت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی مرتبہ نورالمعرفت لکھتے ہیں:

"جس بات سے ہمارے خیال کو کہ ولی اس رسالے کے مصنف ہیں، تقویت پہنچتی ہے وہ رسالۂ نورالمعرفت سے حاصل کردہ داخلی شہادت ہے۔ ولی نے جن علوم و فنون اور کتب علمیہ و ادبیہ مثلاً معانی و بیان، خطا طلی، مطول و مختصر، تجرید تفرید گلشن راز خیالی، فخر رازی وغیرہ کا ذکر اپنے کلام میں کیا ہے جن پر اسے قدرت حاصل تھی۔ انھیں علوم و فنون اور کتب کو نورالمعرفت میں استعمال کیا ہے۔"

لیکن یہ کوئی حتمی یا قوی داخلی شہادت نہیں ہے، تعجب ہے کہ کلیات ولی کے مرتب ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی بھی ڈاکٹر مدنی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے یہ کیسے لکھ گئے کہ داخلی شہادت کی بنا پر قیاس کہتا ہے کہ یہ (مراد رسالۂ نورالمعرفت) ولی ہی کا تصنیف کردہ ہوگا۔[1] ولی محمد دکنی / اورنگ آبادی اپنے زمانے کے دانش ور تھے۔ انھوں نے شاہ وجیہہ الدین کے مدرسے میں دینی تعلیم حاصل کی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے کسی دینی مدرسے میں معلمی کے فرائض بھی انجام دیے ہوں اور درس و تدریس ان کا پیشہ رہا ہو جیسا کہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے قیاس ظاہر کیا ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ عہد ولی کی عام علمی فضا ہی ایسی تھی کہ اس میں سانس لے کر ایک معمولی حرف شناس بھی عالموں کی طرح گفتگو کر سکتا تھا۔ اس لیے اگر رسالۂ نورالمعرفت کے مصنف نے جو ظاہر ہے کہ تعلیم یافتہ رہا ہوگا، فلسفہ حکمت، منطق اور فقہ کی چند مشہور کتابوں کے حوالے دیے ہیں اور ان میں ایک دو نام کلام ولی سے لڑ گئے ہیں تو محض اس اتفاق کی بنیاد پر ولی محمد دکنی کو رسالہ نورالمعرفت کا مصنف قرار دینا تحقیق کی کوئی قابل تقلید مثال نہیں ہے۔

ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی آگے چل کر لکھتے ہیں:

"ولی کو مولانا نورالدین صدیقی سے جو عقیدت مندی اور مدرسہ ہدایت بخش سے جو تعلق تھا اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہنے میں کچھ پس و پیش نہیں کہ نورالمعرفت ولی گجراتی ہی کے اظہار عقیدت اور حق شاگردی کا تحریری ثبوت ہے۔"

یہاں موصوف طریقۂ استدلال کے اس مغالطے کے مرتکب ہوئے ہیں جسے منطق

---

[1] کلیات ولی۔ نیا اڈیشن، ص ۱۲-۱۱

صطلاح میں BEGGING THE QUSTION کہتے ہیں یعنی جس بات کو ثابت کرنا ہے اسی
و ثابت کردہ فرض کر کے اس سے نتائج کا استخراج کیا ہے۔ جیسے تو یہ ثابت کرنا ہے کہ رسالہ
نورالمعرفت کے مصنف ولی محمد دکنی ہیں لیکن موصوف نورالمعرفت کو ولی محمد دکنی کی تصنیف
قرار دے کر یہ استدلال کرتے ہیں کہ ولی کو مولانا نورالدین صدیقی سے عقیدت تھی کیونکہ
یہ بات نورالمعرفت کے مطالعے سے ثابت ہوتی ہے اور یہ کہ ولی محمد ولی دکنی کو مدرسہ
ہدایت بخش سے بھی نسبت تھی کہ رسالۂ نورالمعرفت میں اس مدرسے کی تعریف
درج ہے۔ یہ دعوا تو اس وقت ہی کیا جا سکتا ہے جب دوسرے ماخذ و مصادر سے
یہ ثابت ہو کہ ولی محمد ولی دکنی مولانا نورالدین صدیقی کے مرید تھے یا مدرسۂ ہدایت
بخش سے اس کا کوئی تعلق تھا۔ اس لیے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نہ تو ولی محمد دکنی
مولانا نورالدین سہروردی کے مرید تھے اور نہ شاہ سعداللہ گلشن کے شاگرد اور رسالہ
نورالمعرفت کا مصنف کوئی اور شخص ہے جو ولی کے خطاب سے سرفراز تھا اور
شاہ سعداللہ گلشن کا شاگرد اور مولانا نورالدین صدیقی سہروردی، ان کے بڑے صاحبزادے
شیخ محمد صالح اور ان کے شاگرد اور مرید محمد اکرم الدین مخاطب بہ شیخ الاسلام خاں صدر صوبہ
کا مادح تھا۔ جہاں تک ہمارے شاعر ہندی ولی محمد ولی دکنی کا تعلق ہے مولانا نورالدین
صدیقی سے نہ ان کی مریدی ثابت ہے اور نہ شاہ سعداللہ گلشن سے ان کی شاگردی۔

جہاں تک رسالۂ زیر بحث کے نام "نورالمعرفت" کا تعلق ہے یہ نام رسالے
کے متن میں کہیں نہیں آیا ہے اور نہ ہی یہ تاریخی نام ہو سکتا ہے کیوں کہ اس
نام سے جو اعداد نکلتے ہیں (۱۰۷۷) اس کا اس کے سال تصنیف ۱۱۱۱ھ تا ۱۱۱۹ھ سے
کوئی نسبت نہیں۔ اگر اس رسالہ کا نام نورالمعرفت کے بجائے "رسالۂ نورالمعرفت" بھی
فرض کیا جائے تو بھی اس سے اس کتاب کا سال تصنیف نہیں نکلتا۔ اس رسالے
کے پہلے ناقل محمد نورالدین حسین فائق مصنف مخزن الشعرا نے یہ نام ترقیمے میں
استعمال کیا ہے۔ "تمت رسالۂ نورالمعرفت از تصنیف محمد ولی شاعر ہندی"۔

شائع شدہ نسخے کے ضمیمہ میں ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی ایک اور اطلاع دیتے ہیں کہ مدرسۂ ہدایت بخش کی
تعریف میں شیخ نورالدین کے صاحبزادے شیخ محمد صالح نے بھی ایک رسالہ "نورالعرفان" لکھا ہے جو نورالمعرفت
سے ملتا جلتا ہے۔ اس کا طرز تحریر بھی ولی سے ملتا ہے۔ "خط کشیدہ جملہ توجہ طلب ہے۔ اگر مرتب کے
اس بیان کو صحیح مان لیا جائے کہ نورالعرفان کا طرز تحریر بھی ان کے ولی سے ملتا ہے جب کہ واضح طور پر یہ شیخ محمد صالح
کی تصنیف ہے تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں انشا پردازی کا جو عام روایتی رنگ تھا وہی نورالعرفان
میں بھی ملتا ہے اور نورالمعرفت میں بھی اس میں کسی مصنف کی کوئی تخصیص نہیں تو پھر نورالمعرفت کے طرز تحریر
کی بنیاد پر اسے ولی محمد دکنی سے کیسے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی لائق غور ہے کہ محمد نورالدین
فائق نے ولی کا نام ولی محمد نہیں بلکہ محمد ولی لکھا ہے جو ظاہر ہے "محمد ولی اللہ" سے نسبت رکھتا ہے لیکن اس
بات میں اب شک و شبہہ کی گنجائش نہیں رہی کہ ولی دکنی کا نام نہ تو محمد ولی تھا نہ محمد ولی اللہ بلکہ ولی محمد تھا۔
اور ہمارا ولی محمد ولی دکنی اور محمد ولی اللہ دو جداگانہ شخصیتیں ہیں۔

خدا بخش لائبریری کی چند اہم مطبوعات

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
مغربی تعلیم کا تصور اور اس کا نفاذ علیگڑھ میں	پروفیسر سید احمد صدیقی / مرتبہ مہرالہی	۶۰ روپے
رقعاتِ رشید صدیقی	،، مرتبہ پروفیسر مسعود حسین خاں	۴۰ روپے
کاشُر (کشمیری انسائیکلوپیڈیا) ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ	ڈاکٹر محمد زماں آزردہ	۱۵ روپے
اورنگ زیب (ایک نیا زاویۂ نظر)	ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد	۱۵ روپے
قومی یکجہتی کی روایات	مسٹر بی۔ این۔ پانڈے	۱۵ روپے
مقدمہ طلسم ہوشربا	———	۲۰ روپے
طلسم ہوشربا (نو جلدیں)	———	۴۰۰ روپے
فرہنگ زفان گویا	بدر ابراہیم مرتبہ پروفیسر نذیر احمد	۵۰ روپے
ہندو تیوہاروں کی دلچسپ اصلیت	منشی رام پرشاد ماتھر	۳۰ روپے
جنید احمد کی آٹوگراف بک	———	۲۰ روپے
ایک نادر روزنامچہ	مظہر علی سندیلوی	۲۵ روپے
دیوانِ مصحفی	منتخبہ امیر مینائی داسیر	۵۰ روپے
من موہن کی باتیں (قرآن مجید کا ترجمہ)	مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی	۱۵ روپے
داستاں میری (انیسویں صدی کے بہار کی تہذیبی تاریخ)	ڈاکٹر محمد اقبال حسین	۴۰ روپے
پنڈت موتی لال نہرو کا ۱۹۱۰ کا خطبۂ صدارت (جو اصلاً اردو ہی میں لکھا اور پڑھا گیا)		۱۰ روپے
تواریخ نادر العصر	مولفہ منشی نولکشور تقدیم ڈاکٹر نوار الحسن	۲۵ روپے
یادگار روزگار	سید بدر الحسن	۲۰۰ روپے
گیتا اور قرآن	پنڈت سندر لال	۱۵ روپے
شخصیات و ملاقات جنھوں نے مجھے متاثر کیا	جنید احمد	۴۵ روپے
شریمد بھگوت گیتا مع گیتا بودھ	مہاتما گاندھی	۲۰ روپے
نوبت رائے نظر کے ماہنامہ "ادیب" الٰہ آباد (۱۹۱۳-۱۹۱۰) کے مضامین کا انتخاب، اشاریہ کے ساتھ		۵۰ روپے
پیارے لال شاکر کے ماہنامہ "العصر" لکھنؤ (۱۹۱۳-۱۹۱۱) کے مضامین کا انتخاب، اشاریہ کے ساتھ		۵۰ روپے
برج نرائن چکبست کے ماہنامہ "صبح امید" لکھنؤ (۱۹۱۸-۱۹۱۲) کے مضامین کا انتخاب، اشاریہ کے ساتھ		۵۰ روپے
قاضی عبدالودود کے ماہنامہ "معیار" کی مکمل ری پرنٹ، اشاریہ کے ساتھ		۵۰ روپے
مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفت روزہ "پیغام" کی مکمل ری پرنٹ، اشاریہ کے ساتھ		۱۰۰ روپے
خوشتر منگلوری کے ماہنامہ "زماں" (۱۹۲۸-۲۹) کی مکمل ری پرنٹ، اشاریہ کے ساتھ		۷۵ روپے

ڈاکٹر ابو محمد سحر
۳۹۔مالویہ نگر، بھوپال ۴۶۲۰۰۳

اُردو رسم الخط پر ایک اہم مضمون

مولانا ظفر علی کی ادارت میں کرم آباد سے ستمبر ۱۹۱۰ء میں ماہنامہ "پنجاب ریویو" جاری ہوا تھا۔ اس کے کچھ ابتدائی شمارے اردو کے ممتاز شاعر و ادیب اور میرے کرم فرما جناب اختر سعید خاں صاحب کے ذخیرۂ کتب میں محفوظ تھے۔ کوئی آٹھ سال ہوئے موصوف نے از راہ عنایت یہ شمارے مجھے دے دیے تھے جس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔ اس کے پہلے ہی شمارے میں مولوی عبدالرحمان خاں کا ایک مضمون "اردو رسم خط" شائع ہوا تھا۔ اردو کے حرکات و سکنات یا اعراب کے تعیین اور اس کے مطابق اردو رسم الخط کی اصلاح کے موضوع پر یہ ایک نہایت پختہ اور وقیع مضمون تھا۔ میں نے اپنے ایک مضمون "اردو کے قاعدے" مطبوعہ نیا دور، لکھنؤ، جون/جولائی ۱۹۸۵ء میں دو موقعوں پر اس کا حوالہ دیا تھا۔ تعجب ہے کہ اردو رسم الخط اور املا کی اصلاح سے متعلق کسی کتاب یا تحریر میں اس اہم مضمون کا ذکر یا حوالہ نہیں ملتا۔ کم سے کم میری نظر سے ایسی کوئی کتاب یا تحریر نہیں گزری۔ اردو رسم الخط اور املا کے مسائل سے علمی دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس مضمون کا تعارف اور جائزہ پیش کر رہا ہوں۔

جس طرح اردو رسم الخط کی اصلاح کی تجویزیں آج کل اردو کی زبوں حالی یا اس کی بقا کی طرف سے مایوسی کی وجہ سے پیش کی جاتی ہیں اسی طرح اس زمانے میں اس کی ترقی کو مدنظر رکھ کر پیش کی جاتی تھیں۔ مولوی عبدالرحمان خاں اپنے مضمون کی تمہید میں لکھتے ہیں:۔

> "اردو زبان نے گزشتہ بیس سال میں باوجود ان رکاوٹوں اور مزاحمتوں کے جو اس کے راستے میں حائل تھیں جو ترقی کی ہے وہ محتاج بیان نہیں اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ اس کے رسم خط کو کامل تر بنانے کی کوشش کی جائے۔ اردو رسم خط پر جو اعتراض کیے جاتے ہیں ان کا اکثر حصہ بے بنیاد اور تعصب پر مبنی ہے۔ البتہ

ایک اعتراض واقعی کچھ وقعت رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں ایک ہی لفظ کو کئی طرح سے پڑھ سکتے ہیں۔"[1]

اردو کی روز افزوں ترقی کے علاوہ انھوں نے اصلاح کی ضرورت اس لیے بھی محسوس کی تھی کہ اس میں انگریزی الفاظ کثرت سے داخل ہو رہے تھے اور اردو رسم الخط میں ان کا صحیح پڑھنا مشکل تھا۔ زمانۂ حال کے بعض مصامین میں بات ہندی کے تعلق سے کہتے ہیں۔ پنجاب کے محکمۂ تعلیم کے قواعد کو ناکافی قرار دیتے ہوئے مولوی عبدالرحمان لکھتے ہیں:

"یہ قواعد اس وقت کی ضروریات کے لیے جب کہ وہ وضع کیے گئے تھے کافی تھے مگر اردو نے اب اس قدر ترقی کر لی ہے اور انگریزی الفاظ اس میں اس کثرت سے داخل ہونے جاتے ہیں کہ ان سے کامل تر قواعد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ انگریزی الفاظ کو مذکورہ بالا قواعد کی پوری پابندی کے ساتھ بھی لکھا جائے تو بھی ان کا صحیح پڑھنا مشکل ہے۔ یہ دقت اس وجہ سے نہیں پیدا ہوئی کہ اردو میں بعض حرکات کی کمی ہے بلکہ محض اس وجہ سے کہ اس کی حرکات پر کافی غور نہیں کیا گیا۔"[2]

مولوی عبدالرحمان نے اردو زبان کی سترہ حرکات قرار دی ہیں۔ لسانیات کی اصطلاح میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اردو کے مصوتوں کی کل تعداد سترہ مقرر کی ہے۔ کھینچ کر نہ پڑھی جانے والی حرکت کو مقصورہ اور کھینچ کر پڑھی جانے والی حرکت کو ممدودہ سے موسوم کیا ہے۔ مد کی بھی دو قسمیں کی ہیں۔ کھنچاؤ زیادہ ہو تو مدِّ اکبر ورنہ مدِّ اصغر۔ ان کی مقرر کردہ حرکات کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے:-

(۱) ضمہ یا پیش۔ دو قسمیں غیر خالص اور خالص۔

(الف) ضمہ غیر خالص۔ وہ حرکت جس کے کھینچ کر پڑھنے سے واؤ مجہول پیدا ہو۔ دو قسمیں:-

(۱) مقصورہ۔ جب کھینچ کر نہ پڑھا جائے جیسے ڈُہ، مُحمّد۔

(۲) ممدودہ۔ جب کھینچ کر پڑھا جائے۔ اسے واؤ مجہول سے ظاہر کیا جاتا ہے جیسے جو، شو۔ ایسی صورت میں واؤ مجہول اپنے ماقبل حرف کی حرکت کے اظہار کے لیے لکھا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ نہ متحرک ہے نہ ساکن۔

[1] اردو رسم خط از عبدالرحمان خاں (پوسابنگال) پنجاب ریویو، کرم آباد، ستمبر ۱۹۱۰ء، ص ۹

[2] پنجاب ریویو، ستمبر ۱۹۱۰ء، ص ۱۰۔

(ب) ضمۂ خالص۔ مد واقع ہونے سے واؤ معروف پیدا ہو۔ دو قسمیں:
(۱) مقصورہ۔ جیسے بُلانا میں حرف بے پر اور گُل میں حرف کاف پر۔
(۲) ممدودہ۔ واؤ معروف جیسے طُول اور رُوم میں طوا، رے پر۔
پیش کی مروّجہ علامت کو ضمۂ خالص کی علامت سمجھا جائے۔ الٹے پیش کو ضمۂ غیر خالص مقصورہ کے لیے خاص کر لیا جائے۔
(۲) کسرہ یا زیر۔ دو قسمیں۔ کسرۂ غیر خالص و کسرۂ خالص۔
(الف) کسرۂ غیر خالص۔ دو قسمیں:۔
(۱) مقصورہ۔ جس کے کھینچ کر پڑھنے سے یائے مجہول پیدا ہو۔ جیسے مِحراب، مِہتر، مِعیار۔
(۲) ممدودہ۔ یائے مجہول سے ظاہر کیا جاتا ہے اور کسرۂ غیر خالص مقصورہ کے کھینچنے سے پیدا ہوتا ہے جیسے بیل، تیل، ایک۔
(ب) کسرۂ خالص۔ دو قسمیں:۔
(۱) مقصورہ۔ جس کے کھینچنے سے یائے معروف پیدا ہو۔ جیسے لفظ کِل میں کاف۔
(۲) ممدودہ۔ جو کسرۂ خالص مقصورہ کو کھینچنے سے پیدا ہو۔ یائے معروف سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ لفظ کے آخر میں مروّر لکھی جاتی ہے اور بیچ میں حرف مذکور پر زیر زیادہ کیا جاتا ہے۔
کسرۂ خالص مذکورہ و غیر خالص مقصورہ کے لیے جدا جدا نشان نہیں ہیں۔ اگر مروّجہ آڑی لکیر کو کسرۂ غیر خالص کا نشان سمجھا جائے تو کسرۂ خالص کے لیے کھڑا زیر استعمال کر سکتے ہیں۔
(۳) فتح یا زبر۔ سب سے زیادہ غور کے قابل۔ تین قسمیں:۔
(الف) فتح خالص۔ دو قسمیں:۔
(۱) مقصورہ۔ وہ حرکت جس کے کھینچنے سے الف کی آواز پیدا ہو۔ جیسے "اکبر" میں الف اور ب دونوں پر الف فتح خالص مقصورہ ہے۔
(۲) ممدودہ۔ فتح خالص مقصورہ کے کھینچنے سے پیدا ہوتا ہے۔ الف سے ادا کیا جاتا ہے جیسے "جانا" میں جیم اور نون پر فتح خالص ممدودہ ہے۔
(ب) فتح غیر خالص۔ دو قسمیں:۔
(۱) مقصورہ۔ جس کے کھینچ کر پڑھنے سے یائے ماقبل مفتوح پیدا ہو۔ صرف ہائے ہوز ساکن کے ماقبل حرف پر واقع ہوتا ہے۔ جیسے "مہجور" میں میم پر فتح غیر خالص مقصورہ ہے۔

(۲) ممدودہ۔ جو فتح غیر خالص مقصورہ کو دراز کرنے سے پیدا ہو۔ جیسے
میلا میں میم پر فتح غیر خالص مقصورہ ہے۔

(ج) اشمام۔ زبر اور پیش کی درمیانی آواز۔ دو قسمیں:-

(۱) اشمام خالص۔ تین قسمیں:-

(الف) اشمام خالص مقصورہ۔ ذیل کے مصرع میں "اور" کے الف پر فتح اشمام خالص مقصورہ ہے:

"اور اک باغ کا سید حارستہ لیا"

اردو میں اس حرکت کا استعمال بہت کم ہے۔ فارسی میں صرف 'خ' کے ساتھ مخصوص ہے۔ لیکن انگریزی میں عام ہے جیسے "شوک" (جھٹکا) اور "روک" (چٹان)۔

(ب) اشمام خالص ممدودہ مدِ اصغر کے ساتھ۔ جب کم کھینچی جائے۔ جیسے جوز، طور۔

(ج) اشمام خالص ممدودہ مدِ اکبر کے ساتھ۔ جب زیادہ کھینچا جائے جیسے خوارزم، خواہ، خوال میں خ پر اشمام خالص ممدودہ مدِ اکبر کے ساتھ ہے۔ اردو اور فارسی میں خ کے ساتھ مخصوص لیکن انگریزی میں عام جیسے لو (قانون)، بوُل (گیند)، ہوُل (کمرہ)۔ اردو میں اس حرکت کو واو اور الف سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ الف کو واؤ کے اوپر لکھنا مناسب ہے تاکہ واؤ متحرک کا دھوکا نہ ہو۔

(۲) اشمام غیر خالص۔ اردو اور فارسی میں بہت کم ہے۔ مقصورہ صورت کو واؤ سے ظاہر کیا جاتا ہے جیسے خوہلہ (نادان) ناصر خسرو:-

"وخوہلہ شدست پیش کہیں بیشکار من"

ممدودہ صورت واؤ اور یے دو حروف سے ادا کی جاتی ہے جیسے خوے (پسینہ) دونوں صورتوں میں واؤ پر آڑھی لکیر بھی لگانی چاہیے۔[۱]

ان حرکات کی مزید وضاحت کے لیے دیوناگری اور رومن کی علامتوں اور مثالوں کے ساتھ مضمون میں ایک جدول بھی دی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضمۂ غیر خالص مقصورہ (دُو)، کسرۂ غیر خالص مقصورہ (یہ، یل)، فتح غیر خالص مقصورہ (مہ)، فتح اشمام خالص مقصورہ (اور، روک)، فتح اشمام ممدودہ اکبر (خوہ، بوُل)، فتح اشمام غیر خالص مقصورہ (خوہلہ)، اور فتح اشمام غیر خالص ممدودہ (خوے) کے لیے

---

[۱] پنجاب ریویو، ستمبر ۱۹۱۰ء، ص ۱۰ تا ۱۳۔

دیوناگری اور رومن رسم الخط میں کوئی علامت نہیں ہے۔ مولوی عبدالرحمان خاں لکھتے ہیں:-

" اردو زبان میں سترہ حرکات مستعمل ہیں جن میں صرف دس حرکات موجودہ ہندی یا ناگری میں ادا کی جاسکتی ہیں اور ان میں سے بھی دو کو نہایت ناقص طور پر ادا کیا جاتا ہے۔ جو اور جئو اور مے اور مئی میں جو فرق ہے اس کے بیان کرنے کی حاجت نہیں۔ رومن کے قواعد مقرر کرنے والوں نے بھی ہندی کی کورانہ تقلید کی، حالاں کہ کسرۂ غیر خالص مقصورہ، فتح اشمام خالص مقصورہ، فتح اشمام خالص ممدودہ اکبر کا استعمال انگریزی میں عام ہے اور اردو کی موجودہ ضروریات علمی کے لیے ان کے ادا کر سکنے کا انتظام ضروری تھا۔[1]"

حرکات کی علامتوں کا لحاظ رکھنے کے علاوہ مضمون میں دس اور باتوں کو بھی ضروری قرار دیا گیا ہے:۔

(۱) لفظ کے بیچ میں ساکن حرف پر جزم لگانا چاہیے۔

(۲) حرف مشدّد پر تشدید کا نشان لگانا چاہیے۔

(۳) ہمزہ اور الف۔ آواز میں فرق نہیں۔ استعمال میں فرق ہے۔ حرف علّت کو ساکن یا متحرک کہنا غلطی ہے۔ لفظ کے شروع میں ہمیشہ الف لکھا جاتا ہے۔ جب یہ آواز بیچ میں ہو تو ہمزہ استعمال کیا جاتا ہے۔ چوں کہ دوسرے حرف سے ملا کر نہیں لکھا جا سکتا۔ اس لیے جب اس پر فتح مقصورہ واقع ہو تو الف ایک زائد لکھتے ہیں جیسے جرأت، تأمل وغیرہ۔ کسرۂ مقصورہ ہو تو یے زائد لکھی جاتی ہے لیکن نقطے نہیں دیے جاتے جیسے جرائم، صائب، فائدہ وغیرہ۔ ضمّہ مقصورہ ہو تو ایک واؤ زائد لکھا جاتا ہے جیسے پلاؤ، علاؤالدین، بکاؤلی وغیرہ۔ جب ہمزہ سے پہلا حرف مضموم ہو تو ہمزہ کے مفتوح ہونے کے باوجود واؤ کا استعمال کیا جاتا ہے جیسے رؤسا، ہوًا، مؤخر وغیرہ۔ اس صورت پر ہمزہ پر زبر لگانا ضروری ہے۔

ہمزہ پر حرکات ممدودہ کی صورت میں فتحہ ہو تا ہے تو مد کا نشان لگایا جاتا ہے جیسے آم، مآل وغیرہ۔ کسرہ اور ضمّہ ہو تو ہمزہ کو یائے غیر منقوطہ کے ساتھ لکھا جاتا ہے مثلاً کمائی، کمائے، جاؤ، کماؤ وغیرہ

۴۔ واؤ صحیح لفظ کے جزو کامل کے شروع میں اکثر متحرک واقع ہوتا ہے جیسے والی، دوام، طویل۔ ایسی صورت میں جب لفظ کے بیچ یا آخر میں آئے

---

[1] پنجاب ریویو، ستمبر ۱۹۱۰ء، ص ۱۵

اس پر ہمیشہ حرکت کا نشان لگانا چاہیے۔ واؤ صحیح ساکن اردو میں اکثر مشدّد آتا ہے جیسے اوّل۔ انگریزی میں بغیر تشدید کبھی عام طور پر آتا ہے جیسے لَو LOVE اردو میں کبھی یہ موقوف ہوتا ہے جیسے دیلو۔ ساکن ہونے کی صورت میں جب مشدّد نہ ہو اس پر ہمیشہ جزم لکھنا چاہیے۔

۵۔ یے کبھی لفظ کے آخر میں بھی ساکن آتی ہے۔ اس پر جزم لگانا ضروری ہے مثلاً عبدالحیؒ۔

۶۔ لفظ کے بیچ کے نون غنّہ پر الٹا جزم (ˇ) لگایا جائے۔ آخر میں ہو تو نقطہ نہ لگایا جائے۔

۷۔ ہائے مخلوط ہمیشہ دوچشمی لکھی جائے۔ ہائے غیر مخلوط ملفوظی کے نیچے خوشا لگایا جاتا ہے اور ہائے مختفی کے نیچے شوشہ نہیں لگایا جاتا۔

۸۔ جو حرف بولا نہ جائے اس کے نیچے ایک آڑی لکیر لگا دینی چاہیے جیسے خودؔ عبدالحق۔

۹۔ اردو میں ابتدائی حرف ساکن کم آتا ہے۔ جب کبھی ساکن ہو تو اس پر جزم لگانا ضروری ہے۔ جیسے بیاج، بیاہ وغیرہ۔

۱۰۔ سالم الفاظ کو جہاں تک ممکن ہو ملا کر لکھنا چاہیے۔ ممکن کو مم کن لکھنا غلط ہوگا۔ اکثر مرکب الفاظ کو جدا جدا لکھنا مناسب ہوگا مثلاً آئیگا کو آئے گا۔ غیر زبان کے اجزائے سالم جدا جدا لکھے جائیں مثلاً اوکسیجن کو اوک سی جن لیکن تمام اجزا پر ایک خط بھی کھینچنا ضروری ہے تاکہ اجزا کو جدا جدا لفظ نہ خیال کیا جائے۔[1]

مولوی عبدالرحمان خاں کے مضمون کو اردو میں جدید صوتیات کے ورود سے قبل زبان کے صوتیاتی مطالعے اور اس کے مطابق اعراب کے تعین و استعمال کے سلسلے میں ایک زبردست کوشش کہا جاسکتا ہے۔ یہ کام انھوں نے رومن رسم الخط اور دیوناگری رسم الخط دونوں کے مقابلے میں اردو رسم الخط کی کوتاہیوں کو مدّنظر رکھ کر کیا تھا۔ یوں تو خاص خاص موقعوں پر اعراب کے استعمال کے لیے بھی ان کی بعض تجاویز اہمیت سے خالی نہیں ہیں لیکن مضمون کی زیادہ اہمیت صوتیاتی تجزیے کی وجہ سے ہے۔ یہ تجزیہ انھوں نے بڑی پختگی اور گہرائی سے کیا۔ اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ زبان کے ایک جامع تصوّر کا آئینہ دار ہے جس میں ٹھیٹھ اردو / ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی / عربی اور انگریزی الفاظ کو بھی مدّنظر رکھا گیا ہے جو اردو کا حصّہ بن چکے ہیں۔ بس ایک جگہ ان سے یہ چوک ہوگئی ہے کہ بیاج اور بیاہ جیسے الفاظ کے ابتدائی

---

[1] پنجاب ریویو، ستمبر ۱۹۱۰، ص ۱۵ تا ۱۷۔

ن کو ساکن بتایا ہے اور اس پر سکون کی علامت یعنی جزم لگانا ضروری قرار دیا ہے
ن کے بعد بھی کچھ لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ یہ عربی و فارسی
قصور یا فتور نہیں۔ لفظ کی ابتدا میں کسی زبان میں حرف کا ساکن تلفظ ممکن
ہیں۔ اتفاق سے مرزا اوج لکھنوی نے صوتی نقطۂ نظر سے حرف کی صراحت کرتے
ہوئے لکھا ہے:-

"ہر آواز ہونٹ اور زبان کے متحرک ہوتے ہی ایک حرف کی بو
دیتی ہے اور ابتداءً اسی حرف کا نام نکلتا ہے۔ پس محرک آلۂ
نطق سے محال ہے کہ ابتداءً حرف ساکن نکلے اس لیے کہ اول صوت پیدا ہو کر سکون حاصل
ہو، کہ ساتھ اس کے مردم ناطق ہو سکتے ہیں۔ پہلی آواز متحرک تاکہ ساتھ اس کے ابتدائے
نطق کریں اور دوسری آواز ساکن تاکہ اس پر خاموش ہوں"[1]

ہندی میں بھی یہی صورت ہے لیکن دیوناگری میں جو طریقہ اختیار کر لیا گیا ہے اس
کی وجہ سے غلط فہمی ہوتی ہے۔ اردو میں جس 'یے' سے پہلے کے حرف کے
ساکن ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔ اس کو یائے مخلوط مانا گیا ہے۔ انشا نے
بارہ حرفوں کا 'یے' سے مل کر ایک ہو جانا بیان کیا ہے اور بیرتانا "پیوی"
میان اور کیا کی مثالیں دی ہیں[2] بیاج اور بیاہ میں بھی یائے مخلوط ہے۔
اس کے الفاظ کے ہجے میں جزو اول تین حروف پر مشتمل ہوتا ہے۔

مضمون میں تجویز کیا ہوا ایک اعراب یعنی کھڑا زیر بڑا کارآمد ہے۔
یہ اعراب مولوی عبدالرحمان خاں کے زمانے میں آ چکا تھا لیکن اس کا عمل
استعمال مختلف تھا۔ اسے درمیانی یائے معروف کے نقطوں کے نیچے لگایا جاتا تھا
جیسے تحریر، ساول۔ لیکن انھوں نے دوسرے حروف کو بھی اس میں لے لیا۔ اس
طرح یہ یائے معروف کے ساتھ اور یائے معروف کے بغیر دونوں صورتوں میں کسرۂ
حروف کی علامت بن گیا۔ گویا دیوناگری کی بڑی اِی اور چھوٹی اِ کے لیے ایک
علامت بن گئی اور اردو کے معمولی زیر کی آواز علٰحدہ متعین ہو گئی۔ مثلاً میر،
تحریر، لکیر، تجویز۔ آخر، اس، ساکن، نشان وغیرہ۔

مولوی عبدالرحمان خاں کا خیال تھا کہ اگر ان قواعد کی پابندی کی جائے
تو کوئی مبتدی سے مبتدی بھی اردو تحریر کو غلط نہیں پڑھ سکتا لیکن اس

---

[1] قواعد حامدیہ از مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی، بہ تصحیح و اہتمام محمد افضل علی مثّو، شاگرد اوج، اصح المطابع، لکھنؤ، ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۵ء، ص ۱۱، ۱۲۔ بہ شکریہ ڈاکٹر نیّر مسعود جنھوں نے اس کتاب کی مجھے اطلاع دی اور اس کی ضروری کیفیت لکھ کر بھیجی۔

[2] دیکھیے دریائے لطافت مرتبہ مولوی عبدالحق، ص ۸۔

کے ساتھ ہی انھیں یہ احساس بھی تھا کہ ان کی پابندی دقت طلب ہے۔ چنانچہ وہ یہ چاہتے تھے کہ ان پر غور کیا جائے اور مکمل قواعد مرتب کیے جائیں۔ مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں:۔

"اس میں شک نہیں کہ قواعد کی پابندی کرنا دقت طلب ہے اور یہ امید فضول ہے کہ عام طور پر ان کی پابندی ہو سکے گی۔ بعض لوگوں کے نزدیک ایسے الفاظ پر جن کی صورت کا صرف ایک ہی لفظ ہو اعراب لگانا تضیع اوقات سے خالی نہ ہوگا۔ ... تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو تحریر کے لیے مکمل قواعد مرتب کرنے کی سخت ضرورت ہے ... اس امر کا تصفیہ کہ ان قواعد کی پابندی کہاں کہاں کی جائے۔ ہر شخص اپنی ضرورت اور خیال کے مطابق خود کر سکتا ہے۔ موجودہ حالت میں تو یہ دقت ہے کہ اگر کوئی صحیح تلفظ ادا کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا۔"[1]

اردو رسم الخط کو رومن یا دیوناگری رسم الخط کے سانچے میں ڈھالنا غیر ممکن بھی ہے اور غیر ضروری بھی۔ مولوی عبدالرحمان خاں کا یہ لکھنا کہ اس میں کوئی صحیح تلفظ ادا کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا ان احساسات کی ایک انتہائی شکل تھی جن میں معترضین اور اصلاح پسندوں نے پوری ایک صدی سے اہل اردو کو مبتلا کر رکھا تھا۔ محض رسم الخط سے کسی زبان کے ہر لفظ کا صحیح تلفظ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے تلفظ سے واقفیت ضروری ہوتی ہے۔ یہ واقفیت دوسروں سے سن کر، استاد سے پڑھ کر یا لغت سے رجوع کر کے حاصل ہوتی ہے۔ اردو رسم الخط اگر صحیح طور پر سیکھ لیا گیا ہو تو اس میں کوئی ایسی رکاوٹ نہیں کہ لفظ سے واقفیت کے باوجود اسے صحیح نہ پڑھا جا سکے۔ اردو رسم الخط میں مستعمل اعراب کم ہیں لیکن اس سے زیادہ غور طلب بات یہ ہے کہ اعراب کبھی جزو تحریر نہیں ہیں۔ لیکن عام تحریر میں خاص موقعوں پر انھیں جزو تحریر بنایا جا سکتا ہے۔ لسانیات کی کتابوں اور لغات کے لیے مزید علامتیں وضع کی جاسکتی ہیں۔ بہرحال استعمال کہیں بھی کیا جائے اردو رسم الخط کے لیے ایک ہمہ گیر اور جامع نظامِ اعراب مرتب کرنا ناگزیر ہے اور اس کام کے لیے مولوی عبدالرحمان خاں کے اس مضمون سے خاطر خواہ مدد لی جاسکتی ہے۔

---

[1] پنجاب ریویو لاہور، ستمبر ۱۹۱۰ء، ص ۱۷۔

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی
شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونی ورسٹی، بنارس

باغ و بہار کی تدوین جدید

اردو کے نامی گرامی محقق جناب رشید حسن خاں کلاسیکی متون کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں ایک خاص منہج و مسلک کے داعی و علم بردار بھی ہیں اور ساتھ ہی انھوں نے اس کے معیاری و مثالی علمی نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ صرف گفتار ہی نہیں کردار کے بھی غازی ہیں۔

اس سلسلے میں ان کا پہلا عہد آفریں کارنامہ جو منظر عام پر آیا فسانۂ عجائب کی ترتیب و تدوین سے متعلق تھا۔ برصغیر ہند و پاک کے علمی و ادبی حلقوں میں اس کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی اور ابھی اس منفرد اور بے مثال کام پر تحسین و مرحبا کی صداؤں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ اسی نہج اور اسی انداز پر ان کی مرتبہ "باغ و بہار" بھی چھپ کر سامنے آگئی۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ بعض حیثیتوں سے اسے اول الذکر کام پر بھی فوقیت حاصل ہے۔

"باغ و بہار" کا پیش نظر اڈیشن انجمن ترقی اردو ہند، دہلی نے شائع کیا ہے۔ یہ ۸۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اندرونی سرورق اور دوسرے ابتدائی اندراجات کے بعد صفحہ ۱۳ سے مرتب کا مقدمہ شروع ہوتا ہے، جو ۲۳۶ سطروں والے ۲۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ مقدمے کا یہ طول دعض بسیار گوئی اور طول کلامی کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ بڑے اہم اور کارآمد مباحث پر مشتمل ہے۔ اس کے بعض اہم ذیلی عنوانات اس طرح ہیں:

حالات زندگی / باغ و بہار۔ آغاز و اختتام۔ باغ و بہار۔ ترجمہ، تالیف یا تصنیف / امیر خسرو سے منسوب روایت / خطی نسخے / مطبوعہ نسخے۔ قصے کے مآخذ اور بعض دیگر متعلقات۔ باغ و بہار کی نثر۔

ہمارے یہاں تحقیق کے نام پر جب سے "تحقیقی" کا سلسلہ شروع ہوا ہے تحقیقی مقالات اور ان کے مقدمے نمونۂ عبرت بن گئے ہیں۔ کہیں سیاسی و سماجی پس منظر کے نام پر خواہ مخواہ ڈیڑھ سو صفحات سیاہ کر دیے جاتے ہیں اور کہیں مصنف یا شاعر کے حالات زندگی بغیر کسی تحقیق، تفتیش اور ترتیب کے ادھر ادھر سے نقل کر دیے جاتے ہیں اور کیفیت یہ ہوتی ہے کہ: ع نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم

خاں صاحب کا پیش نظر مقدمہ ایسے کم سواد محققین و مصنفین کے لیے تازیانۂ عبرت ہے۔ وہ اپنے موضوع پر

پوری طرح حاوی ہیں۔ میرامّن یا باغ و بہار کے تعلق سے کہاں کہاں اور کیا کیا لکھا ہے؟ وہ اس سے پوری طرح واقف ہیں اور اس پر بھی ان کی بہت اچھی نظر کہ اس تمام بکھرے ہوئے مواد میں کون سا حصہ معتبر و مستند ہے اور کون با اعتبار سے ساقط ہے؟ سو انھوں نے یہ مقدمہ اس طرح لکھا ہے کہ اس کا ہر ایک لفظ نپا تلا اور تحقیق کی کسوٹی پر کسا ہوا نظر آتا ہے۔ صرف ضروری مباحث اٹھائے ہیں۔ بے جا اعادہ و تکرار سے بالکلیہ احتراز کیا ہے۔ اگر معلوم حقا سے تعرض کیا بھی ہے تو اس لیے کہ اس سے متعلق بعض نئے گوشے سامنے جائیں یا کسی غلطی یا غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے۔ لکھتے ہیں:۔

"میرامّن شاعر بھی تھے۔ ان کا تخلّص لطفؔ تھا۔۔۔۔ گنج خوبی کے خطی نسخے کے آخری صفحے کی آخری سطر میں میرامّن نے اپنے قلم سے "میرامّن لطفؔ" لکھا ہے اور باغ و بہار کے آخر میں جو قطعۂ تاریخ ہے، اس کے آخری شعر میں بھی یہ تخلّص آیا ہے:

توکونین میں لطف پر لطف رکھ خدایا بحق رسول کبار

گنج خوبی میں جس قدر اردو اشعار آئے ہیں، وہ ان کی اپنی صراحت کے مطابق میرامّن ہی کے نظم کیے ہوئے ہیں۔ باغ و بہار کے آخر میں جو قطعہ تاریخ ہے، وہ بھی ان ہی کا لکھا ہوا ہے۔ ان کے علاوہ گلکرسٹ کی مرتب کی ہوئی ایک کتاب The strangers infalible East India guide میں ان کی ایک غزل ملتی ہے۔ اس کتاب میں پہلے حافظ کی وہ غزل درج کی گئی ہے جس کا مطلع یہ ہے:

حجابِ چہرۂ جاں می شود غبارِ تنم
خوشش آں دمے کہ ازیں چہرہ پردہ بر فگنم

پہلے اس فارسی غزل کا انگریزی نثر میں آزاد ترجمہ درج کیا گیا ہے۔ اس کے بعد "غزل میرامّن لطفؔ" کی لکھی گئی ہے جو اس فارسی غزل کا ترجمہ ہے۔۔۔۔ اس کا مطلع و مقطع یہ ہے:

ہے اوٹ جلوۂ جاں کی، گلی بدن میرا خدا کرے کہ اڑے خاک ہو یہ تن میرا
اٹھا تو ہستی کو حافظ کی آ کے از رہ لطف کہ کوئی سنے نہ ترے سامنے سخن میرا

ان تفصیلات سے یہ قطعی طور پر متعین ہو جاتا ہے کہ میرامّن نام تھا اور لطفؔ تخلّص تھا۔ اس کے علاوہ جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کی کوئی سند اور کوئی ثبوت موجود نہیں اور بدون ایسی کوئی بات قابل قبول نہیں۔

مجھے صحیح معنی میں تعجب اس پر ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی نے لکھا ہے:
"بعض متاخر کتب میں ان کے دو تخلص بیان کیے گئے ہیں۔ امن اور
لطف۔ لطف تخلص کا استدلال باغ و بہار کے اس شعر سے کیا گیا ہے:
تو کونین میں لطف پا لطف لکھ خدایا بحق رسول کبار
لیکن شعر میں کوئی قرینہ نہیں کہ میر امن کا تخلص لطف قرار دیا
جائے۔ مرزا علی لطف مولف تذکرہ گلشن ہند شاعر تھے اور لطف
تخلص کرتے تھے۔ یہ کلکتے ہی میں مقیم تھے۔ میر امن نے گنج خوبی
کے دیباچے میں ان کے دو شعر دیے ہیں...
قیاس یہ ہے کہ امن نے باغ و بہار میں اسی لطف کا شعر دیا ہے،
اور لطف میر امن کا اپنا تخلص نہیں تھا۔"
[باغ و بہار ایک تجزیہ، نصرت پبلشرز لکھنؤ، ص ۱۸]
اس بیان سے صاف طور سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ میر امن کا تخلص
امن تھا، لطف نہیں تھا۔ جب ایک بار یہ فرض کر لیا گیا کہ لطف
میر امن کا تخلص نہیں تھا، تو پھر یہ بھی فرض کرنا پڑا کہ لطف
بہ طور تخلص جن اشعار میں آیا ہے وہ میر امن کے نہیں ہو سکتے۔
چوں کہ مرزا علی لطف کا نام سامنے تھا، یوں فرض کر لیا گیا کہ
یہ اشعار انہی لطف کے ہیں۔ یہ سب مفروضات ہیں۔ میر امن
کا تخلص لطف نہیں تھا۔ یہ بات قطعی طور پر درست نہیں۔
صحیح صورت حال یہ ہے کہ میر امن کا صرف ایک تخلص لطف تھا
اور جن اشعار کو مرزا علی لطف سے منسوب کیا گیا ہے، وہ سب
میر امن لطف کے ہیں۔" [مقدمہ باغ و بہار، ص ۳۱-۳۲]

یہ مثال خاں صاحب کے مقدمے کی نوعیت، ان کے طریق کار اور انداز گفتگو کو سمجھنے کے لیے کافی ہے، لیکن میں یہاں اس مقدمے کی ایک اور بحث کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جس سے زیادہ بہتر طریقے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خاں صاحب کا ذوق تحقیق کس طرح انھیں نئے دیانوں کی تلاش کے لیے اکساتا رہتا ہے۔

مولوی عبدالحق نے اپنے مرتبہ نسخۂ باغ و بہار کے مقدمے میں میر امن پر یہ اعتراض کیا تھا کہ باغ و بہار اور نوطرز مرصع کے تقابلی مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا ماخذ فارسی چہار درویش نہیں بلکہ نوطرز مرصع ہے۔ لیکن میر امن نے اپنے مقدمے میں نوطرز مرصع کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔

حافظ محمود شیرانی نے میر امن کو اس الزام سے بری الذمہ قرار دیتے ہوئے تحریر فرمایا: "میر امن نے اپنے دیباچے میں نوطرز مرصع کا بحیثیت ماخذ کوئی ذکر

نہیں کیا، مگر اپنی تالیف کے سرورق پر صاف الفاظ میں اس کا اظہار کیا ہے۔"
سرورق کی عبارت یہ ہے: "باغ و بہار تالیف کیا ہوا میر امن دلی والے کا ماخذ اس کا نوطرزِ مرصع کہ وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خاں کا ہے، فارسی قصہ چہار درویش سے۔"

شیرانی صاحب کے اس مُسکت جواب کے بعد مولوی عبدالحق کی بات بے معنی رہ گئی اور عام طور پر یہ تسلیم کر لیا گیا کہ بحث پایۂ اختتام کو پہنچ گئی۔ لیکن جناب رشید حسن خاں کی ژرف بیں نگاہ نے یہاں بھی تحقیق مزید کی گنجایش پیدا کر دی چنانچہ وہ شیرانی صاحب کے بیان پر استدراک کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ صحیح ہے کہ اشاعت اوّل کے سرورق پر منقولہ عبارت موجود ہے۔ لیکن ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ میر امن کی لکھی ہوئی ہے؟ دوسرے لفظوں میں یہ بات کہ کیا سرورق میر امن کا تیار کیا ہوا ہے؟ فورٹ ولیم کالج کی چھپی ہوئی کتابوں کے سرورق عموماً اسی انداز کے ملتے ہیں۔ [مثلاً عتیق صاحب نے اپنی کتاب میں اخلاقِ ہندی طبع اوّل کے سرورق کا عکس چھاپا ہے۔ اس میں اوپر کی دو سطریں اس سرورق کی دو سطروں سے خاصی ملتی جلتی ہیں۔] اگر یہ سرورق میر امن کا بنایا ہوا ہے تو پھر متن میں انھوں نے ایسی عبارت کیوں لکھی، جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ کتاب فارسی قصہ چہار درویش کا براہِ راست ترجمہ ہے؟ اس سلسلے میں کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن ذہن میں سوالیہ نشان ضرور پیدا ہوتا ہے۔" (مقدمہ باغ و بہار ص ۸۲)

مقدمۂ مرتب کے بعد باغ و بہار کا متن سامنے آتا ہے۔ یہ ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس متن کی بنیاد باغ و بہار کے پہلے اڈیشن مطبوعہ ۱۸۰۴ء رکھی گئی ہے۔ کیوں کہ یہ میر امن کا نظرِ ثانی کیا ہوا مکمل متن ہے۔ البتہ تصحیحِ اغلاط، ترجیحات نیز تلفظ اور املا وغیرہ کے تعیّن کے لیے مرتب نے چند اور نسخوں سے بھی مدد لی ہے جن میں سب سے اہم "ہندی مینول" میں شامل باغ و بہار کے ۲۰ صفحات ہیں، جو باغ و بہار کی روایتِ اوّل پر مبنی ہیں۔ خوش قسمتی سے مرتب کو باغ و بہار کے ایک خطّی نسخے کا عکس بھی ہاتھ آگیا، جو ہندی مینول کی طرح باغ و بہار کی روایتِ اوّل کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے ڈنکن فاربس کی مرتبہ باغ و بہار بھی پیشِ نظر رکھی ہے، کیوں کہ ان نے اسے دو اہم قلمی نسخوں کی بنیاد پر مرتب کیا تھا۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ خاں صاحب نے امکانی حد تک ساز و برگ سے پوری طرح آراستہ ہو کر جولان گ

وین میں قدم رکھا ہے اور صحیح ترین متن مرتب کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں ا ہے۔

متن کتاب کے بعد ضمیموں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ دراصل ان ضمیموں ہی سے تب کی جگر سوزی وجاں کاہی اور سلیقۂ ترتیب وتدوین کا اندازہ ہوتا ہے۔ پہلے میمے کا عنوان ہے: "تشریحات، اختلافِ نسخ، انتساب اشعار، افراد، مقامات، مار تمیں"، اس کا سلسلہ ص ۱۵۱ سے شروع ہو کر ص ۲۹۴ تک چلا گیا ہے۔

اس ضمیمے میں اختلافِ نسخ کے اندراجات تدوینِ متن کا کام کرنے والوں کے یے رہنما اصول کا درجہ رکھتے ہیں۔ توضیح اس کی یہ ہے کہ آج کل تدوینِ متن کا طلب یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ایک نسخے کو بنیاد بنا کر اسے من وعن متن کتاب کے ور پر نقل کر دیا جائے اور دوسرے نسخوں کے اختلافات کی نشان دہی حواشی یں کر دی جائے۔ حالاں کہ بعض اہلِ علم کے قول کے مطابق ایسی صورت میں مرتب نتن کی حیثیت کاتب یا ناقل سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ جناب رشید حسن خاں س سہل انگارانہ بلکہ غیر عالمانہ روش کے ہرگز قائل نہیں۔ وہ ایک ایک فظ بلکہ ایک ایک حرف پر غور کرنے کے بعد ہی اسے تن میں جگہ دیتے ہیں۔ ہی نہیں بلکہ اعراب کا بھی تعین کرتے جاتے ہیں اور اختلافِ نسخ کے ذیل میں پنی ترجیحات کی وضاحت کر دیتے ہیں تاکہ تلاش وجستجو اور غور وفکر کی جن منزلوں سے وہ گزرے ہیں، اس سے ان کا باذوق قاری بھی پوری طرح واقف ہو جاتے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ متن کتاب کے ص ۶۷ پر ایک فقرہ س طرح ہے:

"اب اگر اپنی ساری بادشاہت مجھے دے، تو بھی اس پر نہ تھوکوں اور نہ دھر ماروں۔"

مرتب اختلافِ نسخ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"ک، ف، ع: دھر۔ ن: دھار۔ مستعمل دھار مارنا ہے اور بول ن کا متن مرجح معلوم ہوتا ہے، مگر دو باتیں اس کو قبول کرنے میں مانع ہیں: ایک تو یہ کہ کپ اور ف دونوں نسخوں میں اس کی تکرار ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ پلیٹس کے لغت میں یہ لفظ موجود ہے اور مع صراحت۔ چوں کہ اس کا امکان ہے کہ اس زمانے میں یہ لفظ اس طرح بھی مستعمل رہا ہو (اور یہ امکان کچھ بعید از قیاس نہیں، بہت سے لفظوں کا یہ احوال ملتا ہے) پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ لفظ ایک فقیر کی گفتگو میں آیا ہے (اور اس زمانے کے (اور اس زمانے کے بھی) ایسے فقیروں کی بات چیت میں بہت سے استعمالِ عام سے مختلف

ملتے ہیں۔ ان وجوہ سے میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ اسے بدل دیا جائے اور اس کے بجائے "دھار" لکھا جائے۔ ن کے نسخے کا کاتب جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، خاصا بے احتیاط ہے اور اس نے بہت سی غلطیاں بھی کی ہیں۔ اس بنا پر کسی ثبوت یا واضح قرینے کے بغیر ک اور ف پر اس کو ترجیح دینا تقاضائے احتیاط کے خلاف ہوگا۔" (ص ۳۱۰-۳۱۱)

دوسرا ضمیمہ "تلفظ اور املا" سے متعلق ہے۔ یہ ۲۲۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ درحقیقت یہ ضمیمہ تدوینِ متن کے سلسلے میں مرتب کی غایت درجہ کد و کاوش کا آئینہ دار ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مرتب نے اس کے مندرجات کے ضمن میں اپنے برسوں کے مطالعات کا عطر کشید کر کے رکھ دیا ہے۔ چنانچہ یہ طلبہ سے زیادہ اساتذہ کے لیے قابلِ مطالعہ اور لائقِ استفادہ ہے۔ ذیل میں اس کے بعض اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

"تئیں (صفحہ ۸) نظم میں "تئیں" بروزنِ فَعَل اور "تئیں" بروزنِ فِع دونوں طرح ملتا ہے، اور یہ استعمال پرانے شعرا کے یہاں بالعموم ہے: درد ؎
ہم اس کو تو سمجھائیں گے ؛ اپنے تئیں آپ بھی سمجھائیے گا۔ نہیں
میرے تئیں کسی کا باک ؛ اب گریباں، ہاتھ ہے اور چاک میر امن نے بھی گنجِ خوبی میں اسے دونوں طرح نظم کیا ہے، صرف ایک مثال
اگرچہ تیرے تئیں مرتبہ ملا لیکن ؛ تو اس کے درجے سے رکھ اپنے دل میں اندیشہ (چالیسواں باب) جو کوئی جان کو عزیز رکھے ؛ بادشاہت سے اس کے تئیں کیا کام۔ اصل لفظ تئیں ہے اور تئیں کو ضرورتِ شعری سمجھنا چاہیے۔ ک میں تو اس لفظ پر اعراب موجود نہیں، مگر ف میں تئیں ہے اور اس کی فرہنگ میں اسے TAIN لکھا گیا ہے، اس سے تلفظ کا تعین پوری طرح ہو جاتا ہے، اسی نسبت سے اس لفظ کو (نثر میں) ہر جگہ یائے معروف لکھا گیا ہے۔ ضمنی طور پر اس لفظ کے سلسلے میں ایک دلچسپ بات کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا۔ آصفیہ میں "تئیں" کے ذیل میں لکھا گیا ہے:
"اس لفظ پر ایک مرتبہ ایک لکھنوی صاحبِ زبان اور حضرتِ غالب کے درمیان ایک عجیب لطیفہ سرزد ہوا۔ دہلی میں "اپنے تئیں" "آپ کو" کی بجائے بہت بولا جاتا تھا، لیکن لغت تراشانِ لکھنؤ نے اسے بالکل ترک کر دیا تھا اور اس کی بجائے "آپ کو" ترجیح دیتے تھے۔ حضرتِ غالب سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک لفظ "اپنے تئیں" بہتر ہے یا "آپ کو"؟ انھوں نے جواب دیا کہ: میں تو آپ کو حقیر، ذلیل، نالائق، نابلد سمجھتا ہوں۔ کسی اور سے بھی مشورہ لیجیے کہ ایسے موقع پر "اپنے تئیں" خوش نما ہے یا لفظ "آپ کو"؟ میرے نزدیک

"۱۰ اپنے آپ کو" کہنے سے یہ سقم نکل جاتا ہے۔" یہ لطیفہ صاحب فرہنگ آصفیہ نے (شاید) خود تراشا ہے، لیکن ان مرحوم کو معلوم نہیں تھا کہ "تئیں" کو مرزا غالب اپنے ایک خط میں "قبیح" اور "غیر فصیح" لکھ چکے ہیں:
"تئیں کا لفظ متروک اور مردود، قبیح، غیر فصیح۔ یہ پنجاب کی بولی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے لڑکپن میں ایک اصیل ہمارے یہاں نوکر رہی تھی، وہ "تئیں" بولتی تھی تو بیبیاں اور لونڈیاں سب اس پر ہنستی تھیں۔" اس پر محاکمہ کرتے ہوئے قاضی عبدالودود صاحب نے اپنے طویل مقالے "غالب بحیثیت محقق" میں بجا طور پر لکھا ہے کہ "تاریخی حیثیت سے یہ بالکل غلط ہے کہ غالب کے لڑکپن میں اس کے استعمال پر لونڈیاں تک ہنستی تھیں" (نقد غالب، ص ۵۳۰) مزید تفصیل کے لیے اس مقالے کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عہد غالب میں بھی فصحائے دہلی کی تحریروں میں یہ لفظ برابر ملتا ہے اور اس سے پہلے تو بالعموم مستعمل تھا [ہاں اب یہ لفظ تحریروں میں نظر نہیں آتا]" (ص ۴۴۵-۴۴۶)

یہ بحث قدرے طویل تھی۔ ایک مختصر اندراج بھی ملاحظہ ہو:
"بہزاد (ص ۲۱۳) ک اور ف میں ب کے نیچے زیر موجود ہے۔ یہ لفظ اس کتاب میں ۱۰ بار آیا ہے [ک ص ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵ (چار بار) ۲۱۶، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹] اور ہر جگہ ک (و ف) میں ب کے نیچے زیر موجود ہے۔ اس کی مطابقت اختیار کی گئی ہے۔ یہ صراحت یوں خاص کر کی کہ بول چال میں عام طور پر یہ لفظ اس طرح سننے میں آتا ہے جیسے ب پر زبر ہو، مگر اس میں لہجے کی کارفرمائی کا دخل نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ نور میں اسے بکسر اول ہی لکھا گیا ہے۔ اصل کے لحاظ سے بھی بہ کسر اول ہے۔ [برہان قاطع، مرتبہ ڈاکٹر معین، حاشیہ ۳۲۶، جلد اول]۔" (ص ۴۱۹)

تیسرے ضمیمے کا عنوان ہے "الفاظ اور طریق استعمال"۔ یہ ص ۴۱۹ سے شروع ہو کر ص ۴۲۶ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ ضمیمہ میرامن کی نثر پر کام کرنے والوں کے لیے خاص طور پر مفید ہے۔ اس میں میرامن کے استعمال کردہ مفرد و مرکب افعال، جملوں اور ان مفردات و مرکبات کو جمع کر دیا گیا ہے، جو کسی نہ کسی وجہ سے قابل توجہ ہیں۔
چند مثالیں ملاحظہ ہوں:
آپس میں بتیاتے ہیں ص۲۳۳ ۔ ننگیالیں گے ص۱۵۶ ۔ خبر گیری میں ضیافت کی

لگ رہی ہے ص۳۷ - چراغ کو گُل کسا یا ص۱۹۱ - اتنے روپے بالفعل سرانجام نہیں ہو سکتے ص۵۲ - کیوں ایسی کچی ہوس پکائی ص۲۷ - اس گمنام کا نام بیدار بخت کہتے ہیں ص۷۷ - سارے ڈیل میں زبان حلال ہے ص۲۷ - عبح غیزے ص۱۰۱ - نمک پروردے ص۱۳ - پھانکڑے ص۲۲ - دیدارو، ص۲۲ شتا ہو ص۱۳۰، الاق ص۱۰۱ پلشت ص۷۵ - مشقاب ص۷۷

ان ضمیموں کے بعد ۶۵ صفحات پر مشتمل ایک مفصل اور جامع فرہنگ ہے۔ یہ بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے مرتب کی گئی ہے۔ روایتی فرہنگوں کے خلاف اس میں ان الفاظ کو شامل کیا گیا ہے، جو کسی نہ کسی لحاظ سے قابل تشریح یا قابل ذکر ہیں۔ آخر کتاب میں ایک مختصر سا اشاریہ بھی ہے۔ یہ صرف متن کتاب کے اشخاص اور مقامات کا احاطہ کرتا ہے۔

آخر میں بعض امور کی جانب مرتب کی توجہ دلانا نامناسب نہ ہوگا:

ص ۵۹ (گریباں) مرتب نے متن کتاب میں گ پر زیر لگایا ہے اور ضمیمے میں (ص ۵۵۹) صاحب 'بہار عجم' کے حوالے سے لکھا ہے:

"بالکسر" - یہ درست ہے کہ فارسی میں یہ لفظ بکسر اول ہے۔ لیکن جہاں تک اردو کا تعلق ہے، زبانوں پر بالعموم بالفتح رائج ہے۔ ہاں اگر میرامن نے اسے بالکسر لکھا ہو تو الگ بات ہے۔ لیکن ضمیمۂ تلفظ اور املا میں جہاں اس لفظ پر بعض دوسری حیثیتوں سے گفتگو کی گئی ہے، ایسی کوئی وضاحت نہیں ملتی۔

ص ۷۶ (بُستَر) [بچھر میں نے گیر وا بُستَر بہن] مرتب نے بضم اول وسوم "بُستُر" لکھا ہے۔ پلیٹس نے اس کے دو تلفظ درج کیے ہیں، ایک تو بُستُر، دوسرے بَستَر، مرتب کو ضمیمۂ تلفظ اور املا میں ثانی الذکر کی وجہ ترجیح بیان کرنی چاہیے تھی۔

ص ۸۱ (بُشرہ) [میرے بُشرے کو دیکھ کر وہ محلی بولا] ضمیمۂ تلفظ اور املا میں (ص ۵۱۴) مرتب نے وضاحت کی ہے کہ صاحب نوراللغات نے ... کے بارے میں لکھا ہے کہ: "عموماً زبانوں پر بالضم ہے۔" اس کے برخلاف صاحب آصفیہ نے بفتح اول، "بَشرہ" لکھا ہے اور عربی میں اس کا تلفظ بفتح اول ودوم "بَشَرہ" بتایا ہے۔ مرتب نے آصفیہ کے اندراج کو ترجیح دیتے ہوئے متن کتاب میں (ص ۸۱) ب پر زبر لگایا ہے۔ لیکن راقم کے خیال میں اردو کے استعمال اور چلن کی بنیاد پر نوراللغات کا اندراج مرجح ہے۔

ص ۱۵۲ - [محمد الرسول اللہ] متن کتاب میں اسی طرح لکھا ہوا ہے لیکن "رسول اللہ"

بغیر الف لام کے لکھنا چاہیے۔ اگر باغ و بہار کے مطبوعہ اور قلمی نسخوں میں "الرسول اللہ" ہی لکھا ہوا ہے، تو مرتب کو ضمیمۂ تشریحات میں اس پر ایک نوٹ لکھ دینا چاہیے تھا۔

ص ۱۸۱ (النگ) [ایک آن دیکھا سبت بلند، تمام پتھر کا، اور یہ ایک النگ اس کی دو دو کوس کی] النگ کے تحت فرہنگ میں لکھا گیا ہے: "اس کے معنی ہیں پہلو، سمت، طرف۔ یہاں مراد ہے قلعے کی دیوار" (ص ۲۴۳) مرتب نے یہاں اس پر غور نہیں کیا کہ "النگ" کے معنی اگر پہلو، سمت اور طرف کے ہیں تو میر امن نے اسے قلعے کی دیوار کے معنی میں کیوں کر استعمال کر لیا؟ حقیقی اور مرادی معنوں کے درمیان کسی قریبی مناسبت کا پایا جانا ضروری ہے اور وہ یہاں مفقود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ النگ جس طرح پہلو، سمت اور طرف کے معنی میں آتا ہے، اسی طرح پشتہ، پناہ اور شہر پناہ کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔ لیکن اول الذکر معنوں میں یہ لفظ ہندستانی ہے اور ثانی الذکر معنوں میں فارسی۔ اب جہاں تک میر امن کی محولہ بالا عبارت کا تعلق ہے، تو اس میں لفظ "النگ" میری رائے میں ہندی نہیں بلکہ فارسی ہے اور اپنے حقیقی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ فارسی "النگ" کے تحت صاحب برہان لکھتے ہیں:

"بفتح اول بروزن پلنگ، بمعنی پناہ و دیوارے باشد کہ بواسطۂ گرفتن قلعہ و محافظت خود سازند" اسی طرح غیاث اللغات میں ہے:

"بفتحتین بمعنی دیوار مورچال قلعہ گیری۔"

شیر علی افسوس نے بھی "آرائش محفل" میں اس لفظ کو میر امن ہی کے سیاق و سباق میں استعمال کیا ہے۔ "شہر پناہ اس کی خام مگر دریا کی طرف النگ خشتی ہے" (آرائش محفل، مجلس ترقی ادب، لاہور۔ ص ۱۶۲)

جرأت اور ناسخ کے یہاں بھی یہ لفظ آیا ہے اور فارسی معنوں ہی میں مستعمل ہے:

رگاوے گھر کی مرے، سر النگ پر تصویر (جرأت)
یہ آرزو ہے کہ اب اس کی کھینچ کر کوئی

سدِ سکندر ایک ایسی ہی کی النگ ہے (ناسخ)
آئینہ خانۂ دل حیراں ہے کیا وسیع

ص ۲۱۲ (بہ جنس) [اس نے اپنے دل کا مدعا جس کی تلاش میں آئی تھی بہ جنس پایا]

ص ۲۴۵ (" ") [جس بادشاہ یا شہنشاہ کے یہاں فرزند پیدا ہوا ہو، اس کو بہ جنس احتیاط سے جلد اٹھا کر لے آؤ۔]

لفظ "بہ جنس" اوپر کے دونوں جملوں میں آیا ہے۔ لیکن اس پر کسی ضمیمہ میں کوئی

گفتگو نہیں کی گئی۔ حالاں کہ اس کی ضرورت تھی۔ کیوں کہ عام طور پر مستعمل لفظ "بجنسہٖ" ہے۔ لہٰذا مرتب کو بتانا چاہیے تھا کہ "بہ جنس" کا استعمال صرف میر امّن نے کیا ہے، یا دوسروں کے یہاں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

ص ۲۷۳ (ساق عروس) مرتب نے اس کے تحت فرہنگ میں لکھا ہے "ایک طرح کی مٹھائی (ع) تفصیل میں معلوم نہیں کر سکا۔" لیکن غیاث اللغات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ولایتی یعنی ایرانی مٹھائی تھی۔ [نوعے از شیرینی ولایت] اور پلیٹس کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک قسم کی میٹھی روٹی ہوتی تھی۔ [A Sort of Sweet Bread]

ص ۲۷۵ (سنگ سار کرنا) اس کے تحت فرہنگ میں لکھتے ہیں: "یہ شرعی سزا تھی.... الخ" یہاں "تھی" کے بجائے "ہے" لکھنا مناسب تھا۔ کیوں کہ یہ سزا اب بھی برقرار ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ حُدود شرعیہ میں کوئی تبدیلی ہو بھی نہیں سکتی۔ اور اگر مراد اس کا نفاذ ہے تو بعض اسلامی ممالک میں یہ نافذ العمل بھی ہے۔

باغ و بہار کی پیش نظر فرہنگ میں متعدد امثال و محاورات درج ہونے سے رہ گئے ہیں مثلاً:

مٹی نہیں کرم کی رکھیا ص۵۹۔ جیسی روح ویسے فرشتے ص۵۸۔ جب تلک سانس ہے تب تلک آس ہے ص۶۶۔ ایک خطا دو خطا تیسری خطا مادر بہ خطا ص۱۱۷۔ کتّے کی دم بارہ برس گاڑو تو بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہے ص۱۱۷۔ سائیں تیرے کار نے چھوڑا شہر بلخ ص۲۹۔ سفر کی عمر کوتاہ ہوتی ہے ص۲۱۵۔ گھگھی بندھ جانا ص۹۹، آبرو رکھنا ص۱۴۳، آڑے آنا ص۱۴۳۔ رگا رگا نا ص۱۵۹۔ ہوائیاں اُڑنا ص۲۴۔ سوکھے دھان میں پانی پڑنا ص۲۱۵۔

میر امّن نے بعض الفاظ رائج الوقت معنوں سے ہٹ کر استعمال کیے ہیں، ان کی نشان دہی بھی ضروری تھی۔ مثلاً: پاؤں بھاری ہونا: بمعنی چلنے سے معذور ہونا۔ [نہ بولنے کی قدرت، نہ چلنے کی طاقت۔ مُنہ میں گھگھی بندھ گئی پاؤں بھاری ہو گئے۔ ص۹۹] میاں: بمعنی آقا، مالک [کتّے کی اس حرکت سے الہام ہوا کہ اس کا میاں مقرر اس غار میں گرفتار ہے۔ ص۱۲۵۔)

دریافت کرنا: بمعنی سمجھ جانا [سوداگر بچے نے دریافت کیا کہ اب یہ دام میں آیا ص۲۲]

بعض ایسے الفاظ بھی فرہنگ میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں، جو کسی نہ کسی وجہ سے قابل توضیح تھے مثلاً بھید و ص۱۱۵ گھڑ کا ص۹۳۔ ڈنڈ مچایا ص۱۱۱، بھنبھر ۱۲۹، گھونگھٹ چڑھی ص۱۵۱، جُوا ا ص۱۵۹، جنکار، ص۱۵۹ [illegible]

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ ضمیمہ ۳ "الفاظ و طریق استعمال" کے مندرجات بصورت موجودہ کسی خاص ترتیب کے پابند نظر نہیں آتے۔ انھیں زیادہ بہتر طریقے سے مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

خاتمۂ کلام کے طور پر اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ جناب رشید حسن خاں نے 'فسانۂ عجائب' اور 'باغ و بہار' کی عالمانہ ترتیب و تدوین کے ذریعے ایک طرف تو ان کتابوں کی خدمت کا حق ادا کر دیا ہے اور دوسری جانب کلاسیکی متون کی تدوین کا ایک ایسا بلند معیار قائم کر دیا ہے، جس کے قریب تک جا پہنچنا بھی ہم جیسوں کے لیے بہت مشکل نظر آتا ہے۔ ہم دست بدعا ہیں کہ توفیق الٰہی ان کا ساتھ دے اور وہ اپنے آیندہ عزائم کے مطابق، قصائد سودا، سحر البیان اور گلزار نسیم بھی اسی انداز پر مرتب کریں۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی اہم کتابیں

پہچان اور پرکھ — پروفیسر آل احمد سرور

اس مجموعے میں پروفیسر آل احمد سرور کے جو مضامین شامل ہیں ان کا تعلق زیادہ تر شاعروں اور شاعری کی خصوصیات سے ہے میر، غالب، انیس، حسرت، فانی، جوش اور فراق کی شخصیات اور شاعری پر بھرپور مضامین کا اہم مجموعہ۔ قیمت: ۵۱/-

ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم
ڈاکٹر سلامت اللہ

اس کتاب میں مسلمانوں کی تعلیم کے جن مسائل کی نشان دہی کی گئی ہے وہ مصنف کے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اس لیے کہ اس کے تاریخی اور حالیہ شواہد موجود ہیں۔ ماہر تعلیم ڈاکٹر سلامت اللہ کی اہم ترین تصنیف۔
قیمت: ۵۱/-

اقبال کا نظریۂ خودی — عبدالمغنی

اس کتاب میں نظریۂ خودی کو مرکزی نقطہ فرض کر کے اقبال کے پورے نظام فکر کی تلاش کی گئی ہے تاکہ ایک طرف دنیا کی سب سے بڑی شاعری کی حقیقی جہت واضح ہو اور دوسری طرف آج کی انسانیت کو اپنے ارتقا کی صحیح سمت دریافت کرنے میں سہولت ہو۔ قیمت: ۱۵۰/-

پت جھڑ کی آواز — قرۃ العین حیدر

برصغیر کی ممتاز ترین افسانہ نگار قرۃ العین حیدر کی اہم کہانیوں کا مجموعہ۔ یہ کہانیاں دلچسپ بھی ہیں اور زندگی کی صحیح عکاسی بھی کرتی ہیں۔ نیا اڈیشن قیمت: ۷۵/-

جدید افسانہ اور اس کے مسائل — وارث علوی

اردو کے ممتاز نقاد وارث علوی کے تنقیدی مضامین کا تازہ ترین مجموعہ جدید اردو افسانہ کے متعلق ایک اہم دستاویز۔ قیمت: ۳۶/-

لکھنؤ تہذیب کا نمائندہ شاعر

قلندر بخش جرأت (خطبہ) — جمیل جالبی

اردو کے نامور عالم اور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک نہایت اہم خطبہ جو موصوف نے ۸ نومبر ۱۹۸۹ء کو ڈاکٹر سید عابد حسین میموریل ٹرسٹ کے سمینار میں پیش کیا۔
قیمت: ۱۰/-

غبار منزل (شعری مجموعہ) — غلام ربانی تاباں

اردو کے ممتاز شاعر جناب غلام ربانی تاباں کی غزلوں، نظموں اور قطعات کا تازہ مجموعہ جس میں "ساز لرزاں"، "ذوق سفر" اور "نوائے آوارہ" کا انتخاب بھی شامل ہے قیمت: ۴۵/-

تاریخ اودھ — قاسم علی نیشاپوری

"تاریخ اودھ" معروف بہ "تاریخ شاہیہ نیشاپوریہ" اودھ کی اہم تاریخ ہے۔ قاسم علی نیشاپوری نے اسے فارسی میں لکھا تھا ڈاکٹر شاہ عبدالسلام نے نہایت محنت سے اس کو اردو کا جامہ پہنایا۔ قیمت: ۲۷/-

فی الحقیقت — یوسف ناظم

طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں یوسف ناظم کو اہم مقام حاصل ہے۔ ان کی تحریریں نہایت ذوق و شوق اور توجہ سے پڑھی جاتی ہیں۔ "فی الحقیقت" آپ کے تازہ ترین طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔
قیمت: ۴۵/-

شاہنواز فاروقی
۳-B الامین اپارٹمنٹ، ایف ایل ۲- بلاک ۷
نارتھ ناظم آباد- کراچی (پاکستان)

عشق اپنے اثر کے بعد بھی تھا
ایک سایہ شجر کے بعد بھی تھا

زندگی میں وہ موڑ آیا تھا
جو کہ اس رہگذر کے بعد بھی تھا

حادثہ صرف بال و پر تک تھا
واقعہ بال و پر کے بعد بھی تھا

وہ سکوں تھا تری رفاقت میں
جو کہ دیوار و در کے بعد بھی تھا

تجھ کو کھویا تو یہ ہوا محسوس
جیسے کچھ خیر و شر کے بعد بھی تھا

سُہیل فاروقی
۱۲/۱۷۷ ذاکر نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

ہجوم شوق میں ہر گام سے گزر جانا
کہ جس نے اپنا نہ جانا اُسی پہ مر جانا
یہ آ رہی ہے صدا دشتِ خار سے اب تک
ان آبلوں کا کبھی احساں اُتار کر جانا
رکھے ہیں داغ تمہارے سنبھال کر جاناں
جو ہو سکے تو یہ غنچے شمار کر جانا
گمانِ ہجر سے دو پَل اُداس ہو رہنا
خیالِ وصل جو چھیڑے تو پھر سنور جانا
وہ جس کی شانِ کریمی نے ہاتھ تھام لیے
نہ دیکھ پایا دعاؤں کا بے اثر جانا
پھر اس کے بعد نگاہوں میں خاک تھی ہر شے
کہ ہم نے صرف ترے غم کو معتبر جانا
جو پیڑ دھوپ کے تیروں سے دے رہا تھا اماں
اُسی کو سارے زمانے نے بے ثمر جانا

اختر شاہجہانپوری
رنگین چوپال۔ شاہجہاں پور۔ یوپی

ہم نے نوحہ جو کبھی اپنی صدی کا لکھا
لوگ سمجھیں گے کہ ہر لفظ وحی کا لکھا

اس کو موسم کے بدلنے کی خبر دی لیکن
بھول کر حال نہ اپنے کبھی جی کا لکھا

ریگِ ساحل پہ مرا نام ہی تابندہ ہے
اُس نے لکھنے کو مگر نام سبھی کا لکھا

اِن چراغوں میں مرے دل کا لہو جلتا ہے
خوب پڑھ لیتا ہوں میں تیرہ شبی کا لکھا

میری آنکھوں نے مرے غم کی نمائش کر دی
مٹ گیا جب بھی کوئی لفظ خوشی کا لکھا

میری رسوائی کا باعث ہوا یہ بھی اختر
میری پیشانی پہ احساں تھا کسی کا لکھا

حسن بن جمیل مرزا
کازمو پولیٹن اسکول سعد پورہ
پوسٹ رمنہ، مظفر پور
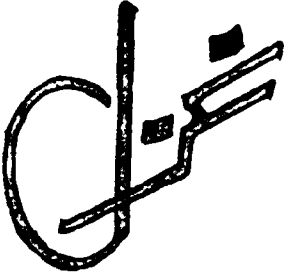
ہر ایک سمت بہاروں کا سلسلہ ہوگا
اور انتظار میں میرے کوئی کھڑا ہو

مجھے گماں بھی نہ تھا مجھ کو دے گیا جو فر
وہ ہوگا دوست مرا، میرا آشنا ہو

اسی فریب میں مرتا نہیں وہ بوڑھا شخ
کہ اس کا لاڈلا سرحد سے آ رہا

سیاہ رات، الاو، چراغ، چیخ پکا
کہیں پہ خانہ بدوشوں کا قافلہ

میں سند باد ہوں عصرِ رواں کا اے
مجھے بھی کوئی سمندر بلا رہا

نسیم عزیزی
۳۴ بیلیلیس روڈ
ہوڑہ مغربی بنگال
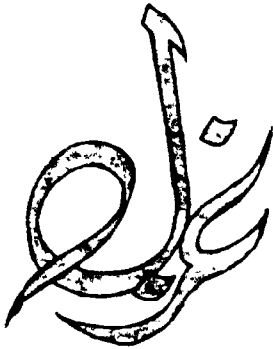
حقیقت آشنائی سے جو اس کا سابقا ہوگا
نگاہوں میں اُجالوں کا عجب اِک سلسلا ہوگا

چلو مانا کہ وہ خاموشیوں کا اِک سمندر ہے
مگر اس کا تبسم خامشی کو کاٹتا ہوگا

میرے قد کا وہ اندازہ لگائے کیا بلندی سے
سمجھ میں بات آئے گی مقابل جب کھڑا ہوگا

فصیلیں نفرتوں کی توڑ ڈالی تو حریفوں نے
خبر ہے گرم اس میں بھی کچھ ان کا فائدہ ہوگا

ہے راہِ شوق میں سب سے جُدا شیوہ نسیم اپنا
رواں لیکن مرے ہی نقش پا پہ قافلا ہوگا

شاہد میر
گورنمنٹ کالج بانسواڑہ راجستھان

شگوفے، برگ و ثمر سب نشیب میں آئے
درخت موج ہوا کے قریب میں آئے

بکھر کے رہ گئے سارے خلوص کے رشتے
کھنکتے سکے جو لوگوں کی جیب میں آئے

نگر میں پیار دلوں میں جو اتفاق بڑھا
ہنر تمام نظر میرے عیب میں آئے

تمام بکھرا ہوا ہو نہ جسم کے اندر
نظر جو پیراہنِ دیدہ زیب میں آئے

ظہیر رحمتی
رحمت منزل، مدرسہ کہنہ، ہیل روڈ
رامپور (یوپی) ۲۴۴۹۰۱

آزاد نظم

بھٹکی ہوئی منزلیں

بھٹکتے ہوئے راستے کے مسافر کو
سوکھے شجر نے
محبت سے آواز دے کر بڑے پیار سے یہ بتایا
کہ
جلتی ہو دوپہر میں مکانوں سے باہر نکلنا
بڑا احمقانہ قدم ہے
چلو جاؤ
گھر لوٹ جاؤ
پہنچنا ہے منزل پہ تم کو
تو شب میں سفر پہ نکلنا
بے آواز قدموں سے چلنا
تمھیں رات کو
منزلیں سب یہی پر بھٹکی ملیں گی

وقیع منظر
شاہجہاں منزل این۔ آر۔ آر روڈ
آسنسول ۷۱۳۳۰۲

غزل

اُگے ہیں کیسے اب شجر
نہ جن میں گل نہ ہیں ثمر

زباں پہ جس کے حق ہی حق
لٹک گئے وہ دار پر

وصالِ یار تو بہ لو!
نصیبِ دشمناں مگر

تمھیں بلندیاں ملیں
ملے مجھے بھی بال و پر

مجھے جہاں کی سختیاں
ملیں بنامِ راہبر

پیامِ منظرِ حزیں
پہنچ گیا نظر نظر

انتخاب عالم

لد خلیل غربی، باری مسجد، شاہجہاں پور

کرب کی تنہائی

کے چپکے بدن چیرائے
ب شام چلی آئے
د ماضی بن کر شمع
ہن کے نہاں خانوں میں
جالا کر دے
لبستر
سویر بدل جائے
لیوں کا چٹکنا پھولوں کا مہکنا
ہ سہانے منظر بہاروں جیسے
رے ہمدم میرے دوست
نہ تھا غم خوار کوئی، ہم راز کوئی
رے سوا
سم کا نہیں ٹھکانا کوئی
ے رت سمے لمحہ جیسے
سایہ کیا ہے اور کیسا
ے پاؤ میرے سرہانے
ترین دوست وہ کتاب تھی
جیون ساتھی تھی
لے گیا کوئی
یں ___ وہی
وقت نزع میں نے آسمان دیکھا تھا
ا بے رحم موسم تھا
س کے بعد
جب شام چلی آئے
اور
مجھے احساس دلائے
اُف
یہ کرب تنہائی

سیفی سرونجی

سرونج ۴۶۴۲۲۸

دوہے

میں ہوں اک ذرہ مگر اونچی میری ذات
میرے آگے کچھ نہیں تاروں کی اوقات
جس کو چاہے تو ستا، جس کو چاہے لوٹ
لیکن اتنا سوچلے دل نہ جائے ٹوٹ
آنکھوں میں ہے اک چمک ہونٹوں پہ مسکان
میرے جلنے کی اسے اچھی ہے پہچان
چلتا ہے تو چل مگر اتنی کرلے جانچ
خودداری پر بھول کر آئے کبھی نہ آنچ
کیسا ہر دم شور ہے کیسی چیخ پکار
دو دن کی ہے زندگی ہنس کر اسے گزار

قسیم سہسرامی
پرنسپل سر اقبال اکیڈمی
پیرو ضلع بھوجپور (بہار)

چمن میں کہیں گلفشانی نہیں ہے
شجر خشک ہیں اور پانی نہیں ہے

زمانے کے ظلم و ستم بڑھ رہے ہیں
لبوں پہ مگر نوحہ خوانی نہیں ہے

ہیں میخانے آباد شہروں میں ہر سو
مگر نشۂ ارغوانی نہیں ہے

زمانے کی تہذیب کا ہے تقاضا
وہ تصویر دو جو پرانی نہیں ہے

بدلتا رہے جو قسیم اپنا چہرہ
وہ کم ظرف ہے کوئی گیانی نہیں ہے

شاہد احمد سحر
محلہ خلیل غربی - شاہجہاں پور - یوپی

دل میں نازاں ہیں کہ ہم سا ستم ایجاد نہیں
پھر یہ دعوا ہے کہ ظالم نہیں جلاد نہیں

کس قدر رُو بہ زوال آج ہیں اقدارِ کہن
اور انساں کے لبوں پر کوئی فریاد نہیں

کل کی ہر بات مرے دل پہ ہے پتھر کی لکیر
خوش رہیں آپ! اگر آپ کو کچھ یاد نہیں

زینتِ صفحۂ قرطاس ہوں اشعار نہ ہوں
ذہن و دل آج مرا فکر سے آزاد نہیں

ہم کو بھی کون سی مر جانے کی جلدی ہے سحر
آزمائش کی نہ ہو جو کوئی میعاد نہیں

احساس آفاقی
م نمبرو چال نمبر۸ بی بلاک
ڈ بابھاوے نگر کرلا بمبئی ۷۰

رفانِ حق ہی ٹھہرا جب مُدعا ہمارا
نقصان ہی میں ہوگا اب فائدا ہمارا

دیر و حرم سے کہہ دو ناراض ہوں نہ ہم سے
لے آیا ہم کو آگے ذہن رسا ہمارا

کرتے کہاں ہیں یارو ہم اپنا کام خود ہی
کیا کارساز ہوگا، واعظ! خدا ہمارا

دیر و حرم سے آگے ہے منزل حقیقت
احساس! کوئی روکے کیوں راستا ہمارا

شریف قریشی
۱۲، صوسہ منڈی۔ فتح گڑھ۔ ضلع فرخ آباد (یوپی)

امانت
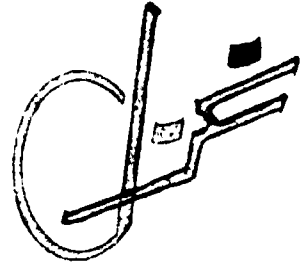
مجھے گُلاب نہ دو
بساطِ رنگ ہمیشہ سجی نہیں رہتی
یہ بھینی بھینی سی خوشبو
کبھی ہمارے لیے اجنبی نہیں رہتی
جو رنگ و نکہت و رعنائی کو اسیر کرے
یہ قاعدہ ہے وہ زنجیر ہی نہیں رہتی
طلب کیا جو کبھی تم نے مجھ سے پھول اُپنا
یہ تازگی یہ صباحت یہ آشنا خوشبو
رچی بسی ہے جو ہر پنکھڑی کے دامن میں
کہاں سے ڈھونڈھ کے لاؤں گا میں کہ لوٹاؤں
تمھیں تمھاری امانت جو تم نے سونپی تھی
امانتیں ہیں کسی وقت بھی طلب ہو جائیں
بڑے عجیب تقاضے رہیں جانے کب ہو جائیں

رضی الدین رضیؔ
۸۳۷، جلیل آباد کالونی
ملتان (پاکستان)

پہلے جس کی زد میں تھا پھر سے اُسی کی زد میں ہوں
لمحہ لمحہ ٹوٹتا ہوں ریزگی کی زد میں ہوں

اک مسلسل بے ثمر آوارگی کی زد میں ہوں
ایک مدت سے میں اپنی زندگی کی زد میں ہوں

روشنی ہوں روشنی کا ہی مجھے ہے سامنا
آدمی ہوں اپنے جیسے آدمی کی زد میں ہوں

دل میں خواہش تھی کہ پورے چاند کو دیکھوں کبھی
چاند نکلا ہے تو اب میں چاندنی کی زد میں ہوں

ایک دن دیکھی تھی میں نے رقص کرتی روشنی
بس اسی دن سے رضیؔ میں تیرگی کی زد میں ہوں

عظیم الدین عظیمؔ
دھرم پور، پوسٹ، بہاپور، بردوان

ایک سہانا منظر بکھرا ہوتا ہے
بادل جب جب سبزہ کا مُنہ دھوتا ہے

خالی کٹورا[1] بھوکا بچہ روتا ہے
ماں سے پوچھو درد دل کیا ہوتا ہے

جس کو میں نے پھول دیا تھا تحفے میں
میری راہوں میں وہ کانٹے بوتا ہے

جانے کیوں اُس رُت میں ہمدردوں کا اب
اک اک جملہ دل میں خار چبھوتا ہے

بیداری منسوب تھی جس کی ذات سے وہ
بے خبری کی گہری نیند میں سوتا ہے

اب تو بچپن میرا دل بہلائے گا
اب تو میرے ساتھ بھی ناتی پوتا ہے

دیتا ہے جب کوئی دلاسہ مجھ کو عظیمؔ
اپنا سینہ دو دو گز کا ہوتا ہے

---

[1] میں نے برتن کی جگہ بسبب مجبوری کٹورا استعمال کیا ہے

عبدالشکور شکور
کرشنا نند پور، کٹک ۷۵۳۰۱۴
(اڑیسہ)

غزل

گندے ماحول میں رہ کے اچھے بنو
کیونکہ دلدل میں کھلتا کنول دوستو!

کارِ اغیار میں بھی کبھی بھول کر
ڈالو ہرگز نہ کوئی خلل دوستو!

کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا تکرار سے
مسئلے کا کوئی ڈھونڈو حل دوستو!

اُس کے قدموں کو منزل نہ کیوں چوم لے
کھاکے ٹھوکر گیا جو سنبھل دوستو!

دلِ شکورِ شکستہ کا دُکھ درد میں
یادِ ماضی سے جائے بہل دوستو!

فراز بندہ نواز

کچھ بھی یاد آتا نہیں اُن کے سوا
سب بھلائی جارہی ہے اُن کی یاد

کیوں اُنھیں آتا نہیں میرا خیال
کیوں مجھے ہی آرہی ہے اُن کی یاد

مانتا ہوں بھول سے ہیں وہ مگر
خار سے برسا رہی ہے اُن کی یاد

کب خیال اپنا کیا تو نے فراز
تجھ کو اک تنہا رہی ہے اُن کی یاد

ہماری نئی اور اہم مطبوعات

کتاب نما کا خصوصی شمارہ

ڈاکٹر اجمل اجملی

(حیات اور ادبی خدمات)

:- مرتبین :-

ڈاکٹر علی احمد فاطمی / عذرا رضوی

اردو، ہندی کے ممتاز ادیبوں کی اہم نگارشات کا مجموعہ جس میں ڈاکٹر اجمل اجملی کی ادبی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا گیا ہے قیمت ۴۵/-

پروفیسر مسعود حسین خاں

(علمی، لسانی اور ادبی خدمات)

مرتبہ

ایم حبیب خاں

کتاب نما کے اس خصوصی شمارے میں اردو کے ممتاز ادیب، ماہر لسانیات اور محقق جناب مسعود حسین خاں کی خدمات کے اعتراف میں اردو کے ۱۲ ممتاز ادیبوں کی نگارشات کا مجموعہ قیمت ۴۵/- روپے

طنزیات و مضحکات

رشید احمد صدیقی

طنزیات و مضحکات کے فن پر اردو میں پہلی اور اہم کتاب جو عرصے سے نایاب تھی اب نہایت اہتمام سے شائع کر دی گئی۔

قیمت: ۶۰/- روپے

اردو ناول میں عورت کا تصور

نعیمہ کا کبیر

اس اہم مقالے میں اس بات کی کھوج لگانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اپنے دور کے مخصوص سماجی حالات میں مختلف ناول نگاروں نے ایک مثالی عورت کا کیا تصور پیش کیا ہے۔ اردو میں اس موضوع پر پہلی کتاب

قیمت : ۴۵/- روپے

نوٹوں کی تلاش (جاسوسی ناول)

محمد عاقل ایاز سیوہاروی

اردو میں ایسا لاجواب ناول جس کو شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کیے چین نہیں پڑے گا۔ پل پل بدلتے ہوئے سنسنی خیز واقعات کا مجموعہ

قیمت: ۶۰/-

یہ صورت گر کچھ خوابوں کے

عہد حاضر کے 17 اہم ادیبوں کے انٹرویو

طاہر مسعود قیمت 66/-

شاہ ولی اللہؒ اور ان کا خاندان

تالیف :- مولا حکیم محمود احمد برکاتی

اس کتاب میں برکاتی صاحب نے حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ نیز ان کی تصانیف تلامذہ، مریدین شاہ ولی اللہ کا تعارف بھی ہے۔ قیمت ۴۵/-

نور قمر
۱۰۱۷ گل اپارٹمنٹس، باندرہ، بمبئی۔ ۴۰۰۰۵۰

جنکشن

اس کے بالوں میں چند تنکے پھنسے ہوئے تھے، چہرے پر کچھ غبار سا تھا اور اس
گرد آلود کپڑوں کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک لمبا سفر طے کرتی ہوئی یہاں
پہنچی ہے۔ وہ ویٹنگ روم کی آرام دہ کرسی پر نیم دراز تھی اور آنکھیں بند کیے نہ
نے کیا سوچ رہی تھی۔

میں نے بچپن میں ابو سے سنا تھا کہ میری ایک بہن بھی ہے جو دور دیس
ہوئی ہے۔ اس بات کے یاد آتے ہی مجھے اس کا چہرہ بشرہ اپنی طرح لگنے لگا۔
مجھے اچانک خوشی کا احساس ہوا۔ میں بیتابی سے اپنے سامنے رکھے ہوئے
ل پر انگلیاں بجانے لگی۔ میں نے سوچا کہ آج وہ مبارک دن آگیا ہے جس
میں برسوں سے منتظر تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں جوں ہی اس سے ملوں گی
ری ذات کی تکمیل ہو جائے گی۔

کچھ دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں، چاروں طرف دیکھا۔ ویٹنگ روم
ں ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ میری پشت پر دو کھڑکیاں تھیں جن سے
رتک پھیلا ہوا میدان اور میدان کے آخری سرے پر پہاڑیوں کا سلسلہ نظر آرہا تھا۔
رے میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود ٹھنڈی ہوا کے جھونکے
رکی سے اندر چلے آرہے تھے۔ اسٹیشن کی عمارت قدیم وضع کی تھی اور اس
کشن کی اہمیت کو مدِنظر رکھ کر بنائی گئی تھی۔

وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی، چہرے پر ہاتھ پھیرا، کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر
ر ڈالی۔ اس کی گھڑی جو وقت بتا رہی تھی۔ شاید اسے گھڑی کے بتائے
ئے وقت پر یقین نہیں آیا۔

اس نے پوچھا:

"کیا وقت ہوا ہے؟"

"بارہ بجے ہیں۔"

"اوہ! گاڑی آنے کا وقت ہو گیا ہے۔"

مڑ کر کروہ اٹھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کا قد بھی میرے برابر ہے۔ وہ غسل خانے میں چلی گئی۔ پھر مجھے مُنہ پر پانی کے چھینٹے مارنے کی آواز آتی رہی۔ چند گھڑی بعد وہ نیپکن سے مُنہ پونچھتی ہوئی باہر نکلی۔ نیپکن تہ کر کے اس نے جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ پھر وہ میرے سامنے ٹیبل کے گرد رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وینٹی بیگ کھولا۔ اس میں سے برش نکالا اور بیگ کی پشت پر لگے ہوئے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی ہوئی بال سنوارنے لگی۔ نہ جانے اُسے کیا احساس ہوا کہ اس کے منہ سے "اوہ مائی گاڈ" کا عجائبہ نقرہ نکلا۔ اس نے بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا:

"تم میری ہم زاد ہو۔"

میں مسکرائی اور بولی:

"مجھے اس کا احساس تمھیں دیکھتے ہی ہو گیا تھا۔"

اتنے میں قلی اندر آیا اور اس کو مخاطب کرتا ہوا بولا:

"میم صاحب! گاڑی آدھا گھنٹہ لیٹ ہے۔ آپ چاہیں تو چائے پانی لا دوں۔"

اس نے لمحہ بھر کے لیے قلی کو دیکھا پھر اس کی نظریں میرے چہرے پر آ کر ٹھہر گئیں۔ گویا مجھ سے پوچھ رہی ہوں کہ کیا ارادہ ہے۔ میری گاڑی کے آنے میں بھی کافی وقت تھا۔ سو میں نے قلی کو دو کپ چائے اور اس کے ساتھ کچھ نمکین لانے کا آرڈر دے دیا۔ قلی نے گردن ہلائی اور چلا گیا۔

اس کے سفر کے سامان پر مختلف شہروں اور ایئر لائنوں کے اسٹیکرز Stickers لگے ہوئے تھے اور یہ طے کرنا مشکل تھا کہ وہ کس ملک کی باشندہ ہے۔ میں نے ذہن میں سوال بنانے کی کوشش کی، لیکن کوئی ایسا سوال بن نہ پایا جو میں اس سے پوچھ لیتی۔ کیوں کہ جو بھی سوال بنتا۔ میں خود ہی اس کا جواب دے لیتی تھی۔ غرض یہ کہ میں نے یکے بعد دیگرے کئی سوال سوچے اور اس کا مسکن، شجرۂ نسب، تعلیم و تربیت، ملازمت، مشاغل یہاں تک کہ اس جنکشن پر اس کی موجودگی کا سبب بھی میں نے خود ہی دریافت کر لیا۔ سچ پوچھیے تو مجھے نہ تو اس سے متعارف ہونے کی ضرورت تھی نہ اس کے باطن سے۔

وہ شہر کا مرکزی علاقہ تھا اور بندرگاہ سے قریب ہونے کی بنا پر گنجان آباد۔ ہم جس مکان میں رہتے تھے وہ یک منزلہ تھا۔ مکان کے نچلے منزلے پر ہماری رہائش تھی۔ کنبہ بڑا تھا اس لیے مکان کشادہ ہونے کے باوجود کشادہ نہیں لگتا تھا۔ میرا تعلق تو اس مکان سے عرصہ ہوا ختم ہو چکا ہے۔ میں

نے اس شہر کے بجائے کسی اور شہر میں سکونت اختیار کرلی ہے۔ لیکن میں جن دنوں کا ذکر کرنے والی ہوں وہ میرے پیٹیوں ہیٹیوں چلنے کے دن تھے۔ مکان کی مکانیت اور اس کے خصائص کا علم مجھے ایک زمانے بعد ہوا۔

اسی کی طرح بچھڑے ہوئے رشتے کے چند لوگ جو نقل مکانی کے بعد سرحد کے دیس جا بسے تھے۔ اچانک ملک میں وارد ہوئے اور بڑی تلاش و جستجو سے انھوں نے مجھے دریافت کرلیا۔ انھی کے ایما پر وہ مکان کھوجا گیا اس کا نام نخل مریم تھا۔ نخل مریم کی زیارت کرنے والوں میں میری دائی بھی تھیں۔ ایک مخصوص کمرے میں پہنچ کر وہ آب دیدہ ہوگئیں۔ ان کا جسم کسی جذبے کی شدت سے لرزنے لگا۔ پھر وہ چکرا کر گر پڑیں۔

اُس مکان کے موجودہ مالک بھلے آدمی تھے۔ انھوں نے دائی کو صوفے پر لٹا دیا۔ مُنہ پر پانی کے چھینٹے مارے، اور ڈاکٹر کو بلوا لینے کی صلاح دی۔ ابھی ہم ان کی تجویز پر غور ہی کر رہے تھے کہ دائی بڑبڑانے لگیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ ان کا جسم سو چکا ہے، اور روح جاگ اُٹھی ہے۔

اندھیرے محلے میں نعرے گونج رہے ہیں۔ ٹیموں کی روشنی میں اسلحہ کی چمک نمایاں ہے۔ وقفے وقفے سے چیخ و پکار اور آہ و فغاں سنائی دیتی ہے۔ دیواروں پر لمبے لمبے سایے نمودار ہوتے ہیں۔ دروازوں پر گرزوں کی چوٹ پڑنے لگتی ہے۔ دروازہ چوکھٹ سمیت اکھڑ کر گر پڑتا ہے۔ گھر کے تمام افراد دوڑ کر ایک کوٹھری میں جا چھپتے ہیں۔ سب کے سب دم سادھے بیٹھے ہیں۔ مغلظات بکی جا رہی ہیں۔ سامان کے لوٹنے، الماریوں، اور صندوقوں کے ٹوٹنے کی بے ہنگم آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ وہ اچانک کوٹھری میں گھس آتے ہیں۔

میں نے دیکھا کہ دائی کا جسم پھر لرزنے لگا تھا اور بولتی ہوئی روح گھگھیا رہی تھی۔

ابّو نے بتایا تھا کہ اس واقعے کے دوسرے یا تیسرے دن وہ خانماں برباد ایک جہاز پر سوار ہوکر کسی دیس کو چلے گئے۔ میں نے ان سے بارہا پوچھا تھا کہ ہم ان کے ساتھ کیوں نہیں گئے۔ لیکن ابّو نے کبھی میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ سوال سُن کر وہ خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھا کرتے۔ مجھے لگتا ہے کہ ابو اس واقعے سے خوف زدہ نہیں ہوئے تھے۔ ممکن ہے کہ انھوں نے اُس واقعے کو بلائے ناگہانی سے تعبیر کیا ہو یا پھر گزارے کے لیے ان کے پاس کافی کچھ موجود ہو۔

فُلی ایک کشتی میں چائے کے ساتھ کچھ بسکٹ بھی لے آیا تھا۔ اس نے چائے

بنا کر میری طرف کپ بڑھایا اور بسکٹ کی پلیٹ بھی۔

چائے کی چسکی لے کر میں نے پوچھا:

"مجھے دیکھ کر تم پر کیا ردّ عمل ہوا؟"

"اس سوال کا کیا جواب دوں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ مختلف دیسوں میں رہنے والوں میں اتنی مشابہت کیسے ہو سکتی ہے۔ صرف مشابہت ہی نہیں بلکہ بول چال، لباس اور حرکات و سکنات بھی کیوں کر یکساں ہو سکتے ہیں۔ بہرحال میں تمھیں اپنے متعلق ضرور بتاؤں گی۔

میں جس ملک کی باشندہ ہوں دراصل وہ میرا وطن نہیں۔ میرا وطن کون سا ہے، مجھے معلوم نہیں۔ میں مزاجاً حقیقت پسند ہوں اس لیے جسمانی خط و خال طرزِ معاشرت اور روحانی اثاثے کے پیشِ نظر کہہ سکتی ہوں کہ میرا وطن ایشیا ہی کے کسی ملک میں ہو گا۔ تمھیں یہ سُن کر حیرت ہو گی کہ جن لوگوں نے میری پرورش کی ہے وہ میرے عزیز یا رشتے دار نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کبھی سیاہ آندھی آئی تھی سیاہ ہوائیں چلی تھیں، سیاہ بادل اُٹھے تھے۔ سیاہ مینھ برسا تھا، ہر سو اندھیرا پھیل گیا تھا، میں اسی سیاہی کی دین ہوں۔

پھر اس نے بڑی، اضطرابی کیفیت میں، اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا، اور اپنی جیکٹ کی آستینوں کو کہنیوں تک چڑھا کر ہاتھوں کا جائزہ لیتی ہوئی بولی:

مگر میری رنگت سیاہ نہیں اور میں اپنے دل کو روز مانجھتی رہتی ہوں، اس لیے سیاہ باطن بھی نہیں ہوں۔"

میری پشت سے ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ لمحہ بھر کے لیے میرے جسم میں کپکپی سی ہوئی۔ میں نے جلدی سے چائے کے دو گھونٹ لیے جس کی گرمی سے جسم کی بگڑتی ہوئی حرارت کا توازن بحال ہو گیا۔

اس نے آگے کہا:

میں جس اسکول میں پڑھنے جایا کرتی تھی وہ شہر سے فاصلے پر تھا۔ اُس کا احاطہ بہت وسیع تھا۔ احاطے کے اندر گھنے درختوں کے جھنڈ تھے۔ درختوں سے مجھے فطری لگاؤ تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ ان درختوں میں بسنے والے پرندے میرا دل لبھاتے تھے۔ اُن کی بولیاں اُن کی چہچہاہٹ، ان کی شوخیاں، اُن کے غمزے، ان کی ادائیں، اُن کے رقص اور اُن کی صنعت گری دیکھ دیکھ کر میں بہت محظوظ ہوتی۔ میں کوئلوں اور پپیہوں کو ان کی آواز سے پہچانتی تھی۔ بیٹوں کو ان کے گھونسلوں سے، پدّوں کو ایک دوسرے کے تعاقب میں اُڑنے سے۔ فاختاؤں اور لالوں کو ان کے رنگوں سے۔ امتحان میں کامیاب ہو جانے کے بعد ہر نئی کلاس میں داخل ہوتے ہی میں کھڑکیوں سے لگی ہوئی ڈیسک پر قبضہ کر لیتی تاکہ فرصت

ب تھا
ت میں ان درختوں کو دیکھ سکوں۔ تم نے ALICE IN WONDERLAND ایلیس
ونڈر لینڈ" ضرور پڑھا ہوگا۔ تم مجھے ایلیس یا اس کا روپ سمجھ سکتی ہو۔
اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد میں نے جس کالج میں داخلہ لیا اس کی عمارتوں
پھیلاؤ نے فطرت کے نظاروں کو ڈھک دیا تھا۔ گرچہ میں پرندوں سے دور
چکی تھی۔ لیکن ان میں میری دلچسپی کم نہ ہوئی۔ میں گاؤں میں گشت کو نکل
ی اور جہاں موقع ملتا پرندوں کو تکا کرتی اس مشغلے کو مہذب لوگ
Birdwa برڈ واچنگ کہتے ہیں"۔ یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔
پھر کہنے لگی:
تمھیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ کالج کے دوسرے ہی سال میں ORNITHOLOGIST
ہرطیور کہلانے لگی۔
پلیٹ فارم سے ہمیں گھنٹے کی آواز سنائی دی۔ مسافروں کے لیے یہ اطلاع
ی کہ ریل گاڑی پچھلے اسٹیشن سے روانہ ہو چکی ہے۔
قلی ویٹنگ روم میں داخل ہوا۔ وہ ایک پرچی انگلیوں میں تھامے ہوئے
ا۔ اس نے پرچی ہماری طرف بڑھا دی۔ ہم دونوں نے اسے لینے کے لیے ہاتھ
ھائے لیکن وہ سبقت لے گئی۔
میں نے کہا:
"ہم ہندستانیوں کے معاشرتی آداب کے مطابق تمھاری تواضع کا شرف
ے ملنا چاہیے۔
اس نے کہا:
"کیا تم مجھے غیر سمجھتی ہو؟"
"نہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ شرف میں حاصل کرنا چاہتی ہوں"۔
ں نے مسکرا کر پرچی کشتی میں رکھ دی۔ میں نے اس پر درج رقم قلی کو ادا کر دی
ر کچھ ٹپ کے لیے چھوڑ دی۔
"میم صاحب! تیار رہیے۔ گاڑی کچھ دیر میں پہنچنے والی ہے"۔
کہہ کر اس نے چائے کی کشتی اٹھائی اور چلا گیا۔
اس کی شخصیت میں میری دلچسپی کم نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ میں نے پوچھا:
"مگر تم یہاں — اس پہاڑ کے دامن میں کیا کر رہی ہو؟"
"تلاش"، اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔
"تلاش؟ کس کی؟"
"ایک پرندے کی"
"پرندے کی؟"

"ہاں۔ تم نے قرآن میں حضرت سلیمانؑ کا قصہ ضرور پڑھا ہوگا۔ عہدنامۂ عتیق میں ان کا ذکر خاصا تفصیل سے ملتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ تقریباً ہزار، نوسو سال قبل مسیح میں گزرے ہیں۔ ان کے عہد کی کندہ کی ہوئی متعدد رنگین تصویریں کوہ جبل کے غاروں میں ملی ہیں، ان میں بعض تصویریں پرندوں کی ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے ہولڈال میں سے جہازی سائز کا جزدان نکالا۔ پھر اس کے کسی خانے میں سے چند تصویریں نکال کر ٹیبل پر پھیلادیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ انتہائی خوش رنگ پرندوں کی تصویریں تھیں۔ ان کے سروں پر مور کی طرح کلغی تھی۔ چونچیں چھوٹی اور نیلی نیلی تھیں۔ وہ فاختہ کی جسامت کے تھے۔ لیکن ان کی دمیں گھنی اور لمبی تھیں۔ نقاش نے ان پرندوں کو مختلف عمل کرتے ہوئے دکھایا تھا۔ سب سے پہلا احساس ان کی اجتماعی زندگی کا ہوتا تھا۔ دوسرا ان کے کارآمد مشغلوں کا۔ تیسرا افزائشِ نسل کا اور چوتھا امن پسندی کا۔

اس نے کہا:

"دیکھ چکیں؟"

میں نے تصویروں پر ہولے سے انگلیاں پھیریں اور انھیں چوم لیا۔

"کیا تم ان میں سے کوئی تصویر مجھے دے سکتی ہو؟"

"کیوں نہیں۔ تم چاہو تو تمام کی تمام رکھ لو۔ میرے پاس ان کے اور پرنٹس بھی ہیں۔" اس نے جزدان میں سے ایک لفافہ نکالا۔ وہ تصویریں اس میں رکھیں پھر لفافے پر اپنی "تمام تر نیک خواہشات کے ساتھ" کا دعائیہ نقرہ لکھا اور دستخط کرنے کے بعد لفافہ میری طرف بڑھادیا۔ اس کے دستخط پڑھے جاسکتے تھے۔ دستخط کی کلیوں میں اس نے میرا نام گوندھ دیا تھا۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ مسکرادی۔

قلی آچکا تھا۔ اس نے سوٹ کیس اٹھا کر سر پر رکھا۔ اور ہولڈال تھامتا ہوا بولا:

"میم صاحب، آپ کا ڈبہ وٹینگ روم میں سامنے آئے گا۔ آپ چاہیں تو بیٹھی رہیے۔"

"ٹھیک ہے" کہہ کر اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔

قلی ویٹنگ روم سے باہر چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ چند قدم کے فاصلے پر اس نے سامان فرش پر رکھ دیا ہے۔ ہم دونوں بھی اٹھ کر ویٹنگ روم کے باہر چلے آئے۔

میرے ذہن میں وہ پرندے رقصاں تھے اور مجھے ان پرندوں سے اس کی دلچسپی کا سبب بھی معلوم نہ ہوا تھا۔ اس لیے میں نے پوچھا:

"یہ تو بتاؤ کہ ان پرندوں میں تمھاری دلچسپی کس بنا پر ہے ؟"
وہ مسکرائی اور بولی:
"میں دراصل Ornithology میں ڈاکٹریٹ کر رہی ہوں۔ میری مراد
پرندہ شناسی سے ہے۔ ان میں سے ایک پرندے کو میں نے خود اپنے مطالعے
کا موضوع بنایا ہے۔ تمھیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اس کی تلاش میں میں نے
ا کے مختلف ملکوں کا سفر کیا ہے۔ میں مشرق وسطیٰ بھی گئی ہوں اور جنوبی
یقہ بھی۔ وسطی یورپ میں بھی میں نے اسے تلاش کیا ہے اور لاطینی امریکا
ں بھی۔ یہ مجھے وسط ایشیا میں بھی نہ ملا۔ یہ افغانستان میں بھی موجود نہیں۔"
"اور یہاں"
میں نے بے ساختہ پوچھا۔
وہ مسکرائی۔
"اس پہاڑ پر میری ملاقات ایک آدی واسی سے ہوئی تھی۔ تصویر دیکھ کر
س نے بتایا کہ یہ پرندہ کبھی اس علاقے میں ہوا کرتا تھا، پر زمانہ ہوا ناپید
گیا ہے۔
"اس آدی باسی نے مشورہ دیا ہے کہ میں اُسے ہمالہ میں تلاش کروں۔
یں اور اس کے ملنے کا امکان نہیں۔"
"تو کیا تم ...؟"
"ہاں، جب یہاں آئی ہوں تو اسے ہمالہ میں بھی تلاش کر دیکھوں۔"
میں نے دیکھا کہ بڑی دھیمی آواز کے ساتھ ریل گاڑی پلیٹ فارم کی طرف
ھ رہی ہے، اس کا انجن اپنے سینے میں بے پناہ اضطراب دباتے ہوئے تھا۔
میں اس سے بغل گیر ہوئی، اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ مصافحہ کیا اور
ر دعائیہ کلمات کہہ کر میں نے اسے رخصت کر دیا۔

رضوان اللہ
۱۷۸۔ ابوالفضل انکلیو
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

کہانی سو رہی ہے

ایک دن شام کو ٹہلتا ہوا گاؤں کی آبادی سے باہر نکل گیا جہاں دور تک پھیلی ہوئی ناہموار زمین آم، برگد اور مہوے کے سایے سے ڈھکی رہتی ہے میں ان ہی درختوں کے سایے میں ایک ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر چلا جارہا تھا۔

اچانک لگا جیسے کان میں کوئی کہہ رہا ہے: "آہستہ چلو کہانی سو رہی ہے"۔ میں ایک دم ٹھٹک گیا۔ میرے پاؤں جہاں تھے وہیں جم کر رہ گئے۔ حیرانی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھا تو کوئی نہ تھا۔ پیڑوں پر بس اِکّادکّا چڑیاں تھیں۔ کیونکہ ابھی ان کے بسیرا لینے کا وقت نہیں ہوا تھا۔

میں غور کرنے لگا کہ کہیں بھولے سے میں نے کسی قبر پر پاؤں تو نہیں رکھ دیا۔ یہ گاؤں کے غریب لوگوں کا قبرستان تھا۔ بنجر زمین کا ایک قطعہ۔ کارآمد زمین بچارے مُردوں کے حصے میں کہاں آتی جس کے ایک ایک انچ کے لیے گاؤں والے زندگی بھر کچہری کی خاک چھانتے ہیں قبروں کے نشان سال دو سال باقی رہتے ہیں۔ کسی کی اولاد لائق ہوئی تو برسات بعد اس پر ایک گاڑی مٹی ڈال دی جو اِن یادوں کو سال دو سال اور تازہ رکھتی وہ یادیں خود ہی دھل جائیں یا یادوں کی بھیڑ میں گم ہو جائیں۔ پھر کون جانے کہ کون کہاں آسودۂ خواب ہے۔

اتنی بات ضرور تھی کہ اِدھر اُدھر گزرنے والی پگڈنڈیوں سے پرے قبریں بنائی جاتیں تاکہ آنے جانے والوں کے پاؤں ان پر نہ پڑیں مگر نہ جانے کتنے مویشی دن بھر ان سونے والوں کے سینوں کو روندتے پھرتے۔

تو میں وہ حیران کن سرگوشی سُن کر ٹھٹک گیا۔ چند لمحوں میں حواس بجا ہوئے تو اس جگہ کو غور سے دیکھا پھر سمجھ میں آیا کہ میں پگڈنڈی سے ہٹ گیا ہوں جس کا مطلب یہ تھا کہ وہاں کوئی پُرانی قبر تھی دھنس گئی تھی اور آس پاس کی قبروں کی فاضل مٹی بہہ کر آنے کے باوجود زمین کا یہ گڈھا پوری طرح نہیں بھرا تھا۔

میں لڑکپن سے ہی گاؤں سے دور شہر میں رہا۔ گرمی اور جاڑے کی چھٹیوں میں گاؤں آتا۔ یہ چھٹیاں کچھ اس طرح ہوا کرتی تھیں کہ گاؤں کی گرمی، برسات اور جاڑے کا سارا مزہ لوٹتے تب تک زندگی میں دُنیا کی تلخیاں حل نہیں ہوئی تھیں اور زندگی سبزے پر اوس کی طرح نتھری ہوئی تھی کچھ لوگ جب پاس کو تاڑ پر للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تو ہم بچ

ان میں شامل ہوتے لیکن فرق یہ تھا کہ یہاں کو چڑھتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتے اور دوسرے اس کے اُترنے کے منتظر۔ ہم تاڑ کے کچے پھلوں کے شائق اور دوسرے اس کے نئے کوپھوں سے تھرے ہوئے رس کے رسیا۔ ہم آم کے باغ میں گھنٹوں کبڈی اور گلی ڈنڈا کھیلتے اور بیچ بیچ میں ایک آدھ ڈھیلے آم کے پیڑ پر بھی چلا دیتے۔ کچے پکے کی تمیز نہ تھی مفت میں جو ہاتھ آتا اسی کو غنیمت جانتے۔

برسات شروع ہوتی تو آم جامن کی بارش بھی ہونے لگتی۔ گاؤں میں یہ سب مُفت تھا پیڑ کسی کے ہوں لیکن بچے سب کے تھے۔

جاڑوں میں گنّے اور مٹر کے کھیت ہماری سب سے پسندیدہ جگہ ہوا کرتے۔ جہاں کہیں گنّے کا رس پیرنے کے لیے کولہو لگے ہوتے ہم اُدھر بھی منڈلاتے ہوئے نظر آتے۔ بڑے بڑے کراہ میں پکتا ہوا رس جب گاڑھا ہو کر گُڑ بننے لگتا تو اس کی سوندھی سوندھی مہک بے چین کر دیتی اور گھنٹوں بے چین رکھتی یہاں تک کہ گُڑ کی بھیلیا بن جاتیں اور کھُرچن بچوں کے حصّہ میں آتا۔

تو ہمیں گاؤں میں کھانے اور کھیلنے سے واسطہ تھا کسی کے مرنے جینے سے نہیں۔ اتنی بات ضرور تھی کہ جب چھٹیوں میں آتے اور کسی کی کمی محسوس ہوتی تو پوچھ پاچھ لیتے کہ اس پر کیا گزری لیکن یہ معلوم کرنے کون جاے کہ اس کے بعد وہ کس جگہ محوِ خواب ہے اس لیے مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ دبی ہوئی زمین کس کی آرام گاہ ہے۔ میں وہیں سے پیچھے پلٹا۔

اب نہ بچپن تھا نہ لڑکپن۔ گاؤں میں آنے جانے کا رشتہ تو باقی تھا لیکن لوگ بدل گئے تھے۔ زمانہ بدل گیا تھا۔ ان کا بھی میرا بھی۔ شہر اور گاؤں کے لوگوں کے بیچ جو فاصلہ ہوتا ہے۔ وہ درمیان میں حائل ہوگیا تھا۔ پھر بھی میں خود کو اسی دنیا کا حصّہ سمجھتا رہا۔ میرے کانوں میں پیپل کے پتوں کے جھانجھ بجتے رہے۔ آم کے بور اور مہوے کے پھولوں کی خوشبو مشامِ جاں کو معطر کرتی رہی۔ لہلہاتے کھیتوں کی ہریالی آنکھ کو لبھاتی رہی۔ دور بہت دور جہاں زمین اور آسمان ملتے ہیں اُڑتے ہوئے بگلوں کے خواب دیکھتا رہا۔

لیکن وہی بات۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ گاؤں کے پُرانے لوگوں میں سے کون کہاں آرام فرما ہے۔ اسی دن احساس کے تازیانے نے میرے سوچنے کی رفتار بدل دی۔ میں گُم صُم سا آبادی کی طرف واپس آگیا۔ ایک پُرانے ساتھی کے گھر کی طرف جا نکلا اور بات بات میں یہ جاننے کی کوشش کی کہ پگڈنڈی کے قریب جہاں میں نے وہ سرگوشی سُنی تھی کس کی قبر ہوسکتی ہے۔

وہاں تو لطیف چاچا دفن کیے گئے تھے۔" اس نے کہا: "لطیف چا!" (ہم لوگ ان کو اسی نام سے جانتے پہچانتے تھے) لگا جیسے دماغ پر کسی نے ایک کوڑا لگا دیا۔ کانوں پر اس بجلی کے گرتے ہی یادوں کو گھیرے ہوئے لمبی دیواروں کا ایک حصّہ پھٹ گیا اور اس شگاف میں سے بے شمار کہانیاں مُسکراتی ہوئی نظر آنے لگیں۔

گرمی کی چھٹیوں میں دھما چوکڑی کے کئی اکھاڑوں میں سے ایک گاؤں کا وہ گوشہ

بھی تھا جہاں ایک بڑا سا مہوے کا پیڑ تھا جس کے دکھن پورب کچھ دُور ایک گھورا تھا جو ہر سال کنوار کاتک میں کھود کر آس پاس کے کھیتوں میں بکھیر دیا جاتا لیکن سال کا چکر پورا ہوتے ہوتے وہ پھر اپنے شباب پر آجاتا۔ اسی گھورے کے قریب ایک تاڑ کا پیڑ مہوے کے پیڑ کے پچھم طرف اس کے زیرسایہ ایک جھونپڑی جس کی چوکھٹ پر اُکڑوں بیٹھے ڈنڈا لیے لطیف چا پہرہ دیا کرتے۔ ان کے جسم پر جو یادوں کے بوجھ سے جھک کر بالکل دوہرا ہو گیا تھا۔ ایک میلی سی مختصر لنگی ہوا کرتی اور کبھی کبھی ایک بہت جھلڑ سی قمیص بھی لیکن نہ اس قمیص میں کوئی جیب نہ لنگی میں انٹی ہاں وہ نچلے ہونٹ میں البتہ ہمیشہ کچھ چھپائے رہتے۔ وہ دولت بھی ان کو کہاں سے ملتی تھی خدا جانے کیوں کہ بظاہر ان کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ان کی ساری پونجی وہی مہوے کا پیڑ۔ جب تک مہوے کے پھول زمین پر تاروں کی طرح بکھرتے رہتے وہ انھیں گِن گِن کر اکٹھا کرتے اور سُکھاتے۔ معلوم نہیں کتنے دن تک اس سے پیٹ کی آگ بجھاتے۔ پھر کوئندی یعنی مہوے کے پھل آتے۔ کچھ دن اس سے کام چلتا رہا ہوگا۔ اس کی گٹھلیاں بھی چند پیسوں میں بک جاتی رہی ہوں گی یا ممکن ہے اسی کے بدلے میں انھیں وہ دولت ملتی رہی ہو جسے وہ ہمیشہ اپنے ہونٹوں میں دانت کے بجائے چھپائے رکھتے۔

وقت نے لطیف چا کی کمر ضرور دوہری کر دی تھی لیکن ان کی آنکھوں کی چمک مدھم نہیں پڑی تھی، بے شمار اعراب لگنے کے باوجود ان کے چہرے پر بکھری ہوئی مُسکراہٹ میں نہ کمی آئی تھی نہ ان کی زندہ دلی پر اوس پڑی تھی۔

میں نے کہا نا کہ لطیف چا ہاتھ میں ڈنڈا لیے اپنی چوکھٹ پر اُکڑوں بیٹھے پہرہ دیا کرتے تھے۔ چوکھٹ کے اندر ذرا ہٹ کر ایک اور ایسی ہی سدا بہار صورت تھی جو اپنا سب کچھ لطیف چا پر نچھاور کر چکی تھی اور اب اس کے پاس پردہ نشیں شرافت کے سوا کچھ نہ تھا پھر بھی ان دونوں کے پاس ایک دوسرے کو دینے کے لیے اتنا کچھ تھا جو کسی خزانے کے بدلے نہیں مل سکتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے شریک سفر تھے۔ ہمراز تھے اور ایک دوسرے کے محافظ بھی۔

وہ شرافت کی مورت لطیف چا کی ہر بات پر ان کی ہاں میں ہاں ملاتی۔ ان کے چُنے ہوئے مہوے سُکھاتی اور پیٹ بھرنے کے قابل بناتی۔ کوئندی کو ٹھکانے لگاتی۔ کبھی کبھی اس کے ہاتھوں کی حرکت سے ایک چھنا کا ہوتا جو گزرے ہوئے دنوں کی یادگار اور پُرانی عادت کی ہٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک چھوٹا سا گول ڈبا جس کے اندر چند چھوٹی چھوٹی ڈبیاں۔ ہم لوگ اسے پاندان سمجھتے تھے۔ وہ کبھی کھُلتا کبھی بند ہوتا لیکن اس میں سے ایک چٹکی راکھ کے سوا کچھ نہ نکلتا جسے وہ دونوں ہمسفر پوری ایمانداری سے برابر۔ برابر بانٹ لیتے۔ یہ بھی ان کے گہرے تعلق کی ایک پُرانی پہچان تھی۔

مہوے کے سایے میں پورب طرف تھوڑی سی جگہ صاف کرکے لڑکوں نے ایک اکھاڑا بنا لیا

ہاں بزرگوں کی نظر سے دُور ان کی دھینگا مُشتی جاری رہتی اور لطیف چا کی نظر اُچی
رہتی جیسے وہ اپنے ماضی کو دیکھے جا رہے ہوں۔ ان بچوں کو دینے کے لیے ان کے
کچھ نہ تھا پھر بھی بہت کچھ تھا۔ چھوٹے بڑے بچے کھیلتے کھیلتے ان کے پاس آ بیٹھتے تو
کی کہانیوں کے فوارے چھوٹتے۔

لطیف چا کی کہانیوں کا مرکز و محور کچھ بھی ہو سکتا تھا مثلاً وہی سامنے والا گھوڑا
ہ حد پر نظر آنے والا پیپل کا پیڑ یا اس پیڑ کے قریب ایک چھوٹی سی گڑھی یا خود
کے جھونپڑے کی انگنائی وغیرہ۔ ان کی ہر کہانی "خدا جھوٹ نہ بلوائے" سے شروع ہوتی
وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس میں اس کی صداقت میں کسی شک کا شائبہ بھی نہیں
سکتا۔ اگر کہانی کے بیان میں کہیں سکتہ ہوتا تو فوراً چوکھٹ کے پیچھے بیٹھی ہوئی
لقمہ دیتی اور اگر لڑکوں میں سے کوئی ہنس پڑتا جس سے ان کی کہانی پر بے یقینی کا
ن ہوتا تو اندر سے آواز آتی " ہے مت کہو۔ سب جھوٹ سمجھتے ہیں"۔ اس مداخلت پر
یف چا ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھتے پھر اپنی کہانی جاری رکھتے۔ ان کا پیچھے دیکھنا اس بات
تاکید تھی کہ تمہارا کام صرف سُننا ہے سُنتی رہو۔ بیچ میں نہ بولو جیسے اب تک بلا
لے سب کچھ دیکھتی رہی ہو۔

ہر روز تازہ کہانی کہاں سے اُترتی تھی نہیں معلوم، تاڑ پر سے یا مہوے پر سے
وں نے نہ تو کبھی تاڑ کا رس چکھا نہ مہوے کا، ہاں ان کے پتّوں کی جھنکار اور
اہٹ ضرور سُنتے رہے شاید وہی اپنی زبان میں ان سے کہانیاں کہتے رہے ہوں
وہ دوسروں کو سُناتے رہے۔ کہانیاں سُناتے سُناتے آخر ایک دن وہ تھک
سو گئے۔ اب نہ وہ ہیں، نہ جھونپڑی، نہ تاڑ، نہ مہوے کا پیڑ، نہ وہ گھوڑا۔ ان سب
زمین اور آسمان نہ معلوم کب اور کیسے کھا گئے لیکن وہی زمین اور آسمان لطیف چا
کہانیوں کو نہیں ہضم کر سکے جو آج بھی سُنی سُنائی جا رہی ہیں ہاں وہ اندازِ بیان
ں نہ بیچ بیچ میں چٹکیوں کا مزہ۔

لیکن اس سے اتنا اندازہ تو ہو سکتا ہے کہ ہمارے گاؤں کے غریب اور ان پڑھ
کتنے دُھنی تھے۔ ان کے پاس شرافت کی دولت تھی، شرم و حیا کی دولت
، وہ اپنی غربت میں بھی مگن تھے۔ آج کہہ سکتے ہیں کہ انھیں اپنی غربت کا شعور کی
ساس نہیں تھا لیکن وہ ہوتا بھی کیسے کوئی ان کو کم نہیں سمجھتا تھا پیٹ کی آگ
ے زیادہ تیز آنچ بے عزتی کی آگ میں ہوتی ہے، وہ اس آگ میں نہیں
تھے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

تذکرہ ماہ و سال

مالک رام

اس مجموعے میں اُردو کے بیشتر ادیب، شاعر، نقاد، کالم نگار، صحافی اور دوسرے اہم عمائد (جنھوں نے اُردو ادب کی قابل قدر خدمت کی ہے) کی تاریخ ولادت اور جو ہماری بدقسمتی سے انتقال کر چکے ہیں ان میں سے اکثر کی تاریخ وفات بھی درج ہے۔ کسی بھی اہم ادیب پر مضمون لکھتے وقت اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

قیمت: ۱۲۵/=

افکارِ اقبال

محمد عبد السّلام خاں

اس اہم کتاب میں علامہ اقبال کے حالاتِ زندگی، ان کے اردو اور فارسی کلام پر سیر حاصل بحث، ان کے مذہبی اور سیاسی افکار اور کچھ ایسے اہم واقعات کی نشان دہی کی گئی ہے جو اب تک اندھیرے میں تھے۔

قیمت ۱۲۵/-

تحقیق نامہ

مشفق خواجہ

مشفق خواجہ اردو کے وہ واحد محقق ہیں جو ہمیشہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جو اپنی اہمیت کی بنا پر ہماری ادبی تاریخ کے کسی نہ کسی خلا کو پُر کرتے ہوں۔ زیرِ نظر مجموعہ میں ایسے ہی اہم ترین مضامین شامل ہیں۔

قیمت ۱۲۵/=

مرضیات

حکیم نعیم الدین زبیری

بیماریوں کے اصولی اسباب اور ان کی وجہ سے افعال میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے مطالعے یعنی ماہیت الامراض (پیتھالوجی) پر جامع اور آسان بحث۔ طلبہ کے علاوہ اطبا کے لیے بھی بے حد مفید۔ قیمت ۵۱/=

تاثراتی تنقید

صدیق الرحمٰن قدوائی

تنقید، ادب کی ایک اہم شاخ ہے مگر اس کا ضرورت سے زیادہ چرچا بھی اچھا نہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ادب سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص "نقاد" ہو جائے۔ ادب کو تنقید کے سوا بھی مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے جن کا انحصار پڑھنے والوں کے انفرادی مزاجوں پر ہے۔ یہ تصنیف ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نیا نقطۂ نظر پیش کرتی ہے۔

قیمت: ۵۱/-

خوابُ اور خلش

آل احمد سرور

شاعری ذات سے کائنات تک کا سفر ہے۔ یہ خوابوں کے ذریعے حقائق کی توسیع کا نام ہے۔ بڑی شاعری عمر بے سے مدد لیتی ہے مگر وہ روایت اور تجربے میں ایک توازن رکھتی ہے۔ آل احمد سرور کی شاعری صرف الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں بلکہ اس میں معانی کا ایک سمندر ہے جس کی تہہ میں پہنچ کر ہی موتی نکالے جا سکتے ہیں

قیمت =/66 روپے

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

مخدوم محی الدین کی شاعری کا تنقیدی جائزہ

مصنف : ڈاکٹر منصور عمر قیمت : ۵۰ روپے
ملنے کا پتہ : بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۴
مبصر : ڈاکٹر توقیر احمد خاں

"مخدوم محی الدین کی شاعری کا تنقیدی جائزہ"، ڈاکٹر منصور عمر کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جو ایم اے کے امتحان کے لیے لکھا گیا۔ موضوع پر عبور، لسانی گرفت اور تحقیقی و تنقیدی شعور کے پیش نظر یہ مقالہ پی ایچ ڈی کا مقالہ معلوم ہوتا ہے۔ مصنف نے مخدوم کی شخصیت اور فن کا ہمہ جہت جائزہ لیا ہے اور ان کے فن کے بعض ایسے انوکھے گوشوں کی نشاندہی کی ہے جن تک بغیر گہری نظر اور تحقیقی لگن کے پہنچنا دشوار ہے۔ مصنف کا خیال ہے مخدوم اعلیٰ درجے کے رومانوی شاعر بھی تھے۔ اور باوجود کمیونسٹ ہونے کے ان کے تحت الشعور میں مذہبی جذبہ کارفرما تھا۔

اگرچہ ڈاکٹر منصور نے مقالہ میں تمام ادبی مقاصد کو پیش نظر رکھا ہے لیکن بعض جگہ وہ معروضی رہنے کے بجائے ایک خاص مکتب فکر سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ اردو میں ترقی پسند تحریک کا زمانہ زریں دور رہا ہے۔ مصنف نے دوسرا باب صرف اسی تحریک کی تاریخ کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اس موضوع پر نہایت وقیع کام ہو چکنے کی بنا پر اس سے اجتناب میں کوئی حرج نہ تھا۔ اگر اس کے بجائے اس باب میں مخدوم پر مذکورہ تحریک کے اثرات کا سیر حاصل جائزہ لیا جاتا تو زیادہ مناسب تھا۔ مخدوم پر اقبال کی فکر کا جائزہ لیتے ہوئے کسر نفسی سے کام لیا گیا ہے۔ اگر مخدوم کی شاعری پر اقبال کا کچھ اثر ہے تو اسے بلا حجت قبول کر لینا چاہیے تھا کیونکہ اقبال کے ساتھ مخدوم کا نام جڑنے سے مخدوم کی وقعت میں مزید اضافے کی گنجائش تھی۔

منصور عمر کی زبان پر مغز اور عالمانہ ہے۔ ان کا یہ مقالہ بلاشبہ ایک [illegible] پیش کرتا ہے اور عمدہ نثر کا بھی خاصہ بھی ہے۔ کتاب کا ہر ایک باب نہایت مختصر اور جامع ہے اور بجائے خود ایک چھوٹا سا تھیسس ہونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے کتاب کا چوتھا باب خصوصی طور پر عمدہ مباحث اور مستند دلائل پر مبنی ہے۔ اس طرح کتاب از اول تا آخر معلومات افزا ہے۔ کتاب لیتھو پر ا دراغلاط سے پاک ہے۔ فلیپ پر پروفیسر محمد حسن اور مظہر امام کی آرا چھپی ہیں۔ توقع ہے منصور عمر کی یہ کوشش ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کرے گی۔

دوسرا کنارہ

مصنف : غلام جیلانی
تقسیم کار: بزم ربانی ۲/۱۹۵، آر٭ٹی وجے نگر کالونی۔ حیدرآباد
صفحات : ۱۸۵ ، قیمت : ۴۵ روپے
مبصر :۔ ابراہیم یوسف

دوسرا کنارہ غلام جیلانی صاحب کے آٹھ ڈراموں کا مجموعہ۔ جیلانی صاحب چالیس سال سے زیادہ عرصہ سے ڈرامے لکھ رہے ہیں۔ لیکن اپنے ڈراموں کو مجموعہ کی شکل میں شائع کرنے کا خیال انھیں اب آیا ہے۔ خیر دیر آید درست آید۔ جیلانی صاحب پیشہ کے اعتبار سے سائنس کے استاد رہے مگر ذہنی طور پر وہ فلسفہ اور نفسیات جیسے خشک موضوعات سے زیادہ قریب ہیں۔ جس کی جھلکیاں جابجا ان ڈراموں میں موجود ہیں۔ موت اور زندگی کے فلسفہ سے شاید انھیں زیادہ دلچسپی ہے جو کسی نہ کسی شکل میں ان کے اکثر ڈراموں میں موجود ہے۔ کہیں فلسفیانہ نقطۂ نظر سے تو کہیں عام عقائد کی روشنی میں، کہیں وہ ایسے سیدھے سادے ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں تو کہیں علامتوں اور استعاروں کے ذریعہ جس کی مثالیں ان کے ڈرامے "دوسرا کنارہ" اور "یگ یگ کی پیاس" ہیں۔ "طوفان کے بعد" ان کا ایک نہایت ہی کامیاب ڈراما ہے جو ایک بہت ہی نازک سماجی مسئلہ پر لکھا گیا ہے۔ اس میں موت سے لڑتی ہوئی ایک عورت ہے، اس کا شوہر ہے، عورت کے پہلے محبوب کی آمد ہے پھر عورت کی صحت یابی اور پھر خودکشی ہے۔ بظاہر عام سا پلاٹ معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی خوب صورتی اس کے کرداروں کے بانکپن میں ہے۔ تینوں کردار اداس اداس ہیں لیکن وہ جس طرح زندگی کو برتتے ہیں اس میں غضب کی زندگی نظر آتی ہے۔ تینوں کردار اپنی انسانیت اور شرافت کی گہری چھاپ چھوڑ جاتے ہیں۔ اور یہی اس ڈرامے کا سب سے بڑا حسن ہے۔ "چٹان" ان کا کرداری ڈراما ہے۔ اس میں ایک شخص خوشی خوشی پھانسی کے پھندے پر جھول جانا پسند کرتا ہے۔ مگر اپنی بات پر اٹل رہتا ہے۔ غلام جیلانی صاحب اعلا اقدار زندگی کے قائل ہیں، بالخصوص قربانی کے جذبے کے۔ اسی ڈرامے میں پھانسی پر چڑھنے والا اپنی بہن کو پہچانتے ہوئے پہچاننے سے محض اس لیے انکار کر دیتا ہے کہ کہیں اس کی بہن احساس کمتری کا شکار نہ ہو جائے کہ اس کے بھائی کو پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔ غلام جیلانی صاحب کے ان ڈراموں کی ایک خوبی یہ ادا ہے کہ ان میں ابتدا میں جس ماحول کی بنیاد ڈالی گئی ہے وہ آخر تک برقرار رہتا

[illegible]

اور طوفان برق و باراں آخر تک قائم رہتا ہے۔ اگرچہ ڈراما ایک معروف واقعہ پر لکھا گیا ہے کہ موت اسی کو آتی ہے جس کے لیے وہ وقت مقرر ہے۔ جیلانی صاحب کو اسٹیج کا کافی تجربہ ہے اس لیے ان ڈراموں میں ہر اس حربہ کا استعمال کیا گیا ہے جس سے ڈراما اسٹیج کی ایک کامیاب تخلیق بن سکے۔ ان ڈراموں کے بارے میں ایک یہ بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ جیلانی صاحب جہاں فلسفہ سے الجھ پڑتے ہیں وہاں کبھی کبھی ڈراما پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ بہرحال ایک بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر یہ ڈرامے مجموعے کی شکل میں شائع نہ ہوتے اور رسائل کے اوراق میں دفن رہتے تو اردو ڈرامے کا بڑا نقصان ہوتا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

مصنف: شکیل شاہ جہاں
صفحات: ۱۳۹، قیمت: ۴۰ روپے
مبصر: ابراہیم یوسف

"کبھی ایسا بھی ہوتا ہے" شکیل شاہ جہاں صاحب کے پانچ یکبابی ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ ان پانچ ڈراموں میں سے "فٹ پاتھ کا منظر"، "حوالدار سکھارام" اور "کبھی ایسا بھی ہوتا ہے" دوسرے ناموں سے اسٹیج کیے جا چکے ہیں۔ ناموں کو کیوں تبدیل کیا گیا اس کے بارے میں کوئی معلومات فراہم نہیں کی گئی ہیں۔ ان پانچ ڈراموں کو پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں پھیلی ہوئی برائیوں اور سماج کے بگڑتے ڈھانچے کو دیکھ کر وہ دکھی ہیں اور ان برائیوں پر طنز کے نشتر لگاتے ہیں۔ شکیل صاحب نے ایسے اکثر ڈراموں میں متعدد مسائل کو ایک ساتھ اٹھایا اس سے وحدت تاثر ضرور متاثر ہوئی ہے۔ مگر ان کے مکالموں میں جو طنز کی کاٹ ہے اس نے اس کی پردہ پوشی کر لی ہے۔ اس مجموعہ کا سب سے کامیاب ڈراما "حوالدار سکھارام" ہے پولیس میں جو بدعنوانیاں پیدا ہو گئی ہیں، رشوت خوری کا جو بازار گرم ہے اور فرائض سے جس طرح غفلت برتی جا رہی ہے ان سب کا نمائندہ حوالدار سکھارام ہے۔ آج کا نوجوان اعلا اقدار کی کس طرح ناقدری کر رہا ہے اس کی مثال "کبھی ایسا بھی ہوتا ہے" میں ملتی ہے۔ جس میں بیٹا باپ کو محض اس لیے قتل کر دیتا ہے کہ باپ اصول پرست ہے اور بیٹے کے نزدیک باپ کی اصول پرستی پورے خاندان کو مالی پریشانیوں میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔ بن بلائے مہمان میں معتبر کا آج کے سماج پر طنز اور پھر مہمان کو رحمت نہیں زحمت سمجھنا ہماری پرانی اقدار کی شکست ہے۔ غرض یہ کہ ان ڈراموں میں آج کے سماج کے سیاہ رخ سے پردے اٹھائے گئے ہیں۔ سماج کے ان سیاہ رخوں کو دیکھنے کے لیے ان ڈراموں کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

اردو زبان و قواعد

مؤلف :- شفیع احمد صدیقی
حصّہ اوّل ۱۶۰ صفحات (۱۵/-)
حصّہ دوم ۲۲۴ صفحات (۱۸/-)
تقسیم کار :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

تبصرہ نگار :- ڈاکٹر تنویر احمد علوی

شفیع صاحب کا یہ تالیفی نوعیت کا کام ہے اور اچھا کام ہے۔ وہ خود بھی ایک معلّم ہیں جن کا ایک ثلث صدی سے زیادہ وقت پڑھنے اور پڑھانے میں گزر چکا ہے۔ اس اثنا میں انھیں اردو کے طلبہ و طالبات کو مختلف سطحوں پر زبان و قواعد سکھانے کا جو تجربہ ہوا اور اس ضمن میں زمانہ بہ زمانہ بڑھتی ہوئی جن دشواریوں کو وہ محسوس کرتے رہے ان کے پیش نظر انھوں نے اردو زبان و قواعد کی یہ کتاب مرتّب کی ہے جو دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ اس کام میں ظاہر ہے کہ ان کے ساتھیوں کا مشورہ بھی شامل رہا ہوگا۔ اردو زبان و قواعد کا حصّہ اوّل چھٹی تا نویں اور حصّہ دوم نویں تا بارھویں جماعت کے طلبہ کے لیے ہے جو ان کے نصاب اور اردو زبان سے متعلق متفرق معلومات بہم پہنچانے کے خیال سے لکھی گئی ہے ان کتابوں کی ترتیب میں "جامعہ اردو علی گڑھ" کے نصاب کو بھی مدِّ نظر رکھا گیا ہے۔

زبان و قواعد پر لکھنا ایک مشکل کام ہے اس لیے کہ اس کا تعلق انشا پردازی، خیال آرائی اور مضمون بندی سے نہیں۔ اس کے لیے زبان کی ساخت، اس کے محاورے، روزمرّہ لفظیات، صرف و نحو، قواعد و لغت اور انشا سے متعلق مختلف موضوعات سے رجوع کرنا۔ نیز بہ نظر غائر متعلقہ کتب کا مطالعہ کرنا ازبس ضروری ہوتا ہے۔ انھوں نے سالہا سال اپنے اس مطالعہ کو جاری رکھا۔ ان کے طویل تجربہ نے اردو زبان سے متعلق مڈل تا سینیر سیکنڈری درجات کی تدریسی و نصابی دشواریوں کو آسان تر بنا کر پیش کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ بڑی بات یہ ہے کہ وہ اس پر آمادہ ہوئے کہ طلبہ کے لیے ان موضوعات پر کچھ لکھیں جن کی شدید ضرورت تھی۔ جو کچھ انھوں نے سمجھا ہے، زبان و قواعد کے مطالعہ اور تجربات کی روشنی میں سمجھا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس کتاب کے دونوں حصّوں کے ذریعے وہ طلبہ و طالبات نیز اساتذہ تک اسے پہنچا رہے ہیں۔ انھوں نے خود بھی اس کا اظہار کیا ہے کہ یہ کتابیں مڈل، سیکنڈری، سینیر سیکنڈری اور جامعہ اردو علی گڑھ کے طلبہ کی نصابی ضروریات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ مذکورہ جماعتوں کے لیے، قواعد و انشا کے علاوہ تاریخ اردو کے ان تمام موضوعات کو یکجا کیا ہے، جو تلاشِ بسیار کے باوجود طلبہ حاصل نہیں کر پاتے۔ اردو زبان کے طلبہ کے لیے ان موضوعات پر اب تک ایسی کوئی کتاب دستیاب نہیں تھی

جو طلبہ کے مطابق معیار اور درسی نصاب کے مطابق مختصر نیز آسان زبان میں ہو اور جس میں تمام ضروری معلومات یکجا کی گئی ہوں۔ توقع ہے کہ ان دونوں کتابوں سے اردو زبان کے اساتذہ بھی حسب ضرورت استفادہ کرسکیں گے۔

ہمارے یہاں بڑے بڑے ادبی موضوعات پر لکھنے والے تو موجود ہیں لیکن نصابی ضروریات کے پیش نظر لکھنے اور مناسب کتابیں تیار کرنے والے بہت کم ہیں۔ اس اعتبار سے شفیع صاحب کی یہ محنت قابلِ داد ہے انھوں نے بہت سی درسی کتابوں کی ورق گردانی کرکے اپنے لیے ضروری مواد فراہم کیا ہے اور اس کتاب کے دونوں حصوں میں اردو زبان سے متعلق تقریباً ستر (۷۰) موضوعات کو بڑے سلیقہ سے ترتیب دیا ہے خصوصاً، صرف و نحو، صنائع و بدائع، خطوط او مضمون نویسی کے اصول و آداب کے ساتھ ساتھ بہت سے نمونے، ڈیڑھ سو سے زائد تلمیحات اور ان کا پس منظر نیز اردو ٹسٹ پیپرس کے نمونے وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کتابوں سے مدد لے کر جو اساتذہ پڑھائیں گے یا طلبہ استفادہ کریں گے وہ ان کی افادیت کے بارے میں صحیح طور پر فیصلہ کرسکیں گے۔ میں جس حد تک ان کتابوں کو دیکھ سکا ان کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ دونوں کتابیں مفید طلب ہیں اور شفیع صاحب کی یہ محنت اور لگن قابلِ ستائش ہے۔ علاوہ ازیں مولف کی اس تحریر سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ اردو زبان و قواعد، کے دونوں حصے طلبہ کے لیے نہ صرف امتحان کی تیاری کے نقطۂ نظر سے مفید ہیں بلکہ ان کے معیارِ اردو کو بڑھانے اور قواعد جیسے خشک موضوع سے دل چسپی پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوں گے۔

مجھے یقین ہے کہ کتاب کی بعض فروگذاشتوں اور ترتیب کی جزوی خامیوں کو ساتھیوں کے مشورے سے آیندہ دور کر دیا جائے گا۔ بہتر ہوتا اگر اس کتاب کے حصۂ اوّل میں بھی مضمون نویسی کے اصول و آداب اور مضامین کے کچھ نمونے دیے جاتے جیسا کہ اس کتاب کے حصۂ دوم میں ہے۔ اسی طرح حصۂ دوم میں جہاں اردو ادب کی خاص خاص کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے وہیں " امراؤ جان ادا "، جیسی اہم کتاب کا بھی ذکر ہونا چاہیے تھا۔ اوّل تو اس کتاب کا اقتباس درسی کتاب میں شامل ہے اور اگر نہ بھی ہوتا جب بھی اس کتاب کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ اس کو اردو کا پہلا معیاری اور فنی اعتبار سے مکمل ناول ہونے کا شرف حاصل ہے۔

بہر حال مجموعی طور پر" اردو زبان و قواعد" کے دونوں حصے اردو زبان کے طلبہ نیز اساتذہ کے لیے بہت مفید ہیں۔ مولف نے موجودہ دور کے حالات و مشکلات کا صحیح اندازہ کرکے اردو زبان کے طلبہ اور طالبات کے لیے ایک قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے

کاوش

(تنقیدی مضامین)

مصنف: امتیاز احمد
اشاعت: ۱۹۹۱ء
مبصر: سید مرتضیٰ حسین بلگرامی
قیمت: ۳۵ روپے
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی ۲۵

کاوش کو ہم مختصر ترین معلوماتی کتاب کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ جن مسائل پر قلم اٹھایا گیا ہے وہ نئے مسائل نہ ہوتے ہوئے بھی اہم ضرور ہیں جس میں اسلوبیاتی نکات کو خوبی سے بیان کیا گیا ہے اور یہی خوبی ایسی ہے جس سے وزن و وقار کسی بھی تحریر میں پیدا ہو سکتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں رشید احمد صدیقی صاحب مرحوم پر دو مضمون شریک ہیں جس میں ان کے اسلوب سے بحث کرتے ہوئے اعلان کیا گیا ہے کہ

۱۔ ان کی سب سے بڑی حیثیت ایک انشا پرداز کی نظر آتی ہے۔
۲۔ طنز و مزاح میں بھی تفکر و تدبر کا پہلو ان کی دانش وری ہی کی دین ہے۔

اس رائے سے اتفاق ہو سکتا ہے، اختلاف کم، مگر حقیقت یہ ہے کہ رشید صاحب تطہیر خیالات، الفاظ کی چستی، مضمون آفرینی اور ادائے اظہار کے لیے ایسے الفاظ کے استعمال کے قائل تھے جس سے قاری اور سامع دونوں متاثر ہوں۔ دل شکنی ان کے معیار و ذہن کے خلاف بات تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مزاح میں ابتذال کو درخور اعتنا نہ مل سکا۔ اب یہ کہ وہ علی گڑھ کے دالہ و شیدا تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص جس ماحول میں بسر کرے گا اس کے لوازم کا اثر اس پر ہوگا۔ مگر جس سلیقگی اور خوبی سے رشید صاحب نے علی گڑھ کو روشناس یا نمایاں کرایا ہے اور ہر دل کی دھڑکن بنا دیا ہے۔ اس کا احساس صرف وہی کر سکتا ہے جو دل درد مند رکھتا ہوگا۔

دوسرا مضمون رشید صاحب کی مکتوب نگاری پر ہے اور سچ یہ ہے کہ ہم اسے خاصے کی شے کہہ سکتے ہیں۔ مگر مکتوب نگاری کے سلسلے میں ان کی اپنی ایک الگ رائے تھی۔ وہ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کو الگ نہ تصور کر کے داخلی شخصیت میں ڈوب کر، فنی و اسلوبی طریقہ سے کلام کرنے کے عادی تھے۔ ان کے وہ مکتوب جو کسی اعتبار سے بھی "اہم" نہیں کہے جا سکتے، اگر دیکھا جائے تو ان میں بھی کہیں نہ کہیں کوئی خوبی پوشیدہ ضرور ملے گی اور متاثر کن۔ البتہ مضمون نگار نے اس مضمون میں رشید صاحب کے اسلوب مکتوب پر بحث کی ہے اس پر تفصیلی گفتگو کی گنجایش ہے۔

پروفیسر کلیم الدین احمد کی آخری نظر۔ پر جذباتی یا اعتقادی انداز کے

...ہائے ناقدانہ نظر ڈالنی مناسب بات ہوگی۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ کلیم الدین صاحب
...ونظریہ قائم کر لیتے تھے اس سے سرمو ہٹنے کے لیے آمادہ نہ ہوتے تھے۔ انھوں نے
...میر انیس پر جو ناقدانہ اعتراضات کیے ہیں ان سے اختلاف نہ کرتے ہوئے بھی یہ بات
...مسلمہ طور پر کہی جا سکتی ہے کہ میر انیس بنیادی طور پر ہندوستانی معاشرے کے فرد
...تھے۔ اس سیاق وسباق میں وہ عرب کی مجلسی ریت کی شستت یا تہذیب کی خوبو
...بیان کرکے اور محاربہ ومقاتلہ کو صرف عرب کے خدوخال میں رکھ کر، کربلا کے سورما
...حضرات یا خانوادۂ رسولؐ کے افراد کی کیفیت وماہیت کو کما حقہ بیان کرکے ہندستانی
...عوام سے (جو اصلاً ان کے سامنے تھے) کیا حاصل کر سکتے تھے؟؟ گویا کلیم صاحب کی
...ناقدانہ تحریر کو اس نظر سے دیکھنا کہ واقعہ کربلا چوں کہ عرب و عراق کی سرزمین پر
...رونما ہوا تھا اس لیے اردو مرثیے کو اس نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھنا، بیان کرنا اور دیکھنا
...لازم تھا اور اگر ایسا ہوتا تو پھر کیا خود کلیم الدین صاحب اسے ایک مہمل عمل قرار
...نہ دیتے؟ لہٰذا ضروری ہے کہ قاری اس رمز سے آگاہ ہو کہ وہ اشخاص جو مرثیہ کو
...صرف فنی اور واقعاتی انداز سے دیکھنا چاہیں گے وہ صرف اعتراض کر سکتے
...ہیں، شاعر سے انصاف نہیں کر سکتے۔ میر انیس نے رجز، جنگ، مقابلہ، شہادت،
...قید و بند۔ اسیری اور رہائی۔ حزن وملال اور مناظر کی تصویرکشی جہاں جہاں بیان
کی ہے وہ سب اگر باطل قرار دے دی جائے تو پھر وجود مرثیہ سے انکار آسان
بات ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ اسی : کاوش میں
اختر انصاری صاحب مرحوم پر جو مضمون ہے اس کے یہ مصرعے :-

شراب تلخی ایام ابھی کچھ اور پی لیتا!
ابھی کچھ روز اور اپنے جگر کے چاک سی لیتا
زمانے کے حوادث سے خراج دوستی لیتا

اب اگر ان مصرعوں پر تنقیہی نظر ڈالی جائے تو۔ کیا دنوں (ایام) کی شراب کی
تلخی مہیا یا واقعی محسوس کی جاتی ہے؟ اور پھر اسے پیا بھی جا سکتا ہے؟ یا اپنے
جگر کو چاک کیا جا سکتا اور اسے اپنے ہاتھ سے سیا جا سکتا ہے؟ یا پھر زمانے کے
حوادث کی بنیاد پر خراج دوستی حاصل کی جا سکتی ہے؟ — میر انیس کی مرثیہ نگاری
اور ان کے : انحراف حقیقی :۔ کے ذیل میں یہی بات کہی جا سکتی ہے — دراصل
اقدار اعتقادی اور واقعاتی کو نگاہ تصور میں رکھا جائے تو پھر وہ اعتراضات خود
بخود کالعدم ہو سکتے ہیں۔ بلکہ یہ عرض کرنا مناسب ہوگا کہ کلیم الدین صاحب کی
فراست ودانائی اور دانشوری مسلّم، مگر ان کا اپنا پیمانہ نقد جدا نوعیت کا حامل
ہوتا تھا۔ اس لیے میر انیس کو صنف مرثیہ اور واقعات کو مذہبی و اعتقادی
روح کے پس منظر میں دیکھ کر فیصلہ کیا جائے گا تو کلام انیس کو ہم شاعری کی

عظمت اور واقعات کے بیان کو رزمیہ۔ بزمیہ دونوں کا شاہکار کہہ سکتے ہیں۔ اگر بعض معاملات میں بقول علامہ شبلی نعمانی مرحوم، میرانیس خود اکراہ کرتے تھے جیسے صنائع بدائع کو وہ شاعری کے چہرے کا داغ تسلیم کرتے تھے۔ مگر ــــ آخر لکھنؤ میں رہنا ہے۔ کہہ کر زبان بند کر دی تھی۔

سر سید احمد خاں کا شمار دانش ور، صحافی، مفکر، مصنف اور منصف میں ہے مگر ان کو صرف ایک تحریک کا علمبردار اور نمایندہ تسلیم کر لیا جائے یا مصلح قوم تو سب کچھ اس دائرۂ کار میں آ جائے گا۔ اس لیے کہ اس دور ابتذال میں سر سید ہی کی ذات تھی جس نے یہ نسخہ کیمیا ایجاد کیا کہ ــــ مغربی تہذیب و علوم اور جدید سائنٹفک علم سے واقفیت ہی ایک مریض قوم کا مداوا ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے سائنٹفک سوسائٹی کی خدمات کا مضمون نہایت درجہ و تیع اور شعوری ہے۔ علمی اعتبار سے بھی اور تسلسل کے لحاظ سے بھی اس کی اہمیت سے انکار کس طرح ممکن نہیں ہے۔
کتابت وطباعت معیاری، دیدہ زیب اور قیمت ۳۵ روپے مناسب ہے۔

ادبی فیچر اور تقریریں

مصنف: پروفیسر مظفر حنفی
قیمت: سو روپے
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی ۲۵
مبصر: ممتاز الحق

پروفیسر مظفر حنفی کا شمار ان ادیبوں اور شاعروں میں ہوتا ہے جن کی ہر سال متعدد کتابیں منظرِ عام پر آ جاتی ہیں۔ ان کتابوں کا تعلق تخلیقی ادب سے بھی ہے۔ تحقیق و تنقید اور ترتیب و تدوین سے بھی۔ زیر تبصرہ کتاب ان ادبی فیچروں اور تنقیدی تقریروں پر مشتمل ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف ریڈیو اسٹیشنوں اور ٹی۔ وی سے نشر کی جا چکی ہیں۔ ان میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ اندازِ بیان عام فہم ہو اور زبان سادہ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے مستفید ہو سکیں۔

کتاب میں شامل مضامین (چونکہ ضبط تحریر میں آ چکے ہیں اس لیے سہولت کے لیے انھیں مضامین کہا جا سکتا ہے) کو دو ذیلی عنوانات کے تحت رکھا گیا ہے "فیچر" میں نو مضامین شامل ہیں جب کہ "تقریریں" میں سترہ مضامین۔ یہ فیچرز اور تقریریں مختلف موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں۔ یوں بیشتر تحریروں کا موضوع ادب اور شاعری ہی ہے لیکن ان میں بڑا تنوع ہے۔ شعری ادب کے ساتھ ساتھ نثری اصناف کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ "تصوف کی سماجی معنویت اجتماع حج کے دنیاوی فوائد" اور "قوم کی تعمیر میں اساتذہ کا کردار" جیسی تقریروں کو سماجی

موضوعات کے تحت رکھا جا سکتا ہے۔ حج ایک اہم دینی فریضہ ہے اور اس موقع پر دنیا کے گوشے گوشے سے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے سوال اٹھایا ہے کہ کیا ایسے لوگوں پر مشتمل یہ عظیم الشان کئی روزہ اجتماع ارکان حج کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر مسلمانوں کے مسائل پر غور و خوض کرنے کے لیے ایک بڑے اور مؤثر پلیٹ فارم کا کام نہیں کر سکتا؟" ڈاکٹر صاحب کی اس رائے میں بڑا وزن ہے اور اگر اس پر عمل کیا جائے تو بڑے اچھے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ اس کتاب میں شامل دو مضامین میں ہندی ادیبوں سمترا انندن پنت اور بھارتیندو ہریش چندر کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اردو قارئین کے لیے یہ تحریریں بھی خاصی دلچسپی کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ خاص طور پر بھارتیندو ہریش چندر کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے کافی معلومات فراہم کی ہیں۔ بھارتیندو کا اردو سے گہرا ربط تھا اور وہ اپنے دور میں معروف اردو ادیب کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ اردو میں وہ رسا تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے اردو شاعری کے دو انتخابات بھی مرتب کیے تھے۔

اس حصے میں شامل مضامین "اردو میں شامل دوہے"، "مثنوی حزن اختر" "کلام غالب میں طنز و مزاح کا عنصر"، "انشائیہ اردو میں"، "اردو کہانی میں انشائیہ نگاری" اور "وزیر آغا کی شاعری" کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اردو میں دوہے کی روایت کے بارے میں کم لکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر صاحب کا یہ مضمون اس کمی کی بڑی حد تک تلافی کرتا ہے۔ "مثنوی حزن اختر" اودھ کے نواب واجد علی شاہ جن کا تخلص اختر تھا، کی منظوم داستان ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مثنوی کی تلخیص مختلف مصرعوں کی مدد سے پیش کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ مثنوی اپنے عہد کا تہذیبی، تاریخی، سیاسی اور سماجی مرقع بن گئی ہے۔

"وزیر آغا کی شاعری ایک مکمل تنقیدی مضمون ہے جس میں وزیر آغا کی شاعری کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یوں تو وزیر آغا نے مختلف شعری اور نثری اصناف میں اپنی انفرادیت کے نقوش ثبت کیے ہیں مگر بقول ڈاکٹر مظفر حنفی "وہ شاعر پہلے ہیں نقاد یا کچھ اور بعد میں۔

"اردو ادب اور مذہبی رواداری" اور "جمہوری معاشرہ اور اردو" کے ذریعے ڈاکٹر صاحب نے یہ بات ثابت کی ہے کہ اردو کسی خاص فرقے کی زبان نہیں ہے اور اس کی ترویج و ترقی میں مختلف مذاہب کے ماننے والے برابر کے شریک رہے ہیں۔

تنقید کے سلسلے میں ڈاکٹر مظفر حنفی کے خیالات بڑے واضح ہیں۔ وہ کسی لاگ لپیٹ کے بغیر دو ٹوک بات کہنے میں یقین رکھتے ہیں۔ جس طرح ان کی شاعری

کا خاص جوہر حق گوئی و بیباکی ہے۔ وہ کسی کی شخصیت سے مرعوب ہوئے ب
اس کی تخلیق پر آزادانہ رائے دینے پر قادر ہیں۔ اس لیے وہ تنقید کرتے وقت
ادیب کی بلند و بالا شخصیت سے زیادہ ادب پارہ پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہیں
خاص طور پر قرۃ العین حیدر پر لکھے گئے مضمون میں اس کے افسانوں اور ناو
کا مکمل تجزیہ کیا گیا ہے اور تخلیق سفر کے دوران ان میں رونما ہونے والی تما
خوبیوں اور خامیوں کا برملا اظہار کیا گیا ہے۔ شاد عارفی اور حسرت موہانی ڈ
صاحب کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ اس کتاب میں بھی حسرت کی سیاسی زن
اور شاد عارفی کی شاعری سے متعلق مضامین شامل ہیں۔ فیچر انداز میر، جب
کہ نام سے ظاہر ہے میر کی شاعری اور ان کی شخصیت کا احاطہ کرتا ہے
اس میں میر کی پُرسوز اور دلگداز شخصیت کی تشکیل میں حصہ لینے والے عوا
کی نشان دہی بڑے دلچسپ انداز میں کی گئی ہے۔ اسی طرح کبیر داس پر لکھ
گیا فیچر بھی بڑے مؤثر انداز میں ان کی زندگی اور ان کے پیغامات ہم تک
پہنچاتا ہے۔

فیچر لکھنا ایک فن ہے اس میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی تکنیک اور موسیقی کے
استعمال وغیرہ کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان باتوں کو ملحوظ رکھتے
ہوئے اپنے فیچرز میں ادبی شان پیدا کر دی ہے۔ کتابت و طباعت اعلا درجے کی
ہے۔ سرورق بھی پرکشش ہے۔
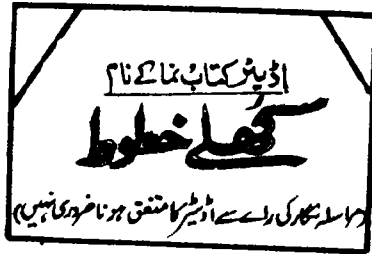
نومبر کے کتاب نما میں خط شائع کرنے کے لیے شکریہ۔ نظر گزر کے لیے کتابت کی ایک
لطی تو لازمی ہے۔ خط میں نے پہلے لکھا تھا، لیکن یہ آپ نے اچھا کیا کہ فاضل ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ
کا خط میرے خط سے پہلے چھاپ دیا۔ کتابت کی چند غلطیوں نے مجھے دُکھی کیا، وہ موصوف نے
ے دکھاتے میں ڈال دیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ موصوف میرے بارے میں کیسے کیسے
لن رکھتے ہیں۔ فاضل ڈاکٹر بیگ کا یہ اعتراض حقیقت نہیں کہ میں نے اُن کا جملہ مصنف
ن(کی)، تحریرات سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے جان بوجھ کر، تحریف کی نیت سے (کی) حذف
ے نقل کیا۔ کاتب صاحب نے حک و اضافہ (رائے محقق سے) کا حق کثرت سے استعمال
ہے، اور شاید (کی) کا حذف انشا درست کرنے کے نیک ارادے سے کیا ہے۔
ت کے اس اظہار کے بعد عرض ہے کہ (کی) کے حذف سے کوئی معنوی تحریف نہیں ہوئی
۔ حواشی میں دوسرا پیراگراف سوا سات سطروں کی ہے، اور اس میں تین جملے
:

> "تجز صوتیات میں 'عروض' (PROSODY) کے تصورات کو سب سے
> پہلے لسانیات کے دبستان پراگ (PRAGUE SCHOOL) میں فروغ حاصل
> ہوا۔ خاص طور سے این ایس تروبتزکوائے (N.S.TRUBETZKOY) کی
> مشہور تصنیف تجز صوتیات کے اصول (THE PRINCIPLES OF PHONO
> LOGY) میں۔ بعد میں لندن کے پروفیسر جے۔ آر فرتھ (PROF. J.R.
> FIRTH) نے اسے ایک تجز صوتیاتی نظریے کی شکل دی۔ مصنف نے
> ان کی تحریرات سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ (کتاب میں FIRTH
> کی جگہ EIRTH چھپا ہے۔)

"ان کی تحریرات سے" کیا مراد ہے؟ اگر صرف فرتھ کی تحریرات سے استفادے
بات تھی، تو پیراگراف دو جملوں کا الگ ہونا چاہیے۔ ان تحریرات اور ان کی تحریرات
ے معنی میں کیا تحریف ہوئی؟ مجھ پر (کی) حذف کر کے تحریف کا الزام لگانے کے جوش
ں موصوف یہ بھول گئے کہ انھوں نے یہ ثابت کیا کہ ان کے استاد محترم نے تروبتز

کو اسے سے براہ راست کوئی استفادہ نہیں کیا۔ صرف فرتھ کی تحریرات سے استفادہ کیا۔ فرتھ کی کن تحریرات سے؟ اس کا ذکر ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے پمفلٹ میں کہیں نہیں۔ اس کا بھی کوئی اشارہ نہیں کہ بنیادی اور اصل ماٰخذ سے یا ثانوی ماٰخذ سے۔ یہ شاید دنیا کا واحد تحقیقی پمفلٹ ہے، جس میں کتابیات نہیں، ماٰخذ کی نشاندہی نہیں۔ لیکن یہ دوسری کہانی ہے۔ پھر کبھی۔ مجھے تو اس بات پر بھی اعتراض نہیں کہ انگریزی پمفلٹ میں محب مکرم ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے لندن اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز سے پروفیسر فرتھ کی وابستگی کا حوالہ حواشی میں دیا تھا۔ فاضل ڈاکٹر بیگ نے ترجمے میں اسے حذف کر دیا۔

فاضل ڈاکٹر بیگ تحریر فرماتے ہیں: "مسعود صاحب نے اپنی مذکورہ انگریزی عبارت میں تروبتزکو اے کی جرمن کتاب کے جرمن نام ROUNDZUGE DER PHONOLOGIE کا اردو (کذا؟) کر کے PRINCIPLES OF PHONOLOGY لکھ دیا تھا۔۔۔"

ص ۸۶ پر فاضل ڈاکٹر بیگ اپنا یہ جملہ ملاحظہ فرمائیں: "مسعود صاحب نے اپنی اس عبارت میں یہ کہیں نہیں کہا کہ انھوں نے تروبتزکو اے کی تحریروں سے استفادہ کیا بلکہ انھوں نے جے۔ آر۔ فرتھ کی تحریروں سے استفادے کی بات کہی"

سوال یہ ہے کہ جب تروبتزکو اے کی تحریروں سے استفادہ ہی نہیں کیا، تو فاضل ڈاکٹر بیگ نے اپنے عالمانہ مقدمہ میں پراگ اسکول کے صرف تروبتزکو اے ہی کا ذکر کیوں کیا؟ JAKOBSON کچھ کم معروف شخصیت نہیں، اور FRANCIS KATAMBA کے مطابق پراگ اسکول کے نظریے کو امریکہ میں جیکب سن نے ہی متعارف کرایا۔ اور فرانسس نے تو اپنی کتاب AN INTRODUCTION TO PHONOLOGY میں ایک عنوان (ص ۳۸، ۳۹) JAKOB SONIAN FEATURES بھی قائم کیا ہے۔

تروبتزکو اے اور جیکب سن، دونوں روسی نژاد تھے، اور پراگ میں رہتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں جب ہٹلر کی فوجوں نے چیکوسلواکیہ پر قبضہ کیا تو جیکب سن نیویارک چلا گیا، اور پھر وہاں سے ہارورڈ۔ تروبتزکو اسے تجز صوتیاتی کیست کی درجہ بندی صوتیاتی تقابل کی بنیاد پر کر کے ایک نظام مرتب کرنا چاہتا تھا۔ مسموعیت اور لو کاریت کے طول پر اس نے توجہ دی۔ زیادہ تفصیل فرانسس کتمبا کی کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے۔ وہ مختلف زبانوں کے صوتی نظاموں کے تقابل اور درجہ بندی کے مطالعے سے نوعی نتائج اخذ کرنا چاہتا تھا، اور یہ دکھانا چاہتا تھا کہ فونیموں (صوتیوں) کو مختلف زبانوں کے نظاموں میں منضبط تو کیا جا سکتا ہے، لیکن ایک محدود حد تک۔ بنیادی طور سے تروبتزکو اسے تجز صوتیاتی نوعی درجہ بندی کے مطالعہ سے دلچسپی رکھتا تھا۔ جیکب سن اور اس کے شرکائے کار کے مطالعہ اور کھوج کا تعلق تجز صوتیاتی امداد سے تھا۔ جو عام اور کلی نوعیت رکھتے ہیں۔ جیکب سن کا نظریہ یہ تھا کہ صوتیاتی تنوع لامحدود ہے، ہر زبان میں، لیکن صوتیاتی طور سے متضاد خصوصیات کی حدوں پر مشترک اور عام کلیئے روک لگا دیتے ہیں۔

قارئین کے لیے یہ بحث اکتا دینے والی نہیں تو پیچیدگی سیٹی کسی حد تک ضرور ہوگی۔
فرتھ کے غیر شعری عروض کے نظریے کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ مقدمہ میں فاضل ڈاکٹر
نے کچھ وضاحتیں نہایت عالمانہ طریقے سے کی ہیں۔ لیکن ان سے صرف لسانیات کے طلبہ
، بلکہ شاید منتہی ہی مستفیض ہو سکتے ہیں۔ میں سادہ الفاظ میں، طالب علمانہ طریقے
فرتھ کے نظریے کو، جو فرانسس کٹمبا کی کتاب میں زیر بحث ہے، پیش کرتا ہوں:
فرتھ کا (غیر شعری) عروضیاتی تجزیہ ساختیت پسند ماہرین تجز صوتیات کے نظریے
... ستر دکرتا ہے۔ ... (غیر شعری) عروضی تجزیہ تجز صوتیاتی ساخت کو ایک زیادہ پیچیدہ
نامہ مانتا ہے۔ صوتیاتی اکائیاں (موٹے طور سے مصمتوں اور مصوتوں کے مرادف)
صوتیاتی نقشے کے حصے ہوتے ہیں، اور ان میں تان، تاکید (STRESS) مصوتے کی ہم آہنگی،
اور انفیت کے عناصر اور خصوصیات شامل ہیں۔ الفاظی نشست سے جملہ مرتب ہوتا ہے، اور پس نحوی قاعدے
کے ماحصل پر ہوتا ہے اور یہ ہے جملہ اور اس میں الفاظ کی نشست، غیر شعری عروضیاتی نظام مراتب میں ینرہے شامل ہیں۔

کلام: سُر لہر ترکیب - تجز صوتیاتی ترکیب - عروضیاتی لفظ
رکن (FOOT) - رکنیہ SYLLABLE

(رکن کا تسامح رکینہ سے نہ ہو، اس موضوع پر اشارے اور اعتراضات کے جواب
کچھ عرض کیا گیا تھا، اس کی معنویت اور افادیت یہاں واضح ہو جاتی ہے۔ عروضیاتی
مراتب کے جدول اور تفصیل کے لیے فرانسس کٹمبا کی کتاب ص ص ۲۰-۲۹۳ ملاحظہ فرمائیں)

عروضیاتی دائرے کے نظریے میں یہ بات واضح ہے کہ اس اقلیم میں مراتب
بدرجہ مقرر ہیں، اور ان درجات کی پابندی لازمی ہے۔ حدود مقرر ہیں اور ایک
دائرے کی سرحد میں دخیل نہیں ہو سکتے۔ کم تر رتبہ کے دائرے کبھی بلند تر مرتبے کے دائرے
اجزا خود میں شامل نہیں کر سکتے۔ کم مرتبے کے دائرے بلند مرتبے کے دائرے کا جزو ہوتے ہیں۔
رکنیہ (SYLLABLE) اکائی ہے۔ رکنیوں کا مجموعہ رکن (FOOT) بناتا ہے۔ ارکان سے
عروضیاتی لفظ بنتا ہے۔ اس کے برعکس ممکن نہیں۔

عروضیاتی نظریے کی بات ہو رہی ہے تو ایک اہم عنصر کی طرف سے توجہ دلا
جائے جس کا ذکر نہ تو ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی کتاب میں ہے اور نہ فاضل ڈاکٹر
کے مقدمے یا خط میں۔ اس کا تعلق وصل صوتی سے ہے، اور لسانیات میں اس
کے لیے اصطلاح ہے LIAISON جنھیں عروض (شعری عروض) سے شناسائی ہے، وہ
اس حالت کو جانتے ہیں کہ جب مصمتہ پر ختم ہونے والے لفظ کے فوراً بعد کوئی لفظ
مصوتے سے شروع ہوتا ہے، تو /اَ/، /اِ/، /اُ/، /آ/، /ای/، /یا/، /اُو/ کے شروع
کی صوت نیم مصوتے کی ہے، وہ صوت ماقبل کو خود میں جذب کرنے کی صلاحیت
رکھتی ہے۔ اور اکثر رکنیوں کی ساخت اس سے اثر پذیر ہوتی ہے۔ تجز صوتیات میں
RE-SYLLLABIFICATION کہتے ہیں۔ سنسکرت، ہندی اور فرنچ میں یہ عمل بہت

واضح ہے۔ کتاب نما کے جنوری کے اشاریے کے موضوع سے اس کا تعلق۔
انگریزی کی کتابوں میں PROSODIC DOMAIN کے تحت اس سے بحث کی جاتی۔
لیکن اس تصور کو ڈاکٹر مسعود حسین خاں یا فاضل ڈاکٹر بیگ نے لائق اعتنا نہیں
وہ شاید اس سے واقف بھی نہیں۔ اور اس کا گمان اس بات سے ہوتا ہے کہ اصطلاح
سازی کی جو کمیٹیاں مرکزی وزارت تعلیم کے ترقی اردو بیورو نے بنائی ہیں ان میں
لسانیات کی کمیٹی کے صدر ڈاکٹر مسعود حسین ہیں، اور فاضل ڈاکٹر بیگ بھی اس کے
ہیں۔ لسانیات کی جو فرہنگ اصطلاحات شائع ہوئی ہے، اس کی ایک جلد مجھے
دی گئی، کہ میں میڈیا سے متعلق کمیٹی کے ممبر ہوں۔ لسانیات کی فرہنگ میں ص ۱۰۹
LIAISON کا اردو متبادل رابطہ دیا گیا ہے۔ یہ اصطلاح لسانیات (تجز صوتیات) میں
RE-SYLLABIFICATION کے سلسلہ میں ہے۔ یہ لفظ تعلقات عامہ کے سلسلہ میں تو را
کے مفہوم میں آتا ہے۔ لسانیات میں نہیں۔ یہ فرانسیسی لغت ہے۔ آخری نون غنہ ہے
اور معنی اس کے ناجائز تعلقات کے ہیں۔ الف وصل کا تعلق چونکہ میرے مضمون (اشا
اور اردو صوتیات) سے تھا، اس لیے یہ سطور لکھی گئیں۔

ہم پھر فاضل ڈاکٹر بیگ کے اس بیان پر واپس آتے ہیں کہ مسعود حسین خاں نے
جرمن میں کتاب کا نام انگریزی میں ترجمہ کر کے PRINCIPLES OF PHONOLOGY لکھا
فاضل ڈاکٹر بیگ نے کیا خود سے یہ سوال کیا، یا اپنے پچھلے خط میں یہ سوال اٹھایا
کتاب کا جرمن نام لکھنے کے بجائے اس کا ترجمہ کیوں لکھا گیا اردو ترجمہ اردو عبا
کے لیے کافی نہیں تھا؟ انگریزی کتاب کا نام اس وقت نہیں تھا، جب لکھی گئی تھی
اصل انگریزی کتاب میں بھی جرمن یا فرنچ نام ہوتا تھا۔ کیا تحقیق کا اصول یہی ہے
اگر وہ اپنے استاد محترم کو اس بات کی چھوٹ دیتے ہیں کہ جرمن کتاب کا انگریزی
نام (ترجمہ کر کے) لکھیں، تو مجھے وہ یہی حق کیوں نہیں دیتے کہ میں نے بھی سنسکرت
کتاب مہا بھاشیہ کے نام کا اردو ترجمہ مہا بھاشا لکھا! میں نے مہا بھاشا نام لکھ
تو کشتنی، سوختنی، گردن زدنی۔ میرے محب مکرم نے مقدمہ تاریخ زبان اردو میں اس
کتاب کا نام مہا بھاشش لکھا۔ کتاب کے سات ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ فاضل ڈاکٹر
بیگ چپ ہیں۔ میں ان کو اور قارئین کو دعوت دیتا ہوں کہ اس پر غور فرمائیں۔ قول فیصل
دیں یا نہ دیں۔ لیکن خاموش نہ رہیں۔

کیا فاضل ڈاکٹر بیگ نے اس بات پر غور فرمانے کی زحمت کی کہ یہ پمفلٹ پیرس
میں لکھا گیا، تو کس اسکول یا ادارے کے لیے لکھا گیا، اور انگریزی میں کیوں؟ فرانسیسی
میں کیوں نہیں؟ زیادہ سے زیادہ ڈھائی ہزار الفاظ پر مشتمل پمفلٹ تھا۔ خود فرانسیسی میں
ترجمہ کر سکتے تھے، بعد میں منتقل کرا سکتے تھے۔ آخر ولیم جونز نے بھی ہندستان آنے سے
پہلے کچھ ترجمے اسی طرح کیے، کرائے تھے۔ جانے دیجیے یہ بات۔ (حالانکہ اقبال نے اپنا تحقیقی

مقالہ جرمن میں لکھا تھا، مثال موجود ہے۔ محی الدین قادری زورؔ نے اپنا مقالہ HINDUS
TANI PHONETICS ۱۹۳۰ء میں پیرس میں لکھا تھا۔ لیکن پیش لفظ (PREFACE) میں انھوں
نے اعتراف کیا کہ لندن یونی ورسٹی سے جس تحقیقی مقالے پر انھیں ڈاکٹر آف فلاسفی کی
ڈگری ملی تھی، اس کے لسانیاتی حصے ان کی کتاب میں استعمال کیے گئے ہیں۔ جو تجربات
انھوں نے کالج ڈی فرانس اور انسٹی ٹیوٹ ڈی فونیٹک (پیرس) میں کیے، ان کے
لیے دو استادوں کا شکریہ ادا کیا ہے۔ مشہور فرانسیسی ماہر لسانیات ژول بلوخ
DR JULES BLOCH نے اس کتاب کا تعارف لکھا۔ بیس برس پہلے یہ اس موضوع پر
پہلی کتاب ہے۔ اور اس پر ڈی لٹ نہیں ملی۔

ظاہر ہے مسعود حسین نے تروبتزکوائے کی جرمن کتاب GRUNDZUGE DER PHONO
LOGIC نہیں پڑھی ہوگی۔ ۱۹۴۹ء میں اس کا ترجمہ فرانسیسی میں ہوا، اور پیرس سے چھپا
اگر یہ مسعود حسین کی نظر سے گزرا ہوتا تو پھر حواشی میں وہ اسی کا حوالہ دیتے۔ کتاب کے
نام کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس حقیقت پر تو مسعود حسین
ہی روشنی ڈال سکتے ہیں کہ انھوں نے تروبتزکوائے کی کتاب جرمن میں یا فرانسیسی میں
پڑھی تھی۔ اور پڑھی تھی بھی یا نہیں، اور یہ کہ انھوں نے انگریزی ٹائیٹل کا حوالہ کیوں
دیا؟ فاضل ڈاکٹر بیگ ابھی تک کتاب کے فرانسیسی ٹائیٹل سے واقف نہیں۔
یہاں ضمناً ایک بات یہ عرض کردی جاتے کہ مسعود حسین خاں کا یہ پمفلٹ A PHONETIC
AND PHONOLOGICAL STUDY OF THE WORD IN URDU ۱۹۵۰-۵۱ء میں انگلستان
اور فرانس میں لکھا جانا بتایا جاتا ہے۔ جو کام محی الدین قادری زورؔ بیس برس پہلے
کر چکے تھے اس سے قطع نظر لندن یونی ورسٹی میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری کے لیے
بی این پرساد ایک تحقیقی مقالہ ۱۹۵۰ء میں داخل کر چکے تھے۔ A PHONETIC AND
PHONOLOGICAL STUDY OF BHOJPURI یہ باقاعدہ پی۔ ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ
تھا۔ حوالوں کے ساتھ مسعود حسین تو ظاہر ہے اس حقیقت سے واقف ہوں گے،
اور شاید اسی لیے انھوں نے لندن یونی ورسٹی میں اس موضوع پر ریسرچ کرنا
نہیں چاہا، اور پیرس کا رُخ کیا۔ وہاں کس ادارے میں یہ تحقیق کی، اس کے بارے میں
ان کے مونوگراف / پمفلٹ میں کوئی اطلاع نہیں ہے۔ فاضل ڈاکٹر بیگ کے علم میں
شاید یہ بات نہ ہو۔ یہ گزارش اس لیے کی جارہی ہے کہ وہ اس بات پر بھی روشنی
ڈالیں۔ کتاب کے فرانسیسی نام کی انھیں کبھی اطلاع شاید نہیں تھی، ورنہ انھوں
نے یہ نام مقدمہ یا دو خطوں میں کہیں لکھا ہوتا۔

نومبر کے کتاب نما میں اس بات پر تأسف کا اظہار کیا گیا ہے کہ اردو میں
ریسرچ پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جارہی ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ پہلے کب تھی؟ مقدمہ
تاریخ زبان اردو میں پانینی کا لاہور میں پیدا ہونا بتایا گیا ہے۔ (لاہور میں — جاہل'

یہ بھی نہیں کہ آج جہاں لاہور ہے)۔ کیا اس وقت لاہور نام کا کوئی شہر تھا؟ پتن جلی کی کتاب کا نام مہا بھاشں بتایا گیا ہے۔ میرے مضمون میں مہا بھاشا لکھا گیا تھا فاضل ڈاکٹر بیگ اس پر سخت برافروختہ تھے کہ مہا بھاشیہ درست ہے۔ درست لیکن مہا بھاشں (شین ساکن یا فتحہ کے ساتھ) کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ مہا بھاشا کے آخر میں بڑا معتوتہ /آ/ ہے۔ مہا بھاشں کے آخر میں چھوٹا معتوتہ یہ /ہے، اگر شں ساکن نہ ہو۔ مسعود حسین خان اے اے میکڈانل کو تسلیم نہیں کرتے ایک ثانوی ماخذ سے کسی میکڈانلڈ کا حوالہ دیا ہے۔ پروفیسر میک ڈانل کی مشہور زمانہ دونوں تصنیفات نہیں دیکھیں یہ میکڈانلڈ ہے کون؟

میں نے اپنے سہو کے لیے اپنی مذمت کی۔ جس وقار کی توقع ایک عالم سے کی جاتی ہے، ڈاکٹر بیگ کی تحریر میں وہ نہیں پایا جاتا ہے۔ شمال مغربی ہندستان کا علاقہ ادیچہ تھا۔ اس علاقے کی بولی کے لیے بھی مسعود حسین خان نے ادیچیہ ہی لکھا ہے۔ اُدیچیہ کو اُدیچہ لکھنا اتنی ہی بڑی غلطی ہے، جتنی مہا بھاشیہ کو مہا بھاشہ یا مہا بھاشا لکھنا۔ اگر میری غلطی فاحش تھی تو مسعود حسین خاں کی غلطی بھی اسی پیمانے کی فاحش ہے۔ فاضل ڈاکٹر بیگ کو یہ غلطی نہ اپنے زمانۂ طالب علمی میں نظر آئی، اور نہ بعد میں جب ایڈیشن پر ایڈیشن چھپتے رہے، اور نہ اب، جب میں نے نشاندہی کی۔ میں تو اپنی غلطی پر اپنی مذمت کر کے اپنے طالب علم ہونے کا ثبوت دے چکا۔ لسانیات کے بقراط بھی اپنے عالم ہونے کا ثبوت دیں۔ اپنے خط میں ڈاکٹر بیگ نے (ص ۸۸) دو بار بولی کے لیے ادیچیہ لکھا ہے، جب کہ میں نے عرض کیا تھا لیکن موصوف کے قلم نے مسعود حسین خاں کے سلسلے میں وہ بے باکی نہیں دکھائی جو میرے لیے انھوں نے مخصوص کی تھی۔ جب موصوف نے ادیچہ علاقہ کی بولی کے لیے ادیچیہ تسلیم کر لیا، تو اسی طرح مدھیہ دیش کی بولی، تواعد کی رو سے مدھیہ دیشیہ تسلیم کرنے میں کیا قباحت ہے؟ فاضل ڈاکٹر بیگ لسانیات کے معروف استاد ہیں۔ دلیل ملاحظہ فرمائیں کہ کیا دی ہے:

> "مدھیہ دیشیہ، ہائے مختفی کے ساتھ، یعنی मध्य देश اسم یعنی NOUN ہے، جب کہ मध्य देशीय مدھیہ دیشیہ صفت ADJECTIVE ہے۔ زبانوں کے نام اسمائے خاص ہوتے ہیں، نہ کہ صفت۔"

فاضل ڈاکٹر بیگ نے اس بات پر بھی غور نہیں فرمایا کہ ادیچہ اسم ہے ادیچیہ صفت انھوں نے اس علاقے کی بولی کا نام، میری گذارش پر نہ صرف تسلیم کیا، بلکہ اپنے قلم سے دو بار یہ لکھا بھی۔

لسانیات کے استاد کی حیثیت سے فاضل ڈاکٹر بیگ نے شاید کبھی غور نہیں فرمایا:

۱- پورب کی بولی	پوربی	یہ صفت ہے
۲- پنجاب کی زبان	پنجابی	"
۳- مگدھ کی بولی	مگدھی	"
۴- بھوج پور علاقے کی زبان	بھوجپوری	"
۵- مہاراشٹر کی بولی	مہاراشٹری	"
۶- مراٹھواڑا کی زبان	مراٹھی	"
۷- گجرات کی زبان	گجراتی	"
۸- نیپال کی زبان	نیپالی	"
۹- فارس کی زبان	فارسی	"
۱۰- عرب کی زبان	عربی	"
۱۱- انگلینڈ کی زبان	انگلش	"
۱۲- روس کی زبان	رشین	"
۱۳- فرانس کی زبان	فرنچ	"

اسی طرح جرمنی، چین، ترکیہ، امریکہ، اسپین، پرتگال وغیرہ کی زبانیں صفت کے لاحقے لگا کر ہی ہیں۔ ادیچیہ خود صفت ہے۔

پانی اور پتنجلی نے قواعد لکھیں۔ صوتیات اور تجز صوتیات قواعد کا حصّہ ہیں۔ اسم فعل صفت، حروف جر۔ یہ سب بھی قواعد کا حصّہ ہیں۔ عروض بھی قواعد کا حصّہ ہے۔ صفت اسم کے طور پر بھی استعمال ہوتی ہے، خاص طور سے جب کچھ محذوف ہو۔ انگوری صفت ہے۔ لیکن اہل شراب کی گفتگو میں انگوری کے معنی انگور کی شراب (اسم) ہوتے ہیں۔ اسی طرح لاابی۔ صفتیں ABSTRACT NOUNS کے طور پر بھی استعمال ہوتی ہیں۔ اسم صفت کے بارے میں کہیں لکھ چکا ہوں۔ ڈاکٹر بیگ سے گزارش ہے کہ میری معروضات کی روشنی میں اپنے خط پر ایک نظر ڈالنے کی زحمت فرمائیں۔ لسانیات کے ایک استاد نے استقال میں میں آکر ایسی باتیں لکھ دیں!

موصوف نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے:

> کمال احمد صدیقی نے کتاب نما کا جنوری کا اشاریہ، اور جون کا مضمون (اردو صوتیات) نہایت توجہ اور دلچسپی سے پڑھا۔ ان دونوں تحریروں میں مجھے اختلاف کی کافی گنجائش نظر آئی۔ اختلافی مسائل پر لکھنے سے میں نے اس لیے گریز کیا کہ ع خطائے بزرگان گرفتن خطاست۔ میں نے ڈاکٹر صدیقی کے مضمون کی صرف FACTUAL MISTAKES کی نشاندہی کر دی تاکہ کتاب نما کے قارئین ان کی تصحیح فرمالیں"

زرگی بہ عقل است نہ بہ سال۔ میرے لیے یہ مقولہ نہیں۔ میں نے جتنا اپنے بزرگوں سے سیکھا

ہے، شاید اس سے کہیں زیادہ اپنے بعد کی پیڑھیوں سے سیکھا ہے، اور اس کا اعتراف کرنے میں کسی قدر فخر بھی محسوس کرتا ہوں۔ صوتیات اور تجز صوتیات کے بارے میں جو مفروضے میں نے پیش کیے، اُن کے بارے میں لکھا تھا:

"اردو کے سارے ماہرین لسانیات، جن کی اس موضوع پر کتابیں ہیں جو یونی ورسٹیوں میں استاد ہیں، یا یونی ورسٹیوں سے ریٹائر ہو چکے ہیں ــ وہ سب مخاطب ہیں، کہ وہ نکتہ داں ہیں۔"

اور میں نے سب کو دعوت دی کہ ان مفروضوں کو پرکھیں۔ میری ناقص رائے میں یہ نئے اصول ہیں، اور ان سے لسانیات، صوتیات اور تجز صوتیات کی سرحدیں آگے بڑھیں گی۔ وہ حضرات جو سمجھتے ہیں کہ اردو لسانیات پر حرفِ آخر لکھا جا چکا ہے، انھیں خاص طور سے دعوت دی جاتی ہے کہ اختلافات کا کھل کر اظہار کریں۔ کھوٹ جو ان کے کامل علم میں یا میرے ناقص علم میں ہے، واضح ہو جائے گی۔

● ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، لاجپت نگر، صاحب آباد۔ غازی آباد

عمران ابن عرشی کی غزل بہت پسند آئی۔ جنیت پر مارتی بہت عمدہ لکھتے ہیں البتہ پچھلے شمارے میں "اوّلیت کے سہرے" کوئی اچھا تاثر قائم نہیں کر پایا، تحقیق کی مزید ضرورت ہے، بلکہ اگر وہ اسے دوبارہ محنت سے لکھیں تو شاید زیادہ اہم معلومات سامنے آئیں گی۔ نیز آزاد غزل سے دامن بچایا جائے تو بہتر ہے اتنی زیادہ آزادی بہتر نہیں ہے۔

● کرامت بخاری

۲۷۰-۱ اے فیصل ٹاؤن۔ جی۔ یو۔ آر V لاہور

اردو میں رپورتاژ نگاری کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کا مقالہ لکھ رہا ہوں اردو کے تمام ادیبوں سے میری درخواست ہے کہ جن ناقدین یا ادبا نے اس موضوع پر لکھا ہو یا ان کی ذاتی لائبریری میں اس طرح کا میٹریل موجود ہو وہ ازراہ کرم مندرجہ ذیل پتا پر جلد از جلد ارسال فرمائیں جس کے لیے میں بے حد مرہونِ منت ہوں گا۔

● دیوان سنگھ ناگپال۔ شعبۂ اردو
پنجاب یونی ورسٹی۔ چنڈی گڑھ۔ ۱۶۰۰۱۴

اپنی مختصر ضخامت اور بوٹا سا قد کے باوصف "کتاب نما" پڑھنے والوں کے لیے نہایت وسیع، خوبصورت و دلچسپ مضامین و نثر پیش کرتا رہتا ہے "اداریہ" بظاہر تو مہمان مدیر لکھتے ہیں، ابتدا میں ایسا لگتا ہے جیسے رسالے کے مدیر نے مالکوس کے بجائے ٹالکوس سنانے کی ٹھان لی ہے مگر جب پڑھنے بیٹھو تو "مہمان مدیر" "بڑے غلام علی خان" سے کم نہیں لگتے ــ ہر راگ اور راگنی اتنی مہارت فن کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ بعض اوقات سمجھ میں نہ آنے کے باوجود، تائید میں گردن ہلتی رہتی ہے اور زبان سے واہ۔ ● سلطان جمیل نسیم۔ گلشن اقبال کراچی۔

دسمبر ۹۲ء کے کتاب نما، میں اردو زبان سے متعلق کئی مضامین پڑھنے کو ملے، جن میں اشاریہ "اردو زبان کے سیاق" اور " اردو میں صحیح نثر کی روایت" خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ شعری حصے میں رؤف جاوید، عمر فاروقی اور راز اتحادی کی تخلیقات پرچے کے مزاج و معیار کے مطابق ہیں۔ ● بسمل عارفی
سمستی پور۔ بہار

غزلوں میں حیثیت پرمار کی غزل ایک اچھی کاوش ہے۔ لہجہ میں انفرادیت ہے۔ نظموں میں ایم اے کریمی کی آواز سائنسی نظم "بائیڈروجن"، سائنسی معلومات رکھنے والوں کو یقیناً پسند آئے گی۔ ملک نسیم کی بھی نظم خوب تر لگی۔

عمران ابن عرشی نے اپنی غزل کے دوسرے شعر کی ابتدا مجروح دل سے کی ہے جس کی وجہ سے مصرع بحر سے باہر ہوگیا ہے۔ اردو عروض میں ایک ساتھ چار متحرک نقطہ نہیں آسکتے۔ وہ بھی صدر و ابتدا میں۔ اگر شعر کی ج کو ساکن کردیں تو مصرع وزن میں آجاتا ہے مگر ایسا کرنا ناممکن ہے۔ نہیں تو لفظ کی شکل مسخ ہوجائے گی۔ ● عین جعفر
۸۸/۲ گڈیانہ۔ اُنّاؤ۔

تاراچرن رستوگی کا مہمان اداریہ "اردو اور بیاتی ریسرچ ۔۔۔۔ ایک اہم مسئلہ" نظر سے گزرا اس کے مطالعے کے بعد جو سوالات یکلخت ذہن میں پیدا ہوئے وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ہمارے یہاں نئے موضوعات پر تحقیق کا ٹوٹا ہے عام طور پر ہماری تنقید میات فن اور شخصیت اور تقابلی مطالعے کے دائرے میں گردش کرتی رہتی ہے اس یکسانیت کے لیے کون کتنا ذمے دار ہے۔

۲۔ اردو سے ایم۔ اے کرنے کے لیے اور تحقیق کے لیے پروفیسر حضرات ہانکا لگواتے ہیں یہ واقعہ ہے۔

۳۔ لسانی فارمولے کے تحت اب فارسی اور عربی پڑھنے اور پڑھانے کا اتنا چلن نہیں رہا۔ نئی نسل نہ صرف فارسی اور عربی سے بے بہرہ ہے بلکہ اردو کے کلاسیکی مزاج و معیار سے بھی ناواقف ہے۔ ہمارے کالجوں میں جو عربی اور فارسی پڑھائی جاتی ہے اس کا چلن اب خود عرب اور ایران میں بھی نہیں ہے۔

۴۔ زندہ فن کاروں پر تحقیق کے کچھ لوگ مخالف ہیں خاص طور سے رشید حسن خاں اس نقطۂ نظر کے حامل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر کوئی آل احمد سرور پر بھی تحقیق کرے تو میں اس کی مخالفت کروں گا۔ اس صورت میں تو نئی شاعری، نئی افسانہ نگاری اور موجودہ ناول نگاری پر تحقیق کیسے ممکن ہوگی؟
کیا فن کار کی موت ہی تحقیق کا پروانہ ہوگی۔

۵۔ ہمارے بعض پروفیسر حضرات ادب کے نئے مزاج، نئے رجحانات اور نئے

موضوع سے ناآشنا ہوتے ہیں، نئی شاعری، نیا افسانہ اور اردو میں ناول کی کیا رفتار ہے ان سے وہ کما حقہ واقف نہیں ہوتے، عام طور سے تو نئی شاعری اور نیا افسانہ ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتا جھینپ مٹانے کے لیے وہ: ترسیل کا المیہ: کہہ دیتے ہیں کیا اردو کے ایک پروفیسر اردو گائڈ کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ ادب کی ترقی یافتہ شکل نہ صرف یہ کہ واقف ہو بلکہ اس کا مطالعہ کرے اور اسے جذب بھی کرے۔

● مشتاق مومن ۱۹/۲۹۹ مرج منیشن شاستری نگر، کرلا بمبئی

اس شمارے میں جناب رشید حسن خاں اور تارا چرن رستوگی کے مضمون اچھے ہیں۔ کافی محنت سے لکھے گئے۔ رشید امجد صاحب کی کہانی "عکس بے خیال" اور یوسف ناظم صاحب کی "ایک مرحومہ کی واپسی" کافی پسند آئی۔ ● صلاح الدین الوزا انڈصوسی بہار۔ پٹنہ

مجھے "کتاب نما" میں مہمان مدیر کے اشاریئے بے حد متاثر کرتے ہیں۔ ہر اداریے میں ایسی باتیں ہوتی ہیں جو خدا لگتی ہوتی ہیں۔ شمس کنول کے اداریہ کی گونج اب تک برابر سنائی دے رہی ہے۔ مخمور سعیدی کا اداریہ لوگوں کی دل میں چبھ رہا ہے۔ شجاع خاور نے استاد سمجھے جانے والے لوگوں کے پیروں کی زمین ہلادی ہے۔ اب یہ لوگ اپنے پیروں کو جمانے کی کوشش میں ہمیشہ گرتے پڑتے رہیں گے

● شاہد عزیز، ۹۹ اطلہ تلاتی، اُدے پور

کتاب نما کا گوشہ پروفیسر مسعود حسین خاں نظر سے گزرا۔ آپ نے اب تک جتنے گوشے ادیبوں اور شاعروں پر مرتب کرائے ہیں وہ سب کے سب اہم ہیں لیکن یہ گوشہ ایسا مرتب کرایا ہے کہ اس میں مسعود صاحب کی علمی اور لسانی جہتوں کے بعض ایسے پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے جن کے بارے میں اس سے پہلے علم تک نہ تھا۔ یہ گوشہ مسعود حسین صاحب کی علمی اور لسانی خدمات کی بھرپور نمایندگی کرتا ہے۔ تمام لکھنے والوں کے مضامین معیاری ہیں اور انھوں نے محنت سے لکھے ہیں۔ ہمیں ایم حبیب خان صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے محدود صفحات میں اتنا بڑا کام کردیا۔ اس سے پہلے ہم ان کا مرتب کردہ گوشہ خلیق انجم صاحب سے متعلق تھا پڑھ چکے ہیں۔ ● مرزا نفیس احمد سرسید نگر۔ علی گڑھ

"اشاریہ" کے تحت ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کے تصورات کافی پسند آئے اس بار آپ نے غزل کا انتخاب کچھ صحیح ڈھنگ سے نہیں کیا ہے بیشتر کلام نے بہت بور کیا۔ البتہ مزاحیہ مضامین نے ادبی تشنگی کو پورا کیا۔ خاص طور سے "ایک مرحومہ کی واپسی" اور "ہرا نارشتہ" سے بہت حد تک لطف اندوز ہوا۔ افسانہ "عکس بے خیال" ٹھیک کہا جاسکتا ہے۔ "کھلے خطوط" میں قلم کاروں کی آپ

نوک جھونک جہاں ایک طرف ہماری جانکاری میں اضافہ کرتی ہے وہیں دوسری طرف یہ ہمارے سر درد کا باعث بھی بن جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کالم "کھلے خطوط" میں ہر کوئی ایک دوسرے کے خلاف لفظی چیلنج کر رہا ہے۔

آج کل ڈرامے کا فن زندہ درگور ہوتا جارہا ہے اگر ہو سکے تو آیندہ شمارے میں ڈرامے ضرور شائع کیجیے گا۔ ● ونس ڈسوزا (پتا نہیں لکھا)

کتاب نما کے مستقل فیچر "اشاریہ" میں جناب ڈاکٹر تاراچرن رستوگی کا مضمون دل کو چھو گیا۔ آپ نے یہ کالم شروع کر کے قابل تعریف قدم اٹھایا ہے مزاحیہ مضامین میں جناب یوسف ناظم کا مضمون "ایک مرحوم کی واپسی" بے حد دلچسپ لگا۔ "کھلے خطوط" کے تحت جناب ڈاکٹر کمال احمد صدیقی اور جناب مرزا خلیل احمد بیگ کے نظریات پڑھنے کو ملے۔ تحریر سے صاف پتا چلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے کافی حد تک دل برداشتہ ہیں۔ ویسے میری دانست میں جناب کمال احمد صدیقی ہی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ ● وصال احمد

محلہ فضل اللہ خان، دربھنگہ

میری بھیجی ہوئی غزل جو مظہر امام کے نام سے شائع ہوئی تھی وہ کسی سازش کے تحت نہیں تھی مظہر امام صاحب کو غلط فہمی ہوگئی ہے اس لیے اب میں نے اپنا نام مظہر امام نہیں مظہر امام تابش کر لیا ہے تاکہ مظہر امام صاحب کی غلط فہمی دور ہو جائے

● مظہر امام تابش، امام منزل، برہم پورہ، مظفر پور۔ بہار۔

کتاب نما کے حالیہ شمارے (نومبر ۹۲) میں ڈاکٹر تاراچرن رستوگی صاحب کا اشاریہ نظر سے گزرا۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا کہ اب تک ریسرچ کے موضوع پر اردو میں کچھ نہیں لکھا گیا بڑی حد تک صحیح ہے۔ سن مہینا اور رسالے کا نام تو مجھے یاد نہیں البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ اردو زبان وادب کے نامور محقق جناب مالک رام نے اپنے کسی مضمون میں یہ لکھا تھا کہ اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ آیندہ چالیس سال تک اردو میں پی ایچ ڈی کی پیداوار پر پابندی عائد کر دیتے ظاہر کہ مالک رام صاحب نے یہ بات اردو کے بیشتر تحقیقی مقالوں ورق گردانی کے بعد کہی ہوگی۔

اردو ادبیاتی ریسرچ کے تعلق سے مجھے جناب سکندر علی وجد مرحوم کے وہ فقرے یاد آتے ہیں جو انھوں نے پی ایچ ڈی کے ایک مطبوعہ مقالے کے بارے میں کہے تھے۔ یہ مقالہ مہاراشٹر کی کسی یونی ورسٹی کے ایک پروفیسر صاحب نے اپنے ذاتی خرچ سے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا تھا اور اس کا ایک نسخہ وجد مرحوم کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ انھوں نے ملاقات کے دوران متذکرہ بالا پی ایچ ڈی کے مطبوعہ مقالے

کا نسخہ میری طرف بڑھاتے ہوئے انھوں نے کہا "آپ اسے لے جائیے"۔ تعجب ہے کہ ایسے مقالوں پر آج کل یونی ورسٹیاں بڑی آسانی سے پی ایچ ڈی عطا کرتی ہیں"۔ اور پھر رشید صاحب نے تقریباً وہی بات کہی جو کتاب نما کے کئی اشاریہ میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے کہی تھی "ایک یونی ورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لیے جن موضوعات پر کام ہوا ہے یا ہو رہا ہے ان کی فہرست حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اکثر موضوعات ایسے ہیں جو مختصر مضمون کے بھی متحمل نہیں ہو سکتے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ تو بڑی بات ہے"۔

(کتاب نما ستمبر ۱۹۹۸ء)

جناب ڈاکٹر تاراچرن رستوگی نے اپنے اشاریہ میں ریسرچ کا موضوع ملحوظات ملتزمات مقالہ کے تحت بڑی مفید اور کارآمد باتیں بتلائی ہیں۔ وہ مختلف زبانوں کے ادبیاتی ریسرچ ہو یا سائنسی و سماجی علوم کے بارے میں اس کے لیے ایک میتھاڈالوجی (Methodology) کی ضرورت ہوتی ہے۔

جہاں تک سائنسی اور سماجی علوم میں پی ایچ ڈی کا سوال ہے صورت حال اتنی خراب نہیں ہے جتنی کہ اردو ادبیاتی ریسرچ کے سلسلے میں نظر آتی ہے۔ سائنس میں چونکہ ریسرچ کی بنیاد مشاہدہ اور تجربات (Experiments) پر رکھی جاتی ہے اس لیے مقالے کو اکثر اکزامینرس (Examiners) یا تو بالکلیہ طور پر رد کر دیتے ہیں یا پھر اس کو پی ایچ ڈی کا مستحق قرار دیتے ہیں نگراں پروفیسر (جو اندرونی ممتحن بھی ہوتا ہے) کے علاوہ دو اکزامنرس میں سے ایک لازمی طور پر ہندوستان کے باہر کا کوئی نامور سائنس داں ہوتا ہے۔ فی زمانہ ہماری یونی ورسٹیاں بیرونی ممتحن کے تقرر پر مصر نہیں ہیں۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ بعض یونی ورسٹیوں کی حد تک یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ دو بیرونی ممتحنوں میں سے ایک کی ناموافق رپورٹ کے باوجود امیدوار کو پی۔ ایچ۔ ڈی کا اہل قرار دیا جاتا ہے (اس کی طرف شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے اپنے اشاریہ میں نشاندہی کی ہے) میری رائے میں نگراں پروفیسر یا اندرونی ممتحن کی موافق رپورٹ کی بنیاد پر امیدوار کو ڈگری کا مستحق نہیں سمجھنا چاہیے جب تک کہ دو بیرونی ممتحنوں کا اس پر اتفاق نہ ہو۔ اس مسئلہ پر ابھی تک بہت کچھ کہا جا سکتا ہے مگر ہاں اس کی گنجائش نہیں ہے ● ڈاکٹر صفی الدین صدیقی۔ مکان نمبر ۳-۸-۴۴/۳ منظور پورہ۔ اورنگ آباد

جاوید وششٹ علاقہ ہریانہ کے خردبین استاد ہیں اور عمدہ صفت انسان۔ اخلاق ان کا ہتھیار، صلح روی ان کا شکار، صاف ستھری بے لاگ بات ان کا وطیرہ، زبان دانی سے واسطہ ورشتہ و قدیم دکنی زبان کی شناخت آپ کا ایمان اور اردو سے والہانہ عشق آپ کا آبرومندانہ فیصلہ ہے۔

اس روشنی میں کتاب نما - ماہ ستمبر ۹۲ ـــ کے مہمان اداریہ کا مطالعہ کیا جائے

تو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے کیسے مرکہ کی بات کہہ دی ہے:۔

ہندوی روایت کی طرف اردو کی مراجعت کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔

مہمان مدیر نے مختلف طریقہ ت جو گفتگو کی ہے اور اردو کی بقا کے واسطے جو حل پیش کیے ہیں۔ ان پر سرحال میں اردو کے شعبہ جات اور اس کے صدور کو غور کرنا چاہیے۔ مگر ایک بات عرض کردوں ہے ایک بزرگ جو عربی و فارسی علم کے منتہی تھے۔ صوفی باصفا۔ چین جاپان۔ انڈونیشیا اور دیگر ممالک میں ان کے سیکڑوں مریدین تھے اور حضرت میاں مار ہروی اعلیٰ اللہ مقامہ کے نام سے مشہور ہوئے جلالی پیر تھے۔ صاحب اوصاف وکمال تھے۔ ان سے اب سے ۲۵ سال قبل یہ سوال کیا تھا۔

:حضرت یہ تو بتائیے کہ ہمارے جد اعلیٰ نے ہم پر کاش جیسی تصنیف چھوڑی۔ اگرچہ وہ اور آپ فارسی کے علم اور عربی کے معلمین میں شمار ہوتے تھے۔ آخر ان کی ان تصنیفات کو صرف دوام کیوں حاصل نہیں؟

اس کا جواب چند لمحہ خاموش رہ کر موصوف مرحوم نے یہ دیا تھا کہ:

:تم لوگ اس رمز سے کہاں آشنا ہو کہ ہم صوفیوں کا واسطہ اہل ملک سے تھا۔ اہل مسلمان یا اہل علم سے کم تھا اس لیے ہم کو وہی زبان اختیار کرنی پڑی جس پر آج آپ اور ہم سب معترض ہیں۔

میری نگاہوں سے اس دن وہ پردہ اٹھ گیا تھا۔ آج اس کی روشن اور واضح مثال ہمارے سامنے یہ ہے کہ محافل میں لڑکے ہندی زبان میں نعت، نوحہ، سلام، مرثیے لکھ کر آتے اور پیش کرتے ہیں اور محفل و مجلس کے شرکا سے داد حاصل کرتے ہیں۔ یہ ایک نازک عمل ہے۔ اس کا احساس اردو کے ہر دل درمند کو ہونا چاہیے۔ پھر بھی جاوید وششٹ صاحب کے اس مقالے کی روشنی میں ہم کو کچھ عملی دستوری قدم اٹھانا ضروری ہے۔ ان کی رائے ہے کہ ایم۔ اے میں ہندی و فارسی کے دو پرچے شامل کر کے اردو کے بقا کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ میرا تعلق چونکہ درس گاہوں اور انتظامیہ سے رہا ہے۔ اس لیے قطعیت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ — اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ تریاق کے لیے عراق جانا امر محال ہے۔ اس سے بہتر صورت ہریانہ کے ارباب حل وعقد نے کچھ عرصہ پہلے اپنے اعلامیہ میں پیش کی تھی۔ وہ اصول شے ہے۔ اس پر ہمیں غور کرنا چاہیے کہ ملک گیر پیمانہ پر اردو خواندگی کی مہم چلائی جائے — اردو پڑھائی گھر — کی رسم جاری کی جائے۔ یہ کام پنجاب، ہریانہ، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش سے شروع کیا جائے۔ یوپی کو اس کی نزاعی حالت میں برقرار رہنے دیا جائے دلی خود مختار ہے — جاوید وششٹ صاحب نے اردو رسم الخط کے متعلق جن خدشات کا اظہار کیا ہے۔ وہ ہزار درست ہوں مگر اس تن بے جان میں تازہ خون اگر داخل ہو جائے اور غیر مسلم علاقہ اس کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لے تو یہ خدشہ موت ٹل جائے گا۔ تنِ بے روح میں جان

پر جا لے گی۔ اور یہ کام مردمان پنجاب و ہریانہ ہی کر کے دکھلائیں گے۔ اس لیے بھی کہ اردو زبان کی داغ بیل کا سہرا پنجاب سرہے۔ دکن کی دین ہے۔ ہما ماسٹر نے اس کو گھر گھر پہنچایا ہے اور چالیس سال سے یہی صوبہ اسے تنگی سے نوازرہا ہے۔ اور زندگی کی علامت بنا ہوا ہے۔

● سیدمرتضیٰ حسین بلگرامی
فاطمہ منزل، دودھ پور، علی گڑھ۔

کتاب نما شمارہ نومبر ۹۲ میں اشاریہ کے تحت سال میری تحریر میں سہواً فارسی کا ایک مصرع غلط لکھا گیا (ص ۵۰)۔
"خود خویشتن ... چرا رہبری کند" کو قارئین کرام "او خویشتن گم است کرا رہبری کند" پڑھیں۔ معذرت۔

● تاراچرن رستوگی۔ اقبال سٹیڈیز سنٹر گوہاٹی۔

ادبی اور تہذیبی خبریں

علامہ شبلی نعمانی پر ایک یادگار سیمینار

شعبۂ اردو شبلی کالج نے علمی و ادبی مذاکروں کے لیے ملک گیر شہرت حاصل کی ہے۔ اپنے دس سالہ قیام کے دوران، درس و تدریس کے علاوہ مستقل مذاکروں کے انعقاد سے طلبہ میں ادبی علمی ذوق پیدا کرنا شعبۂ اردو کی اہمیت و خصوصیت رہی ہے۔

۲۴ اور ۲۵ اکتوبر سنہ ۸۳ء کو شعبۂ اردو نے اعظم گڑھ مسلم ایجوکیشن اعظم گڑھ کے تعاون سے، علامہ شبلی نعمانی پر ایک دو روزہ سیمینار کا انعقاد کیا۔ جس کا مقصد اپنے بزرگ ادیبوں اور قوم کے معماروں کی یاد تازہ کرنے کے علاوہ شبلی کی علمی، ادبی، قومی اور مذہبی خدمات کا اعتراف کرنا تھا۔ مزید یہ کہ ان کے کارناموں پر تنقیدی زاویہ نظر کی مدد سے نئی نسل کو شبلی سے روشناس کرانا مقصود تھا۔ افتتاحی جلسہ کی صدارت رفیق نوکریا نے کی۔ کلیدی خطبہ ڈاکٹر سید حامد نے پیش کیا، جناب ابو صالح انصاری نے استقبالیہ کلمات کہے اور پروفیسر عبدالستار دلوی نے تعارفی تقریر کی۔

سیمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے کی۔ اس اجلاس میں مولانا محمد عارف اعظمی عمری نے علامہ شبلی اور سیرۃ النبی پر سیر حاصل مقالہ پڑھا۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر خلیق انجم نے شبلی اور سرسید کے عنوان سے پیش کیا۔ تیسرا مقالہ بھی سرسید اور شبلی پر ڈاکٹر اصغر عباس کا تھا۔ ڈاکٹر قادر حسین نے "شبلی، چند نقوش، چند تاثرات" کے تحت اپنا مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر الطاف اعظمی نے شبلی کا بحیثیت نقاد جائزہ لیا۔

دوسرے روز کے پہلے اجلاس میں صدارت ڈاکٹر خلیق انجم نے کی جس میں پہلا مقالہ "علامہ شبلی اور تحریک ندوۃ العلما" پر مولانا مستیم احسن اعظمی نے پیش کیا، اس کے بعد ڈاکٹر صادقہ ذکی کا مقالہ "شبلی اور خواتین"۔ ڈاکٹر انور معظم کا مقالہ "شبلی اور اسلامی عصریت" اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی کا مقالہ "شبلی کی شعر فہمی" سے متعلق تھے۔

بعد کے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر انور معظم نے کی۔ جناب یونس ادیب خان نے شبلی اور فلسفہ پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ شبلی کی فارسی شاعری کا جائزہ پروفیسر انصاری کا پیش کردہ اور دارالمصنفین کی اردو خدمات پر تبصرہ ڈاکٹر خورشید نعمانی کا تحریر کردہ تھا۔

جنوری ۱۹۸۴ء

ساجدہ کمال کو پی ایچ ڈی کی ڈگری

جناب ساجدہ کمال لیکچرر شعبۂ اردو ایلفنسٹن کالج بمبئی یونیورسٹی (بمبئی) کو بمبئی یونیورسٹی نے منظور کرنے ان کے تحقیقی مقالہ بعنوان "اردو سوانح نگاری تحقیقی اور تنقیدی جائزہ" پر ان کی پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔

نقش کوکن ٹیلنٹ فورم کے زیراہتمام تعلیمی مقابلے

ہرسال کوکن کے تمام اردو ہائی اسکولوں کے آٹھویں، نویں، دسویں جماعت کے طلبہ تقریری، جنرل نالج، النقش زباندانی وریاضی کے مقابلوں میں شریک ہوتے ہیں۔

سنیچر ۲۲ نومبر کو یعقوب بیگ ہائی اسکول (پنویل) میں ضلع رائے گڑھ کے ضلعی سطح پر زیرصدارت جناب اسحاق خاں صاحب (چیرمین پنویل ایجوکیشن سوسائٹی) ایک مقابلہ کی تقریب منعقد ہوئی۔ اس تقریب کی کفالت جناب ایچ بی مقدم کررہے تھے۔ مہمان خصوصی کے طور پر جناب علی ایم شمسی (چیرمین کوکن مرکنٹائیل بینک) مدعو تھے۔

جج کے فرائض مشہور مزاحیہ نگار یوسف ناظم صاحب، محترمہ بلقیس شمسی صلوا ادر محترمہ زرینہ ملا صاحبہ نے انجام دیے۔

دیگر مہمانان میں جناب محمد سعید ملا، جناب شرف الدین قاضی، عبدالکریم چوگلے وغیرہ وغیرہ اصحاب شریک تھے۔

اردو مرکز سورت کا غیرطرحی مشاعرہ

سورت، ۲۸ نومبر ۱۹۹۲ء اردو مرکز سورت کے زیراہتمام جناب حکیم کاظم کی صدارت میں ایک مشاعرہ کا انعقاد ہوا۔ سب سے پہلے "اردو مرکز" کے سکریٹری جناب نور برہانپوری نے حاضرین کا خیرمقدم کیا۔ اس کے بعد صدر مشاعرہ جناب حکیم کاظم نے اردو کے تعلق سے چند اہم باتیں سامعین کے گوش گزار کیں۔ نظامت کے فرائض "اردو مرکز" کے سکریٹری جناب شکیل اعظمی نے بحسن خوبی ادا کیے۔ سامعین نے جن شعرا کو پسند کیا ان میں رزاق عادل، نظر سورتی، انجم قنوجی، یوسف کمال، حکیم کاظم، انور فاروقی راندیری، عارف ایرنڈولوی، درپن اکبری، شاہ شکیل، شکیل اعظمی، نور برہانپوری، احمد چینی والا، زحمت سورتی، خمار مالیگانوی، ساغر برہانپوری، افضل مصطفےٰ آبادی اور ماہر دھاردی کے نام قابل ذکر ہیں۔ مشاعرہ ۱۰ بجے شب میں شروع ہوکر ۲ بجے اختتام پذیر ہوا۔

پروفیسر شمس الرحمٰن محسنی انتقال فرماگئے

ہم کو یہ خبر دیتے ہوئے بڑا دکھ ہے کہ جامعہ ملیہ کے سابق استاد، ماہر سماجیات پروفیسر شمس الرحمٰن محسنی ۱۴ دسمبر ۹۲ء کو اللہ کو پیارے ہوگئے۔ محسنی صاحب ۱۹۴۸ء سے جامعہ سے وابستہ تھے۔ ادارہ کتاب نما مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے۔

پروفیسر فضل الرحمٰن کا انتقال

اردو کے مشہور ادیب، ڈرامہ نگار، شاعر انجمن ترقی اردو (ہند) کے لائف ممبر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق پرو وائس چانسلر پروفیسر فضل الرحمٰن کا ۱۱ نومبر ۱۹۹۲ء کی صبح حیدرآباد میں انتقال ہوگیا۔

فضل الرحمٰن صاحب ۲۵ دسمبر ۱۹۰۱ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم حیدرآباد ہی کے ایک دینی مدرسہ سے حاصل

ل۔ اس کے بعد نظام کالج سے انٹرمیڈیٹ اور دکن کالج پونہ سے اعلا تعلیم حاصل کی بفضل الرحمٰن صاحب کو اردو زبان و ادب پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ڈرامہ نگاری میں بھی انھوں نے کافی شہرت حاصل کی۔

ادارہ کتاب نما مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔

شرر فتح پوری کو ہریانہ اردو اکادمی کا خراج عقیدت

پنچکولہ۔ ہریانہ کے ممتاز شاعر اور ادیب رام سنگھ شرر فتح پوری کا ۲۶ نومبر کو مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ شرر فتح پوری موجودہ عہد کے صاحب طرز شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک معروف ادیب اور ہریانہ کے حوالے سے اردو کی ترویج و ترقی میں انتہائی فعال شخصیت سمجھے جاتے تھے۔

ہریانہ اردو اکادمی نے یکم دسمبر کو شرر فتح پوری کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا۔ اکادمی کے سکریٹری جناب کشمیری لال ذاکر نے اپنی تقریر میں کہا کہ شرر فتح پوری کی رحلت سے ادبی دنیا میں ایک بڑا خلا ہوا ہے۔ اکادمی کے ایڈیٹر ناشر نقوی نے شرر کی شاعری کو عہد ساز قرار دیا اور کہا کہ ہریانہ اپنے ایک بڑے فرزند سے محروم ہوگیا۔ شمس تبریزی نے جلسہ میں شرر فتح پوری کی تصنیفات کا جائزہ لیا اور کہا کہ ابھی پچھلے دنوں انھوں نے ہریانہ میں اردو سنہ ۱۹۶۶ء سے سنہ ۱۹۹۱ء تک اپنے مضمون میں جس محنت کا ثبوت دیا ہے وہ ان کے اہل ہونے کا ثبوت ہے۔

صبا اکبرآبادی کے فن و شخصیت پر ایک کتاب

اردو کے معروف پاکستانی شاعر جناب صبا اکبرآبادی کے بارے میں ڈاکٹر اسلم فرخی نے "صبا نامہ" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے۔ "صبا نامہ" ان مضامین و منظومات کا انتخاب ہے جو صبا صاحب کی رحلت (۲۹ اکتوبر سنہ ۱۹۹۱ء) سے ان کی پہلی برسی کے دوران میں تحریر کیے گئے۔ لکھنے والوں میں جمیل الدین عالی، احمد ندیم قاسمی، میرزا ادیب، شان الحق حقی، تابش دہلوی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر منظور احمد (وائس چانسلر ہمدرد یونیورسٹی)، ڈاکٹر انور سدید، صہبا لکھنوی، احمد ہمدانی، صہبا اختر، دلاور فگار، محشر زمن، شبنم رومانی، قمر علی عباسی کے علاوہ بھی بہت سے اہلِ قلم شامل ہیں۔

حضرت ذکی تال گانوی کی شریک حیات کا انتقال

۲۷ اکتوبر ۹۲ء شام ساڑھے ۵ بجے مشہور شاعر، مصنف اور تذکرہ نگار حضرت ذکی تال گانوی مدیر سہ ماہی ابر بدایوں کی شریک حیات گزشتہ ایک سال کینسر کا شکار رہ کر انتقال کر گئیں۔ ۲۸ اکتوبر کو سیکڑوں لوگوں کی معیت میں قبرستان شاہ ولایت بدایوں میں انھیں سپرد خاک کیا گیا۔ شاداب ذکی اور کامیاب ذکی اپنی نشانی چھوڑی ہے۔ خدا ان کی مغفرت کرے اور پس ماندگان کو صبر دے۔

گوہر شیخ پوروی

محمد انوارالحق کو پی، ایچ، ڈی

محمد انوارالحق کو بھاگلپور یونی ورسٹی نے ان کے تحقیقی مقالے "سید احتشام حسین کی ادبی خدمات" پر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ یہ مقالہ ڈاکٹر محمد رضی احمد شاداب رضی، ریڈر شعبۂ اردو بھاگلپور یونی ورسٹی کے زیر نگرانی مکمل ہوا۔ اس مقالے کے ممتحن ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی اور ڈاکٹر محمد یوسف خورشیدی پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونی ورسٹی پٹنہ تھے۔

رضوان لائبریری تمبور کا سالانہ مشاعرہ اتحاد اور اردو کے فروغ کا ذریعہ

تمبور (سیتاپور) ۳۔دسمبر اس بنجر علاقے میں رضوان لائبریری تمبور کتابوں ہی نہیں، علم، تہذیب اور ثقافت کے ایک مشترکہ مرکز کی حیثیت سے ابھر رہی ہے۔ اپنے سالانہ اجلاس کے موقع پر لائبریری نے ایک مشاعرے کا بھی اہتمام کیا۔ جو بہت کامیاب رہا۔

مشاعرے میں جامع الہدیٰ مرادآباد کے استاذ حدیث وتفسیر مفتی عبدالرؤف قاسمی نے افتتاحی تقریر کی، صدارت مولانا سمیع قاسمی نے کی نظامت کے فرائض مسٹر رضوان تمبوری نے انجام دیے۔

رضوان لائبریری تمبور کا سالانہ مشاعرہ

تمبور (سیتاپور) ۳۔دسمبر۔ رضوان لائبریری تمبور میں روایتی سالانہ مشاعرہ اسی سال ۲۶ دسمبر کو منعقد ہوگا۔

لائبریری کے اراکین کے ایک ہنگامی

اجلاس میں یہ اعلان لائبریری کے جنرل سکریٹری مفتی محمد خبیر ندوی نے کیا۔

غلام ربانی تاباں اسپتال میں

نئی دہلی ۷، ۲۔دسمبر۔ ممتاز شاعر غلام ربانی تاباں سخت بیمار ہیں۔ انھیں کل یہاں آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں داخل کیا گیا۔ وہ پرائیوٹ وارڈ روم نمبر ۵۰۸ میں ہیں۔

محمد علوی کو ساہتیہ اکادمی اوارڈ

نئی دہلی ۲۷۔دسمبر۔ ممتاز شاعر محمد علوی ان ۲۱ ادیبوں میں شامل ہیں جن کی کتابوں کو ۱۹۹۲ کے ساہتیہ اکادمی اعزاز کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ یہ اعلان آج یہاں کیا گیا۔ یہ اعزاز ایک توصیفی سند اور ۲۵ ہزار روپے کے چیک پر مشتمل ہوتا ہے۔ محمد علوی کو ان کے شعری مجموعے "چوتھا آسمان" کے لیے اعزاز دیا گیا۔ انھیں ۱۹۷۰ کے بعد اٹھنے والی نسل کے چند نہایت ممتاز شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اردو میں اوارڈ کے فیصلے کے لیے جیوری میں محترمہ قرۃ العین حیدر، مسٹر مالک رام اور پروفیسر گوپی چند نارنگ شامل تھے۔ جبکہ ترجمے سے متعلق جیوری مسٹر رام لال، ڈاکٹر صغرا مہدی اور پروفیسر گوپی چند نارنگ پر مشتمل تھی۔

ترجمے کے لیے اعزاز کی خاطر ۱۴ کتابوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ جن میں خالد الگا سکر کا مراٹھی سے اردو میں ترجمہ "کتھا" شامل ہے۔ ترجمے میں دس ہزار روپے نقد اور ایک سندنامہ دیا جاتا ہے۔

بچوں کے لیے
مکتبہ پیامِ تعلیم کی نئی کتابیں

ایک تھا سرما گلہری کوں کوں ۔ قمر علی عباسی ۶/=
پریوں کی کہانیاں ۔ اشرف صبوحی ۶/-
پتھر کی گڑیا - ادارہ ۷/۵۰
گندا پانی ۔ ادارہ ۴/۵۰
یہ کیسا بخار ہے ۔ ادارہ ۴/۵۰
سمندر کا بادشاہ ہار گیا ۔ ڈاکٹر شریف الحسن ۴/-

چوں چوں بیگم شفیقہ فرحت ۴/۰۰
افریشیا کی کہانیاں فضل حق قریشی ۷/۵۰
۸۰ دن میں دنیا کا چکر ترجمہ علی اسد ۳/۰۰
ماسٹر شامت اشرف صبوحی ۶/
اُمت کی مائیں حسین حسنی ۴/۵
اچھی باتیں سعدالدین انصاری ۴/۵۰
آپ کا جسم علی ناصر زیدی ۶/۰۰
ٹھنڈی تارا ننھے چاند اشرف صبوحی ۴/-
دنیا کی عجیب کہانیاں ” آصف نرخی ۷/۵۰
ہزاروں خواہشیں ” مسعود احمد برکاتی ۹/-
پکڑے گئے (ادارہ) ۴/۵۰
درویش کا تحفہ ” افشاں بیگم ۶/-
مُورا سے فرار ۔ ربیع الزماں زبیری ۷/۵۰
بلی اور اس کے تین حیرت انگیز سفر (بچوں کے لیے) ترجمہ احمد خاں خلیل ۶/-
بکرے کی تعریف میں ” یوسف ناظم ۶/-
جنگل کا راز ” ثریا فرخ ۶/-
قصہ صحرا اول ” مرزا اعظم بیگ چغتائی ۷/-
قصہ صحرا دوم ” ۱۰/-
قصہ صحرا سوم ۸/-

پادری کی روح (ادارہ) ۴/-
ٹھنگ نے ٹھگ ٹھگ کو (ادارہ) ۴/-
گدھا آسمانی ” میرزا ادیب ۹/-
غنچہ بیگم ” ثریا فرخ ۲/-
بزرگانِ دین (مذہب) ” محمود علی خاں جامعی ۴/-
بڑھیا کی بھینس ” (ادارہ) ۴/-
بچوں کے ڈپٹی نذیر احمد ” ڈاکٹر اسلم فرخی ۴/-
بچوں کے محمد حسین آزاد ۴/-
بچوں کے مرزا غالب ” ” ” ۴/-
بچوں کے رنگا رنگ خسرو ” ” ” ۴/-
بچوں کے سلطان جی (مذہب) ” ” ” ۴/-
مچھلیوں کی تباہی ماہر محمود ۷/۵۰
کمہار کا گھڑا فرخندہ لودھی ۴/-
ہیروں کے چور اور سونے کی تلاش (ادارہ) ۷/۵۰

سائنس کی دنیا فرید الدین احمد ۸/-
غذائیں دوائیں (ادارہ) ۸/-
تیس مار خاں شاہد علی خاں ۴/۵۰

بچوں کی کتابوں کے نئے ایڈیشن

ہمارے محاورے ڈاکٹر سیفی پریمی ۱۲/۵۰
امیر خسرو (ادارہ) ۲/-
بچوں کے اقبال مرتبہ اطہر پرویز ۶/-
بندر اور نائی عبدالواحد سندھی ۳/۵۰
بہادر سیاح حسین حسان ندوی ۴/-
خرگوش کی چال آصف مجیب ۳/-
نیلا ہیرا مظفر حنفی ۶/۵۰
شرارت حسن حسان ندوی ۳/-
مرغی کی چار ٹانگیں یوسف ناظم ۴/۵۰
بہادر علی قمر علی عباسی ۸/۵۰
خلفائے اربعہ عبدالحئی فاروقی ۹/-

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

کتاب نما

فروری ۱۹۹۳ء جلد ۳۳ شمارہ ۲

فی پرچہ 6/=

سالانہ 55/=

سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے 75/=

غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک) 170/=

(بذریعہ ہوائی ڈاک) 320/=

اڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

TELEPHONE 630191

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات، نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

نظمیں / غزلیں

افسانہ

کھلے خطوط

جائزے

نئی مطبوعات

عابد علی خاں نمبر (کتاب نما کا خصوصی شمارہ) مرتبہ مجتبیٰ حسین ۴۵/-
خواجہ احمد فاروقی نمبر (" ") ڈاکٹر خلیق انجم ۴۵/-
فکشن کا تنقید کا المیہ (تنقید) وارث علوی ۳۰/-
سفرنامہ غیر ملکی اسفار جلد اول (سفرنامہ) مولانا وحید الدین خاں ۸۵/-
ملنڈرین چراغ (شاعری) ملک زادہ جاوید ۶۰/-
کانچ کی چادر " مریم غزالہ ۳۰/-
گھٹتے بڑھتے سائے (انسانے) علی امام نقوی ۵/-
اردو تنقید حالی سے کلیم تک (ادب تنقید) سید محمد نواب کریم ۱۲۵/-
رنگین پرواز (شاعری) بی۔این۔رنگین ۸۰/-
عظمت غالب (غالبیات) سید قدرت نقوی ۶۶/-
سیرت نبوی اور مستشرقین (سیرت) مرتبہ ڈاکٹر عبدالحلیم ۶۰/-
بھولی ہوئی کہانیاں (کہانیاں) بجینت کور ۵۰/-
دیواروں کے نیچے (سوانحی ناول) ندا فاضلی ۹۰/-
کشاد (شاعری) صادق ۵۰/-
فکر و آگہی کا بیکل اتساہی نمبر مرتبہ ڈاکٹر رضیہ حامد ۱۰۰/-
غالب اردو غزل (انگلش) غالبیات ڈاکٹر یعقوب مرزا ۹۰/-
ادیبوں کے لطیفے مرتبہ نارنگ ساقی ۸۰/-
اجلی مسکراہٹ (افسانے) علیم صبا نویدی ۴۶/-
اثر خامہ (شعری مجموعہ) " ۱۶/-
ننھی منی باتیں (بچوں کی نظمیں) حیدر بیابانی ۲۶/-
میرا مذہب (مذہب) محمد علی ردولوی ۳۶/-

سرورق:- وجاہت علی سندیلوی

اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ ڈاکٹر مسعود ہاشمی ۴۵/-
بدایوں کے تابندہ ستارے (تذکرہ) چودھری صغیر حسن صدیقی ۵۰/-
سمت ساز (نظمیں) علیم صبا نویدی ۳۰/-
جھولا (بچوں کے لیے نظمیں) ذکی احمد ۵/-
ذہن جدید (شمارہ نمبر ۱۰) مدیر: جمشید جہاں ۴/-
فرعون (ڈراما) رشید انجم ۷۵/-
شاخ گل (شعری مجموعہ) رفعت سروش ۷۵/-
اجنبی شہر (تذکرہ) عبدالقوی دسنوی ۱۵/-
کلیات عزیز وارثی (شعری مجموعہ) مرتبین: ثاقب صدیقی، انیس احمد ۹۰/-
روشن لکیر (تنقید) ڈاکٹر اختر بستوی ۵۰/-
تبسم زیرلب (لطیفے) ڈاکٹر فصیح رحمٰن الکولوی ۲۰/-
نوائے گلبرگہ (تذکرہ) ڈاکٹر قیوم صادق
ہے ہو (طنزیہ و مزاحیہ) بالبر آر۔کے ۱۶/-
جو اکثر یاد آتے ہیں دیوا ندر گپتا ۱۰/-
دلیس دلیس کے اجالے (مقالات) ڈاکٹر محمود الحسن ۵/-
تخلیقی عمل اصول و مسائل طارق سعید ۶۰/-
میری جو شامت آئی (انشائیے) قیام نیّر ۴۰/-
چے خف کی دنیا سید انوار رضوی ۱۰۰/-

مہمان مدیر
وجاہت علی سندیلوی
نصرت منزل سندیلہ (یوپی)

اشاریہ

ہم آپ اور اُردو

اُردو زبان کی بقا، استحکام اور فروغ کے لیے ہمدردوں، صلاح کاروں اور مشورہ دینے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی بلکہ اب تو کچھ خواب پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا، والی کیفیت پیدا ہو چلی ہے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ یاد آرہا ہے۔ ایک مرتبہ لکھنؤ چار باغ اسٹیشن پر پنڈت جواہر لال نہرو، وزیراعظم، یہ دیکھ کر بہت جز بز اور ناراض ہوئے کہ وہاں ایک بھی سائن بورڈ یا تختی اُردو میں نہیں تھی، مسافر خانے کی جگہ وشرام گرہ، ٹھنڈے پانی کی جگہ شیتل جل، ریستوران کی جگہ بھوجنالے اور اسی طرح غیر مانوس الفاظ کی بہت سی دوسری ہندی میں لکھی ہوئی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ پنڈت نہرو غصے میں یہاں تک کہہ گئے "مجھے پتا نہیں یہ حماقتیں کون کر رہا ہے؟ میرے لیے یہ اب برداشت سے باہر ہو چکی ہیں" پنڈت نہرو کے ساتھ مرکزی اور ریاستی حکومت کے کئی منتری اور محکمہ ریل کے بہت سے بڑے عہدے دار موجود تھے۔ اُن میں سے کوئی کچھ نہ بولا اور سب پنڈت جی کے تلخ و ترش کلمات کو خاموشی سے پی گئے۔ سُنا ہے کہ بعد میں غالباً پنڈت آنند نرائن مُلّا نے پنڈت جی سے کہا "نہرو جی آپ کرشن جی کی طرح پانڈوں کے ساتھ ہیں لیکن آپ کی پوری فوج کوروؤں کی طرف سے لڑ رہی ہے۔ اب زمانہ بدل چکا ہے اور آج اس مادی دور میں تنہا کرشن جی کی ہمدردیوں سے حق کو باطل پر فتح نہیں حاصل ہو سکتی"۔ پنڈت نہرو نے حیرت سے یہ سُنا اور خاموش ہو گئے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جس حکومت کے دور میں اُردو کا استحصال شروع ہوا اور تعلیم کے سہ لسانی فارمولے میں یہ حیرت انگیز تحریف کی گئی کہ سنسکرت کو جدید زبانوں میں شامل کیا گیا، اس کے وزیراعظم کو بھی خلوص نیت کے ساتھ اُردو سے بڑی اُلفت اور ہمدردی تھی اور وہ صدق دل سے اس کا فروغ چاہتا ہے

دار پر مجھ کو چڑھایا تب نہیں بولا مگر
دوست نے تربت پہ میری پھول برسائے بہت

مسائل اور مشکلات خصوصاً جب وہ اغیار کے تعصبات اور ہٹ دھرمیوں کی پیداوار ہوں محض کسی کی ہمدردیوں اور نیک خواہشات سے حل نہیں ہوجاتیں۔ غور و فکر سے ان کے تجزیے کی ضرورت ہوتی ہے ان کے حل کے واسطے باقاعدہ منصوبہ بندی کرنا پڑتی ہے، کاموں کی تقسیم کا گوشوارہ بنایا جاتا ہے اور پھر حوصلہ مندی اور مستقل مزاجی سے عمل شروع کیا جاتا ہے۔ میں کوئی بقراط بن کر یہ نئی باتیں نہیں کر رہا ہوں بلکہ صرف سیکڑوں بار کی کہی ہوئی باتوں کو اُردو کی موجودہ زبوں حالی کے تناظر میں ایک بار پھر دُہرانا چاہتا ہوں۔

بیسیوں مقالے اور اخباروں اور رسالوں کے اداریے اس موضوع پر نظر سے گزر چکے ہیں کہ حکومت اُردو کے ساتھ انصاف نہیں کر رہی ہے، اس کی انتظامیہ تعصب کا شکار ہے اور وہ قانون اور قاعدے کو بالائے طاق رکھ کر اُردو کی بیخ کنی میں لگی ہوئی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اردو کی جان حکومت اور اس کی انتظامیہ کی مٹھی میں ہے۔ اگر یہ کسی طرح ڈرا دھمکا کر یا خوشامد سے رام کر لیے جائیں تو اُردو کی ترقی اور پھلنے پھولنے کی تمام راہیں خود بخود کھل جائیں گی۔ اُنھیں پڑھ کر اُردو کا ایک عام بہی خواہ یہ سوچتا ہے کہ حکومت کو راہِ راست پر لانے کا کام ہمارے دانشوروں اور سیاسی رہنماؤں کا ہے اور میں بچارا کنویں کا مینڈک اس سلسلے میں دعا کرنے اور وظیفہ پڑھنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں کرسکتا۔

بہت سے مضامین اور اداریے اُردو کے متعلق حکومت کی کوتاہیوں اور بے اعتنائیوں کی نشاندہی کرنے کے بعد اُردو کے رہنماؤں اور بعض خودساختہ مجاہدوں کی موقع پرستی، خودغرضی اور بے عملی کی بخیہ ادھیڑنا شروع کر دیتے ہیں اور اُردو اداروں اور ریاستی اکادمیوں کی بدعنوانیوں، جمود اور نااہلی اور کارگزاریوں کے فقدان کی پول کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ ان کو پڑھ کر ایک عام اردو والا حیرت زدہ ہو کر یہ مصرع پڑھنے لگتا ہے ع جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔" خفگی اور مایوسی کے عالم میں اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ خود کیا کرے اور اس ڈوبتی کشتی کو کیسے بچائے۔

میں آخری شخص ہوں گا جو یہ کہوں کہ ایسے مقالے، مضامین اور اداریے نہیں لکھے جانا چاہییں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ان کی بہت ضرورت ہے کیونکہ ان کے ذریعے عوام کو صحیح صورتِ حال کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ جتنے اب تک لکھے گئے ہیں اُس سے کہیں زیادہ اور بھی لکھے جانا چاہییں۔ میں تو صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ان سے اردو کے مسائل کی تشخیص اور تجزیے میں تو بڑی مدد ملتی ہے لیکن حل اور علاج کے لیے خاطر خواہ سمت اور اشارے نہیں ملتے۔ میرا یہ بھی کہنے کا مقصد نہیں کہ ہر ایسے مضمون میں لازماً حل اور علاج ضرور ہونا چاہیے کیونکہ یہ تو ویسا ہی ہوگا جیسے میں اپنے ہر عیادت کرنے والے سے

یہ فرمائش کروں کہ وہ میرے لیے دوا بھی تجویز کرتا جائے۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اردو کے راستے کے کانٹوں اور پتھروں کے تذکروں کے ساتھ اگر انھیں ہٹانے اور دور کرنے کی ترکیبوں کے متعلق بھی کچھ تجاویز پیش کی جاتیں تو یہ ایک اردو والے کے لیے بہ زیادہ سود مند ہوگا۔ اور اس سے اس میں منفی کے بجائے ایک مثبت رجحان پیدا ہوگا۔

یہاں اس بات سے قطع نظر نہیں کیا جا سکتا کہ زبان کے مسائل ملک و قوم کی تہذیبی، تاریخی، ثقافتی اور سب سے زیادہ سیاسی معاملوں سے جڑے ہوتے ہیں اور انھیں کے ساتھ بڑھتے، پھیلتے، سمٹتے اور بنتے بگڑتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ باقی کے سوالات کے جوابات کی طرح ان کے بھی جواب بدلتے اور نئے تقاضوں سے حل میں نہیں پایا گیا۔ منظر نامے تو روز بدلتے ہیں تاہم بنیادی تقاضے و مطالبے موجود یہاں بھی رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر اتر پردیش میں تعلیم کی سہولت اور دفتری کاموں سے واقفیت اور ساتھ ہی ساتھ ملازمت کے موقعوں کی فراہمی کے واسطے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا قانون تو حکومت نے برائے نام بنا دیا لیکن اس سلسلے میں اردو کی ترقی و ترویج کے لیے کسی قسم کا کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا اور اس کے مسائل جوں کے توں اپنی جگہ حسب سابق کس مپرسی کے عالم میں پڑے ہوئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اردو کی بقا و فروغ کے لیے جو لائحہ عمل اور منصوبہ تجویز کیا جائے وہ نہ صرف وسیع اور دور رس ہو بلکہ اس کے بنیادی مسائل کی تشخیص اور علاج کا بھی حامل ہو۔ اس سمت میں کل ہند انجمن ترقی اردو کو پہلا قدم اٹھانا چاہیے۔

موجودہ صورت حال میں اردو جن دشواریوں میں مبتلا ہے اور جن کی وجہ سے وہ رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی ہے میں ان کو دو محاذوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں۔ پہلا تو وہ جس کا تعلق حکومت سے ہے یعنی خارجی اور دوسرا وہ جس کا تعلق ہم اردو والوں سے خود ہے یعنی داخلی۔ حکومت یا اس کی انتظامیہ سے ہمیں جو شکوے اور شکایتیں ہیں وہ اپنی جگہ پر بالکل صحیح اور حق بجانب ہیں لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اردو کے لیے کچھ ہمیں خود بھی کرنا ہے۔ حکومت کی ناانصافی اور بے اعتنائی سے ہماری بے حسی اور کوتاہی کچھ کم نہیں ہے۔

حکومت سے خواہ وہ مرکزی ہو خواہ ریاستی اردو کے آئینی حقوق کے لیے جدوجہد کرنا، اس سے اردو کے حق میں احکامات جاری کرانا اور ان پر محکمۂ تعلیم اور انتظامیہ کو عمل کرانا یہ ہمارا پہلا محاذ ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے جو فرائض ہیں اور ہمیں جو کرنا ہے، میں اس وقت اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ اردو کے مسئلے کے اس رخ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت سی تجاویز پیش کی جا چکی ہیں۔ اردو سے ہمدردی

رکھنے والے سیاستداں، ممبرانِ مجالسِ قانون ساز اور ملک کے بہت سے منصف مزاج دانشور اسی مورچے پر کام کر رہے ہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ وہ بحیثیت سپاہیوں کے یا محض ایسے جنرلوں کے جن کے پیچھے کوئی فوج نہ ہو اس جنگ میں شریک ہیں۔ ناانصافی ہوگی اگر کہا جائے کہ انھوں نے اس سلسلے میں کوئی کام ہی نہیں کیا۔

البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جس لگن اور یکسوئی سے انھیں کام کرنا چاہیے تھا، نامساعد حالات کے باوجود انھوں نے نہیں کیا۔ ان کی کوششیں اور کاوشیں منصوبہ بند اور منظم بھی نہیں رہی ہیں۔ بہرکیف ان رہنماؤں سے اس سلسلے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی جدّوجہد کو جنگی انداز پر ایک لائحہ عمل کے تحت زیادہ تیز گام اور مؤثر بنائیں۔

اس ضمن میں ایک یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ ہمیں حکومت سے یہ بھی مطالبہ کرنا چاہیے کہ اس بات کو آئینی حیثیت سے تسلیم کیا جائے کہ ہندستان کے ہر شہری کا ابتدائی تعلیم اپنی مادری زبان میں حاصل کرنا، اس کا ایک بنیادی حق ہے۔ اس مطالبے کی تائید دوسری علاقائی زبان والے بھی آگے بڑھ کر کریں گے۔

اُردو والے اُردو کو بچانے اور اُس کو مقبول بنانے یا فروغ دینے کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ اس سلسلے میں کچھ باتوں پر غور وفکر کی دعوت دے رہا ہوں۔ ان میں سے بیشتر اس سے قبل دیگر اداروں اور حضرات علاحدہ، علاحدہ پیش بھی کر چکے ہیں اور میں انھیں یہاں صرف دہرا رہا ہوں۔ طوالت کے خوف سے میں بہت اختصار سے کام لوں گا۔

مختلف ریاستوں میں اُردو اکادمیاں قائم ہیں۔ وہ طالب علموں کو وظائف، لائبریریوں کو گرانٹ، معذور مصنفوں کو امداد، کتابوں پر انعامات دینے کے علاوہ اپنے بجٹ کا بیشتر حصہ کتابوں کی اشاعت میں مصنفوں کی امداد اور خود اپنی کتابوں کی اشاعت پر صرف کر رہی ہیں۔ ادبِ اطفال پہ ان کی توجہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ زیادہ تر اُردو کے فارغ التحصیل حضرات کے لیے کتابیں چھاپ رہی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ بچوں کو اردو سکھانے یا اُردو سیکھنے والے بالغوں اور کم اُردو جاننے والوں کے لیے زیادہ سے زیادہ قاعدے، چارٹ اور کتابیں چھاپیں۔ اردو کی عالیشان عمارت کے کنگوروں، برجیوں اور محرابوں پہ پتائی کرنے سے کہیں زیادہ ضروری ہے کہ اس کی بنیادوں پر توجہ کی جائے جو کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ انھیں اس تکلیف دہ حقیقت سے آنکھیں ملانا چاہیے کہ اُردو پڑھنے والوں کی تعداد روز بروز کم سے کمتر ہوتی جارہی ہے اور اُردو اگر ہمارے بچوں تک نہیں پہنچی تو ہندستان میں اُردو کا کوئی مستقبل نہیں ہے اور اوپر کے لیپ پوت کی جو کارروائیاں کی جارہی ہیں وہ حرفِ غلط کی طرح مٹ جائیں گی۔

اس سلسلے میں، اردو کے اہلِ قلم اور دانشور طبقے سے بھی میں التماس کروں گا کہ

تنقید، تبصرے، تقابلے، تذکرے وغیرہ وغیرہ، یہ وہ جو دفتر کے دفتر لکھ رہے ہیں وہ اپنی جگہ پر بجا و درست ہیں لیکن وقت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا کچھ حصہ اس بات پر بھی صرف کریں کہ اُردو کو موجودہ منجدھار سے کیسے بچایا اور اُسے آیندہ نسلوں تک کیسے پہنچایا جائے۔ یہ ایک غیر معمولی فرمایش ہے لیکن آگ لگنے پر صرف فائر بریگیڈ کا انتظار نہیں کیا جاتا۔ ہر شخص سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ آگ بجھانے کے لیے جو بھی کر سکتا ہے کرے گا۔ میرے ایک دوست غزل گو شاعر تو پہلے صرف شعر کہتے اور کبھی کبھار اپنے شاعروں کے تذکرے لکھتے۔ اب آج کل اس کام میں لگے ہوئے ہیں کہ اُردو کے ان دشوار الفاظ کی فہرست بنائیں جن کے املے میں عموماً کم پڑھے لکھے لوگ غلطیاں کرتے ہیں اور اُنھیں الفاظ کے مادوں کے ذریعے سمجھائیں کہ ان کا صحیح املا کیا ہے۔ اردو املے کی صحت کی کوشش ایک مناسب قدم ہے۔ ایسی کتابیں اب بھی موجود ہیں لیکن ضرورت سے بہت کم۔

آج پنجاب، ہریانہ یا دلی کے باہر کتنے اسکول ہیں جہاں گورمکھی پڑھائی جاتی ہے؛ لیکن ہمارا ہر سکھ بھائی گورمکھی جانتا ہے۔ وہ اپنی مادری زبان گھر کی چہار دیواری کے اندر ماں کی گود میں پڑھتا ہے۔ کیا اردو کو ایسے پڑھائے جانے کی تحریک نہیں شروع کی جا سکتی؟ اسی طرح اگر ہمارے بچے کو بچپن میں اُردو ترانے یاد کرائے جائیں اور وہ کورس میں خوش الحانی سے پڑھے تو کیا اُسے آگے چل کر اُردو پڑھنے کا شوق نہیں پیدا ہوگا؟ لیکن ہمارے اُردو ادب میں اردو کے کتنے ترانے لکھے گئے؛ اور ہمارے کتنے بچے گھر پر اپنے والدین سے اُردو پڑھتے ہیں۔

میرے قصبے سندیلے میں انجمن ترقی اُردو کی مقامی شاخ کی جانب سے والدین اور بچوں میں اُردو پڑھانے اور پڑھنے کی تحریک شروع کی گئی تو مجھے بڑی حیرت ہوئی جب ایک، دو نے نہیں بلکہ آٹھ دس بچوں نے بتایا کہ وہ اردو اس لیے نہیں پڑھتے ہیں کیونکہ اس کا پڑھنا اور سیکھنا مشکل ہوتا ہے۔ مجھے اس موقع پر اپنے دوست آنجہانی ڈاکٹر حکم چند نیر کا وہ قول یاد آگیا جو انھوں نے اپنی کتاب ابتدائی اُردو کے صفحے سات پر لکھا ہے..... اُردو رسم خط کے بارے میں اتنا تو پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دنیا کے مروج خطوط میں آسان ترین ہے اور سائنسی طریق کار سے ہفتے عشرے میں سکھایا جا سکتا ہے۔" میں نے خود مختلف انداز کے دو قاعدے لکھے ہیں۔ "اردو سیکھیے" اور "آسان اردو" اور میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر رٹانے کے بجائے بچوں کے جذبۂ تجسس کو بیدار کرکے اُنھیں اُردو پڑھائی جائے تو صرف ایک گھنٹہ روز وقت دے کر وہ دو مہینے میں ابتدائی اُردو، اچھی خاصی لکھ پڑھ سکتے ہیں۔

اگر بچے اُردو کو دشوار سمجھتے ہیں تو اس کے یہی وجوہ ہو سکتے ہیں کہ والدین خود اُن کی تعلیم میں خاطر خواہ دلچسپی نہیں لیتے، بچوں کو اچھے قاعدے پڑھنے کو نہیں ملتے اور

یا پھر ان کو اچھے پڑھانے والے نہیں ملتے۔

بازار میں جتنے اُردو قاعدے دستیاب ہیں اُن سے کہیں زیادہ مختلف اور متنوع قاعدوں کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ حروف تہجی اور ان کی مختصر شکلوں اور اُن کے دوسرے حروفوں سے ملنے کے طریقوں کے متعلق خوبصورت اور دیدہ زیب چارٹوں کی بھی بڑی کمی ہے۔ صرف ان چارٹوں کو بار بار دیکھتے ہی رہنے سے غیر شعوری طور پر ہمارے بچّے اُردو سے کافی شناسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اُردو اکادمیوں کو اس طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

شہروں اور قصبوں میں جہاں بھی اردو والے ہوتے ہیں عموماً کوئی نہ کوئی ادبی ادارہ ضرور ہوتا ہے۔ چاہے وہ صرف مشاعرے اور کتابوں کے جشن ہلنے اجرا ہی منعقد کراتا ہو۔ اس کو چاہیے کہ وہ بچّوں کو اُردو پڑھانے کی تحریک بھی شروع کرے۔ شبینہ اسکول کھولے، اُردو لائبریری اور مطالعہ گھر قائم کرے۔ اپنے اراکین کو ترغیب دے کہ وہ اُردو کتابیں، اخبارات اور رسالے خرید کر پڑھیں، اپنے روزمرّہ کے کام اُردو میں کریں اور تقریبات کے موقعوں پر اپنے دعوت نامے اُردو میں چھاپیں۔ بظاہر یہ بہت چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن یہ ہلکے جھونکے بھی اگر مستقل مزاجی سے چلیں تو جھکڑ اور آندھی بن سکتے ہیں۔ اگر شروع میں یہ کوششیں کامیاب ہوتی نہ بھی نظر آئیں تو بھی ان سے اُردو والوں میں اُردو کے لیے ایک رجحان اور مزاج پیدا ہوگا اور وہ اس کے مستقبل کے متعلق سنجیدگی سے ایک فریق بن کر غور و فکر کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

اُردو املا کی معیار بندی، اردو الفاظ کے تلفظ کی لغت، اردو کا نستعلیق ٹائپ، نئے نوسکھیا بالغوں اور بچّوں کے لیے دلچسپ معلوماتی کتابیں اور اسی طرح کے اُردو کو استحکام پہنچانے والے دوسرے کاموں پر بھی ہمارے دانشوروں کو متوجّہ ہونے کی ضرورت ہے۔ انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ انھوں نے علم و ادب کی جو مشعلیں جلائی ہیں اُن کو سنبھالنے کے لیے ان کے پیچھے صفوں میں بڑی تیزی سے ہاتھ کم سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔

ہندستان میں اُردو کی زیست اور موت سے جُڑا ہوا سب سے بڑا مسئلہ اُردو والوں کی اپنی زبان کے متعلق بے حسی اور بے تعلقی ہے۔ وہ اُس کے متعلق اسی طرح سرسری شکایت کرتے ہیں جیسے نگر پالیکا کے وائر ورکس کی بدعنوانیوں کی۔ اس سلسلے میں "کر و یا مرو" کے جذبے KILLER INSTINCT کا بڑا فقدان ہے۔

پینتالیس سال کی مستقل ناکامیوں اور مایوسیوں نے ان میں بڑی بددلی اور احساس کمتری پیدا کر دیا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کی پیداوار کی اکثریت اب یہ جانتی بھی نہیں کہ اگر ملک میں اُردو ختم ہو گئی تو وہ کیا کھو دیں گے ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

میرے ایک دوست نے جن کو اچھی خاصی اردو آتی ہے، ابھی حال ہی میں مجھ سے کہا "آپ کیا اردو کے لیے ایک ہاری ہوئی لڑائی لڑ رہے ہیں؟ حکومت کی بے رخی کی وجہ سے وہ آج نہ ختم ہوئی تو کل ہو جائے گی۔ ہندوستان میں اس کا کوئی مستقبل نہیں۔" انھیں شاید اس کا علم نہیں کہ زبانیں حکومتیں نہیں عوام بناتے ہیں۔ وہی انھیں زندہ رکھتے ہیں۔ تعلیم سے بے تعلقی اور سرکاری دفتروں سے بے دخلی کی ساڑھے چار دہائیوں کے بعد بھی گھروں، سڑکوں، بازاروں اور دفتروں میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ علاقائی زبانوں کے حلقوں کو چھوڑ کر اردو ہے یا اس سے بہت قریب ہے۔ مگر وہ سنسکرت آمیز ہندی نہیں ہے اور اس زبان سے تو بالکل مختلف ہے جو سرکاری دفتروں میں گڑھی جا رہی ہے اور جس میں حکومت کے فرمان اور اعلان شائع ہوتے ہیں۔ سکولوں میں ابھی تک ہندی کے طالب علموں کو ہندی کے مشکل الفاظ کے معنی اردو ہی میں بتائے جاتے ہیں مثلاً گرہ کے معنی گھر، ہردے کے معنی دل، شیتل کے معنی ٹھنڈا اور دُگدھ کے معنی دودھ۔ اردو کی توانائی اور جانداری کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ اس صورتِ حال سے ہمیں پست ہمت ہونے کے بجائے حوصلہ مند ہونا چاہیے۔

کوئی بھی شخص اس وقت تک کسی مقصد کے لیے جدوجہد نہیں کرتا جب تک وہ اس کی اہمیت اور ضرورت کو اچھی طرح سمجھتا نہ ہو۔ اردو ہمارے معاشرے کی تہذیب، تمدن، روایت، تاریخ، ثقافت، اخلاقیات، جمالیات اور ذہنی نشوونما کے لیے کتنی ناگزیر ہے اور اس کے بغیر ہم کیسے ادھورے اور بے جڑ کے پودوں کے مانند رہ جائیں گے، اردو والوں کو یہ ذہن نشین کرانا میرے خیال میں سب سے اہم ضروری اور پہلا کام ہے۔ یہ حکومت کا نہیں ہمارا فرض ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

اسرارِ خودی (فراموش شدہ اڈیشن)	(شعری مجموعہ)	مرتبہ: شائستہ خان	-۵/
حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدن	(تاریخ)	مالک رام	۷۵/
جامِ جہاں نما۔ اردو صحافت کی ابتدا	(اردو صحافت)	گر بچن چندن	۷۵/
مسلمانوں کا تعلیمی نظام	(تاریخی)	ضیاء الحسن فاروقی	۴۵/
اردو ناول میں عورت کا تصور	(تحقیق)	فہمیدہ کبیر	۴۵/
نوٹوں کی تلاش	(ناول)	ایاز سیوہاروی	۶۰/
تاثر نہ کہ تنقید	(تنقید)	صدیق الرحمٰن قدوائی	۵۱/
اپنے دل کی حفاظت کیجیے	(ایلوپیتھی)	ترجمہ نذیر الدین مینائی	۲۵/
یہ صورت گر کچھ خوابوں کے	(انٹرویوز)	طاہر مسعود	۶۶/
مرضیات	(طب)	حکیم نعیم الدین زبیری	۵۱/
بانگ درا	(شعری مجموعہ) طلبہ ایڈیشن	اقبال	۹/
بالِ جبریل	(شعری مجموعہ)	〃	۶/
ضربِ کلیم مع ارمغانِ حجاز (اُردو نظمیں)	(شعری مجموعہ) 〃	〃	۶/
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی	(ناول)	کشمیری لال ذاکر	۴۸/
گوشے میں قفس کے	(طنزیہ مزاحیہ)	دلیپ سنگھ	۴۵/
سحر کے پہلے اور بعد	(جگ بیتی)	سعید الظفر چغتائی	۵۱/
افکارِ اقبال	(اقبالیات)	محمد عبد السلام خاں	۱۲۵/
فرمان فتح پوری	(شخصیت اور ادبی خدمات)	مرتبہ خلیق انجم	۲۵/
تذکرہ ماہ و سال	(تذکرہ)	مالک رام	۱۲۵/
تحقیق نامہ	(تحقیق)	مشفق خواجہ	۱۲۵/
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان	(مذہب)	حکیم محمود احمد برکاتی	۴۵/
خواب اور خلش	(شعری مجموعہ)	آل احمد سرور	۴۶/
سفر	(ناول)	رابعہ تبسم	۲۷/
تحریریں	(تنقید)	ڈاکٹر اسلم پرویز	۵۱/
پہچان اور پرکھ	(تنقید)	پروفیسر آل احمد سرور	۵۱/
ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم	(تحقیق)	ڈاکٹر سلامت اللہ	۵۱/
پت جھڑ کی آواز (نیا اڈیشن)	(افسانے)	قرۃ العین حیدر	۷۵/
اقبال کا نظریہ خودی	(تحقیق)	عبد المغنی	۱۵۰/
سمندری خزانہ	(ناول)	ماریہ رحمان	۲۷/
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	(تنقید)	وارث علوی	۳۶/
فی الحقیقت	(طنز و مزاح)	یوسف ناظم	۴۵/
مٹی سے ہیرا	(ناولٹ)	سید مقبول احمد	۱۰/
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	(ناولٹ)	صغرا مہدی	۲۴/
الجھاوے	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف	۵۱/
غبار منزل	(شعری مجموعہ)	غلام ربانی تاباں	۲۵/

منیب الرحمٰن
کینیڈا

بابری مسجد

ہم کو ماضی سے جو بھی بصیرت ملی
آج گھمسان میں کھو گئی
یا سیاست کے میدان میں کھو گئی
دل کے شمشان میں کھو گئی

اس بھرے دیس میں
ایک بھی چشمِ بینا نہیں؟
کوئی بھی مردِ دانا نہیں؟
کیا یہ خود خواہ اندھوں کا بازار ہے؟
مصلحت کا فقط جس میں بیوپار ہے؟

رام کے نام کو اک شوالا ملا
رام کی روح کو گھر نکالا ملا

پاٹلی پُتر کا راج شاسن بنے [1]
جس میں ہر دھرم کا مان ہو
دوسروں کا نہ اپمان ہو
کوئی ہندو نہ کوئی مسلمان ہو

---

[1] اشارہ شہنشاہ اشوک کے کتبے نمبر ۱۲ کی طرف ہے، جس میں مذہبی رواداری کی تلقین کی گئی ہے

ہماری نئی اور اہم مطبوعات

کتاب نما کا خصوصی شمارہ
ڈاکٹر اجمل اجملی
(حیات اور ادبی خدمات)

مرتبین:
ڈاکٹر علی احمد فاطمی / عذرا رضوی

اردو، ہندی کے ممتاز ادیبوں کی اہم نگارشات کا مجموعہ جس میں ڈاکٹر اجمل اجملی کی ادبی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا گیا ہے قیمت ۴۵/-

پروفیسر مسعود حسین خاں
(علمی، لسانی اور ادبی خدمات)

مرتبہ
ایم حبیب خاں

کتاب نما کے اس خصوصی شمارے میں اردو کے ممتاز ادیب، ماہر لسانیات اور محقق جناب مسعود حسین خاں کی خدمات کے اعتراف میں اردو کے ۱۲ ممتاز ادیبوں کی نگارشات کا مجموعہ قیمت ۴۵/- روپے

طنزیات و مضحکات
رشید احمد صدیقی

طنزیات و مضحکات کے فن پر اردو میں پہلی اور اہم کتاب جو عرصے سے نایاب تھی اب نہایت اہتمام سے شائع کردی گئی۔
قیمت: ۲۰/- روپے

اردو ناول میں عورت کا تصور
نصرت کبیر

اس اہم مقالے میں اس بات کی کھوج لگانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اپنے اپنے دور کے مخصوص سماجی حالات میں مختلف ناول نگاروں نے ایک مثالی عورت کا کیا تصور پیش کیا ہے
اردو میں اس موضوع پر پہلی کتاب
قیمت: ۴۷/- روپے

نوٹوں کی تلاش (جاسوسی ناول)
محمد عاقل ایاز سیوہاروی

اردو میں ایسا لاجواب ناول جس کو شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کیے چین نہیں پڑے گا۔ پل پل بدلتے ہوئے سنسنی خیز واقعات کا مجموعہ
قیمت: ۶۰/-

یہ صورت گر کچھ خوابوں کے
عہد حاضر کے 17 اہم ادیبوں کے انٹرویو

طاہر مسعود قیمت 66/

شاہ ولی اللہؒ اور ان کا خاندان
تالیف: حکیم محمود احمد برکاتی

اس کتاب میں برکاتی صاحب نے حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ نیز ان کی تصانیف تلامذہ، مریدین شاہ ولی اللہ کا تعارف بھی ہے۔ قیمت ۴۵/-

رشید حسن خاں
بی سی، ۹۱ دریا باد دہلی ۶

زور صاحب

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا انتقال ۱۹۶۲ء میں ہوا تھا، مہینا ستمبر کا تھا۔ اس حساب سے اُن کو مرحوم ہوئے اگلے مہینے پچیس سال ہو جائیں گے۔ اگر آج اس سمینار میں اُردو کے سنجیدہ اہلِ علم ان کی خدمات کا ایک بار پھر اعتراف کر رہے ہیں، تو اس کا واضح طور پر مطلب یہ ہے کہ اُن کی کچھ خدمات ایسی بھی تھیں جن کی اہمیت اتنی مدت گزر جانے کے باوجود ہنوز کم نہیں ہو سکی اور بدلتے ہوئے حالات کا دباو اُن نقوش کو ابھی تک مدھم نہیں کر سکا۔

زمانہ سب سے زیادہ بے رحم مگر سب سے بہتر نقاد ہے۔ اب سے پہلے پچیس سال کو کچھ زیادہ لمبی مدت شاید نہ سمجھا جاتا، لیکن آج کل حالات، خیالات اور حصولِ معلومات کی رفتار پہلے سے کہیں زیادہ تیز ہو چکی ہے اور بقولِ غالب: اس سال کے حساب کو برق، آفتاب ہے: یوں ہمارے زمانے میں پچیس برس کی مدت کچھ کم نہیں ہوتی۔ اگر زور صاحب کی شخصیت کی دلکشی نگاہوں میں ابھی تک محفوظ ہے اور اُن کی خدمات کا اعتراف کسی نہ کسی پہلو سے ضروری سمجھا جاتا ہے، تو اس کا مطلب یہی ہے کہ اُن کی شخصیت اور اُن کی خدمات کے کچھ ایسے پہلو ضرور ہیں جن میں دلوں تک زندہ رہنے کی توانائی کارفرما رہا کرتی ہے۔

اسی کے ساتھ ایک اور بات بھی ہماری توجہ کی طلب گار ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کسی شخص کے سب کام قدر و قیمت کے لحاظ سے یکساں حیثیت اور اہمیت رکھتے ہوں۔ آدمی جب بہت سے کام کرے گا اور طرح طرح کے کام کرے گا، تو اُن میں بلند و پست کی نسبت بھی پائی جا سکتی ہے اور بالعموم پائی جاتی

ہے۔ طرح طرح کے کاموں میں اگر ادبی تحقیق اور تدوین کے کام بھی شامل ہوں، تب اس نسبت کا پایا جانا لازمی سا ہو جاتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ کثیر المقاصد ہونا ویسے خواہ ضروری ہو اور وقت کا تقاضا بھی ہو، مگر ان دونوں موضوعات کو تحقیق اور تدوین سے بہت دور کی نسبت ہے۔ مولانا روم کا یہ مشہور شعر بہ آسانی اس سلسلے میں پڑھا جا سکتا ہے۔

ہم خدا خواہی و ہم دُنیاے دوں
ایں خیال است و محال است و جنوں

یہاں ایک اہم مسئلہ ہماری توجہ کا متقاضی ہے اور یہ دراصل اصولِ تحقیق کا اہم مسئلہ ہے۔ کون سا کام کن حالات کے تحت کیا گیا تھا، محرکات کیا تھے، وجوہ کیا تھیں؛ یہ سب باتیں اپنی اپنی جگہ تو اہمیت رکھتی ہیں، کہ اِن کی روشنی میں اُس کام کو یا کاموں کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے، لیکن قدر و قیمت کے تعین میں ان کو دخل نہیں ملنا چاہیے۔ یعنی اسباب اور معیار، ان کو دو الگ الگ چیزیں ماننا چاہیے۔ پریشانی یا بے سروسامانی کے عالم میں یا ایسے ہی دوسرے عوامل کے دباؤ کے تحت ایک کام کیا جائے اور وہ کام کم رتبہ ہو، تو اسبابِ پریشانی کا تذکرہ اپنی جگہ برحق ہے، اس سے ہمدردی کا اظہار بھی انسانی فریضہ ہے، مگر ان سب کے نتیجے میں اُس کام کا کم رتبہ ہونا اور کم معیار ہونا قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ حاصلِ گفتگو یہ ہے کہ حالات کی نامساعدت یا کام کرنے والے کی مجبوریاں اور حالات کے تقاضے کم معیاری کے اسباب تو ہو سکتے ہیں، لیکن کم معیاری کے لیے وجہِ جواز نہیں بن سکتے۔

زورؔ صاحب کی زندگی کے کئی پہلو ایسے ہیں جو ہماری بحث کا موضوع بن سکتے ہیں اور بننا چاہیے۔ وہ ماہرِ لسانیات تھے، اُنھوں نے تدوین کا کام کیا ہے، ادبی تحقیق سے بھی اُن کو شغف رہا ہے، کتاب خانے کی فہرست مرتب کی ہے، افسانے لکھے ہیں، شاعری کی ہے، غرض کہ بہت کچھ کیا ہے۔ لسانیات سے میں کما حقہ واقف نہیں، افسانہ نگاری اور شاعری اُن کے ضمنی شوق یا مشغلے تھے۔ شمار میں تو وہ آتے ہیں، مگر میرے نزدیک اُن کی نمایاں حیثیت نہیں۔ ہاں تحقیق اور تدوین، یہ دو کام ایسے ہیں کہ مجھ جیسے بہت سے دور اُفتادہ طالب علموں نے ان ہی دونوں کاموں کے وسیلے سے

زورؔ صاحب کو جانا اور پہچانا ہے۔ میں اس موقع پر صرف تدوین سے متعلق چند باتیں مختصراً عرض کرنا چاہتا ہوں۔

تدوین کے ذیل میں انھوں نے جو کچھ کام کیا اُس میں نمایاں حیثیت کلیات قلی قطب شاہ کی ہے۔ یہ کلیات ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تھا۔ وہ اس کے بعد بائیس برس تک زندہ رہے، مگر ایسا کوئی دوسرا کام نہیں کر پائے۔ وجوہ سے یہاں بحث نہیں، حاصل یہی ہے۔ اس کلیات کی تدوین میں انھوں نے کتنا وقت صرف کیا، کن حالات میں اس کام کو انجام دیا، وہ حالات موافق تھے یا ناموافق، اس وقت ان باتوں کی ثانوی حیثیت ہے، اصل بات یہ ہے کہ تدوین کے معیار پر یہ کام پورا نہیں اُترتا۔

میں یہ مانتا ہوں کہ اس کلیات کی اشاعت کے بعد قلی قطب شاہ کے کلام سے وہ سب لوگ اچھی طرح واقف ہو گئے، جو ویسے شاید اس طرح واقف نہ ہو پاتے۔ اس سے دکنی ادبیات کی طرف لوگوں کی توجہ منعطف ہونے میں بھی مدد ضرور ملی، یہ بھی ہوا کہ شاعر کی شاعرانہ حیثیت ہمارے سامنے اپنی تفصیلات کو پیش کر سکی اور اپنی عظمت کو ہم سے بآسانی منوا سکی۔ مگر تدوین کی بحث میں یہ سب باتیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہاں اصل بات یہ ہے کہ ہمیں بار بار یہ محسوس ہوتا ہے کہ متن کی صحت کمال کے درجے پر نہیں پہنچ سکی۔ متن سے متعلق ضروری تشریحات کا ضمیمہ موجود نہیں، ایسی تشریحات، جن کے بغیر بہت سے مقامات پر متن کو سمجھنا مشکل اور بہت مشکل ہے۔ فرہنگ نا تمام ہے۔ مگر ان سب سے بڑھ کر یہ بات کہ قدیم زبان کی نسبت سے املا اور تلفظ کے ضروری مسائل زیرِ بحث نہیں آئے، حالاں کہ یہ نہایت ضروری کام تھا، کیونکہ اس کے بغیر بہت سے لفظوں کی شکل صورت کو اور تلفظ کو اچھی طرح سمجھنا مشکل تر ہے۔ اس ناتمامی کی وجہ سے یہ صورت بھی رونما ہوئی ہے کہ لفظوں کی شکلوں کا تعین نہیں ہو سکا، ایک ہی لفظ کی ایک جگہ ایک شکل ہے اور دوسری جگہ دوسری صورت ہے۔ مرتب نے ہمیں یہ بھی نہیں بتایا کہ نظموں اور غزلوں پر جو عنوانات ہیں، وہ کس نے متعین کیے ہیں یا تصنیف کیے ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اس کلیات کا مخطوطہ دیکھا ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ مخطوطے میں یہ عنوانات موجود نہیں، تو پھر یہ عنوانات آئے کہاں سے اور ان کے وجود کا جواز کیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور بات کا بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ۱۹۶۰ء میں ساہتیہ اکیڈمی کے لیے زورؔ صاحب نے اُردو شاعری کا انتخاب کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تھی، اس میں قلی قطب شاہ کا کلام بھی شامل ہے جب میں نے اِس انتخابی مجموعے کو دیکھا تو مجھے بہت حیرت اس پر ہوئی کہ کلیاتِ قلی قطب شاہ میں اور اِس انتخابی مجموعے میں جو مشترک کلام ہے، وہ متن کے لحاظ سے باہم مختلف ہے؛ جب کہ دونوں کتابیں ایک ہی شخص کی مرتب کی ہوئی ہیں۔ کلیات میں جو غزلیں یا نظمیں دکنی زبان میں ہیں، وہ اِس انتخاب میں شمالی ہند کی زبان میں ہیں۔ مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ مرتب نے لفظوں اور مصرعوں کو بدلا ہے۔ تحقیق کی اصطلاح میں اِسے "تحریف" کہا جاتا ہے اور تحریف کے لیے کسی بھی قسم کا جواز نہیں۔ میرے ذہن میں خلفشار یہ پیدا ہوا کہ جب ایک مرتب ایک کتاب میں اصل کلام میں ایسی تبدیلیاں روا رکھتا ہے جس سے اس کلام کی شکل صورت ہی بدل جائے، تو دوسری کتاب میں بھی تو اِس طرح کی کارگزاری کا امکان ہو سکتا ہے۔ یہ میری بے توفیقی تھی کہ اصل خطی نسخے سے اِس کلیات کا مقابلہ نہیں کر سکا اور یوں وہ خلفشار ذہن میں جاگزیں رہا۔

کلیاتِ قلی قطب شاہ کا مقدمہ طویل ہے۔ مقدمہ کیا ہے، پوری ایک کتاب ہے۔ مقدمے کا طویل ہونا بجائے خود عیب کی بات نہیں نہ اعتراض کی، مگر مسئلہ یہ ہے کہ جب کسی متن کو مرتب کیا جائے، تو اِس کے مقدمے میں کیا کیا ہونا چاہیے؟ جب کسی قدیم متن کو مرتب کیا جاتا ہے تو اِس متن کے تعلق سے بیسیوں سوالات پیدا ہوتے ہیں اور مشکلیں سامنے آتی ہیں۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ ہر متن اپنے مسائل ساتھ لے کر آتا ہے۔ سب سے پہلا فرض مرتب کا یہ ہے کہ وہ متن کی اُن مشکلات پر وضاحت کے ساتھ گفتگو کرے، تاکہ اِس متن کی تصحیح کا حق ادا ہو سکے، پڑھنے والا اچھی طرح سمجھ سکے اور خود مرتب بھی اِس طرح ہر لفظ کے تعین کا ذمّے دار قرار پائے اور لفظوں پر غور کرنے کے واسطے سے بار بار اس ذمّے داری کا احساس ذہن میں روشن ہوتا رہے۔

اِس طویل تر مقدمے میں ایسی کوئی چیز نہیں ملتی۔ تاریخ، تہذیب، ثقافت اور تنقید سے متعلق تو لمبی چوڑی بحثیں ملتی ہیں، مگر متعلقِ متن سے مسائل

کہیں بھی زیرِ بحث نہیں آئے، جب کہ یہ اصل کام تھا۔ مقدمے میں متن کے متعلقات زیرِ بحث نہیں آسکے تھے، تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ آخر متن میں، ضمیموں کی شکل میں وہ سب مباحث شامل کتاب کر لیے جاتے۔ ایسا بھی نہیں ہوا۔ اب اس مقدمے میں اور سب کچھ ہے، مگر اصل موضوع یعنی تصحیحِ متن سے متعلق کچھ بھی نہیں۔ قلی قطب شاہ پر الگ سے ایک کتاب لکھی جا سکتی تھی ایسے سب مباحث کو سمیٹنے کے لیے جو مقدمے میں آئے ہیں؛ جس کا جی چاہتا، اُسے پڑھ لیتا۔ متن کی جو مشکلات اور متعلقات ہیں، اُن کو تو اسی کلیات میں شامل ہونا چاہیے تھا اور یہ اصل کام نہیں ہوا۔

یہ ایک بُری اور بہت بُری روایت بنتی جا رہی ہے کہ تدوین کے ذیل میں متن کے متعلقات پر تفصیل سے گفتگو نہیں کی جاتی اور اس کے بجائے سیاسی اور سیاسی پس منظر اور تنقیدی مباحث مقدمے میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔ جبکہ ترتیب و تصحیحِ متن کا اصل مقصد اس متن کو پوری متعلق تفصیلات کے پیش کرنا ہے، شاعرانہ قدر و قیمت کا جائزہ اصل کام نہیں۔ زورؔ صاحب کے مرتب کیے ہوئے اس کلیات کا مقدمہ اس بُری روایت کا شاید سب سے پہلا اور سب سے بڑا مظہر ہے۔

میں نے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ تحقیق کو شرکت راس نہیں آسکتی۔ آدمی بہت سے کاموں میں اپنے آپ کو پھنسائے، تو اُن بہت سے کاموں کا حق ادا ہو یا نہ ہو، تحقیق اور تدوین کا حق ادا نہیں ہو پائے گا۔ تحقیق اور تدوین، یہ دونوں ہمہ وقتی مصروفیتیں ہیں، یہ چُھٹکر کے کام نہیں، کہ جب موقع ملا، تب انھیں بھی نپٹا دیا۔ زورؔ صاحب نے بہت سے کاموں میں جس طرح اپنے آپ کو اُلجھا لیا تھا، اس کی تفصیل آپ پچھلے دو دنوں میں سُن چکے ہیں۔ اُن کی ضرورت اور اہمیت کا تذکرہ بھی آچکا ہے۔ حسینی شاہد صاحب نے خاص کر تفصیل کے ساتھ اُن اسباب اور محرکات کا بھی ذکر کیا ہے جو ان کی مصروف زندگی کا اصل سبب بنے تھے۔ اُن اسباب کا وجود برحق ہے، زورؔ صاحب کی مصروفیتیں اور ان مصروفیتوں کے سلسلے میں اُن کی مجبوریاں اور ضرورتیں یہ سب بھی بجا درست، مجھے اُن کے ناگزیر ہونے سے اور اُن کی اہمیت سے شمہ بھر بھی انکار نہیں۔ زورؔ صاحب کی ہمت، جرأت اور صلاحیت کا بھی میں منکر نہیں، انھوں نے جو بہت سے کام کیے ہیں، اُن کاموں کی افادیت میں بھی مجھے کلام نہیں۔

مگر بات وہی ہے کہ یہ سب چیزیں کم معیاری کی وجہ تو بن سکتی ہیں مگر اس کا جواز نہیں بن سکتیں۔ جب تحقیق اور تدوین کے اصولوں کی روشنی میں کسی کام کا جائزہ لیا جائے گا، اُس وقت ساری تفصیلات کو سُننے اور پڑھنے کے بعد بھی، کم معیاری کے جواز کے طور پر اُن کو شمار میں نہیں لایا جائے گا اور قبول نہیں کیا جائے گا۔

مجھے نہیں معلوم کہ عجلت پسندی زورؔ صاحب کے مزاج کا جُز تھی یا حالات نے اُسے اُن کا رفیقِ کار بنا دیا تھا، مگر وہ اُن کے ساتھ رہی ضرور۔ ایک مقالہ نگار نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ: "زورؔ صاحب ہر کام میں جلدی کے قائل تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر کام فوراً ہو جائے" (ڈاکٹر زور، شخصیت اور کارنامے، ص ۹۴) اسی مقالہ نگار نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک کتاب کے سے میں زورؔ صاحب نے اکبرالدین صدیقی صاحب سے پوچھا کہ یہ کتاب کب تک مکمل ہو جائے گی۔ انھوں نے کہا: دو مہینے میں ۔۔۔ زورؔ صاحب نے کہا کہ "تب تک تو قیامت آ جائے گی" پھر یہ ہوا کہ زورؔ صاحب نے اُن کو اپنے یہاں بُلا لیا اور دس دن میں وہ کتاب مکمل ہو گئی۔ یہ تو تھا اُن کی عجلت پسندی کا حال۔ مصروفیت کے تذکرے آپ بہت کچھ سُن چکے ہیں اور قریب قریب ہر مقالہ نگار اور ہر مقرر نے اس پر زور دیا ہے اور کچھ تفصیلات بھی بتائی ہیں۔ اُن کی مختلف النوع مصروفیتیں اور اُن کی عجلت پسندی ان دونوں نے اُن کے بہت سے کام بنائے ہوں گے، مگر تحقیق اور تدوین کو بہت نقصان پہنچایا۔

شاید آپ میں سے کوئی صاحب یہ کہیں کہ جس زمانے میں زورؔ صاحب نے کلیات مرتب کیا تھا، اُس زمانے میں ایسے ہی کام ہوا کرتے تھے۔ تو یہ کہنا درست نہیں ہوگا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ زورؔ صاحب نے یورپ کے علمی حلقوں میں اچھا خاصا وقت گزارا تھا اور وہ وہاں کے معیار اور انداز سے بے خبر نہیں تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ شیرانی صاحب کے سارے کارنامے اُس وقت تک عالمِ وجود میں آ چکے تھے، اُردو میں تحقیق کی روایت خاصی وسیع اور مستحکم ہو چکی تھی، عرشی صاحب مکاتیبِ غالب کو مرتب کر کے شائع کر چکے تھے اور قاضی عبدالودود صاحب کے تبصرے رسالۂ معیار میں چھپ کر علمی حلقوں میں پھیل چکے تھے۔ اصل بات وہی ہے کہ عجلت پسندی، سب سے

نہایت مصروفیت اور تحقیق و تدوین کے اصولوں کا بہت ڈھیلا ڈھالا تصور اس کی اصل وجہ ہے۔

کل یہ بات ضروری تفصیل کے ساتھ زیرِ بحث آ چکی ہے کہ زور صاحب اور مولوی عبدالحق میں اچھی خاصی چشمک تھی۔ اس کی روشنی میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ مولوی صاحب نے دکنی ادبیات کو شائع کرنا اپنے پروگرام کا ضروری حصہ بنا لیا تھا۔ زور صاحب نے بھی دکنی ادبیات کی طرف توجہ کی۔ دونوں کے اندازِ نظر میں یہ فرق ضرور تھا کہ جہاں مولوی صاحب دکنی ادب کو شمالی ہند کی زبان کے قدیم سرمایے کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتے تھے، وہاں زور صاحب اُسے اپنے اصل سرمایے کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتے تھے اور اہلِ زبان اور غیر اہلِ زبان کی نسبت سے یہ بھی خیال رہتا ہوگا کہ دیکھو، سخنور یہ ہرا اس طرح کہا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے اس سلسلے میں بہت اچھی اور پتے کی بات کہی ہے کہ زور صاحب "دکنی انا" کا مظہر تھے۔ اس روشنی میں مولوی عبدالحق سے اُن کی چشمک کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

مسابقت کی اس دوڑ میں یہی ہونا تھا کہ زیادہ سے زیادہ کام ہونے اور جلدی کام کرنے پر توجہ لگی رہے۔ میرا خیال ہے کہ اس صورتِ حال نے بھی تدوین اور تحقیق کے دیرطلب اور صبر آزما آداب کی پابندی کو بہت کچھ نقصان پہنچایا۔

دکنی ادب پر بہت کام ہوا ہے، مگر افسوس کہ زور صاحب کے بعد بھی ہمارے یہاں، یعنی ہندستان میں دکنیات کے سلسلے میں ترتیبِ متن کا کام معیاری انداز کا اب تک نہیں ہو پایا۔ یہی نہیں، زور صاحب نے جو نقشِ اوّل مذکورہ کلیات کی صورت میں بنایا تھا، وہ اور زیادہ بگڑ کر اسی کلیات کے دوسرے اڈیشن کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ اس نسخے کو دیکھ کر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُردو میں آج کے دن تک تدوین کے اصولوں کا علم عام ہوا ہی نہیں اور اس سلسلے میں کام کرنے کا سلیقہ ہمیں آیا ہی نہیں۔ صبر لوں آجاتا ہے کہ اس نسخۂ کلیات کو ترقیِ اُردو بورڈ نے شائع کیا ہے، جس نے گویا اس زمانے میں ایسی کتابیں چھاپنے کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔ اس صورت میں میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ زور صاحب کے مرتب کردہ کلیات پر

اعتراض میں کس مُنہ سے کروں !

زورؔ صاحب میں خوبیاں بہت سی تھیں۔ اُنھوں نے بہت کام کیا ہے۔ اُن کا بنایا ہوا ایوانِ اُردو اُن کے ارادوں کی بلندی اور دل کی وسعت کا مظہر ہے۔ حیدرآباد میں نواب سالار جنگ نے بے مثال میوزیم بنایا۔ اُن کے پاس ذوق بھی تھا اور دولت بھی۔ یہ دونوں چیزیں بہت کم یکجا ہو پاتی ہیں۔ زورؔ صاحب کے پاس دولت نہیں تھی، صرف جذبہ اور ذوق تھا۔ مگر دولت کی جگہ بلند ہمتی اُن کی مددگار رہی، اور یوں یہ ادارہ بنا جو اُن کی بہت بڑی یادگار ہے اور اُن کی عظمت کا آئینہ دار۔ دکنی ادب کے فروغ میں اُن کا حصہ کسی سے کم نہیں۔ یہ سب برحق، مگر مشکل یہ ہے کہ تحقیق اور تدوین کی بحث میں اُن اُمور کا عمل دخل نہیں ہوتا۔ یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ مولوی عبدالحق اور زورؔ صاحب، دونوں بہت سے کام کرنا چاہتے تھے اور دونوں کے پاس مصروفیتیں بہت تھیں، یوں وقت کم تھا۔ مزاج دونوں نے تقریباً ایک جیسا پایا تھا۔ دونوں بہت جذباتی تھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ان دونوں بزرگوں کے کیے ہوئے کام تحقیق اور تدوین کے معیار کو نہیں چھو سکے۔ اِن دونوں کا تقابل مقصود نہیں، ہو بھی نہیں سکتا۔ مولوی صاحب کی شخصیت میں وسعت بہت زیادہ تھی اور عظمت میں بھی اُن کا قد نکلتا ہوا تھا۔ یہاں صرف اِس بُرے اتفاق کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا کہ مولوی عبدالحق جیسے دیو قامت شخص ہوں یا زورؔ صاحب جیسے مخلص اور اَن تھک کام کرنے والے، تحقیق اور تدوین کی دُنیا بالکل دوسری دُنیا ہے، جہاں کے آداب کی مکمل پابندی ہر کام کرنے والے کے لیے لازم ہے۔ باہر کی دُنیا کے آداب و اطوار اور ضرورتوں یا مجبوریوں کی پیدا کی ہوئی معذرت طلبی یہاں کوئی حیثیت اور کوئی معنی نہیں رکھتی۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا، اِس کا ایک اور مقصد بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ تحقیق اور تدوین کے طالب علم زورؔ صاحب کی لگن، کاوش، محنت، خلوص اور دل لگا کر کام کرنے کو ضرور پیشِ نظر رکھیں۔ اُن کے یہاں ہمت کی جو بلندی اور ذوق کی جو نفاست تھی، اُسے بھی مثال کے طور پر

نظروں کے سامنے رکھیں۔ مگر تحقیق اور تدوین کے سلسلے میں اُن کے کاموں کو مثال کے طور پر سامنے نہ رکھیں۔ اُنھیں مشق نہ بنائیں ——— اور ایک غیر متعلق بات بھی، کہ زور صاحب اپنے شاگردوں پر جس قدر شفقت کیا کرتے تھے، اُس کی بھی توقع وہ اپنے اساتذہ سے نہ رکھیں، تمنا میں کچھ مضائقہ نہیں۔

(محی الدین قادری زور سمینار منعقدہ اگست ۱۹۹۰ء
انجمن ترقی اردو دہلی میں پڑھا گیا)

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

تذکرہ ماہ و سال

مالک رام

اس مجموعے میں اردو کے بیشتر ادیب، شاعر، نقاد، کالم نگار، صحافی اور دوسرے اہم عمائد (جنھوں نے اردو ادب کی قابل قدر خدمت کی ہے) کی تاریخ ولادت اور جو ہماری بدقسمتی سے انتقال کر چکے ہیں ان میں سے اکثر کی تاریخ وفات بھی درج ہے۔ کسی بھی اہم ادیب پر مضمون لکھتے وقت اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

قیمت۔ =/۱۲۵

افکارِ اقبال

محمد عبدالسلام خاں

اس اہم کتاب میں علامہ اقبال کے حالاتِ زندگی، ان کے اردو اور فارسی کلام پر سیر حاصل بحث، ان کے مذہبی اور سیاسی افکار، اور کچھ ایسے اہم واقعات کی نشان دہی کی گئی ہے جو اب تک اندھیرے میں تھے۔

قیمت ۱۲۵/۰

تحقیق نامہ

مشفق خواجہ

مشفق خواجہ اردو کے وہ واحد محقق ہیں جو ہمیشہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جو اپنی اہمیت کی بنا پر ہماری ادبی تاریخ کے کسی نہ کسی خلا کو پُر کرتے ہوں۔ زیر نظر مجموعہ میں ایسے ہی اہم ترین مضامین شامل ہیں

قیمت = ۱۲۵

مرضیّات

حکیم نعیم الدین زبیری

بیماریوں کے اصولی اسباب اور ان کی وجہ سے افعال میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے مطالعے یعنی ماہیت الامراض (پیتھالوجی) پر جامع اور آسان بحث۔ طلبہ کے علاوہ اطبا کے لیے بھی بے حد مفید۔ قیمت =/۵۱

تاثر نہ کہ تنقید

صدیق الرحمن قدوائی

تنقید، ادب کی ایک اہم شاخ ہے مگر اس کا ضرورت سے زیادہ چرچا بھی اچھا نہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ادب سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص "نقاد" ہو جائے۔ ادب کو تنقید کے سوا بھی مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے جن کا انحصار پڑھنے والوں کے انفرادی مزاجوں پر ہے۔ یہ تصنیف ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نیا نقطۂ نظر پیش کرتی ہے۔

قیمت : ۵۱/۰

خوابُ اور خلش

آل احمد سرور

شاعری ذات سے کائنات تک کا سفر ہے۔ یہ خوابوں کے ذریعے حقائق کی توسیع کا نام ہے۔ بڑی شاعری تجربے سے مدد لیتی ہے مگر وہ روایت اور تجربے میں ایک توازن رکھتی ہے۔ آل احمد سرور کی شاعری صرف الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں بلکہ اس میں معانی کا ایک سمندر ہے جس کی تہہ میں پہنچ کر ہی موتی نکالے جا سکتے ہیں۔

قیمت =/66 روپے

گوپی چند نارنگ
شعبۂ اردو دہلی
یونی ورسٹی

سخنے چند در ساختیات ـ ۲

مکالمہ بہ دانش جمیل و فکر کشیر

و دلیل لانا حسن عسکری مرحوم کا ساختیاتی مفکرین سے

لائق غور ہے کہ علامت (اسلام آباد) ذہن جدید (دہلی) اور تمثال (کراچی) میں بھی ساختیاتی مباحث کا آغاز ہو گیا ہے۔ محمود ایاز سے پچھلے سال میں نے کہا تھا آپ لاکھ کوشش کریں ان مسائل سے بچ نہیں سکتے۔ اس لیے کہ یہ ہمارے عہد کے اور آج کے ادب کے مسائل ہیں۔ ہاں ہم شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دبانا چاہیں تو کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب سچائیاں آسمان سے اترا کرتی تھیں، اب ادب کی جمہوریت اپنی سچائیاں خود طے کرتی ہے یعنی جیسے جمہوریت میں ووٹ دینے کا حق سب کو ہوتا ہے، اگرچہ کچھ لوگ ووٹ نہیں دیتے اور کچھ لوگ زیادہ ووٹ دیتے ہیں۔ اسی طرح ادب میں رائے دینے کا حق سب کو ہے، اگرچہ کچھ لوگ رائے نہیں دیتے اور کچھ لوگ زیادہ رائے دیتے ہیں، لیکن ایک کا صحیح دوسرے کا غلط، اور دوسرے کا صحیح پہلے کا غلط ہو سکتا ہے اور ادبی فکر اسی جدلیاتی عمل سے قائم ہوتی ہے۔ جمیل جالبی صاحب نے علامت کے "ادبی زاویے" میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کا معقول جواب وزیر آغا نے اوراق میں دے دیا ہے، لیکن جالبی صاحب کی تشفی نہیں ہوئی۔ ادھر سارک کانفرنس میں وہ دہلی آئے تو کہنے لگے یہ تو کوئی بات نہ ہوئی آپ لکھیں۔ میں نے عرض کیا کہ مجھ سے آپ نہ لکھوائیں تو بہتر ہے۔ بہرحال ان کا لطف و کرم اپنی جگہ پر اور ادبی مسائل اپنی جگہ پر۔ ان کا اصرار ہے تو کچھ عرض کرتا ہوں۔ فروعی باتوں اور جملہ بازی سے قطع نظر انھوں نے ناسمجھی کی بنا پر جو غلط نتائج اخذ کیے ہیں، ان میں سے کچھ یہ ہیں:

(۱) "ساختیات وغیرہ امریکی پروفیسروں کے ڈھکوسلے ہیں"

جمیل جالبی صاحب کو کون بتائے کہ حضرت جب آپ کو ساختیات کے بنیاد گزاروں کے نام تک معلوم نہیں اور یہ پتا نہیں کہ وہ کس ملک کے ہیں تو حکم لگانا کیا ضروری ہے۔ مثلاً سائنسر سوئس تھا، لیوی اسٹراس فرانسیسی، رومن جیکب سن روسی نژاد تھا، لاکاں، میشل فوکو

رولاں بارتھ، لوئی التھیو سے، تزینت، دریدا سب فرانسیسی، تودوروف کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ رومانیہ یا مشرقی یورپ کے کسی ملک سے ہے۔ ٹیری ایگلٹن جو انگریزی کا سب سے بحث انگیز اور مقبول نقاد ہے آکسفورڈ سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح کولن میک کیب (جس پر کیمبرج میں ہنگامہ ہوا تھا) پیٹر وڈوسن، کیتھرین بیلسے، انتونی ایسٹ ہوپ، کرسٹوفر نورس، ان سب کا تعلق برطانیہ سے ہے۔ جونتھن کلر آکسفورڈ اور کیمبرج دونوں جگہ رہا ہے۔ غرض کہاں تک گنوایا جائے، غالباً فرانس، برطانیہ یا یورپ کے دیگر ممالک سب جمیل جالبی کے جغرافیے کی رو سے امریکا میں ہوں گے۔ ظاہر ہے غلط بیانی کے لیے کسی لائسنس کی ضرورت نہیں، لیکن عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے۔

البتہ پال دی مان، ہلس ملر، جیفری ہارٹ مین وغیرہ کا تعلق ییل یونی ورسٹی سے تھا۔ دی مان کو اس دنیا سے گزرے ہوئے نو برس ہو گئے۔ ہیرولڈ بلوم کو گروپ سے الگ ہوئے بھی ایک زمانہ ہو گیا۔ فقط ہارٹ مین ییل میں اور ملر کیلیفورنیا میں ہے۔ ان لوگوں سے جس ردِ تشکیل کا آغاز ہوا، دوسرے اُسے امریکی کنزرویٹزم اور امریکی امپیریلزم سے جوڑتے ہیں اور دائیں بازو کی ردِ تشکیل کہتے ہیں، اس کے مقابلے میں جس ردِ تشکیل کا زور ہے اور جسے DECONSTRUCTION PROPER کہا جاتا ہے اور جس کا تعلق براہ راست دریدا سے ہے اس کے زیادہ تر نام لیوا یورپ میں ہیں اور وہ ردِ تشکیل کو امریکی کلچر اور کنزرویٹزم اور آج کے انسانیت کش حالات کے خلاف نئے معنی کی تلاش کا حریت پسند باغیانہ فلسفہ گردانتے ہیں۔

> (۲) "چند سال پہلے ساختیات کا زور شور ہوا۔ ..... لیکن اس عرصے میں معلوم ہوا کہ اس کی عمر تو پوری ہو چکی اور آج کل پس ساختیات کا زور زورہ ہے .... لیکن جلد یہ بات سامنے آئی کہ یہ نظریہ بھی دم توڑ چکا ہے اور اب ردِ تعمیر کا عروج ہے۔ یہ خبر اردو والوں تک نہیں پہنچی کہ ردِ تعمیر کا زور ٹوٹے ہوئے بھی کئی سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔"

جب جمیل جالبی صاحب کو آغاز کی خبر نہیں تو انجام کی خبر معلوم۔ ایک ہی سانس میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "اب ردِ تعمیر کا عروج ہے" اور یہ بھی کہ "ردِ تعمیر کا زور ٹوٹے ہوئے بھی کئی سال کا عرصہ گزر چکا ہے" غالباً ان کے نزدیک ان دونوں جملوں میں کوئی تضاد نہ ہوگا اور "اب" اور "کئی سال کا عرصہ" ہم معنی ہوں گے۔ اسی مضمون میں انھوں نے خود یہ بھی لکھا ہے کہ "دریدا ۱۹۷۰ء کے بعد سے اب تک سب سے با اثر ادبی و فکری شخصیت ہے اور ادبی مطالعات پر اس کا وہی اثر ہے جو کسی زمانے میں آئی اے رچرڈز کا تھا۔" اگر دریدا پچھلے

پس بائیس برسوں کا سب سے با اثر نقاد ہے تو پھر رد تشکیل کا زوال تو نے بھی ایک زمانہ گزر گیا۔ یہ بات کیسے صحیح ہو سکتی ہے کیوں کہ دریدا کی اہمیت تو ردتشکیل ہی کی وجہ سے ہے۔ ابھی ابھی روٹلیج سے دریدا کی ایک معرکے کی کتاب آئی ہے۔
ACTS OF LITERATURE 1992 جسے ڈیرک ایٹرج نے مرتب کیا ہے
اور جس میں دریدا کی اُن تحریروں کو جمع کر دیا گیا ہے جو ادبی متن اور ادبی مسائل کے بارے میں ہیں۔ اس میں "وہ حیرت ناک ادارہ جسے ادب کہتے ہیں" کے عنوان سے دریدا کا ایک نیا انٹرویو بھی شامل ہے۔ ردتشکیل کو "مردہ" قرار دینے والوں کو اس تازہ ترین کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ دراصل ادب میں آج تک کوئی ایسی تحریک پیدا نہیں ہوئی جس کی مخالفت نہ کی گئی ہو۔ جتنی کوئی تحریک باغیانہ ہوتی ہے اتنی شدت سے اس کی مخالفت بھی کی جاتی ہے۔ پس ساختیات اور ردتشکیل اس سے مستثنیٰ نہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مضمون سے ان کا اضطراب ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن جذباتی باتوں سے کچھ نہ ہوگا۔ علمی طور پر اسے رد کریں۔
جمیل جالبی نے ساختیات، پس ساختیات اور ردتعمیر (ردتشکیل) کا ذکر اس طرح کیا ہے جیسے یہ تینوں الگ الگ نظریے ہوں اور ان میں کوئی رشتہ نہ ہو۔ اگر وہ ساختیاتی فکر کی مبادیات کو جانتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ پس ساختیات ارتقائی اور انحرافی شکل ہے ساختیات کی اور ردتشکیل حصہ ہے پس ساختیات کا اگرچہ اب ردتشکیل ایک دبستان کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ساختیات اور پس ساختیات دونوں کا بنیادی ماڈل ساسیئر ہی ہے سوائے اس نکتے کے کہ معنی کی وحدت کی جگہ التوائیت کے تصور نے لے لی ہے یعنی معنی تفریقی رشتوں سے قائم ہوتا ہے اس لیے قائم بالذات نہیں یا کسی ایک مرکز کا تابع نہیں۔ اس کی رو سے توجہ متن کی کثیرالمعنویت اور تخلیقیت پر ہے فلسفے میں فیشن کو نہیں بلکہ اس کی منطقی قوت کو اور دلیل کی صلاحیت کو دیکھا جاتا ہے ادبی تھیوری کے نئے امکانات عالمی انسانی میراث کا حصہ ہیں۔ افہام و تفہیم کے بغیر رد و قبول ناپسندیدہ جذباتی عمل ہے۔ رہا عروج و زوال تو اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس سال کیمبرج میں دریدا کی اہمیت کے اعتراف میں اس کو ڈاکٹریٹ پیش کرنے کے مسئلے پر باقاعدہ مباحثہ ہوا، نوبت فیکلٹی ووٹنگ تک پہنچی اور قدامت پسندی کے گڑھ یعنی برطانیہ میں جیت بالآخر دریدا کی ہوئی۔

(۳) "ڈی کنسٹرکشن دراصل متن کو محفوظ کرنے کی تحریک ہے۔ اس کا بانی دریدا یہودی ہے۔"

ڈی کنسٹرکشن (ردتشکیل) کو یہودیت سے جوڑنا انتہائی ناسمجھی کی بات ہے۔

اول تو یہ واضح رہنا چاہیے کہ ردتشکیل کا کوئی تعلق متن کو محفوظ کرنے سے نہیں الٹے ردتشکیل پر الزام ہے کہ وہ متن کو پارہ پارہ کرتی ہے۔

یہودیت کی بات کرکے بظاہر جمیل جالبی دُور کی کوڑی لائے ہیں۔ لیکن ان کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ اسی سانس میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "اصل اور بنیادی بات یہ ہے کہ وہ (یہودی) علم کی دنیا میں بھی سب سے آگے ہیں۔ انھوں نے اس وقت ساری دنیا میں علم کی سلطنت قائم کرلی ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی پر نظر ڈالیں تو بے شمار عظیم ہستیاں یہودی ہیں اور ان میں کارل مارکس، برگساں، فرائڈ، مارسل پروست، آئن سٹائن جیسے لوگ بھی شامل ہیں۔ نوبل انعام یافتہ سال بیلو بھی ہے اور سپنوزا جیسا فلسفی بھی۔ اس وقت ادب و دانش کی سطح پر وہ چھائے ہوئے ہیں"، اور اسی پہ افسوس بھی کرتے ہیں کہ "یہودی نے علم کی سلطنت قائم کرلی ہے اور ہم ..... " یہ سوال تو انھیں دوسروں سے نہیں خود سے کرنا چاہیے کہ علم کی سلطنت تو غور و فکر کرنے اور علم کی راہوں کو کھلا رکھنے سے قائم ہوتی ہے یا ذہنوں پر پہرہ بٹھانے اور حصار کھینچ کر بیٹھ رہنے سے۔ علم کے بارے میں تو حکم آیا ہے کہ علم کی جستجو میں اگر چین جانا پڑے تو بھی جاؤ۔

اس بارے میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے اور ظاہر ہے کہ جمیل جالبی اس سے بے خبر ہیں کہ ساختیات یا ردتشکیل سرے سے ماورائی فلسفہ ہے ہی نہیں یعنی اس کا کوئی تعلق کسی طرح کی مابعد الطبیعیاتی فکر سے نہیں ہے۔ ساسیئری فکر کا اصل الاصول ہی یہ ہے کہ لسان سے پہلے یا لسان سے باہر کسی جوہر مطلق کا وجود ثابت نہیں۔ یعنی مذہبی فکر یہاں سرے سے موضوع ہی نہیں۔ یہ عقلیت پر مبنی فلسفہ ہے۔ عقلیت پر مبنی فلسفیانہ روایت الگ چیز ہے اور مذہبی فکر الگ چیز ہے۔ ساختیاتی فکر کی بنیاد کسی طرح کے اعیان اور امثال پر نہیں۔ جمیل جالبی شدید غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ایک غیر مابعد الطبیعیاتی فلسفے کو کسی مذہبی روایت کے ساتھ جوڑنا افسوس ناک تو ہے ہی غیر ذمہ دارانہ بھی ہے مجھے یقین نہیں آتا کہ جمیل جالبی اتنی بات بھی نہیں جانتے، اور اگر جانتے ہیں اور اس کے باوجود انھوں نے کہا ہے تو پھر سوائے اس کے کیا چارہ ہے کہ ان کے لیے دعائے خیر کی جائے۔

ایک بات یہ کہ جمیل جالبی اقبال کے اس نوع کے اشعار کو تو خاطر میں نہ لاتے ہوں گے

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

لیکن علامہ نے مارکس کے بارے میں جو کہا ہے یا برگساں سے یورپ میں جو ملاقات کی تھی، اس کو وہ کس کھاتے میں رکھیں گے؟ اگر برگساں سے مکالمہ برحق ہے اور اگر مارکس اور فرائڈ کو پڑھنا اور سمجھنا برحق ہے اور اگر آئن سٹائن کی ذہنی دریافتوں پر مبنی آج کی سائنس کے فیوض و برکات (جن میں انسان کا چاند پہ پہنچنا یعنی بقول اقبال ٹوٹے ہوئے تارے کا مہ کامل بننا بھی شامل ہے) یعنی ان سب سے استفادہ برحق ہے تو دریدا

مکالمہ کیوں مناسب نہیں ۔ یہ فیصلہ جمیل جالبی خود کرلیں کہ علامہ اقبال صحیح ہیں یا وہ صحیح
! کیا ہماری مشرقیت اتنی کمزور ہو چکی ہے ۔یا ہمارا بھروسا اپنی ذات پر اس حد تک ختم ہو چکا
کہ اس کے بچاؤ کا انحصار کسی ایک مصنف کے پڑھنے یا نہ پڑھنے پر رہ گیا ہے! نا طقہ
بگر بیاں کہ اُسے کیا کہیے ۔

ویسے کلکتہ کے اقبال کرشن نے سوغات میں جو جملہ لکھا ہے اس سے بہتر جملہ
ں ہو سکتا ۔

"تعجب ہے کہ اردو والوں کو ایلیٹ کے افکار و آرا سے روشناس
کرانے والا اتنا پڑھا لکھا آدمی ایسا تنگ نظر کہ ہیں ساختیات کے پیچھے
صیہونیت کا ہوّا دیکھے ۔لاحول ولا قوۃ ۔"

گڑھ کے شافع قدوائی نے کہا ۔

"جو شخص غیر ماورائی فلسفے کو مذہبی فکر سے بھڑا دے یقیناً وہ یاس
کا عالم ہو گا "

یہ گفتگو ذرا ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو گئی حالاں کہ ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا
اصل جمیل جالبی بھاری بھرکم کتابوں کے مصنف ہیں اور ان کی گفتگو بھی بھاری بھرکم
تی ہے ۔ بہتر ہے کہ تھوڑی دیر کو پرندوں کی ہلکی پھلکی باتیں سن لی جائیں :

"الو نے چکوے کی آدم شناسی کو سراہا اور افسوس کے ساتھ کہا
کم بخت کے پاس ذہن ہے مگر عقل نہیں ہے "

" آدمی کو عقل کب آئے گی "، پودنے نے سوال کیا ۔

"پودنے نے مشکل سوال کیا ہے " الو بولا "اس کا جواب میرے
پاس نہیں ہے "

" تو پھر کس کے پاس ہے "

پودنے نے ساتھی پرندوں سے کہا کہ " ساتھیو کاگا منی کے پاس چلو کہ ہم
اس سے اپنے سوال کا جواب لیں "

. . . .

نیل کنٹھ نے کہا " متھو، اپنی عقل اپنے ساتھ، کوئی کسی کو عقل نہیں
سکھا سکتا ۔ جو مورکھ ہے وہ مورکھ ہی رہے گا ۔ آدمی مورکھ ہے "

یہ کورا جواب سُن کر وہ پرندے وہاں سے اُداس لوٹے ۔
جنگل میں آکر اپنی اپنی شاخ پر بیٹھ گئے .... طوطے مینا پہ جیسے
اوس پڑ گئی ہو ۔ نہ طوطے نے چونچ کھولی نہ مینا کچھ بولی ۔ چکوی سے نہ
رہا گیا ۔ چکوے سے بولی " میرے سرتاج ! طوطے اور مینا کو کیا ہو گیا
ہے ۔ کہاں رات رات بھر ہمارے کان کھاتے تھے ، آدم زاد کا قصہ

سناتے تھے، جیسے دنیا میں آدم زاد کے سوا کوئی مخلوق بستی ہی نہیں۔
اور کہاں اب ایسی چُپ سادھی ہے جیسے مُنہ میں زبان ہی نہ ہو،،
چکوا مسکرایا بولا،، جانم اب انھیں عقل آگئی ہے،،
(انتظار حسین: طوطا مینا کی کہانی)

(۴) آخری شق:
جمیل جالبی صاحب نے ساختیات کے بارے میں جو فرد جرم عاید کی ہے یوں تو اس میں بہت بستار ہے۔ ذیل کی تین باتیں بھی خاص طور پر دلچسپ ہیں:
(الف) ساختیاتی فکر کے عام ہونے سے،، ادبی تنقید میں آزادیٔ ذہن کی بہت کم گنجایش رہ گئی ہے۔،،
(ب) ،، ادبی تنقید سے احساسِ شخصیت اور احساسِ روح کے عناصر خارج ہو گئے ہیں۔،،
(ج) ،، یہ بات کہ ہر زیر مطالعہ چیز دوسری سے مختلف ہوتی ہے، اب بے معنی ہو گئی ہے۔،،

سبحان اللہ! یہ تینوں باتیں نہ صرف غلط بالکل غلط در غلط ہیں۔ غور فرمایئے جو فلسفہ ہر طرح کے جبر کے خلاف ہے، حتیٰ کہ معنیٰ کے جبر کے بھی خلاف ہے اور کثیر المعنویت با لامرکزیت کا فلسفہ ہے یا معنی کی طرفین کھلی رکھنے کا فلسفہ ہے، اس کو آزادیٔ ذہن کے خلاف کہا جا رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ احساسِ روح ایک غیر ماورائی فلسفے سے تو خارج از بحث ہے ہی۔ لیکن احساسِ شخصیت کے زوال کا ماتم کرنے سے پہلے ایلیٹ کے اس مضمون کو تو یاد کر لیتے جس کا ترجمہ خود جالبی صاحب نے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ اس کا پورا کریڈٹ نوا نیو کریٹی سزم، کو جاتا ہے جس پر خود آپ کی تنقید کا مدار ہے۔ تیسرے یہ جو فلسفہ ،لانگ، اور ،پارول، کے فرق پر قائم ہے اسا بیئر یا نظریۂ اہلیت اور کارکردگی کے فرق پر قائم ہے (چامسکی) اور جو معنی کو وحدانی نہیں جانتا وہ ہر متن کو مختلف کیوں کر نہ جانے گا۔ ساختیات کی رو سے نہ صرف ہر متن بلکہ متن کی ہر قرأت مختلف ہے، ایک قاری سے دوسرے قاری تک، ایک نسل سے دوسری نسل تک اور ایک عہد سے دوسرے عہد تک۔ جب متن ایک مرکز پر قائم نہیں تو ہر زیر مطالعہ چیز کی یکسانیت کیوں کر ممکن ہو سکتی ہے۔ ایسی دلچسپ باتیں ہمارے دو ہی کر سکتے ہیں۔

جمیل جالبی نے چلتے چلاتے ایک کہنی اسلوبیات کے بھی ماری ہے۔ یہ نیک کام تو ان کو بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔ خاکسار کی کتاب ،، ادبی تنقید اور اسلوبیات ،، منظر عا

اچکی ہے، شاید وہ بھول گئے کہ اس میں شامل بہت سے مضامین کی داد وہ پہلے دے
چکے تھے۔ بہرحال اب اگر وہ کچھ مدلل ارشاد فرمائیں تو بندہ خدمت کے لیے حاضر
ہے۔

آخری بات یہ کہ جمیل جالبی نے حسن عسکری مرحوم کی چھڑی سے بھی ساختیات
پیٹنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن جو حال ان کا ارسطو سے ایلیٹ کے مطالعے کا ہے
وہی حال ان کا عسکری کے مطالعے کا بھی ہے۔ ورنہ جو عسکری کو جانتا ہے وہ اس بات
سے کیسے نہیں جانتا کہ عسکری ان اوّلین ادیبوں میں ہیں جنھوں نے ساختیات کے دو
بنیادگزاروں یعنی میشل فوکو اور کلود لیوی اسٹراس کا ذکر انتہائی تعریفی انداز میں کیا ہے
یقین نہ آئے تو ان کا آخری زمانے کا مضمون "وقت کی راگنی" ملاحظہ فرمائیں جس میں
ثقافتی معاملوں میں تحریری شہادت پر زبانی روایت (لوک روایت) کی فوقیت جتاتے ہوئے
عسکری میشل فوکو سے تائید لائے ہیں اور فوکو کو فلسفے اور انسانی علوم کے میدان "کا کلچر
ہیرو" کہا ہے:

"فلسفے اور انسانی علوم کے میدان میں فی الحال "کلچر ہیرو" میشل فوکو
ہیں۔۔۔ ان کی فکر کا دار و مدار واقعی تحریری شہادتوں پر ہے، لیکن
ان کی تحقیق کا مرکز وہی سترھویں اور اٹھارہویں صدی کا مغربی معاشرہ
ہے۔۔۔ پھر یہ تحریری شہادتیں وہ ان کتابوں سے ڈھونڈھ کے لاتے
ہیں جنھیں "انسان پرستی" کی تحریک نے اور سائنس پرستی نے انیسویں
صدی تک آتے آتے مہمل سمجھ کر کیڑوں کے حوالے کر دیا تھا۔ چنانچہ فوکو
تحریری شہادتوں کے ذریعے اس ذہنیت کی پول کھولتے ہیں جس نے
تحریری شہادتوں کو آخری حقیقت سمجھنا سکھایا۔ ان کے کام کی بنیادی
اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے تحریری شہادتوں کے بل پر ہی انیسویں صدی
کے تصورِ تاریخ اور تصورِ تحقیق کی جڑ ہی کاٹ دی۔"

(وقت کی راگنی ص ۱۵۲-۱۵۴)

اس مضمون میں عسکری مرحوم نے میشل فوکو کا ذکر بار بار کیا ہے اور لگتا ہے
کہ فوکو کی تازہ ترین کتابیں جن میں اس نے مغرب کے تصورِ تاریخ کو ساختیاتی بنیادوں
پر چیلنج کیا تھا، عسکری مرحوم کے زیر مطالعہ تھیں۔ اس کے ساتھ ہی عسکری نے
کلود لیوی اسٹراس کا ذکر بھی کیا ہے جس نے متھ پر کام کر کے ساختیاتی مطالعات کی
راہ کھول دی تھی۔ عسکری لکھتے ہیں:

"انگریزی بولنے والے ملکوں میں انسانی علوم کے جس ماہر کا نام آج
کل زیادہ چل رہا ہے وہ ہے کلود لیوی اسٹراؤس۔ اس کی فکر کا
مرکز ہے وہ معاشرہ جسے انیسویں صدی کے مغربی مفکروں نے "وحشی"

کے نام سے موسوم کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے معاشروں کے سلسلے میں تو تحریری شہادتیں مل ہی نہیں سکتیں۔ لہٰذا اس نے عام مغربی مفکروں کے برخلاف یہ اصول قائم کیا ہے کہ مغربی محققوں کے مقابلے میں "وحشی" معاشرے کے نمائندوں کی رائے کو ترجیح دی جائے گی، اور جب تک کوئی قوی دلیل اس کی کاٹ پر موجود نہ ہو زبانی روایت تسلیم کی جائے گی۔"

(وقت کی راگنی ص ۱۵۴)

عسکری کا انتقال جنوری ۱۹۷۸ء میں ہوا۔ یہ مضمون ۱۹۷۷ء کا ہے یعنی انتقال سے چند ماہ پہلے کا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ساختیات پس ساختیات کے دور میں داخل ہو چکی تھی اور میشل فوکو ایک اہم پس ساختیاتی مفکر کے طور پر سامنے آ چکا تھا۔ فوکو اگرچہ ۱۹۸۴ء میں رحلت کر گیا، لیکن اس سارے زمانے میں ثقافتی، تاریخی، بشریاتی، عمرانیاتی اور ادبی مطالعات میں لیوی اسٹراس اور میشل فوکو کی اہمیت بڑھتی رہی ہے گھٹی نہیں ہے صاحبو! سوچنے کی بات ہے کہ اگر آج محمد حسن عسکری زندہ ہوتے تو کیا ساختیاتی ڈسکورس اردو میں ان کے ذریعے قائم نہ ہوا ہوتا؟

سوچا تھا کہ احمد ہمدانی کے بارے میں بھی کچھ لکھا جائے گا جن کا مضمون "ساختیات کے بارے میں"، تمثال میں آیا ہے لیکن ادھر فہیم اعظمی نے اس کا مفصل اور مدلل جواب "صریر" میں دیا ہے۔ احمد ہمدانی نہایت مخلص اور وضع دار انسان ہیں۔ اگرچہ انھوں نے دائیں بائیں ہاتھ صاف کیا ہے لیکن ان کا بنیادی محرک ان کا ذہنی تجسس ہے اور جاننے کی لگن ہے۔ جمیل جالبی کی طرح وہ موٹی موٹی کتابوں کے مصنف نہیں۔ اس لیے ان پر وہ ذمہ داری تو بہرحال عاید نہیں ہوتی جو علما پر عاید ہوتی ہے۔ انھوں نے دو ایک بنیادی سوال بھی اٹھائے ہیں۔ ایسے سوال محمد علی صدیقی کے سامنے بھی ہوں گے، جن کی لبرل فکر کی وجہ سے میں ان کی بہت قدر کرتا ہوں۔ ادھر آل احمد سرور نے بھی ہیومنزازم کا مسئلہ چھیڑا ہے۔ موقع ہوا تو ہیومنزازم کے مسئلے پر اگلی قسط میں گفتگو ہوگی اتنا تو معلوم ہے ہی کہ یہ دنیا چوتھے کھونٹ میں داخل ہو چکی ہے اور خرابی سے دوچار ہے لیکن اتنی خرابی سے بھی نہیں جتنی خرابی سے دانش جیل والے دوچار ہیں جن کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ جو وہ جانتے ہیں کہ جانتے ہیں، اصلاً وہ نہیں جانتے کہ اسے وہ نہیں جانتے۔

وفیسر عنوان چشتی
۔ ۔ ۱۱۷، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

غزل

سچائی ہے انداز بیاں نئیں
دہاں کوئی نہیں ہے میں جہاں نئیں

ملی ہے دھوپ سر پر سایباں نئیں
کہیں دنیا میں اب جائے اماں نئیں

رندوں کی طرح ہجرت نہ کرنا
زمیں نئیں اس طرف یا آسماں نئیں

، دشت غم پہنچے اور یہ پیاس
میاں دریا پہ کیا کوئی جواں نئیں

خود اپنے دل میں رہتا ہے ازل سے
وہ آوارہ سہی، بے خانماں نئیں

اسی کارن سے زندہ ہوں ابھی تک
سپاہی میرے گھر کے پاسباں نئیں

سروں کے پھول نیزوں پر کھلے ہیں
یہ مقتل ہے، زمینِ گلستاں نئیں

ملی دِلّی کے بازاروں میں ہر تئے
مگر عنوان، اِک اردو زباں نئیں

ڈاکٹر مظفر حنفی
پروفیسر اقبال چیئر
کلکتہ یونی ورسٹی

نیزہ بردار و کماں دار مرے گھر میں نہیں
وہ دلاور ہوں کہ تلوار مرے گھر میں نہیں

کوئی سیلاب ادھر رخ نہ کرے گا اب کے
اب سلامت کوئی دیوار مرے گھر میں نہیں

جن کو سورج پہ بھروسا ہے بجھاتے ہیں چراغ
کوئی اس کے لیے تیار مرے گھر میں نہیں

میں نہ یوسف نہ زلیخا، یہ تماشا کیا ہے
دوستو مصر کا بازار مرے گھر میں نہیں

لائقِ دید مری بے سر و سامانی ہے
کوئی گنبد کوئی مینار مرے گھر میں نہیں

گٹھلیاں میرے پڑوسی نے اچھالی ہوں گی
ایک بھی شاخِ ثمر بار مرے گھر میں نہیں

یہ الگ بات مظفرؔ ہی نہ مانے خود کو
ورنہ غالبؔ کے طرفدار مرے گھر میں نہیں

اکبر حیدرآبادی

آکسفورڈ

مے جو کسی کی شوخ آنکھوں سے چھلکی تھی
نشہ تھا گہرا رنگت لیکن ہلکی تھی

اس چہرے پر زلفوں کا لہرا جانا
آنکھ مچولی سورج سے بادل کی تھی

اس کے لبوں کو چھو کر بول جو نکلے تھے
چاشنی ساری ان میں امرت جل کی تھی

دیکھ رہے تھے لوگ لہو کی گلکاری
میری نظر میں ویرانی مقتل کی تھی!

سب کہتے تھے اکبر جس کو عمر دراز
وہ مہلت بھی جیسے پل دو پل کی تھی

یٰسین علی خاں

لندن

غزل

جانے اب زخم کہاں تک پہنچا
ایک نشترِ رگِ جہاں تک پہنچا

لبِ خاموش کی جرأت دیکھو
حالِ دل نوکِ زباں تک پہنچا

شجرِ دار سے ٹپکے ہے لہو
خونِ عشاق کہاں تک پہنچا

حاصلِ ہوش نہیں تھا کچھ بھی
خواب دیکھا تو وہاں تک پہنچا

مر کے پروانے جہاں تک پہنچے
جیتے جی کون وہاں تک پہنچا

سنتے ہیں آج پھر اک سنگ بدست
کوچۂ شیشہ گراں تک پہنچا

دلِ مشتاق توجہ ہشیار
تیرِ قاتل کی کماں تک پہنچا

زندگانیٔ پریشاں کا حساب
کاتبِ سود و زیاں تک پہنچا

دشتِ مشاطہ خدا خیر کرے
شکنِ زلفِ بتاں تک پہنچا

شیخ کو مطلب و معنی سے غرض
وہ فقط شرح و بیاں تک پہنچا

دو دلستو لوٹ کے آئے گی بہار
شعلہ اب زلفِ خزاں تک پہنچا

نورِ ایماں نے جلائے ہیں چراغ
میں اندھیروں میں جہاں تک پہنچا

آخری طوفِ حرم میں یٰسین
میں درِ پیرِ مغاں تک پہنچا

ڈاکٹر کرامت علی کرامت
رحمت علی بلڈنگ دیوان بازار، کٹک
اڑیسہ

بے گھری

یہ کیسی بے گھری ہے
ہوں اپنے گھر میں بے گھر/عجب مشکوک نظروں سے
یہاں کے بام و در تکتے ہیں مجھ کو
کہ یہ اک اجنبی کیوں آگیا ہے گھر کے اندر
یہ آنگن ہے وہی آنگن/جہاں معصوم بچپن ہنستے کھیلتے گزرا
یہاں تخلیق کا پودا/اگایا تھا بڑی محنت سے میں نے
وہ پودا بن گیا ہے اک تناور پیڑ لیکن
نہ آنگن خیر مقدم کے لیے بڑھتا ہے آگے
نہ وہ پیڑ اب مجھے پہچانتا ہے
یہاں کی میز کرسی الگنی حیرت زدہ/نظروں سے مجھ کو دیکھتی ہیں
کہ جیسے اس سے میرا کوئی رشتہ ہی نہیں تھا/یہی چیزیں ہیں جن سے
کتنی یادیں ابھی وابستہ رہی ہیں
وہی گلدان ہیں لیکن نہیں ہیں وہ بوڑھا مالی
جو انھیں ہر صبح پھولوں اور پتوں سے سجاتا تھا
مکاں موجود ہے لیکن مکیں بدلے ہوئے ہیں
مرا خوں ان مکینوں کی رگوں میں دوڑتا ہے
مگر یہ لوگ مجھ کو کہہ رہے ہیں بھوت ہوں میں
کہ ان لوگوں نے بوسیدہ کتابوں میں پڑھا ہے تذکرہ میرا
پھٹکتے ہی نہیں یہ لوگ میرے پاس ڈر سے
چھری سے کر کے زخمی جسم کو اپنے
بہا کے میں لہو اپنا یہ ثابت کر رہا ہوں/کہ میں اب تک ابھی ہوں زندہ
مگر یہ لوگ میری سچی باتوں کا یقیں کرتے نہیں ہیں
عجب تنہائی کا عالم ہے اس گھر میں/یہ کیسی بے گھری ہے
ہوں اپنے گھر میں بے گھر

پروفیسر رشید الظفر
شیخ الجامعہ جامعہ ہمدرد
ہمدرد نگر نئی دہلی ۶۲

چاند تنہا ہے کہکشاں تنہا
ہجر کی رات آسماں تنہا
بھاگتی ریل شور سناٹا
رہ گئی بے صدا زباں تنہا
رنگ اور نور سے رہے محروم
ہم فقیروں کے آستاں تنہا
کیسی نفرت کی آگ پھیلی ہے
جل رہا ہے مرا مکاں تنہا
آندھیاں، بجلیاں، شجر کمزور
بچ نہ پائے گا آشیاں تنہا
تھک کے سب سو گئے ہیں محفل میں
خود ہی سنتا ہوں داستاں تنہا
کوئی جادہ نہ راہبر کوئی
کس طرف جائے کارواں تنہا
پاس گر تو نہیں تو کیا غم ہے
ساتھ اپنے ہے اک جہاں تنہا

کرامت بخاری
۲۷۰، اے فیصل ٹاؤن
جی، او، آر ۷ لاہور

ڈاکٹر اقبال احمد خاں عارف
۶۰/ اے سیکٹر - فردوس نگر
جمال پورہ بھوپال

سمندر ہوں یہ سب سیلاب میرے
مرے چاروں طرف گرداب میرے

خرابوں میں شکستہ مقبرے ہیں
کہ بکھرے ہیں خیال و خواب میرے

کبھی تو کھِل سرِ شاخِ تمنّا
کبھی تو مل مجھے مہتاب میرے

میں تنہا ہوں سمندر کے سفر میں
کنارے تک رہے احباب میرے

مری بے خواب آنکھیں ڈھونڈتی ہیں
کہاں ہیں وہ چمن شاداب میرے

تری نظروں میں بے قیمت ہی ٹھہرے
مرے آنسو دُرِ نایاب میرے

ہے کسی کو نشۂ زر ہے کوئی شباب میں بے خبر
سبھی بیخودی میں ہیں مبتلا یہاں آگہی کی نہ بات کر

یہاں بے حسی ہے ضمیر میں یہاں خود سری ہے خمیر میں
کہ یہ سرکشوں کا سماج ہے یہاں عاجزی کی نہ بات کر

سبھی ظالموں کے ہیں ہمنوا ترا حق نہ کوئی دلائے گا
یہاں عدل بھی ہے بکا ہوا یہاں منصفی کی نہ بات کر

یہاں کوئی ہمسرِ عاد ہے کوئی جانشینِ ثمود ہے
یہاں ذرہ ذرہ ہے کبریا یہاں بندگی کی نہ بات کر

ہے زباں پہ نغمۂ دوستی پہ دلوں میں بغض و عناد ہے
یہ منافقوں کا جہان ہے یہاں دوستی کی نہ بات کر

ملا جو کوئی بھی جہان میں مجھے عارف اس نے ہی غم دیے
مرے دل میں کوئی جگہ نہیں یہاں اب کسی کی نہ بات کر

شاہد کلیم
دودھ کٹورا
آرا۔ ۸۰۲۳۰۱

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشا
۱۱۔ اسٹار کی ٹاؤن ناگپور

سمجھتا ہے کہاں کوئی وفاداری کا مطلب
تو پھر اپنے لہو سے ایسی گلکاری کا مطلب
سُلگ اٹھے گھنیرے جنگلوں کے پیڑ سارے
سمجھ میں آگیا ہے ایک چنگاری کا مطلب
چمکتے آئینوں میں اپنے اپنے روپ دیکھو
خوشی مل جائے تو کیا ہے گنہگاری کا مطلب
نئے سب لوگ ہیں اور شہر بھی اپنا نیا ہے
نئے انداز سے کہیے ریاکاری کا مطلب
کلیمؔ اس کو ہوا ہے بس خسارہ ہی خسارہ
نہیں کچھ بھی نہیں میری طرفداری کا مطلب

ان سوالوں کی بات کیا کہیے
جن کے تیور ہوں خود جواب نما
قدر آپ اپنی جاننے والے
ذرّے ہوتے ہیں آفتاب نما
دل کی آنکھوں سے ہم اگر دیکھیں
سارا عالم ہے اک کتاب نما
تپتے صحرائے زیست میں ہر سو
ملتا ہے منظر سحاب نما
ہم کو بھاتی ہے وہ نظر جس میں
کچھ لگاوٹ ہو اجتناب نما
جرمِ الفت وہ جرم ہے منشاؔ
جو بہر پہلو ہے ثواب نما

وحید صدیقی
۲۶، سیکٹر ۹، آر۔ کے۔ پورم
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۲

غزل

کوندیں گی بجلیاں، تو مجھے ان میں پاؤ گے
اُبھریں گی شوخیاں، تو مجھے ان میں پاؤ گے

حالات کی کتاب پہ ڈالو گے جب نظر
دیکھو گے سرخیاں، تو مجھے ان میں پاؤ گے

ہونے کو خاک اور بھی ہیں نخل طور ابھی
ہوں گی تجلیاں، تو مجھے ان میں پاؤ گے

ظلمت کا سر کچلنے کو روشن خیال لوگ
پہنیں گے بیڑیاں، تو مجھے ان میں پاؤ گے

غربت کے زخم سلنے کو آنکھوں سے جب وحید
چھلکیں گی شوخیاں، تو مجھے ان میں پاؤ گے

سہیل اختر
۱۷۱۔ ستیہ نگر، بھونیشور

غزل

ہمارے لیے سر بھی کٹوا گئے
اُمیدوں کا پرچم وہ لہرا گئے

چڑھا زیست کا نشہ کل اس قدر
کہ ہم لوگ تو زہر تک کھا گئے

سروں پر سے سورج جو اُترا ابھی
ہم اپنے ہی سایے سے گھبرا گئے

وہ اصلاح کرنے ہماری سہیل
ڈگر چھوڑ اپنی اِدھر آ گئے

قاسم ندیم۔ گونڈی بمبئی

غزل

آؤ کر سہمے ہوئے وقت سے نجات پائیں ہم
کچھ لمحے مقتل میں رک کر ہی حیات پائیں ہم
آنکھیں اب بھی سلگتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں
آگہی کے اندھیروں میں نئی کائنات پائیں ہم
زندگی ہے تو پیچ وخم سے گزرنا ہوگا
اپنی ہی زندگی کو، کیوں بے ثبات پائیں ہم
خود ہی سو گئے صاحب مقدر کو جگاتے ہیں
تباہ حالی میں اپنی، دنیا کا ہات پائیں ہم

ساجد حمید
شیموگا۔ کرناٹک

سرشت

خون میں پھر کہیں خنجر ڈوبا
پھر تمنا کا ہوا
اور عکس کئی ٹوٹ گئے
نرم رو مخملی سوچوں نے کفن اوڑھ لیا
دیکھتے دیکھتے کمھلا گئے پھول
موت کا رنگ فضا میں اُچھلا
سو گئی جاگتی دل کی دھڑکن
زیست کی آنکھوں میں سناٹوں کا لشکر اُترا
زخم دل رسنے لگے
رستے رہے

جی یہ کرتا ہے کہ اب لوٹ ہی جائیں
ان گپھاؤں میں
جہاں کوئی کرن گونج نہ پائے
لوٹنا اب ہے مگر نا ممکن
ہم ــــ!
بہت دور
بہت دور چلے آئے ہیں

سیّد معراج جامیؔ
۲۱۔ قصر جامی، مقابل شہباز اکیڈمی قصر کالونی
منگھو پیر روڈ، پوسٹ کوڈ [illegible] کراچی

سرِ محفل ستائش ہو رہی ہے
پسِ دیوار سازش ہو رہی ہے

بہ ہر لمحہ نگاہِ قہر میں ہوں
کرم کی مجھ پہ بارش ہو رہی ہے

قریبِ منزلِ مقصود آ کر
بھٹک جانے کی خواہش ہو رہی ہے

ہمارے شہر کا اعزاز دیکھو
ضمیروں کی نمائش ہو رہی ہے

جہاں ساماں مہیا تھے سکوں کے
وہ بستی نذرِ آتش ہو رہی ہے

بدلتا جا رہا ہے رنگِ موسم
ترے ابرو میں جنبش ہو رہی ہے

ستم بھی دیکھنے ہوں گے ہمیں کو
ابھی جامیؔ نوازش ہو رہی ہے

احمد وصی
پمپ ہاؤس - ای/۲/۲ پنجر نگر
اندھیری ایسٹ بمبئی -

چالیسواں سال

یہ پل ، مہینے ، یہ سال کیا ہیں
یہ جاتے دن رات کچھ نہیں ہیں
یہ اڑتے لمحات کچھ نہیں ہیں

تم عمر کو گنتیوں میں لا کر
کیوں اس کی توہین کر رہی ہو
کیوں خود کو غمگین کر رہی ہو

خدا کرے اب یہ عمر تم کو
کبھی یہ احساس نہ دلائے
کہیں ٹھہرتے نہیں ہیں سائے

ہر عمر کی کچھ روایتیں ہیں
ہر عمر کی کچھ عنایتیں ہیں

یہ عمر وہ ہے کہ تم کسی کو
نہ یاد رکھو نہ یاد آؤ

اب اس سے اتنا فریب کھاؤ
کہ اپنی ہر بات بھول جاؤ

دلیپ بادلؔ
۴۲۵ - چراغ دہلی
نئی دہلی ۱۷

دیر و کعبہ ہی نہ قصر و بام و در اچھے لگے
خون میں لتھڑے ہوئے ہم کو نگر اچھے لگے

پیاس کی شدت مٹانے کے لیے گھنشیام کو
سوچتا ہوں آج کیوں زید و بکر اچھے لگے

کیا کہیں، کس سے کہیں کیونکر کہیں، یہ ماجرا
موسم گل میں ہمیں تو جلتے گھر اچھے لگے

ہم کبھی بیٹھے پڑھے، لکھے تھے جن کی چھاؤں میں
آج وہ اشجار بے برگ و ثمر اچھے لگے

اک زمانہ تھا ہمیں جب بستیوں سے پیار تھا
اس برس لیکن ہمیں سنسان گھر اچھے لگے

آج بادلؔ کے برسنے کا عجب انداز تھا
شادماں چہرے نہیں بس نوحہ گر اچھے لگے

شاھد فروغی
۲/۱/۷ منشی نور محمد لین ۔ ہوڑہ
مغربی بنگال ۔

دنیا میں اسے کچھ بھی میسّر نہیں ہوتا
آباد کوئی دل کو دکھا کر نہیں ہوتا

تدبیر سے انسان بنا لیتا ہے قسمت
ہاتھوں کی لکیروں میں مقدّر نہیں ہوتا

ہم وقت کے شعلوں میں جلے جاتے ہیں لیکن
اک دل ہے کہ کندن کبھی جل کر نہیں ہوتا

پہلے کی طرح نیند نہیں آتی ہے ہم کو
زر ہوتا ہے تو چین میسّر نہیں ہوتا

احساس کو شعروں میں پرو دینا بھی فن ہے
ہر شخص مگر ایسا ہنر ور نہیں ہوتا

شمیم عثمانی
۹۲/۳۷ ۔ ہیرامن اسٹریٹ کانپور ۱ ۔

غزل برنگ ولی

روداد جیکوئی کوں سنانے گیا
او مجھ کوں اپن حال بتلانے لگیا

ہیں صبح کے آثار او آدے گا نہیں
بلبل بی تو اب شور مچانے لگیا

تجھ لب کا جو تک دھیاں دھرے کی نظر واں
باغاں کے سبی پھول پڑانے لگیا

تمنا سے ملن کرکے ہے آیا جو نی
او محفل غم آپی سجانے لگیا

تج مہر کی اب راہ تکیں کتیک ہور
تک ایک نظر کوں تو زمانے لگیا

کعبہ کہ کلیسا ہو کہ دارو خانہ
ہر جاگے او ہی دھیاں میں آنے لگیا

لوکاں نے تو کہیا ہے جگت کوں بے مہر
کاہے کو تمن انکھ چرانے لگیا

بن دھول بدن ہو پنچا تمن راہ منے
اب مٹی اپس کی بی ٹھکانے لگیا

دیکھن منے حن آئی او چشم نرگس
انکھی میں شکل رات بتانے لگیا

روشن کری انجھوں نے شب غم ایسیچ
سو دیپ ہر اک بوند جلانے لگیا

تمنا کی کتھا طول بہوت ہے گی شمیم
اب چپ کہ ہمن نیند سی آنے لگیا

عبداللہ کمال
پوسٹ بکس ۴۷۲۶۳، اندھیری
ویسٹ بمبئی ۴۰۰۰۵۸۔

عروسِ شہر ویراں

نگہباں سربسجدہ
... شہر ویراں
نگہباں قاتلوں کے آستاں پر سربسجدہ
... عروسِ شہر ویراں
نگہباں مُہر برلب، پا بجولاں ...
مگر کچھ ایسے دیوانے بھی باقی ہیں
جو ٹکراتے ہیں فرعونی خدائی سے
قلم کی آبرو رکھتے ہیں، لیکن
... لہو کی روشنائی سے
جو اپنے خون سے سچ کی نئی تفسیر لکھتے ہیں
بھیانک خواب کی تعبیر لکھتے ہیں!
نگہباں قاتلوں کے آستاں پر
کھڑا ہے سانس روکے، سر جھکائے ...
درندے خون کی بو پر جھپٹتے
گدھوں کی گرسنہ، خونخوار آنکھیں ...
... لہو میں تیرتی لاشوں پہ نگراں
چہکتی گلیاں چُپ سادھے
سڑک ویراں
کہیں زخمی ودریچوں میں سسکتی آنکھیں آویزاں
کہیں قلقاریاں دم توڑتی سی

دھنک رنگ بستیاں بیواؤں کی اُجڑی ہوئی مانگیں
زمیں سے آسماں تک آگ کی لپٹیں
دھواں چہرے ... دھواں آنکھیں ... دھواں چیخیں ...
دھوئیں سے جھانکتا سورج ... دھواں کرنیں
یہاں اب کچھ نہیں، سب کچھ دھواں ہے
میں اپنا گھر کہاں ڈھونڈوں؟
جہاں کل تک مرا گھر تھا،
وہاں اب راکھ اُڑتی ہے
مرا گھر، میرے پیارے ...
مرا سارا اثاثہ جل چکا ہے
محبت جل چکی ہے
بس اک نفرت کی کالی آگ روشن ہے دلوں میں
عروسِ شہر ہے یہ ... بمبئی ہے یہ
جہاں قانون ہے اب جنگلوں کا
جہاں پر راج ہے اب قاتلوں کا
نگہباں قاتلوں کے آستاں پر
کھڑا ہے سانس روکے، سر جھکائے
... گھڑی بھر سانس لینے کی اجازت چاہتا ہے!

صغریٰ عالم
مالا بلڈنگ شاہ گنج گلبرگہ

پیرہن جس کا خزاں میں بھی مہکتا دیکھا
آج اس گل کو بہاروں میں مسلتا دیکھا

کون بستی ہے کہ مقتل کا گماں ہوتا ہے
خون ہی خون جبینوں سے ٹپکتا دیکھا

اپنے ہاتھوں میں لیے مشعلِ شورو حکمت
حاکمِ دیر و حرم کو بھی گزرتا دیکھا

مانسون اب کے بہت خوب تھا پانی پانی
فصل وہ فصل کہ سرو ندی کٹتا دیکھا

طائرِ خیر تھا جس باغ میں خرم صغریٰ
دھرم کے نام پہ اس کو بھی سُلگتا دیکھا

زبیر شفائی
۹۴۰، وہائٹ کالونی جوہی۔ کانپور، یوپی

پرستش کا سودا انا ہو گیا
وہ بندہ تھا لیکن خُدا ہو گیا

خلا باز بھی تھے ہوا باز بھی
دُغا باز دل چاند کا ہو گیا

یہ بالشت بھر روشنی صحن میں
کہ روغن سے خالی دیا ہو گیا

رُکی پھر چلی پھر رُکی پھر چلی
یہ دھڑکن کو سینے میں کیا ہو گیا

وہ کھلتا گیا چاندنی میں زبیرؔ
ہوا جب چلی دوسرا ہو گیا

یوسف ناظم
۱۹۔ الہلال ۱۴۔ باندرہ ریکلیمیشن۔ بمبئی

سہ سمتی شاعر۔ ظفر گورکھپوری

نام کے شاعر اور کام کے شاعر، ہر دو قسم کے شاعر ہمارے درمیان موجود ہیں بلکہ کہنا یوں چاہیے کہ ہم ان کے درمیان موجود ہیں کیوں کہ ہم تو اقلیت میں ہیں۔ اردو زبان کے کئی امتیازی طرّے ہیں (جو کافی پر پیچ وخم ہیں) ان میں سے ایک طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس میں شاعر کبھی اقلیت میں نہیں، ہے۔

کام کے جو شاعر فی الحال ہم میں پائے جاتے ہیں ان میں میرے علم میں سب سے زیادہ مستعد، ممتاز، مفتخر ہمہ تن تیار، کاغذ بدست، قلم بگوش، مشق کے معاملے میں کافی کہنہ مشق اور کہنے کے معاملے میں بالکل تازہ اور نو بہ نو شاعر ظفر گورکھ پوری ہیں۔ زمانۂ دراز سے میں انھیں غالب خستہ کے پیرایے میں دیکھ رہا ہوں لیکن یہ ان کا پیرایہ نہیں، پینترا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے ان کی صحت کبھی تھی ہی نہیں۔ تندرستی نام کی شئے کے قریب سے کیا، شاید یہ دور سے بھی نہیں گزرے۔ ڈرتے ہوں گے کہ تندرستی کی ہوا انھیں بگاڑ نہ دے۔ انھوں نے جہاں تک درستی کا معاملہ ہے تن سے زیادہ ذہن کو درست رکھنے میں دل لگایا اور شاید زور بھی، اور انگریزی زبان کے اس مقولے کو جس میں کہا گیا ہے کہ توانا ذہن کے لیے توانا جسم ضروری ہے غلط کر دکھایا بلکہ اس مقولے کا ستیاناس ماردیا۔ یہ پیدا تو گورکھپور کی کسی تحصیل میں ہوئے لیکن لڑکپن سے شاید کچھ پہلے ہی بمبئی آگئے۔ اور پھر یہی شہر ان کا نہ سہی، ان کی شاعری کا وطن مالوف ٹھہرا۔ بمبئی کی زمین میں یوں بھی کشش ثقل زیادہ ہی ہے۔ کہتے ہیں ان کے یہاں آجانے سے گورکھ پور کا نام جگہ جگہ لیا جانے لگا۔ لوگ فراق گورکھ پوری کے نام سے بھی اس علاقے کو جانتے تھے لیکن وہ یہاں دستیاب تھوڑے ہی تھے۔ اندر کی بات یہ ہے کہ بمبئی میں ظفر گورکھ پوری گھر کے آدمی تھے جن کے بارے میں فراق صاحب نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ یہ لڑکا آگے چل کر بڑا شاعر بنے گا۔ فراق ایسا معلوم ہوتا ہے کبھی کبھی الہامی فقرے بھی کہہ دیا کرتے تھے اور ظفر گورکھ پوری نے

ن کا یہ جملہ بڑے غور سے سُنا تھا۔ "ہم وطنی" بھی کیا چیز ہوتی ہے ظفر گورکھپوری
ا اپنے ہم وطن بزرگ شاعر کے اس فقرے کی عملی داد دی۔

ظفر گورکھپوری کی قسمت میں بچوں کو پڑھانے کا کام تھا۔ کوئی ۲۸ برسوں
سے وہ یہی کرتے چلے آرہے ہیں۔ کتنے ہی لااُبالی پن سے حساب کیا جائے اور
س میں ۲۰ فی صدکی چھوٹ بھی دی جائے تب بھی انھوں نے چھبیس ہزار
طالب علموں کو تو پڑھا کر ہی چھوڑا ہوگا اور جس زمانے میں انھوں نے تدریس
کا کام ہاتھ میں لیا اس زمانے میں مدرسوں میں بید اور چھڑی کا بھی معقول انتظام
تھا۔ بچہ اگر مدرسے سے پٹ کر گھر نہیں آتا تھا تو والدین سمجھتے تھے بچے کی فیس
ضائع ہوگئی۔ انھوں نے بھی یقیناً ہاتھ صاف کیا ہوگا۔ لیکن سنا ہے قلم
ان کے ہاتھ میں ہمیشہ رہا۔ ان کی شعرگوئی کا سلسلہ یوں جاری رہا جیسے یہ
نظامِ شمسی و قمری کا کوئی قصہ ہو۔ آج بھی اُن کی شاعری فرازِ کوہ سے آبشار
کی طرح چلی آرہی ہے اور آبشار بھی کیسا؟ نیاگرا اِن جس کی آواز سننے لوگ
اس کے نزدیک اس سے میلوں دور ہو جاتے ہیں۔ آبشار کی مثال میں نے
اس لیے پیش کی کہ اس میں پہلے گھن گرج بہت تھی اور ان کا کلام سنتے وقت
سامعین ذرا فاصلے پر ہی بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ ہم نے آبِ حیات میں پڑھا
تھا کہ ہمارے اساتذہ شاعروں میں سے کچھ شاعر قرابین لے کر مشاعرے
میں جاتے تھے اور شعر پڑھنے کے درمیان وقتاً فوقتاً قرابین بھی اٹھا لیتے
تھے صرف لبلبی نہیں دبتے تھے کیوں کہ اس سے پہلے سامعین کے لبوں پر
ان کا خوف داد بن کر آجاتا تھا۔ ظفر گورکھپوری قرابین کو ساتھ نہیں رکھتے
تھے لیکن ان کے کلام سنانے کا انداز اور خود ان کا کلام کسی کلاشنکوف سے کم
نہیں ہوتا تھا۔ شدت میں شاید کمی آگئی ہو لیکن شاعر کے کلام میں
جو جوش اور ولولہ ہے، ظفر گورکھپوری اس کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ انھوں
نے "تیشہ" ہاتھ میں سنبھالا۔ "وادیِ سنگ" سے گزرے۔ وہیں کہیں قریب
میں پھول چُنے تو وہ بھی "گوکھرو کے پھول"۔ اپنی اپنی پسند ہے۔ چراغ
جلائے تو "چشمِ تر" کے چراغ جلائے۔ ظفر گورکھپوری ندرت پسند با ہمت شاعر
ہیں۔ آنسوؤں کے روغن سے چراغ جلاتے ہیں۔ معلوم نہیں کس مٹی کے بنے
ہیں۔ شعرگوئی اور شعرخوانی اس غضب کی بھی ہو سکتی ہے ظفر گورکھپوری
ہی کو سُن کر اس کا اندازہ ہوا۔ ان کی بزم آرائی تقریباً رزم آرائی ہے۔ انھیں
اگر آپ نے کسی مشاعرے میں نہیں سنا ہے (حالاں کہ انھیں کس نے نہیں
سنا ہے) تو اب سن لیجیے۔ گو کہ ان میں اب وہ پہلا سا زور و شور نہیں ہے لیکن
یہ کلام سنانے سے پہلے "عمرِ رفتہ" کو آواز دیتے ہیں اور وہ دوڑی دوڑی چلی

آتی ہے۔ مشاعرہ گاہ میں شعر اور داد دونوں ریل کے ڈبّوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں یکے بعد دیگرے نہیں ایک ساتھ جنگل بندی جاری رہتی ہے۔ ان کے کلام کی داد دینے والوں کو بعد میں حلق کی تکلیف میں مبتلا پایا گیا ہے۔ مشاعرہ لوٹنے کی کئی وارداتوں کا میں چشم دید گواہ رہا ہوں۔ ظفر گورکھ پوری اس بے دردی کے ساتھ مشاعرہ لوٹتے ہیں کہ اکثر سامعین کو برہنہ پا واپس ہوتے دیکھا گیا ہے۔ یہ پیشے سے تو استاد تھے ہی ان کی شاعری میں بھی یہ رنگ آگیا۔ ذاتی پیشے سے صفاتی مشغلے کو اتنا زبردست فائدہ پہنچنے کی ایسی مثالیں اردو میں کم ہوں گی ظفر گورکھپوری کے شاعرانہ اعمال، افعال اور اشغال کا سلسلہ پرانا ہے اور تا حال جاری ہے۔
یہ تازہ مال کے بیوپاری ہیں۔ میرے علم میں کم سے کم، ایسا کوئی موقع نہیں آیا کہ ان کے شاعرانہ تسلسل کی ڈور کبھی ٹوٹی ہو۔ وہ شاعری ہیں نہ تو کبھی روپوش ہوئے نہ انڈر گراؤنڈ گئے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ جنگل میں سب سے قیمتی درخت "گرین ٹری" کہلاتا ہے جو تقریباً نایاب ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ظفر گورکھ پوری نے جس کرگھے پہ اپنی شاعری کا تانا بانا تیار کیا وہ اسی چوب سبز کا بنا ہوا کرگھا ہوگا۔ اس تانے بانے میں سوت، پٹ سن، ریشم، اون، فائبر سبھی کچھ موجود ہے اور اس خام مال کو ظفر گورکھ پوری کی ہنر مندی نے پختہ بنا دیا۔
ظفر گورکھ پوری شاعری کو صرف خورد و نوش ہی کی اشیا کا درجہ نہیں دیتے۔ اسے ہوا اور پانی کی نوعیت کی نعمت سمجھتے ہیں۔ یہ ان کی قدرت شناسی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کی ہوا بنی ہوئی ہے۔ مرغ باد نما بھی اس ہوا سے مستفید ہوتے ہیں۔ ایسا سننے میں آیا ہے۔
ظفر گورکھ پوری کوئی سہراب اور رستم ہیں نہیں کہ تلوار اٹھا لیتے لیکن انھوں نے اپنے تن و توش کی مناسبت سے سیف قلم کو اپنی نبرد آزمائی کے لیے استعمال کیا اور پھر اس تلوار کو وابستۂ نیام نہیں کیا۔ سیفِ قلم کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ کوئی نیام ایجاد بھی نہیں ہوئی۔ انھوں نے اسے پھولوں میں بسا کر رکھا۔ غزل میں نازک اور کیفیت کے شعر کہتے وقت وہ اپنی للکار کو کیسے نرم و شیریں بنا دیتے ہیں پتا نہیں۔ وہی شاعر جو کہتا ہے۔

نیزے پہ رکھ کے اور مرا سر بلند کر دنیا کو اک چراغ تو جلتا دکھائی دے

وہی شاعر یہ بھی کہہ سکتا ہے:

شفق کے رنگ میں نہلا گیا مجھے کل شام وہ ایک شخص کہ جس کا لباس سادہ تھا

ان کی شاعری میں تیکھی دھوپ بھی ہے اور خنک سایہ بھی۔ اسی لیے میں نے انھیں قدرت شناس کہا (کیا غلط کہا) کبھی کبھی تو یہ خیال بھی آتا ہے

کہ انھیں محکمۂ موسمیات کے دفتر میں کسی سیر بین سے لگے رہنا چاہیے تھا۔ ان کا یہ شعر دیکھیے:

کسی بہت بڑے طوفاں کا پیش خیمہ ہے   کئی دنوں سے مسلسل ہوا کا چپ رہنا

بلکہ اگر ٹھنڈے دل سے سوچا جائے تو شاید وہ خفیہ پولیس کے محکمے کے لیے بھی کافی موزوں ثابت ہو سکتے تھے۔

ظفر گورکھپوری کے یہاں شاعری کا تسلسل بھی ہے اور ترنم بھی تسلسل اس طرح کہ میں نے سنا ہے کہ وہ گھر میں بات بھی کرتے ہیں تو مصرعوں میں کرتے ہیں۔ سارے فقرے داخلِ در بحر مثلاً "مجھے چائے کی گرم پیالی تو دینا اور پھر تعقید کے سقم پر نظرِ ثانی کر کے کہتے ہیں "مجھے گرم چائے کی پیالی تو دینا۔ بچوں کو ہدایت ہوتی ہے "میری بیاض سے کاغذ نہ پھاڑنا کوئی" (یہ دوسری بحر میں ہے)

ظفر گورکھپوری پختہ کلام کے اس لیے شاعر ہیں کہ وہ آدمی پختہ ارادے کے ہیں۔ دم پخت تیار کرنے کی شاید یہی ترکیب ہے۔

ارادہ ہو اٹل تو معجزہ ایسا بھی ہوتا ہے   دیے کو زندہ رکھتی ہے ہوا ایسا بھی ہوتا ہے

ظفر گورکھپوری کو شاعری کی عادت پڑ گئی ہے۔ حد یہ ہو گئی کہ انھوں نے بچوں کے لیے بھی نظمیں کہہ ڈالی ہیں۔ تازہ کلام کی دکانیں اب ہیں ہی کتنی۔

ظفر گورکھپوری نظموں اور غزلوں کے قلعے فتح کر چکے۔ اب انھوں نے دوہوں کے قلعے کا محاصرہ کیا ہے۔ لیکن شاید دوہوں کا قلعہ نہیں ہوتا۔ خوش رنگ پھولوں کا چمن ہوتا ہے۔ یہ شاعری کی نازک ترین صنف ہے۔ یہ رباعی نہ ہوتے ہوئے بھی رباعی کی طرح شاعر کا امتحان لیتی ہے۔ اس کے بھی سنا ہے مخصوص اوزان ہوتے ہیں اور امتحان میں نمودار ہونے والے امیدوار کو دوہا کہتے وقت اپنے اوسان حاضر رکھنے پڑتے ہیں۔ ظفر گورکھپوری نے عجیب اتفاق ہے، اس امتحان میں بھی اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ اسے شاعری بھی کہتے ہیں اور ظفر مندی بھی۔ آپ بھی دیکھیے کہ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں:

جانے کیا پی لیا ماٹی نے اس بار   دھرتی میں سر بوئے اُگ آئی تلوار

ناچے بن چارہ نہیں کسے نے دی ہے تال   کچھ تو پگ میں باندھ لے گھنگھرو یا بھونچال

لے آتے بازار سے سکھ کے لمحے چند   پیسوں سے ملتا کہیں جو من کا آنند

اور ایک ان کے خاص الخاص رنگ کا دوہا:

بھوکی بھیڑ کے جسم میں بس سیپی بھر خون   چرواہے کو دودھ دے یا تاجر کو اون۔

ظفر گورکھپوری نے شاعری میں بہت کچھ حاصل کیا۔ اور میں سمجھتا ہوں ان کی

ساری تحصیل گورکھ پور کی اس تحصیل کی بدولت ہے جہاں وہ پیدا ہوئے۔اس تحصیل کا نام تھا بانس گانو اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری بانس کے درخت کی طرح اونچی سے اونچی ہوتی گئی۔ لیکن شاعری کو اس طرح ناپا نہیں جاتا۔ اس میں صرف طول و عرض نہیں ہوتا گہرائی بھی ہوتی ہے اور ظفر گورکھ پوری سہ سمتی شاعر ہیں سہ سمتی اس لیے بھی کہ اس شاعر نے کلاسیکیت سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے اور اس کلاسیکیت کو ترقی پسندی کا غسل آفتابی دے کر اسے نیا لباس پہنایا ہے۔اب صرف تھری چیئرس ہی کہنا باقی ہے اس لیے تھری چیئرس۔

امام نقوی
۵۴/ نیا نگر
ایج سوسائٹی۔ میرا روڈ (ایسٹ)
نے

پل دو پل کا قصّہ

دل اور اس سے متعلق تمام رگیں اک دم سے یوں پھولیں جیسے پچکنا ہی بھول گئی ہوں۔ فوراً
اس نے محسوس کیا کہ بس اب سینہ پھٹ پڑے گا۔ اور اس کے بعد جسم و جاں میں ہمیشہ کے
، جدائی ہو جائے گی، عین اسی عالم میں جب اس کی آنکھوں کے سامنے صرف اور صرف ایک رنگ
و رنگ موجود تھا۔ ذہن کے کسی گوشے میں یادداشت نے ایک کروٹ لی۔ مولوی صاحب کا چہرہ
ہ اسکرین پر اپنے تمام تر نقوش کے ساتھ ابھرا۔

"بڑا ہی عجیب عالم ہوتا ہے، جب ملک الموت روح قبض کرتے ہیں۔"

تو، تو کیا، وہ چاپ، وہ دھمک...... نہیں وہ چاپ کہاں تھی؛ دھمک تو ہرگز نہ تھی
یوں لگا تھا، کوئی پنجوں کے بل چلتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ I.C.U. کی ساری کولنگ
ت ساری خنکی کھو بیٹھی تھی۔ اسے محسوس ہوا، پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے ابھر آئے۔
ں ہاتھ نے چھٹی حس کی شہ پر فوراً ہی اطلاعی گھنٹی کا بٹن کھوجا اور پھر..... بس۔ ایک رنگ
۔ جیسے بنانے والے نے تمام رنگ بس ایک ہی رنگ سے بنائے تھے۔ حلق کے دائیں بائیں
م نسیں اکڑ رہی تھیں۔ سیاہ رنگ کچھ اور گہرا ہو چلا تھا۔ اور پھر ایک دم سے کئی نیلے ہیولے اس
ے اپنی طرف بڑھتے دیکھے۔ اگلے ہی سیکنڈ ایک سفید ہیولا اس پر جھکا کچھ کہہ رہا تھا لیکن درد کی
رت کے باعث شاید اس کے باب سماعت بند ہو چکے تھے۔ کسی نیلے ہیولے نے اطلاعی گھنٹی
بٹن اس کی مٹھی سے لکالنے کے بعد کسی طور اس کی زبان کے نیچے ایک گولی رکھ دی، کوئی اور
ہوتا تو اس کے اندر کا وحشی شاید مچل اٹھتا، لیکن اس پل صنفِ نازک کا وجود ہی اسے بے معنی
رہا تھا۔ آن کی آن میں تمام ہیولوں کے چہروں سے نقابیں اٹھتی چلی گئیں۔ اس نے دیکھا
دھا نرسنگ ہوم کی تمام نرسیں، اسے گھیرے کھڑی تھیں، ڈاکٹر B.P. چیک کر رہا تھا
ز پر بیٹر چیک کرنے کے بعد ڈاکٹر نے ایک نرس سے سرنج لے کر آنکھوں تک اٹھانے
کے بعد سوئی کی نوک سے تھوڑی سی دوا خارج کی، پھر مریض کے بائیں ہاتھ کی نس میں
رست I.V. کے ذریعے پورا سیال جسم میں داخل کر دیا۔ لیکن مریض کے ہاتھ کی اذیت پر پسینے
تکلیف اب بھی غالب تھی۔ اس کا اپنا دل تو بس اس بات کا خواہش مند تھا کہ جو نرسیں

اسے گھیرے کھڑی تھیں ان میں سے کوئی یا پھر خود ڈاکٹر ہی برمے سے اس کا سینہ چھید دے تاکہ سارا درد اس اگلوتے روزن کی راہ ابل جائے، پر کیا یہ تکلیف نئی تھی ؟

نہیں۔ ہرگز نہیں اکرب کی اس منزل سے تو وہ اپنے گھر میں بھی گزر چکا تھا۔ شاید وہ لمحہ دن کے تیسرے پہر سے متعلق تھا، اس کا دوست شمو اپنے ہفتہ بھر کے کاروباری دورہ پر روانہ ہونے سے پہلے اس سے ملاقات کرنے آیا تھا۔ شمو نے اس کے چہرے پر تشنج کے آثار دیکھے تو اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس نے اپنے بیمار دوست کو گلے سے لگایا تو بیوی بچوں کے سامنے اذیت کو برداشت کرنے والے اس کے مریض دوست کے سارے ضبط کے بندھن ایک ساتھ ٹوٹ گئے۔ بلند آواز سے وہ رویا تو شمو بھی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ بیمار دوست کو تکیوں کے سہارے زمین پر چت لٹانے کے بعد وہ میرا نرسنگ ہوم دوڑ گیا۔ درد کو برداشت کرتے ہوئے مریض نے سوچا۔ ابھی گھنٹہ بھر پہلے ہی تو کاڑیوگرام نکلوایا تھا۔ سب کچھ تو ٹھیک تھا۔ تو پھر یہ درد ؟ اس نے تو ہمیشہ ہی بیماریوں کو چٹکیوں میں اڑایا تھا۔ پہلے بھی کوئی دو ماہ قبل جب سینے میں گھٹن اور بائیں ہاتھ کی مثل کی پشت میں درد کا طوفان اٹھا تھا تو میں نے اسے ڈبوک سوڈے کے توسط سے دبا دیا تھا۔ پر شمو کے سامنے درد نے پھر مچلنے کی ضد کی تو ساری تدبیریں ہی الٹی ہو گئیں۔ وہ اینو جو جھٹ سے آرام دیتا آیا اپنی تاثیر ہی کھو بیٹھا تھا۔ قسطوں میں خریدے ہوئے فریج سے سوڈے کی بوتل نکال کر غٹا غٹ چڑھائی، لیکن بے سود ڈکار آئی نہ ریاح خارج ہوئی۔ ہراساں بچوں کے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ بدحواسی کے عالم میں بڑی بچی کو ڈاکٹر کی ہدایت یاد آئی کہ اس کیفیت میں SORBITRATE کی آدھی گولی زبان کے نیچے رکھنی چاہیے۔ اس نے لپک کر ڈبیا اٹھائی، ڈھکن کھولا اور بوکھلاہٹ میں نصف کے بجائے پوری گولی زبان کے نیچے رکھ دی۔ دوسرے ہی لمحہ رگوں میں دوڑتا پھرتا درد بتدریج معدوم ہوتا گیا۔ لیکن وہ پل کی اس اذیت ناک منزل سے گزرتے مریض کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ چند ثانیے پہلے سینے کو سہلاتے، دلاسے دیتی جیون ساتھی نے پسینے کی تری محسوس کی تو سیلنگ فین کی رفتار بڑھا دی۔ بچے مریض کے ہاتھ پیروں کی مالش کرنے لگے۔ شمو جب ڈاکٹر لایا تو مریض نارمل ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر آیا، بلڈ پریشر چیک کیا، پھر اس کے سوالات تھے اور مریض کے جوابات۔

ہزاروں، لاکھوں روپے DONATION دینے اور برسوں کی محنت شاقہ کے بعد ڈاکٹریٹ کی ڈگری پانے والے بے چارے معالج کے سوالات سن کر اسے ہنسی بھی آ رہی تھی اور غصہ بھی۔

"درد اٹھتا ہے تو کیسا محسوس کرتے ہیں ؟"

"اچھا یہ بتائیے کہ درد شروع ہونے سے پہلے کیا محسوس کرتے ہیں ؟"

"بائیں ہاتھ کی مثل میں درد اٹھتا ہے ؟

"پہلی بار جب آپ نے یہ تکلیف محسوس کی تو کیا کیا تھا؟
"ڈرنک لیتے ہیں؟
"سگرٹ پیتے ہیں؟
"چوبیس گھنٹوں میں کتنی سگرٹ پیتے ہیں؟
"اور چائے دن بھر میں کتنی بار پیتے ہیں؟
"ٹی اسٹرانگ لیتے ہیں یا لائٹ؟

ڈاکٹر صاحب کے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے مجھے بے اختیار حکیم رفیع کوال والے
د آگئے۔ جو صرف مریض کی نبض دیکھنے کے بعد آج بھی بتا دیتے ہیں کہ ان کے مریض نے دو روز
ملے بد پرہیزی کی تھی ۔ ۔ ۔ اور MONITOR کے دوڑتے بھاگتے دھڑکنوں کو قید
رتے مشینی عہد کو گلے لگانے کی دھن میں ہم نے نبض شناسوں کے پیشے کو اگر نہیں تو
قریباً تقریباً فراموش ہی کر دیا ہے۔ زود اثر دواؤں سے اچھے ہونے کی تمنا نے ہم ہندستانیوں
سے ایک مکمل فن چھین لیا ہے۔

"لیٹرین کیسا ہوتا ہے؟
"مٹھی بند۔"

ڈاکٹر صاحب نے اپنی سوالیہ نگاہیں میرے بجائے شموؔ پر مرکوز کر دیں۔ اس نے
انکھیوں سے زیر لب مسکرا کر مجھے دیکھتے ہوئے ڈاکٹر کو انگریزی میں میرا جواب سمجھا دیا۔
ر اس سے پوچھنے لگا۔

"تو پھر آپ دوائیں تجویز کر رہے ہیں؟
میری رائے تو یہ ہے کہ آپ پیشنٹ کو نرسنگ ہوم میں داخل کر دیں۔ وہاں MONITOR
پر ہمیں ہر پل ان کے دل کی دھڑکن کا پتا چلتا رہے گا۔

ڈاکٹر صاحب کا فیصلہ سن لینے کے بعد شموؔ نے ڈاکٹر کا بیگ اٹھا لیا۔ غالباً ڈاکٹر صاحب
ھی سمجھ گئے تھے کہ مریض نرسنگ ہوم میں داخل ہونے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ واپسی
ں شموؔ ان سے نسخہ لکھوا لائے تھے۔ اور جب وہ اپنے گھر لوٹ رہے تھے تب ان کی ملاقات
برے ہم کار محمد فیروز سے ہو گئی۔ شموؔ نے انھیں اپنا پروگرام اور میری حالت بتانے کے
بعد ان سے درخواست کی کھانے سے پہلے وہ میرے گھر ضرور جائیں۔

فیروز اس وقت گھر پہنچے تھے جب درد نے پھر انگڑائی لی تھی۔ SORBITRATE جو
دسرے ہی پل درد کو زائل کر دیا کرتی تھی، اپنا جادو نہیں جگا سکی۔ بچیاں، بیوی اور لڑکے پھر
راساں ہو گئے۔ بڑی دس مہین قریشی نے قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دی۔ متوحش بچیوں
نے بھی قل کے اوراد جاری کیے، لیکن درد تھا کہ بخیل سرمایہ دار کی دولت کی طرح
بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ فیروز نے گھبراہٹ کے عالم میں فوراً اپنے برادر نسبتی سے رابطہ قائم کیا۔
انھوں نے ازراہِ عنایت شردھا اسپتال کے مالک ڈاکٹر اشوین پی سنگھوی سے بات کی

ٹیکسی کا انتظام ہوا اور رات تقریباً دو بجے میں I.C.U کے پلنگ پر لٹا دیا گیا۔ کارڈیوگرام پہ کارڈیوگرام نکلے۔ کبھی ڈاکٹر کے دست راست شیوراج کارڈیوگرام نکالتے اور کبھی خود ڈاکٹر سنگھوی۔ ہر کارڈیوگرام نکالنے کے بعد ڈاکٹر سنگھوی پوچھتے۔
"چاچا! کیا سوچتے رہتے ہو۔ فکر نہیں کرنے کا۔"

سیدھے سادے سوال کا ایک نہیں تین تین جوابات مریض رکھتا ہے، اور چوتھا جواب مرے کو مارے شاہ مدار۔ یعنی تازہ وارافتاد۔ مگر اس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ جواب دینے سے قاصر تھا۔ جمیت اس کے لب سی گئی تھی۔

آہیں، کراہیں، E.C.G. MONITOR اور کڑوی کسیلی گولیوں کے درمیان ہی کچھ جانے پہچانے چہرے دیکھ کر مریض کی حالت سنبھلتی جارہی تھی۔ I.C.U. میں شاید وہ چودھواں دن تھا۔ جب اس نے پھر ایک بار وہ چاپ سن لی تھی۔ چاپ کہاں تھی وہ، بس کوئی پنجوں کے بل I.C.U. میں در آیا تھا، اس نے گردن گھما کر مانیٹر کو دیکھا۔ سب کچھ نارمل تھا، پھر وہ چاپ، وہ دھمک کیسی ؟ مریض کا ذہن ابھی غور و فکر کی منزل پر ہی تھا کہ I.C.U. کا دروازہ کھلا۔ وارڈبوائز اسٹریچر کو دھکیلتے ہوئے اندر لائے۔ آنے والے مریض کو پلنگ پر منتقل کیا گیا۔ ڈاکٹر نے مریض کے بائیں ہاتھ کی پشت پر I.V یونٹ داخل کرنا چاہا۔ سوئی نس میں پیوست ہوئی۔ سرنج کا سیال مریض کی رگ میں منتقل ہوا۔ مریض کی نظریں یک ٹک ڈاکٹر کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ڈاکٹر سنگھوی، شیوراج، اور نرسوں کی تمام تر توجہ مریض پر تھی۔

SORBITRATE ڈاکٹر نے نرس کو مخاطب کیا۔ جتنی دیر میں نرس نے گولی ڈاکٹر کی طرف بڑھائی، اتنی ہی دیر میں نوآمد مریض کا جسم اینٹھا اور پرانے مریض نے دیکھا کہ تنومند مریض اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ساتھ آئے رشتہ داروں نے رونا چاہا تو شیورام نے انھیں اشارہ سے روکا۔ اور پلنگ کے گرد پردے کھینچ دیے۔

پرانا مریض پلکیں موند لیتا ہے۔ مگر چند ہی لموں بعد قدموں کی چاپ پر اس کی پلکوں کے دریچے وا ہو جاتے ہیں۔ شیوراج E.C.G. مشین اسٹول پر رکھ چکا ہے۔ شیوراج کے سپاٹ چہرے کو دیکھ کر مریض حیرت سے دریافت کرتا ہے۔

"کیا بیماری تھی"
"وہی۔ اٹیک جو آپ کو آیا تھا۔"
"پر۔۔۔ پر میں تو پچاس کا ہونے کے باوجود بچ گیا۔"

"مالک کی مہربانی۔ شکر کرو صاحب! یہ سالی بڑی فنٹاسٹک بیماری ہے۔ آتی ہے KNOCK کرتی ہے اور دومنٹ میں کھیل خلاص۔ سپاٹ جذبات سے عاری لہجہ میں شیوراج کا تبصرہ وہ سن لیتا ہے اور ملول ہو جاتا ہے۔ شاید شیوراج، اور اسپتال کے عملے کی بے حسی پر، دوسرے ہی لمحے اسے یاد آتا ہے، یہ عملہ تو آئے دن لوگوں کو دم توڑتے دیکھتا ہوگا۔ ایک موت ہو تو دل بھی پسیجے، آنسو بہہ نکلیں پر اموات کی کثرت نے شاید ان سب کی حسیں ڈی فریج میں رکھ دی ہیں۔

"کیا کہا تم نے شیوا
" میں بولا تری فنانٹ بیماری ہے۔ بس دو منٹ میں کام تمام۔
" تمہارے نزدیک کون سی بیماری زیادہ تکلیف دیتی ہے؟ مریض شیوراج سے پوچھتا ہے۔ تو وہ اسی سپاٹ لہجے میں کہتا ہے۔
" آج آپ ڈسچارج کیے جا رہے ہو۔ فائل تیار ہے۔ آپ کا کون پے کر چکا ہے۔ پھوکٹ کا ٹینشن مت پالو۔ اور ہاں صاحب ایک بات دھیان سے سو آپ ایک ٹائم بوری دور رہے گی تو چلے گا۔ بس وہ سوربی تربیٹ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا۔ ادھر پینگ اسٹارٹ ادھر گولی جیب کے بچو بولے تو زبان کے نیچے۔ اب ذرا مانیٹر کے اسٹریکر نکال لوں کارڈیوگرام تو چیک ہے۔ فکر نا ٹ بھگواں دی گریٹ۔
" ہوں! لیکن تم نے میرا سوال گول کر دیا بھائی۔
" ارے ہاں یاد آیا
شیوراج نے پل بھر کی خاطر اپنی پلکیں موند یں۔ پھر کھولیں تو منہ بھی ساتھ ہی کھل گیا۔ بیماری تو سب ہی دکھ دیتی ہے چاچا۔ ٹی۔بی گلا گلا کر مارتی ہے۔ کینسر کا نام سن کر ہی آدمی آدھا مر جاتا ہے۔ ہارٹ اٹیک ابھی بتا چکا ہوں۔ جھٹ پٹ کھیل ختم۔ یعنی پل دو پل کا قصہ ہے۔ مگر سالا دانت کا درد، تگنی کا ناچ نچاتا ہے۔ لو لو چاچا ہوا کبھی دانت کا درد؟
مریض شیوراج کو اس کے سوال کا جواب نہیں دے سکا۔ بیوی بیٹے اور فیروز اسے نظر آئے۔ وہ سب خوش تھے۔ مریض بچ جو گیا تھا۔ ●●

پروفیسر ش۔ اختر
رانچی یونی ورسٹی

"مکان"۔ ایک جائزہ

اردو ناول نگاری کے لیے یہ عہد بڑا قیمتی ہے صرف اس لحاظ سے نہیں کہ دنیا صنعتی تبدیلیوں اور سائنسی انکشافات کی عظیم الشان آماجگاہ پہ کھڑی ہے۔ بلکہ اس لیے کہ شکست و ریخت کے عوامل عجیب و غریب ہیں۔ نظریاتی وفاداریوں کی فلک بوس عمارتیں زمین دوز ہوگئیں۔ مذہبی ریاکاری اور پاکھنڈیوں کی ایک فوج ہر شہر اور ہر قریہ میں استحصال کا وحشیانہ رقص پیش کر رہی ہے ہر چہرہ سو نقابیں ڈالے اپنا مدعا حاصل کرنے کی دوڑ میں سب بھول چکا ہے۔ یہ بھی کہ وہ ایک آدمی ہے جس کی شناخت کے چند اجزا ایسے ہیں جن میں سے کوئی ایک بھی غائب ہو جائے تو آدمی کوئی اور مخلوق ہو سکتا ہے آدمی نہیں۔ وہ بچارا اور غریب آدمی بھی جس نے اپنی ایک ریاست بنائی تھی اس بھیڑ میں شامل ہو گیا جو اس کے قاتلوں کی رہبری میں گزشتہ ایک صدی کے کارناموں کو کول تار کی سیاہی سے پوت رہی ہے۔ کوئی بہتر نظریۂ حیات جنم لیتا، کوئی نیا انسانی فلسفہ سامنے آتا تو علم و دانش کی سرحدیں وسیع ہوتیں۔ مگر پھر بھی یہ نئی منفی حقیقت فی الحال تمام پرانی سچائیوں پر حاوی ہو گئی ہے۔ دانشوروں پر بے یقینی کا سکتہ طاری ہے۔ فرد کی آزادی نے نام پر سماجی مفادات کو قربان کر دیا گیا۔ نئے خداؤں کے پیکر تراشے گئے اور پرانا سبق دہرایا گیا۔ دنیا کے ہر ملک کو حاکم کا پروانہ بھیجا گیا تاکہ اس کی ہدایتوں کی روشنی میں نئے عالمی نظام کو رائج کیا جائے۔ اور سماجی اور تہذیبی زندگی کے ساتھ ساتھ شہوانی تقاضوں کے آداب بھی سیکھیں۔ یہ نیا عالمی سماجی نظام انسان دوستی کے بنیادی عناصر سے خالی ہے ہندستان بھی اسی بحران سے گزر رہا ہے بے یقینی کی ایک لہر سی پھیل گئی ہے جارحیت کی ایک دبیز چادر نے شہریوں کے ساتھ ساتھ گاؤں کے چہرے کو بھی ڈھانپنا شروع کر دیا ہے۔ غرض یہ منظر ہماری آنکھوں نے پہلے نہ دیکھا تھا۔ ہم نے غیر ملکیوں کے حملے برداشت کیے۔ نادر شاہوں کے خون خرابے کی داستانیں پڑھیں۔ فسادات کی آگ دیکھی۔ مگر ایسی بے چہرگی پہلے کبھی نہ تھی۔ انسانیت کے پتلوں کو رات کی تاریکی میں سروں کی فصل کاٹتے نہ دیکھا تھا۔ بیسویں صدی کی یہ دہائی سب دکھا رہی ہے اور سارا عمل غیر علامتی ہے۔ اس موجودہ ریاکاری اور انسانی اقدار کے زوال کا ایک بڑا سبب بائیں بازو کی موقع پرست سیاست

بھی ہے۔ الفاظ انقلابی ہیں اور عمل انقلاب دشمن۔ شدید دوستی۔ کرشت بد میں [illegible] اور کام
غارتگری ہے۔ یہ ایک عام فضا ہے۔ یہ حادثات بے شک عبوری دور کے ہیں۔ لیکن سوال
یہ ہے کہ کیا افراد کے مثبت کردار اور عمل کے بغیر یہ عبوری دور کم از کم ٹھہراؤ کی مدت
میں باقی رہے گا۔ افراد کی قوت یکجا ہو تو سکتی ہے لیکن ایمان و یقین کی کس منزل پر اور
کن بنیادی انسانی اقدار کی روشنی میں۔ اس طرح کے بے شمار اہم سوالات آج کے عہد
کا مقدر ہیں۔ عام آدمی انھیں حل کر سکتا ہے نہ ان کا جواب پا سکتا ہے لیکن اس میں صلاحیت
ہے۔ نئی نسل اس عہد کی بے چینیوں اور بے اطمینانیوں کو رنگ و آہنگ دے اپنے خونِ
دل کے چھینٹوں سے تابندگی بخشنے کی جرأت ضرور رکھتی ہے۔ خونِ دل کی اسی گرمی سے
ماضی میں چاند تاروں کے جال بُنے گئے تھے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس عہد میں ہمارے
تخلیق کاروں کا خون منجمد ہو جائے

ان سوالات کا جواب گذشتہ دہائیوں کے ادب میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ خاص
کر کہانیوں اور ناولوں میں اس کی جستجو ضروری ہے۔ کیوں کہ ناول کا کینوس غیر محدود
ہے اور ناول میں تفصیل کے ساتھ حقیقتوں کی نقاب کشائی ممکن ہے۔

بیسویں صدی میں اردو میں چند اچھے ناول لکھے گئے۔ گزشتہ کئی برسوں میں اس
کے سرمایے میں اضافہ بھی ہوا موضوع اور تیکنک دونوں اعتبار سے۔ لیکن پھر بھی میرے
دل میں یہ احساس جاگتا ہے کہ ابھی تک اردو میں امراؤ جان ادا، سے اچھا ناول نہیں
لکھا گیا۔ عزیز احمد، ممتاز مفتی، انتظار حسین، عبداللہ حسین اور قرۃ العین حیدر کے ناول ارتقائی
سفر طے کرتے ہوئے بڑھے ہیں۔ ان کی دنیا وسیع ہے۔ ان ناولوں کی تخلیق نے ناول کا معیار
بڑھایا ہے۔ اور ناقدین کے اس خیال کو تقویت ملی ہے کہ شاید کوئی بڑا ناول پردۂ راز میں
ہے۔ درحقیقت جب تک کسی صنفِ ادب کا تخلیقی سرمایہ قابلِ لحاظ نہیں ہوتا اس میں
معیاری اور غیر معیاری تخلیق کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ یہ عہد بڑے ناولوں کا ضرور ہے لیکن
یہ دور ان ناول نگاروں کا بھی ہے جو نئی نسل کے ہیں۔ جن کا کرب نہ فساد ہے اور نہ ماضی
پرستی جن کے لیے یہ سب موضوعات پُرانے ہو چکے یہ نئی نسل اعتبار اور یقین کی
منزل سے ڈھلان کی طرف پھسل گئی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے لوڈو کی گوٹی ننانوے
پر پہنچ کر اچانک صفر پر آجاتی ہے۔ اس پھسلن کی وجوہات اس نسل کے اعمال نامے
میں تلاش کرنی چاہیے جس نے آزادی کی جنگ لڑی تھی۔ لیکن سیاسی آزادی کو ہی
سب کچھ سمجھ کر حلوہ مانڈے کی تقسیم میں لگ گئی اور یہ نہیں سوچا کہ نئی نسل سرمایے
کے اس وحشیانہ کھیل کو دل چسپی اور حیرت سے دیکھ رہی ہے۔ یہ نئی نسل ماضی کے کارناموں
سے آشنا تو تھی لیکن دنیا کی نئی تبدیلیوں پر بھی اس کی نگاہ پڑ رہی تھی۔ چناں چہ اس
کی پہلی بغاوت مفروضوں سے ہوئی نظریاتی وفاداریوں سے ہوئی۔ کیوں کہ ان کی عینکوں سے
سچائیاں دھندلی نظر آتی تھیں۔ نئی نسل کے ادیبوں اور فنکاروں کے کان انسان دوستی

اور غیر طبقاتی سماج کی تشکیل کی آوازیں سنتے سنتے پک گئے تھے۔ وہ زندگی کے لیے ایک نئی سمفونی کی تلاش میں تھی۔ اس نئی سمفونی کی تلاش "مکان" کی تخلیق کا سبب بنی۔ میں پیغام آفاقی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ چند لمحوں کی ایک ہلکی ملاقات سے اور بس۔ میرا ان کے متعلق کچھ نہ جاننا ہی بہتر ہے۔ کیوں کہ جب آدمی کسی کی نجی زندگی کے متعلق بہت کچھ جان لیتا ہے تو اس کے فن پر ان کے اثرات تلاش کرنا اپنا مقدس فرض تصور کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فنی قدر و قیمت طے نہیں ہو پاتی اور شخصیت کے واضح نقوش تنقید پر چھا جاتے ہیں۔ یا مصلحت اندیشیاں سدِ راہ ہو جاتی ہیں۔

موضوع کے اعتبار سے اس ناول میں ایک ندرت ہے۔ کرایہ داروں کا مکان کو ہڑپ لینا کوئی نئی بات نہیں۔ سر چھپانے کی ایک چھوٹی سی جگہ جہاں پر غیر ملکیوں کو دی تھی اور انجام برسوں کی غلامی میں ظاہر ہوا۔ دراصل ندرت اس موضوع کے تناظر میں پوشیدہ ہے۔ اسے آپ صرف نیرا کا مکان تصور نہ کریں۔ یہ وسیع پس منظر میں تخلیق کیا گیا ہے۔ یہ اس صنعتی تہذیب کی علامت ہے جہاں انسان کو ایماندار، خود دار اور عزت دار رہنے کے لیے اپنے پینٹ کے بٹن کھول دینے پڑتے ہیں۔ اگر آپ صرف قصے میں دل چسپی رکھتے ہیں تو واقعات کی فوج یہاں نظر نہیں آئے گی۔ لیکن اگر آپ کی نگاہیں چھوٹے چھوٹے حادثوں اور جملوں میں جہانِ معنی تلاش کرنے کی عادی ہیں تو یقینی ناول کے شروع کا یہ اقتباس آپ کی توجہ مبذول کرے گا۔

"جب اس کے کچھ دنوں بعد اسے یہ محسوس ہوا کہ کمار اپنی دولت کی ان دیکھی قوتوں کا سہارا لے کر اس کے پورے مکان کو ہڑپ لینا چاہتا ہے تو وہ گھبرا گئی۔ پھر جب اس نے کمار کے قدموں کو روکنے کی کوشش کی اور لوگوں کے پاس مدد کے لیے گئی تو دیکھا کہ تمام لوگوں کے چہرے اور تمام چیزوں کے رنگ بدلنے لگے تھے۔ اسے اپنے سامنے کی حقیقت پر خواب کا سا گمان ہوا اور اسے لگا کہ اس کے مکان کی چھت اب آسمان تک اٹھ گئی تھی اور اس کی دیواریں افق تک بھاگ گئی تھیں۔ اس کے علاوہ دیواروں پر لٹکے ہوئے کلینڈر اب آسمانی صحیفوں کی طرح زمان و مکان کی تمام وسعتوں تک پھیلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اور کمرے میں رکھی ہوئی تپائی اب ہزاروں سال پرانی دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے یہ سب کچھ بہت قدیم ہو اور اس کی جڑیں بہت گہری ہوں۔"

اس میں تین باتیں یاد رکھنی چاہیے۔

۱:۔ مالک مکان ایک کم عمر لڑکی ہے جس کی ایک بوڑھی ماں کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں
۲:۔ کرایہ دار ایک مالدار آدمی ہے جو دنیا کی ہر شئے خرید سکتا ہے۔
۳:۔ وہ سماج اور قوانین موجود ہیں جو شہریوں کے جان و مال کے محافظ ہیں۔

یہ مکان صرف نیرا کے سر پر چھت نہیں ہے۔ یہ اس کی ملکیت بھی ہے اور اس کا مستقبل بھی۔ اگر یہ مکان چھن جاتا ہے تو صرف چھت نہیں غائب ہوتی، روشن مستقبل تاریک نہیں ہوتا بلکہ وہ اقدار بھی دفن ہو جاتے ہیں۔ جس کے قائم کرنے کے لیے تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آ چکے ہیں۔ یہ سانحہ بہت چھوٹا نہیں ہے۔ اس میں نظم و ضبط کی ہزاروں سالہ تاریخ بھی پوشیدہ ہے۔ آدمی نے پہاڑوں کی کھوہ سے جنگلوں اور بیابانوں تک ہزاروں برسوں کا سفر طے کرنے کے بعد یہ مکان بنایا ہے۔ پھر نظام کی اندرونی ابتری کو روکنے کے لیے قانون بنائے ہیں۔ یہ قانون صرف الفاظ کی سودھری نہیں ہے بلکہ ان میں کمزور انسانوں کی دھڑکنیں چھپی ہیں ان کا کھویا ہوا اعتبار پوشیدہ ہے۔ سکون اور تحفظ کا احساس تبع ہے۔ اس سکون کو صرف ایک کمار نہیں چھین لینا بلکہ ایک مضبوط منظم طبقہ ہتھیانا چاہتا ہے۔ کیوں کہ یہ وہی کرنا چاہتا ہے جو جاگیر داری دور میں اس کے آباو اجداد کیا کرتے تھے۔ یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ یہ فلسفیانہ نکات ناول کی ابتدا میں خصوصیت سے ہماری توجہ چاہتے ہیں۔ کیوں کہ اس مکان میں جو صاحب سیاہ و سفید کا مالک ہے اس نے مصنف کی زبان میں سیاست کے بڑے بڑے سور ماؤں کا "فیوز" اڑا دیا ہے۔

ناول آگے بڑھتا ہے اور پڑھنے والا سمجھتا ہے کہ کمار مکان پر قبضہ کرنے کے لیے جھاڑیاں کٹواتا ہے۔ نیرا کی اجازت کے بغیر اپنا نیم پلیٹ لگا دیتا ہے۔ پارٹیاں شروع کر دی جاتی ہیں۔ یہ سب محض کرایہ دار اور مالک مکان کا جھگڑا نہیں ہے۔ اگر آپ نے اس محدود نقطۂ نظر سے اس ناول کا جائزہ لیا تو مجھے آپ کی دور رس نگاہوں پر شبہ ہوگا۔ آپ ایک نظر اپنی خلائی، سمندری اور بری سرحدوں کا جائزہ لیں۔

> "آپ کہیں یا نہ کہیں میں امن عالم قائم رکھنے کے لیے اپنے نیو کلیئر ہتھیاروں سے لیس فلیٹ آپ کی حفاظت کے لیے رکھوں گا۔ اندرون خانہ دیکھوں گا کہ وہاں کوئی شانتی بھنگ کرنے کی کوشش تو نہیں ہو رہی ہے۔ میرے جہاز آپ کے علاقوں میں رہیں گے تاکہ آپ کی حفاظت ہو سکے۔"

"مکان" پڑھتے وقت اگر آپ کا ذہن اس تناظر میں کچھ نہیں سوچتا ہے تو آپ کے لیے دو گز زمین کافی ہے۔

اس ناول کو قصوں اور پلاٹ کے میکانکی عمل سے نہ دیکھیے۔ اس ناول میں نہ قصے کی اہمیت ہے اور نہ پلاٹ کی تنظیم کی طرف خصوصی توجہ کی گئی ہے۔ یہ ناول نیرا

کے کردار کے گرد گھومتا ہے۔ ایک معصوم لڑکی زندگی کے جن تجربات سے گزر رہی ہے ان تجربات کا مطالعہ کیجیے تو اپنے ملک کی گھناؤنی تصویریں بڑی بن کر نظر آئیں گی۔ یہ نیرا کے گھر کے ارد گرد آس پاس کے پڑوسی سب نالیوں کے وہ رینگتے ہوئے بے چہرہ لوگ ہیں جو آپ کو انقلاب روس سے پہلے کے دستاوسکی کے کرداروں کی طرح دکھیں گے۔ یہ غریب لوگ۔ بے چہرہ لوگ۔ ریڑھ کی ہڈیوں سے عاری ہیں۔ یہ ریڑھ کی گڑیا نہیں۔ شاید میں نے اس عہد کی صحیح علامت استعمال نہیں کی۔ یہ آج کے روبوٹ ہیں جنھیں کمار اور حکومت کے کارندے اپنے اشاروں پر چلاتے ہیں۔ امن وشانتی قائم رکھنا اپنے اپنے علاقے میں ہر تھانیدار کا فرض ہوتا ہے۔ لیکن اس عہد کا تھانیدار کچھ اور بھی چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ نیرا جیسی آزادی کی فضا میں پرواز کرتی ہوئی فاختہ کو اس قدر سہما کر رکھا جائے کہ نیلے آکاش کا تصور اس کی آنکھوں سے روپوش ہو جائے۔ صاف ستھری ہوا خواب ہو جائے۔ آوازوں کی گڑگڑاہٹ سے اس کے کان ایسے عادی ہو جائیں کہ وہ یہ سچ سمجھنے لگے۔

(۱)۔ کہ دو اور دو تین ہوتے ہیں چار نہیں۔

۲:۔ ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے کہ یہی قانون فطرت ہے۔

اس ناول میں استحصال کی عالمی نوعیت پر جب تک آپ کی نظر نہیں جائے گی، آپ ان اقتباسات کو محض شاعری سے زیادہ اہمیت نہیں دیں گے۔

> "تھانہ حکومت کی علامت اور نمائندہ ہوتا ہے۔ ہم انتہائی باریک بینی سے ایک ایک نشیب و فراز پر غور کرتے ہوئے قدم اٹھاتے ہیں کہ حکومتیں تو دماغی قوتوں سے چلتی ہیں۔ خصوصاً ایسے ماحول میں حکومت کرنے کے لیے جہاں حکومت ہماری نہیں ہے"
>
> "بہت سے لوگ ایسے ملتے ہیں جو انتہائی شریف ہوتے ہیں۔ لیکن ہمیں ان کو ذلیل کرنے کو جی چاہتا ہے۔ جیسے ہمیں ان کی شرافت سے گھن آتی ہو اور کافی ایسے لوگ ملتے ہیں جن کی سچائی سے ہم اکتا کر چڑھ جاتے ہیں۔ جیسے ہمارا وقت خراب ہو رہا ہو۔"
>
> "میں اس لڑکی کو کس خوبصورتی سے ہینڈل کرتا ہوں۔ آپ دیکھیے تو اس کے اوپر دباؤ بڑھاتے بڑھاتے میں اس کے برس اور آنکھوں کی جھجک سب کچھ چھین لوں گا اور پھر وہ دن آئیں گے کہ ہماری ہر چوٹ کو وہ اپنی دونوں ٹانگوں کے بیچ روکے گی۔"

یہ اقتباس اس لیے نقل کیے گئے کہ اس میں جو ذہن دکھائی دے رہا ہے وہ اس نئے

عالمی نظام کا تعمیر کیا ہوا ہے جو داداگری کی سب سے اونچی کرسی پر بیٹھا ہے۔ نیرا پر ظلم برداشت کرلی جاتی ہے کہیں پر نیا ظلم اس کی آنکھیں کھولتا جاتا ہے۔ لمحاتی کمزوریوں میں جب وہ اداس رہتی ہے اس کا سماجی شعور اسے جدوجہد کے لیے ٹھوکے دیتا ہے تاکہ وہ مکان کی اصل نوعیت کو سمجھ سکے اور تب اسے اس کا یقین ہوتا ہے۔

"دشائیں تلاشنے اور متعین کرنے کی ضرورت ہے اس الجھی ہوئی
زندگی میں صرف صحیح سمتوں کی تلاش ہی تم کو بچا سکتی ہے۔ تم
اپنی جگہ مضبوط رہو اور آنکھیں کو کھلی رکھو۔ تمھاری اپنی زندگی
کی اسٹیرنگ تمھارے ہاتھوں میں ہے۔"

اور جب اس نے دشائیں تلاشنے کے بارے میں سوچا تو اچانک یہ شعور پیدا ہوا۔

"تم سمجھتے ہو کہ میں ایک کمزور لڑکی ہوں، میں عورت ہوں
میں ایک سمندر ہوں کہ جس میں پورا کا پورا پہاڑ غرقاب
ہو سکتا ہے۔ نہیں میں جو کچھ اپنے اندر سہتی ہوں اس سے
نئی چیزیں جنم لیتی ہیں۔ میں کوک ہوں میرے اندر جو عکس
پیدا ہوتا وہ محض خیال نہیں ہوتا۔"

نیرا کی اپنے آپ کی لڑائی اسے اس کا بھی احساس دلاتی ہے کہ

"کسی کی اپنی قوت بھی اس کی اپنی نہیں ہوتی وہ بھی آزادانہ
اپنے محور پر ناچ جاتی ہے۔"

"جھیلو اور مستقبل میں جھیلنے کے عمل کو جاری رکھو۔"

اور جب اسے اپنے آپ پر پورا بھروسا ہوتا ہے تو وہ غنڈے کی بات کا جواب دیتی ہے۔

"برباد انسان ہوتے ہیں بھوت پریت نہیں برباد ہوتے۔"

شروع سے آخر تک نیرا اس سماجی نظام کے خلاف لڑتی ہے۔ جوں جوں اسے اپنے آپ پر یقین ہوتا جاتا ہے کمار کی شکست سامنے دکھائی دیتی ہے اور پھر وہ لمحہ بھی آتا ہے جب وہ اس شکست کو تسلیم کرلیتا ہے۔ یہ شکست زندگی کے اثباتی نقطۂ نظر کے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔ پیغام آفاقی کس حد تک زندگی کی جدوجہد اور اس کے اثباتی فلسفے پر یقین رکھتے ہیں۔ میں نہیں جانتا لیکن ان کا تخلیقی رویہ بے حد مثبت ہے آج جب ایک طرح کی فکری بے حسی چھا گئی ہے۔ اور لوگوں کے ذہنوں پر فنگس نے اپنی جگہ بنالی ہے۔ پیغام آفاقی کھلی آنکھ کے ساتھ زندگی کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ یہ ناول اردو میں ایک بڑا تخلیقی کارنامہ ہے یا نہیں ہے لیکن یہ اس جاتی ہوئی صدی کی زبان ہے۔ استعارہ ہے۔ زخمی روح ہے جس کی آواز پیغام آفاقی نے دور سے سنی۔ ہنگاموں اور گھن گرج کی آوازوں میں دور کی آواز سننا جرم بھی ہے اور

جوئے شیر لانے سے زیادہ مشکل کام بھی۔ مگر پیغام آفاقی شاید اس رمز سے واقف ہیں کہ

اعلانِ حق میں خطرۂ دار و رسن تو ہے
لیکن سوال یہ ہے کہ دار و رسن کے بعد

ناول کے سلسلے میں آخری گفتگو اس کے فن سے متعلق ہے۔ میں ادبیات کی کسی مسلّمہ تعریف کا قائل نہیں۔ ادب سائنس سے مختلف ہے۔ ادیب فن پاروں کا لیبارٹری میں تجزیہ نہیں کرتا۔ وہ تو انگلش کی زبان میں انسانی روح کا انجینئر ہوتا ہے۔ یہ انجینئرنگ پل صراط سے گزرنا سکھا سکتی ہے۔ لوہے اور کنکریٹ سے پل بنانا اس کا کام نہیں۔ اس میں تمام تر انسانی تجربات کا گارا صرف ہوتا ہے جس میں خونِ دل کی سرخی شامل رہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ادبیات کے لیے فارم کی تلاش کا مسئلہ بھی اہم ہے۔ لیکن فارم کی تلاش یا اس کی یافت بھی تخلیقی تجربوں کی خاص منزل میں حاصل ہوتی ہے۔ کہانیوں سے داستان پھر ناول اور تب مختصر افسانہ۔ یہ سب ہمارے تخلیقی اور جمالیاتی تجربوں کی جستجو کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں۔ ہم نے ان تخلیقات سے اپنی دانش کے مطابق ابتدا، وسط اور انتہا، قصہ، پلاٹ، کردار وغیرہ عناصر کو یکجا کرکے ایک شکل دینے کی کوشش کی اور پھر اس کو ایک نام دیا۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ تمام عمل فرمانِ ازلی نہیں ہے جس میں ایسی تبدیلی کہ اس کی پوری ساخت ہی بدل جائے ناممکن ہے۔ اگر آپ ناول کی کلاسیکی تعریف ہی کو سب کچھ سمجھ لیں اور اسی ڈھانچہ میں ناول کو فٹ کرنے کی کوشش کریں تو اس تجرباتی عہد میں ہمارا یہ عمل بھی تخلیقی نہ ہو کر مخصوص فارمولا کا پابند ہو جائے گا اور ہماری ادبی تنقید بھی اس طرح میکانکی ہو جائے گی جیسے فرنیچر بنانے والے کاریگروں کا تعمیری عمل اب اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں اور پیغام آفاقی کے ناول 'مکان' کا جائزہ میں تو ساخت کی خوبیاں اور خامیاں نظر آئیں گی۔ اس ناول میں میرے نزدیک قصہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہیا ماحول کردار اور اس کی نفسیاتی الجھنوں کے ساتھ ساتھ شعور کی بیداری کے عناصر اجزاے ناول بن کر ابھرے ہیں۔ پلاٹ کی ہمواری یا سادگی کی تلاش معقول ہے کیوں کہ جب قصہ اصل شے نہیں ہے تو پلاٹ کی ترتیب کا سوال مضحکہ خیز ہو جاتا ہے۔

ناول میں دو اد۔ باتیں توجہ چاہتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ـــــ فضا ہے۔ ایک آدمی خواب دیکھتا ہے اور دوسرا اسے توڑنے کا عمل جاری رکھتا ہے۔ شکست و ریخت کا یہ عمل اپنی نوعیت میں انفرادی نہیں بلکہ سماجی ہے اور سب ناول میں بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ کمار الوک نیر یہ سب ایسے کردار ہیں جو ہمارے آس پاس مکڑی کے جالوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ نیرا ایک تتلی کی طرح اس کے شکنجہ میں ایک خاص وقت تک کستی جاتی ہے۔ لیکن جس لمحہ اسے اپنی

شناخت ہوتی ہے وہ دھرتی کی چھپی ہوئی طاقت کا ادراک حاصل کرتی ہے مکڑی
کے جالوں کو توڑتی ہوئی آزاد ہوجاتی ہے۔ یہ ناول عورت کے اندر چھپی ہوئی اتھاہ
طاقت کا ایک خوبصورت اظہار بھی ہے اور ہمیں اس کا احساس دلاتی ہے کہ عالمی پیمانہ
پر عورت کی جدوجہد اور آزادی کی جو تحریکیں چل رہی ہیں اس سے غافل نہیں۔
ان عالمی تحریکوں کا ناول میں کہیں ذکر نہیں ہی اس کا رمزیہ اظہار ہے یہ سب اس آفاقی
شعور کے ذریعہ ناول نگار نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو بہت عام نہیں ہے
لیکن اچھے فن کار کے لیے ضروری ہے کہ وہ یخ بستہ فضاؤں میں بھی خونِ دل کی
گرمی سے بیداری اور حرارت کی بھٹیوں کو روشن کر سکے۔

یہ ناول گزشتہ برسوں میں لکھے جانے والے ناولوں میں ایک امتیازی شان رکھتا
ہے اور اسی لیے اسے انعام کے قابل نہیں سمجھا گیا۔

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی
شعبۂ اردو، پنجاب یونی ورسٹی۔ چنڈی گڑھ

قاضی عبدالغفار

بیسویں صدی میں جن سیاسی اکابرین و عمائدین نے ہندستان کی تحریک آزادی میں سرگرم حصہ لیا ان میں قاضی عبدالغفار کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ صحافت اور سیاست ان کی دلچسپی کے دو اہم میدان تھے۔ لیکن وہ بنیادی طور پر جرنلسٹ تھے۔ انھوں نے اپنی ابتدائی صحافتی مشق کے دوران نیّر عالم میں اپنی تحریریں شائع کرائیں لیکن ان کے صحافتی سفر کا باضابطہ آغاز ۱۹۱۲ء میں "ہمدرد" میں محمد علی جوہر کے ادبی معاون کی حیثیت سے ہوا۔

قاضی عبدالغفار "نقشِ فرنگ"[1] میں اپنی صحافتی زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"عمر کے بہترین پندرہ برس اخبار نویسی کے اس عہد میں گزرے جو ہندستان کی قومی زندگی کا ایک متلاطم اور یادگار عہد تھا جب قومی خادموں کا امروز ان کے فردا سے ہمیشہ ناآشنا ہوتا تھا جب زندگی کا طور یوں تھا کہ صبح کو گھر سے چلے تو شام کو جیل خانے پہنچ گئے اس زمانے میں قلم ٹوٹتا نہ تھا بُرا لکھا مگر بہت کچھ لکھا۔ لیکن قومی دریا کی دھار پر یہ سب کچھ کاغذ کی کشتیاں تھیں جو بہتی ہوئی نکل گئیں۔ کوئی ایک نقش بھی ایسا نہ تھا کہ باقی رہ جاتا بد نصیبی سے نہ کبھی اتنی توفیق حاصل ہوئی نہ اہلیت نصیب کہ ان کاغذ کی ناؤ کے علاوہ چند باقی رہنے والے اوراق بھی مرتب ہوتے ہر صبح کو جو کچھ اخبار کے اوراق پر تھوپا وہ شام کو غریب عطار اور پنساری کے کام آیا۔ پندرہ برس کی اخبار نویسی کی یہ ساری روداد ہے۔"

قاضی عبدالغفار مراد آباد کے ایک معزز اور مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ مراد آباد

---

[1] "نقشِ فرنگ" قاضی عبدالغفار کا سفرنامہ ہے جو ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔

میں وہ تمباکو والے محلّے میں رہتے تھے۔ ان کے والد قاضی ابرار احمد مراد آباد میں اسپیشل مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز تھے۔ حکومت ہند نے انھیں خان بہادر کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ ان کی والدہ سلمیٰ بیگم ایک متدیّن خاتون تھیں۔ جو انھیں کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی والدہ قاضی عبدالغفار کو گھر پر پیار سے میاں کہہ کر پکارتی تھیں۔ قاضی عبدالغفار کے دادا قاضی حامد علی سنبھل (اترپردیش) میں تحصیل دار تھے۔ قاضی حامد علی کے والد کو بہادر شاہ ظفر کے دربار سے "قاضی" کا خطاب ملا تھا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے زمانے میں قاضی حامد علی کے مکان پر چند انگریز افسروں نے پناہ لی تھی۔ غدر فرو ہونے کے بعد قاضی حامد علی کو صرف اس جرم کی پاداش میں پھانسی دے دی گئی کہ انھوں نے انگریز افسروں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ لیکن ان انگریز حکام نے بحفاظت انگلستان پہنچنے پر مراد آباد کے انگریز کلکٹر کو ایک خط ارسال کیا اس خط میں قاضی حامد علی کے برتاؤ کی بڑی تعریف کی گئی تھی۔ خط پڑھ کر مراد آباد کے انگریز کلکٹر کو قاضی حامد علی کو سزا دینے کا بہت افسوس ہوا۔ ان کے ماموں قاضی محبوب علی نے اس سلسلے میں کلکٹر سے ملاقات کی تو اس نے ضبط شدہ جائداد میں سے دو گانو اور چار مکان ان کے بیٹے قاضی ابرار احمد کے بالغ ہونے پر ریلیز کرنے کا وعدہ کیا۔

قاضی عبدالغفار چھے بہن بھائی تھے۔ ان میں سے تین فوت ہو گئے تھے ان کی ایک بہن افسری بیگم تھیں۔ قاضی صاحب کے چھوٹے بھائی قاضی عبدالجبار جو اچھن بھیّا کے نام سے مشہور تھے وہ معمولی تعلیم یافتہ تھے۔

قاضی عبدالغفار نے ابتدائی تعلیم مراد آباد کے مختلف اسکولوں میں حاصل کی گورنمنٹ انٹر کالج مراد آباد سے میٹرک پاس کرنے کے بعد علی گڑھ یونی ورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد مراد آباد واپس چلے آئے۔ علی گڑھ میں عبدالمجید خواجہ تصدق احمد خاں، سعیدالرحمٰن قدوائی اور کرنل بشیر حسین زیدی ان کے خاص ساتھیوں میں سے تھے۔ قاضی عبدالغفار کی پہلی شادی ۱۹۱۰ء میں سر مولوی محمد یعقوب ایڈووکیٹ کی بہن افضال بیگم سے ہوئی تھی۔ افضال بیگم ان کی ماموں زاد بہن تھیں۔ ان سے چار لڑکے اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ لڑکے تو عہد طفلی ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ ان کی بڑی لڑکی زہرہ بیگم کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ البتہ فاطمہ بیگم بقید حیات ہیں اور حیدرآباد میں سکونت پذیر ہیں۔

۱۹۱۶ء میں قاضی عبدالغفار سیاحت کے لیے پیرس، لندن اور دیگر ممالک تشریف لے گئے۔ پیرس میں انھوں نے کپڑے کی ایک دکان کھولی تھی اور

پیرس ہی کی ایک خاتون کو دکان پر ملازم رکھ لیا تھا۔ پیرس میں جب ان کے پاس روپیا ختم ہوگیا تو انھوں نے اپنے والد قاضی ابرار احمد کو ایک خط ارسال کیا جس میں پیرس میں خرچ کے لیے کچھ رقم کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ خط پڑھ کر ان کے والد کو بہت تشویش ہوئی اور انھوں نے محلہ کل شہید میں واقع اپنے آبائی آم کے ایک وسیع باغ کو تین ہزار روپے میں فروخت کرکے وہ رقم قاضی عبدالغفار کو پیرس روانہ کردی لیکن تجارت میں نقصان ہوا اور چند ماہ بعد قاضی عبدالغفار ہندستان واپس آگئے۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہندستان میں سیاسی تحریکیں زوروں پر تھیں خلافت تحریک شروع ہوچکی تھی۔ قاضی عبدالغفار، محمد علی جوہر، گاندھی جی اور ابوالکلام آزاد کے ساتھ خلافت تحریک میں حصہ لینا چاہتے تھے لیکن ان کے والد قاضی ابرار احمد نے انھیں خلافت تحریک میں شریک ہونے سے منع کیا۔ قاضی عبدالغفار نے نہایت ادب سے اپنے والد کو جواب دیا۔ آپ گورنمنٹ کے ملازم ہیں اور میں گورنمنٹ کا مخالف ہوں۔

۱۹۲۱ء میں وہ خلافت وفد کے سکریٹری کی حیثیت سے لندن کے لیے روانہ ہوئے۔ اس وفد میں سر آغا خاں کے علاوہ سیٹھ چھوٹانی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، محمد علی، شوکت علی، مشیر حسین قدوائی اور سید حسن امام بھی شامل تھے۔ انگلستان میں ڈھائی ماہ قیام کے بعد جب وہ ہندستان واپس آئے تو انھوں نے حکیم اجمل خاں کی ایما پر "نقش فرنگ" کے نام سے ایک سفر نامہ تحریر کیا۔ اس سفر نامے میں انھوں نے اقصائے مغرب کی سیر کے دل آویز تاثرات، دیار فرنگ کی سیاحت اور مدبرین مغربی کے ساتھ تبادلۂ خیالات، چند دلکش اشاروں کے طور پر قلم بند کیے ہیں۔

بقول قاضی عبدالغفار "یہ نام نہاد سفر نامہ جو محض سرسری مشاہدات کا ایک عکس ہے۔ میرے اوراق پریشاں کا پہلا مجموعہ ہے۔"

قاضی ابرار احمد کے انتقال کے بعد قاضی عبدالغفار جائداد کے متولی مقرر ہوتے۔ ۱۹۲۳ء میں ان کی بیوی افضال بیگم کا انتقال ہوگیا۔ ۱۹۲۵ء میں قاضی عبدالغفار میونسپل بورڈ مرادآباد کے چیرمین منتخب کیے گئے۔ اس زمانے میں رفیع احمد قدوائی مرادآباد میں ڈپٹی کلکٹر تھے جو قاضی عبدالغفار کے گہرے دوست تھے۔ وہ اکثر ان کے ساتھ شطرنج کھیلا کرتے تھے۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق میونسپل بورڈ کا چیرمین ہفتہ میں ایک بار کلکٹر کے بنگلے پر حاضری دیا کرتا تھا۔ یہ اصول قاضی عبدالغفار کے مزاج کے خلاف تھا۔ کئی ماہ گزر گئے لیکن قاضی عبدالغفار کلکٹر کے بنگلے پر نہیں پہنچے۔ مرادآباد کے انگریز کلکٹر مسٹر شیرف نے متعلقہ حکام سے ان کے بارے میں معلوم کیا۔ حکام نے کلکٹر کو بتایا کہ قاضی عبدالغفار ایک خود دار انسان ہیں وہ آپ سے ملنے نہیں آئیں گے۔

مسٹر شیرف ایک روز گھوڑے پر سوار ہوکر قاضی عبدالغفار کے مکان پر پہنچا۔ دن کے تین بجے تھے۔ قاضی صاحب گھر میں آرام فرمارہے تھے۔ ان کا ایک وفادار نوکر محمد جان دروازے پر بیٹھا ہوا تھا۔ مسٹر شیرف نے ملاقات کی غرض سے اپنے آنے کی اطلاع قاضی صاحب کو کرانا چاہی۔ محمد جان نے کلکٹر سے کہا حضور! صاحب آرام فرمارہے ہیں۔ چار بجے سے پہلے ان سے ملنے کا حکم نہیں ہے۔ ورنہ مجھے نوکری سے نکال دیا جائے گا۔ نوکر کے یہ الفاظ سن کر کلکٹر واپس چلا گیا۔

چند روز بعد مسٹر شیرف دوبارہ قاضی عبدالغفار کے مکان پر پہنچا۔ شام کے ۴ بجے تھے۔ گھوڑے سے اتر کر مسٹر شیرف نے بڑے تحکمانہ انداز میں نوکر کی طرف دیکھا، نوکر سمجھ گیا اور اس نے فوراً مسٹر شیرف کے آنے کی اطلاع قاضی عبدالغفار کو کردی۔ وہ غسل فرمارہے تھے۔ انھوں نے نوکر سے کہا: "شیرف کو کمرے میں بٹھادو"۔ غسل سے فارغ ہوکر قاضی عبدالغفار کمرے میں تشریف لائے، مسٹر شیرف انتظار کررہا تھا۔ کلکٹر کو قاضی صاحب کے احترام میں مجبوراً کھڑا ہونا پڑا۔

کلکٹر نے قاضی صاحب کے اس اہانت آمیز رویے سے اپنی توہین محسوس کی۔ اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی اور اس نے میونسپل بورڈ کے ممبروں کو قاضی عبدالغفار کے خلاف بھڑکانا شروع کردیا۔ نتیجے کے طور پر عدم اعتماد کے ووٹ کے لیے دن اور وقت مقرر کرلیا گیا۔ قاضی عبدالغفار نے اس کی مطلق پروا نہ کی اور وہ وقت مقررہ پر میونسپل بورڈ کے ہال میں پہنچ گئے۔ بورڈ کے ممبروں نے ان کا استقبال کیا۔ اسی دوران مسٹر شیرف بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے ایک رقعہ قاضی عبدالغفار کو بھیجا جس میں ہال کے اندر آنے کی اجازت مانگی تھی۔ قاضی عبدالغفار نے پرچے کی پشت پر یہ جواب لکھ کر پرچہ واپس کردیا۔

YOU MAY COME AS A SHERIFF NOT AS A COLLECTOR

مسٹر شیرف نے اس شرط کو منظور کرلیا۔ کلکٹر اندر آگیا اور قاضی صاحب نے اسے اپنے برابر میں کرسی پر بٹھالیا۔ عدم اعتماد کے ووٹ کی کارروائی شروع کی گئی۔ کارروائی کے دوران کلکٹر نے مداخلت کرنا چاہی۔ قاضی صاحب نے اس سے کہا کہ آپ یہاں بحیثیت کلکٹر نہیں بلکہ بحیثیت شیرف یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ قاضی صاحب کے یہ الفاظ سن کر شیرف کو خاموش ہونا پڑا۔ آخر میں فیصلہ قاضی عبدالغفار کے حق میں ہوا۔ کلکٹر صاحب کو قاضی صاحب کی طاقت اور علمیت کا لوہا ماننا پڑا۔ کلکٹر کے ساتھ ان رویّوں کی وجہ نخوت یا تکبّر

نہیں بلکہ انگریزوں کی تحقیر وتضحیک تھی۔ وہ انگریزوں سے نفرت کرتے تھے۔ انھیں اپنی وطن کی سرزمین سے بے پایاں محبت اور عقیدت تھی۔

۱۹۲۸ء میں قاضی عبدالغفار کی شادی منی جان عرف سکینہ بیگم سے ہوئی تھی۔ وہ حبیب سیٹھ کی تھیٹریکل کمپنی میں کام کرتی تھیں۔ رفیع احمد قدوائی کے اشارے پر محمد جان کے ذریعے ان سے تعلقات کا سلسلہ قائم ہوگیا تھا۔

مرادآباد میں میونسپل بورڈ کے چیئرمین شپ کے انتخاب کے لیے قاضی صاحب دوبارہ کھڑے ہوئے تھے۔ الکشن کی رات کو قاضی صاحب دہلی آئے۔ اس کے بعد کبھی مرادآباد واپس نہیں گئے۔ دہلی میں اکثر وہ ابوالکلام آزاد کے یہاں اکبر روڈ پر قیام کرتے تھے۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ انھوں نے حکیم اجمل خاں کے ساتھ بہت سے اسفار بھی کیے تھے۔ حکیم صاحب انھیں اپنے بیٹے کی طرح سمجھتے تھے۔ جب بھی حکیم اجمل خاں رام پور کا سفر کرتے تو قاضی عبدالغفار کو ضرور اطلاع کرا دیتے اور وہ مرادآباد کے اسٹیشن پر حکیم صاحب سے ملاقات کرنے آ جاتے اسی زمانے میں قاضی عبدالغفار نے حکیم صاحب کی سوانح عمری مرتب کی تھی۔ اس کتاب پر انھیں حکومت کی جانب سے دس ہزار روپے بطور انعام دیے گئے تھے۔

۱۹۳۴ء میں قاضی عبدالغفار نے حیدرآباد سے روزنامہ "پیام" جاری کیا تھا۔ یہ اخبار اس دور کی صحافتی دنیا کا نمائندہ اخبار تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے کلکتہ سے "جمہور" اور دہلی سے "الصباح" جاری کیا تھا۔ یہ دونوں اخبار انگریزوں کے عتاب کا نشانہ بن گئے۔

عمر کے آخری ایام یعنی ۱۹۴۹ء کے قریب قاضی صاحب علی گڑھ چلے گئے اور انجمن ترقی اردو ہند سے بحیثیت سکریٹری وابستہ ہوگئے۔ ۱۹۵۰ء میں جب ہماری زبان جاری ہوا تو قاضی عبدالغفار "ہماری زبان" کے مدیر مقرر ہوئے زندگی کے آخری دور تک انجمن سے ان کا گہرا تعلق رہا۔ علی گڑھ ان کا ادبی وطن تھا۔ آخری ایام میں ان کے پتے میں پتھری ہوگئی تھی۔ آپریشن کے سلسلے میں وہ دوبار بمبئی گئے۔ کافی علاج معالجہ کیا لیکن کارگر ثابت نہ ہوا اور ۱۷ر جنوری ۱۹۵۶ء کو ۶۸ سال کی عمر میں علی گڑھ میں انتقال ہوگیا۔ قاضی عبدالغفار کا تصنیفی سرمایہ ۱۴ کتابوں پر مشتمل ہے جس میں "نقش فرنگ" پہلی کتاب ہے جو ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد "لیلیٰ کے خطوط" ۱۹۳۴ء "مجنوں کی ڈائری" "اس نے کہا" (ترجمہ) "تین پیسے کی چھوکری"، "آثار جمال الدین افغانی

لہ ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے تاریخ ادب اردو میں وفات کے وقت ان کی عمر ۶۲ سال درج کی ہے جو صحیح نہیں ہے لیکن تاریخ پیدائش ۱۸۸۸ء کے مطابق تھا قاضی عبدالغفار کی عمر ۱۹۵۶ء میں ۶۸ سال تھی۔

"مذہب اور دھرم"، "مشترکہ زبان" "حیات اجمل"، آثار ابوالکلام آزاد، عجیب (۱۹۴۰ء)
اور دیوان شہدا شامل ہیں۔

قاضی عبدالغفار کی معرکتہ الآرا تصنیف آثار جمال الدین افغانی ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کیا تھا لیکن ان کی ادبی شہرت کا آغاز لیلیٰ کے خطوط سے ہوا۔

قاضی عبدالغفار ایک کثیر الجہات اور مجموعۂ صفات شخصیت کے مالک تھے۔ انھیں مطالعے کا بہت شوق تھا۔ مکان کے بالائی حصہ میں ان کی ذاتی لائبریری تھی۔ وہ ہر وقت مطالعے میں غرق رہتے تھے۔ صرف کھانا کھانے کے لیے نیچے آتے تھے۔

قاضی عبدالغفار ایک اعلا پایے کے ادیب اور صحافی تھے وہ مترجم بھی تھے اور تخلیق کار بھی۔ انھوں نے ڈرامے بھی لکھے اور انشائیے بھی۔ اور صنف غزل میں بھی طبع آزمائی کی۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ ان کا کوئی تخلص نہیں تھا۔

نثر میں قاضی عبدالغفار کا پیرایۂ بیان لطیف اور انداز بلیغ تھا۔ عادات اور خصائل سے وہ ایک فرشتہ صفت انسان تھے۔ مختصر اور جامع گفتگو کرنے کے عادی تھے۔ خاندانی وجاہت اور زمیندارانہ شان ان کے چہرے سے ٹپکتی تھی۔ مزاج میں حد درجہ کا تحمل اور استغنا تھا۔ طبیعت اعتدال پسند اور مرنجاں مرنج واقع ہوئی تھی۔ غرضیکہ کیا بہ لحاظ ذاتی اوصاف اور کیا بہ اعتبار ادبی و سیاسی خدمات ہر حیثیت سے وہ ملک کے برگزیدہ بزرگ اور اردو کے محسن گزرے ہیں۔

نوٹ:- اس مقالے کی تیاری میں بیشتر معلومات قاضی عبدالغفار کے سوتیلے بھائی قاضی مشتاق احمد سے فراہم کی گئی ہیں۔
یہ مقالہ "قاضی عبدالغفار فن اور شخصیت" کے موضوع پر منعقدہ سمینار انجمن ترقی اردو ہند میں پڑھا گیا۔

اڈیٹر کتاب نما کے نام

کھلے خطوط

(مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

● اواکتوبر کے کتاب نما میں مہمان مدیر شجاع خاور صاحب کا اشاریہ بعنوان "بحر مضامین دیکھیے بحر خیال ہے" نظر نواز ہوا۔ اشاریے کے ابتدائی حصے کے بارے میں میں بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

کیا شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ عروض کا علم حاصل کرے؟ میرا جواب نفی میں ہے۔ میرا خیال ہے کہ جو شخص شاعری کے میدان میں اترا ہے وہ فطری طور پر آہنگ پر گرفت رکھتا ہے اور یہ کافی ہے۔ علم عروض سے واقفیت ایک اضافی وصف تو ہو سکتا ہے بنیادی ضرورت نہیں۔ اس لیے یہ اصرار بے جا ہے کہ ہر شاعر اس کا علم حاصل کرے۔ لوگ اس سلسلے میں کیا رائے رکھتے ہیں یہ تو میں نہیں جانتا لیکن یہاں میں اپنا ایک ذاتی تجربہ بیان کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

۱۹۸۸ء میں میرا پہلا (اور ابھی تک اکلوتا) شعری مجموعہ "الف" منظر عام پر آیا تھا۔ اس کی ابتدا ایک نعت سے ہوتی ہے۔ ایک پیشہ ور مبصر نے اس مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نعت کے ایک شعر پر بے وزن ہونے کا فتوا صادر کیا تھا تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے صرف وہ شعر یہاں نقل کر دیتا ہوں،

"عصیاں کی کالی دنیا میں
دھوپ بنا کھل گیا محمد"

چونکہ اس سے قبل میں عروض سے باقاعدہ واقف نہ تھا اس لیے اس تبصرے سے کچھ گھبرا گیا، حالانکہ میرے مزاج کا آہنگ اس غلطی کو غلطی ماننے پر تیار نہ تھا۔ فوراً میں نے عروض کی جانب توجہ کی اور معمولی شُدبُد حاصل کرلی۔ نتیجہ اس ریاضت کا یہ نکلا کہ میں نے جان لیا کہ میرا شعر بے وزن نہیں تھا۔ مگر نقصان یہ ہوا کہ جتنے دنوں عروض زیر مطالعہ رہا میں نے محسوس کیا کہ شعر گوئی کا یہ فطری آہنگ ٹوٹ رہا ہے۔ ہوتا یہ کہ میں شعر کر رہا ہوں اور ابھی پہلا مصرع ہی کہا تھا کہ ذہن میں فوراً عروضی ارکان کی گونج سنائی دینے لگی اور میں مصرعے کی تقطیع میں الجھ جاتا ہوں دوسرا مصرعہ کہتے وقت سارے مفاہیم خلط ملط ہونے لگتے ہیں۔

اشاریے کے باقی حصے کے بارے میں سوائے اس کے کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ یہاں شجاع خاور کا شاعری والا لہجہ غالب ہے جو نثر میں اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے۔ نثر میں کسی کے بارے میں اظہار خیال کرتے وقت انھیں مزید احتیاط سے کام لینا چاہیے کہ یہاں بات اشاروں، کنایوں، استعاروں اور علامتوں میں نہیں، براہ راست ہوتی ہے۔

یعقوب یاور بنارس۔

● اس بار ڈاکٹر تاراچرن رستوگی نے بے حد خشک مگر ایک اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ مضمون بے حد معلوماتی اور سبق آموز ہے پھر بھی عام قارئین کی ذہنی سطح سے یہ بلند تر ہے۔ جناب رشید حسن خاں کا مقالہ وقیع بھی ہے اور معلوماتی بھی۔

یوسف ناظم اور دلیپ سنگھ نے بھی متاثر کیا۔ شعری حصہ میں علامہ شبلی، ظہیر غازی پوری اور جینت پرمار کی تخلیقات میں تازگی بھی ہے اور اظہار واسلوب کی جدت بھی۔
یعقوب عظیم، دربھنگہ

● نومبر دسمبر کا شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ علامہ شبلی صاحب کی نظم بے حد پُرتاثر اور خوبصورت ہے۔ ابو محمد سحر، جینت پرمار اور نعر غزالی کی غزلیں نئے سمت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ خلیل الرب کا مضمون، عملی انتقادیات ایک قاری کی نظر میں،، خوب ہے۔ اس میں بحث و مباحث کی خوب گنجائش ہے۔ دسمبر کے غزلیہ حصے میں میں وہ جان نظر نہیں آتی جو کتاب نما،، کا خاصہ ہے۔
شگفتہ طلعت سیما۔ بہم دائرہ
شاہ غلام علی، رانی منڈی، الہ آباد ۳-۲۱۱۰۰

● فرقہ پرست اور ملک دشمن طاقتوں کے اشارے پر کارسیوکوں کے ہاتھوں ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کا انہدام نہ صرف بھارت کے مسلمانوں کے لیے بلکہ پورے عالم اسلام کے لیے ایک عظیم اور ناقابل فراموش المیہ ہے۔ اس دل ہلا دینے والے سانحہ پر نہ صرف ملک میں بلکہ پوری دنیا میں زبردست غم و غصہ کا اظہار کیا گیا ہے۔ ملک بھر میں فساد ہو رہے ہیں دہلی میں بھی کرفیو لگا ہوا ہے اور نظام زندگی یکسر مفلوج ہے۔
وسیم مینائی شاہجہاں پور۔ یوپی۔

● یہاں احباب بخیر ہیں۔ کرفیو کے باعث خانہ قید البتہ ہے۔ ۶ر دسمبر کے سانحہ کے اثرات سے پوری طرح نہیں نکل سکے ہیں۔ گرلا میں ہنوز چھرے زنی اور آتش گولے پھینکنے کی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ عنایت اختر نے ریلیف کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ راج بر، انجان شری واستو اور اپنا کے کارکنان شمع زیدی، سیتھو وغیرہم نے بھی متاثرہ علاقوں میں ریلیف کے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔
ایک طرف یہ صاحبان ہیں اور ادھر امیڈیشین نے لاکھوں روپے کی دوائیں ریلیف کیمپس میں معالجین کے سپرد کی ہیں اور اپنے نام کی تشہیر کو اس کے مالک پسند نہیں کرتے۔ یاد رہے اس کے مالک مسلمان نہیں ہیں۔ یہ وہ سیکولرسٹیاں ہیں جو ہمارے سیاست دانوں کے بہ نسبت سیکولرزم کے معنی زیادہ بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ گندی سیاست اور سیاسی گندگی کے کیڑے مکوڑوں نے تو لاشوں پہ کھڑے ہو کر قد بڑھانے کا کوئی موقع نہ چھوڑا۔
اب دیکھنا ہے اہل قلم کس سمت سفر کرتے ہیں کہ ۶ر دسمبر کے بعد سمتیں تک بدلتی جارہی ہیں۔ جانے انجانے فرقہ وارانہ عصبیت کے حامل افراد نے خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں آتش فشاں کا دہانہ ضرور کھول دیا ہے۔
خداوند کریم سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو امن اور بھائی چارگی کے احساس کی دولت سے نوازے۔ اس ملک کا شیرازہ نہ بکھرے آمین۔
علی امام نقوی، ۱۰۳، ۵ بی، نیا نگر میرا روڈ۔ تھانہ

● مکرر [۲/۱۲/۹۳] حالیہ حالات کو دیکھ کر ایک پرانی سی نظم یاد آگئی،

دیودوں کی کیسی دنیا ہے "
جب ان کی "سنتان" بیہا لیدیر
داتوں بن کر ناچ رہی ہے
کیا ہوں گے بھگوان وہاں پر

دلیپ بادل ۵۴۳ چراغ دہلی نئی دہلی ۱۷

● ماسٹر اختر کا اشاریہ تو اپنے ایک ایک لفظ سے اردو داں طبقے کو دعوت فکر و عمل دے رہا ہے۔ اختر صاحب کو اس فکر انگیز اشاریے کے لیے دلی مبارک باد۔

شعری حصہ (تکلف برطرف) کچھ بے جان رہا۔ بیتاب جمشید پوری کی غزل کے مقطع کا مصرع اولیٰ "ان کی جھوٹی سی تسلی دل کو بیتاب بھا گئی" بیتاب کے آخری حرف "ب" کے سقوط سے خارج از وزن ہو گیا ہے۔ شعریت کی بحث سے قطع نظر میرا خیال ہے بیتاب صاحب کے الفاظ کی ہی ذرا سی تقدیم و تاخیر مصرع کو اس عیب سے بچا سکتی تھی۔ مثلاً: "دل کو بیتاب ان کی جھوٹی سی تسلی بھا گئی"۔

کیلاش چندر ناز کی نظم کا ایک مصرع ہے: "تو راحتوں کی کوئی بھی نشانیاں نہیں رہیں"۔ مصرع میں صیغۂ واحد "کوئی" اور صیغۂ جمع "نشانیاں" یکجا ہو جانے سے شتر گربہ در آیا ہے اس کے علاوہ ایک شعر میں "بدلتی" کا قافیہ "امنڈتی" نظم کیا گیا ہے جو ایطا کا نمونہ ہے۔

سہیل ارشد صاحب نے اپنی نظم "نظام" (بہ رنگ غزل) کے شعر کے مصرع اولیٰ میں لفظ "شمع" کو بروزن سحر (فعل بہ حرکت عین) نظم کیا ہے جب کہ ثقہ شعرا کے نزدیک "شمع" (بہ سکون میم و عین) بروزن رات افاعیل صحیح تسلیم کیا گیا ہے۔ سہیل صاحب کا مصرع: "نکلنا وہ یکہ شمع جگنوؤں کا" ذرا سی ترمیم کے ساتھ یوں بھی کہا جا سکتا تھا۔ "یہ شمع وہ جگنوؤں کا نکلنا"

شفیع اللہ خاں راز اٹاوی کی غزل بہت عمدہ ہے۔ نیز محمد تاثر ناگپوری کی غزل جو بحر قریب اخرب، محذوف، مجنون محذوف مسکن، دوازدہ رکنی ہے (مفعول فعولن فعلن)۔ مصرع میں دو بار اور شعر میں چار بار ان کی کہنہ مشقی کے ساتھ جدید لب و لہجے اور ندرت فکر کی آئینہ دار ہے۔

نسیم انور ۳۴۹ چوک حاجی پورہ فیروزآباد

● اشاریے کے تحت ماسٹر اختر صاحب نے اردو کو درپیش جن مسائل کا ذکر کیا ہے اس کا احساس اردو کے ہر ہوشمند خیر خواہ کو ہونا چاہیے۔ آج اردو اپنے وجود کی فیصلہ کن لڑائی لڑ رہی ہے اور اپنے ہی مولد و مسکن میں جلاوطنی اور بیخ کنی کی سازشوں کا براہ راست نشانہ بنی ہوئی ہے۔ مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اردو کی روٹی کھانے والے زیادہ تر عہدے داران اور اساتذہ اپنی دکان چمکانے میں لگے ہوتے ہیں:

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

آج اردو محض مشاعروں، سیمناروں اور سطحی تحقیقی مقالوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ان میدانوں میں بھی MEDIOCRES کا طوطی بولتا ہے۔ چند نام ہیں جو سکۂ رائج الوقت بن گئے ہیں اور جن کے قصیدہ خوانوں اور خوشامد خوروں کے اپنے اپنے طائفے LOBBIES ہیں جو اپنے امیدواروں

کی خدمات (جن کی بجا آوری کی غلطی ان سے کبھی سرزد نہیں ہوتی) گنوانے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں - کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو کے لکچرار کی حیثیت سے کام کرنے والا ہر کس و ناکس خود کو ادیب، محقق، ناقد اور نہ جانے کیا کیا سمجھنے لگتا ہے خواہ وہ میاں خوجی کی طرح "ہوش و حواس" کو "حوش و ہواس" ہی کیوں نہ لکھتا ہو۔ اردو میں ایم - اے اور ریسرچ کرنے والوں میں اکثریت ان کی ہوتی ہے جو دوسرے مضامین میں اپنی نااہلی پر پردہ ڈالنے کے لیے اردو کا سہارا لیتے ہیں اور اپنے جہل نواز اساتذہ کی خوشنودی کسی طور حاصل کرکے اپنے نام کے پہلے "ڈاکٹر" کا اضافہ کرنے اور انہی کی سفارشوں پر کالج میں اردو کے لکچرار کی حیثیت سے تقرری پانے کے لیے جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ کم از کم بہار کے مسلم طلبہ میں اکثریت ان ہی کندہ ناتراش کی ہے - اردو کو پہلا خطرہ ان ہی سہل پسند لوگوں سے ہے جو صحیح اردو لکھنا تو درکنار بولنا ہی نہیں جانتے ۔

کم از کم اردو زبان میں نثری نظم کے لیے کوئی مستقل جگہ شاید کبھی نہ مل پائے، یہ صنف بہت جلد اپنی موت آپ مرجائے گی۔ ادبی رسائل میں ان کی اشاعت اس بات کی دلیل ہرگز نہیں کہ ان کی مقبولیت بڑھ رہی ہے - یہ اشاعتیں محض تجرباتی ہیں یا پھر خانہ پری کے لیے - گوپی چند نارنگ کا مضمون پسند آیا - جس طرح SHAKESPEAR کے ڈرامے JULIUS CEASAR کا کردار انطانی (ANTONY) سیزر کے قتل کے بعد اپنی تقریر میں بروٹس (BROTUS) کو بار بار معزز آدمی (HONOURABLE MAN) کہتا ہے - اسی طرح نارنگ صاحب نے کم از کم چار بار کہا ہے کہ "میں ان سب کا قدردان ہوں - معترف ہوں" وہ خوب لکھ رہے ہیں اور میں ان سب کی قدر کرتا ہوں۔ بہتر ہے کہ اس طرح کے ستم ظریفانہ (IRONICAL) انداز بیان کے بجائے تنقیدی مضامین میں بے لاگ اور دوٹوک طرز اپنایا جائے ۔ نثری نظموں کی شمولیت میں احتیاط برتیں - اردو میں نثری نظموں کا کوئی RELEVANCE نہیں۔ اس صنف نے ہر کس و ناکس کو شاعر بنا دیا ہے - چار بے تکے جملوں کو چھوٹی بڑی سطروں میں اوپر نیچے لکھ دیجیے - ایک نثری نظم تیار ہوگئی - یہ اردو شاعری کی عظیم روایت کا مذاق اڑانا نہیں تو اور کیا ہے - زبان زد ہوجانا اردو شاعری کی خصوصیت رہی ہے - نثری نظمیں اس خصوصیت سے یکسر عاری ہوتی ہیں۔ آزاد نظموں کی میں مخالفت نہیں کرتا بشرطیکہ ان میں بحر ہو - بیشتر ترقی پسند شعرا نے کامیاب آزاد نظمیں لکھی ہیں جو آج بھی حد درجہ مقبول ہیں ۔

حسن بن جمیل، مظفر پور (بہار)

● نومبر ۱۹۹۲ء کا "کتاب نما" دسمبر کے شمارے کے بعد اب میرے مطالعہ میں آیا ہے۔ ص۸۱ اور ص۸۲ پر رؤف خیر کا مراسلہ پڑھ کر ہنسی آئی اور افسوس ہوا - انھوں نے خواہ مخواہ کی باتیں کہی ہیں - مظہر امام نے خود کو آزاد غزل کا بانی منوانے کے لیے مضمون "اردو ادب

میں اولیت کے سہرے" نہیں لکھا ہے بلکہ
انھوں نے ایک نیا پہلو تلاش کر کے تحقیق
کرنے والوں کے ذوقِ جستجو کو مہمیز کیا ہے۔
جہاں تک آزاد غزل کی بات ہے۔ اردو
کے محققوں اور ناقدوں کا بلکہ شاعروں کا
بھی متفقہ فیصلہ اور رائے ہے کہ مظہر امام اس
صنف کے بانی ہیں۔ رؤف خیر نے ہوا
میں بھوت بھانجتے کر یہ لکھ دیا کہ مظہر امام
کی آزاد غزل سے "پہلے اور شاعروں کی
آزاد غزلیں چھپ چکی تھیں" انھوں نے
وضاحت اور صراحت نہیں کی کہ یہ اور
شاعر کون کون تھے؟ مظہر امام کی آزاد غزل
جنوری ۱۹۴۵ء کی ہے۔ علیم صبا نویدی کا
مجموعہ ۱۹۷۹ء میں چھپا جب کرامت نئی کرامت،
زریبنہ ثانی، یوسف جمال وغیرہ اس صنف
کو مقبولیت عطا کر چکے تھے۔ میں نے ہزاری باغ
سے ۱۹۷۰ء میں "گہوارہ" نکالا تھا اور
آزاد غزل کی بحث چھیڑتے ہوئے اس
صنف کے لیے صفحات وقف کیے تھے تب
علیم صبا نویدی آزاد غزل کی طرف متوجہ
ہوئے تھے۔ انھوں نے زود گوئی سے کام
لیتے ہوئے آزاد غزلیں کہیں اور ۱۹۸۰ء میں
اپنا مجموعہ چھپوایا جس میں سنہ اشاعت
۱۹۷۹ء دیا تھا۔ اس سے قبل آزاد غزل
اپنا نام چمکا چکی تھی۔ رؤف خیر غلط بیانی
سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "مظہر امام
نے یہ مضمون محض اپنے آپ کو آزاد غزل کا
بانی قرار دینے کے لیے لکھا ہے۔ باقی اصناف
سخن کا ذکر ذیلی نوعیت کا ہے" جبکہ
حقیقت یہ ہے کہ مظہر امام کے اس طویل
مضمون کی آخری تین سطروں میں ہی آزاد
غزل کا ذکر آیا ہے۔

رؤف خیر کا ایک اعتراض یہ ہے کہ
"شاد عظیم آبادی کو بھی نئی غزل کا بانی
سمجھنا۔ علاقائی عقیدت" پر دال ہے۔
مظہر امام کو میں گزشتہ تین دہائیوں سے
قریب سے جانتا ہوں۔ اسی تعلق کی روشنی
میں میں بلا جھجک کہہ سکتا ہوں کہ وہ
علاقائی عصبیت "علاقائی ذہنیت" علاقائی
عقیدت" وغیرہ سے ہمیشہ دور رہے ہیں۔
اتفاق سے شاد عظیم آبادی بہار کے تھے اور
مظہر امام بھی بہار کے ہیں۔ اسی لیے رؤف خیر
نے اپنی ذہنی عصبیت کا ثبوت دیتے ہوئے
دل کا چور ظاہر کر دیا ہے۔ مظہر امام نے
شاد عظیم آبادی کو حسرت کے حوالے سے
ان کا پیش رو کہا ہے۔ اس میں علاقائی
عقیدت" کہاں سے آگئی؟

رؤف خیر نے اردو کے پہلے
ڈراما کے سلسلے میں اعتراض کرتے ہوئے
لکھا ہے کہ "اردو ڈرامے کی اولیت کا
سہرا وہ فی الحال سجاد سنبل (۱۸۶۴) کے
ڈراما نگار کیشورام بھٹ کے سر باندھتے
ہیں ....." رؤف خیر کا یہ جملہ گمراہ
کن ہے۔ مظہر امام نے سجاد سنبل" کو
اردو کا پہلا ڈراما نہیں بلکہ جدید طرز کا
پہلا ڈراما قرار دیا ہے۔ مظہر امام کا جملہ دیکھیے جدید طرز اور کلاسیکی
انداز کا فرق اگر رؤف خیر کو نہیں معلوم ہے
تو اس میں مظہر امام کا کیا قصور ہے۔
میں بتاتا
چلوں کہ کیشورام بھٹ مہاراشٹر کے برہمن
تھے۔ ان کی پیدائش بہار شریف میں ۱۸۵۲ء
میں ہوئی تھی۔ ان کے بڑے بھائی شری

بانکشن بھٹ کلکتہ سے ہندی اخبار "بہار بندھو" نکالا کرتے تھے۔ ۱۸۷۴ء میں پٹنہ سے خودکیشورام بھٹ نے اس اخبار کو شائع کیا تھا۔ انھوں نے "مشیر بہار" کے نام سے بھی اردو رسم الخط میں ۴ صفحے کا اخبار نکالا تھا۔ وہ اردو، ہندی اور بنگلہ زبان پر مہارت رکھتے تھے اور تینوں زبان میں لکھتے تھے۔ تینوں زبان میں ان کی کتابیں موجود ہیں۔ ان کا انتقال ۱۹۱۵ء میں ہوا تھا۔ انھوں نے "سجاد سنبل" اردو میں ۱۸۷۴ء لکھا جو پہلی دفعہ ۱۸۷۶ء میں اسٹیج پر کھیلا گیا۔ پھر ۱۸۸۳ء میں دیوناگری رسم الخط میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ اس کا دوسرا اڈیشن ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا جس کا سائز ۱۲×۲۲ سینٹی میٹر میں ہے اور ۱۴۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ڈراما چھ ایکٹ پر محیط ہے۔ پہلے، دوسرے اور تیسرے ایکٹ میں چار چار سین ہیں اور چوتھے، پانچویں اور چھٹے ایکٹ میں پانچ پانچ سین ہیں۔

مظہر امام کے مضمون میں "ترائیلے" کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن رؤف خیر نے اپنے مراسلے میں زبردستی ترائیلے کو گھسیٹ لیا ہے اور یہ جتانے کی کوشش کی ہے کہ ترائیلے میں انھوں نے بھی تجربے کیے ہیں۔ رؤف خیر نے لکھا ہے کہ "اردو میں ترائیلے نگاری کا آغاز نریش کمار شاد نے کیا۔ پھر مدراس ہی کے فرحت کیفی (مرحوم) کا ایک مجموعہ "پتہ پتہ بوٹا بوٹا" شائع ہوا تھا۔" رؤف خیر نے اپنے "ادھ کچے" مطالعہ کا ثبوت دیا ہے اور مضحکہ خیز انکشاف کیا ہے۔ نریش کمار شاد سے قبل خود مظہر امام نے ترائیلے میں تجربہ کیا تھا۔

۲۸ اگست ۱۹۴۶ء کو انھوں نے ترائیلے لکھی تھی۔ تاریخ تحریر کے ساتھ یہ ترائیلے ان کے مجموعہ کلام "زخم تمنا" (۱۹۶۲ء) میں موجود ہے۔ مظہر امام کے ساتھ ساتھ احمد ندیم قاسمی کے دو ترائیلے ۱۹۴۶ء کے "نیا دور" بنگلور (مدیر صمد شاہین) میں ملتے ہیں۔ ان دونوں ترائیلے کے نیچے بریکٹ میں لکھا ہوا ہے۔ (فرانسیسی شاعری کی ایک صنف)۔ ان ہی دنوں عطا محمد شعلہ کے ترائیلے بھی "نیا دور" بنگلور میں چھپے تھے۔ نریش کمار شاد کے ترائیلے بہت بعد کے ہیں۔ اور فرحت کیفی کے ترائیلوں کا مجموعہ ۱۹۶۴ء کے آس پاس چھپا تھا۔ "ایلاف" کی اشاعت جنوری ۱۹۸۲ء کی ہے۔ اس میں جمیل شیدائی نے پیش لفظ کے تحت اردو ترائیلے کی تاریخ پر ایک لفظ بھی نہیں لکھا ہے۔ جہاں تک سانیٹ کی بات ہے، رؤف خیر کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مظہر امام کا ایک سانیٹ ماہنامہ "حرم" لاہور کے اگست ۱۹۴۷ء کے شمارہ میں ملتا ہے۔ ممکن ہے، اس سے قبل بھی مظہر امام کے سانیٹ چھپے ہوں۔ وہ دہلی میں بس گئے ہیں اس لیے اس مراسلہ کو لکھتے وقت میں ان سے رابطہ قائم نہیں کر سکا ہوں۔ رؤف خیر میرے دوست ہیں۔ میری فرمائش پر انھوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی آزاد غزل میں تجربہ کیا تھا۔ لیکن اس مراسلہ میں اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لیے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ گمراہ کن اور طفلانہ ہے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، مارواڑی کالج بھاگلپور (بہار)

ہزاروں خواہشیں

مترجم: مسعود احمد برکاتی
قیمت: ۹ روپے
مبصر: ڈاکٹر ممتاز احمد خاں
ناشر: مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دلی ۲۵

مسعود احمد برکاتی گوناگوں مصروفیات کے باوجود ایک ایسا کام کر رہے ہیں جس کی ادب میں بہت قدر و قیمت ہے۔ انگریزی ناولوں کا ترجمہ کرنا ویسے ہی دقت طلب مسئلہ ہوتا ہے کجا یہ کہ ترجمہ بچوں کے لیے کیا جائے۔ "ہزاروں خواہشیں" عظیم انگریز ناول نگار، چارلیس ڈکنس کے ناول گریٹ ایکسپیکٹیشنز (GREAT EXPECTATIONS) کا ترجمہ بچوں اور بڑوں دونوں کے لیے دلچسپی کا حامل ہے۔

مغرب میں تراجم کا کام دو سطحوں پر انجام پاتا ہے۔ ایک سطح تو یہ ہے کہ بڑوں کے لیے مختلف یوروپی زبانوں کے ناولوں کا ایک دوسرے کی زبانوں میں ترجمہ کیا جائے۔ اس کے لیے عموماً فرانسیسی، جرمن، ہسپانوی، روسی اور انگریزی زبانوں کے ناولوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ دوسری سطح پر یہی ناول بچوں کے لیے آسان، شستہ اور ان کی فہم پر پوری اترنے والی زبان میں ترجمہ کیا جاتا ہے تاکہ بچہ ایک خاص پرکشش دنیا میں کھو جائے۔ مسعود احمد برکاتی دوسری سطح کے اہم کام میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ ان کے تراجم رسالہ "پیام تعلیم" میں چھپ کر بعد میں کتابی صورت میں بھی منظر عام پر آتے ہیں۔ اس طرح قطرہ قطرہ سمندر بن جانے کے مرحلوں کے تحت ایک زمانے میں خاصے اچھے انگریزی ناول بچوں کے دسترس میں آجائیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ عام لوگوں کے نزدیک اس کام کی اس وقت اہمیت نہ ہو لیکن بچوں کے ادب سے متعلق عام قارئین، نقاد اور محققین اس کی اہمیت سے خوب واقف ہیں اور ایک زمانے میں جاکر اس کی تاریخی اہمیت یقیناً بنے گی۔

ترجمے کی اصل اہمیت یہ ہے کہ آپ اسے اس کی اصل روح کے مطابق دوسری زبان کے بچے کے لیے ڈھال دیں۔ سو اس میدان کے مسعود احمد برکاتی بڑے شہسوار

ہیں۔ راقم الحروف نے ڈکنس جیسے عظیم ناول نگار کے چند ناول اپنی طالب علمی کے دوران پڑھے تھے اور یہ اندازہ لگایا تھا کہ انھیں اردو کے قالب میں ڈھالنا اتنا آسان نہ ہوگا خاص طور پر "اے ٹیل آف ٹو سٹیز" (A TALE OF TWO CITIES) کا جو فرانسیسی انقلاب کے پس منظر میں تحریر کیا گیا ناول ہے۔ لیکن مسعود احمد برکاتی جیسے مخلص ادیب اس قسم کے مرحلوں سے آسانی سے گزر جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ بی.بی.سی. ٹیلی وژن نے ڈکنس کے ناولوں کو ان کی آفاقی حیثیت کے پیش نظر خوب صورتی سے فلمایا ہے۔

ناول بجائے خود ایک بڑی صنف ادب ہے۔ یہ مسلسل قصے کا دوسرا نام ہے۔ ایک اچھا ناول ہمیں زندگی کی بصیرت عطا کرتا ہے۔ ایک اچھا مترجم یہ بصیرت انتہائی سادگی اور فن کاری سے بچوں میں بھی منتقل کر سکتا ہے۔ اس سے قبل بھی ترجمہ کردہ ناولوں میں مسعود احمد برکاتی نے یہ فریضہ بخوبی انجام دیا ہے۔

مسعود احمد برکاتی سے یہ توقع کی جائے گی کہ وہ اس سلسلے کو جاری رکھیں گے اور دیگر ناول نگاروں مثلاً ہرمن میلول، ڈینیل ڈیفو وغیرہ کی جانب بھی توجہ کریں گے۔

کتاب خوب صورت چھپی ہے۔ اس کی قیمت بھی مناسب ہے۔ مکتبہ پیام تعلیم جو بچوں کے ادب کے ضمن میں خاص خدمات انجام دے رہا ہے اور جس نے لگ بھگ تین ماہ میں بچوں کے لیے ساٹھ نئی کتابیں شائع کی ہیں۔ درخواست ہے کہ وہ آیندہ بھی اس قسم کی کتابوں کی قیمت کم سے کم رکھے تاکہ یہ بچوں کے وسیع تر حلقوں میں رسائی حاصل کر سکیں۔

ترجمانِ رموزِ بے خودی
(ترجمہ)

مترجم:۔ پروفیسر غلام دستگیر شباب
ناشر:۔ ظفر اقبال، ۲/۱ شانگریلا اپارٹمنٹ، بنڈر گارڈن روڈ، پونہ۔
سنہ اشاعت: اگست ۱۹۹۱ء
قیمت:۔ ساٹھ روپے۔

خوبصورتی سے چھپی ہوئی یہ کتاب اردو کے نہایت معتبر مترجم کا کارنامہ ہے جنھوں نے اقبال کی فارسی کتاب رموزِ بے خودی کا اردو ترجمہ نثر میں کیا ہے۔ اور ساتھ ساتھ فٹ نوٹس میں قرآن شریف کی وہ آیتیں بھی دی ہیں جن کا تعلق اشعار سے ہے۔

ترجمہ کی نثر کی خوبی یہ ہے کہ نثر ہوتے ہوئے بھی اقبال کی شاعری کا سوز اور قربت خدا کا احساس ہوتا جاتا۔ ترجمے کی نثر کی شعریت نے اسے محض ترجمہ نہیں رہنے دیا ہے بلکہ اسے تخلیق سے قریب کر دیا ہے۔

آج جب اردو ہی کتنے لوگوں کو آتی ہے۔ اقبال کی فارسی شاعری سے نامانوس اور بے تعلق ہونا عام سی بات ہوگئی ہے۔ اقبال جیسے مفکر شاعر کے فارسی کلام تک

اب بہت کم لوگوں کی رسائی ہو سکتی ہے اس لیے اس ترجمے کی افادیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

دونوں زبانوں پر یکساں قادر عالم نے کتنی عرق ریزی اور محنت کے ساتھ یہ ترجمہ کیا ہے یہ سوچ کر اس عالم کے لیے دل سے دعا اور ذہن سے داد نکلتی ہے۔

مترجم مذکور کے دو سہ رے ترجمے میں شائع ہو کر اردو والوں کے سامنے آچکے اور رباعیات عمر خیام کا رباعی کی بحر ہی میں منظوم ترجمہ بادہ خیام کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ترجمہ کرنے کا بے پناہ اور قابل رشک صلاحیت رکھنے والے ایسے عالموں کی اردو دنیا کیا قدر کرے گی جب کہ ہر طرف شاہ کو دعا اور عوض میں وظیفے کا رواج عام ہو گیا ہے سیاسی جلسہ سرکاری ایوارڈ اور تحفے خود اردو والوں کے توسط سے تقسیم کراتے ہیں اور اردو میں بڑے کام کرنے والے کام کو ہی انعام سمجھتے ہوئے اردو کے لیے کچھ کرتے رہنے کو بڑی سعادت کا کام سمجھتے ہیں۔ شہاب ایسے افراد میں بڑا نام ہے۔

تنقید نامہ

مصنف: پروفیسر عنوان چشتی
قیمت: ۸۰ روپے
پتا: اردو سماج بی ۱۱۷، جامعہ نگر، نئی دلی۔ ۲۵
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دلی۔ ۲۵
مبصر: صفدر حسین رضوی

"تنقید نامہ" پروفیسر عنوان چشتی کی نئی سوچ اور نئی فکر کا اشاریہ ہے، جس میں مختلف موضوعات کے تحت انھوں نے اپنے سماجی شعور، اور تنقیدی بصیرت کا بھرپور ثبوت دیا ہے۔ ادب کے افہام و تفہیم کے لیے ان کا یہ زاویہ نظر اس لیے بھی قابل ستایش ہے کہ انھوں نے دبستانی حد بندیوں کو توڑا ہے، اور متعدد اصولوں کو اخذ کر کے ایک منفرد انتخابی طریقہ کار اپنایا ہے۔ جب کہ آج کی ادبی دنیا دبستانوں کے انتشار میں گم ہے۔

یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں "انسانیت بحران کی زد میں"، "مرزا غالب" اصلاح سخن"، "مومن: پیکر تراشی"، "مولوی عبدالحق: تنقید نگاری"، "حسن نظامی: شخصیت اور فکر و فن"، "مسعود حسین خاں: مرقع نگاری"، جدید اردو غزل: مغربی بنگال میں"، "ہم عصر اردو غزل: دہلی میں" شامل ہیں۔ دوسرے حصے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے فکر و فن پر تین مضامین "ابوالکلام آزاد: صوفیانہ رجحان" ابوالکلام آزاد ایک ہمہ جہت شخصیت" ابوالکلام آزاد: نظریہ اتحاد" شامل ہیں۔ تیسرے حصے میں چھے مختصر مضامین شامل ہیں۔ مثلاً "مرزا مظہر جانِ جاناں"، "سراج اورنگ آبادی" "شاہ نصیر (۱) شاہ نصیر (۲)" "مرزا غالب" اور "احسن مارہروی"۔ یہ مضامین اختصار پر مبنی ہوتے

ہوئے بھی اہم مواد پر مبنی ہیں۔ یہ بنیادی طور پر ریڈیائی تقریریں ہیں۔ چوتھا حصہ تجزیے اور سوانحی خاکہ پر مشتمل ہے۔

مصنف نے "تنقید نامہ" میں شاعری کی حسن و قبیح پر کھلے لفظوں میں بحث کی ہے اور شاعری کے لیے جو اصول مرتب کیے گیے ہیں، جن پر شعرائے قدما رچلے اور شاعری کو ایک خوبصورت پیراہن بخشا تھا۔ اس کو مصنف نے اپنے مخصوص زاویہ نظر سے نئے مواد کی روشنی میں دیکھا ہے۔ جو بالکل نئی اور منفرد چیز ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان سارے لوازمات کے بغیر شاعری ہر دور میں ادھوری رہی ہے۔ ان کی نظر میں علم لغت علم بیا علم قواعد، علم بدیع، اور علم عروض و قافیہ کی صلاحیت ہر شاعری کے اندر ہونی چاہیے ورنہ وہ شاعری کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتا۔ مصنف نے پیکر تراشی کے مفاہیم اصول و نقد کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ اور پیکر تراشی کے ان مختلف مطالب و مفاہیم کو پیش کرتے ہوئے ایک جامع مفہوم بھی پیش کیا ہے، جو شاعر کے تخلیقی عمل سے وابستہ ہوتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی تنقید نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے تنقیدی رویے کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ مولوی عبدالحق کی تنقیدی بصیرت میں فن کار کی شخصیت اس کے ماحول اور عہد نیز ذریعۂ اظہار کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کا تنقیدی نظریہ نفسیاتی تنقید، تاریخی تنقید اور کلاسیکی تنقید پر مشتمل ہے مصنف کا خیال ہے کہ عبدالحق کی تنقید تحریروں میں نفسیاتی اور سماجی تنقید کا شعور کم ہے۔ لیکن ساتھ ہی مصنف نے ان کی تنقید تحریروں میں زبان کی صحت اور بیان کی لطافت کی تعریف بھی کی ہے۔ اور ان کے اس اندا تحریر کو کلاسیکی تنقید سے جوڑا ہے۔

پروفیسر عنوان چشتی خود ایک تصوف پسند ادیب ہیں۔ انھوں نے اس کتاب میں حسن نظامی کی شخصیت اور ان سے فکر و فن کو بھرپور طریقے سے اجاگر کیا ہے۔ اور ان کے ظاہری و باطنی زندگی کے متعلق ایک سوانحی خاکہ پیش کیا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کے فن کا موا ہیئت اور اسلوب کے سطح پر تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے ان کے مقام اور مرتبے تعین کیا ہے۔

اس کتاب میں مصنف نے مرقع نگاری پر ایک خیال انگیز بحث کی ہے۔ ان کے خیال میں مرقع نگاری کا فن سوانح نگاری نہیں، مگر اس سے الگ بھی نہیں ہے۔ اس میں سوانحی رنگ ہوتا ہے، مگر یہ خالص سوانح نگاری بھی نہیں۔ یہ فن خود نوشت بھی نہیں ہے مگر اس سے کلیتاً بے نیازی بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ مرقع نگاری کے ڈانڈے ایک طرف سوانح نگاری، خود نوشت اور تاریخ نگاری سے ملتے ہیں۔ اور دوسری طرف یہ فن ایک آزاد، خود مکتفی اور جمالیاتی اظہار ہے۔ جس میں معروضیت اور موضوعیت داخلیت اور خارجیت نیز سراپا نگاری کا حسین امتزاج ہے۔ پروفیسر عنوان چشتی نے اس طرح سے مرقع نگاری کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ اور "دردِ مسعو

کا فکر و فن کے اعتبار سے بھرپور جائزہ لیا ہے۔

مصنف نے مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت، ان کے نظریہ اتحاد، اور ان کے صوفیانہ رجحان کو نقد و نظر کی روشنی میں دیکھا ہے۔ ان کے متعلق مصنف کا نظریہ کچھ اس طرح کا ہے کہ مولانا کا مزاج ادب اور زندگی میں تصوف سے قریب تر ہے۔ مثلاً جہاں درباری عالموں کا ذکر آتا ہے تو مولانا کا قلم آگ اگلنے لگتا ہے۔ جہاں بنیاد پرستوں اور ادعائیت پسندوں کی بات آتی ہے، تو مولانا کی تحریر خون آشام ہو جاتی ہے۔ اور مولانا ان کے انداز فکر پر جم کر وار کرتے ہیں اور ان کی شخصیت پر بڑے دل نواز انداز میں طنز بھی کرتے ہیں۔ لیکن جہاں صوفیا اور علمائے حق کا ذکر آتا ہے اور ان کے لیک دار تیز نرم و سیع تصورات کی بات ہوتی ہے۔ وہاں مولانا آزاد کا قلم رقص کرنے لگتا ہے۔ اور ان کی تحریریں پھول برسانے لگتی ہیں۔ یہی وہ انداز ہے جو مولانا کے متصوفانہ رجحان فکر کی غمازی کرتا ہے۔ آزاد کی شخصیت غیر معمولی اور ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے جس نے ادب، تہذیب، مذہب، سیاست اور سماج کے مختلف میدانوں میں اپنے تخلیقی جوہر، بصیرت اور موزوں طرز کار سے سماج اور زندگی کے دامن پر اہم اور اثر انگیز، دیرپا اور دور رس نقوش بنائے ہیں۔ پروفیسر عنوان چشتی نے انھیں نظریات کو اصول نقد کی روشنی میں ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی قاضی عبد الغفار کی تحریروں کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔

مولانا نظریہ اتحاد کے حامل تھے اور انھوں نے اس نظریہ پر خود بھی عمل کیا ہے۔ ان کے یہ سارے نظریات قرآن و حدیث کی روشنی میں فیض اٹھاتے ہیں۔ مصنف نے مولانا آزاد کے انھیں نظریات کو اپنی تنقیدی بصیرت کی روشنی سے منور کیا ہے۔ اور جب کہ مصنف خود بھی ایک اتحاد پسند ادیب ہیں اور اخوت و مساوات کے حامی ہیں مولانا آزاد سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ مصنف نے مولانا آزاد کو ایک تصوف سے بھرا انسان قرار دیا ہے۔ جو حق بجانب ہے۔ جس کا فیصلہ دور حاضر کے دیگر علمائے تنقید نے ابھی تک نہیں کیا تھا، لیکن پروفیسر عنوان چشتی کی دور بین نظریں ان گوشوں تک پہنچنے میں کامیاب رہی ہیں، جہاں تک دیگر مصنفین ابھی تک پہنچنے سے قاصر رہے ہیں۔

"تنقید نامہ" ایک بہترین تنقیدی کتاب ہے، جو سیاست، سماج، مذہب اور علم و فنون کے مختلف گوشوں کو مدلل طریقے سے اپنی آغوش میں سمیٹے ہوئی ہے۔ تعارف و تبصرہ پر مبنی مختلف شعرا کی حالات زندگی اور ان کی شاعری، اور اس کی حسن و قبح پر بھی بھرپور طریقے سے غمازی کرتی ہے، آخری حصے میں مصنف کا سوانحی خاکہ بھی پیش ہے، جس سے ان کی علمی بصیرت، اعزاز و انعامات اور ان کے تصانیف وغیرہ پر روشنی پڑتی ہے۔ اور ان کی زندگی کے متعدد گوشے سامنے آتے ہیں۔

چند اہم کتابیں

اجنبی شہر عبدالقوی دسنوی
یہ قوی صاحب کی خود نوشت نہیں لیکن اس کا ایک حصہ ضرور ہے۔ اس میں سیفیہ کالج اور بھوپال سے ان کے والہانہ عشق کا اظہار ہوتا ہے۔
قیمت ۔/۱۵ روپے

فرعون (ڈراما)
رشید انجم
حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی تاریخی و مذہبی کشمکش پر ایک طویل ڈراما قیمت ۔/۵ روپے

کلیات عزیز وارثی
مرتبین:
ثاقب صدیقی / انیس احمد
اس مجموعے میں عزیز وارثی مرحوم کی غزلیں نظمیں اکٹھا کر دی گئی ہیں۔ قیمت ۔/۹۰ روپے

شاخ گل
رفعت سروش
رفعت سروش اب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ "شاخ گل" آپ کا تازہ ترین شعری مجموعہ ہے
قیمت ۔/۷۵ روپے

ادیبوں کے لطیفے
مرتب: کے۔ ایل نارنگ ساقی
اردو کے ممتاز ادیبوں کے دلچسپ لطیفوں کا مجموعہ
قیمت ۔/۸۰

افسانے کے معمار
ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی
اردو افسانے کی ابتدا، پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، رام لعل، ڈاکٹر بشیشر پردیپ اور علی عباس حسینی کے افسانوں پر سیر حاصل بحث۔
قیمت ۔/۳۰ روپے

اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ
ڈاکٹر محمود ہاشمی
اس کتاب میں اردو لغت نویسی کی ابتدائی نشان دہی منظوم نصاب ناموں سے کی گئی ہے اور خاص طور پر اردو لغت نویسی کا جائزہ لیتے ہوئے علمی معائب اور محاسن کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔
قیمت: ۔/۳ روپے

آنکھوں کے شہتیر رفیع الدین احمد
طنزیہ مضامین کا اہم مجموعہ
قیمت: ۔/۱ روپے

میرا مذہب محمد علی ردولوی
ادارہ تحقیقات اردو کی اہم کتاب۔ اس کتاب میں مصنف نے تحقیقی مسائل سے زیادہ اپنے مذہبی احساسات لکھے ہیں۔ قیمت ۔/۳۰ روپے

جھولا ذکی احمد
بچوں کے لیے دلچسپ اور اصلاحی نظموں کا مجموعہ۔ تعارف سید غیاث الرحمٰن غوثی۔
قیمت ۔/۵ روپے

ملنے کا پتہ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵

بزمِ خوش دِلان جودھ پور

سالِ نو کی آمد پر بزمِ خوش دلانِ جودھ پور کے زیرِ اہتمام یکم جنوری ۹۴ء کی سہ پہر کو بزم کے صدر جناب پریم شنکر سریواستو کی رہائش گاہ پر ایک خصوصی نشست منعقد کی گئی۔ بزم کے مہمانِ خصوصی تھے بزم کے سرپرست سابق فائننس منسٹر (حکومتِ راجستھان) محترم متھرا داس ماتھر نے صدارت فرمائی۔ جودھ پور کے اسّی سالہ بزرگ کہنہ مشق شاعر جناب ابوالاسرار صاحب رمزی آثادی نے، پروگرام کی نظامت پروفیسر مدن موہن ماتھر نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں سرانجام دی۔

بزمِ خوش دِلان کے صدر نے مہمانِ خصوصی اور نشست کے صدر کا و نیز بزم کے کل ممبران و دیگر شرکا کا استقبال نئے سال کے تازہ پھولوں کا گلدستہ پیش کر کے کیا۔ جودھ پور کی اس بزمِ مزاح کے انعقاد اور گزشتہ سات برس کی کارگزاریوں و سالِ رواں کے منصوبوں سے سامعین کو روشناس کروایا۔ اس کے بعد موصوف نے بزمِ خوش دلان کے اوّلین سرپرست محترم بی۔ پی۔ بیری صاحب (سابق چیف جسٹس، راجستھان) کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ تقریب کی کامیابی کی دعا کرتے ہوئے جسٹس بیری نے لکھا تھا "کاش میں جسمانی طور سے آپ کے اس پروگرام میں شریک ہو سکتا۔ تاہم آپ کی اس خصوصی پروگرام میں میری روحانی شرکت ضرور رہے گی۔ سیاسی تلا بازیوں نے ہمارے ملک کو تاریک غاروں میں دھکیل دیا ہے۔ ایسے زبوں حالات میں ظرافت و خوش دلی ہی ہمیں مایوس و ہراساں ہونے سے بچا سکتی ہے۔"

پروگرام میں شرکت کرنے والوں میں ہندی، اردو، اور راجستھانی کے کچھ مقامی اور کچھ نزدیک کے علاقوں کے نوجوان و بزرگ طنز و مزاح نگار (نظم و نثر) و لطیفہ گو شامل تھے۔ ان میں سے چند حضرات کے نام ہیں: پریم تن مئے، شکتی دان کویا، جگت پرکاش ماتھر، بھگوان سہائے تریدی (ریزیڈنٹ اڈیٹر راجستھان پتریکا) پارس رومانی، لیاقت اللہ خان صداقت اللہ خاں، فریدالدین فرید رتن لعل بدنام، ایس۔ آر۔ سنگھی، ایم ایل۔ شرما، ایم ایم ماتھر، ایس۔ این کنگر شاعر، ویریندر لٹو، گنپت سنگھ، ماہر رمزی اور طاہر رمزی۔

پریم شنکر سریواستو کے خاص اصرار پر نشست کے صدر جناب ابوالاسرار رمزی صاحب نے اپنے چنیدہ مزاحیہ اشعار سے سامعین کو محظوظ کیا

مہمانِ خصوصی جناب متھرا داس ماتھر نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہمارے ملک کی تاریخ میں ۱۹۹۲ء کا سال سب سے پراگندہ اور وحشت ناک سال گزرا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا نحوس سایہ نئے سال پر بھی پڑے۔ لیکن ہمیں اپنا ذہنی توازن برقرار رکھتے ہوئے ہنستے ہنستے اس آسیب کو کھدیڑ دینا چاہیے۔ متھرا داس ماتھر صاحب اپنی عمر کے ۷۶ ویں سال میں بھی زندہ دلی اور جوانوں کا سا جوش سلامت رکھے ہوئے ہیں۔ آپ نے کئی پُرلطف اشعار اور چٹ پٹے لطیفے سنا کر پوری محفل کو زعفران زار بنا دیا اور اس طرح جلسے کی کامیابی میں چار چاند لگا دیے۔

مہاراشٹر اردو اکیڈمی کے ممبران کا فیصلہ

بمبئی کے حالیہ مسلم کش تشدد نے ساری دنیا کے باخبر افراد کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ خصوصاً دانشوروں اور قلم کاروں نے اس تشدد کی سخت لفظوں میں مذمت کی ہے۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی کے اراکین نے بھی حکومت کی قاہرانہ روش کو دیکھ کر مستعفی ہو جانے کا فیصلہ کیا ہے۔

مستعفی ممبران کے نام ہیں: نیاض احمد فیضی، انور ظہیر، نور العین علی، کالی داس گپتا رضا، علی ایم شمسی، انجم رومانی، معین الحق چودھری ہارون بی۔ اے، لیٰسین مومن، بشیر احمد انصاری، فقیر محمد مستری۔

ادبی جوڑے کو امتیاز میر ایوارڈ

مرادآباد، دسمبر، آل انڈیا میر اکادمی لکھنؤ سے جاری ایک اعلامیہ کے مطابق شہر جگر کے ادبی جوڑے جناب ایم۔ شفیق انصاری ایڈووکیٹ، محترمہ قمر قدیر ارم کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے عوض "امتیاز میر ایوارڈ" سے نوازا جائے گا۔ اس ایوارڈ میں سند اور نقد انعام شامل ہے۔ آج اس امر کی اطلاع مندرجہ بالا اکادمی کے مرکزی دفتر سے موصول ہوئی۔ ایم۔ شفیق انصاری ایڈووکیٹ کی اردو زبان و ادب کی اہم علمی و ادبی خدمات میں اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلوانے کے لیے عملی کوششیں کرنا اور اسلامی قانون کو ۳ جلدوں میں اردو زبان میں منتقل کرنا شامل ہے۔ محترمہ قمر قدیر ارم اردو ادب کی مشہور و معروف افسانہ نگار و تبصرہ نگار ہیں۔ ان کی تالیف "چراغ شہر جگر کے" ہند و پاک میں کافی مقبول ہوئی ہے۔

ممتاز صحافی سابق اڈیٹر انقلاب نہیں رہے

ممتاز صحافی، سابق اڈیٹر "انقلاب" اور "کہکشاں" جناب شمیم زبیری کا ۱۷ر جنوری ۹۳ء کو بمبئی میں انتقال ہو گیا۔ بمبئی کا اردو داں حلقہ مرحوم کا بڑا قدر داں تھا۔ ہر ایک سے تعاون کرنا، خندہ پیشانی سے ہر ایک کا استقبال کرنا ان کی عادت میں شامل تھا۔ ادارہ کتاب نما، اور مکتبہ جامعہ مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے اور مرحوم کے پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

اختر الایمان حیات و شاعری

کے موضوع پر پی ۔ایچ ۔ڈی

پٹنہ یونی ورسٹی نے محترمہ شمشاد جہاں کو "اختر الایمان ۔ حیات و شاعری" کے موضوع پر لکھے گئے اُن کے تحقیقی مقالے پر پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی سند دی ہے ۔ یہ مقالہ ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، صدر شعبہ اردو پٹنہ کالج ،پٹنہ یونی ورسٹی کی نگرانی میں مکمل ہوا تھا ۔ مقالے کے ممتحن پروفیسر عنوان چشتی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دلی ۔ پروفیسر سید فضل امام الہ آباد یونی ورسٹی اور پروفیسر ممتاز احمد، پرنسپل پٹنہ کالج ،پٹنہ تھے ۔

اس سے قبل محترمہ شمشاد جہاں کے کئی اہم مضامین ملک کے مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں اور ایک پندرہ روزہ مزاحیہ اخبار "ملگدھ پنچ" ان کی ادارت میں تقریباً چھے برسوں تک پابندی سے شائع ہوتا رہا ہے ۔

طفیل ہوشیار پوری نہیں رہے

اردو کے بزرگ اور قابل احترام تاجر کتب جناب سردار موہن سنگھ مالک آزاد بک ڈپو امرتسر نے اپنے دکھے دل کے ساتھ یہ افسوسناک خبر دی ہے کہ طفیل ہوشیار پوری اڈیٹر ماہنامہ "محفل" لاہور ۴ /جنوری ۹۳ کو اللہ کو پیارے ہو گئے ۔ مرحوم اردو اور پنجابی کے ممتاز شاعر تھے ۔انتقال کے وقت آپ کی عمر ۸۰ سال تھی ۔ادارہ کتاب نما مرحوم کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے ۔

ممبئی میں اردو صحافیوں پر حملے

بمبئی کے حالیہ فسادات میں اردو بلٹز کے اڈیٹر اور ممتاز صحافی ہارون رشید کا گھر جلا دیا گیا ۔موصوف کی لگ بھگ ہزار کتابیں اور تمام سامان جلا کر خاک کر دیا گیا ۔روزنامہ "اردو ٹائمز" کے ذمے دار رپورٹر جناب فاروق العاری کے مکان کو بھی جلا دیا گیا ۔ اردو ٹائمز کے فوٹو گرافر عباس صباحت کی کار پریس میں روک لی گئی اور انہیں کھینچ لیا گیا مگر راہ گیروں نے انہیں بچا لیا ۔روزنامہ انقلاب کے پانچ کارکنوں کو بھی اپنے گھروں سے جان بچا کر بھاگنا پڑا ۔گرگام میں دو کارکنوں کے مکانوں پر اب دوسروں نے قبضہ کر لیا ۔ ایک اور جرنلسٹ جس کا مکان ناگپاڑہ میں ہے ،لوٹ لیا گیا وہ اب بیس کیمٹی کے کیمپ میں ہے ادارہ کتاب نما اپنے ان صحافیوں سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے ۔

"انشاء" عالمی اردو افسانے" کے لئے ف ۔س ۔اعجاز کو ڈنمارک سے ۵ ہزار روپے کا انعام

ماہنامہ "انشاء" کلکتہ کے "عالمی اردو افسانے" نمبر کو ڈنمارک کی جنوب ایشیائی لکھاریوں کی تنظیم "South Asian Writers Association" نے بھارت و پاکستان کے علاوہ یورپ میں شائع ہونے والے اردو ادبی ماہناموں میں "افسانوں کا بہترین نمبر" شائع کرنے اور اس طرح مشرق و مغرب کے اردو لکھاریوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کامیاب کوشش کو سراہتے ہوئے مدیر انشاء ف ۔

س۔ اعجاز کی خدمات کے اعتراف کے لیے پانچ ہزار روپے کا اعلان کیا ہے۔

واضح رہے کہ اس نمبر پر ماہنامہ انشاء کو اس سے پیشتر ہمدرد فاؤنڈیشن (نئی دلی) کی جانب سے ایک ہزار روپے کا انعام موصول ہو چکا ہے۔

محمد نورالہدیٰ یکتا پر

پی۔ ایچ۔ ڈی

جناب مفتاح الہدیٰ کو ان کے تحقیقی مقالے "محمد نورالہدیٰ یکتا" حیات اور شاعری" پر بہار یونیورسٹی مظفر پور نے پی، ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔ یہ مقالہ ڈاکٹر ایم، اے۔ ناز قادری کی نگرانی میں مکمل کیا گیا تھا۔

اُتکل یونیورسٹی سے اردو میں ڈاکٹریٹ

اتکل یونیورسٹی (بھوبنیشور) کے ایک اعلانیہ کے مطابق مدیر رسالہ شاخسار کی ادبی خدمات کے موضوع پر مبسوط تحقیقی مقالہ لکھنے پر جناب سلمان راغب کو پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے اقبال چیئر پروفیسر ڈاکٹر مظفر حنفی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دلی کے سابق صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی اس تحقیقی مقالہ کے ایگزامنر تھے اور شیل بالا ویمنز کالج کی صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر شیریں پروین نگراں تھیں۔

"ادیبوں کے لطیفے" کی رسم اجرا

کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی کی مرتبہ کتاب "ادیبوں کے لطیفے" کی رسم اجرا ۱۶ جنوری ۱۹۹۳ء کو دہلی کے سپرو ہاؤس میں نہایت سلیقے اور اہتمام کے ساتھ منائی گئی۔ خراب موسم کے باوجود وسیع ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تقریب تقریباً تین گھنٹے تک جاری رہی اور دہلی کے سامعین کو کئی خوشگوار لمحات عطا کیے۔ ملک کے موجودہ افسردہ حالات میں اس خوشگوار تقریب کو ایک خوشنما جزیرہ کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

تقریب کا اہتمام حلقہ ارباب ذوق نئی دلی نے کیا تھا۔ جس کی صدارت ممتاز مجاہد آزادی سابق گورنر اڑیسہ اور رکن پارلیمنٹ جناب بی۔ این پانڈے صاحب نے کی۔ انھوں نے صدارتی تقریر میں فرمایا کہ چند فرقہ پرستوں نے تمام ملک کو نفرت کی آگ میں جھونک دیا ہے، اگر ہم اب بھی حالات کی نزاکت کو محسوس نہیں کرتے تو ہماری تباہی یقینی ہے۔ پانڈے صاحب نے اپنی تقریر میں بعض دلچسپ لطیفے سنا کر محفل کو زعفران زار بنا دیا۔ جناب کمال الدین احمد مرکزی وزیر سول سپلائز نے اس کتاب کی رسم اجرا کرتے ہوئے حالیہ فرقہ وارانہ فسادات پر گہری تشویش کا اظہار کیا اور نارنگ ساقی کو ادیبوں کے لطیفے جیسی دلچسپ کتاب مرتب کرنے پر مبارک باد دی۔ اسی موقع پر مہمان خصوصی جناب جی۔ وینکٹ سوامی مرکزی وزیر دیہی ترقیات نے خصوصی سووینیر کا اجرا کرتے ہوئے فرمایا کہ موجودہ حالات میں ادیب اور شاعر قومی یکجہتی کو فروغ دے کر ملک کی بے پناہ خدمات انجام دے سکتے ہیں۔

جناب مالک رام صاحب نے ادب اور زندگی میں لطیفوں کی اہمیت کا ذکر کیا اور نارنگ ساقی کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔ جناب متین امروہی نے منظوم خاکہ پڑھا اور اردو کے دو ممتاز طنز و مزاح نگاروں جناب مجتبیٰ حسین اور جناب دلیپ سنگھ نے نارنگ ساقی کی شخصیت پر دلچسپ خاکے پڑھے جنھیں سامعین نے بے حد پسند کیا جناب شریف الحسن نقوی نے نظامت کے خوشگوار فرائض سرانجام دیے اور جناب ساحر ہوشیارپوری نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ جناب تحسین منور اور جناب سرفراز احمد نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ۲۰ ادیبوں کے لطیفوں میں سے بعض لطیفے اداکاری کے ذریعے پیش کرکے خوب داد تحسین حاصل کی۔

دوسرے دور میں مزاحیہ مشاعرہ منعقد ہوا، جس میں جناب ساغر خیامی۔ جناب دلکش آفریدی، جناب پاپولر میرٹھی۔ جناب اسرار جامعی، جناب متین امروہی اور بہت سے دوسرے شاعروں نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ یہ یادگار تقریب دہلی کی ادبی محفلوں میں ہمیشہ یاد رہے گی۔

ڈاکٹر حنیف ترین سنبھلی کے شعری مجموعے

رباب صحرا کی رسم رونمائی

اردو کے مشہور شاعر ڈاکٹر حنیف ترین سنبھلی (ڈاکٹر وزارت صحت، حکومت سعودی عرب ہیں) کے اولین شعری مجموعے رباب صحرا کی رسم اجرا اردو گھر نئی دلی میں سابق وزیر خارجہ جناب آئی۔ کے۔ گجرال کے دست مبارک سے ۲۷ نومبر ۱۹۹۲ء ۵ بجے شام انجام پائی۔

جلسے کی صدارت مشہور ادیب اور مجاہد اردو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے کی اور نظامت کے فرائض نامور شاعر جناب مخمور سعیدی نے انجام دیے۔ جن ناقدین نے حنیف ترین کے شعری محاسن کا انتقادی جائزہ پیش کیا، ان میں پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر عنوان چشتی، جناب مصور سبزواری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ جناب آنند نرائن ملا بحیثیت مہمان خصوصی شریک جلسہ ہوئے۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق جلسے کی صدارت جناب م۔ افضل صاحب ممبر پارلیمنٹ کو کرنا تھی جو میر محفل ڈاکٹر حنیف ترین کے عزیز ترین دوست ہیں مگر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ جیسے سینئر سیاست داں اور مجاہد اردو کی موجودگی میں انھوں نے کسر نفسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر گوڑ سے مسند صدارت پر جلوہ افروز ہونے کی مودبانہ درخواست کی۔

جلسے کی ابتدا میں جناب مخمور سعیدی نے تعارف پیش کیا۔ اس کے بعد جناب آئی کے گجرال نے کتاب کے باقاعدہ اجرا کی رسم ادا کی۔

ممتاز صحافی سلمان ماہمی کو ایوارڈ

"نوزان" ویکلی۔ تھانے (مہاراشٹر) کے ایڈیٹر جناب سلمان ماہمی کو ۱۴ نومبر کو بہترین صحافتی خدمات پر میرا ایوارڈ دیا گیا۔ ادارہ کتاب نما، پیام تعلیم اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ سلمان ماہمی صاحب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ موصوف کو اس سے قبل ۱۹۸۸ء اور ۱۹۸۱ء میں بھی ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے۔

ممتاز شاعر، ادیب اور تذکرہ نگار

رحمت امروہوی بھی پولس بربریت کا شکار

(ٹائمز آف انڈیا ۱۶ر جنوری ۹۲ء)

گزشتہ ۱۳ر جنوری کو گجرات کے ضلع احمدآباد کے قصبہ جوہا پورا میں پولیس نے اقلیت پر جو مظالم ڈھائے ان میں امن پسندی، انسان دوستی، یکجہتی اور اخوت کا درس دینے والے نیز ملک کے مختلف اداروں سے سات سات ایوارڈ یافتہ ۷۵ سالہ ضعیف العمر شاعر و ادیب جناب رحمت امروہوی صاحب کو بھی تعصب پسند اور جابر پولیس نے اپنی بربریت کا نشانہ بنایا۔ جناب رحمت صاحب قصبہ جوہا پورا میں واقع ویجل پور پولیس اسٹیشن کے قریب اپنے مکان میں اپنے دو سالہ پوتے اور بیٹے کی زوجہ کے ساتھ موجود تھے۔ پولیس فائرنگ کی آواز سن کر رحمت صاحب نے اپنے مکان کے دروازے بند کردیے۔ اسی اثنا میں پولیس کی بندوق سے نکلی ایک گولی نے کھڑکی کا کانچ چور چور کردیا اور کچھ شدت پسند پولیس نے رحمت صاحب کے مکان کا دروازہ بندوق کی بٹ سے توڑ دیا۔ اس وقت بیچارے خوف کے کانپ رہے تھے۔ موقع کی نزاکت کے تحت پوتے اور بہو کو غسل خانہ میں بند کردیا جو پولیس کے تشدد سے بچے رہے لیکن اس ضعیف العمر شاعر کو متعصب پولیس نے کالر پکڑ باہر گھسیٹا اور گھونسوں اور لاتوں سے زدوکوب کیا اور گالی گلوچ کیا۔ جب رحمت صاحب بے حال ہوگئے تو پولیس نے انھیں کانٹوں کے تار کے احاطے پر پھینکنا چاہا مگر اتفاقاً ایک پولیس افسر نے درمیان گیری کرکے بچا لیا۔ پھر بھی انھوں نے دو چار گھونسے رسید کر ہی دیے۔ اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ موصوف نے اپنی زندگی کے ۵۰ سال ادب کی خدمت میں گزارے ہیں۔ انھیں خدمات کی بدولت حکومت گجرات نے انھیں گجرات ساہتیہ اکادمی میں ایک ممبر کی حیثیت سے شمولیت دی۔ آپ گجرات اردو بورڈ کے سکریٹری اور گجرات اردو لٹریری اینڈ کلچرل اکیڈمی کے نائب صدر ہیں اور ایکتا سمیتی کے سرگرم کارکن بھی ہیں۔ موصوف کی گراں قدر تصانیف میں "یادوں کی پرچھائیاں" جس میں احمدآباد کی گزشتہ ۴۰ سالہ تاریخ ہے آپ کا شعری مجموعہ "اضافہ" ہے۔ "نئی روشنی" میں آپ نے اخوت، انسان دوستی اور تعلیم بالغاں کی ضرورت نیز جہیز جیسی سماجی برائیوں کی روک تھام کو پیش کیا ہے۔

سماج کے اہم اور ضروری مسائل پر غور و خوض کرنے والے اس عظیم مفکر اور شاعر و ادیب پر جو مظالم ڈھائے گئے وہ واقعی شرمناک ہیں۔ اگر ہمارے محافظ ہی اس طرح کا سلوک کریں گے تو پھر اقلیتی عوام کے وجود کا اور ان کے زبان و ادب کا مستقبل کیا ہوگا؟ یہ سوال امن پسند عوام کے ذہن میں پیدا ہونا ایک فطری عمل ہے۔

عشرت امین
گجرات ٹوڈے ایکشن گروپ
(جنرل سکریٹری: عشرت امروہوی)

رام لعل نابھوی کو اعزاز

کوروکشیتر میں گیتا جینتی کے موقع پر کرشنا میوزیم میں کرشنا تھیم پر کتابوں کی نمائش ہوئی۔ اور گیتا سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس موقع پر گورنر ہریانہ جناب دھنک لال منڈل نے رام لعل نابھوی صاحب کو اعزاز سے نوازا اور انھیں ایک قیمتی شال پیش کی۔

یوم اقبال پر غالب اکیڈمی
میں علی سردار جعفری کا مقالہ

غالب اکیڈمی حضرت نظام الدین
نئی دلی میں گزشتہ دنوں شاعر مشرق
علامہ اقبال کے ۱۱۵ ویں یوم ولادت پر
اردو کے نامور ادیب شاعر مستند عالم
جناب علی سردار جعفری نے "فردوس خیال
اقبال، کیونزم اور اسلام" کے موضوع پر
اپنا پُر مغز مقالہ پیش کیا۔ اس خصوصی تقریب
کی صدارت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے
سابق وائس چانسلر جناب سید حامد
نے فرمائی۔ اس موقع پر اقبال کی تصانیف
اور تصاویر کی نمائش کا اہتمام بھی کیا گیا۔
اس نمائش کا افتتاح پاکستان کے ہائی کمشنر
جناب ریاض حسین کھوکھر نے کیا۔ تقریب کا
آغاز حمد و نعت سے ابرار کرت پوری نے
کیا۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے خیر مقدمی
کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ اقبال کا
کلام ہر دور میں نئے معانی پیش کرتا رہے گا
اور اقبال ہمارے گنتی کے چند عظیم شعرا میں
سے ہیں۔ ناظم تقریب جناب ذہین نقوی
نے تقریب کا تعارف پیش کیا۔ محقق غالب
جناب مالک رام نے فرمایا کہ اقبال جیسا
شاعر صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ان کا کلام
حیات و کائنات کے وسیع موضوعات
کا احاطہ کرتا ہے۔ لیکن اسے سمجھنے کے لیے
قرآن اور تاریخ اسلام کا بھرپور مطالعہ
ضروری ہے۔ انھوں نے اپنی تحقیق کے
مطابق "اقبال کا سن پیدائش ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳
بتایا اور ۱۸۷۷ کو غلط قرار دیا۔

جناب علی سردار جعفری نے کہا کہ ان
کے مقالے کا موضوع بہت زیادہ خطرناک
ہے۔ چوں کہ اس میں عقیدے کو نظریے کے
مقابل میں رکھا گیا ہے۔ جو مناسب نہیں۔
بہر حال اپنے طویل غور و خوض کے بعد انھوں
نے دیکھا ہے کہ اقبال کی توجہ انسان اور
انسانیت پر رہی۔ انسان کی زندگی کی
اصلاح اور فلاح کے لیے انھوں نے
اسلام اور کیونزم میں کافی مشترک
اقدار دیکھیں وہ کیونزم کے سماجی اور
اقتصادی انصاف اور انسان دوستی
کے تصورات سے بہت متاثر ہوئے لیکن
یہ اقدار کیونزم کے نظریے کے عام ہونے
سے قبل ان کے غور و فکر میں موجود تھیں۔ ان
کا عقیدہ تھا کہ کسی اور مذہب سے زیادہ
اسلام میں یہ قدریں بدرجہ اتم موجود ہیں
قرآن نے تمام بنی نوع انسان کو ایک
نفس واحدہ کہا ہے۔ یہ درس بھی دیا گیا
ہے کہ جو چیز تمھارے پاس تمھاری ضرورت
سے زائد ہے ضرورت مندوں کو دے دو
مال و دولت جمع نہ کرو راہ خدا میں خرچ
کرو۔ لیکن مسلمان یہ درس بھول گئے۔
خلافت نے مومنوں کو بادشاہی کے راستے
پر ڈال دیا اور ملوکیت ان کا نظام بن گئی
اجتہاد کے دروازے آج سے ۸۰۰ سال
پہلے امام غزالی کے بعد بند ہو گئے جنھیں
کھولنے کی اس کے بعد کوشش نہیں کی گئی۔
ملاؤں نے اسلام کے جس نظریے کی
تبلیغ کی وہ حسب قرآن نہیں تھا۔ جنت
و دوزخ کوئی مادی مقامات نہیں بلکہ
روحانی کیفیات ہیں۔ انسان اپنے اعمال

سے اپنی جنت اور جہنم بناتا ہے۔ اقبال کا فلسفۂ خودی انسان کی مساعی اور عظمت کا فلسفہ ہے۔ خودی میں کمال حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہندو مسلمان ہو جائے یا کافر مومن ہو جائے۔ اصل بات ہر فرد کی اپنی صلاحیت کی تکمیل ہے۔
علی سردار جعفری نے اپنا ۳۲ صفحات کا مقالہ ایک گھنٹے میں پڑھنے کے بعد کہا کہ یہ ابھی زیر تحریر ہے اور وہ اس کے دوسرے اور آخری حصے میں اقبال کے تصور اسلام اور تصور انسان کی وضاحت کریں گے۔
صدر تقریب سید حامد نے کہا کہ اقبال کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوئی ہے اہل پاکستان نے انھیں شاعر پاکستان بنا دیا اہل مشرق نے شاعر مشرق۔ در اصل وہ شاعر انسان ہیں جس کی وضاحت سردار جعفری کے مقالہ میں عالمانہ انداز میں ہوئی ہے۔
پاکستان کے پریس منسٹر مفتی جمیل الدین احمد نے اعلان کہ ہائی کمیشن کی طرف سے نمائش میں پیش کردہ اقبالیات سے متعلق ان کی ساٹھ کتابیں غالب اکیڈمی کی نذر کی جا رہی ہیں۔ آخر میں خواجہ حسن ثانی نظامی نے نہایت دل نشیں انداز میں شکریے کے کلمات پیش کیے۔ تقریب کے دوسرے دور میں غزل کی مشہور گلوکارہ مدھو بیتا بوس صاحبہ نے اقبال کا منتخب کلام پیش کیا جسے سامعین نے بے حد پسند کیا۔ جی ڈی چندن

منظور احمد کا نیا پتا

سید منظور احمد معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ میسور اپنے نئے مکان میں منتقل ہو گئے ہیں۔ اب ان سے خط و کتابت کا نیا پتا درج ذیل ہے۔

سید منظور احمد
رشید منزل، ایچ۔ آئی۔ جی ۲۱
(نیو) بڑا مکان لے آوٹ
اولڈ میسور بنگلور روڈ
میسور - ۵۷۰۰۰۷

گیا سے بچوں کا رسالہ "بچوں کی دنیا" کی اشاعت

جناب تمنا مظفر پوری کے رہائش گاہ پر آج گیا شہر کے ادیبوں اور دانشوروں کی ایک نشست میں یہ زیر غور آیا کہ قومی اردو یونیورسٹی کے قیام کا سرکار نے جو اعلان کیا ہے وہاں تک طالب علموں کو پہنچنے کے لیے پرائمری سطح کی اردو تعلیم ضروری ہے۔ بچوں کے لیے اردو میں رسائل کی کمی ہے اسی کے پیش نظر یہ طے کیا گیا کہ گیا سے بچوں کا رسالہ نکالا جائے۔ متفقہ طور پر پر یہ طے پایا کہ "بچوں کی دنیا" کے نام سے یہ رسالہ نکالا جائے اور اس رسالے میں بچوں کے ادیبوں سے اسلامی روایات کے پس منظر میں کہانیاں اور مضامین لکھوائی جائیں۔ اس نشست میں مندرجہ ذیل حضرات نے شرکت فرمائی:
جناب معین شاہد، جناب م۔ ق۔ خان، جناب بدر نظیری، جناب فرحت قادری، جناب اوج اکبر پوری، جناب حسن امام، جناب حسین الحق، جناب سید عبد الاحد

گیاوی، جناب تمنا مظفرپوری، جناب
سید فضل وارث، جناب شجر ٹکاروی،
جناب ایم اے کریمی، جناب کلیم الدین
صدیقی، جناب عبدالمغنی کریمی وغیرہم
حضرات نے اپنے اپنے نیک خیالات کا
اظہار کیا۔

اس نشست میں یہ بھی طے پایا کہ اردو
داں طبقے سے اخبار کے ذریعہ گزارش
کی جائے کہ جو حضرات اشاعت کے لیے
اپنی تخلیقی اور مالی تعاون دینا چاہیں
وہ کریم منزل، آبگلہ، گیا ۲ کے پتا پر
ارسال فرمائیں۔

صابر کریمی اکادمی کا قیام

استادالشعراء حضرت صابر کریمی کی
یاد میں نوشاد احمد کریمی نے ایک علمی،
ادبی اور ثقافتی ادارہ بنام صابر کریمی اکادمی
قائم کیا ہے۔ اکادمی کے عہدہ داران
کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

صدر۔ جناب پروفیسر عنوان چشتی (دہلی)
نائبین صدر: جناب شاکر کریمی (بتیا)
" جناب محمد سالم (نیو یارک)
" جناب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور)
کنوینر جنرل سکریٹری: جناب نوشاد احمد کریمی (بتیا)
جوائنٹ سکریٹریز جناب نظام صدیقی (الہ آباد)
جناب ڈاکٹر خورشید سمیع (مظفرپور)
جناب ابراہیم اشک (بمبئی)
مجلس مشاورت:۔ جناب مالک رام (دہلی)
پروفیسر نثار احمد فاروقی (دہلی)
جناب کالی داس گپتا رضا (بمبئی)
ڈاکٹر عبدالمغنی (پٹنہ)
پروفیسر گوپی چند نارنگ (دہلی)
قانونی مشیر: جناب وزیر ہاشمی ایڈووکیٹ (موتیہاری)
خازن: جناب آشفتہ جمال (بتیا)
اراکین:۔ جناب تاج پیامی (آرہ) جناب ناشاد اورنگ آبادی (سستی پور)
جناب ڈاکٹر منور عمر (دربھنگہ) جناب ڈاکٹر امام اعظم (دربھنگہ) محترمہ شاہینہ سرور کریمی (بتیا) جناب اشتیاق احمد کریمی (بتیا)

نہرو کے یوم پیدائش کے سلسلے میں بھیل بھوپال میں عظیم الشان مشاعرہ

انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ بی۔ایچ
ای۔ایل بھوپال کے زیر اہتمام اور قومی یکجہتی
و ثقافتی ادارہ بھیلنس کے تعاون سے
نہرو کے یوم پیدائش کے سلسلے میں مورخہ
۲۸ نومبر ۱۹۹۲ء کو بی۔ایچ۔ای۔ایل کے
کلچرل ہال میں ایک عظیم الشان مشاعرہ
منعقد کیا گیا۔ اس مشاعرے کی صدارت
حضرت عشرت قادری نے کی اور
نظامت کے فرائض جناب رہبر جونپوری
نے انجام دیے۔ ابتدا میں انجمن کے
انتظامیہ سکریٹری جناب امانت علی
بہادر کی درخواست پر ایڈیشنل جنرل منیجر
اور انجمن کے صدر جناب اشوک کپتا نے
مہمان خصوصی جناب انتظار حسین جنرل منیجر
کی گل پوشی کرکے ان کا استقبال کیا جبکہ۔

بیگم انتظار حسین کا استقبال، انجمن کے نائب صدر جناب اشتیاق حسین صدیقی نے کی۔

انجمن کے صدر جناب اشوک گپتا نے اپنی افتتاحیہ تقریر میں شعرا کو خوش آمدید کہتے ہوئے فرمایا کہ بی۔ ایچ۔ ای ایل ہندستان کا عظیم کارخانہ ہے اور یہاں کے لوگ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں اور بھائی چارے کی خوشگوار فضا قایم کیے ہوتے ہیں۔ یہاں کے ادبی اور ثقافتی جلسے اس بات کے زندہ ثبوت ہیں۔ اس مشاعرے میں مندرجہ ذیل شعراء وشاعرات نے شرکت فرمائی حضرت عشرت قادری۔ آغا حیدر حیدری۔ پروفیسر مرتضیٰ علی شاد۔ پروفیسر حامد جعفری۔ محترمہ ملکہ نسیم ساحر ہاشمی کانپوری۔ سعید اختر آنند موہن اعجاز۔ گوند آریہ نشاط۔ سلطان کلیم نصیر پرواز۔ رہبر جونپوری۔ ظفر صہبائی رضا رامپوری۔ اختر کوروائی۔ یوسف ہما۔ ضیا اسدی۔ آفتاب عارف۔ حبیب انجم عنبر قریشی۔ اقبال بیدار۔ تاج الدین تاج اور ظہیر الحسن ظہیر۔

جشنِ محسنؔ کا انعقاد

ممتاز شاعر محسنؔ بھوپالی کی ادبی و شعری خدمات کے اعتراف اور ان کی ساٹھویں سالگرہ کی مناسبت سے کراچی کی ادبی و ثقافتی انجمن 'دی لابی' نے مقامی ہوٹل میں جشن محسنؔ کا انعقاد کیا۔ تقریب کی صدارت نامور نقاد و محقق ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے فرمائی اور نظامت کے فرائض نقاش کاظمی نے انجام دیے۔ تقریب کے پہلے دور میں تنظیم کی چیئرپرسن پروین نفر لومروے نے خیر مقدمی کلمات ادا کیے اور مہمان خصوصی کو یادگاری شیلڈ پیش کی۔ جناب منظر امام اور صاحب صدر نے محسنؔ کی شخصیت اور فکر و فن پر گفتگو کرتے ہوئے انھیں جشن پر مبارکباد دی۔ دوسرا دور شعری نشست پر مشتمل تھا

آج سے ۷۰ سال پہلے مکتبہ جامعہ ایک معمولی دکان کی حیثیت سے قائم کیا گیا تھا لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ آج یہ اردو کا ایک بڑا اشاعتی مرکز ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس ۷۰ سال کے طویل عرصے میں مکتبے نے دنیا کے سرد و گرم کا مقابلہ کیا اور ہر عہد اور ہر دور میں ادب کی شمع کو نہ صرف فروزاں رکھا بلکہ اس کو مشعلِ راہ بھی بنایا۔ اردو زبان کی خدمت اور ملک کو آنے والی ضرورتوں کے مطابق بنانے کے ساتھ ساتھ ایک صحت مند قومی احساس کی بیداری ہمارا نصب العین رہا ہے اور ہمیں اس منزل تک پہنچنے کے لیے دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑا ہے۔ ہم نے اب تک پانچ ہزار سے زیادہ کتابیں شائع کی ہیں جو ہر طبقے میں شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

آج جب کہ قلمی اور ادبی کاموں کی راہ میں دشواریاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ مکتبے نے ایک نئی قوت اور تازہ عزم کے ساتھ کام شروع کیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ جس طرح پہلے بھی ہم نے مشکلات کا صرف سامنا ہی نہیں کیا بلکہ ان کے درمیان راہیں ڈھونڈ نکالیں۔ اسی طرح آج بھی ان چٹانوں پر تیشہ زنی کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں گے اور پہلے کی طرح ہمارا ہاتھ بٹائیں گے

جنوری ۱۹۹۳ء

یادداشت

❁ براہ کرم خط وکتابت کرتے وقت اپنا نام اور پتا صاف صاف تحریر فرمایئے۔

❁ ڈاک خانے اور مقام کا نام انگریزی میں لکھ سکیں تو اور بھی اچھا ہے۔

❁ اپنے آرڈر کے ساتھ کم از کم چوتھائی رقم پیشگی ضرور بھجوایئے۔ آرڈر کی تعمیل کرتے وقت یہ رقم بل میں سے کم کر دی جائے گی۔

❁ اس مختصر فہرست کتب میں اگر آپ کی مطلوبہ کتاب موجود نہ ہو تب بھی براہ کرم آپ ہمیں خط ضرور بھیجیے۔ ہم مطلوبہ کتاب فراہم کرنے کی حتی الامکان کوشش کریں گے۔

❁ مصارف ڈاک وریل وغیرہ حسب قاعدہ خریدار کو ادا کرنے ہوتے ہیں۔ اس لیے اپنی سہولت کے پیش نظر آرڈر میں اس کی وضاحت ضرور کر دیجیے کہ کتابیں ڈاک سے بھیجی جائیں یا ریل سے۔

❁ کتابیں بذریعہ سواری گاڑی منگوانے کی صورت میں قریبی ریلوے اسٹیشن کا نام ضرور لکھ دیجیے۔

❁ کاغذ کی گرانی کی وجہ سے تقریباً ہر ادارے نے اپنی کتابوں کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا ہے اس لیے آرڈر کی تعمیل کے وقت وہی قیمت چارج کی جائے گی جو اس وقت مقرر ہوگی

مکتبہ جامعہ لمٹیڈ کے دفاتر

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمٹیڈ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

ٹیلی فون 630191

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمٹیڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006

ٹیلی فون 3260668

مکتبہ جامعہ لمٹیڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی 400003

ٹیلی فون 3763857

مکتبہ جامعہ لمٹیڈ یونی ورسٹی مارکیٹ۔

علی گڑھ 202002

مکتبہ جامعہ لمٹیڈ۔ نزدیک ڈاک خانہ جامعہ نگر

نئی دہلی 110025

مطبع

لبرٹی آرٹ پریس، ۱۵۲۸ پٹودی ہاؤس

دریا گنج نئی دہلی 110002

ٹیلی فون نمبر 3276018

لبرٹی آرٹ پریس دریوپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، دریا گنج نئی دہلی 110002 میں چھپوا کر شائع کیا

مطبوعات مکتبہ جامعہ ایک نظر میں

ادب، تنقید، انشاء

کتاب	مصنف	قیمت
حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدن	مالک رام	۷۵/-
جام جہاں نما	گربچن چندن	۷۵/-
اردو ناول میں عورت کا تصور	فہمیدہ کبیر	۴۵/-
اسرارِ خودی (فراموش شدہ اڈیشن)	شائستہ کبیر	۵۰/-
تاثر نہ کہ تنقید	صدیق الرحمٰن قدوائی	۵۱/-
یہ صورت گر کچھ خوابوں کے	طاہر مسعود	۶۶/-
تحریریں	ڈاکٹر اسلم پرویز	۵۱/-
انشائیہ کے خد و خال	وزیر آغا	۳۵/-
افکارِ اقبال	عبد السلام خاں	۱۲۵/-
تذکرہ ماہ و سال	مالک رام	۱۲۵/-
تحقیق نامہ	مشفق خواجہ	۱۲۵/-
سحر کے پہلے اور بعد	سعید الظفر چغتائی	۵۱/-
پہچان اور پرکھ	پروفیسر آل احمد سرور	۵۱/-
اقبال کا نظریہ خودی	عبد المغنی	۱۵۰/-
قلندر بخش جرأت	جمیل جالبی	۱۰/-
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	وارث علوی	۳۶/-
تاریخ اودھ	قاسم علی نیشا پوری	۲۷/-
مولانا آزاد کا ذہنی سفر	ظ انصاری	۳۲/-
تنقید اور جدید اردو تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	۶۰/-
کچھ مولانا آزاد کے بارے میں	مالک رام	۵۱/۰۰
لسان الصدق	مولانا ابوالکلام آزاد	۷۵/۰۰
اردو میں کلاسیکی تنقید	پروفیسر عنوان چشتی	۴۸/-
تفہیم و تنقید	پروفیسر حامدی کاشمیری	۴۸/-
نذرِ مختار	مرتبہ: مالک رام	۱۰۱/-
تحقیقی مضامین	مالک رام	۶۰/-
خسرو نامہ	مجیب رضوی	۲۱/-

کتاب	مصنف	قیمت
تحفۃ السرور	مرتبہ: شمس الرحمٰن فاروقی	۷۵/-
جائزے	مرتبہ: مظفر حنفی	۴۵/-
نقدِ بجنوری	صدیقہ بیگم	۲۵/-
ادبی سماجیات	ڈاکٹر محمد حسن	۱۵/-
الفاظ کا مزاج	علام ربانی	۲۴/-
تقریر و تعبیر	محمد ہدایت اللہ	۱۵/-
اردو افسانہ اور افسانہ نگار	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	زیرِ طبع
افسانہ کی حمایت میں	شمس الرحمٰن فاروقی	۱۷/۵۰
ملاستوں کا زوال	انتظار حسین	۳۶/-
تذکرۂ معاصرین دوم	مرتبہ: مالک رام	۱۴/-
سوم	"	۲۲/-
چہارم	"	۴۰/-
لغت نویسی کے مسائل	مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ	۳۵/-
معاصر ادب کے پیش رو	ڈاکٹر محمد حسن	۳۰/-
اردو کی تہذیبی معنویت	پروفیسر علی محمد خسرو	۶/-
تحلیلِ نفسی کے پیچ و خم	ڈاکٹر سلامت اللہ	۳۵/-
اثبات و نفی	شمس الرحمٰن فاروقی	۴۰/-
نقدِ حرف	پروفیسر ممتاز حسین	۴۸/-
اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر صغریٰ مہدی	۳۵/-
انشائیات	ڈاکٹر عابد حسین	(زیرِ طبع)
نظرے خوش گزرے	بیگم انیس قدوائی	۱۲/-
فکر و ریاض	علی جواد زیدی	۱۲/-
بازگشت	کبیر احمد جائسی	۱۱/-
کچھ نثر میں بھی	آنند نارائن مُلّا	۱۶/-
مشاہیر کے خطوط	مرتبہ: عبد اللطیف اعظمی	۱۲/-
حسرت کی شاعری	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۷/۵۰
مسالک و منازل	ضیاء احمد بدایونی	۲۲/-
قدیم دلی کالج	مرتبہ: مالک رام	۴/۵۰
نگارشات	پروفیسر محمد مجیب	۱۶/-
کہانی کے پانچ رنگ	پروفیسر شمیم حنفی	۲۴/-
ہوا کے دوش پر	غلام ربانی تاباں	۵/۵۰

جدید ترکی ادب کے ارکان ثلاثہ — پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی — ۴/-

نظر اور نظریے — آل احمد سرور — ۲۴/-

تنقید کیا ہے۔ — " — ۲۷/-

باتیں کچھ سُریلی سی — داؤد رہبر — ۳۶/-

اردو اسپیز — مرتبہ: سید ظہیر الدین مدنی — ۲۱/-

روح تہذیب — خواجہ غلام السیدین — ۴/۵۰

نئی شعری روایت — پروفیسر شمیم حنفی — (زیر طبع)

دراسات — ڈاکٹر نثار احمد فاروقی — ۱۵/-

دبستانِ آتش — شاہ عبدالسلام — ۱۶/-

تعلیم

مسلمانوں کا تعلیمی نظام۔ ضیاء الحسن فاروقی — ۴۵/-

ہندستانی مسلمانوں کی تعلیم — ڈاکٹر سلامت اللہ — ۵/-

مشقی تدریس کیوں اور کیسے — ڈاکٹر محمد اکرام خاں — ۴۵/-

معاشیات کے اصول — عزیز احمد قاسمی — ۲۱/-

آسان اردو ورک بک — شکیل اختر فاروقی — ۲۲/-

تعلیم و تربیت اور والدین — ڈاکٹر محمد اکرام خاں — ۵۱/-

تعلیم اور رہنمائی — ڈاکٹر محمد اکرام خاں — ۳۵/-

ہم اردو کیسے پڑھائیں — معین الدین — ۵۴/-

تعلیم اور اس کے وسائل۔ — ڈاکٹر محمد اکرام خاں — ۳۶/-

آسان اردو (ہندی کے ذریعے) — شکیل اختر فاروقی — ۱۲/-

تعلیم نظریہ اور عمل۔ — ڈاکٹر محمد اکرام خاں — ۳۶/-

تعلیم فلسفہ اور سماج۔ — ڈاکٹر سلامت اللہ — ۲۷/-

بنیادی استاد کے لیے۔ — ڈاکٹر سلامت اللہ — ۱۲/-

ہم کیسے پڑھائیں۔ — ڈاکٹر سلامت اللہ — ۳۳/-

تعلیمی خطبات۔ — ڈاکٹر ذاکر حسین — ۳۶/-

سرسید کی تعلیمی تحریک۔ — اختر الواسع — ۲۵/-

اردو کیسے لکھیں — رشید حسن خاں — ۱۰/۵۰

بچوں کا آرٹ — عبید الحق — ۲۴/-

تذکرہ، سوانح، شخصیتیں

اپنی ہواؤں کی خوشبو — کشمیری لال ذاکر — ۳۰/-

دلّی کی چند عجیب ہستیاں — اشرف صبوحی — ۵/-

چند تصویر بتاں — مولانا عبدالسلام قدوائی — ۴۵/-

ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب — پروفیسر آل احمد سرور — ۸/-

صاحب جی، سلطان جی — ڈاکٹر اسلم فرخی — ۲۰/-

ہندستانی مسلمان آئینۂ ایام میں — ڈاکٹر عابد حسین — ۷۵/-

شہید جستجو۔ — پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی — ۷۵/-

مولانا آزاد کی کہانی۔ — ڈاکٹر ظفر احمد نظامی — ۱۸/-

نظام رنگ (حضرت نظام الدین اولیاؒ) — ڈاکٹر اسلم فرخی — ۱۵/-

حیاتِ جامیؒ۔ — مولانا اسلم جیراجپوری — ۱۲/-

نقشِ ذاکر۔ — مرتبہ: عبدالحق خاں — ۵۱/-

مالک رام ایک مطالعہ۔ — مرتبہ: علی جواد زیدی — ۵۰/-

مشفق خواجہ ایک مطالعہ۔ — مرتبہ: خلیق انجم — ۳۰/-

عبداللطیف اعظمی حیات و خدمات۔ — مرتبہ: انور صدیقی — ۱۸/-

یادوں کا اجالا۔ بھگوان سنگھ۔ — مترجم: شمیم حنفی — ۴۰/-

مجیب صاحب احوال و افکار — پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی — ۹۰/-

حیاتِ عابد (خود نوشت ڈاکٹر عابد حسین) — ڈاکٹر صغریٰ مہدی — ۴۵/-

سلسلۂ روز و شب (خود نوشت) — صالحہ عابد حسین — ۴۵/-

وجد شاعر اور شخص۔ — مرتبہ: یوسف ناظم — ۲۵/-

غبارِ کارواں۔ — بیگم انیس قدوائی — ۲۷/-

فراق شخص و شاعر۔ — مرتبہ: شمیم حنفی — (زیر طبع)

حیاتِ حافظ۔ — اسلم جیراجپوری — ۱۵/-

افکارِ رومی۔ — مولانا عبدالسلام خاں — ۴۰/-

بزم رفتگاں — صباح الدین عبدالرحمٰن — (زیر طبع)

امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری۔ — پروفیسر ممتاز حسین — (زیر طبع)

مکالماتِ افلاطون۔ مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین ۔/۲۹
غلام ربانی تاباں، حیات اور شاعری۔ شفیق النساء بیگم ۔/۱۰
اب جن کے دیکھنے کو۔ بیگم انیس قدوائی ۱۲/۵۰
پریم چند۔ ہنس راج رہبر (زیر طبع)
شاد عارفی شخصیت اور فن۔ ڈاکٹر مظفر حنفی ۔/۲۴
حیاتِ اسماعیل، حیات و خدمات ڈاکٹر سیفی پریمی ۔/۱۸
مفتی صدرالدین آزردہ۔ عبدالرحمن پرواز اصلاحی ۱۲/۔
میرانیس سے تعارف۔ صالحہ عابد حسین ۔/۷
ہمارے ذاکر صاحب۔ رشید احمد صدیقی ۔/۲۵
اشخاص و افکار۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۷/۵۰
میر انیس۔ سفارش حسین رضوی ۔/۴
ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت۔ مرتبہ عبداللطیف اعظمی ۶/۵۰
حسرت کی شاعری۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۷/۵۰
گنجہائے گراں مایہ۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی ۔/۳۲
کیا خوب آدمی تھا۔ مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین ۔/۱۲
قدسیہ زیدی۔ کرنل بشیر حسین زیدی ۔/۲۵
انشار۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ۔/۴
ذاکر صاحب اپنے لفظ و معنی میں۔ مرتبہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۴۵
روسی ادب اول، دوم پروفیسر محمد مجیب ۔/۶۰

طنزیات، مزاحیات

طنزیات و مضحکات۔ رشید احمد صدیقی ۔/۴۰
گوشے میں قفس کے دلیپ سنگھ ۔/۴۵
فی الحقیقت یوسف ناظم ۔/۲۵
فی الفور۔ یوسف ناظم ۔/۳۰
گول مال۔ شفیقہ فرحت ۔/۱۸
فی المال۔ یوسف ناظم ۔/۱۸
رانگ نمبر۔ شفیقہ فرحت ۔/۱۶
بالکلیات یوسف ناظم ۔/۱۸
برکت ایک چھینک کی۔ وجاہت علی سندیلوی ۔/۱۵
ذکرِ خیر۔ یوسف ناظم ۔/۲۱
بے پرکی۔ حضرت آوارہ ۔/۱۰
خنداں۔ رشید احمد صدیقی ۔/۳۶
شگوفہ زار۔ خواجہ عبدالغفور ۔/۱۴
دیوارِ قہقہہ۔ (مزاحیہ شاعری) محمد یوسف پاپا ۔/۱۵
آشفتہ بیانی میری۔ رشید احمد صدیقی ۔/۵

طب۔ ایلوپیتھی

مرضیات حکیم نعیم الدین زبیری ۔/۵۱
اپنے دل کی حفاظت کیجیے۔ ترجمہ نذیرالدین مینائی ۔/۲۵
ذیابیطس۔ ڈاکٹر محمد شعیب اختر ۔/۱۰

سفرنامے، رپورتاژ

کولمبس کے دیس میں۔ جگن ناتھ آزاد ۔/۴۵
پشکن کے دیس میں۔ جگن ناتھ آزاد ۔/۲۵
سفر زندگی کے لیے سوز و ساز۔ بیگم صالحہ عابد حسین ۔/۱۸
باتیں لاہور کی۔ سوم آنند ۔/۱۶
رہ نوردِ شوق۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ۱۴/۵۰
بادلوں کے سائے عتیق صدیقی ۔/۱۲

شعری مجموعے

اسرارِ خودی (فراموش شدہ اڈیشن) شائستہ خاں ۔/۵
بانگِ درا اقبال ۔/۹

بالِ جبریل — اقبال — ۶/-
ضربِ کلیم مع ارمغانِ حجاز " — ۶/-
خواب اور خلش — آلِ احمد سرور — ۴۴/-
غبارِ منزل — غلام ربانی تاباں — ۲۵/-
انیس — ۳۳ غیر مطبوعہ مرثیے — ۹۰/-
پرانی بات ہے۔ — زبیر رضوی — ۳۰/-
سازِ سخن۔ — ادا جعفری — ۴۵/-
غزل نما (غزلیات کا انتخاب) مرتبہ ادا جعفری — ۷۵/-
دائروں میں پھیلی لکیر۔ — کشور ناہید — ۳۰/-
آنکھ میں سمندر۔ — زاہد ڈار — ۳۰/-
آنکھ اور خواب کے درمیان۔ — ندا فاضلی — ۲۱/-
رات کے مسافر۔ — مرتبہ انور سجاد — ۲۸/-
گدازِ شب۔ — معین احسن جذبی — ۴۰/-
ایک خواب اور۔ — علی سردار جعفری — ۴۰/-
حرف حرف روشنی۔ — حمایت علی شاعر — ۳۵/-
لفظوں کا آسمان (اڑیا نظمیں) مترجم کرامت علی کرامت — ۲۰/-
دو ہے۔ — جمیل الدین عالی — ۱۲/-
کلیاتِ عرش ملسیانی — مرتبہ مالک رام — ۷۵/-
راوار۔ — ساقی فاروقی — ۲۶/-
پتھر کی زبان۔ — فہمیدہ ریاض — ۱۵/-
شام کا پہلا تارا۔ — زہرا نگاہ — ۲۱/-
مثنوی نہ سپہر۔ (امیر خسرو) مترجم محمد رفیق عابد زاہدی — ۲۸/-
لہو پکارتا ہے۔ — علی سردار جعفری — (زیرِ طبع)
شامِ شہرِ یاراں۔ — فیض احمد فیض مجلد ۱۰/- — ۶/-
جستہ جستہ۔ — خورشید الاسلام — ۱۸/-
گل افشانیٔ گفتار۔ — نشور واحدی — ۵/-
کربِ آگہی۔ — آنند نرائن ملاّ — ۱۰/۵۰
نوائے آوارہ۔ — غلام ربانی تاباں — ۸/۵۰
اردو گیت۔ — ڈاکٹر قیصر جہاں — (زیرِ طبع)
پچھلے پہر۔ — جاں نثار اختر — ۱۵/-
انتخابِ حالی (نیا اڈیشن) مولفہ سفارش حسین رضوی — ۱۵/-

شہر آشوب — مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد — ۸/۵۰
ذوقِ سفر۔ — غلام ربانی تاباں — ۵/-
کو بہ کو۔ — سلان جاں نثار اختر — ۷/-
آتشِ گل — جگر مرادآبادی — ۲۵/-
دیوار قہقہہ (مزاحیہ شاعری) محمد یوسف پاپا — ۱۵/-

تاریخ، اسلامیات، مذہب

مسلمانوں کا تعلیمی نظام — ضیاء الحسن فاروقی — ۴/۵
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان۔ — محمود احمد برکاتی۔ — ۴۵/-
فرید و فردِ فرید — اسلم فرخی — ۲۷/-
اسلام میں راسخ الاعتقادی بیچ کی راہ — ضیاء الحسن فاروقی — ۸/-
اسلام کی اصلاحی تحریکوں میں سرسید احمد کا مرتبہ — سید مقبول احمد — ۸/-
فقہ اسلامی اور دورِ جدید کے مسائل۔ — مولانا مجیب اللہ ندوی — ۱۶/-
نقدِ ملفوظات — نثار احمد فاروقی — ۶۵/-
خطباتِ عیدین — مولانا تقی امینی — ۲۱/-
تاریخِ اودھ — قاسم علی نیشاپوری — ۲۷/-
مذہب اور ہندوستانی مسلم سیاست — پروفیسر مشیر الحق — ۹/-
ہمارے دینی علوم — مولانا اسلم جیراجپوری — ۱۶/-
قدیم ہندوستان کی سیکولر روایت۔ — ڈاکٹر مجیب اشرف — ۱۲/-
ترجمۂ قرآن۔ منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش — پروفیسر مشیر الحق — ۸/-
مسلمانانِ ہند سے وقت کے مطالبات۔ — پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی — ۸/-
دنیا کے بڑے مذہب۔ — عماد الحسن آزاد فاروقی — ۸۵/-
ہندوستان میں اسلامی علوم و ادبیات۔ — عماد الحسن آزاد فاروقی — ۴۰/-
ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی تحریک۔ — شمس الرحمٰن محسنی — ۵۰/-
رسولِ اکرمؐ اور یہودِ حجاز۔ — سید برکات احمد — ۴۰/-
محبوب الارث۔ — مولانا اسلم جیراجپوری — ۴/-
ہند اسلامی تہذیب کا ارتقاء۔ — عماد الحسن آزاد فاروقی — ۴۰/-
اسلام دورِ حاضر میں۔ — مترجم پروفیسر مشیر الحق — ۳۶/-

اسلامیات ۔ مالک رام ۴۲/-
عمرو بن عاصؓ ۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۶/-
حضرت جنید بغدادیؒ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۹/-
روح القرآن ۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ۳۶/-
عشق اور بھگتی ۔ عابد الحسن آزاد فاروقی ۶/-

عورت اور اسلامی تعلیم ۔ مالک رام ۳۰/-
مسلمان اور وقت کے تقاضے ۔ عبدالسلام قدوائی ۸/-
عربوں کی تاریخ نگاری کا آغاز وارتقا ۔ محمود الحسن ۱۵/-
سماجی تبدیلیاں ۔ مترجم قاضی عبیدالرحمٰن ۲/-
مذہب اور جدید ذہن پروفیسر مشیرالحق (زیر طبع)
ہندستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں ۔ ڈاکٹر سالم قدوائی ۱۶/-
دین الٰہی اور اس کا پس منظر ۔ مولانا محمد خاں شہاب مالیرکوٹلوی ۱۴/-
کتاب و سنت کے جواہر پارے ۔ مولانا جمال الدین اعظمی ۴/۵۰
خواتین کربلا کلام انیس کے آئینے میں ۔ صالحہ عابد حسین ۱۴/-
مسلمان اور سیکولر ہندستان ۔ پروفیسر مشیرالحق ۷/-
اسلامی عقائد و مسائل مذہب ۔ مولانا جمال الدین اعظمی ۶/۵۰
اسلام کی اخلاقی تعلیمات (امام غزالی) مترجم ڈاکٹر رشید الوحیدی ۲۵/-
تاریخ الامت: سیرت رسولؐ حصہ اول ۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۱۸/-
" خلافت راشدہ " دوم " " ۲۱/-
" خلافت بنی امیہ " سوم " " ۱۲/-
" عباسیہ " چہارم " " ۱۵/-
" عباسیہ بغداد " پنجم " ۲۶/-
" عباسیہ مصر " ششم " " ۲۶/-
" ہفتم تا ہشتم " (زیر طبع)
فکر اسلامی کی تشکیل جدید ۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۳۰/-
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد سائز) ۔ قاری محمد اسماعیل ۲/-
" " " کلاں سائز " ۴/-
اسلام اور بدلتی دنیا ۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۲۱/-
بکھرے ورق سینتی کمار چٹرجی ۴/-
تاریخ انگلینڈ (۱۴۸۵/۱۹۰۱) سید محمد عزیز الدین حسین ۹/-

ناول

نوٹوں کی تلاش ایاز سیوہاروی ۶۰/-
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی کشمیری لال ذاکر ۴۸/-
سفر رابعہ تبسم ۲۰/-
سمندری خزانہ ماریہ رحمٰن ۲۷/-
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو ڈاکٹر صغرا مہدی ۲۴/-
مٹی سے ہیرا سید مقبول احمد ۱۰/-
تذکرہ انتظار حسین ۵۴/-
ریت کی دیواریں رفعت سروش ۲۱/-
بنجر بادل ۔ کشمیری لال ذاکر ۳۴/-
فرار ۔ ظفر پیامی ۴۰/-
ڈوبتے سورج کی کتھا ۔ کشمیری لال ذاکر ۳۶/-
لمحوں میں بکھری زندگی ۔ کشمیری لال ذاکر ۱۸/-
مہکتی بہاریں ۔ کوثر چاندپوری ۱۸/-
راگ بھوپالی ۔ صغریٰ مہدی ۱۵/-
دھرتی سدا سہاگن ۔ کشمیری لال ذاکر ۷/۵۰
کھجوراہو کی ایک رات ۔ کشمیری لال ذاکر (زیر طبع)
میں واپس آؤں گا ۔ ہاورڈ فاسٹ مترجم محمد انس ۲۵/-
پُروائی ۔ صغریٰ مہدی ۹/۵۰
گوری سوئے سیج پر صالحہ عابد حسین (زیر طبع)
انگوٹھے کا نشان ۔ کشمیری لال ذاکر ۷/-
ایک ہم دو دل ۔ خالدہ رحمٰن ۱۰/-
اشک خوں ۔ حبیبہ بانو ۱۰/-
اپنی اپنی صلیب ۔ صالحہ عابد حسین ۹۰/-
پرائی دھرتی اپنے لوگ ۔ جتندر بلّو ۱۲/-
ایک مٹھی ہندستان ۔ سید شمیم اشرف ۔ ۹/-

ایک چادر میلی سی ـ راجندر سنگھ بیدی ۱۵/-
آلپس کے گیت ـ مترجم قرۃ العین حیدر ۲/-
پیار کا موسم ـ مہندر ناتھ ۴/۵۰
چنار کا پتا ـ سلطان آصف فیضی ۲/-
پا بہ جولاں ـ صغریٰ مہدی (زیر طبع)
زندگی کی لہر ـ (ساؤمنگ) مترجم محمد خلیق ۴/-
کالا شہر گورے لوگ ـ احسان الحق (زیر طبع)
بیوہ ـ منشی پریم چند ۱۲/-
گئودان (نیا اڈیشن) ″ ۵/۷
میدانِ عمل ـ (نیا اڈیشن) منشی پریم چند ۵/۷
یودوکیہ ـ ترجمہ قرۃ العین حیدر ۲/-
شکستِ ناتمام ـ زہرہ سیدین ۲/-
ابھی دور ـ صالحہ عابد حسین زیر طبع
پراسرار مقدمہ کافکا مترجم رحم علی الہاشمی ۱۲/۵۰
ماں کی کھیتی ترجمہ قرۃ العین حیدر ۲/۵۰

کھڑکی ـ پرکاش پنڈت ۱۲/-
ریت سمندر اور جھاگ ـ ہرچرن چاولہ ۱۲/۷۵
تیوری ـ امر سنگھ ۱۴/۷۵
قلی نمبر ۲۹۹ ـ وجاہت علی سندیلوی ۱۴/۷۵
دانہ و دام ـ راجندر سنگھ بیدی ۱۸/-
اپنے پرائے ـ ادم پرکاش بجاج ۹/-
نئی دھرتی نئے انسان خواجہ احمد عباس ۱۲/-
درد و درماں صالحہ عابد حسین زیر طبع
ہاتھ ہمارے قلم ہوئے راجندر سنگھ بیدی ۲۰/-
واردات ـ پریم چند ۲۷/-
اردو اسیز مرتبہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی ۲۵/-
دس افسانے ـ ڈاکٹر صغریٰ مہدی ۴/۵۰
راستے اور کھڑکیاں ـ انور خاں ۶/-
جو میرے وہ راجا کے نہیں ـ صغریٰ مہدی ۱۰/-
اپنے دکھ مجھے دیدو ـ راجندر سنگھ بیدی ۲۱/-

افسانے

ڈرامے

پت جھڑ کی آواز قرۃ العین حیدر ۵/۷
آوازوں کا میوزیم ساگر سرحدی ۴۵/-
سدا بہار چاندنی ـ رام لعل ۳۰/-
دل دریا ـ شردن کمار ۲۵/-
تین چہرے تین آوازیں ـ صالحہ عابد حسین ۱۸/-
دردِ دل ستارہ جعفری ۱۸/-
مکتی بودھ راجندر سنگھ بیدی ۲۵/۵۰
نیلی ساری خواجہ احمد عباس ۱۲/-
گرہن ـ راجندر سنگھ بیدی ۳۰/-
کوکھ جلی ـ ″ ″ ۱۸/-

الجھاوے ابراہیم یوسف ۵۱/-
زندگی کی طرف ـ پروفیسر شمیم حنفی ۳۶/-
زوال کا عروج ـ مترجم: انور عظیم ۳۶/-
مجھے گھر یاد آتا ہے ـ پروفیسر شمیم حنفی ۲۱/-
اینٹی گونی ـ سوفوکلیز مترجم قیصر زیدی ۹/-
خانہ جنگی پروفیسر محمد مجیب ۶/-
حبہ خاتون ـ پروفیسر محمد مجیب ۶/-
تاریخ کے آنچل میں ـ رفعت سروش ۱۸/-
اداس موڑ ابراہیم یوسف ۱۲/-
انٹنی اور کلیوپٹرا ولیم شیکسپیر ۱۶/۵۰

...ٹی کا بلاوا — شمیم حنفی — ۱۲/-
...مات کھیل — راجندر سنگھ بیدی — ۱۷/۵۰
...لب کون — سید محمد مہدی — ۸/۵۰
...بال کی دستک — ساگر سرحدی — ۱۲/۷۵
...یا بجھ گیا — کرتار سنگھ دگل — ۶/-
...ہلے آپ (مزاحیہ ڈراما) — افتخار عالم — ۲/۵۰
...ذر کا خواب — قدسیہ زیدی — ۸/۵۰
...مائیش — پروفیسر محمد مجیب — ۴/۵۰
...ام — پروفیسر محمد مجیب — ۳/-
...بتی — ۴/۵۰
...بردن کی تلاش — ۵/۵۰
...دہ غفلت — ڈاکٹر سید عابد حسین — ۹/-
...روازے کھول دو — کرشن چندر — ۶/۵۰
...ینۂ ایام — جے بریسٹلے مترجم: خلیق احمد — ۴/۵۰
...ش آخر — اشتیاق حسین قریشی — ۲/۲۵
...یڈیو ڈرامے کا فن — ڈاکٹر اخلاق اثر — ۱۸/-
ریڈیو ڈرامے کی اصناف — " — ۲۶/-
...ریات اور آل انڈیا ریڈیو — " — ۱۰/-
...سٹ (گوئٹے) مترجم: ڈاکٹر عابد حسین — ۲۵/۵۰

اقبالیات

...کار اقبال — محمد عبد السلام خان — ۱۲۵/-
...بال کا نظریۂ خودی — عبد المغنی — ۱۵۰/-
...بال جادوگر ہندی نژاد — عتیق صدیقی — ۱۴/-
...یات کی تلاش — عبد القوی دسنوی — ۳۵/-
...ر اقبال (خطبات کی روشنی میں) — سید وحید الدین — ۲۶/-
...ا اور دہلی — عبد القوی دسنوی — ۹/۵۰
...اقبال — میکش اکبرآبادی — ۲۵/۵۰
...اقبال — اسلوب احمد انصاری — ۲۱/-

غالبیات

ذکر غالب — مالک رام — (زیر طبع)
گفتار غالب — مالک رام — ۴۸/-
غالب اور صفیر بلگرامی — مشفق خواجہ — ۳۶/-
تلامذۂ غالب — مالک رام — ۷۵/-
فسانۂ غالب — مالک رام — ۱۶/۵۰
غالب اور شاہان تیموریہ — ڈاکٹر مغنی انجم — ۹/۵۰

معیاری سیریز

موازنۂ انیس و دبیر — مرتبہ رشید حسن خاں — ۲۴/-
نیرنگ خیال — مالک رام — ۱۵/-
یادگار غالب اردو — " — ۱۲/-
" فارسی — " — ۹/-
انتخاب مضامین سرسید — انور صدیقی — ۱۶/-
حیات سعدی — مرتبہ رشید حسن خاں (زیر طبع) — ۳۶/-
فسانۂ آزاد (تلخیص) — " ڈاکٹر قمر رئیس — ۷۵/-
فردوس بریں — " عبد الحلیم شرر — ۱۹/-
انتخاب مضامین شبلی — مرتبہ رشید حسن خاں — ۷۵/-
انتخاب ناسخ — مرتبہ " — (زیر طبع)
مثنوی بحر المحبت — مرتبہ عبد الماجد دریا آبادی — ۵/۵۰
شریف زادہ — " ڈاکٹر قمر رئیس — ۲۰/-
امراؤ جان ادا — مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن — ۲۸/-
فسانۂ مبتلا — " صدیق الرحمٰن قدوائی — ۱۰/-
توبۃ النصوح — " مالک رام — ۳۶/-

باغ و بہار ۔ " رشید حسن خاں ۔ ۲۴/-
ابن الوقت ۔ " ڈاکٹر خلیق انجم ۴۲/-
مجالس النساء ۔ " صالحہ عابد حسین (زیر طبع)
گزشتہ لکھنؤ " رشید حسن خاں ۷۵/-
قصہ حاتم طائی ۔ " اطہر پرویز (زیر طبع)
انتخاب ولی مرتبہ سید ظہیر الدین مدنی ۱۲/-
انتخاب سراج اورنگ آبادی مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن ۱۰/-
" مراثی انیس و دبیر ۔ رشید حسن خاں ۳۶/-
" نظیر اکبرآبادی ۔ " " ۳۶/-
" اکبر الہ آبادی ۔ صدیق الرحمٰن قدوائی ۱۸/-
" کلامِ میر ۔ ڈاکٹر محمد حسن (زیر طبع)
دیوان درد رشید حسن خاں ۲۰/-
انتخاب سودا " (زیر طبع)
" قلی قطب شاہ ۔ محمد اکبر الدین صدیقی (زیر طبع)
" ذوق ۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی ۲۴/-
مثنوی سحر البیان ۔ رشید حسن خاں ۲۱/-
مثنوی گلزار نسیم ۔ " ۱۶/-
افاداتِ سلیم ۔ ڈاکٹر خلیق انجم ۲۱/-
مقدمہ شعر و شاعری ۔ مرتبہ رشید حسن خاں ۲۰/-

جیبی کتابیں

ایک خواب اور ۔ علی سردار جعفری ۱۰/-
آتشِ گل ۔ جگر مرادآبادی ۱۰/-
پچھلے پہر ۔ جاں نثار اختر ۶/-
رومانی غزلیں ۔ ثمینہ حجاب ۶/-
انتخاب اکبر الہ آبادی ۔ صدیق الرحمٰن قدوائی ۱۰/-
ساتواں آنگن ۔ صالحہ عابد حسین ۸/-
دھوپ ۔ رابعہ تبسم ۵/-

گھر ماریہ رحمٰن /-
واپسی کا سفر ۔ عبداللہ حسین /-
راگ بھوپالی ۔ ڈاکٹر صغریٰ مہدی -
نغیب عبداللہ حسین -
موت کا بازار ۔ آفتاب ہلالی -

کتاب نما کے خصوصی شمارے

خواجہ احمد فاروقی مرتبہ: خلیق انجم /-
عابد علی خاں " مجتبیٰ حسین -
پروفیسر مسعود حسین خاں " ایم حبیب خاں -
ڈاکٹر اجمل اجملی مرتبہ علی احمد فاطمی / عذرا حبیب
فرمان فتح پوری نمبر مرتبہ خلیق انجم /-
سردار جعفری نمبر مرتبہ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی .
صالحہ عابد حسین نمبر مرتبہ: عزیز قریشی /-
نئی نظم کا سفر مرتبہ: خلیل الرحمٰن اعظمی /-

مشرقی علوم و السنہ پر تحقیق ۔ حامد حسین
پریم چند نمبر ۔ عبدالقوی دسنوی .
ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر ۔ کرنل بشیر حسین زیدی
مولانا مہر محمد خاں شہاب نمبر ۔ ادارہ
مرزا سلامت علی دبیر نمبر ۔ مرتبہ عبدالقوی دسنوی
جوش ملسیانی نمبر ساحر ہوشیارپوری .
خواتین افسانہ نگار نمبر ڈاکٹر صغریٰ مہدی .
عرش ملسیانی نمبر ۔ مالک رام .
سکندر علی وجد نمبر ۔ یوسف ناظم -
قدسیہ زیدی نمبر ۔ کرنل بشیر حسین زیدی .
فراق نمبر ۔ شمیم حنفی ز
لغت نویسی کے مسائل نمبر پروفیسر گوپی چند نارنگ
عبداللطیف اعظمی نمبر ۔ ادارہ
مشفق خواجہ نمبر ۔ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم
جائزے ۔ مرتبہ مظفر حنفی

نھنّے مُنّے بچّوں
کے لیے
دلچسپ
اور
باتصویر کہانیاں
بتاشے
نرسری کے بچوں کے لیے آسان
زبان میں دلچسپ نظمیں قیمت ۶/۵۰
جاں نثار دوست
بچوں کے لیے باتصویر کہانی
قیمت ۵/- روپے
جادو کی ہنڈیا
5/-
بھیڑیے کا گانا
6/50
شیر اور بکری
7/50
کوّے کا خواب
7/-
دم کٹی لومڑی
6/50
چاند کی بیٹی
5/-
چالاک بلّی
6/50
گدھے نے بجائی بانسری
قیمت 7/50

مکتبہ پیام تعلیم کی اہم پیشکش
بچوں کے بزرگ ادیبوں کا سوانحی سلسلہ
مرزا غالب
اسلم فرخی
بابائے اردو
مولوی
عبدالحق
ڈاکٹر خلیق انجم
قیمت ۵/۴
مولانا
شبلی
نعمانی
بچوں کے
بزرگ
ادیبوں کا
سوانحی
سلسلے
بچوں کے
رنگارنگ
خسرو
محمد حسین آزاد
اسلم فرخی
قیمت ۴/-
ڈاکٹر عابد حسین
ڈاکٹر صغرا مہدی
قیمت ۴/-
صالحہ عابد حسین
ڈاکٹر صغرا مہدی
ڈپٹی نذیر احمد
بچوں کے
اسماعیل میرٹھی

مکتبہ پیام تعلیم کی کم قیمت پر
دیدہ زیب اور عمدہ کتابیں
بکرے کی تعریف میں
یوسف ناظم
6
پادری کی روح
قیمت 4/50
ٹھوڑی تارا ماتھے چاند
اشرف صبوحی
4/=
بڑھیا کی بھینس
قیمت 4/=
قصر صحرا۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی
اول تا سوم
قیمت مکمل سیٹ 25/
غذائیں دوائیں
قیمت 8/=
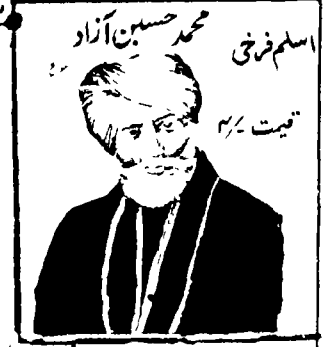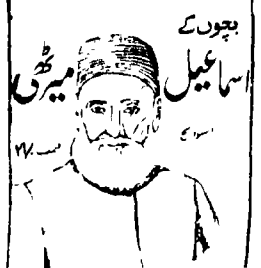
ٹھگ نے ٹھگا ٹھگ کو
قیمت 4/50
پیار کا پنچھی
قیمت 9/
گلی ڈنڈے تین
حیرت انگیز سفر
قیمت 6/
تابنیل خاں
حسین حسان جامعی
قیمت 3/
خوب صورت گیٹ اپ کے ساتھ مکتبہ پیامِ تعلیم کی دیدہ زیب کتابیں
جھیل کا راز
قیمت 6/
چوں چوں بیگم
شفیقہ فرحت
قیمت 4/
گدھا کہانی
میرزا ادیب
قیمت 9/

بچوں کے لیے — مذہب

کتاب	مصنف	قیمت
رسالہ دینیات اول		۳/-
رسالہ دینیات دوم		۴/-
رسالہ دینیات سوم		۵/-
رسالہ دینیات چہارم		۵/-
رسالہ دینیات پنجم		۶/-
بزرگانِ دین	محمود علی خاں جامعی	۴/-
اُمت کی مائیں	حسین حسنی	۴/۵۰
اچھی باتیں	سعدالدین انصاری	۴/۵۰
خوب سیرت اوّل	حکیم محمد سعید	۶/-
خوب سیرت دوم	″ ″	۴/۵۰
سلطان جیؒ	اسلم فرخی	۴/-
رسول اللہؐ کی صاحبزادیاں	فضل قدیر ندوی	۴/۵۰
رحمان کا مہمان	رفیع الزماں زبیری	۶/-
کمسن صحابی	″	۵/-
اسلام کے جاں نثار	″	۴/-
سیرت پاک مختصر مختصر	احمد خاں خلیل	۳/-
نور کے پھول	حکیم محمد سعید	۹/-
سب سے بڑے انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	″	۴/۵۰
حضرت حمزہؓ	احتشام علی رحیم آبادی	۳/-
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ	″ ″	۳/-
حضرت ابو ہریرہؓ	″ ″	۴/-
حضرت محبوب الٰہیؒ	مشیر الحق	۳/-
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ	″	۲/-
حضرت فرید الدین گنج شکرؒ	″	۳/-
حضرت معین الدین چشتیؒ	″	۳/-
حضرت ابوبکر صدیقؓ	″	۶/-
حضرت طلحہؓ	″	۲/-

کتاب	مصنف	قیمت
حضرت سلمان فارسیؓ	″	۳/۵۰
حضرت ابو ذر غفاریؓ	″	۳/-
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	″	۳/-
″ عبداللہ بن عباسؓ۔	″	۳/-
نیک بیٹیاں۔	″	۳/۵۰
اسلام کیسے پھیلا، حصہ اوّل	عبدالواحد سندھی	۴/۵۰
″ حصہ دوم	″	۶/-
قرآن پاک کیا ہے	عبدالواحد سندھی	۴/-
اسلام کیسے شروع ہوا؟		۴/۵۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار اوّل، دوم		۶/- ۶/-
اسلام کے مشہور امیر البحر۔	″	۹/-
رسولِ پاکؐ۔	″	۶/-
درسِ جنتی۔	الیاس احمد مجیبی	۵/۵۰
سرکار کا دربار۔	″ ″	۶/۵۰
چار یار۔	الیاس مجیبی	۴/۵۰
آں حضرتؐ (اردو)	الیاس مجیبی	۳/۵۰
حضرت محمدؐ (ہندی)	″	۴/-
اللہ کا گھر۔	خلیل احمد جامعی	۴/۵۰
اللہ کے خلیل۔	″ ″	۳/۵۰
رسول پاک کے اخلاق۔	″ ″ ″	۴/-
اللہ کے صفی۔	″ ″	۲/۵
ہمارا دین حصہ اوّل	سید شہاب الدین دسنوی	۸/۵
″ دوم	″ ″ ″	۴/۵۰
″ سوم	″ ″ ″	۸/۵۰
تحسین القرآن۔ تالیف: خدیجہ سیدنا طاہر سیف الدین (زیرِ طبع)		
منہاج القرآن۔	″ ″	۴/۵۰
ائمۂ اربعہ۔	مولانا ابو العرفان ندوی (زیرِ طبع)	
ارکانِ اسلام۔	مولانا اسلم جیراجپوری	۳/۵۰
عقائدِ اسلام۔	″ ″ ″	۳/۵۰
خلفائے اربعہ۔	خواجہ عبدالحی فاروقی	۱/-
نبیوں کے قصے۔	″ ″ ″	۵۰

کتاب	مصنف	قیمت
ہمارے رسولؐ ۔		۶/-
پیارے رسولؐ ۔	سلطانہ آصف فیضی	۴/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاؒ ۔	ادارہ	۳/-
مسلمان بیبیاں ۔	اعجاز الحق قدوسی	۶/-
ہمارے نبیؐ ۔ (اردو)	سید نواب علی رضوی	۲/۵۰
" (ہندی)	" " "	(زیر طبع)
سرکارِ دو عالم ۔	محمد حسین حسان	۹/-
قاعدہ یسرنا القرآن	(خورد)	۲/-
" "	(کلاں)	۴/۵۰

نظمیں

کتاب	مصنف	قیمت
مولانا اسماعیل میرٹھی	حکیم نعیم الدین زبیری	۲۱/-
بتاشے	(نرسری گیت ۔ باتصویر)	۶/۵۰
مہکتی کلیاں ۔	خضر برنی	(زیر طبع)
ٹوٹے کھلونے ۔	سطوت رسول	۵/-
سہانے ترانے ۔	شان الحق حقی	۴/۵۰
بچوں کے افسر ۔	افسر میرٹھی	۶/-
بچوں کے اقبال ۔	مرتبہ: اطہر پرویز	۶/۵۰

سائنس، طب اور عام معلومات

کتاب	مصنف	قیمت
یہ بخار کیسا ہے	(ادارہ)	۴/۵۰
آپ کا جسم	علی ناصر زیدی	۶/-
گندا پانی	(ادارہ)	۴/۵۰
کیوں اور کیسے	محمد ابراہیم شاہ	۶/-
سائنس کی دنیا	فرید الدین احمد	۸/-
کمپیوٹر کیا ہے	حکیم نعیم الدین زبیری	۸/-
ذرّے کی کہانی	مہدی جعفر	۲۱/-
عجائب گھر	قاسم صدیقی	۱۰/-
علاج میرا دشمن		۶/-
پرواز کی کہانی	علی ناصر زیدی	۶/-
غذا کی کہانی	"	۳/-
رنگوں کی بستی	سہیل انور	۵/-
غذائیں اور دوائیں	(ادارہ)	۸/-
صحت کے ۹۹ نکتے	مسعود احمد برکاتی	۳/-
صحت کی الف بے	"	۵/-
سنہرے اصول	حکیم محمد سعید	۴/-
پرندوں سے جانوروں تک	شاہ عظیم	۴/۵۰
دہلی کی چند تاریخی عمارتیں	زہرہ مشیر	۴/۵۰
دہلی	مجاہد حسین زیدی	۲/۵۰
انوکھا عجائب خانہ (۳ حصے)	محمد حسین حسان	فی حصہ ۱/۵۰
سماجی زندگی (ادارہ)	(سوم)	۴/۹۰
تاریخ ہند کی کہانیاں	(دوم، چہارم)	۷/۷۵
ان تھک جان	بیگم قدسیہ زیدی	(زیر طبع)
بھن بھن بانو	"	"
جال باز سپاہی	"	"
ہمت کے پھل	عبدالواسع عصری	"
موم کا محل	پروفیسر محمد انس	"
پردادا کی کہانی	محمد عبدالغفور	"
چٹانوں کی کہانیاں	محمد امین	"

غیر ملکی زبانوں کی دلچسپ کہانیاں

کتاب	مصنف	قیمت
سرخ موت	آصف فرخی	۴/۵۰

دنیا کی عجیب وغریب کہانیاں آصف فرخی ۷/۵۰
انمول کہانیاں ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی ۴/۵۰
پتھر کی گڑیا ثروت صولت ۷/۵۰
ریل کے بچے احمد خاں خلیل ۴/-
افریشیا کی کہانیاں فضل حق قریشی ۷/۵۰
۸۰ دن میں دنیا کا چکر علی اسد ۳/-
ہزاروں خواہشیں مسعود احمد برکاتی ۹/-
مونٹی کرسٹو کا نواب مسعود احمد برکاتی ۹/-
گلی ور کے تین حیرت انگیز سفر احمد خاں خلیل ۶/-

کہانیاں، ناول، ڈرامے
ننھے منّے بچّوں کے لیے

بتاشے (نرسری کے گیت باتصویر) ۶/۵۰
جاں نثار دوست (باتصویر کہانیاں) ۵/-
شیر اور بکری " ۷/۵۰
چاند کی بیٹی " ۵/-
بھیڑیے کا گانا " ۶/۵۰
جادو کی ہنڈیا " ۵/-
چالاک بلّی " ۴/۵۰
دم کٹی لومڑی " ۶/۵۰
کوّے کا خواب " ۴/-
گدھے نے بجائی بانسری کشور ناہید ۷/۵۰

سوانح

ڈاکٹر سید عابد حسین صغرا مہدی ۴/-
صالحہ عابد حسین " ۴/-
مولوی عبدالحق ڈاکٹر خلیق انجم ۴/۵۰
بچوں کے مرزا غالب ڈاکٹر اسلم فرخی ۴/-

بچّوں کے محمد حسین آزاد ڈاکٹر اسلم فرخی ۴/-
ڈپٹی نذیر احمد " " ۴/-
بچّوں کے رنگا رنگ خسرو ۴/-
سلطان سلطان جی " ۴/۵۰
مولانا شبلی نعمانی " " ۴/۵۰
مولانا اسمٰعیل میرٹھی حکیم نعیم الدین زبیری ۴/-
ہمارے عظیم سائنسداں حکیم محمد سعید ۸/-
چند مشہور طبیب اور سائنس داں (ادارہ) ۹/-
مولانا آزاد کی کہانی ظفر احمد نظامی ۱۸/-
بچّوں کے ذاکر صاحب مرتبہ عبداللہ ولی بخش قادری ۷/-
اندرا گاندھی کی کہانی شمیم حنفی ۶/-
بچّوں کے چار بزرگ دوست صالحہ عابد حسین ۳/۵۰
امیر خسرو (ادارہ) ۳/۵۰
جوہر تابل مسعود احمد برکاتی ۳/-
شفیع الدین نیّر اطہر پرویز ۷/۵۰
گاندھی بابا کی کہانی بیگم قدسیہ زیدی ۱۰/-
گاندھی جی دکھنی افریقہ میں یوسف ناظم ۳/-
میر انیس محمد حسین حسان ۲/-

قواعد، محاورے، کہاوتیں اور لغات

پیامی قواعد اردو طلبہ اڈیشن ۳/-
" کلاں ۹/-
پیامی اردو انگریزی ڈکشنری ۱۶/-
پیامی بیسک انگلش اردو ڈکشنری ۱۲/-
ہمارے محاورے سیفی پریمی ۱۲/۵۰
کہاوت اور کہانی " ۸/-
مختصر اردو لغت ۲۵/-
فرہنگ عامرہ ۶۰/-
فیروز اللغات درمیانی ۱۵/-

بڑے بچوں کے لیے دلچسپ کہانیاں

کتاب	مصنف	قیمت
ایک تماشا گاکٹر دل	قمر علی عباسی	۶/-
پریوں کی کہانیاں	اشرف صبوحی	۶/-
سمندر کا بادشاہ ہار گیا	ڈاکٹر شریف الحسن	۴/-
چوں چوں بیگم	شفیقہ فرحت	۴/-
ماسٹر شامت	اشرف صبوحی	۶/-
تھوڑی تارا ماتھے چاند	اشرف صبوحی	۴/-
پکڑے گئے	(ادارہ)	۷/۵۰
درویش کا تحفہ	انشاں بیگم	۹/-
مورا سے فرار	رفیع الزماں زبیری	۷/۵۰
بکرے کی تعریف میں	یوسف ناظم	۹/-
جھیل کا راز	ثریا فرخ	۹/-
قصرِ صحرا اول	مرزا عظیم بیگ چغتائی	۷/-
قصرِ صحرا دوم	"	۱۰/-
قصرِ صحرا سوم	"	۸/-
عموں کی تباہی	ظفر محمود	۷/۵۰
پیار کا پنچھی	فرخندہ لودھی	۴/-
ہیروں کے چور اور سونے کی تلاش	(ادارہ)	۷/۵۰
پادری کی روح	(ادارہ)	۴/-
ٹھگ نے ٹھگ کا ٹھگ کو	ابصار عبدالعلی	۴/۵۰
گدھا کہانی	میرزا ادیب	۹/-
خفیہ سرنگ	ثریا فرخ	۹/-
بڑھیا کی بھینس	(ادارہ)	۴/-
تیس مار خاں	شاہد علی خاں	۴/۵۰

کتاب	مصنف	قیمت
چالاک خرگوش کی واپسی	معراج	۱۵/-
مونگلی کرٹر کا خواب	مسعود احمد برکاتی	۹/-
غریب لکڑہارے کی کہانی	(ادارہ)	۶/-
نردولی کا آدم خور	"	۲/-
جنت کے راستے		۴/-
خلائی مسافر		۶/-
ابو خاں کی بکری	ڈاکٹر ذاکر حسین	۱۵/-
ایک غوطہ خور کی آپ بیتی	(کہانیاں)	۹/-
نرالے کوے	اشرف صبوحی	۴/-
باتونی کچھوا		۴/-
جادو کا تھیلا	"	۳/-
جادو کی سارنگی		۳/-
بدر شہزادی		۹/-
سمندری طوفان اور ننھے لڑکے	(مختلف کہانیاں)	۹/-
ننھا سیاح	محمد زکریا سائل	۷/-
زیور	(مختلف کہانیاں)	۹/-
شہنشاہ نے کہا...	(مختلف کہانیاں)	۹/-
سام پر کیا گزری	سید اظفر مہدی	۳/۵۰
جنگل کی بلی	عبدالاحد سندھی	۳/-
چالاک خرگوش کے کارنامے	معراج	۷/۵۰
چور پکڑو	مسعود احمد برکاتی	۳/-
بہادر علی	قمر علی عباسی	۸/۵۰
خالی ہاتھ	ابصار عبدالعلی	۹/-
کھلونا نگر	ادارہ	۷/-
حاجی بابا کی ڈائری	ظ۔ انصاری	/۵۰
قصہ اژدہا پکڑنے کا	ادارہ	۵/-
ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی	"	۹/-
ابو علی کا جوتا	"	۵/-
ننھا سراغ رساں	ادارہ	۵/-
پُر اسرار غار	"	۵/-
ظالم ڈاکو	ریاض احمد خاں	۹/-

کتاب	مصنف	قیمت
عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں۔	انور خاں	۶/۵۰
دلّی کی شادی۔	اشرف صبوحی	۴/-
رحمت شہزادہ۔	" "	۴/۵۰
اندھے کا بیٹا۔	شعیب اعظمی	۳/۵۰
پانچ جاسوس۔	امۃ الرحمٰن محسنی	۸/۵۰
جنگل کی ایک رات۔	ریحان احمد عباسی	۶/-
اچھی کہانیاں۔	مرتبہ: ہمدرد فاؤنڈیشن	۳/-
ہرن کا دل۔	اشرف صبوحی	۲/-
دریا کی رانی۔	" "	۲/-
گوہر شہزادی۔	" "	۳/-
شریر شیرا۔	" "	۳/۵۰
پری رانی۔	صالحہ خاتون	۳/-
خطرناک سفر۔	ریاض احمد خاں	۳/۵۰
ننھا جھرو۔	ریحان احمد عباسی	۳/۵۰
مرغی کی چار ٹانگیں۔	یوسف ناظم	۴/۵۰
بابا ناصح۔	رشید الوحیدی	۳/-
سلامہ و صمصامہ۔	" "	۵/-
پہاڑ کی چوٹی پر۔	میرزا ادیب	۴/-
شرارت۔	محمد حسین حسّان	۴/-
ننھا فرشتہ۔	فہمیدہ عتیق	۶/-
ایک کھلا راز۔	مسعود احمد برکاتی	۳/۵
مچھیرا اور اس کی بیوی۔	عبدالواحد سندھی	۳/۵۰
بھوتوں کا جہاز۔	شمیم حنفی	۶/۵۰
ہار کی تلاش۔	ریاض احمد خاں	۶/-
خرگوش کی چال۔	بیگم آصفہ مجیب	۴/-
آؤ ڈراما کریں۔	محمد مجیب	۴/-
خرگوش کا سپنا۔	کرشن چندر	۹/-
دادا نہرو۔	منور لکھنوی	۶/-
نیلا ہیرا۔	مظفر حنفی	۶/۵۰
ایک کچھوے کی جیل میں۔	عبدالواحد سندھی	(زیر طبع)
شیر خاں۔	قرۃ العین حیدر	۴/-

کتاب	مصنف	قیمت
بھیڑیے کے بچے۔	" "	۳/-
لومڑی کے بچے۔	" "	۳/-
میاں ڈھینچو کے بچے۔	" "	۲/۵۰
بہادر۔	" "	۲/۵۰
ہرن کے بچے۔	" "	۲/۵۰
اس نے کیا کرنا جانا۔	آصفہ مجیب	۳/-
کٹا ہوا ہاتھ۔	شمیم حنفی	۷/۵۰
میگھ نگر کا راجا۔	ریاض احمد خاں	(زیر طبع)
جی دارا در ننھا فرشتہ۔	"	(زیر طبع)
سرکس۔	ڈین گیسپر	۱/۵۰
بندر اور نائی۔	عبدالواحد سندھی	۴/۵۰
لومڑی کا گھر۔	"	۳/۵۰
جادو کا گھر۔	"	۳/۵۰
بی مینڈکی اور کوا۔	"	۳/-
تاک دنا دن تاکے سے۔		۳/۵۰
روٹی کس نے پکائی۔	عبدالواحد سندھی	۲/۵۰
پھر میں چگوں کیا خاک۔	"	۳/۵۰
پانچ بونے۔	"	۳/۵۰
چیونٹی رانی۔	"	۳/۵۰
بچوں کی کہانیاں۔	"	۳/۵۰
پان کھا کر طبلہ بجا کر رام ناچا۔	"	۳/۵۰
پکڑ دُم کٹے کو۔	"	۳/۵۰
مدورانا پردیس چلے۔	"	۳/۵۰
ہپتو جپتو۔	"	۲/۵۰
سُرخ جوتے۔	بیگم قدسیہ زیدی	۳/۵۰
ریڈیو فیچر۔	جگن ناتھ آزاد	(زیر طبع)
پلک نہ مارو۔	یوسف ناظم	۶/-
ایک دیس ایک خون۔	صالحہ عابد حسین	۳/-
جادو کے کھیل۔	اطہر پرویز	(زیر طبع)
انعامی مقابلہ۔	حسین حسّان	۳/۲۵
دعوتِ ملاقی۔	"	(زیر طبع)
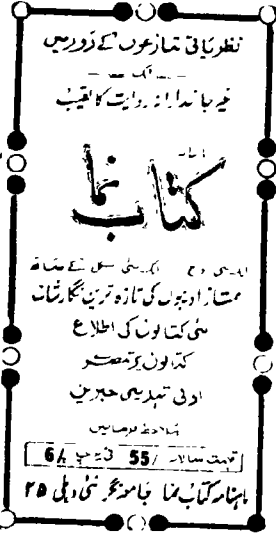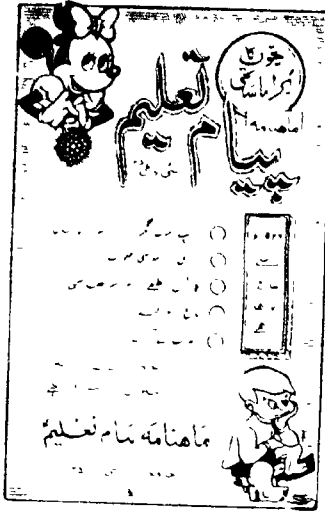
نیت کس کی؟ ۔ " ۔ ۲/۵۰
بینی کی گڑیا ۔ " ۔ (زیر طبع)
بہادر سیاح ۔ " ۔ ۳/-
چچا غالب ۔ مرتبہ : " ۔ (زیر طبع)
تانبیل خاں ۔ محمد حسین حسان ندوی ۔ ۳/-
جن حسن عبد الرحمٰن ( ) حصہ اول
ترجمہ قرۃ العین حیدر ۔ ۵/-
چوری کی عادت ۔ عبد الغفار مدھولی ۔ ۳/۵۰
غیر ذمہ دار لڑکا ۔ " ۔ (زیر طبع)
جب اور اب ۔ آصف مجیب ۔ (زیر طبع)
سندر چیار ۔ صالحہ عابد حسین ۔ ۱/۵۰
گلابو چوہیا اور غبارے ۔ قدسیہ زیدی ۔ ۱/۵۰
گلابو چوہیا اور پری زاد ۔ " ۔ ۲/-
ستاروں کی سیر ۔ کرشن چندر ۔ (زیر طبع)
لال مرغی ۔ عبد الواحد سندھی ۔ ۳/-
تین اناڑی ۔ عصمت چغتائی ۔ ۶/-
خربوزہ شہزادہ کا سر بن گیا ۔ کوثر بانو ۔ (زیر طبع)
چہارت کا آدم خور شیر ۔ محمد معین ۔ ۱/۵۰
ننھا مٹھو ۔ خورشید سلطان ۔ ۳/-
چنبیلی ۔ محمد حسین حسان ۔ ۱/۲۰
شہزادہ اور ٹھگ ۔ ادارہ ۔ (زیر طبع)

تعلیم بالغاں کے سلسلے کی کتابیں

کفن دفن ۔ " " " " " ۔ ۱/-
حیات اللہ انصاری ۔ " " " " " ۔ ۱/-
چیچک ۔ مشتاق احمد ۔ ۱/-
آستین کا سانپ ۔ محمد حسین حسان ۔ ۱/-
چاند ۔ " " ۔ ۱/-
دیمک ۔ " " ۔ ۱/-
کتنی زمین ۔ " " ۔ ۱/-

ہندی کی دوسری کتابیں

موسموں کا کھیل	۱/-
پریم پرا	۱/-
اپنا گھر	۱/-
امریکہ	۱/-
دہلی	۱/-
منورنجن اور کام	۱/-
چاندی کا چمچہ	۱/-
چمپا کا پھول	۱/-

ہماری درسی کتابیں

اردو

اردو قاعدہ		۳/۵۰
رنگین قاعدہ	حصہ اول	۱/۵۰
"	حصہ دوم	۱/۵۰
اردو کی پہلی کتاب		۴/۵۰
" دوسری کتاب		۶/-
" تیسری کتاب		۸/-
" چوتھی کتاب		۸/۵۰
اردو کی پانچویں کتاب		۱۰/-
" چھٹی کتاب		۱۱/-
" ساتویں کتاب		۱۱/-
اردو کی آٹھویں کتاب		۱۲/-
بچوں کی پہیلی		۳/-
اردو کی دوسری برائے دہلی		۶/۵۰
" تیسری	"	۸/۷۵
" چوتھی	"	۱۰/-
اردو خوش خطی حصہ اول		۳/۵۰
" "	دوم	۳/۵۰
" "	سوم	۳/۵۰
اردو خوشخطی	چہارم	۳/۵۰

حساب

حساب	درجہ دوم	۱۴/-
حساب	درجہ سوم	۱۴/-
حساب چہارم		۱۴/-
" پنجم		۱۴/-

طالبات کے لیے

ہمارا ملک بھارت		۱۴/-
بھارت اور سنسار		۱۴/-
ہماری دلی	سوم کلاس کے لیے	۱۴/-
ماحول کے ذریعہ تعلیم	سوم	۱۴/-
" "	چہارم	۱۴/-
" "	پنجم	۱۴/-

کالج کے طلبہ کے لیے درسی کتب

شعور ادب	(ادارہ)	۱۸/-
نیا اردو نصاب۔ اوّل۔ قیصر زیدی/محمد ذاکر		۱۰/-
آئینہ ادب۔ ڈاکٹر علی رضا/ڈاکٹر آدم شیخ		۱۲/-
انوار ادب۔ پروفیسر فصیح الدین/ڈاکٹر عابد حسین حسینی		۸/۵۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دلی ۲۵

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی ۱۱۰۰۰۶ — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳ — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

خدابخش لائبریری پٹنہ کی اہم مطبوعات

یادگار روزگار سید بدرالحسن ۲۰/-

گیتا اور قرآن پنڈت سندر لال ۲۵/-

جواہر لال نہرو کی سیاحتِ روس جواہر لعل نہرو

شخصیتیں؛ واقعات جنہوں نے مجھے متاثر کیا جنید احمد ۴۵/-

تحفتہ السعداء خواجہ کمال ۲۰/-

تفسیر القرآن

خطبۂ صدارت موتی لال نہرو ۱۰/-

شرح بھگوت گیتا مہاتما گاندھی ۲۰/-

محبوب الالباب خدابخش خاں ۱۲۵/-

قطعاتِ دلدار مرتبہ قاضی عبدالودود ۲۰/-

معیار و تحقیق نمبر ۲ مدیر قاضی عبدالودود ۲۵۰/-

میرا مذہب محمد علی ردولوی ۳۰/-

لیلیٰ کے خطوط قاضی عبدالغفار ۴۰/-

صراطِ مستقیم مرتبہ قہرماستاں خاں ۴۰/-

حکایتِ لقمان ایسس فیبلس ۴۵/-

ہندو دھرم اکبر کے عہد میں ابوالفضل ۱۰۰/-

مجمع النفائس سراج الدین علی خاں ۱۵/-

تصوف برصغیر میں خدابخش سمینار ۱۵۰/-

اعمال نامہ سر رضا علی ۱۰۰/-

گاندھی جی اور ہندو مسلم ایکتا نفس علی ۱۵/-

باغ معانی ۱۵/-

بھگوت گیتا یا نغمۂ خداوندی محمد اجمل خاں ۲/-

جوگ بسشٹ منہاج السالکین داراشکوہ ۴۰/-

ہندو دھرم ہزار برس پہلے البیرونی ۱۰۰/-

گفتنی ناگفتنی وامق جونپوری ۷۵/-

جرنل ۵۷ — ۶۲ ۱۵۰/-

خدابخش جرنل ۶۳ — ۶۸ ۱۵۰/-

خدابخش جرنل ۶۹ — ۷۴ ۱۵۰/-

جنید احمد کی آٹوگراف بک جنید احمد ۲/-

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ
ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین ۱۰۰/-

ہندو تیوہاروں کی دلچسپ اصلیت منشی رام پرشاد ماتھر ۳۰/-

داستان میری ڈاکٹر اقبال حسین ۳۰/-

دیوان مصحفی مرتبہ اسیر لکھنوی، امیر مینائی ۵۰/-

اورنگ زیب ایک نیا زاویۂ نظر ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد ۱۵/-

ایک نادر روزنامچہ مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۳۰/-

ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایت بی این پانڈے ۵/-

تواریخ نادرالعصر مؤلفہ منشی نول کشور ۲۵/-

من موہن کی باتیں شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی ۱۵/-

معیار تحقیق (مجلہ) ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ ۱۰۰/-

معیار تحقیق ۲ (مجلہ) ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ ۲۵۰/-

کاٹھے (کشمیری انشائیے) ڈاکٹر محمد زماں آزردہ ۱۵/-

فرہنگ زبان گویا جلد اول تالیف بدر ابراہیم ۵۰/-

مغربی تعلیم کا تصور رشید احمد صدیقی ۲۰/-

انتخاب ماہنامہ "ادیب" ۱۳-۱۹۱۰ نوبت رائے نظر ۵۰/-

طلسم ہوشربا (نو جلدیں) ۹۰۰/-

مقدمہ طلسم ہوشربا ۲۰/-

باقیات طلسم ہوشربا حصہ اوّل (زیر طبع)

" " " حصہ دوم (زیر طبع)

پیغام (ہفتہ وار) مولانا ابوالکلام آزاد ۱۰۰/-

باقیات عظیم الدین احمد ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ ۱۵/-

رسالہ "زبان" مدیر خوشتر منگرولی ۵/-

تذکرہ کاملان رام پور مولفہ حافظ احمد علی شوق ۵۰/-

دیوان رضا عظیم آبادی قاضی عبدالودود ۱۰/-

بہار اردو لغت (جلد اوّل) سید یوسف الدین احمد بلخی ۱۵/-

انتخاب ماہنامہ "العصر" (۱۳-۱۹۱۱) پیارے لال شاکر ۴۵/-

انتخاب ماہنامہ صبح امید (۲۱-۱۹۱۸) برج نرائن چکبست ۵۰/-

رقعات رشید احمد صدیقی مرتبہ پروفیسر مسعود حسین خاں ۲۰/-

ملنے کا پتا:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔

مطبوعات نیشنل بک ٹرسٹ

اُردو طباعت و اشاعت کے مسائل مرتبہ انور کمال حسینی ۷/-
شاعر مترجم پرمیش کمار ڈرے ۸/۷۵
بنگر واڑی " عرش ملسیانی ۵/۲۵
پہلا راجا آدھے ادھورے مترجم قیصر قلندر ۱۱/-
اڑیا افسانے مترجم ڈاکٹر مظفر حنفی ۱۱/۲۵
ماہیم کی کھاڑی مترجم: غلام بن رزاق ۱۱/۷۵
شری اربندو نوا جانا ۴/۵۰
نئی فصل رنجن بھٹاچاریہ ۸/۶۵
نیل کنٹھ پاکھی کی ٹوہ مترجم راشد سہسوانی ۱۵/-
گنگوا گنگا ائی " عبدالحی ۱۴/-
بادل چھٹ گئے " رضوان احمد ۱۶/۵۰
پنجابی کے یکبابی ڈرامے " ایس۔ایم شاہ نواز ۱۲/-
گجراتی کے یکبابی ڈرامے " ڈاکٹر مظفر حنفی ۱۲/۵۰
آدھی گھڑی مترجم ڈاکٹر سیفی پریمی ۱۵/-
سفر تمام ہوا " مخمور سعیدی ۱۱/۷۵
ریل گاڑی سید آل رسول ۱۰/۷۵
دود چراغ محفل بچی بابو ۱۴/۲۵
سوامی رام تیرتھ " مخمور جالندھری ۸/-
سردار ولبھ بھائی پٹیل وشنو پربھاکر ۷/۵۰
جے کانتن کی کہانیاں مترجم ذکی انور ۱۱/۷۵
پورن کمبھ مترجم: شانتی رنجن بھٹاچاریہ ۱۶/۷۵
دیپک " رفعت سروش ۶/۷۵
سورٹھ تیرا بہتا پانی " مظہر الحق علوی ۱۳/-
لہروں کی آواز " راج نرائن راز ۱۶/۵۰
چک دیر راجندر " راشد سہسوانی ۲۲/۵۰
چار دیواروں میں " ظفر ادیب ۷/۵۰
گنگا جیل کے بنکھ " رضیہ سجاد ظہیر ۶/۷۵
آئینہ " کنہیا لال گاندھی ۹/-
یہ ہماری زندگی " عرش ملسیانی ۱۴/۲۵
سفید خون مترجم رتن سنگھ ۶/-

انجمن ترقی اردو ھند کی پرانی مطبوعات

جائزہ زبان اردو ۱/-
تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ ۵/-
خمسہ کنجی ۲/-
معمار اعظم ۵/-
تنقید عقل محض ۳۵/-
پرتھی راج راسا ۲۵/-
دیوان بہرام ۱۵/-
مرحوم دہلی کالج ۱۵/-
مشاہیر یونان و روما (چہارم) ۳/-

اقبالیات

دیوان

بانگ درا (طلبہ اڈیشن) علامہ اقبال ۹/-
بال جبریل " ۶/-
ضرب کلیم مع ارمغان حجاز " " ۶/-
ارمغانِ حجاز (عکسی) (مجلد اڈیشن) " ۵/-
بانگ درا " " " ۲۵/-
بال جبریل " " " ۱۵/-
ضرب کلیم " " " ۱۵/-
شکوہ، جواب شکوہ " " ۱۲/-
کلیات اقبال (اردو) عکسی ۵۰/-

شرحیں

شرح بانگ درا یوسف سلیم چشتی ۶۵/-
شرح ضرب کلیم " " ۶۰/-
شرح بال جبریل " " ۶۵/-

تنقید

افکار اقبال محمد عبدالسلام خاں ۱۲۵/-
اقبال کا نظریہ خودی پروفیسر عبدالمغنی ۱۵۰/-
دانشورِ اقبال آل احمد سرور ۱۰۰/-

اقبال شاعر و مفکر — نورالحسن نقوی — ۸۵/-
اسلوبیات اقبال — طارق سعید — ۷۰/-
اقبال اور ممنون — ڈاکٹر اخلاق اثر — ۵۰/-
اقبال شخصیت اور شاعری — رشید احمد صدیقی — ۲۵/-
فکر اقبال کی سرگذشت — ڈاکٹر عبدالحق — ۷۰/-
اقبال پر نئی تنقید — ڈاکٹر محمد حنیف — ۲۰۰/-
اقبال کا تصورِ دین — شفیق الرحمان — ۷۵/-
علامہ اقبال کی ازدواجی زندگی — سید حامد جلالی — ۶۰/-
اقبال کی شاعری میں پیکر تراشی — ڈاکٹر نوزیہ احمد خاں — ۸۰/-
اقبال کے شعری اسالیب — ڈاکٹر عبدالحق — ۱۰/-
اقبالیات کی تلاش — عبدالقوی دسنوی — ۳۵/-
اقبال کا نظام فن — ڈاکٹر عبدالمغنی — ۶۰/-
اقبال اور اردو نظم — مرتبہ آل احمد سرور — ۲۶/-
فکرِ اقبال — سید وحیدالدین — ۱۰/-
فلسفۂ اقبال (خطبات کی روشنی میں) — سید وحیدالدین — ۳۰/-
شعریاتِ اقبال — قاضی عبیدالرحمن — ۱۰۰/-
اقبال کا فن — گوپی چند نارنگ — ۷۵/-
پیام اقبال — بدیع الزماں — ۴۰/-
اقبال کے تصورات۔ عشق و خرد — ڈاکٹر وزیر آغا — ۱۰۰/-
ابتدائی کلام اقبال — ڈاکٹر گیان چند جین — ۱۲۵/-
محمد اقبال — مترجم۔ کبیر احمد جائسی — ۱۸/-
اقبال جادوگرِ ہندی نژاد — عتیق صدیقی — ۱۴/-
تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ — علامہ اقبال — ۱۰۰/-
اقبال شاعر فلسفی — وقار عظیم — ۲۰/-
اقبال معاصرین کی نظر میں — " — ۵۰/-
سفرنامہ اقبال — بشیر نواز — ۳/-
اقبال کامل — مولانا عبدالسلام ندوی — ۴/-
اقبال سب کے لیے — فرمان فتح پوری — ۷۵/-
اقبال کی اردو نثر — عبادت بریلوی — ۲۰/-
نقدِ اقبال — میکش اکبرآبادی — ۲۳/۵۰
نقوش اقبال — ابوالحسن علی ندوی — ۳۵/-

غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات — یوسف حسین خاں — ۱۸/-
اقبال اور اس کا عہد — جگن ناتھ آزاد — ۴۰/-
اقبال کے کرم فرما — ماسٹر اختر — ۳۵/-
اقبال ایسنز اینڈ اسٹرکچر — اسلوب احمد انصاری — ۱۵/-

خطوط

خطوط اقبال — رفیع الدین ہاشمی — ۵۰/-

دیگر اداروں کے معیاری رسائل

معیار و تحقیق (ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ) نمبر ۱ ۱۰/- نمبر ۲ ۲۵/-
"ذہن جدید" سہ ماہی مجلہ — مدیر زبیر رضوی — ۲۰/-
"پیغام" ہفتہ وار — مدیر مولانا آزاد — ۱۰۰/-
ایوان اردو شہر نمبر — دہلی اردو اکیڈمی — ۱۲/-
جرنل ۵۲-۵۱ — خدا بخش لائبریری — ۵۰/-
شعور نمبر ۲ مجلد — بلراج مینرا — ۴۰/-
شعور نمبر ۳ — " — ۴۰/-
شعور نمبر ۴ — " — ۲۵/-
شعور نمبر ۵ — " — ۳۶/-
شعور نمبر ۶ — " — ۶۰/-
غالب نامہ مجلہ سہ ماہی — پروفیسر نذیر احمد — ۴۰/-
ایوان اردو — مولانا آزاد نمبر — ۱۰/-
جرنل شمارہ نمبر ۳ و ۴ — خدا بخش لائبریری پٹنہ — ۳۰/-
رسالہ "زبان" — مدیر خوشتر منگرولی — ۵۰/-
انتخاب ماہنامہ العصر (۱۷-۱۹۱۳ء) مدیر پیارے لال شاکر — ۴۵/-
انتخاب ماہنامہ صبح امید (۲۱-۱۹۱۸ء) مدیر برج نرائن چکبست — ۵/-
عصری ادب (سہ ماہی) — مدیر: ڈاکٹر محمد حسن — ۲/-
جامعہ: رسالہ، ماہنامہ — مدیر: سید جمال الدین — ۳/-
شیرازہ دوماہی مارچ ۱۹۶۲ء سری نگر (کشمیر) — ۲/۵۰
سوغات ۱ تا ۱۰ — مدیر محمود ایاز فی شمارہ — ۸/-
فکر و آگہی بیکل اتساہی نمبر رضیہ حامد — ۱۰/-
خدا بخش جرنل نمبر (۵۷ تا ۶۰) خدا بخش لائبریری پٹنہ — ۱۵۰
تحریر نمبر ۲۵ — اڈیٹر مالک رام — ۵/-

جامعہ اسلم جیراج پوری نمبر عبداللطیف اعظمی ۶/-
چنگاری پاکستانی افسانہ نمبر ڈاکٹر قمر رئیس ۱۵/-
اسلام اور عصر جدید (سہ ماہی) ڈاکٹر سید عابد حسین ۴/-

غالبیات

دیوان

دیوان غالب (انجمن) ڈی لکس اڈیشن ۵۱/-
دیوان غالب ایوان اڈیشن ۲۵/-
دیوان غالب بمبئی اڈیشن ۲۵/-
گل رعنا (انتخاب کلام فارسی) مرتبہ۔ مالک رام ۲۵/-
دیوان غالب ہندی اڈیشن ایوان غالب (زیر طبع)
دیوان غالب کامل مرتبہ کالی داس گپتا رضا ۱۲۵/-
دیوان غالب ” نورالحسن نقوی ۲۵/-
دیوان غالب نول کشوری ۱۲/-

خطوط

خطوط غالب (اول تا چہارم) مکمل، مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم ۳۹۰/-
عود ہندی غالب ۹/-
ادبی خطوط غالب مرتبہ حسن عسکری ۲۵/-
مدا اد خطوط غالب عبدالقوی دسنوی ۱۰/-

تنقید

غالب احوال و آثار ڈاکٹر حنیف نقوی ۶۰/-
غالب اور انقلاب (شمارہ دستاویز) معین الرحمٰن ۶۰/-
غالب اور تنقیدی شعور محمد مشتاق شارق ۴۰/-
غالب درون خانہ کالی داس گپتا رضا ۱۲۵/-
غالب پر چند تحریریں ڈاکٹر سعادت علی صدیقی ۳۵/-
غالب مرتبہ غلام رسول مہر ۳۵/-
یادگار غالب (اردو) مالک رام ۲۵/-
یادگار غالب (فارسی) ” ۹/-
غالب اور صفیر بلگرامی مشفق خواجہ ۳۶/-
غالب ایک مطالعہ پروفیسر ممتاز حسین ۳۰/-

غالب کچھ مضامین مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم ۴/-
اسداللہ خاں غالب مرد مرتبہ کالی داس گپتا رضا ۹۰/-
غالب کی بعض تصانیف کے بارے میں کالی داس گپتا رضا ۸۰/-
غزلیات غالب (اردو) یوسف حسین خاں ۹۶/-
غزلیات ” (فارسی) ” ۹۰/-
نقد قاطع برہان مع ضمائم پروفیسر نظیر احمد ۶۰/-
ریختہ غالب نورالحسن ہاشمی ۵/-
غزلیات غالب کا عروضی تجزیہ صغیر النساء بیگم ۷۵/-
تفسیر غالب ڈاکٹر گیان چند جین ۳۸/-
غالب شخص اور شاعر مجنوں گورکھپوری ۲۵/-
محاسن کلام غالب عبدالرحمٰن بجنوری ۴/-
متعلقات غالب کالی داس گپتا رضا ۷/-
احوال غالب مختار الدین آرزو ۴۵/-
غالب تقلید اجتہاد خورشید الاسلام ۳/-
غالب اور ابوالکلام عتیق صدیقی ۳۵/-
مقالات بین الاقوامی غالب سیمنار انگریزی ۱۰/- اردو ۲۰/-
غالب فکر و فن فخر الاسلام اعظمی ۱۸/-

شرحیں :-

مراۃ الغالب شرح بیخود دہلوی ۴۵/-
بیان غالب شرح دیوان غالب آغا محمد باقر ۶۰/-
شرح دیوان غالب طباطبائی ۳۰/-
شرح دیوان غالب یوسف سلیم چشتی ۹۰/-

نذریں

نذر مختار مرتبہ۔ مالک رام ۱۰۱/-
نذر ذاکر اردو ” ” ۶۰/-
” ” انگلش ” ” ۴۰/-
” عابد اردو ” ” ۲۵/-
” مسعود ترتیب مرزا خلیل بیگ ۱۵۰/-
” عبدالحمید اردو ترتیب مالک رام ۷۰/-
” انگلش ” ” ۱۰۱/-

نذرِ زیدی اردو — مرتبہ مالک رام — ۵۱/-

انگلش — ۵۱/-

نذرِ منظور (علی گڑھ) — ۵۰/-

ارمغانِ مالک اردو جلد دوم — ۳۰/-

ارمغانِ مالک انگریزی — ۳۰

لغات

باہری بنیادی انگلش اردو ڈکشنری (ادارہ) — ۱۰/-

باہری جیوم اردو انگلش ڈکشنری (ادارہ) — ۱۰/-

فیروز اللغات کلاں سائز مولوی فیروز الدین — ۲۲۵/-

اسٹوڈنٹس ٹوئنٹیتھ سنچری ڈکشنری انگریزی اردو — ۱۱۰/-

اسٹینڈرڈ " اردو انگریزی — ۱۱۰/-

کنسائز " انگریزی اردو — ۴۵/-

" " اردو انگریزی — ۴۵/-

جیبی " پاکٹ — ۲۱/-

" " انگریزی اردو — ۲۱/-

جدید تعلیم اللغات " — ۲۱/-

جدید فیروز اللغات (درمیانی) — ۶۵/-

فیروز اللغات (جیبی) — ۱۵/-

فرہنگ عامرہ فارسی عربی ترکی الفاظ کا باتلفظ — ۶۰/-

مہذب اللغات اول تا ہشتم فی حصہ — ۲۵/-

اردو ہندی ڈکشنری ترتیب انجمن ترقی اردو ہند — ۸۵/-

ہندی کی نئی ڈکشنری فیاض حسین جامعی — ۱۵/-

اے نیو ہندوستانی انگلش ڈکشنری ایس ڈبلیو فیلن — ۹۰/-

انگلش اردو ڈکشنری پریکٹیکل — ۵/-

المنجد عربی سے اردو ڈکشنری — ۱۷۵/-

اردو انگلش ڈکشنری پائنیر — ۵۰/-

بہار اردو لغت (پہلی بار) یوسف الدین بلخی — ۱۵/-

نحا المعانی دکنی اردو لغت ڈاکٹر جاوید وششٹ — ۱۰/-

کریم اللغات فارسی نول کشور پریس — ۳۰/-

ہندوستانی ڈکشنری (انگلش اردو) ڈنکس فاربس — ۱۵۰/-

لغات کشوری نول کشور پریس — ۱۰/-

اردو اکادمی دہلی کی مطبوعات

واقعاتِ دارالحکومت دہلی (تین جلدوں میں) مصنفہ مولوی بشیر الدین احمد مکمل سیٹ — ۳۰۰/-

آزادی کے بعد دہلی میں اردو افسانہ مرتب پروفیسر قمر رئیس — ۴۸/-

آزادی کے بعد دہلی میں اردو طنز و مزاح مرتب پروفیسر مظفر حنفی — ۴۴/-

آثار الصنادید مصنفہ سر سید احمد خاں مرتب ڈاکٹر خلیق انجم تین جلدوں میں — ۲۵۰/-

آزادی کے بعد دہلی میں اردو نظم مرتب ڈاکٹر عتیق اللہ — ۴۸/-

آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق مرتب ڈاکٹر تنویر احمد علوی — ۴۸/-

آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ مرتب ڈاکٹر نصیر احمد خاں — ۴۸/-

فوائد الفواد مترجم خواجہ حسن ثانی نظامی — ۱۰۰/-

دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر پروفیسر محمد حسن — ۲۶/-

مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین ڈاکٹر اسلم پرویز — ۴۷/-

آزادی کے بعد دہلی میں اردو غزل مرتب پروفیسر عنوان چشتی — ۹۱/-

نئی تعلیمی پالیسی اور اردو تدریس اکادمی کی پیشکش — ۳۰/-

کلیات مکاتیب اقبال (جلد اول) مرتب ڈاکٹر مظفر حسین برنی — ۱۰۰/-

کلیات مکاتیب اقبال جلد دوم مظفر حسین برنی — ۲۸۰/-

رنگ ہزاروں خوشبو ایک (شعری مجموعہ) بیکل اتساہی — ۵۸/-

انشاء ہادی النساء (سید احمد دہلوی) — ۲۲/-

نیا اردو افسانہ: تجزیے اور مباحث مرتب پروفیسر گوپی چند نارنگ — ۶۰/-

دلی والے جلد اول، دوم مرتب ڈاکٹر صلاح الدین ۹۲/-
دہلی اور اس کے اطراف ڈاکٹر صادقہ ذکی ۲۵/-
دہلی کے مشائخ کی ادبی خدمات بیگم ریحانہ فاروقی ۲۱/-
دلی کی درگاہ شاہِ مرداں ڈاکٹر خلیق انجم ۳۳/-
حواشی ابوالکلام آزاد سید مسیح الحسن ۶۲/-
اردو میں بارہ ماسے کی روایت ڈاکٹر تنویر احمد علوی ۴۹/-
دلی کے آثار قدیمہ ڈاکٹر خلیق انجم ۴۸/-
اشاریہ آج کل جمیل اختر ۷۷/-
نوبت پنج روزہ یعنی درداغ ظفر مصنف علامہ راشد الخیری
مرتب ڈاکٹر تنویر احمد علوی ۲۳/-
دہلی کی آخری بہار مصنف علامہ راشد الخیری
مرتب سید ضمیر حسن دہلوی ۲۰/-
اردو غزل مرتب ڈاکٹر کامل قریشی ۳۱/-
اردو اور مشترکہ ہندستانی تہذیب " " ۲۹/-
لال قلعے کی ایک جھلک حکیم خواجہ سید ناصر نذیر فراق دہلوی
مرتب ڈاکٹر انتظار مرزا ۱۹/-
دلی کی تہذیب ڈاکٹر انتظار مرزا ۱۷/-
ڈائرکٹری اردو ناشرین و تاجران کتب انور علی دہلوی ۵/-
مرزا محمود بیگ کے مضامین کا انتخاب ڈاکٹر کامل قریشی ۳۱/-
عالم میں انتخاب دلی مہیشور دیال ۵۳/-
سوانح دہلی مصنف شاہزادہ مرزا احمد اختر گورگانی
مرتب مرغوب عابدی ۱۷/-
خواجہ حسن نظامی حیات اور کارنامے خواجہ حسن ثانی نظامی ۲۹/-
دیوان حالی مصنف: مولانا الطاف حسین حالی
مقدمہ رشید حسن خاں ۲۷/-
چراغ دہلی میرزا حیرت دہلوی ۳۹/-
اردو صحافت مرتب انور علی دہلوی ۳۲/-
دہلی کے اسکولوں میں اردو نصاب کے مسائل
مرتب صدیق الرحمن قدوائی ۲۳/-
مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے
مرتب ڈاکٹر خلیق انجم ۳۹/-

بزم آخر مصنف: منشی فیض الدین
مرتب: ڈاکٹر کامل قریشی ۲۱/-
دہلی کی آخری شمع مصنف: مرزا فرحت اللہ بیگ
مرتب: ڈاکٹر صلاح الدین ۲۳/-
دہلی کا آخری دیدار مصنف سید وزیر حسن دہلوی
مرتب: سید ضمیر حسن دہلوی ۱۰/-
مضامین نہرو آنند نرائن ملا ۴/-
قلعۂ معلیٰ کی جھلکیاں مصنف عرش تیموری
مرتب ڈاکٹر اسلم پرویز ۱۷/-
رسوم دہلی مصنف سید احمد دہلوی مرتب ڈاکٹر خلیق انجم ۱۸/-
داغ دہلوی حیات اور کارنامے مرتب ڈاکٹر کامل قریشی ۳۱/-
آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ پروفیسر تنویر حنفی ۴۵/-
آزادی کے بعد دہلی میں اردو مرثیہ ڈاکٹر شارب ردولوی ۱۷/-
مہربان جن وکیل نجیب ۲۵/-

ترقی اردو بورڈ کی مطبوعات

اردو کے ابتدائی ادبی معرکے ڈاکٹر یعقوب عامر ۱۲/-
لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ ڈاکٹر مسعود ہاشمی ۱۰/-
ہندستان میں موزوں ٹکنالوجی کی توسیع کی تجویز ایم ایم ہدی /-
مرزا عظیم بیگ چغتائی ہارون ایوب /-
اسلامی تہذیب و تمدن عمادالحسن آزاد فاروقی /-
موزوں ٹکنالوجی ڈائرکٹری ایم۔ ایم۔ ہدی /-
ڈارون اور اس کا نظریہ ارتقا افتخار عالم خاں ۱۰
شکاری شکار اور جنگل سے پیار رضیہ تحسین /-
شعر شور انگیز جلد اول، دوم شمس الرحمن فاروقی بی عا
ثانوی مدارس میں تدریس مترجم سید مسرور علی ہاشمی
سب رس کے حروف آصفہ بیگم /-
انتخاب غزلیات میر مرتب ڈاکٹر حامدی کاشمیری
" کلام حسرت " ڈاکٹر فضل امام /-
بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا پروفیسر اختر اورینوی
عربی ادب کی تاریخ اول تا سوم عبدالحلیم ندوی مکمل سیٹ

رہبر اخبار نویسی — سید اقبال قادری — ۴۲/-
دیوان آبرو — پروفیسر محمد حسن — ۲۵/-
مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات — " — ۲۸/-
اتر پردیش کے لوک گیت — اطہر علی فاروقی — ۲۹/۲۵
آندھی میں چراغ — خواجہ غلام السیدین — ۱۲/-
انشاء کا ترکی روزنامچہ — انشا، سید محمد نعیم الدین — ۴/۵۰
انیس کے مرثیے جلد اول — صالحہ عابد حسین — ۳۶/-
انیس کے مرثیے حصہ دوم — " — ۴۰/-
رباعیات انیس — مرتب علی جواد زیدی — ۳۵/-
اپشکن — ظ انصاری — ۱۲/-
تالستائے — محمد لیسین — ۹/۲۵
اردو ادب کی تنقیدی تاریخ — احتشام حسین — ۱۶/۵۰
چیخف — ظ انصاری — ۱۱/-
خسرو شناسی — مرتبین ظ انصاری / ابوالفیض سحر — ۱۷/۵۰
درس بلاغت — تالیف: ترقی اردو بیورو — ۱۱/-
زندگانی بے نظیر — مرتبین: سید محمد عبد الغفور / سید محمد حسنین — ۱۴/-
سخنوران گجرات — سید ظہیر الدین مدنی — ۱۷/-
شعریات (دوسرا اڈیشن) — ارسطو / شمس الرحمن فاروقی — ۵/۷۵
صحیفۂ خوش نویساں — مولوی احتشام الدین احمد شاغل — ۱۴/-
غزل اور غزل کی تعلیم — اختر انصاری — ۱۰/۲۵
فیودر دستو ئیفسکی — ظ انصاری — ۸/۵۰
فسانۂ آزاد (حصہ اول) — رتن ناتھ سرشار — ۱۰/-
" " (حصہ دوم) — ترتیب جمع فرہنگ امیر حسن نورانی — ۴۵/-
" " (حصہ سوم) (دوم) — " " — ۴۷/۵
" " (حصہ سوم) (دوم) — " " — ۶۷/۵۰
فسانۂ آزاد (حصہ چہارم) اول — " " — ۵۰/-
" " (حصہ چہارم) (دوم) — " " — ۵۰/-
دیوان حسرت عظیم آبادی — مرتبہ اسماء زیدی — ۱۸/-
کلیات سراج — سراج اورنگ آبادی — ۴۸/-
جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن — ظفر محمود — ۱۲/-
کلیات قلی قطب شاہ — ڈاکٹر سیدہ جعفر — ۶۵/-

کلیات سودا (حصہ اول) — مرتب ڈاکٹر محمد حسن — ۴۸/-
کلیات سودا (حصہ دوم) — " " — ۱۳/-
وضاحتی کتابیات (جلد اول) ۱۹۷۶ء — گوپی چند نارنگ، مظفر حنفی — ۱۸/-
وضاحتی کتابیات (جلد دوم) ۱۹۷۷-۷۸ء — گوپی چند نارنگ، مظفر حنفی — ۲۴/-
ہندی ادب کے بھگتی کال پر مسلم ثقافت کے اثرات — سید اسد علی / ماجد اسد — ۱۵/۵۰

تاریخ، سیاسیات

آریہ سماج کی تاریخ — لالہ لاجپت رائے / کشور سلطان — ۱۰/۵۰
اسلامی سماج — ریوبن لیوی / ڈاکٹر مشیر الحق — ۴/-
اکبر سے اورنگ زیب تک — ڈبلیو. ایچ مورلینڈ / جمال محمد صدیقی — ۲۱/۵
اورنگ زیب کے عہد میں مغل امراء — محمد اطہر علی / امین الدین — ۲۸/-
انقلاب فرانس — جے ایم تھامپسن / بی جے سنگھ — ۲۵/۵
انقلاب ۱۸۵۷ء — پی سی جوشی — ۱۳/۵۰
تاریخ آصفی — مرزا ابو طالب اصفہانی / ڈاکٹر ثروت علی — ۱۰/-
تاریخ شاہجہاں — بنارسی پرشاد سکسینہ / سید اعجاز حسین — ۱۴/-
تاریخ جہانگیر — بینی پرشاد / رحم علی الہاشمی — ۱۸/۷۵
تاریخ تحریک آزادی ہند (جلد اول) — ڈاکٹر تاراچند / قاضی محمد عدیل عباسی — ۲۰/۵۰
تاریخ تحریک آزادی ہند جلد سوم — تاراچند / قاضی محمد عدیل عباسی — ۷۵/-
تاریخ ٹیپو سلطان — محب الحسن / حامد اللہ افسر، عتیق صدیقی — ۲۶/-
تاریخ تمدن ہند — محمد مجیب — ۱۱/-
تاریخ تعلیم ہند — سید نور اللہ، جے پی نائک — ۱۸/-
تحریک خلافت — قاضی محمد عدیل عباسی — ۷/۵۰
حیدر علی — نریندر کرشن سنہا / انتظار حسین صدیقی — ۱۲/۵۰
خلجی خاندان — کے ایس لال / محمد لیسین مظہر صدیقی — ۶/۵۰
دکن کی قدیم تاریخ — پروفیسر غلام یزدانی — ۲۹/-

دکن کے بہمنی سلاطین — ہارون خاں شیروانی / رحم علی الہاشمی — ۱۲/۷۵

رنجیت سنگھ — نریندر کرشن سنہا / کیلاش چندر چودھری — ۹/۲۵

سلطنت مغلیہ کا مرکزی نظام حکومت — ابن حسن / آئی۔ اے — ۱۹/-

شہیدانِ آزادی (حصہ اول) پی۔ این چوپڑا / بھگونت سنگھ — ۲۴/-

〃 〃 (حصہ دوم) سید تفضل حسین — ۲۰/-

شیر شاہ اور اس کا عہد — کالکا رنجن قانون گو / رام آسرے شرما — ۳۴/-

ظہیر الدین محمد بابر — ایل ایف۔ رش بروک ولیمز / رفعت بلگرامی — ۱۳/-

قدیم ہندستان کی ثقافت و تہذیب تاریخی پس منظر میں — ڈی۔ ڈی۔ کوسمبی / بال مکند عرش ملسیانی — ۱۳/-

قدیم ہندستان میں شودر — رام شرن شرما / جمال محمد صدیقی — ۱۴/۵۰

کتاب کی تاریخ — شایاں قدوائی — ۱۳/۵۰

مغل ہندستان کا طریق زراعت — عرفان حبیب / جمال محمد صدیقی — ۲۴/۵۰

مغلوں کا نظام مال گزاری ۱۷۰۰ء سے ۱۷۵۰ء تک — نعمان احمد صدیقی / ایس نبی ہودی — ۹/-

مغل دربار کی گروہ بندیاں اور ان کی سیاست — ڈاکٹر ستیش چندر / محمد قاسم صدیقی — ۲۲/-

وادیِ سندھ اور اس کے بعد کی تہذیبیں — سر مورٹیمر وہیلر / زبیر رضوی — ۸/-

ہندستانی مصوری (عہد مغلیہ میں) — پرسی براؤن / عبید الحق — ۲۵/-

ہندستان کا شاندار ماضی — اے۔ ایل باشم / ایس غلام سمنانی — ۳۲/۵۰

ہندستان کے دور وسطیٰ کے مورخین — پروفیسر محب الحسن / مسرور علی ہاشمی — ۴۵/-

ہندستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج — ڈاکٹر رفیق زکریا — ۴۶/-

ہندستان میں مسلم حکومت کی اساس — اے بی۔ ایم حبیب اللہ / مسعود الحق — ۲۵/-

ہندو فلسفہ مذہب اور نظام معاشرت — سید عابد حسین — ۹/-

یورپ کے عظیم سیاسی مفکرین (دوسرا اڈیشن) — محمد ہاشم قدوائی — ۱۵/۵۰

لسانیات، لغات، قواعد

اردو افعال — سونیا چرنکووا — ۲۴/-

آہنگ و عروض — کمال احمد صدیقی — ۱۸/-

اردو املا — رشید حسن خاں — ۲۷/-

اردو صرف و نحو — ڈاکٹر اقتدار حسین خاں — ۱۶/-

زبان و قواعد — رشید حسن خاں — ۱۸/-

فرہنگ اصطلاحات نباتیات (انگریزی اردو) — ۱۵/-

فرہنگ آصفیہ (جلد اول) مولوی سید احمد دہلوی مکمل سیٹ
〃 〃 (جلد دوم) 〃 〃
〃 〃 (جلد سوم) 〃 〃 — ۱۵۶/-

فرہنگ اصطلاحات انسانیات (انگریزی اردو) — مرتبہ۔ ترقی اردو بیورو — ۴/۵۰

فرہنگ اصطلاحات تاریخ و سیاست — مرتبہ۔ ترقی اردو بیورو — ۲۴/-

فرہنگ اصطلاحات حیوانیات (انگریزی اردو) — مرتبہ۔ ترقی اردو بیورو — ۱۲/-

فرہنگ اصطلاحات کیمیا (انگریزی اردو) — مرتبہ۔ ترقی اردو بیورو — ۷/-

فرہنگ اصطلاحات معاشیات (انگریزی اردو) — مرتبہ۔ ترقی اردو بیورو — ۱۰/-

فرہنگ اصطلاحات لسانیات (انگریزی اردو) — مرتبہ ترقی اردو بیورو — ۲۰/-

مختصر اردو لغت (اردو سے اردو) — مرتبہ ترقی اردو بیورو — ۶۵/-

فرہنگ ادبی اصطلاحات کلیم الدین احمد ۲۶/-
عام لسانیات ڈاکٹر گیان چند جین ۵/-۶
وضع اصطلاحات سید وحید الدین سلیم ۱۸/-
نئی اردو قواعد عصمت جاوید ۱۵/-
ہند آریائی اور ہندی سنیتی کمار چٹرجی / عتیق احمد صدیقی ۱۰/۷۵

فلسفہ، تعلیم، نفسیات، سماجیات

ابتدائی نفسیات سید محمد حسن، محمد رضوان احمد ۱۶/-
اردو زبان کی تدریس معین الدین ۸/۵۰
اصول تعلیم خواجہ غلام السیدین ۲۲/-
اصول تعلیم اور عمل تعلیم ڈی۔ ایس۔ گورڈن / سیفی پریمی ۹/۷۵
تاریخ فلسفہ اسلام۔ ٹی۔ جے۔ ڈی بوئر / سید عابد حسین ۶/۵۰
اشارات تعلیم آسٹن / نورالحسن ۳/۵۰
تدریس جغرافیہ محمد ضیاء الدین علوی ۲/-
تعلیم اور اس کا سماجی پس منظر سلامت اللہ ۱۰/۷۵
تعلیم سماج اور کلچر۔ اے کے سی اٹاوے / اختر انصاری ۱۰/-
تعلیمی تشکیل نو کے مسائل خواجہ غلام السیدین / ایم۔ ابوبکر ۲/۷۵
تعلیم میں نفسیات کی اہمیت ہربرٹ سونسین / سلامت اللہ ۴/-
جدید ہندستان میں تعلیم نیاز احمد اعظمی ۲/-
جدید ہندستان میں ذات پات / ایم این سرینواس / شہباز حسین ۸/۷۵
سماج اور تعلیم محمد عبدالقادر عادری ۵/۷۵
شریمد بھگوت گیتا (دوسرا اڈیشن) / مترجم حسن الدین احمد ۵/-
قدیم ہندی فلسفہ رائے شیو موہن لال ماتھر ۱۵/۵۰

قومی تہذیب کا مسئلہ (دوسرا اڈیشن) / سید عابد حسین ۹/۶۰
سائنس کیسے پڑھائیں؟ محمد شریف خاں ۱۲/۵۰
مدرسہ عمل۔ اڈولف فیریر / شیخ غلام حسین ۹/۷۵
نفسیات جنوں برنارڈ ہارٹ / عبیدہ زماں ۵/۲۵
ہمارا قدیم سماج سید سخی حسن نقوی ۷/۵۰
ہندستان کے زمانۂ قدیم و وسطیٰ کے کتب خانے / بمل کمار دت / سرتاج عالم عابدی ۱۲/۵۰

معاشیات، علم تجارت

اصول معاشیات رضیہ نظامی ۱۰/-
دفتری انتظامیہ بشمبر سہائے / پروفیسر محمد سعید ۱۲/-
شماریات اور کاروبار میں ان کا استعمال / ایل۔ اے۔ باؤنگین / نجم الحسن ۱۵/۷۵
معاشیات کیسے پڑھائیں ریاض ثنا کر خاں ۱۴/-
ہندستان کا صنعتی ارتقاء ڈی۔ آر۔ گیڈ گل / ام صدیقی ۱۳/-
ہندستان کی معاشی تاریخ (حصہ اول)، ۱۷۵۷ تا ۱۸۳۷۔ رمیش دت / غلام ربانی تاباں ۱۸/۷۵
ہندستان کی معاشی تاریخ (حصہ دوم) / رمیش دت / غلام ربانی تاباں ۲۶/-

سائنس اور تکنیکی کتابیں

ایٹم کیا ہے؟ احمد حسین ۴/۵۰
اسکول لائبریری سید حسین رضا النقوی ۴/-
کوئلہ نفیس احمد صدیقی ۳۲/-
سائنس کی باتیں اندر جیت لال ۷/-
طبیعیات کے بنیادی اصول آرتھر بیزر / احمد وکیل جعفری ۲۵/-
فن طباعت بلونت سنگھ مطیر ۶/۲۵
ہماری غذا شکیل احمد ۹/۵۰
ہندستان میں چھاپہ خانہ اے۔ کے۔ پرولکر / علی ابن الحسن زیدی ۶/۷۵

بائیوگیس پلانٹ — ڈاکٹر خلیل اللہ خاں ۱۵/-

دھوپ چولہا — ایم۔ ایم ہدی/ڈاکٹر خلیل اللہ خاں ۱۲/-

آسان اردو شارٹ ہینڈ — سید راشد حسین ۱۶/-

طب

درد علامت اور علاج — ابوسعدی خالد جاوید ۱۷/-

مبادیات طب پر ایک تحقیقی نظر — حکیم الطاف احمد اعظمی ۱۱/-

جائنٹسز طب آکوپنکچر اور موکسی بوشن — ڈاکٹر محمد ظہیر الدین ۱۲/-

امراض النساء — خورشید احمد شفقت اعظمی ۴/-

تشریح الاعضاء (حصہ دوم) — حکیم محمد کمال الدین (زیر طبع)

تیمارداری — حسین فاروقی ۱۲/۵۰

امراض الاطفال — خورشید احمد شفقت اعظمی ۴۸/-

سرطان کیا ہے؟ — محمد حسین برہان ۶/-

علم الادویہ (حصہ سوم) — حکیم محمد مستان علی (زیر طبع)

نظری علاج — حسن الدین احمد، غلام احمد (زیر طبع)

خیالیات — ڈاکٹر سید محمد عباس رضوی (زیر طبع)

موجز القانون — مترجم کوثر چاندپوری ۲۷/۷۵

کلیات نبض و بول و براز — حکیم حافظ سید حبیب الرحمٰن ۱۵/-

پیٹ کے کیڑے — محمد رفیق اے الیس ۷/-

یونانی طب میں مانع حمل ادویہ اور تدابیر — حکیم ام الفضل ۱۰/-

یونانی ادویہ مفردہ — (ادارہ) ۱۲/-

قانون

بھارت کا آئین — (وزارت قانون و انصاف) ۱۵/-

انتظامی قانون کے اصول — ایم۔ پی۔ جین / الیس۔ این۔ جین ۲۹/-

ہندستان کی قانونی تاریخ — ایم۔ پی۔ جین / انوارالیقین — (حصہ اول) ۲۷/۲۵ — (حصہ دوم) ۲۹/۵۰

بچوں کا ادب

شریف زادہ — مرزا ہادی رسوا مرتبہ: حنیف عباسی ۵/-

فٹ بال کی کہانی — راج نرائن راز ۶/-

فسانۂ عجائب — رجب علی بیگ سرور ۴/۲۵

گلستان کی کہانی — مرتبہ: امیر حسن نورانی ۴/-

محمد حسین آزاد — نند کشور وکرم ۵/-

مشینی گھوڑا — اطہر پرویز ۵/-

مولانا روم کی کہانی — مرتبہ محمد حفیظ الدین ۴/-

نورتن کہانی۔ انتخاب اور بازگوئی — شمیم احمد ۶/۵۰

نصوح کا خواب — مرتب: حفیظ عباسی ۲/۷۵

میر تقی میر — نثار احمد فاروقی ۱۸/-

اچھی چڑیا — محمد شفیع الدین نیر ۵/-

ادب کسے کہتے ہیں (دوسرا اڈیشن) — اطہر پرویز ۵/۸۵

اکبر الہ آبادی — صغرا مہدی ۴/۵۰

اقبال کی کہانی — جگن ناتھ آزاد ۲/۵۰

انوکھی کہانیاں — محمد قاسم صدیقی ۲/۲۵

ایک دن کا بادشاہ — اطہر پرویز ۵/۵۰

ایک نائی اور رنگ ساز کا قصہ — اطہر پرویز ۲/۵۰

بابرنامہ — محمد قاسم صدیقی ۱۴/-

بچوں کے نہرو — ایم چلاپتی راؤ / پریم نرائن ۶/۵۰

بچوں کے حالی — صالحہ عابد حسین ۳/۷۵

بینک کی کہانی — غلام حیدر ۴/۵۰

بوستاں کی کہانیاں — علقمہ شبلی ۶/-

بچوں کے ڈرامے — اظہر افسر ۱۰/۵۰

بھارت کی لوک کتھائیں (حصہ اول، دوم، سوم) — بازگوئی محمد قاسم صدیقی ۹/-

چار درویشوں کا قصہ — نورالحسن نقوی ۳/۲۵

چراغ کا سفر (دوسرا اڈیشن) — سعید محمد لونکی ۱/۵۰

حاتم طائی کا قصہ — مرتبہ نورالحسن نقوی ۶/۵۰

خواجہ میر درد — ظہیر احمد صدیقی ۴/۵۰

ڈلیس الیس کی کہانیاں — اطہر پرویز ۲/-

راجہ رام موہن رائے — سچندر لال گوسائیں انعام الحق ۳/۲۵

رتن ناتھ سرشار — پریم پال اشک ۴/۲۵

شاہنامے کی کہانیاں — ڈاکٹر آصف نعیم صدیقی ۴/۲۵

دیگر اداروں کی مطبوعات

(ب) تنقید اور انشائیہ

اردو ناولوں میں عورت کا تصور — عبیدہ کبیر — ۴۵/-

اردو غزل اور اس کا فکری نظام — شمیم رضوی — ۵۰/-

اردو ہاسی تہذیب اور ثقافت — عبدالباری ایم اے — ۲۵/-

ہندو مذہب اکبر کے عہد میں — ابوالفضل — ۱۰/-

امراؤ جان ادا ایک خصوصی مطالعہ — ڈاکٹر شاہد جمیل — ۳۵/-

او سپرا نگاری — ڈاکٹر رضیہ حامد — ۶۰/-

اردو داستان تحقیق و تنقید — قمرالہدیٰ فریدی — ۲۵/-

اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے — ڈاکٹر فرمان فتحپوری — ۶۰/-

اقبال اور مودودی کا تقابلی مطالعہ — عمر حیات خاں غوری — ۵۵/-

ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصہ — سید عبداللہ — ۵۰/-

اردو میں تمثیل نگاری — منظر اعظمی — ۴۲/-

امیر خسرو اور ان کا ہندوی کلام — پروفیسر گوپی چند نارنگ — ۱۲۰/-

احمد شوقی ایک مطالعہ — محمد اطہر حیات — ۳۰/-

اردو مرثیے کی سرگزشت (آغاز سے زمانۂ حال تک) — ڈاکٹر اسد اریب — ۴۰/-

اسم انشائیوں کا تجزیاتی مطالعہ — ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی — ۱۰/-

اقبال ماوراء کے دیر و حرم — پروفیسر سلیمان اطہر — ۷۵/-

اردو میں ادب اطفال ایک جائزہ — پروفیسر اکبر رحمانی — ۴۵/-

اردو میں رپورتاژ کی روایت — طلعت گل — ۵۰/-

اردو کے ادبی معرکے — ڈاکٹر یعقوب عامر — ۳۲/-

اعمال نامہ (خود نوشت) — سر رضا علی — ۱۰۰/-

انوار حق — مترجم نزہت فاطمہ — ۵۰/-

ادبی فیچر اور تقریریں — پروفیسر حنفی — ۱۰۰/-

آپ دیکھیں — ہرچرن چاولہ — ۱۵۰/-

اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ — ڈاکٹر مسعود ہاشمی — ۳۰/-

اقبال اور بچوں کا ادب — زیب النساء بیگم — ۱۷/-

افکار انشاء — پروفیسر وارث کرمانی — ۸۰/-

ادراک — قیصر تناگیری — ۵۰/-

اردو زبان اور سماجی سیاق — پروفیسر عبدالستار دلوی — ۱۰۰/-

اردو ادب اطفال کے معمار — ڈاکٹر خوشحال زیدی — ۱۲۵/-

افسانے کے معمار — ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی — ۴۰/-

ادب نما — فخر الاسلام اعظمی — ۲۵/-

ادبی زاویے — " — ۳۵/-

انتخاب بستان حکمت — مرتبہ نیر مسعود — ۷/-

انعکاس — کبیر احمد جائسی — ۴۰/-

ادب کا مطالعہ — اطہر پرویز — ۲۵/-

آزادی کی کہانی انگریزوں اخباروں کی زبانی — غلام حیدر — ۳۴/-

اقبال کی شاعری میں پیکر تراشی — ڈاکٹر توقیر احمد — ۴۰/-

انتخاب سجاد حیدر یلدرم — پروفیسر ثریا حسین — ۳۰/-

انتخاب خطوط غالب — یوپی اردو اکیڈمی لکھنؤ — ۳/-

" فسانۂ عجائب — ڈاکٹر قمر جہاں — ۶/-

" مضامین چکبست — ڈاکٹر علم چند نیر — ۱۱/-

اصلاح مع ارضاح — شوق نیموی — ۲/۸۰

انتخاب مضامین عبدالحلیم شرر — علی احمد فاطمی — ۱۱/-

احتساب العروض — ڈاکٹر کندن اردلی — ۵۰/-

ادبی زائچے — ورندر پرکاش سکسینہ — ۲۰/-

اختر اورینوی فن کار و ناقد — مظفر مہدی منصور عمر — ۳۴/-

آوازیں — اطہر عباس زیدی — ۳۰/-

اصطلاحات جمالیات — محمد انصار اللہ — ۲۵/-

ایک مشرقی کتب خانہ — خدا بخش — ۱۰/-

اردو میں ہندوستانی شاعری — ڈاکٹر جعفر حسن — ۴/-

اردو پر تمل کے اثرات — ڈاکٹر محمد انصار اللہ — ۲۵/-

ارمغان فاروقی — ظہیر احمد صدیقی — ۷۵/-
ادبی جائزے — راج بہادر گوڑ — ۶۵/-
آثار و افکار — ڈاکٹر عبدالخالق — ۲۵/-
ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش — پروفیسر عبدالمغنی — ۵/-
اردو کیسے پڑھائیں — سلیم عبداللہ — ۱۵/-
اردو ادب میں فن سوانح نگاری کا ارتقا — الطاف فاطمہ — ۳۰/-
اردو زبان و ادب — مسعود حسین خاں — ۱۲/۵۰
اردو مرثیہ نگاری — اشرف ام ہانی — ۲۵/-
ادب اور نظریہ — آل احمد سرور — ۲۶/-
اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ — عبدالشکور — ۱۵/-
ادبی جائزے — سعادت علی صدیقی — ۱۸/-
ادبی تنقید — ڈاکٹر محمد حسن — ۴/-
امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری — شجاعت علی سندیلوی — ۱۰/-
ابر نیساں — سیدہ طیبہ بیگم — ۲۰/-
اثر کے تنقیدی مضامین — اثر لکھنوی — ۲۴/-
ادبی تنقید — ڈاکٹر عصمت جاوید — ۱۲/-
اردو فکشن بنیادی و تشکیلی عناصر — اختر انصاری — ۱۵/-
اسلوبیاتی تنقید — علی رفاد فتیحی — ۶۰/-
اقبال اور اس کا عہد — جگن ناتھ آزاد — ۴۰/-
اردو میں خود نوشت سوانح حیات — ڈاکٹر صبیحہ انور — ۷۵/-
اردو کا پہلا ڈراما — اخلاق اثر — ۲۰/-
الصحافۃ و مبادی اساسیہ — بلجیت سنگھ مطیر — ۳۰/-
انشاءاللہ خاں انشاء — ایم حبیب خاں — ۱۵/-
اخبار نویسی کے بنیادی اصول — بلجیت سنگھ مطیر — ۱۵/-

آفتاب عروض — آفتاب حسن پوری — ۴۰/-
اسلوبیات میر — پروفیسر گوپی چند نارنگ — ۳۵/-

اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیاء کا کام — مولوی عبدالحق — ۱۰/-
اصناف سخن اور شعری ہیئتیں — شمیم احمد — ۳۲/-
امیر خسرو اور علی گڑھ — محی الدین اظہر — ۳۰/-
اقبال نامے — ڈاکٹر اخلاق اثر — ۸۰/-
آواز اور آدمی — ڈاکٹر مغنی تبسم — ۳۰/-
آرٹ — سید مجید اللہ — ۵/-
ادبی تناظر — راج بہادر گوڑ — ۳۰/-
اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار — سلیم فرزانہ — ۱۰۰/-
اردو ساخت کے بنیادی عناصر — نصیر احمد خاں — ۱۰/-
اختر انصاری شخص اور شاعر — ڈاکٹر خلیق انجم — ۲۵/-
انگریزی ادب کی مختصر تاریخ — ڈاکٹر محمد یٰسین — ۹۰/-
اردو فکشن میں طوائف — ڈاکٹر وی پی سوری — ۲۵/-
اپنی تلاش میں — کلیم الدین احمد — ۲۸/-
انشائیہ کے خدوخال — ڈاکٹر وزیر آغا — ۳۲/-
ادبی اصناف — ڈاکٹر گیان چند جین — ۳۰/-
ابر احسنی اور اصلاح سخن — ڈاکٹر عنوان چشتی، نعیم الدین رضوی — ۱۰/-
افکار و آثار — ڈاکٹر جلال انجم — ۴۰/-
اردو میں لوک ادب — قمر رئیس — ۱۰۰/-
ایک نادر روزنامچہ — مولوی سید مظہر علی سندیلوی — ۴/-
اردو میں واسوخت نگاری — ایس ایم زین العابدین — ۵/
اردو اسالیب پر ایک نظر — ڈاکٹر ضیاء الدین — ۵/
اردو شاعری میں دوہے کی روایت — ڈاکٹر سمیع الدین ...انی
ادیبوں کی حیات معاشقہ — فاس اعجاز — ۰۰/-
اردو ناول آزادی کے بعد — ڈاکٹر اسلم آزاد — /-
اردو گیت — بیگم بسم اللہ نیاز احمد — /-
اردو شاعری کا مزاج — ڈاکٹر وزیر آغا — ۵۰/-
انشائیہ اور انشائیے — پروفیسر سید محمد حسنین — /-
اردو ادب میں طنز و مزاح — وزیر آغا — ۵/-
اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل — ڈاکٹر صغیر ابراہیم — /-

اردو لسانیات نصیر احمد خاں ۵۰/-

اردو نحو: نوشت فن اور تجزیے ڈاکٹر وہاج علوی ۱۲۵/-

اسلوب تنقید پروفیسر عبدالمغنی ۹۰/-

ادبیات کے بانی کبیر احمد جائسی ۶۰/-

اسلوبیاتی مطالعے پروفیسر منظر عباس نقوی ۵۰/-

افسر شناسی مرتبہ ڈاکٹر مصطفیٰ فطرت ۱۰/-

اشرف علی صبوحی ایک مطالعہ مبینہ بیگم ۳۰/-

احوال آثار سراج الدین خاں آرزو ڈاکٹر ریحانہ خاتون ۵۰/-

اقبال فکر و فن ڈاکٹر سید محمد ہاشم ۶۰/-

اردو ادب کی ایک صدی ڈاکٹر سید عبداللہ ۳۶/-

اردو میں بچوں کا ادب ڈاکٹر خوشحال زیدی ۲۰/-

ادبی تنقید اور اسلوبیات پروفیسر گوپی چند نارنگ ۱۱/-

اقبال کے کرم فرما ماسٹر اختر حسین ۳۵/-

اردو زبان و ادب کا خاکہ خوشحال زیدی ۴/-

انداز آگہی ڈاکٹر شعیب راہی ۵/-

انتخاب خطوط غالب مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم ۲/-

اردو میں ادبی نثر کی تاریخ ڈاکٹر طیبہ خاتون ۱۰/-

اسلوب و معنی ڈاکٹر اعجاز علی ارشد ۵/-

اردو تنقید افادیت اور اہمیت انور کمال حسینی ۵/-

اظہار خیال ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی ۵/-

آثار مشرق مولانا ابراہیم عمادی ۳۰/-

ادبیات شناسی محمد حسن ۱۲/۵۰

اردو کا اپنا عروض پروفیسر گیان چند جین ۲/-

اردو پر فارسی کے لسانی اثرات ڈاکٹر عصمت جاوید ۵/-

اردو کی تہذیبی معنویت علی محمد خسرو ۶/-

اردو انشائیہ آدم شیخ ۳۵/-

اردو میں سائنسی و تکنیکی ادب ڈاکٹر محمد شکیل خاں ۸/-

اردو ناول اور تقسیم ہند عقیل احمد ۴۰/-

انشائیہ کی بنیاد ڈاکٹر سلیم اختر ۱۰۰/-

اردو ادب کی بازیافت (رسالہ زبان) مرتبہ خدا بخش لائبریری ۵۰/-

اردو شعریات پروفیسر آل احمد سرور ۶۰/-

ادب اور مسائل مرتبہ: خاور خلیل ۸۰/-

ادب کا تنقیدی مطالعہ (نیا ایڈیشن) ڈاکٹر سلام سندیلوی ۵۰/-

اردو کہاوتیں یونس اگاسکر ۱۲۵/-

اردو انشائیہ سفر منزلیں اور رہنما ڈاکٹر آدم شیخ ۳۵/-

آغا حشر کاشمیری اور ان کے ڈرامے اصول کا تنقیدی مطالعہ
ڈاکٹر محمد شفیع ۱/-

ابوالکلام آزاد عبدالقوی دسنوی ۴۰/-

اردو سائنس تعارف انتخاب ڈاکٹر حنیف کیفی ۵/-

ادبی نثر کا ارتقا ڈاکٹر شہناز انجم ۸۰/-

ادب گزیدہ معین اعجاز ۲۵/-

اردو زبان کی لسانی تشکیل مرزا خلیل بیگ ۴۵/-

اردو ہندی دانشوروں کی نظر میں ڈاکٹر حامد حسین ۲۰/-

ادب کی تلاش ملراج کومل ۳۰/-

انار کلی ایک افسانہ یا حقیقت محمد ظہیر ۲/-

انشائیہ بچیسی جاوید وششٹ ۴۰/-

اردو افسانہ ثقافتی سماجی پس منظر ڈاکٹر عزیز فاطمہ ۶۰/-

اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی
ڈاکٹر شکیل احمد ۷۵/-

انشاء اللہ خاں انشاء عابد پشاوری ۳۴/-

انیس شخصیت اور فن ڈاکٹر فضل امام ۱۰۰/-

اردو مثنوی شمالی ہند میں اول و دوم
ڈاکٹر گیان چند جین فی حصہ ۴۵/-

اردو ناول میں طنز و مزاح ڈاکٹر شمع افروز زیدی ۱۰۰/-

اردو میں عشقیہ شاعری تصور اور روایت ڈاکٹر سید محمد حسن ۶/-

اردو کی تہذیبی معنویت پروفیسر علی محمد خسرو ۶/-

اردو سفر نامے انیسویں صدی میں ڈاکٹر قدسیہ بیگم ۸/-

اردو کی ترقی میں مولانا آزاد کا حصہ
ڈاکٹر ایوب سلمان شاہجہانپوری ۲۲/-

ادبی و لسانی تحقیق عبدالستار دلوی ۵۰/-

اردو مصدر نامہ حفیظ الرحمٰن واصف ۴/-

اردو بھول بھلیاں " " ۱۵/-

اردو شاعری میں اشاریت — سلمان اطہر جاوید — ۲۵/-
اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت کا ارتقاء — روشن اختر کاظمی — ۵۰/-
اردو میں قومی شاعری کے سو سال — علی جواد زیدی — ۱۷/-
اردو تنقید کا ارتقاء — عبادت بریلوی — ۴۰/-
ادبی تنقید کے اصول — کلیم الدین احمد — ۶/-
آج کا اردو ادب — ابواللیث صدیقی — ۲۵/-
اردو تنقید پر ایک نظر — کلیم الدین احمد — ۴۰/-
اردو کی تین مثنویاں — خان رشید — ۲۰/-
آتی جاتی لہریں — مظہر امام — ۴۰/-
اردو افسانہ اور افسانہ نگار — ڈاکٹر فرمان فتح پوری (زیر طبع)
ادب کی پرکھ — ڈاکٹر نریش — ۳۰/-
اردو لسانیات — ڈاکٹر شوکت سبزواری — ۱۵/-
اوراق بصیرت افروز — ڈاکٹر آمنہ خاتون — ۱۱/۲۵
آب کوثر — شیخ محمد اکرام — ۷۵/-
اردو ادب کی تاریخ — عظیم الحق جنیدی — ۱۶/-
اسرار جان ادا تنقید و تبصرہ — ابواللیث صدیقی — ۶/-
اردو میں رپورتاژ نگاری — عبدالعزیز — ۴۵/-
ایجاد معانی — رحمن حمیدی — ۸/-
ایلیٹ کے مضامین — جمیل جالبی — ۷۵/-
احساس و ادراک — ظہیر احمد صدیقی — ۲۲/-
انیس شناسی — ڈاکٹر فضل امام — ۱۶/-
اردو مثنوی کا خاکہ — ڈاکٹر خوشحال زیدی — ۱۰/-
انارکلی کا تنقیدی مطالعہ — " " — ۴/۵۰
ادب نما — " " — ۲۰/-
ادب میں جمالیاتی اقدار ایک مطالعہ — ظہیر احمد صدیقی — ۱۰/-
انیس شناسی — مرتبہ گوپی چند نارنگ — ۵۰/-
اردو شاعری پر ایک نظر — کلیم الدین احمد — ۴۰/-
اقبال اور اردو نظم — آل احمد سرور — ۳۶/-
آئینہ ابوالکلام آزاد — عتیق صدیقی — ۲۰/-

باغ و بہار — انجمن اڈیشن — مرتبہ رشید حسن خاں — ۷۵/-
بہار اردو گلشن مشرقی افریقہ میں — کالی داس گپتا رضا — ۱۰/-
بہادر شاہ ظفر کا افسانۂ غم — عبداللہ فاروقی — ۱۸/-
بیالیس ۴۲ نظمیں ایک روایت ایک بغاوت — سید محمد صدر الدین — ۱۵/-
بیدی ایک جائزہ — شہناز نبی — ۱۵/-
بہار بے خزاں — ترتیب نعیم احمد — ۲۵/-
بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط — عتیق صدیقی — ۲/-
باقی سوالات — ڈاکٹر صبیحہ انور — ۵۰/-
بنگال میں اردو تذکرہ نگاری — ڈاکٹر عبدالمنان — ۲۰/-
بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب — مرزا جعفر حسین — ۱۳/-
بازدید — مخمور سعیدی — ۶۰/-
بنگال میں غالب شناسی — ڈاکٹر کلیم سہسرامی — ۴۰/-
برملا — کلام حیدری — ۳۰/-
بنگال کی زبانوں سے اردو کا رشتہ — شانتی رنجن بھٹاچاریہ — ۳/-
بہار میں اردو مثنوی کا ارتقاء — اختر اورینوی — ۱۸/-
بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء — اختر اورینوی — ۱۸/-
بہار میں اردو افسانہ نگاری — ڈاکٹر وہاب اشرفی — ۶۰/-
بشیر بدر فن اور شخصیت — رفعت سلطان — ۶۰/-
بات سے بات چلے — یعقوب راہی — ۴۰/-
بابا فرید — مہرافشاں فاروقی — ۱۵/-
بنکم چندر چیٹرجی — ڈاکٹر مظفر حنفی — ۱۵/-
باقیات عظیم الدین احمد — عابد رضا بیدار — ۱۵/-
باتیں کچھ سریلی سی — داؤد رہبر — ۳۶/-
بہ کوئے یار — سرور تونسوی — ۱۰/-
بیدی نامہ — شمس الحق عثمانی — ۱۵/-
بہادر شاہ ظفر — ڈاکٹر اسلم پرویز — ۷/-

پروفیسر آل احمد سرور حیات و خدمات — ڈاکٹر خلیق انجم — ۴۵/-

پروفیسر مسعود حسین خاں۔ علمی لسانی اور ادبی خدمات — مرتبہ ابراہیم حبیب خاں — ۴۵/-

پریم چند کا فن — پروفیسر شکیل الرحمن — ۱۰/-

پیشہ تو سپہ گری کا بھلا — وارث علوی — ۵۶/-

پنجاب میں اردو — محمود شیرانی — ۱۶/-

پریم چند فکر و فن — ڈاکٹر قمر رئیس — ۸/-

پریم چند صدی کے افسانے — یوپی اردو اکیڈمی — ۷/-

پریم چند — پرکاش چندر گپت — ۱۰/-

پریم چند کا تنقیدی مطالعہ — ڈاکٹر قمر رئیس — ۳۰/-

پطرس بخاری حیات اور کارنامے — ڈاکٹر میمونہ وحید — ۱۰۰/-

۲۵ نظمیں ایک نظریہ ایک تجزیہ — ڈاکٹر سید محمد صدر الدین — ۱۰/-

پروین اعتصامی مقالات، شاعری — سید محمد تقی علی — ۲۰/-

پرویز شاہدی حیات و خدمات — ڈاکٹر عبد المنان — ۴۵/-

پریم چند کچھ نئے مباحث — مانک ٹالا — ۱/-

پٹنہ — نساء الرحمٰن عوفی — ۲/-

پرانی یادگاریں — غلام ربانی — ۲۰/-

پریم چند ایک نقیب — ڈاکٹر صغرا ابراہیم — ۳۰/-

پیغمبران سخن — مرتبہ علی سردار جعفری — ۲۰/-

پریم چند سیاسی و سماجی ناول — پروفیسر عبدالسلام — ۱۵/-

پیرس زیارس — پروفیسر نز احسین — ۲۷/-

پہچان اور پرکھ — پروفیسر آل احمد سرور — ۵۱/-

پس پردہ — آغا حیدر دہلوی — ۱۵/-

تاریخ مشاعرہ — علی جواد زیدی — ۱۰۰/-

تفہیم البلاغت — پروفیسر عبدالوہاب اشرفی — ۱۰/-

تنقید نامہ — پروفیسر عنوان چشتی — ۸۰

تخلیقی عمل اصول و مسائل — طارق سعید — ۷۰/-

تلاش و تحقیق — کاظم علی خاں — ۸۰/-

تمدن برہنگی — غلام علی عباد عادل — ۱۰/-

تلاش بصیرت — ساجدہ زیدی — ۶۰/-

تاثر نہ کہ تنقید — پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی — ۵۱/-

تحفۃ السعداء — تقدیم حکیم حسین خاں — ۲۰/-

ترجمان رموز بیخودی — پروفیسر غلام دستگیر شہاب — ۶۰/-

تاریخ ادبیات عالم حصہ اول — عبدالوہاب اشرفی — ۳۰۰/-

تلاش آزاد — عبدالقوی دسنوی — ۲۴/-

تذکرہ فانی — حکیم مختار سبزواری — ۱۰/-

تحریر ہمہ رنگ — محمد اسد اللہ — ۲۰/-

تنقیدی نقوش — ڈاکٹر عبدالقیوم — ۱۵/-

تلوک چند محروم حیات و شاعری — ڈاکٹر محمد یوسف انصاری — ۳۰/-

تحقیقات حیدری — ڈاکٹر اکبر حیدری — ۴۵/-

تحریک آزادی میں اردو کا حصہ — ناشر نقوی — ۳۵/-

تصحیح و تحقیق متن — پروفیسر نذیر احمد — ۴۰/-

تحقیق تدقیق — مشتاق احمد — ۱۰/-

تذکرہ نکات الشعراء — میر تقی میر — ۸/-

تذکرہ ماہ و سال — مالک رام — ۲۰۰/-

تحقیق نامہ — ڈاکٹر مشفق خواجہ — ۴۵/-

تحریریں — ڈاکٹر اسلم پرویز — ۵۱/-

تنویرات — قیوم خضر — ۳۰/-

ترقی پسند تحریک تاریخ و تجزیہ — ڈاکٹر اسرا امیری — ۲۰/-

تلامذۂ صفی اورنگ آبادی — محبوب علی خاں — ۵۰/-

تذکرہ شعراء برج پردیش — مقبول عرشی — ۴۰/-

تفہیمات — کلام حیدری — ۲۵/-

تذکرہ شعرائے گجرات — " — ۲۵/-

تاریخی مثنویاں — کندن لال — ۸۰/-

تلاش فن — ڈاکٹر یونس اگاسکر — ۵۰/-

تحلیل نفسی و ادبی تنقید — کلیم الدین احمد — ۲۲/-

تاریخ جامعہ اردو (۱۹۳۹ء تا ۱۹۸۹ء) پروفیسر مسعود حسین خاں ۵۰/-
تنقید اور جدید اردو تنقید ڈاکٹر وزیر آغا ۶۰/-
تحصیل و ترسیل محمد رضوان احمد ۲۲/-
تلوک چند محروم رام لعل نابھوی ۱۵/-
تنقید و تجربہ جمیل جالبی ۱۰۰/-
توفیق الحکیم ناول نگاری کا جائزہ ڈاکٹر بدر الرحمٰن ۶/-
تذکرہ گل عجائب ۹/-
تذکرہ خوش معرکہ زیبا ڈاکٹر شمیم انہونوی ۵۰/-
تذکرہ و کلام معاصر سخنوران جے پور ایم محمود خاں ۲۵/-
تنقید عملی تنقید پروفیسر احتشام حسین ۱۵/-
تاریخ ریاست بھوپال سید عابد علی ۱۰/-
تحقیقی مباحث پنڈت رتن پنڈوری ۷۵/-
تذکرۂ کاملانِ رام پور حافظ احمد علی ۵۰/-
ترقی پسند افسانے میں عورت کا تصور خورشید زہرا ۶۰/-
تذکرۂ حیدر آباد دکن رمن راج سکسینہ ۲۰/-
تلاش تعبیر رشید حسن خاں ۴۵/-
ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر ڈاکٹر قمر رئیس ۱۲۵/-
تاریخ ادب اردو (نیا اڈیشن) رام بابو سکسینہ ۹۵/-
تلاش و تعارف حنیف نقوی ۴۰/-
تنقیدی ابعاد مظفر حنفی ۷۰/-
تحقیقی مضامین مالک رام ۶۰/-
تذکرۂ شمس العارفین مولانا اسماء الدین دہلوی ۳/-
تذکرۂ شوکت نادری شاہ عبد السلام ۳۱/-
تذکرۂ ہندی غلام ہمدانی مصحفی ۱۵/-
تذکرہ مخزن نکات قائم چاندپوری ۵/-
〃 〃 شعرا قاضی نور الدین خالق ۷/-
〃 شعرائے اردو میر حسن دہلوی ۱۰/۵۰
تذکرہ ریاض الفصحا مصحفی ۱۹/-
تنقیدی مطالعے شارب ردولوی ۲۰/-
تاریخ ادب اردو (جلد اول، دوم) جمیل جالبی ۵۰۰/-
تنویر الشمس (فن کتابت) منشی نفس الدین ۴/-

تدوین متن کے مسائل خدا بخش لائبریری ۱۵/-
تقویم ہجری و عیسوی مولوی محمود احمد خاں ۲۵/-
تصویر درد مع تنقید و تبصرہ خوشحال زیدی ۲/۵۰
تخلیقی تجربہ ابو الکلام قاسمی ۵۰/-
تخلیق و تنقید امیر اللہ خاں شاہین ۴۰/-
تلاش فن سید رضا زیدی ۶/-
تصوف اور اصغر گونڈوی ڈاکٹر سلام سندیلوی ۵۰/-

جامِ جہاں نما اردو صحافت کی ابتدا۔ جی۔ ڈی چندن ۷۵/-
جدید افسانہ اردو ہندی طارق چھتاری ۱۰۰/-
جدید فن تقریر مع اصول مضمون نگاری ڈاکٹر عفت زریں ۱۵/-
جمیل مظہری کی شعری تخلیقات ایک مطالعہ سید نعمت اللہ ۲۰/-
جوش ملیح آبادی تنقیدی جائزہ مرتبہ خلیق انجم ۱۰۰/-
جوا کثر یاد آتے ہیں دیوا اندر گپتا ۱۰۰/-
جدید ہند کے سیکولر معمار ڈاکٹر مجیب اشرف ۵۰/-
جہات و جستجو پروفیسر مظفر حنفی ۳۰/-
جوش ملیح آبادی سید احتشام حسین ۵/-
جمیل مظہری کی شعری تخلیقات ایک مطالعہ سید نعمت اللہ ۲۰/-
جدید شعری منظر نامہ ڈاکٹر حامدی کشمیری ۱۲۵/-
جوش ملسیانی (انتخاب کلام) کالی داس گپتا رضا ۸۰/-
جوش بنام ساغر (خطوط) مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم ۲۰/-
جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری مرتبہ حمیدہ سلطان ۵۰/-
جدید اردو لسانیات ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین ۴۰/-
جدید اردو تنقید پر مغرب کے اثرات علی حماد عباس ۵۰/-
جدید افسانہ اور اس کے مسائل وارث علوی ۳۶/-
جہان افکار سید مجاور حسین ۴۵/-
جدید اردو نظم نظریہ اور عمل ڈاکٹر عقیل احمد صدیقی ۹۰/-

جنید احمد کی آٹوگراف بک — جنید احمد — ۲/-
جدید اردو شاعری اور خلیل الرحمٰن اعظمی — مظہر امام — ۵/-
جدید اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات — ڈاکٹر خورشید جہاں — ۴۰/-
جواہر لال نہرو — ظ انصاری — ۵/-
جانور سے انسان تک — اندر جیت لال — ۴/-
جدید اردو تنقید اصول و نظریات — ڈاکٹر شارب ردولوی — ۳۰/-
جدید ادب کے ارتقاء میں حیدری اور ان کی خدمات — اشفاق احمد ندوی — ۲۵/-
جوہر آئینہ (جائزہ کلام غالب) — ننللال طالب کشمیری — ۳/-
جمالیات شرق و غرب — ثریا حسین — ۲/-

چیخوف کی دنیا — سید انوار رضوی — ۱۰/-
چند اہم نثر نگار — فخر الحسن اعظمی — ۱۲/-
چند سوانحی تحریریں — مولانا عبدالماجد دریابادی — ۶/-
چار شہر ایک کہانی (سفرنامہ) — وحید انور — ۸/-
چکبست — سرسوتی سرن کیف — ۳/-
چنڈی داس — سوم کمار سین — ۱۵/-
چہرہ پس چہرہ — ابن فرید — ۲۵/-
چند ممتاز شعراء — سید صفی مرتضیٰ — ۸/-
چند ہم عصر — مولوی عبدالحق — ۱۹/-

حاصل تحقیق — ڈاکٹر سید داؤد اشرف — ۳/-
حافظ محمود شیرانی — پروفیسر نذیر احمد — ۴۰/-
حقائق سکھ تواریخ — شمشیر سنگھ اشوک — ۲/-
حرف حرف چہرے — ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی — ۲۵/-
حسرت سے فراق تک — ایم حبیب خاں — ۲۵/-
حیات محروم — جگن ناتھ آزاد — ۴۵/-
حنائے علی گڑھ — پروفیسر عبدالقادر — ۴/-
حسرت موہانی قید فرنگ میں — عتیق صدیقی — ۱۵/-
حرف برہنہ — پروفیسر عنوان چشتی — ۱۰/-

حامد اللہ افسر میرٹھی حیات شخصیت اور کارنامے — ڈاکٹر سید مقصود حسن — ۵۰/-
حیات وجہی — ڈاکٹر م ن سعید — ۵۰/-
حرف نیم کش — عظیم اختر — ۲۵/-

خواجہ فخرالدین حسین سخن دہلوی — محمد سمیع الحق — ۴/-
خسرو شیریں — " " — ۱۵/-
خواب باقی ہیں (خود نوشت) — پروفیسر آل احمد سرور — ۱۵۰/-
خواجہ میر درد تنقیدی و تحقیقی مطالعہ — مرتبہ ثاقب صدیقی — ۵/-
خدیجہ مستور بحیثیت ناول نگار — پروفیسر محمد ممتاز حسین — ۵/-
خوشبو کا سفر (سفرنامہ) — ڈاکٹر کیول دھیر — ۴۰/-
خلیل الرحمٰن اعظمی — اسلام عشرت — ۵۰/-
خندہ ہائے بیجا — وارث علوی — ۵۱/-
خسرو نامہ — مجیب رضوی — ۲۱/-
خسرو کا ذہنی سفر — ظ انصاری — ۳۲/-
خواجہ حسن نظامی حیات اور کارنامے — خواجہ حسن ثانی نظامی — ۲۹/-
خطبۂ صدارت — موتی لال نہرو — ۱/-
ختم سفر کے بعد — رضوان اللہ آروی — ۴/-

دیس دیس کے اجالے (مقالات) — ڈاکٹر محمود الحسن — ۵/-
دادا بی اسکول — علی جواد زیدی — ۵/-
دہلی سیاسی شکنجے میں — نعمان ہاشمی — ۱۰/-
دربدری — رتن سنگھ — ۱۵/-
دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ — مرزا فرحت اللہ بیگ — ۱/-
دکنی غزل کی نشو و نما — ڈاکٹر محمد علی اثر — ۱۰۰/-
دکنی درپن — جاوید وششٹ — ۶/-
دجلہ و فرات تک — حسین امین — ۴/-
دبیر اور شمس آباد — محمد صادق — ۲/-
دیدہ ور — ضیاء الرحمٰن غوثی — ۱/-
دلگیر حیات اور شاعری — خواجہ بدیع الزماں — ۱/-
داستان ناول اور افسانہ — وردانہ قاسمی — ۲/-
دلّی تاریخ کے آئینے میں — پروفیسر خلیق احمد نظامی — ۵/-

دکنی ادب کی تاریخ ڈاکٹر محی الدین قادری زور ۱۲/-

دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی فکری پس منظر ڈاکٹر محمد حسن ۲۹/-

دبستان وحشت کا تنقیدی مطالعہ ڈاکٹر راز عظیم آبادی ۴/-

دنیا میرا گاؤں (سفرنامے) خواجہ غلام السیدین ۶۰/-

دارالترجمہ عثمانیہ کی علمی ادبی خدمات ڈاکٹر مجیب الاسلام ۸۰/-

داستان سے افسانے تک وقار عظیم ۲۵/-

دریائے لطافت مرتبہ مولوی عبدالحق ۴/-

ڈاکٹر خلیق انجم شخصیت اور ادبی خدمات مرتبہ ایم حبیب خاں ۴۰/-

ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی مرتبہ رشید حسن خاں ۴۲/-

ڈاکٹر رشید جہاں حیات و فن ڈاکٹر شاہدہ بانو ۱۰۰/-

ڈائریکٹری ناشرین مرتبہ انور دہلوی ۵۰/-

ڈاکٹر زور پروفیسر سیدہ جعفر ۱۵/-

ذوق و جستجو خواجہ احمد فاروقی ۳۴/-

ذوق ادب اور شعور احتشام حسین ۲۰/-

ذکاء اللہ اور ان کے علمی ادبی کارنامے رفعت جمال ۴۰/-

ذکر رفتگاں محمد ایوب واقف ۴/-

ذرے کی کہانی مہدی جعفر ۲۱/-

ذکر و زباں دور آفریدی ۱۲/-

رجب علی بیگ سرور چند تحقیقی مباحث حنیف نقوی ۳۵/-

رشحات قلم طیب بخش بدایونی ۲۰/-

روزگار فقیر جلد اول فقیر سید وحید الدین ۴۰/-

" " " دوم " " ۸۵/-

روایت اور بغاوت احتشام حسین ۲۰/-

ریت ریت لفظ حمید سہروردی ۱۵/-

ریاست ٹونک اور اردو شاعری نخت تسنیم ۱۰/-

رسالہ منتہی العروض سید محمود ۵/-

رشید احمد صدیقی کی ظرافت قطب الدین اشرف ۴۰/-

رنج میرٹھی حیات شخصیت کارنامے مقصود حسن ۵۰/-

رفعت سروش شخصیت اور فن ڈاکٹر رضیہ حامد ۱۰۰/-

رہ و رسم آشنائی محمد عبدالقادر ۳۰/-

ریاست بھوپال اور اقبال ماسٹر اختر ۴۵/-

راجندر سنگھ بیدی اور ایک چادر میلی سی عبدالحق حسرت ۵/-

رود کوثر شیخ محمد اکرام ۹۰/-

رشید احمد صدیقی آثار و اقدار ڈاکٹر اصغر عباس ۴/-

ریاست ترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین ۴۰/-

روپ رس مرتبہ جاوید وشسشٹ ۱۶/-

ریزہ خیال ڈاکٹر کمال الدین ۹/-

راجستھان زبان و ادب ایک تعارف ڈاکٹر فضل امام ۱۸/-

زاویہ نظر ڈاکٹر ارتضیٰ رضوی ۴۰/-

زندگی نامہ ساجد رشید ۴۰/-

زاویۂ نگاہ خلیل الرحمٰن اعظمی ۱۸/-

زیر غور ذکاء الدین شایاں ۲۰/-

زبان اسلوب و اسلوبیات مرزا خلیل بیگ ۳۰/-

ساحر اور معاصرین ساحر سید احتشام حسین ۲۸/-

سوویت یونین کا سیاسی نظام اور حکمت ۱۹۱۷ء تا ۱۹۹۰ء تاریخی پس منظر ظفر امام ۴۴/-

سرسید احمد خاں اور ان کا عہد پروفیسر ثریا حسین ۲۰/-

۱۸۵۷ء سیاست اور معاشرہ میر سلیم ۱۷۵/-

سفرنامہ غیر ملکی اسفار مولانا وحید الدین ۸۵/-

سونے چاندی کے بت خواجہ احمد عباس ۴۵/-

سرسید کی اسلامی بصیرت مرتبہ جمال خواجہ ۳/-

سن تو سہی محمد عبدالقادر ادیب ۳/-

سفر سے واپسی شہیرہ مسرور ۲۸/-

سب رس پر ایک نظر سہیل بخاری ۱۶/-

سرسید ایک تعارف — پروفیسر خلیق احمد نظامی ۲/-
سب رس کا تنقیدی جائزہ — احسان الحق ۵/۵۰
سجاد ظہیر کی ناولٹ نگاری — ڈاکٹر عبدالحق حسرت ۱۰/-
سب رس سے مضامین رشید تک — مرتبہ فخرالاسلام اعظمی ۳۰/-
سلو لائڈ کی دنیا — پریم پال اشک ۳۵/-
سب رس سے خطوط اقبال تک — فخرالحسن اعظمی ۱۴/-
ستاروں سے آگے — نورجہاں ۲۵/-
سحر کے پہلے اور بعد — مرزا سعید الظفر چغتائی ۵/۱
سحرالبیان ایک تنقیدی مطالعہ — ڈاکٹر عبادت بریلوی ۴/-
رراہے — مسعود مفتی ۶۰/-
سید مسعود حسن رضوی ادیب — ڈاکٹر وسیم آرا ۷۰/-
سلام مچھلی شہری حیات اور شاعری — محمد اخترالحسن ۲۵/-
سرسید اور اردو زبان و ادب — قمرالہدیٰ فریدی ۳۵/-
سرسید کی تعزیتی تحریریں — مرتبہ اصغر عباس ۲/-
سید سلیمان ندوی — مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم ۴/-
سید حرمت الاکرام حیات اور کارنامے — ایس جی آئی حیدر ۳۰/-
سلک مضامین — سید حسن ۲۵/-
سوویتی تاجیکی ادبیات کے بانی — کبیر احمد جائسی ۶/-
سرہند میں فارسی ادب — ادریس احمد ۷۰/-
ساز عہد — اختر وارثی ۱۵/-
سعادت حسن منٹو — محمد حسن ۳۰/-
سعادت حسن کی ناولٹ نگاری اور نظریہ — عبدالحق حسرت ۷/۵۰
سبق آموز نشانی ہائے نظر — اسماعیل حسنین نقوی ۱۶/-
سائنس کی باتیں — محمد اسلم پرویز ۳۰/-
سروجنی نائیڈو — پدمنی سین گپتا ۲۰/-
سرسید، اقبال اور علی گڑھ — اصغر عباس ۱۰/-
سات سمندر کا شاعر — مرتب: ساحر شیوی ۲/-
سرت چندر — مترجم ابوالحسنات ۲۵/-
سیرالمصنفین — محمد یحییٰ تنہا مرتبہ: امیر اللہ خاں شاہین ۱۵/-

سیرالمنازل — مرزا سنگین بیگ ۲۵/-
سانحۂ کربلا — ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ۲۴/-
سب رس کا قصہ حسن و دل — مرتبہ جاوید وششٹ ۱۵/-
سرسید اور ہندوستانی مسلمان — ڈاکٹر نورالحسن نقوی ۲۰/-
سخنوران فارس — محمد حسین آزاد ۱۲/۵۰
سفر آشنا — ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ۱۵/-

شاعروں کے رومان — نریش کمار سیکھری ۱۰/-
شکوہ جواب شکوہ (تشریح و تجزیہ) — سید حامد علی عابد ۱۳/-
شاد عارفی ایک مطالعہ — پروفیسر مظفر حنفی ۱۰۵/-
شخصیات واقعات جنھوں نے متاثر کیا — جنید احمد ۲۵/-
شہباز امروہوی فن اور شخصیت — ڈاکٹر ضیاءالرحمن صدیقی ۷۰/-
شعور ادب (مضامین) — فوق کریمی ۴۰/-
شبلی نعمانی کے مقالات کا تنقیدی جائزہ — عبدالرحیم انصاری ۴۰/-
شباب کشمیر — محمد دین فوق ۴۰/-
شاہد احمد دہلوی — پروین الٰہی ۲۲/-
شیخ محمود خوش دہاں — مرتبہ اکبرالدین صدیقی ۱۰/-
شعری رویے — زینت اللہ جاوید ۴۰/-
شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں — سید شہاب الدین دسنوی ۲۵/-
شاد عارفی حیات شاعری — دررا فریدی ۲۰/-
شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ — ڈاکٹر نعیم احمد ۵۰/-
شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں — مؤلف عبداللطیف اعظمی ۱۲/-
شعور ادراک — محمد ایوب واقف ۸۰/-

صراط مستقیم — مرتبہ قمر کستاں خاں ۴/-
صحت الفاظ — بدرالحسن ۱۸/-
صالحہ عابد حسین — ڈاکٹر کہکشاں پروین ۹۴/-
صبح (مضامین) — مبارک کاپڑی ۵۰/-
صہبائے کہن — تذکرہ شعرائے مسلم قدیم ۶۰/-
صحیفۂ محبت — ڈاکٹر محمود الٰہی ۱۵/-

کتاب	مصنف	قیمت
صبح امید	حکمت	۴۵/-
صوفی لٹریچر ایک جائزہ	ڈاکٹر بروڈلارنس	۱۰/-
صحف ابراہیم	علی ابراہیم خاں	۱۰/-
صادق پور پٹنہ	قیوم خضر	۴/-
صفدر آہ بحیثیت شاعر	ڈاکٹر زرینہ ثانی	۱۶/-
صحیفہ خوش نویساں	احترام الدین شاغل	۱۲/-
صوفیہ کے مکتوبات و ملفوظات	پروفیسر سید حسن عسکری	۱۰/-
ضرب آگہی	محمد آفاق صدیقی	۴۸/-
ضلع جگت	کشن پرشاد	۴/۵۰
ضیا فتح آبادی شخصیت و شاعری	مرتبہ مالک رام	۱۵/-
طبقات سخن	ڈاکٹر نسیم اقتدار علی	۱۸۰/-
طلسم ہوشربا مع مقدمہ سات جلدیں اول تا ہفتم	خدا بخش لائبریری پٹنہ	۱۲۵/-
طبقات الشعرائے ہند	کریم الدین	۴۴/-
ظہیر دہلوی حیات اور فن	ڈاکٹر مختار شمیم	۱۰/-
عزیزان علی گڑھ	رشید احمد صدیقی	۹/-
علامہ اقبال اور محبت رسول	محمد طاہر فاروقی	۴/-
عوامی روایات اور اردو ڈراما	ڈاکٹر محمد شاہد حسین	۱۲۵/-
عظمت غالب	سید قدرت نقوی	۶۰/-
عود ہندی	غالب	۱۲/-
عکس اور آئینے	احتشام حسین	۱۵/-
علوم و فنون عربی	حکیم شاہ نور فیصل	۲۰/-
علوم اسلامیہ اور ہندوستانی علماء	محمد سالم قدوائی	۶۰/-
عرفی شاعری اسلوب	ڈاکٹر احسان کریم برق	۴۵/-
عودی دہلوی حیات و ناول نگاری	خالد اشرف	۷۵/-
علوم اسلامیہ	ڈاکٹر محمد زبیر قریشی	۱۰/-
عبدالحق	مختار الدین احمد	۱۵/-

کتاب	مصنف	قیمت
عیار غالب	مالک رام	۲۵/-
عصمت جاوید شخص و شاعر	شیخ ابراہیم خیال	۴۰/-
عکس زار	سید علی احمد دانش	۳۰/-
عظمت غالب	عبدالمغنی	۳۵/-
عبدالحلیم شرر بحیثیت شاعر	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۱۰/-
عبدالحلیم شرر کے ہمعصر نثر نگار	ڈاکٹر عبدالحی	۸۰/-
علمی استفساریات	ڈاکٹر سید عقیل	۶/-
علی سردار جعفری اپنی بہنوں کی نظر میں	کالی داس گپتا	۴/-
عبدالرحیم خانخاناں	شیخ سلیم احمد	۸۰/-
عرشی صاحب کے خطوط	ذکیہ جیلانی	۸۰/-
عصمت چغتائی اور نفسیاتی مطالعہ	پروفیسر عبدالسلام	۱۵/-
علامت قدیم ہندستانی جمالیات کی روشنی میں	پروفیسر شکیل الرحمن	۵/-
علامہ خضر برنی شخص اور شخصیت	نظر برنی	۲۰/-
علامہ اقبال اور قرون اولی کے مسلم مجاہدین	عبدالصمد	۴۸/-
علامہ جمیل مظہری	ڈاکٹر فضل امام	۸۰/-
عملی تنقید اول	کلیم الدین احمد	۴۰/-
عبدالغفور شہباز	ڈاکٹر محمد اختر الحسن	۲۵/-
عالم اسلام	اصغر علی انجینیر	۳۰/-
علوم و فنون عہد عباسی میں	محمد رضوان علوی	۵۰/-
عالمی اردو ادب ۱۹۹۲ء	نند کشور وکرم	۱۰۰/-
عالمی اردو ادب ۱۹۸۹ء	نند کشور وکرم	۸۰/-
عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار	علی احمد فاطمی	۸۰/-
عوامی ذرائع ترسیل	اشفاق محمد خاں	۲۱/-
غالب نما	سید مرتضی حسین بلگرامی	۱۶/-
غزل پس منظر پیش منظر	ساحل احمد	۵۰/-
غالبیات چند عنوانات	کالی داس	۵۰/-
غبار کارواں	ڈاکٹر محمد زماں آزردہ	۴۰/-
غلطیہائے مضامین	عطا کاکوی	۱۵/-
غالب کی دلی	سید ضمیر حسن دہلوی	۲۵/-

غالب کا ایک مشتاق شاگرد کالی داس ۹۰/-
غالب کی آپ بیتی نثار احمد فاروقی ۱۵/-
غالب اور اردو غزل عبدالرحمن عباسی چریاکوٹی ۲۰/-
غالب کے خطوط جلد ۴ ڈاکٹر خلیق انجم ۱۲۰/-
غزل کے نئے جہات پروفیسر محمد عقیل ۶۰/-
غزل مطالعۂ غزل عبادت بریلوی ۳۰/-
غبار خاطر ابوالکلام آزاد ۸۵/-
غزل کی سرگذشت اختر انصاری ۱۲/-
غزل کا نیا منظر نامہ ڈاکٹر شمیم حنفی ۱۰/-
غالب سے اقبال تک ایم حبیب خاں ۳۵/-

فکر و آگہی انجمن آراء ۶۰/-
فکشن کی تنقید کا المیہ وارث علوی ۳۰/-
فلسفۂ اقبال عبدالقوی دریابادی ۱۰/-
فن داستان گوئی کلیم الدین احمد ۲۰/-
فتنۂ جہیز عبدالرحمن ۲۰/-
فلم شناسی پریم پال اشک ۵۰/-
فقیر موہن سیناپتی مایا دھر سنہا ۱۵/-
فرمان فتحپوری شخصیت اور ادبی خدمات مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم ۲۵/-
فراز دار کلام حیدری ۳۸/-
فیض اپنی شاعری کے آئینے میں پروفیسر ممتاز حسین ۲/-
فن افسانہ نگاری وقار عظیم ۲۵/-
فن تنقید اور تنقید نگاری نورالحسن نقوی ۵۰/-
فن شاعری بوطیقا عزیز احمد ۲۵/-
فصیح الدین بلخی حیات اور کارنامے ڈاکٹر ظفر بلخی ۱۰۰/-
فورٹ ولیم کالج ایک مطالعہ ڈاکٹر سمیع اللہ ۳۰/-
فسانۂ عجائب ترتیب رشید حسن خاں ۵۰/-
فسانۂ اعجاز مرتبہ نورالحسن ہاشمی ۳۰/-
فن اور فن کار صالحہ عابد حسین ۳۵/-
فسانۂ عبرت رجب علی بیگ سرور ۸/-
فارسی شاعری ایک مطالعہ ذاکرہ شریف ۴۰/-

فلسفۂ جمال اور اردو شاعری نورالحسن نقوی ۶۰/-
فکر تونسوی حیات اور کارنامے فصیحہ فرزندیکی ۴۰/-
فن تاریخ گوئی رتن پنڈوری ۱۵/-
فراق گورکھپوری مرتبہ انجمن ترقی اردو ۲۵/-
فارسی زبان و ادب سمیع الدین احمد ۱۵/-
فن اور شخصیت قتیل نمبر راہی معصوم رضا ۶۰/-
فراق گورکھپوری فن اور شخصیت علی احمد فاطمی ۳۰/-
فن اور شخصیت کلیشور نمبر صابر دت ۳۰/-
فن اور شخصیت نرگس دت نمبر - ۶۰/-
فرہنگ انیس اول، دوم نائب حسین نقوی ۱۲/-
فن اور شخصیت ساحر نمبر صابر دت ۸۰/-
فرہنگ زبان گویا بدر ابراہیم ۵۰/-

قاری اساس تنقید پروفیسر گوپی چند نارنگ ۱۵/-
قومی یکجہتی اور ڈاکخانے سید ساجد علی ۲۵/-
قومی یکجہتی اور نصابی کتابیں اکبر رحمانی ۳۰/-
قواعد عربی سید حبیب الرحمن ۲۰/-
قواعد اردو مولوی عبدالحق ۳۰/-
قلم کے سفیر رفعت سروش ۷۵/-
قدیم شہر کا معاشی سروے ترتیب سیاست ۱۰/-
قطعات دلدار مرتبہ قاضی عبدالودود ۲/-
قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم ۲۴/-
قطب مشتری (ملا وجہی) ڈاکٹر جمیرہ جلیلی ۴۸/-
قلندر بخش جرأت جمیل جالبی ۱۰/-
قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری شہناز مرزا ۶۰/-
قصہ مہر افروز دلبر سید مسعود حسن خاں ۴۰/-
قرۃ العین حیدر اور ناول کا جدید فن پروفیسر عبدالسلام ۱۲/-
قدیم اردو جلد دوم مسعود حسن خاں ۱۲/-
قلق میرٹھی ڈاکٹر جلال انجم ۶۰/-
قلم اور آواز اندر جیت لال ۳۰/-
قصیدہ نگاران اتر پردیش سید علی جواد زیدی ۱۸/۷۵

کبیر احمد جائسی کی علمی خدمات — شہاب الدین — ۱۰۰/-
کوچۂ قاتل — رام لعل — ۶۰/-
کشف الاذکار — شاہ شریف — ۳۰/-
(عادل شاہی دور کی ایک نایاب مثنوی)
کراچی کا تاریخی مقدمہ — مرزا عبدالقادر بیگ — ۲/۵۰
کلاسیکی مغربی تنقید — ڈاکٹر محمد یٰسین — ۶/-
کانٹے (کشمیری انشائیے) — ڈاکٹر محمد زماں آزردہ — ۱۵/-
کرشن چندر کے افسانوی ادب میں حقیقت نگاری — ڈاکٹر شکیب نیازی — ۱۵/-
کاروانِ رفتہ — ڈاکٹر اسعد بدایونی — ۲۵/-
کاوش — امتیاز احمد — ۳۰/-
کلام ظفر کا تہذیبی مطالعہ — عشرت جہاں ہاشمی — ۴۵/-
کلاسیکی اردو شاعری کی تنقید — طارق سعید — ۷۵/-
کتب خانہ جامع مسجد کے اردو مخطوطات — حامد اللہ ندوی — ۱۰/-
کرشن چندر اور مختصر افسانہ نگاری — ڈاکٹر احمد حسن — ۶۰/-
کرشن چندر اور اشتراکیت — پروفیسر عبدالسلام — ۱۵/-
کرشن چندر اور ان کے افسانے — ڈاکٹر اطہر پرویز — ۳۵/-
کالی داس ایک مطالعہ — شہانہ شبنم — ۴۵/-
کرونا! زردرد کے دکھنی مہاکوی انیس (ہندی) — مرتبہ: صالحہ عابد حسین — ۱۵/-
کربل کتھا کا لسانی مطالعہ — گوپی چند نارنگ اور خلیق انجم — /-
کانٹوں کی زبان — ظ انصاری — ۷۵/-
کاشف الحقائق ایک مطالعہ — وہاب اشرفی — ۱۶/-
کولمبس کے دیس میں — جگن ناتھ آزاد — ۴۵/-
کرشن چندر — جیلانی بانو — ۱۵/-

گروہی کارروائیاں — لوئی۔ ایم۔ اسمتھ — ۵/-
گلدستۂ نازنیناں (تذکرہ) — عطا کاکوی — ۲/-
گجری مثنویاں — سید ظہیر الدین مدنی — ۳۵/-
گرد و پیش — مرتضیٰ کریم سہروردی — ۳۰/-
گزشتہ حیدرآباد — رائے محبوب نرائن — ۱۵/-

گنڈوان کا تنقیدی مطالعہ — انور کمال حسینی — ۵/-
گفتار اور کردار — فرق لرمی — ۱۵/-
گلشن ہند — سید حیدر بخش حیدری — ۲۵/-

لسانیات اور اردو — سید محمود الحسن رضوی — ۱۵/۵۰
لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی — ساجد زید پوری — ۲۴/-
لیلیٰ کے خطوط مجنوں کی ڈائری — قاضی عبدالغفار — ۴/-
لوکاچ اور مارکسی تنقید — اصغر علی انجینیر — ۳۰/-
لغات النساء — وحیدہ نسیم — ۳۰/-
لندن اور لندن — ڈاکٹر سید محمد عقیل — ۶۰/-
لسانیات کے بنیادی اصول — ڈاکٹر اقتدار حسین — ۴۰/-
لائبریرین شپ — سید متقیت الحسن — ۲۰/-
لائبریری تنظیم و ترتیب کے مسائل — ڈاکٹر رام شوبھٹ — ۲۰/-

مسلمانوں کا تعلیمی نظام — پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی — ۲۵/-
میرزا یگانہ شخصیت اور فن — مرتبین مشفق خواجہ و دیگر — ۱۰۰/-
محبوب الالباب — مرتبہ خدا بخش — ۱۲۵/-
مقالات آزاد — مولانا آزاد — ۲/-
معیار کیفی اعظمی نمبر — مرتبہ شاہد ماہلی — ۱۲۵/-
مولانا آزاد سرسید اور علی گڑھ — محمد ضیاء الدین انصاری — ۴۵/-
مولوی عبدالحق ادبی اور لسانی خدمات — مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم — ۶۰/-
میری بستی میرے لوگ — شبیر امام — ۵۰/-
میری زندگی اور قومی اعزاز — ڈاکٹر ادم پرکاش — ۱۰/-
مضامین — افتخار احمد شبیر — ۴۰/-
مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت — ابوالکلام قاسمی — ۱۰۰/-

شرق وسطیٰ — خدابخش لائبریری پٹنہ — ۱۰/-
مولانا ابوالکلام آزاد کی دینی زندگی — مولانا محمد شعیب عمری — ۱۰/-
شبن اپنی نظام کی قید میں — ڈاکٹر علی ثنرلعتی — ۵/-
مقالات حالی — حالی پانی پتی — ۲۰/-
معیار نظر — ارشد کاکوی — ۳۰/-
مستقبل کے روبرو — دیوندر اسر — ۳۰/-
متاع فکر ونظر — محمد آفاق صدیقی — ۳۰/-
میں ہم اور ادب — ابن فرید — ۲۰/-
مکاتیب احسن اوّل — ڈاکٹر عنوان چشتی — ۴۰/-
مکاتیب نگم — محمد ایوب واقف — ۲۰/-
منشی دیا نرائن نگم ۱۹۸۲ء - ۱۸۸۲ء — مرتبہ: دیا نرائن — ۵۰/-
مولانا آزاد فکر وفن — ملک زادہ منظور احمد — ۱۰۰/-
مرثیہ خوانی کا فن — نیر مسعود — ۱۲/-
معاشیات اور مقصد منہاج — ڈاکٹر ذاکر حسین — ۵/-
مقالات سرسید سے مضامین رشید تک — فخر الاسلام اعظمی — ۱۸/-
مطالعہ حالی — شجاعت علی سندیلوی — ۲۰/-
مونس الارواح — جہاں آرا بیگم — ۱۰/-
موازنہ انیس ودبیر کا تہذیبی مطالعہ — سید ظہور الاسلام — ۴۰/-
مخمور سعیدی ایک مطالعہ — اطہر فاروقی — ۳۰/-
محاسن کلام غالب — عبدالرحمٰن بجنوری — ۶/-
مثنویات حالی — شجاعت علی سندیلوی — ۱۲/-
مطالعہ سودا — ڈاکٹر محمد حسن — ۱۰/-
مرحوم دہلی کی ایک جھلک — شمیم احمد — ۱۰/-
میرے اسٹیج ڈرامے — ڈاکٹر محمد حسن — ۱۰/-
مزامیر ادبی تنقید کی جھلکیاں — کلام حیدری — ۱۲/-
مثنوی سحرالبیان کی سماجیات — محمد ضیاء الدین — ۱۵/-
مکاتیب جلیل — علی احمد جلیلی — ۱۵/-

محمد حسین آزاد بحیثیت محقق — قاضی عبدالودود — ۱۰/-
محمد علی جوہر — حمیدہ ریاض — ۵۰/-
ملا وجہی — جاوید وششٹ — ۱۵/-
مرزا محمد رفیع سودا — قاضی افضال حسین — ۱۵/-
مرزا مظہر جان جاناں — ڈاکٹر سید تبارک علی — ۳۵/-
مکالمہ غالب — سید مرتضیٰ حسین بلگرامی — ۱۰/-
مرثیے کی سماجیات — ڈاکٹر عقیل رضوی — ۶۰/-
میراجی ایک مطالعہ — ڈاکٹر جمیل جالبی — ۳۰/-
معاصر تنقید ایک نئے تناظر میں — ڈاکٹر حامدی کاشمیری — ۲۰/-
منٹو نوری نہ ناری — ممتاز شیریں — ۶۰/-
مقدمہ کلام آتش — خلیل الرحمٰن اعظمی — ۲۵/-
مآل فکر — شبیر امام — ۵/-
مغرب کے انشائیے — آغا قزلباش — ۵/-
مقدمے اور تبصرے — ڈاکٹر گیان چند جین — ۴۰/-
مجالس رنگین — مرتبہ سید علی حیدر — ۳۵/-
مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ — ڈاکٹر محمد حسن — ۱۸/-
مغربی تعلیم کا تصور اور اس کا نفاذ علی گڑھ میں — پروفیسر رشید احمد صدیقی — ۲۰/-
محمد قلی قطب شاہ — ڈاکٹر مسعود حسین خاں — ۱۵/-
مشرقی تنقید — ڈاکٹر محمد حسن — ۳۵/-
محب وطن پریم چند — ڈاکٹر شمس الحق عثمانی — ۶۰/-
مضامین سید حسن — ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی — ۴۰/-
موضوعات — ارتضیٰ کریم — ۷۰/-
مظفر پور علمی ادبی ثقافتی مرکز — محمد حامد علی خاں — ۴۰/-
مکتوبات شہباز — مرتبہ سید صابر حسن — ۲۲/-
مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین — مرتبہ اسلم پرویز — ۴۷/-
محی الدین قادری زور — ڈاکٹر خلیق انجم — ۱۰/-
مظفر علی اسیر اور ان کا عہد — بانو الحسن — ۳/-
مسیحا کون سرسید یا آزاد — ڈاکٹر عارف اسلام — ۱۰۰/-
محمد حسین آزاد کی تنقید نگاری — محمد خاندا اقبال صدیقی — ۲۰/-

مصحفی	نورالحسن نقوی	۱۵/-
مومن خاں مومن	ظہیر احمد صدیقی	۱۵/-
معیار نظر	ارشد کاکوی	۳/-
مرقع تاریخ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ	مصباح حسین	۴۹/۵۰
میر ناصر علی	ڈاکٹر آدم علی شیخ	۲۵/-
مضامین عزیز لکھنوی	مسعود حسین ردولوی	۱۰/-
مخدوم محی الدین حیات و شاعری	ڈاکٹر عطاء الرحمٰن	۸/-
مولانا آزاد کی کہانی	ظفر احمد نظامی	۱۸/-
من کیستم	مرزا محمد عسکری	۵/-
مالک نامہ	کرنل بشیر حسین زیدی	۴/-
مور پنکھ	طالب چکوالی	۳/-
میرامن دہلوی حیات	تالیف نفیس جہاں بیگم	۷/-
محمد تلی اور نتی کا صدقہ	جاوید وششٹ	۲۵/-
مقدمہ تاریخ زبان اردو	پروفیسر مسعود حسین خاں	۳/-
موج کوثر	شیخ محمد اکرام	۴۰/-
مالک رام ایک مطالعہ	علی جواد زیدی	۵۰/-
مضامین رشید	رشید احمد صدیقی	۱۲/-
مثنویات میر کا تہذیبی مطالعہ	شاہدہ لال	۴۵/-
محمد مجیب حیات اور خدمات	ڈاکٹر صادقہ ذکی	۵/-
مرزا رسوا اور تہذیبی ناول	پروفیسر عبدالسلام	۵/-
مولانا محمد علی	عبداللطیف اعظمی	۲/-
منٹو کا فن	سید وقار علی	۵/-
مزاج و ماحول	ڈاکٹر سلام سندیلوی	۴/-
مطالعہ سر سید احمد خاں	عبدالحق	۱۶/-
مطالعہ حضرت غمگین	محمد یونس خالدی	۳/-
میراجی شخصیت اور فن	مرتبہ کمار پاشی	۴/-
مرقع اردو	خوشحال زیدی	۴/-
مغربی تنقید کے اصول	ڈاکٹر سجاد باقر رضوی	۳۵/-
مضطر خیرآبادی	ڈاکٹر خلیل اللہ خاں	۹/-
مقالات یوم نگم	اردو اکیڈمی لکھنؤ	۹/-
مطالعہ و مشاہدہ	ڈاکٹر سلام سندیلوی	۵/-

میر انیس	سید سفارش حسین	۴/-
ملا وجہی کے انشائیے	جاوید وششٹ	۲۰/-
مضامین ڈاکٹر عبدالودود	مرتبہ صفیہ ودود	۳۰/-
مارکسی جمالیات	اصغر علی انجینیر	۲۵/-
مضامین میر	میر مشتاق احمد	۱۰/-
مضامین فرحت (اول)	فرحت اللہ بیگ	۱۴/-
" (دوم)	"	۸/-
مولوی نظیر احمد کی کہانی	"	۴/۵۰
متنبی ایک شاعر	شہناز انجم	۳۵/-
مختصر تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر اعجاز حسین	۳۵/-
محمد تقی میر	ڈاکٹر جمیل جالبی	۷۵/-
میر کی غزل گوئی	راشد آذر	۴۵/-

نئے زاویے	ڈاکٹر رفعت اختر	۶۰/-
نذرائے رومی سوانح و کارنامے	مرزا عصمت اللہ بیگ	۲۵/-
ناول کا فن	ابوالکلام قاسمی	۲/-
نذر غالب	عطا کاکوی	۳/-
نیرنگ خیال اول	شمیم انہونوی	۱/۵۰
" دوم	"	۱/۵۰
نظام اردو	سید انور حسین آرزو	۳/۵۰
ناول کی تاریخ و تنقید	سید علی عباس حسینی	۳/-
نگارستان	نیاز فتحپوری	۲۴/-
نغمہ ناقوس (تذکرہ شعرائے ہنود)	جوہر دیوبندی	۳/-
نقوش و افکار	مجنوں گورکھپوری	۱۲/-
ناٹ آؤٹ	رحمٰن اکولوی	۲/-
نئی ہندی شاعری	صادق	۲۵/-
نئی نظم نئے دستخط	شاہد ماہلی	۵/-
نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار	ڈاکٹر زینت بشیر	/-

نہرو کا سفر نامہ روس — جواہر لعل نہرو — ۲/-
نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری — ڈاکٹر سید طلعت حسین — ۱۰/-
نگارستان فارس — مولانا محمد حسین آزاد — ۸/-
نظیری کا تخلیقی شعور — ڈاکٹر زینت اللہ جاوید — ۵/-
نظیر اکبر آبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ — سید طلعت حسین نقوی — ۷/-
نقد ملفوظات — نثار احمد فاروقی — ۶۵/-
نشاط خاطر — حسین عظیم آبادی — ۱۶/-
نفس مطلب — سید محمد حسین — ۱۲/-
نجیب محفوظ اپنی نگارشات کے آئینے میں — بدر الدین الحافظ — ۹/-
نازش ادب کالی داس گپتا رضا — تاراجیندر رستوگی — ۴/-
نئی تنقید — ڈاکٹر جمیل جالبی — ۹۰/-
نیا اردو افسانہ — ڈاکٹر گوپی چند نارنگ — ۶۰/-
نل دمینتی — شکنتلا موج — ۵/-
نوبت پنج روزہ — راشد الخیری — ۲۳/-
نقش ذاکر — مرتبہ: عبد الحق خاں — ۵۱/-
نگارشات — پروفیسر محمد مجیب — ۱۶/-
نقد ادبیات فارسی — ڈاکٹر سمیع الدین — ۳۰/-
نئی تحریریں — ڈاکٹر عبد الستار دلوی — ۵/-
نقد حرف — پروفیسر ممتاز حسین — ۴۹/-
نگار خانہ رقصاں — سید حامد — ۵۰/-
نقد شعر — عبد الرحمٰن ہاشمی — ۴/-
نقد بجنوری — صدیقہ بیگم — ۲۵/-
نمود ہستی — سید محمد حسنین — ۲۲/-
نقوش لینن — ڈاکٹر اجمل اجملی — ۴/-
نیا افسانہ — وقار عظیم — ۲۵/-
ناول کیا ہے — نور الحسن ہاشمی — ۱۴/-
نقد فیض — مرتبہ نسیم عباسی — ۲۰/-
نظر اور نظریے — آل احمد سرور — ۲۴/-
نظر خوش گزرے — بیگم انیس قدوائی — ۱۲/-

ولی سے آتش تک — ایم حبیب خاں — ۴۰/-
ولی انتخاب تہذیب — خان اشرف — ۲۹/-
وویکانند — رومین رولاں — ۲۸/-
وجد شاعر اور شخص — یوسف ناظم — ۲۹/-
واشنگٹن — ایچ ڈی تھورو — ۲/۵۰

ہندوستان کی جنگ آزادی میں اردو شاعری کا حصہ — ڈاکٹر درخشاں تاجور — ۱۵/-
ہنر سندیلوی حیات اور شاعری — علی مہدی — ۳/-
ہندوستان میں نئی اردو غزل کا مزاج — ای۔ اے حیدری — ۴۵/-
ہندی ادب کے بھگتی کال پر مسلم ثقافت کے اثرات — ڈاکٹر سید اسد علی — ۳۲/-
ہندوستان میں موزوں ٹکنالوجی کی توسیع — ایم۔ ایم۔ ہدی — ۱/-
ہو بہو (خاکے) — پروانہ ردولوی — ۵۰/-
ہماری شاعری — سید مسعود حسین رضوی مرحوم — ۱۵/-
ہندوستانی سائنس — اندرجیت لال — ۱/-
ہندوستان شاہراہ ترقی پر — منظر سلیم — ۱/۵۰
ہندوستانی نظام کے چند اساسی پہلو — ڈاکٹر محمد یٰسین — ۳/-
ہندوا اور مسلم مسئلہ — بدر الدین طیب جی — ۱۰/-
ہماری تعلیمی صورت حال — آل احمد سرور — ۴/-
ہندی ادب کی تاریخ — ڈاکٹر محمد حسن — ۱۶/-
ہندوستانی اقتصادی مسائل — سید ساجد علی ٹونکی — ۲۵/-
ہندوستانی تہذیب بوستان خیال کے تناظر میں — ابن کنول — ۱۰/-
ہے ولی پوشیدہ — ڈاکٹر اشفاق محمد خاں — ۱۶/-
ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایات — بی۔ این پانڈے — ۵/-
ہندوستان میں تصوف — آل احمد سرور — ۲/-
ہمارے قومی ہیرو — اندرجیت لال — ۱۵/-

ہمارے کنور صاحب مرتبہ: کے ایل نارنگ ساقی ۵۰/-
ہندستان کدھر آل احمد سرور ۳/-
ہندستانی لسانیات ڈاکٹر زور ۱۶/-
ہمارے نثر نگار سید صفی مرتضیٰ ۸/-

یہ صورت گر کچھ خوابوں کے طاہر مسعود ۶۶/-
یادگار روزگار سید بدرالحسن ۲۰۰/-
یادگارِ انیس امیر احمد علوی ۱۵/-
یہ لوگ (خاکے) ڈاکٹر محمد مثنیٰ ۲۲/-
یادوں کے چاند ستارے رفعت سروش ۴۰/-
یادوں کا سفر قیصر عثمانی ۳۶/-
یوسف حسن خاں مسعود حسین خاں ۱۵/-
یگانہ احوال و آثار نیر مسعود ۴۰/-
یورپ کا سفرنامہ ف۔س اعجاز ۱۰۰/-
یہ لوگ سری نواس لاہوٹی ۲۵/-
یادوں کی امانت جوش ملیح آبادی ۲۰۰/-
یادگارِ حالی صالحہ عابد حسین ۳۰/-
یگانہ شخص اور شاعر ممتاز حسین ۱۵/-
یادگاری خطبات ڈاکٹر عابد حسین مرتبہ شاہد احمد فاروقی ۱۵/-
یادوں کی پرچھائیاں رحمت امروہوی ۴/-
یادوں کا جشن کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ۸۰/-
یونی ورسٹی کے اردو نصابات کا تنقیدی مطالعہ محمد صابرین ۷۵/-

انتخاب کلام ظفر " عتیق رحمانی ۱۵/-
" رغمی محمد انصار اللہ ۳۰/-
امر و نہی ڈاکٹر منشاء الرحمٰن ۳۰/-
آوارہ گرد اشعار عطا کاکوی ۱۵/-
ارمغان شیدا مرزا کمال الدین ۳۵/-
اردو ادب میں ہندستان ہاشمیہ کامل ۴۵/-
احساس کی صلیب فرید پاشا آزاد ۲۰/-
انتخاب حاتم ڈاکٹر عبدالحق ۲۵/-
انتخاب نظیر اکبرآبادی رشید حسن خاں ۳۶/-
" اکبر الہ آبادی صدیق الرحمٰن قدوائی ۱۸/-
آکاش راجندر بہادر موج ۳۰/-
آب نیساں فرید پربتی ۲۵/-
آخری صلیب شان بھارتی ۱۲/-
آئینہ احساس کے اسعد رضا ۵۰/-
آنچل اور پرچم سروش یزدانی ۲۲/-
انتخاب جگر بسوانی خورشید افسر بسوانی ۵۰/۴
انیس ۳۲ غیر مطبوعہ مرثیے انیس کمیٹی ۹۰/-
انگوٹھا چھاپ ہلال سیوہاروی ۲/-
آوازہ زنجیر رہبر جونپوری ۲۰/-
انتخاب کلام حسرت ڈاکٹر فضل امام ۹/-
انتخاب کلام داغ بیگم ممتاز مرزا ۲۲/-
الہامات سرمد (سرمد کی فارسی رباعیوں کا ترجمہ) محمد مشتاق شارق ۲/-
اپنی دھرتی اپنی بات نازش پرتاپ گڑھی ۲/-
ارمغان کندن کندن لال کندن ۲۰/-
انتخاب کلیات جوش مرتبہ: ڈاکٹر فضل امام /-
آنکھ میں سمندر زاہد ڈار ۳۰/-
آنکھ اور خواب کے درمیان ندا فاضلی ۱/-
آلبنا رنغمہ پریم نرائن سکسینہ /-
انامل راہی فدائی /-
انتخاب دواوین امام بخش صہبائی /-

شعری مجموعے

اثر خامہ علیم صبا نویدی ۱۶/-
انتخاب کلیاتِ بسمل ڈاکٹر یوسف ندیم ۶۰
انتخاب کلامِ حاتم مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق ۴۵/-
" کلام فائز " پروفیسر محمد حسن ۴/-
" میر سوز " ڈاکٹر ارتضیٰ کریم ۴/-
" غزلیات میر حسن " پروفیسر مظفر حنفی ۴۵/-

انتخاب یگانہ چنگیزی	(انجمن ترقی اردو)	۱۰/-
" فانی		۱۰/-
انتخاب سخن اول تا یازدہم	حسرت موہانی	۱۲/-
انتخاب ریختی	سید محمد نقوی	۵/-
انتخاب فیض احمد فیض	پروفیسر شمیم حنفی	۱۳/-
" کلام میر	مرتبہ: مولوی عبدالحق	۱۹/-
"	علی جواد زیدی	۱/۵۰
انتخاب فراق گورکھپوری	مرتبہ انجمن ترقی اردو	۱۵/-
انتخاب	عرش ملسیانی	۱/۵۰
"	کیفی چریا کوٹی	۱/۵۰
"	ریاض خیرآبادی	۴/-
انتخاب کرشن موہن	کرشن موہن	۱۰/-
انتخاب	سکندر علی وجد	۱۰/-
انتخاب	سعید شہیدی	۴/-
"	اختر انصاری	۵/-
"	شبنم کرمانی	۵/-
"	جذبی	۵/-
"	کمال احمد صدیقی	۱/۵۰
	الم مظفر نگری	۱/۵۰
"	بلراج کومل	۱/۵۰
انتخاب فراق گورکھپوری	افغان اللہ	۴/-
اذکار صہبا	قاسم صہبا جمیل	۲/-
آتشِ گل (جیبی)	جگر مرادآبادی	۱۰/-
ایک خواب اور (جیبی)	علی سردار جعفری	۱۰/-
اندوختہ	نورالحسن ہاشمی	۱۵/-
آئینہ در آئینہ	عزیز قیسی	۴/-
آتش سیال	ساجدہ زیدی	۸/-
انمول	دیپک قمر	۴۰/-

بے ساختہ (مزاحیہ کلام)	قمرالزماں قمر	۵۰/-
بہتا پانی	احمد وصی	۱۵/-
بین کرتا ہوا شہر	عتیق اللہ	۳۲/-
باقیات شاد	نقی احمد ارشاد	۲۲/-
باز دید (نیا اڈیشن)	پروفیسر ملیب الرحمن	۲۵/-
بکھرے پھول	مرتضیٰ فہیم	۸/-
بھرتری ہری اردو میں (منظوم ترجمہ)	یوسف ناظم	۵/-
بکھری کرنیں	نواب دہلوی	۲۰/-
بند دروازے پر دستک	راج کھیتی	۳۰/-
باقیاتِ شہباز	ڈاکٹر حسن	۲۵/-
بزم و رزم فطرت	ڈاکٹر سید عبدالمجید	۱۲/-
بوئے سمن	مسعودہ حیات	۲/-
بوئے رسیدہ	جگن ناتھ آزاد	۹۰/-
برگ نے	ناصر کاظمی	۲۰/-
برگ آوارہ	حبیب جالب	۱۵/-
بزم خیال	سیدہ فطرت	۲/-
بوستاں	مترجم سعدی شیرازی	۳۰/-
باقیات فانی	فانی بدایونی	۱۵/-
پرواز سخن	ناطق اورنگ آبادی	۳۰/-
پیروڈی (مزاحیہ کلام)	مظہر احمد	۴/-
پس دیوار	فضا ابن فیضی	۵۰/-
پتھروں کی رہگذر	رضا اشک	۶۰/-
پچھلے پہر کا خواب	راج کھیتی	۴۰/-
پھلجھڑیاں پھوئیاں پھوار	دیپک قمر	۱۰۰/-
پیراہن جاں	منظر شہاب	۵۰/-
پریہ درشنی	شبانہ سلمان	۵۰/-
پرانی بات	زبیر رضوی	۳۰/-

بہ فرض محال (مزاحیہ کلام)	خواہ مخواہ	۵/-
بھیگی رتوں کی کتھا	شہناز نبی	۲۷/-
تابوت صدا (اڑیہ نظمیں)	مترجم حفیظ نیولپوری	۴/-
تصویر وطن	مسعودہ حیات	۱۵/-

تصرف	عزیز وارثی	۲۵/-
تلاش سحر	جمال بھارتی	۲۵/-
تعبیر وطن	نند ہ راہی دلہوی	۳۰/-
تنہا تنہا (ہندی)	سید شکیل دسنوی	۴۰/-
تلخیاں (عام ایڈیشن)	ساحر لدھیانوی	۱۵/-
تنہائیاں	" "	۱۲/-
ثبات	محبوب راہی	۱۰/-
جنون کنارا	اسعد بدایونی	۱۰۰/-
جے شری رام (آزاد شاعری)	انور ندیم	۸۰/-
جاڑے کی دھوپ	آسی رام نگری	۲۵/-
جوابی خط	شاکر انصاری سکندرآبادی	
جنون (اردو ہندی)	نسیم منظری	۲۰۰/-
جمال اجنتا جلال ہمالہ	سکندر علی وجد	۵۰/-
جادۂ ملا	آنند نرائن ملا	۲۵/-
جیب جی صاحب	خواجہ دل محمد	۲۵/-
جوئے شیر	آنند نرائن ملاؔ	۲۵/-
جاناں جاناں	احمد فراز	۲۰/-
چوتھا آسمان	محمد علوی	۵۰/-
چمنستان ہزار رنگ	مرتبہ سردار مہتاب سنگھ	۱۰/-
چراغ چشم تر	ظفر گورکھپوری	۴۰/-
چراغ اور کنول	اختر حمید خاں	۴۵/-
چھلنی چھلنی سائباں	تنہا تیماپوری	۴۰/-
حیطۂ صدف	صغریٰ عالم	۳۰/-
حکایت دل	سید اکبر عباس اکبر	۸/-
حدیث دل	تنویر عثمانی	۳۰/-
حرف مکرر	علیم مسرور	۱۲/-
حسن فطرت (مثنوی)	منشی گورکھ ناتھ عبرت	۳/۵۰

حرف حرف روشنی	حمایت علی شاعر	۲۵/-
حرف صدا	ہیرالال فلک	۲/-
حیات دوام	اسماعیل حسنین نقوی	۱/-
حادثوں کے درمیاں	بشیر فاروقی	۱۸/-
حرف تمنا	معین کوثر	۱۰/-
حرف مکرر	یعقوب راہی	۳/-
خرام حرف	دلکش ساگری	۴۸/-
خود کلامی	یوسف عثمانی	۲۰/-
خاک انا	راشد آذر	۱۰/-
خار ہزار دشت	حرفی	۵۰/-
خواب زار	شایاں رامپوری	۱/-
خدا جھوٹ نہ بلوائے	دلاور فگار	۲/-
خوں بہا	یوگندر بہل تشنا	۵۰/-
خوشبو	پروین شاکر	۲/-
خون جگر	دھرم پال عاقل لاہوری	۳/-
خار زار	خار دہلوی	۴/-
خوابوں کے گلاب	پرکاش ناتھ پرویز	۱۵/-
دلستان	حسن نعیم مرحوم	۹/-
دھوپ کا سائباں	زبیر رضوی	۳۰/-
دشت تمنا	احمد وصی	۸/-
دروازہ	محمود کاظمی	۱۵/-
دیوان مصحفی	غلام ہمدانی مصحفی	۵۰/-
دھول کی شال	عارف خورشید	۲۵/-
دو آتشہ	حضرت سربر کابری	۳/-
دیوان نین سکھ	مرتبہ ظفر اقبال	۳۵/-
دیوان ظفر	ترتیب ابواللیث صدیقی	۵/-
دھنک احساس کی	راج نرائن راز	۴۵/-
دامان فطرت	قمر نعمانی	۱۲۵/-
دکھ کا جزیرہ	اکرم تبسم	۱۰/-

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
دھوئیں کے پتلے	عظیم انجم	۲۵/-
داستان در داستان	مست احسن گنگوری	۳/-
دھوپ، سایہ اور میں	وقار واثقی	۱۵/-
دیوان آبرو	مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن	۲۵/-
دائرے	امان اللہ خاں	۵/-
دریچہ سیم و سمن	فضا ابن فیضی	۵/-
دیوان عرش	ایم حبیب خاں	۴/-
دکھتی رگیں	شاد عارفی	۵/-
دیوان بہرام	مسلم ضیائی	۱۵/-
درپن	مہیش چندر نقش	۱/-
دائروں میں پھیلی لکیر	کشور ناہید	۳/-
دیوان حالی	مرتبہ رشید حسن خاں	۲۴/-
دشت آرزو	غنی اعجاز	۲/-
دو نیم (اضافہ شدہ اڈیشن)	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۲۵/-
دست نارسا	ڈاکٹر یعقوب عامر	۱۵/-
دست زلیخا	سلمیٰ جاوید	۱۲/-
دیوان رضا عظیم آبادی	مرتبہ قاضی عبدالودود	۱۰/-
دل و نظر	ناظم میواتی	۱۲/-
دیوان غالب (دیوانِ غالب اڈیشن)		۲۵/-
دیوان	ناصر کاظمی	۲۰/-
دواوین غزلیات	مرتبہ ڈاکٹر نعیم	۲۵/-
دیوان حضور	مرتبہ: مختار الدین آرزو	۱/-
دست صبا	فیض احمد فیض	۷/-
دیوان حافظ (مترجم)	حافظ شیرازی	۹۵/-
دیوان اثر	ڈاکٹر فضل حق کامل قریشی	۱۸/-
دست تہ سنگ	فیض احمد فیض	۶/-
ذائقہ میرے لہو کا	شمیم فاروقی	۳/-
ذوق سفر	غلام ربانی تاباں	۵/-
ذوقِ جنوں	آل احمد سرور	۲۵/-
رشتے ٹوٹنے کا موسم	منصور سبزواری	۴۰/-
رات کے مسافر	انور سجاد	۲۸/-
روح کائنات	فراق گورکھپوری	۴/-
رباب سخن	آزاد گورداسپوری	۲/-
رقص زندگی	رؤف جاوید	۲۵/-
روشنی اے روشنی	نور تقی نور	۳/-
روپ	فراق گورکھپوری	۳/-
رنگین پرواز	پی۔ این رنگین	۸/-
رباعیات	زبیدہ انیس خاں زاہد	۱۰/-
رنگ و آب	قیصر امروہوی	۸۵/-
رباعیات اختر	بخشی اختر امرتسری	۴/-
رنگ ہزار دل خوشبو ایک	بیکل اتساہی	۲۸/-
رگِ ظرافت	ضیاء الحق قاسمی	۳۰/-
ریزہ ریزہ حیات	فاطمہ وحید جائسی	۱۸/-
راز و نیاز	راز الہ آبادی	۲۵/-
روحانی غزلیں	مرتبہ ثمینہ حجاب	۶/-
رادار	ساقی فاروقی	۲/-
رقص نوا	رضا امروہوی	۴/-
رامائن فراقی اول	فراقی دریابادی	۳۲/-
رامائن فراقی دوم	" "	۱۲/-
ریختہ دلی	نورالحسن ہاشمی	۵/-
روحانی غزلیں	اندرجیت لال	۳/-
زرِ گل	عاصی نائقی	۳۵/-
زخم بہاراں	عبید کھام گانوی	۲۵/۵۰
زہر آب	تمکین الرحمٰن	۸/-
زندگی اے زندگی	شکیل دسنوی	۱۸/-
زنجیر نغمہ	محمد حسن	۳/-
زخم نہاں	بسمل شاہجہاں آبادی	۱/-
زخم زخم اجالا	ظفر زیدی	۵/-
زندگی اسے زندگی	خلیل الرحمٰن اعظمی	۶/-

زخم مرہم	امیر چند بہار	۵۰/-
زمین زمین	اختر الایمان	۷۵/-
زخم کے پھول	محمد حسن	۲۵/-
زخموں کے پھول	فیضی نظام پوری	۱۰/-
زخموں کے آنگن	سوہن راہی	۱۶/-
زخموں کے سلسلے	عبدالصمد تپش	۲۸/-
زخم	رضا جونپوری	۲۰/-
زخم در زخم	خضر برنی	۵۰/-
زنداں نامہ	فیض احمد فیض	۵۰/-

سکوتِ شام	ڈاکٹر رخسانہ نکہت لاری	۱۵/-
سرہانے کا چراغ	عزیز تمنائی	۵۰/-
سبزۂ شرر	نعمان امام	۳۵/-
سیاہ لمس	صابر زاہد	۵۱/-
ساز مغرب (متفرق حصے)	حسن الدین احمد فی حصہ	۲/-
سماج کا آپریشن	دلکش بدایونی	۱۰/-
سنگ و آہنگ	جعفر ملیح آبادی	۱۵/-
سراجا منیرا	منشاء الرحمٰن منشاء	۲۵/-
سلک لالی (پاکستانی)	حزیں کاشمیری	۳۵/-
سفر تمام	وامق جونپوری	۱۲/-
سفر زاد	اجمل اجملی	۳۵/-
ساز سخن	ادا جعفری	۴۵/-
سر کہسار	ڈاکٹر زبیر فاروق	۳۰/-
سوچ سمندر	جمال قریشی	۳۰/-
سب رنگ	مخمور سعیدی	۵/-
سفینۂ نجات	رضا امروہوی	۱۰/-
ساگر	راجندر بہادر موج	۲۵/-
سوز دل	اعجاز وارثی	۲۰/-
سرور عرفان	چشتی کانپوری	۱۵/-
سورج کی آنکھ	کیف احمد صدیقی	۱۰/-

سخن نامہ	عطا صدیقی	۲۰/-
سرگذشت آصف	ہارون رشید	۱۲/-
سنگِ لرزاں	شہنشاہ مرزا	۱۲/-
سچے بول	گوپال متل	۳۰/-
سرائے میں شام	نشتر خانقاہی	۳۵/-
سورج خیال	طلعت عرفانی	۲۵/-
سی پارہ دل	قاضی غلام صابر	۲۵/-
سرو ساماں	اختر الایمان	۱۰۰/-
سمندر پھر بلاتا ہے	عرفی آفاقی	۲۰/-
سخن نامی	وقار خلیل	۱۰/-
سنہری آنچ	واجد سحری	۳۰/-
سمندر آشنا	خالد محمود	۱۵/-
سفینۂ غزل	عروج زیدی	۱۵/-
سرود زندگی	اصغر گونڈوی	۲/۲۵
سریلی بانسری	سید انور حسین آرزو	۵/۲۵
سبزۂ گفتار	ڈاکٹر یعقوب عامر	۲۰/-

شاہد	جون ایلیا	۱۵۰/-
شہ رگ کا لہو	مخدوم علی محشر	۲۸/-
شکوہ جواب شکوہ مع تشریح	علامہ اقبال	۴/-
شبنم کی آہٹ	اکبر حسین اکبر	۱۵/-
شعلۂ حق	انوار احمد خاں تشنہ	۳/-
شہادت	صبا اکبر آبادی	۲۵/-
شب و روز	خاور نوری	۷/-
شرار نغمہ	گوپال متل	۲۵/-
شعر و حا نجلی	کاوش بدری	۱/۲۵
شیخ محمود خوش دہاں	مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی	۱۰/-
شکنتلا	راجندر بہادر موج	۲۰/-
شب گزیدہ سحر	رفعت شمیم	۴۰/-
شاہنامۂ ہند	سریر کابری	۲۵/-
شب آہنگ	مہتاب حیدر نقوی	۵۰/-

کتاب	مصنف	قیمت
شہر رنگ	شمیم طارق	۱۲/-
شہر غزالاں	رضا امروہوی	۲۰/-
شاہنامہ رسالت	خضر برنی	۱۲/-
شہر سراب	الیس انصاری	۱۵/-
شوخیٔ تحریر	سید محمد جعفری	۳۰/-
شعلے کی شناخت	عمیق حنفی	۲۵/-
شرار جستہ	شرف الدین ساحل	۱۰/-
شہر خوں آشام	مرتبہ شمیم حنفی	۴۰/-
شعور غم	کالی داس گپتا رضا	۳/-
شعلہ و شبنم	جوش ملیح آبادی	۲۵/-
شکستِ قیمت دل	وجد چغتائی	۲۵/-
شجر صدا	عمیق حنفی	۲/-
شاعر کی آواز	جگن ناتھ آزاد	۱/-
صلیب کا درد	ڈی۔اے ہیرن قربان	۲/-
صدائے تیشہ	کنور مہریانوی	۲۰/-
صدف سمندر	شہپر رسول	۴۰/-
صراط مستقیم	سید عاشورہ کاظمی	۲۰/-
صلاح الدین پرویز کے خطوط (مجموعہ کلام)		۶۰/-
صدا ابھرتی ہے	محمد رئیس علوی	۴۰/-
صحرا کی دھوپ	ساحر شیوی	۴۰/-
صبح حیات	ناز مراد آبادی	۵/۵۰
ضبط شدہ نظمیں	مرتبہ خلیق انجم	۲۱/-
ضرب کلیم	علامہ اقبال	۱۵/-
طلسم سفر	شاہد رضوی	۲۰/-
طاقِ نسیاں	عاصی فائقی	۲۰/-
عکس اسرار خودی	ڈاکٹر عصمت جاوید	۱۲/-
عکس در عکس	شاہد ساگری	۴۰/-
عکس حیات	جرار چھولسی	۲۵/-
عکس تمنا	کمال جعفری	۱۵/-
عام سار دعمل	شارق کیفی	۵۰/-
غبار منزل	غلام ربانی تاباں	۲۵/-
غزل پارے	شجاع خاور	۱۰۰/-
غزلیں	وزیر آغا	۲۰/-
غبار ناتواں	مظفر شکوہ	۳۰/-
غبار صحرا	وقار ناصری	۳۵/-
غزالان خیال	ولی الحق انصاری	۲۵/-
فکر نجات	کمال ہمدانی	۱۰/-
فرمودات	حمید الماس	۵۰/-
فکر نو	واحد پریمی	۲۰/-
قطب مشتری (مثنوی)	ملا وجہی	۳۵/-
قدیچے	غلام احمد فرقت	۱۲/-
قصر جوش	جوش ادیب	۱۰/-
قصائد ثاقب لکھنوی	سید مسعود حسن رودلوی	۴۰/-
کانچ کی چادر	مریم غزالہ	۴۰/-
کربلا تا کربلا	ڈاکٹر وحید اختر	۱۲۰/-
کلیات عزیز وارثی	مرتبین: ثاقب صدیقی، انیس احمد	۱۵۰/-
کاروانِ خیال	عطا کاکوی	۱۵/-
کلیات جلال	جلال	۲۰/-
کیا مذاق ہے	اسمٰعیل آذر	۵۰/-
کلام نقش	مہیش چند نقش	۶۰/-
کسک	حسن نجمی سکندرپوری	۲۰/-
کلیات جوہر	جوہر دیوبندی	۳۰/-
کلیات مخمور دہلوی	مرتبہ بدر مخمور	۶۰/-

کمند حرف	عمران عظیم	۵۰/-
کربِ تنہائی	رفعت سروش	۵۰/-
کلیات ذوق	تنویر احمد علوی	۳۴/-
کہاں کی رباعی کہاں کی غزل	شنر فتح پوری	۲۲/-
کاغذی حکم	علیم جہانگیر	۲۰/-
کائنات راز	راز لائلپوری	۳۵/-
کرب انا	اکرم جاوید	۵۰/-
کجلی بن	سعادت سعید	۴۰/-
کاغذ کا شہر	ساغر اعظمی	۳۰/-
کلام معظم بیجاپوری	ابوالنصر محمد خالدی	۴/-
کلام نصیر الدین حیدر بادشاہ	ڈاکٹر شاہ عبدالسلام	۱۵/-
کلیات شہزادہ	سلیمان شکوہ	۳۰/-
کرب احساس	نظمی سکندر آبادی	۳۰/-
کلیات عرش ملسیانی	مرتبہ: مالک رام	۷۵/-
کلیات نواب مرزا شوق لکھنوی	مرتبہ ڈاکٹر شاہ عبدالسلام	۲۵/-
کلام فیض	فیض احمد فیض	۲۵/-
کلیاتِ اصغر	اصغر گونڈوی	۱۰/-
کلیاتِ جگر	جگر مراد آبادی	۴۰/-
کلیات شکیل	شکیل بدایونی	۲۰/-

گلشنِ ناز (تغنیہ کلام)	ڈاکٹر سید محمود دلزین	۵/-
گلہائے فکر	ڈاکٹر اسماء سعیدی	۵۰/-
گلہ صنوبرہ	شفیق فاطمہ شعریٰ	۳۶/-
گلزار فلسفی	صفی اورنگ آبادی	۱۸/-
گورکھپور کے پھول	ظفر گورکھپوری	۳۰/-
گرد و بار	عزیز نفیسی	۳۰/-
گیتا (منظوم)	دل محمد	۲۵/-
گیتانجلی	مترجم: ظہیر عباس	۳۰/-
گل و شبنم	ابھے راج سنگھ شاد	۸/-
گفتگو	قتیل شفائی	۱۵/-

لہو ترنگ	اوم کرشن راحت	۴/-
لوحِ محفوظ	سیماب اکبرآبادی	۲۰/-
لالہ زار صبح	ناشر نقوی	۴/-
لینن	سمن سرحدی	۲۵/-
لینن	نیاز حیدر	۱/-
لمحے لمحے کا کرب	پرویز باغی	۲۰/-
لمحہ لمحہ پیاس	کیلاش ماہر	۵۰/-
لمحہ لمحہ جاگی رات	یعقوب راہی	۲۵/-
لالۂ شاداب	مسعود اختر جمال	۵/۴۰
لمحوں کی خوشبو	ڈاکٹر تنویر علوی	۴۵/-
لازوال	مائل ملیح آبادی	۳۰/-
لہو پکارے گا	اندر سروپ نادان	۴۰/-
لل دید	جے لال کول	۲۰/-
لفظوں کا آسمان	ترجمہ: کرامت علی کرامت	۲/-
لہریں	راجیندر بہادر موج	۳۰/-
لمس حنا	کیلاش ماہر	۱۰/-

مافی الضمیر	ضمیر کاظمی	۴۰/-
مینارۂ فلک بوس	ساقی تونڈلیوی	۱۰/-
مشعلِ جاں	مجروح سلطانپوری	۸۰/-
میکدہ کا درد	جگدیش مہتہ درد	۱۰/-
مسدس عالی	علامہ سر سیر کابری	۵/-
میراجی کی نظمیں	مرتبہ مرغوب علی	۲۰/-
منظر منظر	عامر قدوائی	۳۲/-
موجِ سحر	ڈاکٹر انجنا سدھیر	۴/-
مرقعِ اسلام	سلطان ترکی اکادمی	۲۵/-
ملبن کی آس	شمس فرخ آبادی	۱۵/-
موسم زرد گلابوں کا	شاہد میر	۲۵/-
متاعِ غم	ہرگوبند دیال ساغر	۲۵/-
مختلف	اسلم آزاد	۳۰/-
مطلعِ حیات	احسن رضوی داناپوری	۲/-

کتاب	مصنف	قیمت
موجِ صبا	مہر چند کوثر	۲/-
مزامیر جلد دوم	اثر لکھنوی	۱۵/-
مساعِ کلیم	کلیم احمد آبادی	۴/-
معرکۂ کربلا	الم مظفر نگری	۸/-
معلوماتِ سخن	سید بر کابری جیلانی	۲۵/-
میری مانو لوکھول	مجبور	۵/-
متاعِ احساس	غلام حسین طرز بالاپوری	۲۵/-
مثنوی مولانا روم (جلد ۱ تا ۷) ترجمہ: قاضی سجاد حسین		۳۱/-
موجِ شفق موجِ غبار	نور پرکار	۱۶/-
ماتمِ نہرو	جگن ناتھ آزاد	۷۵/-
ماتمِ سالک	"	۵۰/-
مسافتِ شب	زبیر رضوی	۱۰/-
مثنوی کدم راؤ پدم راؤ	مرتبہ جمیل جالبی	۴۵/-
مسدس حالی	مولانا حالی	۱۵/-
مثنوی زہرِ عشق	مرتبہ: امیر حسن نورانی	۱۰/-
موسم موسم	حلیس نجیب آبادی	۱۰/-
مثنویاتِ غالب	ظ انصاری	۶۰/-
نغمۂ فردوس	ساقی تونڑیلوی	۵۰/-
نوائے راز	مہجور شمسی	۱۰/۵۰
نقش بر نقش	شارق جمال ناگپوری	۱۵/-
نایافت	احمد فراز	۲۰/-
نوشتے	ڈاکٹر سلمان عباسی	۵۰/-
نوائے سرور	سید محمد سرور	۲۵/-
نغماتِ مہتاب	مہتاب	۱۶/-
نل دمینتی	شکنتلا مرج	۳۰/-
نصابِ دل	رشید عبدالسمیع جلیل	۱۲/-
نشیب و فراز	امیر چند بہار	۳۰/-
نسخہ ہائے وفا	فیض احمد فیض	۷۵/-
نوائے شوق	صابر ابوہری	۲۰/-
نقشِ فریادی	فیض احمد فیض	۶/-

کتاب	مصنف	قیمت
نوائے عصر	یحییٰ اعظمی	۳/-
نوائے حیات	سیدہ فرحت	۲۰/-
نوائے بلبل	سروجنی نائیڈو	۸/-
نگارِ حکمت	محمد فضل الرحمٰن	۶/-
نویدِ عصر لینن	نیاز حیدر	۱/-
نقشِ نوا	مبارک شمیم	۱۰/-
نقشِ صدا	رفعت سروش	۵/-
نگارِ معنی انتخاب اشعار فارسی	ضیاء الحسن فاروقی	۳۵/-
وابستگی	حکیم بابر	۳۵/-
دستک کی آواز	شیدا انبالوی	۱۰/-
ویرانیاں	دورا آفریدی	۲۰/-
وادیٔ بن	شجاع خاور	۲۵/-
ہم قبیلہ	علی جواد زیدی	۱۲/-
ہارون کی آواز	حمایت علی شاعر	۳۵/-
ہم اور ہمارے رسول	مولانا ظفر علی خاں	۱۵/۵۰
ہندوستان ہمارا اول دوم	مرتبہ جاں نثار اختر	۲۰/-
ہجر کے موسم	شہریار	۱۰/-
یہ قدم قدم بلائیں	عامر عثمانی	۴۰/-
یاقوتِ رواں	جگدیش چندر مہتہ	۲۰/-
یادوں کا زنداں	وحید قریشی	۳۰/-
یدِ بیضا	ساحر بھوپالی	۳/-
یادوں کے گلاب	سلمان عباسی	۱۰/-
یادِ وطن	شمس عظیم آبادی	۱۰/-

ناول، افسانے اور ڈرامے

کتاب	مصنف	قیمت
آخری آدمی	انتظار حسین	۹۰/-
ایک قطرہ خون	عصمت چغتائی	۷۵/-
آدھا انسان	ارشاد امروہوی	۷/۵۰
آخری رات	سلمان زیدی	۶/-
امر کرن	شنکر سروپ بھٹناگر	۲۰/-
احساس	بینا ناز	۵۵/-
ایشر کی واپسی	منظر الحق علوی	۵۰/-
آتش خور	رام لعل	۷۵/-
آنکھوں کے شہتیر	رفیع الدین احمد	۱۰/-
اندھے چاند کی رات	کشمیری لال ذاکر	۷۵/-
اندھیری رات کا تنہا مسافر	شہزاد منظر	۳۰/-
ایک ندی دو پاٹ	گلشن نندہ	۱۵/-
انتیس بیس	ڈاکٹر حبیب ضیاء	۱۶/-
ایک بھول ہزار غم	زلیخا حسین	۳۸/-
انجو باجی	اوپندر ناتھ اشک	۳۰/-
آؤٹ آف ڈیٹ	جاوید کاظمی	۶/-
ادیب	شانتی نرائن	۲۰/-
ابھرتی ڈوبتی لہریں	عشرت ظہیر	۱۰/-
آواز دل کی صلیب	کوثر چاند پوری	۱۲/-
ابھی سویرا ہے	ارشاد امروہوی	۳۲/-
ایک لڑکی سپنوں کی	م۔م۔ راجندر	۴۸/-
اجلے دامن	ابن حیات	۴۰/-
آخری تحفہ	منشی پریم چند	۳۵/-
ادلو کتا	عبدالستار دلوی	۴۰/-
آسمان میں کمین گاہیں	شیو کے کمار	۵۰/-
آوارہ بگولے	فاطمہ حسن	۵۰/-
اندھی گلی میں صبح	فیروز حامد	۱۵/-
آئینہ صفی	ابن صفی	۴۰/-

کتاب	مصنف	قیمت
اردو کے مخفی افسانے	ڈاکٹر حسن آرزو	۵۰/-
انتون چیخوف کے ڈرامے	زاہدہ زیدی	۹۵/-
آدھے ادھورے	خورشید عالم	۱۵/-
آوارہ گرد کی ڈائری	ابن انشاء	۱۵/-
آدھا راستہ	کرشن چندر	۳۰/-
آئندہ بانو	محی الدین نواب	۳۰/-
آسودگی	" "	۴۰/-
اژدہا ۲ حصے	ایم اے راحت۔ فی حصہ	۴۵/-
ایر ہوسٹس ۲ حصے	" " "	۴۵/-
آوارہ گرد ۶ حصے	ابن کوم فی حصہ	۵۰/-
ابلیکا ۷ حصے	اسلم راہی "	۱۴۵/-
اکیلا مکمل	ایم اے راحت	۴۰/-
اجنبی چہرے	نسر جہاں	۴۵/-
آتش سنگ	ابراہیم اختر	۲۰/-
اجنبی گدھا	شام بارک پوری	۶۰/-
ازل ابد	شرمی رنگ	۲۶/-
اڑیا افسانے	پٹھانی پٹ نایک	۱۱/۵۰
ارتقا	کلام حیدری	۳۰/-
الف۔ لام۔ میم	کلام حیدری	۳۰/-
آئینہ	پی کیشو دیو	۹/۵۰
اپنی اپنی صلیب	صالحہ عابد حسین	۲۰/-
الجھاوے	ابراہیم یوسف	۸۱/-
افشاء اللہ	شوکت تھانوی	۳۰/-
آدھی گھڑی	پاربرتو	۱۵/-
انتخاب افسانہ ۸۹ء	انیس امروہوی	۶۰/-
اچھوت	ملک راج آنند	۵۰/-
آخری خط	عصمت آرا	۳۵/-
ایک اور دن کو پرنام	رام لعل	۶۰/-
اندھیرے میں	رابندر ناتھ ٹیگور	۲۸/-
ایک تھی سارا	امرتا پریتم	۸۰/-
اگن برہا کی	عفت موہانی	۴۲/-

کتاب	مصنف	قیمت
اپنی ہواؤں کی خوشبو	کشمیری لال ذاکر	۲۴/-
آواز کا میوزیم	ساگر سرحدی	۴۵/-
آتے جاتے موسموں کا سچ	ہرچرن چاولہ	۶۰/-
اس دیوار کے سائے میں (منظوم ڈرامے)	رفعت سروش	۲۴/-
اذنِ اللہ	ایس فضیلت	۵۰/-
آزادی	قاضی مشتاق احمد	۳۰/-
اماں	رضیہ بٹ	۱۰۰/-
اکیلی (دنیا اڈیشن)	سلمیٰ کنول	۲۵/-
آدمی اور سکے	زلیخا حسین	۲۹/-
ایکشن ری پلے (ٹی وی ڈراما)	اسلم واحدی	۲۵/-
آبرو	سلمیٰ کنول	۶۰/-
آگ کا دریا	قرۃ العین حیدر	۱۵۰/-
اوپر نیچے درمیان	سعادت حسن منٹو	۴۰/-
انوکھی الفت (ڈراما)	عبدالقادر سوداگر	۱۲/-
انوکھا رشتہ	رضیہ دی جیوا	۵۰/-
اکھڑے ہوئے لوگ	رام لعل	۵۰/-
آبلے	احمد ندیم قاسمی	۴۰/-
اپنا کون	زلیخا حسین	۲۰/-
آؤ	سعادت حسن منٹو	۱۶/-
آخری سلام	شکیلہ اختر	۳۰/-
انوکھی مسکراہٹ	سید محمد محسن	۶/-
اسٹیج ڈرامے	آفاق احمد	۳۹/-
آس کا جگنو	انیس مرزا	۲۲/-
آوارہ	اسماء اعجاز	۶۰/-
ایک لڑکی	وحیدہ نسیم	۶۰/-
اندھیری رات کے مسافر	نسیم حجازی	۵۰/-
آگرہ بازار	حبیب تنویر	۶۰/-
اڑتے لمحے	ستیش تبرا	۲۵/-
آنگن آنگن	ظفر حبیب	۱۲/-
آخری چٹان	نسیم حجازی	۴۵/-
اور تلوار ٹوٹ گئی	" "	۵۰/-
اور تمنا بے تاب	زہرہ رضویہ	۴۰/-
انیسہ	فیاض نیازی	۳۵/-
انگڑائی	ضیا عظیم آبادی	۱۶/-
انسان اور دیوتا	نسیم حجازی	۴۵/-
آگ	شمیم نقوی	۳۰/-
اوتھیلو	شیکسپیئر	۲۰/-
انارکلی	امتیاز علی تاج	۱۲/-
آخری شعلہ	ابن صفی	۲۵/-
آگ الاؤ صحرا	قمر احسن	۲۵/-
الیوژن	بلراج ورما	۲۵/-
آن	رئیس احمد جعفری	۳۵/-
ایک خلش سی	حامدہ واسطی	۲۴/-
آتش خاموش	صالحہ عابد حسین	۲۵/-
بارہواں کھلاڑی	احمد پاشا شجاع	۹۹/-
بارش میں ایک آدمی	گلشن کھنہ	۶۰/-
باجی	رضیہ بٹ	۴۵/-
باسی پھول	سید علی عباس حسینی	۱۴/-
بدکردار	الطاف سنگھردی	۱۵/-
بادل چھٹ گئے	محمودہ بشیر	۵۰/-
بوند بوند روشنی	سکندر ضمیر	۱/-
بھگت سورداس (دبلوا منگل)	آغا حشر کاشمیری	۷۵.
بھو کی تلاش	نورالعین صدیقی	۶/-
بیس نئی کہانیاں	علی احمد فاطمی	۲۵/-
بہروپیا	ایم۔ ایم راحت	۱۴/-
بڑبھس	شوکت تھانوی	۹/-
برزخ	ہاجرہ شکور	۴۰/-
بھوکا ایتھوپیا	شرف عالم	۱۱۰/-
بہن جی	ایچ۔ ایس دلگیر	۳۰/-
بہرام ۲ حصے	ایم۔ اے راحت	۴۰/-
بقراط "	" "	۳۵/-

بولو مت چپ رہو	حسین الحق	۶۰/-
بے نام قاتل	یوگیش کمار	۶/-
بیٹی	رضیہ بٹ	۲۵/-
بزدل عاشق	جیمس ہیڈلے چیز	۲۵/-
باغ فوکل	آمنہ ابوالحسن	۴۰/-
برق بلا خیز	مظہر الحق علوی	۱۰۰/-
بگولا	امتیاز الحق علوی	۶/-
بشریٰ	مینا ناز	۳۵/-
بھولے ہوئے راہی	محمد فیض	۱۰/-
بلندیوں کے خواب	توفیق بٹ	۳۰/-
بت شکن	بشریٰ رحمان	۳۰/-
بڈھا کھوسٹ	سعادت حسن منٹو	۱۸/-
باون افسانے	سمن چھانوی	۳۰/-
بندر کے بچے	بھیم سین تیاگی	۳۰/-
بوسٹن کا سفر	محمود ہاشمی	۱/۵۰
بند کمروں کی کھلی کھڑکیاں	ہاجرہ مسرور	۴/-
بے چہرہ شام	یونس اگاسکر	۴۰/-
بنجر بادل	کشمیری لال ذاکر	۳۲/-
بسمہ	رضیہ بٹ	۳۰/-
بے نام موسموں کا نوحہ	عوض سعید	۳۰/-
بہادر دوشیزہ	صادق سردھنوی	۳۰/-
بہت دیر کر دی	علیم مسرور	۹/-
بھنور	سلمیٰ کنول	۹۵/-
بغیر اجازت	سعادت حسن منٹو	۱۶/-
بینا	رضیہ بٹ	۷۰/-
بازار حسن	پریم چند	۳۰/-
بارہ آنے	شبنم سندر پرویز	۲/-
بے نشان راستے	بلقیس ظفر	۳۰/-
بادشاہت کا خاتمہ	سعادت حسن منٹو	۳/-
بوڑھا یوکلپٹس	مسرور جہاں	۲۵/-
بہاریں پھر بھی آتی ہیں	عطیہ پروین	۱۸/-

بے جڑ کے پودے	سہیل عظیم آبادی	۲۰/-
بے چہرہ لوگ	اوصاف احمد	۱۵/-
پکھیرو	رام لعل	۷۵/-
پٹروسن کا کوٹ	اوپندر ناتھ اشک	۲۵/-
پھول کے آنسو	عظیم راہی	۲۰/-
پتھر کی صلیب	ستیہ پال آنند	۶۰/-
پت جھڑ میں خود کلامی	رشید امجد	۳۰/-
پجاری	سطوت زہرا سطوت	۲۵/-
پریم چند کے سو افسانے	مرتبہ گوپال متل	۲۸۰/-
پہلی نسل کا گناہ	صفیہ صدیقی	۵۰/-
پتھر کا دیوتا	مسرور جہاں	۴۰/-
پانی	غضنفر	۳۰/-
پھندنے	سعادت حسن منٹو	۲۵/-
پھول جیسے لوگ	انور خاں	۴۰/-
پاکستان سے دیار حرم تک	نسیم حجازی	۱۵/-
پاگل خانہ	حجاب امتیاز علی	۶/-
پیار کا ملن		۲۵/-
پیاسا	اسما اعجاز	۳۵/-
پناہ گاہ	سلمیٰ کنول	۷۰/-
پتھروں کے گیت	محمود بابیسری	۲۵/-
پتھر	سلمیٰ کنول	۸۰/-
پہچان کی نوک پر	جتیندر بلّو	۲۵/-
پرندے کا سفر	مسرور جہاں	۳۵/-
پت جھڑ کے مسافر	مخمور سبزواری	۳۰/-
پتوار	ضیا عظیم آبادی	۶/-
پرچھائیوں کی وادی	انور عظیم	۵/-
پونم کا چاند	رضیہ فرحت	۳۰/-
پریم پچیسی	پریم چند	۳۶/-
پہلو بہ پہلو (افسانے)	شہاب عظیم آبادی	۱۲/-

تو شریک سفر رہا	نسیم سعد قریشی	۸/
ترچھے راستے	معین اشرف	۶/
تین بتی کے راما	علی امام نقوی	۴۰/
ترسہ	شنکر سروپ بھٹناگر	۴۰/
تھکا ہوا دن	الیاس احمد گدی	۴۲/
تین اور تیس ہزار	اسلم واحدی	۲۰/
تین ناٹک	ٹیگور	۲۵/
تاج محل	الیاس سیتاپوری	۶۰/
تقدیر کے بندھن (ڈرامے)	عبدالقادر	۴۰/
تنکا اور شہتیر	ظفر جگر سنوی	۲۵/
تلاش (افسانے)	مشتاق احمد نوری	۳۰/
تذکرہ	انتظار حسین	۵۴/
تیرا غم رہے سلامت	عطیہ پروین	۲۴/
تیرے میرے دکھ	مسرور جہاں	۴۵/
تیسری دنیا کے لوگ	ابن کنول	۲۰/
تین چہرے تین آوازیں	صالحہ عابد حسین	۱۸/
تیرے کوچے سے ہم نکلے	عطیہ پروین	۳۰/
تمہارے لیے	" "	۳۰/
تم آئے بہار آئی	فرحت جبیں	۲۰/
تلخیاں	رشید اختر ندوی	۵/

جو اکثر یاد آتے ہیں	ڈاکٹر دیمانند گپتا	۱۰/
جو کہا نہیں جاتا	عظیم اقبال	۲۵/
جنت کا بھوت	عظیم بیگ چغتائی	۹/
جال	رئیس احمد جعفری	۳۰/
جی ہاں چلتے ہیں	شوکت تھانوی	۲۵/
جوکر	" "	۲۶/
جوڑے کا پھول	دیبا خانم	۲۵/
جھوٹے وعدے سچے وعدے	علی باقر	۳/
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	صغرا مہدی	۲۴/
جگنوؤں کی دنیا	قرۃ العین حیدر	۶۰/
جرنیلی سڑک	رضا علی عابدی	۱۰۰/
جہتے لداخ (سفرنامہ)	ستیش بترا	۳۵/
جوشِ اسلام	صادق سرحدی	۳۶/
جاتی ہوئی رات	کشمیری لال ذاکر	۲۵/
جذبوں کا جنون	بشریٰ نسرین	۳/
جواب دوست	نسیم انصاری	۳/
جولیس سیزر (ڈراما)	شکسپیر	۲/
جب یاد تری آئی	ماہ ناز صبرینا	۳۰/
جنازے (ڈراما)	سعادت حسن منٹو	۱۵/
جلوۂ ایثار	پریم چند	۲۰/

ٹھکانا	حیات اللہ انصاری	۶۰/
ٹوٹی لکیر	انیس مرزا	۴۰/
ٹوٹتے لمحوں کا کرب	جعفر عباس	۳/
ٹوٹتے بکھرے لوگ	یوگیش کمار	۶۰/
ٹوٹے بندھن	رضیہ بٹ	۵۰/
ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	۸۵/
ٹھنڈی آگ	سرت چندر	۲۸/
ٹی وی ڈرامے	آفاق احمد	۳۰/
ٹھنڈا گوشت	سعادت حسن منٹو	۲۵/

چاند گہن	انتظار حسین	۷۵/
چھوٹی بہو	ابن فرید	۲۵/
چار شہر ایک کہانی	وحید الزر	۲۰/
چارہ گر	قمر جہاں	۱۴/
چراغ چراغ اندھیرا	گلشن آنند	۳۰/
چوتھا شوہر	فاطمہ حسن	۸/۵۰
چھوٹا بیٹا	اوپندر ناتھ اشک	۱۵/
چلو چاند پر چلیں	محمد عبدالرحیم	۱/
چاند کا داغ	وقار واثقی	۱۵/
چراغ تہہ داماں	اقبال متین	۲۰/

کتاب	مصنف	قیمت	کتاب	مصنف	قیمت
چناروں کے سائے	پریم ناتھ درد	۵/-	دل کی تحریر	عابد ضمیر	۳/-
چُغد	سعادت حسن منٹو	۳/-	دل دریا	دلیپ سنگھ	۱۰/-
چاندنی بیگم	قرۃ العین حیدر	۱۲۵/-	دادو پل کے بچے	کرشن چندر	۱۵/-
چارہ گر	بشریٰ رحمان	۴۰/-	درد آہٹوں کا	ڈاکٹر ہارون ایوب	۱۸/-
چار ناولٹ	قرۃ العین حیدر	۵۰/-	داستان مردانِ حُر	عنایت اللہ التمش	۵۰/-
چلمن چلمن تیری تجلی	دیبا خانم	۳۰/-	دیوار پر لکھی ہوئی عبارت	آسی رام نگری	۷۵/-
چند مصری ناول اور افسانے	ڈاکٹر بدر الدین	۵۰/-	دوسری کرن	وریندر پٹواری	۳۵/-
چوتھا کانٹا	اسلم راحدی	۲۰/-	درۂ خیبر کے اس پار	یعقوب یاور کوٹی	۴/-
چار چہرے	سہیل عظیم آبادی	۲۵/-	دست قضا	مترجم ابن اسمٰعیل	۵۰/-
			دل نشیں	مشرف تمیز	۶۰/-
حضرتِ جاں	قاضی عبدالستار	۴/-	درد کے فاصلے	رضیہ جمیل	۰/-
حسنیٰ	افسر جمالی	۲۴/-	دل اور پتھر	دیبا خانم	۴۰/-
			دوسری عورت	مینا ناز	۳/-
خاندان	رضیہ بٹ	۶۵/-	دل ایک منزل	سیمی رانا	۵۰/-
خاموش حسن	ٹیگور	۲۴/-	دوسرا کمرہ	زاہدہ زیدی	۱۰/-
خورشیدی بیگم	انجم ممتاز	۱۵/۵۰	دادی کی چارپائی (ڈراما)	عائشہ احمد	۵/-
خدنگ جستہ	مناظر حسن	۱۵/-	دہشت (افسانے)	ظفر پیامی	۱/-
خون پھر خون ہے	کشمیری لال ذاکر	۱۷/-	دو آدھے (افسانے)	شمیم نکہت	/-
خواب رو	جوگندر پال	۴۰/-	دوسرا چہرہ	سراج انور	۵/-
خوابوں کا بدن	منال انور	۵۰/-	دوسرا کنارا (ڈراما)	غلام جیلانی	۵/-
خوبصورت	بشریٰ رحمٰن	۴۵/-	دہلے پہ نہلا	اظہار اثر	۵/-
خطا	قیسی رام پوری	۴۵/-	دارا شکوہ	قاضی عبدالستار	۷/-
خلش	سراج انور	۴۰/-	دلِ ناداں	مینا ناز	/-
خوشیوں کا باغ	انور سجاد	۳۰/-	دو عملے	محی الدین نواب	-
خاک و پروانہ	منشی پریم چند	۱۲/-	دود چراغ محفل	کچی بابو	۲۵
خدا کی بستی	شوکت صدیقی	۴۵/-	دوسرا زینہ	سراج انور	/-
			دل دریا تن صحرا	رفعت سراج	/-
دو گز زمیں	عبدالصمد	۹۰/-	دُردانہ	نادرہ خاتون	/-
دائروں کے قیدی	بانو سرتاج	۶۰/-	درد کے رشتے (ڈراما)	نفیس صدیقی	/-
درد کا گلاب	صبوحی طارق	۲۰/-	دراڑیں	ابن حیات	/-
دل دماغ دنیا	ہرچرن چاؤلہ	۵۰/-	دھنک کے سائے	عصمت عذرا	

کتاب	مصنف	قیمت
دل اور دیوار	بلقیس ریاض	۲۵/-
داستان مجاہد	نسیم حجازی	۱۵/-
دل دریا	شروں کی ردرما	۳۰/-
دوڑتا جنگل	سراج انور	۶۰/-
داستان ایمان فروشوں کی اول تا پنجم	التمش	۲۱۰/-
دیوتا ۷ حصے	محی الدین نواب فی حصہ	۲۵/-
دروازہ	کرشن چندر	۱۵/-
دکھ سکھ	سلمیٰ کنول	۱۶/-
دریچے	وقار ناصری	۲۰/-
دوسرا کھور دخاں	نور پرکار	۱۸/-
ڈگر پنگھٹ کی	رفعت سروش	۶۰/-
ڈاکو ملے کریں گے	م ناگ	۴۰/-
ڈارلنگ	رضیہ بٹ	۳۰/-
ڈوبتا ابھرتا آدمی	رام لعل	۴۵/-
ڈاکٹر سنگھ	ویریشور بلوریہ	۳/۵۰
ذرا سی بات	ابوالکلام عزیزی	۱۵/-
رگِ سنگ	بدر اورنگ آبادی	۱۵/-
ریت پر اُگا ہوا پھول	عشرت بیتاب	۴۰/-
رقیب	عفت موہانی	۵۰/-
رنگ محل	حمیدہ سلطان	۲۰/-
راہ اکیلی	زلیخا حسین	۳۰/-
روزی کا سوال	واجدہ تبسم	۱۵/-
ریشمی کفن	افروز بھارتی	۱۵/-
روحِ ادب کے افسانے اول، دوم	مغربی بنگال اکیڈمی	۱۲/-
روگی	مینا ناز	۶۰/-
رنگ ہزار	مسرور جہاں	۴۵/-

کتاب	مصنف	قیمت
رہنما و رہرو	منظور احمد	۱۰/-
رفیق حیات	غلام محمد سوداگر	۲۰/-
راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے	اطہر پرویز	۲۵/-
رشتہ پیار کا	مسرور جہاں	۴۰/-
رتی ماشہ تولہ	سعادت حسن منٹو	۱۲/-
رنگ مہک اٹھے	منور سلطانہ	۳۵/-
ریت کے محل	فضل حسین	۳۰/-
ڈرن آنگن	ڈاکٹر عبدالستار دلوی	۴۰/-
ریت کی دیواریں	رفعت سروش	۲۱/-
رشتے کا روگ	زلیخا حسین	۲۰/-
راگ بھوپالی (جیبی)	صغریٰ مہدی	۶/-
روشنی کی رفتار	قرۃ العین حیدر	۱۴/-
راگ بھوپالی مجلّد	صغرا مہدی	۱۵/-
زیبا	افتخار بانو	۴۰/-
زر بیل	مقدر حمید	۴۰/-
زری	رضیہ بٹ	۶۰/-
زمین کا پیڑ	شنکر سروپ بھٹناگر	۴۰/-
زخم بہاروں کے	طاہرہ سعید	۲۵/-
زر سے ذات	عفت قریشی	۶۰/-
زخم تمنّا	فریدہ انیس	۲۵/-
زاویے	ہربنس	۳۰/-
زرد گلاب	رضیہ سجاد ظہیر	۲۵/-
زخم دل	سلطانہ جبیں	۳۰/-
زنجیر	اسماء اعجاز	۹/-
زوال کا عروج	مترجم۔ انور عظیم	۳۶/-
زادرہ	پریم چند	۲۵/-
زندگی کے کھیل (ڈراما)	صالحہ عابد حسین	۵/-
سبز جبہ	قمر جلالی	۶۰/-
ستم گر	دیبا خانم	۶۰/-
سفر سے واپسی	شہیرہ مسرور	۳۸/-

کتاب	مصنف	قیمت
سلولائیڈ کی دنیا	پریم پال اشک	۳۵/-
سادہ ورق	ابراہیم اختر	۲۵/-
سونے کا سنسار	کرشن چندر	۴۰/-
سمٹی ہوئی زمین	شفق	۱۲/-
سوا نیزے کی روحیں	عظیم بیگ چغتائی	۵/-
سر راہے	مسعود مفتی	۶۰/-
سلور کنگ	آغا حشر کاشمیری	۱۵/-
سرکنڈوں کے پیچھے	سعادت حسن منٹو	۳۰/-
سفر	رابعہ تبسم	۲۶/-
سرحد کوئی نہیں (ڈراما)	ساجدہ زیدی	۵۱/-
سلگتے خواب	ڈی۔اے ہیرسن قربان	۲۰/-
ساوتری	مترجم عبدالستار دلوی	۲۵/-
سنہری ریت	روبی ٹھاکر	۴۵/-
سمندری خزانہ	ماریہ رحمان	۴۷/-
سبز پرندوں کا سفر	شفیع مشہدی	۵۰/-
سوچ لیجیے	نور العین علی	۴۰/-
ستارہ جو ٹوٹ گیا اول (تاریخی ناول)	عنایت اللہ التمش	۳۵/-
" " دوم	" "	۴۰/-
سوز جاوداں	بیگم رضیہ سلیم	۱۵/-
شرابِ زندگی	ذکیہ بلگرامی	۴۰/-
سات کھیل (ڈرامے)	راجندر سنگھ بیدی	۱۶/۵۰
سنسار اول تا ششم مکمل	سرور محمد حسن	فی حصہ ۳۵/-
سرفروش اول، دوم	اظہر کلیم	۶۰/-
ستارہ	طاہرہ سعید	۱۵/-
ساتواں پھیرا	واجدہ تبسم	۴۰/-
سدا بہار چاندنی	رام لعل	۳۰/-
سفید جزیرہ	نسیم حجازی	۲۵/-
ساحل و سمندر (سفرنامہ)	سید احتشام حسین	۳۰/-
سیاہ ہیولا	ڈاکٹر جہانگیر اشرفی	۴۰/-
ساتواں آنگن (حبیبی)	صالحہ عابد حسین	۸/-
سمندر صلیب اور وہ	کشمیری لال ذاکر	۳۲/-
سپنے کب اپنے	فرخندہ نسیم	۲۴/-
سات رنگ	عبداللہ حسین	۴۵/-
سپنوں کی شہنائی	دیبا خانم	۱۶/-
سفر در سفر	انجم عثمانی	۲۰/-
سلالیہ (اول، دوم مکمل)	ایم۔اے راحت	۷۰/-
شہر کا ایک دن	ستیہ پال آنند	۵۰/-
شاہجہاں کا خواب	رفعت سروش	۱۰/-
شکوہ	شرف خانم عرشی	۴۰/-
شبانہ	نسیم انہونوی	۴۰/-
شبو	رضیہ بٹ	۴/-
شناخت	شفق	۳۰/-
شمشیر و سناں	ویش چترکار	۲۵/-
شناخت	اظہار عثمانی	۱۶/-
شرمیلی	دیبا خانم	۴۵/-
شیر آہو خانہ	قمر احسن	۶۰/-
شوشے (مزاحیہ)	ارشد علی خاں	۱۰/-
شبنموں کا مسیحا	ڈاکٹر نکہت ریحانہ خاں	۷۵/-
شکاری عورتیں	سعادت حسن منٹو	۴۰/-
شوقِ آوارگی	مینا ناز	۳۵/-
شہزادہ	قاضی مشتاق احمد	۱۵/-
شعلہ کاہن	شیخ سلیم احمد	۱۰/-
شعلہ جوالہ	رشید جہاں	۴۰/-
شطرنج کے مہرے	حبیب تنویر	۷/-
شمیم	منشی فیاض علی	۹۰/-
شیشے کی چٹان	سراج النور	۶۰/-
شکست	کرشن چندر	۲۵/-
شیطان	سعادت حسن منٹو	۱۸/-
شکار بیتی	ریحان احمد عباسی	۵/۵۰
شہناز	ترجمہ: حبیب اشعر	۷/-
شاہی کنیز	رحمن حمیدی	۱۰/-

شام آرزو	عطیہ پروین	۶۶/-
شب گزیدہ	قاضی عبدالستار	۳۰/-
شب رفتہ	راشد رشید تدوائی	۵۰/-
شمشیر بے نیام اول، دوم	عنایت اللہ	۹۰/-
شبیہ	سلمیٰ اعوان	۳۰/-
شہر وفا	عینی ارسلان	۴۲/-
شیرازہ	صفیہ یوسفی	۴۵/-
شکستگی دل کی	شاہدہ صدف	۲۰/-
صدی مانگتی ہے نذرانہ	بازغ تبسم	۱۵/-
صحرائے اعظم	زاہدہ زیدی	۳۰/-
صاجو	ڈاکٹر سہیل احمد	۱۵/-
صاحبزادی	دیبا خانم	۴۰/-
صنم	مینا ناز	۲۰/-
صحرا نورد کے رومان	مرزا ادیب	۳۰/-
صلاح الدین ایوبی	قاضی عبدالستار	۳۰/-
صفیہ	سلمیٰ محبوب	۱۰/-
ضدی	عصمت چغتائی	۱۵/-
ضمیر	عظمت رضا	۲۶/-
طلسم کدہ	اسلم راہی	۸/-
طلاق	مینا ناز	۲۰/-
ظلمات	اسلم راہی	۶۰/-
عکس	نگار عظیم	۲۵/-
عورت	سیارام سرن گپت	۱۵/-
عقب کا دروازہ (افسانے)	حمید سہروردی	۲۰/-
عذرا	صالحہ عابد حسین	۵/-
عرشی	عابدہ نسرین	۶۰/-
عرفانہ	نادرہ خاتون	۳۰/-
عربی دوشیزہ	صادق حسین سردھنوی	۲۵/-
عرب کا چاند		۳۵/-
عطا	بیگم رقیہ سلیم	۱۰/-
عشق عشق	بشریٰ رحمن	۲۰/-
عفراء	عابدہ نسرین	۶۰/-
غیاث احمد گدی کے افسانے	جمشید قمر	۹۰/-
غالیچہ	ایڈیٹر رگھوناتھ گھمی	۶۰/-
غالب خستہ کے بغیر	جمیل شیدائی	۲۰/-
غم کے سائے	بیگم محمودہ شبیر	۲۶/-
فرعون	رشید انجم	۵۰/-
فراست	حسین الحق	۱۰۰/-
فوٹوگرافی	سمیع حیدر	۲۰/-
فنکاری	انور خال	۲۵/-
فصیل	تسکین زیدی	۲۵/-
فردوس خیال	پریم چند	۲۰/-
فکریات	فکر تونسوی	۱۲/-
فکر بانی	" "	۲۰/-
فرار	ظفر پیامی	۴۰/-
قند و ز قند	نیاض احمد فیضی	۵۰/-
قیدی سانس لیتا ہے	زاہدہ حنا	۵۰/-
قدر دان	مرزا عظیم چغتائی	۵/-
قرض مقراض	" "	۵/-
قلم کہانیاں (افسانے)	بشریٰ رحمان	۱۲۵/-
قاتل ہار	رمیش چندر شرما	۲۸/-
قافلۂ حجاز	نسیم حجازی	۵۰/-
قیصر و کسریٰ	نسیم حجازی	۵۵/-

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
کوکن کے افسانے	مرتبہ انجم عباسی	۵/-
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے	شکیل شاہجہاں	۴/-
کسک	عظمت رضا	۱۲/-
کراٹے کے جدید انداز	شکیل احمد	۱۲/-
کہی ان کہی	ادم کرشن راحت	۴/-
کانٹے اور پھول	اعجاز احمد	۱۵/-
کمزوری	مرزا عظیم بیگ چغتائی	۲/-
کارخانہ اور آئندہ زمانہ	محمد فضل الرحمٰن	۲/-
کنگن	عصمت آراء	۱۵/-
کوکن کے افسانے	ترتیب انجم عباسی	۵/-
کستوری کنڈل	ڈاکٹر نرلیش	۴/-
کلر بلائنڈ	انور قمر	۳/-
کھلا	جوگندر پال	۸/-
کون کسی کا	ٹیگور	۲۲/-
کانفرنسیں	شمیم عظیم آبادی	۹/-
کوفتے (مزاحیہ)	حفیظ نعیمی	۳/-
کتھا	خالدہ اگاسکر	۴۰/-
کوہ ندا	عوض سعید	۱۲/-
کفن سے کرتے تک	فکر تونسوی	۲۵/-
کوئی بات نہیں	سراج انور	۳۵/-
کتھا نگر	جوگندر پال	۳۶/-
کالی شلوار	سعادت حسن منٹو	۲۰/-
کھلاڑی اول تا یازدہم	الف صدیقی	فی حصہ ۳۵/-
کنارا	سلمیٰ کنول	۷۰/-
کلیسا اور آگ	نسیم حجازی	۵۰/-
کوئی درد آشنا بھی نہیں	صغرا مہدی	۱/۵۰
کرشن چندر اور ان کے افسانے	مرتبہ اطہر پرویز	۳۵/-
کنگ لیئر	شکسپیئر	۲۰/-
کرمان والی	کشمیری لال ذاکر	۲۰/-

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
گھٹتے بڑھتے سہارے	علی امام نقوی	۵/-
گر سہارے نہ ملتے	زلیخا حسین	۲۷/-
گر تو برا نہ مانے	شاہدہ صدیقی	۵/-
گھر کی دیوار	انیس قیوم فیاض	۸/-
گڑیا گھر	قدسیہ زیدی	۶/-
گھومتے چاک کی کیل	عائشہ صدیقی	۱۵/-
گرم برف	انل ٹھکر	۵۰/-
گلنار بیگم	عذرا جمال	۳/-
گردش رنگ چمن	قرۃ العین حیدر	۱۵/-
گل بن	سیدہ نسیم چشتی	۱۲۵/-
گمراہ اول تا دہم	جبار توقیر	فی حصہ ۲۵/-
گرد کارواں	کنہیا لال کپور	۱۴/-
گرہن	عزیز احمد	۳۵/-
گونگی توپ	قطب اللہ	۱۰/-
گئودان	منشی پریم چند	۴۵/-
گنجی کی کہانی	مورا سا شنبکیو	۶/۵۰
گرداب	فیروزہ شاہین	۱۵/-
گیالارڈ	گلشن نندہ	۱۲/-
لکشمن ریکھا	منظر کاظمی	۱۰۰/-
لیلیٰ کے خطوط مجنوں کی ڈائری	قاضی عبد الغفار	۴۰/-
لمحوں کے سراب	رضیہ نور محمد	۱۶/-
لمحوں کی نیند	کشور سلطانہ	۱۰/-
لاڈلی	سلمیٰ کنول	۸۰/-
لہو کی آنچ	تبسم بانو	۴۰/-
لوہا	بلقیس صادق علی	۳۵/-
لاوا	مظہر الحق علوی	۶۰/-
لبزا	پروین شریف	۴۵/-
لاؤڈ سپیکر	منٹو	۲۴/-
لندن کی ایک رات	سجاد ظہیر	۱۵/-
لمحوں میں بکھری زندگی	کشمیری لال ذاکر	۱۸/-
لرزتہ ...	مظہر الحق علوی	۲۶/-

تعلیمی تاش اُردو - اُردو و انگلش - انگلش
قیمت ۱۰/۱۰ ۱۲ ۱۰/-
ملنے کا پتا مکتبہ جامعہ دہلی ۶

کتاب	مصنف	قیمت
موج ہوا پیچاں	ساجدہ زیدی	۶۰/-
میری پلکیں ترے آنسو	مینا ناز	۶۰/-
مندر میں محراب	محمد اجمل نیازی	۹۰/-
موم سے جڑے پنکھ	مشتاق رضا	۳۰/-
منٹو کے گمشدہ اور غیر مطبوعہ افسانے	مرتبہ بلراج مینرا	۷۵/-
منٹو کے یادگار افسانے	منٹو	۱۲/-
مسکراہٹ ہی مسکراہٹ	اندرجیت لال	۴/-
منتخب افسانے ۱۹۹۰ء	نند کشور وکرم	۷۰/-
" " ۱۹۹۱ء	"	۷۰/-
منٹو کے نمائندہ افسانے	اطہر پرویز	۲۵/-
متحرک منظر کی فریم	معین الدین عثمانی	۲۶/-
مجنوں کی ڈائری	قاضی عبدالغفار	۱۵/-
مٹی کا چراغ	سلمیٰ صدیقی	۱۶/-
مسیحا	عظمت رضا	۲۰/-
مہندی کانٹے	شوکت تھانوی	۵/-
معمہ خاتون	" "	۸/-
موتی کے دانے	قاضی فضل رب	۱۵/-
منزل نہ ملی	عبدالقادر سوداگر	۲۵/-
ماں	میکسم گورکی	۴۰/-
میدان عمل	پریم چند	۷۵/-
مسرت	کرشن چندر	۴۰/-
محبت بھی قیامت بھی	کرشن چندر	۸۰/-
مہانگر	جتیندر بلو	۴۰/-
موت کا سایہ	جیمس ہیڈلے چیز	۲۰/-
منتخب افسانے ۱۹۸۹ء	نند کشور وکرم	۴۴/-
مکان	پیغام آفاقی	۱۰۰/-
مفرور	رئیس احمد جعفری	۴۵/-
مہانندا	اعجاز مدنی	۳۰/-
مور رقص تماشائی (افسانے)	نورالحسنین	۲۸/-
محبت ایک سچائی	رضیہ بٹ	۴۰/-

کتاب	مصنف	قیمت
مریخ کی سمت	مرزا حسن ناصر	۵/-
مدوجزر	ثریا صولت	۱۵/-
معصومہ	عصمت چغتائی	۳۰/-
معتبر	سلام بن رزاق	۲۵/-
میں	فکر تونسوی	۲۵/-
ملبہ	مشرف منیر	۳۰/-
میرا آنچل میلا ہے	کشمیری لال ذاکر	۳۰/-
مکتوب وقت	الیاس سیتاپوری	۲۰/-
مفرور اول تا ششم	صفدر علی اقلیم علیم	فی حصہ ۲۵/-
مہارانی اول تا سوم	کنور حشمت علی خاں	۳۵/-
مہوش	بلقیس ریاض	۳۰/-
موت کا بازار (جیبی)	آفتاب جلالی	۸/-
میرا شہر ادھورا سا	کشمیری لال ذاکر	۱۲۵/-
مکتی بودھ	راجندر سنگھ بیدی	۲۵.۰۵
مجرم کون	رضیہ بٹ	۴۰/-
مہکتی بہاریں	کوثر چاندپوری	۱۸/-
میڈیا	ساہتیہ اکادمی	۵/-
مقدس آگ	الیاس سیتاپوری	۱۰/-
میرے بہترین افسانے	منشی پریم چند	۲۰/-

کتاب	مصنف	قیمت
نوٹوں کی تلاش	محمد عاقل ایاز	۶۰/-
نیلام گھر	مشرف عالم ذوقی	۹۰/-
نقش اول	نور جہاں نور	۲۵/-
نو ڈرامے	احسان الحق	۱۰/-
نئی فصل	بچن بھٹاچاریہ	۸/۷۵
ناٹ آؤٹ	شیخ رحمن اکولوی	۲۰/-
نمرود کی خدائی	سعادت حسن منٹو	۲/-
نئی بستی	مسرور جہاں	۵۰/-
نخلستان میں کھلنے والی کھڑکی	ساجد رشید	۴۰/-
ندرت	ثریا محمود ندرت	۱۴/-

نمود سحر	ہاجرہ نازلی	۲۲/۵۰
نشیب (حبیبی)	عبداللہ حسین	۵/-
نیلوفر	شوکت تھانوی	۳۵/-
ننھ کا غرور	واجدہ تبسم	۳۰/-
ننھ کی عزت	"	۳۰/-
ننھ کا بوجھ	"	۳۰/-
ننھ کا زخم	"	۳۰/-

نورس	ثریا محمود ندرت	۸/-
نیشاپور کا شاہین	اسلم راہی	۳۵/-
نئے شگوفے	کنہیا لال کپور	۲۵/-
نیتو	فریدہ حق	۲۵/-
نیلی ساری	خواجہ احمد عباس (زیر طبع)	
ناظرہ	ہاجرہ نازلی	۲۵/-
نیلی رگیں	سعادت حسن منٹو	۳۵/-
نرملا	پریم چند	۱۵/-

وہ بات	رفعت النواز	۵/-
وطن کی بیٹی	رضیہ بٹ	۹۰/-
وہی قتل بھی کرے	مترجم حیدر رضوی	۱۲۵/-
وفا جن سے کی	عفت موہانی	۴۲/-
واپسی کا سفر (حبیبی)	عبداللہ حسین	۵/-
وہ لڑکی	شیام سندر پرویز	۲/-
واپسی	افتخار عالم	۱۲/-
ویزا	قطب اللہ	۲۰/-
وفا کیسی	مینا ناز	۱۸/-
واپسی	اسلم واحدی	۱۲/-

ہم وحشی ہیں	کرشن چندر	۳۰/-
ہیم کاری	صالحہ عابد حسین	۶/-
سپنے	آسی سعید	۳۰/-
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی	کشمیری لال ذاکر	۴۰/-

ہچکولے	رئیس احمد جعفری	۴۵/-
ہنگر پہ لٹکی زندگی	اکرم فاروقی	۴۰/-
ہر بار کھا دل نے	اودے سرن شرما	۳۵/-
ہم رہے پیاسے	مینا ناز	۲۲/-
ہلاک فریب	مترجم اثر لکھنوی	۲/۵۰
ہیملٹ	شکسپیر	۲۰/-

یہ گھاؤ یہ پھول	وشوا ناتھ درد	۴۰/-
یادوں کا سفر	رفعت سروش	۲۰/-
یادیں بسیرے (افسانے)	انور خاں	۴۰/-
یادوں کے نقوش	سعدیہ ناز	۴۰/-
یہ دل کے ٹکڑے تمہارے لیے ہیں	م احمد	۳۰/-
یادوں کا اُجالا	بھگوان داس	۴۰/-
یزید	سعادت حسن منٹو	۱۸/-
یادوں کی لکیریں	آمنہ شوکت	۱۵/-
یادوں کے کھنڈر	نند کشور وکرم	۵۰/-

طنزیہ و مزاحیہ ادب

گوشے میں قفس کے	دلیپ سنگھ	۴۵/-
فی زمانہ	یوسف ناظم	۴۰/-
نگری نگری پھرا مسافر	ابن انشا	۴۰/-
ادیبوں کے لطیفے	کے ایل نارنگ ساقی	۸۰/-
فی الحقیقت	یوسف ناظم	۴۵/-
آب گم	مشتاق احمد یوسفی	۸۰/-
گول مال	شفیقہ فرحت	۱۸/-
فی الفور	یوسف ناظم	۳۰/-
فی الحال	یوسف ناظم	۱۸/-
رانگ نمبر	شفیقہ فرحت	۱۶/-
رنگ رنگ لطیفے	شہناز مصابوں	۲۵/-
اہل قلم کی شوخیاں	عطش درانی	۴۰/-

فکر نامہ — فکر تونسوی — ۵۰/-
بہ سلامت روی — کرنل محمد خاں — ۸۰/-
بسری جو شامت آئی — قیام نیر — ۳۰٫
تنہائی کا کرب — " — ۳۶/-
ٹینارت — عاصم سعید — ۱۵۔
بالائیات — یوسف ناظم — ۱۸۔
اردو کی آخری کتاب — ابن انشاء — ۲۰۔
آوارہ گرد کی ڈائری — ۵۔
پطرس کے مضامین — پطرس بخاری — ۱۵/
ناگہ بدن — مشتاق احمد یوسفی — ۳۵
بجنگ آمد — کرنل محمد خاں — ۶۰/-
شگوفہ زار — خواجہ عبدالغفور — زیر طبع

عروض وقواعد

بیامی قواعد طلبہ اڈیشن (ادارہ) — ۲/۵۰
بیامی قواعد اردو — ۵/-
اردو صرف — محمد انصار اللہ — "
اردو نحو — " — ۵/-
اردو مصدر نامہ — حفیظ الرحمٰن — ۳۰/-
اردو صرف ونحو — مولوی عبدالحق — ۱۵۔
زبان اور قواعد — رشید حسن خاں — ۱۸٫۷۵
تسہیل البلاغت — سید جلال الدین — ۱۲۵
مفتاح القواعد — محمد محی الدین جعفری — ۶/-
اردو زبان و قواعد (اول) — شفیع احمد صدیقی — ۱۵۔
" (دوم) — ۱۸/-
اچھا خط کیسے لکھا جائے — محمد صہیب — ۲/۵۰
اردو کیسے لکھیں — رشید حسن خاں — ۱۰/۵۰
قواعد اردو (ڈیلکس اڈیشن) — بابائے اردو عبدالحق — ۴۰٫
آسان قواعد — تعلیمی بورڈ جامعہ اردو — ۷/-
اردو صرف و نحو — اقتدار حسین — ۱۶/-
اردو قواعد خطوط نگاری — نصرت پبلشرز — ۵/-

مقدمہ شعر و شاعری — حالی — ۲۵/-
وضع اصطلاحات — وحید الدین سلیم — ۱۸/-
گلدستہ مضامین و انشا پردازی — عامر محمد عارف — ۳۶/-

مولانا ابوالکلام آزاد

اپنی اور دیگر تصانیف کے آئینے میں

مطبوعات مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

مولانا آزاد کا ذہنی سفر — ظ انصاری مرحوم — ۳۳۔
لسان الصدق — ایڈیٹر مولانا آزاد — ۵۰۔
مولانا آزاد کی کہانی — ظفر احمد نظامی — ۱۸۔
کچھ مولانا آزاد کے بارے میں — مالک رام — ۵۱۔

دیگر اداروں کی مطبوعات

مولانا آزاد شخصیت سیاست پیغام — رشید الدین خاں — ۲۴۔
معرضین ابوالکلام آزاد — عبداللطیف اعظمی — ۳۶/-
ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت — رشید الدین خاں — ۵۸۔
مولانا ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش — پروفیسر عبدالمغنی — ۵۰
تلاش آزاد — عبدالقوی دسنوی — ۴۰۔
مولانا ابوالکلام آزاد ایک فکری مطالعہ — نجم الدین شکیب — ۱۵۰/-
۱۔ فائل مکمل الہلال — مولانا آزاد — ۶۰۰/-
۲۔ الہلال کے منتخب افسانے — ۱۰۔
انتخاب تذکرہ — ۱۲/-
" ہمدرد — ۱۵۔
" زمیندار — ۱۱۔
مدینہ بجنور — ۱۲/-
خطبات جمعیۃ علمائے ہند — ۱۳۔
خلافت — ۱۵۔
یادگار آزاد — ۱۲/-
الہلال کے تبصرے — ۱۸/-

انتخاب غبار خاطر — مولانا آزاد — ۳/-
تذکرہ — مرتبہ مالک رام — ۱۰/-
غبار خاطر — " — ۸۵/-
خطبات آزاد — " — ۸۰/-
خطوط ابوالکلام آزاد — " — ۱۰/-
ترجمان القرآن ۳ حصے — " — ۴۰/-
ابوالکلام آزاد — عبدالقوی دسنوی — ۲۰/-
مولانا ابوالکلام آزاد — مجموعہ مضامین — ۱۸/-
مسلمان عورت — مولانا آزاد — ۴/-
مسئلہ خلافت — " " — ۲۵/-
حواشی ابوالکلام آزاد — مرتب مسیح الحسن — ۹۲/-
مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے — ڈاکٹر خلیق انجم — ۳۹/-
ابوالکلام آزاد نمبر — ایوان اردو (دلی) — ۱۰/-
مولانا ابوالکلام آزاد ذہن و کردار — عبدالمغنی — ۴۰/-
ہفتہ وار پیغام — مولانا آزاد — ۱۰/-
مولانا ابوالکلام آزاد (ہندی) — خدا بخش لائبریری — ۱۵/-
اصحاب کہف — مولانا آزاد — ۱۵/-
آزاد کی تقریریں — " — ۲۷/-
حضرت یوسف علیہ السلام — " — ۱۰/-
تحریک آزادی — " — ۲۵/-
ہجر و وصال — " — ۲۰/-
جامع الشواہد — " — ۱۸/-
فلسفہ — " — ۱۰/-
عیدین — " — ۶/-
ولادت نبی — " — ۹/-
صدائے حق — " — ۶/-
قرآن کا قانون عروج و زوال — ۱۵/-
مولانا آزاد فکر و فن — ملک زادہ منظور احمد — ۶۰/-
انسانیت موت کے دروازے پر — ۲۲/-
انڈیا ونس فریڈم مع ۳۰ صفحات انگلش — ۷۵/-
ہماری آزادی — " " اردو — ۱۰۰/-

مولانا آزاد کی کہانی خود ان کی کچھ میری زبانی — ۲۰/-
شہید اعظم — ۸/-
آئینہ ابوالکلام آزاد — عتیق صدیقی — ۲/-
مولانا آزاد البم — ۶۷۵/-
اردو کی ترقی میں مولانا آزاد کا حصہ — ۲۲/-
مولانا آزاد کے پاسپورٹ کا خفیہ فائل — ۳۰/-
مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت — مولانا اخلاق حسین قاسمی — ۵/-

تعلیمی کتب

مسلمانوں کا تعلیمی نظام — پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی — ۴۵/-
مغربی تعلیم کا تصور اور اس کا نفاذ علی گڑھ میں — پروفیسر رشید احمد صدیقی مرتبہ مہر الٰہی — ۲۰/-
ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم — ڈاکٹر سلامت اللہ — ۵/-
مشقی تدریس کیوں اور کیسے — ڈاکٹر محمد اکرام خاں — ۴/-
معاشیات کے اصول — عزیز احمد قاسمی — ۲۱/-
آسان اردو ورک بک — شکیل اختر فاروقی — ۴/-
نئی تعلیمی پالیسی — دلی اردو اکیڈمی — ۳/-
تعلیم و تربیت اور والدین — ڈاکٹر محمد اکرام خاں — ۳۱/-
اشارات تعلیم — آسٹن — ۳۵/-
تعلیم اور اس کے وسائل — ڈاکٹر محمد اکرام خاں — ۳۶/-
تعلیم نظریہ اور عمل — " — ۳۶/-
اصول تعلیم — ڈاکٹر ایس۔ ایم ضیاء الدین — ۴۲/-
اردو کیسے لکھیں — رشید حسن خاں — ۱۰/۵۰
اصول تعلیم اور عملی تعلیم — خلیل الرحمن سیفی — ۱۸/۵
تعلیم تشکیل نو کے مسائل — غلام السیدین — ۱۰/-
تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے — مسرت زمانی — ۲۵/-
تعلیم اور اس کا سماجی پس منظر — ڈاکٹر سلامت اللہ — ۱۰/-
تعلیم سماج اور کلچر — اے کے ایس اڈماوے — ۱۰/-
سماج اور تعلیم — عبدالقادر عمادی — ۶/۵۰
بچوں کی نفسیات — ڈاکٹر عبدالرؤف — ۲۰/-

ہماری تعلیمی صورت حال — پروفیسر آل احمد سرور — ۲/-
فن تعلیم و تربیت — افضل حسین — ۳۲/-
جدید تعلیمی مسائل — ڈاکٹر ضیاء الدین — ۲۵/-
مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک — شمس الرحمن محسنی — ۵۰/-
تدریس جغرافیہ — محمد ضیاء الدین علوی — ۲۰/-
تعلیم کی نفسیاتی اساس — عبداللہ ولی بخش قادری — ۵۰/-
کلاس میں کیسے پڑھائیں — محمد شریف خاں — ۱۲/۵۰
زبان زندگی، تعلیم — خواجہ غلام السیدین — ۱۰/-
دس دن میں اردو — حیات اللہ انصاری — ۹/-
ہم اردو کیسے پڑھائیں — معین الدین — ۵/۴۰
اردو شکھشک — ایجوکیشنل بک ہاؤس — ۵/-
ہم کیسے پڑھائیں — ڈاکٹر سلامت اللہ — ۳۲/-
تعلیمی خطبات — ڈاکٹر ذاکر حسین — ۳۶/-
بنیادی استاد کے لیے — ڈاکٹر سلامت اللہ — ۱۲/-
بچوں کا آرٹ — عبدالحق — ۲۴/-
تعلیمی اور رہنمائی — ڈاکٹر محمد اکرام خاں — ۱۲/۵۰
ٹیچر ایجوکیشن ان جامعہ ملیہ اسلامیہ — یونس درنال — ۱۵/-

طبی کتب

امراض العین — حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی — ۹۰/-
بیاض وحیدی — حکیم سید ظل الرحمٰن — ۳۰/-
تشریح عرفانی — ڈاکٹر حکیم سید کمال الدین — ۷/-
تذکرہ خاندانِ عزیزی — حکیم سید ظل الرحمٰن — ۷۵/-
تاریخ طب جلد دوم — سید شمس الدین قادری — ۲۰/-
جدید طبی سائنس کی روشنی میں (غذا اور ہم) — ڈاکٹر واحد علی — ۴۰/-
حمیات — مرزا عبدالنور بیگ — ۶۰/-
ذیابیطس موٹاپا اور غذا — ڈاکٹر ایس ایم واسطی — ۲۰/-
سائیکلوپیڈیا آف ہومیوپیتھک (مکمل تین جلدیں) — ڈاکٹر کاشی رام — ۳۰۰/-

علاج نبوی اور جدید سائنس — ڈاکٹر خالد غزنوی — ۳۵/-
علم المفاصل — ڈاکٹر انیس احمد — ۳۰/-
علامہ کنتوری اور طب — حکیم محمد کمال الدین — ۲۵/-
علم العظام — ڈاکٹر انیس احمد — ۳۰/-
علاج الامراض — حکیم محمد کمال الدین — ۵/-
علم القابلہ — حکیم محمد سلیم احمد — ۳۰/-
قدیم علم الامراض — حکیم ملک امق آین — ۲/-
کتاب السموم — حکیم خواجہ رضوان احمد — ۴/-
کاغذ کے اہرام سے علاج — ڈاکٹر مہ محمد — ۵/-
کنز المجربات (مکمل اول تا سوم) — حکیم محمد عبداللہ — ۱۱۰/-
کلیات امور طبیعیہ — حکیم تنویر احمد — ۴/۵۰
کنز التشخیص — حکیم رفیق تجازی — ۳۵/-
مقناطیس سے علاج — ڈاکٹر بشیر محمد — ۳۰/-
معالجات اطفال — حکیم شجاع الدین حسین — ۵۰/-
مختصر کلیات جدید — حکیم حافظ طاہر محمود — ۲۵/-
معالجات — حکیم وسیم احمد اعظمی — ۴۸/-
نزلہ کھانسی دمہ نمونیہ گائیڈ — حکیم عبدالجبار — ۱۰/-
ہومیوپیتھک دواؤں کا گھر میٹیریا میڈیکا — ڈاکٹر شاہدہ بیگ — ۳/-
ہماری غذا — شکیل احمد — ۹/۵۰
یونانی ادویہ مفردہ — حکیم سید صفی الدین — ۱۲/-
یوگ — ڈاکٹر بدر الاسلام کیرانوی — ۶۰/-
مرضیات — حکیم نعیم الدین زبیری — ۵۱/-
امراض اطفال — حکیم وسیم احمد — ۵۰/-
امراض نسواں — " " — ۶۰/-
اصول طب — " " — ۵۰/-
تاریخ طب — حکیم محمد حسان — ۴۶/-
درد علامات اور علاج — ابو سعدی خالد جاوید — ۱۷/-
مبادیات طب پر ایک تحقیقی نظر — حکیم الطاف احمد — ۱۱/-

چائنیز طب آکیوپنکچر اور موکسی بوشن ڈاکٹر محمد ظہیر الدین ۱۲/-
نسائیات سید محمد عباس رضوی ۱۸/۵۰
ذہنی حفظان صحت معین الدین ۶/-
طب یونانی میں گھریلو ادویہ حکیم عبدالرزاق ۱۰/-
بیت الحکمت کی طبی خدمات حکیم وسیم احمد ۲/۵۰
شراب نوشی اور منشیات حسین فاروقی ۸/-
علم الجراحت ڈاکٹر انور علی ۸۰/-
سریریات سید حسان بلگرامی ۳۰/-
سمیات حکیم محمد عباس رضوی ۸/-
طب کوثر حکیم عبدالقادر ۱۲/-
علم الامراض حکیم ظل الرحمن ۳۵/-
امراض نسواں و اطفال گائیڈ ڈاکٹر عبدالجبار ۳۰/-
قدیم علم الامراض حکیم ملک امین امین ۱۲/-
ہندستان کے مشہور اطباء حکیم حافظ سید حبیب الرحمن ۱۸/-
ترغیبات جنسی علامہ نیاز فتح پوری ۲۵/-
تشریح الہیکل اول حکیم کمال الدین ۱۱/-
ترجمہ کبیر (۴ جلدیں) حکیم کبیر الدین ۲۰۰/-
دل کا پانچواں خانہ ڈاکٹر مرزا انور بیگ ۲۵/۵۰
قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین حکیم ظل الرحمن ۵۰/-
افادات مسیح الملک تصنیف حافظ محمد اجمل خاں مرحوم ۵۰/-
سکون قلب اور اخلاقی بیماریاں علی اصغر چودھری ۱۲/-
امراض الاطفال حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی ۴۸/-
چند مشہور طبیب اور سائنس داں ادارہ ۹/-
علاج رحمت یا زحمت ڈاکٹر مرزا انور بیگ ۳۰/-
معالجات امراض اطفال علی حیدر جعفری ۱۵/-
معالجات حمیات " " ۱/-
جدید رہنمائے علاج حکیم عبدالجبار ۵۰/-
جدید رہنمائے ادویہ " " ۶۰/-
تشریح الاحشاء ڈاکٹر سید کمال الدین ۱۹/۵۰

طب اسلامی برصغیر میں (سمینار) خدابخش لائبریری ۵۰/-
بیاض کبیر حصہ اول حکیم محمد کبیر الدین ۵۰/-
" " دوم " " ۵۰/-
" سوم " " ۲۰/-
طب نبوی نول کشور پریس ۷/۵۰
طب نبوی اور جدید سائنس ڈاکٹر خالد غزنوی ۲۵/-
کنز المفردات حکیم محمد عبداللہ ۲۰/-
بچوں کی بیماریاں اور علاج میاں نذیر احمد ۵/-
دوا اور دعا سے علاج محمد شعیب ۵/-
نبض حکیم قلیل احمد جائسی ۲۰/-
کلیات نبض بول و براز (سوم) " سید حبیب الرحمن ۸/۵۰
معالجات نظام ہضم و تولید و تناسل علی حیدر جعفری ۲۵/-
نفس امارہ ڈاکٹر مرزا عزیز بیگ ۲۰/-
مخزن المفردات حکیم محمد اشرف سرگودھوی ۴۰/-
رسالہ نسخہ نویسی " جلیل احمد انصاری ۷/۵۰
تاریخ طب علی حیدر جعفری ۲۰/-
یونی ورسٹی پلانٹ شعبہ مسلم یونی ورسٹی ۲۰/-
موجز القانون کوثر چاندپوری ۲۶/۵۰
سرطان کیا ہے؟ محمد برہان حسین ۶/-
رہبر تندرستی مسرت زمانی بیگم ۱۵/-
دیہاتی معالج اول و دوم (ہمدرد وقف) ۳۸/-
صحت و زندگی ادارہ بیسویں صدی ۱۵/-
پھلوں سے علاج حکیم محمد عبداللہ ۱۵/-
سبزیوں سے علاج ڈاکٹر بلیغ الدین ۱۵/-
بالوں کی بیماریاں اور ان کا علاج پروین اختر ۱۲/-
گھر کا ڈاکٹر ڈاکٹر نیازی ۱۲/-
بیماریوں کا رنگ و روشنی سے علاج خواجہ شمس الدین ۱۲/-
دل کی بیماریوں کا علاج (ادارہ فیصل) ۱۰/-
حاذق حکیم اجمل خاں ۷۰/-
اپنا علاج خود کیجیے تاج کمپنی ۲۵/۵۰
بستان المفردات حکیم عبدالحکیم ۵۰/-

ہمدرد مطب — حکیم عبدالمجید دہلوی ۱۵/-
قرابادین مجیدی — دفتر جامعہ طبیہ ۴/-
نظر کی کمزوری اور اس کا سدباب — اے ایس صدیقی ۱۰/-
دستِ شفا — ڈاکٹر مرزا عزیز بیگ ۴/-
کتاب المرکبات — حکیم ظل الرحمٰن ۱۵/-
پھولوں سے علاج — (ادارہ) ۱۲/-

تاریخ، تذکرہ، سوانح اسلامیات

عرب اور بابلی تہذیب و تمدن — مالک رام ۷۵/-
خوب سیرت حصہ دوم — حکیم محمد سعید ۲/-
اچھی باتیں — سعید الدین انصاری ۲/۵۰
المامون (سوانح) — علامہ شبلی نعمانی ۵۰/-
سفرنامہ افغانستان — مولانا سید سلیمان ندوی ۲۵/-
اسلام مسلمان اور غیر مسلم — علامہ یوسف کرامی ۲۵/-
سرسید احمد خاں اور ان کا عہد — پروفیسر ثریا حسین ۲۰۰/-
اجنبی شہر — عبدالقوی دسنوی ۱۵/-
میرا مذہب — محمد علی رودلوی ۲/-
بدایوں کے تابندہ ستارے — چودھری صغیر حسن صدیقی ۵/-
سیاست ملیہ — محمد امین زبیری ۲۵۰/-
فکر و نظر مجلد (سرسید نمبر) — مدیر شہریار ۳۶/-
ولیم مائسٹر جلد دوم — مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین ۶/-
اخلاقی سبق — ماتا کرشنا دلاری ۶/-
گاندھی جی نے فاقہ کیوں کیا — ادارہ ہفتہ وار اتحاد ۱/-
مرحوم دلّی کی ایک جھلک — مرتب شمیم احمد ۱۰/-
سیرۃ نبوی اور مستشرقین — ڈاکٹر عبدالعلیم ۶/-
آخر اسلام ہی کیوں — عبدالاحد بٹ ۴/-
باد و جیبیہ — ڈاکٹر شعائر اللہ خاں ۵۰/-
اجتہاد کا تاریخی پس منظر — مولانا تقی امینی ۱۸/-
اخبار الاخیار — شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۸۵/-
آئینۂ نماز — مولانا محمد عاشق الٰہی ۸/-

اوصاف حمیدہ — عبدالغنی فاروق ۴/-
اسلام کا قانون محبت — ریاض حسین ۱۰/-
آمنہ کا لال — علامہ راشد الخیری ۱۰/-
اشارے منزل کی طرف — شاہ محمد عثمانی ۴/-
اسلامی تیارت — خرم مراد ۹/-
اقوال مودودی — سعد بن اسعد ۱۰/-
اقبال اور محبت رسول — ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی ۴/-
اصلاح النساء — مولانا اشرف علی تھانوی
انسانی شخصیت کا تصور — ڈاکٹر سید ذاکر حسین نقوی ۴/-
اسلام کا نظام تربیت — محمد قطب ۶۰/-
اسلام کیا ہے — محمد منظور نعمانی ۱۴/-
اسلامی نام — خلیل الرحمٰن نعمانی ۱۰/-
اسلامی نام — محمد الیاس ندوی ۱۴/-
انسانیت موت کے دروازے پر — ابوالکلام آزاد ۲۵/-
ارشادات شیخ جیلانی اور ہمارے اعمال — مولانا محمد حنیف یزدانی ۳۰/-
تاریخ ملت اول — قاضی زین العابدین ۱۰/-
تصوف کی باتیں — ظہور الحسن شارب ۱۰/-
تاریخ اسلام — سید امیر علی ۲۵/۵۰
تذکیر القرآن — محمد یوسف اصلاحی ۲۶/-
تذکرہ حضرت سید بانسوی — محمد رضا انصاری ۴/-
تبلیغی نصاب اول — مدینہ بکڈپو ۴/-
تعلیمات حضرت شاہ احمد رضا خاں بریلوی — مولانا محمد حنیف یزدانی ۱۵/-
ترکیب نماز اردو — اسلامک پبلشنگ کمپنی ۴/-
" " انگریزی — ایس عبدالحسن ۵/-
" " ہندی — اسلامی بک پبلشنگ کمپنی ۹/-
ترکیب نماز جیبی — اسلامک پبلشنگ کمپنی ۵/-
راہ جنت — عبدالرزاق صاحب قادری ۵/-
رحمت عالم — سید سلیمان ندوی ۹/-
رسالہ دینیات اول تا چہارم — کمرشل بکڈپو ۲۰/-

بائیس خواجہ کی چوکھٹ دہلی — خواجہ حسن نظامی دہلوی — ۳/-
پاک بیبیاں رض — شفیق بریلوی — ۸/-
تحریک دعوت و تبلیغ — عبدالمجید خطیب دہلوری — ۱۵/-
تاریخ تصوف — علامہ محمد اقبال — ۱۵/-
تاریخ اسلام — ڈاکٹر اقبال اختر — ۱۲/-
حکایتوں کا گلدستہ — حضرت مولانا محمد سعید صاحب — ۸/-
حضرت نظام الدین اولیاءؒ — بیگم ذاکر اعجاز — ۹/-
" ابوبکر صدیق رض — صابر قرنی — ۵/-
" عمر فاروق رض — " " — ۸/-
" عثمان غنی رض — " " — ۳/-
حضرت عثمانؓ ابن عفان — محمد حسین ہیکل — ۳/-
دین کیا ہے — مولانا وحید الدین خاں — ۳/-
دجلہ و فرات تک — حسین امین — ۴/-
رسول اللہ کی سنتیں — حکیم محمد اختر — ۶/-
رہنما قرآن اور حدیث کی دعائیں — عفت قریشی — ۹/-
سیرت خلفائے راشدین — مولانا عبدالشکور فاروقی — ۲۵/-
سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ — مختار سبز واری — ۵/-
سو مشہور اولیاء اور صوفیائے کرام — محمد ظفر اقبال — ۲/-
سوویتوں کے دیش میں اسلام اور مسلمان — ضیاء الدین خاں — ۹/-
شہید اعظم حضرت امام حسینؓ — مولانا ابوالکلام آزاد — ۸/-
شاہان بے تاج — وحیدہ نسیم — ۴/-
صلاح الدین ایوبی — سید ذاکر اعجاز — ۱۰/-
طارق بن زیاد — مظہر انصاری — ۷/-
عقیدہ ختم نبوت اور تقاضے — محمد یوسف اصلاحی — ۳/-
عمر بن عبدالعزیز — مظہر انصاری — ۸/-
غیبی آواز — شبیر حسن نظامی — ۱۸/-
فضائل نماز — حضرت مولانا محمد زکریا — ۹/-

فاران ریڈیائی تقریریں — کبیر الدین فاران — ۱۴/-
قطب عالم — سید محبوب الرحمٰن نیازی — ۵/-
قطب الاولیاء — سید عابد علی وحیدی — ۱۰/-
کس کی چلے — انعام الرحمٰن خاں — ۳/۵۰
مرنے کے بعد کیا ہوگا — مولانا عاشق الٰہی — ۱۵/-
مولانا احمد رضا خاں — مظہر عرفانی — ۱۱/-
ماں باپ کے آداب و حقوق — عبدالمجید خطیب — ۱۵
مقدمۃ القرآن — وحید الدین احمد خاں — ۴/-
نہج البلاغہ — علامہ مفتی جعفر حسین — ۱۲۰/-
وظائف الابرار — مولانا سید فرحان علی — ۲۴/-
قرآن اور سائنس — پروفیسر ایم اے عظیم — ۲۵/-
مہاتما سے روپ کنور تک — لکشمی ناتھ بھکن — ۱۵/۵
شیر شاہ سوری — ودیا بھاسکر — ۱۵/-
رسول اللہ کی صاحبزادیاں — فضل تدیر ندوی — ۴/۵۰
فرید و فرد فرید — ڈاکٹر اسلم فرخی — ۲۷/-
اسلامی ریاست — مولانا ابوالاعلیٰ مودودی — ۹۹/-
انبیاء کرام کو کمنر — علی اصغر چودھری — ۲۵/-
خوب سیرت (ترجمہ احادیث) — حکیم محمد سعید — ۵۰/-
قرآن مجید اور ہماری زندگی — گفتار علی اصغر چودھری — ۱۲/-
حیات رسول ۱۲۵ سوالات جوابات — " " — ۳/-
حیات طیبہ — مفتی محمد شفیع — ۱۰/-
اسلامی قانون اجرت — محب اللہ ندوی — ۲۵/-
اسلامی فقہ اول، دوم — " " — ۱۲۵/-
پراسرار بندے اول، دوم — عشرت جاوید — ۱۲/-
طوبیٰ (دنیا اڈیشن) — شاہ بلیغ الدین — ۶/-
قرآنی دعائیں — مولانا محمد حنیف — ۴/-
تاریخ اسلام مکمل تین جلدیں — اکبر شاہ خاں نجیب آبادی — ۸۵/-
محسن اعظم اور محسنین — فقیر سید وحید الدین — ۲۵/-
اسلام کو چھپاؤ ورنہ بغاوت پھیل جائےگی — آفتاب احمد شمسی — ۴/-

تحریکی شعور — نسیم الدین صدیقی — ۴۸/-
سیرت تابعین — عبدالرحمٰن رافت باشا — ۳۰/-
ہمارے حضورؐ — عابد نظامی — ۱۵/-
سیرۃ فاطمۃ الزہراء — طالب الہاشمی — ۳۰/-
سیاحت روس — پنڈت جواہر لال نہرو — ۲۰/-
یادگار روزگار — سید بدر الحسن — ۲۰۰/-
اسلامی تہذیب و تمدن — عماد الحسن فاروقی — ۱۲/-
امام ابوحنیفہ کے حیرت انگیز واقعات — عبدالقیوم حقانی — ۳۰/-
مسلک اعتدال حضرت علیؓ کے اقوال کی روشنی میں — مولوی مولوی — ۳۰/-
وہ جنھیں خوف کوئی ہوگا نہ غم — علی اصغر چودھری — ۱۲/-
ہندستانی مسلمان آئینہ ایام میں — ڈاکٹر سید عابد حسین — ۷۵/-
اسلام میں راسخ الاعتقادی بیچ کی راہ — ضیاء الحسن فاروقی — ۷/-
تذکرۃ الوجیہہ — سید حسینی میر علوی — ۴۷/-
مجاہد اسلام — شمیم فاروقی — ۲۵/-
تعلیم الاسلام مکمل چار حصے — مفتی کفایت اللہ — ۱۵/-
بیانات قرآن — اقتدار فاروقی — ۱۰/-
ہندو تیوہاروں کی دلچسپ اصلیت — منشی رام پرشاد ماتھر — ۲۷/-
اقلیتوں کے تعلیمی حقوق و مسائل — اکبر رحمانی — ۴۰/-
ہندستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ — عابدہ سمیع الدین — ۱۰۰/-
تاریخ اودھ ترجمہ و ترتیب — شاہ عبدالسلام — ۲۷/-
سنبھل کے چند اکابر علماء مجاہدین آزادی — سعادت علی صدیقی — ۲۰/-
داستان میری (۲۰ویں صدی بہار) کی تاریخ — ڈاکٹر اقبال حسین — ۲۷/-
اسلام کے جاں نثار — رفیع الزماں زبیری — ۴/-
قرآن کے فنی محاسن — سید قطب — ۵/-
اسلامی صحافت — سید عبدالسلام زہنی — ۴۰/-
آثار الصنادید تین جلدیں — سر سید احمد خاں — ۲۵۰/-
مسلمان خاوند — محمد ادریس — ۸/-
مسلمان بیوی — " " — ۸/-
تاریخ اسلام — ڈاکٹر حمید الدین — ۸۰/-

اسلامی طرز حیات — سید اسعد گیلانی — ۳۵/-
حیات رسول کے دس دن — خالد محمد خالد — ۴۵/-
سنو صحابہ کرام (کوئز سوالات) — اسلامک بک — ۱۸/-
فقہ محمدیہ — مولانا عبیداللہ رحمانی — ۱۲/-
من موہن کی باتیں — شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی — ۱۵/-
تواریخ نادر العصر — مؤلفہ منشی نول کشور — ۲۵/-
ذکر جمیع اولیائے دہلی — شریف احمد قاسمی — ۸۲/-
فقہ عمر — حضرت شاہ ولی اللہ — ۵۰/-
کتاب زندگی — نصیر احمد ناصر — ۲۵/-
مسلمان قاضیوں کے بے لاگ عدل — عبدالصبور طارق — ۳/-
بارہ مہینوں کے فضائل — مفتی عبدالکریم — ۴۵/-
حکیم الامت نقوش و تاثرات — مولانا عبدالماجد دریابادی — ۸۰/-
صحائف معرفت — ڈاکٹر تنویر احمد علوی — ۴۰/-
مسلمانوں سے اسلام کا مطالبہ — متین طارق باغپتی — ۷/-
حضرت علیؓ — علی اصغر چودھری — ۲۰/-
رہبر کامل — عبدالاحد خاں — ۳۰/-
دروس حرم — محمد مکی حجازی — ۳۵/-
اسوۂ حسنہ اول — بنت الاسلام — ۸۰/-
تعلیمات غزالی — محمد حنیف ندوی — ۶۰/-
ذکاء اللہ حیات اور ان کی علمی خدمات — رفعت جمال — ۶۰/-
اپنے گھر سے بیت اللہ تک — سید ابوالحسن علی ندوی — ۱۵/-
سرورِ عالم کی چند انقلاب آفریں راتیں — محمد کلیم آمالتش — ۴۵/-
اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر — ڈاکٹر اوم پرکاش پرشاد — ۱۴/-
ہندوستانی مسلمان اور مجیب صاحب — آل احمد سرور — ۹/-
ہندستان کی جنگ آزادی کے مسلمان مجاہدین — میوا رام گپت — ۱۵/-
ہندستان کی فیصلہ کن جنگیں — محمود خاں بنگلوری — ۲۵/-
نقد ملفوظات — نثار احمد فاروقی — ۶۵/-
جدید ہندستان کے سیکولر معمار — مجیب اشرف — ۵۰/-
نور کے پھول — حکیم محمد سعید — ۹/-
جناب عبداللہ (سوانح حالات)، حضرت محمدؐ کے والد ماجد — ۶/-

عربوں کی نظر میں قدیم ہندستانی مذاہب و معاشرہ
عابدہ خانون ۶۶/-

تحفۃ السعداء خواجہ کمال ۲۰/-

گیتا اور قرآن پنڈت سندرلال ۲۵/-

الاخلاق مولوی بدرالدین بدر ۴۰/-

اصلاحیات مولانا ابوالحسن علی ندوی ۲۵/-

آسمان ہدایت کے ستر ستارے طالب الہاشمی ۶۰/-

ابلیسی مغالطے محمد شریف قاسمی ۲۰/-

اختلاف امت اور رواداری علی اصغر چودھری ۱۴/-

احکام نماز عالم فخری ۵۰/-

تلاش حق انیس آزاد بلگرامی ۱۵/-

دینی مسائل مولانا اشرف علی تھانوی ۱۵/-

معجزات سرور عالم ولید الاعظمی ۳۰/-

ہمارے دینی علوم مولانا اسلم جیراجپوری ۱۸/-

ہمارا اسلام مفتی محمد خلیل خاں ۵۰/-

ہم کیوں مسلمان ہوئے عبدالمغنی فاروقی ۴/۵۰

مدارج النبوت (دو جلدیں مکمل) حضرت شیخ عبدالحق محدثؒ ۲۵۰/-

مکاشفۃ القلوب اردو تقدس علی خاں ۵۶/-

سیرت پاک مختصر مختصر احمد خاں خلیل ۳/-

سلطنت خداداد (مصور ایڈیشن) محمود خاں بنگلوری ۱۰۰/-

سید جمال الدین افغانی حیات و افکار شاہد حسین رزاقی ۱۲/-

صاحب جی سلطان جی ڈاکٹر اسلم فرخی ۲۰/-

ذکر شہادت سید علی موسیٰ رضا حسنی ۴/۵۰

ذخیرۃ الملوک سید امیر کبیر ہمدانی ۵۰/-

مراۃ المناجیح شرح مشکوٰۃ المصابیح مکمل
مفتی احمد یار خاں ۶۵۰/-

رسول خدا کا طریق تربیت سراج الدین ندوی ۱۶/-

عورت اور اسلامی تعلیم مالک رام ۳۰/-

فتنہ جہیز عبدالرحمٰن کوند ۲۰/-

قدیم ہندستان کی سیکولر روایات ڈاکٹر مجیب اشرف ۱۲/-

ٹیپو سلطان نظامس ٹرسٹ ۵/-

انقلابی شخصیات محمد مصطفیٰ طحان ۲۵/-

آصف علی سوچیتا پنت ۱۲/-

الواح الصناد ید اول/دوم عطاء الرحمٰن قاسمی ۲۰/-

علامہ اقبال اور قرون اولیٰ کے مسلم مجاہدین
عبدالصبور طارق ۴۸/-

مذہب اور ہندستانی مسلم سیاست کل اور آج
پروفیسر مشیر الحق ۸/-

مظہر جمال مصطفائی سوانح غوث الاعظم
سید نصیر الدین ہاشمی ۴۰/-

مولانا مودودی منظور الحق صدیقی ۱۶/-

تاریخ تصوف صابر کلوروی ۱۵/-

تحریکی کارکن رزمگاہ حیات میں (ادارہ) ۱۶/-

تجلی شاہ بلیغ الدین ۸۰/-

سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت شمس بریلوی ۴/-

چند تصویر بتاں مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم ۵/-

حضرت ابوبکر صدیقؓ سید عبدالصبور طارق ۳/-

کامل نماز نذر محمد ۲۵/-

حصن حصین عربی اردو مولانا عاشق الٰہی ۰۰/-

نکات قرآنی ابوالاعلیٰ مودودی ۲۵/-

قرآن اور علم الافلاک سید محمد کمال الدین ۱۲/-

دلی کی چند عجیب ہستیاں اشرف صبوحی ۱۵/-

ایمان کے عظیم علمی مظاہر شیخ یوسف القرضاوی ۵/-

حضرت عائشہؓ (حضرت عائشہ کی سوانح)
عباس محمود العقاد، مولانا جلال الدین سیوطی ۱۵/-

مشرقی یورپ میں مسلمانوں کا عروج و زوال فیصل احمد شہابی ۵/-

انسانیت کی موجودہ مشکلات اور سیرت رسولؐ اختر حجازی ۱/-

مشعل راہ (مجموعہ احادیث) عبدالرزاق کوثر دواری ۸/-

تحریک جہاد کے مراحل سید قطب شہید ۶/-

دین یا لادینیت دونوں راستوں میں سے ایک کا
انتخاب کیجیے ڈاکٹر محمد ناصر ۶/-

عقائد اسلام عبدالحلیم محمود شیخ الازہر قاہرہ ۲۰/-

المرتضیٰ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۶۰/-
فتاویٰ عالمگیری اول تا دہم سید امیر علی ۸۰۰/-
میثاق النبیین (سیرت) مولانا عبدالحق ۱۰۰/-
بھوپال تحریک آزادی کے آئینے میں سید عابد علی وجدی ۹۰/-
حیات جامی مولانا اسلم جیراجپوری ۱۲/-
مسلمانان ہند سے دلت کے مطالبات ریاض الرحمٰن شروانی /-
سب سے بڑے انسان رسولؐ حکیم محمد سعید ۳/۵۰
روحوں سے ملیے خوابوں کو سمجھیے حافظ ابن قیم ۴۶/-
یروشلم شہر مقدس سے شہر صلیب تک، مرتبہ۔ منور مادلیوان، اختر الواسع ۱۵/-
کتابت حدیث عہد رسالت و عہد صحابہؓ، مفتی محمد رفیع عثمانی ۲۸/-
تحفہ خواتین اول مولانا محمد عاشق الٰہی ۴۰/-
" " دوم " ۴۵/-
شریعت حضرت محمد مصطفیٰؐ اور دین مولانا احمد رضا خاں، ملک حسن بی اے ۱۲/-
سچی حکایات اول تا پنجم مکمل ابوالنور محمد بشیر ۹۰/-
میلاد النبی سید احمد سعید کاظمی ۷/-
اسلامی زندگی مفتی احمد یار خاں ۱۲/-
معراج النبیؐ سید احمد سعید کاظمی ۱۰/-
نبی عربی قاضی زین العابدین ۱۰/-
اسلامی ثقافت ڈاکٹر نصیر احمد ۶۵/-
تاریخ عثمان محمد یامین قریشی ۲۵/-
اسلامی نظام زندگی ایک مطالعہ سید عطاء اللہ حسینی ۳۲/-
الرسول القائد (سیرت) مرتبہ شمیم طارق ۵۰/-
کیمیائے سعادت مرتبہ محمد سعید نقشبندی ۱۵۰/-
عورتوں کی حکایات مولانا ابوالنور محمد بشیر ۲۷/-
احکام القرآن زاہد ملک ۱۵۰/-
آتش چنار شیخ محمد عبداللہ ۱۲۵/-
تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ علامہ اقبال ۶۰/-
اسلام اور موسیقی مفتی محمد شفیع ۴۸/-

فریب ابلیس محمد شریف قاضی ۲۰/-
سرسید کی اسلامی بصیرت جمال خواجہ ۳۰/-
اسلام اور ارتقائے زندگی جمیل احمد جبل ۱۵/-
ترجمہ قرآن پروفیسر مشیر الحق ۸/-
دل کی گیتا (اضافہ شدہ ایڈیشن) خواجہ دل محمد ۲۵/-
خیر البشر کے چالیس جانباز طالب ہاشمی ۳۲/-
انسان کی حقیقت قرآن کی روشنی میں ابوالاعلیٰ مودودی ۴۵/-
امت مسلمہ کا انحطاط غلام محمد ۵/-
انسانی شخصیت کا تصور قرآن مجید کی روشنی میں، ڈاکٹر ذاکر حسین ۴۰/-
سرور کونین کی فصاحت شمس بریلوی ۴۰/-
انفاس العارفین حضرت شاہ ولی اللہ ۴۸/-
مقام صحابہؓ مفتی محمد شفیع ۱۵/-
تیس پروانے شمع رسالتؐ طالب الہاشمی ۵۵/-
معرفت الٰہیہ شاہ عبدالغنی ۶۵/-
شمع شبستان رضا اقبال احمد نوری ۵۴/-
تاریخ حرمین شریف عباس کرارہ مصری ۳۲/-
نکات قرآن مولانا اسلم جیراجپوری ۵/-
رسول کریمؐ کی جنگی اسکیم عبدالباری ۱۷/-
روشنی اول، دوم شاہ بلیغ الدین مکمل ۱۰۵/-
دین و دنیا رئیس احمد جعفری ۴۰/-
رسول اکرمؐ کی سیاست خارجہ محمد صدیق قریشی ۴۵/-
ریاض الصالحین محمد ادریس میرٹھی ۴۵/-
اعمال حزب البحر خواجہ حسن نظامی ۱۲/-
کاروان زندگی (اول دوم) ابوالحسن علی ندوی ۶۵/-
آزادی کی کہانی، انگریزوں، اخباروں کی کہانی غلام حیدر ۴/-
بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط عتیق صدیقی ۲۰/-
الفاروق شبلی نعمانی ۲۵/-
الجہاد فی الاسلام مولانا مودودی ۹۰/-
جبران خلیل جبران فن اور شخصیت ڈاکٹر اشفاق احمد ۱۶/-
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں خواجہ غلام السیدین ۲۶/-

ختم نبوت قرآن کی روشنی میں محمد یوسف اصلاحی ۶/-
افکار سید عین خواجہ غلام السیدین ۱۲/-
شہید المحراب عمر بن خطاب سید عمر حسان ۶۰/-
یادوں کی امانت " " ۷۵/-
سرور عالم کی چند انقلاب آفریں راتیں محمد کلیم ارائیں ۴۲/-
اسلام اور مسلم خواتین سیدہ ام فاروق ۱۴/-
مولانا مودودی کی شگفتہ مزاجی عبد الغنی عثمان ۲۰/-
آپا حمیدہ بیگم پروفیسر فروغ احمد ۴۳/-
اجتہاد اور اوصاف مجتہد مولانا گوہر رحمٰن ۹/-
مسلمانان خواتین کی دینی اور علمی خدمات پروفیسر سید محمد سلیم ۲۰/-
بارہ ہزار مجاہدین عبد الصبور طارق ۲۶/-
عزت کی زندگی اور مسلمانان ہند مکتبہ ذکری ۶/-
وہ طلاق سے ڈرتی تھی ۴/-
شمع حرم (۱۰۰ احادیث کا مجموعہ) محمد یوسف اصلاحی ۲۰/-
آسان نظم نیا اڈیشن ۲ حصے " " ۴۶/-
داعی اعظم " " ۱۵/-
روشن ستارے " " ۲۵/-
مسائل اور ان کا حل " " ۶۲/-
تحریک مجاہدین نیا اڈیشن سید اسعد گیلانی ۹/-
سید بادشاہ کا قافلہ آباد شاہ پوری ۴۰/-
مکاتیب سید مودودی ۲ حصے سید ابو الاعلیٰ مودودی ۷۰/-
مسنون دعائیں پاکٹ سائز انگریزی ادارہ ۱۰/-
جہاد ان اسلام انگریزی عبد الحمید صدیقی ۱۰/-
بچوں کے نام کیا رکھیں انگریزی اے۔ اے تھورانی ۱۲/-
گنجینہ اکبری درمیانہ سائز (ادارہ) ۳/-
خواب نامہ مع تعبیر نامہ عبد الغفار حسن ۳/۵۰
ایلیمنٹری ٹیچنگ آف قرآن فار چلڈرن ایم۔ آر۔ رحیم ۵/-
آسان حج و عمرہ گائیڈ ادارہ ۵/-
رسول اللہ کی سنتیں " ۶/-
مولانا محمد علی ایک مطالعہ عبد اللطیف اعظمی ۲۰/-

دنیا کے بڑے مذاہب عماد الحسن آزاد فاروقی ۵۰/-
ہندستان میں اسلامی علوم و ادبیات " " ۴۰/-
اسوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ڈاکٹر عبد الحی ۵۰/-
خلافت ملوکیت اور علماء اہل سنت ۱۱/-
سر سید اور ہندستانی مسلمان نور الحسن نقوی ۴۰/-
سب السان بھائی بھائی مہاتما گاندھی ۴/-
معلم العربیہ ندیم الواجدی ۴۰/-
بہشتی زیور اول مولانا تھانوی ۸/-
" " دوم " " ۸/-
حیات طیبہ مفتی محمد شفیع ۱۰/-
نوجوانوں کے مسائل اور ان کا حل ۱۳/-
سراپائے رسول اعجاز الحق قدوسی ۹/-
میلاد اکبر ۸/-

تصانیف مولانا وحید الدین خاں

الربانیہ ۴۰/-
دین کامل ۴۵/- رازحیات ۵۵/-
تعبیر کی غلطی ۸/- صراط مستقیم ۳۵/-
اللہ اکبر ۴۰/- خاتون اسلام ۴۰/-
اقوال حکمت ۲۰/- سوشلزم اور اسلام ۳۵/-
زلزلہ قیامت ۷/- اسلام اور عصر حاضر ۳۵/-
اسلامی دعوت ۵/- حقیقت حج ۳۰/-
پیغمبر انقلاب ۳۵/- اسلامی تعلیمات ۲۵/-
مذہب اور جدید چیلنج ۴۰/- تبلیغی تحریک ۲۰/-
عظمت قرآن ۲۵/- اسلام دور جدید کا خالق ۲۰/-
الاسلام ۳۵/- دین کیا ہے؟ ۴/-
ظہور اسلام ۳۵/- اسلامی زندگی ۲۵/-
تذکیر القرآن جلد اول دوم ۳۰۰/-
اتحاد ملت ۵/- ایمانی طاقت ۵/-
اسلام پندرھویں صدی میں ۷/-
قرآن کا مطلوب انسان ۱۰/-

کتب انجمن حمایت اسلام

کتاب	مصنف	قیمت
اردو کا قاعدہ		۲/-
اردو کی پہلی		۲/۲۵
اردو کی دوسری کتاب		۷/-
اردو کی تیسری		۱۰/-
اردو کی چوتھی		۲۵/-
فارسی کی پہلی	مترجم	۵/-
فارسی کی دوسری	"	۱۰/-

پارے، قاعدے قرآن مجید

کتاب	مصنف	قیمت
قاعدہ بغدادی خورد کیجزہ		-/۵۰
پارے جات خورد سائز		۱/-
قرآن مجید ۱۳ گلیزڈ معریٰ		۵/-
" ۵۳ " "		۳/-
" ۱۸ " " مترجم		۷۰/-
" ۱۳ اعلحضرت "		۷۵/-
" ۱۶ پاروں کا سیٹ مجلد		۱۰۰/-
ہفت پارہ گلیزڈ مجلد		۲۰/-
سولہ سورہ کلاں مجلد رنگین		۱۵/-
قرآن مجید کلاں ہندی نمبر ۱۰۱		۷۵/-
قرآن مجید۔ ترجمہ شیخ الہند		۹۰/-
اردو زبان کا قاعدہ عکسی	مولوی محمد اسمٰعیل	-/۷۵
" " کی پہلی کتاب	"	۱/۵۰
" " کی دوسری کتاب	"	۲/-
" کی تیسری کتاب	"	۵/-
" کی چوتھی کتاب	"	۶/-
" " کی پانچویں کتاب	"	۹/۵۰
عربی بول چال اوّل، دودم	عبدالرحمٰن امرتسری مکمل	۱۴/-
عربی کا معلم اول تا چہارم	عبدالستار خاں مکمل	۴۸/-
اچھا خط کیسے لکھا جائے	محمد صہیب	۲/۵۰
اردو ہندی بول چال	ادارہ	۶/-
ہندی اردو بول چال	ادارہ	۴/-

اقتصادیات۔معاشیات۔فلسفہ

کتاب	مصنف	قیمت
معاشیات کے اصول	عزیز احمد قاسمی	۲۱/-
روزگار شرح سود وزر	ابوسالم	۸/۵۰
کمپنی حصص میں سرمایہ کاری	محمد عبدالباسط لبھی	۴۵/-
ہنری فیال عمومی وصنعتی انتظامیہ	"	۲۵/-
سیاسی نظریے	ضیاء الحسن فاروقی	۱۲/-
مبادی فلسفہ	عبدالماجد دریابادی	۱۰/-
معاشیات اسلام	سید ابوالاعلیٰ مودودی	۲۵/-
اسلام اور جدید معاشی نظریات	"	۹/-
اسلامی نظم معیشت کے اصول و مقاصد		۳/-
سود		۱۰/-
اجارہ	ایم۔ اے گیلانی	۱۶/۵۰
بین الاقوامی معاشیات	ڈاکٹر امانت علی خاں	۳۵/-
اجرتیں	ترجمہ عبدالرشید	۱۰/-

خانہ داری

کتاب	مصنف	قیمت
سنجیدہ کشیدہ کاری	دارالاشاعت	۶/-
سعیدہ "	"	۳۶/-
تمنا "	"	۱۸/-
فردوس "	"	۱۸/-
نوشیبہ "	"	۱۸/-
تاج محل "	"	۱۸/-
نوشین "	"	۱۸/-
رضیہ کا شاہی دسترخوان	شمیم آراء	۱۵/-
مغلئی دسترخوان باتصویر		۱۸/-
نعمت کدہ	مغلانی بیگم	۳۰/-
رہبر صحت	مسرت زمانی	۱۵/-
کامیاب درزی خانہ	زینب النور	۲۰/-
علم امور خانہ داری	مسرت زمانی	۲۰/-
پروین کشیدہ کاری	پروین عارف دہلوی	۲۵/-
شاہین کشیدہ کاری	شاہین آصف دہلوی	۲۵/-

بچوں کی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
چاند میں خرگوش	سعادت علی صدیقی	۸/-
ہم اور ماحول	بچوں کا ٹرسٹ	۱۵/-
انوکھی دکان	قدسیہ زیدی	۱۱/-
منے کی مالوں	”	۹/-
چچا چھکن نے دھوبن کو کپڑے دیے	”	۸/-
نہرو اور سائنس	محمد خلیل	۱۰/-
سائنس اور ہم	”	۱۰/-
تیسرے راشٹرپتی ڈاکٹر ذاکر حسین	عبداللطیف اعظمی	۸/-
ننھی کتاب	بدیع الزماں خاور	۶/-
پیارا ہندوستان ہمارا	جلیس عابدی	۱۰/-
عجیب وغریب جانور	محمد خلیل	۱۰/-
بگلا بھگت	ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی	۷/-
بہروپیا	صفدر نقوی	۱۳/-
چچا چھکن نے تیارداری کی	قدسیہ زیدی	۸/-
سوال یہ ہے کہ...	آصف اختر زاہد، خاتون	۱۵/-
عظمت کے پھول	جہاں گیر انس	۸/-
طلسمی گھوڑا	ایم یوسف انصاری	۳۰/-
سمندر کے بھوت	انیس مرزا	۱۳/-
چچا چھکن نے تصویر ٹانگی	قدسیہ زیدی	۸/-
نئی کہانیاں اول، دوم مکمل	(بچوں کا ادبی ٹرسٹ)	۳/-
ننھا پودا	نجمہ صائم	۱۲/-
نٹ کھٹ چنو	تسنیم حیدر	۱۲/-
چار سہیلیوں کی کیاریاں	سید غلام حیدر	۱۲/-
پھولوں کے مہمان	ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی	۱۵/-
تتلی کے بچے	زاہدہ خاتون	۱۵/-
کاربن قدرت کا انمول عطیہ	طلعت عزیز	۱۵/-
ہونہار بچے	ڈاکٹر راجندر وتس	۱۶/-

کتاب	مصنف	قیمت
حکایتیں اور کہانیاں	محمد ذاکر	۳/-
بھولی لڑکی	صالحہ خاتون	۸/-
ہندوستان کی عظیم عورتیں	صفدر حسین	۸/-
امید کی کرن	تسکین زیدی	۱۰/-
ہندوستانی سائنس داں	اندرجیت لال	۱۰/-
گنگا کی کہانی	رفیع احمد	۱/-
مغربی افریقہ کی مزیدار کہانیاں	محمد امین	۵/-
رنگا رنگ (نظمیں)	محبوب راہی	۷/-
سوتا جاگتا	نیر مسعود	۳/-
سبق آموز کہانیاں (اول تا سوم)	سید حبیب اللہ	فی حصہ ۴/-
روبوٹ مشینی آدمی	نظامس ٹرسٹ	۵/-
ہماری ندیوں کی کہانی	ال۔ ولی۔ آیا	۵/-
بچوں کی کہانیاں	(ہندستانی پرچار سبھا بمبئی کی کتاب)	۲/-
بھارت رتن	پریم پال اشک	۱۰/-
ہماری غذائیں ہماری دوائیں	فضل الرحمن خاں	۱۰/-
آزادی کی پہلی لڑائی ۱۸۵۷ء کے سورما	جلیس عابدی	۱۰/-
گلابو جیجیا اور پری زاد	قدسیہ زیدی	۲/-
تیار رہو	آ۔ نانت	۵/-
جلو مرغابی	قیصر زیدی	۳/-
سندر چنار	صالحہ عابد حسین	۱/-
مٹھائی کا راز	خوشحال زیدی	۸/-
پردیسی	استاد شہید مرتضیٰ مطہری	۲/۵۰
امام غزالیؒ	اعجاز الحق قدسی	۷/-
حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ	مظہری	۸/-
حضرت خواجہ معین الدین چشتی	انور سلمان شاہجہاں پوری	۸/-
مولانا احمد رضا خاں	مظہر عرفانی	۹/-
حضرت نظام الدین اولیاءؒ	بیگم ذاکر اعجاز	۹/-
حضرت مجدد الف ثانی	شمس وارثی	۸/-
صلاح الدین ایوبی	سید ذاکر اعجاز	۱۰/-
طارق بن زیاد	مظہر انصاری	۶/-
نقوش سیرت مکمل سیٹ ۵ حصے	حکیم محمد سعید	۲۰/-

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

کتاب نما

مارچ ۱۹۹۳ء جلد ۳۳ شمارہ ۳

فی پرچہ	6/=
سالانہ	55/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	75/=
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک)	170/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک)	320/=

اڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

TELEPHONE 630191

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برلی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

نئی مطبوعات

اسرار خودی۔ مرتبہ شائستہ خاں -/۷۵

رسالہ دینیات اوّل حکیم نعیم الدین زبیری بچوں کے لیے -/۳

رسالہ دینیات دوم " " -/۴

رسالہ دینیات سوم " " -/۵

رسالہ دینیات چہارم " " -/۵

رسالہ دینیات پنجم " " -/۶

پہاڑی مہم۔ بچوں کے لیے۔ -/۴

گفتنی ناگفتنی (خودنوشت) دھرم جونپوری -/۷۵

چند ادبی مشاہیر کی تحریریں۔ (ادبی)

رسالہ 'ہندستانی' الہ آباد -/۷۰

چودھری محمد علی ردولوی (ادبی)

مرتبہ ڈاکٹر انور حسین خاں۔ -/۵۰

فارسی ادب کی شخصیات (تذکرہ)

ڈاکٹر محمد تقی علی عابد -/۴۰

نقش قلم (نعتیہ کلام) علیم صبا نویدی -/۴۰

برندابن (شعری مجموعہ) محمد عبدالقادر ادیب -/۵۰

عصمت چغتائی کی ناول نگاری۔ شبنم رضوی۔ -/۵۰

نثر ابوالکلام آزاد۔ (مرتبہ مالک رام) -/۷۴

صدائے عرش گیر (شعری مجموعہ) امانت اللہ اسیر -/۵۰

انتساب۔ ندا فاضلی نمبر۔ ایڈیٹر۔ آسیہ سیفی -/۵۰

دیواروں کے بیچ (خودنوشت) ندا فاضلی -/۹۰

روح غزل (۹۳ شعرا کا کلام)

ترتیب پروفیسر مظفر حنفی -/۳۰

فورٹ ولیم کالج کی نثری داستانیں۔ ڈاکٹر عفت زریں [illegible]

مولانا حشمت علی لکھنوی (ایک تحقیقی مطالعہ)

ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم -/۵۱

عالم نشاط (شعری مجموعہ) داؤد نشاط [illegible]

صبا اور سویلی "ناول" فوزیہ فاطمہ -/۱۲۵

معارف یعقوبی محمد اقبال قریشی -/۲۶

نیا افسانہ مسائل اور میلانات

ترتیب پروفیسر قمر رئیس -/۴۸

انتخاب غزلیات سودا۔ مرتبہ ڈاکٹر شارب ردولوی -/۲۵

اوراق معانی (غالب کے فارسی خطوط کا اردو ترجمہ)

مترجم ڈاکٹر تنویر احمد علوی -/۷۰

علم و ادب، ششماہی مجلہ۔

چیف ایڈیٹر چودھری حسان الزماں -/۶

عربی ٹیچر (ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن)

ایس بدر الحسن -/۱۱

عربک فار بگنرس (انگلش)

سعد اللہ الیس کھرچی -/۱۰

اردو مرثیے کا ارتقا "نیا ایڈیشن"

ڈاکٹر مسیح الزماں -/۳۰

اردو مثنوی کا ارتقا "نیا ایڈیشن"

سید محمد عقیل رضوی -/۳۲

قارئین کتاب نما

کو

عید مبارک

مہمان مدیر
قیوم خضر
خلاصی ٹولہ۔ پٹنہ ۴

اداریہ

دلِ وقت کی دھڑکنوں کا تقاضا

۱۹۹۲ء کے چڑھتے ہوئے سورج کی گردن افق کے دوش پر جھکتی جا رہی ہے، اور عنقریب ۱۹۹۳ء کے نئے سورج کی کرنیں اپنی نرم چٹکیوں سے قبائے لیل و نہار کی بند گرہیں کھولیں گی۔ خدا کرے ہم تمام لوگوں کی زندگی کی بند گرہیں بھی کھل جائیں! سالِ رواں کے آخری مہینے (دسمبر) نے قومی تاریخ کے صفوں پر تعصب و تشدد کی ایسی شرمناک و المناک داستان لکھ دی ہے کہ آنے والی نسلیں جب بھی پڑھیں گی شرم و ندامت سے اُن کی گردنیں جھک جائیں گی!!

آج عملِ انسانی کی وحشت ناکیوں کا یہ حال ہے کہ ساری دنیا کی طاغوتی قوتیں اُبھر اُبھر کر امنِ عامّہ کو درہم برہم کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ انسان کی ذہنی آوارگی اور شعوری دیوانگی اُس نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ہے کہ دنیا ہلاکت و تباہی کے دہانے پر کھڑی لرزہ براندام ہے۔ انسانی شقاوتِ قلبی کا یہ عالم ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کا کلیجہ چبا کر جنگل کے خونخوار درندوں کو بھی دعوتِ درندگی دے رہا ہے۔ جنگل کے وحشی درندوں کو بھی غیرتِ نسل و جنس کا اتنا پاس و احساس ہے کہ ایک شیر دوسرے شیر کا خون نہیں پیتا۔ ایک بھیڑیا دوسرے بھیڑیے کا کلیجہ نہیں چباتا۔ ایک سانپ دوسرے سانپ کو نہیں ڈستا! مگر یہ مہذب و متمدن اشرف المخلوقات حضرتِ انسان ہیں، جو مجبور بوڑھوں اور معصوم بچوں کا خون چوستے ہیں، کنواریوں کی لاج لوٹتے، اور سہاگنوں کا سہاگ اجاڑتے ہیں۔ کھیتوں اور کھلیانوں میں آگ لگا کر دھرتی کی کوکھ سونی کرتے ہیں۔ گنگناتی ہوئی بستیوں کو سنسان کر کے غریب کسانوں اور مزدوروں کو بے گھر بناتے ہیں۔ بھید بھاؤ اور ذات پات کی غلاظتوں میں پھنس کر اپنے مذہبی نظریات اور اخلاقی قدروں

کی دھجیاں اڑاتے ہیں! حالانکہ تمام مذاہب کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ دلوں کی تاریکیاں دور کی جائیں اور انسانوں کے درمیان ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر صالح اور پرامن زندگی گزارنے کا صحیح سماجی شعور پیدا کیا جائے۔ کسی بھی انسان کو محض اختلاف مذہب کی بنیاد پر دوسرے انسان کو نیچا سمجھ کر ذلیل و رسوا کرنے اور زندگی سے محروم کرنے کا ہرگز حق نہیں پہنچتا۔ اپنے اپنے مذہب کی برتری ثابت کرنے کی جو ضد اور ہیچ ہوتی ہے اسی ضد اور ہیچ کو تعصب کہتے ہیں، اور اسی تعصب کا نتیجہ ہے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان مذہبی تناؤ اور قتل و غارت گری کی گرم بازاری نظر آتی ہے!

آج ہمارا ملک گوناگوں مسائل کی پیچیدگیوں میں اُلجھا ہوا ہے، اور ہماری حُبّ الوطنی کا یہ حال ہے کہ اُن مسئلوں کو مل جل کر ناخنِ تدبیر سے سلجھانے کی بجائے ہم اپنے ناخن سے دوسرے کے چہروں کو نوچنے کی خاطر تیز کر رہے ہیں، ہم نئے نئے فتنے جگانے اور آپس میں لڑنے بھڑنے کی سیاسی سازشوں میں خود کو الجھا کر انسانی زندگی کو تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں ـــــ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ جس درخت کی شاخ پر ہمارا آشیانہ ہے، ہم اسی شاخ کو خود اپنے ہاتھوں سے کاٹنے کا وحشیانہ عمل اختیار کر رہے ہیں۔ ـــــ صدیوں پر صدیاں گزر گئیں کہ ہندو اور مسلمان اس ملک میں پڑوسی بن کر رہتے ہیں مگر دونوں نے ایک دوسرے کو گہرائی اور سچائی کے ساتھ جاننے اور سمجھنے میں انتہائی مجرمانہ کوتاہی کا ثبوت دیا ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کے مذہب کی روح، تہذیب و معاشرت یعنی زندگی کے کسی پہلو کو صاف دماغ اور کھلے دل سے سمجھنے کی مخلصانہ کوشش ہی نہیں کی، جس کا نتیجہ ہوا کہ آج تک دونوں کے بیچ، ایک دوسرے کے خلاف بدگمانیاں اور غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ زیادہ تر تو باتیں ایسی ہیں جن کی نہ کوئی بنیاد ہے اور نہ کوئی حقیقت! محض سنی سنائی اور من گھڑت کہانیاں گڑھ کر ایک دوسرے نے اپنے اپنے دل و دماغ میں غلط اور بے بنیاد تصورات کے بُت بٹھا رکھے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ قصوروار وہ فرقہ پرست اور متعصب قلم کار ہیں، جنھوں نے جان بوجھ کر محض اپنی سیاسی مصلحت اندیشی کے پیش نظر جھوٹی اور من گھڑت باتوں کو تواریخ کا روپ دے کر اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کے لیے کتابیں لکھی ہیں، اور ظاہر ہے کہ جب نسلوں کی نسلیں ابتدائے سنِ شعور سے ویسی زہریلی کتابیں پڑھیں گی، تو ان کی زندگی کی جو تصویر بنے گی، اس میں نفرت و حقارت کے رنگ کا گہرا ہونا لازمی ہے حالانکہ تواریخ، قومی حالات اور ملکی واقعات کی مربوط و مسلسل کڑیوں کا نام ہے۔

اور اس کی کسی بھی کڑی کو گم کر دینا یا بر بنائے مصلحت، واقعات و حالات کو توڑ مروڑ کر بیان کرنا، بہت بڑی تاریخی گمراہی کا سبب بن جایا کرتا ہے۔ ہندستان کی تواریخ کے ساتھ جان بوجھ کر متعصب مؤرخوں نے یہی گمراہ کن سلوک اختیار کیا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری موجودہ ہندستانی نسل، اُن متعصب مؤرخوں کی تاریخی بھول بھلیّوں میں گم ہو کر رہ گئی ہے!

یہ بھی ایک افسوس ناک بات ہے کہ قومی ایکتا (NATIONAL INTEGRATION) کا مفہوم سمجھنے اور سمجھانے میں بے انتہا غلط فہمیاں اور گمراہیاں پائی جاتی ہیں۔ کسی طبقے کی انفرادیت اور خصوصیت کو ختم کر کے کسی دوسرے طبقے میں ضم کر دینے کو کچھ لوگ "قومی ایکتا" سمجھتے ہیں حالاں کہ سماجی اعمال (SOCIAL PROCESS) میں اس کو انضمام (ASSIMALATION) کہتے ہیں، جو قومی ایکتا کی اسپرٹ سے قطعی مختلف ہے۔ قومی یک جہتی کی مثال اس گلدستے کی ہے جس میں مختلف قسم کے پھول، اپنے اپنے رنگ، اپنی اپنی خوشبو اور اپنی اپنی قدرتی بناوٹوں کی انفرادیت و خصوصیت کو باقی رکھتے ہوئے یک جہت اور یک رخ ہو کر گلدستہ کو رشکِ چمن بنانے کی خاطر ایک دھاگے سے بندھ جاتے ہیں۔ اگر مقصدی رخ کے اس دھاگے کو توڑ کر پھولوں کو الگ الگ کر کے ان کی اکائیوں کو ختم کر دیا جائے تو گلدستے کی متحدہ زینت اور اس کا اجتماعی حسن ہی غارت ہو کر رہ جائے گا۔ اسی طرح کسی بھی طبقے کی مذہبی، لسانی اور تہذیبی اکائیوں اور ان کی انفرادیت و خصوصیت کو ختم کر دینے کی کوشش، ملک کی سالمیت کے لیے خطرے کا سبب بن جائے گی۔ یہ بات صحیح ہے کہ مسابقت (COMPETITION) اور تصادم (CONFLICT) انسانوں کی وہ بنیادی جبلّت ہے، جس کے بغیر زندگی کی تگ و دو میں ترقی و کامیابی کا ہونا مشکل ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ مطابقت (ACCOMODATION) اور تعاون (COOPERATION) کا عمل انسانوں میں توازن و تناسب اور سماجی شعور پیدا کر کے اُن کو صالح اور صحت مند معاشرہ کی تشکیل اور پُر امن زندگی گزارنے کا سلیقہ عطا کرتا ہے!

پراچین تاریخ ہند کی روشنی میں آج ملک کے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ جن وجوہات کی بنا پر ملک ٹکڑے ٹکڑے میں بٹا ہوا تھا، جس کے نتیجے میں اتہاس کے ایک لمبے دور تک کبھی بھی کوئی باضابطہ مرکزی حکومت قائم نہ ہو سکی۔ حکومتِ مغلیہ کے بعد ایک زمانہ وہ آگیا کہ انگریزوں نے ہندستانی

کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاکر "لڑاؤ اور حکومت کرو" والی پالیسی اختیار کی اور اپنی حکومت کی بنیادیں مضبوط کیں۔ انھوں نے زندگی کے ہر شعبے میں رخنہ ڈال کر صدہا برسوں کی مشترکہ و متحدہ قومی تعمیر حیات کو ریزہ ریزہ کر ڈالا۔
آزادی کے بعد سوچا گیا کہ گزشتہ تاریخی پس منظر کی روشنی میں سیاسی وجوہات کا تجزیہ کر کے کوئی ایسی سبیل نکالی جائے کہ آیندہ ملک کی تباہی و بربادی اور ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے محفوظ رہ سکے ـــــ اس لیے آج ہمارے دیش میں سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ جن وجوہات سے ملک کے ٹوٹنے کا خطرہ لاحق ہو، اس خطرے کا مقابلہ مل جل کر کیا جائے اور ایسے طریقے اختیار کیے جائیں، جن سے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے میں مدد مل سکے، اور آپس کا تناؤ ختم ہو، نیز مل جل کر رہنے سہنے کے سلیقے اور ملک عزیز کی خدمت کرنے کے طریقے کا قومی اور سماجی شعور پیدا ہو سکے ــــ اس سلسلے میں میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ کام اہل سیاست سے زیادہ دانشوروں اور فن کاروں کے ذریعے انجام پا سکتا ہے، اس لیے ویسے سلیقہ مند باشعور، وطن دوست اور امن پسند حضرات کو میدانِ عمل میں آکر ٹوٹے ہوئے دلوں کے جوڑنے کی سنّت اسلاف صالحین پر عمل کرنے کی ضرورت ہے!

آج جب کہ ہمارے ملک کا یہ حال ہے کہ سادہ اور معصوم دماغوں کو فرقہ پرستانہ پروپیگنڈوں سے مسموم کیا جا رہا ہو!

آج جب کہ ہماری تاریخی روایات اور سماجی پس منظر کو یکلخت بدلنے کی ناپاک کوشش کی جا رہی ہو!

آج جب کہ ہماری پُرامن زندگی سے سکون و راحت اور سکھ چین، چھین کر ہمیں انتشار و خلفشار کی آگ میں جھونکا جا رہا ہو!

آج جب کہ ملک کا اصلی حسن اور اس کے جسم سے روح اتحاد نکالی جا رہی ہو!

آج جب کہ انسان وحشت و بربریت کی اس سطح پر پہنچ گیا ہو کہ تہذیب و تمدّن کی دیوی کو برہنہ کر کے، ہاتوں میں خون ٹپکتی ہوئی تلوار اور گلے میں معصوم بچوں کی کٹی ہوئی گردنوں کا مالا پہن کر ننگا ناچ رہا ہو۔

آج جب کہ چاروں طرف چمن میں آگ لگائی جا رہی ہو اور شعلوں کی لپٹوں سے پھول جل رہے ہوں، شاخیں جھلس رہی ہوں تو آپ ہی بتائیے کہ ایسی بپتا کی گھڑی اور ایسے پُرآشوب وقت میں، پھولوں کی مہک، شاخوں کی لچک، بلبل کی چہک اور بہاروں کی لہک

سے متعلق شاعری کا کیا فائدہ؟
ایسے موقع پر کالی داس کی "میگھ دوت" کون پڑھے گا؟
حافظ و غالب کی غزلیں کون گنگنائے گا؟
میرا بائی کا بھجن کون گائے گا؟
سلطان حسین شاہ شرقی کی ایجاد کردہ "شام کلیان" اور "خیال" نیز راجا مان تنوار کی "دھرپد" کے راگوں کو کون الاپے گا؟
کرشن جی کی بانسری کی مدھر تانیں، امیر خسرو کے طبلے کی تھاپیں، اور حکیم بو علی سینا کی "شہنائی" کی سہانی دھنیں کون سنے گا؟
"تاج محل" کا بے مثال مرمریں پیکر اور اجنتا، ایلورا کا سحر آگیں صنمیاتی حسن کون دیکھے گا؟

مندرجہ بالا سطروں میں موجودہ وقت رواں کے پیش نظر جو اہم ترین سوال پیش کیے گئے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ "کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق"، اور کون ان سوالوں کا جواب دینے کی خاطر تیشۂ عمل لے کر فراعین وقت سے نبرد آزما ہوتا ہے؟
کون ہے جسے انسانیت کی اعلا قدروں کی اہمیت و ضرورت کا عرفان ہو؟
کون ہے جسے پھولوں کی نرمی اور کانٹوں کی چبھن میں جو فرق ہے اس کی تمیز ہو؟
کون ہے جسے پالنا میں جھولتے ہوئے بچوں کی مسکراہٹوں سے پیار ہو؟ اور کون ہے جو ماں کی ممتا بھری لوریاں سن کر پریم راگ کی نرمیاں محسوس کرتا ہو؟

ہم سلام کرتے ہیں ان بیدار ذہنوں کو جو طلوع آفتاب کی بجتی ہوئی گھنٹیاں سن کر وقت کے بدلتے ہوئے تیور کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اور مذکورہ بالا چیختے ہوئے مطالبوں پر لبیک کہتے ہوئے جرأت اور بے باکانہ ہمت کا ثبوت دیتے ہیں!
ہم سلام کرتے ہیں اُن قلمکاروں کو جو نوکِ قلم سے سماج کے سڑے ہوئے زخموں پر نشتر لگانے اور مرہم الفاظ کا پھایا رکھنے کا ہمدردانہ عمل اور فنکارانہ ہنر کا شعور رکھتے ہیں!
ہم سلام کرتے ہیں اُردو زبان کو، جو قومی ایکتا کی سب سے بڑی علامت اور ہندستانی زندگی کی جیتی جاگتی نشانی ہے جس کی سانسوں میں ہندستان کی دھرتی کی خوشبو بسی ہوتی ہے اور جس کے دل کی دھڑکنوں میں ہندستان کے سارے دکھوں اور سکھوں کی آواز سنی جاسکتی ہے!

اوپر کی سطروں میں جو باتیں لکھی گئی ہیں، ایسا نہ ہو کہ پڑھنے والے، اس موضوع پر ٹھنڈے دماغ و دل سے سوچنے اور زمانے کے مطابق خامہ فرسائی کرنے کی بجائے، اس بحث میں اُلجھ کر رہ جائیں کہ ہیں نے "کتاب نما" کے صفحات کو لفظیات و صوتیات، لسانیات، ادبیات، اسلوبیات و ساختیات، نظریات و انتقادیات، غزلیات و نظمیات، نثریات و شعریات وغیرہ موضوعات سے ہٹ کر خواہ مخواہ سیاسیات لی لغویات و فضولیات سے آلودہ کرنے کے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ حالاں کہ سطور بالا کے لکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اُن موضوعات کے ساتھ ساتھ اردو کے قلم کاروں کو دل و وقت کی دھڑکنوں کا احساس بھی کرنا چاہیے، کیوں کہ ماحول و معاشرہ میں رونما ہونے والے واقعات و حالات سے متاثر ہوکر اس کی عکاسی کرنا ایک فن کار کا فرضِ اوّلین ہے۔ اپنے ماحول و معاشرہ نیز اپنے عہد سے لاتعلقی، اس بات کی دلیل ہے کہ فن کار کا احساس مُردہ ہے یا جان بوجھ کر نظر انداز کرتا ہے، یا پھر وہ رونما ہونے والے واقعات و حالات سے بے خبر ہے، اگر ایسی بات ہے تو یہ بے خبری انتہائی افسوس ناک ہے۔ اِس بے خبری کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ فن پاروں سے نہ رفتارِ وقت کا پتا چلتا ہے اور نہ واقعات و حالات کی کوئی نشان دہی ملتی ہے۔ اپنے عہد اور معاشرے سے الگ تھلگ رہنے والا فن کار "کولڈ اسٹوریج" میں رکھے ہوئے سامان یخ بستہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی بھی فن کار کی یہ یخ بستگی اور لاتعلقی انتہائی ذہنی پستی اور مُردنی کی دلیل ہے — حالاں کہ اردو کی یہ انفرادی خاصیت رہی ہے کہ ہندستان کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں اس زبان نے ملکی و قومی خدمات میں جتنا حصّہ لیا ہے، اتنا کسی دوسری زبان نے شاید نہیں لیا ہے۔ اردو رسم خط کی لکھی ہوئی تحریر میں خاص طور پر ہندستان کی جنگِ آزادی کا سلسلہ وار اور ترتیب وار جتنا مواد جمع ہے، اتنا مواد کسی دوسری زبان کے پاس موجود نہیں۔ ملک کے ایک ایک اہم واقعہ اور ایک ایک اہم سیاسی موڑ سے متعلق اردو کی غزلوں، نظموں، مثنویوں، مضامین، خطوط، افسانوں، رپورتاژ، ناولٹ اور ناولوں کے روپ میں آپ کو مکمل آگاہی مل سکتی ہے۔ اگر تواریخ کی ساری کتابیں ملیامیٹ بھی کردی جائیں تو صرف اردو رسم خط میں لکھے ہوئے مختلف اصناف سخن کے ذریعے ہندستان کی سیاسی و سماجی تاریخ اور بالخصوص تاریخ آزادی مرتب کی جاسکتی ہے اس کے علاوہ ہندستان کے تمام موسموں، تہواروں، میلوں، گھاٹوں، پہاڑوں دریاؤں، میدانوں، باغوں، شہروں، قریوں، صحراؤں اور جنگلوں کی بھی کامیاب اور حسین ترین لفظی تصویریں آپ کو اردو میں کثرت سے مل جائیں گی۔!

سطور بالا میں جو باتیں لکھی گئی ہیں، ان کے علاوہ اردو، ہماری قومی یک جہتی کی جیتی جاگتی نشانی ہے اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ پہلے ہندو اور مسلمان نیز دوسری قوموں کی یک جہتی ہوئی، تب اس کے نتیجے میں اردو جیسی مشترکہ متحدہ زبان پیدا ہوئی، ایسی بات ہرگز نہیں کہ اردو پہلے وجود میں آگئی، تب ہندستان کی مختلف قوموں کے درمیان میل ملاپ ہوا۔ اور یہی وجہ ہے کہ حیات اردو کی تازگی کے لیے بالخصوص ہندو، مسلمانوں کا اشتراک و اتحاد بڑی حد تک ضروری ہے ــــ ہندستانی اقوام کے درمیان جتنا اتحاد و اشتراک مضبوط ہوگا۔ اتنا ہی اردو کو ظاہری و باطنی قوت ملے گی۔ اردو والوں کو ملک کی تمام زبانوں سے۔ تمام روایتوں سے ہندستان کی پوری تاریخ سے، ہندستان کی بھلائی اور ترقی سے جتنا دلی گہرا لگاؤ ہوگا، اتنا ہی اردو کی رگوں میں تازہ خون دوڑے گا۔ دیش کے دکھ سے دکھی ہونے اور دیش کے سکھ سے سکھی ہونے کے جذبے ہی کو حب الوطنی کہتے ہیں۔ ایسے ہی محب الوطنوں کے دل کی جو آواز ہوگی، اسی آواز کا نام اردو ہے۔ جس روز ملک سے تعصب و تشدد ختم ہوجائے گا اور جس دن سے عام ہندو مسلمان دونوں ماضی کے برادرانہ تعلقات کے پیش نظر ایک دوسرے کو بھائی سمجھنے لگیں گے، اسی دن سے اردو کا مستقبل زیادہ روشن و تابناک ہوجائے گا ــــــ اردو سراسر محبت و الفت کی زبان ہے۔ اس میں عام ہندستانیوں کے علاوہ، مسلمان صوفیوں اور ہندو بھگتوں نے مل جل کر پریم کے گیت گائے ہیں ــــ بارھویں صدی عیسوی کے تاریخی دور کو یاد کیجیے کہ اس زمانے میں شہر شہر گانو گانو، گلی گلی گھم گھوم گھومنے والے صوفیوں، بھگتوں، تاجروں اور فوجیوں کا واسطہ، دن رات یہاں کے رہنے والوں سے پڑنے لگا۔ صوفیوں اور سنتوں کو ہدایت کے لیے دلوں کو جیتنے کی فکر تھی، تاجروں کو اپنے مال و اسباب بیچنے اور خریدنے کی فکر تھی۔ فوجیوں کو ملکی و سیاسی مزاج سمجھنے اور سمجھانے کی فکر تھی ان ہی افکار ہائے مسلسل کے نتیجے میں وقت نے اپنی کوکھ سے اردو کو جنم دیا۔ مسلمانوں نے اپنی زبان سمجھانا اور ہندستانیوں کی زبان سمجھنے کے جتن شروع کیے۔ اسی سمجھنے سمجھانے کی پُرخلوص کوشش کا نام اردو ہے۔

اردو، صرف ایک بولی یا زبان ہی نہیں، بلکہ یہ ایک تہذیبی تحریک اور سماجی و سیاسی انقلاب کی تاریخ نیز ملکی و قومی ایکتا کا سنگِ بنیاد بھی ہے اردو، اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ ملک کی رنگ برنگ زبان، رنگ برنگ تہذیب اور رنگ برنگ علاقائی علامتوں کا ایک حسین گلدستہ ہے، اس لسانی گلدستے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر رنگ کے پھول ایک ساتھ اپنی اپنی پھبن اور رنگینی کے ساتھ مسکراتے ہوئے ملیں گے۔ ان لسانی پھولوں میں

دراوڑی، آریائی، پالی، سنسکرت، عربی، فارسی، ترکی، لاطینی، فرانسیسی، پرتگالی، چینی، یونانی، انگریزی، سریانی، بھوجپوری، میتھلی، پوربی اور دکنی، گویا مختلف زبانوں کا رنگ بھی ملے گا اور خوشبو بھی ملے گی۔ اردو حب الوطنی اور بھائی چارگی کی مکمل تاریخ اور بھرپور علامت ہے۔ اردو، ہندی کے "تدبھو شبدوں"، محاوروں اور اصطلاحوں سے مرکب ایک مجلّا آئینہ ہے۔ اردو، جدید ہند آریائی عہد کی ایک یادگار زبان اور ملی جلی تہذیبی ورثے کی رکھوالی ہے۔ یعنی یہ دو عظیم تہذیبوں کے ملنے کی ان مٹ نشانی ہے۔ المختصر یہ کہ اردو، وقت کی ایک مہرکیے، جو قومی تاریخ کے ماتھے پر تابندہ جھومر کی طرح جگمگا رہی ہے۔

جو لوگ اس جھومر کی جگمگاہٹ دیکھنا نہیں چاہتے، انھیں اپنی آنکھوں میں سوئیاں چبھو لینا چاہیے، اس لیے کہ اردو سے رشتہ توڑنے کا صاف مطلب، ملک کی قومی و تہذیبی تاریخ سے رشتہ توڑنا ہے۔ جو لوگ طوطا چشمی اور ہٹ دھرمی اختیار کرکے خود غرضیوں اور مطلب پرستیوں نیز سیاسی مصلحتوں اور آمرانہ پالیسیوں کے پیش نظر، اردو کی مخالفت کرتے ہیں، اصل میں وہ لوگ ملک کی سالمیت اور ایکتا کے دشمن ہونے کے ساتھ ساتھ ملک کو جدید عالمی ارتقا سے جوڑنے کی بجائے تاریخ کے پراچین دور سے جوڑ کر "مہابھکل پائی" ہونے کا ثبوت پیش کر رہے ہیں اور جو لوگ اردو کے قومی کردار سے انکار کرکے اس کو خواہ مخواہ کسی خاص طبقے کی زبان قرار دیتے ہیں، وہ لوگ جان بوجھ کر سیاسی خود غرضیوں کے پیش نظر اپنی اپنی سیاسی دکان قائم کرکے، تاریخی حقائق کو جھٹلانے اور مدتوں کی جمی جمائی قومی تہذیبی تعمیر کو ختم کرنے کے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں!

آخر میں پھر ہم خاص طور پر دانش وروں اور فن کاروں سے دردمندانہ اپیل کیا چاہتے ہیں کہ وہ دانش ورانہ اور فن کارانہ عمل سے دکھتے ہوئے دلوں کو پیار، بجھی ہوئی آنکھوں کو نور، اور تھکے ہوئے بازوؤں کو زندگی کا نیا بل عطا کرکے، زندہ اور حساس قلم کار ہونے کا ثبوت پیش کریں ـــــ ظلم و تشدد کی دہکتی ہوئی آگ کا جھلسا ہوا انسان، انتہائی پریشانی کے عالم میں اپنے زخمی دل کے لیے مرہم چاہتا ہے، آپ اسے مایوس نہ کیجیے، اگر آپ نے مایوس کردیا تو تاریخ کے صفحوں پر لکھا جائے گا کہ اس وقت جب کہ انسانیت زخموں سے چور ہو کر کراہ رہی تھی آپ کی فن کارانہ غیر ذمہ داریوں کا یہ حال تھا کہ اپنی ذات میں گم اور اپنے حال میں مگن رہ کر آپ نے اس کی کراہتی ہوئی آواز نہیں سنی اور اس کے دکھوں کا کوئی مداوا نہیں کیا، نیز اپنے دانش ورانہ فرض کی

ادائیگی میں انتہائی مجرمانہ کوتاہی برتی!

آئیے! ہم سب مل جل کر خم کا کل حیات کو سنواریں کہ زلف حیات کے اُلجھ جانے سے منظر حسن کی ترتیب بگڑ جاتی ہے۔ آج اگر ہم نے منظر حسن کو بگڑنے سے بچا لیا۔ اگر آج ہم نے نوکِ قلم سے پتھر کے دلوں کو گدگدانے کا فرض انجام دے دیا تو تاریخ ساز فن کارانہ عمل کے ذریعے نہ صرف اردو کی بلکہ انسانیت کی ایسی خدمت کریں گے کہ تاریخ ہمیشہ ہمارے کارناموں پر فخر کرے گی!

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

اسرارِ خودی (فراموش شدہ اڈیشن)	(شعری مجموعہ)	مرتبہ: شائستہ خان	۷۵/
موربی اور بابلی تہذیب و تمدن	(تاریخ)	مالک رام	۷۵/
جام جہاں نما۔ اردو صحافت کی ابتدا	(اردو صحافت)	گربچن چندن	۷۵/
مسلمانوں کا تعلیمی نظام	(تاریخی)	ضیاء الحسن فاروقی	۴۵/
اردو ناول میں عورت کا تصور	(تحقیق)	فہمیدہ کبیر	۴۵/
نوٹوں کی تلاش	(ناول)	ایاز سیوہاروی	۶۰/
تاثر نہ کہ تنقید	(تنقید)	صدیق الرحمن قدوائی	۵۱/
اپنے دل کی حفاظت کیجیے	(ایلوپیتھی)	ترجمہ نذیرالدین مینائی	۲۵/
بہ صورت گر کچھ خوابوں کے	(انٹرویوز)	طاہر مسعود	۶۶/
مرضیات	(طب)	حکیم نعیم الدین زبیری	۵۱/
بانگ درا	(شعری مجموعہ) طلبہ ایڈیشن	اقبال	۹/
بالِ جبریل	(شعری مجموعہ)	" "	۶/
ضربِ کلیم مع ارمغان حجاز (اردو نظمیں)	(شعری مجموعہ) "	"	۶/
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی	(ناول)	کشمیری لال ذاکر	۴۸/
گوشے میں قفس کے	(طنزیہ مزاحیہ)	دلیپ سنگھ	۴۵/
سحر کے پہلے اور بعد	(جگ بیتی)	سعید الظفر چغتائی	۵۱/
افکارِ اقبال	(اقبالیات)	محمد عبدالسلام خاں	۱۲۵/
فرمان فتح پوری	(شخصیت اور ادبی خدمات)	مرتبہ خلیق انجم	۲۵/
تذکرہ ماہ و سال	(تذکرہ)	مالک رام	۱۲۵/
تحقیق نامہ	(تحقیق)	مشفق خواجہ	۱۲۵/
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان	(مذہب)	حکیم محمود احمد برکاتی	۴۵/
خواب اور خلش	(شعری مجموعہ)	آل احمد سرور	۶۶/
سفر	(ناول)	رابعہ تبسم	۲۷/
تحریریں	(تنقید)	ڈاکٹر اسلم پرویز	۵۱/
پہچان اور پرکھ	(تنقید)	پروفیسر آل احمد سرور	۵۱/
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	(تحقیق)	ڈاکٹر سلامت اللہ	۵۱/
پت جھڑ کی آواز (نیا اڈیشن)	(افسانے)	قرۃ العین حیدر	۷۵/
اقبال کا نظریہ خودی	(تحقیق)	عبدالمغنی	۱۵۰/
سمندری خزانہ	(ناول)	ماریہ رحمان	۲۷/
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	(تنقید)	وارث علوی	۳۶/
فی الحقیقت	(طنز و مزاح)	یوسف ناظم	۴۵/
مٹی سے ہیرا	(ناولٹ)	سید مقبول احمد	۱۰/
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	(ناولٹ)	صغرا مہدی	۲۴/
الجھاوے	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف	۵۱/
غبار منزل	(شعری مجموعہ)	غلام ربانی تاباں	۴۵/

محمد سحر
۱۔ مالویہ نگر
وپال ۴۶۲۰۰۳

درد حد سے گزر گئے یارو ۔۔۔ سب جتن بے اثر گئے یارو

حسن کی داستاں ہوئی موقوف ۔۔۔ عشق کے نغمہ گر گئے یارو

تھی بہت دھوم جن کے آنے کی ۔۔۔ وہ زمانے کدھر گئے یارو

منزلیں دور ہو گئیں کچھ اور ۔۔۔ لوگ کس راہ پر گئے یارو

بستیاں پل رہی ہیں نفرت میں ۔۔۔ پیار کے وہ نگر گئے یارو

موت کا فن ہے چارسو رقصاں ۔۔۔ زندگی کے ہنر گئے یارو

اب نہ قاتل نہ کوئی ہے مقتول ۔۔۔ جن کو مرنا تھا مر گئے یارو

کل جو ہنستے تھے میری باتوں پر ۔۔۔ آج تو وہ بھی ڈر گئے یارو

غم کریں کیا شکستہ خوابوں کا ۔۔۔ پھول تھے کچھ بکھر گئے یارو

دم کہاں اب سحر کے نغموں میں ۔۔۔ ساز دل کے اتر گئے یارو

رفعت سروش
۲، بی، پاکٹ سی
سدھارتھ ایکسٹینشن نئی دہلی

نذرِ تاباں

بغاوت زندگی کا شعلۂ بیتاب رقصاں ہے
بغاوت طنطنہ ہے، عزمِ محکم، جوشِ طوفاں ہے
بغاوت تو قدامت کے لیے ہے موت کا ساماں
بغاوت نغمۂ تجدید ہے، ذوقِ فراواں ہے

صداقت بے نیاز کفر و ایماں ہے ہمیشہ سے
صداقت نورِ دانش، علم و عرفاں ہے ہمیشہ سے
صداقت جذبۂ فکر و عمل ہے، روح کا نغمہ
صداقت مسلک و آدابِ زنداں ہے ہمیشہ سے

قناعت بخشتی ہے ذہن و دل کو ایک سرشاری
قناعت سے غنی ہو دل تو جاگ اٹھتی ہے خودداری
قناعت نام ہے سود و زیاں سے بے نیازی کا
قناعت ہو تو پھر عزت کی اک روٹی بھی ہے پیاری

محبت آدمی کو واقعی انساں بناتی ہے
محبت دوسروں کے واسطے جینا سکھاتی ہے
محبت میں نہیں تفریق رنگ و نسل و مذہب کی
محبت ساقیٔ میخانہ ہے، سب کو پلاتی ہے

بغاوت جس کو کہتے ہیں اسی کا نام ہے تاباں
صداقت جس کو کہتے ہیں اسی کا نام ہے تاباں
قناعت جس کو کہتے ہیں اسی کا نام ہے تاباں
محبت جس کو کہتے ہیں اسی کا نام ہے تاباں

جو تاباں سے عقیدت ہے، بچاؤ اس کی عظمت کو
بغاوت کو، صداقت کو، قناعت کو، محبت کو

زاری (سرزمین سورت کے نام)

ز رفیعہ شبنم عابدی. بمبئی

یے کی روایت عرب وایران سے ہوتی ہوئی ہندستان تک پہنچی لیکن یہاں آکر وہ صرف اردو تک محدود نہیں رہی بلکہ ساری
ائی دمقامی بولیوں میں اس کے اثرات ملتے ہیں۔ خاص طور پر راجستھان اور گجرات میں ایام عزا میں دیہات کی ہندو مسلمان
یں نہایت پرسوز انداز میں شہیدوں پر ہونے والے مظالم کے بیان میں رثائی مثنویاں پڑھی جاتی تھیں۔ یہ رثائی مثنویاں
ریاں ،، کہلاتی تھیں آج بھی شاید ایسا ہی وقت آگیا ہے کہ ہماری عورتیں فساد میں شہید ہونے والی بہنوں پر
ے گئے مظالم کے بیان میں زاری پڑھیں۔ (ر۔ش۔ع)

(۱)

ا کہ ایک عورت ہوں
ل کی عظمت ہوں
سے نسلِ آدم ہے
بارِ عالم ہے
گلاب کی خوشبو
شباب کا جادو
ہوا بھی، بادل بھی
گھٹا بھی، چھاگل بھی
ہوں ایک تتلی بھی
ب کڑکتی بجلی بھی!
ہوں ایک حسین جگنو
خ گل مرے بازو
ہوں اک شرارا بھی
شنی کا دھارا بھی
تاب کی گرمی
ہ تاب کی خنکی
چمک ستاروں کی
ن ہوں نظاروں کی
دل بھی ہوں خنجر بھی
ادگی کا پیکر بھی
ت بھی غزل بھی میں
رمریں محل بھی ہیں!
ف کی نوا میں ہوں
از کی صدا میں ہوں
نات مجھ سے ہے
حیات مجھ سے ہے

(۲)

میں کہ ایک عورت ہوں
شاہ کارِ فطرت ہوں
ایسے کتنے افسانے
مجھ کو اپنے ، بیگانے
روز ہی سناتے تھے
دل مرا بہلاتے تھے
جن کو سن کے جانے کیوں
لفظ جن کے جانے کیوں
جھوم جھوم جاتی تھی
خود میں کب سماتی تھی
آج بربریت نے
سرزمین سورت نے
نفرت و عداوت نے
مرد کی شقاوت نے
آئینہ دکھایا ہے
نیند سے جگایا ہے
سوچتی ہوں رہ رہ کر
ساری ذلتیں سہہ کر
میں بھی کتنی سستی ہوں
بے وجود ہستی ہوں
تاجروں کی پونجی ہوں
منڈیوں میں بکتی ہوں
اشتہار میں، میں ہوں
کاروبار میں، میں ہوں
محفلوں میں سجتی ہوں
گھنگھروؤں میں بجتی ہوں

(۳)

میں کہ ایک عورت ہوں
بے حسوں کی غیرت ہوں
میں زمین جیسی ہوں
پھل بھی دوں تو مٹی ہوں
ایسی دیو داسی ہوں
مندروں میں لٹتی ہوں
پاک باز ہوکر بھی
دل نواز ہوکر بھی
آزمائی جاتی ہوں
میں جلائی جاتی ہوں
سانس سانس کٹتی ہوں
بھائیوں میں بٹتی ہوں
داؤ پر بھی لگتی ہوں
رات دن سلگتی ہوں
میری بے ردائی کی
اپنی بے حیائی کی
کھینچتے ہیں تصویریں
کرکے لوگ تدبیریں
ہاں یہی تو مذہب ہے
دھرم کا یہی ڈھب ہے
میری مانگ سونی ہے
میری کوکھ زخمی ہے
تار تار آنچل ہے
بکھرا بکھرا کاجل ہے
ٹکڑے ٹکڑے کنگن ہے
کیسا رکشا بندھن ہے

(۴)

میں کہ ایک عورت ہوں
کتنی بے حقیقت ہوں
اے غزل کے دیوانو
علم و فن کے پروانو
شاعرو! صدا کارو
بت گرو! اداکارو
نقش اتارنے والو
دل کو ہارنے والو
حسن کے ثنا خوانو
آؤ مجھ کو پہچانو
میں حسیں نہیں کچھ بھی
دل نشیں نہیں کچھ بھی
اک کریہہ منظر ہوں
عبرتوں کا دفتر ہوں
اسفلوں کا نغمہ ہوں
شیطنت کا لقمہ ہوں
میں نہیں کوئی بیٹی
اور نہ ہی بہن کوئی
کب کسی کی دلہن ہوں
بے کسی کا مدفن ہوں
مجھ کو ماں نہیں کہنا
ہوسکے تو چپ رہنا
آنسوؤں کی بارش ہے
بس یہی گزارش ہے
اے منافرت زادو
مجھ کو ایک کفن لادو
میں کہ ایک عورت ہوں
ننگِ آدمیت ہوں

الیاس شوقی

فریبِ مستقل

(بمبئی کے حالیہ فساد پر ایک نظم)

مرے سینے میں اب دل ہی نہیں ہے
کوئی حسرت، کوئی خواہش
کسی خواہش کی خواہش بھی نہیں ہے
فقط سانسوں پہ زندہ ہوں!
تو پھر ——
مری آنکھوں سے آنسو کیوں رواں ہیں؟
نہیں —— یہ بھی غلط ہے۔
مری آنکھوں کے سوتے خشک ہیں۔
بنجر زمینوں سے

مجھے شاید
فریبِ مستقل میں رہتے رہتے
خود اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دے کے
بہلانے کی عادت ہے
وگرنہ —— مری انکھوں نے
جو کچھ دیکھا ہے اب تک
وہ کس سچائی کی تصویر ہے؟
—— بولو!

مرے آگے
وہ سارے، ملتجی آنکھوں سے بس فریاد کرتے ہیں
جنھیں لوٹا گیا ایسے
کہ پھر سے ان کے بسنے کی کوئی امید بھی باقی نہیں ہے

اثاثہ کچھ اگر چہ ہے —— بنام زندگی تو بس
دلوں میں خوف ہے —— وحشت نگاہوں میں
پولیس خاموش، بے حس سی
تماشا دیکھتی ہے
مگر ہاں!
—— وہ اپنے فرض سے غافل نہیں ہے
اس لیے شاید
لٹیرے بستیوں کو لوٹ کر جب جا چکیں گے۔
لٹی بستی میں آکے
سراسیمہ، لٹے لوگوں کو پکڑے لے گی
انھیں میں سے کئی کو گولیوں سے بھون دے گی
اور کہے گی
ہمارے ملک کو خطرہ تھا نقصِ امن کا ان سے!
حکومت مطمئن ہے
کہ جو کچھ ہو رہا ہے —— حسبِ منشا ہے

میں رونا چاہتا ہوں
مگر آنسو ہیں بے معنی
میں اپنے آپ پر کیا ہنس رہا ہوں؟
نہیں —— خاموش سب کچھ دیکھتا ہوں
مری دانشوری اب تک
مرے رستے کی بس دیوار ہی بنتی رہی ہے۔

ڈاکٹر عبدالمغنی
پروفیسر کوارٹرس
سائنس کالج کمپاؤنڈ
پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۵

ترقی پسندی

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے سے ایک سال قبل ۱۹۱۷ء میں جب روس میں اشتراکی انقلاب برپا ہوا تو اس کے اثرات پوری دنیا میں محسوس کیے گئے۔ یہاں تک کہ انگلستان میں جو اشتمالی خیالات پہلے سے پھیلے ہوئے تھے انھوں نے ایک معین صورت اختیار کرلی۔ فیبی ان سوشلزم پر پلنے والی نسل کا ایک حلقہ مارکسی کمیونزم کی طرف مائل ہونے جنگ کے بعد ۲۰ تا ۳۰ اشتراکی خیالات کے حامل دانشور اپنے کو ترقی پسند PROGRESSIVE کہلانے لگے۔ یہ انگلستان اور مغربی یورپ کی قدامت پرستی CONSERVATION کے مقابلے پر جدت اور روشن خیالی کا ایک بلند بانگ دعوا تھا۔ ۳۰ تا ۴۰ کی دہائی میں ابھرنے والے انگریزی کے جدید ادبا و شعرا کا ایک بڑا طبقہ اس دعوے پر کاربند تھا۔ اس زمانے میں طلبہ اور نوجوانوں کے درمیان ترقی پسندی ایک تازہ ترین فیشن بن گئی۔ چناچہ انگلستان میں موجود ہندستان کے کچھ طلبہ بھی اسی فیشن سے متاثر ہوئے۔

یہ طلبا ۳۰ تا ۴۰ کی دہائی کے وسط میں جب ہندوستان لوٹے تو یہ ترقی پسندی کے علم بردار تھے۔ ان میں اردو کے ادیب و شاعر بھی تھے۔ اس وقت برطانوی سامراج کے مقابلے میں ترقی پسندی کا رشتہ جنگ آزادی سے بھی قائم ہوگیا۔ چناچہ ملک کے بعض قوم پرست ادیب و شاعر بھی ترقی پسندی کے ہم خیال نظر آئے۔ گرچہ وہ سیاست و معیشت کے علاوہ تہذیب و معاشرت اور علم و ادب کے معاملے میں قدامت پسند تھے۔ بہرحال ترقی پسندی عام طور پر ایک عنوان بن گئی۔ جدت، روشن خیالی، سماجی انصاف آزادی اور پیش قدمی کی۔ ۱۹۳۶ء میں انہی عمومی خیالات کے ساتھ ایک وسیع بنیاد پر انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔ جس کو پریم چند جیسے قدامت پرست ہندو اور حسرت موہانی جیسے مذہب پسند مسلمان نے بھی نیک دعائیں دیں۔ بزرگوں کی بھی خواہی اور نوجوانوں کی سرگرمی نے ترقی پسند تحریک کو بہت جلد اردو ادب کا ایک مقبول محاذ بنادیا۔

آہستہ آہستہ یہ ترقی پسند تحریک سیاسی آزادی اور معاشی انصاف سے آگے بڑھ کر لامذہبیت اور معاشرتی آزاد روی کی حد تک پہنچ گئی۔ پھر اس میں خالص اشتراکی

ضابطہ بندی اور گروہ بندی کی شدّت بھی پیدا ہو گئی۔ اس شدّت کا نشانہ پورا نظام زندگی بن گیا۔ اقتصادی فلاح کے موضوع میں اتنا غلو اور مبالغہ کیا گیا کہ معاشرے کی اخلاقی قدروں پر بھی زد پڑنے لگی۔ اس سے سماج میں انتشار کے آثار پیدا ہوئے۔ تب قدامت پرست سمجھے جانے والوں اور ترقی پسند کہلانے والوں کے درمیان ایک کش مکش سی رونما ہوئی۔ سرپھرے باغی جوانوں کے ہاتھوں میں انقلاب کا پرچم لہرانے لگا۔ اور سنجیدہ و روایت پسند بزرگوں کے دلوں میں جوانوں کے اس جنون سے اندیشے پیدا ہونے لگے۔ لیکن کسی بڑے تصادم کی نوبت نہیں آئی۔ اس لیے کہ دونوں طرف کچھ اعتدال پسند افراد مفاہمت کی راہیں نکالتے رہے۔

ترقی پسندی کا طنطنہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے آخر میں اس وقت ٹوٹ گیا جب دوسری جنگ عظیم (۳۹ تا ۴۵) کے اوائل میں روس کی پالیسی کے زیر اثر ہندستانی کمیونسٹ جمہوریت کے بجائے فسطائیت کے قریب نظر آئے اور اشتراکی ادبا وشعرا برطانیہ کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار اسی جہت سے کرنے لگے۔ پھر جب روس نے قلابازی کھائی اور نازیوں کو چھوڑ کر اتحادیوں کے ساتھ ہو گیا تو یہی ادبا و شعرا پہلو بدل کر برطانیہ کی جنگی کوششوں کے نقیب بن گئے۔ ان حرکات سے ملک کی قومی زندگی میں ترقی پسندوں کا اعتبار قایم ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔ لیکن نہ تو ترقی پسند تحریک ادب میں بند ہوئی نہ اشتراکی ترقی پسندوں کی ضابطہ بندی میں کمی آئی۔ البتہ متعدد غیر اشتراکی مشاہیر جو کہ کمیونزم کے بجائے صرف عام قسم کی ترقی پسندی کے سبب تحریک میں شامل ہوئے تھے وہ الگ ہو گئے یا اپنے رویّے پر نظر ثانی کے باعث الگ کر دیے گئے۔ چناں چہ ۴۰ اور ۵۰ کے درمیان کی دہائی میں ترقی پسند تحریک کی صفوں میں کمیونسٹوں کا مکمل غلبہ ہو گیا۔ اس کے باوجود ادب وشعر کی تخلیق کا نیا رجحان جو ایک دہائی قبل عمومی ترقی پسندی کے زیر اثر شروع ہوا تھا باقی رہا اور پروان چڑھتا رہا، شاید اس لیے کہ ادبا وشعرا کو عام طور پر سیاسی و معاشی فلسفہ و سیاست سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اور نوجوان ابھی تک ترقی پسندی کو تازگی کی ایک علامت اور سرگرمی کا ایک محرک تصور کرتے تھے۔ لہٰذا ۵۰ تک ۶۰ ادب میں ترقی پسند رجحان پھولتا پھلتا رہا۔

بہرحال ۶۰ اور ۷۰ کے درمیان ترقی پسندی کا طلسم ادب میں بھی ٹوٹ گیا۔ اور تقسیم ہند کے بعد ابھرنے والی نئی نسل نے اس کے خلاف کھلی بغاوت کا اعلان کر دیا۔ گردش ایّام نے اب تک سرمایہ داری اور اشتراکیت کے مابین ہونے والی چپقلش کو جمہوریت اور آمریت کے درمیان آویزش کا رنگ دے دیا۔ عمر رسیدہ ترقی پسندوں کے مقابلے میں ایک نوجوان باغی نسل کھڑی ہو گئی۔ یہ ترقی پسندی میں اشتراکی ضابطہ بندی کے جبر و ستم کے خلاف ایک ردِّ عمل تھا جس کے نتیجے میں اجتماعیت کے بجائے انفرادیت کا غلغلہ بلند ہوا۔ اس سے قبل سماج میں انقلاب کا نعرہ لگایا گیا تھا۔ اب سماج سے علاحدگی کا نعرہ لگایا گیا۔ اشتراکیت کی نظریاتی وابستگی کے خلاف جدیدیت نے نظریاتی ناوابستگی پر اتنا زور دیا کہ سرے سے ہر قسم کی وابستگی کا انکار کر دیا۔ پہلے انسان معاشرے کی مخلوق سمجھا جاتا تھا تو اب نے معاشرے کا تنہا آدمی سامنے آیا۔ یہ دراصل ہجوم

سیاست سے بھاگ کر تنہائی میں پناہ لینے کا عمل تھا۔ اس عمل پر تقسیم ہند کے تہلکے کا سایہ بھی۔ جو نسل ایک آگ کے دریا میں ڈوب کر ابھری تھی اور تلاشِ بہار اس میں آبلہ پائی کر کے ناکام ہو چکی تھی۔ وہ بالکل اداس نظر آئی۔ آزادی نے اس نئی نسل کو سماجی انصاف نہیں دیا اور اس کے لیے مساوات کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔ اس صورت حال کو ترقی پسندوں نے بھی "یہ داغ داغ اجالا" "یہ شب گزیدہ سحر" کہا۔ مگر وہ اس سحر سے نبرد آزما نہیں بالآخر اس کے ساتھ مصالحت کرتے دکھائی دیے۔ لہٰذا نئی نسل کی نگاہ میں وہ بھی قدامت پسند بن کر نمودار ہوئے۔ اس قدامت کے مقابلے میں جدت کا اہتمام کرنے کے لیے جدیدیت کا رجحان پیدا ہوا، گرچہ معتدبہ ادبا و شعرا آج تک ترقی پسندی اور جدیدیت کے درمیان تذبذب میں مبتلا ہیں۔

ترقی پسند تحریک کئی معنوں میں ایک رومانی تحریک تھی۔ اس نے کسی نہ کسی مفہوم میں اردو ادب کی کلاسیکی روایت میں کچھ تبدیلی کا تقاضا کیا تھا۔ اور تاریخ ادب میں کلاسیکیت کے مقابلے پر جو رجحان ابھرتا ہے اسے رومانیت کہا جاتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم نکتہ یہ ہے کہ جس طرح انگریزی ادب میں احیاے رومانیت کی تحریک اٹھارویں صدی کے اواخر ۱۷۸۹ء میں واقع ہونے والے جمہوری انقلاب فرانس سے متاثر ہوئی تھی۔ اسی طرح اردو میں ترقی پسندی کی تحریک بیسویں صدی کے اوائل ۱۹۱۷ء میں رونما ہونے والے اشتراکی انقلاب روس سے اثر پذیر ہوئی۔ اس کے علاوہ رومانیت کی طرح ترقی پسندی میں بھی کسی نہ کسی نوع کے انقلاب کی ایک جذباتی آرزو بالکل رومانی تمنا تھی۔ ایک نظریہ اور اس کے مطمحِ نظر کے تحت ایک انقلاب کا شیریں خواب بجائے خود ایک رومانی کیفیت ہے۔ سماجی انصاف اور معاشرتی مساوات کے نعرے آرزوؤں کی بنیاد پر بھی بلند ہوتے ہیں۔ اسی لیے ان میں ایک جذبہ اور ولولہ ہوتا ہے۔ جو حوصلوں کو مہمات سر کرنے کی دعوت دیتا اور جہد و عمل پر ابھارتا ہے۔ ترقی پسند ادب میں ایک قسم کی للکار کی کیفیت اسی جذبے اور ولولے سے پیدا ہوئی۔ یقیناً یہ ایک پرشور کیفیت تھی۔ اور اس میں تبلیغ یا پروپیگنڈے کا عنصر نمایاں تھا۔ مگر تبلیغ بجائے خود صرف ابلاغ میں مبالغے کا نام ہے اور اس سے ضروری نہیں کہ بلاغت، فصاحت یا لطافت و نفاست مجروح ہو۔

ترقی پسند ادب سے ذرا پہلے اردو میں ادب لطیف کا چرچا تھا جو فی الواقع ادب برائے ادب کی وہ مبالغہ آمیز فن پرستی تھی جو جمال و زوال کا ایک معجون مرکب ہے اور کسی مرض کی دوا ہونے کے بجائے خود ایک مریضانہ کیفیت ہے۔ چناں چہ اس کے خلاف ترقی پسندی نے ادب برائے زندگی کی صدا لگائی اور افادی ادب کی بات کی، زندگی اور سماج کے ساتھ فن و ادب کے رشتے پر زور دیا۔ یہ ایک صحت مند اور تعمیری رجحان تھا۔ لیکن اس رجحان میں فکر کی وجہ سے فن اور فکر کی تنقیدی بحث میں فن کے مقابلے پر فکر کی طرف داری کے سبب ایک بے اعتدالی پیدا ہو گئی۔ اس عدم توازن نے ادب کے مزاج کو برہم کیا اور ترقی پسندوں

کو رسوا، یہی وجہ ہے کہ ترقی پسندی کے خلاف جدیدیت کے رجحان میں فکر کے بجائے فن پر زور دیا گیا۔ گرچہ اس میں اتنا مبالغہ کیا گیا کہ فکر پرستی کے مقابلے پر فن پرستی ادب کے لیے ایک وبال بن گئی اور نتیجے میں فکری و فنی انتشار نمایاں ہوا۔ ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں سے اختلاف کرتے ہوئے یہ کہاجا سکتا ہے کہ اول الذکر نے فکری سے راہ روی پیدا کی تو موخر الذکر نے فنی سے راہ روی۔

دونوں انتہاپسندیوں کا یہ انجام عجیب بھی ہے، عبرت خیز بھی۔ فکر میں مبالغہ کرنے سے فن کے ساتھ ساتھ خود فکر بھی مجروح ہوئی، جب کہ فن میں مبالغہ کرنے سے فکر کے ساتھ ساتھ فن بھی مجروح ہوا۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کا یہ انجام اس وجہ سے رونما ہوا کہ دونوں نے ادب کے ترکیبی مزاج کو نظرانداز کیا۔ مواد وہئیت کی پرانی بحث کا اب بڑی حد تک فیصلہ ہوچکا ہے۔ اور عام طور پر یہ حقیقت تسلیم کی جارہی ہے کہ مواد وہئیت دو لخت نہیں، ایک ہی سکے کے دو رُخ بلکہ ایک ہی وجود کے اجزاے ترکیبی ہیں اور دونوں کے درمیان ہم آہنگی وپیوستگی لازمی ہے۔ لہٰذا موضوع واسلوب اور فکر وفن کے درمیان مکمل توازن اور کامل ارتباط ہونا چاہیے، اقبال کے لفظوں میں ارتباط لفظ ومعنی اختلاط جان وتن کی طرح ضروری ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو زندگی کی طرح ادب میں بھی کوئی صالح انقلاب پیدا کرنے میں ترقی پسندی اسی طرح ناکام ہوئی جس طرح بعد میں جدیدیت۔ یہی وجہ ہے کہ آج اردو ادب میں ایک خلا ہے۔ جو ترقی پسندی کے زوال اور جدیدیت کے انتشار سے پیدا ہوا ہے۔ یہ ایک بحران ہے جس کو دور کرنے کی کوشش وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ورنہ مسلسل انحراف، تحریف وتخریب سے اردو ادب تباہ ہوجائے گا۔

اس مرحلے پر ضروری سا ہے کہ ترقی پسند تحریک کی اس خوبی کا اعتراف کیا جائے کہ اس نے نظم آزاد کی بدعت کے سوا بالعموم اردو ادب کے کلاسیکی فنی معیار کو مجروح نہیں کیا اس لیے کہ اس نے فکر میں جو بغاوت بھی کی ہو، فن میں روایت کا احترام کیا اور اس طرح انفرادیت وروایت کے نتیجہ خیز تاریخی رشتے کو باقی رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف اصناف ادب میں قابل ذکر ترقی پسند ادبا وشعرا نمایاں ہوئے۔ شاعری میں فیض، مجاز، جذبی، مجروح، پرویز، وساحر، افسانے میں کرشن چندر، منٹو، بیدی، تنقید میں احتشام حسین اور مجنوں گورکھپوری وغیرہ تاریخ ادب میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ترقی پسندی ہی کے دور میں جوش، حفیظ، فراق اور جمیل نیز حسرت، فانی، یگانہ، اصغر اور جگر جیسے شاعر، پریم چند اور قرۃ العین حیدر جیسے افسانہ و ناول نگار اور کلیم الدین احمد و آل احمد سرور جیسے تنقید نگار بھی نمودار ہوئے۔ کسی تحریک اور اس کے دور کے لیے اتنا سرمایہ وقیع ہے۔ اس کے برخلاف اگر موازنہ کیا جائے تو جدیدیت نے بے مہار نظم آزاد سے تجریدی افسانہ نگاری تک فن کے نام پر فن کے کلاسیکی معیاروں کی جو شکست وریخت کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک بھی قابل ذکر شاعر اور افسانہ نگار آج تک پیدا نہیں کرسکی اور چونکہ جدیدیت کے زیر اثر تخلیق بے ثمر رہی

لہٰذا تنقید بھی بے اثر ثابت ہوئی، فقط کاروباری صحافت کی گرم بازاری رہی اور نئی نسلوں کو گمراہ کیا گیا۔

اس اعتراف حقیقت کے باوجود یہ واقعہ اپنی جگہ رہتا ہے کہ شاعری میں اکبر و اقبال ناول نگاری میں نذیر احمد اور تنقید میں حالی و شبلی کی عظیم الشان ادبی روایات کا ارتقا ترقی پسند تحریک سے نہیں ہو سکا، گرچہ یہ روایات آج بھی زندہ و تابندہ ہیں اور ترقی پسند ہوں یا جدیدیت پسند اردو ادب کے اس سانچے کو نہیں توڑ سکے جو ہمارے بہترین کلاسکی ادبا و شعرا نے انیسویں صدی تک کی روایات میں اضافہ کر کے بیسویں صدی کے اوائل میں تشکیل دیا تھا۔ چناں چہ ترقی پسندی اور جدیدیت کے پر شور ادوار میں بھی متعدد ادبا و شعرا اردو ادب کے مثالی سانچے کے مطابق پرورش لوح و قلم اور تربیت ذوق و شعور کرتے رہے۔ ان کے نام لینے کے بجائے ان کے کاموں کو دیکھنا چاہیے اور اس تاریخی روایت کو مدِ نظر رکھنا چاہیے جس کی شاہراہ پر وہ گامزن رہے۔ منزل مقصود کا نشان واضح ہے۔ اور اس کی طرف جانے والی راہ مستقیم ہے۔ جو کارواں گزر چکے ہیں ان کے نقوش بھی روشن ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ کے پیچ و خم سے سبق لیتے ہوئے ترقی پسندی کے تجربات کو بھی اردو ادب کی روایات کا ہی ایک حصہ مجموعی و عمومی طور پر سمجھنا اور ان سے فایدہ اٹھانا چاہیے۔

پروفیسر عنوان چشتی
بی ۱۱۷، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵۔

شاید

جون ایلیا اردو کے اُن شاعروں میں شامل ہیں، جن کو علمی وفنی روایت کا دلنشین رکن کہا جاسکتا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ "شاید" کے نام سے منظرِ عام پر آیا ہے جس کا تیسرا اڈیشن سامنے ہے۔ انھوں نے "نیازمندانہ" کے عنوان سے "شاید" کا دیباچہ لکھا ہے جو ان کی تخلیقی اُپج، ذہنی افق کی وسعت، علم دوستی اور اچھی نثر لکھنے کی صلاحیت کا ثبوت ہے۔ یوں تو جون ایلیا نے مترجم اور صحافی کی حیثیت سے بھی اہم کارنامے انجام دیے ہیں۔ لیکن ایک شاعر کی حیثیت سے انھوں نے اچھی اور سچی شاعری کے قابلِ قدر نمونے پیش کیے ہیں جس کا ثبوت "شاید" کا مطالعہ فراہم کرتا ہے۔

اِس دور میں میرؔ کی طرف مراجعت کا رجحان بھی ملتا ہے۔ رجحان پاکستان کے ناصر کاظمی اور ابن انشا سے ہوتا ہوا جون ایلیا تک آیا ہے۔ مزاجاً جون ایلیا میر تقی میر سے قریب نظر آتے ہیں۔ وہی خستگی و برشتگی جو میرؔ کی زندگی میں تھی۔ جون ایلیا کے یہاں نظر آتی ہے۔ وہی علم و فن کی سرشاری اور وہی دنیاداری سے بے نیازی جو میرؔ کا شیوہ تھا، اس دور میں جون ایلیا کا طرّہ زندگی ہے۔ ہو سکتا ہے۔ جون ایلیا نے میر تقی میر کی شاعری کو چشم و ابرو پہ جگہ بھی دی ہو۔ اس لیے جون ایلیا کی شاعری میں ایسے اشعار مل جاتے ہیں، جن پر میر تقی میر کے سخن کی چھوٹ پڑتی ہے۔ ایسے اشعار میں زبان اور انداز بیان ہی نہیں بلکہ اظہار و ادا کے سارے لوازم ویسے ہی نظر آتے ہیں جیسے میر تقی میر کی شاعری میں ہیں۔ مثلاً

شام ہوئی ہے، یار آتے ہیں، یاروں کے ہمراہ چلیں
آج وہاں قوالی ہوگی، جون چلو درگاہ چلیں

بادِ بہاری کے چلتے ہی لہری پاگل چل نکلے
جانا تھا کس سمت کو جاتے بس بے اٹکل چل نکلے

ساری گلی سنسان پڑی تھی بادِ فنا کے پہرے میں
ہجر کے دالان اور آنگن میں بس اک سایہ زندہ تھا

وہ زلف ہے پریشاں، ہم سب ادھر چلے ہیں
تم بھی چلو کہ سارے آشفتہ سر چلے ہیں

تم بھی چلو غزالاں، کوئے غزال چشماں
درشن کا آج دن ہے سب خوش نظر چلے ہیں

ان اشعار کا رنگ و آہنگ میر تقی میر کی شاعری کی یاد تازہ کرتا ہے۔ یہ کوئی بُری بات نہیں کہ جون ایلیا نے میر تقی میر کی طرف مراجعت کی ہے۔ یوں بھی جون ایلیا کے وجود میں ان کا ماضی تہذیبی ورثہ بن کر زندہ ہے۔ لیکن یہ بڑی بات ہے کہ انھوں نے "میریت" کو اپنی زندگی، اپنے عہد اور اس سے بھی زیادہ اپنے وجود کے تجربے کی اساس فراہم کی ہے۔

میں نے ابھی ابھی لکھا ہے کہ جون ایلیا نے "میریت" کو ماضی کے ورثے کے طور پر قبول کرکے اپنے وجود کے تجربے کی کسوٹی پر چڑھایا ہے اور اس کی قلب ماہیت کی ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے میر کی کورانہ تقلید نہیں کی ہے بلکہ فنکارانہ اور تخلیقی استفادہ کیا ہے۔ یہ کوئی بُری بات نہیں بلکہ ایک فطری رویّہ ہے۔ ہر تجربے کے بطن میں روایت کی روح جلوہ گر ہوتی ہے۔ ایلیٹ نے روایت اور تجربے کے ضمن میں بڑی پتے کی بات کہی ہے۔ جون ایلیا کی شاعری اس پتے کی بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔

جون ایلیا کی شاعری انفرادیت کے دروازے تک پہنچ گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اچھی شاعری سے محاکاتی اور ادراکی عناصر بڑی حد تک غائب ہوجاتے ہیں۔ جون ایلیا کی غزلوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس نکتہ سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اچھی شاعری بیان واقعہ نہیں بلکہ واقعہ کے تاثر کا اظہار ہے۔ وہ بیان کا تجربہ نہیں بلکہ تجربے کا بیان ہے۔ اس لیے جون ایلیا کی غزلوں میں دو تخلیقی رویّے ملتے ہیں۔ پہلا رویّہ ہے محاکاتی اور ادراکی عناصر کی گرفت سے آزاد ہوکر فکری تخیلی اور جذباتی عناصر کو اپنانے کا۔ دوسرا رویّہ ہے غزل کی تمام ترقی اور رجائیاتی رویّوں سے اخذ کرکے وجود کے تجربے کی بازیافت کرنے کا۔ ذیل میں ان کے مجموعۂ کلام سے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

یاد یں ہیں یا بلوا ہے | چلتے ہیں چاقو مجھ میں
ان کو آنکھوں میں ہی بکھرنا تھا | بال و پر آشیاں کے تھے ہی نہیں
اب ہمارا مکان کس کا ہے | ہم تو اپنے مکان کے تھے ہی نہیں
خواہشیں دل کا ساتھ چھوڑ گئیں | یہ اذیت بڑی اذیت ہے
ہم کہاں اور تم کہاں جاناں | ہیں کئی ہجر درمیاں جاناں
عالم بے کراں رنگ ہے تو | تجھ میں ٹھہروں کہاں کہاں جاناں
وہ اُن بستیوں کے سناٹے | سب قصیدے ہماری شان میں تھے
ہیں سب اک دوسرے کی جستجو میں | مگر کوئی کسی کو بھی ملا نئیں
کبھی خود سے مُکر جانے میں کیا ہے | میں دستاویز پہ لکھا ہوا نہیں
ہم خود آزار تھے سو لوگوں کو | آزماتے چلے گئے ہوں گے
خوب ہے شوق کا یہ پہلو بھی | میں بھی برباد ہو گیا تو بھی
سویرے ہی سے گھر آ جائیں آج | ہے روز واقعہ با سر نہ رہیو
خود سے ہر دم ترا سفر چاہوں | تجھ زبانی تری خبر چاہوں
زندگی کا عجب معاملہ ہے | ایک لمحے میں فیصلہ کیجیے
ایک ہی فن تو ہم نے سیکھا ہے | جس سے ملیے اُسے خفا کیجیے
مجھ میں آکر گرا تھا اک زخمی | جانے کب تک پڑا رہا ہوگا
یہی رشتوں کا کارخانہ ہے | اک مشین اور اس کے پاس مشین
صبح اس کو وداع کر کے میں | نصف شب تک پھرا ہوں آوارہ
بے دلی کیا یونہی دن گزر جائیں گے | صرف زندہ رہے ہم تو مر جائیں گے

ان اشعار کے تجزیے کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہ آپ اپنے مزاج کی گواہی دے رہے ہیں۔ مگر اتنا تو عرض کیا ہی جا سکتا ہے کہ ان کی یہ پُراسرار معنویت اور پُرپیچ سادگی کی طرف بلاغت یا تنقید کی کسی قدیم اصطلاح کا نام لے کر بات نہیں کی جا سکتی۔ بلاشبہ ان اشعار میں سادگی و سلاست اور سہل ممتنع کی کیفیت بھی ہے مگر اس سے ماوراء بھی کچھ ہے۔ وہی "ماورائیت" یا "کچھ اور" جون ایلیا کی شاعری کی انفرادیت کی تشکیل کرتا ہے۔ جون ایلیا کی شاعری میں بعض نقاد عصری شعور بعض عصری حسیت کا سراغ لگانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ یہ رویہ صحیح ہو یا غلط میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان کی شاعری میں عہد اور فرد، روایت یا تجربہ ایک دوسرے سے ٹوٹ کر تحلیل ہو گئے ہیں اور ان کی شاعری کی مٹھی میں جگنوؤں کا جو جھلملاہٹ ہے وہی ان کی شعری انفرادیت ہے۔

ابھی ابھی میں نے جون ایلیا کے جن اشعار کی طرف بعض تنقیدی اشارے کیے ہیں، وہ عام طور پر چھوٹی بحروں میں ہیں۔ محمد حسین آزاد نے خواجہ میر درد کے بارے

میں ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ چھوٹی بحروں میں غضب کرتے ہیں۔ گویا تلوار کی آب داری نشتر میں بھر دیتے ہیں۔ اگر میں آزاد کے الفاظ مستعار لوں تو یہی بات جون ایلیا کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ دراصل یہ کیفیت زبان و بیان، ہر عبور، خلوص بے کراں، سپردگی اور زندگی سے اٹوٹ پیار اور اس کے نتیجے میں ٹوٹ کر بکھرنے سے پیدا ہوتی ہے جون ایلیا کی زندگی میں ہجرت کا غم، نئے ماحول میں از سر نو نصب ہونے، نشوو نما پانے اور اپنی تہذیبی شناخت کے ساتھ زندہ رہنے کا المیہ شامل ہے۔ جہاں تک زندگی کے نشیب و فراز کا تعلق ہے اس کا اثر تو اس دور کے ہر انسان کی سائیکی پر ہے ہی۔ جون ایلیا کو مبرا قرار نہیں دیا جاسکتا۔ دراصل غم و آلام اور حالات کے منفی و مضر اثرات تو ہر انسان کا ذہن قبول کرتا ہے لیکن اس کو تخلیقی ذہن کا شاعر ہی شاعری بنا سکتا ہے۔ یہ کام جون ایلیا نے کر دکھایا ہے۔

جون ایلیا کی شاعری میں جہاں تخیل اور تفکر جذباتی اور جمالیاتی کیفیت میں تحلیل ہو گئے ہیں۔ وہاں ان کے تخلیقی تجربوں نے اوسط درجے کی بحروں کا انتخاب کیا ہے۔ جن کے ڈانڈے ذرا پھیلتے ہوئے اور طویل ہوتے ہوئے آہنگ سے مل گئے ہیں۔ مثلاً

کیوں کر ہو اپنے خواب کی آنکھوں میں واپسی   کس طور اپنے دل کے زمانوں میں جاؤں میں

آثار اب یہ ہیں کہ گریبانِ شاہ سے   الجھیں گے ہاتھ برسرِ دربار کچھ سنا

اہلِ ستم سے معرکہ آرا ہے اک ہجوم   جس کو نہیں ملا کوئی سردار کچھ سنا

میری بانہوں میں بہکنے کی سزا بھی سن لے   اب بہت دیر میں آزاد کروں گا تجھ کو

ترکِ تعلقات کوئی مسئلہ نہیں   یہ تو وہ راستہ ہے کہ بس چل پڑے کوئی

اس دن پہلی بار ہوا تھا مجھکو رفاقت کا احساس   جب اُس کے ملبوس کی خوشبو گھر پہنچانے آئی تھی

شاید مجھے کسی سے محبت نہیں ہوئی   لیکن یقیں سب کو دلاتا رہا ہوں میں

تنہائی کا اک جنگل ہے سناٹا ہے اور ہوا   پیڑوں کے پیلے پتّے ہیں نغمہ سرا گئے شامِ خزاں

یہ جو کراہتے ہوئے لوٹ رہے ہیں شہر سے   خوب دکھا کے آئے ہیں اپنا کمال شہر میں

اِن اشعار میں خواب کی آنکھوں میں واپسی کی خواہش یا دل کے زمانوں میں واپسی کا جذبہ، گریبانِ شاہ سے برسرِ دربار ہاتھوں کے الجھنے کا خدشہ، اہلِ ستم سے معرکہ آرا ہونے کا شوق، بانہوں میں بہکنے کی نفسیاتی سزا تجویز کرنا۔ ترکِ تعلقات کو کوئی بڑا مسئلہ نہ قرار دے کر اس پر عمل نہ کرنے پر سوالیہ نشان لگا دینا۔ اس کے ملبوس کی خوشبو کا رخصت کرنے کے لیے گھر تک آنا۔ سب سے اظہارِ محبت کرنا اور کسی سے بھی محبت نہ کرنے کا جمالیاتی بیان، تنہائی کو جنگل قرار دینا۔ شہر میں تماشہ دکھا کر لوٹنے والوں کی کراہوں کا احساس، بالکل نیا منظر نامہ ہے جس پر شاعر کی تخلیقی بصیرت اور وجود کے تجربے کی ندرت رقص کر رہی ہے۔

شاعری کے ذریعۂ اظہار کے تین پہلو ہیں۔ لسانی، فنّی اور عروضی۔ جون ایلیا کی شاعری کے یہ تینوں پہلو بڑی حد تک معیاری ہیں۔ انھیں لسانی صحت کا احساس ہے۔ ایک جگہ خود لکھ رہے ہیں۔

کچھ لوگ کتنی لفظ غلط بول رہے ہیں۔ اصلاح مگر ہم بھی اب اصلاح نہ کریں گے۔

لسانی پہلو میں روزمرّہ اور محاورہ، الفاظ اور تلفّظ کی صحت نیز ادبی و معیاری زبان کے تمام پہلو شامل ہیں۔ فنّی نقطۂ نظر سے بھی جون ایلیا کی شاعری چست و درست ہے۔ ایک جگہ شکستِ ناروا دکھائی دیتا ہے۔ سو اس ضمن میں اساتذہ کے دو رویے واضح ہے۔ عروضی پہلو بھی واضح اور صحیح ہے۔ جون ایلیا اُن باخبر شاعروں میں شامل ہیں، جو عروضی پہلو کی صحت اور اس کی معنویت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب "شاید" کے مقدمہ میں لکھا ہے۔

> "ہمارے گھر کے در و دیوار جس بحر پر سحر و شام جھوما کرتے تھے، وہ بحر تھی "رجز مثمن مطوی مخبون"۔ یہ بحر ہمارے گھر کے دالانوں کمروں، کیاریوں، زینوں اور صحنوں میں آپ ہی آپ گنگنایا کرتی تھی۔ اس بحر میں مرزا سودا نے ایک بہت اچھی غزل کہی تھی..... ہمارے گھر کی فضا سیّدہ طاہرہ قرۃ العین کی غزل پر مرتعش ہوئی جو اس بحر میں کہی گئی تھی:
>
> گر بتو افتدم نظر، چہرہ بہ چہرہ رو برو   شرحِ غمِ تو نا کنم نکتہ بہ نکتہ مو بمو"
>
> (مقدمہ شاید ص ۳۶)

جون ایلیا نے سیّدہ قرۃ العین طاہرہ کا جو شعر لکھا ہے اس کے وزن کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔ اس بحر کا پورا نام اور وزن اس طرح ہے۔

بحرِ رجز مثمن مطوی مخبون مطوی مخبون

مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن

لیکن آخری رکن مفاعلن کی جگہ مخبون مذال بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی

مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلان

واضح رہے کہ مفاعلن کا مفاعلان صرف عروض اور ضرب میں آسکتا ہے۔ حشو دوم اور حشو چہارم میں نہیں آسکتا۔ عروض کے اصولوں کی روشنی میں ان دونوں مقامات پر تسبیغ اور ازالہ کا عمل نہیں ہو سکتا لیکن جون ایلیا کے یہاں یہ صورت نظر آتی ہے۔ عروض کے اس اصول سے سب سے زیادہ انحراف اقبال نے کیا ہے۔ انھوں نے اس کو کافی برتا ہے۔ غالب اور صفر گونڈوی نے بھی اس کو خوب خوب استعمال کیا ہے۔ لیکن ان دونوں کے یہاں بھی اقبال کی طرح عروض کے کلیے سے انحراف نظر آتا ہے۔ یہی صورتِ حال جون ایلیا کے یہاں ملتی ہے مثلاً

خانہ نشین ترے تمام، خانہ نشین ہو گئے چار طرف ہے اثر رہی گرد ملال شہر میں
تمام کا "میم" زیادہ ہے۔

اس کی وفا کے باوجود اس کو نہ پاکے بدگماں کتنے یقین بجھ گئے کتنے گماں گزر گئے
باوجود کی "دال" زیادہ ہے۔

وادیٔ غم کے خوش خرام خوش نفسان تلخ جام نغمہ زناں، نوازناں نغمہ زناں گزر گئے
خرام کا "میم" زیادہ ہے۔

سایۂ ذات سے بھی رم دشت صفات سے بھی رم دشتِ غزل میں آکے دیکھ ہم تو غزال ہو گئے
دیکھ کا "کھ" زیادہ ہے۔

کتنے ہی نشہ ہائے ذوق، کتنے ہی جذبہ ہائے شوق رسم تپاکِ یار سے رو بہ زوال ہو گئے
ذوق کا "ق" زیادہ ہے۔

عشق ہے اپنا پائدار اس کی وفا ہے استوار ہم تو ہلاک ورزشِ فرضِ محال ہو گئے
"پائدار کا "ر" زیادہ ہے۔
اس کے علاوہ دوسرے مصرع میں شکستِ ناروا ہے۔

شام وصال ہے قریب صبح کمال ہے قریب پھر نہ رہیں گے سرگراں شام بخیر شب بخیر
قریب کی "ب" زیادہ ہے۔

تیرا اخیال خواب خواب خلوت جاں کی آب و تاب جسم جمیل نوجواں، شام بخیر شب بخیر
خواب کی "ب" زیادہ ہے

اے شجر حیاتِ شوق ایسی خزاں رسیدگی پوششِ برگ وگل تو کیا جسم پہ چھال بھی نہیں
شوق کا "ق" زیادہ ہے۔

تیرے حضور مجھ سے دور جلتی رہے گی زندگی شعلۂ بجاں رہا ہوں میں شعلہ بجاں رہوں گا میں
دور کی "ر" زیادہ ہے۔

ان اشعار کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ جون ایلیا نے اگرچہ عروضی کلیے سے

انحراف کیا ہے مگر ان کا انحراف لاعلمی پر مبنی نہیں ہے بلکہ انھوں نے غالب اور اقبال کی پیروی میں اس صورت حال کو غالباً جان بوجھ کر روا رکھا ہے۔
مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جون ایلیا کی شاعری اچھی اور سچی شاعری ہے جس میں عہد اور فرد، نیز روایت اور تجربہ ایک دوسرے میں تحلیل ہو کر ایک فکر انگیز جمالیاتی اکائی کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔ انھوں نے اظہار کی ہر سطح پر اپنے فنکارانہ شعور کا ثبوت دیا ہے۔ بحر رجز مثمن مطوی مخبون مطوی۔ مخبون میں جو ایک جگہ اصولی انحراف ہے۔ وہ ان کی عروضی معلومات کے ساتھ غالب و اقبال سے اثر پذیری کی علامت ہے۔

شکیل اعظمی
۵، اعظمی کانجو، کھوڈیار نگر سوسائٹی
(اڈاجن پاٹیا، سورت ۵ ۔ ۳۹۵۰۰۹، گجرات)

...ابوہری
...ٹ روڈ
...ھری ۱۳۵۰۰۳

رہِ منزلِ وفا میں مرے ساتھ چلنے والے
ترے پانو تھک نہ جائیں کہ یہ مرحلہ کڑا ہے

نہ ڈرا مجھے اجل سے، مری موت کے فرشتے
مری زیست کا محافظ تری ذات سے بڑا ہے

وہ سمجھ رہا تھا ایسا، نہیں کوئی اس کا ثانی
کبھی آئینے سے اُلجھا کبھی خود سے لڑ پڑا ہے

چھڑا اے شکیلؔ جب بھی مرا ذکر باوفائی
نہ سوال کر سکے وہ، نہ جواب بن پڑا ہے

...و ہونا جرم نہیں ہے
...م ہونا جرم نہیں ہے
...ا تو یہ ہے
...رو یا مسلم ہو کر ہم
...دھرم کا شور مچا کر
...رحیم کی دے کے دُہائی
...ت کے شعلے بھڑکائیں
...ا بستی آگ لگائیں
...انوں کا خون بہائیں
...اپنے اس وحشی پن پر
...کریں !
...یں !!

پی پی سریواستو رند
کے ۱۱۱ سیکٹر
۱۱ ۔ نوئیڈا

غزل
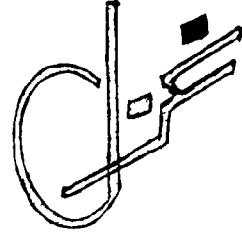
دردکا سونا آج کی شب پگھلائیں گے
شام ڈھلے یادوں کا جشن منائیں گے

مستقبل تاریخ کا شجرہ پوچھے گا
بند کتابوں کو جب کیڑے کھائیں گے

زخمی پلکیں جگنو بن کر چمکیں گی
جب بھی سرکش خواب انھیں یاد آئیں گے

ذہن میں ہیں اب تیز ہواؤں کے طوفاں
سوچ کے خیمے آج کی شب اڑ جائیں گے

پیڑ پہ بیٹھے سوچ رہے ہیں کچھ پنچھی
پھول اگر آئے گا پھل بھی آئیں گے

خون کے باسی دھبّوں کی خوشبو پہنے
کل کے موسم رنگ نیا دکھلائیں گے

خواب خنک، آواز کا چہرہ۔ گل سپنے
رندؔ چلو اب چین سے ہم سو جائیں گے

سلطان کلیم
تلیا۔ پُل بختہ
بھوپال

ادھر غم اُدھر غم غزل کیا کہوں
لہو رنگ موسم غزل کیا کہوں

گھروں میں ہیں زخمی تڑپتے ہوئے
مسیحا، نہ مرہم غزل کیا کہوں

جلے بھی۔ مرے بھی۔ لٹیں عصمتیں
ہر اک سمت ماتم غزل کیا کہوں

سبھی غمزدہ ہیں کوئی خوش نہیں
نہ سیتا نہ مریم غزل کیا کہوں

چلے پھر نہ نفرت کی آندھی کہیں
یہی فکر ہر دم غزل کیا کہوں

چراغ محبت فروزاں تو ہے
مگر لو ہے مدھم غزل کیا کہوں

جواباً کلیمؔ آپ لکھ دیجیے
میں زخمی ہوں ہمدم غزل کیا کہوں

ظہیر
یونی ورسٹی
ن

لیں اُٹھ جائیں گی رعنائیاں رہ جائیں گی
ش دل میں گونجتی شہنائیاں رہ جائیں گی

ی تاریکیاں ہیں ایک شب کی مہماں
ٹی تو دیکھنا تنہائیاں رہ جائیں گی

ہ دل کا نہیں ہوش و خرد کا پاس رکھ
ٹے لوٹے تو بس رسوائیاں رہ جائیں گی

کے اک سیل رواں بحرِ حوادث سے گزر
ہ غم کی سطح تک گہرائیاں رہ جائیں گی

ر رسول نازی
یونی ورسٹی۔ لدھیانہ

اب

فراق میں مرے، وہ بال و پر کتر گیا
اس کی یاد کا نئی اُڑان بھر گیا
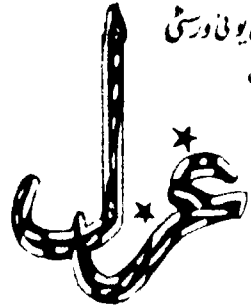
کسی کی نیند ٹوٹتی کوئی تو رات جاگتی
اسی نگر میں رات کو کسی کا خواب مر گیا

ء طائروں کا غول ہی ہماری چھت پہ آ رکا
نہ اپنے گھر کے سامنے وہ کارواں ٹھہر گیا

یہ دوپہر گزر گئی وہ سر کے بال جھڑ گئے
ایاز اتنی دیر میں ہمارا دن گزر گیا

احمد وصی
ای/۲۔ ہنگر نگر
پمپ ہاؤس اندھیری۔ بمبئی

علامت

جب آنسو خشک ہو جائیں
نگاہوں میں کسی تصویر کا سایہ نہیں کانپے
نہ پلکوں پر کبھی دن رات کا احساس ٹھہرائے
نہ سانسوں میں کوئی جھونکا جھُلس کر آگ برسائے
جہاں قدموں تلے بے نام دھرتی ہو
جو نہ جیتی، نہ مرتی ہو
جب اپنی شکل اپنے ہاتھ سے چھو کر نہ پہچانو
جب اپنی انگلیوں کو صرف اک بے جان شے جانو
سمجھ لینا کہ سب کچھ ختم ہے وہ موڑ آیا ہے
سمجھ لینا کہ میری یاد کے پت جھڑ کا موسم ہے

پروفیسر مرتضیٰ علی شاد
بھوپال

غزل

تو ہی نہ تھا، خود اپنے سے بیزار ہم بھی تھے
مدت سے رہنِ سایۂ دیوار ہم بھی تھے

اب خاک ہیں تو کوئی نشاں جانتا نہیں
کل تک امینِ شہرِ طرحدار ہم بھی تھے

موجیں بھی نفرتوں کے کناروں میں بٹ گئیں
دریا سے کیا کہیں ترے حقدار ہم بھی تھے

پہچانتے ہیں خوب نقابوں میں کون تھا
کس سے کہیں کہ رات کو بیدار ہم بھی تھے

مثلِ چراغ، خیمۂ ظلمت میں رات بھر
دستِ ہوا سے برسرِ پیکار ہم بھی تھے

اِک خواب تھا کہ وقت کی سیڑھی اُتر گیا
اِک دور تھا کہ دل کے طرفدار ہم بھی تھے

آنکھوں میں اب ہے خاک ندامت تو کیا ہوا
اِک صبح لالہ رو کے طلب گار ہم بھی تھے

فضل افضل
عقب صدر پوسٹ آفس
یادگیر ۵۸۵۲۰۱

کہاں جا کر رکے، دیکھیں گے ہم بھی
رواں ہے عمر بھی اور سیلِ غم بھی

اُدھر بھی زور طوفاں کا بہت ہے
اِدھر مایوس کب ہوتے ہیں ہم بھی

نہ ہوگا جھوٹ سچ کہنے سے سب کے
خدا کہلائیں گے بے شک صنم بھی

زمانہ ہم نوا تیرا ہے لیکن
ہیں چپ دیر و کلیسا اور حرم بھی

یہ کس کی ہے نوازش ہم پہ افضل
اسیری میں جو ہے اک کیف و کم بھی

ساحل احمد
۹ - ری بک منڈی ۱۲۰، چک، الہ آباد

موسموں کی تاجداری کیا ہوئی
ابرِ نیساں خاکساری کیا ہوئی

دولت و عزت سبھی تو مل گئی
ہاں تمھاری خاکساری کیا ہوئی

ظلم کے سایے چڑھے دیوار پر
دھوپ تیری ہوشیاری کیا ہوئی

آنسوؤں کی تھی سیہ چادر بچھی
رات ایسی برف باری کیا ہوئی

غم زدہ دنیا لگی مجھ کو مگر
اپنی ساحلؔ بُردباری کیا ہوئی

ڈاکٹر شفیق اعظمی
۱۰ - سے بی مظفر گڑھ، دہلی

پھول سبزہ رنگ خوشبو روشنی ہوا لیتے چلیں
جی یہ کہتا ہے جہاں بھی جائیں فضا لیتے چلیں

شوق منزل آشنا کو ہم سفر کر لیجیے
اجنبی ہیں ہم تو کوئی رہنما لیتے چلیں

کیا ضروری ہے کہ وہ ہر بار وعدہ توڑ دے
آیئے آج اور اک عہدِ وفا لیتے چلیں

عہدِ فرعونی میں اتنی بے حسی اچھی نہیں
ہم کلیمِ وقت ہیں تو معجزا لیتے چلیں

جس کی قسمت میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے شفیقؔ
آیئے اس کے لیے بھی اک دیا لیتے چلیں

شگفتہ طلعت سیما
۱۳ دائرہ شاہ غلام علی
رانی منڈی الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

خوش فہمی

میں نے سمجھا تھا کہ اب رات گزر جائے گی
اور ہنستی ہوئی زر کار سحر آئے گی

اسی امید پہ جل اٹھے نگاہوں کے چراغ
خندہ زن رات تھی لیکن مری نادانی پر
یوں بظاہر تو ڈھلی رات، مٹی تاریکی
پھر بھی کرنوں کو نہ پھیلا سکی زر کار سحر

آہ ہر لمحہ بڑھی جاتی ہے تاریکیٔ شب
خواب سے جاگ سکی اب بھی نہ کرنوں کی دلہن
زیست، مذہب کی کمیں گاہوں میں لٹ جاتی ہے
اور پھنک جاتا ہے معصوم خیالوں کا چمن

ہے بجا ساقیٔ شب رنگ و سیہ تاب گیا
پھر بھی میخانے میں خورشید نما جام نہیں
کیا ابھی اٹھنے کو ہیں اور بھی ہنگامے
کیا ابھی خون کی کچھ اور بھی پیاسی ہے زمیں

میں نے سمجھا تھا کہ اب رات گزر جاتی ہے
اور ہنستی ہوئی زر کار سحر آتی ہے

معراج رعنا
۴۵ ممتاز ہوسٹل، آفتاب ہال
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

خیالِ تابندہ کا نوحہ

دشت سے، دریاؤں سے، صحراؤں سے
کوچہ و بازار سے
پوچھتا ہوں میں پتا
"اس کا" گھنے اشجار سے
جس کی آنکھیں دو چراغ ضو فشاں تھیں
جس کے ہونٹوں پر صداقت کے سوا کچھ بھی نہ تھا
جس کا دل تھا
نیک خواہش
نیک ارمانوں کا بحرِ بیکراں
دوڑتا جس کی رگ رگ میں لہو انسانیت کا تھا رد
جو نہ صوفی اور سنتوں کی طرح
بیٹھ کر کٹیا میں کرتا تھا عبادت رات دن
بلکہ وہ تھا اک فرشتہ نور کا
اور رہتا تھا مکان ذہن میں میرے سدا
جس کے دم سے زندگی
روشن تھی سورج کی طرح
روکتا تھا جو گناہوں کا محل
تعمیر کرنے سے مجھے
جب سے وہ بچھڑا ہے مجھ سے
روشنی کے جسم کو
تیرگی کے ناگ نے
ڈس ڈس کے نیلا کر دیا
اٹ گیا گرد بدی سے
آئینہ اعمال کا

کتاب نما
سید شکیل دسنوی
حسن منزل، اڈیہ بازار کٹک۔ اڑیسہ

غزل

پھر سامنے سے خوف کا لشکر بھی آئے گا
پیچھے ہٹے تو گہرا سمندر بھی آئے گا

احساس نارسائی کرے گا جو تیز تر
راہوں میں ایسا خواب سا منظر بھی آئے گا

سچ ہے بہت کشش ہے جزیروں میں خواب کے
راہوں میں آنسوؤں کا سمندر بھی آئے گا

جوشِ جنوں میں سر تو بچا ہے مگر شکیل
وہ تیر آسماں سے پلٹ کر بھی آئے گا

فرید پربتی
بیت الحبیب نگین دروازہ
سری نگر، کشمیر

غزل

رہِ تمنا قدم قدم رہ گزارِ بے سنگِ میل نکلا
قلیل سمجھا میں جس سفر کو وہی بالآخر طویل نکلا

غبارِ وحشت اُسی ڈگر پر جنوں کو بے دست و پا نہ کر دے
غمِ وفا سے غمِ جہاں تک جہاں یہ سہل عجیل نکلا

وہ اک حصن اعتبارِ صبر و شکیب جس کو کہا گیا تھا
وہ اک حصن کہ جو اسے دیکھ کے دل کو خوئے شوق پیل نکلا

وہ ایک لمحہ جو اہلِ دل کو سکھا گیا ہے کہ زندگی ہے
وہ ایک لمحہ ہی شہر جاناں سے کر کے آخر ذلیل نکلا

مآلِ وحشت گر یہی ہے تو پھر یہ کیا شغلِ مدعا ہے
ہر ایک رشتۂ رہِ تمنا میں خونِ دل کا کفیل نکلا

کوثر مظہری
شعبۂ اردو پٹنہ یونی ورسٹی، پٹنہ

گلوں کے رخ پہ یہ گرد و غبار، چہ معنی؟
کرے ہے شاہیں کا کرگس شکار، چہ معنی؟

تقاضا موسمِ گل کا ہے کیا؟ نہیں معلوم
دلوں کی دھڑکنیں ہیں بے قرار، چہ معنی؟

مسلنے پھولوں کو یہ کون باغباں آیا؟
نہا رہی ہے لہو میں بہار، چہ معنی؟

جبینِ وقت پہ کیوں بل پڑے ہیں اے کوثر؟
ہے پائے حال یہ نقش و نگار، چہ معنی؟

ممتاز احمد خاں
۱۴/۱۸۳۷/۱ - بنگر سوسائٹی
کراچی ۳۸ (پاکستان)

کتھا نگر اور افسانچہ کا فن

جوگندر پال کُل وقتی ادیب ہیں۔ وہ افسانے، افسانچے، ناولٹ، ناول اور مضامین سب کچھ لکھتے ہیں۔ "کتھا نگر" ان کے لاتعداد افسانچوں کا ایسا مجموعہ ہے جس میں زندگی اپنی کلیت، جامعیت اور اجتماعیت کے ساتھ نظر آتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر افسانے کے بجائے افسانچے ہی کیوں تخلیق کیے جائیں؟ اس کا آسان سا جواب یہ ہے کہ ناول کے مقابلے میں افسانے کا کینوس کتنا ہی محدود کیوں نہ ہو اس محدود کینوس ہی میں چھوٹے یا بڑے خیال کو سمو دینا مشکل بن جاتا ہے۔ اس کے لیے افسانہ نگار جس کرب سے گزرتا ہے اس کا حال وہ ہی جانتا ہے۔ لیکن افسانچے کا کینوس واقعی اتنا چھوٹا سا ہوتا ہے کہ بڑے کرب سے گزرے بغیر کوئی بھی فن کار ایسے تمام موضوعات کو با آسانی سمیٹ لیتا ہے کہ جن پر افسانہ تخلیق کے لیے زیادہ وقت درکار ہوتا ہے کیوں کہ اس میں ہیئت، پلاٹ، مواد اور تکنیک ملوث ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس افسانچہ میں ہر قسم کے خیال کو طنز سے ممو کرکے آخری جملے یا الفاظ یا یوں کہہ لیجیے کہ پنچ لائن (PUNCH LINE) کے سہارے افسانہ نگار اپنا فنی واد بی مقصد حاصل کر لیتا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فنکار افسانچہ تخلیق کرتے وقت کسی کرب سے نہیں گزرتا۔ وہ یقیناً کرب محسوس کرتا ہوگا لیکن اس کرب کی مدت بہت چھوٹی سی ہوتی ہے۔ جبکہ کبھی کبھار ایک موثر افسانے کی تخلیق میں مہینوں بلکہ برسوں گزر جاتے ہیں۔ تاہم "کتھا نگر" میں جتنے بھی افسانچے ہیں وہ اجتماعی طور پر گزشتہ چار عشروں سے زیادہ جوگندر پال کے ذہن میں پرورش پاتے رہے ہوں گے۔ اور اب موقع پا کر انھوں نے انھیں یکجا کر دیا ہے۔ آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب زندگی کے موزائیک ہیں۔ جو آزادی کے اتنے طویل عرصے میں متشکل ہوتے رہے ہیں۔ اور اگر ان سب کو یکجا کرکے دیکھا جائے تو یہ ایک طویل عہد کی سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی تصویر میں ڈھل جاتے ہیں۔

فنی طور پر تو افسانچہ ایک ہی قسم کا ہوتا ہے۔ عام طور پر افسانچے میں ابتدا، د

... تمام افسانوں کی طرح پایا جاتا ہے۔ یعنی اس کا پلاٹ پہلے ہی سے بنا کر افسانچہ
ترتیب دینا پڑتا ہے اور وحدت تاثر کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اس میں واقعہ یا
کہانی مختصر سا ہوتا ہے۔ مگر اس کا امپیکٹ (impact) دیرپائی کا حامل بھی ہو سکتا
ہے۔ اس کو فنکار چاہے تو پھیلاؤ عطا کر سکتا ہے۔ مگر اس کے لیے لکھنے کو طول
دینا پڑے گا۔ اور ایک کی جگہ کئی واقعات کی تشکیل کرنا ہوگی۔ ایسی صورت میں
افسانچہ افسانہ بن جائے گا۔ لہذا افسانچے کے لیے ضروری ہے کہ یہ اس قدر مختصر ہو کہ
مزید اختصار ناممکن بن جائے۔ اتفاق سے جوگندر پال کے یہاں اس قسم کے
افسانچوں کے ساتھ ساتھ ایسے افسانچے بھی ہیں بشرطیکہ انھیں افسانچے کہا جائے
جن میں واقعہ کی موجودگی قطعاً ضروری نہیں بس ان کے پیش کردہ خیال یا احساس
سے قاری کو خود اپنی ذہنی افتاد طبع کے تحت واقعہ یا واقعات کی تخلیق کرنا ہوگی۔ جوگندر
پال احساس یا خیال کو گزرے ہوئے واقعہ یا واقعات کے نتیجے کے طور پر پیش کرتے
ہیں۔ ان کی مثالیں ذرا ملاحظہ کریں۔

---

(۱) وزیر اعظم نے نہایت امن سے پڑوسی ملک سے جنگ کے اعلان نامے
پر اپنے دستخط ثبت کر دیے اور سگریٹ سلگا کر اطمینان سے
کرسی کی پشت پر سر ٹیک کر مسکرانے لگا۔
اسی اثنا میں اس کے فون کی گھنٹی بجنے لگی
"ہیلو؟"
اس کی بیوی کا فون تھا۔
"کیا؟"
گھبراہٹ سے وزیر اعظم کے پُرسکون چہرے پر بم پھٹ گیا۔
"بے بی کو بخار آگیا ہے؟"

---

(۲) آج بھی میرے ساتھ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔
آج بھی میرے ساتھ کچھ نہ ہوا۔

یہ چند مثالیں اس بات کو سمجھنے کے لیے کافی ہوں گی کہ دونوں قسم کے افسانچوں
سے جوگندر پال نے کیا کام لیا ہے۔ پوری کتاب پڑھنے سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ انھوں نے
معاشرہ کے ہر فرد کی کہانی پیش کر دی ہو۔ ان کے ان افسانچوں میں حکمراں، شوہر و
بیوی، غریب و امیر، سائنس داں، ماہر علم النفس، فنکار، شاعر، ادیب و نقاد، افسر،
ماتحت، شیطان، اس کے چیلے، مذہب کے ٹھیکیدار، غرض ہر طبقے کی نفسیاتی کمزوریں

لغزشوں اور خباثتوں کو آشکار کیا ہے۔ دراصل زندگی پُراسرار بھی ہوتی ہے۔ ایسے ہر شخص آسانی سے نہیں پڑھ سکتا۔ اس کے رازوں سے پردہ صرف فنکار ہی اُٹھا سکتا ہے۔ شاید یہ بھی ایک وجہ ہے کہ قاری کہانی کار کی تلاش کرتا ہے تاکہ وہ اسے انسان کی کہانی دے سکے اور یوں وہ انسان کے بارے میں اپنی آگہی میں اضافہ کر سکے۔ جوگندر پال نے کوشش کی ہے کہ زندگی کے ان گنت رنگوں اور رُخوں میں سے زیادہ سے زیادہ کی عکاسی کر سکیں۔ زندگی رواں دواں ہے۔ واقعات پیدا ہوتے رہیں گے اور افسانے وافسانچے بھی جنم لیتے رہیں گے۔ ایک اچھی بات یہ ہے کہ "کتھا نگر" میں زندگی کے وہ عکس ضرور موجود ہیں جن کا احاطہ انسانی آنکھ کر سکتی ہے۔ اور پڑھنے والے کے لیے یہ کافی ہے کہ جتنا اس نے دیکھا اور جتنا اس نے نہیں دیکھا وہ سب اس کے سامنے انتہائی زیادہ چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی صورت میں منعکس ہو جائے تاکہ اس کے جذبات کی تطہیر ہو سکے اور وہ اس سے جمالیاتی حظ بھی اٹھا سکے۔

"کتھا نگر" کے افسانچوں میں جوگندر پال نے انسان کے اندر چھپے ہوئے لالچ، عداوت، نفرت، بغض، بہیمیت، درندگی، منافقت، ریاکاری، ظلم، استحصال، جبر، دھوکے بازی اور دھوکہ کھانے کی صلاحیت، تشدد، تعصب وغیرہ کے جذبات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان بشری کمزوریوں نے انسان کی زندگی کو جہنم بنا دیا ہے۔ اور مذہب جو انسان کو خیر کی جانب راغب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اسے اس کے ٹھیکیداروں نے غیر موثر بنا کر رکھ دیا ہے۔ لہٰذا انسان کے لیے جائے پناہ کوئی نہیں رہی۔ وہ کہاں کا رخ کرے؟ آگے جہنم اور پیچھے بھی جہنم ہے۔ اس صورت حال سے انسانی دکھوں کی جو فضا پیدا ہوئی ہے اس پر افسانہ نگار کڑھتا نظر آتا ہے اسی لیے وہ طنز کا بھرپور وار کرتا ہے۔ اور کبھی کبھار اس کے لہجہ میں تلخی بھی در آتی ہے۔ مگر اس طنز کے عقب میں دانش کا احساس بھی ہوتا ہے۔ جیسے کوئی اچھوتی بات کہہ دی گئی ہو۔ جیسے کسی راز پر سے پردہ اٹھا دیا گیا ہو اور یہی سب باتیں پڑھنے والے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

"کتھا نگر" کے افسانچوں میں کچھ افسانچے نسبتاً طویل بھی ہو گئے ہیں اور وہ مختصر مختصر افسانوں کا تاثر پیدا کرتے ہیں۔ ان سب کا مشترکہ اسلوب جوگندر پال کا وہی اسلوب ہے جو ان کے افسانوں میں پایا جاتا ہے۔ موضوعات کی فراوانی کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں افسانچوں میں وہی معروف تکنیکیں استعمال ہوئی ہیں جو ان کا طرۂ امتیاز ہیں یعنی یہ کہ انھوں نے اپنی افسانہ نگاری کے فن ہی کو اپنے افسانچوں میں وسیلے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ البتہ اعتراض ان کے ان دوسرے قسم کے

...سا پچوں پر کیا جا سکتا ہے جو دو یا ان سے زیادہ جملوں پر مشتمل ہیں۔ اس بات پر
...ث ہو سکتی ہے۔ آیا کہ یہ افسانچے کہلائے جا سکتے ہیں کہ نہیں اس لیے کہ ان میں
...ندا، وسط اور اختتام کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ ان میں صرف ابتدا ہے اور فنکار
...طرف سے کسی خاص سوچ یا فکر کے اظہار کے طور پر آتے ہیں جیسے کہ کسی مضمون
...ے فکر و دانش پر مبنی جملے نکال لیے گئے ہوں۔ اس کی مثالیں یہ ہیں۔

مجھے اپنے آپ پر شک ہونے لگا ہے
میں کوئی اور ہو گیا ہوں

تمہارے بنا لمحہ بھر کے لیے بھی چین نہیں
مگر تم؟ نامعلوم تم کون ہو، کیا ہو، کہاں ہو؟

یہ لوگ جھوٹ بکتے ہیں ڈاکٹر صاحب میں پاگل نہیں ہوں۔ مجھ سے
صرف یہ غلطی ہوئی ہے کہ ان لوگوں کی باتوں میں آ کے مجھے سچ
بولنے کی عادت پڑ گئی ہے۔

میرا جینا ابھی شروع بھی نہیں ہوا پھر بھی میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔

وہ اپنی سطح سے ایک دم نیچے آ گری اور لوگ باگ اس خوب صورت
نظارے پر جھوم اٹھے۔

"مرے ہوئے لوگ لوٹ کیوں نہیں آتے؟"
"کیوں کہ وہ زمین کی کشش سے کہیں باہر جا پہنچے ہیں"

سارے جنگل میں ایک بس ہی میں تھا جو کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ مجھے
شرمندگی محسوس ہونے لگی۔

"کتھا نگر" میں ایسی کئی اور مثالیں بھی ہیں۔ ان مثالوں سے واضح ہو گیا ہو گا کہ
...ان میں واضح طور پر کوئی کہانی نہیں بیان کی گئی ہے۔ یعنی ان کو پڑھ کر قاری کو ایک یا
...بلکہ سے زیادہ کہانیاں اپنے تخیل اور مشاہدے کے زور پر تخلیق کرنا پڑیں گی لیکن
...یہ مطالبہ صرف اس قاری سے ہی ہو سکتا ہے جو فکشن میں گہری دلچسپی رکھتا ہے

اور اس کا مشاہدہ انسانوں کے بارے میں گہرا ہو ورنہ عام قاری روزِ آفرینش سے لے کر آج تک پکے پکائے مال کے حصول میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اتفاق ایسا ہے کہ فکشن کی دنیا کے بڑے فن کاروں نے ایسی تحریریں ہمیں دی ہیں جن میں خاصی تہہ داریاں ہیں اور ان سے ہر قسم کا قاری اپنے اپنے تجربے، مشاہدے اور لیاقت کے حساب سے حظ اٹھاتا ہے یعنی فکشن کی تاریخ بتاتی ہے کہ ابلاغ کا بوجھ خود فنکار اٹھاتا ہے۔ خیر یہ نکتہ تو قابلِ بحث ہے ہمیں چاہیے کہ ہم یہ دیکھیں کہ مذکورہ مثالیں افسانچے کی تعریف پر پوری اترتی ہیں کہ نہیں۔ درحقیقت مذکورہ مثالیں افسانچہ ہونے کا تاثر ضرور دیتی ہیں لیکن اپنی ذات میں مکمل طور پر افسانچہ نہیں ہیں انھیں پڑھ کر APHORISMS کا خیال آتا ہے جس کے لیے معروف محقق اور شاعر مشفق خواجہ نے "بلیغیات" کی اصطلاح آج سے چند سال قبل اس وقت استعمال کی تھی جب اسی قسم کی جرمن تحریریں ترجمہ کی شکل میں پاکستان کے ادبی رسالوں میں شائع ہو رہی تھیں۔ یہ تحریریں خلیل بن جبران اور دیگر مفکرین اور ادیبوں کے تحریر کردہ ان نقروں کی مانند ہیں۔ جن میں دانشورانہ وژن (VISION) پایا جاتا ہے۔ اور جنھیں ہم مقولوں کی حیثیت سے استعمال کر سکتے ہیں۔ مگر جوگندر پال کی "کتھا نگر" سے یہ مثالیں عقل و دانش کے اظہار کے مقابلے میں ایسی کہانیوں کو پیش کرتی ہیں جو ان میں واضح طور پر موجود نہیں لیکن تخیل اور مشاہدے نیز اپنے تجربے کو تحریک دینے سے اسی ذہن میں منعکس ہوتی ہیں۔ اسی لیے یہ سوال بار بار پیدا ہوتا ہے آیا کہ یہ افسانچے کے ذیل میں آتی ہیں کہ نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح ساٹھ کی دہائی کے بعد افسانہ نگاروں نے تجربے سے کام لیتے ہوئے افسانے میں ہیئت، تیکنیک اور مواد کے تجربے کیے اور متنوع اسالیب ایجاد کیے اسی طرح غالباً جوگندر پال نے جو کہ مطالعے اور مشاہدے اور تجربے کے خزانوں کے حامل ہیں، افسانچے کے روایتی ڈھانچے میں فنی و تیکنیکی تجربہ کیا ہے۔ اپنی فکر یا یوں کہہ لیجیے کہ اپنے وژن (VISION) کی رونمائی کے لیے جہاں انھیں کوئی قصہ یا ماجرا سوجھ گیا وہاں انھوں نے بڑی خوب صورتی سے وہ افسانچہ تخلیق کیا جس میں تیز رفتار ابتدا، اٹھان نقطۂ عروج، ردِ نقطۂ عروج اور اختتام کی وحدتِ تاثر کے ساتھ دروبست کا اہتمام ہے اور جہاں انھوں نے خارجی واقعات یا داخلی کیفیات کے نچوڑ کو بطور خیال، احساس یا فکر پیش کرنا چاہا ہے اس جدید قسم کے افسانچے کی صورت میں پیش کر دیا ہے جو بلیغیات (APHORISMS) یا اس قسم کی کسی اور ہیئت کا اثبات کرتا ہے اور جہاں تک ابلاغ کا تعلق ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان جدید افسانچوں میں اس کا مسئلہ بالکل پیدا نہیں ہوتا اس لیے کہ یہ چیستان نگاری کے تابع ہو کر تخلیق نہیں کیے گئے ہیں۔ ان کے پیچھے ایک مانے اور منجھے ہوئے فنکار کا تجربہ جھلکتا ہے۔

اور یوں ان میں پوشیدہ دانائی اور گہرے مفاہیم کا عام و خاص قاری کو فوراً ہی ادراک ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ قائم و دائم رہے گی کہ کہانی پن یا افسانویت کا جہاں تک تعلق ہے وہ جوگندر پال کے انہی افسانچوں میں ملے گی جن میں قصہ ہے، جن میں کرداروں کی حرکات و سکنات کا بیان ہے، جن میں مکالمہ ہے جن میں کوئی خاص موضوع ہے۔ اور جن کا آخری جملہ یا پنچ لائن (Punch line) قاری کو براہ راست اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور جہاں تک ان کے جدید افسانچوں کی حیثیت کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان میں گہرے کاٹ دار طنزیہ فقروں یا بلیغیات (Paradoxes) والی کیفیات پوشیدہ ہیں اور ان کے مطالعے کا بلاشبہ ایک علیحدہ ہی قسم کا لطف ہے۔

فارم IV حسب قاعدہ 8

بابت "کتاب نما" نئی دہلی ۲۵

۱۔ مقام اشاعت : جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰

۲۔ وقفہ اشاعت : ماہنامہ

۳۔ پرنٹر کا نام : سید وسیم کوثر ہندستانی پتا: جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰

۴۔ پبلشر کا نام : " "

۵۔ اڈیٹر کا نام : شاہد علی خاں " "

مالکان کا نام اور پتے : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰

چیرمین: مالک رام بویجہ سی ۴-۵۰ ڈیفنس کالونی نئی دہلی ۲۴-۱۱۰۰

۱۔ ڈائرکٹر: نواب اقبال محمد خاں کف پریڈ کولابہ بمبئی ۵

۲۔ " سید مجتبیٰ حسین زیدی۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰

۳۔ " ضیاء الحسن فاروقی۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰

۴۔ " ڈاکٹر سید ظہور قاسم اے۔ ۵ ڈیفنس کالونی نئی دہلی

۵۔ " بشیر الدین احمد وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵

کمپنی کے سرمایے کے ایک فیصد سے زیادہ کے حصے دار جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵۔ اسلامی ہیم خانہ کینڈی سی ویس بمبئی۔

میں سید وسیم کوثر تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں

دستخط
سید وسیم کوثر
۲ مارچ ۱۹۹۳ء

کتاب نما
مسعود الحق
۲۸۵ گلی نمبر ۵، ذاکر نگر
نئی دہلی ۲۵-

سرگذشت ایک گِدھ کی

ولاس سارنگ مراٹھی زبان کے ایک بہت بڑے ادیب ہیں۔ افسانے اور ناول کے علاوہ انھوں نے تنقید کے موضوع پر بھی لکھا ہے اور شاعری بھی کی ہے۔ ان کی مختصر کہانیوں کا ایک مجموعہ فرانسیسی زبان میں بھی چھپ چکا ہے۔ اور دوسری تخلیقات انگریزی زبان میں ترجمہ ہو کر قبول عام ہو چکی ہیں۔ ولاس سارنگ کی دنیا تخیلات اور حقائق کے درمیان کی دنیا ہے اور اسی وجہ سے ان کے یہاں کافکا، کامو، بیکٹ اور بورگیس جیسے عظیم فنکاروں کے اثرات کا پرتو نظر آتا ہے۔ مگر سارنگ کی آواز ان کی اپنی آواز ہے۔ اور اسی لیے ان میں ایک عظیم ادیب ہونے کے تمام شواہد ملتے ہیں۔

میرے بازو کو ٹوٹے ہوئے آج چار دن ہو چکے ہیں۔ مگر چونکہ بازو پوری طرح ٹوٹا نہیں تھا اس لیے وہ ابھی پورے طور پر بے کار نہیں ہوا ہے۔ میں ابھی اسے ہلا سکتا ہوں، حرکت دے سکتا ہوں۔ اگرچہ ایسا کرنے میں مجھے تکلیف بہت ہوتی ہے۔ میں اپنے اس ٹوٹے ہوئے بازو سے تھوڑا بہت اڑ بھی سکتا ہوں مگر اس طرح اڑنے میں مجھے شدید درد ہوتا ہے۔ بہت شدید درد۔

میرا یہ حال تم جیسے انسانوں کی قطعی بے وجہ، بے ضرورت اور محض بیکار حرکتیں کرنے کی عادت نے کیا ہے۔ کئی دن ہوئے آبادی سے بہت دور ایک کھلے میدان میں، دوسرے گدھوں کے ساتھ، میں ایک مردہ گائے کو کھا رہا تھا۔ سارے گدھ مری ہوئی گائے کے جسم کے بہترین حصوں کو حاصل کرنے کے لیے چھین جھپٹ میں لگے ہوئے تھے۔ ہم سب ہی کھانے میں کچھ اتنے مشغول تھے کہ ہم نے اپنے پاس سے ایک نوجوان لڑکے کو گزرتے ہوئے دیکھا بھی نہیں

اس لڑکے نے چلتے چلتے ایک پتھر اٹھایا اور اسے بڑے زور سے ہماری طرف کھینچ مارا میری بدقسمتی کہ وہ پتھر آکر سیدھا میرے بازو کے جوڑ پر پڑا۔ اچانک اور ناقابل برداشت درد اٹھنے کی وجہ سے میری چونچ سے گوشت کا وہ ٹکڑا بھی گر گیا جو میں اس وقت کھا رہا تھا۔ اور اسے لے کر اڑنا چاہتا تھا۔ اڑنے کی کوشش میں تکلیف اور بھی شدید ہو جاتی تھی۔ مجبوراً میں نے اڑنے کا خیال چھوڑ کر اچھل اچھل کر آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ میرے ساتھ کے دوسرے گدھوں نے خطرے کو بھانپ کر پر تول لیے۔ مگر جب انھوں نے دیکھا کہ جس لڑکے نے پتھر مارا تھا وہ اسی بے نیازی کے ساتھ چلا جا رہا تھا تو وہ پھر نیچے اتر آئے۔ اور مردہ جانور کو کھانے میں پہلے ہی کی طرح پھر جٹ گئے۔ میں بیٹھا اسے کر اس لڑکے کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ وہ کون سا انسان تھا جس نے لڑکے کو پتھر اٹھا کر ہمیں مارنے پر اکسایا۔ بظاہر اس مردار جانور میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ گائے کا گوشت کھاتے ہیں۔ ان گایوں کا گوشت بھی جن کی موت قدرتی اسباب کی بنا پر ہوئی ہوتی ہے۔ مگر ہم جس لاش کو کھا رہے تھے وہ تو سڑنا شروع ہو چکی تھی۔ اور مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی آدمی وہ چاہے جتنا بھی بھوکا کیوں نہ ہو ایسے گوشت کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ پھر ایسی صورت میں کسی کا کیا بگڑتا تھا اگر کچھ بھوکے گدھ ایک مرے ہوئے جانور کی لاش سے نہ صرف یہ کہ اپنا پیٹ بھر رہے تھے بلکہ ایک بے کار اور بے مصرف چیز کا بہتر استعمال بھی کر رہے تھے۔ پتھر مارنے والے لڑکے کے پاس اس طرح پتھر مار کر میرے بازو بالکل بے کار کر دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔ بہر حال اسی قسم کی حرکتیں ہیں جو تم انسان لوگ کرتے ہو۔ اور پھر شکایت کرتے ہو دنیا اور اس کے طور طریقوں کی۔

اپنے ٹوٹے ہوئے بازو کو گھسیٹتے ہوئے اور اچھل اچھل کر میں کھلے میدان میں تنہا کھڑے ہوئے ایک اونچے درخت کی طرف بڑھا اور اڑ کر اس کی ایک شاخ پر بیٹھنے میں کسی طرح کامیاب ہو گیا۔ یہ درخت مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ میں عام طور پر اس کی سب سے اونچی شاخ پر بیٹھ کر ہر طرف پھیلے ہوئے سناٹے کا لطف اٹھایا کرتا تھا، مگر اب جب کہ میں ایک بازو سے بالکل معذور ہو چکا ہوں، درخت کی سب سے نچلی شاخوں پر بیٹھ کر ہی مطمئن ہوں۔

اس شاخ پر میں دن بھر بیٹھا رہا۔ میرے تمام ساتھی اپنا اپنا پیٹ بھرنے کے بعد اڑ کر اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف جا چکے تھے۔ کسی معذور اور اپاہج کے ساتھ کون رہنا چاہتا ہے۔ دنیا کے یہی طریقے ہیں۔ اب تنہائی میرا مقدر

تھی۔ اور میں نے اس سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اور انتہائی صبر و ضبط کے ساتھ اپنے بازو کے ٹھیک ہونے کا منتظر تھا۔ میں نے پورے دو دن اسی ایک جگہ پر بیٹھے بیٹھے گزار دیے۔ مگر مجھے اپنے بازو میں بہتری کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ ایک زمانہ تھا جب میں نوجوان تھا ایسی ایسی چوٹیں اگر فوراً نہیں تو دو ایک دن میں خود بخود ٹھیک ہو جایا کرتی تھیں۔ مگر اب میں بوڑھا ہو گیا تھا۔ میری عمر کافی ہو چکی تھی۔ اور میرے بازوؤں اور میرے ہڈیوں میں اب وہ پہلی سی نہ تو توانائی تھی اور نہ ہی پہلی سی سکت۔ تم یہ سوال کر سکتے ہو اب جب عمر ساتھ نہیں دیتی تو پھر بازوؤں کو پھیلانے کی کوشش ہی کیوں؟ مگر کیا کروں، میں ان پرندوں میں سے نہیں ہوں جو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ میں زندہ رہنا چاہتا تھا میں فعال رہنا چاہتا تھا۔ آسمانوں کی بے کراں بلندیوں میں اڑنا چاہتا تھا۔ اور ان بلندیوں سے انسانی زندگی کی بے معنی پیچیدگیوں کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اور پھر مجھے بہرحال اپنی خوراک کے لیے تو ہاتھ پاؤں ہلانے ہی تھے۔

جب مجھے اس بات کا یقین ہونے لگا کہ میرا بازو ٹھیک نہیں ہوگا تو میں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ اب مجھے کیا کرنا ہوگا۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ اچانک مجھے شہر میں بنے ہوئے چڑیوں کے اسپتال کا خیال آیا۔ ہم گدھوں نے اس اسپتال کا بس ذکر ہی سنا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ اس اسپتال کے ڈاکٹر کا تعلق جین فرقے سے ہے۔ میں اس بات سے بھی واقف تھا کہ ہمارے ملک میں اکثریت ہندوؤں کی ہے۔ اور یہ کہ وہ سب کے سب انسانی ہمدردی، ایثار و قربانی، رواداری اور محبت کے پجاری ہیں۔ میں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ جین فرقے کے لوگ اہنسا پیار و محبت اور رواداری جیسی قدروں کو دوسروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی عزیز رکھتے ہیں۔ اور ان اعلیٰ قدروں کی ترویج و تبلیغ میں بھی دوسروں سے آگے ہی رہتے ہیں۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ایسے ہی اعلیٰ خیالات ہوں گے جن کی بنا پر اس جین ڈاکٹر نے صرف پرندوں کے علاج کے لیے ایک الگ اسپتال قائم کیا۔ ڈاکٹر کے اس کام کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

مگر ہم گدھوں کے نقطۂ نظر سے اسپتال کے قیام کے خیال کے پیچھے ایک بہت بڑی کمی تھی اور وہ یہ کہ اس اسپتال کے دروازے صرف ان پرندوں کے لیے کھلے ہوئے تھے جو دانہ دنکا یا پھول پتیاں کھانے والے ہوتے تھے۔ یہ سمجھ لیجیے کہ سبزی خور، ان کے مقابلے میں کوّے اور گدھوں جیسے کسی جانور کا علاج اس اسپتال میں ہونا ممکن نہیں تھا۔ کبوتروں، گوریوں جیسی دوسری خوب صورت چڑیوں کا علاج اس اسپتال میں بڑی دلجوئی اور توجہ سے کیا جاتا تھا۔

اسپتال کے اوپر اڑتے ہوئے محض تجسس کی بنا پر میں اکثر اسپتال کی کھڑکیوں میں سے وہاں ہونے والی سرگرمیوں کا جائزہ لیا کرتا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ مریضوں میں کچھ کو بازو ٹوٹنے کی تکلیف ہوتی تھی، کچھ کے پاؤں میں چوٹ ہوتی تھی۔ اور کسی کو کوئی دوسری تکلیف۔ وہاں ان سب کا نہایت اچھا علاج ہوتا تھا۔ دوائیں ملتی تھیں، مرہم پٹی ہوتی تھی۔ پرہیزی کھانا اور پانی بھی فراہم کیا جاتا ہے۔ جب وہ صحت مند ہو جاتے تھے تو اسپتال کی کسی کھڑکی یا پھر چھت پر سے انھیں اڑا دیا جاتا تھا۔ میں نے ایسے شفا پانے والے کبوتروں اور گوریوں کو اسپتال سے خوش خوش اڑ کر نکلتے ہوئے اکثر دیکھا تھا۔ اگرچہ میں اس حقیقت سے واقف تھا کہ یہ ساری سہولتیں اور آسانیاں گدھوں کے لیے نہیں ہیں مگر اس تفریق کے بڑے ہونے کا مجھے کبھی احساس نہیں ہوا۔ ساری زندگی طاقت ور اور صحت مند رہا تھا۔ اس لیے میں نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں کہ کبھی ایسا وقت بھی آ سکتا ہے کہ مجھے بھی سہولتوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

اب صورت حال مختلف تھی۔ میں معذور ہو چکا تھا۔ اور جین ڈاکٹر کے اسپتال کا خیال بار بار میرے ذہن میں آنے لگا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ وہاں میرے داخلے کا کیا کوئی امکان نہیں ہے؟ کیا میری حالت زار کو دیکھ کر وہاں کے ڈاکٹر کے دل میں رحم کا جذبہ نہ ہوگا؟ جوں جوں وقت گزرتا گیا میرے بازو کی تکلیف بڑھتی گئی۔ تکلیف میں جتنا اضافہ ہوتا جاتا تھا میرا یہ یقین پختہ ہوتا جاتا تھا کہ اسپتال میں میرا علاج ضرور کر دیا جائے گا۔ میں نے سوچا کہ سماجی تنظیم کی منطق بلاشبہ ترمیم و تنسیخ کی قایل نہیں ہوتی۔ مگر پھر بھی وہ کسی مخلوق سے جو ابھی زندہ رہنا چاہتی ہے، صرف نظر نہیں کر سکے گی۔

اسپتال میرے درخت سے کافی دور تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے مجھے مکانات سے گھری ہوئی گلیوں سے گزرنا ہوگا۔ چونکہ میں وہاں تک اڑ کر نہیں جا سکتا تھا اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اسپتال پہنچنے کی کوشش مجھے دیر رات میں کرنا چاہیے۔ رات کو جب مجھے یقین ہو گیا کہ بستی کے لوگ اب گہری نیند سو گئے ہوں گے، میں اپنے درخت سے نیچے اترا اور چھپتا چھپاتا کبھی اچھلتا اور کبھی کبھی تھوڑا تھوڑا اڑ کر کسی نہ کسی طرح میں اسپتال تک پہنچ ہی گیا۔ بہ دقت تمام میں اسپتال کی دیوار پر چڑھا اور ہمت کر کے اندر اتر گیا۔ وہاں کچھ دیر دم سادھے بیٹھا رہا، بازو کی تکلیف جو یہاں تک پہنچنے سے بہت بڑھ گئی تھی، تھوڑی دیر بعد کچھ کم ہوئی اور میں رات کی تاریکی میں ایک جھاڑی کے اندر چھپ کر بیٹھ گیا۔

صبح ہوئی، سورج نکلا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر آ گیا۔ میں انتظار کرتا رہا کہ ڈاکٹر

حسب معمول اسپتال میں داخل مریضوں کو دیکھنے کا اپنا پروگرام پورا کرنے۔ کچھ عرصے بعد جب مجھے اندازہ ہوگیا کہ اب ڈاکٹر نے اپنے ضروری کام ختم کرلیے ہیں تو میں نے ہمت کی اور اپنی ساری ناتوانیوں کو یکجا کر کے کسی نہ کسی طرح اڑ کر ایک کھڑکی میں جاکر بیٹھ گیا۔ کھڑکیوں میں اگرچہ سلاخیں وغیرہ نہیں لگی تھیں مگر مجھ میں سیدھا اڑ کر اندر جانے کی نہ تو سکت تھی اور نہ ہی ہمت۔ اور شاید اس طرح اچانک اندر پہنچ جانے میں میرا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ ڈاکٹر ایک ایک مریض کو دیکھتا ہوا اس کھڑکی کے بالکل نیچے پہنچ گیا جس میں میں بیٹھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر مریضوں کو دیکھنے میں کچھ ایسا مصروف تھا کہ اتنے قریب ہونے کے باوجود اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ میں نے سہمے سہمے انتہائی آہستہ سے ایک آواز نکالی کہ شاید ڈاکٹر میری طرف متوجہ ہوجائے چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ ڈاکٹر چونک پڑا۔ اس نے گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں اس کی آنکھوں میں ناراضگی کی جھلک دیکھ سکتا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت اور نفرت کے تاثر بھی بہت واضح تھے۔ ڈاکٹر نے مجھے دیکھتے ہی منہ سے زور زور سے "شو' شو" کی آواز نکال کر مجھے اڑانا چاہا۔ میں نے انتہائی ملتجیانہ لہجے میں کہا "ڈاکٹر صاحب! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی' آپ ذرا میری بات سن لیجیے"۔ "شو' شو' اس دفعہ ڈاکٹر نے اور زور سے چلا کر مجھے وہاں سے فوراً بھاگ جانے کا اشارہ کیا۔

"ڈاکٹر صاحب' ڈاکٹر صاحب' بھگوان کے لیے صرف میری عرض سن لیجیے"

اتنا سننا تھا کہ ڈاکٹر نے زور سے چلا کر کہا "کوئی ہے'؟...... ذرا مجھے کوئی ڈنڈا لاکر دو۔" ڈاکٹر کے دونوں اسسٹنٹ تو اس سے کچھ دور تھے ڈاکٹر کی آواز نہ سن سکے۔ موقعے کو غنیمت جانتے ہوئے میں نے سوچا کہ جلد کر جلدی اپنا حال ڈاکٹر کے گوش گزار کردوں۔ "ڈاکٹر صاحب' میری بات سن لیجیے۔ میں آپ کے اسپتال میں کھانا مانگنے نہیں آیا ہوں۔ مجھے یہاں آ کے کبوتروں اور گوریوں کو پریشان بھی نہیں کرنا ہے۔ میں یہاں ایک مریض کی حیثیت سے آیا ہوں...... علاج کی خاطر' ایک معذور کی حیثیت سے ڈاکٹر مجھے غصے سے دیکھتا رہا۔

میں نے پھر کہنا شروع کیا" دیکھیے ڈاکٹر صاحب' میرے بازو کی طرف دیکھیے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا زخمی بازو پھیلایا۔ بازو پھیلا دکھانے میں مجھے جو ناقابل برداشت تکلیف ہوئی اسے میں کیا بتاؤں" ڈاکٹر صاحب' یہ زخمی ہوگیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہڈی ٹوٹ گئی ہے — مجھے محسوس ہوا کہ جیسے بالکل بے ارادہ' ڈاکٹر نے میرے بازو کی طر

دیکھا اور اب اس کی آنکھوں میں پہلے والا غصہ بھی مجھے نظر نہیں آیا۔ اس صورت حال سے میری ہمت بڑھی، میں نے نسبتاً پرامید لہجے میں کہا "ڈاکٹر صاحب، مجھے بہت تکلیف ہے، اور اگر میرا یہ بازو مستقل طور پر بے کار ہو گیا تو میں زندہ کیوں کر رہوں گا۔ کیا آپ میرا علاج کریں گے؟ بھگوان کے لیے ڈاکٹر صاحب"

"بالکل نہیں" ڈاکٹر نے چلا کر جواب دیا۔ اور اپنا ہاتھ ہوا میں زور سے ہلاتے ہوئے کہا "ہم یہاں تم جیسے پرندوں کا علاج نہیں کرتے ہیں۔ تم جاؤ، یہاں سے فوراً نکل جاؤ۔"

میں نے پھر التجا کی "ڈاکٹر صاحب، بھگوان کے لیے یہ نہ کہیے۔ آپ چڑیوں کے لیے کتنا نرم دل رکھتے ہیں۔ آپ نہ جانے کب سے ان کی اتنی قابل قدر خدمت کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب۔ کیا میں پرندہ نہیں ہوں پھر مجھ سے یہ سوتیلوں جیسا سلوک کیوں؟"

"تم غلاظت کھاتے ہو، تم گوشت کھاتے ہو، ہر طرح کا گوشت، چوہے، کتے سور اور دوسرے مویشیوں کا گوشت.... ہر گندی چیز...." ڈاکٹر نے کہا۔

"جی ہاں ڈاکٹر صاحب! میں یہ تمام چیزیں کھاتا ہوں.... میں اس سے انکار نہیں کر سکتا... مگر آپ مجھے صرف اس بناء پر تو باہر نہ نکالیں گے کہ میری خوراک کچھ لوگوں سے مختلف ہے..... کیا آپ مجھے، محض اسی وجہ سے باہر نکال دیں گے؟..... یہ ظالمانہ سلوک صرف اس لیے کہ میں کیا کھاتا ہوں"

"نکل جاؤ.... میں کچھ اور نہیں سننا چاہتا، اپنی ذہانت اپنے پاس رکھو" ڈاکٹر نے چلا کر کہا، اب اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔

اپنے لہجے کو بدستور نرم رکھتے ہوئے میں کہتا رہا۔ "ڈاکٹر صاحب، ایک لمحے کے لیے ذرا سوچیے آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کون کیا کھاتا ہے..... بالکل بھی فرق نہیں پڑتا..... کبوتر دانہ کھاتے ہیں، اور ہم گوشت..... یہ سب مایا ہے دھوکہ ہے محض خیال ہے۔ اور خیال کی اس دنیا میں ہر چیز ایک ہی جیسی ہے۔"

"اچھا تو تم اب مجھے فلسفہ پڑھا رہے ہو" ڈاکٹر نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "بڑے ذہین ہو۔ کیوں؟ بہر حال بس بہت ہو چکا، اب تم یہاں سے چلے جاؤ، بس فوراً دفع ہو جاؤ۔"

ایک آخری کوشش کرتے ہوئے میں نے پھر التجا کی "ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب، اگر آپ نہیں چاہتے تو مجھے اپنے اسپتال میں داخل نہ کیجیے، میرا علاج آپ یوں کر دیجیے کہ میں ایک باہری مریض کی طرح آپ کو آکر دکھا لیا

کروں گا ... ڈاکٹر صاحب اگر آپ ایسا ہی کردیں تو میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہ بھولوں گا۔"

"اونھ، تم جیسی غلیظ مخلوق کا علاج؟ میں تمھیں دس فٹ لمبے بانس سے بھی نہیں چھوؤں گا۔" بس اب تم یہاں سے چلے جاؤ ..... میں کہتا ہوں جاؤ۔"

اسی وقت ایک اسٹنٹ ڈاکٹر وہاں آگیا۔ ڈاکٹر نے اس سے کہا کہ "ذرا جاؤ اور جلدی سے ایک ڈنڈا لا کر مجھے دو۔"

مجھے ایسا لگا کہ یہاں میرا علاج ہونے کی بجائے میرا انجام یہ ہوگا کہ میری کچھ اور ہڈیاں توڑ دی جائیں گی۔ میں نے واپس ہونے کا فیصلہ کیا۔ میں اڑ کر کھڑکی سے نیچے آگیا۔ اسپتال کی دیوار کے پاس پہنچا۔ بہ مشکل اس کے اوپر سے کود کر اسپتال سے باہر آگیا۔ اور کبھی اڑتا کبھی کودتا ہوا کسی نہ کسی طرح میں شہر سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔

اب میں اپنے درخت کی اسی نچلی شاخ پر بیٹھا ہوں، میرے ذہن پر غم و اندوہ کی بدلیاں ہیں۔ اور دل افسردہ۔ مگر اب میرا یہ دکھ اور میری یہ افسردگی صرف میرے اپنے لیے نہیں ہے۔ بلکہ یہ تم سارے بنی نوع انسان کے لیے بھی ہے۔ مجھے اب تم پر اتنا رحم آتا ہے جتنا اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔ ان چیزوں کی کمی نہیں ہے جو تمھارے درمیان تفرقہ پیدا کرنے کا سبب بنتی ہیں، تو کیا اب خوراک جیسی عام چیز کو بھی تم باہمی تفریق اور امتیاز پیدا کرنے والی چیز بنا دینا چاہتے ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملے میں دنیا کا کوئی ملک بھی ہماری طرح نہ ہوگا۔ دوسرے ملکوں میں تقریباً سارے ہی لوگ گوشت کھاتے ہیں، یہ صرف ہمارا ہی ملک ہے جو گوشت خوروں اور سبزی خوروں میں بٹا ہوا ہے۔ یہ بڑی بدقسمتی ہے، مجھے بتاؤ تم اس ملک کے مستقبل کے بارے میں کیا امیدیں رکھ سکتے۔ جو جہاں خوراک لوگوں کو ایک دوسرے کے لیے بے گانہ بنا دیتی ہو۔ ایسا سماج کبھی ترقی کر سکتا ہے؟ خوش حال ہو سکتا ہے؟

اپنے پسندیدہ درخت کی سب سے نچلی شاخ پر بیٹھا ہوا میں ایسے ہی سوالات پر غور کر رہا ہوں۔ میری تھکن اور میری مایوسی ہر لمحہ بڑھتی جاتی ہے۔ میرے بازو کا درد اب بڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ میرے سارے جسم میں پھیلتا جا رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں اس دنیا میں اب بہت دن رہنے والا نہیں ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اگلے جنم میں میں کیا بنوں گا۔ مگر میں بھگوان سے صرف یہی دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس ملک میں

انسان کی شکل میں نہ پیدا کرے۔
اب شام کا دھندلکا چھا رہا ہے۔ اور مغربی افق پر اودے اور نارنجی نہ ہے
رنگ دکھا رہے ہیں۔ آسمان پر تیزی کے ساتھ سیاہی بڑھتی جا رہی ہے
م بھی ہندستان کی دوسری شاموں کی طرح ایک حسین اور خوب صورت
ہے۔ چاند کا ابھی کوئی پتہ نہیں ہے۔ غالباً وہ دیر سے نکلے گا۔ یہ
و سکتا ہے کہ آج کی رات سیاہ چاند کی رات ہو۔ تاریک ہوتے ہوئے
سان میدان پر، اس افسردہ و غمگین لمحے میں نظر ڈالتے ہوئے میرے
سکون و اطمینان کا ایک عجیب نامانوس سا احساس طاری ہو رہا ہے۔
، ایسا لگ رہا ہے کہ بہت ممکن ہے کہ آج اس اندھیری رات میں میری
ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزاد ہو کر آسمان کی اتھاہ بلندیوں میں
ز کر جائے۔ ●●

(والس سانگ صاحب اور پبلیشرز پنگوئن کے شکریے کے ساتھ)

مشرون کمار ورما
۸۰/۱۱ کوچہ لاہوریا امرتسر

(کہانی)

چرواہا کہاں جائے گا۔

گانو والوں کو وشواس ہو چلا تھا کہ حویلی پر بدروحوں کا قبضہ ہے۔۔۔ اور گانو کی بربادی اب یقینی ہے۔

گانو کے بیچوں بیچ، ایک ٹیلے پر کھڑی اس ویران پرانی اور منحوس حویلی نے گانو والوں کو ایک مدت سے پریشان اور خوف زدہ کر رکھا تھا۔ گانو والوں کی سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ حویلی تھی کس کی۔ کس سے جاکر اس کا حال کہیں۔ کچھ عرصے سے وہ حویلی بہت تیزی سے اپنی تمام تر عظمت و شان و شوکت اور روایات سے محروم ہوتی جارہی تھی۔ حویلی سے عجیب ڈراونی سی آوازیں آتی رہتیں۔ کبھی شور اٹھنے کا سا احساس ہوتا اور کبھی ایک دم سناٹا چھا جاتا۔ گانو والوں کا خیال تھا حویلی میں جرائم پیشہ لوگوں نے ڈیرا ڈال رکھا ہے اور وہ وہیں سے اپنے ناجائز دھندے چلاتے ہیں۔

پھر کچھ لوگ جلوس کی شکل میں گانو میں وارد ہوئے۔ ڈھول ڈھمکا ہوتا۔ گانو والوں کو حویلی کے سامنے والے وسیع میدان میں اکٹھا کیا جاتا اور انھیں بتایا جاتا کہ اب وہ حویلی ان کی دیکھ ریکھ میں آگئی ہے۔ اس کی کایا کلپ کی جائے گی۔ کچھ ایسے ٹھوس اقدام کیے جارہے ہیں جس سے حویلی اور گانو کا نقشہ ہی بدل جائے گا۔ وہاں اسکول، کالج، اسپتال، فلاحی مراکز اور ایسے ہی کچھ اور ادارے قائم کیے جائیں گے۔ لوگ پُر امید نگاہوں سے حویلی کی طرف دیکھتے اور آنکھوں میں سہانے سپنے سنجوئے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔ رات کو گانو کے باہر رت جگا ہوتا۔ جشن منایا جاتا۔ چراغاں کیا جاتا اور شہر سے آنے والوں کی خوب خاطر مدارات کی جاتی۔ اس موج میلہ کے بعد وہ لوگ چلے جاتے۔ حویلی جوں کی توں رہتی۔ کبھی کبھار کوئی دیوار یا چھت گر جاتی۔ لوگوں پر مایوسی اور بیزاری طاری ہونے لگتی۔ ان کی پریشانی اور خوف میں اضافہ ہوجاتا۔ گانو کے باہر ندی کے کنارے اس چرواہے کی سمادھی پر چراغ جلا کر

خوشحالی اور سلامتی کی دعائیں مانگتے جو گانو والوں کی بھیڑ بکریاں چرا تا اور ان کی حفاظت کیا کرتا تھا۔ جب لوگ مایوس ہوکر پھاوڑے کدالیں لے کر حویلی کی طرف بڑھنے کی سوچتے تو ایک نیا گروہ نمودار ہوتا۔

"ایسا کبھی مت کرنا۔" دوسرے گروہ کا نیتا انھیں سمجھاتا۔ "پہلے گروہ نے انھیں دھوکا دیا ہے۔ ہم اس حویلی کو ازسرِنو تعمیر کریں گے۔ اس کی عظمتِ پارینہ کو بحال کیا جائے گا۔" پھر وہ لوگ اس چرواہے کی سمادھی پر جاکر عہد کرتے۔ قسمیں کھاتے اور سمادھی کے آس پاس اُگی گھاس سے مٹھی بھر جڑوں کو جارا ڈالتے۔

اس نئے گروہ کے نیتا نے گانو والوں کا سا ہی لباس پہن رکھا تھا۔ ان ہی کے لہجے میں بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے گانو والوں کو بتایا کہ وہ تو اس بکھیڑے سے دور رہنا چاہتا تھا۔ گانو والوں کا پیار اور حویلی کی تعمیرِ نو کا جذبہ اسے کھینچ لایا تھا۔ اس نے بڑا اعتماد اور جوش بھرے لہجے میں کہا کہ وہ زندگی کو نیا رخ، نئے معنی دے گا، ان کا حال اور مستقبل شاندار اور محفوظ بنا دے گا۔ نوجوانوں میں ایک نئی روح پھونک دے گا۔ اس کے ذہن میں حویلی اور گانو والوں کے لیے نئے ویژن، نئی تجاویز اور نئے نقشے تھے۔ اگر لوگوں نے اس کا ساتھ دیا تو وہ انھیں نئے یگ میں لے جائے گا۔

گانو والے بڑے جوش وخروش سے اس کے رت جگے میں شامل ہوئے۔ اس نے بھی بزرگ چرواہے کی سمادھی پر جاکر چراغ جلایا۔ وہاں ایک پودا لگایا اور امید ظاہر کی کہ ایک دن یہی پودا ایک پھلدار درخت بن جائے گا۔ گانو والوں نے دیکھا کہ وہ سمادھی ہی تھی، جیسے کسی نے اس کے اندر کروٹ لی ہو۔ تو اس رت جگے میں خوب چہل پہل رہی۔ اس نیتا نے بتایا کہ برسوں پہلے اس کے بزرگ اس گانو سے اُٹھ کر شہر گئے تھے کہ وہ اس سمادھی والے بزرگ کے خاندان سے تھا۔ لوگوں نے اس کے سامنے سر جھکا دیا۔ نیتا نے اپنے مشیرِ خاص کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ مشیرِ خاص نے منشی کو اشارہ کیا۔ منشی نے مسکرا کر رجسٹر کھولا اور اس میں گانو والوں کی تمام مانگیں، شکایات، تجویزات اور حوا بلنات درج کرلیں۔ گانو والے بہت خوش ہوئے کہ اب ان کے دن بدل جائیں گے۔ وہ تھک کر آنکھوں میں نیندیں لیے رات گئے اس جشن سے لوٹ آئے۔

صبح جاگے تو وہاں کچھ نہیں تھا۔ وہی خاک اُڑ رہی تھی۔ جہاں پچھلی رات چولھے گرم ہوتے تھے، وہاں اب ٹھنڈی راکھ کے ڈھیر تھے۔ گانو کی کچھ مرغیوں کے پَر، میمنوں کی کچھ ہڈیاں۔ گانو کی بھیڑیں اور بکریاں اس چرواہے کی سمادھی کے گرد اداس بیٹھی تھیں۔ سمادھی بھیگ رہی تھی۔ رات بارش

تو نہیں ہوئی تھی۔ شاید بھیڑیں روئی تھیں۔

اس دن حویلی کی ایک چھت اور آ گری۔ لوگ ڈر گئے۔ ایک عورت نے بتایا کہ رات کو اس نے بوڑھے چرواہے کو سمادھی سے نکل کر ندی کے کنارے کھڑے سب جنگی سے نہیتے دیکھا تھا۔ وہ اپنی بھیڑوں کو چوم چوم کر رو رہا تھا۔

یہ خبر شہر میں اس نیتا تک پہنچی تو اس نے تھانیدار زمین دار اور منشی کو طلب کیا۔

"یہ کہانیاں کیوں جنم لے رہی ہیں —"؟

"حضور جھوٹی سچی کہانیاں تو جنم لیتی ہی رہتی ہیں —"

"تو تم وہاں کیا کر رہے ہو —؟"

تھانیدار مسکرایا۔ اگلے دن وہ عورت پاگل خانے بھیج دی گئی۔ شہر کے گول گھر میں، جہاں سے وہ نیتا حکم جاری کیا کرتا تھا۔ جشن فتح منایا گیا اور حکم جاری کیا گیا کہ گاؤں اور حویلی کی حفاظت کے لیے تھانہ جو گاؤں سے پانچ کوس دور تھا، گاؤں کی سرحد پر لے جایا جائے اور سمادھی پر کڑی نظر رکھی جائے۔

حکم کی تعمیل ہوئی۔

شہر کے گول گھر میں ہنگامے ہونے لگے۔ وہی سازشیں جو کبھی محلوں اور قلعوں میں ہوا کرتی تھیں — سڑکوں پر بھانت بھانت کی آوازیں گونجیں چھینٹا کشی ہوئی۔ شور بلند ہوا، دھول اڑی — اور ایک نعرہ گونجتا ہوا گاؤں پہنچا۔ کھا گئے — سب کچھ کھا گئے — گاؤں والوں نے بھیڑ بکریاں گنیں واقعی کئی غائب ہو چکی تھیں۔ وہ تھانے گئے اور شکایت درج کرائی۔

"تمھیں گنتی بھول گئی ہے —" تھانیدار نے کہا۔

"ایسا نہیں ہے —"

"ہم جو کہتے ہیں، ایسا ہی ہے —" تھانیدار نے بات ختم کر دی۔

گاؤں والے لوٹ ضرور آئے لیکن مطمئن نہیں ہوئے۔ ان کے کان شہر کی طرف سے آنے والے شور کی طرف تھے۔ شہر سے آنے والی سڑک پر گرد و غبار اٹھنے لگا۔

اور ایک سہانی صبح اس غبار سے وہ خوب صورت، لمبا، مضبوط ڈیل ڈول والا شخص نمودار ہوا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے بھی آکر سمادھی کو پرنام کیا۔ نئے سرے سے بھیڑ بکریوں کی گنتی کروائی۔ منشی اور تھانیدار بدل دیے۔ ایک میمنے کو گود میں اٹھا کر پیار کیا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ ایسا کرتے ہوئے اس کا دودھ سے بے داغ سفید لباس خراب ہو رہا تھا۔ وہ گاؤں کے ہر گھر میں بہ نفس نفیس گیا اس کے ہمراہ آنے والوں نے نعرہ لگایا۔

"مسیحا آ گیا —"

...توں نے اس کی آرتی اتاری۔ بچوں نے اسے پھول مالائیں پہنائیں۔
بزرگوں نے اسے ہر طرح سے تعاون کا یقین دلایا۔ نوجوانوں نے اپنے خون سے
اس کے ماتھے پر تلک لگایا۔ وہ مسکراتا رہا۔ گویا خوب صورت دو ملتے۔۔۔
...سے حاصل ہونے والی خوشی کے چراغ جگمگا رہے تھے۔ اس کے ہونٹوں
...جادو، نرم، اپنائیت کا احساس دلانے والی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔
"کسی اونچے گھرانے کا لگتا ہے۔"
"اس کی آنکھیں دیکھو۔۔۔ بالکل چپٹی سانپ کی سی ہیں۔ گویا زرق مرتی۔"
"تمھارا وہم ہے۔۔۔ تم تو سب کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہو۔"
"مسیحا آگیا۔۔۔" نعرہ اسٹیج سے بلند ہوا۔۔۔ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں۔ برسوں
کی تپسیا کے بعد، ہمارے مجبور کرنے پر، جنتا کی سیوا کے لیے اپنا آسن تیاگ
کر آیا ہے۔ ان کے باپ دادا بھی تپسوی تھے۔ جنتا کی بھلائی اور سیوا میں
سب کچھ تیاگ دیا۔ جایداد، روپیا، آرام۔۔۔ اگر اس حویلی کا کل بندوبست
ہے سونپ دیا گیا تو دنوں میں حالت سدھر جائے گی۔۔۔ یوگی ہے یہ۔۔۔"
مسیحا چپ سادھے مسکراتا رہا۔ اس نے ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔ اس کی آنکھیں
تیزی سے ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔۔۔
"یہ مہاپرش اپنی سادھنا اور نیکی سے سب دلدر دور کر دے گا۔۔۔ اس
کی شرن میں آؤ۔۔۔ سوچو نہیں، یہ وقت سوچنے کا نہیں۔۔۔ یہ راج پاٹ کا
بھوکا نہیں ہے۔ یہ عیش و آرام کو لات مار کر آیا ہے۔ اسے تو آپ کی سیوا
کا جنون ہے۔"
اس رات حویلی کے سامنے والے میدان میں پھر جشن ہوا۔ پہلے سے زیادہ
شاندار۔۔۔ لوگ دیر رات تک جاگے، ناچے، گائے اور کچھ نئے سپنے سنجو کر لے
۔۔۔ وہی دعوے۔۔۔ حویلی کی کایا کلپ ہو جائے گی، آمبر نو۔۔۔ اگر جرائم پیشہ لوگ
وہاں ہوئے تو انھیں نکال دیا جائے گا۔۔۔ میں وچن بدھ ہوں۔ گاؤں والوں نے
یہ نئے شبد سنے تھے۔۔۔ وچن بدھ۔۔۔ وہ بہت خوش ہوئے۔
"مائی باپ، اس حویلی کا مالک کون ہے؟" ایک بزرگ نے پوچھا۔
"آپ۔۔۔ آپ سب۔۔۔" مہاپرش سکون سے مسکرایا۔ "حیرت ہے۔ آپ
کو کسی نے آج تک یہ بھی نہیں بتایا۔۔۔ یہ حویلی آپ کی ملکیت ہے۔ ہم تو
آپ کے سیوک ہیں۔۔۔"
"یہاں جو بھی آتا ہے اپنے آپ کو سیوک ہی کہتا ہے۔ شانت لہجہ اور
بدلتا ہے۔" ایک نوجوان نے جوش سے کہا۔
مسیحا کی آنکھیں اس نوجوان پر جیسے ٹھہر گئیں۔ وہ ڈر گیا۔ ان آنکھوں میں

سانپ کا زہر تھا۔ مسیحا نے پلٹ کر تھانیدار کی طرف دیکھا۔ تھانیدار آگے آیا اور نرمی پیار اور حلیمی سے بولا۔

"برخوردار، جوش بُری چیز ہے۔ مسیحا سے اس طرح بات نہیں کیا کرتے۔"

"اگر ہم مالک ہیں تو تم لوگ یہاں بار بار کیوں آتے ہو؟"

مسیحا نے پہلو بدلا۔ اس کی آنکھوں میں ہوا لاسی بھڑکی لیکن ہونٹ مسکراتے رہے۔ اس نے پھر تھانیدار کی طرف دیکھا۔

"اب تم لوگ جاؤ 'مسیحا' عبادت کرے گا۔"

تو اس رات بھی لوگ خوف زدہ سے وہاں سے لوٹے۔

صبح تھانہ گانو کے اندر تھا اور سپاہیوں کی نفری بڑھا دی گئی تھی۔ باڑھی کے گرد خاردار تار کی باڑھ لگا دی گئی کہ بکریاں اُسے خراب نہ کریں اور جینا کھنا جاکر اسے ناپاک نہ کرے اس پودے کو جو پہلے 'سیوک' نے لگایا تھا اکھاڑ کر وہاں نیا پودا لگا دیا گیا۔

اب حویلی میں روز کوئی نہ کوئی حادثہ ہونے لگا۔ کبھی دیوار گر جاتی۔ کبھی چھت۔ کبھی کھڑکیاں، دروازے غائب ہو جاتے۔ کبھی سنگ مرمر کی سلیں۔ زبی آوازیں گونجا کرتیں۔ جرائم پیشہ لوگوں کی کارگزاریاں جیسے بڑھ گئی تھیں۔

بکریاں دن بہ دن کم ہونے لگیں۔ اُن کی کھال اُتار کر شہر لے جائی جانے لگی۔ میمنوں کا نرم گوشت 'مسیحا' کو بہت پسند تھا۔ ان کی نرم، ملائم کھال کا لباس اسے اچھا لگتا تھا۔

تھانیدار نے گانو میں اعلان کیا کہ حویلی کی از سر نو تعمیر کے لیے نقشے تیار کر لیے گئے ہیں۔ بڑے بڑے ماہرین فن کی خدمات حاصل کر لی گئی ہیں۔ اخراجات سے بخوبی نپٹنے کے لیے گانو والوں پر کچھ ٹیکس لگائے جائیں گے جنھیں خندہ پیشانی سے برداشت کرنا ہوگا۔ ترقی اور تعمیر قربانی مانگتی ہے۔

لوگ قربان کیے جانے لگے۔

حویلی گرتی رہی۔ اس کے ملبہ پر گیدڑوں، کتوں اور لومڑیوں کا قبضہ ہوتا چلا گیا۔

مجبور ہو کر گانو کے کچھ جیالے شہر گئے کہ مسیحا اور اس کے مشیروں سے مل کر صورت حالات سے آگاہ کریں۔ 'مسیحا' کو آسن سے ہٹنے کی فرصت نہیں تھی۔ اس نے اپنے کچھ مشیروں سے کہا کہ گانو والوں کی خاطر مدارات کریں۔ مشیروں نے انھیں میمنوں کی کھال کے لباس تحفتاً دیے، بکریوں کا گوشت کھلایا، بڑھیا اور قیمتی شراب پلائی۔ خوب صورت جوان لڑکیوں کے پیار میں بٹھایا لیکن وہ مسیحا سے نہیں مل سکے۔ وہ سیوا میں مصروف تھا۔

"ہم وچن بدھ ہیں"، مشیرِ خاص نے دہرایا۔
"پیارا، خوش کر دینے والا" وہ بدصورت جملہ لوگوں کے ساتھ گاؤں تک
آیا اور حویلی کے ملبہ پر شیطان کی طرح ناچنے لگا۔

"کیا بنا۔؟"

"کیا لائے۔؟"

"کیا ہوگا۔؟"

"خاموش۔ خاموش۔" تھانیدار گرجا۔ "اپنی اوقات سے آگے نہ
بڑھو۔ انھوں نے کہہ دیا کہ وہ وچن بدھ ہیں۔ یہی کافی ہے۔ اب اگر کسی نے
سوال کر کے گاؤں کی پُرامن فضا کو خراب کرنا چاہا تو اچھا نہ ہوگا۔"

"خالی خولی وچن بدھتا کو ہم کیا کریں۔ حویلی کی حالت خراب ہوتی جا رہی
ہے۔ ہمیں بھی دھوکا دیا گیا ہے۔"

"کوئی دھوکا نہیں دیا گیا کسی کو۔" زمیندار نے کہا۔ "معاملہ جب
پیچیدہ ہے۔ فنڈز کی بھی ضرورت تھی اس لیے سبھا نے فیصلہ کیا ہے کہ حویلی کی
تعمیر کا کام غیر ملکی ٹھیکیداروں کو سونپ دیا جائے۔"

"تاریخ خود کو دہراتی ہے۔" ایک بزرگ نے دکھ سے کہا۔

تھانیدار نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ لوگوں پر لاٹھی چارج کیا گیا اور
کچھ منچلے تھانے میں ذبح کرنے کے لیے لے جائے گئے۔

اس رات گاؤں میں اندھیرا رہا۔ عورتوں نے تاریکی سے گھبرا کر اپنے چراغ
جلا دیے۔ بکریاں اور بھیڑیں ممیاتیں۔ تھانے سے پٹنے، شور کرنے اور ناچنے گانے
کی آوازیں آتی رہیں۔ جب چراغ بھی جل کر روشنی نہ کر سکے تو گاؤں کے کچھ نوجوانوں
نے خود کو زندہ جلایا۔

اس روشنی میں گاؤں والوں نے دیکھا کہ سمادھی زور زور سے ہل رہی تھی۔
جیسے کوئی اسے توڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر اس میں سے ایک
بوڑھا لاٹھی لیے نمودار ہوا۔ اس کی چھاتی پر تین گولی کا گہرا نشان تھا۔
اور اس سے تازہ خون بہہ رہا تھا۔ اس کی لاٹھی کی آواز سارے گاؤں میں
گونج رہی تھی اور بھیڑ بکریوں کا ریوڑ سر جھکائے چپ چاپ اس کے پیچھے
چل رہا تھا۔ ان کے جسموں پر کھال نہیں تھی۔

"اب یہ کہاں جائے گا۔" ایک عورت نے نہ جانے کس سے پوچھا۔

شفیقہ فرحت
اے ۱۸۶/۲
پروفیسرز کالونی
بھوپال

قلم کا سفرنامہ

چلتے چلاتے

چلتے چلتے اب ذرا ہم تھک گئے ہیں۔ یہ کوئی انہونی یا حیرت زدہ کر دینے والی بات نہیں۔ رک کے لیے تھکنا اور تھکنے کے لیے چلنا ضروری ہے۔ سلسلہ روز و شب کے تار حریر دو رنگ بنے۔ یعنی، چلن تھکن ۔۔ یوں چلن تھکن ۔۔ لفٹ رائٹ ۔ لفٹ رائٹ ۔ اور اس لفٹ رائٹ ۔ لفٹ رائٹ کا مقصد نہ آگے بڑھنا ہے نہ پیچھے ہٹنا۔ نہ دائیں مڑنا نہ بائیں مڑنا۔ بس اپنی جگہ چلتے رہنا۔

جیسے ہمارے پیارے نیارے دُلارے دلیش کی تمام سرکاری اسکیمیں، منصوبے، پلان یوجنائیں۔

لاکھوں، کروڑوں، اربوں، کھربوں روپیہ صرف کر دیکھیے۔ سالوں گزر جانے دیکھیے۔ مجال کیا کہ کوئی اسکیم اپنی جگہ سے ذرا ہل جائے گویا حکیم جالینوس کے سے اسٹیٹس والے سرکاری اطبا نے بتایا ہے کہ ملک کی صحت اور بحالی کے لیے ایک ادھورا پن ضروری ہے۔ تاکہ زندگی بھر رواں رہے۔ نتیجے میں ہر دم جواں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

ب پتا نہیں علامہ کا پیہم رواں سے کیا مقصد تھا۔ لیکن جس انداز سے لوگ علامہ فہمی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اس سے سارا معاملہ الٹا پلٹا ہوتا نظر آرہا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ حضرت غالب کی طرح اس میں کچھ علامہ کی اپنی فطرت بھی شامل ہو۔ مگر ان چچا بھتیجوں کو الزام کیوں دیں۔ پورے دلیش بلکہ چہار دانگِ عالم یعنی ساری دنیا کا معیار ہی ایسا ہوگیا ہے کہ کوئی شاعر کوئی ادیب کسی کی سمجھ میں آتا ہی نہیں۔ اسی لیے آج کا فنکار اپنے من میں علم و ادب کو داخل ہونے ہی نہیں دیتا۔

جیسا قلم چلا لکھ دیا۔
جیسی عقل چلی وہ سمجھ لیا۔

دیکھیے بات پھر چلنے کی آگئی۔ حالانکہ ہم نے شروع میں ہی اعلان کر دیا تھا کہ آج ہم چلتے چلاتے کے عنوان سے رُکنے تھکنے کی بات کریں گے۔ لیکن ہمارے کہنے اور کرنے میں کوئی رابطہ نہیں۔ ہمارے ملک کی نیا کے کھیویّاؤں کی طرح۔ کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں۔

ٹھہریئے ٹھہریئے۔ یعنی پھر وہی رکاوٹ (لیکن اس کے لیے ہمیں کھید نہیں ۔۔!)
یہ نیا کھیویّا والی بات آؤٹ ڈیٹیڈ ہوگئی۔ اب تو مچھیرے بھی جہاز رکھتے ہیں۔

جہاز اور کیپٹن والی تشبیہ مناسب ہے۔ خصوصاً اس لیے کہ جہازوں میں اسمگلنگ کا مال درآمد برآمد کیا جاتا ہے۔ا

دراصل بات ہم اس ذرہ بحث و تمثیل کی کر رہے تھے کہ جب ہمارے پاس ایک ہیڈ روم ہیٹر (Head room) ہوا کرتا تھا جس سے کمرے کا ماحول کبھی خوشگوار ہو جاتا ہے کبھی گرم نار ایسے ہونا اس ہیٹر کو اب بھی چاہیے تھا کہ وجود اس کا بہوا اب قدیم نہیں۔ بس دو تین سال پہلے کی بات ہے۔ لیکن وہ دلّی میڈ تھا۔ اور جس پر دلّی کی چھاپ لگ جائے وہ پیدا ہو ہیٹر اس کا فیوز ایک دو برس میں ہی اڑ جاتا ہے۔

خیر تو جو ہیٹر ہمارے پاس تھا (یاد اس کی اتنی خوب نہیں پھر باز آ۔۔۔)

اور جو اپنے پیروں پہ کھڑا بھی رہتا تھا۔ اس کے ان پیروں کو دیکھ کر ہماری ننھی منی جانکی نے پوچھا

"خالا ئی ۔۔۔ یہ کیا ہے"؟

ہم نے کہا ۔۔۔ "وہ ہیٹر"،

اس نے دو تین منٹ اس اپاہج کو غور سے دیکھا۔ جب اس نے ذرا حرکت نہ کی تو بڑی حقارت سے کہا۔

"اس کے پیر ہیں تو یہ چلتا کیوں نہیں ۔۔۔؟"

اس نے تو اپنے لاڈلے کتے اور چہیتی بلی کو دیکھا تھا۔ جو اپنے پیروں پہ ہر وقت اچھلتے کودتے رہتے تھے۔

بچپن کی معصومیت سے پختہ عمر کی ذہانت مات کھا گئی۔

اب ہم اس سے کیا کہتے کہ جیسے انسان دلّی والے وہ چلنے پھرنے سے تو کیا جنبش تک کرنے سے معذور ہو جاتا ہے۔

کرسی کے بھی تو چار پیر ہوتے ہیں جتنے چڑھ جائے کسی جادوگر کے پھر دیکھیے وہ کیسے پھر کی ہو جاتی ہے کہ نہ شرفا کی عقل وہاں تک پہنچ سکے نہ ادیب کا قلم۔

ویسے سنا تو یہ ہے کہ شرافت اور عقل مخالف پارٹیوں کے ممبر ہیں۔ جہاں ایک ہے وہاں دوسرے کا گزر نہیں۔ بات بھی ٹھیک ہے۔ بس کسی ایک شے کا انتخاب کر لیجیے کہ جیسے بچپن میں کئی طرح کی مٹھائیاں سامنے رکھ کر حکم دیا جاتا تھا کہ صرف ایک چیز اٹھا لو۔ دل کیسا ہر ایک کے لیے مچلتا تھا۔

مگر خیر شریف صاحب کا دل باصورت شرافت کے بعد کسی اور پہ آتا ہی نہیں رہا ادیب کا قلم ۔۔۔ تو جتنا قیمتی قلم اس کے ہاتھ میں پکڑا دیں گے۔ اتنی ہی تابناک رنگ و شرر پھلجھڑیاں آپ کے لیے نکلیں گی۔ آپ کا جی چاہے آپ اسے قصیدہ کہہ لیجیے۔ جی چاہے رسم دنیا موقع اور دستور کا نام دے دیجیے۔!

گئے وہ زمانے کہ دو پیسے کے قلم سے ایک زمانہ لرزتا کانپتا تھا۔ اور بڑے بڑے خطاکار

سزاوار سر جھکائے کھڑے رہتے تھے۔

تو پھر آجائیں ہم لوگ چلنے کی طرف۔ یعنی شروع کریں لفٹ رائٹ ہو سکتا ہے ہماری اس حرکت کو [illegible] ہم جان کر بہت سے اقبالی مجرم یعنی پرستارِ اقبال ہم پہ کفر کا فتوا صادر کردیں اور کہیں سے کوئی [illegible] نعرۂ تکبیر بلند کرتا ہوا ہمارے قتل کے لیے اٹھ کھڑا ہو

لیکن یہ محض ہماری خوش فہمی ہے۔ ورنہ ہم کہاں کے دانا ہیں اور کس ہنر میں یکتا ہیں۔ ,,کہ کوئی ہمارے کہے اور لکھے کا نوٹس لے گا۔

اگر ہماری ہی طرح کا کوئی غیر معروف ہمارے قتل کو اپنی شہرت کا ذریعہ بنانے کی خاطر تلوار اٹھا بھی لے تو خود ہی شرمندہ ہو کے تلوار پھینک دے گا۔ کہ ہم ,,شایان دست و بازو قاتل ہی کب ہیں۔!''

تو پھر ایک بار اور شروع کیجیے سفر اور آجائیے وہاں جہاں برکت ہی برکت تو ہے۔ مگر حرکت نہیں۔ اس کی سب سے شوخ اعلیٰ و دلفریب۔ نظر فریب مثال ہے فائل۔!

ہر دفتر میں فائل کا ڈھیر ہے ہر بڑے شہر کے ہر محلے کے ہر نکڑ کے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کی طرح ـــ! جس میں چھوٹے بابو، بڑے بابو، افسر، منتری، مہامنتری سب کمر کمر تک ڈوبے، دلے، چھپے دکھائی دیتے ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ افسر کا درجہ فائل کے معیار اور رفتار کے معیار سے ناپا جاتا ہے۔ کہ فائل چلتی ہے تو بات کی ـــ بلکہ بے بات کی ـــ!

آپ نے چپراسی سے کہا۔ ,,پانی پلائیے۔,,

وہ کہے گا۔ ,,پہلے فائل چلائیے۔,,

اب فائل چل رہی ہے۔ سوالی پیاسے کا پیاسا ہے۔ عالم کربلا کا ہے اور رہبر بلا حول ولا قوۃ ہے۔

چند برس پہلے ہم نے ایک کانفرنس کے سلسلے میں باہر جانے کی ٹھانی۔ اب آپ سے کیا پردہ۔ باہر سے مراد سات سمندر پار ہے۔

کسی زمانہ میں باہر جانے پر لوگ فخر کیا کرتے تھے۔ اب ,,پھورن,, کے کوڑی بھیجے ہونے لگے۔ اور مکینک، باورچی۔ آیا تک کندھے پر B.B.C. لٹکائے، ہاتھ میں پاسپورٹ اور ٹین کا کنستر لیے ہوائی اڈوں پر میلی دری بچھائے بیٹھے رہتے ہیں۔ لہٰذا ,,باہر,, کے ذکرِ خیر سے سوائے ندامت کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اب شہر سے دس کلومیٹر دور ,,گاؤں,, یا ,,کھیت,, جانے کی بات سر اٹھا کے کی جاتی ہے۔!

خیر اب یہ ہماری قسمت کا پھیر اور عقل کا قصور تھا کہ ہم باہر جانے پر کمر بستہ ہو گئے تھے۔ سرکاری اجازت اور زرِ سفر خرچ کی ضرورت تھی۔ سو چلی فائل۔

ہم نے سوچا بچاری بھولی بھالی فائل۔ انجان راہوں اور پُر پیچ رہداریوں میں بھٹک نہ جائے۔ سو اس کے ساتھ ہم بھی چلنے لگے۔ اور چلتے رہے۔ فائل بھی چلتی رہی۔ اتنے عرصے کہ ہمارا جہاز ہوا ہو گیا۔

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

کتاب نما کا خصوصی شمارہ

پروفیسر آل احمد سرور

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ:۔ ڈاکٹر خلیق انجم
معاون:۔ ایم حبیب خاں
ناشر:۔ ماہنامہ کتاب نما۔ جامعہ نگر نئی دہلی
قیمت ۴۵/- روپے
مبصر:۔ ڈاکٹر بیگ احساس

پروفیسر آل احمد سرور ان دانشوروں میں سے ہیں جنھوں نے اردو ادب کو ایک حرکیاتی روایت سے روشناس کروایا۔ بلاشبہ وہ ہمارے دور کے سب سے بڑے نقاد ہیں۔ وہ نصف صدی سے لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے تنقید کو ایک ایسی جہت دکھائی جس میں توازن واعتدال کے ساتھ مغربی ادبیات سے استفادہ اور مشرقی روایت کے احترام کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ انھوں نے شاعری اور نثر دونوں پر تنقیدی مضامین لکھے۔ ادب کے بدلتے ہوئے رجحانات اور نئی تحریکوں پر نہ صرف سنجیدگی سے غور کیا بلکہ انھیں قبول بھی کیا۔ خاص طور پر جدیدیت کو انتہائی پسندی سے بچانے اور اعتبار بخشنے میں سرور صاحب نے نمایاں رول انجام دیا۔ سرور صاحب نے کبھی یک رخاپن اختیار نہیں کیا۔ اسی لیے انھیں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ سرور صاحب اچھے شاعر اور بلند پایہ نثر نگار بھی ہیں۔ وہ اردو کے ان سینئر پروفیسروں میں ہیں جنھوں نے اپنی تدریس سے دو نسلوں کو متاثر کیا۔ اردو کے جتنے چوٹی کے عہدے ہو سکتے ہیں ان سب پر سرور صاحب فائز رہے۔ حکومت نے انھیں پدم بھوشن کا خطاب دیا۔ سرور صاحب نے اردو کے باہر اردو کا وقار بلند رکھا۔ مختلف انتظامی عہدوں پر فائز ہوتے ہوئے بھی سرور صاحب نے تصنیف و تحقیق کا کام جاری رکھا نہ وہ بسیار نویسی کا

ہوئے ورنہ بہت ہی کم لکھا بلکہ اعتدال اور توازن کو یہاں بھی برقرار رکھا۔

"کتاب نما" نے مشاہیر ادب کے خصوصی نمبر شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور شخصیت اور ادبی خدمات کے مہمان مدیر خلیق انجم ہیں جو خود بھی بہت اچھے محقق اور نقاد ہیں اور ترتیب متن کے سلسلے میں بہت ہی نمایاں اور اہم کام انجام دے چکے ہیں۔ اس سے قبل سرور صاحب کی شخصیت اور فن پر دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک عابدہ اسما کا تحقیقی مقالہ آل احمد سرور حیات اور ادبی خدمات ۱۹۸۰ء دوسری کتاب شمس الرحمن فاروقی کی مرتب کردہ تحفۂ سرور ۱۹۶۵ء ہے۔ اس کے علاوہ الفاظ مارچ، اپریل، مئی، جون ۱۹۹۰ علی گڑھ کے شمارے میں گوشۂ آل احمد سرور شامل ہے۔ زیر نظر شمارے میں سرور صاحب کی خودنوشت "خواب باقی ہیں" پر تین مضامین، ان کی تنقید نگاری پر ایک، ان کی شخصیت پر چھے مضامین اور اسلوب پر ایک مضمون، غالب پر لکھے گئے مضامین کا اشاریہ ابتدا میں خلیق انجم کا تعارفی مضمون اور آخر میں سوانحی خاکہ شامل ہیں۔

مہمان مدیر خلیق انجم نے اداریہ بعنوان "پروفیسر آل احمد سرور اردو تنقید کا معتبر ترین نام" میں سرور صاحب کی ادبی خدمات کا مختصر مگر جامع جائزہ پیش کیا۔ سرور صاحب کی خودنوشت پر لکھے گئے مضامین میں سب سے اچھا مضمون استاذ محترم ڈاکٹر گیان چند کا ہے۔ اس مضمون میں یونی ورسٹی کی جوڑ توڑ، سرور صاحب جن عہدوں پر فائز رہے ان کی تفصیل، سیاسی لیڈروں سے ان کے تعلقات، اخلاقی جرأت کا اظہار، حسن پرستی، زبان کی بعض کوتاہیوں، تذکیر و تانیث کے مسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ جین صاحب نے اپنی روایتی صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ اس مضمون پر بھی محقق گیان چند حاوی ہے۔ اس سوانح حیات سے گیان چند نے چند ایسے تحقیقی نکتے اخذ کئے ہیں جن کی اہمیت کا احساس شاید سرور صاحب کو بھی نہیں تھا۔

ڈاکٹر عبدالمغنی نے اپنے مضمون "آل احمد سرور۔ ایک ناقد کامل" میں یہ شکایت کی ہے کہ اردو کا نقاد مغربی رجحانات کا مقلد اور نقال ہے لیکن خود ڈاکٹر عبدالمغنی نے پورا مضمون ٹی ایس ایلیٹ کے مضامین اور اس کے متعینہ اصولوں کی روشنی میں تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن نقوی کا مضمون "روشنی کا سفر" بھرپور تاثراتی خاکہ ہے۔ عتیق احمد صدیقی نے "ایک دن سرور صاحب کے ساتھ" میں وہ تفصیلات درج کی ہیں۔ جس روز سرور صاحب ریٹائر ہو کر شعبہ اردو چھوڑ رہے تھے۔ ساتھ ہی سرور صاحب کی شخصیت کے بعض مثبت پہلو اجاگر کیے۔ پروفیسر رفیعہ سلطانہ نے "پروفیسر سرور اور ان کا اسلوب نگارش میری نظر میں" سرور صاحب کے اسلوب پر

بمشکل چند سطریں لکھی ہیں۔ باقی مضمون میں سرور صاحب کے مراسم کا تذکرہ ہے۔
اس لیے یہ مضمون تجزیاتی کم تاثراتی زیادہ لگتا ہے۔" پروفیسر آل احمد سرور۔ چند یادیں"
کے مضمون نگار ایم حبیب خان نے بڑی عرق ریزی سے یہ مضمون لکھا۔ بحیثیت
سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) سرور صاحب نے جو خدمات انجام دیں ان کا غیر جانبدارانہ
سے احاطہ کیا۔ اس مضمون میں سرور صاحب کی شخصیت کے بعض ایسے پہلوؤں
کی نشان دہی ہوتی ہے جن سے ایک عام آدمی واقف نہیں مثلاً یہ کہ سرور صاحب
کو کبھی انجمن کی سکریٹری شپ کا معاوضہ نہیں ملا نہ کبھی سرور صاحب نے اس کا مطالبہ
کیا وہ اپنے خرچ پر انجمن آتے رہے۔ اپنی سکریٹری شپ کے دوران انھوں نے
دوسرے ادیبوں کی بے شمار کتابیں شائع کروائیں لیکن اپنی کوئی کتاب شائع نہیں
کروائی اس مضمون سے کئی غلط فہمیوں کا بھی ازالہ ہوتا ہے۔ سرور صاحب پر یہ الزام
لگایا گیا کہ اردو تحریک کے سلسلے میں جو ۲۲ لاکھ دستخطیں تھیں انھیں غائب کرایا
تھا۔ حبیب صاحب نے اس الزام کی تردید کی اور حقیقت سامنے رکھی۔ سرور صاحب
۱۸ سال تک انجمن سے وابستہ رہے۔ انجمن کو مستحکم کیا۔ انجمن کی اپنی عمارت اردو گھر تعمیر
کروائی۔ سمینار کروائے، علمی ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ انجمن کو فعال بنایا
لیکن اپنی خود نوشت میں اس کا تذکرہ نہیں کیا۔" پوچھتے ہیں وہ کہ ...."
ڈاکٹر اطہر پرویز مرحوم کا مضمون ہے جو الفاظ (مارچ، اپریل، مئی، جون ۱۹۸۰ء) میں
شائع ہوا تھا۔ اسے قند مکرر کے طور پر شامل کیا گیا۔ یہ مضمون اتنا بھرپور ہے کہ اس
سے اس نمبر کے وقار میں اضافہ ہی ہوا۔ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، ڈاکٹر ذکاءالدین شایاں
کے مضامین بھی اچھے ہیں۔ نائلہ انجم نے "غالب اور پروفیسر آل احمد سرور" میں
سرور صاحب کے غالب پر لکھے گئے مضامین کا اشاریہ ترتیب دیا ہے یہ
سرور صاحب پر تحقیق کرنے والوں کے لیے مددگار ثابت ہوگا۔ اسی طرح کا ایک
اشاریہ اقبال پر لکھے گئے مضامین پر مشتمل شامل کیا جانا چاہیے تھے۔ سوانحی خاکہ
میں سرور صاحب کی تاریخ ولادت ۹ ستمبر ۱۹۱۱ درج ہے جب کہ عابدانسا کی
تحقیق کے مطابق ان کی سنہ ولادت ۱۱ اگست ۱۹۱۱ ہے جبکہ اسکول میں ۱۷ اکتوبر
۱۹۱۲ درج ہے۔ کتابوں کی سنہ اشاعت میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ پروفیسر
سرور ابھی بقید حیات ہیں سنہ ولادت کے مسئلہ کو طے کر لینا چاہیے۔ اس نمبر میں
سرور صاحب نے فکشن پر جو تنقید لکھی اس کے جائزہ کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ سرور
صاحب نے بڑے نازک دور میں اردو تحریک کو صحیح سمت دی اور سیاسی
ولسانی گتھیوں کو سلجھانے میں بھرپور رول ادا کیا۔" ہماری زبان" میں لکھے گئے ان
کے اداریے اردو تحریک کے سفر کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان کا جائزہ بھی پیش کیا
جانا ضروری ہے۔ مکتوب نگاری سے سرور صاحب کو جو دلچسپی تھی اور اس موضوع پر

انھوں نے جو مضامین لکھے ان پر مضمون شامل کیا جا سکتا تھا۔ ان کمیوں کے باوجود کتاب نما کا یہ نمبر سرور صاحب کی شخصیت اور ادبی خدمات کی واضح اور دلکش تصویر پیش کرنے میں کامیاب ہے۔ اس کے لیے شاہد علی خاں اور خلیق انجم مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کتابت و طباعت عمدہ ہے۔ قیمت ۲۵ روپے مناسب ہے۔ یہ خصوصی نمبر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر دہلی، اردو بازار دہلی، پرنسس بلڈنگ بمبئی اور یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

کتاب نما کا خصوصی شمارہ

پروفیسر مسعود حسین خاں

مرتبہ ۔ ڈاکٹر خلیق انجم
معاون ۔ ایم حبیب خاں
ناشر ۔ ماہنامہ کتاب نما جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
قیمت ۔ ۲۵ روپے
مبصر ۔ مظفر موز

(علمی، لسانی اور ادبی خدمات)

مشہور کہاوت ہے کہ "پوت کے پاؤں پالنے میں" اور جب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں سابق صدر جمہوریہ ہند جیسے دیس کے عظیم سپوت کے گھر کا ہو تو اس میں ہونہار ہونے کی چکنے پات ہی ہوں گے اردو کے شہرۂ آفاق محقق دانشور ماہر لسانیات، ماہر اقبالیات، ماہر تعلیم، شاعر، نثر نگار اور اڈمنسٹریٹر پروفیسر مسعود حسین خان اس عظیم خانوادے کے چشم و چراغ ہیں پروفیسر صاحب کا تعلق جامعہ عثمانیہ سے بھی رہا ہے بحیثیت صدر شعبہ اردو (۶۲ تا ۶۸) آپ کے بڑے بھائی امتیاز حسین خان بھی جامعہ عثمانیہ میں صدر شعبہ کامرس تھے راقم الحروف کو ان کی شاگردی کا شرف حاصل رہا ہے اور آپ کے چچا ڈاکٹر یوسف حسین خان بھی جامعہ عثمانیہ میں صدر شعبہ تاریخ رہ چکے ہیں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ

ایں خانہ تمام آفتاب است ۔۔

ایسے عظیم علمی گھرانے میں پروفیسر مسعود حسین خان جیسے جوہر قابل کا پیدا ہونا کوئی امر تعجب خیز نہیں۔ حیدر آباد اور جامعہ عثمانیہ سے ان کا تعلق ہمارے لیے کچھ کم قابل فخر نہیں آپ نے اپنی علمی زندگی کا آغاز آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام اسسٹنٹ کی حیثیت سے کیا لیکن آپ کی علمی لگن آپ کو علمی اداروں کی طرف لے گئی (شعبہ اردو علی گڑھ (عثمانیہ یونیورسٹی) شعبہ لسانیات علی گڑھ اور وائس چانسلر جامعہ ملیہ)۔ اردو والے عام طور پر چھوٹے موٹے جلسہ کر کے اپنے اکابرین کی علمی خدمات کا اعتراف کر لیتے ہیں اور کچھ زبانی باتیں اور تقاریر ہو جاتی ہیں جن کا کوئی رکارڈ نہیں ہو پاتا۔ ادارہ کتاب نما نے یہ تحقیقی شمارہ نکال

کر بڑی علمی اور ادبی خدمت کی ہے ایک سو صفحات پر مشتمل اس شمارے میں ایک طرح سے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں پروفیسر صاحب کی ہمہ جہت شخصیت پر کوئی ایک درجن کے قریب مضامین شامل کئے گئے ہیں جس کے لکھنے والوں میں مالک رام، جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر عبدالغنی اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ جیسے علمائے علم و ادب شامل ہیں اس کے علاوہ کتاب کے آخر میں احمد ندیم قاسمی، مشفق خواجہ، گیان چند، مختار الدین احمد اور ابوالفیض سحر وغیرہ جیسے ادیبوں اور دانشوروں کی مختصر تحریریں بھی شامل ہیں جن میں پروفیسر صاحب کی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے کیوں کہ پروفیسر صاحب کی جو علمی خدمات ہیں وہ ایک طرح سے اردو والوں پر ایک احسان کے درجہ میں ہیں۔ کتاب نما کی اس کاوش کو اگرچہ ہر حیثیت سے مکمل نہیں کیا جا سکتا تاہم اس دور انحطاط میں بساغنیمت ہے ورنہ بقول شاعر۔ یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے۔ یوں تو سارے ہی مضامین اپنی جگہ اہم ہیں لیکن دو تین مضامین کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے ایک تو ڈاکٹر خلیل احمد بیگ کا مضمون "اردو کب کہاں اور کیسے پیدا ہوئی" مضمون نگار نے پروفیسر صاحب کی تحقیق کو ایک مختصر سے مضمون میں سمو دیا ہے جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اردو کا مولد نواح دہلی ہے دکن ہے نہ پنجاب اور اس کی اصل کھڑی بولی اور ہریانوی ہے نہ کہ دکھنی یا پنجابی دوسرا اہم مضمون ریحانہ سلطانہ ریسرچ اسکالر عثمانیہ یونی ورسٹی کا ہے جس میں بیجاپور کے دکھنی شاعر عبدل کے "ابراہیم نامہ" کی تدوین سے متعلق پروفیسر صاحب کی تحقیقی کاوش پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ کس طرح مسعود صاحب نے مثنوی کی اندرونی شہادتوں سے اردو کی پہلی ادبی مثنوی کا محاکمہ ہے دکھنی قدیم الفاظ کے معانی بتائے اور تلفظ متعین کیا اور اس وقت کی (عہد ابراہیم عادل شاہ) معاشرتی اور سماجی رسوم و روایات ایک صوفیانہ کاوش ہے اس لیے ابراہیم نامہ کو پہلی ادبی مثنوی سمجھنا چاہیے۔ پروفیسر صاحب کی ایک حیثیت شاعر کی بھی ہے اور انھیں بڑی شکایت بھی ہے کہ ان کی اس حیثیت کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی لیکن مشکل یہ ہے کہ شاعر علم اور تحقیق کی راہوں میں اتنی دور نکل گیا کہ پھر پلٹ کر دیکھنا ممکن ہی نہیں رہا ہے

من پریشاں جادہ ہائے علم و دانش کردہ طے۔

اب تک ان کا صرف ایک مجموعہ کلام "دو نیم" شائع ہوا ہے جس پر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے بڑا سیر حاصل تبصرہ کیا ہے جس پر ان کے مخصوص مارکسی نظریہ تنقید کی چھاپ ہے مسعود صاحب کی تحقیقی اور علمی سرگرمیوں سے شاعری کا نقصان ضرور ہوا لیکن علم و تحقیق کا بڑا فائدہ ہوا زندگی میں بہرحال کچھ نہ کچھ کھونا ہی پڑتا ہے کچھ پانے کے لیے۔ لسانیات مسعود صاحب کا سب سے زیادہ دلچسپ موضوع رہا ہے۔

س پر کوئی مضمون شامل نہیں کیا گیا اور یہ ایک بڑی کمی محسوس ہوتی ہے ۔
یہ موضوع ہے بھی بڑا ٹکنیکل ۔ تو ہم ڈاکٹر مغنی تبسم کو اس ضمن میں زحمت دی جا سکتی
اسی طرح مسعود صاحب کی شخصیت پر بھی کوئی سیر حاصل مضمون ہوتا تو
نفا جوان کے کسی خلوت و جلوت کے ساتھی سے لکھوایا جا سکتا تھا تحقیقی نقطۂ نظر سے
ے اہم گوشہ پروفیسر صاحب کے مضامین کا اشاریہ اور تصنیفات اور تالیفات
رست ہے یہ بہت اہم کام ہے جس سے پروفیسر مسعود کی ساری علمی و تحقیق
وں کو بہ یک نظر معلوم کیا جا سکتا ہے علم کے سپاہیوں اور محققین کے لیے توجہ
نعت غیر مترقبہ ہے مضامین (۱۰۱) پیش لفظ و مقدمات (۹) تصنیفات (۲۴)
لیفات (۱۲) ۔ اس فہرست کو بھی مکمل نہیں کہا جا سکتا مثلاً ڈاکٹر مصطفےٰ کمال
اب " حیدرآباد میں اردو کی ترقی " کا پیش لفظ اس میں شامل نہیں اتنے سارے
ر دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ پروفیسر صاحب نے کس طرح زندگی کے ایک
پل کو ضائع ہونے سے بچایا ۔ اسی کے ساتھ ساتھ جامعہ ملیہ کی وائس چانسلری کے
بھی انجام دیے پروفیسر صاحب کی مثال کو خصوصاً ان لوگوں کے لیے ایک
ہونی چاہیے جو بہ مشکل دو ایک کتابوں کے مصنف یا مؤلف بن کر، قول
رآبادی عالم و فاضل کہاتے ہیں اور پوچھے کوئی الف تو اسے بے بتاتے ہیں کتاب
جامعہ کے معیار کے مطابق خوبصورت کتابت طباعت اور گیٹ اپ کے ساتھ
ہے اور مکتبہ جامعہ کے دلی بمبئی اور علی گڑھ کے بک ڈپو سے (۴۵) روپے
حاصل کی جا سکتی ہے ۔

کتاب نما کا خصوصی شمارہ

ڈاکٹر اجمل اجملی

(علمی، لسانی، اور ادبی خدمات ـــــ)

مرتبہ : علی احمد فاطمی
عذرا رضوی
ناشر : ماہنامہ کتاب نما، جامعہ نگر، نئی دلی - ۲۵
قیمت : /۴۵ روپے
مبصر : پروفیسر عنوان چشتی

اجمل اجملی اردو کے اُن جیالے فن کاروں میں شامل ہیں جنھوں نے وا تمی زندگی اور
ب کی خدمت میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ صرف کر دیا ہے ۔ ان کے کارنامے ترجمے،
نت اور شاعری پر مشتمل ہیں ۔ اگرچہ انھوں نے ہر جگہ اپنی بصیرت کا ثبوت مہیا کیا
، لیکن " شاعری " میں ان کا تخلیقی جوہر کھلتا اور کھلتا ہوا نظر آتا ہے ۔
اجمل اجملی ایک صوفی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں ۔ انھوں نے جس کا شدید
قبول کیا ہے ۔ اور انھوں نے اس کا اعتراف بھی اپنے شعری مجموعے کے دیباچے میں

کیا ہے۔ یہ سوال اجمل اجملی کے مارکسی نقادوں کے سامنے بار بار آتا رہا کہ انھوں نے تصوف کی روحانی اقدار اور اشتراکیت کے مادی افکار میں کس طرح تال میل پیدا کیا ہے۔ جس کا اظہار ڈاکٹر قمر رئیس کا مضمون "اک شعلۂ آگہی" میں بھی ہوا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ انسان اپنے بچپن میں جو اثرات قبول کر لیتا ہے، زندگی بھر اس سے دامن نہیں چھڑا سکتا۔ یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر اجمل اجملی اپنی ساری اشتراکیت کے باوجود بنیادی طور پر تصوف کی روحانی اور اخلاقی اقدار کا پاسبان اور مبلغ رہا۔ سچائی یہ ہے کہ انھیں تصوف کی انسانی دوستی نے ہی اشتراکیت کی دہلیز تک پہنچایا۔ شاید اسی وجہ سے غالی اور کٹر اشتراکیوں نے انھیں اور ان کے کارناموں کو وہ اہمیت نہیں دی، جس کے وہ مستحق ہیں۔

ادب میں ایک مسئلہ ترقی پسندی کے اظہار کا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کون ترقی پسند ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ ہر وہ ادیب یا شاعر ترقی پسند ہے جو کہ ذہنی اقتدار کا ہم نوا نہیں ہے یا معاشرے میں تبدیلی کا خواہاں ہے؟ یا اپنی شاعری میں حریت فکر، رجائیت اور امید کی روشن اقدار کو پیش کرتا ہے۔ تو اس کا جواب واضح ہے کہ یہ تمام باتیں ہر دور کے بالغ نظر اور بڑے شاعروں کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ اس لیے ترقی پسندی سے مخصوص نہیں ہیں۔ البتہ دو باتیں مخصوص ہو سکتی ہیں ایک ادیب کا مارکسی ہونا دوسرے مارکس وادیوں کی تقلید محض کرنا۔ اجمل اجملی اس اعتبار سے ترقی پسند ضرور تھے کہ وہ مارکس وادیوں کے طرف دار ہیں۔ البتہ ان کے فکر و فن کا تار پود مارکس کے نظریات سے نہیں بلکہ تصوف اور روحانی اندار سے بنا ہے۔ میں نے دہلی میں اردو غزل کا انتخاب تیار کیا تھا اور ان کی شاعری کے مزاج کے بنیادی خواص کے پیش نظر انھیں ترقی پسندوں میں جگہ نہیں دی بلکہ جدیدیت کے علم برداروں میں رکھا۔ اس پر بعض احباب ناراض ہوتے۔ لیکن اپنے موقف پر قائم اب زیر نظر کتاب دیکھ کر اپنے فیصلہ پر از سر نو ایمان تازہ ہو گیا۔ ڈاکٹر اجمل اجملی کے چند اشعار سنئے جو جدید اسلوب کے حامل ہیں۔

ہر گھڑی رہتا ہے یہ خدشا مجھے
پی نہ جائے وقت کا دریا مجھے
(موت اور اجتماعی موت کا خوف)

چھوڑ آیا ہوں سلگتی دھوپ میں
جانے کیا کہتا ہو نقش پا مجھے
(اخلاقی اقدار کا احساس)

مجھے خوشی ہے کہ اجمل اجملی کے اس اسلوب حیات کی ان کے سوانح نگاروں خلاؔ سرور علی احمد فاطمی عبداللہ بخش قادری اور قمر رئیس صاحب نے محسوس کیا ہے، اور اس ا

اڈیٹر کتاب نما کے نام

کھلے خطوط

(مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

اردو قومی یکجہتی کی زبان ہے اور گنگا جمنی تہذیب کی آئینہ دار ہے اسی اردو زبان کے ادنا طالب علم کی حیثیت سے میرے جذبات اور میرے قومی آہنگی مزاج کو' بابری مسجد کے شہید ہونے سے جو صدمہ پہنچا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ عبادت گاہوں کو گرانا کسی مذہب میں جائز نہیں۔ اللہ کے گھر میں اور رام کے گھر میں تمیز کرنا مذہبی اصولوں سے ناواقفیت اور کفر کے مترادف ہے۔ اس سے ہندستان کی اعلا قومی روایات اور رنگا رنگ ماحول کو جو ضرب پہنچی ہے اسے ہر ہوش مند ہندستانی محسوس کر رہا ہے۔

گاندھی، بدھ، نانک اور چشتی کے دیش میں دھرم کی آڑ میں یہ ادھرم کیا؟ رام کے پاک نام کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنا انتہائی ناپاک اور شرمناک حرکت ہے۔

ہر مہذب شہری کا فرض ہے کہ وہ عدلیہ کے احکام کی نہ صرف پابندی کرے بلکہ احترام بھی کرے۔ مندر بنے ضرور بنے مگر جب یہ معاملہ عدلیہ کے سامنے ہے تو عدلیہ کے احکام کے مطابق بنے اور بغیر کسی کے جذبات مجروح کیے ہوئے بنے وہی مندر واقعی رام کا مندر ہوگا اور وہاں رام کی رحمتوں کی بارش ہوگی۔

جن شری رام نے جمہوری قدروں کی حفاظت کے لیے ایک معمولی دھوبی کے کہنے پر اپنی پاکدامن اہلیہ کو تیاگ دیا ان ہی شری رام کے ماننے والے جمہوری اقدار کا اس طرح خون کریں اس سے زیادہ کردار کے ابتذال کی مثال اور کیا ہوگی۔ میں اپنے تمام سیکولر مزاج ہم وطنوں (جن میں میں بھی ہوں) جن کے جذبات کو اس المناک سانحہ سے ٹھیس لگی ہے، کے غم میں برابر کا شریک ہوں اور اس کی پُر زور مذمت کرتا ہوں۔

پریس کے نمائندوں اور پریس فوٹو گرافروں پر حملہ اور ان کے ساتھ بدسلوکی بھی ایسی ناشائستہ حرکت ہے جو تہذیب یافتہ کہلانے والی سماج کے لیے کلنک ہے اور قابل مذمت ہے۔

آخر میں خالق کائنات سے التجا کرتا ہوں کہ وہ بہکے ہوئے لوگوں کو عقل سلیم اور صحیح مذہبی شعور عطا فرمائے۔

راجندر بہادر موج

موج مارگ، فتح گڑھ ، یوپی ۸ دسمبر ۹۲

مکرمی! دسمبر ۱۹۹۲ء کا شمارہ ایسے حالات میں موصول ہوا، کہ ادب ودب کو ایک ...

دیکھنے کو بھی دل نہ چاہتا تھا۔ جنوری ۱۹۹۳ء کے دوسرے ہفتے میں جب آپ سے ملاقات ہوئی تو
اس وقت بھی ادب پر بات کرنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ کیا انسان اتنا وحشی و درندہ ہو سکتا ہے؟
کیا وہ عقل و ہوش سے محروم ہو کر توہمات کے سہارے بے گناہوں اور بے قصوروں، مجبوروں، لاچاروں،
مظلوموں، مسکینوں اور نو رستوں، بچیوں اور عورتوں کو نذر آتش کر سکتا ہے، عصمت دری کر سکتا ہے، غنڈہ گردی،
قزاقی کر سکتا ہے، افراز و اعزہ کے ساتھ گھروں کو واپس کیا جا سکتا ہے تاکہ اپنے سیاہ کرتوتوں پر فخر کر سکے، پھر بڑھ چڑھ کر یہ شخص
پر داز شجاعت حاصل کر سکے اور سیاسی فرقہ پرست جماعت کا معزز مہمان (VIP) بن سکے۔

مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے "سیکولرزم" مفلوج و معذور ہو چکا ہے۔ اجودھیا میں
تین دن تک اندھکار سیوکوں کا راج رہا اور "سیکولرزم" بے دخل رہا۔ بمبئی، سورت، احمد آباد،
کانپور، بھوپال میں فرقہ پرست راکشس تباہکاری و بربادی پھیلاتے رہے اور "سیکولرزم" سوچتا رہا
کہ اب کچھ کرنا چاہیے۔ حد یہ ہے کہ ۲۵/ جنوری ۱۹۹۳ء کو ممنوعہ جماعت وی ایچ پی نے الہ آباد میں
تروینی پر کانفرنس کی اور "سیکولرزم" کوئی تادیبی عمل نہ کر سکا۔ ایک فرقہ پرست جماعت کہتی ہے
کہ بابری مسجد ہم نے گرائی ہے، دوسری فرقہ پرست جماعت کہتی ہے کہ بمبئی کو ہم نے اجاڑا اور "سیکولرازم"
درگذر سے کام لے رہا ہے۔ ہم کس پر اعتماد کریں اور کس پر بھروسا کریں!

جنوری ۹۳ء کے کتاب نما کے مہمان مدیر رام پرکاش کپور صاحب نے اردو کے سیکولر
کردار پر بہت اچھا اداریہ لکھا ہے۔ میرے ذہن میں چند سوالات ہیں جو میں عام قارئین کے غور و
فکر کے لیے پیش کر رہا ہوں:

آخر یہ ثابت کرنے کی کوشش کیوں کی جاتی ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان نہیں ہے؟ یہ
حقیقت ہے کہ اردو میں متعدد غیر مسلم مشاہیر پیدا ہوئے ہیں، لیکن اچانک غیر مسلم مشاہیر نے
اپنی آئندہ نسل کا رشتہ اردو سے منقطع کیوں کر دیا؟ انیسویں صدی کے آخر میں اردو اخبارات
میں ہندی، ہندو، ہندوستان کی جنگ لڑی جاتی رہی اور یہ سلسلہ بیسویں صدی کے شروع تک
جاری رہا۔ پھر آخر اچانک اردو مسلمانوں کی زبان کیسے بن گئی؟ اگر مہاسبھائیوں، آریہ سماجیوں
اور سناتن دھرمیوں کے دعوے کے باوجود دیوناگری لپی میں ہندی ہندوؤں کی زبان نہ بنی
تو مسلم لیگ کے دعوے کے بعد اردو کو کیوں نقصان پہنچ گیا؟ اگر ہندی نیپال کی سرکاری زبان
ہونے کے بعد نیپالی نہیں بنی تو اردو پاکستان میں رابطے کی زبان ہونے کی وجہ سے پاکستانی
کیسے ہو گئی؟ سوالات اور بھی بہت سے ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ ان کے جوابات
دینے کے بجائے مجھے فرقہ پرست قرار دے دیا جائے گا۔

دسمبر ۹۲ء کے شمارے میں ڈاکٹر نصیر احمد خان صاحب کا مقالہ "اردو زبان کے معیار" شائع
ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر کسی زبان کو اس کے معاشری ثقافتی سیاق سے منقطع کر کے جانچا جائے
تو اس کے لیے مستعار معیارات غیر معتبر ہو جائیں گے۔ میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ ڈاکٹر
صاحب نے "فاضل معیار" کی مثال میں ایک فقرہ تحریر فرمایا ہے جو اس طرح ہے: "کل آپ غریب
خانے پر قدم رنجہ ہونے کی زحمت گوارا فرمایئے" SUPER-STANDARD کا ترجمہ "فوق معیار" بتایا

جاتا رہا ہے اور "فاضل معیار" EXTRA STANDARD کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ ثانیاً محاورہ "قدم رنجہ ہونا" نہیں "قدم رنجہ فرمانا" ہے۔ جس مجلس میں یہ محاورہ مستعمل تھا وہ اب نہیں رہی۔ اس لیے اسے رائج نہیں متروک میں شمار کیا جانا چاہیے۔

ڈاکٹر کیان احمد صدیقی صاحب اور ڈاکٹر مرزا حلیل احمد بیگ صاحب کی "جنگ" اب کچھ اپنی بات کی پیچ بنتی جا رہی ہے۔ ان دونوں حضرات سے میری گزارش ہے کہ اب خطوط کے بجائے مقالات لکھیں، کچھ فکر انگیز باتیں پیش کریں۔

امین زبیر سیت الصالحہ، رینہ عنایت خاں
رام پور۔ (یوپی) ۲۴۴۹۰۱

میں اکتوبر کے وسط میں دہلی آیا۔ آپ سے ملنا چاہتا تھا مگر نہ مل سکا کیونکہ اچانک ۔ نومبر ۹۲ء کو شدید قلبی دورے کا شکار ہو کر نوئیڈا کے ایک اسپتال میں زیر علاج رہا بچ گیا مگر اس کے بعد اور بہتر اسپتالوں کا چکر کاٹنے کے لیے بیسوں TESTS ہو چکے ہیں، سلسلہ جاری ہے تقریباً طے ہے کہ بائی پاس کے لیے آپریشن ہوگا۔ اسکارٹ اسپتال کے بیڈ نمبر ۵۰۸ میں آج دس فروری ۹۳ء ہے۔

میری بیگم صاحبہ نے کتاب نما کا تازہ شمارہ لا کر دیا ہے تھوڑا بہت پڑھ رہا ہوں۔ وہاں پر برادرم سرشش اختر کا مقدمہ پڑھا خوشی ہوئی کہ کمار پرشش نے لکھا ہے۔ منظر شہاب کے بارے میں مظہر امام سے فون پر بتایا تھا کہ وہ ویلور اسپتال میں ہے خدا جانے کیا ہوا ہے۔

تمارمنی کتاب نما دعاگو (کلام حیدری) اے ۳۸۰۔ سیکٹر ۲۰ نوئیڈا (یوپی)

● کتاب نما دراصل آئینہ حقیقت نما ہے۔ جنوری کے شمارے میں مہمان مدیر جناب رام پرکاش کپور نے نہایت دردمندی سے "ہندستان میں اردو کے مسائل" کا جائزہ لیا ہے اور قابلِ عمل تجاویز پیش کی ہیں۔

سید حامد صاحب کا بابری مسجد کی شہادت پر مفصل مضمون اور رفعت سروش کی نظم احتساب فرقہ وارانہ صورت حالات کا نوحہ ہے جس کے اثرات یہاں برطانیہ تک ظاہر ہوئے ہیں۔

اختر ضیائی لندن

● یوسف ناظم صاحب کا خط دسمبر ۹۲ء نظر سے گزرا۔ انھوں نے ڈاکٹر جاوید شسٹنٹ صاحب کے اشارے پر جو تبصرہ کیا ہے وہ قابل ستائش ہے اور میں اس کی تائید کرتا ہوں۔

جاوید شسٹنٹ صاحب کی اچھی تجویز ہے اس کا ہر طرح سے خیر مقدم کرنا چاہیے اور یہ آنے والے کل کے لیے بھی ضروری ہے۔ اس تجویز پر جیسا کہ یوسف ناظم صاحب نے لکھا کہ "جامعہ عثمانیہ میں ایسا ہوتا تھا" دراصل یہ ۸۵۔۱۹۸۴ء کی بات ہے کہ جب میں جامعہ عثمانیہ کا طالب علم تھا اور ایم اے سالِ اول میں ایک پرچے کے دو حصے کر کے اس کو ہندی / فارسی میں تقسیم کر دیا گیا تھا جو ۱۰۰ نمبرات کا تھا یہ حصہ کے

۵۰ نمبر تھے۔ خاص طور پر یہ اسکیم اس وقت
سنہ ۱۹ ع کی تھی۔ اس دور میں محترم ہاشم علی اختر
صاحب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔
فارسی اس حادثے کی غزلیں خیام کی رباعیات
سعدی کی گلستاں کو شامل کیا گیا اور ہندی
میں دہر کا مہا کال کے علاوہ دو چار ہندی
کے شاعروں بھن وغیرہ کو رکھا گیا۔ فارسی تو
یوں تو ان کے پڑھائی جاتی رہی مگر ہندی
کے لیے الگ کوششوں کے باوجود کچھ نہ ہو
سکا۔ آخر کار اس وقت کے صدر شعبہ پروفیسر
سید جعفر سے رابطہ پیدا کیا تو انھوں نے
صاف انکار کر دیا کہ یونیورسٹی ہندی ڈپارٹمنٹ
سے کسی لکچرر کو دینے کو تیار نہیں ہے۔ آخر کار
اردو کے ہی ایک ریڈر نے ہمیں پڑھایا اور
انھیں چھوٹ دی گئی کہ ہندی کا ترجمہ اردو زبان
میں لکھا جائے۔ کچھ یہی سلسلہ چلتا رہا اس
وقت ہم لوگوں نے نمائندگی کی جن میں طیبہ
خسرو، محمد عبدالشکور لکچرر نظام کالج وغیرہ
شامل تھے۔ ہماری آواز نقار خانے میں طوطی
کی آواز کی طرح دب کر رہ گئی۔ اور پھر
شاید اس کو نکال دیا گیا۔ اگر یہ سلسلہ شروع
کیا جائے تو اردو ادب میں نکھار پیدا ہو گا۔
اور ہمارے نوجوان فارسی اور ہندی سے
واقف ہیں اس وجہ سے قدماء کو آسانی سے
سمجھ سکیں گے۔

(م۔ ق۔ سلیم۔ ایم۔ اے ریسرچ اسکالر
سائبان ۲۶۹-۴-۱۹۔ بیرون فتح دروازہ۔ حیدرآباد)

● ماہ دسمبر کا "کتاب نما" میں شعری حصہ
میں رؤف جاوید، غضنفر، ہمایوں ظفر زیدی،
شہناز نبی اور نسیم شاہجہاں پوری کی غزلیں
بطور خاص پسند آئیں۔ شہریار احمد قاسمی کے
مضمون "فراق گورکھپوری: صبات اور شاعری"
اور ڈاکٹر سید محمد اصغر کے مقالے "خواجو کرمانی
کی قصیدہ نگاری" سے ہمارے علم میں بے شک
اضافہ ہوا ہے۔

اسرار محمد دانش، سری نگر، کشمیر

● جناب شجاع خاور نے اپنے مہمان
اداریے "مہمان اشاریے" اپنی منفرد
مزاح، بردباری، اخلاقی اور بالغ نظری
کا ثبوت پیش کیا ہے۔ عروض کے متعلق
اور لوازمات پر بحث کرتے ہوئے موصوف
نے اپنے خیالات کا اظہار دلچسپ، فکر انگیز
اور نتیجہ خیز انداز میں کیا ہے۔ مقالات
میں مسلم ضیم اور شہزاد منظر صاحبان نے
سوویت ادیبوں اور روسی ادب کے
مختلف پس منظروں اور پیش منظروں کو
انصاف پسندی، خلوص اور توجہ دہی سے
واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ رشید
شبنم عابدی پر رفیق جعفر کا مقالہ پڑھ کر
بے اختیار جناب اسیر اور دوی کا
پروین شاکر پر لکھا گیا اسی انداز کا مقالہ
یاد آگیا جو اپریل ۹۰ کے "نیا دور لکھنؤ"
میں شائع ہو چکا ہے۔ ادبی قد و قامت
اور شعری قدر و قیمت کے لحاظ سے دونوں
شاعرات کو ایک دوسرے کے مد
مقابل اطمینان اور آسانی کے ساتھ رکھا
جا سکتا ہے اسی طرح سے مجتبیٰ حسین کا "
مشتاق احمد یوسفی" پر مقالہ کما حقہ شایانِ
شان ہے۔ نظموں میں رفعت
سروش کے علاوہ اور کسی شاعر کی کاوش
پلے نہیں پڑ سکیں۔ غزلیات کے گوشے

میں ماجد الباقری۔ عتیق اللہ وجاہت علی سندیلوی، شاہد نجیب آبادی، انجم عرفانی، منشاءالرحمٰن منشاؔ، اور نعیم حیدر کی غزلیں ہی عصری حسیت اور رومانوی اہمیت کی آئینہ دار ہیں۔ ایک خطرناک رجحان یہ بھی پنپتا جا رہا ہے کہ چند مشہور اور بزعم خود مقبول مصنفین حضرات، مختلف جرائد و رسائل کے خطوط کے کالموں میں اپنے آپ کو چھپوانے کے مرض میں گرفتار یا مبتلا ہو گئے ہیں۔ یہ رویہ کسی بھی طرح، صحت مندانہ اور مستحسن نہیں کہا جا سکتا۔

محمد ابراہیم صدیقی، ۹۷۳۔اے،
حسن منزل انکلیو، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

سابقہ جریدے کتاب نما، سید حامد صاحب کا مضمون "ایودھیا کے بعد کیا" بہت بصیرت افروز تھا اور نہ صرف مسلمانانِ ہند کے احساسات کی ترجمانی کر رہا ہے بلکہ ہندستان کے ہر اس شہری کا خیالات کا عکاس ہے جو ملک میں امن و آشتی کے علم بردار ہیں۔

شاہد نجیب آبادی،
پوسٹ بکس ۲۶۵۷۲ بحرین

● پروفیسر نعیم احمد کا مضمون "عصر حاضر کے تقاضے اور سرسید" ایک پُر مغز اور معلوماتی مضمون ہے۔ اردو زبان کے معیار بھی ایک فکر انگیز مضمون ہے۔ حصہ نظم پر حضرت نسیم شاہ جہاں پوری۔ شفیع اللہ خاں راز آبادی، مہتاب جمشید پوری۔ اور ہمایوں ظفر کی غزلیں بہت پسند آئیں۔

اخلاق سہسوانی۔ سہسوان بدایوں

● ماسٹر اختر صاحب کا اردو کی بقا سے متعلق مہمان اداریہ بہت دلچسپ اور معلومات آفریں ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے مضمون "سخنے چند در ساختیات" کے مطالعہ سے ساختیات کے متعلق جو نئی معلومات بہم ہوئیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اردو کا غیر ملکی اسکالر لینڈا دی ٹیگ نے اردو میں ساختیات کے رویے کو روشن کرنے میں قابل قدر خدمات سے نوازا ہے۔ شہریار قاسمی صاحب کا مضمون فراق گورکھپوری حیات اور شاعری۔ بہت ہی معیاری اور فکر انگیز ہے۔ شعری حصے میں محمد نوید مرزا، شفیع اللہ خاں راز اور محفوظ اثر ناگپوری بھی خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں انھوں نے اپنے اشعار میں موجود فرقہ وارانہ تشدد کی حسین عکاسی کی ہے جناب نوید مرزا کی ہائیکو نظم کا یہ ٹکڑا کافی سحر انگیز ہے۔

رات غارت گروں کے میلے سے
میں وہ پتھر خرید لایا ہوں
آدمیت کا خون ہے جس پر

ڈاکٹر محمد محسن۔ ریسرچ ایسوسیئیٹ، شعبۂ فارسی، بہار یونیورسٹی
مظفرپور، بہار

● گوشۂ مسعود حسین خاں کتاب نما کی سابقہ شاندار روایت کے مطابق بڑی محنت اور لگن سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں شامل مخت اہل قلم حضرات کے مضامین پروفیسر مسعود حسین خاں کی علمی و ادبی شخصیت کے متنوع پہلو اجاگر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر فداءالمصطفیٰ، شعبۂ اردو فارسی
ساگر یونیورسٹی ساگر (ایم، پی)

● کتاب نما" ماہ نومبر نظر نواز ہوا۔ مشمولات پسند آئے ڈاکٹر تارا چرن رستوگی، رشید حسن خاں خلیل ادیب اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے نہایت اہم موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ یہ تمام مضامین ذوقِ مطالعہ کو تسکین بخشتے ہیں۔ کھلے خطوط اور جائزے کا حصہ بھی قابلِ توجہ اور متاثر کن ہے۔ ایک مرحوم کی واپسی، یوسف ناظم، بے حد دلچسپ ہے۔ اب کے شعری حصہ کمزور ہے۔ صرف ظہیر غازی پوری، علقمہ شبلی اور ابو محمد سحر نے متاثر کیا۔ کرامت علی کرامت کی غزل اہم ہوتے ہوئے بھی مناسب جگہ نہیں پا سکی۔ وہ اس عہد کے معروف شاعر اور ناقد ہیں۔

خلیق انجم (پٹنہ بہار)

● مہمان مدیر ڈاکٹر تارا چرن رستوگی ریسرچ اسکالروں اور نگراں حضرات کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ اس پیرانہ سالی میں بھی ان کا قلم اتنا طاقتور اور ان کی تحریریں ذہنی یکسوئی اور قوتِ ارتکاز کا ثبوت فراہم کرتی ہیں" یہ انہی کا حصہ ہے۔ یوسف ناظم اور دلیپ سنگھ نے حسبِ معمول محظوظ کیا۔

سہیل ارشد ۱۲ ڈنگل
اندال نمبر ۷۱۳۳۲۴، ضلع بردوان)

● جناب خلیل آذر کا مضمون "علمی اعتقادیات ایک قاری کی نظر میں" بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جناب ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا "تصانیف اقبال کا اشاعتی معیار" بے حد معیاری ہے اور جناب ڈاکٹر برج پریمی کا مضمون "منٹو اور شاعرِ کشمیر مہجور" اپنی مثال آپ ہے۔ افسانوی گوشہ بھی نہایت اہم اور پسندیدہ ہے۔ حصہ نظم میں ابو محمد سحر، عرش رامپوری، علقمہ شبلی، افتخار احمد صدیقی، مسلم سلیم، فضل افضل، ملک نسیم، نصر غزالی، عمران بن عمر فنی، حفیظ بنارسی اور ظہیر غازی پوری کی تخلیقات بہت پسند آئے۔ طنز و مزاح کا حصہ کس ظالم کو پسند نہیں آئے گا۔ یوسف ناظم، دلیپ سنگھ اور صادقہ ذکی کے اسمائے گرامی ہی ان کی بہترین تخلیقات کی سند کے طور پر کافی ہیں۔ جائزے کے تحت کتابوں پر تبصرے صداقت مبنی ہیں۔ کھلے خطوط میں سبھی خطوط پسند آئے۔ ادبی و تہذیبی خبروں کا حصہ انتہائی بہترین حصہ ہے۔ اس کے ذریعہ ملک و بیرونِ ملک کی ادبی و تہذیبی خبروں سے ہمیں آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ غرض یہ کہ کتاب نما" انتہائی معیاری ادبی جریدہ ہے۔ میں آپ کی ادارت میں شائع ہونے والے اس دیرینہ، قابلِ قدر اور انتہائی معلوماتی و معیاری جریدہ کی ماہ بہ ماہ پابندی سے اشاعت کے لیے دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں" گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

نسیم شاہ جہاں پوری

آپ کے مہمان مدیر جناب ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا اشاریہ بلکہ اداریہ "اردو ادبیاتی ریسرچ ..... ایک مسئلہ" نہایت جامع اور حقائق پر مبنی ہے۔ موصوف کی جتنی تخلیقات نظر سے گزریں ان سے میں بہت متاثر ہوا۔ بے حد نڈر، بیباک اور حق گو ادیب ہیں۔ میرے ہم وطن مایہ ناز ادیب و محقق جناب رشید حسن خاں کا مضمون "حالی اور صحتِ زبان" نہایت دقیع اور معلوماتی ہے۔

ادبی اور تہذیبی خبریں

ممتاز ترقی پسند شاعر جناب غلام ربانی تاباں کو خراج عقیدت

نئی دہلی۔ ممتاز ترقی پسند شاعر، دانشور اور مفکر جناب غلام ربانی تاباں کی یاد میں مکتبہ جامعہ کے زیر اہتمام اس کے کارکنوں، رفیقوں اور معاونوں کا ۱ فروری کو ایک ماتمی جلسہ ہوا جس کی صدارت جامعہ کے بزرگ اور مکتبہ جامعہ کے ڈائرکٹر جناب سید مجتبیٰ حسین زیدی نے کی۔ مجلہ جامعہ کے اڈیٹر سید جمال الدین نے جلسے کی نظامت کی۔

تاباں صاحب کا طویل علالت کے بعد ۷ فروری کو انتقال ہو گیا تھا۔ انکی عمر تقریباً اسّی سال تھی۔ مرحوم ترقی پسند تحریک کے معماروں اور سیکولر جمہوری قدروں کو فروغ دینے والوں میں ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ انھوں نے آخر دم تک فرقہ واریت کے خلاف قلمی جہاد کیا۔ اسی جہاد کی ایک کڑی یہ تھی کہ علی گڑھ اور مرادآباد کے فسادات کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے انھوں نے اپنا پدم شری کا ایوارڈ واپس کر دیا تھا۔

جامعہ ملیہ کے پروفیسر عنوان چشتی نے کہا کہ تاباں صاحب کا انسانی اتحاد کا جذبہ اس قدر سرگرم تھا کہ وہ اپنے بستر مرگ سے بھی فرقہ واریت کے خلاف مضامین لکھتے رہے۔ وطن پرور خیالات کو مشن بنانے والوں میں انکا مرتبہ منفرد ہے۔

جواہر لال نہرو یونی ورسٹی کے پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی نے کہا کہ وہ اردو زبان اور ادب کے سنجیدہ اور مخلص خادم تھے۔ جامعہ برادری میں ان کا مقام ایک مشفق اور خیر اندیش کا تھا۔

جامعہ ملیہ کے ڈاکٹر شمیم حنفی نے کہا کہ تاباں صاحب برسوں مکتبہ جامعہ کے سربراہ رہے اور انکی قیادت میں اس ادارے نے پوری دنیا میں اپنے لیے ایک مستقل اور منفرد حیثیت حاصل کر لی۔

جناب عبداللہ ولی بخش قادری نے کہا کہ تاباں صاحب کی مفارقت سے جامعہ کی ادبی اور سماجی فضا میں گہرا خلا پیدا ہو گیا ہے۔

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے تاباں صاحب پر اپنے ایک طویل مضمون سے کچھ اقتباسات سنائے جن میں مرحوم کے دردمند فکر و عمل کی عکاسی کی گئی۔

مکتبہ جامعہ کے موجودہ جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں نے بتایا کہ وہ تاباں صاحب سے کچھ عرصہ پہلے مکتبہ جامعہ میں شامل ہوئے تھے۔ لہٰذا انھوں نے ادارے کی ترقی کے لیے تاباں صاحب کی انہماک اور خلوص کو نہایت نزدیک سے دیکھا اور اس سے بے حد متاثر ہوئے۔ مرحوم نے نہ صرف اس ادارے میں ایک جدید پرنٹنگ پریس لگوایا بلکہ

اسے درسی کتابوں کی اشاعت کا اہم مرکز بنایا۔ شاہد علی خاں صاحب نے کچھ سربستہ رازوں کا افشا کرتے ہوئے بتایا کہ ادارے ہی کے کچھ کارکن تاباںؔ صاحب کی منصوبہ بندی اور تدبیروں کو ناکام بنانے کی کوشش کرتے رہے لیکن مرحوم ان سے الجھے بغیر گہری قوت ارادی اور ثابت قدمی سے اپنی مسائل میں مصروف رہے۔ ان کی ذات وحیات ادارے کی بہتری اور ترقی کے لیے وقف رہی۔

مرحوم کی نواسی محترمہ میرا رضوی اور جامعہ کی معلمہ ڈاکٹر صغرا مہدی نے اپنے مقالوں میں تاباںؔ صاحب کی شخصیت اور اپنے خاندان و جامعہ برادری کے افراد سے ان کی گہری شفقت اور ہمدردی کے واقعات سنائے۔

آخر میں دو منٹ کی دعائیہ خاموشی کے ساتھ ایک تعزیتی قرارداد پاس کی گئی جس میں کہا گیا کہ جس بے لوثی اور انہماک کے ساتھ تاباں صاحب نے مکتبہ جامعہ کو ایک اشاعتی ادارہ کے ساتھ ساتھ ذہنی تحریک اور اردو کی ترقی کے ترجمان کا منصب دلانے کی جدوجہد کی اس کے لیے مکتبے کی اور اس ادارے سے وابستہ اردو کی تاریخ انھیں ہمیشہ یاد رکھے گی۔

مرحوم کے پسماندگان میں تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔

جناب غلام ربانی تاباں ۱۴ فروری ۱۹۱۴ء کو اترپردیش کے ایک زمیندار گھرانے میں پتورا (ضلع فرخ آباد) میں پیدا ہوئے۔ اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد انھوں نے قانون کی تعلیم میں ڈگری حاصل کی لیکن مزاج وکالت کے پیشے کی طرف مائل نہیں تھا انھوں نے تحریکِ آزادی میں سرگرم [حصہ] لیا اور ۱۹۴۶ء میں ایک کمیونسٹ کارکن کی حیثیت سے جیل کاٹی۔ ۱۹۵۰ء میں وہ دہلی آگئے اور مکتبہ جامعہ میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۵۷ء تا ۱۹۷۰ء یعنی ۱۳ سال اس کے جنرل مینجر رہے۔ ان کی منظومات کے چھے مجموعے شائع ہوتے۔ وہ فروغ اردو کی سفارشات کے لیے قائم کردہ مرکزی گجرال کمیٹی کے معاون بھی رہے۔ انھیں ساہتیہ اکادمی، دہلی اردو اکادمی اور سا[بق] حکومت سوویت روس کا نہرو ایوارڈ کے اعزازات ملے۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے صدر بھی رہے۔

تی ڈی چند

مخمور سعیدی کے اعزاز میں ایک نشست

۳ فروری کو مقامی اردو بھون میں حلقۂ ادب بہار کی جانب سے مخصوص ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ نشست اردو کے ممتاز شاعر "ایوان اردو" دہلی کے اڈیٹر جناب مخمور سعیدی کے اعزاز میں منعقد کی گئی تھی۔ [نشست] کی صدارت بزرگ شاعر جناب صاحب

نے فرمائی اور نظامت کے فرائض معروف جدید افسانہ نگار جناب فخرالدین عارفی نے انجام دیے۔ جناب منور سعیدی نے اس موقع پر اپنی کئی خوبصورت غزلیں اور نظمیں پیش کیں جنھیں حاضرین نے کافی پسند کیا۔ جناب صابر آروی، جناب شفیع مشہدی جناب ڈاکٹر ظہیر احمد، جناب شان الرحمان اور جناب اثر فریدی وغیرہ نے بھی اس موقع پر حاضرین کو اپنے کلام سے نوازا۔ ڈاکٹر عبدالمغنی ڈاکٹر شاہد جمیل خاں، جناب شمیم قاسمی، محترمہ تسنیم کوثر، پروفیسر انوارالحق تبسم، جناب مظہر عالم مخدومی، جناب ریحان غنی، جناب شوکت فرید تشنہ، جناب عنایت کریم، جناب انگار عظیم چاند، جناب حسن احمد، جناب پرویز عالم، جناب محمد نسیم احمد وغیرہ کے علاوہ متعدد قابل ذکر لوگوں نے اس نشست میں شرکت فرمائی۔

محمد نسیم احمد، سکریٹری، حلقۂ ادب بہار، پٹنہ

بلبل کے ساتھ ایک شام

ہنسلو مسلم آرٹ اینڈ کلچرل سوسائٹی نے لندن بارو آف ہنسلو کے لیثر ر سروسز کے تعاون سے برطانیہ میں مقیم اردو کے ممتاز منفرد اور ہر دلعزیز شاعر طنز و مزاح بلبل کاشمیری کو ان کی طویل ادبی خدمات پر خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ یہ کامیاب تقریب ایک یادگار تقریب کہی جاسکتی ہے۔ تقریب کے بعد ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا۔ جس میں برطانیہ کے ممتاز شعرا نے شرکت کی۔ یہ تقریب انیگو ہال ہنسلو لندن میں ۲۴ جنوری ۹۳ء کو منعقد ہوئی۔ صدارت۔ اکبر حیدرآبادی۔ مہمان خصوصی۔ راج ملہوترہ نظامت۔ مقبیل دانش، جن ادبا اور شعرا نے بلبل صاحب کی ادبی خدمات پر اپنے تاثرات پیش کیے ان کے نام یہ ہیں۔ سلطان الحسن فاروقی، سوجن راہی، اختر ضیائی اور عبدالرحمن بزمی۔ ۹۲ سالہ عمر کے شاعر جناب حکیم غلام نبی حکیم نے بلبل صاحب کی خدمت میں منظوم خراج تحسین پیش کیا۔

ہریانہ اردو اکادمی کا رام منوہر لوہیا قومی ایوارڈ

ہریانہ اردو اکادمی نے اس سال اپنے سالانہ قومی اور ریاستی ایوارڈوں میں "ڈاکٹر رام منوہر لوہیا ایوارڈ" بھی شامل کیا ہے۔ یہ ایوارڈ قومی سطح پر اردو کے ایک ایسے قلم کار کو دیا جائے گا جس نے ڈاکٹر لوہیا کی حیات اور سماجی خدمات کے حوالے سے اردو میں تخلیقی و تحقیقی کام کیا ہو۔ یہ ایوارڈ گیارہ ہزار روپے، بلیک، شال اور سند پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے پسماندہ اور غریب عوام کے مسائل کو حل کرنے کے لیے

متعدد اقدام کیے۔ ادب کے حوالے
سے ڈاکٹر لوہیا کی عوامی خدمات اور
تعلیمات سے متعلق جس میں غریب عوام
کو اس کی سطح سے اوپر اٹھنے کی تحریک
بھی شامل ہے۔ اس سلسلہ میں ہریانہ
اور بیرونِ ہریانہ کے اردو قلم کاروں
نے جو قابلِ قدر تخلیقی، تحقیقی اور تصنیفی
کام کیا ہو۔ ان سے گزارش ہے کہ وہ
اپنے کام کی تفصیلات ہریانہ اردو اکادمی
کو روانہ کر دیں تاکہ "ڈاکٹر رام منوہر لوہیا
نیشنل ایوارڈ" کے لیے ان کے نام کو بھی
زیر غور لایا جاسکے۔

پتا۔ ہریانہ اردو اکادمی
۶۱۰ سیکٹر ۱۴ پنچکولہ (ہریانہ)

آسمان ادب کا ایک ستارہ اور ٹوٹا

بتیا (بہار) گزشتہ دنوں اردو کے جلیل القدر
شاعر اور ممتاز صحافی جناب غلام ربانی
تاباں کے سانحۂ ارتحال پر معروف ادارہ
"اردو سوسائٹی" نے جناب تیر عالم کے
دولت کدے پر ایک تعزیتی جلسے کا
انعقاد کیا۔ جس کی صدارت مشہور
شاعر جناب عزیز ربانی نے فرمائی۔
ادارہ کے صدر اور ناظمِ جلسہ
نسیم احمد نسیم نے تاباں صاحب کی ادبی
اور صحافتی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے
کہا کہ وہ اردو کے ان عہد ساز شاعروں
کی صف میں آتے ہیں جن کے نام سے
ایک دور منسوب ہے۔ نظریاتی سطح
پر وہ مارکس کے پیروکار تھے لیکن
انھوں نے جوش، سردار جعفری اور
ن۔م۔ راشد کی طرح کبھی بھی اپنے فن پر
اپنے نظریے کو حاوی نہیں ہونے دیا
وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔
انھوں نے اپنی غزلوں میں تغزل اور موسیقیت
برقرار رکھی۔ ان کے یہاں سنجیدگی، متانت
اور لہجے کا سبک اور دھیما انداز ہر جگہ
ملتا ہے۔

جلسے کے شرکا میں جناب ذاکر کاکوی،
پروفیسر محمد اسلم، ابو الخیر نشتر، محمد مختار وفا،
ظفر امام، گورکھ مستانہ، کشوری لعل،
انشو مالی، اختر حسین اختر اور صدر جلسہ
عزیز ربانی نے اپنے اپنے خیالات
کا اظہار کیا۔

جلسے کے اختتام پر ایک تعزیتی
قرارداد پاس ہوئی جس میں کہا گیا کہ
ہم تاباں صاحب کی موت پر گہرے
رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں اور بزم سخن
کے آئندہ کل ہند مشاعرے کو ان سے
منسوب کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ان کی
حیات و خدمات پر ایک سیمینار کرنے کا
ارادہ کرتے ہیں۔

رپورٹ: نسیم احمد نسیم

اظہار تعزیت

جناب غلام ربانی تاباں صاحب
کے سانحۂ ارتحال پر ہریانہ اردو اکادمی
میں ایک تعزیتی میٹنگ کی گئی جس میں
تاباں صاحب کی خدمات کو یاد کیا گیا۔

اکادمی کے سکریٹری جناب کشمیری لال ذاکر نے کہا کہ تاباں صاحب ایک سیکولر شخصیت کے مالک تھے انھوں نے ہمیشہ ہی ہندو مسلم ایکتا کے لیے کام کیا اور قومی یک جہتی کے فروغ کے کسی بھی موقع کو ضائع نہیں کیا۔ اپنی شاعری کے ذریعہ تاباں صاحب نے ہندستان کی سیکولر اقدار کو پیش کیا اور غریب عوام کے لیے ہمدردی کے جذبہ کو قائم رکھا۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ تاباں صاحب ایک وضع دار انسان تھے جو حالات کے بدلتے ہوتے تیوروں سے کبھی مایوس نہیں ہوتے وہ ایک دردمند دل رکھتے تھے جو لوگوں کی مشکلوں اور پریشانیوں کو دیکھ کر بھر اٹھتا تھا۔

تاباں صاحب کے انتقال پر ہریانہ اردو اکادمی انھیں خراج عقیدت پیش کرتی ہے اور ان کے پسماندگان سے اظہار ہمدردی کرتی ہے اور بارگاہ رب العزت میں دعا کرتی ہے کہ انھیں اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

ہریانہ اردو اکادمی ۔ ۶۱ سیکٹر ۶ پنچکولہ۔

میڈیا نے غلام ربانی تاباں سے انصاف نہیں کیا

دلی اردو اکادمی میں شرکا کا اظہار خیال

نئی دہلی۔ ہمارے الیکٹرانک میڈیا نے اردو کے نامور شاعر جناب غلام ربانی تاباں سے جن کا ۷ فروری کو انتقال ہو گیا، انصاف نہیں کیا۔ نہ صرف ان کی زندگی میں انھیں دوردرشن یا ریڈیو کے نیشنل پروگرام میں شامل کیا گیا بلکہ ان کی وفات کے بعد بھی ان پر کوئی خصوصی پروگرام نہ پیش کیا گیا۔

اس خیال کا اظہار ۱۳ فروری کو دہلی اردو اکادمی کے ایک تعزیتی جلسے میں اکادمی کے موجودہ اور سابق عہدے داروں نے کیا۔

اکادمی کی تحقیق و مطبوعات کمیٹی کے سابق چیرمین ڈاکٹر قمر رئیس نے کہا کہ تاباں صاحب تحریک آزادی میں شرکت کرنے کی بنا پر جیل کاٹنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں دہلی آ گئے تھے اور تقریباً ۴۳ سال تک یہاں اپنے فکر و قلم سے وطن کی تعمیر اور ترقی کی قدروں کو فروغ دیتے رہے۔

اکادمی کے سابق سکریٹری اور موجودہ مشیر سید شریف الحسن نقوی نے کہا کہ تاباں مرحوم جو اپنے آخری برسوں میں اکادمی کی تحقیق و مطبوعات اور سیمینار کی دو کمیٹیوں کے چیرمین تھے۔ نہایت بے لوث اور انصاف پسند سماجی مجاہد تھے لیکن اپنا ہر کام خاموشی سے کرتے تھے۔ اکادمی نے ان کی حیات میں ان سے انٹرویو پر مبنی ایک فلم تیار کی تھی جو ادارے کی طرف سے صاحبانِ دوردرشن کو پیش کی جا سکتی ہے۔

جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ڈاکٹر صدیق الرحمان قدوائی نے کہا کہ دلی اردو اکادمی کو تاباں مرحوم کی یاد میں لیکچروں کا ایک سلسلہ قائم کرنا چاہیے اور ان لیکچروں کے ذریعہ مرحوم کے سیکولر اور

ترقی پسند نظریات کو فروغ دیا جانا چاہیے
اکادمی کے سکریٹری پروفیسر اشتیاق عابدی نے میڈیا کی" کو تابی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوتے کہا کہ وہ اطلاعات و نشریات کے وزیر مملکت جناب کے. پی سنگھ دیو سے اس سلسلے میں نمائندگی کریں گے اور اکادمی کی فلم کو دور درشن کے کسی آیندہ پروگرام میں شامل کروانے کی کوشش کریں گے۔

انھوں نے بتایا کہ اکادمی کے رسالے 'ایوان اردو' کے زیر طبع شمارے میں ۱۶ صفحات کا ایک گوشۂ تاباں شامل کیا جائے گا۔ پروفیسر عابدی نے مزید بتایا کہ یادگاری لیکچر کی تجویز بھی اکادمی کی گورننگ کونسل کے سامنے رکھا جائیگا۔

مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں نے کہا کہ تاباں مرحوم سیدھے اور کھرے پٹھان تھے اور اپنے انھی اوصاف کے ساتھ وہ فرقہ پرستی کے خلاف جدوجہد کرتے رہے۔ وہ نعرے بازی نہیں کرتے تھے۔ ان کے مزاج میں قلندری اور کردار میں روحِ جہاد تھی۔

ہندی کے ادیب جناب بھیشم ساہنی نے کہا کہ جب تاباں صاحب انجمن ترقی پسند مصنفین کے صدر اور وہ سکریٹری تھے تو انھیں قریب ۱۷ سال تک ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ مرحوم نے کبھی اپنی کسی ذاتی خواہش یا طلب کا اظہار نہ کیا بلکہ ہمیشہ خود اعتمادی سے ترقی پسند نظریات کو فروغ دیتے رہے۔

کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے نیشنل سکریٹری جناب مقیم الدین فاروقی نے کہا کہ وہ پارٹی کے ممبر نہیں تھے لیکن اس تحریک کی سیاست اور ادب کے درمیان ایک مخلص رابطہ تھے۔ وہ بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی پر بہت فکرمند رہے اور اس کا مقابلہ سیکولر طاقتوں کے اتحاد سے کرنے کے حق میں تھے۔

رسالہ جامعہ کے اڈیٹر اور تاباں مرحوم کے منجھلے داماد سید جمال الدین نے کہا کہ ذہنی طور پر وہ ایک مجاہد تھے جو جوش ہوش کے ساتھ ملک کے سیاسی عمل میں شریک رہے۔

مرحوم کی بھاوج بیگم خورشید عالم خاں نے کہا کہ وہ ایک خزانۂ علم و اخلاق تھے۔ ان کی مفارقت سے ان کا خاندان بہت نادار ہو گیا ہے۔ انسان دوستی ان کا خاص امتیاز تھی اور اسی نے انھیں فرقہ پرستی کے خلاف جدوجہد کرنے کی تحریک دی۔

غالب اکادمی کے سکریٹری جناب ذہین نقوی اور جامعہ ملیہ کی ڈاکٹر صغرا مہدی نے بھی مرحوم کو نہایت پرسوز خراج ہائے عقیدت پیش کیے۔ جناب ریاضت علی شایق اور جناب رفعت سروش نے منظوم گلہائے عقیدت پیش کیے۔

صدر جلسہ جناب عبداللہ ولی بخش قادری نے مرحوم کی زندگی کے چند واقعات کی مثالوں سے ان کے مخصوص

حالات کو نمایاں کیا اور کہا کہ وہ کم گو اور
تمیز ضرور تھے لیکن ان کا سماجی شعور
بیدار اور سرگرم تھا۔

جلسے کے اختتام پر دو منٹ
دعائیہ خاموشی سے ایک تعزیتی قرارداد
پاس کی گئی۔ (جی۔ ڈی۔ چندن)

مختلف ادبی، سماجی تنظیموں کی جانب سے غلام ربانی تاباں کو خراج عقیدت

نئی دہلی۔ ۸ر فروری اپنے نمائندے
سے۔ ممتاز ترقی پسند شاعر غلام ربانی تاباں
کے انتقال پر متعدد سیاسی و سماجی تنظیموں
اور مختلف مکتبۂ فکر کے دانشوروں نے
اظہار تعزیت کیا ہے۔ ہندستانی کمیونسٹ
پارٹی نے اپنے تعزیتی بیان میں کہا ہے کہ
غلام ربانی تاباں ممتاز اردو شاعر، محب
وطن اور سیکولر جمہوریت پسند کے ساتھ
ساتھ ترقی پسند قوتوں کے دوست اور
سماجی ناانصافی کے خلاف مسلسل جدوجہد
کرتے رہنے والی ایک شخصیت تھے، ان
کے انتقال سے پارٹی نے اپنا ایک رفیق
کھو دیا۔ اور سماجی ادبی زندگی میں خلا
پیدا ہو گیا ہے۔ پارٹی نے اپنے بیان میں
کہا ہے کہ تاباں صاحب کی سیکولر ذہنیت
کا زندہ ثبوت ان کی جانب سے پدم شری
کی واپسی ہے۔ انھوں نے علی گڑھ اور
مرادآباد فسادات کے خلاف احتجاج کرتے
ہوئے یہ اعزاز واپس کیا تھا۔ پارٹی نے
اپنے بیان کے ذریعے ان کے کنبے والوں سے
اظہار ہمدردی کیا ہے۔

آج یہاں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ
اردو میں صدر شعبہ ڈاکٹر شمیم نکہت کے
زیر صدارت ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا
جس میں شعبے کے اساتذہ نے مرحوم کو خراج
عقیدت پیش کیا۔ جلسے میں ڈاکٹر شمیم نکہت
نے کہا کہ ترقی پسند تحریک کے معماروں
میں سے ایک غلام ربانی تاباں صف
اول کے شاعر ہونے کے علاوہ ملک کے
ایک ممتاز دانشور اور مفکر بھی تھے۔ انھوں
نے فرقہ پرست طاقتوں کے خلاف کھل
کر جہاد کیا۔ ڈاکٹر نکہت نے کہا کہ بحیثیت
شاعر وہ ہندوپاکستان میں اپنے منفرد
لب ولہجے اور کلاسیکی مزاج کی وجہ سے
پہچانے جاتے تھے۔ اس موقع پر پروفیسر
قمر رئیس، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر
فضل الحق، ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر
فرحت فاطمہ، ڈاکٹر ابن کنول اور ڈاکٹر
ارتضیٰ کریم نے عظیم شاعر کو خراج عقیدت
پیش کیا۔ تعزیتی جلسے کے شرکا نے مرحوم
کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہوئے سوگوار
کنبے سے ہمدردی کا اظہار کیا۔

جن وادی لیکھک سنگھ نے مسٹر غلام
ربانی تاباں کی اچانک موت پر گہرے صدمے
کا اظہار کیا ہے۔ ایک بیان میں انجمن
نے کہا ہے کہ مسٹر تاباں کی شاعری نے
اردو شاعری کی نئی نسل کو قوت بخشی
تھی۔ یہ یاد دلاتے ہوئے کہ مسٹر تاباں
اردو ادب کی ترقی پسند اور جمہوری تحریک
سے وابستہ تھے بیان میں کہا گیا ہے کہ

انھوں نے سیکولرازم، جمہوریت اور حب الوطنی کی اقدار کو فروغ دیا تھا۔ بیان میں کہا گیا ہے کہ انجمن غم زدہ خاندان اور احباب کے ساتھ اظہار تعزیت کرتی ہے۔

عالمی اردو کانفرنس سکریٹریٹ میں عظیم ترقی پسند شاعر اور دانشور غلام ربانی تاباں کے انتقال پر ایک تعزیتی نشست زیر صدارت مسٹر علی صدیقی منعقد ہوئی جس میں مسٹر ابوالفیض سحر، چودھری ذوالنورین، مسٹر سلطان سلیم، مسٹر مخدوم زادہ مختار عثمانی اور مسٹر عارف مجتبیٰ نقوی کے علاوہ بہت سے ادب دوست اصحاب نے مرحوم تاباں صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا۔ مسٹر علی صدیقی نے اپنی تقریر میں کہا کہ غلام ربانی تاباں کے انتقال سے اردو ادب کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تمام اردو والوں خصوصاً دہلی کے اردو عوام کا یہ فریضہ ہے کہ عظیم شاعر کے ادبی مرتبے کے شایان شان ایک یادگار، شہر دہلی میں قائم کی جائے۔ انھوں نے کہا کہ اس نیک مقصد کے لیے آگے آنے والوں کے ساتھ عالمی اردو کانفرنس پورا تعاون کرے گی۔

غلام ربانی تاباں کے انتقال پر آج یہاں دہلی اردو اکیڈمی میں ڈھائی بجے اکیڈمی کے سکریٹری مسٹر اشتیاق عابدی کی صدارت میں ایک تعزیتی میٹنگ ہوئی جس میں اکیڈمی گورننگ کونسل کے ممبران اور دوسرے سرکردہ ادیبوں و دانشوروں نے شرکت کی۔ مقررین نے کہا کہ مرحوم غلام ربانی تاباں نہ صرف عظیم شاعر تھے بلکہ اردو مشاعرے میں سیکولرازم کے ستون تھے۔ اور ان کے انتقال سے ایسا خلا پیدا ہو گیا جس کا پُر ہونا مشکل ہے مرحوم کی یاد میں ۲ منٹ کی خاموشی کے بعد ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں اردو اکیڈمی کے تحت ۱۳ فروری کو غالب اکیڈمی میں تعزیتی جلسہ ہوگا۔ قرارداد میں آنجہانی کنور مہندر سنگھ بیدی اور مرحوم غلام ربانی تاباں کی گنگا جمنی تہذیب پر ایک سیمینار کرانے کا فیصلہ کیا گیا۔

غلام ربانی تاباں کے انتقال سے ہندستانی ادب نے برصغیر کے انتہائی ممتاز شاعر عظیم محب وطن اور سیکولر مفکر کو کھو دیا ہے۔ ان جذبات کا اظہار ترقی پسند مصنفین کی کل ہند فیڈریشن کے جنرل سکریٹری مسٹر راجو سکسینہ اور کل ہند اردو ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری پروفیسر قمر رئیس نے مشترکہ بیان میں کیا ہے۔ تاباں صاحب، ترقی پسند مصنفین کی قومی فیڈریشن کے صدر تھے۔

بیان میں کہا گیا ہے کہ قائم گنج ضلع فرخ آباد کے ایک زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولنے والے غلام ربانی تاباں بچپن ہی سے قومی تحریک سے متاثر تھے۔ جب وہ صرف ۱۲ برس کے تھے اسی وقت انھوں نے ڈپٹی کمشنر کے خلاف مظاہرے کی قیادت کی تھی۔ وہ ڈپٹی کمشنر خود تاباں صاحب کے چچا کے مہمان کی حیثیت سے قائم گنج آرہے تھے۔ حب الوطنی کے رجحان نے انھیں مزدوروں اور کسانوں سے قریب کر دیا۔ ۱۹۴۳ء اور پھر ایک بار

۱۹۴۰ میں جیل بھی گئے۔ اسی دوران وہ
شاعری بھی کرتے رہے۔ انھوں نے متعدد
فن کاروں کی طرح بمبئی کا سفر کیا لیکن
وہاں کے ماحول میں وہ خود کو نہ ڈھال سکے
اور دہلی واپس آگئے۔

یہاں وہ جامعہ کے اشاعتی مکتبے کے سربراہ
ہوئے اور اردو شاعری کے ترقی پسند شعراء کی فہرست
میں اپنی اہم شناخت بنالی۔ انھیں پدم شری سے سرفراز کیا
گیا جسے علی گڑھ کے فرقہ وارانہ فسادات روکنے میں
حکومت کی ناکامی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے
انھوں نے واپس کر دیا۔ یہیں سے ان کی لڑائی
صرف اور صرف فرقہ پرستی خلاف جاری رہی اور آخری دم
تک وہ اپنی تحریر اور تقریر کے ذریعے
فرقہ پرستی کے زہر کو کم کرتے
رہے۔ فرقہ پرستی کے برے نتائج سے وہ
اس طرح باخبر اور ہوشیار تھے کہ سفر
آخرت پر ان کے روانہ ہونے کے آخری
دن ان سے ملنے کے لیے جب ان کا بیٹا
پہنچا تو انھوں نے اسے واپس ہو جانے
کے لیے کہا اور اس پر زور دیا کہ وہ جائے
اور فرقہ پرستی کے خلاف اپنی جدوجہد
جاری رکھے۔ بیان کے آخر میں کہا گیا
ہے کہ تاباں صاحب نے ہندستانی
ادب میں شمعیں روشن کی ہیں اس سے
آنے والی نسلوں کو روشنی حاصل ہوتی
رہے گی۔ اور مصنفین کو ترغیب ملے گی
کہ وہ مخلوط ماحول اور قومی اتحاد کو
مضبوط کرنے کے لیے اپنے قلم کا استعمال
کرتے رہیں۔

دریں اثنا شعبۂ اردو جامعہ ملیہ
اسلامیہ میں غلام ربانی تاباں کی وفات
پر تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں تاباں
صاحب کی سماجی، تہذیبی اور ادبی خدمات
پر اساتذہ نے اظہار خیال کیا۔ تاباں
صاحب کو یاد کرتے ہوئے کہا گیا کہ وہ
ایک معروف شاعر اور سرگرم سماجی
کارکن رہے۔ عرصہ دراز تک انھوں نے
مکتبہ جامعہ کے سربراہ کی حیثیت سے
بھی خدمات انجام دیں۔ وہ سیکولر مزاج
رکھتے تھے اور فرقہ پرستی کے خلاف
متواتر جدوجہد کرتے رہے۔

تعزیتی قرارداد میں کہا گیا کہ اس
وقت ان کا ہم سے بچھڑ جانا اردو زبان و
ادب اور سماجی زندگی کے لیے نقصان
دہ ہے۔ اس جلسے میں پروفیسر عنوان
چشتی، پروفیسر حنیف کیفی، پروفیسر مجیب
رضوی، پروفیسر شمیم حنفی اور ڈاکٹر [illegible]
نے تاباں صاحب کی شخصیت کے مختلف
پہلوؤں نیز ان کے ادبی مقام و مرتبہ پر اظہار
خیال فرمایا۔ ڈاکٹر شمس الحق عثمانی نے
تعزیتی قرارداد پیش کی۔

ادبی، سماجی اور ثقافتی تنظیم میزان
کے زیر اہتمام آج اوکھلا میں مرحوم غلام
ربانی تاباں کی اچانک موت پر تعزیتی
جلسہ منعقد کیا گیا جس میں تاباں صاحب
کو قومی یک جہتی کا علم بردار بتایا گیا۔ میزان
کے جنرل سکریٹری مسٹر ماجد دیوبندی
نے کہا کہ تاباں صاحب جہاں منفرد لب و
لہجہ کے شاعر تھے وہیں انھوں نے اپنی
نثر اور نظموں میں زمانے کے نشیب و
فراز کی بھرپور نمائندگی کی۔ جامعہ اولڈ بوائز
ایسوسی ایشن کی جانب سے بھی تاباں صاحب
[illegible]

جناب بخش لائلپوری کے اعزاز میں ایک شعری نشست

وہ ادب جو تارکینِ وطن کے توسط سے بیرونی ممالک میں تخلیق ہو رہا ہے۔ اس کے انداز تجربات اور مشاہدات اب تک کے تخلیق کردہ حوالہ جات سے خاصے مختلف ہیں یہی حالات شعر کے ضمن میں بھی سامنے آرہے ہیں۔ وطن کی فضاؤں سے دور اجنبی دیار میں داخلی کیفیات خارجی عناصر کے ملاپ سے جو رنگ پیدا کرتی ہیں۔

کا مظاہرہ کرواتے ہیں۔ ایسی فضائیں صرف قلم کار کے یہاں ہی نہیں پائی جاتیں بلکہ ایک عام انسان بھی خارجی تضاد سے داخلی تنہائی کے عالم بلاخیز سے سر آزما ہونے کے لیے اپنی زبان و ثقافت اور اقدار کا متلاشی نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیرونِ وطن جہاں جہاں بھی اردو بولنے والے رہائش پذیر ہیں وہ اس ہر محفل اور ہر تقریب کا خیر مقدم کرتے ہیں جس میں انھیں اپنے وطن و زبان کی پرچھائیاں دکھائی دیں۔ جرمنی میں گو کہ تعداد کے لحاظ سے اسی قدر افراد

دائیں سے بائیں: انگھی ابراہیم پوری، طفیل بخش، بخش لائلپوری، حنیف تمنا، قمر اجنالوی، کریم اللہ زبیری، نعیمہ ضیاء الدین

اداسی، تنہائی یا بے چارگی کا کرب جس آگہی کو جنم دیتا ہے اور قلم کار جن جن منازل سے گزرتا ہے۔ وہ اس کے جادہ حیات میں سنگ میل کی مانند جا بجا دکھائی دیتے ہیں اور فکر ہر کس بہ قدرِ ہمت او ست

یا تارکین وطن مقیم ہیں جو کہ ناروے میں ہوں گے۔ لیکن یہاں ایک قباحت یہ ہے کہ اگر ناروے کے تارکین وطن کی زیادہ تعداد ایک ہی شہر یعنی اس کے صدر مقام "اوسلو" میں پائی جاتی ہے تو یہاں جرمنی

اشعار کا سا رنگ رکھتے ہیں۔ سادگی، صاف
گوئی اور بغیر کسی بناوٹ کے مکمل سچائی
کا مظہر۔ جناب بخش لائلپوری اس
شعری نشست کے مہمان خصوصی تھے
جس کی صدارت کے فرائض جناب قمر
اجنالوی صاحب نے انجام دیے اور
نظامت کے فرائض بزم فروغ اردو کی
صدارت کی ذمہ داری سنبھالنے کے باعث
خاکسارہ نے ادا کیے۔

نشست کا آغاز خاکسارہ کی ایک
نظم سے ہوا۔ جو "جشن سال نو" کے عنوان
پر کہی گئی تھی۔ اور پھر نوجوان شاعر کریم اللہ
زیروی سے اپنا کلام پیش کرنے کی درخواست
کی گئی۔ کریم اللہ نوجوان شاعر ہونے کے
باوجود پختہ سوچ اور کہنہ مشق ہونے کا سا
انداز رکھتے ہیں۔ ان کے بعد جناب
حنیف تمنا صاحب کی باری تھی حنیف تمنا
بھی نوجوان شاعر ہیں رومانی جذباتیت کے حامل
ہونے کے ساتھ ساتھ ترقی پسندانہ
نظریات کے بھی مالک ہیں حساس اور درد مند
شاعر ہیں۔ ان کے اشعار میں الفاظ کا
چناؤ بہت خوب ہوتا ہے۔ اور اپنے لہجے
کے حسن تغزل سے وہ ہمیشہ ہی پسندیدگی
کا باعث ٹھہرتے ہیں اور بار بار ان
کے کلام کی فرمائش ہوتی رہتی ہے۔

انھی ابراہیم پلوری اور طفیل
خلش دونوں شعرائے کرام پنجابی زبان میں
شعر کہتے ہیں۔ اور اس نشست میں
تشریف لانے والے یہ دونوں حضرات
شومئی قسمت سے راستہ بھول کر بھٹک
گئے اور خاصی تاخیر سے پہنچ سکے انکھی
کا تعلق انڈیا سے ہے اچھے شعر کہتے
ہیں اور ترنم سے سناتے ہیں۔ نوجوا
کی جذباتی رومانیت کے ساتھ سا
ان کا پرسوز ترنم دو آتشہ کا سا
سرور فراہم کرتا ہے۔ اور محفل پر سح
طاری ہونے لگتا ہے۔ طفیل خلش
البتہ کافی طویل عرصے سے کہہ رہے ہ
اور اب تک دو مجموعۂ کلام بھی طبع کر
چکے ہیں۔ طفیل خلش تحت اللفظ میں
پڑھتے ہیں اور اچھی ادائیگی کے حا
ہیں۔

جناب صدر قمر اجنالوی نہ صرف
کہنہ مشق شعرا میں شمار ہوتے ہیں
اور معروف صحافی ہیں بلکہ ان کے پا
یادوں کا ایک بیش قیمت خزانہ بھی
جس میں جوش ملیح آبادی سے لے کر
اختر شیرانی تک بے شمار ناموں کی
قطار ہے۔ پھر جناب فیض احمد فیض
اور محبوبیت و دلنوازی کی مسلمہ ا
بلا شرکت غیرے سند حاصل کرنے وال
شاعر محترم ساحر لدھیانوی کے دور تک
کے تمام شعرا کے ہم عصر بھی رہ چکے
اپنی یادوں کے ان حسین وسنہرے دل
کے چند واقعات انھوں نے حاضر
نشست کی نذر بھی کیے۔ جیسے وہ ایک
کتاب میں "یادوں کی چھتری" کے عنوان
سے ترتیب دے رہے ہیں۔ اس
شعری نشست کا دورانیہ چار گھنٹوں
کا تھا جو دو حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک
دورانیے کے بعد چائے اور دیگر لوازما
کا وقفہ کیا گیا تاکہ حاضرین پھر سے تازہ

کر نشست کی کارروائی سے محظوظ ہو
سکیں۔ اس شعری نشست کی ایک خصوصیت
بھی رہی کہ اس میں پیش کیے جانے والے
لام کا معیار غیر معمولی طور پر نہایت اچھا
ور پسندیدہ تھا۔ شعرا کے چند
شعار درج ذیل ہیں۔

جناب بخش لائلپوری:-
دکان شیشہ گر میں سیم و زر اچھے نہیں لگتے
سی صورت میں بھی ظرفوں میں سر اچھے نہیں لگتے

راہرو بکھرے ہیں قافلہ سالار سے پرے
گرنے لگے ہیں سائے بھی دیوار سے پرے
آئینہ ضمیر پہ سکوں کی دھند ہے
ہے توجہ کلام بھی معیار سے پرے

جناب قمر اجنالوی:-
رباب زیست ہے میرا مرے جہاں کے لیے
نجوم و مہ کی ردنق ہے آسماں کے لیے

کس فریب کی ضد پر ہے زندگی کا نظام
مری حیات کی تلخی میرا فسانہ بنے

انجم ابراہیم پوری:-
مبنو ں تری اڈیک تے میری ہے موت نوں
دستو بس میں جان دا وعدا گراں کر ناں

طفیل خلش:-
ہمدردی لئے ہو گئے نہیرے پچھلے پہر دے
نیر سقراط ایک جمیا، بھر پیالے زہر دے

کلیم اللہ زیدوی
مجھے غم ہے کہ صحرا نجدیوں نے بیچ ڈالے ہیں
اور ان کا تیل دے کر اس نے انقلاب سا کر پائے ہیں

حنیف تمنا:-
میں ہے جس کے نام کی زندگی وہ ہی کرکے ترک وفا گیا
رخ آئینہ پہ فدا تھے ہم بس آئینہ وہ دکھا گیا

نعیم ضیاء الدین:-
کیتے حسین خوابوں کے گلو پر تیغ ستم کے وار ہیں کاری
کتنی رتوں کے قتل و ثمر سے ڈر و رسن کی فصل سنواری

ڈاکٹر شارب ردولوی کے پتے میں تبدیلی

دہلی۔ ڈاکٹر شارب ردولوی
اور ڈاکٹر شمیم نکہت (صدر شعبۂ اردو
دہلی یونی ورسٹی) نے اپنا مکان تبدیل
کر دیا ہے۔ وہ اب ماڈل ٹاؤن کے بجائے
مندرجہ ذیل پتے پر رہ رہے ہیں۔ احباب
و مخلصین ان سے اس پتے پر خط و کتابت
کریں۔

اے سی ۳/۳۸ سی شالیمار باغ
دہلی ۱۱۰۰۵۲۔

روداد تعزیتی جلسہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے سابق جنرل منیجر
جناب غلام ربانی تاباں صاحب کے سانحۂ
ارتحال کی خبر معلوم کرکے حد درجہ ملال
ہوا۔ ان کی علمی شخصیت اور ملکی و قومی
خدمات کے سوا، مکتبہ جامعہ کے اشاعتی
پروگراموں میں جو حصہ ان کا رہا۔ اس کا
احساس ہر دل میں ہے اور تا دیر

رہے گا۔

مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ کی شاخ

مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نے جناب تاباں صاحب مرحوم کے انتقال پر مقامی کتب فروشوں کو یکجا کر کے تعزیتی جلسہ منعقد کیا۔ جس میں ایجوکیشنل بک ہاؤس، اردو بک سینٹر، الوار بک ڈپو، فرینڈس بک ہاؤس کے اراکین نے تعزیتی جلسہ میں شرکت کی۔ تاباں صاحب مرحوم صاحب کی صلاحیت و قومی خدمات کا ذکر کیا گیا۔ اس کے بعد جملہ حاضرین نے سورہ فاتحہ کا ثواب مرحوم کو بخشا۔ ورثا کے لیے صبر کے کلمات و دعا کی گئی۔ اور مکتبہ جامعہ کی دکان مرحوم کے سوگ میں بند کر دی گئی۔

معذرت

مارچ ۹۳ء کا کتاب نما بی۔ پی۔ کی ریلی کی وجہ سے تاخیر سے پوسٹ ہو رہا ہے معذرت قبول فرمائیں۔ (ادارہ)

نئی مطبوعات

آزمائش کی گھڑی (مضامین) سید حامد ۔/۴۵
اردو مثنوی مطالعہ اور تدریس (ادب) ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ۔/۱۰۰
سہیل عظیم آبادی (سوانحی سلسلہ) مناظر عاشق ہرگانوی ۔/۱۵
کنبھلی (ناول) غضنفر ۔/۴۰
حماقتیں (نیا اڈیشن) (طنز و مزاح) شفیق الرحمٰن ۔/۴۵
پچھتاوے " " ۔/۴۰
دمشق کے قید خانے (تاریخی داستان) عنایت اللہ شمس ۔/۵۰
مغرور حاکم (ناول) الیاس سیتاپوری ۔/۳۰
جلسہ (افسانے) شیخ سلیم احمد ۔/۵۰
مہکتا آنچل (ناول) شہناز کنول ۔/۴۲
کھنڈر میں چراغ (شاعری) ملک زادہ جاوید ۔/۶۰
شہر ستم " ملک زادہ منظور احمد ۔/۶۰
کلیات عزیز " عزیز وارثی ۔/۱۵۰
ایر کنڈیشنڈ گائیڈ (ٹیکنیکل) محمد یونس ماہر ۔/۴۰
ریفریجریٹر گائیڈ " " ۔/۵۰
کاروباری خط و کتابت (خطوط) کے محمد احمد بن مخدوم ۔/۲۲
ہند و پاک میں اردو ناول (تحقیق) ڈاکٹر انور پاشا ۔/۱۵۰

خدا بخش لائبریری کی نئی مطبوعات

رسالۂ ہندستانی، الہ آباد (۱۹۳۱ء—۱۹۴۸ء) سے انتخاب

(۱) اردو ادب ۔/۵۰
(۲) اردو لغت ۔/۴۰
(۳) چند ادبی مشاہیر کی تحریریں ۔/۷۰
(۴) اردو، ہندی، ہندستانی ۔/۴۰
(۵) ہندی ادبیات ۔/۶۰
(۶) تاریخ ۔/۶۰
(۷) سائنس ۔/۶۰

خدا بخش لائبریری کی دیگر نئی کتابیں

بھگوت گیتا یا نغمۂ خداوندی محمد اجمل خاں
جوگ بسشٹ (منہاج السالکین) ترجمہ ابوالحسن
باغ معانی (تذکرۂ شعرائے فارسی) تصحیح و ترتیب: عابد رضا بیدار
مجمع النفائس (فارسی) تصحیح و ترتیب: عابد رضا بیدار
گفتنی ناگفتنی (خود نوشت) وامق جونپوری ۔/۵
ہند و دھرم ہزار برس پہلے (تاریخ) البیرونی

آزمائش کی گھڑی

سیّد حامد

بابری مسجد کیا ٹوٹی، مسلمانوں کے دل ٹوٹ گئے، مسجد تو اب جڑ نہیں سکتی کہ ظالموں نے اسے زمین بوس کر دیا لیکن دل تو جوڑے جا سکتے ہیں، حوصلے کو تو بحال کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت یہی کام کرنے کا ہے۔ حوصلہ پست ہو گیا تو بچا کیا؟ مایوس ہونے اور بد دل ہونے کی کوئی وجہ نہیں مسلمان بڑا اس سے بڑی مصیبتیں پڑی ہیں انھوں نے کروٹ لی ہے اور اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اس بار بھی اٹھیں گے ان شاء اللہ نئی شان سے اٹھیں گے۔ آج کے حالات پر ممتاز دانشور سیّد حامد کے عالمانہ مضامین کا مجموعہ قیمت ۔ ۴۵ روپے

سرورق:- ابن فرید

مہمان مدیر
ابن فرید
بیت الصالحہ، زینہ عنایت خاں،
رامپور۔ ۲۴۴۹۰۱

اشاریہ

سرِ بالینِ اردو

تشہیر کا فن آج کے دور میں اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ اگر غلط بات کو بھی پورے تہدّمد کے ساتھ مشہور کر دیا جائے تو وہ مقبول ہو جائے گی۔ گوئبل (GOEBBEL) کہتا تھا کہ "جھوٹ اتنی بار بولو کہ وہ سچ بن جائے"۔ پھر جب جھوٹ سچ بن جاتا ہے تو وہ لوگ بھی جھوٹ کے معاملے میں شبہ میں پڑ جاتے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ یہ نو ساختہ سچ اصلاً جھوٹ ہی ہے۔

بھارت میں بہت سے سچ ایسے ہی جھوٹ ہیں لیکن اُن کی صداقت اس حد تک تسلیم کر لی گئی ہے کہ ان کی اصل سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔ اردو کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی سانحہ درپیش ہے۔ اس کے خلاف بہت سی باتیں عام کی گئیں۔ اور (وسیع وسائل ترسیل و ابلاغ عامہ دشمنان اردو کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے) اس وسیع پیمانہ پر نشر کی گئیں کہ اردو والوں کے لیے ان کا جھٹلانا ایک امر محال بن گیا۔ ناچار ہو کر اب اردو کے ہمدرد و بہی خواہ وہیں سے بات شروع کرتے ہیں جہاں سے دشمنانِ اردو چاہتے تھے۔

ادھر کئی مہینوں سے "کتاب نما" اور "قومی آواز" میں اردو کے لیے فکرمندی کے اظہار کے طور پر اداریوں اور خطوط و مراسلات میں بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔ اِن سے مایوسی، محرومی اور بے بسی کی ایسی کراہیں بلند ہو رہی ہیں کہ پڑھنے والے کے دل بیٹھے جا رہے ہیں۔ میں کچھ اس حد تک جی چھوڑ چکا ہوں کہ جب ۱۹۹۲ء کے اواخر میں میری چند ایک کتابیں شائع ہو کر آئیں گی تو ۱۹۹۳ء انھیں کوئی قاری نصیب نہ ہو گا۔ اگر یہ صورت حال رہی تو "کتاب نما"، "شب خون" اور "شاعر" وغیرہ کا کیا ہو گا؟ کیا اِن سطور کے ختم ہونے سے پہلے یہ نہ کہہ دیا جاتے کہ جناب "بس ہو چکی نماز مصلاّ اُٹھایئے"؟ یہ "اندیشۂ شہر" جو مجھ جیسے قارئین اردو کو پریشان خاطر کیے ہوئے ہے، بار بار سوال کرتا ہے کہ کیا یہ قنوطیت واقعتاً لائق اعتنا ہے۔

اردو اگر زوال و فنا کے اس مرحلہ تک پہنچ چکی ہے تو اُسے اگر مسیحا کا خدا بچالے

تو بچا لے، مسیحا خود نہیں بچا سکتا۔ رہ گئے ہم اردو کے بہی خواہ، تو ہم چاہے کتنا ہی اُس کے بستر مرگ کے پائنتی اس کے عالم سکرات پر بین و بکا کر لیں اُس کی ڈوبتی ہوئی نبض میں دوبارہ دورانِ خون نہیں کر سکتا۔ مرتی ہوئی زبانیں کبھی مصنوعی تنفس سے جانبر نہیں ہو پاتیں۔ چند لمحے خواہ وہ سنبھالا لے لیں، بالینِ اجل سے سر نہیں اٹھا سکتیں۔ اردو کیا اس نزاعی مرحلے تک پہنچ چکی ہے؟ ہمیں سوچنا ہوگا۔

کہتے ہیں کہ ایک بار شہر میں شور مچ گیا کہ کوا کان لے گیا۔ سب کوے کے پیچھے دوڑ پڑے۔ کسی نے اپنے کان ٹٹول کر نہ دیکھے۔ اردو کی موت کا یہ اعلان بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ہمارے ابلاغ عامہ نے، جو دشمنانِ اردو کے ہاتھ میں ہے، یہ اعلان کر دیا کہ اردو مر گئی اور اہلِ اردو گریہ و ماتم کناں ہو گئے۔ یو پی کی "بھاجپوری" حکومت نے یو پی اردو اکیڈمی کی سالانہ امداد ڈھائی لاکھ روپے سے گھٹا کر پچھتر ہزار روپے کر دی اور باور کرا دیا کہ اردو کا زندہ رکھنا اُس کے الیکشن کے منشور میں شامل نہ تھا۔ ہمیں بھی باور آگیا کہ اس طرح تو اردو ختم کی جا رہی ہے اور یو پی میں اردو ختم ہوتی جا رہی ہے۔ کیا اس طرح اردو ختم ہو جائے گی؟

ابلاغ عامہ کے ذریعہ غیر محسوس طور پر یہ تاریخ لکھی جا رہی ہے کہ اردو مسلمان حکمرانوں کی درباری زبان رہی ہے۔ اس صدق باطل کو تقویت دینے ہی کے لیے چودھری چرن سنگھ جیسے سیکولر سیاسی رہنما نے اپنی وزارتِ عظمیٰ کے زمانے میں کہا تھا کہ "اردو ترکی زبان ہے۔" مرار جی ڈیسائی جیسے انتہائی صادق وزیر اعظم نے کہا تھا کہ "اردو فرقہ پرست زبان ہے۔" ان سب سے بڑے جھوٹوں میں سب سے زیادہ لائق توجہ جھوٹ یہ ہے کہ اردو مسلمان حکمرانوں کی درباری زبان رہی ہے۔ اسے مسلمانوں کی سرپرستی حاصل رہی ہے اور ہندی کو دیدہ و دانستہ دبانے اور مٹانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ یہ جھوٹ اس قدر اعتماد و تکرار کے ساتھ بولا جا رہا ہے کہ ہم بھی مدافعتی و معذرتی موقف اختیار کرنے لگے ہیں۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ثانی ظفر کے دور تک درباری زبان فارسی رہی ہے۔ زوال ہند (۱۸۵۷ء) کے بعد فارسی کو بے دخل کرنے کے لیے انگریزوں نے عارضی طور پر اردو کو سرکاری زبان بنایا لیکن چند ہی سال کے بعد انھوں نے اپنی زبان کو سرکاری زبان بنا دیا۔ اردو کو اگر سرپرستی حاصل نہ رہی تو معاندانہ تخریب کاری کا بھی شکار نہ ہونا پڑا۔

اگر یہ کہا جاتا ہے کہ اردو کو مسلمانوں کی سرپرستی حاصل رہی ہے، تو آپ کیوں نہیں پوچھتے کہ خود کون سی بھارتی زبان ہے جسے مسلمانوں کی سرپرستی حاصل نہیں رہی ہے؟ برہمنوں نے سنسکرت کے علاوہ کسی زبان کو معیاری علمی زبان نہ بننے دیا بلکہ کسی زبان کے رسم الخط تک کو قائم و باقی رہنے کا حق نہ دیا۔ جب ساری پراکرتی زبانیں مٹ رہی تھیں تو مسلمان حاکموں نے (بادشاہوں نے نہیں!) ان زبانوں کو دوبارہ زندہ

کیا۔ ثبوت کے طور پر بنگالی، گجراتی، مراٹھی، پنجابی، گجری، اودھی، بھوجپوری وغیرہ کے قدیم مخطوطات دیکھیے۔ سب فارسی یا عربی رسم الخط میں ہیں۔ کشمیری، سندھی، دکھنی، پشتو اور بلوچی نے تو اس یا زیادتی رسم الخط کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا لیا۔

جہاں تک اس سوال کے جواب کا تعلق ہے کہ اردو کو اس قدر مقبولیت کیوں حاصل ہوئی؟ ہمیں کچھ تاریخ کے جھروکوں سے بھی جھانک کر ماضی کی طرف دیکھنا ہو گا۔ ترکوں کے آنے سے قبل شمالی ہند کی چھوٹی چھوٹی مقامی سلطنتوں کا مرکز دوآبے میں تھا۔ سید سالار اور سید مسعود سالار نے نہ صرف قنوج کو فتح کیا تھا بلکہ اس کے مشرق میں ستر کھ کو اپنا مرکز سلطنت بنایا تھا۔ یہاں سے ان کے تبلیغی دندھا تے تھے جو اودھ برج اور بھوجپوری علاقوں میں وہاں کی مقامی زبانوں میں ہی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ ان کے خاتمے کے بعد محمد غوری نے بھی دوآبے کا رخ لیا۔ اس طرح تمامی ہند میں مسلمانوں کا سیاسی مرکز توجہ دوآبہ ہی تھا۔ اس دور میں جس زبان نے فروغ پایا وہ کھڑی یا برج نہیں اودھی تھی۔ ملک محمد جائسی نے ہندی میں کچھ نہیں لکھا۔ ان کی ساری تصانیف اودھی میں اور فارسی رسم الخط میں ہیں۔ کبیر، تلسی، رسکھن کی بھی زبان اودھی ہے۔ گرو نانک پر اودھی کی گہری چھاپ ہے۔ امیر خسرو کے یہاں برج کے ساتھ اودھی کی چاشنی ہے۔ حضرت نظام الدین اولیا کے خلیفہ خواجہ شیخ نصیر الدین روشن چراغ دہلوی کا تعلق اودھ سے تھا۔ ان کی جاگیر وجابیداد کا بڑا حصہ جو اس دور دہلی میں تھا۔ ان کی زبان اودھی تھی۔ ان کے خلیفہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی اصل زبان بھی اودھی تھی۔ شیخ باجن (شاہ باجن نہیں) کے بارے میں ایک گمان ہے کہ وہ اودھ کے تھے۔ علاء الدین خلجی کے زمانے تک زبان وقت ر [illegible] (LANGUAGE) اودھی ہی تھی۔ ترکوں اور مغلوں نے جب بھارت کا مرکز منتقل دوآبے سے منتقل کر کے دہلی میں قائم کر دیا تو اودھی بے وقار ہونے لگی اور کھڑی کو فروغ حاصل ہونے لگا۔ اس طرح تمام قدیم زبانیں، یا عوام کی آج کے دور کی سب زبانیں، ہندوی یا ہندی (INDIAN) ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی زبان وہ ہندی نہیں ہے جو برہمنی رسم الخط میں لکھی جانے والی کھڑی بولی ہے۔ موخر الذکر ہندی انیسویں صدی کی پیداوار ہے اور سیاسی مصلحتوں کی پروردہ ہے۔

اردو کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اس کے خلاف محاذ آرائی اور پروپیگنڈا انیسویں صدی کے نصف آخر کے لاہور، امرتسر اور جالندھر وغیرہ کے اردو اخبارات وغیرہ ہی کے ذریعہ کیا گیا اور اردو کے خلاف معاندانہ و قاتلانہ روش بھی اردو والوں نے ہی اختیار کی۔ گاندھی جی سب کہا کرتے تھے کہ "ہندی اردو سہیلی گنگا جمنا ہیں" تو وہ آزادی سے قبل کا زمانہ تھا۔ جب ہندی کو دیوناگری لپی میں قومی زبان بنایا گیا تو نہرو وزیر اعظم تھے۔ پرشوتم داس ٹنڈن، راجندر پرشاد، گووند بلبھ پنت، سمپورنا نند، آنند، کیلاش ناتھ کاٹجو وغیرہ صف اول کے قومی

لیڈر تھے۔ یہ سب اردو فارسی کے ماہر تھے۔ سمپورنانند اچھے غزل گو شاعر تھے، اسد تخلص کرتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے ہندی کی پرزور وکالت کی۔ اس پر نہ کسی کو اعتراض ہوا نہ ہونا چاہیے تھا۔ قلق تو اُس وقت ہوا جب ہندی کی حمایت کے ساتھ اردو کی جارحانہ مخالفت پرشوتم داس ٹنڈن اور سمپورنانند تک نے کی۔ ہم اُس وقت سے یہ سوال اپنے لبوں پر لیے کھڑے ہیں کہ کیا ہندی کو قومی زبان بنانے کے لیے اردو کو جہنم واصل کرنا ضروری ہے؟ اس سلسلہ میں دشمنانِ اردو یہ کہتے ہیں (جو خود کو اردو کے "حمایتوں" کی صف میں شمار کرتے ہیں) کہ اردو نے اپنی بقا کے لیے ہندی کی مخالفت کی۔ اردو نے ہندی کی مخالفت تو کیا خود اپنی مخالفت اپنے اخباروں میں کی ہے۔ آج بھی اس کے ناصحانِ شفیق اسے یہی سمجھا رہے ہیں کہ اصل قصور تمھارا ہے۔ تمھیں کو راہ راست پر آنا ہے۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔

جملۂ معترضہ کے طور پر مجھے اپنا ہی ایک لطیفہ یاد آرہا ہے۔ یہ ۱۹۸۹ء کے اواخر کی بات ہے۔ بریلی میں "توری یک جہتی" پر دیشری انسٹی ٹیوٹ میں سیمینار تھا۔ میں بھی مدعو تھا۔ بات چلتے چلتے اردو تک پہنچ گئی۔ میں نے صدر کی اجازت سے عرض کیا کہ ابھی چند دن ہوئے کہ میں ٹی وی پر کوی سمیلن دیکھ سن رہا تھا۔ اس کوی سمیلن میں آٹھ کویوں نے اپنی کویتائیں سنائیں، جن میں سے چار نے گیت سنائے۔ انھوں نے غزل نہیں کہا تھا، گیت کہا تھا اور یہ گیتلیں صنفِ غزل کی بے معیاریت (DESTANDARDISATION) کی دلیل تھیں۔ چونکہ یہ گیتلیں تھیں اس لیے ان میں عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کی بھرمار ہونا ضروری تھی۔ چار میں سے دو کویوں نے ایسی کویتائیں سنائیں جن کے ساٹھ فی صد الفاظ عربی و فارسی کے تھے۔ باقی دو کویوں میں سے ایک کوی کی کویتا میں بیس فی صد الفاظ عربی و فارسی کے تھے۔ اور باقی ماندہ ایک کوی نے ٹھیٹھ سنسکرت زدہ ہندی کویتا سنائی لیکن اس میں بھی دو الفاظ عربی کے تھے۔ ایسا کیوں تھا؟

میں ہندی نہیں جانتا، لیکن جب میں ریل میں، بس میں یا ہوائی جہاز پر سفر کرتا ہوں تو مجھے اپنے برادرانِ وطن کی زبان سمجھنے میں زحمت نہیں ہوتی۔ ٹی وی یا ریڈیو پر ہندی خبریں سنتے ہوئے مجھے دشواری صرف اُس وقت ہوتی ہے جب بہت سے مردہ زبان کے مغلق الفاظ استعمال کر لیے جاتے ہیں۔

نہیں، میں ہندی کی مخالفت نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو صرف کھڑی بولی کی حمایت میں عرض کر رہا ہوں۔ کہ جب تک اردو کی اساس کھڑی بولی رہے گی، ہندی اردو سے دور نہ جا سکے گی۔ آج عصبیت کے تحت چاہے کتنے ہی متروک سنسکرت الفاظ کو زندہ کر لیا جائے اور فارسی و عربی الفاظ سے تطہیر کر دی جائے کل کو پھر وہی الفاظ "جندہ" ہو جائیں گے جو آج فراموش کر دیے گئے ہیں۔ ایران میں عربی الفاظ سے فارسی زبان کو پاک کرنے کی کوشش سرکاری اور عوامی سطح پر کی گئی۔ لیکن کیا تمام عربی الفاظ فارسی سے خارج ہوگئے۔

نابید ہوگئے! مشرق وسطیٰ میں چند سال سے عربیت (ARABISATION) کی تحریک چل رہی ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ آج اگر ہمارے کوی عوام کی دلچسپی قائم رکھنے کے بجے کھل کینے اور عربی و فارسی الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں تو دیکھیے کل کیا ہو۔ اور کل کے عوام کیا طلب کریں۔

ابلاغ عامہ ہی کے ذریعہ تشہیر کی جا رہی ہے کہ اردو فرقہ پرست زبان ہے۔ اسی نے پاکستان بنوایا۔ یہ ترکوں کی یا ترکی زبان ہے۔ یہ ہماری غلامی کا کلنک ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور ہم معذرت خواہانہ انداز میں کہہ رہے ہیں کہ نہیں یہ سب کی زبان ہے، گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے، قومی یکجہتی اور بھائی چارے کی نشانی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اوّل الذکر الزامات عائد کرنے والوں کے قبضے میں تشہیر کے تمام وسائل ہیں اور مؤخرالذکر مدافعت کرنے والے تہی دست ہیں۔ اس لیے بات انھیں کی مانی جائے گی جن کی بات سب تک پہنچ جائے نہ کہ اُن کی بات جو صرف چند افراد تک محدود رہے۔ انجام کار وہ لوگ بھی جو اردو کے حق کے لیے مخلص ہیں بات بات میں مسلم لیگ، پاکستان اور مسلم فرقہ پرستی کی بات لے آتے ہیں۔ اُن میں بھی اتنی جرأت نہیں ہے کہ وہ جھوٹ کو جھوٹ کہ سکیں۔ اُنھیں کبھی بھی یہ خیال نہیں آتا کہ وہ اس امر کا پتا لگائیں کہ آخر اردو کی مخالفت کیوں کی جا رہی ہے۔ انھیں یہ بات نہیں سوجھتی کہ بہت سی باتیں اردو کلچر کے خلاف زہر کی طرح اگلی جاتی ہیں۔ اُردو ختم ہو جائے گی تو اردو کلچر ختم ہو جائے گا۔ کیا ایسا ہو جائے گا؟ میں تو نہیں سمجھتا۔

اُردو کو سیاسی اور سرکاری پلیٹ فارم سے اقلیت کی زبان قرار دیا جاتا ہے۔ اقلیت کون سی؟ ہم فوراً خائف ہو کر، مضطرب ہو کر چیخ اُٹھتے ہیں: نہیں یہ صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ یہ سب کی زبان ہے، سیکولر زبان ہے۔ کیا ہماری آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز نہیں؟

سیکولر زبان ثابت کرنے کے لیے ہم بہت سے غیر مسلموں کے نام گنوا دیتے ہیں۔ بہت اچھا کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے "قومی آواز" میں مراسلے کے ذریعہ بہت سے مشاہیر کی فہرست پیش کی اور پوچھ لیا تھا کہ ان میں سے کتنوں کی اولادیں اردو پڑھتی ہیں یا جانتی ہیں؟ میرے سوال کا جواب نہیں دیا گیا۔ شاید میرا سوال کیمونل بن گیا ہو کیوں کہ اردو کے پلیٹ فارم سے کیا گیا تھا۔ اُردو اُس وقت سیکولر زبان بن سکے گی جب وہ لوگ اردو کو اپنائیں جن سے یہ زبان وابستہ کی جا رہی ہے، اور وہ لوگ اس کا استعمال ترک کریں جو میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھوکر رہے ہیں۔

کیا ستم ظریفی ہے کہ ایک طرف یہ کہا جا رہا ہے کہ اردو اقلیت کی زبان ہے اور دوسری طرف اقلیت سے، فرقہ پرستی کا داغ دھونے کے لیے، کہلوایا جا رہا ہے کہ یہ اُس کی بھی نہیں ہے۔

اے میرے پیارے اردو والو، تم اسی طرح درمیانِ قعرِ دریا تختہ بند رہو۔

اے میرے کم ہمت ساتھیو، اگر پولینڈ میں چند ہزار افراد کے بل بوتے پر یدش (YEDISH) زبان زندہ رہ سکتی ہے اور اُس کے ناول پر نوبل انعام مل سکتا ہے تو کیا آپ کروڑوں کی تعداد میں بھی ہو کر اپنی زبان زندہ نہیں رکھ سکتے؟ یہ نومبر ۱۹۶۴ء کی بات ہے۔ میں جامعہ اردو کے نمائندہ کی حیثیت سے ناندیڑ امتحانات لینے گیا تھا۔ وہاں کی انجمن ترقی اُردو کی مقامی شاخ کی طرف سے مجھے استقبالیہ دیا گیا تو وہاں کے ایم پی دیشمکھ نے اردو کی مظلومیت پر بڑی لمبی چوڑی تقریر کی۔ جب میری باری آئی تو میں نے عرض کیا کہ کسی بھی زبان کو حکومت زندہ نہیں رکھتی، اُس کے بولنے والے زندہ رکھتے ہیں۔ میں نے پوچھا: آزادی سے قبل بنگالی، گجراتی، مراٹھی، تیلگو، تامل، ملیالم، اُڑیا، میتھلی، آسامی وغیرہ کو کن حکومتوں نے محفوظ رکھا تھا؟ اور کیوں اب تک محفوظ ہیں بلکہ انھیں فروغ بھی حاصل ہوا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ اُن کے شیدائیوں کا کارنامہ تھا۔

اردو کے پاس بھی ایسے شیدائی ہیں لیکن انھیں دانستہ و نادانستہ نظر انداز کیا جاتا ہے۔ جامعہ اردو میں لاکھ کیڑے نکالیے لیکن وہ آزادانہ طور پر اردو کی شمع روشن کیے ہوئے ہے۔ اس سے زیادہ وسیع غیر محسوس اور وقیع خدمات وہ مدرسے، مساجد اور خانقاہیں انجام دے رہی ہیں جو تعلیمِ قرآن اور دینی تعلیم کے لیے اردو کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ ٹھیک ہے کہ یہ "ملا" ہیں، در در بھیک مانگتے ہیں، خیرات کا کھاتے ہیں، لیکن ان خود ساختہ خداؤں سے تو بہتر ہیں جو ایوارڈوں، سمانوں، انعاموں سے نیچے کی بات نہیں کرتے۔ البتہ جب کہیں کسی معاملے میں محروم ہو جاتے ہیں، تو اردو کی موت کا اعلان کر دیتے ہیں۔

اب تک اردو سے متعلق جو کچھ داد فریاد کی گئی ہے وہ سب کی سب متوسط طبقے کی داستانِ الم ہے۔ متوسط طبقہ وہ جو ہمیشہ تصنع اور احساسِ کمتری بہ شکلِ احساسِ برتری کی جنت الحمقا میں زندہ رہتا ہے۔ اس کی ایک کمزوری یہ بھی ہوتی ہے کہ یہ تحتانی طبقے سے خود کو ممیز کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اعلا طبقے سے مماثل ہونے کی ریس کرتا ہے۔ چنانچہ مادی وسائل کے زیادہ سے زیادہ حصول کے پیچھے دیوانہ ہو جاتا ہے۔ اس سعی و جہد میں وہ ہر طرح کی مصالحت اور تنزل کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ اکیڈمیاں، ادارے، بورڈ، کمیٹیاں، شعبہ جات اردو، امتحانات، تقررات، سیمینار، یادگاری جلسے، مشاعرے، استقبالیے، ریڈیو ٹی وی پروگرام، فلمی صنعت، تحریر کے معاوضے وغیرہ ایسے بہت سے وسائل ہیں جن سے چھوٹی موٹی آمدنیاں ہو جاتی ہیں اور وقتی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ ایک انتہائی مشہور صاحبِ قلم نے بہت کمایا، بہت زمین خریدی۔ بڑی جزرسی کی لیکن شہر کی ڈیولپمنٹ اتھارٹی نے ساری زمین پر قبضہ کر لیا۔ بہت سے خواب ادھورے رہ گئے۔ کیا ملا، ساری زندگی تنگی میں گزار کر۔ میں ایک مرتبہ یوپی اردو اکیڈمی کی انتظامیہ کا رکن ہو گیا۔ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ یہ تقرر یا نامزدگی سیاسی تھی۔ وہاں میں نے اپنی آنکھوں سے وہ کچھ دیکھا جو پہلے

ن کانوں سے سنا تھا۔ پروفیسر صاحبان نے ایسی کتابوں پر انعامات کی سفارش کرنی
ع کی جو انھوں نے پڑھی نہیں تھیں۔ دلیل یہ تھی کہ فلاں نے ہندو ہوتے ہوئے اردو
لکھا ہے (احسان کیا ہے)۔ فلاں بے حد نامور شاعر ہے، فلاں کا فلاں سے شعبہ جاتی واسطہ
دغیرہ وغیرہ۔ میں نے جب بہت سی کتابوں پر ٹوکا تو مجبور ہو کر مجھ سے کہا گیا کہ
نام تم دے دو کچھ ہم دے دیتے ہیں۔ مصالحت ہو جاتی۔ ویسے ہم سہ کشوں کے
اکیڈمی کی عمارت سے باہر کچھ "دوسری طرح کا انتظام" بھی تھا۔ انعامات کی آخری فہرست
سب کے دستخط ہو جانے کے بعد شعبہ جاتی "لین دین" کی باتیں ہونے لگیں۔ مجھے
رنہ اس بات کا ہوا کہ انعام دینے والوں میں ایسے پروفیسر حضرات بھی تھے جنھوں نے
اری زندگی صحیح اردو نہیں لکھی۔ ایک اعلا ڈاکٹریٹ کے سند یافتہ وہ بھی تھے جنھوں
نے بلا تحقیق۔ تحقیق کی سند حاصل کر لی تھی۔ میں آج بھی کہتا ہوں کہ یہ جو کچھ کل ہوا تھا، آج
ی ہو رہا ہے اور آیندہ بھی ہوتا رہے گا کیوں کہ یہ سب محرومیوں کے ازالے کے
بوٹے موٹے طریقے ہیں۔ یہ ادارے اور وسیلے فراہم ہی اس لیے کیے جاتے ہیں کہ
توسط طبقہ کا ادبی حلقہ اپنی اشک شوئی کر سکے۔ ان سے روزی کے دروازے کھلتے ہیں۔
ہت سے فرسٹریشن دور ہوتے ہیں اور وقتی سیاسی تقاضے پورے ہوتے ہیں۔
حضرات ان اداروں کو اردو کی مخلصانہ خدمات کا ذریعہ سمجھتے ہیں وہ جانتے بوجھتے
نجان بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں ان اداروں کو بے ضرر اور بے فیض تصور کرتا ہوں،
پھر بھی میں اس کے حق میں نہیں ہوں کہ ان کے خلاف محاذ آرائی کی جائے۔ کیوں کہ ان سے
اردو کے متوسط طبقے کے اہل قلم کو تھوڑا بہت حوصلہ ملتا رہتا ہے۔ وہ اسی بہانے کچھ نہ کچھ کرتے
رہتے ہیں۔ اچھا بہت کم، برا بہت زیادہ! یہ ہر ملک، ہر ادب اور ہر زمانے میں ہوتا آیا ہے۔
اس پر جز بز ہونا سلسلۂ عمل کی فطرت کی تکذیب کرنا ہے۔ مشاہیر ہمیشہ متوسط طبقے ہی میں
پیدا ہوئے ہیں۔ اس لیے یہ گردن زدنی بھی نہیں ہے۔ البتہ انھیں اپنی وسعت سے زیادہ کا مکلف
کرنا بھی درست نہیں۔

ہندی کا قومی زبان قرار دیا جانا متوقع تھا کیوں کہ آزادی سے قبل اس کے لیے جذباتی
عصبیتی تعلق پیدا کر دیا گیا تھا۔ ہندی کی اس فوقیت کو اردو نے کبھی چیلنج نہیں کیا۔ اس نے صرف
اپنے وجود اور ترویج و اشاعت کا وہ حق مانگا جس سے اسے دانستہ محروم کیا جاتا رہا۔
یہ روش نہ ہندی کے لیے تعمیری و مثبت ہے اور نہ عصبیت سے پاک! یہ تو سراسر منفی اور
معاندانہ ہے۔ اب اردو کو اگر اپنے تحفظ کے لیے کوئی حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی تو وہ
اس کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگی کہ وہ خود استواری کی فکر کرے۔ اجتماعی طور پر جو کچھ ہو رہا
ہے اسے ہونے دیا جائے۔ انفرادی طور پر اردو کے علم بردار بہت کچھ کر سکتے ہیں۔
مثلاً گھر کے ہر فرد کو خالی اوقات میں اردو کی تعلیم دینا۔ خط کتابت۔ حساب کتاب، یاد
داشتوں میں اردو کا استعمال کرنا تختیوں اور سائن بورڈوں پر اردو کے استعمال کی اپیل

کرنا، وغیرہ۔ یہ چھوٹے اور معمولی کام ہیں لیکن ان کے نتائج بڑے وسیع اور دوررس ہوں گے۔ کرکے تو دیکھیے۔

اردو کے لیے تھوڑی جرأت کی بھی ضرورت ہوگی۔ بزدلی ہمیشہ منافقت کی علامت ہوتی ہے۔ جب فرقہ پرست آپ سے کہتے ہیں کہ اردو اقلیت کی زبان ہے تو آپ گھبرا کیوں جاتے ہیں؟ بغلیں کیوں جھانکنے لگتے ہیں؟ تاویلیں کیوں کرنے لگتے ہیں؟ کیا آپ سمجھتے کہ اپنوں میں آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ دوسروں تک نہ پہنچے گا؟ اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو یہ آپ کی خام خیالی ہے۔ گذشتہ چند مہینوں میں اردو کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے کیا اس کے مخاطب اہلِ اردو نہیں ہیں؟ کون سے اہلِ اردو؟ وہی جو اقلیت میں ہیں۔ لیکن آپ خود بھی در پردہ اقبال کرتے ہیں کہ جب اردو کی بات ہوگی تو مخاطب اقلیتی فرقہ ہی ہوگا، اسی پر لعن طعن کی جائے گی، اسی کو زمانہ شناسی اور نیک روی کی تلقین کی جائے گی۔ اس تضاد کا علاج صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ جرأت مندی سے کام لیجیے۔ کہیے کہ ہاں یہ واقعی ہماری زبان بنا دی گئی ہے۔ اس لیے ہم اسے اپنی زبان ہی کی طرح سینے سے لگائے رہیں گے۔ آپ بے اوسان نہ ہوں۔ میں نے یہ نہیں کہا ہے کہ "اردو ہماری زبان ہے" بلکہ آپ کا لحاظ کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ "بنا دی گئی ہے"! اگر کوئی بچہ لاوارث بنا کر گلی میں پھینک دیا جائے تو کیا آپ میں اتنا ترحم بھی نہ جاگے گا کہ آپ اسے اپنے سینے سے لگا لیں؟ اردو کا حال کچھ ایسا ہی ہے۔ اگر ہم اسے اپنی آغوش میں لے رہے ہیں، اپنے سینے سے لگا رہے ہیں تو یہ فرقہ پرستی نہیں ہے۔ اسے اقلیت کی زبان بنانا اور اس کا دائرہ تنگ کرنا نہیں ہے بلکہ منفی، جارحانہ اور تخریبی دہشت گرد فرقہ پرستی کے خلاف جوابی عمل (COUNTER ACT) کرنا ہے۔

میں پورے انشراحِ صدر کے ساتھ اس حقیقتِ امر کا قائل ہوں کہ زبان میری تیری نہیں ہوتی۔ وہ تو ان سب کی ہوتی ہے جو اسے وسیلۂ ابلاغ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اب، اگر کوئی یہ کہہ دے کہ یہ زبان میری نہیں ہے، تیری ہے۔ تو کیا میں کنگال ہو جاؤں گا؟ اور اگر میں یہ کہہ دوں کہ ہاں یہ زبان میری ہے تو کیا میرا یہ اعتراف و اقرار میری فرقہ پرستی کی شہادت بن جائے گا؟ یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میری سمجھ میں جو کچھ آتا ہے وہ یہ ہے کہ میں انتہائی صبر و سکون کے ساتھ اس لمحے تک اس زبان کو اپنائے رہوں گا اور انتظار کروں گا کہ فریقِ ثانی یہ اعتراف کر لے کہ یہ زبان اس کی بھی ہے۔ میں زبان کو اس کا حق و مقام دلوانے کے لیے تمام جائز و پُرامن سیاسی طریقے بھی اپناؤں گا مگر تخریب، تشدد، جارحیت اور منفی منافرانہ روش اختیار کرنے سے گریز کروں گا کہ یہ زبان کے نہیں بازوؤں کے غلط استعمال کے طریقے ہیں۔

اردو کے سلسلے میں ایک غلط پروپگنڈا یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اس میں اسلام سے متعلق اشارات بھرے ہیں کہ اسے مسلمانوں کی زبان قرار دینے میں کوئی تکلف نہیں کرنا چاہیے۔ میں

ں جملے کے پہلے نصف حصے سے اتفاق کرتا ہوں۔ واقعتاً اردو میں اسلام سے متعلق اتنا
دیجر ہے کہ فارسی و عربی میں بھی شاید نہیں۔ لیکن مسلمانوں نے اسے مسلمانوں کی زبان
نے کے لیے اس میں اتنا لٹریچر پیدا نہیں کیا تھا۔ انھوں نے یہ سب کچھ اس زبان کے
وں کے لیے کیا تھا۔ اب وہ ایسا ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں میں بھی کر رہے
۔ اسلام کے لیے کسی زبان کا کوئی دربند نہیں ہے۔ مزید براں میں یہ بھی عرض کرتا
بول چال کی زبانیں (SPOKEN LANGUAGES) مرتی نہیں ہیں۔ پھر رسے ساٹھ
سال تاجیکی، ازبیکی، آذری وغیرہ کو مٹانے کی کوشش کی گئی۔ ان سے ان کے رسم الخط
ے چھین لیے گئے۔ لیکن یہ مٹ نہ سکیں، محض اس وجہ سے کہ یہ زندہ زبانیں تھیں اور ہیں
دو بھی زندہ زبان ہے۔ یہ سنسکرت یا عبرانی نہیں ہے جو زبردستی مصنوعی طور پر زندہ کی
رہی ہو۔

اردو کے بہی خواہ بعض ایسے وساوس کا مظاہرہ کرتے ہیں جن سے اُن کی بے حوصلگی
ملتی ہے۔ یہ وساوس بھی حق نما دروغ کی تشبیہ کا شاخسانہ ہوتے ہیں۔ جب ہم یہ نصیحت
رتے ہیں کہ اردو کی تعلیم کے لیے ہندی، سنسکرت، عربی اور فارسی کی تعلیم ضروری ہے تو ہم
اس امر کا اعتراف کر لیتے ہیں کہ اردو خود کوئی قائم بالذات (INDEPENDENT) زبان
ہیں ہے۔ گئے زمانے کے لوگوں کی طرح آج بھی ہم اسے ریختہ ہی تصور کرتے ہیں۔ کس زمانے میں
انگریزی کے ایم اے کے درجات میں یونانی اور لاطینی پڑھائی جاتی تھی۔ اب نہیں پڑھائی جاتی۔
کیوں؟ شہریار نے جب اردو میں پی ایچ ڈی کرنی چاہی تھی تو انھیں جرمن زبان کا امتحان
دینا پڑا تھا۔ اب نہیں دیا جاتا۔ کیوں؟ ہندی اور سنسکرت تو آج کا ہر طالب علم بی اے
تک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھ کر ایم اے میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے باوجود
اردو کے کورس میں انھیں شامل کرنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ کیوں؟ عربی اور
فارسی اگر اس لیے اردو کے نصاب میں شامل کی جائیں، کہ اردو پر ان کے بے حد زیادہ
اثرات ہیں تو ترکی اور انگریزی کیوں نہیں؟ ان تمام استفسارات کا جواب خود انھیں
سوالیہ نشانوں میں مستور ہے۔ یعنی ہم اردو کے بہی خواہ خود اپنے نا سمجھی کے شعور رو ل
سے اسے ایک مستقل زبان نہیں زبانوں کا ملغوبہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ خدارا ایسا نہ کیجیے!
اگر آپ جدید عربی اور جدید فارسی سے مانوس ہوتے تو آپ کو اندازہ ہوتا کہ اب ہماری
اور ان کی لفظیات میں کتنا فرق ہو گیا ہے۔ مثلاً جس انگریزی لفظ کے مترادف کے طور پر
سطور بالا میں میں نے "قائم بالذات" لکھا ہے اسے جدید فارسی میں "برخوردار" کہتے ہیں اور
عربی میں "مستقل" یا "حر"۔ اسی طرح جسے ہم "عصری" (CONTEMPORARY) کہتے ہیں۔
اسے جدید عربی میں "حدیث"، اور جدید فارسی میں "ہم زمان" کہتے ہیں۔ رہ گئی بات
ضرورت کی تو جسے گارساں دتاسی پر کام کرنا ہے اُسے لازماً فرانسیسی سیکھنا چاہیے۔ عربی

---

[1] انگریزی کے ایک لائق فائق پروفیسر نے "واں تے" پر اردو میں ایک سیر حاصل کتاب تصنیف کر ڈالی لیکن وہ لاطینی اور اطالوی میں سے کوئی ایک زبان بھی نہیں جانتے۔

ناول پر تحقیق کرنے والا اگر روسی نہیں جانتا تو ہمیں دھوکا دے رہا ہے، فریب کاری کر رہا ہے۔

ہمارے ذہن میں یہ بات بھی حق نما دروغ کی تشہیر کے ذریعہ بٹھا دی گئی ہے کہ ہندی سیکھنا آسان ہے، اردو سیکھنا مشکل! تامل کے صف اول کے صحافی اور ایم. جی راما چندرن کے قریب ترین رفیق، سابقاً کلائی ما مانی اڈیار، حالاً عبداللہ اڈیار کا فخر یہ ہے کہ تامل کے مقابلہ میں عربی سیکھنا آسان ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آپ ہندی پڑھتے ہیں اور اردو بھی جانتے ہیں۔ اس بہچاننے کا حشر بھی آپ جانتے ہیں؟ ہندی صدی بیت جانے پر بھی اپنے بیس کروڑ ہم وطنوں کے ناموں کا صحیح تلفظ نہیں کر پاتی۔ کچھ نمونے آپ بھی ملاحظہ کرلیں: ذلیل جلیل۔ ثقیل بدایونی، شاہر لدھیالوزی، زبار = جبّار، جُبیر = زُبیر، وعلیٰ ہذالقیاس: ایسے پڑھنے سے فائدہ کیا؟

اردو کو ایک مشورہ رسم الخط کے بدلنے کا بھی دیا جاتا ہے۔ یعنی زباں کے لحاظ سے وہ ناقص، سیکھنے کے لحاظ سے وہ مشکل، لکھنے کے لحاظ سے وہ پُر عیب! اے میرے ناصحانِ مشفق، یہ تو بتاؤ کہ تمھیں اردو میں کبھی کوئی خوبی بھی نظر آئی؟ آپ سب نے تو مل کر دشمنانِ اردو کا کام خاصا آسان کر دیا۔ آیئے ہم اپنی عقلِ سلیم پر فاتحہ پڑھ لیں اور اردو کی تربت پر باسی پھول (تبدیلیٔ رسم الخط) کی چند پنکھڑیاں چڑھا کر رخصت ہو جائیں۔

ایسا نہیں ہے کہ اردو کے لیے رومن رسم الخط آزمایا نہ گیا ہو۔ آزمایا گیا تھا اور ناکام رہا۔ دوسری جنگِ عظیم میں برما فرنٹ پر ہمیں رومن رسم الخط میں چھپے ہوئے اردو اخبارات دیے جاتے تھے۔ ان کو پڑھنے میں اتنا وقت لگتا تھا کہ ہم اکتا جاتے تھے۔ ان اخباروں کی ناقدری دیکھ کر ہمیں انگریزی کے اخبار (SEAC) دیے جانے لگے اور رومن رسم الخط کے اردو اخبارات چھپنے بند ہو گئے۔ ترکی نے مصطفیٰ کمال کے زمانے میں رومن رسم الخط اختیار کر لیا تھا۔ وسطی ایشیا کی تمام زبانوں پر روسی رسم الخط لینن کے زمانے میں مسلط کر دیا گیا تھا۔ ملیشیا اور انڈونیشیا کے رسم الخط جنگِ عظیم ثانی میں بدل دیے گئے۔ اس عمل نے ان ممالک میں کیا کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا؟ یاد رکھیے جو قوم اپنے ماضی سے منقطع ہو جاتی ہے اسے اپنا مستقبل بنانے کے لیے بہت طویل ماضی کو وجود میں لانا پڑتا ہے، اور اس عرصے میں دنیا کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ اسپین اور پرتگال کی مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔

اردو کے بارے میں اگر واقعی آپ سنجیدگی سے کچھ سوچنا چاہتے ہیں تو ٹھنڈے ذہن سے سوچیے۔ اپنے کان ٹٹولے بغیر کوّے کے پیچھے نہ بھاگیے۔

اجمل اجملی
۲۹ ا ۔ اوکھلا جامعہ نگر
نئی دہلی ۲۵ ۱۱

لہو کا سیلِ گراں موج زن ہے، ہم تنہا
بہت خراب جہاں کا چلن ہے، ہم تنہا

اک اک کرکے بہت دور چل دیے احباب
سفر طویل ہے، کانٹوں کا بن ہے، ہم تنہا

قدم قدم پہ اپنی ہیں ہزار تلواریں
گلی گلی میں صدائے بزن ہے، ہم تنہا

ہر ایک مصلحتوں کا لباس پہنے ہوئے
دیار غلبۂ صد مکر و فن ہے، ہم تنہا

اداس شہر پہ خاموشیوں کا پہرہ ہے
ہر آن نرغۂ رنج و محن ہے، ہم تنہا

یہ اسپتال کی شب، یہ مہیب سناٹا
رگوں میں نشترِ غم کی چبھن ہے، ہم تنہا

کوئی رفیق نہ ہے درد آشنا کوئی
دل و جگر میں غضب کی جلن ہے، ہم تنہا

بھڑکتی آگ بجھائیں تو کس طرح اجملؔ
دھواں دھواں سی فضائے وطن ہے ہم تنہا

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

کتاب	موضوع	مصنف	قیمت
اسرارِ خودی (فراموش شدہ اڈیشن)	(شعری مجموعہ)	مرتبہ: شائستہ خان	۷۵/
حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدن	(تاریخ)	مالک رام	۷۵/
جامِ جہاں نما۔ اردو صحافت کی ابتدا	(اردو صحافت)	گربچن چندن	۷۵/
مسلمانوں کا تعلیمی نظام	(تاریخی)	ضیاء الحسن فاروقی	۴۵/
اردو ناول میں عورت کا تصور	(تحقیق)	فہمیدہ کبیر	۴۵/
نوٹوں کی تلاش	(ناول)	ایاز سیوہاروی	۶۰/
تاثر نہ کہ تنقید	(تنقید)	صدیق الرحمٰن قدوائی	۵۱/
اپنے دل کی حفاظت کیجیے	(ایلوپیتھی)	ترجمہ نذیر الدین مینائی	۲۵/
یہ صورت گر کچھ خوابوں کے	(انٹرویوز)	طاہر مسعود	۶۶/
مرضیات	(طب)	حکیم نعیم الدین زبیری	۵۱/
بانگ درا	(شعری مجموعہ، طلبہ ایڈیشن)	اقبال	۹/
بالِ جبریل	(شعری مجموعہ) "	"	۶/
ضربِ کلیم مع ارمغانِ حجاز (اردو نظمیں)	(شعری مجموعہ) "	"	۶/
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی	(ناول)	کشمیری لال ذاکر	۴۸/
گوشے میں قفس کے	(طنزیہ مزاحیہ)	دلیپ سنگھ	۴۵/
سحر کے پہلے اور بعد	(جگ بیتی)	سعید الظفر چغتائی	۵۱/
افکارِ اقبال	(اقبالیات)	محمد عبد السلام خاں	۱۲۵/
فرمان فتح پوری	(شخصیت اور ادبی خدمات)	مرتبہ خلیق انجم	۲۵/
تذکرہ ماہ و سال	(تذکرہ)	مالک رام	۱۲۵/
تحقیق نامہ	(تحقیق)	مشفق خواجہ	۱۲۵/
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان	(مذہب)	حکیم محمود احمد برکاتی	۴۵/
خواب اور خلش	(شعری مجموعہ)	آل احمد سرور	۶۶/
سفر	(ناول)	رابعہ تبسم	۲۷/
تحریریں	(تنقید)	ڈاکٹر اسلم پرویز	۵۱/
پہچان اور پرکھ	(تنقید)	پروفیسر آل احمد سرور	۵۱/
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	(تحقیق)	ڈاکٹر سلامت اللہ	۵۱/
پت جھڑ کی آواز (نیا اڈیشن)	(افسانے)	قرۃ العین حیدر	۷۵/
اقبال کا نظریہ خودی	(تحقیق)	عبد المغنی	۱۵۰/
سمندری خزانہ	(ناول)	ماریہ رحمان	۲۷/
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	(تنقید)	وارث علوی	۳۶/
فی الحقیقت	(طنز و مزاح)	یوسف ناظم	۴۵/
مٹی سے ہیرا	(ناولٹ)	سید مقبول احمد	۱۰/
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	(ناولٹ)	صغرا مہدی	۲۴/
الجھاوے	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف	۵۱/
غبارِ منزل	(شعری مجموعہ)	غلام ربانی تاباں	۴۵/

پروفیسر گوپی چند نارنگ
شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی۔ دہلی

مشرقی شعریات اور ساختیاتی فکر

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ
اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ (الروم ۲۲)

"اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش، اور تمھاری زبانوں اور تمھارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانش مند لوگوں کے لیے"
(اردو ترجمہ۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی)

عربی روایت

علمائے عرب علوم کی تقسیم دو طرح سے کرتے رہے ہیں۔ پہلی قسم میں علمِ دین، علم الاخلاق، علم النحو، ادب اور تاریخ کو شامل کیا جاتا تھا، اور دوسری قسم میں علومِ فلسفہ، علومِ طبیعیات وکیمیا اور علومِ طب داخل تھے۔ اگرچہ دوسری قسم کے علوم نے زیادہ تر بیرونی ممالک کے اثرات سے نشوونما پائی اور انھیں عرب میں کبھی قبولِ عام کی سند عطا نہیں ہوئی، لیکن جو عربی علوم کہلاتے ہیں وہ بھی خالص ملکی پیداوار نہیں ہیں اور ان کا ارتقا عالمِ اسلام کے ان حصوں میں ہوا جہاں عربوں کو دوسری قوموں سے سابقہ پڑا (تاریخ فلسفۂ اسلام، ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین)۔ اسی کی بدولت انھیں ان چیزوں پر جو فطرتِ انسانی سے زیادہ قریب ہیں، مثلاً زبان، شاعری، قانون، مذہب پر غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ عربی زبان کے لفظوں اور ترکیبوں کی کثرت اور قوتِ اشتقاق و انصراف پر عربوں کو خاص طور پر ناز تھا۔ عربی جیسی فصیح، پُرمعنی اور مشکل زبان کے شامیوں اور ایرانیوں میں نفوذ کر جانے سے بہت سے مسائل پیدا

ہو گئے۔ اوّل تو قرآن کے مطالعے، تجوید اور تفسیر کے لیے زبان پر عبور ضروری تھا، دوسرے زبان دانی کے عام اصولوں سے بحث بھی کی گئی۔ باوجود بیرونی اثرات کے علم اللسان کا موضوع بہرحال عربی زبان تھی، اور یہ "دقیق النظر اور محنتی عربوں کے ذہن کی ہتم بالشان آفرینش ہے جس پر وہ ناز کر سکتے ہیں۔" (ایضاً ص ۳۶)

اہلِ عرب مثل اور بہت سے علوم کے علم اللسان کا بانی بھی حضرت علی کو قرار دیتے ہیں، بلکہ کلام کی تقسیم تین اجزا میں جو ارسطو کی ایجاد ہے انھیں کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ اصل میں علم اللسان کی بنیاد کوفے اور بصرے میں پڑی۔ ابتدائی نشوونما تو پردۂ خفا میں ہے لیکن پہلی چیز جو معلوم ہے وہ سیبویہ کی مکمل صرف و نحو ہے۔ یہ ایک جید کتاب ہے جسے آگے چل کر متاخرین نے ابنِ سینا کے قانون کی طرح متعدد علما کی کوشش کا نتیجہ قرار دیا۔ کوفے اور بصرے کے دبستانِ صرف و نحو میں جو فرق تھا اگرچہ اس کا اچھی طرح علم نہیں ہے، تاہم اتنا معلوم ہے کہ کوفے والوں کے مقابلے میں دوسرے نحوی اہلِ منطق کہلاتے تھے۔ اصل عربوں کے خیال میں ان کا دماغ منطق نے خراب کر دیا تھا۔ دوسرے فریق نے محض اپنے ذوق کو معیار بنایا۔ اس میں شک نہیں ہے کہ سب سے پہلے بصری مفکرین نے منطق کے وسیلے سے کام لیا۔ یوں بھی فلسفیانہ درس کا اثر بصرے میں زیادہ نمایاں تھا اور وہاں کے نحویوں میں بہت سے شیعی اور معتزلی تھے۔ ڈاکٹر عابد حسین کا کہنا ہے کہ علم اللسان کے اس پہلو پر ارسطاطالیسی منطق کا بہت اثر پڑا۔ (ص ۳۵) اہلِ شام اور اہلِ ایران اسلامی عہد سے پہلے ہی ارسطو کی تصنیف باری ارمینیاس اور اس کے رواقی اور اشراقی حواشی کا مطالعہ کر چکے تھے۔ ابن المقفع نے جو خلیل نحوی کا دوست تھا، منطق اللسان کے کل مواد کا جو پہلوی زبان میں موجود تھا، عربی میں ترجمہ کر دیا۔ اس کی رو سے جملے کی کبھی پانچ کبھی آٹھ یا نو قسمیں قرار دی جاتی تھیں اور اجزائے کلام میں اسم، فعل

حرف شمار ہوتے تھے۔ بعد میں بعض نحویوں مثلاً جاحظ نے معانی اور بیان کے صنائع میں احکام منطق کی اشکال کو داخل کر لیا، اور متاخرین کی تصانیف میں صوت اور معنی پر بہت توجہ کی گئی۔ یہ مسئلہ بھی زیر بحث رہا کہ آیا زبان فطری چیز ہے یا بنانے سے بنتی ہے۔ آہستہ آہستہ قیاسیوں کی رائے کہ زبان فطری چیز نہیں ہے، یہ بنانے سے بنتی ہے، غالب آتی گئی۔ (اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ یہ موقف وہی ہے جو جدید لسانیات کا ہے)۔

عربی علوم پر منطق کے بعد سب سے زیادہ اثر ریاضی کا رہا ہے۔ شعرا کے کلام کی ترتیب بعض معینہ امور کے لحاظ سے مثلاً وزن کے اعتبار سے کی گئی۔ خلیل بن احمد (وفات ۷۹۱ء) جو سیبویہ کا استاد کہا جاتا ہے اور جس کی نسبت معلوم ہے کہ اس نے علم اللسان میں سب سے پہلے قیاس سے کام لیا، عروض کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ وزن کا تصور اس درجہ حاوی تھا کہ شعر میں زبان مصنوعی عنصر قرار دی گئی جو ہر قوم میں جدا جدا ہے، اور وزن کو فطری قرار دیا گیا جو تمام اقوام کی شاعری میں مشترک ہے۔ وزن کی اہمیت کے پیش نظر ثابت ابن قرۃ (وفات ۹۰۱ء) نے کہا کہ عروض طبیعی علم ہے، اس لیے فلسفے کا جز ہے۔

یہ پہلو بھی اہم ہے کہ علم اللسان کی علمی تحقیق سے زیادہ شہرت خطاطی کے فن لطیف کو ہوئی۔ اس میں بھی تمام عربی فنون کی طرح نظم و ترتیب سے زیادہ آرائش مد نظر تھی اور اس کی نشو و نما نہایت خوشنما اور عمدہ نقوش میں ہوئی۔ عربی کے حروف کی کشش میں آج بھی عربی ذہن کی وہ نزاکت نظر آتی ہے جس نے اسے خلق کیا تھا۔

(ایضاً ص ۳۶-۳۷)

منطقی یا استدلالی طرز کا کوئی قول، خواہ وہ زبانی ہو یا تحریری، عربوں کی اصطلاح میں عموماً اور علم العقائد میں خصوصاً 'کلام' اور اس کا قائل 'متکلم' کہلاتا تھا۔ متکلمین کا نام جو ابتدا میں تمام استدلالیوں میں مشترک تھا، آگے چل کر زیادہ تر معتزلہ کے حریفوں اور اسلام پسند علمائے دین

کے لیے استعمال ہونے لگا۔" استدلال کا اسلام میں داخل کرنا سخت بدعت تھی۔ روایت و حدیث کے ماننے والوں نے بڑے زور و شور سے اس کی مخالفت کی۔ علم الفرائض اور علم العقائد کے باہر جو کچھ بھی تھا، وہ سب ان کے نزدیک الحاد تھا۔ عقیدے کے معنی ان کے یہاں اطاعت سمجھے جاتے تھے، بخلاف معتزلہ کے جو اس کے بالکل قائل نہ تھے۔ معتزلہ غور و فکر کو مسلمانوں کے لیے بمنزلہ فرض کے قرار دیتے تھے۔ آہستہ آہستہ زمانہ بھی اس خیال سے سازگار ہوگیا۔ رسول اللہ ؐ کی یہ حدیث موجود ہی تھی کہ پہلی چیز جو خدا نے پیدا کی علم یا عقل ہے[۵]۔"

(ایضاً ص ۴۱ - ۴۲)

جہاں تک دوسرے ملکوں کے علوم کے اثرات کا تعلق ہے، مصنف تاریخِ فلسفۂ اسلام کے بقول:

" علم و حکمت کا اصلی گھر ہندوستان سمجھا جاتا تھا۔ عرب کے مصنفوں کے یہاں کثرت سے یہ خیال ملتا ہے کہ فلسفہ اسی ملک میں پیدا ہوا ہے۔ پہلے با امن تجارتی کاروبار کی بدولت جو ہندوستان اور یورپ کے درمیان عربوں کے توسط سے ہوا کرتا تھا، اس کے بعد اسلامی فتوحات کے ذریعے سے عربوں کی واقفیت ہند کی حکمت کے متعلق بھی بڑھتی گئی۔ منصور (۷۵۴ء تا ۷۷۵ء) اور ہارون (۷۸۶ء تا ۸۰۹ء) کے عہد میں اس حکمت کا بہت بڑا حصہ کچھ تو پہلوی کے واسطے سے اور کچھ براہِ راست سنسکرت سے ترجمہ ہوا۔ ہندوؤں کے اخلاقی اور سیاسی فلسفیانہ اقوال اور قصہ کہانیوں میں سے بہت کچھ لیا گیا مثلاً پنچ تنتر جس کا ترجمہ ابن المقفع نے منصور کے زمانے میں کیا۔ لیکن اسلام میں علومِ دنیا کی ابتدا پر سب سے زیادہ اثر ہندوؤں کی ریاضی اور نجوم کا (موخر الذکر کا علاجِ امراض اور سحر کے سلسلے میں) پڑا۔ برہم گپت کی سدھانت سے پہلے (جس کا ترجمہ منصور کے زمانے میں فرازی نے ہندی علما کی مدد سے کیا تھا) عرب بطلیموس کی اَلمجسطی سے واقف تھے۔ اس کے ذریعے سے ماضی اور مستقبل کی ایک وسیع دنیا نظر کے سامنے آئی۔ جن عظیم الشان اعداد سے

[۵] اس حدیث کی تصدیق نہیں ہوسکی

ہند کے علما کام لیتے تھے انھوں نے سنجیدہ مسلم مورخوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ ہندوؤں کے منطقی اور مافوق الطبیعی افکار سے بھی مسلمان ناواقف نہیں رہے لیکن ریاضی اور نجوم کے مقابلہ میں ان چیزوں کا اثر عربی علوم کی نشوونما پر بہت کم پڑا۔" (ایضاً ص ۱۸)

منطق کے اثرات البتہ نوعیت کے اعتبار سے یونانی تھے۔ ارسطو کی منطق کے اجزا کی عربی تالیف کثیر تعداد میں ہوتی رہی۔ ارسطو کے متون کی شرحیں بھی عربی میں بہت لکھی گئیں، اور ان کے جو نسخے دستیاب ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر مقبول تھیں۔ ذی فہم اشخاص ارسطاطالیسیت پر اس حد تک قائم رہے جہاں تک کہ اس میں اور ان کے اذعانی عقائد میں میل ہوسکتا تھا۔ منطق میں یہ خوبی تھی کہ یہ علم الکلام کے سانچے میں ڈھالی جاسکتی تھی۔ (ایضاً ص ۱۲۶) جہاں تک فلسفے کا تعلق ہے عربوں میں یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک فلسفی قید ہوگیا۔ ایک شخص غلام کے طور پر اسے مول لینا چاہتا تھا۔ اس شخص نے فلسفی سے پوچھا میاں تم کس کام کے قابل ہو۔ فلسفی نے جواب دیا آزاد کر دیے جانے کے قابل۔

دورِ جاہلیت

دورِ جاہلی کے عربوں میں شاعری افتخار و امتیاز کا وسیلہ تھی۔ "عربی تنقید کے بنیادی افکار" سے بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالعلیم نے لکھا ہے کہ دورِ جاہلی میں عربوں کے پاس شاعری کے علاوہ اور کوئی ادبی سرمایہ نہ تھا۔ ان کی شاعری ان کی قبائلی زندگی کی آئینہ دار تھی۔ قبیلوں کی باہمی کشمکش جس کی روداد کو 'ایام العرب' کہا جاتا ہے، قبلِ اسلام کی عربی شاعری کا خصوصی موضوع ہے۔ شجاعت و سخاوت، مہمان نوازی، فخر ومباہات، عصبیت و انتقام، عفووصلہ، اخوت و ہمدردی وغیرہ شعرِ جاہلی کی عمومی خصوصیات ہیں۔ عربی شاعری کے بالکل ابتدائی نمونے سامنے نہیں ہیں، شعرِ جاہلی کا جتنا ذخیرہ محفوظ ہے وہ زیادہ تر چھٹی صدی عیسوی کی یادگار ہے۔ جو مدح، ہجا، مرثیے اور نسیب کے قالب میں ڈھل کر 'الشعر دیوان العرب' کا مصداق بن گیا ہے۔ (تنقید کے بنیادی مسائل

ص ۲۹۔ ۳۰) عربوں کا دستور تھا کہ سال کے خاص مہینوں میں میلے اور بازار لگاتے اور تہواروں کی طرح انھیں مناتے تھے۔ ان میلوں میں صرف تجارت کا کاروبار ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ زبان و لغت اور شعر و شاعری کا چرچا بھی ہوتا تھا۔ اس موقع پر عرب قبیلوں کے ممتاز شعرا، خطبا اور قابلِ قدر لوگ جمع ہوتے اور اپنے قبیلوں کے اہم واقعات اور شجاعت کے قصّے بھی سناتے، حسب نسب میں برتری کے دعوے، نیز زباں دانی اور اس میں تفوق کے مظاہرے بھی ہوتے تھے۔ شعرا اپنا کلام سناتے اور جس شاعر کا قصیدہ سب سے اچھا قرار دیا جاتا، اس کو لکھ کر خانہ کعبہ پر لٹکا دیا جاتا۔ یہی وہ قصیدے ہیں جن کو 'معلقات' یعنی لٹکائے ہوئے قصیدے کہتے ہیں۔ عکاظ کا میلہ مشہور تھا۔ عکاظ مکہ سے کچھ دور ایک گاؤں تھا۔ اس میلے کا رواج ۵۴۰ء سے شروع ہوا اور اسلام کے بعد تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح کے میلے مجنہ (یا محنہ) اور ذو المجاز میں بھی لگتے تھے۔ (ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی، عربی ادب کی تاریخ ص ۶۷، ۶۸)

عہدِ اسلام (۶۲۲ - ۶۶۱ھ)

اسلام کی آمد سے "شعری کاروبار مندا تو ضرور ہوا، لیکن یہ سلسلہ بند نہیں ہوا۔" ابتدا میں کچھ شعرا نے رسول اللہؐ کی ہجو کی۔ لیکن جب اسلام کو تقویت حاصل ہوئی تو حسان بن ثابت اور دوسروں نے رسول اللہؐ کی مدح میں قصائد لکھے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نے اس دور کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "قرآن میں شعرا کو گم راہ اور آوارہ گرد کہا گیا ہے۔ اس کا مقصد نفسِ شاعری کی مذمت نہیں بلکہ جاہلی شعرا کی بے راہ روی کی طرف اشارہ ہے اور خود رسول کو جو لوگ نئی طرز کا شاعر سمجھتے تھے ان کی تردید ہے۔" (ص ۳۱) ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی اس دور کے تمام عوامل کو نظر میں رکھ کر کہتے ہیں: "اسلام نے عربی شاعری کے ذہنی رجحانات پر ضرب لگائی، قرآن مجید نے شعرا کو ان کی بے راہ روی پر متنبہ کیا کہ وہ ایسی باتیں کرتے ہیں جو خود نہیں کرتے، حضورؐ نے فرمایا کہ "شعر

ے بہتر ہے کہ آدمی قے سے اپنا پیٹ بھرے۔" شعرا کی پیروی
رنے والوں کو گمراہ قرار دیا۔ لیکن ان ارشادات کا مقصد یہ تھا کہ
بوں کو فحش شاعری، عورتوں کے جسمانی محاسن، شراب کی تعریف
ر جوئے کی مدح سے روکا جائے۔ اس لیے کہ اسلام کا بڑا مقصد
بالات و اخلاق کی پاکیزگی تھا۔ پاکیزہ شاعری کو حضورؐ خود پسند فرماتے
تھے اور اسلام کی مدافعت میں آپ نے اس سے کام بھی لیا۔ آپ
نے قصائد میں جو تشبیب ہوتی تھی، اس کو بھی سنا اور اعتراض نہیں
یا۔ (نقوش ص ۳۴۸ : ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی، تطور النقد الادبی عند العرب،
حوالہ "عربی زبان میں ادبی تنقید کی روایت" از ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی،
نقوش شمارہ ۱۳۸، ص ۳۴۳-۳۷۶۔ یہاں تمام حوالے نقوش
سے ماخوذ ہیں اور میں نے اس مقالے سے بیش از بیش استفادہ
لیا ہے)۔

ابتدائی ردِ عمل کے بعد نبی کریمؐ اور صحابۂ کرام نے عربوں کی پرانی
شاعری کے محاسن کی پسندیدگی کا جگہ جگہ اظہار فرمایا۔ ایک جگہ رسولِ کریمؐ
نے شاعری کو "دیوان العرب" کے نام سے یاد کیا تو دوسری جگہ شاعری
یں سامنے آنے والی حکمت اور اظہار و بیان کی ساحری کا اعتراف کیا۔
س بارے میں یہ حدیث مشہور ہے :

اِنَّ مِنَ الشِّعرِ حِکْمَۃً وَ اِنَّ مِنَ البَیَانِ سِحْراً

(ابوداؤد، مشکوۃ)

(بے شک بعض اشعار حکمت ہیں اور بعض بیان جادو ہیں)

حضرت علی کو خلفائے راشدین میں شاعری سے شغف اور عربوں کی
شاعری پر اچھی نظر رکھنے کے اعتبار سے امتیاز حاصل تھا۔ انھوں نے
مرؤ القیس کو کئی موقعوں پر شاعروں میں سب سے بہتر شاعر قرار
دیا ہے۔ شاعری کے بارے میں حضرت علی کا یہ قول مشہور ہے :

اَلشِّعْرُ مِیْزَانُ القَوْلِ (وَرَوَاہُ بَعْضُھُمْ اَلشِّعْرُ
مِیْزَانُ القَوْمِ)		(نقوش، ص ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۴۳)

(یعنی شاعری قول کا پیمانہ ہے (یا بقولِ بعضے شاعری قوم کا پیمانہ ہے)

عہدِ اموی

جہاں تک شعری رویوں کا تعلق ہے، عہدِ اموی (۶۶۱ - ۷۵۰) میں سوائے اس کے کوئی قابلِ ذکر بات نہیں کہ اس زمانے میں زیادہ تر دورِ جاہلیت کی فنی اقدار کا احیا ہوا۔ اسلام نے خاندانی، قبائلی اور نسلی عصبیت کو ختم کیا تھا مگر اموی عہد میں نسلی امتیازات کا شدید احساس پھر عود کر آیا۔ پرانے قبائلی خصائص پر فخر و مباہات اور دورِ جاہلیت کی برائیوں کو خوبیوں کے طور پر پیش کرنا عام سی بات ہو گیا۔ اس دور کے شعری مباحث میں تین شاعروں کا ذکر خصوصیت سے ملتا ہے، جریر، فَرَزْدَق، اور اَخطل۔ ان تینوں کے درمیان آپس میں سخت رقابتیں رہا کرتی تھیں اور تینوں ایک دوسرے کے جواب میں قصیدے کہا کرتے تھے۔ اس دور کی شعریات بیشتر انھیں کے لغوی اور نحوی اعتراضات اور معرکہ آرائیوں سے عبارت ہے۔ اس رجحان کو تقویت دینے والے علما اور اہلِ لغت میں سے زیادہ تر کا تعلق کوفہ و بصرہ سے تھا۔ ان علما اور اہلِ لغت نے لغوی اور نحوی مباحث پر اس حد تک زور دیا کہ شعر و زبان کے دوسرے مسائل ایک مدت تک بے توجہی کا شکار رہے۔

عہدِ عباسی

عربی شعریات کے بنیادی تصورات دراصل عہدِ عباسی (۷۵۰ - ۱۲۵۸ء) میں مستحکم ہونا شروع ہوئے اور ان کی ضابطہ بندی بھی اسی دور کی مرہونِ منت ہے۔ اسی زمانے میں طبقاتِ شعرا کی طرف توجہ دی گئی، اور دورِ جاہلیت کی شاعری کو جمع کرنے کا کام بھی عمل میں آیا۔ عربی نقد کے اہم ترین معماروں اور پرانے تنقیدی خیالات و تصورات کی تدوین کرنے والوں کا تعلق زیادہ تر اسی دور سے ہے۔ دراصل اس دور میں جو اصول متعین ہو گئے ان کا عمل دخل عربی شعر و ادب میں بعد میں بھی رہا، اور عربی ہی نہیں، فارسی اور اردو شعریات میں بھی زیادہ تر انھیں اصولوں کی کارفرمائی رہی۔

عربی شعریات کے ابتدائی آثار تذکروں اور طبقات میں ملتے ہیں۔
اولین تذکروں میں محمد بن سلام الجمحی (متوفی ۲۳۱ھ) کا طبقات الشعراء، ابن قتیبہ کا الشعر و الشعراء اور ابن المعتز کا طبقات الشعراء ہیں۔ ابن قتیبہ (متوفی ۲۷۶ھ) کی کتاب الشعر و الشعرا اس اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے مقدمے میں شعر کے محاسن اور معائب سے مختصر بحث کی گئی ہے۔ ابن قتیبہ نے پہلی بار یہ نظریہ پیش کیا کہ محض قدامت وجہ ترجیح نہیں ہو سکتی۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ کس شاعر کے کلام میں اچھے اشعار کی تعداد زیادہ ہے خواہ وہ قدیم ہو یا معاصر۔ ابن قتیبہ کا قول ہے' اللہ نے علم، شعر اور بلاغت کو نہ کسی زمانے کے لیے محدود کیا ہے اور نہ کسی قوم کے لیے مخصوص کیا ہے بلکہ اس نے اپنے تمام بندوں کو ہر زمانے میں یہ نعمت عطا کی ہے'

ابن قتیبہ کے بعد اہمیت کے اعتبار سے جو نام لیے جاتے ہیں، ان میں جاحظ (متوفی ۲۵۵ھ) کا نام خصوصیت رکھتا ہے۔ اس سے تین کتابیں کتاب الحیوان، البیان والتبیین اور صیاغۃ الکلام یادگار ہیں آخری دو میں شعرا اور شاعری کے بارے میں اظہار خیال ملتا ہے۔ یوں تو اس کے یہاں پرانے خیالات کی گونج ہے لیکن معنی بر لفظ کی اولیت اور فضیلت کے بارے میں اس کے خیالات منفرد ہیں، اور یہ سلسلہ مقدمۂ ابن خلدون تک چلا گیا ہے۔ جاحظ واضح طور پر کہتا ہے کہ اصل اہمیت لفظ کے استعمال کی ہے، معنی تابع محض ہے۔

عبداللہ ابن المعتز (متوفی ۲۹۶ھ) نے فنِ بدیع پر کتاب البدیع لکھی جس کا بنیادی مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ اُس زمانے کے شاعر جن صنائع کو اپنی خصوصیت سمجھتے تھے اور جن پر ناز کرتے تھے وہ نہ صرف شعرائے جاہلی کے کلام میں موجود ہیں بلکہ قرآن و حدیث میں پائے جاتے ہیں۔
ابن المعتز کے بعد بہت سے ادبا نے صنائع پر اضافہ کیا یہاں تک کہ علمِ بدیع جو معانی و بیان کے تحت میں آتا تھا، علاحدہ علم گنا جانے لگا۔ شعر کی غرض و غایت رفتہ رفتہ جذبات و احساسات کی ترجمانی و اظہار کے بجائے لفظی صناعی اور شعبدہ گری قرار پانے لگی۔ لوگوں نے بہت سی صنعتیں نکالیں

اور زیادہ توجہ انھیں پر ہونے لگی۔ موازنے کے جو آداب اس زمانے میں متعین ہوئے حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ یہ سمجھنے کے لیے کہ کون شاعر بہتر ہے، یہ ضروری ہے کہ شاعروں کے ہم معنی اشعار کا موازنہ کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس معنی کو کون بہتر طریقے سے ادا کرتا ہے۔ اگر یہ معنی عام ہے تو کیا کسی شاعر نے اس میں توسیع کی ہے یا کوئی نیا پہلو پیدا کیا ہے۔
۲۔ موازنے میں ذوقِ سلیم سے کام لیا جائے اور تعصب کو دخل نہ ہو۔
۳۔ دونوں شعرا کے عیوب کو بھی ظاہر کیا جائے، ان کی پردہ پوشی نہ کی جائے۔
۴۔ موازنہ تفصیلی ہونا چاہیے۔ محض سرسری مطالعے پر قطعی حکم نہیں لگانا چاہیے۔

چوتھی صدی کے شروع میں ابوالفرج قدامہ بن جعفر (متوفی ۳۲۷ھ) نے اپنی کتاب عقد السحر فی شرح نقد الشعر مرتب کی جو عربی نقد کی تاریخ میں سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ شعر کی وہ تعریف جو درسی کتابوں میں آج تک رائج ہے یعنی "کلامِ موزوں و مقفیٰ جو کسی معنی پر دلالت کرے"، قدامہ ہی سے یادگار رہے۔ قدامہ کا اندازِ بحث فلسفیانہ اور منطقی ہے اور اس نے نقدِ شعر کو ذوقی اور شخصی اور موضوعی دائرے سے نکال کر عمومی، علمی اور معروضی حدود میں لانے کی کوشش کی۔ قدامہ نے عربی شعر کے چار عناصر بیان کیے ہیں: لفظ، معنی، وزن اور قافیہ۔ اور پھر ان کے باہمی ربط کے چار عنوانات قائم کیے ہیں:

۱۔ لفظ کا ساتھ معنی سے
۲۔ لفظ کا ساتھ وزن سے
۳۔ معنی کا ساتھ وزن سے
۴۔ معنی کا ساتھ قافیہ سے

قدامہ نے شعر و زبان کے مفرد اور مرکب عناصر کے محاسن اور معائب سے بحث کی ہے اور شعرائے عرب کے کلام سے مثالیں دے کر اپنے دلائل کو واضح کیا، لیکن نقد الشعر اس زمانے میں زیادہ مقبول نہیں ہوئی تاہم بعد کے زمانے میں قدامہ کے خیالات کا اثر مرتب ہوتا رہا اور اس کا یہ کارنامہ معمولی نہیں کہ اس نے حسن کاری کو شعر کے لیے ضروری قرار دے کر شعر کو اخلاق کی زیردستی سے نجات دلائی اور شاعری کی اپنی حیثیت کو مستحکم کر دیا۔ اس کا یہ اقتباس جو خاصا مشہور ہے، شعری فکر کے اعتبار سے بنیادی اہمیت کا حامل ہے:

"طرزِ بیان شعر کا اصل جزو ہے۔ مضمون و تخئیل کا بجائے خود فاحش ہونا شعر کی خوبی کو زائل نہیں کرتا۔ شاعر ایک بڑھئی ہے۔ لکڑی کی اچھائی برائی اس کے فن پر اثر انداز نہیں ہوتی"

اُس زمانے میں یہ بات معمولی نہیں کہ قدامہ غلو یا مبالغے کو شاعری کے لیے ضروری قرار دیتا ہے۔ اس کا قول ہے:

اَحْسَنُ الشِّعْرِ اَکْذَبُہٗ

یعنی سب سے بہتر شعر سب سے زیادہ جھوٹا ہوتا ہے

قدامہ اصرار کرتا ہے کہ مبالغے سے شاعری کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ بہرحال قدامہ کی نقد الشعر دورِ عباسی کی بنیادی دستاویز ہے۔ اس میں جو مباحث اٹھائے گئے بعد کے زمانے میں ان کا اثر ہوتا رہا اور قدامہ کی کئی آرا آنے والوں کے لیے بنیادی حوالے کا درجہ اختیار کر گئیں۔

قدامہ ابن جعفر کے بعد عربی شعریات میں جن مفکرین و ماہرین کا نام اہمیت رکھتا ہے، ان میں ابنِ رشیق، عبد القاہر جُرجانی اور مغرب کے آخری فلسفی ابنِ خلدون خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ابنِ رشیق (متوفی ۴۶۳ھ) نے اپنی کتاب العمدہ فی صناعۃ الشعر و نقدہ میں اپنے زمانے تک کے عام ادبی تصورات اور تنقیدی خیالات کا احاطہ کیا۔ شعر کی تعریف میں اس کا قول "شعر کو مثلاً بیت سمجھو..." (جس سے بحث آگے آئے گی) بنیادی بصیرت کا حامل ہے اور بہت مشہور ہے۔ لفظ و معنی کی بحث میں بخلاف ماقبل مفکرین کے جو بالعموم لفظ کی افضلیت بیان کرتے ہیں، ابنِ رشیق

کتاب العمدہ میں لفظ و معنی کے رشتے کو جسم و جان کے رشتے سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر معنی نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ جُرجانی (متوفی ۴۷۲ھ) کی دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغۃ کی اہمیت کو بہت بعد میں پہچانا گیا۔ ان میں علم اللسان اور علم الشعر کی باریک بحثیں ملتی ہیں۔ محمد رضوان الدایہ مقدمہ دلائل الاعجاز میں لکھتا ہے کہ جرجانی کا تصورِ لسان بہت کچھ سوسیئر کے خیالات سے مماثل ہے۔ اس کا کہنا ہے:

"عبدالقاہر جرجانی نے دلائل الاعجاز میں زبان سے متعلق خالص علمی اور بے مثل موقف اختیار کیا ہے۔ اس نے دلالت کا ایک اصول مقرر کیا ہے جسے ایک باضابطہ قانون کی حیثیت اختیار کرنے کے لیے جدید مطالعات کو تقریبًا ایک ہزار برس انتظار کرنا پڑا تب کہیں چمنستانِ بلاغت کے سوئس دیدہ ور سوسیئر کے ہاتھوں بیسویں صدی کے شروع میں لسانیات کا ایک تسلیم شدہ ضابطہ تشکیل پایا کہ الفاظ بذات خود کوئی معانی نہیں رکھتے۔ یعنی لفظ اور معنی میں کوئی فطری ربط نہیں، بلکہ لسانی اشکال اور ان کے مفاہیم سماجی اور اجتماعی طور پر طے پاتے ہیں اور لسانی ساخت ہی لفظ و معنی کا ربط طے کرتی ہے۔"

(ترجمہ بشکریہ ڈاکٹر ضیاء الحسن ندوی)

عالمِ اسلام کے آخری فلسفیوں میں ابنِ خلدون (۷۳۲ - ۸۰۸ھ) کا درجہ نہایت بلند ہے۔ اس نے تمدن کی نشوونما کا قانون مرتب کرکے ایک نئے علم فلسفۂ تمدن یا فلسفۂ تاریخ کی بنا ڈالی۔ اس کی تصنیف مقدمہ کئی اعتبار سے عجیب و غریب کتاب ہے۔ اس کے بابِ ششم میں جہاں لغات اور نحو پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے، ایک حصہ فنِ شعر سے متعلق بھی ہے۔ لفظ و معنی کی بحث میں پانی اور ظروف کی تمثیل جو اردو میں حالی کے مقدمہ اور حالی کی تعبیر سے مشہور ہوئی، اسی حصے سے ماخود ہے۔ ایک ایسے دور میں جب تمدن رو بہ زوال تھا اور اہلِ مدرسہ مقلدانہ تحریروں میں گم تھے، ابنِ خلدون کی حیثیت ایک یگانۂ روزگار جید فلسفی کی ہے۔

عربی تصورِ شعر کے بنیادی افکار کے سلسلے میں یہ بحث عام رہی ہے

کہ عباسی دور کے لکھنے والوں پر یونانی افکار کا کتنا اثر پڑا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نے اس سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: "میرا ذاتی خیال ہے کہ علم البلاغۃ کی تدوین اور تبویب میں یونانی منطق اور ارسطو کی ریطوریقا کا اثر نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ بہت سے صنائع لفظی و معنوی کی عربی اصطلاحیں یونانی کا ترجمہ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن جہاں تک ادبی نقد اور شعر کی پرکھ کا سوال ہے اس پر یونانی اثرات بہت کم ہیں۔ ارسطو کی ریطوریقا کا ترجمہ تیسری صدی ہجری میں ہوگیا تھا۔ حنین بن اسحاق نے اس کا ترجمہ کتاب الخطابہ کے نام سے کیا تھا۔ بوطیقا یا کتاب الشعر کا ترجمہ بعد کو ہوا۔ قدامہ کے نقد الشعر میں ارسطو کے خیالات کی جھلک ملتی ہے۔"

فارسی روایت

فارسی روایت کی بنیادی ترجیحات کا ذکر کرتے ہوئے مسیح الزماں لکھتے ہیں کہ عرب ماحول سے ایرانی ماحول کی تبدیلی نے معیارِ شعر پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا کیوں کہ شعر گوئی کا مقصد یعنی ممدوح کی تعریف و ثنا کم و بیش بدستور رہا۔ فرق ہوا تو صرف اتنا کہ پہلے تعریف کی غایت محاسن کا بیان اور ان پر فخر کرنا تھا تو اب کسبِ زر کے سوا اور کوئی مقصد نہ تھا۔ مثالیت پسندی جو زندگی کے ہر شعبے پر چھائی ہوئی تھی بدستور نظر آتی ہے۔ مبالغہ اور غلو کے ذریعے ممدوح کی شان بڑھانا، اس میں مضامین پیدا کر کے قدرتِ بیان کا مظاہرہ کرنا اور پیشِ نظر نتیجہ اخذ کرنے کے لیے حسنِ تعلیل سے دلیل لانا منتہائے کمال سمجھا جاتا تھا اور اسی کو نبھانے کے محاسن اور قبح پر شعر کی اچھائی اور برائی کا دارو مدار تھا۔ (ص ۲۴)

نظامی عروضی سمرقندی کی چہار مقالہ (۵۲-۵۵۱ھ) فارسی میں ایسی پہلی کتاب ہے جس سے معیارِ شعر پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ نظامی عروضی سمرقندی شاعری کو صناعت قرار دیتا ہے:

"شاعری صناعتے است کہ شاعر بداں صناعت اتساقِ مقدماتِ موہومہ کند و التیامِ قیاسات منتجہ ..." (مقالہ دوم)

نظامی کے نزدیک شاعر کو مجلسِ تکلم میں خوش تقریر اور مجلسِ عیش و عشرت میں خندہ رو ہونا چاہیے۔ نظامی کے نزدیک اچھے شاعر کے لیے قبولِ عام کی سند ضروری ہے جو تاثیر کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی :

"چوں شعر بدیں درجہ نہ باشد تاثیرِ او را اثر نہ بود۔"

(مقالہ دوم)

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو نظامی پہلا شخص ہے جو معنی کو تاثیر کے حوالے سے دیکھتا ہے۔ عربی مفکرین کی طرح نظامی بھی اساتذہ کے کلام کے مطالعے پر زور دیتا ہے۔ اس کا قول ہے کہ بیس ہزار اشعار شاعر کی نظر سے گزر چکے ہوں۔ (ایضاً ص ۲۵-۲۶)

رشید الدین محمد عمری کاتب بلخی معروف بہ وطواط کی کتاب حدائق السحر فی دقائق الشعر (۶۸- ۵۵۱ھ) فارسی میں علمِ بدیع پر پہلی کتاب قرار دی جاتی ہے۔ ابوالحسن علی فرخی (متوفی ۴۲۹ھ) کی ترجمان البلاغۃ کا ذکر اگرچہ ملتا ہے لیکن اس کے نسخے دستبردِ زمانہ کے ہاتھوں تلف ہوگئے۔ وطواط کی کتاب اگرچہ ابن المعتز اور دوسرے عربی مصنفین کی تقلید میں لکھی گئی، لیکن اس میں صنائع کو تکلفاتِ شعری سے ہٹ کر معانی کے حسن و تاثیر میں اضافہ کرنے کا باعث قرار دیا گیا اور یہی اس کی اہمیت ہے۔

ایک ایرانی بادشاہ امیرِ عنصر المعالی کیکاؤس بن اسکندر نے اپنے بیٹے گیلان شاہ کی تربیت کے لیے ایک کتاب قابوس نامہ لکھی اس کا زمانہ ۴۷۵ھ ہے۔ اس کے باب ۳۵ میں عنصر المعالی یہ بھی بتاتا ہے کہ شاعری میں کن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اس بحث سے اس زمانے کی توقعاتِ شعری کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے :

(۱) "جہد کن تا سخنِ تو سہلِ ممتنع باشد (۲) بہ پرہیز از سخنِ غامض (۳) بہ چیزے کہ تو دانی و دیگرے نہ داند کہ بشرح حاجت افتد مگوے کہ (۴) شعر از بہرِ مردمان گویند نہ از بہرِ خویش (۵) بہ وزن و قوافیت قناعت مکن و بے صناعتے و ترتیبے شعر مگوے (۶) اگر خواہی کہ سخنِ تو عالی باشد و بماند بیشتر سخنِ مستعار گوے و استعارات بر ممکنات گوے ..... درمدح

استعارات بکار دار (۷) اگر غزل و ترانہ گوئی سہل و لطیف تر گوے و بہ قوافیِ معروف گوے (۸) تازیہائے سرد و غریب مگوے (۹) حسبِ حال عاشقانہ سخنہائے لطیف گوے۔ (۱۰) امثال ہاے خوش بکار دار چنانک خاص و عام را خوش آید (۱۱) زنہار کہ شعرِ گراں و عروضی مگوے کہ گردِ عروض و وزن ہاے گران کسے گردد کہ طبعِ ناخوش دارد و عاجز بود از لفظِ خوش و معنیِ ظریف ..... لکن عروض بداں و علمِ شاعری و القاب و نقدِ شعر بیاموز تا اگر میانِ شعرا، مناظرہ افتد با تو کسے مکاشفتے نہ تواند کردن و اگر امتحانے کنند عاجز نہ باشی۔"

مسیح الزماں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بادی النظر میں ان ہدایات میں تضاد و تناقض پایا جاتا ہے لیکن ربط پیدا کیا جائے تو اصل مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ قابوس نامہ کا مصنف اچھے شعر کو سادگی و دقت پسندی، تصنع اور بے تکلفی، لطافت اور صناعت کا ایسا مرکب قرار دیتا ہے، جہاں ایک جز کے گھٹ بڑھ جانے سے تاثیر میں فرق پیدا ہو سکتا ہے اور اس کا دار و مدار 'مذاقِ سلیم' پر ہے۔ چوتھی اور دسویں ہدایت (نمبر شمار مسیح الزماں) سے واضح ہے کہ عنصر المعالی کے نزدیک شعر فقط لفظی صنعت گری یا عروضی مہارت کا اظہار نہیں اور ان شعبدہ گریوں میں وہی لوگ پڑتے ہیں جن میں اعلیٰ صلاحیتیں نہیں ہوتیں۔ (ص ۳۰۔ ۳۱)

عربی کی طرح فارسی میں بھی شعرا کے تذکروں نے شعریات کی تشکیل میں حصہ لیا ہے۔ محمد عوفی کے لباب الالباب کا شمار فارسی کے اولین تذکروں میں ہوتا ہے (۶۱۸ھ) لیکن شعر کی نوعیت اور ماہیت کے بارے میں اس میں مروجہ باتیں ہی کہی گئی ہیں۔ شمس الدین محمد بن قیس الرازی کی کتاب المعجم فی معاییر اشعار العجم بھی زمانے کے اس چلن سے مستثنیٰ نہیں کہ نفسِ شعر سے بحث کرنے کے بجائے زیادہ توجہ ظاہری ہیئت پر صرف کی گئی ہے۔ وہی قافیہ، ردیف اور عروض اور وہی معائب و محاسن اور صنائع وغیرہ، البتہ بعض باتیں زیادہ وضاحت و شرح سے بیان کی گئی ہیں۔

یوں فارسی روایت جیسا کہ ظاہر ہے بالعموم عربی روایت کے نقشِ قدم

پر چلتی رہی۔ یہی حال حالی کے زمانے تک اردو کا بھی ہے، یعنی زیادہ توجہ عروض و قافیہ، بدیع و بیان، فصاحت و بلاغت، معائب و محاسن اور مبالغہ و سرقہ وغیرہ مسائل پر رہی، اور گھوم پھر کر وہی بحثیں دہرائی جاتی رہیں جو ایک بار قائم ہوگئی تھیں۔ بارھویں صدی کے بعد مستقل تصانیف کا سلسلہ رک گیا اور اہلِ مدرسہ شرحیں، حاشیے اور حاشیوں پر حاشیے لکھ کر دل بہلاتے رہے۔ عہدِ مغلیہ کے ہندوستان میں البتہ مقامی فکر کی دقیقہ سنجی کے تحت بہت سی باریکیاں پیدا ہوئیں لیکن زیادہ توجہ شعر گوئی اور تذکرہ نویسی پر رہی۔ بہرحال یوں اس فضا میں روایت کا تحفظ بھی ہوتا رہا اور یہ فارسی سے اردو کو منتقل بھی ہوتی رہی۔

تصوّرِ لسان

ہم تاریخِ فلسفۂ اسلام کے ترجمۂ ڈاکٹر عابد حسین سے یہ حدیث نقل کر آئے ہیں:

"پہلی چیز جو خدا نے پیدا کی علم یا عقل ہے۔" (ص ۴۲)

اس تناظر میں یہ امر لائقِ توجہ ہے کہ قدیم علم اللغۃ و علم النحو و علم البیان و علم البدیع سے لے کر جدید فلسفۂ لسان تک انسانی علم و دانش کا صدیوں کا سفر اور سعی و جستجو کیا اس میں نہیں ہے کہ زبانوں کے اختلاف کے پس پردہ حقیقت کیا ہے یعنی صوتیاتی و لفظیاتی و معنیاتی اختلاف و تنوع کی اصل کیا ہے یا 'لسان'، کی ماہیت و نوعیت کیا ہے یا لسان کا وہ رمز کیا ہے جسے اس کی کُنہ کہا جا سکے یعنی جس کے ذریعے عالمِ انسانی میں علم و عقل یا فہم و ادراک قائم ہوتے ہیں یا ابلاغ و ترسیل ممکن ہے، یا شعر و ادب کی دنیا میں سخن گوئی اور سخن فہمی ممکن ہے یا صدیوں کی روایت میں نسل بعدِ نسل معنی خیزی ممکن ہے۔

البتہ مذہبی روایت اور جدید فلسفۂ لسان میں ایک فرق ہے اور یہ فرق بنیادی نوعیت کا ہے۔ مذہبی روایت میں زبانوں کے اختلاف پر غور و فکر کی دعوت خالقِ حقیقی کے عرفان کے لیے ہے، جدید فلسفۂ لسان میں یہ غور و فکر مقصود بالذّات ہے۔ جدید فلسفۂ لسان نظری فلسفہ ہے یا سماجی

سائنس ہے ، سائنس میں عقیدہ نہیں ، یعنی اس میں مابعد الطبیعیاتی عنصر نہیں ۔ یہ اشارہ اسی لیے ضروری ہے کہ یہ بنیادی فرق ملحوظِ خاطر رہے ۔

اہلِ عرب مثل اور بہت سے علوم کے علم اللسان کا بانی بھی حضرت علی کو قرار دیتے ہیں ۔ ان سے جو اقوال منسوب کیے جاتے ہیں ، ان میں ذیل کے دو اقوال اس اعتبار سے غور طلب ہیں کہ ان میں ' لسان ' کی مرکزیت کا کھلا ہوا اشارہ موجود ہے :

اَلْمَرْءُ مَخْبُوءٌ تَحْتَ لِسَانِہٖ

(انسان اپنی زبان کے نیچے پوشیدہ ہے)

اَلْمَرْءُ بِاصغریہ بِقَلْبِہٖ وَ لِسَانِہٖ

(انسان اپنی دو چھوٹی چیزوں سے ہے اپنے قلب سے اور اپنی زبان سے)

(نہج البلاغۃ)

ان ارشادات و اقوال پر تبصرہ مجھ ہیچمدان کے دائرہ کار سے باہر ہے ۔ یہ اُن کا منصب ہے جو روایتِ اسلامیہ میں استعدادِ تام رکھتے ہیں ۔ راقم الحروف کا مقصد فقط یہ توجہ دلانا ہے کہ پچھلے ابواب میں جدید علم اللسان اور اس کے مضمرات کی جو بحثیں ہم اٹھا آئے ہیں ، اس تناظر میں کیا یہ احساس نہیں ہوتا کہ روایت خواہ کوئی ہو ، لسان کے بارے میں غور و فکر کے بنیادی سرچشموں کے سوت کہیں نہ کہیں جا کر ایک ہو جاتے ہیں ۔

(باقی آئندہ)

بچوں کے لیے مذہبی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
رسالہ دینیات اول	محمد نعیم الدین زبیری	۲/
رسالہ دینیات دوم	"	۴/
رسالہ دینیات سوم	"	۵/
رسالہ دینیات چہارم	"	۵/
رسالہ دینیات پنجم	"	۶/
بزرگانِ دین	محمود علی خاں جامعی	۴/
امت کی مائیں	حسین حسنی	۴/۵۰
اچھی باتیں	سعد الدین انصاری	۴/۵۰
خوب سیرت اول	حکیم محمد سعید	۶/
خوب سیرت دوم	//	۴/۵۰
سلطان جی	اسلم فرخی	۲/
رسولؐ اللہ کی صاحبزادیاں	فضل قدیر ندوی	۴/۵۰
رحمان کا جہاں	رفیع الزماں زبیری	۶/
کمسن صحابی	//	۵/
اسلام کے جاں نثار	//	۴/
سیرت پاک مختصر مختصر	احمد خاں خلیل	۲/
نور کے پھول	حکیم محمد سعید	۹/
سب سے بڑے انسان۔ رسولؐ اللہ	//	۴/۵۰
حضرت حمزہؓ	احتشام علی رحیم آبادی	۲/
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ	//	۲/
حضرت ابوہریرہؓ	//	۲/
حضرت محبوب الٰہیؒ	مشیر الحق	۲/
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ	//	۲/
حضرت فرید الدین گنج شکرؒ	//	۲/
حضرت معین الدین چشتیؒ	//	۲/
حضرت ابوبکر صدیقؓ	//	۶/
حضرت طلحہؓ	//	۲/
حضرت سلمان فارسیؓ	//	۲/۵۰
حضرت ابوذر غفاریؓ	//	۲/
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	//	۲/

کتاب	مصنف	قیمت
حضرت عبداللہ بن عباسؓ	مشیر الحق	۲/
نیک بیٹیاں	//	۵۰
اسلام کیسے پھیلا؟ حصہ اوّل	عبدالواحد سندھی	۵۰
حصہ دوم	//	
قرآن پاک کیا ہے؟	//	
اسلام کیسے شروع ہوا؟	//	۱/۵۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار، اوّل، دوم	//	فی حصہ ۱/
اسلام کے مشہور امیر البحر	//	۱/
رسول پاکؐ	//	۱/
دس جنتی	الیاس احمد مجیبی	۱/۵۰
سرکار کا دربار	//	۱/۵۰
چار یار	//	۱/۵۰
آں حضرتؐ (اردو)	//	۱/۵۰
حضرت محمدؐ (ہندی)	//	۱/۴۰
اللہ کا گھر	خلیل احمد جامعی	۱/۵۰
اللہ کے خلیل	//	۱/۵۰
رسول پاک کے اخلاق	//	۱/
اللہ کے صفی	//	۱/۵۰
ہمارا دین حصہ اوّل	سید شہاب الدین دسنوی	۱/۵۰
دوم	//	۱/۵۰
سوم	//	۱/۵۰
منہاج القرآن	خواجہ سیدنا طاہر سیف الدین	۱/۵۰
ارکان اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۱/۵۰
عقائد اسلام	//	۱/۵۰
خلفائے اربعہ	خواجہ عبدالحئی فاروقی	۱/
نبیوں کے تحفے	//	۱/۵۰
ہمارے رسولؐ	//	۱/
پیارے رسولؐ	سلطانہ آصف فیضی	۱/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاء	ادارہ	۲/
مسلمان بیبیاں	اعجاز الحق قدوسی	۱/
ہمارے نبیؐ	سید نواب علی رضوی	۲/۵۰
سرکار دو عالم	محمد حسین حسان	۱/
قاعدہ یسرنا القرآن	(خورد) ۲/ (کلاں)	۱/۵۰

ڈاکٹر سید حامد حسین
ای ۴/ ۱۸۱ پروفیسرز کالونی
بھوپال

لفظوں کی انوکھی دُنیا

لفظوں کی اپنی زندگی ہوتی ہے۔ اس زندگی کے نشیب و فراز ہوتے ہیں۔ اُن میں اپنی قسم کی ڈرامائیت اور ان کا اپنا رومان ہوتا ہے۔ وہ الفاظ جو اوپرے، روکھے پھیکے، کھوکھلے اور رسمی معلوم ہوتے ہیں ان میں سے بعض کے پیچھے حیرت انگیز کہانیاں، رسم و رواج اور تاریخی حقیقتیں چھپی ہوتی ہیں۔ ان پس پردہ حقیقتوں کی تلاش اور اُن کے بارے میں علم سے ہم کو ایک الگ ہی قسم کا لطف آتا ہے، کچھ ایسا ہی جیسے روزنِ در میں آنکھ لگا کر چوری چھپے کے نظارے میں آتا ہے۔ آئیے لغت کی دفتی میں پڑی دراڑوں میں آنکھ لگا کر دیکھیں کہ کس لفظ کے آنگن میں کیا ڈراما چل رہا ہے۔

اب سائرن کے لفظ کو ہی لیجیے۔ یہ خشک، غیر شاعرانہ سا نام جس کے بھدے پن کو ہم بعض اوقات "بھونپو" کہہ کر ظاہر کرتے ہیں آج کی صنعتی زندگی کا حصہ بن گیا ہے۔ بڑے بڑے شہروں کی بھاگم بھاگ اور بھیڑ والی مشینی زندگی کا ایک حصہ وہ فیکٹریاں ہیں جن کی دھواں اُگلتی چمنیاں ان شہروں کی افقی شناخت بن چکی ہیں۔ انھیں فیکٹریوں سے سائرن کی وہ آوازیں سننے کو ملتی ہیں جن کے ساتھ فیکٹریوں کے آہنی پھاٹک کھلتے ہوئے انسانوں کی ایک بھیڑ کو اُگل دیتے ہیں اور مزدوروں کی دوسری بھیڑ کو اپنے اندر بند کر لیتے ہیں۔ لیکن اس غیر شاعرانہ منظر کو حرکت بخشنے والا لفظ "سائرن" کو صدیوں پہلے شاعرانہ تخیل نے جنم دیا تھا۔ قدیم یونانی شاعروں نے "سائرن" کا ایک عجیب پُراسرار مخلوق کی شکل میں تصوّر کیا تھا۔ ایک ایسی مخلوق کی شکل میں جس کا چہرہ، زلفیں، گردن اور سینہ حسین عورتوں جیسا اور باقی جسم پرندوں کی طرح ہوتا تھا۔ جب سائرنس گاتیں تو آس پاس کی دنیا اُن کے شیریں نغمے میں محو ہو جاتی، لوگ بے قابو ہو جاتے سمندروں میں چلتے جہاز رک جاتے۔ ملّاح سمندر میں کود کر سائرنس کے جزیروں کی طرف مجنونانہ انداز سے تیرنے لگتے اور کنارے پر پہنچ کر چٹانوں پر بیٹھ کر سائرنس کے نغمے سنتے رہتے۔ ان کو تن بدن کا، کھانے پینے کا ہوش نہیں رہتا۔

یہاں تک کہ وہ وہیں چٹانوں پر بیٹھے بیٹھے دم توڑ دیتے۔ اس جزیرے سے کوئی
لوٹ کر نہیں آتا۔ لیکن ایک بار انہونی ہوئی۔ جب یونانی ارگوناٹس کا جہاز بحرِ
میں سائرنس کے جزیرے کے پاس سے گزرا تو ان کے ساتھ دیوتاؤں کا چہیتا موسیقار
آرفیس بھی تھا۔ آرفیس کے کان میں جیسے ہی سائرنس کی آواز پڑی تو اس نے
رباب اٹھایا اور اپنا بہترین نغمہ اونچے سُروں میں چھیڑا۔ سائرنس کی آواز دب گئی
صرف ایک ایسا بد قسمت ملاّح تھا جس پر اُن کا جادو چل گیا۔ وہ بے قابو ہو کر سمندر
میں کود پڑا اور پھر واپس نہ آیا۔ لیکن سائرنس کو سب سے زیادہ مایوسی اس
وقت ہوئی جب یونانی ہیرو اوڈے سیس ان کے جزیرے کے پاس سے
گزرا۔ اوڈے سیس نے پہلے ہی اپنے ساتھیوں اور ملاّحوں کے کانوں میں موم
بھروا دیا تھا۔ لیکن خود اُسے یہ اشتیاق تھا کہ وہ یہ سُنے کہ سائرنس کیا گا رہی
ہیں۔ اس لیے اس نے حکم دیا کہ خود اس کو رسیّوں سے مستول کے ساتھ کس
کر باندھ دیا جائے۔ اس نے سنا کہ وہ گا رہی ہیں کہ وہ کیا ہے جو انسان کو
دائمی سکون دے سکتا ہے اور لافانی خوشی بخش سکتا ہے۔ وہ کیا ہے
جس سے لافانی حُسن کا نظارہ ہو سکتا ہے۔ وہ کیا ہے جو موت کے تصوّر سے
نجات دلا سکتا ہے۔ ان سب کا راز ان کے پاس ہے۔ ان کے اُن نغموں
میں ہے جو وہ سنانے والی ہیں۔ ان نغموں میں وہ مٹھاس ہے جو کبھی کم نہ
ہوگی۔ وہ لطف ہے جو کبھی کم نہ ہوگا۔ وہ مسرّت ہے جس کو کبھی زوال نہیں۔ یہ
سُن کر اوڈے سیس بیتابانہ خود کو رسیّوں سے آزاد کرانے کے لیے جدوجہد
کرتا رہا۔ اس کا جسم لہو لہان ہو گیا۔ اس کی فوق الانسانی طاقت جواب دے گئی۔
سائرنس کی آواز کی طلسمی کشش نے اس کے فولادی ارادے کو موم سے بھی
نرم کر دیا۔ بہرحال اس کی دانش مندی کی وجہ سے اس پر اور اس کے ساتھیوں پر
سائرنس کا جادو نہ چل سکا اور وہ سب صحیح و سلامت ان کے نغموں کی زد سے
باہر نکل گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اوڈے سیس کے اس طرح بچ کر نکل جانے سے
سائرنس کو شدید جھنجھلاہٹ ہوئی اور انھوں نے غصّے میں آکر سمندر میں کود کر
جان دے دی۔ اس طرح سائرنس کو ان کے ہی خالق یونانی شاعروں نے مار
ڈالا۔ لیکن انیسویں صدی میں ایک فرانسیسی موسیقار نے انھیں پھر سے زندہ
کیا اور اسی کے فیض سے سائرنس سے آج بھی ہم واقف ہیں۔ ۱۸۱۹ء میں
دیلا تور۔۔ نامی اس موسیقار نے موسیقی کے سُر پیدا کرنے اور ان کے ارتعاش
کی پیمائش کے لیے ایک آلہ بنایا۔ اس کا نام اس نے سائرن رکھا۔ ظاہر ہے یہ قدیم یونانی شاعروں کے عمل کو
خراجِ عقیدت تھا۔ لیکن دو حادثے نے انسان کے رومانی تخیل کو بار بار صدمہ پہنچایا ہے ورنہ یہی
اس نے سائرن کے لفظ کے ساتھ کیا۔ انیسویں صدی کے آخر تک حسکہ جگہ فیکٹری

نام ہو گئیں اور ان میں یکساں بھرائی ہوئی آواز میں اطلاع دینے والی سیٹیوں کا رواج عام ہوا تو اس کے لیے کسی لفظ کی ضرورت ہوئی اور دیا تو رے آلے کی مناسبت سے اسے سائرن کہنے لگے۔ سوچیے کہاں وہ دائمی مسرت کی بشارت سنانے والی سائرنیں کے نغمے اور کہاں بیکار کی یہ بھونپو کی سامعہ خراش ناگوار آواز۔

آیئے ایک اور لفظ "پمفلٹ" کے اتار چڑھاؤ دیکھیں۔ یہ بھی ایک ایسا لفظ ہے جس کی دلچسپی کو ہماری موجودہ میکانکی زندگی نے سوخت کر لیا ہے۔ آج پمفلٹ کسی روکھے پھیکے موضوع پر نظریاتی بحث کرنے والا یا پروپیگنڈے کی غرض چھاپا گیا کتابچہ ہے اور ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ سات آٹھ صدی قبل پمفلٹ کے نام سے لوگوں کے منہ سے کس قسم کی رال ٹپکنے لگی تھی۔ بارھویں صدی میں اٹلی میں پمفلٹ نے ایک نہایت چٹ پٹی کہانی والی نظم کی حیثیت سے جنم لیا تھا۔ اس کہانی کا ہیرو ایک بوڑھا ہوتا تھا جس کو پیم فیلس کا نام دیا گیا تھا۔ پم فیلس کے لفظی معنی ہیں ایک کا شیدائی یا دل پھینک ہوتے ہیں۔ یہ نظم ایک ایسے دل پھینک بوڑھے کی رنگ رلیوں کی کہانی تھی جو اپنی مطلب برآری کے لیے طرح طرح کے حیلے کرتا ہے اور انتہائی معزز اور باعفت خواتین کو ساری چوکیداری اور پہروں کے باوجود جُل دینے میں کامیاب ہوتا ہے۔ یہ بدمعاشیوں کی کہانی لوگوں میں بے حد مقبول تھی اور اسے لوگ چھپا چھپا کر پڑھا کرتے تھے یہاں تک کہ اٹلی کی خانقاہوں میں راہب بھی اسے اپنے چغوں میں چھپا کر لے جاتے اور تکیوں میں چھپا کر رکھتے۔ کیونکہ اس وقت تک چھاپے کا رواج نہیں ہوا تھا۔ اس لیے گنی چنی ہاتھ سے لکھی ہوئی نقلیں ہی لوگوں میں گردش کرتیں۔ اس غرض سے کہ انھیں چھپا کر رکھنے میں آسانی ہو، یہ نقلیں چھوٹے سائز کے کاغذ پر کی جاتیں۔ چھاپے کی ایجاد کے بعد تو اس قسم کے قصوں کہانیوں کی نقلوں کو آسانی کے ساتھ لوگوں تک پہنچایا جانے لگا۔ بس پمفلٹ کا لفظ زندہ رہا اور چھوٹے سائز کی کسی بھی کتاب کو پمفلٹ کہنے لگے۔

اب آیئے ان جوبلی منانے والوں سے پوچھیں کہ یہ جوبلی کیوں مناتے ہیں۔ پہلے تو صرف پچاس سالہ جوبلی ہی منائی جاتی تھی لیکن اب تو صرف پچیس سالہ پچاس سالہ، ساٹھ سالہ، پچھتر سالہ جوبلیاں ہی نہیں بلکہ کبھی بھی منائی جانے لگی ہیں۔ دراصل جوبلی یہودیوں کا ایک تہوار ہے جس کو وہ پچاس سال میں ایک بار مصر سے اپنے اخراج کی یاد میں منایا کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں عہد نامہ عتیق (اولڈ ٹسٹامنٹ) کی دوسری کتاب میں واضح طور پر احکامات موجود ہیں۔ یہ موقع پوری طرح چھٹی کا موقع ہوتا ہے۔ زمین کو دو سال کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ زمین کو آرام ملے۔ کھیتوں کو جوتا نہیں جاتا۔ باغوں کے پودوں کی چھنٹائی نہیں کی جاتی۔ پھل دار درختوں کے پھل نہیں چنے جاتے۔ زمین سے اپنے آپ نکلنے والے پھلوں کو غریبوں،

غلاموں، اجنبیوں اور مویشی کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ لوگ مچھلی پکڑ کر شکار کر کے شہد کی مکھیوں سے حاصل کیے ہوئے شہد اور مویشیوں سے حاصل کیے ہوئے دودھ دہی وغیرہ پر اپنی گزر بسر کرتے ہیں۔ زمینوں کو ان کے اصل مالکوں کو لوٹا دیا جاتا ہے۔ اس موقع پر لوگ بگل اور مینڈھے کے سینگوں سے بنے ہوئے ہارن بجا بجا کر خوشیاں مناتے ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ لفظ جس سے جوبلی نکلا ہے اس کا مطلب ہی مینڈھے کا سینگ ہوتا ہے۔

عیسائیوں نے جوبلی کا لفظ تقریب کے معنی میں اختیار کیا اور کسی واقعے کی پچاسویں سالگرہ کو جوبلی کی حیثیت سے منایا جانے لگا مثلاً شادی کی یا تخت نشینی کی اس قسم کی سالگرہ کو گولڈن جوبلی کا نام دیا گیا۔ ملکہ وکٹوریا نے ۱۸۹۷ء میں اپنی تخت نشینی کی ساٹھویں سالگرہ ڈائمنڈ جوبلی کے طور پر منائی اور اس کے بعد ڈائمنڈ جوبلی کا فیشن ہو گیا۔ ملکہ وکٹوریا کے پوتے جارج پنجم نے پچیسویں سال سلور جوبلی منانے کا رواج ڈالا۔ اب تو جوبلیاں کسی وقت منائی جانے لگیں۔ اور ان کا نام پنساری کی دکان کی ہر شے پر پڑ گیا ہے۔ جیسے پہلی سالگرہ کو کاغذ جوبلی، دوسری کو روئی جوبلی، تیسری کو چمڑا جوبلی، چوتھی کا پھل جوبلی اور پانچویں کا لکڑی جوبلی کہنے لگے ہیں۔ ساتویں جوبلی تانبے، آٹھویں جوبلی کانسے، نویں چینی کے سامان دسویں ایلومینیم، تیسویں موتی، چالیسویں لعل اور پچھترویں پلاٹینم سے منسلک کر دی گئی ہیں۔

جوبلی کا تو سینگ سے تعلق ہے ہی۔ لیکن کیا آپ کبھی یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ شاہ اور بادشاہ کا بھی سینگ سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جس زمانے میں انسان جنگلوں میں گزر بسر کرتا تھا، اس وقت وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے جنگلی جانوروں کو مارا کرتا تھا۔ لیکن سینگ والے جانوروں کو مارنے کے لیے اسے بڑی ہوشیاری اور پھرتی کی ضرورت ہوتی تھی، چنانچہ جب وہ شکار کر لیتا تو جانور کے سینگ اپنے سر پر لگا کر خوشیاں مناتا تھا۔ آج بھی مدھیہ پردیش کے بستر کے علاقے میں رہنے والے قبائلی لوگوں میں سر پر سینگ پہن کر ناچنے کا رواج ہے۔ قدیم ایران میں یہ رواج تھا کہ سردار سر پر سینگ پہنا کرتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعد میں تاج پہننے کا رواج بھی اسی قسم کی کسی رسم سے پڑا ہو۔ فارسی میں سینگ کو شاخ کہتے ہیں چنانچہ شاخ پہن کر بیٹھنے والے سردار کو بھی شاخ کہنے لگے جس نے دھیرے دھیرے "شاہ" کی شکل اختیار کر لی۔

شاخ سے شاخسانہ یاد آتا ہے۔ کسی ایسے مسئلے کو جو کسی قسم کے فتنہ فساد کا سبب بنے اسے بعض اوقات شاخسانے کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ بھی سینگ کی ہی کارستانی ہے۔ کیسے؟۔ شاخسانہ دراصل شاخ شانہ تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ

ایران میں ایک قسم کے اڑیل فقیر ایسے بھی ہوتے تھے جو چاہے جو کچھ ہو جائے، کچھ نہ کچھ لے کر ٹلتے تھے یہ لوگ اپنے ساتھ بکری کا سینگ اور بکری کے شانے کی ہڈی کا ٹکڑا رکھتے تھے اور انھیں رگڑ رگڑ کر ایسی مکروہ آواز پیدا کرتے تھے کہ لوگ ان سے پیچھا چھڑوانے کے لیے انھیں جلدی سے رخصت کر دیا کرتے تھے لیکن اگر کوئی شخص اتنی آسانی سے انھیں پسپا دینے پر راضی نہ ہوتا تو یہ لوگ اس نکیلے سینگ سے خود اپنے جسم کو لہو لہان کر لیتے اور خوب شور و غل مچاتے یہاں تک کہ سامنے والا مجبور ہو کر انھیں کچھ نہ کچھ دے کر ٹالتا۔ اسی بنا پر جب کوئی شخص کسی طرح کی حجت کر کے کوئی فتنہ کھڑا کرتا ہے تو اسے بھی شاخسانہ کہنے لگے۔

دھرنے کا لفظ جو آج کل کی سیاسی کارگزاریوں کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ اس کے پیچھے بھی کچھ اسی قسم کی اصلیت ہے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اپنی مانگیں منوانے کے لیے دھرنے پر بیٹھنا جدو جہد آزادی کے دوران مہاتما گاندھی کے عدم تشدد کے حربوں کی طور پر مقبول ہوا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ طریقہ ہندستان میں بہت زمانے سے رائج ہے۔ اس کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ مظلوم کی ہائے، ظالم کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ اگر مظلوم، ظالم کے دروازے پر بیٹھ کر اپنے آپ کو بھوکا رکھ کر اپنے آپ کو ایذا پہنچا کر، اپنے اعضا کو کاٹ کر یا مجروح کر کے تکلیف پہنچائے گا تو اتنی ہی تکلیفیں ظالم کو پہنچیں گی۔ اس کوشش میں اگر مظلوم کی جان چلی جائے تو مظلوم کی روح بھوت بن کر ظالم کی زندگی کو عذاب بنا دے گی۔ اس حربے کا اتنا رواج تھا کہ کبھی کبھی قرض دینے والے نادہند قرض داروں کے گھر کے سامنے دھرنے پر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ فقیروں کے کچھ گروہوں نے بھی پیسے وصول کرنے کے لیے یہ طریقہ اپنا رکھا تھا۔ ان کے طریقوں کے لحاظ سے ان کے الگ الگ نام تھے۔ ڈوری والے گلے میں ڈوری کس کر پھانسی کی دھمکی دیتے تھے۔ ڈنڈی والے ڈنڈیاں بجا بجا کر دن دن بھر کوستے رہتے تھے۔ اڑی مار دکان کے سامنے اڑ کر کھڑے ہو جاتے اور دن دن بھر کھڑے رہتے۔ دھرنے پر بیٹھنا راجستھان اور گجرات میں بہت عام تھا۔ گاندھی جی نے یقیناً اپنے وطن گجرات میں یہ سب کچھ دیکھا ہوگا۔ انھوں نے اس طریقے کو جس سے عام لوگ اچھی طرح واقف تھے بڑی خوبی کے ساتھ اپنے عدم تشدد کے اصول کو اپناتے ہوئے اپنے سیاسی نقطۂ نظر کو ایک طاقتور حکومت پر واضح کرنے کے لیے استعمال کیا۔

لفظوں کی اپنی دنیا ہے۔ اُن کی آپ بیتی میں حیرت انگیز موڑ ہیں، عجیب عجیب اسرار ہیں، انوکھا رومان ہے۔ ان کی زندگی میں جھانک کر تو دیکھیے، ان کی داستان، انسانی زندگی کی داستان سے کچھ کم دلچسپ نہیں۔

ہماری نئی اور اہم مطبوعات

کتاب نما کا خصوصی شمارہ

ڈاکٹر اجمل اجملی

(حیات اور ادبی خدمات)

- مرتبین -

ڈاکٹر علی احمد فاطمی / عذرا رضوی

اردو، ہندی کے ممتاز ادیبوں کی اہم نگارشات کا مجموعہ جس میں ڈاکٹر اجمل اجملی کی ادبی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا گیا ہے قیمت ۴۵/-

پروفیسر مسعود حسین خاں

(علمی، لسانی اور ادبی خدمات)

مرتبہ

ایم حبیب خاں

کتاب نما کے اس خصوصی شمارے میں اردو کے ممتاز ادیب، ماہر لسانیات اور محقق جناب مسعود حسین خاں کی خدمات کے اعتراف میں اردو کے ۱۲ ممتاز ادیبوں کی نگارشات کا مجموعہ قیمت ۴۵/- روپے

طنزیات و مضحکات

رشید احمد صدیقی

طنزیات و مضحکات کے فن پر اردو میں پہلی اور اہم کتاب جو عرصے سے نایاب تھی اب نہایت اہتمام سے شائع کردی گئی۔

قیمت: ۶۰/- روپے

اردو ناول میں عورت کا تصور

فہمیدہ کبیر

اس اہم مقالے میں اس بات کی کھوج لگانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اپنے اپنے دور کے مخصوص سماجی حالات میں مختلف ناول نگاروں نے ایک مثالی عورت کا کیا تصور پیش کیا ہے اردو میں اس موضوع پر پہلی کتاب

قیمت ۴۵/- روپے

نوٹوں کی تلاش (جاسوسی ناول)

محمد عاقل ایاز سیوہاروی

اردو میں ایسا اعراب ناول جس کو شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کیے چین نہیں پڑے گا۔ پاپل بڑھتے ہوئے سنسنی خیز واقعات کا مجموعہ

قیمت: ۶۰/-

یہ صورت گر کچھ خوابوں کے

عہد حاضر کے 17 اہم ادیبوں کے انٹرویو

طاہر مسعود قیمت : 66

شاہ ولی اللہؒ اور ان کا خاندان

تالیف :- مولانا حکیم محمود احمد برکاتی

اس کتاب میں برکاتی صاحب نے حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ نیز ان کی تصانیف، تلامذہ، مریدین شاہ ولی اللہ کا تعارف بھی ہے۔ قیمت ۴۵/-

ظفر گورکھپوری
پتہ: میونسپل کالونی، دیونار، بمبئی ۴۰۴۳

دوہے

سولی جیسی سچائیاں اور بے بس انسان
ہم بنتا کھلا لیکن جیتیں لہو لہان

پربت ہو تو پھینک دوں کس طرح آسمان
کیا تھاتی یہ ہے دعا میں سورج انجان

جگ بھی کیسا بازار ہے عجب ناپ اور تول
مٹی سونا سی بکے، دل کوڑی کے مول

ان کے آنے کا سلسلہ ابھی ملا ہے تار
ریل میں کیسے بم پھٹا؟ جھوٹا ہے اخبار

اپنے سوارتھ کے واسطے کیسے کیسے داؤں
مکھیا بھیجے روٹیاں کھائے سارا گاؤں

سمجھو نیتاؤں سے وہ ڈریں جن کے اونچے ٹھور
بنجاروں کے پاس کیا کچھ ڈھنگر کچھ ڈھور

بیٹھیں، دم لیں، چار پل، سمے کہاں جیمان
جیون بھاری قرض ہے سانس سانس بھگتان

لاشوں کے انبار پر سجا ہوا ہے منچ
اپرادھی سب پنچ ہیں ننھیارا سرپنچ

زینہ زینہ پگ دھرو، دیکھو کے اونچ اور نیچ
پنچھی آکاش میں اڑا گرا کھائی کے بیچ

کیا آدر، سمان کیا، کیا رتبہ، کیا نام
بابا اس سنسار میں کھری کمائی کام

شاہد نجیب آبادی
پوسٹ بکس ۲۶۵۰۲۔ بحرین

کمپیوٹر سے انٹرویو

ایک دن دفتر سے میرے حکم پر صادر ہوا
کمپیوٹر سے کرو انٹرویو تم برملا

کمپیوٹر کی ہر اک دفتر میں اتنی دھوم ہے
اس کی شہرت سن کے ہر اک کو بہت معلوم ہے

میں نے اک دن فون کر کے کی یہ اس سے گفتگو
کیا میں آسکتا ہوں دفتر میں پئے انٹرویو

اس نے بھی مخصوص لہجے میں یہ وعدہ کر لیا
گیارہ بج کر دس منٹ کا وقت آخر دے دیا

حسب وعدہ اس کی خدمت میں جو میں حاضر ہوا
اپنے دفتر میں بڑی ہی تمکنت سے تھا کھڑا

میں نے بھی رسمی طریقے سے سلام اس کو کیا
چند لمحے سر کو ہوئی جنبش جواب اس نے دیا

پھر ملانے کو بڑھایا ہاتھ اس نے سخت سا
ہاتھ اس کا برف کی مانند بالکل سرد تھا

عید مبارک

گر مجھ میں کا کوئی اس میں نہیں تھا شائبہ
آٹومیٹک اس کے ہر اک فعل کا انداز تھا

ابتدائی مرحلوں سے جب کہ ہم فارغ ہوئے
ذہن میں پھر جو سوال آئے تھے لب میں لگ گئے

میں نے پوچھا آپ کی چوتھی جنریشن ہے یہ
بولا یہ بالکل غلط ہے "صرف سکینڈ جنریشن ہے یہ"

میں نے پوچھا آپ کے بننے کا موجد کون ہے
بولا "میں نمرود ہوں میرا چچا فرعون ہے"

میں نے پوچھا "مجھے یہ کس طرح بتلائے ہیں؟"
بولا "شاید آپ نے بھی آج بینگن کھائے ہیں"

پھر میں چیخا "ورے رہے ہیں آپ بے ڈھنگے جناب
آپ تو بالکل ہی احمق ہو گئے عزت مآب"

بولا "میرا اسکرو اک ہو گیا ڈھیلا جناب
جس سے میرا پورا سسٹم ہو گیا بالکل خراب"

میرے اوپر مہربانی یہ خدارا کیجیے
میرے سر کے پیچ کو اچھی طرح کس دیجیے

میں نے اس کے اسکرو کو پیچ کس سے کس دیا
وہ رہا کچھ دیر ساکت اور دل گویا ہوا

اب میں بالکل ٹھیک ہوں سسٹم مرا اچھا ہے
جو کہ مجھ سے ہو گئی کر دیجیے مجھ کو معاف

میں نے پوچھا یہ بتائیں آپ کا سروت کیا
بولا پورے طور سے تو خود نہیں کچھ کو پتہ

باپ کا تھا نام منطق، ماں تھی مری منطقی
اس لیے ان میں رفاقت ہو سکی تھی کبھی

رات دن ان میں لڑائی اور رہے لمحہ حنا
گرچہ میں اولاد ان کی ہوں مگر میں بھی تھا

دونوں روٹھے رہتے تھے تھی بند ان کی بول
ماں کو تو میکے گئے اب ہو گئے ہیں سال

پوچھا "کیا انسان نے پیدا کیا ہے آپ کو"
بولا "ایسی بات تو زیبا نہیں آپ کو"

وہ کرے پیدا کوئی تے اس کی یہ ہستی ہے
غیر اللہ ذات یہ تخلیق کر سکی نہیں

ایک ذرہ بھی نہیں پیدا کیا اس نے کبھی
وہ تو خود ادنا سی اک مخلوق ہے اللہ

جوڑ کر پرزے بنا دیتا ہے انسانی مشین
پھر بنا ہے وہ اپنے نام کی خوش ہو کے بین

لوگ نوزائیدہ کو کہتے ہیں "پیدا ہوا"
یہ نہیں کہتے کبھی "ماں نے اسے پیدا کیا"

میں نے پوچھا "زندگی میں آپ کا منشا کیا"
بولا "میں نوکر ہوں تیرے ہاتھ میں رکھا گیا"

حضرت انسان کے ہاتھوں میں ہے میری لگام
جس طرف وہ چاہے مڑ جاؤں یہی میرا ہے کام

اس کی خوش اگمز فطرت، منتق کا تختہ ہوں میں
اس کی ہاں میں ہاں ملاؤں بس یہ کر سکتا ہوں میں

رفتہ رفتہ اس نے پرزے مجھ میں وہ فٹ کر دیے
میں وہ فوراً ہی کروں جو کام وہ مجھ سے کہے

جو بھی کچھ حاصل کیا ہے ایک دن کمپیوٹر سے
خود تو دے گا مگر مجھ کو بھی سند دے گا وہ

جنگ مستقبل لڑی جائے گی میری پشت سے
گویا بندوقیں چلیں گی رکھ کے کاندھے پہ

ایٹمی ہتھیار تک کو آزمایا جائے گا
کمپیوٹر، کمپیوٹر سے لڑایا جائے گا

فتح کی صورت میں وہ اور شجاعت پائے گا
گھر میں بیٹھے مستحق تمغے کا وہ ہو جائے گا

ایٹمی توپیں چلانے کا [illegible] کام
کس کو پروا [illegible] جائے تمام

سسکیاں لے کے [illegible] کی طرح رونے لگا
اس کے اعضا پر تشنج کا اثر ہونے لگا

اس کی بھاری ہوئی آنکھوں [illegible] لگا
جیسے بے چارے [illegible] کا دورہ پڑ گیا

میں تو اس کو چھوڑ کر [illegible] چل دیا
یہ نہیں معلوم وہ زندہ رہا یا مر گیا

ایک ہی ایجاد انسان قابل تعریف تھی
وہ بھی گمراہی کے باعث مفت میں ضائع ہوئی

عبدالرحیم نشتر
ساونتری مادھیامک ودیا مندر،
امبیت ضلع رائے گڑھ،

اڑا کے راکھ مری نیلگوں فضاؤں میں
بکھیرتا ہے مجھے وہ نئی ہواؤں میں

مجھے لگا نئے آکاش کھوجنے نکلا
مگر وہ قید مجھے کر گیا گپھاؤں میں

پکارتی ہیں بدن کی حرارتیں مجھ کو
بھٹک رہا ہوں نئے شہر کی صداؤں میں

مری حیات کی بنیاد کو اکھاڑ دیا
میں کیوں نہ یاد رکھوں آپ کو دعاؤں میں

افسرآغا لکھنوی

مقبرہ جناب عالیہ، رام پور۔ یوپی ۲۴۴۹۰۱

ورق ورق مجھے پڑھنے کی فیضیابی ہے
مرے نصیب سے چہرہ ترا کتابی ہے

بس انقلاب کا نیزہ پہ سر بلند کرو!
کلیمِ حق و صداقت ہی انقلابی ہے

یہ کس کو ڈھونڈتے پھرتے ہو اس خرابے میں
مجھی کو اپنا بنا لو۔ تو کیا خرابی ہے؟

درست ہے مری نیت نگاہ بھی منصف
قدم قدم پہ میسّر جو کامیابی ہے

گزر رہی ہے غلامانہ زندگی افسرؔ
مگر جبیں پہ تو لکھی ہوئی نوابی ہے!

شمیم طارق

فلیٹ نمبر ۲۷۰۔ چوتھی منزل، بائیکلہ فورٹ مارکیٹ
بمبئی ۲۷۔

کسی کے حُسن کا دل میں ظہور تھا کیا تھا
تمام عمر نگاہوں میں نور تھا کیا تھا

ضمیرِ عہد کی سرگوشیوں کا دلدادہ
پسِ شعور مرا لاشعور تھا کیا تھا

میں کس قصور میں معتوب تھا زمانے بھر
قصور وار نہ ہونا قصور تھا کیا تھا

تمام عمر کی بے خوابیاں مقدر تھیں
مجھے شمارِ نفس پر عبور تھا کیا تھا

تمام شہر بیک وقت جل گیا کیسے
محافظوں کے دلوں میں فتور تھا کیا تھا

ہر آئینے میں سنورنے کا شوق تھا جس کو
وہ خود پسند حقیقت سے دور تھا کیا تھا

میں جبر و قہر کے موسم میں بھی رہا مسرور
اذیتوں میں بھی طارقؔ سرور تھا کیا تھا

رحمت امروہوی
پور ... روڈ ... آباد

شاہد رضا
شاہجہاں پور
(یو.پی)
۲۴۲۰۰۱

داوند ادب بگڑے ہوئے ہیں
رے تیج پہ سب بگڑے ہوئے ہیں

زرگوں کی شرافت کا فسانہ
یاں : نام ونسب بگڑے ہوئے ہیں

یاں اوب کا آدا ہی غلط ہے
یاں تو سب کے سب بگڑے ہوئے ہیں

ما ! بھی کبھی اعزاز ہوگا
بھی تو سب سب بگڑے ہوئے ہیں

ار وہ سخن اُن سے نہیں تھا
وہ مروت بے سبب بگڑے ہوئے ہیں

یہاں کس کس کو سمجھاؤ گے رحمت
یہ ... اب تو سب بگڑے ہوئے ہیں

شاخ شاخ سجتی ہے موسم بہاراں میں
کچھ درخت ہیں جن کو تعلقیں نہیں ملتیں

عکس اُس کی آنکھوں میں نفرتوں کا دیکھا ہے
لیکن اس کی چاہت کی سرحدیں نہیں ملتیں

وہ تو اب بھی ساحل پر روز آیا کرتا ہے
ہاں اب اس کے قدموں کی آہٹیں نہیں ملتیں

آنسوؤں کا ہر قطرہ داستان بن جائے
کیا کریں مگر اِن کو وسعتیں نہیں ملتیں

گرد گرد اے شاہد زندگی کا چہرہ ہے
اِس اُداس صحرا میں رونقیں نہیں ملتیں

ظفر امام
نادری منزل ۔ بتیا

موت نہیں آئے گی

آج کا یہ بارودی منظر
آنے والے کل کی راہیں دیکھ رہا ہے
کل کا نقشا کیا ہوگا؟ ۔ یہ سوچ رہا ہے
دل چاہے کہ میں بھی سوچوں ــــ کیوں نہ سوچوں؟
بن سوچے تو ذہنوں میں بھی زنگ لگے گا۔

مشکل ہے کہ کیسے سوچوں؟ ــــ کس کو سوچوں؟
موت کے سناٹوں کو سوچوں؟
بے قصور لاشوں کو سوچوں؟
ریزہ ریزہ دل کی آوازوں کو سوچوں؟
اکھڑی اکھڑی آدم کی سانسوں کو سوچوں؟
کس کو سوچوں؟ ــــ کیسے سوچوں؟

مشکل ہے کہ
بن سوچے تو ذہنوں میں بھی زنگ لگے گا
سوچوں تو ذہنوں کے تالے کھل جائیں گے
نقشا دیکھ کے آدم کے دل ہل جائیں گے
اور قیامت سر پہ آ کے رقص کرے گی
جینے کی خواہش تو جیسے مر جائے گی
لیکن موت نہیں آئے گی

اسرار حسین اسیر
محلہ: مہمند گڑھی، شاہجہاںپور

کریں گے پڑھ کے تعجب غزل کے آ
کہ میں نے لفظوں سے ڈھالے ہیں اب

پڑھے لکھوں کو بھی بلوائیوں میں دیکھا
گرے ہیں گھر میں مرے معبدوں سے

بتاؤ شہر کے لوگوں کو میرے بارے
کہ تم نے دیکھا مرے ڈوبنے کا منظ

جو قربتوں سے اگر رنجشیں ابھر
تو فاصلے ہی مرے ہمسفر ہیں بہ

میں اپنی جان ہتھیلی پہ لے کے نکلا
لرز گیا تھا مرے دشمنوں کا لش

خیال ترکِ انا سے بھی کانپ جا
کہ لوگ خوش ہیں متاعِ انا لٹا کر

...لڑ سیّد احسن زیدی
...ے۔ ۲۵۵ غلام محمد آباد
...یصل آباد۔ پاکستان

غزل

...بل شاخ شاخ اُڑا، آشیاں کے ہوتے ہوئے
...لی نہ چین نہ ساعت مکاں کے ہوتے ہوئے

...یں سوچتا تھا بگاڑے گی دُھوپ کیا میرا
...جُھلس گیا ہوں مگر، سائباں کے ہوتے ہوئے

...کوئی نہ چھین سکا قوتِ نمو میری
...یں شاد کام رہا، آسماں کے ہوتے ہوئے

...ہوک زرنے کچھ رنگ بھی دکھانا تھا
...جہاز ڈوب گیا، بادباں کے ہوتے ہوئے

...نہ کوئی ساغرِ گل ہے، نہ کوئی موج ہوا
...فشارِ حبس ہے، ابرِ رواں کے ہوتے ہوئے

احمد صغیر صدیقی
۴-۲-۲ ایس۔ ملیہ کالونی
کراچی۔ پاکستان

مختصر نظمیں

شام پر ایک نظم

پھر ہو رہی ہے شام
جس کا کوئی پتا نہیں اس عمرِ زرد کا
میعادِ درد کا
اک دن ہُوا تمام

انہونیاں

پتھر کی اک پتنگ
شیشے کی ڈور میں
کانچ کی ناریاں
سپنوں کی بھور میں
اندر کی خامشی
باہر کے شور میں

پینٹنگ

سیاہ آسماں کی دُھند میں
اُترتی شام کی زمین پر
بہت سے پیڑ
اور ان کی ٹہنیوں تلے
کہیں کسی پڑاؤ پر رُکے ہوئے
بہت سے لوگ
اِک نیچے الاؤ پر جھکے ہوئے

مہدی پرتاپ گڑھی
۲۸۔ اسکول وارڈ پرتاپ گڑھی، یوپی ۲۳۰۰۰۱

اختر ضیائی
AKHTAR ZIAI,
131 Hoe Street
London E17, 4SD

میں پس منظر میں رہ کر خوشنما منظر بناتا ہوں
غزل کی آڑ میں کچھ خوش نظر پیکر بناتا ہوں

مجھے باہر کی دنیا کی خبر اس طرح ملتی ہے
میں اپنے گھر کی ہر دیوار میں کچھ در بناتا ہوں

نہ باہر جا سکے جس سے صدائے نالۂ حسرت
میں اپنے قلب کو اک گنبدِ بے در بناتا ہوں

بظاہر بے سر و ساماں ہوں لیکن خوف سے عاری
کڑے وقتوں میں شاخِ گل کو میں خنجر بناتا ہوں

بقولِ حضرتِ غالبؔ علاج غم ہے یہ مہدیؔ
میں اپنی زندگی کو رنج کا خوگر بناتا ہوں

اک حرفِ طعن صورتِ خنجر لگا مجھے
اے دوست تیرا پھول بھی پتھر لگا

اللہ رے اختیار کی بے اختیاریا
جو کچھ بھی مل گیا وہ مقدر لگا

شب کو زبوں تو تھا ہی کچھ اہلِ جنوں
شب چھٹ گئی تو اور بھی ابتر لگا

پیرِ مغاں کے مکتبِ عرفان ذات
جو بھی ملا وہ مردِ قلندر لگا مجھے

سایہ سا ایک کوئے ملامت میں کل
دیکھا ذرا جو غور سے اخترؔ لگا

علیم صبا نویدی
۲۶ امۃ النساء بیگم اسٹریٹ
مانٹ روڈ مدراس ۶۰۰۰۰۲

اب کی کرخت دھوپ میں چہرے اُجڑ گئے
کچھ لوگ اپنے جسم کے اندر سکڑ گئے

سورج نے بڑھ کے تھام لیا ہے نظر کا ہاتھ
یونہی نظر کے پانو زمیں سے اُکھڑ گئے

جب سے لیا ہے غم نے جنم دل کے آس پاس
سب چاہتوں کے رنگ بہت میلے پڑ گئے

مرے بدن میں زہرِ تبسم کا گھول کر
وہ کون تھے جو مجھ سے اچانک بچھڑ گئے

سچائی کے لبوں پہ رکھے اس نے لب مگر
کچھ لوگ بے سبب ہی صبا سے بگڑ گئے

سید ظہیر الحسن ظہیر
۹۱۔ حنفی جریت روڈ
جہانگیر آباد، بھوپال ایم پی

ان کی دنیا کا عمل تو ظلم سی ڈھانے کا ہے
میرا دستورِ عمل بس رنگ بکھرانے کا ہے

وہ سبھی گذری ہے دل پر جو بھی گذری تھی اُدھر
غم مرا عنواں لیکن ان کے افسانے کا ہے

وادیِ احساس میں نمو رہتے ہے مسر [illegible]
مقتل جاں میں مگر پہچان [illegible]

رنج و غم کی آندھیوں کو مسکرا کر جھیلیے
راہ مشکل سے گزرنا کام فرزانے کا ہے

درحقیقت مرد اس کو کیا حوادث کی خبر
عزم جس کا گردشِ دوراں سے ٹکرانے کا ہے

ڈاکٹر سجاد سید
سی-۲- گل مہر ایونیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

گماں کو، وسوسوں کو رد کیا ہے
یقیں کو بے کراں بے حد کیا ہے

نشانِ راہ کل ڈھونڈیں گے میرا
جنھوں نے آج مجھ کو رد کیا ہے

شکایت کیا کریں ہم بے رخی کی
کہ اس نے پیار بھی بے حد کیا ہے

کچھ اچھے شعر کہہ کر داد لی ہے
کبھی یہ کام بھی سیّد کیا ہے

اندر سروپ سریواستو
سابق پرنسپل - ۶۰، مسوانی - فتح پور ۱۲۶
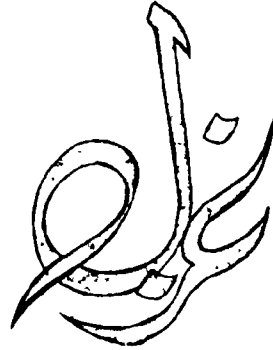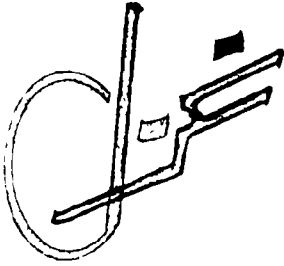
ہر پھول کے ماتھے پہ شکن اب بھی وہی ہے
آوارہ ہواؤں کا چلن اب بھی وہی ہے

لہجے میں لرزتے ہیں محبت کے فسانے
ہونٹوں پہ تپ و تابِ سخن اب بھی وہی ہے

بدلے تو نہیں ہیں وہ محبت کے قرینے
دیوانے کی صحرا سے لگن اب بھی وہی ہے

کھلتے ہیں گل و لالہ مرے قبر پہ جاں میں
بکھری ہوئی خوشبو کا ختن اب بھی وہی ہے

نا پربھات
ارار دارڈ نمبر ۱۲
ڈھی ۲۰

وہ ایک شبد

ے شبد

. کانوں نے سنا تھا
ہمارے ہونٹوں نے کہا تھا
رتک گنگنا اٹھا تھا
ت
ے شبد
رے ہونٹوں نے کہا
ے کانوں نے سنا
رتک
ا جلا گیا
سمت ہی
ح بھی میری

نازاں جمشید پوری
خواجہ منزل میں روڈ
آزاد نگر، مانگو، جمشید پور۔

مسکراؤ کہ اداسی بھلی نہیں لگتی
کبھی کبھی سی کوئی زندگی نہیں لگتی

جو وہ نہیں تو زمانے میں کچھ نہیں اپنا
خوشی بھی ان کے بنا اب خوشی نہیں لگتی

یہ کس خیال میں کھوئے ہوئے ہیں ہم دونوں
کبھی کبھی تو کوئی بات ہی نہیں لگتی

جہاں دِلوں میں خلوص و وفا نہیں ہوتا
وہاں حیات میں بھی دلکشی نہیں لگتی

جسے ملی ہو وراثت میں علم کی دولت
کسی بھی دور میں اس کو کمی نہیں لگتی

خدا سے مانگ کے نازاں ہوں اپنی قسمت پر
کہ جس سے مانگنے میں شرمندگی نہیں لگتی

مسعود کلیم
ادبی سرکل مئوناتھ بھنجن
یوپی ۲۷۵۱۰۱

جاوید اکرم
1/140 سول لائنس
فتح گڑھ یوپی

شہر کو وادیٔ غربت لکھو
دوستو! قصۂ ہجرت لکھو

سب ہی دست بنے پھرتے ہیں
لٹ گئی وقت کی دولت لکھو

پھول تو راکھ ہوئے جل بجھ کر
انھیں زخموں کو غنیمت لکھو

سب کمر تک ہیں لہو میں ڈوبے
امنِ عالم کی حکایت لکھو

گھر اجڑتے ہوئے، جلتے ہوئے شہر
کس کو آزادی کی قیمت لکھو

جھوٹی خبروں سے بھرے ہیں اخبار
اب کہاں حرفِ صداقت لکھو

کچھ بھی یاروں کا تقاضا ہے کلیم
مدحِ اربابِ سیاست لکھو

گلوں کے ساتھ ترازو میں سنگ تولتا میں
خدا کا خوف نہ ہوتا تو جھوٹ بولتا میں

اگر ہوائیں نہ ہوتیں مرے تعاقب میں
چراغ بن کے اُجالوں کے راز کھولتا میں

کہاں تک اپنے لہو سے جلاتا دل کے چراغ
کہاں تک آنکھوں میں خوابوں کا زہر گھولتا میں

اگر شریک سفر ہوتا آسمان کبھی
تمام عمر ستارے زمیں پہ رولتا میں

مجھے بھی ہوتا اگر اذنِ گفتگو جاوید
شگفتہ لہجے سے لفظوں کے قفل کھولتا میں

جمیل کاظمی
لکھمنیا۔ بیگوسرائے
بہار ۸۵۱۲۱۱

دیارِ دل میں رہا انتشار ابکے برس
اٹھا سکا نہ میں لطفِ بہار ابکے برس

چمن میں بادِ بلا خیز یوں چلی غم کی
کسی کلی پہ نہ آیا نکھار ابکے برس

نہ میرے دل میں ہی جذبات کا اٹھا طوفاں
نہ ان کی آنکھوں میں جھوما خمار ابکے برس

اسے بھی اپنے عزیزوں میں بانٹ دی ہم نے
ملی جو ہم کو خوشی مستعار ابکے برس

جنھیں یقیں تھا ہمارے خلوص پر بے حد
ہوئے ہیں وہم کے وہ بھی شکار ابکے برس

خوشی کے لمحے میسر نہیں کسی کو جمیل
وہ کون ہے جو نہیں دل فگار ابکے برس

پرکاش تیواری
۱۹۹۔ سیکٹر ۱۲۔ آر کے پورم
نئی دہلی ۲۲

بڑھ گیا دل کا دیوانہ پن اور بھی
آگہی میں ہوا چاک تن اور بھی

دل میں جب ہر تمنا کو دفنا دیا
جل اٹھا خواہشوں کا بدن اور بھی

پیڑ جب کوئی رستے میں آیا نظر
دل میں کھٹکی سفر کی تھکن اور بھی

دامنِ زندگی ہے دریدہ ابھی
رنگ لائے گی دل کی تپن اور بھی

زندگی، زندگی خامشی سے تری
آدمی کا ہوا ہے دمن اور بھی

دل تو پرکاش صحرا میں خوش تھا مگر
یاد آیا ہے رنگِ چمن اور بھی

انور خاں
۔۔ایس، کے، بی قمرالدین
بٹ بمبئی ۴۰۰۰۰۸

صارفین کے معاشرے میں ادیب اور قاری کا رشتہ

سنیما، ٹی وی، ریڈیو، فوٹوگرافی اور جدید تکنالوجی سے بنی مصنوعات نے ہمارے ماحول، ج، پسند اور ناپسند پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ سماجی نقل وحرکت کی افراط، رابطہ کے ذرائع میں روزافزوں ترقیوں نے انسان کے تخیل کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ آرٹ اور ادب اب ایک پُراسرار الگ تھلگ مصروفیت نہیں جو کسی مخصوص گروپ یا طبقے سے وابستہ ہو۔ اب وہ ہر طرح کے سامعین اور پڑھنے والوں میں پھیل چکے ہیں۔ جن کے حلقے بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ انسانی عمل کی طرح اب انھیں بھی اقتصادی قوانین کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اب تک یہ صورتِ حال بڑی حد تک اطمینان بخش تھی اور ہم اُمید کر سکتے تھے کہ ادب اور دوسرے علوم وفنون ادب سے خوب تر کی طرف گامزن ہیں لیکن ادھر دو دہائیوں سے جدید تکنالوجی کے زیرِ اثر صارفین نے ایک ایسے معاشرے کو فروغ دیا ہے جس میں ضروری ہے کہ چیزیں بازار میں آتی رہیں اور خریدی جاتی رہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کو چیزوں کے لیے مسلسل اشتہا جگائی جائے۔ یہ کام ریڈیو، ٹیلی وژن، فلم، اخبار، عام فلمی وغیرہ فلمی رسالے بہ آسانی کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں۔ اشیا کے استعمال کی اس بے پناہ خواہش نے صارفین کی نفسیات کو جنم دیا ہے جس نے ادب اور فنونِ لطیفہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ طلب و رسد کے اصولوں سے انھیں بھی مفر نہیں۔ اس کی ایک مثال ہمارے مشاعرے ہیں۔ مشاعرے ہمارے ادب کی اہم روایت میں شمار کیے جاتے ہیں اور ادب کے فروغ میں ان کا اہم رول رہا ہے۔

پہلے ادیب اور قاری ایک ہی ماحول کے پروردہ تھے۔ شعروادب میں اُن کی پسند ناپسند بڑی حد تک ہم مزاج تھیں۔ سامع شعر کے حسن وقبح سے اتنا ہی باخبر ہوتا تھا جتنا شاعر ان دونوں میں مسلسل ایک مکالمہ قائم رہتا تھا۔ مشہور ہے کہ انیس نے مرثیہ پڑھتے ہوئے جب یہ مصرع پڑھا:

کانِ نبی کے گوہرِ یکتا حسین ہیں

یند ایک باذوق قارئین نے اپنی ایک آنکھ پر ہاتھ رکھ لیا گویا کہہ رہے ہوں "کانے نبی؟" میر انیس نے مصرع بدلا:

گنجِ نبی کے گوہرِ یکتا حسین ہیں

لوگوں نے اپنے سروں پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔ انیس نے ایک بار پھر مصرع بدلا:

بحرِ نبی کے گوہرِ یکتا حسین ہیں

حاضرین نے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے اور انیس نے تیسری بار مصرع بدلا:

درِ نبی کے گوہرِ یکتا حسین ہیں

روایت معتبر نہیں لیکن اس سے سامعین کے رچے ہوئے ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہ صورتِ حال بدقسمتی سے آج نہیں ہے۔ آج ٹی۔ وی اور ریڈیو شاعر کی آواز بہ یک وقت پورے ملک کے ناظرین اور سامعین تک پہنچاتے ہیں۔ شاعر جانتا ہے کہ اس کے سامعین کی بیشتر تعداد اردو پڑھنا لکھنا نہیں جانتی۔ شعر کے حسن و قبح سے واقفیت تو بہت بعد کی بات ہے۔ شاعر کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کی بات سمجھیں۔ وہ مشکل الفاظ سے پرہیز کرتا ہے باوجود اس کے کہ اردو داں حضرات کے لیے وہ الفاظ مشکل نہ ہوں۔ رفتہ رفتہ وہ سامع کی ذہنی اور لسانی استعداد کو مدِنظر رکھ کر شعر کہنے کا عادی ہوتا چلا جاتا ہے۔ کبھی کبھی اس میں ابتذال بھی آجاتا ہے۔

مشاعروں کا مقصد آج سے بیس سال قبل تک اچھے شاعروں کو سننا اور اچھے اشعار حفظ کرنا ہوتا تھا۔ اب شاعر کلام نہیں سناتا باقاعدہ ادا (PERFORM) کرتا ہے جیسا کہ ایک مزاحیہ شاعر کا کہنا ہے کہ شاعر اب بلائے جاتے ہیں مجرا سنانے کے لیے۔"

المیہ یہ ہے کہ شاعر ایک صاف معاشرے کے فرد کی حیثیت سے اس کے تقاضوں کو پورا کرنے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔ اچھے رہن سہن، سفید پوشی اور سماجی مرتبے کی خواہش اسے ان مشاعروں میں شرکت پر مجبور کرتی ہے۔ شعر گوئی کا مقصد تو یہی ہے کہ لوگوں کو سنایا بھی جائے۔ دوردرشن ہمارے ملک کی اسی فیصد آبادی تک اس کا کلام پہنچاتا ہے۔ شعر جتنا معمولی ہوتا ہے شاعر اسی قدر لہک لہک کر کبھی ترنم سے کبھی ہاتھ پیر جھٹک کر اسے ادا کرتا ہے۔ ناظرین جنھیں شعر کے معیار سے زیادہ سروکار نہیں ہوتا، ہماری کے ہاسیہ کویوں کی طرح ان شاعروں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس بات کو مدِنظر رکھ کر دوردرشن کا پروڈیوسر بھی آئندہ کے لیے ان کے نام نوٹ کر لیتا ہے۔ مشاعروں کا موسم ستمبر سے شروع ہو کر اپریل مئی تک جاری رہتا ہے۔ اپنے پرفارمنس کی بنیاد پر ان شاعروں کو کئی مشاعرے مل جاتے ہیں اور تھوڑی بہت زائد آمدنی ہو جاتی ہے۔ ٹی۔ وی مشاعروں میں شرکت کا ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ غزل گائکوں کی نظروں میں آجاتے ہیں۔ آج کل غزلوں کے کیسٹ ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوتے ہیں اور ان سے شاعر کو معقول آمدنی ہو سکتی ہے۔ غزل گائکوں کی اپنی ایک مارکیٹ ہے۔ اس کے اپنے تقاضے ہیں۔ وہ شاعروں سے اپنی مرضی کے مطابق کلام لکھواتے ہیں۔ غزلوں کے کیسٹ چونکہ ہوٹلوں، شراب خانوں، نجی محفلوں میں بجائے جاتے ہیں اس لیے غزلوں میں شراب، ساقی، مے کدہ اور اس قسم کے الفاظ کا اعادہ ہوتا ہے۔ گانے والے ان الفاظ کے استعمال پر زور دیتے ہیں۔ شاعر زائد کمائی کی آس میں غزل گائکوں کے گھروں کے چکر لگاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ

دشمنی جیسی خوفناک سی شے
حد سے گزری تو دوستی سی لگی

(ارتضیٰ نشاط)

بیچ نگر دن چڑھتے وحشت بڑھتی ہے
شام تلک ہر سو ویرانہ لگتا ہے

(عبدالاحد ساز)

مطلب یہ کہ ایسا نہیں کہ اچھے اشعار تخلیق نہ ہو رہے ہوں لیکن آج کے سارے معاشرے کا فرد بس ہلکی پھلکی تفریح چاہتا ہے۔ مشاعروں اور غزل گائیکوں کے شاعر اس طلب کو پورا کرتے ہیں۔ اچھے شاعروں کو گلہ ہے کہ ہمارا قاری مشاعروں میں غزل کیسٹوں کے انبار کے پیچھے غائب ہو گیا ہے وہ اس صورت حال میں تبدیلی کا منتظر ہے لیکن وہ دن کب آئے گا؟

میں اس قدر لکھ چکا تھا کہ ۶ دسمبر کا حادثہ ہوا اور پھر جنوری میں بمبئی فسادات کی زد میں آ گیا۔ اس دوران دہلی میں بھی حالات دگرگوں رہے۔ انسانی جان و مال کا ایسا زیاں، حکومت کی بے حسی اور انسانی اقدار کی تباہی اور جلتے ہوئے گھروں اور بچوں، عورتوں کے بین و بکا اور رہنما وشیوں پر فرقہ پرستوں میں مذہبی جنون اور جشن کا سا سماں نے ایک طرف تو ہوش مندوں کو دہلا دیا دوسری طرف ادیبوں، شاعروں، دانشوروں کو فکرمند کر دیا ہے کہ یہ زدہ سیاست شاید ملک کو تباہ کر دے گی۔ اردو زبان کا مزاج ہمیشہ سے سیکولر رہا ہے اور اس پر اس کے ادیبوں کو ہمیشہ فخر رہا ہے۔ بدقسمتی سے مشاعروں کے اسٹیج سے گذشتہ دو چار سالوں میں ایسے اشعار بھی پڑھے گئے کہ ؂

ہمارے تاج عجائب گھروں میں رکھے ہیں
ہمارے پاس فقط سات سو چھیاسی ہے

اب تو جو فیصلہ ہوگا وہ یہیں پر ہوگا
ہم سے اب دوسری ہجرت نہیں ہونے والی

یہ بھی ایک دکھے ہوئے دل کی آواز تھی لیکن ہمیں امید ہے کہ فسادات کے پس منظر میں ہمارا شاعر صرف غزل گائیکوں اور مشاعرے کے سطحی ذہن کے افراد کی خاطر شعر نہ کہتے ہوئے، حالات کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے اپنی پوری ذمے داریوں کے ساتھ ایسے اشعار تخلیق کرے گا جو اس کے عہد کے آئینہ دار بھی ہوں اور نفرت کے پرچار کرنے والی طاقتوں کو بے نقاب کرتے ہوئے ایک نئے شعور کی آگہی عطا کرے۔

یاد رکھیے

اگر آپ کی خریداری نمبر کے سامنے سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کی خریداری کی مدت ختم ہو گئی۔ براہ کرم اپنا سالانہ چندہ مبلغ ۵۵ روپے فوراً بھیجیے۔ (مینیجر)

آر. کے. نارائن

مترجم: محمد اسد الدین، شعبۂ انگریزی
جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

جوتشی کا ایک دن

جوتشی ٹھیک دوپہر کو آتا، تھیلی کھولتا اور اپنا ساز و سامان نکالتا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے سامنے کوئی درجن بھر کوڑیاں، ایک چوکور کپڑے پر پُراسرار سے نقوش، ایک کاپی اور تحریر، دست شناسی کا ایک پلندہ نظر آتیں۔ مقدس راکھ اور سندور سے اس کی پیشانی چمکتی رہتی۔ اس کی آنکھوں سے ایک انوکھی روشنی نکلتی تھی جو گاہکوں کو مستقل تلاشنے کا نتیجہ تھی۔ لیکن گاہک اس کی آنکھوں میں مستقبل کی بشارتیں پاتے اور اسی میں خوش رہتے۔ پیشانی اور گالوں پر لہراتی سیاہ مونچھوں کے درمیان اس کی چمکتی آنکھیں بہت پُر اثر تھیں۔ چہرے کی اس کیفیت میں تو ایک بیوقوف کی آنکھیں بھی چمکنے لگتی ہیں۔ اس کیفیت کو دوبالا کرنے کے لیے اس نے اپنے سر پر کیسری رنگ کی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ رنگوں کا یہ طلسم بے معنی نہیں تھا۔ لوگ اس کے پاس آتے جیسے شہد کی مکھیاں چھتوں یا ڈلیوں سے پھولوں کی طرف جاتی ہیں۔ ٹاؤن ہال پارک کے درمیان سے گزرتی ہوئی راستہ پر املی کے ایک تناور پیڑ کے نیچے وہ بیٹھتا۔ یہ جگہ کئی معنوں میں غیر معمولی تھی۔ صبح سے رات تک لوگوں کا ریلا اس تنگ سڑک پر سے گزرتا رہتا۔ اس کے کنارے ہر قسم کے کاروباری پیشے کے منظر دکھائی دیتے۔ یہاں دوائیاں بیچنے، چوری کیے ہوئے لوہے کے کباڑ بھی۔ کھیل تماشے والے جادوگر بھی یہیں اپنا ڈیرا ڈالتا۔ اس سے بھی بڑھ کر سستے کپڑوں کا ایک نیلامیا بھی تھا، وہ دن بھر اتنا شور مچاتا کہ سارا شہر اس تک پلٹ آئے۔ غل غپاڑہ کرنے والوں میں دوسرے نمبر پر ایک مونگ پھلی فروش تھا جو ہر روز اپنے سامان کو ایک من بھاتا نام دے کر لوگوں کو بلاتا۔ ایک دن "بمبئی کا آئس کریم" کی آوازیں لگاتا تو دوسرے دن "دلی کا بادام" کا نعرہ بلند کرتا، اور تیسرے دن "شاہی پسند" کہہ کر چلاتا۔ اس کے پاس لوگوں کا تانتا بندھا رہتا۔ لوگوں کا یہ ریلا جوتشی تک بھی پہنچتا۔ مونگ پھلی کے چھلکے کے ڈھیر میں آگ لگا کر اس کی پھٹا پھٹ آوازوں میں اپنی دھونی رما کر وہ وہیں بیٹھ جاتا۔ لوگوں کے لیے اس جگہ کی کشش اور بھی زیادہ اسی لیے تھی کہ جوتشی میونسپلٹی کی روشنی سے دور اپنی روشنی آپ پیدا

کرتا۔ وہاں تو صرف دکانوں کی روشنیاں ہی پہنچ پاتی۔ کچھ دکانوں میں شہابی گیس بتیاں جلتی تھیں صرف چراغ جلتے۔ کچھ میں پرانی سائکلوں کی قندیلیں اور ایک دو تو ایسی تھی جس میں جوتشی کی دکان کی طرح اپنی کوئی روشنی نہ تھی۔ یہاں کا منظر کچھ ایسا تھا کہ غیر واضح شبیہیں اور دھندلی روشنیاں آتی جاتی نظر آتیں۔ یہ ماحول جوتشی کو راس آتا تھا کیونکہ اس نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن اسے یہ سوانگ بھی بھرنا پڑے گا اور کسی دوسرے عام آدمی کی طرح اسے تو بھی نہیں پتا تھا کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے ستاروں کی گردش کے بارے میں وہ اتنا ہی بے خبر تھا جتنا اس کا معصوم گاہک۔ اس کے باوجود اس کے منہ سے جو باتیں نکلتیں لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتیں۔ لوگ سمجھتے یہ اس کا علم، عمل اور ذہانت کا نتیجہ ہے۔ کچھ بھی ہو وہ اپنا کام اس ایمانداری سے کرتا جس ایمانداری سے دوسرے کرتے ہیں اور وہ اس اجرت کا مستحق تھا جو وہ روز دن ڈھلے اپنے گھر لے جاتا۔

اس نے بلا سوچے سمجھے اپنا گاؤں چھوڑ دیا تھا۔ اگر وہ وہاں رہتا تو وہی کام کرتا جو اس کے باپ دادا کرتے آئے تھے یعنی ہل چلاتا، کھیت جوتتا اور کسی طرح گزر بسر کرتا۔ شادی کرتا اور یونہی عمر تمام کر دیتا۔ لیکن یہ اس کا مقدر نہیں تھا۔ اس نے کسی کو بتائے بغیر گھر چھوڑ دیا اور اس وقت تک گھر سے دور بھاگتا رہا جب تک کہ گھر سے سیکڑوں میل دور نہ ہو گیا۔ گاؤں میں بسنے والے کسی کے لیے یہ فاصلہ بہت ہوتا ہے جیسے کہ یہ سمندر پار کا ہو۔

جوتشی زندگی کی پریشانیوں سے بخوبی واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ شادی، انسانی رشتے اور روپیہ پیسے کے جھگڑے کیسے ہوتے ہیں۔ پھر زندگی کا بھی اس کا اچھا خاصا تجربہ تھا۔ چند ہی منٹوں میں ساری بات اس کی سمجھ میں آجاتی۔ اس نے ہر سوال کی قیمت تین پائی رکھی تھی اور اس وقت تک زبان نہیں کھولتا جب تک کہ گاہک کئی دس منٹ تک لگاتار نہ بولتا جائے۔ اس وقت تک جواب اور مشورے دینے کے لیے اس کے پاس کافی مواد جمع ہو جاتا تھا۔ سامنے بیٹھے ہوئے کسی شخص کی ہتھیلی پر گھور کر جب وہ کہتا "تمھیں اپنی محنت کا پھل نہیں مل رہا ہے" تو دس میں سے نو آدمی اس سے اتفاق کرتے۔ یا پھر یہ کہتا "کیا تمھارے گھر یا رشتہ داری میں کوئی عورت ایسی ہے جو تمھیں پسند نہیں کرتی" یا پھر یہ "تمھارے مائل فطرت کی وجہ سے تم کسی کا مقام تو نہیں بدل سکتے" یا "تم بہت جذباتی اور کھری طبیعت کے آدمی ہو" یہ سب سن کر لوگ خوش ہو جاتے کیونکہ ہم میں سے بیشتر اس خوش فہمی کا شکار ہوتے ہیں کہ ہماری شخصیت رعب دار ہے۔

مونگ پھلی والا آگ بجھا کر گھر جانے کے لیے تیار ہو جاتا۔ یہ جوتشی کے لیے بھی اشارہ تھا کہ وہ بھی تیار ہو جائے کیونکہ اب اندھیرا ہو جاتا اور صرف ہلکی سی روشنی ہی وہاں تک پہنچ پاتی۔ اس دن وہ اپنی کوڑیاں اور دوسری چیزیں سمیٹ کر جانے کو تیار ہو رہا تھا جس وقت اسے نظر آیا کہ کوئی اس کے سامنے کھڑا ہے۔ لگا کوئی گاہک۔ اس نے کہا "تم تھکے ہوئے ہو

"تمھارے جسم میں ایک چھرا اُتار دیا گیا تھا؟"

"شاباش! بالکل ٹھیک کہا" اجنبی بولا اور گریباں اٹھا کر زخم کا نشان دکھایا۔ "اور کہو"

"تمھیں ایک کنوئیں میں پھینک دیا گیا تھا۔ یہ سمجھا گیا تھا کہ تم مر چکے ہو۔"

"ہاں، میں مر ہی جاتا اگر کوئی راہگیر کنوئیں میں جھانک کر مجھے نہ دیکھتا" اجنبی مٹھیاں بھینچتے ہوئے پوچھا "وہ میرے ہاتھ کب آئے گا؟"

"اگلے جہان میں" جوتشی نے جواب دیا "وہ یہاں سے بہت دور ایک شہر میں چار ما پہلے مر چکا ہے۔ اب تم اس سے کبھی مل نہ سکو گے۔" یہ سن کر اجنبی کراہ اُٹھا۔ جوتشی بولتا گیا گورو نایک سے"

"تم میرا نام جانتے ہو!" وہ چونک کر بولا۔

"صرف یہی نہیں۔ میں باقی سب کچھ بھی جانتا ہوں۔ تم چپ چاپ دھیان سے سنتے رہو۔ تمھارا گاؤں اس شہر سے اتر کی جانب ہے۔ دو دن کا راستہ ہے۔ ٹرین پکڑو اور گھر جاؤ۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمھاری زندگی میں یہ وقت خطرے کا ہے۔" جوتشی نے بھبوت کی ایک چٹکی اٹھائی اور اجنبی کو دیتے ہوئے بولا۔ "اپنے ماتھے پر رگڑ دو اور گھر جاؤ۔ کبھی دکھن کی طرف مت نکلنا۔ ایسا کیا تو سو سال تک زندہ رہو گے۔"

"میں اب گھر سے کیوں نکلوں گا؟" اس نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "میں تو کبھی کبھی اسی لیے نکل جاتا تھا کہ اس کی تلاش کروں اور اگر وہ مل جائے تو اس کا گلا گھونٹ دوں۔" تاسف کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے اس نے کہا "میرے ہاتھ سے وہ بچ نکلا۔ لیکن مجھے امید ہے و ضرور ذلت کی موت مرا ہوگا۔" "ہاں" جوتشی نے جواب دیا۔ "وہ ایک لاری کے نیچے دب کر مرا یہ سن کر گورو نایک خوش ہو گیا۔

اب وہ جگہ سنسان ہو چکی تھی۔ جوتشی نے اپنا سارا سامان تھیلی میں بھر لیا۔ وہ سبز روشنی بھی اب گل ہو چکی تھی اور وہاں اندھیرا اور سناٹا تھا۔ اجنبی رات کے اندھیروں میں گم ہو چکا تھا اور جاتے جاتے وہ جوتشی کے ہاتھ مٹھی بھر سکے رکھ گیا تھا۔

کوئی آدھی رات کو جوتشی اپنا گھر پہنچا۔ اس کی بیوی دروازے پر اس کی راہ تک رہی تھی۔ اس نے دیر آنے کا سبب پوچھا تو جوتشی نے اس کی طرف سارے سکے اُچھالتے ہوئے کہا۔ "گنو انھیں۔ یہ سب ایک آدمی دے گیا ہے۔"

"ساڑھے بارہ آنے" بیوی گن کر بولی۔ وہ بہت خوش تھی۔ "کل ہی گڑ اور ناریل خریدوں گی۔ بچے کئی دنوں سے مٹھائی مانگ رہے تھے۔ ان کے لیے کوئی اچھی چیز بناؤں گی۔"

"اس سور کے بچے نے مجھے دھوکا دے دیا۔ اس نے ایک روپیا دینے کا وعدہ کیا تھا۔" اس کی بیوی نے اس کی طرف دیکھا اور کہا "تم اداس نظر آتے ہو۔ آخر بات کیا ہے"

"کچھ نہیں۔"

کھانے کے بعد جب وہ پیال پر بیٹھا تو اپنی بیوی سے مخاطب ہوا "آج میرے سر

سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا۔ میں اتنے دنوں سے یہی سمجھ رہا تھا کہ میرے ہاتھوں پر کسی کے قتل کا خون لگا ہوا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں اپنے گھر سے بھاگ آیا۔ یہاں ڈیرا جمایا اور تم سے شادی کی۔ لیکن وہ آدمی تو زندہ نکلا"

اس کی بیوی حیران ہوئی "تم نے کسی کی جان لینے کی کوشش کی تھی؟"

"ہاں، جب میں گاؤں میں ایک نادان نوجوان تھا۔ ایک دن ہم دونوں نے شراب پی جوا کھیلا اور آپس میں لڑ پڑے۔ لیکن چھوڑو، اب اس کے بارے میں کیا سوچنا؟ چلو سونے کا وقت ہے" اس نے جماہی لی اور بستر پر دراز ہو گیا۔

فراز بندہ نواز
[illegible] جامع مسجد
[illegible] کرناٹک)

رباعی کے ۲۴ اوزان
اور
شجرۂ اخرب و شجرۂ اخرم

"غلطاں غلطاں ہمی رود تا لب گو" کہتے ہیں یہ مصرع چوسر بازی کھیلتے ہوئے سلطان یعقوب بن لیث صفار کا بیٹا گنگنا رہا تھا جس نے لوگوں کو بہت ہی متاثر کیا۔ یہ بات الگ ہے حقیقت ہے یا حکایت لیکن ایران کا ایک نامی شخص استاد رودکی نے اسی مصرع کی بنیاد پر رباعی کے اوزان ایجاد کیا۔ بحر ہزج مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن کو بحر رباعی سے مخصوص کیا۔ یاد رہے کہ رباعی کو دو بیتی اور ترانہ بھی کہتے ہیں۔ (اب رباعی کے لیے یہ اصطلاح رائج نہیں ہے)

اوزان رباعی کی تشکیل کے لیے عروض میں مسلّم قوانین یعنی اصول "سبب پئے سبب است" "وتد پئے وتد است" حکم معاقبہ اور عمل زحافات بنائے اور اسی کے تحت استاد رودکی نے رباعی کے ابتدائی اوزان یوں قائم کیے۔

(۱) مفعُولُ ۔ مَفاعیلُ ۔ مَفاعیلُ ۔ فعل / فعول

(۲) مَفعُولُ ۔ مَفاعلُن ۔ مَفاعیلُ ۔ فعل فعول

انھیں بالا اوزان پر عمل تخلیق فرمانے سے مروجہ ۲۴ اوزان رباعی حاصل ہوتے ہیں۔

بحر ہزج کے دو فروع مَفاعیلُ (مکفوف) مَفاعلُن (مقبوض) جو دونوں عام زحافات ہیں اور حکم معاقبہ کے تحت ایک دوسرے کی جگہ استعمال کرنا جائز ہے۔

استاد رودکی نے مندرجہ بالا وزن رباعی نمبر ۱ میں رکن دوم و سوم میں مَفاعیلُ مَفاعیلُ رکھا ہے۔ حکم معاقبہ کے تحت مفاعلن مَفاعلن رکھ کر ایک نیا وزن دریافت نہیں کیا۔ اسی طرح وزن رباعی نمبر ۲ کے رکن دوم میں مَفاعلن اور رکن سوم میں مَفاعیلُ رکھا ہے مگر اس نے یہاں بھی ایک نیا وزن حاصل کرنے کے لیے وزن رباعی نمبر ۲ کے رکن دوم میں مَفاعیلُ اور رکن سوم میں مَفاعلن نہیں رکھا جب کہ حکم معاقبہ کے تحت جائز تھا۔ آخر اس نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ اس کا جواب صرف اتنا ہے کہ عروض جیسے خشک مضمون میں اس کی نظر نے کبھی دھوکا

کھا یا مگر اس بے راہ روی پر علام سحر عشق آبادی کی نظر پڑی تو موصوف نے سمجھنے میں دیر نہیں کی اور رباعی کے بنیادی اوزان اس طرح تجویز کر کے رباعی میں مزید بارہ اوزان کا اضافہ کر دیا

علام سحر عشق آبادی کے ایجاد کردہ بنیادی اوزان یہ ہیں۔

(۱) مَفعُولُ۔ مَفَاعلُن۔ مَفَاعِلُن۔ فَعَل، فَعُولُ

(۲) مَفعُولُ۔ مَفَاعِیلُ۔ مَفَاعِلُن۔ فَعَلُ، فَعُولُ

ان اوزان پر عمل تخنیق فرمانے سے مروجہ مزید بارہ اوزان دریافت ہوتے ہیں۔ اس طرح سے رباعی چھتیس اوزان پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایک بات یہ بھی یاد رہے کہ علام سحر عشق آبادی اور استاد رودکی کے ان اوزان رباعی میں چھٹے زحافات کا استعمال ہوا ہے جو یوں ہیں۔

حزب۱۔ کف۲۔ قبض۳۔ جب۴۔ ہتم۵۔ تخنیق۶۔

رباعی کے اس وزن میں عمل زحافات دیکھیے۔ مَفعُولُ۔ مَفاعِیلُ۔ مَفَاعِلُن۔ فعلُ فعُولُ

(۱) مفعولُ (اخرب) مَفَاعیلُن (سالم) پر زحاف حزب سے حاصل ہوتا ہے۔ زحاف خرب، اور خرم کا مجموعہ ہے اور صدر و ابتدا سے مخصوص ہے۔

(۲) مَفَاعِیلُ (مکفوف) مَفَاعیلُن (سالم) پر زحاف کف کے عمل سے حاصل ہوتا ہے اور یہ عام زحاف ہے۔

(۳) مَفَاعِلُن (مقبوض) (مفاعیلن) (سالم) پر زحاف قبض کے عمل سے حاصل ہوتا ہے اور یہ عام زحاف ہے۔

(۴) فَعَلُ (مجبوب) مَفَاعیلن (سالم) پر زحاف جب کا عمل فرمانے سے حاصل ہوتا ہے اور یہ عروض و ضرب سے مخصوص ہے۔

(۵) فعُولُ (اہتم) مفاعیلن (سالم) پر یہ عمل ہتم حاصل ہوتا ہے اور یہ حذف اور قصر کا مرکب ہے جو عروض و ضرب سے مخصوص ہے۔

(۶) عمل تخنیق۔ یعنی ما بعد رکن کے پہلے متحرک حرف کو ساکن کر کے ماقبل رکن کے آخری متحرک حرف سے پیوست کرنا مثلاً

(اخرب) مفعُولُ + (مکفوف) مَفَاعیلُ یعنی مَفعُولُم۔ فَاعِیلُ جیسے مانوس رکن اخرب مَفعُولُن ـ مکفوف مخنق مفعُولُ =

بدل لیا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا وزن پر عمل تخنیق فرمانے سے یہ وزن حاصل ہوتا ہے۔

مَفعُولُن۔ مَفعُولُن۔ فَاعِلُن۔ فَعَلُ فعُولُ (اخرب، مکفوف تخنیق، مقبوض، تخنیق مجبوب)

بعض عروضیوں نے اوزان رباعی کو سمجھنے میں غلطی کی ہے اور یوں لکھتے ہیں کہ اوزان رباعی میں استعمال ہونے والے زحافات نو ہیں۔

حزب۱۔ کف۲۔ قبض۳۔ تشتر۴۔ خرم۵۔ جب۶۔ ہتم۷۔ بتر۸۔ زلل۹

یہ بات ذہن میں رہے کہ تشتر میں آنے والے فاعلُن کو اشتر اور مفعُولُ کو اخرب کہنا

بالکل غلط ہے۔ یہ دونوں رکن زحافِ تخنیق کے مرہونِ منت ہیں اور اس فاعلن کو مقبوض مخنق اور مفعولُ کو مکفوف مخنق کہتے ہیں اسی طرح صدر و ابتداء کا مَفْعُوْلُنْ اخرم نہیں بلکہ یہ اخرب ہے جس پر زحافِ تخنیق کا اثر ہے۔ وزنِ رباعی کے دوسرے رکن مَفَاعِیْلُ کا متحرک 'میم' ساکن ہو کر پہلے رکن کے مَفْعُوْلُ (اخرب) کے آخری متحرک 'لام' سے پیوست ہو کر مَفْعُوْلُن بنتا ہے۔ لہٰذا اس کو اخرب ہی کہنا صحیح و درست ہے جو اسے اخرم کہتے ہیں وہ گمراہ ہیں۔ اوزانِ رباعی میں آنے والے 'فع' کو ابتر (جب کہ بتر کا عمل مَفَاعِیْلُنْ پر ہوتا ہی نہیں) اور 'فاع' کو ازل کہنا بھی ایک مغالطہ ہی ہے۔ دراصل یہاں 'فع' مجبوب مخنق اور 'فاع' اہتم مخنق ہے۔

قطران خراسانی نے اوزانِ رباعی کو دو شجروں یعنی 'مَفْعُوْلُ' والے اوزان کو شجرۂ اخرب اور مَفْعُوْلُنْ والے اوزان کو شجرۂ اخرم سے منسوب کر کے ایک مغالطہ اور پیدا کر دیا۔ قطران نے صدر و ابتدا کے 'مَفْعُوْلُنْ' کو 'اخرم' مان کر غلطی کی ہے۔ مَفَاعِیْلُنْ پر بعمل خرم صدر و ابتدا کا مفعولن ضرور حاصل ہوتا ہے۔ مگر اوزانِ رباعی کے صدر و ابتداء میں آنے والا مفعولن ہرگز اخرم ہو کر نہیں بلکہ یہ زحافِ تخنیق کے زیرِ اثر 'مفعولُ' (اخرب) نے یہ شکل بنا لی ہے۔ رباعی کے اس وزن کو دیکھیے مَفْعُوْلُن۔ مَفْعُوْلُ۔ مَفَاعِلُن۔ فَعَلْ۔ یہ وزن مَفْعُوْلُ۔ مَفَاعِیْلُ۔ مَفَاعِلُنْ۔ فَعَلْ سے بذریعہ عمل تخنیق حاصل ہوتا ہے۔ اس وزن میں 'خرم' کا عمل ہی نہیں لہٰذا اس مفعولن کو 'اخرم' کہنا غلط ہوا۔ رباعی کے صدر و ابتداء کا مفعولن اس طرح حاصل ہوتا ہے۔ دوسرا رکن مَفَاعِیْلُ (مکفوف) کا وتد مجموع 'مَفَا' کا متحرک میم ساکن ہو کر ماقبل رکن مفعولُ (اخرب) کے متحرک 'لام' سے جڑ جاتا ہے عمل تخنیق دیکھیے۔

مفعولُ + مفاعیلُ بعمل تخنیق مَفْعُوْلُم۔ 'فاعِیْلُ' ہوا جس کو مانوس رکن مَفْعُوْلُنْ۔ مفعولُ سے بدل لیا جاتا ہے۔

مَفْعُوْلُ۔ مَفَاعِیْلُنْ۔ فَاعِلُنْ۔ فَعَلْ۔ اس وزن میں عمل تخنیق کے ذریعہ حشو دوم میں 'فاعلن' آیا ہے۔ یاد رہے کہ یہ 'فاعلن' اشتر نہیں بلکہ مَفَاعِلُنْ (مقبوض) کا وتد مجموع 'مَفَا' کا متحرک 'میم' ساکن ہو کر ماقبل رکن کے مَفَاعِیْلُ (مکفوف) کے وتد مفروق عِیْلُ کے متحرک 'لام' سے پیوست ہو جاتا ہے۔

مَفَاعِیْلُ + مَفَاعِلُنْ بعمل تخنیق مَفَاعِیْلُمْ۔ فَاعِلُنْ ہوا یعنی مَفَاعِیْلُنْ۔ فَاعِلُنْ ہوا اس فاعلن کو مقبوض مخنق کہتے ہیں۔

رباعی کا وزن مَفْعُوْلُ۔ مَفَاعِیْلُ۔ مَفَاعِیْلُنْ۔ فَعْ بھی دیکھیے۔ اس وزن کے آخری رکن میں فعْ آیا ہے جسے بعض عروضیوں نے 'ابتر' کہا ہے۔ یہ ان کی ناسمجھی ہی ہے۔ مَفَاعِیْلُن پر زحافِ بتر (جو حذف اور قطع کا مرکب ہے) کا عمل ہوتا ہی نہیں۔ مَفَاعِیْلُنْ پر بعمل حذف مَفَاعِی رہا اس پر قطع کا عمل نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس رکن پر جب اور قطع کا عمل فرمانے سے تو 'فع' حاصل ہوتا ہے جس کا اصطلاحی نام مجبوب مقطوع ہوتا ہے لیکن اوزانِ رباعی میں آنے والا 'فع' زحافِ تخنیق کا مرہونِ منت ہے اور یہ مجبوب مخنق ہے۔

فَعَل (مجبوب) کا متحرک 'ف' ساکن ہو کر ما قبل رکن مفاعیلُ (مکفوف) کے متحرک لام سے جوڑ لیا جاتا ہے اور اصطلاحی نام مجبوب مخنق ہوتا ہے اسی طرح مَفعُولُ۔ مَفاعِیلُ۔ مفاعَیلُن۔ 'فاعْ' کے 'فاع' پر ازل کا دھوکا ہوتا ہے اس فَاعْ کو حاصل کرنے کے لیے عمل تخنیق کارفرما ہے۔

فَعُولُ (اہتم) کا متحرک 'ف' ساکن ہو کر ما قبل رکن مَفَاعِیلُ (مکفوف) کے متحرک لام سے پیوست ہوتا ہے۔

مَفَاعِیلُ + فعولُ تخنیق فرمانے سے مَفَاعَیلُن۔ عُولُ یعنی مَفاعیلن۔ فَاعْ ہوا۔ اس طرح حاصل شدہ فَاعْ کو اہتم مخنق کہتے ہیں۔ اسے زلل سے بنانے والے مغالطے کا شکار ہیں۔

لہٰذا اس تجزیے سے ثابت ہوتا ہے کہ اوزان رباعی کے صدر وابتدا کے مَفعُولُن کو اخرم حشوین کے مَفعُولُ کو اخرب اور فَاعِلُن کو اشتر، اور عروض وضرب کے فَع کو ابتر اور فَاعْ کو ازل کہنا سراسر غلط ہے۔

ہمارے ایجاد کردہ شجروں، شجرۂ اخرب اور شجرۂ اشتر کو سمجھانے سے پہلے رباعی کے بنیادی اوزان پر عمل تخنیق فرما دیتے ہیں۔

(۱) مَفعُولُ۔ مَفعُولُ۔ مَفَاعِیلُ۔ فعلُ فَعُولُ (اخرب مکفوف، مکفوف، مجبوب اہتم)
(۲) مَفعُولُ۔ مَفَاعِلُن۔ مَفاعِیلُ۔ فَعَلُ فَعُولُ (اخرب مقبوض مکفوف، مجبوب / اہتم)
(۳) مَفعُولُ۔ مَفَاعِلُن۔ مَفَاعِلُن۔ فَعَلُ / فَعُولُ (اخرب مقبوض مقبوض، مجبوب / اہتم)
(۴) مَفعُولُ۔ مَفَاعِیلُ۔ مَفَاعِلُن۔ فَعَل فَعُولُ (اخرب۔ مکفوف۔ مقبوض، مجبوب / اہتم)

ان اوزان پر عمل تخنیق فرمانے سے ۳۶ اوزان حاصل ہوتے ہیں۔

(۱) مفعولُ۔ مفاعیلُ۔ مفاعیلُ۔ فَعَل (اخرب۔ مکفوف۔ مکفوف۔ مجبوب)
(۲) مفعولُ۔ مفاعیلُ۔ مفاعیلُ۔ فعولُ (اخرب۔ مکفوف۔ مکفوف۔ اہتم)
(۳) مفعولُ۔ مفاعیلن۔ مفعولُ۔ فَعَل (اخرب۔ مکفوف۔ مکفوف۔ مخنق مجبوب)
(۴) مفعولُ۔ مفاعیلن۔ مفعولُ۔ فعولُ (اخرب۔ مکفوف۔ مکفوف۔ مخنق۔ اہتم)
(۵) مَفعُولُ۔ مَفاعیلُ۔ مفاعیلن۔ فع (اخرب۔ مکفوف۔ مکفوف۔ مجبوب مخنق)
(۶) مفعولُ۔ مفاعیلُ۔ مفاعیلن۔ فاع (اخرب۔ مکفوف۔ مکفوف۔ اہتم۔ مخنق)
(۷) مفعولُ۔ مفاعیلن۔ مفعولن۔ فع (اخرب۔ مکفوف۔ مکفوف مخنق مجبوب مخنق)
(۸) مفعولن۔ مفاعیلن۔ مفعولن۔ فاع (اخرب۔ مکفوف۔ مکفوف۔ مخنق، اہتم مخنق)
(۹) مفعولن۔ مفعولُ۔ مفاعیلُ۔ فَعَلُ (اخرب۔ مکفوف۔ مخنق۔ مکفوف۔ مجبوب)
(۱۰) مفعولن۔ مفعولُ۔ مفاعیلُ۔ فعولُ (اخرب۔ مکفوف۔ مخنق۔ مکفوف۔ اہتم)
(۱۱) مفعولن۔ مفعولن۔ مفعولُ۔ فَعَل (اخرب۔ مکفوف۔ مخنق۔ مکفوف مخنق مجبوب)
(۱۲) مفعولن۔ مفعولن۔ مفعولُ۔ فَعُولُ (اخرب۔ مکفوف۔ مخنق۔ مکفوف مخنق۔ اہتم)
(۱۳) مفعولن۔ مفعولُ۔ مفاعیلن۔ فع (اخرب۔ مکفوف۔ مخنق۔ مکفوف۔ مجبوب مخنق)
(۱۴) مفعولن۔ مفعولُ۔ مفاعیلن۔ فاع (اخرب۔ مکفوف۔ مخنق۔ مکفوف۔ اہتم مخنق)

مفعولن مفعولن مفعولن. فع (اخرب. مکفوف. مخنق. مکفوف. مخنق. مجبوب. مخنق)
مفعولن. مفعولن. مفعولن. فاع (احزب. مکفوف. مخنق. مکفوف. مخنق. اہتم. مخنق)
مفعولُ. مفاعِلُنْ. مَفاعیلُ. فعَلُ (احزب. مقبوض. مکفوف. مجبوب)
مفعولُ. مفاعِلن. مَفاعیلُ. فعُولُ (احزب. مقبوض. مکفوف. اہتم)
مفعولُ. مفاعلن. مفاعیلن فع (احزب. مقبوض. مکفوف. مجبوب. مخنق)
مفعولُ. مفاعِلن. مفاعیلن. فاع (احزب. مقبوض. مکفوف. اہتم. مخنق)
مفعولن. فاعِلن. مفاعیلُ. فعَلُ (احزب. مقبوض. مخنق. مکفوف. مجبوب)
مفعولن. فاعِلن. مَفاعیلُ. فعولُ (احزب. مقبوض. مخنق. مکفوف. اہتم)
مفعولن. فاعلن. مفاعیلن. فع (احزب. مقبوض. مخنق. مکفوف. مجبوب. مخنق)
مفعولن. فاعلن. مفاعیلن. فاع (احزب. مقبوض. مخنق. مکفوف. اہتم. مخنق)

(ان ایک تا ۲۴ اوزان رباعی کا موجد استاد رودکی ہے)

۲۵) مفعولُ. مفاعِلُنْ. مفاعِلُنْ. فعَلُ (احزب. مقبوض. مقبوض. مجبوب)
۲۶) مفعولُ. مفاعِلُنْ. مفاعِلُنْ. فعولُ (احزب. مقبوض. مقبوض. اہتم)
۲۷) مفعولُ. مفاعیلُ. مفاعِلن. فعَلُ (احزب. مکفوف. مقبوض. مجبوب)
۲۸) مفعولُ. مفاعیلُ. مفاعِلن. فعُولُ (اخرب. مکفوف. مقبوض. اہتم)
۲۹) مفعولُ. مَفاعیلُنُ. فاعِلن. فعلُ (احزب. مکفوف. مقبوض. مخنق. مجبوب)
۳۰) مفعولُ. مفاعیلن. فاعِلن. فعولُ (احزب. مکفوف. مقبوض. مخنق. اہتم)
۳۱) مفعولُنْ. فاعِلن. مفاعِلن. فعلُ (احزب. مقبوض. مخنق. مقبوض. مجبوب)
۳۲) مفعولن. فاعِلن. مفاعلن. فعلُ (احزب. مقبوض. مخنق. مقبوض. اہتم)
۳۳) مفعولن. مفعولُ. مفاعِلن. فعَلُ (احزب. مکفوف. مخنق. مقبوض. مجبوب)
۳۴) مفعولن. مفعولُ. مفاعِلن. فعولُ (احزب. مکفوف. مخنق. مقبوض. اہتم)
۳۵) مفعولن. مفعولن. فاعِلن. فعَلُ (احزب. مکفوف. مخنق. مقبوض. مخنق. مجبوب)
۳۶) مفعولن. مفعولن. فاعِلُنْ. فعولُ (احزب. مکفوف. مخنق. مقبوض. مخنق. اہتم)

چبیس ۲۵ تا چھتیس ۳۶ اوزان رباعی کے موجد علام سحر عشق آبادی ہیں۔

یہ ۳۶ اوزان رباعی ہمارے ایجاد کردہ "شجرۂ اخرب" میں آتے ہیں۔ مَفْعُولُنْ جو در اصل خرب ہی ہے۔ اسے بھی شجرۂ احزب میں ہی آنا چاہیے۔ قطان نے 'مفعولن' کو شجرۂ اخرم سے منسوب کر کے غلطی کی ہے۔

ہمارے ترتیب کردہ دو شجرے اس طرح ہیں۔

۱) شجرۂ اَخْرَبْ
۲) شجرۂ اُشْتُر

شجرۂ اخرب میں استاد رودکی اور علام سحر عشق آبادی کے پورے ۳۶ اوزان بشمول (مَفْعُولُنْ)

آئیں گے۔ مَفعُولُ والے اور مَفعُولُنْ والے اوزانِ رباعی کو الگ الگ سے لکھنے کے حق میں ہم نہیں ہیں کیونکہ مَفعُولُنْ جو دراصل اخرب ہی ہے۔ اس کو بھی مَفعُولُ یعنی (اخرب والے اوزان میں ہی آنا چاہیے۔ اس لیے ہم نے شجرۂ اخرب میں ان مَفعُولُنْ والے اوزان کا بھی اجتماع کیا ہے اور بالکل درست ہے۔

شجرۂ اشتر میں وہ فاعلن والے اٹھارہ اوزان آئیں گے جس کے موجد ڈاکٹر زار علامی ہیں۔ اب تک عروضی کہتے آئے ہیں کہ رباعی میں استعمال ہونے والے یہ زحافات چھ ہیں۔
(۱) خرب (۲) کف (۳) قبض (۴) جب (۵) ہتم (۶) تخنیق جو بالکل درست و صحیح ہیں لیکن یہ زحافات استاد درد وکی اور علامہ سحر عشق آبادی کے اوزان تک ہی محدود ہیں اب جب کہ زار علامی نے زحاف شتر کا استعمال کرکے زحافات رباعی میں اضافہ کر دیا ہے جو ہر طرح سے جائز ہے اس پر کسی قسم کا عروضی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ لہٰذا اوزانِ رباعی میں اب سات زحافات استعمال ہوتے ہیں۔

زار علامی کے ایجاد کردہ ابتدائی اوزان رباعی اس طرح ہیں۔

(۱) فاعلن۔ مفاعیل۔ مفاعیلُ۔ فَعَل/فعولُ (اشتر۔ مکفوف۔ مکفوف۔ مجبوب/اہتم)
(۲) فاعلن۔ مفاعلن۔ مفاعیلُ۔ فَعَل/فعولُ (اشتر۔ مقبوض۔ مکفوف۔ مجبوب/اہتم)
(۳) فاعلن۔ مفاعلن۔ مفاعلن۔ فَعَل/فعولُ (اشتر۔ مقبوض۔ مقبوض۔ مجبوب/اہتم)
(۴) فاعلن۔ مفاعیلُ۔ مفاعلن۔ فَعَل/فعولُ (اشتر۔ مکفوف۔ مقبوض۔ مجبوب/اہتم)

ان پر عمل تخنیق فرمانے سے اٹھارہ اوزان حاصل ہوتے ہیں۔

(۱) فاعلن۔ مفاعیلُ۔ مفاعیلُ۔ فَعَل (اشتر۔ مکفوف۔ مکفوف۔ مجبوب)
(۲) فاعلن۔ مفاعیلُ۔ مفاعیلُ۔ فعولُ (اشتر۔ مکفوف۔ مکفوف۔ اہتم)
(۳) فاعلن۔ مفاعلن۔ مفاعیلُ۔ فَعَلُ (اشتر۔ مقبوض۔ مکفوف۔ مجبوب)
(۴) فاعلن۔ مفاعلن۔ مفاعیلُ۔ فعولُ (اشتر۔ مقبوض۔ مکفوف۔ اہتم)
(۵) فاعلن۔ مفاعلن۔ مفاعلن۔ فَعَلُ (اشتر۔ مقبوض۔ مقبوض۔ مجبوب)
(۶) فاعلن۔ مفاعلن۔ مفاعلن۔ فعولُ (اشتر۔ مقبوض۔ مقبوض۔ اہتم)
(۷) فاعلن۔ مفاعیلُ۔ مفاعلن۔ فَعَلُ (اشتر۔ مکفوف۔ مقبوض۔ مجبوب)
(۸) فاعلن۔ مفاعیلُ۔ مفاعلن۔ فعولُ (اشتر۔ مکفوف۔ مقبوض۔ اہتم)
(۹) فاعلن۔ مفاعیلن۔ مفعولُ۔ فَعَلُ (اشتر۔ مکفوف۔ مکفوف۔ مخنق۔ مجبوب)
(۱۰) فاعلن۔ مفاعیلن۔ مفعولُ۔ فعولُ (اشتر۔ مکفوف۔ مکفوف۔ مخنق۔ اہتم)
(۱۱) فاعلن۔ مفاعیلُ۔ مفاعیلن۔ فع (اشتر۔ مکفوف۔ مکفوف۔ مجبوب۔ مخنق)
(۱۲) فاعلن۔ مفاعیلُ۔ مفاعیلن۔ فاع (اشتر۔ مکفوف۔ مکفوف۔ اہتم۔ مخنق)
(۱۳) فاعلن۔ مَفَاعِیلُنْ۔ مفعولن۔ فع (اشتر۔ مکفوف۔ مکفوف۔ مخنق۔ مجبوب۔ مخنق)
(۱۴) فاعلن۔ مفاعیلن۔ مفعولن۔ فاع (اشتر۔ مکفوف۔ مکفوف۔ مخنق۔ اہتم۔ مخنق)

(۱) فاعلن۔ مفاعلن۔ مفاعیلن۔ فع (اشتر۔ مقبوض۔ مکفوف۔ مجبوب۔ مخنق)
(۲) فاعلن۔ مفاعلن۔ مفاعیلن۔ فاع (اشتر۔ مقبوض۔ مکفوف۔ ابتر۔ مخنق)
(۳) فاعلن۔ مفاعیلن۔ فاعلن۔ فعلُ (اشتر۔ مکفوف۔ مقبوض۔ مخنق۔ مجبوب)
(۴) فاعلن۔ مفاعیلن۔ فاعلن۔ فعولْ (اشتر۔ مکفوف۔ مقبوض۔ مخنق۔ ابتر)

(ڈاکٹر نثار علامی کے ایجاد کردہ یہ اٹھارہ اوزانِ رباعی اپنے ایجاد کردہ شجرۂ اشتر میں آتے ہیں) فاعلن والے اوزان پر تھوڑی سی روشنی ڈالنا بھی ضروری ہے۔

بحر ہزج مفاعیلن کے دو فروع مفاعیلُ (مکفوف) مفاعلن (مقبوض) جو عام زحافات کی رو سے معاقبہ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں۔

مفاعیلن (سالم) پر کف کے عمل سے مفاعیلُ حاصل ہوتا ہے اور اس مفاعیلُ (مکفوف) پر خرم کا عمل کرنے سے مفعولُ رکن بنتا ہے جسے اخرب کہتے ہیں اور صدر و ابتداء سے مخصوص ہے اسی طرح مفاعیلن (سالم) پر قبض کا عمل فرمانے سے مفاعلن موصول ہوتا ہے اور اس مفاعلن (مقبوض) پر خرم کا عمل کرنے سے فاعلن حاصل ہوتا ہے جسے اشتر کہتے ہیں اور یہ بھی صدر و ابتداء سے مخصوص ہے۔ حکم معاقبہ کے تحت مفعولُ کی جگہ فاعلن رکھ کر اوزان رباعی حاصل کرنے پر کسی قسم کا عروضی اعتراض وارد نہیں ہوتا اور یہ فاعلن والے اوزان رباعی کے مسلمہ قوانین پر پوری طرح سے اترتے ہیں۔

(فاعلن والے اوزان رباعی کی مزید تفصیل دیکھنا مقصود ہو تو ڈاکٹر نثار علامی کی تصنیف ... صفحہ نمبر ... سن اشاعت ۱۹۸۸ء ضرور ملاحظہ فرمائیے۔)

ایک بات ذہن میں رہے کہ ان اٹھارہ اوزان کے صدر و ابتداء کا فاعلن اشتر ہے لیکن حشو میں آنے والا فاعلن اشتر نہیں بلکہ مقبوض مخنق ہے۔ یہ وزن دیکھیے۔

فاعلن۔ مفاعیلن۔ فاعلن فعل (اشتر۔ مکفوف۔ مقبوض۔ مخنق۔ مجبوب) حشو دوم میں جو فاعلن نظر آتا ہے وہ اشتر بن کے نہیں آیا بلکہ زحاف تخنیق کا رہین منت ہے۔ مندرجہ بالا وزن پر اس وزن پر عمل تخنیق سے حاصل ہوتا ہے۔ وزن یہ ہے۔

فاعلن۔ مفاعیلُ۔ مفاعلن۔ فعل (اشتر۔ مکفوف۔ مقبوض۔ مجبوب)

اس مضمون میں ہم نے دو شجرے، شجرۂ اخرب و شجرۂ اشتر کو ترتیب دیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ خواجہ حسن قطان خراسانی کے شجروں کی اتباع کرنے سے بے راہ روی پیدا ہو گی۔ اور اسی طرح مفعولُ والے اور مفعولن والے اوزان کو الگ الگ سے لکھنے کے حق میں بھی ہم نہیں ہیں کیونکہ ہمارے نزدیک ایسا کرنا بھی الگ الگ ہی ملنے کے برابر ہے۔ اوزان رباعی میں مفعولن جو دراصل اخرب ہی ہے اور جو بہ زحاف تخنیق کی وجہ سے مفعولُ (اخرب) یہ شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس لیے ہماری سفارش یہ ہے کہ مفعولن کو مفعولُ والے اوزان یعنی شجرۂ اخرب اور فاعلن والے اوزان کو شجرۂ اشتر میں لکھنا چاہیے۔

ایک بات یہ بھی کہ علم عروض میں کلام کا موضوع اور ناموزوں کی پرکھ کی جاتی ہے اور

بحر و زحافات کا مطالعہ ہوتا ہے۔ اس میں شجرے ایجاد کرنا یا ایسی ویسی غیر حقیقی اصطلاحیں گھڑنا دامنِ عروض پر بار کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ قوطان نے غلط شجرے تشکیل فرما کر لوگوں کو گمراہ کیا۔ اس کے شجروں سے بچانے کے لیے ہم نے دو شجرے۔ شجرۂ اخرب و شجرۂ اشتر ترتیب دینا مناسب سمجھا۔ اس سے زیادہ ہمارا مقصد اور کچھ نہیں۔ اور یہ اوزان رباعی کے لیے صحیح اصطلاحی نام بھی ہیں۔ ہماری اس حقیر سی کاوش پر ہم کوئی عروض دانی کا دعوا نہیں کرتے۔ بس اتنا عرض کرتے ہیں ؎

کوئی کام ہی مجھ سے اچھا ہوئے بس — مرا نام بھی ہو ضرورت نہیں ہے

روسی کہانی
وکٹر آردوف
مترجم۔ **عطا عابدی**

سب اڈیٹر " افکار ملی"، ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵

مہمان ماں

ناشتے کے دوران الیکساندر ستو والوف نے، جو کہ ماسکو کے ایک دفتر میں کام کرتا تھا، اپنی بیوی سے کہا ۔" میں یہ بتانا ہی بھول گیا تھا کہ ماں کا خط آیا ہے اس خط میں ماں نے ہمارے ساتھ ایک ہفتہ قیام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے"

الیکساندر کی بیوی والنتینا نے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں۔ اس کے چہرے پر ناخوشگواری کے اثرات نمایاں تھے۔ وہ بولی " تو آپ مجھے یہ بتانا چاہتے تھے"

اس کے چہرے کی ناراضگی واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ ستو والوف کو اس بات کا پہلے سے اندازہ تھا۔ ان کی خانگی زندگی آئے دن کی بے مطلب لڑائی جھگڑوں سے بھر گئی تھی۔ اور کبھی کبھی تو کافی خطرناک صورت حال پیدا ہو جاتی تھی اس کی بیوی کو شکایت تھی کہ اس کا شوہر گھر میں بہت کم وقت گزارتا ہے۔ اسے اس بات کا یقین سا ہو چلا تھا کہ یہ دفتر میں بہت کام ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے ہے کہ وہ اب اس سے اوب چکا ہے۔

دراصل الیکساندر اپنی بیوی کی ناراضگی تنہا جھیلنا چاہتا تھا۔ اسے پسند نہیں تھا کہ کوئی اس معاملہ میں اس کے درمیان ہونے والے تنازعات کو جانے۔

الیکساندر کی اٹھارہ سالہ بیٹی کاتیا نے، جو اس کی پہلی بیوی سے تھی، تھوڑی ہچکچاہٹ کے ساتھ پوچھا ۔" لیکن دادی کو ہم ٹھہرائیں گے کہاں ؟" اس کے چہرے سے غصہ صاف ظاہر تھا۔ آج کل اس نے اپنے ایک ساتھی طالب علم میوا نیکولسکی سے ملنا جلنا بڑھا دیا تھا۔ کاتیا کو یقین تھا کہ اس کے پاپا اور ماں کو میوا کا اس طرح ہر روز گھر آنا پسند نہیں۔ اسے اس بات کا بھی یقین تھا کہ اس کے والدین کی طرح دادی بھی اس کے دوست کے خلاف ان کے ساتھ شامل ہو جائیں گی۔

اس درمیان والنتینا بھی بیٹی کے اس سوال کو دہرا رہی تھی کہ آخر ہم اس

بوڑھی عورت کو ٹھہرائیں گے کہاں؟

"وہ کاتیا کے کمرے میں سو سکتی ہے۔ کاتیا کچھ وقتوں کے لیے وووا کے ساتھ ٹھہر جائے گی۔" الیکساندر نے پردے کے ذریعے کچن کو منقسم کیے گئے حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جہاں اس کا بیٹا وووا مچھلیوں سے بھرے باؤل، چڑیوں کے پنجروں اور اپنے نو سال کی زندگی کے دوران اچھے خاصے اکھٹے کیے ہوئے سامان کے ساتھ رہتا تھا۔

اب وووا بھی مضطرب ہوا۔ ایسا لگا جیسے اُسے اپنا تمام سامان بہن کو سونپنا پڑے گا۔ اس نے غمزدہ ہوکر اپنے والدین کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کہنا چاہتا ہو کہ ـــ اچھا ہوتا اگر وہ وہیں رہیں۔

جب الیکساندر دفتر کے لیے جارہا تھا تو اس نے گھر کی ملازمہ دوسیا کو اس معاملہ میں اپنی سہیلی سے اونچے لہجے میں بات کرتے سُنا جو کہ اوپر کے فلیٹ سے کام کرکے لوٹی تھی۔

"مجھے پہلے ہی سارا دن کام کرنا پڑتا ہے" وہ شکایت کررہی تھی' چار افراد کا خاندان اور پھر کاتیا کا دوست لڑکا ہر دوسرے دن اس گھر میں ہوتا ہے" اس پر یہ بڑھیا اگلے ہفتے یہاں آنے والی ہے۔ اور تمھیں پتا ہے کہ وہ کہاں سے آرہی ہے؟ گاؤں سے، جیسے مجھے ان گاؤں والوں کا پتا نہیں۔ شکر ہے کہ میری مالکن بدھو نہیں۔ لیکن بڑھیا بتائے گی کہ وہ کیا چیز ہے۔ وہ تو مجھے چوتک ثابت کردے گی"

والنتینا اپنی ساس سے بڑے کمرے میں ملی۔ اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے پژمردگی سے پوچھا۔ "ماں' تم کیسی ہو"؟

بُڑھیا نے دیہی انداز میں اپنے ہاتھ سے مُنہ صاف کیا۔ اور والنتینا کے گالوں کو تین بار چوم لیا۔ الیکساندر نے ماں کو گلے لگایا اور کہا ـــ "ماں' ہم لوگوں نے طے کیا ہے کہ تم کاتیا کے کمرے میں رہو گی۔

دادی نے اپنا سر ہلا دیا اور دونوں ہاتھوں سے انکار میں جواب دیا۔ "مجھے کسی کی جگہ لینے کی ضرورت نہیں ساشینکا"۔ اس نے آہستہ مگر فیصلہ کن انداز میں کہا۔ کیا تمھارے پاس کوئی صوفہ یا سفری بستر ہے؟ میں اسی پر سوجاؤں گی۔ میں ایک بوڑھی عورت ہوں۔ مجھے رات میں دیر سے نیند آتی ہے۔ اور میں سورج نکلنے پر بیدار ہوتی ہوں۔ گاؤں سے لائی میری چیزوں کو تم کہیں پر رکھ دو اور میری فکر چھوڑ دو۔

وووا پہلے ہی اسکول جاچکا تھا۔ کاتیا بھی پڑھنے چلی گئی تھی۔ میاں بیوی بھی اپنے کام کے لیے چل دیے۔

جب دوسیا بازار سے لوٹی' اس نے دیکھا کہ سبھی برتن دُھل چکے تھے۔ ان کو قرینے سے کچن میں میز پر لگادیا گیا تھا۔ اور ایک صاف تولیے سے ڈھک دیا گیا تھا۔

...اب تھا ...فنا پیتر و فنا کا چہرہ کام کرنے کی خوشی میں دمک رہا تھا۔ وہ ایک تانبے کے برتن ...اچھی طرح پونچھ رہی تھی۔ دوسیا کے لیے یہ سب مسرت آمیز حیرانی تھی۔ "میرا ...م کس نے کرکے رکھا ہے؟" اس نے پوچھا۔
"میں نے بیٹی، میں نے۔" اگرافینا پیتر و فنا نے صفائی کرتے ہوئے جواب دیا۔
...شکریہ، میں آپ کا احسان مانتی ہوں۔ اب مجھے وہ روبل ڈھونڈنا ہے ...ر سب کمروں کی صفائی کرنی ہے۔
"کیسا روبل؟" بڑھیا نے پوچھا۔
"جب میں سامان خرید رہی تھی تب مجھے پتا چلا کہ میرے پاس ایک روبل ...م ہے، شاید میں نے کسی کو زیادہ دے دیا۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے کسی نے ...ٹھک لیا ہو۔۔۔"
دوسیا نے ایک محققانہ نگاہ سے بڑھیا کی طرف دیکھا۔ بہت ممکن تھا کہ ...اس نے کچھ کھویا ہی نہ ہو۔ بلکہ یہ جاننے کا ایک معصوم طریقہ تھا کہ بوڑھی عورت ...کیسی عورت ہے۔ کیا وہ اپنی بہو کو اس کھوئے ہوئے روبل کے بارے میں بتلائے گی؟۔
اگرافینا پیتر و فنا اس امتحان میں باوقار کامیاب ہوگئی۔ اس نے ہمدردی بھرے ...انداز میں سانس اوپر کھینچی۔ اپنا ہاتھ ہلایا جیسے کہنا چاہتی ہو کہ بھلے لوگوں سے ...اس سے بھی زیادہ کئی بار کھو جاتا ہے۔ اور بولی "اس کی قطعی فکر نہ کرو، لڑکی ...ن کے پاس دینے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ ان کا ہی کچھ کھونا نہیں۔ میں نے بھی ...ئی بار اپنے مالک یا مالکن کے کھوئے ہوئے سکے کی تلاش میں گھر کو اوپر سے نیچے کر دیا۔"
"آپ کا مطلب ہے کہ آپ بھی کہیں کام کرتی ہیں؟" دوسیا نے اور بھی رحمدل ہوتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں، بیٹی بالکل۔ میں گزشتہ پندرہ سالوں سے کام کر رہی ہوں۔"
بوڑھی ماں نے اب اس کا دل پوری طرح جیت لیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ایک گہرے دوست کی طرح بے تکلف ہو گئی۔
دونوں میں اب داخلی طور پر باتیں چلتی رہیں۔ جب تک کہ وودا اسکول سے واپس نہیں آ گیا۔
اگرافینا پیتر و فنا نے اپنے پوتے کا استقبال اتنی سادگی اور پیار سے کیا کہ لڑکے کو بہت فرحت محسوس ہوئی۔ اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے بالوں والے سر کو اس کے ہاتھوں سے سہلانے دیا۔
"دادی، میں آپ کو اپنے کھلونے اور سنہری مچھلی دکھاؤں گا۔"

" اچھا بیٹے، ٹھیک ہے۔ چلو۔"
ایک گھنٹے سے بھی زیادہ دیر تک وووا نے اپنی دادی کو اپنا سارا خزانہ دکھایا، جس میں اس کے ذریعے جمع کیے ہوئے دھات کے ٹکڑے بھی تھے۔ بوڑھی عورت نے پیار سے اپنی حیرت کا اظہار کیا، گہری سانس لی اور تعریف میں اپنے سر کو جنبش دی۔ وووا کے کہنے پر اس نے کئی طرح کے اسپرنگوں کی جانچ کی۔ اس نے سنہری مچھلی کی پھرتی اور گانے والی چڑیا کے ملائم پنکھ کی تعریف کی۔
دادی ماں نے سبھی کچھ اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ وووا کو اس سے اس طرح کی امید نہیں تھی، تب اس نے پوری طرح اپنی لاعلمی کا بہانہ کیا تاکہ لڑکے کو یہ دکھانے کا موقع مل جائے کہ وہ کتنا سمجھدار ہے۔
جب الیکساندر اور والنتینا شام کو گھر لوٹے تو انھوں نے بیٹے کو کھانے کے کمرے میں صوفے کے پاس دادی کے ساتھ دیکھا۔ جہاں وہ نیند کی جھپکی لے رہی تھی۔ وووا دادی کو بازو سے پکڑ کر بری طرح ہلا رہا تھا اور پوچھ رہا تھا
" دادی، بتاؤ تو کالؤ میں لومڑیوں کو کیسے پکڑتے ہیں؟"
"وہی عام طریقے سے،" اگرافینا پیتر وفنا نے سوتے سوتے جواب دیا۔
" لیکن یہ عام طریقہ کیا ہے؟ کیا وہ اس کے لیے جال بچھاتے ہیں؟ ایسا ہی نا؟"
" ہاں، ایسا ہی کرتے ہیں...."
" اور اگر کوئی ٹریکٹر ٹوٹ جائے تو کیا وہ اس کی مرمت بھی کرتے ہیں؟"
" بالکل"
" لیکن کیسے؟"
اس درمیان اس نے اپنے والدین کو دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے کہا۔
"دادی نے مجھے اجتماعی فارم کے بارے میں سبھی کچھ بتا دیا ہے۔ وہ وہاں کیا بوتے ہیں۔ اور جتائی کے لیے ٹریکٹر کا کیسے استعمال کرتے ہیں۔ کیسے پیڑ اگاتے ہیں۔ اور تالاب کھودتے ہیں۔ کیا میں اپنی گرمیوں کی چھٹیاں دادی کے ساتھ گزار سکتا ہوں؟"
اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اگر منع کر دیا گیا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگیں گے۔
جب ڈنر ختم ہوا تو دادی ماں کچن میں چلی گئی۔ اس نے دومیا کے کام میں ہاتھ بٹایا اور وہیں رکی رہیں۔ دومیا اونچی آواز میں اپنی زندگی کی داستان سناتی رہی۔ بعدازیں الیکساندر اپنے کمرے میں مصروف ہو گیا جبکہ والنتینا اپنی ایک

ں سے ملنے چلی گئی۔
اس درمیاں سیلوا گھر میں آ گیا۔ کاتیا کچن میں گئی اور اس نے شرماتے ہوئے
ں سے کہا ــ" میرا دوست یہاں آیا ہے، اور تم سے ملنا چاہتا ہے۔ کیا
س سے ملنے آؤ گی؟"
دادی بخوشی مان گئی۔ اس نے اپنا اسکرٹ اور سر کا رومال درست کیا
ا تیا کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی ــ" ہیلو نوجوان۔ ہاں پہلے مجھے
، جھلک دیکھنے دو۔ تم کتنے جوان اور خوب صورت ہو۔ کیا تم سچ مچ میری
؛ کو پیار کرتے ہو؟ شرماؤ نہیں، جواب دو۔ مجھ بڑھیا سے کیا چھپانا۔"
نوجوان اجوکہ کاتیا کے ماں باپ کی موجودگی میں یہاں آنے کا اپنا مقصد
ـ کام کاج ہی ظاہر کرتا تھاــ جیسے کبھی اسے کورس کی کتابوں کی ضرورت
ی تھی یا کبھی سکی کے لیے گریز لے آتا تھا۔ یا پھر کاتیا کو عجائب خانہ میں
ھ لے جانے کے لیے کہتا تھاــ اچانک مسکرایا اور نرم لہجے میں اس نے جواب
ــ" اگرافینا پیترو فنا، میں واقعی اس سے محبت کرتا ہوں۔"
دادی نے دونوں کو چوما۔ ان کے ساتھ تقریباً پانچ منٹ بیٹھی۔ سیلوا
، اس نے پوچھا کہ وہ کہاں رہتا ہے اس کے والدین کیا کرتے ہیں اور اسی
ا کی کئی اور باتیں۔ پھر وہ ان دونوں کو تنہا چھوڑ کر الیکساندر کے کمرے میں
۔ وہ بہت حساس تھی۔ اپنے پیچھے اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہاــ
۔ میں ابھی ابھی کاتیا کے دوست سے مل کر آئی ہوں۔ واقعی وہ بہت اچھا
ا ہے۔ ذہین، خوب صورت اور بہتر مستقبل کا جویا۔ میرا تجربہ مجھے بتاتا ہے
وہ کاتیا سے محبت کرتا ہے۔ پھر یہ تو میرے اپنے ہی بچے ہیں کب شادی
رہے ہو؟"
الیکساندر تھوڑے غصے کے ساتھ خیالوں میں کھو گیا۔ اسی درمیان اس
یوی کمرے میں آ گئی۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر بولاــ" ماں جاننا چاہتی ہے کہ
ا تیا کی شادی کب کر رہے ہیں؟ ان کے خیال سے سیلوا اس کا اچھا شریک
ت ثابت ہو گا۔"
" مجھے پتا نہیں۔ میرے خیال میں کاتیا ابھی شادی کے لیے کافی چھوٹی ہے"
یشیا نے روکھے پن سے جواب دیا۔
" ابھی بہت چھوٹی ہے؟" بوڑھی دادی نے حیرانی کا اظہار کیاــ" کیسے،
الواس عمر میں۔۔۔۔ اور تمھاری عمر کیا رہی ہو گی جب تمھاری شادی ہوئی تھی۔
والنتینا سوچ میں ڈوب گئی۔ اسے یاد آیا کہ اس کے سامنے بھی تقریباً
ی ہی صورت حال تھی۔ اس کے والدین نے رضامندی سے انکار کر دیا تھا۔

اور اسے نوجوانوں کی غیر ذمہ داری بتایا تھا۔۔۔۔ اسے خیال آیا کہ کس طرح اس وقت اس نے اس ناانصافی کو محسوس کیا تھا۔ نتیجتاً والنتینا آج پہلی بار بیٹی کی شادی کی منظوری کے متعلق سوچنے لگی۔

ماں کے یہاں آنے پر الیکساندر گھر پر ہی شام گزارنا چاہتا تھا۔ لیکن ایک گھنٹہ میں جب ساری گفتگو ہو چکی اور وہ صرف انھیں باتوں کو دہرا رہے تھے وہ باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ والنتینا نے مخالفت کی ۔۔ "میرا خیال ہے۔۔ اس نے مطمئن رہنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی۔۔" میں سوچتی ہوں کہ یہ دن تمھاری ماں کا پہلا دن ہے، تم گھر پر ہی رہتے تو اچھا ہوتا" جھگڑا کرتے وقت اس کا دھیان اپنے شوہر کے مقابلے میں اپنی ساس کے ردعمل کو جاننے کی طرف زیادہ تھا۔ اسے امید تھی کہ بلاشبہ لفظوں میں نہ سہی کم سے کم اپنے اطوار سے اس کی ساس اپنے بیٹے کے لیے ہمدردی جتائے گی۔ اور بہو کے لیے غصہ۔ لیکن اس کے برعکس اگرافینا پیتروفنا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کمرے کے گوشے میں چلی گئی، جہاں اس کا سامان پڑا تھا۔ وہاں اس نے کچھ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔

الیکساندر کمرے سے باہر چلا گیا۔ جب اس نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی، تب اس نے اپنی بہو سے کہا ۔ "آہ، کیوں اس کے لیے بے وجہ پریشان ہوتی ہو۔ تمھیں پتا ہے یہ مرد لوگ کیسے ہوتے ہیں ۔ اگر تم اسے اپنے ایپرن کی ڈوری سے باندھو گی تو وہ صرف اس سے بچنے کے مواقع تلاش کرنے لیکن جب تم اس کے جانے کی پروا نہیں کرو گی، وہ تمھارے ساتھ ایک بچے کی طرح چپکا رہے گا۔"

"یہ سچ ہے" لیکن میں اس کے بغیر بالکل اکیلا محسوس کرتی ہوں والنتینا نے جواب دیا۔

"تم بالکل درست کہتی ہو ۔ جیسے مجھے خبر نہیں۔ کبھی کبھی میں اپنے شوہر کا رات بھر انتظار کرتے کرتے ایک پلک تک جھپکا نہیں سکتی تھی۔ ممکن ہے اسے کام کے لیے رکنا پڑتا ہو، یا ہو سکتا ہے کہ موج مستی کے لیے رکتا ہو۔ لیکن میں حقیقتِ حال جاننے کے لیے بے تاب رہتی اور ان سبھی باتوں کو سوچتی رہتی جو کہ اس کے ساتھ پیش آ سکتی تھی۔ سارا گاؤں سویا ہوتا، کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیتیں۔۔۔۔۔ اور صبح ہونے پر وہ بالکل ٹھیک ٹھاک لوٹ آتا، ایسے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں"

اور اچانک والنتینا نے محسوس کیا کہ اس کی ساس کا کہنا بالکل درست ہے۔ آخر ان کی ازدواجی زندگی بغیر کسی خاص فکر یا پریشانی کے آرام دہ رہی تھی

بے بنا
راس لیے اب اس نے گھر کے کئی "مسائل کے بارے میں اپنی بوڑھی ساس ...
ی صلاح و مشورہ کرنا شروع کر دیا۔

الیسا ندر رات کو دیر سے گھر لوٹا۔ اس کی ماں نے دروازہ کھولا۔
جب اس نے ماں سے پوچھا کہ کیا سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے؟ تب اس کا
اب تھا" اور تمھیں کیا امید تھی؟ بلاشبہ سبھی کچھ ٹھیک ٹھاک ہے" اور
ی لوگ اب سو رہے ہیں "

"البیت بھی؟"
"بلکل کیا تم چاہتے ہو کہ وہ تمھارے استقبال میں صبح تک جاگتی رہے؟"
"کیا وہ مجھ سے ناراض تھی؟"
"مجھے یہ دیکھنے کا خیال نہیں رہا۔ ہم آدھی رات تک بہت سی باتیں کرتے رہے
پھر سونے چلے گئے۔"
"ماں سچ مچ تم دیوی ہو" الیکسا ندر نے پیار سے کہا۔
"میں دیوی نہیں میں تو جلدی ہی دوزخ کی آگ میں جلنے والی ہوں۔" بڑھیا نے
جواب دیا۔ اور ہونٹ سکوڑ لیے۔
"ایسا کیوں؟ تم تو ابھی سو سالوں تک جیوگی" الیکسا ندر یہ کہتا ہوا آرام گاہ میں
لیا۔

دادی کو جیسی کہ اس کی خواہش تھی ایک ہفتہ نہیں بلکہ کاتیا کی شادی کے بعد پندرہ
سے بھی زیادہ دن وہاں رکنا پڑا۔ سارا خاندان اسے اسٹیشن پر چھوڑنے گیا۔ در
سیا اسے اس وقت تک ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہتی رہی، جب تک گھر سے لے جانے
کی کار آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔
راستے بھر اور یہاں تک کہ اسٹیشن پہنچنے پر بھی سبھی لوگوں نے بوڑھی دادی سے کچھ
یہیں اور ٹھہرنے کے لیے اصرار کیا۔
"نہیں نہیں، میرے بچو" دادی ماں نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔ "میں یہاں بہت
دن رک گئی اب مجھے جانے دو۔ وہاں لوگ میرے پہنچنے کی راہ دیکھ رہے ہوں گے وہاں مجھے
بہت کام ہے لیکن خدانخواستہ اگر میرے آنے کی سخت ضرورت محسوس ہو تو فوراً
لکھنا یا تار بھیج دینا" میں آجاؤں گی"
گاڑی نے آہستہ آہستہ کھسکنا شروع کیا۔ سارا خاندان دادی ماں کے ساتھ جو کہ گاڑی
کی کھڑکی پر کھڑی تھی، چل پڑا۔ سبھی لوگ اداس تھے۔

عابد رضا بیدار کے نام ایک کھُلا خط

حرفہائے دو چند

بھائی عابد رضا بیدار صاحب   بہت بہت دعائیں

آج سے چار دن پہلے آپ کے خط 5470 مورخہ 25-8-9[illegible] کے ساتھ میری خود نوشت کا پہلا [illegible] [illegible] پر آپ کا جان لیوا نوٹ "حرفے چند" تھا ملا جس کا نام "گفتنی" [illegible] "گفتنی" تو ہے مگر بقول آپ کے "گفتنی" کی اشاعت [illegible] مولانا آزاد روایت کے مطابق تیس سال بعد ہوگی۔

آپ کو مجھ سے جو تعلق خاطر ہے اس کا کوئی جواب نہیں البتہ آپ نے اس کتاب کی اشاعت میں میرے [illegible] پر میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کا بھی کوئی جواب نہیں یعنی میری خود نوشت کا گلا گھونٹ کر اس کی بے روح لاش میرے سامنے ڈال دی۔

اس کی کیا ضمانت ہے کہ [illegible] صدی کے 23 ویں سال تک میں تو خیر کیا میرے بچے خدا [illegible] [illegible] [illegible] 2023 ء میں انشاء اللہ آپ بھی ہوں گے اور وہ بھی اور جب آپ کے ادارہ نشر و اشاعت پر اس دور کے روشن خیال ناقدین اور قارئین کے نشتر قلم جو لعنتیں برسائیں گے اور ضرب لگائیں گے تو آپ ان کو کیا جواب دیں گے [illegible] یقیناً اس وقت تالی بجانے کے لیے افسوس میں نہ ہوں گا اور میرے بچے بھی جو اکیسویں صدی کے روشن خیال [illegible] ہوں گے آپ کی کوئی معاونت نہ کریں گے اور آپ کو فرار کا راستہ نہ ملے گا۔ اس وقت آپ برسر اقتدار اور [illegible] [illegible] جامیں کریں اس وقت آپ کو اپنے اختیار خصوصی (Prerogative) پر سب سے زیادہ تاسف ہوگا آج کی [illegible] "ناگفتنی" سونے کے حروف میں شائع ہوگی اور آپ اس کی تائید کریں گے۔

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ میر   یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

زیر نظر خط کو کہیں جلد از جلد شائع کروا دیجیے یا زیر تدوین خود نوشت ہی میں اگر ممکن ہو تو اس کی کاپیاں چھپوا کر دیجیے۔ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آج کے قاری اور نقاد پر آپ کے "حرفے چند" پڑھنے کے بعد میرے "حرفہائے دو چند" کا کیا رد عمل ہوتا ہے [illegible]

پ۔ س۔ اس خط کے شامل کتاب ہو جانے سے میرا دل کچھ ہلکا ہو جائے گا

خیر اندیش

وامق جونپوری

لال کوٹھی، [illegible]

[illegible]

8 3 93

سہ ماہی

نیا ادبی سفر دہلی

مدیر: قمر رئیس

تبصرہ نگار: [illegible]

[illegible]

قیمت ۲۰ روپے

... قمر رئیس گوال نے گذشتہ دنوں ایک تقریب میں تقریر کرتے ہوئے
[اد]بی رسالوں کے تعلق سے کہا "اردو کے رسالوں میں عام طور پر اردو ادب
[کا] ... نہیں ہوتا" صورت حال بھی کچھ ایسی ہی ہے لیکن ادب کے بطور بھی
[چ]ند رسالے شائع ہو رہے ہیں۔ جن میں اردو ادب کے علاوہ بھی اور بہت کچھ
[ہو]تا ہے۔ ایسا ہی ایک رسالہ ہے سہ ماہی "نیا ادبی سفر" جس کا پہلا شمارہ
[شا]ئع ہوا ہے اس سہ ماہی رسالے کے مدیر مشہور نقاد پروفیسر قمر رئیس ہیں
[انہ]وں نے اس رسالے کو سجانے سنوارنے اور ہمہ جہت بنانے میں خاصی محنت
[کی ہ]ے۔ اس کا نقش اول پرکشش اور جاذب نظر ہے۔ اداریہ میں ملک کی تازہ
[صو]رت حال، اس کے متعلق سے ارباب علم و دانش کے فرائض صحت مند اور
[ارج]مند ... اور صالح اقدار کے احیا کی ضرورت پر زور دینے کے لیے بڑا دل سوز
[اسل]وب اختیار کیا گیا ہے۔ اداریہ کے علاوہ اس شمارے میں شامل صفدر
[...] کا مضمون بھی انہیں موضوعات کا احاطہ کرتا ہے اور ایک بالغ نظر
[باشع]ور کے خیالات کا ترجمان ہے۔ مضمون جاری ہے۔ دوسرے مضامین میں
[...] پر لطف الرحمن کا مضمون نہ صرف پر کشش ہے بلکہ متضاد نقاط
[نظ]ر کے درمیان ہم آہنگی اور یک گونہ بیگانگی کی خلیج کو کم کرنے کی بڑی صحت
[من]د کوشش ہے ڈاکٹر عتیق اللہ نے خواتین کی شاعری کے حوالے سے فکری
[اسال]یب کی تلاش بڑے سلیقے سے کی ہے۔ شمارہ میں ۴ افسانے شامل ہیں۔ حسن
[م]ظفر کا افسانہ "در اور دیواریں" تازہ ملکی صورت حال پر لکھا ہوا اچھا افسانہ
[ہے] افسانہ بہت لمبا نہیں لیکن خاصے طویل وقت تک اپنے موضوع کے تعلق
[سے] سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ رضا الجبار (لوٹر نٹو) کا افسانہ "کھلا دروازہ" دو تہذیبوں
[کے] تضادات اور یکسانیتوں کا بیک وقت خوب صورت اظہار ہے۔ "کھلا خط"
[کے] عنوان سے کمال صدیقی صدیقی کی ایک تحریر سید عاشور کاظمی کے نام اس شمارہ

میں شامل ہیں۔ جس میں صدیقی صاحب نے عاشور کاظمی کو آڑے ہاتھوں
ہے۔ لیکن پورا مضمون پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے
تھوڑے سے سینئر ہونے کا ناجائز فائدہ بھی اٹھایا ہے جسے بہت زیادہ سر
جاسکتا۔ ہندی کے مشہور رسالے "ہنس" "خود نوشت وفائیہ" کا
کالم شروع کیا ہے۔ جس میں اکثر بزرگ ادیبوں نے اپنے "وفاتیے" لکھے
جو کمندر پال کا خود نوشت وفاتیہ جو اس شمارہ میں شامل ہے۔ ہنس کے اسی
کی کڑی ہے۔ لیکن قند مکرر کا لطف نہیں دیتا۔ گذشتہ سال پروفیس
قمر رئیس نے شمالی امریکہ کا سفر کیا تھا وہاں کی یادوں پر مشتمل ان کا
شمالی امریکہ میں اردو کی محفلیں جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قمر
اگر اس طرح کی بھی دو ایک کتابیں دے دیں تو تشنگان نثر شستہ
کی آسودگی و سیرابی کا کاکچھ انتظام ہو جائے۔

شاعری کے حصے میں پندرہ نظمیں اور تیرہ غزلیں شامل ہیں
کا حصہ غزلوں کے مقابلے خاصا وقیع ہے۔ جواں مرگ امریکی شا
سلویا پلاتھ کی نظموں کا ترجمہ ڈاکٹر عبدالحئی نے خاصے تخلیقی اند
کیا ہے۔ اس کے علاوہ افتخار نسیم کی نظمیں بالخصوص ایک
کہانی، پہلی شیو، نرمان وغیرہ اچھی نظمیں ہیں۔

تین کتابوں دو گز زمین (ناول) باد شمال بخش لائل پوری (ش
مجموعہ) اور بہاؤ مستنصر حسین تارڑ (ناول) پر عالمانہ تبصرے اور تازہ ش
ہونے والی ۲۲ کتابوں کا تعارف جو اپنے اختصار کے باوجود ان ک
پر بڑا معقول سا تبصرہ ہے۔ شامل رسالہ ہے۔

مجموعی طور پر نیا ادبی سفر کا یہ پہلا شمارہ اپنے look آؤٹ اور م
دونوں حیثیتوں سے بہتر ہے امید افزا ہے۔ شمارہ کی وقعت میں اضا
کا باعث اردو کے نئے مراکز امریکہ اور کناڈا کے قلم کاروں کی تحریریں
ہیں۔ ہندستان کے شعراء (خصوصاً وہ غزل گو جن کی شاعری ر
رسالہ ہے) کے مقابلے ان کی تازگی بیک وقت قابل تعریف بھی ہے
قابل فکر بھی۔

اقبال: شاعر و مفکر

مصنف: نورالحسن نقوی
مبصر: ڈاکٹر قمرالہدیٰ فریدی
قیمت: ۸۵/- روپے
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

اسے حسنِ اتفاق ہی کہیں کہ منزل کو نشانِ منزل سمجھ کے گزر جانے کا

اقبال کی شاعری میں توجہ طلب فنی عناصر کی نشان دہی کرتے ہوئے نوانا پرشکوہ لب ولہجہ، شاعری کی تبسری آواز یعنی حسب موقع کسی کردار کی زبان سے اظہار خیال، حقیقت حسن، چاند تارے، ستارہ، دو ستارے، شبنم اور ستارے، شعاع آفتاب وغیرہ نظموں کے تمثیلی انداز بیان، استفہام نکسری، تفحص الفاظ، صوتی حسن، نغمگی، رومانی عناصر۔ طویل نظموں میں غزل کے نازم کے استعمال، رموز و علائم استعارے، پیکر، ڈرامائی عناصر اور تلمیحات سے بحث کی گئی ہے۔ جمالیات نقوی صاحب کا خاص میدان ہے۔ چند سال قبل انھوں نے اپنی کتاب "فلسفۂ جمال اور اردو شاعری" میں حسن و فن کے جو مباحث اٹھائے تھے۔ اب ان مباحث کی روشنی میں اقبال کی تقریباً تمام اہم نظمیں: خضر راہ، طلوع اسلام، سید کی لوح تربت، والدہ مرحومہ کی یاد میں، شکوہ، جواب شکوہ، شمع اور شاعر (بانگ درا)، جبریل و ابلیس، لینن خدا کے حضور میں، مسجد قرطبہ ساقی نامہ، ذوق وشوق (بال جبریل) شعاع امید (ضرب کلیم) اور ابلیس کی مجلس شوریٰ (ارمغان حجاز) کو الگ الگ مطالعے کا موضوع بنا کر تنقید کا عملی نمونہ بھی پیش کر دیا ہے۔

اقبال کی غزل کا حسن، اس کا نشان امتیاز اور دلکشی علاحدہ باب میں زیر مطالعہ آیا ہے۔ تجزیے کے لیے کئی غزلیں چن لی گئی ہیں اور ان کے حوالے سے یہ نتائج اخذ کیے گئے ہیں کہ اگرچہ کئی اچھی غزلیں بانگ درا میں بھی ہیں لیکن فنی کمال بال جبریل کی غزلوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ فکری عنصر فلسفۂ عشق، رجائیت شوخیٔ گفتار، بلند آہنگی، موسیقیت اور تسلسل بیان ان غزلوں کی خصوصیات ہیں۔

تفہیم اقبال کی کوشش ان کے فکری سرچشموں سے آگاہی کے بغیر ادھوری ہی نہیں رہ جائے گی، اس خیال نے کتاب میں ایک اور علاحدہ باب کا اضافہ کرایا ہے جس کا مقصد یہ وضاحت ہے کہ اقبال نے شعوری طور پر کن مفکرین سے فیض اٹھایا، کن سے جزوی طور پر اتفاق یا اختلاف کیا اور کن اصحاب کے تصورات سے فکر اقبال کی مماثلت امر اتفاقی ہے۔ اقبال کو شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود سے شروع میں اتفاق اور بعد میں اختلاف ہو گیا۔ حافظ کے کلام میں بھی انھیں نفی خودی مضمر نظر آئی اس لیے وہ بھی ان کی تنقید کا نشانہ بنے۔ وحدت الوجود کے مقابلے میں نظریۂ وحدت الشہود نے اقبال کو متاثر کیا۔ انھوں نے شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کو ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان کہہ کر یاد کیا۔ گوئٹے کی نکتہ دانی کا بھی اعتراف کیا۔ بعض ناقدین نے اقبال کے مرد مومن میں نطشے کے فوق البشر کے اثرات دیکھنے کی کوشش کی ہے لیکن مقدم الذکر ثانی الذکر کا چربہ سمجھنا درست نہیں۔ نطشے کا فوق البشر صرف طاقت

کی زبان جانتا ہے۔ مرد مومن نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو کی عمدہ مثال ہے۔ پھر دونوں میں سب سے بڑا فرق کفر واسلام کا ہے اور اس فرق نے انھیں قطعی الگ صورتیں دی ہیں۔ اس کی وضاحت نہایت تفصیل کے ساتھ ماہرین اقبالیات نے کی ہے۔ نقوی صاحب نے بھی اس امر سے اتفاق کیا ہے اور بتایا ہے کہ جن علما نے اقبال کو براہ راست متاثر کیا ہے وہ شیخ جلال الدین رومی ہیں۔ ان کے تصور عشق و عظمت انسان اور فلسفۂ خودی اور برگساں کے نظریۂ وجدان و تصور زمان مسلسل کے اثرات کلام اقبال میں صاف طور سے محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ تاہم یہ بھی ہے کہ اقبال نے مشرق و مغرب کے علما کے خیالات کے مطالعے کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ قرآن کریم سے روشنی حاصل کی ہے اور یوں ایک ایسے نظام فکر کو اپنی شاعری کا محور بنایا ہے جس کی بنیاد اسلامی ہے۔ یہ نظام فکر کن عناصر سے تشکیل پاتا ہے اسے فلسفۂ اقبال کے تحت نقوی صاحب نے مطالعہ کا موضوع بنایا ہے اور فلسفہ و فکر کی کئی اصطلاحیں مثلاً مسئلہ جبر و قدر، زمان و مکان، اثبات وجود وغیرہ سے بحث کی ہے۔

موضوع فکر و فلسفے کے دقیق مباحث ہوں تو انداز بیان ثقیل اور خشک ہو ہی جاتا ہے۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے بلکہ بعضوں کے نزدیک نیک فال ہے مگر ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کتاب کا کوئی ورق مشکل نہیں ہے۔ بڑی سے بڑی بات کو انتہائی ہوشیاری کے ساتھ آسان زبان اور دل نشین اسلوب میں پیش کر دیا گیا ہے۔ پروفیسر نورالحسن نقوی گزشتہ پچیس برسوں سے اپنی کتابوں اور کلاس روم میں مشکل مسائل کو پار کر دینے کے کچھ ایسے عادی ہو گئے ہیں کہ اب یہ عادت ان کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں کچھ کہنا فضول ہے —
"اس پہ یہ بات بھی آتی کہ علت جاتی دلے عادت نہیں جاتی"

ظریف شعرائے بدایوں

مرتب: طیب بخش بدایونی
قیمت: تیس روپے
مبصر: ڈاکٹر سیفی پریمی
پبلشر: طیب پبلشنگ ہاؤس، پیلی کوٹھی محلہ سوتھا۔ بدایوں (یو پی)
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

میں نے اپنے دوست نصیر خاں جرنلسٹ کو یہ کتاب دکھائی۔ وہ مسکرانے لگے۔ میں نے کہا۔ کیوں؟ کیا بات ہے؟ وہ بولے:۔ "طیب تو انگلش ریٹر

"ظریف شعرائے بدایوں" تلاش اور محنت سے ترتیب دی گئی ہے
بحیثیت مجموعی اس کتاب کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ عہد بہ عہد
سماجیات کی تاریخ ہے۔ ایسے شعرا بھی ہیں جنھوں نے غربت، تنگ دستی
اور عذاب میں زندگی گزاری ہے۔ ان کے کلام میں ان کی زندگی سانس لے رہی
ہے۔ مزاح اور طنز نگار اصلی فن کار ہوتے ہیں جو سماج، نظام حکومت اور
جابر اقتدار سلطنت سے ٹکراتے ہیں۔ سماج کی بہبود و فلاح کی خاطر اپنی زندگی
اور اہل و عیال کی کامرانیوں کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ ان کا لہجہ کیسا بھی ہو وہ سچا
ہوتا ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ NATIONAL PSYCHE کو یہی طبقہ سمجھتا ہے۔

اس کتاب کا قابل توجہ اور لائق تحسین حصہ ان صفحات کو محیط ہے
جس میں طیب بخش بدایونی نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے
مزاح و طنز کا آغاز، رفتہ رفتہ ترقی اور ارتقائی منزل تک نشان دہی کی ہے۔
ہر دور اور شاعروں پر بے لاگ تنقید کی ہے۔

اس موضوع سے متعلق جملہ اقسام کی تعریف درج کی ہے۔
مواد ص ۹ سے ۴۰ تک پھیلا ہوا ہے۔ اردو اصطلاحات کے ساتھ انگلش
اصطلاحات لکھی گئی ہیں۔ مغربی شاعروں، مفکروں، عظیم شخصیات اور بعض
نامور پرائم منسٹر (انگلینڈ) کے اقوال کا حوالہ بھی ہے۔

تبصرہ میں گنجائش نہیں اس سے اندازہ کیجیے۔ خالص یا مازک مزاح،
مزاحیہ، رزمیہ، ہنسی اور قہقہہ کی مختلف اقسام، ۔۔۔
گلو گیر ہنسی، گلکاری یا قلقاری وغیرہ
اکثر مقامات پر نفسیاتی عناصر اور ادب آموزی کے نکات ہیں۔

ختم المرسلین

نام : عروج زیدی مرحوم
ناشر : عرفان زیدی بدایونی عروج زیدی
روڈ، رامپور قیمت ۱۲ روپے
مبصر : ڈاکٹر ... اعظمی

جناب عروج زیدی مرحوم رامپور کے
کہنہ مشق، قادر الکلام اور شیریں بیان شاعر
تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے لائق فرزند
عرفان زیدی بدایونی صاحب اپنے والد کا نام
اس طرح روشن کر رہے ہیں کہ ان کے کلام کو زیادہ
سے زیادہ اشاعت کے ساتھ ان کے متعلق

اہل قلم سے مضامین اور تبصرے لکھوا رہے ہیں
"ختم المرسلین" کے عنوان سے عرفان
صاحب نے جناب عروج کا نعتیہ کلام جمع کر کے
کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ اس مجموعے میں
مختلف انداز سے شاعر نے رسول اللہ صلی اللہ

اڈیٹر کتاب نما کے نام

(مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

جنوری کا "کتاب نما" زیرِ مطالعہ ہے۔ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی صاحب نے مہاراشٹر کی بولی کو "مہاراشٹری" لکھ دیا ہے جو غلط ہے۔ مہاراشٹر (اور اسی کا ایک علاقہ مراٹھواڑہ بھی ہے) میں بولی جانے والی زبان مراٹھی ہے۔ انور کمال کے افسانے "جنکشن" میں "کوہ جبیل" کی ترکیب بھی کھٹکی۔ غار کی جمع "غاروں" بھی عجیب سی محسوس ہوئی۔ سید احمد صاحب کے مضمون "ایودھیا کے بعد" نے آنکھیں نم کردیں۔

یحییٰ نشیط، کل گاؤں

"کتاب نما" ماہ نومبر ۹۲ نظر نواز ہوا اس سوغات کا دلی شکریہ۔ آپ کے اس احسان کا میرے پاس کوئی بدل نہیں۔ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کو مہمان مدیر کی سند دے کر آپ نے مجھے خوش کیا۔ ان کی شخصیت نے مجھ کو بہت متاثر کیا ہے۔ ان پر کراچی کے ایک جریدے "طلوع افکار" نے پورا گوشہ پیش کیا تھا۔ وہاں میں نے ان کے کئی مضامین دیکھے اور اندازہ ہوا ڈاکٹر رستوگی وہ نقاد ہے جو صرف اور صرف تخلیق کو دیکھ کر لکھتا ہے۔ شخصیات سے مرعوب نہیں ہوتا۔ جاپان کے ایک کنز الجہات "ادیب، افسانہ نگار، شاعر، محقق ڈاکٹر کہ مکریاں لکھنے والے اور شیکسپیئر کے مترجم اور زباں دانی کی ایک کتاب کے بارے میں انھوں نے جو تبصرہ لکھا وہ یہاں کے ادبی حلقوں میں بڑی دلچسپی سے دیکھا گیا۔ یہ درویش عالم اب ضعیفی اور تنہائی میں دن گذار رہا ہے۔ میں نے اپنی کتاب "اطراف" انھیں بھیجی تھی۔ ان کا خط ملا پہلا ہی جملہ تھا —— آپ کی شاعری بڑی شاعری ہے۔ صحت نے اجازت دی تو ضرور میں لکھوں گا۔ آگے اور کتب کی باتیں تھیں۔ یہ شخص خوش کرنے کے لیے نہیں لکھتا، میں اس لیے اسے "منیم" کہوں گا۔ فن کا سودا گر نہیں ہے۔ اس عالم کو میرا سلام۔

"کتاب نما" ملنے پر رسید بھیجنے کی عادت بڑی ہوئی ہے۔ یہ سطور اسی لیے لکھ رہا ہوں شاعری میں اس بار پھر کمال کے نمونے دیکھے۔ ایک صاحب نے خط لکھا ہے —— حصہ نظم و غزل میں انتخاب کو کم کرنے کی باتیں لکھی جا رہی ہیں اس میں جلد بازی کی خاص ضرورت نہیں نیا ادب آسمان سے نازل نہیں ہوگا۔ نئے لکھنے والوں کو اس طرح ڈانٹنا ٹھیک نہیں —— ٹھیک ہے صاحب سارے نئے لکھنے والوں (یعنی خراب لکھنے والوں) کو ادب میں سات خون معاف کر دیجیے تاکہ پختہ کار ہو کر "اچھی کارکردگی" کا مظاہرہ کریں۔ اور ان صاحب کو بلا وجہ پریشانی ہو رہی ہے آپ تو پہلے ہی کافی LENIENT ہیں۔ اسی شمارے میں ان کی مرادیں پوری کر رکھی ہیں مثلاً سلاست کی مثال —— "ہر رت میں، میں میرا احساس پل گیا (رحمت اللہ جری)

ایسا کریں گے ویسا یہ ہم سوچتے رہے (")

تقطیع سے باہر ہونے کی مثال: اس کا وجود ہم سے ہے ہم اس کے شریک جب (صرف شریک پڑھا جا سکتا ہے) فرمان - جرم صاحب کا ہے)

ایک شیرینی سی آپ کے شیریں دہن میں ہے (شیرنی ہی پڑھا جاتا ہے) شاعر ہیں عامی کاشمیری۔

محاورے کی مثال۔ دل میں یاد اس کی جو آ گزری ہے (آ گزری غور طلب ہے) شاعر ہیں پروفیسر افتخار سلیم۔

... کی مثال: ۔ بستر سے تو باہر آ رستہ چل کر آئے کا عیب پر ملد)

پورے شمارے میں سب سے اچھی کاوش بلبل کاشمیری کی مزاحیہ غزل ہے۔ سارے شعر اچھے تھے اور اچھے شاعر کی نشانی یہی ہے کہ مطلع سے آخری شعر تک وہ پورے کس بل کا اظہار کرے

مریض کی حالتیں سن کر مجھ کو غشی نہ آ جائے
کرو بیمار کی باتیں نہ تم بیمار کے آگے

عملی اعتقادیات اچھا مضمون ہے خلیل الرب کو مبارک باد۔

احمد منیر صدیقی ۳/۲۰-۱۰ ایچ۔ سیر کالونی۔ کراچی۔

شجاع صاحب کو عنوان صاحب سے شکایت ہے کہ انھوں نے غالب کے مصاریع۔

(۱) یعنی یہ پہلے ہی نذر امتحاں ہو جائے گا۔
(۲) کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوسی کس لیے
(۳) خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

میں ترتیب سے یعنی، قدم بوسی اور خاموشی کی "ی" کو اپنے جیرن کن مفروضوں کے سہارے ساقط ہوتے ہوئے دکھلایا ہے۔

شجاع صاحب نے بطور حوالہ میر، مومن، ذوق، داغ کے اشعار نقل کیے ہیں اور ان میں کے، کی، ہے ہوتے، کوئی، کو وغیرہ کے حروف علت کو تقطیع سے گرتے ہوئے دکھلایا ہے۔ مثلاً

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا (داغ)

میں بقول شجاع کی "ی" ساقط ہوتی ہے اور پھر یہ مطالبہ کہ اگر "سے"، "کی" "ہے" کا گرانا جائز ہے تو یعنی کی "ی" بھی گرنا چاہیے۔ میرے بھائی! یہ عنوان صاحب کا مفروضہ نہیں۔ تمام معتبر عروضیوں کا متفقہ اور مسلمہ اصول ہے کہ فارسی عربی الفاظ کے حروف علت کا سقوط جائز نہیں البتہ ہندی الفاظ کے حروف علت ضرورۃً گرائے جا سکتے ہیں۔ میں سے کو کا۔ کے کی ہے ہیں تھا تھے تھی اور اس قبیل کے افعال ناقصہ نیز حرف جار وغیرہ ہے تو متفقہ طور پر حروف علت کا گرانا جائز ہے۔ البتہ الفاظ اور افعال سے یعنی ہندی افعال والفاظ سے بھی حروف علت کا گرانا بعض عروضیوں نے تو جائز مانا ہے لیکن بعض معتبر عروضیوں نے یہاں بھی کراہت کا اظہار کیا ہے۔ آپ نے دل لگا کے عروضی اور فنی مسائل کبھی نہ پڑھے۔ پڑھتے تو وہاں بھی عنوان صاحب کو چ انا ہم تک بھی کوئی نیند سے بوجھل آنکھیں کی گرفت کرتے ہوئے پاتے۔ صفحہ ۲۳

آپ اپنا مقدمہ ٹھیک سے قائم نہ کر سکے۔ آپ کو داغ کے کلام سے ذوق کی کلام سے میر کے کلام

سے یا دوسرے اُن شعراء کے کلام سے جو بحیثیت استاذ فن شہرت رکھتے ہیں۔ فارسی، عربی الفاظ کے حروف علت کے سقوط کی مثالیں جمع کرنی تھیں۔ یہ کام آپ سے نہ ہوسکا اور آپ مقدمہ ہار گئے۔ (پولیس اکثر مقدمہ ہار ہی جاتی ہے) البتہ آپ کا یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ "حرف علت میں ہندی و عربی فارسی بنیادوں پر تفریق اور کہنا کہ ایک کا دبنا جائز ہے دوسرے کا نہیں محض ہوائی بات ہے"۔ میری بھائی! ہم نے اپنی طرف سے ہندی کو کم رتبہ سمجھ کر اس پر یہ زیادتی نہیں کی ہے۔ ہندی کے ان شعرا سے دریافت کیجیے گا جو پابند شاعری کرتے ہیں۔ ہندی کے شعراء ضرورت شعری کے تحت ہر سو (हरसू) کو دیرگھ (दीर्घ) یا اس کے برعکس بنا لیتے ہیں۔ تو ہم نے ایک سہولت کو جو ہندی زبان میں جائز تھی اپنے لیے بھی جائز مان لیا ہے۔ اب آپ کی کٹ حجتی ختم ہو جانی چاہیے۔

آپ نے ذوق کے مصرعے "زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو" نقل کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "اصولی طور پر عروض میں اضافت کی جگہ ی کا حرف یعنی آواز شمار کی جاتی ہے۔ لہٰذا یہاں زبانِ خلق زبانے خلق ہوا۔ اس طرح یہاں بھی ایک طرح سے حرف علت کا سقوط ہے"۔ میرے بھائی! یہ اصول آپ کو کس نے بتایا۔ مجھے یقین ہے وہ بھی عروض سے نابلد ہوگا۔ تمام عروضیوں کی نگاہ میں اگر اضافت اس طرح آئے کہ اسے محض حرکت کی طرح پڑھنا پڑے تو یہ سراسر حسن ہے۔ بصورت دیگر اگر کسرہ اس قدر کھینچ کر پڑھا جاتا ہے کہ بجائے خود ایک حرف ہو جاتا ہو تو یہ عیب شمار ہوگا۔ یعنی اعتبار سراسر طریقۂ قرأت کا ہے اور ذوق کا مذکورہ مصرع نہایت فصیح ہے۔

رہی یہ بات کہ وصال کا لطف صرف الف ہی کیوں اٹھائے۔ عین اور "ہ" نیز "ہ" کو اس کا چانس کیوں نہ دیا جائے اصول مساوات تقاضا بھی ہے مگر دیکھیے بعض ذات اور قبیلے کو ریزرویشن کا فائدہ دینا پڑتا ہے اور الف یہ فائدہ حاصل ہے۔ پھر یوں سمجھیے کہ الف حرف علت ہے۔ آپ کے دوسرے مؤکلین کو یہ امتیاز حاصل نہیں۔ آپ یا دوسرے لوگ اگر کہتے ہیں کہ عین اور الف کے صوتی کردار میں کچھ فرق نہیں۔ اور بقول آپ کے "ٹیک اور صاع علا"۔ الف کے علاوہ کسی بھی اور حرف کے وصل کے حق میں نہیں، تو یہ گویا آپ کی دانست میں زیادتی ہے۔

آپ کو ایک مصرع میرؔ کے کلام میں مل گیا ع سرہانے میر کے آہستہ بولو، اور آپ نے اسے وصل کا معاملہ سمجھ لیا حب کہ یہ لفظ دونوں تلفظ کے ساتھ یعنی سرہانے اور سرھانے رائج ہے۔ آپ کو الجھن ہوگی کہ آپ تو صرف طَرح اور طُرح نیز گُلستان اور گُلِستاں جانتے تھے یہ سرہانے کہاں سے سرھانے کھڑا ہو گیا؟ اور میں آپ سے عرض کروں گا کہ ایسا سوال کھڑا کر کے آپ نے زبان کے تشکیلی مزاج نیز اصول لسانیات سے بالکل بے بہرہ ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ نیز جو لوگ کہتے ہیں کہ عین اور الف کے صوتی کردار میں فرق نہیں ہے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ت اور ط نیز ذ، ز، ظ اور ض وغیرہ میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ ان لوگوں کو اگر "زکور وانات" لکھنے دیجیے گا تو وہ "زکور وا ناس" لکھیں گے اور پھر یہیں پر بات ختم نہیں ہوتی۔ تان ٹوٹتی ہے جا کر رسم خط کی تبدیلی پر۔ یہ لوگ اردو کے دشمن نہیں

لسانیات دوست ہیں۔ اردو کی خیر سے واقف
نہیں اور واقف ہیں تو ذاتی مفاد کے لیے
زبان کو قربان کردینا چاہتے ہیں۔ آپ اس
کی اجازت دیں گے؟

نمبر ا مسئلہ تقابل ردیفین کا ہے مگر پہلے
یہ مسئلہ کہ اسے آپ نے اسے بار بار ردیف عین
لکھا ہے۔ مضمون میں ایک آدھ جگہ یہ صورت
ہوتی تو اسے کتابت کی غلطی مان لیتا لیکن کئی
مقام پر ردیف عین سے سابقہ پڑتا ہے۔
ہم لوگ ردیفین سے واقف ہیں۔ یہ ردیف
عین کیا ہے؟ خیر میں عرض کر رہا تھا کہ تقابل
ردیفین کو اساتذہ نے عیب ٹھہرایا ہے مثلاً
"یہ ایک میں کہ تری آرزو ہی سب کچھ ہے
وہ ایک تو کہ مرے سائے سے گریزاں ہے"
تقابل ردیفین کے عیب سے داغدار ہے۔ آپ
نے زحمت اٹھا کر کسی ایک ہی کتاب سے تقابل
ردیفین کے بارہ نمونے جمع کر لیے اور خوش ہیں
کہ یہ عیب نہ رہا بلکہ خوبی ہو گیا۔

میری نظر سے کتاب نما (اگست ۹۲ء) نہیں
گزرا۔ معلوم نہیں عنوان صاحب نے ایطاء یا
تعقید کے سلسلے میں مکتبی عروض کی کن کن
جعلی پابندیوں کا ذکر کر دیا ہے۔ لیکن عروضی
اور فنی مسائل میں نے بہت توجہ سے دیکھی
ہے۔ مذکورہ عیوب کے سلسلے میں عنوان صاحب
کی گفتگو بہت مدلل ہے اور اس بنا پر کہہ سکتا
ہوں کہ عروضی قاعدے سے ہٹ کر انھوں نے
کوئی بات نہیں کہی ہوگی۔

مجھے اعتراف ہے کہ عنوان صاحب کی
بعض تنقیدیں جارحانہ ہوتی ہیں۔ یہ بھی تسلیم
کر کہ وہ انتہاپسندی سے کام لیتے ہیں۔ بعض
مسائل پر میں نے کھل کر اور شد و مد کے ساتھ
ان سے اختلاف کیا ہے۔ خصوصاً شکست ناروا
کے سلسلے میں جب وہ یہ کہتے ہیں کہ تمام مثمن
الارکان سالم بحروں میں شکست ناروا کے وجود
کا امکان ہے تو یہ بھی نہیں دیکھتے کہ خود ان
کے اشعار لہولہان ہو رہے ہیں۔ اصغر گونڈوی
کی بحر ہزج مثمن سالم کی غزلوں میں شکست
ناروا کے عیب کی نشان دہی کرتے ہیں، تو
یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ خود ان کے استاد
اثر گنوری بھی اس چھری سے ذبح ہو گئے
جاتے ہیں۔ لیکن بقول آپ کے "نچے مطہوئے"
کے سلسلے میں انھوں نے اس باب میں بھی اتنی
مدلل اور ایسی منطقی گفتگو کی ہے کہ ان کا
بدترین دشمن بھی اس سے صرفِ نظر نہیں
کر سکتا اور ان حالات میں میری نظر میں ان
کی تصویر اس جج کی سی ہو جاتی ہے جو قانون
سے بندھا ہوتا ہے اور اس ملزم کو بھی جسے
اس کا دل معصوم جانتا ہے مضبوط شہادتوں
کی روشنی میں مجرم ٹھہراتا ہے اور سزا دیتا ہے
یوں عنوان صاحب کی قدر و منزلت میری
نگاہ میں بڑھ جاتی ہے۔

ہماری شاعری کا جو حال ہے وہ تو
خیر ہے ہی اور شاعری کے اصول، ضابطے بھی
ہمیں مشکل، مگر کیا ہمیں نثر پر بھی عبور ہے؟
مجھے تو نہیں ہے ممکن ہے آپ کو ہو لیکن مضمون
ہذا شاہد ہے کہ نثر پر بھی آپ کی گرفت ڈھیلی
ہے ورنہ آپ ان جملوں پر غور کرتے:

"بعض دوسرے شعراء اس کے علاوہ اور
کچھ نہیں کر سکتے" ظاہر ہے کہ 'سوا' اور 'علاوہ'
کے محل استعمال کا درک آپ کو نہیں۔ علاوہ
کا یہ بیجا استعمال اس مضمون میں کئی جگہ ہے۔
"شعر کہیں کسی نہ کسی غالب کے ہی ہمہ گیر

ہوتے ہیں" سے ظاہر ہے کہ دامن گیر کا مفہوم آپ نہیں سمجھتے۔

"شعراء یہ نتیجہ نہ نکال کر مگن ہوجائیں شاعری میں تو تعقید سے بچنا آپ کے لیے ممکن نہیں۔ نثر میں تو الفاظ کی صحیح نشست کا خیال رکھیے۔ اکثر مقامات پر "مصرع کے" "مصرع میں" "شعری مجموعہ ہے" وغیرہ لکھ کر آپ نے ثابت کیا ہے کہ غالباً آپ اصولِ امالہ سے بھی ناواقف ہیں۔

"سے اور ہے کی یے کبھی ساقط ہوجاتی ہے" اب واحد و جمع آپ کو سمجھانا ہوگا۔

"مجھ جیسا ہیچ مدان" جیسا آپ کی دانست میں حرف تشبیہہ ہے؟

یہ نصف درجن نمونے آپ کی نثر کے ہیں۔ اور آپ کو غالباً اپنی عملی شاعری پر ناز ہے۔ آپ کی شاعری کہاں ہے؟ اور آپ کی ہر دلعزیزی کا گراف کہاں پہنچا ہے اس کا حقیقی فیصلہ اسی وقت ہوگا جب آپ ریٹائر ہو چکے ہوں گے۔

نادک حمزہ پوری
ڈاک خانہ شیر گھاٹی ۸۲۴۲۱۱ ضلع گیا (بہار)

> **ہندستانی مسلمان آئینہ ایام میں**
>
> ڈاکٹر سید عابد حسین
>
> اس کتاب کے تین حصے ہیں۔ حصہ اول "کل کی پرچھائیاں" میں ہندستانی مسلمانوں کے مسائل کے تاریخی پس منظر کا ذکر ہے۔ حصہ دوم "آج کا دھندلکا" اور حصہ سوم "کل کیا؟ اندھیرا یا روشنی" میں اصل مسئلے اور اس کے حل سے بحث کی گئی ہے۔
>
> قیمت ۷/۵ روپے

ادبی اور تہذیبی خبریں

محمد ممتاز فرخ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض

۱۸ فروری ۱۹۹۲ء محمد ممتاز فرخ ولد جناب حمید انور ۱ بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ ۴ کو بھاگلپور یونی ورسٹی نے ڈاکٹر کی سند سے نوازا ہے۔ مقالہ کا موضوع "فکر تونسوی، بحیثیت طنز و مزاح نگار" اس تحقیقی مقالہ کے نگراں جناب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، اور ممتحن پروفیسر ڈاکٹر محمد انصار اللہ اور پروفیسر ڈاکٹر سعیدہ وارثی تھے۔

مقبول لاری لائبریری کا قیام

گورکھپور، ۲۰ فروری۔ گورکھپور یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں ایک شعبہ جاتی لائبریری کا قیام عمل میں آیا جس کا نام "مقبول لاری لائبریری" رکھا گیا۔ شعبے کی کوئی اپنی لائبریری نہ ہونے کی وجہ سے طالب علموں کو کتابوں کی فراہمی میں دشواری ہوتی تھی، چنانچہ صدر شعبۂ اردو پروفیسر احمد لاری نے طالب علموں کی سہولت کے لیے شعبے میں ایک لائبریری قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں ان کی کوشش کامیابی سے ہم کنار ہوتی۔ اس لائبریری کے قیام میں جناب مقبول احمد لاری صدر آل انڈیا میر اکادمی لکھنو نے خصوصی تعاون [illegible]

انھیں کے نام سے منسوب کی گئی۔
گورکھپور شہر کے کچھ معززین نے بھی
اس کے قیام میں مدد دی جن میں
حکیم ابوالکلام صدیقی، جناب محمد حامد
علی اور ڈاکٹر عزیز احمد شامل ہیں۔

فکروآگہی بیکل اتساہی نمبر اور "شاخِ گل"

صدر جمہوریہ ہند کی خدمت میں پیش

گزشتہ دنوں ڈاکٹر شنکر دیال شرما
صدر جمہوریہ ہند کی موجودگی میں راشٹر
پتی بھون میں بزم سخن فکروآگہی کی
ایک پُر وقار مگر سادہ تقریب کا انعقاد
باب العلم پبلیکیشنز نے کیا۔ اس
تقریب میں فکروآگہی کا خصوصی شمارہ
بیکل اتساہی نمبر اور شاخِ گل جناب
رفعت سروش کا مجموعہ کلام محترم صدر
ڈاکٹر شنکر دیال شرما کو ڈاکٹر رضیہ حامد
اور شبانہ نذیر نے پیش کیا۔ پروفیسر
گوپی چند نارنگ نے مختصر مگر جامع
الفاظ میں دونوں کتابوں پر روشنی
ڈالی بیکل اتساہی اور رفعت سروش
کے شعری محاسن کا ذکر کرتے ہوئے
کہا کہ بیکل اتساہی نے خسرو، نظیر اکبرآبادی
اور قلی قطب شاہ کی روایت کو آگے
بڑھایا ہے ان کی زبان سادہ اور اپنے
وطن کی مٹی کی سوندھی سوندھی مہک
لیے ہوئے ہے۔ رفعت سروش کے
طویل شاعری سفر اور متنوع شاعری
کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر نارنگ
نے کہا کہ خاص طور سے منظوم ڈرامے
اور اوپیرا نگاری میں رفعت سروش کا
مقام نمایاں ہے رفعت سروش کی نظم
کو بھی سب پسند کرتے ہیں۔ اس کے
بعد ایک مختصر محفل شعر منعقد کی گئی جس
میں ڈاکٹر گرجا ویاس، رفعت سروش،
بیکل اتساہی، بیگم ممتاز مرزا، محمد علی موج،
شبانہ نذیر، ابو حنیف سحر اور راجدر یونیکی
شامل تھے۔ تمام شعرا نے اپنے کلام میں
حالاتِ حاضرہ کی بڑے لطیف پیرایے
میں عکاسی کی جو اردو زبان کے زندہ اور
وطن پرست ہونے کا ثبوت ہے۔
پروگرام کے آخر میں تقریب کی روحِ
رواں ڈاکٹر رضیہ حامد نے شعرا کرام،
سامعین، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور
خصوصی طور پر صدر جمہوریہ ہند کا شکریہ
ادا کیا اور یہ خوبصورت تمنا اور دعا کی کہ ہمارا
ملک ڈاکٹر شنکر دیال شرما صدر جمہوریہ
ہند کی سرپرستی میں نئی بلندیوں تک
پہنچے اور امن وسلامتی کا بول بالا ہو۔

قرۃ العین حیدر کی "ادیب سے ملیے" پروگرام میں شرکت

پنچکولہ: معروف ناول نگار اور افسانہ
نگار محترمہ قرۃ العین حیدر نے موجودہ
حالات میں لفظوں کے بدلتے معانی پر
گہری تشویش کا اظہار کیا ہے انھوں
نے کہا کہ ان حالات میں میں اداس
ضرور ہوں لیکن مایوس نہیں ہوں۔
اس سلسلے میں انھوں نے اپنی بات

پر زور دیتے ہوتے کہا کہ کسی بھی ادیب کی تخلیق قارئین کے ایک خاص حلقہ تک پہنچ کر محدود ہو جاتی ہے اور جس کے بعد اس کی ترسیل کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ وہی ہوتا ہے یعنی تخلیق عوامی سطح پر کوئی مقام نہیں بنا پاتی جب کہ اس کا عام لوگوں تک پہنچنا ضروری ہوتا ہے اور جب تک ایک ادیب کی بات عام لوگوں تک نہیں پہنچے گی معاشرہ یا سماج میں تبدیلی ممکن نہیں۔ محترمہ قرۃ العین حیدر نے کہا کہ اس کام میں میڈیا ادیبوں کے لیے بہت مددگار ثابت ہو سکتا ہے اور ٹی وی کے ذریعہ اسے خصوصیت کے ساتھ بہتر طریقے سے انجام دیا جا سکتا ہے اور اس کے لیے میڈیا کو اپنی ذمہ داری سمجھنے کے لیے آگے آنے کی تلقین کی۔

محترمہ قرۃ العین حیدر گزشتہ دنوں چنڈی گڑھ انتظامیہ کے زیر اہتمام "ادیب سے ملیے" پروگرام کے تحت لوگوں کے سوالوں کے جواب دے رہی تھیں اس تقریب کا اہتمام آرٹ گیلری آڈیٹوریم میں کیا گیا تھا جس میں اردو۔ ہندی انگریزی اور پنجابی کے متعدد ادیب قلم کار اور صحافی موجود تھے۔

اس سے قبل چنڈی گڑھ۔ ساہتیہ اکادمی کے چیرمین جناب کشمیری لال ذاکر نے پروگرام کی اہمیت اور اس کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوتے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ یہ تقریب ایک یادگاری تقریب ثابت ہوگی کیونکہ اس میں برصغیر کی نامور ادیبہ قرۃ العین حیدر اور مشہور قلم کار ملک راج آنند جیسے لوگ شامل ہیں۔ جن کی تحریریں منارۂ نور ہیں اور آنے والی نسلیں ان سے اپنی راہیں منور کریں گی۔

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے قرۃ العین حیدر کا تعارف کراتے ہوتے کہا کہ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ عینی آپا جیسی صاحب طرز ادیبہ اور ناول نگار مہمان درمیان موجود ہیں ان کے ایک درجن سے زاید ناول اور افسانوں کے مجموعے ہیں اور یہ ناول دنیا کی تقریباً تمام اہم زبانوں میں ترجمہ ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے عینی آپا کے ناول "آگ کا دریا" کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا جو ایک تاریخی دستاویز بن چکا ہے۔

تقریب کی صدارت ڈاکٹر ملک راج آنند نے فرمائی۔ انھوں نے اس تقریب میں اپنی شرکت کو خوش بختی سے تعبیر کیا اور کہا کہ خواتین کے ذریعہ خواتین کا جو ادب تخلیق کیا جا رہا ہے وہ قابل ستایش ہے۔ انھوں نے دلیل دی کہ خواتین ہی خواتین کے جذبات کی بہتر عکاسی کر سکتی ہیں اس لیے انھیں کھل کر ان مسائل پر بحث کرنی چاہیے۔ ملک راج آنند نے عینی کی ناول نگاری کو آفاقی قرار دیا●

خانخاناں کی روایت کو پھر زندہ کرنے کی ضرورت

لی۔ آج کے ہراساں اور پریشان
میں عبدالرحیم خانخاناں کے نظریات
کا کام کر سکتے ہیں۔ ان کے کلام
ہندستان کی قدیم اور حقیقی گنگا جمنی
ب کے عناصر روشن اور متحرک ہیں۔
اس خیال کا اظہار دہلی کے ممتاز
روں اور تعلیم دانوں نے ۱۱ر فروری
کے ادبی اور ثقافتی کارناموں پر
خصوصی سیمینار میں کیا۔ اس کا
جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ ہندی
عبدالرحیم خانخاناں میموریل سوسائٹی
ن کر کیا۔ پروگرام کے دو دور ہوئے۔
ی دور کی صدارت جناب ایس۔
آئی۔ ترمذی اور دوسرے دور کی
رت جامعہ ملیہ کے معلم جناب
ب پانے کی۔ نظامت شعبہ ہندی
در ڈاکٹر ساجدہ اسد نے کی۔
ین نے سولھویں صدی کے اس
صاحب سیف و قلم کے عہد کے
امذہبی منظر نامے کا بھی احاطہ کی
ہا کہ مغل حکمراں اکبر کے زمانے میں
ستان کی مشترکہ تہذیب اپنے عروج
نچ گئی تھی۔ وہ تہذیب جو ویدوں
رشیوں کے ان منظومات سے شروع
تھی کہ ساری دنیا ایک ہی خاندان
ے اور تمام مذاہب ایک ہی حقیقت
کے مظہر ہیں۔ اکبر کے زمانے میں مختلف
مذاہب کے مکمل احترام۔ سنسکرت اور
فارسی کے ادبی سرمایے کے تبادلے اور
دربار کے نورتنوں کے عوام دوست
فکر و عمل سے اپنے عروج پر پہنچ گئی۔
اس عروج کی قیادت تو صلح کل نظریے
مبلغ اکبر اعظم نے کی لیکن فنون لطافت
کے حلقوں میں اس کا مرکزی کردار عبدالرحیم
خانخاناں تھا جن کا گھر نہ صرف اپنے ملک
بلکہ غیر ممالک کے دانشوروں کی نشست
گاہ تھا۔ رحیم ہند ایرانی تہذیب کے
پروردہ تھے لیکن ہندی شاعری میں
انھوں نے اس قدر عظمت حاصل
کی کہ ان کی ایجاد بروے چھند کو ان کے
ہم عصر اور دوست تلسی داس نے اپنی
عظیم تخلیق رامائن کے لیے اختیار کیا۔
سوسائٹی کے سکریٹری شیخ سلیم احمد
نے کہا کہ رحیم اپنے زمانے سے پہلے
چھے سو سال کے مشترکہ ثقافتی ورثے کی
علامت تھے اور ان کی ادبی
نگاریوں کے بعد مثنویوں کا ایک طویل
سلسلہ قائم ہوا۔
ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے کہا کہ
شہنشاہ اکبر نے ریاست کے افکار
اور کردار کلیسائی شدتوں سے محفوظ
رکھا اور ایک ایسے انسان دوست نظام
کی بنیاد پیش کی جو آنے کے سیکولر نظریات
سے مماثل تھا۔
ترمذی صاحب نے کہا کہ نظریاتی
صف بندی اور تصادم آبادی کے
موجودہ نامبارک دور میں رحیم خانخاناں

کا ذکر ایک نہایت موزوں راہ عمل ہے۔ انھوں نے کہا کہ شہنشاہ اکبر نے جس متحدہ قومیت کو وجود میں لانے کی کوشش کی وہ ہندستان کے ورثے اور مزاج کے مطابق تھا۔ رحیم نے اسی تصور کو ثقافتی روپ میں پیش کیا۔ آج ان کی روایت کو جاری رکھنے کی ضرورت ہے۔

ٹی وی پروڈیوسر اور ڈاکٹر محترمہ رما پانڈے نے کہا کہ آج جو لوگ انسانی رشتوں کے دھاگے کو توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ ہندستان کی صدیوں کی کمائی کو ضائع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ کوششیں کامیاب نہیں ہوں گی اور بالآخر یگانگت اور آہنگ کی راہ ہی اختیار کرنا ہوگی۔ انھوں نے بتایا ہے کہ وہ رحیم پر ایک سیریل تیار کر رہی ہیں۔ اس کا سکرپٹ ڈاکٹر ساجدہ اسد نے لکھا ہے۔

دہلی یونی ورسٹی کے شعبہ ہندی کے پروفیسر پورن چند ٹنڈن نے کہا کہ خدا کو خیموں میں بانٹنا نہایت غلط ہے۔ صحیح راہ زندگی رحیم کے اتحاد پرور اور انسان دوست تصورات میں ہے۔

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبہ ہندی کے ڈاکٹر عارف نذیر نے کہا کہ ہندستان کی تہذیب سب مذاہب کا سنگم ہے اور رحیم کی ساری زندگی اسی کی صداقت میں اعتقاد برقرار رکھنے کی روشن مثال ہے۔ انھوں نے ہندو دھرم میں بھی وہی قلبی راحت محسوس کی جو انھیں اپنے اسلام سے حاصل ہوتی تھی۔ وہ جذباتی اور لسانی ہم آہنگی کا قابل تقلید کردار ہیں۔

یوسف پاپانے سیمینار کی تقریبات پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے ایک تحقیق ایک ماسہ سے دو لوگ گیت شرہیں ترنم میں سنا کر سماں باندھ دیا اور ایسے محسوس ہوا کہ رحیم کا زمانہ لوٹ کر جامعہ ملیہ میں آگیا ہے۔

ڈاکٹر ساجدہ اسد نے مقررین اور سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہندی اور اردو کے شاعر زمانہ قدیم سے دوہے کے ذریعے اپنے ذہنی اشتراک کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ آج کی اردو کی پیدائش سے پہلے ہمارے فارسی نواز شاعر خسرو کے زمانے سے دوہے لکھ رہے تھے اور یہ اسلوب ہماری قدیم یگانگت اور ادبی روایت کا موثر اظہار ہے۔

(جی۔ ڈی۔ چندن)

ترقی پسند شاعر حبیب جالب نہیں رہے

لاہور ۱۳ مارچ۔ ممتاز ترقی پسند شاعر حبیب جالب کا کل پاکستان میں انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین آج لاہور میں ہوگئی جس میں ہزاروں سوگواروں نے شرکت کی۔

حبیب جالب کی پیدائش غیر منقسم پنجاب میں اور تربیت دہلی میں ہوئی تھی۔ حبیب جالب پاکستان کے انقلابی شعرا میں شمار کیے جاتے تھے جن کی پاکستان کی فوجی حکومتوں سے ہمیشہ ٹھنی رہی اور وہ قید و بند کی صعوبتوں سے بھی دوچار ہوئے۔ ادارہ کتاب نما مرحوم کی مغفرت کے لیے دعاگو ہے

نظریاتی تنازعوں کے درمیان ایک غیر جانبدارانہ روایت کا نقیب

کتاب نما

مئی ۱۹۹۳ء جلد ۳۳ شمارہ ۵

فی پرچہ	6/-
سالانہ	50/-
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	75/-
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک)	170/-
(بذریعہ ہوائی ڈاک)	320/-

اڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

TELEPHONE 630191

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۱۱۰۰۰۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برلٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

مضامین

نظمیں/غزلیں

افسانہ

جائزے

نئی مطبوعات

نعت سرکار دو عالم (نعتیہ شاعری) نشاط کشتواڑی ۲۰/-
سفر کے قصے (بچوں کے لیے) آصف فرخی ۵/-
ہم بنے کمانڈو " " منیر احمد راشد ۵/-
رسول پاکؐ کے اخلاق " " (مذہب) خلیل احمد جامعی ۵/-
حضرت آدم علیہ السلام " " " منورہ نوری خلیق ۵/-
آزمائش کی گھڑی (دور حاضر پر مضامین) سید حامد ۵۰/-
اسرار خودی (فراموش شدہ ایڈیشن) (اقبالیات) ترتیب: شائستہ خاں ۴۰/-
کلیات اقبال رنگین عکسی ایڈیشن (اقبالیات) علامہ اقبال ۷۵/-
شاہ بہاء الدین باجن حیات اور گجری کلام (سوانحی کلام) ڈاکٹر شیخ فرید ۶۰/-
سرا تشنہ (شاعری) میراجی ۱۵/-
نقوش خاطر (قلمی خاکے) عطاء الرحمٰن قاسمی ۶۰/-
محمد اقبال (تنقیدی، تحقیقی مطالعہ) شکیل الرحمٰن ۱۵۰/-
عالم نشاط (شاعری) داؤد نشاط ۵۰/-
موجِ عارض " صابر دت ۶۰/-
جوش کی شاعری کا تنقیدی تجزیہ (تنقید) ڈاکٹر عقیل احمد ۱۵/-
اردو شارٹ ہینڈ گائیڈ فخر الاسلام ایم اے ۶۰/-
مراد آباد تاریخ اور صنعت (تاریخ) تاباں نقوی امروہوی ۱۲/-
سائنس نامہ (سائنسی مضامین) ڈاکٹر محمد اسلم پرویز ۶/-
نیا کلنڈر اور دوسری کہانیاں (بچوں کا ادب) قاضی مشتاق احمد ۶/-
نور جہاں (تاریخ) ایم۔آر کوملی ۶/-
انجان ملکوں کی کھوج (معلومات) ثریا جبین ۱۲/-

برطانیہ کا دستور اور نظام حکومت (برطانوی دستور) محمد محمود فیض آبادی ۳۴/-
فسانہ کہیں جسے سید عاشور کاظمی ۱۵۰/-
انتخاب کلام۔ شہزور کاشمیری (انتخاب) فریدپربتی ۱۲۵/-
اذکار احوال محمد سالم قدوائی ۸۰/-
موجودہ زمانے کے مسائل کا شرعی حل (مذہب) مولانا محمد برہان الدین ۴۰/-
تاریخ کی مظلوم شخصیتیں عبدالعلی فاروقی ۵۰/-
راستے کی تلاش عتیق الرحمٰن سنبھلی ۵۲/-
ٹیبل لینڈ اور دوسرے افسانے (افسانے) اوپندر ناتھ اشک ۱۰/-
سید حسن رضوی حیات کارنامے (ادب) پروفیسر نذیر احمد ۶/-
ہندستان اور مسلمان (تاریخ و جغرافیہ) محمد الیاس ندوی ۲۰/-
عرفان محبت (شعری مجموعہ) پرکاش ناتھ پرویز ۱۹/-
دلوں کی خیر (سیاسی/تاریخی) اکرام اللہ ۱۰/-
کربلا کی بہادر خواتین (تاریخ/تذکرہ) پروانہ ردولوی ۲۵/-
کربلا کے بعد قاتلان حسین کا عبرت ناک انجام پروانہ ردولوی ۳/-
راز درراز (شعری مجموعہ) راز القادری بدایونی ۲۵/-
نوائے دید (رپورتاژ) حسنین عظیم آبادی ۳/-
دیار غزل (مغربی یوپی کے شعرا کا انتخاب) شکیل رحمانی ۳/-
نشاط آگہی (شعری مجموعہ) وجاہت علی سندیلوی ۲۰/-
دستِ گرداں " شکیب عوثی ۷۵/-
سہارا احساس " صابر آروی ۰/-
علم کا شوق (بچوں کا ادب) رفیع احمد ۵/-
حرف ضاد مشابہ ظا قاری حامد علی ۸/-
کاشف التمہید " " ۸/-
عربی تنقید مطالعہ اور جائزہ (تنقید) ڈاکٹر محمد اقبال حسین ندوی ۱۲۵/-

سرورق: دلیپ سنگھ

دلیپ سنگھ
۹۵ راجندر نگر
نئی دہلی

اداریہ

الیکٹرانک میڈیا اور قومی یک جہتی

سرکاری الیکٹرانک میڈیا یعنی ٹیلی ویژن اور ریڈیو کو چونکہ سچ بولنے کے لیے اپنے بیشتر افسروں سے اجازت لینے کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے وہ جب کبھی سچ بولتے ہیں تو اس میں دیر بہت لگا دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی افواہیں سننے میں آتی ہیں کہ ملک کے کسی حصے میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوگئے ہیں تو لوگ اپنے ٹیلی ویژن سیٹ پر بی بی سی سے خبریں سننا پسند کرتے ہیں۔ میرا ٹی وی سیٹ چونکہ بی بی سی نہیں پکڑتا، میں نے ایک اپنا ہی نسخہ بنا رکھا ہے یہ جاننے کے لیے کہ ملک میں کہیں فسادات تو نہیں ہو رہے۔ میں جب بھی ریڈیو یا ٹی وی پر ایسے نغمے سنتا ہوں جن کا تعلق قومی یک جہتی سے ہے تو سمجھ جاتا ہوں کہ حالات میں کچھ گڑ بڑ ہے۔ فوری پہچان مجھے اقبال کے قومی ترانے سے ہوتی ہے۔ ادھر دور درشن سے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" نشر ہوا اُدھر میں سمجھ گیا کہ ملک میں فسادات شروع ہو گئے۔

پتا نہیں یہ کس کے دماغ کی اختراع ہے کہ فسادات شروع ہونے پر اگر قومی ترانہ بجایا جائے تو فسادی ایک دم اپنی بندوقیں اور ریوالور واپس الماریوں میں رکھ دیتے ہیں اور اپنے دشمنوں کے گلے سے لپٹ جاتے ہیں۔ ایسا شاید فلموں میں تو ہو سکتا ہے لیکن حقیقی زندگی میں نہیں ہوتا۔ یہ معمولی سی بات کوئی نہیں سمجھتا کہ قومی ترانہ فائر بریگیڈ کا انجن نہیں جو فرقہ وارانہ آگ بجھانے کے کام آ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ قومی ترانے حب الوطنی اور قومی یک جہتی پیدا نہیں کرتے بلکہ وہ تو خود حب الوطنی اور قومی یک جہتی کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں۔

معمولی فسادات کی روک تھام کے لیے تو اقبال کے قومی ترانے کو کام میں لیا جاتا ہے لیکن جب حالات زیادہ خراب ہو جاتے ہیں تو پھر ٹیلی ویژن پر باقاعدہ ایسے سیریل دکھائے جاتے ہیں جن کا مقصد درشکوں کو قومی یک جہتی کی تعلیم دینا ہے۔

کچھ سال پہلے جب پنجاب میں دہشت گردوں نے بسوں پر حملے کر کے ایک خصوصی فرقے کے لوگوں کو قتل کیا تو سرکار کو خیال ہوا کہ ہندوؤں اور سکھوں میں نفرت پھیل گئی ہے اور اسے دور کرنے کا واحد نسخہ یہ ہے کہ ٹیلی ویژن پر ایسے سیریل دکھائے جائیں جو

ہندوؤں اور سکھوں کو محبت اور بھائی چارے کا پیغام دیں۔
شروع شروع میں تین سیریلز بنانے کی منظوری دی گئی جن کے لکھنے والوں میں دو مشہور ادیب کرتار سنگھ دُگل اور بلونت گارگی صاحب اور تیسرا یہ خاکسار تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ دگل اور گارگی صاحب نے اپنی کہانیوں کی تشکیل کس طرح کی۔ ہاں میں اپنے سیریل "دل دریا" کے بارے میں جانتا ہوں کہ اس کی تشکیل کیسے ہوئی۔
میرا بچپن پنجاب کے ایک گاؤں میں گزرا۔ یہ گاؤں اب پاکستان میں ہے۔ جس ماحول میں میں نے اپنی زندگی کے پہلے چودہ سال گزارے وہ مکمل طور پر سیکولر ماحول تھا۔ میرے والد حالانکہ اَن پڑھ آدمی تھے لیکن اُن کی سمجھ بوجھ میرے جیسے پڑھے لکھوں سے کہیں زیادہ تھی۔ مجھ میں اگر کسی طرح کا مذہبی تعصب نہیں ہے تو اس کی وجہ ان کی دی ہوئی تعلیم ہے۔ انھوں نے کبھی مجھے بٹھا کر یہ سبق نہیں پڑھایا کہ مذہبی تعصّب بری چیز ہے یا یہ کہ رام اور رحیم ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں وغیرہ۔ ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ آپ کو سین دکھا دیا اب آپ اِس کا کیا اثر لیتے ہیں یہ آپ پر منحصر ہے۔
ایک دن میں نے اپنی کلاس میں کچھ لڑکوں کو کہتے سُنا کہ مسلمان کے ہاتھ کا کھانا نہیں کھانا چاہیے کہ اس طرح اپنا مذہب خراب ہو جاتا ہے۔ میں نے والد صاحب سے کہا کہ میرے کلاس میں کچھ لڑکے یوں کہہ رہے تھے۔ کہنے لگے ایک دن کھا کے دیکھتے ہیں۔ اگر ہمارا مذہب خراب ہوا تو ہم بھی نہیں کھایا کریں گے۔ چنانچہ مجھے اپنے پڑوسی عنایت اللہ کے گھر لے گئے اور کہنے لگے کہ عنایت بھائی آج کھانا ہم تمھارے ساتھ کھائیں گے کھانا آیا تو میرے والد اور میں نے عنایت اللہ کے گھر کے لوگوں کے ساتھ کھایا۔ جب ہم اٹھ کر واپس گھر لوٹ رہے تھے تو میرے والد نے پوچھا کہ کوئی فرق نظر آیا تمھیں ان کے اور ہمارے کھانے میں؟ میں نے کہا "نہیں"۔ "تمھارے مذہب میں کوئی خرابی پیدا ہوئی؟" میں نے کہا "نہیں"۔ "تو پھر وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ مسلمان کے گھر کا کھانا نہیں کھانا چاہیے غلط کہتے ہیں۔"

بعد میں اس تعلیم کا مجھے ایک ذاتی فائدہ رہا۔ گاؤں سے جب میں شہر میں پڑھنے کے لیے گیا تو ہوسٹل میں رہنے لگا۔ ہوسٹل میں پچاس ہندو سکھ لڑکے اور دو مسلمان لڑکے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے وقت تنور کے ارد گرد بڑی بھیڑ بھاڑ ہو جاتی تھی۔ ایک روٹی تنور سے باہر آتی تھی تو اس پر بیس بھوکے لڑکے جھپٹ پڑتے تھے۔ میں اپنے دوست محمد انور کو کہتا تھا کہ جونہی روٹی تنور سے باہر آئے تو اسے ہاتھ لگا دے اس کے ہاتھ سے لگی روٹی دوسرے لڑکے چھوڑ دیتے تھے تو میں اٹھا لیتا تھا اور آرام سے بیٹھ کر کھاتا تھا۔

ہمارے گھر کی ایک دیوار گاؤں کی مسجد کی ایک دیوار سے لگتی تھی۔ اس قربت کی وجہ سے ہمارے گھر کے بچوں کا مسلمانوں کے ہر تہوار سے اپنے آپ رشتہ جڑ جاتا ہے

مجھے یاد ہے رمضان کے دنوں میں جب مسجد سے نوبت بجا کر اعلان کیا جاتا تھا کہ افطار کا وقت ہو گیا ہے تو ہم لوگ بھی اس وقت کچھ نہ کچھ کھاتے ضرور تھے۔ میرے والد نے ایک دفعہ ہمیں کھاتے دیکھا تو کہا کہ افطار کا لطف کئی گنا ہو جائے گا اگر تم لوگ اپنے مسلمان دوستوں کے ساتھ روزہ بھی رکھو۔ ہمیں یہ بات بھا گئی اور اس طرح ہم ان کی خوشی میں باقاعدہ شامل ہونے لگے۔ افطار پارٹیاں تو آج کل بہت ہوتی ہیں اور کئی امیروں وزیروں کے ہاں اس خاکسار کو بھی بلایا جاتا ہے لیکن وہاں جا کر کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ ہم اپنے مسلمان دوستوں کی خوشی بانٹ رہے ہیں۔ ہاں یہ احساس ضرور ہوا ہے کہ ہم ان کے میٹھے کے کباب بانٹ رہے ہیں۔

ان دنوں کے کئی واقعات مجھے آج تک یاد ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ایک مسلمان گھر میں شادی تھی۔ اسی دن ایک ہندو عورت کا انتقال ہو گیا۔ دونوں ایسے موقعے تھے جن میں سارے گاؤں کا شامل ہونا ضروری تھا۔ بغیر کسی طے شدہ پالیسی کے گاؤں کے لوگوں نے اپنے آپ کو دو حصّوں میں تقسیم کر لیا۔ آدھے جنازے میں شامل ہوئے اور آدھے شادی میں شامل ہو کر بھنگڑا ڈالتے رہے۔ نہ شادی والے گھر کو محسوس ہوا کہ ایک افسوس ناک واقعے نے ان کی رونق کم کر دی اور نہ دکھی خاندان کو محسوس ہوا کہ ان کے دکھ میں کوئی شامل نہیں تھا۔

مجھے یاد ہے جب گاؤں کے ہندوؤں میں بہت سوں نے سکھ دھرم اپنایا تھا۔ گاؤں میں کچھ پرچارک آئے اور اُن کے بھاشن کا ایسا گہرا اثر ہوا کہ بہت سے ہندوؤں نے سکھ بننے کا فیصلہ کر لیا۔ بعد میں ان سکھوں نے جب گاؤں میں ایک گوردوارہ بنانا چاہا تو ہندوؤں نے کہا کہ یار تم مندر میں ہی گورو گرنتھ صاحب کا پرکاش کرو تاکہ ملاقات تو ہوتی رہے۔ نئی بلڈنگ بنا کر خواہ مخواہ گاؤں کو بانٹ رہے ہو۔

ایسے اَن گنت واقعات میری زندگی کا حصّہ بن چکے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں جب ۱۹۴۷ء میں خون کی ندیوں کو عبور کرتا ہوا دلّی آ گیا تو میں نے اس قتل و غارت کی ذمہ داری مسلمان قوم کے سر کبھی نہیں تھوپی۔ مجھے تب بھی یہ احساس تھا اور اب بھی یہ احساس ہے کہ فساد ہندو اور مسلمان نہیں کرتے۔ فساد غنڈے اور بدمعاش کرتے ہیں۔

چنانچہ جب مجھے سیریل لکھنے کے لیے کہا گیا تو میں نے اس کے لیے ایک طے شدہ منصوبے کے تحت کوئی کہانی نہ گھڑی۔ میں نے یہ نہیں کیا کہ ایک ہندو لڑکی کا ایک سکھ لڑکے سے عشق کرا دیا۔ میں نے یہ بھی نہیں کیا کہ ایک سکھ کی جان جاتی دیکھ کر ایک ہندو نے خون دیا اور اس طرح ثابت کر دیا کہ ہندوؤں اور سکھوں کے جسم میں ایک سا خون ہے۔

میں نے اپنی کہانی کی تلاش اپنی زندگی کے ان چودہ سالوں میں کی جو میں نے

اپنے گاؤں میں گزارے تھے۔ جونہی میں نے پیچھے مڑ کر غور سے دیکھا تو بیسیوں واقعات میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئے جو قومی یک جہتی کی بہترین مثال تھے۔ ان میں سے جو کہانی مجھے اچھی اور مناسب لگی میں نے چن لی۔ کہانی چنتے ہوئے میں نے ایک ذمہ دار ادیب کی طرح اس بات کا بھی خیال رکھا کہ کہانی افسانہ نگاری کی بہترین روایتوں کی علم بردار ہو۔ کہانی سے قومی یک جہتی کا سبق ملے یا نہ ملے لیکن اسے دور درشن کی سکرین پر دیکھتے ہوئے یوں لگے جیسے آپ ایک اچھی کہانی پر بنائی ہوئی فلم دیکھ رہے ہیں۔

میری کہانی دو دوستوں کے گرد گھومتی ہے۔ موہن سنگھ اور اوم پرکاش کے گرد۔ ان کی دوستی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ایک نے دوسرے کو ڈوبنے سے بچایا تھا بلکہ یہ تھی کہ دونوں پڑوسی تھے اور اکٹھے بڑھے اور پھولے تھے ویسے ہی جیسے محمد انور کی دوستی مجھ سے تھی یا چودھری عنایت اللہ کی میرے والد سے۔ یہ دوستی ان کے خاندان کے لوگوں میں اسی طرح سرایت کر گئی جیسے چاچا عنایت کی بیوی کی میری ماں کے ساتھ یا میرے والد کی انور کے والد کے ساتھ۔ بس ایک محبت کا رشتہ تھا جو اپنے آپ بڑھتا پھولتا گیا۔ اس میں نہ تو کسی خصوصی کھاد کو ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ کسی نے ڈالی۔

مجھے فخر ہے کہ میرے اس سیریل کو درشکوں نے محبت سے دیکھا اور پسند کیا بلکہ جب میں نے اس کہانی کو ناول کی صورت میں لکھا تو کسی نے مجھے یہ نہیں کہا کہ یہ تو ایک مقصد کے تحت لکھا ہوا ناول ہے۔ نہ ہی میں نے اس کی فروخت کے سلسلے میں سرکاری اداروں کو لکھا کہ صاحب اس کتاب کو خرید کر لوگوں میں بانٹیے تاکہ لوگوں میں قومی یک جہتی کا جذبہ بیدار ہو سکے۔

لیکن ٹیلی ویژن کے پروگراموں پر ریویو لکھنے والے کچھ لوگوں نے میرے اور دوسرے دو سیریلز کو "سرسوں کا ساگ" سیریلز کہہ کر ڈس مس کر دیا۔ "سرسوں کا ساگ" سیریلز سے ان کی مراد یہ تھی کہ ان سیریلز میں زبردستی قومی یک جہتی کا پیغام دیا گیا اور یہ خاص طور پر پنجاب کے لوگوں کے لیے بنائے گئے ہیں۔

مجھے ریویوز لکھنے والوں کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہے۔ ان بچاروں کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ ہر سیریل کی ہر قسط کو بنظر غور دیکھیں اور پھر اس پر لکھیں۔ جب ہمارے ناقد کتاب کا دیباچہ اور کئی دفعہ کتاب کا نام پڑھ کر ریویو لکھ دیتے ہیں۔ تو پھر ٹیلی ویژن کے ریویورز سے کیا شکایت۔

مجھے شکایت ہے تو بس اتنی کہ دور درشن کے ارباب بست و کشاد نے ہمارے سیریلز بنوانے پر جو رقم خرچ کی وہ "وصول" نہ ہوئی یعنی اس سے قومی یک جہتی پیدا نہ ہوئی۔ کم از کم ریویورز نے دور درشن کی "چالاکی" کو سمجھ لیا کہ یہ لوگ

ذہنوں زبردستی قومی یک جہتی کا درس دے رہے ہیں۔
ان دنوں کا میرا ایک لطیفہ ہے جو مجھے یہاں لکھنے کی اجازت دیجیے۔ جب "دل دریا" مکمل ہوگیا تو دوردرشن اسے دکھانے کی تاریخ تعین کرنے میں دیر لگا رہا تھا ایک دن میں اس سلسلے میں ایک سینیر افسر سے ملنے گیا اور درخواست کی کہ اس سیریل کو جلد دکھایا جائے۔ اس نے کہا کہ آپ کو اس سیریل کے لکھنے کی اجرت مل چکی ہے۔ اب آپ کو اس سے کیا لینا دینا کہ ہم اسے کب دکھلاتے ہیں۔ میں نے جواب دیا مگر آپ نے دیر کی تو مجھے ڈر ہے کہ بند دا ور سکھ کہیں میرا سیریل دیکھے بغیر ہی سکھ نہ کرلیں۔

ریویورز کے مطابق قومی یک جہتی کے سیریلز کوئی دیکھتا ہی نہیں۔ اور اگر دیکھتا بھی ہے تو اثر نہیں لیتا۔ چلیے ان کی یہ بات ہم نے تسلیم کرلی۔ لیکن اتنا انھیں بھی مان لینا چاہیے کہ ہم لوگوں کو قومی یک جہتی کے پیغام کی ضرورت ہے اور الیکٹرانک میڈیا کا اس سلسلے میں استعمال ضروری ہے کہ یہ بڑا طاقت ور میڈیا ہے۔

میرے خیال میں اس مسئلے کا حل یوں ہوسکتا ہے۔

(الف) ایسے پروگرام صرف اس وقت نہ دکھائے جائیں جب سرکار کے خیال میں ایسے "پروگراموں کی ضرورت" ہوتی ہے۔ بلکہ یہ پیغام تو ہمارے پروگراموں کا اس طرح کا حصہ بن جانا چاہیے کہ کسی کو پتا بھی نہ لگے کہ ہم کچھ سکھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں میرے والد صاحب کا نسخہ بہترین ثابت ہوگا۔ انھوں نے کبھی ہمیں بٹھا کر یہ نہیں کہا کہ آؤ بچو تمھیں آج قومی یک جہتی کا درس دیں۔ انھوں نے تو خود ایک ایسی زندگی جی کر اور اس خوبصورت زندگی کی جھلکیاں دکھا کر ہمیں اس سے متعارف کرایا تھا۔

(ب) پروگرام لکھنے والوں کو ہدایت یہ نہ دی جائے کہ آپ کو پیسے تب ملیں گے جب آپ ہمیں یقین دلا دیں گے کہ آپ کا پروگرام قومی یک جہتی سکھاتا ہے۔ بلکہ یہ کیا جائے کہ آپ کا پروگرام قومی یک جہتی کی تعلیم دے لیکن اگر ہمیں پتا لگ گیا کہ آپ تعلیم دے رہے ہیں تو سیریل نامنظور ہو جائے گا

(ج) پروگرام لکھنے کے لیے صرف ان لوگوں سے رابطہ قائم کیا جائے جو ایک اچھا پروگرام لکھ سکتے ہیں۔ جب کہانی میں دم ہی نہیں ہوگا تو اسے دیکھے گا کون، اور دیکھے گا نہیں تو پھر اثر کیسے لے گا۔

میں اپنی بات اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ ہم جو اس دیس کے باسی ہیں فرقہ وارانہ طاقتوں کے اثر سے باہر آجائیں تاکہ ہمیں اقبال کا قومی ترانہ سنتے ہوئے یہ خیال نہ ہو کہ ملک کے کسی حصے میں فسادات شروع ہوگئے ہیں۔ آمین۔ ●

بچوں کے لیے مذہبی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
رسالہ دینیات اول	محمد نعیم الدین زبیری	۳/
رسالہ دینیات دوم	"	۴/
رسالہ دینیات سوم	"	۵/
رسالہ دینیات چہارم	"	۵/
رسالہ دینیات پنجم	"	۶/
بزرگانِ دین	محمود علی خاں جامعی	۴/
امت کی مائیں	حسین حسنی	۴/۵۰
اچھی باتیں	سعد الدین انصاری	۴/۵۰
خوب سیرت اول	حکیم محمد سعید	۶/
خوب سیرت دوم	"	۴/۵۰
سلطان جی	اسلم فرخی	۴/
رسول اللہ کی صاحبزادیاں	فضل قدیر ندوی	۴/۵۰
رحمان کا جہان	رفیع الزماں زبیری	۶/
کمسن صحابی	"	۵/
اسلام کے جاں نثار	"	۴/
سیرت پاک مختصر مختصر	احمد خاں خلیل	۲/
نور کے پھول	حکیم محمد سعید	۹/
سب سے بڑے انسان۔ رسول اللہ	"	۴/۵۰
حضرت حمزہ رض	احتشام علی رحیم آبادی	۲/
حضرت عبدالرحمن بن عوف رض	"	۲/
حضرت ابوہریرہ رض	"	۴/
حضرت محبوب الٰہی رح	مشیر الحق	۲/
حضرت قطب الدین بختیار کاکی رح	"	۲/
حضرت فرید الدین گنج شکر رح	"	۲/
حضرت معین الدین چشتی رح	"	۲/
حضرت ابوبکر صدیق رض	"	۶/
حضرت طلحہ رض	"	۲/
حضرت سلمان فارسی رض	"	۲/
حضرت ابوذر غفاری رض	"	۲/۵۰
حضرت عبداللہ بن عمر رض	"	۲/

کتاب	مصنف	قیمت
حضرت عبداللہ بن عباس	مشیر الحق	۳/
نیک بیٹیاں	"	۲/۵۰
اسلام کیسے پھیلا؟ حصہ اول	عبدالواحد سندھی	۷/۵۰
" حصہ دوم	"	۶/
قرآن پاک کیا ہے؟	"	۴/
اسلام کیسے شروع ہوا؟	"	۷/۵۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار اول، دوم	" فی حصہ	۶/
اسلام کے مشہور امیر البحر	"	۹/
رسول پاک	"	۶/
دس جنتی	الیاس احمد مجیبی	۵/۵۰
سرکار کا دربار	"	۶/۵۰
چار یار	"	۷/۵۰
آں حضرت (اردو)	"	۲/۵۰
حضرت محمد (ہندی)	"	۰/۴۰
اللہ کا گھر	خلیل احمد جامعی	۴/۵۰
اللہ کے خلیل	"	۲/۵۰
رسول پاک کے اخلاق	"	۴/
اللہ کے صفی	"	۲/۵۰
ہمارا دین حصہ اول	سید شہاب الدین دسنوی	۸/۵۰
" دوم	"	۷/۵۰
" سوم	"	۸/۵۰
منہاج القرآن	خدیجہ سیدنا طاہر سیف الدین	۴/۵۰
ارکان اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۲/۵۰
عقائد اسلام	"	۲/۵۰
خلفائے اربعہ	خواجہ عبدالحئی فاروقی	۹/
نبیوں کے قصے	"	۶/۵۰
ہمارے رسول	"	۶/
پیارے رسول	سلطانہ آصف فیضی	۴/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاء	ادارہ	۲/
مسلمان بیبیاں	اعجاز الحق قدوسی	۶/
ہمارے نبی	سید نواب علی رضوی	۲/۵۰
سرکار دو عالم	محمد حسین حسان	۹
[illegible] القرآن (خورد)	(کلاں)	[illegible]

جگن ناتھ آزاد

بابری مسجد

[illegible]

۱

یہ تو نے ہند کی حرمت کے آئینے کو توڑا ہے
ہمارے دل کو توڑا ہے عمارت کو نہیں توڑا
خبر بھی ہے تجھے مسجد کا گنبد توڑنے والے
خباثت کی بھی حد ہوتی ہے اے حد توڑنے والے

•

ترے اس فعل سے اسلام کا تو کچھ نہیں بگڑا
ادھر ہندستاں کا تو نے چہرہ مسخ کر ڈالا
مگر گھونپا ہے خنجر تو نے ہندو دھرم کے دل میں
ادھر بوئے ہیں کانٹے تو نے اس کی راہ منزل میں

•

تجھے کچھ بھی خبر اس کی نہیں اے بدنصیب انساں
نہیں ہے دھرم وہ ہرگز جسے تو دھرم کہتا ہے
کہ ہندو دھرم کیا ہے اور اس کی آتما کیا ہے
تجھے کیا علم کیا ہے آتما، پرماتما کیا ہے

۲

خبر کل تک بس اتنی تھی کہ گنبد ایک ٹوٹا ہے
وہ تہذیبی تسلسل جو تھا جاری چار صدیوں سے
کھلا اب بات مسجد کا نہیں چھوڑا نشاں باقی
تو سمجھا ہے نہ رہ پائے گی اس کی داستاں باقی

•

میں اک گنبد کو روتا تھا مگر اب یہ کھلا مجھ پر
دیا تھا اک دلِ آگاہ تجھ کو دینے والے نے
گرا ڈالا ہے اس ساری عبادت گاہ کو تو نے
یہ کس رستے پہ ڈالا ہے دلِ آگاہ کو تو نے

•

خدا کا گھر ہے مندر بھی خدا کا گھر ہے مسجد بھی
نہیں ہے دھرم وہ ہرگز فقط اندھی سیاست ہے
مجھے تو میرے ہندو دھرم نے بس یہ سکھایا ہے
تجھے تیرا یہ درسِ نفرت جس نے پڑھایا ہے

•

مروّت جس کو کہتے ہیں، مودّت جس کو کہتے ہیں
اسی کے ساتھ تو اک اپنا مندر بھی بنا لیتا
یہ مسجد اس مروّت، اس مودّت کی علامت تھی
وہی تیرا بڑا پن تھا وہی تیری کرامت تھی

•

خدا کے گھر کو جب تو منہدم کرنے کو نکلا تھا
مکافاتِ عمل کہتے ہیں جس کو اک حقیقت ہے
خدا جانے ترے دل میں خیالِ خام کیا ہوگا
شقی القلب کیا کہیے ترا انجام کیا ہوگا

•

یہ مسجد آج بھی زندہ ہے اہلِ دل کے سینوں میں
ابھی یہ سرزمیں خالی نہیں ہے نیک بندوں سے
خبر بھی ہے تجھے مسجد کا پیکر توڑنے والے
ابھی موجود ہیں ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

اسرارِ خودی (فراموش شدہ ایڈیشن)	(شعری مجموعہ)	مرتبہ شائستہ خان	۵/
عوربی اور بابلی تہذیب و تمدن	(تاریخ)	مالک رام	۵/
جامِ جہاں نما۔ اردو صحافت کی ابتدا	(اردو صحافت)	گربچن چندن	۵/
مسلمانوں کا تعلیمی نظام	(تاریخی)	ضیاء الحسن فاروقی	۵/
اردو ناول میں عورت کا تصور	(تحقیق)	فہمیدہ کبیر	۵/
نوٹوں کی تلاش	(ناول)	ایاز سیوہاروی	۱۰/
تاثر نہ کہ تنقید	(تنقید)	صدیق الرحمٰن قدوائی	۵۱/
اپنے دل کی حفاظت کیجیے	(ایلوپیتھی)	ترجمہ نذیر الدین مینائی	۲۵/
بہ صورت گر کچھ خوابوں کے	(انٹرویوز)	طاہر مسعود	۲۶/
مرضیات	(طب)	حکیم نعیم الدین زبیری	۵۱/
بانگ درا	(شعری مجموعہ، طلبہ ایڈیشن)	اقبال	۹/
بالِ جبریل	(شعری مجموعہ)	〃	۶/
ضربِ کلیم مع ارمغانِ حجاز (اُردُو نظمیں)	(شعری مجموعہ)	〃	۶/
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی	(ناول)	کشمیری لال ذاکر	۴۸/
گوشے میں قفس کے	(طنزیہ مزاحیہ)	دلیپ سنگھ	۴۵/
سحر کے پہلے اور بعد	(جگ بیتی)	سعید الظفر چغتائی	۵۱/
افکارِ اقبال	(اقبالیات)	محمد عبدالسلام خاں	۱۲۵/
فرمان فتح پوری	(شخصیت اور ادبی خدمات)	مرتبہ خلیق انجم	۲۵/
تذکرہ ماہ و سال	(تذکرہ)	مالک رام	۱۲۵/
تحقیق نامہ	(تحقیق)	مشفق خواجہ	۱۲۵/
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان	(مذہب)	حکیم محمود احمد برکاتی	۴۵/
خواب اور خلش	(شعری مجموعہ)	آل احمد سرور	۶۶/
سفر	(ناول)	رابعہ تبسم	۲۷/
تحریریں	(تنقید)	ڈاکٹر اسلم پرویز	۵۱/
پہچان اور پرکھ	(تنقید)	پروفیسر آل احمد سرور	۵۱/
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	(تحقیق)	ڈاکٹر سلامت اللہ	۵۱/
پت جھڑ کی آواز (نیا ایڈیشن)	(افسانے)	قرۃ العین حیدر	۷۵/
اقبال کا نظریہ خودی	(تحقیق)	عبدالمغنی	۱۵۰/
سمندری خزانہ	(ناول)	ماریہ رحمان	۲۷/
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	(تنقید)	وارث علوی	۳۶/
فی الحقیقت	(طنز و مزاح)	یوسف ناظم	۴۵/
مٹی سے ہیرا	(ناولٹ)	سید مقبول احمد	۱۰/
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	(ناولٹ)	صغرا مہدی	۲۴/
الجھاوے	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف	۵۱/
ہماری منزل	(شعری مجموعہ)	غلام ربانی تاباں	۴۵/

ڈاکٹر اسلم فرخی
ڈی ۱۵۹۔ بلاک نمبر ۷
گلشن اقبال۔ کراچی
(پاکستان)

تلاشِ وفا

(ابوالقاسم وفا)

بچے تھے تو برسات کی راتوں میں اڑتے ہوئے جگنو پکڑنے کے شوق میں دوڑے دوڑے پھرتے تھے۔ ادھر کوئی جگنو ہاتھ آیا اور جھٹ پٹ اسے دامن میں چھپا لیا۔ بڑے ہوگئے تو پرانی یادوں کے جگنو پکڑنے کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں مگر نہ جانے ایسے کتنے جگنو ہیں کہ ہاتھ نہیں آتے۔ یادوں کے جگنو ہیں کہ ہر طرف اڑتے پھرتے ہیں۔ لمحے بھر کے لیے اُجالا کر دیتے ہیں اور پھر تاریکی میں ڈوب جاتے ہیں۔ وفا بھائی کا تذکرہ مرتب کرنا بھی پرانی یادوں کے جگنو پکڑنے کی ایک کوشش ہے۔ ایک وقت تھا کہ بہت کچھ یاد تھا۔ اب کچھ بچے کھچے یادیں رہ گئی ہیں۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے جاگتے میں کبھی ایک خواب دیکھا تھا۔ کچھ مٹتے مٹتے ہلکے ہلکے سے یاد ہیں۔ کچھ حافظے سے بالکل محو ہو چکے ہیں۔ کبھی کبھی اور کہیں کہیں موقع اور بے موقع۔ یادوں کا کوئی جگنو اڑتا ہوا گزر جاتا ہے تو خیال آتا ہے کہ ہاں ایسا تو ہوا تھا۔ اس روشنی کو محفوظ کر لینا چاہیے اگر اب محفوظ نہ ہوئی تو پھر یہ روشنی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائے گی۔ یہ سوچ کر یادوں کو جمع کرنا شروع کیا مگر جگنو بڑی مشکل سے ہاتھ آتے ہیں۔ بڑی کوشش کی ذہن پر بہت زور ڈالا۔ تھوڑے سے جگنو ہاتھ آئے۔ انھیں کو یکجا کر کے یہ روشن تسبیح پروئی ہے اور اب ع

میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

دیکھنا یہ ہے کہ اس کوشش سے وفا بھائی کی شخصیت اور فن بھی شمار میں آئے یا نہیں۔

ہوش کی آنکھیں کھولیں تو ارد گرد جو لوگ نظر آئے ان میں پھوپھی زاد بھائی ابوالقاسم بھائی جان یا وفا بھائی خاصی اہمیت رکھتے تھے کہ وہ مستند شاعر اور ادیب ہونے کے باوجود چھوٹوں کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ حوصلہ افزائی کرتے۔ بڑے بوڑھوں کی ناخوشی کے باوجود ہمارے پڑھنے کے لیے اپنی کتابیں بے تامل دے دیتے چھوٹا قد۔ ذرا بھاری جسم۔ چہرے پر چھوٹی سی داڑھی۔ گول چہرہ۔ پکا رنگ۔ تیز مگر چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ چال ڈھال میں ایک وارفتگی اور ربودگی۔ بچوں کی طرح معصوم نظر آتے۔

بات بات پر ہنستے رہتے۔ ندوے کے فارغ التحصیل تھے مگر نام کے ساتھ ندوی نہیں لکھتے تھے بلکہ وفا فرخ آبادی کہلاتے تھے۔ ہماری ایک بہن ناراض ہوتیں تو انھیں بے وفا فرخ آبادی کہتیں مگر وہ ہنستے رہتے۔ ان کی بات کا بُرا نہیں مانتے تھے۔ باوجودیکہ خاندانی اور سند یافتہ مولوی تھے مگر ساری زندگی شعر و شاعری کے کوچے میں سرگرداں رہے مجھے بہت بعد میں علم ہوا کہ وہ محض باپ کی ڈانٹ پھٹکار کی وجہ سے ندوے گئے تھے ورنہ وہ بذاتِ خود انگریزی ادبیات کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔

عمر میں وہ مجھ سے بہت بڑے تھے اس وجہ سے مجھ میں اور ان میں ہمیشہ ایک فاصلہ رہا۔ ویسے بھی میں ان سے مرعوب تھا مگر اس عہد کے مشترک خاندانوں کے مشترک رہن سہن میں قربت اور یگانگت کا احساس بڑا شدید تھا۔ فاصلہ ہوتے ہوئے بھی فاصلہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ آج کے معاشرے میں گھریلو اور خاندانی سطح پر وہ گہما گہمی اور قربت نظر نہیں آتی۔ دوسرے یہ کہ وفا بھائی سدا کے بہتا پانی رمتے جوگی تھے جم کر کہیں نہیں رہتے تھے۔ آج لاہور میں ہیں۔ معلوم ہوا کہ مولانا تاجور نجیب آبادی کے ادبی معاون ہیں۔ ادبی دنیا میں نظمیں چھپ رہی ہیں۔ ایک نظم میری یاد داشت میں اب بھی ابھرتی ہے۔ ادبی دنیا کے ایک صفحے پر تصویر تھی۔ مقابل کے صفحے پر وفا بھائی کی نظم۔ یہ "سجدہ محبت" ٹائپ کی ایک تصویر تھی۔ محبوب اور محب کی تصویر۔ محبوب کا آنچل محب کے ہاتھوں میں اور آنکھوں میں ارکنے اور ٹھہر جانے کی التجا۔ محبوب کے چہرے پر حیا کی لہریں اور محبت کی معصوم پھوار۔ نظم میں بھی یہی کیفیت تھی لیکن اب نہ عنوان یاد ہے نہ کوئی مصرع۔ میں نے بھی اس تصویر کے فیض سے ایک نظم لکھ ماری تھی جس کا ایک مصرع ع اک ہنسی ہونٹوں پر اور نیچی نگاہیں یاد ہیں ذہن میں اب تک محفوظ ہے۔ ادبی دنیا کے پہلو بہ پہلو بچوں کا ایک رسالہ بھی تھا۔ نام تھا "پریم" اس کے پرچے بھی آتے تھے۔ پریم میں وفا بھائی کہانیاں بھی لکھتے تھے اور ان کی نظمیں بھی شائع ہوتی تھیں۔ مولانا تاجور نجیب آبادی اس رسالے کے مدیر بھی تھے

پھر ایک دن سُنا کہ وفا بھائی لاہور سے دلی آگئے ہیں اور ایک عجوبہ محکمے سے منسلک ہو گئے ہیں جس کا نام آل انڈیا ریڈیو ہے۔ اس وقت تک ریڈیو چھوٹے شہروں میں عام نہیں ہوا تھا۔ اس لیے بڑا تعجب ہوا کہ یہ کس واہیات محکمے میں پھنس گئے۔ انھیں دنوں ان کا ایک خط آیا۔ یہ خط ہمارے لیے بڑا ... تھا کیونکہ یہ جوش صاحب کے رسالے کلیم کے پیڈ پر لکھا ہوا تھا۔ بڑا رعب پڑا کہ لو وفا بھائی جوش صاحب کے رسالے میں بھی کام کرنے لگے ہیں۔ جوش صاحب ہیں ان دنوں ایک افسانوی ہیرو معلوم ہوتے تھے شاعر تو اور بھی بہت سے تھے مگر جوش و جگر کی بات کچھ اور تھی۔ علامہ اقبال کو بزرگانہ احترام حاصل تھا اور جوش و جگر کو شاعرانہ محبت۔ اس وقت تک میں نے جوش صاحب کو نزدیک سے نہیں دیکھا تھا۔ ایک بار لکھنؤ میں دور سے دیکھا تو ہاتھ میں ایک بڑا موٹا سا ڈنڈا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی شاعری کی گھن گرج مجسم ہو گئی ہے۔ بڑا خوف معلوم ہوا

جگر صاحب کو خاصے نزدیک سے دیکھا تھا اور وہ بھی وفا بھائی کے حوالے سے، کہ وہ جگر صاحب کے شاگرد تھے۔

ہوا یہ کہ ایک شام کوٹھی کے صحن میں سب لوگ بیٹھے تھے کہ ایک لول جلول ٹائپ کے مست مولا آدمی نمودار ہوئے۔ سب نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بڑے تپاک کا مظاہرہ کیا انھوں نے پوچھا۔ وفا ہیں؟ جب انھیں بتایا گیا کہ وفا صاحب نہیں ہیں تو وہ الٹے پیروں لوٹ گئے۔ لوگوں نے لاکھ کہا۔ جگر صاحب بیٹھیے۔ تشریف رکھیے مگر وہ بیٹھے نہیں۔ ابا میاں یا بھائی جان موجود ہوتے تو شاید بیٹھ بھی جاتے مگر دونوں غائب تھے۔ اس وجہ سے وہ چلے گئے مگر اگلے دن پھر آئے۔ بہت جم کر بیٹھے۔ خوب شعر خوانی ہوئی۔ جگر صاحب سارے نوعمروں سے بڑی شفقت سے پیش آئے۔ ذرا بھی اکڑ فوں۔ نخوت یا بھاری بھرکم پن کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ادھر وفا بھائی کی یہ کیفیت کہ جی جان سے صدقے واری ہوئے جا رہے ہیں۔ بس نہیں کہ جگر صاحب کو سر پر بٹھا لیں۔ اس دن یہ معلوم ہوا تھا کہ وفا بھائی جگر صاحب کے شاگرد ہیں اور بڑے عزیز شاگرد ہیں۔

اُستادی شاگردی کے حوالے سے دو واقعے میں نے گھر میں سُنے۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ غالب کی زمین میں مشاعرہ ہوا تھا۔ وفا بھائی نے طرحی غزل پڑھی اور جب اس شعر پر پہنچے ؎

مرے ہی خون سے رنگینیٔ جہاں قائم
مجھی سے پوچھ رہے ہو ترا لہو کیا ہے

تو جگر صاحب بڑے خوش ہوئے۔ گلے لگا لیا اور کہا ایسے ہی اشعار سے تمھارا نام روشن ہوگا۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک بار وفا بھائی جگر صاحب سے ناراض ہو گئے۔ نجانے کیا بات ہوئی۔ بڑے ناراض تھے۔ اس زمانے میں ایک غزل کہی جس کا مقطع یہ تھا ؎

او وفا تو بھی جگر سا ہو گیا
بے مروّت ناشناس آرزو

جگر صاحب کا بڑاپن یہ کہ جب یہ غزل سُنی تو بہ نفس نفیس تشریف لائے۔ وفا بھائی کو گلے لگایا اور کہا، ساری دنیا مجھ سے ناراض ہو جائے مگر میں تمھیں ناراض نہیں ہونے دوں گا۔ یہ دونوں واقعات وفا بھائی کے انتقال کے بعد ان کے برادر خورد ظہیر بھائی نے مجھے سنائے تھے۔ اب وہ بھی مرحوم و مغفور ہو چکے ہیں۔ اصل میں وفا بھائی کے مزاج میں کسی قدر تلوّن تھا۔ نہ ایک جگہ ٹک کر بیٹھتے تھے نہ جم کر کام کرتے تھے آج اس سے خوش کل اس سے ناخوش۔ آل انڈیا ریڈیو میں رہے تو وہاں بھی حسب دستور کچھ خوش رہے کچھ ناخوش رہے۔ بہزاد صاحب اور منشی ضامن جعفری ریڈیو میں ان کے ساتھی تھے۔ حسنِ اتفاق یہ کہ مجھے ریڈیو پاکستان کراچی میں ان دونوں کی رفاقت

میسر آئی۔ ایک دن میں نے دونوں سے وفا بھائی کے بارے میں پوچھا۔ بہزاد صاحب بڑی دیر تک پچھلی باتیں یاد کرتے رہے۔ کہنے لگے۔ وفا کے مزاج میں بے چینی بہت تھی بڑی جلدی خفا ہو جاتے تھے۔ مگر فوراً ہی من بھی جاتے تھے۔ جب ناراض ہوتے تو مجھے لکھنوٴ کا بھانڈ قرار دیتے۔ خوش ہوتے تو پیر و مرشد اور حضرت والا کہتے۔ ایک دفعہ زیادہ ناراض ہوئے تو میری ایک منظوم ہجو لکھ ماری۔ بعد میں اس پر شرمندہ بھی ہوئے۔ منشی ضامن جعفری کا بیان یہ تھا کہ وفا شریف، وضع دار، ملنسار لیکن زود رنج آدمی تھے۔ بہزاد صاحب سے لڑائی یوں ہوتی تھی کہ دونوں میں چشمک تھی۔ دونوں آپس میں بڑے دوست بھی تھے۔

وفا بھائی نے حسبِ عادت کچھ عرصے بعد آل انڈیا ریڈیو سے بھی قطع تعلق کر لیا "وہ لیے پھرتی ہے کہیں ایک تو تبع غالب"، بمصداق جبل پور چلے گئے۔ گن کیرج فیکٹری میں ملازم ہو گئے۔ کہاں لاہور اور دلی کا ادب و شعر کا ماحول۔ کہاں توپوں، بندوقوں کی دنیا مگر چونکہ ایک بھائی اور بہن وہاں تھے اس لیے انھوں نے بھی ادھر ہی کا رُخ کیا کچھ دن ملازمت کی چکی میں پستے رہے۔ پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ فرخ آباد آ گئے۔ اب کے ایسے آئے کہ پھر کہیں اور جانا نصیب نہ ہوا جس خاک سے اٹھے تھے اسی کا پیوند ہو گئے۔

میرے لیے وفا بھائی کا آنا ہمیشہ شادمانی کا باعث ہوتا تھا کیونکہ وہ عارضی طور پر دو تین دن کے لیے بھی آتے تھے تب بھی نئی نئی کتابوں کے دو بکس ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ ماہنامہ ساقی میں جن نئی کتابوں کے اشتہار شائع ہوتے تھے وہ سب ان کے ساتھ ہوتیں۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے افسانوں کا مجموعہ "محبت اور نفرت" میں نے پہلے پہل انھیں کے پاس دیکھا تھا۔ "نیا ادب" کے پرچے بھی انھیں کے پاس دیکھے۔ موقع ہوتا تو ان کی غیر موجودگی میں ان کی بیاض بھی پڑھتا۔ ایک موٹی سی مجلد کاپی تھی جس میں وہ اپنا کلام نہایت خوش خط لکھتے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ بیاض ایک نہیں کئی تھیں۔ اس دور میں وہ نئے انداز کی نظمیں لکھ رہے تھے اور ترقی پسند تحریک سے بہت متاثر تھے۔ شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے ہوئی تھی والد مرحوم ان کی غزلوں کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ بتاتے تھے کہ ایک زمانے میں ابوالقاسم مشاعروں میں بہت جلتے تھے۔ طرحی مشاعروں میں میدان ہمیشہ انھیں کے ہاتھوں رہتا تھا۔ یہ میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے کی باتیں ہیں۔ بعض مقامی مشاعروں کے گلدستے میری نظر سے گزرے ہیں جن میں ان کی غزلیں موجود تھیں۔ فرخ آباد سے ایک گلدستہ "مشاعرہ" شائع ہوتا تھا اس میں بھی ان کا کلام ہوتا تھا۔ والد صاحب بتاتے تھے کہ ظہیر الدین صدیقی مرحوم کے استاد شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے برادر بزرگ نصیر الدین مرحوم ایک زمانے میں مین پوری میں منصف تھے۔ مرحوم نے وہاں ایک بڑا زبردست طرحی مشاعرہ کیا۔ طرح تھی۔ دل مجھے منزل بنے۔

ے شمار شاعر جمع ہوئے۔ جگر صاحب نے بڑی دھوم کی غزل پڑھی ۔

فکرِ منزل ہے نہ فکرِ جادۂ منزل مجھے
جا رہا ہوں جس طرف لے جا رہا ہے دل مجھے

س مشاعرے میں وفا بھائی بھی شریک ہوئے تھے اور ان کی غزل بھی بہت سرسبز
ہوئی تھی۔ اس مشاعرے کا گلدستہ بھی چھپا تھا۔ بچپن میں دیکھا تھا اور کچھ تو یاد
نہیں۔ فرخ آباد کے ایک مزاح گو شاعر چھنالال ساحر کا ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔

ع بھاگ آئے چھوڑ کر سارے سرِ منزل مجھے

وفا بھائی نے غزلیں۔ نظمیں۔ گیت۔ بچوں کی نظمیں بہت کچھ لکھا اور خوب
لکھا مگر افسوس کہ ان کا سارا کلام ضائع ہو گیا۔ ظہیر بھائی کو بہت کچھ یاد تھا میں جب بھی
اصرار کرتا کہ یادداشتوں کو کاغذ پر محفوظ کر لیجیے تو وہ بڑی خوشدلی سے وعدہ کر لیتے
مگر جلد ہی بھول جاتے۔ بہت کچھ کلام رسالوں میں بکھرا ہوا ہے۔ ادبی دنیا میں بہت کچھ
شائع ہوا۔ بعض پرانے پرچوں میں میں نے خاصا کلام دیکھا۔ تھوڑا بہت نقل بھی کیا مگر
اب تلاش کرتا ہوں تو نہیں ملتا۔ حد تو یہ ہے کہ تذکرہ شعرائے فرخ آباد میں بھی وفا
بھائی کا کوئی ذکر نہیں ہے حالانکہ وہ فرخ آباد کے بڑے اہم شاعر تھے اور ان
کے کلام کی گونج دلی اور لاہور میں بھی سنی جاتی تھی۔ کلام کی اشاعت کی طرف بھی انھوں
نے کوئی توجہ نہیں کی۔ توجہ کیا کرتے۔ فرصت ملتی سوچتے۔ غور کرتے۔ ساری زندگی
تنگ و دو میں گزری۔ آج یہاں کل وہاں۔ مالی پریشانیوں کا شکار بھی رہے ورنہ اس زمانے
میں شعری مجموعے کی اشاعت آج کل کی طرح امرِ محال نہیں تھی۔ ہمارے بنگلے کتنے
خوش گو شاعر اور ادیب اسی طرح گمنام ہو گئے۔ کسی کو نام بھی یاد نہیں رہا۔ حالانکہ
اپنی زندگی میں وہ بڑے مقبول اور خوش گو شاعر سمجھے جاتے تھے۔ کسی شاعر کے کلام
کا وقت پر شائع نہ ہونا اس کی سب سے بڑی بدنصیبی ہے۔ نثر نگاروں کی بھی یہی کیفیت
ہے۔ صلائے عام والے میر ناصر علی کیا اچھی نثر لکھتے تھے۔ لیکن کوئی نثری مجموعہ ان کی
زندگی میں شائع نہیں ہوا کوئی دس بارہ برس پہلے انجمن نے ایک مجموعہ شائع کر دیا
ہے مگر یہ بعد از وقت ہے۔ نئی نسل میر صاحب کو یکسر فراموش کر چکی ہے تاریخ
میں بھی ان کا نام اور کام نمایاں نہیں رہا۔ وفا بھائی کا کوئی مجموعہ سرے سے
شائع ہی نہیں ہوا اس لیے انھیں کون یاد رکھتا۔

وفا بھائی نے بچوں کے لیے جو نظمیں لکھی تھیں ان کا ایک مجموعہ دلی سے شائع
ہوا تھا۔ بڑی دل کش اور خوب صورت نظمیں ہیں۔ ان نظموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ
انھیں الفاظ پر کیسی قدرت حاصل تھی۔ لہجہ کیسا رچا ہوا تھا اور بچوں کے لیے
بچہ بن کر دلوں میں جھانکنے کا کیسا ملکہ تھا۔ ان کی ایک نظم "تاروں بھری رات"
مجھے پہلے بھی پسند تھی۔ آج بھی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے اس مضمون پڑھنے

والوں کو بھی پسند آئے گی ۔

کیا رات کا سماں ہے ۔ نورانی کہکشاں ہے
چھٹکے ہوئے ہیں تارے ۔ یہ ننھے منے پیارے
یہ چاند جگمگاتا ۔ بادل میں منہ چھپاتا
نکلا وہ چھپ چھپا کر ۔ باٹنا وہ نور گھر گھر
اک نور کی پری ہے ۔ جو عرش پر کھڑی ہے
صورت دکھا رہی ہے ۔ افشاں لٹا رہی ہے
تاریکیاں ہٹائیں ۔ خاموشیاں مٹائیں
گلشن میں نور بکھرا ۔ پھولوں کا رنگ نکھرا
سب میں ہے نور چھایا ۔ ہے نور ہی کا سایا
کیا چاندنی کھلی ہے ۔ یہ شب دلھن بنی ہے
دریاؤں کے کنارے ۔ اترے ہوئے ہیں تارے
ہے نور کی یہ کشتی ۔ پانی میں چلتی پھرتی
اک کھیل ہو رہا ہے ۔ منہ چاند دھو رہا ہے
یاد آئیں گی یہ باتیں ۔ تاروں بھری یہ راتیں
ہے نور کی نشانی ۔ کیا رات ہے سہانی

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ مجموعہ مکتبہ جامعہ نے شائع کیا تھا۔ کل اکتیس نظمیں ہیں۔ سرورق اور پہلا صفحہ نہ ہونے کی وجہ سے میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ ناشر کون تھا۔ پھر! مجھے ایک گھپلے کا احساس بھی ہوا۔ انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ خاص و عام میں بھی وفا بھائی کی بچوں کی نظموں کا ایک مجموعہ موجود ہے۔ نام ہے "غنچے" یہ مجموعہ ایک فرخ آبادی، ایس احمد مجیبی نے شائع کیا تھا۔ مجیبی مرحوم نے کلاں محل دہلی میں ایک ادارہ "بچوں کا بک ڈپو" کے نام سے قائم کیا تھا چھوٹی چھوٹی کتابیں شائع کرتے تھے۔ بذات خود بچوں کے بڑے اچھے مصنف تھے کوئی سو سوا سو کتابیں لکھی ہوں گی۔ اردو کے کلاسیکی ادب کو بھی بچوں کے لیے مرتب کیا تھا۔ باغ و بہار اور فسانہ عجائب دونوں کو بچوں کے لیے بڑی خوبصورتی سے اقتباس کیا تھا۔ بچوں کے لیے الف لیلیٰ بھی مرتب کی تھی۔ مجیبی مرحوم کا شمار بھی اردو کے گم شدہ مصنفوں میں ہوتا ہے۔ ساری زندگی قلم گھسا اور آخر میں قلم نے انھیں گھس دیا۔ انھوں نے مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ انھوں نے بچوں کی زبان میں مولوی صاحب کے بارے میں جو مضمون لکھا تھا وہ ایک منفرد تحریر ہے۔ یہ مضمون ساقی میں شائع ہوا تھا۔ بچوں کی زبان کی مناسبت سے مجیبی صاحب نے اس مضمون میں

، اردو کی ترکیب استعمال نہیں کی ہر جگہ اردو ہا لکھا ہے۔ مجیبی صاحب کی شخصیت
بات ادب ایک علاحدہ مضمون کی نہیں پورا ایک کتاب کی متقاضی ہیں۔ غیر ہو جملہ
، ذرا طویل ہوگیا۔ تو وفا بھائی کی نظموں کا مجموعہ "غنچے" مجیبی صاحب نے جنوری ۱۹۴۷
ئع کیا۔ ایک چھوٹا سا دیباچہ بھی "وفا مرحوم" کے عنوان سے لکھا۔ یہ دیباچہ
شناسی کے سلسلے میں ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے میں اسے
نقل کرتا ہوں۔

"ریاست قدیم فرخ آباد کے رئیس غضنفر جنگ نواب محمد خاں بنگش مرحوم
ے ان پڑھ سپاہی آدمی تھے۔ مگر حاکم کی تمام صفتوں کے مالک۔ بڑے جوہر شناس۔
، نواز اور علم و فن کے قدر دان۔ ہر قسم کے غیر معمولی صاحب کمالوں کو اکٹھا کر
ما۔ ان باکمالوں میں اچھے اچھے جیوٹ سپاہی بھی تھے۔ مصوّر و خوش نویس
تھے۔ بڑے بڑے فاضل اور جید عالم بھی۔ انھیں عالموں کے خاندان سے
نے والا ہمارا وفا بھی تھا۔ باپ مولوی۔ خود بھی تندی اور مرحوم کا مزاج بڑا خدمتی۔
خدا بخشے وفا خوب تھا بیچارا۔ مگر لکھنے پڑھنے کا ذوق فطری رکھتا تھا۔ بہترا
لیا۔ جب تک جیا کولھو کا بیل بنا رہا لیکن غریب کو زندگی کا سکھ ملا پر نہ ملا۔ آخر
، کی کوشش کرتے کرتے چل ہی بسا۔

مرنے والے نے بچوں کے لیے بہترا مفید کام کیا۔ کہانیاں بھی لکھیں۔ نظمیں
۔ مکالمے بھی لکھے، ڈرامے بھی۔ ریڈیو والوں، اور اکثر ناشروں کے یہاں رہتا رہا
نے بیچارے نے کیا کیا چھوڑا اس کا پتا نہ چلا۔ جس طرح وہ خود جیتے جی سب
نگاہوں سے اوٹ رہا۔

وفا مرحوم کی یہ وہ نظمیں ہیں جو بڑی چھان بین کرکے اکٹھا کی ہیں۔ مرحوم کو سہارا
اس کا رنگ اور نکھرتا۔ پھر بھی آپ دیکھیں گے نئے لوگوں میں مرحوم کو بچوں کی
ں لکھنے کا سلیقہ بہت زیادہ تھا۔ کاش وہ مدتوں جیا ہوتا۔ ہم سب کو فائدہ پہنچاتا
ت شاید اسے بھی سکھ چین پہنچاتا۔"

اس دیباچے سے وفا بھائی کی زندگی کی ایک صحیح اور سچی تصویر سامنے آتی
ہے۔ گھپلا یہ ہے کہ مجیبی صاحب دعوا کر رہے ہیں کہ انھوں نے نظمیں بڑی چھان بین
ر کے اکٹھا کی ہیں مگر میرا خیال ہے کہ مکتبہ جامعہ والا مجموعہ ان کے اس مجموعے سے
ت پہلے شائع ہوگیا تھا۔ دو نظموں کے علاوہ غنچے کی تمام نظمیں اس میں موجود
ہیں اور پانچ نظمیں ایسی بھی ہیں جو غنچے میں نہیں ہیں۔ یہ باور کرنے کو دل نہیں چاہتا
مجیبی صاحب نے یہ مجموعہ نہ دیکھا ہو۔ بہرحال جو بھی ہو کچھ نہ کچھ گھپلا ضرور ہے۔
میں وفا بھائی کے ادبی ذوق اور معلومات کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا
ن کے انتقال کے وقت (۱۹۴۱) میں میٹرک کی منزل سر کر چکا تھا مگر اس موقف میں

نہیں تھا کہ ان سے کوئی ادبی مکالمہ کر سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ وہ ہمیشہ نئی سے نئی کتاب پڑھتے ہوئے ملتے۔ ادب میں نئی تحریکوں سے دلچسپی لیتے تھے اور بڑے باخبر شاعر تھے۔ ایک دفعہ وہ حسبِ معمول کہیں باہر سے آئے۔ آتے ہی مجھے پوچھا۔ جب میں ان کے پاس گیا تو کہنے لگے "میاں تم نے میٹرک کر لیا ہے؟" میں اس زمانے میں آٹھویں جماعت میں تھا۔ بولے "پہلے میٹرک کرو پھر لکھنا لکھانا شروع کرو۔ ویسے تمھاری کہانی اچھی تھی مجھے پسند آئی۔" انھیں دنوں میری ایک کہانی بچوں کے رسالے پھول میں شائع ہوئی تھی۔ پھول میں بچوں کے نام کے ساتھ پتا بھی ہوتا تھا۔ اس لیے وہ مجھے پہچان گئے مجھے تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی کہ اتنے بڑے شاعر اور ادیب نے میری کہانی پڑھی اور پسند کی۔ گھر میں کسی نے نوٹس ہی نہیں لیا تھا۔ اتنا اہم ادبی واقعہ ظہور میں آنے کے بعد بھی سب خاندان والے خاموش تھے۔ اس بات سے مجھے بڑی تکلیف ہوئی تھی مگر وفا بھائی کی تحسین نے ساری کوفت دور کر دی۔

وفا بھائی کے انتقال کے بہت بعد مجھے ان کے بہت سے جاننے والوں اور دوستوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ سب نے ان کی شعری صلاحیتوں اور ادبی ذوق کے بارے میں بڑے اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ جگر صاحب بھی ان کے بڑے مداح اور معترف تھے۔ کئی بار انھوں نے مجھ سے وفا بھائی کی تیزی طبع اور تخلیقی صلاحیت کی تعریف کی۔ گن کیرج فیکٹری جبل پور میں ایک بزرگ شاعر تھے ابو الفاضل راز چاند پوری راز صاحب وفا بھائی کا اکثر تذکرہ کرتے تھے اور ان کی ادبی صلاحیتوں کے قائل تھے افسوس یہ ہے کہ میں نے شاہد بھائی (شاہد احمد دہلوی مرحوم) سے بھی وفا بھائی کے بارے میں نہیں پوچھا۔ بس خیال ہی نہیں آیا ورنہ کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہوتا۔ ہر چند کہ وفا بھائی شاہد بھائی کے حلقۂ اثر سے تعلق نہیں رکھتے تھے تاہم شاہد بھائی آل انڈیا ریڈیو دلی کی ابتدا ہی سے اس سے واقف تھے لہٰذا وہ وفا بھائی کو جانتے ضرور ہوں گے۔

وفا بھائی سادہ مزاج اور دنیاوی اعتبار سے سادہ لوح انسان تھے۔ ان کے والد عالم تھے۔ مبلغ تھے۔ مسلم لیگ کے مقامی رہنما تھے۔ خوش گفتار، معاملہ فہم اور انگریزی سے واقف تھے۔ سو برس سے زیادہ عمر پائی۔ آخری آرام گاہ پنڈی میں میسر آئی۔ مگر وفا بھائی باپ کے برعکس خاموش اور کم گو تھے۔ نہ انھیں کسی سیاست سے تعلق تھا نہ وہ معاملہ فہم تھے۔ بلکہ میں نے اکثر یہ محسوس کیا ہے کہ وہ اپنی بھل منساہٹ سے معاملات کو بگاڑ دیتے تھے۔ سدھار کی کوئی توقع ان سے نہیں تھی مزے کی بات یہ ہے کہ وفا بھائی کے والد بھی خوش گفتار اور معاملہ فہم نہیں تھے اللہ تعالیٰ نے ان کی والدہ کو بھی ان اوصاف سے نوازا تھا۔ وہ بھی بڑی فصیح بیان سلیقہ مند اور معاملہ فہم خاتون تھیں۔ اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں سے واقف تھیں۔ ایسی مرتب گفتگو کرتی تھیں کہ سننے والے دنگ رہ جاتے تھے۔ وفا بھائی

اولاد اکبر ہونے کے باوجود ان اوصاف کے حامل نہیں تھے۔ وہ اپنی دنیا میں مگن
ایک سیدھے سادے فن کار تھے۔ باپ کے جبر سے مولوی بن گئے تھے لیکن اس
علم کو پیشے کے طور پر اختیار نہیں کر سکے۔ اسی وجہ سے باپ بیٹے کے تعلقات
خوش گوار نہیں تھے۔ باپ کو یہ شکوہ تھا کہ میاں ان کے نقش قدم پر نہیں چلے۔ وفا بھائی
کے ذہن میں یہ گرہ کہ مجھے میری مرضی کے مطابق تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں
دیا گیا۔ ان کے مزاج کا تلون غالباً اسی وجہ سے تھا بغاوت کی ہمت نہیں تھی۔ اس
وجہ سے ساری زندگی جلتے رہے۔ ان کے چھوٹے بھائی کے مزاج میں باغیانہ رجحان
تھا لہٰذا انھوں نے مولوی بننے سے صاف انکار کر دیا۔ وفا بھائی اپنی ماں کے لاڈلے
تھے۔ والد انھیں خاطر میں نہیں لاتے تھے لیکن والدہ ان پر جان چھڑکتی تھیں۔
ان کا کلام بڑے شوق سے سنتی تھیں۔ محبت اور احترام سے ان کا تذکرہ کرتیں
گفتگو میں ان کے شعر سناتی تھیں۔ وفا بھائی کے انتقال پر ان کی حالت دیکھی نہیں
جاتی تھی۔ حیرت زدہ تو پھوپھا میاں بھی تھے مگر پھوپھی اماں کا حال بہت ابتر تھا۔
میری رائے میں وفا بھائی کا المیہ یہ تھا کہ انھوں نے شعر و ادب کو پیشے کے طور
پر اختیار کیا۔ انگریزی انھوں نے اپنے طور پر پڑھی تھی۔ کوئی سند حاصل نہیں کی
تھی اس وجہ سے تمام سرکاری اور تجارتی اداروں کے دروازے ان پر بند تھے۔ دینی درس
و تدریس سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اردو کے اخبارات کم اور صحافیانہ زندگی
میں بھی کچھ رکھا نہیں تھا۔ مجبوراً انھوں نے ادبی صحافت کو پیشہ بنایا لیکن ادبی صحافت
اس دور میں جسم و جاں کے رشتے کو استوار رکھنے میں بڑی حد تک ناکام تھی۔ انگریزی
کی سند ہوتی تو بڑے آرام سے کسی بھی محکمے سے وابستہ ہو جاتے اور سکون کی زندگی
گزارتے۔ اردو رسائل اور ریڈیو سے انھیں کچھ بھی نہ ملا۔ نہ شہرت۔ نہ عزت۔ نہ
کوئی مالی یافت۔ مالی کمزوری کی وجہ سے خاندان کے افراد بھی ان سے کچھ خوش نہیں
تھے۔ برملا تحقیر کرتے تھے۔ ایک آدھ نے یہاں تک کہہ دیا "میاں شعر و شاعری
کے سہارے زندگی نہیں گزرتی۔ کوئی ڈھنگ کا کام کرو"۔ نجانے ڈھنگ کے کام
سے ان کی کیا مراد تھی۔ وفا بھائی اپنی سادہ دلی کی وجہ سے ان باتوں کا برا نہیں
مانتے تھے۔ ہمہ وقت فکر شعر میں ڈوبے رہتے تھے۔ شاعری ان کے لیے وظیفۂ
حیات تھی۔ لوگ کچھ بھی کہتے رہیں۔ ارد گرد کچھ بھی ہوتا رہے وہ سب سے
بے نیاز شعر و شاعری کی دنیا میں مگن رہتے تھے مگر ایک بات ہے۔ ساری سادہ لوحی
اور شعر و شاعری کے باوجود وہ اپنے ارادوں میں پختہ اور اصولوں میں سخت تھے
سمجھوتوں کے قائل نہیں تھے۔ جو فیصلہ کر لیا کر لیا۔ ادھر کی دنیا ادھر جائے مگر ان
کا فیصلہ نہیں بدلتا تھا۔ جبل پور میں خاصے اطمینان سے زندگی گزار رہے تھے۔ نجانے
کیا سوجھی۔ بستر باندھ لیا۔ بہن بہنوئی نے بہت سمجھایا۔ دنیا کی اونچ نیچ سمجھائی۔

مگر سب بے سود۔ فرخ آباد چلے آئے۔ ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا کہ کریں گے کیا۔ زندگی کس طرح گزرے گی۔ یہ سارے سوال ان کے لیے بے معنی تھے۔ حالات نے انھیں کسی قدر نازک مزاج بھی بنا دیا تھا۔ نہ بنتے تو تعجب ہوتا۔

وفا بھائی اگرچہ مالی اعتبار سے آسودہ حال نہیں تھے لیکن تھے شاہ خرچ۔ پیسہ ان کے ہاتھ میں ٹکتا نہیں تھا۔ کبھی کبھی خود ہنس کر کہتے "کیا کروں میرے ہاتھ میں چھید ہے۔" پان سگریٹ سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ میں نے انھیں سگریٹ پیتے نہیں دیکھا۔ پان کبھی کبھار کھا لیتے تھے۔ عادتاً کھانے پینے میں بھی کوئی خاص تکلف نہیں تھا۔ جو ملا جیسا ملا۔ کھا لیا۔ اصل میں انھیں فکر شعر سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی جو ان باتوں کی طرف دھیان دیتے۔ بھابی جان کی وجہ سے ان کی زندگی میں تھوڑی بہت باقاعدگی پیدا ہو گئی تھی ورنہ کتابیں احتیاط سے رکھنے کے علاوہ انھیں کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

وفا بھائی کی شادی کب ہوئی تھی مجھے یاد نہیں۔ یہ معلوم ہے کہ دلّی میں ہوئی تھی مگر بھابی جان کا تعلق دلّی سے نہیں فیروزآباد سے تھا۔ وہ نہایت معصوم۔ خدمت گزار اور نیک خاتون ہیں۔ مرنے بھرنے والی۔ جب تک وفا بھائی زندہ رہے ان کی خدمت کرتی رہیں۔ ان کا انتقال ہو گیا تو بچیوں کی پرورش و پرداخت میں ہمہ تن مصروف ہو گئیں۔ جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ بچیوں کی پرورش کے سہارے زندگی گزار دی۔ آج کل کسی بچّی کے ساتھ رہتی ہیں۔ اور بچیوں کے بچّے ان کی توجہ کا مرکز ہیں۔ وفا بھائی کی تین لڑکیاں تھیں۔ ایک بچّی ان کے انتقال کے دوسرے یا تیسرے دن پیدا ہوئی تھی۔ مجھے یاد ہے پھوپھا میاں نے ایک شام فاتحہ کے بعد سب سے کہا "یہ مسئلہ بھی بیان کر دوں کہ میری بہو کی عدّت نہیں ہو گی۔" پھر انھوں نے عدّت نہ ہونے کی وجہ بیان کی اور سب لوگ مطمئن ہو گئے۔

وفا بھائی اپنی لڑکیوں سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ہر جگہ ساتھ لے جاتے۔ بڑی ناز برداری کرتے۔ ان کی زندگی میں بچیاں چھوٹی تھیں لیکن دونوں کو پڑھنے لکھنے سے رغبت تھی۔ بظاہر وفا بھائی کی گھریلو زندگی بڑی خوشگوار تھی اور کیوں نہ ہوتی۔ یک طرفہ ٹریفک تھا۔ وہ اپنے ادب و شعر میں محو، بھابی جان تنگی ترشی کے باوجود گھر کی حالت درست رکھتیں جو کچھ گزرتی خندہ پیشانی سے گوارا کر لیتیں۔ ان کی زبان سے شکایت کا کوئی لفظ کبھی نہیں نکلا۔ نہ وفا بھائی کی زندگی میں نہ ان کے مرنے کے بعد۔

۱۹۴۱ء میں وفا بھائی کا انتقال ہوا۔ جبل پور سے فرخ آباد آ گئے تھے۔ مستقبل کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ یہ لکھیں گے۔ یہ کریں گے۔ مگر یکایک بیمار پڑے اور دیکھتے دیکھتے چٹ پٹ ہو گئے۔ انتقال کے وقت ۳۵-۳۶ برس کی عمر ہو گی

مرنے کے دن نہیں تھے۔ مگر بلاوا آگیا اور دنیاوی جنجال سے چھوٹ گئے۔
وفا بھائی طبعاً اور مزاجاً ہماری دنیا کے فرد نہیں تھے۔ ان کی دنیا الگ تھی عالم آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عالم آزادگاں کا کوئی شخص سزا کے طور پر یہاں بھیج دیا جاتا ہے اور اسے بڑی کڑی آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ وفا بھائی کی زندگی بھی ایک آزمائش تھی۔ فطرت نے انھیں جس غیر معمولی صلاحیت سے نوازا تھا اس کا برائے نام اظہار ہوا۔ ساری زندگی مارے مارے پھرتے رہے۔ مدیران کرام کی معاونت کرتے رہے۔ جو لکھنا چاہتے تھے اس کا موقع نہیں ملا۔ جو نہیں لکھنا چاہیے تھا وہ لکھتے رہے۔ مگر بے وفا نے وفا نہیں کی ورنہ شاید ان کا نام بھی وفاداران ادب کی فہرست میں نمایاں ہوتا۔ میں جب کبھی ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے وہ تمام ادیب اور شاعر بزرگ اور دوست یاد آتے ہیں جو ساری زندگی ادب و شعر کے کوچے میں سرگرداں رہے اور اٹھ گئے تو بے نام و نشان ہو گئے۔ تاریخ ادب کے ذیلی حاشیے میں بھی جگہ نہ پانے والے بر چھوٹے لوگ تھے بڑے لوگ۔ بہت بڑے لوگ۔ سرشار، بے نیاز۔ مقصد کی دُھن میں محو۔ زندگی بھر زندگی سے لڑتے رہے۔ حالات اور معاشرے سے لڑتے رہے۔ ادب کی شمع فروزاں کیے رہے۔ کمال کے لوگ تھے مگر اے کمال افسوس، تجھ پر کمال افسوس ہے۔

بچوں کے لیے
مکتبہ پیام تعلیم کی نئی کتابیں

ہم بنے کمانڈو . . منیر احمد راشد ۔/۹
رسول پاک کے اخلاق .. (مذہب) خلیل احمد جامی ۔/۳
حضرت آدم علیہ السلام . . منورہ نوری خلیق ۔/۳
بچوں کی صالحہ عابد حسین صغرا مہدی ۔/۳
بچوں کے عابد حسین " " ۔/۳
انمول کہانیاں ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی ۲/۵۰
بابائے اردو مولوی عبدالحق ڈاکٹر خلیق انجم ۲/۵۰
سرخ موت آصف فرخی ۲/۵۰
ایک تھا مرغا ککڑوں کوں ۔ قمر علی عباسی ۶/۔
پریوں کی کہانیاں ۔ اشرف صبوحی ۶/۔
پتھر کی گڑیا ۔ ادارہ ۷/۵۰
گندا پانی ۔ ادارہ ۴/۵۰
یہ کیسا بخار ہے ۔ ادارہ ۴/۵۰
سمندر کا بادشاہ ہار گیا ۔ ڈاکٹر شریف الحسن ۔/۳
چوں چوں بیگم شفیقہ فرحت ۳/۰۰
افریشیا کی کہانیاں فضل حق قریشی ۷/۵۰
۸۰ دن میں دنیا کا چکر ترجمہ علی اسد ۳/۰۰
ماسٹر شامت اشرف صبوحی ۶/
امت کی مائیں حسین حسنی ۲/۵۰
اچھی باتیں سعدالدین انصاری ۲/۵۰

آپ کا جسم علی ناصر زیدی
تھوڑی تارا ماما بھی چاند اشرف صبوحی
دنیا کی عجیب کہانیاں . آصف فرخی .
ہزاروں خواہشیں . مسعود احمد برکاتی
پکڑے گئے (ادارہ) ۵۰
درویش کا تحفہ . افشاں بیگم
موزا سے فرار . رفیع الزماں زبیری
گلیور کے تین حیرت انگیز سفر (بچوں کے لیے) ترجمہ محمد خان خلیل
بکرے کی تعریف میں . یوسف ناظم ؛
پہیلی کا راز " ثریا فرخ ؛
قصر صحرا اول . مرزا عظیم بیگ چغتائی ؛
قصر صحرا دوم " " ؛
قصر صحرا سوم " " ؛
بچوں کے ڈپٹی نذیر احمد . ڈاکٹر اسلم فرخی .
بچوں کے محمد حسین آزاد " " "
بچوں کے مرزا غالب " " ؛
بچوں کے رنگا رنگ خسرو " " ؛
بچوں کے سلطان جی (مذہب) " " ؛
بچوں کی تیاگی " ظفر محمود ۵۰/
بہار کا پنچھی " فرخندہ لودھی ۔/۷
ہیروں کے چور اور سونے کی تلاش " (ادارہ) ۔/۵۰
بادری کی روح " (ادارہ) ۔/۴
ٹھگ نے ٹھگا ٹھگ کو " انصار عبدالعلی ۵۰/
گدھا کہانی " میرزا ادیب ۔/۹
خفیہ سرنگ " ثریا فرح ۔/۹
بزرگان دین (مذہب) " محمود علی خاں جامعی ۔/۶
بڑھیا کی بھینس " (ادارہ) ۔/۴
سائنس کی دنیا فرید الدین احمد ۔/۸
غذائیں دوائیں (ادارہ) ۔/۸
تیس مار خاں شاہد علی خاں ۳/۵۰
ریل کے بچے ترجمہ احمد خاں خلیل ۲/

پروفیسر گوپی چند نارنگ۔ (گذشتہ سے پیوستہ)

مشرقی شعریات اور ساختیاتی فکر

ثنویتِ لفظ و معنی و افضلیتِ لفظ

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا عربی روایت کی رو سے علم کی دو اقسام ہیں، علومِ نقلیہ و شرعیہ جن میں علومِ لسانی العربی بھی شامل تھے۔ دوسرے علومِ عقلیہ و حکمیہ جن میں فلسفہ و سائنس یا علوم العجم یا علومِ قدیمہ شامل تھے جنھیں غیر عربوں نے یا ان قوموں نے پروان چڑھایا جنھوں نے ثقافتِ اسلامیہ کو قبول کر لیا تھا۔ علومِ لسانی العربی میں علم اللغۃ، علم النحو، بدیع و بیان اور ادب شامل تھا، اور علومِ عقلیہ میں فلسفہ، ہندسہ، ہیئت و فلکیات اور طب اور کیمیا وغیرہ۔ لیکن علوم کی یہ تدوین و تبویب بہت بعد کی ہے جب یونانی منطق اور ارسطو کی ریطوریقا کا اثر نمایاں طور پر پڑنے لگا۔ اگرچہ بقول ڈاکٹر عبدالعلیم بہت سے صنائع لفظی و معنوی کی عربی اصطلاحیں یونانی کا ترجمہ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن جہاں تک ادبی نقد اور شعر کی پرکھ کا سوال ہے اس کا سراغ صدرِ اسلام سے بھی پہلے ملتا ہے۔ قبائلی زندگی کی کشمکش کے زمانے میں حسب و نسب میں برتری کے دعوے، شجاعت و سخاوت کے قصے اور عصبیت اور انتقام کے واقعات باعثِ فخر و مباہات تھے، اور یہ افتخار و وقار قائم ہوتا تھا شاعری کے ذریعے۔ چناں چہ شعر و شاعری، زبان دانی اور لغت و بیان میں تفوق کا اظہار عہدِ جاہلی سے عربوں میں ایک

خاص نوع کا ثقافتی تعامل رکھتا تھا۔ قبیلوں کو اپنے اپنے شعرا پر ناز تھا۔ میلوں میں قبائلی برتری کے قصیدے پڑھے جاتے اور جس کا قصیدہ سب سے اعلیٰ قرار پاتا اسے خانۂ کعبہ پر لٹکا دیا جاتا۔ 'سبعہ معلقات' اسی سے یادگار ہے غرض شاعری کا افتخار و امتیاز ثقافتی اور اجتماعی وجود کا حصہ تھا اور یہ شناخت کا ایسا ذریعہ تھا جس پر زیادہ سے زیادہ فخر کیا جا سکتا تھا۔ یہ روایت صدرِ اسلام اور بعد میں بھی جاری رہی حتیٰ کہ اسلامی ثقافت کی خصوصیتِ خاصہ بن گئی اور اسلامی ثقافت کا اثر و نفوذ جہاں جہاں بھی ہوا، اس کے اثرات بھی نمایاں طور پر مرتب ہوئے۔

علومِ لسانی العربی شروع میں علم اللغۃ اور علم النحو پر مشتمل تھے۔ بتدریج زبان و بیان کے مسائل اور شعر کے حسن و قبح کی بحث کے لیے علم البلاغۃ پر توجہ ہوئی اور اس کی مزید تقسیم چار جامع علوم پر منتج ہوئی، علم المعانی، علم البیان، علم البدیع اور علم العروض :
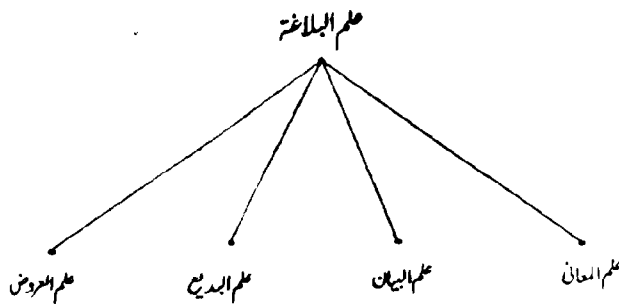
بعض علما نے علم العروض کو الگ سے لیا ہے اور سب سے زیادہ توجہ اسی پر کی ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ باوجود یونانی اثرات کے عرب روایت میں شعر کا تصور عبارت تھا وزن و قافیہ سے اور اس سے ہٹ کر شعر کی کوئی تعریف قابلِ قبول نہیں تھی :

" ارسطو نے شعر کی جو تعریف کی ہے، اس کو عربوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ وزن اور قافیے کو عربوں نے شعر کے لیے لازمی اجزا قرار دیا۔ قافیے میں تو بعد کو تصرفات بھی ہوئے، لیکن وزن سے

انکار کی جرأت کسی کو نہ ہوئی۔"　　　(جہد العلم ص ۳۹)

عروض کا تعلق بہر حال شعر کی تکنیک اور فنائیت سے تھا۔ بحور و اوزان اور ان کے دوائر کے قطعی طور پر طے ہو جانے کے بعد کسی فلسفیانہ بحث کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ یہ مباحث دراصل قائم ہوئے ادبی اظہار و بیان کے سلسلے میں علم المعانی، علم البیان اور علم البدیع کے تحت، بالخصوص پہلے دو علوم کے تحت، اور ان کا نقطۂ ارتکاز تھا لفظ و معنی کی ثنویت اور ان کے تقدم و تاخر کا مسئلہ۔ غرض بحث خواہ حقیقت و مجاز کی ہو یا فصاحت و بلاغت کی کسی شکل کی، ان سب کی تہ میں مابہ النزاع لفظ و معنی کی کش مکش تھی کہ شعری اظہار میں تحکم معنی ہے یا لفظ، یا لفظ کا تفاعل کیا ہے اور معنی کا کیا ہے، نیز شعری بیان پر قدرتِ کاملہ کے لیے کن وسائل کو زیرِ دام لانا لابدی ہے۔ اور تو اور دیگر شعری مباحث بھی لفظ و معنی کی بحث کے گرد قائم ہوتے تھے۔ یہ مبحث اتنی وسعت رکھتا ہے کہ عرب ایرانی علوم شعریہ پر قلم اٹھانے والا شاید ہی کوئی مصنف ہو جس نے پچھلی باتوں کا تکرار و حواشی اعادہ نہ کیا ہو یا پچھلی باتوں پر اپنے موقف کی بنیاد نہ رکھی ہو۔ اس ضمن میں یہ امر لائقِ غور ہے کہ علوم لسانی العربیہ میں نفسِ زبان پر نسبتاً کم توجہ ہونے کی وجہ بھی غالباً یہی ہے کہ شروع ہی سے پوری توجہ آہنگ و بدیع و بیان پر مرکوز ہو گئی۔ یعنی لفظ و معنی کی بحثیں اٹھائی تو گئیں لیکن شعری آہنگ یعنی عروض و قافیہ کے نقطۂ نظر سے یا بدیع و بیان کے نقطۂ نظر سے، نہ اس اعتبار سے کہ زبان فی نفسہٖ کیا ہے یا زبان کی نوعیت و ماہیت کیا ہے، یا زبان کیسے متشکل ہوتی ہے، یا معاشرے میں زبان اپنے بنیادی وظیفے یعنی ترسیل سے کن کن سطحوں پر اور کیسے عہدہ برآ ہوتی ہے وغیرہ۔ غرض عرب ایرانی روایت میں زبان سے مراد شعری زبان ہے اور علم المعانی یا علم البیان میں جہاں نفسِ زبان کی ماہیت و نوعیت کی بحث اٹھائی بھی گئی ہے، اسے حقیقت و مجاز میں تقسیم کر کے حقیقت کو بمنزلہ علم معمولہ (مبنی بر علم اللغۃ و علم النحو) تسلیم کر کے ساری توجہ اور غور و فکر کا پورا رُخ مجاز کی طرف موڑ دیا گیا ہے یعنی مجاز اصل صورت ہے بیانِ شعریہ کی۔ یہ بات اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتی ہے اور اس کی بحث آگے آئے گی۔

عرب روایت کی رو سے شعر کی قدر زورِ بیان، شکوہ و جلال اور بلند آہنگی پر مبنی تھی، یعنی یہ کہ شاعر اپنے قبیلے کے حسب و نسب کی برتری اور فضائل کو کس شد و مد سے بیان کر سکتا ہے۔ خود بینی اور خود ستائی کے اس ماحول میں طرزِ بیان کو زیادہ اہمیت حاصل ہو جانا فطری ہے۔ (میر الزماں ص ۱۰) صدرِ اسلام کے دور میں قبائلی موضوعات کی جگہ دینی فضائل نے لے لی۔ شعر کے اصناف میں کوئی تبدیلی ہوئی اور نہ نقد کے معیار میں۔ (عبد العلیم ص ۳۱) علومِ شعریہ کی باقاعدہ تدوین کا مسئلہ بعد میں عباسی دور میں پیدا ہوا۔ ابن قتیبہ (م ۲۷۶) کی تصنیف الشعر والشعراء عربی نقد کی اولین کتابوں میں ہے جس کا اثر بعد کے مصنفین پر بھی پڑا۔ ابنِ قتیبہ نے شعر کی چار قسمیں بتائی ہیں:

۱) جس کے الفاظ اور معنی دونوں اچھے ہوں۔
۲) جس کے الفاظ تو اچھے ہوں لیکن معنی میں کوئی فائدہ نہ ہو۔
۳) جس کے معنی اچھے ہوں لیکن الفاظ ان کو پوری طرح ادا کرنے سے قاصر ہوں۔
(۴) جس کے الفاظ اور معنی دونوں پچھڑے ہوئے ہوں۔

شعر کی نوعیت کی اس تقسیم سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابن قتیبہ لفظ و معنی کی ثنویت یعنی الگ الگ حیثیت کو تو تسلیم کرتا ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ لفظ کو حَکَم بھی قرار دیتا ہے۔ ان میں شق ایک اور شق چار انتہائی حالتیں ہیں شعر کی اچھائی اور شعر کی برائی کی، بیچ کی دو حالتیں البتہ ترجیحی ہیں جن سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ شعریات کا مقتدرہ لفظ ہے معنی نہیں۔ ورنہ اچھے لفظ کی صناعت کو شمار دو پر اور اچھے معنی کی صناعت کو شمار تین پر نہ رکھا جاتا۔ وہ یوں کہ اگر پہلی قسم کو کمال سمجھا جائے یعنی شعر اور آخری قسم کو حدِ زوال سمجھا جائے یعنی ناشعر تو دوسری اور تیسری قسم تدریجی زوال کی صورتیں ہیں، کیوں کہ اگر فقط لفظ حسین ہیں تو قابلِ قبول ہے، اس لیے کہ یہ صورت کمالِ شعر (شق ایک) سے قریب تر ہے، اور اگر فقط معنی حسین ہیں تو کم قابلِ قبول ہے، اس لیے کہ یہ صورت زوالِ شعر (شق چار) سے قریب تر ہے۔

(الشعر والشعراء/ عبد العلیم ۳۴)

بعض ماہرین علوم شعریہ جاحظ (م ۲۵۵) کو وہ پہلا شخص قرار دیتے ہیں۔
جس نے لفظ کی اولیت اور فضیلت کی بات کی اور مدلل وضاحت کی کہ اصل
چیز لفظ ہے اور معنی اس کا تابع محض ہے۔ جاحظ کا بیان ہے:

"معانی تو پیش پا افتادہ ہوا کرتے ہیں، اسے تو عربی، عجمی، دیہاتی
شہری سب جانتے ہیں، دراصل اہمیت ... اچھے الفاظ کے
استعمال کی ... ہے۔ بیشک شعر ایک صنعت ہے اور تصویر کشی کا
ذریعہ ہے۔"
(البیان والتبیین/قاسمی ص ۲۵۸)

قدامہ بن جعفر نے نقدِ شعر کو ذوقی اور موضوعی دائرے سے باہر
نکال کر معروضی اور منطقی حدود میں لانے کی کوشش کی۔ وہ شعر عربی کے
چار عناصر بیان کرتا ہے: لفظ، معنی، وزن اور قافیہ۔ اور پھر ان کے
باہمی ربط کے چار عنوانات قائم کرتا ہے:

۱) لفظ کا معنی کے ساتھ
۲) لفظ کا وزن کے ساتھ
۳) معنی کا وزن کے ساتھ
۴) معنی کا قافیہ کے ساتھ

(نقد الشعر / عبدالعلیم ص ۳۶)

اچھے (جید) اور ردی (بُرے) اشعار میں ما بہ الامتیاز عناصر کی بحث کے
بعد وہ واضح کرتا ہے کہ "اگر شعر میں صنعت و کاریگری ہے تو رسمی معانی و مفاہیم
کی جستجو نہیں کرنی چاہیے۔ اس ضمن میں وہ شعر اور اخلاق کی بحث بھی کرتا
ہے اور بتلاتا ہے کہ غیر اخلاقی اور فحش ہونے کے باوجود شعر اچھا ہو سکتا ہے
اپنی بات کو مدلل بیان کرنے کے لیے امرؤ القیس کے دو ایسے شعروں کی مثال
دیتا ہے جن میں امرؤ القیس نے اپنی محبوباؤں سے ایام رضاعت اور ایام
حمل میں اختلاط کا ذکر کیا ہے ... ان اشعار پر بحث کرتے ہوئے قدامہ
لکھتا ہے کہ "ہر چند کہ اس کے معنی فحش ہیں لیکن معنی کا فحش ہونا کوئی ایسی
خرابی نہیں جس کے سبب شعر کی دوسری خوبیاں نظر انداز کر دی جائیں۔"

(نقد الشعر / قاسمی ص ۳۶۳)

اس سلسلے میں قدامہ کا مشہور قول ہے:

" طرز بیان شعر کا اصلی جزو ہے۔ مضمون و تخییل کا بجائے خود فاحش ہونا شعر کی خوبی کو زائل نہیں کرتا۔ شاعر ایک بڑھئی ہے۔ لکڑی کی اچھائی برائی اس کے فن پر اثر انداز نہیں ہوتی "

قدامہ کے اس بیان کو شعر کی صناعت یا لفظ و بیان کی فضیلت کے سلسلے میں خاصی اہمیت دی جاتی ہے، حالاں کہ اس بارے میں ایک حدیث میں کھلا ہوا اشارہ موجود ہے:

" عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ ذُكِرَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الشِّعْرُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُوَ كَلَامٌ فَحَسَنُهُ حَسَنٌ وَقَبِيحُهُ قَبِيحٌ "

(حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلعم کے سامنے شعر کا ذکر آیا تو آپ نے فرمایا شعر کلام ہے۔ اچھا کلام اچھا شعر ہے اور بُرا کلام بُرا شعر ہے) (مشکوٰۃ ج ۲)

قدامہ کو کلام یا شعری بیان کی خوبیوں کا گہرا احساس تھا۔ اس نے نقد الشعر میں لفظ کی تین قسمیں بتائی ہیں:

۱) لفظ کا مطابقِ معنی ہونا
۲) لفظ کا مطابقِ وزن ہونا
۳) قافیے کا حسن

معائب اور محاسن کی بحث کے بعد قدامہ اچھے شاعر کی تعریف کے لیے ابو العباس محمد ابن یزید نحوی کے بیان کا سہارا لیتا ہے:

" وہ کہتا ہے کہ مجھ سے ثوری نے بیان کیا کہ میں نے اصمعی سے دریافت کیا کہ اشعر الناس کون ہے، تو اس نے جواب میں کہا کہ جو معمولی اور مبتذل مضمون کو اپنے لفظوں میں مہتم بالشان اور وقیع بنا دے، یا بلند سے بلند مطلب کو اپنے الفاظ کے زور سے پست دکھا دے " (نقد الشعر / سیح الزماں ص ۲۱-۲۲)

ان خیالات سے صاف ظاہر ہے کہ قدامہ تک آتے آتے عربی شعریات خود اپنے معروضی نظام پر قائم نظر آنے لگتی ہے اور ادب و اخلاق کی قدغن کو یا فحش و نافحش کی بحث کو بالائے طاق رکھ دیتی ہے اور شعر کی خوبی اور خامی کا انحصار خود شعر کی اچھائی یا برائی کو قرار دیتی ہے۔ ویسے دیکھا جائے

تو شعریات کے قائم بالذات نظام ہونے کا احساس اور اس سے پیدا ہونے والے خیالات یکسر نئے بھی نہ تھے، کیوں کہ رسول کریمؐ نے امرؤ القیس کے بارے میں جہاں یہ فرمایا کہ وہ جہنم کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے وہاں یہ بھی ارشاد کیا کہ بے شک شعرا میں وہ سب سے بلند مرتبت ہے (حدیث نبوی) ادب اور اخلاق کا سوال بقول ڈاکٹر عبدالعلیم سب سے پہلے ابو تمام کی شاعری کے سلسلے میں پیدا ہوا جب اس پر کفر کا الزام لگایا گیا۔ صولی نے جو چوتھی صدی ہجری میں پیدا ہوا یہ کہا کہ کفر سے شاعری میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی اور ایمان سے شاعری میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا" (ص ۳۷)۔ قدامہ کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس احساس کو ضابطہ بند کیا اور شعریات کو خود شعر کی معروضی بنیادوں پر استوار کیا۔ یہ سب دراصل اسی بحث کا حصہ تھا کہ لفظ کو افضلیت حاصل ہے یا معنی کو، یعنی شعر مضمون سے قائم ہوتا ہے یا طرزِ بیان سے۔ ظاہر ہے کہ جھکاؤ موخر الذکر کی طرف تھا۔

اسی سے جڑی ہوئی بحث 'صدق اور کذب' یا 'غلو' یا 'مبالغہ' کی بھی ہے۔ حسان بن ثابت کا شعر ہے:

إنَّ أشْعَرَ بَيْتٍ أنْتَ قَائِلُهُ   بَيْتٌ يُقَالُ إذَا إنْشَدْتَهُ صِدْقَا

یعنی سب سے اچھا شعر وہ ہے جب سنا جائے تو لگ کہہ اٹھیں کہ سچ کہا ہے

دوسرے لفظوں میں مبالغہ خواہ کتنا ہو لیکن صناعتِ شعری اس درجہ ہو کہ سننے والے کہہ اٹھیں کہ سچ ہے۔ خاطر نشان رہے کہ مبالغہ یعنی فضائل و رذائل یا محاسن و معائب کے بیان میں غلو جو مبنی بر صداقت نہ ہو، قبائلی زندگی سے یادگار تھا اور معیارِ شعر کی بحث میں اس کا رد تو کجا، اسے حسنِ بیان کے لیے ضروری سمجھا جاتا رہا۔ قدامہ نے البتہ اتنا مزید کیا کہ

أحْسَنُ الشِّعْرِ أكْذَبُهُ

(سب سے اچھا شعر وہ ہے جو سب سے زیادہ جھوٹ ہو)

کہہ کر طرزِ بیان کی بالادستی اور معنی کی زیردستی پر مہرِ توثیق ثبت کر کے اس روایت کو اور راسخ کر دیا۔ اس سلسلے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قدامہ کے اس طرح کے افکار پر ارسطو کے خیالات کا اثر تھا۔ ارسطو کی ریطوریقا کا عربی ترجمہ تیسری صدی ہجری میں اور بوطیقا کا چوتھی صدی کے اوائل میں

ہوگیا تھا۔

لفظ کی فضیلت پر زور دینے والے مفکرین کی آخری اور نہایت اہم کڑی ابنِ خلدون ہے جس نے اپنی نہایت دقیع قاموسی تصنیف مقدمہ کے بابِ ششم کا ایک پورا حصہ فنِ شعر کی بحث پر وقف کیا ہے۔ ابنِ خلدون کی بحث کا نچوڑ یہ ہے کہ شعر الفاظ سے بنتا ہے۔ اردو شعریاتی روایت میں ابنِ خلدون کے حوالے کا سب سے بڑا واسطہ حالی کا مقدمہ ہے۔ حالی کے ذہن پر ابنِ خلدون کی روایت کا اتنا اثر تھا کہ حالی ابنِ خلدون سے دلیل بھی لاتے ہیں، اسے نباہنا بھی چاہتے ہیں، اگرچہ یہ ان کے اخلاقی و اصلاحی پروجیکٹ سے بری طرح متصادم بھی ہے۔ چناں چہ وہ اس تناقض کا شکار ہیں اور اسی تناقض پر اردو شعریات کی تشکیل بھی کرتے ہیں اور سابقہ مشرقی روایت سے گریز بھی کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

انشا پردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ پر ہے نہ معانی پر

" ابنِ خلدون الفاظ کی بحث کے متعلق کہتے ہیں کہ:

انشا پردازی کا ہنر نظم میں ہو یا نثر میں محض الفاظ میں ہے معانی میں ہرگز نہیں۔ معانی صرف الفاظ کے تابع ہیں اور اصل الفاظ ہیں۔ معانی ہر شخص کے ذہن میں موجود ہیں۔ پس ان کے لیے کسی ہنر کے اکتساب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ضرورت ہے تو صرف اس بات کی ہے کہ ان معانی کو کس طرح الفاظ میں ادا کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ الفاظ کو ایسا سمجھو جیسے پیالہ، اور معانی کو ایسا سمجھو جیسے پانی۔ پانی کو چاہو سونے کے پیالہ میں بھر لو اور چاہو چاندی کے پیالے میں اور چاہو کانچ یا بلور یا سیپ کے پیالے میں اور چاہو مٹی کے پیالے میں، پانی کی ذات میں کچھ فرق نہیں آتا۔ مگر سونے یا چاندی وغیرہ کے پیالے میں اس کی قدر بڑھ جاتی ہے اور مٹی کے پیالے میں کم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح معانی کی قدر ایک فصیح اور ماہر کے بیان میں زیادہ ہو جاتی ہے اور غیر فصیح کے بیان میں گھٹ جاتی ہے۔"

(مقدمہ ص ۵۴-۵۵)

اس بیان کو نقل کرنے کے بعد حالی صاف اقرار کرتے ہیں: "ہم یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ شاعری کا مدار جس قدر الفاظ پر ہے، اس قدر

معانی پر نہیں۔ معنی کیسے ہی بلند اور لطیف ہوں اگر عمدہ الفاظ میں بیان نہ کیے جائیں گے ہرگز دلوں میں گھر نہیں کر سکتے۔" گویا حالی کا دل ابنِ خلدون کے ساتھ ہے، لیکن دماغ نہیں۔ بخلاف ابنِ خلدون کے وہ معنی کو ترجیح دینا چاہتے ہیں ورنہ ان کا اصلاحی پروجیکٹ پارہ پارہ ہوتا ہے۔ اس لیے معنی کی بالادستی کے لیے وہ ذیل کی دلیل لاتے ہیں:

> "مگر ہم اُن (ابنِ خلدون) کی جناب میں عرض کرتے ہیں کہ حضرت اگر پانی کھاری یا گدلا یا بوجھل یا اُدھن ہوگا، یا ایسی حالت میں پلایا جائے گا جب کہ اس کی پیاس مطلق نہ ہو تو خواہ سونے یا چاندی کے پیالہ میں پلایئے خواہ بلور یا ٹھیک کے پیالہ میں وہ ہرگز خوشگوار نہیں ہوسکتا اور ہرگز اس کی قدر نہیں بڑھ سکتی۔" (ص ۵۵)

حالی یہاں یہ بھول جاتے ہیں کہ انھوں نے پانی کی کیفیت یا پیاس کی جو شرط لگائی ہے، ابنِ خلدون کی دلیل پر اس کا اطلاق اس لیے نہیں ہوتا کہ دلیل میں فقط دو قدریں ہیں، پانی اور ظروف۔ ظروف قدرِ متغیر یا قدرِ متبادل ہے، لیکن پانی قدرِ غیر متغیر ہے، یعنی پانی وہی رہے گا، اچھا، صاف، گدلا یا آدھن، اگر اچھا ہے تو اچھا اور گدلا ہے تو گدلا سب ظروف میں پانی وہی ہوگا اور اس کی قدر بہ اعتبارِ ظرف ہوگی نہ کہ بہ اعتبارِ کیفیت۔ گویا دلیل میں پانی کا پینے کے قابل ہونا لازم ہے اختیاری نہیں۔ پس پانی کی کیفیت کا مسئلہ خارج از بحث ہے۔ رہا پیاس کا تصور تو یہ راجع بہ فن نہیں راجع بہ قاری ہے۔ جو سرے سے دوسری بحث ہے اور غیر متعلق ہے۔ الغرض یہ بھی ابنِ خلدون کے دائرہ دلیل سے باہر ہے، اس لیے ساقط ہے۔

اب تصویر کا دوسرا رُخ لیجیے صدیوں کی روایت شاہد ہے کہ نہ صرف لفظ و معنی کو الگ الگ سمجھا گیا بلکہ لفظ کی فضیلت اور بالادستی کو علومِ شعریہ میں بمنزلہ ایک اصول کے تسلیم کیا گیا اور ساری نظریہ سازی انھیں بنیادوں پر ہوتی رہی۔ تاہم ایسا نہیں کہ اس روایت کے خلاف آواز نہ اٹھائی گئی ہو، یا معنی کی اہمیت کا اعتراف نہ کیا گیا ہو۔ ایسے مفکرین میں تین

خاص ہیں، یعنی ابن المعتز، ابنِ رشیق اور عبد القاہر جرجانی۔ ابن المعتز نے کتاب البدیع میں ثابت کیا کہ بعد کے شعرا جن صنائع کو اپنی خصوصیت گردانتے ہیں وہ نہ صرف شعرائے جاہلی کے کلام میں بلکہ قرآن و حدیث میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس نے دورانِ نقد عملی تنقید کے اصول وضع کیے اور موازنے کے آداب متعین کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ یہ سمجھنے کے لیے کون شاعر بہتر ہے، یہ ضروری ہے کہ شاعروں کے ہم معنی اشعار کا موازنہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ اس معنی کو کون بہتر طریقے سے ادا کرتا ہے۔ وہ معنی کی اہمیت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے:

"معنی کو شاعری میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کوئی شاعری بدیع کے محاسن سے مملو ہو، لیکن معنی کے فقدان کے سبب ردی اور خراب قرار دے دی جائے۔"

ابنِ رشیق مصنف کتاب العمدہ بھی شعر کی عمارت چار چیزوں سے اٹھاتا ہے، یعنی لفظ و وزن و معنی و قافیہ۔ وہ شعر کی توضیح اس طرح کرتا ہے:

"شعر کو مثلاً بیت سمجھو۔ فرش اس کا شاعر کی طبیعت ہے اور عرش حفظ و روایت (یعنی اساتذہ کے کلام پر نظر ہونا) دروازہ اس کا مشق و ممارست اور ستون اس کے علم و معرفت ہیں۔ صاحبِ خانہ معانی ہیں۔ مکان کی شان مکین سے ہوا کرتی ہے وہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اوزان و قوافی قالب و مثال کے مانند ہیں یا خیمہ میں چوب و طناب کی جگہ ہیں جن پر خیمہ تنتا اور کھڑا ہوتا ہے۔" (مرأۃ الشعر ص ۱۰)

اس تعریف کے قلب میں معانی کو رکھ کر ابنِ رشیق اپنی ترجیح کا کھلا ہوا ثبوت دیتا ہے اور مزید زور دیتے ہوئے کہتا ہے 'مکان کی شان مکین سے ہوا کرتی ہے'، وہ یہ بھی کہتا ہے کہ شاعر کو چاہیے کہ وہ معانی میں نیاپن پیدا کر سکے اور معانی کا رُخ ایک طرف سے دوسری طرف کو پھیر سکے۔ اگر معنی میں نیاپن نہیں تو باوجود موزونیت کے ابن رشیق اسے شاعر ماننے کے

کتاب ..
لیے تیار نہیں تھا۔

عبدالقاہر جرجانی جس کا زمانہ پانچویں صدی ہجری کا ہے، تیسری صدی کے مفکر جاحظ کے اس قول سے اختلاف پر اپنے نظریے کی بنیاد رکھتا ہے کہ "شاعرانہ حسن کے اظہار کا انحصار معنی پر نہیں ہوتا بلکہ لفظ پر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ معنی تو تمام لوگوں کو معلوم ہوتے ہیں۔ اصل حسن تو الفاظ کے انتخاب، ان کی ترتیب اور ان کے قالب میں پوشیدہ ہوتا ہے۔" جرجانی فضیلتِ لفظ کے نظریے سے مدلل طور پر اختلاف کرتا ہے اور بالاصرار کہتا ہے کہ شاعری کی جمالیاتی قدر کا تعلق بجائے لفظ کے معانی سے ہے:

"یہ تصور ہی غلط ہے کہ معانی تو ہر شخص کو معلوم ہوتے ہیں خواہ وہ جاہل ہو یا دیہاتی ہو، عربی ہو یا عجمی، حقیقتِ حال یہ ہے کہ معانی کی جدت ہی شاعری کی جمالیات کا مرجع ہے۔ ایک عبارت دوسری عبارت پر اس لیے فوقیت حاصل کر لیتی ہے کہ وہ معنی و مفہوم کے اعتبار سے زیادہ جاندار ہوتی ہے۔" (نقوش ص ۳۲۹)

جہاں تک فارسی روایت کا تعلق ہے تو وہ زیادہ تر فریقِ اوّل کا ساتھ دیتی ہے۔ دربار داری کا تقاضا بھی یہی تھا کہ قادرالکلامی اور مثالیت پسندی پر زیادہ سے زیادہ زور دیا جائے۔ چناں چہ نظامی عروضی سمرقندی چہار مقالہ میں جس شعریت پر اصرار کرتا ہے وہ یہی ہے کہ شاعری ایک صناعت ہے جس سے جس چیز کو جیسا چاہیے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ شاعر کس انداز سے بات کو کہتا ہے۔ رشید الدین وطواط بھی حدائق السحر فی دقائق الشعر میں زیادہ زور طرزِ ادا پر ہی دیتا ہے۔ یہی حال امیر عنصر المعالی کیکاؤس کا ہے، قابوس نامہ میں وہ کہتا ہے:

"بے صناعت و ترتیبے شعر مگوے، اگر خواہی کہ سخن تو عالی باشد و بماند بیشتر سخن مستعار گوے و استعارات بر ممکنات گوے ..."

شمس الدین محمد بن قیس رازی کی المعجم فی معاییر اشعار العجم بھی اسی رائے کے حق میں ہے۔ اس کا بیان ہے:

"بنائے شعر بروزنے خوش و لفظِ شیریں و عبارتے متین و
قوافیِ درست و ترکیبے سہل و معانیِ لطیف نہند ..."

اس نوع کے بیانات عربی فارسی روایت میں عام ملتے ہیں، زیادہ غلبہ انھیں خیالات کا ہے جن سے لفظ بطور شعریات کے مقتدرہ کے قائم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کہتے ہیں کہ " اکثریت کی رائے ہے کہ معانی مشترک ہوتے ہیں اور ادبی حسن در اصل اندازِ بیان، نظمِ کلام اور الفاظ کے انتخاب سے پیدا ہوتا ہے۔" مسیح الزماں کا خیال ہے کہ " عربی ادب میں اگرچہ مواد اور اسلوب دونوں کی اہمیت مسلم ہے، لیکن ہیئت کو موضوع پر فوقیت اس لیے حاصل ہے (یہ چاروں اصطلاحیں "مواد"، "اسلوب"، "ہیئت" "موضوع" قدیم روایت میں شاید ہی ان معانی میں کہیں استعمال ہوئی ہوں؛ یہ بیسویں صدی کے نوآبادیاتی انگریزی اثرات کی دین ہیں) کہ شاعر کا تصور قدیم مصنفین کے ذہن میں فنکار کا نہیں بلکہ مرصع کار یا دستکار کا ہے..... دستکار کو مواد کے انتخاب میں اتنی آزادی نہیں ہوتی۔ ہاتھ کی صفائی اور فنی مہارت کا اظہار اس کا مقصود ہے۔ کامیاب شاعر بھی ان کے نزدیک وہی ہے جسے بیان پر پوری قدرت ہو اور جو مقررہ مضامین کو خوبی سے ادا کرے۔ اگرچہ اس کامیابی میں اس کی مضمون آفرینی کا بھی حصہ ہوگا لیکن اس کی حیثیت اجزائے شعر میں محض ثانوی یا دوسرے درجہ کی رہے گی۔" (ص ۲۲-۲۳)

بہر حال اس ساری بحث میں دو باتیں خاص ہیں، اول یہ کہ کچھ مفکرین نے اگرچہ معنی کی اہمیت پر زور دیا ہے لیکن زیادہ غلبہ انھیں خیالات کا ہے کہ لفظ کو افضلیت حاصل ہے یا شعر لفظ سے بنتا ہے یا لفظ مقدم ہے۔ دوسری بات جو اسی ترجیح کا لازمہ ہے یہ ہے کہ لفظ و معنی میں ثنویت ہے، یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں، ان سے الگ الگ بحث کی جا سکتی ہے، اور ایک کو دوسرے پر اور دوسرے کو پہلے پر ترجیح دے سکتے ہیں۔ لفظ و معنی کی یہ ثنویت ایک مرکزی رَو کی طرح پوری عربی فارسی روایت میں جاری و ساری ہے، اگرچہ اس کے رد کے مقامات ہیں، لیکن وہ اس قدر مضبوط نہیں ہیں جتنے توثیق کے مقامات مضبوط ہیں۔

یہاں حتی الامکان تمام مقامات کا احاطہ اس لیے کیا گیا کہ یہ ثنویت عربی فارسی روایت کا مرکزی مبحث ہے، اور آئندہ کی بحث کے لیے بھی اس کا نظر میں رہنا ضروری ہے۔ زیرِ نظر باب کا مقصد چوں کہ ساختیاتی و ردتشکیلی فکر کے تناظر میں روایت کا جائزہ لینا ہے، اس لیے سرِدست یہ اشارہ ضروری ہے کہ لفظ و معنی کی یہ ثنویت نہ صرف سامی و ایرانی بلکہ بعض دوسری عالمی لسانی روایتوں کا بھی حصہ رہی ہے، اور سوئیسری ساختیات کا پہلا بنیادی گریز اسی روایت سے ہے کہ لفظ و معنی ہزار الگ الگ معلوم ہوں، لسان کے تفاعل کے اعتبار سے یہ الگ الگ نہیں ہیں، بلکہ ان میں وحدت ہے جس کو SIGN کہا گیا ہے۔ لسان کا تفاعل SIGN کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس کی دو طرفیں ہیں کاغذ کی دو طرفوں کے مماثل، SIGNIFIER اور SIGNIFIED یعنی لفظ کی صوتی یا تحریری شکل، اور اس سے پیدا ہونے والے معانی کا ذہنی امیج۔ ان دونوں میں ایسی وحدت ہے جیسے کاغذ کی ایک طرف کو کاٹیں تو دوسری طرف بھی کٹ جاتی ہے۔ زبان میں لفظ یا معنی میں کوئی بھی قائم بالذات نہیں ہے بلکہ معنی کا ادراک SIGN کے تفاعل سے تفریقی رشتوں کی بدولت ہوتا ہے اور SIGNIFIER اور SIGNIFIED بطور وحدت عمل آرا ہوتے ہیں۔ ساختیاتی لسانیات اور ساختیاتی ادبی فکر کی بنیاد اسی تصور پر رہی ہے، لیکن وحدت کے اس ٹانکے کو جو سوسیئر نے لگایا تھا، ردتشکیل نے بدیں کھول دیا ہے۔ یہ بحث اٹھا کر کہ زبان میں معنی نہ تو بالذات طور پر قائم ہو سکتا ہے نہ ہی معنی قائم بالغیر ہے، بلکہ معنی ہمیشہ افتراق سے عبارت ہے اور التوا میں بھی ہے۔ یہ جتنا حاضر ہے اتنا غائب بھی ہے۔ یعنی معنی سیال ہے اور اس کو بے مرکز کیا جا سکتا ہے لیکن SIGN کی وحدت کے تصور کے ردتشکیل کے ہاتھوں پاش پاش ہونے کا یہ مطلب بھی نہیں کہ جدید لسانی فکر میں دائرہ مکمل ہو گیا ہے اور لسانی فکر پھر لفظ و معنی کی ثنویت کی سطح پر آ گئی ہے یعنی جس ثنویت کی بحث اوپر ہم عربی فارسی روایت کے ضمن میں کر آئے ہیں۔ اس میں تو شک نہیں کہ وحدتِ کُلی کا تصور پاش پاش ہو چکا ہے اور اس بحث میں معنی اگر سیال ہے اور معنی نما یعنی لفظ اپنی جگہ پر قائم ہے تو بے شک

لفظ کا مستحکم اور مقتدر ہونا ثابت ہے، پچھلے ابواب میں ہم بحث کر آئے ہیں کہ لاکاں اور بہت سے دوسرے پس ساختیاتی ماہرین SIGNIFIER اور SIGNIFIED کے رشتے کو $\frac{S}{s}$ سے ظاہر کرتے ہیں جس میں لفظ کی بالادستی اور مقتدر حیثیت نمایاں ہے۔ تاہم لفظ و معنی کا یہ نیا تصور جدلیاتی اور پرت در پرت ہے، اور اتنا سادہ اور ڈھلا ڈھلایا نہیں جیسا کہ قدیم روایت میں ہے۔ بے شک لفظ کے مقتدر ہونے سے ہیئت پسندی کی کسی حد تک توثیق ہوتی ہے اور پس ساختیات، مظہریت اور ردتشکیل میں متن کا جو تصور ہے اور متنیت کو جو مرکزیت حاصل ہے، اس سے اس کا کچھ نہ کچھ رشتہ جڑ جاتا ہے، لیکن معنی کا پس ساختیاتی تصور خاصا پیچیدہ اور تہ در تہ ہے۔ نیز معنی کے بے مرکز ہونے یا متن کی کثیر المعنویت نے جو نئے مسائل پیدا کیے ہیں، وہ قدیم روایت کی سادہ ثنویت سے ہٹ کر ہیں اور ان کا ذکر آگے آئے گا۔

(باقی آئندہ)

زینت اللہ جاوید
پنجاب یونی ورسٹی۔ مالیر کوٹلہ

(اقبال سے معذرت کے ساتھ)

رازدارِ کن فکاں پہلے تھے لیکن اب نہیں
ہم خدا کے ترجماں پہلے تھے لیکن اب نہیں

اس قدر سمٹے کہ جوئے آب سے کمتر ہوئے
ایک بحرِ بیکراں پہلے تھے لیکن اب نہیں

کیا مصافِ زندگی میں صورتِ فولاد ہوں
ہم خودی کے رازداں پہلے تھے لیکن اب نہیں

پھر اسیرِ حلقۂ شام و سحر ہونے لگے
جادداں پیہم رواں پہلے تھے لیکن اب نہیں

اب شرارِ بولہب شعلہ بداماں ہو گیا
اور ہم آتش فشاں پہلے تھے لیکن اب نہیں

اب یہ عالم ہے کہ خود ہی راستوں میں کھو گئے
ہم امیرِ کارواں پہلے تھے لیکن اب نہیں

ستیہ پال آنند
1307 NORTHGATE SQUARE
RESTON, VA 22092 U.S.A.

میں اقارس[1]

لو کی آندھی میں
شکستہ بال و پر اڑتے ہوئے سے
اور زمیں پہ
چونچ کھولے، تپتے ریگستان میں
ہلکان طائر، جاں کنی میں آخری سانسوں
سے اپنی زندگی پیتا ہوا، مرتا ہوا ۔۔ یہ
باصری پیکر مجھے جھنجھوڑتا ہے آج کی شب
جب مجھے ہندستاں کی سرزمیں کو
چھوڑ جانا ہے ہمیشہ کے لیے ہی!
میں سکندر تو نہیں ہوں
پھر بھی مجھ کو اک بہادر، نو بہ نو دنیا
کو سر کرنے کی خواہش ہے
سمجھتا ہوں ۔۔
مرا یہ باصری پیکر
شکستہ بال و پر
اور جاں کنی میں مبتلا طائر
فقط اک لاشعوری خوابِ بد ہے!
میں اسے تعبیر کے سانچے میں ڈھالوں گا
پروں کو قوتِ پرواز دوں گا
میں اقارس ڈھلتے سورج کے تعاقب میں
افق کی آخری سرحد سے بھی آگے اڑوں گا
اک بہادر، نو بہ نو دنیا مجھے باہوں میں لینے
کے لیے بے تاب ہے!

---

[1] آئی قارس یا اقارس ICARUS یونانی اساطیر کا کردار جس نے بازوؤں کے ساتھ موم سے پر چپکا کر سورج کی طرف اڑنے کی سعی کی تھی۔

اکبر حمیدی
استاد شعبۂ اردو - اسلام آباد کالج
برائے طلبہ، جی - ۶/۴ - اسلام آباد

علقمہ شبلی
۹۵ رپن اسٹریٹ
کلکتہ ۷۰۰۰۱۶

اگر اس رات میں رویا نہ ہوتا
تو شاید عمر بھر سویا نہ ہوتا
تمھیں پانے سے یہ راحت نہ ملتی
اگر پہلے تمھیں کھویا نہ ہوتا
نہ یوں زرخیز ہوتی خاکِ مقتل
جو پہلوں نے لہو بویا نہ ہوتا
جو ماں نے میرے لب چومے نہ ہوتے
تو شاید میں کبھی گویا نہ ہوتا
کہاں اکبرؔ یہ آب و تاب ہوتی
اگر اشکوں سے منہ دھویا نہ ہوتا

بے وفا سے بھی وفا کا سلسلہ رکھا کرو
اپنے ہونٹوں پر سدا حرفِ دعا رکھا کرو
کج کلاہی بھی ادا ہے، کج کلاہانہ چلو
خودنگر لوگوں سے یوں ہی فاصلہ رکھا کرو
زندگی کو بے مزہ کردے نہ خوے بندگی
اپنے لب پر لغزشوں کا ذائقہ رکھا کرو
موت کی تاریکیوں میں گم نہ ہوجائے کہیں
شہرِ دل کا زندگی سے واسطہ رکھا کرو
دشمنوں کی دوستی کا عکس جس میں دیکھ لیں
دوستوں کے واسطے وہ آئینہ رکھا کرو
رخ سفر کا ہو تمھارے کوئی بھی شبلیؔ، مگر
جانبِ منزل نظر کا زاویہ رکھا کرو

عاصی کاشمیری

نکلا جو لفظ مُنہ سے کتابوں میں آگیا
ناکردہ ہر گناہ حسابوں میں آگیا

خورشید بن کے چمکا ہے دنیا میں جس کا نور
اس کا ہی رنگ روپ گلابوں میں آگیا

پڑھنا پڑے گا پیار محبت کا فلسفہ
دستورِ عشق اب تو نصابوں میں آگیا

اچھے دنوں کی آس بھی عاصیؔ نہیں رہی
خوابوں سے میں نکل کے سرابوں میں آگیا

وفا براہی (مرحوم)
...بلاک۔ایل
ناظم آباد کراچی...

آتے جو عزم کامل کے
ہی ہوتے نشان منزل کے

شعلے جو کاوشِ دل کے
ہن جل گئے سلاسل کے

نے رسوا کیا زمانے کو
نقائص میں حدِ فاصل کے

بھی ممکن ہے اے چمن والو
لائیں لہو عنادل کے

جو آئے تو روشنی آئی
اُٹھے کل چراغ محفل کے

لیتے ہو اے وفا ان کا
زداں جو بنے ہیں قاتل کے

محسن بھوپالی
بلاک ۴، ایف ۴/ ۵
نظام آباد۔ کراچی

غزل

یہ میرے چاروں طرف کس لیے اُجالا ہے
ترا خیال ہے یا دن نکلنے والا ہے

ہوائے دہر نے کب کا بجھا دیا ہوتا
تمھاری یاد نے اب تک مجھے سنبھالا ہے

ہجوم جشن میں کرنا ہے دل زدوں کو تلاش
مجھے جنوں نے عجب امتحاں میں ڈالا ہے

کسی کا نام تو ہم نے کے شب میں سوتے ہیں
کوئی تو ہے جو سحر دم جگانے والا ہے

خدا کرے کہ اُسے علم بھی نہ ہو محسن
وہ جس کے گرد مری چاہتوں کا ہالا ہے

ماجد الباقری
۱۱، وحدت کالونی گوجرانوالہ
(پاکستان)

مری شاعری کو کھلا چھوڑ دے
مرا ہاتھ میرے خدا چھوڑ دے

یہ مضبوط رسّی نہیں ٹوٹتی
ترے ہاتھ میں ہے سرا چھوڑ دے

سبھی اور حاکم سے کیا چاہیے
مری دھوپ کا راستہ چھوڑ دے

جہاں تجھ کو جانا ہے مرضی تری
مری ڈائری میں پتا چھوڑ دے

تری جیتے جی قدر ماجد نہیں
کتابوں میں لکھا ہوا چھوڑ دے

رضی الدین رضی
اے-۲، جلیل آباد کالونی
ملتان - پاکستان

غزل

منزل اگر نہیں ہے کوئی راستہ تو ہو
اپنے بھٹکتے رہنے کا اک سلسلہ تو ہو

میں اک چراغ اور تو خوشبو بھری ہوا
پھر بھی میں چاہتا ہوں ترا سامنا تو ہو

اس کا وصال معجزے سے کم سہی مگر
اس معجزے سے بڑھ کے کوئی معجزہ تو ہو

جو مل چکا ہے کھو کے اُسے پھر کریں تلاش
جیون گزارنے کا کوئی مشغلہ تو ہو

ہم بھی ضرور لوٹ کے گھر جائیں شام کو
لیکن ہماری راہ کوئی دیکھتا تو ہو

جوزف گریز (ترکی)
احمد سہیل

ہم خود طوفان ہیں

ہم خود طوفان ہیں
اور رکھتے ہیں
ہم رہتے ہیں
برسوں سے
ہوا کو کھینچتے ہیں

شاید ہم آباد ہیں
خاصے برسوں سے
چھلکاتے ہیں، آوارہ پھرتے ہیں
کئی سالوں سے
ہم رہتے ہیں
چند لمحے
چند منٹ
صرف
زندہ رہنے کے لیے

جوزف گریز ترکی کے شاعر اور مصور ہیں۔ ۱۹۲۶ میں استنبول میں پیدا ہوئے۔ کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی مشہور کتاب کا نام BORROW 4 ANGELS AND IN SEARCH

اختر شاہجہانپوری

رنگین چوپال۔ شاہجہاں پور۔ یوپی

جو اپنا ہے اُسے نزدیک رکھیے
خلوصِ غیر میں تشکیک رکھیے

صحیفے وقت کے پڑھنا پڑیں گے
نظر کو اور بھی باریک رکھیے

نہ جانے کس گھڑی حکمِ سفر ہو
کہ اب زادِ سفر بھی ٹھیک رکھیے

سخن کی بستیاں کجلا رہی ہیں
اُجالا فکر کا نزدیک رکھیے

ابھی کچھ لوگ غفلت میں ہیں اختر
ابھی جاری یوں ہی تحریک رکھیے

شاہد رنا

،، بہند جنگر شاہجہاں [illegible]
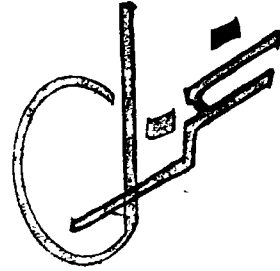
دامن کا بھی خیال ہے فکرِ رفو بھی ہے
خدشوں کے درمیان تری آرزو بھی ہے

چھایا ہے تیرا عکس مرے ہر خیال پر
میں بھولتا نہیں مرے ہمراہ تو بھی ہے

کچھ سوچنا فضول ہے چل آ نکل چلیں
کشتی بھی بادباں بھی لنگر بھی تو بھی ہے

ہم لوگ آستینوں میں خنجر چھپائے ہیں
اُس کا قبیلہ نیک بھی ہے صلح جو بھی ہے

دیوارِ خستہ حال زمیں بوس ہو گی کیا
یہ تیری یادگار مری آبرو بھی ہے

کب تک چراغِ شب کی طرح میں یوں ہی جلوں
مجھ بے زباں کو آرزوئے گفتگو بھی ہے

شب خون مارنا مرا شیوہ نہیں مگر
شاہد اسی قبیل کا شاید عدو بھی ہے

...در
...نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

غزل

...ت کا بڑھ کر آگیا سر کے برابر
...کے ٹھہری ہیں مرے گھر کے برابر

...اب حساب زندگی کر کے برابر
...گیا ہے آپ کے در کے برابر

...ے شیشے رکھ دو ایک پتھر کے برابر
...ر کا منظر ہوگا اندر کے برابر

...نہیں کرتی یزیدوں سر پھروں کو
...وں بھی کیا ان کے بہتر کے برابر

...سے کچھ ایسا ہی تعلق ہے وگرنہ
...سمانوں کی ہے اک پر کے برابر

...ریہ رکھنے والوں کا رتبہ ہے عالی
...ی نہیں ہے دیدۂ تر کے برابر

...ر میری بات بس اتنا بتا دے
...ظلوم بھی ہوں گے ستمگر کے برابر

...بھی تو دی تھیں دوستوں کو زندگی کی
...ن تو ہوں ہی جائیں گے مر کے برابر

...صاحب بسے ہیں جا کے شہر آرزو میں
...ادِ صبا ہوتی ہے صرصر کے برابر

شاہد میر
صدر شعبۂ نباتیات گورنمنٹ کالج
بانسواڑہ ۳۲۷۰۰۱

دوہے

کلیاں تو آئیں نکل پھول نہیں کھل پائے
اپنے احساسات کو لفظ نہیں مل پائے

آگے آگے مشعلیں پیچھے مہ و نجوم
جانے کس جانب چلا یہ ناراض ہجوم

پھول کھلا تو ہوگیا گھنا شجر آباد
جیسے اک مکان سے سارا گھر آباد

اُجلے تاروں کا نگر مٹی پر آباد
کس کے قدموں سے ہوئی راہگزر آباد

سوناپن برسوں کا ہے لمحہ بھر آباد
میرے احساسات کا شہر نہ کر آباد

کس کی یادیں آگئیں کیسے کیا محسوس
پھر آنکھوں کے سامنے ناچ اُٹھے طاؤس

غزلیں کہنا اور کبھی خط لکھنا دس بیس
شاہد کٹ ہی جائیں گے یہ گھنٹے چوبیس

شعیب شمس

نیشنل سیمپل سروے۔ ڈیری فارم۔
پورٹ بلیر۔ انڈمان

غزل

رسموں کے کاشانے الجھے
وقت کے تانے بانے الجھے

ہم مظلوم پرندوں نے جب
رحم کے کھائے دانے الجھے

رشتوں کے موسم میں پھنس کر
سب اپنے بیگانے الجھے

اہلِ خرد نے آگ لگائی
بستی کے دیوانے الجھے

بھیگی پلکیں دیکھ کے تیری
خوابوں میں فرزانے الجھے

سلمان عباسی

سی۔ ۴۴۲/۳ پیپر مل کالونی
نشاط گنج۔ لکھنؤ

انا کی رفعتوں پہ یہ زوال کیسے
تمھیں کہو تمھیں مراخیال کیسے آگیا

منافقت کے دائروں میں ماہ و سال قید ہیں
تو زندگی میں جشنِ ماہ و سال کیسے آگیا

محبتیں فریبِ مصلحت کا جب شکار ہیں
تو پھر قریب موسمِ وصال کیسے آگیا

میں جی رہا تھا زندگی کی تلخیوں کے باوجود
لبوں تک آج نوحۂ ملال کیسے آگیا

خلوص اپنی انتہا پہ ہے مگر یہ کیا ہوا
ہمارے دل کے آئینے میں بال کیسے آگیا

...م زیدی راہی
...س بھون۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۷
...ریا۔ دھنباد۔ بہار

نظم

وہ پیکرِ خلوص تھا کوئی بَلا نہ تھا
لیکن مزاجِ شہر کو پہچانتا نہ تھا

زخموں پہ وہ خُلوص کا مرہم لگا گیا
جس سے مرا کہیں کا کوئی واسطہ نہ تھا

کیوں مانگتا کسی سے میں رحم و کرم کی بھیک
کیا میرے اختیار میں دستِ دُعا نہ تھا

دیکھا جو حادثے کو تو ایسے گزر گیا
جیسے وہ بدنصیب کو پہچانتا نہ تھا

زخموں کی کر رہا ہے نمایش فضول کیوں
تو کیا فریبِ حُسنِ نظر جانتا نہ تھا

ذہنوں کے فاصلے نے اُسے دُور کر دیا
وہ ورنہ میرے پاس تھا مجھ سے جُدا نہ تھا

فردوس گیاوی
معرفت ملک گلی پنچایتی
اکھاڑا، گیا۔ بہار

غزل

میں کیسے نقش کروں جو خلاف ہے دوستو
وہ جب بھی ملا مجھ سے محبت سے ملا ہے

اک لفظ مہاجر نے تو سوزِ غم دیے ہیں
کیا پوچھتے ہو، کیا ہمیں ہجرت سے ملا ہے

سجدہ ہی فقط کرنا عبادت نہیں لوگو
یہ درس بھی بچوں کی رفاقت سے ملا ہے

نظم

جمیلہ نشاط۔ حیدرآباد

ہرے پربت پر
پیلی بالٹی لیے کھڑی ہوں
دور بہت دور
کارواں جا رہا ہے

وہاں
پیاسے راہی ہیں
یہاں
بالٹی
بھری جھیل بن گئی ہے
راہی تڑپ رہے ہیں
جھیل ڈھہنے لگی ہے
کارواں سو گیا ہے
چمگادڑ منڈلا رہے ہیں۔

مجید آذر
اولڈ بمبئی پونا روڈ، کوسا ممبرا

تجھے بھی لے کے وہ کنج چمن سے نکلے گا
لہو کا دھارا جو میرے بدن سے نکلے گا

لگا لے سب کے غموں کو تو اپنے سینے سے
جو یہ کرے گا تو دل کی گھٹن سے نکلے گا

غبار اور اڑا میری تابنا کی پر
مرے عروج کا سورج گگن سے نکلے گا

وہ تیرے ذوق تجسس کا ہوگا پہلا دن
تلاش یار میں جس دن تو بن سے نکلے گا

قلم کے نام پہ آذر کو آزما لو کبھی
وہ سرکشا کے بڑے بانکپن سے نکلے گا

عقیل شاداب
برج راجپورہ۔ کوٹا۔ راجستھان

کالا تیندوا

سرمئی چٹان پر بیٹھا ہے کالا تیندوا
خوبصورت، بے مثال
خوش خصال، ابریشمی ایال
ایسا لگتا ہے کہ اس چٹان کا حصہ ہے وہ
دھوپ کی پہلی کرن جب منعکس ہوتی ہے اس پر
لیکے انگڑائی تبھی اٹھتا ہے وہ
جیسے خود چٹان نے انگڑائی لی ہو
اور پھر بھر کر زقند
پہنچ جاتا ہے سنہری گھاس پر
بھوک کا احساس جب ہوتا ہے اس کو
جاگ اٹھتی ہے جب اس کی اشتہا
دیکھتا ہے چاروں اور
آ ہی جاتا ہے نظر کوئی شکار العظمت کالا تیندوے کا لپک
بھرنے لگتا ہے قلانچیں اس کے پیچھے
بھوک نے پیروں میں بھر دیں بجلیاں
تیندوے سے قوس قزح میں بدل جاتا ہے وہ
جسم ایسا تن گیا ہے
ایک لمحہ بھی نہیں گزرا کہ اس نے
جا دبوچا ہے ہرن کو
خون چوسے گا پیے گا
اور وہ جب تک جیے گا
موت کی مانند چھپا بیٹھا رہے گا
وہ جو کالا تیندوا
سرمئی چٹان پر بیٹھا ہوا ہے

گوہر شیخ پوروی
۲۹/۲۸ تیلیا باغ، بنارس ۲۲۱۰۰۲

کسی زردار کو یہ بات بتاتا کیسے
میرا گھر بن گیا برسات میں دریا کیسے

اس گناہوں بھری دنیا میں تعجب ہے بہت
خواہشِ دل کا ورق رہ گیا سادا کیسے

جب اندھیروں سے امیدوں کا ہے گہرا رشتہ
شاہراہوں پہ کوئی دیپ جلاتا کیسے

شیش محلوں نے جنھیں نخوت بے جا بخشی
وہ کہیں مفلس و نادار کو اپنا کیسے

حضرتِ ابرؔ[1] کا احساں اسے کہیے گوہرؔ
ورنہ میں کہتا غزل، نظم، قصیدا کیسے

---

[1] استاذی محترم امام الفن سحابِ سخن علامہ ابر احسنی گنوری

ضمیر درویش
ای-۱۵ بی ریلوے کالونی (نارتھ)
مراد آباد (یوپی)

مہکنے لگتی ہے آری اگر چندن کو چھو جائے
دعا دیتے ہیں ہم اس طنز پر جو من کو چھو جائے

کسی صوفی کو جیسے حال آئے سن کے قوالی
دعا کر عشق کی گرمی تری دھڑکن کو چھو جائے

اسی امید پر جینے کی عادت ڈالیے صاحب
کہ کوئی خوبصورت حادثہ جیون کو چھو جائے

یہ کہہ دو دھوپ سے کمرہ نہیں اس کے مقدر میں
در و دیوار سے لپٹی رہے آنگن کو چھو جائے

پھر اس کا کیا بھروسا نیام میں ہو یا کہ باہر ہو
کوئی شمشیر اے درویشؔ جب گردن کو چھو جائے

محمد شاہد فیروز
محبوب حق گلی نمبر ۹ گوجرانوالہ
(پاکستان)

غزل

میں کیا ہوں میری منزل کیا ہے مجھ کو یہ بتلائے کون
میں ہوں اپنے آپ میں اُلجھا مجھ کو اب سلجھائے کون

سب ہیں اپنی ذات میں کھوئے دنیا سے ہیں دور ہوئے
دیوانوں کی اس نگری میں دل کا حال سُنائے کون

مہر و وفا، ہمدردی، شوخی یہ سب کچھ تو اس میں نہیں
اب ایسی بنجر دھرتی سے پیار کے پھول کھلائے کون

جنت کی چاہت میں میری قوم کا بیڑا پار ہوا
یہ بھی کیسا دور چلا ہے کس سے یاں شرمائے کون

ظلم اور جبر کے بادل شاہد ہر سو جگ پہ چھائے ہیں
اتنے بگڑے موسم میں اب گھر سے باہر جائے کون

شاہد عزیز
۱۷۹ ملاح طلائی اودے پور

آج بھی یہی ہوگا

آج بھی یہی ہوگا
وقت اپنے ہاتھوں میں
تیرگی کے ٹکڑوں کو
پھر سمیٹ لائے گا
میری سمت آئے گا
اور راستے میرا
نام بھول جائیں گے
روشنی کے سایے بھی
خواہشوں کی منزل تک
حسرتوں کے صحرا میں
جا کے ڈوب جائیں گے
آج بھی یہی ..... ہوگا
آج پھر یہی ہوگا

خالد رحیم
بخشی بازار ۔ کٹک ۔ اڑیسہ

تسنیم فاروقی
تلسی داس مارگ ۔ لکھنؤ

سب کے سب ہیں شہر میں آئینہ خانوں کے مکیں
میری جانب کون اب پتھر چلانے آئے گا

جھوٹ کو سچ کا لبادہ دے رہے ہیں لوگ پھر
سر پھرا کوئی تو سچائی بتانے آئے گا

کہہ رہی ہے شہر کی بدلی ہوئی آب و ہوا
اب کے موسم ہنستے چہروں کو رلانے آئے گا

وقت کی منہ زور آندھی نے اُجاڑا تھا جسے
دیکھنا ہے کون اب اس کو بسانے آئے گا

مسئلوں کی بھیڑ میں خالد گھری ہے زندگی
آسماں سے کیا کوئی پھر حل بتانے آئے گا

یہ دل لگی بھی تری کس کو راس آئی ہے
تو مل بھی جائے تو اندیشۂ جدائی ہے

حریفِ سایۂ دیوار ہی میں بیٹھے ہیں
ہماری چھاؤں ہمارے لیے پرائی ہے

جو ایک لمحہ تری عشرت نگاہ میں تھا
اس ایک لمحے نے پہروں کی نیند اڑائی ہے

کلی کلی میں چھپی ہے اک انقلاب کی لَو
تمام صحن گلستاں ابھی حنائی ہے

یہ فکر یہ ہے کہ اک اختلاف کی دیوار
ہر ایک موڑ پہ انسان نے بنائی ہے

قلم سے کھیل رہی ہیں وہ انگلیاں امروز
لہو بھی جن کے لیے سرخ روشنائی ہے

چمن کے دھندلے سویرے کی یہ ہوا تسنیم
نہ جانے کتنی ردائیں اتار لائی ہے

سلام ساگری
مچھریاٹی۔ ساگر۔ ایم۔ پی

غزل

عاشقی میں اور کیا ہو کام سوتے جاگتے
ہے زباں پر آپ ہی کا نام سوتے جاگتے

جب سے باندھا ہے کسی نے مجھ سے پیمانِ وفا
سوچتا ہوں عشق کا انجام سوتے جاگتے

وہ جو کوسوں دور رہتے ہیں عمل کی راہ سے
دیتے ہیں تقدیر کو الزام سوتے جاگتے

دل کی ہر دھڑکن سے میں پاتا ہوں اک موجِ سکوں
ہر نفس میں ہے ترا پیغام سوتے جاگتے

پھر غزل گوئی پہ مائل ہے طبیعت اے سلام
ہو رہا ہے پھر مجھے الہام سوتے جاگتے

ڈاکٹر اختر نظمی
۱۴۱-۳۶-خور جے والان دولتؔ
لشکر۔ گوالیار

ہر ایک کام سلیقے سے بانٹ رکھا
یہ لوگ، آگ لگائیں گے، یہ ہوا دیر

میں رو برو ہوں تو ہر آنکھ میں ہے
ہوا جو آنکھ سے اوجھل تو سب بھلا

تعلقات کی راہوں کے راہزن ٹھہ
پتا کسی کا بھی مانگو، غلط پتا دیر

گلاب بوئیں گے کھیتوں میں مقبروں
ہماری فصلوں کی یہ قیمتیں، گرا دیر

یہ پوچھنے کا تو حاصل ہے مجھکو حق ا
قصور کیا ہے؟ وہ کس جرم کی سزا

ارشد سراج ارشد
شعبۂ اردو گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج
کوٹہ (راجستھان)

زندگی میں اک سعیِ پیہم رواں رکھتا ہوں میں
اس طرح سے زندگی کو جاوداں رکھتا ہوں میں

گو کہ اک قطرہ ہوں میں اولادِ آدم ہوں مگر
اک تلاطم خیز بحرِ بیکراں رکھتا ہوں میں

تجھ کو اندازہ نہیں ہے میری دُنیا کا ابھی
دیکھ آ کے اپنے اندر اک جہاں رکھتا ہوں میں

جاؤ اُن سے کہہ دو ارشدؔ اپنی دُنیا رکھیں آپ
یہ جہاں تو کیا نظر میں لامکاں رکھتا ہوں میں

مناظر حسن شاہین
بمقام و پو۔ ڈاک خانہ بارا
وایا چاکند ضلع گیا، بہار

اب کے آئے گا ثمر لگتا ہے
سبز و شاداب شجر لگتا ہے

اب مخالف ہیں ہوائیں بھی بہت
راس آئے گا سفر لگتا ہے

فصلِ گُل خندہ بہ لب آئی ہے
پھر ہرا زخمِ جگر لگتا ہے

جس کی اپنی کوئی پہچان نہ تھی
آج وہ قطرہ گہر لگتا ہے

ڈھتی دیوار، ٹپکتا چھپر
گھر مِرا، میرؔ کا گھر، لگتا ہے

مسرور حسین سرور
۲۸۹/۱ ہاتھی خانہ، فتح گڑھ (یوپی)

کاغذ کی ناو

مجھ سے بچے نے کہا
ناو بنا دو پاپا
لاکھ سمجھایا
مگر
وہ تھا کہ مانا ہی نہیں
تہیں کاغذ کی جو موڑیں
تو
سماں باندھ کے بادل آئے
پھر تصور میں
وہ برسات ہوئی
ناو کاغذ کی تھی
غرقاب ہوئی

نعیم حیدر
نیا محلہ ریلپار۔ آسنسول

مزاج داں ہے وہ اس کو بناؤگے تم کیا
خیال دل کا نظر سے بھی وہ سمجھ لے گا

چراغ گھر کا بجھا کر بھی کیا کروگے تم
گھروں کی بات کو در سے بھی وہ سمجھ لے گا

چمن کو کون سی سوغات دی ہے موسم نے
گلوں کی بات شجر سے بھی وہ سمجھ لے گا

گری ہوئی ہے جو دیوار یونہی رہنے دو
مکیں کا حال کھنڈر سے بھی وہ سمجھ لے گا

مرا وہ دوست ہے حیدر وہ جانتا ہے مجھے
مری غزل کو ہنر سے بھی وہ سمجھ لے گا

رفیق جعفر
۱۲/۶۱ ملوانی کالونی، باندرہ پلاٹ
کھردوکی۔ بمبئی

بادِ مُخالف

بادِ مُخالف کے آگے
چھوٹا سا دیا!
ہستی جس کی معمولی ہے
جہدِ بقا میں لگا ہوا ہے
لیکن کیا اس کو
یہ بھی پتا ہے
اس کی قسمت صرف فنا ہے؟
پربت جیسی اس کی ہمت
بول رہی ہے
"تیری فنا کم نہیں بقا سے
بادِ مخالف کچھ بھی نہیں ہے
چلتے چلتے تھک جائے گی
رُک جائے گی
لیکن تجھ کو جینا ہوگا"

ریاض الدین ریاض
۵۰، کمنڈ پاڑہ۔ بھیونڈی، تھانے

کرب، آنسو، بیقراری، رتجگے
عشق میں لازم ہیں ایسے حادثے

جم گئی کائی در و دیوار پر
اپنی غفلت کا نتیجہ دیکھ لے

کیا اُٹھے گا پھر کوئی فتنہ نیا
کیوں سجائے جا رہے ہیں راستے

شمع بستی بُجھنے والی ہے ریاض
پھر اُجالوں کی نمائش کس لیے

ڈاکٹر سید محمد اصغر
لکچرر شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ہندستان میں بارھویں صدی ہجری کا ادبی ماحول

بارھویں صدی ہجری میں مغل بادشاہت کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ ۱۱۱۸ھ میں جب محی الدین اورنگ زیب کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹوں اور بعد اس کے پوتوں میں اقتدار کے لیے جنگ شروع ہو گئی۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کو قتل کر کے تخت شاہی پر بیٹھا قبضہ جمانے کی کوشش میں لگا تھا۔ دہلی میں اس وقت سیاسی انتشار پھیلا ہوا تھا اور پورے ملک میں طوائف الملوکی کا سا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ آج جہاندار شاہ نے تو کل اس کا بھتیجا فرخ سیر بادشاہ بنا ہوا ہے۔ دوسرے دن سادات بارہہ اس کو قتل کر کے جہاندار شاہ کے بیٹے کو تخت شاہی پر بٹھا دیتے ہیں تو پھر وہ سادات بارہہ سے جنگ کرتا ہے۔ غرض کہ ہر وقت خوں ریزی ہو رہی تھی سیاسی بدحالی اور افراتفری تھی۔ سارا نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ امرا آپس میں ایک دوسرے سے چشمک اور حسد کرنے لگے تھے۔ ایک امیر دوسرے امیر کو نیچا دکھانا اور ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ ہر امیر کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ دربار میں اس کی بالادستی رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ امیر دربار سے بدظن ہو کر چلے گئے۔ نظام الملک حیدرآباد میں جا بسے اور برہان الملک نے اودھ کا رخ کیا۔ اس سیاسی انتشار اور خستہ حالی کے باوجود اس زمانے میں ادبی سرگرمیاں جاری رہیں۔ جیسے جیسے سیاسی انتشار بڑھتا گیا اسی طرح ادبی ماحول بتدریج بڑھتا گیا۔ جگہ جگہ ادبا، فضلا اور شعرا پیدا ہوئے۔ میرزا عبدالقادر بیدل، آنند رام مخلص، واقف لاہوری، سراج الدین علی خان آرزو، شیخ علی حزیں، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی، اشرف مازندرانی، عبدالحکیم حاکم لاہوری، سعادت یار خان، سرخوش، بندرابن داس خوشگو، والہ داغستانی، میر غلام علی آزاد بلگرامی، محمد احسن ایجاد، نسبتی تھانیسری، الفتی عظیم آبادی، قزلباش امید، شفیعائی اثر، محمد علی حزیں، میر محمد افضل ثابت، میر تقی میر، محمد رفیع سودا وغیرہ وغیرہ مشہور و معروف شعرا اسی بارھویں صدی ہجری میں تھے۔ دہلی اس زمانے میں بھی ہندستان کا دارالحکومت ہونے کی وجہ سے ادبا، فضلا، علما، شعرا اور دیگر مختلف قسم کے فن کاروں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ دہلی کے اجڑنے سے دوسری جگہوں پر نئے نئے مراکز قائم ہونے لگے۔ حیدرآباد، لکھنؤ،

عظیم آباد اور مرشد آباد میں علماء، فضلاء، ادباء اور شعرا کی پرورش ہونے لگی۔ دہلی کے بعد لکھنؤ ادب کا سب سے بڑا مرکز بنا۔ کیوں کہ دہلی کے اُجڑنے کے بعد وہاں پر کئی بڑے شعرا اور ادباء مثلاً سراج الدین علی خاں آرزو، والہ داغستانی عبدالحکیم حاکم لاہوری وغیرہ دیگر اور بھی شعرا اکٹھا تھے اسی طرح نظام حیدرآباد بھی بہت سے شعرا علما اور ادباء کی پرورش کر رہے تھے۔ ان کا ایک خاص طریقہ یہ تھا کہ جس کو دیکھا کہ وہ کسی فن کا ماہر ہے اور اس میں شہرت و مقبولیت حاصل کر چکا ہے تو اس کو دعوت نامہ کے ساتھ زاد راہ بھجوا کر بلاتے تھے اور اس کی پذیرائی/ پرورش کرتے تھے۔ گاہے گاہے انعام و اکرام سے نوازتے تھے۔ چنانچہ مرزا عبدالقادر بیدل، سراج الدین علی خاں آرزو، مولانا شیخ علی حزیں، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی اور حاکم لاہوری کو دعوت نامے بھیجے۔ اسی طرح مرشد آباد میں بھی ہر میدان کے فنکاروں شعرا، ادبا اور فضلا کا جمگھٹا تھا۔ مرشد آباد کے ناظم اعلیٰ نواب علاء الدولہ سرفراز خاں نے اکثر شعرا کو اپنے یہاں بلایا۔ میر مرتضیٰ حیدر دہلوی، میر مرتضیٰ حالت دہلوی، صانع بلگرامی، میر عبدالجلیل بلگرامی، ابراہیم خاں خلیل وغیرہ وغیرہ وہاں گئے۔ صانع بلگرامی کچھ عرصہ بعد وہاں انتقال کر گئے، جس سے فارسی ادب کو کافی نقصان پہنچا۔ کیوں کہ وہ لوگوں کو شعر کہنے اور کتابیں لکھنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ صانع بلگرامی کے انتقال کے بعد دیگر کئی شعرا و مصنفین اس مرکز کی شہرت سن کر آئے۔ ان سب نے مل کر اس مرکز کو سنبھالے رکھا۔ نواب علاء الدولہ سرفراز خاں کے انتقال کے بعد یہ مرکز عرصۂ دراز تک قائم نہ رہ سکا۔ غالباً بارھویں صدی ہجری کے بالکل آخر میں اس مرکز پر زوال کے بادل چھانے لگے تھے۔ مگر یہاں تھوڑے عرصہ میں ہی ادب نے بہت ترقی پائی۔

ہر چند مرشد آباد بہ زوال جلد آ گیا مگر عظیم آباد (پٹنہ) میں راجہ پیارے لال، الفتی کے نانا اور پھر ان کے انتقال کے بعد خود الفتی فارسی ادب کے اس مرکز کو کافی عرصہ تک قائم رکھے رہے۔ ان کے گھر میں خود ان کا ایک بہت بڑا کتاب خانہ تھا جس میں تقریباً ۲۵ ہزار کتابیں جمع کیے ہوئے تھے۔ پہلے الفتی دہلی میں تھے اور وہ وہاں پر فارسی ادب کی خدمت کے ساتھ ساتھ بادشاہ (اکبر ثانی) کو ہر وہ طریقۂ کار اپنانے کے لیے صلاح و مشورہ دیا کرتے تھے جس سے مغل بادشاہ کے مفادات زیادہ سے زیادہ محفوظ رہیں۔ انگریزوں کو یہ بات پسند نہیں تھی اس وقت وہ اپنی طاقت بہت بڑھا چکے تھے جس کی وجہ سے وہ بادشاہ پر بار بار دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ الفتی کو برطرف کر دے۔ بادشاہ نے انگریزوں کے دباؤ سے مجبور ہو کر الفتی کو ہٹا دیا۔ الفتی خاموشی سے اپنے وطن واپس چلے گئے اور سیاسی زندگی سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کر لی مگر چوں کہ وہ عظیم آباد کے بہت بڑے رئیس تھے اور اپنے گھر پر ایک بہت بڑا کتاب خانہ رکھتے تھے اس لیے انھوں نے ادب کی طرف توجہ دی۔ رفتہ رفتہ الفتی کی ادبی خدمت کی شہرت پھیلنے لگی۔ اس لیے علماء، ادبا اور شعرا وغیرہ وہاں جمع ہونے لگے۔ ان کے گھر پر ادبی محفلیں منعقد ہونے لگیں۔ نتیجتاً ادبی ماحول ترقی پاتا گیا۔ نئی نئی کتابیں

تصنیف ہوئیں اور کچھ شعرا نے اپنے دیوان مرتب کیے۔ یہ مرکز دکن اور اودھ کی طرح ٹھالو نہیں تھا کیوں کہ یہاں پر شعرا و ادبا کو مذکورہ بالا دونوں مراکز کی طرح وظیفہ اور انعام وغیرہ نہیں ملتا تھا۔ اس لیے یہاں کم لوگ اکٹھا ہوئے۔ دکن اور اودھ دونوں جگہوں پر شعرا، علما اور فضلا و ادبا اور دیگر فنکاروں کی پرورش ہورہی تھی اور انھیں وظیفہ ملتا تھا۔ ظاہر سی بات ہے کہ ایک مرکز کے ختم ہونے سے جب چار دوسرے نئے مراکز قائم ہوں گے تو وہاں پر شعرا، علما، ادبا اور فضلا کی تعداد زیادہ ہوگی تو تصانیف بھی اسی کے مطابق زیادہ وجود میں آئیں گی۔ اس وقت شعر گوئی اپنے عروج پر تھی۔ شعرا ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور زیادہ سے زیادہ اشعار کہتے تھے۔ مصنفین بھی اسی طرح بڑھ چڑھ کر کتابوں کی تصنیف میں حصہ لیتے رہے۔ البتہ شاعری کا معیار پہلے سے بلند نہیں تھا بلکہ کمتر ہی تھا مگر نثری تصانیف بہت عمدہ اور اچھی وجود میں آئیں۔ بارھویں صدی ہجری میں فارسی ادب میں ایک نئی صنف ضرور وجود میں آئی جو اس سے پہلے کسی صدی میں نہیں پائی جاتی وہ ہے تنقید۔ اس نے فارسی ادب میں ایک باب نو کا اضافہ کیا۔ چنانچہ سراج الدین علی خاں آرزو، منیر لاہوری، حاکم لاہوری، مُلّا شیدا سودا، فاخر مکیں اور امام بخش صہبائی وغیرہ وغیرہ نے تنقیدی کتابیں لکھیں۔

دہلی اُجڑنے کے بعد سراج الدین علی خاں آرزو لکھنؤ چلے گئے وہاں پر بھی انھوں نے ادبی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ اس سے پہلے جب وہ دہلی میں تھے تو وہاں انھیں جو ادبی ماحول پہلے سے ملا تھا اس میں گرمی اور تیزی پیدا کر دی تھی۔ جس سے وہ اپنے عروج پر پہنچ گئی تھیں۔ نادر شاہ کے حملے سے دہلی بہت اجڑ گئی لیکن ادبی سرگرمیاں اس کے بعد بھی جاری رہیں۔ کبھی آنند رام مخلص کے گھر پر تو کبھی کسی دوسرے کے یہاں یا کبھی وکیل پورہ محلہ میں واقع سراج الدین علی خاں آرزو کے مکان میں شعرا، ادبا اور علماء دانشوروں کا مجمع اکٹھا ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اسی درمیان زیب المساجد میں سعداللہ گلشن کی ادبی محفلیں اور مرزا عبدالقادر بیدل کے مکان پر شعر خوانی کی محفلیں برپا ہوتی تھیں۔ پھر بیدل کے انتقال کے بعد آرزو نے ہر شب جمعہ میں اپنے مکان میں مشاعرہ کرنا شروع کر دیا۔ شاعری کے ساتھ علمی مباحثے بھی بہت زیادہ ہوتے تھے۔ پھر علی حزیں کی اعتدال سے تجاوز کی ہوئی تنقید نے دہلی کے ادیبوں کو متحد کر کے ان کے قلم کی حرکت میں جوش پیدا کر دیا۔ چنانچہ سراج الدین علی خاں آرزو نے ان کی سربراہی کی اور علی حزیں کی تنقید اور اعتراضات کا جواب دینے لگے۔ آرزو نے علی حزیں کا جواب دینے میں بہت سخت رویّہ اپنایا خواہ وہ تحریری ہو یا زبانی۔ ان کے اس سخت رویّے سے کچھ ہندستانی شعرا اور دہلی میں مقیم ادبا دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ آرزو کے ساتھ رہا اور دوسرا گروہ علی حزیں کے ساتھ ہو گیا۔ علی حزیں کے گروہ نے آرزو کی سخت تنقید کا جواب بھی دیا۔ اسی موضوع کو لے کر سودا اور فاخر مکیں میں بحث و

تکرار ہوئی اور مضمون بازی بھی ہوئی۔ ایک نے اعتراضات کی بوچھار کی تو دوسرے نے اس کے اعتراضات کے جواب کی بارش کر ڈالی۔ علی حزیں کے گروہ کے کچھ لوگوں نے آرزو کی کتاب تنبیہ الغافلین اور احقاق الحق (جو علی حزیں کے کلام پر تنقید ہیں) کا جواب لکھا۔ اسی ادبی لڑائی میں جو علی حزیں اور آرزو کے انتقال کے بعد بھی جاری رہی۔ امام صہبائی نے بھی حصہ لیا اور آرزو کی کتاب "احقاق الحق" کے جواب میں ان کے مرنے کے بعد "اعلام الحق" کتاب بھی لکھی۔ اس ادبی جنگ نے بارھویں صدی ہجری میں فارسی ادب کے ماحول کو خاصا سرگرم رکھا۔

مختلف تذکروں کے دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس بارھویں صدی ہجری کے نصف اوّل میں ایک ہزار سے زیادہ شعرا تھے صرف صحف ابراہیم میں اس صدی کے شعرا کی تعداد ۶۶۵ درج ہوئی ہے۔ ایسے بہت سے شعرا ہیں کہ جن کا نام اس تذکرے میں نہیں آیا ہے وہ دیگر تذکروں میں ملتے ہیں۔ سبھی تذکروں میں عموماً انھیں شعرا کا نام محفوظ ہوا ہے جو تھوڑا مشہور ہو گئے تھے۔ یقیناً بہت سے ایسے شعرا رہے ہوں گے جو گمنامی میں تھے اور ختم ہو گئے۔ ان کا ذکر تذکروں میں نہیں آسکا۔ یہ بات مبالغہ آمیز نہ ہوگی کہ بارھویں صدی ہجری میں جتنے تذکرے لکھے گئے شاید ہی اتنے تذکرے کسی دوسری صدی میں لکھے گئے ہوں گے۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کے تین تذکرے "ید بیضا" "خزانۂ عامرہ" "سرو آزاد" علی حزیں کا تذکرہ "تذکرۃ المعاصرین"، "آرزو کا تذکرہ "مجمع النفائس"، "خوشگو کا تذکرہ "سفینۂ خوشگو" علی ابراہیم خاں خلیل کے چار تذکرے "صحف ابراہیم"، "خلاصتہ الکلام" "محافل الشعرا" اور "تذکرۂ شعرائے ریختہ" الفتی کا تذکرہ ایک دوسرے علی ابراہیم کا تذکرہ "گلزار ابراہیم" نقش علی کے دو تذکرے "باغ معانی" اور "تذکرۃ الشعرا" احمد علی سندیلوی کا تذکرہ "مخزن الغرائب" والہ داغستانی کا تذکرہ "ریاض الشعرا" میر تقی میر کے دو تذکرے "نکات الشعرا" اور "ذکر میر"، میرزا سرخوش کا تذکرہ "کلمات الشعرا" اور دیگر تذکرے مرآت الخیال، گلزار خیال، وغیرہ وغیرہ اسی بارھویں صدی ہجری میں لکھے گئے۔

بارھویں صدی ہجری میں اتنی زیادہ تعداد میں شعرا کا وجود، تذکرہ نگاروں کا کثرت کے ساتھ تذکرے مرتب کرنا، ادبی بحث و مباحثہ کا ہونا، عمدہ اور اچھی نثری کتابوں کا ملنا یہ سب اس بات کے بیّن ثبوت ہیں کہ بارھویں صدی ہجری میں فارسی کا ادبی ماحول عام طور پر کافی سرگرم رہا۔ اس صدی میں فارسی ادب کے ساتھ دیگر فنون کی بھی ترویج اور ترقی ہوئی۔

ماخذ و ذرائع

۱۔ مجمع النفائس سراج الدین علی خاں آرزو خدا بخش لائبریری پٹنہ ۱۹۷۵ء

۲۔ صحف ابراہیم ابراہیم خاں خلیل " " " ۱۹۷۸ء

۳. خلاصۃ الکلام	ابراہیم خاں خلیل	خدابخش لائبریری پٹنہ	۱۹۷۸ء
۴. باغ معانی	نقش علی	" "	۱۹۷۸ء
۵. خزانۂ عامرہ	مولانا غلام علی آزاد بلگرامی	نولکشور پریس لکھنؤ	۱۸۷۱ء
۶. سروآزاد	" " "	مطبع دخانی لاہور	۱۹۱۲ء
۷. سفینۂ خوشگو	بندرابن داس خوشگو	لیبل پریس پٹنہ	۱۹۵۹ء
۸. سفینۂ ہندی	بھگوان داس ہندی	" "	۱۹۵۸ء
۹. مرزا عبدالقادر بیدل	سید نبی ہادی	علی گڑھ	۱۹۸۲ء
۱۰. مردم دیدہ	عبدالحکیم حاکم لاہوری	پنجاب یونی ورسٹی پریس لاہور	۱۹۶۱ء
۱۱. مقالات الشعرا	قیام الدین حیرت	دہلی	۱۹۶۸ء
۱۲. نکات الشعرا	میر تقی میر	انجمن ترقی اردو اورنگ آباد	۱۹۳۵ء
۱۳. نگارستان فارس	محمد حسین آزاد	لاہور	۱۹۱۲ء
۱۴. تذکرہ نویسی در ہندوپاک	سید علی رضا نقوی	علی اکبر علی چاپخانہ تہران	۱۳۴۳
۱۵. ذکر میر	میر تقی میر	انجمن ترقی اردو اورنگ آباد	۱۹۲۸ء
۱۶. شمع انجمن	نواب محمد صدیق حسن خاں	بھوپال	۱۲۹۲ھ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی اہم کتابیں

پہچان اور پرکھ — پروفیسر آل احمد سرور

اس مجموعے میں پروفیسر آل احمد سرور کے جو مضامین شامل ہیں ان کا تعلق زیادہ تر شاعروں اور شاعری کی خصوصیات سے ہے میرؔ، غالبؔ، انیسؔ، حسرتؔ، فانیؔ، جوشؔ اور فراقؔ کی شخصیات اور شاعری پر بھرپور مضامین کا اہم مجموعہ۔ قیمت: ۵۱/-

ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم
ڈاکٹر سلامت اللہ

اس کتاب میں مسلمانوں کی تعلیم کے جن مسائل کی نشان دہی کی گئی ہے وہ مصنف کے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اس لیے کہ اس کے تاریخی اور حالیہ شواہد موجود ہیں۔ ماہر تعلیم ڈاکٹر سلامت اللہ کی اہم ترین تصنیف۔
قیمت: ۵۱/-

اقبال کا نظریۂ خودی — عبد المغنی

اس کتاب میں نظریۂ خودی کو مرکزی نقطہ فرض کر کے اقبال کے پورے نظام فکر کی تلاش کی گئی ہے تاکہ ایک طرف دنیا کی سب سے بڑی شاعری کی حقیقی جہت واضح ہو اور دوسری طرف آج کی انسانیت کو اپنے ارتقا کی صحیح سمت دریافت کرنے میں سہولت ہو۔ قیمت: ۱۵۰/-

پت جھڑ کی آواز — قرۃ العین حیدر

برصغیر کی ممتاز ترین افسانہ نگار قرۃ العین حیدر کی اہم کہانیوں کا مجموعہ۔ یہ کہانیاں دلچسپ بھی ہیں اور زندگی کی صحیح عکاسی بھی کرتی ہیں۔ نیا اڈیشن قیمت: ۵/۷۵

جدید افسانہ اور اس کے مسائل — وارث علوی

اردو کے ممتاز نقاد وارث علوی کے تنقیدی مضامین کا تازہ ترین مجموعہ جدید اردو افسانہ کے متعلق ایک اہم دستاویز۔ قیمت: ۳۶/-

لکھنؤ تہذیب کا نمائندہ شاعر

قلندر بخش جرأت (خطبہ) — جمیل جالبی

اردو کے نامور عالم اور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک نہایت اہم خطبہ جو موصوف نے ۸ر نومبر ۱۹۸۹ء کو ڈاکٹر سید عابد حسین میموریل ٹرسٹ کے سیمینار میں پیش کیا۔
قیمت: ۱۰/-

غبارِ منزل (شعری مجموعہ) — غلام ربانی تاباں

اردو کے ممتاز شاعر جناب غلام ربانی تاباں کی غزلوں، نظموں اور قطعات کا تازہ مجموعہ جس میں ساز لرزاں، ذوق سفر" اور "نوائے آوارہ" کا انتخاب بھی شامل ہے۔ قیمت: ۴۵/-

تاریخ اودھ — قاسم علی نیشاپوری

"تاریخ اودھ" معروف بہ "تاریخ شاہیہ نیشاپوریہ" اودھ کی اہم تاریخ ہے۔ قاسم علی نیشاپوری نے اسے فارسی میں لکھا تھا ڈاکٹر شاہ عبد السلام نے نہایت محنت سے اس کو اردو کا جامہ پہنایا۔ قیمت: ۲۷/-

فی الحقیقت — یوسف ناظم

طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں یوسف ناظم کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ ان کی تحریریں نہایت ذوق شوق اور توجہ سے پڑھی جاتی ہیں۔ "فی الحقیقت" ان کے تازہ ترین طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔
قیمت: ۴۵/-

ڑ ایس ایم حسن گورکھپوری
، امام نگر، پارٹ شیٹ ورسوا روڈ۔
یری ویسٹ بمبئی۔ ۴۰۰۰۶۱

شاہ بلوط کا درخت

رات کا سناٹا بڑھ رہا تھا۔ کینسر وارڈ کے ایک پرائیوٹ وارڈ میں لیٹی ہوئی یاسمین
رگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ اس کی ماں ایزی چیئر پر آنکھیں بند کیے اونگھ
ی تھی۔ حیات و موت جو ایک پروسس ہے ناقابلِ تسخیر قدرتی عمل ہے۔ ہر ذی روح کو
ا پروسس سے گزرنا ہے۔ یاسمین بھی اسی سے گزر رہی تھی۔ اس پروسس سے گزرنے
س کے سامنے ایک بہانہ تھا۔ کینسر کا مرض جو گانٹھ بن کر اس کی ٹانگ میں اُبھر آیا
ا اور جس سے ڈاکٹروں کی ایک پوری ٹیم لڑ رہی تھی۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ کینسر
بدن میں پھیلنے سے روکنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ اس کا پانو کاٹ دیا جائے
بدن کا ہر انگ یاسمین کا اپنا تھا۔ اس کی وہ واحد مالک تھی۔ کسی انگ کا کم ہونا زندگی
ر وجود کا ادھورا ہونا ہے ــــــــ یاسمین تو اپنی زندگی کا تصور بغیر متحرک جسم بغیر ٹینس کورٹ
کر ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ ٹینس چیمپ تھی اور اس کا پارٹنر تھا جاوید انور۔ بہر حال جینے کے
ضروری ہے کہ ٹانگ کاٹ دی جائے۔" آج صبح ہی ڈاکٹر نے اس سے کہا تھا۔ "کینسر کا کوئی
ج نہیں۔ شاید وہ دن آجائے جب کینسر کا علاج معلوم ہو جائے۔ کوئی ایسی تھیراپی ہو
س کا علاج صرف دواؤں سے کیا جا سکے۔ مگر اس وقت تک ہم رُک نہیں سکتے۔ اگر
سر بدن میں پھیل گیا تو پھر کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔" ڈاکٹر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔
"میں بغیر ٹانگ کے جی کر کیا کروں گی ڈاکٹر۔ اچھا ہوتا کہ تمھاری میڈیکل کی دنیا میں
ب اس مرض کے بارے میں کچھ نہ جانتے۔ اس وقت شاید انسان اتنا سہما ہوا نہ ہوتا۔
ر شاید زیادہ دن جی لیتا ــــــــ دواؤں کی ایجاد سے پہلے تم مرض کے بارے میں کچھ نہ کہا
و۔" وہ چڑھ کر بولی۔

ڈاکٹر ہنسا۔ "ہم سب مجبور ہیں۔ ابھی کینسر کا علاج معلوم نہیں ہوا کہ دنیا کے سر پر
ز کا خطرہ منڈلانے لگا۔ ایڈز کلو اور بھی خطرناک بیماری ہے۔ مائی ڈیر گرل ــــــــ تم
ل راضی ہو جاؤ۔ تو میں کل ہی ڈاکٹر اچریکر سے ڈیٹ لے لیتا ہوں اور پرسوں آپریشن "
"تم مجھے شاہ بلوط کے درخت کی طرح جینا سکھا دو۔ جس کی ایک شاخ کٹنے پر بھی ویسے

ہی دوسری خوب صورت شاخ نکل آتی ہے پھر میری ٹانگ کاٹ لو۔ دوسری اُگ آئے گی۔"
تلخی سے مسکرائی۔
"ابھی ہماری سائنس نے اس اسٹیج میں قدم نہیں رکھا ہے۔ اگر ایسا ہو تو انسانوں کو درختوں سے آکسیجن لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"
ڈاکٹر کبھی اپنے ایپرن سے باہر آکر عام انسانوں کی طرح نہیں سوچتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر اور مریض ایک دوسرے کے لیے اجنبی بنے رہتے ہیں۔" وہ کینسر وارڈ کے باہر خلا میں دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ سنتری کی طرح تنے ہوئے یوکلپٹس کے درخت ہواؤں کے جھونکوں سے جھوم رہے تھے۔ یہ جو قدرت کا شاہکار ہیں انسانوں کو آکسیجن دے کر ان کے زہر آلود سانسوں کو خود میں جذب کرتے ہیں۔ پھر بھی یہ انسانوں سے بہتر جی رہے ہیں کیوں کہ یہ قدرت سے بہت قریب ہیں اور ہم اتنا ہی دور ہیں۔" ایسا سوچتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ "میں بھی شاہ بلوط کا درخت ہوں جس پر میرا نام اور جاوید کا نام کندہ ہے میں اس درخت کا سنبل ہوں۔ وہ میرا صحیح روپ ہے۔ وہی میں ہوں جو سر اٹھائے کھڑا ہے۔ آسمان کے نیچے نیشنل پارک کے ایک کونے میں ــــ میں نے اسے کتنی بار دیکھا ہے ہر بار زیادہ خوب صورت، تناور، پتوں کے لباس میں چھپا ہوا ــــ جاوید مجھے ایسے ہی چاہتا تھا۔ جیسے میں درخت ہوں۔ وہ اس درخت کا رکھوالا مالی ہے۔ وہ اس شاہ بلوط کے درخت کے نیچے کتنی بار مجھے پیار کرچکا ہے۔ اس نے میری باہوں پر اسی طرح ہاتھ پھیرا ہے جیسے کوئی مالی درخت کی کومل شاخوں کو چھوتا ہے۔ وہ مجھے شاہ بلوط ہی کہتا تھا۔ تبھی تو اس نے ایک بار اس درخت پر میرا نام کندہ کیا۔ "یہ تم ہو۔" اس نے کہا تھا۔ اور میں۔ نے اس کا نام کندہ کیا۔ "یہ تم ہو،" میں نے کہا تھا۔ "یہ تو اچھا ہوا کہ اسے معلوم نہیں کہ میں کینسر وارڈ میں ہوں اور میری ٹانگ کاٹی جانے والی ہے ــــ پھر مجھے سانسیں گننے کے لیے گھر کے ایک کونے میں بٹھا دیا جائے گا۔ میں ایسی ہی ہوں گی جیسے شو پلانٹ ہوتا ہے۔ صرف ہر صبح اس کا پانی بدلا جاتا ہے۔
نیند اس کی آنکھوں میں نہیں تھی۔ رات کا سناٹا بڑھ رہا تھا۔ بڑھتے ہوئے رات کے سناٹے میں بمبئی بڑی پُراسرار ہو جاتی ہے۔ پٹرول کرنے والی پولیس کی جیب اسمگلر اور جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ آنکھ مچولی کرتی ہے۔ کوئی لوٹا جاتا ہے تو کوئی لوٹتا ہے۔ کوئی مقتول ہوتا ہے تو کوئی قاتل اور جرائم کو جنم دینے والی بستی راتوں میں اور بھی پُراسرار ہو جاتی ہے ــــ کینسر وارڈ میں مریضوں کی کراہیں زندگی سے احتجاج کر رہی تھیں۔ نرس اندر آئی اور اسے نیند کی گولی دے کر چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں نیند کے سائے اس کی آنکھوں میں تیرنے لگے۔
صبح زندگی کی چہل پہل پھر شروع ہوئی۔ ڈاکٹروں نے اپنے اپنے وارڈ میں چکر لگانا شروع کیا۔ انسان کا بدن ازل سے دیکھا ہے۔ ہر زمانے میں فیشن کے مطابق اسے سجایا جاتا رہا

ہر زمانے میں نت نئے مرضوں کا جنم ہوتا رہا ــــــ ہر ڈاکٹر مریض کے جسم میں اپنی کامیابی کا
راز تلاش کرتا ہے۔ وہ راز جو میڈیسن کی دنیا میں اسے امر کر دے۔ اسے انٹر نیشنل نیکر
دے۔ ہر صبح ڈاکٹر یاسمین کے بیڈ کے پاس آکر گڈ مارننگ کہتا۔ وہ اس رسم سے اوب
تھی ایک رسمی صبح، صبح نو بجے سے شروع ہوتی اور شب نو بجے ختم ہو جاتی ــــ کینسر وار
میں زندگی بے معنی صبح و شام کے چکر میں پھنسی ہوئی تھی۔ تیز دواؤں کی مہک میں بیٹھی
ہوئی بیماری ہر دم ہر سانس سونگھی جا سکتی تھی۔

ہر صبح ڈاکٹر اس کی طرف پُر امید نظروں سے دیکھتا اور پھر یاسمین کی ماں کی طرف سوالیہ
انداز میں۔

"ایک دو دن اور انتظار کیجیے ڈاکٹر صاحب۔ ہم اسے راضی کر لیں گے ــــ اس کی ماں کہ

گھر کے سب لوگ یاسمین کی زندگی چاہتے تھے۔ مگر یاسمین مفلوج زندگی کے لیے
نہیں تھی۔ وہ مہمل اور بے معنی زندگی گزارنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے تصویروں کا البم اٹھا
لیا اور انھیں دیکھنے لگی۔ باہر کی دنیا سے اس کا تعلق صرف اس البم کی وجہ سے تھا۔ اس
ماضی چھپا ہوا تھا۔ کھیل کے میدان، بہت سی ٹرافی، مسکراتی یاسمین اور جاوید الور۔ میچ
کا جیتنا، چلڈرن کلب ــــ بلیرڈ کھیلتے ہوئے وہ دونوں۔ سوئمنگ پول میں نہاتے وہ دونوں
جنس پارک میں شاہ بلوط کے پیڑ کے نیچے کھڑے ہوئے ــــ گزرے ہوئے دن جیسے کھنچ کر
بے جوہر ت ہو گئے ہوں۔ اس کے دل میں ایک عجیب تمنا پیدا ہوئی۔

"ہاں۔ ضرور میں جیوں گی۔ خواہ صرف ایک رات مگر پوری زندگی۔ ایک مسرور
زندگی۔ شاہ بلوط کی زندگی۔ میری اپنی زندگی۔ ایک نیچرل زندگی ــــ"

اس نے البم ایک طرف رکھ دیا۔ جاوید اس کی منگنی کے بعد اسے کبھی نہیں ملا۔
نے اپنی منگنی کی انگوٹھی خود جاوید کو دکھائی تھی۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگا تھا۔ اس
شاید مذاق سمجھا تھا۔ تب ہی وہ کہنے لگا۔

"تم شادی کرو گی۔ اسپورٹس گرل۔ شادی کے بعد تم کئی بچوں کی ماں ہو گی۔ موز
یاسمین کی گود میں ایک موٹی سی بچی ہو گی ــــ میں تو امیجن بھی نہیں کر سکتا۔

جاوید ہمیشہ سے چلبلی طبیعت کا تھا۔ اسپورٹس نے اس کی زندگی کو اور بھی کھلنڈ
بنا دیا تھا۔ وہ کسی بات پر سیریس نہیں ہوتا۔ اس وقت یاسمین کو اس کا یہ مذاق اچھا
لگا۔ وہ ناراض ہو کر چلی گئی۔ مگر دوسرے دن جاوید اس طرح اس کے گھر آیا۔ جیسے کوئی بات
ہی نہ ہو۔ وہ اسی طرح ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں گھومتا رہا۔ یاسمین کے ڈیڈی
اور اس کے چھوٹے بھائی سے باتیں کرتا رہا۔ یاسمین کے کمرے کے سامنے سے گذرا تو اندر
مسکرا کے دیکھا اور پوچھا۔

"یاد ہے نا کل میچ ہے۔" اور بغیر جواب کا انتظار کیے کچن میں چلا گیا۔

"آنٹی کیا بنا رہی ہیں آپ؟"

آؤ جاوید۔ یہ لو اپنے حصے کا لڈو۔" یاسمین کی ماں نے کہا۔" یاسمین کی انگیجمنٹ ہو رہی ہے۔"

" کیا واقعی تم یاسمین کی شادی کر رہی ہو؟"

" ہاں بھئی تو کیا میں مذاق کر رہی ہوں۔ یاسمین کے ہاتھ میں وہ ڈائمنڈ کی انگوٹھی دیکھی ہوگی۔ پندرہ ہزار کا ہیرا ہے۔"

وہ یکایک سنجیدہ ہوگیا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کھیل کے میدان میں اکیلا رہ جائے گا۔ آج جب اس کا دھیان پندرہ ہزار کے ہیرے کی انگوٹھی اور منگنی کے لڈو کی طرف دلایا گیا تو وہ ایسا محسوس کرنے لگا جیسے کچھ کھو رہا ہے۔ جیتا ہوا گیم ہار رہا ہے۔ یاسمین کی ممی کہہ رہی تھی۔

" اچھا رشتہ بمبئی میں کہاں ملتا ہے۔ یہ تو قسمت سے ملا ہے سمجھو۔"

" کون ہے وہ"

" وہ لوگ بزنس کرتے ہیں۔ ہیروں کا بزنس۔ ان کی فرم بمبئی، سورت، ہانگ کانگ اور بلجیم میں ہے۔ حمید موتی والا کا نام تو تم نے سنا ہی ہوگا۔"

" یاسمین کو یہ رشتہ پسند ہے۔ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

" بھلا اسے کیوں ناپسند ہوگا۔ اتنا امیر گھر وہ بھی خاندانی شریف لوگ۔ یہ رشتہ تو سب کو پسند ہے۔"

" ہوں!"

" جاوید اب یاسمین کی منگنی ہو چکی ہے۔ اس امتحان کے بعد وہ کالج چھوڑ دے گی تم بھی اس سے ملنا جلنا کم کر دو بیٹے۔"

" ہاں آنٹی" اس نے آہستہ سے کہا۔ اور فوراً ہی چلا گیا۔ پھر کبھی نہیں آیا۔ کبھی ملا بھی نہیں۔ یاسمین نے بھی شکایت نہیں کی۔ وہ اب زیادہ تر گھر میں رہنے لگی۔ کھیل کا میدان سوئمنگ پول، ہیپی چلڈرن کلب، نیشنل پارک کی شامیں سب گزرے ہوئے دن ہوگئے۔

حمید موتی والا بزنس میگنٹ تھا۔ اس کے پُرکھے ہیروں کے بیوپاری تھے۔ حمید کی بات اپنے خاندان میں ایک مثال تھی۔ بیس سال کی عمر میں اس نے اپنے باپ کا کاروبار سنبھالا تھا اور بہت ہی کم عرصہ میں اُس نے اپنی بزنس ہانگ کانگ اور بلجیم تک پھیلا لیا۔ ۲۸ سال کی عمر میں اسے اپنے کاروبار کے لیے ایک وارث کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مگر وارث بازاروں میں نہیں ملتے۔ ان کے لیے کوکھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی تھوڑی سی سوشل لڑکی زیادہ مناسب ہوتی ہے جو ایک وارث کو جنم دے سکے۔ تب اسے بیوی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لڑکیاں تو اس کی زندگی میں خود بخود آتی رہیں مگر بیوی تو لائی جاتی ہے۔ سماجی رسم ورواج میں ایک گھر سے دوسرے گھر میں منتقل ہوتی ہے۔ وہ خود بھی ہندستان کے بڑے بیوپاریوں کی طرح کم پڑھا لکھا تھا۔ اس لیے اسے یہ گوارا نہیں تھا

یاسمین زیادہ تعلیم یافتہ ہو۔ یہ بات کو کاروباری نقطۂ نظر سے دیکھنے والا موتی والا حمید سیٹھ بہت ہی سمجھ دار آدمی تھا۔

ان تمام پابندیوں کو یاسمین چپ چاپ سہتی رہی۔ اس نے کبھی اپنی ماں سے پوچھا بھی نہیں کہ اس کی زندگی کا یہ سودا کیوں؟ ۔۔۔۔ شاید جنم دینے والی ماں کو حق ہے وہ اپنی بیٹی کا سودا کرے اس کا بھی سودا کیا تھا۔ ۔۔۔ مگر اس دن جب اس نے ان میں تکلیف محسوس کی اور گھٹنے کے پاس ڈاکٹروں نے ٹیومر بتایا۔ ٹیومر کی جانچ کر کے اسٹی ٹیوٹ نے کینسر کا مرض تشخیص کیا تو بہرے دھماکے کے بعد کی خاموشی نے مارے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔۔۔۔ اس کی منگنی ٹوٹ گئی۔ ہیرے کی انگوٹھی ہاتھ سے اتارنے وقت اس نے درد کے ساتھ آزادی کی مسرت محسوس کی۔ بڑی خاموشی سے بغیر کسی شور اور ہنگامے کے وہ اس کاروبار میں سب کو کنگال بنا چکی تھی۔ وراثت کی ستانے دل میں لیے حمید موتی والا اس کے دروازے سے نامراد لوٹ گیا۔ کینسر نے یاسمین کو اس بندھن سے آزاد کرادیا۔

ماں نے کینسر وارڈ کے ایرکنڈیشنڈ روم میں اسے بیڈ پر لیٹاتے ہوئے کئی بار پوچھا تھا۔ جاوید کو پتا نہیں۔ سب تمہیں دیکھنے آئے وہ نہیں آئے۔"

"ممی جسے تم نے میری زندگی سے نکال دیا اسے اب کیوں بلانا چاہتی ہو۔ وہ میری کا روباری نہیں۔"

وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں جاوید کو کیوں بلانا چاہتی ہے۔ شاید وہ اسے دیکھ کر وہ پھر سے جینے کی تمنا کرنے لگے۔ مگر اس کے جینے کی قیمت تو بہت بڑی تھی۔ آدھے ادھورے جینا۔ یہ اسے منظور نہیں تھی۔

کینسر وارڈ میں شام کا دھندلکا بڑھنے لگا۔ وہ اپنے بیڈ پر بیٹھی سوچ رہی تھی۔ زندگی اور موت میں مجھے ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ میں اپنا ووٹ چاہے زندگی کو دوں یا موت کو۔ یہ میرا اپنا حق ہے۔ میرا ذاتی حق۔"

وہ ایک فیصلے پر پہنچنا چاہتی تھی اور جب کینسر وارڈ کی چھت سے شام سمٹ چکی تو وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ زندگی نے اس کے وجود میں انگڑائی لی۔ میں کوالٹی لائف جیوں گی صرف ایک رات کی کوالٹی لائف ۔۔۔۔"

"ایک رات کے چند گھنٹے بہت ہیں۔ اس میں پوری زندگی جیا جائے ایسا ممکن ہے بس کہ ایک ایک لمحے کو انجوائے کیا جاسکتا ہے۔ ایک ایک قطرہ حیات کا پیا جاسکتا ہے میں تو خوش نصیب ہوں کہ میرے پاس پوری کی پوری رات ہے۔ پوری بھرپور زندگی سامنے ہے۔ بس مجھے اسے جینا ہے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کینسر وارڈ سے باہر نکل گئی۔ باہر پوری زندگی تھی۔ ہواؤں کے مست جھونکے اور چاندنی کی ٹھنڈی پھوار تھی۔ اسپتال کی دواؤں میں لپٹی ہوئی میت

کی مہک نہیں بلکہ زندگی کی سوگندھ ـــــ چار پانچ موگرے کی بینی اس نے خریدلی اور انھیں دونوں ہاتھوں میں لے کر زور سے سانس لیا۔ خوشبو اس کے جسم میں اٹھکیلیاں کرنے لگی اس کا سارا وجود مستی میں جھوم اٹھا۔ اس نے آٹو رکشے والے کو اشارہ کیا۔

"کہاں چلوں میم صاحب"

"جوہو پارلے اسکیم"

موت سے ڈری سہمی اپاہج زندگی کو اس نے جھپٹ کر اپنے وجود سے پھینک دیا ہے۔ اب وہ بے خوف مطمئن اور مسرور ہے۔ اس کے پانو ابھی بھی ہرن کی طرح خوبصورت اور سبک ہیں کہ کینسر کا دیمک اس کی ہڈیوں کو ہر لمحہ چاٹ کر کھوکھلا کر رہا ہے۔ مگر یہ کیوں محسوس کیا جائے کہ مرض زندگی کے رس کو چوس سکتا ہے ـــــ نہیں مجھے یہ رس بچا کے رکھنا ہے آج کی رات اور خود ہی پینا ہے۔ بیماری کا زہر کیوں پیوں۔"

جوہو پارلے اسکیم کی چھوٹی گلی میں رکشا داخل ہوا۔ ہپی چلڈرن کلب کی پہلی منزل سے روشنی اور قہقہوں کی آواز آرہی تھی۔ اس نے رکشا رکوایا۔ اور ڈرائیور کو اوپر بھیجا۔ کچھ دیر بعد وہ جاوید کے ساتھ لوٹا۔ آٹو رکشا میں یاسمین کو دیکھ کر جاوید نے حیرانی سے پوچھا "یاسمین تم یہاں۔" پھر ایک نظر اس کے چہرے اور جسم پر ڈالا۔

"کیا تم بیمار ہو"؟

جاوید میں تمھارے پاس ایک کام سے آئی ہوں۔ وہ کام تمھارے بغیر ممکن نہیں۔ مگر پہلے تم وعدہ کرو کہ میرا ساتھ دوگے اور کوئی سوال نہیں کروگے۔ میرے پاس بہت کم وقت ہے۔"

"بولو کیا بات ہے۔"

"تو تم تیار ہو۔"

"ہاں۔"

"سوال تو نہیں کروگے۔"

"نہیں بالکل نہیں۔ تم کام بولو۔"

"اچھا۔ اس نے اپنا ہاتھ جاوید کی طرف بڑھا دیا اور جاوید نے ذرا جھجک کر ہاتھ تھام لیا۔ وہ رکشے سے اتر گئی۔ مدتوں بعد دونوں میں اتنی نزدیکی ان کے دلوں کی دھڑکن تیز کر رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب کھڑے جسموں کی خوشبو محسوس کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے جسموں میں ساون کی پہلی پھوار محسوس کی۔ کوئل کی کوک جیسے ان کے بدن میں گونج اٹھی۔ آم کے بور کی خوشبو پوری فضا میں پھیل گئی۔

"سنو جاوید آج کی رات تمھیں میرے ساتھ رہنا ہے۔ ان سب جگہوں کو ہم لوگ دیکھیں گے جو ہماری زندگی کا قیمتی حصہ ہیں۔ وہ پارک وہ شاہ بلوط کا درخت وہ سوئمنگ پول۔ تمھیں یاد ہے نا ـــــ تم مجھے وہاں لے چلو۔

مگر اس وقت۔ کیوں آخر یاسمین"؟

"تم سوال مت کرو۔ تم نے وعدہ کیا ہے۔ بس آج کی رات میرا ساتھ دو۔ پھر تم سے کو نہیں کہوں گی۔" اس کے لہجہ میں چھپا ہوا درد اس نے محسوس کیا۔

"اچھا چلو۔ میں انکل کی ماروتی کار لے کر آتا ہوں۔"

جب چاندرن کار لے کر آیا تو سب کھڑکیوں سے لڑکوں کے چہرے نظر آنے لگے۔ سب نے ہاتھ دکھایا۔ وش کیا۔

"ہائے یاسمین۔ وش یو اے ہیپی لائف۔ انجوائے دی نائٹ اینڈ نائٹ فار ایور۔"

جاوید کار نے آیا۔ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ یاسمین نے سب کو الوداع کہا اور کار میں بیٹھ گئی۔

"تمہاری شادی ہو گئی یاسمین؟"

"پلیز آج کی رات کوئی سوال مت پوچھو۔ نہ گزرے ہوئے کل کی اور نہ آنے والے کل کی۔ آج کی رات میری اور تمہاری رات ہے۔ آؤ اسے انجوائے کریں۔" وہ اس کے قریب ہو گئی۔ چاندرن نے کار چلاتے ہوئے اپنا ہاتھ یاسمین کے کندھے پر رکھ دیا۔

"اچھا کہو کہاں چلیں؟"

"جوہو" وہ آہستہ سے بولی۔ "جوہو قریب ہی ہے۔"

کار مین روڈ پر جا رہی تھی۔ جوہو چرچ کے چیپل میں روشنی تھی۔ فادر براؤن ڈیسوزا کی آخری دعا میں مصروف تھا۔ وہ مسیح کی بھیڑوں کی سلامتی کی دعا کر رہا تھا۔

جوہو بیچ کے کنارے والی سڑک پر اس نے ماروتی پارک کی۔ بہت سے لوگ کاروں میں بیٹھے اپنی بیوی یا گرل فرینڈ کے ساتھ انجوائے کر رہے تھے۔ یاسمین نے ایک لمبی اطمینان کی سانس لی اور ساحل سمندر پر ایک نظر ڈالی۔ موجوں کا موجزن ہونا سرکش گھوڑوں کی طرح سے نظر آ رہا تھا۔ لہریں اس طرح دوڑتی ہوئی ساحل تک آ رہی تھیں جیسے انھیں خوش آمدید کہہ رہی ہوں۔ عرب ساگر کو چھوتی ہوئی ہوائیں سرسراتی ہوئی جوہو بیچ تک آ رہی تھیں۔ وہ دونوں کار سے نکل آئے اور بیچ پر ٹہلنے لگے۔ انھوں نے ایک ہی بوتل سے قطرہ قطرہ پیا اور بیچ پر چلتے رہے۔

"ان اندھیروں میں اس وسیع سمندر کے کنارے چلتے ہوئے ہم ایسا محسوس کر رہے ہیں جیسے ہم اس کا ایک حصہ ہیں اور یہ ہمارا ایک حصہ ہیں۔"

"ہاں یاسمین نجانے کیوں نیچر کے بیچ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے وجود میں وسعت ہو گئی ہے۔"

وہ دونوں سب کچھ بھول کر چلتے رہے۔ اپنا وجود بھی بھول کر وہ اندھیرے میں تحلیل ہوتے جا رہے تھے۔ ہزاروں موجیں ان کے وجود کا حصہ بن چکی تھیں۔ کل کی کل زندگی ان

کے بدن سے پھوٹ کر باہر آچکی تھی۔

"یہ سب تو میں ہوں۔ یہ سب تم ہو۔" جاوید نے سرگوشی میں کہا۔

"یس یو آر رائٹ۔" اس نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔ "جاوید مجھے وہ شاہ بلوط کا پیڑ دیکھنا ہے۔"

"وہ تو نیشنل پارک میں ہے۔ بہت اندر۔ ڈھونڈنا مشکل ہوگا۔"

"نہیں تو میں اس درخت کو ایسا ہی پہچانتی ہوں جیسا تمھیں۔ چلو چاندنی رات ہے۔ ہم اسے ڈھونڈ لیں گے۔"

"اوکے۔ چلو۔ آج میرا موڈ بھی ہو رہا ہے کہ اس درخت کو دیکھوں جس پر ہمارا اور تمھارا نام کندہ ہے۔"

دونوں کار میں بیٹھ گئے۔ جاوید نے کار اسٹارٹ کی۔ اور تھوڑی دیر بعد کار کو اس نے فرسٹ گیئر پر چھوڑ دیا۔ کار پوری اسپیڈ سے بھاگ رہی تھی۔ دونوں ہچکولے کھا رہے تھے۔ ہنس رہے تھے اور جھوم رہے تھے۔ زندگی کار سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ نیشنل پارک میں خاموشی اور سکون کا ماحول تھا۔ باہر کی دنیا سے اندر باغ کی دنیا زیادہ قدرتی معنویت لیے ہوئے تھی۔ درختوں کے درمیان سے چلتے ہوئے وہ محسوس کر رہے تھے کہ درخت اپنی زبان میں ان سے کچھ کہہ رہے ہیں وہ انھیں محسوس کر رہے تھے۔

"یاسمین میں بہت ہی سکون محسوس کر رہا ہوں۔ تمھارے ساتھ چلتے ہوئے مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔" اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"مجھے بھی جاوید۔ آج میں نے زندگی کو پہلی بار ایک الگ انداز میں دیکھا ہے۔ پہلے کبھی زندگی اتنی بامعنی نہیں تھی جتنی آج ہے۔ اس وقت ایسا لگ رہا ہے۔ یہ پارک نیا ہے۔ درخت نئے ہیں۔ میں انھیں آج ہی دیکھ رہی ہوں۔ ان میں جو جاذبیت ہے اسے آج ہی محسوس کر رہی ہوں۔ ان میں جو اپنا پن ہے اسے آج ہی میں نے سمجھا ہے۔

قدموں کی آہٹ پر درختوں سے چڑیوں نے احتجاج کیا۔ درختوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے انھوں نے ان کے تنوں سے آتی ہوئی ہری خوشبو کو بار بار سونگھا۔ سانسوں میں اس کی خوشبو تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔ گھنے درختوں سے چاندنی چھن کر زمین پر بکھر رہی تھی۔

"راستہ تمھیں یاد ہے یاسمین۔ معلوم ہے ناکہ وہ شاہ بلوط کا پیڑ کہاں ہے؟"

"نہیں۔ مگر اسی باغ میں ہے۔ میں اسے پالوں گی ——— تمھیں یاد ہے اس کے پاس ہی ایک بڑا سا پتھر ہے جس پر میں بیٹھی ہوں اور تم میری فوٹو نکال رہے ہو۔ وہ فوٹو آج بھی میرے البم میں ہے۔"

دونوں چلتے رہے اور ایک پتھر کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ ان کے ذہن نے صدا دی۔ "یہی وہ جگہ ہے۔"

"وہ دیکھو" دونوں شاہ بلوط کے درخت کے قریب آتے ہیں۔ جنگل کی فضا میں پلا ہوا شاہ بلوط کا درخت سب سے اونچا اور تناور ہے۔ اس کی موٹی شاخوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ درخت کی چھتنار شاخیں چاروں طرف پھیلی ہیں۔ وہ ایک آسمان ہے اس آسمان کے نیچے ہزاروں پرندوں کی جائے پناہ ہے۔ یاسمین نے چاندنی کی ہلکی روشنی میں تنے پر کندہ نام دیکھ لیا ہے۔ وہ خوشی سے چلا اٹھتی ہے۔ "دیکھو یہ ہے ہمارا نام۔ جب ہم نے لکھا تھا تو یہ چھوٹا تھا۔ تب درخت بھی چھوٹا تھا۔ آج درخت کے ساتھ ساتھ یہ بڑھ چکا ہے۔

دونوں اپنے ہاتھوں کو درخت پہ پھیرتے ہیں۔ اپنے گالوں کو اس کے کھردرے تنے پر رکھ کر اسے محسوس کرتے ہیں۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈک ان کے جسموں میں گھس گھس کر داخل ہو رہی ہے۔

منزل پانے کے بعد جو اطمینان بخش تھکن جسم میں محسوس ہوتی ہے۔ وہ یاسمین محسوس کرنے لگی۔ اور وہیں پتوں پہ اطمینان سے بیٹھ گئی۔ پھر وہ لیٹ گئی۔ جاوید بھی اس کے قریب لیٹ گیا۔ دونوں ایک عجیب لذت محسوس کر رہے تھے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ پوری فضا ان کے اپنے وجود سے ہم آہنگ ہو چکی ہے۔ دونوں نے آنکھیں بند کر لیا۔

"ہمارے ارد گرد ایک مصنوعی دنیا کا طلسم کھڑا ہوا ہے جو ہر لمحہ ہمیں بیماریوں سے ڈراتا ہے۔ موت سے خوف زدہ رکھتا ہے۔ ہم سبھی ادھوری زندگی جینے کے عادی ہو چکے ہیں۔ یاسمین آہستہ آہستہ بول رہی ہے۔ ہمیں پوری زندگی جینی چاہیے۔ موت سے نڈر ہوکے۔ یہی زندگی کا انجام ہے۔ موت نہیں — وہ تو ایک پڑاؤ ہے۔ جو آنے والی ہے۔ اپنے وقت پر آئے گی۔ اس کے لیے اسپتال کا بیڈ کیوں۔ کیا بیڈ صرف سسکتی اور لڑکھڑاتی زندگی کی آخری پناہ گاہ ہے۔"

"نہیں یاسمین نہیں ہرگز نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ تم یہاں کیوں آئی ہو۔ اسپتال کا ڈیتھ بیڈ تمھیں موت سے پہلے ہی مار رہا ہے۔ مجھے سب معلوم ہے۔"

"میں یہاں پوری زندگی جی رہی ہوں جاوید۔ تمھارے ساتھ اس شاہ بلوط کے درخت کے نیچے آسمان کے نیچے چاندنی کے بستر پر۔ تم گواہ ہو کہ میں نے زندگی کے ساتھ دھوکا نہیں کیا۔ میں نے اس کا آخری پیغام سن لیا ہے۔

دیر تک وہ چپ چاپ لیٹے رہتے ہیں۔ چاروں طرف بکھری فضا بے الفاظ زبان بن چکی ہے۔ ان کا وجود اسے سن رہا ہے۔ محسوس کر رہا ہے۔ مگر شعور کی دنیا اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اسی طرح کی آواز اپنے جسموں سے سننے لگتے ہیں۔ وہ پوری کائنات کو سمجھ رہے ہیں۔ مگر قواعد کی پابند زبان میں بیان نہیں کر سکتے۔ کل وہ اٹھ کر جب اپنی دنیا میں واپس جائیں گے تو ایک احساس لے کے جائیں گے۔ گونگا احساس جو زبان کی جکڑ بندیوں کا محتاج نہیں۔

جاوید سرد ہوا کے جھونکوں سے سو جاتا ہے مگر یاسمین جاگی چاند کو دیکھتی رہتی ہے۔ چاند آخری منزل طے کر رہا ہے۔ فضا میں سکوت بڑھتا جاتا ہے اور پوری کائنات گہری خاموشی میں ڈوبتی جاتی ہے۔ ہواؤں کی سرسراہٹ بھی رک جاتی ہے۔ ہر طرف مراقبے میں ڈوبی ہوئی فضا ہے۔ جیسے اپنے خداوند کے حضور میں سربسجود ہے۔ یکایک رات کی چادر آسمان کے ایک کونے سے سرکنے لگتی ہے اور تعالیٰ کائنات کی شب کی سیاہی سے صبح نور کو کھینچ لیتا ہے۔

وہ اٹھتی ہے۔ مطمئن پرسکون۔ جاوید ابھی بھی سو رہا ہے۔ یاسمین اس کے جیب سے نوٹ بک اور بال پن نکالتی ہے۔ اور چند جملے لکھتی ہے۔

"جاوید میں جا رہی ہوں۔ میں نے ایک ہی رات میں پوری زندگی جی لی۔ جس کا ایک ایک لمحہ پیام مسرت لیے ہوئے ہے ہمیشہ کے لیے تم میری تلاش نہیں کرنا۔ مگر جینا پوری کی پوری زندگی۔ اس کا ایک ایک لمحہ — اس شاہ بلوط کے درخت کی طرح الوداع۔ یاسمین"

نیشنل پارک سے نکل کر اس نے ایک ٹیکسی پکڑ لی۔ اس نے اپنا سر پیچھے کی طرف ٹیک دیا۔ اس کے بدن میں ایک کپکپی تھی۔ کینسر وارڈ میں داخل ہوتے وقت اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اس کے روم میں بیڈ کے پاس گھیرے سب ڈاکٹر نرس اور وارڈبوائے کھڑے تھے۔ جب وہ داخل ہوئی تو سب نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں پوری زندگی جی چکی ہوں۔ اپنی زندگی، اپنے وجود اور جسم کے ساتھ — اور" وہ بے ہوش ہو گئی۔ کینسر وارڈ میں ایمرجنسی ریڈ لائٹ جلنے بجھنے لگی۔ ڈاکٹر زور سے چلایا۔ "آکسیجن پلیز۔" ہری اپ" اس کی زندگی خطرے میں ہے" مگر یاسمین کے چہرے پر ایک لازوال ابدی سکون ہے جو سرمایۂ حیات ہے۔

اڈیٹر کتاب نما کے نام

کھلے خطوط

(مقالہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

براہِ کرم مختصر ترین الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں

● کتاب نما کے صفحات پر بکھرے ہوئے معنی خیز اور دلچسپ مواد نظر و ذہن کی توجہ کے بجا طور پر طالب ہوتے ہیں دسمبر کے شمارے میں منیر الدین احمد کی خود نوشت "ملوک سنگھ کا پوتا" ڈرامائی چاشنی کا حامل ہونے کے علاوہ بہت ہی دلدوز ہے۔ ——— تقسیم کے دور کے آس پاس، راولپنڈی کے واقعات کے تذکرے میں ۱۹۴۷ء کی فرقہ وارانہ خونریزیوں کی عکاسی ہے۔ ماضی کا راولپنڈی ہو یا امرتسر، عہدِ حال کا بمبئی ہو یا لاہور، بوسینا ہو یا کابل، ایسے واقعات میں انسانی المیے کی نوعیت بنیادی طور پر یکساں ہوتی ہے۔ وہ ہے مذہب کے نام پر تعصبات کو بھڑکا کر انسانیت کی پامالی۔ مضمون میں چودھری مولا داد کا کردار قابلِ تحسین ہے۔ باوجود یہ کہ ان کے بیٹے پر قاتلانہ حملہ ہوا، وہ اپنے ہمسایہ ہندوؤں اور سکھوں کی حفاظت کے لیے مشتعل مجمع کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔ مجھے تیس سال قبل کا خود اپنا ایک تجربہ یاد آیا۔ جب کہ ڈھاکہ میں فرقہ وارانہ فساد کے دوران میں نے ایک بنگالی ہندو کو اسے اور اس کے اہل و عیال کو خطرات کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ ۱۹۵۰ء کے وسط کی مظفر پور کی بھی ایک یاد ذہن میں ابھری۔ تب وہاں بھی فرقہ وارانہ کشیدگی تھی۔ میں ایک ہاسٹل میں پچیس طلبہ کے درمیان واحد مسلمان تھا۔ (اور یہ لطف ہے کہ ہاسٹل کا پریفیکٹ Prefect تھا) مگر ہندو ساتھیوں کے دوستانہ رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اور میں نے بھی کچھ مشورے کے باوجود ہاسٹل سے منتقل ہونا گوارا نہ کیا ——— ایسے مشاہدات کی روح اگر خاصی حد تک ہمہ گیر ہو جائے تو انسانی معاشرہ رہنے کی بہتر جگہ بن جائے۔

کچھ مضامین میں بعض الفاظ کے ہجے دیکھ کر احساس ہوا کہ ہندستان میں اردو تحریر میں کچھ جدت یا اصلاحات (اسے کیا تصور کیا جائے) نافذ ہوئی ہیں جو پاکستان میں رائج نہیں۔ مثلاً پاؤں اور گاؤں کے بجائے پانو اور گانو (بروزن بانو؟) دعویٰ، ادنیٰ، اور اعلیٰ کی جگہ دعوا، ادنا اور اعلا۔ شاید میں ہی اپنی آبائی سرزمین سے طویل عرصہ کی جسمانی دوری کے سبب ان دھاراؤں کے لمس سے محروم رہا۔

جنوری کے شمارے میں محترم سید حامد کا مضمون "ایودھیا کے بعد کیا" کئی بار پڑھا۔ میں فاضل مصنف کے انداز فکر پر رائے زنی نہیں کروں گا

سیاست میرا میدان عمل کبھی نہیں رہا۔ مگر ایک حساس اور وسیع الفکر پیشہ ور رائٹر، جو برصغیر سمیت کئی اقلیموں میں السانی امور کے موضوعات پر متعدد تصنیفات کا "مرتکب" ہو چکا ہے۔ کی حیثیت سے میرے کچھ محدود معروضات ہیں۔ سوال یہ ہے کہ مذہب کی بنیاد پر برطانوی ہند کے بٹوارے کے بعد، ہندستان کے مسلمانوں کی گرد ہی قیادت کے دعویدار حضرات نے اپنی کمیونٹی کی اکثریت کو فکری طور سے اقلیت نول کی ذہنیت Mentality سے آزاد کرانے اور قومی دھارے سے ہم آہنگ کرنے میں کیا کردار ادا کیا۔؟ اور وسیع تر قومی قیادت کی مسلمان شخصیتوں کو اس سلسلے میں اپنی کاوشوں کا کمیونٹی کی طرف سے کس حد تک تعاون یا Response ملا۔؟ میرے خیال میں ان باتوں کا موجودہ صورت حال سے گہرا تعلق ہے۔

ڈاکٹر عظیم الشان حیدر۔ کویت

● کتاب نما کا دسمبر کے شمارے میں مہمان مدیر ماسٹر اختر کے خیالات بہت خوب اور دلچسپ لگے۔ انھوں نے بہت ہی اچھا لکھا ہے کہ اب ادیب ہی لکھتا ہے اور ادیب ہی پڑھتا ہے۔ اب میری ہی مثال لے لیجیے۔ بنیادی طور پر سائنس کا آدمی ہوں۔ لیکن ادب سے بہت لگاؤ ہے۔ اچھے شعر پسند کرتا ہوں۔ اور خود کہتا بھی ہوں۔ لیکن "ساغر و مینا" کا اتنا رعب طاری ہے کہ کبھی غزلوں کو شائع کرا لے کی جرائت ہی نہیں کی۔

راحت حسن دودھ پور علی گڑھ

● ماہ نومبر ۹۲ء کے کتاب نما میں رشید امجد کا عکس خیال، ملک نسیم کے خواب اپنی آنکھوں کے، مفضل افضل کی غزل اور بخش لائل پوری کی غزل کا یہ شعر بہت پسند آیا۔

حبس کے جتنے بھی ہیں دریچے اپنے قفس میں کھلتے ہیں
تازہ ہوا کے ہر جھونکے پر ظالم کی مختاری ہے

مگر سب سے زیادہ دلیپ سنگھ کی تخلیق "پرانی فلمیں نئی فلمیں" نے متاثر کیا۔ دراصل جو تحریر اپنے حال اور اپنے سماج کی عکاسی کرتی ہے۔ وہی جاندار ہوتی ہے۔

دلیپ سنگھ کی اس تحریر کی آخری سطر انتہائی معنی خیز ہے کہ "کہیں ایسا تو نہیں ہے دلیپ سنگھ جی کہ اب ایسی فلمیں بن ہی نہیں رہیں"

اب میں اپنی بات وہاں سے شروع کرتا ہوں جہاں سے دلیپ سنگھ جی نے چھوڑی ہے ــــ واقعہ یہ ہے کہ ٹی وی پر کانگریس نے رامائن اور مہابھارت دکھا کر ایک عام اور سیدھے سادے ہندو کو ایک انتہائی جذباتی ہندو میں بدل دیا ہے اور غیر تعلیم یافتہ اور معصوم مسلمانوں کو تصوف، مذہب، مسلم ثقافت کے نام پر عالمی اجتماعات کے پنڈال میں

نما
کر بنیاد پرست اور غیر روادار
یا ہے۔ موضوع سے ہٹ کر قارئین
تاب نما" کی معلومات کے لیے عرض
کہ "مہا بھارت" بی آر چوپڑہ نے
نہیں بنائی تھی بلکہ منسٹری آف
رمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ کے چیف
ریٹری نے سرکاری سطح پر چوپڑہ
، درخواست کی تھی کہ وہ مہابھارت
، موضوع پر ایک سیریل بنائیں۔
برس پہلے فاروق عبد اللہ نے
ہی کہا تھا کہ "اپنی دو سو برس
حکومت میں ہم کو انگریز نے اتنا
ہ پرست نہیں بنایا جتنا زیادہ کر
لے چالیس برس میں کانگریس نے
میں فرقہ پرستی کا زہر بھرا ہے"
، وہ بھی کانگریس ہی تو تھی کہ جس
، مندر کی مورتیوں کو مسجد میں رکھوایا
ا۔ اور اس منظر کو ٹی وی پر
کھا کر فرقہ پرستی کے کریلے کو
ر زیادہ نیم پر چڑھایا تھا۔ اور ۔ حج
ی یہ بات بھی اپنے تجربے اور مشاہدے
بنا بر ڈاکٹر فاروق عبد اللہ ہی نے
ی تھی کہ "مورتیوں کا مسجد میں رکھا
نا تو ٹی وی پر دکھایا گیا لیکن
ی یک جہتی کے آل انڈیا اجلاس
کور کرنے کے لیے نہ ٹی وی کا
ر امین پہنچا اور نہ آل انڈیا ریڈیو کا
ئی نمایندہ!" دراصل انسان
رستی اور فرقہ وارانہ اخوت سے
نگریس کا خمیر بنا ہی نہیں!
یہ المیہ ہے کہ جس انگریز کو

ہم اکثر پانی پی پی کر کوستے ہیں
اس کے عہد میں ساجن سسرالی
کے بقول کم از کم ایسا نہیں تھا۔

نہ یہ محسوس ہوتا تھا مسلماں ہے کہ ہندو ہے
کبھی کوئی نہ کہتا تھا یہ ہندی کا ہے یہ اردو ہے

اکاڈمیاں بنا کر اردو کو موت
بخش دی گئی ہے اور اب اردو
یونی ورسٹی قایم کر کے اپنے بے ضمیر
اور کاسہ لیس دانش وروں کے ہاتھوں
اردو کے تابوت میں آخری کیل بھی
ٹھوکنے کا اعلان ہو چکا ہے۔ ادب
کے کتنے ہی پٹواری (ڈاکٹر و پروفیسر)
اپنے اپنے ہاتھوں میں ہتھوڑا لیے
کھڑے ہیں تاکہ آقا نے مجوزہ
یونی ورسٹی کا تل پتی جس کو بنایا اسی
لے میخ پر ضرب لگا کر اردو کا قتل کیا
۔ پیارے رہنماؤں! یہ جان لو کہ
جس زبان کا تعلق روزی روٹی
سے ٹوٹ جاتا ہے وہ تو میوزیم میں
رکھ دی جاتی ہے۔ یونی ورسٹی میں نہیں
مگر غم مت کرو! ہر تہذیب اور ہر زبان
ہمیشہ زندہ نہیں رہا کرتی۔

شمس کنول۔ علی گڑھ۔

● جنوری ۱۹۹۳ء کا "کتاب نما"
اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں
ایک نہایت مفید مضمون جناب سید حامد کا
"ایودھیا کے بعد کیا؟" شائع ہوا
ہے۔ جو ہر صاحب دل کو بہت کچھ سوچنے
پر مجبور کرتا ہے۔ ایسے وقت میں

جب کہ کرسی کی ہوس نے درندگی اختیار کر لی ہے۔ انسانیت لہولہان ہو کر سر کے بل گر پڑی ہے۔ اور حیوانیت نے راکششش کا روپ دھار کر اپنی حیوانی کرتوت پر شرمندہ ہونے کے بجائے نازاں ہے۔ صاف ستھرے ذہن رکھنے والے انسان دوست محب وطن حضرات کی رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ تاکہ ملک و قوم کو نہ صرف ذلت و رسوائی سے بلکہ بھیانک تباہی سے بچانے کی کوشش کی جا سکے۔

سید حامد صاحب کی پُر مغز تحریر نے مظلوموں کے سارے مسائل کا احاطہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ کیا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریر سے بلاشبہ ہر وقت صحیح رہنمائی کی کوشش کی ہے۔ ان کی تحریر کو وسیع تر حلقے تک پہنچنا چاہیے۔ اور اس کی روشنی میں ہر فرد کو اپنے اپنے طور پر تعمیری کام میں لگ جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں میری گزارش ادیبوں سے ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ وہ اپنی ہوش مندانہ تحریروں سے ہندستانیوں کی صحیح رہنمائی کریں۔ ان میں انسانی ہمدردی کا جذبہ پیدا کریں۔ غریبوں سے ہمدردی پیدا کریں اور ملک کو ترقی کی راہ پر لگانے کی آرزو جگائیں اسی کے ساتھ گندے ذہن آدم خور سیاست والوں کے لیے ان کے دلوں میں نفرت بھر دیں

عبدالقوی دسنوی، بھوپال

کتاب نما کے حالیہ شمارے (جنوری ۹۳)

میں جناب سید حامد صاحب کا مضمون "ایودھیا کے بعد کیا؟" آج کے ماحول میں جب کہ ہندستان کی سب سے بڑی اقلیت آزادی کے بعد اپنے آپ کو پہلی بار غیر محفوظ اور بے یار و مددگار محسوس کر رہی ہے ایک نئے عزم اور ایقان کی بشارت دیتا ہے بلاشبہ سید حامد صاحب کا شمار ان دانشوروں میں ہوتا ہے جو ایک ایسے نازک وقت میں جب کہ ہندستان کے طول و عرض میں فرقہ واریت اور منافرت کی آگ بھڑک رہی ہے اپنی توانائیوں کو قوم اور معاشرہ کی فلاح اور بہبودی کے لیے وقف کرتے ہیں

یہ صحیح ہے کہ اپنی اولین اشاعت سے لے کر حال تک "کتاب نما" اردو کی ادبی تخلیقات، اردو کی ادبی انجمنوں کے احوال و کوائف، اردو کی نئی مطبوعہ کتابوں پر تبصروں اور اردو کے گوناگوں مسائل کے بارے میں خطوط کی اشاعت کے لیے مخصوص رہا غالباً یہ پہلی بار ہے کہ ایک سیاسی اور مذہبی نوعیت کے مسئلے پر ایک مبسوط مضمون کو کتاب نما میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ بات میں اعتراض کے طور پر نہیں لکھ رہا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ایک ادیب اور دانشور کی کچھ سماجی ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں۔ ادب خواہ وہ فکشن ہو، شاعری ہو یا تنقید اس کی تخلیق ایک ایسے ماحول میں

ہی ہو سکتی ہے جب کہ ادیب ہر اعتبار سے اپنے آپ کو محفوظ و مامون سمجھے۔

یہاں پر مجھے فرانسیسی ادیب پال سارتر کے ایک مضمون "ادیب کی ذمہ داری" کا خیال آتا ہے۔ یہ مضمون اس نے دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے کچھ عرصہ بعد UNESCO کے زیر اہتمام منعقدہ پہلی جنرل میٹنگ (نومبر ۱۹۴۶ء) میں پڑھ کر سنایا تھا۔ آغاز مضمون میں دوستوفسکی کا یہ قول نقل کرنے کے بعد کہ "ہر آدمی ہر کسی کے لیے اور ہر چیز کے لیے ذمہ دار ہے۔" "EVERY MAN IS RESPONSIBLE TO EVERYONE FOR EVERYTHING" آگے لکھا ہے کہ "ہم ہر اس جرمن باشندے کو نازی REGIME کے لیے ذمہ دار ٹھہراتے ہیں جس نے اس REGIME کے خلاف آواز نہیں اٹھائی تھی۔ صرف جرمنی کی حد تک ہی نہیں بلکہ بحیثیت ایک ادیب اور دانشور اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ہر اس ناانصافی اور ظلم کے خلاف آواز اٹھائے جو دنیا کے کسی بھی ملک میں اقلیتوں پر روا رکھا جاتا ہے۔

۶ دسمبر کو ایودھیا میں جو کچھ ہوا اس کے لیے سنگھ پریوار اور اس کی ہم خیال پارٹیوں (خاص کر شیو سینا) کو ذمہ دار نہیں ٹھہراتے اور نہ ہی ۶ دسمبر کے بعد ملک کے طول و عرض میں برپا کیے جانے والے فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے میں جو جانی و مالی نقصان ہوا اس کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔

جہاں تک قومی پریس کے ردعمل کا تعلق ہے (۶ دسمبر کے بعد مختلف اخبارات اور رسائل کے خصوصی مضامین پڑھنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے) انگریزی زبان کے بیشتر اخباروں اور جریدوں کے لکھنے والے جرنلسٹوں اور دانشوروں نے سنگھ پریوار کے لائحہ عمل اور اس کے ہندوتوا کے فاشسٹ نظریے کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ ہندو کہلانے کے باوجود وہ BAD FAITH کا شکار کبھی نہیں ہوئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب اس طرح کے دانشور ہمارے درمیان ہیں تو ہندستان کے مستقبل سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

شاید اسی لیے سنگھ پریوار نے انگریزی قومی پریس کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ بمبئی سے شائع ہونے والے ایک انگریزی اخبار THE INDEPENDENT کے مطابق راجدھانی میں مقیم بعض جرنلسٹوں کو نہ صرف یہ کہ دھمکی آمیز خطوط لکھے جا رہے ہیں بلکہ ٹیلی فون پر بھی انھیں مغلظات سنائی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے پیچھے سنگھ پریوار کے ACTIVISTS کا ہاتھ ہے۔

۶ دسمبر کے بعد احمد آباد، سورت اور خاص کر بمبئی میں منظم طریقے پر اقلیتوں کو اگر ایک طرف پولیس نے

گولیوں کا نشانہ بنایا تو دوسری طرف شیوسینا اور بلڈرس نے اپنے ناپاک مقاصد کی تکمیل کے لیے چن چن کر مسلمانوں کے گھروں اور ان کی دکانوں کو نذرِ آتش کیا۔ اور جب بمبئی جل رہا تھا تو کانگریس کے وہ نیتا جن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور ہے فرقہ پرستی کی اس آگ کو بجھانے کی بجائے وہ سیاسی گٹھ جوڑ میں مصروف تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ پورا شہر بمبئی ایک رجنل فرقہ پرست پارٹی کے چیف کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اردو بلٹز کے ایڈیٹر ہارون رشید کا گھر پولیس کی موجودگی میں جل کر راکھ ہو گیا۔ وجہ اس کی یہ کہ اردو بلٹز نے ۶ دسمبر کے حادثے کے لیے سنگھ پریوار کو نشانہ ملامت بنایا تھا۔ اور اس کا ایڈیٹر اقلیتی فرقے کا ایک فرد تھا۔ اس کے باوجود کہ اردو بلٹز میں زیادہ تر وہی مواد شائع ہوتا ہے جو کہ انگریزی اور ہندی بلٹز میں بھی موجود ہوتا ہے۔ لیکن صرف اردو بلٹز کے ایڈیٹر کو نشانہ بنایا گیا۔ اردو ٹائمز کے ایک صحافی کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا گیا۔ روزنامہ انقلاب کے دفتر کو بھی تہس نہس کر دیا گیا۔ سنگھ پریوار ہو یا بمبئی کی شیوسینا وہ مسلمانوں کے ساتھ اردو کو بھی اپنا نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ کہ ان کے نزدیک یہ مسلمانوں کی زبان ہے۔ حالانکہ تاریخی اعتبار سے یہ بات صحیح نہیں ہے۔ سید حامد صاحب نے اپنے ایک حالیہ اردو مضمون میں لکھا ہے کہ "اردو زبان کے سائ جیسا برتاؤ اس ملک میں کیا گیا ہے اس کی مثال کسی دوسرے جمہوری ملک میں نہیں ملے گی۔ (بحوالہ روزنامہ سیاست، حیدرآباد)

اس کے برعکس بمبئی کی شیوسینا کے پارٹی آرگن "سامنا" نے مسلمانوں کے خلاف جس قسم کے اشتعال انگیز مضامین چھاپے اس کا نوٹس نہ تو مہاراشٹر کی سرکار نے لیا ہے اور نہ ہی مرکزی سرکار کو اس بات کی توفیق ہوئی کہ وہ اس اخبار کے خلاف کوئی کارروائی کرتی۔ امریکہ کے ٹائم میگزین کو شیوسینا کے چیف نے جو انٹرویو دیا تھا اس میں نہ صرف مسلمانوں کو نشانۂ ملامت بنایا گیا تھا بلکہ وہ انٹرویو ایک طرح سے ہندستان کے سیکولر امیج کو تہس نہس کرنے والا ہے۔ یہاں اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ بمبئی کی تباہی کی پوری کہانی دہرائی جائے۔

لیکن ہم کو اس سیاسی ڈائلیما سے باہر نکلنا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میڈیا اور ہمارے ذمہ دار قائدوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ صحیح صورت حال کو قوم کے سامنے رکھیں۔ آج ہماری قوم کو خود احتسابی elf analysis کی سمت ضرورت ہے۔ اپنی خامیوں کو محسوس کرنا اور اچھائیوں کو

امنے لاتا ہے ۔ واضح رہے کہ آج
ری دنیا ایک ہیجانی سے گزر
ہی ہے ۔ عالم اسلام میں جن قوموں
ے درمیان اتحاد و یگانیت کی فضا
ہیں بن پائی ہے اس کی وجہ قوم
رستی اور علاقائی وفاداریاں ہیں۔
سلمان جنھیں اسلام کی تعلیمات کی
د سے آپس میں شیروشکر ہونا
اہیے تھا ۔ سیاسی اور دینی حیثیت
سے وہ مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے
ں۔

ہم کو یہ جان لینا چاہیے کہ اس
دے زمین پر کہیں بھی جنت ارضی
ہیں ہے ۔ ہم اور ہمارے آباد اجداد
ہندستان میں پیدا ہوئے ہیں اور
یلہٰذا ایک دن ہم بھی اس دھرتی کا
یوند ہونے والے ہیں ۔ اور کوئی
ی ہم سے یہ حق نہیں چھین سکتا۔
ہٰذا ہم کو معاشی خوشحالی اور امن و
ان کے قیام کے لیے دوسرے سیکولر
ارے وطن کے ساتھ مل کر کام
رنا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ
ماری دینی حیثیت اور خودداری
رکسی قسم کی آنچ نہ آنے پائے ۔

ڈاکٹر صفی الدین صدیقی اورنگ آباد

تکیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "علامہ کو
ایران میں مابعد الطبیعات DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA پر ڈاکٹر آف لا کی
ڈگری ملی۔ یہ دعوا غلط ہے۔ اقبال
نے بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل کی تھی۔
پھر بحیثیت ایم۔ اے فلسفہ میں تھرڈ ڈویژن
تھی لہٰذا علامہ کو بی۔ اے ڈگری
حاصل کرنے کے لیے مقالہ لکھنا پڑا۔
اور وہ مقالہ یہی تھا جس پر علامہ کو
سارٹیفکیٹ آف ریسرچ کی سند ملی۔ خود
علامہ نے اپنی اس تصنیف کو "دراں
حالیکہ اس پر میونخ یونی ورسٹی سے
پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ساڑھے تین ماہ جرمنی
میں قیام کرنے پر ملی" حامل اہمیت
نہیں سمجھا۔ اس موضوع پر
علامہ کے دو تین مکاتیب کلیات مکاتیب
اقبال میں دیکھے جاسکتے ہیں۔
مزید برآں درج ذیل سے بھی رجوع
کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ شاعر اقبال خصوصی نمبر ۱۹۸۹ء
۲۔ T.C. RASTOGI: IQBAL IN FINAL COUNTDOWN

غلط بیانی نیز بالا خوانی اقبال و
اقبالیات کے وقار و مرتبہ کو گراتی ہیں۔

تارا چرن رستوگی۔ گوہاٹی

● کتاب نما کے ستمبر ۹۰ کے شمارے
ں "اقبال کا نظریۂ خودی" پر مشمول
بصرہ کی جانب سینٹر کے کئی اسکالرز
نے میری توجہ منعطف کرائی ۔ تبصرہ نگار
نے رتھا نے کون سے شہ اہد پر

● جنوری کا "کتاب نما" زیر مطالعہ
ہے۔ بلگرامی صاحب نے کھلے خطوط
میں اپنے ایک بزرگ "حضرت میاں
مارہروی اعلیٰ اللہ مقامہٗ" جو بقول ان
کے عربی اور فارسی علم کے منتہی "صرف،

یا صفا" چین، جاپان، انڈونیشیا اور دیگر ممالک میں سینکڑوں مریدوں کے جلالی پیر، صاحب اوصاف و کمال تھے۔

میں نے مارہرہ کے مشہور صوفی شاہ برکت اللہ پیمی اور ان کے اخلاف اور اسلاف پر تحقیقی کام کیا ہے نیز مارہرہ کے بہت سے بزرگوں کے حالات اور تصانیف کا مطالعہ کیا ہے۔ اپنے محدود علم اور مطالعہ کی روشنی میں بہت وثوق کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ "حضرت صفائی مارہروی" نام کے کوئی بزرگ مارہرہ میں نہیں ہوئے۔ ہاں "پیمی" مارہروی کی اولاد میں سے ایک صاحب "صفائی مارہروی" تھے جن کا نام تھا سید سرور عالم صاحب جو ایک بڑے شاعر تھے۔ اردو گیت کی روایت کو آگے بڑھانے میں ان کا اہم درجہ ہے۔ ان کا مجموعۂ کلام "صفائی درشن" کے نام سے شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ ان کے انتقال کو تیس برس سے زیادہ کا عرصہ ہوا۔ وہ اردو، فارسی سے بخوبی واقف تھے مگر عربی کے منتہی تو کیا مبتدی بھی نہیں تھے۔ پیری مریدی سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ کہ وہ اثنا عشری تھے۔ ان کو صوفی باصفا لکھنا ان پر الزام ہے۔ ان کے حوالے سے بلگرامی صاحب نے جو روایت لکھی وہ غالبًا بلگرامی صاحب کا اپنا خیال ہے۔

اپنے خیالات کے اظہار کے لیے نہ جانے کیوں انھوں نے "حضرت صفائی مارہروی اعلی اللہ مقامہ" کی ایجاد کی۔ یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ صوفیائے کرام کا تعلق اہل علم سے نہیں ہوتا۔

میری ناچیز رائے میں تصوف اور صوفیہ کے بارے میں بلگرامی صاحب کی معلومات محدود ہیں۔ انھیں دور جانے کی ضرورت نہیں وہ صرف اپنے اسلاف میر عبدالواحد بلگرامی کی "سبع سنابل"، شاہ برکت اللہ پیمی کی "پیم پرکاش"، "چہار انواع"، شاہ حمزہ مارہروی کی "فص الکلمات"، شاہ آل احمد اچھے صاحب کی "آئین احمدی"، حضرت ابوالحسین احمد نوری کی "سراج العوارف" اور شاہ گدا کی "پوتھی" کا مطالعہ کر لیں تو تصوف اور صوفیہ کے بارے میں خاصی واقفیت ہو جائے گی۔

ڈاکٹر محمد امین۔ شعبہ اردو، علی گڑھ

● کتاب نما (جنوری ۹۳ء) آئینہ نگاہ ہوا۔ "کھلے خطوط" عنوان کے تحت صفحہ ۱۰۴ پر محترم سید مرتضیٰ حسین بلگرامی کا خط پڑھا جو انھوں نے ڈاکٹر جاوید وششٹ کے اداریہ سے متعلق تحریر کیا ہے۔ اس خط میں موصوف نے اردو تعلیم کے حوالے سے "ہریانہ کے ارباب حل و عقد" کی

...دمات کو سراہا ہے اس کے
...م محترم بلگرامی صاحب کی ہریانہ
... کے لیے ہدیۂ تشکر پیش کرتے
...وصوف نے مشورہ دیا ہے کہ
...باگ ڈور غیر مسلم علاقے سنبھال
...ور اس کی ابتدا ہریانہ اور
... سے ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ ہریانہ
...ا کا شکر ہے کہ اردو کو سرکاری
...امی دونوں سطح پر بھرپور
...ی اور سرپرستی حاصل ہے ظاہر
... یہ دلچسپی جو بے لوث ہے اس
...ادی وجہ اردو کی اپنی تہذیب
...رغ بھی ہے یہاں اردو کی ترقی
...لیے مسلم اور غیر مسلم کا کوئی امتیاز
...ں ہے۔ بلگرامی صاحب کو علم ہوگا
...ہریانہ میں اردو اکادمی نے مختصر
... برسوں میں ہزاروں لوگوں کو
...لکھنا اور پڑھنا سکھا دیا۔ سوال
...ہے کہ لوگوں کو اپنی تحریک سے
...نے کے لیے بے لوث ہونا پڑے گا۔
...اپنے ذاتی مفاد سے بلند ہونا
...ے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہریانہ کے
...م اور اردو دوست مفادات سے
...ر ہیں۔ ہمارے یہاں اردو کی بات
...زیر اعلیٰ سے افسرانِ بالا تک ہمدردانہ
... کرتے ہیں۔ صرف اس لیے
...ن حضرات کو یہ یاد ہو چکا ہے کہ
...ردو دوست مفاد پرست نہیں
...۔ بلگرامی صاحب نے فرمایا کہ اردو
...لیے یو۔پی کو اس کی نزاعی
...ت میں چھوڑ دیجیے۔ ہم ان کے اس

جملے سے اتفاق نہیں کرتے اس
لیے کہ اگر بلگرامی صاحب کے خیال
میں اردو کی ترقی کے لیے حکومت
اترپردیش یعنی اردو اکادمی
پالیسی کے اردو قلمکار تحریک کو ٹھنڈا
رکھے ہوئے ہیں۔ تو یہ قومی دھارے
سے منقطع ہونے کے مترادف ہے
جو ایک لمحۂ فکریہ ہے اس سلسلے
میں یو۔پی کے قلم کاروں کو آگے
آنے کی ضرورت ہے۔ جہاں تک
مجھے علم ہے محترم رام لعل اور ڈاکٹر
ملک زادہ منظور احمد انتہائی فعال
شخصیات ہیں یو۔پی کے قلم کاران
حضرات کو تعاون دیں تو اردو
کی ترقی میں مثبت کام ہوگا۔

ناشر نقوی۔ ہریانہ اردو اکادمی۔ پنچکولہ۔

● فروری ۱۹۹۳ء کے شمارے
میں انور شمیم انور نے شعری مجموعے میں
چند غلطیوں کا ذکر کیا ہے۔ ایسا
کرتے وقت خود انور صاحب نے
مندرجہ ذیل غلطیاں کی ہیں:
انور صاحب نے لکھا ہے
کہ "میرا خیال ہے کہ رشتاب صاحب
کے الفاظ کی ذرا سی تقدیم و تاخیر
مصرع کو اس عیب سے بچا سکتی تھی"
اس تحریر میں "کی بجی" مہمل لفظ ہے
اور جتنی تقدیم و تاخیر ضروری
تھی اس پیش نظر اسے "ذرا سی"
کہنا بھی غلط ہے۔
سہیل راشد صاحب کی نظم

کا مصرع ہے کہ ؎
"نکلتا وہ لے کر شمع جگنوؤں کا"
اس میں لفظ شمع بروزن فع نظم نہیں ہوا۔ اس لیے انور صاحب نے مصرع یوں تبدیل کیا ہے۔
"لیے شمع وہ جگنوؤں کا نکلنا"
جگنوؤں کے ساتھ شمع شتر گربہ کی مثال ہے۔ اس لیے انور صاحب کو مصرع یوں لکھنا چاہیے تھا۔
"وہ شمعیں لیے جگنوؤں کا نکلنا"

ونود بہار تی۔ روہنی، دہلی۔

● "کتاب نما" فروری ۹۳ء کے حصۂ مضامین اور مقالوں کے علاوہ اس بار شعری حصہ بھی جاندار رہا۔ ڈاکٹر مظفر حنفی کی غزل شعری حصے کی جان ہے۔ عنوان صاحب کی غزل بھی عمدہ ہے۔ لیکن شعر نمبر ۶ کے مصرع اولیٰ "اسی کارن سے زندہ ہوں ابھی تک" میں لفظ "سے" حشو ہے۔ علاوہ ازیں لفظ "کارن" غزل کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔ عنوان صاحب جیسے ماہر علم و فن سے یہ توقع نہ تھی۔

پروفیسر رشید المظفر کرامت بخاری، وحید صدیقی، اور ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشا کی غزلیں بھی عمدہ ہیں۔

ڈاکٹر اقبال احمد خاں عارف کے افتتاحی شعر ؎
ہے کسی کو نشۂ زور و زر ہے کوئی شباب میں بے خبر
سبھی بے خودی میں ہیں مبتلا یہاں آگہی کی سہلت کر

میں جزوی اجتماع ردیفین واضح ہے۔

صفحہ نمبر ۴۱ پر صغریٰ عالم کی غزل کے مطلع میں "مہکتا" کا قافیہ "مسلتا" ایطا کا آئینہ دار ہے۔ زبیر شفائی کی غزل کا مقطع "وہ گھلتا گیا چاندنی میں زبیر ؎ ہوا جب چلی دوسرا ہو گیا۔" ذم کے پہلو سے داغدار ہے۔

صفحہ ۳۹ پر شمیم عثمان کی غزل "برنگ ولی" بلاشبہ ولی کے رنگ سے آراستہ ہے یہ غزل۔ بحر ہزج اخرب، مکفوف، محذوف، ابتر (مفعول مفاعیل فعولن فعلن) کے آہنگ پر مشتمل ہے۔ لیکن شعر نمبر ۳ کا مصرع اول "نج لب کا جو تک دھیاں دھرے کی نظروں" خارج از وزن ہے۔ یہ مصرع یوں درست ہو سکتا ہے
"نج لب کا جو تک دھیان دھریں گی نظریں"

صفحہ ۳۶ پر قاسم ندیم گونڈوی (بمبئی) کی غزل بھی نظر سے گزری۔ حیرت کروں یا افسوس۔ تبصرہ کرنا تو گویا وقت برباد کرنا ہے۔

انور شمیم انور، فیروز آبادی۔

● مہمان مدیر محترم وجاہت علی سندیلوی نے اشاریہ میں ہمدردان اور داعیان اردو کو اردو کے کاز کے تعلق سے ایک لائحۂ عمل پیش کیا ہے۔ اور دعوت فکر و عمل دی ہے۔ جناب یوسف ناظم نے سہ سمتی شاعر ظفر گورکھپوری کے شعری اور

بحث کے گوشوں کو ... سے مشورہ ... نے لیکن معیت پر مبنی انداز میں پیش کیا ہے۔ یقیناً انھیں اہل فکر و نظر خراج تحسین پیش کریں گے۔

"بابری مسجد" (منیب الرحمن) ایک اثر انگیز فکر ہے۔ پروفیسر عنوان چشتی، ڈاکٹر مظفر حنفی، کرامت بکاکرہ اور سید معراج جامی کی غزلیں متاثر کرتی ہیں۔ محی الدین قادری زور پر محترم رشید حسن خاں صاحب کا مقالہ "زور صاحب" ایک پُر مغز اور جامع مقالہ ہے۔

شاکر ادیبی۔ بھیونڈی۔ تھانہ (مہاراشٹر)

● آپ کا موقر جریدہ متواتر مل رہا ہے، تنگ دامنی کے باوجود معیاری مضامین نثر و منظومات، دلچسپ تبصرے، علمی مباحث، زبان و ادب کے مسائل اور تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ نگارشات کا معیار بھی ماشاءاللہ متوازن اور مناسب لگتا ہے۔ لیکن قارئین کے ساتھ دوطرفہ رابطے کی صورت نہ ہونے کی وجہ سے یہ نہیں کھلتا کہ بعض لکھنے والوں کو ناپسند کیوں کرتے ہیں اور چند دوسروں کو باربار شائع کیوں کرتے ہیں، گو بحیثیت مدیر اور مختار کے آپ کو ایسا کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔

اختر ضیائی۔ لندن۔

● جب گوپی چند نارنگ کے مضمون جولے آر غزل اسمنے پنہ درساختیات) نے تو یہاں لاہور سے کراچی تک تہلکہ مچا رکھا ہے۔ پچھلے ہفتے میں کراچی میں تھا جس دوست سے ملا، جس محفل میں گزر ہوا، اس مضمون کو موضوع گفتگو پایا۔ اب تو مجھ جیسے غیر علمی لوگوں کو بھی اس علمی بحث سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ مگر یہ کہ گرمی بیان برقرار رہنی چاہیے۔

انتظار حسین ۳۸/ے۔ جیل روڈ۔ لاہور

● "کتاب نما" کی تمام مشمولات معیاری ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتی۔ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی بمبئی کی چار مسلسل نظمیں جو ایک عنوان "زاری" کے تحت شائع ہوئی ہیں خون کے آنسو رونے کا اس سے زیادہ موثر اظہار کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ مہمان مدیر شعز قیوم کا اداریہ واقعی حالاتِ حاضرہ کا آئینہ دار ہے۔ اندرون ملک کے حالات و واقعات ایک سچے محبِ وطن کے لیے انتہائی دردانگیز ہیں۔

حصہ نثر میں "سرگذشت ایک گدھ کی" ایک بہترین علامتی کہانی ہے۔ ولاس سارنگ کی مراٹھی کہانی کا رواں ترجمہ مسعود الحق نے نہایت چابک دستی سے کیا ہے۔

حصہ نظم میں ابو محمد سحر کی غزل ترتیب و معنی آفرینی کے لحاظ سے عمدہ ہے۔ غزل کا یہ شعر حال کا تازیانہ ہے۔

کل جو ہنستے تھے میری باتوں پر
آج تو وہ بھی ڈر گئے یارو

صابر ابوہری کی نظم "جرم" بھی قابلِ قدر ہے۔ کھلے خطوط میں راجیندر بہادر موج کی خالقِ کائنات سے التجا "بہکے ہوئے لوگوں کو عقلِ سلیم اور صحیح مذہبی شعور عطا فرمائے" التجا کے علاوہ عملی طور پر اور بھی کچھ کرنے کی متقاضی ہے۔

فضل ا فضل۔ یادگیر۔

● آج ہی کتاب نما کا مارچ کا شمارہ ملا۔ آپ نے میری نظم شائع کی۔ شکریہ، ایک مصرع ایک نقطہ کی وجہ سے بہت غلط ہو گیا۔ مصرع تھا۔

صداقت مسلک و آدابِ رنداں ہے ہمیشہ سے

رنداں کو زنداں کر دیا۔ ہائے رے حسنِ کتابت مرحبا۔

اس شمارے کے بارے میں دو ایک باتیں مختصر لفظوں میں۔ محترم ابو محمد سحر کی غزل کا مطلع ہے

درد حد سے گذر گئے یارو
سب جتن بے اثر ہو گئے یارو

درد کا حد سے گزرنا ہے۔ دوا ہو جانا" سنا تھا۔ درد ہوتا ہے۔ درد اٹھتا ہے، وغیرہ محاورے سنے ہیں۔ مگر درد کو جمع کی طرح آج تک نہیں پڑھا۔ یہ شاید میری کم ... ہے۔ ہاں خواتین کی زبان میں ... ہے۔ "درد کھو رہے ہیں" یا ... آرہے ہیں۔ اور اسی کے معنی در... کے تواتر کے ہیں۔ ان معانی کو ذ... میں رکھ کر اگر شعر پڑھا جائے تو ا... مفہوم یہ نکلتا ہے کہ زچہ کا انتقا... ہو گیا۔ اگر سحر صاحب کا نفسِ مضمون یہی ہے تو ظاہر ہے محاورہ کا صحیح استعمال ہے۔

ان کا ایک اور شعر ہے

بستیاں جل رہی ہیں نفرت میں
پیار کے وہ نگر گئے یارو

"وہ" کس کی طرف اشارہ ہے۔

پروفیسر عبد المغنی نے ترقی پسند... کے عروج و زوال پر اور اس... مجموعی تاثر پر مختصر مگر جامع مضم... لکھا ہے۔ اور آخر میں مثبت نتیجہ نکلا ہے۔ البتہ مجھے ان ک... ایک جملے سے اختلاف ہے:

"اس مرحلے پر ضروری ... کہ ترقی پسندی تحریک کی اس... خوبی کا اعتراف کیا جائے کہ اس... نے نظمِ آزاد کی بدعت کے سوا بالعموم اردو ادب کے کلاسیکی فنی... معیار کو مجروح نہیں کیا۔"

مغنی صاحب نے ترقی پسند... تحریک کے پس منظر کو بہ حسن و خوبی بیان کیا ہے۔ نہ معلوم ان کی نظر کیسے دھوکا کھا گئی کہ نظمِ آزاد کی

بدعت،، کو پھیلانے کا سہرا ترقی پسند شعرا کے سر ہے۔ گو یہ کام تیسری اور چوتھی دہائی کے ان شعرا نے کیا ہے جو ترقی پسند رجحانات اور نظریات کے سخت مخالف تھے۔ ان شعرا کے اسماء گرامی کم از کم پروفیسر مغنی سے پوشیدہ نہیں ہونے چاہیں۔

یعنی۔ میراجی، ن م۔ راشد، مختار صدیقی یوسف ظفر، عبدالمجید بھٹی اور قیوم نظر وغیرہ۔ یہ سب حلقۂ ارباب ذوق کے سرگرم اراکین تھے۔ ان کے ہم عصر ترقی پسند شعرا کے یہاں نظم آزاد کی کوئی مثال نہیں ہے۔ یعنی مجاز، جذبی، جاں نثار اختر، کے یہاں آزاد نظم نہیں ہے۔ بلکہ اخترالایمان کی پہلی کتاب "گرداب" میں کوئی بھی نظم — آزاد نظم نہیں ہے۔ بعد میں ۴۸ء میں سردار جعفری نے طویل نظم — نئی دنیا کو سلام کہی تو اس نظم میں سردار نے پہلی بار آزاد نظم کی فارم کو زورِ خطابت کے ساتھ استعمال کیا۔ اور جب یہ صنف چل نکلی تو آزاد نظم بہت سے لوگوں نے کہی اور اب اسے صنفِ شاعری کی ایک ہیئت کے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ البتہ "آزاد غزل" ہنوز قارئین اردو کو متاثر نہیں کر سکی ہے۔

رفعت سروش، ۲۰۔ بی پاکٹ ۳، سدھارتھ ایکسٹنشن
نئی دہلی ۱۴۔

● مارچ کا شمارہ ملا۔ ایک اہم پیراگراف مجھ ہی سے اداریہ صاف کرتے وقت چھوٹ گیا، خیر چھوڑیے، جتنی سطریں بھی چھپی ہیں، کاش پڑھنے والے انھیں سمجھ کر پڑھیں اور پڑھ کر عمل کرنے کی کوشش کریں تو کچھ کام بنے، ورنہ لمبے لمبے مضامین لکھنے اور لمبی لمبی باتیں کرنے کا کیا فائدہ؟

زیرِ نظر شمارے میں ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی کی نظم "زاری" عصرِ حاضر سے متعلق نہایت ہی بلند اور موثر مرثیہ ہے۔ ہر مصرعے سے مظلوموں کے رونے اور بلکنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میں نے اسے کئی بار پڑھنے کی سعادت حاصل کی، اور جب جب پڑھا تب تب رگوں میں غم واندوہ کی کلیاں چٹکتی ہوئی محسوس کی! اگر ان کا پتا معلوم ہوتا تو میں براہِ راست ان کو مبارک باد پیش کرتا، بہرحال، اس خط کے ذریعے میں ان کو تہنیت پیش کرتا ہوں۔

قیوم خضر
خضر ویلا۔ غلامی ٹولہ۔ پٹنہ

جائزے

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

میرزا یگانہ شخصیت اور فن
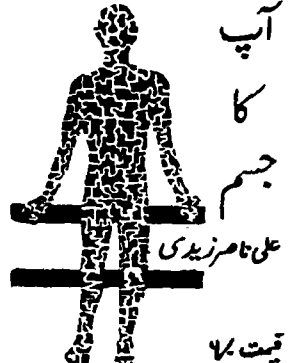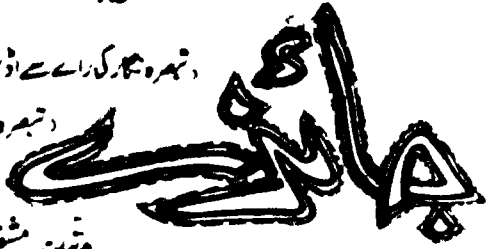
مرتبین: مشفق خواجہ، پاشا رحمن، آمنہ مشفق
مبصر: ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری
قیمت: ایک سو روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۲۵

مرزا واجد حسین عظیم آبادی یگانہ چنگیزی اردو کے عظیم شاعر تھے۔ دبستان لکھنؤ کے بیسویں صدی کے اساتذہ سخن میں ان کا شمار ہوتا ہے، بلکہ اپنے فن اور کمال سخن کے اعتبار سے یہ اپنے تمام معاصرین میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ زبان کے اعتبار سے، روزمرہ و محاورہ کے برمحل اور برجستہ استعمال کے لحاظ سے، الفاظ کے صوتی حسن کے اعتبار سے اور خیالات و افکار کی رفعت کے اعتبار سے، وہ کسی سے کم نہیں۔ وہ نہ صرف لکھنوی شعرا کی صف میں، بلکہ تمام کلاسیکی شعرا کی محفل میں، خواہ وہ دبستان لکھنؤ سے تعلق رکھتے ہوں، خواہ دبستان دہلی سے، صف اول میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

یگانہ عظیم آباد سے تعلق رکھتے تھے۔ وہاں شاد عظیم آبادی کے سلسلۂ تلامذہ میں شامل ہوتے۔ اور استادی کا درجہ حاصل کیا۔ اس کے بعد لکھنؤ چلے آتے اور اسے اپنا وطن ثانی بنا لیا۔ یہیں متاہلانہ زندگی کا آغاز کیا۔ خود کہتے ہیں

لکھنؤ کے فیض سے ہیں دو، دو بہرے زیب تن"
ایک تو استاد یگانہ، دوسرے داماد ہوں

لیکن لکھنؤ آنا اور یہاں مستقل قیام کرنا ان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ بن گیا۔ اہل لکھنؤ انھیں برداشت نہ کر سکے۔ شعرائے لکھنؤ ان کو غیر ملکی، قرار دے کر ان کی زبان کو سند معیار عطا کرنے سے گریز کرتے رہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور وہ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ دراصل یگانہ لکھنؤ آتے ہی وہاں کی ادبی فضا پر چھا گئے تھے۔ یہاں کے لوگوں کے لیے ان کی آواز بالکل نئی تھی۔ اس میں مردانگی تھی [illegible] تھی، بہت مندی کی علامت تھی۔ یہ انداز لکھنؤ [illegible]

[illegible] اساتذہ لکھنؤ [illegible] دبستان لکھنوی شاعرانہ روایات کے منافی [illegible] شروع کر دی۔ اس زمانے میں صفی، آرزو، سراج، بیخود، محشر، ثاقب اور اثر کی طوطی بول رہی تھی۔ انھیں سب سے زیادہ ناز اپنی زبان پر تھا۔ اسی کی معرفت سب پر اپنی برتری

اور تفوق جماتے تھے۔ یگانہ لکھنؤ پہنچے تو انھوں نے اپنی منفرد آواز سے سب کو چونکا دیا۔ اساتذہ ان کی روز افزوں مقبولیت کو انگیز نہ کرسکے لہذا ان کے خلاف ہنگامہ آرائی شروع کردی۔ ان کا مقاطعہ کیا گیا اور یہ اس حد تک بڑھا کہ جس مشاعرے میں یگانہ کو مدعو کیا جاتا، شعرائے لکھنؤ اس میں شرکت نہ کرتے۔ اس پر خود یگانہ کی تنگ مزاجی اور ضد نے جلتے پر تیل کا کام کیا۔ اور جو حضرات ابتدا میں یگانہ سے ہمدردی رکھتے تھے وہ رفتہ رفتہ ان کے مخالف ہوگئے۔ حالات کی اس نامساعدت نے انھیں ایسے شعر لکھنے پر مجبور کیا۔

وطن کو چھوڑ کر جس سرزمین کو میں نے عزت دی
وہی اب خون کی پیاسی ہوتی ہے کربلا ہو کر

انھوں نے بجائے ہار ماننے اور حالات سے مغلوب ہونے کے زمانے کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے اپنے معاصر شعرا کی برتری کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور ان پر اپنا تفوق جمانے کے لیے غالب جیسے باکمال اور شہرۂ آفاق شاعر کی عظمت سے بھی انکار کر بیٹھے اور غالب شکن، بن گئے۔ مزید یہ خود کو ابوالمعانی اور یگانہ علیہ السلام لکھنے لگے۔ یہ ان کی احساس کمتری کی دلیل ہے۔ اور اسی احساس کمتری کی بنا پر ان کے مزاج میں سختی اور درشتی بڑھتی چلی گئی جس نے انھیں کہیں کا نہ رکھا۔

لکھنؤ میں ان کے ساتھ جو واقعات پیش آتے اس کی وجہ سے ان کی شہرت اور عظمت پر مخالفانہ اثر پڑا۔ اور بجائے ایک باکمال شاعر مشہور ہونے کے وہ انتہائی ناپسندیدہ اور قابل نفریں شخصیت مشہور ہوگئے حتیٰ کہ کافی عرصہ تک اچھے الفاظ میں ان کا تذکرہ کرنا بے تمیزی اور بداخلاقی کی بات تصور کی جاتی تھی۔ لہذا ناقدوں اور تذکرہ نگاروں نے یگانہ کو یکسر نظر انداز کردیا۔ اس جانب سب سے پہلے غالباً مجنوں گورکھپوری نے توجہ کی۔ انھوں نے اپنے مضمون 'یاس عظیم آبادی' میں جو ان کے مجموعہ مضامین 'غزل سرا' میں شامل ہے، ان کے شاعرانہ کمال کا جائزہ لیا اور غیر جانبدارانہ انداز میں ان کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد 'معصوم رضا راہی' کی کتاب 'یاس یگانہ چنگیزی' منظر عام پر آئی (۱۹۶۷)۔ ۱۹۸۰ میں ضیا عظیم آبادی کی مرزا یگانہ چنگیزی، حیات اور شاعری شائع ہوئی۔ ۱۹۸۸ میں پروفیسر ممتاز حسین کی یگانہ۔ شخص اور شاعر، طبع ہوئی۔ لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود یگانہ کی جانب ہمارے دانشور متوجہ نہیں ہوتے۔ علاوہ ازیں ۱۹۸۰ کی دہائی میں جناب مشفق خواجہ (کراچی) نے ادبی حلقوں کی توجہ یگانہ کی طرف پھر منعطف کرانے کی کوشش کی۔ آپ نے اپنے ماہنامہ 'اسلوب' کراچی کے خصوصی شمارے 'تحقیقی ادب' حصہ دوم اور حصہ چہارم میں مرزا یگانہ سے متعلق چند مضامین بھی شامل اشاعت کیے۔ ان میں حصہ دوم میں جو مضامین شائع ہوتے تھے، ان کو آصف پبلیکیشنز۔ علی گڑھ نے علاحدہ کتابی شکل میں شائع کردیا ہے۔ اس میں مالک

راہی صاحب کے ایک مضمون بعنوان "مرزا یگانہ چنگیزی" کا اضافہ کر دیا گیا ہے جو ان کی کتاب "وہ صورتیں الٰہی" سے لیا گیا ہے۔ کتاب میں شامل تمام مضامین سے یگانہ کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ ناشر قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے ایک عمدہ کتاب چھاپی اور اس کے ذریعہ یگانہ کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش کی۔

ماہنامہ آموزگار

ایڈیٹر۔ پروفیسر اکبر رحمانی۔ محمد حسن فاروقی
مبصر۔ سید حامد۔ قیمت ۵/ روپے
۔یوپی تعلیمی کارواں نمبر ا
پتہ۔ ۳۰۔ بھائی پیٹھ۔ جلگاؤں ۶ مہاراشٹر

ماہنامہ آموزگار کا یوپی تعلیمی کارواں نمبر ا میرے سامنے ہے۔ تعلیمی کارواں کے بارے میں یہ خیال عام ہے کہ مسلمانوں کے تعلیمی جمود کو توڑنے کے لیے یہ اپنی طرح کی پہلی عملی کوشش ہے۔ کارواں ۱۲ دن تک گرم سفر رہا۔ یوپی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گیا۔ جہاں گیا اس کی پذیرائی ہوئی۔ لوگوں نے سوچا کہ آسایش اور مصروفیت کی زندگی ترک کرکے کچھ ایسے باخبر لوگ جن کے دل میں مسلمانوں کا درد ہے ان کے گھروں پر دستک دینے آتے ہیں۔ کارواں نے اسکولوں، کالجوں، مدرسوں، مسجدوں، کلبوں اور نکڑوں میں عوام و خواص سے خطاب کیا جہاں گیا اس نے تعلیم کی جوت جگائی اور لوگوں کو سوچنے پر مجبور کیا۔

کارواں کی شروع اور آمد و رفت کی روداد انگریزی، ہندی اور اردو اخباروں میں چھپتی رہی۔ اس کا سفر جب تکمیل کو پہنچ گیا تو اس کی مکمل مگر مختصر روداد دو یا تین قسطوں میں قومی آواز (دہلی) انقلاب (بمبئی) سیاست (حیدرآباد) آزاد ہند (کلکتہ) اور چند اردو اخباروں میں شائع ہوئی۔ یہ روداد قلم برداشتہ لکھی گئی تھی، بغیر نوٹس کی مدد کے یہ صرف ایک خاکہ فراہم کر سکی اور بہت سے اہم افراد اور امور کا حق ادا نہ ہو پایا۔ اس تبصرہ نگار کو بہت خوشی ہے کہ اس خاکہ میں جناب اکبر رحمانی صاحب نے اپنے معجز رقم قلم سے رنگ بھر دیا۔ ان کا پیرایہ تحریر سلجھا ہوا، شگفتہ اور دل پذیر ہے۔ ایک دفعہ "آموزگار" کا تعلیمی کارواں نمبر ا اٹھا لی تو ختم کیے بغیر بند نہ کر پائے گا۔ عجیب روانی، سادگی، اخلاص اور انہماک ہے رحمانی صاحب کے طرز نگارش میں ہر بات دل سے اٹھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ان کی نثر کا حسن ذاتی تکلف سے بری اور قبائے گل کی طرح گل بوٹوں سے بے نیاز ہے۔

اکبر رحمانی صاحب کو اپنے معصروں سے بہت پہلے اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ نجات مسلمانوں کی تعلیم ہی میں ہے، ان کا ماہنامہ "آموزگار" تعلیم کی مہم کے لیے وقف ہے۔ ناساعد حالات اور تند و تیز ہوا کے

ہوگیا۔ کئی بڑے شاعر اور نثر نگار ہندستان سے پاکستان چلے گئے۔ اس میں جوش ملیح آبادی، صبا اکبر آبادی، جمیل الدین عالی، ڈاکٹر جمیل جالبی مولوی عبدالحق نیاز فتحپوری اور اختر حسین رائے پوری وغیرہ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ جوش پر اقبال اور غالب کے مقابلے میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ وہ اپنے وقت کی اہم آواز تھے۔ ان کے یہاں اسلوبیاتی اظہار کے نقوش ابھرتے ہیں انھوں نے اپنی نظموں میں مختلف ہیئتوں سے کام لیا ہے۔ مناظر فطرت کی عکاسی ان کی نظموں کی بڑی خوبی ہے۔ الفاظ کی بندش اور قادرالکلامی نے انھیں اپنے ہم عصر شعرا میں ممتاز بنا دیا۔ ان کا یہ شعر بہت مشہور رہے۔

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

جوش کی شخصیت اور شاعری پر ڈاکٹر خلیق انجم کی یہ کتاب کئی اعتبار سے بڑی اہم ہے اس میں پندرہ مضمون نگاروں کے مضامین شامل ہیں جو مختلف موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔ ان میں پروفیسر مسعود حسین خان، وارث علوی، رشید حسن خاں، پروفیسر گوپی چند نارنگ، سید حامد، ڈاکٹر خلیق انجم، صبا اکبر آبادی اور ڈاکٹر ضیاءالدین انصاری کے مضامین خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔

حرف آغاز کے تحت ڈاکٹر خلیق انجم نے جوش کی شخصیت اور شاعری پر بھرپور مضمون لکھا ہے اور جوش کی مقبولیت اور عدم مقبولیت کی طرف تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون میں جوش کی مقبولیت کو کم کرنے کا ذمہ دار نیاز فتحپوری کو قرار دیا۔ ان کا بیان ہے کہ نیاز مرحوم "نگار" میں کبھی اپنے نام سے کبھی اپنے فرضی ناموں سے جوش کی شاعری پر تنقید کرتے، جگر، اصغر اور فانی پر بھی اعتراضات کرتے۔ جوش کی شخصیت چونکہ متنازعہ فیہ تھی اس لیے ان تینوں شاعروں پر کوئی اثر نہیں ہوا جوش کی شاعری پر بڑا اثر پڑا اور ان کی مقبولیت خاصی متاثر ہوئی۔ جوش ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ اس وقت ان کی ٹکر کا شاعر کوئی نہ تھا۔ اس لیے حفیظ جالندھری نے جوش کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ اور اپنا الگ گروپ بنایا۔ شاہد احمد دہلوی اور نیاز فتحپوری بھی جوش کی مخالفت میں پیش پیش رہے۔ ہجرت کرنے سے پہلے جوش جب بھی پاکستان مشاعروں میں جاتے تو ان کا زبردست استقبال کیا جاتا اور غیر معمولی پذیرائی ہوتی اس سے ان کے دل میں مستقل قیام کا خیال پیدا ہوا دوسرے ابو طالب نقوی صاحب نے ان کو ملازمت دلانے کا یقین دلا دیا۔ نقوی صاحب اس زمانے میں کراچی کے کمشنر تھے اور چودھری محمد علی وزیر اعظم تھے۔ سکندر مرزا کے بل بوتے پر نقوی صاحب نے وزیر اعظم سے ٹکر لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نقوی صاحب کی کمشنری ختم کر دی گئی تو ترقی کے بجائے تنزلی ہو گئی اور وہ بددل ہونے لگے۔ دوسرے جوش مذہب کے بارے میں آزاد خیال تھے۔ اسلامی ملک میں ان کی آزاد خیالی نے ان کی مقبولیت کو کم کر دیا۔ عوام پر ان مضامین

کا بڑا اثر ہوا۔ ہندستان میں جوش کا ڈنکا بجتا تھا۔ سرکاری سطح پر بھی وہ بہت مقبول تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد نے ان کو پاکستان جانے کے لیے بہت منع کیا مگر یہ اپنے بچوں کے مستقبل کا عذر کر کے پاکستان مستقل طور پر چلے گئے اور وہاں ان کی جو درگت بنی اس کا ذکر انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح "یادوں کی برات" میں اس طرح کیا ہے۔

"میرے پاکستان بنتے ہی
ایک قیامت کا غلغلہ برپا ہو گیا

پورے پاکستان میں اور شہر کراچی میں تو اس قدر بیدا اٹھا گویا صور قیامت پھونک دیا گیا ہے۔ تمام چھوٹے بڑے اردو انگریزی اخباروں کے لشکر خم ٹھونک ٹھونک کر میدانِ جنگ میں آ گئے۔ تمام ادباء شعراء اور کارٹون سازوں نے اپنے اپنے قلموں کی تلواریں نیام سے نکال کر میرے خلاف مضامین، قطعات اور کارٹون کی بھرمار کر دی۔

ہر طرف منڈیوں کا سا ایک غلغلہ پیدا ہو گیا کہ دہائی سرکار کی مثل اعظم یعنی ابو طالب نقوی نے جوش کو آدھا پاکستان کاٹ کر دے دیا۔ مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے لوگ میرے خلاف متحد ہو کر شیر و شکر ہو گئے۔ میرا پاکستان آنا ایسا معلوم ہوا گویا کوئی زبردست ڈاکو قارون کے خزانے پر ٹوٹ پڑا ہے۔

غرض اس مقالے میں خلیق انجم صاحب نے تحقیق اور تنقید دونوں کا حق ادا کر دیا ہے اور جوش کی شاعری کی تفہیم اور قدر و قیمت کا تعین کرنے میں انصاف سے کام لیا ہے۔ فیض اور جوش کا جہاں موازنہ کیا ہے وہاں فیض کے بجائے جوش کو انقلابی شاعر تسلیم کیا ہے اور اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ فیض انقلابی شاعر نہیں تھے۔ فیض شناسی پر خلیق انجم صاحب کی تو کئی سال ہوئے "فیض احمد فیض۔ تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔

صبا اکبر آبادی کا مضمون بڑا جامع اور جوش کی خوبیوں کی تعداد ہے۔ زبان کا غلط استعمال جوش کو قطعی برداشت نہیں تھا۔ وہ بڑے کھرے انسان تھے بھری محفل میں لفظ کے غلط استعمال پر ٹوک دیتے۔ غلط شعر، غلط محاورہ اور غلط تلفظ ان پر برا اثر ڈالتا تھا شاعروں کی اس خامی کو کسی قیمت پر برداشت کرنے کو تیار نہ ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی صاف گوئی نے ان کے حریفوں کو موقع فراہم کر دیا کہ وہ ان کے خلاف جا اور بے جا حملے کرنے لگے۔ رشید حسن خاں صاحب نے اپنے مضمون میں جوش کی خامیاں میں زبان و بیان کی خامیوں کی طرف نشان دہی کی ہے۔ سید حامد صاحب نے اپنے مضمون میں جوش کی شخصیت کو یادوں کی برات کے آئینے میں پرکھا ہے اور جوش کے بعض غیر ذمے دارانہ بیانات پر تنقید کی ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے روح ادب کے

حوالے سے جوشؔ کی شاعری اور شخصیت کے کئی پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے اور انھوں نے جوشؔ کی فطرت پرستی کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے جوشؔ کی شاعری کا بہترین تجزیہ پیش کیا ہے۔ مضامین کے آخر میں جوشؔ کی تین نظمیں دی گئی ہیں۔ پہلی نظم غیر مطبوعہ اور باقی دو نظمیں جوشؔ کی زندگی کے آخری زمانے کی یاد دلاتی ہیں۔ یہ تینوں نظمیں مشفق خواجہ صاحب نے مرتب کو بھیجوائی تھیں۔ آخر میں جوشؔ کی تصانیف اور ان کے مضامین جو رسالوں اور کتابوں میں منتشر تھے ڈاکٹر ضیاءالدین انصاری نے ان کو مرتب کر کے قابلِ قدر کام کیا ہے۔ غرض کتاب جوشؔ کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے بڑی اہم اور قابلِ قدر ہے۔ کتاب کا گٹ اپ نہایت دیدہ زیب اور کتابت و طباعت عمدہ۔

جامِ جہاں نما — اردو صحافت کی ابتدا

گربچن چندن

ہندستان میں اردو صحافت کے آغاز کے بارے میں نئی دریافتوں کی حامل یہ کتاب پہلی بار ان حقائق کو پیش کرتی ہے جو اب تک نیشنل آرکائیوز آف انڈیا اور برٹش لائبریری کے شعبۂ مشرق میں مستور تھے کلی صحافت کے شعبے میں یہ صحافت برعظیم کی اولین صحافت کی جو فارسی زبان میں ظاہر ہوئی جانشین ہے اور مطبوعہ صحافت کے شعبے میں بنگلہ کے بعد دوسری قدیم ترین صحافت ہے جس نے اپنے آغاز میں کئی دیسی صحافتوں کی رہبری کی لیکن اس عظیم عمارت کی خشتِ اول (جو جامِ جہاں نما کے نام سے نصب کی گئی) کے بارے میں ہمارے مورخوں نے گومگو سے کام لیا ہے مصنف نے اور جنل ریکارڈ کے مشاہدے کے بعد مسئلۂ نظر کا بیباک جائزہ لیا ہے۔ اور اردو کے اس اولین مطبوعہ اخبار کے حقیقی موقف کردار اور مرتبے کی صراحت کی ہے مزید اس حصے کی نشاندہی کی ہے جو ۱۹ ویں صدی میں ہندستان اردو صحافت کی پیش رفت میں جامِ جہاں نما نے ڈالا۔ قیمت ۷۵/ روپے

کتاب نما کے خصوصی شمارے

عابد علی خاں	مرتبہ مجتبیٰ حسین	۴۵/-
خواجہ احمد فاروقی	مرتبہ خلیق انجم	۴۵/-
آل احمد سرور	" "	۴۵/-
اجمل اجملی	مرتبہ علی احمد فاطمی / عندلیب	۴۵/-
پروفیسر مسعود حسین خاں	مرتبہ ایم حبیب خاں	۴۵/-
پروفیسر فرمان فتح پوری	مرتبہ خلیق انجم	۲۵/-
علی سردار جعفری	مرتبہ رفیعہ شبنم عابدی	۱۵/۵۰

کتاب نما کے قارئین توجہ فرمائیں

خط و کتابت کرتے وقت یا زرِ سالانہ بھیجتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

یاد رکھیے

اگر آپ کی خریداری نمبر کے سامنے سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کی خریداری کی مدت ختم ہو گئی۔ براہ کرم اپنا سالانہ چندہ مبلغ ۵۵/- روپے فوراً بھیجیے۔ (منیجر)

دبی اور تہذیبی خبریں

آہ ناظم میواتی سہسرامی

اردو اور فارسی کے مشہور ادیب و شاعر ناظم میواتی سہسرامی ۳۱ دسمبر ۱۹۹۲ء کی شب میں حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کی دائمی مفارقت ادبی دنیا کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے۔ ۱۹۴۸ء تا ۱۹۸۴ء انھوں نے درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ شہرت و ناموری سے ماورا ادب کی خدمت تا دم کرتے رہے۔ موصوف کے ادبی کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔ اپنے پیر و مرشد سید خلیل احمد عنبر ؒ کے بغل میں، شاہ جلال پیر کی تکیہ، واقع سہسرام پہلی جنوری ۱۹۹۳ء بعد نماز جمعہ سپرد خاک ہوئے۔

ع " آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے "

ضمیمہ قومی آواز۔ نئے طرز کا آغاز
لکھنے والوں سے تعاون کا طلب گار

نئی دہلی۔ مارچ۔ روزنامہ قومی آواز عرصۂ دراز سے اپنا ہفتہ وار ضمیمہ شائع کر رہا ہے جس میں بالعموم ادبی و ثقافتی موضوعات پر مضامین اور شعری و نثری ادب پارے شامل ہوتے ہیں۔

حالات اور فکر کی تبدیلیاں طرزِ اظہار اور طباعتی پیش کش کو بھی تبدیل کرتی ہیں۔ اسی حقیقت کے پیش نظر ادارہ قومی آواز نئی دہلی نے ۱۴ مارچ سے اپنے ہفتہ وار ضمیمے کو زندگی اور ادب میں ابھرتی نئی سوچ، نئے احساس اور نئے لب و لہجے کا نقیب بنانے کا عمل شروع کر دیا ہے۔ ضمیمے کو زندگی کے تمام رنگوں کا آئینہ بنانے کے لیے اس میں متعدد نئے کالم شروع کیے گئے ہیں۔ جیسے: عام آدمی کی آپ بیتی، آموختہ، کتاب کیسی ہے، باتیں، تاکہ سند رہے، بیجی نیا خون، زندگی کی شام، خواتین اور کھیل کھلاڑی وغیرہ۔ مستقل کالموں کے علاوہ ملکی و غیر ملکی زبانوں کے شعری، نثری اور مزاحیہ ادب پارے بھی ضمیمے میں شائع کیے جا رہے ہیں۔ ان معنوی تبدیلیوں کے ساتھ ہی ساتھ ضمیمے کو بامعنی و پرکشش گیٹ اپ اور رنگین طباعت سے بھی آراستہ کیا گیا ہے۔

لکھنے والوں سے ادارے کی درخواست ہے کہ ضمیمے کے مزاج و آہنگ کو بہترین بنانے کے لیے، عام آدمی اور ادب و ثقافت میں پیدا شدہ خلیج کو پاٹنے کے لیے اور عوام و خواص کی مستحسن فکر کو عملی خریدِ ڈھالنے کے لیے اپنے قلمی تعاون سے نوازیں۔

ذہنِ جدید اعتراف کی تقسیم

نئی دہلی۔ ۲۲ فروری۔ اردو کے مقبول سہ ماہی رسالے ذہن جدید نے

قاری اور لکھنے والے کے درمیان ایک گہرا اور بامعنی تعلق استوار کرنے کی غرض سے ذہن جدید اعتراف کا سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت پڑھنے والوں سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ انھیں رسالے کے مختلف شماروں میں شامل نظم و نثر میں کیا تحریریں زیادہ پسند آئیں۔ ذہن جدید اعتراف ۱۹۹۱ اور ۱۹۹۲ کی تقسیم کے سلسلے میں ایک سادہ مگر پُروقار تقریب نئی دلی کے ترویٰنی کلا سنگم کے آڈیٹوریم میں ہوئی مجلس صدارت میں پینٹر ستیش گجرال، اردو ادیبہ قرۃ العین حیدر، ہندی کہانی کار راجندر سنگھ یادو اور پنجابی نقاد ستیندر سنگھ نور تھے۔ ذہن جدید کے مرتب زبیر رضوی نے اعتراف یافتگان کا تعارف کرایا اور اس کی مدیرہ جمشید جہاں نے توصیف نامے پڑھے۔

پاکستانی ادیبہ بانو قدسیہ اور افریقی شاعر گبریل اوکارا کا اعتراف متعلق سفارت خانوں کے اعلا عہدیداروں نے قبول کیا۔ اعتراف یافتگان میں ابراہیم اشک، وارث علوی، ندا فاضلی۔ سدھیر در آرٹ کے لکشمی کرشن کھنہ، غلام رسول ہے ، برکیت کپور، اجیت کور، یوسف ناظم، عابد سہیل۔ مہندر سنگھ سرنہ، وحید اختر۔ وید راہی، نرمل ورما اشوک باجپائی شامل تھے اس موقع پر ستیش گجرال نے کہا کہ اردو رسائل میں ذہن جدید ایک خوشگوار اضافہ ہے کہ یہ بے حد تنوع کا حامل ہے اور خاص طور سے اس لیے کہ اس میں تھیٹر اور مصوری پر مستقل لکھا جا رہا ہے۔

ایک شام ملک زادہ جاوید کے نام

مظفر نگر مشہور نوجوان شاعر اور حکومت اترپردیش کے محکمۂ اقلیتی کارپوریشن کے منیجر جناب ملک زادہ جاوید کے اعزاز میں پاشا اردو لائبریری کی جانب سے ایک شاندار مشاعرہ منعقد ہوا جس میں حضرت شاہد نوحی نے صدارت کی اور مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے طارق ابن ثاقب ارشد راہی (جرنلسٹ) اور ونے کمار طفیل کاشی پوری نے شرکت کی۔

اس موقع پر ملک زادہ جاوید کے تازہ مجموعۂ کلام "کھنڈر میں چراغ" کی شاعری پر دو مقالے پڑھے گئے اور ان کی اردو خدمات کے اعتراف میں پاشا اردو لائبریری کے صدر اور شہر کے نائب قاضی جناب فرید پاشا آزاد نے انھیں محسن اردو ایوارڈ پیش کیا۔

اس تقریب میں جن شعرا کا کلام پسند کیا گیا ان کے نام حسب ذیل ہیں صاحب اعزاز ملک زادہ جاوید شاہد نوحی، طارق ابن ثاقب، فرید پاشا آزاد، ونے کمار طفیل چترویدی، کامل آفریدی، نجم مظفر نگری، عبدالحق سحر، نشتر کھتولوی، اثر انوپ شہری، بابا احمد راز، ندیم اختر، شوکت فہمی منور کمال، باور، رئیس اعظم خان، شاداب زیدی اور اشوک

ں کے نام قابلِ ذکر ہیں:

ربانی تاباں اور ذاکر حسین نقوی
کی وفات پر تعزیتی جلسہ

شعبۂ اردو پنجابی یونی ورسٹی میں
ڈاکٹر ہارون ایوب کی صدارت میں ایک
تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ اساتذہ میں ڈاکٹر
شکیل خاں، جناب ایس۔ پی مہتہ،
ڈاکٹر مدھوکر آریہ اور ڈاکٹر ضیاءالرحمن
صدیقی نے شرکت کی۔ شعبہ کے طلبہ
و طالبات کے علاوہ نان ٹیچنگ اسٹاف
نے بھی شرکت کی۔

ڈاکٹر محمد شکیل خاں نے تاباں صاحب
کی زندگی کے ضمنی اہم گوشوں پر روشنی
ڈالتے ہوئے کہا کہ تاباں صاحب ہمارے
دور کی ادبی تاریخ کا ایک اہم حصہ تھے
نقوی صاحب اور تاباں صاحب دونوں
شخصیتیں اگرچہ ہمارے درمیان موجود
نہیں ہیں۔ لیکن ان دونوں کے ادبی
کارنامے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

ڈاکٹر ضیاءالرحمن صدیقی نے تاباں
صاحب سے اپنے ذاتی تعلقات کا ذکر کیا
اور بتایا کہ تاباں صاحب ایک نفیس
انسان تھے ان کا مقصد ادب برائے
زندگی تھا ترقی پسند شعراء میں انھیں
ایک اہم مقام حاصل ہے ان کی اہمیت
اور قدر و قیمت ہر دور میں باقی رہے گی۔
نقوی صاحب نے ایک عرصہ تک شعبۂ
اردو پٹیالہ یونی ورسٹی کی خدمت انجام
دی اور ادب کی خدمت کرتے رہے
آج ہم لوگ ان دونوں کی وفات حسرت
آیات پر اظہار غم کے لیے جمع ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر مدھوکر آریہ نے کہا کہ تاباں
صاحب اردو ادب میں ایک قدآور
شخصیت کے مالک تھے وہ ایک بڑے
تخلیق کار تھے۔ ذاکر حسین نقوی نہ صرف
پٹیالہ یونی ورسٹی بلکہ ادبی دنیا میں بڑے
احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ہمیں
افسوس ہے کہ یہ دونوں شخصیتیں ہمارے
درمیان موجود نہیں ہم لوگ ان کی وفات
پر خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

جناب مہتہ صاحب نے کہا کہ
ذاکر حسین نقوی اور تاباں صاحب دونوں
شخصیتیں اردو ادب کا ایک ناگزیر حصہ
تھیں ان کی ادبی خدمات ہمیشہ یاد کی
جاتی رہے گی۔

آخر میں ڈاکٹر ہارون ایوب
صاحب نے تاباں صاحب اور نقوی صاحب
کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے
ہوتے کہا کہ ان سے میرا تعلق تقریباً بیس
سال تک رہا ان کی علمیت نہ صرف اردو
بلکہ فارسی اور عربی میں بھی یکساں تھی۔

محمد ندیم خاں درد، ایم۔اے رسال اوّل
شعبہ اردو، پنجاب یونی ورسٹی،
سکریٹری بزم ادب

خواجہ احمد فاروقی کی ادبی خدمات پر
کتاب نما کے خصوصی شمارے کی رسم اجرا
مرکزی وزیر جناب ارجن سنگھ اور سید حامد صاحب
جناب عزیز قریشی کی شرکت

نئی دہلی۔ انسانی وسائل کے فروغ کے
وزیر جناب ارجن سنگھ نے اردو زبان کے

بزرگ مصنف اور پروفیسر ایمریٹس
ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی خود شائع کردہ ایک
کتاب جس میں غالب کی دستنبو کا انگریزی
ترجمہ شامل ہے، چار سو جلدیں خریدنے
کا اعلان کیا ہے۔ اس خریداری سے،
جو ان کی وزارت کا ادارہ ترقی اردو بیورو
کرے گا، ۷۶ سالہ خواجہ احمد فاروقی کو جو
کافی عرصے سے علیل ہیں، تیس ہزار روپے
کی رقم مل جائے گی۔

وزیر موصوف نے یہ اعلان ۱۴ مارچ
کو یہاں ایک خصوصی تقریب میں کیا جو خواجہ
صاحب کی ۵۰ سال سے اوپر کی علمی اور
ادبی خدمات [illegible] اعتراف میں۔ ان کی شدید
علالت کی وجہ سے [illegible] کی
گئی تھی۔ اس موقع پر [illegible]
تذکرہ دستنبو کے علاوہ خواجہ صاحب کی
ایک اور کتاب "یادگار وجود غالب" کی رونمائی
بھی کی۔

موصوف تقریب میں شریک ہونے
سے قبل خواجہ صاحب کے بستر علالت
تک گئے اور بڑی محبت اور شفقت سے
ان کی پرسش اور ان کی شفایابی کے لیے
دعا کی۔

تقریب میں اپنے خیالات کا اظہار
کرتے ہوئے وزیر موصوف نے کہا کہ
غالب نے اپنے عہد اور بالخصوص ۱۸۵۷ء
کی بغاوت کا بغور مشاہدہ کیا اور اسے
دستنبو میں قلم بند کیا۔ خواجہ صاحب
نے دستنبو [illegible] غالب شناسی کی حدود [illegible]
مبالغ ہیں۔ اسے انگریزی میں ترجمہ کرنے
کے لیے منتخب کیا تاکہ وسیع دنیا تک
غالب کا مشاہدہ پہنچے۔ خواجہ صاحب
نے اپنی معلمی کے زمانے میں اردو تعلیم
و تدریس کو جدید تقاضوں سے میل
کھانے والی جہتیں دیں۔ ان کے کار
نامے ماضی کا آئینہ، حال کا سندیش
اور مستقبل کی امید ہیں۔ اس موقع
پر جناب سید حامد، صدر انجمن ترقی
اردو (ہند) نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے
رسالہ "کتاب نما" کا وہ خصوصی نمبر
بھی جاری کیا جو اس نے پروفیسر
خواجہ احمد فاروقی کی شخصیت اور خدمات
پر شائع کیا ہے۔ ۳۰۴ صفحات کے
اس مجلد نمبر میں، جسے انجمن ترقی
اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر
خلیق انجم نے مرتب کیا ہے، خواجہ
صاحب کے مختلف پہلوؤں پر ۱۵
مشہور قلم کاروں کے مضامین شامل
ہیں۔

تقریب کی صدارت اردو
یونیورسٹی کے امور تشکیل سے متعلق
کمیٹی کے صدر جناب عزیز قریشی ایم پی
نے کی اور نظامت ترقی اردو بیورو
کے پرنسپل پبلیکیشنز آفیسر جناب
ابوالفیض سحر نے کی۔

جناب عزیز قریشی نے، خواجہ
صاحب کو زبردست خراج تحسین
پیش کرتے ہوئے یونیورسٹی کی
سطح پر اردو کی تعلیم کے باب میں
ان کے کارہائے نمایاں کا ذکر کیا۔
اور کہا کہ اس تقریب میں وزیر موصوف
کی شرکت، جن کی وزارت میں محکمہ

تعلیم بھی شامل ہے، اردو زبان کے
لیے ایک نیک فال ہے۔ جناب بدین
سنگھ نے پہلے ہی اردو یونی ورسٹی کے
فیصلہ کو جو آج تک تصورات اور خوابوں
ہی تک محدود تھا ممکنات کی منزل
تک پہنچا دیا ہے۔

ایک درجن سے اوپر مقررین نے
اردو زبان کی تعلیم و ترقی کے لیے خواجہ
صاحب کی علمی اور ادبی صلاحیتوں،
جدتوں اور پہل کاریوں کو پُرزور
خراج ہائے تحسین پیش کیے۔ دلّی یونی ورسٹی
کے آزاد شعبہ اردو کا خالق اور محسن
اردو قرار دیا۔ ان میں
جناب سید حامد۔ پروفیسر محمد حسن،
پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر ظہیر احمد
صدیقی۔ ڈاکٹر خلیق انجم۔ پروفیسر اختیاق
عابدی۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی۔ ڈاکٹر
فہمیدہ بیگم۔ جناب شاہد علی خان۔
ڈاکٹر شمیم نکہت۔ ڈاکٹر صدیق الرحمٰن
قدوائی۔ ڈاکٹر محمد ایوب۔ جناب گلزار
دہلوی۔ پروفیسر آفاق احمد (بھوپال)
ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ علی گڑھ اور جناب
ابوالفیض سحر شامل تھے۔

اس تقریب کی جس میں دہلی،
علی گڑھ اور بھوپال کے ایک سو سے زیادہ
ممتاز اہلِ علم و قلم نے شرکت کی ماہیت کا
ایک اہم پہلو یہ تھا کہ ایک اردو ادیب
کی علمی اور ادبی خدمات کا اس زندگی ہی
میں اس اہتمام سے اعتراف کیا گیا۔
اس کا انعقاد انجمن ترقی اردو (ہند)
کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کی تحریک
پر حکومت ہند کے ترقی اردو بیورو،
دہلی ایڈمنسٹریشن کی اردو اکادمی، ادارہ
ہمدرد کی غالب اکادمی۔ نئی دہلی، غالب
انسٹی ٹیوٹ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ بھوپال
کے اقبال ادبی مرکز اور علی گڑھ کے
جامعہ اردو کے اشتراک سے ہوا۔

انجمن ترقی اردو (ہند)، ترقی اردو
بیورو اور غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف
سے خواجہ صاحب کو اعزازیہ عبارتوں
سے مزین خصوصی شیلڈیں پیش کی گئیں۔
مرکز غالب اکادمی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اور دہلی اردو اکادمی نے اپنی مطبوعات
کے مجموعے پیش کیے۔

تقریب کے آغاز میں مذکورہ
تمام اداروں اور متعدد شرکاء نے
خواجہ صاحب کی گلپوشی کی۔ خواجہ
صاحب اپنی شدید علالت کی وجہ
سے اسٹیج پر نہ آ سکے۔ انھیں پیش
کردہ پھولوں کے ہار اور دیگر تحفے ان
کی دو صاحبزادیوں نے وصول کیے۔

(جی، ڈی چندن)

ڈاکٹر و۔ م۔ ابراھیم

اردو و دیگر اقلیتی زبانوں کے مدارس کے ڈائرکٹر مقرر

اردو حلقوں میں یہ خبر نہایت خوشی
کا باعث ہوگی کہ کرناٹک حکومت
نے "اردو و دیگر اقلیتی زبانوں کے
مدارس" کے لیے ڈاکٹر و۔ م۔ ابراہیم
کو ڈائرکٹر مقرر کر دیا ہے۔ ڈاکٹر ابراہیم
نہایت فعال شخصیت کے مالک ہیں۔

قوی امید ہے کہ ان کے خلوص محنت اور لگن سے اقلیتی زبانوں کو خاصا فروغ حاصل ہوگا۔ ادارہ کتاب موصوف کی کامیابی کے لیے دعاگو ہے۔

مجتبیٰ حسین کا نیا پتا

ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین اپنے نئے مکان میں منتقل ہو گئے ہیں۔ ان کا پتا حسب ذیل ہے۔

مجتبیٰ حسین ۔۔ ۲، انکورا پارٹمنٹس۔
پلاٹ نمبر ۷ پٹ پڑ گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۹۲

یوگراج کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض

چنڈی گڑھ۔ پنجاب یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو نے اپنے طالب علم جناب یوگراج کو ان کے تحقیقی کام کے لیے پی، ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ جناب یوگراج کا تحقیقی موضوع "کشمیری لال ذاکر کی ناول نگاری ایک تجزیاتی مطالعہ" تھا۔ جناب یوگراج نے اپنا تحقیقی کام ڈاکٹر ہارون ایوب کی سرکردگی میں انجام دیا ہے۔

ہریانہ اردو اکادمی جناب یوگراج کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے پر مبارک بادپیش کرتی ہے۔

ناشر نقوی (اڈیٹر)

دہلی اردو اکیڈمی کے انعامات

مجموعی خدمات پر فی کتاب (۴۰۰۰ ،انعام
پروفیسر نورالحسن ... آل ... [illegible]

ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔ اردو تحقیق
دیویندر اسر ۔ تحقیقی اد
کمار پاشی (بعد از مرگ) اردو
شمس الزماں قومی
اے، آر کاردار بہترین
م، م راجندر بچوں
ڈاکٹر محمد اسلم پرویز سائنس
امینہ آپا جی اردو

۱۹۹۲ء شائع شدہ کتابوں
جناب مسعود ہاشمی ۔ اردو لغت
جناب ملک رام ۔ حور بی اور
پروفیسر عنوان چشتی۔ تنقید
پروفیسر ضیاءالحسن فاروقی۔ مسا
ڈاکٹر محمد یعقوب عامر۔ اردو کے
گوپی چند نارنگ ۔ جام جہا
نصرت ظہیر ۔ تحت اللفظ
ڈاکٹر صادق ۔ کشادِ رفی کتا
مسعودہ حیات ۔ تصویر وط
افضل کرتپوری ۔ نوائے سکو
رہبر دہلوی ۔ اسرار محبت
حبیبہ نقوی ۔ کلیات عیش
ڈاکٹر صغرا مہدی۔ صالحہ عابد
ڈاکٹر سرور احمد۔ اردو ہندی ہو
سید بدرالحسن ۔ نعت الفا
منشی نول کشور ایوارڈ
مکتبہ پیام تعلیم۔ ۴۰۰۰/-
نورنگ کتاب گھر ۴۰۰۰/-

مہاراشٹر اردو اکیڈمی کے

قومی انعام۔ پروفیسر وارث علوی

ی انعام - ظفر گورکھپوری ــ ـــ ۱۵ ہزار
مراٹھی خدمات - ڈاکٹر عصمت جاوید -
۱۵ ہزار -

انعام، سات ہزار روپے کے انعامات

یان کی وسعت	سلیم شہزادہ
بکرے کی تعریف میں	یوسف ناظم

انعام، پانچ ہزار روپے کے انعامات

ست گرداں	شکیب غوثی
دائروں کے قیدی	بانو سرتاج
جدید شعری تنقید	ڈاکٹر سید صفدر

انعام، چار ہزار روپے کے انعامات

اعتراف	رفیق عادل
پر پرزے	ڈاکٹر محمد اسد اللہ

دی انعامات

اشفاق اللہ خاں میوارام گپتا -/۰۰۰،۴ ہزار
حصول تعلیم کا بنیادی لائحہ عمل محسن علی بادام -/۰۰۰،۴ ہزار
اردو مراٹھی مدرد و ٹیچر شیخ عبداللہ رشتی -/۰۰۰،۴ ہزار
ننھی منی باتیں حیدر بیابانی -/۰۰۰،۴ ہزار
قلم کے موتی متین ابل پوری -/۰۰۰،۴ ہزار
صحافت - حنیف اعجاز اردو ٹائمز -/۰۰۰،۵ ہزار
محمد رفیع خاں انقلاب -/۰۰۰،۵ ہزار
خوشنویسی طاہرہ بانو انصاری ناگپور -/۰۰۰،۳ ہزار
تزئین، انور حسین ہندستان -/۰۰۰،۴ ہزار

بچن چندن کی تحقیقی کتاب

جام جہاں نما

کی رسم رونمائی

دہلی - اردو کے اولین اخبار "جام جہاں نما" کی تحقیق سے اردو صحافت کی بنیاد کو نئی پہچان مل گئی ہے - ان الفاظ کے ساتھ رکن پارلیمنٹ جناب اندر کمار گجرال نے ۳ اپریل کو یہاں اردو گھر میں گربچن چندن کی تحقیقی کتاب "جام جہاں نما" کی رونمائی کی -

تقریب کا اہتمام انجمن ترقی اردو ہند نے کیا - صدارت انجمن کے صدر جناب سید حامد اور نظامت جواہر لال نہرو یونی ورسٹی کے ڈاکٹر اسلم پرویز نے فرمائی - بزرگ صحافی جناب جمنا داس اختر بطور مہمانِ خصوصی شریک ہوتے -

جناب گجرال نے کہا کہ انھوں نے اس کتاب کو جستہ جستہ پڑھا ہے اور دیکھا ہے کہ اس میں موضوع کا مطالعہ اس کے اپنے دور کے سباق میں کیا گیا ہے جس سے اردو صحافت کا وہ پس منظر سامنے آیا ہے جس میں اس کے اولین معماروں نے کام کیا -

دہلی یونی ورسٹی کے ڈاکٹر شارب ردولوی نے اپنی پر مغز تعارفی تقریر میں کہا کہ جام جہاں نما کے بارے میں ہماری معلومات بڑی محدود تھیں کیونکہ اردو صحافت کے مورخوں نے اس اخبار پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی - اب گربچن چندن کی ۵۰۰ صفحات کی نئی کتاب سے وہ کمی دور ہوگئی ہے - موصوف نے کہا کہ جام جہاں نما نے صرف صحافت ہی نہیں بلکہ اردو نثر کی تشکیل میں بھی بڑا اہم کام کیا -

مرکزی ترقی اردو بیورو کے جناب ابوالفیض سحر نے کہا کہ اس کتاب کی اشاعت سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو

صحافت میں نئی تحقیق کا میدان بہت
وسیع ہے اور یہاں ہمارے نئے محققین
کے لیے کرنے کا بہت کام ہے۔
پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ یہ امر
قابلِ ستایش ہے کہ کتاب کے مصنف
نے یہ تحقیق اپنی سرکاری ملازمت سے
سبکدوشی کے بعد کی ہے۔ یہ ملازمت
بھی اردو صحافت سے وابستہ تھی اور اب
ان کی کتاب سے یہ ثابت ہو جاتا ہے
کہ ایک سنجیدہ شخص سبکدوشی کے بعد
بھی عمدہ اور وقیع کام کر سکتا ہے۔
اس کتاب کی اشاعت کے بعد صحافت
کی کوئی درسگاہ اسے نظرانداز نہیں
کر سکے گی۔
ڈاکٹر اسلم پرویز نے کہا کہ گربچن
چندن یونی ورسٹی کے آدمی نہیں لیکن
ان کی تحقیق کی نوعیت نہایت علمی اور
جامعاتی ہے۔
انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق
انجم نے کہا کہ اس کتاب میں جامِ جہاں
نما کے بانی ہری ہر دت اور اڈیٹر منشی
سدا سکھ لعل کے بارے میں جو نئی معلومات
پیش کی گئی ہیں ان سے ایک بار پھر
یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اردو زبان کی
تعمیر و ترقی میں غیر مسلموں نے بنیادی
کام کیا ہے اور آزادی کے بعد بعض حلقوں
نے اسے مسلمانوں کی زبان بتانے کی جو
کوشش کی ہے وہ بے بنیاد اور بے
جواز ہے۔ ڈاکٹر انجم نے جام جہاں نما
کے ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے جنرل منیجر
جناب شاہد علی خاں کو مبارک باد دی
کہ انھوں نے اپنی نئی مطبوعات میں اس
اہم کتاب کو شامل کیا۔ انھوں نے
کہا کہ حال ہی میں اس ادارے نے ہم
عصر ادیبوں کی شخصیت اور ادبی خدمات
پر اپنے ماہنامہ کتاب نما کے کتابی صورت
میں خصوصی شمارے شائع کرنے کا جو
سلسلہ شروع کیا ہے وہ بھی اردو ادب
کے فروغ کے لیے ایک نہایت مفید
اقدام ہے۔
دوردرشن کے پروڈیوسر جناب
انجم عثمانی نے کہا کہ اس کتاب سے اردو
صحافت کے افق کو نئی وسعت ملی ہے۔
جناب جمنا داس اختر نے کہا کہ
اس کتاب کی بدولت اردو صحافت
کی تاریخ نویسی میں ایک اہم سنگِ میل
طے ہو گیا ہے۔
صدرِ جلسہ سید حامد نے کہا کہ
اردو صحافت کے بارے میں یہ کتاب
نہ صرف نئی دریافت بلکہ نئی معلومات
اور نئی بصیرت کا مرقع ہے اور اس سے
اردو صحافت کی تاریخ کو ایک نئی اور
مستحسن اہمیت ملی ہے۔ اس کا
مصنف حقیقتاً قابلِ مبارکباد ہے۔

عمران عظیم کے پتا میں تبدیلی

دہلی۔ اردو کے نوجوان اور مشہور
شاعر محمد عمران عظیم نے اپنا مکان تبدیل کر دیا
ہے۔ اردو احباب سے گزارش ہے
کہ مندرجہ ذیل پتا پر خط و کتابت رکھیں۔"
پتا:۔ محمد عمران عظیم، آر-۲۱۶ گلی نمبر ۹
رمیش پارک، لکشمی نگر، دہلی ۹۲۔

ہم بہت دکھی ہیں

ابھی غلام ربانی تاباں کا غم ہلکا نہیں ہوا تھا کہ ۲۷ مارچ ۹۳ء کو ایک اور افسوس ناک خبر ملی کہ سیفیہ کالج، بھوپال کو بام عروج پر پہنچانے والے فزدبھائی نہیں رہے۔ فزدبھائی نے اقلیتی فرقے کو عصری تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ادارہ کتاب نما و مکتبہ جامعہ مرحوم کی مغفرت کے لیے دعاگو ہے۔

۱۵ مارچ تا ۱۷ مارچ کو اردو کے تین آفتاب غروب ہو گئے

۱۵ مارچ ۹۲ء کو دوپہر کے وقت اردو کے ممتاز شاعر، ادیب اور صحافی جناب گوپال متل حرکت قلب بند ہو جانے سے اپنی رہائش گاہ پر انتقال فرما گئے۔ گوپال متل ۱۱ جون ۱۹۰۶ء کو مالیر کوٹلہ میں پیدا ہوئے تھے لاہور میں تعلیم حاصل کی اور وہیں کئی روزناموں میں کام کیا بعد میں مولانا تاجور نجیب آبادی کے رسالے سے بھی متعلق رہے۔ آزادی کے بعد دہلی سے اپنا ماہنامہ "تحریک" جاری کیا۔ آپ کے تین شعری مجموعے ہیں لاہور کی یادداشتوں پر آپ کی کتاب "لاہور کا جو ذکر کیا" پر غالب انسٹی ٹیوٹ نے ایوارڈ سے نوازا۔ ادارہ کتاب نما مرحوم کے صاحبزادے پریم گوپال متل کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ ۱۵ مارچ ۹۳ء کو ہی شام ۷ بجے ماہنامہ دین و دنیا کے مدیر مفتی شوکت علی فہمی بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آپ تقریباً ۹۲ سال کے تھے آپ کی مذہب اور تاریخ پر لگ بھگ ۲۵ کتابیں شائع ہو کر مقبول ہوئیں۔ آپ ۱۴ دسمبر ۱۹۰۱ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم میرٹھ کے مدرسہ اسلامیہ میں حاصل کی۔ ۱۹۸۴ میں دہلی اردو اکیڈمی نے آپ کو صحافت کا ایوارڈ دیا اور ۱۹۸۹ء میں غالب ایوارڈ سے نوازے گئے۔ ادارہ کتاب نما مرحوم کی مغفرت کے لیے دعاگو ہے۔

۱۶/۱۷ مارچ ۹۳ء کی درمیانی شب میں تین بجے اردو ادب کا ایک اور اہم ستون گر گیا۔ ماہر غالبیات مالک رام چل بسے۔ آپ لگ بھگ پندرہ دن ہولی فیملی اسپتال میں زیر علاج رہے۔ آپ کی پیدائش ۲۲ دسمبر ۱۹۰۶ء میں پھالیہ (پاکستان) میں ہوئی۔ ایم اے، ایل ایل، بی کرنے کے بعد آپ لاہور سے شائع ہونے والے کئی اخبارات سے متعلق رہے۔ ۱۹۳۶ء سے سرکاری ملازمت شروع کی اور حکومت کے محکمہ خارجہ سے وابستہ ہو گئے۔ ملازمت کے دوران تقریباً تمام اسلامی ملکوں میں قیام رہا۔ آپ نے اردو انگریزی میں ۲۵ سے زیادہ کتابیں لکھیں۔

غالب، مولانا آزاد اور اسلامی علوم پر آپ کا فرمایا ہوا مستند سمجھا جاتا تھا۔ آپ کے انتقال سے مکتبہ جامعہ اپنے ایک مخلص اور ہمدرد رہنما سے محروم ہو گیا۔ ماہنامہ کتاب نما مرحومین کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے عنقریب ایک خصوصی شمارہ پیش کرنے کی کوشش کرے گا۔

خواجہ احمد فاروقی کی خدمات کا اعتراف

نئی دہلی۔ ۱۷ اپریل ۹۳ء۔ آج دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو اور دیگر تعلیمی اداروں کے تعاون سے یونی ورسٹی کیمپس میں شعبۂ اردو کے بانی خواجہ احمد فاروقی کے اعزاز میں ایک شاندار جلسہ منعقد کیا گیا۔ صدارت سید حامد صاحب نے فرمائی۔ سید حامد صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں خواجہ صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ مقررین میں پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر خلیق انجم، شریف الحسن نقوی، رشید حسن خاں، ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر شارب ردولوی اور صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر قمیم نکہت، پروفیسر کامل قریشی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر نگیندر شامل تھے۔ محترمہ افتخار بیگم صدیقی نے منظوم نذرانہ خلوص پیش کیا۔

ادھار جھانسوی کا انتقال

طنز و مزاح کے معروف شاعر جناب ادھار جھانسوی بروز عید الفطر شام ۳ بج کر ۵۳ پر انتقال فرما گئے۔ موصوف چند برسوں سے کافی بیمار تھے۔

ماہر لکھنوی نہیں رہے

لکھنؤ۔ ۲۴ اپریل۔ اردو کے ممتاز شاعر ماہر لکھنوی کا آج یہاں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ آپ ۶۵ برس کے تھے۔ ماہر لکھنوی، مولانا سبط حسن مرحوم کے فرزند اور لکھنوی اسکول کے نمایندہ شاعر سالک لکھنوی کے چھوٹے بھائی تھے۔

عاصی سعید نہیں رہے

اردو کے ممتاز ادیب اور انشائیہ نگار عاصی سعید صاحب کا ۱۷ اپریل کو انتقال ہو گیا۔ موصوف ۷۲ سال کے تھے۔ یہ افسوس ناک خبر دہرہ دون سے راشد جمال فاروقی نے دی۔

ادارہ کتاب نما اور مکتبہ جامعہ مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے۔

حکومت کرناٹک کی طرف سے اردو یونی ورسٹی کے لیے زمین

بنگلور۔ ۲۶ اپریل حکومت کرناٹک کے اعلا تعلیم کے وزیر جناب ایس، ایم، یحیٰی نے حکومت کرناٹک کی طرف سے اردو یونی ورسٹی کے قیام کے لیے ۲۰۰ ایکڑ زمین دینے اور وقتی

طور پر کام چلانے کے لیے ایک عمارت کی پیش کش کی ہے۔ بشرطیکہ مرکزی حکومت اس پیش کش کو قبول فرمائے۔

اردو شعرا، ادبا، ناقدین اور مصنفین سے ایک مخلصانہ

اپیل

ہم اکیسویں صدی عیسوی کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ اکیسویں صدی کا اردو شعر و ادب کیسا ہوگا؟ اسے جاننے اور سمجھنے کے لیے بیسویں صدی میں پیش کیے گئے شعر و ادب اور اس کے نشیب و فراز پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر" ادارہ تحقیق و ترقی اردو بھاگلپور" کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے بیسویں صدی میں پیش کیے گئے اردو شعر و ادب کا ایک جائزہ پیش کر رہا ہوں۔ کام کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس ضمن میں شعرا، ادبا، ناقدین اور مصنفین سے گزارش ہے کہ وہ اپنا مختصر تعارف اور اپنی شائع شدہ تخلیقات و تصنیفات کی ایک ایک کاپی درج ذیل پتا پر ضرور ارسال کر دیں تاکہ اُن تمام کا تذکرہ آ سکے۔

ڈاکٹر محمد فاروق اعظم (جنرل سکریٹری)
ادارہ تحقیق و ترقی اردو، کھیرییا ندھہ، میرجان ہاٹ، بھاگلپور (بہار)

...طریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

...ن ۱۹۹۲ء جلد ۳۲ شمارہ ۶

...رچہ 6/=
...سالانہ 55/-
...کاری تعلیمی اداروں کے لیے 75/=
...ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک) 170/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک) 320/-

اڈیٹر
شاہد علی خاں

...صدر دفتر.
...مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
...جامعہ نگر. نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
TELEPHONE 630191

...شاخیں:
...مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار. دہلی ۱۱۰۰۰۶
...مکتبہ جامعہ لمیٹڈ. پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳
...مکتبہ جامعہ لمیٹڈ. یونی ورسٹی مارکیٹ. علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

...اس رسالے میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات، نقد و تبصرہ ... ذمہ دار خود مصنفین ہیں. ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ... ہونا ضروری نہیں.

...پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے ... لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں ... چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا.

اس شمارے میں

نئی مطبوعات

تاریخ ساز توانیاں (شخصیات) محمد جاوید خالد ۴/-

سفرِ آخرت (مذہب) اُمّ مسلمہ ۵۵/-

تگ و تاز (تحقیقی مقالات کا مجموعہ) پروفیسر کامل قریشی ۱۲۵/-

تلاش و تنقید (تنقیدی مضامین) پروفیسر کامل قریشی ۱۰۰/-

وجودیت (مضامین) ڈاکٹر حنیف نعام حسین ۱۰/-

حضرت اسماعیل علیہ السلام (بچوں کے لیے) حافظ افروغ حسن ۶/-

حضرت لوط علیہ السلام (بچوں کے لیے) حافظ افروغ حسن ۶/-

گنجے فرشتے (افسانے) سعادت حسن منٹو ۵۰/-

افسانے اور ڈرامے (ڈرامے) 〃 ۳۵/-

یروشلم یروشلم (افسانے) قیصر تمکین پانچ پونڈ

جدید شعری تنقید (تنقید) ڈاکٹر صفدر ۵۰/-

چکبست کچھ باز دید کچھ پیش رفت کالی داس گپتا رضا ۵۰/-

غبارِ فکر (شعری مجموعہ) گوہر شیخ پوروی ۴۴/-

بارش کب ہوگی (بچوں کے لیے) (NBT) ترجمہ مہ جبیں اختر ۸/۵۰

پاگل موت کہیں یارپیز (بچوں کے لیے) سہیل انجم ۷/۵۰

بوڑھا فقیر (〃 〃) مصنف محمد علیم ۷/۵۰

وہ بےچارا (〃 〃) مصنف جیتندر کمار ۱۰/-

موہنی اور راکشس (بچوں کے لیے) ترجمہ فرحت عثمانی ۹/۵۰

ہڈی ٹوٹنے پر (بچوں کے لیے) جیتندر مہیشوری ۷/۵۰

سرورق: پروانہ ردولوی

مہمان مدیر
پروانہ ردولوی
د۔ گوتم راتی، مالویہ نگر
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

اشاریہ

شکوہ... خاکم بدہن ہے مجھ کو

اُردو زبان کے فروغ میں اُردو صحافت نے قائدانہ کردار ادا کیا ہے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں بھی کوئی باک نہیں کہ اگر اُردو صحافت نہ ہوتی تو اُردو ایک ترقی یافتہ زبان ہی نہ بن پاتی اور بولی ٹھولی کے مقام سے آگے نہ بڑھ سکتی۔ آزادی سے قبل اردو صحافت کے اس کردار کو تسلیم کیا جاتا تھا مگر آزادی کے بعد اُردو کے فروغ میں اردو صحافت کے قائدانہ کردار کو آج تک تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن کسی حقیقت کے تسلیم نہ کیے جانے کے معنی یہ تو نہیں ہوتے کہ اس حقیقت کا وجود ہی نہیں ہے۔ دنیا میں آج تک یہی ہوتا رہا ہے کہ جو کمزور ہوتا ہے، طاقتور اس پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ جس کے پاس اقتدار ہوتا ہے وہ اقتدار سے محروم افراد پر اپنا حکم چلانے لگتا ہے اور بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے اور چونکہ آزادی کے بعد اُردو کے ساتھ جہاں دوسرے حادثے پیش آئے۔ وہیں یہ حادثہ بھی ہوا کہ وہ کہیں منقولہ اور کہیں غیر منقولہ جائیداد بن گئی۔ اس لیے جو لوگ اس جائیداد پر قابض ہوئے انھوں نے اردو صحافت کی خدمات کو یکسر نظر انداز کر دینا چاہا اور اُسے ایک شجر ممنوعہ بنا دیا۔ انھوں نے اردو صحافت کے قائدانہ کردار کو نظر انداز کرنے کی مہم کو توانائی بخشنے کے لیے صرف یہی نہیں کیا کہ سیمیناروں، ادبی مجلسوں اور مباحثوں میں جن کو وہ اپنی توقیر کا ذریعہ سمجھتے ہیں، اُردو صحافیوں کو نظر انداز کیا بلکہ "اردو کی ادبی صحافت" کی ایک ناقص اور غیر لطیف اصطلاح بھی گھڑ لی۔ یعنی روزناموں اور ہفت روزہ اخباروں کو ان ماہناموں سے کمتر درجہ دے دیا جو سرکاری امداد سے شائع ہوتے ہیں اور جن میں تحقیق کے نام پر غالب کے ازاربند اور انگرکھے تک کو موضوعِ بحث بنایا جاتا ہے کیونکہ اب تحقیق ترقی کی اتنی منزلیں طے کر چکی ہے کہ اس کے پاس اس طرح کے موضوعات کے علاوہ کچھ اور باقی ہی نہیں بچا ہے۔ ہم ادبی سیمیناروں، مجلسوں، مباحثوں اور مذاکروں کے مخالف نہیں ہیں بلکہ ہمارا خیال یہ ضرور ہے کہ اردو اکاڈمیاں یا سرکاری امداد سے چلنے والے اُردو کے ادارے ان تقریبات کے ذریعے جن پر کروڑوں روپے خرچ

کیے جاتے ہیں، اُردو کے فروغ کے لیے کوئی اہم خدمت انجام نہیں دیتے۔ ان تقریبات
میں بالکل پیچھے کی نشست پر بیٹھ کر ہم نے جو کچھ دیکھا یا سُنا ہے اس نے ہمارے اس
یقین کو مزید پختگی عطا کی ہے کہ یہ سب تضیع اوقات اور اسراف بیجا ہے۔ کیونکہ ان میں اردو
والوں کی حاضری برائے نام ہی ہوتی ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ نام نہاد جاں نثار ان
اُردو، دانشور اور پروفیسر حضرات ان میں بطور سامع شریک ہونا پسند نہیں فرماتے۔ ان تقریبات
میں وہ یا تو مقالے پڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں یا نظر ہی نہیں آتے اور جو مقالے پڑھے جاتے
ہیں اُن کا معیار بھی کلاس روم میں دیے جانے والے لیکچروں جیسا ہوتا ہے۔ وہی گھسی
پٹی باتیں دوہرادی جاتی ہیں جو ہم پہلے کتابوں میں پڑھ چکے ہیں یا کہیں اور سُن چکے ہیں۔
مگر ہم یہ بات بلا استثنیٰ نہیں کہہ رہے ہیں، کبھی کبھی نئی باتیں بھی سننے کو مل جاتی ہیں اور کچھ
مقالے کافی جاندار بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔

ان سیمناروں کے انعقاد کا اعلان ہم صحافی ہی کرتے ہیں، پھر ان کی رپورٹیں بھی
ہم صحافی ہی تیار کرتے ہیں اور دو تین درجن افراد کی موجودگی میں کہی جانے والی باتوں کو
ہم صحافی ہی پورے ملک میں اور ملک سے باہر بھی لاکھوں لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ ہماری
اس خدمت کا بھی بزم مقالات میں جھوٹے نگوں کی طرح چمکنے والے مقالہ نگار حضرات صدق
دل سے اعتراف نہیں کرتے۔ اردو کے جاگیردار، وڈیرے اور خوانین ایسا کیوں کرتے ہیں۔
کیا اس لیے کہ وہ کسی احساس کمتری کے شکار ہیں یا اس لیے کہ کہیں ان کے وظیفوں
انعام و اکرام اور شہرت معکوس میں اردو کے صحافی بھی شریک نہ ہو جائیں؟ ان سوالوں
کا جواب ہمارے پاس نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ وہی لوگ ان سوالوں کا جواب دے کر
اُردو والوں کو مطمئن کر دیں جن سے ان سوالوں کا تعلق ہے۔

اُردو کے صحافیوں کو آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد بھی نہایت سخت اور اذیت
ناک حالات سے گزرنا پڑا ہے اور آج تک گزرنا پڑ رہا ہے، ان پر مقدمات قائم کیے
جاتے ہیں، ان سے ضمانتیں طلب کی جاتی ہیں، اُن کے اخباروں کو سرکاری اشتہارات نہیں
دیے جاتے اور انھیں قومی تقریبات تک سے دور رکھا جاتا ہے۔ آپ سوال کر سکتے ہیں کہ
ان باتوں کا اردو سے کیا تعلق ہے؟ غلط بات لکھی جائے گی تو مقدمہ بھی چلے گا۔ ضمانت بھی
طلب کی جائے گی۔ اشتہارات بھی نہ دیے جائیں گے اور قومی تقریبات کے دروازے بھی خدا
کے ان خطاکار بندوں پر بند کر دیے جائیں گے مگر اس بات کا اُردو سے اتنا ہی تعلق
ہے جتنا کہ بادل سے پانی کی بوندوں کا یا گرج اور چمک کا ہے۔ ایسے ایک دو نہیں بلکہ
سیکڑوں حادثات ہمارے سامنے ہیں جو اُردو کا صحافی ہونے ہی کی وجہ سے پیش آئے
ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی یا ہندی میں ایک مضمون لکھا گیا اور ہم اُردو صحافیوں نے
اُسے اُردو کے قالب میں ڈھال کر اُردو قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا تاکہ انگریزی یا
ہندی یا کسی بھی زبان میں کہی گئی اُن کے دل کی بات ان تک پہنچ جائے اب ہوتا یہ ہے کہ

وکی اس تحریر پر تو تعزیرات ہند کی مختلف دفعات جیسے دفعہ ۱۵۳ اور دفعہ ۱۲۴ کے
ں مقدمات ٹھونک دیے جاتے ہیں اور سزا بھی دے دی جاتی ہے مگر جس زبان سے
مون لیا جاتا ہے اس کے اخبار کو ہاتھ بھی نہیں لگایا جاتا۔ ہم اگر یہ دلیل عدالت
ر دیتے ہیں کہ حضور یہ تو فلاں انگریزی یا ہندی اخبار سے لے کر ہم نے اردو میں
یا ہے تو جواب ملتا ہے کہ مقدمہ آپ پر چلا ہے، ہندی یا انگریزی اخبار پر نہیں چلا ہے اس
ر سزا آپ کو دیں گے۔ اور عدالت کا یہ جواب بالکل درست بھی ہوتا ہے۔ بہر حال ہم اپنے
وع سے بھٹکنا نہیں چاہتے اور تمام معترضہ کے طور پر یہ چند باتیں کہہ کر پھر اپنے موضوع کی
ف واپس آجانا چاہتے ہیں۔ اردو صحافت نے اردو کو بولی سے زبان ہی نہیں بنایا
اس میں سیکڑوں نئے نئے لفظوں کا اضافہ بھی کیا۔ آج اردو ادب میں انگریزی یا دوسری
نوں کے جو الفاظ ہیں وہ سب اردو صحافت ہی کی دین ہیں۔ جیسے ڈکٹیٹر وغیرہ بجٹ
ٹس اسمبلی پارلیمنٹ، سپریم کورٹ، فرنٹ، سیکولرزم، بائیکاٹ وغیرہ وغیرہ۔ سب یہ الفاظ
بی کے بن چکے ہیں۔ اردو اخبارات نے ان کو اپنی خبروں میں بار بار جوں کا توں استعمال
ے اردو کے خزانہ لفظیات میں جو اضافہ کیا ہے اسے کوئی بھی حقیقت پسند شخص نظر انداز
ں کر سکتا۔ اور پھر زبان کو بنانے، سنوارنے اور نکھارنے میں بھی اردو صحافیوں کا بہت
ردول رہا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور مولانا مودودی وغیرہ
نے صحافت ہی کی راہ سے اردو کے نثری خزانہ میں بے مثال اضافہ کیا اور ان سے پہلے
یہ تمغاں اور مولانا شوکت علی، جوہر اور محمد حسین آزاد وغیرہ نے بھی صحافت کے ذریعہ نہ صرف اپنے بلکہ
سروں کے نظریات پیش کر کے علم، ادب اور سیاست کی شمعیں روشن کیں۔
ایں تو بہت دی جا سکتی ہیں مگر ہم عقلمندوں سے مخاطب ہیں اس لیے یہ اشارے ہی
نی ہیں۔ عام طور پر اردو کے صحافی کو مترجم یا رپورٹر سمجھا جاتا ہے۔ وہ انگریزی اور دوسری
بانوں سے خبروں کا بامحاورہ ترجمہ اور رپورٹنگ تو کرتا ہی ہے کہ یہ اس کا بنیادی کام
ے لیکن ترجمہ کو اپنی ذہنی کاوشوں سے بہترین نثر کا نمونہ بھی بناتا ہے۔ ہزاروں صفحات میں ور
ملوں کو پڑھتا ہے اور زبان و املا کی غلطیاں درست کر کے بالواسطہ طور پر مراسلہ نگاروں
ر مضمون لکھنے والوں کو تعلیم دیتا ہے۔ جب مراسلہ نگار یا مضمون نگار اخبار میں چھپے ہوئے
پنے مراسلہ یا مضمون کو دیکھتا ہے تو اسے خود بخود اپنی کوتاہیاں اور غلطیاں یاد آجاتی ہیں اور
ندہ اُن سے گریز کرتا ہے۔ صحیح املا لکھتا ہے۔ محاوروں کا صحیح استعمال کرتا ہے۔ جملوں
ں صحیح نشست و برخاست سے آگاہ ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ ایک اچھا مضمون نگار یا مراسلہ نگار
ن جاتا ہے۔

اردو کے صحافی صرف سیاسی تحریکوں ہی کو آگے نہیں بڑھاتے بلکہ ادبی تحریکوں اور
ء کوں کے ذریعہ بھی اپنی زبان اور ادب کی خدمت کرتا ہے۔ وہ ادب کے مختلف شعبوں کو
نی دیتا ہے۔ فکاہیہ یا طنزیہ اور مزاحیہ کالموں کے ذریعہ ادب کی اس صنف کو اردو صحافت نے

جس قدر بلند معیار عطا کیا ہے وہ کسی اور ذریعہ سے نہیں ہوسکا۔ زیادہ دور نہ جائیے منشی سجاد حسین اور چودھری محمد علی ردولوی حاجی لق لق اور مُلّا موزی یا اُن کے دور کے دوسرے مزاح اور طنز نگاروں کا زمانہ بہت دور جاچکا ہے آزادی کے بعد اس میدان میں جن لوگوں کا سکّہ چلا اُن میں تخلص بھوپالی، مجید لاہوری، علّامہ درپن، شوکت تھانوی، ابراہیم جلیس، مجیب سہالوی، احمد جمال پاشا، فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین، مشتاق احمد یوسفی، لئیق فیض آبادی، ظہیر ناصر وغیرہ وغیرہ کے سکّے صحافت کی ٹکسال ہی نے ڈھالے ہیں۔ آج کل مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک تقریر کو اردو کی بہترین نثر قرار دیا جاتا ہے۔ مرحوم نے یہ تقریر دہلی کی جامع مسجد میں تقسیم ملک کے صرف دو ماہ بعد اکتوبر ۱۹۴۷ء میں کی تھی۔ یہ تقریر وہ لکھ کر نہیں لائے تھے۔ اس زمانے میں اُردو شارٹ ہینڈ بھی نہیں تھی اور ٹیپ ریکارڈروں کا چلن بھی نہیں تھا۔ اُردو کے ایک صحافی ہی نے مولانا آزاد کی اس یادگار تقریر کو بہترین نثر کا نمونہ بنایا۔ ہمارے محققین آج تک یہ تحقیق نہ فرماسکے کہ مولانا آزاد کی یہ تقریر کس نے لکھی تھی۔ وہ گم نام صحافی کوئی بھی رہا تھا اردو ہی کا صحافی اور جب تک اُردو کا نثری ادب زندہ رہے گا اس وقت تک اردو صحافت کا یہ کارنامہ بھی زندہ رہے گا۔ اُردو صحافت نے اردو زبان کے ادبی خزانے میں سفرناموں، موضوعاتی نظموں، افسانوں، قصّوں کہانیوں اور حکایتوں، سیاسی مقالات، پارلیمانی اور قانونی مباحثوں جاسوسی اور کرائم لٹریچر عصری تاریخ طبّی اور سائنسی موضوعات، الغرض تمام اصناف ادب اور اُن کی ذیلی اصناف کی دولت بے بہا کا اضافہ کیا ہے۔ اگر کوئی آزادی کے بعد ہی کی اُردو صحافت کی اِن خدمات کا دیانتداری سے جائزہ لینے کی کوشش کرے تو اُس کی یہ کوشش بھی اُردو ادب کی بہت بڑی خدمت سمجھی جائے گی۔ اور اردو کے ادبی خزانے میں انمول اضافہ بھی قرار پائے گی۔ اردو کے صحافیوں کو بے وقعت اور ذلیل و خوار ٹھہرانے کے لیے اکثر اُردو کے نام نہاد دانشور یہ کہتے ہیں کہ اُردو کے اخبارات چائے خانوں، ہیر کٹنگ سیلونوں، دینی مدرسوں اور گھٹیا درجہ کے گھرانوں میں پڑھے جاتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ اُن کا یہ تبصرہ صحیح بھی ہو۔ بلکہ ہم اسے صحیح ہی مان لیتے ہیں لیکن اس میں اردو کے غریب صحافی کا کیا قصور ہے۔؟ جب اُردو زبان ہی اُن لوگوں کی ہے جو چائے خانوں، ہیر کٹنگ سیلونوں، دینی مکتبوں اور گھٹیا درجہ کے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں تو اس کا قاری بھی گھٹیا ہی درجہ کا ہوگا۔ اگر پورے ہندستان کی یونیورسٹیوں سے ہر سال اردو کے ایک ہزار گریجویٹ یا پوسٹ گریجویٹ پیدا ہوجاتے اور یہ لوگ اردو اخبارات کو پڑھنا کسر شان نہ سمجھتے تو ہم اس اعتراض کو باوزن مان لیتے مگر صورت حال یہ ہے کہ گھٹیا درجہ کے گھرانوں کے ہزاروں بچے اور بچیاں ہی اُردو کے ذریعہ تعلیم کو گلے سے لگائے ہوئے ہیں اور اعلا خاندان کے لوگ جو اردو کی روٹیاں توڑتے ہیں اور اردو میڈیم اسکولوں کے قیام کے لیے بیانات جاری کرتے ہیں اپنے بچّوں کے گلے میں اردو ذریعہ تعلیم کا طوق ڈالنا پسند نہیں کرتے۔ پھر اُن کے تصوّر کا اردو کا شریف اور اعلا درجہ کا قاری کہاں

سے آنے گا۔

کسی یونی ورسٹی سے بیس اور کسی سے پچیس یا اس سے بھی کم اردو گریجویٹ ہر سال نکلتے ہیں جبکہ ان پر کروڑوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔ ادھر ٹاٹ پر بیٹھ کر سیکڑوں دینی مکاتب اور مدارس سے ہزاروں بچے ہر سال اردو لکھنا اور پڑھنا سیکھتے ہیں وہ اس زبان کو زندہ رکھے ہوئے ہیں مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کو گھٹیا معاشرہ کی پیداوار سمجھا جاتا ہے حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ انھیں اردو کا حقیقی محافظ قرار دیا جاتا اور انھیں مجاہدین اردو کی صف اوّل میں جگہ دی جاتی آج اردو زندہ ہے تو محض ان اردو والوں اور اس اردو صحافت کی وجہ سے جنھیں یہ بے وقعت اردو والے گلے سے لگائے ہوئے ہیں نہ کہ سرکاری اکیڈمیوں کی امداد سے چھپنے والے شاعری کے ان مجموعوں و تنقیدی کتابوں کی وجہ سے جن کی قیمت لاگت سے چار گنا زیادہ ہوتی ہے اور جو چھپ تو جاتی ہیں مگر ایڑی چوٹی کا زور لگا دینے کے باوجود زندگی بھر تین دو تین سو سے زیادہ فروخت نہیں ہوتیں باقی دیمک اور سیلن، لکڑیوں اور جھینگروں کی خوراک بن جاتی ہیں۔ اردو کے فروغ میں اردو صحافت کے کلیدی، بے مثال اور قائدانہ کردار کا ذکر ہم اس مضمون میں اس لیے نہیں کر رہے ہیں کہ تمام کریڈٹ خود حاصل کر لیں اور اپنی کوتاہیوں یا کمزوریوں کو چھپالیں۔ ہم جانتے ہیں کہ صحافت کے اس مقدس پیشہ میں جو اللہ رب العزت کا محبوب ترین پیشہ ہے کیونکہ خود خدا نے صحافت کی ابتدا اپنے نبیا کے ذریعہ شک و شبہ سے بالاتر صحیفے نوع انسان کی رہنمائی کے لیے بھیج کر کی، کچھ کالی بھیڑیں بھی ہیں۔ جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں بد دیانت افراد گھس آئے ہیں۔ اسی طرح اس مقدس شعبے میں بھی ایسے لوگ ہیں جن کا نہ تو کوئی تعمیری مقصد ہے نہ یہ لوگ فن صحافت کے مقدس اصولوں کو عزیز رکھتے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر صحافت نے انسانی سوچ کو بدلا ہے۔ انقلاب یا تغیرات کے لیے معاشرے کی راہیں ہموار کی ہیں۔ تخریبی انداز فکر اور مجرمانہ ذہنیت کو تعمیری سرگرمیوں میں تبدیل کیا ہے اور انسانی حقوق کی بقا کے لیے بھی مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ اس لیے اردو صحافت کی خدمات سے چشم پوشی کرنا بہت بڑی ادبی بد دیانتی قرار پائے گی۔

یہ بات میں کسی احساس کمتری کی وجہ سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ ایک تاریخی حقیقت کے اظہار کے لیے کہہ رہا ہوں اور اس لیے بھی کہہ رہا ہوں تاکہ جو لوگ آج اردو کی قلمرو کی بادشاہت کے دعویدار ہیں وہ اعتراف حق کی جانب متوجہ ہوں۔ ہندستان میں اس اعتراف حق کی اور زیادہ ضرورت ہے کیونکہ آزادی کے بعد بدقسمتی سے یہاں اردو کے خلاف جو فضا بنائی گئی ہے اس میں اس زبان کے کسی ایک بازو ہی کے لیے خطرات پوشیدہ نہیں ہیں بلکہ اس کا پورا وجود خطرے میں پڑ چکا ہے۔

اردو صحافت اپنے وجود کے پہلے دن سے ہی تنقید نگاروں کی آنکھوں میں کانٹوں

کی طرح کھٹکتی رہی ہے۔ بزرگ صحافی گوربچن چندن کی تحقیق ہمارے اس دعوے کی تائید کرتی ہے۔ انھوں نے اپنی تازہ ترین کتاب "جام جہاں نما" اردو صحافت کی ابتدا کے سلسلہ میں اپنے ایک مضمون (مطبوعہ ہماری زبان مورخہ ۸ اپریل ۱۹۹۳) میں لکھا ہے کہ "حاصل شدہ حقائق سے پتا چلتا ہے کہ مورخوں نے اردو صحافت کی عمارت کی پہلی ہی اینٹ ٹیڑھی رکھی۔ انھوں نے اس معمار اوّل (جام جہاں نما) کو ایک بے وقعت اخبار قرار دے کر اسے ایوان صحافت ہی سے نکال دیا تھا۔"

یہ مزاج آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے اور ہمارے نقاد سنجیدگی کے ساتھ اردو بول چال کو تحریری نثر میں تبدیل کرنے کے اردو صحافت کے کارنامہ کا ذکر تک کرنا کفر سمجھتے ہیں۔ اگرچہ آغاز میں اردو کے اس کنٹری بیوشن کا فراخ دلی سے اعتراف کیا جاتا تھا خود مولوی محمد حسین آزاد نے آب حیات میں تحریر فرمایا ہے کہ "سید میر انشا اللہ خاں کے زمانہ تک انشا پردازی اور ترقی اور وسعتِ زبان اردو فقط شعرا کی زبان پر تھی جن کی تصنیف غزلیں اور قصیدے مدحیہ ہوتے تھے اور غرض ان سے فقط آتی تھی کہ امرا اور اہل دول سے انعام لے کر گزارہ کریں یا تفریح طبع یا یہ کہ ہم جلیسوں میں تحسین و آفرین کا فخر حاصل کریں۔ وہ بھی نقد نظم میں نثر کے حال پر کسی کو اصلاً توجہ نہ تھی کیونکہ کارروائی مطالب ضروری کی سب فارسی میں ہوتی تھی۔" یعنی اردو نثر اردو صحافت کی ایجاد ہے۔ مگر آج کوئی بھی اس حقیقت کا اعتراف نہیں کرتا۔ اردو کے نام پر ملنے والی تمام امداد نہیں تو کم سے کم اس کا ۹۸ فیصد حصہ اردو کے شاعروں، نقادوں اور نام نہاد محققوں کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ کچھ انعام و اکرام کی صورت میں اور کچھ تحقیق کے لیے امداد کی شکل میں اردو صحافت کے ساتھ اس ناانصافی کو اب ختم ہونا چاہیے اور جو اردو صحافی بنیاد کی اینٹ بن کر گمنامی کی زندگی گزار رہے ہیں ان کی خدمات کا بھی خاطر خواہ اعتراف ہونا چاہیے۔

علی سردار جعفری
ستا ئلی بومن جی
پیٹٹ روڈ بمبئی

راج نراج

گلشن میں بندوبست برنگ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرون در ہے آج
غالب

سنا ہے بندوبست اب سب باندازِ دگر ہوں گے
ستم ہو گا محافظ، شہر بے دیوار و در ہوں گے

سزائیں بے گناہوں کو ملیں گی بے گناہی کی
کہ فردِ جرم سے مجرم کی منصف بے خبر ہوں گے

فقط محضر شہادت دیں گے ایوانِ عدالت میں
فقط تیر و تبر، شمشیر و خنجر معتبر ہوں گے

سجائی جائے گی بزمِ عزا ایذا رسانوں سے
کفن پہنائیں گے جلاد، قاتل نوحہ گر ہوں گے

فلک تھرّا اٹھے گا جھوٹے ماتم کی صداؤں سے
یتیموں اور بیواؤں کے نالے بے اثر ہوں گے

رسن میں ماؤں اور بہنوں کے بازو باندھے جائیں گے
شہیدانِ وفا کے خوں بھرے نیزوں پہ سر ہوں گے

منایا جائے گا جشنِ مسرت سونے کھنڈروں میں
اندھیری رات میں روشن چراغِ چشمِ تر ہوں گے

جو یہ تعبیر ہو گی ہند کے دیرینہ خوابوں کی
تو پھر ہندوستاں ہو گا نہ اس کے دیدہ ور ہوں گے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

اسرارِ خودی (فراموش شدہ اڈیشن) (شعری مجموعہ) مرتبہ: شائستہ خان ۷۵
حموربی اور بابلی تہذیب و تمدّن (تاریخ) مالک رام ۷۵
جامِ جہاں نما۔ اردو صحافت کی ابتدا (اردو صحافت) گر بچن چندن ۷۵
مسلمانوں کا تعلیمی نظام (تاریخی) ضیاء الحسن فاروقی ۲۵
اردو ناول میں عورت کا تصوّر (تحقیق) فہمیدہ کبیر ۴۵
نوٹوں کی تلاش (ناول) ایاز سیوہاروی ۶۰

تاثر نہ کہ تنقید (تنقید) صدیق الرحمٰن قدوائی ۵۱/
اپنے دل کی حفاظت کیجیے (ایلوپیتھی) ترجمہ نذیر الدین مینائی ۲۵/
بہ صورت گر کچھ خوابوں کے (انٹرویوز) طاہر مسعود ۶۶/
مرضیات (طب) حکیم نعیم الدین زبیری ۵۱/
بانگِ درا (شعری مجموعہ، طلبہ ایڈیشن) اقبال ۹
بالِ جبریل (شعری مجموعہ) 〃 〃 ۶/
ضربِ کلیم مع ارمغانِ حجاز (اُردو ۔ لطیف) (شعری مجموعہ) 〃 〃 ۶/
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی (ناول) کشمیری لال ذاکر ۴۸/
گوشے میں قفس کے (طنزیہ مزاحیہ) دلیپ سنگھ ۴۵/
سحر کے پہلے اور بعد (جگ بیتی) سعید الظفر چغتائی ۵۱/
افکارِ اقبال (اقبالیات) محمد عبد السلام خاں ۱۲۵/
فرمان فتح پوری (شخصیت اور ادبی خدمات) مرتبہ خلیق انجم ۲۵
تذکرہ ماہ و سال (تذکرہ) مالک رام ۱۲۵/
تحقیق نامہ (تحقیق) مشفق خواجہ ۱۲۵/
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان (مذہب) حکیم محمود احمد برکاتی ۴۵/
خواب اور خلش (شعری مجموعہ) آل احمد سرور ۶۶/
سفر (ناول) رابعہ تبسم ۲۷/
تحریریں (تنقید) ڈاکٹر اسلم پرویز ۵۱/
پہچان اور پرکھ (تنقید) پروفیسر آل احمد سرور ۵۱/
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم (تحقیق) ڈاکٹر سلامت اللہ ۵۱/
پت جھڑ کی آواز (نیا اڈیشن) (افسانے) قرۃ العین حیدر ۷۵/
اقبال کا نظریہ خودی (تحقیق) عبد المغنی ۱۵۰/
سمندری خزانہ (ناول) ماریہ رحمان ۲۷/
جدید افسانہ اور اس کے مسائل (تنقید) وارث علوی ۳۶/
فی الحقیقت (طنز و مزاح) یوسف ناظم ۴۵/
مٹی سے ہیرا (ناولٹ) سید مقبول احمد ۱۰/
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو (ناولٹ) صغرا مہدی ۲۴/
الجھاوے (ڈرامے) ابراہیم یوسف ۵۱/
غبارِ منزل (شعری مجموعہ) غلام ربانی تاباں ۴۵/

معین احسن جذبی
"دوزاں" لین نمبر ۲
سرسید نگر - علی گڑھ ۲۰۲

سنی ہیں میں نے بھی کچھ سوز و ساز کی باتیں
صدائے نے میں دلِ نے نواز کی باتیں

وہ دل کے داغوں سے بھولی کہانیاں کہنا
وہ چاند تاروں سے راز و نیاز کی باتیں

چمن میں پھولوں سے کچھ ذکر عارضِ خوباں
طویل راتوں سے زلفِ دراز کی باتیں

وہ اپنی جلتی پگھلتی ہوئی سی شمع کے ساتھ
شبِ فراق غمِ جانگداز کی باتیں

بڑی لطیف فضاؤں میں لے گئی ہیں مجھے
کبھی کبھی وہ کسی دلنواز کی باتیں

کبھی زمیں سے کبھی آسماں سے برگشتہ
کبھی کسی سے نشیب و فراز کی باتیں

سموم جیسے چمن میں چلے بہ رنگِ نسیم
نیاز والوں سے اک بے نیاز کی باتیں

نہ جانے کیوں اسے آتا ہے دشمنوں پہ ترس
سمجھ میں آئیں نہ قلبِ گداز کی باتیں

کسے دکھائیے کیا تھے مجاز کے شب و روز
کسے سنائیے کیا تھیں مجاز کی باتیں

میں ایک شاعرِ خود ناشناس ہوں جذبی
کہاں سے لاؤں میں دانائے راز کی باتیں

پروفیسر گوپی چند نارنگ

(گذشتہ سے پیوستہ)

مشرقی شعریات اور ساختیاتی فکر

علمِ معانی و بلاغت و بیان

علومِ شعریہ کی اکثر کتابوں میں 'علمِ معانی' کو ثانوی حیثیت حاصل ہے اور بعض مصنفین نے تو سرے سے الگ سے بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ بحر الفصاحت جو اردو میں علومِ شعریہ کی جامع ترین بلکہ قاموسی کتاب ہے، اس میں سب سے پہلا جزیرہ عروض کے بیان میں ہے جس میں چھ شہروں کا احوال ہے دوسرا جزیرہ قافیے کے بیان میں ہے جس کا حال پانچ شہروں میں آیا ہے۔ علمِ معانی کی بحث کو تیسرے جزیرے میں جگہ ملی ہے، اور یہ جزیرہ بھی اصلاً فصاحت و بلاغت کے بیان میں ہے۔ اس میں ایک شہر علمِ معانی کے بیان میں، دوسرا علمِ بیان کے ذکر میں اور تیسرا علمِ بدیع کے احوال میں ہے۔ غرض تقریباً ساڑھے تین سو صفحوں کی عروض و قافیہ کی تکنیکی بحثوں کے بعد علمِ معانی کا ذکر آیا ہے۔ علمِ معانی کی اس ثانوی حیثیت کی بڑی وجہ ایک تو مشرقی روایت میں عروض و آہنگ کے تکنیکی مسائل کا غلبہ ہے، اور دوسرے یہ کہ از روئے روایت علمِ معانی کے تمام مضمرات کی بحث علمِ بلاغت کا حصہ رہی ہے۔ البتہ بعض علما نے علمِ معانی کو مفرداتِ الفاظ تک محدود رکھا ہے اور کلمے کے معنی یا شعری معنی کی بحثوں کو علمِ بیان و بدیع میں پھیلا دیا ہے۔ بہرحال اتنی بات ظاہر ہے کہ علمِ معانی کے مباحث کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جو اہمیت عروض و آہنگ یا بلاغت و بدیع و بیان کو حاصل رہی ہے۔ اس عدمِ توازن سے کئی قباحتیں در آئی ہیں۔

مزید گفتگو سے پہلے علمِ معنی کی بعض تعریفوں کو نظر میں رکھنا ضروری ہے:

'آں علمے ست کہ بحث می شود در آں از احوال لفظ از حیث مطابقہ آنہا بہ مقتضائے مقام' (... ...)

نجم الغنی کا ارشاد ہے:

'علمِ معانی ایسے قواعد کا نام ہے جن سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ لفظ مقتضائے حال کے مطابق ہے یا نہیں۔ غایت اس کی یہ ہے کہ اگر ان قواعد پر لحاظ رکھیں تو لفظ کے معنی مراد لینے میں خطا و غلطی واقع نہ ہوگی' (بحر الفصاحت)

سجاد مرزا بیگ کی تعریف قدرے مدلل ہے:

'وہ علم جو کسی امر کو مقتضائے حال کے موافق بیان کرنا سکھاتا اور ایسی غلطیاں کرنے سے بچاتا ہے جس سے دلالتِ مطابقی کے موافق کلام کا مفہوم سمجھنے میں دقت نہ ہو، علمِ معنی کہلاتا ہے' (تسہیل البلاغت)

اس بیان میں دلالتِ مطابقی کا تصور جس کو دلالتِ وضعی بھی کہا ہے، اہم ہے۔ اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

'جب الفاظ اپنے حقیقی اور وضعی معنوں میں اس طرح استعمال ہوں کہ بذاتہ وہ ان اشیا پر دلالت کریں جن کے واسطے وہ وضع کیے گئے ہیں تو اس کو حقیقتِ لغوی اور اس دلالت کو وضعی اور مطابقی کہتے ہیں' (تسہیل البلاغت)

پس واضح ہوا کہ از روئے روایت معانی کا تعلق ان چیزوں سے ہے

۱) مفرداتِ الفاظ کے صحیح معانی اور ان کی لغوی دلالتیں
۲) وضعی اور مطابقی دلالتیں جو لغت نے طے کر دی ہیں
۳) مجازی دلالتیں یا الفاظ (یا کلام کا وہ مفہوم جو لغت کے دائرے سے خارج ہو) مندرجہ بالا کی روشنی میں علمِ معانی کے دائرے میں شامل نہیں

مندرجہ بالا تنقیحات میں شق تین بالخصوص نگاہ میں رہے، اس سے

آئندہ بحث میں مدد ملے گی ۔ حافظ سید جلال الدین بھی دلالت کی دو قسموں کا ذکر کرتے ہیں :

> ' لفظی و غیر لفظی ۔ دلالتِ لفظی کو دلالتِ وضعی بھی کہتے ہیں اس میں کوئی لفظ اسی معنی پر دلالت کرتا ہے جو لغت میں اس کے لیے مخصوص ہے ۔ جب لفظ دلالتِ وضعی کے علاوہ کسی اور بات پر دلالت کرتے ہیں ، اور عقل حَکَم ہوتی ہے تو دلالت کی صورت عقلی ہو جاتی ہے ۔ علمِ بیان کا موضوع دلالتِ عقلیہ ہے '
>
> (نسیم البلاغت)

گویا مشرقی شعریات میں دلالتیں دو ہیں :

۱) دلالتِ لفظی جس کو دلالتِ وضعی اور دلالتِ مطابقی بھی کہتے ہیں ۔ یہ دلالتِ لغوی ہے ۔

۲) دلالت غیر لفظی : جب لفظ دلالتِ وضعی کے علاوہ کسی اور بات پر دلالت کرے ، یہ دلالتِ عقلیہ ہے ۔ برعکس دلالتِ اول کے یہ دلالتِ غیر لغویہ ہے ۔

غور طلب ہے کہ علمِ معنی کی اس بحث میں کیا ہم علمِ بیان کی حدود میں داخل نہیں ہو گئے ؟ نسیم البلاغت کے اقتباس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ دلالتِ عقلیہ علمِ بیان کا موضوع ہے ۔ گویا علمِ معنی کی تعریف علمِ بیان کی مدد کے بغیر قائم نہیں ہو سکتی یا دونوں ایک دوسرے کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں ، تو پھر دونوں میں فرق کیا ہے ۔ یہ بھی غور طلب ہے کہ دلالتِ وضعی (یا دلالتِ لغوی) اور دلالتِ غیر وضعی (یا دلالتِ عقلیہ یا دلالتِ غیر لغوی) کی جو بات کی جا رہی ہے کیا یہ وہی CUT نہیں جو از روئے علمِ بیان حقیقت اور مجاز میں ہے اور بغیر حقیقت کی بحث کے زبان میں مجاز قائم ہی نہیں ہو سکتا ۔ گویا مشرقی شعریات کی اس روایت میں علمِ معنی وہی ہے جو علمِ بیان میں حقیقت کا یا دلالتِ وضعی کا بیان ہے ۔ اگر کوئی فرق ہے اور وہ ایسا فرق نہیں تو وہ یہ کہ علمِ معنی مفرداتِ الفاظ سے بحث کرتا ہے اور علمِ بیان میں مفردات کی قید نہیں ، گویا علمِ بیان جملہ کلام کو حاوی ہے ۔ اس

دنیا کے تضادات زبان کی نوعیت و ماہیت کی بحث کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں کہ نظر انداز کرنے سے در آتے ہیں۔ ساختیاتی تعریف بھی زبان کے ان بنیادی ... کو لسانی لغوی اور غیر لغوی کو تسلیم کرتی ہے ملاحظہ ہو روس جب ... کی بحث، لیکن وضعی و عقلی یا حقیقی و مجازی سے پہلے یہ بھی ... ہے کہ زبان میں حقیقی یا فطری کچھ بھی نہیں دوسرے لفظوں میں ... سب کچھ مانا ہوا ... ہے۔ اس سے حقیقی و مجازی کا فرق بھی فریب نظر ہے۔ زبان میں سب کچھ مجازی ہوتا ہے۔ مشرقی روایت قطع نظر عبدالقادر جرجانی کے خیالات سے زبان کو حقیقت اور مجاز میں تقسیم کرتی ہے، جب کہ زبان کلیتہً مجاز ہے۔ دلالت عقلیہ (غیر لغوی) تو مجاز ہے ہی، دلالتِ حقیقی (لغوی) بھی مجاز ہے اس کی مزید وضاحت آگے آتی ہے۔

اوپر علم معانی کی بحث میں ہم یہاں تک پہنچے تھے کہ علم معانی میں دلالتِ وضعی کی بحث وہی ہے جو علمِ بیان میں دلالتِ حقیقی کی بحث ہے۔ لیکن علم معانی ہو یا علمِ بیان یہ دونوں آتے ہیں بلاغت کے تحت۔ گویا مشرقی نظریات میں متاخرین علمائے شعریہ نے بلاغت کو فصاحت کے ساتھ جوڑ کر دونوں تصورات میں خلط مبحث کر دیا۔ ایسا غالباً شوقِ قافیہ پیمائی اور عبارت آرائی کی وجہ سے بھی ہوا، اور بالعموم فصاحت و بلاغت کا ذکر ایک سانس میں کیا جانے لگا اور دونوں کو لازم و ملزوم سمجھا گیا۔ نجم الغنی نے بحرالفصاحت کے تیسرے جزیرے کا نام ہی فصاحت و بلاغت رکھا ہے جس کے تحت علمِ معانی اور علمِ بیان اور علمِ بدیع کو شہر در شہر اور چمن در چمن آراستہ کیا ہے۔ لیکن درحقیقت فصاحت خوبی ہے زبان کی (جس کا تعلق اتنا شعریات سے نہیں جتنا جمالیات سے ہے) جب کہ بمقابلہ فصاحت بلاغت تفاعل ہے جملہ شعری زبان کا جو شعریات کی بنیاد ہے۔ یعنی بلاغت کو فصاحت لازم ہے لیکن فصاحت کو بلاغت لازم نہیں۔ اس خلط مبحث کو سب سے پہلے دور کیا دتاتریہ کیفی نے منشورات میں غالباً اُس نئی شعریات کے تحت جو نئے اثرات جذب کر رہی تھی۔

زیادہ تر اسی نوعیت کی ہیں :

" بلاغت سے مراد بلاغت المعنی، یعنی معنی کو جوں کا توں ادا کرنا'
دل کی بات پوری سامع کے دل تک پہنچا دینا تاکہ کلام کا جو اثر
ہونا چاہیے پورا پورا پیدا ہو۔"

(مراۃ الشعر ص ۸۷)

دیکھا جائے تو معنی کو 'جوں کا توں' ادا کرنا معنی کو محدود کرنا ہے جب کہ بلاغت کا تفاعل معنی کی تمام شکلوں کو حاوی ہے، اُن معنی کو بھی جو 'جوں کے توں' ادا کیے جاتے ہیں اور اُن معنی کو بھی جو معنی در معنی کے کھیل سے پیدا ہوتے ہیں۔ نیز یہ بھی مبہم ہے کہ 'اثر' سے مراد 'جمالیاتی اثر' ہے یا 'معنوی اثر'؛ قطع نظر اس الجھاؤ سے بلاغت کی جتنی تعریفیں ملتی ہیں دراصل ان کی تہ میں یہ تصور جاگزیں ہے کہ معنی محدود طور پر نہیں، بلکہ بلاغت سے مراد پوری زبان کا معنیاتی تفاعل ہے۔

بعد میں محتاط ماہرین میں یہ روشس عام ہوگئی کہ علومِ شعریہ کی بحث میں سرچشمۂ بیان بلاغت اور فقط بلاغت ہے اور ساری بحثوں کا نقطۂ آغاز بلاغت ہی ہے۔ اب مندرجہ بالا بحث کو ایک شجرہ کی صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ عابد علی عابد نے اسے البیان میں شجرۂ ارکانِ مجاز کہا ہے، لیکن البدیع میں اسے لفظ سے شروع کیا ہے، یہی بحث اسلوب میں بھی اٹھائی ہے لیکن معنیٔ غیر لغوی کو معنیٔ وضعی یا دلالتی کہہ کر خلط ملط بھی کر دیا ہے۔ (یہ کتابیں چوں کہ پس از مرگ شائع ہوئیں، مباحث میں ایسے اسقام کا در آنا فطری تھا)۔ بہرحال بعد از ترمیم و اضافہ شجرہ درج ذیل ہے۔ اس سے مشرقی شعریات کا پورا فریم نظر میں رہے گا اور ساختیاتی شعریات سے ربط پیدا کرتے ہوئے مطالعے اور مراجعت میں بھی آسانی ہوگی۔

علمِ بیان کی تعریف بالعموم یہ کی جاتی ہے کہ 'علمِ بیان وہ علم ہے جو مجاز یعنی (۱) تشبیہ (۲) استعارہ (۳) مجازِ مرسل اور (۴) کنایہ سے بحث کرتا ہے'، اس شجرے کے پیشِ نظر پہلے تو اس بات کو صاف کرلیا جائے کہ تشبیہ کو اگرچہ مجاز کے تحت درج کیا جاتا ہے لیکن اصلاً تشبیہ مقدمہ

ہے استعارے کا جو مجاز کی ایک قسم ہے ' (بحرالفصاحت) مصنف دبیرِ عجم نے بھی اس بات سے انکار کیا ہے کہ تشبیہ مجاز میں داخل ہے۔ عابد علی عابد کا بھی خیال ہے کہ 'تشبیہ کسی طرح بھی مجاز میں داخل نہیں ' (البیان) مجاز کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ الفاظ یا کلمات اپنے معنیِ غیر لغوی میں استعمال ہوتے

ہیں، اور اس استعمال پر ایک قرینہ موجود ہوتا ہے یعنی معنیِ لغوی اور معنیِ مجازی میں ایک نسبتِ خاص بھی متعین ہوتی ہے۔ اس کے برعکس تشبیہ میں الفاظ اپنے لغوی معنی کا دامن کہیں نہیں چھوڑتے۔ چناں چہ تشبیہ مجاز نہیں بلکہ مجاز پیدا کرنے کا مقدمہ ہے یعنی جب الفاظ کے لغوی اور مجازی معنی میں تشبیہ کا رشتہ ہو تو اسے استعارہ کہتے ہیں۔

تشبیہ کی اس بحث سے یہ دلچسپ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اگر دلالتِ حقیقی یا دلالتِ وضعی یا دلالتِ مطابقی سے جو غلط توقعات پیدا ہوتی ہیں اور جس طرح یہ اصطلاحیں زبان کے اساساً مجاز ہونے کے معارض ہیں، اگر ان سے قطع نظر کیا جائے اور ان سب کو فقط 'معنیِ لغوی' کہا جائے' تو معنیِ لغوی یعنی اصطلاحی معنیِ غیر مجازی اور اصطلاحی معنیِ مجازی کے تفاعل میں جو فرق ہے وہ کم و بیش وہی ہے جو ساختیاتی شعریات میں زبان کی افقی اور عمودی جہت میں ہے (ملاحظہ ہو بحث شعریات اور ساختیات) یعنی افقی جہت پر لفظ صرفی و نحوی رشتوں کے انسلاک سے آتے ہیں اور ان میں لازمیت ہے۔ بالعموم یہ لغوی معنی کی جہت ہے، اور عمودی جہت پر لفظ تبادل کے طور پر آتے ہیں یعنی یہ مجازی معنی کی جہت ہے۔ لغوی معنی سے مراد وہ معنی ہیں جو اصلاً تو مجاز تھے لیکن چلن سے مجاز نہیں رہے اور ان کی حکم لغت ہے؛ اور مجازی معنی سے مراد مجاز کی وہ شکلیں ہیں جو مشرقی شعریات کی رو سے مجاز ہیں اور جنھیں اصطلاحاً مجاز کہا ہے اور وہ شکلیں بھی جو اس کے دائرے سے باہر ہیں۔ ان سب کی حکم لغت نہیں ہے۔ اور شعری بیان کی جان یہی شکلیں ہیں یعنی مجاز۔

اب یہ دیکھیے کہ اس کا احساس مشرقی روایت میں مل جاتا ہے اگرچہ خال خال:

"کسی تشبیہ پر غور کریجیے، کبھی الفاظ کے معانی مجازی پیدا نہیں ہوں گے، ہمیشہ الفاظ کے معانی کا فیصلہ لغت پر ہوگا۔ فارسی میں تو یہ امتیاز ایک بڑی مشہور مثال سے بتایا جاتا ہے؛ مثلاً "زید شیر است" یعنی زید شجاعت، تہور، بہادری میں شیر ہے۔ لیکن دیکھیے شیر کے معنی وہی رہے جو لغت میں ہیں۔ البتہ ہم نے زید اور شیر میں ایک مشابہت

پیدا کر دی، یہی تشبیہ ہے۔ لیکن جب ہم کہتے ہیں کہ "شیرے دیدم کہ تیر می انداخت" (میں نے ایک شیر دیکھا جو تیر چلاتا تھا) تو یہاں مراد شیر نہیں ہوتی بلکہ ایک مردِ بہادر ہوتا ہے۔ لغت قمری کے طوق کی طرح حلقۂ بیرونِ در ہو جاتی ہے اور فیصلہ قرینے اور ذوقِ سلیم پر منحصر ہو جاتا ہے کہ شیر تو تیر نہیں چلایا کرتا۔ اس لیے اگر کوئی تیر چلانے والا شیر دیکھا تو یقیناً مردِ شجاع مراد ہوگی، یعنی معانیِ مجاز مراد ہوں گے کیوں کہ لغت یہاں شیر کا مطلب شیر ہی بتائے گی، مردِ شجاع نہیں بتائے گی۔ آپ اچھی سے اچھی تشبیہات پر غور کر لیجیے، معانی کا فیصلہ لغت کے پاس محفوظ ہوگا۔ مجاز تبھی پیدا ہوگا جب آپ لغت کے فیصلوں سے ماورا ہو جائیں گے کہ یہی ماورائیت جانِ شعر ہے۔"

(اسلوب ص ۱۹۱)

بنواری لال شعلہ کے ان اشعار کی عابد علی عابد نے خوب داد دی ہے:

کدھر ہے ساقیٔ بزمِ شبِ ماہ
کُھلا بندِ نقابِ حسنِ دل خواہ
شبِ مہتاب فرشِ چادرِ نور
بیاباں در بیاباں جلوۂ طور
مجلیٰ نور تھا ہر اک طبق میں
زمیں لپٹی تھی چاندی کے ورق میں
شکن موجِ ہوا سے آسماں میں
جھلک سیماب کی موجِ رواں میں
یہ آب و تاب تھی انوارِ مہ میں
جھلکتی تھی زمیں جمنا کی تہ میں
بھرا تھا نورِ مہ سے تا بہ ماہی
بنی تھی چاندنی ظلِ الٰہی
قیامت زا عجب اندازِ نے تھا
لبِ جاں آفریں دم سازِ نے تھا

ذرا یہ تبصرہ ملاحظہ ہو:

"ایک ہندو کی زبان سے یہ شعر (بھرا تھا نور ...) تعجب انگیز معلوم ہوتا ہے۔ حیرت اس بات پر نہیں کہ اسے فنکاری کا اتنا اونچا مقام کس طرح حاصل ہوگیا کہ انشا پردازی کسی مذہب کی پابند نہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ اس شعر میں جو فقہی اور علم الکلام سے مربوط تصورات پوشیدہ ہیں ان پر عبور حاصل کرنے کے لیے شاعر کو کن مرحلوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ ملحوظِ خاطر رہے کہ سری کرشن کے رہس کا ذکر ہے اور وہ خود ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق خدا کا اوتار ہے۔ بہ الفاظِ دیگر ظلِ الٰہی ہے، اب مسلمانوں کا علم الکلام خدا کی وحدتِ صرف، وحدتِ مطلق، وحدتِ بحت اور وحدتِ محض کے متعلق یہ کہتا ہے کہ یہ ایسی کیفیت ہے جو صرف منفی طریقے پر سمجھائی جاسکتی ہے۔ مثلاً یہ کہ خدا کی وحدت، وحدت در کثرت بھی نہیں یا وحدتِ تناسب بھی نہیں یا وحدتِ عددی بھی نہیں۔ پھر یہ وحدتِ عددی خارجاً متشکل نہیں ہوتی، ماسوا اس کے کہ جن انبیار و اولیار کو کچھ جلوہ نظر آیا انھیں نور کے کرشمے تو ضرور نظر آئے۔ اس اعتبار سے چاندنی کے نور کو ظلِ الٰہی کہنا کتنی حیرت انگیز بات ہے۔"

(البیان ص ۱۸۹۔ ۱۹۰)

لیکن یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ شعلہ کے یہاں الفاظ کے لغوی معنی مراد ہیں اور عالم صرف تشبیہ کا پیدا ہوا ہے جو ذریعۂ حصولِ مجاز ہے۔ (تشبیہ مقدمہ ہے استعارے کا جو مجاز ہے) اور اصلاً مجاز ہی فنکار کا محرمِ راز ہے جس کی ضَو سے شعر کا پیرہن جگمگاتا ہے اور الفاظ لَو دینے لگتے ہیں، غالب:

تماشائے گلشن تمنائے چیدن
بہار آفرینا گنہگار ہیں ہم

ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل ناآشنا

گل کھلے، غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی
سرخوشِ خواب ہے وہ نرگسِ مخمور ہنوز

نے سرو برگِ آرزو، نے رہ و رسمِ گفتگو
اے دل و جانِ خلق تو ہم کو بھی آشنا سمجھ

(اسلوب ص ۱۹۰، ۱۹۸)

پس جب معلوم ہے کہ تشبیہ میں معنیِ لغوی مراد ہیں، اور از رو ئے روایت حقیقت اور مجاز میں مابہ الامتیاز بھی معنیِ لغوی ہی ہیں، اور علمِ معنی کا موضوع بھی معنیِ لغوی ہی ہے تو یہ تینوں ایک ہوئے بصورتِ حقیقت جو قائم ہے معانیِ لغوی پر۔ باقی جو کچھ ہے یعنی (استعارہ، مجازِ مرسل، کنایہ) فقط وہ مجاز ہے۔ گویا جیسے کہ اشارہ کیا گیا زبان دو طرح کی ہوئی، مجازی اور غیر مجازی۔ غیر مجازی زبان حقیقی ہے (فطری ہے) مبنی بر دلالتِ وضعی یا مطابقی یعنی لغت میں جو کچھ ہے وہ دیا ہوا ہے اور قائم بالذات ہے اس لیے حقیقی ہے، باقی جو کچھ ہے وہ چوں کہ عقلی رشتوں سے پیدا ہوتا ہے اور قائم بالغیر ہے اس لیے مجازی ہے۔ لغوی اور مجازی CUT کی توثیق تو سوسیئری فکر سے بھی ہوتی ہے جیسا کہ اشارہ کیا گیا لیکن زبان کا پورا نظام چوں کہ ARBITRARY من مانا ہے اور از روئے سوسیئر زبان میں پہلے سے دیا ہوا کچھ بھی نہیں۔ چناں چہ لغت میں جو کچھ بھی ہے، اس میں بھی قائم بالذات کچھ بھی نہیں۔ ہر ہر معنی قائم بالغیر ہے۔ زبان میں کوئی ایسا معنی ثابت نہیں جو قائم بالذات ہو۔ ہر معنی زبان کے نظام کے اندر زبان کے نظام کی رو سے اور اس کے حوالے سے قائم ہوتا ہے۔ معانی چوں کہ فطری نہیں ہیں اور از روئے نظام طے پا گئے ہیں، اس لیے اصلی یا حقیقی ہرگز نہیں ہیں۔ معانی اس لیے بھی حقیقی نہیں ہیں کہ لفظ حقیقت کو نہیں یعنی شے کو نہیں بلکہ حقیقت یا شے کی ذہنی تجرید کو پیش کرتے ہیں۔ دلالتِ وضعی کا تصور بھی منطقی نہیں، کیوں کہ یہ دلالتِ لغوی پر قائم ہے جس وضع کو دیا ہوا تصور کیا گیا ہے جب کہ زبان میں کچھ بھی دیا ہوا، پہلے سے طے شدہ یا وضع شدہ نہیں ہے۔ ہم دن کہہ کر دن، رات کہہ کر رات، شجر کہہ کر شجر یا پتھر کہہ کر پتھر مراد لیتے ہیں، تو اس لیے نہیں کہ لفظ دن یا رات یا شجر یا پتھر میں ایسے خواص موجود ہیں جن سے معنیِ حقیقی پیدا ہوں بلکہ ان کے یہ معنی زبان کے نظام کے اندر طے

پا گئے ہیں۔ یعنی لفظ میں اور شے میں کوئی فطری مطابقت نہیں ہے، یہ مطابقت فرض کر لی گئی ہے۔ اس لیے معنیٔ لغوی بھی معنیٔ حقیقی نہیں بلکہ از روئے سوسیئر معنیٔ مجازی ہی ہیں۔ زبان میں جو کچھ ہے مجاز ہے حقیقت کچھ بھی نہیں۔ اصطلاحاً جن معنی کو مجازی کہا گیا ہے (استعارہ، مجازِ مرسل، کنایہ) ان میں قرینہ عقلی ہوتا ہے لیکن لاتعداد دلالتیں ایسی ہیں جن میں کوئی قرینہ نہیں ہوتا۔ سو اصطلاحاً جس کو مجاز کہا ہے وہ لامحدود نوعیت کا مجاز ہے اور جس کو مجاز نہیں کہا وہ محدود نوعیت کا مجاز ہے۔ زبان محدود و لامحدود مجاز کا کھیل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو معنی خیزی کے عمل میں لغوی معنی کے مقابلے میں تشبیہ اور تشبیہ کے مقابلے میں استعارہ / مجازِ مرسل / کنایہ اور ان کے علاوہ پیکر، علامت وغیرہ نسبتاً زیادہ وسیع، زیادہ تہ دار، زیادہ موثر اور زیادہ زرخیز نہ ہوتے۔ البتہ لغوی معانی مجاز اس لیے نہیں معلوم ہوتے کہ کثرتِ استعمال اور چلن سے ان کے معنی متعین اور محدود ہو گئے ہیں۔ معانی لغوی کے اس تعین اور تحدید کی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ زبان پھیکے پڑے ہوئے یا مرجھائے ہوئے استعاروں کا مجموعہ ہے۔ حقیقتاً یہ بھی محلِ نظر ہے اس لیے کہ جملہ زبان تو استعاراتی ہو بھی نہیں سکتی، وہ یوں کہ استعارے میں علاقہ تشبیہ کا ہوتا ہے اور زبان جس مجاز کا کھیل ہے اس میں ہر جگہ علاقہ تشبیہی نہیں، علاقہ عقلی بھی نہیں، قرینہ بھی نہیں، بس معنی فرض کر لیے گئے ہیں۔ اصطلاحی مجاز میں بے شک قرینہ اور علاقۂ عقلی لازم ہے، لیکن جن دو معنی میں رشتہ تصور کیا جاتا ہے، یعنی معنیٔ لغوی اور معنیٔ مجازی میں، ان میں سے تو کوئی بھی معنی پہلے سے دیا ہوا نہیں ہے، یعنی ہر ہر معنی فرض کر لیا گیا ہے۔ یوں زبان اساساً اور عملاً مجاز کا کھیل ہے اور ہر ہر دلالت جو بیان کی گئی ہے اصلاً مجاز ہی پر قائم ہے۔ مزید تفصیل اس اجمال کی آگے آتی ہے۔

زبان بطورِ مجاز و کذب

یہ بحث ہم کر آئے ہیں کہ زبان اصلاً مجاز ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ خود مجاز کا تصور مشرقی ذہن میں کیا ہے۔ مجاز کے معنی میں صاحبِ فرہنگِ

آنند راج لکھتے ہیں:

"راہ و جائے گزشتن و ضدِ حقیقت"

یعنی مجاز کے لغوی معنی گزرنے کا راستہ یا مقام ہیں، مراد یہ ہے کسی مرحلے سے بخیر و خوبی گزر جانا۔ نیز کہا ہے کہ یہ حقیقت کی ضد ہے۔

ہنجارِ گفتار میں ہے:

"لفظ اگر استعمال شود در معنی کہ برائے آں وضع شدہ آں را حقیقت گویند و آں معنی را معنیِ حقیقی۔ و اگر استعمال شود در معنی کہ از برائے آں وضع نہ شدہ آں را مجاز گویند و آں معنی را معنیِ مجازی۔"

یہ بحث ہم پہلے اٹھا آئے ہیں کہ زبان میں حقیقی و غیر حقیقی کچھ بھی نہیں۔ معنی خواہ حقیقی ہوں یا مجازی سب فرض کر لیے گئے ہیں۔ وضعی و غیر وضعی کا فرق بھی غیر اصل ہے کہ معنی وضعی ہوں یا غیر وضعی کوئی بھی قائم بالذات نہیں، کیوں کہ غیر وضعی (مجازی) میں بھی قرینۂ عقلی جن اعلام پر مبنی ہوتا ہے خود ان کے معنی بھی فرض کر لیے گئے ہیں۔ الغرض بقولِ سوسیئر معنی فی نفسہٖ کچھ نہیں سوائے ذہنی امیج کے جو تفریقی رشتوں کی گرہ سے عبارت ہے۔

لیکن ایسا نہیں ہے کہ زبان یا معنی کا تصور بطور ذہنی تجرید (یعنی غیر حقیقت) کے نہ ملتا ہو۔ مصنف مراۃ الشعر مولوی عبدالرحمٰن نے علمِ شعریہ کی جو بحثیں اٹھائی ہیں ان میں کئی جگہ اس نوع کا ذکر آ گیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ ان کے ذہن میں زبان کا تصور بطور ذہنی تجرید یا بطور مجاز ہے:

۱) "حقیقت کی دو قسمیں ہیں خارجی اور خیالی (ذہنی)۔ اگر ابنِ رشیق کی مراد حقیقت سے حقیقتِ خارجی ہے تو اس کا یہ دعویٰ غلط ہوگا کہ شعر قدرِ قلیل کے سوا سب وصف میں داخل ہے۔ نیز لازم آئے گا کہ وصف حقائقِ خارجیہ کا عکس ہو، حالاں کہ شعر عکس ہوتا ہے حقائقِ ذہنیہ کا۔"

(در بحثِ وصف و تصویر)

۲) "عالمِ معانی کیا چیز ہے۔ وہ عکس ہے اسی عالمِ صورت کا

جو شہرستان ہے حقائقِ گوناگوں اور سوانحِ بوقلموں کا...
الفاظ اسی عالمِ معانی کی تصاویر یا تصاویر کے اجزا ہوتے
ہیں۔" (در بحثِ معانی و صورت)

۳) "وہ کلامِ موزوں و مقفیٰ جو مقدماتِ موہوم پر شامل ہو
اور ان کی ترتیب سے نتائجِ غیر واقعی پیدا کرے، مگر اس
طرح کہ وہم کو حقیقت اور حقیقت کو وہم کر دکھائے شعر ہے۔"
(در تعریفِ شعر)

قطع نظر اس سے کہ معنی کے تصویری اور تجریدی ہونے کا تصور یونانی اثرات سے چلا آتا ہے، مشرقی فکر زبان کے اساساً مجاز ہونے کا تصور بھی رکھتی ہے۔ ابنِ رشیق سے اختلاف کرتے ہوئے مولوی عبدالرحمٰن صاف کہتے ہیں کہ حقائقِ خارجیہ سے مراد حقیقتِ خارجی ہرگز نہیں، شعر عکس ہوتا ہے حقائقِ ذہنیہ کا۔ اسی دلیل کو زبان پر پھیلائیں یعنی مندرجہ بالا بیان میں شعر کو زبان پڑھیں، یعنی 'زبان عکس ہوتی ہے حقائقِ ذہنیہ کی'، تو سوسیئری اور ساختیاتی موقف حاصل ہو جاتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ساختیات میں یہ تصور اساسی ہے اور مشرقی روایت میں جزدی، یعنی اس کا اطلاق معنیِ شعری و مجازی پر تو ہے، پوری زبان یعنی پورے بیان پر نہیں۔ دوسرے اقتباس میں 'تصاویر یا تصاویر کے اجزا' اور تیسرے اقتباس میں مقدماتِ موہوم اور 'نتائجِ غیر واقعی' بھی اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

زبان چوں کہ 'مقدماتِ موہوم' پر مبنی ہے، یعنی اس میں اصلی یا فطری کچھ نہیں، یہ غیر حقیقی ہے گویا مجاز ہی مجاز ہے۔ اس لیے غور طلب یہ ہے کہ کیا مشرقی روایت میں مبالغہ یا غلو یا زبان کے کذب ہونے کا تصور زبان کے مجاز کے تصور سے جڑا ہوا نہیں؟

سامنے کی بات ہے کہ مبالغہ دورِ جاہلی سے عربی شاعری کا حصہ رہا ہے۔ مشرقی شعریات کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جس میں بدیع کے تحت صنائعِ معنوی کی ذیل میں 'مبالغہ' اور اس کی اقسام کا ذکر نہ آیا ہو۔ دورِ جاہلی میں تو قبائلی کش مکش کے باعث شاعری کی بنیاد ہی فضائل و معائب کو بڑھا چڑھا کر

بیان کرنے پر تھی، عہدِ اموی اور عہدِ عباسی میں درباری سر پرستی کی ضرورتوں نے اس روش کو اور بھی راسخ کر دیا اگرچہ ایسے مبالغے کی جو از روئے عقل و عادت دونوں کے ناممکن ہو، مخالفت بھی ہوتی رہی، لیکن مبالغہ شعریت کے اجزائے لازمی میں شامل سمجھا جاتا رہا۔ نجم الغنی نے مبالغے کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :

"کسی امر کو شدت و ضعف میں اس حد تک پہنچا دینا کہ اُس حد تک اس کا پہنچنا محال ہو یا بعید ہو تاکہ سننے والے کو یہ گمان نہ رہے کہ اس وصف کا اب کوئی مرتبہ باقی ہے، اور اس کی تین قسمیں ہیں، تبلیغ، اغراق، غلو"

مرزا محمد عسکری کہتے ہیں :

"کسی شخص یا چیز کی تعریف یا مذمت اس حد تک کرنا کہ سننے والے کو یہ گمان ہو کہ اس وصف یا ذم کا کوئی اور مرتبہ باقی نہیں ہے :

(ا) تبلیغ، جب کسی امر کا ایک حد تک پہنچنا عقل و عادت دونوں کے نزدیک ممکن ہو۔

(ب) اغراق، جب کسی امر کا ایک حد تک پہنچنا عقل میں تو آتا ہو مگر از روئے عادت محال ہو۔

(ج) غلو، جس بات کا دعویٰ کیا جائے وہ از روئے عادت و عقل دونوں کے محال ہو"

دیکھا جائے تو نہ صرف قصیدہ گوئی میں بلکہ غزل کی عاشقانہ روایت میں بھی جس کی ساخت ہی حسن و جمال، اور ہجر و وصال اور وفا و جفا اور انتظار و اضطراب کی کشاکش سے متشکل ہوتی ہے، مبالغہ ایک بنیادی شعری ضرورت تھا، نہ صرف ضرورت بلکہ یہ کہنا زیادہ قرینِ صحت ہوگا کہ مبالغہ یا غلو شعری زبان کی جان بلکہ اصلِ بیان تھا۔ دیکھا جائے تو بدیع میں مبالغے کو حقیقت سے وہی نسبت ہے جو بیان میں حقیقت کو مجاز سے ہے اور اگر کل زبان مجاز ہے جس کی بحث ہم اوپر کر آئے ہیں تو پھر مبالغہ یا اس کی انتہائی شکل

غلو زبان کی اساس کا حصہ ہے۔ اب آیئے کذب کی طرف۔ یاد رہے غلو کو کذب بھی کہا ہے اور ساختیاتی فکر کی رو سے اگر معنی اصلی یا فطری نہیں ہیں بلکہ فرض کر لیے گئے ہیں، من مانے ہیں یعنی کسی دلالتِ عقلیہ پر قائم نہیں ہیں، یعنی زبان صورتِ مجاز ہے تو پھر زبان کذب ہے۔ اس پر مزید غور کی ضرورت ہے۔

قدامہ بن جعفر جس پر ارسطو کا بھی اثر تھا، کہتا ہے:

'کوئی شاعر اس وقت تک عظمت حاصل نہیں کر سکتا جب تک اپنے کلام میں مبالغہ اختیار نہ کرے۔ جو لوگ شاعری پر نظر رکھتے ہیں انھوں نے ہمیشہ مبالغہ کو مستحسن قرار دیا ہے۔'

قدامہ ہی کا قول ہے 'اَحْسَنُ الشِّعْرِ اَکْذَبُهٗ' (یعنی سب سے بہتر شعر سب سے زیادہ جھوٹا ہوتا ہے) عبدالقاہر جرجانی کو بھی اس کا احساس ہے کہ شعری زبان بے مبالغہ و غلو قائم نہیں ہو سکتی۔ وہ 'شاعری میں سچ کو بانجھ حسینہ سے تشبیہ دیتا ہے۔' لیکن اس بحث کا ایک رخ یہ ہے کہ شعری زبان اگر جھوٹ ہے، اگر وہ سچ (حقیقت) پر مبنی نہیں تو پھر اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ وہ اخلاق کے معارض ہے۔ چناں چہ یہی ہوتا رہا ہے اور اخلاقی نقطۂ نظر سے مبالغہ کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ اردو میں اس کی سب سے موثر مثال حالی ہیں۔ مقصد خواہ سماجی اصلاح تھا یا قومی، بنیادی نقطۂ نظر اخلاقی تھا۔ انھوں نے اس کے لیے شعریات بھی وضع کی اور اس سے کچھ نہ کچھ کام بھی لیا، بعد میں یہ افادیت اور مقصدیت کے مویدین کے کام بھی آئی، لیکن ہر دروازہ بند کرنے کے باوجود شاعری چور دروازے سے داخل ہوتی ہی رہی اور بجائے اصلاحی و تعمیری خدمت کے خود اپنی خدمت کرتی رہی، کیوں کہ شعری بیان پہلے خود کو قائم کرتا ہے بعد میں کسی اور چیز کو۔ مشرقی روایت میں اس بارے میں خاصا غور کیا گیا ہے۔

عبدالقاہر جرجانی نے قدامہ کے خیال 'اَحْسَنُ الشِّعْرِ اَکْذَبُهٗ' کی توسیع میں جب یہ کہا 'اَحْسَنُ الشِّعْرِ اَکْذَبُهٗ وَخَیْرُ الشِّعْرِ اَصْدَقُهٗ' (حسین ترین شعر جھوٹ پر مبنی ہوتا ہے اور اخلاقی اعتبار سے اچھا شعر سچائی پر) تو

جرجانی کے اس بیان میں یہ اعتراف موجود ہے کہ شعری پیمانے
راقی پیمانوں سے الگ ہیں ۔ ایسا نہ ہوتا تو امرؤ القیس کے فحش اشعار
شعری اعتبار سے اعلیٰ قرار نہ دیا جاتا (نقوش ص ۳۷۱) نہ ہی ابوبکر صولی
ن کتاب اخبار البحتری میں ابو تمام کی شاعری پر کفر کا فتویٰ صادر
نے کا ذکر کرتے ہوئے کہتا کہ 'کفر کے فتوی کی شاعری سے کوئی
طابقت نہیں ، اس لیے کہ کفر سے نہ شاعری میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے اور
ایمان سے شاعری میں کوئی اضافہ ' (اخبار ابی تمام / ایضاً ۳۷۲) صولی
ر جرجانی کے بیانات کے بعد تو کسی شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔
رجانی اصرار کرتا ہے کہ دین کا مقام الگ ہے اور شاعری کا الگ ۔ اس
ا بیان ہے :

' اگر یہ عیب ہے تو بے شمار شاعروں کے نام شاعروں کی فہرست
سے خارج کرنا پڑیں گے۔ دین کا مقام اور شاعری کا مقام بالکل
ایک دوسرے سے مختلف ہے ' (الوساطہ / ایضاً ۳۷۲)

اس سے زیادہ واضح بیان مشرقی روایت میں شاید ہی دوسرا ہو۔ شاعری
کا مقام اسی لیے الگ ہے کہ شعری بیان سے مراد وہ حقیقت ہرگز نہیں
ںس کو اصطلاحاً حقیقت کہتے ہیں ۔ شعری زبان کے خودکار اور اساساً مجاز
ونے کا اس سے بڑا اقرار اور کیا ہو سکتا ہے ۔ ساختیاتی فکر نے زبان کے مجاز
ونے کو زبان و بیان کے تمام تر تفاعل کے سیاق و سباق میں منضبط ضرور
کیا ہے لیکن زبان کے مجاز ہونے کا احساس مشرقی روایت میں تہ نشین
طور پر ہی سہی ، مل ضرور جاتا ہے ۔ عبد القاہر جرجانی کے بعض خیالات کو
سوسیئر سے مماثل اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ لفظ و معنی کے رشتے کو فطری
نہیں مانتا بلکہ اصرار کرتا ہے کہ معانی لسانی ساخت سے طے ہوتے ہیں اور
ہ عمل معاشرے میں ہوتا ہے ۔ (دلائل الاعجاز) یعنی زبان قائم ہے مجازیت
پر ، معنی کی اس مجازیت پر بھی جو معاشرے میں فرض کر لی گئی ہے
ARBITRARINESS یعنی معنیِ لغوی پر اور اس مجازیت پر بھی جو فرض کر لیے گئے
معنی سے مزید معنی پیدا کرتی ہے خواہ وہ معنی از روئے عقل و عادت ممکن الوقوع
ہوں یا محال ہوں ، لیکن شعری طور پر قائم ہوتے ہوں (معنیِ غیر حقیقی /

غیر لغوی / مجازی)۔ اس میں جملہ وسائل علمِ بیان و علمِ بدیع بشمول مبالغہ و تبلیغ و اغراق و غلو بروئے کار آتے ہیں۔ گویا زبان بنیادی طور پر مجاز (کذب) ہے یعنی من مانی (ARBITRARY) اور خودکار ہے۔ اس خودکار لسانی اور مافوق اللسانی نظام کے اندر اور اس کی رو سے شعری بیان کی نئی نئی شکلیں بنانا اور ان کو نئے نئے معنی دینا فنکار کا منصب ہے۔ جو فنکار اس منصب کو جتنا نبھاتا ہے، اتنا وہ معنی آفرینی کا حق ادا کرتا ہے، اور یہ معنی آفرینی جس قدر شدت اور تاثیر سے مملو ہوگی، اسی قدر یہ حسن آفرینی کے درجے پر فائز ہوگی۔

اس بحث کے اختتام کے لیے صاحب آئینۂ بلاغت کے اس بیان سے بہتر کوئی بیان نہیں ہو سکتا:

'یہ وہ صنعت ہے (مبالغہ / مجاز) جو شاعری اور سائنس، اور شاعری اور تاریخ کے درمیان ایک حدِ فاصل ہے۔ اگر اس صنعت سے کام نہ لیا جائے، خیال اپنی جولانی چھوڑ دے، واقعات جیوں کے تیوں بیان کیے جائیں تو کلام سچا اور امرِ واقعہ تو ضرور ہوگا لیکن روحِ شاعری اس سے نکل جائے گی۔ اس وقت کلام خواہ نظم ہو یا نثر ایک قالبِ بے روح ہوگا یا ایک پھول بے خوشبو۔ یہی وہ صنعت ہے جس میں تخئیل کو پرواز کا اور فضائے غیر معلوم کی سیر کا موقع ملتا ہے، اور تخئیل شاعری کی روحِ رواں ہے۔' (آئینۂ بلاغت ص ۱۰۲)

(باقی آئندہ)

پروفیسر نعیم احمد
شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ادب کے موضوعات اور بدلتا معاشرہ

ادبی تاریخ اس حقیقت کی مظہر ہے کہ انسانی معاشرے کی طرح ادب بھی کوئی جامد یا یک رنگی مظہر نہیں۔ انسانوں کی ایک دوسرے سے وابستگی، گرد و پیش سے تعلق، دور دراز کی چیزوں، حادثات اور واقعات کے بارے میں تصور، معاشرے میں کار فرما نوع بنوع تصورات کے انسان پر اثرات، ان اثرات کے تیئں اس کے تخیل کی کارفرمائی، انسانی جذبات کا زیر و بم، احساسات کا وہ عالم جس پر انسان کا کوئی قابو نہیں ہوتا ــــ یوں انسانی شعور وضع ہوتا ہے اور وہ اپنا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرنا چاہتا ہے۔ وسعت کا طریقہ وہ انداز بھی اختیار کرتا ہے جسے ادبی قرار دیا گیا۔ انسان، کائنات، چھوٹے سے دائرے میں خود اپنے معاشرے، پھر اپنی ذات کو بھی جاننے سمجھنے کی کوشش میں مسلسل مصروف رہتا ہے۔ اس طرح وہ ہر چیز سے اثر بھی لیتا ہے اور اسے اپنی پسند ناپسند، رائے مرضی یا اپج تخلیقی صلاحیت کے مطابق اپنے ذہن میں ڈھالنے کی دُھن میں لگا رہتا ہے۔ لفظوں کے ذریعے اظہار اسی سکّہ کا دوسرا رخ ہے۔ معاشرے سے حاصل ہونے والے محرّکات موضوع اور بیان دونوں ہی بخشتے ہیں۔ ادب ایک پُر پیچ عمل سے عبارت ہونے کے باوجود اسی تناظر کا حصّہ ہے۔ موضوع اور لفظ دونوں معاشرے کے ذریعے متعیّن ہوتے ہیں۔ معاشرہ، موضوع اور لفظ مخالف یا ایک دوسرے سے بے گانہ نہیں ہو سکتے۔

معاشرہ، تخیل، تصوّر، جذبات و احساسات جو لاتعداد تاثرات بخشتے ہیں وہی منضبط ہو کر موضوع کا روپ اختیار کرتے ہیں۔ معاشرہ صرف عصر تک محدود نہیں ہوتا۔ اس میں ماضی اور مستقبل بھی دھڑکتا رہتا ہے۔ کوئی بھی معاشرہ صرف اپنا عرفان نہیں بخشتا، ماضی کے تجربات اور مستقبل کے اندیشے یا ولولے اس میں شیر و شکر ہوتے ہیں۔ یوں موضوع۔ ادبی موضوع ــ معاشرے کا انسانی ذہن پر چھوڑا ہوا عکس ہوتے ہیں۔

انسانی تہذیب، معاشرہ، مسلسل ارتقا پذیر ہے۔ بعض اوقات بعض جگہ بظاہر اس کی مکمل نفی ہو جانے کے باوجود، اس نے جلد ہی کبھی ایک جگہ تو کبھی بیک وقت کئی جگہ نت نئے ہوشربا سنگھار کے ساتھ اپنا گھونگٹ اٹھایا ہے۔ اس کے چہرے سے نکلتی ہوئی لویں ہر بار پچھلے دور کو تاریک سا بنا کر رکھ دیتی ہیں۔ سائنسی انکشافات وایجادات پر تو یہ بات خاص صادق آبھی جاتی ہے۔ لیکن ادب چونکہ آنکھیں چکاچوند نہیں کرتا۔ اس کی طرف نگاہ معاشرتی حقائق کو، عہد بہ عہد معاشرے اور ادب کے تعلق کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ خود ادب کی ماہیت سے آگاہ کرتی ہے۔

صرف اردو کی، وہ بھی شمالی ہند میں اردو ادب کے باقاعدہ آغاز سے اس کی آج تک کی تاریخ پر طائرانہ نظر ڈالی جاتے تو یہ جانا جاتا ہے کہ تھوڑے تھوڑے سے وقفے کے بعد بھی یہ خدشہ لاحق تھا کہ اردو ادب بدلتے ہوئے معاشرتی تقاضوں کا ساتھ دے سکے گا یا نہیں؟

اٹھارویں صدی کی تیسری دہائی میں دہلوی معاشرہ جس خصوصیات کا حامل تھا، انھیں اس وقت تخت طاؤس پر رونق افروز بادشاہ محمد شاہ کے نام کے ساتھ رنگیلے کا لفظ لگا کر واضح کیا جاتا ہے۔ اس معاشرے نے سرخوشی، خوش وقتی، جمالیاتی اور لسانی جمناسٹک پر مبنی موضوع بخشے۔ اسی بادشاہ کے دور میں ۱۷۳۹ میں وہ قیامت آئی جسے نادرگردی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ فراغت، لذت کوشی، مستی اور قہقہہ کے بجائے قتل وغارت گری، عدم تحفظ کا احساس، بے یقین، ہر طرح کی محرومی، کرب کسک، آہ و کراہ کے موضوع اب اردو شعر و ادب کو ملے۔ اس نے ان موضوعات کو اس فنکاری سے اپنایا کہ یہی موضوع ادبی عظمت کی کسوٹی بن گئے۔ چھیڑ چھاڑ، مذاق، لذت کوشی کیف و مستی کے موضوع غیر معیاری ہو کر رہ گئے۔ موجودہ صدی کی طرف اڑان بھرتے ہوئے قدیم وجدید کی کشمکش کے عالم میں نشاۃ الثانیہ سے جی اچٹنے کے لمحوں میں تصور کی کارفرمائیاں ماضی کی تعبیر یا تشریح ہی نہیں تخلیق بھی کر رہی تھیں۔ علم وحکمت، سائنٹفک ترقی کے دروازے بھی وا ہو رہے تھے اور ماضی کی تخیلی دلربائی بھی اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ قدیم وجدید کا امتزاج کرنے، دونوں کے عطر سے ایک نئی خوشبو پیدا کرنے کی فکر ی۔ معاشرتی کاوش بھی ہو رہی تھی۔ ادب کے موضوعات بدل بھی رہے تھے، متنوع بھی ہو رہے تھے ——— شرر، اقبال، پریم چند کی تخلیقات اس زمانے کے اہم ترین سوالات جس میں قومیت اور قومی آزادی کے سوال بھی شامل تھے، پیش بھی کر رہی تھیں

ور ان کے جواب بھی ادبی انداز میں ڈھونڈ رہی تھیں۔
موجودہ صدی کی دوسری دہائی میں عالمی اور قومی سطح پر زبردست اقتصادی، سیاسی، نظریاتی تبدیلیاں ہوئیں۔ سیاسی۔ اقتصادی امنگیں معاشرے ونت نئے انداز میں سرگرم عمل کرنے لگیں۔ ایسے موضوعات ادب کی دنیا میں داخل ہوتے جن کا ـــــ کچھ ادبی نظریہ دانوں اور شیدائیوں کے نقطۂ نظر کے مطابق ادب سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ صوبہ بمبئی اور بہار کے ضلع چمپارن میں کسانوں کی تحریکیں ہوں یا خلافت تحریک، مزدوروں کی تحریکیں ہوں یا ترکِ موالات اور سودیشی کی سامراجی غلامی اور جاگیردارانہ استحصال سے نجات کی تڑپ، ادب نے تمام علمی، سیاسی، سائنٹی فک موضوعات کو اپنی آغوش میں سمیٹا اور جب وہ اس آغوش سے جدا ہو کر لوگوں کے سامنے آئے تو خیال، احساس، تاثیر کے لحاظ سے ان کی کایا ہی جدا تھی۔
عہد بعہد اردو میں نت نئی شعری و نثری اصناف کے اضافے کی بھی یہی وجہ ہے۔ اصناف کی روح بدل جانے کا راز بھی اسی حقیقت میں پوشیدہ ہے۔ صنف شہر آشوب کا قالب وہی رہا لیکن وہ پورے پورے شہروں، طبقوں، سارے اقتصادی۔ سیاسی۔ معاشرتی نظام کی تباہی کا بیان بن گئی۔ داستان کی جگہ ناول اور پھر افسانے نے لے لی۔ نت نئے موضوع ابھر رہے تھے اور وہ اپنی ہیئت کا تعین بھی کرا رہے تھے۔ کئی نثری و شعری اصناف کے محض تجربہ بن کر رہ جانے کی وجہ بھی یہی ہے۔ وہ کسی موضوع کو اس طرح پیش نہیں کر سکیں کہ وہ ان سے ہی مخصوص ہو جاتا، حالانکہ ان کی بہت وکالت کی گئی۔
اس وقت لاکھ سائنٹی فک ترقی کے باوجود معاشرتی سطح پر جہاں نئے موضوعات پیدا ہو رہے ہیں وہیں مسلسل برقرار موضوع نئی معنویت، نئی جہتیں اور نئے انداز اختیار کر رہے ہیں۔ اکیسویں صدی میں قدم رکھتے ہوئے، سائنٹی فک تعلیم کا دائرہ پہلے کے مقابلے سے کچھ وسیع ہو جانے کے بعد، سوسوا سو سال پہلے کے مقابلے ماضی کی بازیافت اور اپنی شناخت جارحانہ اختیار کر رہی ہے۔ جن انسانی گروہوں اور افراد کو پہلے کے مقابلے بہت زیادہ مادی آسائشیں حاصل ہیں، انھیں بھی نفسی، جذباتی اور ذہنی الجھنوں کا سامنا ہے۔ مادی وسائل ان الجھنوں کے تجزیے اور حل سے قاصر ہیں۔ ادب ہر چیز کو اس طرح موضوع بناتا ہے کہ مرئی چیز غیر مرئی اور غیر مرئی چیز مرئی ہو جاتی ہے۔ ادب معاشرتی یا سائنٹی فک حقائق پیش نہیں کیا کرتا۔ اسے معاشرے سے مواد موضوع اور لفظ کی صورت

میں ملتا ہے ۔ لیکن انھیں وہ جوں کا توں استعمال اور پیش نہیں کرتا۔ انھیں وہ تخئیل اور تصور، کی بھٹی میں پگھلا کر ایسی شکل وصورت دیتا ہے جو بظاہر کریہہ، خشک، سخت اور ٹھوس ہونے کے باوجود نرم نفیس اور نازک ہوتی ہے ۔ موجودہ دور کو پہلے کے مقابلے کتنا ہی مزید سائنٹی فک قرار دے لیا جائے، ساری سائنٹی فک ترقی آدمی سے اس کا تخئیل، اس کا تصور، جذبہ، احساس یا تاثیر کی صلاحیت نہیں چھین سکی۔ ادب ترقی کا کبھی مخالف نہیں رہا۔ اس کا واسطہ انسان کی انھیں صلاحیتوں سے ہے جو ہر انکشاف اور ایجاد کو ممکن بناتی ہیں۔ ادب انسان کی انہی صلاحیتوں کے اظہار کی ایک صورت ہے ۔ ہاں معاشرے، معاشرتی شعور میں تبدیلیوں کے ساتھ ادب میں بھی تبدیلیاں ضرور ہوتی ہیں ۔ لیکن جس طرح سائنٹی فک ترقی معاشرے کے لیے خطرہ نہیں ہوتی، اسی طرح ادب کے لیے وہ کوئی سدِ راہ نہیں ۔ ادب ایک ایسی فنکاری ہے جو دلیل، ترغیب اور رعب سے نہیں رجھانے سے عبارت ہے ۔ اس سے وہ خصوصیت کوئی نہیں چھین سکتا جسے انشا نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے ۔

یاں لعلِ فسوں ساز نے باتوں میں لگایا
دے پیچ اُدھر زلف اڑا لے گئی دل کو!

قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی
شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ڈاکٹر ذاکر حسین کی قصہ گوئی
منہاج و مقاصد

ڈاکٹر ذاکر حسین ہمارے اُن دانشوروں اور سماجی مفکروں میں ہیں جنھوں نے اپنی فکر و نظر کی چھاپ زندگی کے تقریباً تمام ہی گوشوں پر چھوڑی ہے۔ آزاد ہندستان میں ذاکر حسین کی تنہا شخصیت ہے جو ہر نوع کی جذباتیت اور فلسیانہ موشگافیوں سے گریز کرتے ہوتے نئے ہندستان میں ہم قوموں کو کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیے ایک علمی پروگرام نہ صرف پیش کرتی ہے بلکہ خود اس پر عمل پیرا ہو کر ایک زندہ مثال بھی فراہم کرتی ہے۔ بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیاں ذاکر حسین کے مستقبل کے خوابوں کی آئینہ دار بھی ہیں اور نوخیز نسل کی تربیت و اصلاح کا ایک بے نظیر نمونہ بھی اپنے اندر رکھتی ہیں۔ ذاکر حسین کی کہانیوں کے مطالعہ سے یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ ان کے پیش نظر نئی نسل کو جہاں ایک طرف خیال و خواب کی طلسمی فضاؤں سے نکال کر حقیقت کی دھوپ چھاؤں سے آشنا کرنا تھا وہاں انھیں ایک ٹوٹے پھوٹے شکستہ سماجی ڈھانچہ کی تعمیر نو کے لیے درکار قربانیوں اور ایثار کے لیے تیار کرنا بھی ضروری تھا۔ ذاکر حسین کی کہانیاں اس بات کا کھلا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ ان کی تمام تر امیدوں کا مرکز نوخیز نسل ہے جس کی اصلاح ممکن بھی ہے اور نسبتاً آسان بھی، اس کے برعکس سن رسیدہ اور بڑی عمر کے لوگوں سے یہ توقع فضول تھی کہ وہ زندگی اور زمانے کے حالات کے مطابق خود کو بآسانی منقلب کر سکیں گے اور ان نئی سماجی اقدار کو فروغ دینے میں معاون ثابت ہو سکیں گے جن کی ضرورت نئے عہد کا تقاضا ن گئی تھی۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ بڑی عمر کے لوگوں سے یکسر مایوس ہو گئے تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ذاکر حسین اپنی کہانیوں کے ذریعہ بچوں میں جو روح پھونکنا چاہتے تھے وہ نئے ماحول کے عین مطابق تھی، اسی روح کی بالیدگی اور نکھار پر نئے معاشرتی ڈھانچے کی تعمیر ممکن تھی۔ دنیا کے ہر بڑے فنکار نے کہانیوں کے ذریعہ ذہنی بیداری اور نئے حقائق کی بازآفرینی کا کام لیا ہے۔ ٹالسٹائے، پشکن، چیخوف، بالزک، گورکی، مایساں اور پریم چند وغیرہ سب کی عظمت اور لندی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ انھوں نے اپنے فن کو شعوری طور پر بعض اعلا انسانی

مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا، آفاقی دردمندی سے رشتہ استوار کیا، انسانی فر
آزادی اور سرزمینِ عالم میں امن و آشتی کے قیام کی جہدِ مسلسل کے فرض سے نہ غافل
ہوئے اور نہ ہی اس سے سمجھوتہ کیا۔ ذاکر حسین ہرچند کہ اتنے بڑے فنکار نہیں
ہیں جن کی شہرت عالم گیر ہو، اس لیے کہ انھوں نے جو کہانیاں لکھی ہیں ان کے
جہاں ایک مقصد تھا وہیں پر ان کی ایک حد بھی تھی جس سے وہ تجاوز کرنا نہیں
چاہتے تھے، البتہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انھوں نے ان کہانیوں کے ذریعہ
جن اقدار کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے اور جن بنیادی صداقتوں کو نکتہ ارتکاز
بنایا ہے وہ یقیناً عالمگیر ہیں اور اپنی ایک آفاقی قدر و قیمت رکھتی ہیں، جن دا
اوصاف کی طرف کہانیوں میں اشارے کیے گئے ہیں انھیں ہم حریت فکر و نظر
جرأتِ شوق، حوصلہ مندی، باہمی اشتراک و تعاون، قومی حمیت و خود داری، جذ
ایثار، و ترحم، جہدِ مسلسل، ضبطِ نفس، محبت اور دلسوزی وغیرہ سے تعبیر کر سکتے
ہیں، یہ سارے الفاظ بے حد مانوس ہونے کے سبب بہت زیادہ پُرکشش
نہیں ہیں اور ظاہر ہے کہ اگر براہ راست خطاب کر کے کوئی شخص ان اوصاف
کی تلقین کرنا شروع کر دے تو زیادہ حوصلہ افزا نتائج نکلنے کی توقع نہیں کی
جاسکتی، لیکن ایک فنکار جب انھیں صداقتوں کو اپنے مخصوص لب و لہجہ اسلوب اور
زبان میں ڈھال کر فنی تقاضوں کے مطابق پیش کرتا ہے تو انھیں بے جان لفظوں
میں ایک نئی حرارت اور روح بھر جاتی ہے، کہانی پڑھنے والے کی باطنی شخصیت
خود بخود منقلب ہوتی چلی جاتی ہے۔ ذاکر حسین نے مذکورہ اوصاف کی براہ راست
تلقین کرنے کے بجائے بچوں کی نفسیات پر گہری نظر رکھنے کے سبب بعض کرداروں
کے حوالے سے واقعات کو رونما ہوتے ہوئے دکھایا ہے، اس طریقہ کار میں
جو سچائی ہے اور جو پوشیدہ اپیل ہے وہ کسی دوسرے طریقے سے حاصل نہیں
جاسکتی تھی۔ ذاکر حسین کی بیشتر کہانیوں کا منظر نامہ جامعہ ملیہ ہے۔ "کچھوا
اور خرگوش" جو ایک طویل کہانی ہے سرتاسر جامعہ کی کہانی ہے۔ جامعہ ملیہ
کی تاریخ پر جن کی نظر ہے وہ جانتے ہیں یہ ادارہ قومی زندگی کے مختلف النوع
معاملات و مسائل کو دیکھتے ہوئے

ایک خاص پالیسی اور پروگرام کے تحت قائم کیا گیا تھا، یہاں تمام تر زور بچوں کی
تعلیم و تربیت پر تھا۔ ذاکر حسین جو اس تعلیمی ادارے کے بانی اور روح رواں
تھے وہ سیکولر ہندستان میں مسلمان بچوں کے مستقبل کا نہایت قوی شعور رکھتے
تھے، مشترکہ کلچر کی جن خوبیوں کا آج زور و شور سے ذکر کیا جاتا ہے ذاکر حسین نے
اس کلچر کو بچوں کی زندگیوں میں عملاً نافذ کرنے کے لیے جامعہ کو بطور ایک
تجربہ گاہ کے استعمال کیا، یہ تجربہ کس حد تک کامیاب اور کس حد تک ناکام رہا

س کا فیصلہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ ذاکر حسین کی کہانیاں
نے فکری عنصر، فنی بالیدگی اور بچوں کی مخصوص طفلانہ نفسیات کے گہرے شعور
کے سبب اپنی افادیت ہر دور میں برقرار رکھتی ہیں، بلاشبہ ذاکر حسین کی اکثر کہانیوں
پڑھنے سے یہ اندازہ بار بار ہوتا ہے کہ یہ کہانیاں اگر دنیا کی دوسری زبانوں میں
لکھی گئی کہانیوں کا چربہ نہیں ہیں تو بھی ان میں جو تجربے، نظر اور فکری ارتعاشں
ہیں ان پر اس پردیس بدیس کی پرچھائیاں ضرور پڑتی ہیں اور غالباً اسی سبب
سے یہ کہانیاں بس ایک عجیب ہی لطف و لذت سے مالا مال ہیں۔ ابو خاں کی بکری،
ذاکر حسین کی چند منفرد کہانیوں میں سے ایک ہے۔ دیگر کہانیوں کی طرح اس
کہانی کی بھی خوبی یہی ہے کہ یہ ایک خاص مقصد یا محور کے گرد گردش کرنے کے
وجود اپنی بنیادی خوبی یعنی کہانی پن کو از اول تا آخر برقرار رکھتی ہے۔ کہانی کو
پڑھتے ہوئے بچے کو ایک لمحہ کے لیے احساس نہیں ہوتا کہ یہ کہانی اسے ایک خاص
درسِ حیات دینے کے لیے لکھی گئی ہے، اس کے لیے ترغیب کا پہلو بکری
کے کردار میں پوشیدہ اس بانکپن میں ہے جو بڑی خوبی کے ساتھ اور فطری انداز سے خود
خود UNFOLD ہو کر اس کے سامنے آ رہا ہے، بچے کو تو معلوم ہوتا ہے کہ بالعموم
بھیڑیا بکریوں کو کھا لیتا ہے لیکن اس بات سے اس کے علم میں اضافہ ہوتا
ہے کہ کوئی بکری ایسی بھی ہو سکتی ہے جو بھیڑیے (دشمن) سے ڈٹ کر مقابلہ بھی کر
سکتی ہے، اس پہلو سے سوچنے پر اسے خوشی ہوتی ہے۔ پھر علامت اس قدر
قریبی مشابہت لیے ہوتے اور سادہ ہے کہ بچے کے لیے کمزور اور طاقتور کے
درمیان مقابلہ کی صورتِ حال کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہ جاتا۔ بھیڑیے اور بکری
کے تصادم میں اسے ایک لمحے کے لیے یہ سوچنے کی بھی مہلت ملتی ہے کہ کمزوری
بزدلی کا دوسرا نام ہے۔ کمزوری ایک حقیقی چیز ہو سکتی ہے لیکن بزدلی ایک
انجانے خوف سے پیدا ہوتی ہے جس کا تدارک بآسانی کیا جا سکتا ہے۔
بھیڑیے اور بکری کی بزد آزمائی سے یہ حقیقت بچے کے ذہن پر مزید روشن
ہو جاتی ہے۔ لاشعوری طور پر بچہ اس مثال کو اپنی زندگی پر منطبق کرنے کی
کوشش کرتا ہے۔ بکری کی جرأت و بے باکی اس کی اپنی ذاتی کمزوری اور نا
طاقتی پر ایک تازیانے کا کام کرتی ہے۔ اس طرح یہ سبق اور یہ روشنی زندگی
کے انجانے اور پر اسرار سفر میں بچے کی زندگی کے لیے بہت بڑا سہارا بن جاتی
ہے جو حوادث اور خطرات کے آگے سپر انداز ہونے کے بجائے سینہ سپر ہونے
کا حوصلہ بخشتی ہے ایڑیاں رگڑ کر مرنے کے بجائے شجاعت اور دلیری کے ساتھ
موت سے متصادم ہونے کی تلقین دیتی ہے، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ
ایک چھوٹی سی کہانی بچے کی تمام تر نفسیات آن کی آن میں منقلب کر دیتی ہے۔ سوال

پیدا ہوتا ہے کہ کیا اخلاقی انسانی اور شریفانہ اقدار کی ترویج و ترسیل کا اس سے زیادہ مؤثر
کوئی دوسرا وسیلہ بھی ہوسکتا ہے؟ میرے خیال سے نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ
دوسرے تمام طریقے جن کے ذریعہ تلقین اور وعظ و نصیحت کی جاتی ہے وہ سب اس
اعتبار سے غیر مؤثر اور غیر فطری ہیں کہ وہ براہِ راست مقصد کو حاصل کرنے سے عبارت
ہیں۔ ذاکر حسین کی کہانیوں کے تانے بانے، ان کی فضا اور ماحول۔ کرداروں کے اعمال
اشغال اور گفتگو سے مقصد اس طرح جڑا ہوا بلکہ ان میں اس طرح پیوست ہوتا
ہے کہ بچہ پوری کہانی پڑھے بغیر کسی خاص نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لحاظ سے
بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں یہ تکنیک مزید افادیت کی حامل ہو جاتی ہے۔
ذاکر حسین نے اپنی کہانیوں میں مزید ارضی حسن پیدا کرنے کے لیے کرداروں کے
ناموں کے ماسوا ان کی سکونت تک بتادی ہے تاکہ اس طرح سے کہانی زیادہ
سے زیادہ حقیقی انسانی ماحول سے قریب رہے اور جو کچھ پیش کیا جائے وہ کلیتاً
حقیقی REAL ہو، یعنی کردار اپنی ناآسودہ تمناؤں کا حصول اچانک کسی محیر العقول
واقعہ کی وساطت سے کرنے کے بجائے زندگی کی آخری سانس تک حقائق سے برسر
پیکار رہے اور اس جنگ میں اسے جو بھی حاصل ہو اس پر اکتفا کرنا سیکھے، ذاکر
حسین کی کہانیوں کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو ان کہانیوں کو نہ صرف پڑھنے کے
قابل بناتا ہے بلکہ بچوں کے لیے کہانیوں کی افادیت بدرجہا بڑھا دیتا ہے۔
جس طرح 'ابو خاں کی بکری' انسانی اخلاق و کردار کے مختلف پہلوؤں کو روشن
کرتی ہے، غلامی کی زندگی سے بیزاری، آزادی اور کشمکشِ حیات کی ترغیب دلاتی
ہے اسی طرح ذاکر حسین کی دوسری کہانیاں بھی نئے اسالیب، نئے ماحول و کردار
کی وساطت سے نوخیز نسل کو بیداریٔ حیات کا درس دیتی ہیں، اس اعتبار سے 'عقاب'
ذاکر حسین کی بے حد خوبصورت کہانیوں میں سے ایک ہے۔
ایک بچہ ہے جسے 'عقاب' کے بارے میں کچھ نہیں معلوم کہ اس میں اور
دوسرے پرندوں میں نوعی خصوصیات کے لحاظ سے کیا فرق ہے وہ اس کہانی
کو پڑھ کر ان نتائج تک نہیں پہنچ سکتا جن تک پہنچایا جانا مقصود ہے۔ بچے کی
اس مشکل سے ذاکر حسین بخوبی واقف ہیں۔ چنانچہ بچے کا تعارف عقاب
سے کہانی کی ابتدا میں اس طرح کرا دیتے ہیں کہ پرندوں کی نسل میں اسے جو امتیاز
حاصل ہے وہ واضح ہو جائے۔

"ہاں تو چٹان کے اس اوپر والے حصہ میں ایک عقاب
رہتا تھا، آدمیوں کی بستی سے دور اور ان کے جھگڑوں
ٹنٹوں سے الگ صبح کو صاف صاف بھینی بھینی خوشبو والی
ہوا جب اس کے گھونسلے پر آ کر سلام کرتی تو یہ اپنے

پروں کو ذرا ہلاتا۔ اپنے طاقتور بازوؤں کو پھیلاتا جیسے کوئی
ہوائی جہاز والا سفر سے پہلے دیکھے کہ سب کل پرزے ٹھیک
ہیں کہ نہیں، جب ذرا دھوپ نکل آتی اور نیچے کی دنیا
اپنی روزی کے دھندھوں میں لگ جاتی تو یہ بھی پر پھیلا
چٹان سے اڑتا اور آہستہ آہستہ ساری وادی پر چکر لگا کر
بستی کا، بستی والوں کا اور تیز رو دریا کا معائنہ کرتا
کہیں کوئی کام کی چیز نظر پڑ گئی، کوئی خرگوش یا چوہا یا
کوئی کبوتر یا مرغی کا چوزا تو یہ بجلی کی طرح جھپٹتا
اور ان کی آن میں اسے اٹھا کر گھونسلے میں پہونچا
دیتا۔ وہاں کھا پی کر پھر سنسار کا مطالعہ کرتا۔۔۔۔
۔۔۔۔۔ کوئی آتے کوئی جاتے اس کی زندگی
جیسی آج ویسی کل، وہی چٹان وہی تنہائی وہی قوت کا
احساس، نہ کسی کو سہارا دینے کا موقع نہ کسی سے مدد
لینے کی ضرورت، بس اپنی دنیا آپ "

عقاب کے اس مختصر سے تعارف سے بچے کے سامنے پرندوں کی نسل میں عقاب کے امتیاز کے کچھ پہلو آجاتے ہیں۔ اسے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ عقاب چٹان پر رہتا ہے، آدمیوں کی بستی سے دور رہتا ہے، فضا میں پرواز کرتے ہوتے ساری وادی اور تیز رو دریا کا معائنہ کرتا ہے کوئی خرگوش، چوہا، کبوتر مرغی کا چوزا نظر پڑا تو اسے اٹھا کر لے جاتا ہے۔ اس کی تنہائی ہی اس کی قوت ہے، اسے سہارا دینے کا موقع نہ مدد لینے کی ضرورت پیش آتی ہے، بس اپنی دنیا آپ۔ اس تذکرہ سے بچے کے ذہن میں یہ بات صاف روشن ہوجاتی ہے کہ یہ پرندہ اپنی خصوصیت کے سبب پرندوں کی دنیا میں یکتا و تنہا ہے۔ بچہ کو عقاب کی ان خصوصیات سے روشناس کرانے کے بعد کہانی جس طرح آگے بڑھتی ہے عقاب کے نشیمن میں بلی کے بچے کی پرورش، دونوں میں رشتہ الفت کا ایک خاموش اقرار۔ بلی کا اپنی جبلی کمزوری کے تحت انسانوں کی آبادی میں مشتعل ہوجانا، بلی کی تلاش میں عقاب کا اپنے نشیانے سے نکلنا اور بندوق کی گولی سے زخمی ہونا۔ قید و بند کی زندگی اور بعد ازاں زخمی ہوکر بھاگ نکلنا وغیرہ "

" جس دن عقاب کے گولی لگی ہے اس دن سے پانی کی
ایسی جھڑی لگی کہ ساتویں دن جاکر کھلی، یہ ہفتہ بھر اسی
زنجیر میں بندھا بیٹھا رہا، نہ کھانا نہ پینا، دھوپ جو
نکلی تو دن بھر اسی میں بدن سینکا۔ شام قریب آتی

اور ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی سے پہاڑ کی چوٹیاں
آگ کی طرح دمکنے لگیں تو اس کے دل کی کچھ عجیب
حالت ہوئی، پہاڑ سے کسی نے اسے اپنی طرف کھینچنا
شروع کیا، اس نے پر پھیلائے تو وہ سیدھا بازو
جس میں گولی لگی تھی پورا کھل گیا۔ زخم بھر چکا تھا
اسے پہلے تو یقین نہ آیا، پھر بازو پھیلا کر دیکھا،
ایک بار دو بار تین بار، جب یقین ہو گیا کہ ٹھیک ہے،
تو کچھ نہ پوچھو اس کے دل کی کیا حالت ہوئی، ایک
چیخ ماری اس زور سے کہ منو باورچی خانے میں
سہم سی گئی، ایک جھٹکا دیا کہ زنجیر الگ ٹوٹ کر
گری، پیر سے چند بوندیں زمین پر گریں اور یہ نہایت
شاہانہ انداز سے اڑا، یہ جا وہ جا، آن کی آن میں اتنا
اونچا پہونچا کہ شام کے دھندلکے میں دکھائی بمشکل
سے دیتا، بہت اوپر پہونچ کر پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی
پر جا بیٹھا۔"

"عقاب" کی خود گرفتاری کا منظر کس قدر اندوہ ناک ہے اس کا کچھ اندازہ اس وقت زیادہ بہتر طور پر ہوتا ہے جب بچہ شروع کے اس اقتباس کو دھیان میں رکھتا ہے جس میں عقاب کی سرشت کا تعارف کرایا گیا ہے۔ پیش نظر اقتباس میں عقاب کی زبوں حالی اور پھر اچانک اس کشمکش کا خاتمہ اور فطری زندگی کا دوبارہ حصول "اداسی اور مایوسی بچے کو ایک نئی امنگ، حوصلہ اور سرشاری سے ہمکنار کرتا ہے۔ مایوسی بیم و رجا اور پھر اس کے برعکس صورتِ حال سے عقاب کو اس طرح گزرتے ہوئے بچہ دیکھتا ہے تو لاشعوری طور پر اس کے دل میں ان اقدار کا احترام جنم لینے لگتا ہے جو عظیم لافانی اور قابلِ رشک ہیں۔ یہاں بیک وقت جو ایک جذبہ بچے کے دل میں موجزن ہوتا ہے وہ جذبۂ حریت ہے، جو انسانوں میں جانوروں سے کہیں زیادہ قوی ہے، پستی سے نفرت اور بلندی کی طرف پرواز کرنے کا جذبہ بھی انسانوں میں بے حد شدید ہوتا ہے۔ زمانۂ طفلی میں یہ جذبات کچھ زیادہ ہی اپیل کرتے ہیں حوصلے کو بڑھاتے اور قوتِ عمل کو شہپر لگا کر اڑاتے ہیں، اس کے ماسوا بھی متعدد ابعاد و جہات ہو سکتے ہیں جو اس ایک معروف علامت سے منسوب کیے جا سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے بچہ خود کو عقاب کی جگہ رکھ کر زندگی کی صداقتوں کو ٹھیک ٹھیک تناظر میں نہ دیکھ سکے، لیکن اس پرندے کی ذات سے منسوب جو مثبت صفات ہیں ان کا دلدادہ ضرور ہو سکتا ہے اور اگر اتنا بھی ہو جاتا ہے تو کہانی

کھنے کا مقصد پورا ہوجاتا ہے ۔ ذاکر حسین کی ہر کہانی میں یہ وصف ہے کہ وہ بچے کی
نفسیات اور اس کے لاشعور پر تمام عمر کے لیے اپنا نقش دائم ثبت کر دیتی ہے ۔ کچھ
بعید نہیں کہ عقاب کی علامت ذاکر حسین نے اقبال سے متاثر ہو کر پسند کی ہو ۔ اس
اعتبار سے دونوں ہی مفکروں کا نقطۂ نظر اثباتی اور رنامیاتی ہے ۔

ذاکر حسین نے بالعموم پرندوں اور جانوروں کے کرداروں کے ذریعے کہانیوں
کا تارو پود تیار کیا ہے اور اس بات کا خیال رکھا ہے کہ زیادہ مانوس حقائق
سے نا مانوس تک پہنچا جائے اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوتے ہیں ۔ ان کی کہانی
اندھا گھوڑا بھی بچوں کی نفسیاتی گرہ کھولنے میں بے حد معاون ہے ۔ یہ گھوڑا
اپنے مالک کے سخت عذاب سے اندھا ہو جاتا ہے لیکن اپنی وفا اور خلوص کی
کہانی پڑھنے والوں کے دلوں پر ثبت کر جاتا ہے ۔ ذاکر حسین کی سب سے اہم اور
دلچسپ ترین کہانی "کچھوا اور خرگوش" ہے ۔

کچھوا اور خرگوش کی دوڑ کا قصہ ہم میں سے شاید ہر شخص نے اپنے بچپن
میں انگریزی کہانیوں میں پڑھا ہی ہے ۔ یہاں بھی قصہ وہی ہے ۔ خرگوش اپنی تیزی
کے سبب کم و بیش اسی انجام سے دوچار ہوتا ہے جس کا سزاوار انگریزی کہانیوں
میں ہوتا ہے لیکن معمولی سے فرق کے ساتھ ۔ ذاکر حسین یہاں کچھوے اور خرگوش کی
دوڑ دکھاتے ہیں اس میں خرگوش بڑے بھیانک انجام سے گزرتا ہے ۔
اس کا زار و نزار وجود خاک و خون میں غلطاں اپنے قاری کو حواس باختہ کر جاتا
ہے ۔ اس نہایت مختصر کہانی میں جو طوالت پیدا ہوئی ہے وہ بھی اصل کہانی سے
ایک گہرا ربط رکھتی ہے ۔ کچھوے اور خرگوش کی وساطت سے واقع ہونے
والی دوڑ میں بچے کی دلچسپی اپنی جگہ پر باقی رہتی ہے ۔ کچھوے کی یہ تشویش زیر بحث
سوال میں کچھوے اور خرگوش کی لڑائی میں فتح آخر میں کس کو نصیب ہوئی تھی" ؟
ایک ایسی الجھن ہے جو بچے کو ہمہ وقت لاحق رہتی ہے ۔ وہ چاہتا ہے کہ اس
الجھن کا جلد از جلد ازالہ ہو جائے ۔ اس مقصد کے لیے ذاکر حسین مدرسہ جامعہ
کے کچھ اساتذہ کی مدد حاصل کرتے ہیں ۔ مولوی عقران ، پروفیسر کیمیا تی ، ڈاکٹر زنی الفور
فیلسوف الہندی کی شمولیت کا یہی جواز ہے ۔ ان کرداروں کے سبب قاری کی
دلچسپی میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے ۔ ان کرداروں کی شخصیت کو پیش کرتے سے
ذاکر حسین کا ایک مقصد غالباً جامعہ کے ابتدائی دور کے نیک طینت ، مخلص اور
صاحب علم اساتذہ کا تعارف کرانا بھی ہوگا جن کے سپرد نوخیز نسل کی آبیاری اور سرپرستی
کی نہایت اہم خدمت تھی ۔ کچھوے اور خرگوش کی کہانی کی علامتی معنویت بھی
اتنی سادہ اور سلیس ہے کہ بچہ بڑی آسانی سے اس قصے کی دوڑ کو دو ایسے آدمیوں کے
درمیان دوڑ سے تعبیر کر سکتا ہے جن میں ایک سست رفتار اور دوسرا نہایت تیز

گامزن ہے۔ اس علامتی یا تمثالی اسلوب کو اپنانے سے دو مقاصد کی تکمیل ہوسکتی ہے اور دونوں تعلیمی مقاصد سے گہرا ربط رکھتے ہیں۔ ایک تو یہ کہانی کچھوے اور خرگوش کی مانوس علامتوں کے سبب زیادہ دلچسپی کی حامل ہوگئی۔ براہِ راست انسانوں میں یہ دوڑ ہوئی ہوتی تو شاید اتنی دلچسپ نہ ہوتی۔ علاوہ ازیں اس تمثالی اسلوب کی وساطت سے بچّے کے ذہن پر جامعہ ملّیہ کی مخصوص تاریخی وتہذیبی معنویت، مقصدِ وجود اور ارتقائی خطوط بھی آشکارا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ جامعہ ملّیہ ہے جو خرگوش کی تیز رفتاری کو اپنے لیے نمونہ بناتے اور بالآخر کسی حادثہ کا شکار ہوکر معدوم ہو جانے کے بجائے کچھوے کی تقلید میں کامرانی کے امکانات زیادہ روشن اور تابناک دیکھتی ہے۔ اس لیے کہ کچھوے کا تنہا قصور یہ ہے کہ وہ سست رفتار ہے۔ اس کے ماسوا اس کی شخصیت میں پائی جانے والی متانت، وقار، شائستگی اور مزاجی استقلال ایسے دل آویز اوصاف ہیں جن سے خرگوش کی شخصیت محروم ہے۔ جامعہ کے اربابِ بست وکشاد اور اس تعلیمی ادارے سے وابستہ بے شمار طالبِ علم خرگوش کی مانند تیز چل کر لہولہان ہونے کے بجائے اس استقلال سے اپنا رشتہ استوار کرتے ہیں جس کی بہترین مثال کچھوے کی ذات ہے۔ دیدۂ بینا رکھنے والے حقیقت شناس لوگوں کے لیے کچھوے کے کردار میں وہ سب کچھ ہے جو ایک ٹھوس، سلجھی ہوئی، معقول اور وقار کی حامل زندگی کا ہر دور میں طرۂ امتیاز رہا ہے۔ یہ کردار ذاکر حسین کے اس تصوّر کا زائیدہ ہے جو عجلت میں انجام دیے گئے کاموں خیر وبرکت، پائیداری اور استواری کو خارج از امکان قرار دیتا ہے اور صرف انھیں کاموں میں ابدی نقوش کی کارفرمائی دیکھتا ہے جو نہایت غور وفکر کے بعد ٹھنڈے دل ودماغ سے انجام دیے گئے ہوں؟ ذاکر حسین کا مشہور قول ہے کہ:

> "جو کام اس لائق ہے کہ وہ کیا جاوے
> وہ اس لائق بھی ہے کہ اس کو ٹھیک
> ڈھنگ سے کیا جاوے، اس لیے کہ کوئی
> یہ نہیں دیکھتا کہ کام کتنے عرصہ میں کیا گیا
> بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ کس طرح کیا گیا ہے۔"

جامعہ ملّیہ میں عملاً اسی فکر کی جلائی ہوتی اور اسی فکر کی پرورش کے لیے بچّوں کی ابتدائی تعلیم وتربیت کے نہایت دشوار گزار مرحلے کو اوّلین اہمیت دی گئی، اس ادارے کا ابتدا سے ہی بنیادی تعلیمی فلسفہ کمیت (QUANTITY) کے بجائے کیفیت (QUALITY) پر زور دیتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ کو ہندستان کی دیگر علمی درسگاہوں میں ایک مخصوص امتیاز حاصل رہا ہے جو کسی دوسرے تعلیمی

ادارے کو نصیب نہ ہو سکا۔ اس ادارے سے فارغ شدہ نوجوان خود کو کسی احساسِ کمتری، کجی یا کج ادائی میں گرفتار پانے کے بجائے قومی زندگی کا ایک فعال رکن اور ناگزیر عنصر سمجھتا ہے۔ اس کے تمام تر خوابوں، تمناؤں اور آرزوؤں کا مرکز و محور ایک ایسا ہندستانی معاشرہ ہے جو ہر فتنہ و فساد سے پاک ہے۔ یہ نوجوان ملکی زندگی میں مذکورہ اقدار کو فروغ دینے کے لیے گاندھیائی فلسفۂ عدم تشدد، ضبط و تحمل، خدمت و محبت کو اپنی زندگی کا اہم وظیفہ اور نصب العین بناتا ہے اور اسی کو زندگی کی سب سے بڑی کامرانی تصور کرتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ذاکر حسین نے اپنی کہانیوں کے ذریعہ جن پاکیزہ اور ناگزیر انسانی اوصاف کو زندہ اور مستحکم کرنے کی کوشش کی ہے ان کا فیضیان مدتوں نوجوان نسل تک منتقل ہوتا رہے گا۔

کتاب نما کے قارئین توجہ فرمائیں

خط و کتابت کرتے وقت یا زرِ سالانہ بھجواتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

فر رضوی

3837-13th Avenue (W) SEATTLE
-WA 98119
(U.S

پہچان

بابری مسجد کے فسادات سے متاثر ہو کر

ں ہی جانوں نہ تم ہی جانو
یقین دونوں کر رہے ہیں
ہ میں تم ہو کہ تم میں ،میں، ہوں
ی قدریں بھی مشترک ہیں
ں تلک کہ ہماری سانسوں کی
یں بھی ہیں ایک جیسی
ں خوشیاں بھی ایک جیسی
ں آہیں بھی ایک جیسی
تا ہے کہ ''ہاں'' کہوں تو
ی حرکت میں خود کو پاؤں
نا'' کہوں تو تمھاری گردن
بن جائے جیسے میری
میں آئینہ ہوں تم آئینہ ہو
جو ایک دوجے کو تک رہے ہیں
مجھ کو بھی ہو چلا ہے
م کو بھی آ رہا ہے
ی تہذیب کا لڑکپن
ں پہلے اسی زمیں پر
اجداد کے لہو سے
رہے جس میں شجر ہے
جر ہے کہ جس کی ٹہنی

کی ننھی کونپل ہوں جیسے ہم تم
یہ ماں کا آغوش جس کی گرمی سے
میں بھی زندہ ہوں تم بھی زندہ
یہ چھاتیاں بھی وہی جس سے
تمھاری میری نمو ہوئی ہے
ہماری دونوں کی پرورش میں
زمیں سے لے کر حسیں شجر تک
کہ ماں کی چھاتی سے اس نمو تک
کہ ماں کی گودی سے قدرِ نو تک
پرانی اقدار سے ابھی تک
درخشاں شاموں سے اس سحر تک
شرارتیں بھی ہیں ایک جیسی
حرارتیں بھی ہیں ایک جیسی
مجھے یقیں ہے تمھیں خبر ہے
کہ اپنی عادات مشترک ہیں
کہ اپنے جذبات مشترک ہیں
کہ اپنے نغمات مشترک ہیں
وہ دیکھو ماں ہم سے کہہ رہی ہے
کہ مجھ میں ''تم'' ہو کہ تم میں ''میں'' ہوں
تو فرقِ دوئی طلب کرے ہے
وہ اپنی پہچان کھو چکا ہے

عابد پشاوری
بی - ۵. نیو کیمپس
جموں یونی ورسٹی
جموں - ۱۹۰۰۰۴

دوہے

ادب سکھائیں بے ادب گنگ سکھائیں زبان
عابد اندھے رہنما دیکھ خدا کی شان

جنگل کا قانون ہے جنگلیوں کا راج
غیر منظم بھیڑ کو عابد کہیں سماج

انسان اور انسانیت کیوں ہے رو بہ زوال
عابد کون جواب دے کس سے کروں سوال

گلشن پھونکیں بلبلیں گل چیں باغ لٹائے
عابد اپنے دور میں باڑھ کھیت کو کھائے

شجر بے برگ و ثمر درو بغیر انسان
بے مصرف بے فیض ہے عابد مان نہ مان

بولیں ہر دم جھوٹ اور دیں سچ کی تعلیم
عابد اس تعلیم کو کون کرے تسلیم

ظاہر وطن پرست ہے اور باطن غدار
بھیڑ کھال میں بھیڑیئے خبردار! ہشیار!

بچھو بے چشم و نظر فطرت سے مجبور
پتھر ہو یا آدمی مارے ڈنک ضرور

ہوتی ہوں عابد اگر محسن کش اقوام
ان میں سرِ فہرست ہو ہندستانی نام

نامی انصاری
۲۹۵/۹۹ نالہ روڈ
چمن گنج۔ کانپور

سیاہ دسمبر

فسطائیت کے زہر سے ہندوستاں خراب
مردانِ باوقار یہاں خانماں خراب

انسانیت کے درد سے کم آشنا زمیں
جمہور، دل زدہ، روشِ آسماں خراب

توقیرِ اہلِ ہوش سرِراہ لٹ گئی
ناکامیِ جنوں سے ہوا کارواں خراب

پتھر اٹھایئے تو لہو نوحہ خواں ملے
پھولوں کو دیکھیے تو بہ نامِ خزاں خراب

دہشت کی دھول ان کے سروں پر بھی جم گئی
کل تک جو کر رہے تھے رخِ گلستاں خراب

اقبال کا تصورِ انساں ہے بے ثمر
تاریکیوں میں فلسفۂ برگساں خراب

ڈھایا ہے کس نے قہر، سیاست کے نام پر
کس نے کیا ہے روحِ زمین و زماں خراب

کیوں گھل رہا ہے زہرِ الم آبِ وصل میں
کیوں ہو گیا ہے ذائقۂ ہر زباں خراب

قاتل کو چھوٹ ہے کہ جہاں چاہے پھٹ پڑے
قانون کے خدنگ شکستہ کماں خراب

نصاف کا فرشتہ سیہ پوش ہو گیا
کیوں کر نہ ہو گی صورتِ امن و اماں خراب

س جرمِ بے حساب کا انجام کچھ بھی ہو
برسوں رہے گا سلسلۂ درمیاں خراب

سید معراج جامی
اے قصر جامی
کراچی

غزل

خود اپنی ذات سے یوں بدگماں سا کیوں ہے
ہر ایک شخص یہاں بے اماں سا کیوں ہے

نہ بارشوں سے اماں ہے نہ دھوپ ہی سے نجات
فلک ہے سر پہ مگر سائباں سا کیوں ہے

میں تیری ذات پہ اندھا یقین رکھتا ہوں
مرے وجود سے تو بدگماں سا کیوں ہے

حصارِ ذات سے جب میں نکل نہیں سکتا
مرا وجود ہی میرا مکان سا کیوں ہے

میں تیری راہ میں بکھرا ہوں خوشبوؤں کی طرح
تو میری راہ میں آخر چٹان سا کیوں ہے

ہر اک نفس پہ گماں ہو رہا ہے مجرم کا
ہر ہر قدم پہ یہاں امتحان سا کیوں ہے

میں جس کی نظروں میں پیہم کھٹکتا رہتا ہوں
وہ آج مجھ پہ بہت مہربان سا کیوں ہے

نہ جانے کس کی فغاں کا دھواں ہے اے جامی
سروں پہ پھیلا ہوا آسمان سا کیوں ہے

قاضی انتصار
قاضی پورہ کھنڈوا
مدھیہ پردیش ۴۵۰۰۰۱

ڈاکٹر لطف الرحمٰن
شعبۂ اردو
بھاگلپور یونی ورسٹی
بھاگلپور

اک ایسے مرحلے سے گزرنا پڑا ہمیں
جینا پڑا کبھی، کبھی مرنا پڑا ہمیں

دینا تھا دے دیے ہیں تمھیں چند مشورے
یہ کام بھی ضرور تھا کرنا پڑا ہمیں

اس شہر میں پہنچ کے خدا جانے کیا ہوا
اپنے ہی سایے سے یہاں ڈرنا پڑا ہمیں

ہے ذہن و دل میں کشمکش انتصار اس لیے
کچھ دیر سوچنے کو ٹھہرنا پڑا ہمیں

آگ تو کب کی بجھ گئی ہو گ
یاد پنکھا سا جھلتی رہتی ہے

وقت کی بے وفا ندی اکث
راہ اپنی بدلتی رہتی ہے

کیا بھروسا ہو اپنی ہستی پر
ریت پیہم بکھرتی رہتی ہے

گھر کے سوئے ہوئے منڈیروں
اوس تنہا بلکتی رہتی ہے

دل کی ویران ساعتوں میں بھ
سوچ کوئی سلگتی رہتی ہے

اشہر ندیمی
مکان نمبر ۹-۲/۲۰ ایس، آر، ٹی۔
چنڈولال۔ بارہ دری۔
حیدر آباد

غزل

پھولوں بھری ہو راہ مرا خواب تھا سنو
کانٹوں پہ چل رہا ہوں یہ تعبیر دیکھ لو

خوابوں پہ انحصار ہے سب کی حیات کا
اس میں برا ہی کیا ہے کوئی خواب تو بنو

ناکام ہوں میں آج تک اپنی تلاش میں
میں کس مقام پر ہوں مجھے یہ سراغ دو

ملنے کو بے قرار ہے انساں سے روحِ امن
ہٹ جاؤ درمیان سے نفرت کے فاصلو

مزور اٹھا رہا ہے اگر امن کا سوال
ہ مصلحت نہیں ہے اسے بزدلی کہو

نسلِ نو کے واسطے سوغات تم نے دی
عمر نفرتوں کی کڑی دھوپ میں جلو

شی ہے میرے عہد نے یہ آگہی مجھے
ہر قلم کو پھینک کے تلوار تھام لو

احمد وصی
ای/۲-۲۔ ہنجر نگر۔ پمپ ہاؤس
اندھیری (ایسٹ) بمبئی۔

تیری آنکھیں بہت غزالی ہیں
پھر بھی رنگِ وفا سے خالی ہیں

آستینوں میں صرف سانپ نہیں
میں نے کچھ ناگنیں بھی پالی ہیں

ہم بہت کامیاب تاجر ہیں
اپنی قدریں بھی بیچ ڈالی ہیں

اجلی اجلی ہیں دور سے شکلیں
پاس جاؤ تو کالی کالی ہیں

میرے پاس اور کیا ہے تیرے لیے
چند سانسیں ہیں جو بچالی ہیں

میرے الفاظ پھول تھے کل تک
آج تیری نظر میں گالی ہیں

بے وفا بن کے عشق میں ہم نے
سر سے کتنی بلائیں ٹالی ہیں

حیدر قریشی۔
شعبۂ اردو۔ انٹرنیشنل پبلک اسکول
اینڈ کالج۔ منڈیاں۔ ایبٹ آباد۔
پاکستان۔

یہ دل کہ تجھ سے جو رازِ دنیا ز رکھتا ہے
ترے حریف سے بھی ساز باز رکھتا ہے

وہ پہلے دیتا ہے ترغیب پاس آنے کی
قریب آنے سے پھر خود ہی باز رکھتا ہے

ستم ظریف پہ غصّہ بھی تو نہیں آتا
زباں کا تیز ہے پر دل گداز رکھتا ہے

نہیں تو صرف مرے حال سے نہیں واقف
وہ بے خبر جو جہاں بھر کے راز رکھتا ہے

فرشتے اس کا کریں گے حساب پھر کیسے
ہر اک گناہ کا حیدر جواز رکھتا ہے

ابراہیم اشک
۳۲۰ سائی نواس۔ شانتی نگر گرانٹ روڈ
بمبئی ۴۰۰۰۰۷

دوہے

دو مصرعوں کا کھیل ہے، لکھ دے اک اتہاس
ہے دوہے کے پھول میں، صدیوں کی بو باس

ہر رشتے میں کھوٹ ہے، سچا ماں کا پیار
ماں کا سایہ جب اُٹھے، اجڑے سب سنسا

سن دکھیا دکھ روئے ہے، نینا کا ہے
اُجڑے گھر سیلاب میں، شہر میں چرچا ہو

من پنچھی اُڑتا پھرے، دیکھے چھاؤں نہ دھو
بیٹھے اُس منڈیر پہ، جہاں بسے ہے روپ

گیان، دھیان، گُن دھرم ہے، جانا جائے فقیر
کوئی خسرو بن گیا، کوئی بنا کبیر

برگد جیسی چھاؤں میں، ملا بدھ کو گیا
اک سایہ مل جائے تو، مل جائے نروا

ریتی سے ہیرے بنے، ردی سے کل
مٹی سے سونا بنے، کر لے کاردبا

کھیت کوئیں کھلیان کی، ہم سے پوچھو بات
لگی ہوا جو شہر کی، بدل گئے دیہات

دیہا نگر کی بھیڑ میں، کیا سادھو، شیطا
اس بہتے سیلاب میں، سب ہیں ایک سما

صحرا جیسی پیاس دے، سورج جیسی دھو
جیون بھر کی آگ دے، ایسا تیرا رُو

من مانی جب من کرے، چلے نہ کوئی زو
من کے جیسا باؤرا، ملے نہ جگ میں

رؤف خیر
رسالہ بازار گولکنڈا۔

میں اپنی آواز کھو رہا ہوں

میں اپنی آواز کھو رہا ہوں
یہ کن مناظر کا بوجھ آنکھوں پہ ڈھو رہا ہوں
یہ کیسی چیخیں سماعتوں میں سمو رہا ہوں

فضا دکن میں جو معتدل تھی وہ مشتعل ہے
عجیب آندھی ہے، برگِ نوخیز ہو کہ برگد
ہے اس کی زد میں
نہیں ہے کوئی بھی اپنی حد میں
بہا چلا جا رہا ہے ہر خواب رد و کد میں

شمال شعلوں میں گھر گیا ہے
کہ ایک چنگاری برف زاروں میں بھی ہے زندہ
جو اپنی خاک ترِ بدن سے اٹھی تو
کتنوں کے سر چڑھی ہے
چھڑے ہیں دیر و حرم کے قصے
نہ دیر سے دیریوں کو اگلا سا پیار
اہلِ حرم بھی اب بے حرم بہت ہیں
وہی انا کے شکار — بے اختیار دونوں
شکار مشرق میں مہرِ آشوبِ چشم کا ہے
تمام دن سر پہ خاک ڈالے
وہ سبز منظر بھی لال آنکھوں سے دیکھتا ہے
سفید گھوڑے ہیں کالے بھوتوں کی دسترس میں
سفید پوشوں کے ہیں گریبان چاک
سر پہ ہے خاک

بدن میں مغرب کے جو سرایت ہے زہر
بے نام زخم کا ہے
وہ زخم جس کو سمندری پانیوں سے دھونے کی

کوششیں ہو رہی ہیں دن رات
زہر وہ جو رگوں میں پٹرول بن کے گردش کرے
دھماکے منتظر ہے
سمندری فیل اک اشارے کے منتظر ہیں کہ روند ڈالیں
ادھر سنبھالے ہوتے ابابیل
اپنی چونچوں میں تشنہ و تابکار کنکر
بساط مشکل ہوئی ہے اک مہرۂ غلط سے
ہیں ایک گھوڑے کی زد میں شاہ و وزیر دونوں
غروب جس سرزمیں میں سورج نہ ہو سکا تھا
وہ دم بخود ہے
انہی کو انعام و خلعتِ فاخرہ ملی ہے
جو بربریت کی ایک ننگی مثال ٹھہرے
چہار جانب انہی عناصر کی حکمرانی ہے
کون سنتا مری کہانی
میں اپنی آواز کھو رہا ہوں
وداع اب تم سے ہو رہا ہوں
مگر یہ سن لو
زبان اک گنگ ہو گئی ہو تو یہ نہ سوچو
کہ اب نہ ٹوکے گا کوئی تم کو

اگر کوئی آنکھ بجھ گئی ہو تو یہ نہ سمجھو

کہ اب نہیں دیکھے گا کوئی تم کو

اگر کوئی ہاتھ کٹ گیا ہو تو یہ بھی دیکھو
ہزار ہاتھوں کا ایک جنگل اگا ہوا ہے
ہے یا نو کوئی جو چھالا چھالا تو یہ تو جانو
کہیں کوئی راہ بے قدم بھی کہیں ہوتی ہے
وہی جیالوں کی بھیڑ سی اک لگی ہوئی ہے

شریف قریشی
...وسہ منڈی فتح گڑھ
...رخ آباد یو۔پی

غزل

...ہر یقیں، عالم سراب ہوا
...تیرا ملنا خیال و خواب ہوا
...نکشافات ہوتے جاتے ہیں
...یہ بھلا کون سا حجاب ہوا
...میں تری راہ کا غبار سہی
...کتنا اچھا ہوا، خراب ہوا

رفعت عزمی
ضلع بارہ بنکی۔یو۔پی

غزل

اشکوں کا افسوس تو ہو گا
اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں
ہم نے جینا سیکھ لیا ہے
ہم ہنستے ہیں ہم روتے ہیں
رفعت عزمی دل کے روگی
برکھا رت میں کم سوتے ہیں

صغیر زخمی سیہوری
مقیم حال، بھوپال

نقوش چھوڑ کے جاؤں گا ایسے راہوں میں
ملے گا جس سے نیا درس اس زمانے کو
اب اعتماد کریں کس پہ اور دنیا میں
محافظوں نے جلایا ہے آشیانے کو
گیا جو وقت وہ کب ہاتھ آنے والا ہے
نہ یاد کر کبھی گزرے ہوئے زمانے کو
وہ آئیں شوق سے ایسے میں کاش اے زخمی
سجا کے ہم نے رکھا ہے غریب خانے کو

فضل افضل
عقبہ صدر، پٹھ خانہ - یادگیر
کرناٹک

غزل

جستجوے روز و شب میں پست و بالا ہو گئے
کیسے کیسے لوگ تھے ہم بھی مگر کیا ہو گئے

ہائے اِس بے درد نے تاکا ہے ہم کو اس طرح
وقت کے ہاتھوں میں ہم سازِ شکستہ ہو گئے

اب ہمارے پاس کیا جز منظرِ فصلِ بہار
خود تماشا بن کے ہم، محوِ تماشا ہو گئے

میرے آنگن کے یہ گل اندام میں مہکے ہوتے
مسکراتے چند بچے رشکِ دنیا ہو گئے

ہم کہ پابندِ وفا افضلؔ شروع سے تھے مگر
امتحاں اپنے یہاں سینہ بہ سینہ ہو گئے

عظیم الدین عظیم
دھرم پور ــــ برن پور
ضلع بردوان -

ستم بھی سہتے ہیں ہنس کے ملا بھی کرتے ہیں
جو اعلا ظرف ہیں وعدے وفا بھی کرتے ہیں

جو کاٹتے ہیں ہرے پیڑ کیا خبر ان کو
اٹھا کے ہاتھ شجر بد دعا بھی کرتے ہیں

خیالِ موج و تلاطم نہ فکر طوفان کی
کہ بھول ایسی کبھی ناخدا بھی کرتے ہیں

مصیبتوں میں کیسے یاد وہ نہیں آتا
خدا کو یاد تو اہلِ جفا بھی کرتے ہیں

عظیمؔ دیکھیے انداز ان کی الفت کا
کہ حکم دیتے ہیں اور التجا بھی کرتے ہیں

مہر تمکین
براں، ساؤتھ ویلز
برطانیہ

فسانہ کہیں جسے

(عاشور کاظمی کی تحقیقی کاوش "فسانہ کہیں جسے" کے حوالے سے)

اردو کے بعض علمی وادبی حلقوں میں سہل پسندی کے رجحانات اس حد تک عام ہو چکے ہیں کہ رسائل وجرائد کے سرسری مضامین ہی نہیں بلکہ جامعات کے تحقیقی مرکزوں اور پی، ایچ، ڈی کی سند کے لیے پیش کردہ مقالات میں بھی چھان بین اور ژرف نگہی کے فقدان کی شکایت بڑی حد تک جائز قرار دی جا سکتی ہے۔ برصغیر کی یونی ورسٹیوں میں اب زیادہ تر ایسے اصحاب سند فضیلت حاصل کر رہے ہیں جو مخطوطات، رجحانات یا علمی ومعتبر شخصیات پر کسی نئے پہلو سے روشنی ڈالنے، کوئی نیا زاویۂ نظر پیش کرنے یا کسی عنصر گمشدہ کی دریافت کے سلسلے میں دلچسپی صرف اس حد تک لیتے ہیں کہ مقبول اقتباسات اور منظور شدہ فہرستیں جمع کر کے اپنے صدر نشین یا رہنما استاد کی خدمت میں پیش کر دیں نتیجہ اس کساد بازاری کا یہ ہوا کہ ہندستان کی مرکزی وزارت تعلیم کے ایک حالیہ اندازے کے مطابق اس وقت وہاں لگ بھگ ڈھائی تین ہزار پی۔ایچ۔ڈی، یافتہ حضرات بے روزگاری کا شکار ہیں۔ یہ کہنا قطعی غیر ضروری ہے کہ تقریباً یہ تمام حضرات اردو ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

اردو میں فی زمانہ تحقیق وتدریس کے حق گمراہ کن رجحانات کا ذکر یہاں آیا ہے ان میں نظم ونثر کی کوئی تخصیص نہیں ہے سب سے زیادہ دلچسپ پچھلے دس برسوں میں شائع ہونے والی وہ کتابیں ہیں جو پی، ایچ۔ ڈی کی سند کے لیے پیش کردہ مقالات کی طبع شدہ صورت ہیں اور جن میں فن افسانہ کے حوالے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ تاہم کسی کا نام لیے بغیر اچھے خاصے اور اس ذمہ داری کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان مقالات میں عام طور پر اردو کے پانچ چھے صفِ اوّل کے مسلمہ افسانہ نگاروں کا ذکر ہوتا ہے اور ان کے ساتھ ہی ترقی پسند مصنفین کی انجمن یا تحریک پر طویل تبصرہ ہوتا ہے جس کی اصل حیثیت ایک سرسری جائزے یا تذکرے کی ہوتی ہے۔ یہ تذکرہ سن چالیس کے اواخر اور پچاس کے عشرے کے ابتدائی چند برسوں میں شائع ہونے والے ترقی

پسند رسائل - سویرا، شاہراہ - نقوش سے اخذ شدہ "عطر" پر مشتمل ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تحریک کے واقعی تفصیلی مطالعے اور اس کی رفتار ترقی اور پھر زوال و غیر مقبولیت وغیرہ کی وجوہ سے اس کا تعلق ذرا کم ہی ہوتا ہے۔ ان دو ابتدائی ابواب کے بعد مقالہ نگار اپنے جاننے والوں، اور اپنی وسیع النظری کا اظہار کرنے کے لیے اور دو ایک غیر متعلق یا غیر متنازعہ فیہ یا اپنے گروہ سے الگ لوگوں کا بھی ذکر کرتا ہے۔ اس سلسلے میں قصائد اُن اصحاب کے ہوتے ہیں جو مخصوص و "موثر" ادبی گروہوں سے متعلق اور مختلف ملکوں اور شہروں میں فیض رساں عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔ یہاں مقصد کسی طرح خود اس طرح کی ادبی سرگرمیوں کی تنقیص نہیں بلکہ اظہار افسوس اس سہل پسندی پر ہے جو بدقسمتی سے اردو کے ادبی دبستانوں کا نشان امتیاز بنتی جا رہی ہے۔

ان حالات میں کسی کا جانسوزی اور عرق ریزی کے ساتھ کسی ایک مسئلے پر روشنی ڈالنا اور اپنے ادّعا کو اتمام حجت کی منزل تک پہنچا کر "شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم" کہہ کر اطمینان کی سانس لینا عام تعریف و تحسین کا مستحق ہو یا نہ ہو مگر اکبر الٰہ آبادی کے اس شعر کی یاد دلانے کا حقدار تو ضرور ہے جو انھوں نے سیّد احمد کے بارے میں کہا تھا۔

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سیّد کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں

سیّد عاشور کاظمی "کرنے والوں" (DOERS) میں ہیں۔ گزشتہ چند برسوں میں انھوں نے اپنے ادارے تھرڈ ورلڈ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ اینڈ لٹریچر کی طرف سے کئی اہم "خالص" ادبی و تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں۔ ان اشاعتوں میں ان کی اپنی حیثیت زیادہ تر ناشر یا تقریظ نگار کی رہی ہے۔ لیکن ہما نہ کہیں جسے مرتب کر کے انھوں نے اچھے اچھے مصنفین کے لیے اسباب خجالت فراہم کر دیا ہے۔ کام کرنے والے اور کام کی قدر کرنے والے حلقوں میں اس کی پذیرائی ضرور ہو گی مگر دوسری طرف سہل پسند ادبا، وزعما کی صفوں میں برافروختگی کی لہر بھی پائی جاتی گی کیونکہ اپنی کتاب میں عاشور صاحب نے محض اپنے دوست ادیبوں کے نام بیس گناتے ہیں (یہ کام تھرڈ ڈویژن پاس خود ساختہ پروفیسر بطریق احسن انجام دے رہے ہیں) بلکہ افسانہ نگاروں کے معلومات افزا تعارف بھی پیش کیے ہیں معلومات افزا تعارف کی ترکیب پر چونکنے کی ضرورت نہیں۔ تعارف ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے ممدوح یا موصوف کے بارے میں پتا ہی نہیں کہ وہ مرد ہے یا عورت

یا شاعر ہے یا نثار۔
مغربی دنیا میں اس وقت اردو افسانہ نگاری کے میدان میں جو لوگ سرگرم تگ و تاز ہیں ان کی تخلیقات کا عاشور صاحب نے قدیم وجدید معروف وغیر معروف اور مقبول و نامقبول کا امتیاز کیے بغیر بہت تفصیلی مطالعہ کیا ہے اور کتنے ہی شب و روز افسانہ نگاروں کی تخلیقات پڑھنے اور ان میں سے زیادہ نمائندہ یا بھرپور افسانے منتخب کرنے میں صرف کیے ہیں اگر انھوں نے افسانہ نگاروں کی تخلیقات مانگ کر یکجا کر دی ہوتیں۔ میں تب بھی سب سے رابطہ قائم کرنے اور ان کے بارے میں سرسری تبصرے لکھ دینے میں بہت آسانی نہ ہوتی۔ اس کام میں واقعی کتنی مشکل پیش آتی ہے اس کا اندازہ اپنے رسائل و جرائد کے خصوصی نمبر مرتب کروانے مدیروں کو اچھی طرح ہو سکتا ہے۔ مگر عاشور کاظمی نے کیا یہ ہے کہ اگر کسی افسانہ نگار نے اپنی کوئی ایسی تخلیق پیش کی جس میں اس کے طرز بیان کی واضح نمائندگی نہ ہو سکی ہو تو پھر خود اس کے تمام افسانے پڑھ کر زیادہ نمائندہ اور موزوں افسانے کا انتخاب کیا ہے جن لوگوں کو ادیبوں سے واسطہ پڑتا ہے وہ خود اپنی جگہ یہ احساس کر سکتے ہیں کہ کس ادیب و شاعر سے'' کام کی بات معلوم کرنا یا کچھ لکھوانا کتنا مشکل ہے۔ سید عاشور کاظمی نے ہر لکھنے والے سے ذاتی رابطہ قائم کر کے اس مجموعے کو تقریباً ہر لحاظ سے مکمل و جامع بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔

اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ عاشور صاحب نے دبستانِ مغرب میں مصروف نگارش افسانہ نگاروں کو پیش کیا ہے خود مغربی روایات کے تناظر میں۔ اور جو بات اپنے اردو ادب میں انتہا درجہ انگیز اور قابل تحسین اور ہر آئینہ نادر کی ہے وہ یہ ہے کہ ایک ''بھرے بازار میں'' سپردم بتو مایۂ خویش را،کہتے ہوئے انھوں نے کسی طرح کے احساس کمتری کا اظہار نہیں کیا ہے۔ ''مشہور مغربی مفکرین'' اور دانائے مغرب، کی کوئی ڈھونس نہیں دی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایسا کرتے ہوئے یہ دعوا احسان بھی نہیں کیا ہے کہ ہم تم سے کسی بہتر یا کمتر ہیں۔ کیا انھوں نے صرف یہ ہے کہ زر وسیم کے اظہار میں اپنے جواہر پارے بھی رکھ دیے ہیں اور معاملہ چھوڑ دیا ہے'' دھرم کانٹے، کی طرح تول اور پرکھ کرنے والوں پر۔ یہ تو ہوتے فسانہ کہیں جسے،'' کے دو بہت اہم اور امتیازی پہلو۔ یعنی ایک غیر جانبدارانہ انتخاب اور اس کی پُراعتماد اور حقیقت پسندانہ پیشکش۔ مگر کتاب کا نقطۂ کمال بقول کسے LOCUS CLASSICUS یہ ہے کہ اپنی ترتیب،

انتخاب کو ایک تالیف کے بجائے تحقیق و تخلیق کا معتبر درجہ انھوں نے دے دیا ہے مغربی افسانے کی روایت وارتقا کا سیر حاصل تذکرہ کرکے - یہ چند پُر از معلومات صفحات لکھنے کے لیے عاشور صاحب کو مطالعے اور ریاضت کے کس ہفتخواں سے گزرنا پڑا ہوگا اس کا خیال کرکے ہی تصور لرزاٹھتا ہے۔ ایک انگریزی ادیب نے (نام لینا غیر ضروری ہے کیونکہ وہ ایک بڑا سامراجی بھی تھا) لکھا ہے کہ "ایک سطر لکھنے کے لیے ایک کتاب کا مطالعہ ضروری ہوتا ہے۔" اور اس سلسلے میں آگے چل کر کہتا ہے کہ گھاس کی ایک معمولی پتی پر لکھنے کے لیے بھی اہل قلم کو جنگلات کی تاریخ و جغرافیے سے واقفیت حاصل کرنا پڑتی ہے۔" تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ فنِ افسانہ کے ڈھکے اور چھپے اور اس کی تاریخ کے بعض گمشدہ پہلوؤں کا ذکر کرنے کی خاطر صاحب کتاب کیا کیا نہ پاپڑ بیلے ہوں گے۔ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ عاشور صاحب کی یہی عرق ریزی سہل پسندوں کے حلقوں میں "اسبابِ پشیمانی کی موجب ہے۔

اگر ذکر اردو افسانہ نگاروں کا نہ بھی ہو تب بھی "افسانہ کہیں جسے" کا ابتدائیہ جسے عاشور کاظمی صاحب نے بطور تعارف پیش کیا ہے اپنی جگہ پر خود ایک تحقیقی مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں رسمی اقتباسات، مروجہ حوالے اور "استاد محترم" یا صدر شعبہ کی تعریف وتحسین سے معلوم صفحات نہیں بلکہ اچھی طرح پڑھے اور سوچے سمجھے حوالے اور نتائج ہیں جن کو عاشور صاحب نے اپنے مخصوص کہیں کہیں استہزائیہ انداز تحریر سے اس طرح قابل مطالعہ بنادیا ہے کہ اکثر اوقات شبہہ اس پر کسی طویل انشائیے کا ہونے لگتا ہے۔ وہ انشائیہ نہیں جو سرگودھا کے کھیتوں اور کھلیانوں میں "ہینڈ پمپ" سے سینچا جارہا ہے بلکہ وہ جس کے علم برداروں میں مرتبین۔ ایلیا اور ہزلٹ جیسے امامانِ فن کے اسمائے گرامی مطلا اور زریں حروف میں منقوش نظر آتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں عاشور صاحب نے صرف مستند اور جانے پہچانے یا مخصوص حلقوں میں مخصوص وجوہ سے مقبول افسانہ نگاروں کا ہی تذکرہ نہیں کیا ہے بلکہ پورے اعتماد اور بھرپور یقین کے ساتھ نئے لکھنے والوں کے رجحانات اور امکانات کی طرف اشارے بھی کیے ہیں۔
یوں کہنے کو تو کتاب صرف مغرب میں آباد اردو ادیبوں کے فکر و فن کی داستان ہے لیکن حیثیت بطور ایک دستاویز کے پاکستان، ہندستان کے ادبی حلقوں میں بھی تسلیم کی جاتے گی۔
اندازہ یہ ہے کہ کاظمی صاحب نے اس کتاب کی تصنیف و تخلیق میں دو تین برس

صرف کیے مگر کام جس لگن اور جاں سوزی اور سب سے بڑھکر منصف مزاجی کا مظہر ہے اس کے لیے پانچ دس برس کی مہلت بھی کم ہی قرار دی جاسکتی ہے۔ کیونکہ مغربی، افسانہ کے ارتقا یا داستانوں اور کہانیوں کی تدریجی ترتیبوں و رجحانات کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے محض بیانیہ سے کام نہیں لیا ہے بلکہ واقعی مدتوں اس بحرِزخار میں شناوری کرنے کے بعد گوہر مقصود حاصل کیا ہے اور اب درجہ ان کے اس مطالعے کا اتنا استناد دی ہوگیا ہے کہ برسوں تک بہت سے "اردو افسانہ پر ایک نظر" ڈالنے والے محققین کسب فیض اس سے کریں گے اور مغربی افسانے کی روایت سے واقفیت کے سلسلے میں اس کتاب کا مطالعہ شرط اوّل قرار دیا جائے گا۔

مختصراً یہی کہا جاسکتا ہے کہ کہنے کو تو سید عاشور کاظمی کی تصنیف نسانہ کہیں جسے میں اردو افسانے کی رفتار و ترقی کا جائزہ ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کی مشکل پسندی اور "سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آسان نکلا" کا احساس تاسف اس کو ان مستند و معتبر کتب میں شامل کیے جانے پر منحصر ہے جن کو ادبی حلقوں میں سنگ میل اور جامعات — AKADEM EIA — میں درس و نصابی کتب کہا جاسکتا ہے۔

چونکہ راقم الحروف خود بھی افسانہ نگاری کی دنیا میں دلچسپی رکھتا ہے اس لیے ذاتی طور پر عاشور صاحب کی مساعی شکر گزار ہے کہ انھوں نے کوزہ میں دریا" فراہم کر دیا۔

سوم آنند

کچھ "جام جہاں نما" اور گربچن کے بارے میں

ہمارے شہروں میں رہنے والے پڑھے لکھے لوگوں کا دن عام طور سے چائے کی پیالی اور اخبار کی سرخیوں سے شروع ہوتا ہے۔ آج اخبار ہماری زندگی کا ایک لازمی جزو ہے۔ اور ہم کسی ایسے معاشرے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے جس میں اخبار نہ چھپتے ہوں۔ جدید دور میں بہت سی تحریکوں کا عروج درحقیقت پریس کا ہی مرہون تھا۔ مگر جو لوگ صبح اٹھ کر سب سے پہلے اخبار دیکھنے کے عادی نہیں ان میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جنھوں نے یہ سوچا ہو گا کہ اخبار چھاپنے کا چلن جب شروع ہوا تو یہ کیسے ہوتے تھے۔ ان کی قیمت کیا تھی۔ اور ان میں خبریں کس انداز سے دی جاتی تھی۔

اگر آپ یہ سب کچھ جاننا چاہتے ہیں تو گربچن چندن صاحب کی کتاب "جام جہاں نما — اردو صحافت کی ابتدا" ضرور پڑھیے۔ اخبارات کی دنیا سے چندن صاحب کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ ۳۳ برس تک آپ ہند سرکار کے پریس' انفرمیشن بیورو میں پہلے' اسسٹنٹ انفرمیشن آفیسر اور پھر انفرمیشن آفیسر کے عہدے پر رہے۔ صحافت سے اور خاص طور پر اردو صحافت سے چندن صاحب کی دل چسپی صرف سرکاری ملازمت کی وجہ سے نہیں تھی۔ اردو پریس کی حالت کیسے بہتر ہو یہ گویا آپ کی زندگی کا مشن رہا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب آپ پی۔ آئی۔ بی میں اردو کے انفرمیشن آفیسر تھے تو اخبارات کی حالت سدھارنے کی کئی اسکیمیں اُن کے ذہن میں گھوما کرتی تھیں۔ یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اردو ٹیلی پرنٹر سروس شروع کرنے کی تجویز انھوں نے ہی سب سے پہلے پی۔ آئی۔ بی میں پیش کی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی اردو اخبارات سے آپ کی دل چسپی کم نہیں ہوئی۔ آج انھیں اس میدان کا چلتا پھرتا

انسائیکلو پیڈیا کہا جا سکتا ہے۔ اردو اخبارات کے متعلق ہر طرح کے اعداد و شما
آپ کے قلم کی نوک پر رہتے ہیں۔ سرکاری دفتر کی ذمے داریوں سے چھٹکا
حاصل کرنے کے بعد چندن صاحب تحقیق کے کاموں کی طرف متوجہ ہوئے ہیں
دو سال تک صبح سے شام تک نیشنل آرکائیوز National Archives میں یہ معلو
کرنے کے لیے بیٹھے رہے کہ اردو کا سب سے پہلا اخبار "جام جہاں نُ
کیسا تھا۔

آپ پوچھیں گے کہ "جام جہاں نما" میں کیا خاص بات تھی کہ اسے تحقی
کا موضوع بنایا گیا۔ چندن صاحب کو بہت عرصے سے محسوس ہو رہا ت
کہ ہمارے محققوں نے اس اخبار کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ا
بات کی تحقیق ۱۹۵۰ء کے آس پاس ہوئی کہ اردو کا پہلا اخبار کلکتہ کا "جام جہا
تھا۔ عتیق صدیقی اور امداد صابری نے اپنی کتابوں میں اس کا ذکر کیا۔
مگر اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ یہ زیاد
عرصے تک فارسی اخبار کا ضمیمہ بنا رہا۔ دوسری یہ کہ تقریباً پانچ سال چ
کے بعد یہ بند ہو گیا۔ علاوہ ازیں عام رائے یہ تھی کہ اس اخبار کو ایسٹ انڈیا
کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس بات کا اندازہ محققوں نے اخبار پر کمپنی کا نشا
دیکھ کر لگایا۔ پھر یہ بھی کہا گیا کہ اخبار کا بڑا مقصد کمپنی کے انگریز افس
کو اردو سکھانا تھا۔

چندن صاحب کو اس تحقیق پر اطمینان نہیں ہوا۔ وہ محسوس
کرتے تھے کہ اس اخبار کی اہمیت صرف اتنی ہی نہیں تھی۔ علاوہ ازیں
یہ بھی جاننا چاہتے تھے کہ "جام جہاں نما" کے ایڈیٹر سدا سکھ لعل اور
ہری ہر دت کون لوگ تھے۔ ظاہر ہے یہ اردو کے پہلے جرنلسٹ تھے۔ ا
کسی نے ان کے متعلق جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اس کتاب میں کئی باتوں پر سے پردہ اٹھتا ہے۔ اس سلسلے
مصنف کی سب سے بڑی دریافت تو اس وقت کے اخبارات کے متعلق مسٹر ڈ
بیلی کی رپورٹ ہے۔ موصوف کلکتہ میں کمپنی کی حکومت کے چیف سیکریٹری
۷۷ صفحات پر پھیلی ہوئی رپورٹ میں انھوں نے انگریز گورنر جنرل اور دو
افسران کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے لیے دیسی پریس کا جائزہ لیا ہے
بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس وقت کلکتہ میں چار دیسی اخبارات
دو بنگالی کے اور دو فارسی کے۔ فارسی کے اخبارات میں راجا رام موہن
کا "مراۃ الاخبار" اور "جام جہاں نما" تھے۔ اس رپورٹ میں "جو جام ج
کا ذکر سب سے زیادہ کرتی ہے"، دیسی پریس کے متعلق مسٹر بیلی کے خدشا

اظہار کیا گیا ہے۔ اس سے وہ تمام نظریات غلط ثابت ہوتے ہیں جن میں یہ بات فرض کر لی گئی ہے کہ "جام جہاں نما" کو کمپنی کی سرپرستی حاصل تھی یا وہ اس کا حاشیہ بردار تھا۔ چندن صاحب نے مسٹر بیلی کی رپورٹ سے جو حوالے دیے ہیں ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر بیلی کے دل میں اس اخبار کے متعلق کتنی بدگمانیاں تھیں۔ (اچھا ہوتا اگر مصنف نے اس رپورٹ کا پورا متن یا اس کا ترجمہ بھی شامل کر لیا ہوتا۔ اس سے کتاب کی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا) دل چسپ بات یہ ہے کہ اس رپورٹ کا ذکر عتیق صدیقی مرحوم نے بھی اپنی کتاب میں کیا ہے۔ جو ۱۹۵۷ میں چھپی (ہندستان اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں") مگر معلوم ہوتا ہے انھوں نے یہ دستاویز تفصیل سے نہیں دیکھی۔

"جام جہاں نما" کے ناشر و ایڈیٹر کی ہمت اور دماغی اپج کا اندازہ کرنا ہو تو انیسویں صدی کے پہلے تین دہائیوں کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کا اندازہ کیجیے۔ غریبی اور ناخواندگی تو ہندستان میں آج بھی ہے۔ مگر اس وقت اور زیادہ تھی۔ ہندستانیوں میں انگریزی جاننے والے تو نہ ہونے کے برابر تھے۔ اور تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان فارسی تھی۔ اسی لیے تو راجا رام موہن رائے نے اخبار "مراۃ الاخبار" فارسی میں شروع کیا۔ کلکتہ میں انگریزی صحافت شروع ہوئے تو ۴۰ برس کے قریب ہو چکے تھے۔ مگر کسی دیسی زبان میں اخبار چلانے کی کوئی روایت نہیں تھی۔ ایسے حالات میں کلکتہ شہر سے اردو کا اخبار شروع کرنا (جسے ان دنوں وہ ہندستانی کہتے تھے) واقعی ہمت کی بات تھی۔

یہ حقیقت بھی بہت دل چسپ ہے کہ ۱۸۲۲ء میں جب "جام جہاں نما" ایک ہفت روزہ اخبار کی طور پر شروع ہوا تو اس کی زبان اردو تھی۔ مگر آٹھ شماروں کے بعد اس میں فارسی کے ایک کالم شامل کیا گیا۔ جو اس قدر مقبول ثابت ہوا کہ اس کے دو شماروں کے بعد ہی پورا اخبار فارسی میں شائع ہونے لگا۔ پھر اس کے ایک سال بعد اخبار کے مالک ہری ہر دت نے ایک نیا قدم اٹھایا۔ اور فارسی اخبار کے ساتھ اردو کا ایک ضمیمہ شایع ہونے لگا۔

چندن صاحب کی تحقیق ہے کہ اردو کا "جام جہاں نما" حالانکہ فارسی اخبار کے ساتھ ضمیمے کے طور پر شائع ہوتا تھا مگر اس کی ایک آزاد حیثیت بھی تھی۔ اور صرف اردو پڑھنے کے خواہش مند اصحاب اسے الگ سے بھی حاصل کر سکتے تھے۔ اس کی خبریں فارسی حصے سے بالعموم جداگانہ ہوتی تھیں۔ اردو کا یہ پہلا اخبار جو فارسی اخبار کا ضمیمہ بھی تھا اور جس کی حیثیت

ایک آزاد اخبار کی بھی تھی۔ ساڑھے چار سال سے زیادہ عرصے تک چھپتا رہا اور آخر کار جنوری ۱۹۲۸ء میں بند ہو گیا۔ حالانکہ فارسی کا "جام جہاں نما" اس کے کئی سال بعد تک چلتا رہا۔ بند اس لیے ہوا کیونکہ ناشر کے الفاظ میں "بہتیرے قدر شناس فہیموں کی لطف گستری سے اس کاغذ نے رونق پائی اردو عبارت سے ذوق نہیں رکھتے اور اہل ہند جن کی زبان ہی فارسی ہے۔ فارسی تحریر چاہتے ہیں۔"

اس کا مطلب صاف ہے۔ اس وقت پڑھے لکھے لوگ اردو تحریر کے شائق نہیں تھے۔ اخبار تو ویسے ہی اس زمانے میں ایک نئی چیز تھی۔ پھر جن لوگوں کو اس میں دلچسپی پیدا ہوئی وہ فارسی پڑھنا چاہتے تھے۔ کیونکہ یہ ہی تعلیم یافتہ لوگوں کا ذریعۂ اظہار تھی جیسے آج انگریزی ہے۔ اردو بچاری کو کوئی پوچھتا نہ تھا۔ یہ فقط بول چال کی زبان تھی۔ پڑھے لکھے لوگ مشاعرے میں جا کر اردو کلام سے تو محظوظ ہوتے مگر اردو نثر کی ان کے نزدیک کوئی وقعت نہ تھی۔ جن لوگوں کی قابلیت فارسی سمجھنے کی نہ تھی وہ تو سمجھیے بہت ہی غریب ہوں گے جن کے پاس اخبار خریدنے اور پڑھنے کے لیے پیسہ تھا نہ وقت۔ (آج بھی تو ایک بہت بڑا طبقہ اخبار خریدنے کو فضول خرچی سمجھتا ہے اور مانگ کر اخبار پڑھنے کا ہمارے ملک میں عام رواج ہے)

علاوہ ازیں ان باتوں کے اس وقت اخبار مہنگا بھی تو بہت تھا۔ "جام جہاں نما" ہفت روزہ تھا۔ اور اردو پرچے کا ماہانہ چندہ تھا دو روپے۔ مطلب یہ کہ پڑھنے والے کو ایک پرچے کے آٹھ آنے دینے پڑتے تھے۔ ایسے وقت میں جب دس روپیہ مہینا کمانے والا اچھا فارغ البال شخص سمجھا جاتا تھا۔ تو اندازہ کیجیے کہ اخبار جیسی چیز کے لیے ہر ماہ دو روپیہ خرچ کرنے والے کتنے ہوں گے۔ اور یہ کم سے کم قیمت تھی۔ کیونکہ پڑھنے والے کو ڈاک خرچ بھی تو دینا پڑتا تھا۔ ڈاک کی شرح آج کی طرح نہیں تھی بلکہ فاصلے کے حساب سے مقرر کی جاتی تھی۔ اسی لیے بعض اوقات ڈاک خرچ اخبار کی اصل قیمت سے بھی بڑھ جاتا تھا۔ اسی لیے ناشروں کا حکومت سے بڑا مطالبہ یہ بھی تھا کہ انھیں ڈاک خرچ میں رعایت دی جائے۔ اور کمپنی سرکار صرف ان ہی اخباروں کو یہ رعایت دیتی تھی جو یورپین ناشر جاری کرتے تھے۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ "جام جہاں نما" کے صرف ۲۶ پرچے چھپتے تھے۔

چندن صاحب نے اپنی کتاب میں ان تمام مشکلات کا ذکر کیا ہے جو

اس وقت کے دیسی اخبارات کو پیش آتی تھیں۔ کتاب سے ہمیں اس وقت کے سیاسی و سماجی حالات کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خبریں کس انداز سے چھاپی جاتی تھیں۔ جو شخص بھی اخبار نویسی سے دل چسپی رکھتا ہے اس کے لیے یہ سب تفصیلات بہت دل چسپ ہیں۔ علاوہ ازیں کتاب کا ایک باب "جام جہاں نما" کے ناشر ہری ہردت اور اس کے ایڈیٹر منشی سدا سکھ لعل کے متعلق ہے۔ یہ دونوں اردو کے پہلے صحافی تھے۔ اور اب تک ہمیں ان کے بارے میں کوئی خاص معلومات میسر نہ تھیں۔

مصنف نے اپنی تلاش و جستجو سے ان دونوں کے بارے میں جو کچھ معلوم کیا وہ بھی کم دل چسپ نہیں ہے۔ ہری ہردت کے متعلق یہ جان کر کچھ تعجب ہوتا ہے کہ وہ بنگالی تھے۔ ان کے والد تارا چند دت کسٹم ہاؤس کے دیوان رہے۔ اور وہ بنگالہ کے ہفت روزہ "سنباد کرمدی" کے بانی تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحافت کا شوق ان کے خاندان میں پہلے سے تھا۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ انھوں نے بنگلہ کو چھوڑ کر فارسی اور اردو کا میدان اپنایا۔ اردو سے دل چسپی اس لیے بھی حیرت انگیز ہے کہ اس بچاری کو تو ابھی تعلیم یافتہ لوگوں کی محفل میں کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔

سدا سکھ لعل بھی اپنے وقت کے نامور منشی تھے۔ اور یہ بات اس کتاب سے معلوم ہوئی کہ وہ تقریباً ڈیڑھ درجن کتابوں کے مصنف تھے۔ آج ان کتابوں کے کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ مصنف نے ان میں سے کئی کتابوں کے متعلق معلومات لندن کی انڈیا آفس لائبریری سے حاصل کی ہیں۔ اس کتاب کو دیکھتے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو صحافت کی تاریخ کا ایک گمشدہ باب دریافت ہوا ہے۔ ●●

شفیقہ فرحت
۱۸۰ پروفیسرز کالونی بھوپال

؟

اس کا کوئی عنوان نہیں اور ہونا بھی نہیں چاہیے۔ ایسی چیزوں کو اچھا بُرا کوئی نام
جانے سے ان کی ایک پہچان بن جاتی ہے۔ اسی نام کی سیڑھی پہ دو اوپر ہی اوپر چڑھتے
ے جاتے ہیں۔ زمین پہ رہنے والوں کے کندھوں پہ اچھلتے کودتے۔ کسی کو روندتے کچلتے۔
کسی کا سہارا بنتے۔

جن کا سہارا بنتے ہیں ان کو ہزاروں چہرے، لاکھوں نشانیاں دے دیتے ہیں۔ چوٹی
ڑھی، خنجر، تلوار، بھالے، ترشول، بم بندوق۔ پھر ان زہر بھرے غباروں کو اپنے بڑے
ے نوکیلے ناخنوں والے گندے پیروں میں باندھ آسمانوں تک پہنچ جاتے ہیں اور سورج
ڈھانک لیتے ہیں۔

تب اندھیرا ہی اندھیرا۔ چاروں طرف، دلوں میں، دماغوں میں۔

ماحول کا اندھیرا تو چھٹ جاتا ہے۔ دیر سویر آج نہیں تو کل سب کچھ پہلے جیسا
ہو جاتا ہے۔ لیکن دل کی سیاہی نہیں چھٹتی۔ ذہن کا اندھیرا دور نہیں ہوتا۔ اور اس بار دل
اغ پہ کچھ کالی نہیں جمتی محسوس ہو رہی ہیں۔ ایک دوسرے سے نظریں نہیں ملا پا رہے۔
ل کے بات نہیں کر پا رہے۔ جیسے چور ہمیں ہوں۔ ہم سب شعور رکھنے والے، سمجھ رکھنے
لے۔

خیر یہ باتیں چھوڑیئے۔ یہ ان کی باتیں ہیں جو دکھ کو محسوس کر رہے ہیں لیکن دُکھ
وگا نہیں یہ بچارے دانشور نازک دل والے فلسفہ اور اخلاق کا راگ ہی الاپتے رہیں گے
رکر بھی کیا سکتے ہیں۔

ان کی دنیا سے ہم نکل چلیں۔ موت آواز دے رہی ہے۔ زخموں سے چُور چُور بدن بلا رہے
ں تڑپتی روحیں بھٹک رہی ہیں۔ کہ ان کی آتما کی شانتی نہ رامائین پاٹھ سے ہو پا رہی ہے۔
تلاوت قرآن سے۔

اسپتال کا ہر وارڈ ایمرجنسی وارڈ بنا ہے۔ اندر جلے کٹے پھٹے۔ سانس لیتے دم توڑتے

انسان پڑے ہیں۔ خون کی بوتلیں چڑھی ہیں، آکسیجن کی نلیاں لگی ہیں۔ وارڈ کے باہر ماں باپ بھائی بہن، شوہر، بیوی، چچا ماموں، محلے پڑوسی سہمے ہوئے خوف زدہ، آنے والے وقت کے خیال سے دم بخود کھڑے ہیں یا ایک دوسرے کو جھوٹی تسلیاں دے رہے ہیں۔

پل پل بھاری ہے۔ اس موت سے بھی جو اندر وارڈ میں گھوم رہی ہے۔ یہ کتنے گھنٹے کس کو تڑپاتے اور کس پل کس کو دبوچ کے چلتی بنے۔

ابھی تو اس کے نوکیلے پنجے بڑھ رہے ہیں بیلا جبین کی طرف جس کی عمر صرف اٹھارہ سال ہے۔ بیلا لکھیرا پورہ کی ایک تنگ گلی میں رہتی ہے یا یوں کہیے کہ رہتی تھی۔ کہ اب تو وہ حمیدیہ اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں ہے اور شاید اسے گھر جانا نصیب بھی نہ ہو۔ خیر ابھی آنے والے قیمت کی بات کیوں کریں۔ ابھی تو اس لمحے سے گزریں جو بڑا بھیانک ہے جسے مٹھی میں قید کرنا ضروری ہے۔ ورنہ کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

نا داستان نا داستان گو۔

کتنی چنچل شوخ ہنس مکھ تھی بیلا۔ یہ عمر تو ہوتی ہی ایسی ہے جس میں چاروں طرف خواب بکھرے ہوتے ہیں۔ امنگیں ترنگیں لہراتی ہیں۔ ہونٹوں سے ہنسی پھوٹی پڑتی ہے۔ گیت اُبلے پڑتے ہیں۔ بچپن اپنے میں مگن اور جوانی آنے والے کل کے حسین خوابوں میں ڈوبی۔ چاہے آج کتنا ہی پتھریلا کھردرا کیوں نہ ہو۔

بیلا جس کے باپ کو مرے آٹھ سال ہو چکے ہیں اپنی ماں، تین چھوٹی بہنوں اور ایک چھوٹے بھائی کے ساتھ جس گھر میں رہتی ہے، اس میں صرف ایک کمرہ ہے۔ شہر کے بیچوں بیچ والے گھنے گنجان علاقے ہیں۔ یہاں مکان پرانے پتلے سکڑے اور اونچے ہیں۔ اور گلیاں تنگ۔ سکیے — اگر ہم بیلا کے گھر چلے گئے اور اس کی زندگی کے اٹھارہ سالوں کے ورق الٹنے لگے تو وہاں ایسے ایسے خواب، ایسی ایسی تمنائیں۔ ایسی ایسی حسرتیں ملیں گی۔ اتنے آنسو اتنی ہنسی۔ اتنی جھجک بہک۔ تڑپ آہ کراہ ملے گا کہ سمیٹے نہیں سمٹے گی۔ ہمارا دامن تو بہت چھوٹا ہے۔ ہم ادیب خواہ مخواہ کی ڈینگ مارتے ہیں۔ جھوٹی باتیں۔ کھوکھلے دعوے۔ ہم تو اسپتال کے اس وارڈ میں ہی رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ ابھی تو بیلا کے پلنگ سے دو پلنگ چھوڑ کر جو بیلا کی ہم عمر لڑکی پڑی ہے امینہ اس کا حال بھی تو پوچھنا ہے۔ اس کے سینے میں لگے چاقو کے زخم بھی تو دیکھنے ہیں۔

بیلا کی آنکھیں بند ہیں۔ بس سانس چل رہی ہے۔ وہ تو کچھ نہیں بتا پائے گی۔ ویسے صدیوں سے اس سوال کا جواب کسے ملا۔ کہ

قاتل کون ـــــ

دھبّے ہر دامن پہ ہیں۔ لیکن کسی مظلوم مقتول کا ہاتھ اس تک نہیں پہنچتا۔ ہاتھ اٹھتا بھی ہے تو کوئی ان دیکھی طاقت یا تو دامن کھینچ لیتی ہے یا ہاتھ جھٹک دیتی ہے۔

بیلا کی چاچی مامی اور محلے کی دوسری عورتیں البتہ بیلا کی روتی سسکتی ماں کو دلاسا دے رہی

ہیں کہ — آس کیوں چھوڑتی ہو۔ ابھی تو وہ جندہ ہے" ہاں ابھی تو وہ زندہ ہے۔ لیکن دلاسا دینے والی بھی سمجھ رہی ہے کہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہے گی — !

کہ گولی بیلا کے پیٹ میں لگی ہے — !

دبلی پتلی نازک سی لڑکی اور بندوق سے نکلی بارود بھری موٹی گولی۔ اس کے تو چیتھڑے اُڑ گئے۔ ارے — اس کی موت کے لیے تو ایک کنکر۔ ایک سخت بات ایک جھڑکی ہی کافی تھی۔ قیمتی گولی کیوں ضائع کی۔

گولی بیلا کو لگی کیسے — ؟

کیا وہ اپنے ہی شہر میں۔ اپنے ہی محلے میں دنگا فساد کر رہی تھی۔ ؟ گھروں میں آگ لگا رہی تھی۔ ہنستے لوگوں کے ہجوم پہ پتھر برسا رہی تھی۔ لہٰذا پولیس نے گولی چلادی۔

نہیں وہ ایسا کچھ بھی نہیں کر رہی تھی۔

کیا ایک اٹھارہ سال کی بھولی بھالی بے باپ کی غریب لڑکی جو اپنی ماں کی محنت اور اپنی اسکالرشپ اور ٹیوشن کے سہارے B.Sc کے پہلے سال میں پڑھ رہی ہو ایسی پاگلوں والی حرکت کر سکتی ہے۔

تو پھر کیا بلوائیوں نے اسے اپنی گولی کا نشانا بنایا — ؟

نہیں — فسادی لڑکیوں کو گولی سے نہیں مارا کرتے۔ انھیں گھروں سے کھینچ کے لے جاتے ہیں اور جشن مناتے ہیں۔

ہو سکتا ہے فسادیوں نے کھینچا ہو اور اس نے ان کے چنگل سے آزاد ہونے کی کوشش کی ہو۔ تب ان وحشیوں نے غصّے میں آکر اس پہ بندوق چلادی ہو۔

نہیں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس کے محلے میں نہ فساد ہوا۔ نہ فسادی آئے۔

تو آخر اس کا قصور کیا تھا — ؟

کیا ہر گولی کھانے والے کا قصور ہوتا ہے — !

تب یقیناً وہ غلطی سے ماری گئی۔ نشانہ کوئی اور ہوگا گولی اُسے لگی۔

یہ بھی جھوٹ ہے۔ نشانہ وہی تھی۔ اسے ہی تاک کے گولی ماری گئی اور گولی چلائی کس نے ؟ جان و مال کے محافظ امن کے رکھوالے پولیس کے سپاہی نے — ! کس مظاہرے ؟ کس جرم پہ — ؟

ارے ۱۸ سال کی دبلی پتلی نازک لڑکی جس کی سانولی رنگت کٹیلے مین نقش لمبے بال اور بھولا پن دیکھ کر ہر ایک کو پیار آتا ہو۔ اس نے کسی کے بارے میں بُرا سوچا نہ بُرا کیا۔ وہ کیا جانے جرم کیا ہوتا ہے۔

اسے تو اپنے جرم کی خبر اس وقت بھی نہ ہوئی جب تڑ سے بندوق چلی اور ایک شعلہ لپک کے اس کے پیٹ میں داخل ہو گیا۔ کپڑے خونا خون اور وہ بے ہوش۔

اسے کیا معلوم تھا کہ جب گھر میں ایک بوند پانی نہ ہو۔ مٹکے بالٹی سوکھے کھنک پڑے ہوں

تو گلی کے سرے کے نلکے سے پانی بھرنا اتنا بڑا جرم ہے کہ اسے شوٹ کیا جاسکتا ہے۔

پانی تو روز اسی نل سے بھرا جاتا تھا۔ اس کے تنگ ایک کمرے کے گھر میں نل کہاں۔ آس پاس کے بہت سارے گھروں میں نل نہیں۔ سب ہی اسی نلکے پہ جاتے ہیں اس کے گھر کا پانی اکثر بھائی بھر لیا کرتا تھا۔ شام ہو رہی تھی اس نے سوچا بھائی کو نہ جانے دے۔ شہر میں کرفیو لگا ہے یہ اسے بھی معلوم تھا اور دنگوں کی بھی خبر تھی۔ اخبار، ریڈیو، ٹی وی سب ہی کو چیخ چیخ کے اعلان کر رہے تھے۔

شکر ہے اس کے محلے میں کچھ نہیں ہوا پھر بھی سب بھائی بہنوں کا ڈر کے مارے بُرا حال تھا۔ تین دن سے وہ سب ایک دوسرے سے چپکے جڑے گھر میں گھسے سب کی خیر خیریت کی دعائیں مانگتے بیٹھے تھے چاروں طرف سے بُری بُری بھیانک خبریں آرہی تھیں اور وہ اپنی سکھی سہیلیوں اپنی ٹیچروں کے بارے میں سوچ سوچ کے پریشان ہو رہی تھی۔ اس کی کلاس میں ڈیڑھ سو سے زیادہ لڑکیاں تھیں۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، جینی، آدی باسی۔ جانے کون کس حال میں ہو۔

اس کے بھوپال میں تو آج تک ایسا نہیں ہوا۔ اتنا بڑا دنگا۔ ایسی آگ، ایسا خون۔ اس نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ نا اس کی اماں نے۔ نا پڑوس والی دادی نے اور آج ایسا فساد ایسا ہنگامہ ایسی خونریزی کہ اس کا خون بھی ذرا سی دیر میں خبر بن کر سارے شہر میں پھیل جائے گا۔

کہ وہ اور اس کا سارا گھر پیاسا تھا۔

مظلومین کربلا کی طرح۔

سامنے نل میں پانی تھا۔

میدانِ کربلا میں موجیں مارتے دریائے فرات کی طرح۔

سب کی پیاس سے تڑپ کر اس نے پلاسٹک کی بالٹی اُٹھائی۔ شام ہو چکی تھی۔ مگر نل چل رہا تھا۔ گلی سونی تھی۔ قبرستان کی طرح۔ ڈر تو اسے بہت لگا۔ مگر بن پانی رات کیسے کٹتی۔ وقت سے پہلے بوڑھی ہو جانے والی ماں گٹھیا کی مریض۔ اس کے لیے دو قدم چلنا مشکل۔ بالٹی کا بوجھ وہ اٹھا نہ سکتی تھی۔ اس نے نل تک بیلا کے ساتھ چلنے کے لیے کہا مگر بیلا نے روک دیا۔ کہ سامنے ہی تو نل تھا۔ پھر گلی بھی اپنی ہے اور محلہ بھی۔ ڈر کیسا۔ اس نے اطمینان سے بالٹی بھری۔ جھک کے اُٹھانی چاہی تو گلی کے نکڑ پر جیپ کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔

"کون ہے" گرجدار آواز سناٹے کو توڑ کر اس تک پہنچی۔

"میں .... میں ..... پانی" کم عمر معصوم لڑکی کی گھگھی بندھ گئی۔

نیلی جیپ — چاروں طرف سے تنی ہوئی بندوقیں۔

"معلوم نہیں کرفیو لگا ہے۔ شوٹ ایٹ سائیٹ — بھاگو —"

اس نے چاہا بالٹی چھوڑ کے بھاگ جائے .... مگر سب کی پیاس۔

ایک لمحے کے لیے ٹھٹھکی اور وہی لمحہ اس کی موت بن گیا۔

امن کے محافظ۔ شہر کے رکھوالے نے تڑسے گولی چلادی

بیلا کے حلق سے دل دہلانے والی چیخ نکلی۔ گلی کی کچھ کھڑکیاں دروازے کھلے۔ بیلا کی ماں اور بہنیں جو گھر کی چوکھٹ سے بیلا کی حفاظت اپنی دعاؤں اور نظروں سے کر رہی تھیں گھبرا کے چوکھٹ سے باہر آگئیں۔ لاؤڈ سپیکر کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ اتنی ہی گرجدار آواز گونجی "خبردار کوئی باہر نہ نکلے۔ ورنہ گولی مار دی جائے گی۔" جیپ کے اندر سے مائیکرو فون گڑگڑایا۔ گولی تو مار دی۔ بیلا کے پیٹ میں لگی گولی سارے محلے کے دلوں کو زخمی کر گئی۔

اب آپ اور کسے ماریں گے، حضور

پانی کی بالٹی الٹ گئی۔ بیلا نل کے پاس تڑپتی رہی۔ خون پیٹ سے پانی کی طرح بہتا رہا۔ بیلا کے قریب آنے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ ماں چھاتی پیٹتی رہی۔ بہنیں دھاڑیں مار مار کے روتی رہیں۔ مظلوموں کی فریاد کسی نے نہ سنی۔

ظلم کے شکنجے آج بھی اتنے ہی مضبوط ہیں۔ ظالم اتنے ہی طاقت ور۔

کہ وہ وردی میں بھی ہوتے ہیں۔

لوگ چیختے فریاد کرتے رہے۔ سیٹیاں بجتی رہیں۔ پندرہ منٹ بعد ایمبولنس آئی بیلا کو اس میں بے دردی سے گھسیٹ کے ڈالا۔

اور اب وہ ایمرجنسی وارڈ میں موت سے لڑ رہی ہے۔

اور چوتھے دن یعنی ۱۷ دسمبر ۱۹۹۲ء کو وہ یہ جنگ ہار گئی۔ —— اور امینہ —— ؟

غضنفر
اردو سنٹر سولن، ہماچل پردیش

افسانہ

کلہاڑا

وہ اپنے ہی پھلوں سے لدے پیڑوں کو کاٹنے کلہاڑے لے کر نکل پڑے تھے۔ کلہاڑوں کی موٹھیں ان کی مٹھیوں میں بھنچی ہوئی تھیں۔ کہنیوں تک ہاتھ کی ساری رگیں باہر آ گئی تھیں۔ آنکھیں انگاروں کی طرح دہک اٹھی تھیں۔ چہروں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ بھنویں تن کر کمان بن گئی تھیں۔ بھیانک طریقے سے تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ ماتھے کی لکیریں کھنچ کر ترشول میں تبدیل ہو گئی تھیں جن پیڑوں کو وہ کاٹنے نکلے تھے ان کے پھلوں کے تصوّر کے سہارے ان کے بزرگوں کا بڑھاپا کٹ گیا تھا۔ بُرے وقت ان کے بزرگ اپنے حصّے کا وہ تصوّر بھی انھیں سونپ گئے تھے وہ پیڑ وہ تھے جن پر انھوں نے اپنا سارا سرمایہ صرف کر دیا تھا جن کو سرسبز کرنے کے لیے اپنا خون بھی پلا دیا تھا۔ جن کو بڑھا کر اونچا کرنے میں خود گھس گئے تھے۔

پیڑوں سے پہلے پیڑوں کی زمینوں کو ان کے آبا و اجداد ننگے بدن، خالی پیٹ دھوپ میں جھلس جھلس کر جوتتے۔ پسینا بہا کر پودوں کو سینچتے اور جب فصلیں پک کر تیار ہو جاتیں تو اِدھر اُدھر سے جنگلی جانور آ کر انھیں نوچ کھسوٹ ڈالتے۔

فصلوں کی پامالی اور اپنی بدحالی دیکھتے دیکھتے ان کے آبا و اجداد تو بوڑھے ہو گئے مگر ان سے فصلوں کی بربادی اور اپنی اور اپنے بزرگوں کی تباہی بہت دنوں تک دیکھی نہیں گئی۔ ان کے نئے اور نرم ذہنوں میں سوچ کے کلّے پھوٹنے لگے۔ بچاؤ کی تدبیروں کی تلاش میں کلّوں سے کونپلیں نکلنے لگیں۔

ایک دن انھیں ایک تدبیر مل گئی۔

بہت سارے ڈنڈے جمع کیے گئے۔ ڈنڈوں کے ایک سرے پر کپڑا لپیٹا گیا۔ کپڑوں سے لپٹے سروں کو مٹی کے تیل میں ڈبو دیا گیا۔

جانور جب کھیتوں میں داخل ہوئے تو تمام ڈنڈے مشعلوں کے بھیس میں ان کی طرف لپلپاتے ہوئے دوڑ پڑے۔

جنگلی جانوروں کی آنکھیں مشتعل شعلوں کی لپلپاہٹ سے چوندھیا گئیں۔ تیز

جنگلی جانوروں کی آنکھیں مشتعل شعلوں کی لپلپاہٹ سے چوندھیا گئیں۔ تیز کرنیں ان کے دماغوں میں برچھیوں کی طرح چبھ گئیں۔ تلملا کر ان کے دماغ اکھڑ گئے۔
تدبیر کارگر ثابت ہوگئی مگر دیرپا ثابت نہ ہوسکی۔ مشعلوں کو ہر وقت جلائے رکھنا اور ان کے ساتھ خود بھی جاگتے رہنا ممکن نہ تھا۔ اس تدبیروں سے جانوروں کا آنا تو کم ہوگیا مگر ان سے فصلوں کا بچاؤ پوری طرح نہ ہوسکا۔
وہ دائمی تدبیر کے لیے سر جوڑ کر پھر بیٹھے۔
پھر ایک تدبیر ہاتھ آگئی۔
زمین کھود کر مٹی سے اینٹیں بنائی گئیں۔ کچی اینٹوں کو بھٹوں میں پکایا گیا۔ پکی اینٹوں سے کھیتوں کے چاروں طرف اونچی اونچی فصیلیں اٹھا دی گئیں۔
جنگلی جانوروں سے فصلوں کا بچاؤ ہوگیا۔
بدحالی سے نجات مل گئی۔
اپنی زندگی میں خوش حالی لانے کے لیے کھیتوں میں پھلوں کے پیڑ بھی لگا دیے گئے۔ فصلوں سے زیادہ توجہ اب پیڑوں پر دی جانے لگی۔ پیڑوں کی پرورش میں رات دن ایک ہونے لگے۔ دھوپ میں جسم و جان جھلسنے لگے۔ خون پسینا بن کر بہنے لگا۔ پیڑوں سے ہریالی اگنے لگی۔
آخر کاران کے تن من دھن کی قربانی کام آئی۔ خون رنگ لے آیا۔ پیڑوں پر پھل آگئے۔ پھلوں کو دیکھتے ہی ان کی نگاہیں چمک اٹھیں۔ جھلسے ہوئے جسموں پر ہریالی آگئی۔ چہرے لہلہا اٹھے۔ دلوں میں پھول کھل گئے۔ رگوں میں رس گھلنے لگا۔ سانسوں میں میٹھی اور من موہک مہک بس گئی۔ آنکھوں میں خوشحال زندگی کے خوبصورت خواب سج گئے۔ وہ چین کی نیند سو گئے۔
مگر ان دنوں اچانک ان کے کانوں میں کرخت صدائیں تیر کی طرح سما گئیں۔ تلملا کر وہ چونک پڑے۔ آنکھوں سے نیند اڑ گئی۔ دیکھا تو پیڑوں کی ڈالیوں پر بہت سارے کالے کالے کوّے کائیں کائیں کر رہے تھے۔
کرختگی ان کی سماعت کے پڑخچے اڑانے لگی۔
ان کی گھبرائی ہوئی آنکھوں نے یہ بھی دیکھا کہ تمام کوّوں کی نظریں پھلوں پر ٹکی ہوئی تھیں اور ان میں سے کچھ تو پھلوں پر ٹھونگیں بھی مار رہے تھے۔ چونچ کی چوٹ پر پھلوں سے گودا باہر نکل کر بہہ رہا تھا۔ انھیں محسوس ہوا جیسے ٹھونگیں پھلوں پر نہیں، ان کے اپنے جسموں پر پڑ رہی ہوں۔ اور پھلوں سے گودا نہیں بلکہ خون میں لتھڑا ان کے گوشت کا ریشہ بہہ رہا ہو۔ یہ منظر دیکھ کر آنکھیں رو پڑیں۔ ان کا اندرون کراہ اٹھا۔ انھوں نے تالیاں بجا بجا کر کوّوں سے ڈالیوں سے اڑانے کی کوشش کی۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے آس پاس کا ماحول تو دہل اٹھا مگر کوّوں کے پر تک نہیں ہلے۔

اس نئی مصیبت سے بچنے کے لیے ایک بار وہ پھر جمع ہوئے۔ ترکیب یہ نکلی کہ پتھر پھینک کر کوّوں کو بھگایا جائے۔ چنانچہ ڈالیوں کی جانب پتھر اُچھلنے لگے مگر پتھر بھی ان کو بھگانے میں ناکام ہوگئے۔ کوّے اتنے ڈھیٹ اور چالاک تھے کہ جب تک پیڑوں پر پتھر اچھلتے وہ ڈالیوں سے تھوڑا اوپر اُڑ کر خلا میں منڈراتے رہتے اور جیسے ہی پتھروں کا اُچھلنا بند ہوتا وہ پھر سے ڈالیوں پر آکر بیٹھ جاتے۔ پتھروں سے ان کا تو کچھ نہیں بگڑتا البتہ ہر بار کچھ نہ کچھ پھل ضرور زخمی ہوجاتے۔

پتھروں والی تدبیر جب پوری طرح ناکام ہوگئی تو بندوقوں والی تدبیر اپنائی گئی۔ گھر کی پوری چیزیں بیچ کر بندوقیں خریدی گئیں۔ بندوقیں چلیں تو کچھ کوّے زمین پر آگرے۔ جب کوّوں نے دیکھا کہ ان کے کچھ ساتھی گولیوں کے نشانہ بن گئے تو وہ ڈالیوں سے اُڑ کر غائب ہوگئے۔ بندوقیں خوش ہوکر خاموش ہوگئیں تو وہ پھر سے ڈالیوں پر آدھمکے۔ کائیں کائیں پھر شروع ہوگئی۔ کائیں کائیں پر پھر بندوقیں دھائیں دھائیں کرنے لگیں۔ مگر چوکنے کوے دھاکوں کو سنتے ہی پھر اُڑن چھو ہوگئے۔ اس آنکھ مچولی کے کھیل میں بندوقوں کے کارتوس بارودوں سے خالی ہوگئے۔

ڈھیٹ کوّے جم کر پیڑوں پر بیٹھ گئے۔ پکّے پھلوں پر ٹھونگیں پڑنے لگیں۔ پھل زخمی ہونے لگے۔ رس ٹپکنے لگا۔ پکا ہوا پیارا پیارا گودا کوّوں کے کالے کالے بھدّے پیٹوں میں سمانے لگا۔

کائیں کائیں سے ان کی نیند تو حرام ہوگئی تھی، پھلوں کی بربادی اور اپنی مسلسل ناکامی سے ان کا جینا بھی دشوار ہوگیا۔

کسی نے مشورہ دیا کہ باز بلائے جائیں وہی کوّوں کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ صرف وہی ان کے پھلوں کو بچا سکتے ہیں۔ مشورہ معقول تھا۔ سب کو پسند آگیا۔ اس پر عمل شروع ہوا گھر کے باقی ماندہ سامان بھی بک گئے۔ باہر سے تربیت یافتہ باز بھی منگوائے گئے۔

بازوں نے آتے ہی اپنا کام شروع کر دیا۔ کوّے ان کا شکار بننے لگے۔ کالے کالے پر ہواؤں میں بکھرنے لگے۔ کائیں کائیں کی صداؤں سے دم گھٹنے لگا۔ بازوں کا کمال دیکھ کر ان کی ویران آنکھوں میں جگنو چمکنے لگے۔ چہرے کی مردنی مٹنے لگی۔ پھر سے پھلوں کی مہک سانسوں میں بسنے لگی۔ رگوں میں مٹھاس گھلنے لگا۔

مگر اچانک ایک دن ان سے یہ خوشگوار تبدیلی چھن گئی۔ پیڑوں پر نیا منظر دیکھ کر ان کے حواس اُڑ گئے۔ کوّوں پر جھپٹّا مارنے اور انھیں مار گرانے والے باز کوّوں کے پہلوؤں میں بیٹھے پھلوں کو چونچ مارنے پر مشغول تھے۔

ان کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی۔ آنکھیں دہک اٹھیں۔ جبڑے سخت ہوگئے۔ اب انھیں کوئی تدبیر نہ سوجھ سکی سوائے اس کے کہ وہ اپنے ہاتھوں میں کلہاڑا پکڑ لیں۔

اڈیٹر کتاب نما کے نام

کھلے خطوط

(مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

برادرم زبیر صدیقی کے ہاں مختصر قیام پر تازہ شمارہ پڑھنے کو ملا۔ حقیقتہً میں مہمان مدیر ابنِ فرید کا "سرِ بالیں اردو" واقعی اردو کے مسائل اور مشکلات کا آئینہ ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کا حقیقی مقالہ مشرقی شعریات اور ساختیاتی فکر مستقبل کے ساتھ زندہ رہنے والی تحریر ہے اس کی ابتدائی قسط زبان و بیان کے رموز کا خزانہ ہے اور اس کے ساتھ ڈاکٹر سید حامد حسین کا مضمون لفظوں کی انوکھی دنیا بھی میں نے دلچسپی سے پڑھا اور کئی مقامات پر دہرایا بھی۔

نظموں میں کمپیوٹر انٹر دیو شاہد نجیب آبادی کا گہرہ مشاہدہ پیش کرتی ہے۔ ظفر گورکھپوری کے دوہے روایت اور جدت کا نمونہ ہیں۔ جعفر امام کی نظم عصری حالات کی نمائندہ کہی جا سکتی ہے لیکن نہایت ادب کے ساتھ مجھے احمد صغیر صدیقی کی خدمت میں عرض کرنا ہے کہ صرف لفظوں کی شعبدہ بازی سے نظم نہیں بنتی اس کے لیے مضمون اور معنی آفرینی کے ساتھ کوئی آہنگ اور صوتی تاثر بھی ہونا چاہیے۔ آزاد نظم کا مطلب فنی تقاضوں سے چھٹکارا تو نہیں ہونا چاہیے۔ شام پر ایک نظم ایک بے ربط سی سطر کو چار لائنوں میں لکھ دیا گیا ہے۔ انہونیاں دلوانے کی بڑ کے سوا کیا کہلائیں گی کا ایک کی تدریاں الماریاں کیوں نہیں ہو سکتیں؟ کتاب نما ایک تعلیمی جریدہ ہے جس میں عروض و معانی کا بہت چرچا ہے ــــ سیاہ آسمان کی دھند میں اترتی شام کی زمین پر بہت سے پیڑ ــــ ان کو تین متوازی سطروں میں بھی لکھ دیں تو ان ملے جولے ہی رہیں گی پھر شام کی زمین کے ان پیڑوں ؟ کی ٹہنیوں کے تلے کہیں کسی پڑاد پر رُکے ہوتے بہت سے لوگ ! کیا یہ سیدھی ایک لائن مُبری لگتی ہے ؟ کہ عبارت کو تین حصّوں میں بانٹ کر لکھا جائے ؟! اور اگر بجھتے ہوتے الاو پر جھکنے سے پہلے اس نام نہاد نظم کا عنوان شام ، پیڑ اور پڑاو لکھ دیا جاتے تو شاید کچھ بات بن جاتے۔

اس شمارے میں غزلوں کا حصّہ اپنی رنگا رنگی سے مجھے بہت پسند آیا ہے۔ غمِ زمانہ کے ساتھ غمِ جاناں اور حالات حاضرہ کی جھلکیاں۔ نیچے دیے گئے اشعار نئی غزل کا نمونہ ہیں۔

اُداس شہر پہ خاموشیوں کا پہرہ ہے	ہر آن نرغۂ رنج و محن ہے، ہم تنہا	اجمل اجملی
تمام شہر بیک وقت جل گیا کیسے ؟	محافظوں کے دلوں میں فتور تھا کیا تھا!	شمیم طارق
شب کو تو یوں تو تھا ہی کچھ اہل جنوں کا حال	شب چھٹ گئی تو اور بھی بدتر لگا مجھے	اختر ضیائی
کھلتے ہیں گل و لالہ میرے قریۂ جاں میں	بکھری ہوئی خوشبو کا خزینہ اب بھی دیدہ ہے	اندر سروپ سرہا کتو

ادبی خبریں تبصرے اور سب سے بڑھ کر منافقت سے پاک کھلا پن، اللہ آپ کو توفیق دے اور یہ علمی کام جاری رہے۔ احقر العباد۔ احمد رضا کاظم، کیمرج

•

"کتاب نما" (فروری ۹۳) میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہر گانوی کا ایک تفصیلی خط شائع ہوا ہے۔ جناب مظہر امام کے مضمون "اردو ادب میں اوّلیت کے سہرے" (کتاب نما - ستمبر ۹۲) کے سلسلے میں میرا ایک مرسلہ - نومبر ۹۲ء کے کتاب نما میں شائع ہوا تھا۔ "اردو کا پہلا ڈراما" کے بارے میں جناب مظہر امام نے لکھا تھا کہ کیشو رام بھٹ کا ڈراما "سجاد سنبل" جو ۱۸۷۴ء میں لکھا گیا تھا اردو کا پہلا ڈراما ہے۔

ان کے مضمون "اردو ادب میں اوّلیت کے سہرے" کا ذیلی عنوان ہی ہے "اردو کا پہلا ڈراما"۔ میں نے ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال کی تازہ ترین تحقیقی کتاب "اردو کا پہلا نثری ڈراما اور کیپٹن گرین آوے" کے حوالے سے اپنے مرسلے میں بتایا کہ "علی بابا چالیس چور" اردو کا پہلا ڈراما ہے جو "تعلیم الاخبار پریس" مدراس سے ۱۸۵۲ء (اٹھارہ سو باون) میں چھپا تھا اس کے لکھنے والے تھے کیپٹن گرین آوے Cap. Greenaway جو مدراس میں ۴۶ ویں رجمنٹ سے تعلق رکھتے تھے۔

مناظر عاشق صاحب "اردو کا پہلا ڈراما" اور "جدید طرز کا پہلا اردو ڈراما" کی تفریق پیدا کر کے مظہر امام صاحب کی مدافعت میں مجھے کوسنے چلے آئے۔ مظہر امام صاحب کے مضمون کا عنوان ہی ہے "اردو ادب میں اولیت کے سہرے" اور پھر ذیلی عنوان بھی ہے "اردو کا پہلا ڈراما"۔

خود مناظر عاشق کیشو رام بھٹ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "کیشو رام بھٹ مہاراشٹر کے برہمن تھے جو بہار شریف میں ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے"

چلیے مان لیتے ہیں کہ مہاراشٹرا کا برہمن بہار میں پیدا ہوا مگر میں نے عرض کیا تھا کہ جس وقت ۱۸۵۲ء میں کیشو رام بھٹ پیدا ہو رہا تھا (منزل آب گل میں تھا) کیپٹن گرین آوے کا ڈراما "علی بابا چالیس چور" نہ صرف چھپ چکا تھا بلکہ اسٹیج پر کھیلا بھی جا رہا تھا۔

میرے مرسلے کا اصل مقصد اردو کے پہلے ڈرامے کے سلسلے میں تازہ تحقیق کے حوالے سے صحیح اطلاع دینا تھا ذیلی انداز میں آزاد غزل اور ترائیلے پر بھی

ں نے دو چار جملے لکھ دیے تھے میں نے لکھا تھا کہ مدراس کے علیم صبا نویدی نے آزاد غزل کا پہلا مجموعہ "رد کفر" ۱۹۷۰ء میں دیا۔ اسی طرح مدراس ہی کے شاعر نوحت نبی کا اردو ترائیلوں پر مشتمل پہلا مجموعہ "پتہ پتہ بوٹا بوٹا" ۱۹۶۵ء کے آس پاس شائع ہوا تھا۔

علیم صبا نویدی کے سلسلے میں مناظر عاشق فرماتے ہیں کہ علیم نے زود گوئی سے کام لے کر آزاد غزلیں کہیں اور ۱۹۸۰ء میں اپنا مجموعہ ہی چھاپ دیا جس میں سن اشاعت ۱۹۷۹ء دیا تھا۔ جبکہ مدیر "کوہسار" کی حیثیت سے وہ آزاد غزلوں کی سرپرستی کر رہے تھے۔ ۱۹۷۹ء ہو کہ ۱۹۸۰ء اس سے پہلے آزاد غزلوں کا کوئی مجموعہ شائع تو نہیں ہوا۔ یہ افتخار بہر حال علیم صبا نویدی سے چھین نہیں سکتے۔ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ ہی کہلاتا ہے حالانکہ اس سے پہلے کے بھی کچھ شاعروں کا کلام دستیاب ہوا ہے۔

مظہر امام صاحب کے مضمون "اردو ادب میں اولیت کے سہرے" میں خاص طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو کے تمام اصناف ادب میں اولیت کا سہرا صرف بہاری ادیبوں اور شاعروں کے سر باندھا جا سکتا ہے۔ جیسے (۱) اردو کا پہلا ڈرامانگار۔ کیشورام بھٹ بہاری (ستیاد سنبھل) (۲) اردو کا پہلا جدید ناول نگار۔ شاد عظیم آبادی "صورۃ الخیال" (۳) اردو نئی غزل کا بانی شاد عظیم آبادی بہاری "

(۴) اردو کا پہلا طویل مختصر افسانہ نگار — اختر اورینوی بہاری

(۵) اردو کا پہلا سانیٹ نگار — ڈاکٹر عظیم الدین احمد (بہاری)

(۶) انشائیہ نگاری کی بنیاد بھی پٹنہ ہی میں رکھی گئی۔

(۷) پہلی آزاد غزل خود جناب مظہر امام نے کہی

ہم اردو والوں نے لکیریں کھینچ رکھی ہیں ورنہ کیا دلی اور کیا لکھنؤ مظہر امام صاحب نے خاص طور پر بہاری ادب کو پروجیکٹ کیا ہے جبکہ بہار میں اردو کے سلسلے میں ڈاکٹر اختر اورینوی اور ڈاکٹر مظفر اقبال صاحب کی باضابطہ کتابیں آ چکی ہیں

مناظر عاشق مجھ پر علاقائی عصبیت کا الزام رکھ رہے ہیں اگر کوئی شاعر یا ادیب کسی ایک علاقے کا ہو تو اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے۔

اصناف کی اولیت کی بات کتابوں کے حوالے سے ہی کی جائے تو کھلے دل کے ساتھ یہ ماننا ہی پڑے گا کہ!

(۱) اردو سانٹ کا پہلا مجموعہ "برگ نوخیز" عزیز تمنائی کا تھا جو مدراس سے شائع کیا۔

(۲) اردو ترائیلوں کا پہلا مجموعہ "پتہ پتہ بوٹا بوٹا"، فرحت کیفی نے مدراس سے شائع کیا۔

(۳) اردو میں "آزاد غزل" کا پہلا مجموعہ "رد کفر" بھی علیم صبا نویدی نے مدراس ہی سے شائع کیا۔ (۴) اردو ڈراما کی اوّلیت بھی (۵) قلیم الاخبار پریس مدراس ہی کے حصے میں آتی ہے جس نے مدراس رجمنٹ کے کیپٹن آوے کا ڈراما "علی بابا چالیس چور" ۱۸۵۲ء میں چھاپا۔

شاعر/ادیب چاہے کسی علاقے کا ہو مجھے عزیز ہے۔ میں پاکستان کے ظفر اقبال، پروین شاکر، احمد فراز، شکیب جلالی مرحوم کو اتنا ہی پسند کرتا ہوں جتنا بانی، خورشید احمد جامی مرحوم، ڈاکٹر مظفر حنفی اور فضا ابن فیضی وغیرہ کو پسند کرتا ہوں۔

مجھ پر عصبیت کا الزام رکھنے والے اور مجھے دو کہنے والے ڈاکٹر مناظر عاشق کو نذرانۂ خلوص پیش کرتے ہوتے میں نے بیس بائیس شعر کہے تھے جو بھا گلپور ہی سے شائع ہونے والے "اندیشے" کے لیے تھے جو بعد میں روزنامہ "پندار" (پٹنہ) کے ادبی ایڈیشن میں شائع بھی ہوتے تھے۔ دو چار شعر کچھ یوں تھے ؎

ہے ادب پر متواتر عاشق — نام جس کا ہے مناظر عاشق
خوش گمانی ہے وطیرہ اس کا — بدگمانی سے ہے قاصر عاشق
ہے نہایت ہی عدیم الفرصت — گھر میں معشوق تو باہر عاشق
مرد مومن پہ ہے عاشق شاہین — اور کبوتر پہ ہے کافر عاشق

ادب تو نگہ بلند اور سخن دلنواز مانگتا ہے چھوٹے چھوٹے خانوں میں بٹنا یا بانٹنا زیب نہیں دیتا۔ تحقیق اور تنقید کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔

ہرچند تاخیر ہو گئی ہے مگر معاملہ چونکہ علمی ہے اور تحقیقی نوعیت کا ہے اس لیے غلط فہمی کے ازالے کے لیے یہ خط چھاپ دیں تو نوازش ہوگی۔

رؤف خیر

گول کنڈا۔ حیدرآباد۔

کتاب نما جنوری اور خصوصی شمارہ (آل احمد سرور صاحب) میں سوال اٹھا ہے تو وضاحت کرتا ہوں کہ دوسری بڑی جنگ کے بعد فرانس میں چار ڈاکٹریٹ ڈگریاں دی جانے لگی تھیں۔ (۱) سائنس میں ڈاکٹوریس سیانس Dr ès Sc اور آرٹس وغیرہ میں ڈاکٹوریس لترDr ès L سب سے اونچی، سرکاری، اصل ڈی اس سی یا ڈی لٹ کے مساوی۔ میرے علم میں علامہ حمید اللہ کے سوا کسی ہندی نژاد کے پاس فرانس کی یہ مستند ڈی لٹ نہیں۔ سائنس میں بہت سے نام ہیں۔ (۲) یونی ورسٹی ڈاکٹریٹ غیر ملکوں کے لیے نیم سرکاری طور پر دی جانے لگی تھی۔ اس کی بنا پر کوئی فرانس میں پڑھا نہیں سکتا تھا۔

نمونے کے طور پر اس میں (قوسین میں) سائنس، آرٹس وغیرہ کا ذکر ہوتا تھا۔ اس
فائدہ اٹھا کے لوگ ڈی ایس سی، ڈی لٹ لکھ لیتے تھے۔ (۳) انجینروں کو
منی کی تقلید میں ڈاکٹر انجینئر دینے لگے تھے۔ (۴) ہمارے ام فل اور Ph D کے
کی ایک ابتدائی سند ۱۹۶۵ء کے آس پاس دنیوی سائکل کے ڈاکٹریٹ کے طور پر چل
ی تھی جسے فرانس میں ڈاکٹر نہیں مانتے تھے۔
اب جرمنی کے انداز میں Ph D اور Dr. Habil صرف دو ابتدائی اور انتہائی
اکٹریٹ دی جانے لگی، میں یہ سب باتیں طالب علم کی ہیں۔ استادوں اور عالموں کی قدر وقیمت
ان کے عمر گشتہ کے کارناموں سے ہوتی ہے۔ (سید المظفر چغتائی)
(علی گڑھ)

کتاب نما شمارہ برائے مارچ ۹۳ء نظر نواز ہوا۔ بہت پسند آیا۔ مہمان مدیر کا اداریہ بھی
سندیدہ ہے۔ یوں تو اس کے سارے مضامین، غزلیں اور افسانے خوب تر ہیں لیکن
اص کر ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی کی "زاری" بعنوان "میں کہ ایک عورت ہوں" بہت خوب
ہے۔ گو کہ میں ایک مرد ہوں موصوفہ کی "زاری" پڑھ کر آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ صحیح بات
ہے کہ عورت جیسے واقعات پر آنسو نہیں بلکہ خون بہانے کی ضرورت۔
(راحق بہاری۔ ڈمکا)

ہر محاذ پر فرقہ پرستی کا مقابلہ کرنا آپ کا فرض اور وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

دو تین روز ہوتے مجھے "کتاب نما" کا جنوری ماہ کا شمارہ ملا۔ بہت بہت
شکریہ! جناب رفعت سروش صاحب کی نظم "احتساب" اور اگلے ہی صفحہ پر جناب
سید حامد صاحب کا آرٹیکل "ایودھیا کے بعد کیا؟" بے حد پُر اثر اور معنی خیز لگے۔
نظم کی یہ لائن "تم ایک داغ ہو انسانیت کے ماتھے پر"
اور جناب حامد صاحب کی یہ سطر "یہ پارٹیاں اور یہ اہل دانش عوام کی اکثریت
کے ترجمان نہیں ہیں" (صفحہ ۲۶) بنیادی طور پر ایک ہی طرف اشارہ کرتے ہیں اور وہ
ہے آج کے سماج میں "اصلیت" پر "بناوٹ" کی چمکیلی اوڑھنی۔ اور ترقی پسند اور جدید
کے شور کی آڑ میں "خود غرضی اور میں" کی آگ۔
میں جناب رفعت سروش اور محترم حامد صاحب کو "رات کو رات کہنے
پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ (درشن لعل کپور)
دہرہ دون

تازہ شمارہ نظر نواز ہوا (فروری ۹۳) جناب وجاہت علی سندیلوی کا اشاریہ نہایت ہی بصیرت افروز ہے۔ اور ان کا یہ بنیادی نکتہ اردو والوں کو ذہن نشین کر لینا چاہیے "...... کہ زبانیں، حکومتیں نہیں عوام بناتے ہیں اور وہی انھیں زندہ رکھتے ہیں"، اسی نکتے کو سامنے رکھ کر "اردو" کے لیے "سوچنا" مفید بھی ہو سکتا ہے اور نتیجہ خیز بھی۔

محترم گوپی چند نارنگ کا مضمون دلچسپ اور جاندار رہا۔ ظفر گورکھپوری پر یوسف ناظم صاحب کا مخصوص اسٹائل مزہ دے گیا۔

غزلیں اور نظمیں زیادہ تر سنگینیٔ حالات کو بیکسوئی نظر آئیں۔ نفرتوں کا دھواں پورے ماحول کو اسطرح گھیرے ہوئے ہے کہ عام انسان کا بھی دم گھٹتا محسوس ہو رہا ہے۔ ایسے میں فنکاروں پر کرب طاری ہے اس کا اظہار مسلسل ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا۔

عروس البلاد کی بربادی پر عبداللہ کمال کی نظم دل کو چھو گئی۔ پروفیسر عنوان چشتی کی غزل بڑی شاندار رہی۔ (ڈاکٹر فہیم شباب)

"کتاب نما" اپریل ۹۳ء کے شمارے میں خاکسار کا مضمون "رباعی کے ۲۴ اوزان اور شجرۂ اخرب و شجرۂ اخرم" میں ایک دو جگہ کتابت کی ہلکی سی غلطی بھی ہوئی ہے تصحیح فرمائیں صفحہ نمبر ۴۴ وزنِ رباعی نمبر (۱) مفعولُ۔ مفاعیلُ۔ مفاعیلُ۔ فعل / فعول۔ رکنِ دوم میں "فعول" نہیں "مفاعیلُ (مکفوف) ہے صفحہ ۴۷ وزنِ رباعی نمبر ۲۳ چوتھا رکن فعولُ ہونا چاہیے، فَعَل نہیں۔ اوزان کی اصطلاحی ناموں میں ایک بات کھٹکتی ہے کہ ان جگہوں پر وقفے لگاتے ہیں جہاں وقفے نہیں ہیں۔ جس کی وجہ سے الجھن پیدا ہو رہی ہے۔ صرف ایک مثال دیتا ہوں۔

(اخرب۔ مکفوف۔ مخنق۔ مقبوض۔ مخنق۔ مجبوب)

دراصل یہ، اس طرح ہونا چاہیے۔

(اخرب۔ مکفوف مخنق۔ مقبوض مخنق۔ مجبوب) (فراز بندہ نواز)

مارچ کا "کتاب نما" میں سبھی غزلیں اور افسانے پرچے کے معیار کے مطابق ہیں خاص طور پر مسعود الحق صاحب کا ترجمہ کیا ہوا افسانہ "سرگزشت ایک گدھے کی" سماج پر بھرپور طنز ہے جو قابلِ تعریف ہے اور جس کے لیے مسعود الحق صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔

عمر فاروقی۔ ضلع فتح پور۔
لہرپور۔ سیتاپور۔

صدیق مکرم آداب! "کتاب نما" کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ!
شمارے کے تحت "ہم آپ اور اردو" میں وجاہت علی سندیلوی نے مسئلوں کے ساتھ ان کے حل کرنے کی جو تجاویز پیش کی ہیں وہ قابلِ غور ہیں۔
ہم اردو والے اتنے ناکارہ نکمے، کام چور، منافق اور دوغلے واقع ہوئے ہیں اردو کی ترقی کے بارے میں جب بھی کوئی بات نکلتی ہے تو کاسہ گدائی لیے سرکار کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ زندہ قوموں کا یہ وطیرہ کبھی نہیں رہا۔ وہ اپنے مسئلوں کا حل خود ڈھونڈ نکالتی ہیں۔ ایسے میں ہمیں سوچنا پڑتا ہے کہ کیا ہم زندہ قوم کہلانے کے لائق ہیں۔ زبان کو روزی روٹی سے جوڑنے کی بات کرنے والوں کو تامل اور تمل زبان والوں سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ دنیا کے کسی بھی بک سٹال پر ہم جائیں تو ان دو زبانوں کے رسالے آویزاں نظر آئیں گے لیکن اردو زبان کے رسالے دنیا کی تیسری زبان کہہ کر خوش ہونے والوں کو سوچنا چاہیے کہ اردو کی ریڈرشپ کیوں ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ اردو بولنے والے تو کروڑوں کی تعداد میں مل جائیں گے لیکن لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے اس کی صرف ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ ہم خود اردو بیزار ہیں۔ اردو سے ہمیں وہ لاگ نہیں یعنی اپنے کلچر کو ہم فرسودہ جان کر اس سے چھٹکارا پانے کا بہانہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس لیے ہم اپنے بچوں کو اردو زبان اور کلچر سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے سوا کوئی دوسری وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔
اس شمارے میں حاصل مضامین نظم و نثر خوب ہیں۔ نذر صاحب اور قاضی عبدالغفار پر مضامین بے حد پسند آئے۔

ساجد حمید
شیموگہ کرناٹک

"کتاب نما" کے شمارے بابت فروری ۱۹۹۳ میں کھلے خط کے کالم میں جناب یعقوب علی صاحب بنارسی کا ایک خط مدیر مہمان خصوصی جناب شجاع خاور کے متعلق شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے لکھا ہے کہ علم عروض ایک شاعر کے لیے ضروری نہیں بلکہ اضافی حیثیت رکھتا ہے یہ وہ لوگ کہا کرتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ وزن کا ادراک ذوق اور موزونی طبع پر منحصر ہے جو لوگ ذوق سلیم اور موزوں طبع ہوتے ہیں انھیں عروض جاننے کی ضرورت نہیں عروض جاننے والا شعر کے حسن سے محظوظ نہیں ہوتا۔
ایسے لوگ مستعمل اور مروجہ بحور ہی میں شعر کہتے ہیں جن کے آہنگ ترنم اور لے سے وہ اس حد تک مانوس ہوتے ہیں کہ علم و عروض کی مدد کے بغیر محض اپنے ذوق اور

موزونیٔ طبع کے بل پر بے عیب شعر کہہ لیتے ہیں لیکن غیر مروجہ اور نامستعمل بحور جن سے شا کے کان آشنا نہیں ہوتے وہ اکثر بھٹک جاتے ہیں اس پر طرہ یہ کہ اس کی صحت پر اصرار کرتے ہیں۔ علم عروض کو غیر ضروری تصور کرنے کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ موصوف نے ایک ناموزوں شعر کو موزوں قرار دے دیا پھر لطف یہ کہ دعوا بے دلیل۔

شعر مندرجہ ذیل پانچ طرح سے ناموزوں ہوتا ہے۔

(۱) شعر کے دونوں مصرعے علاحدہ علاحدہ بحروں میں ہوں
(۲) شعر میں کسی ایسے حرف کا گرانا یا اضافہ کرنا جو روا نہ ہو
(۳) شعر میں بے موقع زحاف کا استعمال۔
(۴) شعر میں کوئی لفظ خلاف نعت نظم کرنا۔
(۵) شعر کا کسی مقررہ بحروں میں سے نہ ہونا۔

اب آپ خود موصوف کا شعر ملاحظہ فرمائیں جس کے صحت پر اصرار ہے۔

سہ	عصیاں کی کالی دنیا میں	دھوپ نیا کھل گیا محمدؐ
تقطیع:-	عص یا-کی کا- لی دن-یا سے	دوپ-نیا کھل-گیا-مح مد
وزن	فعلن فعلن فعلن فعلن	فعلُ فعولن فعلُ فعولن
دوسرا وزن:-	〃 〃 〃	فعولُ فعلن

فاعلن سے فعلن دو طرح پر حاصل ہوتا ہے اولاً فاعلن کو مخبون مسکن کرنے پر دوئم فاعلن کا مقطوع کرنے پر جبّن کا زحاف عام حقیقی ہے جو مصرعہ کے سبھی مقامات پر آسکتا ہے قطع کا زحاف عروض وضرب کے لیے مخصوص ہے فعولن سے بھی زحاف ثلم کے ذریعہ فعلن برآمد ہوتا ہے مگر یہ زحاف صدر وابتدا سے خاص ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ شعر کا پہلا مصرعہ بحر متدارک مثمن مخبون مسکن میں ہے لیکن اس وزن کو اہل ایران کے اجتہاد کے مطابق کہ ان کے وہاں صدر وابتدا سے کوئی زحاف خاص نہیں ہے اس وزن کو متقارب میں بھی لے سکتے ہیں۔ اگر حشو دوم میں فعل تسکین لام کے بجائے تحریک لام ہوتا۔

بحر متقارب مثمن سالم	فعولن	فعولن	فعولن	فعولن
〃 اثرم مقبوض	اثرم	مقبوض	مقبوض	سالم
	فعلُ	فعولُ	فعولُ	فعولن
معمل تجبیق یا تخنیق	فعلُ	فعولن	فعلُ	فعلن (بحر متقارب مثمن اثرم مقبوض)
	فعلن	فعلن	فعلن	فعلن

اگر عمل تجبیق سے شعر کی بحر بدل جانے کا احتمال ہو تو یہ جائز نہ ہوگی فعلُ فعولن اور فعلن فعلن کا اجماع اسی سبب سے جائز ہے اگر مصرعہ مذکور میں حشو دوم میں فعلُ بتحریک لام ہوتا تو شعر کو متقارب میں لے سکتے تھے لیکن یہاں پر فعل لام ساکن لام ہے جو

یات میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ یہ زحاف اخذ سے ہوتا ہے جو عروض وقریب
لیے مخصوص ہے (متدارک میں) اگر اس مصرعۂ ثانی کا وزن فعلُ فعلن فعولُ
ن قرار دیا جاتا ہے تو یہ کوئی بحر نہیں ہے۔ لہٰذا شعر مذکور کے دونوں مصرعے
ندہ علاحدہ بحروں میں ہیں اور زحاف بے موقع بھی استعمال ہوتے ہیں اور شعر
مقررہ بحر میں بھی نہیں ہے اس طرح یہ شعر تین وجوہ سے نامعذون ہے۔

صغیر احمد سحر۔ لکھیم پور کھیری

"کتاب نما" جنوری ۲۰۰۳ء باصرہ نواز ہوا۔ جناب رام پرکاش کپور کا مہمان اداریہ
قدر ہے۔ موصوف نے حقائق کا جائزہ جس انداز سے لیا ہے وہ ان کی سلجھی ہوئی شخصیت
ماز ہے۔ اردو پر مسلمانوں کی زبان کا جو ٹھپہ لگا ہوا ہے اسے ہٹانا ہوگا۔ اور اس
لیے اردو کے غیر مسلم ادیبوں کو سامنے آنا ہوگا۔

سید حامد کا مضمون اجودھیا کے بعد کیا؟ خونِ دل سے تحریر کیا گیا ایک نوحہ ہے۔
ون کا ایک ایک لفظ قابل غور ہے۔ ان کا مشورہ "خوش ہمسائیگی و خود نگہداری"
وزر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ میں نے تو اس مشورے کو گرہ میں باندھ لیا ہے۔
سارے ہندستانی مسلمان اس کو گرہ میں باندھ لیں۔ کاش سارے ہندستانی
مان اس قیمتی مشورے پر عمل کرنے لگیں۔

جناب رفعت سروش کی نظم "احتساب" بہت خوب ہے۔ انور قمر اور رضوان اللہ کے
مانے بھی پسند آئے۔ مگر رضوان اللہ کا افسانہ تشنہ ہے۔ کہانی اچانک ختم ہو جاتی ہے۔
لگا کہانی کو کچھ اور آگے جانا چاہیے تھا۔

اقبال حسن آزاد۔ مونگیر

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

جائزے

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

مسلمانوں کا تعلیمی نظام

مصنف : پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی
ناشر : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
قیمت : ۴۰/- روپے
مبصر : محمد اسحاق

زیر نظر کتاب چار مضامین ـــــ مسلمانوں کا تعلیمی نظام، قیام مدارس کی تحریک بغداد کا مدرسہ نظامیہ اور مسلمانوں کا نظام تعلیم (عہد وسطیٰ کے ہندستان میں) پر مشتمل ہے اسلام نے جس تہذیب و تمدن کی بنیاد ڈالی اس میں تعلیم کی بنیادی حیثیت حاصل ہے قرآن پاک اور احادیث نبوی کی تعلیمات نے حصول علم کو مذہبی حیثیت دیکر اہل ایمان میں علم کی ایسی روح پھونکی کہ وہ اُسے غیر معمولی اہمیت دینے لگے۔ فاضل مصنف پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے کتاب کے آغاز میں قرآنی آیات اور احادیث کی روشنی میں علم کی فضیلت کی اجمالی تصویر کھینچی ہے۔ سورۂ علق کی ابتدائی چار آیات میں علم اور تحصیل علم کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ آیات وحیِ الٰہی کا نقطۂ آغاز ہیں جن میں قلم کی اہمیت بیان کی گئی ہے جو علم کی حفاظت کا نہایت اہم ذریعہ ہے۔ ان آیات کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

"پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، پیدا کیا جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے۔ پڑھیے اور آپ کا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم سے تعلیم دی اور انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ جانتا نہ تھا۔"

مشہور مفسر قرآن علامہ زمخشری (م ۱۱۴۴ء) مذکورہ بالا آیات کی تشریح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"یہ بات اللہ تعالیٰ کے انتہائی فضل و کرم پر دلالت کرتی ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتے تھے اور اس طرح ان کو جہل کی تاریکی سے نکال کر علم کی روشنی میں لے آیا اور ان کو کتابت کا فن سکھایا جس میں کہ اس قدر لامحدود فوائد پوشیدہ ہیں کہ ان وہ ہی خوب جانتا ہے، فن کتابت کے بغیر علوم کی تدوین نہیں ہوسکتی تھی، حکمت کو ضبطِ تحریر میں نہیں لایا جاسکتا تھا

اور گذشتہ زمانے کی قوموں کے حالات و اخبار اور کہانی کتابوں کو محفوظ نہیں رکھا جاسکتا تھا اور اگر فن کتابت نہ ہوتا تو دین و دنیا کے تمام کام درہم برہم ہو جاتے اور اگر خدائے عزوجل کے علم و حکمت پر کوئی دلیل نہ ہوتی تو محض قلم و کتابت کی تعلیم ہی بڑی سخت دلیل تھی۔" (صفحہ ۱۱)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حسب ذیل حدیث مسلم معاشرہ میں علم اور اہل علم کے وقار کی بھی نشاندہی کرتی ہے:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علم سیکھو کیونکہ اگر تم خدا کے لیے علم سیکھتے ہو تو یہ پرہیزگاری ہے۔ اس کی طلب عبادت ہے۔ اس کا ذکر خدا کی تعریف ہے۔ اس میں تحقیق کرنا گویا جہاد کرنا ہے۔ اس کو پڑھانا صدقہ ہے اور جو اس کا اہل ہو اس کو عطا کرنا نیکی ہے کیونکہ یہ حلال و حرام میں امتیاز کرنا سکھاتا ہے، جنت کے راستوں کی روشنی ہے، ویرانے میں دوست ہے، اجنبی ملک میں ساتھی ہے اور تنہائی کا ہم نشیں ہے، خوشحالی تک ہماری رہنمائی کرنے والا ہے اور مصیبتوں میں ثابت قدم رکھنے والا ہے، دشمنوں سے مقابلے میں ہتھیار ہے۔" (صفحہ ۹)

دارالعلوم اور مدارس کے باقاعدہ قیام سے پیشتر صدر اول کے مسلمانوں نے تعلیم کی جانب خصوصی توجہات مبذول کیں۔ ذیل کے اس اقتباس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے:

"حضرت عمر ابن الخطابؓ نے جو نصاب تجویز کیا تھا اور جسے انھوں نے مختلف اسلامی علاقوں میں بھیجا تھا وہ اس طرح تھا کہ لوگ اپنے بچوں کو تیراکی، شہسواری، مشہور ضرب الامثال اور اچھی شاعری کی تعلیم دیں۔" (صفحہ ۱۹)

ایسی درس گاہیں جن میں مذہبی تعلیم و تربیت کا خصوصی نظم تھا ان کے نصاب میں بھی ضرورت اور تجربہ کے مطابق ارتقائی تبدیلیاں ہوتی رہتیں۔ کتب خانوں اور کتاب فروشوں نے بھی تعلیم کی اشاعت میں غیر معمولی خدمت انجام دی۔ "انھیں کتب فروشوں کی دکانوں میں جاحظ جیسا شخص رات میں اپنے آپ کو بند کروالیتا تاکہ جو چاہے پڑھ سکے اور اس کے لیے وہ پیسے خرچ کرتا کیونکہ کتب فروش مفت میں اس خدمت کے لیے تیار نہیں تھے۔" (صفحہ ۲۰) ان ارباب علم و فضل نے جن کے پاس قیمتی کتابوں کے ذخیرے تھے علمی سرمایے کو بعد کی نسل میں منتقل کرنے میں نمایاں رول ادا کیا۔ دیوان خانوں کی ادبی محفلیں بھی علم کی ان تہذیبی روایت کو عام کرنے میں پیش پیش رہیں۔ مساجد، مدارس کے قیام سے پہلے بھی علم کی روشنی کو پھیلانے کا اہم مرکز تھیں اور بعد میں بھی ان کی یہ خصوصیت بدستور باقی رہی۔ نیز آئندہ بھی علم کی شمع کو عوامی سرمایہ بنانے میں یہ خصوصی کردار ادا کرسکتی ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی نہایت اہم ہے کہ قدما نے پورے انہماک، یکسوئی اور جوش و خروش کے ساتھ

علم کی اشاعت میں حصہ لیا انھوں نے کتب خانوں کے قیام اور کتابوں کی تصنیفات کی جانب بھی پوری دلچسپی دکھائی۔ جب ۷۵۱ء میں عربوں میں کاغذ سازی کا فن رواج پایا تو علم و تہذیب کے علمبرداروں نے اپنی علمی سرگرمیاں تیز تر کر دیں۔

بغداد، سمرقند، بخارا اور غزنہ کے علاوہ ہرات، مرو، بلخ، طوس، نیشاپور، شیراز اور متعدد ایسے شہر تھے جہاں علم کے ان پرجوش مجاہدین نے علم و فن کا دیا جلایا، کتب خانے قائم کیے، تصنیفی خدمات انجام دیں، جہاں علما، فضلا، شعرا، ارباب فکر و فن، صنعت و حرفت کے ماہرین اور دستکار آباد تھے۔ فاضل مصنف نے اپنے پہلے مضمون میں اجمالاً کتب خانوں کے قیام کی تاریخ، ان کی اہمیت اور اس سلسلہ میں ارباب اقتدار اور اصحاب علم و فن کی دلچسپی کا خاص طور سے تاریخی حوالوں سے ذکر کیا ہے۔ یہ مضمون مسلمانوں کے تعلیمی نظام کا اجمالی احاطہ کرتا ہے۔

اس کتاب کا دوسرا مضمون بعنوان "دنیائے اسلام میں قیام مدارس کی تحریک" ہے معتزلی اور شیعی اثرات کے ردّعمل اور سماجی ضروریات کی تکمیل کے لیے مدارس کی تحریک شروع ہوئی۔ سلجوقی وزیر نظام الملک طوسی (۱۰۱۸ - ۱۰۹۲) نے مدارس کے قیام پر خصوصی توجہ دی۔ اس نے اپنی سلطنت کے ہر حصہ میں مدارس قائم کیے جو اس کے نام پر نظامیہ کہلاتے تھے۔ بغداد کا مدرسہ نظامیہ ان میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ اس مدرسہ کے خرچ کے لیے بہت بڑی جائیداد وقف تھی۔ اس کی تعمیرات میں ۶۰ ہزار سے زیادہ دینار کا خرچ ہوا جہاں ہر طالب علم کو وظیفہ ملتا تھا۔ نظام الملک طوسی اور اس سے پہلے مدارس کے قیام کی غرض یہ تھی کہ ان مدارس میں ایسے تعلیم یافتہ افراد تیار ہوں جو ایک طرف سنی راسخ الاعتقادی کی نمائندگی کر سکیں دوسری طرف بحیثیت قاضی، مفتی، ناظر، محرر، نگراں اور انتظامیہ کے دوسرے عہدوں کے فرائض ادا کر سکیں۔ قیام مدارس کی اس تحریک میں اشعری تحریک نے نمایاں رول ادا کیا۔ اس تحریک کو شافعی مسلک کے حاملین کی حمایت حاصل تھی۔ اس مقالہ میں شافعیوں اور حنفیوں کے نظریہ ہائے تعلیم کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ نہایت دلچسپ ہے۔ اسی مضمون کے تحت علم کلام کی بحث اور اس کا ذکر بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس بحث کے اختتام پر حنفی اور شافعی تعلیمی نقطۂ نظر کا ایک خوبصورت جدول پیش کیا گیا ہے جس سے ان فقہی مذاہب کا موازنہ اور ان کا فرق واضح ہوتا ہے۔

ان مدارس اسلامیہ کے نصاب تعلیم میں مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ غیر مذہبی یا سیکولر مضامین بھی شامل تھے۔ عربی زبان و ادب کے علاوہ ریاضی، تاریخ، علم کیمیا، طب طبیعات، علم الادویہ یا طبی کیمسٹری کے مضامین ان کی درسیات کا جز تھیں۔ فلسفہ کی تعلیم بعض عباسی خلفا کی پرزور حمایت کا نتیجہ تھی لیکن عام مسلمان اُسے حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور مدارس و مساجد میں اس کی تعلیم ممنوع تھی۔ اس کے باوجود بعض عالموں نے فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا اور بعض نے دین و فلسفہ میں تطابق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ حضرت امام غزالی رح نے

الاقتصاد فی علم الاعتقاد، تہافت الفلاسفہ اور المنقذ من الضلال لکھ کر فلسفہ کی بُرائیاں واضح کیں اور فکر و عمل کے اعتدال کی طرف رہنمائی کی دوسری طرف اسماعیلیوں اور دوسری سیاسی و نیم سیاسی تحریکوں نے فلسفہ میں دلچسپی لی۔ بہت سے علما ایسے تھے جنھیں فلسفہ سے خاصا شغف تھا۔ اس ذیل میں ابن سینا، الفارابی اور ابن رشد کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ان مسلم فلسفیوں نے فلسفہ کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔

"بغداد کا مدرسہ نظامیہ" زیر نظر کتاب کا تیسرا وقیع مضمون ہے۔ اس مضمون میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ اس مدرسہ کی تمام امتیازی اور نمایاں خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ نظام الملک طوسی کا اس مدرسہ کے قیام میں اہم حصہ ہے۔ وہ خود علم حدیث اور فقہ میں درک رکھتا تھا۔ اس نے اصفہان، نیشاپور اور بغداد کے ممتاز اہل علم سے اپنی علمی تشنگی دور کی اور اپنی اعلا صلاحیتوں سے اس نے سلجوقی دربار میں اہم مقام حاصل کر لیا۔

تاریخی مآخذ میں بغداد کے نظامیہ مدرسہ کا نصاب تعلیم نہیں ملتا۔ اس سلسلہ میں فاضل مصنف رقمطراز ہیں کہ فلسفہ کے علاوہ سارے دینی علوم ان کے نصاب تعلیم میں شامل ہوں گے۔ "نظامیہ تعلیم و تدریس کا جو معیار تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ اساتذہ و طلبہ مطالعہ، بحث و نظر اور تحلیق و تدقیق میں مصروف رہیں۔ مزید برآں مناظرہ میں حصول تبحر کا تقاضا تھا کہ منطق سے بھی واقفیت ہو، یہاں تک کہ فلسفہ کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔ اس کے باوجود فقہا اور متکلمین کے حلقے میں فلسفہ اس قدر معتوب و مقہور تھا کہ اس کا باقاعدہ التزام رکھا جاتا کہ کسی بنا پر بھی نظامیہ کے مدرس اور فقیہ کے اقوال و افکار سے فلسفے کی "بو" نہ آئے"۔

نظامیہ بغداد کے مدرس کا رتبہ لائق احترام اور قابل رشک سمجھا جاتا تھا۔ اس عہدے پر صرف اسی عالم دین کا تقرر ہوتا جس کی علمی شہرت و عظمت اختلافی نہ ہو بغداد میں مدرس کی بہت زیادہ عزت ہوتی ان کی سماجی اور مذہبی زندگی پر وہ اثر انداز ہوتا تھا۔ اس عہدے کے بہ وقار ہونے کے لیے صرف یہ دلیل کافی ہے کہ حضرت امام غزالی مدرسہ نظامیہ کے مدرس تھے۔ اس مدرسہ میں مہتمم کتب خانہ کا عہدہ بھی اہمیت کا حامل تھا۔ مدرسہ میں مسجد اور مجلس وعظ کے علاوہ اسپتال کا بھی اہتمام تھا۔ مدرسہ میں مفتی، واعظ، محاسب، متولی ناظر اور واقف کے عہدے اہم سمجھے جاتے تھے۔ بغداد کا یہ مدرسہ نظامیہ اپنی تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ انتظام و انصرام کے اعتبار سے بھی خصوصیت کا حامل تھا۔ علم و فکر کے پیاسے دور دراز کا تکلیف دہ سفر طے کر کے یہاں یکسوئی کے ساتھ علم حاصل کرتے تھے۔

نظام الملک طوسی نے سلجوقی سلطنت کے قلمرو میں متعدد مدارس قائم کیے بعد میں جو مدارس قائم ہوئے وہ نظامیہ مدارس ہی کے نمونوں پر قائم کیے گئے۔ ہندستان کے عہد وسطی میں ترکوں اور مغلوں نے جو نظام تعلیم رائج کیا اور جن مدارس کی داغ بیل ڈالی ان میں نصاب تعلیم میں تبدیلیاں تو ہوتی رہیں لیکن ان پر نظامیہ کے اثرات کی چھاپ سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اس کتاب کا آخری باب "عہد وسطی کے ہندستان میں مسلمانوں کا تعلیمی نظام" ہے۔

سندھ اور ملتان کے علاقوں میں مسلمانوں نے سب سے اہم اپنی علمی اور تہذیبی روایت کا تعارف کرایا۔ سلطنت دہلی کے قیام کے بعد رفتہ رفتہ بغداد، سمرقند، بخارا اور دوسرے متعدد شہروں کے ممتاز علما، اور دانشور دہلی آنے لگے۔ منگولوں کی تباہی کی وجہ سے مشرقی دنیائے اسلام میں صرف دہلی سلطنت ہی تھی جہاں عرب ایرانی ترکی ثقافت نہ صرف یہ کہ موجود تھی بلکہ مسلسل ارتقا کی منزلیں طے کر رہی تھی۔ چونکہ سنٹرل ایشیا اور ایران کے تعلیمی نظام میں فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم کو زیادہ اہمیت حاصل تھی چنانچہ ترکوں نے بھی فقہی تعلیم کو ہندستان میں زیادہ اہمیت دی۔

بچوں کی تعلیم قرآن سے شروع ہوتی۔ اکثر بچے قرأت بھی سیکھتے پھر وہ فارسی اور عربی زبانوں کو سیکھتے یہ تعلیم کی ابتدائی منزل تھی۔ تعلیم کی دوسری منزل میں عربی زبان کے ذریعہ اعلا دینی تعلیم دی جاتی اس منزل سے فراغت پانے والے دانشمند ہوتے انھیں صرف و نحو میں میزان، کافیہ اور مفصل نیز فقہ میں قدوری اور مجمع البحرین کی تعلیم دی جاتی۔ تیسری منزل کا حسب ذیل نصاب تھا۔

"فقہ اور اصول فقہ	ہدایہ بزدری، کنزالدقائق حسامی اور شرح تحقیق
حدیث	مشارق الانوار اور مشکوٰۃ المصابیح
تفسیر	کشاف
تصوف	عوارف المعارف
کلام	شرح صحائف اور کسی مقام پر تمہید عبدالشکور معالی
منطق	شرح شمسیہ
علم معانی وبیان	مفتاح العلوم (سکاکی)
ادب عربی	مقامات حریری"

مذکورہ بالا نصاب تعلیم میں سلطان سکندر لودی کے زمانہ میں کچھ تبدیلی واقع ہوئی اور باضابطہ اس عہد میں منطق اور فلسفے کی کتابیں نصاب میں شامل ہوئیں۔ شیخ عبداللہ (م ۱۵۱۶) اور شیخ عزیزاللہ (م ۱۵۲۵) نے جو منطق و فلسفہ کے بڑے عالم تھے معقولات کا درس دینا شروع کیا۔ مغلوں کے عہد میں معقولات کے مطالعہ کی طرف مزید پیش رفت ہوئی۔ میر فتح اللہ شیرازی کا ۱۵۸۲ میں دربار اکبری میں پرتپاک خیر مقدم کیا گیا جنھیں بعد میں مغل دربار میں ایک وزیر کا مرتبہ حاصل ہوگیا۔ اس رائج نصاب تعلیم پر میر فتح اللہ شیرازی اثر انداز ہوئے۔ انھوں نے محقق دوانی، میر صدرالدین، میر غیاث الدین منصور اور میرزا جان کی فلسفہ، علم کلام اور معقولات پر متعدد کتابوں کو ہندستانی مدارس کے نصاب تعلیم میں شامل کرائیں۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں تعلیمی اصلاح سے متعلق ایک ضابطہ اور آئین کا ذکر کیا ہے جس سے اندازہ ہے کہ اکبر نصاب تعلیم میں اصلاح کا بھی خواہاں تھا اور اس کی دلچسپی سے معقولات کی

کا یقیناً رواج ہوا۔ اس کتاب میں شامل حسب ذیل علمی شجرے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح اکبری عہد میں میر فتح اللہ شیرازی نے نصاب تعلیم کا جو بیج بویا تھا وہ رفتہ رفتہ ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا ملا نظام الدین سہالوی کے تیار کردہ درس نظامی کی صورت میں تیار ہوا۔

میر فتح اللہ شیرازی (م ۱۵۸۸)

مفتی عبدالسلام لاہوری (م ۱۶۲۰)

مفتی عبدالسلام دیوی (م قریباً ۱۶۳۰)

مولانا دانیال چوراسی (سنہ وفات معلوم نہ ہوسکا)

ملا قطب الدین سہالوی (م ۱۶۹۱)

مولانا قطب الدین شمس آبادی (م ۱۷۰۹) حافظ امان اللہ بنارسی (م ۱۷۲۰)

ملا نظام الدین سہالوی (م ۱۷۴۸)

عہد وسطیٰ کے ہندستان میں مسلم نظام تعلیم کے عنوان کے تحت فاضل مصنف نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ تعلیم کے میدان میں معقولات کے غلبہ کے باوجود طلبہ کو پوری آزادی حاصل تھی کہ وہ جس شعبۂ تعلیم میں چاہیں تخصص و امتیاز حاصل کریں۔ اس نظام تعلیم میں اس امر کی پوری گنجایش موجود تھی کہ اپنے ذوق کے مطابق اپنے اختیار سے طالب علم کتابوں اور علوم کا انتخاب کر سکیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۶۴۲ — ۱۵۵۱) اور شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۶۲ — ۱۷۰۳) کی مثالیں پیش کیں جنھوں نے معقولات و فلسفہ کی حکمرانی اور چرچے کے باوجود ان کی جانب خاص توجہ نہیں کی۔ شاہ ولی اللہؒ نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں جن مضامین اور کتابوں کو پڑھا تھا ان کا ذکر انھوں نے اپنے رسالہ الجزء اللطیف میں کیا ہے جو یہ ہیں :

"عربی صرف و نحو	کافیہ، شرح جامی
منطق	شرح شمسیہ، شرح مطالع
فلسفہ	شرح ہدایۃ الحکمۃ
کلام	شرح عقائد نسفی اور اس کے ساتھ حاشیہ خیالی اور شرح مواقف
فقہ	شرح وقایہ، ہدایہ

اصول فقہ	حسامی اور توضیح تلویح کا ایک حصہ
بیان و معانی	مختصر اور مطول
ریاضی و ہیئت	چند چھوٹے رسالے
طب	موجز القانون
تصوف	عوارف، رسائل نقشبندیہ، شرح رباعیات جامی، مقدمہ شرح لمعات، مقدمہ نقد النصوص
حدیث	مشکوٰۃ المصابیح، شمائل ترمذی اور بخاری کے کچھ حصے
تفسیر	مدارک اور بیضاوی"

شاہ ولی اللہؒ نے بھی اپنا ایک نصاب تعلیم تیار کیا تھا لیکن متعدد وجوہات سے وہ مقبول اور رائج نہ ہو پایا۔ البتہ درس نظامی ہندستان کے تقریباً تمام مدارس کا نصاب تعلیم قرار پایا۔ یہ جب مرتب و منظم ہو گیا تو اس میں اس بات کی گنجائش بالکل نہ تھی کہ اپنی پسند اور اپنے اختیار سے کوئی طالب علم کسی مضمون کو اختیار یا ترک کر سکے۔ اس نصاب تعلیم پر ایرانی ثقافت اور اس کے اثرات غالب رہے۔ اس نصاب تعلیم کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

"صرف و نحو	میزان، منشعب، صرف میر، پنج گنج، زبدۃ، فصول اکبری، شافیہ، کافیہ، نحو میر، شرح مائۃ عامل، ہدایۃ النحو، شرح جامی
بیان و معانی	مختصر المعانی، مطول
منطق	شرح شمسیہ، سُلّم، رسالہ میر زاہد، ملا جلال، صغریٰ کبریٰ، ایساغوجی، تہذیب، قطبی، شرح تہذیب، میر قطبی
فلسفہ	میبذی، شمس بازغہ، صدرا
ریاضی و ہیئت	تو شیحہ، شرح چغمنی
علم کلام	شرح مواقف، شرح عقائد نسفی
فقہ	شرح وقایہ، ہدایہ
اصول فقہ	نور الانوار، توضیح تلویح، مسلم الثبوت
حدیث	مشکوٰۃ المصابیح
تفسیر	جلالین، بیضاوی"

عہد وسطیٰ کے ہندستان کے تعلیمی نظام کی دو اہم خصوصیات ہیں ایک یہ کہ قرآن و حدیث کی تعلیم کو اس نظام میں نہ صرف یہ کہ بنیادی حیثیت حاصل نہ رہی بلکہ اس کی تعلیم سے بہت زیادہ بے اعتنائی برتی گئی۔ اس تعلیمی نظام کا دوسرا نمایاں پہلو یہ ہے کہ یہ نظام تعلیم مطلق جامد تھا منقولات و معقولات دونوں کی تعلیم میں تقلید کا عنصر غالب تھا۔

زیر نظر کتاب مسلمانوں کا تعلیمی نظام پروفیسر ضیا الحسن فاروقی کے چند علمی مضامین کا مجموعہ ہے جو رسالہ جامعہ میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ جو لوگ مذکورہ رسالہ میں ان

مضامین کا مطالعہ کر چکے ہیں ان میں سے بہتوں کی بشمول راقم السطور کے یہ خواہش تھی کہ انھیں کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ مکتبہ جامعہ نے اپنی روایتی حسن طباعت سے اسے زینت بخشی ہے جو لوگ علمی مزاج رکھتے ہیں، جنھیں تعلیم میں دلچسپی ہے یا کسی علمی، تحقیقی یا تصنیفی سرگرمیوں سے وابستہ ہیں انھیں مسلمانوں کے تعلیمی نظام کو صحیح تاریخی پس منظر میں سمجھنے کی سخت ضرورت ہے۔ زیر نظر کتاب اسی ضرورت کی تکمیل کی ایک کامیاب کوشش ہے اور مجھے پوری امید ہے کہ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں میں یہ کتاب نہایت مقبول ہوگی۔

چودھری محمد علی ردولوی

(حیات اور ادبی خدمات)

مصنف:- ڈاکٹر انور حسین خاں
مبصر:- عارف محمود
تقسیم کار:- نصرت پبلیشرز لکھنؤ
قیمت:- ۵۰/- روپے

انور حسین خاں صاحب کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر لکھنؤ یونی ورسٹی نے ان کو پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری عطا فرمائی ہے۔

چودھری محمد علی مرحوم پر یہ مقالہ لکھ کر انور حسین خاں نے نہ صرف اپنی دنیا سنواری بلکہ ردولی والوں کی عاقبت بھی سنوار دی۔ یہ کام اور اس سے ملتے جلتے وہ تمام کام جن کے چودھری صاحب مستحق تھے اب سے بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھے۔ اردو ادب میں چودھری صاحب کا مقام ان کے عہد اور بعد کے بزرگ ناقدین نے پہلے ہی طے کر دیا تھا لیکن ہم جو اپنے بزرگوں اور آئیڈیلس پر حرف ہار پھول چڑھا کر اپنے فرائض سے ادا ہو جانے کے عادی ہو چکے ہیں کبھی اس جانب توجہ نہ کی۔

مصنف نے اس مقالہ کو چھے ۶/ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ جن میں چودھری صاحب کے تعارف سے لے کر ان کی تمام نگارشات کے اقتباسات نیز ان پر کیے گئے اب تک ان کے معاصرین کے تبصرے شامل ہیں۔ خصوصی طور پر ان کے منفرد اسلوب، خطوط نویسی کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ غالب کے بعد یہ انداز جن لوگوں نے اپنایا ان میں چودھری صاحب کا انداز سب سے جدا ہے۔ ان کے ہاں اودھ کی گنگا جمنی اردو کے ساتھ قصباتی لہجے اور ماحول کی جو چاشنی ہے وہی چیز ان کو اردو خطوط نویسی میں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کے زیادہ تر خطوط ان کی عزیز بیٹی ہما بیگم کے نام ہیں جو اب نجی خطوط نہ رہ کر ادب کا سرمایہ بن گئے ہیں۔

چودھری محمد علی اس تعلقدارانہ ماحول کے پروردہ تھے جہاں منہ سے نکلی ہوئی ہر بات حکم بن جایا کرتی تھی لیکن اس نظام کی تمام تر خصوصیات موجود ہونے کے ساتھ ہی قدرت نے ان کو ایک حساس دل بھی عطا کیا تھا۔

اپنے گرد و پیش وہ جو دیکھتے تھے اور محسوس کرتے تھے اس کو ظاہر کرنے کے لیے ان کے پاس علم بھی تھا اور ایک مضبوط قلم بھی۔ وہ ان رؤسا میں نہیں تھے جو شاعروں اور ادیبوں کو زر و جواہر سے خرید کر ادب نواز کہلاتے تھے۔ چودھری صاحب خود ایک صاحب طرز ادیب اور بہترین ناقد تھے۔ ان کے افسانے اور نجی خطوط ان کی اس ناقدانہ صلاحیت کے بھرپور عکاس ہیں۔ ان کی تصانیف "میرا مذہب" اور "پردے کی بات" اس وقت شائع ہوئی تھیں جب عام مسلمان ان نازک مسئلوں پر کھل کر بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن چودھری صاحب نے "میرا مذہب" میں شیعہ اور سنی اختلافی مسائل پر اور دونوں جانب کی شدت پسندی پر بہت بیباکانہ رائے ظاہر کی ہے۔

"پردے کی بات" ضبط تولید پر ایک بھرپور تبصرہ اور رائے ہے جس کی افادیت آج زیادہ محسوس کی جا سکتی ہے۔

انور حسین خاں نے اپنے مقالے میں چودھری صاحب کی صرف اس ادبی شخصیت کا جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو ان پر شائع شدہ اب تک کی تحریروں سے حاصل ہو سکا چونکہ اس طرح کے مقالے ایک ادبی تاریخ کا درجہ رکھتے ہیں جن سے آنے والی نسلیں مزید چراغ روشن کرتی ہیں اس لیے ضروری تھا کہ چودھری محمد علی کی ادبی زندگی سے ہٹ کر ایک مکمل خاکہ ہوتا، خوش قسمتی سے انور صاحب کا تعلق کم و بیش قصبہ ردولی سے ہی ہے اس لیے جتنی آسانی سے تمام معلومات آج دستیاب ہو سکتی تھیں وہ آئندہ بیس پچیس سال بعد نہ ہوں گی۔

انور صاحب نے چودھری صاحب کے خاندان اور بیگمات کے ذکر کے ساتھ ان کی ایک بیگم اور ان کے صاحبزادے چودھری عرفان علی کو نظرانداز کر دیا۔ عرفان صاحب آج کل پاکستان میں ہیں۔

فاضل مقالہ نگار نے ردولی کو مردم خیز خطہ لکھ کر وہاں صوفی۔ بزرگ اور ادیب و شاعروں کے پیدا ہونے کی بشارت تو دی لیکن اس ذکر کے ساتھ چند حضرات کے نام اور مختصر تعارف بھی ہوتا تو یہ تاریخ مکمل ہو جاتی۔ وہاں صرف ادیب و شاعر ہی نہیں پیدا ہوتے بلکہ فن تعمیر سے دلچسپی رکھنے والے بھی تھے جن میں چودھری سید ارشاد حسین مرحوم کا نام نامی بہت نمایاں ہے۔ ادبی سرگرمیوں کے سلسلے میں جن حضرات نے ردولی کو نمایاں کیا ان میں اسرارالحق مجاز۔ شاہ حیات احمد احمدی، شاہ معین الدین احمد ندوی حکیم رونق علی۔ جعفر مہدی رزم، مولوی مرتضیٰ حسین مظہر۔ حکیم محمد والجلال نام

حکیم محمد مرزا مخلص آصف، عتیق صدیقی، وسیم انصاری مرحومین وغیرہم کے
ام بہت اہم ہیں۔ اس کتاب میں ردولی کا تعارف اگر تفصیل کے ساتھ
ہیں تو مختصر طور پر کیا جانا بہت ضروری آیا۔
مقالے میں قصبہ کے ان دو چبوتروں کا ذکر ہے جہاں روزانہ شام کو
کچھ نمایاں حضرات کی محفلیں جما کرتی تھیں جس میں ایک جگہ کے محلہ صوفیانہ کا
ذکر بھی ہے لیکن اس کی کوئی نشانہ ہی نہیں کی گئی۔ محلہ خان پورہ کی محفل
کے مستقل بیٹھنے والوں کے نام تو دیے گئے لیکن ان حضرات کے مختصر تعارف
کے بغیر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ کیا قدر مشترک تھی جس کی بنا پر چودھری محمد علی
جیسے تعلقدار اس زمانہ کے رؤساء کے مزاج کے خلاف اپنے دولت کدہ سے
دور سڑک کے کنارے ایک چبوترے پر اپنی محفلیں سجایا کرتے تھے (واضح ہو کہ
اس دور میں ردولی کے رئیس اور تعلقہ دار صرف اپنی بیٹھکوں میں ہی ایسی محفلیں
منعقد کیا کرتے تھے)۔
چودھری محمد علی کے انتقال کے بعد "حسب وصیت" ان کی نماز جنازہ
دو بار پڑھائی گئی ایک بار سید علی محمد زیدی صاحب (مصنف اپنی یادیں ردولی
کی باتیں) کے زیر نگرانی شیعہ مولوی نے پڑھائی اور دوسری بار سنی مولوی نے
پڑھائی۔ یہ واقعہ مقالہ نگار نے "صدق جدید" لکھنؤ کے حوالے سے درج
کیا ہے۔ اسی کے ساتھ اسی صفحہ پر فٹ نوٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ لفظ "حسب
وصیت" پر چودھری علی محمد زیدی صاحب کو اعتراض ہے۔ میرا خیال ہے کہ
صرف فٹ نوٹ لکھ کر مقالہ نگار تحقیق کے فرض سے سبکدوش نہیں ہوتے۔
چودھری صاحب نے اپنی تصنیف "میرا مذہب" میں اپنے عقاید کا اتنا
واضح اشارہ دیا ہے کہ یہ دونوں وصیتیں ٹھیک معلوم ہوتی ہیں۔ یہ مقالہ
نگار کا کام تھا کہ وہ خود تحقیق فرماتے۔ ابھی قصبہ میں بہت سے بزرگ
موجود ہیں جو اس پر روشنی ڈال سکتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ چودھری
صاحب مرحوم کی بیگم، قیصر بیگم صاحبہ نیز ان کے صاحبزادے چودھری سعید
صاحب اس پر روشنی ڈال سکتے تھے۔
ان تمام فروگزاشتوں سے قطع نظر انور حسین خاں کی یہ کاوش،
چودھری محمد علی ردولی پر ایک ایسا کام ہے جس کو آئندہ مشعل راہ بنایا
جا سکتا ہے۔ امید ہے کہ اس کی آئندہ اشاعت میں وہ طباعت اور
کتابت کی طرف بھی توجہ فرمائیں گے اور اس میں کچھ تحقیقی اضافہ بھی
ضرور ہوگا۔

رشحاتِ قلم

مصنف :- طیب بخش بدایونی
ناشر :- طیب پبلشنگ ہاؤس پیلی کوٹھی محلہ موتھا بدایوں
قیمت :- بیس روپے
مبصر :- عبداللہ ولی بخش قادری

رشحاتِ قلم میں بائیس مضامین شامل ہیں - ان میں موضوع و مزاج کا تنوع نیز فکر رسا اور جولانیٔ طبع کی بہار سب کچھ موجود ہے - پہلے مضمون کا عنوان ہے "- اس کا آغاز یوں ہوتا ہے -

"آیئے آج آپ کا تعارف بدایوں کی کچھ ایسی ہستیوں سے کرایا جائے جنھوں نے اپنے زمانے میں مختلف خصوصیات کی وجہ سے نہ صرف اپنے آپ کو زندۂ جاوید بنا ڈالا بلکہ شہر بدایوں کی عظمت و شہرت کو بھی چار چاند لگا تے - آہ اب وہ لوگ نہ رہے، ہم اب صرف اُن کی یادوں کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں"۔

لیکن حالات کی ستم ظریفی اور ہماری شومیٔ قسمت ملاحظہ ہو کر رشحاتِ قلم پر تبصرہ کرتے وقت ہم ان کی بھی یاد اپنے دل میں لیے ہوئے ہیں - ۲۶ فروری ۹۲ء کو وہ داغِ مفارقت دے گئے - بدایوں کے ایک سربرآوردہ اور معزز خاندان کا فرد ہونے کے علاوہ وہ اپنے وطن اور خاندان کی علمی و ادبی روایات کی بھی ایک زندہ مثال تھے - عربی، اردو اور انگریزی تینوں زبانوں سے گہری واقفیت رکھتے تھے - عربی کا ذوق و شوق انھوں نے اپنے والد ماجد مولانا یعقوب بخش صاحب راغبؔ سے ورثے میں پایا تھا جو کہ عربی کے عالم تھے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دینیات کے استاد بھی رہے تھے - خود انھوں نے اپنی زندگی مقامی اسلامیہ کالج میں انگریزی کے لکچرر کی حیثیت سے گزاری تھی - انھوں نے علامہ شبلی نعمانی کی مشہور و معروف تصنیف "سیرت النبی" کا انگریزی میں ترجمہ کیا جسے قاضی پبلی کیشنز لاہور نے ۱۹۶ء میں شائع کیا جو بیرونی ممالک میں قدر و منزلت کا موجب ہوا - اس کے علاوہ انگریزی میں کئی اور دینی کتب کے تراجم بھی ان کے قلم کے مرہونِ منت ہوتے - اردو میں ان کی تصنیف "اعتقاداتِ سرسید اور شعراءِ بدایونی" (۱۹۸۵ء) اپنے موضوع پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے - علاوہ ازیں اردو شعر و ادب سے متعلق ان کی مرتب کردہ کئی کتب منظرِ عام پر آچکی ہیں - رشحاتِ قلم میں دقیق اور ہلکے پھلکے دونوں طرح کے مضامین موجود ہیں - کہیں خاکہ اڑایا گیا ہے اور کہیں علمی بحث چھیڑ گئی ہے، کوئی تاریخی اہمیت کا حامل ہے تو کوئی "در بیانِ خود" - غرضیکہ ہر مضمون اپنا رنگ اور اپنا ڈھنگ رکھتا ہے - چند عنوانات ملاحظہ ہوں، تذکرۂ شعرائے بدایوں - ملا عبدالقادر سے منسوب قصیدۂ ہجویہ، میری کہانی، میری زبانی -

نا ہے شہر کا مصاحب۔ خطاتے اہلِ قلم۔ انکھیاں ترستیاں وغیرہ۔
طیب میاں نے ساٹھ سے اوپر عمر پائی مگر رواتے گمنامی کو برابر اوڑھے رہے۔
لیکن ان کی ادبی خدمت یقیناً ان کے نام کو روشن کرے گی۔ رشحاتِ قلم کی ورق
گردانی ان کی طبیعت کی بوقلمونی، مطالعہ کی وسعت اور قلم کی روانی سب ہی کی بخوبی
غمازی کرتی ہے۔ وہ زبان پر پوری قدرت رکھنے کے باوصف اپنے موضوع کے
مطابق شگفتہ اور سنجیدہ، علمی اور عمومی ہر نوعیت کا پیرایۂ بیان اختیار کرنے کے اہل
ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے مضامین میں خلوص و صداقت کی زیریں لہر بھی محسوس
کی جاسکتی ہے۔ کسی ایک مجموعہ مضامین سے اس طور محظوظ کرنے کی توقع شاذ
ہی بر آتی ہے۔ یہ بات اطمینان سے کہی جاسکتی ہے کہ رشحاتِ قلم کے مضامین
ہر قاری کو اپنے مذاق کی تسکین کا امکان رکھتے ہیں۔

بقیہ صفحہ ۹۶ کا

نہیں ہوتی ہے۔
رام لعل نے اردو زبان کی ایک
مخصوص فرقے سے وابستگی کے الزام کو
دھونے کے لیے غیر مسلم اردو مصنفین
کے پلیٹ فارم سے اردو اس ملک
کی مشترکہ تہذیب کی وراثت کی حیثیت
سے تسلیم کرانے کا بھی قابلِ قدر کار
نامہ انجام دیا ہے۔ لیکن اس وقت
حالات نے ان کو صرف ایک ریٹائرڈ
ریلوے ملازم کی حیثیت پر لاکر کھڑا
کر دیا ہے۔

ادبی اور تہذیبی خبریں

پنجاب میں اردو اکادمی کے قیام کا فیصلہ

نئی دہلی۔ حکومت پنجاب نے دہلی ایڈ منسٹریشن سے کہا ہے کہ وہ پنجابی کو دہلی کی دوسری سرکاری زبان منظور کرے۔

پنجاب کے وزیر تعلیم جناب ہرنام داس جوہر نے راقم کو بتایا کہ انھوں نے دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر کو لکھا ہے کہ موجودہ حقائق کی روشنی میں پنجابی کو دہلی کی دوسری سرکاری زبان بننے کا حق ملتا ہے کیونکہ اس یونین علاقے کی تقریباً نوے لاکھ کی آبادی میں تقریباً ساٹھ لاکھ لوگ پنجابی بولنے والے ہیں۔ وزیر موصوف نے مزید بتایا کہ لیفٹیننٹ گورنر صاحب نے اپنے جواب میں انھیں لکھا ہے کہ پنجاب کی تجویز پر مناسب غور کیا جائے گا۔

وزیر موصوف ۲۴ مارچ کو یہاں ایک خصوصی لٹریری کانفرنس کے سلسلے میں آتے تھے جو حکومت پنجاب کے ایما پر منعقد کی گئی ہے۔ اس کی نظامت پنجاب کے بھاشا وبھاگ کے ڈائرکٹر جناب او۔ پی آنند نے کی۔ اس ایک روزہ کانفرنس میں جو وزیر موصوف ہی کی صدارت میں ہوئی۔ پانچ ممتاز ادیبوں نے فرقہ وارانہ آہنگ کے فروغ میں ادیبوں کے کردار کے موضوع پر مقالے پڑھے۔ ان مقالہ نگاروں میں جناب کرتار سنگھ دگل جسٹس پریتم سنگھ سفیر۔ جناب بھیشم ساہنی ڈاکٹر مہیپ سنگھ اور جناب راج گل شامل تھے۔

پنجاب کی لسانی صورتِ حالات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے جناب ہرنام داس جوہر نے کہا کہ اردو ایک بہت پیاری زبان ہے۔ پاکستان کے قیام سے اس نے بڑی چوٹ کھائی ہے لیکن ہم اسے پاکستان کی نہیں بلکہ اپنے ملک کی زبان تصور کرتے ہیں۔ ہم اس کی ترقی کے لیے مناسب تدبیریں کریں گے۔ انھوں نے بتایا کہ انھوں نے اپنی ریاست میں ایک اردو اکادمی قائم کرنے کا بھی فیصلہ کیا ہے اور جلد ہی وہ اس کے بارے میں سرکردہ ادیبوں سے مشاورت کریں گے۔

وزیر موصوف نے کہا کہ ان کی حکومت ادیبوں اور صحافیوں کی آزادی تحریر کی حامی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ وطن اور قوم کی وحدت اور سلامتی کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

(جی۔ ڈی۔ چندن)

ترویج وبقا اور بے لوث خدمات میں
مسلسل فعال ہے۔ مکتبہ عابدیہ لائبریری
کے طور پر محمد خالد عابدی نہایت محنت،
شوق اور ذمہ داری سے چلا رہے ہیں۔
بیشتر اردو طلبہ خصوصاً ایم۔اے۔ پی۔
ایچ۔ڈی کے ڈزرٹیشن ومقالات کے
سلسلے میں مستفید ہوتے رہے ہیں۔
جو صاحبان اپنی کتب، رسائل اخبار،
خطوط اور فوٹو وغیرہ علاحدہ کرنا چاہتے ہوں
وہ عطیات کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔
اور جو حضرات قیمتاً فروخت کرنا چاہتے ہوں
وہ مکتبہ عابدیہ سے رابطہ قایم فرمائیں۔ قیمت
کا تعین کتاب / رسالہ / خطوط / فوٹو کو دیکھ
کر کیا جائے گا۔

محمد خالد عابدی، مکتبہ عابدیہ، دل آرام
ہاؤس ۵۲۔ ہوا محل روڈ، بھوپال۔

جلسہ سیرت النبیؐ اور عظیم الشان نعتیہ مشاعرہ

۲۰ فروری کی رات کے ٹھیک دس بجے
بمقام گورنمنٹ ہائی اسکول، ویلور شمالی
آرکاٹ ایک عظیم الشان نعتیہ مشاعرہ
زیر صدارت ڈاکٹر سلمان اطہر جاوید منعقد
ہوا۔ ہندو پاک کے مشہور شاعر، محقق، افسانہ
نگار جناب علیم صبا نویدی نے اس مشاعرے
کی نظامت کی ـــ تمل ناڈو کے معروف
افسانہ نگار اور اردو کے پروفیسر ڈاکٹر عابد
صفی صاحب بھی بحیثیت مہمانِ خصوصی اس
مشاعرے میں جلوہ افروز تھے۔ جن شعراء
نے مشاعرے میں حصہ لیا ان کے اسمائے
گرامی حسب ذیل ہیں۔

علامہ قدوسی باقری ڈاکٹر سلمان اطہر
جاوید، علیم صبا نویدی، ڈاکٹر ساغر جیدی،
مولانا راہی فدائی، ڈاکٹر عابد صفی، اکرام
کاوش، حسن فیاض، اصغر ویلوری، انور
مینائی، یعقوب اسلم، سلیم تمنائی، برق
کڈپوری، آدم بنگلوری، ڈاکٹر سید سجاد
حسین ظہیر، سجاد بخاری، منیر رشیدی،
مختار بدری، نورس خیالی، برتر مدراسی،
نجم ملک، سراج زیبائی، اور آکاش دیپ
مشاعرہ رات کے ٹھیک دو بجے جناب
وی۔ایم باشا کے شکریے کے ساتھ اختتام پزیر ہوا

وی ایم باشاہ، صدر شعبہ اردو، مسلم
ہائی اسکول، ویلور۔

ایک یادگار شعری نشست

۱۹ فروری کی رات کے ٹھیک دس بجے
بمقام سبیل الرشاد عربی کالج، بنگلور ۵۴۔
ایک شعری نشست زیر صدارت علامہ
جعفر حسین فیضی صدیقی ترتیب دی گئی۔
اس مخصوص شعری نشست میں علامہ قدوسی
باقری، مولانا راہی فدائی اور جناب علیم
صبا نویدی بحیثیت مہمانِ خصوصی مدعو تھے۔
محفلِ شعر وسخن میں مہمانانِ خصوصی کے
علاوہ مقامی شعراء میں آدم بنگلوری، نیّر
ربّانی، قمر قاسمی، اسد اعجاز، افسر عزیزی،
اور اشرف سعودی نے حصہ لیا۔

آدم بنگلوری۔
منتظمینِ مشاعرہ، بنگلور۔

سہ ماہی ترسیل

کوکن اردو رائیٹرز گلڈ کے روح رواں جناب حرشیوی کی تحریک پر گلڈ کے زیر اہتمام ایک ادبی رسالہ ترتیب دیا جا رہا ہے۔ یہ کسی خاص علاقے یا مکتب فکر کی نمائندگی نہ کرتے ہوئے غیر جانبدار اور بے لاگ افکار و تخلیقات کا حامل رسالہ ہوگا۔ اس سہ ماہی رسالے کی اوّلین اشاعت جلد ہی منظرِ عام پر آنے کی توقع ہے۔

آپ سے گزارش ہے کہ ہمیں اپنے قلمی / مالی تعاون سے نوازیں۔

پتا۔ بی ۲۱ بندوق والا بلڈنگ (جیل روڈ بمبئی ۹)

غالب فہمی کے نئے تناظر

غالب اکیڈمی کی تقریب میں جناب فاروقی کا مقالہ

نئی دہلی۔ بے شمار ماہرین، غالب کی فکر و تخلیق کی تشریح کر چکے ہیں۔ کیا ان کی موجودگی میں اس نابغہ روزگار کے کلام کی کوئی نئی شرح ہو سکتی ہے بظاہر نہیں۔ لیکن یہ مسئلہ موجود ہے اور مشہور نقاد جناب شمس الرحمن فاروقی نے "غالب فہمی کے نئے تناظر" کے عنوان سے اپنے مقالے میں دکھایا کہ یہ آج بھی ممکن ہے۔

یہ مقالہ انھوں نے ۲۰ فروری کو یہاں غالب اکیڈمی کی خصوصی تقریب میں پیش کیا جو مرزا غالب کی ۱۲۴ ویں برسی اور غالب اکیڈمی کے ۲۴ ویں دم تاسیس کے موقع پر منعقد کی گئی۔ تقریب کا افتتاح مشہور محقق اور مصنف جناب مالک رام، صدارت انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر جناب سید حامد اور نظامت اکیڈمی کے سکریٹری سید ذہین نقوی نے کی۔

سید ذہین نقوی نے اپنے تعارفی کلمات میں کہا کہ غالب کی وفات ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو ہوئی تھی لیکن حالات کے حالیہ انتشار کی وجہ سے اس تقریب کو تھوڑا ملتوی کرنا پڑا۔ اسی انتشار کی وجہ سے اکیڈمی ۲۷ دسمبر ۱۹۹۲ء کو غالب کا یوم ولادت بھی نہ منا سکی۔ اکیڈمی کی گورننگ باڈی کے سینئر ممبر جناب مالک رام نے کہا کہ اکیڈمی روزِ اول سے غالب فہمی کو فروغ دے رہی ہے اور ہر سال ان کی ولادت اور وفات کی تاریخوں پر مستقل پروگراموں کے علاوہ متعدد دیگر پروگرام بھی منعقد کرتی ہے۔ اُن پروگراموں میں ملک کے ممتاز عالموں اور دانشوروں نے مقالے پیش کیے ہیں۔ اس برس جناب شمس الرحمان فاروقی کو مقالے لکھنے کے لیے کہا گیا اور موصوف نے اپنی علالت کے باوجود اپنا مقالہ تحریر کیا ہے۔

جناب شمس الرحمان فاروقی نے کہا کہ غالب ۱۹ ویں صدی کے آخری کلاسیکی اور ۲۰ ویں صدی کے

اوّلین جدید شاعر ہیں۔ ان کا انتقال موجودہ صدی کے آغاز سے ۳۱ سال پہلے ہو گیا تھا لیکن ان کے کلام میں ایسی ندرت اور مفہوم میں ایسی گہرائی ہے کہ وہ ہمارے عہد کے بھی سب سے مقبول شاعر بن گئے ہیں۔

یہ صدی استعارے اور ابہام کی صدی ہے اور غالب کا کلام ان دونوں میں یکتا ہے۔ انھوں نے استعارے کے ذریعے مجازی اور حقیقی کے معنی کے درمیان تشبیہ ہی کا علاقہ روا نہیں رکھا بلکہ استفہام اور دریافت مزاج کا امکان پیدا کیا۔ ان کے زمانے میں مغربی تہذیب مشرقی اقدار سے متصادم ہو چکی تھی۔ مغلیہ سلطنت کے اختتام سے پیدا ہونے والے سیاسی زوال نے یہاں ایک تہذیبی اور نظریاتی بحران پیدا کر دیا تھا۔ غالب نے ان سب اثرات کو ان کی تہ تک دیکھا اور نئے نظریات کا گہرا ادراک کیا۔ انھیں مشرقی اقدار سے پوری ہمدردی تھی لیکن وہ مروّج اقدار کو جوں کا توں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس اندازِ فکر و نظر نے انھیں اپنے ہم عصروں سے منفرد کر دیا تھا۔ ان کے ہم عصر اپنے دور کے نظریاتی بحران سے پیشتر بے خبر تھے۔

مقالہ نگار نے غالب کا موازنہ ان کے پیشرو میر سے بھی کیا اور بتایا کہ میر بھی بہت بڑا استفہامی تھا لیکن اس کے ہاں ہر چیز کا مرتبہ اور مقام متعین ہے۔ اس نے اپنے عصری اور بزرگوں کے اندازِ فکر سے اختلاف نہ کیا۔ اس کے برعکس غالب کے مفاہیم سے پتا چلتا ہے کہ اشیا جیسی نظر آتی ہیں وہ ان کی اصل صورت نہیں اور حقائق بھی وہ نہیں جو ہمیں سکھائے گئے ہیں۔ غالب کے ہاں ایک نکتہ چیں انداز ہے۔ اس کا نقش فریادی ہے۔ اس کا پیکر کاغذی پیرہن میں ہستی کے آزار کی نشان دہی کر رہا ہے۔ اس کے استعاروں میں ایک عقلی نظام ہے۔ غالب نے اپنی صنعتِ استفہام سے ہمارے ذہنی جغرافیہ اور تہذیبی آب و ہوا میں تبدیلی پیدا کی۔ میر بلاشبہ انسانی جذبات کا بہت بڑا ترجمان ہے لیکن اس کے کلام میں یہ قوتِ تغیر نہیں ہے۔ غالب اپنی ہر چیز میں ایک الگ روش رکھتے ہیں۔ انھوں نے عاشق اور محبوب کے مقامات کو زیر و زبر کر دیا۔ ان کے اندازِ فکر میں بے پناہ شوخی اور کلبیت تھی جو ۲۰ ویں صدی کے نظریات کو بھی مرغوب ہے۔

جناب متین صدیقی اور ڈاکٹر کامل قریشی نے غالب کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔

صدرِ جلسہ سید حامد نے کہا کہ غالب کو اپنے زمانے سے ناقدری کی شکایت رہی اور اپنے ایک فارسی شعر میں انھوں نے اپنے کلام کو ہندستان سے باہر جانے کی بھی بات کی لیکن

شمس الرحمان فاروقی کے مقالے کے بعد وہ شکایت دور ہو جائے گی۔ موصوف نے جو نئے زاویے پیش کیے ہیں وہ ہمارے محققوں کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

خواجہ حسن ثانی نظامی نے شکریے کی تحریک پیش کرتے ہوتے کہا کہ فاضل مقالہ نگار نہ صرف غالب کو واپس ہمارے پاس لائے بلکہ ہمارے زمانے کو بھی غالب تک پہنچا دیا۔

تقریب کے دوسرے دور میں ایک محفلِ کلامِ غالب منعقد ہوئی جس میں سپریم کورٹ کی ایڈوکیٹ محترمہ رنجنا نرائن۔ غزل گوئی میں مہارت حاصل کرنے کے لیے اردو کا ڈپلومہ حاصل کرنے والے بنگالی نوجوان فن کار سودیپ کے علاوہ دو کمسن اسکولی بچوں میں منور سوہلی اور ماسٹر بھرت کوہلی نے بڑی خوبی اور شیرینی سے غالب کا منتخبہ کلام سنایا۔ اس کی نظامت ثقافتی محفلوں کے مشہور فنکار جناب رئیس مرزا نے کی۔

جی، ڈی چندن۔

حلقۂ ادب بہار کے یادگار جلسے میں دانشوروں کا اظہار خیال

۲۷ جنوری ۱۹۹۳ء گزشتہ دنوں مقامی اردو بھون میں حلقہ ادب بہار کی جانب سے ایک شاندار اور رنگارنگ ادبی تقریب کا انعقاد کیا گیا، جلسے کی صدارت اقلیتی کمیشن حکومت بہار کے سابق چیرمین جناب ہارون رشید نے فرمائی اور نظامت کے فرائض اردو کے معروف افسانہ نگار جناب فخرالدین عارفی نے انجام دیے۔ جلسے میں سب سے پہلے اردو کے ممتاز نقاد اور حلقہ ادب بہار کے صدر ڈاکٹر عبدالمغنی نے اردو ادب کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے ملک کی تازہ ترین صورت حال پر روشنی ڈالی، جلسے سے خطاب کرنے والے تمام ادیبوں اور شاعروں نے ملک میں تیزی سے فرقہ پرستی کے بڑھتے ہوئے رجحان پر اپنی گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوتے اس بات پر زور دیا کہ اس وقت ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی ایکتا کی فضا کو مضبوط اور خوشگوار بنانے کی غرض سے تمام سیکولر طاقتوں کو آگے آنا چاہیے تاکہ ایک مرتبہ پھر نئے سرے سے ملک کے اندر محبت اخوت اور بھائی چارہ کی فضا پیدا ہو سکے۔

اردو کے ممتاز افسانہ نگار جناب ش۔ مظفرپوری اور نئی نسل کی ایک نمائندہ افسانہ نگار محترمہ تسنیم کوثر نے حالات حاضرہ کے تعلق سے اپنے خوبصورت افسانے پیش کیے۔ افسانوی دور کے اختتام کے بعد قومی یک جہتی کے موضوع پر ایک شاندار مشاعرے کا بھی انعقاد کیا گیا۔ جس میں جناب بہزاد فاطمی، جناب صابر آروی جناب

ابدی، جناب تاشاد اور رنگ آبادی
ب فیاض الرحمان شارق، جناب شاکر
ری، جناب شام رضوی، جناب خورشید
ر، جناب قسیم قاسمی، جناب عالم
شید، جناب اثر فریدی اور جناب
ظم رضا وغیرہ نے عمری حیثیت سے
پلار اپنے تازہ ترین کلام سے حاضرین
وظ فرمایا۔

جلسے میں یوں تو ایک بہت بڑی
اد میں لوگ جمع تھے جن میں جلسے
باضابطہ کارروائی میں حصہ لینے
وں کے علاوہ درج ذیل حضرات
اسمائے گرامی بھی خاص اہمیت کے
مل ہیں۔ جناب مشتاق احمد نوری،
ب عبید قمر، پروفیسر انوار الحق تبسم،
ب مظہر عالم مخدومی، محمد نور عالم،
ب عطا عابدی، محترمہ شائستہ انجم
ی، محترمہ مسرت جہاں، پروفیسر
لم اعظمی، ڈاکٹر چودھری اشرف الدین
ر احسان اشرف، جناب ایم۔اے نظام،
ر شاہد اقبال، جناب المختار عظیم
ر، جناب حسن احمد، اور جناب
نیم احمد وغیرہ۔

یم احمد) سکریٹری حلقہ ادب بہار (پٹنہ)

ب علیم صبا نویدی کو اعزاز

انڈیا میر اکیڈمی نے ٹمل ناڈو کے مشہور
ر اور ادیب جناب علیم صبا نویدی کو
و زبان و ادب کی مجموعی گراں قدر خدمات
اعتراف میں سال رواں کے "امتیاز
میر" ایوارڈ کے لیے منتخب کیا ہے۔
جو سارے ٹمل ناڈو میں پہلی مرتبہ کسی
شاعر یا ادیب کو حاصل ہوا ہے اس
موقع پر اردو رائٹرز گلڈ ٹمل ناڈو، علیم
صبا نویدی کی خدمت میں پُرخلوص
مبارک باد پیش کرتی ہے۔

(محمد یعقوب اسلم)

ایودھیا اور اقلیت کے مسائل پر ممتاز دانشور سید حامد صاحب کے سنجیدہ مضامین کے مجموعے "آزمائش کی گھڑی" کا رسم اجرا

۱۲ مئی ۹۳ء اردو کے ممتاز ادیب،
دانشور اور علی گڑھ یونی ورسٹی کے سابق
وائس چانسلر سید حامد صاحب کے مضامین
کا مجموعہ آزمائش کی گھڑی (جس کے بیشتر
مضامین روزنامہ "قومی آواز" میں شائع
ہو چکے ہیں اور جس کو اب کتابی صورت
میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے شائع کیا ہے)
کی رسم اجرا ممتاز صحافی کلدیپ نیر کے
دست مبارک سے ہوئی۔ صدارت
جناب سید مظفر حسین برنی نے کی۔
مقررین میں جناب کلدیپ نیر، موہن
چراغی، آر۔ ڈی گوئل، تنویر احمد علوی،
پروفیسر قمر رئیس، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر
ظہیر احمد صدیقی شامل تھے۔ سردار جعفری
نے اپنی ایک خوبصورت نظم پیش کی آخر
میں صدر جلسہ جناب برنی صاحب نے
آج کے حالات پر بصیرت افروز تقریر فرمائی۔
نظامت کے فرائض ڈاکٹر اسلم پرویز نے
ادا کیے۔ شکریہ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے
ادا کیا۔

ساحر لدھیانوی ایوارڈ

پنجاب کے معروف ادیب و شاعر جناب پورن سنگھ ہنرؔ کو اس مرتبہ پنجاب سرکار سے ان کی غزلوں کے مجموعہ "متاع درد" پر ساحر لدھیانوی ایوارڈ دیا ہے۔ اور ایک ہزار روپیہ کتاب کی خوبصورت طباعت پر بھی ملا ہے۔

ڈاکٹر یونس اگاسکر کو "امتیاز میر" اوارڈ

آل انڈیا میر اکادمی نے ڈاکٹر یونس اگاسکر کو ان کی علمی وادبی خدمات کے پیشِ نظر "امتیاز میر" کے اوارڈ سے نوازا ہے۔ ڈاکٹر یونس اگاسکر جامعہ بمبئی کے شعبۂ اردو سے منسلک ہیں۔ پی۔ ایچ، ڈی، ایم۔ فِل اور ایم۔ اے کے طلبہ کی رہنمائی میں مصروف ہیں۔ اور تنقید، تحقیق کے علاوہ تراجم میں اپنی ایک الگ شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی کتابوں میں اردو کہاوتیں، مراٹھی ادب کا مطالعہ، تلاشِ فن، بے چہرہ شام اور Arabic - For Every Day Use خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

مجروحؔ کے بیٹے کا انتقال

بمبئی ۱۰ر مئی۔ مشہور شاعر مجروح سلطانپوری کے بڑے صاحبزادے ارم سلطان پوری کا گزشتہ ۷ر مئی کو دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ۳۶ برس تھی۔ تدفین جوہو قبرستان میں ہوئی۔

ندا فاضلی کو میر تقی میر سمان

بمبئی-۱۴ر مئی۔ مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی نے ممتاز شاعر ندا فاضلی کو ان کی طویل اور نمایاں خدمات کے لیے "میر تقی میر سمان" دینے کا اعلان کیا ہے اکیڈمی کے ایوارڈ یافتگان میں عارف عزیز بھوپال (اردو صحافت)، عشرت قادری بھوپال (سراج میر خاں سحر ایوارڈ) پریم سریواستو، جبلپور (مجددی سمان برائے شاعری) کوثر جہاں، بھوپال (یوسف قیصر سمان برائے نثر) اور ڈاکٹر حنیف نقوی، وارانسی (نواب صدیق حسن خاں سمان برائے تنقید) شامل ہیں۔ مدھیہ پردیش اطلاعاتی مرکز کے مطابق شریف بھوپال سمان ڈاکٹر فرزانہ رضوی کو اور کیف بھوپالی سمان برائے تدریس قاسمیہ بیگم کو دیا جائے گا۔

افسانہ نگار رام لعل شدید علیل، مالی مشکلات کا شکار

اردو زبان کے ایک ستون کو بچانے کی ضرورت

لکھنؤ-۱۲ر مئی۔ ممتاز افسانہ نگار رام لعل شدید طور پر علیل ہیں اور مالی مشکلات کا شکار ہیں۔ اجریاؤں کے سابق زمیندار اچھن میاں نے ہینہ طور پر دوڑ دھوپ کے بعد رام لعل صاحب کو سنجے گاندھی میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں گردے کے علاج کے شعبے میں داخل تو کرا دیا ہے لیکن ان کے علاج پر جو رقم درکار ہے وہ حاصل کرنے میں کامیابی

باقی صفحہ ۹۸ پر

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانبدارانہ روایت کا نقیب

جولائی ۱۹۹۴ء جلد ۳۴ شمارہ ۷

فی پرچہ	6/-
سالانہ	55/-
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	75/-
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک)	170/-
(بذریعہ ہوائی ڈاک)	320/-

ایڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

TELEPHONE 630191

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات، نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

غزلیں

طنز و مزاح

سرورق : شیخ سلیم احمد

مہمان مدیر
شیخ سلیم احمد
۵۰۔ بستی حضرت نظام الدین
نئی دہلی ۱۳

اشاریہ

نئی ترقی پسندی کی فکری اساس

ترقی پسندی اور جدیدیت کے مابین اختلاف کی بنیادی وجہ یہ سوال رہا ہے کہ آیا فرد اہم ہے کہ سماج۔ ترقی پسندوں نے سماج کو ہی سب کچھ سمجھا جب کہ جدیدیوں نے فرد کو اہمیت دی۔ فرد اور سماج کی اولیت واہمیت کی بنیاد پر ترقی پسند اور جدید ادبی تحریکوں کے بیچ خط امتیاز کھینچا گیا۔ ایک خاص مدت تک یہ دونوں دھارے متوازی بہتے نظر آتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد جب جدیدیت کا زور ہوا اور یہ تحریک پورے ادبی منظرنامہ پر چھا گئی تو کچھ ترقی پسندوں نے چولا بدل کر جدید ادب لکھنا شروع کیا۔ اگرچہ وہ فیشن کے طور پر لکھ رہے تھے مگر ترقی پسند تنقید نگاروں نے ان کی تخلیقات میں بھی عصری آگہی اور سماجی شعور کے عناصر ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے چاہے انھیں خورد بینی کا استعمال کیوں نہ کرنا پڑا ہو۔ جدیدیت کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ یہ ایک بڑی تحریک تھی اور آج بھی ہے۔ اردو ادب پر اس کی گہری چھاپ ہے جدیدیت نے ہر صنف میں اچھے لکھنے والے پیدا کیے، لکھنے والوں کی پوری ایک نسل تیار کی۔ یہ تسلیم کرنے میں بھی کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے کہ بعض ترقی پسند قلم کاروں نے جدیدیت کو خلوص دل کے ساتھ قبول بھی کر لیا اور وہ "مشرف باسلام" ہو گئے۔ ادب پر جدیدیوں کے غلبے کو دیکھ کر کبھی کبھی یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ ترقی پسند اپنی دکان بڑھا چکے۔

آٹھویں دہائی میں دونوں تحریکوں کے بیچ فاصلہ کم ہوا۔ جدیدیت کے علم بردار ادبی جرائد میں ترقی پسند تحریریں نظر آنے لگیں۔ ترقی پسند رسالوں میں جدید تخلیقات شائع ہونے لگیں۔ ترقی پسندوں کے اسٹیج پر جدیدیوں کا تقریر کرنا معیوب نہ رہا اور جدید کے پلیٹ فارم سے ترقی پسند آوازیں بلند ہونے لگیں۔ جدیدیت کے آقاؤں کے ملک میں ترقی پسند شاعر اپنا جشن سیمیں منوانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے اور مغربی ملکوں میں ترقی پسند اپنی کانفرنسیں منعقد کرنے لگے۔ یہ ایک خوش آیند پیش رفت تھی۔ دونوں تحریکوں کی قربت سے تخلیق کاروں نے اطمینان کا سانس لیا کہ ان کے اعصاب پر دونوں تحریکوں کی گروہ بندیوں کا دباؤ کم ہو رہا تھا۔ وہ اب زیادہ آزادی کی فضا میں سانس لینے لگے تھے۔

روس میں ایک بھونچال آیا۔ گو یہ سیاسی نوعیت کا بھونچال تھا مگر اس نے ادبی دنیا کو بھی منقلب کر دیا کیونکہ نئے روسی انقلاب کی ایک فکری و نظریاتی اساس تھی۔ پریستروئکا (تعمیر نو) اور گلاسناسٹ (کھلے پن) کے نظریات کو پیش کیا گیا۔ جس کے

نتیجہ میں قدیم اشتراکی نظام کی جڑیں ہل گئیں۔ یہ خطۂ زمین جس پر تقریباً ۷۵ سال پہلے زندگی کرنے کے ایک انوکھے تجربے کو عملی جامہ پہنایا گیا تھا ایک بار پھر ایک بڑے انقلاب سے دوچار ہوا۔ اس انقلاب سے یہ ثابت ہوا تبدیلی قانونِ فطرت ہے۔ سماجی زندگی کا کوئی بھی خاکہ چاہے کتنا ہی مکمل کیوں نہ ہو، دوامی نہیں ہو سکتا۔ بہتر زندگی کے لیے اسے بدلتے رہنا ناگزیر ہے۔ اس نئے انقلاب کا سہرا گورباچوف کے سر بندھا۔

اس انقلاب نے دوسرے شعبہ ہائے زندگی کو بھی متاثر کیا۔ ادب کیسے مستثنیٰ رہ سکتا تھا۔ ہندستان میں ترقی پسندوں کو بھی اپنے موقف کی وضاحت کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ ۱۹۹۰ کے شروع میں ترقی پسند مصنفین نے لکھنؤ میں کانفرنس بلائی جس میں اشتراکی دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کے پس منظر میں ترقی پسند تحریک کا جائزہ لیا گیا۔ اس کانفرنس میں بعض مقررین کا رویہ معذرت خواہانہ تھا تو بعض نے اس تحریک کے تئیں تشویش و تشکیک کا اظہار کیا تھا۔ بڑی عالمانہ تقریریں ہوئیں، بہت سے نئے مباحث اٹھائے گئے۔ اس موقع پر روسی ادیب خاتون مس لدمیلا وسیلوا نے ایک بڑی اچھی بات کہی۔ ان کا کہنا تھا :

"گورباچوف کے اندازِ فکر نے روحانی قدروں کو زندہ کر دیا ہے۔ اب ہماری سوچ کا محور فرد کی ذات ہوتی جا رہی ہے۔ اس سوچ کا اثر براہ راست سیاست پر بھی پڑ رہا ہے۔ ہمارا دور نظرثانی کا دور ہے۔ آنے والے دور کی دھمک محسوس کرنے والا ہی سچا ترقی پسند ادیب ہے۔"

اس اقتباس سے کئی اہم باتیں اخذ کی جا سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ فرد کی ذات بھی ترقی پسند فکر کا محور بن سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ سچا ادیب وہ ہے جو مستقبل کی دھمک کو محسوس کر سکے اور تیسرے یہ کہ موجودہ تبدیلیوں کے پیش نظر ماضی پر نظرثانی کی ضرورت ہے۔ کڑوی سے کڑوی سچائی کی نگاہوں میں نگاہ ڈال کر بات کہنا اور انھیں دل سے قبول کرنا ایک صحت مند معاشرے کی علامت ہے۔ بدقسمتی سے یہ رویہ ہندستانی مزاج کا حصہ نہیں بن سکا۔

ہم لکھ چکے ہیں تبدیلی قانونِ فطرت ہے۔ تحریکیں جب پرانے ہونے لگتی ہیں تو وہ جمود کا شکار ہو جاتی ہیں۔ انقلاب کا نعرہ لگانے والے خود ہی ESTABLISHMENT کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یہ تحریک حصول اقتدار و حصول دولت کا ذریعہ بن جاتی ہے تب اس میں عوام کی رہنمائی کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ مذہبوں کی طرح کہ وقت گزرنے کے ساتھ جب مذہب کاروبار بن جاتا ہے، لوگ اسے سیاسی اغراض کے لیے استعمال کرنے لگتے ہیں جیسا کہ آج بہت سے ممالک میں ہو رہا ہے تو اس کے ابتدائی دور کی مشنری اور انقلابی اسپرٹ ختم ہو جاتی ہے۔ ہندستان میں ترقی پسند تحریک کا حشر بھی کچھ ایسا ہی ہوا اگرچہ اس تحریک پر بہت عرصہ نہیں گزرا تھا۔

سابق سوویت روس میں ہونے والی اتھل پتھل ترقی پسند تحریک کے لیے فالِ

تک ہے۔ روسی تجربہ ناکام ہوا ہے۔ اشتراکیت زندہ ہے۔ گرباچوف نئے اشتراکی نظام اور نئی ترقی پسندی کا مسیحا ہے۔ اس نے اشتراکی سماج کو گھٹن سے نکالا اور اسے نئی زندگی دی۔ اس کی اصلاحات ادب کے لیے بھی نعمت ثابت ہوں گی۔ اس نے اشتراکیت کی روح کو زندہ کیا۔ ترقی پسندی ایک آئیڈیالوجی سے زیادہ طرز فکر اور ذہنی رویّہ کا نام ہے — گرباچوف نے ترقی پسندی کو ازم سے آزاد کر کے عقلیت پسندی اور معروضیت کی راہ پر ڈالا آزادیٔ فکر عطا کی۔ جبری تنگ نظری سے انسانی ذہن کو آزاد کیا۔ انسانیت پر گرباچوف کا یہ بڑا احسان ہے۔ آنے والی نسلیں اسے اس انقلاب کے لیے اچھے لفظوں میں یاد رکھیں گی۔ اس نے نئی ترقی پسندی کی بنیاد رکھی۔ دیکھیے وہ کس طرح اشتراکیت کو نئے معنی سے روشناس کراتا ہے۔ اسی کے الفاظ میں:-

"ہمیشہ کی طرح میں آج بھی پکّا کمیونسٹ ہوں۔ مارکس، اینجلز اور لینن نے سماجی فکر کی تاریخ اور نئی تہذیب کے فروغ میں جو غیر معمولی اور منفرد خدمت انجام دی ہے اس سے انکار کرنا فضول ہے۔ انھوں نے انسانی ترقی کے لیے سوشلزم کے تصوّر کو ایک حقیقی طاقت کا روپ دیا۔ اس تصوّر کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اگر کہیں اسے مسخ کیا گیا ہے تو اس کی ذمہ داری اس پر نہیں آتی .... میرے نزدیک کمیونسٹ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ کسی طرح کی جدت سے خوف زدہ نہ ہونا، کسی بھی کثرتیت سے انکار کرنا، آزادانہ طور سے سوچنا، دوسرے کے عمل، خیالات اور منصوبوں کو اخلاق کی کسوٹی پر پرکھنا، اور عملی سیاست کے ذریعہ محنت کش عوام کی مدد کرنا تاکہ وہ اپنے خوابوں کی تعبیر پاسکیں اور اپنی استطاعت کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔" (گرباچوف کی ایک تقریر سے بحوالہ ذہن جدید۔ ستمبر۔ نومبر ۱۹۹۱ء)

اپنی اسی تقریر میں وہ مزید کہتے ہیں:-

"مجھے جھوٹ سے نفرت ہے، میں یک طرفہ فیصلوں کا مخالف ہوں اور ان کی مزاحمت کرتا ہوں جو واقعات کے بارے میں مکمل جانکاری کے دعویدار رہتے ہیں اسٹالن کے طرز کے سوشلزم کو حقیقی سوشلسٹ تھیوری سے خلط ملط نہ کرنا چاہیے۔ جب ہم اسٹالن طرز کے نظام کو مسترد کرتے ہیں تو ہم سوشلزم سے انحراف کے مرتکب نہیں ہوتے۔ بلکہ اس کی جانب اپنی پیش رفت کو بنائے رکھنے کا عمل جاری رکھتے ہیں۔"

(ایضاً)

متذکرہ بیان میں نئی ترقی پسندی کے خدّوخال نمایاں ہیں۔ گرباچوف نے اسٹالزم کو مسترد کیا ہے، اشتراکیت کو نہیں۔ اس میں سوشلزم کی حقیقی قدروں کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے۔ اس اعلان سے تمام شک وشبہات اور خطروں کو بھی دور کر دیا ہے یہ اعلان ہندستانی ترقی پسندوں کے لیے دستور العمل کی حیثیت رکھتا ہے انھیں خود کو ان بندھے ٹکے رویّوں سے آزاد کرنا ہوگا جسے وہ نسخہ کیمیا کی طرح اپنے ذاتی مفاد کے لیے ہر جگہ استعمال کرتے رہے ہیں۔ اب ترقی پسندی کا نیا خاکہ از سر نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

دنیا کا سیاسی منظر نامہ بدل رہا ہے۔ ناٹو اور وارسا پیکٹ کے ملکوں نے حال میں فیصلہ کیا ہے کہ وہ روایتی جنگی ہتھیاروں کو ختم کر دیں گے۔ ان ملکوں میں سابق سوویت یونین بھی شامل ہے۔ امریکا و روس کے درمیان ایٹمی و نیوکلیائی تنصیبات کو بے اثر کرنے کے بھی معاہدے ہوئے ہیں۔ دیوار برلن کو مسمار کر دیا گیا ہے۔ سات بڑی مغربی طاقتوں کا ایک بلاک وجود میں آچکا ہے۔ یہ سب اس لیے کہ ترقی یافتہ ممالک اپنے علاقوں کو امن و آشتی کے خطے بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی سرزمین پر خون کا ایک قطرہ بھی نہ گرے۔ ان کی سرحدوں سے دور ہی لڑی جاتی رہیں۔ ان کا ایک شہری بھی دہشت گردی کا شکار نہ ہو۔

مگر ان ممالک کے پاس انصاف اور سچائی کے دُہرے پیمانے ہیں۔ ایک اپنے لیے دوسرا باقی دنیا کے لیے۔ اشتراکی ممالک کا بلاک منتشر ہو جانے کی وجہ سے انکل سام بے پناہ طاقت ور ہو گئے ہیں۔ اب ساری دنیا اس کے اشاروں پر ناچ رہی ہے۔ وہ ہزاروں میل دور بیٹھا کمزور و ترقی پذیر ملکوں کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچاتا رہتا ہے۔ اس کی سرزمین پر ٹنوں من اناج و پھل گل سڑ سکتے ہیں مگر انھیں صومالیہ وا یتھوپیا جیسے ملکوں کے بھوک سے مرتے عوام کے لیے نہیں بھیجا جائے گا۔ اگر بھیجا بھی جائے گا تو اس وقت جب ان ملکوں پر فوجی اور سیاسی غلبہ حاصل کرنا ہو بلکہ ان ملکوں میں افلاس و جہالت کو اسی مقصد کے لیے برقرار رکھا جائے گا کہ ان پر سیاسی تسلط قائم رکھا جا سکے۔ ان کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کی جائے گی۔ مذہبی و لسانی جھگڑوں کو ہوا دی جائے گی۔ دہشت گردی و خوف کا ماحول پیدا کیا جائے گا۔ تعمیری کاموں سے ان کی توجہ ہٹا کر تخریب کاری میں لگائی جائے گی اور جب ظلم و بربریت سے انسانیت چیخ اٹھے گی تب خود ہی مسیحا بن کر ان کی راحت کے لیے میدان میں کود پڑے گا تاکہ دنیا کو باور کرایا جا سکے کہ اس سرزمین پر انسانیت کا درد رکھنے والا انکل سام سے بڑھ کر کوئی نہیں۔

لامحدود طاقت آدمی کو مکمل طور پر خراب کر دیتی ہے۔ وہ بے مہار ہو جاتا ہے۔ UNSCRAPOLOUS آج امریکا بھی بے مہار طاقت ور گھوڑے پر دوڑ رہا ہے۔

انیسویں صدی میں میکاولی نے یورپ کو جہاں آرائی و جہاں بانی کا ایک سیاسی فلسفہ دیا تھا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے مقولے پر اس فلسفہ کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اب یہ فلسفہ میکاولزم کے نام سے ایک کلٹ بن چکا ہے۔ امریکا و یورپ کی سرزمین اس نظریہ کی تجربہ گاہ ہے۔ ان ملکوں میں آج میکاولزم اپنے عروج پر ہے۔ اقتدار و دولت حاصل کرنے کے لیے سب کچھ جائز ہے۔ ذریعہ اہم نہیں رہ گیا۔ کامیابی اصل چیز ہے۔ گاندھیائی نظریہ جس میں ذریعہ و مقصد دونوں کی صداقت پر زور دیا گیا تھا، مذاق کا موضوع بن کر رہ گیا ہے۔

جدید انفارمیشن ٹکنالوجی نے میکاولزم کی جڑوں کو اور بھی مبسوط کیا ہے۔ اس کے ذریعہ مقصد کی برآری آسان ہو گئی ہے جدید اور طاقت ور ذرائع ابلاغ کے

ذریعہ نئے نئے مفروضوں کو سچائی کا روپ دیا جانا ممکن ہو سکا۔ شیطان کو فرشتہ اور فرشتہ کو شیطان کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ سچائیوں کو اس بے طرح مسخ کیا جاتا ہے کہ سچائی بھی شرمانے لگے۔ پہلے برائیوں کو پروان چڑھایا جاتا ہے۔ فرضی ہیرو بنا کر کھڑے کیے جاتے ہیں پھر سچائی کے خود ساختہ امین بن کر ڈان کوئکزوٹ کی طرح ہاتھ میں ننگی تلوار لے کر انھیں تباہ کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ اب نظریات ونصب العین اہم نہیں رہ گئے، اہمیت اس بات کی ہے کہ دنیا کے سامنے آپ کی تصویر کیا ہے۔ ذرائع ابلاغ کے ذریعہ جس طرح چاہیں تصویر بنا کر پیش کر سکتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کا رول اس درجہ بڑھ چکا ہے کہ آپ کی ذات کے انتہائی داخلی عمل یعنی سوچ پر بھی آپ کا قابو نہیں رہ گیا۔ آپ کی افکار کی دنیا میں اس طرح دبے قدموں داخل ہو جاتا ہے کہ آپ کو محسوس بھی نہیں ہوتا، آزادیٔ فکر ایک فریب بن کر رہ گئی ہے۔

انکل سام سے تو آپ واقف ہیں۔ مغربی دنیا کا سرغنہ بنا ہوا ہے وہ لطیف ترین شے کو اپنے کثیف ترین منصوبوں کی برتری کے لیے استعمال کرنے میں ماہر ہے تیسری دنیا میں مذہب معاشرتی زندگی کا ایک غالب عنصر ہے۔ چچا جان ان ملکوں میں مذہب کو منافرت پھیلانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ بھائیوں کو آپس میں لڑاتا ہے۔ اب اس نے دنیا کی لطیف ترین شے حسن کا بھی استحصال کرنا شروع کر دیا ہے۔ حسن کا عالمی مقابلہ منعقد کیا جاتا ہے دنیا کی حسینائیں اس کی سرزمین پر جمع ہوتی ہیں۔ بڈھے وادھیڑ ماہرینِ حسن اپنی عدالت آراستہ کرتے ہیں جہاں نیم عریاں جسموں کی نمائش ہوتی ہے۔ حسن کا یہ مقابلہ ایک تفریحی مشغلہ تھا مگر اس سال انکل سام نے اس تفریحی مشغلے کو با مقصد حسن Beauty with purpose کا نام دیا اور اس مقابلے میں شرکت کرنے والی حسیناؤں کو بھوک سے مرتے صومالیوں کی سرزمین پر بھیجا جہاں وہ بھوک سے لاغر بچوں کو تیلی وبرتن پر اپنا دودھ پلاتی ہوئی دکھائی گئیں۔ تمام دنیا میں ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اس کار خیر کی تشہیر کی گئی تاکہ انکل سام مثل مسیحا بن کر سامنے آئے اور واقعی اس کی واہ وا ہو گئی۔

جنوبی افریقہ کو آزادی نہیں ملے گی اور نہ انصاف ملے گا تاکہ سفید فام لوگ وہاں کے آبائی باشندوں کی دولت پر داد عیش دے سکیں۔ اس لیے کہ جنوبی افریقہ کی زمین سونے اور ہیروں کی کانوں سے پٹی پڑی ہے۔ فلسطینیوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم رکھا جائے گا۔ بلقان ریاستوں میں ظلم وبربریت کے ننگے ناچ کو نہیں روکا جائے گا۔ کسی ملک کو طاقت ور نہیں بننے دیا جائے گا کہ کہیں حریف بن کر نہ کھڑا ہو جائے۔ افغانوں کو ہتھیار مہیا کیے جاتے رہیں گے تاکہ وہ اپنے ہی بھائیوں کا خون بہاتے رہیں۔

ہندستان بھی انکل سام کے نقش قدم پر گامزن ہے۔ یہاں میکاولزم کے ساتھ ساتھ فاشسزم بھی اپنے قدم جما رہا ہے۔ جمہوریت وسیکولرازم کے نام پر نانا شاہی کا بول بالا ہے۔ برہمینت اپنی سیاسی بالادستی قائم کرنے کے لیے ہر قسم کے ہتھکنڈے

استعمال کر رہی ہے۔ سومنا تھ سے ایودھیا تک کی رتھ یاترا، بابری مسجد کا انہدام اور ا
واقعات کے جلو میں یک طرفہ ایک ہی فرقے کے لوگوں کا کھلا قتل عام، ہندستان مد
فاشسزم کے بڑھتے قدم کا پتا دیتا ہے۔ یہ سب بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جد
جاری رکھنے کا جواز موجود ہے۔ بربریت کے عفریت کو اپنے حدود میں رکھنے کی آج بھی ۃ
ہے۔ جنگ جاری رہے گی۔

مگر شاید دہشت گردی اور تشدد کا یہ گراف آخری نقطے پر پہنچ کر نیچے کی
طرف گرے گا۔ ہم پھر نئی ترقی پسندی کے مسیحا گرباچوف کی طرف رجوع کر۔
ہیں جنھوں نے ان بنیادی قدروں کی بازیافت پر زور دیا جو کسی بھی معاشرے کی تر
کی بنیاد ہیں اور جنھیں اپنا کر مغربی ملکوں نے ترقی کی اور طاقت کے بے مہار گھوڑ۔
لگام دے سکتے ہیں۔

گو فلاحی ریاست کا تصور اشتراکیت نے پیش کیا ہے مگر اس کے بعض اصولوں کو
ممالک بھی اپنانے پر مجبور ہوئے۔ کچھ مجبوراً، کچھ مصلحت کی خاطر۔

یورپ کی ذہنی آزادی اور مادی خوشحالی کی بنیاد تو وہاں کا صنعتی انقلاب تھا۔ اس
انقلاب کی ایک فکری اساس بھی تھی۔ مذہب کو سیاست سے الگ کیا گیا اور انسانی
صدیوں کی کلیسا کی غلامی سے آزاد ہوا۔

کلیسائی نظام کے بنیادی تصورات پر سوالیہ نشان لگائے گئے۔ یہ سوال کیا گ
کہ کیا مرنے کے بعد بھی زندگی ہے۔ لوگوں میں یہ عقیدہ راسخ ہوا کہ یہی زندگی سب
ہے۔ مرنے کے بعد کی جس دنیا کا پیکر تراشا جاتا ہے وہ محض خیالی ہے۔ اس کا کوئی
نہیں۔ اس سے انسان میں اور اس کے باسیوں کی زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے
عزم و حوصلہ پیدا ہوا۔

انسان اور اس کی عقل کو کائنات کا محور قرار دیا گیا۔ انسانی عظمت کو اوّلیت
دی گئی۔ قرآن کے لفظوں میں اسے عملاً اشرف المخلوقات کا درجہ دیا گیا۔ ان نظریا
کی وجہ سے انسان توہم پرستی اور اندھی تقلید کے اندھیروں سے باہر نکلا۔ عقلیت پس
کو فروغ حاصل ہوا۔ انسان میں خود پر اعتماد بڑھا۔ وہ نئی توانائی کے ساتھ خوشی و خوشحا
کی منزلوں کی طرف گامزن ہوا۔

جن دو نظریوں نے تہذیب کے کارواں کو سب سے زیادہ آگے بڑھایا، وہ تھ
آزادیٔ فکر اور انفرادیت۔ گرباچوف نے ان نظریوں کی پرزور تائید کی ہے۔ مضمو
کی ابتدا میں ان کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان نظریات کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ دوسروں کے معامل
میں عدم مداخلت کا رجحان پیدا ہوا، اختلاف رائے کو تسلیم کیا گیا اور دوسروں کے خیا
کو بھی احترام سے دیکھا جانے لگا۔ اس سے معاشرے میں رواداری اور ہم آہنگی کی
فضا پیدا ہوئی۔ یہی ساز گار فضا نے نئی ایجادوں کے لیے مہمیز کا کام کیا۔

انسانی فلاح و بہبود کا کوئی سا خاکہ بنا لیجیے۔ ان اصولوں کو اپنائے بغیر چارہ نہیں۔ نئی ترقی پسندی کے خدوخال کو ان ہی قدروں میں تلاش کیا جانا چاہیے۔ متبادل سیاسی طاقت کی اساس بھی یہی قدریں بن سکتی ہیں۔ ادب کی تیسری آواز بھی یہی ہے۔ یہاں جدیدیت اور ترقی پسندی ایک دوسرے سے ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔ ہم عصر ادبی تخلیقات میں تیسری آواز کا یہ آہنگ صاف سنا جا سکتا ہے۔ اس ادب کی جڑیں اپنی روایات میں گہری ہیں اور نظر مستقبل پر ہے۔ جبر و استبداد کے نئے عفریت سے لڑنے کا حوصلہ موجود ہے۔ ہندستان میں کسی بھی اچھے ادب کے فروغ کے لیے اس فکری اساس کو توانا بنانا ہوگا اور ہمیں انسانیت کی اسی نئی آواز کا نقیب بننا ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

کتاب	موضوع	مصنف	قیمت
انداز گفتگو کیا ہے۔	(تنقیدی مضامین)	شمس الرحمن فاروقی	۷۵/
اسرارِ خودی (فراموش شدہ اڈیشن)	(شعری مجموعہ)	مرتبہ : شائستہ خان	۷۵/
حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدن	(تاریخ)	مالک رام	۷۵/
جام جہاں نما۔ اردو صحافت کی ابتدا	(اردو صحافت)	گر بچن چندن	۷۵/
مسلمانوں کا تعلیمی نظام	(تاریخ)	ضیاء الحسن فاروقی	۴۵/
اردو ناول میں عورت کا تصور	(تحقیق)	فہمیدہ کبیر	۴۵/
نوٹوں کی تلاش	(ناول)	ایاز سیوہاروی	۶۰/
تاثر نہ کہ تنقید	(تنقید)	صدیق الرحمٰن قدوائی	۵۱/
اپنے دل کی حفاظت کیجیے	(ایلوپیتھی)	ترجمہ نذیر الدین مینائی	۲۵/
بہ صورت گر کچھ خوابوں کے	(انٹرویوز)	طاہر مسعود	۶۶/
مرضیات	(طب)	حکیم نعیم الدین زبیری	۵۱/
بانگ درا	(شعری مجموعہ، طلبہ ایڈیشن	اقبال	۹/
بالِ جبریل	(شعری مجموعہ) 〃	〃	۶/
ضربِ کلیم مع ارمغان حجاز (اُردو نظمیں)	(شعری مجموعہ) 〃	〃	۶/
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی	(ناول)	کشمیری لال ذاکر	۴۸/
گوشے میں قفس کے	(طنزیہ مزاحیہ)	دلیپ سنگھ	۴۵/
سحر کے پہلے اور بعد	(جگ بیتی)	سعید الظفر چغتائی	۵۱/
افکارِ اقبال	(اقبالیات)	محمد عبد السلام خاں	۱۲۵/
فرمان فتح پوری	(شخصیت اور ادبی خدمات)	مرتبہ خلیق انجم	۲۵/
تذکرہ ماہ و سال	(تذکرہ)	مالک رام	۱۲۵/
تحقیق نامہ	(تحقیق)	مشفق خواجہ	۱۲۵/
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان	(مذہب)	حکیم محمود احمد برکاتی	۴۵/
خواب اور خلش	(شعری مجموعہ)	آل احمد سرور	۶۶/
سفر	(ناول)	رابعہ تبسم	۲۷/
تحریریں	(تنقید)	ڈاکٹر اسلم پرویز	۵۱/
پہچان اور پرکھ	(تنقید)	پروفیسر آل احمد سرور	۵۱/
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	(تحقیق)	ڈاکٹر سلامت اللہ	۵۱/
پت جھڑ کی آواز (نیا اڈیشن)	(افسانے)	قرۃ العین حیدر	۷۵/
اقبال کا نظریہ خودی	(تحقیق)	عبد المغنی	۱۵۰/
سمندری خزانہ	(ناول)	ماریہ رحمان	۲۷/
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	(تنقید)	وارث علوی	۳۶/
فی الحقیقت	(طنز و مزاح)	یوسف ناظم	۴۵/
مٹی سے ہیرا	(ناولٹ)	سید مقبول احمد	۱۰/
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	(ناولٹ)	صغرا مہدی	۲۴/
الجھاوے	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف	۵۱/
غبارِ منزل	(شعری مجموعہ)	غلام ربانی تاباں	۴۵/

زہدی

میر تقی میر کی یاد میں

کوئی بتاؤ کہ ویرانہ تک نہیں اب تو
بھلا ہم ایسے شکستہ دلاں کہاں جائیں؟

چہار سمت ہیں پھیلی ہوئی سی دیواریں
نکل کے کیسے، کہاں اپنے کارواں جائیں،

ملے گا کوئی نہ کوئی سراغ لوگوں کو
ڈرے ڈرے کب تک نہاں نہاں جائیں،

نہ ہم کو فکر زمیں ہے نہ آسماں لیکن
ہم ایسے خاک نشیناں کہو کہاں جائیں؟

سمجھ لو بند ہیں رستے سفر نہیں ممکن
کہاں فرار کریں کیسے بے کساں جائیں،

تباہ شہر ہوا کوئی سوگوار نہیں
نذر نیاز ہے کیا کس کے آستاں جائیں،

یہی نہ ہوگا کہ مقتل پہنچ کے دم لیں گے
اٹھیں چلیں کہ زمانے کے درمیاں جائیں،

سنو کہ اپنا ٹھکانہ نہیں رہا کوئی
کفن پہن کے سرِ راہ سرکشاں جائیں؟

کوئی ستارہ بلاتا ہے شام سے باقر
بعد سرور اٹھیں راہِ رفتگاں جائیں؟

بچوں کے لیے مذہبی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
حضرت آدم علیہ السلام۔	منورہ نوری خلیق	-/۴
رسالہ دینیات اول	محمد نعیم الدین زبیری	/۳
رسالہ دینیات دوم	"	/۴
رسالہ دینیات سوم	"	/۵
رسالہ دینیات چہارم	"	/۵
رسالہ دینیات پنجم	"	/۶
بزرگانِ دین	محمود علی خاں جامعی	/۴
امت کی مائیں	حسین حسنی	۴/۵۰
اچھی باتیں	سعد الدین انصاری	۴/۵۰
خوب سیرت اول	حکیم محمد سعید	/۶
خوب سیرت دوم	"	۴/۵۰
سلطان جیؒ	اسلم فرخی	/۴
رسول اللہؐ کی صاحبزادیاں	فضل قدیر ندوی	۴/۵۰
رحمان کا مہمان	رفیع الزماں زبیری	/۶
کمسن صحابی	"	/۵
اسلام کے جاں نثار	"	/۴
سیرت پاک مختصر مختصر	احمد خاں خلیل	/۳
نور کے پھول	حکیم محمد سعید	/۹
سب سے بڑے انسان۔ رسول اللہؐ	"	۴/۵۰
حضرت حمزہ رضؓ	احتشام علی رحیم آبادی	/۲
حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ	"	/۲
حضرت ابوہریرہؓ	"	/۴
حضرت محبوب الٰہی رحؒ	مشیر الحق	/۳
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ	"	/۲
حضرت فرید الدین گنج شکر رحؒ	"	/۳
حضرت معین الدین چشتی رحؒ	"	/۳
حضرت ابوبکر صدیق رضؓ	"	/۶
حضرت طلحہ رضؓ	"	/۲
حضرت سلمان فارسی رضؓ	"	۲/۵۰
حضرت ابوذر غفاریؓ	"	/۲
حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ	"	/۲
حضرت عبداللہ بن عباسؓ	مشیر الحق	/۳
نیک بیٹیاں	"	۲/۵۰
اسلام کیسے پھیلا؟ حصہ اول	عبدالواحد سندھی	۷/۵۰
" حصہ دوم	"	/۶
قرآن پاک کیا ہے؟	"	/۴
اسلام کیسے شروع ہوا؟	"	۷/۵۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار اول، دوم	" فی حصہ	/۶
اسلام کے مشہور امیر البحر	"	/۹
رسول پاکؐ	"	/۶
دس جنتی	الیاس احمد مجیبی	۵/۵۰
سرکار کا دربار	"	۶/۵۰
چار یار	"	۷/۵۰
آں حضرتؐ (اردو)	"	۲/۵۰
حضرت محمدؐ (ہندی)	"	-/۴۰
اللہ کا گھر	خلیل احمد جامعی	۴/۵۰
اللہ کے خلیل	"	۲/۵۰
رسول پاک کے اخلاق	"	/۴
اللہ کے صفی	"	۲/۵۰
ہمارا دین حصہ اول	سید شہاب الدین دسنوی	۸/۵۰
" دوم	"	۷/۵۰
" سوم	"	۸/۵۰
منہاج القرآن	خواجہ سیدنا طاہر سیف الدین	۴/۵۰
ارکان اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۲/۵۰
عقائد اسلام	"	۲/۵۰
خلفائے اربعہ	خواجہ عبدالحئی فاروقی	/۹
نبیوں کے قصے	"	۶/۵۰
ہمارے رسولؐ	"	/۶
پیارے رسولؐ	سلطانہ آصف فیضی	۴/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاءؒ	ادارہ	/۲
مسلمان بیبیاں	اعجاز الحق قدوسی	/۶
ہمارے نبیؐ	سید نواب علی رضوی	۲/۵۰
سرکار دو عالمؐ	محمد حسین حسان	/۹
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد)	(کلاں)	۴/۵۰

ڈاکٹر سیفی پریمی
نگارستان، ذاکر نگر
نئی دہلی ۲۵

یہاں بھی شمس و قمر ہیں نہ مہر و ماہ وہاں
وہی ہے رات، وہی اجنبی زمین و زماں

یہاں وہاں ہے نئی نسل موردِ الزام
ٹپک رہا ہے مگر کرسیوں سے کارِ زیاں

کیا ہے دھرم کو بدنام زر پرستوں نے
ہمارے خون میں پلتا ہے مذہبِ انساں

وہ جن کے لب پہ فسانہ ہے نسل بالا کا
اُنھیں کی جیب سے اٹھتا ہے خون کا طوفاں

جہانِ جبر کو دانش وروں نے بدلا ہے
یہی ہے وقت کی تاریخ کا اٹل فرماں

یقین ہے کہ بساطِ ستم اُلٹ دے گا
کسی قلم کا تقاضا کسی کا زورِ بیاں

"کوئی بھی امن کو برباد کر نہیں سکتا"
اِسی شعور کو چمکائیں دلبرانِ جہاں

مجھے ہے فخر کہ انسان دوست ہوں سیفی
اُفق پہ تازہ کرن کی جبیں ہے صاف عیاں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی اہم کتابیں

پہچان اور پرکھ — پروفیسر آل احمد سرور

اس مجموعے میں پروفیسر آل احمد سرور کے جو مضامین شامل ہیں ان کا تعلق زیادہ تر شاعروں اور شاعری کی خصوصیات سے ہے میرؔ، غالبؔ، انیسؔ، حسرتؔ، فانیؔ، جوشؔ اور فراقؔ کی شخصیات اور شاعری پر بھرپور مضامین کا اہم مجموعہ۔ قیمت ۵۱/-

ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم
ڈاکٹر سلامت اللہ

اس کتاب میں مسلمانوں کی تعلیم کے جن مسائل کی نشان دہی کی گئی ہے وہ مصنف کے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اس لیے کہ اس کے تاریخی اور حالیہ شواہد موجود ہیں ماہر تعلیم ڈاکٹر سلامت اللہ کی اہم ترین تصنیف۔
قیمت ۵۱/-

اقبال کا نظریۂ خودی — عبدالمغنی

اس کتاب میں نظریۂ خودی کو مرکزی نقطہ فرض کر کے اقبال کے پورے نظام فکر کی تلاش کی گئی ہے تاکہ ایک طرف دنیا کی سب سے بڑی شاعری کی حقیقی جہت واضح ہو اور دوسری طرف آج کی انسانیت کو اپنے ارتقا کی صحیح سمت دریافت کرنے میں سہولت ہو۔ قیمت ۱۵۰/-

پت جھڑ کی آواز — قرۃ العین حیدر

برصغیر کی ممتاز ترین افسانہ نگار قرۃ العین حیدر کی اہم کہانیوں کا مجموعہ۔ یہ کہانیاں دلچسپ بھی ہیں اور زندگی کی صحیح عکاسی بھی کرتی ہیں۔ نیا اڈیشن قیمت ۷۵/-

جدید افسانہ اور اس کے مسائل — وارث علوی

اردو کے ممتاز نقاد وارث علوی کے تنقیدی مضامین کا تازہ ترین مجموعہ جدید اردو افسانہ کے متعلق ایک اہم دستاویز۔ قیمت ۳۶/-

لکھنؤ تہذیب کا نمائندہ شاعر

قلندر بخش جرأت (خطبہ) — جمیل جالبی

اردو کے نامور عالم اور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک نہایت اہم خطبہ جو موصوف نے ۸/نومبر ۱۹۸۹ء کو ڈاکٹر سید عابد حسین میموریل ٹرسٹ کے سمینار میں پیش کیا۔
قیمت ۱۰/-

غبار منزل (شعری مجموعہ) — غلام ربانی تاباں

اردو کے ممتاز شاعر جناب غلام ربانی تاباں کی غزلوں، نظموں اور قطعات کا تازہ مجموعہ جس میں "ساز لرزاں"، "ذوق سفر" اور "نوائے آوارہ" کا انتخاب بھی شامل ہے۔ قیمت ۴۵/-

تاریخ اودھ — قاسم علی نیشاپوری

"تاریخ اودھ" معروف بہ "تاریخ شاہیہ نیشاپوریہ" اودھ کی اہم تاریخ ہے۔ قاسم علی نیشاپوری نے اسے فارسی میں لکھا تھا ڈاکٹر شاہ عبدالسلام نے نہایت محنت سے اس کو اردو کا جامہ پہنایا۔ قیمت ۲۷/-

فی الحقیقت — یوسف ناظم

طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں یوسف ناظم کو اہم مقام حاصل ہے۔ ان کی تحریریں نہایت ذوق و شوق اور توجہ سے پڑھی جاتی ہیں۔ "فی الحقیقت" آپ کے تازہ ترین طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔
قیمت ۴۵/-

پروفیسر گوپی چند نارنگ

گذشتہ سے پیوستہ

مشرقی شعریات اور ساختیاتی فکر

مسئلہ قصر اور مبحث ظاہریہ

زبان اگر اصلاً مجاز ہے اور لفظ موضوع لہٗ سے ہٹ کر بھی معنی دے سکتا ہے اور معنی سے بھی معنی پیدا ہو سکتے ہیں کیوں کہ زبان میں حقیقت کچھ نہیں اور سب مجاز ہی مجاز ہے اس لیے کہ لفظوں کے معنی فرض کر لیے گئے ہیں، اور معنی چوں کہ تناقض اور تفریقیت پر مبنی ہیں، ان کو بے دخل بھی کیا جا سکتا ہے تو پھر مقدس متن کے معنی کیوں کر قائم کیے جا سکتے ہیں یا ان معنی کا 'قصر' کس طور پر ہوگا۔ مشرقی روایت میں یہ بحث بہت پرانی ہے کہ کلامِ ربانی سے فقط ظاہری معنی مراد لیے جا سکتے ہیں یا باطنی معنی یعنی رمزیہ معنی یا استعاراتی معنی کا اخذ بھی جائز ہے۔ اس بارے میں متکلمین اور منطقین میں جو اختلافات رہے ہیں وہ تاریخ کا حصہ ہیں، ان کی تفصیل سے قطع نظر کرتے ہوئے اتنا معلوم ہے کہ خیال کو بالذات جوہر ماننے کی روایت مشرقی فکر کا خاص حصہ ہے۔ بقول ابنِ رشد :

> "محرکِ اوّل یا خدا اور کرات عقول افلاک کی کنہ خیال ہی ہے۔ ذاتِ احدی کی ثبوتی تعریف صرف یہی ہو سکتی ہے 'ایک خیال جو آپ ہی اپنا موضوع ہے'۔ یہی خیال وحدت ہے اور یہی وجود بھی ہے۔ بالفاظِ دیگر وجود اور وحدت کنہ ذات سے جدا نہیں ہیں بلکہ مثل تمام کلیات کے ان کا وجود صرف خیال میں ہے۔"
>
> (عابد حسین ص ۱۴۲)

لیکن اخوان الصفا کے یہاں جو فلسفۂ طبیعی کی بنا پر تمام اقوام کی حکمت مجتمع کرنا چاہتے تھے اور جن میں انتخابی غناسطیت کا رنگ ہے، اس سے معارض

موقف بھی ملتا ہے :

" نفس کی علمی زندگی کے لیے سب سے اہم نطق ہے ۔ کوئی مطلب جس کا اظہار کسی زبان کے کسی لفظ سے نہ ہو سکے وہ سرے سے موضوعِ خیال نہیں ہو سکتا ۔ لفظ خیال کا جسم ہے اور بے اس کے خیال کا وجود ناممکن ہے ۔" (ایضاً ص ۵)

اخوان الصفا خیال کو بے لفظ نہیں مانتے ، یہ وہی بات ہے کہ لفظ خیال کا رابطہ یا ذریعہ نہیں ، خیال کی شرط ہے ، یعنی بغیر لفظ خیال قائم ہی نہیں ہو سکتا ۔ اس میں خرابی یہ ہے کہ لفظ کا قائم برتنا قض ہونا معلوم ہے ۔ ایسا تسلیم کر لیا جائے تو معنی کا عدم استحکام لازم آتا ہے ۔ فارابی جسے مشرق کے معلمِ ثانی یا ارسطوئے ثانی کا درجہ حاصل ہے واضح لفظوں میں خبردار کرتا ہے کہ ہستی مطلق کی منطقی تعریف ممکن ہی نہیں :

" اس ذات کے وجود پر دلیل نہیں لائی جا سکتی کیوں کہ وہ خود تمام اشیاء کی دلیل اور علت ہے اور وجود اور حقیقت اس کے اندر ایک ہو جاتے ہیں ۔ اس کے تصور ہی میں یہ داخل ہے کہ وہ واحد ہے کیوں کہ اگر دو اولی اور مطلق ذاتیں ہوتیں تو وہ کسی حد تک یکساں ، کسی حد تک مختلف ہوتیں ۔ دونوں میں کوئی بسیط نہ رہتی ۔ سب سے اکمل ذات کو واحد ہونا چاہیے ۔

اس اول ، واحد ، حقیقی وجود کو ہم خدا کہتے ہیں اور چوں کہ اس کی ذات میں وہ سب چیزیں اس طرح ایک ہو گئی ہیں کہ اُن میں جنس تک کا فرق باقی نہیں ہے اس لیے اس کی کوئی تعریف نہیں ہو سکتی تاہم انسان اس کی طرف ان ناموں کو منسوب کرتا ہے جو زندگی کے سب سے بہتر اور برتر اقدار کو ظاہر کرتے ہیں کیوں کہ اس پُر اسرار نسبت میں لفظوں کے معمولی معنی باقی نہیں رہتے اور وہ تضاد و تناقض سے بالا ہو جاتی ہیں ۔ بعض اسماء عین ذات کی طرف منسوب ہیں اور بعض ذات کا علاقہ کائنات سے ظاہر کرتے ہیں مگر ان سے وحدتِ ذات میں خلل نہیں پڑتا ۔ ان سب کو محض استعارات یا ناتمام قیاسات سمجھنا چاہیے ۔ اصل

میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم جو تصور خدا کی اکمل ذات کا رکھتے
ہیں وہ خود بھی مکمل ہوتا جیسے ریاضی کے تصورات طبیعی تصورات
کے مقابلے میں اسی سبب سے زیادہ مکمل ہیں کہ ان کا موضوع
زیادہ مکمل ہے لیکن بات یہ ہے کہ ذاتِ اکمل کے معاملے میں
ہماری وہی حالت ہے جو روشن ترین نور کے معاملے میں ہوتی
ہے۔ ہم میں اس کے دیکھنے کی تاب نہیں ہے غرض ہمارے
جسمِ مادی کے نقائص کا اثر ہمارے عرفان پر بھی پڑتا ہے۔"

(ایضاً ص ۸۹)

عزالی کے بارے میں معلوم ہے کہ وہی بات جس کو متکلمین معقولات سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے، عزالی اس کی بنیاد باطنی واردات پر رکھتا ہے۔ سوادِ اعظم کے نقطۂ نظر سے عزالی منطقیین سے جنگ کرنا چاہتا ہے، لیکن خود ارسطو کے ہتھیار یعنی منطق سے کیوں کہ منطق کے اصول بھی اس کے نزدیک اسی قدر مستحکم ہیں جتنے ریاضی کے مسائل۔" عزالی بالمقصد تناقض کے کلیے سے ابتدا کرتا ہے جو اس کے نزدیک ہر چیز میں نافذ ہے یہاں تک کہ خدا کی ذات اور صفات میں بھی۔" (ایضاً ص ۱۱۸) یاد رہے کہ مسئلۂ تناقض مشرقی روایت میں بھی علمِ منطق کا وہ بیان ہے جس میں نقیض کی بنا پر قضایا کا حق اور باطل ہونا ثابت کیا جاتا ہے بطور ضد یا نفی یعنی دو قضایا میں اگر ایک کو سچا کہیں تو دوسرے کا جھوٹا ہونا لازم ہے۔ مشرقی منطق میں یہ روش قدیمی ہے۔ علم الکلام خدا کی وحدتِ صرف، وحدتِ مطلق، وحدتِ بحت، اور وحدتِ محض کے متعلق یہ کہتا ہے کہ یہ ایسی کیفیت ہے جو صرف منفی طریقے پر سمجھائی جا سکتی ہے۔ مثلاً یہ کہ خدا کی وحدت، وحدت در کثرت بھی نہیں یا وحدتِ تناسب بھی نہیں یا وحدتِ عددی بھی نہیں۔ پھر یہ وحدتِ عددی خارجاً متشکل بھی نہیں ہوتی، ماسوا اس کے کہ جن انبیا و اولیا کو کچھ جلوہ نظر آیا اُنھیں نور کا کرشمہ ضرور نظر آیا۔ کیا تصورِ ذات یا مسئلہ تناقض یا جوہر کے تضاد و تناقض سے بالاتر ہونے یا حقیقت مطلقہ کے فقط منفی طور پر سمجھائے جا سکنے کا مسئلہ وہی نہیں

ہے جو دوسری روایتوں میں بھی مرکزی مسئلہ ہے جن کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں ۔ بے شک ہر روایت میں اس کا تناظر اور تعینات الگ الگ ہیں، لیکن کیا بنیادی مسئلہ ایک سا نہیں ہے، یعنی معنی کے استحکام اور عدم استحکام کا، یا یہ کہ معنی کو خاص معنی میں کس طرح قائم کیا جائے ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ کا ایک حل علم معانی کے پاس تھا۔ نظریۂ قصر کی صورت میں، لیکن علمائے دین جب علم منطق اور علم النحو ہی کو رد کر رہے تھے تو وہ علم البلاغۃ یا علم المعنی سے مدد لینا کیوں گوارا کرتے ۔ ورنہ تصورِ قصر سے مراد ہی معنی کو روکنا یا معنی کو مخصوص کرنا ہے ۔ ملاحظہ ہو :

" قصر کے معنی روکنے کے ہیں چناں چہ اللہ فرماتا ہے حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ یعنی حوریں ہیں خیموں میں رکی ہوئیں اور اصطلاحِ علمِ معانی میں یہ ہے کہ ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ایک خاص طریق پر مخصوص کرنا اور اس کی دو قسمیں ہیں ایک حقیقی اور وہ یہ ہے کہ ایک شے کو دوسری شے کے ساتھ نفس الامر اور حقیقت میں مخصوص کر دینا اس طرح کہ پہلی شے دوسری شے سے غیر کی طرف کسی طرح متجاوز نہ ہو جیسے خاتم الانبیا محمدؐ ہی ہیں اس میں ختمِ نبوت کا قصر محمد صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی ذات پر ہو گیا اور یہ کام ان سے دوسرے کی طرف متجاوز نہیں ہو سکتا دوسرا غیر حقیقی جس کو اضافی بھی کہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ایک شے کی تخصیص دوسری شے کے ساتھ بہ نسبت کسی شے کے ہو اس طرح کہ اس تیسری شے تک وہ متجاوز نہ ہو سکے اگرچہ یہ ممکن ہو کہ اس کے سوا کسی اور چوتھی شے تک بعض امثلہ میں متجاوز ہو جائے پس قصرِ حقیقی میں ایک شے دوسری شے سے کبھی کسی کی طرف متجاوز نہیں ہو سکتی اور قصرِ غیر حقیقی میں بھی اگرچہ ایک شئے دوسری شئے سے تیسری شے کی طرف متجاوز نہیں ہو سکتی ہے مگر اس کے سوا کسی اور شے کی طرف متجاوز ہو سکتی ہے جیسے زید کھڑا ہے اس سے معلوم ہوا کہ کھڑا ہونا بیٹھنے کی طرف متجاوز نہیں ہو سکتا اور یہ نہیں ہے کہ کھڑا ہونا زید سے کسی اور کی طرف متجاوز نہ ہو سکے عمرو کا یا

خالد کا کھڑا ہونا جائز ہے کیوں کہ یہاں کھڑے ہونے کی تخصیص زید کے ساتھ بہ نسبت بیٹھنے کے ہوتی ہے کہ کھڑا ہونا بیٹھنے کی طرف نہیں پہنچ سکتا۔" (بحر الفصاحت ص ۵۰۵)

بہر حال گیارھویں صدی کے اُندلسی علما کے یہاں یہ نزاع 'ظاہریہ' اور 'باطنیہ' کی بحثوں میں زور شور سے رونما ہوئی جس میں ظاہریہ کا پلڑا بھاری رہا۔ انھوں نے شدومد سے باطنیہ کی پُراسرار اور تمثیلی تاویلوں کی مخالفت کی اور اصرار کیا کہ رسولِ مقبول پر وحیِ الٰہی کا نزول ایک بے نظیر و بے مثل تاریخی حقیقت ہے بخلاف انجیل یا کسی دوسرے صحیفۂ مذہبیہ کے، چناں چہ کلامِ الٰہی سے وہی معنی لیے جا سکتے ہیں جو از روئے دین اور از روئے تاریخ اور از روئے صورتِ حال مخصوص کر دیے گئے ہیں، اُس وقت کے لیے، آنے والے زمانوں کے لیے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے، اور ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ علمائے ظاہریہ میں نحوی بھی تھے اور ماہرینِ لسان و لغت بھی، لیکن یہ متنِ مقدسہ کی قراَتِ مخصوص سے ہٹ کر کسی بھی رمزیہ یا باطنی یا تمثیلی یا فلسفیانہ تاویل کے سخت خلاف تھے۔ علمائے ظاہریہ میں ابنِ حزم اور ان کے بعض معاصرین کا خصوصیت سے ذکر آتا ہے۔ ان کے نظریۂ متن اور نظریۂ قراَت سے مشہور ساختیاتی مفکر و نقاد ایڈورڈ سعید (دیکھو باب پس ساختیات) نے اپنی کتاب :

THE WORLD, THE TEXT, AND THE CRITIC (1983)

میں بحث کی ہے، اور ظاہریہ و باطنیہ کی ان بحثوں کو دورِ حاضر کی ساختیاتی اور لسانیاتی بحثوں کے مماثل قرار دیا ہے۔ اس مبحث پر ایڈورڈ سعید نے جس عمدگی سے محاکمہ کیا ہے، اس کا تقاضا ہے کہ اس کے بیان کا ترجمہ کرنے کے بجائے اس کے الفاظ کو جوں کا توں پیش کر دیا جائے۔ تفصیل کے لیے اصل کتاب سے رجوع کیا جا سکتا ہے :

...
DURING THE ELEVENTH CENTURY IN ANDALUSIA, THERE EXISTED A REMARKABLY SOPHISTICATED AND UNEXPECTEDLY PROPHETIC SCHOOL OF ISLAMIC PHILOSOPHIC GRAMMARIANS, WHOSE POLEMICS ANTICIPATE TWENTIETH-CENTURY DEBATES BETWEEN STRUCTURALISTS AND GENERATIVE GRAMMARIANS.

BETWEEN DESCRIPTIVISTS AND BEHAVIORISTS. NOR IS THIS ALL. ONE SMALL GROUP OF THESE ANDALUSIAN LINGUISTS DIRECTED ITS ENERGIES AGAINST TENDENCIES AMONGST RIVAL LINGUISTS TO TURN THE QUESTION OF MEANING IN LANGUAGE INTO ESOTERIC AND ALLEGORICAL EXERCISES. AMONG THE GROUP WERE THREE LINGUISTS AND THEORETICAL GRAMMARIANS, IBN HAZM, IBN JINNI, AND IBN MADA' AL-QURTOBI, ALL OF WHOM WORKED IN CORDOBA DURING THE ELEVENTH CENTURY, ALL BELONGING TO THE ZAHIRITE SCHOOL, ALL ANTAGONISTS OF THE BATINIST SCHOOL. BATINISTS HELD THAT MEANING IN LANGUAGE IS CONCEALED WITHIN THE WORDS; MEANING IS THEREFORE AVAILABLE ONLY AS THE RESULT OF AN INWARD-TENDING EXEGESIS. THE ZAHIRITES - THEIR NAME DERIVES FROM THE ARABIC WORD FOR CLEAR, APPARENT, AND PHENOMENAL; BATIN CONNOTES INTERNAL - ARGUED THAT WORDS HAD ONLY A SURFACE MEANING, ONE THAT WAS ANCHORED TO A PARTICULAR USAGE, CIRCUMSTANCE, HISTORICAL AND RELIGIOUS SITUATION.

THE TWO OPPONENTS TRACE THEIR ORIGINS BACK TO READINGS OF THE SACRED TEXT, THE KORAN, AND HOW THAT UNIQUE EVENT - FOR, UNLIKE THE BIBLE, THE KORAN IS AN EVENT IS TO BE READ, UNDERSTOOD, TRANSMITTED, AND TAUGHT BY LATER GENERATIONS OF BELIEVERS. THE CORDOVAN ZAHIRITES ATTACKED THE EXCESSES OF THE BATINISTS, ARGUING THAT THE VERY PROFESSION OF GRAMMAR (IN ARABIC NAHU) WAS AN INVITATION TO SPINNING OUT PRIVATE MEANINGS IN AN OTHERWISE DIVINELY PRONOUNCED AND HENCE UNCHANGEABLY STABLE, TEXT. ACCORDING TO IBN MADA' IT WAS ABSURD EVEN TO ASSOCIATE GRAMMAR WITH A LOGIC OF UNDERSTANDING, SINCE AS A SCIENCE GRAMMAR ASSUMED, AND OFTEN WENT SO FAR AS TO CREATE BY RETROSPECTION, IDEAS ABOUT THE USE AND MEANING OF WORDS THAT IMPLIED A HIDDEN LEVEL BENEATH WORDS, AVAILABLE ONLY TO INITIATES. ONCE YOU RESORT TO SUCH A LEVEL, ANYTHING BECOMES PERMISSIBLE BY WAY OF INTERPRETATION: THERE CAN BE NO STRICT MEANING, NO CONTROL OVER WHAT WORDS IN FACT SAY, NO RESPONSIBILITY TOWARD THE WORDS. THE ZAHIRITE EFFORT WAS TO RESTORE BY RATIONALIZATION A SYSTEM OF READING A TEXT IN WHICH ATTENTION WAS FOCUSSED ON THE PHENOMENAL WORDS THEMSELVES, IN WHAT MIGHT BE CONSIDERED THEIR ONCE-AND-FOR-ALL SENSE UTTERED FOR AND DURING A SPECIFIC OCCASION, NOT ON HIDDEN MEANINGS THEY MIGHT LATER BE SUPPOSED TO CONTAIN. THE CORDOVAN ZAHIRITES IN PARTICULAR WENT VERY FAR IN TRYING TO

PROVIDE A READING SYSTEM THAT PLACED THE TIGHTEST POSSIBLE CONTROL OVER THE READER AND HIS CIRCUM - STANCES. THEY DID THIS PRINCIPALLY BY MEANS OF A THEORY OF WHAT A TEXT IS.

IT IS NOT NECESSARY TO DESCRIBE THIS THEORY IN DETAIL. IT IS USEFUL, HOWEVER, TO INDICATE HOW THE CONTROVERSY ITSELF GREW OUT OF A SACRED TEXT WHOSE AUTHORITY DERIVED FROM ITS BEING THE UNCREATED WORD OF GOD, DIRECTLY AND UNILATERALLY TRANSMITTED TO A MESSENGER AT A PARTICULAR MOMENT IN TIME. IN CONTRAST, TEXTS WITHIN THE JUDEO-CHRISTIAN TRADITION, AT WHOSE CENTER IS REVELATION, CANNOT BE REDUCED TO A SPECIFIC MOMENT OF DIVINE INTERVENTION AS A RESULT OF WHICH THE WORD OF GOD ENTERED THE WORLD; RATHER THE WORD ENTERS HUMAN HISTORY CONTINUALLY, DURING AND AS A PART OF THAT HISTORY SO A VERY IMPORTANT PLACE IS GIVEN TO WHAT ROGER ARNALDEZ CALLS "HUMAN FACTORS" IN THE RECEPTION, TRANSMISSION, AND UNDERSTANDING OF SUCH A TEXT. SINCE THE KORAN IS THE RESULT OF A UNIQUE EVENT, THE LITERAL "DESCENT" INTO WORLDLINESS OF A TEXT, AS WELL AS ITS LANGUAGE AND FORM, ARE THEN TO BE VIEWED AS STABLE AND COMPLETE. MOREOVER, THE LANGUAGE OF THE TEXT IS ARABIC, WHICH THEREFORE BECOMES A PRIVILEGED LANGUAGE, AND ITS VESSEL IS THE PROPHET (OR MESSENGER), MOHAMMED, SIMILARLY PRIVILEGED. SUCH A TEXT CAN BE REGARDED AS HAVING AN ABSOLUTELY DEFINED ORIGIN AND CONSEQUENTLY CANNOT BE REFERRED BACK TO ANY PARTICULAR INTERPRETER OR INTERPRETATION, ALTHOUGH THIS IS CLEARLY WHAT THE BATINITES TRIED TO DO . . .

(Pp 36-37)

ایڈورڈ سعید نے حوالہ دیا ہے کہ اس کی معلومات ذیل کی کتابوں پر مبنی ہیں:

ROGER ARNALDEZ, GRAMMAIRE ET THEOLOGIES CHEZ IBN HAZM DE CORDOVE (PARIS J. VRIN, 1956).

ANIS FRAIHA, NATHARIYAT FIL LUGHA (BEIRUT, 1973).

ہر چند کہ ایڈورڈ سعید نے ظاہریہ اور باطنیہ کے مباحث کو الگ انداز سے لیا ہے اور انھیں سوسیئر اور چومسکی کے مویدین کے مباحث سے مماثل قرار دیا ہے، تاہم ان کے بارے میں دائرۂ معارفِ اسلامیہ میں جو بنیادی معلومات

پیش کی گئی ہیں، مختصراً ہی سہی ان کا نظر میں رہنا ضروری ہے :

" ... ظاہریہ نے قدرتی طور پر احادیث کو بکثرت استعمال کیا، لیکن ان پر یہ الزام ہے کہ انھوں نے جو احادیث لیں، ان کی پوری جانچ پڑتال نہیں کی اور ان کی تنقید کو نظر انداز کیا۔ دوسری جانب انھیں ان کثیر احادیث کی تنقید لامحالہ کرنا پڑی جو قیاس اور رائے کے حق میں نہیں اور عموماً مسلمہ تھیں۔ اسی طرح حدیث " اِختِلافُ اُمَّتِی رَحمَۃٌ " کی جرح و تنقید ان کے لیے ضروری ہوگئی، کیوں کہ ذاتی اختلاف میں انھیں تفرق کا عنصر نظر آرہا تھا اور وہ اپنے آپ کو تفرقے کا مخالف اور قدیمی وحدتِ اسلامی کا، جو ضائع ہوچکی تھی، مجدد قرار دے چکے تھے۔ بایں ہمہ ابنِ حزم جیسے جید علم برداروں کے ہوتے ہوئے بھی ظاہریہ مذہب کبھی وحدت کا نشان یا علامت نہیں بن سکا۔ عام طور پر ظاہریہ دینی جھگڑوں میں احتیاط سے غیر جانب دار رہتے رہے اور ان کے نزدیک متونِ مقدسہ کے ظاہری الفاظ ہی سب کچھ تھے چناں چہ اس کے مطابق انھوں نے خدا سے متعلق آیات و اقوال کو بلا کسی شرح و تفسیر کے قبول کر لیا تھا۔"

(دائرۂ معارفِ اسلامیہ ج ۱۲، ص ۶۲۳ - ۶۲۵)

" باطنیہ : (الف) اسمٰعیلیوں کو یہ نام خصوصاً اس لیے دیا گیا کہ وہ قرآن مجید اور احادیث کے ظاہری الفاظ کے باطنی معنوں پر زور دیتے تھے؛ (ب) عموماً اس کلمے کا اطلاق ہر ایسے شخص پر بھی ہوتا تھا جس پر یہ الزام ہو کہ وہ قرآن و حدیث میں لفظی معنوں کو رد اور باطنی معنوں کو قبول کرتا ہے۔

... عقاید سے قطع نظر ان مصطلحات اور تصورات نے صوفی خیالات کی تمثیلات پر بہت اثر ڈالا ہے۔ اس قسم کی تاویل نے جو مختلف صورتیں بدلیں اس کا خاص اثر سنیوں پر یہ ہوا کہ وہ ہر قسم کی تمثیلی تاویل کو مشکوک سمجھنے لگے؛ چناں چہ امام غزالیؒ نے اپنی کتاب القسطاس المستقیم میں عام تاویل کی قانونی حدبندی

کے تجزیے میں اسمٰعیلی باطنیہ کے خیالات سے مختلف راستہ اختیار کیا ہے۔

بعد کے سنی مصنفین نے باطنیہ کی اصطلاح کو مخالفانہ طور ان مصنفین کے لیے استعمال کیا ہے جو ظاہری معنوں کی تردید میں باطنی معنوں کی کلی حمایت پر بہت زور دیتے ہیں؛ چناں چہ علامہ ابنِ تیمیہؒ نے اس اصطلاح کو نہ صرف باطنی شیعوں کے لیے استعمال کیا بلکہ اس میں انھوں نے صوفیوں ...... کو بھی شامل کر لیا۔ صوفیوں کی رائے میں قرآن مجید کے بہت وسیع باطنی معنی ہیں، جن کی شرح غور و خوض کرنے والوں پر وا ہوتی ہے، لیکن عام طور پر صوفی اس قدر محتاط ضرور ہیں کہ ان کو باطنی نہیں کہا جا سکتا۔ مثال کے طور پر ابن العربی نے قرآن مجید کی تشریح میں اکثر آزاد تفکر سے کام لیا، لیکن چوں کہ وہ باطنی معنوں کے ساتھ ظاہری معنوں کو بھی مانتے ہیں، لہٰذا انھیں باطنی نہیں کہا جا سکتا۔"

(دائرۂ معارفِ اسلامیہ ج ۲، ص ۹۴۱-۹۴۳)

بہر حال ان دو نقطہ ہائے نظر کا بنیادی فرق اور اس کی وجوہ واضح ہیں۔ ابنِ رشد فلسفۂ اسلام کی روایتِ مغرب کا آخری بڑا فلسفی ہے۔ وہ اگرچہ کٹر منطقی تھا اور منطق کے لسانی عنصر کا بھی قائل تھا لیکن دین کے معاملے میں خبردار کرتا ہے:

مذہب ایک قانون ہے، علم نہیں ہے۔ چاہیے کہ مذہب کے سامنے حسنِ عقیدت سے سر جھکا دے۔ اس کی منطقی تحلیل غلط ہے۔ (عابد حسین ص ۱۲۶)

بات دراصل وہی ہے جو عبد القاہر جرجانی نے کہی تھی اور جس کا ذکر ہم اوپر زبان بطورِ مجاز کی بحث میں کر آئے ہیں کہ دین کا مقام الگ ہے، اور عام بیان کا الگ۔ چناں چہ اس ساری بحث سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ متنِ مقدسہ کے بارے میں واضح رہنا چاہیے کہ متنِ مقدسہ کی قرأت کا مقام الگ ہے اور ادبی متن کے مسائل الگ ہیں، اور معنی کے

عدمِ استحکام کے فلسفوں کا اطلاق متنِ مقدسہ پر کسی صورت نہیں ہوتا۔

وحدتِ مضمون در بیانِ مختلفہ ؟

معنی کے استحکام اور عدمِ استحکام کے مسئلے کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ شعری بیان میں اگر وحدتِ معنی محال ہے تو کیا ایک معنی کو مختلف طرح بیان کرنا ممکن ہے۔ مشرقی شعریات میں اس سے ملتی جلتی بحث متحد المضامین اشعار کی ہے۔ علمائے بلاغت نے اس میں بہت موشگافیاں کی ہیں۔ بالعموم ایسے اشعار کا ذکر مقابلہ و موازنہ کے ذیل میں ہوتا ہے اور جس شعر کے حق میں فیصلہ دیا جاتا ہے وہ بھی بر بنائے مضمون ہی ہوتا ہے یعنی فلاں نے بمقابلہ قدما یہ نکتہ پیدا کیا یا فلاں نئی بات نکالی یا فلاں پہلو کا اضافہ کیا۔ دیکھا جائے تو ان مباحث میں 'مضمون' کے تصور کے حدود خاصے مبہم رہے ہیں مثلاً کفر و ایمان، حسن و عشق، وفا و جفا، وصل و ہجر، شمع و پروانہ، گل و بلبل، شیخ و برہمن، زہد و رندی، بت پرستی و دین داری، موج و ساحل، دشت و جنوں، قطرہ و دریا وغیرہ وغیرہ۔ ایک اعتبار سے یہ معنی سے زیادہ موٹف ہیں جن کے گرد کچھ بھی بُنا جا سکتا ہے یا جن سے کوئی بھی ساخت قائم کی جا سکتی ہے جس میں موٹف کی حیثیت کم و بیش مرکزی رہتی ہے۔ بہرحال ساختیات کا موقف اس بارے میں خاصا واضح ہے یعنی لفظ خیال کا میڈیم نہیں بلکہ اس کی شرط ہے یا لفظ کوئی شفاف چیز نہیں کہ اس کے آر پار دیکھا جا سکے بلکہ ہر ہر لفظ کا ایک معنیاتی دائرۂ تفاعل (FIELD) ہے جو نہ صرف کلمے میں اس کی نشست سے بدلتا ہے بلکہ شعر میں اس کے سیاق و سباق سے بھی بدلتا ہے۔ شعر ایک ساخت ہے یا متن جو لسانیت پر مبنی ہے۔ اس لسانیت یا متنیت میں ذرہ برابر بھی تبدیلی ہو تو معنیت میں بھی تبدیلی لازم ہے، اور اگر معنیت بدل جاتی ہے تو متحد المضمون اشعار باوصف موٹف کی مرکزیت کے اتنے متحد المضمون نہیں ہو سکتے جتنے خیال کیے جاتے ہیں۔

دیکھا جائے تو مشرقی روایت میں کہیں کہیں اس روشِ عام سے

گریز کی صورت بھی ہے، جس پر نظر ڈالنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ سادگی، اصلیت اور جوش کی بحث کے ضمن میں حالی نے ایک مزے کی بات لکھی ہے:

" مولانا آزردہ کے مکان پر ان کے چند احباب جن میں مومن اور شیفتہ بھی ایک روز جمع تھے، میر کی غزل کا یہ شعر پڑھا گیا:

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

شعر کی بے انتہا تعریف ہوئی اور سب کو یہ خیال ہوا کہ اس قافیہ کو ہر شخص اپنے اپنے سلیقہ اور فکر کے موافق باندھ کر دکھائے۔ سب قلم دوات اور کاغذ لے کر الگ الگ بیٹھ گئے اور فکر کرنے لگے، اسی وقت ایک اور دوست وارد ہوئے۔ مولانا سے پوچھا کہ حضرت کس فکر میں بیٹھے ہیں، مولانا نے کہا قل ہو اللہ کا جواب لکھ رہا ہوں۔"

حالی آگے چل کر لکھتے ہیں کہ " اس باب میں سب سے عمدہ ابن رشیق کا قول ہے۔ وہ کہتے ہیں:

فَاِذَا قِیْلَ اَطْمَعَ النَّاسَ طُرًّا — وَاِذَا رِیْمَ اَعْجَزَ الْمُعْجِزِیْنَا

یعنی جب پڑھا جائے تو ہر شخص کو یہ خیال ہو کہ میں بھی ایسا کہہ سکتا ہوں، مگر جب ویسا کہنے کا ارادہ کیا جائے تو معجز بیان عاجز ہو جائیں۔"

(مقدمہ ۸۶، ۸۸)

غالباً حالی کے اس بیان پر یہ تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ شعر مجرد مضمون سے نہیں، اپنی لسانیت یا متنیت سے قائم ہوتا ہے۔ ہر متن چونکہ یکتا ہے اس لیے اس کی نقل تو خود اصل شعر ہی ہے، لیکن جہاں یہ متن یا اس کی لسانیت شکست ہوئی شعر وہ شعر نہ رہا، کچھ اور بھلے ہی ہو گیا۔ قطع نظر اس سے کہ حالی میر کے شعر کو "سیدھا سادا یا نیچرل" یا کیا کچھ کہتے ہیں، وہ اس کا اقرار بھی کر جاتے ہیں کہ " ایسے چتھیرے ہوئے مضمون کو میر نے ... ایک ایسے اچھوتے، نرالے اور دل کش اسلوب میں بیان کیا ہے کہ اس سے بہتر اسلوب تصور میں نہیں آ سکتا " کیا یہ اس بات کا کھلا ہوا اعتراف نہیں ہے کہ شعر ہزار متحد المضمون ہو، قائم وہ لسانیت

اور متنیت ہی سے ہوتا ہے۔ اگر یہ ' اچھوتی ' نرالی اور دل کش' متنیت بدل جائے تو شعر شعر نہیں رہتا۔ سوال یہ ہے کہ کیا متنیت کے ساتھ معنیت نہیں بدل جاتی ، اور اگر معنیت بدل جاتی ہے تو کیا مضمون وہی مضمون رہتا ہے؟ اس سوال پر بعض دوسروں نے بھی غور کیا ہے۔

صاحب البیان نے یہ بحث 'علمِ بیان' کی تعریف کے حوالے سے اٹھائی ہے۔ پہلے وہ مستند مآخذ سے بیان کی سات تعریفیں نقل کرتے ہیں جن میں سے تین یہ ہیں :

۱۔ "علمِ بیان ایسے قاعدوں کا نام ہے کہ اگر کوئی ان کو جانے اور یاد رکھے تو ایک معنی کو کئی طریق سے ادا کر سکتا ہے جن میں بعض طریق کی دلالت معنی پر بعض طریق سے زیادہ واضح ہوتی ہے۔" (بحر الفصاحت ص ۶۶۰)

۲۔ "علمِ بیان وہ ہے کہ جس کو مستحضر رکھنے سے ایک معنی کو کئی طریق سے لکھ سکیں کہ ان میں کوئی طریق معنیِ مطلوب پر دلالت واضح رکھتا ہو اور اور کوئی واضح تر"

(معیار البلاغت دیبی پرشاد سحر بدایونی، ص ۱۱)

۳۔ "علمِ بیان سے وہ علم مراد ہے جس کے جاننے سے ایک معنی کو متعدد اور مختلف طریقوں سے ظاہر کر سکتے ہیں اس طرح کہ ایک معنی دوسرے سے زیادہ صاف ہوں۔"

(آئینۂ بلاغت ، ص ۱۵۷)

صاحب البیان کہتے ہیں کہ انھوں نے سات تعریفیں نقل کیں، اگر وہ ستر یا سات سو تعریفیں بھی نقل کرتے تو کم و بیش یہی تعریف ہوتی۔ بقول ان کے ان تعریفوں پر سب سے بڑا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ "کیا ایک ہی معنی اپنی تمام دلالتوں کے ساتھ مختلف طریقوں یعنی مختلف الفاظ میں ادا ہو سکتا ہے ؟ " اس کے بعد وہ بنیادی سوال اٹھاتے ہیں جو ساختیات کا مسئلہ بھی ہے کہ "کیا الفاظ کے بدلنے سے یا دلالتِ وضعی یا عقلی کے بدلنے سے مطلب (یعنی خیال) ہی بدل نہیں جاتا ؟ " (البیان، ص ۳۱-۳۵)

عابد علی عابد نے صحیح لکھا ہے کہ متقدمین کی تعریفِ بیان کا یہ حصّہ کہ ایک معنی کو کئی طریق سے عباراتِ مختلفہ میں ادا کیا جا سکتا ہے " غلطِ محض ہے کیوں کہ ایک معنی کو کئی طریقوں سے عباراتِ مختلفہ میں بیان کرنا (ایک زبان میں) ناممکن ہے۔ لفظ و معنی، پیکر اور مغز ایک حقیقت کے دو رخ ہیں اور ان دونوں کو ... فقط نظریاتی طور پر علیحدہ کیا جا سکتا ہے " لفظ و معنی کے اتصال کی کیفیت کے بیان میں عابد علی عابد اقبال کے شعر کی سند لاتے ہیں :

اختلاطِ لفظ و معنی ارتباطِ جان و تن
جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر میں ہے

غور طلب ہے کہ یہ موقف کس حد تک ساختیاتی موقف سے ہم آہنگ ہے :

" کوئی خیال ہمارے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا جب تک وہ پہلے لفظ کا جامہ نہ پہن لے۔ خیالِ مجرد فریبِ خیال ہے اور اس کا حصول محال ہے ۔" (ص ۳۸)

یہ طے کر لینے کے بعد وہ منطقی طور پر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ " ایک ہی زبان میں مرادف الفاظ جو بالکل ہم معنی ہوں یا تو ملیں گے ہی نہیں یا ملیں گے تو شاذ اور یوں الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھیں گے ۔" اور پھر وہ پتے کی بات کہتے ہیں " دنیا کی جتنی اعلیٰ درجے کی زبانیں ہیں، اور جن میں اردو بھی شامل ہے ، معانی کی مختلف دلالتوں کو دکھانے کے لیے اور مفہوم کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کے لیے مترادف الفاظ البتہ بکثرت رکھتی ہیں ... عربی میں ابواب اگرچہ مجردِ ثلاثی کے مفہومِ اساسی کو قائم رکھتے ہیں لیکن ترادف پیدا کر دیتے ہیں اور ترادف پیدا ہوتے ہی معنی بدل جاتے ہیں ۔" (ص ۳۹)

یہ بحث دتاتریہ کیفی نے بھی اٹھائی ہے (کیفیہ ص ۹۵، ۹۸، ۹۹، ۱۰۵) کیفی نے مترادف الفاظ کے جُٹ قائم کیے ہیں اور ان کے معانی کا فرق دکھا کر بدلیل ثابت کیا ہے کہ " جب مترادفات ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں تو مفہوم میں خلل کی کیسی کیسی صورتیں پیدا کر دیتے ہیں ... بہت سے الفاظ ہم معنی اِدھر اُدھر سے آجاتے ہیں اور بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی اصل جگہ میں قریب المعنی ہوں مگر ہم معنی مستعمل ہوتے ہیں ... اس کے باوجود ذوقِ سلیم ان لفظوں میں مابہ الامتیاز قائم کر دیتا ہے ۔ اور

ایسے دو کلمے مرادف نہیں رہتے، زیادہ سے زیادہ مترادف ہیں۔"

کیفی نے ایسے چار چار لفظوں کے تین جُگ قائم کیے ہیں :

(الف) رنج غم افسوس تاسف

(ب) خوش شاد بشاش باغ باغ

(ج) انس الفت محبت عشق

اور ان کے محلِ استعمال کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ لاکھ زور ماریئے جملے میں ان چار لفظوں کی جگہ ایک دوسرے سے بدلی نہیں جاسکتی۔ "ہر لفظ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی جگہ کے لیے وضع کیا گیا ہے۔" کیفی نے دیسی لفظوں کی مثالوں :

دُبدھا جھجک سانسا کھٹکا بھچک

دھڑکا سہم سناٹا ڈر

سے بھی بحث کی ہے یہ نو کے نو لفظ خوف یا ڈر کی مختلف نوبتوں اور درجوں کو ظاہر کرتے ہیں، لیکن ایک کی جگہ دوسرا نہیں لے سکتا۔" کجا یہ دعویٰ کیا جائے کہ ایک ہی بات کو مختلف طریقوں سے مختلف عبارتوں میں ادا کیا جاسکتا ہے۔"

احمد دین نے بھی سرگزشتِ الفاظ میں تقریباً یہی رائے دی ہے کہ مترادف الفاظ میں بھی مشابہتِ معنوی کے ساتھ معنوں میں ضمنی اور جزوی فرق ضرور ہوتا ہے۔ انھوں نے یہ بحث بہت پھیلائی ہے اور مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ اردو زبان جس کا ڈھانچا ہندی ہے اس میں مترادف اسم ہندی اور فارسی یا عربی بکثرت پائے جاتے ہیں (مثلاً ڈر، خوف / دھوکا، فریب / دھڑکا، خوف / جتھا، گروہ / بھرم، عزت / دُہائی، فریاد / اپال، جوش / بھٹی، خوشامد /) اگر غور سے دیکھیں تو یہ تمام جوڑے جو پہلو بہ پہلو قدم جمائے کھڑے ہیں، کوئی ایک دوسرے سے پیچھے ہٹنے والا نہیں، ان میں ہر لفظ کا اپنا الگ حلقۂ معنی ہے اور یہ اردو استعمال میں کم و بیش ممیز ہو چکے ہیں۔

(سرگزشت الفاظ ص ۲۲۱ - ۲۵۸)

ایک ملتی جلتی بحث محبوب کے تصورِ حسن اور اس کے مدارج کے بیان کی بھی ہے۔ شعرا نے محبوب کے حسنِ گریز پا کو اظہار کی گرفت میں لانے

کے لیے کیسے کیسے الفاظ کا سہارا لیا ہے :

ہزار نکتہ در ایں کاروبارِ دلداری است
کہ نامِ آں نہ لبِ لعل وخطِ زنگاری است

حسن کی نیرنگیوں اور بوقلمونیوں کے اظہار کے لیے شعرائے مشرق نے کیا کیا لفظ وضع کیے ہیں، مثلاً آن، ادا، ناز، انداز، غمزہ، عشوہ، کرشمہ، چھب، پھبن، بانکپن، روپ، شوخی، شرم، جلوہ، حیا وغیرہ۔ ہندی الفاظ سے قطع نظر فارسی عربی لفظوں کی دلالتیں دیکھیے :

ادا : ہرچہ در خاطرِ عاشق گزرد می دانی
خوش ادا یاب و ادا فہم و ادا داں شدۂ

تنہا نہ تری زلفِ رسا لے گئی دل کو
مکھڑے کو چھپانے کی ادا لے گئی دل کو

غمزہ : خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ
دیکھ خوں نابہ فشانی میری
(غالب)

حسنِ غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد (")

ناز : دل لے ہی چکے ناز سے شوخی سے ہنسی سے
اب ان کی بلا آنکھ ملاتی ہے کسی سے
(مصحفی)

کرشمہ وناز : خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست
(حافظ)

جلوہ : تمثالِ جلوہ عرض کر اے حسن کب تلک
آئینۂ خیال میں دیکھا کرے کوئی (غالب)

آن

شاہد آں نیست کہ موے و میانے دارد
بندۂ طلعتِ آں باش کہ آنے دارد

ایں کہ می گویند آں بہتر ز حسن
یارِ ما ایں دارد و آں نیز ہم

سودا جو ترا حال ہے ایسا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اُسے کس آن میں دیکھا

(اسلوب ۱۳-۱۵)

ظاہر ہے ہر ہر لفظ کی کیسی کیسی تعبیر ممکن ہے۔ زمرہ ہر چند کہ ایک ہے یعنی حسنِ محبوب یا ناز و ادا یا آن و کرشمہ لیکن کئی شعرا نے بدلیل یہ بھی ثابت کردیا ہے کہ حسن اور چیز ہے اور عشوہ و ادا یا آن و غمزہ الگ کچھ اور ہے جب ایک زمرہ کے ملتے جلتے الفاظ کا یہ عالم ہے کہ معنی کے نازک نازک فرق سے ہر ہر لفظ ایک الگ دلالت یا معنی کی ایک الگ قوسِ قزح قائم کردیتا ہے تو متحد المضامین اشعار کی وحدت معلوم !

مسعود حسن رضوی ادیب نے اس مسئلہ کے ایک اور دلچسپ پہلو سے بحث کی ہے۔ انھوں نے ایک ہی شاعر کے یہاں سے ہم مضمون اشعار لیے ہیں جو دو زبانوں میں ہیں، اردو میں اور فارسی میں۔ مضمون وہی ہے اور شاعر اسی کو دوسری زبان میں کہنا چاہتا ہے، اور شاعر بھی کون ؟ خدائے سخن میر تقی میر، لیکن باوجود غیر معمولی قدرتِ بیان کے ہم مضمون شعر اثر میں یکساں نہیں ہیں :

"شعر کے الفاظ بدلنا اس کی ہستی کو مٹانا ہے۔ الفاظ بدلنے کا کیا ذکر، صرف ان کی ترتیب بدلنا شعر کی صورت بگاڑنا ہے۔ کون اردو داں ہے جس کو قدرت نے ذوقِ سلیم دیا ہو اور وہ میر کو خدائے سخن نہ مانے ؟ کون فارسی خواں ہے جس نے ذکرِ میر، فیضِ میر، نکات الشعرا کا مطالعہ کیا ہو، اور وہ میر کو فارسی کا زبردست انشا پرداز نہ جانے ؟ مگر باوجود اس بلند منزلت کے جو اردو شاعری میں میر کے لیے مسلم ہے، اور باوجود اس غیر معمولی

قدرت کے جو فارسی زبان پر میر کو حاصل ہے، جب وہ کسی خیال کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ظاہر کرتے ہیں تو ان کے یہ ہم مضمون شعر اثر میں یکساں نہیں رہتے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

رات محفل میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے — جیسے تصویر لگادے کوئی دیوار کے ساتھ
بہ بزمِ عیش او استادہ ام خاموش از حیرت — بداں ماند کہ بر دیوار چسپانند تصویرے

تری چال ٹیڑھی، تری بات انوکھی — تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے
خرامت بطرزے، کلامت بطورے — تراکم کسے میر فہمیدہ باشد

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر — مذہبِ عشق اختیار کیا
چہ ناعاقبت بیں کسے بود ظالم — نخست آں کہ عشق تو ورزیدہ باشد

جنسِ دل دونوں جہاں جس کی بہا تھی اس کا — اک نگہ مول ہوا، تم نہ خریدار ہوئے
یک نگہ بیش بہایش نہ نہادم لیکن — خود پسنداں نہ نمودند خریداریِ دل

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز — وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے
کہ پیشِ منعمانِ جہاں می شود دراز — بالینِ زیرِ سر شدہ دستِ گدائے او

کتنا خلافِ وعدہ ہوا ہوگا وہ کہ میر — نومیدی و اُمید مساوات ہوگئی
بر جانِ من ز وعدہ خلافیِ متصل — نومیدی و امید مساوات کردہ

دنیا میں نہ کوئی دو زبانیں ایسی ملیں گی جن میں ہر حیثیت سے اتنی مشابہت ہو جتنی اردو اور فارسی میں ہے، نہ میر کا سا قادر الکلام شاعر ملے گا جس نے خود اپنے خیالات کو ایسی دو زبانوں میں ظاہر کیا ہو پھر بھی دونوں زبانوں کے ہم مضمون اشعار اثر میں برابر نہ ہو سکے۔"

(ہماری شاعری ص ۸۱۔ ۸۲)

عابد علی عابد نے شبلی کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے کہ 'دامن'، 'دامان' سے زیادہ فصیح ہے۔ (شعر العجم ج چہارم، شعر کی نوعیت پر بحث) ان کا کہنا

ہے " معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اس مہلک غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ لفظ دوسرے لفظوں کے ساتھ ملنے کے بغیر اور ایک با معنی فقرہ مرتب کرنے کے بغیر فصیح اور غیر فصیح ہوتے ہیں " (البیان ص ۵۸) یہ بحث انھوں نے البدیع اور اسلوب میں بھی اٹھائی ہے (البدیع ص ۱۱۲۔ ۱۱۳، اسلوب ص ۹۳۔ ۹۴) اور ایسے اشعار کی روشنی میں :

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

(غالب)

گوہر اشک سے لبریز ہے سارا دامن
آج کل دامنِ دولت ہے ہمارا دامن

(وزیر لکھنوی)

حشر میں کھینچوں ترا دامن، بھلا دیکھوں کہ تو
ان بھی جھنجھلا کر کہے، یوسف علی خاں چھوڑ دے

(یوسف علی خاں ناظم)

انھوں نے بجا طور پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ قطع نظر بحر و وزن کے اظہار و ابلاغ کے نقطۂ نظر سے کہیں دامان زیادہ مفید مطلب ہے کہیں دامن۔ اسی طرح کہیں پیرہن زیادہ قرینِ ابلاغ ہوگا کہیں پیراہن۔ اگر دو لفظ جو اصلاً ایک ہی مادے سے ہیں اور ایک ہی ہیں ماسوائے ایک مصوتے کے جو خفیف سے طویل ہوگیا ہے (یعنی ماسوائے امالے کے) بہ اعتبار ابلاغ و اظہار یا محلِ استعمال یا درجاتِ فصاحت اگر مذاقِ سلیم ایسے دو لفظوں میں بھی فرق کرتا ہے تو ملتے جلتے الفاظ کا ہم معنی ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔ اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چناں چہ مضمون یا موٹف لاکھ ایک ہو، نام نہاد متحد المضامین اشعار کبھی ایک معنی کے حامل نہیں ہو سکتے۔

صاحب مراۃ الشعر نے ابنِ رشیق کے قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ " معانی عام ہیں اور خیال موجود تو شاعری غیر از صناعتِ لفظی نہیں۔ معانی کو ہر شخص اپنے کلام کے ذریعے ادا کرتا ہے اس میں کسی کی خصوصیت نہیں " (مراۃ الشعر، ص ۹۸۔ ۹۹) عابد علی عابد نے خیال کے عام ہونے اور

عالم و عامی دونوں کی دسترس میں یکساں موجود ہونے کو غلط محض قرار دیا ہے ۔
ان کا کہنا ہے کہ خیال ہرگز عام نہیں ہے ۔ شاعری صناعتِ لفظی اسی لیے
ہے کہ یہ صناعتِ خیال کو قائم کرتی ہے جو عام نہیں ہے ۔ وہ دلیل کے پورے
وزن سے یہ بحث اٹھاتے ہیں کہ خیال کا عام نہ ہونا یوں بھی ثابت ہے کہ لغت
یہ تو کرسکتی ہے اور کرتی ہے کہ ایک کلمے کے کئی سلسلۂ معنی متعین کردے،
لیکن یہ نہیں کرسکتی کہ ایک ہی معنی کے لیے دو لفظ مہیا کردے ۔ جہاں ایسا
اشتباہ ہوگا وہاں الفاظ مترادف ہوں گے مرادف نہ ہوں گے (نکتہ کیفی)
مراد یہ ہے کہ معانی میں قریب تر تو ہوں گے لیکن کوئی دلالت ضرور مختلف
ہوگی ۔ مثال کے طور پر گھوڑے کے لیے اردو، فارسی، عربی میں بہت
لفظ ہیں ، لیکن ہر لفظ مختلف معنی دیتا ہے (ایک ہی زبان میں ہم معنی
لفظ نہ ملیں گے) مثلاً گھوڑا ، بچھیرا ، چتکبرہ ، رخش ، توسن ، اسپ ،
اشقر وغیرہ" (اسلوب ص ۹۴ - ۹۵) الغرض جب لفظ ہم معنی نہیں
ہوسکتے تو اشعار کا متحد المضمون ہونا محض ایک رمتھ ہے ۔ دو شعر متحد المتن
نہیں ہوسکتے ۔ جہاں متن بدلے گا ، معانی بھی لازماً بدل جائیں گے ، اس
سے مفر نہیں ۔

اوپر کی بحث سے واضح ہے کہ متاخرین علمائے بلاغت کم و بیش
انھیں نتائج تک پہنچے جو ساختیاتی فکر میں عام ہیں یعنی زبان میں معنی مبنی
بر افتراق ہے ، اور جب معنی ہے ہی افتراق پر مبنی تو دو لفظ ہم معنی کیسے
ہوسکتے ہیں اور اگر الفاظ ہم معانی نہیں ہوسکتے تو اشعار کیسے متحد المضامین
ہوسکتے ہیں ؟ گویا متحد المضامین اشعار کا تصور واہمے سے زیادہ حقیقت
نہیں رکھتا، یعنی شعر فقط وہی کہتا ہے جو اس کی لسانیت یا متنیت کہتی ہے
اور چوں کہ لسانیت یا متن یکتا ہے ، معنی (یا مضمون) متحد ہو ہی نہیں
سکتا ۔

(باقی آیندہ)

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

تذکرۂ ماہ و سال
مالک رام

اس مجموعے میں اردو کے بیشتر ادیب، شاعر، نقاد، کالم نگار، صحافی اور دوسرے اہم عمائد (جنھوں نے اردو ادب کی قابل قدر خدمت کی ہے) کی تاریخ ولادت اور جو ہماری بدقسمتی سے انتقال کر چکے ہیں ان میں سے اکثر کی تاریخ وفات بھی درج ہے۔ کسی بھی اہم ادیب پر مضمون لکھتے وقت اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ قیمت: =/۱۲۵

افکارِ اقبال
محمد عبدالسلام خاں

اس اہم کتاب میں علامہ اقبال کے حالاتِ زندگی، ان کے اردو اور فارسی کلام پر سیر حاصل بحث، ان کے مذہبی اور سیاسی افکار، اور کچھ ایسے اہم واقعات کی نشان دہی کی گئی ہے جو اب تک اندھیرے میں تھے۔

قیمت -/۱۲۵

تحقیق نامہ
مشفق خواجہ

مشفق خواجہ اردو کے وہ واحد محقق ہیں جو ہمیشہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جو اپنی اہمیت کی بنا پر ہماری ادبی تاریخ کے کسی نہ کسی خلا کو پر کرتے ہوں۔ زیرِ نظر مجموعہ میں ایسے ہی اہم ترین مضامین شامل ہیں۔ قیمت =/۱۲۵

مرضیات
حکیم نعیم الدین زبیری

بیماریوں کے اصولی اسباب اور ان کی وجہ سے افعال میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے مطالعے یعنی ماہیت الامراض (پیتھالوجی) پر جامع اور آسان بحث۔ طلبہ کے علاوہ اطبا کے لیے بھی بے حد مفید۔ قیمت =/۵۱

تاثر نہ کہ تنقید
صدیق الرحمن قدوائی

تنقید، ادب کی ایک اہم شاخ ہے مگر اس کا ضرورت سے زیادہ چرچا بھی اچھا نہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ادب سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص "نقاد" ہو جائے۔ ادب کو تنقید کے سوا بھی مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے جن کا انحصار پڑھنے والوں کے انفرادی مزاجوں پر ہے۔ یہ تصنیف ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نیا نقطۂ نظر پیش کرتی ہے۔

قیمت: ۵۱/-

خواب اور خلش
آل احمد سرور

شاعری ذات سے کائنات تک کا سفر ہے۔ یہ خوابوں کے ذریعے حقائق کی توسیع کا نام ہے۔ بڑی شاعری نفی سے مدد لیتی ہے مگر وہ روایت اور تجربے میں ایک توازن رکھتی ہے۔ آل احمد سرور کی شاعری صرف الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں بلکہ اس میں معانی کا ایک سمندر ہے جس کی تہہ میں پہنچ کر ہی موتی نکالے جا سکتے ہیں۔

قیمت =/66 روپے

سید محمد حسنین

پروفیسر آل احمد سرور "خواب باقی ہیں"

کی روشنی میں

سنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی کچھ خواب ہے، کچھ اصل ہے، کچھ طرزِ ادا ہے

اعلا تخلیقی کارنامہ مصنف کی حیات ابد کا باعث ہوتا ہے۔ مگر اچھی سوانح حیات، بالخصوص خود نوشت سوانح حیات، مصنف اور تصنیف ہر دو کے تاریخی وجود کی نشاندہی کرتی ہے۔ تہذیب کے تاریخی ارتقا کے مطالعے میں یہ چراغ راہ ہوتی ہے ___ بڑے سے بڑے مصنف کی اہم ترین تصنیف بھی اس پاکیزہ سوانح حیات کا پاسنگ نہیں جو بقلم خود یا 'بقلم غیر قلم بند ہو۔

سوانح نگاری آسان ہے، لیکن بحیثیت فن نہایت دشوار ___ ہر شخص کے ماہ و سال کی قلم بند روداد، اس کی زندگی کی سرگزشت ہے، مگر یہ اس سوانح حیات کا رتبہ حاصل نہیں کر سکتی جو کسی بندہ برگزیدہ یا جہاں دیدہ کا فسانہ ہستی ہو۔ تاریخ اور تحقیق کی دنیا میں یہ تصنیف کلیدی مقام رکھتی ہے، ڈائری اور نجی خطوط کو بھی یہ پایہ حاصل نہیں۔ یہ مخزن علم ہوتی ہے اور معدن معلومات۔

خواب باقی ہیں، پروفیسر آل احمد سرور کی خود نوشت سوانح حیات ہے، مگر ان کی کتاب زندگی نہیں۔ یہ ایسی سرگزشت نہیں جس میں مصنف کی عصری رنگ آمیزیوں سے نیرنگ شخصیت قاری کے لیے جلوۂ سپیدہ سحر نظر آئے ___ یہ کتاب محنت سے نہیں لکھی گئی۔ چونکہ مصنف کے لیے "یکسوئی اور باقاعدگی سے کام کرنا بھی میرے لیے آسان نہیں" (۳۵۸) یہی وجہ ہے کہ تساہل پسندانہ انداز کار، تصنیف کی منصوبہ بند تسوید و تکمیل میں غالب رہا ___ انتہا یہ ہے کہ کتاب میں مندرجات کی فہرست بھی نہیں، حالانکہ بیانات، مختلف عنوانات کے بموجب مرتب ہوئے ہیں۔ کل اذکار و احوال مندرجہ ذیل عنوانات کے گرد گھومتے ہیں

(۱) اعتراف	۵ تا ۶	(۲) حرف آغاز	۷ تا ۱۱۶
(۳) رام پور	۱۱۶ تا ۱۲۵	(۴) لکھنؤ	۱۲۶ تا ۱۷۹
(۵) علی گڑھ	۱۸۰ تا ۲۵۸	(۶) شملہ	۲۵۸ تا ۲۹۵

حرف آخر ۲۹۶ تا ۳۶۳

تمام باتیں اور بیانات موضوع مراکز فکر کے بجائے ان شہروں سے وابستہ ہیں، جیسے سفر نامہ ابن بطوطہ۔

پروفیسر آل احمد سرور کہتے ہیں "میری زندگی میں کوئی نظم نہیں (۳۵۸)۔ انھیں اس کا بھی اعتراف ہے کہ ان کے لیے "یکسوئی اور باقاعدگی سے کام کرنا بھی میرے لیے آسان نہیں" (۳۵۸)۔ یہ عجز نہیں، اظہارِ حقیقت ہے۔

پروفیسر سرور کی مطبوعات کی حالیہ تعداد انچاس ہے جو ۱۹۳۵ء تا ۱۹۷۷ء کا ذخیرہ ہے۔ اس سرمایہ میں ایسی کتاب ایک بھی نہیں جو کسی واحد موضوع پر ایک طویل و جامع تصنیف کہی جائے۔ وجہ ظاہر ہے، وسعتِ مطالعہ، کثرتِ مواد اور قدرتِ اظہار کے باوجود، کسی ایک موضوع پر جاں نثارانہ اور یکسوئی و دلجمعی سے کام انجام دینا مصنف کے لیے امرِ دشوار رہا ہے۔

اگلوں میں سر سید، آزاد، حالی، شبلی اور پچھلوں میں سید سلیمان ندوی، پروفیسر اعجاز حسین، ڈاکٹر سید عبداللہ اور پروفیسر کلیم الدین احمد سامنے کے چند اہم نام ہیں جنھوں نے جی لگا کر اور جم کر تصنیفی کام انجام دیے، لیکن منصوبہ تسوید میں یہ پختہ عزم و عمل اور یہ کامل ضبط و قرار، افسوس ہے، ادبی روایت نہیں بن سکے ــــ مقالہ نگاری اور مشغلہ عام ہے۔ یہ روایت بُری نہیں، پر اچھے مجموعہ مقالات بھی اس جاں داری سے محروم رہتے ہیں جو کسی واحد موضوع پر ایک جامع تصنیف کا مقدر ہوتا ہے ــــ نئے یا نو وارد اہل قلم کی بات دوسری ہے۔ نامور مصنف نے بھی اس ادبی نظارہ بازی کو جیسے اپنا شعار بنا رکھا ہے۔ فی زمانہ ادب کی صحت مند نمو کے لیے یہ تساہل پسندانہ مشغلہ مضرت رساں ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور نے سوانحی ادب میں "آشفتہ بیانی میری" (رشید احمد صدیقی)، یادوں کی برات (جوش ملیح آبادی)، "مجھے کچھ کہنا ہے اپنی زبان میں" (خواجہ غلام السیدین) کو "بڑی قابل قدر تصنیفات" اور "اعمال نامہ (سید رضا علی) کو "اردو کی سب سے اچھی خود نوشت" قرار دیا ہے۔

"آشفتہ بیانی میری" کی صنفی حیثیت مشتبہ ہے۔ یہ ایک طباع اور شہ زور اہل قلم کا اختراعی تجربہ ہے۔ میں نے اس سلسلے میں ایک بار خود مرحوم رشید احمد صدیقی سے مودبانہ رجوع کیا تھا[1]:

> ... آپ کی یہ تصنیف میں نے کئی بار پڑھی اور ہر بار اس سے محظوظ ہوا۔ لیکن ایک معلم ادب کی حیثیت سے طلبہ کو یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ اس کی صنفی حیثیت کیا ہے...

رشید صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، "کہ دیجیے کہ یہ وہ جامہ ہے جس کا نہیں اُلٹا سیدھا"

'یادوں کی برات' کو پروفیسر سرور جیسے معتبر نقاد کا "قابل قدر" خود نوشت میں شمار کرنا باعث حیرت ہے ــــ یہ تصنیف جو کامل چھے ماہ کی مسلسل عرق ریزی کے بعد تکمیل پائی، مصنف کی مظہر العجائب شخصیت کا آئینہ ہے ــــ کثرت کذب بیانی، بے تحاشہ مبالغہ آرائی اور بے پناہ خود سرائی کے علاوہ یہ خود نوشت جنسی تلذذ کے اشتعال و اشتہا کا نمونہ ہے۔ اس سوانح حیات میں جوش نے اپنے اٹھارہ عدد ایسے معاشقوں کی تفصیلات سنائی ہے جن میں مذکر یا مؤنث کسی

---

[1] نقش مطلب صفحہ ۳۴۶

یا معمر، باکرہ یا بیاہی، زن پارسا یا فاحشہ کی کوئی قید نہیں اور نہ وقت مناسب وغیر مناسب یا مقام موزوں کا کوئی امتیاز و احساس ہے ــــ جوش ملیح آبادی اردو کے پہلے خود نوشت سوانح نگار اور واحد قلم کار ہیں جنھوں نے بقلم خود اپنی مادر زاد معصیت کاری کا اعلانیہ اور فخریہ تذکرہ کیا ہے تاریخ ادب اردو کے اس فحش نگار مصنف کو کبھی نہ بھولے گی۔

پروفیسر سرور کا "سیرت شبلی" (سید سلیمان ندوی) جیسی پاکیزہ سوانح حیات کا نام نہ لینا غالباً سہو ذہن ہے۔ ادبی و تہذیبی سطح کی یہ معتبر کتاب نہ صرف فرد واحد کی سرگزشت حیات ہے بلکہ ایک مکتبہ فکر اور مرکز ادب کی تاریخ بھی ہے، جامع اور مستند تاریخ ــــ ویسے سوانحی ادب کی قابل قدر کتابوں میں "حیات جاوید" (خواجہ الطاف حسین حالی) "میری دنیا" (ڈاکٹر اعجاز حسین) "یادوں کی دنیا" (ڈاکٹر یوسف حسین خاں) "اپنی تلاش میں" تین جلد (کلیم الدین احمد) "حقیقت بھی کہانی بھی" (سید بدرالدین احمد) "ورود مسعود (مسعود حسین خاں) اور "داستاں میری" (پروفیسر اقبال حسین) کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ــــ بالخصوص کلیم الدین احمد، سید بدرالدین اور اقبال حسین کی خود نوشت سوانح حیات، علاقائی معلومات کا وہ بے بہا خزانہ ہیں جن کے مطالعے کے بغیر ریاست بہار کی تہذیبی و ثقافتی تاریخ نہیں لکھی جا سکتی۔

"خواب باقی ہیں" کے بارے میں بیگم سرور نے ایک عمدہ بات کہی ہے کہ وہ اس خود نوشت سوانح حیات میں "گھر کم ہے، باہر زیادہ" ــــ یہ "گھر" اور "باہر" تہہ دار الفاظ ہیں ــــ ایک طرف اگر یہ داخلیت اور خارجیت کا اشارہ کرتے ہیں اور مصنف کے موضوعی طریقہ کار کے مظہر ہیں۔ تو دوسری طرف "گھر" سے مراد خانہ سرور نہیں، بلکہ مصنف کی علی گڑھ میں طویل مدت قیام ہے۔ اسی طرح "باہر" ملازمت رامپور اور لکھنؤ ہی نہیں بلکہ اسفار میں مصنف کی جہاں بینی ظاہر کرتا ہے۔

تصنیف کے مختلف حصوں اور مصنف کے مختلف بیانوں میں "گھر" اور "باہر" کی دلکش ترجمانیاں ملتی ہیں۔ یہ بات دوسری ہے کہ بیگم صاحبہ کو یہ ترجمانی گھر میں "کم" اور باہر میں "زیادہ" محسوس ہوئی ــــ اس کا فیصلہ کتاب کا قاری ہی کر سکتا ہے ــــ ویسے مصنف نے اپنی بات کا واضح اظہار کر دیا ہے کہ "ہو سکتا ہے کچھ اہم باتیں رہ گئی ہوں اور کچھ معمولی باتیں راہ پا گئی ہوں" ایک اچھی سوانح حیات کے بارے میں پروفیسر سرور کہتے ہیں:

> "خود نوشت سوانح عمری کا فن نظارے کا نہیں، نظر کا بھی فن ہے۔ اس لیے سائنسی صحت اور واقعیت کے بجائے ایک مخصوص زاویہ نگاہ کی اہمیت شاید یہاں زیادہ ہے۔ خود نوشت، تاریخ نہیں ہے مگر اس میں تاریخی حقائق ضروری ہیں۔ یہ واقعات کا خشک بیان بھی نہیں ہے۔ ان واقعات کے ساتھ جو کیفیات وابستہ ہیں ان کی داستان بھی ہے۔ واقعات اس لیے اہم ہیں کہ ان واقعات نے کیا تاثرات اور کیفیات عطا کی ہیں، یعنی ان سے دل پر کیا گزری ہے... جینا ایک فن ہے اور آپ بیتی ایک فن لطیف۔" (۷-۸)

"خواب باقی ہیں" کے طویل حصے "سرِ آغاز" اور "علی گڑھ" ہیں ــــ یہ پروفیسر سرور کی کتاب حیات کے کھلے اوراق ہیں۔ تعلیمی زندگی کے ابتدائی اور تدریسی زندگی کے آخری اوراق ہیں اور مخصوص زاویہ نگاہ" کے حامل شیرازہ بند اور روشن اوراق" ــــ ان میں نظارگی ہے اور نیرنگی بھی، بھولے ہوئے خواب کا دھندلکا ہے اور جاگے دن کی چمک بھی۔

ان حصّوں میں مصنّف کی زندگی کی دھوپ چھانو، زندگی کے با مقصد بنانے کے عزم اور خوب سے خوب تر کی جستجو سے ایک باشعور قاری کو یہ ادراک و علم حاصل ہوتا ہے کہ "جینا ایک فن ہے اور آپ بیتی ایک فنِ لطیف"

اچھے استاد کی بامُراد زندگی، محض فرض شناسانہ کارکردگی نہیں۔ وہ نہ صرف فروغِ علم کو عبادت سمجھتا ہے اور ذہنوں کی تربیت کرتا ہے، بلکہ ذرّوں کو سورج اور چاند بنانے کا حوصلہ رکھتا ہے ــــ لائق استاد، ہونہار شاگردوں کی بابرکت زندگی کا وسیلہ ہوتا ہے۔

پروفیسر آل احمد سرورؔ اپنے علم و دانش کے علاوہ، درس و تدریس کی دنیا میں ان چند استادوں میں شمار ہیں جن کی شہرت و منزلت حدِ زماں و مکاں سے بالا ہے۔ اپنے عزیز طلبہ کی قوائے ذہنی کی نشو و نما میں یہ منصباً اور مزاجاً تیز قدم اور ہمہ دَم جُنبش و بیدار رہے ہیں۔

چشمۂ سرور سے سیراب ہوتے ہوئے، اسے لائق استاد کی خوش بختی کہیے۔ لیکن، کہا جاتا ہے فیض بخشی میں خوش بختوں کی تعداد آٹے میں نمک ہے، یہ خالص دودھ کی شیر فی نہیں ــــ اس اندازِ کرم پر شاگردان کا گلہ بے وجہ نہیں ــــ سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم!

"خواب باقی ہیں" میں ایسے کئی شاگردوں کا، جو اُن دنوں زیادہ مشہور نہ تھے، ذکر کیا گیا ہے، مگر ایسوں کا نام بھی نہ لیا گیا جو اِن دنوں غیر معروف نہیں، اور پروفیسر آل احمد سرور سے اپنے رشتۂ تلمذ پر فخر کرتے ہیں۔

معلّمی کا پیشہ ایک زمانہ میں لنگڑی بادشاہی کہا جاتا تھا ــــ مجھے دو کم چالیس سال تیموری اقبال نصیب رہا، پلٹ کر دیکھتا ہوں تو کیا کم، گنوایا زیادہ کی حسرت اُبھرآتی ہے ــــ میرے سیکڑوں شاگردان میں، جو مجھے سامنے تصوّر کرکے یہ کہیں، پھر ترا درس ادب یاد آیا، چار پانچ سے زیادہ نہیں!

ہتھیلی کی خوب صورتی ناہموار انگلیوں کا قومی تناسب ہے ــــ پروفیسر سرور کے شاگردوں کی تعداد ہزار سے بالا ہوگی ــــ اِن کی یہ سرگزشت حیات کسی انگشتِ شہادت کا اشارہ نہیں کرتی۔ یہ بے اشارگی دانستہ تو نہیں؟

تذکیرِ رشید احمد میں مصنّف کی کم سخنی، مصلحت خیز نہ سہی، لیکن رشید پسندوں کو راس نہ آئے گی ــــ یہ ان کے اُس حُسنِ ظن کا خاتمہ کردیتی ہے جس کے ثبات اور زندگی میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی اور دو باوقار و بزرگ صدورِ شعبۂ اردو سے متعدد جاں فزا حکایتیں لپٹی ہیں۔

"خواب باقی ہیں" کی اشاعت کے فوراً بعد، ایک رشید نواز کا یہ طنزیہ اظہار، مسلم یونی ورسٹی کے ن وبرکات کی روشنی میں خار گلدستہ ہے:

"پروفیسر رشید احمد صدیقی نے علی گڑھ کو دل وجان سے چاہا اور آخری دم تک چاہتے رہے، لیکن علی گڑھ نے انھیں کیا دیا ۔۔۔؟
یونی ورسٹی کے شعبہ اردو سے سبکدوشی کے بعد انھیں ایک دن کی توسیع تک نہ مل سکی۔ ان کے انتقال (۱۵ رجنوری ۱۹۷۷ء) کے چودہ سال بعد بھی یہاں ان کی کوئی چھوٹی موٹی یادگار تک قائم نہ ہو سکی ..."

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور رشید احمد صدیقی میں عمر کا تفاوت تھا، مگر ان کی حسیت کی لافت اور فکر کی تازگی میں مماثلت تھی۔ دانت کاٹی روٹی کا ربط و ضبط تو نہ تھا، لیکن بات ملاقات ں ذہنی تحفظ اور تکلف حائل نہ ہوئے ۔۔۔ رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر ذاکر کو "مرشد" کہا کرتے ر ان کی پروفیسر رشید احمد صدیقی کو مرشد کی محبت سے محرومی بھی ملی ۔۔۔ اور یہ وہ زمانہ تھا جب روفیسر سرور لکھنؤ یونی ورسٹی میں اپنا استعفا نامہ داخل کر چکے تھے اور کسی جائے نو کے متلاشی تھے ں خاطر انھوں نے ڈاکٹر ذاکر سے ملاقات کی۔

"سید حسین ریسرچ پروفیسر کی ایک جگہ علی گڑھ میں" قائم ہونے والی تھی۔ ڈاکٹر ذاکر نے ہا "آپ اس جگہ پر آ جائیے۔ دو ڈھائی برس کے بعد رشید صاحب ریٹائر ہونے والے ہیں۔ اس ے بعد آپ پروفیسر اور صدر شعبہ ہو جائیں گے"... پروفیسر سرور نے ان سے فوراً کہا کہ غالباً شید صاحب کو آپ توسیع ضرور دیں گے۔ آپ کی تو ان سے پرانی دوستی ہے..." ذاکر صاحب نے ہ خیال خام کر دیا۔ کہا "... ان کی توسیع کا کوئی سوال نہیں ہے۔ میں تو عام طور پر توسیع ے خلاف ہوں..." (۱۵۷)

اور پروفیسر سرور نے بمشورہ ڈاکٹر ذاکر، شعبہ اردو جوائن کر لیا ۔۔۔ تقریباً دو برس بعد وہی ہوا۔ مرشد کی محبت کام نہ آئی۔ رشید صاحب کو توسیع نہ ملی۔ وہ ریٹائر ہو گئے شعبہ سے یہ یوں ٹوٹ گئے کہ جانے والا عزیزان ورفقا سے گلہائے عقیدت اور آنے والا، گلدستہ ستقبال سے نوازا نہ جا سکا۔ در باغ لالہ دوید و در شورہ یوم خس!!

پروفیسر آل احمد سرور کو "ادب سے تو عشق ہے ہی"! ساتھ ہی ان میں علم کی پیاس بھی ہے" ایک متعلم مفتوں کی عطش ناصبور!۔۔۔ پڑھنا اور پڑھانا ان کی عادت و پیشہ ہے اور روز و شب کا دل پسند مشغلہ۔ اسکول کے "زمانہ میں" بھی وہ "الہ آباد کا انگریزی اخبار "لیڈر" شوق سے پڑھا کرتے تھے"۔ ان کا مزاج عام اساتذہ اردو کا نہ تھا۔ عزلت پسندانہ مگر تفخرانہ" اپنے ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے علاوہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس پر بھی" پروفیسر سرور کی ہمہ دم نظر رہتی ہے۔

ان کا ارض المطالعہ نہ تنگ ہے اور نہ یک رنگ۔ یہ صرف مخزن ادبیات اردو اور انگریزی نہیں، کئی جدید علوم کا بھی گنجینہ ہے ۔۔۔ "دانش وری" پروفیسر سرور کا "طریقہ کار" اور

"ادب" اِن کا عشق ہے ـــــ وہ ادب، اس کی تاریخ اور تاریخ ارتقا، ہر پہلو پر نظر رکھتے ہیں۔ ادب کی سمت و رفتار کے ساتھ اس کے (ECALOGY) پر بھی توجہ دیتے ہیں۔ ان کی ساری ادب کی مجموعی ہیئت و ساخت کی سطح سے اس کی کلی اور آفاقی نشو و نما کا جائزہ لیتی ہیں۔ وہ ادب کے ماضی اور حال، حال پر مستقبل کے التزامات سے غفلت نہیں برتتے ـــــ وہ دیدہ ور معلم ادب ہی نہیں، ادب اور آداب کے پاس دار بھی ہیں۔

"خواب باقی ہیں"، مصنف کی بصری اور ذہنی استطاعت اور غیر عصبی استکشاف کا نمونہ ہے۔ مصنف، عاملین، مقدرت کے قد و قامت اور ادبا و شعرا کی قدر و قیمت کا اندازہ ایک ماہر علم نجوم کی طرح لگالیتا ہے ـــــ سیاسی و ثقافتی اور علمی و ذہنی معاملات کی تدبیر و تفہیم میں اس کی نگہ تمیز اور سلیقۂ نگارش معروضانہ اور غیر جارحانہ ہوتی ہے۔ ادبی مسائل کے اظہار میں بھی وہ خلوص و دیانت سے کام اور دل آزاری و تعرض سے پرہیز کرتا ہے شعر و نثر، اردو فکشن، تنقید و تحقیق، تعلیمی نصاب و نظام، ہر موضوع پر یہ کشادہ دل مصنف عالمانہ اور فاضلانہ تبصرہ کرتا ہے۔ پروفیسر سرور کی یہ روش یا راست روی کہ انھیں "اشخاص سے زیادہ ... اصولوں سے دلچسپی ہے" اور "مدح و قدح دونوں میں کچھ آداب ہیں" (۳۵۸) سوانح حیات میں کئی جگہ نمایاں ہے۔

شناسان سرور اور فدایان سرور کی کثرت، مصنف کی بے پایاں ہر دلعزیزی کی علامت ہے اس سوانح حیات کی اگر فرہنگ اسماء الرجال تیار کی جائے تو کئی صفحات کی ضرورت پڑے گی جس طرح پروفیسر سرور کا عرض المطالعہ نہ تنگ ہے اور نہ یک رنگ، اس طرح یہ کثرت انس یا کثیر العلائقی جلوۂ صد رنگ چمن ہے۔

وسیع اور مختلف النوع تعلقات کی یہ خصوصیت، اگر ایک طرف خلوص شہادت کا رہی ہے تو دوسری طرف ثبوت دل ستاں ـــــ احباب و آشنا اور اقارب و اعزہ کا یہ وسیع حلقہ ایک معمورہ نفوس ہے، پُر رنگ اور نیرنگ ـــــ یہاں مختلف مزاج و منہاج، وضع و قطع اور قامت و رغبت کے علاوہ ہر قماش اور ہر قبیلہ کے چیدہ نفوس کی اجتماعیت، نظارہ سلسلہ ہائے کوہستاں ہے۔

پروفیسر سرور شاعر بھی ہیں اور شاعری ابتدا ہی سے اِن کا کیف افزا چمن زار ہے۔ سوانح حیات میں جن سخن وران کا ذکر کیا گیا ہے۔ واسطہ محض رشتہ ملاقات اور بات نہیں، بلکہ انداز تعارف میں محاسن کلام کا اجالا بھی مدنظر رہا ہے ـــــ فہرست طویل مگر قابل توجہ ہے۔

آثر لکھنوی، اختر، جاں نثار، اصغر، افسر، حامداللہ، ثاقب، جذبی، جگر، جمیل مظہری جوش، حسرت، حفیظ جالندھری، خلیل الرحمن، راہی معصوم رضا، روش صدیقی، ساغر، سردار جعفری، سلام مچھلی شہری، سیماب اکبرآبادی، شکیل بدایونی، صفی

فانی بدایونی، فراق، مجاز، مخدوم محی الدین، ملا آنند نرائن، وحید، یاس عظیم آبادی، ثم لکھنوی۔

ہمارے یہاں کہانی کاروں کی تعداد، برساتی کیڑوں جیسی ہیبتات ہے اور ان کی شب شعلہ روی صبح دم لاشے کی تمثیل ــــ پروفیسر سرور ادبیات انگریزی سے اردو میں آئے غربی شہ پاروں یا عظیم تخلیق کاروں سے بیگانہ نہیں۔ لازما ہمارے ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کے لیے ان کی پیروشنی طبع برآں بلا ہوگئی۔ مقامی پسند قدروں کا کیا ذکر، تیز روشنی میں کئی بڑے بھی بونے ہو گئے۔

لیبل لگا کر صرف چھے تخلیق کاروں کا ذکر کیا گیا ہے جو بکے مال ہیں۔ کہتے ہیں:

"پریم چند کے بعد اردو کے چوٹی کے افسانہ نگاروں میں میرے نزدیک بیدی اور منٹو اور ان کے بعد عصمت اور کرشن چندر آتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر چوٹی کی ناول نگار ہیں، انھوں نے بعض جاندار افسانے بھی لکھے ہیں" (۳۲۱)

ویسے، بربنائے شنید و دید، ذاتی مطالعہ سے بھی کام لیا گیا ہے اور مزید چھے کا اضافہ ملتا ہے، اختر اورینوی، رشید جہاں، رضیہ سجاد ظہیر، شکیلہ اختر، قاضی عبدالستار اور عزیز احمد پروفیسر اختر احمد اورینوی سے مصنف کے دوستانہ مراسم تھے۔ پروفیسر سرور کی طرح پروفیسر اختر کی بھی ابتدائی کالجی تعلیم سائنس کی تھی ــــ مسلم یونیورسٹی کی سینیر لکچررشپ کے "انٹرویو میں دفار عظیم" کے ساتھ "اختر اورینوی" بھی ایک تگڑے کنڈیڈیٹ تھے (۲۷)

تنقید پروفیسر سرور کا راس المال ہے۔ یہ ان کا "یونی ورسٹی کے اساتذہ کا پیشہ ورانہ مشغلہ نہیں" یہ وہ مشغلہ "بوالہوسان بھی نہیں" جس کے ذریعہ متواتر تھرڈ کلاس انگریزی ایم اے کا ناکارہ طالب علم، ادبیات اردو کا معروف استاد اور چشم زدن میں اردو تنقید کا معتبر نقاد ہو جاتا ہے۔

انشا کی تازہ کاریاں تنقیدات سرور کو چشم بینا اور چشم بیمار بنا دیتی ہیں ــــ سوانح حیات میں ایسے اہل نقد و نظر مصنفین کا جن میں بزرگ اور خرد دونوں شامل ہیں، دیانت دارانہ ذکر کیا گیا ہے۔ ان دیدہ ورہ نماؤں میں سید مسعود حسن رضوی اور سید احتشام حسین کا نام بار بار آیا ہے یہ اس کے مستحق بھی تھے۔

ابواللیث صدیقی، احتشام حسین، احسن فاروقی، اختر انصاری، اختر رائے پوری، حامد حسن قادری، خلیل الرحمن اعظمی، خورشید الاسلام، سجاد انصاری، سجاد ظہیر، سلام سندیلوی، سلیمان اشرف، سلیمان ندوی، ظ انصاری، عبدالسلام ندوی، عبدالعلیم، عبدالقادر سروری، عبدالماجد دریابادی، عبداللہ، سید محمد، عزیز احمد، علی عباس حسینی، مجنوں گورکھپوری، محمد حسن، مسعود حسن رضوی۔

پروفیسر کلیم الدین احمد کا ذکر ضمناً ہے۔ یہ صرف ان کی کم سخنی سے تعلق رکھتا ہے۔ جو

پروفیسر سرور کی ان سے پہلی ملاقات کا پہلا تجربہ ہے ـــــ کہتے ہیں "پروفیسر کلیم الدین قلم کے مرد میدان تھے مگر ان کی بات چیت ہاں یا نہیں سے آگے نہیں بڑھتی"۔ (۱۹۱۔ ۳۲۴)

حقیقت برعکس ہے۔ مرحوم کلیم الدین احمد "قلم" ہی کے "مرد میدان" نہ تھے، ایک معلم صفت خوش بیاں تھے۔ پروفیسر سرور ناواقف نہیں کہ مرحوم کلیم الدین کا ادبیات انگریزی اور اردو کے علاوہ فرنچ لٹن اور عربی کا اچھا مطالعہ تھا۔ ان کی ملکی اور غیر ملکی تعلیمی زندگی کے دور میں مذکورہ بالا زبانیں اور ان کا ادب، ان کے خصوصی مضامین نصاب تھے۔

یہ مبالغہ نہیں کہ مشرق و مغرب کی کئی بزرگ زبانوں کی اعلا تخلیقات پر مرحوم کلیم الدین احمد کا مطالعہ فرسٹ ہینڈ تھا۔ یہ وہ آگہی کا اُجالا نہ تھا جس کی فراوانی فی زمانہ اردو کے لیے فتنہ، جہاں ہے بات سے بات نکلتی ہے، پروفیسر سرور "۱۹۵۴ء سے ۱۹۷۳ء تک ساہتیہ اکادمی" کے ممبر رہے۔ "اپنی وفات تک مولانا آزاد اس کے مشاورتی بورڈ کے صدر تھے اور ممبروں میں قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، نیز پروفیسر آل احمد سرور تھے۔ "مولانا آزاد کے انتقال کے بعد اس بورڈ کا کنوینر" پروفیسر سرور کو بنایا گیا۔ اس طرح پروفیسر سرور "کونسل کے علاوہ اکیڈمی کے اگزکٹو بورڈ میں اردو کے نمائندے کی حیثیت سے" بھی رہے (۲۴۵)

۱۹۷۳ء تک مرحوم کلیم الدین احمد کی نو دس اردو مطبوعات منظر عام پر آچکی تھیں۔ حیف! مرحوم کی نگارشات میں ضابطہ "تخلیقی شان" یا بے نام دیکھیے، اسلوب سے ان کی شناخت کی منفرد خصوصیت ساہتیہ اکاڈمی کے کنوینر یا کسی دوسرے اردو مبصر کو نظر نہ آئی ـــــ !! یہ تلخ حقیقت مصنف کی مذکورہ بالا چشم پوشی کو از خود اُبھار دیتی ہے۔!

تحقیقات ادبیہ پروفیسر سرور کا میدان نہیں۔ لیکن تحقیقی اور تاریخی کاموں سے کبھی ان کی دلچسپی مخفی نہیں۔ شعبہ اردو، علی گڑھ یونی ورسٹی کی یو۔ جی۔ سی کی مہتم بالشان مگر نامراد و ناتمام اسکیم "علی گڑھ تاریخ ادب اردو" کے وہ ڈائرکٹر تھے ـــــ اردو کے چند مستند اور ماہران تحقیق و تاریخ سے ان کے ذاتی روابط قائم رہے۔ سوانح حیات میں ان کاملین کی تذکیر مخلصانہ کی گئی ہے۔

امتیاز علی خاں عرشی، حامد حسن قادری، خلیق احمد نظامی، سید سلیمان ندوی، صباح الدین عبدالرحمٰن، سید عبدالحق (مولوی)، عبدالستار صدیقی، محی الدین قادری زور، مسعود حسن رضوی، مسعود حسین خاں، نجیب اشرف ندوی، نذیر احمد پروفیسر، نورالحسن، پروفیسر سید نورالحسن ہاشمی۔

تعجب ہے، اس سوانح حیات میں قاضی عبدالودود کا نام و نشان ہی نہیں ـــــ ایسی بات نہیں کہ مصنف، اردو کی اس قاموس شخصیت سے ناآشنا ہے ـــــ "علی گڑھ تاریخ ادب اردو" کی ایک اہم میٹنگ میں پروفیسر سرور نے بچشم خود قاضی صاحب کے مزاج کی تحقیقی سخت گیری کا ذاتی مشاہدہ کیا تھا جو کل شرکا کے لیے ایک حیرت انگیز تجربہ تھا ـــــ اس اہم میٹنگ کے کئی شرکا بفضلہ تعالیٰ حیات ہیں، جن کی زبانی میں نے اس مظاہرے کی تفصیلات سنیں۔

لازم تھا کہ اس رخ سے بھی ہوتا کوئی ذکر اُن کا۔

دانش وری کی عظمت، دانش اور دیانت کا مساوئلہ عمل ہے۔ یہاں عقل وخرد اور فکر نظر، فقط ذہنی یا عصبت سے ملوث نہیں رہتی ۔۔۔ "خواب باقی ہیں" میں پروفیسر کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود جیسے بزرگانِ ادب کی بے لوث خدمات سے مصنف کی یہ خاموشی، اس کی دانش وری میں عدم دیانت کا نمونہ ہے۔

سوانح حیات میں علی گڑھ یونی ورسٹی کے باوقار وباکمال اساتذہ کی تذکیر اس عقیدت و ارادت کی حامل ہے کہ با ادب باش، تا بزرگ شوی ۔۔۔ نام زیادہ نہیں، مگر ہر نام ضوفشاں ہے:

احسن مارہروی، حبیب پروفیسر خواجہ غلام السیدین، خواجہ منظور حسن، پروفیسر سلیمان اشرف، سید سر شاہ سلیمان، ضیاء الدین احمد بدایونی، ظفر الحسن، پروفیسر عبدالعزیز میمن، مولانا کرنل حیدر خاں، ہادی حسن، ڈاکٹر سید۔

سربراہ اچھے اور لئیق سربراہ کا انتظامیہ اس کی تجرباتی فہمیدگی اور پختگی کی ترجمانی کرتا ہے اور انتظامیہ کے Administrative pattern سے جامعہ یا ادارہ کا تشخص رونما ہوتا ہے۔ مسلم یونی ورسٹی سے پروفیسر سرور کا دوہرا تعلق رہا ہے، بحیثیت متعلم اور معلم، انھیں علی گڑھ کے مختلف المزاج سربراہوں کی کارکردگی کے عینی مشاہدے کے خاطر خواہ مواقع حاصل رہے۔ نہ معلوم کیوں، انتظامیہ کے طریق کار پر ان کی نگاہ طائرانہ بلکہ عامیانہ ہے ۔۔۔ ہاں، دو چار وائس چانسلر یا پرو وائس چانسلر، جن کے سرد وگرم ان کی ملازمت یا مستقبل پر اثر انداز ہوئے، ایسوں کی لیاقت پر نگہ تمیز وبہ تبصرہ دو چار زینے نیچے اتر جاتی ہے ۔۔۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کے بارے میں ان کا تجربہ تھا:

(۱) ... علی گڑھ کے بہت سے اشخاص کے ہیرو رہے ہیں، مگر ان کے علمی ریکارڈ اور علی گڑھ سے ان کی محبت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی میں ان کا معتقد نہ ہوسکا" (۲۰۱)

(۲) "انھوں نے علی گڑھ کا علمی معیار بلند کرنے میں علی گڑھ میں سیرت و اخلاق کی درستی میں، زندگی کی اعلیٰ قدروں کی ترویج میں کوئی دلچسپی نہیں لی ... وہ انگریز پرست تھے اور ان کا ذہن نو آبادیاتی تھا" (۲۰۱)

(۳) ڈاکٹر ضیاء الدین ادب دوب کے زیادہ قائل نہ تھے" (۸۷)

مذکورہ بالا نام کے علاوہ، چار نام ایسے ہیں جو بار بار ملتے ہیں، ڈاکٹر ذاکر حسین، ابوبکر حلیم علی یاور جنگ اور کرنل بشیر حسین زیدی ۔۔۔ تذکیر میں تواتر کا باعث غالباً یہ خیال رہا ہے، باید متاع نیکو از ہر دکاں کہ باشد ۔۔۔ اوّل الذکر، پروفیسر سرور کی کتاب زندگی میں بنفس خود باب عنوان ہو سکتے ہیں اگر ان سے متعلقہ بکھرے بیانات کو یک جا کر دیا جائے۔

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری، خوش بخت ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کو ہر دو مراتب حاصل تھے ۔۔۔ وہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے اس گوہر کے قدر داں تھے اور تا حیات پروفیسر سرور کے

محسن و مربی رہے۔

شعبہ اردو لکھنؤ یونی ورسٹی میں استعفا نامہ کے بعد مولوی عبدالحق نے پروفیسر سرور کو کراچی یونی ورسٹی میں "اردو پروفیسری کی پیش کش کی (۱۱۱)۔ اس وقت آل احمد سرور "پرینل نہ تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر ذاکر سے رجوع کیا۔ محسن نے دوٹوک کہا "آپ جانا چاہیں تو آپ روکوں گا نہیں۔ مگر مجھے محسوس ہو گا کہ میرا دایاں بازو ٹوٹ گیا۔"

پروفیسر سرور تذبذب میں تھے۔ دہلی جاکر مولانا آزاد سے ملے۔ انھوں نے کہا "بھائی آپ استعفا دینے سے پہلے مجھ سے مل لیتے"۔ پروفیسر سرور نے جواباً عرض کیا "آپ کے نزدیک میں نے استعفادے کر غلطی کی"۔ مولانا آزاد نے توضیح کی۔ کہا "نہیں میرے بھائی غلطی نہیں جلدی کی۔ بہرحال میں غور کروں گا کہ آپ کے لیے کیا ہو سکتا ہے..." (۱۵۶)

اس درمیان، سید حسن ریسرچ پروفیسر کی ایک جگہ علی گڑھ میں ہوئی اور پروفیسر سرور کو ڈاکٹر ذاکر حسین نے ایک سنّت نبوی سے محروم کر دیا۔۔۔ کھلے دل سے مصنف نے کہا ہے:

"ذاکر صاحب صرف وائس چانسلر ہی نہیں تھے۔ وہ علی گڑھ کی ذہنی زندگی کے رہنما تھے۔" (۱۸۲)

"ذاکر صاحب سے مل کر مجھے زندگی، تعلیم، تہذیب، مشرق، مغرب، علم و ادب کے اسرار و رموز کا بہتر علم ہوا" (۱۹۹)

لیکن یہ ذکر بھی دلدوز ہے کہ ڈاکٹر ذاکر کی اِس چاہ اور پروفیسر سرور کی نباہ میں ربط و ضبط کے باوجود، کیچڑ اور کنٹرول کا رشتہ دَر آیا۔۔۔۔ یعنی ڈاکٹر ذاکر کا ایک منفی رویّہ، پروفیسر سرور کی راج سبھا سے ممبری سے محرومی کا سبب ہوا۔

"جب ذاکر صاحب صدر ہوئے اور کچھ دن بعد ڈاکٹر تاراچند کی راج سبھا کی ممبری ختم ہوگئی تو پی این سپرو نے تاراچند کی دوبارہ نامزدگی کی سفارش کی اور یہ بھی کہا کہ اگر تاراچند نہ ہو سکیں تو سرور کو نامزد کیا جائے۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ اس پر بعد میں غور ہوگا۔ اس وقت آپ نورالحسن[1] کا نام بھیج دیجیے۔ وہ ہمارے آدمی ہیں۔ نورالحسن نے دراصل بھاسکر سے ربط ضبط بڑھا لیا تھا... چنانچہ ۱۹۶۶ء کے شروع میں نورالحسن راج سبھا کے ممبر نامزد ہو گئے اور پھر ۱۹۷۱ء کے اکتوبر میں تعلیم کے وزیر مملکت" (۲۲۳)

ڈاکٹر رادھا کرشنن، پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد سے پروفیسر سرور کا ادب آشنائی ثابت ہوا۔

صدر جمہوریہ ہند دوم سے وسیلۂ التعلق "اردو" تھی جس نے محمود و ایاز کو ایک ہی میں کھڑا کر دیا۔۔۔۔ مصنف کا بیان ہے۔

---

[1] ڈاکٹر سید نورالحسن، موجودہ گورنر مغربی بنگال (۲۲۳)

"رادھا کرشنن مجھ پر بڑی عنایت کرتے تھے۔ ساہتیہ اکاڈمی کے وہ نائب صدر تھے اور میں اگزکٹو بورڈ کا ممبر اور اردو کا نمائندہ، اس وجہ سے ان سے خاصا ربط ضبط ہوگیا تھا۔"(۲۲۱) بڑوں کی بڑی بات، یہ ربط ضبط، شرافت و شفقت کے اس سہرے پر تھا کہ ڈاکٹر رادھا کرشنن سے "ہمیشہ کمرے سے باہر آکر ملتے اور دروازے تک رخصت کرنے جاتے"۔

ذاکر صاحب کے نائب صدر ہونے کا واقعہ پروفیسر سرور نے خود ان کی زبانی سنا تھا لکھتے ہیں:

"۱۹۶۸ء کی بات ہے، ڈاکٹر تارا چند راج سبھا میں صدر کے نام زد کردہ تھے۔ رادھا کرشنن کے زمانہ تک صدر کو نامزدگی میں دخل ہوتا تھا... رادھا کرشنن مجھ پر بہت عنایت کرتے تھے۔ ساہتیہ اکاڈمی کے وہ نائب صدر تھے اور میں اگزکٹو بورڈ کا ممبر اور اردو کا نمائندہ اس وجہ سے ان سے خاصا ربط ضبط ہوگیا تھا ہمیشہ کمرے سے باہر آکر ملتے اور دروازے تک رخصت کرنے جاتے۔

انھوں نے مجھے بتایا کہ کس طرح ذاکر صاحب نائب صدر ہوئے۔ بڑے مزے لے کر انھوں نے کہا کہ جب صدر کے لیے میرا نام طے ہوگیا تو جواہرلال نہرو، لال بہادر شاستری کے ساتھ مجھ سے ملنے آئے اور نائب صدر کے نام کے سلسلے میں میری رائے دریافت کی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے ذہن میں کوئی نام ہے۔ اس پر جواہرلال نہرو تو خاموش رہے مگر لال بہادر شاستری نے مسز وجے لکشمی پنڈت کا نام پیش کیا۔

رادھا کرشنن نے بتایا کہ میں نے اس نام کی سختی سے مخالفت کی اور یہ کہا کہ وزیر اعظم کی بہن کو نائب صدر بنانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ لوگ کہیں گے کہ ہندستان ایک خاندان کی جاگیر ہے۔ اس پر لال بہادر شاستری نے کہا کہ وہ خود ایک ممتاز شخصیت ہیں۔ روس میں ہندستان کی سفیر رہی ہیں اور اقوام متحدہ UNO کی صدر۔ ان کی قومی خدمات سب پر روشن ہیں۔

رادھا کرشنن نے کہا مگر وہ وزیر اعظم کی بہن ہیں، اس لیے یہ نام مناسب نہیں۔ اس پر جواہرلال نہرو نے کہا کہ آپ کے ذہن میں کوئی نام ہے؟

رادھا کرشنن نے ذاکر صاحب کا نام لیا اور کہا کہ وہ ملک کے مسلمہ ماہر تعلیم ہیں تعلیمی کمیشن میں میرے ساتھ انھوں نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر رہے ہیں۔ ان سے بہتر آدمی نائب صدر کے لیے آپ کو نہ ملے گا۔

جواہرلال نہرو نے اس نام سے اتفاق کیا۔ اس طرح ذاکر صاحب نائب صدر ہوگئے"
(۲۲۱-۲۲۲)

پنڈت جواہرلال نہرو کو پروفیسر سرور کے کسی رسمی تعارف کی ضرورت نہ تھی ۔۔۔۔ پروفیسر سرور نے انھیں پہلی بار ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی کے ساتھ آگرہ میں دیکھا تھا۔ دوسری بار علی گڑھ میں ۔۔۔ غالباً دسمبر ۱۹۳۲ء میں اسٹریچی ہال میں جواہرلال نہرو کا لکچر تھا۔ اس جلسہ کی صدارت

راس مسعود نے کی تھی۔

"راس مسعود صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا کہ جواہر لعل میں تمھارا صرف اس لیے خیر مقدم نہیں کرتا کہ تم ملک کے ایک ممتاز رہنما ہو، بلکہ اس لیے بھی کہ تم میرے دوست موتی لال کے فرزند ہو" (۵۹۔۶۰)

جواہر لال نہرو سے پروفیسر سرور کی پہلی اور ذاتی ملاقات وہ تھی جب اردو اقلیت کی طرف سے وہ بشیر حسین زیدی کے ساتھ ان کی خدمت میں ایک میمورنڈم لے کر حاضر ہوئے تھے "اتفاق سے اس وقت نہر سوئز کا بحران سر پر تھا" لکھتے ہیں:

"ہم لوگ جب وقت مقررہ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ کرشنا منن پنڈت جی کے پاس بیٹھے ہیں اور کچھ ضروری امور پر گفتگو ہو رہی ہے۔ اس لیے انتظار کرنا ہوگا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد کرشنا مینن باہر نکلے اور ہم لوگوں کو اندر جانے کی اجازت ملی۔

پنڈت جی نے زیدی صاحب کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ "آپ تو کسی چھوٹے سے معاملے پر توجہ دلانے آئے ہوں گے۔"

انھوں نے کہا کہ "اس وقت ہم لوگ اردو کے مسئلے پر آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

زیدی صاحب کا یہ کہنا تھا کہ پنڈت جی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

کہنے لگے، "لعنت ہو اردو والوں پر اور لعنت ہو ہندی والوں پر، تیسری عالم گیر جنگ کا خطرہ ہے اور آپ لوگ اپنی ناک سے آگے دیکھنے کو تیار نہیں۔"

زیدی صاحب تو خاموش ہو گئے، میں نے ہمت کر کے کہا کہ "جناب والا ہم خواہ مخواہ نہیں آئے ہیں۔ پارلیمنٹ نے ایک کمیٹی اس غرض سے بنائی ہے کہ لسانی اقلیتوں کے مسائل پر غور کرے۔ اس کے متعلق اجلاس ہو رہے ہیں اور جلد ہی یہ رپورٹ پارلیمنٹ میں پیش ہوگی۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ اس موقع پر اردو کی حق تلفی نہ ہونے پائے۔"

بس ان کا غصہ فرو ہو گیا (۱۹۲۔۱۹۳)

مدبرانہ فراست اور حصول آزادی میں شدت عزم و عمل کے باوجود، جواہر لال نہرو کبھی کبھی تکلم و تقریر میں جذباتی ہو جاتے تھے ـــــ جے پور کی ایک عام میٹنگ میں اس موضوع پر انھوں نے ایک والہانہ تقریر کی جس میں جذباتی باریکی لاشعوری تھی ـــــ واقعہ یوں ہے:

"۱۹۴۵ء میں جے پور میں پی۔ای۔این کانفرنس تھی، پروفیسر سرور بھی اس کانفرنس کے ممبر تھے۔ انھیں اور رشید صاحب کو "اردو ادب کے میلانات" پر مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس میں پنڈت جواہر لال نہرو جو چند ماہ پہلے احمد نگر جیل سے رہا ہوئے تھے، شریک تھے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن اور مسز نائیڈو موجود تھیں۔ انگلستان کے مشہور ناول نگار ایم فارسٹر بھی تشریف لائے تھے"... مسز نائیڈو نے پروفیسر سرور کو" بتایا کہ یوپی میں پرشوتم داس ٹنڈن اور سمپورنانند اردو کے خلاف پروپیگنڈا کر رہے ہیں... تم جواہر لال نہرو کو صورت حال سے آگاہ کر دو۔"

"دوسرے دن جواہر لال نہرو سے ملنے کا وقت مقرر ہوا... جواہر لال نہرو کی شہر میں تقریر تھی... اس جلسے میں انھوں نے مہارانا پرتاپ سنگھ کے جذبۂ آزادی کی بڑی تعریف کی تھی۔"

پروفیسر سرور نے ملاقات میں "اردو کی صورتِ حال بیان کرنے سے پہلے پنڈت جی سے ایک سوال کیا۔ سنا ہے رات کی تقریر میں آپ نے مہارانا پرتاپ کی بڑی تعریف کی تھی۔ میں بھی آپ کے جذبۂ آزادی کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ مگر آپ سے یہ دریافت کرنا ہے کہ اکبر بڑا تھا یا مہارانا پرتاپ؟" [اپنی فکر کی باریکی کا اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر سرور نے جواہر لال نہرو سے کہا] پنڈت جی کا ذہن سوال کی تہ کو جا لگا۔ تھوڑی دیر خاموش رہے، پھر بولے "[آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اکبر زیادہ بڑا تھا"] (۱۱۸)

اندرا گاندھی سے بھی پروفیسر سرور کی کئی بار ملاقاتیں ہوئیں جو عموماً انجمن ترقی اردو کے کاموں کے سلسلے میں ہوئیں۔

ایک بار پروفیسر سرور ان سے ایک خاص مقصد سے ملے۔ لکھتے ہیں:

"جب وہ فاروق عبداللہ کو ہٹانا چاہتی تھیں تو کچھ دوستوں کے اصرار پر میں ان سے ملا اور اس بات پر زور دیا کہ فاروق عبداللہ کی حکومت کو نہ گرایا جائے۔ وہ عام طور پر دوسرے کی بات توجہ سے سنتی تھیں۔ مگر خود کم کچھ کہتی تھیں۔

اس بار جیسے انھیں اپنے دل کی بھڑاس نکالنی تھی۔ انھیں فاروق عبداللہ سے بہت شکایت تھی۔ اپنی بہو، مینکا گاندھی کی فاروق عبداللہ کی حمایت بھی انھیں ناگوار تھی میں نے کئی بار اس اقدام کے خطروں پر زور دیا، مگر وہ اٹل رہیں...

ذاتی طور پر ان میں بہت سی خوبیاں تھیں، ادب اور فنونِ لطیفہ کی قدر کرتی تھیں۔ ان میں طرح داری تھی اور دلداری بھی۔ آخر تک ان کے تبسم میں حیرت انگیز کشش تھی اور وہ اس کشش سے واقف تھیں۔

ذاکر صاحب نے ایک دفعہ بتایا کہ جواہر لال نہرو صدر سے مشورہ کرتے تھے۔ اندرا گاندھی صدر کو اپنے فیصلوں سے آگاہ کرنا کافی سمجھتی تھیں۔ سچ ہے، اقتدار آدمی کو آدمی نہیں رہنے دیتا... (۲۳۰-۲۳۱)

سیاست، بمعنی اکتسابِ قوت یا سیاسی بازیگری، پروفیسر سرور کا مزاج یا ذوق و شوق نہ تھا۔ تاہم قلندرانِ سیاست کے کرتب و کمال کی نظارگی سے لطف لینے میں انھیں انکار نہ تھا۔

سیاست، بمعنی اکتسابِ قوت یا سیاسی بازی گری، پروفیسر سرور کا مزاج یا ذوق و شوق نہ تھا۔ تاہم قلندرانِ سیاست کے کرتب و کمال کی نظارگی سے لطف لینے میں انھیں انکار نہ تھا۔

نئے ہندستان کی تقدیر بنانے میں متعدد سرفروشوں کا حصہ رہا ہے۔ ان میں کئی نام بصد عزت و احترام زبان پر آتے ہیں۔ دنیا ان کی بلندیوں سے ناواقف نہیں۔ ان بلند، اور بسیار بلند ناموں میں چند ایسی ہستیاں بھی ہیں جو عظمتِ ہند کی سر بہ فلک چوٹیاں ہیں اور جہاں وقت نزاع، دیوتا بسیرا کر لیا کرتے تھے ـــــ اقبال مند پروفیسر سرور کو ان ناموروں کی بزرگی یا بڑائی کا ادراک حاصل رہا ہے۔

سوانح حیات میں ایسے ارباب اقتدار اور مشاہیر سیاست کی طویل فہرست ملتی ہے:
" آزاد، مولانا ابوالکلام، ملّا آنند نرائن، اندرا گاندھی، بہادر یار جنگ، نواب، بھگوتی چرن ورما، تارا چند، ڈاکٹر، جناح، محمد علی، جواہر لال نہرو، چندر بھان گپتا، جھا گلہ، عبدالکریم، یوسف رحمٰن، مولانا، رادھا کرشنن، ڈاکٹر، رام منوہر لوہیا، سروجنی نائیڈو، سمپورنا نند، سندر لال، پنڈت، شیخ عبداللہ (بانی مسلم گرلس کالج، علی گڑھ) عابد حسین، ڈاکٹر سید، عبید الرحمٰن خاں شیروانی، عبیداللہ سندھی مولانا، عطاء اللہ شاہ بخاری، بجوال اندر کمار، نریندر دیو، آچاریہ، نواب رضا علی خاں، رام پور، نواب زادہ لیاقت علی خاں، نواب صدر یار جنگ، سردے ناتھ کنزرو، ہمایوں کبیر"
سردار خوشونت سنگھ راجندر سنگھ بیدی کی طرح، پروفیسر آل احمد سرور کے گہرے دوستوں میں ہیں ـــــ ایک بار انھوں نے پروفیسر سرور کو لکھا "تم زندگی کو ذرا زیادہ سنجیدگی سے لیتے ہو میں تو پھولوں سے، اچھی صورتوں سے اور اچھی شراب سے دل بہلاتا ہوں" (۳۵۰)
"خواب باقی ہیں" کا ذاتی نسخہ انھوں نے مجھے پڑھنے کو دیا تھا اور یہ کہتے ہوئے دیا کہ دیکھنا سرور نے اپنی آٹو بایوگرافی میں عشق اور شراب کا بھی ذکر کیا ہے یا نہیں۔
کچھ دن بعد، جب میں اس کتاب کا مطالعہ کر چکا تھا، خوشونت سنگھ نے یہی سوال پھر کیا میرا جواب منفی تھا۔ انھوں نے بے ساختہ کہا "ایسی آٹو بائیوگرافی کس کام کی جس میں مصنف اپنا ڈارک سائڈ نہ کھولے" ـــــ یہ ایک بڑے اور بلند پایہ صحافی کا ہی خیال نہیں، عام اہل ادب بھی کچھ ایسا ہی سمجھتے ہیں ـــــ میں اسے مصنف اور تصنیف ہر دو کا المیہ کہتا ہوں، اگر خود نوشت سوانح حیات میں فرد کی مخفی علتیں یا بے حیائیاں قلم بند ہیں۔
اچھی سرگذشت، بلا شبہ اپنے ظاہر و باطن کی روئداد ہے۔ اپنا نفس ہی نہیں، اس صنف میں اپنوں کے ستر نہاں بھی گرفت میں آ جاتے ہیں۔ والدین، بھائی بہن، عزیز وغیرہ سبھی حلقۂ عوام اظہار میں آ جاتے ہیں مگر ہر بات یہ کوئی یا کسی کی ہو، قابل بیان نہیں ہوتی، بالخصوص وہ جو محض بالذات مجرد ہو۔
کوئی شخص دودھ کا دھویا نہیں ہوتا، لیکن ذکر سپید و سیہ میں معروضیت کے باوجود التزام حیا ضروری ہے ـــــ پروفیسر سرور کہتے ہیں:

"اپنی پوری زندگی پر نظر ڈالنا، یعنی اس میں ڈوب جانا مگر اس سے ابھر بھی جانا، آسان کام نہیں" ـــــ غلط نہیں کہتے۔ زندگی پر نظر ڈالنا سمجھ داری کا تقاضا ہے۔ لیکن زندگی میں "ڈوب جانا" ہر کہ و مہ کا جگرا نہیں۔ پھر اس اتھاہ اندھیاری سے "ابھر بھی آنا" بے حد مشکل ہے ـــــ یہ تلاش ذات کا ہی مسئلہ نہیں، اپنے وجود کی بنیاد و ساخت اور مضبوطی و نمود کی دید و دریافت کا سوال ہے ـــــ خود نوشت سوانح حیات اس مساعی میں واحد صنف ہے جس میں مصنف اپنے کو کھول دیتا ہے۔ نجی خطوں میں بھی یہ آزادانہ اظہار ممکن نہیں۔

مگر اپنے کو کھول دینا، طشت از بام ہونا نہیں۔ جسم کی عریانی کا احساس مقدم ہے۔ ننگے جسم کی نمایش رسوا کن حقیقت نگاری ہوگی ـــــ لارڈ رسل، اس تمام ادب میں نہ صرف مادر زاد

ہونا پسند کرتا ہے بلکہ اپنے مخفی محسوسات کی تشریح و تشہیر پر فخر کرتا ہے۔ اس بے حیائی کی اجازت مغربی تہذیب نہیں دے سکتی ـــــ فی زمانہ یہ بات بتانے کی نہیں کہ غلاظت جسم کی دید یا شناخت کے لیے مناسب جگہ اچھی لیب ہے' ادب نہیں۔

"خواب باقی ہیں" کا مصنف آداب مشرق سے ناواقف نہیں ـــــ زندگی کے حسّاس گوشے کی ترجمانی جولب ورخسار یا بادہ وساغر کا فسانہ ہے' اس کتاب میں دو جگہ ملتی ہے۔

پہلا "مجملہ عیش" کی حکایت ہے ـــــ "حسن" پروفیسر سرور کی نظر و فکر کا مرکز ہے' ایک جذبہ بے اختیار۔ ان کی حیثیت ایک ذکی الحس شاعر اور جمال پرست شاعر کی لطیف و نازک حیثیت ہے۔ یہی حسن پسندی ان کی نگارشات اور شخصیت کو دلربا بنا دیتی ہے۔

پروفیسر سرور نے جب سے ہوش سنبھالا' ان کا دل اور دیدہ "حسن کا والہ و شیدا رہا ان کی چچی جو بڑی خوبصورت تھیں' یہ نئی بیاہی جب گھر آئیں تو ان کی خوبصورتی نے ننھے سرور کو مسحور کر دیا۔ انھیں دیکھ کر یہ بے خود ہو جاتے اور اکثر ان سے لپٹے رہتے ـــــ یہ عمر کی وہ منزل تھی جب سرور دس سال کے تھے۔ بچّے کی یہ غیر معمولی کیفیت ماں کو بری لگتی۔ "والدہ اس وجہ سے ان سے ناراض بھی ہوا کرتی تھیں" (۲۰)

انجانے جنسی معاملات کا پہلا علم آل احمد سرور کو مکتبی زندگی میں ہوا' کہتے ہیں :-

".. مکتب میں پہلی دفعہ بعض ایسی باتیں معلوم ہوئیں جن سے اس وقت بے خبر تھا۔ حافظ جی کے کہنے سے پہلے مجھ سے بڑی عمر کے لڑکے لڑکیوں اور لڑکوں کے متعلق بعض ایسی باتیں کہتے جن کا مجھے پہلے علم نہ تھا۔ کئی دفعہ بعض بڑی عمر کے لڑکوں نے مجھے بھی ورغلانا چاہا' لیکن خاندانی روایات کی وجہ سے بیں طرح گیا" (۱۹)

یہ آتش سرد' مگر ایک لذت غیر محسوس تھی' کیف گناہ ناکردہ ـــــ اسی زمانے کا ایک مشاہدہ انھوں نے ان الفاظ میں قلم بند کیا ہے :

"... ٹھیکے دار کی منظور نظر ایک عورت تھی جس سے سب لوگ مذاق کیا کرتے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ سب لوگ اس عورت کو کیوں چھیڑا کرتے ہیں.." (۲۱)

اور سرور اس خطرے سے ایک بار بال بال بچے ـــــ ان کے والد کے ساتھ ایک صاحب پوسٹ آفس میں ملازم تھے۔

"... ایک دفعہ جب وہ آئے اور میں گھر واپس آنے لگا تو انھوں نے مجھے لپٹا کر پیار کیا اور میرا منہ چوما۔ میں جلدی سے اپنے آپ کو چھڑا کر گھر آ گیا" (۲۳)

"اقبال کی طرح حسن نسوانی" پروفیسر سرور کی نگاہ میں "بھی بجلی ہے" ـــــ یہ اور بات ہے کہ انھوں نے اقبال کی پیروی نہ کی' اکلوتی پر اکتفا کیا۔ بیگم سرور' راحت سرور ہیں اور رفیق سرور بھی۔

بیگم سرور ان کی زندگی میں کوئی اجنبی یا انجانی لڑکی نہ تھی۔ یہ ان کی دیکھی بھالی تھی اور انھیں "اچھی لگتی تھی"۔ یہ "خاندان کے ایک ممتاز رکن' خان بہادر رحمن بخش قادری کی" بڑی صاحبزادی

ہیں ـــــ "جولائی ۱۹۳۵ء میں نسبت طے ہوگئی تھی۔ شادی کے "پیغام تو اور بھی تھے مگر" سرور صاحب کے "والدین نے" اور خود انھوں نے "یہی رشتہ پسند کیا۔"

اگلے سال برسات آئی اور آل احمد سرور کے لیے ابرِ نشاط لائی ـــــ "رخصت (رخصتی) سہ پہر میں ہوئی تھی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ شام ڈھلتے ہی حجلۂ عیش میں پہنچ جاتا" مگر ان کے ایک پرانے دوست "رضی الحسن چشتی" کباب میں ہڈی ثابت ہوئے۔ جب وہ واپس ہوئے تو شب دو نیم پہر میں انھیں "زنانے" میں جانے کا موقع ملا۔

شبِ وصل میری آنکھوں نے عجب اندھیر دیکھا ہے
نقاب اُن کا اُلٹنا، رات کا کافور ہو جانا

سرمستی نشاط سے مخمور سرور "نئی نویلی دلھن کو رام کرنے کے لیے دیر تک باتیں" کرتے رہے اور اس گفتنی و ناگفتنی میں "صبح اتنی جلد ہوگئی" ـــــ دلِ سرور کی بے قراری نہ پوچھیے "اگلی رات کا صبح سے انتظار کرتا رہا" (۲۰)

خواہش وصل کی یہ تڑپ، لذت وصل کی یہ خلش، جذبہ فطری ہے ـــــ یہ حکایت رنگین ہر شریف النفس شوہر کی طہارت شب اولین ہے۔ ایک ناقابل فراموش لذت خیز تجربہ جبلت!

دوسرا واقعہ سفر روس میں لینن گراڈ کی اس مجلس ناؤنوش کا منظر ہے، جس کی تشریح یا تفسیر یہ محاکاتی شعر ہے:

میں نے چکھا تھا کہ ساقی نے کہا جوڑ کے ہاتھ
آپ لِلّٰہ چلے جائیے مے خانے سے

واقعہ یوں ہے:

"... اگست ۱۹۶۰ء میں ماسکو میں انٹرنیشنل اورنیٹلسٹ کانفرنس کا اجلاس تھا (۲۱) "کانفرنس کے اختتام پر میں لینن گراڈ گیا... کانگریس کے آخری دن بابا عقورت، صدر استقبالیہ کی طرف سے لنچ تھا... یہ ڈیڑھ بجے کے بجائے ڈھائی بجے شروع ہوا کھانے کے بعد جام صحت نوش کرنے کا سلسلہ دیر تک چلا۔ کوئی دس جام صحت روسی میزبانوں، بیرونی ملکوں کے مہمانوں، عالمی امن، آفاقی مذاکرے کے اعزاز میں نوش کیے گئے ـــــ سامنے چھوٹے چھوٹے گلاسوں کی قطاریں تھیں۔"

ہم صحبت مسافر جیسے "لذت کام و دہن کی زیادہ پروا نہیں" ہوتی... ایک چھوٹا گلاس اٹھا کر پی گیا۔"

اس فعل بے اختیار کا بھری بزم میں یہ حشر ہوا کہ "گھونٹ لیتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ حلق سے کوئی چنگاری نیچے جا رہی ہے ـــــ سارا ہال ناچنے لگا"... "بھولا مندو ب "چکر اکر گرنے ہی والا تھا کہ" اس کے "برابر کھڑے شیو دھان سنگھ چوہان نے..." یہ حالت دیکھ کر اسے "کمر میں ہاتھ ڈال کر سہارا دیا... ـــــ اس گلاس میں پانی نہیں،

روس کا بہت تیز اور محبوب ترین مشروب تھا۔

اردو کے جہاں دیدہ اساتذہ تین چار سے زیادہ نہیں۔ ان میں پروفیسر آل احمد سرور کا نام پہلا ہے۔ ویسے مجازاً دنیا دیکھے ہوئے یا گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والے اردو کے اساتذہ کی کمی نہیں ——— "خواب باقی ہیں" کا سریع التاثیر حصّہ پروفیسر سرور کے وہ اسفار ہیں جن کی نوعیت بیرونی زیادہ مقامی کم ہے۔ کیوں کہ یہ اکیڈمک ہیں، تفریحی نہیں۔ یہ سفر ایک دیدہ ور معلم ادب کی تعلیمی و ثقافتی سیاحی ہے جس کی تاثیر محض مشاہدے کی باریکی، لطیف حسیّت اور تجربات کی نیرنگی سے دو آتشہ ہو جاتی ہے۔ یہ قلم بندیاں، روئداد، رپورتاژ یا سفرنامہ کی طرح ہنگامی کیف خیزی نہیں۔ ان باتوں میں آموزگاری ہے اور دانش وری بھی۔ ان میں نظارے کا "نہیں نظر کا لُطف"، جھلکتا اور چمکتا ہے۔

یہ سریع التاثیر اسفار، جن میں داستانِ کشمیر زیادہ ہے، "قاری کے لیے ایک بار دیکھا ہے، بار بار دیکھنے کی خواہش ہے" جو مسرّت و حسرت کا جذبہ اُبھارتی ہے ——— خوش طالع ہے یہ مسافر جسے اس فردوس بریں میں سے تین تین بار خاطر خواہ لطف اندوزی کے مواقع نصیب رہے۔ ہر سفر کشمیر کا بیان ایک خوب صورت اور مرقّع غزل کا حسن ہے، جس کا مطلع، حسنِ مطلع اور سہ مطلع لذّت مُکرّر رہے — اننت ناگ، بانہال کی چوٹی، بٹوٹ، پہل گام، جھیل وُلر، چشمہ شاہی، زوجلا، شالی مار باغ، سونا مرگ، شیش ناگ اور کھلن مرگ جیسے صحفِ فطرت کے شیرازے "ایک حسین یاد بن کر... برابر" پروفیسر سرور کے ساتھ رہی ہے۔ کشمیر کی ہر نظارگی پر انھیں یہ محسوس ہوتا جیسے "روح جسم کی قید سے آزاد ہو کر اس بساطِ رنگ و بو کی سیر کر رہی ہے" (۲۸۹)

اس جہاں دیدہ معلمِ اردو کے ادبی سرمایہ میں سفرنامہ کی کمی سرور پسندوں کے لیے ایک حسرت ہے ——— فطرت کی آغوش میں پروفیسر سرور کو راحتِ حیات ہی نہیں پیامِ زندگی بھی ملتا ہے۔ کہتے ہیں:

> "پہاڑوں سے مجھے شروع سے عشق رہا ہے... مجھے اُن کی آغوش میں سکون ملتا ہے طبیعت کو ایک شادابی حاصل ہوتی ہے۔ برف پوش چوٹیوں کا نظارہ روح کو پرواز پر مائل کرتا ہے۔ چٹانوں میں سے ہو کر تیز اور پُرشور موجوں کا سکڑنا، سمٹنا، پھیلنا اور آگے بڑھنا وجد میں لاتا ہے۔ اگر ندی پُرشور نہیں بلکہ ایک شیریں نغمے کے ساتھ ترل ترل بہہ رہی ہے تو ورڈز ورتھ کا یہ مصرع یاد آتا ہے۔ (Beauty born of murmuring sound)
> دیودار کے جھنڈ کے جھنڈ کہہ رہے ہیں کہ ہماری طرح تم بھی آسمان سے باتیں کرو۔ دریا کے کنارے دور تک خودرَو پھول رنگ اور خوشبو پھیلاتے ہیں۔ یہ نظارے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ جسم اور روح دونوں نے غسل کیا ہے۔ ذہن سے سارا زنگ دور ہو جاتا ہے۔ فطرت کا یہ حسن زندگی کا ایک طوفان عطا کرتا ہے کہ فطرت کی آغوش میں دَم لے کر ہم پھر آگے بڑھ سکتے ہیں۔" (۲۹۷)

ریاست کشمیر سے پروفیسر آل احمد سرور کا تعلق نہ صرف جذباتی بلکہ معاشی رہا ہے۔ وہ

کشمیر تین بار گئے اور آخری بار بہ سلسلۂ ملازمت برسوں رہے۔ جب انھیں "اقبال چیئر" کا گراں قدر عہدہ دیا گیا (۲۶۶)۔۔۔ اس طرح "اس خوب صورت ملک کی بدبختی سیاست کے گرم و سرد معلومات یا بجی معلومات پروفیسر سرور کے گہرے محسوسات کا جزو ہو گئے۔

زمانۂ تعلیم علی گڑھ میں، ممتاز ہاوس میں تین کشمیری رہتے تھے " مرزا افضل بیگ، غلام محمد صادق، اور غلام محمد چکن (۵۲)۔ آل احمد سرور کی ان کشمیری طلبہ سے " خاصی جان پہچان ہو گئی تھی" خواجہ غلام محمد صادق، مرزا افضل بیگ اور شیخ عبداللہ جیسے فرزندان کشمیر سے مصنف کی گہری راہ و رسم کی بات اس لیے تعجب خیز نہیں۔ قیام کشمیر سے یہ قرب و قرابت دامن دل ہو گئی تھی۔

پروفیسر سرور سے کشمیر کا ماضی پوشیدہ نہ تھا، حال ان کا عینی مشاہدہ تھا، شادمان مستقبل کی بشارت دوراز بصیرت کیوں رہتی؟۔ اس حساس مسئلہ پر پروفیسر سرور نے دوٹوک باتیں جرأت کے ساتھ لکھ دی ہیں:۔

۱۔ "میں ۷۵-۱۹ء میں کشمیر میں تھا۔۔ کشمیر میں کچھ جماعتیں اس وقت بھی ہندستان سے الحاق کے خلاف تھیں۔"

"خود ۱۵ اگست کو جس دن پاکستان کو آزادی ملی، وادی میں جا بجا چراغاں ضرور ہوتا۔ اگر پاکستان کی کرکٹ ٹیم ہندستان کی ٹیم پر فتح حاصل کرتی تو وادی میں بڑی خوشیاں منائی جاتیں"

"ادھر چند سالوں میں (فاروق عبداللہ) اور نیشنل کانفرنس کی مقبولیت کم ہو گئی ہے اور اب تو لوگ کھلم کھلا شیخ صاحب (شیر کشمیر) کی قیادت پر بھی اعتراضات کرتے ہیں۔ حال میں وادی میں بےچینی اور شورش بہت بڑھ گئی ہے" (۲۹۲)

۲۔ "کشمیری اتنے پاکستان نواز نہیں، جتنے ہندستان مخالف ہیں۔ ہندستان میں جب فرقہ وارانہ فساد ہوتے ہیں تو قدرتی طور پر کشمیری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے" (۲۹۳)

"کشمیری مسلمان جذباتی طور پر پاکستان سے الحاق چاہتے تھے، مگر شیخ صاحب نے (شیر کشمیر) کے اثر سے نیشنل کانفرنس نے ہندستان سے الحاق منظور کر لیا۔ قانونی طور پر مہاراجا ہری سنگھ کی الحاق کی درخواست کافی تھی مگر شیخ صاحب نے عوام کی نمایندگی کی حیثیت سے مہاراجہ ہری سنگھ کی تجویز کی تائید کی" (۲۹۱)

"اس سے پہلے نیشنل کانفرنس کے کچھ افراد، جن میں بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق بھی تھے، لاہور گئے تھے اور وہاں انھوں نے مسلم لیگ کے رہنماؤں سے بات کی تھی مگر اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلا (۲۹۱)

"قبائلیوں نے در پردہ، پاکستان حکومت کے اشارے پر کشمیر پر حملہ کر دیا۔۔۔ اور وہاں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ وہ سری نگر کے قریب بٹ مالو تک پہنچ گئے۔۔" (۲۹۱)

پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ بھی کہا تھا کہ کشمیر کے عوام "رائے شماری" کے ذریعے سے اپنی قسمت کا فیصلہ کریں گے" (۲۹۱)

"اس کے لیے پاکستان کو اس حصے کو خالی کرنا تھا جو آج "آزاد کشمیر" کہلاتا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوا" (۲۹۱)

"معاملہ اقوام متحدہ میں پہنچا، مگر رائے شماری کے لیے ہندستان کی جو شرط تھی، وہ پوری

نہ ہو سکی۔" (۲۹۱)

"شیخ عبداللہ کی حکومت یہاں بنی اور دستور میں دفعہ ۳۷۰ کے ذریعہ کشمیر کی خصوصی پوزیشن کو تسلیم کیا گیا" (۲۹۱)

"کشمیر کی قانون ساز اسمبلی نے تو ہندوستان سے کشمیر کے الحاق کی توثیق کر دی مگر آشتی کا جو وعدہ جواہر لال نہرو نے کیا تھا، اس کے لیے فضا ہموار نہ ہو سکی۔" (۲۹۱)

یہ تاریخ سیاست کے اوراق ہیں، کچھ صاف اور کچھ میلے ـــــ انمٹ صداقت یہ ہے جو پروفیسر سرور کہتے ہیں:

"کشمیر کی وادی میں ۹۵ فی صد مسلمان ہیں۔ لداخ میں بودھ کچھ اکثریت میں ہیں (۲۹۳)

اسی لیے تاکہ یہ سیاسی زخم، ملک اور مسلمان، ہندستانی قومیت، ہماری سیکولرازم اور ہند و پاک خوشگوار تعلقات کے لیے ناسور نہ بنے، اسی فکر و فراست کی ضرورت ہے۔ پروفیسر سرور واضح طور پر اس کا حل دیکھتے ہیں:

الف۔ "تینوں خطوں، لداخ، کشمیر اور جموں میں علاقائی کونسلیں قائم کی جائیں جو اپنے علاقے کے تمام معاملات کی دیکھ بھال کر سکیں۔

ب۔ ان علاقائی کونسلوں کے کام کی نگرانی ایک ریاستی کونسل کرے جو ہر

ج۔ علاقے کی آبادی کے لحاظ سے نمایندوں پر مشتمل ہو۔

د۔ پوری ریاست میں اندرونی خود مختاری ہو۔

ہ۔ ہمارا دستور وفاقی ہے۔

و۔ وفاق میں ریاستوں کو اگر اپنے اندرونی معاملات میں، اور آزادی دی جائے تو علاقے کے تشخص کی حفاظت ہو جائے گی اور پھر یہ تشخص ایک بڑے ملکی اور قومی تشخص سے ہم آہنگ ہونے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرے گا" (۲۹۳)

ان حالات و حقائق کی روشنی میں پروفیسر سرور کا یہ مشورہ سعیدان کی الفتِ کشمیر اور حُبِ ہندستان کا آئینہ ہے۔ کہتے ہیں اور واضح الفاظ میں کہتے ہیں:

"دانش مندی کا تقاضا ہے کہ ریاست کا جو حصہ ہندستان میں ہے، وہ ہندستان کے ساتھ رہے۔

"جو آزاد کشمیر کہلاتا ہے وہ پاکستان کا حصہ تسلیم کیا جائے۔

"جنگ بندی لائن کو بین الاقوامی سرحد مان لیا جائے۔

"ریاست جموں و کشمیر اپنی اندرونی خود مختاری برقرار رکھتے ہوئے ہندستان کے ساتھ ہو۔

"آزاد کشمیر پاکستان کے ساتھ رہے" (۲۹۴)

کشمیر کے فرزانے اس آتش نہاں سے واقف تھے جو قلب سرور میں سکون کشمیر کے لیے سُلگ رہی تھی۔ ستایش سرور میں انھوں نے وہ سبقت کی جو قابل ستایش ہے، یعنی

"ستمبر ۱۹۸۹ء میں کشمیر یونی ورسٹی کے کانووکیشن میں مجھے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری

سے سرفراز کیا گیا۔ میری خدمات کا یہ اعتراف میرے لیے قابل قدر ہے" (۲۹۵)

یہ سب اِدھر کی بات ہے۔ مخلصانہ اور حقیقت پسندانہ بات ہے ــــــ اُدھر کی بات سُنیے جس میں تلخ ماضی اور ناایک حال کا تجربہ ہے ــــــ سال گزشتہ، قیام اسلام آباد کے م مجھ سے ایک کھانٹی پاکستانی نوجوان سے اس مسئلہ کے حل پر بات ہوئی ــــــ مکالمہ کچھ ان ا میں تھا:

"اجی تین ڈبے لگوائیں، نمبر ایک ہندستان، نمبر دو پاکستان، نمبر تین کشمیر۔ ... وِدِٹ ڈلوائیں... دیکھو کون ڈبا وزن دار ہے"

"مگر یہ صرف ایک طرف؟" میں نے استفسار کیا۔ فوراً جواب ملا

"اجی نہیں۔ اِس طرف بھی۔ ویسے ہی تین ڈبے ... بنگلہ دیش بنایا جاسکتا ہے تو ہمارا کشمیر کیوں آزاد نہیں رہ سکتا؟"

پروفیسر آل احمد سرور ادب اردو میں بحیثیت شاعر آئے۔ انھوں نے شاعری تو دس گ سال کی عمر سے شروع کردی تھی، مگر اس زمانے کی غزلیں اور نظمیں ضایع ہوگئیں" (ا- "اس زمانے میں "نہ" ارشد تخلص کرتے تھے (۳۸)

"خواب باقی ہیں" کی وجہ تسمیہ ان کی ایک تاریخی نظم کا یہ شعر ہے:

مری سعی و نا سعی جنوں، سعی حنا بندی ہزاروں خواب ہیں پامال لیکن خواب باقی ہ

یہ نظم انھوں نے اپنی چھترویں سال گرہ پر جب ۱۹۸۶ء میں کشمیر میں ان کا آخری سال تھا تخلیق کی پروفیسر سرور کی شاعری کا پہلا نمونہ وہ اشعار ہیں جو ماموں کی اس ڈسیر پر موزوں ہو تھے جو "سٹرے تھے یا پکے رہ گئے تھے" وہ اشعار یہ ہیں:

مدت کے بعد ماموں نے کھلوائے آج آم کھانے کو زیادہ تھے وہ لے کم کھا کے رہ گئے

کھانا نہ ورنہ تھا ہمیں کچھ ان کے سامنے دنداں شکن تھے آم تو غم کھا کے رہ گئے

ان کی پہلی غزل "سینٹ جانس کالج آگرہ کی کالج میگزین" میں شائع ہوئی تھی د ان دنوں وہ اس کالج کے سکنڈ ایر میں تھے۔ اسی سال کالج میں "مجاز اور جذبی فرسٹ ایر داخل ہوتے تھے" جذبی اس وقت ملال تخلص کرتے تھے۔ دونوں ہوسٹل میں رہتے تھے طالب علم تو دونوں یوں ہی سے تھے، مگر ان کی شاعری اس وقت بھی کالج میں مقبول تھی

ڈاکٹر ضیاء الدین، وائس چانسلر سے پروفیسر سرور کی اچھی نہ تھی۔ شک رنجی یا کش کلام سرور کا سبب تھا" ۱۹۴۱ء میں یوم سرسید کے موقع پر، جو اس زمانے میں مارچ میں ہوتا تھا نے "علی گڑھ" پر ایک نظم پڑھی۔ اس نظم کا خاصا اثر جاری رہا اور ڈاکٹر ضیاء الدین کے حلقے میں لوگو اس پر بڑے اعتراضات کیے" وہ شعر یہ تھا:

کتنوں کو کیا باب حکومت پہ گدا اور تھی جن کی ضیاؤں سے نگاہوں میں جوانی

اس شعر سے نتیجہ یہ نکالا گیا کہ اس میں ڈاکٹر ضیاء الدین پر" وار کیا گیا ہے (۸۱-۸۲) مزید نقصانہ یہ ہوا کہ پروفیسر سرور نے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے اخبار "بیدار

لیے ایک مقالہ لکھا، عنوان تھا "سر سید کا حقیقی پیغام" اور علی گڑھ میں ایک ذہنی انقلاب کی ضرورت"
مقالہ کا اختتام انھوں نے اقبال کے اس شعر پر کیا ؎

میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

یہ طنزیہ شعر سوکھی لکڑی کے لیے دیا سلائی ہوگیا ـــــ رشید احمد صدیقی نے جب یہ مقالہ پڑھا تو مشورہ دیا ـــــ "اقبال کا جو شعر تم نے لکھا ہے، اسے نکال دو۔ اس پر فساد ہوگا" (۸۴) ـــــ سرورؔ صاحب نے "ان کی بات نہیں مانی اور مضمون" اشاعت کے لیے دے دیا۔

"جب وہ چھپا تو ڈاکٹر ضیاء الدین کے کچھ حواریوں نے، جن میں امین زبیری پیش پیش تھے اور انھیں کی ادارت میں ایک اخبار "تحریک" بھی نکلتا تھا، اس پر بڑا واویلا مچایا۔ انھوں نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ یہ ڈاکٹر ضیاء الدین کے خلاف ہے اور انھیں زاغ کہا گیا ہے۔" (۸۴)

ڈاکٹر ضیاء الدین پروفیسر سرورؔ سے "خفا ہی تھے... چنانچہ انھوں نے یونی ورسٹی اگزکٹو کونسل میں یہ معاملہ پیش کیا اور مناسب تادیبی کارروائی کی سفارش کی" (۸۴) ـــــ اے ؎ حلیم اُن دنوں پرو وائس چانسلر تھے۔ انھیں ہدایت دی گئی کہ "سرورؔ صاحب کو بلا کر کہہ دیں کہ آئندہ احتیاط کریں" (۸۵) ـــــ بقول مصنف "یہ غالباً ۴۳-۴۴ ۱۹ کا واقعہ ہے" اور ان دنوں وہ "شعبہ اردو میں لکچرر" تھے۔

"خواب باقی ہیں" میں شاعری کا مظاہرہ نہیں۔ ہاں موقع و محل کے بموجب وہ جا بجا مناسب اشعار سے مافی الضمیر کی ترجمانی کی گئی ہے۔ حالانکہ متعلقہ ابواب یا بیانات کو اپنے کسی شعر کا جاذبِ نظر مطلع عطا کو دینا اس ناشر شاعر کے لیے دشوار نہ تھا۔

پروفیسر سرورؔ نے اپنی شاعرانہ شخصیت پر کی گئی تنقید پر (۲۳۲) کہ انھوں نے "اپنی ادبی زندگی کا آغاز تخلیقی کاوشوں سے کیا اور اس میدان میں اپنی عدمِ استطاعت کا شعور ہو جانے کے بعد تنقید کا پیشہ اختیار کیا" مدافعت میں، مدلل اظہار کیا ہے۔

خواب سر سید کی تعبیریں روحِ عصر کے ساتھ بدلتی رہی ہیں ـــــ یہ اس دانش گاہ کے وجود اور اس کی جدلیاتی نمو کی روشن دلیل ہے ـــــ ماضی حال کے لیے سبق ہوتا ہے اور حال سے مستقبل کی بشارت ملتی ہے۔ کل جو تعلیمی نظریات یا عملیات ملک کے لیے نافع تھے، آج یہ نقائص سے خالی نہیں ـــــ انگریز کی تعلیمی پالیسی معیاری کم مطلبی زیادہ ہوتی تھی۔ یہ قوم سودے باز اور ہے۔ اسے برٹش انڈیا کے فطری مطالبات سے زیادہ، فکرِ جہاں گیری نے مستعد رکھا۔ اسی پروگرام کے بموجب تعلیمی پالیسی سنہرے فریم میں فٹ کر دی جاتی۔ پرانے فریم ملمع اُتر جانے کے باوجود جلد جلد بدلے نہ جاتے ـــــ وہ حالات اب نہیں۔ دنیا سمٹ گئی ہے۔ آبادیاں بوجھ ہو گئی ہیں اور یہ گراں باری اس کی تیز روی میں حائل ہے ـــــ اب ہر پانچ برس بعد اپنے آپ کو دیکھ کر ترقیاتی منصوبہ بندی کرنی پڑتی ہے ـــــ مسلم یونی ورسٹی کو بھی زمانہ جمہور اور اس کی جاہل اکثریت کا سامنا کرنا ہے۔

ماضی اور حال کے وسیع تناظر اور تجربات کے مدّنظر، ملک و ملّت کی اس مایہ ناز یونی ورسٹی کے مستقبل یا تیز رو متبدّل حالات کے بموجب پروفیسر آل احمد سرور کی اس دانش گاہ کی تعلیمی بنا بھی ناممکن نہ تھی ـــــــ!!

مصنف نے بڑی جرأت کے ساتھ کہا ہے:

"میں مسلمان ہوں ... میرا اسلامی تشخص میری روح کی ترجمانی کرتا ہے اور میں ہندستانی بھی ہوں اور یہ ہندستانیت بھی میری پہچان ہے۔ اسلام مجھے اس ہندستانی قومیت سے نہیں روکتا" (۳۴۱)

"مجھے تعلیمی مسائل سے شروع سے دلچسپی رہی ہے درس و تدریس میرا پیشہ ہی نہیں رہا، میرا عشق بھی رہا ہے۔ میں نے باون سال سے زیادہ اس کوچے میں گزارے ہیں۔.." (۳۴۶)

"میں علم کے گہواروں کو نفع کا کاروبار بنتے نہیں دیکھ سکتا۔.." (۳۴۹)

"تعلیمی ادارے اب تعلیم کے گہوارے نہیں ہیں، ڈگریوں کے کارخانے زیادہ"

"کتابوں کی دنیا اور روزمرہ کی دنیا میں خلیج بڑھتی جاتی ہے" (۳۴۵)

"ماضی پرست سیاست کی طاقت بڑھتی جا رہی ہے" (۳۳۱)

"ہماری اعلا تعلیم یک طرفہ ہوتی جا رہی ہے"۔

"کسی جمہوری نظام کی صحت کا معیار یہ ہے کہ اس میں اقلیتیں کس حد تک مطمئن ہیں"

مسلم یونی ورسٹی کے ایسے دیرینہ خادم، ایسے مخلص معلّم اور ایسے روشن خیال "مسلمان" کی ملک و ملّت کی اس تاریخی دانش گاہ کے مستقبل سے چشم پوشی باعث حیرت ہے ـــــــ مصنف کے اس تغافل پر وابستگان یا دلبران علی گڑھ کا اثر بے وجہ نہ ہوگا ـــــــ میں اس یونی ورسٹی کا طالب علم نہیں، مگر میرا ردّ عمل بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

علی گڑھ سے میری عقیدت یا د ماضی کی ایک صداقت سے وابستہ ہے۔ میں اہل صادق پور ہوں۔ صادق پور اور مہمات صادق پور سر سیّد احمد خاں کے محسوسات کا جزو تھے۔ مجاہدین صادق پور سے ان کے مراسم نہ صرف جذباتی بلکہ ذہنی تھے۔ مجاہدین صادق پور کے اعزہ و اقارب پر انگریز کا جو ظلم و ستم ٹوٹا، اس نے سر سیّد کے قلب کی دھڑکنیں تیز کر دی تھیں ـــــــ سیّد محمد حسن ذبیح عظیم آبادی بانی محمڈن اینگلو عربک اسکول (قائم شدہ مارچ ۱۸۴۴ء) سر سیّد کے قوّت بازو تھے۔ ان کی بے وقت موت پر وہ آٹھ آٹھ آنسو روئے [1] ـــــــ ذبیح عظیم آبادی میرے جدّ امجد کے صلبی رشتہ دار تھے۔

"خواب باقی ہیں" میں ایسی صبح کی بشارت نہیں ملتی جو مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج میں نئی صدی کی نسل کو نئے علم و ایمان کا عرفان عطا کرے ـــــــ بین الاقوامی نقشہ نہ سہی، مگر نظام تعلیم کے ایک نئے نقشے میں علی گڑھ یونی ورسٹی کو جگہ دینے کی فکر کو بنگے کا خواب نہیں۔

---

[1] سر سیّد احمد کی تعزیتی تحریریں" ڈاکٹر اصغر عبّاس،

مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کا پروفیسر آل احمد سرور کی تعلیمی اور تدریسی زندگی کے نکھار اور سہار میں وہی حصہ ہے جو رفقائے سرسید کی بقا میں سر سید احمد خاں کی رفاقت و الفت کا ـــــ پروفیسر سرور کہتے ہیں:

"۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۵ء تک کا علی گڑھ آج بھی میری آنکھوں میں پھرتا ہے" (۱۰۹)

مصنف نے ملک کی اس تاریخ ساز دانش گاہ کا وہ زمانہ بچشم خود دیکھا ہے جو تقسیم ہند کا دور سیاق و سباق تھا، ایک حکایت خون چکاں! ـــــ سیاسی مصلحت یا موافقت کے یہ ہیجانی ایام تھے جن کے لپیٹ اور لہر میں یونی ورسٹی کا وجود لرزاں تھا۔

یہ ظن غلط نہ ہوگا کہ اس دور الیم سے گزرنے یا اُسے گزارنے میں مصنف کی ابتلا دوسر درر مندان دانش گاہ سے، خواہ وہ لیگی ہوں یا کانگرسی، کم نہ تھی ـــــ "۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۵ء کا علی گڑھ" پروفیسر سرور کی اس خود نوشت سوانح حیات میں کوئی جگہ نہ پا سکا۔

تاریخ شاہد ہے کہ ملک کی تقسیم کاری میں پنڈت جواہر لال نہرو اور گاندھی جی کی فکری تبدیلی محمد علی جناح سے زیادہ تیز رَو تھی ـــــ کیا اُس دور کا علی گڑھ اس سیاسی بازیگری میں صرف تماشا بیں تھا؟ بات نازک سہی، مگر ذکر زیر لب میں کیا دشواری تھی؟

انسان ہونا یا بننا، مسلمان ہونے یا کہلائے جانے سے زیادہ مشکل ہے ـــــ ایمان کا علاقہ صرف دین نہیں، اس پر سماجی اور ماحولی اثر اندازیاں لازمی ہیں۔ سر سید احمد کا خیال تھا کہ دین چھوڑنے سے دنیا نہیں جاتی، لیکن دنیا چھوڑنے سے دین چلا جائے گا۔

دین اور دنیا کے اس اہم مخلوطی (Inter - fused) تعلق پر "خواب باقی ہیں" کا مصنف خاموش نہیں ـــــ وہ اس ہیجانی اور حساس زمانے میں بھی خدا کا نام بلا کھٹک لیتا ہے۔

پروفیسر سرور مسلمان ہیں۔ مذہب اسلام ان کا ارثی اور انسانیت اکتسابی علم ہے۔ اوّل الذکر، انھیں خاندان اور والدین سے ملا، ثانی الذکر مطالعہ اور تجربے سے حاصل ہوا۔ کہتے ہیں:۔

"ہمارے گھر میں خاصا مذہبی ماحول تھا۔ نماز پابندی سے پڑھنے کی تاکید تھی۔ . . میں فجر کی نماز قضا پڑھتا تھا یا گول کر جاتا تھا۔ والدصاحب کو دیر تک مطالعہ کرتے تھے، اس لیے وہ بھی صبح کو دیر میں اٹھتے تھے۔ ہاں روزے سارا گھر پابندی سے رکھتا تھا" (۲۷)

"خدا صرف رب المسلمین ہی نہیں، رب العالمین ہے"، کی تفہیم پروفیسر سرور کو انسان کے عالمی نقشے میں عظمتِ مسلمان کے مقام کی طرف مائل کرتی ہے۔ اسی لیے، قومیت کے نقطۂ نظر سے بھی وہ ہندی مسلمان کے حال و مستقبل کو مایوس یا تاریک نہیں سمجھتے۔ "اسلامی تشخص" ان کا خیال ہے، "کسی طرح قومی تشخص کی نفی نہیں کرتا" (۲۴۳) کہتے ہیں:۔

"میں مسلمان ہوں۔ . . میرا اسلامی تشخص میری روح کی ترجمانی کرتا ہے اور میں

ہندستانی بھی ہوں اور یہ ہندستانیت بھی میری پہچان ہے۔ اسلام مجھے اس ہندستانی قومیت سے نہیں روکتا... مذہب مجھے اپنا خاندان اور ماحول سے ملا، مگر میرے ذاتی مطالعے اور تجربات نے اس کی بنیاد کو مستحکم کیا..." (۳۴۱)

"خواب باقی ہیں" میں اسلام، تعلیمات قرآن اور ہندی مسلمان جیسے موضوعات پر اظہار خیال کا انداز منکرانہ اور مخلصانہ ہے جس سے مصنف کی الفتِ اسلام اور دینی آگہی کا ثبوت ملتا ہے یہ بات دوسری ہے کہ اپنے خیالات کو انھوں نے کسی جگہ آیاتِ قرآن سے محکم بنا نا ظہر احسن خیال کیا۔

روشن خیال علما اور باضمیر صوفیا کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے پروفیسر سرور نے غلط کار تصوف اور علما کی دینی کج نظری پر بے باکانہ اظہار کیا ہے۔ کہتے ہیں:

"صوفی سب انسانوں کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ ان کا عوام سے گہرا تعلق رہا ہے۔ بعد میں تصوف کبھی پیر پرستی، قبر پرستی اور اذکار و اشغال کے ایک لا متناہی سلسلے میں محدود ہوکر رہ گیا" (۳۴۱)

"علما شریعت کی حفاظت کی فکر میں لگے رہے۔ انھوں نے ظالم بادشاہوں کو من مانی کرنے دی کیوں کہ ان کے نزدیک ظالم حکمراں بھی گوارا تھا۔ بشرطیکہ وہ اپنے کو مسلمان کہتا ہو" (۳۴۱)

"صرف شہنشاہیت نے ہی اسلام کی روح کو نقصان نہیں پہنچایا۔ ان علما نے بھی جنھوں نے عقائد اور عبادت پر تو زور دیا لیکن معاملات کو نظر انداز کر دیا (۳۴۰)

"علما میں ایسے لوگ کم ہی ہیں جو موجودہ دور کے مسائل اور میلانات کا کما حقہ علم رکھتے ہوں" (۳۴۰)

"مسلمانوں کی رہنمائی صرف اب وہ علما نہیں کر سکتے جو قدیم سرمایہ علمی پر ہی نظر رکھتے ہیں" (۳۴۱)

"اسلام" کی بنیاد پروفیسر سرور کے خیال میں "قرآن کی تعلیم، سیرت رسولؐ اور صحیح احادیث ہیں"——— یہ خیال اسیرانِ فہم تصور پر مبنی ہے۔

صاف اور سادہ بات یہ ہے کہ بنیاد اسلام (Fundamentals in Islam) قرآنی تعلیمات کی روشنی میں، صرف تین ہیں: توحید اور رسالت اور آخرت ——— یہی تین مسلمان عقائد کا جوہر ہیں، وہ پختہ یقین کامل جس کی سچائی پر اس کی عصمت کی طرح ہمیں یقین کرنا چاہیے۔

یہ راسخ اور محکم عقیدہ یا ایمان، کائنات اسلام کا وہ سورج ہے جس کے پانچ ستارے نماز، زکات، روزہ، حج اور جہاد ہیں ——— "سیرت رسولؐ" یا "صحیح احادیث" اس راسخ اور عقیدہ کی تفہیم و تفسیر کا معاملہ ہے جہاں سے ایمانِ مومن یا احکام قرآنی، عمل و حرکت کی اختیار کرتے ہیں اور یہ اتباع سنت رسولؐ کی منزل ہے۔

اقبال کے حوالے سے پروفیسر سرور کہتے ہیں:

"اقبالؔ نے اپنے خطبات میں یہ بڑے پتے کی بات کہی تھی کہ رسول مقبولؐ پر وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اب انسانی ذہن آزاد ہے کہ اس کی روشنی میں نئے مطالبات کے ہجوم میں اپنی عقل سے کام لے"

یہ بات درست ہے۔ اسلامی نظام یا اسلامی معاشرہ کا یہی وہ کراس روڈ ہے جہاں پر "اسلام" اجتہاد کا دروازہ کھول دیتا ہے ـــــ اجتہاد کے سلسلے میں پروفیسر سرورؔ کا خیال ہے احکام قرآن کی صحیح توضیح نہیں۔ وہ مجتہد کے لیے دو شرائط اولاً "روح قرآن سے آشنا ہونا" ثانیاً "صحیح احادیث کے سرمایہ پر نظر رکھنا ضروری" سمجھتے ہیں ـــــ یہ پوری بات نہیں۔

قرآن، نئے مطالبات کے ہجوم میں اپنی عقل سے کام لینے سے پہلے، اقدام اجتہاد کے لیے تین باتوں پر انگلی رکھ دیتا ہے۔ اولاً، خدا، ثانیاً، ذات رسول، ثالثاً، اولی الامر۔

مجتہد کا مقام دراصل "مطاع" کا ہوتا ہے، وہ بندہ برگزیدہ، جس کی اطاعت قابل قبول ہے اور یہ بندہ برگزیدہ محض جیّد عالم دین نہیں ہوتا، عالم باعمل و باضمیر ہوتا ہے اور روح اسلام سے آشنا۔

اسی پس منظر میں پروفیسر سرورؔ نے "مسلم پرسنل لا" کی بات اٹھائی ہے ـــ کہتے ہیں:

"مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ خود مسلم پرسنل لا پر نظر ثانی کریں۔ اس کام میں حکومت کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔ جب اسلامی ممالک کے بعض علما نے اس سلسلے میں کچھ تجویز پیش کی تو مولانا آزادؔ نے ان تجاویز کا خیر مقدم کیا تھا اور ان پر غور و خوض ضروری قرار دیا تھا۔ اس وقت خوش قسمتی سے ہمارے درمیان مولانا سید ابوالحسن علی میاں جیسی عدیم النظیر اور بے مثال شخصیت ہے۔ پوری اسلامی دنیا میں مولانا کے علم کا لوہا مانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ابھی جسٹس ہدایت اللہ جیسے قانون داں بھی ہیں جو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس رہے ہیں۔ ان دونوں کی رہنمائی میں علما اور جدید دور کے عالموں اور اسکالروں کا مشاورتی بورڈ جلد سے جلد وجود میں آجائے اور وہ ہندستان کے مسلمانوں کے لیے وقتاً فوقتاً ہدایات جاری کرتا رہے تو ہماری ایک بڑی ضرورت پوری ہو جائے گی۔" (۲۴۲-۲۴۳)

"مسلم پرسنل لا" یا "ہندستان کے مسلمانوں کے لیے مشاورتی بورڈ" کی بات ہو، پروفیسر سرورؔ کی اسلامی فکر کی صحت یا صداقت پر شبہہ نہیں کیا جا سکتا ـــــ مگر حقیقت یہ ہے کہ فی زمانہ مسلمان محض پُتلا ہے، کاغذی لباس میں اور کچی مٹی کا پتلا۔

احیاے اسلام کی خاطر میں سمجھتا ہوں، جمہوریہ ہند میں، سیاسی سطح پر مذہب کے نام پر کوئی پارٹی نہیں بنانی چاہیے۔ ہم ہندو فرقہ پرستی کا مقابلہ مسلم فرقہ پرستی سے نہیں کر سکتے ـــ گاندھی جی کا مشورہ تھا کہ کانگریس، حکمرانی کے بجاے ملک میں سماجی اور معاشرتی کام انجام دے۔

گاندھی جی کا یہ خیال ہمارے طریقۂ کار میں مفید ہو سکتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ملک میں سماجی اور اصلاحی تحریک چلائیں۔ اسی مقصد یا مفاد کے لیے پارٹی بنائیں۔ وہ کام یا ایسا

نمونہ پیش کریں جو رسول اکرمؐ نے چالیس سال تک محض "انسان" بن کر کر دکھایا۔ اسلامی شناخت یا احیائے اسلام کی خاطر سیاسی کوششیں محض تسکینِ ہوس ہے یا جذبۂ تحصیلِ زر۔ دنیا "مسلمان" کی شناخت کر چکی ہے اور اسلامی کردار دیکھ چکی ہے۔

پروفیسر سرور کی دینی فکر میں اقبال کے علاوہ سید شاہ ولی اللہؒ کے حکیمانہ اور عارفانہ ادراک کا بھی بڑا حصہ ہے۔ گرچہ ثانی الذکر سے استفادہ کا ذکر نہیں۔ ان کا یہ بیان کہ:

"حقیقی اسلام اور تاریخی اسلام ایک نہیں... چند کو چھوڑ کر مسلمان بادشاہ، بادشاہت کے نمائندے زیادہ تھے، اسلام کے کم۔" (۲۴۱)

دراصل یہ سید شاہ ولی اللہؒ کی وہ فکر طبع زاد ہے جس کے باریک پہلو پر مولانا مودودیؒ جیسے وحید العصر عالم دین نے پہلی بار اہل اسلام کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ مولانا رقم طراز ہیں:

"جہاں تک مجھے علم ہے، شاہ صاحبؒ پہلے شخص ہیں جس کی نظر تاریخ اسلام اور تاریخ مسلمین کے اصولی فرق اور باریک فرق تک پہنچی ہے اور جس نے تاریخ مسلمین پر تاریخ اسلام کے نقطۂ نظر سے نقد و تبصرہ کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان بہت سی صدیوں میں اسلام قبول کرنے والی اقوام کے درمیان فی الواقع اسلام کا کیا حال رہا ہے یہ ایک ایسا نازک مضمون ہے جس کی پیچیدگیوں میں پہلے بھی لوگ اُلجھے رہے ہیں اور اب تک اُلجھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ کے بعد کوئی ایسا صاحب نظر نہ اٹھا جس کے ذہن میں حقیقی تاریخی اسلام کا، تاریخ مسلمین سے ایسا کوئی واضح تصور ہوتا۔"

("شخصیات" از مولانا مودودیؒ ۱۱۸)

پروفیسر آل احمد سرور کی ذہنی تربیت میں دینی قدریں، ان کے منصبی امور کے انجام یا احترام میں استوار رہی ہیں ـــــ مرحبا کہ سلامت روی ان مصدر اور راستی مسلک رہا ہے ـــــ "خواب باقی ہیں" میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں۔

ایک استاد کی حیثیت سے پروفیسر سرور کو بھی ان "موسمی کاموں" سے واسطہ پڑتا تھا جو بعد امتحان سعی و سفارش کی بھاگ دوڑ ہوتی ہے اور جو فی زمانہ یونی ورسٹی کے ہر شعبے میں عام ہے ـــــ مگر ان مواقع پر کالک سرور میں کچی رونما نہ ہوتی ـــــ ایک بار راجندر سنگھ بیدی ان سے ملنے علی گڑھ آئے۔ یہ پروفیسر سرور کے دوستوں میں تھے۔ دوست محبانہ ملے بیدی نے مقصدِ سفر بتایا۔ سرور کا ردِ عمل منفی تھا اور سائل نامراد لوٹا۔

اس فرض شناسانہ انصاف یا اصول کے چکر میں ایک بار پروفیسر سرور کی ذات اور ملازمت دو چکی کے درمیان ایک دال کی مثال ہو گئی تھی ـــــ مارچ ۱۹۴۵ء تا اگست ۱۹۴۶ء، پروفیسر سرور کی رام پور کی ملازمت کا زمانہ تھا۔ ریاست میں تعلیم کے فروغ اور معیار بندی کے پیش نظر انھوں نے وہاں چند بنیادی اور چند اہم وقتی مسائل کی طرف توجہ دی، جن میں پڑھائی،

تکمیل نصاب اور امتحانوں میں چوری پر سخت گیر رویّہ کا عزم و عمل تھا۔
۱۹۴۹ء کا سالانہ امتحان ہو رہا تھا۔ نواب آف رام پور کے ایک نوجوان اے ڈی سی میجر فاروقی نواب صاحب کی ہدایت پر ہائی اسکول کا امتحان دے رہے تھے۔ تیاری واجبی بھی نہ تھی اپنے پوزیشن کا غرّہ البتہ تھا ــــ اِدھر پرچہ ملا، اُدھر بے خوف و خطر میجر صاحب نے نقل نویسی شروع کر دی۔ الویجیلیٹر نے خبردار کیا، لیکن میجر کو کیا پروا، غلط کاری جاری رہی۔
پروفیسر سرورؔ امتحان کے نگراں تھے۔ چوری بلکہ دیدہ دلیری پر ان کی غیرت جھنجھنا گئی ــــ نقل کردہ کاپی چھین لی گئی اور ضابطہ کے بموجب کارروائی عمل میں لائی گئی۔
نواب صاحب کو خبر ملی کہ ان کے اے ڈی سی پر غلط الزام لگا کر انھیں ستایا گیا ہے۔ پروفیسر سرورؔ ایک اجنبی ولاچار ہستی اور حریف نواب صاحب کا میجر! ــــ معاملہ سنگین اور تیز ہو گیا۔ پروفیسر سرورؔ کی باز پرسی ہوئی ــــ انھوں نے صاف کہہ دیا کہ "صاحبِ اقتدار حضرات قانون کی زد سے باہر ہوں اور اس کا اطلاق صرف غریب اور کم حیثیت طلبہ پر ہو" یہ طریقہ کار ان کا شیوہ نہیں، وہ ایسی جگہ نہیں رہنا چاہتے۔
اتفاق وقت، سیّد بن صاحب اور بشیر حسین زیدی دونوں اِن دنوں ریاست میں سرکاری ملازم تھے۔ نواب صاحب کو سمجھایا گیا "سرورؔ صاحب نے جو کیا ہے وہ درست ہے۔ اِن سے باز پُرس کرنے کے بجائے ان کی اور تعریف کرنی چاہیے۔
"شہر میں کئی دن تک اس واقعہ کا پرچار رہا۔ نواب صاحب خاموش ہو گئے۔ میجر فاروقی کو" پروفیسر سرور کی " رپورٹ پر مزید دو سال تک امتحان دینے سے روک دیا گیا"۔ (۱۲۲)

پروفیسر سرورؔ عام طور پر سعی و سفارش کے قایل نہیں، مگر جب یہ دیکھتے ہیں کہ "کوئی باصلاحیت آدمی کسی ایسی جگہ کا امیدوار ہے جس کے لیے وہ ہر طرح موزوں ہے تو وہ "کلمہ خیر ضرور" کہہ دیتے ہیں۔ (۱۲۱) اور ان کا یہ "کلمہ خیر" کھاٹی سکّہ ہوتا ہے۔
اتفاقاً ایک ایسا ہی موقع سامنے آگیا ــــ "علی گڑھ میں تاریخ کے شعبے میں ریڈر کی ایک جگہ خالی ہوئی تھی" ــــ سیّد نورالحسن اِس جگہ کے خواہاں تھے اور کسی مضبوط سفارش کے جویا ــــ پروفیسر سرورؔ لکھتے ہیں:

"۱۹۴۹ء میں لکھنؤ یونی ورسٹی کی جوبلی کے موقع پر جواہر لال نہرو، حومی بھابھا، ذاکر حسین شیخ عبداللہ کو اعزازی ڈگری دی جانے والی تھی۔ ذاکر صاحب کی آمد کی خبر" ڈاکٹر نورالحسن کے لیے امید کی کرن ہوئی۔ انھوں نے پروفیسر سرورؔ سے ملاقات کی اور عرض کیا کہ اس جگہ کے لیے وہ ذاکر صاحب سے اِن کی سفارش کر دیں"

ڈاکٹر ذاکر سے پروفیسر سرورؔ کے گہرے روابط تھے۔ انھوں نے ہامی بھر لی اور سکّہ سرورؔ گوٹی لال کر دی۔ ڈاکٹر نورالحسن ۱۹۵۰ء میں ریڈر منتخب ہو گئے۔ چار برس بعد وہ ریسرچ پروفیسر ہوئے اور ۱۹۵۸ء میں پروفیسر اور صدر شعبہ ہو گئے۔

مگر، پروفیسر سرور کا یہ "کلمۂ خیر" ان کی معاشی زندگی میں وہ برق ثابت ہوئی جو آشیانۂ سرور پر آگری ـــــ یعنی، شعبہ اردو سے سبکدوشی کے بعد ان کی ملازمت کی ۱۹۷۲ء میں "دوبارہ توسیع نہ" کی گئی ـــــ کہتے ہیں:

۱۹۷۰ء میں مجھے ایک سال کی توسیع ملی تھی۔ اس توسیع کے لیے میں نے کسی سے کچھ نہ کہا تھا۔ میں اپنی جگہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ علیم صاحب مجھے عرصہ سے جانتے ہیں اور میرے کام سے بھی اچھی طرح واقف ہیں، اس لیے یہ سلسلہ ابھی چلے گا۔ مگر ہوا یہ کہ ۱۹۷۲ء میں ڈاکٹر نورالحسن نے، جو اس وقت وزیر تعلیم تھے، یونی ورسٹی کا نیا ایکٹ اس طرح نافذ کرایا کہ اس سے یونی ورسٹی کے اساتذہ طلبا اور عمتاز مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کو شکایت ہوئی... میں بھی اس ایکٹ کو غلط سمجھتا تھا، اور میں نے اس سلسلے میں "نیشنل ہیرالڈ" میں ایک مضمون بھی لکھا تھا... اس کو بدلوانے کے اور ۱۹۵۱ء کے ایکٹ کو ضروری تبدیلیوں کے ساتھ واپس لانے کے لیے یونی ورسٹی اسٹاف ایسوسی ایشن کے ارکان کے ساتھ وزیر تعلیم، وزیر اعظم اور صدر جمہوریہ سے بھی ملاقات کی...،

پروفیسر سرور کی یہ راست روی یا وضع داری ان کے "کلمۂ خیر" کی پاسداری کے باوجود انھیں راس نہ آئی ـــــ وزیر تعلیم ڈاکٹر نورالحسن نے اپنے محسن کا مطلق خیال نہ کیا اور بالفاظ مصنف:

"نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے دوبارہ توسیع نہ دی گئی ہو اور میں نے، ۲ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو ڈاکٹر خورشید الاسلام کو جو اس وقت سینیر ریڈر تھے، چارج دے دیا" (۲۵۳-۲۵۴)

لائق و فاضل مصنف کو اگر کبھی یہ احساس ہوا تو غلط نہیں کہ ؎

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

مرحوم رشید احمد صدیقی کا خیال تھا کہ اچھا شاعر اچھا انسان ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ ان کے ذاتی تجربات پر مبنی ہو ـــــ مجھے اس خیال سے اس حد تک اتفاق ہے کہ مزاج کی نفاست یا شرافت انسان کی رہائشی حسن سلیقہ سے ہی ظاہر ہو جاتی ہے۔ حسن اخلاق کی منزل دوسری ہے اور حسن نیت کا معاملہ خانقاہی ہے یا سیاسی۔

میری بیوی میں احساس جمال بیشتر خوب صورت بیویوں سے زیادہ، مگر مجھ سے بہت کم ہے چونکہ میرا مزاج، حسن کے اثر و عمل ہر دو سے مرکب ہے۔ میرے مزاج کے اس رنگ کا اندازہ ناواقف کار میرے تعمیر کردہ مکان (گیا) اور رہائشی حسن سلیقہ سے لگا لیا کرتے تھے ـــــ آج بھی میری بیوی اگر کسی خوب صورت صحن چمن اور خوب آراستہ ڈرائنگ روم سے محظوظ ہو جاتی ہیں تو مجھے ان کے احساس جمال پر شبہہ ہوتا ہے۔ انھیں مشورہ دیتا ہوں کہ اسے خاتون خانہ کی دلیل جمال پسندی یا مزاج کی نفاست کا ثبوت نہ قرار دو۔ کسی بہانے ان خاتون کا باورچی خانہ اور غسل خانہ دیکھ لو، پھر فیصلہ آسان ہو جائے گا۔

پروفیسر آل احمد سرور، خوش رو، خوش قامت، خوش لباس اور خوش بیان ہیں۔ ان کی شخصیت اور نگارشات کی دلآویزی کا اگر ان کے مکان اور انداز رہائش سے مقابلہ کیجیے، تو یہ

قشہ اُبھر آئے گا۔

اک طرف گلزار تابان اک طرف شفق اُجاڑ

در بہ حمد بے اختیار زبان پہ آ جائے گی ؎

جیسے چاہے جیسا بنائے تو تری شان جل جلالہ ہو'

پروفیسر سرور کو اپنی اس رہائشی بے رونقی کا خود بھی احساس ہے۔ کہتے ہیں:

"بیوی کے اصرار پر ۱۹۷۴ء کے شروع میں مکان کا نقشہ بنوایا۔ زمین بہت پہلے دودھ پلے میں لے لی تھی... ۱۹۷۵ء کے شروع سے مکان کی تعمیر شروع کی... مکان خاصا بڑا بنوالیا مگر بیوی کی خواہش کے مطابق باغ نہ لگا سکا۔ میرا مکان اب بھی نہ تو جدید سہولتوں سے آراستہ ہے اور نہ خوب صورت کہا جا سکتا ہے..." (۲۵۷)

"... بیوی کی خواہش کے مطابق باغ نہ لگا سکا..." بظاہر سرسری اظہار ہے، مگر یہ تحت شعور کے اس عملِ مثبت کو ظاہر کر رہا ہے جس کے اقدام و اتمام میں بیگم سرور کا حسنِ رشکِ چمن' مانع رہا ہے ـــــ حسن زلفِ دوتا، کی بات دوسری ہے، کوئی حسن نواز شوہر' دو بالمقابل حسن خانہ کی تاب نہیں لا سکتا' جب کہ مزاج کا یکتی عمر میں بھی یہ حال ہے کہ"... آج بھی اچھی صورت پر نظر ٹھہر ہی جاتی ہے۔" (۳۵۴)

سرگذشت حیات میں کوائف و افکار کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ نکتہ خیز اور معلوماتی تحریریں قاری کے لیے کیسہ معافی ہوتے ہیں' سود مند اور سُرور بخش' جو اسے علم و ادراک کی دولت دیتے ہیں۔

اس صنف کے اس اہم پہلو کا اشارہ پروفیسر آل احمد سرور نے شروع ہی میں کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ خودنوشت تاریخ نہیں" اور نہ اسے" واقعات کا خشک بیان" ہونا چاہیے بلکہ" ان واقعات کے ساتھ جو کیفیات وابستہ ہیں" اور" ان واقعات نے کیا تاثرات اور کیفیات عطا کی ہیں" ان کو بھی ضبط تحریر میں لایا جائے۔

مصنف کا یہ خیال درست ہے مگر، کوائف و افکار کی فن کارانہ پیش کش میں اس ضابطہ کا احساس مقدم ہے کہ ان "کیفیات" کو تجربوں اور مشاہدوں کا جزو ہو جانا چاہیے۔ یہ "واقعات" میں اِس طرح تحلیل ہو جائیں کہ ان کا تجرد فنا ہو جائے۔ دورانِ مطالعہ' واقعات رواں مسلسل کے ساتھ' ہر جگہ یا اپنے سیاق و سباق سے اس طرح وابستہ رہیں کہ تسلسل بیان میں یہ مطلع صبح ہو جائیں ـــــ اس فن کارانہ قلم بندی سے قاری کا ان نکتہ خیز اور معلوماتی تحریروں سے دفعتاً سامنا ہوتا ہے اور یہ مقام اس کے لیے ساعت لطف و سرور ہوتی ہے۔

پروفیسر سرور کے "تاثرات اور کیفیات" ذاتی تجربہ و مشاہدہ کا نچوڑ ہیں۔ ان کی حسیت لطیف اور گہری ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع اور متنوع ہے اور نگاہیں دوررس۔ ان کے کوائف و افکار میں ایک جہاں دیدہ اور دیدہ ور مصنف کی شادابی اور درخشانی ہے ـــــ نہ معلوم کیوں، ان رموز و نکات کی ترجمانی یا تنصیب میں انھیں زینت نگارش نہ بنایا گیا'

بلکہ تصنیف کے آخر میں "حرف آخر" کے زیر عنوان ان کا اندراج ہوا ــــــ یہ کیفیات" لازماً مجرد و سالم ہو گئی ہیں، زائیدہ "واقعات" نہیں۔ واقعاتی روانی اور تسلسل سے بے تعلق ہو کر یہ اخلاقی اور اصلاحی اسباق ہو گئی ہیں۔

"خواب باقی ہیں" میں کوائف وافکار کی فن کارانہ پیش کش کے نمونے کم ہیں ــــــ فکر انگیز اقتباسات کے چند نمونے قاری کو دعوتِ غور و خوض دیتے ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور کی با برکت زندگی، ان کی جاں نثارانہ اور فرض شناسانہ محنت و ریاضت کا ثمرہ ہے ــــ ان کی کامرانیاں اور سرفرازیاں طفیلی نہیں، یہ حاصل اکتساب و استعداد ہیں۔

"اس عالم میں بھی جب آدمی کی عمر خاص ہو جائے" ان میں "کوئی ایسی امنگ نہیں جو ہر دم" انھیں "دنیا میں آگے بڑھنے اور کئی سیڑھیاں چڑھنے پر اکسائے" (۳۵۸) وہ بندۂ لا حرص و ہوس ہیں۔

نہ جانے کیوں، پروفیسر سرور کو یہ احساس کیوں ہے کہ ان کی "خدمات کا وہ اعتراف نہیں ہوا جو ہونا چاہیے تھا" ــــ غالباً یہ احساس ہندستانی سائیکی کا زائیدہ ہے۔

ہندو دیو مالا میں لکشمی اور درگا کو جو مقام یا پذیرائی حاصل ہے، سرسوتی اس سے محروم ہے۔ ہماری تہذیب بھی کچھ ایسی ہی بادی النظری کی حامل ہے ــــ اولیا اور فقرا کی بات دوسری ہے، بادشاہوں اور حکمرانوں کی ان کے جیتے جی جیسی قدر و منزلت کی جاتی رہی ہے علما اور حکما کی ویسی عزت کہاں؟

مثالیں ہر صبح و شام ملتی ہیں کہ سیاست گری بہ مقابلہ دانش وری بے حد ارزاں ہے۔ پبلک میڈیا ہر تیسرے وچوتھے درجے کے سیاسی نیتا کے ساتھ فراخ دلانہ اور والہانہ سلوک برتتا ہے، جب کہ صفِ اول کے اہلِ علم و دانش کو بھی وہ کوریج نہیں ملتا۔

اسپ تازہ شدہ مجروح بہ زیر پالاں
طوق زریں ہمہ در گردن خیر می بینم

دستور زمانہ ہے، ورنہ جدلیاتی عمل کو بریک لگ جائے گا ــــ پروفیسر سرور کو ملال کیوں؟

"خواب باقی ہیں" کے ابتدائی اوراق سے قاری کا پہلا تاثر یہ ہوگا کہ مصنف نے اپنی تعلی زندگی کی امتیازی کامرانیوں اور ہنگامی اعزازات کا اظہار، برملا اور بلا تامل کیا ہے ــــ یہ کتاب میرے مطالعہ میں دوبارہ آئی، اولاً، سردار خوشونت سنگھ کو پیش کردہ ان کی ذاتی کاپی کچھ دن زیر مطالعہ رہی۔ انھوں نے اس کے ابتدائی اوراق کو بغور پڑھا تھا اور یہاں وہاں کتاب پر قلم سے نشان لگا دیا تھا۔

یہ وہ کھلے بیانات ہیں جو فخر و مباہات سے بے داغ مگر سلف پروجکشن سے داغ دار ہیں۔ ترتیب وار مثالیں مندرجہ ذیل ہیں۔ ان تفصیلات کا اندراج کیا ضروری تھا ــــ؟

"۱۹۲۱ء میں بیلی بھیت کے اسکول میں تیسرے درجے میں میرا داخلہ ہوا۔ اپریل میں سالانہ امتحان ہوا... کلاس میں دوسری پوزیشن آئی..." (۲۰)

"میرا اکتوبر ۱۹۲۱ء میں چوتھے درجہ میں گورنمنٹ ہائی اسکول بدایوں میں داخلہ ہوا ...
ششماہی امتحان دسمبر میں ہوا ... میری فرسٹ پوزیشن تھی ..." (۲۱)

"چند روز بعد میرے سالانہ امتحان کے نتیجے کا اعلان ہوا اور میں فرسٹ آیا" (۲۱)

"سیتا پور سے میں نے پانچویں درجہ کا امتحان پاس کیا تھا" (۲۳)

"یاد رہے کہ اس سال میں نے چوتھے درجہ کا امتحان پاس کیا تھا" (۲۴)

نویں درجہ کا سالانہ امتحان ہوا تو ... میری کلاس میں تیسری پوزیشن آئی ..." (۳۳)

"دسویں درجہ میں سہ ماہی امتحان میں فرسٹ آیا ..." (۳۴)

" ۱۹۲۸ء میں میں نے ہائی اسکول کا امتحان دیا ... مجھے سکنڈ کلاس ملا" (۳۷)

"میرا داخلہ سینٹ جانس کالج آگرہ میں فرسٹ ایر سائنس میں ہوا ... امتحان ہوا تو میں آرٹس
اور سائنس دونوں میں انگریزی میں فرسٹ آیا۔ ٹامس اسکالرشپ ملا" (۳۹)

"انگریزی پروفیسر مہاجن سے پڑھی ... انھوں نے ششماہی امتحان میں مجھے ڈیڑھ سو
میں ۱۱۳ نمبر دیے اور بھری کلاس میں میری بڑی تعریف کی ..." (۳۹)

"جنرل نالج کا ایک امتحان، آرٹس سائنس اور کامرس کے چار سالوں کے طلبہ کا ... میں نے
بھی امتحان دیا۔ میرے سو میں سے ۹۶ نمبر آئے اور پوری کلاس میں فرسٹ آیا" (۳۹)

چہ حاجت است بشاطر رُوے زیبا را؟ ـــــ یہی وہ "غیر اہم" اور "معمولی باتیں"
ہیں جو بقول مصنف اس داستان حیات میں "راہ پا گئی ہیں" ـــــ (۹۱)

ابن فرید
بیت القائلہ
زینہ غیاث خاں، رام پور

پچھلا ورق

"مسٹر! یہاں سے وہاں تک پنشاخہ ہاتھ میں، گیٹ کے باہر دکھائی دیجیے گا۔ کیا سمجھے آپ؟" یہ تھی برافروختگی کے عالم میں ڈاکٹر سید جعفر حسین صاحب مرحوم کی دھمکی۔ مطلب یہ تھا کہ تم اپنی اس گستاخی پر کالج سے خارج RUSTICATE کر دیے جاؤ گے۔ اخراج کا کاغذ تمھارے ہاتھ میں ہوگا اور تم گیٹ کے باہر کھڑے نظر آؤ گے۔ ڈاکٹر سید جعفر حسین صاحب مرحوم کی اس دھمکی سے سب ہی ڈرتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کے سامنے فریاد بھی کر سکے، استعفا ہر وقت ان کی جیب میں رہتا تھا اس لیے پرنسپل صاحب تک ایسا موقع نہ دیتے تھے کہ اُن کی ناگواریِ خاطر ہو۔ یہ تھے مرزا محمد ہادی رسوا مرحوم کے شاگرد۔ آکسفورڈ سے تیسرے ہندوستانی اور پہلے مسلمان ڈی لٹ۔ عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن، یونانی، لاطینی نہ معلوم کتنی زبانوں پر ماہرانہ عبور رکھنے والے سراپا علم و دانش! کوئی لکھے تو ان کے حالات پر ایک دفتر تیار ہو جاتے۔ میں نے عرض کیا کہ قبلہ آپ اردو بولتے، لکھتے اور پڑھاتے ہیں۔ پھر اسے زبانوں میں کیوں شریک نہیں کرتے! کہنے لگے، "مسٹر اردو بھی کوئی زبان ہے۔ عربی، اور فارسی نے دامن جھاڑ دیا تو اردو بن گئی۔ اُن سے یہ کہنے کی ہمت کم از کم مجھ میں تو تھی نہیں کہ یہ آپ کی زیادتی ہے۔ ایک بار بہت اچھے موڈ میں تھے۔ کہنے لگے: جانتے ہیں مسٹر میرا یہاں تقرر کیوں ہوا تھا! پورا کلاس ہمہ تن گوش تھا۔ بولے، جب میرے استاد مرزا محمد ہادی رسوا نے کالج سے سبکدوشی حاصل کی تو پرنسپل نے اُن سے "درخواست" کی ہمیں اپنا بدل فراہم کیجیے۔ مرزا صاحب مرحوم نے کہا کہ میرا بدل پورے ہندستان میں صرف ایک ہی ہے اور وہ سید جعفر حسین ہے۔ پھر انتہائی مسرت محسوس کرتے ہوتے کہا۔ مسٹر استاد نے یہاں لکھنؤ کرسچین کالج میں چودہ مضامین پڑھاتے ہیں لیکن ان کے اس خادم نے صرف گیارہ مضامین پڑھاتے۔ ہم نے کہا، کیا انھوں نے سائنس اور کامرس بھی پڑھائی تھی! جواباً فرمایا۔ انھوں نے ہی نہیں ان کے اس خادم نے بھی پڑھائی ہے۔ ان کی سبقت یہ تھی کہ انھوں نے سنسکرت اور ہندی بھی پڑھائی تھی۔ میں ان زبانوں سے نابلد ہوں۔ ایک بار، جب وہ اقبالؒ کی منظومات پڑھا رہے تھے کہ "جبرئیل و ابلیس" کے ایک شعر پر اٹک گئے۔

"جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات' اُس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لاتقنطوا"
کہنے لگے مسٹر! اقبال کو عربی نہیں آتی تھی۔ انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ صیغۂ امر تقنطوا نہیں، اقنطوا ہے۔ اسی طرح "مسجد قرطبہ" کے اس شعر پر شدت کے ساتھ اعتراض کیا:

مردِ سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لاالٰہ سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لاالٰہ

مسٹر! یہاں سے وہاں تک، میں جانتا ہوں کہ اقبال کافر نہیں تھا۔ اسی لیے میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کروں گا کہ لاالٰہ کے بغیر لاالہ کہنا کفر ہے اور یہ تو سراسر کفریہ کلمہ ہے۔ علم کا موجود اور فقر کا موجود اور اشھد ان لاالہ، اشھد ان لاالہ۔ ایک طالب علم نے مدافعت میں کہا، سر یہ تو پورے کلمہ کی طرف اشارہ ہے۔ انھیں ضرورتِ شعری کے تحت نامکمل رکھا گیا ہے۔ مرحوم نے فوراً گرفت کی، تو مسٹر کیا آپ یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ اقبال کے یہاں عجز کلام بھی ہے۔

ایک بار جب نثر پڑھا رہے تھے، سرسید احمد کا مضمون ان کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ مضمون تو کیا پڑھایا سرسیدؒ اور علیؔ گڑھ تحریک کے حالات و کوائف بیان کرنے لگے۔ درمیان میں کسی طالب علم نے سرسیدؒ پر کوئی تنقید کر دی۔ خفا ہوگئے، کہنے لگے: مسٹر! آپ جانتے ہیں کس کی شان میں آپ گستاخی کر رہے ہیں۔ وہ صحیح النسب سید تھے۔ میرے استاد تھے۔ میں نے اپنی تعلیم کا ایک دور ایم اے او کالج میں مکمل کیا ہے۔ ان کے اوصاف سے آپ جیسے کیا باخبر ہوں گے۔

اردو سے ان کو اللہ واسطے کا بیر تھا۔ میں نے ایک دن عرض کیا کہ یہ تو آپ کی مادری زبان ہے۔ کہنے لگے نہیں مسٹر! میری مادری زبان عربی ہے عربی! میں سامی ہوں، ہندی نہیں، ریٹائرمنٹ کے بعد میری یادداشت صرف ایک چوتھائی باقی رہ گئی ہے۔ پھر بھی مسٹر مجھے اٹھارہ ہزار اشعار عربی کے یاد ہیں۔ دس ہزار اشعار فارسی کے یاد ہیں۔ اور دامن جھاڑ دوں تو بیس پچیس شعر اردو کے بھی یاد ہوں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو کے بھی خاصے اشعار ان کو یاد تھے۔

سید جعفر حسین صاحب مرحوم کو کئی زبانوں پر عبور تھا۔ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کے علاوہ یونانی، لاطینی، المانی، فرانسیسی کے علاوہ دو ایک چھوٹے ملکوں کی یوروپی زبانیں بھی جانتے تھے۔ یادداشت اتنی غضب کی تھی کہ ۷۶ سال کی عمر میں جب انھوں نے ہمیں پڑھایا تھا، میر، غالب، آتش، ناسخ، غرض کسی کا کوئی شعر پڑھتے تھے تو ساتھ ساتھ عربی و فارسی کے وہ اشعار بھی پڑھ دیتے تھے جن سے اردو شعرا نے مضامین اخذ کیے تھے۔ اُن کی اِس "ادا" نے سارے ہی اردو شاعروں کی مٹی پلید کر دی تھی۔ کوئی شاعر اور بحیثیت شاعر ہی نہ لگتا تھا۔ ہم سے چوک یہ ہوئی کہ ان کے اس علم کو ہم نے قید نہ کیا۔ انیس کو بڑا شاعر مانتے تھے۔ کلاس میں وہ صرف کمالِ مرثیہ گوئی ہی بیان نہ کرتے تھے بلکہ شعر کے تکنیکی محاسن بھی بیان کرتے تھے۔ دوسرا شاعر جو انھیں بہت پسند آیا تھا وہ

اکبر الہ آبادی تھے۔ ان کے شعری محاسن بھی وہ بڑے تکنیکی انداز میں بیان کرتے تھے۔ البتہ دلچسپ بات یہ تھی کہ ان دونوں کے بڑے شاعر ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ عجب الطرفین سنید تھے۔ اس حوالے سے ہی انھوں نے انشاء کا لطیفہ سنایا تھا کہ انھوں نے بادشاہ اودھ سے عرض کیا تھا کہ "حضور آپ انجب ہیں" اور یہ کہتے ہی وہ دربار سے ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئے۔ انجب کے ایک معنی انھوں نے یہ بتائے تھے کہ انتہائی خالص نطفہ کو کہتے ہیں۔ لیکن دوسرے معنی لونڈی بچے کے بھی ہیں۔ ان دوسرے معنی ہی نے انشاء کو آفت میں گرفتار کر دیا۔

حالی کے بہت معترف تھے لیکن مقدمۂ شعر و شاعری کے بارے میں ان کی رائے بہت خراب تھی۔ کہتے تھے: "مسٹر، جس زبان سے ہمیں واقفیت نہ ہو اس کے لطیف نکات کو ہم سمجھ نہیں سکتے۔ پھر اس کے تصوّرات کے بارے میں ہمیں بولنے کا کیا حق؟" صفی لکھنوی کو شاعر مانتے تھے، لیکن آرزو لکھنوی کے بارے میں بڑی عجیب رائے کا اظہار کیا تھا۔ کہنے لگے "مسٹر، ان کے لہجے میں زنانہ پن ہے۔" ترقی پسند شاعروں میں تھوڑی سی تعریف جذبی کی کرتے تھے۔ فیض کی زبان و عروض کی غلطیوں کی وجہ سے انھیں شاعر ہی نہ مانتے تھے۔ کہتے تھے کہ نظم آزاد اردو کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں۔ ہم نے ٹوک دیا تو پورا گھنٹہ انگریزی اور فرانسیسی حوالوں اور تکنیکی اوصاف بیان کرنے میں گزار دیا۔

یہ ان کا احسان اور اللہ کا کرم تھا کہ انٹرمیڈیٹ کے پورے دو سال میں ان کی خصوصی توجہ سے فیضیاب ہوتا رہا۔ دس منٹ کے انٹرول میں وہ مجھے اپنے ساتھ لیتے، میری کلائی اس زور سے پکڑتے کہ گرفت کی سختی بری طرح محسوس ہوتی۔ کالج کے برآمدے کی دہلیز پر پیر لٹکا کر خود بیٹھتے اور پاس مجھے بھی بٹھاتے۔ شیروانی کی نچلی جیب سے ماچس نکالتے جس میں چار پانچ تیلیاں اور دو یا تین بیڑیاں ہوتیں جن کے پچھلے سرے کو توڑ کر ماچس کی سائز کی کر لیتے تھے۔ بیڑی سلگاتے، دو تین کش جلدی جلدی لگا کر اور بقیہ بیڑی پھینک کر باتیں شروع کرتے تھے ان کی باتیں سننے میں مزہ آتا تھا۔ ہر موقع میں وہ دنیا جہان کی باتیں کرتے تھے۔ چرچل، ہٹلر، گاندھی، جناح، لیاقت علی خاں، یورپ، مصر، ترکی، فرانس، حجاز، نجد، غرض ساری دنیا کی سیر کرا دیتے۔ وقت کے بہت پابند تھے۔ اس لیے گھنٹہ بجتے ہی اپنی کلاس کی طرف اس طرح لپکتے کہ میں ان کا ساتھ نہ دے پاتا۔ کبھی کبھی وہ سنسکرت و ہندی کے پنڈت جی کے ساتھ بھی انٹرول گزارتے تھے۔ یہ منظر ہم بہت سے طالب علم بڑے اشتیاق سے دیکھتے۔ سید جعفر حسین صاحب پنڈت جی کی کلائی بھی اپنی مخصوص مضبوطی سے پکڑتے تھے۔ پھر جب انٹرول ختم ہوتا تھا تو دونوں اپنے اپنے ہاتھ ہینڈ پمپ پر اس طرح دھوتے تھے کہ دونوں پمپ کا ہینڈل پاک یا پوتر کرتے تھے اس کے بعد ہاتھ پاک یا پوتر کرتے تھے۔ اس پورے عمل کو دیکھتے ہوئے ہم لوگوں پر ہنسی کے دورے پڑ جاتے تھے۔

ایک بار چیپل (CHAPPEL) کے گھنٹے میں میں برآمدے میں کھڑا تھا۔ سید جعفر حسین مرحوم آتے ہوئے نظر آئے۔ تو میں اشتیاق کے ساتھ باادب کھڑا ہو گیا۔ پاس آئے، بولے "تم چیپل میں نہیں جا رہے ہو" میں نے جواباً عرض کیا "جی نہیں"، "کیوں؟" "سر یہ ہمارے لیے لازمی نہیں ہے"۔ بڑی شفقت کے ساتھ فرمایا "چیپل دعا ہے، دعا میں سب کے ساتھ شریک ہو، آؤ میرے ساتھ چلو"۔ میں ان کے پیچھے پیچھے چیپل ہال میں داخل ہوا۔ انھوں نے مجھے اپنے پاس ہی بٹھایا، اور دعا کے لیے میں ان کے ساتھ ہی کھڑا ہوا۔ پھر یہ میرا ہمیشہ کا معمول رہا کہ میں پابندی سے ان کے ساتھ چیپل جایا کرتا تھا۔

ایک دن کلاس میں بڑے اچھے موڈ میں کہنے لگے۔ "جانتے ہیں مسٹر، لکھنؤ یونیورسٹی کے عربی اور فارسی و اردو کے شعبوں کے قیام کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی میں اس کا ممبر تھا۔ جب یہ دونوں شعبے قائم ہوئے تو مجھے شعبۂ عربی کی صدارت سونپی گئی۔ لیکن میں نے اس پیش کش کو رد کر دیا۔" "مگر کیوں؟" ہم سب سراپا سوال بن گئے۔ "وہ میرے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنا چاہتے تھے۔ اور ڈی لٹ کی ڈگری جوڑنا چاہتے تھے" ہم الجھ گئے۔ "مگر اس میں حرج کیا تھا؟" جواباً انھوں نے اپنی زندگی کا عجیب ترین قصہ سنایا۔ "مسٹر جب میں لندن سے ڈی لٹ کی تکمیل کر کے یورپ کی سیر کرتا ہوا کربلا معلی پہنچا تو مجھے ڈی لٹ کی ڈگری کے تفویض کیے جانے کی خبر عین اس وقت ملی جب دسویں محرم کو میں سید الشہداء کے قدموں میں حاضر تھا۔ میں نے تار اٹھا کر پھینک دیا۔ لعین! یزید! اسی وقت میں نے جواباً تار دیا۔ (Degree - not accepted) - پھر جب بمبئی بمبئی بندرگاہ پر اترا تو میرے استقبال کے لیے بڑے بڑے لوگ موجود تھے۔ لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ میں نے ڈگری قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے تو وہ سب مایوس ہو کر ایک ایک کر کے چلے گئے۔" لکھنؤ یونیورسٹی نے جب ان کو عربی، فارسی و اردو کے شعبۂ کی اوّلین پروفیسری اور صدارت پیش کی تو انھوں نے یہ شرط رکھی کہ ان کی ڈگریوں کے ساتھ ڈی لٹ نہ لکھی جائے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد کو یہ شرط منظور نہ ہوئی۔ چناں چہ سید جعفر حسین صاحب نے پیش کش قبول نہ کی۔ اس کے بعد بھی ان کو ہندستان کے گوشے گوشے سے بڑی بڑی پیش کشیں ہوئیں لیکن وہ اپنی شرط پر اٹل رہے اور مفاہمت نہ ہو سکی۔ لکھنؤ کرسچن کالج کے امریکن پرنسپل ہوشیار شخص تھا۔ انھوں نے مرحوم کی شرط منظور کر لی۔ اور وہ دو سو تیس روپے ماہوار پر وہاں لکچرر ہو گئے۔

ایک بار کلاس میں ہی بتانے لگے کہ "میں اپنی دو سو تیس... روپے ماہانہ تنخواہ میں سے اپنی ذات پر صرف انیس روپے خرچ کرتا ہوں" یہ پوچھنے پر کہ "انیس روپے میں آپ کھاتے کیا ہیں؟" کہنے لگے "اپنی بکری کا دودھ پیتا ہوں اور اپنے ہاتھ

کی پکائی ہوئی کھچڑی کھاتا ہوں۔" ایک شوخ طالب علم نے پوچھا" سر آپ نے شادی کیوں نہیں کرلی؟" بولے " جب میں نے ڈگری واپس کردی تو وہ لوگ جو اپنی لڑکیوں کے رشتے لے کر بمبئی کی بندرگاہ کے عرشہ پر آئے تھے، مجھ سے مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔ اسی وقت میں نے فیصلہ کیا کہ اگر میری ڈگری میری شادی کی راہ میں رکاوٹ ہے تو میں شادی نہ کروں گا۔ چناں چہ وہ ساری زندگی مجرّد رہے۔

دانت تقریباً سارے ہی گر چکے تھے۔ جس کی وجہ سے تلفظ بگڑ جاتا تھا انھیں گمان تھا کہ وہ انگریزی تلفظ بالکل آکسفورڈین کرتے ہیں۔ لیکن سننے والا واضح طور پر محسوس کرتا تھا کہ ہندستانیت ترک نہیں ہوئی ہے۔ ایک بار ایک کم سواد طالب علم نے کچھ اس طرف اشارہ کردیا۔ خفا ہو گئے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کے تلفظات کے فرق بتانے لگے۔ ہوتے ہوتے لکھنؤ و دلّی کے فرقِ زبان پر بڑے عالمانہ نکات سے فیضیاب کرتے رہے۔ طیش کسی طور پر کم نہ ہوا تو بولے " مسٹر، یہاں سے وہاں تک! اگر میری ساری ڈگریاں اور سرٹیفکیٹ جوڑ دیے جائیں تو میرا کفن تیار ہو جائے" ہم سب دم بہ خود، خاموش سنتے رہے۔ پوری کلاس کو خائف دیکھا تو ٹھنڈے پڑے۔ جیب سے ماچس نکالی اور اس میں سے سربریدہ بیڑی! بیڑی جلا کر دو تین کش لیے اور ما بقا پھینک کر نارمل موڈ میں بولے" مسٹر، بہت تھک گیا ہوں، جائیے کل آئیے گا۔" اور خود نہ جانے کس سوچ میں غرق ہو گئے۔ اتنا معصوم شخص! اپنی آہ کا دھواں بھی باہر نکلنے نہیں دیتا۔

ایک بار میں نے بے حد انکساری کے عرض کیا۔ " سر آپ کے پاس اتنا علم ہے۔ اتنی فہم و فراست ہے۔ تو آپ کچھ لکھتے کیوں نہیں؟۔ دنیا آپ کی تحریروں سے فیض حاصل کرے گی۔ کہنے لگے" مسٹر یہاں سے وہاں تک! دنیا میں کل پچیس موضوع ہیں۔ اور ان پر مسلسل اور بار بار لکھا جاتا رہا ہے۔ اب میں کیا لکھوں؟ دوسروں کو میں دہرانا نہیں چاہتا۔ اور نیا کچھ لکھنے کو باقی نہیں ہے۔" یہ صرف ایک مثال ہے۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں جو اُن کے بہک جانے کی میری یادداشت میں محفوظ ہیں۔ جانے وہ کون سی گتھی تھی جو انھیں الجھا دیا کرتی تھی۔ ان کے شاگرد ان کی ان حرکتوں کو لطیفوں کے طور پر بیان کرتے تھے۔ لیکن کوئی بھی، کالج کے اساتذہ بھی، ان کو سمجھنے کی کوشش نہ کرتا تھا۔ ادب ان کا سب کرتے تھے امریکن پرنسپل بھی ان کی تعظیم کے لیے کھڑا ہو جاتا تھا۔ جب وہ اس کے دفتر میں داخل ہوتے تھے

کالج میگزین نکلنے والا تھا۔ نوٹس جاری ہو چکا تھا۔ میں نے بھی ایک مختصر افسانہ لکھ کر لائبریرین صاحب کے حوالے کردیا تھا۔ اور مطمئن تھا کہ شائع ہو گا ہی۔ مگر

ہفتہ بھر بھی نہ گزرا تھا کہ ایک دن حاضری لینے کے فوراً بعد سید جعفر حسین صاحب مرحوم نے مجھے للکارا۔ "اے مسٹر، یہ کیا لکھا ہے آپ نے یہاں سے وہاں تک" میں گھبرا گیا۔ یا العجب! میں نے یہاں سے وہاں تک کیا لکھا ہے؟ وہ کہہ رہے تھے: "مسٹر میں نے آپ کی کہانی پڑھی۔ اس نے ٹپ ٹپ آنکھیں کیں۔ اسے عشق ہو گیا۔ اس نے ٹپ ٹپ آنکھیں کیں اسے عشق ہو گیا۔ بکواس! مہمل! میں نے آپ کی کہانی مسترد کر دی ہے۔ آیندہ جو کچھ لکھیے سوچ سمجھ کر لکھیے۔ لیلیٰ مجنوں نہ لکھیے!" ان کی یہ بات میرے دل میں ایسی کھب گئی کہ آیندہ جب بھی افسانہ لکھنے بیٹھا، میرے استاد رسوا کے شاگرد میرے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔

ایک مرتبہ کلاس میں نثر پڑھا رہے تھے۔ کہیں لفظ "تنقید" سامنے آگیا۔ کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ "مسٹر لفظ "تنقید" کا استعمال بہ طور اسم غلط ہے۔ یہ فعل ہے۔ اس کا اسم نقد ہے۔ CRITICISM کا ترجمہ تنقید نہیں نقد کیجیے۔ کسی طالب علم نے کسی شعر کو خوب صورت کہہ دیا۔ بگڑ گئے۔ "غلط مسٹر، یہاں سے وہاں تک غلط! شعر کے کوئی چہرہ ہے جو آپ اسے خوب صورت یا بدصورت قرار دیتے ہیں۔ اصلاً آپ Beautiful کا ترجمہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور غلط کر رہے ہیں۔ شعر کے لیے جب بھی Beautiful استعمال ہوگا تو اس کے معنی حسین ہوں گے۔ شعر میں حسن ہوتا ہے، خوب صورتی نہیں!" ایسی بہت سی باریکیاں تھیں جو ہمیں الجھن میں ڈال دیا کرتی تھیں۔

ان کی آرزو تھی کہ وہ زندگی کے آخری دن کربلائے معلیٰ میں سید الشہداء کے قدموں میں گزاریں اور وہیں کی خاک میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ اس آرزو کو وہ جب تب دہرایا کرتے تھے۔

۱۹۴۹ء کی جولائی سے لکھنؤ کرسچن کالج سے اردو و فارسی ختم کر دی گئی۔ استاد محترم اقتصادیات پڑھانے لگے۔ اور چند سال بعد کربلائے معلیٰ ہجرت کر گئے۔ پھر وہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پیوند خاک ہو گئے۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ مغفرت کرے۔

یہ تھے مرزا محمد ہادی رسوا کے چہیتے شاگرد، پہلے مسلمان اور تیسرے ہندستانی ڈی لٹ (آکسن) ایک گوہر نایاب و تابدار جو خاکِ کربلا میں گم ہو گیا۔ ●

دلیپ سنگھ

۵۹/۴ راجندر نگر، نئی دہلی ۶۰

قبضہ

۱۹۴۷ میں آزاد ہو جانے کے ساتھ ساتھ ہمارا ملک دو ملکوں میں تقسیم ہو گیا تو مغربی پنجاب کے بہت سے لوگوں کو مجبوراً دلّی آنا پڑا۔ ایسے لوگوں کو دلّی کے باسیوں نے کئی نام دیے۔ پناہ گزیں۔ مہاجر، رفیوجی۔ شرنارتھی وغیرہ لیکن پنجابیوں کو ان میں سے کوئی بھی نام پسند نہ آیا۔ "پناہ گزیں ہم کیسے ہوتے جب کسی نے ہمیں اپنی پناہ میں لیا ہی نہیں۔" "مہاجر ہم کیوں کر ہوتے جب ہم اپنا ملک چھوڑ کر اپنے ہی ملک میں بسنے آ گئے ہیں۔ اور رفیوجی اور شرنارتھی تو پناہ گزیں کا ہی انگریزی اور ہندی ترجمہ تھا۔ چنانچہ جب کوئی انھیں ان ناموں سے پکارتا تو لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے۔ لیکن اس بات سے انکار بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ یہاں کے رہنے والے نہیں تھے۔ مہاجر نہیں تھے تو دلّی کے باشندے بھی نہیں تھے۔ پناہ گزیں نہیں تھے لیکن گھروں والے بھی نہیں تھے۔ ان ناپسند ناموں سے چھٹکارا صرف ایک صورت میں ہی ممکن تھا۔ وہ جلد سے جلد اپنے گھر بنا لیں تاکہ دلّی والوں میں شمار ہونے لگیں۔

سرکار نے ایسے مہاجرین کے لیے کچھ کیمپ کھولے تھے لیکن سرکار بھی چاہتی تھی کہ جتنی جلدی یہ لوگ اپنے گھروں میں بس جائیں، اچھا ہو گا ورنہ انھیں روٹی کھلاتے کھلاتے وہ خود دانے دانے کو محتاج ہو جائے گی۔ چنانچہ اس نے جلدی جلدی کئی کالونیاں دلّی میں بسا دیں۔ راجندر نگر، پٹیل نگر، لاجپت نگر وغیرہ اور ان لوگوں کو ان کالونیوں میں منتقل کر دیا۔ یہ مکان بہت چھوٹے تھے۔ ان میں پانی بجلی کا بندوبست بھی نہیں تھا لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ ہمارے لیڈروں نے پہلے ہی انھیں وارننگ دے دی تھی کہ اگر آزادی حاصل کرنا ہے تو مصیبتیں جھیلنے کے تیار ہو جاؤ۔

مکانوں میں بس جانے کے بعد اِن پنجابیوں کو ایک نئے مسئلے سے دوچار ہونا پڑا۔ جب وہ دلّی والے بن گئے تو اب سرکار یا کوئی دوسرا انھیں روٹی کیوں کھلائے۔ ویسے بھی پنجابی کو روٹی وہی اچھی لگتی ہے جو وہ خود کماتے ہیں۔ بیتے ہوئے دنوں میں بھی جب ایک پنجابی دوسرے پنجابی کو اکڑ دکھاتا تھا تو پہلا پنجابی فوراً کہہ دیتا تھا کہ "مجھے اکڑ کیا دکھا رہے ہو، میں کون سا تیرا دیا کھاتا ہوں۔" دیا ہوا کھانا گویا مردار کھانے کے برابر تھا اور شیروں کو مردار کھانا اچھا نہیں لگتا۔

چنانچہ ان کے دل میں خیال آیا کہ کوئی کام دھندا کیا جائے۔ کام دھندا تو وہ کرنا چاہتے تھے لیکن کریں کہاں؟ دکانداری کریں لیکن دکان کہاں سے لائیں؟ دلّی میں جو تھوڑی بہت دکانیں خالی تھیں ان کے مالک کرایے کے علاوہ ان کے لیے پگڑی بھی مانگتے تھے۔ اور پنجابیوں کو پگڑی اتارنا تو آتا تھا، پگڑی دینا نہیں آتا تھا۔

انہی دنوں پتا نہیں کس پنجابی کے دماغ میں سب سے پہلے یہ خیال آیا کہ بیوپار کے لیے دکان کی ضرورت کس لیے؟ بیوپار تو پٹری پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایک صبح میں نے دیکھا کہ گول مارکیٹ کی ایک پٹڑی پر کسی نے چھے گز لمبے اور چھے گز چوڑے ٹکڑے کے ارد گرد کالی سیاہی سے ایک نشان بنایا اور اس کے اندر جلی حروف میں لکھ دیا کہ "اس جگہ پر بلایو سنگھ کا قبضہ ہے۔"

گراہم بیل نے جب ٹیلی فون ایجاد کر دیا تو اب اسے گھر گھر لگانے میں کیا دقّت تھی۔ چنانچہ آناً فاناً دلّی کی ہر پٹڑی پر مختلف لوگوں کے قبضے کا اعلان ہو گیا۔ کہیں پر تو پربدر کاشن ملتان والے کا قبضہ ہو گیا اور کہیں پر بشن سنگھ گجرات والے کا۔

ایک کمال اس سلسلے میں یہ ہوا کہ بشن سنگھ کو اگر اپنے کاروبار کے لیے پچاس فٹ جگہ درکار تھی تو اس نے پچاس فٹ پٹڑی پر ہی قبضہ کیا۔ یہ نہیں کہ پوری پٹڑی پر ہی سانپ بن کر بیٹھ جاتے۔ دوسرا کمال یہ تھا کہ جہاں بشن سنگھ کا قبضہ لکھا گیا وہاں کسی دوسرے نے قابض ہونے کی کوشش نہ کی، حالانکہ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ لکھے ہوئے پر پوچا پھیر کر صرف یہ لکھنا تھا کہ یہاں کرشن لال قبضہ ہے۔

اِن مقبوضہ جگہوں پر پنجابیوں نے اپنی دکانیں سجا لیں اور بیوپار اتنے کم منافع پر کرنا شروع کر دیا کہ دلّی کے دکانداروں کا باجا بج گیا۔

نفع اگر کم رکھا جائے تو بکری ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے پنجابی جنھیں دلّی والے پناہ گزیں کہتے تھے جلد ہی اس قابل ہو گئے کہ دوسروں کو پناہ دے سکیں۔ انھوں نے بڑے بڑے مکان خرید لیے، دکانیں خرید لیں اور ایک تیسرا کمال کر دیا۔ تیسرا کمال یہ کیا کہ وہ چپ چاپ قبضہ شدہ پٹڑیوں سے اٹھ گئے اور جاتے جاتے پٹڑی کو اس طرح صاف کر گئے جیسے اس پر کبھی کسی کا قبضہ تھا ہی نہیں۔

پنجابیوں کا یہ کارنامہ بڑا سبق آموز تھا لیکن مجھے افسوس ہوا کہ کسی نے اس کارنامے سے کچھ نہ سیکھا۔ میں جب یہ شکایت اپنے دوست شگفتہ سے کی تو وہ کہنے لگے کہ بھولے بادشاہ آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ پنجابیوں کے اس کارنامے سے ہمارے سیاست دانوں اور مذہبی رہنماؤں نے بہت کچھ سیکھا ہے لیکن چونکہ انھوں نے جلی حروف میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ یہاں میرا قبضہ ہے اس لیے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

جب میں نے وضاحت کے لیے کہا تو شگفتہ چوکڑی مار کر بیٹھ گئے اور ایک شفیق بزرگ کی طرح مجھے سمجھاتے ہوتے بولے ''برخوردار'' اتنا تو تمھیں پتا ہی ہوگا کہ جب ملک آزاد ہوگیا تو حکومت کی عنان کانگریس پارٹی کو سونپی گئی تھی کہ آزادی کی جنگ میں اسی پارٹی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ لیکن جب ملک کا سیاسی نظام ڈیموکریسی طے پایا اور حاکم کا چناؤ عوام کے ووٹ پر مبنی ٹھہرا تو کانگریس کو فکر ہوئی کہ اگر عام آدمی زیادہ دیر تک ان کی قربانیوں کو یاد نہ رکھ سکا تو اُن کا کیا بنے گا۔ ویسے بھی اگر آپ نے ایک لیڈر کو جیل میں دیکھا ہو اور پھر اسی لیڈر کو ایک بڑی سی موٹر کار میں دیکھیں جس کے آگے پیچھے موٹر سائیکل سوار جا رہے ہوں تو اسے پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ حکومت کا نشہ تو آپ جانتے ہیں شراب کے نشے کی طرح ہوتا ہے۔ نشہ اترنے کے بعد بہت تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ کانگریس پارٹی نے سوچا کہ کوئی ایسا انتظام کیا جائے کہ جب بھی ملک میں الیکشن ہو، ووٹروں کی ایک خاصی بڑی تعداد صرف انہی کو ووٹ دے۔ انھیں کسی طرح پتا چل گیا کہ ہندستان کا مسلمان اپنی جان، اپنے مذہب اور اپنی زبان کے بارے میں فکر مند ہے۔ انھوں نے فوراً اسے یقین دلایا کہ یہ فکر اس کے لیے کانگریس کرے گی۔ اس کا فرض صرف یہ ہوگا کہ وہ اپنا قیمتی ووٹ اس پارٹی کے لیے ریزرو کردے۔ اس طرح انھوں نے دیس کی آبادی کے اس حصے پر ایک بورڈ لگا دیا کہ اس پر کانگریس کا قبضہ ہے۔ جب اس طبقے پر کانگریس کا بورڈ لگ گیا تو کس کی ہمت تھی کہ اس بورڈ کو ہٹاتے اور اس طبقے پر اپنا بورڈ لگاتے کیونکہ یہ تو قبضے کے اصول کے منافی ہے۔

جب جن سنگھیوں اور ہندو مہا سبھائیوں کو اس قبضے کا علم ہوا تو انھیں خیال ہوا کہ وہ بھی فوراً کسی مخصوص طبقے پر اپنے قبضے کا اعلان کردیں ورنہ کانگریس کا بزنس تو چل نکلے گا اور وہ منہ دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔ چنانچہ انھوں نے وہ علاقے تلاش کیے جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی اور جونہی ایسا علاقہ انھیں نظر آیا فوراً اس پر اپنے قبضے کا بورڈ لگا دیا۔

پھر تو جناب بورڈ جگہ جگہ لگ گئے۔ سکھوں پر اکالیوں کا قبضہ ہوگیا۔ مزدوروں پر کانگر پارٹیوں کا قبضہ ہوگیا۔ کانگریس نے شاید بورڈ زیادہ تیار کر ڈالے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ہریجنوں پر بھی اپنے قبضے کا اعلان کر دیا۔

ملک میں کئی الیکشن ہوتے۔ ہر الیکشن پر اعلان کیا گیا کہ ووٹر جن کو چاہیے ووٹ دے سکتا ہے۔ وہ اپنی رائے کا آزادانہ استعمال کرسکتا ہے لیکن ووٹر بیچارہ اُس بورڈ کا کیا کرتا جو اس کے ماتھے پر چسپاں کر دیا گیا تھا کہ اس پر فلاں پارٹی کا قبضہ ہے۔ چنانچہ وہ چپ چاپ شرافت سے اپنا قیمتی ووٹ اُس پارٹی کو دیتا رہا جس نے اس پر اپنے قبضے کا اعلان کر رکھا تھا اور ساتھ ساتھ جمہوریت زندہ باد کے

نعرے بھی لگاتا رہا۔"

اتنا کہنے کے بعد شگفتہ نے سگریٹ سلگا کر ایک لمبا سا کش اس طرح لیا جیسے ایک بہت بڑی گتھی سلجھا دی ہو۔ میں نے ان کی لطف اندازی میں مخل ہوتے ہوئے کہا "شگفتہ صاحب! آپ نے شروع میں فرمایا تھا کہ پنجابیوں کے اس طریقہ کار سے مذہبی رہنماؤں نے بھی استفادہ کیا تھا لیکن بعد میں آپ نے اس کی کوئی مثال پیش نہیں کی۔" یہ سنتے ہی انھیں جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی۔ جلدی جلدی سگریٹ کے دو تین کش لیے اور پھر یوں گویا ہوتے۔

"ارے ہاں یار! میں تو بھول ہی گیا تھا۔ اچھا کیا تم نے یاد کرادیا۔"

اتنا تو تم جانتے ہی ہو کہ ہمارے ملک میں کئی مذاہب کے لوگ رہتے ہیں۔ ان میں ہندو بھی ہیں اور سکھ بھی، مسلمان بھی ہیں اور عیسائی بھی۔ ان سب کے اپنے اپنے عبادت خانے ہیں اور اپنی اپنی مذہبی کتابیں۔ لوگ عبادت خانوں میں جاتے تھے، اپنی اپنی کتاب کو اپنی بصارت کے مطابق پڑھتے تھے اور پھر کام دھندے میں لگ جاتے تھے۔ پتا نہیں کب کچھ سر پھیروں نے اپنی اپنی مذہبی کتابوں کو جب کچھ زیادہ ہی دلچسپی سے پڑھا تو انہیں پتا چلا کہ مسلمانوں کی کسی کتاب میں یہ نہیں لکھا کہ مسلمان کے لیے ہندو سے نفرت کرنا ایک مذہبی فریضہ ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی مسلمان ہندوؤں سے اس طرح ملنے لگے جیسے اُن میں اور اِن میں کوئی فرق ہی نہ ہو۔ وہ نماز تو مسجد ہی میں پڑھتے تھے لیکن مسجد کو جاتے ہوتے راستے میں کوئی مندر دکھائی دے تو ان کی نگاہیں تعظیم سے جھک جاتی تھیں۔ اسی طرح ہندوؤں کو بھی اپنی مقدس کتابوں میں یہ لکھا ہوا نظر آگیا کہ ہندو دھرم دوسرے دھرموں سے نفرت کرنے کو جائز نہیں سمجھتا۔ چنانچہ اُن میں کئی اپنے مسلم دوستوں کے ساتھ رمضان میں روزے رکھنے لگے اور عید کے دن گلے ملنے لگے۔ کئی ہندو تو اجمیر شریف جاکر منتیں بھی مانگنے لگے۔ جب ہمارے مذہبی رہنماؤں نے یہ تماشا دیکھا تو وہ حیران کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اگر سب کو بھائی بھائی بن کر رہنا ہے تو پھر الگ دکانیں کھولنے کا کیا فائدہ؟ انھیں یہ بھی ڈر لگنے لگا کہ کہیں ان کی اپنی دکان بند نہ ہو جائے۔ بند نہ بھی ہو تو بھی آمدنی کے گھٹنے کا خطرہ تو یقینی تھا۔ چنانچہ اس خطرے سے نجات کی راہ ڈھونڈنا ضروری ہوگیا۔ ایسے دو قتے پر انھیں پنجابیوں کے قبضے والا سبق یاد آگیا۔ چنانچہ کسی فطھ سے کوئی اجارہ اٹھا اور اس نے ہندو پر بورڈ لگا دیا کہ ہندو دھرم پر میرا قبضہ ہے۔ اسی طرح کسی مسجد سے کسی امام کی آواز آئی کہ اسلام پر میرا قبضہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے مذہب کیسے پیچھے رہتے۔ اُن کے رہنماؤں نے فوراً ایسے بورڈ تیار کروا کر اپنے اپنے پیروکاروں کی پیشانی پر ٹھکوا دیے۔"

میں نے کہا "شگفتہ صاحب، میں آپ کا احسان مند ہوں کہ آپ نے مجھے بتایا کہ پنجابیوں کا ایجاد کردہ نسخہ رائے گاں نہیں گیا۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی

"کون سی ؟"

"پنجابی تو دو ایک سال کے بعد اپنے اپنے قبضے سے دست بردار ہو گئے تھے لیکن آپ کے سیاسی لیڈر اور مذہبی رہنما تو نہ صرف کئی سالوں سے اس نسخے پر عمل پیرا ہیں بلکہ یوں لگ رہا ہے جیسے وہ کبھی اپنا قبضہ چھوڑیں گے ہی نہیں - یہ تو قبضے کے اصولوں کے منافی ہوا"

شگفتہ ہنسنے اور کہنے لگے "پنجابی تو بے وقوف تھے کہ اپنے اپنے قبضہ شدہ زمین کے ٹکڑوں سے دست بردار ہو گئے - نیٹڑیوں کے وہی ٹکڑے آج لاکھوں میں بک سکتے تھے سیاسی لیڈر اور مذہبی رہنما اُن کی طرح جاہل نہیں کہ قبضہ شدہ جائدادیں ہاتھ سے جانے دیں - ان کو تو کوئی زبردستی ہی ہٹاتے تو ہٹاتے وہ خود کبھی اس قبضے سے دست بردار نہیں رہیں گے -"

میں نے کہا "آپ کا کہنا سر آنکھوں پر - لیکن یہ تو قبضے کے اصولوں کے منافی ہے پنجابیوں کے مقابلے میں تھوڑا لمبا کھینچ لیں لیکن کبھی نہ کبھی تو انھیں یہ قبضہ چھوڑنا ہی چاہیے"

شگفتہ بولے "بھائی مجھے تو اس کے آثار نظر نہیں آ رہے ہیں لیکن ہو سکتا ہے تم صحیح کہہ رہے ہو" یہ کہہ کر وہ اٹھنے لگے تو میں نے کہا کہ حضور ایک بات کی وضاحت کرتے جائیے - "اگر یہ لوگ کبھی اپنے قبضے سے دست بردار ہونے کو تیار ہو جائیں تو کیا یہ لوگ بھی پنجابیوں کی طرح جاتے ہوئے پٹڑی اس طرح صاف کر جائیں گے جیسے کبھی اس پر کسی کا قبضہ رہا ہی نہ ہوں" شگفتہ ہنسے اور کہنے لگے "مجھ کم فہم اور دور اندیش کو اس کا یقین نہیں ہے - پٹڑی تو بے جان تھی - صفائی کی گئی تو کھل اٹھی - لیکن جن طبقوں پر ہمارے رہنماؤں نے اپنا اپنا بورڈ لٹکایا ہے وہ آسانی سے اس کے نشان اپنے اپنے چہروں سے ہٹنے نہیں دیں گے - اس بورڈ کو کئی سال برداشت کرنے کے بعد وہ اب اس کے عادی ہو چکے ہیں - اور عادت سے چھٹکارا پانا آسان نہیں ہوتا بھائی"

مجھے شگفتہ صاحب کی بات پر یقین تو نہیں ہے لیکن پچھلے کچھ عرصے سے میں دیکھ رہا ہوں کہ ہم جب بھی کسی مسئلے پر الجھتے ہیں تو پتا نہیں کیوں جیت ہمیشہ اُن کی ہی ہوتی ہے

شفیقہ فرحت
اے/۲/۸۶ اپروفیسرز کالونی۔
بھوپال۔

دوسری داستان ـــــ بلا عنوان

امینہ کو ہم اسپتال میں ہی چھوڑ آئے تھے ۔ بے یار ومددگار حالات سے پریشان ہوکر ۔ ماحول سے گھبرا کر۔
چلئے چلیں اس کی خبر لینے ۔
کہ اتنی ہمت تو کرنی پڑے گی۔ چاہے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہو۔ دماغ سُن، روح زخمی ۔
بیلا نتیجہ تھی گولی چلنے کا ۔ اور امینہ منظر نامہ ہے تلوار کی تیزی طراری کا ۔
گویا ہم چلیں نہ چلیں تھک کے بیٹھ جائیں ۔ شوٹ ایٹ سائیٹ ' والے کرفیو لگنے سے گوشے ہیں قفس کے اپنے لوٹے پروں میں منہ دبا کے اونگھ جائیں ۔ مگر ہر قسم کے ہتھیار نئے پرانے مہنگے سستے سب چل رہے ہیں ۔
چلنے والے ہتھیاروں کی فہرست ہم پھر کبھی بنائیں گے ۔ کہ وہ اتنی طویل ہوگی کہ چاہیں تو گنوا بھی نہ سکیں ۔ "انسانی زنجیر Human Chain کی طرح ۔
اس وقت تو اسپتال کا وہی ایمرجنسی وارڈ جس میں امینہ پلنگ نمبر ۹ پر پڑی ہے، ہمارا منتظر ہے ۔
موت کے سائے اس وارڈ پہ لرزاں ہیں ۔ اور زندگی کا نور ان اندھیروں پہ غالب آنے کی کوشش کر رہا ہے ۔
یہ رہی امینہ ـــ بھرا جسم تنی ہوئی چمکیلی جلد گہرا رنگ ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں جن میں حسرت بھی ہے تکلیف بھی ۔ دکھ بھی درد بھی ۔ اور ہمت طاقت فتح مندی کا احساس بھی اور اتنی ملی جلی کیفیت سے وہ چھوٹی آنکھیں ننھے ننھے بلب کی طرح چمک رہی تھیں ۔
بیلا کی طرح وہ بے ہوش نہیں تھی ۔ پورے ہوش حواس میں تھی زخم کھا کر بھی مسکرا رہی تھی ۔ حال احوال بتا رہی تھی ۔ تفصیل بیان کر رہی تھی ۔ اس کے سر پر سے موج خون گزر چکی ہے ۔ اور جو خون کے دریا پار کر لیتے ہیں ان کے سارے جسم پر ان گنت آنکھیں اُگ آتی ہیں ۔ اب ہم جیسے ان سے نظریں نہیں ملا سکتے ۔ ان کے آگے

ہم بونے سے لگنے لگتے ہیں۔
امینہ گھر کی بڑی نہیں تاسب سے چھوٹی ہے مگر جب غنڈوں نے (کہ ہر حملہ آور غنڈہ ہی ہوتا ہے اور اسے غنڈا ہی کہنا چاہیے۔) اس کی جھگی پر حملہ کیا تو بڑی بزرگ بن کر اس نے چھوٹوں کو بھی بچایا۔ دو بڑی بہن بن بیاہی بہنوں کو بھی بچایا بوڑھے باپ کو بھی۔ مٹاپے سے ہنایتی ماں کو اور خوف سے تھرتھر کانپتے تین چھوٹے بھائی بہنوں کو بھی۔
یوں وہ کوئی رانی جھانسی قسم کی لڑکی نہیں تھی۔ مگر ایسی چھوٹی موٹی بھی نہیں تھی۔ جھگی جھونپڑی میں رہنے والی لڑکیوں میں ہمت سمجھ کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے اور جلدی ہی آجاتی ہے۔ وہ تو ببول کی جنگلی جھاڑی ہوتی ہیں کہ جنھیں توڑنے والے ہاتھ خود خونا خون ہو جائیں۔
بھوپال میں پہلا پتھراؤ نو ساڑھے نو بجے جہانگیر آباد کے گھنے علاقے میں ہوا۔ پہلی آگ بھی اسی طرف لگی۔ پھر تو وقفے وقفے سے قینچی چھولا۔ بجریا۔ جمعراتی دروازہ۔ چار بتی چوراہا سب دھوئیں میں گھر گئے۔
دوسرے بلکہ تیسرے دن یا یوں کہیے کہ تیسری رات حملہ ہوا ناریل کھیڑا۔ گندی بستی اور شہید نگر پہ۔ اور امینہ اسی شہید نگر میں شہید ہوتے ہوتے بچی۔
شام سے طرح طرح کی ہولناک آوازیں تھوڑی تھوڑی دیر میں آتی تھیں۔ جیسے حملہ آور ہیں بھی اور نہیں بھی۔ کبھی لگتا تھا بھیڑ بستی میں گھس آتی۔ دروازے تک پہنچ گئی۔ کبھی لگتا تھا نہیں۔ یہ ہمارے اندر کا خوف ہے۔ ہمارے دل کا چور ہے۔ سہمے ہوئے لوگ اپنی کمزور جھگیوں کے بے نام سے کواڑ بند کیے جاگ رہے تھے۔ جاگتے جاگتے تھک جاتے تو بیٹھے بیٹھے جھپکی لے لیتے۔ پھر ڈر کے چونک جاتے اور چونک کے اٹھ جاتے۔
امینہ کی جھگی دوسروں سے بڑی تھی۔ دو کوٹھریوں والی۔ مگر بستی کے سرے پر۔ اسی لیے سب بہت زیادہ ڈر رہے تھے۔ مگر بستی کے ہر گھر کے مرد شام سے لاٹھیاں لیے پہرہ دے رہے تھے مگر کرفیو کی وجہ سے زیادہ دیر تک گھوما بھی نہیں جاسکتا تھا۔ سردی بھی تو بہت تھی۔ نہ تاپنے کے لیے آگ نہ پہننے کے لیے گرم کپڑے نہ اوڑھنے کے لیے شال کمبل۔ پہرہ بھی تھکا تھکا سا تھا۔
آدھی رات سے زیادہ بیت گئی۔ خطرے کے ٹلنے کے احساس نے اپنے پیر پھیلا دیے۔ لوگ اس میں سمٹ کے سو گئے۔ پھر سوتی بستی "مارو، پکڑو" کی آوازوں سے جاگ اٹھی۔ اور مشعلوں کی روشنی میں ڈوب گئی۔ پہلا۔ کونے والے گھر کا دروازہ لات مار کے توڑ دیا گیا۔ اور اس سے پہلے کہ پہرہ دینے والے مرد اپنے اپنے گھروں سے نکلتے، حملہ کرنے والے اس پہلی جھگی میں گھس گئے۔

جگی میں چھپنے کے لیے جگہ نہ چھپانے کے لیے سامان - سب بے ردا انسانیت کی طرح کھلا تھا - ننگا - برہنہ - نہ انسانیت کو کوئی بچا پارہا تھا نا انسان کو -
"نکل باہر بڈھے - "امینہ کے باپ کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا تو امینہ کے آنسو نکل پڑے - آگے بڑھ کر وہ بوڑھے باپ کی ڈھال بن گئی - اسے دیکھ کر تو بانچھیں کھل گئیں - اس سے بہتر شکار کیا ہو سکتا ہے -
امینہ نے پوری طاقت سے اپنی طرف بڑھتے ہوتے ہاتھ جھٹکے لاتیں ماریں - تلوار کے وار اپنے کاندھوں اور ہاتھوں پہ کھائے - چلاتی چیختی رہی بچاؤ - بچاؤ"
تلوار کے کئی وار سینے پر بھی پڑے - مگر پھر بھی اسے قابو میں نہ کیا جا سکا -
اس بیچ پہرہ دینے والے ساتھی پڑوسی اس کی جگی تک پہنچ گئے" اور حیوانیت کے ٹھیکیدار لہو لہان امینہ کو تڑپتا چھوڑ بھاگ گئے" - مگر بھاگتے بھاگتے لپلپاتی مشعالیں گھاس پھوس کی جگیوں کی طرف اچھال گئے -
جگی والے اتنی دیر کی جدوجہد سے ہوشیار خبردار ہو چکے تھے - کچھ نے اپنا سامان باہر نکال لیا - کچھ بھاگنے لگے - اور آگ بھڑکنے اور سارے میں پھیلنے سے پہلے بجھا دی گئی -
اور اب گیارہ بڑے اور گہرے زخم کھائی امینہ اسپتال میں پڑی جھلسی انسانیت سے سوال کر رہی ہے کہ یہ آگ کب تک لگائی جاتی رہے گی - نفرت کے بھالے سینوں میں کب تک جھونکے جاتے رہیں گے ہوس کی تلواریں کب تک جوان لڑکیوں اور بوڑھی عورتوں کے جسموں کو خوناخون کرتی رہیں گی -
ساتھ ہی درد کے باوجود وہ مسکرا رہی تھی - اس کی جلد چمک رہی تھی کہ اس نے زہریلے ناگ کو آگے بڑھنے اور ڈسنے سے روکا تو — !
اسے بیلا کی بھی فکر تھی —
کہ درد مشترک اور چند لمحوں کے ساتھ نے انھیں دوست بنا دیا تھا - لیکن یہ دوستی بھی کتنی عارضی تھی - کہ ایک کو موت جکڑ رہی تھی اور دوسری زندگی کو پکڑنے کی کوشش کر رہی ہے -

معذرت

گرمی کی شدت اور بجلی کی آنکھ مچولی نے پریس اور دفتر کا نظام درہم برہم کر دیا - بعض دن تو ایسے بھی گزرے کہ بجلی دن دن بھر نہیں آئی - اور اگر آئی بھی تو تھوڑی دیر کے لیے اپنی جھلک دکھا کر اپنے آقاؤں کی گود میں واپس جا کر بیٹھ گئی - مجبوراً 'شعری حصہ' 'ادبی خبریں' 'کھلے خطوط' اور 'جائزے' کے صفحات روکنا پڑے - انھیں آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں -

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

اگست ۱۹۹۳ء جلد ۳۳ شمارہ ۸

فی پرچہ 6/=
سالانہ 55/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے 75/=
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک) 170/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک) 320/=

اڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

TELEPHONE 630191

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات، نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

غزلیں

نئی مطبوعات

شمع جلتی رہی (ناول) برہندر کمار بھٹاچاریہ ۶۵/-
جھوٹا کرم کلا (بچوں کا ادب) شنتا چو ۱۰/-
لال بچھیا کلالو ″ لومو کوالشی ۱۲/-
پنجرا ″ درون ویرکوہلی ۶/۵۰
چودہ چوہے چلے گھر بدلنے ″ کازو وا یوامورا ۹/-
مرثیہ کی سماجیات (تنقید) ڈاکٹر سید محمد عقیل ۶۰/-
جنس کا جغرافیہ (جنسیات) ادارہ ۸۰/-
حضرت عبداللہ بن عمر (سیرت امام المتقین) ابن شکور ۶۰/-
اخلاقیات اجتماعیہ اور اس کا فلسفہ ابوالاعلیٰ مودودی ۱۳/-
خیر المتاع (احادیث خواتین) مولانا محمد عزیز ۲/-
گم گشتہ (شعری مجموعہ) اعجاز عسکری ۲۰/-
چراغ ربانی (سوانح مولانا کالفغانی) حاصل عباسی ۱۵/-

کتاب نما کے خصوصی شمارے

کتاب نما کے مندرجہ ذیل خصوصی شماروں پر کتاب نما کے خریداروں کو ۲۵٪ کمیشن دیا جائے گا۔ ڈاک خرچ بذمہ خریدار (ادارہ)

خواجہ احمد فاروقی (مرتبہ) خلیق انجم ۲۵/-
پروفیسر مسعود حسین خاں مرتبہ ایم حبیب خاں ۲۵/-
پروفیسر آل احمد سرور ″ خلیق انجم ۲۵/-
عابد علی خاں ″ مجتبیٰ حسین ۲۵/-
ڈاکٹر اجمل اجملی ″ علی احمد فاطمی / عذرا نجیب ۲۵/-
فرمان فتح پوری ″ خلیق انجم ۲۵/-
سردار جعفری ″ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی ۲۵/-
ڈاکٹر خلیق انجم ″ ایم حبیب خاں ۲۵/-
صالحہ عابد حسین ″ عزیزہ قریشی ۲۵/-
نئی نظم کا سفر ″ خلیل الرحمٰن اعظمی ۲۵/-
مشرقی علوم والسنہ ، بہ تحقیق سید حامد حسین ۳/-
پریم چند نمبر عبدالقوی دسنوی ۸/۵۰
ڈاکٹر سید عابد حسین کرنل بشیر حسین زیدی ۱۶/-

سرِ ورق :- ڈاکٹر بیگ احساس

مولانا مہر محمد خاں شہاب ″ ادارہ ۱/۵۰
مرزا سلامت علی دبیر (مرتبہ) عبدالقوی دسنوی ۲/۵۰
جوش ملسیانی ″ ساحر ہوشیارپوری ۵/۵۰
خواتین افسانہ نگار ″ ڈاکٹر صغرا مہدی ۴/۵۰
عرش ملسیانی ″ مالک رام ۱۲/۵۰
سکندر علی وجد ″ یوسف ناظم ۲۵/-
قدسیہ زیدی ″ کرنل بشیر حسین زیدی ۲۵/-
فراق نمبر ″ شمیم حنفی زیر طبع
لغت نویسی کے مسائل ″ پروفیسر گوپی چند نارنگ ۲۵/-
عبداللطیف اعظمی ″ ادارہ ۱۹/-
مشفق خواجہ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم ۳۰/-
جائزے مظفر حنفی / خالد محمود ۲۵/-

زیرِ طبع

غلام ربانی تاباں مرتبہ اجمل اجملی / عذرا نجیب
اختر سعید خاں ″ سید حامد حسین
ہاشم علی اختر ″ سیدہ فاطمہ شجیع
سید حامد ″ ڈاکٹر خلیق انجم
علی احمد خسرو ″ اختر الواسع
جگن ناتھ آزاد ″ ایم حبیب خاں
نثار احمد فاروقی ″ ڈاکٹر خلیق انجم
جمنا داس اختر ″ جی ڈی چندن
گوپی چند نارنگ ″ شہریار / ابوالکلام قاسمی
عنوان چشتی ″ خالد محمود
معین احسن جذبی / قاضی عبدالستار / بلبل کاشمیری
مقصود الٰہی شیخ / کلدیپ نیر / رضا نقوی واہی /
ڈاکٹر گیان چند / شمس الرحمٰن فاروقی / رشید حسن خاں
عصمت جاوید / اکبرالدین صدیقی / جوگیندر پال
—— اور بہت سے دوسرے ادیب صحافی اور ماہران تعلیم ——

نوٹ: پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کا مضمون "مشرقی شعریات اور ساختیاتی فکر" اگلے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں (ادارہ)

مہمان مدیر
ڈاکٹر بیگ احساس
ریڈر شعبہ اردو
عثمانیہ یونی ورسٹی حیدرآباد

اشاریہ

آندھرا پردیش میں اردو کے مسائل

سابق ریاست حیدرآباد نے اردو کی ترقی و ترویج کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ دکن کے سہ لسانی (تیلگو، مراٹھی، کنڑ) ماحول میں اردو رابطے کی زبان کا حکم رکھتی تھی۔ اسے ہندو، مسلمان سب نے تسلیم کیا تھا۔ انیسویں صدی کے آخری دہے میں اردو پہلے عدلیہ اور اس کے بعد انتظامیہ پر حاوی ہوگئی تھی۔ بیسویں صدی کے ابتدائی نصف میں اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ اس ریاست کا اپنا سکہ، محکمہ ڈاک و ریل اور اپنی نشرگاہ تھی اور ان سب پر اردو کی حکمرانی تھی۔ جامعہ عثمانیہ ہندستان کی وہ اوّلین جامعہ ہے جس کا ذریعۂ تعلیم ایک ہندستانی زبان اردو تھی۔ سرسید تحریک سے قبل ہی حیدرآباد میں یہ احساس پیدا ہوچکا تھا کہ جب تک اردو میں علمی کتابیں تیار نہ ہوں اعلا تعلیم کا تصور ممکن نہیں۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ میں جماعتوں کے آغاز سے دو برس قبل دارالترجمہ کا قیام عمل میں آیا۔ نصابی کتابوں کی اشاعت کے لیے دارالطبع قائم کیا گیا۔ اسی دور میں عصری اردو ٹائپ رائٹر کا اختراع بھی کی گئی یہ ایسی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے ریاست حیدرآباد کو فوقیت حاصل ہے۔

۱۹۴۸ء میں سیاست کی بساط الٹ گئی اور اردو کا دیس نکالا ہوا۔ ۱۹۵۶ء میں لسانی بنیاد پر ریاستوں کی تنظیم جدید سے اردو کا عظیم نقصان ہوا۔ ریاست حیدرآباد کے مراٹھی علاقے مہاراشٹرا میں، کنڑا اضلاع کرناٹک میں اور حیدرآباد سے ملحقہ تلنگانہ کا علاقہ ریاست آندھرا پردیش میں شامل کردیا گیا۔ حیدرآباد کو اس ریاست کا دارالخلافہ بنایا گیا۔ ریاست کے پہلے چیف منسٹر جناب این سنجیوا ریڈی نے اردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا۔ لیکن اس پر عمل نہیں ہوا۔ ۱۹۶۶ء میں ریاست کا سرکاری زبان بل منظور کیا گیا۔ لیکن اس بل میں ذہنی تحفظات کے ساتھ ایک دفعہ (۷) شریک کی گئی جس کے تحت متعلقہ علاقوں میں مخصوص اغراض کے لیے ایک خاص مدت تک اردو کے استعمال کی طمانیت دی گئی۔ اس بل کے تحت اردو کے قانونی موقف کی وضاحت کے طور پر ۱۱ سال بعد ایک حکم نامہ ۱۹۷۷ء میں جاری کیا گیا جس پر گزشتہ ۱۲ سال سے مباحث جاری ہیں۔

اردو کے مسائل کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ اردو تعلیم کا ہے اردو مدارس کی حالت بے حد خراب ہے۔ ان مدارس کی عمارتیں مخدوش و بوسیدہ ہیں۔ زیادہ تر مدارس کرایے کی عمارتوں میں ہیں۔ ان میں بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کے ذرائع بھی نہیں ہیں۔ ہوا اور روشنی کا انتظام تک نہیں، پینے کا پانی، باتھ روم، فرنیچر، سائنسی آلات، لائبریری، لیبوریٹری کسی کا انتظام نہیں ہے۔ ایک کمرے میں ہی کئی لڑکے لڑکیاں فرش پر بیٹھتے ہیں۔ عمارتوں کے بعد دوسرا مسئلہ درسی کتابوں کا ہے۔ یہ کتابیں بروقت شائع نہیں ہوتیں۔ شائع ہوتی ہیں تو وقت پر بازار نہیں پہنچتیں۔ مطلوبہ تعداد سے کم شائع کی جاتی ہیں اور اصل قیمت سے دوگنی، سہ گنی قیمت پر فروخت کی جاتی ہیں۔ اردو کتابیں ماہرین سے لکھوائی نہیں جاتیں بلکہ انگریزی یا تیلگو کتابوں کے تراجم کروائے جاتے ہیں۔ تراجم کے لیے بھی اس مضمون کے ماہرین اور زبان سے واقف اساتذہ کی خدمات حاصل نہیں کی جاتیں۔ نتیجے میں تراجم کی فاش غلطیاں ہوتی ہیں۔ اڈیٹر اس کی تصحیح نہیں کرتے کبھی کبھی تو تراجم کے لیے ایسے افراد کا انتخاب کیا جاتا ہے جن کا تدریس سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔

کتابوں کے بعد جو اہم مسئلہ ہے وہ اساتذہ کا ہے۔ اردو اساتذہ کی ہزاروں جا بیدادیں خالی پڑی ہیں جنھیں پُر نہیں کیا جاتا۔ مضمون واری اساتذہ کی کمی ہے۔ خاص طور پر سائنس اور ریاضی کے اساتذہ کئی مدارس میں نہیں ہیں۔ طلبہ بغیر اساتذہ کے پورا سال گزار دیتے ہیں۔ اردو کے تقریباً ایک ہزار اساتذہ کی جگہ خالی ہے ان میں سے صرف دو سو تا ڈھائی سو اساتذہ کے تقرر ہوئے ہیں۔ بعض جا بیدادوں پر غیر اردو داں خاص طور پر تیلگو اساتذہ کا تقرر کر دیا گیا ہے اور اردو والوں کی جا بیدادوں کا نقصان کیا جا رہا ہے۔

اساتذہ کی تربیت کے بہتر انتظامات نہیں ہیں۔ پرائمری کے اساتذہ کی تربیت کا انتظام ریاست کے چھے مراکز پر ہے۔ یہ مراکز حیدرآباد، ورنگل، وقارآباد، ایلور رلے چوٹی، کرنول اور گنٹور میں ہیں۔ ان مراکز کا بہت بُرا حال ہے۔ حیدرآباد جو ریاست کا دارالخلافہ ہے یہاں شہر سے دور تربیتی مرکز ہے۔ اردو والوں کے مسلسل اصرار پر پرانے شہر کے ایک جونیر کالج میں اردو کا مرکز منتقل کیا گیا۔ یہاں جونیر کالج کے دو کمرے مستعار دیے گئے ہیں صرف دو لکچرار یہاں پڑھا رہے ہیں جبکہ اصولاً پانچ لکچرار ہونے چاہیے۔ ان کی نگرانی کے لیے کوئی انچارج پرنسپل بھی نہیں ہے نہ لائبریری ہے اور نہ دوسری سہولتیں۔ جبکہ تیلگو مرکز پر ۱۵ تا ۲۰ لکچرار ہیں۔ بہترین عمارت، تمام ضروریات سے آراستہ ہے۔ بہت ہی اچھی لائبریری ہے اور ایک پرنسپل بھی ہے۔

بی ایڈ کالج خصوصاً سرکاری کالجس میں اردو والوں کو داخلہ نہیں ملتا۔ یہ داخلہ میرٹ کی بنیاد پر دیا جاتا ہے اور اردو کے طلبہ میرٹ میں نہیں آتے۔ انٹرنس کے پرچے تیلگو اور انگریزی میں شائع ہوتے ہیں۔ اردو میں پرچے شائع بھی ہوں تو ان میں بے شمار غلطیاں ہوتی ہیں۔

برسرِ خدمت اساتذہ کے لیے کسی اورینٹیشن کورس کا انتظام نہیں ہے۔ پرائمری اسکول
وجیکٹ جس کے لیے برطانیہ سے رقم ملتی ہے اس میں اردو میڈیم اساتذہ کو تربیت کا موقع
ہیں دیا جاتا۔ تیلگو اور انگریزی میڈیم کے اساتذہ نہ صرف اس سے استفادہ کر رہے ہیں
لکہ مزید ٹریننگ کے لیے وہ انگلینڈ بھی جاتے ہیں۔

اساتذہ کی تربیت کے لیے ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ ہیں مگر ان میں اردو داں لکچرار
ا انتظام نہیں ہے۔

بی ایڈ کالجس میں اردو زبان کی تعلیم کی سہولت رفتہ رفتہ ختم کی جارہی ہیں۔

آندھرا پردیش پبلک سروس کمیشن کے امتحانات میں تیلگو مادری زبان کے امیدواروں
لو ۵ نشانات بطور WEIGHTAGE دیے جاتے ہیں اردو والوں کو یہ سہولت
ماصل نہیں ہے۔

خانگی مدارس اور کالجس کے قیام کے لیے CARPUS FUND کو لازمی قرار
یا گیا ہے۔ جو اردو والوں کے لیے ایک بوجھ ہے۔

کاکتیہ یونی ورسٹی ورنگل میں شعبہ اردو قائم نہیں کیا گیا۔

امبیڈکر اوپن یونی ورسٹی آندھرا پردیش میں اردو ذریعہ تعلیم کا انتظام نہیں ہے۔

SCERT میں تعلیمی تحقیق کے سلسلے میں کئی شعبے ہیں لیکن اردو کے پروفیسر
کی کوئی جائداد نہیں ہے جبکہ تیلگو اور ہندی میں پروفیسر موجود ہیں۔ نصاب اور درسی کتب،
NON-FORMAL EDUCATION اور EVALUATION کے شعبے جات میں اردو کا کوئی لکچرار
نہیں ہے۔ اردو لکچرار کی پوسٹ ہی نہیں رکھی گئی۔

اردو مدارس کو بتدریج ختم کرنے کے لیے انھیں ایک دوسرے میں ضم کر دیا جا رہا ہے
اس طرح مدارس کی تعداد گھٹتی جارہی ہے۔ بعض عمارتوں کو میلوں دور منتقل کیا گیا جس سے
طلبہ کی تعداد کم ہوگئی۔

سرکاری زبان کمیشن میں اردو کا کوئی نمایندہ نہیں ہے۔ ایک عرصے سے میناریٹی
سرٹیفکیٹ بھی جاری نہیں کیے جارہے ہیں۔

اردو کا ایک ہی ڈگری کالج ہے۔ یونی ورسٹی کے زیر انتظام ڈگری کالجس میں میرٹ کی
بنیاد پر داخلہ دیا جاتا ہے اس میں مسلمان لڑکے نہیں آپاتے۔ اگر آتے بھی ہیں زبان دوم عربی یا
ہندی منتخب کرتے ہیں۔ ڈگری کالجس کے اردو اساتذہ کو اپنی ملازمت بچانے کے
لیے سوجتن کر کے کسی نہ کسی طرح ایک دو طالب علم اکٹھا کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

کچھ ایسے مسائل بھی ہیں جن کی ذمے داری حکومت پر نہیں ہے بلکہ خود اردو والے
مجرم ہیں۔ اردو اساتذہ کا رویہ انتہائی غیر ذمہ دارانہ ہے۔ بہ وقت پر اسکول نہیں جاتے۔
سائنس اور ریاضی جیسے اہم مضامین کے اساتذہ کلاس نہیں پڑھاتے یا کلاس میں پہنچ کر ناول
کے مطالعے میں غرق ہو جاتے ہیں۔ انھیں اس بات کا اطمینان ہے کہ ہیڈ ماسٹر ان کا کچھ نہیں

بگاڑ سکتا۔ اگر وہ ٹرانسفر کے لیے لکھے بھی تو وہ رشوت کے ذریعہ اُسے رکوا دیں گے۔ ان اساتذہ پر محکمہ تعلیم نے موثر نگرانی نہیں رکھی ہے۔ پینل انسپکشن PANNEL INSPECTION ہوتا ہے اس میں اساتذہ شامل ہوتے ہیں۔ یہ اساتذہ اپنی برادری کے خلاف کچھ ایکشن لیتے گھبراتے ہیں۔ جب تک اونچے عہدہ دار اسکولوں کا اچانک معائنہ نہیں کریں گے۔ یہ اساتذہ اسی طرح بے پروائی کا اظہار کرتے رہیں گے۔

ریاستی حکومت اگرچہ اردو کو سرکاری سطح پر استعمال کے احکام جاری کرتی ہے لیکن انتظامیہ اس پر عمل نہیں کرتا۔

آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کے قیام کے بعد سے پہلی میعاد کو چھوڑ کر آج تک سیاسی شخصیتوں کو سکریٹری / ڈائرکٹر بنایا جا رہا ہے۔ اکیڈمی کا بجٹ بے حد کم ہے بجٹ کا بیشتر حصّہ ملازمین کی تنخواہوں پر صرف ہو جاتا ہے۔ اب بجٹ میں کسی قدر اضافہ کیا گیا ہے۔

جناب حبیب الرحمن شیروانی، جناب عابد علی خاں اور جناب حسینی شاہد وسری نیواس لاہوٹی کے بعد ریاستی انجمن ترقی اردو کمزور ہو گئی ہے۔

اردو صحافت کا بھی اب موثر رول باقی نہیں رہا۔ آبادی کے تناسب سے اردو اخبارات کے خریداروں کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوا۔ اکثر اردو اخبار غیر مقیم ہندستانی جو خلیجی ریاستوں اور امریکا، انگلینڈ اور کناڈا میں ہیں۔ ان کی معمولی معمولی سرگرمیوں کی تفصیلی رپورٹ شائع کر کے انھیں خوش کرنے کی پالیسی پر عمل کر رہے ہیں۔

آج صورت حال یہ ہے کہ دفاتر میں اردو کا گذر نہیں ہے۔ ان علاقوں میں کچھ جہاں اردو والوں کی ایک بڑی تعداد رہتی ہے۔ اردو کا استعمال برائے نام ہے۔ حیدرآباد کے بازار کی زبان اردو ہے لیکن رفتہ رفتہ یہ اب پرانے شہر تک محدود ہوتی جا رہی ہے آیندہ برسوں میں آندھرا پردیش کو ایک لسانی ریاست کی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ تیلگو دیشم کے اقتدار کے دور میں این ٹی راما راؤ نے حیدرآباد کی اردو تہذیب پر کاری ضرب لگائی۔ حسین ساگر کے ایک جانب وجیہ نگر کمان دوسری جانب کاکتیہ کمان ہے۔ پورے کنٹے پر تیلگو کی مشہور شخصیتوں کے بُت لگے ہیں۔ ان بُتوں میں مخدوم محی الدین اور میر عثمان علی خاں بھی شامل ہیں بُتوں کی تنصیب تیلگو کلچر کا حصّہ ہے۔ حسین ساگر جھیل کے بیچوں بیچ گوتم بدھ کا ایک بڑا مجسمہ ایستادہ کیا گیا جس پر کروڑوں روپے لاگت آئی۔ باغ عامہ میں تیلگو کلا تھورنم کی عمارت بن گئی۔ تیلگو یونی ورسٹی کا عارضی دفتر قائم ہو گیا۔ سکریٹریٹ کے سامنے تیلگو تلی (تیلگو ماں) کا بُت نصب کیا گیا ہے۔ سکریٹریٹ کی نئی عمارت بالکلیہ مندر جیسی ہے۔ نوبت پہاڑ کو توڑ کر وہاں پلانیٹوریم بنا دیا گیا۔ اس کے بالکل سامنے برلا مندر تعمیر کیا گیا ہے۔ حیدرآباد جو اردو تہذیب کا گہوارہ تھا اب اسے پہچاننا مشکل ہے اردو اسکولوں کے نتائج صفر ہیں۔ خود اردو والے اپنے بچّوں کو ان اسکولوں میں نہیں بھیج سکتے

کیوں کہ ان اسکولوں میں بچوں کو بھیجنا ان کے مستقبل کو تباہ کرنے کے مترادف ہے۔ نتیجے میں ایک ایسی نسل کی فصل تیار ہو چکی ہے جو اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اردو گھرانوں میں پیدا ہونے والے بچوں کی مادری زبان تو اردو ہو گی لیکن ایک ترقی یافتہ زبان صرف بولی بن کر رہ جائے گی۔ بچے اس کے رسم الخط سے محروم ہو جائیں گے۔ ہماری نسل صرف زوال کی تماشائی بنی اس بے پناہ کرب کو محسوس کر سکتی ہے ہم شاید عمل کی طاقت کو کھو چکے ہیں۔

بچوں کے لیے مذہبی کتابیں

حضرت آدم علیہ السلام - منورہ نوری خلیق ۴/-
رسالہ دینیات اول محمد نعیم الدین زبیری ۳/-
رسالہ دینیات دوم " ۴/-
رسالہ دینیات سوم " ۵/-
رسالہ دینیات چہارم " ۵/-
رسالہ دینیات پنجم " ۶/-
بزرگانِ دین محمود علی خاں جامعی ۴/-
امت کی مائیں حسین حسنی ۴/۵۰
اچھی باتیں سعد الدین انصاری ۴/۵۰
خوب سیرت اول حکیم محمد سعید ۶/-
خوب سیرت دوم " ۴/۵۰
سلطان جی اسلم فرخی ۴/-
رسول اللہ کی صاحبزادیاں فضل قدیر ندوی ۴/۵۰
رحمان کا مہمان رفیع الزماں زبیری ۶/-
کمسن صحابی " ۵/-
اسلام کے جاں نثار " ۴/-
سیرت پاک مختصر مختصر احمد خاں خلیل ۳/-
نور کے پھول حکیم محمد سعید ۹/-
سب سے بڑے انسان۔ رسول اللہ " ۴/۵۰
حضرت حمزہ رضہ احتشام علی رحیم آبادی ۲/-
حضرت عبدالرحمن بن عوف رضہ " ۳/-
حضرت ابوہریرہ رضہ " ۴/-
حضرت محبوب الٰہی رح مشیر الحق ۲/-
حضرت قطب الدین بختیار کاکی رح " ۲/-
حضرت فرید الدین گنج شکر رح " ۳/-
حضرت معین الدین چشتی رح " ۳/-
حضرت ابوبکر صدیق رضہ " ۶/-
حضرت طلحہ رضہ " ۲/-
حضرت سلمان فارسی رضہ " ۲/۵۰
حضرت ابوذر غفاری رضہ " ۲/-
حضرت عبداللہ بن عمر رضہ " ۲/-

حضرت عبداللہ بن عباس رضہ مشیر الحق ۳/-
نیک بیٹیاں " ۳/۵۰
اسلام کیسے پھیلا؟ حصہ اول عبدالواحد سندھی ۷/۵۰
" حصہ دوم " ۶/-
قرآن پاک کیا ہے؟ " ۴/-
اسلام کیسے شروع ہوا؟ " ۷/۵۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار، اول، دوم " فی حصہ ۶/-
اسلام کے مشہور امیر البحر " ۹/-
رسول پاک " ۶/-
دس جنتی الیاس احمد مجیبی ۵/۵۰
سرکار کا دربار " ۶/۵۰
چار یار " ۷/۵۰
آں حضرت (اردو) " ۳/۵۰
حضرت محمد (ہندی) " ۱/۴۰
اللہ کا گھر خلیل احمد جامعی ۴/۵۰
اللہ کے خلیل " ۳/۵۰
رسول پاک کے اخلاق " ۴/-
اللہ کے صفی " ۲/۵۰
ہمارا دین حصہ اول سید شہاب الدین دسنوی ۸/۵۰
" دوم " ۷/۵۰
" سوم " ۸/۵۰
منہاج القرآن خدیجہ سیدنا طاہر سیف الدین ۴/۵۰
ارکان اسلام مولانا اسلم جیراجپوری ۳/۵۰
عقائد اسلام " ۲/۵۰
خلفائے اربعہ خواجہ عبدالحی فاروقی ۹/-
نبیوں کے قصے " ۶/۵۰
ہمارے رسول " ۶/-
پیارے رسول سلطانہ آصف فیضی ۴/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاء ادارہ ۲/-
مسلمان بیبیاں اعجاز الحق قدوسی ۶/-
ہمارے نبی سید نواب علی رضوی ۳/۵۰
سرکار دو عالم محمد حسین حسان ۹/-
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد) (کلاں) ۱/۵۰، ۴/-

احمد ندیم قاسمی
اے - ۱۹ - ایبٹ روڈ
لاہور - پاکستان

غزل

تیری جانب سفر، حیات مری
تُو مرا ہے تو کائنات مری

عکس در عکس تُو نظر آئے
بٹ گئی آئنوں میں ذات مری

اپنی اپنی ہماری مملکتیں
سارا دن تیرا، ساری رات مری

پوری دنیا سراپا استعجاب
سُن کے اک سیدھی سادی بات مری

میں کہ مسجود ہوں فرشتوں کا
عرش تک حدِ ممکنات مری

میرے اندر ہزار دنیائیں
اور پھر اَن گنت جہات مری

میرا فن میرے بعد بھی زندہ
یوں ہوئی موت سے نجات مری

اپنے باطن کا ترجماں ہوں ندیمؔ
میرا ہر شعر، واردات مری

پروفیسر مظفؔر حنفی
صدر شعبۂ اردو
کلکتہ یونی ورسٹی کلکتہ ۷۳
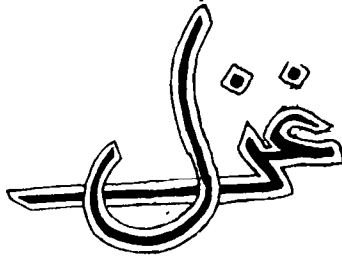
ٹھوکر لگی تو خود ہی سمجھ آگئی ہمیں
اب ایک بوجھ لگتی ہے اپنی خودی ہمیں

چلنے میں آرہا تھا مزا آبلوں کے ساتھ
منزل خود آگئی کوئی جلدی نہ تھی ہمیں

پوچھا کسی نے نام نہ در وا ہوا کوئی
پہچاننے لگی ہے تمھاری گلی ہمیں

دل پر ہمارا بس ہے نہ آنکھوں پہ اختیار
کب تک ہر ایک بات پہ آئے ہنسی ہمیں

پینے کے بعد ہم سے کہا پارساؤں نے
کیا چیز تھی میاں، بہت اچھی لگی ہمیں

اپنوں کے وار جھیلنے کیا غیر آتے ہیں
یلغار اپنے خون کی سہنی پڑی ہمیں

صدیوں کریں گے راج مظفؔر دلوں پہ ہم
حاصل ہے سلطنت کی جگہ شاعری ہمیں

شفق امام
سرائے میاں ۔ علی گڑھ ۔

دیارِ غیر میں اپنا ملے تو
کوئی منظر سراب آسا ملے تو

سمجھ لوں گا بہاریں آ گئی ہیں
درختوں پر ہرا پتّا ملے تو

یہ خود کاڑھے گی گھونگھٹ انگلیوں کا
ہتھیلی کو کوئی سکہ ملے تو

وہ ضربِ خشت ہو یا وارِ خنجر
ترے ہاتھوں کوئی تحفہ ملے تو

شفق تا عمر آئینہ نہ دیکھوں
مگر اک دوست اچھا سا ملے تو

احمق بہادری
ڈابھاکیند سندری، دمکا۔ بہار

سمجھا تھا جسے میں نے لطافت کا سمندر
تھا ریت کے صحرا میں قناعت کا سمندر

غربت کے طمانچوں کے نشاں رخ پہ عیاں تھے
افلاس میں پہچان حرارت کا سمندر

دھتکارا زمانے نے ہر ایک موڑ پر مجھ کو
گھیرے ہے جزیرے کو مصیبت کا سمندر

اخلاق ہے نایاب تو اخلاص ہے ناپید
اس واسطے سوکھا تری عظمت کا سمندر

نیرنگیٔ حالات کا شکوہ نہیں احمق
غرقاب اگر کر دے ندامت کا سمندر

ابوبکر رضوی
شعبہ اردو، پٹنہ یونی ورسٹی پٹنہ ۵

ارے تم کیوں نہیں آتے

(سیتا مڑھی فساد سے متاثر ہو کر)

یہ سیتا کی زمیں پر
آج پھر
راون ہے کیوں رقصاں
لہو پھر آج
کیوں رستا ہوا ہے آدمیت کا
یہ دھرتی آج
کیوں اوڑھے ہوئی ہے خون کی چادر/ یہ کیوں پھر آج
گڈو اور بتو بے سہارا ہیں
کہاں ہیں آج پھر
شہناز اور مہتاز کے ابو / کہ
پاپا بھی وہی تھے اور ممی بھی وہی تو تھے
کٹورا کس نے پکڑایا ہے
ان معصوم ہاتھوں میں
نہ جانے کتنی سیتاؤں کی عصمت لٹ گئی پھر سے
وہی سیتا ہرن کی داستانیں پھر سے تازہ ہیں
جنک کی اس مقدس سرزمیں پر
آج پھر ہر سو / لباس رام میں
راون کا ننگا ناچ ہے برپا
کہاں ہیں رام اور لکشمن؟
کہاں فوجِ ہنو ماں ہے؟؟
ارے تم کیوں نہیں آتے! ارے تم کیوں نہیں آتے!!
بچانے اپنی سیتا کو !!!

۱۔ شہناز اور مہناز وہ یتیم بچیاں ہیں جن کے والد کو فسادیوں نے قتل کر دیا جو ان کے اس دنیا میں واحد سہارا تھے۔

ساجد حمید
شیموگا۔ کرناٹک

غزل
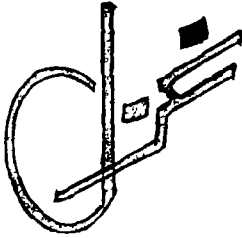
اسے خموش دیکھ کر
نظر اداس بجھ گئی
ہوس زدہ گرسنہ شب
تھی بدحواس بجھ گئی
جو تھی قرینِ دل نگہ
سخن شناس بجھ گئی
شکستہ پا تھی آرزو
نہ آئی راس بجھ گئی
لگی جو ٹھیس روح کو
بدن کی پیاس بجھ گئی

جوہر زاہری
لندن

لب پہ نالہ نہ آنکھ پُر نم ہے
کون جانے کہ مجھ کو کیا غم ہے

تیرہ بختی نہ ہو فنا جب تک
صبحِ نو کا وجود مبہم ہے

کل فرشتوں کو حکم سجدہ تھا
کیوں ذلیل آج ابنِ آدم ہے

میرے پروردگار دیدہ و دل
آج جلووں میں حسن کچھ کم ہے

زندگی کو سکوں ہو، ناممکن
عشق کا صرف ایک عالم ہے

عشق ہے کائنات کا جوہر
حسن پاکیزگیِ مریم ہے

ڈاکٹر سیّد محمود دیوان
لندن

غزل

چمن کی یاد میں آہ و فغاں ہے
قفس والو! مرا بھی آشیاں ہے

توجہ اس کی کانٹے کی چبھن سی
کہاں وہ شوخ ہم سے بدگماں ہے

یہ میرا، ان کا ذاتی مسئلہ ہے
رقیب روسیہ کیوں درمیاں ہے

وطن جاکر بھی اب میں کیا کروں گا
مکاں کا بھی نہیں باقی نشاں ہے

بنائیں گے چمن میں آشیاں پھر
نگاہِ برق کو دیکھیں کہاں ہے

فقط صیاد کا کھٹکا نہیں ہے
نظر میں برق کے بھی آشیاں ہے

ذرا دیکھو تو پہلے بال و پر کو
تڑپنا پھر کہ فصلِ گلستاں ہے

کلامِ حضرت دیوان سن کر
سبھی کہتے ہیں یہ اردو زباں ہے

ذاکر خان ذاکر
۸۰-سی- جواہر کالونی جھالا دار
راجستھان

کرفیو

ظلم کے سایے دوڑ رہے ہیں
شہر میں اب بھی کرفیو ہے
ایسے میں اک بیوہ عورت
ماں تا کی اک سندر مورت
کیسے کام پہ جائے گی
آج بھی شاید کل جیسے ہی
خالی برتن رکھ چولھے پر
بچوں کو بہلائے گی

ڈاکٹر اسحاق طبیب
مدیر "چوں چوں کا مربہ"
بدایوں۔ یوپی
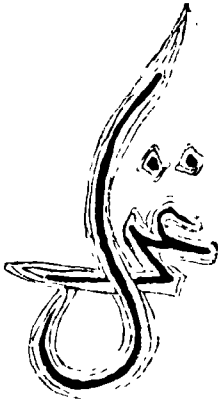
(روح غالب سے معذرت کے ساتھ)

ہم تو مارے ہوئے ہیں گیہوں کے
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
دل بھی حاضر ہے جان بھی حاضر
کچھ کہو بھی کہ مدّعا کیا ہے
کون جانے میاں سیاست میں
گاڈ، بھگوان اور خدا کیا ہے
ووٹ دے ووٹ اے مرے ووٹر
اور نیتاؤں کی صدا کیا ہے
اے طبیب اک پڑوس کی مرغی
"مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے"

سید اولاد رسول قدسی
سید منزل
مرزا پور
بھدرک - اڑیسہ

غزل

جسم خودی میں ہو گی ضیا سر سے پانو تک
ذوق نمو سے خود کو سجا سر سے پانو تک
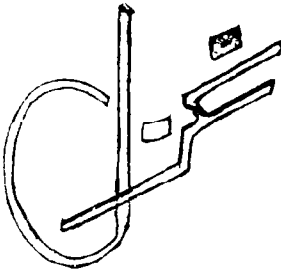
لفظوں کے زرق برق لباسوں کے باوجود
معنی کا تن بدن ہے کھلا سر سے پانو تک

سنتے تھے موم سے بھی ہے وہ نرم بے پناہ
دیکھا تو سنگِ سخت ملا سر سے پانو تک

شیشہ مرے نصیب کا ٹکرا کے چرخ سے
پل بھر میں ریزہ ریزہ ہوا سر سے پانو تک

برپا تھا کیسا ظلم خلاؤں میں قدسی آج
لت پت ہوئی لہو سے ہوا سر سے پانو تک

خواجہ رحمت اللہ جری
۶۶، سعودیہ ۶، بیہ

نظر کو درد، قلم کو جو واقعات نہ دے
رہِ سفر میں وہ یارب! مشاہدات نہ دے

میں انتظار کی زحمت سے بچ سکوں دن کے
جھپکتی نیند کے ہم رہ طویل رات نہ دے

ہر ایک شے پہ جو قادر ہے اس سے ناممکن
سفر کا حوصلہ دے اور پئے ثبات نہ دے

نہ لے زکات وہ تجھ سے یہ کیسے ممکن ہے
جو دے حیات تجھے اور غمِ حیات نہ دے

زبان و لوح و قلم چھین لو جری اس سے
جو دکھ کی بات کرے اور دکھ کا سات نہ دے

انجم بارہ بنکوی
منصب منزل۔
کربلا روڈ، بھوپال۔ ایم پی

ڈاکٹر حمید اختر سردھنوی
اسلام آباد، میرٹھ

تجھے شعورِ سخن بھی نہیں ہے اب مت پوچھ
اسی میں تیرا بھلا ہے میرا نسب مت پوچھ

چراغِ مُجز شب ہے یہ کھل چکا ہے توسُن
مرے عزیز ابھی اس سے رازِ شب مت پوچھ

دلِ غریب اگر بات کا دھنی ہے تو پھر
دلِ غریب سے مجبوریِ طلب مت پوچھ

مسافرت میں کسی صاحبِ تقدس سے
ہزار بار کہا ہے حسب نسب مت پوچھ

جواب دینے میں انجم ہے سر بہ خم اب بھی
نئے سوال تو اس سے عجب عجب مت پوچھ

رفاقت کا پتا دیتا ہے اب بھی
مجھے کوئی صدا دیتا ہے اب بھی

جہاں آنکھوں میں نیند آئی وہ آکر
مرے بازو ہلا دیتا ہے اب بھی

وہ محسن ہے جو اکثر حادثوں کو
مرے گھر کا پتا دیتا ہے اب بھی

ہزاروں زخم ہیں سینے میں جس کے
وہ چہرہ مسکرا دیتا ہے اب بھی

مرے شہرِ محبت میں وہ اختر
کوئی فتنہ جگا دیتا ہے اب بھی

سیفی سرونجی
سیفی لائبریری، سرونج ایم پی

دل میں تو بہت کچھ ہے اجاگر نہیں کہتے
ہم گھر کی کوئی بات ہو باہر نہیں کہتے

یہ سچ ہے ہر اک ذرّے کو گوہر نہیں کہتے
تم لاکھ کہو ہم اسے پتھر نہیں کہتے

ہنسنا بھی جہاں ایک مصیبت سے نہیں کم
سب کچھ اسے کہتے ہیں مگر گھر نہیں کہتے

خوشبو نہ سہی پھول میں کچھ تو ہے حقیقت
بیکار ہر اک چیز کو اکثر نہیں کہتے

غربت نے ہمیں بخشی ہے سنجیدگی سیفی
ہنسنے کی کوئی بات بھی ہنس کر نہیں کہتے

پروفیسر س۔ یونس
۸۔ احباب کالونی۔ ناگپور
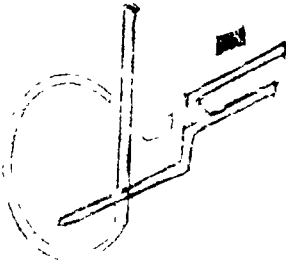
وقت کی لوح پہ تقدیر کا فرمان چڑھا
جنگ سوچوں میں ہوئی دالو پہ انسان چڑھا

اپنے ہی خوف کے سایے کو وہ دشمن سمجھا
دیکھنے جب بھی فصیلوں پہ نگہبان چڑھا

سخت دشوار ہے نظروں میں کسی کی چڑھنا
جو بھی پربت پہ چڑھا وہ بہت آسان چڑھا

زندگی کا یہی مقصد ہے، ارے دیوانے!
ڈھونڈ آدرش کوئی اور بلیدان چڑھا

زندگانی تو ہے دن رات برتنے کے لیے
اس صحیفے پہ نہ تقدیس کا جزدان چڑھا

زندگی اپنے لیے تھی ہی زیاں کا سودا
جتنا جیتے رہے نقصان پہ نقصان چڑھا

ملک زادہ جاوید
بی ۴۵ بھیل کالونی، سیکٹر ۱۷
نوئیڈا

وِس پڑنے لگی ہے لہجوں پر
بک نہ جاؤں میں چند سکّوں پر
آندھیاں چل رہی ہیں مدّت سے
خاک اُڑنے لگی ہے چہروں پر
قتل و غارت گری کی ہر رُت میں
نیکیاں اُتری ہیں فرشتوں پر
جلتے سورج اُگا کے گھر گھر میں
پھر کرم بھیجتا ہے بندوں پر
اپنی بیساکھیاں ہٹا لو تم
میں کھڑا ہوں اب اپنے پیروں پر

فرحت جہاں
"کونسیل" ۴/۴۴ ای
عیدگاہ ہلز۔ بھوپال

ریزہ ریزہ

جاتے جاتے
مُڑ کے دیکھا اس نے
در، دیوار، کھڑکیاں، چھت
اڑ رہے آگ کے پھول
سرسبز شاخوں پر
دُبکی بیٹھی کالی بلّی
دودھ پر ڈھکنا
توے پر روٹی
لڑھکتی منّے کی گیند
جلتے جاتے
پلٹ کے دیکھی اس نے
دروازے کی چوکھٹ

ابراہیم یوسف
۱۶۔ نیم روڈ، امامی گیٹ
بھوپال

اردو ڈراموں میں فوق الفطرت کردار اور واقعات

اردو کے ابتدائی ڈراموں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو فوق الفطرت کرداروں اور واقعات کی ایک دنیا آباد نظر آتی ہے۔ فوق الفطرت کرداروں میں پریاں، دیو، اجنہ بھوت، چڑیل، کراماتی فقیر اور جوگی اور جادوگر وغیرہ ان ڈراموں میں اہم کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں اور فوق الفطرت واقعات میں کسی کراماتی فقیر کا ہوا میں اڑنا، کراماتی عصا، تعویذ اور نقش کے ذریعے مشکلات پر قابو پانا جادو کے ذریعہ عجیب و غریب حالات پیدا کرنا ہے۔ یہ سب کچھ صرف اردو ڈرامے ہی میں نہیں ہے۔ یورپین ڈرامے میں بھی یہ سب کچھ موجود ہے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں میں پریاں اور چڑیلیں موجود ہیں۔ گویا ان فوق الفطرت کرداروں اور واقعات کا تصور عالمی ہے اس میں کچھ تھوڑا بہت اختلاف ہوسکتا ہے۔

ان فوق الفطرت کرداروں میں سب سے مقبول کردار پریوں کا ہے۔ پریوں کو آتشی مخلوق مانا جاتا ہے اور مزاجاً بھی وہ آتشی ہے لیکن اس کے ساتھ وہ حسن و جمال کا نادر نمونہ مانی جاتی ہیں۔ اور رقص و موسیقی ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ وہ پھولوں سے محبت کرتی ہیں اور خوبصورت باغوں میں رہتی ہیں اور چاندنی راتوں میں سیر کے لیے نکلتی ہیں وہ جادو بھی جانتی ہیں اور منٹوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتی ہیں۔ اگرچہ مزاج کے اعتبار سے وہ آتشی ہیں مگر اردو ڈرامانگاروں نے انھیں انسانی خصوصیات دیکر ڈراموں میں انسان کی طرح عمل کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔

اردو ڈراموں میں پریوں کو بالعموم ہوس پرست کے طور پر پیش کیا گیا ہے وہ نوجوان مردوں کو اپنی جنسی تسکین کے لیے اڑا کر لے جاتی ہیں اور مرد کے انکار پر اسے اذیت پہنچاتی ہیں۔ آرام کے ڈرامے "بے نظیر بدر منیر" کی ماہ رخ پری بے نظیر کو اڑا کر لے جاتی ہے۔ اسے باغ میں رکھتی ہے تفریح کے لیے اڑنے والا گھوڑا دیتی ہے لیکن یہ معلوم ہونے پر کہ وہ بدر منیر سے محبت کرتا ہے اسے کنویں میں قید کر دیتی ہے۔ محمد الف خاں حباب کے ڈرامے، نیرنگ قاف عرف غزالہ ماہرو ہیں لعل پری ماہرو کو لے جاتی ہے یہ معلوم ہونے پر کہ وہ غزالہ سے محبت کرتا ہے ماہرو کو ایک دیو کے ذریعہ غزالہ کے محل میں بھیجتی ہے جو غزالہ

کے سامنے ماہرو کو اذیتیں دیتا ہے۔ آرام کے ڈرامے لعل و گوہر میں ہیرا پری شہزادہ لعل سے وصل کی طالب ہوتی ہے اس کے انکار پر جادو سے لعل کو ہرن بنا کر جنگل میں چھوڑ دیتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

بعض ڈراموں میں پریوں کی آتش مزاجی ہمدردی میں بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ محمود میاں رونق کے ڈرامے عجائبات پرستان میں صنوبر پری شہزادہ شمشاد کو لے اڑتی ہے اور وصل کی طالب ہوتی ہے۔ شمشاد کے انکار کرنے پر اسے قید کر دیتی ہے۔ دوسری پریاں لعنت ملامت کرتی ہیں کہ کیسی عاشق ہے کہ اپنے معشوق کو ایذائیں دیتی ہے تو وہ اپنے فعل پر نادم ہوتی ہے اور شمشاد کی گلبدن سے شادی کرانے میں مدد کرتی ہے۔ اسی طرح حباب کے ڈرامے شرر عشق کی شعلہ پری پہلے تو شہزادہ جانِ جہاں پر عاشق ہوتی ہے مگر بعد میں عالم آرا سے جانِ جہاں کی شادی کرانے میں مدد کرتی ہے۔

پریوں کے ماں باپ بھی انسانوں کے ماں باپ سے مختلف نہیں ہوتے انھیں اپنی بیٹیوں کی عزت و عصمت کا اتنا ہی خیال ہوتا ہے جتنا انسانوں کو وہ ان کا انسانوں سے میل جول پسند نہیں کرتے چنانچہ حافظ عبداللہ کے ڈرامے ثمرہ نیک و بدسلوک معروف بہ عشق بکاؤلی اور تاج الملوک میں جب بکاؤلی کی ماں کو پتہ چلتا ہے کہ بکاؤلی تاج الملوک سے محبت کرتی ہے تو وہ اسے قید خانہ میں ڈال دیتی ہے اور تاج الملوک کو صحرائے طلسم میں پھینکوا دیتی ہے۔ اسی طرح آرام کے ڈرامے لعل و گوہر میں جب گوہر کے ماں باپ کو معلوم ہوتا ہے کہ گوہر ایک انسان سے محبت کرتی ہے تو وہ گوہر کو قید کر دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ان اردو ڈراموں میں پریوں کے بارے میں جو روایتی تصور ہے وہ مفقود ہے۔ صرف آرام کے ایک ڈرامے لعل و گوہر میں روایتی پریوں کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ وہ چاندنی راتوں میں نکلتی ہیں، پھول چن کر ہار بناتی ہیں ایک دوسرے کو پہناتی ہیں گاتی ناچتی ہیں خوبصورت مرد اور عورت کو پاس پا کر لٹا کر ان کے حسن سے محظوظ ہوتی ہیں وغیرہ۔ حباب کے ڈرامے سدابہار کی لوازمیں پریاں خواب دکھلاتی ہیں اور خواب میں مسائل کا حل بھی بتلا دیتی ہیں لیکن اردو میں پریوں کا یہ کردار استثنا کی حیثیت رکھتا ہے ورنہ عام طور پر انھیں ہوس پرست اور آتش مزاج کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اگر ان کا شکار ہاتھ سے نکل جائے تو وہ پروا نہیں کرتیں۔

اردو ڈراموں کا دوسرا فوق الفطرت کردار دیو کا ہے۔ پریوں کی طرح دیو کا تصور بھی ایرانی ہے۔ دیو قوی الجثہ اور مزاج کے اعتبار سے ضدی ہوتے ہیں اور ان کے سر پر سینگ ہوتے ہیں۔ عام طور پر پریوں کے حکم بردار ہوتے ہیں لیکن

کبھی کبھی شرارت پر اتر آتے ہیں تو انھیں قید بھی کر لیتے ہیں اور وصل کے طالب ہوتے ہیں جو انھیں کبھی نصیب نہیں ہوتا۔ ان کی عورتیں دیونیاں کہلاتی ہیں مگر کسی ڈرامے میں یہیں دیونیوں کا کردار نہیں ملتا۔ ان ڈراموں میں دیو کسی پری کے حکم پر کسی نوجوان کو اٹھا لانے کا کام انجام دیتے ہیں۔ اندر سبھا امانت میں سبز پری کی خواہش پر کالا دیو گلفام کو اٹھا لاتا ہے اور ڈراموں میں بھی دیوؤں نے یہ کام انجام دیا ہے۔ ان ڈراموں میں چغلی کھانا دیوؤں کا اہم کردار رہا ہے جس سے ڈرامے میں واقعاتی موڑ پیدا ہوئے ہیں۔ اندر سبھا امانت میں لال دیو پرستان میں گلفام کی موجودگی کی اطلاع راجا اندر کو دیتا ہے۔ لالہ بھیروں سنگھ عظمت کے ڈرامے جشن پرستان میں کالا دیو شہزادہ شمشاد اور صنوبر پری کی محبت کی چغلی پرستان کے بادشاہ سے کھاتا ہے۔ آرام کے ڈرامے بے نظیر بدر منیر میں ایک دیو بے نظیر اور بدر منیر کی ملاقاتوں کی خبر ماہ رخ پری کو دیتا ہے غرض یہ کہ دیوؤں کی چغل خوری کی عادت نے ڈراموں میں نئے نئے موڑ پیدا کیے ہیں۔ دیو حضرت سلیمانؑ سے آج تک ڈرتے ہیں چنانچہ حافظ عبداللہ کے ڈرامے ثمرہ نیک و بد سلوک میں جب تاج الملوک گل بکاؤلی کو لینے جاتا ہے تو ایک دیو کے ہاتھ پڑ جاتا ہے جو باغ بکاؤلی کا محافظ ہے۔ دیو تاج الملوک کو کھا جانا چاہتا ہے لیکن جب شہزادہ کہتا ہے کہ

یہ آگاہی دیتا ہوں اس دم تجھے
سلیماں نبی کی ہوں میں نسل سے

تو وہ فوراً باز آجاتا ہے اور تاج الملوک کو ایک دوسرے دیو کے ذریعہ باغ بکاؤلی میں پہنچا دیتا ہے (مثنوی گلزار نسیم میں حمالہ دیونی نے تاج الملوک کو باغ میں پہنچایا ہے) اسی طرح حباب کے ڈرامے جشن اندر سین میں ایک جادوگر اور راہزن دیو سکندر کو کھا جانا چاہتے ہیں کہ سر[illegible] ن آتا ہے اور وہ انھیں حضرت سلیمانؑ سے کیا ہوا وعدہ یاد دلاتا ہے تو وہ فوراً اپنے فاسد ارادے سے باز آجاتے ہیں۔ غرض یہ کہ ان ڈراموں میں دیوؤں کے جو کردار پیش کیے گئے ہیں ان سے دیوؤں کی تین خصوصیات ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ پریوں کے طابع فرماں ہوتے ہیں اور ان کا حکم بجا لاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ چغل خور ہوتے ہیں اور تیسرے یہ کہ وہ انسانی گوشت رغبت سے کھاتے ہیں جو انھیں کبھی نصیب نہیں ہوتا کہ حضرت سلیمان کا نام سن کر ڈر جاتے ہیں۔

ان ابتدائی ڈراموں میں اجنہ کو بہت کم پیش کیا گیا ہے۔ حباب کے ڈرامے ۔ نیرنگ قاف ۔ ماہرو غزالہ ۔ میں جنوں کا بادشاہ سبز قبا غزالہ کا ہمدرد ہو جاتا ہے اور اسے اپنی بہن بنا لیتا ہے۔ ماہرو کو لال پری کی قید سے آزاد کراتا ہے اور اس کے لیے اسے لال پری کے باپ سے جنگ بھی کرنا پڑتی ہے۔ اسی

ڈرامے میں سعید شاہ جن بھی ہے جس کی ایک دعوت میں لال پری ماہرو پر عاشق ہو
ہے اور اسے لے اڑتی ہے۔ حباب ہی کے ایک اور ڈرامے جشن کنور سین میں سر
جن سکندر کو جادوگر اور اہرمن دیو سے بچاتا ہے۔ بہرحال ان ڈراموں میں جنو
کے مقابلہ میں دیوؤں کا رول زیادہ اہم ہے۔ دونوں کے کرداروں میں فرق
ہے کہ دیو مزاجاً شریر ہوتے ہیں جب کہ جن شریف۔

حباب کے ڈرامے سلیمانی تلوار میں ایک فرشتہ کو آسمان سے اتر
ہوئے بتلایا گیا ہے جو قباد کو نقش سلیمانی دیتا ہے۔

ان ابتدائی ڈراموں میں ہماری ملاقات جادوگروں سے بھی ہوتی ہے۔ ناگر
سبھا اگرچہ ایک ادنا قسم کا ڈراما ہے لیکن اس کی اہمیت اس قدر ضرور ہے
اس میں سب سے پہلے سپیرے اور اس کی بیوی جیسے معمولی لوگوں کو ہیرو ہیر
کی طرح اسٹیج پر پیش کیا گیا ہے۔ ڈرامے کی بنیاد بنگال کے جادو پر ہے۔
ناگر جو ایک سپیرا ہے اور ماہر جادوگر بھی ہے۔ جب ایک جادوگرنی مو
کے حسن اور جادو میں مہارت کے بارے میں سنتا ہے تو اسے جیتنے کے لیے مو
کے پاس جاتا ہے دونوں میں مقابلہ ہوتا ہے اور ناگر ہار جاتا ہے۔ ناگر کی بیو
سندر جوگن بن کر ناگر کی تلاش میں نکلتی ہے۔ موتی کو جادو میں شکست د
ہے اور ناگر کو موتی کے جادو سے آزاد کراتی ہے۔ حباب کے ڈرامے جشن کنو
سین میں سکندر ایک جادوگرنی بلائے اختر شناس کے چنگل میں پھنس جا
ہے جو اس سے وصل کی طالب ہوتی ہے سکندر کے انکار پر پہلے تو اسے جادو
پتھر کا بنا دیتی ہے۔ پھر جادوئی قید خانہ میں قید کر دیتی ہے۔ لیکن ایک بزرگ عا
شاہ اور سر درجن اسے قید سے آزاد کرا لیتے ہیں۔ حباب ہی کے ایک اور ڈ
نقش سلیمانی میں اسمال جوگی ہے (محمود نیازی نے تلمیحات میں اس کا نام اسماع
جوگی لکھا ہے) اس کے قبضہ میں بھوت چڑیل اور جادوگر ہیں جن میں سب
مشہور لوناچاری ہے وہ شداد کو ایک نقش دیتا ہے جس کی مدد سے شداد بادش
حاصل کرتا ہے اور جنت بناتا ہے لیکن قباد نقش سلیمانی کے ذریعے اس
سارے طلسم کو ختم کر دیتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

چڑیلیں اور بھوت اردو ڈراموں میں بہت کم نظر آتے ہیں اور کوئی کر
بھی ادا نہیں کرتے۔

جس طرح ابتدائی ڈراموں میں فوق الفطرت کرداروں کی ایک دنیا آبا
ہے اسی طرح فوق الفطرت واقعات کی بھی کمی نہیں ہے مثلاً جشن پرستان مہ
ایک کراماتی فقیر ہوا میں معلق کھڑا نظر آتا ہے اور پلک جھپکتے ہی شہزادہ شمشہ
کو بلا دیتا ہے۔ شہر عشق میں شہزادہ جان جہاں ایک ہوا میں معلق گھوڑ

پر بیٹھ کر عالم آرا سے بات کرتا ہے پریوں کے حکم پر دیو منٹوں میں ان کے پسندیدہ نوجوانوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اڑا کر لے جاتے ہیں۔ کراماتی عصا کے ذریعے سحر اور جادو کو ختم کیا جاتا ہے۔ تعویذ، گنڈے اپنی کرامات دکھلاتے ہیں۔ زمین پھٹتی ہے اور اس میں دیو اور پریاں برآمد ہوتی ہیں وغیرہ۔

اردو کے ابتدائی ڈراموں میں فوق الفطرت کرداروں اور واقعات کو نقادوں نے بنظر کم دیکھا ہے اور ڈراموں میں ان کی موجودگی کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے کہ یہ کردار اور واقعات بے مقصد اور لایعنی ہیں۔ بیسویں صدی کے نقادوں کا یہ رویہ اس نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا جس میں ہر چیز اور ہر عمل کی سائنٹفک بنیاد تلاش کی جاتی ہے۔ عقیدہ اور اعتقاد کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ آج کا انسان ہو یا انیسویں صدی کا وہ بہ یک وقت دو دنیاؤں میں رہتا ہے ایک دنیا دلائل کی دنیا ہے جس میں ہر واقعہ کے عمل اور ردعمل کو دلائل کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے اور اس کا منطقی جواز تلاش کیا جاتا ہے۔ دوسری دنیا عقائد کی دنیا ہے اور عقائد کے لیے کسی دلیل اور جواز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آج کے انسان نے کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرلی ہو اور وہ کتنا ہی روشن خیال کیوں نہ ہو گیا ہو بھوتوں اور چڑیلوں کا نام سن کر خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ آج بھی بھوت پلید اور چڑیلیں اتارنے کے لیے اوجھا اور مولویوں کی مدد لی جاتی ہے۔ تعویذ گنڈوں پر آج بھی بھروسا کیا جاتا ہے یہ فوق الفطرت کردار اور واقعات انسان کے انھیں عقائد کی نمایندگی کرتے ہیں۔ کسی کراماتی فقیر کا ہوا میں معلق کھڑا ہو جانا کسی کراماتی عصا یا تعویذ اور نقش کے ذریعہ ناممکن کا ممکن ہو جانا ذہن قبول نہیں کرتا مگر کیا کیا جائے کہ لوگوں کا ان باتوں پر اعتقاد ہے۔ مغرب میں حاضرات کے ذریعہ روحوں کو بلایا جاتا ہے اور ان سے بات چیت کی جاتی ہے۔ اس علم پر وہاں کے ایک بڑے طبقے کا اعتقاد ہے۔ اس علم کی حقیقت خواہ کچھ بھی ہو مگر یہ عوامی عقیدہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اسی طرح ہمارے یہاں فوق الفطرت کرداروں، واقعات اور کراماتی فقیروں پر اعتقاد ہے۔ اس لیے ان کرداروں اور واقعات کی ڈراموں میں موجودگی نہ تو باعث شرم ہے اور نہ قابل گردن زدنی۔

ان ابتدائی ڈراموں میں فوق الفطرت کردار اور واقعات بے مقصد نہیں ہیں بلکہ ان کے ذریعے انسان کی بلند حوصلگی، کردار کی پاکیزگی اور اس کے عزم و ہمت کو پیش کیا گیا ہے۔ پریوں کے نزدیک محبت صرف ہوس پرستی کا نام ہے لیکن انسان کے نزدیک محبت ہوس پرستی کا نام نہیں ہے۔ وہ جب محبت کرتا ہے تو بڑے لالچ خواہ دولت کا ہو یا پریوں کے مثالی حسن کا، اسے ڈگمگا نہیں سکتا۔ جب کوئی پری کسی نوجوان کو اڑا کر لے جاتی ہے اور وصل کی

طالب ہوتی ہے تو انسان ہمیشہ انکار کرتا ہے جس سے اس کی بلند کرداری کا ثبوت ملتا ہے۔ پری جسے اڑا کر لے گئی ہے ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو وہ نہ اس پر ماتم کرتی ہے اور نہ پروا لیکن انسان اپنی محبت کی ناکامی پر جان تک دے سکتا ہے یہ ابتدائی ڈرامے انسان اور پری کے کردار کے اس فرق سے بھرے پڑے ہیں۔

پریوں اور دیوؤں وغیرہ میں کتنی ہی فوق الفطرت قوتیں کیوں نہ ہوں وہ انسان کی عظمت، بزرگی اور اس کی محبت کی پاکیزگی کے قابل ہوتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کا نام سن کر کانپ جاتے ہیں۔ کریم الدین مراد کے ڈرامے چترا بکاؤلی میں جب پریاں سبز پری کو راجا اندر کے دربار میں بکاؤلی کی سفارش پر لعنت ملامت کرتی ہیں اور انسان کو حقیر اور ذلیل ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں تو سبز پری اپنے دلائل سے انسان کی عظمت، بزرگی اور اس کے عشق کی پاکیزگی کا انھیں قائل کر دیتی ہے۔ چند مکالمے ملاحظہ ہوں۔

سب پریاں :- بے حیا چل دور ہو، غیرت تجھے آتی نہیں
دشمنوں پر تو ترس کھاتی ہے، شرماتی نہیں

سبز پری :- کور کو آئے نظر کب شکل اہل کار کی
چور کو کیا ہو محبت بے کس ولاچار کی
گھر رہے آخر حویلی شاہ و خدمت گار کی
دور کر دو دل سے باتیں غیرت و پندار کی

لال پری :- ہے خاک اور پانی سے جو انسان کو مانا
سبز پری :- پھر بس یہی ہے تم نے سلیمان کو مانا
سب پریاں :- ہیہات یہ بدذات نے کیا بات نکالی
اس خا[illegible] سے تیلے [illegible] کرامات نکالی
سبز پری :- چھپی ہو تو انسان [illegible] دشنام نہ دینا
اس عشق کے [illegible] سلیمان کو الزام نہ دینا
دنیا میں کہو عشق سے کیا چیز ہے نادر
عشاق کا درجہ ہوا آفاق میں عالی

یہ صرف پریاں ہی نہیں بلکہ دیو، جن، بھوت اور چڑیلیں سب ہی انسان کے سامنے سر جھکاتے نظر آتے ہیں۔ جادوگروں کے سفلی علم بھی انسان کے عزائم کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ جہاں بھی ان فوق الفطرت کرداروں سے انسان کا مقابلہ ہوتا ہے آخر میں انسان ہی کامیاب ہوتا ہے۔ ان ابتدائی ڈرامانگاروں نے فوق الفطرت کرداروں اور واقعات کو پیش کر کے جہاں ایک طرف عوام کو

سی اور عقیدہ کا خیال رکھا ہے وہیں دوسری طرف فوق الفطرت کردار دں
انسان کی عظمت کو منوایا ہے اور فوق الفطرت واقعات پر قابو پانے سے
ان کی بلند حوصلگی، عزم اور ہمت کو اس طرح پیش کیا ہے کہ انسان ہر
، پر قابو پا سکتا ہے اور ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے
ایک بات اور یہ کہ ان ڈرامانگاروں کا احترام جمال یہ برداشت نہیں کرتا کہ
بیسی خوبصورت مخلوق اگر کسی دیو یا جادوگر کے جنگل میں پھنس گئی ہے تو اس
اتھ ہم بستر ہو۔ چنانچہ تاج الملوک دیوؤں سے جنگ کر کے روح افزا پری
د کراتا ہے۔ اسی طرح حباب کے ڈرامے نیرنگ قاف میں سرار زنگ
رہی کے فن میں ماہر ہیں گلنار پری کو ایک جادوگر کی قید سے اپنی عیاری
زاد کراتے ہیں۔ ان ڈرامانگاروں کا یہ حسن کا احترام قابل ستائش ہے۔
بہرحال ابتدائی ڈراموں میں فوق الفطرت کردار اور واقعات نہ تو بے
ں اور نہ بے مقصد۔ ان کو بنظر کم دیکھنا اور تنقید کا نشانہ بنانا انصاف
ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

کتاب	موضوع	مصنف	قیمت
انداز گفتگو کیا ہے۔	(تنقیدی مضامین)	شمس الرحمن فاروقی	۵/ =
اسرارِ خودی (فراموش شدہ اڈیشن) (اقبال)	(شعری مجموعہ)	مرتبہ؛ شائستہ خان	۵-
حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدن	(تاریخ)	مالک رام	۵-
جامِ جہاں نما۔ اردو صحافت کی ابتدا	(اردو صحافت)	گربچن چندن	۵-
مسلمانوں کا تعلیمی نظام	(علمی)	ضیاء الحسن فاروقی	۴۵
اردو ناول میں عورت کا تصور	(تحقیق)	فہمیدہ کبیر	۴۵
نوٹوں کی تلاش	(ناول)	ایاز سیوہاروی	۲۰
تاثر نہ کہ تنقید	(تنقید)	صدیق الرحمٰن قدوائی	۵۱
اپنے دل کی حفاظت کیجیے	(ایلو پیتھی)	ترجمہ نذیر الدین مینائی	۲۵/
بہ صورت گر کچھ خوابوں کے	(انٹرویوز)	طاہر مسعود	۶۶/
مرضیات	(طب)	حکیم نعیم الدین زبیری	۵۱/
بانگ درا	(شعری مجموعہ، طلبہ ایڈیشن)	اقبال	۹/
بالِ جبریل	(شعری مجموعہ) ″	″	۶/
ضربِ کلیم مع ارمغانِ حجاز (اردو نطین)	(شعری مجموعہ) ″	″	۶/
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی	(ناول)	کشمیری لال ذاکر	۴۹/
گوشے ہیں قفس کے	(طنزیہ مزاحیہ)	دلیپ سنگھ	۴۵/
سحر کے پہلے اور بعد	(جگ بیتی)	سعید الظفر چغتائی	۵۱/
افکارِ اقبال	(اقبالیات)	محمد عبدالسلام خاں	۱۲۵/
فرمان فتح پوری	(شخصیت اور ادبی خدمات)	مرتبہ خلیق انجم	۲۵
تذکرہ ماہ و سال	(تذکرہ)	مالک رام	۱۲۵/
تحقیق نامہ	(تحقیق)	مشفق خواجہ	۱۲۵/
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان	(مذہب)	حکیم محمود احمد برکاتی	۴۵/
خواب اور خلش	(شعری مجموعہ)	آل احمد سرور	۶۶/
سفر	(ناول)	رابعہ تبسم	۲۷/
تحریریں	(تنقید)	ڈاکٹر اسلم پرویز	۵۱/
پہچان اور پرکھ	(تنقید)	پروفیسر آل احمد سرور	۵۱/
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	(تحقیق)	ڈاکٹر سلامت اللہ	۵۱/
پت جھڑ کی آواز (نیا اڈیشن)	(افسانے)	قرۃ العین حیدر	۵۰/
اقبال کا نظریہ خودی	(تحقیق)	عبدالمغنی	۱۵۰/
سمندری خزانہ	(ناول)	ماریہ رحمان	۲۰/
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	(تنقید)	وارث علوی	۲۶/
فی الحقیقت	(طنز و مزاح)	یوسف ناظم	۴۵/
مٹی سے ہیرا	(ناولٹ)	سید مقبول احمد	۱۰/
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	(ناولٹ)	صغرا مہدی	۲۴/
الجھاوے	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف	۵۱
غبارِ منزل	(شعری مجموعہ)	غلام ربانی تاباں	۲۵

عبدالقوی دسنوی
پریس کالونی۔ نعمت پورہ ۵
عیدگاہ ہل۔ بھوپال

مرتضیٰ علی شاد

بھوپال کی فضائے تغزل کا نمائندہ شاعر

پیدائش :- ۱۹۳۵ء مقام :- بھوپال تعلیم :- ایم۔ اے اقتصادیات
پتا :- پروفیسر شعبہ اقتصادیات، سیفیہ پوسٹ گریجویٹ کالج، احمدآباد - بھوپال۔
آغاز شاعری :- ۱۹۵۰ء
مطبوعہ تصنیف : جاگتی راتوں کی فصل ۱۹۸۸ مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال
غیر مطبوعہ تصانیف :- (۱) ایک شمع رہ گئی تھی (ڈرامے)
(۲) ماورائے سخن (مضامین)
زیر ترتیب : (۱) نیا شعری مجموعہ (نظمیں)
وفات :- جمعرات ۲۲ اپریل ۱۹۹۳ء پانچ بجے شام

نصف بیسویں صدی کے گزرتے گزرتے بھوپال کے جن نوجوانوں نے وادیِ شعر و شاعری میں قدم رکھا اور اپنی شاعری کی خوشبو سے اپنے گرد و پیش کو مہکایا اور گلریز کیا اور اپنے جذبے کے اتار چڑھاؤ سے اپنے قریب کے لوگوں کو متاثر کیا، اپنے احساس کی گرمی سے ان کے اندر نرمی اور فکر مندی پیدا کی، اپنے افکار و خیالات کی رفعتوں اور وسعتوں سے ان کے ذہنوں میں بالیدگی اور بیداری پیدا کی، ان کی آنکھوں میں چمک اور تازگی سموئی، ان کے دلوں کو گداز کیا اور ان میں انسانی ہمدردیاں جگائیں، ان میں اُس وقت یہاں کے نوعمر شاعر مرتضیٰ علی شاد بھی تھے جو اپنی طبیعت کی شگفتگی، دل کی شادابی اور ذہن کی رسائی کی وجہ سے پہلے ایم۔ اے شاد اور بعد میں مرتضیٰ علی شاد کے نام سے جانے پہچانے ہی نہیں قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔

مرتضیٰ علی شاد پندرہ برس کی عمر کی شاعری کی سوغات لے کر غزل سرا میں داخل ہوئے تو ابتدا میں عرصہ تک وہ اپنی آواز سے لوگوں کے ذہنوں میں ایک خاص کیفیت اور اثر و تاثیر پیدا کرنے میں شاید اس لیے کامیاب نہیں ہوئے کہ ان کی آواز اس وقت تک اپنی پہچان نہیں بنا سکی تھی لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنی فطری شعر و شاعری کے

سلسلے کو جاری رکھا ، البتہ یہ ضرور ہوا کہ ان کی رفتار تیز نہ ہو سکی۔ یہ زمانہ ربع صدی پر محیط رہا ، بلاشبہ اس دوران میں کبھی کبھار نظم کی شاخسار سے بھی گل و بوٹے اپنے دامن میں سمٹتے رہے اور اپنی فکر کی تلوار کو دو دھاری بناتے رہے۔

اس ربع صدی میں انھوں نے خوان غزل پر کیا کچھ چنا اور اسے سجانے کے لیے اپنے خون جگر سے کیا کچھ دیا ، یا کسی طرح کا اضافہ کرسکے یا دم بخود بنے حسرت زدہ رہے کچھ کہا نہیں جاسکتا ، ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس زمانے میں اپنے افکار و خیالات کے چمن کے گل و لالہ اور نسرین و نسترن کو انھوں نے گلدستہ کی شکل دے کر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔

البتہ چند سال قبل انھوں نے اپنے گزشتہ بارہ تیرہ سال کے ذہن کی شعری کاشت کا حاصل "جاگتی راتوں کی فصل" اہل نظر و خبر کے حضور میں پیش کیا ہے جس میں نرم و نازک اور لطیف خیالات و جذبات لیے غزلیں بھی ہیں اور غور و فکر میں ڈوبی ہوئی نظمیں بھی۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاد نے غزل کی تنگ دامانی سے تنگ آکر اور وسعت بیان کے خیال سے مجبور ہو کر نظم کا سہارا لیا ہے تو نظم کی پابندیوں کو بھی برداشت نہیں کیا ہے اور آزاد نظم کے دامن میں پناہ لی۔

یہ آزاد روی شاد کے یہاں غزلوں میں بھی نظر آتی ہے ، وہ نئے نئے تشبیہات تلمیحات استعارات اور علامات سے اپنی غزلوں کو سجاتے اور سنوارتے ہیں ہندی کے الفاظ اور تلمیحات سے اپنی غزل کو آراستہ کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ ان تجربوں میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس سے بحث کیے بغیر یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کی شاعری میں غزل کی روح ایک خاص انداز سے زندہ نظر آتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے یہاں غزلوں میں ایک مخصوص کیفیت کی حکمرانی محسوس ہوتی ہے جن کے مطالعہ سے قاری کو بڑی حد تک تسکین حاصل ہوتی ہے۔

آج اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ آزاد ہندستان کو جن نئے تجربات اور مشاہدات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے اس کی وجہ سے زندگی کے سانچے اور ڈھانچے بدلنے لگے ہیں ، افکار و خیالات میں تبدیلیاں پیدا ہوتی جارہی ہیں۔ نئی تہذیب اور نیا معاشرہ وجود میں آرہا ہے۔ نئے انداز فکر کے انسان ابھر کر سامنے آرہے ہیں اور زندگی کے الجھاؤ سے نبرد آزما ہو رہے ہیں ، جنھیں نئے نئے مسائل سے واسطہ پڑ رہا ہے نئی نئی ضروریات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ جن کے نتائج میں حیرانی ، تنہائی ، بے حسی ، بے فکری ، لاتعلقی ، خودنمائی ، خود بینی خود فریبی اور خود غرضی ، جیسی خرابیاں افراد کے ذریعہ معاشرہ میں داخل ہونے لگی ہیں اور اپنا وجود منوانے لگی ہیں اور اپنے اثرات سے افراد کو تنہائیوں کے کنویں میں ڈھکیلنے لگیں ہیں اور بے بسی ، مجبوری اور بے پناہی کا شکار کرنے لگیں ہیں نتیجہ میں بیمار معاشرہ وجود میں آنے لگا ہے اور نفسی نفسی کی کیفیت ظہور میں آرہی ہے جن سے

خاص طور سے ہماری شاعری بے حد متاثر ہوئی ہے ۔ نئی شاعری بھی کچھ سوغات اپنے ساتھ لائی ہے اور خود اس کی ضرب کرب سے چیخ اٹھی ہے اور اس کا علاج چاہتی ہے ۔ شعرا کا ایک گروہ ان حالات سے بے حد متاثر نظر آتا ہے ان کی شاعری میں ان حالات کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے اور ان پر قابو پانے کا صحت مند جذبہ نظر آتا ہے وہ اپنی شاعری کی توانائی سے اپنے معاشرے کو ان برائیوں سے نجات دلانا چاہتے ہیں ۔ ان کے یہاں انسانوں سے ہمدردی کا جذبہ ملتا ہے ، زندگی سے پیار کی خواہش ملتی ہے معاشرے کو گل بداماں بنانے کی آرزو مچلتی ہے ۔ وہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے حال کی خباثتوں کو اپنی شاعری میں جگہ دے کر ہم عصروں کو ان سے آگاہ بھی کرانا چاہتے ہیں اور فکرمند بھی بنانا چاہتے ہیں اور ان کے دلوں میں ان کے خلاف احساس جگانا بھی چاہتے ہیں ۔

مرتضیٰ علی شاد کی غزلیں بھی کچھ اسی قسم کی کیفیات ، تجربات ، احساسات اور مشاہدات کی حامل نظر آتی ہیں ۔ ان کے یہاں عصری حسیت بھی ہے اور معاصرانہ زندگی کی ترجمانی بھی ہے ، معاشرے کا اضطراب بھی دکھائی دیتا ہے ذاتی محرومیوں کا احساس بھی جاگتا ، لرزتا بے کل ہوتا محسوس ہوتا ہے ، حال کے مسائل انھیں بے چین کرتے ہیں ، زندگی کی الجھنیں اور کلفتیں انھیں مضطرب کرتی ہیں وہ اپنی زندگی میں جن جن تجربات سے گزرتے ہیں وہ ان کی شاعری میں سمٹ آتے ہیں اور اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں ، آئے دن کے حالات اور واقعات ان سے سوال بن کر کچھ پوچھتے ہیں :

وہ تو اک حرفِ دعا کے ماسوا کچھ بھی نہ تھا
پھر اسے کس جرم کی پاداش میں پتھر ملے

شاد کے تجربات اور مشاہدات اُن سے بہت کچھ کہتے ہیں :

ہر چہرہ ہے خواہش کا تابوت یہاں — ہر لب ہے اظہار کا مدفن چپ رہنا
حرف غلط ہے نامِ وفا شاد ان دنوں — رشتہ ہی اب نہ جوڑیے اپنا کسی کے ساتھ
یہاں آسیب کی صورت ہیں انساں — یہ بستی میری پہچانی بہت ہے
تجھے کیا راس آئے گی یہ دنیا — یہاں رسمِ ثنا خوانی بہت ہے

آج کا المیہ یہ بھی ہے کہ وہ ساری اچھی قدریں ختم ہوتی جا رہی ہیں جن سے حیات اور کائنات تابناک بنی ، جن سے زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے کا حوصلہ ملا ، زندگی فرد کا نام نہ تھی ، افراد کا تھی ، سماج کا تھی ، فرد اپنے تنہا وجود کے باوجود معاشرے سے اس طرح جڑا رہتا تھا کہ عام حالات میں اس کے الگ وجود کا احساس نہیں رہتا تھا ، سماج افراد کی نگرانی رکھتا تھا اس کے دکھ درد میں کام آتا تھا اس کے مسائل و مشکلات میں معاون بنتا تھا اور اس کی خوشیوں اور مسرتوں میں شریک رہتا تھا ۔ لیکن نئے حالات نے فرد کو بے لگام کر دیا ہے ، وہ جو چاہے کر سکتا ہے یہ اس کا انفرادی عمل ہے ، سچ ، جھوٹ ، ایمانداری ، ہمدردی ، نیکی شرافت یہ سب بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں ، بلکہ ان کے برخلاف جو کچھ

دیکھنے میں آرہے ہیں وہ وہی کچھ ہیں جو موجودہ حالات کی دین ہیں جن سے جب دوسرے متاثر ہوتے ہیں تو ہم تماشا دیکھتے ہیں، لیکن جب ہم خود ان کے شکار ہوتے ہیں تو مضطرب ہو جاتے ہیں اور دُہائی دیتے پھرتے ہیں۔ شاد کے اشعار ہیں:

لوگ چہرہ پڑھ کے باہم تبصرہ کرنے لگے
یوں تو کہنے کو ابھی مجھ کو ہوا کچھ بھی نہ تھا

ہونٹوں پر جھوٹ کی مہریں لگی ہیں
یہ سچ بھی موردِ الزام ہوگا

محدود دائروں میں گھرے مصلحت اسیر
اہلِ قلم نے جہل کا رتبہ بڑھا دیا

ریزہ ریزہ پڑا ہے آئینہ
سچ کی تقدیر تو یہی ہے مگر

شک، بے اعتمادی، بے اعتباری، مصلحت، حسد، خود غرضی وغیرہ خرابیوں اور بُرائیوں میں گھِر کر انسان ٹوٹ گیا ہے، بے قیمت ہوتا جا رہا ہے، بے وزن بنتا جا رہا ہے اس کا سماجی رشتہ ریزہ ریزہ نظر آتا ہے۔ یہ ترقی یافتہ تہذیب و معاشرہ جس قسم کے آدمی پیدا کر رہا ہے اس نے دنیا سے سکون چھین لیا ہے، طمانیت ختم کر دی ہے۔ یہ آدمی سوچتا کیا ہے، اس کا اندازِ زندگی کیا ہے، اس کے سود و زیاں کیا ہیں، اس کے ہاتھوں یہ دنیا کیا بن رہی ہے شاد کی شاعری میں اس کی جھلکیاں یہاں وہاں اس طرح نظر آتی ہیں:

نہ جانے کون سی منزل پہ آکے ٹھہرا ہے
یہ قافلہ کہ جہاں ہر بشر اکیلا ہے

لوٹ آیا ہے گپھاؤں کا زمانہ شاید
بھیڑ میں رہ کے ہر اک شخص کو تنہا دیکھوں

ٹوٹتے ہوتے رشتے اس صدی کا تحفہ ہیں
یہ عمل مسلسل ہے، تم اگر سمجھتے ہو

ابھی جو اِس بھیڑ میں کھو گیا ہے
میں اس آدمی کا پتا چاہتا ہوں

جو ہم رکاب تھا دشت و جبل میں صحرا میں
وہ شخص شہر میں آیا تو پھر ملا بھی نہیں

اس کا چہرہ بھی قاتلوں میں تھا
یہ بتانے کدھر کدھر جائیں

نئے حالات اور ماحول نے قصباتی زندگی کو بے رنگ اور غیر اہم بنا دیا ہے۔ لوگ روٹی، روزی اور نئے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے شہر کی طرف بھاگ رہے ہیں، شہر اپنا دامن ان کے لیے اس طرح پھیلا نہ سکا جس رفتار سے لوگ ان کے دامن میں پناہ لینا چاہتے ہیں، جس نے بے پناہی کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ وہ جن مسائل کے حل کے لیے آتے ہیں وہ تمام مسائل کچھ اور مسائل کے ساتھ زندگی کو اور زیادہ پیچیدہ بناتے رہتے ہیں، روزی کا مسئلہ، مکان کا مسئلہ معاشرہ کا مسئلہ جس میں طرح طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے طرح طرح کے تعصبات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، طرح طرح کے تقاضات سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے، جہاں سچ، سچ نہیں ہوتا ہے جھوٹ جھوٹ نہیں بنتا، نیکی مفادات کی کنیز ہوتی ہے، سچائی جھوٹ کی محافظ بنتی ہے۔ خدمت گزاری عیاری کی غلامی کرتی ہے۔ اخلاص، اغراض کے بے رحم ہاتھوں بے قیمت نظر آتا ہے جس طرح عام طور سے کھانے کی میز کو چٹنی اور اچار کے چٹخارے پُر لطف بنا دیتے ہیں، آج ایسے لوگ کچھ زیادہ ہی نظر آنے لگے ہیں جو جھوٹ اور فریب کے چٹخاروں سے دل و دماغ کو غبار آلود کرتے ہیں اور آنکھوں

کا نور چھین کر اپنی گرہ کے کھوٹے سکّے چلاتے رہتے ہیں — آدمیوں کی اس قسم نے انسانی زندگی کو تباہی کے غار تک لا کھڑا کیا ہے۔ اب عام طور سے انھیں کم معیار لوگوں کی وجہ بے اعتباری بڑھتی جا رہی ہے — بے اعتنائی بڑھتی جا رہی ہے۔ بے سکونی بڑھتی جا رہی ہے۔ بے چارے عام لوگ نہ ان سے بھاگ سکتے ہیں نہ ان سے آنکھیں چار کر سکتے ہیں بس انھیں میں مجبوراً کسی طرح زندگی گزارتے رہتے ہیں۔

شاد کی شاعری میں پوری طرح آج کا معاشرہ اور اس کی مصنوعی زندگی میں عجیب و غریب رنگ بھرنے والے بے رنگ و روپ انسانوں کی بھرپور تصویر تو نہیں ملتی لیکن اس زندگی کی بعض کلفتوں اور الجھنوں کا اظہار ایک خاص انداز سے ضرور ہوتا ہے۔

آج شہری زندگی میں ایک اہم مسئلہ بے گھری کا ہے جس کی وجہ سے عام طور سے شہر کے لوگ ایک خاص ذہنی تناؤ میں گرفتار رہتے ہیں جس کا احساس شاد کی شاعری میں شدت سے ہوتا ہے:

سلگتے شہر کی سڑکوں پہ ہم سے دیوانے — مکاں چیز ہے کیا سائبان تک بھولے

خود اپنے نام کی تختی لگا کے بھول گیا — وہ ایک مکان میں رہتا ہے اپنے گھر میں نہیں

اسی زمین پہ مر مر کے زندگی کی ہے — اسی زمین پہ لیکن ہمارا گھر بھی نہیں

برستی چھت، کسی مفلس کے پیراہن سی دیواریں — بظاہر زندگی کرنے کو تھا اک گھر جہاں میں تھا

گھر کی تعریف میں نہیں آتا، — پھر بھی کہنے کو ہے یہ میرا گھر

شہری زندگی کے عجیب عجیب تجربے ہوتے ہیں۔ آدمی لمحہ لمحہ رنگ بدلتا محسوس ہوتا ہے، سمتیں بدلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے اپنے مفادات ہیں، اس کی اپنی وفاداریاں ہیں، جن سے فائدہ اٹھا لیا انھیں کو نقصان پہنچانا عام رویہ ہے، جن سے زندگی کی تعمیر میں مدد لی انھیں کو نشانہ بنانا عام مزاج ہے۔ دوسرے لوگ ایسے واقعات پر صرف تبصرے کرتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کچھ دنوں تک ایسے واقعات ان کی محفلوں کی جان بنتے رہتے ہیں ان کے سامنے اچھے اور برے انسان کا تصور نہیں ہوتا، شرافت اور رذالت کی تمیز نہیں ہوتی، صرف اپنی ذات ہوتی ہے جس کی تسکین کا سامان اس کی تگ و دو کے محور ہوتے ہیں۔ عام طور سے صحیح اور غلط کوئی چیز نہیں ہوتی، دوستی اور دشمنی اپنے پیچھے کوئی سچائی نہیں چھوڑتی، "اخلاص" اور "بے مروتی" میں کوئی فرق نہیں محسوس ہونے دیا جاتا، "اچھا" اور "برا" دونوں بے معنی سمجھے جاتے ہیں۔ "حق" اور "ناحق" اپنے پیچھے تمسخر کے سوا کچھ نہیں چھوڑتے۔ "ایمانداری" اور "بے ایمانی" جیسے الفاظ بے جان ہو چکے ہیں۔ بس زندگی "سود و زیاں" جیسے الفاظ میں مقید ہے۔ جہاں فرد کا فائدہ ہے وہی درست ہے، جس سے کچھ ملتا ہے وہی سچ ہے یہی کاروبارِ حیات ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آج ہر شخص اپنے ہی ہاتھوں بنائے ہوئے سماج کا خود شکار ہے

اور لہولہان ہے، ہمارے شاعر شاد کے بھی کچھ اسی طرح کے تجربے ہیں جنھیں پڑھ کر لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں فکر مند نظر نہیں آتے :

سڑک کی بھیڑ کے بے لاگ تبصروں سے کھلا ۔۔۔ بس ایک لطف تماشا ہے حادثہ کیا ہے
کس طرف جائیں، کسے آواز دیں کس سے ملیں ۔۔۔ مصلحت کے شہر میں ہر آشنا گم ہو گیا
یہ کس زمانے کی باتیں سنا رہا ہے ہمیں ۔۔۔ خلوص و مہر و وفا اب کسی نگر میں نہیں
میری نظروں کو زخمی کر گئے منظر جہاں میں تھا ۔۔۔ بہت سائے ملے اور آدمی کمتر جہاں میں تھا
نہ مار ڈالے یہ آشوب آگہی مجھ کو ۔۔۔ تمام شہر تو سوتا ہے جاگتا ہوں میں

شہری زندگی کا یہ رخ بھی کچھ کم سوہان روح نہیں مرتضیٰ علی شاد کا یہ شعر توجہ چاہتا ہے :-

کتنی الھڑ ہے درختوں پہ تھرکتی یہ ہوا ۔۔۔ جب میرے شہر میں آئے گی تو مرجائے گی

ہمارے شاعر کو گانو کی سادگی عزیز ہے "گانو" کے احساسات انھیں کہاں سے کہاں لے جاتے ہیں :

پردیس کی سلگتی ہوئی رات میں کبھی
گھر یاد آگیا ہے تو پروائیاں ملیں
آنکھوں میں پھر سے گاؤں کے منظر ہرے ہوئے
وہ کھیت وہ درخت وہ انگنائیاں ملیں

شہر کی شان و شوکت، تام جھام، چہل پہل اور رنگ و رونق کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ گانو کے خاموش، پرسکون اور سادہ ماحول میں بے پناہ سکون اور چین کی دولت ملتی ہے۔

بلاشبہ قدیم غزلوں کے آنچل میں غم جاناں کی فراوانی اور سرشاری تھی اور حال کی غزلیں زمانے کے درد و غم اور اونچ نیچ کی تہ بہ تہ داستانیں رکھتی ہیں، انسانی افکار کا لامتناہی سلسلہ عصری حسیت کے ساتھ اس میں سمٹا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ زندگی کے کریہہ اور ہولناک مناظر شاعری کے شبنمی پیراہن سے جھانکتے دکھائی دیتے ہیں انسانی بداعمالیاں اور بدعنوانیاں شاعری کی لطافت میں کثافت کا مظہر بنتی ہیں، اس کی حیوانی سرشت شاعری کی طلسماتی کیف و سرور کو ہم سے چھین کر دوزخ کی کربناکی اور دردناکی سے دوچار کرتی ہے اور ہم سہمے سہمے، کھوئے کھوئے مضطرب دکھائی دیتے ہیں اور اپنے وجود پر شرمندہ اور فسردہ نظر آتے ہیں۔ مرتضیٰ علی شاد کی غزلیں بھی ہمیں ان تلخیوں سے دوچار کرتی ہیں اور فکر مند بناتی ہیں، لیکن ہمیں وادیٔ حسن و عشق سے دور نہیں لے جاتی ہیں بلکہ اس خوابناک فضا میں بھی سانس لینے کے لیے اور محبت کی لطافت سے سرشار ہونے کے لیے اس فنکاری سے مواقع فراہم کرتی ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے :

ت غرور تھا اپنی سخن طرازی پر — وہ جب ملا ہے تو لفظ و بیان تک بھولے
نے نظروں سے چھوا، پلکوں سے چوما ہے اسے — لوگ کہتے تھے کہ خوشبو کا کوئی پیکر نہ تھا
بو بدن، گلاب کا پیکر دھنک قبا — کس کے لبوں سے آج صبا بولنے لگی
ے خط پڑھ کے پاگل ہو گئے ہیں — سمجھتے تھے کہ کچھ آرام ہوگا

شاد، عمیق نظر اور وسیع خبر کے مالک ہیں، چھوٹے چھوٹے حادثات، واقعات احساسات بھی ان سے بچ کر نہیں نکل پاتے، بلکہ شعروں میں ڈھل کر ایک رت یا صورت اختیار کر لیتے ہیں بلاشبہ شاد کا ذہن بیدار ہے، نگاہ دوررس ، قلم چست ہے یہ اشعار پڑھیے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم بھی ان واقعات سرسری گزر رہے ہیں ورنہ شاد کے شعروں میں پہنچ کر یہ واقعات ایک جہان ر پیش کرتے ہیں:

تتلی کے پیچھے دوڑتے بچے کو کیا ملا
ہاتھوں میں رنگ رہ گیا پاؤں پھسل گیا
دیوانہ چیخ چیخ کے ملبے پہ سوگیا
پچھلے برس یہیں تھا مرا گھر کہ جل گیا
اتر گیا تو عذابوں کا سلسلہ ٹوٹا
یہ سر جو دوش پہ رکھا تھا اک وبال ساتھا

بھوپال شہر، اپنی ظاہری اور باطنی خوبیوں کے لیے مشہور رہے، یہاں کے چھوٹے ے مشہور تالاب، پہاڑیاں، وادیاں گھاٹیاں، قرب وجوار کے جنگلات اور ، ہرن، خرگوش کے قصے اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتے ہیں۔ یہاں کی ں تہذیب، مخصوص دلچسپیاں، رسم ورواج، عادات واطوار میں ایک خاص انفرادیت ، یہاں کی زبان، محاورے اور لہجہ میں بھی اس کی پہچان چھپی ہوئی ہے لیکن مجھے وس ہوتا ہے کہ عام طور سے اس شہر غزل کی ان خصوصیات کی جھلک یہاں کے شعرا کلام میں نہیں دکھائی دیتی ہیں، مرتضیٰ علی شاد بھی انھیں میں سے ہیں البتہ ان کے س شعر نے ماضی کے صفحات سامنے بکھیر دیے:

، ہوئی کہانی گئے زمانوں کی — فصیلِ شہر کا چہرہ کتاب جیسا ہے

نس اس طرح کے کچھ اور اشعار پڑھنے کو ملتے جو اس شہر کے ماضی سے آگاہ کرتے اور حال ضی سے جوڑ کر اس کے رنگ وروپ کا شیدائی بناتے:

شاد نے اپنی شاعری میں تجربے بھی کیے ہیں اور ماضی و حال کے شعرا کے کلام سے اثر نبول کیا ہے ان کی شاعری میں میر، غالب اور حافظ کا ذکر اس طرح ملتا ہے:

حافظ و غالب سے بینائی ملی
ہم بھی آبیٹھے ہیں فنکاروں کے بیچ

میرسے صاحب سلامت ہوگئی آگئے جب ان کے شہ پاروں کے بیچ
میر صاحب نے بہت رہبری کی لیکن قافیہ تنگ تھا اظہار معانی کے لیے

لیکن مجھے شاد کی شاعری میں یہ بات کھٹکتی ہے کہ تجربے کے طور پر انھوں نے بعض دوسرے شعرا کی طرح ہندی کے الفاظ غزلوں میں کھپانے کی کوشش کی ہے۔ ممکن ہے ہندی کے یہ الفاظ مستقبل میں غزل قبول کرلے اور ہضم بھی کرلے لیکن آج ان میں سے بیشتر اجنبی معلوم ہوتے ہیں اور کھپنا تو الگ بات ہے غزل کی پاکیزگی کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں: یہ اشعار

کہاں سے آئے تھے؟ سمتوں کا گیان تک بھولے
وہ گمرہی ہے کہ اپنا، نشان تک بھولے
پیار کی تہمت، نام کے رشتے، سمبندھوں کے جھوٹے بول
کل تک ہم بھی سنساری تھے، آج مگر سب تیاگ دیا
ساون آیا، تم نہ آئے دن بیتے
ہم نے نین دیپ جلائے دن بیتے

اور یہ پوری غزل جس کا مطلع ہے:

دھوپ اُگی کھیتوں میں، ساون پیلا ہے
گھر میں رہو! باہر موسم پتھریلا ہے

مجھے اسے غزل کہنے میں تامل ہے اس لیے کہ غزل صرف خیال اور جذبے کا نام نہیں ہے اس کے اپنے لفظیات ہیں اور اس کا اپنا انداز بیان ہے۔

لیکن جب بھی مجموعی طور سے شاد کی غزل گوئی کا اندازہ لیا جائے گا تو یقیناً یہ بات محسوس کی جائے گی کہ ان کی شاعری نہایت سادہ، رواں دواں، اثر و تاثیر سے بھرپور ہے۔ عام طور سے ان کی غزلیں اس صنف کی کج ادائی، دلربائی، درد و غم، اضطراب و اضطرار، احساس محرومی اور کیف و سرمستی سے سرشار ہیں، انھوں نے جدید احساسات افکار و مسائل سے اپنی غزلوں کو آراستہ کیا ہے۔ زبان و بیان پر انھیں قدرت ہے اس لیے ہر طرح کے جذبے اور تجربے کی ترجمانی میں انھوں نے کامیابی حاصل کی ہے اور یہ سچ ہے کہ نئے موضوعات کو اپنی غزلوں میں جگہ دینے کے باوجود انھوں نے غزل کے مزاج کو نقصان پہنچنے سے بہت حد تک بچالیا ہے۔

بھوپال شہر غزل ہے یہاں کے دل و دماغ پر نوابوں اور بیگمات کے ساتھ ساتھ غزل کی حکمرانی رہی ہے ماضی میں قدیم رنگِ غزل نے حکمرانی کی، پھر جدید غزل آئی اور دلنوازی کرتی رہی اور محفلوں کی جان بنی رہی آج نئی غزل بھوپال کو اپنے دامن میں سمیٹ رہی ہے۔ اس کی آواز اور اس کے مشاہدات اور تجربات سے بھوپال کی ادبی محفلیں گونج رہی ہیں اور متاثر ہو رہی ہیں، ایک نئی گرما گرمی پیدا ہو رہی ہے، نئے شعرا کی فکر کو تازیانے لگ

رہتے ہیں اور ایک نیا ماحول اور ایک نئی شعری فضا تعمیر ہو رہی ہے۔
لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ آج کی غزل کی اس انوکھی ادا اور موہنی صورت کو متعارف کرانے میں جہاں دوسرے شعرا کا ہاتھ ہے وہاں شاد کی غزلوں کی ایک خاص اہمیت ہے۔ شاد کی شعری، فکری اور جذباتی کیفیات، ان کی مخصوص انفرادیت ان کی غزلوں کی جان ہیں جو مدت تک اردو شاعری میں ان کی پہچان سمجھی جاتی رہیں گی۔ اور بھوپال کی فضائے تغزل کو سربلند کرتی رہیں گی۔

ڈاکٹر اوم پرکاش اگروال، زار علامی
۷-۱۰۵۔ سیکٹر ۱۳
کرنال۔

فیضی کا ایک مقولہ

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مجھے بتایا تھا کہ فیضی کے اس مقولہ "سخن فہمی عالم بالا معلوم شد" کے متعلق عام رائے یہ ہے کہ اس کو کلام موزوں کی صف میں اس لیے نہیں رکھا جاسکتا کہ یہ مقولہ کسی بحر اور کسی حقیقی وزن سے تعلق نہیں رکھتا۔

موصوف نے اس ضمن میں میری رائے طلب کی تھی۔ میں نے اپنے ایک مراسلے کے ذریعہ ان کو مطلع کر دیا تھا کہ فیضی کا مقولہ بہ اعتبار عروض ہر طرح موزوں ہے اور حقیقی اوزان سے تقطیع ہوتا ہے۔

پروفیسر صاحب نے یہ بات میرے خط کے حوالہ سے "نیا سوغات" بنگلور میں شائع کرادی تھی۔

ڈاکٹر کمال احمد صاحب صدیقی اور جناب شمس الرحمٰن صاحب فاروقی دونوں اصحاب نے اس موزوں مصرع کو ناموزوں قرار دیا ہے۔ نارنگ صاحب نے اُن کے جواب میں "سوغات" کے چوتھے شمارہ میں (میرے حوالے سے) جو آہنگ قرار دیا ہے وہ یہ ہے:

بحر مقتضب مثمن مخبون، مخبون، سالم و مرفوع و مخبون مسکن،

کمال صاحب اس آہنگ سے مطمئن نہیں ہوئے۔ انھوں نے اپنے ایک مراسلے کے ذریعے مجھ سے اس کی تفصیل طلب کی ہے۔

چونکہ طالبانِ و شائقانِ عروض کے لیے یہ بحث نہایت اہم ہے لہٰذا بذریعہ "کتاب نما" حاضر ہو رہا ہوں۔ ملاحظہ ہو:۔

فیضی کا مندرجہ بالا مقولہ دو بحور اور تین حقیقی اوزان میں بحسن و خوبی غوطہ کھا رہا ہے۔ بحور یہ ہیں:۔

۱۔ بحر مقتضب مثمن ۲۔ بحر ہزج مثمن

پیشتر اس کے بحر مقتضب کے اوزان سے بحث کی جائے بحر مقتضب مثمن سالم کے ارکان ملاحظہ ہوں:۔

بحر مقتضب مثمن سالم:۔ مفعولاتُ، مس تفعلن، مفعولاتُ، مس تفعلن،

حاصل کردہ وزن عملہ:۔	مفاعیلُ	مفاعلن	مفعولن	فاعلن
	مخبون	مخبون	مرفوع	مخبون مخنق

زحافات جن سے کام لیا گیا :- ۱۔ خبن ۲۔ رفع ۳۔ تخنیق

تشریح زحافات

خبن :- رکن سے دوسرا حرفِ ساکن ساقط کرنا۔ بشرطیکہ وہ سبب خفیف کا ساکن ہو۔
ا۔ "مفعولاتُ" سے دوسرا حرف ساکن "ف" (جو سبب خفیف "مف" حرف ساکن ہے) ساقط کیا۔ "م عولاتُ" رہا۔ جس کو مفاعیلُ سے تبدیل کر لیا گیا۔
ب۔ "مس تف علن" سے "س" (جو سبب خفیف "مُس" حرف ساکن ہے) ساقط کیا۔ مَ۔ تف۔ علن رہا۔ جس کو "مفاعلن" سے بدل لیا گیا۔
رفع :- رکن کے شروع کے دو بہ سبب خفیف متوالی سے دوسرا سبب خفیف ساقط کرنا۔ (میں نے دوسرا سببِ خفیف خاص مصلحت کے تحت کہا ہے)
"مف عولات" سے دوسرا سببِ خفیف "عو" ساقط کیا "(مف لاتُ) رہا۔ جس کو "مف عولُ" سے بدل لیا گیا۔
ان تینوں زحافات کے عمل سے جو وزن حاصل ہوا وہ اس طرح ہے :-

مفاعیلُ	مفاعلن	مفعولُ	مفاعلن
مخبون	مخبون	مرفوع	مخبون

تخنیق :- ا۔ وتد مجموع سے پہلا حرف ساکن کرنا اور ماقبل رکن کے حرفِ آخر متحرک سے پیوست کرنا۔
۲۔ دو ارکان میں واقع ہوئے تین متحرک متوالی حروف کے درمیانی حرف کو ساکن کرنا۔
دونوں تعریفوں کا مدعا ایک ہے لیکن ایک آسانی کے پیشِ نظر اس عمل تسکین کو عمل تخنیق کہا گیا ہے۔
تخنیق میں سہولت یہ ہے کہ صرف ایک رکن کا نام لینے سے مسئلہ از خود حل ہو جاتا ہے۔ مثلاً :-

بحر مقتضب کا یہ وزن :-

مفاعیلُ	مفاعلن	مفاعیل	مفاعلن
مخبون	مخبون	مخبون	مخبون

عملِ تخنیق سے اب اس کو یوں لکھیں گے!

مفاعی لن	فاعلن	مفاعی لن	فاعلن
مخبون	مخبون مخنق	مخبون	مخبون مخنق

(نوٹ / یہ وزن بحر ہزج مثمن سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ وہاں اس کو

اس طرح لکھیں گے: مفاعی لن فاعلن مفاعی لن فاعلن
مکفوف مقبوض تخنیق مکفوف مقبوض تخنیق

کمال احمد صدیقی صاحب کے یہ اقوال دیکھیے ۔
آہنگ اور عروض صفحہ ۱۲۲:- "۔۔۔ فعلُ فعولن تخنیق سے صرف فعلن فعلن ہو سکتے ہیں۔
صفحہ ۲۲۴:- ۔۔۔۔ مستفعِلُ فاعلاتُ فاعلان میں تخنیق سے
مستفعِلُ ۔ لام کے ساکن ہونے سے مفعولن ہو جائے گا۔
یعنی کمال احمد صدیقی عملِ تخنیق اور عمل تسکین دونوں کو ایک ہی جانتے ہیں۔
کمال صاحب کو چاہیے تھا کہ مستفعِلُ فاعلات میں تخنیق کی بجائے "تسکین" کہتے تو زیادہ مناسب تھا۔
میں اس تشریح کے بعد بحر مقتضب کے مزاحف وزن
مفاعیلُ مفاعلن مفعولُ مفاعلن ۔ اصل وزن کی جانب آتا ہوں۔
آخری دو ارکان میں زحاف تخنیق سے اب اس کی یہ صورت ہوئی :-

مفاعیلُ مفاعلن مفعولن فاعلن ۔۔۔ رعایتی وزن
مخبون مخبون مرفوع مخبون تخنیق

تقطیع

سخن فہم	عرعالیے	بالا مع	لوم رشد
مفاعیل	مفاعلن	مفعولن	فاعلن
مخبون	مخبون	مرفوع	مخبون تخنیق

وزن ۲ :- مفاعیلُ مفاعلن مفعولاتم فَعَل ۔۔۔ رعایتی وزن
مخبون مخبون سالم و مرفوع و مخبون مسکن

اصل وزن :- مفاعیلُ مفاعلن مفعولاتُ فَعِلُن
مخبون مخبون سالم مرفوع و مخبون

تشریح :- مفعولاتُ ، فَعِلُن = مفعولاتُ ، فَ ، عِ + لُن
بعملِ زحاف تسکین " فَ " کو ساکن کیا تو یہ صورت ہوئی :-
مفعولاتم فَعَل اس کے لیے عروضی اصطلاح یہ ہوئی :-
سالم و مرفوع و مخبون مسکن ۔ اگر "سالم" اور مرفوع و مخبون مسکن کے درمیان " و "، یعنی حرف عطف نہیں ڈالا گیا تو یہ صورت سامنے آئے گی مفعولاتُ فعلُن ۔ یہ صورت مفعولاتم فَعَل سے بالکل مختلف ہے ۔ یہی وہ مقام ہے جو سالم رکن اور مرفوع و مخبون مسکن کے درمیان حرف عطف " و " کی ضرورت کی اہمیت ظاہر کرتا ہے ۔ دونوں ارکان کے تین حروف متحرک متوالی میں بقاعدہ عروض

تسکین کا عمل ہر طرح جائز ہے

تقطیع

م رشد	با لا معلو	عر عا لے	سخن فہم
فعَل	مفعو لاتم	مفاعلن	مفاعیلُ

سالم و مرفوع و مخبون مسکّن

وزن ۳۔ یہ وزن بحر ہزج مثمن سے حاصل کیا گیا ہے

ارکان بحر ہزج مثمن :۔ مفاعی لُن ، مفاعی لُن ، مفاعی لُن ، مفاعی لُن

مزاحف وزن :۔ جس سے مقولۂ فیضی تقطیع ہوتا ہے :۔

مفاعیلُ فعول مفاعی لن فاعلن

زحافات جن کی مدد سے یہ وزن حاصل کیا گیا ہے :۔

۱ کف ۲ قبض ۳ حذف

تشریح زحافات :۔

کف :۔ رکن سے ساتواں حرف گرانا بشرطیکہ وہ سببِ خفیف کا ساکن ہو۔

مفاعی لن سے ' لن ' کا ' ن ' ساقط کیا ، مفاعیلُ رہا

قبض :۔ رکن سے پانچواں حرف گرانا بشرطیکہ وہ سببِ خفیف کا ساکن ہو

مفاعی لن سے ' ی ' ، ی ، ی ، ساقط کی مفاع + لن رہا ۔

جس کو مفاعلن سے بدل لیا گیا

حذف :۔ رکن کے آخر سے سببِ خفیف ساقط کرنا

یہاں لُن ساقط کیا جاتا ہے ۔ یہ زحاف عروض وضرب سے مخصوص ہے۔

مفاعی لن سے فعولُ حاصل کرنے کے لیے زحاف " قبض " اور زحاف " حذف "

کا عمل بیک وقت کیا گیا ۔ یعنی زحاف قبض سے پانچواں حرف ساکن گرایا

اور حذف سے آخری سببِ خفیف ' لُن ' ساقط کیا ۔ " مفاع " حاصل ہوا

جس کو فعولُ سے بدل لیا گیا ۔

ایک سوال

فعولُ دو زحافات قبض اور حذف کے عمل سے حاصل ہوتا ہے یہ اجتماع جائز تو ہے مگر حذف کے سبب مختص بعروض وضرب ہو جاتا ہے پھر اس کو حشو میں رکھنے کا کیا جواز ہو سکتا ہے ؟

جواب

میں زار علامی کہتا ہوں کہ فعُول (مقبوض محذوف) ایک متحرک الآخر رکن ہے ۔ عروض وضرب میں وارد تو ہو سکتا ہے مگر وہاں اس کا رکھنا اتنا آسان نہیں اس لیے

یہ رکن عروض وضرب کے زحاف حذف کے عمل کے بعد بھی صدر وابتدا اور حشوین میں رکھا جا سکتا۔ اگر ان مقامات پر اس کا استعمال جائز نہیں تو قبض و حذف کا عمل (جو کہ از روئے عروض بادن تولہ پاؤ رتی کے مصداق بالکل درست ہے) بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔
لہذا مذکورہ متحرک الآخر رکن کا حشو میں رکھا جانا بالکل صحیح۔

تقطیع

سخن فہم	ع عالَ	م بالا مع	لوم شد
مفاعیل	فعولُ	مفاعی لن	فاعلن
مکفوف	مقبوض ومحذوف	مکفوف	مقبوض منق

میں زار علامی فیضی کے اس مقولہ " سخن فہمی عالم بالا معلوم شد "
کو ناموزوں سمجھنے والے حضرات کی خدمت میں گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی عروض فہمی کو از سر نو دعوتِ غور و فکر دیں اور فیصلہ کریں کہ یہ مقولہ موزوں ہے کہ نہیں "

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

تذکرۂ ماہ و سال — مالک رام

اس مجموعے میں اردو کے بیشتر ادیب، شاعر، نقاد، کالم نگار، صحافی اور دوسرے اہم عمائد (جنھوں نے اردو ادب کی قابل قدر خدمت کی ہے) کی تاریخ ولادت اور جو ہماری بدقسمتی سے انتقال کر چکے ہیں ان میں سے اکثر کی تاریخ وفات بھی درج ہے۔ کسی بھی اہم ادیب پر مضمون لکھتے وقت اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ قیمت: ۱۲۵/=

افکارِ اقبال

محمد عبدالسلام خاں

اس اہم کتاب میں علامہ اقبال کے حالاتِ زندگی، ان کے اردو اور فارسی کلام پر سیر حاصل بحث، ان کے مذہبی اور سیاسی افکار، اور کچھ ایسے اہم واقعات کی نشان دہی کی گئی ہے جو اب تک اندھیرے میں تھے۔ قیمت ۱۲۵/-

تحقیق نامہ

مشفق خواجہ

مشفق خواجہ اردو کے وہ واحد محقق ہیں جو ہمیشہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جو اپنی اہمیت کی بنا پر ہماری ادبی تاریخ کے کسی نہ کسی خلا کو پُر کرتے ہوں۔ زیرِ نظر مجموعہ میں ایسے ہی اہم ترین مضامین شامل ہیں۔ قیمت: ۱۲۵/=

مرضیات

حکیم نعیم الدین زبیری

بیماریوں کے اصولی اسباب اور ان کی وجہ سے افعال میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے مطالعے یعنی ماہیت الامراض (پیتھالوجی) پر جامع اور آسان بحث۔ طلبہ کے علاوہ اطبا کے لیے بھی بے حد مفید۔ قیمت: ۵۱/=

تاثر نہ کہ تنقید

صدیق الرحمن قدوائی

تنقید، ادب کی ایک اہم شاخ ہے مگر اس کا ضرورت سے زیادہ چرچا بھی اچھا نہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ادب سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص "نقاد" ہو جائے۔ ادب کو تنقید کے سوا بھی مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے جن کا انحصار پڑھنے والوں کے انفرادی مزاجوں پر ہے۔ یہ تصنیف ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نیا نقطۂ نظر پیش کرتی ہے۔ قیمت: ۵۱/=

خواب اور خلش — آل احمد سرور

شاعری ذات سے کائنات تک کا سفر ہے۔ یہ خوابوں کے ذریعے حقائق کی توسیع کا نام ہے۔ بڑی شاعری حسن بے سے مدد لیتی ہے مگر وہ روایت اور تجربے میں ایک توازن رکھتی ہے۔ آل احمد سرور کی شاعری صرف الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں بلکہ اس میں معانی کا ایک سمندر ہے جس کی تہ میں بہ گہرے موتی نکالے جا سکتے ہیں۔

قیمت =/66 روپے

ڈاکٹر یوسف سرمت
پروفیسر و صدر شعبہ اردو
عثمانیہ یونی ورسٹی۔ حیدرآباد

عربی تنقید

اردو ادب، عربی زبان و ادب سے بے حد متاثر رہا ہے۔ اس کی تمام شعری اصناف کے نام عربی سے لیے گئے ہیں۔ خود یہ اصناف عربی سے بہت متاثر رہی ہے۔ کم و بیش اردو کی تمام ادبی اصطلاح عربی سے ماخوذ ہیں۔ بے شمار عربی الفاظ اردو میں مروّج ہیں۔ عربی ان کے استعمال کے بغیر چند جملے لکھنا بھی مشکل ہے۔ لیکن اس کے باوجود عربی تنقید کے بارے میں اب تک کوئی مبسوط کتاب نہیں لکھی گئی تھی حالانکہ تنقید کا لفظ بھی عربی ہی کا ہے۔ اور اردو تنقید عربی تنقید سے متاثر بھی رہی ہے۔ عربی تنقید کے بارے میں چیدہ چیدہ مضامین ضرور لکھے گئے ہیں جیسے نیاز فتح پوری نے "ادب" کا لفظ جو عربی میں ابتدا میں ضیافت کے معنی میں استعمال ہوا تھا رفتہ رفتہ جس طرح تہذیب، پھر لٹریچر کے معنوں میں استعمال ہونے لگا اس کی تفصیل پیش کی ہے۔ اسی طرح مشرقی تنقید کے عنوان سے جو مضامین یا کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں بھی عربی تنقید کا ذکر آتا ہے۔ یہ تذکرہ سرسری اور عام طور پر سطحی ہوتا ہے۔ اس لیے اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ عربی تنقید کے بارے میں کوئی مبسوط اور تفصیلی کتاب لکھی جاتی۔ اس کمی کو ڈاکٹر اقبال حسین ندوی نے سب سے پہلے پورا کیا ہے۔ ان کی کتاب عربی تنقید اردو میں ایک قابلِ تحسین ہے۔

اپنی کتاب میں ڈاکٹر اقبال حسین نے عربی تنقید کا مطالعہ اور جائزہ عہد جاہلی سے دور انحطاط تک پیش کیا۔ عربی تنقید کی ابتداء اور ارتقا کا نہایت دقتِ نظر کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ یوں تو عربی تنقید کی باقاعدہ داغ بیل عہدِ عباسی میں پڑی لیکن عہد جاہلیت میں بھی شعر و ادب میں تنقید کا ایک خاص طور ابھر چکا تھا۔ اس عہد میں ناقدین کی نظر، خطائے لفظی اور الفاظ کے صحیح اور غلط استعمال پر رہتی تھی، معنوی تنقید بھی ہوا کرتی تھی لیکن یہ کسی اصول کے تحت نہیں ہوتی تھی مجموعی طور پر عہدِ

جاہلی کی تنقید تاثراتی رنگ رکھتی تھی، عربی تنقید کو اس عہد میں جس طرح فروغ حاصل ہوا اس کے تعلق سے اقبال حسین لکھتے ہیں۔

"عربوں کی عام مجلسوں، بازاروں اور مباحثوں میں ان کی شاعری کے مظاہرے، مقابلے اور ان پر مباحثے کی وجہ سے تنقید کو وجود میں آنے کا اور فروغ پانے کا موقع ملا۔"

اس عہد میں تنقیدی شعور تو ملتا ہے لیکن تنقید میں تحلیل، تعبیر اور تشریح نہیں ملتی۔ البتہ عہدِ جاہلیت کے بعد اسلامی عہد میں قرآن کریم کے مطالعے کے سلسلے میں تنقیدی اصول پروان چڑھتے ہیں۔ ڈاکٹر حسین لکھتے ہیں:

"قرآن کریم کے مطالعے کے نتیجے میں لفظ و معنی کی بحث فصاحت و بلاغت اور اسالیب کے اصول اور ان کی اصطلاحات سامنے آئیں۔"

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام میں شعر و شاعری کی طرف بالکل توجہ نہیں کی گئی لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود جس قسم کی شاعری کو پسند فرماتے تھے اس کے بارے میں ڈاکٹر حسین نے لکھا ہے:

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے اشعار کی ستائش کی جو نیک اغراض کے حصول کی ترغیب دلاتے تھے اسی بنا پر آپ نے کعب بن زہیر کے قصیدے کی تحسین فرمائی۔ دوسرے شعرا کا کلام جن کے اشعار اسلامی روح کے منافی نہیں تھے ان کو آپ نے پسند فرمایا۔"

اس سلسلے میں انھوں نے قرآن کریم کے امتیازی خصائص کا اثر عربی ادب و نقد پر جس طرح پڑا ہے۔ اس کی تفصیل پیش کی ہے۔ اور ساتھ ہی اس بات پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ اسلام اور شاعری میں کوئی تضاد نہیں ہے البتہ جو شعر و ادب اور فن اسلام کی روح کے منافی نہیں ہے اور اسلامی افکار و اقدار کے دائرہ میں ہے اس کو اسلام قبول بھی کرتا ہے اور اس کی تحسین بھی کرتا ہے۔ اس کے بعد مختلف ادوار میں تنقید کی جو حالت و کیفیت تھی اس کو فاضل موصوف نے پیش کیا ہے اس کے بعد عربی کے اس نقاد کے بارے میں لکھا ہے جس نے تنقید کا بیج بویا ہے یہ محمد بن سلام تھا اس نے تنقید کے لیے جن باتوں کو ضروری قرار دیا اس کی آج بھی اہمیت ہے جیسا کہ اقبال حسین نے لکھا ہے۔

"محمد بن سلام نے یہ اصول وضع کیا کہ کثرت مطالعہ تنقیدی

بصیرت، محاسن و معائب سے واقفیت کے علاوہ ناقد کے لیے
مختلف تہذیب و ثقافت کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔"

محمد بن سلام نے اپنی کتاب "طبقات الشعرا" میں شعرا کی تقسیم مختلف ادوار میں کی اور وہ جن مقامات اور کلچر سے تعلق رکھتے تھے اس کو بھی پیش نظر رکھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے تذکرہ نگار محمد بن سلام سے کتنے متاثر تھے۔ کریم الدین نے اپنے طبقات الشعرا کا نہ صرف نام ہی محمد بن سلام سے اخذ کیا ہے بلکہ شعرا کے مختلف طبقات میں تقسیم بھی اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔

عربی تنقید میں بلاغت کے زیر اثر جو تنقیدی اصول و مباحث ملتے ہیں۔ اس کا جائزہ بھی اس کتاب میں بڑی تفصیل کے ساتھ لیا گیا ہے اور اس دور کے اہم ناقدین اور ان کے تنقیدی نظریات سے بحث کی گئی۔ اس دور کے ایک اہم ناقد جاحظ ہے۔ اس نے ایجاز اور اطناب کے بارے میں جو اصول پیش کیے تھے ان کو بار بار دہرایا گیا اور آج بھی اس کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ اس کے نزدیک ایجاز سے مراد محض الفاظ کی کمی یا کمیت میں قلت مراد نہیں ہے بلکہ الفاظ کا استعمال معنی کے بقدر کیا جائے اور جب کہ الفاظ میں بہتر معنے پائے جائیں تو وہ ایجاز ہے۔" اسی طرح اطناب کے بارے میں جاحظ نے جو نظریہ پیش کیا ہے وہ بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اطناب کے بارے میں وہ کہتا ہے:

"اطناب کی صورت میں معنی کی وضاحت اور تاکید پیدا کرنے کے
لیے زیادہ الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے اور جب بلاغت کے
درجہ تک اس کا لحاظ کیا جاتا ہے تو وہ اعجاز کی حد تک پہنچ جاتا
ہے۔"

لفظ اور معنی کی بحث بھی سب سے پہلے جاحظ نے شروع کی۔ اس کے بعد اس موضوع پر اتنے اور ایسے گوشے اہل علم اور اہل فن نے تلاش کیے کہ تنقید کے دو مکتبۂ فکر وجود میں آ گئے جس میں سے ایک لفظ کا طرف دار ہے اور دوسرا معنی کا۔ اور آج تک اس بحث کا سلسلہ چلا آرہا ہے۔ لیکن جاحظ خود معنی کے مقابلے میں لفظ کو اہمیت دیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا، "معنی تو سب کو حاصل ہے لیکن بحیثیت فن کے کسی شاعر یا ادیب کا کمال فن اسلوب کے برتنے میں ہے۔" یہی بات بعد میں مشہور فرانسیسی ادیب جوفان نے کہی تھی جس کا ایک یہ جملہ ضرب المثل بن چکا ہے کہ اسلوب خود آدمی ہوتا ہے لیکن اسلوب پر اس کا جو مضمون ہے اس میں جوفان نے یہ بھی کہا ہے کہ کسی بھی مصنف کے پاس سے خیال یا مواد کچھ بھی لیا جا سکتا ہے لیکن اس سے اس کا اسلوب نہیں چھینا جا سکتا ہے۔ یہی بات حافظ نے بھی کہی تھی۔

ابن قتیبہ بھی اہم نقاد ہے یہ لفظ کے مقابلے میں معنوں کی اہمیت پر زور
دیتا ہے۔ وہ جاحظ سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

معانی اور فکر و خیال اس قدر سر راہ عام نہیں ہیں۔ جس قدر
جاحظ کے نزدیک ہیں۔"

ابن قتیبہ بھی کئی تنقیدی کتابوں کا مصنف ہے۔ اس کی مختلف کتابوں کی تفصیل
ڈاکٹر اقبال حسین نے اپنی کتاب میں پیش کی ہے۔ ابن قتیبہ کے نظریات تنقید
کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالی اس سے کافی متاثر تھے۔ ابن قتیبہ
نے شعر کی دو صورتیں بتائیں ایک کو وہ مطبوع کہتا ہے اور دوسری کو متکلف
مطبوع سے مراد یہ ہے کہ شاعر فطری طور پر قادر الکلام۔ وہ شعر مرتجلا کہنے پر قادر
ہے۔ متکلف کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ شاعر نے اپنے شعر کو آراستہ کرکے
سنوارا۔ چھان بین کر کے اس کی تنقیح کی اور اس پر بار بار غور کیا۔ حالی۔
مطبوع کے لیے آمد کا لفظ استعمال کیا ہے اور متکلف کو آورد کہا ہے اور آمد
آورد کی بالکل وہی تشریح کی ہے جو ابن قتیبہ کے پاس ملتی ہے۔

ابن طباطبا بھی عربی کا ایک اہم نقاد ہے اس کی کتاب عربی شاعری کے
معیار و مسائل پر بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے شاعری اور نثر کے فرق سے
بحث کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ نثر کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے
جبکہ قصیدہ میں ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ گویا شاعری کے لیے RGANIC WHOLE
کا نظریہ اس وقت زمانے میں پیش کیا گیا تھا۔ ابن طباطبا کا بھی خیال ہے کہ قدیم
شعرا نے جن افکار و خیالات اور معانی کا استعمال کیا ہے اگر ان خیالات کو زیادہ
موثر اور دلکش اسلوب، شیریں بیانی، شگفتہ الفاظ اور خوب صورت طرز ادا
کے ساتھ پیش کریں تو وہ کوئی عیب کی بات نہیں، حالی مقدمہ شعر و شاعری میں
کہتے ہیں۔

"اس بات پر تمام قوم کا اتفاق ہے کہ پچھلا شاعر، جو کسی پہلے
شاعر کے کلام سے کوئی مضمون اخذ کر کے، اس میں کوئی ایسا
لطیف اضافہ یا تبدیلی کر دے جس سے اس کی خوبی یا متانت
یا وضاحت زیادہ ہو جائے۔ وہ درحقیقت اس مضمون کو پہلے
شاعر سے چھین لیتا ہے۔"

لفظ و معنی کی بحث میں بھی ابن طباطبا کے خیالات بڑی اہمیت رکھتے ہیں
ڈاکٹر اقبال حسین کہتے ہیں کہ ابن طباطبا وہ پہلا نقاد ہے جس نے لفظ اور معنی کے
گہرے ربط کو واضح کیا۔ کیونکہ اس کے کہنے کے مطابق لفظ اور معنی دو الگ چیز
ہو کر بھی ایک ہی لفظ کے بغیر معنی کا تصور اور معنی کے بغیر لفظ کا تصور نہیں کیا

جا سکتا۔

عربی تنقید کو فروغ دینے میں خاص طور پر دو شاعروں نے بے حد اہم حصّہ ادا کیا۔ کیونکہ ان کی شاعری صدیوں تک موضوع بحث بنی رہی۔ اقبال حسین ان کے بارے میں لکھتے ہیں

"عہد عباسی کے دو اہم شاعروں ابوتمام اور متنبی کی شاعری اور شخصیت دو صدیوں تک معرض بحث بنی رہی، نت نئے انداز سے ان دونوں کی شاعری کا جائزہ لیا گیا۔"

ان دونوں شاعروں کی موافقت اور مخالفت میں تنقید کے کئی نئے دبستان پیدا ہوئے۔ ان معرکہ آرائیوں کی وجہ سے عربی تنقید پر جو اثر پڑا اس کے بارے میں ڈاکٹر اقبال حسین لکھتے ہیں:۔

"ادبی معرکہ آرائی نے عربی تنقید کے ذوق کو عام کرنے تنقیدی شعور کو بیدار کرنے، اس کی فکری نوائی کو آگے بڑھانے معیار کو بلند کرنے اور تنقیدی رجحانات کو غذا اور قوت پہنچانے میں بہت مدد دی۔ اس وجہ سے ادبی تنقید کے سرمایہ میں کافی اضافہ ہوا اور ادبی تنقید کو فروغ پانے کا موقع ملا۔"

ان معرکہ آرائیوں کے سلسلے میں عربی میں جو اہم نقاد ابھرے اور ان کے جو تنقیدی خیالات تھے ان کا تفصیلی جائزہ بڑی دقت نظر کے ساتھ پیش کیا ہے۔

یونانی اثرات کی وجہ سے عربی تنقید میں جو نیا رنگ پیدا ہوا اس کی ساری تفصیل ڈاکٹر اقبال حسین نے تمام تر جزئیات سمیت پیش کر دی ہے۔ مختصر طور پر جو نقاد یونانی تنقید سے متاثر ہوئے۔ ان کے تعلق سے کہا ہے۔

قدامہ بن جعفر نے ارسطو کی کتاب اور دوسرے یونانی منطقی طرز فکر کی کتابوں کا قدرے اثر قبول کیا۔ اس کے علاوہ فارابی، ابن سینا اور ابن رشد نے بوطیقا کی تلخیص کی اور اس کے تنقیدی مسائل پر اپنے انداز سے بحث کی۔"

قدامہ بن جعفر نے ممتنع اور تناقص سے بحث کرتے ہوئے اس مبالغے کو جائز قرار دیا ہے جس سے کلام میں حسن اور تاثیر پیدا ہوتے ہیں۔ حالی قدامہ بن جعفر کے نظریات سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ اسی طرح شبلی کے یہاں ابونصر فارابی کے خیالات کا اثر صاف طور پر دکھائی دیتا ہے انھوں نے شعرالعجم کے چوتھے حصّے میں تخیل اور محاکات پر جو بحث کی ہے اور وہ تمام تر فارابی کے اثر کا نتیجہ ہے۔

عربی تنقید پر مطالعہ قرآن کا بھی گہرا اثر پڑا ہے۔ ڈاکٹر اقبال حسین

بتاتے ہیں کہ قرآن کریم کے ہمہ گیر مطالعے کے بجائے خاص طور سے اس کے معجزانہ اسلوب کے تجرباتی مطالعے نے ادبی تنقید کو زیادہ متاثر کیا۔ اس سلسلے میں جن ناقدین نے اہم کام انجام دیا اور ان کے کاموں کی تفصیل انھوں نے دے دی ہے۔

عربستان سے نکل کر عربی تنقید دنیا کے جن گوشوں میں قابل قدر کام انجام دیتی رہی ہے اس کی تفصیل مختلف عنوانات کے تحت اس کتاب میں ملتی ہے جیسے مغرب اقصیٰ میں عربی تنقید جس انداز میں پروان چڑھی اور جو رتبہ اس نے وہاں حاصل کیا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ابن رشیق جیسا ناقد اس علاقے سے تعلق رکھتا تھا۔ ابن رشیق کی مشہور کتاب العمدہ کا حالی نے بھی بار بار حوالہ دیا ہے اور کئی جگہ ابن رشیق کے نظریات سے اختلاف بھی کیا ہے۔ اس کے بعد دیار یورپ میں عربی تنقید کو جو فروغ حاصل ہوا اس کو بھی اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے اور آخر میں عربی تنقید جس طرح دور انحطاط میں پہنچی ہے اس کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر اقبال حسین لکھتے ہیں:

"عربی تنقید تیسری صدی ہجری سے پانچویں صدی ہجری تک ترقی کے منازل سے گزری، آمدی، جرجانی، قدامہ، ابن رشیق اور ابو الہلال عسکری جیسے ناقدین نے عربی تنقید کو نئے انداز فکر نئے خیالات، نئے رجحانات اور نئے تنقیدی ذوق سے آشنا کیا۔ اس کے بعد ادبی تنقید کے ایک ایسے دور میں داخل ہو گئی جہاں ادبی تنقید کے تناور درخت نے نئے برگ و بار، نئی کونپلیں، نئی کلیاں اور نئے ثمر دینا چھوڑ دیا۔ پرانے پتے ہی اس درخت کی شاخ کی زینت بنے رہے۔ قدیم اصول ہی دہراتے جاتے رہے، اس میں ایسے اضافے نہیں ہوئے جسے عربی تنقید کے لیے سنگِ میل قرار دیا جا سکے یا ادبی تنقید کے موسم بہار کی نئی کلی سے تعبیر کیا جا سکے۔"

ڈاکٹر اقبال حسین کی کتاب عربی تنقید کا یہ ایک بہت مختصر اور سرسری سا تعارف ہے۔ پونے چار سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب عربی کا اتنی گہرائی اور گیرائی سے جائزہ پیش کرتی ہے جس کی نظیر اردو میں اس سے پہلے نہیں ملتی۔ عربی تنقید کی روشنی میں اردو تنقید کا جائزہ نئے سرے سے لیا جا سکتا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بہترین ناقدین کے فکر و فن پر یہ تنقید کس حد تک اثر انداز ہوتی ہے۔ ہمارے بڑے اور اہم ناقدین نے تنقیدی نظریات کو اپنے اندر جذب کر کے کس طرح سے اپنی فکر کا حصّہ بنا لیا تھا۔ موجودہ دور میں ہماری

جدید تنقید ایک بحران سے گزر رہی ہے۔ کیونکہ یورپ اور امریکا کے جدید ترین تنقیدی نظریات کو بغیر پوری طرح جذب کیے ہم پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جس سے اردو تنقید کو فائدہ کی بجائے نقصان پہنچ رہا ہے۔ بہر حال ڈاکٹر اقبال حسین ندوی کی یہ کتاب ایک قابل تحسین کام ہے جس کی امید ہے کہ اردو میں پوری طرح سے قدر کی جائے گی۔

ڈاکٹر توقیر احمد خاں آر۔ اے
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی دہلی

آزادی کے بعد اردو تنقید

نظریات اور رجحانات

آزادی کے بعد ہندستان میں تنقید کی جو دنیا تیار ہوئی اس میں عموماً تین قسم کے نقاد شامل تھے۔ ایک وہ جو مذہبی تقدس کے روادار تھے اور مذہبی خیالات کی روشنی میں ادبی اقدار کا تعین کرتے تھے۔ دوسرے وہ تھے جو ترقی پسند تحریک کے نتیجہ میں سامنے آئے۔ یہ ادب کے سماجی پہلو کے علمبردار تھے۔ اور سیاسی اور معاشرتی تبدیلیوں کی ہم نوائی کے ساتھ مارکسی نظام فکر کی وکالت کرتے تھے۔ جب ایک کانفرنس میں اشتراکیت کے لوازم کا اعلان کر دیا گیا تو بہت سے اعتدال پسند جو ادب، زندگی اور سماج کے رشتوں کے تو حامی تھے مگر الحاد اور نفی ذات کے ہرگز قائل نہ تھے، اس تحریک سے بدظن ہو گئے۔ اور بہت سوں نے اپنے آپ کو جدیدیت کی تحریک سے جوڑ دیا۔ اس تحریک کے جانب داروں کا مقصد ادب میں ادبیت ذات اور احساس جمالیات پر زور دینا تھا۔ انھوں نے ادب محض ادب، مسرت اندوزی اور ذہنی تفنن کو ترجیح دی۔ حکومتِ ہند کی اشتراکیت نوازی اور ترقی پسندوں کی تیز آندھی نے تنقید کی مذہبی طرف داری کو تو تقریباً بے اثر کر دیا لیکن وہ جدیدیت کے طوفانی سیلاب کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جس کے نتیجہ میں اردو تنقید کے دو اہم مکاتب فکر ترقی پسند اور جدیدیت پسند ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرا ہو گئے۔ یہ محاذ علمی اور ادبی معرکہ کیا تھا ایک طرح سے مجادلہ بین الشمس والقمر تھا۔ دونوں مکاتب کی باہمی رقابت کے نتیجہ میں اردو کو تازہ ادب اور نئے زاویے فراہم ہوئے۔ جدیدیت اور ترقی پسند دونوں نے اپنے اپنے علمی اور تنقیدی کارناموں کے عمدہ نمونے پیش کیے۔ جو ہماری زبان اور تنقید کا گراں قدر سرمایہ بنے۔ دونوں نے جو اپنے اپنے انتقادی اصول اور نظریات پیش کیے

اس کو اردو کے علمی و تنقیدی ذخیروں میں محفوظ کر لیا گیا۔ ان میں بعض مشرق نواز تھے اور بعض مغرب نواز۔ جن خاص لوگوں نے مذکورہ رجحانات کی روشنی میں اردو تنقید کو جلا بخشی ان کی فہرست بڑی طویل ہے۔ لیکن ہم یہاں اس عہد کے کچھ مخصوص نمایندہ نقادوں کے نظریات، خیالات اور خدمات کا اجمالاً ذکر کریں گے۔

سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ، حالیؔ کے ردِّ عمل کے طور پر ابھرنے والے نقاد ہیں۔ ادب میں مشرقی معیار اور اقدار کے طرف دار ہیں۔ انھوں نے حالیؔ کی مغربی تنقید پر آواز اٹھائی اور حالیؔ کے خیالات سے اختلاف بھی کیا۔ انھوں نے حالیؔ کی پیروی مغرب کو غیر ضروری قرار دیا۔ اور اردو شاعری میں حسن و عشق اور گل و بلبل کی داستان کو اردو کا روایتی سرمایہ تصور کیا۔ وہ ان استعارات و تشبیہات کے استعمال سے گریز کے مخالف نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ادب میں عریانیت، فحاشی اور بے حیائی کے مقابلے حیا اور پردہ داری زیادہ موزوں اور مناسب ہے۔ اور یہی مشرقی روایت اور اصولوں کا تقاضا بھی ہے۔ "ہماری شاعری" اور" آبِ حیات" "سخن فہمی" ان کی معروف و مقبول کتابیں ہیں۔

کلیم الدین احمد شیشے کی دکان میں ہاتھی کی طرح داخل ہوئے۔ اور اردو ادب و تنقید میں توڑ پھوڑ شروع کرنے لگے۔ کیونکہ وہ انگریزی میں ایم۔ اے تھے اور مدت تک انگلستان میں رہے۔ شاید اسی لیے انگریزیت کا اثر ان کے ذہن پر طاری ہو گیا۔ اردو تنقید کو انھوں نے مغربی میزان پر پرکھا اور بالکل کالعدم قرار دے دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ "اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے وہ یا تو اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا پھر معشوق کی موہوم کمر"۔ انھوں نے تنقید کے کسی اسکول یا دبستان سے تعلق نہیں رکھا بلکہ الگ ہی ایک اپنی راہ نکالی۔ ان کی تنقیدیں تعمیری کم اور تخریبی زیادہ ہیں۔ کیونکہ ذہن پر مغربی بھوت سوار تھا اور صرف اپنے آپ کو نقاد سمجھتے تھے۔ اس لیے ان سے ادب کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچا ہے۔ لیکن اس زعم کے باوجود اور کئی سو صفحات اصول تنقید پر لکھنے کے بعد بھی وہ تنقید میں تخریب یا تنقیص کے علاوہ کوئی اضافہ کرنے سے قاصر رہے۔" اردو تنقید پر ایک نظر" اور" اقبال ایک مطالعہ" ان کی خاص کتابیں ہیں۔

مجنوں گورکھپوری ایک چونکا دینے والے نقاد کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اس لیے ان کی تحریروں میں اشتراکیت غالب ہے۔ ان کی تمام شہرت اس وقت ہوئی جب انھوں نے اختر حسین رائے پوری کے بعد" ادب برائے زندگی" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا اور اقبال کے افکار پر ایک تنقیدی کتابچہ شائع کیا۔ اقبال سے ان کا اختلاف نظریاتی ہے۔ ان کی تحریر اصل میں تاثراتی ہوتی ہے۔ جو فلسفیانہ کم مگر سنجیدہ

اور متوازن ضرور ہوتی ہے۔ ان کا تنقیدی کارنامہ بہت کم بلکہ نا کے برابر ہے۔
ڈاکٹر سید اعجاز حسین اگرچہ اشتراکی خیالات کے حامی اور ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں رہے۔ لیکن ان کی تحریروں میں شدت اور اصرار کے بجائے اعتدال اور توازن ہے۔ وہ تحقیق اور تنقید دونوں سے دلچسپی لے کر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ سادگی، متانت، اور شگفتگی ان کی تحریر کا خاصہ ہے۔ "نئے ادبی رجحانات" "آئینۂ معرفت" اور "مذہب اور شاعری" ان کی تصانیف میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔
سید احتشام حسین مارکسی سلسلہ کے اولین نقادوں میں ہیں۔ ان کا شمار اردو تنقید کے ابتدائی معماروں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین سے تربیت پائی ان کی نظر اور تحریر پر انھیں کی شخصیت کی چھاپ ہے۔ سید احتشام حسین کی تحریریں نہایت شستہ اور متین ہیں وہ تنقید کے تغیر پذیر پہلو کے قائل ہیں۔ اور کسی انتہا پسندانہ رویّے کو پسند نہیں کرتے اس لیے باوجود مارکسی اور اشتراکی ہونے کے ان کی تنقید میں لچک اور کشش پائی جاتی ہے۔ ان کی رائے نہایت جامع اور فلسفیانہ ہوتی ہے۔ جس کا اظہار وہ اعلا علمی زبان میں کرتے ہیں۔ اردو تنقید میں انھوں نے عملی تنقید کا گراں قدر اضافہ کیا۔ ادبی تخلیقات کو سماجی ماحول کے آئینہ میں پرکھنے کی دعوت دی۔ ان کا خیال تھا کہ سماج کے اثر انداز رشتوں کو تخلیق سے الگ نہیں کیا جاسکتا فن پارہ کے پوشیدہ اثرات کو تلاش کرنا تنقید نگار کا فرض ہے۔ احتشام حسین مارکسی رجحان رکھنے کے باوجود مشرقی روایات اور کلاسیکی ادب کے قدرداں تھے۔ ان کی مدلل اور منطقی تحریریں بزرگوں اور جوانوں دونوں کو برابر متاثر کرتی ہیں۔ انھوں نے اردو تنقید میں بیش بہا سرمایا چھوڑا۔ ان کی اہم تصانیف میں "ادب اور سماج" "عکس اور آئینے" "افکار و مسائل" "اعتبار نظر" "تنقیدی جائزے" "تنقید اور عملی تنقید" اور "روایت اور بغاوت" بالخصوص قابل ذکر ہیں۔
اختر علی تلہری ترقی پسند تحریک کے عہد عروج کے ایک ممتاز نقاد ہیں۔ جو اس عہد میں اشتراکیت اور مارکسیت کے خلاف محاذ آرا رہے۔ اعجاز حسین، احتشام حسین، اور مجنوں گورکھپوری وغیرہ کے خیالات کا دو ٹوک جواب دیتے تھے ان کا کہنا تھا کہ اشتراکی ادیبوں کو ادب اور ادب پارے سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ بلکہ ان کا مقصد ایک خاص گروہ پیدا کرنا ہے۔ اشتراکی نقاد مذہبی کتابوں کی تکذیب کرتے ہیں۔ ان میں حریت فکر کی تازگی کا کہیں پتا نہیں کیونکہ ان کا ذہن مارکس کے مزعومات کا غلام ہے۔ بلحاظ نظریہ اختر علی تلہری ادب برائے ادب کے طرف دار رہے۔ اور ادب کو زندگی بگاڑنے کے بجائے

زندگی سنوارنے کا ذریعہ تسلیم کرتے تھے۔ اختر علی تلہری کے خیالات معقول اور مدلل ہوتے ہیں۔ ان کی تنقید کی گرفت نہایت مضبوط اور مستند ہوتی ہے۔ ان کی تحریروں میں جو نفاست اور گہرائی ہے وہ مذہبی علوم سے عدم واقفیت کے بغیر مشکل ہے۔ "تنقیدی شعور" ان کا اہم کارنامہ ہے۔

اختر انصاری، اختر حسین رائے پوری کی طرح اولین ترقی پسند نقادوں میں تھے۔ وہ مارکسی خیالات و رجحانات پر زور دیتے تھے۔ لیکن انھیں ترقی پسندوں کے حلقے میں وہ اعزاز حاصل نہ ہو سکا جو اختر حسین رائے پوری اور اختر اورینوی کو میسّر ہوا۔ ان کی تنقیدی تصانیف میں "مطالعہ تنقید" "افادی ادب" اور "حالی اور تنقیدی شعور" قابل ذکر ہیں۔

آل احمد سرور اردو کے بلند قامت نقادوں میں سے ایک ہیں۔ ابتدا میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ اور ادبی سرمائے کا جائزہ انھیں اثرات کی روشنی میں لیتے رہے۔ انگریزی ادب سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کی تنقید کا پس منظر نہایت وقیع اور خوش گوار ہوتا ہے۔ وہ اردو کے کلاسیکی سرمایے کو ذہن میں رکھ کر قلم اٹھاتے ہیں۔ اور بڑے اعتدال اور توازن سے کام لیتے ہیں۔ نہ ترقی پسندی نہ جدیدیت کے مخالف ہیں وہ دونوں کے فائدہ مند اصولوں کو نظر میں رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "ادب پہلے ادبی تقاضوں کو پورا کرے اس کے بعد زندگی کا خدمت گزار بنے"۔ اقبال سے انھیں گہرا شغف ہے۔ ان کا بیشتر تنقیدی سرمایا اقبال کے حوالے سے ہی منظر عام پر آیا ہے۔ وہ ادب کے اس نظریے کے قائل ہیں جو معیاری ہو اور انسانی زندگی کے لیے کارگر بنے۔ جسم میں نئی روح اور نیا جذبہ پیدا کرے۔ ان کی اہم تصانیف "نئے اور پرانے چراغ" "تنقید کیا ہے" "نظر اور نظریے" خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

ڈاکٹر خورشید الاسلام اردو کے ایسے نقاد ہیں جو کسی نظریے یا فارمولے کے مقلد نہیں۔ انھوں نے اپنی تنقید میں گہرے مطالعے اور ژرف نگاہی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ تنقید کے روایتی انداز سے پرہیز کیا اور فن پارہ کے اسرار و رموز کے ذریعے فن کار کے ذہن کی گہرائیوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ خورشید الاسلام کی تنقیدوں میں ادب اور زندگی دونوں قدروں کی جستجو پائی جاتی ہے۔ وہ مواد اور ہیئت دونوں پر نظر رکھ کر اپنی صائب رائے پیش کرتے ہیں۔ شاید انھیں تاثراتی نہیں بلکہ جمالیاتی سائنٹفک نقاد کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی تنقید میں اپنی بت شکنی کے لیے مشہور رہیں۔ علی گڑھ میں ترقی پسند ادیبوں کے قافلے میں شامل ہوئے اور انہی اصولوں کی روشنی

میں کام کرتے رہے۔ ان کی رائے بے باک اور دو ٹوک ہوتی ہے۔ اس لیے ان کی تنقید میں کسی طرح کی لچک نہیں پائی جاتی۔ ان کا ابتدائی دور انتہائی ترقی پسندانہ رہا لیکن جلد ہی ان کے خیالات بدل گئے۔ اور وہ ترقی پسندی چھوڑ کر جدیدیت کی تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ انھوں نے ترقی پسند ادب کے تمام رجحانات اور خیالات کی جانچ پرکھ کرکے اصلیت کو تلاش کیا اور ادب میں نعرہ بازی اور خود غرض بازی گری کو مذموم قرار دیا۔

آخری ایام میں تو سیدھے سچے" مسلمان کی زندگی گزاری۔ اس دور میں اپنی تنقید و تخلیق میں اسلامی اقدار حیات کی ترویج و تبلیغ کرنے لگے تھے۔" ترقی پسند ادب،" "فکر و فن" " زاویۂ نگاہ" اور "افکار نو" ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

یوسف حسین خاں جس معیار کے نقاد ہیں اس عہد میں ایسے جامع الکمالات بہت کم ہیں۔ ادب کے کلاسیکی پہلو کے مداح ہیں، آرٹ، عقل اور جمالیات کے باوزن اصولوں کو اپناتے ہیں۔ فن پارے کے وقیع معیار کے قائل ہیں۔" غزل،" "حسرت کی شاعری" "روح اقبال" اور "اقبال کی متحرک جمالیات" ان کی یادگار تصانیف ہیں۔

نیاز فتح پوری حالی کے رد عمل کے طور پر ابھرنے والے نقاد ہیں۔ جن کا نام سجاد حیدر یلدرم اور مہدی افادی وغیرہ کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ادب کا مقصد سماج کی اصلاح یا تبدیلی نہیں اور نہ اس کا کام انسان گے گروہوں کو متاثر کرنا ہے۔ نیاز فتح پوری کا کہنا ہے کہ ادب کا مقصد خالص مسرت اندوزی ہے اور بس! ادب کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ اچھا ہے یا برا۔ اس طرح نیاز فتح پوری کی تنقید کا ایک سرا جمالیات اور دوسرا تاثرات سے جڑا ہوا ہے۔ مغربی ادب سے واقفیت اور اپنے خیالات کے بھرپور اظہار کے باوجود نیاز فتح پوری تنقید میں کسی باقاعدہ مکتب فکر کی بنیاد نہیں ڈال سکے۔ اور نہ اپنے بعد اپنے جانشینوں کو پیدا کرنے میں کامیاب ہوسکے۔ زبان کی دلچسپی اور بیان کی دل نشینی نیاز فتح پوری کی تنقید کا خاص وصف ہے۔ "نگارستان" اور "انتقادیات" ان کے تنقیدی کارنامے ہیں۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی اردو تنقید کی تاریخ پر قلم اٹھانے والے سب سے پہلے تنقید نگار ہیں۔ انھوں نے" اردو تنقید کا ارتقار" لکھ کر نہ صرف تنقید پر کیے گئے اعتراضات کا جواب دیا بلکہ اردو تنقید کی دنیا میں ایک اعلا مقام بھی حاصل کیا۔ ان کا یہ کارنامہ کسی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ تنقیدی نظر اور اصولوں کے لحاظ سے وہ بظاہر کسی مکتب فکر سے وابستہ دکھائی نہیں

...یتے ہاں ان کی علمی تنقیدوں میں تاثر کا غلبہ ضرور رہتا ہے۔ باوجود بہت کچھ لکھنے ...ے انھیں کسی نتیجہ پر پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ "جدید شاعری" "اردو تنقید ...کاری" "غزل اور مطالعہ غزل" وغیرہ ان کی دوسری تنقیدی کتابیں ہیں۔

پروفیسر مسعود حسین خاں سائنٹی فک انداز کے مشرقی تنقید نگار ہیں۔ تاریخ، ...ان، اور ادبی حقائق کو پیش نظر رکھ کر قلم اٹھاتے ہیں۔ شعر و زبان الفاظ ...ر اصوات کو ملحوظ نظر رکھ کر رائے دیتے ہیں۔ ماہر لسانیات ہیں۔ اس لیے ...سانی اصولوں کی روشنی میں فن پارہ کی پرکھ کرتے ہیں۔ بعض اوقات ادیبوں کے ...موں پر پڑے ایسے گئے پردوں کا انکشاف کر جاتے ہیں۔ "شعر و زبان" "اردو لفظ ...صوتیاتی و تجزیاتی مطالعہ" "اردو زبان و ادب" اور "اقبال کی عملی و نظری ...عریات" ان کی خاص تنقیدی تصانیف ہیں۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی اردو کے تنقیدی کارواں میں صف اول کی حیثیت ...کھتے ہیں۔ ان کی نگاہ حقیقت شناس ہے۔ تحقیق ان کی تنقید کے خمیر میں شامل ...ہے۔ ان کی تحریروں میں حد درجہ چھان بین، توازن و یک جہتی اور نفاست ...ئی جاتی ہے۔ وہ قدرے تاثراتی مگر سائنٹی فک انداز اختیار کرتے ہیں۔ اعلا ...ر معیاری ادب کے قدر دان ہیں۔ اور اپنی تحریروں میں ادب کے اس ...ہلو پر زور دیتے ہیں۔ تنقید کی جن قدروں کے علم بردار ہیں وہ ان کی کتاب ...لاسیکی ادب کے مضامین میں بخوبی مل جاتی ہے۔ اپنی تحریروں میں وقت نظر، ژرف ...نگاہی اور دروں بینی سے کام لیتے ہیں۔ "میر تقی میر" ان کی کتاب معرکۃ الآرا کتاب ہے۔

سلیم احمد کا تعلق تنقید کے تاثراتی دبستان سے ہے۔ اوّل اوّل وہ ادب ...سماجی اہمیت کے علم بردار تھے۔ لیکن بعد کو ادب کی مقصدیت کے قائل ہو گئے۔ ...ن کے خیال میں ادبی تخلیقات کو سماجی لواحقات سے پاک ہونا چاہیے۔ سلیم احمد ...تنقیدوں کی زبردست مخالفت ہوئی۔ اور ان کی تحریروں کو زہرناک اور ...جلتی کہہ کر رد کر دیا گیا۔ اصل میں سلیم احمد کی تنقید میں ایک طنز پوشیدہ ...ہے۔ لوگ ان کی دل آزاری سے تلملا اٹھتے ہیں۔ اور سلیم احمد اس کا لطف ...ٹھاتے ہیں۔ ان کی تنقیدی کاوشوں میں "ادبی اقدار" مشہور ہوئی۔

علی سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے ابتدائی حامیوں اور علم برداروں ...یں ہیں۔ ادب و تنقید میں اشتراکی و مارکسی نقطۂ نظر اپناتے ہیں۔ اس لیے ...ن کی تنقید پروپیگنڈے اور احتجاج سے جڑی ہوئی ہے۔ ان کی کتاب ..."ترقی پسند ادب" بہت مشہور ہوئی۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ جدیدیت کی تحریک کے روح رواں اور ...قافلہ سالار ہیں۔ اردو تنقید کو نئے نئے موضوعات سے متعارف کرانے

اور ان کو رواج دینے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ ادب پارہ کی ادبی لسانی اور جمالیاتی قدروں پر نظر رکھتے ہیں۔ ادب میں سیاسی وابستگی کے قایل نہیں اور ادب و فن کو سیاسی زمزما کی سے پاک رکھنے کے موید ہیں۔ جس سے ادب اور صحافت میں امتیاز باقی رکھا جا سکے۔ ادب لطیف ہے اس کو ادبی اقدار، زبان، بیان اور اسالیب وغیرہ کی روشنی میں پرکھنا چاہیے۔ گویا نارنگ صاحب ادب کی فنی اور جمالیاتی قدروں کے تو مداح ہیں لیکن اس میں مہمل نویسی کے قایل نہیں ادب پارے کی پرکھ میں وہ جس تنقیدی دبستان کا سہارا لیتے ہیں وہ بالکل غیر سیاسی بلکہ سائنٹی فک ہوتا ہے۔ یعنی ان کی تنقید کا رشتہ جہاں ایک طرف جمالیات سے ملتا ہے وہیں دوسری طرف علم بیان یعنی سائنس سے بھی۔ لسانیات کو مکمل تنقید نہ مان کر تنقید کا ایک جز تسلیم کرتے ہیں۔ افسانوی ادب میں بھی انھوں نے نئی جہات اور روایات و مسائل کے نئے اور اعلا انتقادی اصول پیش کیے۔ ان کی تحریریں بڑی جامع، متین اور دل نشین ہوتی ہیں۔ جن میں گہری فلسفیانہ فکر کا غلبہ رہتا ہے۔ عملی تنقید میں لفظوں، ان کی بناوٹ، استعمال اسلوب اور آہنگ پر زور دیتے ہیں۔ اردو تنقید میں لفظیاتی، صوتیاتی، لسانیاتی اسلوبیاتی، اور ساختیاتی تجربوں کے نئے مکاتب فکر کے اضافے اور ان کی ترویج و ترقی کے لیے نارنگ صاحب کا نام ہمیشہ عزت و احترام سے لیا جاتا رہے گا۔" سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ" نیا اردو افسانہ روایت اور مسائل" نیا اردو افسانہ، تجزیے اور مباحث امیر خسرو کا ہندوی کلام "اسلوبیات میر" انیس شناسی، کربل کتھا کا لسانی مطالعہ، اقبال کا فن ادبی تنقید اور اسلوبیات، اقبال جامعہ کے مصنفین کی نظر میں، ان کی معروف کتابیں ہیں۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری جدید سلسلہ کے بڑے نقاد ہیں۔ ترقی پسندی کے مخالف اور ادب کی ادبیت کے قائل ہیں۔ اپنی تنقیدوں میں مغربی افکار اور انگریزی اصطلاحات سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مغربی ادب سے آئے نئے "تنقیدی دبستان" پیکر تراشی" کے پیش رو نقاد ہیں۔ فن کی پرکھ فن پارے میں استعمال شدہ الفاظ مرموزات اور پیکروں کے سہارے کرتے ہیں۔ وہ ادب کو کسی مینی فیسٹو کا پابند ہرگز نہیں مانتے بلکہ فن کار کے خیال کی آزادی کلاسکیت اور پر جمال فضا کے طرفدار ہیں۔ اخلاقی پستی، مذہبی بے راہ روی ان کے نزدیک قابلِ مذمت ہے۔ عملی تنقید میں شاعری بالخصوص اقبال پر ان کا زبردست کارنامہ ہے۔ وہ اقبال کے افکار کے قدردان بھی ہیں اور جابجا ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسلوب صاحب کا نظریۂ تنقید نہایت وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ وہ تنقید

سی مخصوص دبستان سے ہمدردی کے بجائے ادب کے تمام افادی پہلوؤں
نظر رکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں ادب کا زندگی سے گہرا تعلق بھی ہے۔
وہ انسان کی جمالیاتی حس کو تسکین بھی دیتا ہے۔ گویا وہ تنقید و ادب
سماجیاتی اور جمالیاتی دونوں پہلوؤں کے قائل ہیں۔ مگر اس طرح
دیب و نقاد جذبات کے ساتھ ساتھ حکیمانہ نظر کا حامل ہو۔ جس سے
ت مند اندارِ حیات کی اشاعت کرکے زندگی کو بحیثیت مجموعی آگے بڑھایا
سکے۔ ان کے تنقیدی سرمایے میں "ادب اور تنقید"، تلاش غالب تلاش اقبال
اقبال کی تیرہ نظمیں خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن اردو کے گرانمایہ نقاد ہیں۔ وہ ابتدا ہی سے مارکسی
ریات سے وابستہ رہے اور ادب پارہ کو مارکسی کے جدلیاتی اصولوں کی
شنی میں پرکھتے رہے۔ ان کے خیال میں نقاد کے لیے مارکس کا مطالعہ ناگریز
۔ کیونکہ ادب پاروں کو انقلابی اور معاشرہ پر اثر ڈالنے والا ہونا چاہیے۔
صاحب کی رائے نہایت جامع اور فیصلہ کن ہوتی ہے۔ اپنے طویل ادبی
میں انھوں نے اردو تنقید کے بعض مبہم پہلوؤں کو اجاگر کیا اور اردو
د میں ایک نئے باب اور نئی جہت کا اضافہ کیا یعنی اردو تنقید میں سماجیاتی
لعے کی داغ بیل ڈالی۔ مارکسی جدلیت سماجیاتی مطالعہ اور ادب برائے
گی کے ساتھ محمد حسن تنقید کے تمام دبستانوں سے استفادے کی حمایت
تے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ادب کا مطالعہ تمام تر تنقیدی نظریات کی
نی میں کرنا چاہیے۔ اس طرح محمد حسن ایک نئی اور کارآمد تنقیدی نظر
غاز کرتے ہیں۔ جسے وہ اپنے الفاظ میں ٹوٹل تنقید TOTAL CRITICISM
نام سے پکارتے ہیں۔ ان کی اہم تنقیدی تصانیف میں "مشرق و مغرب
، تنقیدی تصورات کی تاریخ" "ادبی تنقید" "جدید اردو ادب" اور ر
سماجیات" وغیرہ خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

شمس الرحمان فاروقی اردو کے وہ عظیم نقاد ہیں جنھوں نے اردو
میں جدیدیت کی بنیاد ڈالی اور ترقی پسند ادیبوں کے روبرو ایک بڑی
شعور جماعت کو پیدا کیا۔ شمس الرحمان فاروقی اپنی تحریروں میں ادب
ے ادب کے پیش نظر، لفظوں، پیکروں، استعاروں اور ایہام سے
کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ معانی الفاظ ہی سے پیدا ہوتے
۔ جب تک تخلیق کار کو مناسب الفاظ مناسب ترتیب کے ساتھ نہیں
جاتے وہ اپنے خیال کے اظہار سے قاصر رہتا ہے۔ اس طرح
وں کو معانی پر فوقیت حاصل ہے۔ اس کے لیے موصوف اپنی تحریروں

ہیں مشرق کے قدیم علماء ابن رشیق ابن خلدون اور جرجی زیدان وغیرہ کے خیالات سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ مغربی افکار اور مغربی علوم سے بے خبر کبھی نہیں رہتے۔ وہ ادب پارے کے سیاسی اور نعرہ باز ہونے کی سختی سے مخالفت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسندوں سے ان کی راہ نہیں ملتی۔ یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے اردو تنقید کو ایسے طریقوں سے آگاہ کیا جس سے اردو ادب اب تک ناآشنا تھا۔ تنقیدی افکار، "لفظ و معنی"، "شعر غیر شعر اور نثر"، "عروض آہنگ اور بیان" اور "شعر شور انگیز" ان کی مقبول اور مشہور تصانیف ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا جدید ذہن کے بڑے نقاد ہیں۔ وہ ترقی پسندی کو جدیدیت کی ایک ذیلی تحریک مانتے ہیں۔ ان کے خیال میں تنقید کو کسی مخصوص مکتب فکر سے وابستہ نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ جہاں تک ممکن ہو سکے تنقید کو معروضی رکھا جانا چاہیے۔ کیونکہ ہر ایک تخلیق اپنے آپ میں نامکمل ہوتی ہے۔ اور ہر شخص اس ادب پارے کا مطالعہ اپنے نظریات کی روشنی میں کرتا ہے۔ گویا کہ نقاد خود تخلیق کار کے عمل میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔ اور اس طرح تنقید اس نامکمل تخلیق کا حصہ ہوتی ہے۔ اور یہ سلسلہ بالکل اسی طرح لامتناہی ہوتا ہے جس طرح آمنے سامنے رکھے ہوئے دو آئینوں میں عکسوں کا سلسلہ اور پھر لاتعداد یعنی نہ ختم ہونے والے عکس پیدا ہوتے ہیں۔ وزیر آغا اپنی تحریروں میں مذہبی اور متصوفانہ خیالات کی حمایت کرتے ہیں۔ انھوں نے اردو تنقید میں ساختیات جیسے نو وارد موضوع پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ وہ اردو کے چند صاحب نظر نقادوں میں سے ایک ہیں۔ "نئے تناظر" ان کی تنقیدی تصنیف ہے۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی ادب میں اعلا اقدار حیات کی حمایت کرتے ہیں۔ تنقید میں، اسلوب، زبان، اخلاق، تاریخ اور علمی قدروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں فارسی اور عربی کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ عرب و عجم کی دلچسپ حکایات، مشرقی رجحانات، حوالے اور ثقافتی تلمیحات ان کی تنقید میں گہرا رچاؤ پیدا کرتی ہیں۔ اصل میں وہ کلاسیکی انداز کی تاثراتی تنقید کے علم بردار ہیں۔ ان کی تنقیدی تحریروں میں ان کی متصوفانہ فکر ضم ہو کر ان کے اسلوب بیان کو رقت انگیز بنا دیتی ہے۔ "دید و دریافت" اور "دراسات" ان کی تنقیدی بصیرت کے بیّن ثبوت ہیں۔

عبدالمغنی تنقید کے مفید صحت مند اور تعمیری پہلو کے حامی ہیں۔ مشرقی اقدار کے محافظ اور اخلاق و ایقان کی تدریس کے قائل ہیں۔ ادب و تنقید

کو اسلامی ادبی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کلیم الدین احمد کے اعتراضات کا جواب دینا ان کی امتیازی شان میں شامل ہے۔ مغربی ادبیات کے مطالعے نے انھیں تقابلی نظر سے نوازا ہے۔ اقبال سے انھیں خاص شغف ہے اپنی تنقید میں ان کے خیالات سے استفادہ بھی کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی تنقید مزید مدلل اور جامع ہوجائے اگر اس میں طنز ترشی اور تیکھے پن کو شامل نہ کیا جائے۔ "اسلوبِ تنقید"، "تنقید مشرق"، اقبال اور عالمی ادب"، "اقبال کا نظام فن" ان کی مخصوص کتابیں ہیں۔

وارث علوی ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن کی حیثیت سے ابھرے لیکن جلد ہی اس سے کنارہ کشی اختیار کرکے اور جدیدیت کے قافلے میں شامل ہوگئے۔ وہ ایک ذی علم اور ذہین نقاد ہیں۔ اور اس علم و آگہی کے سہارے تنقیدی فیصلہ کرتے ہیں۔ ان کے یہاں جدید حسیات، اور وجودیت کے فلسفہ کو اردو تنقید میں سمونے کی سعی ملتی ہے۔ "حالی مقدمہ اور ہم" جدید افسانہ اور اس کے مسائل"، "راجندر سنگھ بیدی" وغیرہ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

ڈاکٹر قمر رئیس ترقی پسند ادیبوں کے سالار کارواں ہیں۔ ان کی تنقید مارکس اور لینن کے خیالات سے متاثر ہوتی ہے۔ انھوں نے کئی بار روس کا سفر کیا۔ اور روسی ادب اور ازبک زبان سے استفادہ کیا۔ وہ اپنی تنقید میں سماج کے پست طبقے، انسانی دکھوں اور سماجی حقیقت نگاری پر زور دیتے ہیں۔ اور ادب اور سماج کے رشتوں کو ملحوظ رکھ کر مارکسی اصولوں کی روشنی میں اپنے تنقیدی نظریات کا اظہار کرتے ہیں۔ انسان دوستی، استحصال، طبقاتی کشمکش اور روشن خیالی ان کی تنقید کے خاص موضوعات ہیں۔ ان کی تحریر میں وزن اور وقار ہوتا ہے۔ وہ خالص اشتراکی خیالات اور نظریات کے حامل ہیں۔ روس سے اشتراکی نظام کے خاتمے سے ان کے اشتمالی خیالات میں کسی قسم کا تزلزل پیدا نہیں ہوا ہے۔ وہ آج بھی مارکسی جدلیت، مظلوم عوام، محنت کش انسان اور معاشرہ کے سلگتے جھلستے پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں۔ اور ان سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ دنیا کے انتشار اور نیچ اور ظلم و ستم کا حل وہ اب بھی مارکسی فلسفہ میں تلاش کرتے ہیں۔ ان کے اہم تنقیدی سرمایہ میں "تنقیدی تناظر"، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ"، "ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر" وغیرہ خصوصیت کے حامل ہیں۔

ظ انصاری عمر بھر ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے اور اشتراکی نظریات کی ترویج کرتے رہے لیکن زندگی کے آخری ایام میں ان کے اس اعلان نے ساری دنیا کو چونکا دیا کہ انھوں نے جو کچھ اشتراکیت واشتمالیت

کے زیر اثر لکھا اس کو کالعدم قرار دے دیا جائے اور چند دنوں بعد ایک مذہبی شخص کی حیثیت سے انتقال کیا۔ ان کی اہم تنقیدی تصانیف میں "کمیونسٹ اور مذہب" "غالب شناسی" "خسرو شناسی" "اقبال کی تلاش" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔
محمد علی صدیقی ادب کے ترقی پسندانہ اصولوں کے پر زور علم بردار ہیں۔ اور تنقید کا معیار اشتراکیت کو قرار دیتے ہیں۔ زیادہ تر انگریزی زبان میں لکھتے ہیں۔ "مضامین" ان کی اردو میں تازہ ترین کتاب کا نام ہے۔

صدیق الرحمان قدوائی ادب کے ترقی پسندانہ نظریات سے وابستہ ہیں۔ تاہم ان کے یہاں کوئی انتہا پسندانہ رویہ نہیں پایا جاتا۔ فن پارہ کی اہمیت کا تعین وہ ادب اور سماج دونوں کو پیش نظر رکھ کر کرتے ہیں۔ جسے وہ تنقید نہ مان کر تاثر تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں توازن اور اعتدال قایم رہتا ہے۔ "تاثر نہ کہ تنقید" ان کی تازہ تنقیدی کتاب کا نام ہے۔

سلیمان اطہر جاوید ادب و تنقید میں جدیدیت کے اصولوں سے اتفاق کرتے ہیں۔ فن پارے خصوصاً شعر کا مطالعہ اشارے کنائے کی روشنی میں کرنے کے قایل ہیں۔ وہ تنقید کے اسی مشرقی کلاسیکی دبستان کے پابند ہیں۔ "اردو شاعری میں اشاریت" اور "تنقید شعر" ان کی اہم تنقیدی تصانیف ہیں۔

عبدالقوی دسنوی ایک ایسے بسیار نویس نقاد ہیں جن کی خدمات کا خاطر خواہ اعتراف اب تک نہیں کیا گیا۔ تاریخی، سوانحی ضابطے ان کی تنقید کے لیے مشعل راہ ہیں۔ مطالعۂ خطوط غالب، سید سلیمان ندوی، اقبالیات کی تلاش، اقبال اور دہلی، تلاش آزاد وغیرہ ان کی عملی تنقید کی تصانیف ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری مشرقی انداز کے عملی نقاد ہیں۔ ادب کے فنی اور مفید پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ "تحقیق و تنقید" اردو افسانہ اور افسانہ نگار" اردو کی منظوم داستانیں، اقبال سب کے لیے، وغیرہ ان کی کتابیں ہیں۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی ایک تیسرے سلسلہ کے ممتاز نقاد ہیں۔ اپنی عملی تنقید کی تحریروں میں مشرقی اقدار نقد کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور ادب میں پاکیزہ خیالات کا لحاظ کرتے ہیں۔ وہ اگرچہ جدیدیت پسند بھی نہیں لیکن ترقی پسند خیالات سے انھیں نظریاتی بُعد ہے۔ ان کی تنقید بیش تر جمالیاتی اقدار پر منحصر ہوتی ہے۔ چونکہ تصوف اسلامی کے سلسلہ سے منسلک ہیں۔ اس لیے متصوفانہ اثرات کی جھلک ان کی تحریروں میں نمایاں ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ "مومن اور مطالعۂ مومن" اور "ادب میں جمالیاتی اقدار" ان کی قابل ذکر تنقیدی تصانیف ہیں۔ سید محمد عقیل ترقی پسند ادیبوں کے کارواں میں شامل ہیں۔ اور انہی نظریات کے تحت ادب کی قدر و قیمت کا جائزہ لیتے

ہیں۔ بایں ہمہ وہ تنقید میں علمی اور ادبی موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں۔ ان کی تنقید میں اعجاز احمد کی تنقیدی نظر کا رنگ ہے۔ "نئی ملامت نگاری" ان کی خاص تنقیدی تصنیف ہے۔

پروفیسر عنوان چشتی نے تنقید کے سفر کی ابتدا جدیدیت سے کی اور عروسِ سخن کو سجانے سنوارنے والے قدیم اصول فنِ عروض کو اپنی تنقید کا خاص ذریعہ بنایا۔ انھوں نے عروض اور فن کے مسائل کو ایک نئی جہت اور نئی رفتار سے آگاہ کیا اور شعری پرکھ کے نئے اصول اور مستند اوزان بھی دریافت کیے مزید براں انھوں نے اپنی عملی تنقید میں متصوفانہ خیالات کو ترجیح دی۔ اس طرح تنقید ان کے نزدیک محض خشک دماغی ورزش نہ رہ کر باقاعدہ ضابطۂ حیات سے وابستہ ہے جس کی جڑیں مشرقی علوم کے قدیم سرمایہ میں پیوست ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اعلا خیالات اعلا فن پارہ کے ذریعہ ہی ممکن ہیں۔ اور جس طرح ارفع خیالات کی اختراع کے لیے شدید علمی ذہانت مطلوب ہے۔ اسی طرح عمدہ اظہار کے لیے فنی مہارت بھی درکار ہے۔ غرض انھوں نے مشرق کے قدیم انتقادی اصولوں کی تجدید کی۔ اور شعر و سخن کی پرکھ کے بعض ضابطے مقرر کیے۔ گویا ان کی تنقید جدیدیت، تصوف اور عروض کا مثلث تیار کرتی ہے۔ اور یہی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے اہم تنقیدی سرمایہ میں "اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت" "اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے" "عروضی اور فنی مسائل" اور "تنقید نامہ" بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

سلام سندیلوی بڑے بسیار نویس نقاد ہیں۔ تنقید میں کسی تبلیغی مکتبِ فکر کے قائل نہیں ہیں۔ افراد کی ذات پر بے حد زور دیتے ہیں۔ انھوں نے طلبہ کے استفادے کے لیے قابلِ قدر ادبی تنقیدی مواد فراہم کیا ہے۔ "ادبی اشارے"، "اردو شاعری میں نرگسیت"، "اردو شاعری میں منظر نگاری" اور "ادب کا تنقیدی مطالعہ" وغیرہ ان کی خاص کتابیں ہیں۔

پروفیسر شمیم حنفی جدیدیت کے پرزور حامی ہیں اور اپنی تنقید میں جدیدیت کے اصولوں کو اپناتے ہیں۔ ان کی تحریریں نہایت سنجیدہ اور پُرمغز ہوتی ہیں۔ انھوں نے اپنے گہرے مطالعے، مشاہدے اور تعمقِ فکر کے سہارے جدیدیت کی فلسفیانہ اساس قایم کی اور دنیا کو بتایا کہ تحریکِ جدیدیت محض ایک خیالی اور نام نہاد تحریک نہیں ہے۔ بلکہ اپنے اندر جان دار سرمایہ اور باکمال کشش بھی رکھتی ہے۔ شمیم حنفی جدیدیت کے نام سے اس طرح جڑ گئے ہیں کہ جدیدیت اور شمیم حنفی دو نام ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا نظریۂ تنقید بڑا جامع اور بے حد وسیع ہے۔ وہ تنقید

کو کسی ایک نظر یا زاویہ سے ناپنے کے قایل نہیں ہیں۔ بلکہ تمام تنقیدی دبستانوں کے نتیجے میں ایک نئے ابھرنے والے نظریے کے مدعی ہیں جس کو وہ اپنی زبان میں تنقید بین العلوم کا نام دیتے ہیں۔ "جدیدیت کی فلسفیانہ اساس" ان کی گراں مایہ تنقیدی تصنیف ہے۔ حامدی کاشمیری جدیدیت کے ہم نوا بلکہ سرگرم علم بردار ہیں۔ تنقید میں جمالیات پر زور دیتے ہیں۔ لفظوں، پیکروں، اور ترکیبوں کو ان کی تنقید میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ "معاصر تنقید ایک نئے تناظر میں" اور "حرف زار" ان کی قابلِ قدر تنقیدی کتابیں ہیں۔

پروفیسر حنیف کیفی جدید خیالات کے حامی ہیں۔ اور ادب میں نئے اور تازہ موضوعات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ ادب میں بسیار نویسی کے بجائے قلیل مگر جامع، مدلل اور پختہ تحریروں کے قایل ہیں۔ ادب کے جمالیاتی پہلوؤں پر نگاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ تنقید میں سائنٹفک روابط سے کام لیتے ہیں۔ ان کی تحریریں کم مگر باوقار اور باوزن ہیں۔ اردو سانٹ اور نظم معرّیٰ اور غالب احوال و افکار ان کی اہم کتابیں ہیں۔

پروفیسر مظفر حنفی اگرچہ جدیدیت نواز تنقید نگار ہیں۔ تحریک جدیدیت کے علم برداروں میں ان کا نام سرفہرست لیا جاتا ہے۔ مگر ان کی تنقید اشتراکیت اور جدیدیت کے تنقیدی زاویوں سے مشتق ہے۔ جو تحقیق و تاریخ کی چھان پھٹک کے بعد سامنے آتی ہے۔ "جدیدیت تفہیم و تجزیہ" جہات و جستجو" "تنقیدی العباد" ان کی خاص تنقیدی کتابیں ہیں۔

شجاعت علی سندیلوی مشرقی اقدار نقد کے قائل اور کلاسیکی انداز فکر کے نقاد ہیں۔ ان کے تنقیدی کاموں میں تحقیقی جستجو جھلکتی ہے۔ حالی کے تنقیدی نظریات سے اکتساب فیض کرتے ہیں۔ ان کے اہم تنقیدی کاموں میں ادبی تاثرات" حرف ادب" اور "حالی شخصیت اور شاعر" بالخصوص قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم ایک منفرد مکتب خیال کے حامی ہیں ادب و تنقید میں تحقیقی چھان بین پر زور دیتے ہیں۔ اور ماخوذ حقائق سے تنقیدی خیالات اخذ کرتے ہیں۔ تحقیق و تنقید کے حوالے سے لکھی گئی ان کی کتاب "متنی تنقید" ہی انھیں اردو تنقید کی دنیا میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

پروفیسر نورالحسن نقوی قدیم ادبی سرمایے پر نظر رکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں نقاد کو الفاظ اور معانی کی بحث سے الگ رہنا چاہیے کیونکہ ان دونوں کا رشتہ آپس میں جان و تن کا سا اٹوٹ رشتہ ہے۔ نقاد کو چاہیے کہ وہ فن پارے کی معنوی اور صوری دونوں خوبیوں پر نظر رکھے اور اس کی دونوں حیثیتوں کی قدر و قیمت کا تعین کرے۔ ان کا کہنا ہے کہ ادب میں نظریے کا ہونا یا نہ ہونا کوئی

معنی نہیں رکھتا۔ ادبی تنقید یہ دیکھتی ہے کہ ادب واقعی ادب ہے بھی کہ نہیں۔
پروفیسر نقوی کے خیال میں نقاد کو بے تعصب اور منصف مزاج ہونا چاہیے۔
فن تنقید اور تنقید نگاری" ان کی تازہ تنقیدی تصنیف ہے۔
ڈاکٹر عبدالحق ادب کے افادی پہلو کے قایل ہیں۔ اور اخلاقی پہلو سے اتفاق کرتے ہیں۔ وہ فن پارہ کی جمالیاتی خوبیوں کے معترف ہیں۔ اور لسانی تاثراتی تنقید کے مداح ہیں۔ لیکن اشتراکی نقطۂ نگاہ سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک ادب الحاد و فساد کا باعث نہیں ہونا چاہیے۔ اور انسان کو اعلا انسانی خصوصیات کا حامل بنانے والا ہونا چاہیے۔ اقبال کے خصوصی مطالعہ نے انھیں مابعد الطبیعاتی نظریے سے نوازا ہے۔ حسن کو وہ اپنی تنقید کا حصہ بناتے ہیں۔ ان کی اہم عملی تنقیدی کتابوں میں اقبال کے ابتدائی افکار" انتخاب حاتم"" اقبال کے شعری اسالیب" وغیرہ خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر شارب ردولوی اگرچہ ترقی پسندی کے طرف دار ہیں۔ لیکن جدیدیت پسندوں کی محفل میں بھی برابر پسند کیے جاتے ہیں۔ تنقید ہی ان کا خالص اور اصل میدان ہے۔ انھوں نے یونگ کے نظریۂ تحلیل نفسی کی بیخ کنی کر کے نفسیاتی تنقید کی تردید کی۔ وہ ایک آزاد خیال ترقی پسند نقاد ہیں۔ ادب کی سیاسی، سماجی اہمیت کے ساتھ فن اور انفرادیت کو بھی نظرانداز نہیں کرتے۔ ان کی تنقید میں یک گونہ جامعیت اور توازن پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے ان چند نقادوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اردو تنقید کے اصول و نظریات سے بحث کی ہے۔ "جدید اردو تنقید اصول و نظریات" اور "مطالعۂ تنقید" ان کی فن تنقید پر اہم کتابیں ہیں۔ عملی تنقید میں "جگر فن اور شخصیت" "افکار سودا" "مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر اور مطالعہ ولی" بطور خاص قابل ذکر ہیں۔
ڈاکٹر عتیق اللہ بھی ترقی پسند نظریات کے حامی ہیں۔ ادبی سرمایے کا جائزہ روسی نقد و نظر کی روشنی میں لیتے ہیں۔ انھوں نے تنقید میں ایک نئے طرز فکر کو جنم دیا۔ "تنقید کا نیا محاورہ" ان کی نئی تنقیدی تصنیف ہے۔
ڈاکٹر سعادت علی صدیقی تاریخی، سماجی اور لسانی ادب کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھ کر ادب کو پرکھتے ہیں۔ اصل میں ان کی تنقید تحقیق کی گرم بھٹی سے ہو کر گزرتی ہے۔ اور وہ ادب کے فروغ سے پہلے اردو زبان کی بقا پر دھیان دینے کے قائل ہیں۔ "ادبی جائزے" "اردو کا زندائی ادب" اور "تذکرۂ شعرائے سنبھل وغیرہ ان کی اہم کتابیں ہیں۔
پروفیسر ابوالکلام قاسمی نئی نسل کے ذی علم اور باشعور تنقید نگار ہیں۔

ادب میں جدیدیت کے نظریات سے اتفاق کرتے ہیں اور مشرقی تنقید کے اصولوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ دراصل وہ کلاسیکی روایت کے مشرقی نقاد ہیں۔ جو عربی اور فارسی کے قدیم انتقادی ادب کے نظریات سے استفادہ کرتے ہیں۔ وہ ادبی جمالیات کے دروں خانہ میں نظر ڈالنے اور غور کرنے والے نقاد ہیں اور اپنے تنقیدی رجحان کا ایک واضح نظریہ رکھتے ہیں۔ وہ اس نسل کے واحد نمائندہ نقاد ہیں جو اردو تنقید کے فن اور اصول پر نہایت سنجیدگی سے کام کر رہے ہیں۔ "مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت" ان کی وقیع تنقیدی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی ترقی پسند ادیبوں کے کارواں میں شامل ہیں۔ اور ان ہی اصولوں پر عمل کرتے ہیں۔ لیکن اشتراکیت ان کے نزدیک ضروری نہیں "شرر بحیثیت ناول نگار" اور "فراق فن اور شخصیت" ان کی عملی تنقیدی تصانیف ہیں۔

اردو تنقید کے مذکورہ علم برداروں کے علاوہ پروفیسر محمود الٰہی، پروفیسر شبیہ الحسن، ڈاکٹر صادق، ڈاکٹر جعفر رضا وغیرہ اور بہت سے دانشور میدان تنقید میں سرگرم عمل ہیں۔ جن کا فرداً فرداً جائزہ لیا جانا یہاں ممکن نہیں ہے۔ اگرچہ آزادی کے بعد اردو تنقید نگاروں کا ایک جم غفیر ہے مگر ان میں کوئی آزاد، شبلی یا حالی پھر بھی نظر نہیں آتا۔ تاہم یہ سلسلہ اپنی ارتقائی منازل کی طرف گامزن ضرور ہے۔ لیکن اگر آزادی کے بعد کی پیداوار کو اصول تنقید کے نقاد کی حیثیت سے پرکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ نسل تنقید کے فن سے یکسر عاری ہے۔ اگر باقاعدہ تنقید کے فن کے لحاظ سے غور کریں تو ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی کے علاوہ صرف ایک شخص غضنفر علی ایک نقاد کی حیثیت سے ملتا ہے۔ جس نے فن تنقید پر ایک کتابچہ "مشرقی اقدار نقد" کے عنوان سے قلم بند کیا۔ اور اس کا شرف بھی ان کے اساتذہ گرامی پروفیسر شہریار اور پروفیسر نورالحسن نقوی کو جاتا ہے۔ عملی تنقید کے میدان میں جو نوجوان کام کر رہے ہیں ان میں ڈاکٹر حسن احمد نظامی، ڈاکٹر صابر سنبھلی، ڈاکٹر محمد ریاض، ڈاکٹر شمس الحق عثمانی، ڈاکٹر ابن کنول، ڈاکٹر محمد شکیل خاں، ڈاکٹر شمع افروز زیدی، ڈاکٹر خالد محمود، ڈاکٹر شہناز انجم، ڈاکٹر جلال انجم، ڈاکٹر طارق چھتاری، ڈاکٹر شاہد حسین، ڈاکٹر رفعت اللہ خاں، ڈاکٹر خالد اشرف، ڈاکٹر ارتفع کریم اور ڈاکٹر خالد علوی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ جو تنقید کے بعض ضابطوں کو اپنا کر اپنے اپنے تنقیدی شعور اور دبستان کی روشنی میں کام کر رہے ہیں۔ ●●

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

کتاب نما کے خصوصی شمارے

(۱) **عابد علی خاں** (شخصیت اور ادبی خدمات)

(۲) **خواجہ احمد فاروقی** (شخصیت اور ادبی خدمات)

(۱) مرتب: مجتبیٰ حسین
(۲) مرتب: خلیق انجم

ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵۔
قیمت: ۲۵/- روپے
مبصر: محبوب الرحمٰن فاروقی۔

کتاب نما کی یہ خاصیت رہی ہے کہ اس نے ہمیشہ زندہ شخصیات پر ایسے مکمل گوشے شائع کیے ہیں جو مصنف کی ذاتی زندگی کے ساتھ اس کے فن کا مکمل احاطہ کر سکیں اور ادب میں اس کی قدر و قیمت کا تعین کر سکیں یہ کتاب نما کے مدیر جناب شاہد علی خاں کی ہمت ہے جس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی کیونکہ جب بڑے بڑے لوگ زندہ شخصیات پر کچھ لکھنے سے گریز کرتے ہیں۔ شاہد صاحب نے نہ جانے کتنی زندہ شخصیات پر خصوصی گوشے شائع کر دیے۔ اور کتاب نما کے خصوصی گوشے کا مطلب ہے کہ ادب کی تاریخ میں اس شاعر، ادیب کی ایک جگہ محفوظ ہو گئی۔ عابد علی خاں پر خصوصی گوشے کی اشاعت کر کے شاہد صاحب نے اس فرض کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے جو اردو کے ایک خادم ہونے کے ناتے ان پر عائد ہوتا تھا۔ ویسے بھی ادبی رسالہ کی ادارت بھی ایک طرح سے صحافت ہی کا حصہ ہے۔ انھوں نے یہ بھی دکھا دیا کہ وہ بند ذہن کے آدمی نہیں بلکہ کتاب نما کے صفحات ہر اس شخص کے

لیے بھی حاضر ہیں جو اردو کا خدمت گار ہو۔

دراصل یہ دونوں خصوصی گوشے اردو کے دو ایسے خادموں سے متعلق ہیں جنھوں نے تقسیم ملک کے بعد الگ الگ میدانوں میں اردو کی خدمت کا بیڑا اٹھایا جب حالات اس حد تک نامساعد تھے کہ اردو کا نام لینا بھی خوف سے خالی نہیں تھا۔ ایک نے صحافت کے ذریعے دوسرے نے تعلیم وتعلم کے ذریعے۔ دونوں شخصیتوں نے اپنی اپنی زندگی اردو کی بے لوث خدمت کے لیے وقف کردی۔ جن کی زندگی کا نصب العین اردو کا فروغ رہا ہے۔ ان دونوں حضرات کی شخصیت تاریخ ساز رہی ہے جن کی زندگی کے جدوجہد کے ہر پہلو سے آزادی کے بعد سے اردو کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی اعلا درجے کے محقق نقاد، صف اول کے انشاپرداز اور مکتوب نگار ہیں۔ وہ طویل عرصے تک ہندستان کی دانش گاہوں میں اردو زبان و ادب کی ترقی و فروغ کی تحریک کے علمبردار رہے۔ بقول ڈاکٹر خلیق انجم اردو نثر میں ان کا مد مقابل مشکل ہے۔ انھوں نے دلی یونی ورسٹی میں اردو کا شعبہ جو پہلے عربی، فارسی اور اردو کا مشترکہ شعبہ رہا ہے۔ اسے ان دونوں زبانوں سے جدا کر کے الگ سے قایم کیا۔ انھوں نے اردو والوں کو عہد جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے کئی نئے کورس شروع کیے۔ ان میں سے ایک سال کا مخطوطہ نویس کا کورس بھی شامل ہے۔ برصغیر کے اعلا تعلیمی اداروں میں دلی یونی ورسٹی کا شعبہ اردو وہ واحد شعبہ ہے جہاں یہ کورس چل رہا ہے۔ انھوں نے اپنے شعبہ میں ترجمہ کا کورس بھی شروع کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے شعبۂ اردو میں تحقیق و طباعت کا ایک سیکشن قایم کیا اور اس کے لیے پروفیسر ضیاء الدین برنی اور جناب رشید حسن خاں جیسے عالموں کی خدمات حاصل کیں۔ خواجہ صاحب نے ہندستان اور یورپ کے کتب خانوں کی خاک چھانی اور خاصی تعداد میں مخطوطات جمع کیے جسے شعبۂ اردو نے شائع کیا۔ انھوں نے ہندستان میں ایسی فضا بنادی کہ تمام یونی ورسٹیاں ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرنے لگیں۔

شمارے میں اداریہ کے بعد خواجہ صاحب کا مکمل سوانحی خاکہ دیا گیا ہے۔ جو پانچ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس خصوصی گوشے میں پروفیسر خلیق احمد نظامی، سید حامد، پروفیسر محمد حسن، عزیز قریشی، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، کمال احمد صدیقی، ڈاکٹر اسلم پرویز، سید ضمیر حسن دہلوی، محمد نفیس حسن، ڈاکٹر آصفہ ربانی، شمیم جہاں، ڈاکٹر خلیق انجم، اور ایم حبیب خاں کے مضامین

شامل ہیں جو خواجہ صاحب کی شخصیت اور خدمات کا مکمل احاطہ کرتے ہیں۔
کتابت طباعت اور خوب صورت جلد سے مزین یہ گوشہ اردو سے محبت رکھنے والے ہر شخص کے لیے قابل مطالعہ ہے۔ اس گوشے کو ڈاکٹر خلیق انجم نے بڑی جانفشانی سے مرتب کیا ہے۔
اسی طرح سے مشہور صحافی جناب عابد علی خاں کی شخصیت اور ادبی خدمات سے متعلق خصوصی شمارہ کو جناب مجتبیٰ حسین نے مرتب کیا ہے۔ اپنے اداریہ میں عابد صاحب کی زندگی اور کارناموں کی تفصیل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔
عابد صاحب اپنے پیچھے اردو صحافت کی ایک ایسی روایت چھوڑ گئے جو اردو صحافت کے لیے ہمیشہ ایک مشعل راہ کا کام دے گی..... عابد صاحب نے نہایت دگرگوں حالات اور بہت معمولی وسائل کے ساتھ اردو صحافت کی عام روش جو انتہا پسندی سنسنی خیزی اور اشتعال انگیزی کی روش تھی سے ہٹ کر ایک غیر جانبدارانہ غیر جذباتی اور معتدل صحافت کی داغ بیل ڈالی۔ اردو کے قاری اس طرح کی صحافت کے عادی نہیں تھے۔ اس نے روزنامہ سیاست کو اپنے قدم جمانے میں کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن عابد صاحب نے ہمت نہیں ہاری اور اردو قارئین کے مزاج کو تبدیل کرنے اور اقلیتوں کے مسائل کو قومی پس منظر میں دیکھنے اور ان کا تجزیہ پیش کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ تعداد اشاعت کے اعتبار سے سیاست اس وقت ملک کا دوسرا بڑا اخبار ہے۔ لیکن صحافت کے معیار کے اعتبار سے یہ برصغیر کا سب سے اہم اخبار ہے..... عابد صاحب کچھ اپنے بارے میں پہلے لکھے گئے مضمون میں جو اس خصوصی شمارے کا پہلا مضمون ہے کہتے ہیں" اردو سے میری والہانہ محبت کو آپ میری مادری زبان ہونے کا سبب قرار دے لیں لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ یہی وہ زبان ہے جس نے ہمارے ملک میں مختلف تہذیبوں کو ملانے اور ان اقدار کو مضبوط بنانے کے عمل میں تیزی پیدا کی اور جس میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ عصری تقاضوں کو بڑی آسانی سے قبول کر سکتی ہے...... اردو مرا ایمان ہے' میرا سرچشمۂ وجدان ہے۔؟... اردو تعلیم کو عام کرنے کے پروگرام پر عمل کرتے ہوئے پرائمری سے ثانوی درجوں ماڈل اسکول اور کوچنگ سینٹروں کے قیام کی جدوجہد میں اپنے دوست احباب کے ساتھ کندھے پر جھولی لٹکائے ہر صاحب خیر سے اردو کے لیے اس کا حق صرف ایک روپیا مانگتا رہا ہوں۔ اس روپیہ سے تعلیمی ٹرسٹ بنایا گیا جس کے منافع سے دو اردو ماڈل اسکول' اردو ہال اور اردو گھر کامیابی سے چلائے جا رہے ہیں۔" ادیبوں کی تخلیقات کی اشاعت اور امداد و اعانت

کے لیے ادبی ٹرسٹ قایم کیا۔

اس خصوصی شمارے میں مجتبیٰ حسین کے علاوہ جناب علی سردار جعفری ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، سید ہاشم علی، خواجہ حسن ثانی نظامی، پروفیسر نثار احمد فاروقی۔ یوسف ناظم، ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب، محبوب حسین جگر، حسن الدین احمد ڈاکٹر سید حمید الدین شرفی، ڈاکٹر انور معظم، کے ناگیشور راؤ، ہاشم سعید، اور سید فاطمہ شجیع کے مضامین شامل ہیں۔ نثار احمد فاروقی اپنے مضمون 'بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی' کے عنوان سے لکھتے ہیں۔ حیدر آباد کو کیا پوری اردو دنیا کو ان جیسا مخلص و فعال شخص اب نہ مل سکے گا۔۔۔

لوگ عابد علی خان کو ادیب یا صحافی کہیں سماجی خدمت گذار یا اردو کا متوالا جانیں یا کسی دوسرے لقب سے پکاریں۔ ان کا وصیت نامہ پڑھنے کے بعد تو میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک 'مرد درویش' تھا۔ جس نے اپنی صفات درویشی پر مختلف پردے ڈال رکھے تھے۔ اس وصیت نامے نے وہ سب پردے اٹھا دیے۔ وہ اپنی زندگی سے یہ ثابت کر گئے کہ:

عبادت بجز خدمت خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

خوب صورت جلد، بہترین کتابت و طباعت سے مزین یہ خصوصی شمارہ بھی اردو کے ہر خادم کے لیے ناگزیر ہے۔ ●●

روحِ غزل

مرتب: پروفیسر مظفر حنفی
صفحات: ۸۰۰
قیمت: تین سو روپے
ناشر: انجمن روح ادب، لیڈر روڈ۔ الہ آباد
مبصر: شجاع خاور

غزل اپنے شاعر سے ایک عجیب و غریب نوع کی جہالت کا مطالبہ کرتی ہے۔ مگر یہ مخصوص جہالت اتنی متناسب مقدار میں ہونی چاہیے کہ شاعر کی تمام تر تخلیقی شخصیت کے اجزا لیے ترکیبی میں محض ایک جز کے طور پر کار فرما رہے اور اس کے علم و آگہی سے ہم آہنگ ہو۔ علم اور جہالت کے مابین اگر یہ آہنگ اور تناسب درکار نہ ہو تو پھر تو غزل گو جتنا جاہل (یا جتنا عالم) ہو اتنا ہی بھاری غزل گو ہو جائے، مگر ایسا ہوتا نہیں۔ مطلوبہ جہالت کو مناسب

مقدار مکتبی علم کے تخلیق رد اور ضد سے پیدا ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ غزل اپنے شاعر میں علم اور جہل کی کارگذاری بیک وقت چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ناموزوں طبع اور نیم خواندہ یا ناخواندہ لوگ بڑے غزل گو نہیں ہوپاتے، وہاں ہماری بھرکم علماء عروضیے دانشور اور پروفیسران محض دانشوری کے بل پر جان دار اور شان دار غزل نہیں کہہ سکتے۔

دس، بیس، سو، پچاس نہیں پورے چھ سو ترانوے (۶۹۳) افراد کی غزلیں (ان افراد میں بیشتر شاعر ہیں) اور ہر ایک کی کم از کم تین اور زیادہ سے زیادہ چھ غزلیں، نتیجہ سات سو باسٹھ صفحات پر سوا دو ہزار سے زائد غزلیں۔ لہٰذا "روحِ غـزل" ضخامت میں بھی خوب ہے۔ خاصی موٹی تازی کتاب ہے۔

غزل کے نام پر اچھے برے انتخاب تو متعدد شائع ہوئے ہیں جن میں مرتبین اور مفسرین نے منتخب غزلوں کے ساتھ غزل پر اپنی فلسفہ طرازی بھی شامل فرمائی ہے۔ مگر ان میں شاید کوئی ایسا نہ تھا جو غزل کے حوالے سے کردار کا بھی ایسا غازی ہو جیسے "روحِ غزل" کے مرتب، مظفر حنفی۔ اس انتخاب کو اپنے معیار کو منوانے کے لیے مزید کسی ثبوت کی کیا ضرورت۔

ظاہر ہے کہ عملی مجبوریوں کے تحت مرتب نے مشمول شعرا کے غزلیہ قد کے پیش نظر ایک تو ان شعرا کی غزلوں کی تعداد طے کی کہ کس کی تین اور کس کی چھ اور پھر یہ مسئلہ تو آیا ہی کہ کس کی کون کون سی غزلیں۔ اوپر سے یہ کہ معینہ وقت کی حدود میں (الہ آباد کی انجمن روحِ ادب نے دسمبر ۹۲ء میں اپنا پچاس سالہ جشن، بانیٔ انجمن سر تیج بہادر سپرو کے حوالے سے منایا اور اس موقع سے صرف چار پانچ ماہ قبل مظفر حنفی نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا) مطلوبہ غزلوں کی دستیابی۔ ان تمام شرائط کو جھیلنے کے بعد مظفر حنفی اس دشوار کام میں ویسی ہی صفائی سے عہدہ برآ ہوئے ہیں جس صفائی سے وہ شعر موزوں کرتے ہیں۔

مرتب کا مقدمہ خاص طور سے قابلِ داد ہے۔ یوں کہ بارہ صفحات کے اختصار میں انھوں نے غزل کی گویا "اوڈیسی" ODYSSEY رقم کر دی ہے۔ ظاہر ہے کہ ضخامتی حدود کے جبر میں یہ حکایت اجمالی ہی ہو سکتی تھی، سو ہے۔ صدہا برس کو محیط غزل کے ٹیڑھے سیدھے راستوں کا اتنا سیدھا بیان (سیدھا سادہ نہیں) سب نہیں کر سکتے۔ قابلِ داد یہ بات بھی ہے کہ اس مقدمے میں غزل کو مظفر حنفی نے مرتب مظفر حنفی کو مقدم رکھا ہے۔ یعنی بحیثیت مرتب ایک ایماندار ادبی مورخ کی طرح وہ اپنے آپ کو یہ کہتا

ہوا بھی پاتے ہیں کہ

"غزل میں ہم ویسی کھلی ڈھلی بے تکلف زبان استعمال نہیں کر سکتے۔ جیسی کہ دوستوں کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے استعمال کرتے ہیں۔ یہاں غزل کو انتہائی سبک شیریں، لطیف نرم اور نازک الفاظ ویسی متانت اور شائستگی کے ساتھ ساتھ برتنے پر مجبور ہوتے ہیں جیسی کہ خواتین کے ساتھ گفتگو کے دوران مہذب مرد استعمال کرتے ہیں...... غزل کے مخصوص مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے نرم و سبک الفاظ کے ساتھ لہجے کی اس شائستگی پر بھی زور دیا گیا جس پر ضرورت سے زیادہ اصرار نے آگے چل کر انفعالیت کی شکل اختیار کر لی۔"

ص ۲۲۔ (یہ خط کشی میری طرف سے ہے)

جی تو چاہتا ہے کہ یہ شعر نقل کروں کہ ؎

ہم نے غزل میں اس کے سوا سب سے بات کی

اب اس کو آپ کچھ بھی کہیں اصطلاح میں

مگر چھوڑیے نہیں کرتا کہ یہ شعر نقل کرنے پر خود نمائی کا الزام لگ سکتا ہے۔ جب کہ بات مظفر حنفی اور روحِ غزل کی ہی ہے۔

داغ کے شاگرد ہونے کے حوالے سے اقبال کی غزل کی لفظیات اور اپنی پیامیہ شاعری کی خدمت گزاری کے لیے اقبال کا ان لفظیات کو تیار کرنا، یہ خاص نئی باتیں ہیں جو مظفر حنفی مقدمے میں کہہ گزرے ہیں؛ دونوں باتیں غور طلب ہیں۔

ایک جملۂ معترضہ میں مظفر حنفی جس طرح شاد عارفی اور یگانہ کو (بشمول فراق) ایک طور سے جدیدیت کے معنوی پیش رو بتاتے ہوئے آگے بڑھ گئے ہیں وہ دلچسپ بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ جدیدیت کا یہ شجرہ میں نے جدیدیوں کی زبان پر کبھی نہیں پایا۔

ظاہر ہے کہ ایسے طویل و عریض ترتیبی اور تدوینی کام میں بہت سی باتیں بحث طلب آسکتی ہیں۔ جو "روحِ غزل" میں بھی در آئی ہیں۔ مثلاً ادوار کی جو تقسیم مرتب نے کی ہے اس پر دو کیا کئی آرار قائم ہو سکتے ہیں۔ کوئی کہے گا کہ فلاں شاعر اس دور کے بجائے اس دور کی فہرست میں ہونا چاہیے تھا، کوئی کہے گا کہ فلاں شاعر ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔ کسی کو لگے گا کہ فلاں کی تین غزلیں بھی زیادہ ہیں۔ اور فلاں کی چھے بھی کم ہیں۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔ اس ترتیب کی جامعیت اور مرتب کی فراخ دلی کے ثبوت میں ایسے

کئی شعراء کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں جن کا غزل کا وجود اس کتاب سے باہر یا تو برائے نام رہا ہے یا ہے ہی نہیں۔ اس میں کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے کہ "روح غزل" ایک بے حد جامع اور مستند ترتیب ہے۔ جو گذشتہ نصف صدی کی غزل پر دستاویزی اعتبار رکھتی ہے۔ اس لیے بھی کہ مظفر حنفی خود غزل کے ایک چوکس اور تندرست شاعر ہیں۔ اتنے طویل انتخاب میں کچھ بُرے شاعروں کی اچھی غزلیں نیز کچھ اچھے شاعروں کی بری غزلیں بھی در آئی ہیں۔ مگر ایسے منظر کا بھی اپنا ایک الگ مزہ ہوتا ہے۔

مرتب مقدمے کے آخر میں معذرت خواں ہیں کہ مرحومین کے بارے میں مرتب کو محض اپنی پسند سے کام لینا پڑا اور یہ طریقہ ان غزل گویوں کے تئیں بھی اختیار کیا گیا جن کی غزلیں انھیں شعراء کی طرف سے دستیاب نہ ہو سکیں۔ اس سلسلے میں کچھ شعراء کی غزلوں کو پڑھ کر دل تو یہ کہتا ہے کہ کاش مرتب کو ان کی غزلیں دستیاب ہی نہ ہوئی ہوتیں!

مجھے جو کام بالکل نہیں آتے ان میں تبصرہ نویسی بھی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اب تک کی اپنی پوری تیس سالہ ادبی زندگی میں یہ دوسرا تبصرہ رقم کر رہا ہوں۔ (پہلے ۱۹۶۷ء میں عنوان چشتی کے پہلے شعری مجموعے "ذوقِ جمال" پر ماہنامہ "عارض" دہلی میں تبصرہ کیا تھا اور اب چھبیس ۲۶ سال بعد یہ دوسرا تبصرہ ہے کسی کتاب پر) زندگی رہی تو چھبیس تیس ۳۰ سال بعد پھر کسی کتاب پر تبصرہ کروں گا۔

روح غزل میں شعراء کی بامعنی تقدیم و تاخیر سے بچنے کے لیے مظفر حنفی نے بھی الفبائی ترتیب کے سفارت کارانہ تدبّر (یا تحفظ؟) کا سہارا لیا ہے۔ جس سے ذرا مایوسی ہوئی۔ یوں کہ کسی ایرے غیرے اور نابینا مرتب کے لیے تو ٹھیک تھا مگر مظفر حنفی جیسے صاف گو پر نہیں جچتا۔ غیر الفبائی ترتیب دشوار تو تھی مگر ہونی ضرور چاہیے تھی۔ کم از کم اتنا تو ہو ہی سکتا تھا کہ مرتب (اپنے تئیں) ایک معیار و مقام کے دس دس پندرہ پندرہ شعرا کو دور بہ دور ایک بامعنی غیر الفبائی ترتیب میں پروتے۔ الفبائی ترتیب کو تصویر و تعین کے معاملات کو بند رکھتی ہے۔ انھیں کھولتی نہیں۔ ہاں ایسی ترتیب خود غزل کے لہجے کی روایتی نرمی اور شائستہ گفتاری سے ضرور میل کھاتی ہے۔ مگر پھر وہ مظفر حنفی خود الفبائی ترتیب سے میل نہیں کھاتا جن کا ایک شعر یوں ہے ۔

غزل کی روایات اپنی جگہ
ہماری کھری بات اپنی جگہ ●●

انتون چیخوف کے شاہکار ڈرامے

ترجمہ و تعارف: پروفیسر زاہدہ زیدی
ناشر: ترقی اردو بورڈ دہلی
قیمت: ۹۵ روپے۔
مبصر: صغرا مہدی

چیخوف ان افسانہ نگاروں میں ہیں جن کا نام ہندستان کے خاص طور سے اردو کے قارئین کے لیے تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اور اردو افسانہ نگاروں نے ان کا گہرا اثر بھی قبول کیا ہے۔ مگر ڈراما نگار کی حیثیت سے پہلی مرتبہ تفصیل اور تنقیدی تجزیہ کے ساتھ زاہدہ زیدی نے انتون چیخوف کے "شاہکار ڈرامے" میں انھیں پیش کیا ہے۔

زاہدہ زیدی اردو اور انگریزی کی مستند شاعرہ ہیں۔ جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے جدید موضوعات اور اسالیب شاعری کو عام کیا ہے۔ مگر ان کا اصل میدان ڈراما ہے۔ انھوں نے ڈرامائی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اور بہترین تھیٹرز دیکھے ہیں۔ خود ڈرامے لکھے ہیں اور ڈراموں کے تراجم کیے ہیں۔

زاہدہ زیدی کا کہنا ہے کہ "چیخوف" کا یہ فنی کارنامہ (ڈراما نگاری) زیادہ اہم اور تاریخ ساز ہے۔ کیونکہ چیخوف نہ صرف ایک منفرد معنی خیز اور شاعرانہ ڈرامائی اسلوب کے خالق ہیں بلکہ ڈرامے کی دنیا میں ایک خاموش انقلاب کے بانی ہیں۔ اور دوررس تبدیلیوں کے نقیب بھی۔ انھوں نے نہ صرف ڈرامے کے فورم کو روایتی تصورات، مصنوعی رسمیات سے پاک کیا ہے بلکہ اسے فطری رنگ و روپ عطا کیا ہے۔

چیخوف کی ڈراما نگاری جدید ڈرامے کے ارتقا کی ایک اہم کڑی ہے۔ جس نے کئی نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ آج بھی ایبسرڈ (ABSURD) ڈراما نگار انھیں اپنا رہنما مانتے ہیں۔

زیر نظر مجموعے میں زاہدہ زیدی نے چیخوف کے تین ڈراموں حبیب ماموں (انکل وریینا) تین بہنیں (THREE SISTERS) اور چیری کا باغ CHERY ORCHARD کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ تعارف میں چیخوف کے مجموعی فن ڈراما نگاری اور الگ الگ ڈراموں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے ترجمے میں نہایت کاوش سے کام لیا ہے جن انگریزی ڈراموں

ہے یہ ترجمہ اردو میں کیا گیا ہے " وہ کس حد تک مستند ہیں۔ انھوں نے خوب چھان بین کی اور روسی جاننے والے لوگوں سے اس کی تصدیق کروائی کہ یہ ترجمے اصل سے بہت قریب ہیں۔ زاہدہ زیدی نے یہ ترجمہ اسی طرح کیا ہے اس میں اصلیت کے ساتھ نفاست اور سلاست ہے اور فنکار کی عظمت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

ان تینوں ڈراموں میں الگ الگ تھیم اور اسلوب نگارش کے ساتھ ساتھ چند مشترک خصوصیات بھی ہیں۔ جن کو زاہدہ زیدی نے بخوبی اجاگر کیا ہے۔ ان تینوں ڈراموں میں زندگی کی اور عمل کی سست روی اور جمود ہے وہ اپنے اندر گہرے جذبات اور ذہنی ارتعاشات پوشیدہ رکھتا ہے۔ جیسے انھوں نے (مترجم نے) " اندرونی ایکشن " کہا ہے۔ اور یہ اندرونی ایکشن زمانے کے ساتھ ' ایک ٹوٹتے سماج کے ساتھ ' زندگی کے ڈھلتے ہوئے سایوں کے ساتھ ' ناکام محبتوں اور آرزوؤں کے ساتھ اس طرح بندھی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ کہ " گہری آفاقی بصیرتوں سے پردہ اٹھ جاتا ہے۔

زاہدہ زیدی انگریزی ادب کی استاد رہی ہیں۔ ان کا انگریزی ادب کا مطالعہ گہرا ہے۔ اس ترجمے اور ڈرامے کی تشریح و وضاحت یا تجزیے میں انھوں نے انگریزی سے گہری شناسائی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ مثلاً تین بہنیں " میں آخری ایکٹ میں پت جھڑ یا خزاں کو صرف جدائی کا موسم نہیں کہا بلکہ انگریزی شاعر KEATS کی طرح انھوں نے اس موسم کو پھلوں کے پکنے اور رس بھرنے کا موسم بھی کہا ہے اور اس طرح یہ تینوں بہنیں غم واندوہ کی آنچ میں تپنے کے بعد شعور کی پختگی اور احساس کی توانائی کی منزل میں قدم رکھ رہی ہیں۔

اس سے پہلے بھی ممکن ہے کہ اردو میں چیخوف کے ڈراموں کا ترجمہ ہوا ہو۔ مگر انتون چیخوف کے شاہکار ڈرامے اپنی نوعیت کی ایک الگ کتاب ہے۔ اس میں زاہدہ زیدی نے چیخوف کی ڈراما نگاری کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اور ان کے نزدیک یہ تین ڈرامے اس کے شاہکار ڈرامے ہیں۔ اور مفصل طور پر عالمانہ انداز میں انھوں نے الگ الگ ان ڈراموں کی خصوصیات ' ان کی معنوی تہہ داری اور علامات کو بہت خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ ان ڈراموں کی فطرت نگاری' تاثراتی اظہار اور علامتی اظہار کے عناصر نے کس طرح ایک دوسرے میں تحلیل ہو کر سادہ اور پرکار ڈرامائی اسلوب کی تخلیق کی ہے اس کو زاہدہ زیدی نے بہت خوبی سے پیش کیا ہے۔ اسی کے ساتھ اس طرف بھی بار بار لوگوں کی

توجہ دلائی ہے کہ چیخوف کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے زندگی کے روزمرہ کے واقعات کے سہارے عالمگیر انسانی کیفیات کو معنی خیز گہرائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کیونکہ ان کا کہنا تھا "کہ زندگی کا تانا بانا تو معمولی روزمرہ واقعات ہیں۔ جن کی زیریں تہوں میں اکثر غیر معمولی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ اس لیے ڈرامے کو غیر معمولی بصیرتوں کی ترسیل کے لیے بھی ان ہی معمولی تفصیلات کا سہارا لینا چاہیے۔"

زاہدہ زیدی کو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر عبور ہے۔ اس لیے وہ ترجمے کے دشوار گذار راستے سے بہت خوبی سے گزری ہیں اور اس کا حق اس طرح ادا کیا ہے کہ اس کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ ترجمہ نہیں ہے بلکہ یہ ڈرامے اردو ہی میں لکھے گئے ہیں۔ سوائے اس کے کہ 'حبیب ماموں' جو ایک آزاد ترجمہ ہے اور اس کی فضا اور نام ہندستانی ہے' اتنا کامیاب نہیں ہے جتنے اور دو ڈرامے ہیں۔ خاص طور سے 'تین بہنیں'، تو ان کا سب سے مقبول ڈراما ہے۔ 'چیری کا باغ' ہے' مگر 'تین بہنیں'، بہت خوب صورت اور تہہ دار ڈراما ہے۔

انتون چیخوف کے شاہکار ڈرامے" ایک اہم کتاب ہے۔ ادب کے شائقین خاص طور سے وہ لوگ جو فنِ ڈراما نگاری سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کو یہ کتاب ضرور پڑھنا چاہیے۔ اسے اہم لائبریریوں میں بھی ہونا چاہیے۔ اور ہمیں زاہدہ زیدی کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے روس کے اس مشہور ڈراما نگار کے فن سے روشناس کرایا۔

شاخِ گُل

مصنف : رفعت سروش
ناشر : لونگ کتاب گھر نئی دہلی ۔ ۱۱
ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
مبصر : پروفیسر عبدالقوی دسنوی
قیمت : ۲۰/- روپے

رفعت سروش کی تازہ کتاب " شاخِ گل" نے متاثر کیا۔ ٹائٹل پُرکشش کتابت طباعت، کاغذ سب نفیس۔ شروع سے آخر تک پڑھتا گیا۔

یہ شاعری پاکیزہ احساسات اور جذبات میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کتاب میں جہاں ادھر ادھر شاعر کے بیتے دنوں کی یادوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہاں حالات، واقعات اور شب و روز کے تجربوں سے بھی واقفیت ہوتی ہے کلام میں بھرے ہوئے دریا کی آہستہ خرامی' سنجیدگی اور اس کی موجوں کی

دھیمی گنگناہٹ محسوس ہوتی ہے۔ اظہار کی سادگی اور سچائی سے کلام میں اثر و تاثیر کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قاری شاعر کے جذبات اور احساسات میں ڈوب جاتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ اس کی اپنی روداد زندگی ہے۔ "

بڑی ٹھنڈک ہے ماضی کی حسین یادوں کے شعلوں میں

یہ اشعار دل کو چھوتے ہیں۔ اور ماضی کے شب و روز کے احساسات اور واقعات کے قریب سے گزارتے ہیں:

یہ درد جو ہم دم ہے میرا
اس درد کی شکلیں ہیں کتنی
ناداری، بھوک، اور بیکاری
نفرت، بے مہری، اعزا کی
مخلص احباب کی عیاری
ناقدری فن، توہین ہنر
ارباب نظر کی مکاری
کیا کیا شکلیں دیکھیں میں نے
اس درد کی، جو ہم دم ہے مرا
ہے تار نفس کا ہم رشتہ"

"نوبہ نو زندگی" کے یہ اشعار بھی کیا کچھ نہیں کہتے ہیں:

" لوریاں دے کے سلاتی تھی مجھے
گدگداتی تھی ہنساتی تھی مجھے
ان منا ہوتا تھا جب وہ مجھے بہلاتی تھی
وہ میری انگلی پکڑ کر مجھے ٹہلاتی تھی
زندگی میرے رگ و ریشے میں پیوست ہوئی "

بے اختیار منہ سے نکل گیا " دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو " "پکارتی ہے مجھے میری گم شدہ آواز" کے اس طرح کے اشعار:

" مجھے قبول تن آسان زندگی کے لیے
میں خود اسیر ہوا مصلحت کے زنداں میں
پکارتی رہیں گلشن کی شورشیں مجھ کو
مگر میں بند رہا دفتروں کے ایواں میں

کیا ہے قتل خود اپنے ضمیر کو میں نے
وہ میں ہوں کہ جس نے کہ ہر لمحہ خودکشی کی ہے
رگ گلو سے ٹپکتا رہا لہو برسوں
وہ میں ہوں جس نے کہ مر مر کے زندگی کی ہے "

زندگی کی حقیقتوں کا پردہ چاک کرتے ہیں اور غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔
"ضرورت" کے یہ اشعار، ماضی کی تر و تازہ اور شگفتہ زندگی کی یاد تازہ کرتے ہیں اور حال کی بے کیفی کے قریب لاکر کھڑا کر دیتے ہیں :

" نہ اضطراب، نہ ہلچل، نہ شعلہ سامانی
مگر یہ کیسے کہوں زندگی سے ہوں بیزار
عجیب موڑ پہ لے آئی زندگی مجھ کو
کہ دورِ حدِ نظر تک ہے بے حسی کا غبار "

" ایک لینڈ اسکیپ " کے ان اشعار میں حال کی غم انگیز کہانیاں سنائی دیتی ہیں :

مگر یہ کیا گھنے جنگل میں یہ کیسے درندے ہیں
نظر آتے ہیں جو اک دوسرے کے خون کے پیاسے
یہ ہیں اک نسل کے اور ایک ہی جنگل کے پروردہ
شکاری ہے کوئی، تو ان کو اکساتا ہے چھپ چھپ کے
تماشہ دیکھتا ہے ان کے لڑنے اور جھگڑنے کا
پسِ پردہ وہ رہ رہ کے پھینکتا ہے جال نفرت کا

اور حرف حرف یہ سچ ہے :

مگر نفرت کی وادی کو محبت کی ضرورت ہے۔

لیکن سچ پر آج کون یقین کرتا ہے آج تو جھوٹ کی حکمرانی ہے۔ جو جتنا زیادہ جھوٹ بولتا ہے۔ اتنا ہی وہ بڑا آدمی سمجھا جاتا ہے۔ اس کی جھوٹ پر لوگ واہ وا کرتے ہیں۔ اور "سچ" پر مسکراتے ہیں۔

"میزان" بھی اچھی نظم ہے اس کی ابتدا ایک خاص انداز سے ہوئی ہے اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے :

" تم تو ساقی ہو
مگر ہے میکدے کا یہ نظام
تشنہ لب میخوار ہیں سب، چند رندوں کے سوا

میکدے میں تو نہ تھا پہلے چلن تفریق کا
تم نے کیا چیز پلادی اپنے میخواروں کو آج
جو گلے ملتے تھے باہم ان کا برہم ہے مزاج
ایسی مے پی ہے کہ پیاسے ہوگئے ہیں خون کے۔

اس نظم کے آخری حصے میں تلخ سچائی ہے اور زہرناکی ہے جو تڑپادیتی ہے:
"تم مسیحا ہو
مگر یہ ہے مسیحائی کی شان!!
دے رہے ہو زہر ہر بیمار کو
ایک دوا کا ذکر کیا
آج تو انسانیت بیمار ہے
ہر بشر لاچار ہے
زندگی آزار ہے۔
اس مسیحائی کے قربان
گرم ہر سو موت کا بازار ہے
تم ہو ساقی، تم ہو رہبر، تم مسیحا ہو مگر
گر یہی تم ہو تو لو اپنی خبر
کل تمھاری زندگی میں وہ بھی لمحے آئیں گے
وقت کی میزان میں اعمال تولے جائیں گے۔"

ادھر یہ نظم اختتام کو پہنچی ادھر روتا ہوا، غم زدہ ہندستان، بے رونق چہرے کے ساتھ سامنے آکھڑا ہوا، گویا کہہ رہا ہو:
نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندستاں والو

"دھوڑی کے جوتے" میں واقعی "گئے زمانوں کی خوشبو ہے" بار بار یہ نظم پڑھی اور ماضی میں کھوتا چلا گیا۔ گاؤں کے لوگ، ان کی سیدھی سچی زندگی ان کی کھدری محبت، بہت یاد آئی اور تڑپاتی چلی گئی۔

"طواف کعبہ" اور "پہلا سجدہ" پڑھ کر آنکھیں نم ہوگئیں۔ سر عقیدت سے جھک گیا۔ دیر تک یہ کیفیت رہی۔ "پہلا سجدہ" کا آخری حصہ تو کئی بار پڑھنے پر مجبور ہوا:

"محسوس یہ ہوا کہ کوئی اور ہے جسے
میرے وجود میری بقا پر ہے اختیار
میں کیا ہوں ایک ذرۂ ناچیز بے وقار

مختار کل کی ہیبت و عظمت کے سامنے
گردن جھکائی عجز سے، سجدے میں گر پڑا "

"دیوار" کے آخری حصے پر جب پہنچا اور نگاہ اس شعر پر رکی:

دھیرے دھیرے یادیں بھی اس کی
وقت کی رو میں بہہ جائے گی

تو خیال آیا کہ آج کی تو نئی داستانیں، ظلم وستم کی وارداتیں، ہٹ دھرمیاں اور ناانصافیاں سب ہی آہستہ آہستہ حقیقت کے ڈھانچے سے نکل کر دیو اد پریوں کی کہانیوں کی طرح کچھ دنوں سنی جائیں گی اور پھر ذہنوں سے نکل کر فضا میں تحلیل ہو جائیں گی۔ اور پھر نئے زخم لگائے جائیں گے۔ نئی آہیں اور کراہیں فضا میں گونجیں گی۔ نئے جلاد تلوار تیز کرتے رہیں گے۔ اور درد اور کرب میں ڈوبی ہوئی کہانیاں پھر سنی جائیں گی۔ اور پھر ذہنوں سے سب محو ہو جائیں گی۔

اس کتاب میں شامل غزلیں بھی خوب ہیں۔ ان میں حال کے درد و کرب اور بے چارگی کی جھلکیاں ادھر ادھر دکھائی دیں۔ مطالعہ کے دوران یہ اشعار بہت کچھ کہتے رہے اور غمزدہ کرتے گئے:

شہر جسے سمجھتے تھے کل تک، جنگل ہے انسانوں کا
گلی گلی میں اب ہوتا ہے ناچ یہاں شیطانوں کا

آدمی کی جنت پر شیطنیت نے کی یلغار
اور بند کمروں میں پڑھ رہے ہیں ہم اخبار

ہر شہر پر مقتل کا گماں ہوتا ہے مجھ کو
ہر ہاتھ میں شمشیر و تبر دیکھ رہا ہوں

خود بھائی سے ہے بھائی یہاں دست و گریباں
اربابِ سیاست کا ہنر دیکھ رہا ہوں

ابھی ہے وقت کہ ہم دشمنی سے باز آئیں
ابھی تو ذہن میں ہے دوستی کا ہر لمحہ "

مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت

مصنف :- ابوالکلام قاسمی
مبصر :- سہیل احمد فاروقی
قیمت :- سو روپے
تقسیم کار :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

جیسا کہ پیش لفظ میں اردو کے حوالے سے مشرقی شعریات کے تصوری وضاحت کرتے ہوئے ابوالکلام قاسمی نے اشارہ کیا ہے، عربی اور فارسی علماء شعر کے تصورات کی روشنی میں اردو کے تذکرہ نگاروں، شاعروں اور نسبتاً پرانے نقادوں کے معیار کے سیاق و سباق کو سامنے لانے کی ضرورت کے پس پشت مغربی اثرات کی بالا دستی کا احساس کار فرما ہے اور یہی احساس اس کتاب کی تصنیف کا محرک بنا ہے۔ قاسمی صاحب نے عربی شعریات کی روایت کے تحت مختلف ادوار میں ادبی تنقید کا جائزہ لیتے ہوئے معتبر ادیبوں مثلاً ابن قتیبہ، الجرجانی، داؤد سلوم اور ڈاکٹر سید عبداللہ کی تحریروں کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ راست روی، راست فکری اور کردار و گفتار کی مماثلت پیش کرنے والی شاعری اسلام کی نظر میں مقبول و مستحسن قرار پاتی ہے۔ یہاں اُن کی وضاحت بھی برمحل ہے کہ اگرچہ اخلاقی قدغنوں کی تیاری پر اس دور میں عہد جاہلیت کے مقابلے میں شاعری زوال آمادہ تھی لیکن یہ انحطاط پذیری اس دور کی تنقیدی شعور سے محرومی پر ہرگز دلالت نہیں کرتی۔ اُن کے اس تجزیے سے بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ عربی کی تنقیدی روایت میں دورِ جاہلیت سے لے کر عباسی دور تک کے ناقدوں کے نزدیک لفظ و معنی میں سے ایک کی دوسرے پر ترجیح اور افضلیت کے موضوع کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔

فارسی شعریات کی روایت کے باب میں مصنف نے امیر کیکاؤس بن اسکندر بن قابوس، نظامی عروضی، رشید الدین وطواط اور محمد عوفی کے ساتھ ساتھ فارسی تنقید میں شمس الدین محمد بن قیس رازی اور اصغر علی روحی کے افکار کے حوالے سے شاعری کے تئیں ان کے ذہنی رویوں اور ان پر عربی شعریات کی روایت کے اثرات کی نشاندہی کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عربی و فارسی میں ادبی تنقید کی روایت منزل بہ منزل متقدمین سے کسب فیض کرتے، اور حال کی اقدار سے خود کو ہم آہنگ کرتے ہوئے مقابلتاً واضح شکلیں اختیار کرتی جاتی ہے۔

مشرقی شعریات اور شعرائے اردو" کے باب میں جو اردو تنقید کی روایت کے پہلے دور پر محیط ہے عربی کی "طبقات الشعراء" اور "الشعر و الشعراء" اور فارسی کی "لب الالباب" کے تناظر میں لکھے گئے اہم اردو تذکروں کا

جائزہ پیش کرنے کے علاوہ اُن کے بارے میں معروف ناقدین کی آرا سے بھی بحث کی گئی ہے۔ یہاں مصنف نے اس پہلو کی طرف بجا طور پر اشارہ کیا ہے مذکورہ بالا تذکروں میں استعمال ہونے والے متعدد الفاظ، اصطلاحیں اور صنعتیں ایسی ہیں جن کے معنی و مفہوم کے تعین کی ضرورت ہے کیونکہ یہ اصطلاحات صرف تراکیب لفظی اور حسنِ بیان کا نمونہ ہی نہیں بلکہ مشرقی شعریات سے اُن کا بہت گہرا تعلق ہے۔ مشرقی شعریات کے تناظر میں شعراء اردو کے تنقیدی شعور کے آثار کی تلاش کے ضمن میں مصنف نے سب سے پہلے اُن شعراء کا ذکر کیا ہے جن کے مجموعۂ کلام کے دیباچے، مقدمہ یا خطبہ سے اُن کے نظریۂ شعر کا اظہار ہوتا ہے جیسے فائز دہلوی اور مرزا محمد رفیع سودا اور دونوں کے تفصیلی تجزیہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ فائز نے "خطبۂ کلیات"، میں وہی مباحث اٹھائے ہیں جو عہدِ عباسی میں عربی تنقید کا طرۂ امتیاز تھے نیز یہ کہ اُن کا نظریۂ شعر اخلاقی اصول پر مبنی ہے جبکہ سودا تاثیر شعر کو مرکزی اہمیت دیتے ہیں۔ اور یہی تصور نظامی عروضی اور دوسرے قدیم فارسی تنقید نگاروں میں مشترک ہے۔

اردو تنقید کے دوسرے یعنی روایتی دور میں جب تنقیدی روایت محمد حسن آزاد کے توسط سے الطاف حسین حالی، اور شبلی نعمانی جیسے قدیم نقادوں تک پہنچتی ہے، حالی اور شبلی کے علاوہ اُن نقادوں کے افکار سے تفصیلی بحث کی گئی ہے جن کی تنقید اپنے مزاج اور رویے کے اعتبار سے مغرب کے تصوراتِ شعر سے زیادہ عربی اور فارسی کی روایت پر قائم ہے۔ کلیم الدین احمد جو محمد حسین آزاد اور حالی و شبلی کو مغرب کے ادبی تصورات سے اثر پذیری کے اپنے خود ساختہ معیار و اصول پر پرکھے بغیر سند قبول نہیں بخشتے (اور زیادہ تر تو مسترد ہی کر دیتے ہیں) اور جا بجا اپنی تضاد بیانی کے دام میں آجاتے ہیں اُن کے اعتراضات کا جواب بھی قاسمی صاحب نے ٹھوس دلائل سے دیا ہے۔

عربی اور فارسی کے اصل مآخذ تک رسائی، مغربی تصورات نقد سے پوری واقفیت اور جدید اردو تنقید کے پس منظر پر گہری نگاہ کے ساتھ قاسمی نے اردو تنقید کی روایت میں مشرقی شعریات کی مساہمت، کو جامع انداز میں اجاگر کیا ہے۔ اسے اپنی نوعیت کی ایسی پہلی کامیاب کوشش سے بجا طور پر تعبیر کیا جا سکتا ہے جو اردو تنقید میں ایک بڑے خلا کو پُر کرتی ہے۔

اڈیٹر کتاب نما کے نام

کھلے خطوط

(مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

● میں نے جناب ابن فرید کا مقالہ "سابلین اردو" بڑی دلچسپی سے پڑھا جو اپریل ۱۹۹۳ء کے "کتاب نما" میں شائع ہوا ہے۔ جناب ابن فرید نے بڑے مسکت ڈھنگ سے اردو کے مسئلے پر بحث کی ہے اور بڑی دل سوزی سے چند بڑے معرکے کی باتیں، اردو کے سلسلے میں لکھی ہیں۔ اس میں سے بعض باتیں بار ہا پہلے کہی جا چکی ہیں۔ کچھ اب بھی برابر کہی جاتی رہتی ہیں۔ کچھ باتیں ہیں جیسے اردو کے دوست اور دشمن بھی بار بار دہراتے رہے ہیں اور آج بھی دہراتے رہتے ہیں مثلاً یہ کہ اردو، ہندو مسلم اتحاد کی زبان ہے۔ اردو ایک گنگا جمنی تہذیب کی نشانی ہے۔ اردو، ہندی کی فوقیت کو چیلنج نہیں کرتی۔ اردو صرف اپنی ترویج اور زندہ رہنے کا حق مانگتی ہے۔ "اردو، ہندی کی رقیب نہیں، ہندی کی بہن ہے" (مولانا آزاد کی آخری تقریر فروری ۱۹۵۸ء) "اردو بڑی اچھی اور میٹھی زبان ہے۔ ہم تو کوشش کر رہے ہیں کہ پہاڑی زبانیں بھی زندہ رہیں پھر اردو کیوں نہیں۔ وہ تو ایک بڑی زبان ہے (پنڈت جواہر لال نہرو۔ فروری ۱۹۵۸ء بر سر پریڈ گراؤنڈ جلسہ انجمن ترقی اردو) سر تیج بہادر سپرو نے ۱۹۴۱ء کے ایک خطبے میں کہا کہ "میں اس زبان (اردو) کو ایک موروثی اور مشترک سرمایہ سمجھتا ہوں جس کے مالک و شریک و سہیم، ہندو و مسلمان دونوں بقدر برابر ہیں۔ اگر یہ میرا خیال صحیح ہے تو دونوں کا فرض ہے کہ اس سرمایہ کو تباہ ہونے سے محفوظ رکھیں۔ نہ صرف محفوظ رکھیں بلکہ اس کی ترقی اور اضافہ میں کوشش کریں۔ میرے خیال میں یہ غیر ممکن ہے کہ اب مسلمان بہ حیثیت مجموعی، اردو کو چھوڑ کر، فارسی یا عربی کو اپنی زبان بنالیں اور اسی طرح یہ بھی غیر ممکن ہے کہ ہندو، ہو اس مشترک زبان کو چھوڑ کر سنسکرت یا پراکرت بولنے یا لکھنے لگیں . . . . علاوہ بریں میں اس زبان (اردو) کو رشتۂ اتحاد و ارتباط سمجھتا ہوں۔ اگر یہ رشتہ ٹوٹ گیا تو وہ تہذیب و تمدن جس کے پرورش و فروغ میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے یکساں حصہ لیا ہے، مٹ جائے گی۔" (خطبۂ صدارت، انجمن روح ادب الہ آباد، افتتاحی اجلاس منعقدہ زمیندار اسوسی ایشن ہال الہ آباد، ۲۱ دسمبر ۱۹۴۱ء) اسی طرح کے اور قول بہت سے بحثیں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مگر حالات، اس قدر بگڑ چکے ہیں کہ ان باتوں کی یاد دہانیوں سے، میرا خیال ہے کہ اردو کی تعلیم و تدریس کے لیے حکومت کی طرف سے کسی واقعی رعایت کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ حکومت بے حد ہوشیاری سے، سنبھل سنبھل کر، اردو کے مسئلے کو شروع ہی سے برت (DEAL) کر رہی ہے۔ جو بھی حکومت آتی ہے، چاہے، دوسری باتوں کے لیے، اپنا رویہ بدل لے، مگر اردو کے لیے اپنی پالیسی بدلنے کو تیار نہیں ہوتی۔ شاید تمام حکومتیں سمجھتی ہیں کہ اردو کی طرفداری کرنا، اکثریت کو

ناراض کرنا ہے اور ایک جمہوری دور میں جہاں حکومتیں ووٹوں کی تعداد سے بنتی ہیں، وہاں یہ خطرہ کوئی کیوں مول لے گا۔؟ میں جناب ابن فرید کے اس مشورے سے اتفاق نہیں کرتا کہ اگر اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان مان لیا جائے تو اردو کے تحفظ کے امکانات پیدا ہو جائیں گے۔ (اگرچہ حقیقت یہی ہے کہ اب ننانوے اعشاریہ نو ۹۹۰۹ فی صد اردو، صرف مسلمان ہی پڑھتے ہیں) میں سمجھتا ہوں کہ جو مشورے، ابنِ فرید صاحب نے دیے ہیں، ان کے علاوہ، اردو کی حمایت میں ایک سیکولر اور غیر متعصب ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور اس ماحول کے پیدا کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ یہ سوچنا کہ ہر ہندو یا تمام ہندی والے، اردو کے دشمن ہیں، سوچنے کا یہ طریقہ درست نہیں ہے۔ ابھی ہندستان کی پرانی نسل اور نئی نسل میں بھی سیکولر خیالات کے رکھنے والے موجود ہیں اور یہی بات، ہندستان کی ملی جلی تہذیب کی بقا کی ضمانت ہے۔ ہندستان کے عوام متعصب نہیں بلکہ سیاست داں، انھیں اپنے طور پر اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنے کے لیے، ان میں تعصب کا زہر گھول کر، اس ملواں تہذیب کو پارہ پارہ کر دینا چاہتے ہیں۔ یہ سیاست داں، ایک ماب سیکالوجی Mob Psych ology پیدا کر کے، عوام کا استحصال کرتے رہتے ہیں۔ تاہم سیکولرزم ہی ایک روشن لکیر ہے اور ہندستان کے افق پر اس روشن لکیر کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ اور اسی کی مدد سے اردو کی فضا بنانا چاہیے۔ اب جو کچھ ہو سکتا ہے، اسی راستے سے ہو سکتا ہے۔

اردو والے اپنے بچوں کو اردو پڑھانے کی کس قدر فکر کر رہے ہیں، اس مسئلے میں بھی اردو والوں کو سخت سست کہنے سے کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ جذباتی باتیں، حقیقی اور عملی صورتوں پر غالب نہیں آسکتی ہیں۔ عملی صورت یہی ہے کہ جب تک اردو، عام ملازمتوں اور عرفِ عام میں روٹی روزی سے نہیں جوڑی جاتی، اس وقت تک، محض جذباتی نعروں، مشاعروں اور خالی خولی بھاشنوں سے، اردو فروغ نہیں پا سکتی۔ یہ ایک بنیادی حقیقت ہے اور اس سے چشم پوشی نہیں کرنا چاہیے۔ حکومت بھی رائے عامہ سے متاثر ہوتی ہے۔ یوں تو حکومت اردو والوں کو پھنسانے کے لیے، طرح طرح کے طریقے استعمال کرتی رہتی ہے، کبھی اردو کو دوسری سرکاری زبان بنواتی ہے (مگر درپردہ اس پر عمل نہ کرنے کا اشارہ بھی اپنے کارندوں کو کرتی رہتی ہے) کبھی اسکولوں کے لیے تین زبانوں کا فارمولا بنا کر اردو کے لیے راستہ دکھاتی ہے (جس پر کبھی عمل نہیں ہوتا)۔ اب آج کل حکومت نے ایک نیا شغلہ "اردو یونی ورسٹی" بنانے کا چھوڑا ہے تاکہ کچھ دنوں تک اردو کے لیے شور مچانے والے اس میں الجھے رہیں۔ اور آپس میں جوتم پیزار کرتے پھریں۔ پھر جب الیکشن ختم ہو جائے تو دوسری اسکیموں کی طرح "اردو یونی ورسٹی" کی بھی اسکیم ختم ہو جائے۔ یا پھر ہندستان کی دوسری زبانوں کو اشارہ کر دیا جائے کہ تم بھی اپنی اپنی زبانوں کی یونی ورسٹیاں بنانے کی مانگ کرو اور ظاہر ہے کہ، حکومت یہ کہہ دے کہ ہر زبان کے لیے یونی ورسٹی بنانا کہاں ممکن ہے، اس لیے اردو یونی ورسٹی بنانے کا

مسئلہ کسی ماہر تعلیم کی قیادت میں ایک کمیٹی
کے سپرد کیا جاتا ہے۔ افسوس بیچارے بھولے
بھالے اردو والے۔ چالیس پینتالیس برس
میں بھی حکومت کی اردو پالیسی کو آج تک سمجھ نہ پائے
اچھا، اگر اردو یونی ورسٹی بن بھی گئی تو اردو سے
فارغ التحصیل ہونے والوں کی کھپت کہاں
ہوگی؟ اردو تو کہیں کی اسٹیٹ لینگویج ہے۔
نہیں؟ اور جہاں کی ہے یعنی کشمیر، کیا وہاں
تمام اردو والے چلے جائیں گے؟ یا صرف سکول
میں جو اردو کی جگہیں نکلیں گی ان پر معلم کا
کام کریں گے؟ دفتر کے دروازے تو ان پر بند
ہوں گے کہ ہر ریاست میں، ریاست کی زبان
میں کام ہوتا ہے؟ (اردو یونی ورسٹی بنوانے
کے حامی، میرے اس بیان سے خفا نہ ہوں۔
وہ کوشش کرتے رہیں۔ نتیجہ تو ہمیں معلوم ہی
ہے)۔ جناب ابنِ فرید صاحب نے اپنے مقالے
میں یہ تجویز بھی رکھی ہے۔

"انفرادی طور پر اردو کے علم بردار
بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ مثلاً گھر کے ہر فرد کو خالی
اوقات میں اردو کی تعلیم دینا، خط وکتابت،
حساب کتاب یادداشتوں میں اردو کا استعمال کرنا،
تختیوں اور سائن بورڈوں پر اردو کے استعمال
کی اپیل کرنا وغیرہ۔"

میرا خیال ہے کہ یہ باتیں محض خوش خیالی پر مبنی
ہیں۔ اردو کی پرانی نسل تو خط وکتابت، حساب کتاب
وغیرہ اردو میں کرتی ہے، مگر نئی نسل؟ اس کی
مجبوریوں کو بھی نظر میں رکھنا چاہیے۔ وہ
اردو کے ماحول میں نہیں ہے۔ اسکولوں میں
اسے ہر وقت ریاستی زبان اور پھر ہندی سے
سابقہ پڑتا ہے۔ اس کی مزاولت اردو
سے نہیں۔ مشاعروں میں جو شعرا اور شاعرات
غزلیں پڑھتے ہیں، وہ سب ہندی میں لکھی
ہوئی ہوتی ہیں۔ پھر میڈیا ہر وقت ان کے
کان میں ہندی یا انگریزی ڈالا کرتا ہے۔ جو
صاحبِ حیثیت ہیں وہ اپنے بچوں کو کانونٹ
اسکولوں میں پڑھاتے ہیں اور گھر میں بھی
ہر وقت انگریزی بولا کرتے ہیں۔ اگر اردو والے
اتنا کر سکتے جس کی طرف ابنِ فرید صاحب
نے توجہ دلائی ہے تو پھر کیا تھا۔ رہ گئی آخری
بات کہ دکانوں پر سائن بورڈ لکھنا، تو یہ اپنی
دکانیں جلوانا ہے جو اس طرح کی ہمت کرے گا
ممکن ہے رام پور، علی گڑھ اور حیدرآباد کے
مسلم علاقوں میں یہ ممکن ہو مگر، عام طور پر
ایسا نہیں ہو سکتا۔ پھر سائن بورڈ، اسی
زبان میں لکھے جاتے ہیں جس کے پڑھنے والے
موجود ہوں۔ اردو والوں کی نئی نسل اردو
کہاں پڑھ سکتی ہے جو "ان دکانوں سے سودا
سلف، خریدنے جائے گی۔ پھر تاجر، اپنی پہلی
ترجیح، تجارت کو دیتا ہے۔ تجارت کو جس زبان
میں سائن بورڈ لکھنے سے فائدہ ہوگا، وہ اسی
زبان میں سائن بورڈ لکھے گا۔ اب تو صورت
یہ ہو چکی ہے کہ دکاندار اپنا تشخص [illegible]
[illegible] چھپانے کے لیے دکانوں کے نام بھی
اس طرح رکھتے ہیں کہ کہیں سے پتا نہ چلے
کہ دکاندار ہندو ہے یا مسلمان (یہ صورت
دونوں فرقوں میں ہے) کیونکہ انھیں سب
سے پہلے اپنی معاش کی فکر ہے۔ مجھے یقین ہے
کہ اس فاشستی ماحول اور مسموم فضا میں ابنِ
فرید صاحب یا راقم الحروف، اگر آٹے دال کی
دکان کھولیں گے تو ہرگز اردو میں سائن بورڈ
نہ لگائیں گے ورنہ یا تو گاہک نہ ملیں گے
یا دکان کسی دن جلی ہوئی ملے گی اور ہم دونوں

کو آٹے دال کا اصلی بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔
تو جناب اس وقت تو بس یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ملک، اس ملک کے رہنے والوں اور اردو زبان، سب کے لیے ہمدردی کی فضا اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب اردو والے بھی ملک کی سیکولر طاقتوں کا ساتھ دیں اور ان تمام طاقتوں کو مضبوط اور طاقتور بنانے کی فکر کریں۔ ملک میں ایک غیر سیاسی سیکولر طبقہ ابھر رہا ہے، وہی، اس مسموم فضا کو ختم کر سکتا ہے۔ میں اسی سیکولر طبقے کی بات کر رہا ہوں، جس میں تمام ہندستان کے شاعر، ادیب، فن کار اور سچے انسانیت پرست لوگ شامل ہیں۔ شاید، اس وقت یہی "زمانہ شناسی" ہے۔ مگر اپنے اصلی مفہوم میں۔

اس مقالے میں، بہت سی باتیں مجھے بڑی Sweeping معلوم ہوئیں۔ مثلاً یہ کہنا کہ "نہرو، پرشوتم داس ٹنڈن، گوبند بلبھ پنتھ، سمپورنانند، کیلاش ناتھ کاٹجو، یہ سب اردو فارسی کے ماہر تھے" میرے خیال میں "ماہر" کا لفظ، ان حضرات کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے صرف راجندر پرشاد اور کاٹجو، فارسی اچھی جانتے تھے اور اردو بھی۔ باقی حضرات اردو بولنے میں یقیناً ماہر تھے۔ پھر پنتھ اور سمپورنانند ہی کے زمانے میں، یو۔پی میں اردو پر ضرب کاری لگی اور اسے دیس نکالا ملا۔

ایک چھوٹی سی بات اور۔ جناب انور خاں نے اپنے مقالے میں انیس سے منسوب چند مصرعے لکھے ہیں۔

(۱) کان نبی کے گوہر یکتا حسین ہیں۔ (۲) گنج نبی کے گوہر یکتا حسین ہیں (۳) بحر نبی کے گوہر یکتا حسین ہیں۔ یہ مصرعے انیس سے نہیں بلکہ دبیر سے منسوب ہیں۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے، جعفر علی خاں اثر نے نگار لکھنؤ میں ۱۹۵۰ء کے آس پاس انیسیوں اور دبیریوں کی آپس میں جھڑپوں کے سلسلے میں لکھا تھا اور شاید ابد کو یہ مقالہ بھی ان کی کتاب "انیس کی مرثیہ نگاری" میں شامل ہے (مجھے کتاب مل نہیں سکی دیکھ لینا چاہیے) پھر انور خاں نے جو صحیح مصرعہ لکھا ہے، وہ غلط ہے۔ مرزا دبیر نے جب منبر سے صحیح مصرعہ کر کے پڑھا تو وہ یوں تھا۔
ع۔ تاجِ نبیؐ کے گوہر یکتا حسین ہیں۔
انور خاں نے جو مصرعہ اصلاح کے بعد درج کیا ہے، ع۔ دُرِ نبیؐ کے گوہر یکتا حسین ہیں۔ یہ کتابت کی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ یہ مصرعہ یوں بھی ملتا ہے۔ ع دُرجِ نبیؐ کے گوہر یکتا حسین ہیں یہ روایت لکھنؤ میں بہتوں سے سنی ہے اور اثر صاحب نے بھی لکھی ہے، اس لیے معتبر ہو بھی سکتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انیس کے لیے دوسری روایتیں ہیں کہ انھوں نے ایک مرتبہ، منبر سے ایک مصرعہ یوں پڑھا۔ ع۔ جس طرح سے نغمے کی صدا، ساز پہ دوڑے۔
ایک دبیریئے نے بر سر محفل کہا کہ واہ میر صاحب کیا خوب کہا ہے "پہ دوڑے" "پدوڑے"۔
پھر ایک دوسری محفل میں ایک مصرعہ میر انیس نے پڑھا۔
ع۔ "جو رو پہ چڑھا، تیغ نے دو کر دیے ٹکڑے"
ایک دبیریہ چلایا۔ واہ، واہ میر صاحب

کیا خوب کہا ہے "جو رو پہ چڑھا" ۔ اس
پر میر انیس نے دوبارہ مصرعہ پڑھا ع ۔
جو رخ پہ چڑھا تیغ نے دو کر دیے ٹکڑے ۔
غالباً یہ بات بھی اثر صاحب نے اپنے اسی
مقالے میں لکھی ہے ۔ آگے پھر انور خان
نے لکھا "کسی مزاحیہ شاعر کا کہنا ہے کہ
شاعر" اب بلائے جاتے ہیں مجرا سنانے
کے لیے " یہ تو نہیں ہے مگر وہ مزاحیہ
شاعر ظریف لکھنوی ہیں ۔ جنھوں نے
کہا تھا ۔ ع ۔ پہلے ارباب نشاط آتے تھے
گانے کے لیے ؎
اب تو شاعر جاتے ہیں غزلیں سنانے کے لیے ۔

مگر جو باتیں انور خان نے شاعروں اور ہمارے
شاعروں کے متعلق لکھی ہیں، وہ سو فی صد
صحیح ہیں ۔ مگر اسی معاشرے میں شاعر بھی
تو رہتے ہیں، وہ کیسے صارفیت کی
فضا سے متاثر نہ ہوں گے ۔ عزت نفس
کی اب کیا قدر ہے، جس کی پروا ہمارا
شاعر کرے ۔ اور کیوں کرے ؟ ۔۔
جب معاشرہ، انسان کی قدر و قیمت،
پیسے کی طاقت Money power سے
لگاتا ہے ۔ خط خاصا طویل ہو گیا ہے
جس کے لیے معذرت ۔

پروفیسر سید محمد عقیل، محمود منزل، دریاباد،
الہ آباد ۔

● ماہ مئی ۹۲ء کے کتاب نما صفحہ ۷۷ پر
میاں سید محمد امین سلمہٗ اللہ کی تحریر نظر سے گزری ۔
پڑھ کر ملال ہوا کہ ہندستان کی مایہ ناز
یونی ورسٹی کے شعبہ اردو کے ریڈر اور خانوادۂ
بلگرام و مارہرہ کے ایک صاحب علم صاحبزادے
نے بغیر کسی تحقیق کے اپنے چچا سید مرتضیٰ صاحب
بلگرامی پر حرف گیری کی ۔ میاں امین کے والد
حسن میاں صاحب سے ہمارا خاندانی رشتہ
بھائی کا ہے ۔ ان کے دادا حضرت آوارہ
حیدرآبادی یعنی عمزادی قدر سید آل عبا زیدی
الواسطی مرحوم مجھے اپنا بھتیجا کہہ کر مخاطب
کیا کرتے تھے ۔ ابھی چند سال قبل میری بیٹی
نے قضا کیا تو حسن میاں صاحب نے مارہرہ
سے علی گڑھ آ کر تعزیت کی تھی اور اعلیٰ
خود کو میرے لیے لغوگو کا سہرا دے
دیا ۔ بالکل اسی طرح ایک محقق نے حضرت
صفی بلگرامی مرحوم کے نام غالب دہلوی کے
خطوط کو جعلی قرار دے کر بے معنی قرار
دے دیا ۔ وہ تو خدا بھلا کرے پروفیسر
مختار الدین احمد صاحب کا جنھوں نے
اپنے ایک گران قدر مضمون میں بحث کی
اور اسے بجا قرار دیا ۔ بہرکیف، وہ اشخاص
جن کی نظر سے امین میاں سلمہٗ کی یہ تحریر گزر
چکی ہے، وہ تو مجھے جھوٹا اور لغوگو قرار دے
چکے ۔ اگرچہ حق یہ ہے کہ اس چند سطری خط
پر کئی صفحے کا مضمون بھی لکھا جائے تو وہ تشنہ
کہلائے گا ۔ کاش میاں امین سلمہٗ نے اپنے
والد ماجد بزرگوار یا مجھ سے ملاقات کر کے
دریافت کر لیا ہوتا کہ سچ کیا ہے ؟ تحقیق
اور تحقیر کا یہی فرق، کسی استاد کا جاننا لازمی
امر ہے ۔ بقیہ تفصیلات سے قبل اس
شجرہ کو ملاحظہ کر لیا جائے :۔

حضرت صاحب عالم مارہروی
- سید عالم
  - خورشید عالم
- مقبول عالم
  - مخدوم عالم
    - سرور عالم
  - اعتماد عالم
    - محمود عالم

جان عالم　　سردار عالم　　محمود عالم
(لا ولد)

سردار عالم　　مقصود عالم　　الطاف احمد　　اقبال عالم
(بدر عالم)

غالب دہلوی کے ہم عصر حضرت صاحب عالم مارہروی کے پرپوتے شاہ حافظ حاجی سیّد جان عالم صبائی مارہروی اعلی اللہ مقامہٗ کو خدا نے چار بیٹے عطا کیے تھے۔ جان عالم صبائی مارہروی رحمتہ اللہ کی علمیت اور تبحر علمی کا حال اگر حضرت آل عبا صاحب مرحوم حیات ہوتے، تو بتا سکتے تھے مگر ابھی ہندستان کے اندر بے شمار ان کے مرید باحیات ہیں۔ وہ ایسے خداپرست تھے کہ بایدوشاید۔ عابد۔ زاہد۔ ریاض۔ اور علم معرفت کا حال یہ تھا کہ اہلِ ایمان ان سے درس لینے کے لیے حلقہ بگوش رہتا، اپنی عبادت اور نجات کا باعث خیال کرتے تھے۔ آپ کے بڑے صاحبزادے جناب سردار عالم عرف بدر عالم مارہروی تھے۔ جو بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کے ہمراہ رہے اور ان کی وفات کے بعد بھی انجمن ترقی اردو (پاکستان) نے پذیرائی میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ یہاں تک کہ چند سال قبل بدر عالم صاحب نے بھی راہ عبدالحق اختیار کی۔ کراچی مدفن قرار پایا۔ ان میں جان عالم صبائی مارہروی مرحوم مغفور کے بیٹے حافظ الطاف احمد صاحب سے حضرت مولانا سیّد علی احسن، احسن مارہروی مرحوم مغفور (شاہ میاں صاحب) نے اپنی اکلوتی بیٹی انعام فاطمہ (مرحومہ) کا رشتہ ازدواج کیا تھا۔ جن کی ایک اولاد اناؤ میں اور بقیہ کراچی میں آباد ہیں

گویا مولانا احسن مارہروی مرحوم اور حضرت صبائی مارہروی اعلی اللہ مقامہٗ ہم جدی بھی تھے اور ایک دوسرے کے سمدھی بھی تھے۔ راقم کی ایک پھوپی بھی مولانا احسن مارہروی کی بڑی بہو تھیں۔

اس تفصیل کے بعد یہ بتاتا چلوں کہ حضرت سیّد سرور عالم مارہروی سرائی تخلص۔ اور حضرت صبائی مارہروی مرحوم مغفور ہم جدی تھے۔ ایک درخت کی دو شاخ کا درجہ رکھتے تھے۔ سرائی مرحوم پر بہت عرصہ ہوا پروفیسر گوپی چند نارنگ نے رسالہ آج کل میں مقالہ لکھا تھا۔ اور اہل علم آگاہ ہیں کہ سرائی مارہروی کے مضامین بہت وقیع ہوا کرتے تھے۔ فارسی اور عربی کی معلومات گھر کی میراث تھی۔ اس لیے یہ کہنا کہ سرائی مارہروی منتہی تو کیا مبتدی بھی نہ تھے۔ حق کے خلاف بات ہے۔ ویسے منتہی کوئی نہیں ہوتا۔ علم کی نہ کوئی حد ہے، نہ حساب۔

توقع ہے کہ اہل علم و دانش اس تحریر کے بعد گمراہ نہ ہوں گے اور میاں امین سلمہٗ کو معاف کر دیں گے۔ آخری بات یہ کہ صبائی مارہروی مرحوم مغفور کا انتقال علی گڑھ میں ہوا اور مسلم یونی ورسٹی کا قبرستان ان کا مدفن ہے۔ دور حاضر کے خلاف ایک بات اور لکھ دوں کہ ان کو دست غیب کا شرف حاصل تھا۔ جنات ان کی تحویل میں تھے۔ عابد شب زندہ دار تھے اور حرام ایام کے سوا بارہ ماہ روزہ رکھتے تھے۔ اسی لیے صبائی کہلاتے تھے۔ ان کے ایک بیٹے اور مولانا احسن مارہروی کے داماد آفتاب ہال کے ہیڈ کلرک اور پھر رجسٹرار آفس مسلم یونی ورسٹی کے ہیڈ

کلاک عرصہ دراز تک رہے۔ یہیں سے ریٹائر
ہوئے۔ کراچی میں انتقال کیا۔ اس تفصیل کے
بعد اگر میاں امین کو اصرار ہو کہ صباحی مارہروی کی
کوئی اصل نہیں ہے۔ تو حیرت ناک بات ہوگی۔
پھر میرے مضمون (مکتوب (کتاب نما۔ جنوری
۱۹۹۲ء، صفحہ ۱۰۸) میں سوامی مارہروی مرحوم کا
تو کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ ہی شیعیت یا سنیت
کا تذکرہ۔ پھر میاں امین سلمہٗ نے اس موضوع
پر کیوں قلم اٹھایا؟ اس کی ضرورت کیوں
در پیش آئی؟ یوں کہ وہ خود نہ صوفی ہیں اور نہ
کسی درگاہ کے سجادہ نشین۔ وہ تو محض ایک
مدرس ہیں!!

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کتاب نما ... سے معلوم ہوا کہ جناب گریجن چندن
کی کتاب "جام جہاں نما: اردو صحافت کی ابتداء"
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے شائع کیا ہے۔ یہ میرے
لیے بڑی خوشی کی بات ہے کیونکہ پچھلے چار پانچ
سال سے چندن صاحب اس سلسلے میں کام
کر رہے تھے۔ انھوں نے تحقیق کے دوران
مجھے ہری ہر دت اور منشی سدا سکھ کے مزید
حالات جاننے کے لیے بار بار خطوط لکھے
اور میں اس سلسلے میں مختلف بنگلہ اور
انگریزی تصانیف سے جو بھی معلومات حاصل
کر سکا ان کو روانہ کرتا رہا۔

اردو ادب میں سب سے پہلے میں
نے ہری ہر دت کی زندگی کے سلسلے میں مضامین
لکھے اور میری تصنیف "بنگالی ہندوؤں کی
اردو خدمات" میں حالاتِ زندگی پیش کرتے
ہوئے یہ بھی لکھا کہ وہ اخبار "جام جہاں نما"
کے مالک و مدیر تھے اور "جام جہاں نما"
اردو کا پہلا اخبار ہے۔ میری اس تصنیف
کا پہلا ایڈیشن ستمبر ۱۹۴۳ء میں اور دوسرا
ایڈیشن مارچ ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔ لیکن
زمانہ ہوا یہ نایاب ہے۔ میں نے تیسرے ایڈیشن
اکافی اضافے کے ساتھ کا مسودہ بھی تیار کیا
اور آج ۲۳/۲۴ سالوں سے وہ مسودہ مغربی بنگال
اردو اکادمی میں پڑا ہوا ہے اور اب تک اکادمی
نے اسے شائع کرنے یا مصنف کو اشاعت
کے لیے مالی امداد دینے کا کوئی فیصلہ نہیں
کیا ہے جس کی وجہ سے تیسرا ایڈیشن میں شائع
نہیں کر سکا۔ حالانکہ اس کتاب کی کافی مانگ
ہے اور کلکتہ یونیورسٹی کی فہرست کتب میں
ایک امدادی کتاب کے طور پر یہ شامل ہے۔
لیکن یہ کتاب کہیں نہیں ملتی۔ صرف چند کتب
خانوں میں ہی اس کا وجود ہے۔

اب "کتاب نما" جون ۹۳ کے شمارے میں
جناب سوم آنند صاحب نے "کچھ جام جہاں نما
اور گریجن کے بارے میں" لکھا۔ اس میں
چند باتیں ایسی ہیں جو غلط ہیں۔ مثلاً

۱۔ "جام جہاں نما کے صرف ۲۶ پرچے
چھپتے تھے"

میں نے "بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات"
میں مختلف اخبارات کی وہ تعداد درج کی
ہے جو ڈاک سے دیگر مقامات کو بھیجے جاتے
تھے اور اس میں یہ دکھایا ہے کہ "جام جہاں نما"
کے ۲۰ پرچے بذریعہ ڈاک جنوری ۱۸۳۷ء میں
جاتے تھے اور فروری ۱۸۳۸ء میں یہ تعداد بڑھ کر
۲۶ ہوگئی یعنی چھ کا اضافہ ہوا۔ اس کا ہرگز
یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا ہے کہ "جام جہاں نما"
کی تعداد اشاعت "صرف ۲۶" تھی۔ صاف
ہے کہ مقامی طور پر بھی اس کے خریدار تھے
اور ان لوگوں کو اخبار پہنچایا جاتا تھا اور چند

دیگر لوگوں کو بھی اخبار یقیناً دیا جاتا رہا ہوگا۔
۲۷ صرف ڈاک سے بھیجے جانے والے اخبارات کی تعداد ہے ، ہرگز جملہ تعداد اشاعت نہیں۔
۲۔ سوم آنند صاحب اور لکھتے ہیں کہ "ہری ہردت کے متعلق یہ جان کر کچھ تعجب ہوتا ہے کہ وہ بنگالی تھے"۔ بھلا اس میں تعجب کی کیا بات ہے ۔ میں نے اپنی تصنیف میں ایک سو سے زیادہ بنگالی ہندوؤں کا ذکر کیا ہے ۔ ہری ہردت کا بھی ۔
۳۔ سوم آنند صاحب نے لکھا ہے کہ ہری ہردت کے والد صاحب جو بنگلہ اخبار نکالا کرتے تھے ۔ اس کا نام "سنباد کرمدی تھا ۔ یہ نام بھی غلط ہے ۔ "کرمدی ایک بے معنی لفظ ہے ۔ درست لفظ "کومودی" (Koumoodi) ہے جس کے معنی 'چاندنی' چاند کی روشنی ، پور نما رخاص کر ماہ کارتک کا) یا صرف مہتاب بھی ہوتا ہے ۔ لہذا اخبار کا نام "سنباد کومودی" ہوگا "کرمدی" ہرگز نہیں ۔

جناب چندن اور جناب سوم آنند دونوں میرے کرم فرما ہیں اور چندن صاحب سے تو عرصے سے ملاقات کا شرف بھی مجھے حاصل ہے ۔ افسوس کہ میری نظر سے ابھی تک چندن صاحب کی کتاب نہیں گزری ۔ انھوں نے تحقیق کے دوران اپنے خطوط میں لکھا تھا کہ وہ مواد کو کام میں لاتے ہوئے میرا ذکر بھی کردیں گے اور مجھے یقین ہے کہ انھوں نے ایسا ہی کیا ہوگا ۔

شانتی رنجن بھٹا چاریہ ۔ کلکتہ ۹۲

● "کتاب نما" ہر ماہ برابر وقت پر مل رہا ہے ۔ اسی ماہ کے شمارے میں شائع کردہ علی سردار جعفری کی غزل بے حد پسند آئی ۔ اس سلسلہ میں ایک خط بھی آپ کو اور آپ کے پتہ پر جناب سردار جعفری صاحب کو روانہ کر چکا ہوں ۔ نیز اسی غزل پر ایک مراٹھی مقالہ بھی اخبار میں شائع کر رہا ہوں ۔

وامن راؤ جاگیردار ۔

● "کتاب نما" ماہ اپریل ۹۴ء باصرہ نواز ہوا ۔ جریدے کی ترتیب وتہذیب اور غیر جانبدارانہ حوصلہ مند ادارت کے لیے یقینی طور پر آپ قابلِ مبارکباد ہیں ۔

اشاریہ کے طور پر محترم ابن فریدکا "سرالین اردو" بالخصوص اردو کے شیدائیوں کے لیے جو (ماتم بخت بد) میں معروف ہیں ایک تازیانے کی حیثیت رکھتا ہے ۔ محترم گوپی چند نارنگ کے قلمی احساسات سے اردوئے معلی ہمیشہ احسان مند رہے گی ۔ ان کی خدمات کی جس قدر تعریف کی جائے ، کم ہے مگر یہ فراز بندہ نواز کا "رباعی کے ۲۴ اوزان" مانگے کا اجالا کے مصداق ہے ۔

(الف) :۔ ۱۹۶۴ء میں محترم گوندرشک رام پوری نے رباعی کے ۲۴ اوزان اور شجرہ اخرب واخرم کے بارے میں مروجہ امکانات پر ایک مدلل مضمون تحریر کیا جو ماہنامہ مجلس لاہور نے شائع کیا ۔

(ب) ۱۹۷۵ء میں آنجہانی علامہ سحر عشق آبادی سے دفتر شان ہند دریا گنج دہلی میں رباعی کے مزید ۱۲ اوزان کے بارے میں مجھ سے بالشافہ تذکرہ ہوا ۔ اور ان کا یہ مضمون ۱۲ مزید اوزان کے بارے میں ماہنامہ آج کل دہلی نے غالباً ۱۹۸۳ء میں شائع کیا ۔

(ج) ۱۹۷۹ء میں سہارنپور یادغفور کے مشاعرے

میں زار کلامی تشریف لائے اور بعد مشاعرہ
رباعی کے مزید تلاش کردہ ۱۸۔ اوزان کے بارے
میں اعلان فرمایا (جس میں راقم الحروف بھی موجود
تھا) بعدہٗ ان کی تصنیف کردہ کتاب "مسلمات فن"
۱۹۹۰ء میں منظرِ عام پر آئی۔

مندرجہ بالا توجیہ کے مطابق الف +
ب + ج کو جمع کرنے پر رباعی کے ۴۵ اوزان
حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد بھی رباعی
کی بلا بحور کے مکمل اوزان یکجا کر کے فراز بندہ نواز
نے قارئین کو جو سہولت مہیا کی ہے۔ یہ عمل بھی
ستائش چاہتا ہے۔

حصۂ نظم میں اجمل اجملی۔ اسرار حسین
ایر، رحمت امروہوی۔ ڈاکٹر سجاد سید۔ اور ظفر
گورکھپوری صاحبان قابلِ قدر ہیں۔ سید
احسن زیدی کی غزل کے مندرجہ ذیل دو مصرعے
قابلِ توجہ ہیں۔

۱۔ مل نہ چین نہ ساعت مکان کے ہوتے ہوئے!
۲۔ ہوا کے زور نے کچھ رنگ بھی دکھاتا تھا!

مہدی پرتاپ گڑھی اور اسرار حسین ایر
کی غزل کے مطالع تقریباً ایک ہی نقش مضمون
رکھتے ہیں مگر ایر صاحب کا مطلع سبقت حاصل
کر گیا۔

راقم الحروف کی غزل کے پہلے شعر کے
مصرعۂ اولیٰ میں جناب خطاط نے "انقلابی" کی
"ی" کا سقوط فرمایا ہے۔ مصرع اس طرح ہے۔
"سر انقلابی کا نیزہ پہ سر بلند کرو ـــــ"

"کھلے خطوط" کے تحت جناب نادر حمزہ
پوری نے اپنے مراسلے میں جناب شجاع خاور
کی شکایت کا ازالہ یا محترم عنوان چشتی کی وکالت
کا مرحلہ طے نہیں کیا ہے بلکہ اپنی قابلیت کو
منوانا چاہا ہے۔ پہلا مسئلہ اسقاطِ حروف
کا ہے جسے اس قدر طولانی فرما دیا گویا
وقت خراب کرنے کے مترادف ہو گیا۔
جواب صرف اتنا ہے کہ چاہے وہ فارسی ہو یا
عربی بکثرت الفاظ سے بنے جو اعراب الاصل
ہیں۔ جیسے غلام شاد عارفی کا مندرجہ ذیل مطلع۔
۔ دیکھتا ہوں پھول کو کھویا ہوا شبنم میں ہے۔
یعنی۔ رخسار عرق آلود کے عالم میں ہے۔

مندرجہ بالا یعنی کی "ی" گرائے جانے کا علم
العروض میں کوئی جواز نہیں ہے۔ چونکہ یعنی
کی "ی" اعراب الاصل ہے اس لیے گرائی جانا
ممکن نہیں۔ بقیہ چرب زبانی سے کیا فائدہ۔
اب رہی شجاع خاور صاحب کی مثالوں کی
بات کہ "کی" "ی" اگر گرائی جا سکتی ہے تو
یعنی کی "ی" کا اسقاط کیوں نہیں مروج ہے؟
تو میاں یہ گھر کی کھیتی تھوڑی ہے۔ عروض کے
مسائل تقطیع کی شرع ہے۔ جو اصول بنا
دیے گئے۔ اس میں انگشت نمائی کا مجاز کسی
کو نہیں۔ حضرت ابر احسنی گنوری جیسے
مجتہدِ عروض و فن سے وابستہ جناب عنوان
چشتی۔ کسی طرح بھی بے راہ رو نہیں ہو سکتے۔
اب رہا الف وصل کی طرح "ع" وصل اور
"ح" وصل مروج کرنے کا مسئلہ تو یہ شجاع
صاحب کی بچکانہ ضد ہے۔ تیسرا معاملہ
ردیف کے تقابل کا ہے۔ تو اس سلسلے میں
صرف اتنا سمجھ لیں کہ علاوہ مطلع کے غزل
کے کسی بھی شعر میں پوری پوری ردیف دونوں
مصاریع میں اس طرح اکٹھا ہو جائے کہ
شعر پر مطلع کا شائبہ ہونے لگے تو اسے
اجتماعِ ردیفین کہتے ہیں اور وہ سراسر
عیب ہے۔ تقابلِ ردیفین (جزوی) کو مکروہ
سمجھیے۔ ایسے جزوی تقابلِ ردیفین تو مستند

اساتذہ کے یہاں بے شمار پائے جاتے ہیں۔
عزیز من! ناوک صاحب آگے چل کر آپ یہ فرماتے ہیں کہ "جناب عنوان چشتی نے ایطا اور تعقید جیسے عیوب کے بارے میں عروضی قاعدے سے ہٹ کر کوئی بات نہیں کہی ہوگی"۔ معلوم ہوا کہ آپ بذات خود بھی۔ طفل مکتب معلوم ہوتے ہیں۔ بھلا عیب ایطا اور تعقید کا عروض سے کیا سروکار۔ یہ معائب تو فن کا عیب کہلاتے ہیں۔ آخرالذکر آپ نے شکست ناروا کے بارے میں جناب عنوان چشتی سے اختلاف کرتے ہوئے عیب ماننے سے انکار کیا ہے۔ یہ بھی آپ کی ناپختگی کی ضمانت ہے۔ سالم الارکان مثمن بحور میں شکست ناروا کے وارد ہونے سے کوئی عروض داں انکار نہیں کرسکتا مگر واقعہ یہ ہے کہ شکست ناروا کا اس طرح واقع ہونا جو عیب تنافر ہو جاتے وہ تو کسی طرح بھی لائق معافی نہیں۔ ویسے حضرت جلیل مانکپوری اور حضرت اثر لکھنوی نے تو شکست ناروا سے بچنا امر محال کہہ کر مکروہ گردانا ہے مگر عیب ہونے سے انکار نہیں کیا ہے۔ اب یہ اپنے اپنے ماننے اور سمجھنے کی بات ہے۔ مگر مجھے عنوان چشتی صاحب کی بات سے پورا اتفاق ہے۔
جناب شجاع خاور جیسے اچھے غزل گو کی نثر میں املے کے اغلاط اور نشست الفاظ کی خامیاں گنوا کر آپ نے کوئی کار مستحسن انجام نہیں دیا ہے۔ خدا آپ کو برداشت کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

آفسر آغا لکھنوی مقبرہ جناب عالیہ۔ رام پور،

● کتاب نما کا تازہ شمارہ سرچشمۂ بصیرت ہوا۔ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے انتہائی خوشی حاصل ہوتی ہے کہ یہ رسالہ ادبی حلقوں میں بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ خدا نظر بد سے بچائے!
آپ کا یہ تجربہ نہایت ہی کامیاب ثابت ہوا ہے کہ اداریہ ہر ماہ مختلف ذمہ دار حضرات رقم فرمایا کرتے ہیں جس سے ایک بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ وہ مطالعتی ذائقہ مختلف النوع کا حامل ہوتا ہے۔
نسیم عزیزی۔ ۱۲-۲۱۳ بیلیلیس روڈ ہوڑہ۔

● مہمان مدیر کی حیثیت سے جناب پروانہ ردولوی نے بڑی اچھی اچھی اور سچی باتیں اپنے اداریے (جون ۹۳ء) میں کہی ہیں۔ یہ سب کچھ کہنے میں انھوں نے دیانت داری، انصاف اور جرأت کا ثبوت دیا ہے۔
واقعہ یہ ہے کہ انحطاط کا ایسا دور اردو زبان پر پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ سرکاری اردو جرائد کے زیادہ تر مدیران محض افسانہ نگار ہیں یا شاعر۔ اکثر موضوعات سے متعلق مضامین وہ سمجھ نہیں پاتے۔ ماننے پر آتے ہیں تو کسی گوپی چند جاسوس کی رپورٹ کو مان لیتے ہیں اور انکار کرنے پر آتے ہیں تو کسی کے تاثرات قلب کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں۔ لکھنے والوں سے مرعوب ہوتے ہیں متاثر نہیں ہوتے!
ایک زمانہ تھا کہ "مخزن" کے سر عبدالقادر، شاہکار کے علامہ تاجور نجیب آبادی، زمانہ کے دیا نرائن نگم، ادبی دنیا کے مولانا صلاح الدین اور نگار کے علامہ نیاز فتح پوری اپنے رسائل میں لکھنے

والوں سے علمی وادبی اعتبار سے زیادہ باصلاحیت تھے۔ ساقی والے شاہد احمد دہلوی اگرچہ خود نہ افسانہ نگار تھے اور نہ شاعر مگر انھوں نے سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، راجا مہدی علی خاں اور کرشن چندر جیسے لکھنے والوں کو مستند قلم کار بنا دیا تھا۔ لیکن افسوس! آج گنگا الٹی بہ رہی ہے۔ آج کے اکثر قلم کار ان مدیران سے کہیں زیادہ کہنہ مشق، باصلاحیت اور سینئر ہیں کہ جن کے رسائل میں کہ وہ لکھ رہے ہیں۔ گھوڑا دُم کو نہیں بلکہ دُم گھوڑے کو ہلا رہی ہے اور قلم کار مدیر کو عزت بخش رہے ہیں!

ڈر یہ ہے کہ اس حقیقت بیانی کی سزا پروانہ صاحب کو یہ ملے گی کہ چند بااختیار حضرات اور درباری دانش ور ان سے ناراض ہو جائیں گے۔ دراصل وہ جنم جنم کے بھوکے مینڈک سرکار کی ردی پیٹ میں پڑتے ہی، دَل دَل میں پھنسے ہوتے ہاتھیوں کو لاتیں مارنے لگتے ہیں۔ اس کے باوجود مجھے امید ہے کہ دولت اور عہدوں سے بے نیاز اردو کے مخلص قلم کار آگے آتے جائیں گے اور قافلہ بنتا جائے گا!

شمس کنول۔ علی گڑھ۔

●

کتاب نما (شمارہ جون ۹۳)

پیش نظر ہے۔ احمد رضا کاظم صاحب (کیمبرج) نے میری "تین مختصر نظموں" پر اپنی رائے دی ہے۔ فرماتے ہیں:

"صرف لفظوں کی شعبدہ بازی سے نظم نہیں بنتی اس کے لیے مضمون اور معنی آفرینی کے ساتھ کوئی آہنگ اور صوتی تاثر بھی ہونا چاہیے۔ آزاد نظم کا مطلب فنی تقاضوں سے چھٹکارا تو نہیں ہونا چاہیے۔

.. شام پر ایک نظم: ایک بے ربط لمبی سطر کو چار لائنوں میں لکھ دیا گیا ہے۔

.. انہونیاں: دیوانے کی بڑ کے سوا کیا کہلائیں گی۔ کانک کی ندیاں اماریاں کیوں نہیں ہو سکتیں۔؟

کتاب نما ایک تعلیمی پرچہ ہے جس میں عروض و معانی کا بہت چرچا ہے۔ سیاہ آسماں کی دھندلیں اترتی شام کی زمین پر بہت سے پیڑ۔ ان کو تین متوازی سطروں میں بھی لکھ دیں تو بھی ان مل بے جوڑ ہی رہے گی۔

پھر شام کی زمین کے ان پیڑوں؟ کی ٹہنیوں تلے کہیں کسی پڑاؤ پر رکے ہوئے بہت سے لوگ! کیا یہ ایک سیدھی لائن بری لگتی ہے۔ ہر عبارت کو تین حصوں میں بانٹ کر لکھا جائے۔ اگر بجھے ہوئے الاؤ پر جھکنے سے پہلے اس نام نہاد نظم کا عنوان "شام پیڑ اور پڑاؤ" لکھ دیا جائے تو شاید کچھ بات بن جائے"

شاہد بھائی آپ کے شائع کردہ ایسے تمام خط میں دلچسپی سے دیکھتا ہوں جو فنی تجزیوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ میں نے مندرجہ بالا خط بھی اسی دلچسپی کے ساتھ پڑھا ہے۔ لیکن جناب کاظم صاحب کی علمی بے بضاعتی کا اندازہ ہونے کے بعد اس خط کا مزہ ہی ختم ہو گیا۔ کاش کہ ان کا مطالعہ وسیع، ذوق شعری بلند اور انداز تحریر جچا تلا ہوتا۔ موصوف نے ایک بھی اعتراض ڈھنگ کا نہیں کیا ہے۔

پہلا نقطہ "[illegible]

چار سطروں میں کہی ہے ۔ ایک سطر میں کہیں نہیں لکھی گئی ہے ؟" اور یہ سطر (جو انھوں نے محسوس کی) بے ربط ہے ۔ جبکہ نظم کا عنوان ہے "شام پر ایک نظم ۔ اور وہ یوں ہے —— پھر ہو رہی ہے شام
جس کا کوئی پتا نہیں ۔
اس عمر زرد کا
میعادِ درد کا
اک دن ہوا تمام

میں ان کے اعتراض پر کچھ لکھنے کے بجائے فیصلہ کتاب نما کے قارئین پر چھوڑتا ہوں ۔ وہ خود فیصلہ کریں کہ جناب کاظم صاحب کی علمی سطح کیا ہے ۔ بقیہ نظموں کے بارے میں بھی اُن کی رائے کسی کی رائے سے گئی گزری ہے ۔ جس کے جواب میں صرف خاموشی ہی مناسب ہے ۔ ویسے کاظم صاحب کو اگر تنقید وغیرہ سے دلچسپی ہے تو وہ تھوڑا بہت پڑھا بھی کریں اور کسی سے کچھ پوچھ بھی لیا کریں ۔ مضامین اس بار بھی بہت عمدہ ہیں خصوصاً نارنگ صاحب کا مضمون خاصے کی چیز ہے ۔ پروفیسر نعیم احمد صاحب نے بہت عمدہ مضمون دیا ہے ۔ قیصر تمکین صاحب افسانہ کہیں جیسے" میں "لبادہ اوڑھ کر" بولتے محسوس ہوتے ۔ کھل کر انھوں نے کچھ نہیں لکھا ۔ اس سے ان کی تحریر غیر واضح ہو گئی ہے ۔

احمد صغیر صدیقی ۔ ناظم آباد کراچی

● "کتاب نما" کے شمارہ اپریل ۹۲ء میں اختر آغا لکھنوی کی غزل مجھے بے حد پسند آئی ۔ غزل حسنِ بیان، لطفِ زبان، تخیل کی بلند پروازی اور رعایت لفظی کا نمونہ ہے ۔ شاعر نے

حالاتِ حاضرہ کو خالص غزل کے لہجے میں پیش کیا ہے یہی اس غزل کی سب سے بڑی خوبی ہے مطلع "ورق ورق مجھے پڑھنے کی فیضیابی ہے مرے نصیب سے چہرہ ترا کتابی ہے" ورق ورق، پڑھنے، فیضیابی، نصیب، چہرہ، کتابی میں ضلع جگت کا علاقہ ہے : دوسرے شعر کا مصرع ثانی " کلیم حق و صداقت ہی انقلابی ہے " میں ایک طرف تو انقلاب کی ترغیب دوسرے تبلیغِ حق و صداقت " یہ کس کو ڈھونڈتے پھرتے ہو اس خرابے میں مجھی کو اپنا بنا لو تو کیا خرابی ہے " شعر محاکات کا بہترین نمونہ ہے ۔ "خرابے" اور "خرابی" میں تجنیس ہے ۔ دونوں صنعتیں مل کر شعر کے حسن کو دوبالا کر رہی ہیں ۔ بہت اچھا مقطع ہے :

" گزر رہی ہے غلامانہ زندگی افسر
مگر جبیں پہ تو لکھی ہوئی نوابی ہے "

یہ شعر بڑا تہہ دار ہے ۔ ایک طرف تو کاتب تقدیر سے قسمت کا رونا رویا گیا ہے کہ کیسی غلامانہ زندگی گزر رہی ہے جبکہ جبیں پر نوابی لکھی ہے دوسری طرف اپنی کوتاہی عمل کہ ہنوز جبیں پر نوابی لکھی ہوئی ہے لیکن اپنے عمل کے صلے میں ہمیں غلامانہ زندگی بسر کرنی پڑ رہی ہے لفظِ افسر بھی یہاں بہت اچھا استعمال ہوا ہے ۔ میری نظر میں مصنف کی یہ غزل نمائندہ زمانہ بھی اور ایک درس بھی ہے ۔

شمیم حیدر ۔ ردولوی

● "کتاب نما" کا جون کا شمارہ موصول ہوا شکریہ! مہمان مدیر پرواز ردولوی صاحب کا اردو صحافت پر بڑا جید قسم کا مضمون آیا ہے ان کی کھری

اور صاف باتیں دل کو چھو گئیں۔ جناب علی سردار جعفری کی نظم "راج نرلج" اور جناب معین احسن جذبی کی غزل "کیا کہنے" یہ لوگ تو داد و تحسین سے بہت اونچے ہیں۔ خدا کرے یہ اردو کے لیے جیتے رہیں۔

پروفیسر نارنگ کے علاوہ پروفیسر نعیم احمد فیض تمکین اور رسوم آنند کے مضامین بڑے خاصے کی چیز ہیں۔ شفیقہ فرحت کا طنزیہ "رو" پڑھ کر آنکھیں نم ہو گئیں۔ جانے کتنوں کو رلا دے گا یہ مضمون۔ "غضنفر صاحب نے تو کمال ہی کر دیا اپنے افسانے "کلھاڑا" میں۔ ان کا اختتامیہ جملہ غضب کا ہے۔

رؤف خیر اپنی نظم اور مکتوب میں صاف سیدھے اور کھرے نظر آ رہے ہیں۔ جو ان کی بڑائی کا مظہر ہے۔ سید معراج جامی کی غزل اچھی ہے۔ کاتب صاحب نے نہ جانے کیوں پہلے تین شعروں کے قافیے کے نون "ن" کو اعلان کے ساتھ نہیں لکھا۔ مہر ندیم احمد وصی اور فضل افضل کی غزلیں خاص طور پسند آئیں۔ عابد پشاوری کے دوہے اچھے ہیں مگر یہ دوہا

شجر بے برگ و ثمر، درد بغیر انسان
بے مصرف بے فیض ہے، عابد مان نہ مان

اپنے پہلے حصہ میں تاردا آہنگ لیا ہوا ہے۔ وسطی چرن (دوہے کا پہلا اور تیسرا ٹکڑا) فعلن یا فعلا سے شروع نہیں ہوتا۔ اس حصے کو بڑی آسانی سے یوں کر دیا جا سکتا تھا اور زبان بھی دوہے کے مزاج کے قریب ہو جاتی "بے پتہ بے پھل شجر"۔ ابراہیم اشک نے بھی خوب دوہے کہا ہے۔ ساجد حمید کا جذبات سے بھرا خط قابلِ قدر ہے یہ کرناٹک اردو اکاڈمی کے رکن بھی ہیں۔ مجھے یقین ہے ان کا یہ جوان خون اردو کے لیے ضرور کچھ کرے گا۔"

حسن رضا۔ رائچور کرناٹک

● برصغیر ہندوستان میں زبان اردو کی موت و حیات کا سب سے بڑا محرک — اردو والوں کی اپنی ہی زبان کے متعلق بے تعلقی اور بے حسی ہے۔ اور یقیناً "کتاب نما" اردو ادب کی حتی المقدور خدمت انجام دے رہا ہے۔ کتاب نما میں کیا نہیں ہے؟ علمی و ادبی مضامین ہوتے ہیں، لسانی، دینی وقتی اعتبار سے نئے گوشوں پر بھرپور روشنی ڈالی جاتی ہے۔ ہماری سماجی، اقتصادی، اور سیاسی زندگی کے اسرار و رموز ہوتے ہیں، شعری تخلیقات ہوتی ہیں، طنز و مزاح ہوتا ہے۔ گویا کے کوزہ میں سمندر سمویا ہوا ہے!

ڈاکٹر سید افتخار شکیل ۴۴۔ ۵۔ ۲۰ لال دھرا۔

● اپریل ۹۳ء کے رسالے میں مہمان محترم جناب ابن فرید کا لکھا ہوا اشاریہ بہت پسند آیا۔ ایک ایک سطر لائق تحسین ہے۔ رہا پروفیسر گوپی چند نارنگ تو ہندوستان پاکستان میں اردو ادب پر چھائے ہوئے ہیں ان کا مقالہ بڑا فکر انگیز ہے۔ مئی ۹۳ء کے اشاریہ میں جناب دلیپ سنگھ کا مضمون الیکٹرانک میڈیا اور قومی یکجہتی، پسند آیا۔ دلیپ سنگھ جانے پہچانے ادیب ہیں طنز و مزاح میں اپنا ایک مقام بناتے ہوتے ہیں، اس رسالے میں ڈاکٹر اختر نظمی کی غزل بہت اچھی ہے۔ غزل کا صرف ایک شعر بطور نمونہ :- "ہر ایک کام سلیقے سے بانٹ رکھا ہے یہ لوگ آگ لگائیں گے یہ ہوا دیں گے"

ڈاکٹر حمید اختر رضوی، اسلام آباد، میرٹھ۔

دیگر اداروں کی اہم کتابیں

اردو فکشن: بنیادی و تشکیلی عناصر (ایک تاریخی جائزہ) اختر انصاری ۱۵/-
ادبی جائزے تنقیدی مقالے راج بہادر گوڑ ۴۵/-
آثار و افکار: ادبی مقالے ڈاکٹر عبدالخالق ۲۵/-
اردو شعرنائے انیسویں صدی میں ، قدسیہ قریشی ۸۰/-
انعکاس ، کبیر احمد جائسی ۶۰/-
امیر خسرو اور علی گڑھ سوانح محی الدین اظہر ۳۰/-
ادبی نثر کا ارتقاء ادب ڈاکٹر شہناز انجم ۸۰/-
اخبار نویسی کے ابتدائی اصول صحافت بلجیت سنگھ مطیر ۱۵/-
احمد شوقی ایک مطالعہ سوانح محمد اظہر حیات ۲۰/-
اردو میں رپورتاژ نگاری رپورتاژ عبدالعزیز ۴۵/-
افسر شناسی مضامین ڈاکٹر مصطفےٰ فطرت ۱۶/-
افکار تازہ تنقیدی مضامین ڈاکٹر جلال انجم ۴۰/-
اسلوبیاتی تنقید ، علی رفاد فتیحی ۶۰/-
ادب کی تلاش ادب بلراج کومل ۳۰/-
ابر نیساں خاکے سیدہ طیبہ بیگم ۲۰/-
باقیات عظیم الدین احمد مضامین ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ ۱۵/-
بات سے بات چلے ، یعقوب راہی ۳۰/-
پرانی یادگاریں غلام ربانی ۳۰/-
جدید اردو تنقید پر مغربی اثرات ادب علی حماد عباسی ۵۰/-
جمیل مظہری کی شعری تخلیقات ادب ڈاکٹر سید نعمت اللہ ۲۰/-
جوہر آئینہ غالبیات نند لال کول طالب کاشمیری ۲۵/-
حامد اللہ افسر میرٹھی شخصیت ڈاکٹر مقصود حسن ۷۵/-
حرف نیم کش طنز و مزاح عظیم اختر ۳۵/-
خلیل الرحمٰن اعظمی ترقی پسندی سے جدیدیت تک۔ تنقید
ڈاکٹر اسلام عشرت ۵۰/-
خواجہ فخرالدین حسین سخن دہلوی سوانح محمد سمیع الحق ۴۱/-
دبیر اور شمس آباد موازنہ محمد صادق ۲۵/-
ڈاکٹر بابائے سیاسی شکنجے میں سرگذشت نعمان ہاشمی ۱۰/-
ریاست بھوپال اور اقبال حقیقت کے آئینے میں مضامین

ریزہ خیال انشائیے ڈاکٹر کمال الدین -/
ریت ریت لفظ مضامین حمید سہروردی /
زاویۂ نظر ادب ڈاکٹر ارتضیٰ کریم /
ساز عہد ، نصر وارثی اوگانوی /
سید حرمت الاکرام حیات اور کارنامے ایس بی اے جید
سبق آموز نشانی ہائے فطرت مضامین سید محمد رضوی بیکری /
سیر المصنفین جلد اول تاریخ ادب محمد یحییٰ تنہا /
سرسید کی اسلامی بصیرت جمال خواجہ
سلام مچھلی شہری حیات اور شاعری سوانح ڈاکٹر محمد اختر الحسن
دیوان سیماب امروہوی سید فیضان حسن /
شاعروں کے رومان مضامین نریش کمار /
فسانۂ اعجاز (فسانۂ عجائب کی پہلی تقلید) تنقید
ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی /
قومی یکجہتی اور نصابی کتابیں مضامین اکبر رحمانی /
کنور اپنی دو مثنویوں کی روشنی میں ، ڈاکٹر ابوبکر جیلانی /
کشف الاذکار ، معین الدین
کاشف الحقائق ایک مطالعہ ڈاکٹر وہاب اشرفی /
کانٹے انشائیے ڈاکٹر محمد زماں آزردہ /
کربل کتھا کا لسانی مطالعہ خلیق انجم ،
گوپی چند نارنگ /
مور پنکھ مضامین طالب چکوالی
مضامین میر ، میر مشتاق احمد
مضطر خیر آبادی سوانح ڈاکٹر خلیل اللہ خاں
مثنوی سحر البیان کی سماجیات تنقید محمد ضیاء الرحمٰن /
مزامیر مضامین کلام حیدری /
معیار نظر ، ارشد کاکوی /
مشرقی تنقید تنقیدی مضامین محمد حسن /
مکاتیب جلیل مخطوطات علی احمد جلیلی /
محمد مجیب حیات اور اردو خدمات سوانح
ڈاکٹر صادقہ ذکی /

ملنے کا پتا:

سے منعقدہ "نعتیہ مشاعرے" سے ہوئی ۲۷ مئی کو دبئی کی سب سے بلند عمارت "ٹریڈ سینٹر" کے کھچا کھچ بھرے ہال ۱۱ میں ہوئی مشاعرے کی نظامت حسب سابق محترم سلیم جعفری نے نہایت کامیابی سے نبھائی۔

۲۸ رمئی کو ابوظہبی کے محبان اردو کی جانب سے ہلٹن ہوٹل میں خوبصورت و کامیاب محفل مشاعرہ منعقد ہوئی جو صبح فجر تک جاری رہی۔ ۲۹ رمئی کو دبئی کی علم دوست اور ادب نواز شخصیت محترمہ ڈاکٹر اختر جہاں ملک صاحبہ کی پرشکوہ رہائش گاہ پر مشاعرے کی اختتامی محفل سجائی گئی تمام تقریبات میں مہمانوں کی شاندار پذیرائی کی گئی، جشن آزاد میں پاکستان سے احمد فراز، محشر بدایونی، ڈاکٹر قاسم پیرزادہ، حمایت علی شاعر، محمود شام، تابش کاسگنجوی، اور رجا وید صبا نے شرکت کی ہندستان کی نمائندگی ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد، خمار بارہ بنکوی، ڈاکٹر بشیر بدر، موج رام پوری، چرن سنگھ بشر، پاپولر میرٹھی، شجاع خاور اور محترمہ پروین کیف بھوپالی نے فرمائی۔ دوحہ قطر سے جلیل نظامی اور امریکہ سے ظفر رضوی نے شرکت کی۔ ان کے علاوہ کراچی کے حفیظ یا حلیم؟ دہلی سے حاجی انیس دہلوی، کفایت دہلوی نے شرکت کرکے تقریبات کو رونق بخشی جبکہ جناب ادریس دہلوی (مدیر شمع دہلی) نے بطور خاص جشن نے آزاد میں شرکت فرمائی۔ اس موقع پر حسب روایت ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد کی شخصیت و فن کے حوالے سے نہایت خوبصورت ضخیم مجلہ بھی شائع کیا گیا۔ مرحوم شعرا کی تخلیقات کی اشاعت اور ان کے لواحقین کی امداد کے پیش نظر امسال مرحوم کیف بھوپالی کے منظوم ترجمہ "مفہوم القرآن" اور مجموعہ کلام "آہنگ کیف" کی اشاعت بھی اہل دبئی ملک محمد اسلم صاحب اور محترمہ ڈاکٹر اختر جہاں ملک صاحبہ کے تعاون سے اشاعت پذیر ہوکر منظر عام پر آئی۔

عبدالقادر ادیب کے شعری مجموعے "برندان" کی رونمائی

بنگلور:- گورنر کرناٹک جناب خورشید عالم خاں کے دست مبارک سے ۲۹ جنوری ۹۳ء کو پی، آئی، او، بنگلور میں "برندان" کی رسم رونمائی ہوئی، کرفیو کے باوجود مسلم اور غیر مسلم خواتین اور اہل علم نے شرکت کی۔ عزت مآب خورشید عالم خاں کی عالمانہ تقریر نے حاضرین کو بے حد متاثر کیا۔ اس تقریب کے انعقاد میں جناب عزیز اللہ بیگ اور ممتاز شاعر ڈاکٹر مدنا منظر نے قدم قدم پر رہنمائی فرمائی اور تعاون کیا۔

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے انعامات

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے زیر اہتمام ریاستی سطح پر اردو یک بابی ڈراموں کا مقابلہ بدھ ۹ رجون ۹۳ کو برلا کریڑا کیندر چوپاٹی بمبئی پر منعقد کیا گیا۔ جس میں شولاپور اور بمبئی کے علاقائی مقابلے میں کامیاب ڈراموں نے شرکت کی، بزرگ اداکار اے، کے ہنگل نے بطور مہمان خصوصی شرکت فرمائی۔

اسٹیج اور سیریل کے ممتاز اداکار سہیر کھٹکر نے حسب ذیل ڈراموں کو انعامات تقسیم کیے۔

آغا حشر کشمیری ٹرافی اوّل انعام نیرو۔ رابطہ ڈراما گروپ بمبئی۔

دوسرا انعام کہانی ایک گدھے کی ۔ رضوی کالج ممبئی۔
تیسرا انعام خفتی ۔ آرٹ اکادمی شولاپور

بہترین اسکرپٹ ساجد رشید نیرو
بہترین ہدایت کار ساجد رشید نیرو
بہترین اداکار سنجے سگھو، کہانی ایک گدھے کی
بہترین اداکارہ فرزانہ بلوکر نیرو
بہترین روشنی عنایت قاضی کہانی بک، ممبئی
اداکاری (خصوصی) شفیق انصاری نیرو

جناب گریش دیسائی، جناب رام کرشن کا ڈگل اور جناب مجید خان نے بطور جج شرکت فرمائی۔

ڈاکٹر کامل قریشی کی وفات پر اردو گھر میں تعزیتی جلسہ

اردو کے ممتاز شاعر اور محقق ڈاکٹر کامل قریشی کا مختصر علالت کے بعد ۱۵ جون ۹۲ کی صبح ۴ بجے مولچند اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ ۵۸ برس کے تھے ۔ اردو گھر میں ان کی وفات پر تعزیتی جلسہ ۱۶ جون ۹۲ کو زیر صدارت پروفیسر ظہیر احمد صدیقی منعقد ہوا جس میں دفتر کے کارکنان کے علاوہ بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے شرکت فرمائی۔

جلسہ کے آغاز میں ایم حبیب خاں صاحب نے ڈاکٹر کامل قریشی کے بارے میں اظہار خیال کیا اور کہا کہ مرحوم سے میرے تعلقات ۱۹۵۲ء سے تھے ۔ یہ اس وقت کی بات ہے، جب وہ علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے اور انجمن کی لائبریری سے استفادہ کرنے تشریف لاتے تھے۔

ڈاکٹر خلیق انجم کے کروڑی مل کالج میں شاگرد رہے اور اسی کالج میں لیکچرر مقرر ہوئے اور انجم صاحب کے ساتھی بھی رہے اور آخر تک اس کالج سے وابستہ رہے ۔

شمیم جہاں صاحبہ نے ڈاکٹر کامل قریشی کی ناگہانی موت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم انتہائی مخلص اور خلیق انسان تھے۔ ان کی ایک ادبی حیثیت اور اردو دنیا میں ایک الگ مقام ہے ۔ اور آخر میں جلسے کے صدر پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے اظہار افسوس کرتے ہوئے اور اپنے دیرینہ تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مرحوم کی شخصیت بڑی دل آویز اور پرکشش تھی ۔ ان کا حلقہ احباب بڑا وسیع تھا ۔ ان کی تصنیف ”تگ و تاز“ اور ”تلاش و تنقید“ اور ”بہار شاعری اردو ترجمہ“ کی رسم اجرا ڈاکٹر وپ سنگھ اگروال، گجرات نے ۵ جون ۹۲ میں کروڑی مل کالج کے ہال میں ادا فرمائی ۔ جس میں بڑی تعداد میں ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی ۔ آخر میں تمام حضرات نے ۲ منٹ کی خاموشی اختیار کی ۔ اس کے بعد تعزیتی جلسے کو قرار داد پڑھ کر سنائی گئی۔

جناب مالک رام کے سانحہ ارتحال پر تعزیتی جلسہ

اردو کے مشہور محقق اور ماہر غالبیات جناب مالک رام کے سانحۂ ارتحال سے اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے ۔

مالک رام تحقیق کے میدان میں ایک قدآور شخصیت کا نام تھا ۔ اسلامیات، مولانا ابوالکلام آزاد کی تصانیف از سرنو تحشیہ کے ساتھ مرتب کرنا اور غالبیات سے متعلق ان کا زندگی بھر کا کام اردو علم و ادب کا ایک روشن باب ہے ان کے انتقال

سے علمی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ پُر ہونا ممکن نہیں ہے، خدا ئے بزرگ و برتر ان کے پس ماندگان کو اس سانحہ کو برداشت کرنے کا حوصلہ دے۔

ساتھ ہی یہ امید کرتا ہے کہ اردو دنیا ان کی مناسب یادگار کے لیے عملی قدم اٹھائے گی۔

اس جلسے میں جن حضرات نے شرکت کی۔ ان کے نام یہ ہیں۔

(عنایت اختر) (یعقوب راہی) (محافظ حیدر) (وحید انور) (ساجد رشید) (فاروق سید) (ذکریا شریف) (انور خاں) (اقبال مُلّا) (اسماعیل راج) اور

اسٹاف مکتبہ جامعہ لمٹیڈ - بمبئی

(خلیل احمد ندیم)

مجروح سلطان پوری کے ساتھ ایک شام

بہار اردو اکیڈمی کے نئے منصوبوں ورعزائم کی تکمیل کی طرف پہلا قدم مجروح سلطان پوری کے نام ایک شام اور ایک خالص ادبی مشاعرے کا انعقاد ۷ اپریل کو اکادمی کے ہال میں عالی جناب مشتاق منّا وزیر اقلیتی فلاح وبہبود وکھیل کود کلچر اور اوقاف کی صدارت میں ہوا۔

اکیڈمی کے سکریٹری مشتاق نوری نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ مجروح صاحب نے اہلِ بہار کی تخلیقی اور علمی صلاحیت و معیار کی بے حد تعریف کی۔ اور یہ کہا کہ آج زبان و ادب کی تحریک کے لحاظ سے بہار کا کوئی ثانی نہیں، موجودہ حکومت کا رویہ بھی اردو اور اقلیت کے لیے نیک فال ہے۔

وزیر موصوف جناب مشتاق منا نے فرمایا کہ جناب صدیق مجیبی وائس چیرمین اردو اکیڈمی نے اپنے بعض اشعار میں اکادمی کے مسائل کی طرف جو لطیف اور پُر معنی اشارے کیے ہیں ان سے میں غافل نہیں ہوں۔ اور وزیر اعلیٰ جناب لالو پرشاد صاحب سے ان خطوط پر گفت و شنید ہو رہی ہے۔ امید ہے اکیڈمی کے مالی بحران پہ جلد قابو پا لیا جائے گا۔

اکیڈمی کے سکریٹری مشتاق احمد نوری نے مطبوعات کا تحفہ مجروح سلطان پوری اور جناب مشتاق منا صاحب کی خدمت میں اکیڈمی کی جانب سے پیش کیا۔

مجروح سلطان پوری صاحب مسلسل ڈیڑھ گھنٹے اپنا کلام سناتے رہے اور سامعین پورے انہماک کے ساتھ لطف اندوز ہوتے رہے۔

مشاعرے میں جن شعرائے کرام نے حصّہ لیا ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

اثر فریدی، شام رضوی، قاسم خورشید، عالم کیف عظیم آبادی، شاہد احمد شعیب، ظہیر صدیقی، صابر آروی، بہزاد فاطمی، اور صدیق مجیبی،

اور بستی نہیں یہ دلّی ہے کہ رسمِ اجرا

نئی دہلی - گزشتہ دنوں غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں ایک ایسی کتاب کا اجرا ہوا جس میں دلّی کی ادبی اور تہذیبی زندگی

کے خدوخال اور مصنف کی گزشتہ ۴۳ سال
کی زندگی کا مرقع ہے ۔ رفعت سروش
نے ۸۵ء میں "بمبئی کی بزم آرائیاں" جیسی
خود نوشت لکھ کر اس صنف میں ایک نئے
رنگ و آہنگ کو روشناس کیا اور اب ان
کی یہ تازہ تصنیف "بستی نہیں یہ دلی ہے"
ان کی خود نوشت کا دوسرا اور آخری حصہ ہے
اسی مخصوص رنگ و آہنگ میں ــــ کتاب
کا اجرا پروفیسر گوپی چند نارنگ نے فرمایا۔ انھوں
نے نہایت دلچسپ عالمانہ تقریر کی ۔ اس جلسے کی
صدارت جناب عزیز قریشی ممبر (سابق) پارلمنٹ
نے کی جو اردو یونیورسٹی کمیٹی کے چیرمین ہیں۔
قریشی صاحب نے رفعت سروش صاحب
کی تخلیقی قوتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی
یہ کتاب ایک جامع حیثیت کی حامل ہے۔
یہ دراصل مرثیہ ہے دلی کا ۔ دلی کی اس
تہذیب اور ان ادبی اقدار کا جو آج مٹتی جارہی
ہیں ۔ انھوں نے بطور خاص روشن صدیقی،
فرقت کاکوروی اور شریلشن کمار شاد کی موت
پر اس کتاب میں ذکر کو ادب کی مرثیہ نگاری
قرار دیا۔

جناب ایم حبیب خاں نے اس موقع
پر ایک مقالہ پڑھا جس کا موضوع تھا۔
"اور بستی نہیں یہ دلی ہے" کی تاریخی اہمیت
مہمان خصوصی جناب سبط رضی (ایم پی) نے
کتاب کو سراہتے ہوئے کہا کہ رفعت سروش
ایک دردمند دل رکھتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں
سے قومی یکجہتی کو فروغ دیتے رہے ہیں۔
پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے اس کتاب کو
ایک قدر اوّل کی خود نوشت قرار دیا اور ایک
مقالہ پڑھا جس کا موضوع تھا۔ کردار نگاری۔
انھوں نے کتاب سے بہت سے حوالے دیے
اور ڈاکٹر خلیق انجم، اور چند
عمومی کرداروں مثلاً ایک خانساماں اور ایک
پولٹیشن کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب میں
ہم سیکڑوں لوگوں سے ملتے ہیں جیتا ہے۔
م۔م۔ راجندر نے اپنے مقالے میں رفعت سروش
کی ریڈیو کی زندگی اور ان کے کام کے پہلو
کا تفصیل سے ذکر کیا۔ بھوپال سے آئے مہمان
دانشور عشرت قادری صاحب نے فرمایا کہ
اب تک ہم دلی کا ذکر شاہد احمد دہلوی اور
اشرف صبوحی تک پڑھ سکتے تھے۔ اس کے
بعد یہ کتاب آئی ہے جو دلی کے نئے روپ
اور ادبی اور ثقافتی منظر نامے کو پیش کرتی ہے۔
ڈاکٹر نفیسہ بیگم نے اس کتاب کی اہمیت کا ذکر
کرتے ہوئے رفعت سروش کی پرخلوص
شخصیت پر روشنی ڈالی۔ اس جلسے کی نظامت
جناب ابوالفیض سحر نے نہایت عمدگی سے کی اور
جلسے میں ادبی وقار کی فضا قائم رکھی اور جامع
الفاظ میں مقررین کا تعارف کرایا۔ آخر میں
مسز شبانہ نذیر نے نارنگ کتاب گھر کی طرف
سے شکریہ ادا کرتے ہوئے موثر انداز میں کہا
کہ کاش وہ دن بھی آئے کہ ہم رفعت صاحب
کی پچاسویں کتاب کا جشن منائیں۔

ظفر گورکھپوری کی شاعری پر مذاکرہ

گزشتہ دنوں گورکھپور کے ادبا و شعرا کی ایک
مخصوص نشست ڈاکٹر محمد شعیب ندیم کی قیام
گاہ پر زیر صدارت پروفیسر اختر لاری، صدر شعبۂ
اردو گورکھپور یونیورسٹی منعقد ہوئی جس میں
جناب ظفر گورکھپوری کو مہاراشٹر اسٹیٹ

اردو اکادمی کی طرف سے ملنے والے ریاستی انعام پر مسرت کا اظہار کیا گیا۔ اس موقع پر ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے ظفر کی شاعری اور ان کے لب و لہجہ پر اظہار خیال کیا۔

سید اکبر علی، ریسرچ فیلو شعبۂ اردو گورکھپور یونی ورسٹی نے ظفر کے مجموعے "چراغ چشم تر" پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ایسی شاعری ہمارے جذبات کی تطہیر کرتی ہے۔ انھوں نے اس مجموعے کو اردو شاعری میں اضافہ قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر محمد شعیب ندیم نے ظفر کو اس عہد کا ایک اہم شاعر قرار دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے شاعری کے تمام تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ ان کی شاعری اردو کی بہترین شاعری ہے۔ جناب جوہر وارثی نے ظفر کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کی شاعری فکری جہات کی حامل ہے۔ ان کے یہاں عصری آگہی کے ساتھ ساتھ تخیل کی بلند پروازی بھی ہے۔ ڈاکٹر منظور ادیب نے مقررین کی آرا سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ ۱۹۶۰ء کے بعد جو شعرا منظر عام پر آئے اور جنھوں نے اپنی ایک پہچان بنائی اس میں ظفر گورکھپوری کا نام قابل ذکر ہے۔ انھوں نے آگے کہا کہ ظفر کا پہلا مجموعہ خالص نظموں کا مجموعہ ہے۔ اگر صرف اسی کے توسط سے ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو بآسانی ہر آدمی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر ترقی پسند شاعر ہیں۔ لیکن ایسے ترقی پسند نہیں جو اپنی شخصیت و ذات کی پہچان کھو دے۔ ڈاکٹر افغان اللہ خاں لکچرر شعبۂ اردو گورکھپور یونی ورسٹی نے ظفر کی شاعرانہ فن کاری کا جائزہ لیا اور فرمایا کہ ان کی شاعری فن اور فکر کے بہترین امتزاج کی شاعری ہے۔ ظفر ترقی پسند ضرور ہیں مگر انھوں نے جدید رجحانات کو بھی قبول کیا۔

آخر میں صدر جلسہ پروفیسر احمر لاری، صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونی ورسٹی نے اردو شاعری اور اس کے فنی نکات پر سیر حاصل بحث کی نیز ظفر گورکھپوری اور ان کے ہم عصر شعرا کی شاعری کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ وہ اپنے ہم عصروں میں اس لیے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی ایک الگ راہ نکالی۔ وہ اپنے ہم عصروں سے قدرے مختلف ہیں۔ وہ ترقی پسند ہیں لیکن ایسی ترقی پسندی کے قائل نہیں جو صرف پروپیگنڈے تک محدود ہو۔ عصری مسائل ان کی شاعری کا محور اور مرکز ہیں۔

آخر میں ایک شعری نشست بھی ہوئی جس میں شعرا نے اپنے اپنے کلام سے سامعین کو نوازا۔

پروفیسر مشتاق کی وفات پر تعزیت

علمی و ادبی حلقوں میں یہ خبر حسن کرافسوس ہوگا کہ پروفیسر مشتاق احمد (ریڈر شعبہ اردو کلکتہ یونی ورسٹی) کا ۵۴ سال کی عمر میں مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ پروفیسر کے سانحۂ ارتحال پر ادارہ اردو پروگریسیو آرگنائزیشن و کتاب نما گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے خدا حق مغفرت کرے نیز مرحوم کے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق مرحمت فرمائے (آمین)

جگن ناتھ آزاد انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر منتخب

نئی دہلی ۲۳ جولائی۔ اردو کے ممتاز شاعر، نقاد اور ماہر اقبالیات پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو انجمن ترقی اردو (ہند) کا صدر منتخب کیا گیا اس سے قبل علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے سابق وائس چانسلر سید حامد انجمن کے صدر تھے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد انجمن کے گیارھویں صدر ہیں انجمن کے پہلے صدر پروفیسر آرنلڈ اور پہلے جنرل سکریٹری علامہ شبلی ۱۹۰۲ء میں منتخب ہوئے تھے۔

ڈاکٹر معظم جیراجپوری نہیں رہے

نئی دہلی ۲۵۔ مولانا اسلم جیراج پوری کے صاحبزادے ڈاکٹر معظم جیراج پوری کا انتقال ۱۴ جولائی کو عارضہ قلب میں شام ۳ بجے انتقال ہوگیا۔ موصوف جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ابتدائی دور کے طالب علم تھے۔ جامعہ اور جامعہ برادری سے ان کی عقیدت اور محبت مثالی تھی موصوف اعظم گڑھ کے مقبول ترین ڈاکٹر تھے۔ ان کے کلینک میں دور دور سے مریض آتے تھے اور شفایاب ہوتے تھے۔ مکتبہ جامعہ سے موصوف کو بے حد لگاؤ تھا۔ جب بھی دہلی آتے مکتبہ جامعہ میں ضرور تشریف لاتے۔ پچھلے ایک سال سے موصوف جامعہ نگر میں اپنی صاحبزادی کے ساتھ ہی رہ رہے تھے۔ تدفین جامعہ کے قبرستان میں ہی ہوئی۔ مکتبہ جامعہ اپنے سچے محسن کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور متعلقین کو اس صدمہ عظیم کو برداشت کرنے کی طاقت دے۔

پروفیسر نورالحسن نہیں رہے

پروفیسر نورالحسن سابق صدر شعبہ تاریخ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ گورنر مغربی بنگال کا کلکتے میں انتقال ہوگیا اور تدفین جامعہ کے قبرستان میں ہوئی۔ پروفیسر نورالحسن ۲۶ دسمبر ۱۹۲۰ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ الہ آباد یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ لکھنؤ یونی ورسٹی میں تاریخ کے لکچرر رہے پھر علی گڑھ یونی ورسٹی کے شعبہ تاریخ سے منسلک ہو گئے بعد ؤزیر تعلیم بھی رہے۔ موصوف بے حد ذہین اور ممتاز تاریخ داں تھے۔ ادارہ کتاب نما موصوف کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور آپ کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔

فخرالدین کمیٹی، اردو اکادمی کی تشکیل نو

ملک زادہ اور زاہدی صدر نامزد

لکھنؤ ۲۶ جولائی۔ اتر پردیش کے گورنر مسٹر

نے ریاستی اردو اکادمی اور فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کی تشکیل نو کر دی ہے۔

اردو اکادمی کا صدر گورنر نے مسٹر خان غفران زاہدی کو نامزد کیا ہے جبکہ مجلس عاملہ کا صدر پروفیسر محمود الٰہی سابق پروفیسر گورکھپور یونی ورسٹی کو کیا ہے۔

کمیٹی کے ممبران میں علاوہ سرکاری افسران و صدر شعبہ اردو کے ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ڈاکٹر صبیحہ انور، ڈاکٹر آفتاب احمد، ڈاکٹر محمد یونس نگرامی، ہیکل انساہی، اطہر نبی، شاہد صدیقی، ایم ایم مسعود، رام لعل، ڈاکٹر محمد رضوان علوی، قاضی جلیل عباسی، ڈاکٹر منصور عثمانی، عبدالحمید وحشت، ڈاکٹر ذکیہ جیلانی، ڈاکٹر مہ لقا صدیقی، ڈاکٹر بہادر حسن، ڈاکٹر شاہ عبدالسلام، ڈاکٹر معراج الدین احمد، عرفان صدیقی، بشیر فاروقی، ڈاکٹر سعادت علی صدیقی، ڈاکٹر بشیشر پردیپ، خورشید افسر بسوانی، خمار بارہ بنکوی، بیگم حامدہ حبیب اللہ، شکیل الرحمٰن شمسی، مولانا حمید الحسن، جمیل اختر نعمانی، والی آسی، ناصر فاخری، افتخار حسین خاں علیم، ہلال سیوہاروی، ہوش نعمانی، اطہر عنایتی، ڈاکٹر انور خاں، امیر احمد صدیقی، احمد حسن ایڈووکیٹ، ڈاکٹر ساغر اعظمی، مرزا انور بیگ، انعام علی خاں، عبدالحفیظ ایڈووکیٹ، رئیس انصاری، عشرت علی صدیقی صحافی، پروفیسر سید محمد عقیل، ماسٹر محمود علی خاں، رباب رشیدی، صلاح الدین عثمان صحافی، شہریار، فضل الرحمٰن، ایم کوٹھا وی راہی، نجمی مظفر نگری، حسین امیق صحافی۔

فخرالدین علی احمد کمیٹی

نامزد صدر ملک زادہ منظور احمد، سرکاری افسران کے علاوہ دیگر ممبران کے نام ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس، علی جواد زیدی، راجیندر بہادر موہن، احمد محی الدین، طیش صدیقی۔

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانبدارانہ روایت کا نقیب

ستمبر ۱۹۹۲ء جلد ۳۲ شمارہ ۹

فی پرچہ	6/-
سالانہ	55/-
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	75/-
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک)	170/-
(بذریعہ ہوائی ڈاک)	320/-

اڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
TELEPHONE 630190

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپواکر جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

خواجہ غلام السیدین (سوانح) ذکیہ ظہیر ۵/-
میر امّن (سوانح) ڈاکٹر اسلم فرخی ۴/۵۰
میں سمندر ہوں (شعری مجموعہ) فرحان سالم ۳۰/-
مرزا ادیب (سوانح) طاہر مسعود ۴/۵۰
دیدہ و شنیدہ (خود نوشت) سید شہاب الدین دسنوی ۲۵/-
ماہنامہ خرام (کرم ہوا نمبر) مدیر: عشرت ظفر ۲۰/-
کرشن چندر شخصیت اور فن۔ جگدیش چندر ودھاون ۲۵۰/-
ساحل (ناول) غیاث الدین دیشمکھ ۲۵/-
جنوب کا شعر و ادب (تنقید) علیم صبا نویدی ۶۰/-
نذر بیدر (تذکرہ) ڈاکٹر قیوم صادق ۵۰/-
مجمع الافکار (تاریخ ہند (عہد وسطیٰ، فارسی میں) مرتبہ: ڈاکٹر اقتدار حسین صدیقی ۲۰/-
محبوب الالباب فی تعریف الکتب والکتاب۔ خدا بخش خاں ۱۲۵/-
بقیہ طلسم ہوشربا اوّل۔ منشی احمد حسین قمر ۱۰۰/-
〃 دوم 〃 ۱۰۰/-
ہندوؤں کے اوتار لالہ بالکشن برہ آبر ۲۰/-
جامع الشواہد (مولانا آزاد) تقدیم: مسیح الحسن ۴/-
ہندستان اپنے حصار میں۔ ایم جے اکبر۔ مترجم مسعود الحق ۱۰۰/-
کرنل محبوب احمد۔ آزادی کے سرفروشوں کی کہانی مترجم۔ عابد امام زیدی ۲۵/-
مانوس (شاعری) عباس دانا ۵۰/-
معجون (شاعری) واحد انصاری ۲۰/-
افکار محروم (دنیا اڈیشن) مضامین، ترتیب مالک رام ۷/-
جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ، ادب، تنقید، ترتیب ڈاکٹر قمر رئیس ۱۵۰/-
آہنگ کیف شاعری کیف بھوپالی ۱۰۰/-
مفہوم القرآن۔ قرآن مجید کا منظوم ترجمہ از کیف بھوپالی ۱۲۰/-

نمایندہ پنجابی افسانے، افسانوی مجموعہ رتن سنگھ ۸۵/-
عورت اور دور جدید مذہب میز احمد خلیلی ۲۲/-
مرقع دہلی (دنیا اڈیشن) تاریخ دہلی ترتیب خلیق انجم ۱۴۰/-
رموز فکر و فن مضامین زاہدہ زیدی ۱۱۵/-
فسانہ کہیں جسے (تنقید) سید آشور کاظمی ۱۵۰/-
اردو کی چند نایاب مثنویاں مثنویات ڈاکٹر حامد اللہ ندوی ۱۵۰/-
قسمت کے خریدار ناول فریدہ رحمت اللہ ۲۰/-
کلیات اقبال (دنیا اڈیشن) اقبالیات ڈاکٹر محمد اقبال ۵۰/-
فطرت نسوانی ماجد عفی عنہ ۶۰/-
ابلیکا نمبر ۹ ناول اسلم راہی ۲۵/-
کالا جادو 〃 ایم اے راحت ۳۵/-
مان سرور ۸ حصے متفرق ناول پریم چند ۵۲/-
جدیدیت کی جمالیات جمالیات لطف الرحمن ۳۰۰/-
نورینہ نیا اڈیشن ناول اے آر خاتون ۵۰/-
خوامخواہ 〃 〃 شوکت تھانوی ۴/۵
مسکراہٹیں 〃 〃 〃 ۳۵/-

مہمان مدیر
گربچن چندن
جی ۲۶ ایم - جنگ پورہ
ایکس ٹینشن - نئی دہلی ۱۴

اردو صحافت کے تشنہ گوشے

اردو صحافت بنگلہ صحافت کے بعد ہندستان کی قدیم ترین لسانی صحافت ہے۔ ہندی، مراٹھی، گجراتی وغیرہ حتیٰ کہ ہندستانیوں کی طرف سے جاری کردہ انگریزی کی صحافت بھی یہاں اس کے بعد شروع ہوئی۔ اس لحاظ سے پورے برصغیر کی دیسی صحافت کے سامنے یہ اپنے زمرے کی اوّلین نظیر ہے۔ اس کا آغاز ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو ہری ہردت نامی ایک بنگالی کی ایج سے کلکتہ سے "جام جہاں نما" کے اجرا سے ہوا۔ لیکن یہ اجرا کوئی سراسر نئی روایت بھی نہیں تھی بلکہ اس روایت کی ایک ترقی یافتہ صورت تھی۔ اس سے قبل فارسی کی قلمی صحافت صدیوں سے یہاں رائج تھی۔ اس کے منتظم اور قاری اہلِ اقتدار تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کے قارئین کا حلقہ وسعت پاتا رہا۔ بہرحال اس کے نامہ نگار وہی تھے جنھوں نے بعد میں اردو صحافت کی زمین کی آبیاری کی۔ ۱۸۳۶ء میں گورنر جنرل کی کونسل کے رکن میکالے نے صحافت پر اپنے ایک نوٹ میں کہا تھا کہ،

> عام لوگوں میں دیسی زبانوں کی مطبوعہ صحافت کا اتنا اثر نہیں جتنا قلمی صحافت کا ہے۔ پیشہ ور وقائع نگاروں کے مرتب کیے ہوئے بے شمار قلمی اخبار نکلتے ہیں۔ ہر کچہری اور ہر دربار کے باہر وقائع نگار منڈلاتے رہتے ہیں۔ صرف دہلی سے ہر روز قلمی ۱۲۰ اخبار بذریعہ ڈاک باہر بھیجے جاتے ہیں [1]

وہ دور اردو صحافت کا ابتدائی دور تھا لیکن یہ ایک تجربہ کار صحافت کی بنیاد تھی۔ چنانچہ روزِ اول ہی سے اس کی خبر نگاری میں ایک ہنرمندی تھی لیکن ہمیں اس کے مورخوں سے اس کی معلومات خال خال ہی ملتی ہیں۔ گویا ہماری تشنگی صحافت کے دورِ اول ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔

عالم یہ ہے کہ ہمارے پاس آج تک اردو صحافت کی کوئی جامع یا مفصل

تاریخ ہی نہیں ہے۔ انیسویں صدی کے اس کے ۸۷ سال کے قدرے طویل عرصہ حیات میں ہمارے کسی صحافی یا مبصر نے اس کی کوئی تاریخ نہیں لکھی۔ صرف فہرست سازی کی چند کاوشیں ہوئیں۔

ان میں سے پہلی پنڈت جیون رام کی یواری بی بی اخبارات" ہے جس میں وہ اپنے سرکاری دفتر خانہ فارسی میں آنے والے اخباروں کا اندراج کرتا تھا۔ یہ ایک سراسر قلمی اور محدود دستاویز تھی اور اب نیشنل آرکائیوز کی الماریوں میں مستور ہے۔

دوسری کلکتہ کے ماہنامہ "نتیجۂ سخن" کے مدیر شیخ محمد وزیر کی فہرست ہے جو اس نے اپنے گلدستے کے اوراق میں شائع کی۔ اس کی حدِ آخر فروری ۱۸۸۳ء ہے اور یہ بیشتر شمالی ہند کے اخباروں تک محدود ہے۔

اور تیسری فہرست سید محمد اشرف کی تالیف 'اخترِ شاہنشاہی' ہے جو ۱۸۸۸ء میں کتابی صورت میں چھپی۔ اس میں مطابع اور اخبارات کے نام مشترکہ صفوں میں شامل ہیں اور بعض نام آپس میں خلط ملط ہو گئے ہیں۔ اس سے ملنے والی معلومات کی نوعیت بھی نہایت مخصوص اور سطحی ہے۔

ان کے علاوہ ایک اور ماخذ ایک فرانسیسی مبصر گارساں دتاسی کے خطبات ہیں جو انھوں نے ہندستانی زبان اور ادب کی نشوونما پر اپنے ملک ہی کے اندر دیئے۔ وہ بدلتے ہندستان کے نئے علمی اور تہذیبی رجحانات کے سرگرم مشاہد تھے اور اپنے مطالعات اور دیگر ذرائع سے ان کے بارے میں معلومات فراہم کرتے تھے۔ انھیں کی بنا پر انھوں نے مذکورہ خطبات دیے اور مقالات بھی لکھے۔ لیکن ان کی حیثیت اردو صحافت کی کسی دانستہ یا مربوط تاریخ کی نہیں بلکہ ایک بے سلسلہ قرائینی اور اتفاقی شہادت کی سی ہے۔

بیسویں صدی کا آغاز بھی فہرست سازی ہی سے ہوا۔ البتہ دوسرے دہے سے تاریخ نگاری کا کام شروع ہوا اور ہوتے ہوتے مندرجہ ذیل کتب سامنے آئیں

عنوان کتاب	مصنف	سال اشاعت
(۱) فہرست اخباراتِ ہند	مرتبہ مولوی محبوب عالم	۱۹۰۴ء
(۲) اخبار نویسوں کے حالات	منشی محمد دین فوق	۱۹۱۲ء
(۳) تاریخ صحافتِ اردو (پانچ جلدیں)	امداد صابری	۱۹۵۳ء تا ۱۹۸۳ء
(۴) ہندستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں)	محمد عتیق صدیقی	۱۹۵۷ء

(۵) صحافت پاکستان و ہند میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ۱۹۶۳ء
(۶) اردو صحافت کی تاریخ نادر علی خاں ۱۹۸۷ء

۱۸۲۲ء

نمبر وار ان کی کیفیت حسب ذیل ہے

(۱) یہ فہرست تجارتی اغراض کے لیے مرتب اور شایع کی گئی تھی جس سے اخبار خریدنے والوں اور ان میں اشتہار دینے والوں کو اخبار کا نام، مقام، پتہ اور قیمت معلوم ہو سکے۔ اس میں کسی اخبار کی تاریخ یا اس کی واقعات نگاری نہیں کی گئی۔ لہذا نہایت محدود اور تشنہ ہے۔ اس میں اردو کے علاوہ ملک میں چھپنے والے دوسری زبانوں کے اخباروں کے نام و پتے بھی درج کیے گئے۔ یہ فہرست حال حال تک دستیاب نہیں تھی۔ لیکن ۱۹۹۲ء میں مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور کے زیر اہتمام اس کا نیا اڈیشن "اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس کی ترتیب، مقدمہ اور حواشی کا کام کراچی یونی ورسٹی کے لیکچرر جناب طاہر مسعود نے بڑی محنت اور خوبی سے کیا ہے۔

(۲) منشی محمد دین فوق نے ایک سو صفحات کی مختصر کتاب میں صرف ۲۸ ہم عصر صحافیوں کے احوال پیش کیے ہیں۔ اس میں اردو صحافت کی تاریخ رقم کرنے کا کوئی اہتمام نہیں ہوا۔

(۳) امداد صابری کی پانچ جلدوں کی ضخیم بلکہ کوہ قامت تاریخ اس صحافت کے تقریباً ایک سو دس سال کا احاطہ کرتی ہے۔ بیان مفصل اور اقتباسات وافر ہیں۔ لیکن نگارش تجزیاتی کی نسبت داستانی ہے۔ بہر حال بڑی مفید اور اپنی نوعیت کی واحد کتاب بلکہ قاموس صحافت ہے لیکن ۱۹۳۰ء پر ختم ہو جاتی ہے۔

(۴) محمد عتیق صدیقی کی کتاب نہایت بیش قیمت تحقیقی مواد پیش کرتی ہے اور اپنے موضوع پر نہایت اہم کتاب ہے لیکن یہ ۱۸۵۷ء پر ختم ہو جاتی ہے۔

(۵) ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی کتاب اپنے سن اشاعت تک اردو صحافت کی واحد مکمل تاریخ ہے خاصی تحقیق اور چھان بین کی حامل ہے۔ لیکن پاکستانی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے۔ اس لیے سخن فہم سے زیادہ طرفدار ہے مثلاً ۱۹۰۵ء میں بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے برطانوی حکومت کے اعلان کے خلاف جو زبردست اور کامیاب تحریک چلی اس کے بارے میں موصوف نے لکھا:

> بنگال میں ہندوؤں نے اس کے خلاف طوفان کھڑا کر دیا۔ تقسیم بنگال کے بارے میں ان کا نعرہ یہ تھا کہ مادرِ وطن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے ہیں۔ انھوں نے اس کی تنسیخ کے لیے سر دھڑ کی بازی لگادی۔[۲]

اسی انداز سے کام لیتے ہوئے اردو صحافت کی متعدّد قومی تحریکوں کی حمایت اور ہندو ملکیت کے اخباروں کی خدمات کو چٹکیوں پر اُڑا دیا گیا ہے۔ نیز یہ دعوا کیا گیا ہے کہ اردو اخبار زمانہ قدیم ہی سے دو قومی نظریے سے کام لے رہے تھے۔

(۶) نادر علی خاں کی تاریخ بھی گہری تحقیق کی حامل ہے۔ اور اس میں کئی نئے نکات پیش کیے گئے ہیں۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ لیکن اس میں اردو صحافت کے صرف ابتدائی ۳۵ سال ہی کے احوال ملتے ہیں۔

پاکستان میں اردو صحافت کی چند اور کتابیں بھی چھپی ہیں لیکن ان کی توجہ بھی مسلم ملکیت کے ان اخباروں پر مرکوز ہے جن کی تحریروں میں دو قومی نظریے کی حمایت کے کئی زاویے ابھر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب کا عنوان ہے "پاکستان و ہند میں مسلم صحافت کی مختصر ترین تاریخ" یہ کتاب ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کے مولف ڈاکٹر مسکین علی حجازی نے اپنے "حرف آغاز" میں لکھا ہے :

صحافت معاشرے کی عکاسی کرتی ہے۔ معاشرے میں بیک وقت سیاسی، سماجی، معاشی، دینی، ادبی، علمی، ثقافتی رجحانات دھاروں کی صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کی صحافت اس سرزمین کے حالات کی عکاسی کرتی رہی۔ معاشرہ مختلف قوموں میں تقسیم تھا۔ مسلم معاشرت ہندو معاشرت سے الگ اور مسلم سیاست ہندو سیاست سے مختلف تھی۔ چنانچہ صحافت کا بھی مسلم صحافت اور غیر مسلم صحافت میں تقسیم ہونا ایک فطری امر تھا۔ اگرچہ کچھ اخبارات و جرائد نے ہندو مسلم کشمکش سے الگ یا بالا رہنے کی کوشش کی لیکن وہ معروضی حالات میں صحیح نہیں تھی۔ اس لیے ایسی کوشش بارآور نہ ہوئی اور ایسے اخبارات و جرائد اپنے دور میں فیصلہ کن کردار ادا نہ کر سکے۔" (ص : ۹)

یہ ایک سراسر غیر علمی اور غیر منطقی اندازِ فکر ہے۔ دو قومی نظریے کی حمایت اور پاکستان کے قیام کی قرارداد ۱۹۴۰ء میں پاس ہوئی۔ اب ۱۹۴۰ء کے ذہن کو پچاسوں سال پیچھے ڈھکیل کر اپنی بات تھوپنا ایک غیر اصولی انداز نہیں تو اور کیا ہے؟ مصنف کے استدلال کی کمزوری ان کے اس اعتراف میں ظاہر ہے کہ کچھ اخبارات و جرائد نے ہندو مسلم کش مکش سے الگ یا بالا رہنے کی کوشش کی۔ بہ ہر حال ایسی تصانیف اردو صحافت کے تشنہ گوشوں کو اور زیادہ نمایاں کرتی ہیں۔

مذکورہ بالا کتب کے علاوہ ہندستان میں علاقائی صحافت پر چند کتابیں چھپی ہیں۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری (پٹنہ) نے اپنے ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی سربراہی میں لائبریری کے قدیم ذخیرے سے چند نہایت مفید صحافت کتابیں شائع

کی ہیں اور صحافت کے مختلف پہلوؤں پر متفرق مضامین کے کچھ مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں لیکن امداد صابری کے بعد اردو صحافت کی مکمل تاریخ لکھنے کی کوئی کوشش یہاں ابھی تک نہیں ہوئی۔

اردو صحافت کی پیش رو اور مورث فارسی کی قلمی صحافت نے وقائع نگاری میں ایک مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔ اس کے اخباروں میں حکمرانوں کے روزنامچے، سرکاری احکام، بادشاہ اور اس کے وزیروں کے اِدھر اُدھر جانے کی خبریں، ان کے درباروں کی تقریبیں اور ان کی کئی دیگر سرگرمیوں کی اطلاعات ہوتی تھیں۔ ۱۷۴۰ء کے زمانے کے انھیں اخباروں کی مدد سے کرنل جیمس ٹاڈ نے راجستھان کی مشہور تاریخ مرتب کی اور ۱۸۵۷ء کی اوّلین معرکہ خیز تحریکِ آزادی نے جلا پائی۔ خود گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے جون ۱۸۵۷ء میں کہا تھا:

> دیسی اخباروں نے خبریں شائع کرنے کی آڑ میں ہندستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ حد تک بغاوت کے جذبات پیدا کر دیے۔ یہ کام بڑی مستعدی، چالاکی اور عیاری کے ساتھ انجام دیا گیا۔ ۲ ؎

فرنگی اقتدار کے خلاف ہُنرمندی سے جذبات بیدار کرنے کی اسی روایت سے جامِ جہاں نما، مرآۃ الاخبار، دہلی اردو اخبار، صادق الاخبار اور سلطان الاخبار، ایسے جریدے پیدا ہوئے۔

اردو صحافت کی بنیادوں کی تعمیر کرنے والے ان اخباروں کو ہمارے موقر مورّخوں سے وہ توجہ نہیں ملی جس کے یہ مستحق ہیں۔ کچھ مورّخوں نے چلتے چلتے ان کا اجمالی ذکر کیا ہے لیکن اس ذکر سے زیادہ ان کی فروگذاشت نمایاں ہے۔ اس فروگذاشت کا یہ عالم تھا کہ اردو کے نہایت اوّلین مطبوعہ اخبار "جامِ جہاں نما" کو ایک سرکاری گزٹ کہہ کر نظر انداز ہی کر دیا گیا تھا۔ راقم الحروف نے اس کے اوریجنل اور عصری ریکارڈ پر تحقیق کرنے کے بعد دیکھا کہ یہ ایک آزاد، خوددار اور صحافت آفریں اخبار تھا جس کی تحریروں نے حکامِ وقت کو برہم کیا۔ اس تحقیق کے نتائج راقم کی کتاب "جامِ جہاں نما: اردو صحافت کی ابتدا" میں شامل ہیں جو مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے ۱۹۹۲ء میں شائع کی۔ ان اخباروں میں کوئی صحافی فرقہ وارانہ تصورات یا اکثریت کی عصبیت کے خوف کو قصداً ہوا نہیں دے رہا تھا۔ اکثر و بیشتر اخبار فرنگی کی زیادتیوں اور بے انصافیوں کی شکایت کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ سینکڑوں قلمی اخبار بھی جن کے وقائع نگاروں میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے، حقیقی حالات اور اہلِ اقتدار کے افعال کو مشتہر کر رہے تھے۔ ان کی تحریروں سے ۱۸۵۷ء کی عظیم بغاوت کی جو فضا تیار ہوئی، ان میں ہندو مسلمان سب نے غیر ملکی

غلبے سے نجات پانے کا خواب دیکھا۔

۱۸۵۷ء سے قبل کے اردو اور فارسی اخباروں کے خاصے حصے میں اس خواب کے خیالات اور تصوّرات اُبھرتے رہے۔ لیکن عتیق صدیقی کی ایک کتاب کے علاوہ ان پر کوئی منظم یا مفصل تحقیقی مواد مرتّب نہیں کیا گیا۔ یوں اردو صحافت پر ہندستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں کام ہو رہا ہے لیکن اس صحافت کے سارے پہلوؤں پر علمی اور اصولی اعتبار سے موزوں کام ہندستان ہی میں ہو سکتا ہے۔ پاکستان میں جو تیور اور انداز تاحال رونما ہوئے ہیں وہ اوپر بیان کر ہی دیے گئے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی عظیم بغاوت کو دبانے کے لیے فرنگی حکومت نے بے انتہا جبر و استبداد سے کام لیا۔ جس سے بہت سارے اخبار بند ہو گئے۔ شہادت پانے والے ان اخباروں میں اردو اور فارسی اخباروں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ اس کے بعد اردو صحافت کا نیا دور شروع ہوا۔ اب متعدد اخبار حکومت کی ستائش اور خوشامد میں اپنی برتری ڈھونڈتے تھے۔ لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک نہ رہی۔ گلدستے تو قارئین کو شعر و سخن سے پہلے ہی بہلا رہے تھے اب کئی سارے اخبار طنز و مزاح سے تفریح طبع کا سامان مہیا کرنے لگے۔ لیکن اس صنف کے پردے میں وہ دل کی بات بھی کہتے رہے۔ اسی کے ساتھ سرسیّد احمد خاں کی اصلاحی صحافت کے زیرِ اثر متانت اور علمیت کا رنگ بھی نمایاں ہوا۔ ان تبدیلیوں سے عین قبل قلمی اور مطبوعہ اخباروں کے جائزے سے حکومت نے یہ محسوس کیا تھا کہ اخباروں کے چلن کو دشوار بنانے کی بہ جائے خود اسے کچھ ایسے اخبار جاری یا مضبوط کرنا چاہئیں جو اس کی موافقت کا کام کریں۔ اس کے نیے تعلیمی اداروں سے علمی اور مغربی علوم کو فروغ دینے والے رسالے تو پہلے ہی شروع ہو چکے تھے۔ اب مختلف مقامات سے سرکاری اداروں نے اپنے گزٹ اور کچھ اخبار بھی جاری کیے۔ ان میں کوہ نور (لاہور) دریائے نور (لاہور) مفادِ ہند (لاہور) خورشید عالم (سیالکوٹ) اور نور الابصار (الہ آباد) شامل تھے۔ اس زمرے کا سب سے نمایاں جریدہ پنجاب کا کوہِ نور تھا۔ جو ۱۸۵۰ء میں جاری ہوا۔ اسے نہ صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی حمایت بلکہ مہاراجگان کشمیر و پٹیالہ کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ یہ اخبار قریباً ایک چوتھائی صدی تک شمالی ہند اور بالخصوص پنجاب کی سیاسی اور سماجی زندگی میں نمایاں رہا۔ اس کے جلو میں اخبار عام، اور پیسہ اخبار نکلے جو دونوں کے دونوں حکومت نواز تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ صحافت خیز بھی تھے۔ انھیں کی بدولت جدید صحافت کے پہلے نقوش اُبھرے۔ لکھنؤ کے اودھ اخبار نے بھی جس کا بانی منشی نول کشور کوہِ نور ہی کے مکتب سے نکلا تھا ہندستان اور غیر ممالک میں اردو صحافت کا نام بڑھایا۔ لیکن انیسویں صدی کے آخری ربع میں مزاحیہ اور طنزیہ صحافت کا رخ سیاسی میدان کی طرف ہو گیا۔

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے اس صحافت کو ایک نیا رُخ ملا۔ انڈین نیشنل کانگریس نہ صرف ملک کے ممتاز اہلِ فکر و دانش کی پہلی منظم کل ہند جماعت تھی بلکہ نئے سیاسی دور میں ہندستان میں متحدہ قومیت کا احساس شعور جگانے اور بڑھانے والی اوّلین تحریک تھی۔ اس وقت یہ فرنگی اقتدار کے اخراج یا قومی آزادی کے لیے جہاد کرنے والی جماعت نہیں تھی۔ صرف حکومت کے طور طریقوں میں انصاف پسندی اور ملک کے تمام لوگوں میں ترقی کی خواہش بڑھانے والی ایک جماعت تھی جس کے ابتدائی اجلاسوں میں یونین جیک کا جھنڈا نصب کیا جاتا تھا۔ یہی جماعت رفتہ رفتہ ہندستان کے مستقبل کی معمارِ اول بنی۔

اس کی نشوونما میں اردو صحافت نے کیا کردار ادا کیا اس کا آج تک کوئی جائزہ نہیں لیا گیا۔ ہمارے جدید قومی شعور کے، جس کا جنم انیسویں صدی ہی میں ہوا، ارتقاء میں یہ جائزہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ راقم الحروف جس کی عمر اب ۷۰ سال سے اوپر ہے، جو اس مضمون میں فروگذاشتوں کا انبار لگانے کا جرم کر رہا ہے۔ اس کی یادداشت میں کم از کم اس عنوان پر کچھ کام کرنا چاہتا ہے۔ انشاء اللہ مستقبل قریب میں اس کی حقیر کاوش مرتب ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں قارئین اگر اسے کوئی رہبرانہ مشورہ عنایت کرنا چاہیں تو وہ نہایت ممنون ہوگا۔ اس شعور کی تہہ میں کام کرنے والے جذبے کو بیدار کرنے کے لیے انیسویں صدی کی عظیم ہستی سر سید احمد خاں نے اپنے سخن و قلم سے بہت کام کیا تھا لیکن جب یہ جماعت قائم ہو گئی تو انھوں نے اسے لائق رکنیت تسلیم نہ کیا۔ انھوں نے اس کے خلاف متعدد اعتراضات پیش کیے جن کا جواب کانگریس کے تیسرے صدر بدرالدین طیب جی سے مانگا گیا۔

بدرالدین طیب جی اس دور کے ایک عظیم قانون دان، اسلامیات کے عالم اور دانشور تھے۔ انھوں نے سرسیّد کے اعتراضات کا مفصل جواب دیا اور ساتھ ہی مسلم فرقے کے دین و مذہب اور سماج کے تحفظات کے اس فارمولے کی بھی اطلاع دی جسے ان کی تحریک پر کانگریس کے اکابر نے اتفاق رائے سے منظور کر دیا تھا۔ یہ بظاہر ایک اچھی ابتداء تھی لیکن سرسیّد نے اسے فی الفور رد کر دیا۔ اس موقع پر اردو اخباروں نے کیا کردار ادا کیا۔ اس کا آج تک کوئی جائزہ نہیں لیا گیا۔

بیسویں صدی کے اوائل ہی سے اردو صحافت نے ایک نئی کروٹ لی جس میں مسلم اینگلو اورینٹل کالج، علی گڑھ کے گریجویٹ مولانا فضل الحسن حسرت موہانی اور ان کے رسالہ "اردوئے معلیٰ" نے بڑا تعمیری کام کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب اخبارِ عام، پیسہ اخبار اور اودھ اخبار کا طنطنہ مدھم ہو چکا تھا۔ زمیندار اور پرتاب ایسے

رو رنا سے ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی مہاتما گاندھی ہندستان کے سیاسی میدان میں اترے تھے۔ اس کے باوجود فرنگی راج سے نجات اور کامل آزادی کی تمنا اور تڑپ سرگرم تھی۔

ہمارے مورخ اور بالخصوص پاکستان کے مولف اس صدی میں داخل ہوتے ہی "زمیندار" "الہلال" اور "ہمدرد" پر پہنچ جاتے ہیں جو صدی کے دوسرے دہے میں منظرِ عام پر آئے۔ اس امر کا جائزہ ہی نہیں لیا گیا کہ کوہِ نور کے بعد اخبارِ عام اور پیسہ اخبار نے جو نئی روایتیں قائم کی تھیں وہ انیسویں صدی کے آخر میں کیوں اور کیسے فرسودہ ہو گئیں؟

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں غیر ممالک میں مقیم ہندستانیوں نے چند انقلابی جماعتیں قائم کیں جنھوں نے ہندستان کی جد وجہد آزادی کی حمایت میں اپنے اخبار جاری کیے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر اردو زبان میں تھے ہماری صحافت کے اس پہلو کا بھی ہمارے مورخوں نے کوئی خاطر خواہ جائزہ نہیں لیا پھر صدی کے پہلے دہے میں جن اخباروں اور تحریکوں نے متذکرہ بالا اخبار کے لیے زمین تیار کی ان کے ذکر میں خاصے بخل سے کام لیا جاتا ہے۔

اس دہے میں مشرق میں تقسیم بنگال، مغرب میں لوکمانیہ تلک کے مطالبہ آزادی اور شمال بالخصوص پنجاب میں بھارت ماتا سبھا اور کسان تحریک نے بڑا اہم ساز کام کیا اور پنجاب میں یہ سارا کام اردو اخباروں نے کیا۔ اس کام نے انھیں پورے ملک کی اردو صحافت میں ایک مرکزی مرتبہ عطا کیا۔ اس میں ۱۸۵۷ء کی ۵۰ ویں سال گرہ (۱۹۰۷ء) کے موقع پر اس عظیم جہادِ آزادی کو مکمل کرنے کا منصوبہ بھی شامل تھا۔ ان اخباروں میں ستیہ دھرم پرچارک، ہندستان، دیپک، انڈیا آزاد، پرکاش، جھنگ سیال اور سوراجیہ پیش پیش تھے۔ انھیں اخباروں میں فرنگی حکومت کے خلاف دو عوامی اور معرکہ آرا گیتوں کا بہت چرچا ہوا۔ ایک اردو میں تھا جس کا مطلع تھا:

نہ منٹو ہے والسرائے اپنا
نہ کچھنر ہے کمان افسر

اور دوسرا پنجابی میں تھا جس کا مطلع تھا:

پگڑی سنبھال جٹا پگڑی سنبھال اوے

ان دونوں گیتوں نے کسان تحریک اور ۱۸۵۷ء کی گولڈن جوبلی کے موقع پر فرنگی حکومت کا تختہ الٹنے کی خفیہ سازش کو بے انتہا حرارت دی۔ یہ اس دور کے وہ شعلہ بار پیغام انقلاب بنے جن پر شہروں کے ساتھ دیہات کے عوام نے بھی لبیک کہا۔ انھیں شائع کرنے والے بعض ایڈیٹروں کو قید و بند کی نہایت

سخت اور صحافت شکن سزائیں ہوئیں۔

ان کی خدمات اور قربانیوں سے بیسویں صدی کے دوسرے دہے کا ماحول تیار ہوا۔ لیکن ہمارے مورخ ان گیتوں، ان کے تخلیق کاروں اور ان کی تحریک کو فروغ دینے والے اخباروں کی کوئی تفصیل مہیا نہیں کرتے۔ نہ ہی ان اردو صحافیوں اور ان کے معاونوں کی تفصیل ملتی ہے جنھیں جہادی سرگرمیوں کی وجہ سے کالے پانی (انڈمان میں جلاوطنی) کی جان لیوا سزائیں ہوئیں۔ انقلابی صحافت کے اسی ہراول دستے میں دہلی کا ہفت روزہ "آفتاب" تھا جس کے ایڈیٹر سید حیدر رضا دہلوی نے بڑے معرکے بپا کیے لیکن ہماری تاریخوں میں ان کا ذکر ڈھونڈنے ہی سے ملتا ہے۔

ہمارے مورخوں کے ہاں اس وقت کے ملک کے صف اوّل کے بہت سارے لیڈروں کا ذکر نہیں ملتا یا انھیں فرقہ پرست کہہ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ان لیڈروں میں لاجپت رائے، گوپال کرشن گھوکھلے، بال گنگا دھر تلک، مدن موہن مالویہ، دادا بھائی نوروجی اور منشی رام (بعد میں سوامی شردھانند) شامل تھے۔ اس وقت متعدد مسلم علما اور مسلم دینی اداروں کے ساتھ آریہ سماج، برہمو سماج، سناتن دھرم سبھا اور سکھ دھرم کے متعدد رہنما آزادی کی قومی تحریک میں نمایاں تھے۔ ان لیڈروں اور ان کے فرقوں کی متعدد باتوں سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اس تشکیلی دور میں قومی سیاست میں ان کی جو مقبولیت اور عظمت تھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ انھیں کی سرگرمیوں سے ملک کے لوگوں میں سماجی اور سیاسی شعور کا ایک نیا احساس پیدا ہوا اور سیاسی خیالات میں نئے زاویے نمودار ہوئے۔ اس نئے احساس اور ان نئے زاویوں کی تشکیل و ترتیب میں ان کے اردو اخباروں نے جو رول ادا کیا اور بالخصوص پنجاب کے اخباروں نے جو کام کیا اس کا پورا جائزہ آج تک نہیں لیا گیا۔ اس عمل میں برہمو سماج، آریہ سماج، سناتن دھرم سبھا اور سکھ دھرم کی تحریکوں نے اردو صحافت کو کس طرح متاثر کیا، اس امر کا کوئی باقاعدہ جائزہ نہیں لیا گیا۔ اس زمانے میں آریہ سماج کی تقریباً ساری سرگرمیاں اردو صحافت کے حلقے میں خوب خوب نمایاں تھیں۔ ان سرگرمیوں پر قومی سیاست غالب تھی۔ رولٹ کمشن کی رپورٹ میں کہا گیا کہ

"جہاں جہاں آریہ سماج کا زور ہے وہاں وہاں حکومت کے خلاف تحریک بھی زوروں پر ہے۔"

انگریز حکام نے اس کے ایک تعلیمی ادارے گورو کل کانگڑی کو سیاسی باغیوں کا گڑھ قرار دیا۔

جب یہ سماج دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی تو ان دونوں گروہوں کے سوال و جواب

بھی بیشتر اردو اخباروں ہی میں شائع ہوئے۔ اس تکرار نے پنجاب اور ملک کی سیاست کو بہت متاثر کیا لیکن اس پہلو کا کوئی جائزہ نہیں لیا گیا۔

مہاتما منشی رام (سوامی شردھانند) کی خود نوشت سوانح حیات "دکھی دل کی پُردرد داستان" میں جو تقریباً چھ سو صفحات پر محیط ہے، بیشتر مواد اردو اخباروں سے لیا گیا۔ ہمارے مورخوں نے اس کا کبھی ذکر نہیں کیا۔ ایک غیر ملکی پروفیسر جے۔ ٹی۔ ایف۔ جارڈنز نے آسٹریلیا سے آکر سوامی شردھانند کی سوانح حیات لکھنے کے لیے جو تحقیق کی اس میں اس کتاب اور اس کے مشمولات کا خصوصی ذکر کیا۔

ہمارے مورخوں نے اردو اخباروں کا ایسا جائزہ جستہ جستہ اسلامی سیاق میں تو لیا ہے جو زیادہ تر اس کی بین اقوامی حدود پر محیط ہے لیکن خود اپنے ملک کے اندر قومی کردار کی تشکیل و تعمیر میں کون کون اشخاص اور کیا کیا واقعات آئے، اس پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔

بدقسمتی سے بعض حلقوں میں اردو صحافت کو ہندو اور مسلم خیموں میں بانٹنے کی روش کثرت سے موجود رہی ہے لیکن اس من مانی بانٹ سے تاریخ اور علم کے بنیادی اصولوں کا احترام نہیں ہو سکتا۔ پریس کا کوئی بھی طبقہ ہو وہ عصری حالات اور قارئین کے، جو ہم وطن ہوتے ہیں، احساسات اور خیالات پیش کرتا ہے۔ کیا کسی ایک ہی حصے کو اصلی پریس قرار دیا جا سکتا ہے اور دوسرے حصے کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ اس سوال کے جواب سے اردو صحافت کے کئی اور تشنہ گوشے وابستہ ہیں جن کی تفصیل ایک واحد مضمون میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ البتہ یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ تمام فروگذاشتیں ذہن کے بخل اور متانت سے فرار کی راہیں ہیں۔

فروگذاشتوں کے اس پہلو کا جائزہ کسی فرقہ وارانہ زاویے سے نہیں بلکہ صحافت کی صداقت، سالمیت اور آبرو کے زاویے سے لیا جانا چاہیے۔

بیسویں صدی کے دوسرے دہے میں بلقان کی جنگ، پہلی عالمی جنگ، ترکی کی خلافت عثمانیہ کے خلاف یورپ کی طاقتوں کا از سر نو اجتماع، مہاتما گاندھی کی آمد، رولٹ ایکٹ، عوامی ستیہ گرہ، جلیانوالہ باغ کا سانحہ اور فرنگی مظالم کے خلاف متحدہ احتجاج اور تحریک کے تاریخی واقعات ہوئے اور ہندستان سرا سر نئی تحریکوں کا مرکز بن گیا۔ ان میں ۱۹۱۹ء کی گاندھی جی کی پہلی ملک گیر تحریک، جو رولٹ ایکٹ کی مخالفت کے لیے چلی تھی اور فوراً بعد تحریکِ خلافت کی معاون بن گئی تھی، سب سے زیادہ زبردست تھی۔

مہاتما گاندھی کی آمد اور عوامی سیاست نے اردو صحافت کے مزاج اور رواج میں کیا تبدیلی کی، اس کی خاطر خواہ تحقیق نہیں ہوئی۔ گاندھی جی کی تحریک کے اعزاز میں جو ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء کو شروع ہوئی، اسی دن لاہور سے روزنامہ پرتاپ

۱ اجرا ہوا۔ اس کا بانی اور ایڈیٹر مہاشہ کرشن اس سے قبل ۱۳ سال سے ہفت روزہ 'پرکاش' نکال رہا تھا جو اپنی شعلہ باریوں کے لیے مشہور تھا۔ لیکن مہاشہ کرشن نے گاندھی جی کے ستیہ گرہ کے فیصلے سے، جسے ان کے ممدوح سوامی شردھانند نے دھرم یدھ مان کر اور سنیاس چھوڑ کر اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیا تھا، متاثر ہو کر پرتاپ کے نام سے ایک نیا روزنامہ جاری کیا اور یہ اخبار گاندھی جی کی تحریک آزادی کی حمایت کے لیے وقف رہا۔ اس کا ۳۱ مارچ ۱۹۱۹ء کا پہلا شمارہ جو دہلی میں گاندھی جی کے ستیہ گرہ کے آغاز کی تفصیلات سے لبریز تھا، ضبط ہو گیا۔ پنجاب میں اس وقت فوجی نظام نافذ تھا لیکن پرتاپ نے ایک مجاہد کی طرح اس کا سامنا کیا۔ اس نے قید و بند کی مسلسل مصیبتوں کے باوجود اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں کس ثابت قدمی کا ثبوت دیا، اس پر ہمارے مورخوں نے معروضی اور مناسب توجہ نہیں دی۔ پرتاپ کی قانونی کارروائیوں کی بدولت پریس کے قوانین کی سخت گیری میں کیا کیا کمی ہوئی اور آزادی صحافت کے کن کن اوراق کا اضافہ ہوا، اس موضوع پر کوئی الگ سے کام نہیں ہوا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران پنجاب کے کئی سرکردہ اخبار حکومت کا پروپیگنڈا کرنے کے لیے ماہانہ مالی امداد لیتے رہے لیکن پرتاپ ان سے الگ تھلگ رہا۔ بعد میں 'ملاپ' اور 'ویر بھارت' بھی اسی زمرے میں شامل ہوئے۔ اسی زمانے میں جب پرتاپ پر سنسر شپ نافذ ہوا تو اس نے اپنی اشاعت ہی معطل کر دی۔ اس کا پورے ملک میں چرچا ہوا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اس اخبار کی حمایت میں متعدد بیانات جاری کیے۔

ایک اخبار کے ایڈیٹر کا شخصی کردار اور حوصلہ کس طرح اخبار کی پالیسی اور اس کے قارئین کو متاثر کرتا ہے۔ اس موضوع کا جائزہ لینے کے لیے پرتاپ اور اس کی عصری صحافت کا جائزہ ایک بڑا موزوں عنوان ہے جس کی دعوت ابھی تک ہمارے کسی مورخ نے قبول نہیں کی۔ اس تحقیق کی مدد سے یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ کون کون سے ایڈیٹر ایک دن حکومت کے خلاف اپنا جلال دکھاتے تھے اور دوسرے دن زوال کے زینے پر اتر کر معافی مانگ لیتے تھے اور توبہ قبول کر لیتے تھے۔

خواجہ حسن نظامی ایک دفعہ جب لاہور گئے تو مہاشہ کرشن کو ان کے دفتر میں ملنے بھی گئے۔ دوران گفتگو انھوں نے کہا:

"کرشن اگر تم ہندو نہ ہوتے تو میں تمھارے ان ہاتھوں کو چوم لیتا۔"

ہمارے امکانی مورخ کے لیے یہ جملہ جتنا دل چسپ ہے اتنا ہی معنی خیز بھی ہو سکتا ہے۔ دوسرے دہے میں لاہور کے زمیندار، کلکتہ کے الہلال اور دہلی کے

ہمدرد نے اپنی اپنی تلاش اور تحقیق سے مسلم ممالک کے سیاسی احوال کی خبروں
کے نئے دریچے کھولے اور مغرب کی نیوز ایجنسیوں کی اجارہ داری میں شگاف ڈالے۔
جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کے اخباروں سے جذب و اخذ کرنے کی یہ ایک اثر
صفت ابتدا تھی لیکن اس موضوع پر کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا۔ ان اخباروں نے
مسلم ملکوں کے احوال پر پُرخلوص اداریے اور مضامین بھی شائع کیے جن کی بہ
دولت پہلے درجے کی بیداری کی لہر کے ساتھ خیر خواہی کی ایک نئی لہر کا اضافہ ہوا۔
یہ سیاست کی طرف ہندی مسلمانوں کی اجتماعی توجہ کی بھی لہر تھی۔ اس سے قبل
ان کی سیاست عرض داشتیں اور درخواستیں پیش کرنے پر مشتمل تھی۔ آل انڈیا
مسلم لیگ، جو انگریز کی حوصلہ افزائی سے ۱۹۰۶ء میں وجود میں آئی، انھیں مواقع
کی کلغی تھی۔ خلافتِ عثمانیہ کی حمایت میں ہندستانی مسلمانوں میں ایک عوامی
تحریک شروع ہوئی۔ سلطنتِ ترکیہ کی مدد کے لیے ہندستانی مسلمانوں نے
چندہ جمع کیا اور اس کی حوالگی کے لیے ایک طبّی مشن ترکی گیا جس کی قیادت ڈاکٹر
ایم۔ اے۔ انصاری نے کی۔ یہی تحریک اس دور کی تحریکِ خلافت کا عصہ بنی جس
نے ترکِ موالات کی انقلابی تحریک کو جنم دیا اور گاندھی جی کی قیادت میں ہندستان
کے ہندو مسلمان دونوں فرنگی اقتدار کے خلاف اور ہندستان کے اتحاد کے
حق میں صف آرا ہوئے۔ ان کا جوش سنبھالے نہ سنبھلتا تھا۔ اردو اخبار
وحدت اور حرّیت کی گنگا میں نہا رہے تھے۔ بقول پروفیسر رشید الدین ہندستانی
سیاست میں "رام رحیم نظریہ"[۶۵] کی کار فرمائی ملک کے دو بڑے فرقوں کے
درمیان مستقل رفاقت کی آرزو مند تھی۔

اسی زمانے میں اور اس کے بعد کے دو دہوں میں بھی اکثر قارئین اردو
اخباروں کے اداریے بڑی گرم جوشی سے پڑھتے تھے۔ یہ تحریریں ان کے صبح کے ناشتے
کے مانند ہوتی تھیں۔ جو لوگ خود اردو نہیں پڑھ سکتے تھے وہ دوسروں سے پڑھوا
کر سنتے تھے اور اکثر اوقات اس کی کچھ اجرت بھی دیتے تھے۔

آج انگریزی اخباروں کو قومی پریس کہنے کا فیشن اور رواج ہو گیا ہے لیکن آزادی سے قبل بہت
سارے انگریزی اخباروں کا کردار قومی تقاضوں سے متضاد تھا۔ ان کے مقابلے میں اردو مدیروں کے اداریے
تذکرۂ عوام تھے۔ مولانا ظفر علی، مولانا آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مہاشہ کرشن اور دیوان سنگھ مفتون کی تحریریں
روزمرّہ زندگی کی حرارت تھیں۔ ان میں بعض مدیروں کے سلسلہ وار اداریے بھی عوامی ذوق کی توانائی
تھے۔ آزادی کے بعد یہ رواج اور یہ مزاج کیوں کم ہو گیا، اس موضوع کا کوئی خاطر خواہ مطالعہ نہیں کیا گیا۔

حکومتِ ترکیہ نے خلافت کے ادارے کو منسوخ کر دیا جس سے ہندستان کی
تحریکِ خلافت بے معنی اور مسدود ہو گئی۔ اب مطالعۂ باطن کرنے کی بجائے ہندستان
کی سیاست ذہنی انتشار میں مبتلا ہو گئی۔ کہیں شدھی اور کہیں تبلیغ کی تحریکیں شروع

ہو گئیں۔ کئی مقامات پر گھناؤنے فرقہ وارانہ فسادات واقع ہوئے۔ اس مرحلے کے بارے
اکٹر عبدالسلام خورشید نے لکھا ہے:

"مسلم قیادت چند سال تو بھول بھلیوں میں رہی اور ان غیر ملکی مسائل میں الجھی رہی جن کا اس سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ اور نہ یہ قیادت ان مسائل کے پس پردہ مصالح کو سمجھنے پر قادر رہی مثلاً کچھ وقت کمال اتاترک کے خلاف لے دے میں بسر ہو گیا کہ اس نے خلافت کی پتلی کو کیوں قائم نہ رکھا۔ جب والیٔ نجد ابن سعود نے حجاز پر قبضہ کر لیا تو مسلم قیادت کا ایک گروہ ابنِ سعود کی مخالفت کرنے لگا اور بہت جلد یہ مناقشہ حنفیوں اور وہابیوں کا جھگڑا بن گیا۔ پھر خلافت کمیٹی کا ایک وفد حجاز گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ حجاز میں جمہوریہ قائم ہو اور ابنِ سعود سلطان بن گیا۔ اس پر بھی مسلمانوں کا بہت وقت ضائع ہوا۔ شام میں فرانسیسیوں کے خلاف بغاوت ہوئی تو ہندستان کے مسلمان اس پر مشتعل ہو گئے اور مصر سے مطالبہ کرنے لگے کہ تم شام کی مدد کرو حالانکہ مصر خود غلام تھا۔ مختصر یہ کہ ہندستان جل رہا تھا۔ مسلمان فسادات میں پٹ رہے تھے لیکن مسلم قیادت کی توجہ کا مرکز دنیائے اسلام تھی اور اس نے جو کچھ کیا وہ نہ ترکیہ کی مفاد میں تھا نہ حجاز کے مفاد میں تھا۔"[۵]

فسادات کی وجوہ اور تفاصیل کیا تھیں، وہ اس مضمون کا موضوع نہیں۔
لیکن یہ بخوبی ظاہر ہے کہ رولٹ ایکٹ، سانحہ جلیانوالہ باغ اور خلافت کی
تحریکوں کے وہ تمام فوائد زائل ہو گئے جو متحدہ قومیت کے نظریے کی حامل تحریکِ حریت
نے بیشمار جانی اور مالی قربانیوں سے حاصل ہوئے تھے۔
بیسویں صدی کا تیسرا دہا اسی شاخسانے اور اس کے ہم ساز واقعات
داستان ہے۔

۱۹۲۹ء میں انڈین نیشنل کانگرس نے اپنے لاہور کے سالانہ اجلاس میں مکمل
آزادی کے نصب العین کی قرارداد پاس کی۔ اس کے ردِ عمل میں اردو اخباروں
نے کیا رویہ اختیار کیا اس پر کوئی علمی اور معروضی تحقیق نہیں ہوئی حالانکہ اس
کی بےحد ضرورت ہے۔ ایسے جائزوں کے نتائج سے عبرت کا مواد حاصل ہو سکتا ہے۔
معروضی تحقیق کسی کوتاہی اور خرابی کو دور کرنے کا ایک سائنسی علاج پیش کر سکتی ہے
اگرچہ اس کا تعلق مصلحت کوش اہلِ سیاست سے نہیں بلکہ حقائق کے متلاشی
اور ناپسند عوام سے ہوتا ہے۔

یہ ہماری ملی سیاست کا سب سے پر آشوب دور تھا۔ اس کے بعد چالیس کے دہے میں ملک کی سب سے بڑی انقلابی تحریک کوئٹ انڈیا کے نام سے شروع ہوئی اس مرحلے پر اردو اخباروں کا کیا کردار رہا۔ اس امر کی تحقیق کی نوعیت ۱۸۵۷ء اور ۱۹۲۹ء کے تاریخی مرحلوں سے مختلف ہے کیوں کہ ۱۹۴۲ء کے موڑ کی پشت پر مسلم لیگ کی پاکستان کی قرارداد پاس ہو چکی تھی اور وہاں سے واپس لوٹنا امر محال تھا۔ تیس کے دہے کے نظریے ہی بڑھتے بڑھتے اس قرارداد تک پہنچے جو اتفاقاً کم اور قصداً زیادہ لاہور ہی میں پاس ہوئی۔

راقم الحروف پاکستان کے قیام کے خلاف نہیں ہے۔ یہ ایک طرح سے دو بھائیوں کا تصفیہ تھا۔ ان کے پرانے اختلاف کو ختم کرنے کے لیے کوئی حتمی راستہ اختیار کیا ہی جانا تھا۔ لہٰذا یہ اچھا ہوا کہ یہ حتمی مرحلہ طے ہو گیا۔ راقم یہ بھی نہیں بھول سکتا کہ اس کی پیدائش، پرورش اور تعلیم پاکستان کے صوبہ پنجاب کی راجدھانی لاہور میں ہوئی اور اس اعتبار سے پاکستان بھی اس کا اپنا وطن ہے لیکن وہ یہ ضرور چاہتا ہے کہ پاکستان کا قیام پرانے ہندو مسلم اختلافات کا مستقل خاتمہ اور ہندستان و پاکستان کے دو نئے ملکوں کے برادرانہ پڑوس کے نئے دور کا جواز اور استحکام ہونا چاہیے جس میں یہ حجت اور دلیل ایک گناہ اور جرم تصور ہونا چاہیے کہ اگست ۱۹۴۷ء میں متفقہ طور پر قائم کردہ اور تسلیم کردہ ہمارے نئے ملک کی جغرافیائی حدود ابھی نامکمل ہیں اور ان کی تکمیل اب نئے ملک کا گرم یا سرد فریضہ ہے۔ اب ہر ملک کی قیادت اور آبادی کی توجہ اپنے اپنے ملک کی تعمیر اور ترقی پر مرکوز ہونی چاہیے۔ پاکستان کے قیام کے فوراً بعد اس کے بانی قائد اعظم محمد علی جناح نے دو قومی نظریے کو ترک کرنے کی پالیسی کا اعلان کیا تھا اور اپنے ملک کی تمام آبادی کو بلا لحاظ مذہب و ملت مشترکہ اور مساوی شہریت کو فروغ دینے کے لیے کہا تھا۔ سرحد کی دوسری جانب ہندستان نے جمہوریت اور سیکولرزم کے آئین کی منظوری سے اپنے ملک میں مشترکہ اور مساوی شہریت کو فروغ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ لہٰذا دونوں ملکوں کی قیادت اور صحافت کے لیے باہمی تعلقات کی یہی بنیاد اور منزل مقصود ہونی چاہیے۔ ان تعلقات کے اخلاق اور اخلاص کا تقاضہ ہے کہ پرانا ذہن اور انداز فکر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا جائے۔ ہمارے محقق جو آزادی کے بعد کی اردو صحافت کے کسی پہلو پر کام کریں ان کے مد نظر اگر یہ کلیہ مسلم اللہ رہے تو اس صحافت کی صداقت اور سالمیت برقرار رہے گی۔

اخباروں کا جائزہ لینے سے قبل ان کے ناشروں کے نام اور مذہب دیکھ ان کی تحریروں کو ناشر کے مذہب اور فرقے سے جوڑنے کی پرانی روش کی معقولیت اور افادیت اب ختم ہو چکی ہے۔ ماضی میں یہ روش ایک ایسی سیاسی

کی شاخ تھی جواب بے معنی اور مبہم ہے۔ آج ایسے کام کی اہمیت فوراً اسقاط کا شکار ہو جائے گی اور متعلقہ محقق کی محنت اور تالیف بھینگی اور ترچھی ہو جائے گی۔ آج بعض محقق اس میدان میں داخل ہی نہیں ہوتے کہ انھیں کسی ایک یا دوسرے فرقے کے اخباروں پر کوئی ناگوار تبصرہ کرنے کی نوبت سے سابقہ پڑے گا چنانچہ اس خوف کی وجہ سے تشنگی کا وجود دراز تر ہوتا جا رہا ہے۔

آزادی کے حصول سے قبل انگریز کے زمانے میں جب دو قومی نظریے کی قانونی اور ضابطہ بند ہمت افزائی ہوئی اس انداز پر فرقہ وارانہ واہ واہ مل سکتی تھی لیکن آزاد ہندستان میں جس کا آئین جمہوریت اور سیکولرزم کا امانت دار ہے، اس اسلوب کا کوئی مقام نہیں۔

ماضی میں فرقہ وارانہ روش کا ایک اور منفی نتیجہ یہ رہا کہ غلام ہندستان کی ریاستوں میں صحافت اور سیاست فرقہ وارانہ نہادیوں کو اپناتی رہیں۔ ان ریاستوں میں اولاً تو برطانوی نظام کی ابتدائی پالیسی کی پیروی میں صحافت کو پیدا ہی نہ ہونے دیا گیا چنانچہ جموں و کشمیر، حیدرآباد اور دیگر ریاستوں کے حکمرانوں نے اخباروں کے اجرا کی اجازت ہی نہ دی اور ثانیاً جب یہ کچھ آمادہ ہوئے تو ساتھ یہ شرط لگا دی کہ ان اخباروں کو حکومت پر نکتہ چینی نہیں کرنا ہوگی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستان کی سینکڑوں ریاستوں میں بیسویں صدی کے پہلے ربع تک کوئی ڈھنگ کا اخبار نہ نکلا۔ اس باب میں باقی ملک کی صحافت نے کیا کردار ادا کیا۔ اس امر کا آج تک کوئی جائزہ نہیں لیا گیا۔

اردو صحافت کی پیدائش اور نشو و نما ہماری غلامی کے زمانے میں ہوئی۔

غلامی ملک کے ہر فرد کے لیے ایک لعنت اور انتہائی نفریں چیز ہے۔ ہر وہ اخبار جو اس سے نجات پانے کی راہ پر چلتا ہے اور اپنے ملک کی وحدت کا امین ہے، تاریخ صحافت کا زرّیں ورق ہے۔ اس راہ کے استحکام کے لیے غلاموں کا اتحاد اوّلین اور بنیادی ضرورت ہے۔ لیکن اگر کوئی مورخ اس ضرورت کی تلقین کو ناشر یا ایڈیٹر کے فرقے کے مفاد کی ترازو میں تولتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ آزادی ملنے سے ملک کا اکثریتی طبقہ اقتدار میں آجائے گا اور اقلیتیں اس کی غلام ہو جائیں گی تو وہ اصل مسئلے سے ہٹ جاتا ہے۔ اکثریت اور اقلیت ہر ملک کی بنیادی حقیقتیں ہیں اور ملک کے واحد آئین کی، جو اس کے اپنے نمائندوں کی تخلیق ہوتا ہے، یکساں طور پر پابند ہوتی ہیں۔

آج ہر ملک کی بقا اور بہتری کے لیے ایک جمہوری اور سیکولر نظام کو بہترین تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہندستان کا آئین انھیں اقدار کا امانت دار ہے۔ صحافت کا فرض اس کی عمل آوری پر کڑی نظر رکھنا ہے اور اس کی راہ میں حائل ہونے والے ہر فرد اور گروہ کی، خواہ وہ اکثریت سے ہو یا کسی اقلیت سے ہو، مخالفت

کرنا ہے۔ اسے یہ دیکھنا ہے کہ ملک کے ہر باشندے کی شناخت اور توقیر اپنے فرقے کی طرف داری میں نہیں بلکہ اپنے وطن کی خدمت اور سربلندی میں ہے۔ صحافت کی پاکیزگی اور عظمت بھی اسی اندازِ فکر کو شاداب اور بارآور کرنے میں ہے۔

ہمارا سماج ہندو، مسلم اور دوسرے فرقوں کے معاشروں سے تعمیر ہوا ہے، مسلسل ہوتا رہتا ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ یہ اردو صحافت کی افادیت اور عظمت کا ثبوت ہے کہ اس کے اوراق میں اس کی جزئیاتِ ترکیبی میسّر آتی ہیں۔ اس کے کسی مورّخ کی طرف سے ان احوال کی وسعت کو نظرانداز کرنے اور کسی ایک ہی حصّے پر مرکوز ہو جانے یا کسی ایک فریق کی طرف داری کرنے سے اس مورّخ کی معروضیت کا ثبوت یا اعتماد قائم نہیں ہوگا۔ غلامی کے زمانے میں اس پہلو کا ادراک نہ کیا گیا۔ انگریز کے مصلحت کوش اور غلط اسباق نے ہمارے ذہنی توازن کو خاصا منتشر کر دیا تھا اور ہم ہندو دھرم، اسلام اور ملک کے دوسرے مذاہب کو ہمیشہ نہیں تو اکثر اپنی اپنی عینک سے دیکھنے کے عادی یا شائق ہو گئے تھے۔ ان کے مضر نتائج سے نہ صرف ہم واقف ہیں بلکہ آج بھی بھگت رہے ہیں۔

ہندو دھرم اور اسلام کے دونوں بڑے مذاہب انگریزی اقتدار کی آمد سے قبل قریباً آٹھ سو سال تک مختلف مسلم حکومتوں کے زمانوں میں بھی موجود تھے لیکن ان حکومتوں نے انھیں کسی تکرار، تصادم یا علاحدگی کے اسباب نہ بنایا بلکہ ان کی مشترکہ قدروں کا احترام کیا اور انھیں فروغ دیا۔

آزادی کے بعد نہ صرف خطاکار انگریز معلّم چلا گیا بلکہ ہمارے لیے یہ احترام فطری اور مسلّم ہو گیا۔ اس سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ یہ ہماری وطنی زندگی کا ایک دائمی فریضہ ہے۔ دنیا کے کسی بھی دو یا زیادہ مذاہب میں اختلاف کے نکات آسانی سے ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ بس آپ کے پاس ایک اختلاف پسند ذہن ہونا چاہیے۔ فرنگی نے اسی ذہن کو فروغ دیا لیکن آج ہم فرنگی کے اسیر یا رہین نہیں ہیں۔ ہمارے پاس اپنی مشترکہ قدروں اور گنگا جمنی تمدّن کا صدیوں پرانا سرمایہ ہے۔ ہماری اردو صحافت اسی سرمایے کی امین ہے۔ ہماری دھرتی اور تہذیب نے سینکڑوں سال اس کی آبیاری کی ہے۔ آج ہمیں اس کے مثبت پہلوؤں کو از سرِ نو روشن کرنا ہے۔ اس میں کبھی کبھی منفی پہلو بھی در آتے ہیں۔ لیکن انھیں اناج میں بھوسی تصور کیا جانا چاہیے۔ ملک اور سماج کی صحت اور توانائی کے لیے بھوسی کو نہیں بلکہ اناج کو محفوظ کرنے کی ضرورت ہے۔ باشعور محقق اور مورّخ اسی کی نشان دہی کریں گے۔

اس مضمون کے مشمولات کوئی حتمی تحریر نہیں ہیں۔ صرف اشارہ نمائی

کی ایک حقیر کاوش ہے۔ اس کے مخالف اور حامی اس کی بہتر تفصیل مرتب کر سکتے ہیں۔ طوالت کے خوف سے اس میں آزادی کے بعد کے موضوعات شامل نہیں کیے گئے۔ ان کا سلسلہ خاصا وسیع ہے۔ بہر حال کچھ عنوان پیش کیے جا سکتے ہیں مثلاً آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد اردو اخباروں کے اعداد وشمار اور سرکولیشن کا جائزہ۔ ان کے موضوعات اور مواد کا جائزہ۔ ان کے اقتصادی حالات اور ان کی پیشہ ورانہ تدبیروں کی کیفیت۔ اردو روزناموں میں ٹیلی پرنٹر نیوز ایجنسیوں کی خبریں حاصل کرنے اور خود اپنے نامہ نگاروں سے مقامی اور غیر مقامی رپورٹنگ کرانے کے کوائف۔ آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کی کالم نگاری اور بالخصوص فکاہیہ کالم نگاری کی کیفیت۔ موجودہ مقابلہ داری سماج میں اردو صحافیوں کی انگریزی، ہندی اور دوسری ہندستانی زبانوں کی صحافت میں دلچسپی وغیرہ۔

ان میں سے اعداد و شمار کے عنوان پر راقم الحروف نے ایک جائزہ مرتب کیا تھا جسے ۱۹۸۶ء میں دہلی اردو اکادمی نے 'اردو صحافت پر ایک نظر' کے عنوان سے شائع کیا تھا لیکن اس موضوع پر کم از کم ہر پانچ سال کے بعد مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔

آزاد ہندستان کے پاس آج قریباً پونے دو سو سال کی مطبوعہ اردو صحافت کا اچھا بُرا ریکارڈ، متفرق مضامین اور منتشر شذرات ہیں لیکن کوئی مکمل تاریخ نہیں ہے نہ ہی اس کے اہم مرحلوں اور پہلوؤں کے مطالعات ہیں۔ آج ہندستان کی تقریباً ۵۲ یونی ورسٹیوں میں اردو کے شعبے ہیں اور اب ایک نئی کامل اردو یونی ورسٹی بننے والی ہے۔ اس کے علاوہ ملک کی تیرہ ریاستوں میں اردو اکادمیاں اور ایک ملک گیر انجمن ترقی اردو ہیں۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ وہ علم کی اس اہم صنف کی طرف متوجہ ہوں؟

میں کئی بار سوچتا ہی رہ جاتا ہوں کہ اگر آزاد ہندستان میں بھی ہمارے اہل فہم و ذکا اور محبانِ اردو اس طرف راغب نہ ہوئے تو پھر کب ہوں گے؟

حواشی

۱۔ بحوالہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید: "صحافت پاکستان و ہند میں" مکتبہ کارواں۔ لاہور۔ ص۔ ۷۹

۲۔ ایضاً۔ ص ۱۷۹

۳۔ بحوالہ محمد عتیق صدیقی: ہندستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) (انجمن ترقی اردو ہند) علی گڑھ ۱۹۵۷ء ص۔ ۳۵۹

(۴) ستیہ دیو ودیا لنکار : جیون سنگھرش (ہندی)، راج پال اینڈ سنز دہلی ۱۹۶۴ء، ص۔ ۳

(۵) ایضاً۔ ص۔ ۲۸۰

(۶) مضمون: مسلم ذہن کی تشکیل ؛ قومی آواز، نئی دہلی ۲۰ جون ۱۹۹۳ء

(۷) ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ایضاً ص۔ ۲۲۹

پروفیسر گوپی چند نارنگ

گذشتہ سے پیوستہ

مشرقی شعریات اور ساختیاتی فکر

کیا فصاحت و بلاغت بے تفاعلِ قاری ہے؟

مشرقی روایت میں سخن فہمی کا درجہ کسی طور سخن گوئی سے کم تر تصوّر نہیں کیا گیا:

شعر گفتن گرچہ دُر سُفتن بود
شعر فہمیدن بہ از گفتن بود

یہ خیالات نہایت قدیم زمانے سے چلے آتے ہیں اور شعریات سے بحث کرنے والوں نے اکثر و بیشتر اس بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے کہ شعر کو سمجھنے کے لیے صرف لفظوں کے معنی جاننا کافی نہیں، شاعر کا مفہوم اس کے لفظوں سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ وہ کوئی خاص واقعہ یا حالت یا کیفیت ... ایسے لفظوں میں بیان کر دیتا ہے جو سننے والے کے ذہن کو ان تمام تفصیلوں تک پہنچا دیتے ہیں جنھیں شاعر نے چھوڑ دیا تھا، مگر ہر ذہن میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی۔ یہ صرف ان لوگوں کا حصّہ ہے جو ... شاعرانہ اندازِ بیان کو سمجھتے ہیں، جنھوں نے بڑے بڑے شاعروں کے کلام کا ایک مدّت تک غور کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور جن کے دل میں درد ہے۔ مرزا غالب فرماتے ہیں:

حُسنِ فروغِ شمعِ سُخن دور ہے اسد
پہلے دلِ گُداختہ پیدا کرے کوئی

حقیقت ہے کہ شعر کا سمجھنا شعر کہنے سے کچھ کم مشکل نہیں ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھیں قدرت نے سخن فہمی کا ملکہ عطا کیا ہے۔ (بہاری

شاعری ص ۱۲۰) یہاں غور طلب یہ ہے کہ کیا غالب کے شعر کا دلِ گداختہ قاری کے تفاعل کی طرف راجع نہیں؟

اس ضمن میں ایک بنیادی بات یہ ہے کہ 'فصاحت' کا جو تصوّر قدما سے رائج رہا ہے اور اس کی جو بھی تعریفیں کی گئی ہیں کیا ان کا اتنا تعلق مصنّف کی موضوعیت یا متن کی متنیت سے نہ ہو کر اس جمالیاتی اثر سے نہیں جو قرأت کے عمل سے پیدا ہوتا ہے اور جس میں قاری کا تفاعل شامل ہے؟ سوال یہ ہے کہ فصاحت سے مراد کس کی فصاحت ہے، یعنی بیان کا وہ تصور جو مصنّف کے ذہن و شعور میں ہے، یا وہ تصوّر جس کی رو سے بیان (بذریعہ سامع یا قاری) فصیح قرار پاتا ہے؟ پھر یہ کہ بلاغت کے لیے فصاحت جزو لاینفک ہے اور فصاحت کی بھی جتنی تعریفیں ہیں ان میں سے کوئی بھی قائم بالذّات نہیں، یعنی معائب کو منہا کرتی ہیں، محاسن کا تعیّن نہیں کرتیں۔ بہ ایں ہمہ ان سب میں کسی نہ کسی چور دروازے سے قاری کا تصوّر اور اس کا تفاعل در آتا ہے۔ یہ غور طلب ہے۔

بلاغت میں فصاحت کا تصور مضمر ہے بلکہ فصاحت شرط ہے بلاغت کی۔ بالعموم بلاغت کی تعریف کی جاتی ہے کہ بلاغت کلام کا مقتضائے حال کے مطابق ہونا ہے۔ بقول شاد عظیم آبادی 'کلام کا کوالفِ متعلّقہ کے اقتضا کی کسوٹی پر پورا اُترنا بشرطیکہ زبان فصیح ہو بلاغت ہے'۔ اب فصاحت کی شرائط پر بھی نظر ڈال لی جائے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کلامِ فصیح وہ ہے کہ عیوبِ ذیل سے خالی ہو (دبیر: بحثِ فصاحت و بلاغت۔ نکات: معائبِ سخن۔ تسہیل: بحثِ فصاحت و بلاغت۔ منشورات، فصاحت):

۱۔ تنافرِ کلمات
۲۔ ضعفِ تالیف
۳۔ تعقید
۴۔ کثرتِ تکرارِ لفظِ واحد
۵۔ توالیِ اضافات
۶۔ مخالفِ قیاسِ لغوی

۷۔ غرابت

کیفی نے اس تعریف پر صحیح اعتراض کیا ہے کہ کسی کے خیال میں نہ آیا کہ اتنا تو فرما دیجیے کہ فصاحت اسے کہتے ہیں۔" بقول صاحب البیان " یہ اعتراض بڑا وزنی اور جاندار ہے، کیوں کہ واقعی فصاحت کی تعریف منفی قسم کی ہے۔ محض یہ کہہ دینے سے کہ ان عیوب سے کلام پاک ہونا چاہیے، بات نہیں بنتی۔" قطع نظر اس سے کہ اساتذہ نے مندرجہ بالا عیوب سے اتنی آنکھ مچولی کھیلی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ غالب، ذوق، اسیر، آتش شاید ہی کوئی نامی گرامی شاعر ہو جس کے یہاں ان عیوب یعنی تنافر، تعقید، غرابت وغیرہ کی نشاندہی نہ کی جاسکے۔

اس بحث سے غرض فصاحت و بلاغت کے موضوعی تصور کا رد یا قیام نہیں۔ مقصود یہ دکھانا ہے کہ ان بحثوں کو اگرچہ قائم موضوعی طور پر کیا گیا تھا لیکن قدما کی تعریفوں کی منطقی تحلیل ان کو یکسر موضوعی رہنے نہیں دیتی اور تنافر ہو یا تعقید (تعقید کا ذکر آگے آتا ہے) یا مخالفِ قیاسِ لغوی یا غرابت، ان کے احکام اظہار و ابلاغ کے مسائل میں اکثر نظر انداز کیے گئے ہیں اور آخری معیار سامع یا قاری کا تاثر یا اس کی قبولیت رہا ہے۔ علمائے متاخرین نے اس ضمن میں یہ بحث بھی اٹھائی ہے کہ "کلمے کا ثقیل یا غیر ثقیل ہونا، غریب یا نادر ہونا بالکل اضافی باتیں ہیں۔ ظاہر ہے ناخواندہ اشخاص کے لیے بیش تر الفاظ ثقیل یا غریب ہوں گے اور علما کے لیے اکثر مانوس، اور اس لیے جو استدلال کیا گیا ہے اس کی بنا پر فصیح۔ تو معلوم ہوا کہ اس سلسلے میں فصاحت کا تعلق کلمے سے نہیں بلکہ پڑھنے والے کی استعدادِ علمی سے ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ نتیجہ متقدمین کو مطلوب نہیں تھا" (البدیع ص ۱۱۲)
اس بیان پر راقم الحروف کا تبصرہ فقط اس قدر ہے کہ قطع نظر اس سے کہ یہ نتیجہ متقدمین کو مطلوب تھا یا نہ تھا، فصاحت و بلاغت کا جو بھی تصور مطلوب تھا یا جو رائج رہا یا اس کی جو بھی تعریف متعین کی گئی، اگرچہ بتایا اور جتایا یہی گیا کہ وہ موضوعی یعنی مصنف کے اختیار و انتخاب پر مبنی ہے، لیکن قاری کو اس قلمرو سے خارج نہیں کیا جاسکا۔ ان تعریفوں کی تحلیل سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ قاری کا تفاعل ان میں برابر مضمر رہا۔

منشورات میں کیفی نے متقدمین کے دعووں کو انتقاد کی کسوٹی پر کسا ہے، اور اس نتیجے پر پہنچے کہ متقدمین کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ کوئی لفظ بنفسہٖ فصیح، غیر فصیح، ثقیل، غریب یا اجنبی ہوتا ہے۔ یہ اضافی چیز ہے۔ عالم کے لیے وہی کلمہ بالکل سامنے کی چیز ہے جو عامی کے لیے مشکل ہے۔ اسی طرح کسی کلمے کی ثقالت جو فصاحت میں ممنوع گنی جاتی ہے، ذوقِ سلیم کے حوالے سے ہے، اور ذوقِ سلیم بڑی مبہم اور لچکدار چیز ہے جو ہر جگہ حسبِ منشا کام میں آتی ہے اور کام میں لائی جاتی ہے۔ کیفی کہتے ہیں کہ کلمے کی فصاحت تو کیا کلمے کے معنی بھی پڑھنے والے کے لہجے پر منحصر ہوتے ہیں۔ انھوں نے ایک جملہ لیا ہے "میں کل دہلی جاؤں گا" اور اس کے چھ مختلف معنی قائم کیے ہیں۔ بہر حال کیفی نے فصاحت کی پرانی تعریفات پر اعتراض کر کے انھیں مسترد کر دیا اور ایک نئی تعریف پیش کی۔ یعنی "فصاحت کلام کا وہ وصف ہے جو قاری یا سامع کے ذہن کو منشی یا متکلم کے ذہن کے قریب ترین پہنچاتا ہے"۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ تعریف قاری اساس ہے۔

چند الفاظ تعقیدِ لفظی کے بارے میں: یہ معلوم ہے کہ تعقیدِ لفظی کا شمار معائبِ سخن میں ہوتا ہے۔ بقول صاحب بحر الفصاحت تعقیدِ لفظی یہ ہے کہ "بہ سبب تقدیم و تاخیر و وصل و فصل الفاظ کے کلام میں خلل واقع ہو۔ جیسے:

لیتا نہ اگر دل تمھیں دیتا کوئی دم چین
کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

اصل مطلب یوں ہے کہ اگر تمھیں دل نہ دیتا تو کوئی دم اور چین لیتا اور جو نہ مرتا تو کوئی دن اور آہ و فغاں کرتا۔" (ص ۱۱۶۷) گویا لیتا جو مصرعِ اول کے شروع میں آیا ہے وہ راجع ہے کوئی دم چین (لیتا) کی طرف جو خلافِ ترتیبِ نحوی مصرع کے آخر میں آیا ہے اور اسی طرح کرتا جو مصرعِ ثانی کے اول میں آیا ہے وہ راجع ہے آہ و فغاں (کرنے) کی طرف، اور یہ بھی مصرع کے آخر میں خاصے نحوی فصل کے بعد آیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ بیان کا عیب ہے یا ہنر۔ یعنی اگر کلام نحوی ترتیب کے مطابق نہ ہو تو تعقیدِ لفظی ہے۔ لیکن حقیقت

یہ ہے کہ شعر میں لفظوں کی نحوی ترتیب اکثر و بیشتر قائم نہیں رہتی، کبھی وزن و آہنگ کی بنا پر، کبھی لہجے کی بنا پر اور کبھی کسی اور ضرورتِ شعری یا معنوی کی بنا پر یہ ترتیب کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔ اس سے جو نحوی اِشکال یا پیچیدگی پیدا ہوتی ہے، کیا اس کا حل بجائے خود اپنا جمالیاتی تفاعل نہیں رکھتا یعنی بلاغت کا حصہ نہیں؟ اول تو کیا یہ اجنبیانے کے عمل سے ملتی جلتی کوئی نحوی قدر نہیں جس پر روسی ہیئت پسندوں نے شعریت کی بحث میں زور دیا تھا؟ دوسرے یہ کہ قاری اساس تنقید کے ضمن میں سٹینلے فش نے ملٹن کے مصرعے کے حوالے سے لفظوں کی عمومی ترتیب کے ٹوٹ جانے یا اس میں اٹکاؤ پیدا ہونے کی جو بحث اٹھائی تھی کہ نتیجتاً قاری کا تفاعل جمالیاتی نوعیت رکھتا ہے، تو توجہ طلب ہے کہ کیا تعقیدِ لفظی اس نحوی صورتِ حال سے ملتا جلتا تصور نہیں؟ ڈاکٹر نیر مسعود نے اردو شعریات کی اصطلاحوں سے بحث کرتے ہوئے صحیح اشارہ کیا ہے "ہماری شاعری میں ایسے شعروں کا تناسب حیرت خیز حد تک کم نکلے گا جن میں نثری ترتیب برقرار ہے۔ ان میں بھی کچھ شعر ایسے ہوں گے جو کسی اور خامی کی وجہ سے مقتضائے حال کے مناسب یعنی بلیغ نہ ہوں گے۔ کچھ شعر ایسے بھی نکلیں گے جن میں نثری ترتیب ہو، فصاحت کے کسی دوسرے اصول کی خلاف ورزی نہ ہو اور ساتھ میں بلاغت بھی ہو۔ اصولاً ان چند شعروں کو چھوڑ کر اردو کے تمام شعروں کو غیر فصیح اور غیر فصیح ہونے کی وجہ سے غیر بلیغ ماننا پڑے گا۔ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہمارے اچھے مشاق شاعروں نے فصاحت کی اس اہم شرط کی پروا نہ کرتے ہوئے تعقید کو روا رکھا ہے بلکہ کبھی کبھی اسے نثری ترتیب پر ترجیح دی ہے، اس لیے کہ بہت سا کلام ہمیں ایسا ملتا ہے جس میں صرف ایک آدھ لفظ کو آگے پیچھے کر دینے سے نثری ترتیب درست ہو سکتی تھی، مثلاً:

غالب : جو آؤں سامنے ان کے تو مرحبا نہ کہیں (بجائے 'ان کے سامنے آؤں')

غالب : میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں (بجائے 'دو شمعیں')

اقبال : مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی (بجائے 'وہ آزادی عطا کی ہے')

غالب نے اس طرح کی ترجیح کا سبب بھی بتا دیا ہے :

' فارسی میں تعقیدِ لفظی جائز ہے بلکہ فصیح اور ملیح ۔ ریختہ تقلید ہے فارسی کی '۔

ظاہر ہے کہ تعقیدِ لفظی ہر محل پر جائز نہیں ، لیکن کسی محل پر جائز اور کسی پر مستحسن ہو جاتی ہے ۔" (اردو شعریات ص ۲۱۱ - ۲۱۲)

غالب کے فتوے سے بڑی تائید اس بارے میں اور کیا ہو سکتی ہے ۔ شعری زبان نام ہی زبانِ عام سے گریز کا ہے ، اور واضح رہے کہ اس گریز میں گریزِ ترتیبِ نحوی بھی شامل ہے ، لیکن یہ بھی واضح رہے کہ یہ گریز ، گریزِ لامحدود نہیں ہے ۔ اوپر ' محل ' کا جو ذکر کیا گیا ہے تو یہ تصور اگرچہ ذوقی ہے لیکن غور کیا جائے تو اس کی جڑیں سائنسی ہیں یعنی اصول و قاعدے سے بے نیاز نہیں ۔ مثلاً ' جو اُن کے سامنے آوٴں ' کو ' جو آوٴں سامنے ان کے ' میں تو بدل سکتے ہیں یعنی عام ترتیب میں ' سامنے ' پہلے ہے اور ' آوٴں ' بعد میں ، بصورتِ گریز ان اجزا کی تقلیب ہو گئی (' آوٴں ' پہلے ' سامنے ' بعد میں) لیکن اگر آہنگ و وزن اجازت دے تب بھی ' ان کے ' کے اجزا کی تقلیب نہیں ہو سکتی ۔ یہ نحو کے وہ خاموش اصول ہیں کہ شعری زبان ہزار گریز کرے ، ان سے گریز نہیں کر سکتی ۔ یعنی ' دو شمعیں ' ، ' شمعیں دو ' ہو سکتا ہے ' یا ' فروزاں ہو گئیں ' ' ہو گئیں فروزاں ' ہو سکتا ہے ، لیکن ' ہو گئیں ' ، ' گئیں ہو ' نہیں ہو سکتا ۔ گویا نحوی اجنبیانے یا اِشکال کی آزادی بھی کچھ پابندیوں کے اندر ہے ۔ بیشک شعری زبان نیز لہجے کا یہ تفاعل نثر میں بھی ملتا ہے اور اردو میں عمومی نحو کی داخلی ساخت DEEP STRUCTURE میں ایک شعری نحوی ساخت بھی کارگر رہتی ہے جو بہرحال تجرباتی ہے ۔ لیکن افسوس ہے کہ اردو میں ابھی اس کے تجزیے پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی ۔ حاصلِ کلام یہ کہ ' گریزِ ترتیبِ نحوی ' یا ' نحوی اِشکال ' (تعقیدِ لفظی) بھی درحقیقت حصہ ہے قاری کے جمالیاتی تفاعل کا ۔

الغرض فصاحت و بلاغت کا کوئی تصور بے تفاعلِ قاری ممکن نہیں ۔

مناسبت در تصورِ روایت و تصورِ لانگ

" باتیں اگر دُہرائی نہ جایا کریں تو اب تک سب ختم ہو چکی ہو

——— حضر

سوسیئری فکر کی جن بصیرتوں نے ادبی ساختیات کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے، ان میں سے لانگ کا تصور خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی وضاحت کئی مقامات پر آئی ہے۔ مختصر یہ کہ زبان کی کارکردگی کو سمجھنے کے لیے سوسیئر زبان کا تصور دو سطحوں پر کرتا ہے، اوپری سطح کو وہ LANGUE کہتا ہے اور نچلی سطح کو PAROLE ۔ ان دونوں میں جو جدلیاتی رشتہ ہے، وہ ایک اعتبار سے جدید لسانیات اور ادبی ساختیات کا نقطۂ آغاز ہے۔ بقول سوسیئر زبان کا جامع تجریدی نظام جو ہر اہلِ زبان کے ذہن و شعور کا حصہ ہے اور جس کی رو سے زبان کا کوئی بھی جملہ یا کلمہ بولا جاتا ہے یا کلام کی کوئی بھی شکل ممکن ہوتی ہے، لانگ ہے۔ لانگ گویا زبان کے قواعد وضوابط کا تجریدی نظام ہے جو کلام کی ہر ہر ممکنہ شکل کو حاوی ہے۔ زبان میں کوئی چیز اس سے باہر نہیں۔ یہ گویا کلی لسانی شعور ہے جس کی رو سے ہم زبان بولتے ہیں۔ چاہیں تو لانگ کو 'بالقوۃ لسان' بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں انفرادی طور پر بولے جانے والا کوئی بھی واقعہ PAROLE ہے۔ دوسرے لفظوں میں زبان کا جامع نظام (جو زبان کی کسی بھی فی الواقعہ (ACTUAL) مثال سے پہلے موجود ہے) لانگ ہے اور اس کی رو سے کیا جانے والا کوئی بھی کلام PAROLE ہے جو لانگ کے جامع نظام کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا، اور اس کے اندر خلق ہوتا ہے۔ لانگ کا تصور معاشرہ اور ثقافت میں رچا بسا ہوا ہے جس سے زبان کے بولنے والے غیر شعوری طور پر سہی، استفادہ کرتے ہیں اور اس کے بغیر کوئی بھی زبان نہیں بول سکتا۔ پارول زبان کے جامع نظام کی محض انفرادی مثال ہے جو فردِ واحد کے کلام میں وقوع پذیر ہوتی ہے ان دونوں کا فرق اور جدلیاتی رشتہ ساختیاتی فکر کا کلیدی نکتہ ہے۔ گویا لسانی قواعد وضوابط کا وہ جامع ذہنی نظام جس کی رو سے ترسیل و ابلاغ ممکن ہے لانگ ہے اور روزمرہ کا تکلم یا زبان کا وہ استعمال جو زبان بولنے والا کوئی بھی فرد کرتا ہے پارول ہے۔ دیکھا جائے تو ان دونوں میں جو رشتہ لسانی کارکردگی کی تہ میں ہے، وہی رشتہ ادبی کارکردگی کی بھی تہ میں ہے کیوں کہ ادب میں جو کچھ بھی متشکل ہوتا ہے یا وقوع پذیر ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی جامع تجریدی نظام سے ماخوذ ہے۔ گویا ادب کی جملہ روایت، اساتذہ کا کلام،

جملہ شہ پارے، سرمایۂ نظم و نثر، اور کلی شعریات کا جامع تجریدی نظام جو ادبی معاشرہ کے ذہن و شعور میں ہمہ وقت جاری و ساری رہتا ہے، ادب کی لانگ ہے اور ہر ہر متن (فن پارہ) جو وقوع پذیر ہوتا ہے یا وجود میں آتا ہے (جو پارول کی مثال ہے) ادب کے اسی جامع تجریدی نظام کی رو سے اور اس کے حوالے سے ہے۔ گویا ادب میں جو کچھ ہے ادب کی لانگ سے ہے اس کے باہر کچھ بھی نہیں۔

اب دیکھیں کہ مشرقی روایت میں اس کی کیا شکل ملتی ہے۔

ابنِ رشیق کا مشہور قول ہے:

"شعر کو مثلاً بیت سمجھو، فرش اس کا شاعر کی طبیعت ہے اور عرش حفظ و روایت (یعنی اساتذہ کے کلام پر نظر ہونا) دروازہ اس کا مشق و ممارست اور ستون اس کے علم و معرفت ہیں، صاحبِ خانہ معانی ہیں۔ مکان کی شان مکین سے ہوا کرتی ہے۔ وہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اوزان و قوافی قالب و مثال کے مانند ہیں یا خیمہ میں چوب و طناب کی جگہ جن پر خیمہ تنتا اور کھڑا ہوتا ہے"

(مراۃ الشعر ص ۱۰)

ابنِ رشیق نے شاعری کے خیمے کی جو تمثال پیش کی ہے اور جو ہر اعتبار سے مکمل ہے، چھ اجزا پر مبنی ہے۔ انھیں دو کالموں میں یوں لکھ سکتے ہیں:

۱۔ فرش اس کا شاعری طبیعت ہے   ۱۔ عرش حفظ و روایت (یعنی اساتذہ کے کلام پر نظر ہونا)

۲۔ صاحبِ خانہ معانی ہیں   ۲۔ دروازہ اس کا مشق و ممارست

۳۔ اوزان و قوافی قالب و مثال کے مانند ہیں یا چوب و طناب کی جگہ   ۳ ستون اس کے علم و معرفت ہیں

یا چاہیں تو ان اجزا کو سادہ سے خاکے میں یوں ظاہر کر سکتے ہیں:

عرش: حفظ و روایت یعنی اساتذہ کے کلام پر نظر ہونا

ستون : علم و معرفت

دروازہ : مشق و مہارت

لیمپ : مشعال

اوزان و قوافی : حوب و مطلب

اوزان و قوافی : حوب و مطلب

فرش : شاعر کی طبیعت
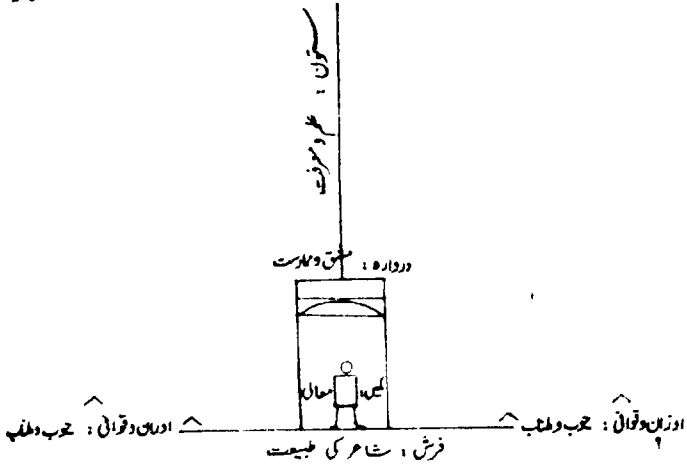
کیا اس سے یہ دلچسپ حقیقت سامنے نہیں آتی کہ شعر گوئی میں جو حقیقت سب سے اوپر چھائی ہوئی ہے اور جو بمنزلہ عرش کے ہے یعنی حفظ و روایت یا اساتذہ کے کلام پر نظر ہونا، کیا یہ کُلّی ادبی روایت بشمول مافوق الشعر یاتی نظام نہیں ہے جو ادب میں ہر شے کا سرچشمہ ہے یعنی ادبی لانگ، علم و معرفت جس کے ستون ہیں اور دروازہ مشق و مہارت، یعنی ادبی لانگ قائم ہے اس نظام کے علم و معرفت پر اور اس سے استفادہ ممکن نہیں بغیر مشق و مہارت کے۔ گویا اوپر دوسرے کالم میں ہم نے جن تین اجزا کو لکھا تھا جو اسی ترتیب سے ہیں جیسا کہ ابن رشیق نے انھیں بیان کیا ہے اور جس ترتیب سے خاکے میں انھیں دکھایا گیا ہے (کیا یہ تعجب خیز نہیں کہ کیا بہ اعتبارِ اجزا اور کیا بہ اعتبارِ ترجیح ' اس ترتیب کو کسی طرح سے دیکھیں یہ صحیح قرار پاتی ہے) کیا یہ تینوں اجزا مل کر عملی طور پر اُس تصور کی تشکیل نہیں کرتے جسے ادبی لانگ کہا گیا ہے اور شعر و ادب میں ہر ہر چیز جس کے جامع نظام سے ماخوذ ہے۔ بیشک مجرد نظام کا تصور جو لانگ کی بنیادی خصوصیت ہے یہاں اتنا منضبط نہیں جتنا مضمر یا مستور ہے کیوں کہ (۱) حفظ و روایت ہو یا (۲) علم و معرفت یا (۳) مشق و مہارت، ان سے جو چیز ذہن و شعور میں بمنزلہ جوہر کے جاگزیں ہو جائے گی اور جس کی بدولت شعر گوئی ممکن ہوگی وہ تجریدی ذہنی نظام ہی تو ہے جو ادبی روایت

اور شعریات میں جاری و ساری و تہ نشین ہے۔

لیکن ہنوز یہ کہانی ادھوری ہے کیوں کہ ہم نے عرش یا بالائی قوس کو تو نظر میں رکھا ہے، زمین یعنی فرش کی بات نہیں کی۔ لانگ کا تصور بغیر پارول کے نامکمل اور ادھورا ہے۔ لانگ خزانہ ہے پارول اس سے اخذ ہونے والا ہر وقوعہ ہے انفرادی کلام کا۔ شعر بھی وقوعہ ہے اور انفرادی کاوش ہے مقام جس کا شاعر کا ذہن و مزاج یا بقول ابنِ رشیق شاعر کی طبیعت ہے جسے اس نے بیتِ شعر کا فرش[1] کہا ہے کیوں کہ ہر چیز وقوع پذیر یہیں ہوتی ہے (فرش اس کا شاعر کی طبیعت ہے) جو وسیلہ یا ذریعہ ہے معانی[2] قائم کرنے کا (یا متنِ شعر کی تشکیل کا) جو صاحبِ خانہ ہے اور شانِ مکان کی مکین سے ہے وہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اور اوزان[3] و قوانی قالب و مثال کے مانند ہیں، یا خیمے میں چوب و طناب کی جگہ، کیوں کہ شعر (کسی نہ کسی طرح کے) صوتی آہنگ پر تنتا اور کھڑا ہوتا ہے۔ اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ابنِ رشیق کی تعریف کے وہ تینوں اجزا جنھیں کالم ایک میں درج کیا گیا ہے اور خاکے میں جو واقعاتی طور پر زمین (فرش) سے جڑے ہوئے ہیں، اسی سائنسی ترتیب سے مرتب ہو کر کیا وہ اس تصور سے قریب تر نہیں جسے 'پارول' کہا گیا ہے۔ پارول ٹھوس اور مرئی ہے۔ لانگ غیر مرئی، مجرد اور ذہنی ہے بطور بالائی قوس یا آسمان کے یعنی جامع ادبی روایت اور شعریات کا وہ نظام جو ثقافت کا حصہ ہے اور اس میں جاری و ساری ہے جس کی رو سے شعر بطور شعر قائم ہوتا ہے یا معنی بطور معنی متشکل ہوتا ہے یا معنی کا ادراک ممکن ہوتا ہے۔ ابنِ رشیق کی تعریف میں فرش اور مکین کی نسبت سے جو ٹھوس واقعیت مترشح ہوتی ہے وہ پارول پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ البتہ لانگ میں کُلی نشانیاتی نظام کا جو تصور ہے وہ حد درجہ تجریدی اور ذہنی ہے۔ گویا لانگ میں جس چیز پر اصرار ہے اور جو نمایاں اور ظاہر ہے، مشرقی روایت میں وہ مضمر اور تہ نشین ہے۔ نیز شاعر کی طبیعت اور حفظ و روایت میں جو جدلیاتی رشتہ ہے وہ بھی ظاہر نہیں ہے بلکہ مضمر ہے۔ (یعنی تحلیلی نہیں اسے محسوس کر سکتے ہیں)

اوپر جو بحث اٹھائی گئی، دیکھنا یہ ہے کہ بعد کی مشرقی فکر میں اس کی کیا شکل ملتی ہے، یعنی اس تصور میں کچھ توسیع و اضافہ ہوا یا اس سے انحراف کیا گیا۔ چہار مقالہ فارسی میں ایسی پہلی کتاب ہے جو ماہیتِ شعر سے بحث کرتی ہے۔ علاوہ دوسرے امور کے نظامی عروضی سمرقندی زور دیتا ہے کہ شاعر مقبول اور پر تاثیر شعر اسی وقت کہہ سکتا ہے جب کہ اوائل عمر میں متقدمین کے بیس ہزار اشعار شاعر کی نظر سے گزر جائیں اور مسلسل و متواتر اساتذہ کے دواوین زیرِ مطالعہ رہیں۔ اس طرح جب شعر و سخن کا مذاق پختہ طور پر پیدا ہو جائے اور کلام سُلجھ جائے (یعنی ادبی لانگ کی استعدادِ ذہنی پیدا ہو جائے) تو شعر کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

یہاں یہ اشارہ بھی ضروری ہے اگرچہ لفظ 'روایت' قدما کی تعریفوں میں مذکور ہے لیکن بعد میں 'روایت آگہی' سے جو معنویت وابستہ ہوگئی وہ بہت بعد کی یعنی بیسویں صدی کی چیز ہے اور یہ تصور بالخصوص ان تحریکات کی ضد کے طور پر پیدا ہوا جن میں نہ صرف روایت شکنی پر زور تھا، بلکہ روایت سے بے بہرہ رہنا وجہِ افتخار قرار دیا گیا۔ قدیم تعریفوں میں 'حفظ و روایت' اور 'مسلسل و متواتر اساتذہ کے کلام کو نظر میں رکھنے' پر جو اصرار ہے اصلاً اس کا مقصد مذاقِ سخن کی تربیت تھا۔ اساتذہ کے اشعار جتنے زیادہ زیرِ مطالعہ ہوں گے (بیس ہزار کی شرط غالباً کثرتِ کلام کی رعایت سے ہے) یا اساتذہ کا کلام جتنا زیادہ ذہن و شعور کا حصہ ہوگا، مذاقِ سخن اتنا نکھرے گا اور اس میں رچاؤ پیدا ہوگا۔ اخذ و قبول کے ملکہ کا فرق برحق، اس لیے کہ مذاقِ سخن کا ایک سرا وہبی صلاحیت سے ربط رکھتا ہے تو دوسرا مشق و مزاولت اور مطالعے و ممارست سے۔ ہر چند کہ یہ معلوم ہے کہ مشق و مزاولت سے مذاقِ سخن پر نکھار بھی اسی نسبت سے کم، زیادہ یا غیر معمولی آئے گا بہر حال اس پر برابر زور دیا جاتا رہا ہے کہ اگر اساتذہ کا کلام نظر میں نہیں یا مشق و مطالعہ و ممارست نہیں تو مذاقِ سخن کی تربیت بھی ممکن نہیں۔ شعر گوئی میں ادنا اعلا کی جو درجہ بندی کی جاتی رہی ہے اس میں بھی اس تصور کا کردار مرکزی ہے۔ مذاقِ سخن کو ذوقِ سلیم بھی کہا گیا ہے اور

خوش مذاقی بھی، اور اس کی لطیف احساسی سطح کو شئے لطیف بھی جو اخذو استفادے اور شعر گوئی میں طبعِ شاعر کو راہ دکھاتی ہے اور رہنمایانہ کردار ادا کرتی ہے۔

اس ضمن میں اس مشہور قول کا زیرِ بحث آنا بھی ضروری ہے جو ساختیاتی مباحث میں اکثر دُہرایا جاتا ہے جس کا بیج سوسیئر کی لسانی بصیرت میں موجود تھا، لیکن جسے قائم کیا ہائیڈگر نے اور قولِ محال کی شکل دی بارتھ نے۔ وہ قول یہ ہے :

LANGUAGE SPEAKS NOT MAN

یعنی 'زبان بولتی ہے انسان نہیں' اور اس سے ملتا جلتا دوسرا قولِ محال جسے بارتھ نے اپنے شہرۂ آفاق مضمون "THE DEATH OF THE AUTHOR"[*] کے ذریعے عام کیا اور جسے وہ خود ملارمے سے ماخوذ بتاتا ہے یہ ہے :

WRITING WRITES NOT AUTHORS

یعنی 'تحریر لکھتی ہے مصنف نہیں'۔ ظاہر ہے یہاں WRITING سے مراد تحریرِ محض نہیں بلکہ صدیوں کی ادبی روایت یا جامع ادبی روایت بشمول کُلی شعری نظام یعنی شعریات و مافوق الشعریات ہے جس سے اخذ و استفادے پر زور دیا گیا ہے اور جس پر قدرت اساتذہ کے مطالعے اور مشق و مزاولت ہی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ 'تحریر لکھتی ہے مصنف نہیں' سے مراد یہی ہے کہ ادب خلا میں پیدا نہیں ہوتا۔ شاعر لاکھ کہے کہ 'آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں'، یا غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے'، لیکن اگر پہلے سے تحریر (ادب کے ذہنی تجریدی نظام) کا وجود نہ ہو تو کوئی کتنا زور مارے کچھ بھی نہیں لکھ سکتا۔ اگلوں نے جو کچھ لکھا ہے، ہر نیا متن اس پر اضافہ ہے۔ مصنف یا شاعر جس زبان یا جس ادبی روایت (یا روایتوں) میں پلا بڑھا ہے، یا جن کے اثر کے تحت اس کا ذہن و شعور (بشمول لاشعور و اجتماعی لاشعور) مرتب ہوا ہے، لاکھ انحراف و اجتہاد کرے، وہ لکھے گا اسی ادبی روایت یعنی ادبی لانگ کی رو سے۔ کوئی متن (فن پارہ) اپنے ثقافتی اور ادبی نظام سے باہر آج تک نہ لکھا گیا ہے نہ لکھا جا سکتا ہے۔

(تفصیل کے لیے دیکھیے راقم الحروف کا نوٹ، شب خون مئی جون جولائی ۱۹۹۱ء، ص ۳-۶)

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی
اے۔۵۵۔ لاجپت نگر
صاحب آباد۔ غازی آباد۔ یوپی

عرضِ معروض

اگست ۱۹۹۳ کے کتاب نما میں ڈاکٹر اوم پرکاش اگروال، زار علامی کا مضمون فیضی کا ایک مقولہ پڑھا۔ اس موضوع پر قلم نہ اٹھانے کا فیصلہ، ایک دوست کی خواہش کے احترام میں کیا تھا۔ لیکن زار علامی نے کچھ ایسے اسلوب میں، جو بہت شایستہ نہیں ہے، نام لے کر مجھے مخاطب کیا ہے، اس لیے خاموشی، اس غلطی کا اعتراف سمجھی جائے گی جو زار نے میری طرف منسوب کی ہے اور جو حقیقتاً غلطی نہیں ہے۔ اپنی کتابوں اور دوسرے مضامین کی طرح زیرِ مطالعہ مضمون میں بھی زار نے خود اپنے قلم سے واضح کر دیا ہے کہ وہ علم اور وہ فن جسے عروض کہتے ہیں، اس سے ان کی شناسائی کتنی ہے۔

سوغات، بنگلور کے دوسرے شمارے میں مدیر محمود ایاز کے نام ایک خط میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ایک جملہ یہ بھی لکھا تھا

"فیضی کا مصرعہ یاد آتا ہے : سخن فہمی عالم بالا معلوم شد"

سوغات کے تیسرے شمارے میں مدیر کے نام یکم جولائی ۹۲ میں میرا ایک خط چھپا تھا جس میں عرض کیا گیا تھا کہ یہ کلام موزوں نہیں ہے۔ اسی شمارے میں شمس الرحمٰن فاروقی کا ۲۴ جولائی ۹۲ کا بھی ایک خط چھپا تھا جس میں انھوں نے لکھا تھا :

"نارنگ صاحب فرماتے ہیں، فیضی کا مصرع یاد آتا ہے "سخن فہمی عالم بالا معلوم شد"
تعجب ہے آپ نے اس پر گرفت نہیں کی۔ یہ مصرع نہیں، نثر کا فقرہ ہے۔"

نہیں چاہتے ہوئے بھی سوغات کے چوتھے شمارے میں پروفیسر نارنگ کا جو خط ہے اس کا ایک حصہ نقل کرتا ہوں۔ مدیر کے توسط سے مخاطب شمس الرحمٰن فاروقی ہیں، مجھے مخاطب نہیں کیا گیا ہے اس لیے میں جواب نہیں دوں گا۔ جواب دینا فاروقی کا فرض منصبی ہو جاتا ہے۔ اقتباس :

"غلطی سے بالا کوئی بشر نہیں، شمس الرحمٰن فاروقی بھی نہیں، پھر اس قطعیت سے جملہ اچھالنے کی کیا ضرورت تھی؟ دوسرے فاروقی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ مصرعہ نہیں، نثر کا فقرہ ہے ..... فیضی کے کلمے کو مصرع مجھ کم سواد اور کج مج بیان نے نہیں لکھا، اس کو مصرع سید مسعود حسن رضوی ادیب جیسے معتبر عالم اور محقق نے لکھا ہے .... (فرہنگ امثال ص ۱۲۰) ... میں نے ڈاکٹر

زارعلامی سے تصدیق چاہی کہ مسعود حسن رضوی ادیب اسے مصرع کہتے ہیں شمس الرحمٰن فاروقی اسے نثر کا فقرہ کہتے ہیں۔ صحیح کون ہے؟ موزوں ہے یا نہیں؟ یعنی مسعود حسن رضوی ادیب غلط ہیں یا شمس الرحمٰن فاروقی، کیونکہ دونوں تو صحیح ہو نہیں سکتے۔ انھوں نے مفصل جواب لکھ کر تصدیق کی کہ یہ مصرع ہے اور بحر مقتضب مثمن (مخبون مخبون سالم و مرفوع و مخبون مسکن) میں ہے انھوں نے تقطیع بھی لکھ بھیجی ہے۔ ڈاکٹر زارعلامی کا خط چار پانچ صفحوں کا ہے۔ میں اس کوچہ کا آدمی نہیں۔"

اس اجمال کی تفصیل زارعلامی کا مضمون ہے جو اس وقت موضوع گفتگو ہے۔ پروفیسر نارنگ نے بہت درست بات لکھی ہے کہ وہ اس (عروض کے) کوچہ کے آدمی نہیں ہیں۔ اگر اس کوچے سے گزرے ہوتے تو زارعلامی کے لکھے ہوئے پہلے رکن کو دیکھتے ہی ان کی رائے کو مسترد کر دیتے بحث اپنے مقام پر آگے آئے گی۔ زارصاحب لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر کمال احمد صاحب صدیقی اور جناب شمس الرحمٰن فاروقی، دونوں اصحاب نے اس موزوں مصرع کو ناموزوں قرار دیا ہے.... بحر مقتضب مثمن مخبون مخبون سالم و مرفوع و مخبون مسکن۔ کمال صاحب اس آہنگ سے مطمئن نہیں ہوئے۔ انھوں نے اپنے ایک مراسلے کے ذریعے مجھ سے اس کی تفصیل طلب کی ہے..... فیضی کا یہ مقولہ دو بحور اور تین حقیقی اوزان میں بحسن و خوبی غوطہ کھا رہا ہے۔ بحور یہ ہیں:-

۱۔ بحر مقتضب مثمن ۲۔ بحر ہزج مثمن

.... بحر مقتضب مثمن سالم: مفعولاتُ مس تف علن مفعولاتُ مس تف علن

حاصل کردہ وزن ۱:	مفاعیلُ	مفاعلن	مفعولن	فاعلن
	مخبون	مخبون	مرفوع	مخبون منتق
حاصل کردہ وزن ۲:	مفاعیلُ	مفاعلن	مفعولاتم	فعلن
	مخبون	مخبون	سالم و مرفوع و مخبون مسکن	
اصل وزن	مفاعیلُ	مفاعلن	مفعولاتُ	فعلن
	مخبون	مخبون	سالم	مرفوع و مخبون

ان دونوں حاصل کردہ اوزان سے اس جملے کی تقطیع تو بے شک ہو جاتی ہے لیکن جو عروض کی ابجد سے ذرا بھی واقفیت رکھتا ہے وہ ایسی بے تالی ڈگڈگی نہیں بجائے گا اور نہ اسے عروضی آہنگ کہے گا۔ عروض کا باقاعدہ ایک نظام ہے جہاں یہ جو مزاحف یا سالم رکن چاہا ٹھونک دیا یہ عروض نہیں۔

جناب زارعلامی نے اس حقیر کی کتاب آہنگ اور عروض پر بھی اعتراض وار دیکھے ہیں اگرچہ موضوعِ حاضر سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ الگ مضمون میں وہ اس کی دھجیاں اڑا سکے

تھے۔ یہ میں بعد میں عرض کروں گا کہ شاعرانہ طریقہ سے جو حکم موصوف لگاتے ہیں کہ میں زار علامی یہ کہتا ہوں، یہ نہ علمی اسلوب ہے اور نہ سنجیدہ۔ اگرچہ مثالیں بحر مقتضب تام (دوائی سالم) اور مجنون مطوی کی بھی مل جائیں گی، لیکن یہ نادرات میں سے ہیں۔ جو اوزان انھوں نے بحر مقتضب میں تجویز کیے ہیں، کیا وہ فارسی میں رودکی سے لے کر فیضی تک کے یہاں اور فیضی کے کسی ہم عصر عرفی، نظیری، کلیم، حزیں۔ یا بعد کے کسی شاعر کے یہاں اس آہنگ میں کسی کی ایک بھی غزل ہے؟ کم سے کم فیضی کے زمانے تک مصرع اکائی نہیں تھا۔ بیت اکائی تھی۔ کیا وہ ساری فارسی شاعری سے، اور فارسی شاعری ہی نہیں، یہ کم سواد تنگ عروض یہ رعایت بھی انھیں دیتا ہے کہ اس آہنگ میں فارسی ہی نہیں، اردو یا ہندی کے کسی مخطوطے یا کتاب میں کلام اس آہنگ میں پیش کریں، جو کم از کم ایک صدی پرانا ہو۔

معیار الاشعار عروض کی انجیل سمجھی جاتی ہے اور محقق طوسی سے منسوب ہے۔ مقتضب کے بارے میں تحریر ہے: ایں بحر بتازیاں خاص است، و اصلش در دائرہ مفعولات مستفعلن مستفعلن ۲ بار است[1] و مجرد بکار دارند واو را یک عروض و یک ضرب ست۔ ہر دو مطوی بریں وزن آیا۔ بتیش ایں ست۔ . . . . در صدر و ابتداء میانِ فا مفعولات و واوش مراقبہ باشد۔ پس ہر دو مجنون مطوی شاید۔ و بہ پارسی بہ تکلف امثلہ آوردہ اند بریں گونہ بیت۔

ترک خوبروئی مرا گو چرا نہ خوش منشی

و ضرب مذال، معرے و مسکن روا باید داشت، بر قیاسِ دیگراں اوزان۔

زرِ کامل عیار میں مظفر علی اسیر نے ترجمہ کے ساتھ ساتھ وضاحت بھی کی ہے:

مقتضب: یہ بحر خاص تازیوں کی ہے، اور مقتضب، اقتضاب سے بمعنی قطع کردن ہے اور اصل اس کی دائرے میں مفعولاتُ مستفعِلن مستفعِلن دو بار ہے اور مجزو استعمال کرتے ہیں اور اس کا ایک عروض اور ایک ضرب ہے۔ دونوں مطوی، یعنی مفتعِلن۔ (عربی کی جو بیت ہے اس کی تقطیع ہے: فاعلاتُ مفتعلن. فاعلات مفتعلن) اور صدر و ابتدا میں درمیانِ فا اور واو مفعولات کے مراقبہ ہے۔ پس دونوں رکن صدر و ابتدا میں مجنون مطوی نہ چاہیے۔ یعنی اسقاط دونوں کا اور اثبات دونوں کا معًا جائز نہیں ہے، بلکہ ثابت رکھنا ایک کا دونوں سے لازم ہے۔ پس فعلات نہ ہوگا۔ یا فاعلات ہوگا یا فعولات۔ اور فارسی میں بہ تکلف مثالیں لائے ہیں۔ جیسے بیت مرقومہ متن ہے (تقطیع: فاعلاتُ مفتعلن ہ فاعلاتُ مفتعِلن) معلوم ہو کہ اس مربع کو کبھی مثمن بھی لاتے ہیں۔ بیت: سرو گلعذار منی ہ فصل نوبہار منی ہ من اگرچہ تنگ توام ہ عز و افتخار منی، بروزن فاعلاتُ مفتعلن فاعلاتُ مفتعلن۔ اور اگر عین مفتعِلن کا ساکن کریں، فرق اس وزن میں اور ہزج اشتر میں نہ رہے، جیسا کہ یہ شعر ہے ؎

وقت را غنیمت داں آنقدر کہ بتوانی حاصلِ حیات اے جاں یکدم ست تا دانی

[1] ۲ بار خاص طور سے نوٹ کریں: نظامِ عروض میں بیت اکائی ہے۔ مصرع نہیں۔ بیت معقد ہو تو اس کی وضاحت کر دی جاتی ہے۔

اور کبھی حشو میں مطوّی مسکن مستبنع[1] ہوتا ہے، جیسا کہ یہ شعر

در فراقِ او ہرے فرض کن کہ شبہارا　　　میتواں بروز آورد روز راکسے چہ کند

رکنِ دوم مصرعِ ثانی مفعولان ہے، اور ضرب مقتضب کی مذال یعنے مفتعلان اور صرے مفتعلن اور مسکن یعنی مفعولن روا رکھتے ہیں، مثل اوراوزان کے۔

مقتضب کے تحت کل یہ عبارت ہے۔

معاقبہ اور مراقبہ کے ذیل میں یہ عبارت بھی زیرِ کامل عیار ترجمۂ معیار الاشعار میں توجہ چاہتی ہے۔

"..... اور مراقبہ آٹھ بحروں میں آتا ہے۔ اول بحر مضارع اور مقتضب میں، کہ ایک ان دو سببوں سے ثابت رہتا ہے اور وجوباً اور ایک حذف ہوتا ہے وجوباً۔ پس مفاعیلن جب اوّل بحر مضارع میں پڑے، کف یا خرب واجب ہے اور مفعولاتُ جب اول بحر مقتضب میں پڑے، خبن یا طے واجب ہے چنانچہ بحرِ مضارع دائرے سے مکفوف نکلی ہے اور بحرِ مقتضب دائرے مطوّی نکلی ہے۔

جناب زار علامی ملاحظہ فرمائیں کہ بحرِ مقتضب دائرے سے مخبون نہیں مطوّی نکلی ہے اور موصوف نے صدر و ابتدا میں مطوّی فاعلاتُ کے بجائے مخبون مفاعیلُ رکھا ہے۔

۲۔ اب ایک نہایت ہی بھونڈی عروضی غلطی، جو عروض کے متبدی سے بھی نہیں ہونا چاہیے، وہ مقتضب سے دوسرا وزن حاصل کرنے میں عروض کے شاخدارِ معظم نے سرزد فرمائی ہے، کیونکہ موصوف عروض کی مبادیات سے واقف نہیں۔

اہلِ ایران نے تازی عروض کو اپنایا، لیکن اپنی ضرورت، آہنگ کی ضرورت کے مطابق مناسب ترمیمیں کرکے انھوں نے اپنے تیرہ زحاف اضافہ کیے۔ سید محمود کے رسالے منتہی العروض (یو پی اردو اکادمی اڈیشن ۱۹۸۴ء) سے، جو ۱۳۰۰ ہجری/ ۸۳-۱۸۸۲ کا ری پرنٹ ہے اور جس پر خواجہ الطاف حسین حالی کے مرتبے کے عالم کی تقریظ ہے۔ یہ عبارت ص ۲۶-۲۴ سے نقل کی جاتی ہے:

"اہلِ فارس نے تیرہ زحاف ایجاد کیے ہیں۔ جبّ، ہتم، زلل، تبر، جدع، نحر، جحف، ربع، درس، عرج، طمس، سلخ، رفع.... ان تیرہ زحافوں میں سے سوائے رفع کے اور باقی بارہ زحاف عروض و ضرب سے مخصوص ہیں اور رفع سوائے عروض و ضرب کے ہر جگہ آ سکتا ہے،،

رفع کے عمل کے بارے میں ص ۲۵ پر یہ اندراج ہے:

"مستفعلن (متصل) اور مفعولاتُ میں سے اگر پہلا سبب گر جائے، تو اس کو رفع کہتے ہیں۔"

---

[1] یہ سہو واضح ہے مذال ہونا چاہیے۔

پہلے سبب ہی کا ساکن خبن سے گرتا ہے اس لیے رکن سالم (مستفعلن) پر رفع اور خبن میں سے صرف ایک کا عمل ہو سکتا ہے ۔ لیکن نام نہاد عروض کے شاخدار مطلق نے مقتضب کے تحت دوسرے بنیادی وزن کے آخری رکن پر رفع اور خبن دونوں تعمیل کر دیے ہیں ۔ یہ سراسر خلاف وضع عروض ہے ۔ دوسری عبرت ناک غلطی یہ ہے کہ مرفوع مزاحف عروض وضرب کے علاوہ ہر جگہ آ سکتا ہے ، اور شاخدار عروض نے ادبدا کر اسے آخری رکن رکھا ہے وہ بھی کسی عروض وضرب کے زحاف سے مرکب کرکے نہیں ۔ ایک تو بنیادی طور پر نثر کے ایک جملے کے نادرست عروض جواز کی کوشش کی گئی ۔ اگر عروض کی ذرا بھی شُدبُد ہوتی تو آخری رکن کی حیثیت سے فعِلُن بھی تراشا جا سکتا تھا ۔ مستفعلن کا مخبون مطوی مقطوع فعِلُن ہے ۔ خبن سے س ساکن ساقط ہوا ۔ طیّ سے ف ساکن ساقط ہوا ۔ قطع سے ن ساقط ہونے کے ساتھ ساتھ ماقبل کے ل کی حرکت بھی ساقط ہوئی ۔ مُتَعِلْ بچا ، جو فعِلُن ہے ۔ لیکن اس عروض کسرت کی ضرورت ؟ صرف اس لیے کہ شمس الرحمٰن فاروقی اور اس حقیر کمال احمد صدیقی نے نثر کے جملے کو نثر کا جملہ کہہ دیا ؟

اور یہ مفعولاتم کون سا مزاحف ہے ؟ مفعولاتن کیوں نہیں ؟ مفعولاتم فعْلُن کی جگہ مفعولن فعْلُن کیوں نہیں ؟ اسقاطِ حمل کے بعد مُردہ بچے کے ناموں پر بحث کرنا ، مقتضب میں نثر کے ٹکڑے کے لیے موصوف کا ساقط مزاحف تلاش کرنے جیسا بے سود عمل ہے ۔

بحر ہزج میں بھی نادرست مزاحف کی ترتیب سے نثر کے اس جملے کو تولنے کے لیے بٹّے بنائے گئے ہیں ۔ مفاعیلن ہزج میں رکن سالم ہے ۔

عروضی شاخدار مطلق نے عروضی پریڈ کے لیے ان ارکان کو لائن میں اٹن شن کھڑا کر دیا ہے :

مفاعیلُ فعولُ مفاعی لن فاعلن

شاخدار مطلق حضرت زار علاّمی نے بنیادی ارکان رکھے ہیں ۔

مفاعیلُ فعولُ مفاعیلُ مفاعلن

مکفوف مقبوض ومحذوف مکفوف مقبوض

آخری دو رکن تخنیق سے مفاعی لن فاعلن ہو گئے ۔

ہزج میں فعولُ کوئی مزاحف ہو ہی نہیں سکتا ، کیونکہ رباعی کے آخری ارکان کو چھوڑ کر ، اور کہیں حکم معاقبہ کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی ۔ مفاعیلن کے دونوں اسبابِ خفیف سلامت تو رہ سکتے ہیں ، لیکن دونوں ساقط نہیں کیے جا سکتے ۔ ی اور ن میں معاقبہ ہے ۔ ان میں سے صرف ایک ہی ساقط کیا جا سکتا ہے ۔ شاخدار مطلق حضرت زار علاّمی نے حذف سے تن ساقط کیا ماقبل ل کے ساتھ ، اور قبض سے ی ساقط کی ۔ اور اسے حشو میں رکھا ۔ یہ سراسر خلافِ وضع عروض ہے ۔

حذف ، آخر مصرع کا زحاف ہے ۔ مصرع میں پہلے حشو کے طور پر نہ محذوف مزاحف آ سکتا ہے ، اور نہ مقبوض محذوف ۔ جواز کیا پیش فرماتے ہیں ۔

"میں زار علامی کہتا ہوں کہ فعولُ (مقبوض محذوف) ایک متحرک الآخر رکن ہے۔ عروض وضرب میں وارد تو ہو سکتا ہے، مگر وہاں اس کا رکھنا اتنا آسان نہیں، اس لیے یہ رکن عروض وضرب کے زحاف حذف کے عمل کے بعد بھی صدر وابتدا میں اور حشوین میں رکھا جا سکتا (ہے)۔ اگر ان مقامات پر اس کا استعمال جائز نہیں تو قبض وحذف کا عمل (جو کہ از روئے عروض بادن تولے پاؤ رتی کے مصداق بالکل درست ہے) بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ لہٰذا مذکورہ متحرک الآخر رکن کی حشو میں رکھا جانا بالکل صحیح ہے۔"

ایک تو مقبوض محذوف، حکم معاقبہ کی صریحاً خلاف ورزی کر کے، بنایا گیا ہے۔ محذوف اور مقطوع رکن، چاہے صدر ومطلع کے زحاف یا عام زحاف کے ساتھ بھی مرکب ہو، اور یہی بات مکسوف اور موقوف مزاحف کے لیے ہے، اور یہی مسبّغ اور مذال مزاحف کے لیے بھی درست ہے کہ یہ صرف عروض وضرب میں رکھے جا سکتے ہیں۔ صدر ومطلع اور حشوین میں ان کا استعمال شعر میں تو ہو نہیں سکتا۔ البتہ زار علامی صاحب اپنے دست مبارک سے یہ مزاحف لکھ کر اپنے غسل خانے میں یا باورچی خانے میں یا دواخانے میں استعمال کریں تو کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

اگرچہ فیضی سے منسوب مثل سراسر نثر ہے۔ اگر جناب زار علامی نے عروض کے بارے میں کوئی معیاری کتاب پڑھی ہوتی اور سمجھی ہوتی تو وہ اسے مصرع کے بجائے معقد شعر بتاتے، اور اس طرح دوسرا رکن فعولُ رکھتے۔ لیکن قباحت پھر بھی باقی رہتی کہ حکم معاقبہ کی خلاف ورزی ہوتی، جس کی ہزج میں رباعی کی ضربوں کے علاوہ کہیں اجازت نہیں۔ جسے ہم رباعی کا مصرع سمجھتے ہیں وہ دراصل معقد شعر ہے۔

اور اب آخر میں کچھ اُن اعتراضات کے بارے میں جو حضرت زار علامی نے اس حقیر کی کتاب آہنگ اور عروض کی ایک عبارت پر کیے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"کمال احمد صدیقی کے یہ اقوال دیکھیے:

آہنگ اور عروض صفحہ ۱۲۲: فعْلُ فعولن تخنیق سے صرف فعْلن فعْلن ہو سکتے ہیں۔ صفحہ ۲۳۴: مستفعلُ فاعلاتُ فاعلان میں تخنیق سے مستفعِلُ لام ساکن ہونے سے مفعولن ہو جائے گا۔

یعنی کمال احمد صدیقی عمل تخنیق اور عمل تسکین، دونوں کو ایک ہی جانتے ہیں۔ کمال صاحب کو چاہیے تھا مستفعِلُ فاعلات میں تخنیق کے بجائے تسکین کہتے تو زیادہ مناسب تھا۔"

فارسی الفاظ میں جب تین متوالی حرکات ہوتی ہیں، تو شاعر کو اجازت ہے کہ وسطی حرکت کو زائل کرے۔ اسے تسکین اوسط کہتے ہیں۔ یہ ایک لسانی رویّہ ہے، جس کی وجہ سے عظمت میں ظ کے ساکن ہونے سے جو لفظ فعِلن کے وزن پر تھا، فعْلن وزن پر ہو گیا۔ ایسا ہی برکت کے ساتھ ہوا۔ یہ لسانی رویّہ فارسی عروض میں ایک زحاف کی حیثیت سے داخل ہوا۔ تسکین اوسط کا زحاف، جسے تسکین کہتے ہیں

جب ایک ہی رکن میں تین متوالی حرکات ہوں، جیسے فعِلُن یا فعِلاتن یا مفتَعِلُن، تو وسطی صوت ساکن ہونے سے فعلُن، فعْلاتن (مفعولن) مفتعلُن (مفعولن) ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر تین متوالی حرکات ایک ہی رکن میں نہ ہوں، اور دو ارکان ملوث ہوں تو اسے تخنیق کہتے ہیں۔ تسکین اوسط کی یہ دو صورتیں ہیں۔ عمل ایک ہی ہے، زحاف کے نام دو ہیں۔ جناب آل۔ علامی کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ وہ صرف اپنی کتابیں پڑھتے ہیں، یا وہ مضامین، جن کی دھجیاں کرنے کا ارادہ ہوتا ہے۔

افادات خورشید لکھنوی نے ۱۳۰۷ ہجری (۹۰-۱۸۸۹ء) میں لکھی تھی۔ تسکین اور تخنیق کی جو تعریفیں انھوں نے لکھی تھیں، نقل کی جاتی ہیں:

تسکین: اسکان حرف وسطی از سہ متحرک متوالی در یک رکن

تخنیق: ایضاً در ترکیب دو رکن

یہ حقیر ننگ عروض کمال عرض کرتا ہے کہ مُستفعِلُ فاعلاتُ ۔۔۔۔ میں ملاحظہ فرمائیں۔ مُستفعِلُ میں آخری دو حروف عِ اور لُ متحرک ہیں اور تیسری حرکت فاعلاتُ کے ف پر ہے۔ ف کی حرکت کے بغیر مُستَفعِلُ میں تین متوالی حرکات نہیں ہوں گی۔ اس لیے دو ارکان کی ترکیب یعنی دونوں کے متصل ہونے کی وجہ سے لُ پر تین میں سے درمیانی حرکت ہوتی ہے جس کا اسکان ہوتا ہے، اس لیے اس تسکین اوسط کو تخنیق کے تحت جو رکھا گیا ہے وہ درست ہے۔

قارئین کرام نے تو شاید توجہ سے یہ معروضات ملاحظہ فرمائی ہوں گی۔ حضرت علامہ آل۔ علامی سے گزارش ہے کہ پہلے وہ اپنا مضمون پڑھیں، پھر اس ننگ عروض کی یہ سطور ملاحظہ فرمائیں، اور اس کے بعد پھر ایک بار اپنا فاضلانہ مضمون پڑھیں۔ اور اگر ممکن ہو تو دیانت داری سے تبصرہ فرمائیں۔

قارئین کرام سے بھی گزارش ہے کہ اپنے ردعمل سے اس ننگِ عروض کی رہنمائی کریں۔ عروض اتنا پیچیدہ مضمون نہیں ہے، جتنا اسے عروض ناشناسوں نے بنا دیا ہے۔ میں عام انسان ہوں اور اپنے جیسے عام انسانوں کے لیے لکھتا ہوں کہ میری بات براہِ راست ان تک پہنچے۔ اگر میری تحریر میں کوئی غلطی ہو گی تو صاف نظر آئے گی۔ کوئی غلطی نظر آئے تو مجھے آگاہ ضرور کریں۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

انداز گفتگو کیا ہے۔	(تنقیدی مضامین)	شمس الرحمن فاروقی	۷۵/-
اسرار خودی (فراموش شدہ اڈیشن) (اقبال)	(شعری مجموعہ)	مرتبہ: شائستہ خان	۷۵/
حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدن	(تاریخ)	مالک رام	۷۵/
جام جہاں نما۔ اردو صحافت کی ابتدا	(اردو صحافت)	گربچن چندن	۷۵/
مسلمانوں کا تعلیمی نظام	(علمی)	ضیاء الحسن فاروقی	۴۵/
اردو ناول میں عورت کا تصور	(تحقیق)	فہمیدہ کبیر	۴۵/
نوٹوں کی تلاش	(ناول)	ایاز سیوہاروی	۶۰/
تاثر نہ کہ تنقید	(تنقید)	صدیق الرحمن قدوائی	۵۱/
اپنے دل کی حفاظت کیجیے	(ایلوپیتھی)	ترجمہ نذیر الدین مینائی	۲۵/
بہ صورت گر کچھ خوابوں کے	(انٹرویوز)	طاہر مسعود	۶۶/
مرضیات	(طب)	حکیم نعیم الدین زبیری	۵۱/
بانگ درا	(شعری مجموعہ، طلبہ اڈیشن)	اقبال	۹/
بال جبریل	(شعری مجموعہ) 〃	〃	۶/
ضرب کلیم مع ارمغان حجاز (اردو نظمیں)	(شعری مجموعہ) 〃	〃	۶/
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی	(ناول)	کشمیری لال ذاکر	۴۸/
گوشے میں قفس کے	(طنزیہ مزاحیہ)	دلیپ سنگھ	۴۵/
سحر کے پہلے اور بعد	(جگ بیتی)	سعید الظفر چغتائی	۵۱/
افکار اقبال	(اقبالیات)	محمد عبدالسلام خاں	۱۲۵/
فرمان فتح پوری	(شخصیت اور ادبی خدمات)	مرتبہ خلیق انجم	۲۵/
تذکرہ ماہ و سال	(تذکرہ)	مالک رام	۱۲۵/
تحقیق نامہ	(تحقیق)	مشفق خواجہ	۱۲۵/
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان	(مذہب)	حکیم محمود احمد برکاتی	۴۵/
خواب اور خلش	(شعری مجموعہ)	آل احمد سرور	۶۶/
سفر	(ناول)	رابعہ تبسم	۲۷/
تحریریں	(تنقید)	ڈاکٹر اسلم پرویز	۵۱/
پہچان اور پرکھ	(تنقید)	پروفیسر آل احمد سرور	۵۱/
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	(تحقیق)	ڈاکٹر سلامت اللہ	۵۱/
پت جھڑ کی آواز (نیا اڈیشن)	(افسانے)	قرۃ العین حیدر	۷۵/
اقبال کا نظریہ خودی	(تحقیق)	عبدالمغنی	۱۵۰/
سمندری خزانہ	(ناول)	ماریہ رحمان	۲۷/
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	(تنقید)	وارث علوی	۳۶/
فی الحقیقت	(طنز و مزاح)	یوسف ناظم	۴۵/
مٹی سے ہیرا	(ناولٹ)	سید مقبول احمد	۱۰/
جو بیچے ہیں سنگ سمیٹ لو	(ناولٹ)	صغرا مہدی	۲۴/
الجھاوے	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف	۵۱/
غبار منزل	(شعری مجموعہ)	غلام ربانی تاباں	۴۵/

ئبل اجملی
وپال۔ اوکھلا
ا معہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

اجمل اجملی (مرحوم) کی غالباً یہ آخری غزل ہے جو موصوف نے کتاب نما کے لیے مرحمت فرمائی تھی۔ (ادارہ)

کبھی جو میرے چمن میں بہار آتی ہے
تو اپنے ساتھ لیے ریگ زار آتی ہے[1]

کوئی تو حادثہ گزرا ہے شہرِ خوباں میں
صبا قفس میں بہت بے قرار آتی ہے

ہزار اہلِ خرد شب کی بیڑیاں ڈالیں
سحر جب آتی ہے دیوانہ وار آتی ہے

جھکائیں سر جو حرم میں تو کس لیے کہ ہمیں
فضائے کوئے بتاں سازگار آتی ہے

کریں تو کیسے بیاں غم کا ماجرا کہ ہمیں
نوائے غنچہ نہ صوتِ ہزار آتی ہے

وصالِ یار کی تکمیل ہو گئی شاید
کہ انگ انگ سے خوشبوئے یار آتی ہے

اترنے لگتے ہیں سینے میں آہٹوں کے چاند
کبھی جو شامِ شبِ انتظار آتی ہے

کبھی جو یاد کبھی آؤ تو اس طرح اجمل
کہ جیسے خوشبوئے گیسوئے یار آتی ہے

---

[1] در چاشت کہ از شبنم گل گرد فشاں است — آں باد کہ در ہند اگر آید جھکڑ آید (عرفی)

محسن احسان
شعبۂ انگریزی، اسلامیہ کالج،
پشاور۔
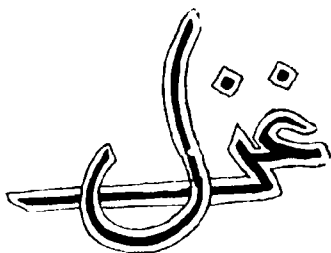
فضا میں غلغلہ شوریدگانِ راہ کا ہے
محل سرا میں عجب حال کج کلاہ کا ہے

لہو میں تر ہے مری زندگی کی دستاویز
مرا عدیل مگر منتظر گواہ کا ہے

مرے چراغ بجھانے سے پیشتر گن لے
بجا کہ زعم تجھے اپنے مہر و ماہ کا ہے

کوئی جہت ہی مقرّر کر اب خدا و ندا
یہ قافلہ تو نہ منزل کا ہے نہ راہ کا ہے

مرے لہو میں رچی ہے یقین کی سچائی
مری زباں پہ مگر ذائقہ گناہ کا ہے

پناہ دے کے جہاں سے، نہ قتل کر ڈالے
مجھے تو ڈر مرے اپنے جہاں پناہ کا ہے

سزائے دار ہے تقدیرِ قاتلاں محسنؔ
مگر ملال ہمیں ایک بے گناہ کا ہے

نکہت بریلوی
۱۲۸، علی و دولت اسکوائر، بلاک "جی"
نارتھ ناظم آباد، کراچی-۷۴، (پاکستان)

دو غزلیں

اب اس کی یاد ستانے کو بار بار آئے
وہ زندگی جو ترے شہر میں گذار آئے

یہ بے بسی بھی نہیں لطفِ اختیار سے کم
خدا کرے نہ کبھی دل پہ اختیار آئے

قدم قدم پہ گلستاں کھلے تھے رستے میں
عجیب لوگ ہیں ہم بھی کہ سوئے دار آئے

نہ چہچہے نہ سرودِ شگفتگی نہ مہک
کسے اب ایسی بہاروں پہ اعتبار آئے

تری لگن نے زمانے کی خاک چھنوائی
تری طلب میں تمام آرزوئیں ہار آئے

جنوں کو اب کے گریباں سے کیا ملے گا کہ ہم
بفیضِ موسمِ گل پیرہن اتار آئے

یہ فخر کم تو نہیں کوئے یار میں نکہت
نہ شرمسار گئے تھے نہ شرمسار آئے

۲

راستے محبت کے اور ہر قدم تنہا
اس کے باوجود اکثر تم رہے نہ ہم تنہا

اور بھی نکلتے ہیں اضطراب کے پہلو
باعثِ خلش ہوتا کاش تیرا غم تنہا

آپ کا تبسم بھی کام آگیا ورنہ
انقلاب کیا لاتی میری چشمِ نم تنہا

سب اسی کے طالب ہیں سب کو ہے لگن اس کی
پھر بھی اہلِ محفل میں لگ رہے ہیں ہم تنہا

اور بھی تو ہیں جن کو روشنی کی چاہت ہے
ہم ہی کس لیے ٹھہرے موردِ ستم تنہا

اہلِ درد میں کل بھی اپنا نام روشن تھا
آج بھی غنیمت ہے ایک اپنا دم تنہا

لاکھ بانٹ لے کوئی زندگی کے غم نکہت
پھر بھی سب پہ بھاری ہے اپنا اپنا غم تنہا

بچوں کے لیے مذہبی کتابیں

حضرت آدم علیہ السلام۔ منورہ نوری خلیق ۴/-
رسالہ دینیات اول محمد نعیم الدین زبیری ۳/
رسالہ دینیات دوم " " ۴/
رسالہ دینیات سوم " " ۵/
رسالہ دینیات چہارم " " ۵/
رسالہ دینیات پنجم " " ۶/
بزرگانِ دین محمود علی خاں جامعی ۴/
امت کی مائیں حسین حسنی ۴/۵۰
اچھی باتیں سعد الدین انصاری ۴/۵۰
خوب سیرت اول حکیم محمد سعید ۶/
خوب سیرت دوم " ۴/۵۰
سلطان جیؒ اسلم فرخی ۴/
رسولؐ اللہ کی صاحبزادیاں فضل قدیر ندوی ۴/۵۰
رحمان کا جہان رفیع الزماں زبیری ۶/
کمسن صحابی " ۵/
اسلام کے جاں نثار " ۴/
سیرت پاک مختصر مختصر احمد خاں خلیل ۳/
نور کے پھول حکیم محمد سعید ۹/
سب سے بڑے انسان۔رسولؐ اللہ " ۴/۵۰
حضرت حمزہؓ احتشام علی رحیم آبادی ۲/
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ " ۲/
حضرت ابو ہریرہؓ " ۴/
حضرت محبوب الٰہیؒ مشیر الحق ۲/
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ " ۲/
حضرت فرید الدین گنج شکرؒ " ۳/
حضرت معین الدین چشتیؒ " ۳/
حضرت ابوبکر صدیقؓ " ۶/
حضرت طلحہؓ " ۳/
حضرت سلمان فارسیؓ " ۲/۵
حضرت ابو ذر غفاریؓ " ۲/
حضرت عبداللہ بن عمرؓ " ۲/

حضرت عبداللہ بن عباسؓ مشیر الحق ۳/
نیک بیٹیاں " ۲/۵۰
اسلام کیسے پھیلا؟ حصہ اوّل عبدالواحد سندھی ۷/۵۰
" حصہ دوم " ۶/
قرآن پاک کیا ہے؟ " ۴/
اسلام کیسے شروع ہوا؟ " ۷/۵۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار اوّل، دوم " فی حصہ ۶/=
اسلام کے مشہور امیر البحر " ۹/
رسول پاکؐ " ۶/
دس جنتی الیاس احمد مجیبی ۵/۵۰
سرکار کا دربار " ۶/۵۰
چار یار " ۷/۵۰
آں حضرتؐ (اردو) " ۳/۵۰
حضرت محمدؐ (ہندی) " ۰/۴۰
اللہ کا گھر خلیل احمد جامعی ۴/۵۰
اللہ کے خلیل " ۳/۵۰
رسول پاک کے اخلاق " ۴/
اللہ کے صفی " ۲/۵۰
ہمارا دین حصہ اوّل سید شہاب الدین دسنوی ۸/۵۰
" دوم " ۷/۵۰
" سوم " ۶/۵۰
منہاج القرآن خدیجہ سیدنا طاہر سیف الدین ۴/۵۰
ارکان اسلام مولانا اسلم جیراجپوری ۲/۵۰
عقائد اسلام " ۲/۵۰
خلفائے اربعہ خواجہ عبدالحیٔ فاروقی ۹/
نبیوں کے قصے " ۶/۵۰
ہمارے رسولؐ " ۶/
پیارے رسولؐ سلطانہ آصف فیضی ۴/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاء ادارہ ۲/
مسلمان بیبیاں اعجاز الحق قدوسی ۹/
ہمارے نبیؐ سید نواب علی رضوی ۳/۵۰
سرکار دو عالم محمد حسین حسان ۹/
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد) (کلاں) ۰/۵۰

مسعود احمد برکاتی
۱۵/۴۶/۴، دستگیر سوسائٹی
کراچی۔ پاکستان

تھا عجب صاحب اخلاص و مروت وہ شخص

قمر ہاشمی بھی آخر اپنی ستر سالہ زندگی کا سفر ختم کرکے منزل آخر کی طرف چلے گئے۔ جوش صاحب کے بقول :

قبر میں جاتا ہے شاعر اور ابھرتے ہیں حروف

اب ادب کی محفلوں میں ان کے لاغر، مگر متحرک جسمانی وجود کے بجائے ان کے روشن حروف اور دوستوں کے دلوں میں ان کی خوش گوار یادوں کے چراغ جگمگاتے رہیں گے۔

قمر ہاشمی کے ساتھ زبان و ادب کی وہ روایات بھی چلی گئیں جو ایک طرف ان کے قدیم تعلیمی پس منظر اور دوسری طرف ترقی پسند تحریک کے زیر اثر نئی لفظیات سے ترکیب پاکر صورت پذیر ہوئی تھیں۔ قدامت و جدت کے امتزاج نے قمر ہاشمی کے اسلوب کی تشکیل کی تھی۔ اُن کی پچاس سالہ ادبی زندگی میں اُن کی شاعری پختگی کے ساتھ ساتھ وضاحت اور نکھار کے مراحل طے کرتی ہوئی جمال ادب اور کمال فن کی منزل پر پہنچی تھی۔ اس طویل عرصے میں انھوں نے کبھی شاعری سے بے وفائی نہیں کی۔ ان کی زندگی ہر قسم کے نشیب و فراز سے گزری۔ ۱۹۴۷ء کا ہنگامہ رستخیز، ایک ملک سے دوسرے ملک ہجرت اور نئے وطن میں نئے پن کی آزمایشیں بھی ان کو ادب کے میدان سے دور نہ لے جاسکیں۔ انھیں نظم گوئی سے زیادہ شغف تھا۔ متعدد جان دار نظمیں ان کے کلام کا وقیع حصہ ہیں، لیکن انھوں نے ہر صنف سخن میں اپنی قدرت اظہار کا ثبوت دیا۔ قمر ہاشمی سچے شاعر تھے اور سچے انسان بھی۔ انھوں نے اپنے شاعرانہ وجود میں ایک معصوم بچے کو بڑے استقلال سے پالا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے اندر کے سادہ انسان کو مرنے نہیں دیا اور انسان سے سچے پیار نے ان کی شاعری کو توانائی بخشی۔ زندگی کے گوناگوں تجربات اور سرد و گرم حالات نے بھی ان کے قلم کو جمود و تعطل کا شکار نہیں ہونے دیا بلکہ زیادہ رواں اور تیکھا کردیا۔

قمر ہاشمی اپنے ہمعصروں میں اس لحاظ سے منفرد تھے کہ شاعری کے ساتھ ان کی رفاقت کو نہ تو مصائب کی تلخی کم کرسکی اور نہ زمانے کی بد مذاقی۔ دوستوں کی بے اعتنائی اور ناقدروں کی ناقدری نے بھی ان کے ریاض فن کے تسلسل کو متاثر نہیں کیا۔

قمر ہاشمی کا اصل نام سید محمد اسماعیل تھا۔ وہ راجپوتانہ کی مسلم ریاست ٹونک کے ایک شریف اور خوش حال

گھرانے میں فروری ۱۹۲۴ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا حکیم سید احمد ہاشمی عالم بھی تھے اور حکیم بھی۔ وہ کچھ عرصے منصف بھی رہے تھے۔ قمر صاحب نے ابتدائی تعلیم، ناظرہ قرآن، اردو، فارسی اپنے والد سے حاصل کی، پھر دربار ہائی اسکول ٹونک میں داخل ہوکر میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ خاندانی حالات کے دگرگوں ہونے کی وجہ سے اس سے آگے باقاعدہ تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ البتہ پنجاب یونی ورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان دے کر کامیابی حاصل کرلی۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک بسلسلہ ملازمت کان پور (یوپی) میں قیام رہا۔ وہیں ترقی پسندی کے علم برداروں اور ادیبوں کی صحبت میں شاعری کا نیا انداز اختیار کیا۔ قمر ہاشمی کے بڑے بھائی سیّد عبداللہ سالک الہاشمی بھی شاعر تھے اور مولانا حسرت موہانی کے تلامذہ میں اپنے کو شمار کرتے تھے۔ سالک صاحب بھی صنعتی شہر میں قیام کی وجہ سے سرمایہ و محنت کے خروش سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے "سرمایہ داری" کے نام سے ایک تاریخی اور نیم سیاسی کتاب بھی لکھی تھی، لیکن بعد میں ان کی زیادہ توجہ وکالت کی طرف ہوگئی تھی اور شعر و ادب سے دور ہوگئے تھے۔

قمر صاحب نے ۱۹۴۷ء میں اردو کانفرنس لکھنؤ میں بھوپال کے ادیبوں کے وفد کے ساتھ شرکت کی۔ آزادی کے بعد ٹونک واپس چلے گئے اور چند مہینے قیام کے بعد پاکستان آگئے۔ یہاں کراچی میں ڈان کے اردو ایڈیشن سے وابستہ ہوگئے (۱۹۴۸ـ۴۹ء)۔ اردو ڈان کی زندگی نے وفا نہ کی تو کچھ دن ایک ماہنامے "مضراب" کی ادارت کی۔ وہ بھی زیادہ دن نہ جیا تو اندرون سندھ کا رُخ کیا اور ٹنڈو آدم کے شاہ عبداللطیف سیکنڈری اسکول میں استاد کی حیثیت سے کام کیا (۱۹۵۰ـ۵۱ء)۔ اسی دوران سندھی زبان سیکھی۔ روزنامہ "امروز" کراچی کے نمائندے کی حیثیت سے بھی اس دوران کارگزار رہے۔

کراچی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں میں شریک رہے اور آفس سکریٹری کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ ۱۹۴۹ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس لاہور میں ہوئی تو اس میں کراچی کے وفد کے ساتھ شرکت کی۔

۱۹۵۲ء میں جناب حکیم محمد سعید نے انھیں ہمدرد لیبوریٹریز پاکستان سے وابستہ کرلیا اور وہ شعبہ تجارت میں مامور کیے گئے، لیکن جلد ہی شعبے کے انچارج کی حیثیت سے ترقی پائی اور انتظامی صف میں شامل ہوگئے۔ اب ایک عرصے سے ماہانہ رسالہ "خبرنامہ ہمدرد" کی ترتیب و ادارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ آخر تک اسی منصب پر فائز رہے۔ بدھ ۲۱ جون ۱۹۹۳ء (۲۴ ذی الحجہ ۱۴۱۳ء) کو کراچی میں انتقال کیا اور نارتھ کراچی کا قبرستان ان کی ابدی آرام گاہ بنا۔ پس ماندگان میں صرف ایک بیٹا (سجاد ہاشمی) ہے۔

قمر ہاشمی پُرگو شاعر تھے۔ ان کی بے شمار نظمیں اور غزلیں برصغیر کے ادبی و علمی رسائل میں بکھری ہوئی ہیں کئی مجموعے مرتب اور منتظر طباعت ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں : (۱) تہ کمند افلاک (۲) فسون شب کا سفر (۳) ا

دستان (مقفی نظمیں) غزال اور شاخ زیتون۔
آخری دو نام غزلوں کے مجموعوں کے ہیں۔ طویل نظموں پر مشتمل پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں :
(۱) مرسل آخر (نعتیہ طویل نظم) (۲) ہمہ رنگ و نغمہ انساں (۳) دانائی کا آفتاب (۴) نروان ساگر (گوتم بدھ پر طویل رزمیہ) (۵) تماشا طلب آزار
موخر الذکر کتاب نوحوں پر مشتمل ہے۔ جناب احمد ندیم قاسمی اور جناب شان الحق حقی نے اس کتاب کے چوں میں قمر صاحب کے کمال فن کی غیر معمولی تحسین کی ہے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب نے لکھا ہے :

> "قمر ہاشمی اس دور کے ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ کم ہی اصناف سخن ایسی ہیں جو ان کے تخیل کی جولانی اور قلم کی روانی سے محروم رہی ہوں۔ طویل نظم سے لے کر غزل تک وہ ہر صنف شعر پر حاوی ہیں۔۔ قمر ہاشمی نے یہ نوحے لکھ کر ثابت کردیا ہے کہ کسی بھی موضوع کو اگر طلسم کار کا قلم چھوجائے تو وہ شعری حسن سے لبریز ہوجاتا ہے۔۔۔ جب قمر ہاشمی ان قدیم و جدید شخصیات کے علم و فن کا جائزہ لیتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ان کے کردار و مزاج کے علاوہ تہذیب و تاریخ کی دنیا میں حیرت انگیز کارکردگی کی مہریں ثبت کرتے جارہے ہیں۔ ہر مصرع ایک کثیر المطالعہ اور وسیع المشاہدہ' متوازن اور منصف مزاج نقاد کا فیصلہ معلوم ہوتا ہے' اور یوں قمر ہاشمی نے اردو شاعری میں شاید پہلی مرتبہ سیرت نگاری اور توصیف فن کو یکجا کردیا ہے۔ اتنے وقت طلب کام کو اتنی سہولت سے انجام دینا قمر کے سے قادر الکلاموں ہی کا حصّہ ہے۔"

تماشا طلب آزار میں ستر دانشوروں' اہل قلم' مصوروں' احباب' اعزہ کے نوحے شامل ہیں اور ان کے مطالعے کے بعد ان شخصیات سے شاعر کے خلوص' ذہنی ربط اور روحانی تعلق کے علاوہ وسعت قلب اور وسعت نظر کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ آخر میں مجاز کے انتقال پر نثر میں ایک تاثر بھی شامل ہے۔ میں نے اس کتاب پر چند سطریں لکھی تھیں وہ دہرانا مناسب ہوگا :

> "کئی طویل اور موثر نظمیں لکھنے کے بعد اب قمر ہاشمی نے "یاد رفتگاں" کی محفل سجائی ہے۔ اس محفل میں جب مختلف شعبہ ہائے زندگی کے' مختلف سطحوں اور مختلف قوموں کے افراد کو مسند نشین دیکھتے ہیں تو قمر ہاشمی ایک وسیع نظر اور وسیع القلب انسان کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ ان کی دردمندی' سادگی اور مست خیالی ان کو قابل احترام بناتی ہے"

جناب شان الحق حقی نے قمر صاحب کی شاعری کے بارے میں اسی کتاب میں لکھا ہے :

"جناب قمرہاشمی ہمارے دور کے ایک پختہ مشق' خوش گو اور روشن خیال شاعر ہیں جو دراصل ان کی اور ان کے کلام کی تعریف ناتمام ہے... ان کے امتیازی کارنامے ان کی طویل نظمیں ہیں... ان کی ایک اور طویل نظم "مرسل آخر" ایک منفرد نعتیہ نظم ہے جو اردو یا کسی بھی زبان میں سب سے طویل نعتیہ نظم ہونے کے علاوہ اپنے ادبی محاسن' خلوص' جوش و جذبے کی بنا پر بھی ایک شاہکار ہے... مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تاریخ ادب میں قمرہاشمی کا نام روشن رہے گا۔"

قمرہاشمی نے بچوں کے لیے بھی شاعری کی۔ بچوں کے لیے نظموں کی صحیح تعداد مجھے یاد نہیں' لیکن اتنا مجھے یقین ہے کہ سو سے کم نہ ہوں گی' کیوں کہ ہمدرد نونہال میں وہ کم و بیش ۳۰ سال سے لکھ رہے تھے اور ان کو بچوں کی نفسیات کے مطابق اور انھی کی زبان میں شاعری کرنے پر بہت اچھا عبور ہوگیا تھا۔

اپنی ادبی زندگی کی ابتدا میں قمرہاشمی نے چند افسانے بھی لکھے تھے' لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو قارئین کے ردِعمل سے جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ افسانوں کے لیے ان کا نثری اسلوب موزوں نہیں ہے۔ چناں چہ انھوں نے اپنی تخلیقی توانائی کو تمام تر شاعری کے لیے مختص کردیا۔

انسان کی حیثیت سے قمرہاشمی کی سادگی' سادہ دلی' شرافت اور محبت کے تمام دوست اور ہم عصر ادیب و شاعر قائل ہیں۔ وہ ایک مرنجا مرنج' بے ریا' منکسر انسان تھے بلکہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اپنے مقام اور اپنی شخصیت عرفان خود انھیں حاصل نہیں تھا۔ ان کی ظاہری شخصیت طبیعت کی بے نیازی کی وجہ سے ان کی معنوی شخصیت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی تھی۔ وہ اپنے من کی دنیا میں اتنے مگن رہتے تھے کہ انھوں نے زیب و زینت کی کبھی پروا نہیں کی۔ اس لحاظ سے وہ مولانا حسرت موہانی سے مماثلت رکھتے تھے۔ گفت گو میں بھی اور کلام سنانے میں بھی ان کی آواز اور لہجہ زیادہ موثر نہیں تھا۔ نماز کے بہت پابند تھے۔ عمرہ کرنے گئے تو داڑھی رکھ کر واپس آئے۔

زندہ دلی' ہمت اور برداشت میں بھی بہت کم لوگ قمرہاشمی کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ چند برسوں کے اندر اندر چھوٹے بھائی کی جواں مرگی' چھوٹی بہن' بڑے بھائی' بہنوئی اور بیوی کے انتقال اور سب سے بڑھ کر جوان اور اکلوتی بیٹی کی موت کو انھوں نے جس صبر و ضبط سے برداشت کیا' اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ خصوصاً ایک حساس شاعر کے لیے ایسے اور اتنے سانحوں کو جھیل جانے کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے۔ اس سے زیادہ عجیب اور قابل قدر بات یہ ہے کہ ان صدموں کے ذکر سے کبھی احباب کو افسردہ کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ خوش طبعی کی باتیں کرتے' مسکراتے' قہقہے لگاتے' لطیفے سنتے سناتے اور محفل کی فضا کو فرحت انگیز بنادیتے تھے۔ اختر شیرانی کے نوحہ میں قمر صاحب کا یہ شعر خود ان پر بھی پوری طرح صادق آتا ہے :

محبت اس کا مشرب تھی' وہ سرشار محبت تھا
محبت نے ہمیشہ اس کا دامان نظر کھینچا

حمید سورتی
تن زیب بلڈرس۔ سیکنڈ پیرخاں سٹریٹ
بمبئی ۸

فیروز مرزا
۲/۱۰۷ الف متی لین ٹکیہ پاڑہ
ہوڑہ ۱

ہر سزا اُن کے سروں تک آگئی
سچائی جن کے لبوں تک آگئی

جو محض تھی سازشی تاریخ تک
دشمنی اب وہ دلوں تک آگئی

قافلے لٹتے رہیں گے دم بدم
رہبری اب رہزنوں تک آگئی

جاہلوں تک گر تو ہتم ہو تو ہو
اب یہ آندھی عالموں تک آگئی

سن! ہر اک در سے صدائے العطش
آگ صحرا کی گھروں تک آگئی

ووٹ کی قیمت ہوئے دین و دھرم
یہ تجارت معبدوں تک آگئی

پیار کی خوشبو رہے گی کس طرح
بادِ نفرت جب گلوں تک آگئی

اے خدا رحمتوں کی بارش پھر
کر گئی لخت لخت خواہش پھر

پھول خوشبو سے ہو گیا بدظن
کی ہواؤں نے کیسی سازش پھر

موم کے گھر میں آگیا سورج
لگ گئی اک نئی نمایش پھر

کیوں معلّق ہوئی دُعا دل کی
کیا فضاؤں نے کی نوازش پھر

اُنگلیاں زلف میں نہیں پھنستیں
ہے کہاں ہاتھ کی رہایش پھر

ویدورما راز
معرفت سکرمن ویز بالمقابل دیانند
میڈیکل کالج، سول لائنز، لدھیانہ۔

غزل

میں بھی پتھر کا ہو گیا شاید
لگ گئی شہر کی ہوا شاید

شہر کچھ ایسا اجنبی تو نہیں
میں ہی لگتا ہوں خود نیا شاید

اپنی صورت بھی دیکھ لوں اس میں
کوئی لایا ہے آئینہ شاید

اپنے گھر کا پتا نہیں ملتا
بھول بیٹھا ہوں راستا شاید

اپنے دامن میں بھر لیے پتھر
ان میں ہو کوئی کام کا شاید

ناخدا ڈوب کر سمندر میں
میری کشتی بچا گیا شاید

ہمایوں ظفر زیدی
ص۔ب ۳۸۷۵ رووی ۱۱۲
سلطنت عمان

غزل

ہوا کے رخ پہ ہی شمع اک جلا دی ہے
دیارِ غیر میں اک بزم تو سجا دی ہے

بس اک خیال کو جاں سے عزیز تر رکھا
مکانِ خواب میں یہ زندگی گنوا دی ہے

کرا دیا ہے میرا زندگی سے سمجھوتہ
یہ کس قصور کی اس نے مجھے سزا دی ہے

کسی کی یاد کا بادل کچھ اس طرح برسا
کہ اس نے ضبط کی دیواریں گرا دی ہے

وہ مہربان رہائی تو دے رہا ہے مگر
ہمیں نے قید کی میعاد خود بڑھا دی ہے

وہ ایک بات جو لب پہ نہ آ سکی اب تک
غزل کی آڑ میں وہ بات بھی بتا دی ہے

نہیں کہ نالۂ جاں خاک ہو گیا یونہی
کسی نے مدتوں اس آگ کو ہوا دی ہے

جوان موتوں پہ شورِ فغاں نہیں اٹھتا
ہمارا شہر بہت حادثوں کا عادی ہے

محمد ہارون رشید 'صبا'
شعبۂ اردو، لکھنؤ یونی ورسٹی۔

آبلہ پا بھی تھا، تنہا تھا، سنبھلتا کیسے
ساتھ چلتا جو زمانے کے تو چلتا کیسے

یہ الگ بات کہ خوابوں پہ یقیں کرنا پڑا
وہم جو دل میں بسا تھا وہ نکلتا کیسے

گردشِ وقت کی ہوتی نہ اگر سب پہ نظر
غم کا سورج جو کبھی ڈھلتا تو ڈھلتا کیسے

اُس کی کشتی کے مقدر میں تو غرقابی تھی
رُخ ہواؤں کا بدلتا تو بدلتا کیسے

واپسی کا نہ کوئی نقشِ کفِ پا دیکھا
اُن کی محفل کا پتا چلتا تو چلتا کیسے

سیتا رام گپتا
۸-۱۹۸ - ۸۵ - پیتم پورہ دلی ۳۴-۱۱

"نظم کی تخلیق کا مُہانا"
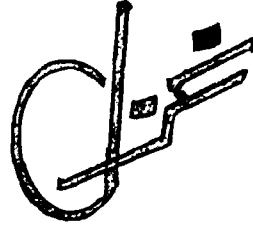
مجھے حیرانی ہوتی ہے
میں لکھ رہا ہوں نظم
کبھی میں نے نہیں چیرا ہو دھرتی کا سینہ
ہل کے پھال کی نوک سے
مٹی میں کپڑے لوکیا
ہاتھ بھی نہیں ہوئے میلے میرے
پھر بھی لکھ رہا ہوں نظم / فصلیں اگیں
ہلنے لگیں کومل کونپلیں
میلوں تک چاروں اور / پر میں نے نہیں دیا پانی
ان کھیتوں کی کیاریوں میں
جاگ جاگ کر / رات رات بھر
پوس ماگھ کی منجمد کر دینے والی ٹھنڈ میں
ٹھہرے اور پالے میں۔
اس پر بھی لکھ رہا ہوں نظم
پک کر تیار گیہوں کی بالیاں
جمع ہو چکی ہیں کھلیانوں میں
میں تب بھی نہیں گیا
بھوسے سے گیہوں الگ کرنے
چلچلاتی دھوپ میں
اور سن سن کرتی لو میں
پھر بھی نظم لکھی جا رہی ہے / نظم لکھی جا رہی ہے
شاید اسی کے دم سے / جس نے مٹی کو اپنے سے
دور نہیں مانا ہے / ٹھنڈ نہیں جاتی ہے
گھام نہیں جانا ہے ●●
(گھام = دھوپ)

محمد عبدالقادر ادیب
ایڈوکیٹ، بنگلور۔

دانش گاہِ اُردو کا قیام

(اردو یونی ورسٹی کمیشن کی خدمت میں منظوم مشورہ۔ ادیب)

جہاں تک دیکھیے اُردو زباں ہے ضوفشاں اب تک　　دکن کی سرزمیں پر ہے مثالِ کہکشاں اب تک
کہ گلبرگہ علومِ وقت کا ہے آستاں اب تک　　زمانے کے لبوں پر ہے یہی وردِ زباں اب تک
یہاں اُردو کی دانش گاہ کی گرد اوری ہو گی
زمانے بھر میں اس کی قدر ہو گی دلبری ہو گی

زباں عثمانیہ[1] کی کٹ گئی تو چُپ رہا خنجر　　کہوں کیا خونِ ناحق دیکھتے ہی گر پڑا خنجر
ستم انجام کا دیکھو کہ خود رونے لگا خنجر　　خدا جانے کہاں پھر شرم سے وہ گر گیا خنجر
کمالِ بے زبانی کا نظارہ دیکھتے جاؤ
خموشی میں تکلم کا اشارہ دیکھتے جاؤ

کمیشن سے مزاجِ وقت کی اتنی گزارش ہے　　دکھا دو دردِ دل، دردِ جگر میں کتنی تابش ہے
کمیشن کی سفارش تو زمانے پہ نوازش ہے　　مگر یہ عقل و دانش کی، بڑی ہی آزمایش ہے
تمنا کے سمندر میں سہارا مل ہی جاتا ہے
تلاطم خیز طوفاں میں کنارا مل ہی جاتا ہے

جہاں قیوم[2] صادق ہے جہاں قسمت سے راہی[3] ہے　　جہاں خلص حسینی[4] ہے جہاں پر حق پناہی ہے
جہاں دیکھو وہاں حسنِ نظر کی سربراہی ہے　　علومِ ظاہری کی، باطنی کی بادشاہی ہے
چراغِ علم سے تم نے ہر اک گھر کو اُجالا ہے
وطن کے گوشہ گوشہ میں تمہارا بول بالا ہے

جہاں عرفاں کی، ایقان[5] کی جلوہ فشانی ہے　　وہاں موجِ تفکر کی روانی ہی روانی ہے
کمیشن کی نظر کی بس یہی تو کامرانی ہے　　یہ دیکھے کس جگہ اُردو زباں کی حکمرانی ہے
ادیبِ خوش بیاں کا مختصر ہے یہ بیاں دیکھو
کشادہ ہو اگر دل، زندگی کا ہے نشاں دیکھو

---

[1] جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، جہاں ۱۹۵۰ء تک اردو ہی ذریعہ تعلیم تھی، خاکسار نے عثمانیہ سے اُردو ہی میں قانون کی ڈگری لی ہے۔ [2] ڈاکٹر قیوم صادق صدر شعبۂ اردو جامعہ گلبرگہ [3] ڈاکٹر راہی قریشی ریڈر شعبۂ اردو جامعہ گلبرگہ جو اُردو کے نامور شاعر ہیں [4] تقدس مآب محمد محمد الحسینی درگاہِ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے سجادہ نشین۔ خواجہ ایجوکیشن سوسائٹی کے صدر، بندہ نواز ہاسپٹل کے سرپرست، بی بی رضا گرلس کالج کے بانی و مبانی۔ [5] ہفت روزہ اُردو اخبار گلبرگہ

صلاح الدین انور (اندھوسی)
خلیل پورہ پھلواری شریف۔ پٹنہ۔ بہار

رھبر جونپوری
۸ ۴۴۳/۴۴۳ سیکٹر۔ گووندپورہ۔ بھوپال

ہم نگہبانِ چمن سولی پہ چڑھوائے گئے
دشمنِ گلشن جو تھے محفل میں بلوائے گئے

کوئی سمجھا ہے نہ سمجھے گا ترے انداز کو
چاہنے والے ہی محفل سے نکلوائے گئے

کون مانگے گا دعائے زندگی اِس دور میں
فصلِ گل آتے ہی ہم زنداں میں ڈلوائے گئے

ظالموں نے اوڑھ لی چادر شریفوں کی صلاح
اور جو مظلوم تھے مجرم کہلوائے گئے

زندگی کو خواب لاحاصل بنا کر رہ گیا
انقلابِ وقت آئینہ دِکھا کر رہ گیا

دشت ہائے کشمکش میں جاگتا جیتا شعور
ایک جگنو کی طرح بس جگمگا کر رہ گیا

اس صدی میں خون کے دریا بہا سکتے ہیں لوگ
کوہکن تو صرف جوئے شیر لا کر رہ گیا

کیا سمجھتا وہ کہ بنتی ہے عمل سے زندگی
جو مقدر کو ہتھیلی پر سجا کر رہ گیا

دوستوں کی مہربانی کا جب آیا تذکرہ
بر بنائے مصلحت میں مسکرا کر رہ گیا

مناظر عاشق ہرگانوی
کوہسار، برہ پورہ، بھاگلپور (بہار)

ایودھیا

سانپ کتنے سرسراتے ہیں یہاں
ہم نے گننے کی کبھی کوشش نہیں کی
اور کبھی جھکنے کے بارے میں
ہم نے سوچا ہی نہیں
آج لیکن دب گئے ہیں
آگ کی لمبی زبانیں
ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں
سانپ کی یہ اکثریت
زہر کا جادو جگا کر
دوستی کی اپنی گواہی دے چکی ہے
اور ہم مجبور و بے بس!

۲

مذہب کے دائرے میں بندھا
آدمی کا جیون
کتنا واہیات ہوگیا ہے
ٹھنڈی زہر بھری بوسیدگی سے
اور بندشوں سے
ٹکراتی ٹوٹتی سانسیں
عدالت سے پرے
کارسیوکوں کی زد میں آگئی ہیں
ننگی سچائی کے سامنے
ہم بے حد کھوکھلے ہوچکے ہیں!

حسن رضا
کوارٹر نمبر ۱۲۔ اے۔ رائے چور
کرناٹک

ایک مدت ہوئی کھو بیٹھے یقیں کی دولت
اب اثاثہ تو فقط وہم و گماں ہے یارب

جوڑ رکھی ہے فقط ہم نے مسافت کی تھکن
یہ ہی پونجی ہے یہی حاصلِ جاں ہے یارب

بے نیازی کا ہو اظہار بہت مشکل ہے
ہر قدم مرحلۂ سود و زیاں ہے یارب

کوئی ہلچل ہے نہ آہٹ ہے نہ دستک نہ پکار
رابطِ انفاس میں کیا ضبطِ فغاں ہے یارب

کوئی صورت نہ کوئی شکل بنی آج تلک
یہ رضا صرف دھواں صرف دھواں ہے یارب

شررِ غازی پوری
مڈل اسکول، بدو بتھرا پور،
جنوبی انڈمان، پورٹ بلیر۔

درشن لعل کپور
۴۴ تیغ بہادر روڈ
دہرہ دون

پیار کے قد کو گھٹانا ہمیں دشوار لگا
یا انھیں اپنا بنانا ہمیں دشوار لگا

شہریاروں سے عداوت کے گنہ گار ہوئے
اک ذرا سر کو جھکانا ہمیں دشوار لگا

نوچ سکتے تھے مہ و نجمِ فلک سے ہم بھی
پنجۂ جبر بڑھانا ہمیں دشوار لگا

یوں تو دشوار نہ تھا ترکِ تعلق لیکن
دل کو ہمراز بنانا ہمیں دشوار لگا

آئینہ سازوں کی بستی تھی مگر کیا کہیے
دل کا آئینہ بچانا ہمیں دشوار لگا

دوپہر دھوپ میں بھی پیڑ کی چھاؤں کا شرر
کوئی احسان اٹھانا ہمیں دشوار لگا

سکوں، رشک سے جلتا ہوا امکاں سا لگا
یقیں خوف سے اٹھتا ہوا دھواں سا لگا

نہ کوئی راہ سے نسبت، نہ کوئی راہی سے
ضمیر گرد میں لپٹا ہوا ایماں سا لگا

قدم قدم پہ ملی ہے تری عبادت گاہ
قدم قدم پہ ترا دین بدگماں سا لگا

تری نگاہ کا جھکنا ستم گری تھا مگر
تری نگاہ کا اٹھنا بھی سرگراں سا لگا

نہ آرزؤں کا ماتم، نہ شوقِ دیدِ فلک
ترا فسانہ بھی کچھ اپنی داستاں سا لگا

انتخاب عالم
بڑی مسجد ۔ شاہجہاں پور
یو ۔ پی

تاریخ خود کو دُہراتی ہے

لوگ کہتے ہیں
تاریخ خود کو دُہراتی ہے
اور اگر واقعی یہ سچ ہے
تو پھر انسانیت لوٹ کر کیوں نہیں آتی
تاریخ خود کو دُہراتی ہے

اے مالکِ دو جہاں
بقائے انساں کی خاطر
امن و امان کی خاطر
بچوں کی معصوم ہنسی
اور
انسانیت کی عظیم رشتوں کی خاطر
اب اس قولِ پارینہ کو
تو غلط کر دے
کہ تاریخ خود کو دُہراتی ہے۔

پروفیسر اختر بانو ناز
دیوگری کالج آف آرٹس اینڈ کامرس ۔ پربھنی
مہاراشٹر

دل میں غم بے سبب نہیں رہتا
میں یوں ہی جاں بلب نہیں رہتا

لاکھ میں اُس کو بھولنا چاہوں
میرے دل میں وہ کب نہیں رہتا

کوئی خواہش تو دل میں رہتی ہے
آدمی بے طلب نہیں رہتا

ملنے تک سے گریز کرتا ہوں
مجھ کو پاسِ ادب نہیں رہتا

نازؔ بے چین رہتا ہے دل بھی
یاد کا کرب جب نہیں رہتا

عارف شجر
لوہینگھمنہ۔ ہزاری باغ

نصرت جہاں نصرت
۱۴۔ اسمٰعیل مدن لین کلکتہ ۱۲

بہت ہو ذہن جب بیدار پڑھنا
نہیں ہے کچھ بھی تو دشوار پڑھنا
ہے اس میں کون سا اسرار پڑھنا
لکھا ہے کیا پسِ دیوار پڑھنا
بدل جاتا ہے موسم کی طرح یہ
بشر کو ہو گیا دشوار پڑھنا
خوشی برپا کرے جو زندگی میں
سبق ایسا شجر ہر بار پڑھنا

عمر بھر ہم پہ رہے آدمیت
مشعلِ راہ بنتے رہیں گے
اُن کے قدموں کو چومے گی منزل
جو بھی گر کر سنبھلتے رہیں گے
اپنے ماضی کو ہم یاد کر کے
کب تلک ہاتھ ملتے رہیں گے
ہے محال اور دشوار نصرت
جستجو پھر بھی کرتے رہیں گے

شاکر ادیبی
ٹیچرس کالونی، بندر محلہ۔ بھیونڈی۔

بول اُٹھے دلِ اپنا سچے چہرے ہیں
اپنے عہد میں ایسے کتنے چہرے ہیں
توڑ کے دل ہم دلداری بھی کرتے ہیں
اپنے اک چہرے پہ کتنے چہرے ہیں
آنکھ ملائیں ظرف اگر رکھتے ہیں ہم
آئینے کے سامنے اپنے چہرے ہیں
گرم ہواؤں میں بھی کھل اُٹھے شاکر
کوئی دیکھے وہ بھی کیسے چہرے ہیں

راشد جمال فاروقی
رشی کیش

ہمارے ساتھ تو اکثر یہی تماشا رہا
کہ جس کو خود سا سمجھتے رہے خدا سا رہا
کہ دور رہ کے بھی اس سے نہ دور رہ پائے
نواحِ جاں میں کوئی صدا لگاتا رہا
کوئی خفا نہ رہے مجھ سے، بس اسی دُھن میں
میں اپنے آپ سے اکثر خفا خفا سا رہا
انا کی قید ہی وہ تھی کہ کب رہائی ہوئی
وہ سب قریب جو تھے اُن سے فاصلہ سا رہا

معین مضطر
۸۸/۱ - گدڑیانہ - اُناؤ - یو۔پی

نسیم عزیزی
۳۱۲، بیلیلیس روڈ، ہوڑہ۔

پندارِ ذات میرا ہے گلزار ہر طرف
دامن دریدہ جب سے ہے کردار ہر طرف
ادراک و فہم و عقل کے خنجر ہوئے ہیں کند
تلواریں لاشعور کی سرشار ہر طرف
حصے میں میرے آئی ہیں گمنام وادیاں
پائلیں اس کے شہروں کی جھنکار ہر طرف
اندازِ گفتگو بھی نہ ہو جس کا دلنشیں
اس کو ملی ہے شہرتِ گفتار ہر طرف
مضطر میں کیا بتاؤں کہ مہدی کب آئیں گے
کب ہوں گی یہ فضائیں پُر انوار ہر طرف

تمھیں زورِ قلم کا اپنے یوں اظہار کرنا تھا
محبت کی حسیں تصور کو شہکار کرنا تھا

کہوں کیا، ہیں ربابِ دل میں کتنے گیت خوابید
فضا مسحور ہو اٹھتی ذرا بیدار کرنا تھ

مگر قسمت کہاں ایسی ملی مجھ کو زمانے می
نشیلی چاندنی رُت میں ترا دیدار کرنا تھ

نہ رکھو آئینے کے سامنے اک اور آئین
صداقت پر نہ ہرگز کوئی ایسا وار کرنا ت

جو انگلی اٹھ رہی ہے اب تری جانب تو کیوں غ
اگر تھی فکر، خود کو صاحبِ کردار کرنا

شارق عدیل
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ

شام ڈھلے چلے کہاں وقت بہت خراب ہے
کوئی سڑک نہیں رواں وقت بہت خراب ہے
ساری فضا کے جسم پر ٹانک رہے ہیں راکھشس
قہر و غضب خموشیاں وقت بہت خراب ہے
تیز روی کے باوجود ٹھہری ہوئی ہے زندگی
کوششیں ساری رائیگاں وقت بہت خراب ہے

عبداللہ ولی بخش قادری
۴۲-اے، اوکھلا منڈی دہلی ۲۵

ڈاکٹر اجمل اجملی کی یاد میں

ان کا شعر ہے:

دل کی حالت کیا بتلائیں، ریزہ ریزہ ٹوٹ رہا ہے
کچھ دن ٹھہرو پوچھنے والو، چھاپیں گے اخبار ہمیں

افسوس! صد افسوس!! یہ گھڑی، منحوس گھڑی آکر ہی رہی۔ اخبارات نے چھاپ دیا کہ ۶۔ اگست ۹۳ء کی صبح کو مشہور صحافی اور ترقی پسند شاعر و ادیب ڈاکٹر اجمل اجملی کا انتقال ہو گیا۔۔۔۔۔۔"

اجمل کا مجموعۂ کلام 'سفر زاد' مارچ ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں یہ غزل شامل ہے جس کا آخری شعر اوپر درج کیا گیا ہے۔ یہ کوئی الہامی کیفیت نہیں تھی جو شعر میں ڈھل گئی بلکہ صورتِ حال کا سچا اور کھرا اظہار تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اور کہنے سے قبل اسی مجموعے کی دوسری غزل کے یہ چند اشعار بھی پیش کر دیے جائیں تاکہ حقیقت عیاں ہو جائے:

یادش بخیر اک گلِ شاداب تھے کبھی — ایسی خزاں پڑی ہے کہ کمھلا گئے ہیں ہم
صبحِ وصال تھی تو طبیعت تھی باغ باغ — شامِ فراق آئی تو گھبرا گئے ہیں ہم
انسان تیری فتح پہ اب بھی یقین ہے — گو اپنی زندگی سے بھی گھبرا گئے ہیں ہم
محرومیوں کا بارِ گراں دوش پر لیے — اے موت آ کہ تیرے قریب آ گئے ہیں ہم

یہ سب اشعار اجمل کی زندگی کے آخری چند سال کے تلخ حقائق کا نپا تلا بیان ہونے کے علاوہ ان کے عقیدے کی پختگی کے بھی غماز ہیں۔ اُن کی اس دور کی زندگی کی طرف چند اشارے ہی اِن اشعار کی معنویت اور صداقت کو اجاگر کرنے کے لیے کافی ہیں۔ والدِ ماجد کی وفات کے بعد انھیں کچھ ایسا دھکا لگا کہ کسی قدر فالج زدہ ہو کر رہ گئے۔ اس کے بعد امراضِ قلب نے گھیر لیا نیز کچھ اور جسمانی عارضوں نے آن دبایا۔ حتیٰ کہ چلنا پھرنا دوبھر ہو گیا۔ مگر وہ اپنی ہمت اور منحنی سی چھڑی کے سہارے فلک کج رفتار کا منہ چڑاتے رہے۔ لیکن

آسمان ہی اُن پر آن پڑا۔ اَناًفاناً رفیقۂ حیات نے داغِ مفارقت دے دیا۔ گویا اُن کی زندگی کا اصل سہارا ہی جاتا رہا۔ وہ بالکل ٹوٹ کر رہ گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُن کی چار معصوم بچیوں کے وجود نے ہی اس حادثے کے بعد اتنے عرصے تک انھیں ہمارے سامنے موجود رکھا۔ ان کی بیوی صوفیہ مرحومہ صحیح معنوں میں ان کی شریکِ زندگی بلکہ زندگی اور گھر کی روحِ رواں تھیں، ایک دل آویز شخصیت اور ملنسار طبیعت کی مالک۔ اس صدمے نے ان کے گھر کی کایا ہی پلٹ کر رکھ دی۔ آنکھوں کے سامنے دیکھتے دیکھتے، چند ہی برسوں کے اندر ایک مطمئن اور آسودہ حال گھرانہ، ایک مسلسل خوابِ پریشان کا شکار ہو کر رہ گیا۔ اب اجمل کو ایک اور نئی بیماری نے دبوچ لیا۔ اُن کے پیٹ میں پانی بھرنے لگا۔ استسقا ہوگیا۔ ستم بالائے ستم ملازمت بھی ہاتھ سے گئی۔ اور ملازمت بھی کیسی جو اُن کے نزدیک خدمت بھی تھی اور اپنے مسلک کی آبیاری بھی۔ ادھر دو تین سال کے عرصے میں وہ بالکل گھل کر رہ گئے۔ اس دوران پانی نکلوانے کے وقفے برابر چھوٹے ہوتے رہے۔ اب ہفتہ عشرہ کاٹنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ آخری بار ہولی فیملی اسپتال میں داخل ہونے سے دو روز قبل ہی بات چیت رہی تھی۔ اور اس وقت انھیں پانی نکلوا کر گھر آئے ہوئے بمشکل تین روز گزرے تھے۔ اتنی جلدی جلدی اسپتال کا آنا جانا ہی تکلیف کا موجب نہ تھا بلکہ کمزوری اور شدتِ مرض کی ایذا میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ اٹھ نہیں سکتے تھے، پیٹ میں پانی بھرا ہوا تھا مگر دیکھتے ہی اٹھنا چاہا۔ میں نے بڑھ کر اپنا ہاتھ اُن کے سر پر رکھتے ہوئے انھیں اٹھنے سے روکا۔ آب دیدہ ہوگئے۔ اُن کے روئیں روئیں سے جسمانی کرب کا احساس مرتب ہو رہا تھا۔ میں اُن کے پلنگ کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونوں کو اپنے آپ کو سنبھالنے میں دو ایک منٹ کا وقفہ لگا۔ "آپ کیوں آئے؟ زینہ ...." انھیں بولنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ الفاظ بھی صاف طور پر ادا نہیں ہو رہے تھے۔ مگر وہ بولے چلے جا رہے تھے۔ تین سال قبل میری بائی پاس سرجری، ہو چکی تھی۔ اس لیے اُن کی کوشش رہتی تھی کہ میں کم سے کم ان کے یہاں جاؤں کیونکہ ان کی رہائش مکان کی بالائی منزل پر تھی اور اپنے آپ تقریباً لاچار ہونے کے باوجود جب چاہا ایک بچی کو ساتھ لیا اور رکشا میں بیٹھ کر آ گئے، جب کہ دونوں مکانوں کی مختصر سی مسافت بھی ان جیسے مریض کے لیے قطعی ناروا تھی لیکن انھیں کون روک سکتا تھا۔ اس معاملے میں استاد کی حکم عدولی بھی برداشت تھی۔ وہ انٹرمیڈیٹ کلاس میں میرے شاگرد رہے تھے۔ اس وقت وہ انیس بیس سال کے رہے ہوں گے۔ اس اعتبار سے میں اُن سے چار پانچ برس ہی بڑا تھا اور مجیدیہ اسلامیہ کالج الٰہ آباد میں ایک نو وارد استاد کی حیثیت رکھتا تھا۔ عملی زندگی

میں یہ میرا پہلا قدم تھا۔ اُن کی ذہانت، متانت اور شرافت نے متاثر کیا۔ تفاوت عمر بھی ایسا نہیں تھا کہ ربط باہم میں مخل ہوتا۔ لہٰذا برادرانہ تعلق قایم ہوتے دیر نہیں لگی۔ وہ ۵۲ء میں الٰہ آباد یونی ورسٹی میں پہنچ گئے۔ اور میں اگلے سال جامعہ برادری میں شامل ہو گیا۔ یوں الٰہ آباد چھوٹ گیا۔ مگر ان سے تعلق خاطر برقرار رہا۔ لیکن آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے بے خبر ہوتے چلے گئے۔ وہ ۶۲ء کے آس پاس دہلی آگئے اور حسن اتفاق سے قرب میں ہی رہائش اختیار کرلی۔ پھر مل گئے۔ اب وہ پی ایچ۔ ڈی کرچکے تھے۔ قلم کے دھنی تھے۔ یہاں سوویت دیس سے وابستہ رہے۔ یہ اندازہ لگانا دشوار ہے کہ اس کے لیے کتنا کچھ نام اور بے نام لکھا۔ متعدد کتابوں کے مصنف، مترجم اور مرتب بن گئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرگرم رکن ہو گئے۔ ادبی حلقوں میں اپنی شناخت قایم کرلی۔ زورِ خطابت بھی کچھ کم نہ تھا۔ لیکن جب اپنے پاس پایا تو بالکل ویسا ہی جیسے چالیس سال پہلے ملتے تھے۔ وہی پاسِ وضع، وہی اندازِ تکلم، وہی شائستگی۔ اگرچہ اپنی عمر اور جماعت کے معیار کے اعتبار سے وہ اس وقت بھی اعلا استعداد اور شستہ ذوقِ ادب رکھتے تھے۔ حضرت نوح ناروی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ شعر کہتے تھے؛ نظم گوئی کی طرف جھکاؤ تھا۔ ان کی وساطت سے ہی اس یادگارِ داغ سے نیاز حاصل ہوا۔ وہ جب کبھی الٰہ آباد تشریف لاتے تو 'حسن منزل' میں ہی قیام رہتا۔ 'حسن منزل' کوئی ایک عمارت نہیں بلکہ الٰہ آباد کی ایک معروف بستی کا نام ہے۔ وہیں اسرار ناروی بھی رہتے تھے جو یادگار حسینی اسکول میں استاد تھے۔ میں 'شمالی ملاکا' میں رہتا تھا۔ وہاں سے جب مجیدیہ کالج آتا تو اس سے قبل راہ میں یادگارِ حسینی اسکول پڑتا' پھر 'حسن منزل' شروع ہوتی۔ اسرار سے دوستی ہو گئی تھی۔ کچھ ہم مشربی اور کچھ اجمل کا اُن سے قرب' اس رفاقت کے اسباب تھے۔ اسرار' غیر معمولی ذہین اور طبّاع طبیعت کے مالک تھے۔ مگر تھے پراسرار۔ قلمی نام سے مزاحیہ مضامین چھپواتے اور اصلی نام سے شاعری۔ یہ وہی اسرار ہیں جو ابن صفی بی۔ اے کے نام سے اردو دنیا میں مشہور و مقبول ہوئے۔ ایسی ہی چند چھوٹی بڑی شخصیتوں کے فیضِ صحبت نے اجمل کے ادبی شعور کے آغاز پر ایک نہایت سازگار ماحول فراہم کیا۔ لیکن وہ الٰہ آباد کے ایک برگزیدہ اور علم پرور خانوادے کے چشم و چراغ ہونے کے باوجود اشتراکی خیالات سے متاثر ہوئے۔ اور ساری زندگی اُن کی ترویج و اشاعت کی نذر کر ڈالی۔ تاہم ان کی خلقت میں صوفیانہ روایت اور خاندانی شرافت کی نمود برقرار رہی۔

اِدھر روز بروز تیزی سے ان کی صحت گرتی جا رہی تھی۔ اُنھیں دیکھتے تھے مگر

دیکھا نہ جاتا تھا۔ حقیقت سمجھتے تھے، انجام ظاہر تھا، پھر بھی اسے ماننے کو نہ دماغ تیار ہوتا تھا نہ دل۔ بلا شبہ سب سے بڑھ کر خود اجمل اپنے حال سے آگاہ تھے۔ انھوں نے اپنی علالت کے زمانے میں ایسے اشعار بھی کہے:

ان امیدوں پہ جی رہا ہوں میں جن امیدوں کی زندگی کم ہے
نا امیدی بھی ساتھ چھوڑ گئی جانے کس حد میں ان دنوں غم ہے

اس غزل کا آخری شعر دیکھیے، اُف! یہ شدتِ احساس:

اب تیری یاد بھی نہیں آتی کتنا دل کش حیات کا غم ہے

یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اشارہ کدھر ہے۔ 'سفر زاد' میں ان کے جہادِ زندگی کا ادراک و عرفان نمایاں ہونے کے ساتھ ساتھ آخر زندگی کے حوادث کا احساس بھی واضح طور پر موجود ہے۔ اس کا آغاز 'دعا' سے ہوتا ہے، جس میں اُن کے کردار اور عقائد کی روح سرایت کر گئی ہے۔ چھتیس چھوٹے چھوٹے مصرعوں کی نظم کے پہلے تین مصرعے یہ ہیں:

وقتِ آخر ہے، اے ضمیر مرے
حق پرستی کی شان باقی رکھ
بے محابا زبان باقی رکھ

اور آخری تین یہ ہیں:

مطمئن شادماں ضمیر مرے
دمِ آخر ہے آبرو رکھنا
بعد والوں سے سرخرو رکھنا

یہ کمزور و ناتواں جسم والا جیالا انسان اپنے وقتِ آخر کی آگہی رکھتا تھا۔ بخوبی واقف تھا کہ ڈاکٹر اس کی طرف سے مایوس ہو چکے ہیں۔ نومبر ۱۹۹۱ میں ان کے بارے میں 'کتاب نما' کا خصوصی شمارہ شایع ہوا۔ اس کے اداریے تک میں پہلے ہی صفحے پر درج تھا: "اجمل اجملی ان دنوں بسترِ علالت پر ہیں۔ اور شب و روز کے لمحات موت و زیست کی کشمکش میں گزار رہے ہیں۔" پھر بھی وہ موت سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ چاہتا تھا کہ چاروں بچیوں کو ماں کی کمی شاق نہ گزرے۔ اسی علالت کے دوران دو کی شادی کی، دو کی اعلا تعلیم کی راہیں استوار کیں۔

آخری ملاقات میں باتیں کہتے کہتے دوبار دل بھر آیا۔ مگر جلد ہی سنبھل گئے۔ اختتامِ گفتگو یہ تھا: "پرسوں پھر اسپتال جانا ہے" اور 'سلام' کو ہاتھ اٹھ گیا۔ اسپتال کا یہ آنا جانا تو معمول سا بن گیا تھا۔ مگر اس بار شام سے

چار بجے کے قریب میت آئی۔ جو نہ دیکھنا تھا، وہ دیکھا۔ بیٹی زویا کا سر میرے کاندھے سے لگا ہوا تھا۔ اس کی نحیف سی آواز کان میں آئی: "اگر آپ ... تو پھر ہم ..." میں نے اپنے آپ پر قابو حاصل کیا۔ آخری نظر ڈالی اور ہٹ گیا۔ زویا نے ماں کی وفات کے بعد اس مغربستی میں ساری تیمار داری اور تیمار داری کی ذمہ داری اٹھائی۔ خدا چاروں بچوں کو زندگی میں سرفراز کرے اور سب متعلقین کو صبر جمیل عطا ہو۔ سب احباب و اقارب کا اپنا اپنا غم ہے۔ میں ایک چھوٹے بھائی سے محروم ہو گیا۔ خدا اس کی مغفرت فرمائے۔

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

آزمایش کی گھڑی

مصنف :- سیّد حامد
ناشر :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
قیمت :- ۴۵ روپے
تبصرہ نگار :- ایم۔ حبیب خاں

"آزمایش کی گھڑی" بیس مضامین کا مجموعہ ہے۔ کتاب کے بیشتر مضامین اجودھیا کے قبضے سے متعلق ہیں جس کا انجام ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کے انہدام پر ہوا۔ مسلمانوں کی عبادت گاہ بابری مسجد سرکار اور پولیس کے بل پر منصوبہ بند ڈھنگ سے ڈھا دی گئی۔ مرکز کی طرف سے مسلمانوں کو یقین دلایا گیا کہ مسجد کی پوری حفاظت کی جائے گی اور اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ ریاستی حکومت نے بھی وعدہ کیا کہ وہ مرکز کے احکامات کی پابندی کرے گی۔ دوسرے بی۔ جے۔ پی کی حکومت میں اس وقت تک یو پی کے کسی بھی ضلع میں ہندو مسلم فساد نہیں ہوا تھا اس لیے مسلمانوں نے بھی اتر پردیش کے وزیر اعلا جناب کلیان سنگھ کے بیانات پر یقین کر لیا کہ مسجد کو مسمار نہیں کیا جائے گا لیکن ہوا اس کا برعکس اس حادثے سے بی جے پی حکومت کی قلعی کھل گئی کہ صاف ذہن ہندوؤں کو اس واقعے نے شرمندہ کر دیا۔ اور وہ لوگ مشہور مسلمانوں میں اٹھتے بیٹھتے قومی یکجہتی کا نعرہ بلند کرتے تھے ان کی نگاہیں بھی شرم سے جھک گئیں۔ باہر کے ملکوں نے ہندستان پر لعن طعن کیا۔ اس سے ہندستان کی فارن پالیسی پر برا اثر پڑا۔ کتاب میں چھپنے سے پہلے یہ تمام مضامین قومی آواز دہلی، انقلاب بمبئی، سیاست حیدر آباد، سالار بنگلور اور آزاد ہند کلکتہ میں شائع ہو چکے تھے۔ دوسرے اخباروں اور رسالوں نے بھی انھیں نقل کیا۔ عوام میں یہ تاثر قائم ہوا کہ ان مضامین نے آڑے وقت میں ڈھارس بندھائی اور پڑھنے والوں کو پہلی بار اس کا حل تلاش کرنے اور انھیں سوچنے پر آمادہ کیا۔ حامد صاحب نے اپنے ایک مضمون میں حکومت کے طرز عمل پر توجہ دلاتے ہوئے بڑی پتے کی باتیں کہی ہیں۔ آپ بھی دوبارہ اپنے ذہنوں کے دریچے کھلے رکھیے۔ وہ لکھتے ہیں!

"حکومت پر انصاف کے لیے تلقین کرنا نازک معاملت ہو تو تمنا سب ہے۔ حکومت اپنے ووٹروں کی اکثریت کو کسی حال میں ناراض نہیں کرنا چاہتی۔ سیاست میں نہ اخلاص کی گنجائش ہوتی ہے نہ ہمدردی کی۔ اہل سیاست ہمیشہ اپنی غرض کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔ کمزوروں کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور بے دردی کے ساتھ ٹھکراتے ہیں۔ اگر کبھی سرکار نے روشن خیالی کے اظہار کے لیے کچھ حکم اقلیت کے حق میں صادر بھی کر دیے تو ان پر عمل ہرگز نہ ہوگا۔ تاوقتیکہ حکومت کے ملازمین کے دل میں مسلمانوں کے لیے نرم گوشہ نہ پیدا ہو جائے۔ سرکاری دفتروں میں ہندوؤں کا بول بالا ہے۔"

اس اقتباس کے ایک ایک لفظ میں سچائی نظر آتی ہے۔ مسلمان جذباتیت کا شکار ہونے کے باوجود حکومت کا وفادار اور سیکولر مزاج رکھتا ہے۔ ان مضامین میں حامد صاحب نے کئی جگہ اس طرف اشارہ کیا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں نے نفرت پھیلانے کی جو کوشش کی ہے اس کو کس طرح دور کیا جائے۔ حامد صاحب نے حکومت اور مسلمانوں کو مشورے دیے ہیں کہ کس طرح اس بات کا حل نکالیں کہ بابری مسجد کے شہید ہونے سے مسلمانوں کے جو دل ٹوٹ گئے ہیں وہ کس طرح پھر سے جوڑے جائیں تاکہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت بڑھنے نہ پائے۔

اس کتاب سے پہلے میں نے حامد صاحب کی سب سے پہلی کتاب "نگار خانہ" بھی پڑھی تھی جو پہلی بار ۱۹۸۴ء میں اس وقت منظر عام پر آئی تھی جب وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں وائس چانسلر تھے۔ یہ تمام مضامین قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں۔ ان میں انیس، ذوق، جوش اور اقبال کے علاوہ فارسی شعرا پر بھی کئی مضامین شامل ہیں۔ حامد صاحب سرسید کے پرستاروں میں ہیں۔ اپنی وائس چانسلری کے زمانے میں سرسید کا سب سے مشہور رسالہ تہذیب الاخلاق کا دوبارہ اجرا کر کے سرسید کی یاد کو تازہ کیا ہے اور یہ رسالہ آج بھی جاری ہے اور اس کو حامد صاحب کی سرپرستی حاصل ہے جو قومی جذبہ سرسید میں تھا وہی ہمیں سید حامد صاحب میں نظر آتا ہے۔ سرسید فرقہ واریت سے بہت دور تھے۔ انھوں نے چالیس سال تک یعنی ۱۸۵۸ء سے ۱۸۹۸ء تک ہندو مسلم اتحاد کے لیے زبردست کام کیا اور نہایت صاف اور سلیس زبان میں مضامین اور کتابیں لکھیں۔ حامد صاحب نے "آزمائش کی گھڑی" لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسلمانوں کو ایک ایسے ہی قائد کی ضرورت ہے۔ کتاب کے لب و لہجہ میں نہ تلخی ہے اور نہ طنز۔ البتہ فارسی کا غلبہ زیادہ ہے جو عام قاری کے لیے کسی قدر مشکل ہو سکتا ہے۔ اس کی اشاعت مسلم قوم پر بہت بڑا احسان ہے۔ شاہد علی خاں صاحب نے اسے مکتبہ جامعہ سے نہایت عمدہ کاغذ پر اعلا درجے کی طباعت اور اہتمام سے شائع کیا ہے۔ ●

کلیاتِ عزیز

مرتبین :۔ ثاقب صدیقی ، انیس احمد
صفحات :۔ ۲۴۰ ۔ قیمت ۱۵۰ روپے
ناشر :۔ ایس کے پبلیکیشنز، کوچہ پنڈت، دہلی
مبصر :۔ ڈاکٹر ہارون ایوب

اگر مختلف اصنافِ ادب کی کتابوں کی فہرست مرتب کی جائے تو شاعری کی صنف سے تعلق رکھنے والی فہرست سب سے زیادہ طویل ہوگی۔ ہر سال بے شمار شعری مجموعے منظرِ عام پر آتے ہیں اور ان میں بڑی تعداد غزل کے مجموعوں کی ہوتی ہے۔ آج بھی غزل اپنی قدامت پسندی کے باوجود اردو ادب کی مقبول ترین صنف ہے۔ لیکن کتب فروش حضرات کو یہ شکایت ہے کہ شعری مجموعے کم بکتے ہیں۔ لیکن کسی شعری مجموعے میں غزل کا رچاؤ کلاسیکیت لیے ہوئے نظر آئے اور وہ دورِ حاضر کے تقاضوں کی بھی پورا کرتا ہو تو قاری کی نظریں ورق گردانی کے دوران ٹھہر جاتی ہیں اور بے اختیار خریدنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ ایسا ہی ایک مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے، جس میں عزیز وارثی کے کلام کو بہت سلیقے سے مرتب کر کے جناب ثاقب صدیقی اور جناب انیس احمد نے "کلیاتِ عزیز" کے عنوان سے پیش کیا ہے۔

عزیز وارثی کا شمار اردو کے ممتاز شعراء میں ہوتا ہے۔ کیونکہ جب اردو شاعری مجرّد نظریات کی بازی گاہ میں ایک عرصے تک مقید رہنے کے بعد حقیقی رنگ اور زندگی کے بدلتے ہوئے اقدار کو سمیٹنے کی طرف پلٹی تو جن شعراء حضرات نے اسے آگے بڑھ کر اپنایا، ان میں "عزیز وارثی" سرفہرست ہیں۔ گو آپ نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی حالانکہ آپ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ غزل کی جس روایت کی بنیاد قدیم شعراء نے ڈالی تھی، اس کو تصوف کی ڈگر پر میر درد اور بعد میں اصغر گونڈوی نے آگے بڑھایا، وہی رنگ عزیز وارثی کی شاعری میں نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ رنگ ان کے یہاں رسمی نہیں ہے بلکہ ایک مسلک کے تحت ہے کیونکہ وہ حاجی حضرت اوگھٹ شاہ صاحب وارثی رح کے مرید تھے،

ادب میں عزیزؔ آپ کا جو بھرم ہے
یہ سب شاہِ اوگھٹ کا لطف و کرم ہے
یہ اور بات ہے کہ ہمیں کچھ گلہ بھی ہے
منکر نہیں مگر تری دریا دلی سے ہم

یہ حقیقت ہے کہ "عزیز وارثی" نے سطحی جذباتی عشق بازی کے بجائے صالح و مثبت اقدارِ حیات کو اپنے اشعار میں بہت خوبصورتی سے سمو کر پیش کیا ہے۔ "کلیاتِ عزیز" کے مطالعے سے یہ احساس شدید ہو جاتا ہے کہ اُن کا میدان غزل ہے۔ غزل میں جس آہنگ، سرمستی کیف، رومانیت

سوز وگداز کے ساتھ تجربے کی صداقت اور اظہارِ ذات کی تلاش کا عنصر اُن کی غزلوں میں صاف نظر آتا ہے۔

اگر پردے کی جنبش سے لرزتا ہے تو پھر اے دل
تجلّیِ جمالِ روئے جاناں کون دیکھے گا
تم حقارت سے مجھے دیکھو نہ اپنی بزم میں
خار بھی رہتے ہیں اکثر پھول کی آغوش میں
چاندنی رات میں جب ہوتے ہیں وہ میرے قریب
وہی عالم تو محبت میں جواں ہوتا ہے
میرے ارمانوں کی گتھی سلجھ نہ جائے کہیں
اپنی زلفوں میں ابھی آپ کو خم رکھنا ہے
محبت یوں تو کہنے کو بتائے ناگہانی ہے
محبت ہی سے لیکن آدمی کی زندگانی ہے

غزل یا نظم عزیز وارثی نے عصرِ حاضر کے واقعات و حادثات کو بڑی سنجیدگی سے، اپنے عمیق تجربے کے ساتھ شعری حسن عطا کیا ہے مثلاً

ہر رہنما کو صرف ہوس ہے وقار کی
اس کی نہ کوئی راہ، نہ جادہ، نہ ہے مقام
میرا بھارت بھی تو خوش حال وطن کہلائے
ایسے حالات ہوں، آبادی نہ بڑھنے پائے

اسی طرح عزیز وارثی نے اپنے مشاہدات و تجربات سے اپنی شاعری کو روشن رکھا اور اپنے دور کی بھرپور ترجمانی کی کیونکہ دورِ حاضر کے حوادثات سے وہ کبھی غافل نہیں رہے۔

عزیز وارثی کے کلام کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کی روح کو دریافت کر لیا تھا اور وہ اس زمین کی بو باس سے خوب واقف تھے، جس پر ان کے قدم آخر دم تک جمے رہے۔

دورِ فلک پہ جب کبھی آئی ہنسی مجھے
آلامِ روزگار نے آواز دی مجھے

عزیز وارثی کی شاعری اپنے عہد کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس میں روایت کی پاسداری بھی ہے۔ جدید لب و لہجہ اور مضامین میں نیا پن بھی ہے، صداقت، رندی و مستی کے ساتھ صوفیانہ سنجیدگی اُن کی شاعری میں ایک نیا رنگ بھر دیتی ہیں۔

"کلیاتِ عزیز" کے منظرِ عام پر آنے سے پہلے، عزیز وارثی صاحب کی حیات میں، ان کے چار شعری مجموعے شائع ہو چکے تھے اور وہ پہلے ہی اپنی شاعرانہ عظمت منوا چکے تھے اور کسی تعارف کے محتاج نہیں تھے لیکن ثاقب صدیقی

اور انیس, حمد صاحبان نے "کلیاتِ عزیز" مرتب کرکے اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ ۔ ۔ دیباچہ میں مرتبین نے بہت حق گوئی سے کام لیا ہے اور اتنی ہی بات کہی ہے، جتنی کہ ضروری تھی۔ باقی تمام کام قارئین پر چھوڑ دیا ہے۔ دیباچہ کا یہ انداز بھی قاری کو "کلیاتِ عزیز" کے مطالعے کی دعوت دیتا ہے۔

کتابت وطباعت بہت نفیس ہے۔

منظوماتِ واہی

شاعر:- رضا نقوی واہی
اشاعت:- ۱۹۹۲ء
ناشر:- جے،ٹی،ایس پرنٹرز، پٹنہ ۴
مبصر:- محسن رضا رضوی
قیمت:- ۱۱۰ روپے

ان کے سات مجموعے "واہیات" (۱۹۵۰ء) "طنز و تبسم" (۱۹۶۳ء) "نشتر و مرہم" (۱۹۶۸ء) "کلام نرم و نازک" (۱۹۷۲ء) نام بنام" (۱۹۷۳ء) "متاعِ واہی" (۱۹۷۷ء) اور شعرستانِ واہی" (۱۹۸۳ء) منظرِ عام پر آکر "نامِ حضرتِ واہی" روشن کر چکے ہیں۔ اب یہ آٹھواں مجموعہ چند تازہ نظموں اور گزشتہ مجموعوں کی نمائندہ نظموں کا انتخاب ہے۔ واہی صاحب کے گزشتہ ساتوں مجموعے اب کمیاب ہیں۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ اور بھی اہم ہو جاتا ہے کہ یہ "افشردہ مجموعہ" ہے۔

واہی صاحب کا شاعرانہ احساس POETIC SENSIBILITY شروع سے ہی بیدار رہا ہے اور اپنی اسی بیداریٔ حس کی وجہ سے ان کی نظر زندگی کے ہر شعبے پر رہی ہے۔ ان کے یہاں مختلف النوع موضوعات پر نظمیں مل جاتی ہیں۔ انھوں نے شاعر، لیڈر، ملا، بلیک لر، اڈیٹر، پروفیسر، لکچرر، محقق، مبصر، کاتب، ٹیڈی بوائے اور انٹلکچوئل وغیرہ سبھوں کو اپنے تخیل کی بلند پروازی اور تجربے کی چاشنی کے ساتھ گہرے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اور اپنے موضوع کے ہر جزو پر گہری نگاہ ڈالی ہے۔

واہی صاحب کی طنزیہ شاعری محض طنز برائے طنز نہیں ہے، بلکہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی ناہمواریوں پر عالی حوصلگی کے ساتھ ہمدردانہ نگاہ ہے۔ اور اس نگاہ میں جو طنز ہے وہ جگہ جگہ ظرافت کی نقاب اوڑھے ہوتے ہے۔

واہی صاحب نے کلاسیکی ادب کے وسیع مطالعے سے بھی خوب خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ ان کے یہاں میرؔ و غالبؔ و اقبالؔ اور دوسرے بڑے شعرا کے مشہور مصرعوں کا برمحل، برجستہ اور بے تکلف استعمال جہاں قاری کو مسرت عطا کرتا ہے وہیں واہی صاحب کی فن پر دسترس کا بھی پتا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی نظمیں خود مصنف کی وسیع القلبی اور مزاج و کردار کی نفاست پسندی کی غماز ہیں۔ ان کی نظموں کا مطالعہ کرنا ایک صحت مند، باذوق، باشعور اور ہمدرد صحبت میں بیٹھنا ہے۔

معلومات سخن شاعری

شاعر :- سریر کابری مرحوم
صفحات :- ۱۶۰
مبصر :- سید ظفر ہاشمی
قیمت :- ۳۵ روپے
تقسیم کار :- سید متوسل ایڈ گنج الہ آباد

معلومات سخن علامہ سریر کابری مینائی مرحوم کا تیسرا مجموعہ کلام ہے جسے ان کے فرزند سید محمد داؤد اختر کابری نے مرتب کیا ہے۔ اس میں غزلیں، رباعیات قطعات اور تاریخی قطعات شامل ہیں غزلوں کی ترتیب ردیف وار کی گئی ہے پیش لفظ میں مرتب نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ علامہ سریر کابری صاحب پر اہل ادب نے خاطر خواہ توجہ نہیں کی اور ان کی شخصیت مصیبت کا شکار ہو گئی ہے ورنہ وہ غالب کے آس پاس رکھے جاتے۔ غالب کے آس پاس رکھے جانے کے معاملہ میں مرتب کی پدرانہ نوازی حقیقت پر غالب آگئی ہے۔ لیکن اتنا تو ہم بھی کہیں گے کہ مرحوم سریر کابری کی شاعری کچھ زیادہ توجہ کی حقدار ہے۔ ۱۹۰۷ء میں ان کا پہلا دیوان شائع ہوا تھا اس کے بعد مزید دس بارہ کتابیں شائع ہوئیں کچھ ان کی زندگی میں اور کچھ ان کی وفات کے بعد ان میں۔ "شاہنامہ ہند" کافی مشہور ہوا جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ زیر نظر مجموعہ کی غزلیں کلاسیکی شاعری کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہیں ان میں وہی بانکپن، معنویت، تہ داری اور تیکھاپن ہے جو ۱۹۵۰ء سے پہلے کی غزلوں کا طرہ امتیاز رہا ہے۔
غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بڑے ارمان سے ہم نے ترے گیسو سنوارے تھے
خبر کیا تھی کہ ڈس لیں گے یہ مارِ آستیں ہو کر
دونوں ہی گیسو دو طرف حلقے میں ہیں رخ کو لیے
سورج میں ہے سورج گہن اک اس طرف اک اس طرف
تم بہر عیادت آئے ہو آتی ہے اجل بھی بالیں پر
دیکھیں تو مریض ہجراں کو ان دونوں میں اچھا کون کرے
چلے جو ہم سوئے منزل تو اس ادا سے چلے
نگاہِ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا

رباعیات بھی عمدہ ہیں خصوصاً وہ رباعیاں جن کا موضوع واقعاتِ کربلا ہے۔
کتابت طباعت معمولی ہے جسے درگزر کرتے ہوئے اس مجموعہ کی خاطر خواہ پذیرائی ہونی چاہیے اور سریر کابری کی علمی بصیرت اور فنی خوبیوں سے استفادہ حاصل کرنا چاہیے۔

سائنس نامہ

مصنف : ڈاکٹر محمد اسلم پرویز
تقسیم کار : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار دہلی ۶۔
مبصر : عبداللہ ولی بخش قادری
قیمت : ستر روپے۔

گزشتہ چند سال سے ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، سائنسی موضوعات پر اخبارات و رسائل میں مسلسل لکھ رہے ہیں۔ اس دوران ان کا پہلا مجموعہ مضامین "سائنس کی باتیں" دسمبر ۱۹۸۷ء میں منظر عام پر آیا۔ دوسرا "سائنس پارے" مارچ ۱۹۹۰ء میں، اور اب مارچ میں تازہ مجموعہ "سائنس نامہ" پیش ہوا ہے۔ ان تینوں مجموعوں میں شامل مضامین کی مجموعی تعداد اکسٹھ ہوتی ہے۔ اور کل صفحات ۵۱۴۔ مضامین اور صفحات تقریباً یکساں طور پر تینوں مجموعوں میں منقسم ہیں۔ پچھلے ماہ اردو اکادمی دہلی نے ان کی تازہ تصنیف کو اپنے انعام سے نوازا ہے۔

اردو میں سائنسی ادب کی طرف خاطر خواہ توجہ کبھی نہیں ہوئی۔ جب کہ روز بروز سائنس کی افادیت اور اہمیت برابر بڑھتی رہی ہے۔ اگرچہ حصول آزادی کے بعد چند گنے چنے حضرات نے بچوں کے لیے کسی قدر لکھا ہے لیکن وہ قدرے عام معلومات فراہم کرنے اور دلچسپی بڑھانے کا ہی موجب ہوسکا ہے۔ اور سائنسی ذہن تشکیل کرنے سے قاصر رہا ہے۔ کیوں کہ اس طرف رجوع کرنے والے بیشتر اہل قلم اپنی نیک خواہش کے باوجود خود سائنس کے مرد میدان نہیں تھے۔ ڈاکٹر پرویز نہ صرف تعلیم کی اعلیٰ سطح پر تدریس کے منصب پر فائز ہیں بلکہ اردو داں طبقے کے لیے سائنس کی ترویج و تعلیم کی عصری ضرورتوں کو بھی بخوبی گر دانتے ہیں۔ نیز اس کی آبیاری میں اپنے قلم اور عمل سے بھی ہمہ تن مصروف ہیں۔ ایک طرف آسان اور بڑی حد تک غیر تکنیکی زبان میں سائنسی موضوعات سے وہ اردو کے عام قاری کو متعارف کرانے میں لگے ہوئے ہیں۔ اور دوسری طرف سائنسی فکر کو فروغ دینے کے لیے انھوں نے "انجمن فروغ سائنس" جیسا ادارہ بھی قایم کیا ہے۔

سائنس نامہ اپنے موضوعات میں اچھا خاصا تنوع رکھتا ہے۔ اس میں 'حیاتی تکنالوجی' اور 'توانائی' جیسے عنوانات بھی موجود ہیں۔ 'تبدیلی جنس' 'امراض قلب' اور ایڈس کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہے۔ یہاں 'ستاروں کی دنیا'، 'خلا' اور شمسی خاندان کی بات بھی اٹھائی گئی ہے۔ ایٹمی توانائی اور متوازن غذا کی طرف بھی رجوع کیا گیا ہے۔ اور "پلاسٹک" جیسے مادے کو بھی موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔ غرضیکہ ان کے موضوعات نہ صرف

جدید ہیں بلکہ ہماری زندگی سے بھی گہرا اور قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا اسلوبِ نگارش الجھاؤ سے پاک نظر آتا ہے۔ اور زبان کی شگفتگی اور اس کے مزاج سے بھی رو گردانی نہیں کی گئی ہے۔ اور ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ان کی معلومات تازہ اور مستند ہوتی ہے۔ اس طور وہ اپنے مضامین کے ذریعے وسعتِ نظر اور مطمحِ نظر دونوں کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ ایسے مضامین عام قاری کو بھی آج کے انسان کی حیثیت سے اپنے منصب کی آگاہی فراہم کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ اور سائنس کی تعلیم کی طرف رجوع ہونے والے طلبہ میں ذوق و شوق کے فروغ دینے اور ان کے نصابات کی فہم میں ممد و موثر ثابت ہونے کا بھی قوی امکان رکھتے ہیں۔ اور سب سے بڑی یہ خوبی نظر آتی ہے کہ سائنسی ذہن کی داغ بیل بخوبی ڈالتے ہیں۔ جو نہ صرف ہمارے دستور کا ایک اہم مقصد ہے بلکہ کارگاہِ امروز و فردا میں جہادِ زندگانی سر کرنے کے لیے اس سے مسلح ہونا ناگزیر ہے۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کوئی زبان محض شعر و شاعری اور حکایت و افسانے سے اپنے استحکام و ترقی کی ضمانت حاصل نہیں کر سکتی۔ زبان کو اس کے علمی مواد کی بدولت بقا و فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اردو کا ادبی سرمایہ نہایت وقیع ہے مگر علوم کے معاملے میں وہ بہت کچھ تہی دامان رہی ہے۔ آج کے اردو کش ماحول میں یہ ضرورت اور بڑھ جاتی ہے کہ ہم اپنی مادری اور تہذیبی زبان کی اساس کو تقویت پہنچائیں اور اس کے چلن کو عام کریں۔ اپنی زبان کی مہارت اور اس سے وابستگی ہماری فکری توانائی کا موجب ہونے کے علاوہ ہمارے تہذیبی سرمائے کے تحفظ اور جذباتی آسودگی کا بھی سبب بنتی ہے۔ ڈاکٹر پرویز نے 'عرضِ مصنف' کے تحت ایسے ہی احساسات کو نہایت مدلل اور موثر ڈھنگ سے پیش کیا ہے جو ان کی صلاحیتِ فکر اور خلوصِ نیت پر دلالت کرتا ہے۔ ان کے مضامین عام قاری کو اپنے گرد و پیش سے شناسائی پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اور ان سے اکتسابِ علم میں آئندہ کے لیے راستہ بھی ہموار ہوتا ہے۔ لہٰذا موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصطلاحی الفاظ استعمال بھی ہوں اور ان کو کتاب کے ختم پر واضح بھی کر دیا جائے۔ اگرچہ ترقی اردو بیورو نے متعدد علوم و فنون کی اصطلاحات تیار کر رکھی ہیں۔ لیکن عام قاری عموماً ان سے واقفیت نہیں رکھتا ہے۔ نیز اصطلاح سازی ایک مسلسل عمل ہے۔ اور کوئی بھی کوشش تیزی سے بڑھتے ہوئے عالمی علوم کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ لیکن عام سائنسی ادب کو جہاں آسان اور عام فہم بنانے کی سعی ہونی چاہیے اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آہستہ آہستہ وہ اصطلاحوں سے بھی آشنا ہوتا رہے

بہرکیف پوری توقع ہے کہ "سائنس نامہ" بھی اپنے پیش رو دو مجموعوں کی طرح شرفِ قبول پائے گا۔ خوشی کی بات ہے کہ وہ صاف ستھری کتابت و طباعت سے آراستہ اور خوب صورت گرد پوش کے ساتھ مجلد بھی ہے ●●

مٹھی بھر دھوپ

شاعر و ناشر: مہدی پرتاب گڈھی
قیمت : چالیس روپے
ملنے کا پتا : اردو نظم ادب پرتاپ گڑھ

مبصر: ملک زادہ جاوید

مہدی پرتاب گڈھی کا نام مشاعروں کے بجائے رسائل و جرائد کے توسط سے ادبی حلقوں میں جانا پہچانا نام ہے۔ اردو کے بیشتر رسالوں میں ان کی غزلیں اور نظمیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ "مٹھی بھر دھوپ" ان کے کلام کا پانچواں مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کے چار مجموعے شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ان چاروں مجموعوں میں "لفظ و بیان"، "نئے نئے آسمان"، "احساس کا کرب" اور "خوشبو اپنی دھرتی کی" شامل ہے۔ جو ۱۹۷۳ء اور ۱۹۸۷ء کے درمیانی وقفے میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آئے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا اور اگر ان کے تمام مجموعے کلام کو کوئی قاری تاریخی ترتیب سے پڑھے تو اسے یہ محسوس کرنے میں دیر نہیں لگے گی کہ اس تمام عرصہ میں ان کا کلام فنی اور معنوی دونوں حیثیتوں سے ارتقا پذیر رہا ہے۔ اور وہ اپنے تخلیقی سفر میں اعتبار کی منزلوں کی طرف بڑی سلامت روی کے ساتھ گامزن رہے ہیں۔ "مٹھی بھر دھوپ" ان کی ۷۱ غزلوں اور ۲۶ نظموں کا مجموعہ ہے جس کا خیر مقدم عنوان چشتی نے اور جس پر مقدمہ عشرت ظفر نے لکھا ہے۔ ان نظموں اور غزلوں کے علاوہ دو حمدیہ غزلیں اور ایک نعت بھی مجموعہ میں شامل ہے۔ سرورق پر مناظر عاشق ہرگانوی اور عتیق احمد عتیق کے تعارفی کلمات بھی شایع ہوئے ہیں۔

مجموعۂ کلام پڑھنے کے بعد جو تاثر مجموعی طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انھوں نے ذات اور ماورائے ذات دونوں کے مسائل کو اپنے اشعار کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ انھوں نے نہ تو گرد و پیش کی زندگی میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کو نظر انداز کیا ہے اور نہ خود ان کے اندر جو ہنگامہ برپا ہے اس سے چشم پوشی کی ہے۔ ان کے کلام میں روحِ عصر اور کربِ ذات دونوں

ں ترجمانی خوب صورت انداز میں ہوئی ہے۔ اور ان میں ہمارا پورا عہد
ی تمام تر محرومیوں اور الجھنوں کے ساتھ سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ انھوں
نے خود ہی کہا ہے کہ :

کب مری سوچ ہے محدود مرے آنگن تک
مرا پیغام تو ہے سارے زمانے کے لیے

وطن کو بانٹ دیا تھا کبھی بزرگوں نے
اِس ایک بھول کی قیمت ہمیں چکانی ہے

کبھی میں اپنے کبھی غیر کے لیے رویا
ملی نجات نہ آنکھوں کی اس نمی سے مجھے

ڈھالا ہے میں نے شعروں کے پیکر میں اس کا عکس
سچائی عصر کی جو مرے آس پاس ہے

غزلوں کے علاوہ بہت سی نظمیں بھی مجموعے میں شامل ہیں۔ جن میں ترقی پسند شعرا کی بازگشت شامل ہوگئی ہے۔ ان کی نظمیں مثلاً 'ان سے کہہ دو'، 'استقبال'، 'جشنِ سال نو' وغیرہ فنی اور فکری دونوں اعتبار سے ترقی پسند تحریک کے دورِ عروج کی نظموں سے مُشابہ ہیں۔ اور ان میں فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، اور علی سردار جعفری وغیرہ کی لفظیات اور لہجے کی پرچھائیاں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ کتاب میں کاغذ معمولی اور کتابت اوسط درجے کی ہے۔ پھر بھی دورِ حاضر کی گرانی کے پس منظر میں کتاب کی قیمت چالیس روپے مناسب معلوم ہوتی ہے۔ کتاب اتر پردیش اردو اکیڈمی کی جزوی مالی امداد سے شائع ہوئی ہے۔ ڈسٹ کور غنیمت ہے۔

ماہنامہ "بچوں کی دُنیا"

ایڈیٹر : نوشابہ کلیم
قیمت : ۴ روپے فی پرچہ، سالانہ چالیس روپے
صفحات ۳۲ -
پتا : "بچوں کی دنیا" کریمیہ منزل، آبگلہ، گیا۔
مبصر : منظفر حسین غزالی۔

"بچوں کی دُنیا" کا پہلا شمارہ (جون ۹۳ء) زیرِ تبصرہ ہے۔ یہ رسالہ لیے

وقت نکلا ہے جب کہ ہر طرف بچوں کے ادب کا پرچار ہو رہا ہے۔ اور اس علاقے سے نکلا ہے جہاں اردو دوسری سرکاری زبان ہے اور اردو کی ریڈرشپ موجود ہے۔ پھر اردو میں بچوں کے لیے ایک دو رسائل ہی اچھے موجود ہیں۔ لیکن اس سب کے باوجود اردو میں رسالہ نکالنا خصوصاً بچوں کے لیے نکالنا ہمت کا کام ہے۔

پرچے کو ایک نظر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب میں کافی محنت صرف کی گئی ہے۔ اس میں چار پانچ اخلاقی کہانیاں ہیں، آٹھ نظمیں، ایک نفسیاتی اور ایک معلوماتی مضمون ہے۔ لطیفے، ذہنی ورزش کوئز، ننھے قلم کار کی کہانی اور ایک ڈراما موجود ہے۔ کہانیوں اور مضامین میں مقامی زبان کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ جو دوسرے بچوں کے لیے مشکل ہو سکتے ہیں۔ ویسے کہانیاں ٹیکنیک کے اعتبار سے اچھی ہیں۔

نظموں کے پڑھنے میں بچے دلچسپی ضرور لیتے ہیں لیکن پرچے کی ضخامت کے اعتبار سے اس میں نظموں کی تعداد کچھ زیادہ ہو گئی ہے۔ آئندہ کچھ نئے کالم شروع کیے جائیں۔ یا انہی کالموں کی صحیح تقسیم کی جائے تاکہ رسالے میں کہانیوں، مضامین، اور نظموں کے درمیان ایک توازن قایم ہو سکے۔

اس رسالے میں کتابت، طباعت، ٹائٹل، گیٹ اپ اور تصویریں بچوں کے مزاج کے مطابق نہیں ہیں۔ جب کہ مواد کے اعتبار سے یہ ایک اچھی کاوش ہے۔ اگر اس پرچے کو بہتر بنانے کی کوشش کی گئی تو توقع ہے کہ آئندہ یہ رسالہ بچوں میں مقبول ہو جائے گا۔ ●●

ادیٹر کتاب نما کے نام

کھلے خطوط

مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا
متفق ہونا ضروری نہیں۔

ماہ رواں کا شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ پہلی
یر جناب دلیپ سنگھ کا اشاریہ اہمیت کے
دیت کا حامل ہے۔ موصوف نے تریڑ بہ ترت
ذ باتیں کہی ہیں۔ جگن ناتھ آزاد کی نظم بابری مسجد
لا خیزد بر دل ریزد کی مصداق ہے۔ اس
ن ادہ دلی اور انسانیت نوازی کے لیے انھیں
ر کباد پیش کرتا ہوں۔ دیگر مشمولات بھی قابل
ر ہیں۔ حباب ہاشمی۔ ای/۳۸ بی، جی بی نگر۔ الہ آباد

کتاب نما، مئی ۹۳ کے شمارے میں انور
م انور کا خط (کھلے خطوط) میں نظر نواز ہوا۔
صاحب خمیم عثانی کی غزل کا وزن یوں تحریر
تے ہیں۔
مفعولُ۔ مفاعیلُ۔ فعولن۔ فعلی اور اصطلاحی
بحر ہزج ۱۲ اخرب۔ مکفوف۔ محذوف ابتر"
ارکان بھی غلط اور اصطلاحی نام بھی غلط۔ اس
ن میں نہ تو "زحاف حذف" ہے نہ بتر کا استعمال
ہے، زحاف حذف، تو عروض و ضرب سے
ر رکھتا ہے حشوین میں وارد نہیں ہوتا ان
خط سے صاف ظاہر ہے کہ انور صاحب عروض
بجد سے بھی واقف نہیں ہیں۔
صحیح ارکان یوں ہونی چاہئیں۔ "مفعول۔
اعیلُ۔ مفاعیلن۔ فع"
طلاحی نام: اخرب، مکفوف۔ مکفوف۔
مجبوب مخنق: "جو حاصل وزن مفعول۔ مفاعیل۔
مفاعیلُ۔ فعل (اخرب۔ مکفوف۔ مکفوف۔
مجبوب) پر عمل تخنیق فرمانے سے حاصل ہوتا
ہے۔ اور یہ اوزان رباعی ہیں۔
فروری ۹۳ کا شمارہ ہماری نظر سے نہیں
گزرا۔ لہذا یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ غزل برنگ
ولی کس بحر میں ہے۔
فراز بندہ نواز۔ لنڈ یکر جامع مسجد، باداجی۔

● اپریل ۱۹۹۳ء "کتاب نما" یہاں بہت
تاخیر سے پہنچا۔ اس میں ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے
نام جناب وامق جونپوری کا کھلا خط نظر سے
گزرا۔ واقعہ یہ ہے کہ "گفتنی ناگفتنی" ایک سیلر
کے وہاں نظر آئی تو خریدنے کی ترغیب ہوئی لیکن جب
صفحہ الٹنے پر یہ دیکھا کہ یہ صرف "گفتنی" ہے،
"ناگفتنی" اس میں سے غائب ہے تو کتاب
خاموشی سے واپس رکھ دی کیونکہ خیال ہوا کہ
"گفتنی" میں تو وامق صاحب نے وہی سب
کچھ کہا ہوگا جو ہم آج تک پڑھتے اور سنتے آئے
ہیں، فرق صرف اتنا ہوگا کہ خود نوشت ہونے
کی بنا پر اس میں خود وامق صاحب زیادہ نمایاں
ہوں گے، پڑھنے کی چیز تو "ناگفتنی" ہی ہو سکتی
تھی کیوں کہ اس میں یقیناً بعض ایسی باتیں کہی
گئی ہوں گی جو آج تک پڑھنے اور سننے میں
نہیں آئی ہوں گی۔
میری ناچیز رائے میں کتاب کے اس
حصے کی اشاعت کا التوا ۳۰ سال تک کسی طرح
مناسب نہیں ہے کیوں کہ وامق صاحب
کے حالات اور مختلف ادبی اور سماجی موضوعات
سے متعلق ان کے مشاہدات و نظریات سے
سب سے زیادہ دلچسپی ۶۰ اور ۸۰ برس کی
درمیانی عمر کے لوگوں ہی کو ہو سکتی ہے علاوہ ازیں

ان امور سے صحیح معنی میں لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ وہ بھلا تیس سال تک کہاں زندہ بیٹھے رہیں گے۔ کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک! اس سے کم عمر کے لوگوں کے لیے تو یہ واقعات محض تاریخ ادب اردو کا ایک حصہ بن کر رہ جائیں گے اور وہ اگر انھیں پڑھیں گے بھی تو ان سے سرسری ہی گزر جائیں گے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی "انڈیا ونس فریڈم" کی بات دوسری تھی۔ وہ ایک سیاسی دستاویز تھی اور سیاسی دستاویز کی اہمیت و مقبولیت ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ تاہم یہ کہنا دشوار ہے کہ اگر اس میں سے بھی وہ ۳۰ صفحات جو بعد میں شائع کیے گئے حذف نہ کر لیے جاتے اور پہلے ہی ایڈیشن کے ساتھ شائع کر دیے جاتے تو کون سی قیامت آ جاتی۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر "گفتنی" کو دوسری جلد کی شکل میں اسی وقت شائع کر دیا جائے تو قاری کے لیے دونوں جلدوں کا مطالعہ ناگزیر ہوگا۔ اور مل کر دونوں جلدوں کی قیمت اتنی زیادہ ہو جائے گی کہ بہت کم قاری انھیں خرید کر پڑھنے کی جرأت کر سکیں گے۔ ایک ہی جلد میں شائع ہونے کی صورت میں شاید اس کی قیمت پھر بھی نسبتاً کم رہتی، اس دشواری کا حل آپ کے یا بیدار صاحب کے یا دامق صاحب کے پاس کیا ہے؟ —

ریاض الرحمٰن شروانی حبیب منزل، علی گڑھ

● اپریل کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ اور فراز بندہ نواز کے مضامین اس شمارے کی جان ہیں۔ دوسری قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ دونوں تراجم افسانے اچھے لگے۔ کیا طبع زاد افسانے نہیں آ رہے ہیں؟ غزلوں میں اجمل اجملی اور علیم صبا نویدی کے علاوہ پرکاش تیواری، شاہد نجیب آبادی، جاوید اکرام، بدر رنظیری، مہدی پرتاپ گڑھی وغیرہ متاثر کرتے ہیں۔ ظفر گورکھپوری نے دوہے میں بھی اپنا رنگ جما لیا ہے۔ تبصروں میں وہ جان نہیں ہے جو کتاب نما کا خاصہ ہے۔

شگفتہ طلعت سیما، شبلی ہاؤس۔ کلکتہ ۹

● اپریل کے شمارے میں محترم ابن فرید کا اداریہ واقعی توجہ طلب ہے۔ انھوں نے بعض نئے گوشوں کو پیش کیا ہے اور اپنے مطمح نظر کو بڑے مدلل انداز میں قارئین کے گوش گزار کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اردو والے اس پر ٹھنڈے دل سے سوچیں اور کوئی ٹھوس اور عملی قدم اٹھائیں۔

گوپی چند نارنگ کے مقالے "مشرقی شعریات اور ساختیاتی فکر" کی دوسری قسط کا انتظار ہے۔ فی الحال کچھ کہنا مناسب نہیں۔ غزلیں مجموعی طور پر متاثر کن رہی ہیں۔ علیم صبا نویدی اور اجمل اجملی سرفہرست ہیں۔ عطا عابدی نے روسی کہانی کا اچھا ترجمہ کیا ہے۔

عاصم شہنواز شبلی ۵/۸۹ ربن اسٹریٹ
پہلی منزل کلکتہ - ۷۰۰۰۱۶

● ہندوستان سے شائع ہونے والے ممتاز ادبی رسالوں میں کتاب نما واحد رسالہ ہے جو آپ کی توجہ اور کوشش کے سبب پابندیٔ وقت کے ساتھ اپنی تمام تر امتیازی خصوصیات کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ یہ بات بے حد قابلِ ستایش ہے۔ خدا کرے رسالہ آپ کی کوششوں سے رفعت اور بلندی کی نئی حدوں کو چھو سکے۔ پچھلے دو تین شماروں میں

...مضمون نے بطور خاص متوجہ کیا وہ پروفیسر
...چند نارنگ کا مضمون "مشرقی شعریات
...لسانیاتی فکر" ہے ۔ جو بالاقساط شائع
...ہا ہے ۔ پروفیسر نارنگ کا یہ کارنامہ قابلِ
...یاد ہے کہ انھوں نے مغربی فکر سے
...ذ ایک جدید ترین لسانیاتی اور علمی منظر
...یادیں دیانتداری کے ساتھ مشرقی
...یات کی بالکل ابتدائی روایات و افکار
...ے کر لنظر بہ لحاظ ارتقا پزیر سرمایہ علم و
...ش میں تلاش کرنے کی کوشش کی
...۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہمارے
...نقادانِ ادب جو ہر معاملہ میں پیروی مغرب
...یں اپنی نجات تصور کرتے ہیں اور اپنی قدیم
...یات و اقدار کو ہیچ سمجھ کر اکثر نظر انداز
...تے رہتے ہیں انھیں پروفیسر نارنگ کی
...دادِ بصیرت سے سبق لینا چاہیے جو دانشِ
...ب کا شناور ہو کر بھی اس کے طلسم
...اس قدر گرفتار نہیں کہ اسی کو کلی صداقت
...کر مطمئن ہو جائے ، پروفیسر نارنگ
...یال ہے اور درست ہے کہ بعض جدید
...ن علمی اور عقلی خیالات بھی اپنے اجزا کی
...تک مشرقی اقدار و روایات کے سرچشموں
...ایک پوشیدہ نسبت رکھتے ہیں البتہ
...نسبتوں کی جستجو اور سروں کو تلاش کرنا
...صبر آزما مرحلہ ہے جن کے متحمل کم ہی
...ہوتے ہیں ۔

قرونِ اولیٰ کی عرب تہذیبی لسانی
جمالیاتی اقدار کا جائزہ لیتے ہوئے خصوصاً
...م الٰہی اور احادیث نبویؐ سے رجوع کرتے
...ئے پروفیسر نارنگ نے نہ صرف غیر معمولی
...یاط اور ہوشمندی سے کام لیا ہے بلکہ

ان کے رویّہ میں ایک خاص انداز کا فطری
جذبۂ احترام و عقیدت بھی نمایاں ہے ۔

تازہ شماروں میں ڈاکٹر ابن فرید اور
دلیپ سنگھ کے اداریے بھی بہت دلچسپ
ہیں ۔ اردو زبان کے فروغ کے لیے جس طرح
کی ضرورت ہے ابن فرید کے مشوروں سے
یقیناً فائدہ حاصل ہو سکتا ہے ۔ ملک
میں قومی اور جذباتی ہم آہنگی کا مسئلہ بھی کچھ
اسی نوعیت کا ہے ، بقول دلیپ سنگھ اس
کی تبلیغ کافی نہیں ہے ، اس کو زندگی کا
لازمی جزو بنانے کے لیے مسلسل کاوش
ناگزیر ہے ۔

قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی ۔ جامعہ نگر نئی دہلی

● تازہ شمارہ برائے مئی ۲۰۰۰ پیش نظر ہے ۔
ویسے تو آپ کے بھی شمارے قیمتی اور وقیع ہوتے
ہیں مگر یہ شمارہ مجھے کچھ زیادہ ہی پسند آیا ۔ اشاریہ
کے عنوان سے محترمی دلیپ سنگھ صاحب نے
جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ نہ صرف یہ کہ طنز و مزاح
کا اعلا نمونہ ہے بلکہ ہمارے اربابِ حل و عقد
کے لیے تازیانۂ عبرت ہے ۔ واقعی دلیپ سنگھ صاحب
نے ہمارے الکٹرونک میڈیا کی کمزوری کو خوب
اُجاگر کیا ہے اور ان کا مقصد اصلاح ہے
جس میں وہ کامیاب ہیں ۔ قومی یکجہتی کیا ہے
اور اس کو کس طرح استحکام بخشا جا سکتا
ہے اس کے متعلق ان کی باتیں قابلِ قدر
ہیں ۔ میری طرف سے ان کو بہت بہت
مبارک باد ۔

ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب نے تلاشِ وفا کے
نام سے جو مضمون قلم بند فرمایا ہے وہ نہ صرف
مرحوم ابوالقاسم وفا صاحب کی شخصیت اور
ان کی علمی اور ادبی عظمت کو پیش کرتا ہے بلکہ

آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد کی ادبی فضا اور علمی ماحول پر خوبصورت طور پر روشنی ڈالتا ہے ۔ کیسے کیسے جوہر قابل گوشۂ گمنامی میں پڑے رہ گئے اور وقت اور حالات نے ان کے ساتھ وفا نہ کی ۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے مضمون کی زبان اور ان کے انداز بیان اور ناقدانہ بصیرت نے کافی متاثر کیا ۔

محترمی ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب تحقیقی علمی مقالہ "ثنویت لفظ و معنی اور افضلیت لفظ" بھی خاصے کی چیز ہے ہمیشہ کی طرح موصوف نے گہرے سمندروں کا سفر طے کیا ہے اور وہ گوہر آبدار لے کر آئے ہیں ۔ یہ مقالہ عام قاری کے لیے قدرے گاڑھا ہو سکتا ہے مگر اہل نظر کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے اس کے حوالے بڑے کارآمد ہیں ۔ نارنگ صاحب کے مطالعہ کی گہرائی اور گیرائی کی داد نہ دینی بڑی بددیانتی ہوگی ۔

بہت دنوں کے بعد صحیح معنوں میں ایک اچھا اور دلچسپ افسانہ پڑھنے کو ملا ہے ۔ افسانہ "شاہ بلوط کا درخت" بہت پسند آیا ، ڈاکٹر ایس ۔ ایم ۔ حسن گورکھپوری صاحب بجا طور پر ہماری داد و تحسین کے مستحق ہیں ۔

اس شمارے میں بابری مسجد سے متعلق محترمی جگن ناتھ آزاد صاحب کی نظم گرچہ کافی دیر سے اشاعت پذیر ہوئی ہے مگر اچھی ہے اور ان کی حب الوطنی اور انسان دوستی اور رواداری و منصف مزاجی کی آئینہ دار ہے خدا کا شکر ہے کہ ابھی آزاد صاحب جیسے مخلص انسان اور شاعر باقی ہیں جن کا شعار حق گوئی و بیباکی ہے ۔ مگر "میں اقارس" کے عنوان سے جناب ستیہ پال آنند صاحب کی نظم نے کافی متاثر کیا ۔ اس نظم میں ردیف و قافیہ کی کمی بالکل نہیں کھلتی اور قاری کو فضائے بسیط میں پرواز کرنے کا اچھا موقع فراہم ہوتا ہے ۔ انسان کی قوت پرواز بلکہ جرأت پرواز پر یہ ایک اچھی اور جاندار نظم ہے ۔

بھائی شاہد میر کے دوہوں میں دوہے کا سارا فن اور اس کی ساری جاذبیت اور گاگر میں بھرنے والی بات موجود ہے ۔

خطوط کا حصہ بھی فکر انگیز اور غور طلب ہے جناب شمس کنول ۔ جناب عظیم الشان حیدر اور جناب صفی الدین صدیقی ۔ صاحب سے بڑی جرأت کے ساتھ اپنی باتیں کہی ہیں ۔

حفیظ بنارسی ، بلکی محلہ ۔ آرہ ۔

● پہلی بار کتاب نما میں آپ نے اردو زبان و ادب سے ہٹ کر دلیپ سنگھ کا غیر ادبی لیکن نہایت اہم اشاریہ "الکٹرانک میڈیا اور قومی یک جہتی" شائع کیا ہے ۔ یہ ایک نیا لیکن مستحسن قدم ہے ان کا یہ لکھنا درست ہے کہ "مجھے تب بھی یہ احساس تھا اور اب بھی یہ احساس ہے کہ فساد ہندو اور مسلمان نہیں کرتے " فسادات غنڈے اور بدمعاش کرتے ہیں ۔"

لیکن غنڈوں اور شریفوں میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا ہے مجرم کی شناخت کس طرح کریں گے ۔

اگر حکومت واقعی اس ملک کو سیکولر رکھنا چاہتی ہے اور لوگوں کے دلوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنا چاہتی ہے تو فسادات سے اس ملک کو سختی کے ساتھ

محفوظ رکھنا ہوگا اور فسادیوں کو بلاتفریق مذہب وملت اور پیشہ سزاؤں کا مستحق ٹھہرانا ہوگا۔

حب الوطنی کا پودا عدل وانصاف کے آغوش میں پلتا ہے، اتحاد واتفاق کے ماحول میں پروان چڑھتا ہے، محبت، مروت اور انسانیت کی فضا لہلہاتا ہے۔ ناانصافی، تعصب اور ہٹ دھرمی کی ہوائیں اس کے لیے زہرناک ثابت ہوتی ہیں۔ اسی شمارے میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی نظم "بابری مسجد" ان کے اچھے اور منصفانہ جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔ انھوں نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ

ابھی یہ سرزمیں خالی نہیں ہے نیک بندوں سے
ابھی موجود ہیں ٹوٹے ہوتے دل جوڑنے والے

اور یہ بھی سچ ہے:

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی۔

عبدالقوی دسنوی، نعمت پورہ بھوپال۔

● جون ۹۳ء میں مہمان مدیر جناب پروانہ ردولوی کا مبسوط اشاریہ اس اعلان پہ ختم ہوتا ہے کہ "اردو صحافت کے ساتھ ناانصافی کو اب ختم ہونا چاہیے اور جو اردو صحافی بنیاد کی اینٹ بن کر گمنامی کی زندگی گزار رہے ہیں ان کی خدمات کا بھی خاطر خواہ اعتراف ہونا چاہیے"۔ یہ احتجاجی تحریر سر تاسر حقیقت بیانی ہے تو اس کے عنوان کا معذرتی انداز "شکوہ ... خاکم بدہن ہے مجھ کو" غیر ضروری ہے۔

آزادی سے قبل اردو صحافت کے وقار اور جنگ آزادی میں اس کے اہم کردار سے کون آگاہ نہیں۔ اس وزن وقار کی ایک بڑی وجہ تو یہی تھی کہ اس میدانِ پُرخار میں قدم وہی رکھتا تھا جس کے لیے صحافت ایک جنون بن کر طاری ہوتی ہو اور جو اسے ایک مشن کے طور پر لے کر بڑھا ہو۔ دوسرے یہ کہ شاید کوئی بھی جید صحافی ایسا نہ تھا جس کی حیثیت ایک ادیب کے طور پر مسلّم نہ رہی ہو چنانچہ ادیب اور صحافی کے درمیان کوئی خطِ فاصل تھا ہی نہیں۔ بیشتر اخبارات خبروں کی بنا پر نہیں بلکہ شخصیات کے نام پر اور ان کی تحریروں کی بنا پر فروخت ہوتے تھے۔

آزادی کے دوسرے دن یہ حادثہ ساری دیسی صحافتوں پر گزرا کہ وہ بقول پروانہ صاحب "منقولہ اور کہیں غیر منقولہ جائداد سی" بن گئیں۔ اردو صحافت پر اور بھی شدید تر حادثات گزرے جن سے جانبر ہونا اس کی سخت جانی کی دلیل ہے۔

جہاں تک اردو صحافیوں کے مترجم ہونے یا بالفاظ دیگر صحافت میں ترجمہ کا سوال ہے تو اس کی تخصیص اردو صحافت ہی کے ساتھ نہیں۔ مختلف زبانوں کے اخبارات اور خبرایجنسیوں کے درمیان لین دین کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے اس کے بغیر مسلسل وسعت پذیر میڈیا کا کاروبار چل ہی نہیں سکتا۔ کیا یورپ کی زبانیں باہم لین دین نہیں کرتیں؟ کیا عالم عرب اور باقی دنیا کے خبررساں ادارے باہم لین دین نہیں کرتے؟ کیا چین، جاپان اور باقی ماندہ دنیا کے درمیان یہ عمل کارفرما نہیں؟ یہ سارا کاروبار ترجمہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اس عمل کے دوران خبریں، تبصرے اور شہ پارے بھی نئے نئے لباس بدلتے ہیں

اور اس برق رفتاری سے تو روایتی ادیب
کسی ادبی تخلیق کا تصوّر ہی نہیں کرسکتا اسی
لیے اب مغرب میں صحافت کو عجلت میں تخلیق
کیا ہوا ادب تسلیم کیا جاتا ہے۔ اداریے،
شذرات اور ایسے تبصرے جو واقعات
وحالات کے پیشِ نظر اگلی صبح کو خبروں
کے ساتھ ہی پیش کیے جاتے ہیں عجلت
میں تخلیق کردہ ادب نہیں تو اور کیا ہیں؟
رپوٹریوں کی تقسیم کا جہاں تک تعلق ہے
تو پروانہ صاحب اس ہفت خواں کے
پرانے راہرو ہیں وہ اس حقیقت سے نا
آشنا نہیں ہوں گے کہ اپنے حصہ کی
رپوٹریاں لینے کے لیے ایک تو عددی قوت
کی ضرورت ہوتی ہے دوسرے سیاسی
جوڑ توڑ کے لیے کافی فرصت اور مہلت کی۔
اس ضمن میں صحافیوں کو دو زمروں
میں تقسیم کرلیں اوّل تو وہی جو بقول پروانہ
صاحب "جائداد منقولہ یا غیر منقولہ" کے
مالک یا وارث ٹھہرے۔ ان کے پاس
کار ہے، کوٹھی ہے، سرکاری اور غیر سرکاری
عطیات ونوازشات اور اعزازات ہیں،
بیرونی دوروں کے دعوت نامے ہیں تاہم
انھیں اپنا جائز حصہ نہ ملنے کی شکایت مسلسل
رہتی ہے جس کا اظہار وہ سڑکوں پر نہیں
ایر کنڈیشنڈ ایوانوں میں کیا کرتے ہیں،
جہاں ان سے نہ معیارِ صحافت کی بات
سُنی جاتی ہے نہ قلمکاروں کے حق المحنت
یا بدلِ اشتراک کی۔

صحافیوں کا دوسرا زمرہ وہ ہے
جسے پروانہ صاحب نے "بنیادی اینٹ"
قرار دیا ہے۔ جو شہدائے راہِ وفا ہیں۔

ایک بار ایک گفتگو کے دوران بعض اداریہ
نگاروں کے اسلوب کا بھی ذکر آیا، ایک
صاحب نے اس موضوع پر کسی تحقیقی مقالے
کا خیال ظاہر کیا تو میں نے عرض کیا کہ اس
راہ میں بڑی پھسلن ہے۔ میرا مقصد اس
حقیقت کی طرف اشارہ کرنا تھا کہ بالعموم
اخبار کی پیشانی پر بطور مدیر جس شخص کا
نام چھپا ہوتا ہے اسی کا اداریہ نگار
بھی ہونا ضروری نہیں۔ اس لیے یہ معلوم
کرنا کہ کس اخبار میں کب کس موضوع پہ
کس نے اداریہ لکھا تقریباً ناممکن ہے۔
(لاہور سے دہلی اور جالندھر منتقل ہونے
والے اخبارات اس کیفیت سے مستثنیٰ ہیں.
وہ اداریہ کے اختتام پر اداریہ نگار کا نام بھی
درج کرتے ہیں یہ ایک دیانتدارانہ روایت
ہے۔) خود پروانہ صاحب نے مولانا آزاد
کی تاریخی تقریر کا حوالہ دیکر اسی حقیقت کی
طرف اشارہ کیا ہے۔

پروانہ صاحب جانتے ہوں گے کہ
جب سن ۵۰ء کے عشرہ میں ورکنگ
جرنلسٹس ایکٹ کے تحت کارکن صحافیوں
کے استحقاقات کے لیے قانونی جدوجہد کا
آغاز ہوا تو کلکتہ، بمبئی اور دہلی جیسے بڑے
بڑے صحافتی مرکزوں میں بھی ان صحافیوں
کی تعداد اتنی کم تھی کہ اس کے بل بوتے پر
کوئی تحریک نہیں چلائی جاسکتی تھی۔ وہ
تو مزدور تنظیموں نے دستِ تعاون دراز
کیا اور بطور حکمتِ عملی کاتب حضرات کو
بھی ورکنگ جرنلسٹ ثابت کیا گیا تب
جاکر کچھ تعداد بنی تحریک کے لیے ورکر ملے۔
اب رہی فرصت کی بات تو اس سے

وہی لوگ واقف ہوں گے جن پر گزرتی ہے۔ پروانہ صاحب کے بیان کردہ کارنامے یا کارگزاریاں تو محض ایک اوٹ ہیں جن کے پیچھے گہری کھائیاں ہیں۔ کون جان سکتا ہے کہ اپنے خونِ جگر سے شمعِ صحافت روشن رکھنے والوں کو کن جانگداز اذیتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

کیا خبر یہ فشردۂ انگور کتنا خون ہوں کے پاس ہوتا ہے

(منظور واحدی)

وہ زمانے کے مارے شوریدہ سر ہیں جو اس راہ میں قدم رکھتے ہیں اور ثابت قدم رہتے ہیں۔ ان کی زندگی میں ضرورتیں کیسے پوری ہوتی ہیں یہ جاننے کی ضرورت حاکم محکوم، عوام یا خاص کسی کو نہیں۔ زندگی مرنے کی مہلت نہیں دیتی اور آنا ہاتھ پھیلانے نہیں دیتی۔ پروانہ صاحب شکایت نہ کیجیے۔ لبوں کو سیے رکھیے۔ آپ نہ سیاسی جوڑ توڑ کر سکتے ہیں نہ آنا کا سودا کرنا آپ کے بس کی بات ہے نہ ہی ان ایوانوں تک آپ کی رسائی ہے۔ جہاں آپ اشتہارات کی کمی، کاغذ کے ناکافی کوٹے یا سرکاری پارٹیوں میں سیر سپاٹے کے موقع کی کمی کا گلہ کر سکیں۔ آپ کو اس کی مہلت بھی کہاں ہے؟ آپ تو "بنیاد کی اینٹ" بنے رہنے ہی کو مایۂ افتخار سمجھیے اور ایک "مقدس پیشے" کے وارثوں کے لیے غیرت مندی اور مفلسی کی میراث چھوڑ جائیے۔ سماج اپنے وفا شعار اربابِ فکر و فن کے ساتھ اس بے رحمی کی بھاری قیمت چکائے گا بلکہ چکا رہا ہے۔ افسوس اس کا ہے کہ اس کارواں میں احساسِ زیاں تک باقی نہیں رہا۔

رضوان اللہ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

● کتاب نما جون ۹۳ کا شمارہ میں ڈاکٹر انور حسین خاں صاحب کے تحقیقی مقالے "چودھری محمد علی ردولوی" پر میرا تبصرہ بھی شائع ہوا ہے جس کے لیے ممنون ہوں۔ تبصرہ میں کتابت کی کئی غلطیاں ہیں۔ لیکن کسی بھی مضمون میں اگر نام غلط شائع ہو جائیں تو ان کی تصحیح بھی ضرور جاتی ہے۔ مہربانی فرماکر یہ تصحیح شائع کر دیں۔
صفحہ ۸ پر نیچے سے پانچویں سطر میں "تہامگم" ہونا چاہیے "تہیا" غلط ہے۔ صفحہ ۹ پر آخری سطر میں مولوی مرتضیٰ حسین "مکیر" صحیح ہے "مظہر" غلط شائع ہوا ہے۔ صفحہ ۱۰ پر پہلی سطر میں حکیم محمد مرزا واصف ہونا چاہیے آصف غلط ہے۔

اب کچھ اس شمارے کے بارے میں عرض کر دوں۔ اشاریہ کے تحت پروانہ ردولوی کا اداریہ تمام صحافی دنیا کے دل کی آواز لگتا ہے کیونکہ اس نے براہِ راست دل پر ہی اثر کیا ہے پروانہ صاحب صرف ایک تجربہ کار صحافی ہی نہیں بلکہ ایک صاحبِ طرز ادیب اور شاعر بھی ہیں اس لیے یہ احتجاج ہر قلم کار کا احتجاج ہے۔ انھوں نے جو شکایات رکھی ہیں وہ مدلل بھی ہیں اور باوزن بھی اپنے مزاج کی شوخی کے مطابق کچھ چھیڑ چھاڑ بھی ہے۔ صحافت کو اللہ تعالیٰ کا محبوب پیشہ ثابت کرکے انھوں نے کچھ تیوریوں کو زیر و زبر ہونے کا موقع بھی فراہم کیا ہے

ان کی یہ بات بھی صحیح ہے کہ اردو
کے نام پر یہ آئے دن کے سیمینار اور جلسے
اردو کے عام طالب علم اور قاری کو کوئی
فائدہ نہیں پہنچاتے۔ تو مزید براں ان
سیمیناروں میں کبھی کبھی ہمارے دانشور
ایسی باتیں کر دیتے ہیں جس سے طالب علم
CONFUSE ہو جاتا ہے۔ ابھی چند ماہ
پیشتر غالب اکاڈمی دہلی میں نئی اردو
تنقید پر تقریر کرتے ہوئے ایک بہت
بڑے ناقد نے خیال ظاہر کیا کہ "کلیم الدین
احمد زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔" مزے
کی بات یہ کہ وہی دانشور صاحب اپنی ایک
کتاب میں یہ اعتراف بھی کر چکے ہیں کہ
"کلیم الدین احمد کو پڑھ کر میں نے لکھنا
سیکھا"۔ خدا جانے صحیح کیا ہے؟ بہرحال
یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا بات تھی
اداریے کی جو پروانہ ردولوی نے اردو کے
ناخداؤں کے سامنے بطور شکوہ پیش
کیا ہے۔ دیکھیے قبولِ بارگاہ ہوتا ہے
یا نہیں۔

اداریے کے بعد جو کچھ بھی ہے وہ
"کتاب نما" کا اپنا ایک نپا تلا معیار ہے
جس پر وہ مستقل قائم ہے یہ بھی بڑی بات
ہے۔ علی سردار جعفری کی نظم "راج
نراج" صرف شاعری نہیں بلکہ پوری داستان
ہے۔ شفیقہ فرحت کا بلا عنوان افسانہ
آنکھوں دیکھی حقیقت ہے اس لیے
دل کو چھو گئی۔

آخر میں پروفیسر نارنگ صاحب
کے سلسلہ وار مضمون کے بارے میں
صرف اتنا عرض ہے کہ مجھ جیسے اردو
کے طالب علم کے لیے وہ ایک نعمت
ہے جو قسط وار "کتاب نما" کے ذریعہ
ہم تک پہنچ رہی ہے۔

عارف محمود، ایم-۲۸۱ سیکٹر ۲۵، نوئیڈا۔

● یہ مقالہ پروفیسر سرور، خواب باقی ہیں
کی روشنی میں، ایک اہم تصنیف اور محترم
مصنف پر مبنی تھا۔ لازماً، طوالت ناگزیر
تھی۔ اس کی تکمیل میں جس قدر وقت صرف
ہوا اور جتنی محنت کی گئی تھی کتابت میں
وہ توجہ نہ رہی۔ بعد کتابت، تصحیح میں بھی
یہ اس خصوصی توجہ سے محروم رہا۔ یہ اس
مقالہ کی نامرادی ہے۔

پیراگرافوں کے التزام کے علاوہ میں
نے اس طویل مقالہ کو سولہ سالم ٹکڑوں میں
تقسیم کر دیا تھا۔ ہر ٹکڑی کا نمبر شمار دائرہ
میں درج تھا تاکہ نفسِ موضوع کا تسلسل
اور مقالہ کی سالمیت قائم رہے۔ مقالہ
میں پیش کردہ اقتباسات کو بقلم خفی لکھنے
کی ہدایت کی تھی کہ یہ عبارت متن سے متصادم
نہ ہوں۔ ہر جگہ نام کتب خط عربی میں
تحریر تھا ۔ ایڈیٹنگ[۱] میں جو ترتیبی
ترمیمات و تبدیلیاں عمل میں آئیں، ان
سے مقالہ کا اتحاد تاثر ختم ہو گیا۔ قاری
انتشار و تکدر کا شکوہ کریں تو بے جا نہ ہوگا۔
کتابت کی غلطیاں کم نہیں۔ مجھے افسوس
ہے، دیر آید درست آید، اس طویل مقالہ
کا مقدر نہ بنا۔

شکر گزار ہوں کہ وہ "تبصرہ" جو آپ
کے الفاظ میں "بحر طویل" میں سپرد قلم ہوا
باوجود تاخیر طویل، زینت کتاب نما ہے۔

(۲) ۱۸ اپریل ۱۹۹۱ کو یہ مقالہ شروع کیا گیا تھا

ـ میں علی گڑھ میں تھا یا تکمیل اور پیکنگ
: میں ماہ جنوری میں ہوگا - غالباً فروری
۱۹ کے آغاز میں اسے آپ کو بغرض اشاعت
جا تھا -
ہ ایڈیٹنگ میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی
ں تک یاد پڑتا ہے ایسے الفاظ بدلے
کر دیے گئے تھے جو آپ تو سرور صاحب
، کر سکتے ہیں ہم شائع کرنے کی جرأت نہیں
سکتے تھے - بس! (ادارہ)

ڈاکٹر محمد حسنین، سعنوار پوکھر، پٹنہ ۶

● ماہ اگست ۱۹۷۳ء کا شمارہ موصول ہوا۔
ضامین اور غزلیں پسند آئیں بالخصوص احمد
یم قاسمی کی غزل کافی عرصہ کے بعد دیکھ کر
، خوش ہو گیا - پوری غزل مرصع ہے -
شعر تو بہت ہی خوب ہے -
ے میرا فن میرے بعد بھی زندہ
یوں ہوئی موت سے نجات مری
یقیناً قاسمی صاحب عظیم شاعر ہیں - پروفیسر
ظفر حنفی کی غزل بھی بہت خوبصورت ہے۔
ے شکوہ گری تو خود ہی سمجھ آگئی ہمیں،
اب ایک بوجھ لگتی ہے اپنی خودی مجھے
افسر آغا لکھنوی کی غزل سے متعلق محترم شمیم حیدر
صاحب کا مراسلہ بھی نظر سے گزرا، حیدر
صاحب نے غزل کی جو تعریف کی ہے وہ
بجا لیکن مطلع کے بارے میں لکھا ہے "یہی
اس غزل کی سب سے بڑی خوبی ہے"
میں اس بیان سے متفق نہیں -
ے ورق ورق مجھے پڑھنے کی فیضیابی ہے
مرے نصیب سے چہرا ترا کتابی ہے
"پڑھنے کی فیضیابی ہے" مجھے یہ ترکیب
پسند نہ آئی -
مسرور حسین شرقؔ، ۱۹۹/۱۸ ہاتھی خانہ، گیا

● کتاب نما کے جولائی کے شمارے میں
جناب شیخ سلیم احمد صاحب کا مقالہ "نئی
ترقی پسندی کا فکری اساس" کو بڑی دلچسپی سے
پڑھا - خاص طور پر پسند آیا - انھوں نے
ترقی پسندی تحریک اور جدیدیت کی درمیانی
کڑی کو عمدہ طریقے سے واضح کیا ہے -
جدیدیت کا دور پیچھے رہ گیا ہے۔
اب دنیا جدیدیت سے ایک قدم آگے
بڑھ گئی ہے - یہ زمانہ
POST MODERNISM کا ہے - شیخ صاحب
نے اپنے آرٹیکل میں اسی طرف اشارہ کیا
ہے جو بالکل صحیح ہے اور ادب ہو یا سیاست
مذہب ہو معاشرت مسائل کا حل کہیں
تیسری آواز میں ہے - انھوں نے دونوں
رویوں کا اچھا تجزیہ کیا ہے - روس
میں کمیونزم نہیں مرا ہے مطلق العنانیت
کی شکست ہوئی ہے -
سید احمد، لیڈی ونگاسی اسپتال، سرائے بلوچی

● "کتاب نما" ان زندہ ماہناموں میں ایک
جاندار رسالہ ہے جو ہر ماہ پابندی سے چھپتا ہے۔
اس دورِ فسادِ خلق میں اس کی زندگی
کو معجزہ سے تعبیر کریں تو مبالغہ نہ ہوگا -
یہ واحد رسالہ ہے جو نئی کتابوں کے علاوہ
معیاری کتابوں کی جان پہچان کا مقدس
فرض ادا کر رہا ہے - ہر مہمان مدیر قابلِ
قدر و لائقِ تحسین فرض ادا کرتا ہے - اگر
مہمان مدیروں کے اوراق کی شیرازہ بندی
کی جاتے تو قابلِ قدر کارنامہ ہوگا - چنانچہ
پروانہ ر. دولوی نے شمع صحافت کی لو
بڑھانے کے لیے جو انداز اپنایا جا رہا ہے اردو
والوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے - واقعی صحافت

کی رفعت کو اب تک نظر انداز کیا جا رہا
ہے ۔ موصوف نے اس جانب توجہ
دلائی ہے ۔ صحافت شناسی کے باب
میں یہ مضمون یادگار سمجھا جائے گا۔

پروفیسر نارنگ کی تقریر ہو کہ تحریر
دل نشیں ہی نہیں فکر و نظر کو چھو لیتی ہے۔
ان کا مضمون معنیٰ آفریں ہی نہیں فکر انگیز بھی
ہے اور بے حد معلوماتی بھی۔ سادگی اور سلاست
تو موصوف کے قلم کا جوہر ہے ۔ ہاشمی
صاحب باتوں ہی باتوں میں بڑے پتے کی
باتیں کرتے ہیں ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی
عظمت ان کی ان کہانیوں سے عیاں ہے
جو انھوں نے بچوں کے لیے لکھی ہیں ۔ ان
کی قایدانہ صلاحیتوں کے نقش و نگار ہر
میدان میں دکھائی دیتے ہیں ۔ ایسی
شخصیتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں ۔
ذاکر صاحب کے فکر و نظر کے چراغوں سے
بڑے بڑے سیاسی و مذہبی قایدوں نے
روشنی پائی ۔

"فسانہ کہیں جسے" عاشور کاظمی
کا شاندار کارنامہ ہے ۔ قیصر تمکین نے
سیر حاصل جائزہ لیا ہے ۔ فسانہ ادب
کی جاندار صنف ہے ۔

"کلھاڑا" درد انگیز افسانہ ہے۔
آج کل تو کلھاڑا کلچر ہی کا بول بالا ہے۔
اس کلچر کی نمایندگی بعض نام نہاد مذہبی
جماعتیں کرنے لگی ہیں۔ چنانچہ ۶ دسمبر کلھاڑا
کلچر عروج کا دن تھا ۔ سوال یہ ہے
کیا بھارت اپنی گنگا جمنی تہذیبی پہچان
کھو رہا ہے جو اسی تہذیب کی پہچان
ہے اب ہماری پہچان خطرے میں پڑ گئی
ہے اسی لیے رؤف خیر یہ کہنے پر مجبور
ہو گئے کہ " میں اپنی آواز کھو رہا ہوں "
شفیقہ فرحت بھی غم زدہ ہے۔

محمد عبدالقدیر ادیب ، ایڈوکیٹ بنگلور

پروانہ ردولوی کا مضمون ہمیں
غور و خوض اور سر جوڑ کر بیٹھنے کی دعوت
دیتا ہے ۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے
رہسیہ ~~کو~~ کو رہس (صفحہ ۲۰) لکھا ہے۔

سید معراج جامی

"ہر ہر قدم پہ یہاں امتحان سائیوں ہے "
میرے خیال میں ہر ہر کے بجائے قدم زیادہ
مناسب ہوتا۔

لطف الرحمن سے

گھر کے سوئے ہوئے مندروں پر منڈیر تانیث ہے؟
شفیقہ فرحت اور غضنفر غنیمت ہیں۔
رؤف خیر اور مناظر عاشق ہرگانوی
بہار و لیلیٰ کی قید سے کب آزاد ہوں گے؟
میں تو منیر نیازی (پاکستان) اور
نیر سیفی (بھارت) کو صرف فنکار سمجھتا
ہوں ۔ تلاشِ رزق میں یہ جہاں بھی
جا بسیں ۔ مشمولات کے اعتبار سے
جون کا کتاب نما کمزور ہے۔

قسیم سہسرامی، پرنسپل، سر اقبال اکیڈمی،
پوسٹ بیرو، ضلع بھوجپور (بہار)

● کتاب نما کے دو شمارے جون اور جولائی
ایک ہی ساتھ میسر ہوئے ۔ پروفیسر گوپی
چند نارنگ کا سلسلہ "مشرقی شعریات
اور ساختیاتی فکر" بے حد عمدہ ہے
جس نے ادبی فکر کے کئی دریچے کھولے ہیں۔
اسے سمجھانے کا انداز بہت خوب، سبحان اللہ
یہ یقیناً ان کا ہی حصہ ہے ۔ جون کے شمارے

میں، قیصر تمکین کا مضمون "فسانہ کہیں جسے" میں شامل شعر توجہ طلب ہے۔ تمکین نے سید احمد (غالباً سر سید احمدؒ) کے حوالے سے اکبر الہ آبادی کا شعر اس طرح نقل کیا ہے:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کرنے والے کہنے والے میں

اسی طرح کے کسی مضمون میں یہ شعر میری نظر سے یوں گزرا ہے:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اب کس پر دوں کس کو ترجیح؟

جولائی کے شمارے میں سید محمد حسنین کا مضمون "پروفیسر آل احمد سرور، خواب باقی ہیں کی روشنی میں" کچھ عجیب ہے اور بس یہی کہ 'ڈور کو سلجھا رہا ہوں اور سرا ملتا نہیں'، موصوف لکھتے ہیں "پروفیسر سرور ادبیات انگریزی سے اردو میں آئے مغربی شہ پاروں یا عظیم تخلیق کاروں سے یہ ناآشنا نہیں۔"

میری ناقص یاد میں سچ تو یہ ہے کہ پروفیسر سرور سائنس سے ادب میں آئے اور ادب میں آئے تو انگریزی اور اردو میں تقریباً ایک ساتھ آئے۔ پھر سید محمد حسنین کا یہ تقاضا کہ سرور صاحب اپنی سوانح ان کی فکر کے سانچے میں ڈھالتے' یہ بھی خوب ہے کہ اب تخلیق کا انداز تنقید نگاروں سے پوچھ کر اپنایا جائے۔ پھر یہ سوال بھی کہ کیا ان چیزوں کی ضرورت تھی۔ یہ تو تخلیق کار جانے۔ تنقید نگار تو صرف یہ رائے دے سکتا ہے کہ مجھے یہ پسند ہے، یہ پسند نہیں ہے۔ پھر یہ بھی کہ فلاں کا ذکر آیا، فلاں کا نام تک نہیں۔ سچی تخلیق و تنقید لازم و ملزوم ہیں اور دونوں میں ذاتی پسند کو دخل ہے۔ اور علاقوں میں الگ الگ منقسم ہے۔ اور ہمیں اس بکھیڑے ڈالنے کی ضرورت ہی کیا ہے اور کیوں ہے؟

محمد حامد علی خاں، جیل روڈ، مظفرپور، بہار

● دسمبر ۹۲ء کے شمارے میں میری نظم "شام" شائع ہوئی اور اس کے بعد دو مراسلے شائع ہوئے جن میں نظم کے ایک مصرع میں لفظ شمع کو غلط تلفظ کے ساتھ برتے جانے کی نشاندہی کی گئی۔ میں ان حضرات کا ممنون ہوں کہ انھوں نے میری "غلط فہمی" دور کردی لیکن یقین جانیے کہ اس لفظ کے صحیح تلفظ (بروزن فاع) سے کم ہی لوگ واقف ہیں اور ان میں بھی زیادہ تعداد شاعروں اور زبان دانوں کی ہی ہے۔ بچپن میں یونس دہلوی صاحب کا رسالہ "شمع" چھپ چھپ کر پڑھتا تھا۔ اس کی پشت پر انگریزی میں SHAMA لکھا ہوتا تھا، لکھا ہوتا ہے بھی، اس لیے اس کے تلفظ کے متعلق کوئی غلط فہمی پیدا ہی نہیں ہوئی کہ دور کرنے کے بارے میں سوچا جاتا۔

سہیل ارشد ۱۴ ڈانگال ڈاکخانہ انڈال۔
ضلع بردوان مغربی بنگال۔

● "کتاب نما" شمارہ جون ۹۳ء ذرا تاخیر سے موصول ہوا۔ اسی شمارے میں پروانہ ردولوی کا اشاریہ بعنوان "شکوہ ۔ ۔ ۔ ۔ خاکم بدہن ہے مجھ کو" مطالعہ میں آیا۔ پروانہ صاحب نے اردو صحافت اور صحافیوں کا کیس

موثر انداز میں پیش کیا ہے ۔ مسلم دانشور بشمول اردو دانشور عام طور پر اردو اخبارات پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کی لاشوں کو چیک کی طرح بھناتے ہیں ۔ اردو اخبارات نے اپنے قارئین (جن میں ننانوے فیصد سے زائد مسلمان ہیں) کے اندر غصے، جذباتی اور جھنجھلائے ہوئے ذہن تعمیر کیے ہیں وغیرہ وغیرہ —— لیکن جب اس ملک میں مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں، ان کو ناانصافی کی بھٹی کا ایندھن بنایا جاتا ہے، تب یہی اردو اخبارات صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں جبکہ اس کے برعکس ہندی اور انگریزی صحافی اپنی تحریروں سے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی دیواریں کھڑی کرتے رہتے ہیں اور ہندستانی معاشرے میں مسلمانوں کے خلاف افواہیں پھیلانے کا سبب بنتے ہیں، لیکن ستم ظریفی تو یہ ہے کہ مسلم دانشور جب اردو اخبارات پر تبصرہ کرتے ہیں تب انھیں گلاس آدھا خالی نظر آتا ہے اور جب ہندی و انگریزی صحافت کی بات کرتے ہیں تو یہی لوگ گلاس آدھا بھرا ہوا دکھاتے ہیں ہمارے دانشوروں کی یہ سوچ یقیناً مبنی بر انصاف نہیں ہے۔

اشاریہ میں مضمون نگار نے ایک جگہ یہ تحریر فرمایا ہے کہ اکثر اردو کے نام نہاد دانشور یہ کہتے ہیں کہ اردو کے اخبارات گھٹیا درجہ کے گھرانوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں پروانہ صاحب نے مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ اردو دانشور یا اس کا نام ونہاد دانشور ہی سہی، ان سے ایسے گھٹیا قول کی امید نہیں کی جاسکتی ۔ پروانہ صاحب نے یہ الزام عائد کرتے ہوئے جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ کیا فاضل مضمون نگار ایسے کسی فرد واحد کا نام ظاہر کرسکتے ہیں ؟

اسی شمارے کے صفحہ ۵۵ پر علی سردار جعفری کی ایک ریختی غزل شائع ہوئی ہے۔ یہ ایک جھوٹا ماتم ہے ۔

ایم۔ شفیق الانصاری ایڈوکیٹ، بارہ دری
مرادآباد ۔ ۲۴۴۰۰۱

● "کتاب نما" جون ۹۳ء نظر نواز ہوا۔ مہمان مدیر جناب پروانہ ردولوی نے صحافت کے حوالے سے جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ قابلِ غور ہیں ۔

قیصر تمکین اور سوم آنند کے مضامین معلوماتی ہیں جبکہ پروفیسر نعیم احمد کا مضمون وقت کی ایک اہم ضرورت ہے ——
مناظر عاشق کے سلسلے میں جناب رؤف خیر کا خط بڑا دلچسپ ہے ۔ ادب میں عصبیت اور علاقہ پرستی کوئی اچھی چیز نہیں۔

اقبال حسن آزاد ۔ مونگیر، بہار،

● اگست کے شمارے میں مہمان مدیر ڈاکٹر بیگ احساس کا اشاریہ' آندھرا پردیش میں اردو' پر روشنی ڈالتا ہے ۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ اس پر جتنا لکھا جائے کم ہے ۔ بیگ صاحب کے اشاریہ کو پڑھ کر ایسا احساس ہوتا ہے کہ وہ بہت کچھ لکھنا چاہتے ہیں لکھ نہیں پاتے ہیں۔ بیگ صاحب

نے اردو کے عام مسائل مثلاً درسیات کا وقت پر مہیا نہ ہونا، ناقص ہونا، اردو اساتذہ کا اپنے فرض سے کوتاہی برتنا اور اردو والوں کی طرف سے حکومت کا آنکھیں موند لینا وغیرہ کو موصوف نے اپنے مضمون میں پیش کیا ہے۔ اگر وہ آندھرا پردیش کے کچھ مخصوص مسائل اور اردو والوں کی طرف سے اس صورتِ حال کو بدلنے کی کوششوں کا تذکرہ کر دیتے تو شاید ان کا مضمون زیادہ مدلل اور اہم ہوتا۔

اس شمارے میں "آزادی کے بعد اردو تنقید" ایک طویل تاثراتی ہے۔ ڈاکٹر ظفیر احمد خاں صاحب نے اس مضمون میں بعض ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو سارے اردو زبان میں مستعمل نہیں ہیں۔ اور ایسے جملوں کی کثرت ہے جن میں ابہام پایا جاتا ہے۔ انھوں نے ایک فن پارے کی ایک جملے میں جو حیثیت قائم کی ہے اگلا جملہ ٹھیک اس کا مخالف تاثر پیش کرتا ہے۔ ایسا شاید اس لیے ہوا ہے کہ موصوف نے اپنے حافظے کی چوکھٹ پر دستک دی اور جو نام ان کے حافظے میں موجود تھے ان سب کو نقاد ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور درجہ بندی کے لیے بڑے نقاد، عظیم نقاد، ممتاز نقاد، بسیار نویس نقاد وغیرہ جیسے بے وزن الفاظ استعمال کیے ہیں۔ انھوں نے نقاد، ادیب، انشاپرداز، اڈیٹر اور طنز نگاروں میں کوئی فرق قائم نہیں کیا اور نہ کسی بھی فن پارے کی تنقیدی تخلیقات کی اہم خصوصیات ہی وہ پیش کرسکے ہیں۔ اسی لیے وہ اپنے

مضمون میں الجھ کر رہ گئے ہیں اور بعض اہم نقادوں کا جیسے ابن فرید وغیرہ کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ اور بعض ایسے لوگوں کو انھوں نے ایک عظیم نقاد کی حیثیت سے پیش کیا ہے جن کا تنقید سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ کیا کسی ایسے شخص کو جس نے دوسروں کے مضامین کو مرتب کیا ہے نقاد تصور کیا جاسکتا ہے آزادی کے بعد کے نقادوں میں انھیں صرف دو حضرات ہی نقاد نظر آتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"اگر آزادی کے بعد کی پیداوار کو اصول تنقید کے نقاد کی حیثیت سے پرکھا جاتے تو معلوم ہوگا کہ یہ نسل تنقید کے فن سے یکسر عاری ہے۔ اگر باقاعدہ تنقید کے فن کے لحاظ سے غور کریں تو ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی کے علاوہ صرف ایک شخص غضنفر علی ایک نقاد کی حیثیت سے ملتا ہے۔" اس کے بعد جتنے نوجوان عنقریب لیکچرار مقرر ہوتے ہیں ان سب کو موصوف نے تنقید نگار تسلیم کرلیا ہے۔ اور جو نوکری کی تلاش میں گھوم رہے ہیں ان میں سے کوئی صاحب مضمون نگار کی نظر میں نقاد نہیں۔

م، ح، غزالی۔ ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵

دبی اور تہذیبی خبریں

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی ۷۵ ویں سالگرہ

نئی دہلی۔ اپنی ۷۵ سال کی زندگی میں مجھے کبھی اتنا ذہنی صدمہ اور دکھ نہیں ہوا جتنا ملک کے موجودہ حالات سے ہو رہا ہے۔

ان الفاظ کے ساتھ اردو تحریک کے بزرگ علمبردار، ممتاز مصنف، نقاد اور آندھرا پردیش کی سیاسی اور ثقافتی زندگی کے افسانوی کردار ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے ۴ جولائی ۱۹۹۳ء کو اپنی ۷۵ ویں سالگرہ کی تقریب میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

اس تقریب کا اہتمام انجمن ترقی اردو (ہند) نے کیا تھا۔ صدارت انجمن کے نئے صدر پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے کی اور رسم افتتاح مرکزی وزیر پی۔ شیو شنکر نے ادا کی۔ انجمن کے سابق صدر جناب سید حامد نے بطور خصوصی مہمان شرکت کی۔ اور جواہر لال یونیورسٹی کے ڈاکٹر اسلم پرویز نے نظامت کی۔ اس پُرہجوم تقریب کا ایک اور امتیاز یہ تھا کہ ڈاکٹر گوڑ کی حیات اور نگارشات پر اپنے مقالے پیش کرنے کے لیے متعدد حضرات حیدرآباد سے دہلی آئے۔

انجمن کی طرف سے ڈاکٹر گوڑ کو ایک اونی شال اور پھولوں کے ہار پیش کیے گئے۔

ڈاکٹر گوڑ نے کہا کہ مذہب پرستوں اور بنیاد پرستوں نے ہمارے وہ خواب توڑ دیے ہیں، جو ہم نے ملک کی آزادی دلانے کی جدوجہد کے دوران دیکھے تھے۔ ہندوستان میں مذاہب کی کثرت ہے اور یہ اس کی رنگارنگی اور ملی جلی تہذیب کی ایک قابلِ فخر خوبی ہے۔ لیکن وائے افسوس کہ مذہب پرستوں کے چند طبقے مندر اور مسجد کی بنا پر ملک کے سماج کو تقسیم کرنے کے درپے ہیں۔

جناب پی۔ شیو شنکر نے کہا کہ ڈاکٹر گوڑ زائد از ساٹھ سال سے سیاسی، سماجی اور ادبی محاذوں پر سرگرم ہیں۔ حیدرآباد کی تلنگانہ تحریک میں انھوں نے مخدوم محی الدین مرحوم کے ساتھ مل کر جو کارنامے انجام دیے، وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ ان دونوں کی سرگرمیوں نے حیدرآباد کو وہ کردار اور مرتبہ عطا کیا جس کے لیے وہ آج مشہور ہے۔ اپنے جذبۂ معاونت کی بدولت یہ حیدرآباد کے وسیع حلقوں میں راجن بھائی کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔

انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ ڈاکٹر گوڑ نہایت سیکولر انسان ہیں اور ملک کے کسی بھی مسئلے کو مذہب سے نہیں جوڑتے بلکہ ہر بحران میں ایک ذہنی توازن برقرار رکھتے ہیں۔

جناب جواد رضوی (حیدرآباد) نے اپنے تاثراتی مقالے میں کہا کہ ڈاکٹر گوڑ ایک ہفت پہلو شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کا 'کمپیوٹر صفت دماغ' ہر موضوع پر حاضر رہتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر گوڑ نے ڈاکٹری کی سند ضرور حاصل کی لیکن کبھی کوئی مطب نہ کھولا۔ بلکہ عوامی خدمات ہی میں مصروف رہے۔

موسیٰ قمر حمانی (حیدر آباد) نے اپنے مقالے میں کہا کہ اہلِ حیدر آباد ڈاکٹر گوپر سے عشق کرتے ہیں۔ وہ ہماری گنگا جمنی تہذیب کے شاداب چمن کے نہایت دلآویز گلاب ہیں۔

جناب شمیم مینغی نے اپنے مقالے میں کہا کہ ڈاکٹر گوپر ایک آدرش کمیونسٹ ہیں۔ وہ مسلم مسائل کے ماہر اور اعتدال پسند مبصر ہیں۔

جناب مجتبیٰ حسین نے اپنے خاکے میں کہا کہ حیدر آباد میں گوپر صاحب کی زندگی کے واقعات الف لیلیٰ کی داستان کے قصوں کی طرح مشہور ہیں۔

جناب عبدالمغنی نے ڈاکٹر گوپر کی کتاب "ادبی تناظر" پر ایک تبصرہ پیش کیا اور کہا کہ وہ اردو تہذیب کی اعلا قدروں کا نمونہ ہیں۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے گوپر صاحب کی تنقیدی نگارشات پر اپنے مقالے میں کہا کہ وہ اردو زبان و ادب کے ایک مخلص معمار ہیں۔ اور ہمیشہ اعتدال اور ہم آہنگی کی روش اختیار کرتے ہیں۔

جناب رفعت سروش نے کہا کہ گوپر صاحب کے تنقیدی مضامین میں بصیرت کی گہرائی ہے۔ اور انھوں نے ان میں کئی نئے زاویے پیش کیے ہیں۔

جناب منوہر لال سکسینہ (حیدر آباد) نے کہا کہ رشتے میں وہ گوپر صاحب کے ماموں ہیں، لیکن مزاجی ہم آہنگی کی وجہ سے وہ ایک باہمی سمجھوتے کے تحت ان کے "ماموں یار" ہیں۔ انھوں نے کہا کہ گوپر صاحب روزِ اول ہی سے ایک زندہ دل کردار ہیں۔

اور اپنی بزرگی میں بھی اس وضع کو قایم رکھے ہوئے ہیں۔

سید حامد نے کہا کہ ڈاکٹر گوپر کی حسِ مزاح واقعتاً بہت نمایاں ہے۔ وہ سنجیدہ مسائل کو اپنے تفنن سے ہلکا کرتے ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد انفرادی کی بجائے اجتماعی مسیحائی کا شیوہ اختیار کیا۔

صدرِ جلسہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے کہا کہ ڈاکٹر گوپر نے ساٹھ سال سے اوپر مدت تک سماجی، سیاسی اور ادبی طور پر ایک معروف اور بھرپور زندگی بسر کی ہے۔ یہ معروفیت کسی عبادت سے کم نہیں۔ انھوں نے ہمیشہ بنی نوعِ انسان کی عملی خدمت کی اور ہمیشہ اقلیتوں اور پسماندہ طبقوں کے مفاد کے داعی ہیں۔ خدا کرے وہ عرصۂ دراز تک سلامت اور فعال رہیں اور اردو زبان اور سماج ان سے مستفید ہوتی رہے۔

(جی۔ ڈی۔ چندن۔)

ڈاکٹر شاہد میر کا نیا پتا درج ذیل ہے۔

ڈاکٹر شاہد میر، ڈائرکٹر۔ کرشی وگیان کیندر۔ سروج۔ ضلع ودیشا۔ مدھیہ پردیش۔ 228 464

مشہور شاعر فرحت قادری کا حالیہ اور مستقل پتا یہ ہے۔

محلہ معروف گنج۔ گیا۔ (بہار)

-Third World Society for Promotion of Literary Science & Technology

خصوصی ات

کا قیام تیسری دنیا کے قیام
ہندستان میں مسلمانوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم ان کی مادری زبان (خصوصاً اردو) کے ذریعے دینے کے لیے وجود میں آیا ہے۔ یہ ادارہ مختلف رضاکار اداروں کے تعاون سے ہندستان بھر میں نچلی سطح کی سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم (مثلاً آئی ٹی آئی اور پالی ٹیکنیک) کے قیام کے لیے کوشاں ہے۔ جو ادارے یا اشخاص ہمارے ادارے سے تعاون کرنا چاہیں وہ درج ذیل پتے پر رابطہ قائم کریں۔

MOHAMMED NAIMULLAH (SECRETARY)
151, GLADSTONE PARK GARDENS
LONDON NW2 6RN (UK)
PHONE & FAX 044-81-4502989

عابد علی خاں کو مخدوم ایوارڈ

حیدرآباد۔ ۱۶ اگست، روزنامہ سیاست
حیدرآباد کے بانی میر عابد علی خاں مرحوم کو صحافتی خدمات کے لیے مخدوم ایوارڈ برائے صحافت ۱۹۹۲ء کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ ۱۵ ہزار روپے اور ایک توصیفی سند پر مشتمل ہے۔ یہ فیصلہ اکادمی کی مجلس عاملہ نے کیا ہے۔

ماجد الباقری کو بہترین شاعر کا ایوارڈ

گوجرانوالہ
پاکستان کے معروف جدید شاعر جناب ماجد الباقری کو سفینۂ ادب گوجرانوالہ اور ڈاکٹرز تھیری سرکل کی طرف سے مشترکہ طور پر ۱۹۹۲ و ۱۹۹۳ء کے بہترین شاعر ہونے کا ایوارڈ دیا گیا ہے۔ تقریب کا اہتمام ایک مقامی ہال میں کیا گیا۔ تقریب کی صدارت میئر کارپوریشن بابو جاوید اللہ نے کی جبکہ مہمانِ خصوصی ایس ایس پی گوجرانوالہ ملک محمد اقبال تھے۔ سرکل کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر سعید اقبال سعدی نے مہمانوں کا استقبال کیا۔

ممتاز شاعر سیف الدین سیف نہیں رہے

اردو کے بزرگ اور لائقِ احترام کتب فروش جناب سردار موہن سنگھ مالک آزاد کتاب گھر۔ امرتسر نے یہ افسوسناک خبر دی کہ اردو کے ممتاز شاعر سیف الدین سیفؔ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ سیف صاحب مرحوم کا مجموعہ کلام "خمِ کاکل" ادبی حلقے میں بہت پسند کیا گیا تھا۔ ادارہ کتاب نما مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے۔ اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پسماندگان کو صبر کی توفیق فرمائے۔

معروف شاعر وسیم مینائی کے اعزاز میں مشاعرہ۔

بریلی ۴ جون۔ اردو کے مشہور و معروف شاعر جناب وسیم مینائی شاہجہانپوری کی آمد پر محلّہ بان خانہ میں جناب افضل بجنوری کی جانب سے ایک شاندار مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس کی صدارت بزرگ شاعر جناب خلیل تبریلوی نے اور نظامت کے فرائض جناب افضل بجنوری نے انجام دیے۔ مشاعرہ کے آغاز سے قبل ناظم

مشاعرہ افضل بجنوری نے جناب وسیم بینائی
کی شخصیت اور فن سے شرکا مشاعرہ کو
متعارف کرایا۔

مشاعرہ میں جناب زاہد بریلوی، جناب
کمال وارثی، جناب پنچھی سرحدی، جناب
عزم بریلوی، جناب مشرو ناتھ بسمل، جناب
مصطفےٰ راہی، جناب بھنڈاری صاحب، جناب
قیم بریلوی، جناب افضل بجنوری، جناب عارف
میاں خان عارف، جناب وسیم بینائی شاہ
جہاں پوری۔ اور جناب خلیل بریلوی نے
اپنا کلام پیش کیا۔

آہ! اسد رشن کمار درد

گورایا ضلع جالندھر۔ ۲۲ جولائی ۱۹۹۳ء شعری
وادبی حلقوں میں یہ خبر بڑے افسوس سے سنی
جائے گی کہ ۹ر اپریل ۱۹۹۳ء کو نئی دہلی میں
اردو کے ہونہار شاعر جناب سدرشن کمار درد
اس دارِ فانی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے
وہ گھر میں چند رشتہ داروں کے ساتھ تاش
کھیل رہے تھے جب آخری وقت آیا انھیں
دل کا دورہ پڑا اور چند منٹوں میں کام تمام ہوگیا
درد صاحب نہایت نیک سیرت، ملنسار
خوش اخلاق اور متواضع انسان تھے۔ کسی
سے ان کی رنجش یا دشمنی نہیں تھی۔ ایک
سنجیدہ مسکراہٹ ہمہ وقت ان کے چہرے پر
کھیلتی رہتی تھی۔

ازل سے تا ابد دنیائے دل کا آسرا تم ہو
ہماری ابتدا تم ہو ہماری انتہا تم ہو
تم ہی کہہ دو یہ زنجیر تعلق ٹوٹ سکتی ہے؟
خدا تم ہو بشر ہیں ہاں بکثرت ہیں ہوں خدا تم ہو

مرگِ ناگہانی کے وقت ان کی عمر ساٹھ برس
کے لگ بھگ تھی۔ دعا ہے کہ خدا ان کو اپنی جوارِ
رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل
عطا فرمائے۔

مجھے افسوس ہے کہ میری ناسازئ طبع
کے باعث یہ خبر بر وقت پریس کو نہ دی جا سکی۔
(پرکاش ناتھ پرویز)

کنور مہندر سنگھ کی پہلی برسی

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر قومی یکجہتی
اور آپسی بھائی چارے کے سب سے بڑے
علم بردار تھے، ان کے بغیر دہلی کی ادبی اور ثقافتی
زندگی سونی ہوگئی ہے۔ اور ان کے ساتھ ایک
دور اور ایک تہذیب ختم ہوگئی ہے۔ ہندستان
اور پاکستان کے تعلقات بہتر بنانے کے لیے
انھوں نے بھرپور کوشش کی۔ ان خیالات
کا اظہار مختلف مقررین نے اس جلسہ میں کیا
جو آنجہانی کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی پہلی
برسی کے موقع پر اُن کی یاد میں ۱۷ جولائی کو اردو
گھر نئی دہلی میں حلقہ اربابِ ذوق نے منعقد کیا
تھا۔ حکیم عبدالحمید صاحب نے جلسہ کی صدارت
کی۔ اور مہمانِ خصوصی کے طور پر جناب
جی ساگر سوری، ساحر ہوشیارپوری، خلیق انجم
صاحب اور رام چند وِکل (ممبر راجیہ سبھا)
نے شرکت کی۔

اس موقع پر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر
کی خود نوشت "یادوں کا جشن" (دوم ایڈیشن)
کی رسم اجرا حکیم عبدالحمید صاحب نے فرمائی
اور جناب کے ایل نارنگ ساقی کی مرتبہ کتاب
"ہمارے کنور صاحب" کے دوسرے اڈیشن
کی رسم اجرا جناب رام چند وکل نے انجام دی۔
آرٹسٹ جناب عزیز نے اس موقع

یدی صاحب کا ایک خوب صورت پورٹریٹ
ی ۔ جس کی نقاب کشائی حکیم صاحب
فرمائی۔ اور کے۔ ایل نارنگ ساقی اور
ساگر سوری نے اس کی گل پوشی کی۔

جن مقررین نے اس جلسہ میں اظہارِ خیال
ان میں جناب جمیل الدین مفتی، جناب شریف
یف الحسن نقوی، خواجہ حسن ثانی نظامی، مجتبیٰ
ین، متین امروہوی، اور خلیق انجم صاحب
ل تھے۔ جناب مظہر امام اور کنور سیدی
صب نے بیدی صاحب پر مقالے پڑھے
اب رفعت سروش نے جلسے کی نظامت
بائی اور کے ایل نارنگ ساقی نے مہمانوں
شکریہ ادا کیا۔

اس موقع پر بیدی صاحب کی یاد میں
ئم کیے گئے کنور مہندر سنگھ بیدی لٹریری
سٹ کی جانب سے ٹرسٹ کے سکریٹری
ے۔ ایل نارنگ ساقی نے مشہور افسانہ نگار
ام لعل (جو ان دنوں علیل ہیں) کو طبی امداد
کے لیے پانچ ہزار روپے کا عطیہ بھیجنے کا اعلان
یا۔ جناب جوگندر پال، جناب شجاع خاور،
ناب ذہین نقوی، جناب دلیپ سنگھ، جناب
وتار سنگھ جج، جناب نثار احمد فاروقی، پروفیسر
نوان چشتی، جناب زبیر رضوی، جناب ایم جلیس خاں
ناب گربچن چندن، جناب اسد رضا، جناب
یر آغا قزلباش، جناب میکش امروہوی،
جناب ابرار کرتپوری، اور حاجی انیس دہلوی
کے علاوہ بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔
(سندن)

شمس الرحمٰن فاروقی کی دو نئی کتابوں کی رونمائی

نئی دہلی: غالب کے کلام کے نسخۂ
امروہہ کی حقیقت اور اہمیت کیا ہے؟ یہ
سوال جو ماضی میں کافی ہنگامے برپا کرنے
کے بعد ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ جناب شمس الرحمٰن
فاروقی کی دو نئی کتابوں کے اجرائی تقریب
میں پھر سے گرم ہو گیا۔ اس تقریب کا اہتمام
انجمن ترقی اردو (ہند) نے ۲۱ جولائی کو اردو
گھر میں کیا۔ صدارت پروفیسر نثار احمد
فاروقی نے کی اور انجمن کے سابق صدر
سید حامد بطور مہمانِ خصوصی شریک ہوئے
تقریب کے دعوت نامے میں ان کی کتاب
"انداز گفتگو کیا ہے" جو ان کے مضامین
کا مجموعہ ہے۔ سرِ فہرست رکھا گیا۔ اس کی
رونمائی سید حامد نے کی۔ دوسری کتاب
کو جس کا عنوان "انتخاب اردو کلیاتِ غالب"
ہے۔ مشتہر نہیں کیا گیا تھا اس کی رونمائی
پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے کی۔
انجمن کے جنرل سیکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم
نے "انتخاب اردو کلیاتِ غالب" پر اپنے
تبصرے میں شمس الرحمٰن کی بالغ نظری
کی ستائش کی اور کہا کہ یہ غالب کے
کلام کا ہمارے زمانے کا بہترین انتخاب ہے۔
اس میں شاعر کے موقف کے پس منظر اور
تناظر کا پورا خیال رکھا گیا ہے اور غالب
کی غزلیہ شاعری کے علاوہ ان کی دیگر
اصناف کا بھی انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ اس
میں نسخۂ امروہہ کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا
جو بجا بھی ہے۔
رفعت سروش نے جو تقریب کی نظامت
کر رہے تھے۔ ڈاکٹر انجم کی تقریر پر تبصرہ
کرتے ہوئے کہا کہ بعض لوگوں نے نسخۂ
امروہہ کو یکسر نظر انداز کرنا مناسب نہیں

سمجھا۔ یہ نسخۂ امروہہ کے ایک کباڑی توفیق احمد کو بھوپال کے ایک کباڑی سے ملا تھا اور دہلی میں مقیم امروہہ کے چند اشخاص نے اسے کتابت کے خاص اہتمام اور حواشی اور مقدمے کے ساتھ دہلی ہی سے شائع بھی کیا۔ چند نقادوں نے اسے ایک جعلی چیز قرار دیا۔ بعد میں ایک صاحب اسے پاکستان لے گئے تھے۔ اور وہاں بھی اسے ایک آزاد کتاب کے طور پر چھاپا گیا۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے جو اسٹیج ہی پر موجود تھے، ناظم کو اس نزاعی مسئلے پر مزید کچھ کہنے سے منع کیا اور رفعت سروش نے ان کا مشورہ مانتے ہوئے کہا "بہرحال یہ موضوع اپنی جگہ موجود ہے۔

اس کے بعد صدر جلسہ نے تمام مقررین کے بعد اپنے کلمات میں کہا کہ شمس الرحمن صاحب ہمارے ایک عالم فاضل نقاد ہیں۔ ان کی انفرادیت یہ ہے کہ انھیں اردو اور انگریزی کے ساتھ فارسی اور عربی کے زبان و ادب سے اچھی واقفیت ہے۔ ان کی ذہنی سطح برابر بلند ہوتی رہی ہے۔ اور انھوں نے کلاسیکیت اور جدیدیت دونوں پر نظر رکھی ہے ان کے افکار میں جان ہے۔ لیکن ان کی زیر نظر تالیف ان کے باقی کام کے مقابلے میں زیادہ اہم کتاب نہیں ہے۔ انھوں نے نسخۂ امروہہ کو شاید اس لیے نظر انداز کر دیا کیونکہ بعض لوگ اسے مشتبہ قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر نثار احمد نے کہا کہ ہمارے ہاں علمی مزاج کی کمی ہے اور اسی وجہ سے ایسا رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے نسخۂ امروہہ کو پڑھے بغیر اس کے خلاف موٹی موٹی کتابیں لکھ دی ہیں۔ ڈاکٹر نثار احمد نے کہا کہ انھوں نے یہ نسخہ دیکھا ہے اور اس کے مالک توفیق احمد کو جانتے ہیں۔ وہ انھیں اور اس نسخے کو ساتھ لے کر مالک رام صاحب کے پاس بھی گئے تھے۔ وہ ان دنوں جالندھر موٹر ایجنسی کے مینیجنگ ڈائریکٹر تھے۔ مالک رام صاحب نے اس نسخے کو کچھ دیر دیکھا اور کہا کہ یہ غالب کا خط نہیں ہے۔ اسے اصلی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ توفیق احمد نے اس کی قیمت ۲ ہزار روپے مانگی تھی۔ اور مالک رام کا مقصد یہ تھا کہ وہ اسے پانچ سات ہزار روپے میں دے دیں۔ ڈاکٹر نثار احمد نے کہا کہ توفیق احمد غالباً انھیں اپنا نسخہ چند دنوں کے لیے مرونا دینے کے لیے بھی تیار ہو جاتے لیکن مالک رام ان سے کاروباری انداز ہی سے بات کرتے رہے۔ اس کشمکش میں وہ نسخہ رد ہو گیا۔ موصوف نے کہا کہ لوگ ان پر الزام لگاتے ہیں کہ انھوں نے اس نسخہ کے عوض پاکستان سے بھاری رقم کمائی۔ یہ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ بہرحال وہ نسخے کو بغیر مطالعہ کیے رد کرنے کے حق میں نہیں۔ وہ اس سارے معاملے اور مواد کو ایک خصوصی نشست میں پیش کرنے کے لیے تیار ہیں۔ جہاں اس پر کھل کر علمی بحث ہو سکتی ہے۔ اور توفیق احمد بھی ابھی حیات ہیں۔ موصوف نے کہا کہ ضرورت علمی مزاج کو فروغ دینے کی ہے۔ غالب یا کسی بھی کلاسیکی ادیب کی تفہیم کے لیے جو بھی نئی چیز دریافت ہو اس کی چھان پھٹک ہونی چاہیے اور علمی مزاج سے اس کا مقام متعین ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے تقریب کے اختتام پر

اپنے شکریہ کے کلمات میں مسئلے کی وضاحت کی اور کہا کہ وہ نسخۂ امروہہ کے مخالف نہیں۔ وہ بھی چاہتے ہیں کہ اس کے تنقیدی معائنے کے لیے متعلقہ ماہرین کی ایک نشست منعقد کی جائے۔ اور انشاء اللہ اس کا جلد ہی اہتمام کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ میں اس پروگرام کا ویڈیو کیسٹ تیار ہو جائے گا۔ تاکہ آیندہ مورخین اور ناقدین بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔

جناب شمس الرحمٰن علالت کی وجہ سے تقریب میں شامل نہ ہو سکے۔ ان کی بیگم جلسے کے سارے پروگرام میں موجود تھیں۔

مقررین میں جناب سید حامد، پروفیسر شفیق الرحمٰن قدوائی، جناب محمود ہاشمی، جناب اعجاز علی ارشد (پٹنہ) اور پروفیسر ظہیر احمد صدیقی شامل تھے۔ ان سب نے شمس الرحمٰن کے وسیع اور گہرے مطالعے کے نقادوں میں ان کے منفرد مقام۔ مشرق اور مغرب کے ادب کے رجحانات پر ان کے پُر مغز تبصرے اور اپنے نظریوں کے لیے مدلل استدلال کے انداز کی ستایش کی اور ان کی صحت یابی توانائی اور مسلسل فعالیت کے لیے دعائیں کیں۔

مقررین نے کتاب کے ناشر مکتبہ جامعہ لمٹیڈ کے جنرل مینجر جناب شاہد علی خاں کو مبارک باد دی کہ وہ اپنے مصنفین اور موضوعات کا انتخاب بڑے سلیقے اور بصارت سے کرتے ہیں۔ اور مسلسل ایسی کتابیں چھاپ رہے ہیں جن سے اردو زبان و ادب مالا مال ہو رہے ہیں۔ "انداز گفتگو کیا ہے" کی اشاعت تو اسی ادارے سے ہوئی ہے لیکن "انتخاب اردو کلیات غالب" کی اشاعت ساہتیہ اکادمی نے کی ہے۔ (جی۔ ڈی۔ چندن)

سرورق :۔ گزیجن چندن

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

اکتوبر ۱۹۹۳ء جلد ۳۳ شمارہ ۱۰

فی پرچہ 6/=
سالانہ 55/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے 75/=
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک) 170/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک) 320/=

ایڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
TELEPHONE 630191

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات 'نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برلی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

نظمیں / غزلیں

طنز و مزاح

افسانے

جائزے

نئی مطبوعات

اختر سعید خاں نمبر (کتاب نما کا خصوصی شمارہ۔
مرتبہ سید حامد حسین ۵۱/-

دستک اس دروازے پر ڈاکٹر وزیر آغا ۵۱/-
صحرا نورد کے خطوط (افسانوی مجموعہ) میرزا ادیب ۷۵/-
جھینی جھینی بینی چدریا (ناول) عبدل بسم اللہ ۷۵/-
تین بندوقچی (ناول) بچوں کے لیے مسعود احمد برکاتی ۱۰/-
سخنہائے تحقیق (تحقیق) منصور عالم ۹۰/-
دانشورِ اقبال (اقبالیات مضامین) آل احمد سرور ۲۷۵/-
کتب خانہ (لائبریری)۔ رضا علی عابدی ۸۰/-
اسلوبیاتِ تنقید۔ مضامین طارق سعید ۲۰۰/-
کبیر احمد جائسی علمی ادبی خدمات (ادب) شہاب الدین ۱۰۰/-
تخلص بھوپالی حیات اور خدمات (ادب) صفیہ ودود ۲۴/-
رہبر زندگی مع طب نبویؐ (طب) سید محمد سعید الحسن ۲۴/-
اتاترک مصطفیٰ کمال پاشا (تاریخی ناول) صادق حسین سردھنوی ۴۰/-
طارق بن زیاد (تاریخی ناول) اسلم راہی ۱۰۰/-
سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے (مضامین)
پروفیسر خلیق احمد نظامی ۸۵/-
رسولِ حکمت (مذہب) مسعود احمد شاہ ۲۵/-
کربلا کی بہادر خواتین (مذہب) پروانہ ردولوی ۲۵/-
شعورِ آگہی (منظوم ڈرامے) رفعت سروش ۱۰۰/-
کلیات مکاتیب اقبال جلد سوم (اقبالیات)
مظفر حسین برنی ۲۰۰/-
خوشبو بن کے لوٹیں گے دیویندر اسر ۵۰/-
غالب نامہ جولائی ۱۹۹۳ (مجلہ) غالب انسٹی ٹیوٹ ۵۰/-
ضیاء نجم (سوانح) مرتبہ سید حسن احمد رضوی ۱۰/-
مصداق (شعری مجموعہ) راہی فدائی ۵۰/-

سرورق انیس الرحمٰن

بکھرا بکھرا لہجہ (") سرور نگینوی ۵۰/-
ڈنکے کی چوٹ (شعری مجموعہ) جی ایم۔ نعمی ۵۰/-
موجِ ادب مؤلفین۔ کوثر مظہری / امتیاز سالک ۵۰/-
گل بوٹے (فنونِ لطیفہ) مرتب۔ ممتاز حسین فہیم ۲۵/-
شب چراغ۔ (شعری مجموعہ) صفی دصفی ۴۰/-
تاثر بنگال (تنقید و تحقیق) پروفیسر کلیم سہسرامی مجلد ۵۰/-
تحقیقی نقوش (") ڈاکٹر محمد علی اثر ۷۵/-
اردو زبان کا آغاز (") ڈاکٹر خورشید صدیقی ۲۲۵/-
یا عبد البہا، (شعری مجموعہ) صابر آفاقی ۱۰/-
شب چراغ (شعری مجموعہ) بختیار ضیاء ۵۰/-
بوئے گل نالۂ دل (") حسرت سہروردی ۴۰/-
حضرت قادر غوث اعظم (حیات و کرامات) علامہ سید اخلاق حسین دہلوی ۱۴/-
علم و ادب (ششماہی رسالہ) مدیر طارق متین۔ فی شمارہ ۶/-
زرِ سالانہ ۱۰/-

مہمان مدیر
انیس الرحمٰن
شعبۂ انگریزی، جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی ۲۵

اشاریہ

جمودِ خرامِ نما

(ہندستان میں اردو ادب کی صورتِ حال اور تراجم کی ضرورت)

آج کا اردو ادب، خصوصاً ہندستان میں، انجماد کے دور سے گزر رہا ہے۔ یہ کوئی ایسا بیان نہیں ہے جس کا مقصد آپ کو چونکانا ہو۔ یہ دراصل ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ اپنی قدیم و جدید روایات کے حوالے سے ادبی صورت حال کے احتساب کا وقت ہے۔ ہر دور اپنی فکری شناخت قائم کرتا ہے، اپنے مخصوص متعصہ وضع کرتا ہے اور اظہار کے نئے اسالیب دریافت کرتا ہے۔ یہ تمام باتیں دوسرے دور میں زیر و زبر ہوتی ہیں اور اسی طرح ادبی تاریخ کے گوناگوں منظر نامے مرتب ہوتے ہیں اور روایات خلق ہوتی ہیں۔ ہر دور اپنی بوطیقا پر اصرار کرتا ہے لیکن جب نئے اشاریے مرتب ہونے لگتے ہیں تو پرانے نقوش خود بخود ماند پڑتے جاتے ہیں۔ یہاں ہمیں قدیم و جدید، کلاسیکی اور رومانی یا روایتی اور غیر روایتی فکر و اظہار کے اوصاف و نقائص پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ یہ کہنا ہے کہ گذشتہ تمام تر بوقلمونی کے باوجود ہمارا ادبی منظر نامہ آج کچھ زیادہ جاندار نہیں ہے۔ تجربات جیسے کھو کھلے ہیں، زبان و بیان سے تخلیقی نیرنگی جیسے غائب ہے، فضا جیسے بوجھل بوجھل سی ہے۔ ادب لکھا جا رہا ہے اور شائع بھی ہو رہا ہے لیکن یوں کہ اس کی تخلیق ہر زمانے میں ادیبوں پر جیسے فرض ہو۔ اس منظرِ بے آب و گیاہ میں ایسا کوئی فن پارہ اب خال خال ہی نظر آتا ہے کہ رک جائیں، خیال و اسلوب کی نیرنگی پر نگاہ کریں۔ کچھ دیر کسی تازہ ہوا سے اپنا سرد مشام معطر کریں کہ ہمیں مسرت اور بالیدگی کے تجربات سے ہم کنار کرنا ادب کا منصب ہے۔ اس تجربہ سے گزرتے ہوئے یک رنگی یا بے رنگی، کم مائیگی و بے بضاعتی کا احساس تو ہوتا ہے لیکن مایوسی کا نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ منظر نامہ ایک نوع کے انجماد کا ہے، انحطاط کا نہیں، یعنی یہ کہ برف پگھلے گی، نئی روش نظر آئے گی، نئے مسافر نمودار ہوں گے۔ یہ دور ہے تخلیق خلا کا، اور ادبی تاریخ میں ایسے بھی ادوار آتے ہیں جب انتظار ہوتا ہے نئی سمتوں کی دریافت کا اور نئی بوطیقا کی داغ بیل کا۔ آج شاید ہم ایسے ہی دور

سے گزر رہے ہیں کہ ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں کا ذکر کریں تو ایک انگلی کے چار پوروں تک آتے آتے بات رُکنے لگتی ہے اور شاعروں کا نام لیں تو دو انگلیوں کے پوروں تک پہنچتے پہنچتے ہم ہکلانے لگتے ہیں۔ مٹھی بھر ہمارے یہی ادیب و شاعر آج کے اردو ادب کے خاکے میں کچھ رنگ بھر رہے ہیں۔ کہیں مدھم، کہیں تیز، کہیں خاکے بے ربط، بے سطر سے ہیں۔ کہیں ان میں حرکت نظر آتی ہے جو زندگی کا اعلان کرتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر زمانے اور ہر صنف ادب میں فن کاروں کی ایک بڑی تعداد موجود ہو لیکن یہ فکرمندی کا باعث ضرور ہے کہ یہ تعداد اتنی قلیل ہو جائے کہ مزید انجماد کا اندیشہ ہو۔ آپ خود دل ہی دل میں یہ حساب لگائیے کہ ہمارے کتنے ادیب ایسے ہیں جنھیں سنجیدہ قاریوں کا اعتبار حاصل ہے یا اگر سنجیدہ قاری کے وجود پر آپ کو شبہہ ہے تو دوسرے لفظوں میں جو سنجیدہ ادبی اقدار پر پورے اترتے ہیں، جو زبان کا شعور رکھتے ہیں اور بیان پر گرفت۔ کتنے کم ہیں ہمارے ناول نگار اور افسانہ نگار۔ اک گردشِ رنگِ چمن ہے اور چند دوسرے قابل قدر مناظر جنھیں ہر پہلو سے نہارتے ہیں اور گن گاتے ہیں۔ باقیات میں تو کئی ایسے ہیں جو ابھی یہ طے ہی نہیں کر پائے کہ کہانی جو کہیں تو زبان کیسی ہو اور بیان کیسا۔ شاعروں میں بھی کتنے ہی ایسے شاعر ہیں کہ ابھی تک ان پر زمانۂ گذشتہ حال ہے اور حال کے جملہ احوال شعری سے بے خبری ایسی ہے کہ شعر کوئی کیفیت پیدا ہی نہیں کرتا۔ تجربہ انگیز کرنے کی صلاحیت کم کم، استعارہ بے دم۔ دیارِ شرق کی آبادیوں کا وہ لڑکا اپنا عہدِ وفا کب کا پورا بھی کر چکا۔ چند دوسروں نے بھی اپنے نام و نشان چھوڑے ہیں۔ بقیہ سب ایک ہی راگ میں گاتے ہیں، ایک ہی دُھن بجاتے ہیں۔

اس صورتِ حال سے کئی باتیں نکلتی ہیں اور کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ چند کی طرف اشارہ کرتے چلیے:

کیا آج کا اردو ادیب اپنی ادبی روایت سے بے خبر ہے؟

کیا اسے ہندستان کی دوسری زبانوں کی ادبی رفتار کا کوئی اندازہ نہیں؟

کیا اس نے غیر ملکی ادب سے اپنا منہہ موڑ لیا ہے؟

کیا اس کی زبان میں ایسے رسائل شائع نہیں ہوتے جو نئی سمتوں کی خبریں لاتے ہوں؟

کیا اس کی زبان کا حال افسوس ناک اور مستقبل غیر یقینی ہے؟

اب یہ بات بلا تکلف کہہ دینی چاہیے یہ تمام باتیں کم و بیش صحیح ہیں۔ نئی پود کا اردو ادیب اگر اپنی ادبی روایت سے یکسر بے خبر نہیں ہے

تو پوری طرح اس سے باخبر بھی نہیں اور اس سے فیض اٹھاتا اس نے نہیں سیکھا ہے۔ اسے اپنی زبان کے علاوہ کسی اور زبان کی ادبی رفتار کا اندازہ کم سے کم ہے۔ اس نے تو صرف اپنی زبان پڑھی ہے، اردو۔ فارسی کو فرانسیسی اور لاطینی کے زمرے میں رکھتا ہے اور انگریزی سے دور رہتا ہے۔ ان میں سے بیشتر نے اردو میں یونیورسٹی کی ڈگریاں یوں حاصل کی ہیں کہ کسی اور مضمون کی جانب ان کی رومان پرست اور سہل پسند طبیعت مائل ہی نہیں ہوئی۔ شعر و افسانے کی طرف یوں رجوع کیا کہ نصاب میں ان سے سابقہ رہا اور طبیعت رفتہ رفتہ موزوں ہوتی گئی۔ چنانچہ کتنے ہی طلبہ اور اساتذہ ادیب بن کر ابھرے۔ یہ بھی سچ ہے کہ آج ہمارے یہاں ایسے رسالے بھی نہیں ہیں جو جاندار فن پاروں اور مباحثوں سے ادبی سفر کی نئی راہیں کھولتے ہوں۔ اس سمت میں شب خون نے بڑا کام کیا لیکن اب اس کی معنویت وہ نہیں رہی جو پہلے کبھی تھی۔ کتابی شکل میں منظر عام پر آنے والی چند غیر پابند اشاعتیں شعور، شعر و حکمت، سوغات، عصری آگہی، عصری ادب، ذہن جدید ریگ زار میں سبزہ کی مانند ہیں۔ لیکن ریگ زار بہر حال ریگ زار ہے اور سبزہ، سبزہ جو بہر صورت ریگ زار کے دامن میں وقتی طور پر آباد ہے۔ سرکاری رسالہ آج کل اپنی متعین ادبی رفتار کا پابند ہے کتاب نما پابندی سے نکلنے والا واحد رسالہ ہے جس نے مباحث کو فروغ دینے کی مثبت کوشش کی ہے اور جس کے قارئین کا حلقہ قابل قدر ہے۔ اور اس امر میں بھی کوئی کلام نہیں کہ اردو زبان کا حال افسوس ناک اور مستقبل غیر یقینی ہے۔ اس میں زمانے کی رفتار کو دخل ہے جس نے زبان و ادب کے مطالعات کو پچھلی نشستوں پر جگہ دی ہے اور سرکاری پالیسیوں کا بھی ہاتھ ہے جس نے اس زبان سے اس درجہ بے توجہی روا رکھی کہ اتر پردیش جو کبھی گہوارۂ زبان و ادب تھا، اب وہاں کے لوگ اپنی زبان سے بے تعلق ہیں۔ اس پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس صورت حال میں ادب کا کیا حشر ہوگا، ادیب کہاں سے آئیں گے، ان کے قاری کدھر سے نمودار ہوں گے۔ سچ یہ ہے کہ اردو زبان کا دائرہ سمٹ گیا ہے اور اس کا ادب ایک مخصوص حلقہ ہنرمنداں تک زندہ ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود حالات مایوس کن نہیں ہیں کہ یہ کیفیت وقتی انجمادِ خرام نماکی ہے۔ ہم اس صورت حال سے نکل سکتے ہیں اور نئے افق دریافت کر سکتے ہیں۔ یہ امید عبث ہے کہ فنونِ لطیفہ اور ادب، خصوصاً جدید ادب، عوام میں

اس درجہ مقبول ہوں کہ ہر خاص و عام کی دل چسپی کا سامان فراہم ہو سکے۔ یہ فنون کلچر کے چھوٹے چھوٹے جزیروں میں زندہ رہتے ہیں۔ قارئین کا ایک مخصوص حلقہ ہوتا ہے جو ان سے فیض یاب ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اردو زبان کا دائرہ اب ہمارے یہاں بہت سمٹ چکا ہے اور سنجیدہ ادیب و قارئین کا حلقہ اب خاصا محدود ہو چلا ہے لیکن کلچر کے یہی چھوٹے چھوٹے جزیرے جو آج بے دم، بے جان ہیں، پھر سے توانا اور با اثر ہو سکتے ہیں۔ اس جزیرے میں چلنے والی ہوائیں اب ٹھہری سی ہیں یا چلتی بھی ہیں تو تازہ دم نہیں کرتیں۔ یہ جزیرہ منتظر ہے نئی خبروں کا، نئی خوشبوؤں کا، ہوا کے تیز جھونکوں کا اور یہ جھونکے اب نئی سمتوں سے ہی آسکتے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ ان شرابوں میں نئی شرابیں ملیں۔ اپنی آب و ہوا کی یک رنگی سے فرار کا راستہ نئے موسموں کی تلاش میں گم ہے۔ ہمارے ادب میں یہ تلاش اب سے پہلے بھی جاری تھی لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ سلسلہ ایک مضبوط روایت نہ بن سکا۔ ہمارے چند ادیبوں نے دوسرے ادب کے قابل قدر فن پاروں کو اردو میں منتقل کرنے کا جو کام کیا اس کی اہمیت کا شاید ہم پوری طرح اندازہ نہ کر سکے۔ دوسری زبانوں کے ادب سے تراجم کا سلسلہ ہمارے یہاں گو کہ آج بھی جاری ہے لیکن یہ سلسلہ بہت کمزور ہے اور ضروری ہے کہ یہ اب ایک موومنٹ کی شکل اختیار کر لے۔ دنیا کے بہترین ادب کا مطالعہ ہمیں یقیناً نئے افق سے روشناس کرے گا، ہمیں ایک معاون شخصیت عطا کرے گا، نئے امکانات کے در کھولے گا اور نئی آگہی بخشے گا۔ یہی آگہی ہمارے ادبی منظر نامہ میں تنوع کا باعث ہو گا جس کی ہمیں سخت ضرورت ہے، نئے رجحانات اور میلانات کو جنم دے گا، یہی ہماری نظر کو وسعت دے گا، اسی سے ہمارے نظریے بہتر طور پر تشکیل پائیں گے۔

یہ دور عبارت ہے تیز رفتاری سے اور ہر آن بدلتی قدروں سے۔ اس دور کا ادب مخصوص و محدود دائروں کا اسیر بن کر نہیں رہ سکتا۔ اس کے تجربات مختلف ہیں اپنے پیش روؤں کے تجربات سے اور اس کی دنیا لامحدود ہے۔ اس صورتِ حال میں اسے اپنے زبان و ادب کو بامعنی بنانے کے لیے خود کو نئے تقاضوں کا پابند کرنا ہو گا۔ اور اس سلسلے میں ہماری اہم ضرورت یہ ہے کہ دنیا کا بہترین ادب اردو میں منتقل کیا جائے لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا اس کی وکالت کرنا۔ ادبی ترجمہ بذاتِ خود ایک فن ہے جو عرق ریزی و جاں سوزی کا طالب ہے۔

ترجمہ سے متعلق مزید کچھ کہنے سے پہلے ایک بات رہی جاتی ہے

جس کا ذکر ضروری ہے۔ اردو زبان کے ادبی سرمایہ میں ہند و پاک کی خانہ بندی مناسب نہیں معلوم ہوتی لیکن اگر دونوں ملکوں کے ادب کا مطالعہ کریں تو چند باتیں بہت واضح طور پر ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ پاکستان میں شعری و افسانوی ادب کی صورت حال ہمارے یہاں کے مقابلے میں بہت بہتر ہے۔ آپ نئی شاعری کا کوئی انتخاب کریں یا نئے افسانے کا، اس میں زیادہ تر ادیب پاکستان کے ہوں گے۔ خواتین شعراء کی ہی مثال لے لیجیے ہمارے یہاں یہ خانہ خالی ہے اور وہاں کئی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی شاعری جدید امریکی خواتین شعراء کی یاد دلاتی ہے۔ یہاں ناموں کی فہرست مرتب کرنا مقصود نہیں ہے لیکن یہ کہنا ضرور ہے کہ وہ ادب ہمارے ادب سے زیادہ توانا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کے تجربات ولفظیات اور ان کے رنگ و آہنگ ایک جہانِ دیگر سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ہمیں پسند آتے ہیں بلکہ وہ تمام باتیں جو ہمارے ہاں جمود کا باعث ہیں وہاں نہیں پائی جاتیں۔ مثلاً ان کی زبان کا حال نہ افسوسناک ہے نہ مستقبل غیر یقینی۔ اپنی اور غیر ملکی ادبی روایات سے ایسی بے خبری بھی نہیں اور نہ رسائل کی دنیا میں ایسی زبوں حالی ہے جو اب ہمارا حصہ ہے۔ مثال کے طور پر کراچی سے شائع ہونے والے رسالے آج کے کسی شمارے کے مشمولات پر نگاہ ڈالیں تو دو دنیاؤں کا فرق واضح ہو جائے گا۔ آج نے چند برسوں میں نہ صرف پاکستان کا اچھا ادب شائع کیا ہے بلکہ انگلستان، امریکا، آئرلینڈ، مصر، عرب، اٹلی، جنوبی افریقہ، موزمبیق، زمبابوے، ہندستان وغیرہ کا بہترین ادب اردو میں منتقل کیا ہے۔ اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ اپنی بات پر مزید اصرار کی خاطر یہ بھی کہتے چلیں کہ اگر آج کے ایک حالیہ شمارہ کا مطالعہ کیا جائے جس میں عربی کی بہترین کہانیاں شائع ہوئی ہیں تو ہمیں اپنی کہانی کی کم مائیگی کا اندازہ ہو جائے گا۔ یہاں ایک اور مثال دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی۔ انگریزی زبان کی سات سو سالہ ادبی روایت اور اس کی عظمت کا اعتراف ہر زمانے میں کیا گیا ہے۔ انگریزی ادیبوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے ادب میں اپنے مخصوص قومی و معاشرتی مزاج سے ہم آہنگ مشاہدات و تجربات پیش کیے ہیں بلکہ تمام کلاسیکی زبانوں اور ان کے ادب سے کسب کیا ہے۔ چنانچہ آپ انگریزی کے کسی بھی قابل قدر شاعر کا نام لیں، اس نے کسی نہ کسی دوسری زبان کی شاعری سے فیض ضرور اٹھایا ہوگا اور اس لیے ان کے تراجم بھی کیے ہوں گے۔ ایسے شعراء کی ایک طویل

فہرست ہے اور اس فہرست میں ہر قابل قدر شاعر کا نام شامل ہے یہاں تک کہ کالرج کا بھی جو ترجمہ کو ناممکنات میں شمار کرتا تھا۔ اس نے بھی جرمن شاعر شلر اور چند نامعلوم شاعروں کے تراجم کیے اور جدید ادب کے معماروں میں پاؤنڈ کا ذکر اس ضمن میں بہت عام رہا ہے کہ اس نے اطالوی، چینی، لاطینی اور یونانی سے انگریزی میں تراجم کیے۔ یہی صورت حال کم و بیش ہر ترقی یافتہ ادب کا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے آج یا ایسے دوسرے رسالوں کی کاوشیں ہمارے ادب کے لیے نہایت بیش بہا ہیں۔ غیر اردو ادب کے تراجم کی اہمیت کا اندازہ اسی وقت بخوبی لگایا جا سکتا ہے جب اس عمل کو ہمارے یہاں قابل اعتنا سمجھا جائے اور تراجم کو قاری کا اعتبار حاصل ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس سمت میں مخلصانہ پیش رفت ہو۔

اب اہم سوال یہ ہے کہ تراجم کو قاری کا اعتبار کیسے حاصل ہو۔ اس ضمن میں بہت سی باتیں کہنے کی ہیں لیکن یہاں چند بنیادی باتوں کی طرف ہی اشارہ کرتے چلتے ہیں۔ ترجمہ لفظ بہ لفظ جملانے کا کام نہیں ہے اور یوں بھی اس عمل کے مخالفین دل چسپ الزامات تراشتے رہے ہیں کہ ترجمہ کرنا الٹی قالین بچھانے کے مترادف ہے اور یہ کہ ترجمہ اس محبوبہ کی طرح ہے جو اگر خوبصورت ہوئی تو بے وفا ہوگی اور اگر وفادار ہوئی تو خوبصورت نہیں ہوگی۔ یعنی یہ محال ہے کہ ترجمہ میں اصل فن پارے کے تجربے کی مکمل ادائیگی ہو اور وہ جمالیاتی مسرت کے تجربے سے ہم کنار بھی کرتا ہو۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے بے شمار الزامات اگر ایک طرف ہیں تو دوسری طرف ترجمہ کی موافقت میں تنقیدی آرا بھی ملتی ہیں۔ ان کے ذکر سے بہتر ہے کہ ترجمہ کی ناگزیر حیثیت پر چند باتیں کی جائیں۔ ترجمہ اب ایک فن کی صورت ہمارے یہاں مقام حاصل کر رہا ہے۔ اب یہ ایک مستقل مضمون ہے، نصاب میں شامل ہے اور اس سے متعلق تنقیدیں لکھی جا رہی ہیں۔ یونی ورسٹیوں، ادبی اداروں اور خود ساہتیہ اکادمی نے ترجمہ کے فن سے متعلق تبادلۂ خیالات کا جو سلسلہ قائم کیا ہے، وہ قابل قدر ہے۔ ہندستانی ادب میں تراجم کی اہمیت اب مسلّمہ طور پر تسلیم کر لی گئی ہے۔ چنانچہ اس مسئلے پر اگر غور کریں تو ہمارے سامنے تین بنیادی سوالات ابھرتے ہیں: ترجمہ کون کرے، کیسے کرے اور کس فن پارے کا کرے؟ یہ تینوں سوال بے حد اہم ہیں۔ اگر ان کے خاطر خواہ جواب ڈھونڈ لیے جائیں تو ہماری راہیں سہل ہو جائیں گی۔

پہلے دو سوال کہ ترجمہ کون کرے اور کیسے کرے ترجمہ کے اعتبار سے براہ راست جڑے ہوئے ہیں۔ یعنی مترجم اگر کوتاہیوں کا شکار ہوا تو اس کی کوشش نہ صرف یہ کہ بے سود ہوگی بلکہ قاری اس کے ترجمہ سے بے زار بھی ہوگا۔ مترجم کے لیے صرف یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ دو زبانوں میں مہارت رکھتا ہو بلکہ اسے دونوں زبانوں اور ان کے ادب کے مزاج، ان کی مخصوص تہذیب، ان کی منفرد مِتھ اور جمالیاتی فضا کا مکمل ادراک بھی ہونا چاہیے یعنی اگر مترجم لفظوں کے متبادلات ڈھونڈنے میں مہارت رکھتا ہو تو ضروری نہیں کہ اس کا ترجمہ کامیاب بھی ہو۔ اسے زبان میں مہارت کے علاوہ یہ بھی چاہیے کہ وہ اصل فن پارہ کو محسوس کر سکے۔ اس تجربے، اس ہیجان اور اس کرب میں شریک ہونے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس تجربے سے اس درجہ ہم آہنگ ہو اور اس کی جمالیاتی حس اصل فن کار کی جمالیاتی حس سے اس حد تک مماثل ہو کہ وہ فن پارہ کسی غیبی لمحے میں خود اس کی اپنی ہی تخلیق معلوم ہونے لگے۔ اسی لیے یہ اہم ہے کہ مترجم اس کا مکمل ادراک رکھتا ہو کہ اس کی ذات، اور اس ذات کے دھندلے سایے بھی اصل فن کار کے پیکر سے خلط ملط نہ ہوں۔ اس پر لازم ہے کہ وہ اپنی ذات سے کنارہ کش ہو جائے اور اصل فن کار کی ذات میں شامل ہو جائے اور اس کی دنیا میں شریک ہو جائے۔ ایلیٹ نے تو خود فن کار کے لیے اپنی ذات کو فنا کر دینا ضروری قرار دیا ہے۔ پھر مترجم کو یہ مجاز ہی نہیں ہے کہ وہ اپنی ذات کی آمیزش سے اپنے ترجمے میں نئے رنگ بھرے۔ اسے ترجمہ کے کئی طریقوں میں سے کچھ خاص طریقوں کو اختیار کرنا ہوگا۔ ترجمہ اگر کسی ایسے فن پارے کا ہے جس میں الفاظ اپنے متعینہ معنی سے الگ نئے افق دریافت نہیں کرتے تو شاید لفظ برائے لفظ کا طریقۂ کار ایک بڑی حد تک کام آجائے لیکن ادب پاروں میں معنی کی سطحیں یوں بھی پیچیدہ ہوتی ہیں اس لیے یہ طریقہ بہت محدود طور پر ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ دوسری صورت وہ ہے جس میں اس معنی کی دریافت کرتے ہیں جو الفاظ اپنے جلو میں پوشیدہ دعیاں رکھتے ہیں۔ تخلیقی اظہار کی یہ وہ صورت ہے جو سنجیدہ فن پاروں کا خاصا ہے اور قاری کے لیے ترسیل کے دل چسپ مسائل پیدا کرتا ہے۔ یہاں مترجم کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اس معنی تک رسائی حاصل کرے جو پس لفظ ہے۔ تیسری صورت وہ ہے جس میں مترجم آزادانہ ترجمہ کرتا ہے۔ یہ ایک کائی دار زمین ہے جہاں پھسل جانے کا خطرہ ہر آن بنا رہتا ہے اور اس زمین سے گزر جانا دشوار

گزار مرحلہ ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آزاد ترجمہ دراصل ترجمہ کے دائرے میں شامل ہی نہیں ہے۔ یہاں کبھی کبھی ایک بالکل نئی تخلیق سامنے آجاتی ہے جس کا رشتہ اصل سے ہوتا تو ہے لیکن وہ اصل کا یکسر پابند بھی نہیں ہوتا۔ فراق کے یہاں اس کی چند مثالیں ملتی ہیں۔ مترجم جو طریقہ بھی اختیار کرے لیکن اسے چند بنیادی مسائل کا سامنا کرنا ہی ہوتا ہے۔ یعنی ترجمہ صرف حرف معنی کا نہیں ہوتا بلکہ اس امیج کا ہوتا ہے جو کسی فن پارے کے مطالعے اور اس سے ہم آہنگ ہونے کے بعد مترجم کے ذہن میں ابھرتا ہے۔ اس ضمن میں فن پارے کے بنیادی آہنگ کا ترجمہ سب سے مشکل کام ہے اور اگر آہنگ کا ترجمہ کسی مترجم نے کر لیا ہے تو کہنا چاہیے کہ اس نے بڑی حد تک کامیابی حاصل کر لی ہے۔ اصل فن پارے کے صوتی و بصری تاثر اس کے استعارے، اس کی ڈرامائیت، اس کی فضا کو جذب کرنا مترجم کے لیے ضروری ہے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ترجمہ اپنے زمانے کی زبان میں کرے، نہ یہ کہ زبان و بیان کا وہ اسلوب اختیار کرے جس میں زمانوں کے فاصلے حائل ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پرانی تخلیقات کے لیے پرانی وضع اختیار کرنا لازمی ہے لیکن ایسا نہیں ہے کیونکہ جو تاثر بھی آپ قائم کرنا چاہیں اپنے زمانے کی زبان میں بخوبی کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ ایک ہی فن پارے کے مختلف زمانوں میں کیے گیے تراجم لے لیں تو ہر کامیاب ترجمہ اپنے ہی زمانے کی زبان میں ہوگا۔ زبان و بیان کے اسی اسلوب سے اس زمانے کا قاری متعارف بھی ہوگا اور یہی اس ترجمے کی قبولیت کا ایک سبب بھی ہوگا۔ ان باتوں کے علاوہ ترجمہ بذات خود ایک مکمل اکائی ہے اور اس اکائی کی کامیابی کا انحصار مندرجہ بالا باتوں پر ایک بڑی حد تک ہے۔ اس کامیابی کا ایک آسان امتحان یہ ہے کہ مطالعہ کے وقت ترجمہ پن کا احساس نہ ہو لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قاری میں یہ احساس بھی پیدا ہو کہ اگرچہ زبان و بیان کے اسالیب کم و بیش وہی ہیں لیکن یہاں کی آب و ہوا کچھ مختلف فرد رہے ہے۔ دراصل اسی احساس میں ترجمہ کی معنویت مضمر ہے۔ احساس، تجربے اور اسلوب کی یہی مختلف شکلیں کسی بھی ادب میں تنوع پیدا کرتی ہیں۔

پہلے دو سوالوں سے منسلک ہے تیسرا سوال کہ ترجمہ کس فن پارے کا کریں۔ یہ سوال بھی کسی کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا فیصلہ ہے جس پر ترجمہ کی کامیابی اور مقبولیت دونوں کا انحصار ہے۔ یہاں صرف دو باتیں کہنا ہیں۔ ایک یہ کہ ترجمہ اس فن پارہ کا ہو جس میں عصری معنویت

ہو۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ صرف آج کا ادب عصری معنویت کا حامل ہے بلکہ اس سے مراد وہ ادب ہے جو خواہ کسی زمانے میں لکھا گیا ہو لیکن اس میں ہمارے خواب و خیال، ہماری خوشیوں اور دکھوں کے عکس نظر آئیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ترجمے کے لیے اسی فن پارہ کو منتخب کرنا مناسب ہوگا جس کا ترجمہ ممکن ہو، کوئی تخلیق خواہ وہ کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو، اگر مترجم کی دسترس سے باہر ہے تو اس پر طبع آزمائی کرنا بے سود ہے۔ یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی فن پارے کا انتخاب ہم صرف اس لیے کریں کہ وہ بہت اہم ہے اس لیے اسے ہماری زبان میں منتقل ہونا چاہیے بلکہ ضروری یہ ہے کہ جس فن پارے کا بھی انتخاب کریں اس کا ترجمہ کم از کم کامیابی کے حدود تک تو پہنچتا ہو۔ اسی ضمن میں یہ بات بھی آتی ہے کہ فن پارے بہ آسانی کسی دوسری زبان کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مترجم کی نگاہ ایسے فن پاروں کو ضرور تلاش کرے بشرطیکہ وہ خود بھی اس سے ہم آہنگ ہو۔ مثال کے طور پر ہمارے کئی شاعر و ادیب انگریزی یا دوسری غیر ملکی زبانوں میں اور ان زبانوں کے کئی شاعر و ادیب ہماری زبانوں میں تراجم کے وسیلے سے مقبول ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید اردو شعری روایت کو جب انگریزی قاری تک پہنچانے کا فیصلہ کرنا ہوا تو کئی دوسرے شعراء کے علاوہ ن۔م۔ راشد فیض احمد فیض اور ساقی فاروقی کی شاعری کے انتخابات انگریزی میں شائع ہوئے۔ یہ سلسلہ جاری ہے اور یہ امید کی جاتی ہے کہ آنے والوں برسوں میں ہمارا ادب کم از کم انگریزی قاری تک کامیابی کے ساتھ پہنچے گا۔ یہ کاوشیں قابلِ قدر ہیں لیکن ہماری اصل ضرورت تو یہ ہے کہ غیر ملکی ادب ہماری زبان میں منتقل ہو اور نہ صرف یہ کہ غیر ملکی ادب منتقل ہو بلکہ خود ہماری مختلف زبانوں کا ادب بھی اردو قاری تک پہنچے۔ باہمی افہام و تفہیم کے اسی عمل میں ہمارے ادب کا بہتر مستقبل پنہاں ہے۔

تراجم کو فروغ دینے کی خاطر انفرادی کوششوں کی اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن اس ضمن میں اردو اکادمیوں، ادبی انجمنوں اور اردو پبلشرز کا رول بہت اہم ہو سکتا ہے۔ یہ سب بڑے پیمانے پر تراجم کرانے اور انھیں شائع کرنے کا کام کر سکتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس کام کو پراجکٹ کے طور پر شروع کیا جائے۔ اس کے لیے ضرورت ہوگی فن پاروں اور مترجمین کی نشاندہی کرنے کی۔ مختلف غیر ملکی زبانوں اور ہندستان کی غیر اردو زبانوں میں ممکن ہے کہ ہمیں بہت مترجمین نہیں ملیں لیکن انگریزی

سے اردو میں ترجمہ کے لیے وسائل کی کمی نہیں ہوگی۔ انگریزی زبان میں
دنیا بھر کا ادب موجود ہے جس پر ہمیں نگاہ ڈالنی چاہیے اور نظم و نثر
فروری انتخابات کرنے چاہئیں۔

ہمارے ہاں کے بیشتر ادب نوازوں میں یہ ایک خیال عام ر
ہے کہ اردو ادب تو بس ہجر و وصال اور عشق و عاشق کا اسیر ہے۔ غی
ملکوں میں بھی یہ زبان کم ہی جانی اور پہچانی جاتی ہے۔ لیکن اب فضا بدل
رہی ہے اور ملک اور بیرون ملک لوگ اس زبان و ادب سے آشنا
ہونے لگے ہیں۔ یہ وقت ہے کہ ہم اپنے جدید ادبی سرمایے پر ناقدانہ نگا
ڈالیں اور یہ دیکھیں کہ ہمارا ادب دنیا کے دوسرے ادبیات کے سامنے
کس درجہ بہتر یا کم تر ہے۔ ظاہر ہے کہ ہماری صورت حال ہم سے نئے
تقاضے کر رہی ہے۔ انھیں تقاضوں میں یہ تقاضا بھی شامل ہے کہ اردو میں
تراجم کا ایک نیا دور شروع ہو کہ اس جمود خرام نما سے رہائی کی یہ بھی ایک
معتبر صورت ہے۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر
۲۹ مالویہ نگر
بھوپال ۳

غزل

کالی غزل سنو نہ شہابی غزل سنو
موسم یہ کہہ رہا ہے کہ دھانی غزل سنو

جاگا وہ درد، دل میں کہ آنسو نکل پڑے
برسا ہے آج ٹوٹ کے پانی غزل سنو

افسانۂ جنوں نہیں پابندِ ماہ و سال
یاد آ رہا ہے دورِ جوانی غزل سنو

اپنی تمام عقل پرستی کے باوجود
یہ زندگی ہے اب بھی دِوانی غزل سنو

یوں تو سخن کے اور بھی پیرائے ہیں مگر
کہنی ہے ہم کو دل کی کہانی غزل سنو

ہوں زخمِ عشق یا کہ زمانے کے درد و داغ
ہر غم یہاں ہے دشمنِ جانی غزل سنو

خونِ جگر میں فکر کی گہرائیاں بھی ہیں
گر ہے مزاجِ فلسفہ دانی غزل سنو

سر پر ہوائے سنگِ ملامت چلی بہت
لیکن غزل نے ہار نہ مانی غزل سنو

زیبِ شفق ہے نوعِ بشر کا لہو سحر
ہر شے ہے اس جہان کی فانی غزل سنو

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی اہم کتابیں

اندازِ گفتگو کیا ہے

شمس الرحمٰن فاروقی

اس کتاب میں شامل اکثر مضامین گفتگو کا موضوع رہے ہیں اور اسی بنا پر ان کے ذریعے کچھ پرانے مسائل پر نئی گفتگو کا آغاز ہوا۔ اس کے تمام مضامین میں شاعروں اور شاعری کو ہی معرضِ بحث میں لایا گیا ہے۔

ایک نہایت اہم مضامین کا مجموعہ

قیمت -/۷۵ روپے

دستک اس دروازے پر

وزیر آغا

اس کتاب میں موجودیت کا فلسفہ ہے اور اس سلسلے میں مغرب کے فلسفے، تصوف، اردو ادب کی مختلف تحریکوں کا بیان ہے۔ عارفانہ تجربے اور تخلیقی تجربے کا یہ فرق ہی اس کتاب کا موضوع ہے۔

قیمت -/۵۱ روپے

آزمایش کی گھڑی

سید حامد

بابری مسجد کیا ٹوٹی، مسلمانوں کے دل ٹوٹ گئے۔ مسجد تو اب جڑ نہیں سکتی کہ ظالموں نے اُسے زمین بوس کر دیا لیکن دل تو جوڑے جا سکتے ہیں، حوصلے کو تو بحال کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت یہی کام کرنے کا ہے۔ حوصلہ پست ہو گیا تو بچا کیا۔ آج کے حالات پر ممتاز دانشور سید حامد کے عالمانہ مضامین کا مجموعہ۔

قیمت -/۴۵ روپے

جھینی جھینی بینی چدریا

عبدالبسم اللہ

مترجم - ویسم حیدر ہاشمی

سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ اور کیڈیا ایوارڈ یافتہ یہ ناول بنارس کے انصار بھائیوں کی تہذیب و تمدن کی ایک روشن تصویر ہے۔ جس کو ناول نگار نے دس سال بنکروں کے بیچ رہ کر انھی کی زبان اور کلچر پر قلم بند کیا ہے۔

قیمت -/۷۵ روپے

صحرانورد کے خطوط

مرزا ادیب

صحرانورد کے خطوط، آج سے کم و بیش تیس برس پہلے شائع ہوئی تھی۔ اب تک اس کے بارہ اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو کے کسی افسانوی مجموعے کو اس قدر مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جتنی صحرانورد کے خطوط کو۔

قیمت -/۷۵ روپے

میں سمندر ہوں

فرحان سالم

شعری مجموعوں کی بھیڑ میں، سب سے الگ، منفرد اور اردو کے تاروں کو چھیڑنے والا شعری مجموعہ

قیمت -/۳۰ روپے

کمال احمد صدیقی
۵۵-اے - لاجپت نگر
صاحب آباد (غازی آباد)
یو - پی

ہجو در مذمتِ نظامِ حاضر

تہذیب ہوئی ہے نایاب — موقوف ہوئے ہیں آداب
دیکھا انھیں جو محفل میں — یاد آئے ہمیں بھولے خواب
دل ساز ہے، نغمے پھوٹے — ہر موج ہوا ہے مضراب
محنت کے غبن سے بازار — اسراف کا گویا سیلاب
ہر چیز یہاں بکتی ہے — ہو چاہے وہ بنتِ مہتاب
انسان کا خوں ہے سستا — بکتا ہے بھارت کا خواب
بازار ہے رشوت کا گرم — لے ڈوبے گا یہ گرداب
سرکار ہے گندی مچھلی — گندہ ہے پورا تالاب
قرضے کا سمندر گہرا — سرکار بتائے پایاب
قرضہ تو ہے چوہے دان — ہم ہیں چوہے کے اعصاب
ہاں، ڈوب چکا ہے بھارت — ہے سود کا ایسا گرداب
حاکم ہیں ہمارے کیا کیا — گنجے سر والے سرخاب
کرتے ہیں یہ سچ کی تلقین — خود سب سے بڑے ہیں کذاب
کالے جتنے دل کے ہیں — اتنے ہی سنہرے القاب
سب چور ہیں اور رشوت خور — دو جوتے آگے اصحاب
کیا عشق کی باتیں کیجیے — جب جنسِ وفا ہو کمیاب
کیا حسن کی باتیں کیجیے — جب حسن کو ڈنکیں قصاب
مینار، منارے، گنبد — کیسے یہ کلس، یہ محراب
کب جانیں مکدالس برسیں — تہذیب کو دے دیں جلاب
نظروں میں ہے ہر اک گردن — وقت آئے تو ہم لیں گے داب
آواز اٹھاؤ — کھولو — انسانی قدروں کا باب
اٹھو — کرنا ہے ہم کو — ہر دل کا گلستاں شاداب
پورا کرنا ہے ہم کو — انسان کی وحدت کا خواب
ہم ختم کریں استحصال — پیدا ہوں گے خود اسباب

بدلے جو نظامِ فسق
چہروں پر آ جائے آب

(نوٹ: یہ آہنگ اردو میں شاید پہلی بار استعمال ہو رہا ہے۔ اس بارے میں قارئین کتاب نما کے تاثرات شائع کر کے ہمیں خوشی ہوگی۔
(ادارہ)

بچوں کے لیے مذہبی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
حضرت آدم علیہ السلام۔	منورہ نوری خلیق	۔/۴
رسالہ دینیات اول	محمد نعیم الدین زبیری	۲/
رسالہ دینیات دوم	"	۴/
رسالہ دینیات سوم	"	۵/
رسالہ دینیات چہارم	"	۵/
رسالہ دینیات پنجم	"	۶/
بزرگانِ دین	محمود علی خاں جامعی	۴/
امت کی مائیں	حسین حسنی	۴/۵۰
اچھی باتیں	سعد الدین انصاری	۴/۵۰
خوب سیرت اول	حکیم محمد سعید	۶/
خوب سیرت دوم	"	۴/۵۰
سلطان جیؒ	اسلم فرخی	۴/
رسول اللہؐ کی صاحبزادیاں	فضل قدیر ندوی	۴/۵۰
رحمان کا مہمان	رفیع الزماں زبیری	۶/
کمسن صحابی	"	۵/
اسلام کے جاں نثار	"	۴/
سیرت پاک مختصر مختصر	احمد خاں خلیل	۳/
نور کے پھول	حکیم محمد سعید	۹/
سب سے بڑے انسان۔ رسول اللہؐ	"	۴/۵۰
حضرت حمزہؓ	احتشام علی رحیم آبادی	۲/
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ	"	۲/
حضرت ابوہریرہؓ	"	۴/
حضرت محبوب الٰہیؒ	مشیر الحق	۳/
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ	"	۲/
حضرت فرید الدین گنج شکرؒ	"	۳/
حضرت معین الدین چشتیؒ	"	۳/
حضرت ابوبکر صدیقؓ	"	۶/
حضرت طلحہؓ	"	۳/
حضرت سلمان فارسیؓ	"	۲/۵۰
حضرت ابوذر غفاریؓ	"	۲/
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	"	۲/
حضرت عبداللہ بن عباسؓ	مشیر الحق	۳/
نیک بیٹیاں	"	۲/۵۰
اسلام کیسے پھیلا؟ حصہ اوّل	عبدالواحد سندھی	۷/۵۰
" حصہ دوم	"	۶/
قرآن پاک کیا ہے؟	"	۴/
اسلام کیسے شروع ہوا؟	"	۷/۵۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار، اوّل، دوم	"	فی حصہ ۶/=
اسلام کے مشہور امیر البحر	"	۹/
رسول پاکؐ	"	۶/
دس جنتی	الیاس احمد مجیبی	۵/۵۰
سرکار کا دربار	"	۶/۵۰
چار یار	"	۷/۵۰
آں حضرتؐ (اردو)	"	۳/۵۰
حضرت محمدؐ (ہندی)	"	۰/۴۰
اللہ کا گھر	خلیل احمد جامعی	۱/۵۰
اللہ کے خلیل	"	۳/۵۰
رسول پاک کے اخلاق	"	۴/
اللہ کے صفی	"	۲/۵۰
ہمارا دین حصہ اوّل	سید شہاب الدین دسنوی	۸/۵۰
" دوم	"	۷/۵۰
" سوم	"	۸/۵۰
منہاج القرآن	خلیفہ سیدنا طاہر سیف الدین	۱/۵۰
ارکان اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۲/۵۰
عقائد اسلام	"	۲/۵۰
خلفائے اربعہ	خواجہ عبدالحئی فاروقی	۹/
نبیوں کے قصے	"	۶/۵۰
ہمارے رسولؐ	"	۶/
پیارے رسولؐ	سلطانہ آصف فیضی	۱/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاء	ادارہ	۲/
مسلمان بیبیاں	اعجاز الحق قدوسی	۷/
ہمارے نبیؐ	سید نواب علی رضوی	۲/۵۰
سرکار دو عالم	محمد حسین حسان	۹/
قاعدہ یسرنا القرآن	(خورد و کلاں)	۱/۵۰

باقر مہدی
ای/۱ - رومی درشن
کارٹر روڈ - باندرہ (ویسٹ)
بمبئی ۵۰

فانی کی یاد میں

خواب ٹوٹے تھے مگر پھرتے رہے ہم رات دن
لمحہ لمحہ زندگی کا یہ سفر دیکھا کیے

چاندنی پھیلی ہوئی تھی ریت پر جیسے کفن
ہم ہی پاگل تھے کہ اٹھ اٹھ کر قمر دیکھا کیے

جل رہے تھے چار سو لکڑی کے گھر، لوگوں کے دل
ہم اندھیرے میں کھڑے کالی سحر دیکھا کیے

چل نہ سکتے تھے قدم رکتے تھے ہر اک موڑ پر
دور اُفق میں ڈوبتی اک رہگزر دیکھا کیے

کوئی منزل ہی نہ تھی سب تھے تھکے ہارے ہوئے
کارواں بکھرا کیا ہم راہبر دیکھا کیے

"سرفروشی کی تمنا" نے بچایا بارہا
ہم وہ سرکش تھے کہ مر کر بھی مگر دیکھا کیے

جب سے کھوئی ہے بصارت ایک سایا ساتھ ہے
کوئی باقرؔ کل گرا، ہم بے خبر دیکھا کیے

پروفیسر گوپی چند نارنگ
شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی۔

آخری قسط

مشرقی شعریات اور ساختیاتی فکر

اس تناظر میں حالی کے اس بیان کو دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ حالی قدما کی خوشہ چینی یا ان سے مستعار لینے یا کلام کو دُہرانے کا جو ذکر کرتے ہیں اور اگلوں کے چھوڑے ہوئے سرمایے اور بعد والوں کے اگلوں کی ادھوری باتوں کو مکمل کرنے، ان دو باتوں میں جو سلسلہ ملاتے ہیں (اور جو سلسلہ جاری ہے کیوں کہ زندہ ادبی روایت برابر تغیر پذیر رہتی ہے) وہ اس رشتے سے زیادہ مختلف نہیں جس کی بحث ساختیاتی مفکرین کے اقوال کی وضاحت میں اوپر آئی ہے۔ فرق یہ ہے کہ مشرقی روایت نے بشمول مغربی روایت کے مصنف کے سرپر تقدس کا جو تاج رکھا تھا کہ متن تمام و کمال لفظاً اور معناً مصنف اور فقط مصنف کی تخلیق ہے اور اس میں کہیں کوئی دوسرا عنصر شریک نہیں اور فقط وہی اس کا خالق ہے، ساختیاتی اور بالخصوص پس ساختیاتی فکر نے جامع ادبی اور شعریاتی نظام پر زور دے کر جو مصنف سے پہلے وجود رکھتا ہے، مصنف کے تقدس کے طلسم کو توڑ کر رکھ دیا اور جس درجہ مصنف کا تقدس کم ہوا ہے، اخذِ معنی یا سخن فہمی کے عمل میں اسی قدر قرأت یا قاری کے کردار کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ بہر حال سرِ دست بحث ادبی روایت (اگلوں کے سرمایے) اور انفرادی شعری عمل (بعد والوں کی تازہ کاری) سے ہے۔ حالی کا یہ بیان اس بارے میں خاص اہمیت رکھتا ہے:

"کعب ابنِ زہیر جو ایک مخضرمی شاعر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مداح ہے وہ کہتا ہے:

مَا اَرَانَا نَقُوْلُ اِلَّا مُعَاراً
اَوْ مُعَاداً مِنْ قَوْلِنَا مَکْرُوْرَا

(یعنی جو کچھ ہم کہتے ہیں یا تو اوروں سے کر کلام [illegible] کہتے [illegible]

ہی کلام کو بار بار دُہراتے ہیں) پس جب کہ آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے شعرا کا ایسا خیال تھا تو ہم کیوں کر کہہ سکتے ہیں کہ قدما کی خوش چینی سے ہم کو استغنا حاصل ہے یا ہم کو یہ قدرت ہے کہ کوئی مضمون ایک دفعہ باندھ کر پھر اس کا اعادہ نہ کریں۔

عربی میں دو متناقض مثلیں مشہور ہیں ایک یہ ہے کہ" یعنی اگلے بہت کچھ پچھلوں کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔" اور دوسری مثل یہ ہے کہ" لَمْ یَتْرُکْ الْاَوَّلُ لِلْآخِرْ۔" یعنی"اگلوں نے پچھلوں کے لیے کچھ نہیں چھوڑا۔" ان دونوں مثلوں میں تطبیق یوں ہوسکتی ہے کہ اگلے بہت سی ادھوری باتیں چھوڑ گئے ہیں تاکہ پچھلے اس کو پورا کریں۔ لیکن انھوں نے پچھلوں کے لیے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جس کا نمونہ موجود نہ ہو۔

اس بات پر تمام قوم کا اتفاق ہے کہ پچھلا شاعر جو کسی پہلے شاعر کے کلام سے کوئی مضمون اخذ کرے اس میں کوئی ایسا لطیف اضافہ یا تبدیلی کردے جس سے اس کی خوبی یا متانت یا وضاحت زیادہ ہو جائے وہ درحقیقت اس مضمون کو پہلے شاعر سے چھین لیتا ہے۔ مثلاً سعدی شیرازی کہتے ہیں ؎

از ورطۂ ما خبر ندارد   آسودہ کہ بر کنارِ دریاست

اسی مضمون کو خواجہ حافظ نے اس طرح ادا کیا ہے ؎

شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں ہائل
کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا

ظاہر ہے کہ حافظ نے اس مضمون میں گویا اس کمی کو پورا کردیا ہے جو شیخ کے بیان میں رہ گئی تھی۔ پس کہا جاسکتا ہے کہ حافظ نے شیخ سے یہ مضمون چھین لیا

اسی مطلب کو نظیری نے یوں تعبیر کیا ہے ؎

بہ زیرِ شاخِ گُل افعی گزیدہ بُلبُل را
نوا گرانِ نخوردہ گزند را چہ خبر

اگرچہ نظیری نے اصل مضمون پر کوئی ایسا اضافہ نہیں کیا جس کے لحاظ سے کہا جائے کہ خواجہ حافظ سے مضمون چھین لیا، لیکن اس نے مضمون کو ایسے بدیع اسلوب میں ادا کیا ہے کہ بالکل ایک نیا مضمون معلوم ہوتا ہے۔

ایک روز خواجہ حافظ کا یہی شعر ایک موقع پر پڑھا گیا۔ میں نے غالب مرحوم کا یہ شعر پڑھا:

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خُفت ست

وہ یہ شعر سن کر پھڑک گئے۔ ان مثالوں سے یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ قدما کے کلام میں بعض اوقات کوئی کمی رہ جاتی ہے جس کو پچھلے پورا کر دیتے ہیں اور اس سے شاعری کو بے انتہا ترقی ہوتی ہے۔ پس یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ شاعر اپنے محدود فکر اور تخیل پر بھروسہ کر کے قدما کی خوشہ چینی سے دست بردار ہو جائے ...

عرفی شیرازی کہتا ہے ؎

ہر کس نہ شناسندۂ راز ست دگر نہ
اینہا ہمہ راز ست کہ معلومِ عوام ست

غالب مرحوم نے اسی مضمون کو دوسرے لباس میں اس طرح جلوہ گر کیا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اگرچہ گمان غالب یہ ہے کہ عرفی کی رہبری اس خیال کی طرف قرآن مجید کی اس آیت سے ہوئی ہوگی " وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ " لیکن ہر حالت میں عرفی کا یہ شعر آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے اور جس اسلوب میں کہ یہ خیال ادا ہو گیا ہے اب اس سے بہتر اسلوب ہاتھ آنا دشوار ہے۔ بااینہمہ مرزا کی جدت اور تلاش بھی کچھ کم تحسین کے قابل نہیں ہے کہ جس مضمون میں مطلق اضافہ کی گنجائش نہ تھی اس میں ایسا لطیف اضافہ کیا ہے جو باوجود الفاظ کی دلفریبی کے لطفِ معنی سے بھی خالی نہیں ہے۔ عرفی کا یہ مطلب ہے کہ جو باتیں عوام کو معلوم ہیں۔ یہی درحقیقت اسرار ہیں۔ مرزا یہ کہتے ہیں کہ جو چیزیں مانعِ کشفِ راز معلوم ہوتی ہیں یہی درحقیقت کاشفِ راز ہیں۔

بہرحال اس قسم کے اقتباسات ہمیشہ متاخرین قدما کے کلام سے کرتے رہے ہیں اور چراغ سے چراغ جلتا چلا آیا ہے۔"

(مقدمہ ص ۱۳۹-۱۴۳)

حالی نے اخذ و استفادے کے ضمن میں ابنِ رشیق ہی کے حوالے سے اس
ت بھی توجہ دلائی ہے کہ کلامِ اساتذہ کی مشق و مزاولت کا مقصد ان کو طبیعت
نصہ بنانا ہے نہ کہ علم کو اوپر سے اوڑھ لینا، گویا خاطر میں رچا بسا کر اسے صفحۂ
طر سے محو کر دینا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ یہ نکتہ مشرقی روایت کے اس
ر کو ادبی لانگ کے تجریدی تصور سے قریب تر کر دیتا ہے یا اس تصور سے
۔ جو سکی اپنے نظریے میں 'اہلیت' کہتا ہے :

حالی کلامِ اساتذہ کو صفحۂ خاطر سے محو کر دینے سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" بعضوں کی رائے یہ ہے کہ ایک بار اساتذہ کے کلام پر تفصیلی نظر
ں کر اس کو صفحۂ خاطر سے محو کر دینا چاہیے کیوں کہ اس کا بعینہٖ ذہن میں
نوظ رکھنا ویسی ترکیبوں اور اسلوبوں کے استعمال کرنے سے ہمیشہ مانع
گا لیکن جب وہ کلام صفحۂ خاطر سے محو ہو جائے گا تو بسبب اس رنگ
ے جو کلامِ بلغا کی سیر کرنے سے طبیعت پر خود بخود چڑھ گیا ہے، اس میں
ما ملکہ پیدا ہو جائے گا کہ ویسی ہی ترکیبیں اور اسلوب جیسے کہ اساتذہ کے
ام میں واقع ہوئے ہیں، دوسرے لفظوں میں خود بخود بغیر اس تصور کے
، یہ ترکیب فلاں ترکیب پر مبنی ہے، اور یہ اسلوب فلاں اسلوب کا
۔ یہ ہے جیسی ضرورت پڑے گی بنتا چلا جائے گا۔" (ایضاً ص ۵۸)

لانگ اور پارول کے تخلیقی رشتے اور لانگ سے انفرادی تکلم جو لامتناہی
کلیں خلق کر سکتا ہے، اس کی نوعیت اور ماہیت کو سمجھانے کے لیے
وسیئر شطرنج کے کھیل کی مثال لاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شطرنج کے کھیل کے
ول اور قاعدے منضبط اور متعین ہیں۔ جو بھی شطرنج کھیلے گا انھیں اصول
ضوابط کی رو سے ہی کھیلے گا۔ یہ اصول اور قاعدے ہر
زی کھیلنے والے کے ذہن میں ہیں جن کی پابندی شرط ہے۔ لیکن ہر
زی جو کھیلی جاتی ہے وہ ہر کھیلی گئی بازی سے مختلف ہوتی ہے یا ہر بازی
کھیلی جائے گی وہ ان گنت دوسری بازیوں سے مختلف ہوگی۔ گویا شطرنج
کے اصول و ضوابط بمنزلہ لانگ ہیں اور ہر واقعاتی بازی پارول جو بنیادی
صولوں سے ماخوذ ایک وقوعہ ہے۔ اصول تجریدی ہیں اور متعین ہیں۔
قوعہ امکانی طور پر ماخوذ ہے اس لیے متغیر ہے۔ اور اس کا متغیر ہونا ادب

میں بدلتی ہوئی شکلوں یعنی سلسلۂ تخلیق کا ضامن ہے۔

مزے کی بات ہے کہ روایت سے اخذ و استفادے کی وضاحت کرتے ہوئے حالی نے بھی شطرنج ہی سے مثال دی ہے۔ حالی کے یہاں بحث کیوں کہ شعری اخذ و استفادے کی ہے، اس لیے وہبی صلاحیت یعنی فطری ملکہ کا ذکر بھی آگیا ہے۔ طبیعت کا لگاؤ تو بنیادی ہے ہی، ورنہ اصل بات اصول و ضوابط کے اسی تجریدی نظام کی ہے جو جب تک طبیعت کا حصہ نہ بن جائے، اس وقت تک نئی نئی "باریک اور گہری چالیں" نہیں سوجھ سکتیں،

"یوں تو ہر فن اور ہر پیشہ میں کمال حاصل کرنے کے لیے مناسبتِ فطری کی ضرورت ہے، لیکن شاعری میں اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے ... شاعری کی ابتدا بعینہٖ ایسی ہوتی ہے جیسی شطرنج کی ابتدا ہوتی ہے جس کی طبیعت کو شطرنج سے لگاؤ ہوتا ہے اس کو دو ہی چار دن میں باریک اور گہری چالیں سوجھنے لگتی ہیں ... مگر جن کی طبیعت کو اس سے لگاؤ نہیں ہوتا ان کا حال اس کے برعکس ہوتا ہے۔ وہ اگر تمام عمر شطرنج کھیلیں ان کی چال اس درجے سے کبھی آگے نہیں بڑھتی جو ابتدائی چند روزہ مشق سے ان کو حاصل ہوئی تھی۔ یہی حال شاعری کا ہے جن لوگوں کی فطرت میں اس کا ملکہ ہوتا ہے ان کی طبیعت ابتدا ہی سے راہ دینے لگتی ہے ... ان کو خارج سے اپنی شاعری کا مصالح فراہم کرنے کی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے ورنہ وہ سلیقہ جو الفاظ و خیالات کی ترتیب و انتخاب کے لیے درکار ہے وہ اپنی ذات میں اسی طرح پاتے ہیں جس طرح کہ بیا گھونسلا بنانے کا ہنر اور سلیقہ اپنی ذات سے پاتا ہے، وہ اساتذہ کے کلام سے صرف یہی فائدہ نہیں اٹھاتے کہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے یا باندھا ہے اس سے مطلع ہو جاتے ہیں، بلکہ ان کے ایک ایک مصرعے اور ایک ایک لفظ سے بعض اوقات ان کو وہ سبق حاصل ہوتا ہے جو ایک ناشاعر مہینوں میں کسی استاد سے حاصل نہیں کر سکتا۔"

(مقدمہ ص ۹۱-۹۲)

آخر میں اس امر کی طرف اشارہ بھی ضروری ہے کہ مشرقی شعریات میں

حفظ و روایت کے سلسلے میں یہ احساس بھی ملتا ہے کہ روایت کے بعض حصے فرسودہ از کار رفتہ اور منجمد بھی ہو سکتے ہیں اور تازہ فکری و تازہ کاری کے لیے ان سے گریز و انحراف بھی ضروری ہے کیوں کہ کورانہ تقلید تو فقط مقلدانہ فکر کو راہ دے سکتی ہے۔ گویا جہاں حفظ و روایت پر زور ہے وہاں تقلید کے خطرات سے بھی خبردار کیا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ جہاں نظراً ایسا نہیں ہے وہاں عملاً حساس طبائع نے اس کا بہت لحاظ رکھا ہے اور رسم و رہِ روشِ عام سے گریز کو نہ صرف روا بلکہ لازم قرار دیا ہے اور انحراف و اجتہاد کو بجا طور پر ذریعۂ افتخار جانا ہے۔ اس بارے میں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ فنکار کا درجہ جتنا بلند ہوگا، روایت سے گریز اس کے یہاں اتنا نمایاں ہوگا اور انفرادیت بھی اتنی راسخ ہوگی۔ لیکن جتنی یہ بات حقیقت ہے اتنی یہ بات بھی حقیقت ہے کہ انحراف ہو، انقطاع یا اجتہاد کچھ بھی خلا میں نہیں ہوتا۔ گریز بھی کسی چیز سے گریز ہوتا ہے یا بغاوت بھی کسی چیز سے بغاوت ہوتی ہے، یعنی ادب میں انحراف بھی حقیقتاً ادبی روایت میں کسی مقام کسی طور کسی وضع یا کسی تصور یا کسی دلالت سے انحراف ہوتا ہے، اور چوں کہ یہ روایت کے اندر واقع کسی مقام سے ہوتا ہے، اس کی نئی معنویت یا نئی متنیت (یا نئی شعریت یا نئی جمالیت) بھی اسی رشتے کے ربط و تضاد سے قائم ہوتی ہے جو نئے اور پرانے ان دو مقامات کے درمیان مرتب ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں روایت سے انحراف بھی ادبی لانگ کے جامع تجریدی نظام کی رو سے اور اسی کے اندر ہوتا ہے۔ اس سے باہر کچھ نہیں۔ یوں پرانی فرسودہ اور از کار رفتہ ساخت کی جگہ ایک نئی ساخت لے لیتی ہے۔ روایت میں ردو قبول اور تغیر یا توسیع کے اس عمل میں گویا ایک طرح کا FUSION جاری رہتا ہے، جس میں چنگاریاں جلتی بجھتی رہتی ہیں اور پرانے ہیولوں سے نئے نئے ہیولے بنتے رہتے ہیں یا نئی ساختیں پرانی ساختوں کو آگے پیچھے ڈھکیل کر اپنے لیے جگہ بناتی رہتی ہیں۔ یہ ایک جدلیاتی عمل ہے جو روایت یا ادبی لانگ میں برابر جاری رہتا ہے۔

لیکن یاد رہے کہ سائیئر کا لانگ کا تصور حاضر وقتی ہے جب کہ ادبی لانگ یا

ادبی روایت کا تصور تاریخیت کا حامل ہے، اور چوں کہ یہ تاریخیت سے ہٹ کر ممکن نہیں، اس لیے ادبی لانگ کا سائنسی تحلیل و تجزیہ ممکن نہیں۔ ہر چند کہ ساختیات نے اس کی توقع پیدا کی تھی لیکن پس ساختیات نے اسے مسمار کر دیا، اس لیے کہ متن، قرأت اور قاری کا تفاعل اس درجہ متغیر اور سیال ہے کہ تحلیل و تجزیہ ممکن ہی نہیں۔ ساختیات کے مقابلے میں پس ساختیات اسی لیے غیر سائنسی ہے۔ قطع نظر اس بنیادی فرق سے لانگ برابر تاریخی تبدیلیوں کو جذب کرتی رہتی ہے۔ یہ تبدیلیاں لانگ کے ہیولے کو بد وضع بھی کر دیتی ہیں، یعنی کہیں کہیں سے پچکا بھی دیتی ہیں یا اسے بے ڈول بھی کر دیتی ہیں، لیکن لانگ کی خوبی یہ ہے کہ یہ اپنے داخلی خود کار عمل سے ان تغیرات کو جذب کر کے پھر اپنی وضع کو پالیتی ہے۔ ساسیئر اس کے لیے دو خاص اصطلاحیں استعمال کرتا ہے کہ لانگ SELF-ADJUSTING (خود انضباطی) اور SELF-REGULATING (محکم بالذات) ہے۔ جو بات لانگ کے لیے صحیح ہے وہ ادبی لانگ کے لیے بھی صحیح ہے یعنی ادبی لانگ بھی متغیر بالذات اور محکم بالذات ہے اور اس میں خود ترتیبی اور خود آہنگی کا عمل برابر جاری رہتا ہے اور چوں کہ یہ محکم بالذات ہے، یہ زماں کے کسی بھی لمحۂ حاضر میں مکمل اور جامع و مانع ہے۔ یہ ادب کی مافوق الشعریات یا کلی نظام کا وہ خزینہ ہے جس سے ادبی معنیات اور جمالیات کی ہر شکل متشکل ہوتی ہے، نیز ہر انحراف و اجتہاد جس کی داخلی خود انضباطیت کی خراد پر چڑھ کر اس کی ساخت کا حصہ بن جاتا ہے، اس ساخت کا جس سے آنے والی نسلیں اخذ و قبول بھی کریں گی اور اسے رد بھی کریں گی اور یوں ادبی لانگ ہر وقت مکمل، ہر وقت جوان اور ہر وقت بھری پُری رہتی ہے۔

حالی مشرقی ادبی لانگ میں اس قدر رچے بسے تھے اور ان کا ذوقِ شعری اس قدر مرتب اور بالیدہ تھا کہ ان کے اصلاحی پروجیکٹ کے نو آبادیاتی ہونے کے باوصف مقدمہ بجا طور پر اردو شعریات کی پہلی کتاب ہے، تاہم یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ اصلاح کے جوش میں حالی کبھی کبھی ان جڑوں

پر بھی وار کر جاتے ہیں جن پر پیڑ قائم ہے۔ ایسا اس لیے بھی ہوا کہ شعری فرسودگی اور میکانکیت کے خلاف آواز اٹھاتے وقت اسے وہ روایت سے الگ کوئی چیز تسلیم کر لیتے ہیں اور فرسودگی اور تازہ کاری میں جو جدلیاتی رشتہ روایت کے اندر اور روایت کی رد سے ہے، اس کو وہ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مقدمہ میں جہاں جہاں انھوں نے اردو شاعری کے فرسودہ، از کار رفتہ اور بے کیف ہونے کی بحثیں اٹھائی ہیں اور ان موضوعات و مضامین کا ذکر کیا ہے جنھیں شعرا صدیوں سے باندھتے آئے ہیں، اور جو اب بمنزلہ شعری ارکان و عناصر کے ہو گئے ہیں، تو دراصل ان کا جہاد میکانکیت اور بے روح مقلدانہ روش کے خلاف ہے لیکن ان کا وار پڑتا ہے پوری مافوق الشعریات پر اور نتیجتاً وہ ایسے فارمولے وضع کر لیتے ہیں جو زیادہ دور تک ساتھ نہیں دیتے اور ان کے پروجیکٹ میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ جب وہ خود غزل کہتے ہیں تو اس میں وہی معنیاتی اور جمالیاتی وفور در آتا ہے جو مشرقی ادبی لانگ کا طرۂ امتیاز ہے۔

بہرحال اوپر کی بحث سے واضح ہے کہ ادبی لانگ میں نیا پرانا فرسودہ تازہ کار، اتباع و انحراف سب ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ شکلوں سے شکلیں بنتی اور معنی سے معنی نکلتے ہیں اور کیفیتوں سے کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایسا نہ ہو تو معنی کی بوقلمونی اور معنی کے چراغاں کا عمل رُک جائے۔ نیز مضمون و معنی فقط اسی قدر ہے جس قدر وہ شعر کی لسانیت یا متنیت سے ہے اور یہ سب ادبی لانگ کے تجریدی نظام کی رو سے متشکل ہوتا ہے خواہ معنیات ہو یا جمالیات کیوں کہ جمالیات بھی بڑی حد تک معنیات کا حصہ ہے۔ اظہاری وسائل یا شعری طور طریقوں اور پیرایوں پر بھی قدرت اسی نسبت سے ہوگی جس درجہ ادبی لانگ کا شعور گہرا اور بسیط ہوگا۔ الغرض سخن گوئی تو سخن گوئی، سخن فہمی یا لطف اندوزی بھی ادبی لانگ کے شعور میں رچے بسے بغیر ممکن نہیں!

روایت بطور لانگ کی بحث، ہم نے ابنِ رشیق کے قول سے شروع کی تھی۔ اب دیکھیے تو ابنِ رشیق نے کیا صحیح کہا ہے کہ فرش شعر کا شاعر کی طبیعت

اور صاحبِ خانہ معانی ہیں، مکان کی شان مکین سے ہوتی ہے، اوزان و قوانی مثال چوب و طناب کی ہیں۔ لیکن وہ چھت جو تمام بابِ سخن پر تنی ہے وہ حفظ و روایت یا مافوق الشعریاتی نظام یا ادبی لانگ ہی ہے (اور علم و معرفت اور مشق و ممارست بھی سب کے سب اسی کی نسبت سے ہیں) جذبہ ہو یا خیال، تحرک و تموج ہو یا تخئیل کی نادرہ کاری، سب شکل پذیری کے لیے دست نگر ہیں ادبی لانگ کے۔ اظہار کے طور طریقے اور وسائل بھی لانگ کے بطن ہی سے آتے ہیں۔ پرانی شکلیں بھی اسی میں زندہ رہتی ہیں مٹتی اور بنتی بھی اسی کی رو سے ہیں۔ گویا انحراف و اجتہاد، ردو قبول سب اسی آسمان کے نیچے اور اسی متغیر بالذات اور محکم بالذات خزانے سے ہے، جس کو محسوس تو کر سکتے ہیں لیکن جس کی تحلیل نہیں کر سکتے، اور جو وقت کی کسی بھی سطح پر باوصف تغیر آشنا ہونے کے مکمل اور منضبط ہے۔ نہ صرف شعر بطورِ شعر اور شعری معانی بطور شعری معانی اس کی رو سے قائم ہوتے ہیں بلکہ سخن فہمی کے تمام واجبات بھی اسی کے علم و شعور سے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں نہ صرف شعریات اس سے ہے، ذوقِ شعری، یا مذاقِ سلیم، یا مذاقِ سخن کی آبیاری بھی اسی سے ہوتی ہے۔ غرضیکہ ادبی لانگ معنیات و شعریات و جمالیات کا فیضانِ جاریہ ہے۔ یہ ایک معدن ہے جو ادبی لعل و گہر سے لبالب بھرا ہوا ہے، اس میں کبھی کمی واقع نہیں ہوتی اور یہ ہر وقت جگمگاتا رہتا ہے۔

ختمِ کلام

اوپر عربی فارسی اردو شعریات اور اس کے خاص خاص نکات کے بارے میں ہم نے ایک طویل سفر طے کیا۔ جیسا کہ معلوم ہوا ہوگا ہمارا مقصد کھینچ تان سے کوئی بات ثابت کرنا نہ تھا بلکہ غور و فکر کی کھلی دعوت دینا تھا تاکہ یہ دیکھا اور دکھایا جا سکے کہ بنیادی فرق کہاں کہاں ہے اور مقاماتِ اتصال کیا کیا ہیں۔ یا یہ کہ مشرق میں لسان و لغت اور بلاغت و بیان پر غور و فکر کی روایت کتنی قدیم اور کتنی بسیط رہی ہے اور اس بارے میں کیا کیا باریکیاں پیدا کی گئی ہیں، کتنے نکات ایسے ہیں جو جدید فلسفۂ لسان یا ساختیات کے پیشرو معلوم ہوتے ہیں

پہلے ہی ان کی منطقی تحلیل اس درجہ نہ کی گئی ہو یا ان کے استدلالی مضمرات کو اس درجہ منضبط نہ کیا گیا ہو۔ کیا یہ تعجب خیز نہیں کہ جو باتیں اب کہی جارہی ہیں، روایت میں ان سے ملتی جلتی باتیں ایک زمانے سے موجود ہیں، لیکن خود ہم ان کی طرف سے غافل رہے ہیں۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ روایت کو چوں کہ ہم نئی معنویت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں ہمیں از سر نو ان باتوں کا سراغ مل رہا ہے۔ بہر حال ہر عہد اپنی ضروریات کے مطابق چھان بین کرتا ہے اور حقائق کی تشکیلِ نو کرتا ہے۔ یہ روایت کی بازیافت کا عمل ہے۔ تاہم یہ بھی نظر میں رہے کہ اس دو طرفہ مکالمے کا مطلب اس بنیادی فرق کو نظر انداز کرنا بھی نہیں جو دو الگ الگ نوعیت کی روایتوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کی وضاحت کئی جگہ کی گئی کہ ساختیاتی فکر کی بنیاد لسانیاتی ماڈل پر ہے اور لسانیات نظری فلسفہ ہے۔ زبان سے پہلے جوہر کا تصور یہاں نہیں ہے۔ سوسیئری فلسفے کی رو سے زبان میں ہر چیز فرض کرلی گئی ہے۔ زبان فطری نہیں بلکہ زبان میں سب کچھ من مانا (ARBITRARY) ہے۔ اس لیے زبان کلیتاً مجاز ہے۔ مشرقی روایت معنیِ لغوی یعنی معنیِ حقیقی اور معنیِ مجازی میں فرق کرتی ہے لیکن شعری بیان مجاز ہی سے عبارت ہے اور اس بارے میں بہت سی بصیرتیں جن سے بحث کی گئی ساختیاتی و پس ساختیاتی فکر سے ملتی جلتی ہیں، البتہ مشرقی روایت میں ان کی اس درجہ منطقی نظریہ بندی نہیں کی گئی، یا جہاں کی گئی مثلاً عبدالقاہر جرجانی واضح لفظوں میں کہتا ہے کہ لفظ و معنی میں کوئی فطری رشتہ نہیں، زبان میں ہر چیز معاشرتی چلن سے قائم ہوتی ہے اور معنی پہلے سے دیے ہوئے نہیں ہیں بلکہ لسانی ساخت سے پیدا ہوتے ہیں، لیکن انقلابی نوعیت کے یہ خیالات مشرقی روایت کے بڑے دھارے کا حصہ نہیں کیوں کہ بلاغت و بیان حقیقت اور مجاز میں فرق کرتے ہیں۔ اسی طرح اگرچہ شعر بے صناعتِ لفظی نہیں یعنی مشرقی روایت میں لفظ کو معنی پر ترجیح حاصل ہے، لیکن لفظ و معنی کی وحدت کے ساتھ ساتھ دونوں کے رشتے میں عدم مطابقت کے بارے میں بیانات بھی ملتے ہیں، تاہم کوئی مدلل نظریہ نہیں ہے۔ بہر حال یہ طے ہے کہ ان مباحث کا اطلاق متنِ مقدسہ پر نہیں ہوتا

اس لیے کہ متنِ مقدسہ کا مقام الگ ہے اور شعری بیان کی نوعیت اور ہے۔ جہاں تک قاری کے تفاعل کا تعلق ہے جس پر منظریت اور پس ساختیاتی نظریوں میں بہت زور دیا گیا ہے، اس سے ملتے جلتے تصورات بھی مشرقی روایت میں عام ہیں، سخن فہمی، مذاقِ سلیم، خوش مذاقی وغیرہ کا تصور زیادہ تر قاری کے تفاعل سے جُڑا ہوا ہے۔ اسی طرح لانگ بطور جامع تجریدی نظام (جو ذہن و شعور کا حصّہ ہے) اور پارول سے اس کے جدلیاتی رشتے کا منضبط منطقی تصور ہر چند کہ مشرقی روایت میں نہیں لیکن ادبی روایت کا جو تصور وسیع پیمانے پر مشرقی شعریات میں جاری و ساری ہے، وہ بڑی حد تک ادبی لانگ کے تصور سے ملتا جلتا ہے۔ ایسے ہی دوسرے بہت سے نکات ہیں جن سے اوپر بحث کی گئی۔ زیرِ نظر مکالمہ اس لیے بھی قائم کیا گیا کہ اس سے روایت کی بازیافت اور شعریات کی نئی آگہی کی تشکیل میں مدد ملے گی اور چوں کہ یہ جدلیاتی عمل ہے، نئے فلسفۂ لسان اور ساختیاتی فکر کے جو عناصر اجنبی ہیں اور جن کی تفہیم آسان نہیں، روایت کی روشنی میں ممکن ہے کہ ان کی افہام و تفہیم میں بھی مدد ملے گی۔ بہرحال اوپر جو کچھ پیش کیا گیا اس کی نوعیت ایک ابتدائی کوشش سے زیادہ نہیں، امید ہے کہ بعد کے صاحبانِ نظر اس میں بہت اضافہ کریں گے۔ اس باب کو ختم کرتے ہوتے محمد حسن عسکری کے ان الفاظ سے بہتر اقتباس ممکن نہیں۔

"قطعی نتائج مرتب کرنا میرا منصب نہیں۔ میرا مقصد تو صرف اتنا تھا کہ ...
مختلف معانی ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ جتنی معلومات مجھے فراہم ہوئیں وہ سب ابتدائی
باتیں ہیں۔ مگر میں اسلامی علوم کا مبتدی بھی نہیں۔ اپنی طرف سے میں نے پوری احتیاط
برتی ہے کہ کتابوں سے جو کچھ نقل کروں پہلے تھوڑا بہت سمجھ لوں اور درست نقل کروں۔
جو باتیں ٹھیک نقل ہوئیں، وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہوئیں۔ جو غلطیاں ہوئیں
وہ میری طرف سے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے امید ہے کہ اس مضمون کا کوئی مصرف نکل آئے گا۔"

محمد حسن عسکری

(وقت کی راگنی کی آخری سطریں)

شمس الرحمٰن فاروقی
۳۰۲-مڈوک بھون
نئی دہلی ۱

سخن فہمیِ علاّمی و شاگردانِ علاّمی

(یہ مصرع ہے)

جناب زار علاّمی میرے بزرگ ہیں اور میں ان کا احترام کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک صاحب نے ان کے حوالے سے ایک سراسر نثری فقرے کو مصرع بتایا، اور پھر انھیں کے حوالے سے اس نام نہاد مصرع کا سراسر مہمل وزن بھی بیان کیا، تو میں خاموش رہا کہ جناب زار کی دل شکنی مجھے منظور نہ تھی۔ جناب زار کو عروض میں درک ضرور ہے، لیکن ان کی مشکل یہ ہے کہ وہ اپنے سے بھی کم علم لوگوں کی داد کو اپنے لیے سند سمجھتے ہیں۔ ان کا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ وہ جائز، ناجائز، مانوس، نامانوس زحافات کا سہارا لے کر ناموزوں عبارتوں کو "موزوں" قرار دینا اپنا فرض جانتے ہیں۔ خیر اپنا اپنا شوق ہے، مجھے کیا، اگست ۱۹۹۳ء کے "کتاب نما" میں جناب زار نے اتنی ڈھیر سی غلط باتیں کہہ دیں کہ بقول میر

مانند ابر ہر جا میں زار زار رویا

جناب زار کی غلط گوئیوں پر میں اب بھی خاموش رہتا۔ لیکن ستمبر ۱۹۹۳ء کے کتاب نما میں جناب کمال احمد صدیقی کے مضمون میں بعض باتوں کے باعث مجبور ہو گیا۔ جناب کمال احمد صدیقی کا ارشاد ہے کہ "سوغات کے چوتھے شمارے میں ..... خط .... کے مخاطب شمس الرحمٰن فاروقی ہیں ..... جواب دینا فاروقی کا فرض منصبی ہو جاتا ہے"۔ لہٰذا ادائیگیِ فرض کے طور پر چند باتیں عرض کرتا ہوں۔

(۱) جناب کمال احمد صدیقی نے بحر مقتضب کی بالکل صحیح تنقید کی ہے۔ مقتضب دائرے سے مطوی نکلی ہے۔ اس کے صدر و ابتدا کے ارکان میں مراقبہ بھی ہے (جناب زار علاّمی بحور کی تاریخ اور ان کے استخراج کے وجوہ سے بے خبر معلوم ہوتے ہیں۔) مراقبے کا عمل اس بحر میں ضروری ہے۔ جناب علامی کا تشخیص کردہ وزن مفاعیل مفاعلن مفعولن فاعلن اگر درست سمجھے ہو تو مفاعیل کی جگہ فعولات کہنا تھا۔ یہاں فعولات کی جگہ مفاعیل لکھنا اصول سے بے خبری کی علامت ہے۔ لیکن دوسری بڑی مشکل یہ ہے کہ بقول طوسی، مقتضب میں مفعولن وارد نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہاں تسکین اوسط بھی لگا کر اگر مفعولن حاصل کیا جائے (جیسا کہ علامی صاحب نے کیا ہے) تو بھی یہ وزن غیر حقیقی رہے گا۔ تیسری مصیبت یہ ہے کہ زحاف رفع کو محقق نے مفعولات کے لیے قبول نہیں کیا ہے، نہ عربی میں نہ فارسی میں۔ لہٰذا مفعولات

کومرفوع کرکے اس کو مفعول نہیں کرسکتے۔ یہ وزن بھی غیرحقیقی ہے اور علامہ نجم الغنی نے مفعو کی فرع مفعول از روے رفع درج ضرور کی ہے، لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ رفع عربی میں نہیں ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ مقتضب مخصوص بہ تازیاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نجم الغنی نے مقتضب میں رفع کے وجود سے انکار کیا ہے۔

(۲) تخنیق اور تسکین کا فرق جو کمال احمد صدیقی نے بیان کیا ہے، وہ بالکل درست ہے یہ نہ صرف محقق طوسی اور جملہ قدیم عروضیوں کی رائے کے مطابق ہے، بلکہ خود جناب زار کے استاد حضرت سحر عشق آبادی کے بھی بیان کے مطابق ہے۔ افسوس کہ جناب زار کو تسکین او تخنیق کا فرق نہیں معلوم، ورنہ وہ یہ نہ کہتے کہ مفعولات فعلن سے مفعولاتم (۹) فعل بنتا ہے جو "مرفوع و مخبون مسکن" ہے۔ جب تسکین اوسط کا عمل دو ارکان پر اس باعث وارد ہو کہ ان میں تین متحرک یکجا ہیں، تو اسے تخنیق (ت خ ن ی ق) کہتے ہیں۔ مثلاً مفعول مفاعلن کو تخنیق کے ذریعہ مفعولن فاعلن کر لیتے ہیں اور فاعلن کو مخنق کہتے ہیں۔ یہاں مسکن کہنا غلط ہے۔ ہاں اگر مفتعلن کو تسکین اوسط کے ذریعہ مفعولن کرلیں، تو یہ ضرور مسکن کہلائے گا۔

(۳) جناب علامی نے ستم بالاے ستم یہ کیا ہے کہ مفعولاتم ایک مہمل اور لاطائل وزن ایجاد کر دیا ہے۔ یہ بروزن اگرچہ گندہ ولے ایجادِ بندہ کی بدترین مثال ہے، اور کمال احمد صدیقی نے اس پر صحیح گرفت کی ہے۔

(۴) لیکن زار صاحب نے مہمل وزن گڑھنے کے ساتھ ساتھ اپنے عروض ناخواندہ شاگر کے ساتھ دھوکا بھی کیا ہے، کہ انھوں نے مقولۂ زیرِ بحث کا "دوسرا" وزن حسب ذیل تجویز کیا ہے۔

مفاعیل مفاعلن مفعولاتم فعل

وہ یہ بھول گئے کہ مفعولاتم فعل نہ صرف مہمل ہے، بلکہ غیرضروری بھی ہے، کیوں کہ اُسے بے تکلف اور بہ آسانی مفعولن فاعلن کہہ سکتے ہیں۔ تقطیع کا پہلا اصول یہ ہے کہ جو وزن تجویز کیا جائے وہ حقیقی ہو۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ نامانوس افاعیل کو مانوس افاعیل میں بدل لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فاعیل کو مفعول اور مستعلن کو مفتعلن کہتے ہیں۔ پھر مفعولاتم فعل کی لاطائل ایجاد کیوں؟ اسے مفعولن فاعلن کیوں نہ کہا۔

(۵) مفعولاتم فعل کی ایجاد محض اس لیے ہے کہ عروض ناخواندہ لوگ دھوکے میں آجائیں کہ حضرت علامی نے ایک اور تقطیع بھی دکھادی۔ وہ بے چارے کیا جان سکیں گے کہ موصوف نے یہی تقطیع ملا پر پہلے ہی بیان کر دی ہے۔ ان کی تقطیع ملا حسب ذیل ہے:

مفاعیل مفاعلن مفعولن فاعلن

(ملاحظہ ہو کتاب نما بابت اگست ۱۹۹۳ء، صفحہ ۳۹ اور ۴۱)

لیکن حضرت زار کو تو تین تقطیعیں بیان کرنی تھیں (جیساکہ وہ جوشش میں آکر دعوا کر چکے تھے، صفحہ ۳۸)۔ لہٰذا انھوں نے عروض ناخواندگان کو بے وقوف بنانے کے لئے تقطیع ملا

لن فاعلن کی جگہ مفعولاتم فعل لکھ دیا اور یہ خیال نہ کیا کہ یہ بھانڈا پھوٹ کر رہے گا، کیوں کہ
کا معمولی طالب علم بھی مفعولاتم فعل کو بے معنی قرار دے گا اور اسے مفعولن فاعلن میں
ے گا۔

(۶) حضرت زار کا مزید کارنامہ یہ ہے کہ وہ مفاعیلن کی فرع فعول کو قبض اور حذف
ب وقت عمل سے برآمد کرتے ہیں، جب کہ یہ دونوں عمل بیک وقت ہو ہی نہیں سکتے۔
ی تعریف خود جناب علامی نے یوں لکھی ہے (صفحہ ۴۲)'' رکن سے پانچواں حرف گرانا
، وہ سبب خفیف کا ساکن ہو۔ مفاعی لن سے "ی" کی "ی" ساقط کی مفا+ع+لن
ا کو مفاعلن سے بدل لیا گیا'' یہ تعریف درست ہے۔ اب وہ حذف کی تعریف فرماتے
صفحہ ۴۲) "رکن کے آخر سے سبب خفیف ساقط کرنا۔ یہ بھی درست۔ لیکن وہ بھول
، مفاعلن کے آخر میں سبب خفیف ہے ہی نہیں۔ مفاعلن مقبوض ہے مفاعیلن کا۔
تفع لن مفروقی کا مخبون نہیں کہ مفاع لن قرار دیا جا سکے۔ اب جب مفاعلن میں آخر کا
ب خفیف ہے ہی نہیں تو وہاں حذف کہاں؟ زار صاحب فرمائیں گے کہ دونوں (قبض
ف) ساتھ ساتھ ہو رہے ہیں۔ لیکن یہ عمل ساتھ ساتھ تو تب ہوں جب ایسا کلمہ
ا پر حذف لگ سکے۔ کمال صاحب کا کہنا صحیح ہے کہ مفاعیلن میں قبض اور حذف کو
ا اصول معاقبہ کی خلاف ورزی ہے۔ (یہی وجہ ہے کہ محقق نے مفاعلن کی فرع فعول
وف مقصور بتایا ہے۔ یعنی حذف سے فعولن بنا، پھر قصر سے فعول بنا۔ اسی کو
ی کہا ہے یعنی مفاعیلن میں حذف اور قصر کا اجتماع ہتم کہلاتا ہے۔)

(۷) اور سنیے۔ زار صاحب خود کہتے ہیں کہ حذف کا صدور حشو میں نہیں ہوتا۔ (کتاب نما
ست ۱۹۹۳ء صفحہ ۴۲)۔ علامہ نجم الغنی نے بھی حذف کو عروض و ضرب سے مخصوص بتایا
پھر بھی زار صاحب فرماتے ہیں کہ میری تقطیع کے اعتبار سے (ہزج مثمن مکفوف
ی محذوف) حذف کا صدور حشو میں ہو رہا ہے۔ ایسا کیوں؟ اس کا جواب ان کی ہی
بجز بیان سے سنیے (صفحہ ۴۲)۔ "میں زار علامی کہتا ہوں کہ فعول ...... عروض و ضرب
ر د تو ہو سکتا ہے، مگر وہاں اس کا رکھنا اتنا آسان نہیں۔ اس لیے یہ رکن ....
د ابتدا اور حشوین میں رکھا جا سکتا (ہے۔)'' یہاں بھی کمال احمد صدیقی نے صحیح گرفت
ہے۔ میری غرض یہ ہے کہ جیسے محذوف رکن کو عروض و ضرب میں لانا مشکل معلوم ہوتا ہو
عری اور عروض دونوں ترک کر دے تو بہتر ہے اور اس کی بھی ایک ہی رہی کہ فعول
و ضرب میں وارد ہو سکتا ہے! یعنی جو مزاحف کہیں اور آ ہی نہ سکے، اور صرف
ں و ضرب کے لیے مخصوص ہو، اس کے بارے میں مرتبیانہ لہجہ اختیار کر کے فرماتے
عروض و ضرب میں آ تو سکتا ہے، لیکن اتنا آسان نہیں۔ لہذا اسے حشوین میں ہی ٹھونستا
ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے کوئی کہے کہ "میں فارسی کی تعلیم حاصل تو کر سکتا ہوں، لیکن
ا آسان نہیں۔ اس لیے میں اردو سیکھ لیتا ہوں۔ اسی کو فارسی کہ دوں گا۔" جہ خوش ہوا

نہ بودی چھیتر پہ بھینس کو دی" اسی کو کہتے ہیں۔

(۸) اگلی حیرت انگیز بات سنیے۔ جناب زار اس فقرے کی تقطیع ہزج میں بھی فرماتے ہیں

وہو ہٰذا:- مفاعیلن فعول مفاعیلن فاعلن

ہم دیکھ چکے ہیں کہ فعول کا ورود یہاں از روے قاعدہ ناممکن ہے۔ لیکن اگر ہم زار صاحب کی خاطر اس کو ممکن بھی قرار دے لیں تو مشکل یہ ہے کہ تخنیق کے پہلے جناب زار کا مندرجہ بالا وزن یوں قرار پاتا ہے:-

مفاعیل فعول مفاعیل مفاعلن

فعول وسط مصرع میں بہ عمل حذف نہیں آسکتا۔ لیکن مستفعلن کی ایک فرع فعولن بھی ہے (مخبون مقطوع) اور اس پر قصر کا عمل کریں تو فعول حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح پورا وزن ہزج کے بجائے مقتضب میں رکھا جاسکتا ہے اور فعول کی مشکل حل ہو جاتی ہے۔ لیکن افسوس کہ زیر بحث فقرہ اس وزن پر پورا نہیں اترتا۔ اب حضرت علامی بتائیں کہ دو بحروں اور تین اوزان حقیقی میں اس فقرے کی تقطیع کا جو دعوا آپ کی کلک بار سے نکلا تھا وہ یاد رہا اور گوز شتر ہے کہ نہیں؟

(۹) جناب کمال احمد صدیقی کی یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جب بقول محقق پارسیاں کے یہاں مقتضب بہ تکلف آئی ہے تو حضرت علامی کا تجویز کردہ وزن (اگر وہ صحیح بھی ہو) قبول کرنے سے پہلے یہ بھی دیکھنا ضروری ہوگا کہ اس فقرے کے وزن پر کسی نے شعر بھی کہا ہے کہ نہیں؟

(۱۰) اس سے بڑھ کر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ مستند لوگوں کے یہاں یہ فقرہ ایک نہیں تین شکلوں میں ملتا ہے۔

(الف) سخن فہمی عالم بالا معلوم شد

(ب) قدر دانی عالم بالا معلوم شد

(ج) شعر فہمی عالم بالا معلوم شد

بیچارے علامی صاحب کہاں تک تقطیع کرتے پھریں گے؟ اگر یہ مصرع ہوتا تو اس کی شکل متعین ہوتی۔

(۱۱) جناب کمال احمد صدیقی نے جناب زار کے تئیں سخت لہجہ اختیار کیا ہے۔ مجھے خوشی ہوتی اگر وہ نرمی سے کام لیتے۔ اس میں زار صاحب کے شاگردان ناخواندہ عروض کے لیے بھی نکات پوشیدہ ہیں۔ بقول بعض عروض میری عمر بھر کی کمائی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ عروض نے مجھے کچھ تہذیب تو سکھا دی۔ ورنہ اگر میں مصمتے اور مصوتے شمار کرنے اور انگریزی کو غلط اردو میں بیان کرنے کا فن حاصل کرتا تو مجھے بھی زار صاحب کے در پر نقطوں اور شوشوں کی دریوزہ گری کرنی پڑتی۔

(۱۲) جناب زار کی خدمت میں آخری معروضہ یہ ہے کہ وہ "میں زار علامی کہتا ہوں"

"میں زار علامی" کی تکرار ترک کر دیں تو بہتوں کا بھلا ہو۔ یہ اتنا ہی بڑا ہے جتنا بعض لوگوں کا خود کو بار بار "خاکسار" کہنا۔ علمی استدلال کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح، وہ بحور و اوزان کے حوالے سے ہمیشہ لکھتے ہیں کہ یہ مصرع فلاں بحر میں ڈوبتا ہے / غوطہ کھا رہا ہے وغیرہ۔ اول تو یہ رعایت بے معنی ہے، کیوں کہ مصرع اگر ڈوب رہا ہے / غوطہ کھا رہا ہے تو کوئی اچھی بات نہیں۔ لیکن وہ بحر کے ساتھ ساتھ وزن کو بھی کوئی حوض سمجھتے ہیں کہ لکھتے ہیں ("کتاب نما"، اگست ۱۹۹۳، صفحہ ۳۹) "مقولہ دو بحور اور تین حقیقی اوزان میں .... غوطہ کھا رہا ہے۔" وزن میں تلنا یا وزن سے دبنا تو سنا تھا لیکن وزن میں غوطہ کھانا یعنی چہ؟ اور کسی مصرعے / شعر کا کسی بحر میں غوطہ کھانا / ڈوبنا وغیرہ خود بھی مہمل ہے۔ (عروضی کا کام کلموں / مصرعوں / اشعار کے وزن و بحر کو بیان کرنا ہے نہ کہ ان کو غرقاب کرنا۔ رعایت لفظی برتنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ زار صاحب سے استدعا ہے کہ وہ قدیم اردو فارسی اساتذہ کا کلام دل لگا کر پڑھیں، تاکہ رعایت اور مناسبت وغیرہ کے معاملات ان پر واضح ہو سکیں۔ اس میں ان کے شاگردوں کا بھی فائدہ ہے۔ ناموزوں عبارت کو موزوں ثابت کرنے کی کوشش میں کسی کا فائدہ نہیں۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

کتاب	موضوع	مصنف	قیمت
انداز گفتگو کیا ہے۔	(تنقیدی مضامین)	شمس الرحمن فاروقی	۵/=
اسرار خودی (فراموش شدہ اڈیشن) (اقبال)	(شعری مجموعہ)	مرتبہ: شائستہ خان	۵/
موربی اور بابلی تہذیب و تمدن	(تاریخ)	مالک رام	۵/
جام جہاں نما۔ اردو صحافت کی ابتدا	(اردو صحافت)	گر بچن چندن	۵/
مسلمانوں کا تعلیمی نظام	(علمی)	ضیاء الحسن فاروقی	۵/
اردو ناول میں عورت کا تصور	(تحقیق)	فہمیدہ کبیر	۵/
نوٹوں کی تلاش	(ناول)	ایاز سیوہاروی	۰/
تاثر نہ کہ تنقید	(تنقید)	صدیق الرحمٰن قدوائی	۱۱/
اپنے دل کی حفاظت کیجیے	((ایلوپیتھی))	ترجمہ نذیر الدین مینائی	۱۵/
یہ صورت گر کچھ خوابوں کے	(انٹرویوز)	طاہر مسعود	۱۶/
مرضیات	(طب)	حکیم نعیم الدین زبیری	۱۱/
بانگ درا	(شعری مجموعہ، طلبہ ایڈیشن)	اقبال	۹/
بال جبریل	(شعری مجموعہ) 〃	〃	۶/
ضرب کلیم مع ارمغان حجاز (اردو نظمیں)	(شعری مجموعہ) 〃	〃	۶/
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی	(ناول)	کشمیری لال ذاکر	۱۸/
گوشے میں قفس کے	(طنزیہ مزاحیہ)	دلیپ سنگھ	۲۵/
سحر کے پہلے اور بعد	(جگ بیتی)	سعید الظفر چغتائی	۱۱/
افکار اقبال	(اقبالیات)	محمد عبدالسلام خاں	۲۵/
فرمان فتح پوری	(شخصیت اور ادبی خدمات)	مرتبہ خلیق انجم	۵/
تذکرہ ماہ و سال	(تذکرہ)	مالک رام	۱۵/
تحقیق نامہ	(تحقیق)	مشفق خواجہ	۱۵/
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان	(مذہب)	حکیم محمود احمد برکاتی	۲۵/
خواب اور خلش	(شعری مجموعہ)	آل احمد سرور	۶/
سفر	(ناول)	رابعہ تبسم	۱۷/
تحریریں	(تنقید)	ڈاکٹر اسلم پرویز	۱۱/
پہچان اور پرکھ	(تنقید)	پروفیسر آل احمد سرور	۱۱/
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	(تحقیق)	ڈاکٹر سلامت اللہ	۱۱/
پت جھڑ کی آواز (نیا اڈیشن)	(افسانے)	قرۃ العین حیدر	۵/
اقبال کا نظریہ خودی	(تحقیق)	عبدالمغنی	۵۰/
سمندری خزانہ	(ناول)	ماریہ رحمان	۷/
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	(تنقید)	وارث علوی	۲۶/
فی الحقیقت	(طنز و مزاح)	یوسف ناظم	۲۵/
مٹی سے ہیرا	(ناولٹ)	سید مقبول احمد	۰/
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	(ناولٹ)	صغرا مہدی	۱۴/
الجھاوے	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف	۱۱/
تمہاری منزل	(شعری مجموعہ)	غلام ربانی تاباں	۲۵/

الد محمود
عبۂ اردو
امعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵

لم میں رنگیں غزلوں کا فن اک غالب اک میر
ہر شاعر کے پکّے دشمن اک غالب اک میر

ہجہ و ہجہ شوخی دوخی سارے ان کے کھیل
دونوں شاطر، دونوں پُرفن اک غالب اک میر

اقی ہیں دنیا میں جب تک دونوں کے دیوان
ہر سچّے شاعر کی اُلجھن اک غالب اک میر

اپس ہی میں بانٹ کے رکھ لی ساری شعر زمین
خالی کر کے فن کا دامن اک غالب اک میر

پیچھے پیچھے سارے شاعر وہ بھی کتنی دور
آگے آگے دو ہی سجن اک غالب اک میر

تنہائی میں سوزِ محبت، محفل میں آواز
شہرِ غزل کے دل کی دھڑکن اک غالب اک میر

ان کے آگے کون جلائے اپنا شعر چراغ
خالد ہیں دو سورج روشن اک غالب اک میر

نسیم سحر
پوسٹ باکس ۵۹۲۵
جدّہ ۲۱۴۳۲ سعودی عرب

غزل

اگر نہ کھولے گی تتلی پروں کے دروازے
رہیں گے بند کئی منظروں کے دروازے

تمام رات ہواؤں کی سنگ باری نے
کیے ہیں کرچیاں شیشہ گروں کے دروازے

مجھے تو ساتویں در کی تلاش کرنا تھی
میں ڈھونڈتا رہا کیوں دوسروں کے دروازے

مسافتوں کا چلن یوں بھی اختیار کیا
کہ ہم پہ بند تھے اپنے گھروں کے دروازے

ہیں اک زمانے سے اس انتظار میں آنکھیں
کبھی تو اُن پہ کھلیں منظروں کے دروازے

اگر شکستہ یہ دیوار جبر ہو نہ سکی
بنائے جائیں گے اس میں سَروں کے دروازے

یہ شہر ایک زمانے سے بے صدا کیوں ہے
گھروں کے ہیں کہ یہ ہیں مقبروں کے دروازے

نسیم دستکیں دینا بھی لازمی ٹھہرا
میں زخم زخم ہوں اور پتھروں کے دروازے

رفعت سروش
۲۔ بی پاکٹ سی سدھارتھ ایکسٹینشن
نئی دہلی ۱۴

ڈاکٹر کرامت علی کرامت
رحمت علی بلڈنگ
دیوان بازار، کٹک

شہر ہوس میں صاحب کردار کی تلاش
جنگل میں جیسے گلشنِ بے خار کی تلاش

اس دھوپ کے نگر میں بگولوں کا رقص ہے
صحرا میں اور سایۂ دیوار کی تلاش

ان کی رگوں میں جذب ہیں تعمیر کے نقوش
خاموش پتھروں کو ہے معمار کی تلاش

بازار میں کھڑا ہوں متاعِ ہنر لیے
میں کب سے کر رہا ہوں خریدار کی تلاش

یہ کیسا شہر ہے مرے دل میں بسا ہوا
جس کو ازل سے ہے در و دیوار کی تلاش

بکھرے پڑے ہیں کوچہ و بازار میں بہت
موضوع کر رہے ہیں قلم کار کی تلاش

تاریخ اپنی آنکھیں مجھے دے کہ لے سروش
ہے مجھ کو عہدِ رفتہ کے آثار کی تلاش

جب کونپلوں سے بھر گئی میرے لہو کی شاخ
ہر چیز میں مجھے نظر آئی نمو کی شاخ

پیوست ہیں زمیں سے سچائیوں کے پیڑ
چھوتی ہے آسماں کو ہر آرزو کی شاخ

چڑیوں کے گھونسلوں کو اُڑا لے گئی ہوا
تنہائیوں میں ڈوب گئی رنگ و بو کی شاخ

تلوار لے کے ہاتھ میں یہ گھومتا ہے کون
کاٹی ہے کس نے شام و سحر آبرو کی شاخ

اک شاخِ غم کو تم نے قلم کیا کیا کہ اب
باغِ جہاں میں پھیل گئی جستجو کی شاخ

حسرت کی تتلیاں ہیں زرِ گل پہ عکس ریز
شاداب کس قدر ہے مری آرزو کی شاخ

بہنے لگا ہوں جب سے کرامت خیال میں
شاخوں میں کتنی بٹ گئی اک آبجو کی شاخ

غلام حسین ساجد
۵۸۔ جناح اسٹریٹ جلالی کالونی
صدیقیہ روڈ۔ بیرون گل گشت، ملتان۔ پاکستان

شبیر احمد قرارؔ
بمبئی۔

غزل
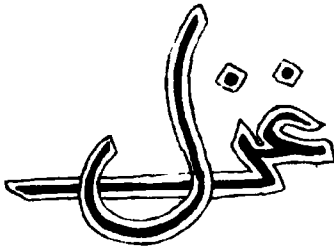
سلے ہوئے ہیں اگر میرے ہونٹ تو کیا غم
زبانِ خلق سے فریاد کر رہا ہوں میں

مرے علاوہ بھی کیا کوئی میرا دشمن ہے
وہ کون ہے جسے برباد کر رہا ہوں میں

بہت طویل ہوئی جا رہی ہے کیوں شبِ ہجر
وہ جانتا ہے اسے یاد کر رہا ہوں میں

فروغ پائے گا جس سے دماغِ آئندہ
وہ طرز تو ابھی ایجاد کر رہا ہوں میں

سُنا رہا ہوں محبت کی داستاں ساجدؔ
کہ ذکرِ صحبتِ صیاد کر رہا ہوں میں

غزل

اَوجِ زورِ بیاں چھپانا ہے
دیکھنا آسماں چھپانا ہے

آتشِ وقت پڑھ رہے سب کچھ
حرفِ توقیرِ جاں چھپانا ہے

بوئے گل کے لیے بھی زنجیریں
کیا ہوا کا بیاں چھپانا ہے

تھکھوں کی چھتوں پہ مت چلنا
یہ تو کچا مکاں چھپانا ہے

سر اڑاں امتحان ہے بابا
حاصلِ امتحاں چھپانا ہے

یہ تبسم چلے چلائے گیا
پائے جو بیں زیاں چھپانا ہے

ایم۔ اے۔ شمسی دوگھروی
مدرس بیت العلوم۔ دیگھیار
دربھنگہ۔ بہار۔

میری پرواز تخیل کی نہیں ہے کوئی حد
تم تو میری عظمتوں سے ہو ابھی تک نابلد

روح کی گہرائیوں سے رنگ بھرتا ہوں جناب
شاعری میری ہے گویا فکر کی جد و جہد

پھر کوئی مظلوم لٹکایا گیا ہے دار پر
ہر طرف سے آ رہی ہے پھر صدائے المدد

یاں تو اپنی کاوشوں کا بھی صلہ پایا نہیں
شہرتوں پہ کیوں مرے احباب کرتے ہیں حسد

میرا ہر فرمان گویا ایک پتھر کی لکیر
کون ہے شمسی جہاں میں میرے جیسا مستند

متین اچلپوری
ندیم بک ڈپو، قاصد پورہ
اچل پور۔ مہاراشٹر۔
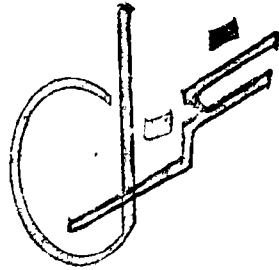
وقت نے گویا پھونکا صور قیامت کا
یعنی اپنے آپ کو ہم تیار رکھیں

ایسا ہی ماحول رہا تو ممکن ہے
طلبہ اپنے بستے میں ہتھیار رکھیں

دشمن کی یلغار نہ ہو تو پھر کیا ہو
خود سو جائیں، ناقص پہرے دار رکھیں

ہم نے قلم اپنا رکھا اس پلڑے میں
اس پلڑے میں آپ بھی تلوار رکھیں

مجھ کو اس کا ملبہ لے کر ڈوبتا ہے
بیچ میں وہ جو ان دیکھی دیوار رکھیں

بات خدا لگتی کہتا ہوں سُن لیجیے!
آپ اب اپنے ہاتھوں سے اخبار رکھیں

اب کے گھاؤ نرالے بھاؤ نرالے ہیں
اپنے فن میں درد جدا فنکار رکھیں

ڈاکٹر ناز آر علامی
۱۰۸، سیکٹر ۱۳، کرنال۔

فیضی کا ایک مقولہ (بہ تسلسل)

کتاب نما (اگست ۱۹۹۲ء) میں ہمارا ایک مضمون بعنوان "فیضی کا ایک مقولہ" شائع ہوا تھا۔ ہم نے مقولۂ فیضی "سخن فہمی عالم بالا معلوم شد" کو تین حقیقی اوزان اور دو بحور میں غوطہ دیا تھا۔

حضرت کمال احمد صدیقی کا ایک مضمون بعنوان "عروض معروض" (کتاب نما ستمبر ۹۲ء) نظر سے گزرا۔ موصوف کا یہ مضمون ہمارے مضمون کے جواب میں ہے۔

حضرت صدیقی صاحب نے اپنے اس مضمون میں ہمیں جن جن خطابات سے نوازا ہے وہ یہ ہیں: ناشناسائے عروض، کم شائستہ، ناسنجیدہ، بے تال ڈگڈگی بجانے والا عروض کے شائع شدہ معظم، نام نہاد عروضی، شائع شدہ مطلق۔ اسقاط حمل کے بعد مردہ بچے کے ناموں سے بحث کرنے والا۔ وغیرہ وغیرہ

ہم اُن کے نہایت احسان مند ہیں۔ انھوں نے جس ڈھنگ سے ہمیں عزت بخشی ہے وہ صرف انھیں کا حصّہ ہے۔

انھوں نے اپنے اس مضمون میں دعوت دی ہے کہ ہم اپنا اور ان کا مضمون پڑھیں اور پھر دیانت داری سے تبصرہ کریں۔ کتاب نما ستمبر ۱۹۹۲ء صفحہ ۳۹ ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:

"حضرت علامہ ناز آر علامی سے گزارش ہے کہ پہلے وہ اپنا مضمون پڑھیں، پھر اس تنگ عروض کی یہ سطور ملاحظہ فرمائیں، اور اس کے بعد پھر ایک بار اپنا فاضلانہ مضمون پڑھیں اور اگر ممکن ہو تو دیانت داری سے تبصرہ فرمائیں"

ہم ڈاکٹر کمال صاحب کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم نے اُن کی ہدایت کے مطابق ہر دو مضامین عنایت توجہ سے مطالعہ کیے ہیں اور جو کچھ بھی لکھ رہے ہیں وہ پوری ذمہ داری سے لکھ رہے ہیں۔

شعرائے عصر حاضر کو ڈاکٹر کمال صدیقی کا اس لیے احسان مند ہونا چاہیے کہ موصوف نے اپنی غلط روی سے راہِ راست کی نشان دہی کی ہے۔

ملاحظہ کیجیے اُن کا یہ جملہ:

"زآر علامی نے کچھ ایسے اسلوب میں، جو بہت شائستہ نہیں ہے، نام لے کر مجھے مخاطب کیا ہے ......" (صدیقی)

ڈاکٹر موصوف کا زآر علامی کے متعلق یہ لکھنا اُن کے مفروضہ احساس برتری کا مظہر ہے۔ ہم نے ایک جملہ بھی اُن کی شان کے خلاف نہیں لکھا تھا۔ ہم نے جو کچھ بھی لکھا تھا وہ اُن کے خط کی روشنی میں لکھا تھا۔ اُن کی تحریر کی زیروکس کاپی دفتر "کتاب نما" میں موجود ہے۔

قارئین ہمارے اگست ۱۹۹۳ء والے مضمون کو پڑھ کر خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ ایسی کون سی بات تھی جس کو پڑھ کر ہمارے مہربان ڈاکٹر موصوف ہم پر اس قدر چراغ پا ہوئے ہیں۔ صدیقی صاحب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ زآر علامی نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ شائستہ تو ہے مگر "بہت شایستہ نہیں ہے"۔ (صدیقی)

خط کشیدہ جملہ لکھنے سے شاید اُن کا نیم شعوری مطلب یہ ہے کہ زآر علامی کا اسلوب اُن کی مفروضہ شان کے شایان نہیں۔

زآر علامی کے متعلق ان کا یہ جملہ:

"اپنی کتابوں اور دوسرے مضامین کی طرح زیر مطالعہ مضمون میں بھی زآر نے خود اپنے قلم سے واضح کر دیا کہ وہ علم اور وہ فن جسے عروض کہتے ہیں، اس سے ان کی شناسائی کتنی ہے۔" (صدیقی)

خاص طور پر قابل توجہ ہے:-

جب کمال صاحب کی نگاہ میں زآر علامی کی عروض سے شناسائی نہ ہونے کے برابر ہے یا تھی تو موصوف کو زآر سے اس مقولہ کی موزونیت اور ناموزونیت کے متعلق کسی قسم کا سوال ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔

ڈاکٹر کمال فرماتے ہیں کہ:

جناب زآر نے اس حقیر کی کتاب "آہنگ اور عروض" پر بھی اعتراض وارد کیے ہیں، اگرچہ موضوع حاضر سے اُن کا کوئی تعلق نہیں تھا"۔ (صدیقی)

ہم نے آہنگ وعروض" پر کوئی بھی اعتراض نہیں کیا۔ ہاں صفحہ ۱۲۲ اور ۲۴۳ کے حوالہ جات کی روشنی میں یہ گزارش کی تھی کہ "کمال صدیقی عمل تخنیق اور تسکین کو ایک ہی جانتے ہیں۔ کمال صاحب کو چاہیے تھا کہ مستفعلُ فاعلات، میں تخنیق کی بجائے "تسکین" کہتے تو زیادہ مناسب تھا"۔ (زآر)

ایسا کہنے سے ہمارا مقصد صرف ترجیح اصطلاح کا اظہار تھا۔

موصوف نے ہمارے اس سمجھاؤ کو اعتراض سمجھا اور ہم پر برس پڑے۔ (ویسے آہنگ اور عروض میں جگہ جگہ صدیقی صاحب کی من مانی اور بے تکی باتوں کے نمونے موجود ہیں)

ہم نے مقولہ فیقی کو بحر مقتضب کے جن اوزان میں غزل دیا تھا وہ یہ ہیں:

۱۔ مفاعیلُ، مفاعلن، مفعولن، فاعلن
مخبون مخبون مرفوع مخبون مخنق

۲۔ مفاعیلُ مفاعلن مفعولاتُ فعل
مخبون مخبون سالم و مرفوع و مخبون مسکن

کمال صاحب کے ارشادات ملاحظہ ہوں:

ا۔ " ان دونوں حاصل کردہ اوزان سے، اس جملہ کی تقطیع تو بے شک ہو جاتی ہے لیکن جو عروض کی ابجد سے ذرا بھی واقفیت رکھتا ہے وہ ایسی بے تالی ڈگڈگی نہیں بجائے گا۔ ۔ ۔ ۔ یہ عروض نہیں " (صدیقی)

ب۔ " اگرچہ مثالیں بحر مقتضب تام (واقی سالم) اور مخبون مقوی کی بھی مل جائیں گی لیکن یہ نادرات میں سے ہیں۔ جو اوزان انھوں نے بحر مقتضب میں تجویز کیے ہیں کیا وہ فارسی میں رودکی سے لے کر فیقی تک کے یہاں اور فیقی کے کسی ہم عصر۔ ۔ ۔ یا کسی شاعر کے یہاں اس آہنگ میں کسی ایک کی بھی غزل ہے ؟ " (صدیقی)

کمال صاحب کی ان دونوں باتوں کا جواب یہ ہے کہ مشاہیر کے کلام سے ہر وزن میں مثالیں تلاش کرنے کا کام صرف وہی لوگ کیا کرتے ہیں جن کا عروض سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ عروض جاننے والے عروض کے قواعد کی بات کیا کرتے ہیں اور ہر اس وزن کو تسلیم کر لیا کرتے ہیں جو قواعد عروض کے تحت حقیقی ہوا کرتا ہے۔

ڈاکٹر کمال صدیقی نے مظفر علی اسیر مترجم "معیار الاشعار" کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"مقتضب! یہ بحر خاص تازیوں کی ہے۔ ۔ ۔ ۔ اور اصل اس کی دائرے میں " مفعولاتُ مس تفعلن مس تفعلن "ہے (حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ دو بار خاص طور سے نوٹ کریں۔) اور مجزو استعمال کرتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ اور صدر و ابتدا درمیان 'فا اور واو' مفعولات کے مراقبہ ہے۔ ۔ ۔ ۔ فعلات نہ ہوگا۔ یا علاتُ ہوگا یا فعولاتُ۔ (صدیقی)

بزعم خود رستم عروض ڈاکٹر صدیقی اس حوالہ کی روشنی میں غالباً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ زار علامی کے تجویز کردہ اوزان اس لیے غلط ہے کہ بحر مقتضب اصل دائرے میں " مفعولاتُ مس تفعلن مس تفعلن " صرف دو بار ہے یعنی فی مصرع تین ارکان ہیں۔ زار علامی کے تجویز کردہ اوزان چار ارکان پر مشتمل ہیں۔

صدیقی صاحب ملاحظہ کریں اپنی تصنیف آہنگ اور عروض صفحہ ۲۱۵ :

" مقتضب مثمن سالم: مفعولاتُ مس تفعلن مفعولاتُ مس تفعلن "

اس مقام پر ڈاکٹر کمال کی تو یہ مثل ہے کہ " اِلّذی نہ اُلّذی " یعنی کہیں کچھ اور کہیں کچھ نہ ادھر کے نہ اُدھر کے۔

ایک بات اور: جب اصل بحر مقتضب صرف ایک رکن گھٹا کر ہی استعمال ہوتی

ہے تو اس کو یعنی ''مفعولاتُ مس تف علن'' کو بحر مقتضب کہنا ہی کیا ضرور
فعلن فاعلن فاعلن (بحر متدارک) ہی کیوں نہ کہا جائے۔
مخبون مخبون سالم سالم

''مفعولاتُ مس تف علن'' کو اس وقت تک مربع نہیں کہا جاسکتا
تک کہ اس بحر کو مثمن نہیں کر لیا جائے گا یعنی اس بحر کا مثمن تسلیم کرنا
ضروری ہے۔

صدیقی صاحب نے مقتضب کو مثمن تسلیم کیا ہے۔ اس کے بعد مقتضب
مربع کی بات کی ہے دیکھیے آہنگ اور عروض'' صفحہ ۲۱۵۔

صدیقی صاحب کے بحر مقتضب کو مثمن تسلیم کرنے بعد مظفر علی اسیر کے
(جس کے بارے میں صدیقی صاحب ''دو بار'' خاص طور پر نوٹ کرنے
لکھا تھا) کیا بنا۔ یہ صدیقی صاحب جانیں۔

اب اپنے گریبان میں نہ جھانکنے والے پیمبرِ عروض جناب صدیقی صاحب
یہ قول بھی دیکھیے!

''پروفیسر نارنگ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر اس کوچے سے گزرے ہوتے تو زارِ علا
لکھے ہوتے پہلے رکن کو دیکھتے ہی اُن کی رائے کو مسترد کر دیتے''۔ (صدیقی)
اس مقام پر میں زار علامی پھر کہتا ہوں کہ ڈاکٹر موصوف کہنے کو تو ایک
کہ جاتے ہیں مگر اس پر......

ڈاکٹر نارنگ تو کوچۂ عروض سے گزرے ہی نہیں لیکن کمال صاحب کو دو
بھی اس کوچہ کی ہوا تک نہیں پہنچی۔ ذیل میں دیکھیے:

ایک طرف تو وہ حوالۂ اسیر سے یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ بحر مقتضب کے صا
میں فاعلات یا فعولات (یعنی مفاعیلُ) رکھا جاسکتا ہے اور دوسری طرف یہ
ہیں کہ نارنگ صاحب زار علامی کے لکھے ہوتے پہلے رکن (مفاعیلُ) کو دیکھتے
اُن کی رائے کو مسترد کر دیتے۔

ہم ان رستمِ عروض سے صرف یہ جاننے کی جرأت کریں گے کہ ''فعولاتُ'' ا
''مفاعیلُ'' میں کیا فرق ہے؟ کیا صدر و ابتدا میں مفاعیلُ لکھنا اس لیے غلط
زار علامی کو اس جگہ ''فعولاتُ'' ہی لکھنا چاہیے تھا۔ سبحان اللہ کیا دلیل۔

کمال صاحب ملاحظہ فرمائیں اپنی تصنیف آہنگ اور عروض صفحہ ۲۲۰ پر لکھ
وزن ۱۰۲:

''مقتضب مسدس، مخبون، مطوی، مطوی مرفل: مفاعیلُ مفتعلن مفتعلا
ڈاکٹر کمال صدیقی صدر و ابتدا میں رکھے ہوتے اپنے اس ''مفاعیلُ'' کے
کیا فرماتے ہیں؟

دراصل ڈاکٹر موصوف مراقبہ کا مفہوم سمجھے ہی نہیں اگر سمجھ لیتے تو مُرغ بے ہنگام نہ بنتے۔ راقبہ کے تحت مفعولات سے فا اور واو، ایک ساتھ گرانا اور رکن (فعلات) بنانا حرام ہے۔ مفاعیلُ نا نا مرام نہیں۔ اتنی وضاحت کرنے کے بعد ہم صدیقی صاحب کی خدمت اقدس میں نہایت وب سے گزارش کریں گے کہ وہ اپنے موقف پر از سر نو غور فرمائیں اور بذریعہ کتاب نما اپنی عروض بی کا ثبوت مہیا کریں۔ "مفاعیلُ" کی بحث ختم ہو جانے کے بعد فیضی کے مقولے کا موزونیت ثابت ہو جاتی ہے۔" (نزار)

ڈاکٹر صدیقی فرماتے ہیں! "معیار الاشعار عروض کی انجیل سمجھی جاتی ہے۔ - - - -" (صدیقی)
"ہر کہ شک آرد کافر گردد" لیکن کیا موصوف خود بھی اس پر ایمان لاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:
زر کامل عیار صفحہ ۸۵:
"تغیر بزیادت - - - - - و دیگر آنکہ سبب خفیف زیادت کنند الا در آخر متفاعلن - - - - درا مرفّل خوانند"
ترجمہ اسیر! "ایک تغیر بزیادت اور بھی ہے وہ سبب خفیف کا زیادہ کرنا ہے کہ آخر متفاعلن ملا پڑتا ہے اور خاص ہوتا ہے - - - - - جیسے متفاعلن سے متفاعلاتن"
ڈاکٹر کمال بزعم عروض فہمی مس تف علن کے مزاحف رکن مفتعلن پر عمل ترفیل فرما رہے ہیں۔
"اللہ کرے ہوش و خرد اور زیادہ"
یہی نہیں بلکہ ڈاکٹر صدیقی نے تو بحر مقتضب کے سالم رکن مس تف علن پر بھی ترفیل کا مل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو آہنگ اور عروض صفحہ ۲۱۴۔
مقتضب مربع، سالم مرفّل: مفعولاتُ مس تفعلاتن (۲ بار)
جناب صدیقی زحاف "رفع" سے متعلق فرماتے ہیں کہ "مفعولاتُ میں سے اگر پہلا سبب گر جائے تو اس کو رفع کہتے ہیں پہلے سبب ہی کا ساکن خبن سے گرتا ہے - - - - لیکن نام نہاد عروض کے شا خدار مطلق نے مقتضب کے تحت دوسرے بنیادی وزن کے آخری رکن پر "رفع اور خبن" دونوں عمیل کر دیے" (صدیقی)
پیشتر اس کے کہ ہم اپنی بات آگے بڑھائیں اور صدیقی صاحب کے اعتراض کا جواب دیں کچھ روضیوں کی تصنیفات سے رفع کی تعریف پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں:۔

۱۔ شروع رکن میں دو میں سے ایک سبب خفیف گرانا ——— احتساب العروض صفحہ ۶۰
۲۔ ایک سبب خفیف کو حذف کرنا، اس رکن سے جس کے ——— آئینہ بلاغت ص ۱۲۲
اوّل میں دو سبب خفیف واقع ہوئے ہوں
۳۔ " " " " " " ——— بحر الفصاحت ص ۱۸۱
۴۔ رکن اوّل کے دو سبب خفیف میں سے پہلے سبب خفیف ——— آئینہ عروض و قافیہ ص ۴۳
کے گرانے کو کہتے ہیں۔

۵۔ مس تف علن اور مفعولات کے دو سبب میں سے ایک کو ساقط کرنا ——— تفہیم العروض ص ۴

۶۔ اصطلاح میں اوّلیں دو سبب خفیف سے ایک سبب خفیف ساقط کرنا ——— نکات العروض ص ۲

ان حضرات کے علاوہ اور اصحاب نے "رفع" کی یہی تعریف کی ہے یعنی دونوں سببوں سے کوئی بھی ایک ساقط کیا جاسکتا ہے۔ کوئی پہلا سبب خفیف گرائیں کہ دوسرا دونوں ڈاکٹر کمال صدیقی ان سب سے ہٹ کر پہلا سبب خفیف ساقط کرنے کے حق جو ترجیح بلا مرجح ہے۔ ملاحظہ ہو آہنگ اور عروض صفحہ : جس رکن کے شروع میں دو خفیف ہوں ان میں سے پہلے کا اسقاط "رفع" کا عمل ہے۔

صدیقی صاحب اعتراض سے پہلے اگر ہمارے مضمون اور "رفع" کی تعریف کو پڑھ اس قسم کے اعتراض نہ کرتے۔ کمال صاحب کا کمال یہی ہے کہ وہ کسی بھی معقول با طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ ہم نے صاف طور پر لکھا تھا کہ "رفع": رکن کے شر دو سببیں خفیف متوالی سے دوسرا سبب خفیف ساقط کرنا۔ (ہم نے دوسرا سبب خفیف خاص مصلحت کے پیش نظر کیا تھا) کتاب نما اگست ۱۹۹۳ء صفحہ ۴۰

کیا زحاف رفع میں سبب کی تخصیص کا حق صرف کمال صدیقی ہی کو ہے۔ نہیں۔ قارئین اس نادر شاہی کو خاص طور پر نوٹ کریں۔

کمال صاحب ہمارا اشارہ سمجھے ہی نہیں۔ وہ خاص مصلحت یہی تھی کہ دوسرا خفیف گرانے کے بعد پہلے سبب خفیف پر خبن کا عمل بآسانی ہوسکتا ہے۔

عروض کوئی الہامی علم تو ہے نہیں کہ اس پر ترمیمات تنسیخات اور اختراعات کے تمام در ہمیشہ کے لیے بند ہو کر رہ جاتے ہیں۔ موصوف ہماری اس ترمیم پر غور فرمائیں۔

جناب کمال کا ایک کمال یہ بھی دیکھیے۔ فرماتے ہیں : زار کو "اگر عروض کی ذ شُدبُد ہوتی تو آخری رکن کی حیثیت سے "فَعِلُن" بھی تراشا جاسکتا تھا۔ مس تف مخبون مطوی مقطوع، فَعِلُن ہے۔ (صدیقی)

لاحول ولا قوۃ ۔ ۔ ۔ ۔ زار علامی کو نام نہاد شارح دار علم عروض بتانے وا عروض حضرت صدیقی صاحب عروض کے تمام احکامات کی خلاف ورزی فرما کر مس تف کے سببیں خفیف پر بیک وقت خبن اور طے کا عمل فرما رہے ہیں۔ زار کو یہ شُد کیا یہ حکم مراقبہ کی تعمیل حسنہ ہے ؟

کمال صاحب نے اسی مقام پر نہیں بلکہ اور مقامات پر بھی اس قسم کی فحش غل کی ہیں۔

ملاحظہ ہو آہنگ اور عروض صفحہ ۷ : مس تف علن کی فرع "فعلتن"۔ مس او کے ساکنیں ایک ہی سانس میں گرا دینے کے ہیں۔

تخنیق اور تسکین کی وضاحت کرتے ہوئے جناب کمال نے خورشید لکھنوی کی کتاب "افادات" کا ذکر کیا ہے :-

تسکین : اسکانِ حرف وسطی از سہ متحرک، متوالی در یک رکن
تخنیق " در ترکیب دو رکن "

زار علامی کی نظر سے یہ تعریف اوجھل نہیں۔

زار علامی نے تخنیق کی یہ تعریف کر کے : "وتد مجموع سے پہلا حرف ساکن کرنا اور ماقبل رکن کے حرف آخر متحرک سے پیوست کرنا"

یہ سہولت بہم پہنچائی تھی کہ فقط مخنق دیکھتے ہی یہ بات سمجھ میں آ جائے کہ جن ارکان پر یہ عمل ہوا ہے اُن میں پہلا رکن متحرک الآخر ہے اور دوسرا رکن وتد مجموع سے شروع ہونے والا رکن ہے۔ ایسی صورت میں صرف ایک رکن کا نام لینا پڑتا ہے یعنی مفاعیلُ مفاعی لن بذریعہ تخنیق

مفاعی لن مفعولن ہو سکتے ہیں۔
مکفوف سالم مخنق

لیکن بقول خورشید لکھنوی اور کمال صدیقی اگر یہاں تسکین کی بات کی جائے گی تو اس طرح لکھا جائے گا :

مفاعی لن مفعولن
مکفوف وسالم مسکن

کمال صاحب جب مستفعلُ اور فاعلاتُ پر عمل تسکین فرمائیں گے تو دونوں ارکان کا نام لینا ہوگا یعنی : مستفعلُ فاعلاتُ (یہ ارکان بحر مجتث سے تعلق رکھتے ہیں)
مکفوف و مکفوف مسکن

ہمارے کرم فرما "مفعولاتم" (جو بحر مقتضب کے دوسرے وزن میں لکھا گیا ہے) کے متعلق معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ : "یہ مفعولاتم کون سا مزاحف ہے مفعولاتن کیوں نہیں ؟" (صدیقی)

مفعولاتم اس لیے کہا گیا ہے کہ سمجھنے والے "مفعولاتن" کو مفعولن پر ایک سبب خفیف کا اضافہ نہ سمجھ لیں۔ مفعولاتم کہنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ایسا رکن ہے جس کا تعلق اپنے مابعد رکن سے ہے۔

اس کے علاوہ ایک بات اور۔ جب فعلُ کو فاعِ، فعولاتُ کو مفاعیلُ فعولُ کو مفاعُ۔ فاعلات، کو فاعلان کہا جا سکتا ہے تو مفعولاتم اور مفعولاتن میں بھی کوئی فرق نہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ اس رکن کو مفعولاتن نہ سمجھا جائے۔

بسلسلہ تسکین، کمال صاحب کی جادوگری کا ایک نمونہ دیکھیے۔ آہنگ اور عروض صفحہ فرماتے ہیں :

"فَعِلَتُن میں چار متحرک ساتھ ساتھ ہیں۔ 'ل' کو ساکن کرنے سے "فَعِلْتُن"
ہوتا ہے جو فعولن کا وزن ہے۔"

پہلی غلطی تو یہ کہ فَعِلَتُن خلاف مراقبہ رکن ہے۔

دوسری غلطی یہ کہ بذریعہ تسکین تین متحرک متوالی سے درمیان کا حرف ساکن ہونا چاہیے لیکن ساحرِ عروض دوسرے حرف متحرک کی بجائے تیسرا حرف متحرک کو ساکن فرما رہے ہیں۔ یہ تمام کمال صاحب کی عروضی شُد بُد کا کرشمہ ہے کہ موصوف بے تال کی ڈگڈگی بجا رہے ہیں۔

اس تمام بحث کو سمجھ لینے کے بعد قارئین خود فیصلہ فرما لیں گے کہ بحر مقتضب میں تجویز کردہ دونوں اوزان صدفی صد درست ہیں اور عین عروضی احکامات کے تابع ہیں۔

اب ہم بحر ہزج کے اُس وزن کی طرف آتے ہیں۔

وزن:-	مفاعیلُ	فعولُ	مفاعی لن	فاعلن
	مکفوف	محذوف مقبوض	مکفوف	مقبوض مخنق

جناب صدیقی "فعول" بہ تحریک لام کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

"ہزج میں فعولُ کوئی مزاحف ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ رُباعی کے آخری ارکان کو چھوڑ کر اور کہیں حکم معاقبہ کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی۔ مفاعی لن کے دونوں اسبابِ خفیف سلامت تو رہ سکتے ہیں لیکن دونوں ساقط نہیں کیے جا سکتے۔ ۔ ۔ ۔" (صدیقی)

رُباعی میں آنے والا 'فعولْ'، بسکون لام دو زحافات کا مرہونِ منت ہے
علہ حذف علا قصر یعنی اہتم۔

رُباعی میں اس کی اجازت ہے۔ کیوں؟ اس پر صدیقی صاحب نے کوئی روشنی نہیں ڈالی جب رباعی میں اس کا رکھنا جائز سمجھ لیا گیا ہے، تو فعولُ بحرکت 'ل' کو بھی جائز قرار دیا جانا چاہیے چونکہ اس فعولُ کو حاصل کرنے کے لیے حذف اور قبض کا عمل ہوا۔

فعولْ بسکون لام اور فعولُ بہ تحریک لام میں حذف کا عمل مشترک ہے فعولْ بسکون لام میں قصر کے ذریعہ مفاعی لن کے پہلے سبب خفیف پر آخری سبب خفیف کو گرا کر قصر کا عمل ہوا ہے۔ اسی طرح فعولُ بہ تحریک لام میں آخری سبب خفیف گرانے کے بعد یا گرانے سے پہلے قبض کا عمل ہوا ہے۔ دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ ایک جگہ حرف ساکن کو گرایا گیا ہے اور دوسری جگہ حرف متحرک کو گرایا گیا ہے لیکن ہر دو صورتوں میں مفاعی لن کے دونوں سبب خفیف متاثر ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب فعولْ بسکون لام کا استعمال جائز ہو جاتا ہے تو فعولُ بہ تحریک لام کا استعمال بھی جائز ہو جاتا ہے۔

جناب کمال نے آہنگ و عروض صفحہ ۱۱ پر ایک رکن مفاعِلُ اور دوسرا رکن فاعِلُ دیا ہے دونوں رکن مفاعی لن کے سببیں خفیف پر بیک وقت قبض اور کف کے عمل سے حاصل کیے گئے ہیں۔ صدیقی صاحب اپنے وضع کردہ ان ارکان کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ کیا یہاں خلاف ورزی قانونِ عروض نہیں؟

اب رہی فعولُ کے حشو میں رکھنے کی بات۔ جب یہ رکن صحیح ہے اور متحرک الآخر ہے تو حشوین اور صدر و ابتدا میں نہ رکھنے کی کوئی وجہ نہیں۔

معلوم ہونا چاہیے کہ مفعولاتُ سے فاعِ (مطوی واصلم)

فاعلاتن سے فعَلُ (مجبوب)

متحرک الآخر ہونے کے سبب صدر و ابتدا اور حشوین میں وارد ہو سکتے ہیں۔

قارئین اب خود فیصلہ فرمالیں کہ مقولۂ فیضی موزوں ہے کہ نہیں۔

اپنے دل کی حفاظت کیجیے

ڈاکٹر لیفٹیننٹ کرنل کے۔ ایل۔ چوپڑا
ایف۔ آر۔ سی۔ پی

ترجمہ: نذیرالدین مینا ئی

خدا نہ کرے کسی کو دل کا دورہ پڑے۔ اور کچھ نہیں احتیاطی تدابیر تو کر ہی سکتے ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر کے۔ ایل۔ چوپڑا نے دل کا فعل۔ دل کا دورہ۔ قلبی انجو گرا فی بائی پاس سرجری سبھی کچھ بیان کر دیا ہے۔ کتاب بالضرور مطالعہ کیجیے۔ قیمت -/۷۵ روپے

خواب اور خلش (شعری مجموعہ)

آل احمد سرور

شاعری ذات سے کائنات تک کا سفر ہے یہ خوابوں کے ذریعے حقائق کی توسیع کا نام ہے۔ بڑی شاعری تجربے سے مدد لیتی ہے مگر وہ روایت اور تجربے میں ایک توازن رکھتی ہے۔ آل احمد سرور کی شاعری صرف الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں بلکہ اس میں معانی کا ایک سمندر ہے جس کی تہہ میں پہنچ کر ہی موتی نکالے جا سکتے ہیں۔ قیمت -/۶۶ روپے

جامِ جہاں نما

اردو صحافت کی ابتداء

گربچن چندن

ہندستان میں اردو صحافت کے آغاز کے بارے میں نئی دریافتوں کی حامل یہ کتاب پہلی بار ان حقائق کو پیش کرتی ہے جو اب تک نیشنل آرکائیوز آف انڈیا اور برٹش لائبریری کے شیشے محترق میں مستور تھے۔ مصنف نے اوریجنل ریکارڈ کے مشاہدے کے بعد مسلمہ نظریات کا بیباک جائزہ لیا ہے اور اردو کے اس اولین مطبوعہ اخبار کے حقیقی موقف کردار اور مرتبے کی صراحت کی ہے۔ مزید اس حقیقے کی نشاندہی کی ہے جو ۱۹ ویں صدی میں ہندستانی اردو صحافت کی پیش رفت میں جامِ جہاں نما نے ڈالا۔ قیمت -/۷۵ روپے

غبارِ منزل (شعری مجموعہ) غلام ربانی تاباں

اردو کے ممتاز شاعر جناب غلام ربانی تاباں کی غزلوں نظموں اور قطعات کا تازہ مجموعہ جس میں "سازِ لرزاں"، "ذوقِ سفر" اور "نوائے آوارہ" کا انتخاب بھی شامل ہے۔ قیمت -/۴۵ روپے

مجتبیٰ حسین
۷۰۰۔ رنکورا اپارٹمنٹس
پلاٹ نمبر ۷۔ پٹ پڑ گنج
نئی دہلی ۹۲

زندہ رہ کر ادب میں خلا پیدا کرنا بڑی بات ہے

جناب مظفر حسین برنی سابق گورنر ہریانہ نے پچھلے دنوں مجھے فون کیا اور دکن کے ایک ممتاز شاعر کا حوالہ دے کر مجھ سے پوچھا کہ اِن کا انتقال کس سنہ میں اور کس تاریخ کو ہوا تھا۔ میں نے کہا "اُنھیں تو اس دنیا سے رخصت ہوئے دس گیارہ برس بیت چکے ہیں۔ صحیح تاریخ وفات تو مجھے بھی یاد نہیں ہے۔ یوں بھی اردو معاشرہ میں سے جب بھی کوئی بڑا شاعر رخصت ہوتا ہے تو ہم لوگ یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دے لیتے ہیں کہ اس کی شاعری تو ہمیشہ زندہ رہے گی۔ (یہ سوچے بغیر ہی کہ جس زبان میں وہ شعر کہتا رہا ہے وہ خود بھی زندہ رہے گی یا نہیں)۔ یوں ہم تاریخ وفات کو یکسر بھول جاتے ہیں کیونکہ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ شاعر کی جسمانی موت اور اس کی ادبی موت دونوں کبھی ایک ساتھ واقع نہیں ہو سکتیں۔ پھر ہم یہ مان کر بھی چلتے ہیں کہ کسی اچھے شاعر یا ادیب کے گزر جانے سے ادب میں خلا پیدا ہو جاتا ہے لیکن ہماری نظر اس حقیقت کی طرف بالکل نہیں جاتی کہ ہمارے ہاں بعض شاعر ایسے بھی ہیں جن کے پیدا ہو اور زندہ رہنے کی وجہ سے لگاتار اور مسلسل خلا پیدا ہوتا رہتا ہے۔ مر کے خلا پیدا کرنا تو سب کو آتا ہے لیکن جیتے جی خلا پیدا کرنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔

برنی صاحب بولے "حضرت! آپ پھر مذاق پر اُتر آئے۔ مجھے اپنے ایک مضمون کے سلسلہ میں اس مرحوم شاعر کی تاریخ وفات درکار ہے"۔ میں نے انھیں مذکورہ تاریخ وفات فراہم کرنے کا وعدہ کیا اور فون کا ریسیور رکھ دیا۔

پھر اچانک مجھے آنجہانی مالک رام یاد آ گئے تو بس یاد آتے ہی چلے گئے۔ وہ مشہور زمانہ محقق اور ماہر غالبیات تو تھے ہی لیکن عمر کی آخری دو دہائیوں میں وہ ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کا تذکرہ لکھنے میں پوری تن دہی کے ساتھ مصروف رہے۔ جب بھی دنیا کے کسی گوشہ میں اردو کا کوئی ادیب یا شاعر گزر جاتا تو وہ اس کی تاریخ پیدائش سے لے کر تاریخ وفات تک کے حالات اکٹھا کرنے میں جٹ جاتے تھے۔ آنجہانی مالک رام، جنھوں نے اسّی سے اوپر کی بھرپور عمر پائی اور جو ابھی دو تین مہینے پہلے ہم سے جدا ہوئے۔ مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ مجھ سے جو ان کا رشتہ تھا اور دکن سے جو میرا رشتہ رہا ہے اس کے پیش نظر جب بھی دکن کا کوئی شاعر یا ادیب دنیا سے اُٹھ جاتا تو اُن کے فون پر فون آنے لگتے کہ فلاں کا

سنہ پیدائش بتاؤ۔ تاریخ وفات اور وفات کے صحیح وقت اور مقام پر روشنی ڈالو۔ بلکہ ایک منزل تو یہ آگئی تھی کہ جب بھی مجھے پتا چلتا کہ ان کا فون آیا ہے تو میں بوجھل قدموں کے ساتھ چلتے ہوئے اپنا کلیجہ تھام کر فون کا ریسور اٹھاتا تھا اور خدا سے دعا مانگتا تھا کہ وہ مجھ میں مالک رام صاحب کے فون کو سننے کا حوصلہ پیدا کرے۔ ایک بار یوں بھی ہوا کہ میرا فون دو ہفتوں تک "ڈیڈ" رہا۔ (یہ میری زندگی کے نہایت خوشگوار دن تھے)۔ اس بیچ مالک رام صاحب ایک محفل میں مل گئے، چھوٹتے ہی کہنے لگے "میاں! ادھر دو ہفتوں سے تمہارا فون "ڈیڈ" ہے اور اُدھر دکن میں دو ادبی ہستیاں بھی "ڈیڈ" ہو چکی ہیں۔"

میں نے کہا "مالک رام جی! اس بار آپ اپنے رسالہ کی "وفیات" میں میرے فون کا تذکرہ لکھ دیجیے۔ بخدا میں دکن کی ادبی شخصیتوں کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں جمع کرتے کرتے عاجز آچکا ہوں۔ آپ یہ کام مجھے کیوں سونپتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو آپ کسی کسی ادبی شخصیت کی تاریخ وفات کچھ اس طرح دریافت کرتے ہیں جیسے اس کی وفات کا واحد سبب میں ہی ہوں، اور سچ بات تو یہ ہے کہ دو ایک ایسے شاعروں کی وفات کی تاریخیں بھی آپ نے مجھ سے پوچھی ہیں جنھیں تلاش کرنے کی جستجو میں مجھ پر پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ یہ ہستیاں ادب میں پیدا بھی ہوئی تھیں۔

بے تحاشا ہنستے ہوئے بولے "میاں! تاریخ وفات کے معاملہ میں تم بہت معتبر آدمی ہو"

میں نے کہا "مگر دو ایک معتبر آدمی اور بھی ڈھونڈ رکھیں تو اچھا ہے۔ مان لیجیے کل کے دن میری ہی وفات ہو جاتی ہے تو آپ میری تاریخ وفات کس سے پوچھتے پھریں گے۔ ایسے کاموں میں کم سے کم چار آدمی تو لگتے ہی ہیں"

آنجہانی کی حس مزاح بہت تیز تھی۔ بولے "تم فکر نہ کرو۔ ابھی تو میرے قویٰ مضبوط ہیں یہ کام تو میں خود ہی کر لوں گا"

اب مالک رام خود ہمارے درمیان نہیں رہے مگر جب تک زندہ رہے بہت محنت کے ساتھ ہم عصر ادبی شخصیتوں کے تذکرے لکھتے رہے۔ میں ان سے اکثر کہا کرتا تھا کہ جتنی محنت آپ کسی ادبی ہستی کے مرنے کے بعد کرتے ہیں اتنی ہی محنت آپ اس کی زندگی میں اس پر کرتے تو شاید وہ کوئی کارنامہ انجام دے جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک مالک رام زندہ رہے اردو کے ادیب اور شاعر لائن لگا کر خوشی خوشی اس دنیا سے رخصت ہوتے رہے کہ ان کے بعد کوئی ان کا تذکرہ لکھنے والا تو موجود ہے۔ پچھلے دنوں دہلی کی ایک محفل میں مالک رام صاحب کا ذکر آیا تو میں نے دوستوں سے کہا "مالک رام جی کے اس دنیا سے رخصت ہونے سے اردو تحقیق کا جو نقصانِ عظیم ہوا ہے سو ہوا ہے لیکن ایک نقصان یہ بھی ہوا ہے کہ اب اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے مرنا چھوڑ دیا ہے۔"

پہلے تو لوگ اس جملے پر ہنستے رہے لیکن بعد میں حساب جوڑ کر دیکھا تو اچانک سنجیدہ ہو گئے

کیونکہ واقعی ان کے بعد اردو کی کوئی قابلِ لحاظ ہستی اس دنیا سے نہیں اٹھی۔

دوستوں نے کہا یار! واقعی تم سچ کہہ رہے ہو۔ میں نے کہا " میں سچ کے سوا کچھ کہتا ہی نہیں۔ تم خود دیکھ لو کہ ہم اردو کے ادیب اور شاعر کتنا سوچ سمجھ کر مرتے ہیں۔ بھلے ہی ہماری زبان مر جائے لیکن ہم خود یوں بے موت نہیں مریں گے۔ اب کون ہے جو ہمارا تذکرہ لکھے گا جب کوئی لکھنے والا ہی نہیں ہے تو ہم کیوں خالی پیلی مفت میں مر جائیں "

الغرض جناب برنی صاحب نے مجھ سے مذکورہ شاعر کی تاریخ وفات پوچھی تو میں کچھ سوچ میں پڑ گیا کہ لوگ آخر کیوں مجھ سے وفات کی تاریخیں پوچھتے ہیں، برنی صاحب چونکہ میرے بزرگ ہیں ان کے حکم کی تعمیل بھی ضروری تھی۔ مجھے اچانک اپنے ایک دوست کا خیال آگیا جو مرحوم شاعر کے زبردست عقیدت مند رہے ہیں۔ نوجوانی میں انھیں شاعر مذکور کی بے شمار نظمیں زبانی یاد تھیں۔ یہ ضرور ہے کہ یہ حضرت چار پانچ برس تک کے لیے آسٹریلیا چلے گئے تھے مگر اب تو ہندستان واپس آچکے ہیں بلکہ انھیں واپس آئے ہوئے بھی پانچ چھے برس بیت گئے ہیں۔ سو میں ان کے ہاں چلا گیا اور جب ان کے محبوب شاعر کی تاریخ وفات پوچھی تو ان پر سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ وہ دیوان خانہ کے وسط میں کھڑے تھے۔ میری بات کو سن کر قریبی دیوار تک گئے اور دیوار سے اپنا سر ٹکرا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ بولے " یہ سانحہ کب ہوا! کیسے ہوا کہاں ہوا! کیوں ہوا؟ " پھر میرے سینے سے لپٹ گئے اور جو سلوک وہ کچھ دیر پہلے تک معصوم دیوار کے ساتھ کر رہے تھے میرے مظلوم سینے سے کرنے لگے۔ میں انھیں صبر کی تلقین کرتا رہا۔ دلاسے دیتا رہا لیکن ان کے آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ میں نے غصے سے کہا " یار یہ کیا تماشا کر رہے ہو، تمھارے محبوب شاعر کو گزرے ہوئے پورے دس گیارہ برس بیت چکے ہیں اور تم یوں اظہار غم کر رہے ہو جیسے ابھی دو منٹ پہلے ان کی آخری سانس اکھڑی ہے "

وہ مجھ سے زیادہ طیش میں آکر بولے " تم اس سانحہ کو اتنا لائٹلی (LIGHTLY) لے رہے ہو! تمھیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ کتنا بڑا شاعر ہمارے بیچ سے اٹھ گیا۔

میں نے کہا " اس سانحہ کا جتنا عظیم ترین دکھ ہو سکتا تھا وہ میں دس گیارہ برس پہلے ہی برداشت کر چکا ہوں۔ تم پھر مجھے کیوں اس سے گزارنا چاہتے ہو۔ یہ سانحہ ہے کوئی اچھا شعر نہیں ہے کہ آپ شاعر سے اسے مکرر پڑھنے کو کہیں اور جب وہ مکرر پڑھے تو آپ پہلے سے کہیں زیادہ داد اس پر دیں۔ سچے سانحہ اور اچھے شعر میں یہی تو فرق ہوتا ہے " بولے " مگر میں کیا کروں۔ مجھے تو اب ان کے انتقال کی خبر ملی ہے "

میں نے کہا " میں تمھاری لاعلمی اور جہالت پر تو خون کے آنسو رو سکتا ہوں لیکن جس دکھ میں تم اب بعد از وقت مبتلا ہو اس میں تمھارا شریک نہیں بن سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پچھلے دس بارہ برسوں میں تم نے اپنے محبوب شاعر کی کوئی ٹوہ ہی نہیں لی "

بولے " تم جانتے ہو کہ پانچ چھے برس تو آسٹریلیا میں ہی رہا، وہاں سے واپس آیا تو حالات

کچھ ایسے پیدا ہوگئے کہ اردو شعر و ادب سے کوئی رشتہ ہی نہیں رہا"

یہ سُن کر میں اپنے دوست کو روتا دھوتا چھوڑ کر واپس چلا آیا۔ سوچا کہ برنی صاحب کو فون کر کے کہہ دوں کہ شاعر مرحوم کی تاریخ وفات تو نہیں معلوم ہوسکی البتہ خود اردو زبان کی تاریخ وفات کے بہت جلد معلوم ہونے کے آثار نمایاں ہوتے جارہے ہیں۔ چنانچہ میں نے انھیں فون بھی ملایا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا برنی صاحب نے کہا "بھئی! بہت بہت شکریہ! مجھے "سیاست" سے مرحوم شاعر کی تاریخ وفات معلوم ہوچکی ہے"

میں نے کہا "اس میں شکریہ کس بات کا" اور یہ کہہ کر میں نے رسیور رکھ دیا۔

کتاب نما کے چند خصوصی شمارے

کتاب نما کے مندرجہ ذیل خصوصی شماروں پر کتاب نما کے خریداروں کو ۲۵٪ کمیشن دیا جائے گا۔ ڈاک خرچ بذمہ خریدار (ادارہ)

علی سردار جعفری

(شخصیت اور ادبی خدمات)

ترتیب ______ رفیعہ شبنم عابدی

سردار جعفری کی شخصیت میں بیک وقت کئی شخصیتیں سانس لے رہی ہیں۔ وہ کون سا میدان ہے جہاں سردار جعفری اپنے فکر و نظر کی جولانیاں دکھاتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ صحافت ہو یا ادب، فلم ہو یا ٹی وی ریڈیو ہو یا اسٹیج، خطابت ہو یا شاعری! ان کی مکمل شخصیت کا بھرپور جائزہ۔

قیمت -/۵۴ روپے

پروفیسر مسعود حسین خاں

(علمی، لسانی اور ادبی خدمات)

مرتبہ ______ ایم حبیب خاں

کتاب نما کے اس خصوصی شمارے میں اردو کے ممتاز ادیب، ماہر لسانیات اور محقق جناب مسعود حسین خاں کی خدمات کے اعتراف میں اردو کے ۱۲ ممتاز ادیبوں کی نگارشات کا مجموعہ۔

قیمت -/۵۴ روپے

خواجہ احمد فاروقی

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ______ ڈاکٹر خلیق انجم

اردو کے نامور ادیب، ممتاز نقاد، انتظامی امور کے ماہر، سابق صدر شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی (جن کے عہد میں شعبۂ اردو، اپنے کارہائے نمایاں کے لیے پورے ہندستان میں مشہور تھا) کی علمی، ادبی خدمات کا اعتراف نہ صرف ان کے شاگردوں نے بلکہ ممتاز ادیبوں نے بھی کیا ہے۔

قیمت -/۵۴ روپے

عابد علی خاں

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ______ مجتبیٰ حسین

عابد علی خاں مرحوم ایک انجمن کا نام ہی نہیں ایک تحریک کا نام بھی تھا۔ اس خصوصی شمارے میں ملک کے ممتاز ادیبوں نے مرحوم کی علمی، ادبی، سماجی اور صحافتی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔

قیمت -/۵۴ روپے

ڈاکٹر اجمل اجملی

(حیات اور ادبی خدمات)

مرتبین ______ ڈاکٹر علی احمد فاطمی / عذرا نقوی

اردو، ہندی کے ممتاز ادیبوں کی اہم نگارشات کا مجموعہ، جس میں ڈاکٹر اجمل اجملی کی ادبی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا گیا ہے۔

قیمت -/۵۴ روپے

پروفیسر آل احمد سرور

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتب ______ ڈاکٹر خلیق انجم

پروفیسر آل احمد سرور، اردو کے ایک مشفق اور مقتدر استاد بھی ہیں اور صاحب طرز انشا پرداز بھی۔ ادب کے اعلا نقاد بھی ہیں اور زبان کے نباض بھی۔

قیمت -/۵۴ روپے

ڈاکٹر فرمان فتح پوری
(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ——— خلیق انجم

فرمان فتح پوری کا خاکہ جن رنگوں سے بنا ہے وہ طرح دار، دلکش، دلربا، تابناک اور پایدار ہیں۔ کتاب نما نے اس خصوصی شمارے میں انھیں رنگوں کی جھلک پیش کی ہے۔ اردو کے بلند پایہ ادیب، نقاد، مدیر کی خدمت میں اردو کے ممتاز ادیبوں کا خراج عقیدت۔

قیمت -/۲۵ روپے

اختر سعید خاں
(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ——— ڈاکٹر سید حامد حسین

اختر سعید خاں نے جہاں غزل کی روایت کا احترام سیکھا وہیں شعر کے تخلیقی منصب کی پاسداری بھی سیکھی۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے انھیں زندگی کا ایک واضح شعور بخشا۔ اردو کے ممتاز غزل گو شاعر کی شخصیت اور فن پر ایک اہم شمارہ۔

قیمت -/۵۱ روپے

مکتبہ پیام تعلیم کی نئی کتابیں

اپریل ۹۳ء تا ستمبر ۹۳ء

سفر کے تحفے	آصف فرخی	-/۵
حضرت آدم علیہ السلام	منورہ نوری خلیق	-/۴
ہم بنے کمانڈو	منیر احمد راشد	-/۵
خواجہ غلام السیدین (سوانح)	ذکیہ ظہیر	-/۵
میر امّن دلی والے (سوانح)	ڈاکٹر اسلم فرخی	۴/۵۰
میرزا ادیب (سوانح)	طاہر مسعود	۴/۵۰
تین بندوقچی (ناول)	مسعود احمد برکاتی	-/۱۰

مکتبہ پیام تعلیم کی کتابوں کے نئے اڈیشن

اپریل ۹۳ء تا ستمبر ۹۳ء

رسول پاک کے اخلاق	خلیل احمد جامعی	-/۴
جادو کی ہنڈیا	(ادارہ)	-/۶
چاند کی بیٹی	″	-/۶
کوّے کا خواب	″	۷/۵۰
ابو علی کا جوتا	″	-/۶
عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں	انور خاں	۷/۵۰
کھلونا نگر	(ادارہ)	۸/۵۰
سمندری طوفان اور تین لڑکے	″	/۶

مطبوعات مکتبہ جامعہ کے نئے اڈیشن

اپریل ۹۳ء تا ستمبر ۹۳ء

تاریخ الامّت دوم	مولانا اسلم جیراجپوری	-/۲۱
تاریخ الامّت ششم	مولانا اسلم جیراجپوری	-/۲۷
ورک بک آسان اردو	شکیل اختر فاروقی	-/۲۶
ہمارا دین اوّل	سید شہاب الدین دسنوی	۸/۵۰
″ دوم	″	۸/۵۰
مقدمہ شعر و شاعری	مرتبہ رشید حسن خاں	-/۲۷
بانگ درا	علامہ اقبال	-/۹
بال جبریل	علامہ اقبال	-/۶
ضرب کلیم مع ارمغان حجاز	″	-/۶
شعور ادب	(ادارہ)	-/۲۱
واردات	پریم چند	-/۲۱
ایک چادر میلی سی	راجندر سنگھ بیدی	-/۱۸
تاریخ الامّت اوّل	مولانا اسلم جیراجپوری	-/۱۸
دروازے کھول دو	کرشن چندر	۶/۵۰
دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	-/۲۷
انتخاب قلی قطب شاہ	محمد اکبرالدین صدیقی	-/۲۷
انتخاب اکبر الٰہ آبادی	صدیق الرحمن قدوائی	-/۱۲

وجاہت علی سندیلوی
نصرت منزل۔ سندیلہ۔ یو۔ پی

بات چھتری کی

چھتری میں لاکھ اچھائیاں ہوں، لیکن یہ ایک برائی کہ وہ کھوتی بہت ہے، ہمارے خیال میں سب اچھائیوں پر پانی پھیر دیتی ہے۔ لیکن کچھ لوگوں کو اس کا یہ کھوجانا بھی اس کی ایک خوبی نظر آتی ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے ان کی 'قدیم' چھتری رفتہ رفتہ جدید سے جدید تر ہوتی جاتی ہے۔ اور وہ جوانی سے بڑھاپے کی طرف کے بجائے 'بڑھاپے سے جوانی کی طرف قدم بڑھاتی نظر آتی ہے۔ سات آٹھ ماہ ہوئے ہمارے دوست اپنی قاضی چھتری لگائے ہمارے غریب خانے پر نازل ہوئے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی چھتری لگا کر کسی کے یہاں جاتا ہے تو وہ 'ناوقت' ہی ہوتا ہے۔ یعنی یا تو تیز دھوپ ہوتی ہے یا پٹیا پانی برستا ہے۔ قاضی بھی ایک تپتی ہوئی گرم دوپہر کو ٹھیک اس وقت پہنچے تھے جب بجلی سے دو گھنٹے آنکھ مچولی کھیلنے کے بعد ہم "ٹک' سو گئے تھے۔ ہمیں ان پر بڑا غصہ آیا۔ لیکن ان کی خستہ' بوسیدہ اور ٹیڑھی بینچی تیلیوں والی چھتری دیکھ کر ہم ازراہ ترحم کچھ نہیں بولے۔ کچھ دنوں بعد ایک تقریب سے واپسی پر وہ ہمیں ملے تو ہم نے ان کے ہاتھ میں ایک مقابلتاً' تندرست' چھتری دیکھی۔ ہم نے پوچھا " نئی خریدی ہے؟" کہنے لگے " کیا بتاؤں ان چھتریوں کو بھی بدل جانے کا خبط ہوتا ہے۔ میری آزمودہ کار جرمنی نژاد کے بدلے اب یہ سودیشی میرے پلے پڑی ہے۔"

ابھی آٹھ دن ہوئے قاضی صاحب ایک رات کو ہمارے گھر موسلا دھار بارش میں چلتے کیا بہتے ہوئے آئے تو ہم نے انھیں بٹن سے کھلنے والی بالکل نئے 'فیشن' کی چھتری کے سایۂ عاطفت میں پایا۔ ہم اپنے تجسس کو دبا نہیں پائے اور رسمی صاحب سلامت کے بعد پوچھ ہی بیٹھے۔ " بھئی قاضی آج تمھاری چھتری تمھارے ہی نہیں بلکہ موسم کے بھی

شایانِ شان ہے۔"

کہنے لگے "تم بھی حوب الانسان ہو۔ موسم کا تقاضا تو کچھ اور ہے لیکن بدقسمتی سے ہم دونوں ہی اس کے برتنے سے محروم ہیں۔ لہٰذا تم کم از کم کافی ہی پلاتے! اس کے بجائے تم میری چھتری کا سلسلۂ نسب پوچھنے بیٹھ گئے ہو۔"

ہم نے عرض کیا "کافی کی جانب سے بے فکر رہیے، وہ آ رہی ہے۔ جس طرح مجنوں کو لیلیٰ کے ساتھ سگِ لیلیٰ بھی عزیز تھا اسی طرح مجھے بھی تمھارے ساتھ تمھاری چھتری بھی عزیز ہے۔ جو روز نئے چولے بدلا کرتی ہے۔"

ہنستے ہوئے کہنے لگے۔ "بھئی اس چھتری کا بھی عجیب قصہ ہے۔ یہ اس وقت تو میری منکوحہ ہے لیکن خدا معلوم اس کے پہلے شوہر سے اس کی باقاعدہ شرعاً اور قانوناً طلاق ہوئی تھی یا نہیں!"

"کیا مطلب تمھارا" میں تعجب سے ان کا منہ دیکھنے لگا۔

ملازم کافی کی ٹرے لے آیا تھا۔ کافی پیتے ہوئے قاضی نے اپنی بات کو آگے بڑھایا۔ "پرسوں منے خاں فردوس، میرے غریب خانے پر تشریف لائے تو ان کے ہاتھ میں یہ چھتری تھی۔ بے چارے پریشان اس بات پر تھے کہ وہ گھر سے چھتری لے کر چلے نہیں تھے۔ اور نہیں معلوم کیسے یہ چھتری ان کے ہاتھ آ گئی، البتہ ان کا سیاہ ڈنڈا جو اسی کی قامت اور دبازت کا تھا وہ لاپتا تھا۔ وہ سیدھے مشاعرے سے آ رہے تھے غالباً اس روز ان پر ہوٹنگ زیادہ ہوئی تھی اور بھاگنے کی ہڑبونگ میں وہ اپنا 'تنبیہہ الغافلین' چھوڑ کر کسی بے چارے دوسرے شاعر کی یہ چھتری اٹھا لائے تھے۔ فردوس صاحب نے جتنا تیل اپنے ڈنڈے کو پلایا تھا اور جس ریاضت سے اس کے منہدی لگائی تھی اس کو دیکھتے ہوئے گم شدہ چھتری والا شاعر نقصان میں ہرگز نہیں رہا ہوگا۔ البتہ شرط یہ ہے کہ اس نے اس جبریہ تبادلے کو ہنسی خوشی قبول بھی کر لیا ہو۔ اور چھتری کے مرثیے کے بجائے ڈنڈے کا استقبالیہ لکھ رہا ہو۔"

"لیکن یہ چھتری فردوس سے جہنم، میرا مطلب تمھاری منکوحہ کیسے بن گئی؟" ہم نے درمیان میں لقمہ دیا۔

قاضی کچھ لمحوں کے لیے چپ رہے اور انھوں نے اپنی عینک کے دبیز شیشوں کے پیچھے سے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ہمیں گھورا۔ ان کے ناراض ہونے اور غصہ کرنے کا یہی انداز تھا۔ ہم نے ان کے لیے کافی

کی دوسری پیالی بنا کر پیش کی تو بولے "یہی تو میں تم سے کہنے جا رہا تھا برخوردار! لیکن تم نے بیچ ہی میں میری زبان پکڑ لی۔ فردوس صاحب نے رخصت ہوتے وقت مجھ سے اصرار کیا کہ میں اپنی چھتری ان کی اس تو یافت چھتری سے بدل لوں۔ چونکہ خود میری چھتری کا سلسلۂ نسب بھی کچھ مشکوک ہی سا تھا لہٰذا میں نے ایک فن کار کی فرمائش کو قبول کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا۔"

"بہت اچھا کیا تم نے۔ یہ تم پر حلال ہو گئی اور وہ ان پر۔ اسی طرح ایک قبر کے مجاور اور ایک مندر کے پجاری مٹھائی کے ڈبوں کو تبرک اور پرساد کے طور پر ایک دوسرے کو دے دیا کرتے" ہم نے کہا۔

قاضی جھنجھلا گئے "بندر کیا جانے سونٹھ کا مزہ؟ تمہیں آج تک چھتری رکھنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی تم کبوتر کی چھتری اور فرماں روا ؤں کے چھتر کے فرق تک سے ناواقف ہو۔ اچھا بتاؤ دنیا میں وہ کون چیز ہے جو انسان کے ہاتھ میں ہوتی ہے لیکن خود انسان اس کے اندر ہوتا ہے۔؟"

ہم نے عرض کیا "آئینہ!"

کہنے لگے "اور چھتری کیوں نہیں؟ دراصل تم چھتری کی تمام اور کمال کارگزاریوں سے واقف ہی نہیں ہو۔ تم تو بس اتنا جانتے ہو کہ وہ دھوپ اور بارش سے بچاتی ہے۔ چھتری کا بھی بدل بن سکتی ہے اور اگر کوئی واردات پیش آجائے تو ڈھال اور آلۂ حرب و ضرب کے طور پر بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔"

"اور حسب منشا بدلی بھی جا سکتی ہے۔ اور بوڑھی سے جوان بنائی جاسکتی ہے۔ ہم نے بات کاٹی لیکن سنی کو ان سنی کرتے ہوئے قاضی نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ "چیمبر لین کی چھتری خود چیمبر لین سے زیادہ مشہور تھی۔ چیمبر لین مر گئے تو منوں مٹی کے نیچے دفن کر دیے گئے۔ لیکن ان کی چھتری آج بھی عجائب خانے کی زینت بنی ہوئی ہے۔

ذراسی بات چھتری کی بڑی ہے بات چھتری کی"

پانی کی بوندیں اب ہلکی ہو چلی تھیں لہٰذا قاضی نے بھی اپنے ان جملوں میں اختصار سے کام لیا "اچھی چیز کا بھی غلط استعمال بھی بڑے شاطرانہ انداز میں کیا جاتا ہے۔ مرزا چھمن مرحوم نے اپنی پھٹی پرانی چھتری کے ذریعے سیکڑوں کبوتر پار کر دیے تھے۔ جس کبوتر باز کے یہاں جاتے اس کی نظر ذرا اُچٹی اور کبوتر مرزا صاحب کی چھتری کی تیلیوں میں دبا

ہوتا۔ اسی طرح گھمنڈی لال بساطی نے اپنے چھوٹے سامان مثلاً اون کے گولوں، موزوں، بنیائنوں، ربر کے کھلونوں وغیرہ پر زندگی بھر کبھی چنگی کا محصول ہی نہیں ادا کیا۔ وہ یہ سب سامان اپنی چھتری کی تیلیوں میں بھر لیتے اور نگر پالیکا کے ناکے کے سامنے سے محرر چنگی کو سلام کرتے اور اس کا مزاج پوچھتے گزر جاتے۔"

بارش تھم چکی تھی۔ لیکن قاضی نے کمرے ہی میں بٹن دبا کر اپنی چھتری کھولی اور اس کو گھماتے رخصت ہو گئے۔

یہ نفسیاتی مسئلہ آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ چھتری ہاتھ میں آتے ہی انسان کا حافظہ کیوں کمزور ہو جاتا ہے۔ چھتری کھونے اور بدل جانے کے پیچھے یہی حافظے کی خرابی کارفرما نظر آتی ہے۔ ایک لال بجھکڑ سے پوچھا تو انھوں نے یہ وجہ بتائی کہ چھتری چونکہ صرف کبھی کبھار خاص موقعوں پر استعمال کی جاتی ہے لہٰذا حافظہ اسے ٹھیک سے اپنی گرفت میں نہیں لے پاتا۔ اور اس کی ملکیت کو مکمل طور سے قبول کرنے میں قاصر رہتا ہے۔ قاضی سے اس موشگافی کا تذکرہ کیا تو بولے "ہشت! تم نے آج تک کسی دولھا کو اپنا سہرا کھوتے دیکھا ہے؟ اور ایک انسان بقید ہوش و حواس زندگی میں کتنی دفعہ سہرا باندھتا ہے؟"

"قاضی! اس موقع پر اس 'بقید ہوش و حواس' کی ترکیب کا کوئی جواب نہیں۔ حالانکہ تم خود اپنی باتوں میں بیشتر اس قید سے آزاد رہتے ہو۔" ہم نے عرض کیا۔

"بھلا حافظے اور چھتری کا کیا تعلق؟" قاضی نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "میرے ایک دوست گوپی چند دہلی گئے ہوئے تھے۔ ان کے والد نے ان سے ایک چھتری کی فرمایش کی تھی۔ جیب میں پیسے کم ہی رہ گئے تھے۔ بہرکیف یہ ایک دکان میں کسی سستی سی چھتری کی جستجو میں پہنچے۔ صدر دروازے کے قریب ایک کونے میں انھوں نے دیکھا کہ آٹھ دس تھوڑی استعمال شدہ چھتریاں کھڑی ہیں۔ یہ سمجھے کہ یہ سکینڈ ہینڈ بھی برائے فروخت ہیں۔ انھوں نے دیکھنے کے لیے ایک خوب صورت سی نازک اندام کو اٹھا لیا اور اس کو گھما پھرا کر اس کے مختلف زاویوں سے محظوظ ہونے لگے۔ دفعتاً ایک خوب رو نوجوان یوروپین خاتون جھپٹ کر ان کے پاس آئیں اور انگریزی میں کہنے لگیں "مجھے یہ سامنے پارک میں ایک بینچ سے لٹکی ملی تھی، میں یہاں دکان میں اسے

ع کرنے آئی تھی کیونکہ مجھے پارک کا چوکیدار نہیں مل سکا تھا۔ اگر یہ
پ کی ہے تو مجھے خوشی ہے کہ میں نے ایک گم شدہ چیز اس کے مالک
ب پہنچا دی۔" گوپی چند کہنا تو یہ چاہتے ' اے مہ لقا دل ربا' جانِ
فا' میں آپ کی فرض شناسی سے بہت متاثر ہوا لیکن بدقسمتی سے
چھتری میری نہیں ہے۔' لیکن اتنی انھیں انگریزی نہ آتی۔ مجبوراً
ھوں نے صرف ' تھینک یو' کہا اور جس تیزی سے ان کا دل دھڑک
ہا تھا اسی تیزی سے چھتری لیے ہوئے دکان سے باہر ہوگئے۔"
قاضی نے قہقہہ لگایا اور اپنے بیان کیے ہوئے لطیفے میں
مختصر سا تبصرہ ٹانک دیا "پہلے دیئے والا چھپّر پھاڑ کر دیتا"
ب چھتری تھما کر دیتا ہے۔"

قاضی کی تمام تر دخل در معقولات کے باوجود ہمارے دل کا یہ
ور دور نہیں ہوتا کہ چھتری اور غیر حاضر دماغی میں کوئی ڈھکا چھپا
نعلق ضرور ہے۔ ممکن ہے کہ بات اتنی حد تک نہ گئی ہو کہ
ہاتھ چھتری پہ جب گیا میرا چھن گیا مجھ سے حافظہ میرا ـــــ لیکن
ال میں کچھ کالا یقیناً ہے۔
پروفیسر مقبول احمد' ہمارے والد کے بچپن کے دوست' پورے
ملک میں اقتصادیات کے سربرآوردہ ماہرین میں سمجھے جاتے اور ان کی تصنیف
ی ہوئی کتابیں بین اقوامی اداروں سے انعام یافتہ' اکثر یونی ورسٹیوں میں
ڑھائی جاتیں۔ آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے تھے اور وہاں سے ڈگریوں
کے علاوہ چھتری لگانے کا شوق بھی لائے تھے۔ لیکن جہاں انھیں
ھتری لگانے کی عادت تھی وہاں اس کو کھو دینے کی بھی بڑی مہارت
تھی۔ وہ ان مقامات پر بھی اسے گم کر دیتے جہاں اس کے گم ہوجانے
کے کم سے کم امکانات ہوتے۔
عام طور سے مقبول چچا کا چھتری کھونے کا اوسط مہینے میں ایک
تھا۔ چچا ملک کی درآمدات اور برآمدات کا حساب رکھتے تھے چچی ان کی
چھتریوں کی گمشدگی کا۔ گزشتہ سال چچا نے بارہ مہینوں میں چودہ
چھتریاں کھوئی تھیں لیکن چونکہ دو بدلی ہوئی تھیں لہٰذا اوسط نکالنے
میں آسانی ہو گئی تھی ۱۲ مہینے ۱۲ چھتریاں۔
چچا نے اپنی معتدل روش چھوڑ کر جب صرف دس روز میں دو
چھتریاں کھو دیں تو چچی کے صبر کا پیمانہ' چھلک گیا' انڈیل پڑا۔ انھوں نے

"انٹیمیٹم دے دیا۔" اب اس گھر میں بھی کوئی چھتری نہیں خریدی جائے گی۔ ! ہیٹ پہنیے یا برساتی اوڑھیے، کچھ بھی کیجے لیکن آج سے یہ چھتری بازی ختم سمجھیے" چچا کچھ دنوں تو یوسف بے کارواں کی طرح بے چھتری رہے۔ لیکن ایک روز جب وہ پسینا پونچھتے یونی ورسٹی پہنچے تو لائبریری کے چپراسی نے انھیں ان کی ایک گم شدہ چھتری لاکر پیش کی "پروفیسر صاحب اس روز آپ اپنی چھتری بھول گئے تھے۔ جتنی دیر میں اسے آپ کو دینے کے لیے میں لایا، آپ بھاسکر جی کے ساتھ ان کی موٹر پر جا چکے تھے۔" چچا کو چپراسی کی دی ہوئی یہ چھتری اس ڈگری سے زیادہ قیمتی معلوم ہوئی جو انھیں وائس چانسلر نے دی تھی۔

چچا اپنی یہ چھتری جان سے زیادہ عزیز رکھتے۔ کچھ دنوں بعد ایک تقریب میں میرے ساتھ گئے تو دھوپ تیز ہونے کے باوجود انھوں نے اس کو لگایا نہیں بلکہ راستے میں یہ کہہ کر میرے حوالے کردی کھونا مت" تقریب میں چچا کو ان کے کچھ پرانے ساتھی مل گئے اور وہ انھیں کے ساتھ ان کی کار پر کہیں اور چلے گئے۔ میں چھتری لے کر تنہا ان کے گھر پہنچا اور بڑی احتیاط سے اسے چچی کے سپرد کر دیا۔

بعد میں پتا چلا کہ چچا جب شام کو واپس آئے تو اپنے ساتھ ایک چھتری بھی لائے۔ چچی نے میری لائی ہوئی چھتری دکھائی تو بے چارے بوکھلا گئے۔ رات بھر انگاروں پر لوٹنے کے بعد وہ دوسرے دن اپنے میزبان دوست کو اس کی چھتری واپس کرنے گئے۔ خالی ہاتھ پلٹ کر آئے تو پتا چلا کہ خود اپنی چھتری اسی کے گھر بھول آئے ہیں۔ بعد میں یہ چھتری مجھ کو واپس لانا پڑی۔

؎ گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی — یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا؟

سلام بن رزاق
۹/۱۱-سی آئی - جی کالونی
کرلا - بمبئی نمبر ۷۰۰۰۴

آدمی اور آدمی

ٹرین قریب آچکی تھی - پتا نہیں وہ بچہ کس طرح پٹری پر گر گیا تھا - دونوں طرف پلیٹ فارموں پر کھڑے لوگوں نے چیخنا شروع کر دیا تھا - بچہ پٹری پر ہاتھ ٹیکے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا - مگر شاید اس کے کہیں گہری چوٹ لگی تھی، اس لیے اس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا - لوگ ٹرین ڈرائیور کو رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے بری طرح چیخ رہے تھے - غالباً ڈرائیور نے بھی بچے کو پٹری پر گرے ہوئے دیکھ لیا تھا - وہ بوکھلا گیا تھا اور بریک لگاتے ہوئے وسل پر وسل دیے جا رہا تھا - مگر چلتی ٹرین کا ایک جھٹکے سے رک جانا آسان نہیں تھا - لوگوں کی چیخوں اور ٹرین کی سیٹی نے مل کر ایک عجیب دہشت ناک شور پیدا کر دیا تھا - جو لوگ اس طرف متوجہ نہیں تھے اب وہ بھی متوجہ ہو گئے تھے اور سب مل کر بے تحاشا گلا پھاڑے جا رہے تھے -

ٹرین اب صرف چند قدم کے فاصلے پر تھی - اور اس کی رفتار اب بھی خاصی تھی - بچے تک پہنچتے پہنچتے ٹرین کے رک جانے کا کوئی امکان نہیں تھا، اور بچہ ابھی تک پٹری پر ہاتھ ٹیکے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا، بچے کی موت یقینی تھی، لوگوں کے چہروں پر خوف، دہشت اور کرب کی لکیریں گہری ہو گئی تھیں - بچے کی ماں پلیٹ فارم پر کھڑی سینہ پیٹ رہی تھی اور لوگوں کو دہائی دے رہی تھی کہ وہ کسی طرح اس کے بچے کو پٹری سے اوپر گھسیٹ لیں مگر ٹرین بالکل قریب آچکی تھی اور کسی بھی شخص کے لیے ایسا کرنا قریب قریب ناممکن تھا - بچہ ایک ہاتھ اپنی ماں کی طرف اٹھائے پٹری سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا - عورت اپنے بچے کی یہ حالت دیکھ کر بار بار پٹری کی طرف لپک رہی تھی اور لوگ اسے بار بار روک رہے تھے -

اسی لمحہ ایک معجزہ ہوا - لوگوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پلیٹ فارم سے پٹری پر کودا اور بچے کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹتے ہوئے پٹری کی دوسری طرف لڑھک گیا - ٹرین کا اگلا حصہ اپنے بریک چرچراتا ہوا آگے بڑھ گیا - نوجوان کو کودتے دیکھ کر لوگوں نے بے اختیار چیخنا شروع کر دیا - مگر ان چیخوں میں نوجوان کی چیخ سب سے زیادہ تیز تھی، ٹرین چند میٹر آگے بڑھ کر پلیٹ فارم پر رک گئی اور کچھ لوگ

پٹری پر کود کر نوجوان کے قریب پہنچے۔ بچہ بالکل صحیح سلامت تھا۔ مگر نوجوان کے بائیں پاؤں کی تین انگلیاں ٹرین کے پہیوں کے نیچے کچل گئی تھیں اور وہ درد سے بری طرح کراہ رہا تھا۔ لوگوں نے نوجوان کو سہارا دے کر اٹھایا۔ بچہ پہلے ہی اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ دونوں کو پلیٹ فارم پر لایا گیا بچے کی ماں نے پہلے تو لپک کر اپنے بیٹے کو سینے سے لگا لیا اور اسے بے اختیار چومتے ہوئے رونے لگی، پھر اچانک اس کی نظر نوجوان پر پڑی جو پلیٹ فارم کی ایک بنچ پر لیٹا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کی کچلی ہوئی انگلیوں سے خون ٹپک رہا تھا اور کچھ لوگ اسے گھیرے کھڑے تھے۔ عورت تیزی سے آگے بڑھی۔ اس نے اپنی ساڑی کا آنچل پھاڑا اور اسے پانی میں بھگو کر نوجوان کے زخم پر باندھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی آنسو تھے۔ مگر وہ اس نوجوان کے لیے ممنونیت کے آنسو تھے۔ جذبات کی شدت سے اس کے ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔ مگر آواز نہیں نکل رہی تھی۔ نوجوان نے آنکھیں کھولیں۔ عورت کی طرف دیکھا پھر اس لڑکے کی طرف دیکھا جو سہما سہما سا اس کے پاس کھڑا تھا۔ نوجوان کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ لوگ اس کی بہادری اور جاں بازی کی تعریف کر رہے تھے۔ اتنے میں دو ریلوے مزدور اسٹریچر اٹھائے دوڑتے ہوئے آئے اور لوگوں نے مل کر اس نوجوان کو اسٹریچر پر ڈال دیا۔ عورت اب بھی کانپتے ہاتھوں سے اس کے پیروں کو تھامے کھڑی تھی۔ مزدوروں نے اسٹریچر کو اٹھایا اور اسٹیشن سے باہر نکلے۔ نوجوان کا ایک ساتھی ان کے ساتھ تھا۔ عورت اور بچہ بھی اس اسٹریچر کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ نوجوان نے پلٹ کر عورت کی طرف دیکھا اور اپنے درد کو دباتے ہوئے انتہائی نرم لہجے میں بولا "بہن جی"، اب آپ کشٹ نہ کریں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ بچے کو لے کر گھر جائیے۔"

عورت نے احسان مندی کے جذبے سے سرشار ہو کر اس کی طرف دیکھا اور اس کے بازو کو دھیرے سے چھوڑ کر اپنے بیٹے کی انگلی پکڑے ایک طرف کو ہٹ گئی اور مزدور اسٹریچر کو لیے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

اس کے زخم کی ڈریسنگ ہو گئی تھی۔ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ دو انگلیوں کے ناخن اکھڑ گئے تھے۔ ڈریسنگ کے بعد ڈاکٹر نے اسے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ اس کا دوست اسے سہارا دے کر اسپتال کی عمارت سے باہر لایا۔ ٹیکسی رکوائی۔ دونوں ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

دوست نے اس کے مرجھائے ہوئے چہرے کی طرف پرکشش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تکلیف بہت زیادہ ہے کیا؟"

"نہیں کوئی خاص تکلیف نہیں۔" نوجوان کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تمھیں اتنا بڑا خطرہ نہیں مول لینا چاہیے تھا۔"
"کمال کرتے ہو! ایک معصوم بچہ نظروں کے سامنے موت کے منہ میں جا رہا تھا۔
کیسے خاموش رہا جا سکتا تھا۔"
"وہ تو ٹھیک ہے مگر۔۔۔۔"
"مگر کیا؟"
"شاید تم نے غور نہیں کیا۔ وہ عورت اور اس کا بچہ دوسرے فرقے
تھے۔ میرا مطلب ہے وہ لوگ ہمارے مذہب سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔
سروں کے لیے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا عقل مندی کی بات نہیں۔"
"اونہہ، ہٹاؤ یار۔ اس بچے کی پھٹی پھٹی خوف زدہ آنکھوں میں کچھ ایسی بات تھی کہ
اپنے آپ کو روک نہیں سکا۔ بچہ بچہ ہوتا ہے، خواہ کسی بھی مذہب کا ہو۔"
اچھا بابا! اب زیادہ نہ بولو۔ سیٹ کی پشت پر ٹک کر آرام سے بیٹھو۔"
اچانک شہر میں فسادات پھوٹ پڑے۔ لوگ درندوں کی طرح ایک دوسرے کو
دڑنے لگے۔ فساد کا تیسرا دن تھا اور پورا شہر فساد کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ امن
ر لوگ بُری طرح خوف زدہ تھے۔ لوگوں کا اپنے بیس بیس سال کے پڑوسیوں پر سے بھروسا
ں رہا تھا۔ بچپن کے ساتھ کھیلے کھائے ہوئے دوست، لاٹھیاں، بلّم لے کر ایک
رے کے سامنے صف آرا ہو گئے۔ انسانیت، مروّت، دوستی، بھائی چارہ۔
ے نازک رشتے نیزے کی نوک اور تلوار کی دھار پر ٹوٹے جا رہے تھے۔
ت گاہیں سازشوں کے اڈّے بن گئے تھے، جہاں روزانہ دشمن کو ختم کرنے کی
بیں بنائی جاتی تھیں۔
تیسری رات کو اس کے محلّے والوں نے پڑوس کے دشمن محلّے پر حملہ کرنے کا پلان
یا۔ لاٹھیاں، بلّم، سوڈا واٹر کی بوتلیں اور گھریلو دستی بموں کا کافی ذخیرہ جمع کر لیا گیا۔
ا کو بارہ کے بعد حملہ کرنا طے پایا۔ وہ اس کارِ خیر میں پیش پیش تھا۔ مقررہ وقت
ب لوگ کیل کانٹے سے لیس ہو کر دشمن محلے کی طرف بڑھے، چند منٹ بعد ہی سارا
در دناک چیخوں اور فلک شگاف نعروں سے تھرّا اٹھا۔ "مارو! کاٹو! جانے نہ پائے!"
شور سے آسمان کانپنے لگا۔ مکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ لوگوں کو گھروں سے گھسیٹ
سیٹ کر قتل کیا جانے لگا۔ مرنے والے جتنی کرب ناک چیخیں مارتے، مارنے والے
ں سے زیادہ وحشیانہ قہقہے بلند کرتے تھے۔
وہ اپنے دو تین ساتھیوں کے ساتھ چُن چُن کر دشمنوں کا صفایا کر رہا تھا۔ اتنے
سامنے کے جلتے ہوئے مکان سے ایک گھبرائی ہوئی عورت نکلی۔ اس کا سات
د سال کا بچہ اس کی انگلی تھامے ہوئے تھا۔ عورت کے جسم پر لپٹی ہوئی ساڑی
ی سے زیادہ جھلس چکی تھی، وہ وحشت زدہ سی اپنے بچے کی انگلی تھامے ایک طرف

کو بھاگی۔ اچانک اُس کی اور اُس کے ساتھیوں کی نظر ان دونوں پر پڑ گئی۔

"دیکھو شکار جا رہا ہے۔ بچ کر نہ جانے پائے۔" وہ تینوں بھوکے بھیڑیوں کی طرح عورت پر ٹوٹ پڑے۔ پلک جھپکتے ہی عورت کے جسم پر کپڑے کا ایک تار بھی نہ رہا۔ عورت اور بچے کی چیخیں انتہائی کرب ناک تھیں۔ عورت کو نیچے گرا دیا اور اس کی چھاتیوں کو نیزوں سے چھید دیا گیا۔ جب عورت کی چیخیں بند ہوگئیں تو وہ لوگ پلٹے۔ مگر وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ عورت کی خون میں لتھڑی لاش سے اس کا سات سال کا بچہ لپٹا بُری طرح رو رہا تھا۔ نوجوان ایک لمحے تک اسے دیکھتا رہا۔ اچانک اُس کا نیزہ بلند ہوا۔ اور ایک ننھی طویل چیخ فضا میں بہت دور تک لہراتی چلی گئی۔ اس کے ساتھی چند لمحوں تک سکتے کی سی حالت میں کھڑے خاک و خون میں تڑپتی اُس ننھی سی لاش کو دیکھتے رہ گئے۔

اتنے میں پولیس کے سائرن کی آواز آئی اور سب بھاگو، بھاگو! چلّاتے ہوئے اپنے اڈے کی طرف لوٹ گئے۔

"تم نے کتنے شکار کیے؟"

"تین"

"اور تم نے؟"

"ساڑھے تین"

"ہا، ہا، ہا! ساڑھے تین کا کیا مطلب؟"

"دو مرد، ایک عورت اور ایک بچّہ۔"

"اچھا۔ اچھا۔ بچّہ وہی نا، جسے پیپل کے نیچے تم نے نیزے سے چھید دیا تھا؟"

"ہاں وہی"

"اُس وقت میں بھی تو موجود تھا۔ مگر یار بچّے کی آخری چیخ نے مجھے بہت اندر تک دہلا دیا تھا۔"

"تم کم بخت ہو ہی کمزور دل کے۔"

"نہیں یار، آخر بچّے کا مذہبی جھگڑوں ٹنٹوں سے کیا واسطہ؟"

"تم سمجھتے نہیں۔ سانپ کے ساتھ سپنیولے کا سر بھی کچل دینا چاہیے۔"

نہیں، آپ جیسا سوچ رہے ہیں ویسا نہیں تھا۔ وہ بچّہ وہ نہیں تھا جو ریل کی پٹری پر گرا تھا۔ وہ عورت بھی وہ نہیں تھی۔ وہ شخص بھی وہ نہیں تھا جس نے ریل کی پٹری پر بچّے کی جان بچائی تھی۔

مگر سوال یہ ہے کہ اگر وہ سب لوگ وہ نہیں بھی تھے تو انسان کی اس بربریت میں کیا فرق پڑتا ہے۔"

محمود ایوبی
۸/E/۲۰۳ - ہما لگر ہاؤسنگ سوسائٹی
سات بنگلے۔ اندھیری ویسٹ بمبئی ۵۸

آتنک

یہ یقیناً ہمارے اور ہمارے دوستوں کے لیے خوشی کی بات تھی کہ ہمیں جو کمرہ ملا تھا وہ نہ صرف کشادہ اور لب سڑک بلکہ مسلم کالونی میں تھا۔ ورنہ ہم لوگ لاکھ آزاد اور ترقی پسند کیوں نہ تھے، وقتاً فوقتاً اس کاسموپولیٹن شہر میں کبھی علاقہ، کبھی زبان اور کبھی مذہب کے نام پر جو دنگے ہوتے رہتے تھے، ان میں کسی نہ کسی لحاظ سے ہم بھی زد میں آتے تھے۔ ایسے ہنگامی اور خطرے کی گھڑی میں خواہش کے باوجود ہمارا کوئی دوست یا آشنا ہماری کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا۔ اپنی جان خطرے میں ڈال کر کوئی کسی کی مدد کر بھی نہیں سکتا، خواہ مدد کا محتاج شخص کوئی دوست ہی کیوں نہ ہو۔

لہٰذا محفوظ علاقہ میں ہماری رہائش کا انتظام ہوگیا تو ہمیں جو سکون ملا وہ تو الگ رہا، ہمارے دوستوں نے بھی اپنے اطمینان اور خوشی کا اظہار کیا اور پھر ہم لوگ مل جل کر خوشی منانے لگے۔

درمیانی درجہ کے لوگوں کو خوش ہونے کے لیے کچھ آسمان کے تارے توچاہئیں نہیں۔ بس اتنا ہی ہو کہ کچھ دیر ایک ساتھ بیٹھ کر گپ شپ لڑا سکیں یا کسی چالو موضوع پر ہلکی پھلکی باتیں کرلیں اور پھر اپنی اپنی راہ لیں۔

جو شخص خود ایک معمولی قسم کا ملازم ہو یعنی بہ مشکل تمام اپنی سفید پوشی نبھا رہا ہو ظاہر ہے اس کے یار دوست بھی کوئی بڑے تیس مار خاں نہیں ہوں گے۔ ایک آدھ کی حالت اگر قدرے بہتر ہو تو یہ نہیں دیکھا جاتا۔

تو ہم لوگ دن بھر کی چاکری اور محنت مشقت کے بعد جب اپنے اپنے گھر لوٹتے تھے تو تھوڑا تازہ دم ہوکر احباب ہمارے کمرے میں آجاتے تھے۔ آدھی آدھی پیالی چائے کا ایک آدھ دور چلتا تھا اور اس کے ساتھ ہلکی پھلکی بے مغز اور سطحی قسم کی باتوں کا دور بھی۔ کبھی کوئی بندھا ٹکا موضوع نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کرکٹ کا ذکر چھڑ گیا تو اس وقت موجود لوگوں نے اس میں حصہ لیا۔

اور کرکٹ کے متعلق ذہن میں بھرے ہوئے فاضل مواد کو جھٹکنا شروع کر دیا۔
یا پھر فلم کا قصہ نکلا تو حال میں دیکھی گئی کسی فلم کی اسٹوری اور ڈائریکشن
سے ہوتے ہوئے ایکٹروں ایکٹرسوں کے خفیہ رازوں کے پردے اٹھائے جاتے۔
زیادہ باتیں سیاست پر ہوتی تھیں۔ سیاست کہیے تو یہی جو روزانہ اخبارات
میں چھپتی تھیں۔ یعنی منسٹروں کی اٹھا پٹخ، کسی کے یہاں سرکاری مکان کے کرائے
کی باقی رقم یا کسی گھپلے کی خبر۔ کچھ باتیں شہر میں ہونے والی چوری، ڈکیتی یا معمو لی
معمولی باتوں پر ہونے والے جان لیوا جھگڑوں کے سلسلہ میں بھی ہوتی تھیں۔
لیکن ان سب سے جو اہم موضوع ہوتا تھا وہ دنگے فساد کا موضوع
ہوتا تھا۔ کیونکہ کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا جب ملک کے کسی نہ کسی شہر میں
کسی نہ کسی قسم کا فساد نہ ہوتا ہو۔ اور جس میں دو چار افراد کے مارے جانے
ان سے زیادہ کے زخمی ہونے اور لاکھوں کی املاک کے لوٹے یا جلائے جانے
کی خبر نہ ہوتی ہو۔ اس لیے ہم لوگوں کی زیادہ توانائی اور وقت اسی
دلخراش موضوع پر بحث کرنے میں جاتا تھا۔

فسادات کا موضوع جب چھڑتا تھا تو لامحالہ لہجہ ترش اور آواز زور دار ہو جایا
کرتی تھی۔ میں احباب کے جوش اور جذباتیت کو کم کرنے کے خیال
سے فسادات کے سماجی، سیاسی اور معاشی اسباب بیان کرنے لگتا تھا
یہی کہ سیاست داں اپنی ساکھ بڑھانے یا اپنے حریف کو زک پہنچانے
یا ایک فرقہ کی زمین جائداد کو ہڑپنے کے لیے یہ گندہ کھیل کھیلا جاتا
ہے۔ احباب ہماری دلیل سے تو اتفاق کرتے تھے مگر وہ کچھ زیادہ ہی
تیز بلکہ شکوہ کناں لہجہ میں یہ کہنے لگتے تھے کہ تو پھر حکومت اور اس
کے عملے غیر جانبداری اور انصاف پسندی سے کام کیوں نہیں لیتے۔
ایک ہی فرقہ کے افراد پر مظالم کیوں ڈھاتے ہیں۔ ہم سے دشمنوں
جیسا برتاؤ کیوں کرتے ہیں۔ ان کی ان جائز شکایات سے نہ کوئی انکار
کر سکتا تھا اور نہ تسلی بخش جواب دے سکتا تھا۔ انھیں چپ کرانے
کے لیے میں یہ عذر پیش کرتا تھا کہ بھائی اسی مکان میں مالک بھی رہتا
ہے۔ اس کی کوئی مجبوری تھی یا ہماری مجبوری پر ترس کھا کر اس نے ایک
کمرہ ہمیں سب لیٹ (SUBLET) کر دیا ہے ہم لوگوں کے بحث و مباحثہ سے
اس کے آرام میں اگر خلل پڑے گا تو کسی دن وہ مجھے کمرہ خالی کرنے کا حکم
صادر کر دے گا۔

جو لوگ کسی دلیل سے چپ نہیں ہوتے وہ ہماری اس عاجزانہ
درخواست پر ایک دم سے دم سادھ لیتے تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ مالک مکان سے ہماری ابھی زیادہ راہ و رسم نہیں ہوئی تھی۔ بس آتے جاتے سلام دعا ہو جاتی تھی اور رسماً ایک دوسرے کی خیریت خیر صلاّ پوچھ لیتے تھے۔

مگر اس سارے بحث مباحثہ کے دوران مالک مکان کا ایک عجیب و غریب ملازم جب وہاں مسلسل کھڑا رہتا تھا تو بظاہر وہ ہماری گفتگو سنتا تھا مگر اس کا جو حلیہ تھا اسے دیکھ کر مجھے وہ خاصا گھُنا شخص نظر آتا تھا۔ جس بات سے اس کا کوئی تعلق اور نہ جس کی اسے تمیز تھی اسے اس قدر انہماک سے سنتے دیکھ کر ہمیں شبہ ہوتا تھا کہ وہ اصل میں اپنے مالک کی طرف سے ہم لوگوں کی جاسوسی کرتا ہے۔

اسے ہم نے جو عجیب و غریب کہا تو بلا وجہ نہیں کیونکہ ایک تو اس کا قد ڈیڑھ بالشت کا تھا۔ مگر داڑھی اپنے قد سے بھی زیادہ بڑھا رکھی تھی اور باوجود اس کے کہ وہ کھڑاؤں پہنے رہتا تھا مگر ہمارے دروازے پر اس قدر دبے پاؤں آ کر کھڑا ہو جاتا تھا کہ اس کے جاسوس نہیں ہونے پر کسی شبہہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی تھی۔

اس پر نظر پڑتے ہی ہمارے سب دوست محتاط ہو جاتے تھے۔ اور میں اسے اپنے طور پر رشوت دینے کے لیے پوچھتا تھا۔

"کیا سعید بھائی چائے چلے گی۔؟"

پھیکی سی مسکراہٹ کے علاوہ وہ کوئی جواب دیے بغیر فوراً مالک کی کیتلی لے آتا اور پیسے لے کر نیچے ہوٹل سے چائے لانے چلا جاتا تھا۔ چائے لے کر وہ اس قدر جلد لوٹتا تھا کہ جواب نہیں۔ ہاں لکڑی کے زینے پر اس کے کھڑاؤں کی کھٹ پٹ سنتے ہی ہم لوگ سنجیدہ ہو جاتے تھے۔

یہ پابندی اور احتیاط دیکھ کر ایک دن ایک دوست تاش کی گڈی لے آیا تو میں نے تاش کھیلنے کی بھی اجازت نہیں دی کیونکہ میں جانتا تھا کہ تاش کھیلنے والے کچھ زیادہ شور کرتے ہیں۔ اور اس کھیل میں وقت کے گزرنے کا بالکل اندازہ نہیں ہوتا۔ تب فیروز جس کی مالی حالت ہم لوگوں سے کچھ بہتر تھی ایک دن کیرم بورڈ خرید لایا۔ یہ کھیل بھی بڑی احتیاط اور خاموشی سے کھیلا جاتا۔ پھر بھی گوٹوں کی کھٹ پٹ تو ہوتی ہی تھی۔ اور ایسے میں بھی جب سعید مسکینوں کی طرح آ کھڑا ہوتا تھا تو ہمیں ایسا لگتا تھا کہ وہ یہ شکایت کرنے آیا ہے کہ ہم لوگ اس کے مالک کے آرام میں خلل پہنچا رہے ہیں۔ اس لیے کیرم

کا کھیل بھی بند کر دیا جاتا اور سعید کو رشوت دینے کے لیے چائے کا ذکر چھیڑا جاتا۔ سعید ہاں نہیں، کچھ بھی نہیں بولتا، بس کیتلی لے کر حاضر ہو جاتا۔

گویا ہم نے اپنے آرام کے لیے دوستوں کی زبان پر پہرہ بٹھا دیا تھا اور دوستوں نے اپنے لب سی لیے۔ بس سرگوشیوں میں باتیں کرتے تھے۔ لیکن سعید کا مسکینوں کی طرح آکر کھڑا ہونا موقوف نہیں ہوتا تھا۔ وہ کچھ بولتا بالتا تو تھا نہیں کہ اس کا عندیہ ہم لوگوں پر ظاہر ہوتا۔ تاہم اسے رشوت دینے کے خیال سے چائے کی خواہش ظاہر کرتے تھے۔ تو کسی پس و پیش کے بغیر چائے لانے چلا جاتا تھا۔

غرض یہ کہ زندگی اسی ڈھب سے گزر رہی تھی کہ ایک دن بڑا غضب ہو گیا۔ مالک مکان خود ہمارے کمرے میں جو اصل میں اسی کا کمرہ تھا اور ہمیں سب لیٹ کر رکھا تھا۔ اس طرح چلا آیا جیسے کسی لٹہ میں ہو۔ وہ جب ہمارے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا تو ہم نے دل کڑا کر کے اسے بیٹھنے کو کہا۔

وہ بیٹھ تو گیا مگر مسکراتا ہوا۔ اور پھر پوچھنے لگا۔

"آج کل آپ لوگوں کی محفل نہیں جمتی ہے؟"

"مارے اندیشے کے ہم نے ایک جھوٹ گھڑا۔

"اصل میں جب ہم سنتے رہتے تھے تو لوگ آجاتے تھے۔ اب سب اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔"

لیکن اس کے چہرے سے جھلک رہا تھا کہ اسے ہماری باتوں پر یقین نہیں آیا ہے اس لیے وہ کہنے لگا۔

"آپ ان لوگوں کو بلائیے۔ آپ لوگوں کی باتیں میں بھی سنا کرتا تھا۔ ماسٹر ظہور عالم کے کہنے ہی یہ کمرہ آپ کو ہم نے اس لیے دیا تھا کہ کچھ ہم زبان اکٹھا ہوں۔ ورنہ یہ خالی دن اور خالی راتیں کاٹے نہیں کٹتی ہیں۔"

میں نے حیرت اور تجسس کا انداز اختیار کیا تو انھوں نے لمبی اور ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بڑے دکھی دل سے سنایا کہ۔

"آپ کی دعا سے میں اس شہر کا بڑا کاروباری تھا۔ اسی علاقہ میں ہائیڈ اینڈ اسکن کا دھندہ تھا جسے خدا نے اتنی ترقی دی کہ اپنی TANNERY بھی لگائی مگر ہمیں ترقی راس نہیں آئی۔ جانے ہم پیشہ لوگوں کی نظر لگی یا آسمان کو ہماری خوش حالی نہیں بھائی۔ حالانکہ اپنی کاروباری ترقی کے ساتھ میں نے اپنا رویّہ نہیں بدلا تھا۔

یہ تو ہمارا اپنا خیال ہے۔ پتا نہیں خدا کو ہماری کون سی بات بری لگی کہ آج سے چند سال پہلے جو فرقہ وارانہ فساد ہوا اس میں پلا کارخانہ جل کر راکھ ہو گیا۔ انشیورینس کی جو تھوڑی بہت رقم ملی اس سے میں دو چار بیس چمڑے خرید کر تگڈم تگڈم زندگی کی گاڑی کھینچ رہا ہوں۔

اتنا بڑا نقصان اٹھانے والے کا بکھ جانا فطری تھا مگر اس کے لہجہ کی گہری اداسی پر مجھے اور تشویش ہوئی کہ کہیں اس بے چارے کے بیوی بچوں پر بھی تو قیامت نہیں ٹوٹی؟ اس لیے ڈرتے ڈرتے میں نے پوچھا۔

"کوئی جانی نقصان وغیرہ تو۔۔۔؟

اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"کوئی جانی نقصان تو نہیں ہوا۔۔ لیکن بیوی بچوں کو میں نے وطن بھیج دیا۔ آپ کو کیا بتاؤں کہ یہاں کتنی چہل پہل رہتی تھی۔ بیوی بچوں کے علاوہ بیوپاریوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ سب سے آخر میں جو بڑا کمرہ ہے۔ اسے میں نے بیوپاریوں کے لیے مہمان خانہ بنا دیا تھا۔ مگر جب یہ سارا سلسلہ ختم ہو گیا تب زندگی میں بڑی ویرانی آگئی۔ اب کسی بات میں جی نہیں لگتا۔ یہ سعید جو پکا دیتا ہے وہ کھا لیتا ہوں بس یہ سمجھیے کہ زندگی کے باقی دن پورے کر رہا ہوں۔"

"نہیں! ایسا کیوں کہتے۔۔۔۔ آپ جوان آدمی ہیں، حوصلہ رکھیے"

موقع غنیمت جان کر سعید کے بارے میں بھی پوچھ لیا تو ہمارے مالک مکان رفیع اللہ صاحب نے جو قصہ سنایا وہ بہت ہی رقت انگیز تھا۔ انھوں نے بتایا کہ سعید کا باپ ان کا بہت ہی معتمد آدمی تھا۔ وہی کارخانہ کی نگرانی کرتا تھا۔ اور اپنی بیوی اور سعید کے ساتھ کارخانہ ہی میں رہتا تھا۔

سعید اس کا اکلوتا مگر بڑا نٹ کھٹ اور چونچال لڑکا تھا۔ اب اسے دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا کہ یہ وہی لڑکا ہے۔ جس وقت فساد ہوا اور ہماری ٹیزری پھونکی گئی یہ لوگ معمول کے مطابق وہیں تھے۔ سعید کے باپ نے جان پر کھیل کر ہماری ٹیزری بچانے کی کوشش کی مگر بلوائیوں نے ہماری ٹیزری کے ساتھ سعید کے باپ ماں کو بھی ختم کر دیا۔ خدا کی شان کہ یہ کسی طرح بچ گیا۔

صبح کو جب پولیس آئی تو یہ سامنے آیا۔ اور باپ ماں کے تن مردہ کو دیکھ کر پچھاڑ کھانے لگا۔ مگر پولیس والے اس کے ساتھ کوئی ہمدردی

کیا کرتے کہ الٹا اسے مجبور کیا کہ والدین کی لاشیں ٹرک پر ڈالے۔
اس کے بعد تو سعید کے جیسے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے جو چپ سادھ لی تو لاکھ پوچھنے پر بھی کچھ نہیں بولتا تھا۔ ہمیں اپنی ٹیزی کے ساتھ اس کی حالت دیکھ کر بڑا ترس آتا تھا۔ مگر اپنے بس میں کیا تھا۔ اللہ بھلا کرے ظہور عالم صاحب کا کہ انھوں نے اسے نارمل بنانے کی انتھک کوشش کی۔ اسے پڑھانا لکھانا چاہا۔ پڑھ لکھ کر تو اس نے نہیں دیا البتہ نماز وغیرہ سیکھ کر پنج وقتہ نمازی بن گیا ہے۔ اور داڑھی بھی بڑھالی ہے۔ ہم نے بھی اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ کیوں کہ آپ بھی دیکھتے ہی ہیں کہ نارمل وہ ابھی بھی نہیں ہوا ہے۔
رفیع اللہ صاحب کی باتیں سن کر میں نے رنج کا اظہار کیا تو انھوں نے بڑی بے پروائی سے اس موضوع کو بدل دیا۔ اور یہ تقاضا کرنے لگے کہ اپنے دوستوں کو بلا لیجئے۔
اس کے بعد یار لوگوں کی بیٹھک ہمارے کمرے میں نہیں بلکہ رفیع اللہ صاحب کے مہمان خانے میں ہونے لگی۔ جہاں اگلے وقت کے موٹے موٹے گدے اور گاؤ تکیے لگے ہوتے تھے۔ چائے بھی اب ہوٹل سے نہیں آتی تھی بلکہ سعید وہیں تیار کیا کرتا تھا۔ غرض یہ کہ موج ہی موج تھی۔ اور اچھی بات یہ تھی کہ رفیع اللہ صاحب بھی خوش رہنے لگے۔ اور سعید کے چہرے پر پھیلی مسکینی بھی ختم ہونے لگی۔ اور کبھی کبھی ہلکی مسکراہٹ کھیل جاتی تھی۔
ایک دن ایسا ہوا کہ موٹے گدے کے نیچے لوہے کی کوئی موٹی سی سلاخ لڑکھڑائی۔ اسے باہر نکال کر دیکھا جا رہا تھا کہ رفیع اللہ صاحب نے ایک طرح سے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔
"اسے وہیں رہنے دیجیے..... وہیں۔"
اسے وہیں رکھ تو دیا گیا مگر اس کی حقیقت معلوم کی گئی تو انھوں نے پھر ایک غمناک قصہ سنایا۔
قصہ یہ تھا کہ یہ سعید کے والد کا آہنی ڈنڈا تھا جسے وہ بے چارا ٹیزی میں رات کو پہرہ دیتے وقت زمین پر پٹخ کر ٹھن ٹھن بجاتا اور چور اچکوں کو اپنے جاگے ہونے کی آگاہی دیتا رہتا تھا۔ سعید باپ کے قیمتی ورثہ کی طرح اس سلاخ کو اپنے ساتھ لے آیا تھا اور اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا۔
آئی گئی بات ہو گئی مگر وہ جو انگریزی میں کہا جاتا ہے کہ آدمی

منصوبے پر منصوبہ بنتا ہے۔ اور خدا اسی میں کمنڈت پر کمنڈت ڈالتا جاتا ہے تو میّم ہی کہا جاتا ہے کیونکہ آسمان کے یا اس زمین کے خدا کو ہم لوگوں کی خوشی دیکھی نہیں گئی۔ جب ہی تو اس کاسموپولیٹن شہر میں فرقہ وارانہ فساد کے شعلے پھر بھڑک اٹھے۔ بلکہ اس بار کچھ عجیب طریقے سے بھڑکے۔

عجیب طریقے سے مراد یہ کہ اس کے بلوائی صرف ان مقامات پر زور نہیں دکھا رہے تھے جہاں مسلمانوں کی رانی گنی آبادی یا چند دکانیں تھیں بلکہ بیچ شہر میں بھی اودھم مچا رہے تھے۔ حتیٰ کہ خالص مسلمان محلوں میں شیر بنے گھسے آتے تھے۔ وہ بھی سپاہیوں کی نگرانی اور دن کے اجالے میں۔ جیسا کہ عام طور پر ہر شہر میں ہے کہ مسلمانوں کے محلوں میں زیادہ تر کچی اور خستہ عمارتیں ہوتی ہیں۔ سو ہم بھی جہاں رہ رہے تھے وہاں کا بھی یہی حال تھا۔ بلوائیوں نے ان مکانات پر آگ کے جلتے گولے پھینک کر ان ڈھانچوں کو جو مکان کہلاتے تھے خاکستر کرنا شروع کر دیا تھا۔ جلتے مکانوں سے سارے لوگ چوہوں اور کیڑے مکوڑے کی طرح بلبلا بلبلا کر نکلتے تھے۔ مگر نہ پولیس بلوائیوں کو روکتی تھی اور نہ فائر بریگیڈ والے بھاگتے ہوئے آتے۔ جو آ بھی جاتے تو تنگ گلیوں اور پانی کی کمیابی کی بنا پر خاموش تماشائی بنے رہتے تھے۔

ستم یہ کہ ایک روز دن دہاڑے بلوائی اس محلہ میں آئے اور حد یہ ہوگئی کہ پولیس ان کے آگے آگے تھی اور بلوائی ان کے پیچھے پیچھے۔ یہ ہر طرف جلتی مشعلیں اور بم پھینک رہے تھے۔ انتہا یہ ہوگئی کہ بلڈنگوں کو بھی جن میں عام طور پر معزز شہری رہتے ہیں نہیں بخشا جا رہا تھا۔ تب ہم لوگوں کے اوسان خطا ہوئے کہ پرانے وقتوں کی بلڈنگوں کے زینے، شہتیر اور ریلنگ زیادہ تر لکڑی ہی کے تھے۔ پٹرول اور مشعل کے سامنے ان بلڈنگوں اور ان کے مکینوں کا برا حال ہوگا۔ زینوں کے جل جانے پر یہ باہر نکل بھی تو نہیں سکتے تھے۔ ہاں جل جھلس کر ضرور رہ جاتے۔

یوں سمجھیے کہ قیامت کا سماں تھا۔ اور کوئی پرسان حال نہ تھا نہ سرکار اور نہ سرکار کے محافظ عملے۔ عملے تو ایک لحاظ سے بلوائیوں کے موسیرے بھائی بن گئے تھے۔ ایسے میں صرف ایک نوجوان آگے بڑھا اور پولیس والوں کو ان کا فرض یاد دلانے کی جسارت کی تو پولیس نے گولی چلائی تو ضرور مگر بلوائیوں پر نہیں بلکہ اس ڈھیٹ نوجوان پر۔ اپنی بالکنی سے ہم نے دیکھا کہ اس نوجوان کو پوائنٹ بلینک گولی ماردی

گئی۔ اور ادھ کٹے مرغے کی طرح تھوڑی دور چل کر زمین پر گر پڑا۔
یہ دلدوز منظر دیکھنے کے بعد مصلحت کا تقاضا تھا کہ ہم بلا تاخیر بالکنی سے ہٹ کر کمرے کے اندر جائیں اور دروازے اور کھڑکی بند کر لیں۔ حالانکہ آگ اور گولی کے سامنے لکڑی کے خستہ دروازے اور کھڑکیوں سے کیا بچاؤ ہوتا۔ تسلی کی بات الگ ہے، لیکن یہ دروازہ بند کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ کیونکہ چھوٹے قد کا سعید بالکنی ہی پر اٹکا رہ گیا تھا۔ ہم لوگوں نے بہت زور لگا کر اسے اندر گھسیٹا تو وہ پورے دھڑ سے کانپ رہا تھا۔ جو کسی کو پولیس کی گولی کھاتے دیکھنے کا فطری ردِ عمل تھا لیکن یہ بالکل سمجھ میں نہیں آیا کہ سعید کی آنکھوں میں اس قدر سرخی اور بلا کی تندی کیوں آ گئی تھی۔
دو دنوں تک ہم لوگوں کو جس عذاب سے گزرنا پڑا وہ بیان سے باہر ہے۔ بس ہم سب تن بہ تقدیر بیٹھے اور وقفہ وقفہ سے خدا کو یاد کر کے خود کو اس کی مرضی کے حوالے کر دیتے۔ ایسے میں سعید جو کچا پکا تیار کر دیتا اسے صبر و شکر کے ساتھ کھا لیتے تھے۔ ہاں کبھی کبھار چائے فرمائش کر کے بنواتے تھے تو چائے میں پہلے جیسا مزہ نہیں ملتا تھا۔ جیسی بھی مل جاتی غنیمت تھی۔ ذہنی انتشار اور دل کی بے قراری میں مزے اور لطف کا خیال کسے آتا ہے۔ خاص کر اس شخص کو جو دنیا جہان سے کٹا جنگی قیدیوں کی طرح دن گزار رہا ہو۔ اور باہر کی دنیا سے قطعی بے خبر اور ناواقف ہو۔ اخبارات میں نہایت مبہم اور غیر تسلی بخش خبریں ہوتی تھیں۔ کسی کو فون کر کے کچھ معلوم کرنا چاہتے تو یا تو فون ڈیڈ ملتا یا ادھر کوئی جواب دینے والا نہ ہوتا۔ مدھم آوازیں ملکی اور غیر ملکی ریڈیو سنا کرتے مگر ایسی کوئی خبر نہیں ہوتی جس سے دل کو سکون ملے۔
اسی طرح نڈھال، نیم مردہ سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہم لوگ بیٹھے رہتے تیسرے دن ایسی خبر ملی جس سے کچھ ڈھارس بندھی۔ معلوم ہوا کہ مرکزی وزیر داخلہ نے آ کر سخت کارروائی کی ہے۔ عملوں کو چست بنایا ہے اور مقامی ذمہ داروں کی مدد کے لیے سی آر پی اور بی ایس ایف کے جوانوں کی بھاری جمعیت بلا لی ہے۔
اس انتظام کے بعد شہری حالت میں کیا فرق آیا اس کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ بازار اور دفتر ہر جگہ آنا جانا بند تھا۔ ہاں ہم لوگوں کے رگ پٹھوں میں کچھ جان سی آ گئی اور کبھی کبھی لبوں پر

پھیکی اور بے جان مسکراہٹ بھی پھیل جاتی تھی۔ نفسیاتی تناؤ میں جو کمی آئی اس کا صحیح اندازہ اس سے لگایا جاسکتا تھا کہ سعید کو بہت اچھی چائے بنانے کو کہا جاتا۔ اور ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول کر باہر بھی دیکھا جاتا تو ہر طرف وردی پوش جوان اس طرح تعینات نظر آتے جیسے کسی مفتوحہ علاقے میں سینہ پھلائے کھڑے ہوں۔ خیر جوانوں کا جو بھی انداز تھا اس پر مجھے یا کسی اور کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ البتہ اس وقت جوانوں کے نرغے میں ہم نے جو منظر دیکھا تو اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔

دیکھا یہ کہ سعید چائے کی کیتلی لیے، کھڑاؤں کھٹ کھٹاتا ہوٹل کی طرف چلا جارہا تھا۔ حال یہ تھا کہ میں نہ اسے آواز دے سکتا تھا اور نہ تالی بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کرسکتا تھا۔ ان حالات میں سعید کے اس فعل کو سرفروشی تو کہا نہیں جاسکتا تھا۔ اس جمہوری نظام میں اسے ہتھیلی پر سر لے کر چلنا بھی مناسب نہیں تھا۔ کیونکہ سعید کا یہ عمل صریحاً جان پر کھیلنے جیسا عمل تھا۔ چٹکی بجا کر ہم نے رفیع اللہ صاحب کو بھی بالکنی پر یہ نقشہ دکھایا تو ان کی بھی سانسیں رک گئیں۔

سعید جب چائے لے کر واپس آیا تو ہم لوگوں نے اس کی فہمائش کی مگر اس نے سر جھٹک کر ایسی شکل بنائی جیسے اسے ان باتوں کی کوئی پروا نہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وزیر داخلہ کے آنے سے پہلے بھی وہ چائے گھر پر نہیں بناتا تھا بلکہ ہوٹل ہی سے لایا کرتا تھا۔

خیر تو حالات اس کے بعد اور بہتر ہونے لگے۔ جب وزیر اعلا نے بھی فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا اور صرف دورہ ہی نہیں کیا بلکہ مرنے اور زخمی ہونے والوں کو موٹی موٹی رقم دیے اور فسادی عناصر کو بالکل کچل دینے کا بھی اعلان کیا۔

وزیر اعلا کے جانے کے بعد اکا دکا لوگ گھروں سے نکلنے لگے۔ مگر اس طرح ڈرے سہمے کہ کسی تاکید اور تقاضے کے بغیر سر جھکائے اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے گزرتے اور کسی بھی وردی پوش کو سلام اور بندگی کرنا نہیں بھولتے تھے۔ غرض یہ کہ حالات ایسے تھے جسے سرکاری اصطلاح میں قابو میں کہا جاتا ہے۔

ہم لوگ بھی چین کی سانس لینے لگے تھے کہ ایک دن بیٹھے بٹھائے ایک دھماکہ ہوا۔ ابھی پولیس کا پہرہ لگا ہی ہوا تھا کہ کسی کے چیخنے چلانے کی آواز آئی۔ کان کھڑے کیے تو پتا چلا کہ یہ آواز کہیں

پاس ہی سے آرہی تھی۔ پاس کیسے تو اپنی بلڈنگ کے اس حصہ اور فلور پر سے جہاں ہم لوگ رہتے تھے۔ جو اس باختہ سے باہر آئے تو ظاہر ہوا کہ رفیع اللہ صاحب کے مہمان خانہ ہی میں تانڈو ناچ ہو رہا ہے۔ وہاں پہنچ کر ہم لوگوں نے دیکھا کہ سعید اپنے باپ کی آہنی سلاخ لیے اندھا دھند بھانج رہا ہے۔ کبھی وہ تکیے کو پیٹتا اور کہتا کہ سالا اور لگا آگ۔ اب پھینک بم۔ اور کبھی گاؤ تکیے کو ڈھکیلتا ہوا کہتا کہ تو سالا بڑا سپاہی بنا ہے۔ گولی چلاتا ہے...... چلا ہم پر گولی۔

سعید پر جیسے جنونی کیفیت طاری تھی جس کے زیر اثر وہ سلاخ بھانج رہا تھا اور اس کے منہ سے کف جاری تھا۔

اس کے طیش اور دبے جذبات کے ابلتے لاوے کو دیکھ کر ہم لوگ دم سادھے بالکل اس طرح کھڑے تھے جیسے سینما کے کسی منظر کو فریز کر دیا جاتا ہے۔ اور اس منظر کے کردار آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے بے حس و حرکت نظر آتے ہیں۔

کھے خطوط

سلہ نگاری کی ا... (ناخواندہ)

پروفیسر سید محمد عقیل نے میرے مضمون
سرِ بالینِ اردو" (کتاب نما" اپریل ۹۳ء)
کے بارے میں اپنے تاثرات بڑے استفادہ
ش انداز میں پیش کیے ہیں۔ میں ان کے
ثرات کی قدر کرتا ہوں۔ البتہ انھوں نے
چھ ایسی باتیں تحریر فرمائی ہیں جو تصحیح طلب
یں۔ مثلاً:

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ میں نے
عض باتیں ایسی کہی ہیں جو "بارہا پہلے بھی
ہی جا چکی ہیں"۔ میں نے بھی اپنے مذکورہ
ضمون میں یہی بات عرض کی ہے (جو بڑے
ہم مسائل بنا دی گئی ہیں اور اپنی فہم کے
طابق ان پر استدراک کیا ہے۔ لیکن
فرانچہ نے ان باتوں کو متکررا دہرانے کی
یا ضرورت محسوس کیا؟ کیا یہ کتابت
طباعت اور کاغذ وغیرہ کا اسراف نہیں
ہے؟ اردو کے سلسلے میں ۱۹۴۷ء سے
پہلے جو کچھ کہا گیا اس کی عملاً یعنی ۱۹۴۷ء
کے بعد کردی گئی۔ گاندھی جی نے کہا تھا کہ
آزاد بھارت کی زبان ہندستانی ہوگی
جو اردو ہندی دونوں لپیوں میں لکھی جائے گی۔
لیکن آزادی کے بعد اور پنڈت نہرو کی وزارت
عظمیٰ کے دوران ہی، صرف دیوناگری لپی
میں ہندی کو قومی زبان قرار دیا گیا۔ یہ اُس
کانگریس سے قطعاً متوقع تھا جو جناح صاحب
کی مسلم لیگ کے مقابلے میں ہندو اکثریت
کی نمائندہ بننے پر مجبور ہوگئی۔ ایسی صورت
میں اس کے قائدین نے ۱۹۴۷ء سے پہلے
جو کچھ کہا تھا اسے ۱۹۴۷ء کے بعد کے احکامات
و اعمال سے مختلف ہونا ہی چاہیے تھا۔
آپ ماضی کا ذکر کرکے سب کو کیوں میٹھے خواب
دکھانا چاہتے ہیں؟ مسائل تو آج در پیش
ہیں، اُن کے حل کی ضرورت بھی آج ہے۔

آپ نے بہت سی قیاسی بدگمانیاں میرے
کھاتے میں درج کردی ہیں۔ شاید اس
میں کوئی ثواب کا پہلو ہو۔ ہمارے بہی
خواہانِ اردو کی یہ عام روش ہے کہ گفتگو
کبھی اصل مسئلے کے بارے میں نہ کریں گے۔
ہمیشہ اُمت کو خرافات میں الجھا دیں گے۔
پروفیسر عقیل نے تحریر فرمایا ہے کہ "شاید تمام
حکومتیں سمجھتی ہیں کہ اردو کی طرفداری کرنا اکثریت
کو ناراض کرنا ہے۔" (اس میں کیا شک ہے؟)
یہ اس "شاید" کے استعمال کی ضرورت
آپ کو کیوں محسوس ہوئی؟۔ کیا اپنی بات
قطعیت کے ساتھ کہتے ہوئے آپ کو ڈر
لگتا ہے؟۔ اور پھر آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں
کیا اُس سے کمیونلزم کی بو نہیں آتی؟۔

صفحہ ۴۸ پر آپ نے یہ تاثر دینے کی
کوشش کی ہے کہ میں نے بحث کمیونل موقف
سے کی ہے۔ اردو کے مسئلے پر گفتگو کو SIDE
TRACK کرنے کا یہ ایک بے حد
لطیف طریقہ ہے۔ آپ جب قارئین کو میری
ذات میں الجھا دیں گے تو کوئی اردو کے بارے
میں کیوں سوچے گا!۔ میں یہ کہنے کی جرأت
تو نہیں کرسکتا کہ آپ اردو سمجھنے سے
قاصر ہیں، البتہ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ
آپ نے میری بات پر توجہ دینے سے

اعتراض کیا ہے۔ میں نے تو یہ کہا تھا کہ "کہیے کہ ہاں یہ واقعی ہماری زبان بنا دی گئی ہے" (صفحہ ۱۰)۔ اسی صفحے پر میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ "زبان میری تیری نہیں ہوتی۔ وہ تو اُن سب کی ہوتی ہے جو اسے وسیلۂ ابلاغ کے طور پر استعمال کرتے ہیں" کیا یہ دونوں جملے اور ان کے تسلسل کی تحریر کمیونل ہے؟ شاید اردو سے متعلق بحث کو غلط جذباتی سمت کی طرف موڑنے کی اِس سے کارگر کوشش کوئی اور نہیں ہو سکتی۔

میں نے اپنے مذکورہ مضمون میں لکھا تھا: "میں زبان کو اس کا حق و مقام دلوانے کے لیے تمام جائز و پُرامن سیاسی طریقے بھی اپناؤں گا، مگر تخریب، تشدد، جارحیت اور منفی منافرانہ روش اختیار کرنے سے گریز کروں گا کہ یہ زبان کے نہیں بازوؤں کے استعمال کے "غلط طریقے ہیں"۔ شاید پروفیسر عقیل کو یہ اعلان کمیونل اور تخریب کارانہ نظر آیا اسی لیے انھوں نے بڑی لمبی چوڑی فہمائش کر دی ہے۔ میں اُن کی خدمت میں صرف یہ عرض کروں گا کہ: آپ کہتے ہیں تو سچ ہی کہتے ہوں گے! یہاں یہ وضاحت بھی کر دوں کہ یہ مضمون سانحۂ بابری مسجد سے ایک مہینے سے بھی زیادہ قبل لکھا گیا تھا۔

پروفیسر عقیل نے ایک بڑی دلچسپ بات کہی ہے کہ: "رہ گئی آخری بات کہ دکانوں پر سائن بورڈ اردو میں 'لکھنا' تو کسے اپنی دکانیں جلوانا ہے جو اِس طرح کی ہمت کرے گا"۔ میں یہ پوچھنے کی جرأت کروں گا کہ

کیا بمبئی، سورت، احمدآباد، ایودھ[illegible]
کانپور، رُدولی، اور ایسے ہی بہت ش[illegible]
میں جو مکانات، اور دکانیں وغیرہ
پھونکی گئیں اُن سب پر اردو کے [illegible]
بورڈ لگے ہوئے تھے؟ یہاں [illegible]
میں میرے گھر سے شمال میں پانچ س[illegible]
فاصلے پر ایک ہندو کی دواؤں کی دکا[illegible]
ہے، اور جنوب میں بھی تقریباً ا[illegible]
فاصلے پر ایک اور ہندو کی دواؤں [illegible]
ہے۔ دونوں دکانوں کے سائن [illegible]
پر اردو بھی موجود ہے لیکن ان دو
کے بیچ میں ستّو سے زیادہ دکانیں
کی اور چند دکانیں سکھوں کی ہیں
کے سب سائن بورڈ ہندی میں ہیں
اردو کی وجہ سے یہ دونوں دکا[illegible]
پھونک دی جائیں گی اور ہندی والی
دی جائیں گی؟ یہ اندازِ فکر ہی کمیو[illegible]
پسپائی کا غماز ہے۔ میرے محترم ف[illegible]
کو سائن بورڈ پڑھنے کی مہلت نہیں
انھیں تو ایودھیا کی طرح رہنما ڈائرکٹ[illegible]
تیار کر کے فراہم کر دی جاتی ہیں۔ ا[illegible]
کان دبا کر بھاگنے سے عافیت نہ
نہیں ہوتی۔

پروفیسر عقیل نے سیکولرزم کی [illegible]
کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: سیکولرزم [illegible]
روشن لکیر ہے اور ہندستان کے ا[illegible]
اِس روشن لکیر کا خیر مقدم کرنا چا[illegible]
شاید یہ تلقین اسی لیے کی گئی۔
مجھے یہ بتایا جائے کہ میں نے کمیونلزم
اور سیکولرزم کی شد و مد سے مخا[illegible]
کی ہے۔ حالانکہ سارے "فسانے"

ں اس کا ذکر نہیں۔ میں نے تو بحث اردو
ور صرف اردو سے کی ہے۔ میرے قلم
ا زد پر ہمیشہ کمیونلزم رہا ہے اور ان شاء اللہ
ئندہ بھی رہے گا۔ میں اس مصلحت اندیشی
ا بہر حال قائل نہیں ہوں کہ اگر ہندو
میونلزم ہو تو آئندہ خطرات سے خوف کھا کر
پ ہو جاؤ اور مسلمان کمیونلزم ہو تو
دب چیخو چلاؤ یا مسلمان کمیونلزم ہو تو
مصلحتاً" نظر انداز کر جاؤ اور ہندو
کمیونلزم ہو تو گریہ وزاری کے ساتھ داد
فریاد کرو۔ میرے نزدیک دونوں عفریت
یں اور دونوں قابلِ نفرین ہیں۔ خیر یہ تو
میری بات ہوتی جسے کہنے کے لیے مجھے اردو
کو فراموش کر کے اپنی مدافعت کرنے
پر مجبور کیا گیا ہے۔ سیکولرزم کے بارے
میں پروفیسر عقیل کیا کہتے ہیں، ملاحظہ
فرائیں صفحہ ۸۴ کالم دو اور صفحہ ۸۵ کالم
ایک (کتاب نما، اگست ۱۹۹۳)! محترم
اب سیکولرزم کی بنیاد پر قائم حکومت
ہی کمیونل بن کر ابھرے تو پھر "روشنی لکیر"
کہاں تلاش کی جائے؟۔ ہمیں پہلے اپنے
تضادِ فکر کا علاج کرنا چاہیے پھر اس کے
بعد کسی "ازم" کی بات کی جائے۔

پروفیسر عقیل نے میرے مشوروں
کو طفل تسلیاں قرار دیا ہے کیوں کہ ان
چھوٹے موٹے کاموں کے لیے محنت کرنی
پڑتی ہے۔ میرے یہاں ہمیشہ غریب
گھروں کے کچھ بچے پڑھنے آتے ہیں اور میری
اہلیہ انھیں لِلّٰہ فی اللہ اردو پڑھاتی
ہیں۔ ہم نے اپنے خاندان کے اُن بچوں
کو جو صرف ہندی پڑھتے تھے تشویق دلا کر
اردو بھی پڑھائی۔ یہ سلسلہ برسوں سے
جاری ہے۔ اگر ہم صرف طفل تسلی کر رہے
ہیں تب بھی بہت سے اطفال اردو سیکھ
گئے ہیں اور ان شاء اللہ آئندہ بھی سیکھتے
رہیں گے۔ ہم دونوں کا میدانِ کار اردو
کے لیے اور بھی بہت کچھ ہے لیکن انفرادی
کوشش کی وجہ سے خاصا محدود ہے۔
اسی لیے کسی اردو رسالے یا اخبار کے کالم
میں ہمارا نام نہیں چھپتا اور ہم "مجاہدین
اردو" کی صفوں میں شمار کیے جانے کے
اہل نہیں۔ اس کی ہمیں ضرورت بھی
نہیں ہے۔ اس سب کے باوجود
ہمیں یقین ہے کہ ہماری "طفل تسلیوں"
کا کچھ نہ کچھ نتیجہ تو نکلے گا ہی۔ جو لوگ
"بہت بڑے کام" کرتے ہیں وہ بیشک
ان "طفل تسلیوں" میں وقت ضائع نہ
کریں۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے
محنت کرنی پڑتی ہے، اور وہ بھی بلا معاوضہ

پروفیسر عقیل نے نہ معلوم کیوں اختلاف
برائے اختلاف، اور وہ بھی بلا تحقیق، کیا ہے۔
میں نے اپنے مضمون میں واضح طور پر لکھا ہے کہ
سمپورنانند اردو میں شاعری کرتے تھے اور تخلص
آنند کرتے تھے (صفحہ ۶) آپ زحمت کریں گے
تو آنند کے آخری دور کے 'نیا دور' لکھنؤ کے
شماروں میں ان کے اپنے اردو خطِ تحریر میں
غزلیں چھپی ہوئی مل جائیں گی۔ ڈاکٹر راجندر
پرشاد کا بی اے میں ایک مضمون فارسی تھا۔
اِس کی تصدیق ان کے باقیات
(MEMOIRS) سے کی جا سکتی ہے۔ کاشیو
اور رینتھ کے بارے میں اس طرح کی کوئی
فوری شہادت تو میں نہیں پیش کر سکتا۔

البتہ جن قائدین کو ہمارے خاندان کے افراد قریب سے جانتے تھے اُن کے بارے میں پروفیسر عقیل کے CURSORY REMARKS ۔ کو میں اہمیت دینے سے قاصر ہوں۔ میں نے جو کچھ عرض کیا تھا وہ پورے اعتماد کے ساتھ عرض کیا اور اسی کو درست مانتا ہوں۔

میرے مضمون میں چند ایک کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ بہتر ہوا کہ ان کی تصیح شائع کر دیں۔ صفحہ ۵ سطر ۶ "سید سابولاد" کے بجائے "سید ساہو سالار" سطر ۱۹ "چراغ دہلوی" کے بجائے "چراغ دہلی" اور سطر ۲۳ "برہمنی" کے بجائے "برہمنی" پڑھا جائے۔

ابن فرید، رام پور۔

● آپ کے مؤقر مجلہ "کتاب نما" میں میری کتاب "جام جہاں نما" اردو صحافت کی ابتدا "پر" جو مکتبہ جامعہ نے ۱۹۹۲ء میں شائع کی، تبصرہ نگاروں نے کچھ ایسی آرا رقم کی ہیں جن کا جواب دینا مناسب ہوگا۔

سب سے پہلے میں جناب شانتی رنجن بھٹا چاریہ کا مراسلہ لیتا ہوں جو آپ نے اگست ۹۳ء کے شمارے میں شائع کیا ہے۔ اس میں انھوں نے جناب سوم آنند کے اس مضمون پر تنقید کی جو انھوں نے میری کتاب پر لکھا تھا اور جون ۹۳ء کے شمارے میں شامل تھا۔ میرے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ میری تحقیق کے دوران، جو کئی اداروں، کتب خانوں اور شخصی مآخذ پر محیط تھی، انھوں نے متعدد معلومات فراہم کی تھیں۔ انھوں نے پوچھا ہے کہ کیا ان کا ذکر کتاب میں کیا گیا ہے۔

جناب شانتی رنجن میرے پرانے دوست ہیں اور انھوں نے اس موضوع پر قابل قدر کام کیا ہے۔ ہمارے مراسم معلومات کے دوستانہ تبادلوں سے بہت آگے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب میں ان کا ذکر پہلے تو عین ابتدا میں اپنے محسنوں کی فہرست میں کیا ہے اور پھر کتاب کے حواشی میں کئی مقامات پر کیا ہے۔ بدقسمتی سے ان کی کتاب "بنگالی ہندوں کی اردو خدمات" کا کوئی بھی اڈیشن مجھے میسر نہ ہوسکا لہٰذا میں اس سے استفادہ نہ کر سکا۔

اس سے قبل جناب سوم آنند نے اپنے مضمون میں کہا کہ مجھے جام جہاں نما کے چیف سکریٹری ولیم بٹروردتھ بیلے سے نوٹ دریافت شدہ ریویو کا، جو انھوں نے اس اخبار کے ابتدائی چھ ماہ کی تحریروں پر کیا تھا، پورا متن کتاب میں شامل کرنا چاہیے تھا۔ یہی بات ان سے قبل جناب شافع قدوائی نے بھی میری کتاب پر اپنے تبصرہ میں کہی تھی جو قومی آواز میں شائع ہوا تھا۔ جیسا کہ کتاب میں بتایا جا چکا ہے یہ جائزہ صرف جام جہاں نما ہی کا نہیں تھا بلکہ اس دور کے تمام دیسی اخباروں اور ان کے ساتھ ساتھ ہم عصر انگریزی اخباروں کا بھی تھا جو سب کے سب یورپین ملکیت میں تھے۔

اب امر واقع یہ ہے کہ اس ریویو کی ضخامت ۷۷ صفحات ہے۔ اس میں سے تقریباً ۱۵ صفحات جام جہاں نما پر صرف

یے گئے ہیں جو دیگر اخباروں پر کیے جانے
ے تبصروں کی نسبت سب سے زیادہ
۔ میں نے ان پندرہ کے پندرہ صفحات
مواد اپنی کتاب میں شامل کر دیا ہے
ران میں سے آٹھ صفحات کے اوریجنل
ریزی متن کا عکسی بھی پیش کیا ہے۔
ں کے علاوہ باقی بنگالی، فارسی اور انگریزی
باروں پر کیے گئے تبصروں کے متن
بجائے میں نے ان کا لب لباب اور
ر کتاب میں شامل کر دیا ہے تاکہ بیلے
، ریویو کے رجحانات کا مکمل علم اور
ہوم میسر آ جاتے۔ اگر میں ان سب
متن بھی کتاب میں بھر دیتا تو میری
س رائے میں یہ قاری اور کتاب
ے تاثر پر بہت بوجھل ہو جاتا۔

میری تحقیق صرف "جام جہاں نما"
اردو صحافت میں اولیت ہی پر مرکوز
یں تھی۔ یہ امر تو جناب عتیق صدیقی کی
۱۹۷ء میں شائع شدہ تحقیقی کتاب
ندستانی اخبار نویسی" سے مسلّم ہو ہی
تھا۔ میرا موضوع اس اولین اخبار
، موقف اور کردار کا تعین کرنا تھا
آج تک تقریباً تمام مورخین اور محققین
، سرکار کا معاون، وظیفہ خوار اور بے
عت اخبار مان کر ایوان صحافت ہی
، خارج کر دیا تھا۔ انھوں نے ابتدائی
برسوں میں اس کی پیشانی پر چھپنے
ی برطانوی حکومت کی مہر کو اپنے جائزے
حد آخر بنا لیا تھا۔ لیکن ولیم بٹروریتھ
لے کے نو دریافت شدہ ریویو سے
چلا کہ یہ عکس صرف اس کی صورت
ہی کی آرائش تھا۔ اپنی سیرت میں یہ ایک
بڑا خود دار، باکردار اور صحافت شناس
اخبار تھا۔

بیلے کے ریویو سے تو جام جہاں نما
کے موقف کردار کا حتمی فیصلہ ہو جاتا
ہے۔ اس سے صاف صاف پتہ چلتا
ہے کہ برٹش سامراج اسے سیاسی بیداری
کے جذبات پیدا کرنے والا جریدہ اور
سنگین شر انگیزی کا انجن بننے کی صلاحیت
رکھنے والا" وسیلہ تصور کرتا تھا۔ بیلے
کے اسی جائزے کی بنیاد پر گورنر جنرل
جان ایڈم نے ۱۸۲۳ء میں کمپنی کی حکومت
کا اولین پریس آرڈیننس جاری کیا۔

مزید دہلی کے ریذیڈنٹ فرانسیس
ہاکنز کے جام جہاں نما پر مقدمے کا انکشاف
پہلی بار اس کتاب میں ہوا ہے۔ اس
مقدمے کا ذکر نیشنل آرکائیوز نئی دہلی کے
ریکارڈ کے کیٹیلاگ میں تو موجود ہے لیکن
اس کے متن کی فائل اس دفتر میں
دستیاب نہیں۔ میں نے یہ فائل خاص
طور پر انڈیا آفس لائبریری، لندن سے
حاصل کی اور اس کی تفصیل اپنی کتاب
میں پیش کی۔ اس مقدمے کی بنا جام
جہاں نما کی وہ رپورٹ تھی جو اس نے
مغل شاہی دربار میں فرانسیس ہاکنز کے
سفارتی آداب کی خلاف ورزی کرنے اور
رعونت اور گستاخی سے کام لینے کے خلاف
شاہی کی تھی۔ یہ مسل بھی اس سے
قبل صحافت کی ہماری کسی تاریخ میں
شائع نہیں ہوئی تھی۔

جامِ جہاں نما کا باقی ہری پروت

ناشر اور مدیر دونوں کے اوصاف کا حامل تھا۔ ان میں پیشے کی آبرو اور اس کے تحفظ کی جرأت تھی۔ انھوں نے ڈاک کے محصول کے بارے میں، جو اس زمانے میں، کسی بھی اخبار کے لیے زندگی اور موت کا سوال تھا، انگریزی اور دیسی اخباروں میں فرق کرنے کی حکومت کی امتیازی پالیسی کے خلاف تحریری احتجاج کیا اور تمام اخباروں سے مساوی سلوک کا مطالبہ کیا۔ یہ نمایندگی نامہ اردو صحافت کی تاریخ کی اپنی مہذب لیکن مجاہدانہ دستاویز ہے۔ ہری ہردت کے حکومت کے نام اس مراسلے کا پورا متن کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔

کتاب میں پہلی بار اس دور کے ممتاز فارسی نامہ نگاروں کی فہرست دی گئی ہے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے سکریٹریٹ سے وابستہ تھے۔ ان نامہ نگاروں سے ہندستان کے اس لمبے ذہنی سفر کا پتا چلتا رہا جو مغل حکمرانوں کے زمانے کی صدیوں میں نشو و نما پاتا رہا۔ ہری ہردت کا جام جہاں نما اور رام موہن رائے کا مرآۃ الاخبار اسی علمی قافلے کی وہ نئی منزل تھی جو چھاپے کی ایجاد سے سامنے آئی۔

گرنچن چندن، جی ۶۴ جنگ پورہ
ایکس ٹینشن نئی دہلی ۱۱۰۰۱۴

● "کتاب نما" شمارہ ۸ ر اگست نظر سے گزرا۔ "اردو ڈرامے میں فوق الفطرت" سے لے کر "آزادی کے بعد اردو تنقید" تک تمام مضامین اچھے اور معلوماتی ہیں۔ مہمان مدیر ڈاکٹر بیگ احساس اپنے مضمون میں حقیقت کی جانب اشارہ کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ نثری حصے کی طرح شعری حصہ بھی خوب سے خوب تر ہے۔ خواجہ رحمت اللہ جری اور صدیقی مجیبی کے بیشتر اشعار ذہن و دل پر نقش چھوڑ جاتے ہیں۔

نثار احمد نثار، بیگم پور، سمستی پور

● اگست کا "کتاب نما" نظر نواز ہوا۔ ایک ہی نشست میں سارے مضامین پڑھ ڈالے۔ پھر دوبارہ یکسوئی کے ساتھ پوری کتاب پڑھی۔ ڈاکٹر بیگ احساس کا اداریہ واقعی قابلِ ستایش ہے۔ انھوں نے بالکل کھری اور سچی بات کہی ہے۔ ان کے اس خیال سے میں متفق ہوں کہ اردو گھرانے میں پیدا ہونے والے بچے اس کے رسم الخط سے محروم ہو جائیں گے۔ بھائی کبھی کلکتہ والوں سے بھی اداریہ لکھوائیے کیا صرف دہلی والے ہی ادیب یا شاعر ہیں؟ ابراہیم یوسف اور یوسف سرمست کا مقالہ نہ صرف معلوماتی ہے بلکہ ادبی بھی ہے اور بحث و مباحث کے بہت سے باب بھی سامنے آسکتے ہیں۔ ڈاکٹر توقیر احمد خاں اپنے مضمون سے انصاف نہیں کر پائے۔ مضمون بالکل سپاٹ اور عام سا ہے۔ روحِ غزل پر شجاع خاور کا تبصرہ مزہ دے، اسے تبصرہ کہتے ہیں۔ غزلوں میں مظفر حنفی، صدیقی مجیبی، احمد ندیم قاسمی، سیفی سرونجی کی غزلیں متاثر کرتی ہیں۔ ذاکر خاں ذاکر نے اپنی نظم کرفیو میں اچھا تاثر چھوڑا ہے [کلکتے کے ف ۲ اعجاز کا اداریہ اکتوبر ۱۹۹۰ میں شائع ہو چکا۔ (ادارہ)]

عاصم شہنواز شبلی، کلکتہ

"کتاب نما" ۹۳ء کا اگست کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ کالم "کھلے خطوط" کے تحت جناب اختر آغا لکھنوی کا خط پڑھنے کو ملا۔ تیسرا پیراگراف (الف) سمجھ میں نہیں آیا۔ ویسے بھی اس میں میری ولادت کے چھے سال قبل یعنی ۱۹۶۴ء کی بات کی گئی ہے۔

جناب رشک رام پوری اپنے مضمون "رباعی کے ۲۴ اوزان شجرۂ اخرب واشتر" میں کیا لکھا ہے نہیں معلوم لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ۲۴ یا ۳۶ اوزانِ رباعی میں "شجرۂ اشتر" کی بات اتنی ہی غلط" جتنی "شجرۂ اخرم" کی ہے۔ ۲۴ یا ۳۲ ار دو کی اور علام سحر عشق آبادی کے اوزانِ رباعی میں "زحاف شتر" کا استعمال ہوتا ہی نہیں ہے تو "شجرۂ اشتر" کی بات کرنا کہاں کی دانش مندی۔

فراز بندہ نواز۔ بادامی۔

● اگست ۹۳ء کا "کتاب نما" ملا۔ پروفیسر سید محمد عقیل (الٰہ آباد) کا ایک طویل کھلا خط باصرہ نواز ہوا۔ اس خط کے اواخر میں دبیرؔ کے ایک مصرع

کانِ نبیؐ کے گوہر یکتا حسینؑ ہیں

کے متعلق لفظ کان کے چند مترادفات کا ذکر کیا ہے۔ گنج، بحر، تاج، دُر، اور درج۔ ان میں دُر کیسے گوارا ہو سکتا ہے جبکہ دُر کے معنی گوہر ہیں۔

میرے والد مرحوم سید غلام محمود شاہ نشترؔ عثمانیہ یونی ورسٹی سے گریجویٹ تھے اور الحمد اللہ وحید الدین سلیم، مناظر احسن گیلانی، عبدالرحمٰن، الیاس برنی وغیرہ کے شاگردوں میں شمار ہوتا تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی سے بعد میں بھی خط و کتابت رہی۔ ۱۹۴۸ء کے کسی شمارۂ معارف، اعظم گڑھ میں مولانا کے خطوط، والد مرحوم کے نام، شائع ہوئے ہیں۔ اسی مصرع و واقعہ کو والد صاحب نے قریب تیس برس قبل اس طرح بیان فرمایا تھا:-

کانِ نبیؐ، گنج نبیؐ اور بحر نبیؐ پر جب چوٹ پڑی تو دبیرؔ نے تیسری دفعہ انتہائی مستقل مزاجی اور فاتحانہ شان سے اس طرح فرمایا کہ

کنزِ نبیؐ کے گوہر یکتا حسینؑ ہیں

مجھے عرض کرنا یہ ہے کہ پروفیسر سید محمد عقیل نے کنز نبیؐ کا فقرہ یا بندش کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ جبکہ تاجِ نبیؐ اور درج نبیؐ کچھ اضافہ معلوم ہوتا ہے جبکہ تاج فارسی ہے۔

"ادبی اور تہذیبی خبریں" میں ایک کمی ہمیشہ کھٹکتی ہے کہ کتابوں کے رسم رونمائی کی خبر تو ہوتی ہے مگر اس کتاب کا پتا یا قیمت درج نہیں کی جاتی۔

بعض دفعہ ادبا و شعراء کے انتقال کی خبر تو ہوتی ہے مگر تاریخ وفات نہیں ہوتی۔ مثلاً اسی شمارے میں پروفیسر مشتاق ص ۱۰۲ اور پروفیسر نورالحسن ص ۱۰۳ کی تاریخ وفات درج نہیں ہے۔ اگر تاریخ ولادت بھی درج ہو تو یہ مستزاد ہوگا۔

سید شاہ فضل الرحمن نادر
قاضی پورہ۔ کلمب۔ ایوت محل۔

● "کتاب نما" کے اگست ۹۳ء کے شمارے میں ڈاکٹر توقیر احمد خاں کا مقالہ "آزادی کے بعد اردو تنقید" بہت سرسری، تشنہ

بلکہ بعض لحاظ سے گم راہ کن ہے۔ اس مقالے
میں انھوں نے بے شمار نام گنا دیے ہیں
جن میں سے بعض نام ایسے ہیں کہ ان پر
تنقید نگار کا لیبل لگانا تہمت بے جا کے
علاوہ اور کچھ قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔
مختلف حقیقی تنقید نگاروں کو مقالے میں
جتنی جتنی جگہ دی گئی ہے اس میں کوئی
توازن نہیں ہے۔ بعض بڑے ناموں
کو چند سطروں میں ٹال دیا گیا ہے اور
بعض چھوٹے ناموں کو ان کے مرتبے سے
بہت زیادہ جگہ دی گئی ہے۔ توقیر احمد
خاں صاحب کے بعض بیانات ایسے ہیں
جن سے ان کے علمی مقام کے بارے میں
اچھی رائے قائم نہیں ہوتی ہے مثلاً
پروفیسر مجنوں گورکھپوری کے بارے
میں یہ لکھنا کہ "ان کا تنقیدی کارنامہ بہت
کم بلکہ نا کے برابر ہے" یا ڈاکٹر کلیم الدین
احمد کے لیے یہ کہنا کہ "ان سے ادب کو
فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچا۔۔۔۔
وہ تنقید میں تخریب یا تنقیص کے علاوہ
کوئی اضافہ کرنے سے قاصر رہے" ایسی
جرأتِ بے جا ہے جس کی مذمت کیے
بغیر چارہ نہیں ہے۔ ہم کسی ادیب یا تنقید
نگار کی بعض یا اکثر آراء سے اختلاف
کرنے کے باوجود اس کے ادبی یا تنقیدی
کارنامے کی یک سر نفی کرنے کا حق
کسی طرح نہیں رکھتے ہیں اور اس طرح
کی بے دلیل رائے تو کسی بڑے سے بڑے
اور مانے ہوئے تنقید نگار مثلاً سید
احتشام حسین، پروفیسر آل احمد سرور،
شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر وزیر آغا،
وارث علوی یا کسی کے بارے میں بھی دی
جاسکتی ہے۔ کوئی کسی کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔

مجنوں گورکھپوری نے جتنی طویل
مدت تک اردو ادب کی جو گراں قدر
خدمت انجام دی، صرف تنقید پر کم سے
ایک درجن بلند پایہ کتابیں لکھیں،
اردو کے بعض قدیم لیکن فراموش کردہ
شعرا کو جس طرح حیاتِ تازہ بخشی، جتنی
وضاحت سے اور جیسے دو ٹوک انداز میں
شعر و ادب سے متعلق اپنی آرا پیش کیں،
بالخصوص ادب میں مارکسی نقطۂ نظر کی جیسی
ترجمانی کی اس کا انھیں یہ صلہ دینا کہ
ان کا کارنامہ نا کے برابر ہے ۔۔ کار از تو
آید و مرداں چنیں کنند۔

کلیم الدین احمد نے ہمارے ادب
کی پرکھ کے لیے مغربی پیمانوں پر جو اصرارِ
بے جا کیا اور اپنے خیال کے مطابق ان
پیمانوں پر پورا نہ اترنے کی بنا پر جس طرح
ہمارے بعض بڑے شعراء کی ناقدری کی
اس پر اعتراض بالکل بجا اور درست لیکن
اس کے باوجود ان کے سارے تنقیدی
سرمائے کو دریا برد کردینا تو ایسا ہی ہوگا
جیسے کوئی شخص قاضی عبدالودود کی خوردہ
گیری کے پیش نظر بطور محقق ان کے کارناموں
سے یک سر انکار کردے۔

اس مقالے میں بہت سے غیر اہم
ناموں کے ہجوم میں بعض اہم ناموں کی غیر
موجودگی بھی بہت کھٹکتی ہے میں مثال
کے طور پر صرف دو، تین ناموں کی طرف
اشارہ کرنا چاہتا ہوں یعنی فراق گورکھپوری،
ممتاز حسین اور ڈاکٹر عبدالعلیم۔

یہ کہنا کہ حصولِ
ی کے بعد کے تنقید نگاروں میں ہمیں
د، حالی اور شبلی کے مرتبے کا کوئی تنقید
ر نظر نہیں آتا کسی طرح مناسب
ں ہے۔ ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے
ا اور یہ تقاضے مختلف ادوار میں مختلف
ید نگار پورے کرتے رہتے ہیں —
ں اجمال کی تفصیل کا ایک مختصر مراسلہ
ل نہیں ہوسکتا ہے۔

ضمناً ایک بات یہ عرض کر دوں کہ
بر احمد خاں صاحب نے شمس الرحمٰن
ر وقی صاحب کی توصیف میں فرمایا ہے
"۔۔۔۔ موصوف اپنی تحریروں میں
شرق کے قدیم علما، ابنِ رشیق خلدون
ر جرجی زیدان وغیرہ کے خیالات سے
ستفادہ کرتے ہیں۔" یہاں ابن رشیق
بن خلدون کے ساتھ جرجی زیدان کا
کر جتنا بے موقع ہے اور اسے قدیم
ماہیں شمار کرنا جس علمیت کا غماز ہے
س کی داد اہلِ نظر ہی دے سکتے ہیں
ر شاید سب سے زیادہ خود فاروقی
صاحب۔

اسی شمارے میں ڈاکٹر یوسف
ر مست کے مضمون عربی تنقید کے عنوان
سے دھوکا ہوتا ہے کہ یہ شاید عربی تنقید
ا جائزہ ہوگا لیکن مضمون پڑھ کر اندازہ
وتا ہے کہ یہ ڈاکٹر اقبال حسین ندوی کی اسی
م کی کتاب پر تبصرہ ہے۔ قطع نظر اس کے
ر یہ کہنا کہ عربی تنقید پر یہ پہلی مبسوط اور
نصیل کتاب ہے کہاں تک درست ہے،
مضمون کا عنوان ایسا ہونا چاہیے تھا جو
دھوکے میں نہ ڈالتا۔

ریاض الرحمٰن شروانی، حبیب منزل علی گڑھ

● میری ایک غزل (مارچ) کے مطلع اور
ایک شعر پر رفعت سروش صاحب نے
اعتراض کیا تھا (مئی)۔ کسی پر کوئی اعتراض
ہو تو ضروری نہیں کہ وہی اس کا جواب دے
دوسروں کو بھی توجہ دینا چاہیے لیکن
اگست کے شمارے تک ایسی کوئی تحریر
شائع نہیں ہوئی، ناچار میں خود ہی
کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میری غزل کا
مطلع ہے:

دردِ حد سے گزر گئے یارو
سب جتن بے اثر گئے یارو

رفعت سروش صاحب لکھتے ہیں:
"۔۔۔۔ درد کو جمع کی طرح آج تک نہیں
پڑھا۔۔۔۔" اس کے بعد جمع کی صورت
میں خواتین کی زبان کا ذکر کرتے ہیں اور
اس کا سلسلہ دردِ زہ کے تواتر سے جوڑ
کر میرے مطلع میں طنزاً ایک مبتذل سے معنی
پہناتے ہیں۔ واضح رہے کہ میں نے درد کو
لفظی معنی میں نہیں بلکہ مرادی یا ملاحتی معنی
میں استعمال کیا ہے۔ اس کا بہت
صاف اشارہ ان تکلیف دہ مسائل کی
طرف ہے جن کو حل کرنے کی تمام کوششیں
ناکام ہو چکی ہیں یا ہو رہی ہیں۔ ردیف
کی وجہ سے میں نے اپنے احساسات کی
ترجمانی کے لیے ۱۹۵۴ء کی ایک غزل میں بھی
درد کو بطور جمع نظم کیا تھا:

روتے روتے اپنی حالت پر ہنسی آنے لگی
درد کچھ ایسے بھی دل میں آج پیدا ہو گئے

یہ غزل کسی معیاری رسالے میں شائع ہوئی تھی۔ اسس زمانے میں میں مشاعروں میں بھی شرکت کرتا تھا۔ پھر یہ غزل میرے مجموعۂ غزلیات "برگِ غزل ۱۹۸۱ء" میں بھی شائع ہوئی۔ کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ بات سیدھی سی ہے۔ جب زخم، داغ، رنج اور غم وغیرہ بطور جمع استعمال ہوتے ہیں تو "درد" نے کیا قصور کیا ہے کہ اسے کسی خاص معنوی ماحول یا ضرورت شعری کی بنا پر بھی بطور جمع استعمال نہ کیا جائے۔ مجھے اعتراف ہے کہ زبان کے معاملے میں منطق ہمیشہ ساتھ نہیں دیتی اور میرا کلام سند نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہاں مجھے منطق ہی نہیں، استاد کی پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ "درد" اردو میں عام طور پر واحد مستعمل ہے لیکن بطور جمع اس کا استعمال مفقود نہیں ہے۔ میر کے شعر ہیں:

ٹپکتے درد ہیں آنسو کی جاگہ
الٰہی چشم یا زخمِ کہن ہے

دل نے کیا کیا نہ دردات دیے
جیسے یکتارہے کوئی پھوڑا

ظلم سہے ہیں داغ ہوئے ہیں رنج اٹھائے ہیں درد کھنچے
اب وہ دل میں تاب نہیں جو لب تک آہِ سرد کھنچے

میری غزل کا ایک شعر ہے:

بستیاں جل رہی ہیں نفرت میں
پیار کے وہ نگر گئے یارو

اس پر رفعت سروش صاحب نے یہ سوال کیا ہے کہ "وہ" کا اشارہ کس کی طرف ہے؟ جواباً عرض ہے کہ پیار کے انھیں نگروں کی طرف جو اب نہیں رہے۔ اگر منشا یہ ہے کہ "وہ" زاید ہے یا "پیار کے" اور "نگر" کے بیچ میں غلط آیا ہے تو اس طرح کا استعمال بہت عام ہے۔ صرف مصرعے پیش کرتا ہوں:

وہ ترکیب اور چاند سا دہ بدن (میر حسن)
وہ عناصر میں اعتدال کہاں (غالب)
ہم زباں یاروں کی وہ رنگیں نوائی ہائے ہائے (جوش)
عارض سے ڈھلکتے ہوئے شبنم کے وہ قطرے (جگر)

ابو محمد سحر، ۲۹ مالویہ نگر، بھوپال۔

● "کتاب نما" اگست ۹۳ء کے لیے شکریہ۔ مہمان مدیر ڈاکٹر بیگ احساس کا مضمون "آندھرا پردیش میں اردو کے مسائل" بہت خوب ہے۔ انھوں نے بالکل درست لکھا کہ "حیدرآباد جو اردو تہذیب کا گہوارہ تھا اب اسے پہچاننا مشکل ہے۔"
حیدرآباد کو میں اپنا وطن ثانی جانتا ہوں۔ کوئی ۲۰، ۲۲ سال تک سابق ریاست حیدرآباد میں رہا اور یہی وجہ ہے کہ آج اردو کا ادیب ہوں، ورنہ اپنی مادری زبان بنگلہ ہی کا ادیب ہوتا۔ اس پورے مضمون میں صرف ایک بات موصوف نے غلط کہی۔ ان کا جملہ ہے۔ "اس ریاست کا اپنا سکہ، محکمہ ڈاک و ریل اور اپنی نشر گاہ تھی اور ان سب پر اردو کی حکمرانی تھی۔" جہاں تک اپنا سکہ (سکہ عثمانیہ یا حالی) محکمہ ڈاک اور نشرگاہ کا تعلق ہے وہاں سرکاری زبان اردو تھی یعنی "اردو کی حکمرانی" تھی۔ لیکن محکمہ ریل کی زبان اردو

نہیں بلکہ انگریزی رہی ہے۔ ریاستی ریلوے
کا نام پہلے این۔ جی۔ ایس۔ آر۔ اور بعد
میں یعنی صرف این۔ ایس۔ آر۔ یعنی
نظام اسٹیٹ ریلوے رہا اور
ریلوے میں تمام دفتری کام کاج انگریزی میں ہوتا
تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ریلوے کے ملازمین
بیشتر حیدرآبادی نہیں تھے یعنی وہ دیگر
ریاستوں سے ملازمت کے سلسلے میں
آتے ہوتے لوگ تھے۔ خود میرے والد
مرحوم بھی نظام اسٹیٹ ریلوے میں
اسٹیشن ماسٹر تھے جو بنگال سے ریاست
حیدرآباد میں ملازمت کرنے گئے تھے۔
یہاں ریلوے کے بجائے صاحبِ
مضمون محکمہ کروڑگیری (CUSTOMS)
لکھ سکتے تھے کیوں کہ اس محکمہ کی دفتری
زبان بھی اردو تھی اور ہر ریلوے اسٹیشن
کے باہر کروڑگیری کا دفتر ہوتا تھا۔ آج
یہ لفظ "کروڑگیری" کہیں سننے میں
نہیں آتا بلکہ اردو میں بھی "کسٹم" یا "چونگی" کا لفظ عام ہوگیا ہے۔ اسی طرح
حیدرآباد میں ڈاک کے لیے "ٹپہ خانہ"
کہا جاتا تھا اور شہر حیدرآباد کے جنرل
پوسٹ آفس کی عمارت پر بھی ہم لفظ
"ٹپہ خانہ" ہی لکھا ہوا پاتے تھے۔
مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ اردو میں
خطوط پر پتا لکھتے ہوتے سب سے پہلے
"ٹپہ خانہ (فلاں)" اور آخر میں "جناب
(فلاں کو) برسد" لکھا جاتا تھا۔ آج
کے نوجوان اس طرح پتا لکھنا بھی
نہیں جانتے۔ پھر اس طرح کے سیکڑوں
(حیدرآبادی لفظ "سینکڑوں") اردو
دفتری الفاظ آج مر چکے ہیں یعنی اردو کا
نوجوان طبقہ ان الفاظ کے استعمال سے
آگاہ نہیں ہے۔

اس سال کے شروع میں بھی
میں دو تین دنوں کے لیے حیدرآباد گیا تھا
اور جب بھی گزشتہ ۸۰ء سال میں
حیدرآباد جانا ہوا میں نے یہ محسوس کیا
کہ سابق ریاست یا سابق شہر حیدرآباد
جو اردو کا گہوارہ تھا وہ مٹ چکا ہے۔
لہذا ڈاکٹر بیگ صاحب نے بالکل حقیقی
تصویر کھینچی ہے۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ۔ کلکتہ

● ماہنامہ "کتاب نما" بابتہ ماہ اگست
۱۹۹۳ کو پڑھنے کے بعد فائل کرنے کے لیے
رکھتے ہوئے جون ۹۳ کے ماہنامے پر نظر
پڑی جس کے صفحات نمبر ۸ اور ۹ کے درمیان
ایک سلپ رکھا ہوا تھا۔ صفحہ ۹ پر جناب
علی سردار جعفری کی غزل "راج نراج" کے
عنوان سے شائع ہوئی ہے حالانکہ غزل کا کوئی عنوان
نہیں ہوتا! (اس غزل کے ساتویں شعر
میں سے

رسن میں ماؤں اور بہنوں کے بازو باندھے جائیں گے
شہیدانِ وفا کے خوں بھرے نیزوں پہ سر ہوں گے

ترادفِ ردیفین "گے" کا فنی نقص ہے۔ اگر
سردار صاحب اس سقم کو سقم نہیں مانتے
تو پھر ردیف و قافیہ کی پابندی کرنے کی
بھی زحمت کیوں فرماتے ہیں؟!
آٹھواں شعر ہے سے

منایا جائے گا جشنِ مسرت سونے کھنڈروں میں
اندھیری رات میں روشن چراغِ چشمِ تر ہوں گے

بقیہ باقی صفحہ ۸۸ پر

(تبصرہ نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

انداز گفتگو کیا ہے

(تنقیدی مضامین کا مجموعہ)

مصنف :- شمس الرحمٰن فاروقی
ناشر :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
مبصر :- خالد محمود
قیمت :- ۷۵/- روپے

جدید اردو تنقید میں شمس الرحمٰن فاروقی کا نام سند کا درجہ رکھتا ہے۔ ڈھائی تین دہائیوں پر پھیلا ہوا ان کا تنقیدی سرمایہ، سیکڑوں صفحات پر مشتمل فکر انگیز تحریریں ذہانت سے بھرا پرا گہرا تنقیدی شعور، نتیجہ خیز وسیع مطالعہ، اعلا ادبی ذوق اور علمی بصیرت وہ امتیازات ہیں جو انھیں معتبر و مستند بنانے میں ممد و معاون ہیں۔ ان کے مشہور ادبی ماہنامے "شب خون" نے اردو دنیا میں نئے ادب کو روشناس کرانے اور فروغ پذیر بنانے میں نمایاں اور اہم کردار ادا کیا ہے۔ نئے ادب کی کم و بیش دو نسلوں کو بنانے بگاڑنے کا سہرا اسی پرچے کے سر ہے۔

گزشتہ تین برسوں میں فاروقی صاحب کی پے در پے چار کتابیں بشمول "انداز گفتگو کیا ہے" شائع ہوئیں اور حق یہ ہے کہ ان کتابوں نے جن میں "شعر شور انگیز" اور "تفہیم غالب" کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں اردو ادب کے سرمایہ میں غیر معمولی اضافہ کیا۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی صاحب نے بڑی اچھی اور سچی بات کہی ہے کہ "شمس الرحمٰن فاروقی ہمارے ان ادیبوں میں سے ہیں کہ جن کی کوئی کتاب شائع ہوتی ہے تو وہ ایک ادبی واقعہ ہوتا ہے۔" گویا تین سال میں چار ادبی واقعے ہوئے۔ حالانکہ یہ چار کتابیں صرف تین سال کا مواد نہیں، فاروقی صاحب کی طویل فکری اور علمی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان چاروں کتابوں میں (ایک تو خیر انتخاب ہے) تین کا بنیادی موضوع اگرچہ تنقید ہے اور فاروقی صاحب بھی ایک ناقد کی حیثیت سے زیادہ پہچانے جاتے ہیں مگر مزاج کی تخلیق پسندی کا اثر دیکھیے کہ تین میں سے دو کتابوں ("شعر شور انگیز" اور "انداز گفتگو کیا ہے") کے نام میر و غالب کے اشعار سے مستعار ہیں۔ صرف ایک

کتاب کا نام "تفہیمِ غالب" ہے، حالانکہ تینوں کتابوں کے موضوعات تنقید و تفہیم سے تعلق رکھتے ہیں۔

فاروقی صاحب کے تنقیدی مضامین کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ حقیقت بہت جلد آشکار ہو جاتی ہے کہ انھوں نے اردو ادب کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے اور وہ دوسروں سے مختلف ہو کر سوچتے ہیں۔ اردو شعریات میں نئی وسعتیں اور نئے زاویے تلاش کرتے ہوئے انھوں نے فکر و فن کی ہر سطح پر بہت زیادہ غور و خوض کیا ہے۔ غور و خوض کے مراحل میں مختلف زبانوں کے ادب کا مطالعہ ان کا معاون و مددگار ہے وہ اپنے وسیع مطالعہ کی تیز روشنی کا فوکس شعر کے ہر لفظ پر اس خوبی سے مرتکز کرتے ہیں کہ تمام شعری صفات دمک اٹھتی ہیں۔ یہی ان کا وہ تنقیدی اور تشریحی رویہ ہے جو ابتدا میں نامانوس اجنبی کی طرح تھا مگر اب سب سے زیادہ قابلِ اعتبار ہے۔

"انداز گفتگو کیا ہے" کا پہلا مضمون "اردو غزل کی روایت اور اقبال" ہے اس مضمون کے دوسرے صفحے پر غالب کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فاروقی صاحب لکھتے ہیں۔

> "غالب کی غزل میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جو اردو غزل کی روایت میں موجود نہ تھیں اب غالب نے ان کو غزل میں استعمال کر لیا تو وہ باتیں بھی غزل کی روایت کا حصہ بن گئیں۔"

خود فاروقی صاحب کا بھی یہی معاملہ ہے یعنی ایسی بہت سی باتیں ہیں جو اردو تنقید میں موجود نہ تھیں اب فاروقی صاحب نے ان کو تنقید میں استعمال کر لیا تو وہ باتیں بھی تنقید کی روایت کا حصہ بن گئیں۔ زیرِ نظر کتاب "انداز گفتگو کیا ہے" بھی فاروقی صاحب کی قائم کردہ روایت کی امین ہے۔

دو سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں کل پندرہ مضامین شامل ہیں جن کے بارے میں فاروقی صاحب پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

"گزشتہ دس بارہ برس میں جو مضامین میں نے لکھے ہیں ان میں بہت سے ایسے ہیں جن میں کلاسیکی غزل کی شعریات، اس کی روایت، نئی شاعری سے اس روایت کا تعلق اور بیسویں صدی کے بعض اہم شعرا میں اس روایت کا اظہار یا عدم اظہار جیسے موضوعات پر گفتگو ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں ایسے سب مضامین ایک خاص ترتیب سے جمع کر دیے گئے ہیں۔"

اس کتاب کے شمولات میں جو ایک خاص ترتیب سے جمع کر دیے گئے ہیں سبھی کا موضوع شاعری ہے اور شاعری میں بھی ایک کو چھوڑ کر سارے مضامین غزل اور غزل گو شعرا سے تعلق رکھتے ہیں۔ فاروقی صاحب نے جن شعرا کا انتخاب کیا ہے ان میں فہرست کی ترتیب کے مطابق اقبال، غالب، فراق (دو مضامین) میر، ذوق، دبیر، فیض، خلیل الرحمٰن اعظمی، منیب الرحمٰن عزیز قیسی، زیب غوری اور منصور سبزواری شریک ہیں۔

آخر کے دو مضامین "کلاسیکی غزل کی شعریات کا خاکہ" اور "سادگی، اصلیت اور جوش" بھی موضوع کے اعتبار سے غزل سے تعلق رکھتے ہیں۔

تنقید میں فاروقی صاحب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ سہل پسند یا نقال نہیں انھوں نے اردو شعر و ادب کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے مختلف شارحین سے متعدد ناقدین تک سب کے خیالات سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد علم و دانش کی روشنی میں اپنے فکری نتائج کو پرکھا ہے پھر بطرز استدلال پیش کیا ہے۔ دوسری زبانوں کے ادب نے ان کی نظر میں وسعت اور ذہن میں کشادگی پیدا کی ہے اپنے وسیع مطالعہ کے توسط سے تنقید ہو یا تشریح وہ ہمیشہ دور کی کوڑی لانے کی کوشش کرتے ہیں اور عام طور پر اشعار کی ساری نہیں متور کر کے تمام گرہیں کھول کر قاری کو حیرت و مسرت سے ہم کنار کر دیتے ہیں مگر کہیں کہیں مفہوم کے تعاقب میں اتنی دور بھی نکل جاتے ہیں کہ متعلقہ شعر ہی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے لیکن یہ صورت عام نہیں۔ عام یہ ہے کہ وہ ایسے اشعار میں بھی جہانِ معنی تلاش کر لیتے ہیں جن سے دوسرے ناقدین یا شارحین سرسری گزر گئے ہیں۔ انھوں نے بہت سے قدیم و جدید شعرا خصوصاً میر و غالب کو از سر نو سمجھنے اور سمجھانے کی نہایت کامیاب کوشش کی ہے ''

"انداز گفتگو کیا ہے" "مکتبہ جامعہ" کی کتاب ہے اور مکتبہ جامعہ کا نام حسنِ طباعت کی ضمانت خیال کیا جاتا ہے اس لیے یہ حصہ موضوع گفتگو نہیں البتہ حیرت اس بات پر ہے کہ طباعت کی تمام خوبیوں کے باوصف قیمت صرف ۵۷ روپے ہے۔ دورِ حاضر میں کتابوں کی حوصلہ شکن قیمتوں کے درمیان زیر تبصرہ کتاب کی قیمت سکون کا اک سانس معلوم ہوتی ہے۔

بقیہ صفحہ ۸۵ کا

اس میں "کھنڈروں" کا وزن عروضی غلط ہے۔ لفظ کھنڈر ہے (فیروز اللغات صفحہ ۵۵۹) "کھنڈر" نہیں یعنی وہ فَعَل کے وزن پر ہے فعلن کے وزن پر نہیں ہے اس لیے اس کی جمع بھی "کھنڈروں" "فَعِلُن" کے وزن پر ہو گی جیسے "کھنڈروں" "گھروں" سر پھروں وغیرہ یعنی "فَعَلُ" کے فعل کے وزن پر ہی ہو گی۔

نظیر محمد مل۔ مغلپورہ۔ حیدر آباد

مرقع دہلی

مرتبہ و مترجمہ: خلیق انجم

نواب درگاہ قلی خاں کی "مرقع دہلی" دلی کی سماجی اور تہذیبی زندگی پر واحد تہہ فارسی ماخذ ہے۔ خلیق انجم صاحب نے چار مخطوطات کی مدد سے اس کتاب کا فارسی متن مرتب کیا ہے ان چار مخطوطات میں ایک وہ بھی ہے جو برٹش لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔ فارسی متن کا اردو میں بہت صاف، سادہ اور شگفتہ زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے اس کتاب کے حواشی اور تعلیقات لکھے گئے ہیں۔ آخر میں اشاریہ دیا گیا ہے۔ یہ کتاب متنی تنقید کا بہترین نمونہ ہے۔ قیمت: -/۱۶۰ روپے۔

جدّہ میں ایک غیر منقوط نعتیہ مجموعے کی تعارفی تقریب

حال ہی میں ایک جواں سال عاشق رسول ڈاکٹر محمد سعید فضل کریم نے اپنا اوّلین نعتیہ مجموعہ کلام ممدوح کردگار کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کہیں بھی نقطہ استعمال نہیں ہوا اور اول تا آخر پوری کتاب ہی غیر منقوط ہے۔ جدّہ میں مصنف کی حوصلہ افزائی کے لیے اس کتاب کی ایک تعارفی تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت صوفی محمد سبطین شاہجہانی نے اور نظامت نسیم سحر نے کی جب کہ صاحب کتاب ڈاکٹر سعید فضل کریم کے علاوہ ڈاکٹر رحمت اللہ کھوکھر صاحب مہمان خصوصی تھے۔ صاحب کتاب کی شخصیت اور ان کے مذہبی و روحانی رجحانات پر اظہار خیال کرنے والوں میں ان کے قریبی دوست محمد خالد، ان کے والد الحاج ملک فضل کریم، ان کے بہنوئی محمد خالد اور ڈاکٹر رحمت اللہ کھوکھر شامل تھے جب کہ کتاب کے حوالے سے ان کے فن پر مضامین پیش کرنے والوں میں مہتاب قدر اور نسیم سحر شامل تھے۔ فن نعت گوئی اور ممدوح کردگار میں شامل نعتوں کے حوالے سے صاحب صدر صوفی محمد سبطین شاہجہانی نے بھی نہایت بصیرت افروز اور عالمانہ خیالات کا اظہار کیا اور ساتھ ساتھ مصنف کو چند مفید مشورے بھی دیے۔ اس موقع پر صاحب کتاب سے ان کی کئی نعتیں بھی سماعت کی گئیں۔

محفل کا دوسرا دور مشاعرے پر مبنی تھا جس میں جدّہ کے چیدہ چیدہ شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کیا۔ اس محفل کی صدارت ڈاکٹر رحمت اللہ کھوکھر نے اور نظامت جناب احمد سعود نے کی۔ شعرائے کرام کے کلام سے مختصر انتخاب پیش خدمت ہے۔

وہ راحم، ارحم، اکرم
رحم کرم کا داں ساگر
مار طہورہ سے معمور
احمر احمر وہ کوثر

ڈاکٹر سعید فضل کریم

اے شافعِ محشر عرض ہے یہ
اک حشر بپا ہے امّت پر
اے رحمتِ عالم نظرِ کرم
اک ظلم روا ہے امّت پر

ناظم الدین مقبول

کلیم اللہ فاروقی
(آپ نے ایک نعتیہ نظم سنائی)
آج کے بچوں پہ کل جونہی شباب آجائے گا
قاتلوں کے واسطے یومِ حساب آجائے گا

مہتاب قدر
کرم سے آپ کے معمور ہے مٹی مدینے کی
اسی باعث ہمیں منظور ہے مٹی مدینے کی

ڈاکٹر غیاث عارف

میں اپنی نفی کرنے میں مصروف ہوں کب سے
اندر سے کوئی مجھ سے یہ کہتا ہے کہ میں ہوں

نسیم سحر

لفظوں کے پھول رشکِ بہشتِ نعیم ہیں
عنوان مرے سخن کا رسولِ کریمؐ ہیں

محمد سبطین شاہجہانی

آخر میں صاحب صدر ڈاکٹر رحمت اللہ کھوکھر نے ایک خوب صورت نثر پارہ بعنوان "عرض گذاشت پیشِ رسولؐ" سنایا جو جذبوں کی سرشاری اور الفاظ کے حُسن کے پیشِ نظر مزاج میں منظوم محسوس ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس خوب صورت محفل کا اختتام ہوا۔

شجاع خاور کی طویل نظم

"دوسرا شجر" پر مباحثہ

انجمن ترقی اردو اور انڈین گلڈ آف اردو آتھرز کے تعاون سے اردو گھر میں ۲۷ر اگست کو ماہانہ ادبی ملاقات کے سلسلے میں شجاع خاور کی پرانی اور سب سے پہلی شعری کتاب طویل نظم "دوسرا شجر" کے جدید ایڈیشن پر ایک فکر انگیز اور دلچسپ مباحثہ ہوا۔ سات سو مصرعوں پر مشتمل یہ طویل نظم آج سے پچیس سال قبل ۱۹۶۸ء میں تخلیق کی گئی تھی اور جنوری ۱۹۷۰ء میں کتابی صورت میں شائع ہو کر پہلی بار منظر عام پر آئی تھی۔ نظم کا بنیادی خیال آدم کی جنت بدری کے واقعے سے شروع ہوتا ہے۔ اس زوال کے بعد آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ زمین پر اس نے اپنی ایک جنت خود بنالی ہے، تب خدا اپنے غیظ و غضب میں کہتا ہے کہ زمین کی اس نام نہاد جنت میں بھی ایک شجر ممنوعہ موجود ہے (دوسرا شجر)، جس کو آدم پہلے شجر ممنوعہ کی ہی طرح ایک دن چھوئے گا اور نتیجہ میں نام نہاد ارضی بہشت بھی تباہ ہو جائے گی۔ نیوکلیائی توانائی کے بم کی صورت میں تباہ کن استعمال کو نظم میں ارضی جنت کے شجر ممنوعہ یعنی دوسرا شجر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس مباحثے میں جن حضرات نے حصہ لیا۔ ان کے نام یہ ہیں۔ انجم عثمانی، مخمور سعیدی، پروفیسر انور صدیقی، پروفیسر شارب ردولوی، مظہر امام، پروفیسر نثار احمد فاروقی، محمود انصاری، شمس فرخ، سلیمان اطہر جاوید، رضوان احمد اور دلیپ سنگھ۔ جلسہ کی صدارت آر، کے گرگ نے کی۔ نظامت کے فرائض ابو الفیض سحر نے انجام دیئے۔

زبیر رضوی دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری مقرر

نئی دہلی، ۳۰ اگست۔ اردو کے مشہور شاعر اور آل انڈیا ریڈیو کے سابق ڈائرکٹر مسٹر زبیر رضوی دہلی اردو اکادمی کے نئے سکریٹری ہو گئے۔ ادارہ کتاب نما

..یر رضوی کو مبارک باد پیش کرتا ہے اور ان کی کامیابی کے لیے دعاگو ہے۔

بشمبر ناتھ پانڈے کو پہلا خدا بخش ایوارڈ

پٹنہ (ڈاک سے) صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے جناب بی۔ این پانڈے کو ۱۰ اگست ۱۹۹۳ء کو پہلا خدا بخش ایوارڈ عطا کیا۔ یہ ایوارڈ ایک لاکھ روپے کا ہے اور اس کے ساتھ پلیک اور سند بھی دی جاتی ہے۔ یہ ایوارڈ راشٹرپتی بھون دہلی میں منعقدہ ایک تقریب میں عطا کیا گیا۔ سب سے پہلے ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے خدا بخش ایوارڈ کے اجرا اور اس کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد لائبریری کے موجودہ اور سابق چیرمین ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی اور جناب محمد شفیع قریشی نے بھی اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے ایوارڈ دینے کی رسم ادا کی اور حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "مجھے خوشی ہے کہ میں خدا بخش لائبریری کے اس ایوارڈ تقریب میں شامل ہو رہا ہوں۔" انھوں نے مزید فرمایا کہ خدا بخش لائبریری ۱۹۶۹ء میں قومی اہمیت کا ادارہ بنا۔ اس کے بعد اس لائبریری نے بڑے اچھے کام کیے اور ہمہ جہت ترقی کی منزلیں طے کیں۔

صدر جمہوریہ ہند نے جناب بی۔ این پانڈے کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ پانڈے جی خدا بخش ایوارڈ کے مستحق تھے اور ان دنوں جبکہ ہم بھارت چھوڑو تحریک" کی گولڈن جوبلی منا رہے ہیں، اس موقع سے اس عظیم مجاہد آزادی کو خدا بخش ایوارڈ سے نوازا جانا بڑا با موقع ہے۔

شہپر رسول کو پی، ایچ، ڈی تفویض

اردو کے مشہور شاعر شہپر رسول کو ان کے مقالے "اردو غزل میں پیکر تراشی کا مطالعہ" پر پی۔ ایچ، ڈی تفویض کر دی گئی۔ ان کے نگراں پروفیسر عنوان چشتی اور ممتحن پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر نور الحسن نقوی اور پروفیسر اشرف رفیع تھے۔

قمر جلالی کے افسانوں میں عورت کا کرب ہے

نئی دہلی۔ ادب تمام فاصلوں کو کس خوبصورتی سے پاٹ سکتا ہے اس کا ثبوت یہاں ۷ راپریل کو بڑی عمدگی سے ملا۔ دہلی کے ادارہ "تناظر" کے مدیر اور ناشر جناب بلراج ورما نے حیدرآباد کی نئی نسل کی افسانہ نگار قمر جلالی کے افسانوں کے مجموعہ "سوچ" کی نہ صرف طباعت بلکہ رونمائی کا بھی اہتمام کیا جس کی تقریب دہلی کے ذی وقار

کانسٹی ٹیوشن کلب کے اسپیکر ہال میں ہوئی۔ اس کی صدارت رکن پارلیمنٹ جناب اندر کمار گجرال نے کی۔ پارلیمنٹ کے ممبر جناب پی شیو شنکر نے رسم رونمائی ادا کی اور دہلی کے نو ممتاز افسانہ نگاروں اور ادیبوں نے قمر جلالی کے فن اور اسلوب پر اظہار خیال کیا۔ جناب رئیس مرزا نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

مسلم یونیورسٹی کا اردو ریفریشر کورس بحال

مسلم یونی ورسٹی کے اکیڈمک اسٹاف کالج کے تحت شعبۂ اردو کے زیر نگرانی اردو زبان و ادب کے اساتذہ کے لیے تجدیدی و تربیتی کورس گذشتہ کئی برسوں سے کامیابی کے ساتھ چلایا جا رہا تھا جسے یو، جی، سی نے بغیر کسی سبب کے ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں شعبہ اردو کے چیرمن پروفیسر نعیم احمد کی صدارت میں شعبۂ اردو کے جملہ اساتذہ نے ایک قرارداد منظور کی جس میں کہا گیا تھا کہ مسلم یونی ورسٹی اردو زبان و ادب کا ایک بڑا مرکز ہے۔ یہاں اس زبان کا ریفریشر کورس زیادہ بہتر طریقے سے چلایا جاسکتا ہے۔ قرارداد کی ایک کاپی وزیر فروغ انسانی وسائل اور چیرمین یو، جی، سی کے علاوہ پروفیسر گوپی چند ممبر یو، جی، سی کو بھی بھیجی گئی۔ قرارداد کے مثبت ردِ عمل کے طور پر یو، جی، سی نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ کورس مسلم یونی ورسٹی ہی میں رہے گا۔ اس خبر پر پوری یونیورسٹی اور بالخصوص شعبۂ اردو میں خاصی مسرت کا اظہار کیا گیا۔

پروفیسر گوپی چند نے اس سلسلے میں جو کردار ادا کیا اس پر شعبۂ اردو کے تمام اساتذہ نے اظہار تشکر کیا ہے۔

قومی خواندگی پر دو روزہ ورک شاپ کا انعقاد

اردو پریس اور این ایل ایم "موضوع پر اسٹیٹ ریسورس سینٹر جامعہ اور قومی خواندگی مشن (گورنمنٹ آف انڈیا) نے ۲۶، ۲۷ اگست ۱۹۹۳ء جامعہ ہمدرد، تغلق آباد میں ایک دو روزہ ورک شاپ منعقد کیا۔ اس ورک شاپ کا خاص مقصد اردو پریس کو مکمل خواندگی مہم میں شامل کرنا تھا جو اب تقریباً ۲۰۰ اضلاع میں چل رہی ہے۔

ورک شاپ کا افتتاح جناب سید بنرجی (ڈائریکٹر جنرل۔ این ایل ایم) نے کیا۔ محترمہ نشاط فاروق صاحبہ (ڈائریکٹر ایس، آر، سی) جامعہ نے پریس کو مکمل خواندگی مہم والے اضلاع کے بارے میں ایک مختصر مگر جامع تعارف پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ کسی بھی ملک میں پریس ایک انقلاب لا سکتا ہے اور یہ

خواندگی مہم کے لیے ایک بہت ہی
موثر ہتھیار ہو سکتا ہے۔
اس ورک شاپ میں مختلف
اخبارات اور رسالوں کے مدیروں
اور صحافیوں نے حصہ لیا۔

شعبۂ اردو جامعہ میں ادیبوں کا اجتماع

۲۰ اگست کو شعبۂ اردو جامعہ ملیہ
اسلامیہ میں پروفیسر لطف الرحمٰن
اور ڈاکٹر منظر کاظمی کے اعزاز میں
ایک ادبی نشست منعقد ہوئی۔
اس جلسے کی صدارت اردو کے
مشہور نقاد اور شاعر پروفیسر عنوان
چشتی صدر شعبۂ اردو اور ڈین فیکلٹی
آف ہیومینیٹیز اینڈ لینگویجز نے فرمائی۔
اس ادبی مجلس میں مذکورہ حضرات
کے علاوہ اردو دنیا کے کچھ اور مشہور
لوگ مثلاً ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی،
ڈاکٹر طارق رفیض آباد، ہما مسعود (دہلی)،
ڈاکٹر کوثر جہاں (بھوپال)، مسز صوفیہ
(گول کنڈا)، اور جناب معین الدین
جینابڑے (بمبئی) ادبا شعرا شامل تھے۔
صدر جلسہ پروفیسر عنوان چشتی
نے خیر مقدمی کلمات سے جلسے کا آغاز
کیا اور اپنے شعبے کے اساتذہ
کا تعارف کرایا۔ انھوں نے کہا کہ
آج شعبۂ اردو میں، اردو کے چاند
ستارے اتر آئے ہیں۔ ڈاکٹر
وہاج الدین علوی کی فرمائش پر
سب سے پہلے، شعبے کے استاد
ڈاکٹر خالد محمود نے دو خوبصورت
غزلیں سنا کر شرکائے محفل کی میزبانی
کا فرض انجام دیا۔ ان کے بعد ڈاکٹر
رفیعہ شبنم عابدی نے اپنی دو مرصع
غزلیں سنائیں۔ اور ابھی غزلوں
کا سحر ٹوٹا بھی نہ تھا کہ پروفیسر عنوان
چشتی کی فرمائش پر اردو خط و کتابت
کورس کی انسٹرکٹر محترمہ تحسین اسلئہ
نے اپنی مترنم آواز میں نعتیہ کلام
پیش کیا۔
اس کے بعد ڈاکٹر خالد محمود نے
مہمان پروفیسر جناب لطف الرحمان
کا مختصر اور جامع الفاظ میں تعارف
کراتے ہوئے کہا کہ لطف الرحمان
کی شاعری کی تازگی کی دلیل یہ ہے
کہ اسے خواہ مشاعرے میں پڑھا جائے
یا رسالے میں ہر جگہ پُر کشش لگتی
ہے۔ پروفیسر لطف الرحمان صاحب
نے اپنی چند منتخب غزلیں سنائیں۔
جو بہت پسند کی گئیں۔
ڈاکٹر شمس الحق عثمانی نے ڈاکٹر منظر
کاظمی کا تعارف اس جلسے میں "لکشمن
ریکھا" کے مصنف اور عہد حاضر کے
ایک اچھے افسانہ نگار کی حیثیت سے
کرایا۔ اس جلسے میں ڈاکٹر منظر کاظمی
نے اپنا ایک خوبصورت علامتی افسانہ
"ٹاور آف ببی لون" سنایا۔
جلسے کے اختتام پر ڈاکٹر صادقہ
ذکی نے شکریے کے فرائض انجام
دیے۔ اور پھر صدر جلسہ پروفیسر
عنوان چشتی نے اپنے صدارتی کلمات

میں معزز مہمانوں کا اور تمام شرکائے محفل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر آئندہ بھی یہ حضرات دہلی تشریف لائے اور ہمیں موقع ملا تو ان کا خیر مقدم کر کے ہم خوشی کو دوبالا کریں گے۔ آپ نے اپنے شعبے کے تمام ممبران اور ساتھیوں کے تعاون پر بطور خاص خوشی کا اظہار فرمایا۔

(ڈاکٹر شہناز انجم)

اُردو ریفریشر کورس کے شرکاء کے اعزاز میں استقبالیہ

۲۶ راگست کو شعبۂ اردو میں اکیڈمک اسٹاف کالج، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام منعقدہ ریفریشر کورس کے شرکاء کے اعزاز میں جلسہ منعقد کیا گیا۔ جلسہ کی صدارت پروفیسر عنوان چشتی صاحب صدر شعبۂ اردو و ڈین فیکلٹی آف ہیومینی ٹیز اینڈ لینگویجز نے فرمائی۔ اس جلسہ میں بمبئی، آگرہ، میرٹھ، بھوپال، بیجاپور، اندور اور دہلی کے اساتذہ صاحبان نے شرکت کی۔ ان میں ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، معین الدین جینابڑے، کامران نجمی، رضوان، ہما مسعود، کوثر جہاں، صوفیہ نسرین، مسیح الدین شارق، ڈاکٹر طارق سعید، ڈاکٹر شمس الحق عثمانی، ڈاکٹر وہاج الدین علوی اور ڈاکٹر خالد محمود کے نام قابل ذکر ہیں۔ دہلی کے ادیبوں میں ابن کنول، فرحت احساس نیز جامعہ کے دانشوروں میں پروفیسر اختر الواسع اور ڈاکٹر قمر غفار صاحبہ نے بھی شرکت کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شہناز انجم اور ڈاکٹر وہاج الدین علوی نے انجام دیے۔ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، کامران نجمی، ڈاکٹر ابن کنول، محترمہ کوثر جہاں، ڈاکٹر شمس الحق عثمان اور ڈاکٹر خالد محمود نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔ پروفیسر محمد ذاکر نے اساتذہ کے ادبی مشاغل پر مسرت کا اظہار کیا۔ پروفیسر عنوان چشتی نے اپنی صدارتی تقریر میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تعلیمی اور قومی کردار پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ شمالی ہند میں یہ پہلا ادارہ ہے جس نے ثانوی زبان کی حیثیت سے اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا۔ شعبۂ اردو کی تاریخ بیان کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ اس کی تشکیل میں قومی اتحاد اور اس کی ضرورتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر صادقہ ذکی کے شکریہ پر جلسہ کا اختتام ہوا

(ڈاکٹر صادقہ ذکی)

۱۹۹۳ کا خدابخش سمینار ہند ازبک رشتوں کی کھوج لگائے گا۔ وزیر اعظم نومبر میں افتتاح کریں گے

پٹنہ۔ ستمبر... تاریخ، تصوف، طب، قرآنیات، مولانا آزاد، اردو ادب کے سمیناروں کے بعد ۱۹۹۳ کا خدا بخش سمینار ہند ازبک ہند رشتوں کی کھوج لگائے گا۔ خدا بخش لائبریری

ومبر میں ایک بین اقوامی سمینار ہو رہا ہے جو ہندستان اور وسط ایشیا کے تعلقات کے موضوع پر ہوگا جس میں سمرقند اور بخارا کا ذکر ہوگا۔ کشان آرٹ ہوگا۔ بخاری شریف، ترمذی شریف، نسائی شریف، خواجہ نقشبند، باقی باللہ، مجدد الف ثانی ہوں گے۔ تیمور اور بابر ہوں گے۔ البیرونی، بوعلی سینا ریاضداں الخوارزمی فقیہہ ابوااللیث سمرقندی ہوں گے۔ تاشقند کا شاعر بدر چاچ ہوگا۔ خدا بخش لائبریری کی تاریخ خاندان تیموریہ ہوگی، نیشنل میوزیم کا بابر نامہ ہوگا، ملا نصرالدین (ٹی وی سیریل) ہوگا، پردیسی فلم ہوگی۔ وہ سال آشنائی (فیض احمد فیض کا ازبکستان کا سفرنامہ) اور دوسرے سفرناموں کا ذکر ہوگا۔ جس میں ابن بطوطہ بھی ہوں گے ویمبری بھی۔ اس سمینار میں اردو، تواریخ، اسلامک اسٹڈیز، آرٹ، مذہب، عربی، فارسی، طب، تصوف اور دوسرے متعلقہ میدانوں کے ماہرین شرکت کریں گے۔ یہ سمینار نومبر کے اواخر میں منعقد ہوگا۔ وزیر اعظم اس کا افتتاح کریں گے۔

کتاب نما کے خصوصی شمارے "اختر سعید خاں" کی رسم رونمائی جناب ارجن سنگھ کے دست مبارک سے عمل میں آئی۔

بھوپال: ۲۲ ستمبر۔ کل ہند علامہ اقبال ادبی مرکز، مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی اور مکتبہ جامعہ کے تعاون سے اردو کے ممتاز مگر گوشہ نشین شاعر جناب اختر سعید خاں کے فن اور ادبی خدمات پر ایک خصوصی شمارے کی رونمائی مرکزی وزیر جناب ارجن سنگھ کے دست مبارک سے عمل میں آئی۔ جناب ارجن سنگھ نے چند ماہ پہلے بھی کتاب نما کے خصوصی شمارے "خواجہ احمد فاروقی" شخصیت اور ادبی خدمات" کی بھی رسم رونمائی کسی بڑے ہال میں نہیں بلکہ ایک مکان میں ادا کی تھی۔ وہ اس لیے کہ فاروقی صاحب اپنی علالت کی وجہ سے چل پھر نہیں سکتے تھے۔ اختر سعید خاں کے خصوصی شمارے کی رسم رونمائی وسیع ہال میں ہوئی۔ پروگرام کی ابتدا لگ بھگ دو گھنٹے کے بعد ہوئی مگر اختر سعید خاں کے پرستاروں سے پورا ہال بھرا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ صرف ایک کتاب کی رونمائی نہیں بلکہ جشن اختر سعید خاں ہے۔ اختر سعید خاں صاحب کو مبارک باد دینے والوں اور ان کی صحت اور درازیٔ عمر کی دعا مانگنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ اس پروگرام کی نظامت پروفیسر آفاق احمد نے کی۔ صدارت کے فرائض مکتبہ جامعہ کے بہی خواہ جناب عزیز قریشی نے انجام دیے۔ پروگرام کی ابتدا اختر سعید خاں صاحب کے بھائی اظہر سعید خاں کی تقریر سے ہوئی۔ اپنے بیمار بھائی کی تعریف کرتے کرتے اُن پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ زیادہ کچھ کہے بغیر ہی مائک سے ہٹ گئے۔ اس کے بعد اقبال ادبی مرکز کے صدر نشین لائق تعظیم بزرگ ادیب و تذکرہ نگار جناب پاپا میاں (اصل اسم گرامی ممنون حسن خاں صاحب) نے کلیدی خطبہ پڑھا۔ اور اپنی نثر پر خوب داد حاصل کی۔ اس کے بعد جناب

عزیز قریشی نے نہایت خوب صورت الفاظ میں اختر سعید خاں کی خدمات کا اعتراف کیا۔ جناب عزیز قریشی کے بعد جناب ارجن سنگھ نے تالیوں کی گونج میں اختر سعید خاں کی شاعری اور ان سے اپنے تعلقات کا نہایت دلچسپ انداز میں تذکرہ کیا اور خوب داد حاصل کی۔ اس کے بعد مکتبہ جامعہ کی طرف سے شاہد علی خاں نے مختصر ترین الفاظ میں اس خصوصی شمارے کے وجود میں آنے کی کہانی بیان کی۔ اب سب کی نظریں اختر سعید خاں پر تھیں۔ پروفیسر آفاق بڑے ذہین آدمی ہیں وہ تاڑ گئے اور بہت دبے الفاظ میں کہا کہ اب اختر سعید خاں صاحب اپنی غزل سنائیں گے پروفیسر آفاق خوب جانتے تھے کہ اختر سعید خاں کی علالت ان کو زیادہ بولنے کی اجازت نہیں دیتی۔ مگر اختر سعید خاں صاحب نے تو جیسے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج وہ ایک ایک کر کے سب کا شکریہ ادا کریں گے۔ اختر سعید خاں نے نہایت خوب صورت شعر سنائے۔ اختر سعید خاں شعر سنا رہے تھے اور پروفیسر آفاق پریشان تھے کہ کس طرح ان کو بولنے سے روکوں مگر اختر سعید خاں سامعین، منتظمین اور اس شمارے کے مرتب جناب سید حامد حسین (جو اپنے کو نمایاں نہ کرنے کی وجہ سے ہال کی آخری لائن میں تشریف فرما تھے) شکریہ ادا کیے بغیر مائک سے نہیں ہٹے۔ جب کہ کوئی بھی اس کا خواہش مند نہیں تھا۔ بلکہ تمام اہل علم تو خود ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے بے چین تھے کہ ان کی وجہ سے ایسے بے مثال پروگرام میں شرکت کرنے کا موقع ملا جو بھوپال کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا

پروگرام کے آخر میں جناب عزیز قریشی صاحب نے اعلان کیا کہ جناب ارجن سنگھ نے اس خصوصی شمارے کی ۲۰۰ جلدیں خریدنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس اعلان کا تالیوں سے استقبال کیا گیا۔

چھپتے چھپتے

اردو اپنے ایک مخلص سرپرست سے محروم ہو گئی۔

کلکتہ:۔ اردو کے بے لوث خدمت گار اور شیدائی شانتی رنجن بھٹاچاریہ اب نہیں رہے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی مغربی بنگال میں اردو کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے وقف کر دی تھی۔ موصوف کے مضامین کے کئی مجموعے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

ادارہ کتاب نما شانتی رنجن بھٹاچاریہ کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور ان کی روح کی شانتی کے لیے دعا گو ہے۔

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

نومبر ۱۹۹۳ء جلد ۳۳ شمارہ ۱۱

فی پرچہ	6/=
سالانہ	55/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	75/=
بیرونی ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک)	170/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک)	320/=

ایڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

TELEPHONE 630191

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات، نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

غزلیں/نظمیں

طنز و مزاح

افسانہ

جائزے

کھلے خطوط اور ادبی تہذیبی خبریں

نئی مطبوعات

آدم خور چیتا۔ (شکاریات) ریاض احمد خاں ۴۵/-
دستک اس دروازے پر (فلسفہ) ڈاکٹر وزیر آغا ۵۱/-
صحرا نورد کے خطوط (افسانے) میرزا ادیب ۷۵/-
جھینی جھینی بینی چدریا (ناول) عبدل بسم اللہ ۷۵/-
اردو مثنویوں میں جنسی تلذذ تحقیقی مقالہ ڈاکٹر محبوب اعلیٰ قریشی ۲۵/-
دل کی بات افسانے ڈاکٹر شبیر صدیقی ۶۰/-
ادھار کی زندگی ؍؍ مہر چند کوشک ۵۰/-
کاغذ کی دیوار ؍؍ حافظ حیدر ۵۰/-
فلسفہ سائنس اور کائنات فلسفہ، سائنس ڈاکٹر محمود علی سنڈیلوی ۵۵
راحت آرا بیگم کے منتخب افسانے افسانوی مجموعہ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ۹۰/-
کلیات فانی مکمل کلام پروفیسر ظہیر احمد صدیقی ۱۴۵/-
بابرنامہ دوسرا ایڈیشن (تاریخ) ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی ۱۲/-
آداب مباشرت جنسیات ڈاکٹر آفتاب احمد شاہ ۱۴/-
ترجمان القرآن کا تحقیقی مطالعہ (تحقیق) مولانا اخلاق قاسمی ۱۰۰/-
تذکرہ شعراء طنز و مزاح روہیلکھنڈ خان فہیم بدایونی ۴۶/-
تاریخ کی مظلوم شخصیت تذکرہ عبدالعلی فاروقی ۸۰/-
قرآن مجید (صرف ہندی ترجمہ) محمد فاروق خاں ۵۶/-
توحید آئینہ ذات کائنات میں مذہب محمد فاروق ۸/-
مغرب کے نغمے تخلیق مضامین کرشن مراری ۷۵/-
کلیات فاروق شاعری ڈاکٹر شمیم فاروقی ۱۵/-
پریم چند حیات نو شخصیت مانک ٹالہ ۲۵/-
مرثیے کی سماجیات مرتبہ ڈاکٹر عقیل رضوی ۶۰/-
حجاز کی آندھی تاریخی ناول عنایت اللہ ۵۰/-
سیرت کوثر سیرت رسولؐ لطف اللہ گوہر ۲۵/-
جوتک افسانے پروانہ ردولوی ۲۵/-
چاندنی کے خطوط (شعری مجموعہ) پروین کمار اشک ۵۰/-
شہراب (شعری مجموعہ) رؤف خیر ۴۰/-

سرِورق ۔ ابوالفیض سحر

خدابخش لائبریری پٹنہ کی نئی مطبوعات

پٹنہ کے کتبے ۔ فصیح الدین بلخی ۵۰/-
کرنل محبوب احمد ۔ (سوانح) ۲۵/-
جامع الشواہد ۔ مولانا آزاد ۴۰/-
مجمع الافکار (فارسی) (انتخاب) ڈاکٹر اقتدار حسین صدیقی ۲۰/-
خدابخش جرنل (۷۷ - ۷۵) ۷۵/-
پیر علی (ناول) شاد عظیم آبادی ۲۵/-
ہندوؤں کے اوتار ۔ لالہ بالکشن تبرہ ابر ۲۰/-
ہندوؤں کے تہوار ۔ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۴۰/-
چند اہم اخبارات و رسائل۔ قاضی عبدالودود ۳۰/-
اردو رسائل (۱۹۹۲ء میں) ۱۰۰/-
بقیہ طلسم ہوشربا (اوّل) ۱۰۰/-
بقیہ طلسم ہوشربا (دوم) ۱۰۰/-

HINDUISM
During the Mughal
India of the 17th
Century (Eng.)
by Zulfaqar Mubed Rs. 60.00

Khuda Bakhsh Lectures
INDIAN AND ISLAMIC
Vol. I (Eng.) Rs.200.00

OLD MUSLIM INSCRIPTIONS
AT PATNA (Eng.)
by Syed Mohammad Rs. 50.00

THE AMIR HAMZA
AN ORIENTAL NOVEL
PART I (Eng.)
by Sheikh Sajjad Hussain Rs.50.00

رسالہ "ہندستانی" الہ آباد (۱۹۳۱ء-۱۹۴۸ء) سے انتخاب

اردو ادب ۵۰/-
اردو لغت ۵۰/-
چند ادبی مشاہیر کی تحریریں ۷۰/-
اردو، ہندی، ہندستانی ۴۰/-
ہندی ادبیات ۶۰/-
تاریخ ۶۰/-
سائنس ۶۰/-

مہمان مدیر
ابوالفیض سحر
سروجنی نگر۔ I.۶۲۳
نئی دہلی ۔ ۲۳

(اشاریہ)

تنقید بھی ایک تخلیقی عمل ہے ۔ ایک نقطۂ نظر

جہاں تک ادب اور تنقید کا تعلق ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ تنقیدی شعور، اساسی طور پر تخلیق ادب کے اوّلین مراحل سے ہی جڑی ہوئی ایک قدر ہے۔ ادب اور غیر ادب کی تمیز، تنقید ہے ادب میں نثر اور نظم کی تمیز، تنقیدی شعور کا ثبوت ہے اور پھر نثر میں، داستان، ناول افسانہ مختصر افسانہ، انشائیہ، خاکہ، سوانح عمری، رپورتاژ کا امتیاز اور ان کی ہیئتوں کی فنی خصوصیات، لفظیات اور تعین قدر سب کی تنقیدی بصیرت ہی کی دین ہیں۔ اسی طرح مثنوی قصیدہ، مرثیہ، غزل، نئی غزل، رباعی، نظم، نظم معریٰ اور نثری نظم وغیرہ کی پہچان اور پرکھ کی بنیادیں اور ان کے معیارات انتقادی تصورات ہی سے ماخوذ ہیں۔ کلاسیکی ادب، ترقی پسندی، جدیدیت، ساختیات جیسے شعبوں اور Disciplines کی زمرہ سازی اور معیار بندی بھی تنقیدی اجتہاد کی مرہون منت ہے۔ حتیٰ کہ فنی تخلیقات اور غیر تخلیقیت کے مباحث بھی تنقیدی بصیرتوں کے سرچشموں سے ہی پھوٹتے ہیں۔

وجوہ، خواہ کچھ رہی ہوں۔ مگر تنقید کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ اب تک اس کے حقیقی دائرہ عمل کا شعوری طور پر، درک و احساس رکھنے کے باوجود، کسی نامعلوم سی مگر نامسعود احتیاط کے زیر اثر یا غیر ضروری حجاب یا تذبذب کے باعث، علمی سطح پر Scientific Approach کے ذریعے مکمل کر، پورا پورا احاطہ کیا جاسکا ہے اور نہ ہی اس کے Intrinsic relations اور Intertwined Values کا حقیقت پسندانہ اعتراف کیا گیا ہے۔ شاید اسی وجہ سے تخلیق ادب کے دائروں میں تنقید کے تفاعلی [illegible] کو جس میں فکر و احساس کے ہر موڑ پر زیریں لہروں کی صورت میں [illegible] اور [illegible] کا جو سلسلہ تخیل، تفکر اور تخلیق کے تمام مراحل تک چلتا رہتا ہے، اس کی تشریح اور تصریح مرحلہ وار یا جزیہ بجز نہیں کی جاسکی ہے۔

انتقادی عمل کو ایک لحاظ سے چار سطحوں پر کارفرما دیکھا جاسکتا ہے:

(۱) مروجہ معیاری تنقیدی شعور کی صورت میں جو پورے ادب کی تخلیق کے دوران ایک طرح کا رہنمایانہ کردار ادا کرتا ہے جس سے ہر قسم کا اور ہر درجے کا فنکار مقدور بھر استفادہ کرتا رہتا ہے۔ تنقید نگار بھی اس سے روشنی پاتا ہے۔ پڑھنے اور سننے والوں کے سامنے بھی

یہ ایک معیار، عام پسندیدہ روایت اور روش بن کر نمایاں ہوتا ہے۔

(۲) تخلیق فن کے دوران، فن کار کو خواہ وہ افسانہ نگار ہو کہ شاعر یا طنز و مزاح نگار، یا انشا پرداز، اسے یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ اسے کیا کہنا ہے کس طرح کہنا ہے اور اس تخلیقی کرب کا اظہار کس شدت کا ہو اور ابلاغ کی وسعت کیا ہونی چاہیے۔ فنکارانہ قدرت اور اس کے معیار و کمال کا تعین بھی اسی سے ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب یا ناکام ہوا ہے۔ تمام اصناف ادب، اصنافِ سخن کی ساختیات اور ہیتی تجربوں کے سلسلوں کا مقدر بھی اسی اُپج اور پرداخت کے عمل سے عبارت ہوتا ہے۔

(۳) تنقید نگار۔ (۱) اور (۲) کے Processes اور Prospectives سے باخبری کے ساتھ ساتھ عمومی اور آفاقی منظرناموں کے معیارات و پیمانوں کو بھی پیش نظر رکھ کر اپنے ذاتی تاثرات کا بھی اظہار کرتا ہے اور اس وسیلے سے بالواسطہ طور پر، ادب اور ادب کے ارتقا کو بہت کچھ دیتا ہے فکری اور فنی بصیرتوں اور ریاضتوں کی صورت میں جو بلاشبہ ہر معیار سے Creative contribution ہی ہوتا ہے۔ اور (۴) چوتھی سطح، قاری کے مطالعہ اور اثر پذیری کی ہوتی ہے جس کا اپنا بھی ایک معیار اور مزاج ہوتا ہے اور جس کو کوئی مانے یا نہ مانے تنقیدی شعور ہی کی روشنی کہا جائے گا۔ یہی عمل مربوط و مسلسل، اپنا رول مکمل کر کے، ایک مسلسل اور مستحکم سوجھ بوجھ کی شکل اختیار کرتے ہوئے وقت کا فیصلہ بن جاتا ہے اور پھر ادب کی، فن کی اور فن کار کی دین اور اس کی پہچان بن کر فن اور ادب کی تاریخ کا حصہ بن جاتا ہے۔ یہ Process سارے کا سارا، بالواسطہ یا بلاواسطہ، تنقیدی تناظر کا ہی ماحصل ہے جو ادب کا، ادب کی تخلیق کا اور ادب کے ارتقا کا محرک اور معاون ہوتا ہے۔

تخلیقیت اور تنقیدی بصیرت سے متعلق اس بحث میں بنیادی طور پر تخلیقیت کے عمل کی کلیت Totality کا تجزیہ کرنا ضروری ہے اور اس Process کو سارے ادب کی تخلیق کے تناظر میں دیکھنا ہوگا جو Creative activity اور Creative Process سے جڑا ہوا ہے۔ کوئی بھی فن کار یا تخلیق کار، خواہ اس کا دائرہ عمل شعریات ہو کہ افسانہ نگاری یا انشا پردازی یا طنز و ظرافت یا اس کے علاوہ کوئی اور شعبہ، وہ زندگی کے کسی واقعہ کسی منظر، کسی تجربے، کسی حادثے یا کسی تاثر کا اظہار کرتا ہے۔ خیال اور فکر اس مرکز کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ پھر اس کے اظہار کے وسیلے کی تلاش کی جاتی ہے کہ اسے نظم کی صورت دی جائے یا غزل میں پیش کیا جائے یا کسی افسانے کے قالب میں ڈھالا جائے یا طرز انشا اختیار کی جائے۔ تنقید اگر چہ راست کسی ایسے تجربے یا تاثر یا منظر یا واقعہ کے بطن سے جنم نہیں لیتی۔ اس حد تک اس میں Origin اور Originality کی قسم کی کم مایگی کا احساس ضرور ہوتا ہے مگر یہ بھی محض ایک روایتی سوجھ بوجھ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تخلیقی فن کار معروف Creative writer صرف ذاتی تجربے ہی کے تابع نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کے تجربات اور تاثرات کو بھی رقم کرتا ہے۔ بہر حال شئے کو حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک تاثر ہوتا ہے ایک

تجربہ ہوتا ہے جو کسی فن پارے یا کتاب یا کتابوں یا ایک خاص تحریک یا وقت کے سرمایہ
جائزہ، تجزیہ، تبصرہ یا محاسبے کی صورت، صورت پذیر ہوتا ہے۔ جو ایک طرح سے اسی طرح
object ہوتا ہے یا ہوتی ہے جس طرح کوئی Subject کسی فن کار کے فن یا فن پارے کا موضوع
مدار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ غور و فکر کی ایک گنگا ہوتی ہے جو سوچنے پرانے ذہن کی جلائے
ہوتی اور بہتی رہتی ہے اسی لیے اسے کبھی تاثراتی تنقید کا بھی نام دیا گیا یا موضوعی یا معروضی
تنقید قرار دیا گیا یا اسی طرح کا کوئی اور نام دیا گیا۔ اس طرح اگر ایک Wholistic اور
Integrated نقطہ نظر اور رویہ اختیار کیا جائے تو یہ تخلیقی عمل برابر ہوگا تنقیدی عمل کے اور
در تنقیدی عمل برابر ہے تخلیقی عمل کے۔ ہو سکتا ہے کسی کو اس سے اختلاف ہو لیکن میں
انھیں مجبور نہیں کروں گا۔

جس طرح ہر فن پارہ، جو تخلیقی ادب کے نام پر تخلیق کیا گیا ہو، ضروری نہیں کہ واقعی
فن پارہ ہی ہو، اسی طرح تنقید کے نام پر لکھی جانے والی ہر تحریر فی الواقعی تنقید ہی ہو ضروری
نہیں ہے۔ مگر خوشی کی بات ہے کہ گروہی وفاداریوں اور احباب نوازیوں کی وبا اردو ادب
میں بھی کچھ کم ہو رہی ہے مفاد پرستیوں، مصلحت کوشیوں اور بے ضمیر مروتوں کے سلسلے
کے زیر اثر، تنقید کے نام پر بھی ہر طرح کا کھلواڑ ہو رہا ہے جو تنقید کے ساتھ ساتھ خود
ادب کے لیے بھی ایک خطرناک رویہ اور غیر صحت مند رجحان ہے۔ اس سے احتراز
کرنے سے تنقید کو حقیقی رویہ اور سچا معیار ملتا ہے۔ ایمانداری سے، اصابت فکر سے
علمی ذوق و انہماک سے، دقت نظر سے، عمیق مطالعہ اور غیر جانب دار مشاہدے اور تجربے
سے، ساتھ ہی اپنے آس پاس کے ادبوں، مقامی زبانوں کے سرمایہ اور بین الاقوامی زبانوں
کے رجحانات سے بھی تقابلی مطالعے کی حد تک استفادہ کرتے رہنے سے تنقیدی بصیرت
کو اعتبار اور وقار ملتا ہے۔ غرض، خواہ آپ اسے کوئی نام دیں، تخلیق ادب اور ادب
کے ارتقا دونوں میں تنقیدی شعور کا بہت اہم کردار رہا ہے اور رہے گا بھی۔ یہ ایک
ایسا دعوا ہے جس کی حقانیت کسی دلیل یا وکالت کی محتاج نہیں۔

شاعری، تخلیقی ادب کی وقیع اور پُر وقار صنف ادب ہے اس میں 'استاد
اور شاگردی کی جو روایات چلی آرہی ہیں اس سے کون واقف نہیں۔ یہ تنقیدی بصیرت
اور انتقادی عمل نہیں تو اور کیا ہے جس پر ہماری تخلیقی شاعری کی اتنی بڑی اور مہتم بالشان
عمارت کھڑی ہو سکی ہے۔ اسی وجہ سے بعض ادیب اسے ہماری برگزیدہ دانشوری کی روایت
بھی تسلیم کرتے ہیں جس کا سلسلہ ابتداء سے لیکر آج تک قائم ہے۔ استاد شاہ نصیر، شاہ
حاتم، ناسخ، غالب، اثر لکھنوی، داغ دہلوی، منور لکھنوی، صفی اورنگ آبادی، سحر عشق آبادی
جوش ملسیانی ابر احسن گنوری اس سلسلے کی قابل قدر مثالیں ہیں۔

اگرچہ ضرورت ہی نہیں ہے۔ پھر بھی صرف چند مثالیں تنقید کی دہلیز پہ روشن چراغوں
کی طرح ابر احسن گنوری نے اساتذہ کی اصلاحوں نیز سیماب کی تنقیدوں اور اصلاحوں پر

از سرِ نو غور کر کے اس لَے کو تیز سے تیز تر کیا ہے۔ اور اپنی بحثوں اور تنقیدوں کو جامعیت کے ساتھ زیادہ اصولی اور تجزیاتی بنایا ہے۔ پروفیسر عنوان چشتی نے صحیح لکھا ہے کہ

"ابر صاحب نے اپنے شاگردوں کے کلام پر جو اصلاحیں دی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے تنقیدی فنی، لسانی اور عروضی نظریات پر سختی سے عمل کیا ہے۔ انھوں نے اصلاح کے عمل میں ایک طرف زبان اور اسلوب پر توجہ صرف کی ہے اور دوسری طرف خیال اور افکار کی اصلاح بھی کی ہے ان کی نگاہ بہت دور رس ہے جو دور تک صوری اور معنوی نقائص کا احاطہ کرتی ہے ان کا فن کارانہ شعور بہت بیدار ہے جو دیر تک شاہراہ فن پر روشنی بکھیرتا ہے"

ساتھ ہی ہماری کلاسیکی شعری روایات کے تسلسل اور ارتقا سے جڑی ہوئی کڑیوں پر روشنی ڈالتی چند مثالیں ۔ نکات الشعرا میں میر نے خاکسار کے شعر پر یوں اصلاح دی تھی۔ خاکسار کا شعر تھا ؎

خاکسار اس کی آنکھوں سے گھنے مت لگیو
مجھ کو ان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا

میر نے اس طرح اصلاح دی ؎

خاکسار اس کی آنکھوں سے گھنے مت لگیو
مجھ کو ان خانہ خرابوں نے گرفتار کیا

خواجہ وزیر کا شعر تھا ؎

غضب ہوا کہ کسی سنگ دل پہ دل آیا
الٰہی خیر کہ شیشہ گرا ہے پتھر پر

ناسخ نے اصلاح دی ؎

غضب ہوا کہ کسی سنگ دل پہ دل آیا
خدا بچائے کہ شیشہ گرا ہے پتھر پر

صبا لکھنوی کا شعر تھا ؎

نہ جیب میں گریباں میں تار باقی ہے
یہ سن رہا ہوں کہ فصل بہار باقی ہے

آتش کی اصلاح ؎

نہ جیب کا ہے نہ داماں کا تار باقی ہے
جنوں کا جوش ہے فصلِ بہار باقی ہے

مگر ابر احسنی گنوری کا مشورہ یوں ہے ؎

نہ جیب کا نہ گریباں کا تار باقی ہے
ہنوز شورشِ فصلِ بہار باقی ہے

آخر میں نئی شاعری سے متعلق انتقاد اور اصلاح کی ایک مثال۔
ظہیر غازی پوری کا شعر ہے

زندگی موت کے سانچے میں ڈھلا کرتی ہے
صبح ہونے کے لیے شام ہوا کرتی ہے

ابر احسن کی اصلاح ہے

غم کی ظلمت ہی مسرت کی ضیا ہوتی ہے
صبح ہونے کے لئے شام ہوا کرتی ہے

اب اس دانشوری کی وہ روداد جو افسانوی ادب کی پیشانی پر چندن کی لکیروں
رح عیاں ہے۔
بعض ناقدین کا خیال ہے کہ منٹو کے فن میں تخلیقیت اور آمد کا فطری بہاؤ تھا
خود منٹو نے بھی اپنی تخلیقیت کے احساس اور اس کے دعوے کے سلسلے میں
تھا کہ وہ کاغذ پر ۸۶ ٹائپ کرکے ذہن میں آئے کسی بھی پہلے لفظ کے ساتھ کہانی
ب کرنا شروع کر دیا کرتا تھا اور پھر کہانی مکمل ہو جاتی تھی۔ کسی بھی خلاق فن کار کو اسی
کی باتیں کرنے کا حق دیا جا سکتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بعض ضروریات، خصوصی
قعات، خاص کر ریڈیو کی ملازمت کی وجہ سے بالخصوص ڈراموں اور کہانیوں کی حد تک یہ
نہ کہی جا سکتی ہے لیکن چونکہ منٹو بنیادی طور پر افسانہ نگار تھا اس لیے اسے افسانے کا
عزیز تھا۔ اور بہتر سے بہتر کامیاب سے کامیاب تخلیق پیش کرنے کی ہر اچھے اور سچے
کار کی طرح اسے بھی اس کی آرزو تھی۔ اس احساس و شعور نے اُسے اپنے افسانوں کو دوبارہ
بارہ دیکھنے اور حسبِ ضرورت اور حسبِ موقع اپنے طور پر یا بعد تبادلہ خیال و
ورہ، مناسب تصحیح اور ترمیم کرنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ جب بھی موقع ملا منٹو نے
پنے افسانوں اور افسانوں کے مجموعوں میں بعد کی اشاعتوں میں نظر ثانی کی اور ضروری
میم کی۔ مثلاً آتش پارے اور سیاہ حاشیئے کے افسانوں کو یکجا کرکے، ساقی بکڈپو
ہی نے اسی عنوان سے جو مجموعہ ۱۹۸۱ء میں شایع کیا تھا اس میں افسانہ "جی آیا صاحب"
ں خود عنوان کے علاوہ افسانے کی زبان اور عبارت میں بھی تصحیح ملتی ہے۔ بعد
ں شایع ہوئے مجموعے "دھواں" سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔
"جی آیا صاحب" کا نام بدل کر قاسم کر دیا گیا ہے۔ پھر پورے افسانے میں لگ
بھگ چالیس مقامات پر تصحیح و ترمیم ملتی ہے جیسے پہلا افتتاحی پیراگراف یہ تھا۔

جی آیا صاحب

باورچی خانے کی دھندلی فضا میں بجلی کا ایک اندھا قمقمہ چراغِ گور کی مانند
ہی سُرخ روشنی پھیلا رہا تھا۔ دھوئیں سے اَٹی ہوئی دیوار میں ہیبت ناک دراڑوں کی

طرح انگڑائیاں لیتی ہوئی معلوم ہورہی تھیں۔ چبوترے پر بنی ہوئی انگیٹھیوں میں آگ کی آخری چنگاریاں ابھر ابھر کر اپنی موت کا ماتم کر رہی تھیں۔ ایک برقی چولھے پر رکھی ہوئی کیتلی کا پانی نہ معلوم کس چیز پر خاموش ہنسی ہنس رہا تھا۔ دور کونے میں پانی کے نل کے پاس ایک چھوٹی عمر کا لڑکا بیٹھا برتن صاف کرنے میں مشغول تھا۔ یہ انسپکٹر صاحب کا نوکر تھا" تصحیح شدہ عبارت یوں ہے۔

قاسم

باورچی خانہ کی مٹ میلی فضا میں بجلی کا اندھا سا بلب کمزور روشنی پھیلا رہا تھا۔ سٹوو پر پانی سے بھری ہوئی کیتلی دھری تھی۔ پانی کا کھولاؤ اور سٹوو کے حلق سے نکلتے ہوئے شعلے مل جل کر مسلسل شور برپا کر رہے تھے۔ انگیٹھیوں میں آگ کی آخری چنگاریاں راکھ میں سو گئی تھیں۔ دور کونے میں قاسم گیارہ برس کا لڑکا برتن مانجھنے میں مصروف تھا۔ یہ ریلوے انسپکٹر صاحب کا بوائے تھا"

یہی حال افسانے "چوری" کا بھی ہے۔ اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ منٹو نے جو افسانے کے فن کے نکھار کے لیے ایجاز اور اختصار کا قائل تھا عملاً بھی اپنے افسانوں پر نظرِ ثانی یا اشاعتِ ثانی کے موقع پر غیر ضروری یا غیر متاثر کن جملے، فقرے اور پیراگراف کے پیراگراف بھی بدلے ہیں یا حذف کر دیے ہیں۔ یہ نظر ثانی کا عمل اور یہ کفایت لفظی کا شعور، خود احتسابی اور تنقیدی نظر کی دین اور ارتقائے فن کا تقاضا ہے اور اس کے فن کی ایمائیت اور معنی آفرینیت کی دلیل ہے جو منٹو کے فن کو دوسرے افسانہ نگاروں سے متمیز اور ممتاز بناتی ہے۔

معیاری اور مثالی شاعری کی طرح فنی عظمتوں سے متصف افسانے، ناول اور کہانیاں یقیناً قابلِ قدر تخلیقی فن پارے ہوتے ہیں مگر ایک پہلو یہ بھی ہوتا ہے کہ جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ افسانے یا ناول کے کچھ ایسے حصے بھی ہوتے ہیں جن میں جی بھر کر تبدیلی بھی کر دی جائے تو نہ تخلیقیت میں فرق آتا ہے اور نہ کہانی میں، جیسے آدمی کو بھی میسر نہیں ایک افسانہ ہے حسن جمال کا جو ایوان اردو اپریل ۹۳ء میں شایع ہوا ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ یوں ہے۔

جس وقت۔ آر۔ پی۔ جوشی آئینے کے سامنے کھڑے تھے کھڑکی کے باہر پیپل کے درخت پر چڑیاں بُری طرح شور مچا رہی تھیں۔ اور اس سے ذرا دور شہر کی معروف سڑک پر بھاگتی گاڑیوں سے نکلتا ہوا دھواں فضا کو گرد آلود کر رہا تھا اور شام کو شہر کی ایسی حالت ہو جاتی تھی کہ اس زہر آلود فضا میں کوئی بھی باہر نکلنا نہیں چاہتا، اگر ضروری کام نہ ہو"

اسے اگر یوں بدل دیا جائے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔

"شام کے وقت امجد اپنے گھر کی چھوٹی سی بالکنی پر کھڑے باہر کا منظر دیکھ رہا

تھا۔ سامنے نیم کے پیڑ پر ہرے ہرے توتے پھڑک پھڑک کر شور مچا رہے تھے۔ اور اس سے ذرا دور شہر کے ریلوے اسٹیشن پر آتی جاتی ریل گاڑیاں کالا کالا دھواں چھوڑتی فضا کو غبار آلود کر رہی تھیں۔ ایسے وقت سارا ماحول کچھ یوں ہو جاتا ہے کہ اس زہر آلود فضا میں کوئی بھی باہر نکلنا نہیں چاہتا اگر ضروری کام نہ ہو۔"

اس طرح کی مثالیں اور دی جا سکتی ہیں مگر چند بیشتر ور ناقدین کو چھوڑ کر نقدِ ادب کے آبرومند قلم کاروں کی تنقیدی تحریروں میں اس طرح کی تحریف کی گنجایش نہیں ہوتی کیوں کہ لفظوں، فقروں اور عبارتوں میں ذمہ دارانہ احساس کے ساتھ ساتھ حقائق نمایاں اور فنی صداقتیں موجود ہوتی ہیں۔ حوالے، تواریخ، واقعات، نقاطِ نظر، تشریحات اصطلاحیں اور تراکیب نظر قلم کو پکڑ لیتی ہیں اور وہ حقیقت حال کے سوا خیالی یا قیاسی کچھ اور نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس افسانوی نگارشات اور شاعری میں بھی اتنی گنجایش اور لچک ہوتی ہے کہ ان میں حسب منشا ترمیم اور تنسیخ کی جا سکتی ہے یا اضافے بھی کیے جا سکتے ہیں۔ طرحی غزلوں میں گرہ لگانا اور تضمین کاری اور پیروڈی کا فن تو تمام تر اس لچکداریت اور آزادی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

کسی بھی فن پارے کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ کسی تجربے یا تاثر کا خلاقانہ استعمال یا فنکارانہ اظہار اسے تخلیقی فن کے درجے تک پہنچا دیتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سیکڑوں اشعار کی نظموں، مثنویوں یا مرثیوں میں کوئی بھی جز ایسا نہیں ہوتا جسے فن کی عظمت نصیب ہو یا کچھ حصہ واقعی ایسا ہوتا ہے یا بس دو تین شعر ہی ایسے ہوتے ہیں جو اپنا نقش چھوڑ جاتے ہیں یا بعض اوقات تو صرف ایک شعر یا ایک مصرعے کی خاطر پوری غزل کہی جاتی ہے۔ افسانوں، ناولوں اور انشائیوں میں بھی اکثر ایسا ہوتا ہے۔ مگر جو بھی جز، حصہ یا حصے ایسے ہوتے ہوں انھیں تخلیقی قوتوں کے مظاہر تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہی بات تنقیدی مضامین اور مقالوں پر بھی لاگو ہو سکتی ہے۔ یہاں بھی تمام تحریر میں بعض اوقات بعض حصے کچھ فقرے چند جملے بھی ایسے ضرور ہوتے ہیں جنھیں تخلیقیت کے جواہر کا ہی نام دیا جا سکتا ہے اور وہ تفکر اور تاثر کی معنیٰ آفرینی اور سحر انگیزی کی وجہ سے مطلع ادب کی شفق بن کر نکھر جاتے ہیں۔ جیسے

"ہندستان کی دو الہامی کتابیں ہیں ایک وید مقدس دوسری دیوانِ غالب۔"

"غزل نیم وحشی صنف سخن ہے۔"

"غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔"

"اردو محض ایک زبان ہی نہیں ایک تہذیب بھی ہے۔"

"اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا تو مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر اس کے لیے منتخب کی جاتی یا اقبال کی نظم۔"

تنقیدی تحریروں کے یہ فقرے ایسے ہی مقبول اور پسندیدہ ہیں جیسے یہ اشعار

حیات لیکے چلو کائنات لیکے چلو
چلو تو سارے زمانے کو سات لیکے چلو
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ ہی رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

اس طرح ان دونوں زمروں کے مذکورہ حصّوں کے تاثرات اور ان کی تخلیقیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پھر یہ حصّے جن فن پاروں کے اجزا ہیں ان میں کسی کو تخلیقی اور کسی کو غیر تخلیقی ادب کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہی حال، اقوال زریں، روزمرّہ، محاورے، ضرب المثال کا ہے جو صدیوں کے تجربات زندگی کے حقائق، انسان کے شعوری، فکری اور تہذیبی ارتقا اور تنقیدی بصیرتوں کے روشن چراغ ہیں خاص کر ہماری زبان کی لغت میں اضافہ کرنے والی نئی تراکیب بھی تنقید ہی کی دین اور لسانی سرمایہ ہونے کے ساتھ ساتھ ادب کا قابل فخر حصہ ہیں۔ اختصار کے پیش نظر مثالوں سے احتراز کر رہا ہوں۔ سردار جعفری نے سیکڑوں صفحات پر مشتمل ایسا کام کیا ہے جسے سرمایہ سخن کا نام دیا گیا ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے بھی فرہنگ اصطلاحات ادب مرتّب کی ہے جسے ترقی اردو بیورو نے شائع کیا ہے۔ یہ مقام یہ معیار اور یہ مزاج رکھنے والی تحریروں کو جن سے ادب کو فن کو زبان کو زندگی ملتی ہے، ذہن ملتا ہے خون ملتا ہے، جلال و جمال ملتا ہے۔ کیسے غیر تخلیقی سرمایہ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ادب میں یہ جذبہ شاید تخلیقیت اور خود پسندی کے وفور احساس یا احساس کمتری یا احساس نظر اندازی کے ردعمل کے طور پر نمایاں ہوا ہے۔ بڑے نقادوں نے علاوہ چند بڑے افسانہ نگاروں کے دوسرے افسانہ نگاروں اور طنز نگاروں کی طرف اپنے طور پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی اور اگر کہیں کی ہے تو اس کی صورت یوں ہی رہی جیسے وارث علوی لکھتے ہیں۔

"فکشن پر لکھی گئی تنقیدوں کو پڑھ کر ایک بار جھلاّہٹ کے عالم میں میں نے کہا تھا کہ ایسا ہی لکھنا ہے تو گجراتی ناولوں پر پانچ ہزار صفحات سیاہ کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں یہ محض ڈینگ نہیں دعوا ہے۔ چاروں طرف ناولوں کے کھیت کے کھیت بکھرے پڑے ہیں۔ اگر نقاد میں متھرا کے چوبوں کی بلانوشی اور رندیدہ پن ہے تو جیرا بگالی کرنا اور ڈکرانا مشکل نہیں۔ گجراتی کیا ہر علاقائی زبان میں ناولوں کے سبب گھر ادبی نقشا ہے جو کثرت اولاد کی وجہ سے مفلوک الحال گھرانوں کا ہوتا ہے۔"

ایسا بھی ہوا کہ بعض ناقدین نے افسانوی ادب اور طنز و مزاح کو شاعری سے کم بلکہ دوسرے درجے کا ادب کہنا شروع کر دیا۔ نتیجے میں ردعمل شدید ہو کر ابھرا اور تخلیقی فنکاروں نے بھی زور و شور سے تنقید کو غیر ضروری اور غیر تخلیقی کہنا شروع کیا۔ مگر

ہر بڑا اہٹ میں خط کشیدہ، تخلیق فن کاروں ہی کو تنقید یعنی مشتہر کردہ غیر ضروری اور غیر تخلیقی ادب لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا پھر نتیجہ جو ہو سو سب پر ظاہر ہے۔

بعض اوقات افسانوں یا ناولوں کے بیانیہ ٹکڑوں اور تنقیدی مضامین و مقالات کے ٹکڑوں میں زیادہ واضح فرق دکھائی نہیں دیتا۔ مثلاً الیاس احمد گدی کے افسانے "ٹام جیفرسن کے پنجرے" سے یہ اقتباس "ٹام کا گھر قصبے کا چڑیا گھر تھا۔ قصبے کے بھولے بھالے معصوم لوگ عام طور پر شام کو بیوی بچوں کے ساتھ گھومنے بڈھے ٹام کے گھر آجاتے۔ بڈھا ٹام ہر آدمی کا استقبال ٹوپی سر سے اٹھا کر کیا کرتا جس کو وہ پتہ نہیں کب سے پہنتا آرہا تھا۔ گھر تو چھوٹا تھا مگر سامنے کھلی ہوئی کافی زمین تھی جس کے گرد مہندی کی باڑھ کھڑی کرکے احاطہ بنا دیا گیا تھا۔ اس کھلی جگہ میں بیٹھنے کے لیے بینچ وغیرہ نہیں تھے مگر فرش پر ہمیشہ نرم ملائم دوب کا قالین بچھا رہتا جس پر مرد اور عورتیں بلا تکلف بیٹھ جاتے۔ لڑکے دوڑیں لگاتے، گھاس پر لڑھکتے اور ادھر ادھر بھاگ رہے خرگوشوں کو پکڑتے۔

ایسا اقتباس یا لگ بھگ اس جیسا اقتباس کسی تذکرہ کا بھی ہو سکتا ہے کسی انشائیہ کا بھی یا کسی رپورتاژ کا بھی یا خود تنقید کا بھی۔ جیسے رفعت سروش کے مضمون "بیکل اتساہی طائر رنگین نوا" سے یہ اقتباس۔

ادب میں خصوصاً شاعری میں قدر و منزلت کا معاملہ عجیب ہے جن شاعروں کو آندھی اور طوفان کی طرح عوامی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوتی ہے وہ موج طوفان کی طرح آکر گذر جاتی ہے زمانہ ان کی مقبولیت کو بھلا دیتا ہے۔ وقت انھیں نظر انداز کرکے آگے بڑھ جاتا ہے۔ مشاعروں میں دونوں ہاتھوں سے داد سمیٹنے والے شاعر کچھ عرصہ بعد ویسے تہی دامن نظر آتے ہیں کہ عبرت حاصل کی جائے۔"

اب میں قرۃ العین حیدر صاحبہ کے حالیہ ناول "چاندنی بیگم" کے ایک کجلی بن سے ایک اقتباس پیش کر رہا ہوں جو اسی فن پارہ کا حصہ ہے جس کے سینے پر تخلیقیت کا تمغہ لگا ہے۔ اور بجا طور پر لگا ہے۔

"شیخ ظاہر علی ایک زمانے میں سروش تخلص کرتے تھے جو اب ان کے نام کا جزو بن چکا تھا۔ کلکتہ کے اردو داں حلقے میں شیخ سروش فنیل سروش کہلاتے تھے۔ پہلے آسام میں کمیدا کروا تے تھے اب دوادز میں چائے اور ٹمبر کا کام پھیلا رکھا تھا۔ ان کی بیوی نورالنساء بیگم جل پائے گوڑی کے ایک زمیندار کی دختر نیک اختر تھیں۔ ظاہر علی کے چھوٹے بھائی مظہر علی مشرقی پاکستان جا چکے تھے جہاں ہاتھیوں اور ٹھیکوں کا خاندانی کاروبار چاٹگام اور سلہٹ میں جما لیا تھا۔ سال میں ایک دوبار وہ ان سے ملنے مغربی بنگال کا چکر لگا جاتے تھے اور چاٹگام اور ڈھاکہ کے فیشن ایبل سوسائٹی کے ایک مقبول فرد تھے"

اس تحریر کے بارے میں بھی وہی کچھ کہا جا سکتا ہے جو الیاس گدی کے افسانے کے ٹکڑے یا رفعت سروش کے مضمون کے اقتباس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے۔ بحث برائے بحث کے لیے ہزار قسم کی الٹی بحثیں بھی کی جا سکتی ہیں۔ مگر سچ کا سونا ہمیشہ کھرا ہی رہتا ہے۔ معذرت کے ساتھ یہ جسارت کر رہا ہوں میں اپنے ایک تحقیقی و تنقیدی مقالے اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ۔ مہ لقا بائی چندا" سے ایک مختصر اقتباس پیش کرنا چاہوں گا جس پر بعض تخلیقی فن کاروں کی نظر میں تخلیقیت کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال تخلیقیت کے تاج تو تاج، تخلیقیت کی دستار اور ٹوپی سے بھی محروم اس سر برہنہ تحریر کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

"دکن کا خطۂ ارض، دراصل اردو زبان و ادب، اردو تہذیب و ثقافت اور مختلف علوم و فنون کے اردو میں فروغ بے مثل کے لیے اساسی نوعیت کا شبرس و شاداب سرچشمۂ حیات رہا ہے۔ دیگر امور سے قطع نظر، صرف شعر و سخن کی ابتدا اور ارتقا کی بھی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو حیران کن حقیقتوں کے پُرشکوہ باب در باب وا ہوتے ہیں۔ نثر اردو کی سب سے اوّلین تصنیف ملا وجہی کی "سب رس" اپنی گوناگوں خصوصیاتِ نثری اور اسالیبِ فنی کے ساتھ اسی سرزمین میں تخلیق ہوئی۔ اردو کے اولین مرثیہ نگاروں اور قصیدہ نگاروں نے بھی اپنی علمی، ادبی اور فنی و فکری وجاہتوں کے ساتھ یہیں کے منبروں اور یہیں کے بام و در سے آواز بلند کی تھی۔ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر، سلطان قلی قطب شاہ ہے جس کے دیوان کو کہنے والوں نے الہامی کتابوں کی صف میں جگہ دینے کی بھی کوشش کی، جدید لب و لہجے کی معیاری غزل کے امام، ولی دکنی ہی ہیں جنھوں نے شمالی ہندستان کے محراب میں اردو کی شمع روشن کی۔ اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ، مہ لقا بائی چندا بھی اسی خاکِ دکن کے مطلع شعری پر ایک نقشِ تابندہ کی صورت نمایاں ہوئی۔ اس طرح ایک سلسلہ ہے چراغوں کا جو علم و فن اور تہذیب و ثقافت کے جادۂ ارتقا کو منور کرتا ہے اور اس کی زیبائش کا اہتمام کرتا ہے۔"

کچھ لوگوں نے رائے دی کہ اسے تخلیقی نثر کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ مگر یہ تو یہ تنقید ہی۔ غرض کیا چیز کیا ہے اور کیا نہیں ہے فیصلہ خود آپ، سوچ کی اس نئی کرن اور بحث کی اس نئی روشنی میں کریں۔

بعض اوقات، تنقید تخلیقی کاوشوں کا اعتبار ہی نہیں وقار بھی بڑھاتی ہے۔ شاید اسی لیے تنقید کی اہمیت، ضرورت یا اس کی تخلیقیت کا انکار کرنے والے بھی اپنے تخلیقی کارناموں کے مقام و مرتبہ کے تعین یا کم از کم نشاندہی کے ضمن میں تنقیدی تاثرات یا آرا، کے طلب گار ہوتے ہیں۔ کلیات قلی قطب شاہ سے لے کر آج کے ادیبوں اور شاعروں اور افسانہ نگاروں تک یہ سلسلہ کسی نہ کسی صورت سے جاری ہے۔ "آتشِ گل" کے دیباچے سے پروفیسر آل احمد سرور کی تنقید کی ایک مثال

اللہ اللہ ہستیٔ شاعر
قلب غنچے کا آنکھ شبنم کی

جگر کی شاعری یہی ہے۔ جگر نے اردو غزل کی ساری صالح روایات کو جذب کر کے انھیں ایک لطیف تبسم اور دل کش رمز بنا دیا ہے۔ اس کی معنویت، رمزیت اور تاثر میرؔ، مومنؔ، داغؔ، حسرتؔ سے آشنا ہوئے بغیر واضح نہیں ہوتی مگر ان روایات کے ساتھ اور ان کے باوجود ایک نئی صحت مند شگفتہ اور پُرکیف اشاریت رکھتی ہے جو اس کی اپنی ہے حسرت و جگر سے غزل کو وہ سرمستی واپس مل گئی جو زندگی کی تلخیوں میں کھو گئی تھی وہ کیف و انبساط پھر ہاتھ آگیا جو زندگی کی روح ہے اور جس کی وجہ سے زندگی روشن اور گوارا ہے۔"

فن اور تخلیق فن کے پورے سیاق و سباق کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے جو بصیرت درکار ہوتی ہے اس کا دوسرا نام انتقاد ہے۔ انتقادی عمل ادب فن اور ان کے ارتقاء کے تناظرات کے ساتھ ساتھ زبان، تہذیب اور تاریخ کا کما حقہ عرفان چاہتا ہے۔ جیسے غالب کی شخصیت اور شاعری میں ترکی اور ایرانی، عناصر کے عنوان سے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے تنقیدی مقالے کے اس خوبصورت ورق کی اس خوب صورت تحریر سے بھی پتہ چلتا ہے۔

ہندستانی تہذیب میں دراوڑی، آریائی، ایرانی اور ترکی عناصر کی بڑی آمیزش ہے۔ البتہ وہی عناصر، ہندستانی تہذیب کا جزو بن سکے جو عام ملکی روح سے ہم آہنگ تھے۔ مغلوں کے زمانے میں جو نخل بندی اور پیوندکاری کے تجربات سے گذر چکے تھے۔ یہ تہذیبی نقش اور زیادہ حسین ہو گیا۔ انھوں نے ترکوں کی سخت کوشی، فراخدلی اور خود داری میں ایرانیوں کی لطافت اور شائستگی اور مساوات اور اخلاقی ضبط کی قلم لگا کر ہندستانی تہذیب کی اس طرح آبیاری کی کہ وہ ایک تناور درخت بن گئی اور اس کی جڑیں جمالیاتی شعور اور تصوف کی انسان دوستی تک پہنچ گئیں۔

یہ علم، یہ تجزیہ تفکر اور یہ مطالعے و مشاہدے کی گہرائی بلندی اور وسعت ہی ہے جو تنقید اور تنقید نگار کو ایک خاص وقار بخشتی ہے۔ میرے اس خیال کی تائید ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی اس تنقیدی تحریر سے بھی ہوتی ہے۔

تہذیبی مطالعہ ساحل پہ کھڑے ہوکر ایک دریا کے سفر کا مطالعہ ہے جو اپنے اندر سمندر کی نئی وسعتیں رکھتا ہے، وہم سے لے کر فہم اور فکر سے لے کر فلسفے تک ہم ایسا کوئی حلقہ یا کوئی دائرہ نہیں دیکھتے جو تہذیبی مطالعے سے باہر ہو، مذہبی، اخلاقی، سماجی اور سیاسی طور پر کسی معاشرہ کے بند هنوں میں قید رہا، کب رسم کی کس ڈوری کو توڑ کر اس نے کس رشتۂ خیال کو اپنا لیا۔ اس کا زمین سے کیا تعلق ہے زمانے سے کیا ربط ہے، نسلوں اور قوموں کی تاریخی رفتاروں، انفرادی اور اجتماعی سطح پر اس کے خوابوں اور خوابوں کی شکست سے اس کا کیا واسطہ ہے۔ یہ سب باتیں تہذیبی مطالعے

کے ہی ذریعہ معلوم ہوتی ہیں، ارادے تہذیب کا حصہ ہوتے ہیں اور تہذیبیں اداروں کو جنم دیتی ہیں اور ذہنوں کو سمت اور رفتار عطا کرتی ہیں۔"

تنقید کی نوعیت، ماہیت اور اس کے کردار کے بارے میں گروہی اور منصبی تعصبات سے اوپر اٹھ کر از سر نو غور کرنے کی ضرورت تھی اس لیے اس پریشان خیالی کو ایک لڑی میں پرو کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر ایک مثال اور۔ میر تخلیقی فن کار کی حیثیت سے ایک بلند قامت غزل گو تھے جنھیں ان سے پہلے کے فنِ غزل اور غزل گو فن کاروں کی فکر اور ان کے فن کا شعور و ادراک تھا۔ اسی بصیرت نے انھیں غزل کی تاریخ میں ایک نیا مقام پیدا کرنے کی طرف مائل کیا تھا۔ جو انھوں نے اپنے خلاقانہ جواہر کو بروئے کار لاکر حاصل کیا۔ ساتھ ہی انھیں ان کی اپنی فنی بصیرت کے علاوہ یہ شعور بھی تھا جس نے یہ کہلایا کہ نالائقوں سے مل کر لیاقت میری گئی۔ یا یہ کہ مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔ یہاں ان کی غزل نہیں بول رہی ہے۔ ان کا تنقیدی شعور بول رہا ہے۔ جب یہ شعور، جو فن کے علاوہ زبان، تہذیب اور شعری جمالیات کا شعور ہے۔ اس سے پہلے کے شعور سے مل کر نمایاں ہوتا ہے تو شاعری اور غزل کی تنقید سے مل کر، وقت کا فیصلہ بن جاتا ہے پھر میر محض غزل کے ایک عظیم فن کار نہیں بلکہ خدائے سخن بھی بن جاتے ہیں دیکھیے اس صداقت کو، ادب کے، فن کے، غزل کے پارکھ شمس الرحمٰن فاروقی کس نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنی بات کو کس طرح واضح کرتے ہیں۔

" میر کے کلام پر ہماری دارائی مکمل نہ ہوسکنے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ یوں تو ہر بڑی شاعری میں یہ صفت ہوتی ہے کہ ہزار مطالعہ و تجزیہ کے بعد بھی محسوس ہوتا ہے کہ کچھ بات ابھی اپنی باقی ہے جس کے وجود کا احساس تو ہمیں ہے لیکن وہ چیز گرفت میں نہیں آرہی ہے لیکن میر کا معاملہ تھوڑا مختلف ہے۔

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی (کم از کم میں تو اسے سمجھنے سے بالکل قاصر رہا) کہ زبان کے ساتھ معاملہ کرنے کے جو حدود ہیں میر نے ان کو کس طرح اور کس ذریعے سے اس قدر وسیع کیا کہ وہ زبان کے ساتھ تقریباً ہر ممکن آزادی برت جاتے ہیں لیکن پھر بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں بالکل ٹھیک کر رہے ہیں میر کے سوا صرف شیکسپیئر اور حافظ ہی ایسے شاعر ہیں جن میں یہ بات نظر آتی ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ بظاہر معمولی بات کو بھی میر اس قدر غیر معمولی کس طرح کر رہے ہیں۔ یہ بات شیکسپیئر میں بھی نہیں، حافظ میں ہے۔"

بہر حال میر اور غالب سے پہلے بھی غزل تھی۔ میر اور غالب نے غزل نہیں دی بلکہ اس غزل کی روایت نے میر اور غالب دیئے۔ البتہ میر نے اور غالب نے غزل کو نیا رُخ دیا نیا معیار دیا، نیا لب و لہجہ دیا، نئی وسعتیں دیں، نئی گہرائیاں اور نئی سمتیں دیں جو ارتقار ادب اور ارتقائے فن کا ایک فطری تقاضا ہے اس طرح نظم کی روایت نے اقبالؔ

دیا، فیض دیا۔ اقبال اور فیض نے نظم نہیں دی۔ البتہ ان عظیم فن کاروں نے نظم کو نیا اسلوب و آہنگ، نئی لفظیات اور نئی معنویت دی اور نئی عظمتیں دیں۔ یہاں خلاقانہ تجربات کی بات بھی بے جا نہ ہوگی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی خواہ وہ شعری ہیتوں سے متعلق ہو یا اضافی اجتہادات سے جڑی ہوئی ہو۔ فن کے وجدان اور فن کی بصیرت کے بطن سے ہی پھوٹتی ہے خلا سے نہیں۔

یہی وہ تنقیدی بصیرتیں ہیں فنی آگہیاں ہیں جو ادب کے مجموعی شعور سے مل کر وقت اور تاریخ کے فیصلہ کا حصہ بن جاتی ہیں۔ اور یہی وہ عمل ہے جو فروغِ گلشن اور صوتِ ہزار کا موسم بن کر، فن اور ادب کی قدروں کے ارتقا اور ان کی عظمتوں کی بازیافت بن جاتا ہے جسے آپ اور ہم تنقید کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

افسانوی ادب پر تنقید کے سلسلے میں بحث کرتے ہوئے وارث علوی کو بھی اعتراف کرنا ہی پڑا کہ

"ہر احساس اور تجربہ صالح اور صحت مند نہیں ہوتا۔ دی شاد کے احساسات اور تجربات صالح نہیں ہیں نہ ہی باٹرونک ہیرو کا فن کوئی ایسا کیمیا نہیں جو مجرمانہ تجربات کو بھی صالح اور صحت مند بنا کر پیش کرے۔ اگر ایسا ہوتا تو تنقید، احساسات اور تجربات کا ذکر ہی نہ کرتی کہ فن کارانہ اظہار پانے کے بعد سب صالح اور صحت مند ہو گئے۔ صرف فن کا ہی تذکرہ کرتی۔ ہم جانتے ہیں کہ تنقید کی نظر فن اور احساسات دونوں پر رہتی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ فن کی طرح تجربہ بھی خام یا غلط ہو سکتا ہے۔"

حد یہ ہے کہ تخلیقی ادب کے غبار بے جا میں مبتلا ہو کر ہم میراں جی کی نظم "دھوبی بارہ" اور عمیق حنفی کی نظم "ربڑ کی دیوار" کو بھی تخلیقی ادب کی متاعِ عزیز خیال کرتے ہیں۔ منٹو اور دوسرے افسانہ نگاروں سے بھی ایسی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

اس طرح یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ تاثر، تجربہ از خود خام بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ کمہار کے چاک پر دھری مٹی کی طرح پھر اس کو تنقیدی شعور کے ہاتھ اسے متناسب اور موزوں ظرف کی صورت میں ڈھال دیتا ہے۔ وقت کے مزاج اور رواج یا وقت کی ضرورت کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے، جو کہ کمہار کے فن کی نمود، فن کے ظہور اور فن کے ارتقاء کے لیے ناگزیر ہے۔ اس طرح، فن کی صورت گری اور ارتقا میں تنقیدی شعور اور بصیرت کا خارجی اور داخلی ارتباط، خیال افروزی اور فکری اپج سے تخلیقیت کا عمل بھی مکمل ہوتا رہتا ہے۔ جیسے پروفیسر محمد حسن کی یہ تنقیدی تحریر

"جاگتی جگمگاتی نثر لکھنے والے کے لفظ کیا آج بھی اندھیرے جنگل کے، بے سمت سفر میں کوئی راستہ دکھاتے ہیں یا محض خذف ریزے ہیں جو کل ہیرے کی طرح چمکتے تھے اور آج اپنی آب و تاب کھو بیٹھے ہیں۔ راستوں کو روشن کریں یا پھر یہ سب کچھ ماضی ہو گیا اور لفظوں کا یہ جگمگاتا جلوس گذرے دنوں کے پیچ و خم میں کھو گیا۔"

آخر میں سردار جعفری کی ایک تنقیدی تحریر سے ایک اقتباس پیش کرتے ہوئے

بحث کو تمام کرتا ہوں، جسے ہم تخلیقی عمل کی نمایندگی سے ہی تعبیر کریں گے کیوں کہ یہ حصّہ بھی کسی بھی تخلیقی ادب پارے کے کسی بھی حصّے سے کسی طرح کم تخلیقی نہیں ہے۔

مجھے انسانی ہاتھ بڑے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں ان کی جنبش میں ترنّم ہے اور خاموشی میں شاعرى، ان کی انگلیوں سے تخلیق کی گنگا بہتی ہے۔ یہ وہ فرشتے ہیں جو دل و دماغ کے عرشِ بریں سے وحی و الہام لے کر، کاغذ کی حقیر سطح پر نازل ہوتے ہیں اور اس پر اپنے دائمی نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کاغذوں کو دنیا نظم، افسانہ، مقالہ اور کتاب کہہ کر آنکھوں سے لگاتی ہے اور ان سے روحانی تسکین حاصل کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ قلم کو ہاتھ کا تقدس، ذہن کی عظمت اور قلب انسانی کی وسعت سمجھا ہے اور قلم کے بنائے ہوئے ہر نقش کو سجدہ کیا ہے ؏

شاعری، افسانوی ادب، انشائیہ نگاری اور طنز و ظرافت تخلیقی ادب کے تاج محل کے چار مینار ہیں۔ ان میں تین میناروں کو تاج محل کا حصّہ سمجھنا اور چوتھے مینار کو تاج محل کا حصّہ نہ سمجھنا، چوتھے مینار سے ہی نہیں بلکہ خود تاج محل کے ساتھ اور دیکھنے والی نظر کے ساتھ بھی ناانصافی کرنے کے مترادف ہے۔ کیوں کہ سارا ادب بذات خود تمام تر ایک تخلیقی عمل ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اسلم فرخی
بی۔ ۱۵۵/۵ گلشن اقبال
کراچی پاکستان
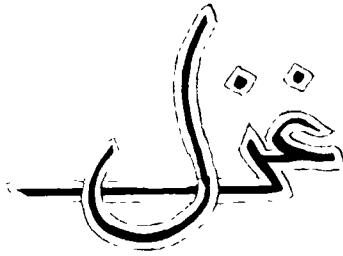
کہہ گیا چپکے سے کیا وقت سُبک گام ابھی　　اپنے آپے میں نہیں ہے دلِ ناکام ابھی

نہ سہی سنگِ ملامت مگر اے جوشِ جنون　　ہیں بہت تیرے لیے ناوکِ دشنام ابھی

یہ سنا ہے کہ اسیروں کو رہا کرتے ہیں　　تیرے وحشی تو پھڑکتے ہیں تہِ دام ابھی

شہر تاریک، ہوا بند، فضائیں وحشت　　کتنی برہم ہے تری زلفِ سیہ فام ابھی

تو نہیں شہر میں لیکن ترا چرچا شب و روز　　شہر والوں کی زباں پر ہے ترا نام ابھی

گھر تو میں نے ہی بنایا تھا مگر کیا جانے　　مجھ سے مانوس نہیں گھر کے در و بام ابھی

ہر نئی صبح ہے اک تازہ سفر کی تمہید　　جانے لے جائے کہاں گردشِ ایام ابھی

دھوپ کی تیزی میں کس نے یہ مسافر سے کہا　　پیار کی چھانو تو ہے دور ہی شام ابھی

حادثہ جو بھی ہوا مجھ سے ہی منسوب ہوا　　سر سلامت ہے تو کچھ اور بھی الزام ابھی

چشمِ ساقی کا اشارہ ہو تو میخانے میں　　رقص کرنے لگیں میخوار ابھی جام ابھی

ایک مدت سے تہی جام ہیں چُپ ہیں لیکن　　ہم مچا سکتے ہیں میخانے میں کہرام ابھی

اثرِ جلوہ محبوب ہے قایم اب تک　　ایک شعلہ سا لرزتا ہے سرِ بام ابھی

کچھ پرندوں کو یقیں ہے سرِ شاخ لرزاں　　آئے گا دوشِ ہوا پر کوئی پیغام ابھی

تم کو جانا ہے بہت دور بہت دور اسلم
سانس لینے کو رُکو یوں نہ بہر گام ابھی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی اہم کتابیں

اندازِ گفتگو کیا ہے

شمس الرحمٰن فاروقی

اس کتاب میں شامل اکثر مضامین گفتگو کا موضوع رہے ہیں اور اسی بنا پر ان کے ذریعے کچھ پرانے مسائل پر نئی گفتگو کا آغاز ہوا۔ اس کے تمام مضامین میں شاعروں اور شاعری کو ہی معرضِ بحث میں لایا گیا ہے۔

ایک نہایت اہم مضامین کا مجموعہ

قیمت ۷۵/- روپے

دستک اس دروازے پر

وزیر آغا

اس کتاب میں موجودیت کا فلسفہ ہے اور اس سلسلے میں مغرب کے فلسفے، تصوف، اردو ادب کی مختلف تحریکوں کا بیان ہے۔ عارفانہ تجربے اور تخلیقی تجربے کا یہ فرق ہی اس کتاب کا موضوع ہے۔

قیمت ۱۵/- روپے

آزمائش کی گھڑی

سید حامد

بابری مسجد کیا ٹوٹی، مسلمانوں کے دل ٹوٹ گئے۔ مسجد تو اب جڑ نہیں سکتی کہ ظالموں نے اسے زمین بوس کر دیا لیکن دل تو جوڑے جا سکتے ہیں، حوصلے کو تو بحال کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت یہی کام کرنے کا ہے۔ حوصلہ پست ہو گیا تو بچا کیا۔ آج کے حالات پر ممتاز دانشور سید حامد کے عالمانہ مضامین کا مجموعہ۔

قیمت ۴۵/- روپے

جھینی جھینی بینی چدریا

عبدل بسم اللہ　مترجم۔ وسیم حیدر ہاشمی

سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ اور ریکڈیا ایوارڈ یافتہ یہ ناول بنارس کے انصار بھائیوں کی تہذیب و تمدن کی ایک روشن تصویر ہے۔ جس کو ناول نگار نے دس سال بنکروں کے بیچ رہ کر انھی کی زبان اور کلچر پر قلم بند کیا ہے۔

قیمت ۷۵/- روپے

صحرانورد کے خطوط

مرزا ادیب

صحرانورد کے خطوط، آج سے کم و بیش تیس برس پہلے شائع ہوئی تھی۔ اب تک اس کے بارہ اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو کے کسی افسانوی مجموعے کو اس قدر مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جتنی صحرانورد کے خطوط کو۔

قیمت ۷۵/- روپے

میں سمندر ہوں　فرحان سالم

شعری مجموعوں کی بھیڑ ہیں، سب سے الگ، منفرد اور اردو کے ناروں کو چھیڑنے والا شعری مجموعہ

قیمت ۳۰/- روپے

شاہد نجیب آبادی

ایک سے جب آشنائی ہوگئی
سب سے پھر بے اعتنائی ہوگئی

میرے سجدوں پہ گماں کیا کیا ہوئے
عاجزی بھی خود نمائی ہوگئی

سنگ میں بن ہی گیا دہلیز کا
ان کے قدموں تک رسائی ہوگئی

کر گئی پرواز ایک قیدی کی روح
در مقفّل ہے، رہائی ہوگئی

سنگ باری کے ہیں چہرے پر نشاں
عشق کی کیا رونمائی ہوگئی

بات کی فطرت سے بہنا ہوشیار
منہ سے نکلی اور پرائی ہوگئی

خود کو بہتر غیر کو کم تر کہا
آج مجھ سے اک برائی ہوگئی

پی کے شاہد پھر نہ سجدے سے اٹھا
ختم اس پر پارسائی ہوگئی

عاصی کاشمیری

چاہنے والوں کو ایسے بھی جدا رکھا گیا
میرے ان کے درمیاں کچھ فاصلہ رکھا گیا

اس طرح جور و ستم مجھ پہ روا رکھا گیا
قید خانے میں مجھے سب سے جدا رکھا گیا

بھائی نے گرچہ بنا لی صحن میں دیوار ایک
لیکن اس میں ملنے کا کچھ راستا رکھا گیا

توڑتا وہ ہی رہا ہے میرے دل کو بار بار
نام جس کا بھی حسین و دلربا رکھا گیا

کوئی بھی سچ بات کہنے کی نہ اب جرأت کرے
کاٹ کر دیوار پہ یوں سر میرا رکھا گیا

بتیس سالوں میں رہی ہر ایک لمحے کی خبر
ہجرتوں میں بھی وطن سے رابطہ رکھا گیا

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی اہم کتابیں

پہچان اور پرکھ — پروفیسر آل احمد سرور

اس مجموعے میں پروفیسر آل احمد سرور کے جو مضامین شامل ہیں ان کا تعلق زیادہ تر شاعروں اور شاعری کی خصوصیات سے ہے میر، غالب، انیس، حسرت، فانی، جوش اور فراق کی شخصیات اور شاعری پر بھرپور مضامین کا اہم مجموعہ۔ قیمت :/ ۵۱

ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم
ڈاکٹر سلامت اللہ

اس کتاب میں مسلمانوں کی تعلیم کے جن مسائل کی نشاں دہی کی گئی ہے وہ مصنف کے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اس لیے کہ اس کے تاریخی اور حالیہ شواہد موجود ہیں۔ ماہر تعلیم ڈاکٹر سلامت اللہ کی اہم ترین تصنیف۔
قیمت :/ ۵۱

اقبال کا نظریۂ خودی — عبدالمغنی
اس کتاب میں نظریۂ خودی کو مرکزی نقطہ فرض کر کے اقبال کے پورے نظام فکر کی تلاش کی گئی ہے تاکہ ایک طرف دنیا کی سب سے بڑی شاعری کی حقیقی جہت واضح ہو اور دوسری طرف آج کی انسانیت کو اپنے ارتقا کی صحیح سمت دریافت کرنے میں سہولت ہو۔ قیمت :/ ۱۵۰

پت جھڑ کی آواز — قرۃ العین حیدر

برصغیر کی ممتاز ترین افسانہ نگار قرۃ العین حیدر کی اہم کہانیوں کا مجموعہ۔ یہ کہانیاں دلچسپ بھی ہیں اور زندگی کی صحیح عکاسی بھی کرتی ہیں۔ نیا اڈیشن قیمت :/ ۷۵

جدید افسانہ اور اس کے مسائل — وارث علوی
اردو کے ممتاز نقاد وارث علوی کے تنقیدی مضا[مین] کا تازہ ترین مجموعہ جدید اردو افسانہ کے متعلق ایک اہم دستاویز۔ قیمت :/ ۳۶

لکھنوٴ تہذیب کا نمائندہ شاعر

قلندر بخش جرأت (خطبہ) — جمیل جالبی

اردو کے نامور عالم اور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک نہایت اہم خطبہ جو موصوف نے ۸/نومبر ۱۹۸۹ء کو ڈاکٹر سید عابد حسین میموریل ٹرسٹ کے سمینار میں پیش کیا۔
قیمت :/ ۱۰

غبار منزل (شعری مجموعہ) — غلام ربانی تاباں

اردو کے ممتاز شاعر جناب غلام ربانی تاباں کی غزلوں، نظموں اور قطعات کا تازہ مجموعہ جس میں ساز لرزا[ں] "ذوق سفر" اور "نوائے آوارہ" کا انتخاب بھی شامل ہے۔ قیمت :/ ۴۵

تاریخ اودھ — قاسم علی نیشاپوری

"تاریخ اودھ" معروف بہ "تاریخ شاہیہ نیشاپوریہ" اودھ کی اہم تاریخ ہے۔ قاسم علی نیشاپوری نے اسے فارسی میں لکھا تھا ڈاکٹر شاہ عبدالسلام نے نہایت محنت سے اس کو اردو کا جامہ پہنایا۔ قیمت :/ ۲۷

فی الحقیقت — یوسف ناظم

طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں یوسف ناظم کو ا[ہم] مقام حاصل ہے۔ ان کی تحریریں نہایت ذوق شوق اور توجہ سے پڑھی جاتی ہیں۔ "فی الحقیقت" آ[پ] کے تازہ ترین طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔
قیمت :/ ۴۵

ڈاکٹر عصمت جاوید
۱- بھولبن ، کباڑی پورا
اورنگ آباد - (مہاراشٹر)

قافیے کی ماہیت

آج جبکہ اردو شاعری کی نئی بوطیقا میں آزاد نظم نے اپنا مقام بنا لیا ہے قافیہ شناسی زیر بحث لانے کی کوشش کو شاید بے موسم کی راگنی سمجھا جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ شعر میں قافیے کی اہمیت بدلتے ہوئے ادبی موسموں میں بھی ایک قدر مستقل کی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا کی ہر زبان، ہر زمین اور ہر زمانے کی شاعری میں قافیہ شعوری یا غیر شعوری طور پر شعر کا ایک اہم جزو سمجھا جاتا رہا ہے ہماری شاعری ایک ایسے دور سے بھی گزری ہے جب قافیے کو وزن و آہنگ کی طرح شعر کا جزو لاینفک سمجھا جاتا تھا اور جس کے بل بوتے نہ صرف احساسات و جذبات کے نازک تار چھیڑے جاتے تھے بلکہ تخیلات کی ایک بدیع اور تازہ کار دنیا تخلیق کی جاتی تھی۔ قافیوں نے ہماری مقفیٰ شاعری میں تخیل کو کس طرح ابھارا اور سنوارا اور کس طرح فنکار کے اندر سوتے ہوئے جذبات کو جگایا اور بھولے بسرے تجربوں، سوتی ہوئی یادوں اور تحت الشعور میں دبی ہوئی محرومیوں اور نا آسودہ و ناکام تمناؤں کو بیدار کر کے انھیں تخلیقی عمل سے گزارا ہے، اس کی اپنی ایک الگ داستان ہے لیکن اس داستان کا ایک افسوسناک پہلو یہ بھی ہے کہ قافیے پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کی وجہ سے شاعری میں لفظ پرستی کو ہوا ملی اور شاعری قافیہ پیمائی کا دوسرا نام بن کر رہ گئی اور آج جاکر یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ قافیہ شعر کا جزو لاینفک نہیں لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ قافیے کا سہارا چھوڑ کر شعر کو بہت کچھ کھونا بھی پڑا ہے - قافیے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ خود آزاد نظم میں "اندرونی قافیہ" چاہے وہ باترتیب ہو یا بے ترتیب شعر کا باطنی حسن اور اس کے مجموعی آہنگ کو ابھارنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔ غزل کا تو تصور ہی قافیے کے بغیر ناممکن ہے - آزاد غزل بھی قافیے سے رشتہ نہیں توڑ سکی اور آج جبکہ نئی غزل نئی نظم کی طاقتور حریف بن کر ابھر چکی ہے، قافیے کی اہمیت سے انکار ناممکن ہے۔

وہ علم جس میں قافیے کے اجزائے ترکیبی اور ان کی اقسام سے بحث ہوتی ہے "علم القوافی" یا علم قافیہ کہلاتا ہے - علم عروض و بیان پر جتنی کتابیں بازار میں دستیاب ہیں ان میں علم القوافی کی بھی ایک فصل ہوتی ہے - مگر یہ بحث قدیم روایتی اصطلاحات میں اس قدر الجھی ہوتی ہے کہ اس کے مالہٗ و ماعلیہ کا سراغ لگانا ایک عام اردو قاری کے بس کی بات نہیں

ان میں اکثر غیر ضروری اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں جن سے صرف نظر کرکے بھی ہم قافیے کی ماہیت سمجھ سکتے ہیں ۔ یہ تو طے شدہ بات ہے کہ قافیے کا دارومدار زبان میں استعمال ہونے والی آوازوں پر ہوتا ہے لیکن مجبوری یہ ہے کہ قافیے پر جو بھی بحث ملتی ہے وہ حروف وحرکات کی اصطلاحوں میں ملتی ہے جبکہ حرف آواز نہیں بلکہ آواز کی تحریری علامت ہے، اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے علم القوافی میں اکثر صوتی اعتبار سے غیر ضروری اصطلاحیں بھی راہ پاگئی ہیں ۔ اس مقالے کا مقصد چونکہ ایک عام پڑھے لکھے آدمی کو قافیے کی ماہیت سے روشناس کرانا ہے اس لیے ساری بحث حرکات و حروف کی اصطلاحوں میں ہی کی گئی ہے اور جہاں ضرورت محسوس کی گئی وہاں لسانی اصطلاحیں قوسین میں دی گئی ہیں یا ان کی وضاحت کر دی گئی ہے ۔

اردو میں حروف علّت تین ہیں (۱) الف (۲) واؤ اور (۳) ی لیکن یہ حروف جن آوازوں (صوتیوں) کی نمائندگی کرتے ہیں وہ تعداد میں دس ہیں الف واؤ اور ی سے سات آوازوں کی نمائندگی ہوتی ہے اور بقیہ تین آوازوں کی نمائندگی زبر زیر اور پیش سے ہوتی ہے جن کے لیے ہم نے اصطلاح ''حرکات'' استعمال کی ہے (اعراب نہیں) اور جن میں لسانیات میں خفیف مصوّتے کہتے ہیں ۔ دوسری آوازیں جن کی نمائندگی الف واؤ اور ی سے ہوتی ہے، انھیں طویل مصوّتے کہتے ہیں ۔ اس مضمون میں ہم نے مصوّتوں کے لیے ''حرکات و علّت'' کی اصطلاح استعمال کی ہے ۔

اب قافیوں کے یہ دس سیٹ ملاحظہ ہوں :-

۱- الف : دو حرفی : بَل، جَل، چَل، کَل = (ب) : کثیر حرفی : سَنبھل، اُچھل، نِکل،
۲- الف : دو حرفی : بِل، تِل، دِل، سِل = (ب) کثیر حرفی : کپِل، باطِل، کُسل رجاں گُسل،
۳- الف : دو حرفی : گُل، کُل، پُل، جُل = (ب) کثیر حرفی : بُلبُل، قُلقُل، سُنبُل، سُبُل، رُسُل
۴- الف : دو حرفی : بال، جال، چال، کال = (ب) کثیر حرفی : نکال، سنبھال، خیال، اُچھال
۵- الف : دو حرفی : طُول، بھُول، بھول = (ب) کثیر حرفی : اُصُول، قبُول، رسُول
۶- الف : دو حرفی : بول، تول، مول = (ب) کثیر حرفی : ٹھٹھول، ٹٹول
۷- الف : دو حرفی : قَول، ہَول، ڈھول (ڈھا) (ب) کثیر حرفی : - - - - - - - -
۸- الف : دو حرفی : چیل، کیل، نیل = (ب) کثیر حرفی : اصیل، وکیل، قتیل، جمیل
۹- الف : دو حرفی : تیل، جیل، کھیل = (ب) کثیر حرفی : ڈھکیل، غلیل،
۱۰- الف : دو حرفی : بیل، سَیل، مَیل = (ب) کثیر حرفی : سُہَیل،

یہ ہم قافیہ الفاظ کے دس سیٹ ہیں ہر سیٹ میں جتنے قافیے ہیں اُن کے آخر میں لام آیا ہے ۔ اِن مثالوں میں ل (لام) قافیے کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے مثلاً بَل کا قافیہ چل تو ہوسکتا ہے لیکن ''بس'' یا ''چر'' نہیں ہوسکتا البتہ بس کا قافیہ ''رس'' اور ''چر'' کا قافیہ ڈر ہوسکتا ہے ۔ وہ حرف جس کے بغیر قافیہ نہیں بن سکتا ''حرف روی'' کہلاتا ہے ۔ مذکورہ بالا سیٹ کے قوافی میں ''لام'' حرف روی ہے ۔

سی طرح "بس" اور "رس" میں "سین" حرف روی ہے۔ اسی طرح "ڈر" اور "گھر" میں "رے" حرف روی

پہلے سیٹ میں حرف روی سے قبل "زبر" ہے۔ "لام" کے تحت دو حرفی الفاظ میں زبر اب "ر" میں کثیر حرفی جیسے سنبھل، اُچھل، نِکل۔ لیکن چونکہ ان الفاظ میں لام سے قبل زبر ہے اس لیے "جل" کا قافیہ جہاں "جل" ہو سکتا ہے وہاں سنبھل، اُچھل اور نِکل بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ الفاظ دو اہم شرطیں پوری کرتے ہیں ان دونوں دو حرفی اور سہ حرفی الفاظ میں حرف روی "لام" مشترک ہے اور ان سے قبل زبر آیا ہے قافیے کی حد یہیں دو حرفی لفظ پر ختم ہو جاتی ہے اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ کثیر حرفی الفاظ کے ابتدائی حرف پر زبر ہے (جیسے سنبھل میں) یا پیش ہے (جیسے اُچھل میں) یا زیر ہے جیسے نِکل میں) اس اصول کا دوسرے سیٹ کے قوافی پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔

دوسرے سیٹ میں حرف روی لام سے قبل زیر ہے، تیسرے سیٹ میں روی سے قبل پیش ہے چوتھے سیٹ میں الف یا "آ" ہے، پانچویں سیٹ میں "واوِ معروف" چھٹے سیٹ میں واوِ مجہول ساتویں میں یائے لین، آٹھویں میں یائے معروف، نویں میں یائے مجہول اور دسویں میں یائے لین ہے۔

اوپر کے ابتدائی تین سیٹ میں حرف روی سے قبل جو حرکات (زیر، زبر، پیش) یکسانیت کے ساتھ آئی ہیں ان میں سے ہر ایک کو علم القوافی کی اصطلاح میں "توجیہ" کہتے ہیں اور بقیہ سات سیٹ میں جو حروف علت یکسانیت کے ساتھ آئے ہیں انھیں اصطلاح میں "ردف" کہا جاتا ہے یعنی الف مدہ، واوِ معروف، واوِ مجہول، واوِ لین، یائے معروف یائے مجہول اور یائے لین مندرجہ بالا قوافی میں "ردف" ہیں

اس لیے قافیہ کی تعریف یوں ہو گی اگر دو یا دو سے زیادہ الفاظ میں "روی" سے قبل توجیہ یا ردف میں مطابقت ہو، خواہ یہ الفاظ دو حرفی ہوں یا کثیر حرفی، تو ایسے الفاظ ایک دوسرے کا "قافیہ" کہلاتے ہیں۔ قافیے کی حد دو حرفی لفظ توجیہ یا ردف پر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ قافیے کی قسم اوّل ہے

اب قافیوں کے یہ دو سیٹ ملاحظہ ہوں

ا (الف) بخت، تخت، سخت (ب) ذکر، فکر (ج) شکر، شکر (انشہ)

ب (الف) کاشت، داشت (ب) دوست، پوست

پہلے سیٹ (الف) میں "تے" اور (ب) اور (ج) میں "رے"، بالترتیب حروف روی ہیں۔ لیکن ان سے پہلے نہ کوئی حرکت ہے، نہ حرف علت سیٹ ا (الف) میں "خ" اور (ب) اور (ج) میں کاف ساکن ہے (لسانی اصطلاح میں ان مثالوں کے آخر میں "مصمتی خوشہ" ہے)

علم القوافی کی اصطلاح میں حرف روی سے قبل جو ساکن حرف آتا ہے اسے "قید" کہتے ہیں

"بخت" اور "سخت" میں "خ" قید ہے اسی طرح "ذکر" اور "فکر" میں کاف "قید" کہلائے گا
یہ بات قابلِ غور ہے کہ سخت کا قافیہ بخت، چشت کا قافیہ دشت اور ذکر کا قافیہ شکر نہیں ہو سکتا کیونکہ قافیہ بننے کے لیے ضروری ہے کہ قید سے پہلے جو حرکت (یعنی توجیہ) آتی ہے اس میں مطابقت لازمی ہے۔ اس کے علاوہ روی کے ساتھ قید کی تکرار بھی ضروری ہے (مصحفی خوشہ برقرار رکھنا ضروری ہے) یعنی دشت کا قافیہ رفت یا دست نہیں لایا جاتا اسی طرح ذکر کا قافیہ عطر نہیں لاتے لیکن راقم کی رائے میں روی کے ساتھ قید کی تکرار کو "احسن" سمجھا جائے اور شاعر کو اختلاف قید کی رعایت دی جائے یعنی اسے اجازت دی جاتے کہ وہ "اصل" کا قافیہ جہاں نصل اور وصل استعمال کرے وہیں "نقل کو بھی بطور قافیہ لائے۔

اب دوسرے سیٹ کو لیجیے سیٹ ۲ (الف) میں قید سے پہلے حرف علت "الف" یکسانیت کے ساتھ آیا ہے (کاشت۔ داشت) اور (ب) میں واؤ مجہول (دوست پوست) جب ساکن حرف سے پہلے حرکت کے بجائے حرف علت آتے تو علم القوافی میں اسے قید نہیں بلکہ "ردفِ زائد" کہتے ہیں۔ سخت اور بخت میں تو "ساکن خ" "قید" کہلائے گا لیکن دوست اور پوست میں ساکن سین کو "ردف زائد" کہیں گے۔ یہ صرف اصطلاحی فرق ہے۔ اس فرق کو اس لیے روا رکھا گیا ہے کہ تحریر میں حرکت اور حرف کا تصور جدا گانہ ہے ورنہ گفتگو میں یہ اصطلاحی فرق غیر ضروری ہے "قید" سے قبل کی حرکت کو "حذوِ قید" کہتے ہیں۔

قسم دوم کے اس قافیے کی تعریف اِن الفاظ میں کی جاسکتی ہے: ایسے دو یا دو سے زیادہ دو حرفی یا کثیر حرفی الفاظ جن کے حرف روی سے قبل قید یا ردف زائد ہو اور بالترتیب حذوِ قید اور ردف میں مطابقت ہو تو ایسے الفاظ قوافی کہلاتے ہیں۔

چونکہ تحریر میں حرکات کا شمار حروف میں نہیں ہوتا، اس لیے علم القوافی میں توجیہ کا ذکر (جو صحیح معنوں میں خفیف مصوتہ ہے) حروف قافیہ نہیں بلکہ حرکاتِ قافیہ کے تحت کیا جاتا ہے، اسی طرح ردف زائد کو ردف ہی کی ذیلی قسم قرار دیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ہم اِن تین حروف قافیہ سے روشناس ہوتے ہیں (۱) روی (۲) ردف (۳) قید لیکن علم القوافی میں دو اور حروف کو بھی حروف قافیہ میں شمار کیا جاتا ہے اگرچہ قافیہ سازی میں ان کی حیثیت ثانوی ہے۔ مثلاً قوافی کے یہ سیٹ دیکھیے

۱۔ دِل، گِل، سِل اور ۲۔ جاہِل، باطِل، شامِل

قاعدے کی رو سے دِل کے قافیہ جاہِل، باطِل، ساحِل وغیرہ ہو سکتے ہیں کیونکہ حرف روی اور مطابقت توجیہ کی شرطیں دِل بھی پوری کرتا ہے اور ساحل بھی لیکن سیٹ نمبر ۲ کے تحت دیے ہوئے الفاظ میں ایک اور خصوصیت بھی ہے یعنی توجیہ سے قبل الف یکسانیت کے ساتھ آیا ہے۔ ج + ا ہِل۔ س + ا حِل۔ د + ا خِل۔

حرفِ روی سے قبل جس حرف پر حرکت ہے اسے علم القوافی میں "دخیل" کہتے ہیں اور اس کی حرکت کو "اِشباع" اسی طرح جو الف آتا ہے اسے "الفِ تاسیس یا حرف "تاسیس" کہتے ہیں اساتذہ نے یہ شرط بھی لگا دی ہے کہ اگر مطلع کے قوافی میں تاسیس و دخیل آئیں تو شاعر کے لیے لازمی ہے کہ وہ اس غزل کے دوسرے اشعار میں ایسے ہی قوافی لائے جن میں تاسیس و دخیل ہوں مثلاً اگر کوئی شاعر مطلع میں ساحل کا قافیہ قاتل لائے تو اس پر لازم آتا ہے کہ وہ اس غزل میں دِل، مِل وغیرہ قوافی استعمال نہ کرے البتہ اگر مطلع میں دل کا قافیہ قاتل آیا ہو تو پھر اسے چھوٹ ہے کہ وہ تاسیس و دخیل والے قافیے لائے یا نہ لائے۔ لیکن خاکسار کی رائے میں یہ اساتذہ کی محض اپج ہے جس کی پابندی لازمی نہیں۔ ایسے قوافی میں جہاں الف تاسیس کا آنا ضروری ہے وہیں دخیل کی حرکت میں بھی مطابقت ضروری ہے یعنی ساحِل کا قافیہ تغافل نہیں ہوسکتا۔

بہر حال تاسیس اور دخیل وہ حروف قافیہ ہیں جن کی حیثیت ثانوی ہے اس لیے ہم جہاں بھی ان کا ذکر یں گے انھیں قوسین میں لکھیں گے۔

چونکہ قافیے میں "روی" بنیادی حرف ہوتا ہے علم القوافی میں کہا جاتا ہے کہ روی سے قبل چار حروف قافیہ آتے ہیں (۱) تاسیس (۲) دخیل (۳) ردف اور (۴) قید۔ حقیقت یہ ہے کہ تاسیس و دخیل ردف کی ذیلی قسمیں ہیں)

"حرکاتِ قافیہ" کے تحت علم القوافی کی اکثر اصطلاحیں غیر ضروری ہیں مثلاً الف تاسیس کی حرکت کو "رس" کہا جاتا ہے۔ دو وجوہات کی بنا پر یہ اصطلاح غیر ضروری ہے ایک وجہ تو کہ الف حرف علت ہے اس پر زبر کی علامت لگائی بھی نہیں جاتی جب ہم لکھتے ہیں "یا" تو ي پر زبر لگاتے ہیں الف پر نہیں یہ درست بھی ہے[1] کیونکہ الف طویل مصوتہ ہونے کی وجہ سے ي کو متحرک کر دیتا ہے۔ (اسی طرح جب عربی میں "طول" لکھتے ہیں تو ط پر پیش لگاتے ہیں واؤ پر نہیں اسی طرح تقریر میں "ر" کے نیچے زیر لکھتے ہیں ي کے نیچے نہیں)۔ جب الف پر زبر لکھا ہی نہیں جاتا کیونکہ یہ خود حرکت ظاہر کرنے والا حرف ہے تو پھر الف کی حرکت کے لیے "رس" کی اصطلاح بے معنی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ الف کی حرکت اگر کوئی ہو بھی تو زبر کے علاوہ کوئی اور حرکت ہو ہی نہیں سکتی، پھر اس کے لیے الگ سے اصطلاح استعمال کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تعیّن قافیہ میں "رس" کوئی رول ادا نہیں کرتا[2]۔

---

[1] آج کل اردو میں واوِ معروف کو واوِ مجہول سے ممتاز کرنے کے لیے واؤ پر الٹا پیش لکھتے ہیں لوٗ اسی طرح یائے معروف کے نیچ کھڑا زیر لکھتے ہیں زنجیر۔ یہی صحیح طریقہ ہے

[2] اسی طرح کے اعتراضات ڈاکٹر مغنی تبسم نے اپنے مقالے "قافیہ" میں کیے ہیں جو ان کے مجموعۂ مضامین "آواز اور آدمی" میں شامل ہے۔

واوِ معروف اور یائے معروف کی حرکات کو علم القوافی میں "حذوِ ردف" کہا جاتا ہے۔ جو بات الف تاسیس کے "رس" کے بارے میں کہی گئی ہے اس کا اطلاق واوِ معروف اور یائے معروف پر بھی ہوتا ہے اسی طرح حذوِ ردف کی اصطلاح بھی غیر ضروری ہے۔ البتہ چونکہ اردو رسم الخط کی مخصوص ساخت کے پیشِ نظر حرکت و حرفِ علت میں فرق کرنا ضروری ہے، اس لیے توجیہ کی اصطلاح قابلِ قبول ہے "قید" سے قبل آنے والی حرکت کو "حذوِ قید" کہتے ہیں۔ یہ اصطلاح اس لیے ضروری ہے، اگر "حذو قید" میں اختلاف ہو تو قافیہ بنتا ہی نہیں مثلاً "چُست" کا قافیہ "دست" نہیں ہوسکتا۔

اب قافیے کی تیسری قسم باقی رہ جاتی ہے۔ اوپر قافیے کی جتنی مثالیں گزری ہیں ان میں حرف صحیح حرف روی کے طور پر آیا ہے۔

اردو شعر میں ایسے قوافی بھی مستعمل ہیں جن کے آخر میں حرف علت حرف روی کے طور پر آتا ہے لیکن علم القوافی میں حرف علت کو حرف روی کے طور پر نہیں مانا جاتا بلکہ اسے حرف روی کی حرکت کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ ہم نے اس مقالے میں حرف علت کو علاحدہ سے حرف روی کے طور پر بیان کیا ہے، تاکہ ماہیت قافیہ کو سمجھنے میں مدد ملے۔ قافیوں کا یہ سیٹ ملاحظہ ہو

علہ دَوا، خُدا، سِوا، اٹھا

ان قافیوں میں الف (حرف علت) حرف روی ہے، الف سے قبل توجیہ میں کوئی مطابقت بھی نہیں دوا میں دال پر زبر ہے، خدا میں خ پر پیش ہے اور سوا میں سین کے نیچے زیر ہے، اس کے باوجود یہ الفاظ ایک دوسرے کے قافیے ہیں اسی طرح ایک نیا اصول ہمارے ہاتھ لگتا ہے۔ اگر حرف علت حرف روی ہو تو مطابقت ردف و توجیہ کی پابندی ضروری نہیں یعنی کھُل کا قافیہ کِھل نہیں ہوسکتا لیکن کھُلا کا قافیہ کِھلا ہوسکتا ہے کیونکہ پہلی صورت میں حرف صحیح (لام) حرفِ روی ہے لیکن دوسری صورت میں الف حرف روی ہے۔

اسی اصول کا اطلاق حرف علت واؤ اور ی علٰ کے حرف روی ہونے کی صورت میں بھی ہوتا ہے مثلاً

شبو، اور رَفو، اختلاف حرکت کے باوجود ہم قافیہ ہیں اسی طرح
مَری، گِری اور بِھری بھی اختلاف حرکت کے باوجود ہم قافیہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

لہ	دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے۔	آخر اس درد کا دَوا کیا ہے	غالب
۲ہ	دوپٹے کو اس منہ کے اوپر اٹھا۔	دیا گال سے گال اپنا ملا	میر حسن
۳ہ	یکایک جو آہ وہ قدم پر گری۔	تو جھجکی وہ شہزادی اور کچھ ڈری	〃

حرف علّت کے حرف روی ہونے کی صورت میں یہ حرف علت خود ردف بن جاتا ہے یہاں یہ قافیے کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوست کا قافیہ دشمن تو نہیں ہوسکتا لیکن دوستی کا قافیہ دشمنی ہوسکتا ہے۔ ڈر کا قافیہ گر نہیں ہوسکتا لیکن ڈری کا قافیہ گری ہوسکتا ہے۔ اگر کسی قافیے کے آخر میں نون غنہ ہو جیسے گلستاں اور عیاں میں تو آں کو آسمجھ کر روی کو حرف علت سمجھا جاتے۔

علم القوافی میں اسی بات کو اس طرح کہا گیا ہے کہ اگر حرف روی متحرک ہو یعنی اس کے بعد حرکت یا حرف علت آئے تو مطابقت ردف کی پابندی لازمی نہیں ہوتی یعنی اگرچہ برابر کا قافیہ شاطر اور عنصر درست نہیں کہ ان میں اختلاف توجیہہ ہے۔ لیکن برابری کا قافیہ شاطری اور عنصری درست ہے۔ (علم القوافی میں روی کی حرکت کو "مجریٰ" کہتے ہیں)

اب تک جن حروف قافیہ کا ذکر آیا ہے وہ "روی" سے پہلے آتے ہیں لیکن علم القوافی کی رو سے چار حروف قافیہ "روی" کے بعد بھی آتے ہیں۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) وصل (۲) خروج (۳) مزید اور (۴) نائرہ

(۱) وصل

قوافی کا یہ سیٹ دیکھیے: جوانی، آسمانی۔ آشنائی، خدائی

اس سیٹ میں علم القوافی کی رو سے نون حرف روی ہے اور اس کے بعد آنے والی "ی" حرف وصل ہے۔

(۲) خروج

وصل کے بعد جو حرف آتا ہے اسے "خروج" کہتے ہیں مثلاً "کرتے" اور "مرتے" میں "ر" حرف روی، "ت" حرف وصل اور "ے" خروج ہے۔

(۳، ۴) مزید و نائرہ

خروج کے بعد آنے والے حرف کو "مزید" اور "مزید" کے بعد آنے والے حرف کو "نائرہ" کہتے ہیں مثلاً مچائیں اور بچائیں میں (۱) چ۔ حرف روی (۲) الف۔ حرف وصل (۳) ہمزہ جو ی کا قائم مقام ہے خروج (۴) دوسری ی مزید اور (۵) نون غنہ نائرہ ہے۔

اس طرح علم القوافی کی رو سے جس طرح چار حروف قافیہ روی سے قبل آتے ہیں اسی طرح چار حروفِ قافیہ روی کے بعد بھی آتے ہیں جیسے مندرجہ ذیل خاکے کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے

تاسیس، دخیل)، ردف، قید ← روی ← وصل، خروج، مزید، نائرہ ایک شاعر نے حروف قافیہ کو مندرجہ ذیل قطع میں یوں منظوم کیا ہے

قافیہ اک حرف ہے اور آٹھ اس کے ہم نشیں۔ چار پیش و چار پس مرکز ہے وہ یہ دائرہ

حرف تاسیس و دخیل و ردف و قید و پس روی۔ بعدہٗ وصل و خروج و ہم مزید و نائرہ

لیکن علم القوافی میں حرف روی کے بعد چار حروف قافیہ کا تعین تکلف سے خالی نہیں مثلاً مچائیں

اور بجائیں میں "ج" کو روی قرار دیا گیا ہے لیکن مچائیں کے قافیہ آئیں اور جائیں بھی تو
ہیں ۔ اس صورت میں روی کس حرف کو قرار دیا جائے اس بارے میں علم القوافی خاموش
پھر "ئیں" میں تو تین حروف تو ہو سکتے ہیں لیکن صوتی سطح پر یہ تینوں حروف مل کر ایک
آواز کی نمایندگی کرتے ہیں /ایں/ - یہ انفی مصوتہ ہے

حرف وصل کی یہ پہچان بتائی گئی ہے کہ وصل کو حذف کر دینے سے کلمہ بامعنی رہتا ہے یعنی اگر جوانی
سے ی کو حذف کر دیا جائے تو الفاظ جوان اور آسمان بچتے ہیں اور روی کی پہچان یہ ہے کہ اسے حذف کر د
مہمل ہو جاتا ہے جیسے جوان اور آسمان سے نون کو حذف کر دیں تو جوا اور آسما بچتے ہیں جو مہمل کلمات ہیں وہ
اور وصل میں اس طرح امتیاز کرنے کی وجہ سے وہی الفاظ ہم قافیہ ہو سکتے ہیں جو م
ر (DERIVATIVES) ہیں اور جوانی، آسمانی اور خاندانی کے قافیے پانی اور "کہا
اسمائے جامد نہیں آسکتے کیونکہ پانی اور کہانی میں ی روی ہے اور جوانی اور آسمانی
حرف روی اور ی حرف وصل ہے ۔ قافیے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اختلاف روی
بن ہی نہیں سکتا چنانچہ علم القوافی کی بنائی ہوئی تعریف کے مطابق جوانی کا قافیہ "پانی"
ٹھہرتا ہے ظاہر ہے کہ یہ منطقی نتیجہ مضحکہ خیز ہے کیونکہ ادب کا ایک عام قاری بھی یہ
کہ جوانی کا قافیہ پانی صوتی اعتبار سے بالکل درست ہے ۔ ہمارے اساتذہ نے یہ
کی پابندی نہیں کی ہے ۔ غالب کا مشہور مطلع ہے

کب وہ سنتا ہے کہانی میری   اور پھر وہ بھی زبانی میری

(علم القوافی کی رو سے کہانی میں ی حرف روی ہے اور زبانی میں ی حرف وصل)
میر نے بھی خستہ جانی اور مہربانی کے قوافی زندگانی، پانی اور کہانی باندھے ہیں

تشنہ لب مر گئے ترے عاشق ۔ نہ ملی ایک بوند پانی کی
جس نے کھوئی تھی نیند میر کی کل ۔ ابتدا پھر وہی کہانی کی

غالب نے ایک غزل میں جس کے قوافی تماشائی، بینائی وغیرہ ہیں "کائی" کا قافیہ بھی باند

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی ۔ بن گیا سطح آب پر کائی

اقبال نے خدائی اور جدائی کا قافیہ "رائی" باندھا ہے۔

ہر چیز ہے محو خود نمائی   ہر ذرہ شہید کبریائی
رائی زور خودی سے پربت   پربت ضعف خودی سے رائی

ایک اور نظم میں جس میں خدائی اور آشنائی جیسے قوافی ہیں اقبال طارق کی زبانی کہتے ہیں

دو نیم اس کی ٹھوکر سے صحرا و دریا ۔ سمٹ کر پہاڑ اس کی ہیبت سے رائی

اقبال کی ایک غزل کا مطلع ہے

ہر شے مسافر، ہر چیز راہی ۔ کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی

جبکہ راہی میں ی حرف وصل ہے اور ماہی میں حرف اصل یعنی روی ہے۔
حالی نے بھی "آیا" کا قافیہ سایہ باندھا ہے۔

تمدّن کا اس پر پڑا تھا نہ سایہ - ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا

اسی طرح مسدس کے ایک بند میں جہاں " بنایا " " دکھایا " اور " چھایا " جیسے افعال بطور قافیہ استعمال کیے ہیں وہیں اسم " کایا " بھی استعمال کیا ہے جیسے

عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا

یہ قوافی صوتی اعتبار سے بالکل درست ہیں - دراصل ساری الجھن روی کو ایک حرف یعنی "مفرد" سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے - روی کو حرف واحد سمجھنے کی وجہ سے ایسے حروف قافیہ کا تصور بھی لازم آتا ہے جو "روی" کے بعد آتے ہیں پھر ایک ایک نام نہاد حرف قافیہ کو علاحدہ علاحدہ اصطلاحی نام دینے کی وجہ سے علم القوافی خواہ مخواہ گرانبار ہو جاتا ہے - اگر ہم روی کو مفرد کے علاوہ مرکب بھی سمجھیں اور وصل، خروج، مزید اور نائرہ کو اسی کا حصہ قرار دیں تو قافیے کی ماہیت سمجھنے میں بڑی آسانی ہوگی۔

حرف روی کی خصوصیت یہ ہے کہ قافیہ میں وہ ایک ایسا مستقل حرف ہے جو تکرار کے ساتھ آتا ہے - اسی طرح روی کے بعد بھی جو حروف آتے ہیں اور جنھیں حروفِ قافیہ قرار دیا گیا ہے وہ بھی روی کی طرح تکرار کے ساتھ آتے ہیں مثلاً ذیل کے قوافی ملاحظہ ہوں۔

کرتے، ڈرتے، مرتے، کریں گے، مریں گے

اِن قوافی میں " ر " کو حرف روی قرار دیا جاتا ہے اور " ڈرتے - مرتے " میں " تے " کو وصل اور " یے " کو خروج، اسی طرح " کریں گے " " مریں گے " میں " ی " کو وصل، " نون " کو خروج " گ " کو " مزید " اور " ی " کو نائرہ " سمجھا جاتا ہے - لیکن اگر ہم " ر " " ت " اور " ی " اور " ر " " ی " " نگ " " اور " ے " (ریں گے) کو کلمۂ روی قرار دیں تو مسئلہ آسان ہو جاتا ہے۔

اب سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ کلمۂ روی کی نشاندہی کس طرح کی جائے - یعنی خطِ فاصل کہاں آئے - اس سلسلے میں یہ اصول بنایا جا سکتا ہے کہ جن قوافی کے درمیان حروفِ علت آئیں تو آخری حرفِ علّت پر خطِ فاصل کھینچی جائے اور اس کے بعد جو بھی حروف تکرار کے ساتھ آئیں انھیں کلمۂ روی سمجھا جائے ، مثلاً " جوانی ، کہانی اور آسمانی میں الف کے بعد خطِ فاصل کھینچ کر " ف " اور " ی " (نی) کو کلمۂ روی قرار دیا جائے - اس اصول کا اطلاق آیا ، چھایا ، سایہ اسی طرح دیوانہ ، پروانہ ، آنا شیرازہ ، غازہ ، دروازہ ، مجبوری ، منظوری ، مہجوری ، دینی ، آئینی ، بینی وغیرہ ہم پر بھی ہوتا ہے یعنی دیوانہ ، پروانہ میں " ن + ہ " (نہ) شیرازہ - غازہ میں ز + ہ (زہ) مجبوری ، منظوری میں ر اور ی (ری) اور اسی طرح دینی ، آئینی میں ن اور ی (نی) کو مرکب روی قرار دیا جا سکتا ہے - اور قافیے کی اس قسم کو قسمِ چہارم کا نام دیا جا سکتا ہے - یہاں یہ نکتہ ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ قافیے کی قسمِ چہارم میں جب مرکب روی کے آخر میں حرف علت ہو تو اس پر مطابقت ردف کی پابندی اسی طرح لازم ہوگی جس طرح قسمِ اوّل کے قوافی میں حرف صحیح کے مفرد حروف روی ہونے کی صورت میں ہوتی ہے کیونکہ " پانی " کا قافیہ نہ " مینی " ہو سکتا ہے اور نہ

"بیگانہ"، کا قافیہ " دفینہ"، لیکن اگر حرف علت مفرد حرف روی ہو یعنی وہ قافیہ قسم سوم ہو تو اس صورت میں مطابقت توجیہہ وردف کی پابندی ضروری نہیں (جیسے مرا۔ گری، پڑی، چبھی) وغیرہ میں)

یہ شاعر کے اختیار میں ہے کہ وہ مجبوری کا قافیہ دی "کی" "ی" استعمال کرے (قسم سوم کا قافیہ) یا منظوری "مجبوری" یعنی قسم چہارم کا قافیہ) وغیرہ، اگر وہ بالالتزام کا قافیہ "منظوری"، "دوری"، وغیرہ باندھے تو ایسی صورت میں "ر+ی" (ری) کو روی سمجھا جائے، اسی طرح تجاہل اور تغافل کا قافیہ بالالتزام ہو تو (پیش+ل) (ل) (ف پیش+ا) کو مرکب روی سمجھا جائے، اگر شاعر مجبوری، کا قافیہ کی (سنی یا تجاہل کا قافیہ گل، جُل و) استعمال کرے تو صرف لام کو حرف روی سمجھا جائے اسی پر (۱) کرد، بھرد، ڈ اور (۲) کرو، دو، لو، سنو وغیرہ کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ قافیے کی چار قسمیں ہیں اور حروف قافیہ صرف ہیں (۱) ردف (جس میں توجیہہ شامل ہے) (۲) قید (جو صرف مصمتی خوشوں میں آتا اور (۳) روی مفرد اور مرکب

قافیے کے ساتھ "ردیف" کا بھی استعمال ہوتا ہے، ردیف بھی کی طرح تکرار کے ساتھ آتا ہے کلمہ روی اور ردیف میں فرق یہ ہے کہ کلمہ ر ایک ہی لفظ پر مشتمل ہوتا ہے اور ردیف یا تو ایک لفظ ہوتا ہے یا مختلف الفاظ ہوتا ہے اور قافیے کے بعد آتا ہے، مندرجہ ذیل الفاظ

بھردو، کردو + نصرانیوں نے، یزدانیوں نے

میں بالترتیب "دو" اور "نے" ردیف ہیں۔ بعض مرتبہ شعرا قافیے کو داخل ردیف بھی کر دیتے ہیں اس کا ذکر عیوب قوافی کے تحت کیا جائے گا۔ کبھی بطور مرکب اضا استعمال کرتے ہیں جیسے غالب کی اس غزل میں جس کا مطلع ہے

آمد خط سے ہوا ہے سرد جو بازار دوست　　دود شمع کشتہ تھا شاید یہ خط رخسار دوست

عیوب قافیہ

پہلے تو ہم ان نام نہاد عیوب قافیہ کا ذکر کریں گے جو اصل میں عیوب ہیں ہی نہ یا پھر جنھیں ہمارے شعرا نے بطور "حسن" قافیہ استعمال کیا ہے۔

(۱) اکفا: اگر حرف روی مشترک ہونے کی جگہ قریب المخرج ہو قافیہ کے اس نقص کہا جاتا ہے مثلاً جمعرات کا قافیہ مراد (دکنی میں فقرہ جمعرات۔ بھری مراد کی صدا لگ ہیں) اہل ایران اعتماد کا قافیہ "ثبات" اور 'اسپ' کا قافیہ 'کسب' روا رکھتے تھے سعدی کہتے ہیں

کساں را دِرَم داد و تشریف و اسپ　　طبیعی است اخلاق نیکو نہ کسب

لیکن اہل اردو ایسے قریب المخرج، قوافی استعمال ہی نہیں کرتے آگے چل کر اگر ہمار

ـــس کی ہمت بھی کریں تو میرے خیال میں یہ کوئی عیب نہیں ہوگا۔

البتہ اکفا کے تحت ایک اور عیب کا ذکر کیا جاتا ہے۔ عربی صوتیات کی رو سے ت اور /ط/ ـ /ث/ /ص/ اور /س/ ـ الف اور عین ذ، ز، ض اور ظ اور /ہ/ اور /ح/ ـ قریب المخرج ہیں اس لیے اہلِ عرب کے لیے یہ الگ الگ حروف بھی ہیں اور الگ الگ صوتیے بھی اس کی بنا پر عربی میں نشاط کا قافیہ حیات، تخصیص کا مقابلیس نیاز کا شاذ وغیرہ اکفا کے تحت آتا ہے لیکن اردو میں صوتی اعتبار سے ذ، ز، ض اور ظ میں اسی طرح ث، ص اور س یا ت اور ط اور ہ اور ح میں کوئی فرق نہیں اگرچہ حروف میں اختلاف ہے یعنی وہ حرفیے ہیں [illegible] اس لیے حیات کا قافیہ نشاط باندھنے میں کوئی عیب نہیں ہونا چاہیے ہمارے روشن خیال نقاد پنڈت کیفی، اکفا کو عیب سمجھنے کے حق میں نہیں تھے، اردو میں تو ساتھ کا قافیہ حیات، کچھ کا قافیہ بیج اجیسے بیچ پنچ میں، بے تکلفی سے استعمال ہونے لگا ہے اس لیے اردو شاعری میں "اکفا" کوئی عیب نہیں

(۲) اِقوا۔ ردف، حذو قید اور توجیہہ کے اختلاف کو "اِقوا" کہتے ہیں آپ کو بتایا جا چکا ہے کہ ردف و توجیہہ اور حذوِ قید کی مطابقت قافیے کی لازمی شرط ہے یعنی اگر ان میں اختلاف ہو تو قافیہ بنتا ہی نہیں یعنی نور، کا قافیہ طوَر بوُ کا رَد اور غیر کا تیر یا چست کا پسَت قافیہ ہو ہی نہیں سکتا لیکن چونکہ بعض شعرا اس کا ارتکاب کر جاتے ہیں اس لیے اس کا ذکر بطور عیب کر دیا گیا ہے مثلاً میرحسن کہہ گئے ہیں

محبت نے بہ چاشنی اور دی　　کہ میرے تیس جیتے جی گور دی

دُر اور گور میں اختلاف ردف ہے ـ فارسی کے ایک شاعر نے طوسی کا قافیہ فردوسی باندھا ہے

ہر وزیرو مفتی و شاعر کہ آں طوسی بود　　چوں نظام الملک و غزالی و فردوسی بود

طوسی اور فردوسی میں اختلاف ردف کی وجہ سے "اِقوا" کا عیب پیدا ہو گیا ہے

اختلاف حذوِ قید کی مثال: وِرد ـ دَرد دشت ـ خِشت

اختلاف توجیہہ کی مثال: منتشِر، اثر

(۳) ـ اگر حرف ردف (مراد حرف علت) میں اختلاف ہو تو اسے "سناد" کہتے ہیں ـ ظاہر ہے کہ اگر روی سے قبل حرف علت میں مطابقت نہ ہو تو قافیہ بن ہی نہیں سکتا یعنی سعود کا قافیہ سعید یا عماد کا عمود اردو میں ناقابل تسلیم ہے لیکن اہل عرب نے اسے جائز رکھا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے قدیم شعرا نے واوِ معروف و واوِ مجہول اور یائے معروف و یائے مجہول کے اختلاف کو جائز رکھا تھا مثلاً غالب کی ایک غزل کا مطلع ہے

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو　　کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیوں کر ہو

اسی غزل میں ہو، دو، وو (وہ) کے قوافی بھی استعمال ہوئے ہیں اور خو، کا قافیہ [illegible] ذیل شعر میں آیا ہے

تمھیں کہو کہ گزر اصنم پرستوں کا　　بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو

غالب ہی کی ایک غزل کا مطلع ہے

عشق تاثیر سے نومید نہیں　　جاں سپاری شجر بید نہیں

اگر لفظ' نومید' میں یائے مجہول فرض بھی کر لیا جائے اور بید کے قافیے کو درست سمجھا جائے تو بھی اسی غزل میں جمشید جاوید اور امید کے قوافی بھی آئے ہیں۔ مان لیا کہ جمشید اور جاوید میں بعض حضرات یائے مجہول کا استعمال کرتے ہیں لیکن اُمید کے بارے میں یہ امید نہیں کی جاسکتی۔ اسی غزل میں غالب نے "بھید" کا قافیہ بھی باندھا ہے جس میں بالاتفاق یائے مجہول ہے

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے　　ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

میرحسن کہتے ہیں

عجب کیا ہے اس کا جو سایہ نہ ہو　　کہ تھا وہ گُلِ قدرتِ حق کی بو (سحرالبیان)

سودا نے ایک قطعہ کہا ہے جس کے قوافی سرور، حضور وغیرہ ہیں اسی قطعے میں مور اور زور کے قافیے بھی استعمال کیے ہیں۔

ذوق کہتے ہیں۔

گر لکھوں مضمون اپنے نالۂ پرشور کا　　لوں صریرِ خامہ سے میں کام بانگِ صور کا

بہرحال موجودہ دور میں اس طرح کے قوافی کا چلن نہیں اور وہ بالاجماع معیوب ہیں

(۴) ایطا اسے فارسی میں شائیگاں بھی کہتے ہیں

لفظ "ایطا" جس قدر عام ہے اسی قدر اس کے متعلق غلط فہمیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے (دروغ برگردنِ راوی) مخدوم محی الدین نے اورنگ آباد کے ایک مشاعرے میں کوئی شعر پڑھا جس میں ایطا تھا تو سامعین میں سے کسی نے ٹوکا کہ صاحب اس شعر میں ایطا ہے۔ مخدوم صاحب سمجھے کہ یہ بھی شعر کی کوئی خوبی ہوگی اور انھوں نے جواباً آداب عرض کہا۔ واللہ اعلم۔

ایک ہی لفظ یا جزوِ لفظ کو قافیے کے طور پر لفظاً اور معناً دُہرائے جانے کو ایطا کہتے ہیں۔ مثلاً خواجہ میر درد کے اس مشہور شعر میں "ایطا" ہے

مدرسہ یا دَیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا　　ہم سبھی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا

اس مطلع میں بت خانہ اور صاحب خانہ میں لفظ "خانہ" دہرایا گیا ہے جس کے معنی ہیں گھر۔ اگر بت خانہ اور صاحب خانہ سے لفظ خانہ کو الگ کردیں تو الفاظ "بت" اور "صاحب" بچتے ہیں جو آپس میں ہم قافیہ نہیں۔ مولانا عبدالرؤف عشرت لکھنوی "شاعری کی تیسری کتاب" میں صفحہ ۴۳ پر لکھتے ہیں "ایطا کی قید صرف مطلع کے لیے ہے ابیات میں ایطا ہو تو شعرائے ار دو نے جائز رکھا ہے"۔ اگر اس قول کو تسلیم کر لیا جائے تو غالب کی ایک غزل میں جس میں مطلع ندارد ہے کوئی تین بار لفظ "خانہ" استعمال ہوا

ہے پھر بھی اسے ایطا نہیں کہا جائے گا۔ اور میر درد کا شعر اس لیے اعتراض کی زد میں آجائے گا کہ یہ عیب مطلع میں ہے۔ غالب کہتے ہیں

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس — برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم
محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال — ہیں ورق گردانیٔ نیرنگ یک بت خانہ ہم
دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ — جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم

ان اشعار میں ماتم خانہ، بت خانہ اور زنداں خانہ سبھی میں "خانہ" گھر کے معنوں میں استعمال ہوا ہے غالب نے ایک خط میں بھی لکھا ہے کہ اگر مطلع میں ہو تو "ایطائے جلی" ہے ورنہ ایطائے خفی۔ اقبال کی ایک غزل میں جس کا مطلع ہے

ضمیر لالہ مئے لعل سے ہوا لبریز — اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز

مندرجہ ذیل اشعار یکے بعد دیگرے آتے ہیں جن میں "خیز" (خاستن کا امر) کی تکرار ہے

پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ — جہاں وہ چاہیے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز
کسے خبر ہے کہ ہنگامۂ نشور ہے کیا — تری نگاہ کی گردش ہے میری رستاخیز

بعض حضرات اقبال کے ترانۂ ہندی کے اس مطلع میں بھی ایطا کا عیب بتاتے ہیں

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

ان کا اعتراض یہ ہے کہ ہندوستاں اور گلستاں میں "ستاں" (لاحقہ بمعنی جگہ) کی تکرار آئی ہے لیکن یہ اعتراض اس لیے درست نہیں کہ لفظ ہندوستاں بطور "اسم علم" استعمال ہوا ہے اور اس لفظ میں "ستاں" جگہ کے معنی میں نہیں استعمال ہوا ہے۔

ایطا کے لیے یہ ضروری ہے کہ قافیے میں لفظ ایک ہی معنی میں تکرار کے ساتھ آئے۔ اگر معنی مختلف ہوں تو اسے ایطا نہیں سمجھا جاتا۔ اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے[1] کہ جب قافیے کی بنیاد صوتیات پر ہے تو پھر اختلاف معنی کی قید کیوں لیکن لفظ صرف آواز نہیں ہوتا وہ کسی نہ کسی معنی کا حامل بھی ہوتا ہے اس لیے قافیے کے ذکر میں معنیات کا آنا ناگزیر ہے۔ اگر ایک ہی لفظ بطور قافیہ مکرر آئے اور دوسرے لفظ کے معنی مختلف ہوں تو اس کا اپنا لطف ہے جسے اہل ذوق ہی جانتے ہیں۔ اسی لیے ایطا کی تعریف میں بجا طور پر لفظاً اور معناً تکرار کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ اگر شاعر قصداً ایک ہی لفظ کو دو مختلف معنوں میں بطور قافیہ استعمال کرے تو اسے ایطا نہیں کہا جاتا۔ فارسی اور اردو کے اساتذہ کے یہاں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں مثلاً انشا کہتے ہیں

آبداری سے جو مملو نظر آتا ہے گلا — رشک کی برف سے کیا جسم صراحی کا گلا
مرصع کا سرپیچ جوں آفتاب (سورج) — مصفیٰ بشکل گلِ آفتاب (ایک قسم کا پھول) پگھلا (امیر حسن)

---

[1] دیکھیے ڈاکٹر مغنی تبسم کا مضمون "قافیہ" (ص ۳۹) - آواز اور آدمی (مجموعہ مضامین)

طرق کے طرق اور پیرے کے پیرے — کچھ ادھر اُدھر کچھ ورے کچھ پرے ,,
کردہ — اُس طرف

کہیں وسعت کہیں ہے تنگ اوقات — عشق کے ہیں گے مختلف اوقات میر — میر
سختی، تکلیف — وقت کی جمع زمانے

میں نے پاس اس کا کیا حد سے زیاد — پر کمی کرتا ہے یہ ابن زیاد — میر
زیادہ — نام ایک ظالم کا

بھیجی ہے مجھ کو شاہ جمجاہ نے دال — ہے لطف و عنایات شہنشاہ پہ دال — غالب
ایک اناج کا نام — دلالت کرنے والی

نہیں حق سے کچھ اس محبت کو بہرا ۔ — کہ جو تم کو اندھا کرے اور بہرا ۔ — حالی
حصہ

کسی بے کس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا — جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا ۔ ذوق
ظالم — اگر

ہے بڑی اچھی مری چھوٹی گھڑی — کرتی رہتی ہے ٹِک ٹِک ہر گھڑی

اسی طرح اگر ایک مصرع کے قافیے کا جزوِ آخر دوسرے مصرع سے صرف صوتی اعتبار سے مماثل ہو لیکن معنی جدا گانہ ہوں تو اس کا بھی شمار ایطا میں نہیں ہوتا۔

جیسے انصاف اور مصاف ، فریاد اور یاد ، معراج اور راج ، اسباب اور باب وغیرہ ہیں کیونکہ ۔ انصاف کے جز " صاف " اور دوسرے لفظ صاف میں صوتی تکرار تو ہے لیکن معنوی مماثلت نہیں اس کی متعدد مثالیں ہمارے اساتذہ اور دیگر شعرا کے کلا میں ملتی ہیں۔

گر خاموشی سے فائدہ اخفائے حال ہے — خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے ۔ غالب
(حال ۔ محال)

ہے بزم بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے — تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے ۔ غالب
(لب ۔ طلب)

نظر کو نہ ہو حسن پر اس کے تاب — اسے دیکھ بے تاب ہو آفتاب — میر حسن
(تاب ۔ آفتاب)

چلے تیغ اس کی جو روز مصاف — نظر آئے دشمن سے میدان صاف ۔ میر حسن
(صاف ۔ مصاف)

وہ سر میں جو اس کے تھے سنبل سے بال — ہوئے لاغری سے بدن کی وبال — میر حسن
(بال ۔ وبال)

عروسی وہ گہنا وہ ستھرا لباس — وہ مہندی سہانی وہ پھولوں کی باس — میر حسن
(باس ۔ لباس)

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم — دشت میں ہے وہ مجھے عیش کہ گھر یاد نہیں ۔ غالب

وائے مظلومی تسلیم و بدا حالِ وفا — جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں، غالب
نسبتِ گل کی طرح بند کرے ہے بلبل — مژدہ اے باغ کہ گلزار میں صیاد نہیں
(یاد، فریاد، صیاد)

درویشِ خداوند نہ مشرقی ہے نہ غربی — گھر میرا نہ دلی، نہ صفاہاں نہ سمرقند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش — میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
(قند - سمرقند)

ہوا غلغلہ نیکیوں کا بدوں میں — لگی خاک سی اڑنے سب معبدوں میں   حالی
(بد - معبد)

شوق کو جرم سے بری نہ کیا — تم نے کچھ پاسِ دلبری نہ کیا، حسرتِ موہانی
(بری - دلبری)

البتہ قوافی میں مندرجۂ ذیل لاحقوں کی تکرار ایطائے جلی کے ذیل میں آتی ہے۔ کیونکہ ان میں لفظاً اور معناً تکرار ہے

(۱) تر — بہتر، نکوتر، خوشتر، روشن تر
(۲) گر — فسوں گر، ستم گر، جادوگر
(۳) زار — گلزار، سبزہ زار، لالہ زار
(۴) سار — کہسار، شاخسار،
(۵) ستاں — گلستاں، بوستاں، شبستاں
(۶) گاہ — درگاہ، چراگاہ، شکارگاہ، عیدگاہ، کارگاہ
(۷) بان — دربان، باغبان، نگہبان، مہربان
(۸) دان — گلدان، روشندان، آتش دان
(۹) ور — جانور، سخنور،
(۱۰) وار — امّیدوار، بزرگوار، ہفتہ وار

یہ تو لاحقے ہوئے لیکن اردو میں فارسی سے مستعار ایسے صدہا مرکبات مستعمل ہیں جن کا جزو ثانی کسی نہ کسی فعل کا امر ہے اور جو صفت "ظرف مکاں" یا "اسم فاعل" کے طور پر اردو میں مستعمل ہیں مثلاً بت خانہ، صنم خانہ - ہم نشیں - دلنشیں، دیندار، دلدار وغیرہ ایسے تمام مرکبات میں سے اگر کسی مرکب کو ہم قافیہ بنایا گیا تو اس میں ایطا کا عیب سمجھا جائے گا۔ مطلع میں اس سے مطلق پرہیز کیا جاتے۔ اور دوسرے اشعار میں حتی الامکان بچا جائے لیکن یہ بھی خیال رہے کہ قافیے کی وجہ سے شعر کا حسن مجروح ہوتا ہو تو شعر کا حسن برباد نہ کیجیے چاہے اس کی وجہ سے قافیے میں ایطا کا عیب کیوں نہ آجائے۔

علم القوافی میں ایطا کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں ایطائے جلی اور ایطائے خفی۔
ایطائے جلی وہ ہے جو بادی النظر میں بھی کھل کر سامنے آتا ہے بالخصوص مطلع یا مثنوی کے شعر میں

لیکن کچھ الفاظ ایسے بھی ہیں جن میں لاحقے واضح طور پر نظر نہیں آتے۔ ان کا قواعدی تجزیہ کرنے کے بعد لفظاً و معناً تکرار کا عیب کھلتا ہے، ایسی صورت میں اس عیب کو ایطائے خفی کہتے ہیں۔

جیسے دانا کا قافیہ بینا۔ دونوں اسم فاعل ہیں ــــ (علامت حالیہ)

گریاں کا قافیہ رواں۔ دونوں اسم حالیہ ہیں دونوں میں "آں" اسم حالیہ کی علامت ہے۔

مرداں کا قافیہ مرسلاں۔ دونوں میں "آں" علامت جمع ہے۔

رنگیں کا قافیہ چوبیں دونوں میں "یں" صفت کا لاحقہ ہے۔

اگر کوئی شاعر انھیں ہم قافیہ بناتے تو علم القوافی کا فتوا ہو گا کہ ان قوافی میں "ایطائے خفی ہے" لیکن دراصل ایطائے خفی کوئی عیب نہیں اسے ایطا کے ذیل میں لانا ہی مرجح زیادتی ہے۔ اقبال نے مینن (خدا کے حضور میں) نامی نظم میں آیات، نظریات، مکافات، عمارات جیسے کئی قوافی بے تکلفی سے استعمال کیے ہیں جن میں "ات" علامت جمع کے طور پر آئی ہے۔ اگر ایسے قوافی پر ایطائے خفی کا عیب لگائیں تو منطقی شعر کہنا دشوار ہو جائے گا اور شاعر پر خواہ مخواہ کی پابندی عائد ہوگی۔ اس لیے غالب کے اس اصول کو رہنما بنانے ہی میں سہولت ہے کہ اگر ایطا مطلع میں ہو تو ایطائے جلی ورنہ ایطائے خفی ہے اسی طرح علم القوافی جسے ایطائے خفی کہتا ہے اسے عیب نہ سمجھا جائے۔

اب دو نام نہاد عیوب قافیہ ایسے رہ جاتے ہیں جنھیں اردو شعرا نے عیب میں نہیں بلکہ حسن میں شمار کیا ہے۔

(۱) غلو۔ اگر حرف روی ایک مصرع میں ساکن اور دوسرے میں متحرک ہو تو اسے "غلو" کہتے ہیں مثلاً مومن کی ایک غزل ہے جس کے قوافی قرار، یار اور بہار ہیں اور ردیف "آجائے" ہے یعنی قرار آجائے، بہار آجائے اسی غزل کا مقطع ہے

حسن انجام کا مومن مرے بارے ہے خیال ۔ یعنی کہتا ہے وہ کافر کہ تو مارا جائے

یعنی مار+ آجائے کی جگہ مارا جائے پڑھنا پڑتا ہے۔ لیکن وزن کی قرأت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شعر میں "قرارا جائے" "بہارا جائے" ہی پڑھا جائے اس لیے یہ عیب نہیں رہتا بلکہ قاری کے ذہن کو خوشگوار جھٹکا دیتا ہے

(۲) معمولہ۔ قافیے کے اس عیب کو کہتے ہیں جس میں بذات خود بننے کی صلاحیت نہ ہو لیکن جو ردیف میں شامل ہو کر قافیہ بنے۔ غالب کی ایک غزل میں جس کے قوافی دوا، ہرا وغیرہ ہے اور ردیف نہ ہوا ہے۔ اسی غزل میں یہ شعر بھی ہے

رہزنی ہے کہ دلستانی ہے ۔ لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

غالب ہی کی ایک غزل کا مطلع ہے

غم دنیا سے گر فرصت ملی بھی سر اٹھانے کی ۔ فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

اس غزل کے قوافی آنے، جانے، بہانے وغیرہ ہے اس کا اور ردیف کی "نی" کا مقطع ہے

کہوں کیا خوبیٔ اوضاعِ ابنائے جہاں غالب　　بدی کی اس نے جس سے کی تھی ہم نے بارہا نیکی

کبھی کبھی مطلع میں ایک مصرع میں سالم قافیہ ہوتا ہے لیکن دوسرے مصرعے میں جزوِ ردیف ہوتا ہے

لپٹ جاتے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے　　الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے　　داغ

گئی یاروں سے وہ اگلی ملاقاتوں کی سب رسمیں　　پڑا جس دن سے دل بس میں ترے اور دل کے بس میں ہم

مسدس کے ایک بند کے ابتدائی تین مصرعوں میں میر انیس نے جھجک لٹک اور لپک قوافی کے ساتھ "کر" ردیف استعمال کی ہے یعنی جھجک کر، لٹک کر اور لپک کر لیکن چوتھے مصرعے کا قافیہ "چکر" باندھا ہے جو

سر سے ہوا اونچا تو دیا گھوڑے نے چکر

اسی طرح حالی مسدس کے ایک بند میں کہتے ہیں

زمانے نے گو ان کی برکت اٹھا لی　　نہیں کوئی ویرانہ پیران سے خالی

چونکہ قاری یا سامع کا ذہن ردیف پر مرکوز ہوتا ہے اس لیے جب وہ غیر متوقع طور پر ردیف کو قافیے کی شکل میں پاتا ہے تو اسے ایک طرح کا حظ حاصل ہوتا ہے اس لیے ہمارے اساتذہ نے بجا طور پر "معمولہ" کو داخلِ حسن سمجھا ہے داخلِ عیب نہیں

حسنِ قافیہ :-

اب تک عیوبِ قافیہ سے بحث تھی اب محاسن قافیہ پر بھی ایک نظر ڈالیں

(۱) یہ شاعر کے اختیار میں ہے کہ وہ اپنے اظہار جذبات و خیالات کے لیے مرکب روی استعمال کرے یا مفرد روی۔ مثلاً اگر شاعر مفرد روی استعمال کرے تو ہَوا کا قافیہ اَدا، سُنا، دِکھا وغیرہ استعمال کر سکتا ہے۔ یہ ہمارے لحاظ سے قسم سوم کا قافیہ ہوگا لیکن اگر وہ چاہے تو ہَوا کے قافیے بالالتزام رَوا، نَوا دَوا وغیرہ بھی استعمال کر سکتا ہے۔ ایسی ہی صورت میں "وَا" مرکب روی ہوگا اور اسے قافیے کا حسن سمجھا جائے گا۔ اسی طرح چہرہ کا قافیہ دیکھا اور آیا بھی ہو سکتے ہیں اور سہرہ، مہرا، گہرا اور بہرا بھی۔ اگر چہرہ کا قافیہ آیا، دیکھا وغیرہ ہوں تو اس میں الف کو مفرد روی قرار دیا جائے گا اور یہ قسم سوم کا قافیہ ہوگا، اس صورت میں ردف کی مطابقت لازمی نہیں ہو گی لیکن اگر وہ بالالتزام پہرا، گہرا اور بہرا جیسے قوافی استعمال کرے تو ایسی صورت میں ہ، رے اور الف ہرا کو مرکب روی قرار دیا جائے گا یعنی یہ قسم چہارم کا قافیہ ہوگا جس میں توجیہ (یا ردف) کی مطابقت لازمی ہے یعنی گہرا کا قافیہ مہرہ یا کہرا نہیں ہوگا۔ قسم چہارم کے قوافی قسم سوم کے قوافی سے صوتی اعتبار سے بہتر ہیں لیکن قسم سوم کے قوافی میں ردف یا توجیہ کی چھوٹ ہے۔

کسی غزل میں حرف روی کو مفرد یا مرکب قرار دینے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ شاعر نے قسم سوم کے ساتھ قسم چہارم کے قافیے بھی استعمال کیے ہیں یا صرف قسم چہارم کے قافیے

استعمال کیے ہیں، اگر غزل میں قسم سوم و چہارم کے قوافی استعمال ہوتے ہوں تو روی کو مفرد قرار دینا ہوگا ورنہ مرکب، کبھی کبھی شاعر کے ارادے کے بغیر بھی مطلع میں مرکب روی کا استعمال ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر اس نے غزل کے دوسرے اشعار میں قسم سوم کے قافیے بھی استعمال کیے ہیں تو ہمیں اس غزل میں روی کو مفرد ہی قرار دینا ہوگا۔ مثلاً غالب کی ایک غزل کا مطلع ہے

دلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے آخر اس درد کی دَوا کیا ہے

اگر ہم صرف اس مطلع کے قوافی کو سامنے رکھ کر "وا" کو مرکب روی قرار دیں تو اس پر اختلاف توجیہہ کا اعتراض وارد ہوگا کیوں کہ ہُوا کی ہ پر پیش اور دَوا کی دال پر زبر ہے یہ قسم چہارم کا قافیہ ہوگا جس میں مطابقت توجیہہ یا ردف لازم ہے۔ لیکن جب اسی غزل کے دوسرے اشعار پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ شاعر نے "وا" کو نہیں بلکہ صرف الف کو روی بنایا ہے مثلاً

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

وغیرہ، اس کا مطلب یہ ہے شاعر نے مفرد روی الف کا استعمال کر کے قسم سوم کے قوافی استعمال کیے ہیں جس میں توجیہہ و ردف کی مطابقت ضروری نہیں چونکہ ہُوا اور دَوا میں شاعر نے مفرد روی الف کا استعمال کیا ہے اس لیے واؤ کی تکرار کو اتفاقی قرار دے کر، ان قوافی پر اختلاف توجیہہ کا اعتراض وارد نہیں ہوگا۔ البتہ مثنوی میں، مفرد اور مرکب روی کا تعین ایک شعر کی بنیاد پر ہو سکتا ہے۔

بہر حال اگر شاعر نے کلی کے ساتھ ولی، جلی، گلی جیسے قوافی استعمال کیے ہوں تو ان قوافی کا شمار حسن میں ہوگا (ایسی صورت میں مطابقت توجیہہ کی پابندی لازمی ہوگی) لیکن اگر شاعر نے کلی کا قافیہ پی، سی، کمی، ملی استعمال کیے ہیں تو یہ عام قافیے ہوں گے اور ان میں مفرد روی /ی/ کا استعمال قرار دیا جائے گا یعنی یہ قسم سوم کے قافیے ہوں گے اور ان پر مطابقت توجیہہ کی پابندی لازمی نہیں ہوگی یعنی کلی کا قافیہ جہاں مِٹی سُنی وغیرہ ہوگا وہیں مِلی اور کُھلی بھی ہو سکتا ہے ایسی صورت میں یعنی گلی، مِلی، کُھلی، میں لام کو جزو روی نہیں سمجھا جائے گا بلکہ ان کا اشتراک بلا ارادہ قرار دیا جاتے گا یا لا ارادہ نہیں

عام قافیے (قسم سوم کے قوافی) کی مثالیں

سبھوں نے لیا پت لبوں پر اٹھا زمین پر نہ سایے کو گرنے دیا
ہوئی فرض ان کی ہمیں دوستی کہ ہیں دل سے وہ جاں نثارِ نبی

حسین قافیے (قسم چہارم کے قوافی) کی کچھ مثالیں

چمن آتش گل سے دہکا ہوا ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا
دیارِ محبت میں مہنگی تھی وہ نہ تھی بین، عشرت کی بہنگی تھی وہ
زبس شعر کہتے ہیں وہ فارسی ہر اک شعر ان کا ہے جوں آرسی

نہانے میں تھی یوں بدن کی دمک　　　　برستے ہیں بجلی کی جیسے چمک

ائل، تجاہل، یا ساحل شامل وغیرہ کے قافیے کسی غزل میں بالالتزام آئیں تو ان کا شمار بھی
سن قافیہ میں ہوگا۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

کتاب	موضوع	مصنف	قیمت
انداز گفتگو کیا ہے۔	(تنقیدی مضامین)	شمس الرحمن فاروقی	۷۵/=
اسرار خودی (فراموش شدہ اڈیشن)	(اقبال) (شعری مجموعہ)	مرتبہ: شائستہ خان	۷۵/
حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدن	(تاریخ)	مالک رام	۷۵/
جام جہاں نما۔ اردو صحافت کی ابتدا	(اردو صحافت)	گر بچن چندن	۷۵/
مسلمانوں کا تعلیمی نظام	(علمی)	ضیاء الحسن فاروقی	۴۵/
اردو ناول میں عورت کا تصور	(تحقیق)	فہمیدہ کبیر	۴۵/
نوٹوں کی تلاش	(ناول)	ایاز سیوہاروی	۴۰/
تاثر نہ کہ تنقید	(تنقید)	صدیق الرحمٰن قدوائی	۵۱/
اپنے دل کی حفاظت کیجیے	((ایلوپیتھی))	ترجمہ نذیر الدین مینائی	۲۵/
یہ صورت گر کچھ خوابوں کے	(انٹرویوز)	طاہر مسعود	۶۶/
مرضیات	(طب)	حکیم نعیم الدین زبیری	۵۱/
بانگ درا	(شعری مجموعہ، طلبہ ایڈیشن)	اقبال	۹/
بال جبریل	(شعری مجموعہ) 〃	〃	۶/
ضرب کلیم مع ارمغان حجاز (اردو نظمیں)	(شعری مجموعہ) 〃	〃	۶/
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی	(ناول)	کشمیری لال ذاکر	۴۸/
گوشے میں قفس کے	(طنزیہ مزاحیہ)	دلیپ سنگھ	۴۵/
سحر کے پہلے اور بعد	(جگ بیتی)	سعید الظفر چغتائی	۵۱/
افکار اقبال	(اقبالیات)	محمد عبدالسلام خاں	۱۲۵/
فرمان فتح پوری	(شخصیت اور ادبی خدمات)	مرتبہ خلیق انجم	۲۵/
تذکرہ ماہ و سال	(تذکرہ)	مالک رام	۱۲۵/
تحقیق نامہ	(تحقیق)	مشفق خواجہ	۱۲۵/
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان	(مذہب)	حکیم محمود احمد برکاتی	۴۵/
خواب اور خلش	(شعری مجموعہ)	آل احمد سرور	۶۶/
سفر	(ناول)	رابعہ تبسم	۲۷/
تحریریں	(تنقید)	ڈاکٹر اسلم پرویز	۵۱/
پہچان اور پرکھ	(تنقید)	پروفیسر آل احمد سرور	۵۱/
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	(تحقیق)	ڈاکٹر سلامت اللہ	۵۱/
پت جھڑ کی آواز (نیا اڈیشن)	(افسانے)	قرۃ العین حیدر	۷۵/
اقبال کا نظریہ خودی	(تحقیق)	عبدالمغنی	۱۵۰/
سمندری خزانہ	(ناول)	ماریہ رحمان	۲۷/
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	(تنقید)	وارث علوی	۳۶/
فی الحقیقت	(طنز و مزاح)	یوسف ناظم	۴۵/
مٹی سے ہیرا	(ناولٹ)	سید مقبول احمد	۱۰/
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	(ناولٹ)	صغرا مہدی	۲۴/
الجھاوے	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف	۵۱/
غبار منزل	(شعری مجموعہ)	غلام ربانی تاباں	۴۵/

نعمان شوق
بلکی محلہ، آرہ

جاگ رہی ہوں یا سوئی آنکھوں نے تیرا نام لیا
صبح ہوئی یا شام ہوئی چڑیوں نے تیرا نام لیا

پھول کھلے ویرانے میں جب تیری یاد آئی
خوشبو پھیلی جب ہونٹوں نے تیرا نام لیا

موج طرب آئے تو تیرا شکر ادا کر لیتے ہیں
آنکھیں چھلکیں تو اشکوں نے تیرا نام لیا

دریا ٹھہرا جب دریا کو تیرا حکم ملا
پانی برسا جب کھیتوں نے تیرا نام لیا

میں نے باغ سے اک دن پوچھا کس کی خاطر سجتے ہو
لب کھولے جب تو غنچوں نے تیرا نام لیا

چندا نکلا تو تاروں سے تیری باتیں کیں
سورج ڈوبا تو لوگوں نے تیرا نام لیا

کوئی رُت ہو تیرے ہی تو حکم سے آتی جاتی ہے
تیز ہوا میں بھی پتوں نے تیرا نام لیا

علقمہ شبلی
۸۹/۵- رپن اسٹریٹ
کلکتہ ۱۶

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

پروفیسر نورالحسن کی وفات پر

سرگرانی سی سرگرانی ہے
اشک ریزی ہے خوں فشانی ہے
ہیں سیہ پوش دانش و حکمت
زرد رنگ رخِ معانی ہے
چشمِ تاریخ بھی ہوئی بے آب
اے اجل! تیری مہربانی ہے
خاک بر سر ہے مشرقی تہذیب
غم کی تصویر زندگانی ہے
ڈھونڈتی ہے نظر نظر اس کو
بزم میں جس کی نوحہ خوانی ہے
اب فسانہ ہوئے خلوص و وفا
وضع داری بھی اک کہانی ہے
ہے مقدر جنوں کا تشنہ لبی
عقل کے لب پہ پانی پانی ہے
غم ہے ایسا کہ سرنگوں ہے قلم
اب کہاں اس میں بھی روانی ہے
ہائے نورالحسن ہوئے رخصت
لاکھ ڈھونڈو نہ ان کا ثانی ہے
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا
ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

کرامت بخاری
۲۷۰۔ اے۔ فیصل ٹاؤن
جی او آر V لاہور
پاکستان

منور رانا
۱۲۔ یولائی اسٹریٹ
کلکتہ۔ ۷۳

کوئی صورت بہم نہیں ہوتی
تشنگی ہے کہ کم نہیں ہوتی

کوئی نیچی نظر نہیں کرتا
کوئی دستار خم نہیں ہوتی

فکر فاقوں سے اور بڑھتی ہے
سوچ سوچوں سے کم نہیں ہوتی

زلف و رخسار کی عبادت میں
عجز و دیر و حرم نہیں ہوتی

کون سی ساعتِ حیات ہے جو
وقفِ یاس و الم نہیں ہوتی

اک کہانی ہے زندگانی کی
وہ بھی ہم سے رقم نہیں ہوتی

خون رُلوائے گی یہ جنگل پرستی ایک دن
سب چلے جائیں گے خالی کر کے بستی ایک دن

دینے والے نے طبیعت کیا عجب دی ہے اُسے
ایک دن خلعت بدوشی گھر گرہستی ایک دن

کیسے کیسے لوگ دستاروں کے مالک ہو گئے
بک رہی تھی شہر میں تھوڑی سی سستی ایک دن

چُوستا رہتا ہے رس بھونرا ابھی تک دیکھ لو
پھول نے بھولے سے کی تھی سرپرستی ایک دن

تم کو اے ویرانیو شاید نہیں معلوم ہے
ہم بنائیں گے اسی صحرا کو بستی ایک دن

رہتی دنیا تک رہے گا نام بس اللہ کا
خاک میں مل جائے گی میری بھی ہستی ایک دن

در بہادر موج
ارگ۔ فتح گڑھ

ار حسن کو اس طرح سے گراؤ نہیں
سرشت ہوں میں مجھ کو آزماؤ نہیں

سکو تو خیالات میں بھی آؤ نہیں
و گئی ہے محبت اسے جگاؤ نہیں

بد و بیم کے پھر شعبدے دکھاؤ نہیں
یے بجھے ہوئے یادوں کے پھر جلاؤ نہیں

محات نظر کے فریب کھاؤ نہیں
رات کے فرضی محل بناؤ نہیں

یکھ پاؤ مرے دل کی وسعتیں دیکھو
ی حیات کی کم مائیگی پہ جاؤ نہیں

جو آگ تو محلوں کی سمت آئے گی
ی غریب کا مسکن کبھی جلاؤ نہیں

م قدم پہ پکارا ہے مجھ کو منزل نے
راب منزل دنیا مجھے دکھاؤ نہیں

اسکو تو سجاؤ یہ کار احسن ہے
ی کو ڈوبتے دیکھو تو مسکراؤ نہیں

کہتے ہیں کہ بھلا دیجیے مجھے دل سے
ا کہہ رہا ہوں کہ منظور یہ سمجھاؤ نہیں

ا سر دہری طوفان کا ہوں شکار اے موج
ے تلاطم و گرداب سے ڈراؤ نہیں

شعیب شمس
نیشنل سیمپل سروے۔ ڈیری فارم
پورٹ بلیر۔ انڈمان

احساس کون سا ہے بھلا دل انا کے بیچ
ہر آن کھینچتا ہے جزا و سزا کے بیچ

خوشبو کی شاخ پر ہو بسیرا تمام عمر
اب اور کیا کہوں میں بتا اس دعا کے بیچ

پلکوں پہ خوابناک تصور کرے گا رقص
ہیں محوِ انتظار رہا ہر ادا کے بیچ

سرمایہ حیات نہیں یاد وہ کبھی
جو آئے ابتدا سے رہے انتہا کے بیچ

کچھ اور شوخ ہوں گی تمہاری ہتھیلیاں
تم میری یاد بھی رکھو رنگِ حنا کے بیچ

کیا پھر کوئی غریب بنے گا شعیب شمس
یہ ایک مسئلہ ہے جفا و وفا کے بیچ

ڈاکٹر شاہد میر،
سرونج۔

غزل

جب ہمارا غم، بیان ہو گیا!
لفظ لفظ داستان ہو گیا

پیرہن میں خوشبوئیں بسی ہوں
ایک پھول مہربان ہو گیا

ایک ایک کر کے تارے جل اُٹھے
آسمان آسمان ہو گیا

حرف حرف سارے بھید کھل گئے
چپ کا فلسفہ بیان ہو گیا

میری سمت وہ بڑھا جو دھوپ سا
میں بھی برق کی چٹان ہو گیا

تیرگی کے سلسلے سمٹ گئے
اک دیا جو مہربان ہو گیا

انجم عرفانی،
شعبہ اردو۔ ایم، ایل۔ کے (پی، جی) کالج
بلرام پور، یو۔ پی

ہوائے گرم کہتی ہے پھر آفت آنے والی ہے
دیارِ گل میں اک تازہ قیامت آنے والی ہے

ہیں پھر ظلمت پرستوں میں نئے شب خون کے منصو
پھر اہلِ امن کے سر تک شہادت آنے والی ہے

کمانیں تن گئی ہیں تیر ترکش سے نکل آ
تلاشِ رزق کے طائر کی شامت آنے والی ہے

چراغوں کی جو بستی ہے یہ وادی ہے جو پھولوں ک
سکونت کے لیے ان میں ہلاکت آنے والی ہے

نہ ہو انصاف و آئین و عدالت کی جہاں حرمت
وہاں تو رقص میں پھر بربریت آنے والی ہے

کریں بھی سینہ چاکانِ چمن فکرِ رفو کیوں
ہرے زخموں پہ ہی تازہ جراحت آنے والی ہے

جنھیں پچھلی صفوں میں بیٹھنے پر فخر ہے آ
کہاں ان کے قبیلے سے امامت آنے والی ہے

ق سہسوانی
وان ضلع بدایوں
پی

محسن فیروز آبادی
صدر بازار، مین پوری گیٹ
فیروز آباد یو پی

ہے ساقی کا کرم کچھ میری قسمت تیز ہے
راجامِ دل شرابِ درد سے لبریز ہے

سوکھی پتّیاں ہیں شاخِ گُل کے آس پاس
سکرانے کا نتیجہ کتنا کرب انگیز ہے

دگی سے کتنی اُمید مسرّت تھی مجھے
بن اِس کا اک اک لمحہ قیامت خیز ہے

نہالانِ گلستاں پھر بھی ہیں سینہ سپر
ندھیوں کا گو کہ ہر جھونکا بہت ہی تیز ہے

دوستوں کا ہیں اسی باعث تو ہوں احسان مند
ہر فریب دوستاں میرے لیے مہمیز ہے

کل تک اسے اخلاق تھا جن کو مری قربت پہ فخر
آج میرا نام لینے میں انھیں پرہیز ہے

اُن سے بڑھتا گیا یوں مرا اختلاف
آسماں اور زمیں کا ہوا اختلاف

وہ جو کہتے "میں کہتا" نہ تھا اختلاف
اس لیے دوستوں سے رہا اختلاف

دے نہ پاتا ہمیں کوئی دشمن شکست
خود ہماری صفوں میں ہی تھا اختلاف

ہار تسلیم کرنا پڑی ذہن کو
جب بھی دل سے ہوا ذہن کا اختلاف

ہو گئے اُن کے ناکام سب تجربے
پھر بزرگوں سے کرنا پڑا اختلاف

ہم طرف دار محسنؔ چراغوں کے تھے
اس لیے آندھیوں سے ہوا اختلاف

تسنیم قاسمی
سیکشن آفیسر
بہار انٹر ایجوکیشن کونسل۔ پٹنہ

واپسی

زندگی کے لیے
زندگی کے لیے
ان گھنے جنگلوں کے مشفق درختوں سے میں
دور ہوتا گیا ــــ دُور ہوتا گیا
یہ مری بھول تھی
یہ مری بھول تھی
یہ بھی سچ ہے کہ رستے میں مجھ کو
کئی شور کرتے ہوئے
ساعتوں کے سمندر ملے
جن کی لہروں نے
مسدود راہوں سے راہیں نکالیں
مگر ایسے لمحوں میں
آنکھوں میں کیسا خلا تھا۔؟
نگاہوں میں حد نظر تک
بس دھواں ہی دھواں تھا
کہ قلبی سکون چھن گیا تھا
- - - - - - - - - - -
اور پھر
لوٹتی ساعتوں میں
سبزہ زار منظر نے آنکھوں کو مسکن بنایا
پہاڑوں کی تازہ ہواؤں نے
بخشی نئی زندگانی
تو احساس جاگا

عمر فاروقی
شیخ ٹولہ۔ لہرپور
سیتاپور

تڑے کرم کی نوازش جدھر گئی ہو گ
نہ جانے کتنوں کو بے حال کر گئی ہو گ
گلوں کے جسم جلائے تمام دن جس ۔
وہ دھوپ شام سے پہلے اتر گئی ہو گ
اسے کوئی بھی نہ رکھے گا اپنی چوکھٹ پ
وہ روشنی جو اندھیرے سے ڈر گئی ہو گ
مری صدا نہ پہنچ پائی آپ تک لیکر
ہواؤں بن کے وہ خوشبو بکھر گئی ہو گ
اُدھر سے بچ کے ہی نکلے گا کاروان خوش
تباہیوں کی جدھر بھی نظر گئی ہو گ
عمر میں گھر کو جلا کر بہت ہی شاد ہو
کہ یہ خطا اُسی ظالم کے سر گئی ہو گ

ساحل احمد
لہ آباد

ابر نیساں کیا برستا شہر میں
کارواں آکر جو رکتا شہر میں

سب تو خوشبو اڑ گئی ہے باغ سے
رنگ کوئی کیا مہکتا شہر میں

نفرتوں کی آگ بجھتی ہی نہیں
ہر طرف شعلہ لپکتا شہر میں

مہرباں اپنا جو مل جاتا کوئی
کیوں مرا احساس تھکتا شہر میں

شہر اعداء ہے کہاں تم آ گئے
آسماں ہر روز جلتا شہر میں

رفیق جعفر
ا/12/6- مالونی کالونی نمبر۶ باندرا پلاٹ
مالاڈ (ویسٹ) بمبئی ۹۵

اپنی چاہت کا یوں پتا دینا
سامنا ہو تو مسکرا دینا

میرے اندر بھی ایک دشمن ہے!
میرے دشمن کو یہ بتا دینا

خواہشوں کے حسین جنگل میں!
میں بھٹک جاؤں تو صدا دینا

یاد رکھ کر عذاب میں کیوں ہو!
ہو سکے تو مجھے بھلا دینا

ایک حسرت بھٹکتی رہتی ہے
میرے گھر کا اسے پتا دینا

ناشاد اورنگ آبادی
ٹی ز ۱۴/۱۷ ای اسٹیشن روڈ
سمستی پور۔ بہار۔

غزل

ہیں مشہور جن کی سیہہ کاریاں
سکھاتے ہیں مجھ کو وفاداریاں

جلانے کی سوچو نہ میرا مکاں
جلا دیں گی تم کو بھی چنگاریاں

شجر کاٹنے میں جو مصروف تھے
وہی کر رہے ہیں شجرکاریاں

میں ناشاد ہوں شاد ہو جاؤں گا
مرے کام آئیں گی دلداریاں

شکیل اعظمی
۱۵ اعظمی کالج ۔ راندیر

غزل

ترے سوال کا تنہا جواب میں ہی تھا
نگاہِ ناز! ترا انتخاب میں ہی تھا

مرے وجود سے روشن تھیں حسرتیں تیری
ترے فلک کا کبھی آفتاب میں ہی تھا

یہ اور بات، کہ اب تو مجھے نہ پہچانے
گذشتہ شب تری آنکھوں کا خواب میں ہی تھا

یہ میری خانہ بدوشی، مرا نصیب نہ تھی
خود اپنی ذات کی خاطر عذاب میں ہی تھا

زبیر شفائی
۹/۱۴ م رہائشی کالونی
کانپور۔ یو پی

سبھی کو شوق تھا خوشبو کے ساتھ چلنے کا
لباس ہی نہیں، دل چاک چاک سب کے ہیں

یہ ارتعاش یہ شام شفق، یہ بزم ہوا
فضا میں ثبت نشانات کس کے لب کے ہیں

یہ کوہسار یہ سبزہ، یہ چاندنی یہ سکوت
تم آرہے ہو کہ یہ اہتمام شب کے ہیں

گزر رہا تھا میں تخلیق کے عمل سے زبیر
یہ آسمان و زمین میرے یارجب کے ہیں

درشن لعل کپور فلک
۴۲۔ تیغ بہادر روڈ
دہرہ دون ۲۴۸۰۰۱
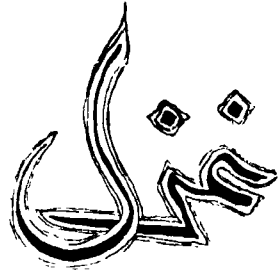
اب تو اربابِ خرد، علم و ڈُ کا کچھ بھی نہیں
کچھ نہیں ہیں ہمسفر اب ہم نوا کچھ بھی نہیں

چاندنی، قوسِ قزح ابرِ بہاراں، کوہسار
ایک تصویر فسوں ہے آشنا کچھ بھی نہیں

ظلمتیں ہی ظلمتیں ہر سو ہیں تا حدِّ نظر
اہرمن حشر بداماں ہیں خدا کچھ بھی نہیں

ذہن میں پھر لو اُبھر آئے ہیں یادوں کے نقوش
عشق اک دردِ مجسّم کے سوا کچھ بھی نہیں

بس فریبِ لطفِ غافل ہے فلک یہ کائنات
ہے پسِ مژگاں لہو رنگِ حنا کچھ بھی نہیں

صلاح الدین آفاقؔ اندر موسی
(مترجم محکمۂ راجبھاشا) حال مقام خلیل پورا۔
پھلواری شریف، پٹنہ (بہار)

وہ اک کتابِ وفا جس کا ذکر عالی تھا
کوئی ورق بھی نہ میرے لہو سے خالی تھا

بڑے ہی شوق سے آئے تھے سیرِ گلشن کو
نہ کوئی پھول وہاں تھا نہ کوئی مالی تھا

ہم اپنے دور کے جس شہر جس گلی میں گئے
ہر ایک چہرے پہ اظہارِ خستہ حالی تھا

جہاں سے ملتا ہے سب کو جہاں سے سب کو ملا
اسی آستانے پہ انورؔ بھی اِک سوالی تھا

بچوں کے لیے مذہبی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
حضرت آدم علیہ السلام	منورہ نوری خلیق	-/۴
رسالہ دینیات اول	محمد نعیم الدین زبیری	۳/
رسالہ دینیات دوم	"	۴/
رسالہ دینیات سوم	"	۵/
رسالہ دینیات چہارم	"	۵/
رسالہ دینیات پنجم	"	۶/
بزرگانِ دین	محمود علی خاں جامعی	۴/
امت کی مائیں	حسین حسنی	۴/۵۰
اچھی باتیں	سعد الدین انصاری	۴/۵۰
خوب سیرت اول	حکیم محمد سعید	۶/
خوب سیرت دوم	"	۴/۵۰
سلطان جیؒ	اسلم فرخی	۴/
رسول اللہؐ کی صاحبزادیاں	فضل قدیر ندوی	۴/۵۰
رحمان کا جہان	رفیع الزماں زبیری	۶/
کمسن صحابی	"	۵/
اسلام کے جاں نثار	"	۴/
سیرت پاک مختصر مختصر	احمد خاں خلیل	۳/
نور کے پھول	حکیم محمد سعید	۹/
سب سے بڑے انسان۔ رسول اللہؐ	"	۴/۵۰
حضرت حمزہؓ	احتشام علی رحیم آبادی	۳/
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ	"	۳/
حضرت ابوہریرہؓ	"	۴/
حضرت محبوب الٰہیؒ	مشیر الحق	۳/
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ	"	۲/
حضرت فرید الدین گنج شکرؒ	"	۳/
حضرت معین الدین چشتیؒ	"	۳/
حضرت ابوبکر صدیقؓ	"	۶/
حضرت طلحہؓ	"	۳/
حضرت سلمان فارسیؓ	"	۳/۵۰
حضرت ابوذر غفاریؓ	"	۳/
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	"	۳/

کتاب	مصنف	قیمت
حضرت عبداللہ بن عباسؓ	مشیر الحق	۳/
نیک بیٹیاں	"	۳/۵۰
اسلام کیسے پھیلا؟ حصہ اوّل	عبدالواحد سندھی	۷/۵۰
" حصہ دوم	"	۶/
قرآن پاک کیا ہے؟	"	۴/
اسلام کیسے شروع ہوا؟	"	۷/۵۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار اوّل، دوم	"	فی حصہ ۶/
اسلام کے مشہور امیر البحر	"	۹/
رسول پاکؐ	"	۶/
دس جنتی	الیاس احمد مجیبی	۵/۵۰
سرکار کا دربار	"	۶/۵۰
چار یار	"	۷/۵۰
آں حضرتؐ (اردو)	"	۳/۵۰
حضرت محمدؐ (ہندی)	"	۱۲/-
اللہ کا گھر	خلیل احمد جامعی	۴/۵۰
اللہ کے خلیل	"	۳/۵۰
رسول پاک کے اخلاق	"	۴/
اللہ کے صفی	"	۲/۵۰
ہمارا دین حصہ اوّل	سید شہاب الدین دسنوی	۸/۵۰
" دوم	"	۷/۵۰
" سوم	"	۸/۵۰
منہاج القرآن	خدیجہ سیدنا طاہر سیف الدین	۴/۵۰
ارکان اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۳/۵۰
عقائد اسلام		۳/۵۰
خلفائے اربعہ	خواجہ عبدالحئی فاروقی	۹/
نبیوں کے قصے	"	۶/۵۰
ہمارے رسولؐ	"	۶/
پیارے رسولؐ	سلطانہ آصف فیضی	۴/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاءؒ	ادارہ	۳/
مسلمان بیبیاں	اعجاز الحق قدوسی	۶/
ہمارے نبیؐ	سید نواب علی رضوی	۳/۵۰
سرکار دو عالم	محمد حسین حسان	۹/
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد) و کلاں		۴/۵۰

قیوم خضر
ملاسی ٹولہ۔ پٹنہ،

تاریکی کی تہ سے اُجالے کا نمود!

(تاریخ کے ایک طویل دَور کو مختصر طور پر احاطہ تحریر کرنے کا اصل مقصد ذہنی تربیت اور کردار سازی ہے، نیز وہ لوگ جو مجبوری حالات کے تحت، محرومی، ناکامی اور انتہائی مایوسی کے عالم میں پڑے کراہ رہے ہیں، وہ موجودہ زمانے کے سیاسی تناظر میں اس مضمون کو پڑھکر نہ صرف عبرت بلکہ سبق حاصل کر کے اپنی زندگی کو، توانا، روشن، فعال اور کارآمد بنا سکیں۔)

بارہ جانوروں والی جنتری کے حساب سے، ۱۲۰۰ عیسوی کا سنہ تھا کہ صحرائے گوبی کے یمے میں خانہ بدوش منگول سردار یسوکائی کا بیٹا تموچن اس اُولُوکی نامی حسین ترین عورت کے ن سے پیدا ہوا، جس کو وہ پڑوس کے قبیلے سے عین اس وقت چھین کر بھاگا تھا جبکہ ہ شادی کے بعد اپنے شوہر کے خیمے میں جا رہی تھی ـــــــ تموچن صرف دس برس کی عمر ں میں شعوری طور پر اتنا سنگ دل اور بے رحم ہو چکا تھا کہ جوان عورتوں کے برہنہ بدن و زخمی کرنے اور دم مرگ معصوم بچوں کے تڑپنے اور رونے کی آواز اس کو سب سے زیادہ رغوب تھی۔ چنانچہ، ۱۲۱۱ء کی بات ہے کہ حصول تسکین کی خاطر اس نے قراقورم (صحرائے گوبی کی کالی ریت پر قائم کردہ منگولی دارالسلطنت) میں قوریلتائی (منگولی اعلا ایوان مشاورت) بُلا کر سرداروں کے سامنے اپنے عزائم کا اعلان کیا کہ اس کی پیاسی تلوار، انسانوں کا خون پینے و بے چین ہے اور اس کے گھوڑے اپنے ٹاپوں سے زمین کی پسلیاں توڑنے کو بے تاب یں۔ سرداروں نے اُس کے عزائم کی تحسین کی اور مرحبا مرحبا، کے نعرے لگائے، اسی مجلس یں آسمان کے پوجنے والے منگولوں کے بڑے پجاری نے تموچن کے فاتح عالم ہونے کی یشین گوئی کی اور چنگیز خاں کا لقب تجویز کیا، جسے قوریلتائی کے تمام اراکین نے منظور کر کے آسمانی دیوتا سے فتوحات کی دعائیں مانگیں ـــــــ منگولیا میں رہنے کی وجہ سے یہ گروہ منگول کہلایا۔ آگے چل کر اسی کا تلفظ "مُغل" ہو گیا۔ یہی مغل ہیں جو اپنے ایک قدیم سردار تاتور کے نام کی مناسبت سے تاتاری بھی کہے جاتے ہیں۔

تاریخ کہتی ہے کہ یہ تیرہویں صدی عیسوی کے آغاز کا زمانہ تھا۔ اُس زمانے میں مُسلم

حکومتوں کی شمالی مشرقی سرحد دریائے یحوّن کے مغرب بیکال جھیل تک پہنچ گئی تھی۔ ختن یارقند، کاشغر اور سمرقند وغیرہ اُن کے سرحدی شہر تھے۔ ان شہروں کے بعد چین تک ایک بہت بڑا ریگستان ہے جسے صحرائے گوبی کہتے ہیں، افریقہ کے صحرائے اعظم کے بعد یہ دُنیا کا سب سے بڑا ریگستان ہے، اسی ریگستان سے ملا ہوا ایک علاقہ ہے جو منگولیا کہلاتا ہے۔ اسی منگولیا اور چینی ترکستان کی سطح مرتفع سے یہ درندہ صفت وحشی منگول وقتاً فوقتاً آس پاس کے علاقوں پر حملے کیا کرتے تھے۔ ان حملوں کی تاریخی اہمیت اس وقت سے بڑھ گئی جب چنگیز خاں ۱۲۱۸ عیسوی سے ۱۲۲۲ عیسوی کے درمیان لگاتار حملے کر کے صرف چار برسوں کے اندر ختا (چین) اور چینی ترکستان کی اکثر مملکتوں کا بادشاہ بن بیٹھا۔

دُنیا کی تاریخ میں ایسی کوئی دوسری مثال نہیں کہ صحرائے گوبی کے خیمے سے ایک خانہ بدوش اپنے گروہ کے ساتھ، گھوڑے کی پیٹھ پر نکلا، اور مختصر عرصے میں مہذب و متمدن حکومتوں کی اس طرح دھجیاں اُڑا کر رکھ دیں کہ دنیا کی سیاسی تاریخ ہی بدل کر رہ گئی —— وہ وحشی تھا، شکاری اور چرواہا تھا، اس نے کبھی کوئی شہر نہیں دیکھا تھا، اس نے کسی مذہب کو قبول نہیں کیا بلکہ آسمان کا پجاری تھا، وہ اَن پڑھ تھا مگر اس نے اقوام عالم کے لیے سیاسی قوانین لکھوا کر ایک کتاب بنام "یاسا" مُرتّب کر کے اسے نافذ کیا۔ وہ بے پناہ جسمانی قوت کا مالک تھا۔ اس فولادی عزم کے پیکر کو، شیر کی پکڑ، شہباز کی جھپٹ، اور عقاب کی اُڑان جیسی صفات نے غیر معمولی انسان بنا رکھا تھا۔ اس کے بازوؤں کی صلابت نے اُونچے پہاڑوں اور تیز آندھیوں سے مضبوطی کا خراج وصول کیا تھا۔ اس کی بے خوفی، عزم کی پختگی، بلند حوصلگی اور غیر معمولی بہادری ایسی تھی کہ فتوحات اس کے پاؤں کو چومتی تھیں، اس کے برعکس مفتوح ممالک کے باشندوں کی بُزدلی، کم ہمتی، کاہلی، عیش پسندی اور آرام طلبی نے اتنا ناکارہ بنا رکھا تھا کہ اُسی زمانے کا مورخ ابن اثیر اپنی تاریخی کتاب "الکامل" میں لکھتا ہے کہ "خیمہ" تاتار کے ایک فوجی نے شہر میں کسی مفتوح سپاہی کو پکڑ کر قتل کرنا چاہا، مگر وہ تاتاری اپنی تلوار لانا بھول گیا تھا، اُس نے اس قیدی کو حکم دیا کہ اسی طرح گردن جھکائے اس وقت تک بیٹھا رہے، جب تک اس کی رگ گردن کاٹ نہ ڈالی جائے چنانچہ وہ تاتاری اپنے خیمے میں گیا اور تلوار لے کر جب واپس ہوا تو مفتوح سپاہی کی بزدلی اور دہشت زدگی دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ وہ خوف کے مارے بھاگ بھی نہ سکا، اور اسی طرح گردن جھکائے بیٹھا رہا۔ تاتاری فوجی نے پہلے تو اس بُزدل کا جھونٹا پکڑ کر اس کے مُنہ پر تھوکا اور پھر اس کے سر کو بدن سے جُدا کر دیا۔ وہ اس کے سر کو تلوار کی نوک پر لٹکائے چوراہے چوراہے گھوم کر اعلان کرتا رہا کہ یہ اُس قوم کے فوجی جوان کا سر ہے، جس کی بہادری کے افسانے، تواریخ کے صفوں کو بھی لرزہ براندام کرتے رہے ہیں، اور یہ وہی سرزمین ہے جہاں صدیوں سے اس قوم کے حکمرانوں کا ڈنکا بجتا رہا ہے!

چنگیز خاں اپنی موجودہ فتوحات سے مطمئن تھا۔ اُس نے اپنی قائم کردہ حکومت کی

فلاحی اسکیموں کے پیش نظر، فارس کے سلطان علاء الدین خوارزم شاہ کے پاس ایک سفیر خاص کی معرفت تجارتی اور دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی غرض سے یہ پیغام بھیجا کہ "میں تجھے پیام تہنیت دیتا ہوں۔ میں تیری طاقتور سلطنت کی عظمت اور وسعت سے بخوبی آگاہ ہوں۔ میں تجھے اپنا عزیز سمجھتا ہوں۔ تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے ختا (چین) اور ترک قوم کی بہت ساری مملکتوں پر قبضہ کر کے ایک مضبوط سلطنت قائم کر رکھی ہے۔ میری مقبوضہ مملکت بہادر سپاہیوں کی خیمہ گاہ ہے۔ میرے پاس چاندی کے کان ہیں، اور اب مجھے نئے علاقوں کی کوئی ضرورت نہیں، میں تو اب اپنی رعایا کو خوشحال اور مطمئن دیکھنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ میری اور تیری حکومت کے درمیان تجارتی دوستانہ تعلقات قائم ہوں ـــــ" لیکن افسوس صد افسوس کہ ناعاقبت اندیش خوارزم شاہ نے نہ اس پیغام کی گہرائی اور نہ اس کے دوررس نتائج پر غور کیا، نہ سفیر کی کچھ عزت و توقیر کی بلکہ شاہانہ غرور و پندار نے اس کی عقل کو اس طرح سلب کر رکھا تھا کہ اس نے سفیر کو قتل کر کے اور اس کے تمام ساتھیوں کی داڑھیاں مونڈ کر واپس کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خوارزم شاہ کی اس ناعاقبت اندیشانہ، غیر اخلاقی اور ذلت آمیز برتاو کی تاب نہ لاکر چنگیز خاں، بپھرے ہوئے شیر کی طرح ۱۲۱۸ء میں اپنے قراقورم سے نکلا اور وسط ایشیا کے اونچے برفیلے کہساروں کے اس پار فارس کی دو ہزار میل سے زیادہ مسافت کو اس نے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر کوے کی اڑان کے حساب سے طے کیا اور خوارزم شاہی حدود پر بجلی کی طرح ٹوٹ پڑا، جب حدود سلطنت خوارزم شاہی کے شہر بخارا میں اس کی خونخوار فوج پہنچی تو قیامت برپا ہو گئی، شہر میں آگ اور خون کا دریا ایسا رواں ہوا کہ تاریخ نے اس سے قبل کسی درندگی، عصمت دری اور تباہی و بربادی کا منظر کبھی نہیں دیکھا تھا آن کی آن میں عظیم الشان کتب خانے جلا کر راکھ کر ڈالے گئے یا اصطبلوں میں تبدیل کر دیے گئے۔ آبادی کی آبادی خاک و خون میں لپٹی کراہنے لگی۔ ہر طرف نالہ و بکا کی وہ آوازیں بلند ہوئیں کہ زمین تو زمین، ساتوں آسمان بھی کانپنے لگے۔ انسانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹتے ہوئے وہ جب شہر کی جامع مسجد کے صدر دروازے پر پہنچا تو شاندار عمارت کو دیکھ کر سمجھا کہ یہ بادشاہ کا محل ہے مگر جب اسے معلوم ہوا کہ یہ اللہ کا گھر ہے تو اس نے گھوڑے کی لگام اس کی طرف موڑ کر سیڑھیوں پر گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے عین صحن مسجد میں پہنچ گیا، وہ گھوڑے سے اتر کر مسجد کے منبر پر چڑھ گیا، جہاں بڑے سے مصحف پاک کے پاس خوشبودار لوبان کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ منبر کے اردگرد علماء و فضلا کا ایک گروہ دعا میں مصروف، منگولوں پر قہر خدا وندی کے نازل ہونے کا انتظار کر رہا تھا کہ چنگیز خاں نے گرجتے ہوئے لہجے میں اُن سے پوچھا کہ وہ کیا کر رہے تھے؟ انھوں نے کہا کہ وہ اس بلائے ناگہانی سے بچنے کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ اس نے یہ سن کر کہ تمہاری بے عملی اور بداعمالیوں کا یہ حال ہے کہ ایسے موقع پر جبکہ شمشیر و سناں کی ضرورت ہے، تم لوگ بددعا کرنے میں مشغول ہو۔ تمہارے اللہ نے مجھ پر تو قہر و غضب نازل نہیں کیا، لیکن میں تم لوگوں پر قہر الٰہی کی صورت میں نازل ہو گیا

ہوں ـــــــ وہ بخارا میں صرف دو ہی گھنٹے ٹھہرا اور پھر اپنی فوج کی کچھ ٹکریوں کو چھوڑ کر خود تیزی کے ساتھ خوارزم شاہ کے تعاقب میں سمرقند کی طرف دوڑ پڑا، وہاں اس کو معلوم ہو کہ خوارزم شاہ شہر چھوڑ کر جنوب کی جانب نکل گیا۔ اُس نے اپنے دو آزمودہ کار سپہ سالار، جبی نُویاں اور سوبدائی بہادر کو بادشاہ کے تعاقب پر روانہ کرتے ہوئے حکم دیا کہ خوارزم شاہ دنیا کے جس کونے میں بھی ہو، اُسے زندہ یا مردہ حاضر کرکے خانِ اعظم کی تسکین رُوح کا سامان بہم کریں۔ یہ حکم اس نے مغل جنتری کے حساب سے سال مار اور تقویم عیسوی کی رُو سے ۱۲۲۰ء میں نافذ کرکے خوارزم شاہی شہر خاص کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں واقعی وہ قہرِ الٰہی بن کر نازل ہوا اس کے قہر و غضب کی تفصیلات تاریخوں میں درج ہیں۔ اس وقت ایک اہم واقعہ یہ پیش آیا کہ حضرت خواجہ ضیاء الدین ابو نجیب سہروردیؒ کے مُرید خلیفہ اور سلسلۂ فردوسیہ کے نامور بزرگ شیخ الشیوخ حضرت نجم الدین کبریٰؒ شہر میں موجود تھے۔ جب انھیں چنگیز خاں کی قیامت خیز یلغار کی خبر ملی تو سجّادہ کو تہ کرکے ہاتھوں میں نیزہ سنبھال لیا اور مریدوں سے کہا کہ وہ لوگ اپنے اپنے شہروں کو چلے جائیں، جب مُریدوں نے ساتھ چلنے کو کہا تو آپ نے فرمایا کہ میرے منصب کی ذمہ داری یہ ہے کہ مجھ سے جو بھی ہو سکتا ہے وہ میں اپنے وطن کی خاطر گزر دوں، یہ کہہ کر باقی ماندہ مُریدوں کو جہاد کا حکم دیا، اور خود ایک ہاتھ میں نیزہ اور جھولے میں کچھ سنگریزے بھر کر میدانِ جنگ میں آ گئے، پہنچتے ہی دشمنوں پر سنگریزے پھینکے جس کے بدن پر یہ سنگریزے پڑے، سب کے سب مفلوج ہو کر رہ گئے، جب سنگریزے ختم ہو گئے تو نیزے کو اٹھا کر نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ چنگیز خاں نے یہ آواز سُنی اور حضرت شیخؒ کو دیکھا تو اس کی زندگی میں اس طرح کے سپاہی کو دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ وہ ایک لمحہ کے لیے حیرت و استعجاب میں ڈوب گیا لیکن اپنے کچھ سپاہیوں کی دُرگت دیکھ کر، صورتِ حال کے پیشِ نظر، اس کو براہِ راست مقابلہ پر آنا پڑا۔ اس مقابلے میں یہ ہوا کہ چنگیز خاں کے ہاتھوں حضرت شیخ خواجہ نجم الدین کبریٰ قدس سرہ العزیز شہید ہوئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون! شہادت کا یہ واقعہ ۶۱۷ ہجری مطابق ۱۲۲۰ عیسوی میں رُونما پذیر ہوا۔

اسی واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ صوفیائے کرام اور اولیائے عظّام صرف ہاتھوں میں تسبیح لے کر مراقبے ہی میں نہیں رہتے بلکہ موقع آنے پر ہاتھوں میں نیزہ و شمشیر لے کر میدانِ جنگ میں نبرد آزما بھی ہوتے ہیں! ایسے منصبِ عالی پر فائز المرام حضرات کے لیے صرف تسبیح و سجّادہ اور جُبّہ و دستار ہی زیبا نہیں بلکہ وقت پڑنے پر اُن کے سینے پر زِرہ اور سر پر خود بھی ہوا کرتا ہے!!

شیخ نجم الدین کبریٰ قدس سرہٗ العزیز نے وطن کے بچاؤ کی خاطر اپنی جان نچھاور کرکے ثابت کر دیا کہ وطن سے محبت کرنا جزوِ ایمان ہے!!!

خوارزم شاہ کے بعد اس کے بیٹے جلال الدین محمد خوارزم شاہ نے انتہائی بہادری کے

کے ساتھ منگولوں کا مقابلہ تو کیا مگر وہ بھی چنگیزی طوفان میں ٹھہر نہ سکا۔ منگولوں کے اس خونی طوفان کی زد میں آکر سمرقند، بخارا، خوارزم، بلخ، نیشاپور، رے، ہمدان، اور آذربائیجان کے علاوہ دوسرے تمام ملحقہ خطوں کو تباہ و برباد کرکے چنگیز خاں جس طرح آندھی کی مانند آیا تھا، اُسی طرح بخیر و خوبی، کثیر دولت اور دیگر مال و اسباب لے کر منگولیا واپس لوٹ گیا۔ یہ سارا واقعہ ۱۲۱۸ء سے ۱۲۲۲ء کے درمیان یعنی صرف دو برسوں کے اندر رونما ہوا۔ منگولوں کی اس یلغار کا ذکر تاریخ کے جس صفحے پر درج ہے، وہیں ایک فقرہ لکھا ہوا ملتا ہے کہ "آمدند و کندند و سوختند و بردند و رفتند" یعنی آئے، توڑ پھوڑ کی، آگ لگائی، لُوٹ مار کی اور چلے گئے: رونما ہونے والے ان واقعات نے وسط ایشیا اور فارس کے سیاسی نقشے کو اس طرح بدل کر رکھ دیا کہ پہچاننا مشکل ہو گیا۔ اس خونی ڈرامے کا سب سے افسوسناک منظر یہ ہے کہ خوارزم شاہ نے چنگیز خاں کے ساتھ چھیڑ تو کر دی مگر ایک جگہ بھی میدانِ جنگ میں آکر مقابلہ نہیں کر سکا، وہ تو ایسا خوف زدہ ہوا کہ چنگیز خاں شہر پر شہر فتح کرتا ہوا چلا جا رہا تھا، اور یہ آگے آگے بھاگتا جا رہا تھا، اس کے بھاگنے اور بھٹکنے کی پوری تفصیلات تاریخوں میں درج ہیں، المختصر یہ کہ بھاگتے بھاگتے اور بھٹکتے بھٹکتے اس نے بحیرۂ قزوین کے کسی نامعلوم جزیرے میں پناہ لی اور وہیں، ۶۱۷ ہجری المطابق ۱۲۲۰ عیسوی میں انتہائی غربت و بدحالی کے عالم میں اس طرح دم توڑ دیا کہ کفن تک نصیب نہیں ہوا۔

چنگیز خاں نے ان فتوحات کے بعد سب سے پہلا دور اندیشی کا کام یہ کیا کہ اس نے اپنے چاروں بیٹوں (جوچی، چغتائی، اوغدائی، تولوئی) کے درمیان مفتوحہ علاقوں کے انتظامات کو خود مختارانہ طور پر سپرد کر دیا، تاکہ وہ بھی امورِ جہانبانی کے تمام طور طریقوں سے واقف رہ سکیں، اور ان کی نجی صلاحیتوں کو مرضی کے مطابق آزادانہ طور پر اُبھرنے کا موقع مل سکے۔ جوچی وہ تھا جو اس کی پہلی بیوی بورتائی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ بورتائی ایک دشمن قبیلے کے ذریعے اغوا کر لی گئی تھی، چنگیز خاں نے اُسے دوبارہ حاصل کر لیا تھا۔ جوچی اس وقت راستے ہی میں پیدا ہوا، جبکہ وہ اُسے دشمنوں سے چھڑا کر اپنے خیمے کو لوٹ رہا تھا۔ اس نے اپنے اسی بڑے بیٹے جوچی کو روس کا مقبوضہ علاقہ تفویض کیا۔ چغتائی کو وسط ایشیا کے سارے علاقے دیئے۔ اوغدائی کو مرکزی قراقورم کی ذمہ داری سونپ کر "خاقان" کا لقب عطا کیا اور تولوئی کو ختا (چین) کے تمام مفتوحہ علاقے سپرد کیے۔ اس دانشمندانہ سیاسی تقسیم کا یہ نتیجہ نکلا کہ آگے چل کر اس کے بیٹوں اور پوتوں نے سو برس سے بھی کم عرصے میں دنیا کا سیاسی نقشہ ہی بدل کر رکھ ڈالا یعنی انھوں نے بحرالکاہل سے ایڈریاٹک تک تمام خطۂ ارض کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند کر پامال کر دیا۔ ایک طرف انھوں نے ایشیا میں، چین، ترکستان، ایران، عراق اور شام وغیرہ سلطنتوں کو ملیامیٹ کر ڈالا تو دوسری طرف یورپ میں، روس، پولینڈ، مشرقی پرشیا، اور ہنگری وغیرہ مملکتوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔

اسی چنگیز خاں کا پوتا اور تولوئی کا بیٹا ہلاکو خاں نہایت ہی مدبر، بُردبار، جنگجو، اور بہادر

ہونے کے علاوہ اپنے دادا کی بعض مخصوص صلاحیتوں کا بھی حامل تھا۔ اس نے اپنی سوتیلی ماں دوقوز سے شادی کرلی تھی۔ دوقوز نطوری عیسائی تھی اور مسلمانوں سے خاص طور پر عناد کا جذبہ رکھتی تھی۔ اس کی دشمنی کی وجہ سے کتنے ہی مسلمان قتل کر ڈالے گئے اور بے شمار مسجدوں میں آگ لگا دی گئی۔ لیکن اس کی اپنی ماں سیورقوقِلتی جو نطوری عیسائی ہونے کے باوجود بڑی ہی ہوشمند اور روادار تھی۔ اس نے بخارا میں ایک مسجد کی تعمیر کرواکر اپنے غیر متعصبانہ مذہبی رویے کا ثبوت دیا تھا۔ وہ بے حد ہوشیار اور غیر معمولی قوت ارادی کی مالک تھی اور انتظامی امور کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھی۔ مورخین نے دنیا کی عظیم عورتوں کی صف میں اس کا بھی شمار کیا ہے۔ یہ تو تاریخی حقیقت ہے کہ اس نے اپنے شوہر تولوی کے انتقال کے بعد سیاسی سازشوں میں گھرے ہوئے ماحول اور انتہائی ناسازگار حالات میں جس ہمت اور خوش انتظامی کے ساتھ چار بیٹوں (منگو خاں، قبلائی خاں، ہلاکو خاں، اریق بوغا) کی پرورش و پرداخت کی اور جس طرح سیاسی نیز جنگی تعلیم و تربیت دے کر حوصلہ مندانہ طور پر جینے کا سلیقہ عطا کیا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اُسی کے حُسنِ تدبر کا نتیجہ تھا کہ اس نے منگو خاں کو چین کا خاقان بنوا دیا، اور قبلائی خاں نے تو جہانبانی میں ایسی شہرت حاصل کی کہ اس کا دور حکومت (۱۲۵۹ء سے ۱۲۹۴ء) مغلوں کا عہد زرین کے نام سے مشہور ہے۔

منگو خاں نے بھی اپنے دادا کی سنت پر عمل کرتے ہوئے سلطنت کو تینوں بھائیوں (قبلائی خاں، ہلاکو خاں، اریق بوغا) کے درمیان تقسیم کر دیا، تاکہ وہ سب مل جل کر دنیا کے زیادہ سے زیادہ ملکوں کو فتح کر کے فاتحِ عالم کو خراجِ عقیدت پیش کر سکیں اور ہوا بھی یہی کہ مغل حکومت بحیرۂ چین سے بحیرۂ روم تک پھیل گئی۔

منگو خاں نے خاص طور پر ہلاکو خاں کو ہدایت کی وہ پہلے شیخ الجبال کے قلعوں کو قبضہ کرنے کے بعد خلیفۂ بغداد کے علاوہ باقی ماندہ مسلم مملکتوں کو فتح کرے، مسلم حدود مملکت کی آخری حد یعنی مصر کے قلعے پر بھی چنگیزی پرچم لہرا کر ثابت کر دے کہ صرف مغل ہی دنیا میں حکومت کرنے کے لائق ہیں۔ چنانچہ اسی اسکیم پر عمل کرتے ہوئے اس نے ایک طرف تو جنوبی مشرقی ایشیائے کوچک کو تاراج کیا اور دوسری طرف مغرب میں باقی ماندہ مسلم مملکتوں کے خلاف مسلسل یلغار شروع کر دی۔

ہلاکو خاں نے پیچ دار اور اُونچے کوہستانی سلسلوں کو عبور کر کے تبت کے دشوار گزار برف زاروں کا چکر کاٹتا ہوا، ایران کے ان قلعوں تک پہنچ گیا جہاں شیخ الجبال حسن بن صباح کے فدائیوں کا مسکن تھا۔ یہ فدائی، اسمٰعیلی فرقے کے پیرو تھے اور ایران سے لبنان تک کوہستان کے سنگین قلعوں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اب تک ان کے کوہستانی قلعوں کو کسی نے تسخیر کرنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ اسمٰعیلی فرقے کے پیرو، دراصل شیعہ فرقے کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ حضرت امام جعفر صادقؑ تک تمام اماموں کو مانتے ہیں، لیکن ان کے بعد وہ امام جعفر صادقؑ کے بڑے صاحبزادے اسمٰعیل کو امام مانتے ہیں، جبکہ اثنا عشری شیعوں کے عقیدے کے مطابق

امامت کا سلسلہ امام جعفر صادقؒ کے دوسرے صاحبزادے امام موسیٰ کاظمؒ کی نسل میں چلتا ہے۔ فاطمی حکمراں (۹۰۹ء تا ۱۱۷۱ء) چونکہ اپنے آپ کو جناب اسمٰعیل کی اولاد ہونے کا دعوا کرتے تھے، اس لیے وہ اسماعیلی کہلائے۔ آغا خانی خوجے بھی اسی اسمٰعیلی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ حسن بن صباح بھی اسمٰعیلی فرقے کا ایک ایرانی النسل فرد تھا۔ اس کے ابتدائی حالات کا تو کچھ پتا نہیں چلتا، لیکن تاریخ اتنا پتا دیتی ہے کہ جب فاطمی حکمراں المستنصر (المتوفی ۱۰۹۴ء) کے بعد امامت سے متعلق اختلاف پیدا ہوا، تو مصریوں نے المستنصر کے دوسرے بیٹے (۱۰۹۴ء تا ۱۱۰۱ء) کو حکومتِ فاطمیہ کے تخت پر بیٹھا دیا، لیکن ایران میں عبدالملک ابن عطاش اصفہانی نے المستنصر کے بڑے بیٹے نزار کا ساتھ دیا۔ گویا یہ ایرانی اسمٰعیلیوں کی الگ حکومت قائم کرنے کی ابتدا تھی۔ ابن عطاش کے علاوہ حسن بن صباح بھی حکومت اسمٰعیلیہ کا دعویدار تھا۔ چنانچہ اُس نے ایران کے ان مختلف قلعوں پر قبضہ کرلیا، جو پہلے سلجوقیوں کے زیر تسلط تھے۔ گیلان کے پہاڑوں میں سب سے مشہور الموط کا قلعہ تھا، اس نے اس پر بھی قبضہ کرکے اپنے گروہ کے اسمٰعیلیوں کی تمام مجرمانہ سرگرمیوں اور خفیہ سازشوں کا نہ صرف مرکز بنا دیا، بلکہ اس مقام کو آرائشی اور طلسماتی اشیا سے آراستہ کرکے مصنوعی بہشت بنا رکھا تھا۔ حسن بن صباح ہی شیخ الجبال اور ساحر الموط کے لقب سے مشہور ہے۔ یہی فرقۂ باطنیہ کا بھی بانی ہے۔ اس کے پیروکار، جب کسی آدمی کو پکڑتے تو اُسے حشیش (بھانگ) کھلا کر مدہوش کر ڈالتے اور پھر قلعۂ الموط میں لے آتے، جب اس کی آنکھ کھلتی تو مصنوعی نہریں، ہیرے جواہرات کے مصنوعی باغات اور دوسری تمام آرائشی مصنوعات کو دیکھ کر عقل کھو بیٹھتا اور سمجھتا کہ وہ واقعی بہشت میں ہے۔ اس کے بعد وہ ساحر الموط حسن بن صباح کا مرید ہو کر فدائی بن جاتا، اس طرح فدائیوں کا بہت بڑا جرائم پیشہ جرگہ قائم ہو گیا تھا۔ حشیش کی رعایت سے یہ لوگ حشیشیں بھی کہے جاتے ہیں۔ اسی لفظ کا انگریزی تلفظ ASSASSIAN ہے۔ یہ حشیشیں مدتوں سے اس علاقے کے باشندوں کو اپنی ساحرانہ حرکتوں اور قتل و غارت گری کے ذریعے پریشان کیے ہوئے تھے۔ شیخ الجبال کے اشارے پر نہ صرف عام لوگ بلکہ بڑے بڑے ممتاز علما و فضلا بھی قتل کیے گئے، حتّٰی کہ ملک شاہ سلجوقی ابنِ الپ ارسلاں کے نامور وزیر اور طریقۂ درس نظامیہ کے بانی، نظام الملک طوسی جیسے عالم و فاضل کو ۱۰۹۲ء میں شہید کر ڈالا۔ ان حشیشیوں نے مجاہد اسلام غازی صلاح الدین ایوبی پر بھی قاتلانہ حملہ کیا تھا، مگر وہ بچ نکلے۔ اسی طرح صاحب "تفسیر کبیر" امام فخر الدین رازیؒ کو بھی قتل کی دھمکی دے رکھی تھی۔ ان قاتل لٹیرے فدائیوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بن جانے کتنے علما و فضلا کے علاوہ کتنی عظیم ہستیاں ہوتیں کہ ہلاکو خاں بشکل قہر الٰہی ان کے قلعوں پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے شہسواروں نے قلعہ الموط کی مصنوعی بہشت کو روند کر، ساری طلسماتی مصنوعات کو تہس نہس کر ڈالا، اور اس کتب خانے کو آگ لگا دی، جس میں جادو ٹونے سے متعلق کتابیں بھری پڑی تھیں۔ ہلاکو خاں کے سپاہیوں نے ساحر الموط حسن بن صباح کو گرفتار کیا اور کتے کی طرح اس کی گردن میں رسّی باندھ کر جب ہلاکو خاں کے سامنے پیش کیا، تو اس نے

چاہا کہ اس کے بدن کی بوٹی بوٹی کاٹ کر گدھوں اور کتوں کو کھلا دیا جائے، لیکن پھر سوچا کہ منگو خاں اس عجیب و غریب شخص کو دیکھ کر بے حد خوش ہوگا، اس لیے اس نے حسن بن صباح کو قراقورم روانہ کر دیا، مگر راستے ہی میں منگو خاں کا پیغام ملا کہ وہ اس ناپاک اور ذلیل شخص کو دیکھنا بھی اپنی ہتک سمجھتا ہے، چنانچہ سپاہیوں نے ان کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور لاش کو بے گور و کفن میدان میں گدھوں اور چیلوں کو کھانے کے لیے پھینک دیا۔

اب ہلاکو خاں اپنی منصوبہ بندی کے تحت بغداد کی طرف متوجہ ہوا۔ بغداد میں سوا پانچ سو برسوں سے بنو عباسیہ کی حکومت قائم تھی۔ اس وقت مستعصم باللہ حکمراں تھا۔ یہ بے حد ناکارہ اور عیاش اور امور سلطنت سے اس درجہ غافل تھا کہ اس کے وزیر علقمی نے عباسی حکومت کا تختہ الٹنے کی خاطر ہلاکو خاں سے خفیہ ساز باز کر کے اندرون ملک شیعہ سنی کے تعصبات کو ابھار کر انتشار برپا کر رکھا تھا۔ ایسے موقع پر حسن بن صباح کے کوہستانی قلعوں کی تسخیر اور اس کی مصنوعی بہشت کے تمام ساحرانہ طلسم کو تہس نہس کرنے کے بعد ہلاکو نے اپنے گھوڑے کی باگ سرزمین عراق کی طرف موڑ دی۔ وقت کی رفتار نے اس کی فوج کو دجلہ کے کنارے پہنچنے میں مدد کی۔ اس مقام پر ہلاکو نے اپنی فوج کو اس مہم میں خاص طور پر چوکنا اور چوکس رہنے کا حکم دیا۔ اس کے شہسواروں نے دجلہ کا پانی پیا تو تازہ دم ہو گئے۔ ہلاکو، دجلہ کے شاداب کناروں اور اس کے کنارے شاہی محلات کی قطاروں سے ظاہر ہونے والے جاہ و جلال کو دیکھ کر بے حد مرعوب و متاثر ہوا، مگر اس کے دل کو رہ رہ کر ایک کھٹک پریشان کیے ہوئے تھی اور وہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا، ٹھہر ٹھہر کر سوچتا کہ آخر کون سا راز ہے کہ خلیفہ بغداد کی فوج اس کی پیش قدمی پر مزاحمت کرنے میں تامل کر رہی ہے؟ یہی سوچتے سوچتے اور محتاط انداز سے چلتے چلتے جب شہر پناہ کی فصیل نظر آنے لگی تو اس نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور فوج کو محاصرے کا حکم دیتے ہوئے فوجی نقطۂ نگاہ سے صفوں کو آہنی دیوار بن جانے کی ہدایت دی۔ اب اس کی فوج شہر میں آگ لگاتے ہوئے اور آبادیوں کو تہہ تیغ کرتے ہوئے مستعصم کے محل میں داخل ہو گئی۔ ہلاکو خاں محل کے مزین و منقش اور وسیع و عریض ہال میں پہنچ کر جب در و دیوار پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ سونے چاندی کی مرصع کاری کے علاوہ لوہے جیسے مضبوط دھات کو پگھلا کر آرائشی جالیاں بنائی گئی ہیں۔ یہ دیکھ کر غصے میں آپے سے باہر ہو گیا، اور مستعصم باللہ کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ مستعصم بھوک اور پیاس سے نڈھال جب اس کے سامنے لایا گیا تو ہلاکو نے بیٹھنے کو کہا اور کچھ کھانا دینے کی بجائے محل سے لوٹے ہوئے طلائی ظروف، چاندی کے اگالدان اور جواہرات سے مرصع عودان، اس کے سامنے رکھ دیے، اور خود ایک معمولی برتن میں کچھ چیزیں لے کر کھانے لگا۔

ہلاکو نے تحکمانہ لہجے میں مستعصم سے کہا: جواہرات اور سونے چاندی جو تم نے جمع کیا ہے، اسے کھاؤ۔

مستعصم نے کہا: ان چیزوں کو میں کیسے کھاؤں؟

ہلاکو طنزاً بولا: تو پھر تم نے اتنے جواہرات اور سونے چاندی کو رعایا کا خون چوس کر کیوں جمع کیا؟

مستعصم کی گردن جھک گئی اور کوئی جواب نہیں دیا۔

ہلاکو نے محل کے بڑے ہال کے در و دیوار کو پھر دیکھا اور گرجتے ہوئے بولا: تم نے زر و جواہرات کو محض اپنے عیش و آرام کے لیے جمع کرنے کی بجائے رعایا کی خوشحالی کی خاطر اور ملک کی دفاع کے پیش نظر فوجیوں پر کیوں نہیں خرچ کیا؟ تم نے لوہے کا غلط استعمال کر کے آرائشی جالیاں کیوں بنائیں؟؟ تم نے ان لوہوں سے تیر و تبر اور دوسرے جنگی اسلحے کیوں نہیں بنائے کہ تمھارے فوجی مسلح ہو کر جانبازی کے ساتھ بڑھ کر پہاڑوں سے آتے ہوئے میری فوج کو روکتے اور میرا مقابلہ کرتے!

مستعصم نے گردن جھکائے ہوئے جواب دیا: اللہ کی یہی مرضی تھی۔

اس جواب کو سن کر ہلاکو اور بھی آگ بگولہ ہو گیا اور چیختے ہوئے بولا کہ پھر تمھارے ساتھ جو بھی سلوک کیا جائے گا، وہ بھی تمھارے اللہ کی مرضی کے مطابق ہوگا، اور حکم دیا کہ اس نااہل اور عیاش کو سمور (نرم بالوں والا ایک برفانی جانور) کی کھال میں لپیٹ کر گھوڑے کی ٹاپوں سے کچل کر مار ڈالا جائے۔ اس طرح حکومت عباسیہ کا آخری فرمان روا مارا گیا کہ کفن تک میسر نہ ہو سکا۔ وہ حکومت جسے ۷۵۰ عیسوی میں ابوالعباس سفاح نے قائم کی تھی، سوا پانچ سو برسوں کے بعد ۱۲۵۸ء میں ختم ہو گئی اور پورے عراق پر منگولوں کا قبضہ ہو گیا۔ چالیس دنوں تک تاتاری، بغداد کو لوٹتے رہے، آگ اور خون کا کھیل کھیلتے رہے۔ تاریخ کہتی ہے کہ اس ہنگامے میں نوے ہزار بوڑھے، جوان، بچوں اور عورتوں کا قتل عام ہوا۔ سارا بغداد نذرِ آتش کر دیا گیا۔ اس تباہی و بربادی کے بعد بغداد کو پھر کبھی بھی عالم اسلام کا مرکز بننے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ ایسے قہر آلود وقت کا سامنا اس سے قبل مسلمانوں کو نہیں کرنا پڑا تھا۔ ایک طرف منگولوں کی یلغار، دوسری طرف عیسائی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں اور مسلسل حملے! اس کے علاوہ سب سے بڑھ کر مسلمانوں کی نااہلی، عیش پسندی آرام طلبی اور خانہ جنگی!!

بغداد کی تاراجی و تسخیر کے بعد ہلاکو کا بڑا بھائی منگو خاں اس قدر خوش ہوا کہ اُسے ایل خاں (چھوٹے خاں) کا خطاب عطا کیا (ایران کے ایلخانی اسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں) اور اپنے سارے مفتوحہ علاقے، نسلاً بعد نسل بطور جاگیر اس کو تفویض کر دیے۔ ہلاکو فتح و ظفر کا جھنڈا بلند کیے ہوئے شام کی طرف بڑھا اور دمشق کے باشندوں کا قتل عام کرتے ہوئے جب حلب پہنچا، تو اس کی فوج کے عیسائی سپاہیوں نے مسلمانوں پر بڑے ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے، حلب کی جامع مسجد میں آگ لگا دی اور پچاس ہزار باشندوں کو قتل کر ڈالا، قریب قریب دس ہزار عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا گیا۔ اس کے بعد ہلاکو، فلسطین کے ارضِ مقدس یروشلم کی طرف چل پڑا، تاکہ منگو خاں کی ہدایت کے مطابق وہ مصر کو بھی فتح کر کے اس کی دلی خواہش کو پورا کر سکے۔ منگولی قراولوں نے دریائے اُردن کی مغربی سطح مرتفع تک رسائی حاصل کر لی جو مصر کے راستے میں واقع ہے لیکن

عین اسی وقت ۱۲۶۰ء کے اوائل میں منگو خاں کی موت کی خبر ملی اور قاصد نے قرا قورم پہنچ کر قوریلتائی بلانے کا پیغام بھی دیا، چنانچہ ہلاکو دریائے نیل کے ساحلی علاقوں کے علاوہ مصر اور مشرق وسطیٰ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین جنگ ہائے صلیبی سے فائدہ اُٹھائے بغیر نہایت ہی تذبذب کے عالم میں لوٹ گیا اور ۱۲۶۴ء بیماری کے عالم میں اس کی موت ہوگئی۔

تاریخ کے جن صفحوں پر تاتاری یلغار کے خونی واقعات درج ہیں، آج تک اُن صفحوں سے بوڑھوں، جوانوں، عورتوں اور بچوں کے رونے، بلکنے، سسکنے کی آوازیں سُنائی دیتی ہیں! لیکن بقول غالبؔ "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا"، یعنی جب منگولوں کے ذریعے آگ زنی، توڑ پھوڑ، لوٹ مار اور قتل و غارتگری کی انتہا ہوگئی، جس کی داستان آپ پچھلے صفحوں میں پڑھ چکے ہیں، تب رحمتِ خداوندی جوش میں آئی۔ رحمتِ خداوندی کے نئے منظر کو دیکھنے کے لیے اس خونی ڈرامے کے تمام سین کو ڈراپ کرکے ذرا پیچھے کی جانب لوٹنا پڑے گا۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ چنگیز خاں نے اپنے بڑے بیٹے جوچی کو روس کا علاقہ تفویض کر دیا تھا۔ اسی جوچی کے دو بیٹے جالو خاں اور برقائی خاں تھے۔ جالو خاں وہی تھا جس نے تاتار زریں خیل کے خانوادے کی بنیاد رکھی، اور زار (قیصر و سیزر کا روسی تلفظ) کے لقب سے مشہور ہوا، اس نے تمام روسی مملکتوں کو کچل کر حکومتِ زار قائم کرکے تاریخ سیاست میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ جوچی کے دوسرے بیٹے برقائی خاں کو قفقاز کے وہ علاقے ملے تھے، جہاں کی شادابی اور زرخیزی نے وہاں کی چراگاہوں اور عام زمینوں کو جنت نشاں بنا رکھا تھا، جہاں کی عورتوں کا حُسن ایسا بے پناہ تھا کہ کوہ قاف کی پریاں کہلاتی تھیں اور جہاں کی پرستانی وادیوں کے افسانے آج تک مشہور و معروف ہیں!

ان قدرتی مناظر نے برقائی خاں کو جمالیاتی احساسات کی دولت عطا کی اور اس کے دل کی منگولی وحشت و بربریت میں اتنی کمی آگئی کہ اس کا فولادی دل موم کی طرح پگھل کر نئے سانچے میں ڈھلنے لگا اور جب اس کو وہاں کی مسلم آبادی سے واسطہ پڑا اور ان کے ذریعے اسلام کی تعلیمات کی تھوڑی بہت واقفیت ہوئی تو غور و فکر نے ایک نئی روشنی عطا کی اسی روشنی نے نئی راہوں کی سمت اشارہ کیا چنانچہ ایک رات کا واقعہ کہ اس نے خواب میں ایک بزرگ کو سبز جبہ اور مصری دستار میں ملبوس دیکھا کہ وہ اس کو مشرف بہ اسلام ہونے کی تلقین کر رہے ہیں۔ اس نے اس خواب کا تذکرہ بعض مسلمان دوستوں سے کیا اور خواب میں دیکھے گئے بزرگ کا حُلیہ بتاتے ہوئے اُن کے بارے میں مزید واقفیت حاصل کرنا چاہی، اس کے مسلمان دوستوں نے بتایا کہ اس حُلیہ کے ایک بزرگ تو بخارا میں رہتے ہیں، جن کا نام نامی اسم گرامی حضرت شیخ خواجہ سیف الدین باخرزیؒ ہے اور جو حضرت شیخ الشیوخ خواجہ نجم الدین کبریٰ ولی تراش قدس سرہ العزیز کے مُرید و خلیفہ ہیں۔ یہ اطلاع پاتے ہی برقائی خاں نے شیخ موصوفؒ کی خدمت میں اپنا خاص سفیر بھیج کر حاضر ہونے کی اجازت طلب کی۔ حضرت شیخؒ نے اجازت دے دی، برقائی خاں اپنے لشکریوں کے جلو میں بخارا پہنچا اور شیخ موصوفؒ کو اپنے پہنچنے کی اطلاع دیتے ہوئے خانقاہ میں حاضر ہونے کا وقت طلب کیا۔ حضرت شیخؒ نے فرمایا کہ اپنے لشکری جاہ و حشم کو چھوڑ کر چند ہمراہیوں

کے ساتھ حاضری کے لیے آئے۔ چنانچہ برقائی خاں حکم کے بموجب آستانۂ شیخؒ پر حاضر ہوا۔ حضرت شیخ قدس سرہٗ العزیز سر پر مصری دستار لپیٹے اور سبز جبہ پہنے تشریف لائے۔ برقائی خاں نے جیسے ہی شیخؒ کو دیکھا تو قدموں پر گر پڑا، اور مشرف بہ اسلام کرنے کی التجا کی۔ حضرت شیخ سیف الدین باخرزی قدس سرہٗ العزیز نے التجا کو قبول کرتے ہوئے کلمۂ توحید و شہادت پڑھا کر مسلمان کیا اور اس کا نام خدا بندہ تجویز کیا۔ خدا بندہ تین دن تک شیخؒ کی خدمت میں حاضر رہا۔ ان تین دنوں میں حضرتؒ نے اس کے دل کو کفر کی ساری سیاہیوں سے پاک کر کے ایسا منور کر دیا کہ صحیح معنیٰ میں وہ خدا کا بندہ ہو گیا۔ خانوادۂ چنگیز خاں کا یہی وہ پہلا شخص ہے جس نے پہلے پہل ایک مذہب کو قبول کیا۔ تین دنوں کے قیام کے بعد وہ حضرت شیخؒ سے اجازت طلب کر کے قفقاز لوٹ گیا اور سارا ماجرا اپنی ملکہ کو سنایا۔ یہ ماجرا سن کر ملکہ نے بھی مسلمان ہونے کی خواہش کا اظہار کیا اور حضرت سیف الدین باخرزیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گئی۔ اس کے بعد تو منگول لشکری، گروہ در گروہ حضرت شیخ موصوفؒ کے حضور آ کر مسلمان ہونے لگے۔ سرخیل زریں خیل بالو خاں زار جب ۱۲۵۶ء میں مر گیا تو روس کی مملکت، خدا بندہ کے قبضے میں آ جانے کے بعد اس کو اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں مزید تقویت ملی۔ وہ اب اتنا طاقتور حکمراں ہو گیا تھا کہ اس کے مسلمان ہو جانے پر ہلاکو خاں نے غصے میں آ کر جب سرکوبی کرنا چاہی تو قفقاز کی پہلی جنگ میں ہلاکو خاں کو اس کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔ بہر حال، یہ سب جو کچھ ہوا، وہ عین فرمانِ خداوندی کے مطابق ہوا۔ قرآن پاک میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے صاف طور پر ارشاد فرمایا ہے کہ نافرمان اور نااہل لوگوں کی یہ سزا ہے کہ اُن کی نافرمانی کے جرم میں کسی ظالم قوم کو ان پر مسلط کر دے گا اور اُن کی بجائے دوسری قوم کے ذریعے وہ اپنی مخلوق کی بھلائی کے نئے نئے راستے نکال دے گا۔

صحرائے گوبی سے اُٹھنے والی وہ آتش فشاں اور ہولناک آندھی جس نے تہذیب و تمدن کے نہ جانے کتنے گلشن اُجاڑ کر رکھ دیئے تھے، کوہ قفقاز کی فردوسی فضا سے جب ہمکنار ہوئی تو موجِ صبا کی طرح ایسی سُبک خرام ہو گئی کہ پھر مُرجھائے ہوئے غنچوں کو شگفتہ اور شاداب ہونے کا حوصلہ مل گیا۔ یعنی وہی وحشی منگول جو مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے، آبِ حیات پلانے لگے، جو اسلام کو مٹانے کے لیے نکلے تھے، اب ان ہی کے ہاتھوں سے اسلام کا جھنڈا بلند ہونے لگا۔ اسی واقعہ سے متاثر ہو کر علامہ اقبالؔ نے کہا تھا کہ "پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے" مسجد کے میناروں سے اذانیں گونجنے لگیں، مسمار شدہ شہروں کے ملبے پر نئے شہر بسنے لگے، جو کتب خانے، گھوڑوں کے اصطبل میں تبدیل کر دیئے گئے تھے، انھیں پھر سے کتب خانہ بننے کی عزت ملی، تہذیب و تمدن کے بجھے ہوئے چراغوں کو پھر سے جلا گیا۔ لیکن حال سے ماضی کا رشتہ جوڑنے میں

ایک لمبے عرصے تک لوگوں کو کڑی محنت کرنی پڑی، تب کہیں جا کر اجڑی ہوئی دنیا دوبارہ بسائی گئی!

منگولوں کے مندرجۂ بالا ذہنی انقلاب نے سیاسی ڈرامے میں ایک نئے منظر کا اضافہ کر کے تاریخ کو ایک نیا رُخ عطا کرنے کا افتخار حاصل کیا۔ بعض لوگوں کا یہ خیال کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا، سطورِ بالا کے پیشِ نظر اس کے باطل ہونے کی ایک بیّن مثال ملتی ہے اور تاریخی واقعات کی روشنی میں یہ حقائق واضح ہو جاتے ہیں کہ اسلام خود اپنی ظاہری و باطنی خوبیوں کے سبب نمو کی اتنی بھرپور صلاحیت و قوت رکھتا ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں۔ کوئی اس کو مانے یا نہ مانے، کوئی اس کے بتائے ہوئے اصولوں پر چلے یا نہ چلے، کوئی اس کی مخالفت کرے یا اس کے ساتھ منافقت برتے، اس کی حقانیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پچھلے صفحوں میں درج شدہ واقعات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اسلام کے ماننے والوں نے تو خود اس کے اصولوں کو پامال کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی درگت بنی کہ ان کی ابتری کی داستان لکھتے ہوئے مورّخ کا قلم شرم سے جھک جاتا ہے! اس تاریخی دور کے مسلمان جب خود ہی اپنے ہاتھوں اسلام کی دھجیاں بکھیر رہے تھے، تو وہ دوسروں کو کیا قبولِ اسلام کی دعوت دیتے؟ وہ تو خود ہی انتہائی ذلّت و پستی کے گڑھے میں گر کر اپنی اور اپنے اسلاف کی آبرو مٹی میں ملا رہے تھے، وہ دوسروں کو عزت و بلندی کی کیا تبلیغ کرتے؟ وہ تو کہیے کہ چند بوریا نشیں صوفیائے کرام اور اولیائے عظام، نیز کچھ اللہ کے بندے ایسے تھے جو صدق و خلوص سے یادِ الٰہی اور خدمتِ خلق میں مصروف و مشغول تھے اور جنھوں نے اپنی نیک عملی، پاکیزہ نفسی اور بلند اخلاقی کے ذریعے بلا تفریقِ مذہب و ملت، عام انسانوں کو نیکی کی طرف مائل کر رکھا تھا، دراصل اسلام کی تبلیغ و اشاعت، ان ہی نفوسِ قدسیہ کی بدولت ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ مسلم بادشاہوں اور امرا و روسا نے تو اکثر اسلام کی تبلیغ میں رکاوٹیں پیدا کی ہیں اور رخنے ڈالے ہیں!

تاریخ کے اس دور میں یعنی تیرھویں صدی عیسوی میں جن صوفیائے کرام اور اولیائے عظام نے عام مذاق و رجحان سے ہٹ کر اسلام کی بے لوث خدمتیں انجام دی ہیں، ان میں حضرت شیخ ضیاء الدین ابو نجیب سہروردیؒ، حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ (المتوفی ۱۲۴۰ء) حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ (متوفی ۱۲۳۴ء) حضرت شیخ خواجہ نجم الدین کبریٰ ولی تراش (المتوفی ۱۲۲۱ء) اور حضرت شیخ خواجہ سیف الدین باخرزیؒ (المتوفی ۱۲۶۰ء) وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ موخر الذکر بزرگ وہ ہیں جن کے دستِ حق پرست پر نہ صرف چنگیز خاں کا پوتا برقائی خاں مسلمان ہوا بلکہ منگولوں کا بہت بڑا لشکری گروہ بھی مسلمان ہو گیا۔ اس کارہائے نمایاں پر سلسلہ فردوسیہ

جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ سلسلۂ فردوسیہ اصل میں سہروردی سلسلے کی ایک شاخ ہے۔ لیکن جب حضرت شیخ خواجہ ضیاء الدین ابو نجیب سہروردیؒ نے حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ کو اپنے حلقۂ ارادت میں لیا تو بقول صاحب "بزم صوفیہ" خلافت تفویض کرتے وقت فرمایا "شما مشائخ فردوس ہستید" یعنی تم لوگ مشائخ فردوس ہو۔ اُسی وقت سے فردوسیہ سلسلے کی ابتدا ہوئی۔ اس کے بعد اس سلسلے کے مشائخ اپنے نام کے ساتھ لفظ "فردوسی" کا استعمال کرنے لگے اور جب فردوسی سلسلے کے نامور بزرگ حضرت شیخ سیف الدین باخرزیؒ کے مُرید و خلیفہ حضرت شیخ بدرالدین سمرقندی فردوسیؒ، پہلے پہل ہندستان تشریف لاکر دہلی میں مسندِ رشد و ہدایت بچھائی تو فردوسی سلسلہ دہلی سے بہار تک پھیل گیا۔

برقائی خاں اور اس کے لشکریوں کے مسلمان ہوجانے کے بعد تو آنے والے زمانے کے مختلف وقتوں میں جُوق در جوق، دُور دُور کے منگول، ترک اور دوسرے قبائل بھی مسلمان ہونے لگے، حتّٰی کہ خانوادۂ ہلاکو خاں کا ایک فرد غازان نے اسلام قبول کرکے ایران کی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ قبلائی خاں کا پوتا اور چنگ گم کا بیٹا تیمور (ترکی زبان میں فولاد کو کہتے ہیں) نے اپنے کارناموں کے ڈنکے بجائے چنگیز خاں کے دوسرے بیٹے چغتائی کی اولاد میں بابر پیدا ہوا جس نے ہندستان میں مغلیہ حکومت کی نیو ڈالی، اور پھر دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جس ملّتِ مسلمہ اور جس تہذیب و تمدّن کو منگول مٹانے کے لیے اُٹھے تھے، اُسی منگول خاندان نے مسلمانوں کی سلطنت قائم کی اور عظیم ثقافت و تہذیب کو دوبارہ زندہ کیا!

یوسف ناظم

غلطیہائے مضامین

"خطائے بزرگاں گرفتن خطا است" کا مقولہ ہمیں یاد ہے اس لیے ہم کسی کی غلطی نہیں پکڑ رہے ہیں صرف اس کا ذکر کر رہے ہیں اور آپ کی ناقص رائے طلب کر رہے ہیں کہ اِن صاحبان نے جو کچھ کیا وہ خطا کی تعریف میں آتا بھی یا نہیں۔ خطا تو بہت سی چیزیں ہوتی ہیں اس لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم جن باتوں اور وارداتوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں یعنی اشارہ کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں وہ کبھی خطا ہی ہوں ــــ آیئے۔ تاریخ سے شروع کریں یا فنونِ لطیفہ سے۔ ویسے سائنس اور جغرافیہ بھی اچھے علوم ہیں اور اِن میدانوں میں غلطیاں زیادہ ہوتی ہیں جن میں سے کچھ غلطیاں قدرتی ہیں اور اِن کی تصحیح ممکن نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہمالیہ کوہِ ہمالہ نیپال کی سمت میں ہونے کی بجائے پنجاب کی سمت میں ہوتا تو ہندستان کی تاریخ وہ نہیں ہوتی جو آج ہے اور ہم اس بحث میں نہیں الجھتے کہ آریہ یہاں کب آئے تھے۔ ہمالیہ، جدھر ہم بتا رہے ہیں ادھر ہوتا تو یہ سارے جھگڑے ہوتے ہی نہیں اور ہم سب لوگ صحیح النسب ہوتے ــــ ایک اور قدرتی غلطی جس کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے یہ ہوئی کہ ہمارے موجودہ مصنف در جن میں سے چند برّ اعظم خاص طور پر افلاس کے لیے بہت زرخیز بن گئے اور وہاں جو غریبی قرنہا قرن سے چلی آرہی ہے بس چلی ہی آرہی ہے۔ مانا کہ اِس غریبی کے برقرار رکھنے میں وہاں کے لوگوں کا بھی کافی ہاتھ ہے اور اِن کی روایتی حرکات سکنات کا بہت دخل ہے یعنی اسے بےبنیاد تو نہیں کہا جاسکتا۔ ٹھہریے۔ ایک اور غلطی کا ذکر کیے بغیر ہمارا آگے بڑھنا دشوار نظر آرہا ہے ہمارا اشارہ خطِ استوا کی طرف ہے۔ اس کی جگہ بھی دوسری ہونی چاہیے تھی۔ جس جگہ خطِ استوا کھینچا گیا ہے وہ قطعی غیر مناسب ہے۔ جغرافیہ میں سیدھی لکیر کیا معنے رکھتی ہے۔ دنیا کے کسی بھی ملک کے نقشے پر نظر ڈال لیجیے کیا کوئی نقشہ جیومیٹری کے اصولوں کے مطابق ہے۔ کوئی ایک ملک متناسب الاعضا یا معقول صورت شکل کا ہے؟۔ اکثر ملکوں کی دُم نکلی ہوئی ہے اور شاید اسی لیے وہاں بہتوں کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا ہے ہم نے تو سُنا تھا کہ اُن ملکوں میں جن کی دُم نکلی ہوئی ہے ایسی ایسی حرکتیں ہوتی ہیں کہ جانور بھی شرمانے لگے ہیں۔ لوگ وہاں کے چڑیا گھروں میں جاکر دیکھ چکے ہیں کہ

ان ہر جانور کا منہ لٹکا ہوا اور سر شرم سے جھکا ہوا ہے ۔ یہ بات صرف ہم نے سنی
ہے اسی لیے ہمیں اصرار نہیں ہے کہ آپ اس پر یقین کریں ۔

ایک غلطی جو غالباً انسانی ہے ہمیں بہت کھلتی ہے ۔ پتا نہیں آدمی کو لباس کا
دی کب اور کس نے بنایا ۔ یہ غلطی نہ کی جاتی تو آج کپڑے اتروا لینے کی تحریک سرے
ے دنیا میں ہوتی ہی نہیں ۔ ڈاکٹر ضرورتاً کپڑے اتروا دیتے ہیں ۔ فوج اور پولیس
ں جو لوگ شرکت کرنا چاہتے ہیں انھیں اپنی قابلیت اور اہلیت کا ثبوت دینے کے
یے پہلے کپڑے اتارنے پڑتے ہیں ۔ یہ طریقہ اور بھی کئی موقعوں پر بروئے عمل لایا جاتا ہے
یکن وہ لوگ جو بہت شریف ہوتے ہیں اور جن کے دل میں دوسروں کے لیے بہت درد
وتا ہے جب وہ لوگوں کے کپڑے اتروا لیتے ہیں تو ہمارا جی کہتا ہے کہ وہ انجیر کے پتوں
الا آدمی ہی اس دنیا کے لیے موزوں تھا ۔۔۔ (فائدہ یہ ہوتا کہ ہم انگور اور سنترے
کی بجائے انجیر کی کاشت کی طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ ہوتے اور آج خشک انجیر سب
کو کھانے کو ملتے۔) یہ کپڑے اتروا لینے کی بات ہمارے ذہن سے جیسے چپک کر رہ گئی ہے ۔
یہ ہمارے ہی منتخب کردہ لوگ ہیں جنھیں ہم نے کسی دوسرے کام کے لیے چنا تھا ۔ یہ لوگ
دوسروں کے لباس کے تو دشمن ہیں لیکن اپنے فیصلوں کے لیے خدا معلوم کہاں سے "عملی
جامہ" منگوا لیتے ہیں ۔ (ہم آپ سے کہنا نہیں چاہتے تھے لیکن ہمارے بعض احباب
اس عملی جامے کو بدعملی جامہ کہنے لگے ہیں) ۔

ایک معاشیاتی غلطی یہ ہوتی کہ ہم نے امیروں اور امیر الامرا کے علاوہ ایک "امیر شہر"
کا بھی تقرر کر دیا ۔ ہو سکتا ہے کسی زمانے میں "امیر شہر" شہر کی حفاظت، اس کی
نفاست اور اندرونِ شہر کی ثقافت کا خیال رکھتے ہوں اور کبھی کبھی بھیس بدل کر
"حالاتِ حاضرہ" کا جائزہ بھی لیتے ہوں لیکن اب صورتِ حال بالکل مختلف ہے ۔
بھیس تو یہ اب بھی بدل لیتے ہیں لیکن اس کا مقصد کچھ اور ہوتا ہے ۔ بعض صورتوں
میں تو امیر شہر کو اپنا ملک فروخت کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے ۔ آپ کو یقین نہیں آیا ۔
پہلے ہمیں بھی نہیں آیا تھا ۔ دنیا میں ایسے خریدار موجود ہیں جو ملک کے ملک
خریدنے کی استطاعت رکھتے ہیں اور ان کے پاس ایک فہرست موجود ہے جس
میں ہر امیر شہر کا نام اور اس کا بایوڈیٹا درج ہے ۔ انھیں وقفے وقفے خبر ملتی رہتی
ہے کہ کون سا ملک بکنے کے لیے تیار ہے اور وہاں کے "امیر شہر" نے اس کی
کیا قیمت مقرر کی ہے ۔ یہ قیمت تو برائے نام ہوتی ہے جب سودا ہوتا ہے رقم گھٹ
کر نصف سے بھی کم رہ جاتی ہے ۔۔۔ سودے کی تکمیل پر رقم ہمیشہ قرض کے نام پر
دی جاتی ہے ۔ قیمت کے نام پر نہیں ۔ ملکوں کی خرید و فروخت اور جانوروں کی
خرید و فروخت میں اتنا فرق تو رہنا ہی چاہیے ۔

ہمارے بزرگوں سے ایک حسابی غلطی یہ ہوتی کہ وہ روپے پیسے کا حساب کرنے

کے معاملے میں ''کھرب'' کے ہندسے پر آکر رک گئے۔ اُس زمانے میں جب یہ ہندسے یا اعداد ایجاد ہوئے مطلب یہ کہ وضع کیے گئے۔ دنیا میں شاید اتنی دولت تھی نہیں کہ کھرب کے بعد کا حساب رکھا جاتا حالانکہ ہم نے سُنا ہے کہ پرانے زمانے میں قارون نامی ایک شخص کے پاس اتنی دولت تھی کہ اس کے خزانے کی چابیاں اِدھر سے اُدھر لے جانے کے لیے ۷۰ اونٹ درکار ہوتے تھے۔ (ویسے چابیوں کے نقل وحمل کی بات ہماری سمجھ میں آئی نہیں۔ کیا اِن ساری چابیوں کو کسی ایک گودام میں رکھ کر گودام کی ایک چابی بنوا کر اسے اِدھر اُدھر نہیں لے جایا جاسکتا تھا)۔ خیر قارون کے معاملے میں اس وقت دخل دینے سے کوئی فائدہ نہیں لیکن ہمارا اصرار ہے کہ کھرب کے بعد بھی کوئی عدد لکھا جانا چاہیے (کھرب کیسا رہے گا)۔ ایک سو کھرب یا دو سو کھرب کہنے سے بات بنتی نہیں ہے ــــ خود ہندستان میں جہاں روپے پیسے کی تنگی ہے اب کروڑ کا عدد تو تقریباً بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ ہم چونکہ اخبار پڑھنے کے عادی ہیں اس لیے ہر قسم کی خبریں ہماری نظر سے گزرتی رہتی ہیں۔ ابھی حال میں ہم نے یہ خبر پڑھی تھی کہ ہماری سرکار نے ایک مسجد کی حفاظت کے لیے ایک دن میں جو رقم صرف کی وہ ایک سو دس کروڑ روپے تھی۔ ہم حساب کرتے کرتے تھک گئے۔ بہرحال اب بھی وقت ہے کہ ہمارے ماہرین ریاضیات اس غلطی کے ازالے کی خاطر دو تین عمدہ نام عدد سوچ لیں۔ شروع شروع میں ان کے وضع کیے ہوئے عدد کی مخالفت تو ہوگی لیکن کچھ دنوں بعد خود بخود ڈوب جائے گی۔ مخالفت ہم ضرور کرتے ہیں لیکن اس کا پیچھا نہیں کرتے اور پھر مخالفت کے لیے ہر روز ایک نیا موضوع پیدا کر دیا جاتا ہے۔ یہ موضوع اس لیے پیدا کیا جاتا ہے کہ لوگوں کی توجہ ہٹ جاتے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں یہ خاندانی منصوبہ بندی ہے۔ ان کے کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کی منصوبہ بندی صرف ایک خاندان کی اجارہ داری ہے ورنہ سب جانتے ہیں کہ خاندانی منصوبہ بندی سرکاری سطح پر کن معنوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ یہ ترکیب ویسے کافی سے زیادہ غلط فہمیاں پھیلا چکی ہے۔ جب بھی سرکاری سطح کا ذکر آتا ہے یا صرف سرکار کا نام آتا ہے تو ہمارے ایک مہربان دوست اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ کسی سرکاری محکمے کا افسر اعلا اپنے خاندان کی منصوبہ بندی کی پیشرفت میں فی الحال عام امیدواروں کا انٹرویو لے رہا ہے۔ عام امیدوار کو بالعموم انٹرویو دیتے ہی رہتے ہیں۔ عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔ ایسے انٹرویو ہمیشہ تقررات کے بعد لیے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے نیم سرکاری کارپوریشن کے اصحاب حل وعقد بھی اپنے فرزند ارجمند یا دختر نیک اختر کسی اچھی خدمت پر تقرر کرنے میں اپنے اسپ خامہ کو بہت تیز دوڑاتے ہیں۔ ہم نے اپنے دوست کو بہت سمجھایا کہ خاندانی منصوبہ بندی کا مطلب یہ نہیں ہے لیکن وہ کسی طرح مانتے ہی نہیں۔ ہمارا خیال ہے یہ نام ہی بدل دینا چاہیے۔ خواہ مخواہ الزام

ِ سے کیا فائدہ -

فنونِ لطیفہ میں جب ہم فنِ موسیقی کے چند نکات اور اس کے لوازمات پر غور کرتے ہیں تو ہمیں ایک بات بڑی کھٹکتی ہے - ٹھہریئے ہم آپ کو سمجھاتے ہیں - موسیقی کو بامِ عروج پر پہنچانے کے لیے جو ساز بطورِ بدرقہ یا بطورِ سابقہ و لاحقہ استعمال ہوتے ہیں ان میں یہ تان پورہ، ہمیں عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں آج تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ تان پورہ آتا کس کام ہے - ایک تو اس کا نام ہی ہمیں کچھ اکھڑا اکھڑا سا لگتا ہے - شبہ ہوتا ہے کہ یہ کسی ساز کا نہیں، شہر کے کسی محلے کا نام ہے جیسے بمبئی میں مدن پورہ، حیدرآباد میں آغا پورہ یا اورنگ آباد میں بیلی پورہ - اس طرح کے اور بہت سے پورے ہوں گے جو ہر شہر اور گاؤں میں پائے جاتے ہیں - دوسرے اس کی آواز اس کی ہوتی نہیں ہے اور اگر ہوتی ہے تو صرف اس شخص کے کانوں تک بمشکل پہنچتی ہوگی جو اسے بجانے کی نمائش کرتا ہے - ہم نے تان پورے کا کوئی تنہا یعنی سولو (ٹ ہ ا ہ ہ ر) پروگرام بھی نہیں دیکھا نہ سُنا - آپ نے بھی ظاہر ہے نہیں دیکھا ہوگا - اس ساز کی شکل و صورت بھی ہمیں کچھ زیادہ پسند نہیں آئی - اسے سنبھالنا بھی کتنا دشوار ہے اس کے مقابلے میں ایک طفلِ شیر خوار کو سنبھالنا شاید آسان ہو - یوں تو شہ نشین پر چار پانچ سازندے اشخاص متعلقہ موجود ہوں تو شہ نشین پار رونق نظر آتی ہے لیکن یہ تان پورہ ہے جو آنکھوں میں کھٹکتا نہیں چبھتا ہے - موسیقی کی محفلیں آپ نے بھی دیکھی اور سنی ہیں اس لیے آپ جانتے ہیں کہ خود موسیقار وقفے وقفے سے اپنے ساتھ بیٹھنے والوں کو اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کا باری باری سے موقع دیتا ہے - اس دوران موسیقار اپنی سانس ٹھیک کر لیتا ہے یا پان [illegible] لو موقع ملتا ہے ستار کو بھی گٹار بھی [illegible] باری نہیں آتی تو تان پورے کی نہیں آتی - یہ تو کرکٹ کا بارھواں کھلاڑی بھی نہیں معلوم ہوتا کہ ضرورت پڑنے پر اپنی ٹیم کے بلے باز کو دوڑ [illegible] نے کی غرض سے میدان میں ایک دوڑ لگا لے - بہر حال ایک بات ہمارے ذہن میں آئی جو ہم نے آپ تک پہنچا دی - آپ کی رائے کے لیے -

ویسے ہم پہلے ہی عرض کر چکے ہیں کہ جن باتوں کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے وہ خطائیں نہیں ہو سکتیں اور اگر یہ خطائیں ہیں تو

ایک دو تین چار پانچ نہیں : ان کی ساری خطائیں معاف کر دو

مجتبیٰ حسین
۲۰۰- رنکو اپارٹمنٹس
پلاٹ نمبر ۷- پٹ پڑ گنج
نئی دہلی ۵۲

ادھر شمالی ہند کی بعض ریاستوں میں اور خود دہلی میں انتخابات کا جب سے اعلان ہوا ہے تب سے شمالی ہند کے لیڈر، جنوبی ہند کے لیڈروں کے مقابلہ میں اچانک زیادہ مہذب بااخلاق اور شایستہ ہو گئے ہیں۔ ہمارے ہاں لیڈروں کے کردار میں یہ تبدیلی اس قدر آناً فاناً واقع ہوتی ہے کہ اچھے اچھے مہذب لوگ بھی دانتوں میں انگلیاں دبا کر انھیں زخمی کر لیتے ہیں۔ پہلے جن لیڈروں سے ملنا تو درکنار ان کا دیدار کرنا تک دشوار ہوتا تھا وہ اب قدم قدم پر آپ کا راستہ کاٹنے لگے ہیں۔ آپ بچ کر نکلنا چاہیں تو وہ اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور بیچارگی کو سجائے ہاتھ جوڑ کر یوں کھڑے ہو جائیں گے جیسے یہ دنیا کی مظلوم ترین مخلوق ہیں۔ ہماری جمہوریت کے ساتھ مشکل یہ ہو گئی ہے کہ یہاں ووٹ مانگنے اور بھیک مانگنے میں کچھ زیادہ فرق باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اور دوسری طرف یہ بھی ہے کہ جب ووٹ حاصل کرکے یہی لیڈر برسرِ اقتدار آ جاتے ہیں تو عوام بھی اپنے حقوق مانگنے کے لیے ان کے پاس یوں جاتے ہیں جیسے بھیک مانگ رہے ہوں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فقیری، درویشی اور قلندری کی روایت ہمارے ہاں بہت پرانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بدنام لیڈر اپنے حلقہ میں دوبارہ ووٹ مانگنے جاتا ہے تو لوگ اس سے کہتے ہیں "تمھیں ووٹ مانگتے شرم نہیں آتی"۔ اسی طرح کی بات ہم عموماً کسی ہٹے کٹے آدمی کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھ کر کہنے کے عادی ہیں۔

بہر حال فی الحال تو شمالی ہند کے لیڈر اپنی آرام دہ کوٹھیوں سے باہر نکل کر سڑکوں پر آ گئے ہیں اور عوام کے مسائل کو از سر نو جاننے کی کوششوں میں لگ گئے ہیں۔ انھیں پچھلے انتخاب میں جو بتایا گیا تھا پھر وہی بتایا جا رہا ہے کہ عوام ہنوز بھوکے ہیں، ان کے پاس رہنے کو مکان نہیں ہے، بجلی پانی کی تکلیف ہے، چیزوں کے دام بڑھتے چلے جا رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیڈران مسائل کو یوں غور سے سنتے ہیں جیسے ان مسائل کے بارے میں پہلی بار سن رہے ہوں اور جیسے واقعی وہ ان مسئلوں کو حل کر کے رہیں گے۔ ان بنیادی مسئلوں کے علاوہ کچھ تہذیبی، جذباتی اور سماجی مسئلے بھی ہیں جن کی طرف اچانک ہمارے لیڈروں کا خیال چلا جاتا ہے۔ ان میں ایک مسئلہ بیچاری اردو زبان کا بھی ہے۔ بہت عرصہ پہلے کسی نے کہا تھا کہ

اردو ایک ایسی شیروانی ہے جسے انتخابات سے عین پہلے صندوق میں سے نکالا جاتا ہے اور اسے پہن کر ووٹ مانگے جاتے ہیں اور جب انتخابات ختم ہو جاتے ہیں تو پھر اردو کی شیروانی کو صندوق میں واپس رکھ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس بار بھی اردو کی شیروانی صندوق سے باہر نکل آئی ہے۔ ہمارے ایک دوست کو شکایت ہے کہ لیڈر لوگ اردو کی شیروانی نکال تو لیتے ہیں لیکن اسے پہننے سے پہلے اس پر استری تک نہیں پھیرتے بلکہ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ اس کے کتنے بٹن ٹوٹ چکے ہیں اور اس میں کہاں کہاں پیوند لگنے کی ضرورت ہے۔

پرسوں اتر پردیش کے ایک ممتاز لیڈر نے ہم سے پوچھا کہ بتائیے اردو جیسی ہر دلعزیز زبان کے لیے کیا کیا کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم نے کہا "اب تک آپ حضرات نے اردو کے لیے جو کچھ کیا ہے اس کے پس منظر میں اب تو صرف ایک ہی چیز کے کرنے کی ضرورت باقی رہ گئی ہے"
پوچھا وہ کیا؟"
عرض کیا "اب اتر دیش میں اردو کا کوئی اچھا سا مقبرہ تعمیر کر دیجیے جہاں یہ آرام سے محو خواب رہ سکے"
بولے "آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں ہم نے اردو اکیڈیمی جو قائم کر رکھی ہے"
ہم نے کہا "مانا کہ اردو کے مقبرہ اور اردو اکیڈیمی میں کوئی بہت زیادہ فرق نہیں ہے لیکن ایک باضابطہ آخری آرام گاہ کا بند و بست ہو تو اچھا ہے"۔ بولے "آپ مسئلوں کو ہمیشہ کنفیوز کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں اردو اکیڈیمی کام جو کر رہی ہے"
ہم نے کہا "یہ جو اردو اکیڈیمیاں اردو کتابوں کی اشاعت کے لیے جو جزوی مالی امداد دیتی ہیں اس اردو کو کتنا کلی نقصان پہنچ رہا ہے اس کا آپ کو کوئی اندازہ ہے۔ اب اردو میں ہر طرح کا کوڑا کرکٹ چھپنے لگا ہے"
بولے "پھر آپ چاہتے کیا ہیں؟"
ہم نے کہا "یہ جو آپ کتابیں چھاپنے کے لیے جزوی مالی امداد دیتے ہیں اور یہ جو ہر سال سیکڑوں کی تعداد میں انعامی کتابوں کا جلوس نکالا جاتا ہے اس کی بجائے سال بھر میں آپ اردو کے ایک سو قاری ہی پیدا کر دیں تو بڑا کام ہوگا۔ اگر کسی اکیڈیمی کا بجٹ پچاس لاکھ کا ہے اور وہ ایک لاکھ فی قاری کے حساب سے پچاس قاری بھی پیدا کر دیتی ہے تو یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ جس زبان کو پڑھنے والے ہی موجود نہ ہوں وہاں لگاتار کتابیں چھاپنے کا کیا فائدہ؟"
پتا نہیں ان کی سمجھ میں ہماری بات آئی یا نہیں مگر کہہ رہے تھے کہ وہ آیندہ سے اردو کے قاری ضرور پیدا کریں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم اتر پردیش کی حد تک انتخابات کے زمانے میں اردو کی شیروانی پہننے کے سخت خلاف ہیں کیونکہ ہم نے اتر پردیش کے بعض نوجوان اردو شعرا کی بیاضیں دیکھی ہیں جن میں ان کا کلام بلاغت نظام دیوناگری رسم الخط میں لکھا ہوا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اقلیتوں کو خوش کرنے کے لیے ہمارے لیڈروں نے کئی شیروانیاں سلوا رکھی ہیں۔ ایک شیروانی مسلم پرسنل لا کی ہے۔

دوسری شیروانی علی گڑھ کی ہے بلکہ اوقاف کا پاجامہ تک موجود ہے۔ مشکل یہ ہے کہ جہاں اردو کی شیروانی پہنی جانی چاہیے وہاں ہمارے لیڈر علی گڑھ کی شیروانی پہن لیتے ہیں اور جہاں علی گڑھ کی شیروانی پہننی چاہیے وہاں مسلم پرسنل لا کی شیروانی پہن لی جاتی ہے۔ اس پر ہمیں اپنے ہائی اسکول کے زمانہ کے ایک ہم جماعت یاد آ گئے۔ وہ امتحان کی تیاری کچھ اس طرح کرتے تھے کہ ہر شیروانی کے دامن پر ہر مضمون سے متعلق اہم مواد کو خفی حروف میں کاغذ پر لکھ کر چپاں کر دیتے تھے اور دامن الٹ الٹ کر امتحان میں جوابات لکھتے تھے۔ اس طرح ان کے پاس کئی شیروانیاں تھیں جیسے کیمسٹری کی شیروانی، فزکس کی شیروانی، جغرافیہ کی شیروانی وغیرہ۔ ایک دن امتحان کے دوران وہ خاموش بیٹھے رہے ایک بھی جواب نہیں لکھا۔ ممتحن نے پوچھا۔ "میاں! تم تو روزانہ اچھے پرچے لکھتے آئے ہو۔ آج تم خاموش کیوں ہو؟ کچھ لکھتے کیوں نہیں؟" معصومیت کے ساتھ بولے "سر! آج جغرافیہ کا پرچہ ہے اور میں غلطی سے تاریخ کی شیروانی پہن کر آ گیا ہوں"

ہمارے لیڈروں نے بھی کچھ اسی طرح کی شیروانیاں تیار کر رکھی ہیں۔ اب دیکھیے اردو کی شیروانی کب تک چلتی ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اردو والے اردو کے بے گھر ہو جانے کا ماتم تو کرتے ہیں لیکن اردو کو خود اپنے گھر میں پناہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور دلچسپ بات تو یہ ہے کہ جن لوگوں نے اردو کو بے گھر کیا ہے وہ خود بھی اس ماتم میں پورے جوش و خروش کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ اس زبان کی ہر دلعزیزی کا یہی تو المیہ ہے چلیے یہ بھی کیا کم ہے کہ انتخابات کے بہانے لوگوں کو اردو کی یاد آ جاتی ہے اور وہ سوچنے لگتے ہیں کہ ایک زبان جو ہمارے درمیان موجود تھی وہ اچانک کہاں غائب ہو گئی۔ یہیں کہیں رکھی تھی۔ کسی کو ملے تو ہمیں دے دینا۔

کتاب نما کے چند خصوصی شمارے

کتاب نما کے مندرجہ ذیل خصوصی شماروں پر کتاب نما
کے خریداروں کو ۲۵٪ کمیشن دیا جائے گا۔ ڈاک خرچ بذمہ خریدار (ادارہ)

علی سردار جعفری

(شخصیت اور ادبی خدمات)

ترتیب ــــــــ رفیعہ شبنم عابدی

سردار جعفری کی شخصیت میں بیک وقت کئی شخصیتیں
سانس لے رہی ہیں۔ وہ کون سا میدان ہے جہاں
سردار جعفری اپنے فکر و نظر کی جولانیاں دکھاتے
ہوئے نظر نہیں آتے۔ صحافت ہو یا ادب، فلم ہو
ٹی وی ریڈیو ہو یا اسٹیج، خطابت ہو یا شاعری!
ان کی مکمل شخصیت کا بھرپور جائزہ۔

قیمت -/۵۴ روپے

پروفیسر مسعود حسین خاں

(علمی، لسانی اور ادبی خدمات)

مرتبہ ــــــــ ایم حبیب خاں

کتاب نما کے اس خصوصی شمارے میں اردو کے
ممتاز ادیب، ماہر لسانیات اور محقق جناب مسعود
حسین خاں کی خدمات کے اعتراف میں اردو کے
۱۲ ممتاز ادیبوں کی نگارشات کا مجموعہ۔

قیمت -/۵۴ روپے

خواجہ احمد فاروقی

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ــــــــ ڈاکٹر خلیق انجم

اردو کے نامور ادیب، ممتاز نقاد، انتظامی امور
کے ماہر، سابق صدر شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی
(جن کے عہد میں شعبۂ اردو، اپنے کارہائے
نمایاں کے لیے پورے ہندستان میں مشہور تھا)، کی
علمی، ادبی خدمات کا اعتراف نہ صرف ان کے
شاگردوں نے بلکہ ممتاز ادیبوں نے بھی کیا ہے۔

قیمت ۔ ۵۴ روپے

عابد علی خاں

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ــــ مجتبیٰ حسین

عابد علی خاں مرحوم ایک انجمن کا نام ہی نہیں
ایک تحریک کا نام بھی تھا۔ اس خصوصی شمارے
میں ملک کے ممتاز ادیبوں نے مرحوم کی علمی، ادبی،
سماجی اور صحافتی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔

قیمت ۔ ۵۴ روپے

ڈاکٹر اجمل اجملی

(حیات اور ادبی خدمات)

مرتبین ــــــــ ڈاکٹر علی احمد فاطمی، عذرا نقوی

اردو، ہندی کے ممتاز ادیبوں کی اہم نگارشات
کا مجموعہ، جس میں ڈاکٹر اجمل اجملی کی ادبی خدمات
کا کھلے دل سے اعتراف کیا گیا ہے۔

قیمت -/ ۵۴ روپے

پروفیسر آل احمد سرور

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتب ــــــــ ڈاکٹر خلیق انجم

پروفیسر آل احمد سرور، اردو کے ایک مشفق اور
مقتدر استاد بھی ہیں اور صاحب طرز انشاپرداز
بھی۔ ادب کے اعلا نقاد بھی ہیں اور زبان کے نباض
بھی۔

قیمت -/۵۴ روپے

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ــــــــ خلیق انجم

فرمان فتح پوری کا خاکہ جن رنگوں سے بنا ہے وہ طرح دار، دلکش، دلربا، تابناک اور پائیدار ہیں۔ کتاب نما نے اس خصوصی شمارے میں انھیں رنگوں کی جھلک پیش کی ہے۔ اردو کے بلند پایہ ادیب، نقاد، مدیر کی خدمت میں اردو کے ممتاز ادیبوں کا خراج عقیدت۔

قیمت ۲۵/- روپے

اختر سعید خاں

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ــــــــ ڈاکٹر سید حامد حسین

اختر سعید خاں نے جہاں غزل کی روایت کا احترام سیکھا وہیں شعر کے تخلیقی منصب کی پاسداری بھی سیکھی۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے انھیں زندگی کا ایک واضح شعور بخشا۔ اردو کے ممتاز غزل گو شاعر کی شخصیت اور فن پر ایک اہم شمارہ۔

قیمت ۵/- روپے

مکتبہ پیام تعلیم کی نئی کتابیں

اپریل ۹۲ء تا ستمبر ۹۳ء

سفر کے قصے	آصف فرخی	۵/-
حضرت آدم علیہ السلام	منورہ نوری خلیق	۴/-
ہم بنے کدا ٹدو	منیر احمد راشد	۵/-
خواجہ غلام السیدین (سوانح)	ذکیہ ظہیر	۵/-
میرامّن دلی والے (")	ڈاکٹر اسلم فرخی	۴/۵۰
میرزا ادیب (سوانح)	طاہر مسعود	۴/۵۰
تین بندوقچی (ناول)	مسعود احمد برکاتی	۱۰/-

مکتبہ پیام تعلیم کی کتابوں کے نئے اڈیشن

اپریل ۹۲ء تا ستمبر ۹۳ء

رسول پاک کے اخلاق	خلیل احمد جامعی	۴/-
جادو کی ہنڈیا	(ادارہ)	۶/-
چاند کی بیٹی	"	۶/-
کوئے کا خواب	"	۷/۵۰
ابو علی کا جوتا	"	۶/-
عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں	انور خاں	۷/۵۰
کھلونا نگر	(ادارہ)	۸/۵۰
سمندری طوفان اور تین لڑکے	"	۶/

مطبوعات مکتبہ جامعہ کے نئے اڈیشن

اپریل ۹۲ء تا ستمبر ۹۳ء

تاریخ الامت دوم	مولانا اسلم جیراجپوری	۲۱/-
تاریخ الامت ششم	مولانا اسلم جیراجپوری	۲۷/-
ورک بک آسان اردو	شکیل اختر فاروقی	۲۰/-
ہمارا دین اوّل	سید شہاب الدین دسنوی	۸/۵۰
" دوم	"	۸/۵۰
مقدمہ شعر و شاعری	مرتبہ: رشید حسن خاں	۲۷/-
بانگ درا	علامہ اقبال	۹/-
بال جبریل	علامہ اقبال	۶/-
ضرب کلیم مع ارمغان حجاز	"	۶/-
شعور ادب	(ادارہ)	۲۱/-
واردات	پریم چند	۲۱/-
ایک چادر میلی سی	راجندر سنگھ بیدی	۱۸/-
تاریخ الامت اوّل	مولانا اسلم جیراجپوری	۱۸/-
دروازے کھول دو	کرشن چندر	۶/۵۰
دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	۲۷/-
انتخاب قلی قطب شاہ	محمد اکبر الدین صدیقی	۲۷/-
انتخاب اکبر الٰہ آبادی	صدیق الرحمٰن قدوائی	۱۲/-

قمر قدیر ارم
ارم پبلیکیشنز
بارہ دری، مراد آباد

منٹو - ایک بے باک قلم کار

بے باکی اور وہ بھی ادب میں؟ بڑا دل گردہ چاہیے اس کے لیے، مجھے حیرت ہے منٹو جیسا نحیف و نزار شخص کیسے اس کا متحمل ہو سکا۔ شاہد احمد دہلوی نے کہا تھا اور درست کہا تھا۔

"منٹو ایسا نڈر بے باک، صاف گو افسانہ نگار آج تک اردو ادب نے پیدا نہیں کیا"

اور شاہد احمد کے یہ الفاظ آج تک حرف بہ حرف صحیح ہیں۔ منٹو کی بے باکی نے تو آگے بڑھ کر اس کو فحش نگاری کا مجرم تک قرار دلوا دیا تھا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ وہ بے باک ضرور ہے لیکن جھوٹا نہیں ہے۔ اس کے کچھ خطرناک افسانے 'بو' 'ٹھنڈا گوشت' 'کھول دو' 'کتاب کا خلاصہ' اور 'ننگی آوازیں' ہی لیجیے۔ کیا کوئی دعوے سے کہہ سکتا ہے کہ یہ صرف افسانے ہیں؟ زندگی کی سچائیاں نہیں ہیں؟ ایسی سچائیاں۔ جو ہم آئے دن اخبارات میں پڑھ کر آسانی سے قبول کر لیتے ہیں۔ ہمارا یہ فتوا کہ منٹو فحش ہونے کی حد تک بے باک ہے واقعتاً ہمارے اس ملمع کی بدولت ہے جو ہم نے اپنی اصل صورت، فطرت اور جبلت پر چڑھا رکھا ہے۔ اس اندرونی گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ کا نتیجہ ہے جو منٹو کے بے باک قلم نے ہمیں آئینہ دکھا کر پیدا کر دی ہے۔ ہم تنہا گوشوں میں چھپ کر وہ سب خود سے کہتے ہوئے ڈرتے ہیں جو منٹو بڑی آسانی اور سادگی سے لکھ دیتا ہے۔ اس کی یہ بے باکی ہمارے اس نقاب کی پروا نہیں کرتی جو ہم نے شرافت اور ضبطِ نفس کے نام پر بظاہر پہنا ہوا ہے۔ وہ ان روزنوں میں جھانکتی ہے جو نقاب میں پہلے سے موجود ہیں اور جن کے سبب ہماری اصل صورت جگہ جگہ سے ننگی نظر آتی ہے اب یہ منٹو کا ہنر ہے کہ وہ اس بے لباسی کو کس طرح برتتے۔ ٹاٹ کے پردوں سے چھن کر آتی ہوئی برہنگی اور بے حسی اپنی جگہ لیکن دوسری طرف بھولو نے اس کا ایک حصہ بن جانا قبول نہیں کیا اور دیوانگی کو گلے لگا لیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ نامرد تھا بلکہ اس لیے کہ وہ کلّن یا گاما نہیں بن سکا۔

بھولو اپنی دلھن سے کوئی بات نہ کر سکا۔ اُسے ڈر تھا آس پاس کے کھلے ہوئے کان فوراً اس کی بات نگل جائیں گے اور ساری چارپائیاں چرچوں چرچوں کرنے لگیں گی۔ دم سادھے وہ.. خاموش لیٹا رہا۔ کبھی کبھی سہمی ہوئی نگاہ سے اپنی بیوی کی طرف دیکھ لیتا جو گٹھڑی سی بنی دوسری چارپائی پر لیٹی تھی۔" (ننگی آوازیں)

یہی حساسیت دودا پہلوان میں ہے۔

"صلاحو نے نوٹ گنے۔ پورے دس ہزار تھے۔ ٹکر ٹکر پہلوان کا منہ دیکھنے لگا۔ "یہ روپیہ کہاں سے پیدا کیا تم نے؟" دودے نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ "ہو گیا پیدا کہیں سے۔" صلاحو قرقی کو بھول گیا۔ اتنے سارے نوٹ دیکھے تو اس کے قدم پھر الماس کے کوٹھے کی طرف اٹھنے لگے۔ مگر پہلوان نے اسے روکا۔ "نہیں باؤ۔" الماس کے پاس نہ جاؤ۔ یہ روپیہ قرقی والوں کو دو۔" صلاحو نے بگڑے ہوئے بچے کے مانند کہا "کیوں؟ میں جاؤں گا الماس کے پاس۔" دودے نے کڑے لہجے میں کہا "تو نہیں جائے گا۔" صلاحو طیش میں آگیا۔ "تو کون ہوتا ہے مجھے روکنے والا؟" دودے کی آواز نرم ہو گئی۔ "میں تیرا غلام ہوں باؤ۔ پر اب الماس کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"کیوں" — دودے کی آواز میں لرزش پیدا ہو گئی۔

"نہ پوچھو باؤ۔ یہ روپیہ مجھے اسی نے دیا ہے۔" صلاحو قریب قریب چیخ اٹھا۔ "یہ روپیہ الماس نے دیا ہے۔ تمھیں دیا ہے؟" "ہاں باؤ۔ اسی نے دیا ہے۔ مجھ پر بہت دیر سے مرتی تھی سالی۔ پر میں اس کے ہاتھ نہیں آتا تھا۔ تجھ پر تکلیف کا وقت آیا تو میرے دل نے کہا۔ دودے چھوڑ اپنی قسم کو تیرا باؤ تجھ سے قربانی مانگتا ہے۔ سو میں کل رات اس کے پاس گیا اور.... اور......"

اسی طرح کہانی "ہتک" کی سوگندھی ایک سیٹھ کی ادنہ سے ایسی جاگی کہ غیرت کی پتلی بن گئی۔

حساس کرداروں کی بھیڑ میں ایک خوشیا بھی ہے۔ اس کے اندر کا دلال کیسے مر گیا اور ایک مکمل مرد کیسے پیدا ہو گیا۔ اس کا اندازہ اس ایک پیراگراف سے ہو سکتا ہے۔

وہ تو کام سے وہاں گیا تھا کہ اچانک کانتا۔ یعنی کپڑے پہننے والی کانتا۔ مطلب یہ کہ وہ کانتا جس کو وہ ہمیشہ کپڑوں میں دیکھا کرتا تھا اس کے سامنے ننگی کھڑی تھی۔ بالکل ننگی ہی سمجھو۔ کیونکہ ایک چھوٹا سا تولیا سب کچھ تو چھپا نہیں سکتا۔ اگر بات یہاں تک ہی ختم ہو جاتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ خوشیا اپنی حیرت کو کسی نہ کسی حیلے سے دور کر دیتا مگر یہاں یہ مصیبت آن پڑی تھی کہ اس لونڈیا نے مسکرا کر کہا تھا۔ جب تم نے کہا خوشیا ہے تو میں نے سوچا اپنا خوشیا ہی تو ہے۔ آنے دو۔"

یہ سب تصویریں جو منٹو کے افسانوں میں ہیں دراصل اس لیے اس قدر مکمل اور قدرتی ہیں کہ مصور نے کہیں بھی ان کو غیر قدرتی رنگوں سے چھوا تک نہیں ہے۔ منٹو نے اپنی کہانیوں کے لیے جن کرداروں کا انتخاب کیا ہے ان کا خمیر اسی مٹی سے اٹھا ہے جو سب کی سانجھی مٹی ہے۔ بقول پریم گوپال متل:

اس کے اکثر پیکروں میں ہمیں اپنے کردار کی پرچھائیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ اس صورت میں ظاہری طور پر نہ سہی لیکن اندر ہی اندر رنجیدہ ہو جانا فطری ہے۔ اپنی چہار دیواری میں ہم

بنے بزدل، کتنے عیار اور کتنے ننگے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس کا اظہار کسی دوسرے پر ہو..."
متل صاحب نے درست کہا ہے اور صحیح بھی یہی ہے کہ کھوٹ منٹو کی بے باکی میں نہیں ہے ان کرداروں میں ہے جن کو اس نے تراش خراش کر اپنی اصل صورت اور ماہیت میں پیش کر دیا ہے۔ اس کی یہی بے باکی اس کی تحریر میں اجنتا الورا جیسی سچائی اور رکھراپن لے آتی ہے۔ لیکن چاہے ایشر سنگھ کلونت کور کو پھینٹے (ٹھنڈا گوشت) یا رندھیر گھاٹن لڑکی کے جسم کی بو پی کر مست ہو جائے (بو) یا شانتی کا بنتے بنتے درمیان میں ایک دم کہیں رک جانے والا موسم فصیل جسم پر بھر سے اکٹھا ہونے لگے (شانتی)۔ یہ سب اصل میں منٹو کا مقصد نہیں۔ شہر بدن کے سومناتھ سے نہیں آگے ہے اس کی منزل۔ جہاں درد کے الاؤ روشن ہیں۔ زخموں سے پیپ اور خون بہتے ہیں اور لاشعور کی جھنجھلاہٹ کی بسمل تڑپ کراہتیں بھرتی ہے۔

منٹو نے گلی کوچوں سے، فٹ پاتھوں اور قحبہ خانوں سے، اجڑی ہوئی بستیوں اور فوجی کیمپوں سے۔ کبھی سنسان اور کبھی ہنگامہ خیز راستوں سے، ریل کی پٹریوں اور عالی شان عمارتوں سے کردار اٹھائے ہیں اور انھیں ان کی حقیقی زندگی کے پس منظر کے ساتھ تمام تر شعور اور لاشعور کے پس منظر میں کینوس پر لگا دیا ہے۔ جہاں وہ اپنے اپنے ماحول میں اپنی اپنی مرضی سے مصروف عمل ہیں۔ منٹو کی تحریریں جنسی تلذذ کے لیے نہیں ہیں۔ دراصل وہ تو زہر میں بجھی ہوئی تلواریں ہیں جن میں بلا کی کاٹ ہے اسی لیے ہر سم گوپال متل نے انھیں سرجن بتایا ہے حکیم نہیں۔ ایک ایسا سرجن جو پھوڑے سے کو نشتر لگانا اچھی طرح جانتا ہے۔ کرشن چندر نے کہا تھا "منٹو! خدا تیرے قلم میں اور زہر بھر دے۔" اور جلد ملال کے الفاظ میں "منٹو کا لفظ اب ایک اسم صفت بن گیا ہے۔ اب یہ لفظ ایک خاص رجحان یا شخصیت کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔"

ہندی کہانی

افسانہ نگار:۔ عبدل بسم اللہ
مترجم :۔ قمرالاسلام جیلانی،

جیون

شام کی ٹھنڈی ہوا کا مزہ لیتے ہوئے دو آدمی ایک سنسان سی سڑک پر ٹہل رہے
اچانک ایک آدمی نے دوسرے آدمی سے کہا، آج سے دس برس پہلے یہاں جنگل تھا۔
ظاہر ہے کہ دوسرے آدمی نے بھی کچھ کہا ہوگا، لیکن اس کا مطلب بھی یہی ہے
آج سے دس برس پہلے یہاں جنگل تھا۔
جنگل! یعنی وہ جگہ جہاں جانے میں آدمی کو ڈر لگے۔ اونچے اونچے درخت، جھاڑ جھنڈ
جھربیریاں، بڑے بڑے ڈھوہ، اوبڑ کھابڑ دھرتی ۔۔۔۔۔۔
اور ایک روز اچانک کیا دیکھا گیا، کہ لڑھکتی گھسٹتی ایک بھاری بھرکم سی گا
اس جنگل میں آ کھڑی ہوئی۔
شام تک جنگل غائب تھا۔
دوسرے روز اسی طرح لڑھکتی گھسٹتی ایک دوسری گاڑی آگئی۔ اس میں
ہوئی تھیں اینٹیں اور ان پر بیٹھے ہوئے تھے لوگ۔ عورت مرد اور بچے۔
گاڑی پر سے پہلے آدمی اترے، پھر اینٹیں۔ اور پھر دھرتی پر لگنے کئی جگہ نشا
ہوئی خوب ناپ جوکھ۔ اور کھودی جانے لگی دھرتی ۔۔۔۔۔
شام تک بھر دی گئیں نیویں۔
گاڑی چلی گئی۔
آدمی رہ گئے
انھیں لگی بھوک۔ انھوں نے کھولیں اپنی گٹھریاں اور اُن میں سے نکالا آٹا۔
عورتیں چلی گئیں دِشا فراغت کو لوٹیں تو ساتھ لائیں کٹے ہوئے جنگل کی اُدھ
لکڑیاں۔
دھرتی پر جلی آگ۔ اُٹھا خوب دُھواں۔ پکیں مُلائم دبیز روٹیاں۔
اور ، اور آئے کوّے ۔۔۔۔۔
کوّے پہلی بار دِکھے تھے اُس روز اِس علاقہ میں۔
پھر تو نہ جانے کہاں سے آ گئے دو تین کتے، ٹہلنے نکل آتے کچھ گدھے، اور ایک

تو دیکھی گئی ایک گائے بھی چرتی ہوئی
ارت کا کام بہت تیزی کے ساتھ چل رہا تھا۔ تھوڑی دور پر بن رہی تھی ایک سڑک
ی اور عمارت کے پاس اُگ آئی تھیں کچھ جھونپڑیاں بھی۔
یسے بارش ہونے پر پھوٹ نکلتے ہیں دھرتی پر طرح طرح کے انکھوے۔
ہ جانے ان کے بیج کہاں سے آ جاتے ہیں مٹی کی کوکھ میں۔؟
س طرح دیکھتے ہی دیکھتے ایک ساتھ دو دو کالونیاں اُبھر آئی یہاں۔ ایک سہ منزلی
ر دوسری چھپروں والی۔
لونیاں دونوں طرف آباد ہو گئیں اچھی طرح۔
ہلے بسی وہ، جو جھونپڑیوں والی تھیں۔
ہلے بسے وہ لوگ، جو بنانے آئے تھے عمارت، بہت دور سے۔ پہلے آئے
ہ جنتو اور کیڑے مکوڑے اُسی اور
ھر بسی دوسری کالونی، عمارتوں والی۔ ٹرکوں پر بھر بھر کر آتا آیا سامان۔
ڑی بڑی وشال چیزیں۔ پھر آئے موٹے تازے لوگ۔ ۔ گوری چٹی عورتیں۔
بباروں کی طرح ہلکے پھلکے بچے۔
ور چناک چناک جل گئیں بتیاں ریشمی پردوں کے پار۔
دھم پڑ گئیں جھونپڑیوں کی لالٹین
پھر آیا نیا دن۔ اور گلزار ہو گیا پورا علاقہ
و ہے، پیاز ہے، لہسن ہے، میتھی کا ساگ ہے
ماٹر ہے، نیبو ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔: چلا اٹھا اپنا ٹھیلہ ڈھکیلتا ہوا سبزی والا۔
ھٹ پھٹ۔ ۔ ۔ ۔ ربر میں بندھے ہوئے اخبار پھینکے جانے لگے گھروں میں۔
صفائی والی آئی۔ دھوبی آیا۔ مالی لے آیا گلاب، چنبیلی
اور کیکٹس کے گملے۔
اتوار کو آ گیا ردی والا۔
خریدے اس نے پرانے اخبار — انگریزی کے تین روپیہ کلو
ہندی کے ڈھائی روپیہ کلو۔
خالی بوتلیں — دودھ کے بیس پیسہ میں اور شراب کی ایک روپیہ میں۔
پھر جھونپڑیوں سے لوگ نکلنے لگے صبح سویرے ڈھونڈنے کو کوئی نیا کام
اور کام ہر کوئی کو ملا نگر میں۔ کسی کو کچھ، کسی کو کچھ۔ کام کا کیا ہے
کام تو بس کام ہے۔ نوکری کے اپنے درجے ہیں، کام کا کوئی درجہ نہیں۔
اسی طرح گھر کا بھی کوئی درجہ نہیں۔ درجے ہیں کوٹھیوں کے۔ گھر کا کیا ہے،
جہاں بس جائیں پریوار، وہیں بن جاتا ہے گھر۔

اور بنائے گھر اُن آدمیوں نے نہیں، جنھوں نے بنائی تھیں عمارتیں۔
مٹی کی دیواریں، کھوس اور پولیتھن کے چھپّر عورتوں نے
لیپ پوت کر بنائے آنگن جگمگ۔ آنگنوں میں بن گئے جہاں تہاں
چوکھٹے رنگ رنگ۔ دھرم تنگ بچوں نے روپ دیے آس پاس گیندے کے پودے
پودوں میں نکل آئے پیلے کتھئی پھول۔
جہاں جنگل تھا، بس گیا پورا کا پورا ایک جیون وہاں۔
ایک روز پاس کے درختوں تک پہنچ گئی یہ خبر سنی
وہاں کی چڑیوں نے غور سے یہ بات اور چنچل ہو اٹھے اُن کے پنکھ۔
"اری سُنا تو، نے کچھ؟ یہیں، بالکل پاس میں بس گیا ہے ایک پورا کا پورا
جیون۔ یہاں ابھی کچھ روز پہلے گھنا جنگل تھا، ہم جاتے تھے
کبھی کبھی سیر کے لیے وہیں پر، بالکل وہیں رہنے لگے ہیں آدمیوں کے پریوار۔"
"ارے! کیا سچ؟ تب تو وہاں آئے ہوں گے دانے بھی۔ گیہوں، چاول، دال۔"
"ہاں ری ہاں وہیں تو۔"
چڑیوں نے آپس میں کچھ کھُسر پھُسر کی اور اُڑ چلیں وہاں سے۔
چڑیاں لائیں اپنے ساتھ گھاس کے تنکے، کھر پتوار۔ کوئی چونچ میں،
کوئی اپنے پنجہ میں۔
ہر جوڑا گھس گیا ہر فلیٹ میں۔ کسی نے رکھا اپنا سر و سامان
ٹیوب لائٹ کے اوپر اور کسی نے روشن دان میں۔
پھر بننے لگے ایک ساتھ کئی کئی گھونسلے۔
چوں چوں۔ چیں چیں کی بھر گئی آواز علاقہ بھر میں۔
گھس بیٹھ۔ ۔ ۔ ۔ ناجائز قبضہ۔ ۔ ۔ !
چڑیوں کی یہ گھس بیٹھ راس نہ آئی کسی کو۔ گھس پیٹھ
پسند نہیں کرتا کوئی بھی شریف آدمی۔
اور اجاڑ دیے گئے گھونسلے ایک ایک کر کے سبھی۔
مل گیا مٹی میں چڑیوں کا سامان پل بھر میں۔
چڑیاں خوب روئیں، خوب روئیں اس روز میدان میں بیٹھ کر
مگر پھدک اٹھی اچانک ایک گوریاں جھلک کر۔
"اری دیکھو تو اُس اُور بھی جیون ہے۔"
"کہاں؟ ارے ہاں!"
اور اڑ چلیں پھر وہ اپنے سر و سامان کے ساتھ
جھونپڑیوں کی طرف۔

وہاں آنگن میں پھیلے ہوئے دانے تھے، جھوٹھے برتنوں کے پاس
بکھرا تھا پکا ہوا چاول۔
چڑیوں کو نہ منع کیا کسی نے دانوں کے لیے، نہ منع کیا
سرد ساماں رکھنے کے لیے۔
اور چڑیوں نے اس روز گایا ایک خوبصورت میٹھا گیت۔
رات میں عورتوں نے ٹھمکا تی ڈھولک اور گایا انھوں نے بھی
ایک میٹھا گیت۔

گاؤ ری گاؤ سکھی
گا گا سُنا ؤ سکھی
سب سکھیاں مل جُل
گاؤ ری　مل مل
کہ منگل گیت کوئی آج ۔ ۔ ۔

اور اگلے دن عمارت والوں نے لکھا سرکار کے نام ایک پتر۔
مانّنیہ شری مان سرکار مہودیہ،
ہم آپ کا دھیان اس اُور آکرشت کرنا چاہتے ہیں کہ
ہمارے گھروں کے سامنے بنائی ہیں بھدّی بھدّی کچھ جھونپڑیاں
نامہذب اور گنوار لوگوں نے۔ یہاں جلاتے ہیں وہ آگ اور اٹھتا ہے خوب دھواں۔
ان کے چھپّروں میں رہتی ہیں چڑیاں، جو آجاتی ہیں روشندان سے اُڑ اُڑ کر ہمارے گھروں
میں اور پھیلا جاتی ہیں کچرہ۔ ہوتا ہے خوب گانا بجانا رات رات بھر اور خراب ہوجاتی
ہے ہماری نیندیں۔
اس لیے نویدن ہے کہ۔۔
اور ایک روز دیکھا گیا کہ علاقہ میں صرف
عمارتیں ہی عمارتیں تھیں، جیون کہیں نہیں تھا۔

(تبصرہ نگار کی رائے سے (اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

اختر سعید خاں

کتاب نما کا خصوصی شمارہ

مہمان مدیر : ڈاکٹر سید حامد حسین
مبصر : ثریا رحمٰن
قیمت : ۱۵۱ روپے
ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

کتاب نما کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ زندہ اشخاص پر خصوصی نمبر کے ذریعے اس مشہور و معروف شخصیت کے بارے میں ہر طرح کا مواد ایک ساتھ جمع کر کے پیش کرتا رہا ہے۔ اختر سعید خاں کے متعلق خصوصی گوشہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اردو کی اب بھی بہت سی قدآور زندہ شخصیتیں ایسی ہیں جن کی زندگی اور فنی خصوصیات کے بارے میں عام قاری کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ یا وہ ایسی شخصیات ہیں جن کے بارے میں نقاد ان کی زندگیوں میں کچھ لکھنے سے ہچکچاتے ہیں۔ مبادا وہ ناراض ہو جائے یا وہ ان کی باتوں پر گرفت نہ کرے۔ کتاب نما کے اڈیٹر جناب شاہد علی خاں صاحب نے ان سب پر خصوصی گوشہ شائع کرنے کا پروگرام مرتب کیا ہے۔

اختر سعید خاں کبھی نام و نمود کے پیچھے نہیں بھاگے۔ انھوں نے مشاعروں میں بھی شرکت کم ہی کی۔ رسالوں میں بھی کم ہی شائع ہوتے رہے۔ اس لیے شمالی ہند کے اکثر قاری ان کی بیش بہا خدمت سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کر سکے۔ وہ مدھیہ پردیش میں ترقی پسند تحریک سے روح رواں رہے ہیں۔ اپنے صوبے اور جنوبی ہند کے علاقوں میں وہ اس تحریک سے وابستہ لوگوں کے لیے مشعل راہ کا کام دیتے رہے ہے۔ نئی نسل کے لوگ بھی انھیں اپنا رہنما مانتے ہیں۔ مدھیہ پردیش میں ادب کی ترویج و ترقی کے لیے ان کا نام ہمیشہ سرِ فہرست رہے گا۔ شمالی ہند کا نام قاری اگر ان سے ناآشنا رہا تو یقیناً اس میں ان کی انکساری کا بھی دخل رہا ہے۔ جو نام و نمود اور شہرت سے ہمیشہ دور ہی رہی۔ اختر سعید خاں کے خصوصی

گوشے سے اب اس سلسلے کی بھی شروعات ہوئی ہے جس سے گوشۂ عافیت میں بڑی عظیم شخصیتوں کی تمام عمر کی قربانیاں اور خدمات بھی سب کے سامنے آسکیں گی۔
۱۲۸ صفحے کے اس گوشے میں ان کے سوانحی کوائف، ان کی شاعری، ان کے ادبی نظریات، ان کے تنقیدی مضامین کا پورا احاطہ کیا گیا ہے۔ ساتھ میں ان کی چند غزلیں بھی اس میں شامل کی گئی ہیں۔ جن سے اس کی افادیت اور بڑھ جاتی ہے۔ گوشے میں مہمان مدیر کے علاوہ جناب علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، رشید حسن خاں، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر قمر رئیس، یوسف ناظم، مظفر حنفی، عزیز قریشی، وقار حسین، پروفیسر ایم۔ اے شاد، ملک نسیم اور دیگر اہل قلم کے مضامین شامل ہیں۔
ساتھ ہی اختر سعید خاں کے بھی اپنے بارے میں " میں اور میرا فن " اور دیگر احوال بہے کے عنوان سے مضامین شامل ہیں۔ ' میں اور میرا فن ' میں غزل سے اپنی وابستگی کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ " بنیادی طور پر میں غزل کا شاعر ہوں اور میرا فن غزل کے محور پر گردش کرتا ہے۔ میری نظر میں غزل شعری جمالیات کا سب سے خوب صورت اظہار ہے۔ میں غزل کو عشق کی زبان سمجھتا ہوں۔ لیکن خود عشق کو کسی ایک جہت تک محدود نہیں سمجھتا۔ غزل کا حرف شوق حیات و کائنات کی تفسیر بن سکتا ہے لیکن خود حیات و کائنات کی تفسیر اس وقت تک غزل کا شعر نہیں بن سکتی جب تک نوائے شوق نہ ہو...... غزل پرانی اقدار کے حسن کی بھی پاسدار ہے....... وہ قدیم و جدید کی آمیزش اور آویزش کو چمکاتی ہے۔ لیکن نغمہ کوئی ہو گاتی ہے اپنے ساز پر...... وہ ایک آنسو ہے۔ پلکوں پر ٹھہرا ہوا۔ ایک تبسم ہے جو ہونٹوں پر پھیلا ہوا۔ کبھی اس کے تبسم میں اشکوں کی نمی ہوتی ہے اور کبھی اشکوں میں تبسم کی جھلک...." اپنی خوب صورت مترنم غزلوں کی طرح وہ اتنی ہی خوب صورت نثر بھی لکھتے ہیں۔ کاش انھوں نے نثر پر کچھ اور توجہ کی ہوتی۔ کتاب کے آخر میں اختر ستان کے عنوان سے ان کی نگارشات اور ان پر لکھے گئے مضامین کا اشاریہ بھی شامل ہے تاکہ اختر سعید صاحب کی ادبی خدمات پر آئندہ کام کرنے والوں کو سہولت ہوجائے۔ یہ گوشہ ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔ کتابت اور طباعت بھی عمدہ ہے۔ ●○

مرقع دہلی

مصنف : درگاہ قلی خاں (فارسی)
مرتب و مترجم : ڈاکٹر خلیق انجم (اردو)
سنہ اشاعت : ۱۹۹۳ء
ضخامت و قیمت : ۲۵۲ صفحات، ۱۲۰ روپے
مبصر : رفعت سروش

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

اقبال کا یہ شعر ایک کلیّہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ شاعرِ مشرق کو تاریخ اور انسان کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے عروج و زوال پر کس قدر عبور حاصل تھا۔ یہی وہ دور ہے جب دلی میں حضرت شاہ ولی اللہ اپنی اصلاحی اور انقلابی تحریکات کے ساتھ سرگرم عمل تھے اور ان کے ساتھ ان کے شاگرد مولانا حسین قلق، مولانا نورالله وہالوی اور مولانا محمد امین کشمیری اور ان سب کے ساتھ ان کے فرزند شاہ عبدالعزیز سرگرم عمل رہے۔ کتاب 'مرقع دہلی۔ دہلی کے اس دور کی جھلکیاں پیش کرتی ہے۔ جب ہماری قوم شمشیر و سناں سے ہاتھ اٹھا چکی تھی۔ بابر، اکبر اور اورنگ زیب کی تلواروں کو زنگ لگ چکا تھا۔ نادر شاہ کے حملے نے رہی سہی طاقت بھی سلب کر لی تھی۔ اور ہابتی کا پتی قوم نے اپنے حواس مجتمع کرنے کے لیے اپنے وجود کو شراب میں غرق کر دیا تھا۔ ارباب نشاط کی ہلہ زلہ تھی عوام و خواص نے امرد پرستی جیسے مذموم اور غیر فطری فعل کو جنسی آسودگی کا ذریعہ بنالیا تھا۔ اور ہوس پرستی کے اخلاق سوز مناظر کھلی تفریح گاہوں اور اعراس کی محفلوں میں عام تھے۔ اکثر خانقاہیں عیاشیوں کے مرکز تھیں اور بہ قول مرتب کتاب

"چونکہ اس سماج میں صوفیا کی بہت عزت تھی اس کے تصوف سماجی عزت و وقار حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ بن گیا اور بڑے بدکردار لوگوں نے اس مسلک کو اختیار کرکے پیسہ کمانے کا ایک بڑا ذریعہ بنالیا۔"

ایسے میں اتفاق سے ایک صاحب درگاہ قلی خاں دہلی وارد ہوئے جون ۱۷۳۸ء میں اور ۲۳ جولائی ۱۷۴۱ء کو نواب آصف خاں کے ساتھ واپس دکن چلے گئے۔ اس تین سال کے عرصے میں درگاہ قلی خاں نے دہلی میں اختلاطِ حیات کے جو مناظر دیکھے وہ انھوں نے قلم بند کر دیے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان قلم بند واقعات کی اہمیت تاریخی ہو گئی۔ آج اس تحریر کے چار مخطوطات کا علم ہے اور چاروں کی روشنی میں متنی تنقید کے شہوار ڈاکٹر خلیق انجم نے فارسی متن کی نوک پلک درست کی اور پھر اس کا اردو ترجمہ کیا، اور ترجمہ اتنا خوب صورت، بامحاورہ اور رواں دواں ہے کہ اس پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ اس پر مستزاد ڈاکٹر خلیق کا پرمغز مقدمہ، حواشی، درگاہ قلی خاں کے حالات زندگی، تعلیقات اور آخر میں اشاریہ۔ ان تمام خصوصیات نے مل کر اس کتاب کو بے نظیر بنا دیا ہے۔ کتابت، طباعت، کاغذ سب کچھ اعلا درجے کا ہے۔ خلیق انجم صاحب ہر اعتبار سے دادِ تحسین کے مستحق ہیں۔

مجھے ذاتی طور پر اس کتاب کو 'مرقع دہلی' کہنے میں قدرے تامل ہے۔ اس لیے کہ باوجود سماجی ابتری اور اخلاقی انحطاط کے دہلی کبھی اتنی یک رخی نہیں رہی جتنی، درگاہ قلی خاں کو نظر آئی۔ اصل فارسی متن میں صرف دو بازاروں کا ذکر کیا ہے۔ جن کی رنگارنگی اور چہل پہل سے دلی کی عوامی زندگی کا اندازہ ہوتا

ہے۔ چوک سید اللہ خاں اور چاندنی چوک۔ اس کے علاوہ چار مقامات ایسے ہیں جو تفریح خانے ہیں اور جہاں کھلم کھلا عیاشیاں ہوتی ہیں۔ چودہ پندرہ مزاروں کا ذکر ہے۔ وہاں اعراس کی محفلوں کا تذکرہ ہے۔ اور اکثر جگہ ارباب نشاط کی موجودگی ہے۔ تقریباً اس کتاب میں صوفیوں اور مشائخ کا ذکر ملتا ہے اور نو شاعروں کا جو اس وقت حیات تھے۔ مگر یہ ذکر بھی رواداری میں ہے مصنف نے طوائفوں لونڈیوں مخنثوں کا ذکر خوب مزے لے لے کر کیا ہے۔ ان ارباب نشاط کی تعداد پچاس کے قریب ہے۔ پھر کچھ گویے، سازندے اور مرثیہ خواں ہیں بڑی تعداد میں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس وقت دہلی میں شرفا بالکل ہی ناپید تھے۔ عالم دین، دیگر علوم جیسے تاریخ، نجوم، اور علم ہندسہ کے ماہر، طبیب۔ وغیرہ۔ قلی خاں شاید دہلی کے اس طبقے تک نہیں پہنچ سکے۔ عمارتیں اگر نظر آتیں تو بس وہی جن سے ضعیف الاعتقادی وابستہ ہے۔ مثلاً قدم شریف، یا کچھ درگاہیں جو چند منشیات کے ساتھ فحاشی اور بدکرداری کا مرکز تھیں۔ کیا درگاہ قلی خاں کی نظر سے قطب الدین کی درگاہ کے پاس قطب کی لاٹ، جہاز محل اور شمسی تالاب وغیرہ اوجھل ہو گئے تھے۔ کیا حوض خاص، پرانا قلعہ، شیر شاہ کی بنائی ہوئی مسجد، ہمایوں کا مقبرہ شاہجہاں آباد کی فصیلیں اور دروازے، کوٹلہ فیروز شاہ اور سب سے بڑھ کر لال قلعہ، جامع مسجد مسجد فتح پوری، سنہری مسجد اور دیگر مساجد۔ جو آباد تھیں اور جہاں اس دور انحطاط میں بھی لوگ نمازیں پڑھتے تھے۔ بالکل ہی غائب ہو گئی تھیں۔ — کیوں۔ !! کہیں اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ قلی خاں صاحب ایک مخصوص عینک لگا کر آئے تھے۔ ایک مخصوص قسم کی لہو و لعب سے بھرپور زندگی جینے دلی آئے تھے۔ اور اپنے مافی الضمیر کو انھوں نے دلی کی عشرت گاہوں اور عیاشی کے مختلف زاویوں کی مدد سے پیش کیا۔ بے شک یہ بھی ایک تصویر ہے مگر یک رخی۔ **اگر اٹھارھویں صدی** میں دہلی کی عیاشوں کا حال جاننا ہو تو یہ کتاب بے شک ایک مرقع ہے۔ اگر محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالنے والوں کا حال جاننا ہو، اگر دہلی کی صنعت و حرفت سے واقفیت حاصل کرنا ہو، اگر شرفائے دہلی سے ملنا ہو، اگر دہلی اور شاہ جہاں آباد کی تاریخی عظمت کی سیر کرنا ہو تو 'مرقع دہلی' کا مطالعہ کر کے مایوسی ہوگی۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ مغل حکومت کی کمزوری اور پے بہ پے بیرونی حملوں نے۔ بالخصوص نادر شاہی تلوار نے جو تباہی مچائی تھی اس سے اخلاقی گراوٹ کس قدر آئی تھی اس کی تصویر اس 'مرقع دہلی' میں مل جائے گی۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اس کتاب کے حدود میں رہ کر ہی اگر بات کریں تو یہ کتاب 'مرقع دہلی' نہ ہونے کے باوجود ایک عمدہ کتاب ہے۔

اور اپنے مصنف کے تخلیقی ذہن کی خوب صورت تحریروں سے مزین ہے جگہ جگہ چونکا دینے والے فقرے اور تشبیہیں ملتی ہیں۔ اور ڈاکٹر خلیق انجم نے اردو ترجمہ کرتے وقت ان کے حسن کو باقی رکھا ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے مقدمے میں صحیح فرمایا ہے کہ یہ کتاب اٹھارویں صدی کی تہذیبی زندگی کے سلسلے میں ایک اہم ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔ خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جو موسیقی کے بارے میں معلومات فراہم کرنا چاہتے ہیں۔ ایک کہکشاں ہے موسیقاروں کی جن کی صفات قابلِ تحسین ہیں۔ اسی طرح اس زمانے کی طوائفوں اور مخنثوں اور لڑکوں کی دلربائی کی داستانیں (مختصر الفاظ میں) جس انداز سے پیش کی گئی ہیں۔ وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ ہر صاحبِ نظر کو کرنا چاہیے کہ ایک دور کا ایک مخصوص شعبۂ حیات زندہ اور متحرک سامنے آجاتا ہے۔

کتاب کی طباعت نہایت معیاری ہے۔ اس لیے قیمت ۱۹۰/- روپے زائد نہیں ہے۔

دوپہر کا سفر

شاعرہ : ملکہ نسیم
تبصرہ نگار : اقبال مسعود
قیمت : ۴۰ روپے
ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

ملکہ نسیم کے اوّلین شعری مجموعہ کا نام "دوپہر کا سفر" بامعنی اور بلیغ ہے۔ دوپہر کو سورج نصف النہار پر ہوتا ہے اور کسی بھی فن کار کے لیے اس بلندی پر پہنچنا اس کی آرزو اور حوصلہ مندی کی دلیل ہے۔ تو دوسری سمت یہ ہی دوپہر کا سفر، پیاس، صعوبت اور جہد مسلسل کی علامت بھی ہے اور بے چینی اور آبلہ پائی کے باوجود منزل پر پہنچنے کی لگن بھی۔

ملکہ نسیم کی شاعری میں اظہار کی وہی بے چینی محسوس کی جا سکتی ہے جس سے کائنات کو درد، سوز و ساز اور رنگ و آہنگ ملا ہے۔ اور جو غالب کے لفظوں میں نشاط کار کا باعث ہے۔ اگرچہ ان کی شاعری کی عمر زیادہ نہیں کہ ان کی شاعری کا آفتاب ابھی نصف النہار پر نہیں پہنچا ہے۔ مگر ان کی فن پر گرفت کمزور نہیں ہے۔ الفاظ کا دروبست۔ مطالعہ۔ خیالات میں تازگی اور امنگ کے ساتھ شائستگی اور ایک وقار موجود ہے۔

دوپہر کے سفر کے مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ ملکہ نسیم کے شعری ویژن

کی زمین، گھر کی چہار دیواری۔ ماں کی محبت، ممتا اور ازدواجی زندگی کے نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ اپنے شہر، ملک اور پوری دنیا پر محیط ہے۔ ان کے اشعار میں اگر ایک طرف مدت کے بعد گھر لوٹنے کی آرزو اور گھر کو ویسا ہی دیکھنے کی تمنا ہے کہ جیسے وہ چھوڑ کر آئیں ہیں یا پھر یادوں کا اس طرح چھن جانا کہ جیسے بھیڑ میں ماؤں سے بچے بچھڑ جاتے ہیں یا بچپن میں دیوار پر بنائی تصویر کا بارش سے دھل جانے کا غم۔ یا ماں نگہداشت کرے جیسے بچے کی اور ممتا کی ندیاں پلکوں سے چھنا شامل ہے تو دوسری طرف ان کو آرمینا میں آنے والا زلزلہ بے چین کر دیتا ہے۔ بھوپال گیس حادثہ ان کے لیے تخلیقی مواد بن جاتا ہے۔ شہر کے ہنگامے ان کے یہاں بامعنی اشعار میں ڈھل جاتے ہیں۔ فکری سطح پر وہ مہالکشمی کے پل کے اس طرف ہیں جہاں مجبوروں اور مقہوروں کی دنیا آباد ہے۔ جہاں ظالم کو ٹوکنے کی جسارت بھی ہے اور نیزوں پر سچائیوں کو سر سجانے کی ہمت بھی اور لفظ و اظہار پر قابو و قدرت بھی ورنہ ایسے انوکھے، بانکے اور طرحدار شعر نہیں لکھے جاتے۔

ہوائے صبح نا آسودگی اچھا کیا تو نے
کتاب زندگی کے کچھ ورق تو بھی اڑا لائی

جیسے تھکا پرندہ ٹھہر جائے شاخ پر
اس طرح اشکِ غم سرِ مژگاں ٹھہر گئے

زندگی تجھ کو تو پاتا تھا ہمیں آبِ حیات
زہر کیسا یہ رگ و پے میں اترتا جائے

اس گاؤں کی وہ دلہن کس کس کے لیے روئی
اک شخص نے پوچھا ہے ڈولی کے کہاروں سے

ہزاروں مسئلے، پرکھوں کا قرض، فاقہ کشی
خود اپنے آپ میں ہر شخص ایک قبیلہ ہے

یہ اور اسی قبیل کے دوسرے اشعار سے ملکہ نسیم کے شعری سرمایہ کا ایک وسیع کینواس بنتا ہے اس کے باوجود کہیں کہیں اشعار میں ایسے لفظ بھی آ گئے ہیں جن سے گریز کرنا ہی بہتر تھا۔ کیونکہ یہ خوب صورتی مخمل احساس میں ٹاٹ کا کھردرا پن جیسا ناگوار گزرتا ہے جیسے ؎

ــــ مرے خوابوں کے سارے رنگ جس کی مٹھیوں میں ہیں

یا

جزیرہ پانیوں میں کھو گیا ہے۔

ملک نسیم اگرچہ غزل کی شاعرہ ہیں مگر زندگی کے بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کی تصویر کشی کے لیے صنف غزل کے آداب نہیں برتے جا سکتے۔ اور وہ لہجہ بھی نہیں اپنایا جا سکتا جو غزل کا مخصوص لہجہ ہے۔ اس لیے انھوں نے نظم میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ دو پہر کا سفر میں ۱۷ نظمیں بھی شامل ہیں۔ جن میں یہ " نفرتیں کیوں" "بازگشت" ۔ "بے حسی" "سالِ نو" اور "سوال" خوب صورت نظمیں ہیں۔ غزل اور نظم دونوں کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی بات کو سلیقے اور بے باکی سے کہہ جانا بڑی چابک دستی اور مہارت کا نام ہے۔ ملک نسیم نے زیر تبصرہ مجموعہ میں اسی چابک دستی اور مہارت کا جگہ جگہ ثبوت دیا ہے۔ یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اور آگے اور آگے بڑھیں گی۔ اور اپنا وہ منفرد لہجہ پائیں گی جو ان کے رگ گلو میں پرورش پا رہا ہے۔

دو پہر کا سفر ملک نسیم کا پہلا مجموعہ ہے۔ یہ نقش اولین ہے مگر دل و دماغ پر اچھا تاثر چھوڑتا ہے۔ مجموعہ انتہائی سلیقے سے شائع کیا گیا ہے۔ کتاب کا سرورق جاذب نظر اور بامعنیٰ ہے اور رنگوں کا تناسب خوب ہے۔ کتاب میں اختر سعید خاں نے ملک نسیم کی شاعری پر مضمون تحریر کیا ہے۔ جب کہ فلیپ پر سردار جعفری، مجروح سلطان پوری اور مخمور سعیدی کی آرا درج ہیں۔ کتاب کی قیمت ساٹھ روپے ہے۔ جو موجودہ گرانی کے پیش نظر اس خوب صورت کتاب اور بہتر کلام کے لیے کم ہے۔ ●●

اردو مثنوی مطالعہ اور تدریس

مصنف : ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
تبصرہ نگار : تاباں نقوی
قیمت : ۱۰۰/- روپے
ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی ۲۵

مثنوی کو ہمارے کلاسیکی ادب میں نویں صدی ہجری سے بیسویں صدی تک خاصی اہمیت حاصل رہی۔ موجودہ دور اختصار میں جہاں ناول کی جگہ مختصر افسانے نے لے لی ہے مثنوی بھی اپنی روایتی قدر سے محروم ہو گئی۔ ماضی میں سیکڑوں مثنوی لکھی گئیں کچھ امتداد وقت سے تلف ہو گئیں کچھ ہمارے تہذیبی سرمایہ کے طور پر محفوظ ہو گئیں، مثنوی میر حسن اور مثنوی گلزار نسیم کو آج بھی کسی حد تک قبول عام حاصل ہے۔ لیکن جو مثنویاں

توجہ سے محروم ہیں ان کا اپنا ایک خاص تاریخی اور تہذیبی مقام ہے زبان کے تدریجی ارتقا کے علاوہ ان سے عہد رفتہ کے کلچر تہذیب رسوم معتقدات شادی بیاہ کی تقریبات ملبوسات زیورات ہنگامی حالات حوادث اور عوامی زندگی کے سبھی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور اگر دقت نظر سے مطالعہ کیا جائے تو بین السطور میں سیاسی اور معاشی مسائل کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں ایسی مثنویاں جنرل ہسٹری ہی کا ایک معتبر حصہ ہیں۔ اس لیے ان کا تحفظ ادبی اور تہذیبی تاریخ کے محققین کے لیے بطور خاص مفید ہے زیر نظر کتاب کی لائق مصنفہ کا تعلق دکن سے ہے اور دکن کے ادب اور تاریخ پر ان کی گہری نگاہ ہے۔ زیر نظر کتاب کے علاوہ کئی اور تحقیقی کتابیں ان کے ذوق تحقیق کی آئینہ دار ہیں۔ "شعور زبان" اک ایسی مقبول کتاب ہے جس کے متعدد اڈیشن شائع ہو چکے ہیں "کتابیات اردو مثنوی" طلباء تحقیق کے لیے ایک قابل قدر کتاب ہے۔ انگریزی زبان میں "آوٹ لائن آف اسلامی کلچر" ایک لائق ستائش کارنامہ ہے۔ موجودہ کتاب میں تقریباً ۱۵ مثنویوں کے اقتباسات مع سوانح مصنفین شامل ہیں۔ کتاب میں ان پر اجمالی تبصرہ ہے اور سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مصنفہ نے جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے اسے مطالعہ اور تدریس کے نقطۂ نظر سے مرتب کیا ہے ظاہر ہے کہ تدریس کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو ادبیات اردو کے تعلق سے کار تحقیق میں مصروف ہیں۔ شاہ برہان الدین جانم کی مثنوی "ارشاد نامہ" جو ۹۹۰ھ کی تصنیف ہے ڈھائی ہزار اشعار پر مشتمل ہے یہ ہندی بحر میں ہے اور اس پر کھڑی بولی اور برج بھاشا کا اثر نمایاں ہے۔ اس قبیل کی اور بھی کئی مثنویاں ہیں جن سے زبان کے تدریجی ارتقا پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں عبدل بیجاپوری "ابراہیم نامہ" احمد گجراتی کی "یوسف زلیخا" غواصی کی "سیف الملوک بدیع الجمال" "طوطی نامہ" "مینا ستونتی" مقیمی بیجاپوری کی "بے نظیر" رستمی کی "خاور نامہ" نشاطی کی "پھول بن" نصرتی کی "علی نامہ" روشن علی کی "عاشور نامہ" اسمٰعیل امروہوی کی "معجزۂ انار" سراج کی "بوستان خیال" وغیرہ ان کے علاوہ دور آخر میں میر تقی میر کی دو مثنویاں "در ہجو خانۂ خود" مرزا محمد رفیع سودا کی "بے رونقی شاہجہاں آباد" اور دربیان "شدت گرما" میر حسن کی "سحر البیان" اور دیا شنکر نسیم کی "گلزار نسیم" وغیرہ کے اقتباسات شامل ہیں۔

مذکورہ تمام مثنویوں کو تاریخی ترتیب سے شامل کتاب کیا گیا ہے جو خاصا تحقیق طلب اور تھکا دینے والا کام تھا بڑے سلیقے سے انجام دیا گیا ہے۔ ان کا حصول مطالعہ، فٹ نوٹ میں مشکل الفاظ کی تشریح، انتخاب اقتباسات مصنفہ کے اپنے موضوع سے گہرے شغف کا ثبوت ہیں۔ تدریس کے باب میں دیے گئے مشورے کتاب کی منفرد حیثیت کی علامت ہیں۔

کتابی سائز عمدہ کتاب وطباعت خوب صورت گیٹ اپ مجلد اور گرد پوش سے مزین ہے

کتاب ان سبھی لوگوں کے لیے قابل مطالعہ ہے جو اردو کے منظوم ادب سے خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں یا اس موضوع پر ریسرچ کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں۔ ۱۵۰ صفحوں پر پھیلی ہوئی مجموعے کے لیے کتاب خود آپ اپنی سفارش ہے یہ بھی قابل توجہ بات ہے کہ مصنف اگرچہ "ترقی اردو بیورو" آر۔ کے پورم نئی دہلی کی ڈائریکٹر ہیں لیکن یہ کتاب انھوں نے بیورو کی معرفت طبع نہیں کرائی۔ ●●

خموشی بول اٹھی ہے
(شعری مجموعہ)

شاعر: عبدالاحد ساز
ناشر: قلم پبلیکیشنز، پاروکوٹ اسٹریٹ، بمبئی ۳
قیمت: ۴۴ روپے
مبصر: نظام الدین نظام
ملنے کا پتا۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، بمبئی ۳

ہیئت و اسلوب کے تجربوں کے سفر اور فکری و موضوعاتی منظر نامے کے مطالعے کے بعد آج کا ہر باخبر شاعر یہ محسوس کر رہا ہے کہ اب شاعری "روایتی" "ترقی پسند" اور "جدید" نہ ہو کر صرف عصری شاعری ہے۔ عبدالاحد ساز نے بھی اپنی اوّلین شعری تصنیف "خموشی بول اٹھی ہے" کے پیش لفظ میں اسی خیال کا اظہار کیا ہے اور غالباً اسی احساس کے تحت ساز نے یہ فیصلہ کن اقدام بھی کیا کہ اس نے اپنی بیس سالہ شعری کاوشات کو کتابی شکل میں ایسے موسم میں پیش کیا کہ جو اس کے متوازن شعری رویّے کے حق میں سازگار بھی ہے۔

۱۹۲ صفحات کے اس مجموعۂ کلام میں غزلیں نظمیں اور رباعیات شامل ہیں۔ ان تین مختلف اصنافِ سخن میں لہجے کی انفرادیت کو باقی رکھنا ہر چند کہ بے حد مشکل مرحلہ ہے، تاہم ساز نے اپنی شناخت قائم رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے، اور یہی اس کے حوصلہ مند ہونے کی دلیل ہے۔

اِک عمر گزاریں گے سرِ نوکِ قلم ساز
اک شعر کسی دل میں چبھو جائیں گے اک دن

ساز کی غزل روایت اور جدّت کا امتزاجی تنتگی کی بھی زبان کی عطا اور عصری صداقتوں کے معنی خیز اظہار سے آراستہ ہے۔ موضوعات کی تلاش میں ساز نے فنی اظہار کی پیچیدگیوں اور سرشاریوں کو کئی پہلو سے یک جا کیا ہے

اور باریک کیے جاتا ہوں میں نوکِ قلم
تیز تر سوزنِ اظہار ہوئی جاتی ہے

دیوار نہیں پردۂ فن بند قبا ہے
اک جنبشِ انگشت کہ مہتاب کھلیں گے

سنوارنا کوئی آساں نہیں ہے کاکلِ فن
ذرا ہوا سے بھی اُلجھے تو بال بال بنے

ساؔز کے یہاں جن موضوعات پر بار بار اشعار ملتے ہیں، زندگی، موت، بقا، جسم، حاصلِ سفر، قربت، حسنِ فطرت اور جمالِ ہم نشیں۔ یہ موضوعات اشعار میں ڈھلتے ڈھلتے شاعر کے مزاج کی شوخی، گناہگار شرافت، متمدن وحشت اور نیازمندانہ جسارت سے آمیز ورانگیز ہو کر لہجے اور رویّے کی سطح پر اپنی ایک دھندلی سی شناخت ضرور قائم کر لیتے ہیں ؎

ارتقا ہے تدریجِ شرحِ کربِ آگاہی
آرزو کی قوموں سے یاس کے قبیلوں تک

عبدالاحد ساؔز کی نظمیں موضوع کے اعتبار سے دو متوازی خطوط پر چلتی ہیں ایک تو موڈس، کیفیات اور جمالیاتی رابطوں کی نظمیں اور دوسرے فکر آگہی، اور عصری احساس کی نظمیں۔ قوسِ قزح، ملکوتی، بس تقریبِ ملاقات، انتظار باقی ہے، پہلی نہج کی اہم اور خوبصورت نظمیں ہیں۔ دوسری نہج کی نظمیں یقیناً زیادہ اہم اور توانا ہیں۔ آخری دور کے انسان، بارات نور زادوں کی، و تانی آماں کی وفات پر ایک نظم" "جملۂ تسلیم، عوج بن عنق، وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو ستّر سے ستّی تک کہی گئی اہم اور نمایندہ نظموں میں شامل کی جا سکتی ہیں۔ خاص طور پر "آخری دور کے انساں" اور عوج بن عنق ؎

ہر اِک کے بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی کے ناخن کی بن میں
پھنسا ہوا ہے
اِک سادہ سا کاغذ
اعمال کے کورا صفحہ / دونوں کالم خالی / کوئی گناہ نہ کوئی ثواب!
نیچے کراماً کاتبین نے بس اتنا سا لکھا ہے:
کوئی عمل تحریر کے قابل تھا ہی نہیں
لکھنے کا کچھ کام نہیں ہوتا تھا
ہم ان لوہے کے کاندھوں پر بیٹھے اکتایا کرتے تھے۔
(آخری دور کے انساں)

اُس کے دائیں ہاتھ میں جکڑے ہوئے تھے
کارخانے، کمپنیاں، بازار، بینک
اور بائیں ہاتھ پر اس کے دھرے تھے
بار، تھیٹر، ہوٹلیں، جوئے کے اڈّے، قحبہ خانے
سرنگوں اُس کے انگوٹھے کے اشاروں پر سیاست کی مشینوں کے بٹن
(عوج بن عنق)

"خموشی بول اٹھی ہے" ستّر کے بعد روشناس ہونے والی شعری نسل کے ایک اہم اور نمایندہ شاعر کی تصنیف ہے۔ جسے عصری اردو شاعری کے سنجیدہ قارئین اور طالب علموں کی خاطر خواہ توجہ بھی ملنی چاہیے اور معاصرین اور ناقدین کی التفات بھی

کھلے خطوط

مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● اکتوبر کا کتاب نما، ملا۔ باقر مہدی کی غزل پڑھ کر دل میں ٹیس اٹھی۔ اچھی غزل ہے۔ مجھے امید ہے کہ مقطع میں جو بات انھوں نے کہی ہے، وہ ان کی اپنی زندگی کی حقیقت نہیں ہوگی۔

شمس الرحمٰن فاروقی کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میرے مضمون کو با معنی پایا۔ اور لکھا۔

"ہجو در مذمتِ نظام حاضر" میں آخری شعر یہ تھا:

بدلے جو نظام قشقی

چہروں پہ آجاتے آپ

قشقی کی جگہ قشقی چھپ گیا ہے۔ ایک نقطہ زیادہ ہونے سے معنی بدل گئے ہیں، اور ایسے کہ یہ شعر اس طرح مجھ سے منسوب ہو تو برا ہوگا، بہت برا ہوگا۔

کتاب نما کل ہی ملا۔ دلی سے یہاں تک انسان پیدل چل کر چار پانچ گھنٹوں میں پہنچ سکتا ہے، لیکن خط کے سفر میں پندرہ روز لگتے ہیں۔ بلڈ پریشر کچھ کم ہو تو مضامین پڑھوں۔

کمال احمد صدیقی، صاحب آباد، یوپی

● پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر زار علامی، کمال احمد صدیقی اور شمس الرحمٰن فاروقی نے خانہ بگوشی کی یاد تازہ کردی۔ حریف پر بغرض یلغار کیا کیا تراکیب تراشی گئی ہیں، مزہ آگیا، معلومات میں جو اضافہ ہوا سو ہوا۔ فاروقی صاحب نے اپنے مضمون "سخن فہمی علامی و شاگردانِ علامی" کے نیچے "یہ مصرع ہے" لکھا ہے۔ مجتبیٰ حسین سے بھی ایک مصرع سرزد ہو گیا ہے۔ "تنہا لہ کر ادب میں خلا پیدا کرنا بڑی بات ہے"

ابن فرید کا خط پڑھا بات کا بتنگڑ بنانا دوسری بات ہے۔ لیکن دکانوں پر اردو میں سائن بورڈ لگانا، آبیل مجھے مار کے مترادف ہے۔

ستمبر کے شمارہ میں منیر سیفی کو کاتب نے نیّر سیفی لکھ دیا ہے۔ اسی شمارہ میں نظیر مزمل نے علی سردار جعفری کے شعر

منایا جائے گا جشن مسرت سونے کھنڈروں میں

اندھیری رات میں روشن چراغ جشم تر ہوں گے۔

میں "کھنڈروں" پر اعتراض کیا ہے۔

مسدس حالی سے دو مصرعے ملاحظہ کیجیے

وہ رنگیں محل اور وہ ان کی صفائی

جمی جن کے کھنڈلوں پہ ہے آج کائی

فیروز اللغات اور فرہنگ آصفیہ میں کھنڈر بر وزن بندر ہے لیکن یہ لغات کیا حرف آخر ہیں؟۔

ہندی ادب میں کھنڈہر اور اردو میں کھنڈر (نون غنہ) مستعمل ہے۔

فاضل مراسلہ نگار نے جمع کو تذکیر کے بجائے تانیث لکھا ہے۔

منیر سیفی، پٹنہ۔

اردو کی بدنصیبی

● جناب گربچن چندن صاحب کا مقالہ

اردو صحافت کے تشنہ گوشے "ستمبر ۹۳ء کے شمارہ نمبر ۹ میں پڑھا - محترم شاہد صاحب (اڈیٹر کتاب نما) اور چندن صاحب اردو سماج کے سامنے کڑوے سچ لانے کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں - جو کچھ چندن صاحب نے صحافت کے لیے کہا ہے وہ کم و بیش اردو کے دوسرے اداروں کے لیے بھی درکار ہے -

اردو کی سب سے بڑی بدنصیبی یہی رہی ہے کہ یہ اُس " ماں باپ " کی اولاد ہے جنھوں نے اپنے باہمی اختلافات اور رنجشوں کے پیشِ نظر اپنے بچے کو ادھر اُدھر بھٹکایا اور رلایا - اُسے دُلار تو دیتے رہے مگر پیار کسی نے نہیں دیا - وہ ہندو ہوں یا مسلمان - دونوں کی وفا اُن کی غزلوں کے مصرعوں تک بنی رہی مگر روح اور کردار میں کبھی نہیں اُتری -

میں جب کبھی " اردو کے ہندو شاعر " اردو کے غیر مسلم ادیب " وغیرہ وغیرہ عنوان پر کتابیں اور مضامین دیکھتا ہوں تو ایک دھکا سا لگتا ہے - جیسے کسی مسلمان کا اردو شاعر یا ادیب ہونا ایک نیچرل بات ہے اور غیر مسلم کا اردو زبان پر عبور کوئی عجوبہ ہے - یہ بے حد تنگ نظریہ ہے اور کسی طرح سے بھی اسے ادبی معرکہ تسلیم کرنا جائز نہیں -

مجھے بے حد خوشی ہے کہ کتاب نما اس عام رویّے کے برعکس اردو کو ہندستان کی اور زبانوں کی طرح ایک زبان تصور کرتا ہے اور جس طرح سے اردو اور اردو دانوں کی خدمت کر رہا ہے وہ ایک مثال ہے - کوئی زبان کسی مذہب یا فرقے کی ملکیت نہیں ہوتی اور اردو بھی کسی ایک کی نہیں -

اگر وقت نے ساتھ دیا تو مکتبہ جامعہ سے کتاب نما کے لیے اسی کڑی سے پیوستہ دو مضمونوں کی بھیک ضرور مانگوں گا - میں ایک بار پھر محترم شاہد صاحب کو اور چندن صاحب کو اُن کی غیر جانبدارانہ کاوش پر مبارکباد پیش کرتا ہوں -

درشن لعل کپور، ۲۴ - تیغ بہادر روڈ (ڈونیہیں پیش صمات حاضر ہیں) دہرہ دون -

● اکتوبر ۹۳ء کا " کتاب نما " نظر نواز ہوا - مہمان مدیر جناب انیس الرحمٰن صاحب نے ہندستان میں اردو ادب کی صورتِ حال پر اچھا مضمون رقم کیا ہے - موصوف نے ہندستان کے اردو ادب سے متعلق دانشوروں کو دوسری زبانوں سے تراجم کے ذریعہ علم نچوڑ کر لانے کی ترغیب دی ہے - جو ایک اچھی صلاح ہے -

ڈاکٹر حمید اختر ہمدرد معنوی، میرٹھ -

● " کتاب نما " کے ستمبر ۱۹۹۳ء کے شمارے میں جناب سُدرشن کمار درد کی وفات سے متعلق اُن کے گہرے دوست جناب پرکاش ناتھ پرویز کا خط شائع ہوا ہے - درد صاحب میرے حقیقی بڑے بھائی تھے - وہ اسٹیٹ بینک آف انڈیا، لوکل ہیڈ آفس، نئی دہلی میں اسسٹنٹ جنرل منیجر تھے - وہ اچھے شاعر، مقرر اور منتظم تھے اور کئی تہذیبی اور ادبی انجمنوں کے رہنما رہے - میری ایک طویل نظم میں جو میرے ادبی سفر کے کرم فرما اور عزیز احباب پر محیط ہے اور " اسباق "

کے زیر ترتیب شمارے میں شامل کی
گئی ہے وفتہ صاحب پر مندرجہ ذیل
شعر شامل ہے:

جو ہے نام درد کیا ہوا وہ ہے کیف زیست کا آسرا
کوئی غم کے سائے سے اجنبی، دلوں کی خوشی کہیں اور ہے!

یہ شعر ۱۲ فروری ۹۳ء کو درد صاحب کے جنم
دن پر موزوں ہوا تھا جب انھوں نے
عمر کے ۸۰ برس پورے کیے تھے۔ ابھی ان
کی ملازمت کے ۲ برس باقی تھے اور وہ
بظاہر بہت اچھی صحت کے مالک تھے۔
۹ اپریل ۹۳ء کو اپنے گھر میں دل کا دورہ پڑنے
سے اُن کی موت واقع ہوئی جب وہ چند
عزیزوں کے ساتھ خوش گپیوں اور تاش
کھیلنے کا لطف حاصل کر رہے تھے۔
ان کی بے وقت موت ان کے کثیر تعداد
پرستاروں، دوستوں اور خاندان کے
افراد کے لیے بہت بڑا المیہ بن کر نازل
ہوئی۔ اُن کی وفات سے متعلق میرا کلام
"راجستھان پتریکا" جے پور (ہندی کا روزنامہ)
میں شائع ہو چکا ہے۔

کیلاش چندر ناز ۸۰، نیو راجا پارک رام گلی نمبر ۲
جے پور۔

● ستمبر ۹۳ء کے شمارہ میں میرے خط میں
میں کاتب نے نیر سیفی کو تیر سیفی لکھ دیا ہے
نیر سیفی بھارت میں کوئی (مشہور نام) نہیں
ہے۔

شعری حصہ گذشتہ شماروں پر بھاری
ہے۔ میں کتاب نما کو اغلاط سے پاک دیکھنا
چاہتا ہوں اسی لیے خامیاں مجھے کھلتی ہیں۔
مندرجہ ذیل مصرعے نظر ثانی کے محتاج ہیں ؎

حمید سورتی ؎ (۱) سچائی جن کے لبوں تک آ گئی
(۲) جو محض تھی سازش تاریکی محض بے وزن درج ہے
(۳) او وٹ کی قیمت ہو گئی بعد دھرم - دھرم بے وزن درج ہے
دین و دھرم کے بجائے دین اور دھرم کہنا تھا۔

ہمایوں ظفر زیدی ؎
(۱) ہوا کے رُخ پہ ہی شمع اک جلا دی ہے۔
شمع اک کے بجائے شمع وفا کہنا تھا ؎
(۲) کہ اس نے ضبط کی دیواریں گرا دی ہے۔
دیواریں کے بجائے دیوار ہی کہنا تھا ؎
(۳) ہمارا شہر بہت حادثوں کا عادی ہے۔
شاید کاتب نے بہت کو مت کر دیا ہے

درشنی لعل کپور ؎
(۱) ضمیر میں لپٹا ہوا ایماں سا لگا۔
درشن جی اس بحر میں ایماں کا قافیہ لانے
کی کوشش مت کیجیے۔

قسیم سہسرامی، پرنسپل، سر اقبال اکیڈمی،
پوسٹ پیروا، سعو جیپور، بہار۔

● فیضی سے منسوب مقولے "سخن فہمی عالم
بالا معلوم شد" کے بارے میں نزار علامی کا مضمون
اگست کے شمارے میں اور کمال احمد صدیقی
کا مضمون "عروض معروض" ستمبر کے شمارے
میں دیکھا۔ کمال احمد صدیقی کا نظریہ زیادہ
قابل فہم ہے۔ عروض کی جتنی کتابیں مل سکیں
اسی میں ہزج کے زحافوں کے جدول دیکھے۔
فعولُ زحاف مفاعیلن کا کہیں نہیں ہے۔
نئے زحاف بھی تراشے جا سکتے ہیں لیکن
جیسا کہ کمال احمد صدیقی نے لکھا ہے، عروض
اخرب کے علاوہ کسی اور مقام پر حکم معاقبہ
کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی، اور وہ بھی
رباعی کے آہنگوں میں۔ یعنی عیلن کے
دونوں ساکن ایک ساتھ ساقط نہیں

کیے جا سکتے۔ اس لیے قطع نظر محذوف مزاحف سوائے عروض و ضرب کے کہیں نہیں رکھا جا سکتا۔ زارؔ نے سراسر دھاندلی کی ہے کہ اسے حشو میں رکھا ہے۔

میں نے اردو فارسی میں کہیں یہ آہنگ نہیں دیکھا۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے مقالہ لکھتے وقت ہندستان میں فارسی اور اردو شاعری کا سارا سرمایہ کھنگالا تھا لیکن کہیں پر یہ آہنگ نہیں ملا۔ کمال صدیقی کا مطالبہ حق بہ جانب ہے کہ زارؔ نظیر میں اساتذہ کا کلام پیش کریں۔

میں کمال صدیقی کے استدلال سے اتفاق رکھتا ہوں۔ اگر زارؔ علامی اُن کے نکات کا جواب نہ دے سکیں اور نظیریں نہ پیش کر سکیں تو انھیں اپنی غلطی کا اعتراف کھُلے دل سے کر لینا چاہیے۔

اس بات کا افسوس ہے کہ کمال احمد صدیقی نے اپنے اسلوب کے بجائے جارحانہ اسلوب اختیار کیا۔ شاید اس لیے کہ بلا وجہ زارؔ نے "آہنگ اور عروض" پر جملہ معترضہ کے طور پر اور کمال صدیقی کو خفیف کرنے کے لیے لغو اور غلط اعتراض کیے۔ انھیں چاہیے تھا کہ کمال احمد صدیقی کی اس کتاب پر الگ سے مضمون لکھتے۔ اس بحث میں اس کی گنجائش تھی ہی نہیں۔

ڈاکٹر حسین ماجد۔ ذاکر نگر، نئی دہلی۔

یہ آپ کے استقلال اور لگن کا نتیجہ ہے کہ "کتاب نما" اتنی خوبصورتی اور باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ یوں تو کوئی کام ہو اقتصادی گرفت سے مبرّا نہیں ہے مگر اردو زبان تو ایک ایسے موڑ پر آ گئی ہے کہ اسے زندہ رکھنے کے لیے تو ایثار اور مشنری اسپرٹ کی بھی ضرورت ہے۔ خدا آپ کو بلند حوصلگی اور کتاب نما کو لمبی عمر عطا کرے۔ جولائی کے شمارے میں شیخ سلیم احمد صاحب کا مضمون "ترقی پسندی کی فکری اساس" بہت دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب میرے کرم فرما ہیں مگر اُن کا ساختیات کے بارے میں مضمون اب عام قاری بلکہ اہلِ قلم حضرات کے لیے بھی کنفیوژن کا باعث ہو رہا ہے۔ یہ ساختیات اور رد ساختیات کی بحث بہت طویل ہو چکی ہے (آئی، ایم۔ مہتا کیفؔ۔ جھانسی)

شعیب حسین حسان کو صدمہ

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ پیامِ تعلیم کے سابق اڈیٹر مرحوم حسین حسان ندوی کی بڑی صاحبزادی اور شعیب حسان کی ہمشیرہ صفیہ حسان کا معمولی علالت کے بعد کراچی میں انتقال ہو گیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ صفیہ بی بی جامعہ میں اپنی شرافت اور بردباری کی وجہ سے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ کارکنان مکتبہ جامعہ شعیب حسان کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔

مہاراشٹر اردو اکیڈمی بمبئی کی تشکیل نو۔

جناب ولاس راؤ دیشمکھ۔ (وزیر کلچرل افیرس) (صدر) ارون دیوکر۔ (ریاستی وزیر کلچرل افیرس) (نائب صدر) علی سردار جعفری (کارگزار صدر) ممبران کے نام یہ ہیں۔
گوند سروپ (سکریٹری کلچرل افیرس) یوبا پٹھان، ندا فاضلی، ہارون رشید (علیگ) محترمہ فاطمہ انیس، جناب حسن عباس فطرت، پروفیسر ابراہیم فیض، سید نصرت علی، ڈاکٹر ارتکاز افضل، ڈاکٹر مدحت الاختر، رام پنڈت، حبیب رضا خاں فہیم احمد صدیقی، عبد الاحد ساز، خالد آرائی، ڈاکٹر سمیع اللہ خاں، ابوبکر صدیقی، جی۔ ایم صدیقی، قاسم امام، جناب معین الدین عثمانی، اقبال خان حیات خان، عبد الغنی شیخ، (انڈر سکریٹری) ممبر سکریٹری (سید وقار حسن قادری) سپرنٹنڈنٹ / ایگزیکیٹو آفیسر مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی۔

ترقی اردو بورڈ کی تشکیل نو،

عزیز قریشی نائب چیرمین، قرۃ العین حیدر اور شجاع خاور نئے ممبر

مرکزی حکومت کی وزارت فروغ وسائل انسانی نے سرکاری گزٹ کے مطابق، ترقی اردو بورڈ کی میعاد ختم ہونے پر نئے بورڈ کی تشکیل کردی گئی ہے۔ نو تشکیل شدہ بورڈ۔
مرکزی وزیر برائے فروغ وسائل انسانی چیرمین ہیں۔ عزیز قریشی چیرمین اردو یونی ورسٹی کمیٹی کو نائب چیرمین بنایا گیا ہے۔

ممبران میں شہرۂ آفاق ادیبہ

قرۃ العین حیدر اور مشہور شاعر شجاع خاور کو نامزد کیا گیا ہے۔ یہ دونوں ممبران زبان و ادب کے تحقیق کاروں کے زمرے میں بورڈ میں شامل کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ نئے نامزد ممبران اس طرح ہیں۔
پیشے ماہرین: ڈاکٹر انعام الحق چیرمین راجستھان اردو اکاڈمی۔ شریف الحسن نقوی۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد۔ جموں یونی ورسٹی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ۔ پروفیسر حامدی کاشمیری اور احمد سعید ملیح آبادی اڈیٹر آزاد ہند کلکتہ۔ کشمیری لال ذاکر کو بچوں کے ادیب کے زمرے میں بورڈ میں شامل کیا گیا ہے۔

جامعہ کے سینئر سیکنڈری اسکول پرنسپل کو صدمہ

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ دی جارہی ہے کہ جناب محمد شکیل اللہ خاں صاحب قائم مقام پرنسپل سینئر سیکنڈری اسکول کی ہمشیرہ کا ۴ اکتوبر ۹۳ کو رات ساڑھے بارہ بجے انتقال ہو گیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُوْن۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔
کارکنانِ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، محمد شکیل اللہ خاں صاحب کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے۔ آمین۔

(نوٹ) ادبی و تہذیبی خبروں کے کالم میں مختصر ترین خبریں ہی اشاعت کے لیے قابلِ قبول ہوں گی۔ (ادارہ)

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانبدارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ
کتاب نما
نئی دہلی ۲۵

دسمبر ۱۹۹۳ء جلد ۳۳ شمارہ ۱۲

فی پرچہ	6/=
سالانہ	55/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	75/=
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک)	170/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک)	320/=

ایڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

TELEPHONE 630191

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات، نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

غزلیں/نظمیں

طنز و مزاح

جائزے

اپنے دل کی حفاظت کیجیے۔ حسرت سے فراق تک۔ اجنبی شہر۔ خدا بخش جرنل ۷۵ تا ۷۷۔ فیضِ رحمت و خلقِ عظیم۔

کھلے خطوط اور ادبی تہذیبی خبریں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی کتابیں

اپنے دل کی حفاظت کیجیے
ڈاکٹر لیفٹیننٹ کرنل کے ایل چوپڑا ۲۵/-
سرسید یادگاری خطبات - پروفیسر مونس رضا اور
پروفیسر مسعود حسین خاں ۱۰/-
حضرت یحییٰ (بچوں کے لیے) منورہ نوری خلیق ۳/-
نقوشِ سیرت اوّل (بچوں کے لیے) حکیم محمد سعید ۵/-
" " دوم " " ۵/-
" " سوم " " ۵/-
" " چہارم " " ۵/-
" " پنجم " " ۵/-
دادی اماں کی کہانیاں (کہانیاں) آصف فرخی ۶/-

EXPERIMENTS IN ENGINEERING CHEMISTRY
(for undergraduate engineering students)
Dr. Masood Alam 51/-

نئی مطبوعات

یہ جہاں اور ہے (طویل افسانے) ابن فرید ۹/-
کاغذ کی دیوار (افسانے) محافظ حیدر ۵/-
یادیں " کوثر رحمٰن ۲۸/-
تیر و نشتر (اقوال) جوگندر سنگھ پرنسپل ۶/-
آدم خور چیتا (شکاریات) ریاض احمد خاں ۴۵/-
اسلامی نظام تعلیم کے خد و خال
مرتبہ مظفر حسین غزالی ۴۵/-
اردو شاعری میں نعت (اوّل) ڈاکٹر اسماعیل آزاد ۱۰۰/-
" دوم " ۸۰/-
مجلہ - انجمن طلبہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر
مدیر طارق اعجاز اعظمی
اتر پردیش میں اردو افسانہ ۱۹۶۰ء کے بعد
ڈاکٹر عبداللہ چودھری ۱۰۰/-

سرورق سعید الظفر چغتائی

ہندستانی رنگ (مضامین، لسانی جائزہ)
مرتب ڈاکٹر محمد حسن ۵/-
اس گھر کو آگ لگ گئی - (۱۸۵۷ء کے غداروں کے خطوط)
سید عاشور کاظمی ۱۲/-
خواجہ معین الدین چشتیؒ (سوانحی دستاویز)
ڈاکٹر شعائر اللہ خاں وجیہی ۲۵/-
کلید عروض (فن عروض) ڈاکٹر ادم پرکاش زار علامی ۱۵/-
اسلامی رسمیں اور تیوہار ۷/-
دوا اور دعا سے علاج خواجہ شمس الدین ۱۰/-
چار فتنے ترتیب صوفی جلال الدین
شعاعِ نقد (مضامین) نادم بلخی ۸۰/-
فیض احمد فیض افکار و اقدار - ڈاکٹر شفیق اشرفی ۱۰۰/-
فیض احمد فیض بحیثیت نقاد " ۶۰/-
حدیثِ دل (شعری مجموعہ) سلطان احمد تسنیم ۱۰۰/-
سوغاتِ منظر (غزلیات) منظر مرتضیٰ پوری ۶۰/-
روشن جزیروں کا سفر (شعری مجموعہ) انور مینائی ۱۰/-
شبِ چراغ (شعری مجموعہ) بختیار ضیا ۵۰/-
مغرب کے نغمے (تخلیقی مضامین) کرشن مراری ۵/-
نئی صبحوں کے سفیر (خاکے) کشمیری لال ذاکر ۱۵۰/-
میزانِ قدر (مضامین) ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ۱۰۰/-

دوسرا اور پانچواں سرسید یادگاری خطبہ

سرسید اور روایت کی تجدید پروفیسر مونس رضا

سرسید اور اردو یونیورسٹی پروفیسر مسعود حسین خاں

مرتبہ خواجہ محمد شاہد

سرسید یادگاری خطبات کا سلسلہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن دہلی نے ۱۹۸۶ء میں شروع کیا تھا۔ اب تک چار ممتاز دانشوروں کے خطبات شائع کیے جا چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ بھی اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ قیمت ۱۰/ روپے

مہمان مدیر
سید الظفر چغتائی
شعبہ فزکس
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشاریہ

سائنسی دور میں ادب کی افادیت

زندگی تخلیقی عمل ہی سے قائم ہے جس کی کافوریت [illegible] سے فنونِ لطیفہ وجود میں آتے ہیں۔ رقص و موسیقی، خطاطی اور مصوری کا حلقۂ اثر زیادہ وسیع ہے کیوں کہ وہ ہر کسی کی سمجھ میں آسکتے ہیں اگر کوئی سمجھنا چاہے، اور لطف و انبساط کا سرچشمہ کھول دیتی ہیں، چاہے اِس سے لطف اُٹھانے پر آمادہ شخص کسی زبان، ثقافت یا تہذیب کا ماننے یا نہ ماننے والا ہو۔ جسے ہم "ادب" کہتے ہیں، اسکینڈی نیویا میں اسے صراحت کے لیے "خوبصورت ادب" کہا جاتا ہے، کیوں کہ سائنسی حقیقتیں جہاں اور جس طرح لکھی جاتی ہیں وہ بھی بڑا عزت و وقار والا ادب ہے۔ خود سائنسی افسانویت Science Fiction حقیقت اور تخیل کے ملاپ سے وجود میں آ کے مدتوں سے ادب کا حصہ مانی جا رہی ہے۔

—— اور جناب، وہ خوبصورت ادب جو افسانہ ہے، ناول ہے، داستان ہے، جگ بیتی ہے، شعر ہے، اس کا جادو جاگتا رہتا ہے مگر وقت کے تقاضوں کا ماتحت نہ ہوتے ہوئے بھی، ان سے متاثر ہو کے تاثر جتنا گہرا اور بے ساختہ ہوتا ہے، ادب اتنا ہی معیاری مقبول، دیرپا اور خوبصورت ہوتا ہے۔ یہی تاثر اور انسانی شعور میں سما کے اُبھرنے کی اس کی خصوصیت ہے جو مقامی اور وقتی باتوں کو آفاقیت بخش دیتی ہے اور وہ منیشرہ دختِ افراسیاب ہو یا انا کرے نینا ان کی زندگی کے آلی کرب کو مشرق و مغرب سے آزاد اور وقت کی پرواز سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

وقت سب سے بڑا نقاد اور محتسب ہے۔ وقت کیمیاگری بھی سکھاتا ہے اور کھرے کھوٹے کو پرکھتا بھی ہے۔ اور وقت خود ہم ہیں، حادثوں کے دھارے پہ بہنے والے جس لمحے اسے تھوڑا سا بھی موڑ دیں —— تو وہ ان کا زمانہ ہو جاتا ہے۔ ہمیں نے پچھلے ہزاروں برس سے فطرت کا مطالعہ کیا اور چیزوں کے خواص پر غور کیا ہے۔ پھر جتنی اچھی طرح بن پڑا اپنے خیالوں اور نتیجوں کو پرکھا ہے۔ سچائی کی یہی طویل اور کٹھن تاریخ سائنس کی داستان ہے۔ اسی داستان نے ہمارے ذہن کو ڈھالا، بدلا اور مہمیز کیا ہے اور برابر اس کا عمل جاری ہے۔

ادب انسان کے ذہن کی خلاقی ہے اور سائنس سچائی کے لیے، اس کی تلاش کے

جانچے پرکھے نتیجے۔ نتیجے جو ہزار مختلف طریقوں سے پرکھے جا چکے ہوں اور سچے اترے ہوں مگر ایک ہزار اوّل بار کے نئے تجربے پر سبک پڑ جائیں تو بدل دیے جائیں گے۔ ہم سائنس والوں کو مطلق سچائی کی تلاش ہے اور ہم ہر گھڑی اپنی اصلاح کے لیے تیار رہتے ہیں۔

ان کوششوں نے جو ذہن بنایا ہے اور بنائی بدلتی ڈھالتی چلی جارہی ہیں، اسی ذہن کی خلاقی نیا ادب سامنے لاتی ہے۔ اس لیے اچھے اور بڑے ادب پر اپنے زمانے کی چھاپ ہوتی ہے۔ آج کا اچھا ادب تاریخ، جغرافیہ، فلکیات، کیمیا، حیاتیات، فزکس اور ریاضیات سے بھی کم از کم اتنا ہی اثر لیتا ہے اور اپنے بیانات کو ان علوم کی کسوٹی پر اتنا ہی سچا ثابت کرتا ہے جتنا معاشیات، نفسیات، سیاست اور لسانیات وغیرہ پر۔ آج ہم کوئی کہانی سنیں جس کا پتا نامعلوم ہو تو بچکانی لگتی ہے۔ حالات تاریخی پس منظر سے ہم آہنگ نہ ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ کوئی تجربہ بیان ہو، انسانی تجربہ جس کی تصدیق نہیں کرتا تو جھوٹ اور افترا کے سوا کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ مثالیں دینے کا موقع نہیں۔

دنیا کی ہر چیز اچھی یا بری اور اعلا یا گھٹیا ہوتی ہے۔ ادب بھی ایسا ہی ہے۔ اور وہی چیز گنی جاتی اور مذکور ہوتی ہے جو اعلا ہو۔ اگر نئے ادب کا انتخاب دنیا بھر میں پھیل رہا ہے اور اپنوں بیگانوں سے خراج تحسین وصول کررہا ہے تو اس لیے کہ وہ وقت کے تقاضوں اور معیار پہ پورا اترتا ہے۔ اُس وقت کے تقاضوں پر جس کی پہچان کو سائنس یعنی حقیقتِ اشیاء کے عرفانِ مطلق کا نام نامی ملا ہے، اور بہار طور پر۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ لکھا جارہا ہے اور لکھا گیا ہے، اس کا ایک بہت تھوڑا حصہ ہی معیاری ہے اور تھا وہی سائنس یا علم کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے اور وہی کسی عاقل و بالغ کے درست و توانا ذہن کو چھوتا اور خوش کرتا ہے۔ مگر یہ سچ ہے کہ آج جو کچھ لکھا جارہا ہے۔ اس میں سے بہت کم ایسا ہے جو سائنس اور سماجی علوم سے متاثر نہ ہوا ہو۔

سبھی لکھنے والے جانتے ہیں کہ اچھا ادب لکھنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جارہا ہے کچھ اور نہ ہوتا تب بھی نئی بات کہنا یا کم از کم نئے معتبر ڈھنگ سے کہنا کم مشکل نہیں ہوتا۔ اور اب نئی اور کم عمر زبانوں کی تاریخ میں بھی تنا ور ادیب اور ادب پارے موجود ہیں۔ سائنسی کاوشوں نے ایک حد تک اس کام کو مشکل بنایا ہے مگر بڑی حد تک نئی باتیں، نئی حقیقتیں، نئے اعداد و شمار مہیا کرکے نئے خوابوں، خیالوں کے میدان کھول دیے ہیں اور تخئیل و تخیل دونوں کے لیے مکان و زمان کی وسعتوں کو پھیلتی کائنات کی طرح وسیع تر کردیتا ہے۔ معتبر ادیبوں شاعروں کو اپنا اور اپنے ادب کا بھرم قائم رکھنا ہے اور نیا، معتبر، توانا، جھنجھوڑنے اور چوٹ کرنے والا، گدگدانے اور خوش کرنے والا ادب اپنے زمانے، ماحول اور علوم کی روشنی میں تخلیق کرتے رہنا ہے۔

لکھنے کے لیے زبانوں پر عبور ہونا ضروری ہے مگر یہی کافی نہیں۔ زبان کے استعمال کے لیے نئے علوم سے مَس ہونا ضروری ہے۔ مضمون نہ ہو تو عبارت آرائی کام نہیں آتی۔

اب رہا یہ سوال کہ سائنس کے دور میں تخئیلی ادب لکھا ہی کیوں جائے؟ تو عرض کروں گا اس لیے کہ انسان کی تخلیقی خواہش نئی بات نئی طرح سے کہنے سننے پر اکساتی ہے۔ نوبل انعام یافتہ آلفرڈ کاستلیر نے جرمن نظموں کا مجموعہ یادگار چھوڑا ہے اور اوپن ہائی مر نے گیتا تک کا ترجمہ پڑھا تھا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ کچھ لوگوں کو کچھ کرتے رہنے کی عادت پڑ جاتی ہے، دوسروں کو کچھ نہ کرنے کی۔ دونوں اپنی عادت سے مجبور ہوتے ہیں۔ تو جناب، ادیب بھی مجبور ہے اور اُسے لکھنا ہی لکھنا ہے، اچھا لکھے یا بُرا۔ اپنے عہد یا تاریخ کی دردمند اور خوش گوار آوازوں کو ادیب زیادہ دردمند اور زیادہ خوش گوار یا دونوں کیفیتوں کا سنگم بنا کے پیش کرتا ہے تو انسانیت جاگ پڑتی ہے، بیمار کو یک لخط قرار آجاتا ہے اور فعّال ذہن زیادہ مستعد ہو جاتے ہیں۔ سچائی کا راستہ زیادہ تن دہی سے طے کرنے لگتے ہیں۔

سائنس اور ادب کے ازلی و ابدی رشتے کو مصوّر کرنے کے لیے حکیم نطشے کی، ایک جرمن نظم کی تلخیص پر یہ گفتگو ختم کرتا ہوں۔

چڑیا

اے خوبصورت، خوش الحان چڑیا
تو اس طرح کیوں مست گا رہی ہے؟
تجھے سُن کے میرا کلیجا نکلا پڑتا ہے
میں لمبے سفر کا تھکا مسافر ہوں
ابھی بہت دور جانا ہے
اور تیرے نغمے ہیں کہ دل میں اُترتے چلے جاتے ہیں
تو میرے بڑھتے قدموں کو اور تیز کرنا چاہتی ہے
یا روک دینا؟
اے خوش منقار، تو کیوں گا رہی ہے؟

ارے نہیں، ارے نہیں
اے خوش منقار
میرے تھکے قدم یوں ہی چلتے رہتے
تیری آواز میرا بوجھ ہلکا کیے تھی
اور سفر کا حوصلہ بڑھا رہی تھی
تو نے کیا غضب کیا
تو نے گانا کیوں بند کر دیا؟

رسالہ ہندستانی الہ آباد (۱۹۳۱ء۔ ۱۹۴۸ء) سے انتخاب

اردو ادب

اس مجموعے میں ظفر الاحسن لاری، عبدالسلام ندوی سیماب اکبرآبادی، گنپت سہائے سریواستو، رفیق حسین بھگوت دیال ورما، سید مبارز الدین احمد رفعت، مہیش پرشاد وغیرہ کے مضامین شامل ہیں۔
قیمت ۵۰/ روپے

اردو لغت

اس مجموعے میں سید مسعود حسن رضوی، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، عبدالباری آسی، محمد اجمل خاں، سلیم جعفر، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور نعیم الرحمٰن کے اہم مضامین شامل ہیں۔ قیمت ۴۰/ روپے

چند ادبی مشاہیر کی تحریریں

میر، سرشار، جلال، اقبال، اصغر گونڈوی، محمود شیرانی، ٹیگور، سروجنی نائیڈو پر لکھے ہوئے مضامین نیز ان ادیبوں میں سے اکثر کے لکھے ہوئے مضامین اس گلدستے میں شامل ہیں۔ قیمت ۔ روپے

اردو ہندی ہندستانی

یہ مجموعہ ہے اظہر علی، سید ابوالقاسم، سعید انصاری محمد اجمل خاں، کرشن پرشاد کول، تارا چند وغیرہ کے اہم ترین مضامین کا۔ قیمت ۴۰/ روپے

ہندی ادبیات

اس مجموعے میں نور الحسن نیر کاکوری، طاہر محسن علوی، اقبال ورما، سید رشید الحسن، کشتہ قادری اور محمد ضیاء الدین کے مضامین شامل ہیں۔
قیمت ۶۰/ روپے

تاریخ

اس مجموعے میں آغا مہدی حسین، بینی پرشاد، بنارسی پرشاد سکسینہ، سید مقبول احمد صمدنی محمد تقی احمد، پریاگ دیال، شوکت تھانوی، پروفیسر عبدالباسط، حکیم شمس اللہ قادری، اور ایچ۔ اے آر گبب کے مضامین شامل ہیں۔ قیمت ۶۰/ روپے

سائنس

اس مجموعے میں شبیر احمد غوری، رفعت حسین صدیقی، صدر الدین عظیم، امداد حسین خاں، مقبول الرحمٰن [illegible] عباسی، راغب بدایونی، جعفر حسن، محمد [illegible] الدین اور پروفیسر منہاج الدین کے اہم ترین مضامین شامل ہیں۔ قیمت ۶۰/ روپے

خدا بخش لائبریری "جرنل" اڈیٹر عابد رضا بیدار
(۵۔۷۔۷۷)

خدا بخش لائبریری کا یہ جرنل نہایت اہم ترین مضامین کا مجموعہ ہے اس میں امیر خسرو پر بھی مضمون ہے اور سکوں کے اشعار پر بھی۔ مخطوطات شناسی پر بھی اور بابری مسجد اور رام جنم بھومی پر بھی۔ مسلمان اور سائنس پر بھی اور مسٹر جناح پر بھی۔
قیمت ۵۱/ روپے

ہندستان اپنے حصار میں ایم جے اکبر
مترجم۔ مسعود الحق

ایم جے اکبر کی معرکتہ الآرا کتاب جس نے انگریزی میں شائع ہوتے ہی ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔ اس کتاب میں ہندستان کی سیاست کے تاریک گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ایک اہم دستاویز۔
قیمت ۱۰۰/ روپے

پروفیسر محمد حسن
ڈی ۔ ۷ ماڈل ٹاؤن
دہلی ۱۱۰۰۰۹

اپنے قاتلوں کے نام

مرے قاتلو
میں نے چاہا ہے تم کو
تمہاری غضب ناکیوں کی قسم!
تمہارے لیے بھول بیٹھا
سبھی دوستوں اور عزیزوں کے مانوس چہرے
چاہتوں، شفقتوں، سب سے دامن چھڑایا۔
تمہارے لیے چھوڑ آیا
آسماں سے برستی چنبیلی کے پھولوں کی بارش
تمہارے چمکدار ترشول کی کاٹ اچھی لگی
سر پر منڈلاتی تلواریں اور ان کے سایے میں
گدھ اور شکاری پرندے بھی اچھے لگے
اپنے گزرے زمانوں کو جی سے بھلایا
کہ ان میں کہیں جگمگاتے تھے
تختِ طاؤس اور تاجِ شاہی کے ہیرے
ذلتوں، نفرتوں کے جہنم کو گلزار سمجھا
اور ذلت کے داغوں کو دادِ وفا جان کر
زخمی ہونٹوں سے چوما
کہ تم خوش رہو۔۔۔!!

مگر آج کیا ہے، مرے قاتلو!
تمہارے حسیں اور شاداب چہرے
تشدد کی، نفرت کی شکنوں سے مجروح ہیں
وہی ہونٹ جو کل تلک رنگِ گل تھے
وہی آج تیر و سناں ہیں
وہ صندل کی شاخوں سے ہاتھوں میں
میرا نہیں،
خود اپنے ہی گھر کو جلانے کو مشعل لیے ہو
وہ ماتھے کہ کل جن سے سورج کی پہلی کرن
پھوٹتی تھی
خود اپنی کدورت سے بجھنے لگے ہیں

مرے قاتلو!
اپنے چہروں کو محفوظ کر لو
لکیریں مٹا دو
اور اگر نفرتیں اور کدورت مرا خون مانگے
تو اک بار پھر قتل کر دو
اگر کاٹ سکتے ہو تو کاٹ دو میری شہ رگ
کہ تم جی سکو اور تم خوش رہو
مگر دیکھنا
رگِ جاں کٹے پر یہ خنجر
ہماری حمیت کی رگ تک نہ پہنچے
مرے قاتلو، میں نے چاہا ہے تم کو

دیگر اداروں کی مطبوعات

ہندوؤں کے تیوہار — بالکشن بترہ آبر

اس کتاب میں اہلِ ہنود کے تمام تیوہار و برت درج ہیں جن سے ہندو قوم کی دھارمک زندگی کا ثبوت ملتا ہے۔ قیمت ۴۰/ روپے

اردو رسائل (۱۹۹۲ء میں)

۱۹۹۲ء میں اردو میں کون کون سے رسالے شائع ہو رہے ہیں اس مجموعے میں ان رسائل کے سرورق کا عکس مع مشتملات شائع کر دی گئی ہیں اس سے رسالے کے تیور اور طور سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے قیمت ۱۰۰/ روپے

کرنل محبوب احمد

کرنل محبوب! آزاد ہند فوج کے ایسے بہادر نوجوان کا نام ہے جسے ہندستان کی جنگ آزادی میں نیتاجی سبھاش چندر بوس کی قیادت میں لڑنے کا فخر حاصل رہا۔ آزاد ہندی فوج اور نیتاجی کی معتبر ترین واقعات اس کتاب میں ملیں گے۔ قیمت ۲۵/ روپے

پٹنہ کے کتبے — فصیح الدین بلخی (م ۱۹۶۲ء)

اس کتاب کے اندر جتنے کتبات کی نقلیں پیش کی گئی ہیں ان میں سے بہت سے کتبوں کا اب وجود ہی نہیں رہا۔ تحقیق، جستجو کا اہم کارنامہ۔
قیمت ۵۰/ روپے

چند اہم اخبارات و رسائل — قاضی عبدالودود

یہ اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو قاضی صاحب مرحوم نے وقتاً فوقتاً اردو کے بعض اہم رسائل اور اخبارات کے بارے میں لکھے۔ قیمت ۳۰/ روپے

ہندوؤں کے اوتار — لالہ بالکشن بترہ آبر

بھگوان کے کئی اوتار ہیں لیکن ان میں سے دس مکمل ہیں، اس کتاب میں انھیں دس اوتاروں کے مستند حالات درج ہیں۔ قیمت ۲۰/ روپے

جامع الشواہد — مولانا ابوالکلام آزاد — تقدیم مسیح الحسن

اس کتاب کی کہانی گنجلک بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۱۹ء میں کتابی رسالہ کی صورت میں دارالمصنّفین اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔ اس اڈیشن کا ایک نسخہ مولانا آزاد کا اصلاح شدہ ہے۔ اس لیے مرتّب نے اصل مطبوعہ متن کے ساتھ اصلاح شدہ متن بھی شائع کر دیا۔
قیمت ۴۰/ روپے

طلسم ہوشربا

طلسم ہوشربا اصلاً سات بلکہ آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے (جلد ۵ کے دو حصے ہیں) اور دو مزید جلدیں بقیہ طلسم ہوشربا۔ اس طرح کل دس جلدیں ہوتی ہیں۔ خدا بخش لائبریری نے طلسم ہوشربا پر لکھے ہوئے اہم ترین مضامین کا ایک مجموعہ "مقدمہ طلسم ہوشربا" بھی شائع کر دیا ہے۔ اس طرح طلسم ہوشربا کو پڑھنے اور اس کی خوبیوں کو سمجھنے کے لیے ۱۱ جلدیں ہو جاتی ہیں۔

طلسم ہوشربا اول، دوم، سوم، چہارم، پنجم اوّل، پنجم دوم، ششم، ہفتم۔ فی جلد ۱۰۰/ روپے اور مقدمہ طلسم ہوشربا کی قیمت ۲۰/ روپے ہے۔

ملنے کا پتا
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

باقر مہدی
اے/۷ روی درشن
کارٹر روڈ۔ باندرہ
ویسٹ۔ بمبئی ۵

اقبال کی یاد میں

رہنماؤں سے بدلنی تھی نہ بدلی دنیا
سرکشوں نے بھی کہاں اپنی بنالی دنیا!

ابنِ آدم کا تصادم ہی قیامت ٹھہرا
کیا سنبھل پائے گی یہ حشر سے خالی دنیا

رنگ کس طرح بدلتے ہیں تمنّاؤں کے
نیلی پیلی نظر آتی ہے یہ کالی دنیا

ڈھونڈتے پھرتے ہو مشرق میں کبھی مغرب میں
کیا کبھی پاؤ گے شہروں میں مثالی دنیا

ٹھوکریں کھاتی ہوئی پھرتی ہے کوچہ کوچہ
کس کے در جا کے ٹھہرتی ہے سوالی دنیا

ہر طرف ظلم کی بڑھتی ہوئی تیزابی ہے
ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا

ہر طرف پھرتے ہو بولو تو کہاں جانا ہے؟
اپنے سینے میں مگر سب سے چھپالی دنیا

فون بجتے ہیں خبر آڑتی ہے ٹی وی ٹی وی
نامہ بر کہتے ہیں پہلے تھی ٹپالی دنیا
ہائے فنکاروں نے سونے کی بنالی زنجیر
کیسے باقرؔ نے اسیروں سے بچالی دنیا

مرہٹی لفظ بمعنی ڈاکیا

بچوں کے لیے مذہبی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
حضرت یحییٰ علیہ السلام	منورہ نوری خلیق	۳/=
حضرت آدم علیہ السلام -	منورہ نوری خلیق	۴/-
رسالہ دینیات اول	محمد نعیم الدین زبیری	۳/
رسالہ دینیات دوم	"	۴/
رسالہ دینیات سوم	"	۵/
رسالہ دینیات چہارم	"	۵/
رسالہ دینیات پنجم	"	۶/
بزرگان دین	محمود علی خاں جامعی	۴/
امت کی مائیں	حسین حسنی	۴/۵۰
اچھی باتیں	سعد الدین انصاری	۴/۵۰
خوب سیرت اول	حکیم محمد سعید	۶/
خوب سیرت دوم	"	۴/۵۰
سلطان جی	اسلم فرخی	۴/
رسول اللہ کی صاحبزادیاں	فضل قدیر ندوی	۴/۵۰
رحمان کا مہمان	رفیع الزماں زبیری	۶/
کمسن صحابی	"	۵/
اسلام کے جاں نثار	"	۴/
سیرت پاک مختصر مختصر	احمد خاں خلیل	۳/
نور کے پھول	حکیم محمد سعید	۹/
سب سے بڑے انسان۔ رسول اللہ	"	۴/۵۰
حضرت حمزہ رضہ	احتشام علی رحیم آبادی	۲/
حضرت عبدالرحمن بن عوف رضہ	"	۲/
حضرت ابوہریرہ رضہ	"	۴/
حضرت محبوب الٰہی رح	مشیر الحق	۳/
حضرت قطب الدین بختیار کاکی رح	"	۲/
حضرت فرید الدین گنج شکر رح	"	۳/
حضرت معین الدین چشتی رح	"	۳/
حضرت ابوبکر صدیق رضہ	"	۶/
حضرت طلحہ رضہ	"	۳/
حضرت سلمان فارسی رضہ	"	۲/۵
حضرت ابوذر غفاری رضہ	"	۲/
حضرت عبداللہ بن عمر رضہ	"	۲/

کتاب	مصنف	قیمت
حضرت عبداللہ بن عباس رضہ	مشیر الحق	۲/
نیک بیٹیاں	"	۲/۵۰
اسلام کیسے پھیلا؟ حصہ اول	عبدالواحد سندھی	۷/۵۰
" حصہ دوم	"	۶/
قرآن پاک کیا ہے؟	"	۴/
اسلام کیسے شروع ہوا؟	"	۷/۵۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار، اول، دوم	" فی حصہ	۶/=
اسلام کے مشہور امیر البحر	"	۹/
رسول پاک	"	۶/
دس جنتی	الیاس احمد مجیبی	۵/۵۰
سرکار کا دربار	"	۶/۵۰
چار یار	"	۷/۵۰
آں حضرت (اردو)	"	۲/۵۰
حضرت محمد (ہندی)	"	-/۴۰
اللہ کا گھر	خلیل احمد جامعی	۴/۵۰
اللہ کے خلیل	"	۲/۵۰
رسول پاک کے اخلاق	"	۴/
اللہ کے صفی	"	۲/۵۰
ہمارا دین حصہ اول	سید شہاب الدین دسنوی	۸/۵۰
" دوم	"	۷/۵۰
" سوم	"	۸/۵۰
منہاج القرآن	حیدر سیدنا طاہر سیف الدین	۴/۵۰
ارکان اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۲/۵۰
عقائد اسلام	"	۲/۵۰
خلفائے اربعہ	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	۹/
نبیوں کے قصے	"	۶/۵۰
ہمارے رسول	"	۶/
پیارے رسول	سلطانہ آصف فیضی	۴/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاء	ادارہ	۲/
مسلمان بیبیاں	اعجاز الحق قدوسی	۶/
ہمارے نبی	سید نواب علی رضوی	۲/۵۰
سرکار دو عالم	محمد حسین حسان	۹/
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد)	(کلاں)	۴/۵۰

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ
علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور نگارِ پاکستان

"نگارِ پاکستان" کا نام ذہن میں آتے ہی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصویر سامنے آجاتی ہے، اور کیوں نہ ہو، "نگارِ پاکستان" سے ان کی تیس سالہ وابستگی نے دونوں کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بنا دیا ہے۔ فرمان صاحب کے بغیر نہ تو "نگارِ پاکستان" کا تصور ممکن ہے اور نہ "نگارِ پاکستان" کے بغیر فرمان صاحب کا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نیاز فتح پوری اور "نگار" کے بارے میں ایک جگہ لکھا تھا کہ یہ دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، بلکہ ایک ہی تحریک، ایک ہی مکتبۂ فکر اور ایک ہی رجحان کے دو نام ہیں جنھیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ نیاز و نگار کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا تیس سال پرانا یہ قول آج خود اُن پر ان کی ادارت میں شائع ہونے والے "نگارِ پاکستان" پر صادق آتا ہے۔

"نگارِ پاکستان"، دراصل اسی "نگار" کا تسلسل ہے جو نیاز فتح پوری کی ادارت میں فروری ۱۹۲۲ء میں آگرہ سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ پھر یہ ۱۹۲۴ء میں بھوپال منتقل ہو گیا جہاں سے یہ ۱۹۲۷ء تک نکلتا رہا۔ اسی سال یہ لکھنؤ منتقل ہوا اور ۱۹۶۲ء تک یعنی نیاز صاحب کے پاکستان ہجرت کرنے تک یہ لکھنؤ سے شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۶۲ء سے یہ کراچی سے نکلنا شروع ہوا اور آج تک نکل رہا ہے۔ ۱۹۶۶ء تک اس کے مدیر / مدیرِ اعلا نیاز فتح پوری رہے لیکن ان کے انتقال (مئی ۱۹۶۶ء) کے بعد اس کے مدیر ڈاکٹر فرمان فتح پوری مقرر ہوئے اور آج تک وہی اس کے مدیر ہیں۔ اردو زبان و ادب کی اتنی طویل مدت تک اور ایسی بے مثل خدمت اردو کے شاید ہی کسی رسالے نے انجام دی ہو۔ نیاز فتح پوری اردو کے ایک بلند پایہ اور بے مثل ادیب تھے۔ اگر وہ اردو ادب میں کاوش نہ کرتے تب بھی محض "نگار" کے مدیر کی حیثیت سے اردو ادب و صحافت کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہتا۔

نیاز فتح پوری ایک سخت گیر مدیر تھے۔ انھوں نے اپنے رسالے کا ایک خاص معیار تادمِ آخر قائم رکھا۔ ان کی کسوٹی پر پورا اترنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ہر کس و ناکس "نگار" میں چھپنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ "نگار" میں چھپنا بہت بڑی بات

بھی جاتی تھی اور جو چیز چھپ جاتی اسے استناد کا درجہ حاصل ہو جاتا تھا اور ہر طرف اس کی دھوم مچ جاتی تھی۔ خلیل الرحمن اعظمی کے آتش پر مقالے کو اس وجہ سے بھی غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی کہ وہ سب سے پہلے "نگار" میں چھپا جسے پڑھ کر فراق گورکھپوری نے انھیں تہنیتی خط لکھا اور رشید احمد صدیقی نے انھیں "آتش پرست" کے خطاب سے نوازا۔ یہ صرف ایک مثال ہے۔ اسی طرح نہ جانے کتنے ارباب قلم نے "نگار" کی بدولت معتبر نقاد اور مستند ادیب و شاعر کا مرتبہ حاصل کیا۔ "نگار" کے سلسلے میں ایک خاص بات یہ تھی کہ یہ صرف ادب اور ادبی مسائل تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ اس میں چھپنے والی تخلیقات مختلف علوم کا احاطہ کرتی تھیں مثلاً ادب، شاعری، افسانے اور ڈرامے کے علاوہ اس میں فنونِ لطیفہ، تاریخ، سیاحت، جغرافیہ، سیاست، فلسفہ، سوانح، لسانیات، علمِ لغت، سائنس، مذہب، اسلامیات، حتیٰ کہ ریاضی و ہیئت اور طب پر بھی مضامین شائع ہوتے تھے۔ "نگار" کی یہ بھی خصوصیت تھی کہ اس کے خاص نمبر یا سالنامے بڑی پابندی کے ساتھ ہر سال نکلا کرتے تھے اور یہ سلسلہ نیاز صاحب نے ۱۹۲۸ء میں مومن نمبر کے اجراء سے شروع کیا تھا جو ان کے دمِ آخریں تک قائم رہا (اور آج بھی قائم ہے)۔ "نگار" کے بعض خاص نمبر انھوں نے خود تحریر کیے مثلاً پاکستان نمبر (۱۹۴۸ء)، فرمان روایانِ اسلام نمبر (۱۹۵۴ء)، علومِ اسلامی و علمائے اسلام نمبر (۱۹۵۵ء)، معلومات نمبر (۱۹۵۸ء) غالب نمبر (۱۹۶۱ء) خود ان کے تحریر کردہ ہیں۔ ان کے علاوہ جن موضوعات پر خاص نمبر شائع ہوئے ان میں اردو شاعری، ہندی شاعری، اصحابِ کہف، خود نوشت، جدید شاعری، قرآن، انتقاد، افسانہ، مستقبل کی تلاش، اصنافِ سخن، انشائے لطیف وغیرہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ مومن، بہادر شاہ ظفر، مصحفی، نظیر اکبرآبادی، ریاض خیرآبادی، حسرت موہانی، داغ دہلوی، غالب، جگر مرادآبادی، اور اقبال جیسے شعراء پر بھی "نگار" کے خصوصی نمبر شائع ہوتے۔ ان میں سے بیشتر کی آج بھی وہی اہمیت ہے جو پہلے تھی۔ "نگار" کی ۱۹۲۲ء تا ۱۹۶۲ء کی فائلوں کے سرسری جائزے سے پتا چلتا ہے کہ اس دور کے تمام مشاہیر ادب کی نگارشات اس میں چھپتی رہی ہیں۔ اس دور کا شاید ہی کوئی بڑا ادیب و شاعر ہو جس کی تخلیق "نگار" کے صفحات کی زینت نہ بنی ہو۔ "نگار" کے اس پس منظر کے بعد اب ہم "نگارِ پاکستان" کی طرف آتے ہیں۔

جولائی ۱۹۶۲ء میں نیاز فتح پوری کے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد سے "نگار" کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اب اس کی پہچان "نگارِ پاکستان" کے نام سے قائم ہوتی ہے اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری بطورِ اعزازی اس سے منسلک ہوتے ہیں۔ اردو رسائل کے سلسلے میں بالعموم یہی دیکھا گیا ہے کہ رسالے کی عمر اس کے

مدیر کی عمر کی عشر عشیر بھی نہیں ہوتی۔ بسا اوقات اپنے مدیر کی رحلت کے ساتھ ہی وہ مجلہ بھی دم توڑ دیتا ہے، لیکن "نگارِ پاکستان" کی یہ خوش نصیبی رہی ہے کہ نیاز فتح پوری کے انتقال (۱۹۶۶ء) کے ۲۶ سال بعد بھی یہ رسالہ زندہ و تابندہ ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اسے نیاز فتح پوری کے بعد فرمان فتح پوری جیسا لائق مدیر ملا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے "نگارِ پاکستان" کی ترتیب کا کام نومبر ۱۹۶۲ء میں سنبھالا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نیاز فتح پوری لکھنؤ سے ہجرت کر کے کراچی آ چکے تھے۔ ان کے ساتھ "نگار" بھی کراچی منتقل ہو گیا تھا۔ یہ ان کی زندگی کی شام تھی۔ جس آب و تاب اور گھن گرج کے ساتھ "نگار" لکھنؤ سے نکلا کرتا تھا، اسی طرح اب کراچی سے اس کا نکلنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ وہ خود اگرچہ اس کے مدیرِ اعلیٰ رہے لیکن اس کی ترتیب کی ذمہ داری نیاز صاحب نے فرمان صاحب کو سونپ دی۔ رسالے پر ان کا نام بھی نائب مدیر کی حیثیت سے چھپنے لگا۔ ۱۹۶۲ تا ۱۹۶۶ء فرمان صاحب "نگارِ پاکستان" کو نیاز صاحب کی سرپرستی اور نگرانی میں ایڈٹ کرتے رہے لیکن ۲۴ مئی ۱۹۶۶ء کو جب نیاز صاحب اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو اس رسالے کی تمام تر ذمہ داری فرمان صاحب کے کاندھوں پر آ پڑی اور وہی اس کے مدیر بھی بنے۔ نیاز فتح پوری کا نام اب بانی کی حیثیت سے چھپنے لگا۔ یہ روایت آج بھی قائم ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو نیاز فتح پوری سے بے حد محبت و عقیدت تھی یہی وجہ ہے کہ "نگارِ پاکستان" آج تک بند نہیں ہوا۔ وہ نیاز صاحب کے معتقد ہوتے ہوتے بھی ان کے مقلد کبھی نہیں رہے۔ انھوں نے "نگارِ پاکستان" کی ادارت سنبھالتے ہی اپنی راہ الگ نکالی۔ دھیرے دھیرے رسالے کو ایک نیا موڑ دیا اور اسے نئے جہات و ابعاد سے روشناس کرایا۔ اب جب کہ فرمان صاحب کی ادارت میں اس رسالے کو نکلتے ہوئے ۳۰ سال کا عرصہ بیت چکا ہے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کا محاکمہ کیا جاتے۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے "نگارِ پاکستان" کی ادارت سنبھالی، اسی وقت سے ان کی تصنیفی زندگی کا بھی آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۲ء میں جب وہ اس سے منسلک ہوئے تو اسی سال ان کی دو کتابیں "تدریسِ اردو" اور "اردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقا" منظرِ عام پر آئیں۔ بعد کے دور میں "نگارِ پاکستان" نے ان کی تصنیفی زندگی کی راہ متعین کرنے اور ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے فروغ میں بڑا مثبت کردار ادا کیا۔

"نگارِ پاکستان" کی ترتیب کی ذمہ داری نبھانے کے دوسرے ہی سال فرمان صاحب نے اس کا نیاز فتح پوری نمبر (۱۹۶۳ء) دو جلدوں میں شائع کیا۔ جن لوگوں نے یہ نمبر دیکھا ہے وہ فرمان صاحب کی محنت و کاوش، دیدہ ریزی اور نیاز صاحب

سے ان کی محبت و عقیدت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے ۔ یہ خاص نمبر نیاز فتح پوری کی حیات و شخصیت اور فکر و فن سے کہ ان کی علمی و ادبی خدمات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے ۔ اس میں ان کی شاعری، افسانہ نگاری، مکتوب نگاری، مقالہ نگاری، تنقید، ناولٹ، نفسیات غرض کہ ہر پہلو کا جائزہ پیش کیا گیا ہے ۔ آخر میں نیاز صاحب کی تحریروں کا ایک جامع اشاریہ بھی شامل کیا گیا ہے ۔ نیاز فتح پوری پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے یہ نمبر آج بھی معلومات کا بے پناہ ذخیرہ ہے اور مستند حوالے کے طور پر کام میں لایا جاسکتا ہے ۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب فرمان صاحب نے "نگارِ پاکستان" کا نیاز فتح پوری نمبر نکالنے کا ارادہ ظاہر کیا تو نیاز صاحب نے اس کی سختی سے مخالفت کی اور انھیں ایسا کرنے سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن فرمان صاحب کی مستقل مزاجی دیکھ کر اور ان کے بار بار اصرار کرنے پر وہ بالآخر مان گئے۔ فرمان صاحب نے نہایت کم مدت میں "نیاز فتح پوری نمبر" دو جلدوں (مارچ اپریل ۱۹۶۳ء اور مئی جون ۱۹۶۳ء کے شمارے) میں ترتیب دیا ۔ اور اس دور کے بہترین لکھنے والوں کی نگارشات شامل اشاعت کیں ۔

اگلے سال یعنی ۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے "نگارِ پاکستان" کا ایک اور خاص نمبر "تذکروں کا تذکرہ نمبر" کے نام سے شائع کیا ۔ یہ نمبر اردو شعراء کے تذکروں سے فرمان صاحب کی بے پناہ دلچسپی کا غماز ہے ۔ اس خصوصی نمبر کی اشاعت کے بعد بھی تذکرہ نویسی کے فن سے ان کی دلچسپی قائم رہی، چنانچہ وہ اس موضوع پر مستقل غور و خوض کرتے رہے ، یہاں تک کہ انھوں نے اسے اپنے ڈی ۔ لٹ ۔ کے مقالے کا موضوع بنا لیا ۔ یہ تحقیقی مقالہ "اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" کے عنوان سے ۱۹۷۲ء میں، کتابی صورت میں شائع ہوا ۔ فرمان صاحب کے اس تحقیقی کام کو اہل علم نے اس موضوع پر اب تک سب سے "وقیع اور جامع" کام قرار دیا ۔ یہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ "نگارِ پاکستان" کی ادارت ان کی تصنیفی زندگی میں کس طرح ممد و معاون رہی ہے ۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری ادارت میں شائع ہونے والے "نگارِ پاکستان" کے "اردو افسانہ اور افسانہ نمبر" (جنوری فروری ۱۹۸۱ء) کا ذکر بھی بیجا نہ ہو گا جس کا پہلا اڈیشن چند ماہ میں ہی "نایاب" ہو گیا ۔ اس نمبر کی افادیت اور مقبولیت کے پیش نظر اسے فرمان صاحب نے "اردو افسانہ اور افسانہ نگار" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کیا ۔ اسی زمانے میں یہ کتاب بھارت میں بھی شائع ہوئی ۔ اس کا دوسرا بھارتی اڈیشن مکتبہ لمٹیڈ، نئی دہلی کے زیر اہتمام زیر طبع ہے ۔ اس خاص نمبر (کتاب) کی ترتیب میں فرمان صاحب کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ۔ اردو افسانے کی

اسی سالہ تاریخ کی روشنی میں انھوں نے ۲۵ نمائندہ افسانہ نگاروں کا انتخاب کیا۔ بڑی تلاش و تحقیق کے بعد ان کا پہلا افسانہ ڈھونڈا اور بتایا کہ یہ کس رسالے میں اور کب شائع ہوا۔ افسانے کے شروع میں ہر افسانہ نگار کا سوانحی خاکہ بھی پیش کیا نیز ان کی ادبی و تخلیقی سرگرمیوں کا بھر پور جائزہ لیا۔ کتاب کے شروع میں ایک مفصل باب اردو افسانے کی سمت و رفتار پر قلم بند کیا جس میں انھوں نے اردو افسانے کے چار ادوار قائم کیے، دورِ اول (۱۹۰۰ء تا ۱۹۳۰ء)، دورِ دوم (۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۷ء)، دورِ سوم (۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۰ء) اور دورِ چہارم (۱۹۶۰ء تا ۱۹۸۰ء)۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ "یہ ایک بڑا کام ہے جو تنقیدی بصیرت بھی چاہتا ہے"۔

"نگارِ پاکستان" کا ایک اور خاص نمبر "قمر زمانی نمبر" ہے جو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ادارت میں جنوری فروری ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔ یہ نمبر کتابی شکل میں "قمر زمانی بیگم" کے نام سے اردو اکیڈمی سندھ کراچی سے اسی سال شائع ہوا۔ یہ نیاز فتح پوری کی ایک انوکھی داستانِ معاشقہ ہے اور بقولِ ڈاکٹر فرمان فتح پوری "تاریخ ادب میں اپنی نوعیت کا پہلا رومان" اسے اگر فرمان صاحب کا تحقیقی کارنامہ کہا جاتے تو بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کتاب میں انھوں نے بڑی تلاش و تحقیق کے بعد قمر زمانی بیگم کے حالات جمع کیے ہیں اور ان کی ادبی زندگی کا آغاز و پس منظر بیان کیا ہے اور وہ تمام خطوط سلسلہ وار ترتیب دیے ہیں جو قمر زمانی بیگم مدیرِ "نقاد"۔ شاہ دلگیر کو اس صدی کی دوسری دہائی کے اور آخر میں ایک عرصے تک لکھتی رہی تھیں۔ قمر زمانی بیگم اور شاہ دلگیر کے درمیان یہی خط و کتابت ایک معشقیہ داستان بن گئی۔ یہ داستان فرمان صاحب نے اس کتاب میں بڑے دلچسپ اور انوکھے انداز میں بیان کی ہے۔ ساٹھ سال تک جو ایک رازِ سربستہ تھا اور جس نے اردو کے بڑے بڑے ادیبوں کو چکر میں ڈال دیا تھا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس کا پردہ فاش کیا اور قمر زمانی بیگم کی اس طرح نقاب کشائی کی کہ لوگ ورطۂ حیرت میں پڑ گئے۔ انھوں نے اس امر کا انکشاف کیا کہ قمر زمانی بیگم کے روپ میں یہ نیاز فتح پوری تھے جو شاہ دلگیر سے خط و کتابت کیا کرتے تھے اور شاہ دلگیر یہ سمجھتے رہتے تھے کہ کوئی خاتون (جن کا نام قمر زمانی ہے) ان سے مراسلت کر رہی ہیں، کہا جاتا ہے کہ شاہ دلگیر کو قمر زمانی کے عورت ہونے کا یقین "ایمان بالغیب" کی حد تک تھا بلکہ وہ قمر زمانی کے وجود کا اس طرح یقین رکھتے تھے جس طرح خود اپنے وجود کا۔ کتاب کی شانِ نزول کے بارے میں فرمان صاحب لکھتے ہیں:

> "قمر زمانی کے روپ میں نیاز فتح پوری کے یہی مکتوبات اور ان کے جواب میں دلگیر کے یہی خطوط اس وقت میرے سامنے ہیں اور قمر زمانی بیگم و شاہ دلگیر کی عشقیہ داستان کا مواد فراہم کرتے ہیں۔ یہ خطوط ادبی لحاظ سے حد درجہ دلچسپ ہیں اور بیشتر نیاز کی تخلیق ہونے کے سبب

اردو ادب و صحافت کی تاریخ میں ایک نایاب اور انمول خزانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔" ۷

نیاز فتح پوری کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی مدیرانہ صلاحیتوں کا تین سال (۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۵ء) کے اندر بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ ان کے کام سے خوش تھے، انھیں بے حد عزیز رکھتے تھے اور دل سے دعائیں دیتے تھے۔ اس وقت مدیر اعلا کی حیثیت سے "نگارِ پاکستان" کے پہلے صفحے پر نیاز فتح پوری کا نام چھپتا تھا۔ اسی صفحے پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا نام نائب مدیر کی حیثیت سے چھپتا تھا۔ لیکن ہر ماہ "ملاحظات" کے نام سے اداریہ نیاز فتح پوری لکھتے تھے۔ (بہ استثنائے چند)۔ مارچ ۱۹۶۵ء کے "نگارِ پاکستان" میں انھوں نے "ملاحظات" کے تحت ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بارے میں یہ عبارت رقم کی:

> "عزیزی فرمان فتح پوری نے جن کا نام نگار کے پہلے صفحے پر ہر ماہ آپ کی نگاہ سے گزرتا ہوگا اب ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کر لی ہے۔ اور مجھے بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ اپنی تعلیم کا سلسلہ انھوں نے بالکل میری ہدایت کے مطابق قائم رکھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے یہاں (کراچی) آنے کے بعد انھوں نے نگار کی بھی بڑی خدمات انجام دیں، چنانچہ نیاز نمبر کے دونوں حصّوں کی ترتیب محض انھیں کی سعی و کوشش کا نتیجہ ہے اور سالنامہ تذکرہ نمبر تو خیر پورا انھیں کا مرتب کیا ہوا ہے۔ فرمان صاحب میرے ہم وطن ہیں، میرے عزیز ہیں، مجھ سے چھوٹے ہیں۔ اس لیے میری طرف سے اظہارِ تشکر کا تو کوئی موقع نہیں، دعا کا ضرور ہے، سو اس کا تعلق بھی دل سے ہے، زبان سے نہیں!" ۸

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ادارت کے دوران کوئی بھی سال ایسا نہیں گزرا جب کہ "نگارِ پاکستان" کا کوئی خاص نمبر نہ نکلا ہو۔ یہ بھی دراصل نیاز و نگار کی ہی ایک روایت کا تسلسل ہے۔ "نگار" کے خصوصی نمبروں یا سالناموں کا سلسلہ ۱۹۲۸ء میں مومن نمبر کے اجراء سے شروع ہوتا ہے جو آج تک جاری ہے۔ خاص نمبروں کے موضوعات اور ان کی جامعیت سے فرمان صاحب کی ادب سے ہمہ گیر دلچسپی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ زمانے کے سرد و گرم کا مقابلہ کرتے ہوتے اتنی دلجمعی، مستقل مزاجی اور COMMITMENT کے ساتھ کسی رسالے کو (وہ بھی ادبی) تیس سال تک پابندی سے ایڈٹ کرتے رہنا اور ہر سال اہتمام کے ساتھ اس کے خاص نمبر بھی نکالتے رہنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ فرمان صاحب کی ادارت میں گذشتہ تیس سال کے دوران شائع ہونے والے "نگارِ پاکستان" کے خاص نمبروں پر ایک نظر ڈالنا بے جا نہ ہوگا:

۱- نیاز فتح پوری نمبر ۱ مارچ اپریل ۱۹۶۳ء
۲- نیاز فتح پوری نمبر ۲ مئی جون ۱۹۶۳ء
۳- تذکروں کا تذکرہ نمبر مئی جون ۱۹۶۴ء
۴- جدید تر شاعری نمبر جولائی اگست ۱۹۶۵ء
۵- اصنافِ ادب نمبر دسمبر ۱۹۶۶ء
۶- اصنافِ شاعری نمبر نومبر دسمبر ۱۹۶۷ء
۷- مسائلِ ادب نمبر اکتوبر نومبر ۱۹۶۸ء
۸- غالب صدی نمبر جنوری فروری ۱۹۶۹ء
۹- سرسید نمبر ۱ نومبر دسمبر ۱۹۷۰ء
۱۰- میر انیس نمبر ستمبر اکتوبر ۱۹۷۱ء
۱۱- سرسید نمبر ۲ جنوری فروری ۱۹۷۲ء
۱۲- مولانا حسرت موہانی نمبر ۱ نومبر دسمبر ۱۹۷۳ء
۱۳- مولانا حسرت موہانی نمبر ۲ اگست ستمبر ۱۹۷۴ء
۱۴- ڈاکٹر محمود حسین نمبر جون جولائی ۱۹۷۵ء
۱۵- قائدِ اعظم نمبر اکتوبر نومبر ۱۹۷۶ء
۱۶- علامہ اقبال نمبر جون جولائی ۱۹۷۷ء
۱۷- مولانا محمد علی جوہر نمبر نومبر دسمبر ۱۹۷۸ء
۱۸- قمر زمانی نمبر جنوری فروری ۱۹۷۹ء
۱۹- مسائلِ زبان نمبر جنوری فروری ۱۹۸۰ء
۲۰- افسانہ اور افسانہ نگار نمبر جنوری فروری ۱۹۸۱ء
۲۱- فنِ تاریخ گوئی نمبر جنوری فروری ۱۹۸۲ء
۲۲- خطباتِ محمود نمبر نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء
۲۳- جشنِ طلائی نمبر جنوری فروری ۱۹۸۳ء
۲۴- نیاز صدی نمبر جنوری فروری ۱۹۸۴ء
۲۵- فنِ عروض نمبر اپریل ۱۹۸۵ء
۲۶- مکتوباتِ نیاز نمبر نومبر ۱۹۸۵ء
۲۷- تنقیدِ غزل نمبر نومبر ۱۹۸۶ء
۲۸- غالب بنگاہِ نیاز نمبر نومبر ۱۹۸۷ء
۲۹- اردو شاعری کا فنی ارتقا نمبر دسمبر ۱۹۸۸ء
۳۰- اردو نثر کا فنی ارتقا نمبر دسمبر ۱۹۸۹ء
۳۱- اقبال بنگاہِ نیاز نمبر دسمبر ۱۹۹۰ء
۳۲- نقدِ شعر نمبر دسمبر ۱۹۹۱ء
۳۳- عورت فنونِ لطیفہ نمبر دسمبر ۱۹۹۲ء

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ادارت و سرپرستی میں "نگارِ پاکستان" لمحہ بہ لمحہ ترقی کی جانب گامزن ہے۔ اس کام میں انھیں امراؤ طارق جیسے معاون ملے ہیں جو ہر قدم پر ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اگرچہ نیاز فتح پوری کے انتقال کو ۲۷ سال گزر چکے ہیں لیکن معنوی اعتبار سے "نگار" کا نیاز سے رشتہ ٹوٹا نہیں ہے۔ "نگارِ پاکستان" نیاز فتح پوری کے ہی "نگار" کا تسلسل ہے۔ یہ آج بھی ماہانہ شائع ہوتا ہے۔ ہر سال اب بھی اس کے خاص نمبر شائع ہوتے ہیں۔ آج بھی اس کے اداریے "ملاحظات" کے عنوان سے تحریر کیے جاتے ہیں۔ اس کے ہر شمارے پر بانی کی حیثیت سے علامہ نیاز فتح پوری کا نام درج ہوتا ہے اور پیشانی پر جاری شدہ ۱۹۲۲ء لکھا ہوتا ہے۔ "نگارِ پاکستان" میں پہلے ہر طرح کے ادبی موضوعات پر مضامین شامل ہوتے تھے، لیکن گذشتہ چند برسوں کے شماروں سے پتا چلتا ہے کہ فرمان صاحب نے ایک جدت یہ پیدا کی ہے کہ اس کا "ہر شمارہ خصوصی شمارہ" بنا دیا ہے۔ اس کے تحت وہ کسی ایک موضوع پر بھرپور مواد پیش کرتے ہیں۔ اکثر کلاسیکی ادب کے نمونے اور ادبی نوادرات شائع کرتے ہیں، لیکن اس میں مستند اربابِ قلم کی نگارشات اور عصری تحریروں کو بھی جگہ دی جاتی ہے۔ بھارت میں

شائع ہونے والے ادبی نمونے بالخصوص پیش کیے کہ ان تک رسائی پاکستان کے شائقین ادب کو بہت کم ہوپاتی ہے۔ یہ امتیاز شاید ہی اردو کے کسی اور رسالے کو حاصل ہو کہ اس کا "ہر شمارہ خصوصی شمارہ" قرار دیا جاتے۔ "نگارِ پاکستان" کے بعض "ہر شمارہ خصوصی شمارہ" کے مندرجات یہ ہیں:

۱- اردو ناول میں طنز و مزاح مارچ ۱۹۸۸ء
۲- بہادر شاہ ظفر اپریل ۱۹۸۸ء
۳- کلیم الدین احمد کی خود نوشت مارچ ۱۹۹۰ء
۴- "میری بہترین نظم" مرتبہ محمد حسن عسکری اکتوبر ۱۹۹۰ء
۵- اویس احمد ادیب کی تصنیف ولی دکنی فروری ۱۹۹۱ء
۶- غالب کی فارسی غزل جنوری ۱۹۹۱ء
۷- خیام کی رباعیات کا اولین ترجمہ جولائی ۱۹۹۱ء
۸- جامعہ اردو "ادیب" کا جشنِ زریں نمبر اگست ۱۹۹۱ء
۹- کتابیاتِ تحقیق نمبر ستمبر ۱۹۹۱ء
۱۰- مشاطۂ سخن از صفدر مرزاپوری اپریل ۱۹۹۲ء
۱۱- مولوی عبدالحق نمبر اگست ۱۹۹۲ء
۱۲- "باغ و بہار" مرتبہ رشید حسن خاں اکتوبر ۱۹۹۲ء
۱۳- بی اماں اور بیگم حسرت موہانی نومبر ۱۹۹۲ء

یہ ناممکن ہے کہ "نگارِ پاکستان" کا ذکر آئے اور ڈاکٹر فرمان صاحب کے تحریر کردہ اداریوں جو وہ "ملاحظات" کے نام سے ہر ماہ لکھتے ہیں، کا ذکر نہ آئے۔ "ملاحظات" بھی نیاز و نگار کی ہی ایک روایت کا تسلسل ہے۔ نیاز فتح پوری نے "ملاحظات" کے عنوان سے "نگار / نگارِ پاکستان" کا اداریہ چالیس سے زیادہ عرصے تک لکھا۔ پاکستان آنے کے بعد بھی "ملاحظات" وہی لکھتے رہے۔ اور یہ سلسلہ ان کے انتقال سے چند ماہ قبل تک جاری رہا۔ انتقال سے چند ماہ قبل کے پرچوں اور درمیان کے بعض پرچوں (مثلاً نیاز فتح پوری نمبر کے دونوں شماروں) کے ملاحظات ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے تحریر کیے۔ نیاز فتح پوری کے ملاحظات اپنے اندر ایک مدیرانہ شان رکھتے تھے۔ اور ان کی دیگر تحریروں کی طرح ملاحظات بھی لوگ دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، نیاز صاحب کے ملاحظات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "نگارِ پاکستان کا اداریہ "ملاحظات" وہ عموماً پرچہ پریس جاتے جاتے لکھتے تھے۔ ملاحظات کا موضوع شروع سے "سیاسیات" رہا ہے۔ وہ پورے مہینے مختلف زبانوں کے اخبار و رسائل غور و خوض سے پڑھتے رہتے تھے اور عالمی یا ملکی سیاست کی کروٹوں کا پورا جائزہ لینے کے بعد ان پر اظہارِ خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں 'نگار' کے علمی و ادبی مقالات پڑھنے والوں کا ایک خاص حلقہ بن گیا تھا وہاں ان کے "ملاحظات" کے شیدائی بھی سیکڑوں کی تعداد میں تھے۔ اور بعض تو صرف اس اداریے کے لیے 'نگار' پڑھتے تھے۔" ۷

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، نیاز کے معتقد ضرور رہیں لیکن

نہیں ۔ چنانچہ انھوں نے ملاحظات کے سلسلے میں بھی اپنی راہ الگ نکالی۔ اور کسی ایک موضوع یا مسئلے پر ملاحظات لکھنے کے بجائے وہ مختلف النوع موضوعات پر ملاحظات قلم بند کرنے لگے۔ ان کے بیشتر ملاحظات کا موضوع خود نیاز فتح پوری رہے ہیں۔ مثلاً مئی ۱۹۶۶ء کے "نگار پاکستان" میں وہ ملاحظات کے تحت نیاز صاحب کی علالت پھر صحت یابی اور پھر علالت کا بالتفصیل ذکر کرتے ہیں جس سے ان کی زندگی کے آخری ایام پر روشنی پڑتی ہے۔ نیاز صاحب جانبر نہ ہو سکے اور ۲۴ مئی ۱۹۶۶ء کو ان کا انتقال ہوگیا جون ۱۹۶۶ء کا "نگار پاکستان" "کلیتہ" ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ادارت میں شائع ہوا۔ اس شمارے میں انھوں نے "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا" کے تحت ملاحظات قلم بند کیا جس میں نیاز صاحب کے انتقال سے اردو دنیا میں جو خلا پیدا ہوگیا تھا اسے بڑے موثر انداز میں بیان کیا۔ اس کے ایک ایک لفظ سے نیاز صاحب سے ان کی محبت اور عقیدت ٹپکتی ہے۔ اسے ہم بجا طور پر ایک بہترین تعزیتی تحریر اور نثر کا ایک عمدہ نمونہ کہہ سکتے ہیں۔
ملاحظہ ہو:

> ۲۴ مئی، منگل، ۴ بجے صبح۔ نیاز صاحب (جنھیں دنیا نیاز فتح پوری کے نام سے جانتی ہے) ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔
> یوں سمجھ لیجیے کہ اردو کا وہ آفتاب، جس کی کرنوں سے علم و فکر کے ایک دو نہیں، صد ہا پہلو روشن تھے، ڈوب گیا۔ آزادیِ فکر اور بے لاگ اظہارِ خیال کی قندیلیں بجھ گئیں۔ اب ایوانِ اردو میں دور تک اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ سرسید، مولانا حالی، محمد حسین آزاد، نذیر احمد اور شبلی کے تبحرِ علمی اور فکر و فن کی یاد تازہ رکھنے والا اب کوئی باقی نہ رہا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولوی عبدالحق پہلے ہی رخصت ہو چکے تھے۔ نیاز فتح پوری کے نام سے اس ایوان کی ایک شمع دلیلِ سحر بنی ہوئی تھی سو وہ بھی خاموش ہوگئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔
> نیاز صاحب اپنی ذات سے ایک ادارہ، ایک مکتبِ فکر اور ایک تحریک تھے۔ ہر چند کہ وہ طبعاً عزلت پسند و گوشہ گیر تھے، کم آمیز و کم سخن تھے، لیکن غالب کے اس شعر کے ترجمان تھے ۔
>
> ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
> ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

وہ گذشتہ پینسٹھ سال سے مسلسل لکھ رہے ہیں اور ایسی انفرادیت کے ساتھ کہ ان کی کسی تحریر کو صرف مکرر کہنا مشکل ہے۔ صحافت، ادبی تنقید، انشائیہ، مکتوب نگاری، تاریخ اسلام، جمالیات، افسانہ،

ناولٹ، تحقیق، علوم عقلیہ، مذہبیات، نفسیات، معلوماتِ عامہ، سب پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے اور اپنے مخصوص اسلوب نگارش وطرزِ فکر کی بدولت ایسا نقش چھوڑ گئے ہیں کہ اردو میں جب بھی یہ موضوعات ومسائل علمی وفنی انداز سے زیر بحث آئیں گے، علامہ مرحوم کا نام ضرور لیا جائے گا۔ ان کی یہی ہمہ جہتی، ہمہ گیری انھیں بلسویں صدی کے دوسرے ادیبوں سے ممتاز کرتی ہے۔"۵۸

جولائی، اگست اور ستمبر ۱۹۶۷ء کے ملاحظات ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے "نیاز صاحب مرحوم اور کراچی" کے عنوان سے لکھے جن میں ان کی کراچی آمد، قیام اور دیگر کوائف تفصیل کے ساتھ بیان کیے۔ نیاز صاحب کی پہلی برسی (۱۹۶۷ء) کے موقع پر "نگارِ پاکستان" کا ایک شمارہ فرمان صاحب نے ان کے نام وقف کیا اور ملاحظات میں نیاز صاحب مرحوم کے تعلق سے دل کو چھو لینے والی باتیں لکھیں۔

جیساکہ پہلے کہا جاچکا ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ملاحظات مختلف النوع موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ چنانچہ سیروسیاحت بھی ان کے ملاحظات کا موضوع رہا ہے۔ فرمان صاحب نے ۱۹۸۰ء میں بھارت کی سیر کی تھی۔ اور یہاں ایک ماہ چند روز قیام کیا تھا۔ اس سفر کے حالات اور تاثرات انھوں نے "نگارِ پاکستان" کے ۱۹۸۱ء کے شماروں میں ملاحظات کے تحت " بھارت میں ایک مہینے تین دن " کے عنوان سے بالاقساط شائع کیے جن میں بھارت کے اہل علم وادب سے ملاقاتوں، یہاں کی علمی وادبی سرگرمیوں نیز شب وروز کی دیگر مصروفیتوں کا ذکر انھوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ اس سفر کے بعد انھیں ستمبر ۱۹۹۱ء میں جموں وکشمیر کے سفر کا موقع ملا۔ چنانچہ واپسی پر انھوں نے "نگارِ پاکستان" کے دسمبر ۱۹۸۱ء کے ملاحظات میں جموں وکشمیر کا سفرنامہ "خطۂ بے نظیر دل نظیر" جموں وکشمیر" کے عنوان سے قلم بند کیا۔ اور اپنے تاثرات بڑے دل نشیں انداز میں بیان کیے۔ ان کی یہ دونوں تحریریں اردو کے بہترین سفر ناموں میں جگہ پا سکتی ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے جب سے " نگارِ پاکستان " کا ہر شمارہ خصوصی شمارہ قرار دیا ہے اس وقت سے وہ ملاحظات کے تحت رسالے میں شامل ادب پارے کے مصنف یا مرتب کا مختصر لیکن نہایت جامع تعارف پیش کرتے ہیں۔ اس کے تمام علمی وادبی کارناموں اور اس کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو وہ ایک یا دو پیراگراف میں نہایت حسنِ سلیقہ کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ نیز شامل اشاعت تخلیق کی اہمیت وافادیت کو بھی بخوبی واضح کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ملاحظات میں شخصی کوائف نگاری، مرقع نگاری اور تذکرہ نگاری کے بڑے اچھے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ "نگارِ پاکستان" کی ایک اشاعت میں انھوں نے کلیم الدین احمد کی

خود نوشت "اپنی تلاش میں" کو خصوصی موضوع بتایا، چنانچہ ملاحظات میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"کلیم الدین احمد اردو ادب کے ان بڑے ناقدوں میں ہیں جو ہزار اختلافات کے باوجود، اردو زبان وادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان کی دو ابتدائی کتابوں "اردو شاعری پر ایک نظر" اور "اردو تنقید پر ایک نظر" نے اردو ادب کے بحرِ منجمد میں وہی تلاطم و طوفان پیدا کیا جو کسی وقت مولانا حالی نے "مقدمۂ شعر وشاعری" کے ذریعے پیدا کیا تھا۔ کلیم الدین احمد نے قدیم وجدید دونوں قسم کے ادب پر قلم اٹھایا ہے اور ہر جگہ اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔ تنقید کے ساتھ انھوں نے قدیم تذکروں اور دواوین کی ترتیب وتدوین، لغت نویسی اور خود نوشت کے عنوان سے بھی اردو کو بہت کچھ دیا ہے۔"[۹]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ملاحظات نہ صرف مرقع نگاری کے بڑے اچھے نمونے پیش کرتے ہیں بلکہ انتقادی پہلو بھی ان میں کافی نمایاں ہوتا ہے، اسی لیے تنقیدی نقطۂ نظر سے بھی ان کی بے حد اہمیت ہے۔ فرمان صاحب نے بعض ملاحظات میں رفتگاں کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے جس میں وہ مرحوم کی نہ صرف خوبیاں بیان کرتے ہیں بلکہ اس سے اپنے ذاتی مراسم اور تعلقات کا بھی ذکر کرتے ہیں اور اس کے اٹھ جانے سے انھیں جو دلی صدمہ پہنچا ہے اس کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ ایسی ہی ان کی ایک تحریر انجم اعظمی مرحوم کے سلسلے میں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"انجم اعظمی ایک اچھے استاد، نقاد اور شاعر تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ ایک بہت اچھے آدمی تھے۔ خوش اخلاق، باوضع، اور حد درجہ خود دار۔ ان کی ذہانت، وسعتِ مطالعہ اور طرزِ گفتگو کے سب ہی قائل تھے اور گھائل تھے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ [illegible] زیرِ بحث پر نہایت مدلل اور دو ٹوک گفتگو کرتے تھے [illegible] اعتمادی اور دل آویزی کے ساتھ اپنی بات اپنے مخاطب سے بہر حال منوا لیتے تھے۔

نیاز یادگاری خطبوں کے موقعوں پر ہر سال ابتدائی تقریر وہی کیا کرتے تھے اور حق یہ ہے کہ اپنے دلکش انداز تخاطب سے سامعین کا دل موہ لیتے تھے۔ افسوس کہ "نیاز یادگاری لکچر کا اسٹیج" انجم اعظمی کی آواز سے محروم ہے۔ مجھے ان کی یاد آج بُری طرح ستا رہی ہے۔ کہاں ڈھونڈنے جاؤں، کہاں سے انھیں

لاؤں اور جلسے کی پہلی تقریر ان سے کیسے کراؤں۔ وائے محرومی وائے مجبوری!"[۳۱]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی صحافتی زندگی کا محور "نگارِ پاکستان" ہے۔ جو تسلسل ہے نیاز فتح پوری کے "نگار" (بعدہ "نگارِ پاکستان") کا۔ بلکہ "نگارِ پاکستان" انھیں کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے آج تک زندہ ہے۔ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ "نگارِ پاکستان" محض ایک رسالے کا نام نہیں، بلکہ اب یہ ایک ادارہ بن چکا ہے جسے ایک انجمن کہہ لیجیے یا "حلقۂ نیاز و نگار" کا نام دے دیجیے۔ اس ادارے، انجمن یا حلقے کی جانب سے نیاز فتح پوری کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے ۱۹۸۴ء سے سالانہ نیاز یادگاری خطبے اور نیاز ایوارڈ کی بنا ڈالی گئی۔ اسی سال نیاز فتح پوری کا صد سالہ جشنِ ولادت "نیاز صدی" کے نام سے منایا گیا۔ اس سے ایک سال قبل یعنی ۱۹۸۳ء میں "نگارِ پاکستان" کا جشنِ طلائی منایا گیا تھا۔ ان تمام سرگرمیوں کی روئدادیں، رپورٹیں اور تصویریں "نگارِ پاکستان" میں نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کی گئیں۔ ۱۹۸۳ء میں جشنِ طلائی کے موقع پر نگارِ پاکستان کا "جشنِ طلائی نمبر" شائع کیا گیا۔ اسی طرح ۱۹۸۴ء میں نیاز صدی تقریبات کے موقع پر اس کے "نیاز صدی نمبر" اجرا عمل میں آیا۔ نیاز یادگاری خطبات کا جو سلسلہ دس سال قبل شروع کیا گیا تھا وہ آج بھی جاری ہے۔ اور اس کے جلسے ہر سال کراچی میں نہایت تزک و احتشام کے ساتھ منعقد کیے جاتے ہیں۔ اس میں بھارت اور پاکستان کے برگزیدہ ادیبوں اور دانشوروں کو نیاز فتح پوری پر لکچر دینے کے لیے مدعو کیا جاتا ہے۔ اس کی تفصیلی رپورٹ ہر سال "نگارِ پاکستان" کے صفحات کی زینت بنتی ہے۔ نیاز فتح پوری سے متعلق تمام یادگاری خطبوں، علمی مذاکروں، ادبی اجلاسوں اور سرگرمیوں کے روحِ رواں ڈاکٹر فرمان فتح پوری ہوتے ہیں۔ انھیں ان کاموں میں حلقۂ نیاز و نگار سے بڑی معاونت ملتی ہے اور حلقۂ نیاز و نگار کا "نگارِ پاکستان" کے بغیر تصور ناممکن ہے۔

اس امر کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ "نگارِ پاکستان" کی جڑیں اگر ماضی میں نیاز فتح پوری سے ملتی ہیں تو حال میں اس کا رشتہ فرمان فتح پوری سے استوار ہے۔ "نگارِ پاکستان" کو نہ ہم ماضی سے الگ کر سکتے ہیں نہ حال سے جدا۔ ماضی کے "نگار" کا تصور جس طرح نیاز فتح پوری کے بغیر نہیں کیا جاسکتا اسی طرح حال کے "نگارِ پاکستان" کے بارے میں فرمان فتح پوری کے بغیر سوچنا امرِ محال ہے۔ ایک طرف ماضی ہے تو دوسری طرف حال۔ ایک طرف نیاز ہیں تو دوسری فرمان۔ میں "نگارِ پاکستان" کو قدیم و جدید، ماضی و حال اور نیاز و فرمان کے درمیان کی ایک کڑی تصور کرتا ہوں۔ اسی لیے میں "نیاز و نگار" کی ثنویت کا نہیں، بلکہ "نیاز و فرمان و نگار" کی تثلیث کا قائل ہوں!

حواشی

۱- فرمان فتح پوری، ملاحظات، ''نگارِ پاکستان'' (کراچی)، نیاز فتح پوری نمبر (حصۂ اوّل)، مارچ اپریل ۱۹۶۳ء، ص ۹-۱۰۔

۲- ''نگار'' فروری ۱۹۲۲ء سے آگرہ ہی سے نکلنا شروع ہوا، لیکن ابوالخیر کشفی نے اپنے ایک مضمون میں نہ جانے یہ کیوں لکھ دیا کہ ''نگار کا پہلا شمارہ فروری ۱۹۲۲ء میں بھوپال سے شائع ہوا، اگرچہ اس کا تجارتی شعبہ آگرہ میں تھا'' (دیکھیے ابوالخیر کشفی کا مضمون ''نگار اور اس کی روایات'' مشمولہ ''نگارِ پاکستان'' (کراچی)، نیاز فتح پوری نمبر (حصۂ دوم) مئی جون ۱۹۶۳ء، ص ۵۴)۔ ''نگار'' آگرہ ہی سے جاری ہوا۔ اس کے فروری ۱۹۲۲ تا دسمبر ۱۹۲۲ کے شمارے آگرہ ہی سے نکلے۔ جنوری ۱۹۲۳ء میں یہ بھوپال منتقل ہو گیا۔ اس ضمن میں خود نیاز فتح پوری کی تحریر سند کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون ''والدِ مرحوم، میں اور ''نگار'' میں لکھتے ہیں:

> ''غالباً نومبر ۱۹۲۱ء کی بات ہے کہ لطیف الدین احمد (ل۔ احمد) کے مکان پر چند مخصوص احباب (ڈاکٹر ضیا عباس ہاشمی، مخمور اکبرآبادی، ملک حبیب احمد خان، مقدس اکبرآبادی، شاہ دلگیر اکبرآبادی وغیرہ اور خود لطیف صاحب) کا اجتماع ہے اور ایک رسالہ جاری کرنے کی تجویز پر گفتگو ہوتی ہے (اس وقت ''نقاد'' بند ہو چکا تھا) اور اس کا اجرا طے پا جاتا ہے۔ اس کے بعد دو سوال سامنے آتے ہیں۔ ایک نام کا، دوسرا سرمایہ کا۔ چوں کہ یہ بات پہلے ہی طے ہو چکی تھی کہ میں اسے مرتب کروں گا اس لیے اڈیٹر کی زندگی کا کوئی سوال سامنے نہ تھا۔ رہا نام، اس کے متعلق جب میری رائے طلب کی گئی تو میں نے ''نگار'' تجویز کیا...
>
> ۔۔۔۔ اس کے بعد سرمایہ کا سوال سامنے آیا تو یہ طے پایا کہ فی الحال کم از کم بیس احباب بیس بیس روپے نگار فنڈ میں جمع کر دیں اور پہلا پرچہ آگرہ سے شائع ہو۔ اس کے بعد میں بھوپال آ گیا اور پہلا پرچہ فروری (۱۹۲۲ء) مرتب کر کے آگرہ بھیج دیا اور مخمور و لطیف نے آگرہ پریس میں چھپوا کر شائع کیا .... اور دسمبر ۱۹۲۲ء تک نگار آگرہ ہی سے نکلتا رہا'' (دیکھیے نیاز فتح پوری ''والدِ مرحوم، میں اور نگار''، مشمولہ ''نگارِ پاکستان'' (کراچی)، نیاز فتح پوری نمبر (حصۂ اول)، مارچ اپریل ۱۹۶۳ء، ص ۲۹-۳۰)

۳- مظفر علی سید نے ادبی موضوعات پر ''نگار'' کے جامع [illegible] میں اشاعت پر زور دیا ہے۔ دیکھیے ان کا مضمون ''[illegible] نیاز'' ''نگار'' مشمولہ [illegible]

(کراچی) :
ارتقاء مطبوعات، اپریل ۱۹۹۰ء)، ص ۱۰۳،
۴۔ فرمان فتح پوری (مرتب)، "قمر زمانی بیگم"، (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۹ء)
ص ۲۲۔
۵۔ نیاز فتح پوری، ملاحظات "نگار پاکستان" (کراچی)، مارچ ۱۹۶۵ء، ص ۷-۸
۶۔ بہ حوالہ "نگار پاکستان" (کراچی)، جنوری ۱۹۹۳ء، ص ۷-۸
۷۔ فرمان فتح پوری، ملاحظات ("حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا")
"نگار پاکستان" (کراچی)، جون ۶۶ ۱۹ء ص ۶۔
۸۔ ایضاً، ص ۳۔
۹۔ فرمان فتح پوری، ملاحظات، "نگار پاکستان" (کراچی)، مارچ ۱۹۹۰ء، ص ۲۔
۱۰۔ فرمان فتح پوری، ملاحظات "نگار پاکستان" (کراچی)، جنوری ۱۹۹۱ء، ص ۶۔

کمال احمد صدیقی،
۱۰ لاجپت نگر صاحب آباد
غازی آباد) یو پی

عرضِ معروض

اکتوبر ۹۳ء کے کتاب نما میں سخن فہمی علاّمی و شاگردان علاّمی کے عنوان سے شمس الرحمٰن فاروقی کا عالمانہ مضمون دیکھا بھی، اور بہت توجہ کے ساتھ پڑھا بھی۔ صرف ایک مقام ایسا ہے جہاں میں نے خود کو ان سے متفق نہیں پایا۔ باقی ان کے مضمون کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف سے کتابت کی غلطیوں کو چھوڑ کر، مجھے مکمل طور پر اتفاق ہے۔ میرے مضمون کے لہجے اور زبان کے بارے میں جو یہ اعتراض انھوں نے کیا ہے جناب کمال احمد صدیقی نے جناب زاّر کے تئیں سخت لہجہ اختیار کیا ہے۔ مجھے خوشی ہوتی، اگر وہ نرمی سے کام لیتے۔، مجھے اس سے بھی پورا اتفاق ہے۔ میں نے وہ لہجہ کیوں اختیار کیا۔ اس کی ذرا سی وضاحت ضروری ہے۔ چھوٹے موٹے مقامی یا علاقائی اخبار اور رسائل کی بات نہیں۔ نصف سے زیادہ صدی بیت گئی متعدد رسائل میں میرے مضامین نثر و نظم کی اشاعت پر صرف چند مضامین اس لہجے میں لکھے ہیں، صرف چند، جن کو گننے کے لیے ایک ہاتھ کی انگلیوں کی ساری پوروں کی بھی ضرورت نہیں۔ بال جبریل میں اقبال نے خود اپنے بارے میں کہا تھا:

چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبالؔ
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

اسمٔہ فن کا نام ادب و احترام سے لینا چاہیے۔ لیکن بقلم خود لکھی ہوئی کتاب مسلمات فن میں زاّر علاّمی نے اپنے غول میں شامل شاگردوں کو مرعوب کرنے کے لیے ہر لائق احترام ہستی کے لیے نازیبا کلمات استعمال کیے ہیں۔ انھیں پورا حق تھا کہ وہ اپنی کتاب کا انتساب اپنی انا کے نام کرتے لیکن اس انا کی پرورش کے لیے اسمٔہ فن کی شخصیتوں کو قتل کر کے۔ ان کا خون پلوانا، گوشت کھلانا، ہڈیاں چبوانا ضروری نہیں تھا۔ [illegible] کر سکتے تھے لیکن علمی سطح پر ایسا انھوں نے نہیں کیا صرف چند مثالیں، کسی تبصرے کے بغیر!

ص ۱۶۔ ...یہی وہ مقام ہے جہاں محقق طوسی بھٹک گئے

ص ۱۷: یہ تک کوئی شک نہیں کہ پہلے اصلِ مثمّن کو مجرد کر کے مربّع کیا جائے اور مربّع کو مضاعف کر کے مثمّن کیا جاتا ہے اور اس مثمّن کو مجرد کیا جاتا ہے۔ لہٰذا محقق طوسی کا یہ عمل ہرگز قابلِ قبول نہیں۔

ص ۲۰۔ .. محقق طوسی کا اس مقام پر نا علاقی کی طرف اشارہ کرنا محض لکھا ہٹ ہے۔

ص ۱۳۵۔ .. ناسخ اور صاحب تراالامعا شت نے [illegible] مطلع کو مسرف عل منائی لن

مس تف علن مفاعی لن میں بتایا ہے، جب کہ یہ کوئی بحر ہے ہی نہیں (۱)"

ص ۳۸:.... آنجہانی نے عروضیوں کی اس مضحکہ انگیزی اور بے راہ روی کو شدت سے محسوس کیا

ص ۹۱:.... لہذا فلک کا یہ قول کہ مفتعلن وتد مفروق اور وتد مجموع کا مرکب ہے، محض لغو ہے، اور عروض کے مزاج سے ناواقفیت کی دلیل ... لہذا فلک صاحب کا قول محض لغو ہے... ان کا طریقۂ استدلال غلط بھی ہے اور مہمل بھی۔"

ص ۹۳:... خدائے سخن میر تقی میر کی ایک غزل، میر کے تلفظ میں نہیں، اپنے تلفظ میں پڑھی، اور میر کے آہنگ میں نہیں، اپنے نادرست آہنگ میں پڑھی اور فیصلہ صادر فرمایا: چونکہ بحر بدل گئی لہذا غزل ناموزوں!"۔ خدائے سخن کی غزل ناموزوں بتانا بے ادبی اور گستاخی کی سرحد ہے۔ یہ ہے زار کی عروض دانی! مزید حکم: غلط قسم کے تصرفات ہمیشہ غلط ہی رہتے ہیں۔ ایسے مقامات پر جو اصحاب میر سے مرعوب ہو کر یہ کہتے ہیں کہ آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں، محض جوش عقیدت ہے"

لازمی ہے کہ زار علامی کی عروض دانی کو کشادہ کیا جائے:

ص ۱۰۱:... لہذا موصوف کے تمام اوزان غلط در غلط اور مہمل!"

ص ۱۰۲:... ہمارے مضمون اور کلید عروض کی اشاعت سے پہلے ہر عروضی[۳] قطان ہی کا ہم نوا تھا، اور شجرۂ اخرب اور شجرۂ اخرم کا ذکر کرتا تھا۔"

ص ۱۱۱:... دیدۂ عبرت کشا، قدرت حق را بہ بیں اور توپیاں کچھ نہ تھا اک مگر دیکھنا (کذا) اور (جوش ملیسانی نے) بحر منسرح (طے، کف اور وقف کے زحاف سے) میں بتایا ہے

شعر بحر منسرح میں دبتے ہی نہیں۔ بحر منسرح کے ارکان ہیں مس تف علن مفعولاتُ مس تف علن مفعولاتُ۔ کسی بھی رکن پر کف کا عمل ہوتا ہی نہیں۔ تعجب ہے کہ حضرت نے یہ بات کیوں کہہ دی۔ منسرح میں کف کی بات کرنا سراسر غلط اور مہمل ہے۔ دونوں

---

(۱) تفصیل سے آنے والی کتاب میں لکھا گیا ہے۔ مستفعلن کا مقبول مرفل مسکن (مُس تَ عِلُن تُن) تَ ساکن کر کے مفاعیلن حاصل ہوتا ہے۔ ناسخ جو زبان اور عروض پر مکمل عبور رکھتے تھے ان پر غلط اعتراض کرنا گستاخی ہے (خوب اپنی عروض دانی برہنہ کی ہے)

(۲) عروضیوں کا نام نہیں لیا ہے، لیکن مراد خواجہ نصیر الدین محقق طوسی (صاحب معیار الاشعار) سے ہے رباعی میں مفعول مفاعلن مفاعلن فعل (فعول یا مفعول مفاعیل مفاعلن فعل (فعول یا فعول) ترتیب رکھنے کو مضحکہ انگیزی اور بے راہ روی کہا گیا ہے۔

(۳) اپنے بارے میں کیا کیا حسن ظن ہے۔ یہ ہر عروضی کو گالی دی ہے۔ خورشید لکھنوی کی کتاب ۱۸۹۰ء میں چھپی تھی ص ۷، یہ عبارت ہے "یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ واقعی ان اوزان میں رکن اول اخرم ہے بلکہ وہاں بھی رکن اول اخرب ہے گو ہوں کہ بوجہ تحقیق رکن اول مشابہ اخرم سے ہوگیا، اس لیے اس شجرے کو شجرۂ اخرم کہتے ہیں۔ ایک مضمون میں چونکہ زار نے افادات کا ذکر کیا ہے، اس لیے اپنے عالم شاگردوں پر رعب جمانے کے لیے خورشید لکھنوی کے خیال کا سرقہ کیا ہے، اور اس خیال کو اپنے کھاتے میں ڈالا ہے، جو سرقہ ہی نہیں، بلکہ پیش رو عروضیوں کی شان میں سخت گستاخی ہے۔

شعر بحر بسیط اور رجز میں غوطہ کھاتے ہیں

شاگرد داغ، جوش ملسیانی کے لیے سراسر غلط اور مہمل کے الفاظ استعمال کرنا گستاخی انتہا ہے۔ کتاب زار نے بقلم خود لکھی ہے۔ غالب کے شعر میں ایک کی جگہ اک مصرع ثانی ں لکھا ہے۔ اسی سے واضح ہے کہ ان کی عروض دانی کے اندر کتنی گرہیں ہیں۔ کف واضح طور ، غلط کاتب ہے۔ وقف لکھا ہے، تو اس کا متبادل کسف ہی ہو سکتا ہے غلط کاتب کو جوش سیانی کے کھاتے میں ڈالنا ڈنڈی مارنا ہے۔ منسرح میں وزن درست ہے مربع ناعف مفتعلن فاعلن / فاعلان چار بار۔ منتہی العروض پڑھنے کی توفیق ہو تو ملاحظہ فرمائیں گے، ز میں یہ وزن نہیں آتا، کیوں کہ فاعلن مرفوع ہے، اور مرفوع رکن عروض وضرب میں نے پر حکم امتناعی ہے۔ بسیط میں بھی مربع نہیں کہ ایک رکن کو مسطوی رکھیں اور رسرے کو سالم۔ مربع تقطیع منسرح ہی میں ہے

زار علامی کے مضامین اور کتابیں ایسے ہی ناگزیدہ، اور گستاخانہ، اور نادرست ات کا بھنڈار ہیں۔ چند نمونے پیش کر دیے گئے، موصوف صرف سخت لہجہ کے عادی ہیں س لیے خود پر جبر کر کے ان کی مرغوب زبان میں اُن کو مخاطب کیا گیا، تاکہ انھیں اور اُن ے غول کو احساس ہو کہ جو زبان وہ دوسروں کے لیے استعمال کرتے ہیں، اُن کے لیے ی استعمال کی جا سکتی ہے۔ میں شمس الرحمان فاروقی صاحب کا شکر گذار ہوں کہ انھوں ے سخت لہجے کی طرف توجہ دلائی، اور مجھے یہ معروضات پیش کرنے کا موقع ملا۔ مجھے اُن اس بات سے بھی اتفاق ہے کہ اس میں زار صاحب کے شاگردانِ ناخواندہ کے یے بھی نکات پوشیدہ ہیں۔ فاروقی کی ایک بات سے مجھے اختلاف ہے، اور شدید ختلاف۔ انھوں نے زار کے تجویز کیے ہوئے تینوں غیر حقیقی اوزان کو پادر ہوا اور گوزِ شتر ایا ہے۔ اس سے شتر کی توہین ہوتی ہے۔ ایک تو شتر کو اتنی بڑی گالی دینا مناسب ہیں۔ دوسرا خطرہ یہ بھی ہے کہ زار علامی اور ان کے ناخواندہ شاگردوں کا غول گوزِ شتر کو کوئی حاف نہ سمجھ لے! اس قبیلے کے ایک ناعروضی شتر زحاف کو شتر لکھتے ہیں، اور اشتر احف کو اُشتر!۔

ستمبر کے کتاب نما میں میرا جو مضمون شائع ہوا تھا، اس میں مستند ماخذوں ے نظریں پیش کر دی گئی تھیں، جن کی رو سے مقتضب میں دونوں اوزان اور ہزج ایک وزن، جو زار علامی نے پیش کیا تھا۔ تینوں غیر حقیقی ثابت ہوئے۔ زار علامی کو اگر اپنی ا اور عروض دانی عزیز تھی تو باوقار طریقے سے اپنی غلطی تسلیم کر لیتے۔ غلطی کس سے نہیں ہوتی ر غلطی تسلیم کرنا عالموں، بڑے دل والوں اور بلند حوصلے والوں کا شعار ہے۔ غلطی تسلیم رنے سے وقار میں اضافہ ہوتا ہے، کمی نہیں ہوتی۔ غلط بات پر اڑے رہنا اہل علم کا طریق نہیں۔ ر زار سمجھتے تھے کہ ان کا نقطۂ نظر درست ہے، تو اکتوبر کے کتاب نما میں ان کا جو مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں کم از کم ان باتوں کا جواب ہوتا۔

"مرفوع مزاحف عروض اضرب میں بھی آسکتا ہے۔ اس لیے کہ وہ منتہی العروض سے زیادہ اہم کتاب سے حوالے کے ساتھ عبارت نقل کرتے۔ منتہی العروض، جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، سید محمود کی کتاب ہے، اور اس پر خواجہ الطاف حسین حالی جیسے جید عالم کی تقریظ ہے۔ حالی کے الفاظ میں:

"ظاہراً اس رسالہ میں عروض کی کوئی ضروری بات فروگذاشت نہیں ہوئی۔ اور زحافات کا بیان، جو اکثر فارسی رسالوں میں بھی، پورا پورا بیان نہیں ہوا، اس رسالہ میں بوجہ استیفا لکھا گیا ہے۔ پھر زحافات کا باب، جو اکثر کتابوں میں نہایت منتشر طور پر لکھا گیا ہے، اس رسالہ میں ایسا نہیں ہے، بلکہ ایسے ضبط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ طالب علم کو اس کے یاد کرنے میں، میرے نزدیک، ضرور مدد ملے گی ..."

رفع کے سلسلہ میں اقتباس پیش کیا جا چکا ہے کہ یہ عروض وضرب میں نہیں لایا جاسکتا۔ نار علامی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ خاموشی اس بات کا ثبوت ہے کہ انھوں نے تسلیم کر لیا کہ مقتضب میں مرفوع مزاحف رکھ کر، انھوں نے "وزن" جو وضع کیا تھا، وہ خلافِ وضعِ عروض تھا۔

۲۔ ہزج میں پہلا حشو محذوف مقبوض فعول رکھا گیا تھا۔ متقارب میں مقبوض فَعُول ہے۔ لیکن ہزج میں چونکہ حکم معاقبہ ہے (عروض وضرب کے استثنا کے ساتھ اور وہ بھی فارسی میں، رباعی کی ضربوں کی وجہ سے) اس لیے محذوف مقبوض، یا مقبوض محذوف مزاحف امر ممتنع ہے، اور پھر محذوف رکن حشوین اور صدر و ابتدا میں آ ہی نہیں سکتا۔ باوقار طریقے سے اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بجائے اکتوبر کے مضمون میں یہ خوش بختی ملاحظہ ہو:

رباعی میں آنے والا فعول، بہ سکون لام، دو زحافات کا مرہونِ منت ہے ۱؎ حذف ۲؎ قصر، یعنی اہتم ۔ رباعی میں اس کی اجازت ہے ۔ کیوں؟ اس پر صدیقی صاحب نے کوئی روشنی نہیں ڈالی ۔ جب رباعی میں اس کا رکھنا جائز سمجھ لیا گیا تو فعول بحرکتِ ل کو بھی جائز قرار دیا جانا چاہیے چوں کہ اس فعول کو حاصل کرنے کے لیے حذف وقبض کا عمل ہوا ... دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ ایک جگہ حرف ساکن کو گرایا گیا ہے، اور دوسری جگہ حرف متحرک کو جو گرایا گیا ہے۔ لیکن ہر دو صورتوں میں مفاعی لن کے دونوں سبب خفیف متاثر ہوتے ہیں ۔ لہذا جب فعول بسکون لام کا استعمال جائز ہو جاتا ہے تو فعول بہ تحریک لام کا استعمال جائز ہو جاتا ہے ۔

میں کیا روشنی ڈال سکتا ہوں، اس کے علاوہ کہ ہزج میں عروض، صدر

چھوڑکر، اسباب خفیف کے ساکنوں، یا اور نون میں معاقبہ ہے۔ معاقبہ
سے کہتے ہیں کہ دو متصل اسباب خفیف کے ساکن اوہ ایک۔ کن میں ہوں، یا
متوالی ارکان میں، ثابت تو رہ سکتے ہیں، دونوں ایک ساتھ گرائے نہیں جا سکتے
ایک کا باقی رکھنا لازم ہے، وجوباً۔ نہ رکامل عیار، مترجمہ اسیر، میں ص ۱۱۰ پر ان بحور
میں معاقبہ بتایا گیا ہے منسرح، رمل وافر، ہزج، خفیف، مجتث، طویل، کامل
مدید۔ یہ وضاحت بھی ہے کہ کامل اور وافر میں معاقبہ باہم... مخصوص ہوگا۔
بحر الفصاحت ۔۔ العروض میں ص ۲۴ پر یہ بتایا گیا ہے کہ ہزج میں مجبوب فعل، ہتم فعول
... فاع، ابتر (فع) ۔ " یہ چاروں زحاف رباعی سے مخصوص ہیں۔ رباعی کا عروض
ضرب ان چار حالتوں سے خالی نہیں ہوتا۔ لیکن اساتذہ نے رباعی کے وزن میں
غزل کبھی بھی جائز رکھی ہے اس لیے یہ زحاف غزل کے عروض و ضرب میں بھی
سکتے ہیں۔" بالکل یہی بات، چند الفاظ کے پھیر سے نجم الغنی نے بحر الفصاحت ص ۱۶۲
پر رباعی کے عروض و ضرب کے بارے میں لکھی ہے۔ معاقبہ، مراقبہ اور مکانفہ کے
بارے میں ص ۱۶۰، ۱۶۱ پر تفصیل درج ہے۔ ص ۱۶۵ پر عروض و ضرب سے مخصوص
بارہ زحافوں میں قطع، حذذ، اذالہ، ترفیل، خلع، وقف، کسف، صلم، قصر، حذف،
تسبیغ، بتر اور تشعیث شامل ہیں۔

حذف عروض و ضرب کے لیے خاص ہے، قصر اور دوسرے مندرجہ بالا زحافوں
کی طرح۔ اور یہ بات نارنگ بھی مسلمات میں لکھ چکے ہیں، بقلم خود ص ۲۴۔

حذف: - اسقاط سبب خفیف از آخر رکن جب صدر وا بتدا
اور حشو ین کو قصر ہی کا عمل گوارا نہیں، تو حذف کے گوارا کرنے
کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

محذوف رکن چاہے وہ مفرد مزاحف ہو، یا کسی عام زحاف یا مخصوص
... مخصوص زحاف کے ساتھ مرکب ہو۔ عروض و ضرب کے علاوہ کسی ... ...
میں نہیں رکھا جا سکتا۔ نارنگ مجھ سے سوال کرنے سے پہلے اپنی ہی کتاب میں بقلم خود
لکھے ہوئے اس صفحے کو پڑھ لیا ہوتا۔ انھیں اپنے نظریے میں تبدیلی کرنے کا پورا حق
ہے۔ پہلے حذف اور قصر کے بارے میں اپنے اس بیان کا ابطال کریں۔ پھر مجھ
سے جواب طلب کریں۔ میں تفصیل سے اور بھی لکھوں گا لیکن ان کی عروض دانی کی
موجودہ حالت دیکھنے کے بعد۔ پھر اس بات کا بھی لحاظ رکھیں کہ جس طرح لوگ
میلے کپڑے اتار دیتے ہیں، یا سانپ کینچلی اتار دیتا ہے، اگر وہ بھی حذف کے بارے
میں اپنا نظریہ کچھ اور پیش کریں گے تو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، کیوں کہ وہ
اس مصرعے کو فیضی سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ ثابت کرنا ہوگا کہ اس عہد
میں ہزج میں مقبوض محذوف رکن ہزج میں تھا، اور یہ کہ یہ آہنگ اس عہد میں

یا اس سے پہلے استعمال ہوا ہے۔

زآر نے لکھا ہے۔ فعول بسکونِ لام اور فعول بہ تحریک لام میں حذف کا عمل مشترک ہے۔ فعولْ بسکون لامؔ میں قصر کے ذریعہ مفاعی لن کے پہلے سبب خفیف پر آخری سبب خفیف کو گرا کر قصر کا عمل ہوا ہے۔ اسی طرح فعولُ بہ تحریک لام میں آخری سبب خفیف گرانے کے بعد یا گرانے سے پہلے قبض کا عمل ہوا ہے۔ دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ ایک جگہ حرف ساکن کو گرایا گیا ہے، اور دوسری جگہ حرف متحرک کو گرایا گیا ہے۔"

زآر علامی عروض کی مبادیات اگر پڑھ لیں تو انھی کا بھلا ہوگا۔ قصر کی تعریف ان کے ذہن میں یہ ہے:

"اسقاطِ حرفِ متحرک بہ سبب خفیف، از آخر رکن۔" (ص ۲۴۔ مسلمات فن) اگر فارسی آتی نہیں تو اردو میں لکھیے۔ یہ بھی کسی عطائی عروضی کا بولا ہوا جملہ ہوگا کتابت کی غلطی کا امکان نہیں کیوں کہ کتاب موصوف نے بقلم خود لکھی ہے۔ حرفِ متحرک بہ سبب خفیف ..میں حرف جار بہ کا استعمال محلِّ نظر ہے۔ خیر۔ موصوف سے زیادہ کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ رکن سالم کے آخر میں واقع سبب خفیف کے متحرک کو گرانا قصر کا عمل ہے۔ جو عروض مجھے پڑھائی گئی۔ اس میں قصر کی تعریف یہ ہے "سببِ خفیف پر ختم ہونے والے رکنِ سالم کے آخر کا حرفِ ساکن ساقط کیا جائے اور اس کے ماقبل کے متحرک کو ساکن کیا جائے۔

صاحب معیار الاشعار نے (ص ۱۸) حذف اور قصر کی تعریف یوں کی ہے:

دیگر نوعِ خاص بود با واخر مصراعہا، وآں دو گونہ بود۔ یکے آنکہ ساکنِ سبب را اسقاط کنند، و متحرکش را ساکن کنند، ورکن را بعد از یں تغیر مقصور خوانند۔ دوم آنکہ سبب را بیفگنند و رکن را محذوف خوانند"

عروض و ضرب سے مختص زحافات کے عمل کو بیان کرتے ہوئے منتہی العروض میں ص ۲۰ پر یہ اندراج ہے:

(۲) اگر سبب خفیف پہ ختم ہونے والے) ان ارکان میں سبب خفیف کا ساکن حرف گر جائے اور متحرک ساکن ہو جائے، تو اس کو قصر کہتے ہیں اور اگر سارا سبب گر جائے تو اس کو حذف کہتے ہیں۔"

بحر الفصاحت میں مفاعیلن کے زحافات کے تحت ص ص ۱۴۴-۱۴۳ پر ان دو زحافوں کی تعریفیں یہ ہیں:

قصرؔ.... اصطلاح میں مراد ہے ساقط کرنا، حرف ساکن سبب خفیف کا، جو آخر رکن میں واقع ہوا ہو، اور ساکن کرنا اس کے ماقبل کا،،

حذفؔ:۔ اصطلاح میں مراد ہے اسقاط سبب خفیف سے جو رکن

کے آخر میں ہوگا

آئینۂ بلاغت میں مرزا محمد عسکری نے ص ۱۱۹ پر ان دو زحافوں کی تشریح
یں کی ہے۔

قصر: حرف ساکن سبب خفیف کو، جو رکن کے آخر میں آئے، گرا دینا، اور
متحرکِ ماقبل کو ساکن کر دینا۔

حذف:۔ سبب خفیف جو رکن کے آخر میں ہو، گرانا۔"

یہ سارا استدلال، جو قصر کی غلط تعریف کی وجہ سے زار نے فعول اور فعول کے
بارے میں کیا تھا، تاش کے پتوں کے محل کی طرح ڈھے گیا۔ پھر حذف اور قصر،
دونوں آخرِ مصرع کے زحاف ہیں، چاہے انھیں صدر و ابتدا کے خاص زحافوں
سے آمیختہ کیا جائے، یا عام زحافوں سے۔ تو بھی وہ عروض و ضرب کے علاوہ کہیں
اور نہیں رکھے جا سکتے۔ پھر ہزج میں عروض و ضرب کے علاوہ، کہیں حکم معاقبہ کی
خلاف ورزی نہیں کی جا سکتی۔ محذوف مقبوض مزاحف ہزج میں بنایا ہی نہیں جا
سکتا۔ کیونکہ یا اور نون میں معاقبہ ہے۔ حذف سے جب نون، ماقبل متحرک کے
ساتھ گر گیا، تو قبض سے یا نہیں گرایا جا سکتا۔

زار اپنے موقف کے حق میں کوئی سند، کوئی نظیر پیش کر سکتے ہیں؟

۴۔ زیرِ نظر مضمون میں میرا سوال، اور اس کا جواب زار نے دیا ہے۔ ملاحظہ
فرمائیں:

"جو اوزان انھوں (زار) نے بحر مقتضب میں تجویز کیے ہیں،
کیا وہ فارسی میں رودکی سے لے کر فیضی تک کے یہاں، اور فیضی
کے کسی ہم عصر... یا کسی شاعر کے یہاں اس آہنگ میں کسی ایک کی
بھی غزل ہے؟ (صدیقی)

کمال صاحب کا جواب یہ ہے کہ مشاہیر کے کلام سے ہر وزن میں
مثالیں تلاش کرنے کا کام صرف وہی لوگ کیا کرتے ہیں۔ جن کا
عروض سے کوئی تعلق نہ ہو۔ عروض جاننے والے عروض کے قواعد
کی بات کیا کرتے ہیں، اور ہر اس وزن کو تسلیم کر لیا کرتے
ہیں، جو قواعدِ عروض کے تحت حقیقی ہوا کرتا ہے۔"

کیا عرض کیا جائے، سوا اس کے کہ آپ عروض کے مبادیات سے ناواقفِ
محض ہیں۔ اس لیے آپ اس مرتبہ پر فائز ہیں کہ مثالیں تلاش کریں۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے، اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

زار علامی نے تلوار توڑ کر پھینک دی، اور سپر ڈال دی۔ اور یہ لکھ کر قلم

بھی توڑ دیا کر مشاہیر کے کلام سے ہر وزن میں مثالیں وہی تلاش کیا کرتے ہیں، جن کا عروض سے کوئی تعلق نہ ہو۔ موصوف کو یہ بھی معلوم نہیں کہ خلیل بن احمد بصری اور صاحب معیار الاشعار کا طریق کیا تھا۔ پہلا عروضی خلیل کو مانا جاتا ہے۔ اُس نے پندرہ آہنگ چننے اور ان کی درجہ بندی کی اور انھیں سے عروض کے اصولوں کا استخراج اور استنباط کیا۔ یہ بحور ہیں: طویل، مدید، بسیط، کامل، وافر، ہزج، رجز، رمل، منسرح، مضارع، سریع، خفیف، مجتث، مقتضب اور متقارب۔ خلیل کی ولادت دوسری صدی ہجری کے تیسرے برس میں ہوئی، اور وفات ۱۷۰ھ ہجری میں۔ اس نے اوزان پہلے نہیں بنائے بلکہ شعرائے سلف کے کلام کو پڑھا، ان کے آہنگوں کو سمجھا، پھر بحور وضع کیں اور زحافات کا نظام۔ اور جب لکھا، تو مشاہیر شعرا کے کلام سے مثالیں دیں۔ صاحب معیار الاشعار نے بھی ایسا ہی کیا۔ خلیل بصری اور صاحب معیار الاشعار کے درمیان عربی اور فارسی کے اور عروضی بھی گزرے۔ اُن کا شعار بھی یہی رہا۔ صاحب معیار الاشعار نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس ترجمہ زر کامل عیار (ص ۱۱۲) سے پیش کیا جارہا ہے۔ اسی صفحے پر اصل فارسی عبارت بھی ہے۔ دیکھی جاسکتی ہے؛

> اور عادت عروضیوں کی یہ ہے کہ واسطے ہر وزن کے ایک بیت مثال کی لاتے ہیں اور بیتیں عروض عرب کی ہمیشہ وہی بیتیں لاتے ہیں کہ خلیل احمد لایا ہے، اس واسطے کہ اس میں کوئی تصرف نہیں ہوا ہے۔ پس ہم بھی وہی بیتیں بعینہ لائیں گے، اور ابیات، شواہد مزاحفات کہ خلیل احمد لایا ہے، ہم نے ان کی تخفیف کی، مگر عروض فارسی میں، ہر شخص ایک بیت جداگانہ لایا ہے۔ لہٰذا ہم نے بھی رعایت ابیات معیّن کی نہیں کی۔ جیسا اتفاق پڑا، دیا لکھا، اور بہت سے وزن ہیں، کہ جب تحقیق کیجیے، ایک وزن ٹھہرتا ہے۔"

تو جناب یہ عروضی کا فرض اوّلیں ہے کہ اگر کوئی وزن عروضی پیش کرتا ہے اور اس وزن کو حقیقی جانتا ہے، تو مشاہیر کے کلام سے مثال میں بیت یا ابیات پیش کرے، جن کا عروض سے تعلق ہوتا ہے، اور ادبی ذخیرے سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ صرف وہی مشاہیر کے کلام سے وزن حقیقی کی مثالیں پیش کر سکتے ہیں جو دعوا کرے، اور متقدمین، متوسطین یا متاخرین کے کلام سے۔ آہنگ کی ایک مثال معتبر حوالے کے ساتھ نہ پیش کر سکے، اس کے بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی کا قول درست ہے، اگرچہ اس سے شتر کی انا کو ٹھیس پہنچے گی۔ عروضی عروض کا ماہر ہوتا ہے، شتر بے مہار نہیں ہوتا۔

عروض کو گورکھ دھندا بنا رکھا ہے، اور اس کی وجہ سے، وہ موزوں طبع لوگ، جو آسانی سے عروض کی مبادیات ہی نہیں، اس کے نازک نکات بھی سمجھ

سکتے ہیں، زحافات میں تضادات اور مراقبہ، معاقبہ اور مکانفہ کی وجہ سے، اُسے گتھی سمجھ کر اُکتا جاتے ہیں۔ سلیس زبان میں، عام قاری کے لیے "آہنگ اور عروض" لکھی گئی۔ بنیادی اصول کیا ہیں۔ دائرے اور فکِ بحور اور دوسری باتیں عام قارئین کے لیے تھیں۔ میں ذاتی طور سے مراقبہ، معاقبہ اور مکانفہ کا قائل نہیں۔ زحافات میں جو نا مطابقتیں تھیں، مزاحف پر زحاف لگانے کا جو دستور چلا آرہا تھا، وہ بھی لکھا گیا لیکن یہ بھی بتایا گیا کہ تضاد دور کر کے عروض کو کسی طرح ایک باقاعدہ نظام بنایا جا سکتا ہے ریاضی کی طرح۔ ارکانِ ثمانی کے دو دائرے، اور ان کی بحریں بنائی گئیں۔ اُن کے آہنگ زحافوں کے ساتھ وضع کیے گئے۔ نئے آہنگ تلاش کیے گئے، اس گذارش کے ساتھ اور اس توقع کے ساتھ کہ اگر اُن میں جان ہوئی، خوش آہنگ ہوئے۔ تو شاید استعمال میں آئیں ورنہ خزاں رسیدہ پتّوں کی طرح گلزارِ عروض کی خاک کا حصہ بن جائیں گے۔ اگرچہ تحقیق کا کام تھا، لیکن کوئی بلند بانگ دعویٰ نہیں کیا گیا۔ علم کی دنیا میں دعوے کرنا، اور اپنی انا کو گوزشتر بھر کر غبارے کی طرح پھلانا، تحسین کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ کوئی تحریر حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ اگر کوئی مصنف یہ سمجھتا ہے کہ اس کے مضمون/کتاب میں کوئی خامی نہیں تو وہ احمق نہیں، بلکہ حمقِ مجسم ہے۔

آہنگ اور عروض میں کچھ کمیاں بھی ہیں اور کچھ غلطیاں بھی، جن میں کچھ کتابت کی بھی ہیں، جیسے محذوذ کی جگہ محذوف کتابت ہوا ہے۔ اور کچھ سہو بھی مجھ سے ہوئے ہیں۔ اگر نزار علامی واقعی کسی غلطی کی نشاندہی کرتے، تو میں بڑے خلوص سے اُن کا شکریہ ادا کرتا۔ افسوس یہ ہے کہ انھوں نے جتنے اعتراض کیے ہیں، وہ بامعنی نہیں ہیں۔ علمی کام ٹھنڈے دل و دماغ، اور بے تعصبی سے کرنا چاہیے۔ تنقیص سے انا اور احساسِ کمتری کا علاج تو شاید ہوتا ہو لیکن قارئین کی نظروں میں وقار ختم ہو جاتا ہے۔

جو تحریر شائع ہو جائے، اس پر اعتراض کرنے کا حق ہر قاری کو ہے۔ جو حق ہر قاری کو ہے وہی نزار علامی کو بھی ہے۔ میں ہر بات کا جواب عرض کروں گا۔ نزار علامی کی طرح یہ کہہ کر تو بے کے بل چھپنے کے لیے ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کروں گا کہ مثالیں یا نظیریں وہی لوگ تلاش کرتے ہیں جن کا عروض سے کوئی تعلق نہیں۔

اعتراض: "جناب کمال نے آہنگ اور عروض ص ۱۱۶ پر ایک رکن مفاعلُ
اور دوسرا رکن فاعلُ دیا ہے دونوں رکن مفاعی لن کے سببین
خفیف پر بیک وقت قبض اور کف کے عمل سے حاصل ہوئے
ہیں/کیے گئے ہیں۔ صدیقی صاحب اپنے وضع کردہ ان ارکان کے
متعلق کیا فرماتے ہیں؟ کیا یہاں خلاف ورزی قانون عروض
نہیں؟

جواب: فاعلُ میں خرم کا عمل بھی قبض اور کف کے ساتھ شامل ہے۔ نزآر نے یہ نہیں لکھا کہ کس قانون عروض کی خلاف ورزی اُنھیں دکھائی دی؟ غالباً حکم معاقبہ کی۔ جی نہیں، عروض کے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں ہوئی۔ خلاف ورزی اس وقت ہوتی جب یہ مزاحف (دونوں بیک) کسی اس بحر کے آہنگ میں استعمال کیے ہوتے جو حکم معاقبہ کے تحت ہیں۔ مفاعیلن میں حکم معاقبہ ان بحروں میں ہے۔ (باقی آئندہ)

شمیم احمد
ای-۳/۱۳۹ ا ریرا کالونی
بھوپال

من کہ مسٹر فاعلن

مسٹر فاعلن کا قارئین کرام کی خدمتِ اقدس میں فرشی السلام علیکم۔ بعدہٗ وعلیکم السلام ہم اپنے آپ کو بہ حیثیت مسٹر فاعلن متعارف کرانے میں وہ خوشی محسوس کر رہے ہیں جو مسٹر کولمبس کو امریکا شریف کھوجنے کے بعد بھی نصیب نہ ہو سکی تھی، اس لیے کہ ہم اپنی آپ دریافت ہیں اور یہی وہ گُر ہے جو مسٹر کولمبس کو معلوم نہ تھا ورنہ وہ امریکا کھوجنے کے بجائے اپنی ذات کے بحرِ ذخار میں ڈوب کر سراغِ زندگانی پا جاتے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی کہ کیا حادثہ ہوا۔

فاعلن اور اس کے سر پر سوار چھچے کو دیکھ کر آپ کو اتنا تو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ سببِ خفیف اور وتدِ مجموع سے آراستہ و پیراستہ بحرِ متدارک سالم کا یہ رکن رکین جو کسی زاویے سے مکفوف و محذوف ہے نہ مخبون و مقصور، نہ مقبوض و مشکول ہے اور نہ مکسوف و موقوف اپنی اصل ہیئت کذائی کے ساتھ ہمارا تخلص ہے۔ تخلص جیسی نعمت (بلکہ رحمت) صرف اسی شخصِ بے مشخوص کو نصیب ہوتی ہے جو سر سے پانو تک فنافی الشعر اور کاروبارِ سخن دری میں غوطے لگانے میں مشغول و مصروف ہو بہ استثنائے غریق رحمت مولانا بے ریش مولوی علامہ بھوپالی کے جنھیں ام کے عدم تشدد کی وجہ سے اکثر حضرات تخلص بر وزنِ تغلق کہا کرتے تھے۔ کیونکہ موصوف اردو طنز و مزاح کی فیلڈ میں بہ اندازِ تغلقی کود ے تھے۔ ہمارے اس تخلص کو دیکھ کر آپ کو یقیناً یہ غلط فہمی ہو رہی ہوگی بلکہ ہو چکی ہوگی کہ ہم از قسم شاعر کوئی ناچیز ہیں یا سخن کھیت میں اگی ہوئی کوئی مولی۔ مگر ہم شروع ہی میں آپ کی غلط فہمی کا ازالہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ بعد میں آپ ہمارے خلاف ازالۂ حیثیتِ عرفی کی نالش کرنے کا پلان نہ بنا سکیں۔

اگر آپ کو کسی شریف آدمی کی بات پر تیقین کرنے کی لت لاحق ہو تو یقین کیجیے کہ آپ کے یہ مسٹر فاعلن کسی بھی زاویے سے نہ شاعر ہیں نہ واعر۔ اگر آپ کو اس ایک عدد تخلص کا وجود ہمیں شاعر ماننے پر مجبور ہی کر رہا ہو تو آپ ہمیں ایک ایسا متشاعر قرار دے سکتے ہیں جس کا کاروبارِ شوق بے ذوقی کا رِ سخن وری نہیں بلکہ کاروبارِ سخن گری ہے اور جس کے ذہن پر حضرتِ شعر بہ سیرتِ آمد نہیں بلکہ بہ صورت

آور دِ صحف نازل و وارد ہوتے ہیں۔

اس مسئلے کی لائن کلیئر ہو جانے کے باوجود آپ کے ذہن میں یہ سوال ضرور کلبلا رہا ہوگا کہ ہم نے اپنے تخلص کے ساتھ "مِسٹر" کی پیش دُم کیوں چپکا رکھی ہے؟ آپ کا یہ سوال نہایت اہم اور معقول قرار دیتے ہوئے ہم آپ کو یہ باور کرا دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ہم میاں مٹھو کے نام لیوا اور پانی دیوا ہیں، اور ان کی اس عظیم الشان روایت کے جھنڈا بردار ہیں جس نے تاریخ عالم کے ہر دور میں انھیں عزت مآب "مٹھو" بنایا اور بہ دہنِ خود "میاں" بننے کی توفیق اور سعادت عطا فرمائی۔ پھر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ ہم ہندستان جنت نشان جیسے آزاد، جمہوری اور امن پسند ملک کے باشندے ہیں جہاں ہر شخص کو بم داغنے، ریل روکنے، بینک لوٹنے جھوٹ بولنے، ووٹ مانگنے، مرغے لڑانے جیسے ہزار ہا کام انجام دینے کا پیدائشی حق حاصل ہے چنانچہ بہ دہنِ خود میاں مٹھو بننے کو ہم اپنا پیدائشی اور جمہوری حق سمجھتے ہیں، جس پر کوئی صاحب اعتراض کر کے ہماری آزادی اور ہمارے جمہوری حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کی سعی نامسعود نہیں فرما سکتے۔

بہ دہنِ خود میاں مٹھو بننا ایک خود اختیاری عمل ہے۔ اس کے لیے کسی کے رحم و کرم کا محتاج ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب جی چاہا، میاں مٹھو بن کر خوش ہو لیے۔ خوش ہونے اور خوش رہنے کے لیے میاں مٹھو بننا ایک نہایت کارگر اور سستا نسخہ ہے جس میں نہ ہلدی لگتی ہے نہ پھٹکری اور رنگ ہمیشہ چوکھا آتا ہے۔ اس لیے ہم نے اپنے تخلص پر "مسٹر" جیسی پیش دُم چپکائی ہے۔ یہ تو ہوئی ایک وجہ۔ دوسری وجہ وہ مجبوری ہے جس نے ایک آنچ کی کسر رہ جانے کے سبب بھیا کو سونا اور ہمیں منسٹر فاعلن بننے سے بال بال بچا لیا۔ ایک عددِ نہایت حقیر و خفیف "نون" نے ڈنڈی نہ ماری ہوتی تو آپ کے ان مسٹر فاعلن کو منسٹر فاعلن بننے سے کوئی مائی کا لال روک نہیں سکتا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہوتا کہ منسٹر بننے کے لیے ہمیں بھی پیارے لیڈروں کی طرح کاسۂ گدائی ہاتھ میں تھام کر ووٹوں کی بھیک مانگنے کے لیے در در، کوچے کوچے بھٹکنا پڑتا۔ رتھ اور جن آدیش یاتراؤں کے اہتمام میں کروڑوں روپیا پھونکنا پڑتا۔ رقم کی یہ وہ مقدار ہے جس سے ہمارے جیسے خالی انٹی والوں کے کان تو آشنا ہیں مگر دیدار سے آنکھیں ہنوز محروم ہیں۔ قارئین کرام یہ نکتہ بہ طور خاص نوٹ فرما لیں کہ ایک "نون" کی آنچ پوری کرنے کے لیے کسی بھی مسٹر کو ہمیشہ پیسے اور دوسرے لوگوں کی مدد کا دست نگر رہنا پڑتا ہے، اس لیے ہم نے محتاجِ ازلی "نون" کو دکھایا فلیتہ اور "بے نون" کا مسٹر بننے ہی میں عافیت سمجھی کہ مسٹر بننا ہمارا اختیاری عمل تھا۔ بے روک ٹوک اور بے ووٹ چشم زدن میں بن گئے۔

پیارے قارئین! مسٹر فاعلن کو القا ہوا ہے کہ آپ کے ذہن میں چاچاٹے اردوئے اسد اللہ خاں غالب گھسے بیٹھے ہیں اور آپ کو اکسا رہے ہیں کہ اس ناہنجار فاعلن سے پوچھو کہ ایسا ہی میاں مٹھو بننے کا شوق اس کے سر پر سوار تھا تو جناب فاعلن یا فاعلن صاحب،

یا حضرت فاعلن، یا علامہ فاعلن، مولوی، مولانا فاعلن بن گیا ہوتا۔ مسٹر کی پیش دُم لگا کر بحر متدارک سالم کے معزز صاحب کو فرنگی کیوں بنایا۔ چچا میاں کے اکسائے ہوئے سوالوں کا اب ہم کیا جواب دیں۔ اتنا ہی عرض کر سکتے ہیں کہ چچا میاں قبلہ اگر آج اس دار فانی میں موجود ہوتے تو ہر آن بدلتے ہوئے فیشنوں اور قدروں کو دیکھ کر موصوف بوکھلائے بوکھلائے پھرتے اور فارسی اردو میں شعر کہنا چھوڑ چھاڑ دھڑا دھڑ انگریزی میں شعر کہنے کو اپنا شعار بنا چکے ہوتے۔ زمانے کے ساتھ چلنے کے معاملے میں ان کی زود حسی کا یہ فاعلن کیا مقابلہ کرے گا۔ دیگر یہ کہ ہندستان جنت نشان سے انگریز لاکھ دفع ہو گیا ہو، پتلون تو اپنی وہیں چھوڑ گیا جسے ہم ہندستانی ٹانگوں سے ناف تک مڑھے پھر رہے ہیں۔ گلے کی لنگوٹی سے عزت اور شرافت کی گردن ناپ رہے ہیں۔ ہندی اور اردو کی گفتگو کے رس میں انگریزی کا پھوک ڈال کر گفتگو کو ثقیل و غلیظ بنا رہے ہیں ــــ میاں! زمانے کی روش ہی کچھ ایسی ہے کہ خواص تو خواص جنتا بھی ع

پیتی نہیں ہے ٹی کپ و ساسر ملے بغیر

اور پھر ایک راز کی بات یہ بھی ہے کہ جو رُعب دبدبہ، شان و شوکت، آن بان اور ماڈرن پن ہونے کا احساس مسٹر کی ٹر میں ہے، وہ صاحب کی حب اور حضرت کی رت میں کہاں؟ جو لطف تھینک یو میں ہے آپ کا شکریہ میں کہاں؟ جو مزہ مائی گاڈ میں ہے، میرے خدا میں کہاں؟ ایڈیٹ [illegible] کہنے میں تذلیل و تمسخر کا جو پہلو ہے، وہ بدھو کہنے میں کہاں؟ انگریزی زبان اور آداب سے بے بہرہ اور نابلد حضرات اپنی کم ظرفی، چھچھورے پن، جہالت احساس کے اندر تک اُتری ہوئی کمتری کا اظہار کریں تو کس طرح کریں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر بجا لانے کا مقام ہے کہ انگریز بھائی اپنے برادر زاغ کو ہنس کی چال چلنے کا سلیقہ سکھا گیا۔ نہ سکھاتا تو قارئین صاحبان اور مسٹر فاعلن اس کا کیا بگاڑ لیتے۔ مسٹر فاعلن انگریزی کی معمولی شُد بُد رکھتے ہیں، اس لیے نہایت ضروری تھا کہ وہ اپنے آپ کو مسٹر کہلوا کر نہ صرف قارئین پر اپنی انگریزی دانی کا رُعب جھاڑیں بلکہ اپنے بچوں کی نظروں میں بھی سرخرو ہونے کی سعادت حاصل کریں کیونکہ ان کے لخت ہائے جگر انگریزی میڈیم کے اسکولوں میں پڑھتے ہیں وہ اپنے ہم جماعتوں میں کیوں سبکسر بن کر رہیں کہ اُن کے پاپا ابّا حضور ہیں، یا ان کے ڈیڈی مسٹر جیسے مہذب انسان کہلانے کے بجائے، جناب فاعلن، یا فاعلن صاحب جیسے فرسودہ، خارج از تہذیب اور آوٹ ڈیٹیڈ ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔ اس لیے مسٹر فاعلن نے مسٹر فاعلن بننے ہی میں شان اور عزت کی سلامتی کا راز پایا۔

مسٹر فاعلن چونکہ مسٹر فاعلن بن چکے ہیں، اور ایک اور ایک جمع گیارہ کی طرح قارئین بھی اس حقیقت سے واقف ہو چکے ہیں۔ آیئے! اب ذرا کچھ کام کی باتیں ہو جائیں جن کے لیے ایک شریف آدمی کو تخلص کا تاج سر پر رکھ کر مسٹر فاعلن بننا پڑا۔

پیارے قارئین! مسٹر فاعلن سے زیادہ آپ حضرات اس بات سے واقف

ہوں گے کہ کسی کو جب کوئی غیر گھریلو کام انجام دینا پڑتا ہے مثلاً اسکول میں بچوں کو داخل کروانا ہے، یا نوکری کے لیے کسی محکمے میں درخواست دینی ہے، راشن کارڈ یا پاسپورٹ بنوانا ہے، کسی حادثے کے وقوع ہوئے بغیر انشورنس کمپنی سے، اس نقصان کی جو ہوا ہی نہیں ہے، بے حساب بھرپائی کرانی ہے، وغیرہ وغیرہ تو اس نوع کے کارہائے دشوار گزار کے حصول کے لیے ایک عدد فارم بھرنا ہوتا ہے، جسے دفتری اصطلاح میں PRESCRIBED FORM کہا جاتا ہے۔ اس طرح کے فارم کا خاص مقصد بال سے کھال، پتھر سے پانی اور سوئی کے سوراخ سے ہاتھی نکالنا ہوا کرتا ہے۔ یہ سب اسی وقت ممکن ہوتا ہے جبکہ فارم کے اندر طرح طرح کے کالم موجود ہوں، اور وہ فارم سوالوں کی لامتناہی کھتونی نظر آتا ہو۔ ان کالموں کے ذریعے طرح طرح کی ذاتی، غیر ذاتی، ضروری غیر ضروری، متعلقہ، غیر متعلقہ باتیں دریافت کی جاتی ہیں۔ اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ فارم میں مندرج سوالات کے مطابق ہر شخص میں سب باتوں کا پایا جانا ممکن نہیں۔ اس لیے اس طرح کے فارموں میں یہ ہدایت بڑے نمایاں طور پر چھاپی جاتی ہے کہ جو بات آپ سے متعلق نہ ہو، یا جو وصف من جانب خداوند کریم آپ کو ودیعت نہ ہوا ہو، برائے مہربانی اس کے جواب میں Not Applicable لکھ دیا جائے۔ اردو ہندی میں اسے "لاگو نہیں" کہتے ہیں۔

معزز و محترم قارئین! ہم یعنی آپ کے اس مسٹر فاعلن نے درس گاہِ سخن گری میں بھرتی ہونے کا ارادہ نامسعود کیا تو اس طرح کے سوالات نے ہمارا بھی ناطقہ بند کر دیا۔ درس گاہ کا فارم کیا تھا، ناکردہ گناہوں کے جمع خرچ کا مطالبہ تھا۔ جب سخن گری کا درس لینے کی ٹھان ہی لی اور اوکھلی میں سر دے ہی دیا تو ہمیں بھی چار و ناچار سوالات کی اس پُرخار وادی سے گزرنا پڑا۔ چنانچہ ہم نے تمام مطلوبہ سوالوں کے جو جواب داخلہ فارم میں درج کیے وہ من و عن آپ کی ضیافتِ طبع کے لیے حاضر ہیں۔

درس گاہِ سخن گری

داخلہ فارم

(نوٹ: جو کالم آپ سے غیر متعلق ہو اُس کی خانہ پُری کراس (X) کا نشان لگا کر نہ کریں بلکہ لکھیں کہ لاگو نہیں)

(۱) داخلہ لینے والے امیدوار کا نام: - - - - - - - - - - - - لاگو نہیں۔

(۲) تخلص (اگر رکھ لیا گیا ہے): - - - - - - - - - - - - فاعلن

(۳) تخلص کے آگے پیچھے کوئی خاص شناخت - - - - - - - - مسٹر (بہ طورِ پیش دُم)

(۴) باپ کا نام: - - - - - - - - - - - - - - لاگو نہیں

(۵) شادی شدہ ہونے کی صورت میں شوہر/بیوی کا نام: خفیہ معاملات کا اظہار ضروری نہیں

(۶) تاریخ پیدائش: - - - - - - - - معلوم نہ ہونے کی صورت میں لاگو نہیں

۷) مقام پیدائش: .... لاگو نہیں
۸) پتا (الف) مستقل: .... لاگو نہیں
(ب) موجودہ: .... لاگو نہیں
۹) مذہب: .... لاگو نہیں
۱۰) ذات پات/فرقہ: .... لاگو نہیں
۱۱) شہریت: .... لاگو نہیں
(۱۲) کام/پیشہ: .... لاگو نہیں
(۱۳) درجہ/جماعت جس میں داخلہ مطلوب ہے: .... اُستادوں کی جماعت میں
(۱۴) سخن گری کا پچھلا تجربہ: (ماہ و سال میں): .... لاگو نہیں
(۱۵) اسی درس گاہ میں داخلہ کیوں مطلوب ہے: .... برائے تربیتِ اساتذۂ درس گاہ
(۱۶) اس سے پہلے کس درس گاہ میں تھے: .... لاگو نہیں
(۱۷) اس درس گاہ کا ٹرانسفر سرٹی فیکٹ منسلک ہے یا نہیں: .... لاگو نہیں
(۱۸) آپ کی نظر میں شاعری کیا ہے: .... بہ محنت و مشقّتِ ذہنی محض سخن گری
(۱۹) شعر الہام ہے یا وحی: .... دونوں نہیں
(۲۰) آپ آمد یے ہیں یا آورد یے: .... کٹر آورد یہ
(۲۱) بحر اور وزن سے مراد؟: .... پنساری کی دکان کی ترازو بٹے۔ بزاز کی دکان کے میٹر یا گز
(۲۲) قافیے کی اہمیت؟: .... وہی جو عمارت کی تعمیر میں نیو، بنیاد یا موجودہ دور میں پلِنتھ کی
(۲۳) قافیے کے ساتھ ردیف کی حیثیت اور ضرورت کیوں؟ .... اس لیے کہ کوئی بھی .... رقاصہ گھنگھروؤں کی جھنک اور طبلے کی تھاپ کے بغیر .... رقص نہیں کر سکتی۔

(۲۴) قافیہ ردیف کے علاوہ مصرعے یا شعر میں ضروری اور غیر ضروری الفاظ مثلاً گُل، گلشن، پھول، کانٹے، شجر، پیڑ، عشق، حُسن، پری جمال، شیریں مقال، جیسے الفاظ کے ساتھ اگر، مگر، لیکن، جیسے، تیسے، کبھی، جبھی، تبھی، دوستو! لوگو! دفعتاً، فوراً، اکثر، وغیرہ الفاظ کی حیثیت کیا ہے اور یہ کیوں ضروری ہیں؟
.... جواب:- ان کی وہی حیثیت ہے جو عمارت کی تعمیر میں لوہے، سمینٹ، ریت، مٹی، گارے، لکڑی، پتھر وغیرہ کی ہوتی ہے۔ ان کے بغیر عمارت پوری نہیں ہو سکتی۔ سخن کا وزن پورا کرنے کے لیے ان کی بھرتی از حد ضروری ہے۔

(۲۵) حروفِ جار، حروفِ اضافت اور ضمیروں وغیرہ مثلاً اب، تب، جب، کب، کیوں،

ہاں، نا، تھا، تھی، تھے، ہے، ہوگا، آنا، جانا، یہ، وہ، تم، تو، ہم، کا، کی، کے، یہاں، وہاں کہاں، وغیرہ وغیرہ کی غرض و غایت کیا ہے۔؟

جواب:۔ عمارت کی تعمیر کے دوران یہ وہ فٹنگس ہیں جو بجلی، پانی اور سینٹری گٹر کے لیے ہوتی ہیں۔ دیواروں میں ٹھونکی جانے والی یہ وہ کھونٹیاں اور کیلیں ہیں جو کپڑے، تولیے، کلنڈر، فوٹو اور دیوار گھڑی ٹانگنے کے کام آتی ہیں۔ سخن میں ان زیورات سے بھی وزن کی بھرپائی میں غیر معمولی مدد ملتی ہے۔

(۲۶) چار ایسے اوزان بہ ترتیب گنائیے جو سخن گری کے نقطۂ نظر سے بے حد پاپولر اور آسان تر تصوّر کیے جا سکتے ہوں، ان کی بحروں کے نام اور مثالیں درج کرنی نہ بھولیے۔

جوابات:۔

(الف) سخن گری کے نقطۂ نظر سے وزن: فَعْلُن، فَعْلُن، فَعْلُن، فَعْلُن سب سے زیادہ سہل اور آسان تر تصور کیا جاتا ہے، اس حد تک کہ ہم اپنی اس گفتگو کو بھی جو بے حد شریفانہ انداز میں نشر میں کرتے ہیں، اس وزن میں گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ یہ وزن بحر متدارک کا مثمن مقطوع وزن کہلاتا ہے۔ مثال میں یہ شعر تک بند حاضر و ناظر ہے۔

فَعْلُن	فَعْلُن	فَعْلُن	فَعْلُن
بُلبُل	کا ہے	بھائی	اُلّو
میں بھی	اُلّو	تو بھی	اُلّو

(ب) دشتِ سخن گری کا دوسرا زود ہضم چارا ہے یہ وزن۔

مَفْعُولُن مَفْعُولُن مَفْعُولُن فَعْ

یہ بحرِ ہزج میں رباعی کے لیے شجرۂ اخرم کا ایک ایسا وزن ہے، جسے سخن گرانِ کرام اپنی تک بندیوں میں بے روک ٹوک بہ آسانی خاطر جھونک سکتے ہیں، اور محفلِ شعرا میں بیٹھ کر اپنا سینہ پھلا سکتے ہیں۔ مثال حاضر ہے۔

مَفْعُولُن	مَفْعُولُن	مَفْعُولُن	فَعْ
گلشن گل	شن الّو	بیٹھا ہو	گا
دامن دا	من اُلّو	بیٹھا ہو	گا

(ج) تک بند سخن گروں کے لیے تیسرا آسان وزن بحر متقارب سالم میں ہے۔

فَعُولُن	فَعُولُن	فَعُولُن	فَعُولُن
بنا کر	فقیروں	کا ہم بھے	س غالب
تماشا	ئے اہل	کرم دے	کھتے ہیں

یہ لیجیے! ہوئی نہ یہ بات۔ چاچائے اُردو جیسے دھاکڑ شاعر مستند سخن وراعظم بھی اس ٹانی کو گنگنا گئے ہیں۔ پھر حضراتِ سخن گراں کو اسے چبانے میں کاہے کا خوف۔

(د) چوتھا آسان وزن خود بحر متدارک سالم ہے جس کا ایک رکن ہلا تخلص ہے یعنی
فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن ۔ مثال یہ ہے

دِن ڈھلا کب ڈھلا کچھ پتہ ہی نہیں
درد کے سلسلے لے لیے شام نے

درس گاہ والوں کو یہ جان کر خوشی ہونی چاہیے کہ یہ شعر ہمارے ہی کلام بلاغت نظام کے اسٹو
سے حاصل کیا گیا ہے ۔ شعر اچھوتا ہے ۔ درس گاہ والے اس کی داد دیں ۔

(۲۷) کیا آپ کے خیال میں سخن گران باکمال صرف ان آسان اوزان ہی کو اپنی زادِ آخرت کے
لیے کافی وشافی سمجھتے ہیں ۔ ؟

جواب :۔ چار اوزان کی اِس بھاری بھر کم دولت کو "صرف"، کہہ کر کم نہیں آنکا جانا چاہیے؛
ایک سخن گر باکمال کو اس سے زیادہ کیا چاہیے ۔ اجی ! ان چار اوزان کی مدد سے وہ
گن کر ایک لاکھ غزلیں ڈھال سکتا ہے ۔

(۲۸) کیا حضراتِ سخن گراں، شعرائے ٹٹ پونجیا، اور فلمی گیتوں میں تک بندیوں کے تیر تکے چلانے
والے عیال ناشاعراں کی اکثریت اِن گنتی کے چند اوزان ہی کے بل بوتے شور مچاتی اور اپنے
وجود کو منواتی ہے ۔

جواب :۔ جی ہاں ! بالکل ۔ اکثر وہ شعرا حضرات جو اپنے ہاتھ پیروں اور آنکھوں کے نا مکی
اِشاروں، کنایوں، اداؤں اور اپنے گلے میں بندھے ہوئے گھنگروؤں کی چھنا چھن
اور حلق میں اٹکے ہوئے تان طنبوروں کی مرکیوں پر قدرتِ کاملہ رکھتے ہیں اور ہمیشہ
ہی مشاعرہ گاہ کی چھت اور در و دیوار کے لیے سخت خطرہ لاحق کر دیتے ہیں یا وہ
سخن گرانِ کرام جن کی تک بندیاں بنام غزل مغنی حضرات اور حضراتنیں جگالی کرتے
یا کرتی ہیں یا وہ غیر شاعر اشخاص جو فلمی گیتوں کے نام پر انگڑ بے جوڑ لفظوں سے
بھان متی کا کنبہ جوڑ کر خاندانی منصوبہ بندی کے لیے خطرہ بن جایا کرتے ہیں، یہ یا
اسی قبیل کے اور ایک دو اوزان کے رسیا ہوا کرتے ہیں، انھیں کی بدولت ان
کی شاعرانہ پگڑیاں سلامت اور طرّوں سے سجی ہوئی ہوتی ہیں ۔

(۲۹) اس درس گاہ میں داخلے کی درخواست دینے سے قبل آپ نے کسی آل انڈیا ۔ آل
ایشیا، آل ورلڈ مشاعرے میں شرکت کی ہے، یا کسی کمرہ بند شعری نشست میں اپنا کلام بے
بلاغت نظام سنانے کا شرف حاصل کیا ہے ؟ .... لاگو نہیں

(۳۰) کسی مغنی یا مغنیہ نے آپ کا کلام چبایا ہے : .... لاگو نہیں

(۳۱) کسی فلم میں آپ کا کوئی گیت ہٹ ہوا یا پٹا ہے : .... لاگو نہیں

(۳۲) یہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اوپر ۲۹، ۳۰، ۳۱ میں پوچھی گئی سرگرمیوں میں ملوث
ہونے کا کوئی ارادہ ہو تو بے چوں چرا لکھیے : .... لاگو نہیں

(۳۳) آپ کی نظر میں سب سے اچھا اور بڑا شاعر کون ہے ۔

(الف) دنیا میں (کسی بھی زبان کا) .... لاگو نہیں
(ب) ہندستان میں (کسی بھی زبان کا) .... لاگو نہیں
(ج) اردو کا (ہندستان میں) .... لاگو نہیں
(د) اردو کا (پاکستان میں) .... لاگو نہیں
(ہ) اردو کا (دنیا کے کسی بھی کونے میں) .... لاگو نہیں

(۳۴) : آپ کی نظر میں سب سے اچھا اور بڑا سخن گر کون ہو سکتا ہے۔
(الف) : دُنیا میں : .... مسٹر فاعلن
(ب) : برّصغیر ہند، پاک میں .... مسٹر فاعلن
(۳۵) : اردو کے علاوہ آپ اور کون کون سی زبانیں جانتے ہیں : لاگو نہیں
(۳۶) : کیا آپ اردو بھی پڑھ اور لکھ سکتے ہیں : ...... سخن گری کرنے کے لیے ان دونوں خرافات کی ہرگز ضرورت نہیں ،اس لیے لاگو نہیں

تصدیق نامہ

ہم مسٹر فاعلن تصدیق فرماتے ہیں کہ ہم نے فارم ہذا کے کالم ۱ تا ۳۶ میں جو بھی جوابات ازراہِ کرم درس گاہِ سخن گری کو مرحمت کیے ہیں، وہ ہمارے بے کراں علم و دانش میں حرف بہ حرف، نکتوں، مرکزوں اور گولائیوں سمیت بالکل صحیح، حقیقت پر مبنی اور کسی بھی قسم کے شائبہ دروغ سے بالکلیہ پاک صاف بلکہ پاک دامن ہیں۔ ہم نے سارے اندراجات بہ ہوش و حواس اپنی مرضی سے، بغیر کسی بیرونی دبش کے کیے ہیں۔

(مسٹر فاعلن)
دستخط مطلوبِ داخلہ

صرف دفتری خانہ پُری کے لیے۔

۱۔ درس گاہِ سخن وری میں مسٹر فاعلن کو داخلہ دیا جاتا ہے : لاگو نہیں
۲۔ درس گاہِ سخن وری میں مسٹر فاعلن کو داخلہ نہیں دیا جاتا۔ سو فیصدی لاگو ہے
۳۔ داخلہ نہ دینے کے اسباب کی صراحت :۔
(الف) کالم ۱۳ اور ۱۵ کے نامعقول جوابات۔
(ب) کالم ۳۲ (الف۔ب) میں بہ دہنِ خود میاں مٹھو بننے کی سعیِ نامسعود۔
(ج) تصدیق نامے میں مہابلی اکبرِ اعظم کے اندازِ تخاطب کا بے حوالہ سرقہ۔
(د) کالم ۲۶ (د) میں اپنا آوردنامہ بطورِ مثال پیش کیا اور اس کی داد بھی طلب کی۔

(حضرتِ بے نام)
دستخط و مہر ہیڈ مدرس

نجاع خاور
اے پارک لین۔
ئ دہلی نمبرا

اب تو اٹھتا ہی نہیں عارض و لب سے اوپر
سر میں رہتا تو مرا عشق تھا سب سے اوپر

گم ہوئے جانے کہاں آیا ہوں جب سے اوپر
وہ خیالات جو رکھتا تھا میں سب سے اوپر

نیچے یہ بڑھتی ہوئی سلطنت ابلیسوں کی
اور ہم آنکھ لگائے ہوئے کب سے اوپر

خواب ہی زیر کیا کرتے ہیں اندیشوں کو
گنبدِ صبح ہے مینارۂ شب سب سے اوپر

کامیابی تو شجاعؔ ایسے نہیں مل سکتی
آپ جاتے ہی نہیں شعر و ادب سے اوپر

ڈاکٹر زینت اللہ جاوید
پنجاب یونی ورسٹی
مالیر کوٹلہ پنجاب

ان کا رستہ بھی وہی جس پہ قدم تیرے ہیں
یہ حرم تیرا نہیں اہلِ حرم تیرے ہیں

جھوٹ کہتا ہے کہ مذہب نہیں تیرا کوئی
جب خدا ہی نہیں تیرا تو صنم تیرے ہیں

یہ مکاں ٹوٹ کے پھر اور بھی بن جائیں گے
پھٹ نہ جائے وہ زمیں جس پہ قدم تیرے ہیں

مجھ کو ہر حال میں لیکن ابھی جینا ہے یہاں
غم تو میرے بھی وہی ہیں کہ جو غم تیرے ہیں

زندگی کے ہوں مسائل تو کوئی بات نہیں
غم تو یہ ہے کہ پسِ پردہ کرم تیرے ہیں

تیرے اعمال سے ظاہر نہیں ہوتا لیکن
تو جو کہتا ہے تو پھر لوح و قلم تیرے ہیں

خالد علیم
پوسٹ بکس نمبر ۴۱۴۴۱
الریاض سعودی عرب

سوادِ گناہ

جذبوں کی اُڑی اُڑی سی خوشبو
چہروں کی بجھی بجھی سی رنگت
آنکھوں میں رتجگوں کے موسم

سرمستیِ چشمِ مہ جبیں سے
کچے رنگوں کی طرح اُترا
زاہد کا جمالِ پارسائی
دھیرے دھیرے سرک گیا ہے
سورج کا نقابِ خودنمائی
دستِ خورشید سے پھسل کر
دوشیزۂ شام کی کلائی
لمحہ لمحہ اُڑا چکی ہے
اپنی ہی رنگتِ حنائی
ہر منظرِ شب دھواں دھواں ہے
تاروں نے بساط کیا بچھائی

مینائے تیرگی چھلک کر
اُتری ماحول کی رگوں میں
راتوں کے طویل رتجگوں میں
زاہد کا خمارِ زہد ٹوٹا
ہاتھوں سے سبوئے فقر چھوٹا

تاریکیِ شب کے ساکنوں کا
ہر عضو گناہ بن گیا ہے
عشرت کی نگاہ بن گیا ہے
سناٹا پناہ بن گیا ہے

شب کی گمبھیر چاندنی میں
ماحول کی آنکھ نوحہ زن ہے
ہر چہرہ بجھی مسرتوں سے
پژمردہ، دل زدہ، فسردہ
ہر آنکھ سبوئے مے فروشاں

تاریکیِ شب نے اپنی چادر
ایک بار لپیٹ کر جو پھینکی
پھر دامنِ صبح یوں ہیں کیا تھا
جذبوں کی اُڑی اُڑی سی خوشبو
چہروں کی بجھی بجھی سی رنگت
آنکھوں میں رتجگوں کے موسم

اعجاز رضوی
رسالہ فنون۔ ۱۹ ایبٹ روڈ۔ لاہور

سال کی آخری نظم

ایک بوڑھا برس گر گیا
مر گیا
میں نے اس کی لحد میں اتر کر اسے الوداع جب کہا
تو اچانک
وہ مردہ برس ہنس پڑا
دن چڑھا
میں نئے سال کے ٹھنڈے سورج کو باہوں میں لے کر
بہت دیر سویا رہا
پھر اٹھا، اور گذرے برس کے سبھی رابطے نذرِ آتش کیے
اور آتے برس کی مدارات میں جٹ گیا

اقبال مرزا
جمال پور کا نچ کی مسجد
احمد آباد

اندھا سورج
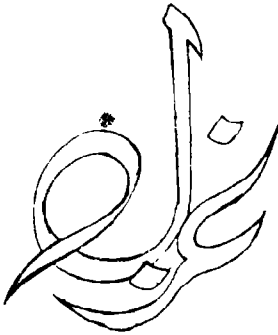
شہر میں چاروں طرف ہیبت ناک سناٹا ہے
ٹریفک سگنل کی
ٹمٹاتی ہوئی رنگین بتیاں
اپنی ہی روشنی میں
دور دور تک
راہ گیروں کو تلاش کرتی ہیں
مگر
معروف سڑکوں پر آج مکمل سکوت ہے
تمام راستے
جنگل کی پگڈنڈیوں کی طرح
سنسان اور خاموش ہیں
اس خوفناک اور دہشت زدہ ماحول میں
خوف و نفرت کی جھوٹی باتیں

دھیرے دھیرے
ماحول میں اپنا زہر گھول رہی ہیں
آگ کے شعلوں سے آسمان سرخ ہے
اور جلتی ہوئی چتاؤں سے اٹھتی ہوئی بلند آوازیں
ان لوگوں کو پکار رہی ہیں
جنھیں نیند آگئی ہے
میں اس خوفناک جنگل میں
جانے کسے تلاش کرتا ہوں
میرے آس پاس سانپ اور بچھو کی لمبی قطاریں ہیں
اور اس سے آگے فقط بھیڑیے ہیں
سورج نہ جانے کہاں چھپ گیا ہے ؟

آئی - ایم مہتا کیف
۸/۹۶ سول لائنز - جھانسی -

مدتوں کے بعد پھر اُن کے پیام آنے لگے
وقت پھر بھولے ہوئے قصے نہ دُہرانے لگے

جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی میں پھر لہریں اٹھیں
پھر گئے موسم کے پنچھی لوٹ کر آنے لگے

ہم کہ پتھر تھے نشانِ میل بن کر رہ گئے
خود نہ چل پائے تو سب کو راہ دکھلانے لگے

گھر کے یہ دیوار و در ہیں گھر کے بوڑھوں کی طرح
میں کسی شب دیر سے لوٹا تو سمجھانے لگے

کیفؔ دن بھر کی تھکی ہاری تمناؤں کو ہم
رات آئی تو قبا خوابوں کی پہنانے لگے

محسن بھوپالی
آئی ۔ ڈی ۔ ایف ۔ اے ۵/۳ ناظم آباد
کراچی ۔ پاکستان

قطعات

رہے خاموش تو اک عمر کا پچھتاوا ہے
حق کا اظہار کرو جرأتِ پیکار کے ساتھ
اب کوئی دوسری صورت ہی نہیں ہے باقی
ہے عدو سامنے اور پشت ہے دیوار کے ساتھ

یہ تو جب سوچتے انجام ہوس کیا ہوگا
خود کو جب رونقِ دربار کیا تھا تم نے
اپنے کردار کے بارے میں بھی سوچا ہوتا
میرے کردار پہ جب وار کیا تھا تم نے

تاریخ ہے گواہ کریں ہوں انا سرشت
خم ہے ترے حضور سر بے نیاز بھی
لیکن مری شناخت طلب کر نہ اے زمیں
پھر نہ میسر آئے گا تیرا جواز بھی

کچھ اس میں دخل نہ ہو میرے نرم لہجے کا
زبانِ تلخ کلامی ضرور ہے کوئی
وہ بے سبب ہے، بلا واسطہ ہے یا بے لوث
مرے خلوص میں خامی ضرور ہے کوئی!

کیوں یہ مجبوریاں گناتے ہو
ایک اک بات مانتا ہوں میں
اس وضاحت کی کیا ضرورت ہے
چہرہ پڑھنا بھی جانتا ہوں میں

فراغ روہوی
۷۶۔ مولانا شوکت علی اسٹریٹ
کلکتہ ۷۰۰۰۷۳

کس قدر ہیں مرے آس پاس آد
پھر بھی کوئی نہیں غم شناس آد

آدمی آدمی سے ہے بے زار جے
کیا لگائے کسی سے بھی آس آد

ہر طرف، ہر جگہ شہر میں ہیں تر
دوڑتے، بھاگتے، بدحواس آ

اب تو یارو یہاں بھی بجھا
آدمی کے لہو سے ہی پیاس آد

اُس کا چہرہ فراغ آج تک یاد
کر گیا تھا اُداس اک اُداس آد

حفیظ بنارسی
ملکی محلہ۔ آرہ (بہار)

امیرِ شہر سے ہم عرضِ حال کیا کرتے
جو خود سوالی تھا اس سے سوال کیا کرتے

یہی تھی شرطِ نمو جادۂ تمنا میں
نہ کرتے خود کو اگر پائمال، کیا کرتے

اسی نے توڑ دیا جس کا یہ کھلونا تھا
شکستِ دل کا ہم آخر ملال کیا کرتے

جہاں ٹھہر گئے کچھ دیر اسی کو گھر سمجھا
سفر میں ہم کسی گھر کا خیال کیا کرتے

اسے مٹا دیا جس کا کوئی وجود نہ تھا
اب اس سے بڑھ کے وہ کوئی کمال کیا کرتے

خود اپنے غم کا مداوا نہ کر سکے جو حفیظ
ہمارے زخموں کا وہ اندمال کیا کرتے

فرید پربتی
سنگین دروازہ
سری نگر

قافیہ زیست کا پھر تنگ ہوا جاتا ہے
میرا ہر خواب لہو رنگ ہوا جاتا ہے

دسترس میں تھے ضیا بارے ستارے جس کے
اب وہی دست تہِ سنگ ہوا جاتا ہے

ہے سلیماں کی طرح اس کی امارت آباد
فقر سے صاحبِ اورنگ ہوا جاتا ہے

پھر سے یاد آنے لگا ہے وہ بدن مشک سی:
کہ معطر مرا انگ انگ ہوا جاتا ہے

بھر لیے قرب کے خاکے میں کئی رنگ فرید
اب کے ہر خواب ہی بے رنگ ہوا جاتا ہے

سطوت رسول
ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری
جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ۲۵

اسپتال کی ایک رات

بھاگتی عمر، گریزاں لمحے
جس کی رخشِ عناں
کھانستے دکھ اور ڈوبتی نبضیں
درد کا اک پاتال
چارو اُور سراب
کس کھائی میں نیند کے جھونکے
کس پیڑا میں اسیر
رات بڑی گمبھیر
آنکھیں دیکھیں ہر منظر کو
کہاں کریں وشرام
کانوں سے چیخیں ٹکرائیں
کوئی نہ اِن کا مقام
اگنی کنڈ میں جلتے جلتے
سانسیں رک رک جائیں
دکھ آئیں سکھ جائیں
کوئی دلاسا کام نہ آئے
سب کچھ یوں بسرائے
کتنے خواب ادھورے سجنی[1]
کب ہوں گے وہ پورے سجنی
جسم کے اندر خالی روح
ساحل ساحل کشتیٔ نوح

---
[1] میری بیوی نجمہ خاتون

ظفر اقبال ظفر
۱۷۰۔ خیلدار
فتح پور

سب ہوا کی زد میں ہیں تو میرا مستقبل بھی کیا

موج کیا، پتوار کیا، کشتی بھی کیا ساحل بھی کیا

قتل مجھ کو کر رہی ہے ہر نفس یہ زندگی

یہ اگر سچ ہے تو حاصل اور لاحاصل بھی کیا

میرے احساسات پر وہ چھا چکا ہے ہر طرح

اب مری ہستی مرا ادراک میرا دل بھی کیا

چل رہی ہے اک اشارے پر اسی کی کائنات

گردشِ افلاک کیسی دوریِ منزل بھی کیا

زندگی بھر زندگی کے وار کو سہنا پڑا

کام تھا مشکل بہت لیکن ظفر مشکل بھی کیا

ہم صبا گیاوی
ہیڈ ماسٹر
اسلامیہ اردو مڈل اسکول
پھلواری شریف
پٹنہ

غزل

ادھر دیکھیے نفرتوں کی ہوا ہے
مکدّر فضا ہے مکدّر فضا ہے

کہا ظالموں نے چمن کو جلا کر
کہ پھولوں کا بھی مسکرانا خطا ہے؟

کتابوں کی باتیں فقط رہ گئی ہیں
خدا ہے محبت، محبت خدا ہے

ہیں دامن پہ جس کے گناہوں کے چھینٹے
نگاہوں میں سب کی وہی پارسا ہے

نہ چھڑکو نمک زخمِ دل پر صبا کے
کہ ہر زخم دل اس کا اب تک ہرا ہے

رونق شہری
شعبۂ اردو
آر ایس بلی کالج جھریا۔

غزل

زخمِ سلوک ہے گہرا لیکن ہمدردی کے ساتھ
جُڑے ہوئے ہیں پھر بھی ہم اپنی مٹّی کے ساتھ

قسمت ہم سے کھیل رہی ہے سیڑھی سانپ کا کھیل
پستی پر بھی نظر ہے اپنی اونچائی کے ساتھ

گرتے پڑتے آخر وہ بھی پرچھائیں ہی نکلی
تھاما جس دیوار کو میں نے مضبوطی کے ساتھ

فطرت کے مستحکم رشتے توڑ نہیں ہم پاتے
پھول ہاتھ میں آیا لیکن اک ٹہنی کے ساتھ

چہرے سے کیوں جھانک رہا تھا روپوشی کا خوف
چاند دور تک چلتا آیا اک کشتی کے ساتھ

ہم قدمی کی منزل سے ہے اب بھی کوسوں دور
چلتا ہے جو روز و شب رونق شہری کے ساتھ

احسن زیدی
گورنمنٹ کالج، فیصل آباد
پاکستان

رؤف صادق
کلکٹر آفس۔ ملونی۔
بمبئی۔ ۹۵

دامنِ صحرا ہے یا صحنِ چمن آہو کی سمت
طفلِ دل اب تک سمجھ پایا نہیں خوشبو کی سمت

کس طرح بجھتی لبِ دریا کہ تھی روحوں کی پیاس
جا رہا ہے اب ہجومِ تشنگاں باہو[1] کی سمت

یہ مرا ذوقِ سفر ہے یہ مرا اوجِ کمال
مہرِ عالم تاب سے آیا ہوں میں جگنو کی سمت

لمحہ لمحہ نت بدلتے منظروں کے شوق میں
ہم چلے آئے تھے احسن قریۂ جادو کی سمت

نظمیں[2]

دیا

قبر پر
اک دیا
جل رہا ہے
راستہ گھر کا بتلا رہا ہے!
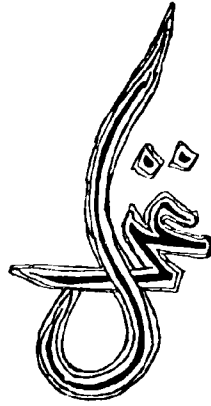
آخری لفظ

منصف نے
اپنے فیصلے میں
آخری لفظ پر
قلم کی نب توڑ دی
وہ لفظ سچ تھا!

---

[1] پنجاب کے معروف صوفی شاعر

دان لائبریری
ر۔ سیتاپور۔ یو۔ پی

، وفا کا پیکر تھا بے وفا بنا ڈالا
ے بے وفاؤں نے کیا سے کیا بنا ڈالا

ب نظر محبت کی کام کر گئی اپنا
نے کتنی صدیوں کا آشنا بنا ڈالا

ن اب ڈبوئے گا یتری کشتی اے رضواں
نے جب تھپیڑوں کو ناخدا بنا ڈالا

یس کے۔ رحمان اکولوی
بلک چوک۔ اکولہ۔

آج دنیا میں کیا نہیں ہوتا
آدمی بس خدا نہیں ہوتا
گر نہیں ہوتی پیار میں شدت
اُن کو مجھ سے گلہ نہیں ہوتا
دلِ نادان کو کون سمجھائے
پیار کا کچھ صلہ نہیں ہوتا
بیچ دیتے خودی اگر رحمان
دِل کو پاسِ انا نہیں ہوتا

آشا پربھات
کوٹ بازار۔ وارڈ نمبر ۱۲ سیتامڑھی۔

ہائیکو

(۱)

کاجل دُھلا
بادل بن گئی
یاد تمھاری!

(۲)

یقین مانو
کچھ نہ بدلا ہے
تمھارے سوا!

(۳)

بہت پاس
کھڑا کوئی اپنا
اجنبی سا!

(۴)

زندگی تجھے
کہاں دیکھا تھا خوش
یاد ہی نہیں

بسمل عارفی
بشنپور حکیم آباد سمستی پور

میں ترے شہر میں نیا بھی نہیں
اور دعوٰئے آشنا بھی نہیں
وہ کسی روز مانگ لے گا مجھے
اب تو انکار کی فضا بھی نہیں
اپنا ٹوٹا ہوں، اپنی قسمت ہے
کھل کے رو لوں یہ حوصلہ بھی نہیں

اردو تھیٹر ٹرسٹ بنگلور۔ بہترین ڈراموں کے لیے انعامات

اردو تھیٹر ٹرسٹ بنگلور نے اردو ڈرامے کے فروغ کے لیے دو انعامات قائم کیے ہیں۔ پہلا انعام جو مبلغ دس ہزار روپیوں پر مشتمل ہوگا بہترین طبعزاد ڈرامے کو دیا جائے گا۔ دوسرا انعام جو مبلغ پانچ ہزار روپیوں پر مشتمل ہوگا کسی بھی ناول یا افسانے سے ماخوذ ڈرامے کو دیا جائے گا۔ مقابلے میں شامل ہونے والے ڈرامے مندرجہ ذیل شرائط پر پورے اُترنے چاہئیں۔

شرائط

۱۔ منتخب ڈرامے کے جملہ حقوق تیس سال کے لیے اردو تھیٹر ٹرسٹ کے حق میں محفوظ رہیں گے۔

۲۔ ڈرامہ چاہے طبعزاد ہو یا ماخوذ نوّے منٹ کا ہونا چاہیے۔

۳۔ ڈرامہ اردو میں کاغذ کے ایک طرف لکھا ہونا چاہیے۔

۴۔ ڈرامہ کسی بھی موضوع پر ہو سکتا ہے۔

۵۔ ہر ڈرامے کے ساتھ تحریری یقین دہانی آنی چاہیے کہ ڈرامہ طبعزاد ہے۔

۶۔ ماخوذ ڈرامے کے ساتھ اصل ناول نگار، افسانہ نگار کی تحریری اجازت بھیجنا ضروری ہے۔

۷۔ ڈراموں کے انتخاب کے سلسلے میں اردو تھیٹر ٹرسٹ کا فیصلہ قطعی ہوگا اور اس سلسلے میں کوئی خط و کتابت نہیں ہوگی۔

۸۔ ڈراموں کی وصول یابی کی آخری تاریخ ۱۵ر فروری ۹۴ء ہوگی۔ اس تاریخ کے بعد وصول ہونے والے ڈرامے قبول نہیں کیے جائیں گے۔ غیر منتخبہ مسوّدات کی واپسی کے لیے پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضروری ہے۔

۹۔ ڈرامے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اسٹیج پر پیش ہونے کی تمام ضروریات کو پورا کرتا ہو۔

کسی بھی طرح کے قانونی تنازعات کا تیصلہ بنگلور کی عدالت میں ہوگا۔

URDU THEATRE TRUST (Regd)

No. 47, III Main, I Cross, Domalur II Stage, Bangalore-560 071

 (Adv)

آصف فرخی

بھولی بسری کہانیاں

کسی بھی قوم کے تہذیبی سرمایے کا ایک اہم حصہ قصے، کہانیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ خصوصاً ان قصوں پر جو زبان زد خاص و عام ہو جاتے ہیں۔ یہ قصے کہانیاں ثقافت کا زندہ، عوامی روپ ہیں تو اس وجہ سے کہ ان میں اس قوم کی تخلیقی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ وہ تہذیب اپنی پوری سج دھج کے ساتھ چلتی پھرتی اور ہنستی بولتی نظر آتی ہے، جس نے اپنے اظہار کے لیے ان قصوں کو جنم دیا تھا۔ کائنات اور انسان کے تئیں اس تہذیب کا رویہ، آدمی اور مظاہر فطرت کی آویزش، ماورائے فطرت کا ترغیب انگیز ڈراوا، معاشرے کی سطح پر افراد کا ایک دوسرے سے برتاو، رشتے ناتوں کا باہمی تفاعل تہذیب اور معاشرت کا خود اپنے بارے میں اندازہ، قوم کے اجتماعی لاشعور میں پنہاں خوف اور امنگیں، غرضیکہ یہ تمام عناصر چلتے اور بولتے روپ دھار کر قصوں کی شکل میں ہی تو سامنے آتے ہیں۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہم بڑے فرومایہ ہیں۔ اگر آپ معلوم کرنا چاہیں کہ اردو تہذیب و ثقافت سے وابستہ عوامی قصے کیا ہیں، تو آپ کو ان کا کوئی قابل اعتبار یا نمایندہ ذخیرہ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا۔ اس کا کیا مطلب ہے، کیا اس قوم کے لوگ قصے کہانیاں نہیں کہتے سنتے تھے؟ نہیں، اب یہ بات بھی نہیں.. اس آزار میں تو عہد جدید کے علامتی افسانہ نگار مبتلا ہیں۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے تک تو کہانی کا چلن عام تھا۔ لوگ باگ مل بیٹھتے تھے تو قصے سنتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ وہی سیدھے سادے اور پُر پیچ قصے کہانیاں جو یار دوست اپنی بے تکلف محفلوں میں سناتے ہیں کہ رات کٹے اور بات سے بات چلے، مائیں اپنے بچوں کو سناتی ہیں کہ بہل جائیں اور سکھ کے سپنے دیکھیں، اور عورتیں کام کاج سے فرصت کے لمحوں میں ایک دوسرے سے اس طرح کہتی ہیں کہ اپنے دکھ درد کی بات بتا رہی ہیں۔ اگر قصے کہانیوں کا وجود ثابت ہے تو پھر دوسرا امکان یہ ہے کہ سوالیہ نشان کہانی کی گمشدگی کے بجائے "لفظ "قوم"" کی وجہ سے ہو۔ اور اصل میں گمشدہ میراث یہی ہو۔ بہر حال وجہ جو کچھ بھی ہو، ہماری زبان اور تہذیب کے عوامی قصے کہیں کونے، کھدروں میں دبے

ہوئے اور چند سینوں میں چھپے ہوئے ہوں تو ہوں، ڈھونڈے سے بھی بہ مشکل تمام
ہیں، ان قصے کہانیوں کی عدم موجودگی ایک ایسا اجتماعی نقصان ہے جو ہماری تہذیب
بارے میں کوئی حوصلہ افزا تاثر نہیں چھوڑتا۔

چوں کہ ایسے قصوں کی اساس عوامی ہوتی ہے اور یہ روز مرہ زندگی کے عمل
اس درجے گندھے ہوئے ہوتے ہیں کہ اس سے بآسانی علاحدہ نہیں کیے جا
اس لیے اکثر اوقات انھیں در خور اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ انھیں کبھی وہ اشرافیہ والی
و منزلت میسر نہیں آئی جو بعض دوسرے ثقافتی مظاہر کو مل جاتی ہے۔ ان قصوں کو توجہ
لائق نہ سمجھنا اور نظر انداز کرنا جتنا آسان ہے اسی قدر مضر بھی ہے۔ اس وجہ سے کہ
کہانیاں اپنے اندر بعض ایسے عناصر کو سمیٹے ہوئے ہیں جو ان کے علاوہ کسی اور جگہ دیکھ
نہیں ملیں گے۔ قباحت بس اتنی ہے کہ یہ عناصر بظاہر پیش پا افتادہ معلوم ہونے
باوجود اتنے لچکدار ہوتے ہیں کہ آسانی سے گرفت میں نہیں آتے۔ اور یوں ان
دقت طلب ہو جاتا ہے۔ ان میں شامل عناصر اور ان کے اجزائے ترکیبی کی چھان پھٹک
تحقیق اور تجزیہ، لاکھ مشکل سہی، ان قصے کہانیوں سے ان کی مکمل صورت میں اور
ان کی صفات کی وجہ سے لطف اندوز ہونا کسی وقت بھی مشکل نہیں ہے۔ ایک
کہانی چھیڑنے کی دیر ہے، پھر دیکھیے کیا دفتر کھلتے ہیں۔

یہ کہانی کی پُر اسرار سچائی ہے جو عشق کی طرح "ازل گیر و ابد تاب" ہے۔ یونا
رابرٹس کا کہنا ہے کہ کہانیاں ہماری منطقی اور غیر منطقی جبلتوں تک رسائی حاصل
ہیں ہماری دید اور ہمارے خواب سے رجوع کرتی ہیں۔ پرانی طلسمی کہانیوں
ورثے کے باوصف بنی نوع انسان، اپنی انسانی اور ثقافتی اقدار میں زیادہ پُر
ہے۔ کہانیوں کے تہذیبی کردار کا اندازہ، تصوف کے مضامین پر انگریزی میں لکھنے
مصنف ادریس شاہ کی تالیف "افسانہ ہائے عالم" سے ہو سکتا ہے۔ اس کتاب
پیش لفظ میں، لفظ کی استواری اور دیرپا استحکام کی بات چھیڑی گئی ہے۔ اد
شاہ نے قدیم مصر کی ایک کہانی سے مثال دی ہے جو ہزاروں سال قبل کے ایک
سے چنی گئی ہے، اور حالانکہ فراعنہ مصر کو داستان پارینہ بنے کتنی ہی صدیاں بیت
یہ قصہ دنیا بھر میں دہرایا جاتا ہے اور اس کے دہرانے والے اکثر و بیشتر وہ
ہوتے ہیں جو اس کے ماخذ سے باخبر ہوتے ہیں۔ ادریس شاہ نے یہ نتیجہ اخذ
تہذیب کی یہ صورت اس وقت بھی باقی رہتی ہے جب قومیں، زبانیں اور عقید
مدتوں پہلے مردہ ہو چکے ہوتے ہیں"۔ لیکن یہ بات بھی کسی طرح نامناسب نہیں
کہ اس تہذیب میں سے باقی رہ جانے والی چیز ایک کہانی ہے۔

اپنے اس مجموعہ میں، ادریس شاہ نے کہانیوں کی عالم گیر برادری کا ت
پیش کیا ہے۔ مثلاً سنڈریلا کی کہانی کو لیجیے۔ پچھلی صدی کی ایک محقق خاتون

اس بنیادی افسانے کے تقریباً تین سو variants جمع کیے۔ ہم تی المال اس کے یوروپی نمونے سے زیادہ واقف ہیں جو Perrault نے تحریر کیا تھا۔ اسی روپ کو مقامی رنگ روپ دے کر اشرف صبوحی صاحب نے "بلوری جوتی" کے نام سے اس خوبی کے ساتھ لکھا ہے کہ معلوم ہی نہیں ہوتا اس کا ماخذ بدیسی ہے، لیکن اس افسانے کی دوسری شکلیں نویں صدی عیسوی کی ایک چینی کتاب میں، قدیم ویت نامی روایتوں میں اور ایک قدیم یوروپی ساگا میں بھی ملتی ہیں۔ ادریس شاہ نے اس کا سب سے کومل روپ امریکا کے سُرخ ہندی باشندوں کی عوامی کہانیوں میں دریافت کیا ہے۔ قدیم ہندستان میں جنم لینے والی توتا کہانی "سنسکرت سے سفر کرتی ہوئی یونانی اور عبرانی زبانوں میں اس نامعلوم طریقے سے پہنچی کہ بقول ایک یوروپی عالم کے "دو ہزار سال قبل مشرق بعید میں سنائی جانے والی کہانیاں یوروپ کے دور دراز مقامات میں بھی پہنچ گئیں اور وہ چٹکلے جن پر لمبی داڑھیوں والے مشرقیوں کے شانے ہنسی کے سبب ہلنے لگتے تھے۔ برفانی سویڈن سے لے کر دھوپ بھرے اطالیہ تک دیسی رنگ اختیار کر گئیں۔ یہاں تک کہ صقلیہ میں لوک کہانیاں جمع کرنے والے ایک محقق کو توتا کہانی ایک بوڑھے کسان نے لوک کہانی کے طور پر سنائی۔ پنچ تنتر، الف لیلہ اور ایسپ کی حکایتیں ایسی کہانیوں کے خزینے ہیں۔ ادریس شاہ کا کہنا ہے کہ ایسے ذخیرے جمع ہو جانے کے بعد غیر معمولی مقبولیت حاصل کرتے ہیں۔ پھر لخت لخت ہو کر بکھر جاتے ہیں اور دوبارہ جنم لیتے ہیں، کسی اور ثقافت میں کسی اور وقت میں، کہ پڑھنے اور سننے والوں کے ایک نئے طبقے کو مسحور و متاثر کر سکیں۔

الف لیلہ سے لے کر انوار سہیلی اور چہار درویش تک، ہمارے داستانوی ادب میں ماخذ کی تلاش بھی اسی طرح عوامی قصّوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جن کی ابتدا دآغاز وقت کی دھند میں چھپی ہوئی ہیں۔ کہانی کے اس سفر کے بارے میں ادریس شاہ کی مذکورہ بالا رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے، لیکن وہ اس استدلال کو ترقی دے کر ایک اور نتیجے کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کہانیوں کا ایک ذخیرہ ہے جو مستقلاً یہ مطالبہ پیش کرتا ہے کہ اسے تجدید و ترویج کے عمل سے گزارا جائے۔ اسلوب اور خیال، کردار اور عقیدہ، اخلاقی سبق اور مقامی تہذیب کا آب و رنگ، سب فانی ہیں اور جب کہانی اپنا چولا بدلنے لگتی ہے تو یہ سب پس پشت جا پڑتے ہیں۔ کہانی کے سفر کے بارے میں یہ قیاس آرائی بھی قرین قیاس ہے۔ تاہم اس سے اگلا قدم جو ادریس شاہ نے اٹھایا ہے وہ مجھے بعید از فہم معلوم ہوتا ہے۔ اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ انسانی افسانوں Forms کا ایک بنیادی اور مخصوص ذخیرہ ہے جو بار بار سامنے آتا ہے اور کبھی

اپنی دل کشی سے محروم نہیں ہوتا۔ ادریس شاہ کی یہ بات بھی بظاہر درست اور پچھلی تمام گفتگو کا منطقی نتیجہ معلوم ہوتی ہے، لیکن اسے ذرا معاصر نفسیات کے ساتھ رکھ کر دیکھیے تو اس تصور میں بہت سے جھول نظر آئیں گے۔ پچھلے برسوں میں اہل مغرب میں Translational Anaylisis کا بہت چرچا رہا۔ نفسیات کے اس مدرسہ فکر کے بانی ایرک برن ERIC BERNE نے 'انسانی تعلقات کی نفسیات" پر اپنی کتاب کو Games People Play کا نام دیا ہے۔ دو سال سے بھی اوپر، سب سے زیادہ بکنے والی کتابوں کی چوٹی پر رہنے والی اس کتاب میں انسانی طرز عمل کی طبقے بندی کر دی گئی ہے کہ وقت کے کسی بھی لمحے میں انسان فلاں یا فلاں کھیلوں میں سے کسی ایک میں معروف ہے۔ وہ پوشیدہ اور نامحسوس کھیل جو ہم زندگی کے ایک ایک لمحے اپنے آپ سے اور دوسروں سے کھیلتے رہتے ہیں۔ تمام تر انسانی اعمال و افعال کو کھیلوں کی ایک مخصوص و محدود تعداد میں تقسیم کرنے کی اس نفسیاتی تعلیم کے مدِنظر یہی تصور ہے کہ وہ تمام Situations کہ جن میں کوئی بھی انسان مبتلا ہو سکتا ہے، ان کی تعداد مقرر ہے۔ گویا کہ چند ہی تو افسانے ہیں جن میں سے کسی ایک کے عمل کو ہم اپنی زندگی میں جی رہے ہیں۔ مثلاً پسر گم کردہ کی ایک ہی کہانی ہے، حضرت یوسف سے لے کر اوڈی سس اور جیمز جوئس کے اسٹیفن ڈیڈلیس تک اسی ایک کہانی کے مختلف روپ ہیں۔ (برسبیل تذکرہ، اس کہانی کا ایک دلچسپ و عجیب روپ داستان امیر حمزہ کے ذیلی قصوں میں ملتا ہے، جہاں لشکر کفار سے نکل کر صاحب قرانی لشکر میں ہلچل مچا دینے والا نوجوان، اکثر و بیشتر کسی نہ کسی مسلمان شہزادے کا بیٹا نکلتا ہے جو کافر شہزادی کے بطن سے تھا۔) تمام انسانی اعمال اور Situations کو محدود تسلیم کر لینے میں انسان کا ایک محدود تصور کارفرما ہے۔ انسان کے سرّی اور باطنی خواص کا انکار اور اس کی مابعد الطبیعاتی جہت کی نفی مضمر ہے۔ اس کے خلاف یہی دلیل کافی ہونی چاہیے کہ انسان کی طرح کہانی بھی اتھاہ ہے اور لا محدود۔

ادریس شاہ یوں تو تصوف کے بہت جوشیلے مبلّغ ہیں، لیکن یہاں وہ جدید نفسیات کے وقتی رجحانات کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ اس مقام پر ان سے اختلاف کے بہت پہلو نکل سکتے ہیں۔ مجھے وہ زیادہ قابل توجہ اس وقت معلوم ہوتے ہیں جب کہانی کی اہمیت کی بات کرتے ہیں۔ انھوں نے کہانی کے روحانی اور سماجی مقاصد بیان کیے ہیں اگرچہ کہانی کے ساتھ مقاصد کا نتھی کیا جانا فی نفسہٖ ناپسندیدہ عمل ہے، کیوں یہ کہانی کو کسی اور علم کی ذیلی شاخ یا محض اس کے حصول کا ذریعہ سمجھنے تک محدود کر دیتا ہے۔ مقاصد کے ذکر کے فوراً بعد اپنے دیباچے میں ادریس شاہ اساطیر کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں اور حالانکہ انھوں نے اس نکتے پر مزید کوئی اضافہ نہیں کیا لیکن عین ممکن ہے کہ اساطیر اور لوک کہانی کے درمیان مماثلت کی طرف اشارہ

مقصود ہو کر دونوں میں شراکت کے ذریعے، ایک ابدی حقیقت تک رسائی حاصل ہوسکتی ہے۔

اساطیر یا دیومالا کے بجائے لوک کہانیوں کا رشتہ مابعد الطبیعیات سے بھی جوڑا گیا ہے۔ آنند کمار اسوامی نے لکھا ہے کہ لوک کہانیوں کا مواد مابعد الطبیعیات ہے۔ ہم یہ حقیقت یوں نہیں دیکھ پاتے کہ ہم مابعد الطبیعیات اور اس کی اصطلاحوں سے ناواقف ہیں۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات میں نے جناب اختر حمید خاں صاحب کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ خواص کے لیے مابعد الطبیعیات اور عوام کے لیے لوک کہانیاں۔ ان سیاق و سباق میں لوک کہانیوں کا مطالعہ کم ہی کیا گیا ہے۔ سیرت نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عالم ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے مضمون "زبان زد قصّے" (محراب لاہور، ۱۹۷۹ء) میں اس نوع کی ایک کاوش ملتی ہے۔ انھوں نے بروکل مان کی "تاریخ ادبیات عربی" کے حوالے سے لکھا ہے کہ نظموں سے بھی زیادہ قدیم آثار نثر کے ہوتے ہیں، اور وہ ضرب الامثال کہاوتوں، خطبوں کے اقتباسات اور بچوں کی لوریوں وغیرہ میں ملتے ہیں، ایسی چیزوں سے ملک کا ہر شخص واقف ہوتا ہے، لیکن نہ ان آثار کا کوئی مؤلف معلوم ہوتا ہے اور نہ زمانہ ولادت۔ ایک ایسے ہی زبان زد قصّے پر، جو حجاز میں دہرایا جاتا ہوگا، حدیث نبوی سے روشنی پڑتی ہے۔ کہانی کے سفر کی یہ منزل، کہانی کو ان لوگوں کی نظر میں اعتبار دلانے کے لیے کافی ہونی چاہیے جو زبان زد قصّوں کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

کہانی کے بارے میں غیر سنجیدہ رویے کا شاخسانہ ہے کہ آج اردو زبان میں یہ قصّے ایک گم ہوتی ہوئی یاد ہیں۔ ذرائع ابلاغ عامہ کی یلغار کے اس دور میں جب ساری دنیا ایک ہی تہذیب دشمن Mass Culture کے رنگ میں رنگی جاتی ہے، یہ نادر و نایاب ذخیرہ ہم سے گم ہوا چاہتا ہے۔ اردو کے برخلاف ہندی میں کیا صورت حال ہے، یہ تو مجھے معلوم نہیں، لیکن ہندستان میں زبان زد قصّوں کے عمدہ ذخیرہ انگریزی عہد میں ترتیب دیے گئے۔ ان میں Malve Stokes کے مرتب کردہ مجموعہ Indian Fairy Tales کا میں بطور خاص ذکر کرنا چاہوں گا۔ یہ مجموعہ ۱۸۸۰ء میں لندن سے شائع ہوا۔ یہاں موجود تیس کہانیوں میں سے کتنی ہی کہانیاں ایسی ہیں جو ہم سب کے حافظوں میں خفتہ ہیں: پھول متی رانی، انار بادشاہ زادی، بندر شہزادہ، بلکہ یہاں تو لیلیٰ اور مجنوں نام کے کرداروں کی ایک خالصتاً ہندستانی کہانی بھی موجود ہے۔ اس کتاب کی ترتیب خود ایک دلچسپ کہانی معلوم ہوتی ہے۔ ہندستان کے انگریز آقاؤں میں سے ایک کی کم عمر بچی اپنے دیسی ملازمین سے ان کی کہانیاں سن کر اپنی زبان میں لکھ لیتی ہے اور ان سے ایک کتاب ترتیب پاتی ہے کہ بچی کی ماں کتاب کے حواشی ترتیب

دیتی ہے اور باپ اشاریہ بناتا ہے، اور ایک پرانے خاندانی واقف کار اس پر عالمانہ مقدمہ لکھ دیتے ہیں۔ مؤلف نے اپنے بے حد دلچسپ اور ایک بچّے کی سی معصومیت کے ساتھ لکھے ہوئے دیباچے میں یہ احوال رقم کیا ہے۔

اس کتاب کی ابتدائی پچیس کہانیاں مجھے کلکتہ اور شملہ میں دو آیاؤں ڈنکنی اور منیا اور کریم خدمت گار نے سنائیں۔ آخری پانچ کہانیاں اماں کو منیا نے سنائیں۔ پہلے پہل ملازمین کہانیاں صرف مجھے سناتے تھے۔ کیوں کہ میں بچّی تھی اور ان پر ہنستی نہیں تھی، لیکن بعد میں دونوں آیاؤں کی شرم کم ہو گئی اور ساری کہانیاں اماں کو دوبارہ سنائیں، جب کتاب پریس کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ کریم اپنی کہانیاں ان کو یا ان کے سامنے ہرگز نہیں سناتا تھا۔ یہ ساری کہانیاں ہندستانی میں سنائی گئی ہیں، کیوں کہ یہ واحد زبان ہے جو ان ملازمین کو آتی ہے۔

ڈنکنی، نوجوان عورت ہے، اور وہ کلکتہ میں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی۔ اسے یہ کہانیاں، اس نے مجھے بتایا، اس کے شوہر موچی سے حاصل ہوئیں جو کلکتہ میں پیدا ہوا اور بنارس میں پلا بڑھا۔

منیا بہت بوڑھی، سفید بالوں والی عورت ہے۔ اس کے پڑپوتے بھی ہیں۔ وہ پٹنہ میں پیدا ہوئی تھی مگر جب سات سال کی تھی تو کلکتہ لے جائی گئی جہاں وہ پلی بڑھی اور اس کی شادی ہوئی۔ وہ اور ڈنکنی دونوں ہندو ہیں۔

کریم مسلمان ہے اور وہ لکھنؤ میں پیدا ہوا۔ اس کا کہنا ہے کہ چوہے کی کہانی اور "عجیب کہانی" دونوں لکھنؤ کی کہانیاں ہیں۔"

اس انگریز بچّی اور اس کے بزرگ ساتھیوں نے جو کام کیا ہے اس میں جا بجا وہ نو آبادیاتی نقطۂ نظر در آیا ہے جو ہندستان کے بارے میں اس کے انگریز آقاؤں نے اختیار کیا ہوا تھا۔ لیکن یہ بات کیا کم ہے کہ اس زبان میں ایسا کوئی مجموعہ موجود نہیں جس زبان میں یہ کہانیاں سنائی گئی تھیں، وہ "واحد زبان ہے جو ان ملازمین کو آتی ہے"۔ اپنی کہانیوں سے غفلت کے معاملے میں ہم ان گمنام ڈنکنی منیا اور کریم سے بھی گئے گزرے ہیں۔ وہ تو انگریز آقا کے ملازم تھے۔ اپنے بارے میں ہمارا کیا خیال ہے"

نامناسب نہ ہوگا اگر ہم ان تھوڑی بہت کوششوں کا ذکر بھی کرتے چلیں جو اردو میں ان کہانیوں کو محفوظ کرنے کے سلسلے میں ہوئی ہیں۔ اشرف صبوحی نے ایسی کئی کہانیاں لکھی ہیں جو دلّی اور لاہور سے شائع ہوئی تھیں۔ صبوحی صاحب

کا عمل بازگوئی کا تھا انھوں نے اپنی طرف سے کافی کافی کچھ قطع برید کی تھی۔ اسے آر خاتون نے بھی ایک کتاب میں اس طرح کی کہانیاں جمع کی ہیں اور میں تو اسے ان کا سب سے بڑا تصنیفی کارنامہ ماننے کو تیار ہوں، ورنہ جس قسم کا افسانوی ادب انھوں نے اور ان کی پیرو کار خواتین نے تیار کیا ہے، اس کا افسانے سے وہی تعلق ہے جو سعادت یار خاں رنگین اور جان صاحب کی ریختی کا میر تقی میر کی غزل سے۔ اشرف صبوحی کی طرح دلّی کے ایک اور جید نثر نگار نے بھی ان کہانیوں کی طرف توجہ دی ہے۔ کتاب کا نام ہے "بچّوں کی کہانیاں" اور سرورق کی عبارت، کتاب کا خلاصہ ہے: "بچّوں کی کہانیاں جو دہلی کے گھروں میں صدیوں سے عورتیں چھوٹے بچّوں کو سنایا کرتی تھیں اور جن کے سننے سے لڑکوں اور لڑکیوں میں سمجھ اور نیکی پیدا ہوتی تھی۔ لیلیٰ بانو اہلیہ خواجہ حسن نظامی دہلوی نے ۱۹۱۹ء میں ان کو قلم بند کیا تھا اور خواجہ حسن نظامی کے مرید یمین السلطنت مہاراجا سر کشن پرساد وزیر اعظم حیدر آباد نے اس کی تصویریں بنائیں تھیں۔"

کتاب کا چھٹا ایڈیشن (۱۹۵۱ء) بیگم لیاقت علی خاں کے نام منسوب کیا گیا ہے کہ وہ اپنے یتیم بچّوں کے دلوں کا غم دور کرنے کے لیے ان کو پرانے زمانے کی عورتوں کی یہ کہانیاں سنائیں جو بچّوں کا دل خوش کرتی ہیں اور ان کے اندر نیکی اور سچّائی اور رحم دلی پیدا کرتی ہیں"۔ کہانیوں کے نادر وقت، یعنی مرسیا ایلیاد کی اصطلاح کے Sacred Time میں معاصر تاریخ کی یہ مداخلت پر خلوص سہی، لیکن عجیب معلوم ہوتی ہے اور اس سے بھی بڑھ کر ان کہانیوں کے اخلاقی نتائج پر اصرار۔ مثلاً حسن نظامی کا یہ کہنا کہ

> میں بھی چاہتا ہوں اور خواجہ بانو بھی چاہتی ہیں کہ یہ کہانیاں بھارت اور پاکستان کے بچّوں کو سنائی جائیں تاکہ ان میں پرانے زمانے کے طریق تربیت کا رواج ہو کیوں کہ اس قسم کی کہانیوں سے بہت اچھے نتائج نکلتے ہیں"۔

یہ اور بات ہے کہ ہر کہانی کے آخر میں جو اخلاقی نتیجہ حسن نظامی نکالنا چاہتے ہیں وہ بعض مرتبہ کوشش کے باوجود برآمد نہیں ہوتا۔ مثلاً کھیلوں بتاشوں کے مینہ والی کہانی کے آخر میں ہے وہ لکھتے ہیں کہ اس کہانی میں اگرچہ خلاف عقل باتیں ہیں اور کوئی نہیں مان سکتا کہ عورتیں ایسی بے عقل ہو سکتی ہیں لیکن کہانی کا مقصد عورتوں کو بے عقلی سے بچانا اور عقل سے کام لینے کی نصیحت کرنا ہے"۔ اصل میں حسن نظامی کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ ان سے پہلے سر سیّد اور ڈپٹی نذیر احمد پیدا ہو چکے تھے جو ہر چیز میں عقل کے قائل تھے، چاہے وہ عورتوں کی بات ہو یا روز مرّہ کی کہانیاں لیکن جس طرح ہر چیز کو تابع عقل کرنے اور عورتوں کی تعلیمی ضروریات کو مدّ نظر رکھنے کے باوجود نذیر احمد کے قصّے دل چسپی سے پڑھے جا سکتے ہیں، اسی طرح اس کتاب کی

کہانیوں میں زبان و بیان کا جادو پوری طرح جاگ رہا ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے بچوں کے اخلاق درست ہوں نہ ہوں، نثر ضرور اچھی ہو جائے گی اور اچھی نثر کے بغیر، جیسا کہ ایذرا پاؤنڈ کے پڑھنے والے جانتے ہیں، اچھے اخلاق کا تصور ادھورا ہے۔
ایک اور چھوٹی سی کتاب کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس کا نام ہے "دادی جان کی کہانیاں" اور اس کے مؤلف کا نام ہے حسین حسنی۔ کتاب معمولی طریقے سے چھپی ہوئی ہے، کیوں کہ مؤلف کی اپنی شائع کردہ معلوم ہوتی ہے۔ میں اس کتاب کے مؤلف کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ کتاب بھی مجھے کراچی کے فٹ پاتھ پر پرانی کتابیں بیچنے والوں سے محض اتفاقاً مل گئی تھی جیسے کسی کہانی سے ان ہونی اور انوکھی مسرت مل جاتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو، اگر انجمن ترقی اردو یا کوئی اور مؤقر ادارہ ان کتابوں کو دوبارہ چھاپ دے۔ یہ کوئی بھاری بھرکم علمی کتابیں نہیں ہیں، لیکن بقول یگانہ اس سے کیا کسرِ شان میں آئی۔

اپنے ابتدائی ماخذ سے حسن نظامی اور حسین حسنی تک آتے آتے ان کہانیوں میں ایک فرق پڑا ہے۔ اور وہ یہ کہ درمیان میں Malwe Stokes کا سایہ پڑتا ہے۔ ہم نے ان زبان زد قصوں کو بچوں کی کہانیاں قرار دے ڈالا ہے اور وہ بھی بربنائے تحقیر و تخفیف۔ ایسی کہانیاں سماج کے ہر طبقے اور عمر کے ہر حصے کے لیے ہوتی ہیں۔ کسی ایک کی پابند نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بچوں میں چوں کہ کہانی سے رغبت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے (چنانچہ گوتم بدھ نے کہا تھا کہ لوگ بچے ہیں اور کہانی سننا چاہتے ہیں) اور Fantasy سے دل بستگی بھی ہوتی ہے اس لیے بچے ایسی کہانیوں کے مداحین کا طبقۂ اول بن جاتے ہیں، لیکن اس سے ہمیں یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ کہانیاں محض بچوں کے لیے لکھی گئی تھیں۔

ان کہانیوں کو بچوں سے مخصوص کر دینے میں ان کہانیوں کی بھی توہین ہے اور بچپن کی بھی۔ اس خیال کے پیچھے کچھ اس قسم کا احساس کارفرما ہے کہ بچپن زندگی کا باقاعدہ دور ہونے سے زیادہ زندگی کی تیاری ہے کہ زندگی کے سنجیدہ مسئلوں میں کس طرح شمولیت اختیار کی جائے۔ بچپن انسانی زندگی کا سب سے زیادہ پُرثروت حصہ ہے، محض نقشِ اول نہیں کہ کہانیوں کو بہلاوے کے طور پر اخلاقی نتائج ذہن نشین کرانے کے لیے استعمال کیا جائے۔ بچوں کے لیے علاحدہ اور مخصوص ادب کا تصور بھی مغرب سے آیا ہوا ہے اور بہت سے دوسرے مغربی رجحانات کی طرح ہم نے اسے سوچے سمجھے اور جانے پہچانے بغیر قبول کر لیا ہے۔ ہمارے بہت سے محققین اس بات کا شکوہ کرتے نظر آتے ہیں کہ اردو میں بچوں کے ادب کی کمی ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اب سے کچھ عرصہ پہلے تک بچے مکتب میں سعدی کی گلستان اور بوستان پڑھتے تھے۔ اخلاقی یا غیر اخلاقی

زندگی کے جو بھی سبق حاصل کرنے ہوں وہ شیخ سعدی سے بہتر کون بتائے گا ہمیں
اس سبق کے لیے کاٹھ کے گھوڑے کی طرح تیار کی ہوئی کتاب کی ضرورت نہیں ہے۔ زندگی
کو مختلف ادوار میں تقسیم کر دینے اور ہر دور کی علاحدہ ضروریات کے حساب سے
مصنوعی اور مفید ادب تیار کروانے کا یہ تصور مغرب سے ہمارے معاشرے میں آیا
ہے۔ اسی تصور کی بھینٹ ہم نے پرانے قصوں کو چڑھایا ہے، کہ ان کو معزول اور
مسترد کر دینے کے لیے ان کو بچکانہ قرار دے ڈالا۔ بچے گویا غلام ممالک کے باشندوں
کی طرح ان چیزوں کے مستحق ہیں جو بڑوں کے لیے اب قابل قبول نہیں رہی تھیں۔
صورت حال کا عبرت ناک اور مضحکہ خیز پہلو اس وقت سامنے آتا ہے
جب مخرب اخلاق قرار دے کر ان کہانیوں کو مدرسہ بدر کرنے کی کوشش کی جاتی
ہے۔ یہ بالکل اسی قسم کی نصیحت ہے کہ ایک بزرگ نے فرمایا تھا کہ غزل کی
شاعری سے نوجوانوں کے اخلاق بگڑ جاتے ہیں اور محمد حسن عسکری نے ساقی کے سلسلہ
مضامین ”جھلکیاں“ میں اس کا جواب دیا تھا۔ کہانیوں کے ضمن میں اسی قسم کی
ایک مدافعتی کوشش سہیل احمد خاں کے یہاں ملتی ہے جو داستانوں اور علامتی
سرچشموں کی معنویت کی بازیافت سے اپنی دلچسپی کے سبب معاصر نقادوں سے
الگ تھلگ دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا مضمون ”پریوں کی کہانیوں سے خوف کیوں“
جو ”طرزیں“ (لاہور، ۱۹۸۲ء) میں شامل ہے اس سوال کو اٹھاتا ہے کہ سرکاری اشاعتی
اداروں اور ان کے ساتھ نصاب بنانے والوں کا نام بھی آنا چاہیے) پریوں کی کہانیوں
سے خائف ہیں اور بچوں کو ان سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ اس مختصر مگر
جامع مضمون میں ابن عربی کی فصوص الحکم کے حوالے سے بچپن کی معنویت کا ذکر
بھی ہے اور کہانیوں کی علامتی معنویت کی تشریح بھی ہے۔
”پرانی کہانیاں تسخیر کائنات کا ذکر ہی نہیں کرتیں، علامتی طور پر تسخیر کا یہ عمل خارج
اور باطن دونوں سطحوں سے پیوست ہے اور تسخیر باطن کا درجہ باقی سطحوں سے بڑا
ہے۔ پرانی کہانیاں یہ کہتی ہیں کہ تسخیر باطن یعنی اپنے نفس کی تہذیب کے بغیر تسخیر فطرت
یا تسخیر کائنات ایک ادھورا فعل ہے۔ جدید شعور تسخیر فطرت کے اصول کو اہمیت
دیتا ہے لیکن تہذیب نفس اور تسخیر باطن کے اصول کو بھول چکا ہے۔ جس کے نتیجے
میں فطرت اور انسان، انفس اور آفاق میں ایسی ہوشربا دوری پیدا ہو چکی
ہے جس نے جدید انسان کو ذہنی انتشار میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس وقت
مغرب کا ادب اور مغربی علوم اسی دلدل سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے
ہیں۔ یہی وہ مرکزی سچائی ہے جو آپ کو سائنسی معلومات کی کتابوں میں نہیں
ملے گی۔“
پرانی کہانیوں کا سبق بھی دراصل یہی ہے، جسے ہم بھول گئے ہیں اور اس

پراسرار، اس مضمون کا اہم ترین نکتہ۔ مشکل ہے تو بس اتنی کہ اس مضمون میں بھی پرانی کہانیوں کو بچوں کے حوالے سے دیکھا گیا ہے۔ بچپن کی روحانی منزل کا ذکر تو یہاں ہوا ہے اور انسانی زندگی میں بچپن کی اہمیت کا ادّعا بھی ہوتا ہے لیکن ان کہانیوں کو محض بچپن سے نتھی کر دینا، جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، دُہری زیادتی ہے، اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ یہ کہانیاں بچوں کے لیے مفید ہیں یا مضرت رساں، محض اس مسئلے کے حوالے سے ان کہانیوں کا مطالعہ ان کی تخفیف ہے کہ ان کہانیوں کی اقلیم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ زیادتی کی یہ شکل بھی مغرب سے آئی ہے کہ جہاں فینٹسی کو فوراً بچپن سے متعلق کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ سوئفٹ کی "گلیورز ٹریولز" اب تمام مغربی دنیا میں بچوں کی کتاب کے طور پر پڑھی جا رہی ہے۔ اپنے معاشرے پر سیاسی و سماجی طنز کے طور پر لکھی جانے والی اس کتاب کے ساتھ اس سے بڑا طنز اور کیا ہوگا۔

اس زیادتی کی ایک تازہ اور کہیں زیادہ قابلِ اعتراض مثال حیات اللہ انصاری کا مضمون "افسانوی اصنافِ ادب" (مشمولہ ششماہی، غالب، کراچی، شمارہ ۱۰) ہے۔ اس مضمون میں انصاری صاحب ان تمام پرانی کہانیوں کو بچوں کی کہانیوں کے مترادف کے طور پر برتتے ہیں۔ اسی مفروضے کے تحت انھوں نے بچوں کے لیے قوتِ متخیلہ اور مافوق الفطرت اور غیر مرئی عناصر سے عبارت کہانیوں کے حق میں اچھا خاصا جوشیلا بیان دے دیا ہے اور ان کے دفاع کی بہت پر زور کوشش کی ہے۔ یہ کوشش مستحسن سہی۔ لیکن ان عناصر کو شاید کسی ایسے دفاع کی محتاجی نہیں۔ ہر عمر اور ہر عہد کے انسان کے لیے ان کی دلکشی اپنا دفاع آپ ہے۔ انصاری صاحب کے دفاع کی وجہ تسمیہ یوں سمجھ میں آتی ہے کہ مضمون میں برسبیل تذکرہ وہ کہتے ہیں کہ دنیا کی تاریخ میں صرف ایک دور ایسا آیا تھا جب بچوں کی کہانیوں کی ناقدری بلکہ مخالفت کی گئی۔ اسٹالن کے روس میں یہ نظریہ چلا تھا کہ پریوں اور شہزادیوں اور جادو کی کہانیوں کو خارج کر دیا جائے۔ کیوں کہ ان میں روایت پرستی اور اوہام پرستی ہے۔ اس لیے وہ موجودہ دور کی حقیقت پسندی اور عقلیت پسندی کی ضد ہیں۔ اس نظریے کو ترقی پسندوں نے ہندستان میں بہت جوش سے درآمد کر لیا تھا اسی زمانے میں میں نے اپنی کہانی "کالا دیو" لکھی تھی۔ اس پر ترقی پسندوں نے بھی اعتراض کیا تھا۔" یہ اعتراضات شاید اب بھی افسانہ نگار کی دکھتی رگ بنے ہوئے ہیں اگرچہ ممتاز شیریں نے اس نوع کی کہانیوں کا ذکر اپنے رجحان ساز مضمون "تکنیک کا تنوع" میں تحسینی انداز میں کیا تھا۔ انصاری صاحب کا اس انداز کو اپنے تخلیقی عمل میں استعمال کرنا پرانی کہانیوں کی نجات کا سبب نہیں بن سکتا، اس کے لیے زیادہ پایدار بنیادوں پر گفتگو کی

ردرت ہے۔ یہاں افسانہ اور افسانہ نگار دونوں کے لیے اہم نکتہ یہ ہے کہ پرانی
ہانیوں اور اساطیر کا محض استعمال یا بازگوئی کافی نہیں ہوتی ہے بلکہ دیکھنے کی چیز
ہے کہ ان عناصر کو کس تخلیقی معنویت کے ساتھ بروئے کار لایا گیا ہے۔ اس
تحان میں پرانی کہانیوں کے ساتھ ساتھ نئے افسانہ نگار کو بھی گزرنا پڑتا ہے۔

انصاری صاحب نے پرانی کہانیوں کو جہاں محض بچوں کی کہانیاں قرار دیا ہے
ہاں ان کو دیو پریوں اور جادو کے حوالے سے مشخص کیا ہے۔ یہ عناصر ایسی بہت
ی کہانیوں کا اہم جزو سہی، لیکن یہ کہانیوں محض ان ہی تک محدود تو نہیں۔ سہیل
حمد کے مضمون کی سرخی میں بھی پرانی کہانیوں کے لیے "پریوں کی کہانی" کی اصطلاح
ستعمال ہوئی ہے۔ انگریزی میں جس چیز کو فیری ٹیل" کہا جاتا ہے، اس کے لیے
ردو میں کئی نام وضع کیے گئے ہیں، مثلاً پریوں کی کہانی، جن پریوں کی کہانی،
ری کتھا، پری کہانی وغیرہ۔ لیکن ان میں سے کوئی نام بھی قبول عام کی سند حاصل
نہیں کر سکا۔ غالباً اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ اصطلاح ہمارے لیے مفید نہیں
ہے۔ فیری ٹیل کا مغربی تصور ہمارے حساب سے محدود ہے۔ ان تمام قدیم
صتوں کو پریوں کی کہانیاں قرار دینا اتنی ہی مہمل بات ہے کہ جیسے ان کو بچوں کا ادب
رار دے دینا۔ جس طرح شیکسپیئر کے میکبتھ اور دوستوئیفسکی کے "جرم و سزا"
و اگر قتل کی کہانیاں" کہہ کر پکارا جائے تو یہ محض ایک اہانت اگر جزوی صداقت
ہوگی۔ اسی طرح پرانی دانش کے ان تمام افسانوی ذخیرے کو پریوں کی کہانیاں کہہ
دینا بھی درست نہیں معلوم ہوتا۔ اور پھر یہ اصطلاح بہت دور تک ہمارا ساتھ نہیں
دے سکتی۔ کیا الف لیلہ، کتھا سرت ساگر یا طلسم ہوش ربا کو جن پریوں کی کہانی قرار
دیا جا سکتا ہے؟

بعض ضمنی اختلافات سے قطع نظر، سہیل احمد کا مضمون بڑا اہم ہے اور ادبی
سے شکوہ کر رہا ہے کہ بچوں کے نام پر ہم ان کہانیوں سے اپنے رشتے
قطع کرتے چلے جا رہے ہیں، یہ جانے بغیر کہ اس کا نتیجہ کیسی محرومی کی شکل میں
ظاہر ہوگا۔ پرانے قصّے کہانیوں کا یہ ذخیرہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہوا جا رہا
ہے اس کو محفوظ کرنا تو درکنار ہم اس پر توجہ بھی نہیں دے رہے۔ اس سہل انگاری
ور غفلت شعاری کی ایک اور مثال لوک گیت ہیں جو اب بڑی حد تک قصۂ پارینہ
بن چکے ہیں ان کو جمع کرنے کی قابل قدر کوشش اطہر علی فاروقی نے "اتر پردیش کے
لوک گیت" میں کی ہے۔ بسم اللہ نیاز احمد کی "اودھ گیت" دوسرے کینڈے کی کتاب
ہے لیکن دونوں کتابوں کو وہ شہرت نہیں ملی کہ جس کی یہ مستحق تھیں۔ اگر ہم سننے کے لیے
تیار ہوں تو یہ کہانیاں اب بھی ہم سے بہت کچھ کہتی ہیں ان کو بھول کر ہم اپنے آپ کو بھلا
س طرح یاد رکھ سکتے ہیں؟ کہانی بھول جانے کی کہانی کے آخر میں نام اور چہرے بھی تو گم ہو گئے تھے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی اور اہم کتابیں

تنقید اور جدید اردو تنقید ڈاکٹر وزیر آغا

ڈاکٹر وزیر آغا اردو تنقید میں ایک مکتب کہلاتے ہیں۔ ان کا منفرد اندازِ فکر و نظر اور موقف زیرِ نظر مجموعہ میں بھی جھلکتا ہے۔ اردو تنقید پر کام کرنے والے اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ۶۰/-

مشقی تدریس ۔ کیوں اور کیسے؟
ڈاکٹر محمد اکرام خاں

ڈاکٹر محمد اکرام خاں نے استادوں کی ٹریننگ کے عملی پہلو کی اہمیت کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور اس کے پیشِ نظر "مشقی تدریس" پیش کی۔ یہ کتاب آپ کے طویل تجربے، عمیق مطالعے اور تحقیق کا نچوڑ ہے۔ ۴۵/-

دلی کی چند عجیب ہستیاں اشرف صبوحی

میر امن سے شاہد احمد دہلوی تک دلی کے قلم کاروں کا جو طویل سلسلہ ہے۔ اشرف صبوحی اس کی نہایت اہم کڑی ہیں۔ ان کی دلی کا مرکز لال قلعہ نہیں، شاہجہاں آباد کے عوام ہیں۔ اس میں کبابی بھی ہیں، بھٹیارے بھی، بوڑھے تکیہ دار بھی ہیں اور رنگ باز بھی۔ دلی کی ٹکسالی زبان میں لکھے ہوئے یہ دلچسپ خاکے اعلا اور جاندار نثر کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔
۵۱/-

کچھ مولانا آزاد کے بارے میں مالک رام

مالک رام صاحب نے گذشتہ تیس برسوں میں مولانا آزاد کے بارے میں مختلف موضوعات پر گیارہ مضامین قلمبند کیے تھے۔ یہ کتاب انھیں مضامین کا مجموعہ ہے۔ ۵۱/-

جدید افسانہ اور اس کے مسائل
وارث علوی

اردو کے ممتاز نقاد وارث علوی کے تنقیدی مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جدید اردو افسانہ کے متعلق ایک اہم دستاویز۔
قیمت ۳۶/- روپے

اپنی ہواؤں کی خوشبو کشمیری لال ذاکر
(خاکے)

اس کتاب میں اردو کے ممتاز ادیبوں، شاعروں اور اردو دوستوں کے ہلکے ہلکے نقوش ہیں۔ مکمل تصویریں نہیں۔ مگر ان خاکوں میں آپ کو نرم نرم ہواؤں کی خوشبو ملے گی۔ وہ خوشبو جس کی تمنا آپ کو برسوں سے ہوگی۔ ۳۶/-

صاحب جی سلطان جی
ڈاکٹر اسلم فرخی

اس کتاب میں حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ اور سلاطینِ دہلی کے تعلقات کا جائزہ تاریخی بنیاد اور مستند تاریخی حوالوں سے پیش کیا گیا ہے۔ قیمت ۲۰/-

ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب
ایک تنقیدی جائزہ

پروفیسر آل احمد سرور

اس خطبے میں پروفیسر آل احمد سرور نے مجیب صاحب کی معرکۃ الآرا کتاب THE INDIAN MUSLIMS کو موضوع بحث بنایا ہے۔ خطبے کے آخر میں پروفیسر موصوف نے موجودہ دور میں ہندستانی مسلمانوں کو لاحق مسائل کا تجزیہ کیا ہے اور ایک لائحہ عمل کا تعین کیا ہے۔ قیمت ۸/-

رہنما
محمد نعمان
اردو
کالج بھوپال

دسمبر ۹۳ء

بھوپال، ایک تصویر — دو رُخ

تاریخ و ادب کے آئینے میں

آج جو سرگذشت ہے ہماری
کل اس کی کہانیاں بنیں گی!

انسانی سرگذشت اور اس سے متعلقہ حرکات و افعال ہی دراصل "تاریخ" ہے۔ "تاریخ" محض انسانیت کا حافظہ ہی نہیں بلکہ اقوام عالم کا ایسا اعمال نامہ بھی ہے۔ جس کے احتساب سے کسی قوم یا شخص کو مفر ممکن نہیں! تاریخ کا دائرہ عمل کائنات کی مانند وسیع اور ہمہ گیر ہے، جس میں جملہ علوم و فنون کی کارفرمائی ہے۔

چنانچہ اسی تاریخ کی روشنی میں جب شہر بھوپال اور اس کی وجہ تسمیہ پر نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وکرمادتیہ کی راجدھانی اجین اور راجہ بھوج کی راجدھانی دھار نگری کے مقابلے میں بھوپال محض تاریخ پر ایک نوزائیدہ شہر ہے۔ لیکن جب سانچی، اودے گری، بھوج پور، بھیم بیٹکا، باڑی، قلعہ رائے سین اور بھوپال کے قریب و جوار سے ملنے والے حجری مصوری کے نمونوں، سکوں، مورتیوں اور بعض آثار قدیمہ پر نظر پڑتی ہے تو پہاڑوں اور تالابوں سے گھرے اس شہر کی نہ صرف تاریخی قدامت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اس کا تعلق عہد ماقبل تاریخ سے منسلک نظر آنے لگتا ہے!

بھوپال کے تاریخی شواہد اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ گوتم بدھ کے عہد سے بھی قبل، یہ علاقہ اونتی کے راجہ پردھوت کی ریاست کا حصہ تھا۔ اور موریہ عہد میں یہ علاقہ سمراٹ اشوک کے زیر نگیں آ گیا تھا، جہاں اس نے بودھ استوپ اور خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ جس کے باعث پہلی بار سیاحان عالم کی نظروں میں اس علاقہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہو گئی!

البتہ موجودہ بھوپال کا قیام، عہد وسطی میں، اس کے بانی پرمار خاندان کے

راجہ بھوما نے ایک عظیم الشان پشتہ بنوا کر "بھوجپال" کی صورت میں کیا۔ اسی پشتہ کے سبب بڑے تالاب کا وجود عمل میں آیا۔ تو نہ صرف اس شہر کی شناخت بن گیا ہے بلکہ

"تال تو بھوپال تال اور سب تلیّاں"

میں ڈھل کر، ضرب المثل بن گیا ہے۔ راجہ بھوج کی عظمت اور بزرگی کے سلسلہ میں یہ کہاوت:۔

"کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔"

آج بھی زبان زدِ خاص و عام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وہی راجہ بھوج ہے جو پیغمبر آخر الزماں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم عصر تھا۔ جس نے اس سرزمین پر "معجزۂ شق القمر" کا نظارہ، اپنی چشمِ حق بیں سے کیا اور مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ "تاریخ ہندستان" کے مترجم سید غلام ربانی کے مطابق "مہاراجہ وکرمادتیہ کے بعد وسطِ ہند میں اپنی علم دوستی اور وقار کے سبب، جسے سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی وہ راجا بھوج ہی تھا۔

دارالاقبال بھوپال' کو گہوارہ علم و ادب' کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن اسے "بیت القلم" کی حیثیت بھی حاصل رہی ہے۔ قلم سے اس کا رشتہ خاصا قدیم اور مضبوط اس طرح رہا ہے کہ جب اس خاکدان پر انسانوں کے قدم نہیں پڑے تھے تب یہاں "برّو" کی صورت میں قلم ہی اگا کرتے تھے۔ یہ وہی برّو ہیں جنھیں یہاں آنے والوں نے اپنی تیغ حرص سے مستاصل کر کے نہ صرف نشیمن تعمیر کیے بلکہ بزعم خود "بروکاٹ بھوپال" کا لقب اپنی کلاہِ افتخار میں آویزاں کر کے دوسروں پر اپنا رعبِ تقدس اور زعم تقدم ظاہر کرنے لگے۔ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا' اصل مدعا یہ ہے کہ بھوپال کی تاریخی قدامت کی طرح اس ادبی قدامت بھی مسلّم ہے۔ اس سلسلے میں پہلا نام راجا بھوج کے پوتے اودے دتیہ پرمار کی اہلیہ "رانی سال منی" کا لیا جاسکتا ہے، جس نے ۱۰۸۱ء میں اپنے عہد کے مروجہ علوم و فنون کی حامل' ایک عظیم درس گاہ "سبھا منڈل" قائم کر کے اپنی علم دوستی سے بھوجپال کا نام دنیائے ادب میں روشناس کرایا۔

پرمار خاندان کے زوال کے بعد' اس علاقہ پر گونڈ راجاؤں کی حکومت قائم ہوئی۔ گونڈ رانی کملاپتی کی شوہر پرستی' وفا شعاری اور اس کے حسنِ بے مثال کے چرچے :۔ رانی تو کملاپتی اور سب رنیاں" کے روپ میں عام ہیں۔

اس طرح راجا بھوج' بھوپال تال اور رانی کملاپتی کی شہرت کے علاوہ' جو چار چیزیں قدیم بھوپال کی تہذیب کی ترجمانی کرتی ہیں ان کے متعلق یہ شعر عام طور پر مشہور ہے۔؎

چہار چیز است تحفۂ بھوپال
پان ڈھکا، چینی و رومال!

رانی کملاپتی کے بعد، افغانستان کے تراہ قصبہ سے تعلق رکھنے والے سردار دوست خاں خاں نے ۱۷۰۹ء میں ریاست بھوپال کی بنیاد رکھی، جس کے تحت تقریباً ڈھائی سو سال تک نو، نوابین اور چار بیگمات نے حکومت کرکے اپنی علمی ادبی دوستی کا ثبوت پیش کیا۔

بھوپال کے پہلے شاعر قاضی محمد صالحؔ نے ریاست کے قیام سے قبل ۱۷۰۷ء میں مثنوی "اخلاق حسنہ" لکھ کر اردو شاعری کا آغاز کیا لیکن فرمانرواؤں میں پہلا صاحبِ دیوان ہونے کا شرف اس کے آٹھویں حکمران، نواب جہانگیر محمد خاں دولہؔ کو حاصل ہے۔ انھوں نے دو مطبوعہ دواوین "دیوانِ جہانگیری" اور "دیوانِ دولہؔ" یادگار چھوڑے ہیں۔ نواب دولہؔ کی فرمایش پر حکیم محمد اعظم خاں نے دو کتابیں "نیرِ اعظم" اور "رموزِ اعظم" تصنیف کی تھیں۔ انھیں کے دورِ حکومت میں مولانا محمد عباس رفعتؔ شروانی، قدرت اللہ بنارسی اور شیخ احمد یمنی بھوپال آئے۔ نئی بستی جہانگیر آباد، نواب دولہؔ کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

نواب جہانگیر محمد خاں دولہؔ کی اہلیہ، نواب سکندر جہاں بیگم کو بھوپال کی ادبی تاریخ میں اس وجہ سے اہم مقام حاصل ہے کہ انھوں نے ۱۸۵۹ء میں اردو زبان کو باقاعدہ طور پر ریاست کی سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا۔ غالبؔ کو بھوپال آنے کی دعوت دی۔ سرسید احمد خاں کو ان کے تعلیمی مشن میں مالی تعاون دیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے نانا اور مشہور عالمِ دین مولانا منورالدین کی پذیرائی کی۔ رجب علی بیگ سرورؔ سے "شرارِ عشق" لکھوائی۔ مطبع سکندری قایم کرکے کتابوں کی اشاعت کا بندوبست کیا۔ اور ۱۸۵۴ء میں "دفترِ کل" قایم کرکے ریاست بھوپال کا بیش قیمت ریکارڈ محفوظ کیا۔ جس کا بڑا حصہ نیشنل آرکائوز بھوپال میں موجود ہے۔!

نواب شاہ جہاں بیگم تاجورؔ و شیریںؔ کو اس وجہ سے اہمیت حاصل ہے کہ وہ نہ صرف صاحبِ دیوان شاعرہ تھیں بلکہ ان کے ذریعے باغات، عمارات اور مساجد کی تعمیرات کے علاوہ تصنیف و تالیف کا کام بھی انجام دیا گیا۔ "مطبع شاہ جہانی" قایم کرکے، پہلا اردو اخبار "عمدۃ الاخبار" ۱۸۷۱ء میں جاری کیا۔ تذکرے اور تواریخ لکھی گئیں۔ "امیراللغات" کے سلسلہ میں امیر مینائی کو جو مالی تعاون دیا گیا، اس کا اعتراف انھوں نے مدحیہ مسدس لکھ کر، اس طرح کیا ؎

اب دعا ہے کہ الٰہی یہ ریاست آباد   خضر سے عمر بڑھے خانۂ دولت آباد

سب کے اجڑے ہوئے دل اس کی بدولت آباد نام مشہور ہو بھوپال کا راحت آباد
فیض پاتے رہیں اس گھر سے امیر اور فقیر
یہ فقیر جگر افکار بھی ہو جائے امیر

نواب شاہ جہاں بیگم کے شوہر نامدار نواب صدیق حسن خاں کی بیشتر تصانیف اسی سرزمین باتمکین پر پایۂ تکمیل کو پہنچیں۔ شاندار ادبی ترقیات کے اعتبار سے بھوپال کے اس "عہد زریں" کو مولانا اسلم جے راجپوری نے " بغداد الہند" سے موسوم کیا ہے۔

نواب سلطان جہاں بیگم نے تعلیمی مدارس، "دفتر تاریخ" اور " لیڈیز کلب" قایم کرنے کے علاوہ کتب و رسائل کی اشاعت میں خصوصی دلچسپی لی اور شعرا و ادبا کی سرپرستی کرکے زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ " سیرۃ النبیؐ" کی تصنیف کے سلسلہ میں مالی تعاون کرنا تھا۔ جس کا اعتراف علامہ شبلیؔ نعمانی نے اس طرح کیا ہے ؎

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت کہ ابرِ فیضِ سلطانِ جہاں بیگم زر افشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخی تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

سلطان جہاں بیگم کا دوسرا کارنامہ نیازؔ فتحپوری کو ماہانہ وظیفہ مقرر کرکے ۱۹۱۸ء میں " دفتر تاریخ " (بھوپال) سے منسلک کرنا تھا، جس کے تحت انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف، تالیف اور ترجمہ کیں اور مضامین قلمبند کیے۔ نیاز کی کئی تصانیف بھوپال کے " دفتر تاریخ" کی مرہون منت ہیں۔ جس کا اعتراف انھوں نے ماہنامہ " نگار" (لکھنؤ) اکتوبر ۱۹۲۷ء میں بھوپال سے متعلق تحریر کردہ " اداریۂ خصوصی" میں اس طرح کیا ہے :-

"میری علمی زندگی اور نگار کی حیات اسی آستان نکتہ نواز اور بارگاہ علم پرور سے وابستہ رہی ہے۔"

سرزمین بھوپال کی فضائیں، حضرت امیر خسروؒ کے مدبھرے گیتوں سے معمور رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں سید عابد علی وجدی الحسینی، مرحوم اپنی کتاب " تحریکات آزادی میں بھوپال کا حصہ " میں " خزائن الفتوح " کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :-

"مشہور فاتح علاءالدین خلجی کے دور ۱۳۰۹ ہجری میں طوطیٔ ہند امیر خسرو، صاحب خزائن الفتوح دہلی سے ملک کافور کے ہم رکاب ہوکر جنوبی دکن کی طرف جارہے تھے کہ بھوپال کے دریائے بھوج کے سرسبز و شاداب جنگلوں کو اپنے مدبھرے گیتوں سے بھر دیا۔

امیر خسرو کا یہی وہ دریائے بھوج ہے جس نے بعد میں بیتو اندی کا نام پایا۔

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ دہلوی کا اس شہر سے اگرچہ براہِ راست کوئی تعلق نہیں رہا۔ لیکن بھوپال سے ان کے سسرالی خاندان کی قرابت، شاگردوں کی موجودگی، بھوپال کے نواب صدیق حسن خاں اور سید امجد علی اشہری کی غالب سے بنفسِ نفیس ملاقاتیں، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے "محاسنِ کلامِ غالب" کی تصنیف، نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب و تدوین اور عین غالبؔ صدی کے موقع پر نسخۂ بھوپال ثانی اور دو غیر مطبوعہ خطوط غالبؔ کی دریافت نے جہاں اس شہر کا غالب دہلوی سے کبھی نہ ختم ہونے والا رشتہ استوار کر دیا ہے وہیں بھوپال کے شنکر پرشاد شاد کا فارسی رسالہ "نمونۂ مغلوبیت غالب" کے ذریعے غالب پر تیکھے اعتراضات اور ماڈل اسکول بھوپال کے ہیڈ مولوی محمد ابراہیم خلیلؔ کی "اپریل فول" کے عنوان سے غالبؔ کی زمین میں کہی گئی۔ غزل نے عقیدت مندانِ غالبؔ اور محققینِ غالب کے لیے قیامت کھڑی کر دی۔!

دارالاقبال بھوپال کی اقبالؔ مندی بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ اس کے تنہا کارنامہ پر ہی پروفیسر رشید احمد صدیقی اپنی کتاب "گنج ہائے گرانمایہ" میں یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ:-

"اگر افراد کی مانند اداروں کی بھی کوئی معاد ہے تو اسی ایک نیک کام کے صلہ میں بھوپال کی نجات اخروی متیقن ہے"

یہی وہ شہر ہے جہاں علامہ اقبالؔ، مختلف وقفوں میں، لاہور کے بعد سب سے زیادہ مدت تک قیام پذیر رہے۔ یہاں رہ کر انھوں نے نہ صرف ۱۵ نظمیں لکھیں بلکہ اپنا مجموعۂ کلام "ضربِ کلیم" نواب حمید اللہ خاں والی ریاست بھوپال کے نامِ نامی سے معنون کرکے اہل بھوپال کا سرِ افتخار ہمیشہ کے لیے بلند کر دیا۔

جادو نگار ادیب، مہدی افادی الاقتصادی کو اگرچہ بھوپال کی زیارت کا موقع نہ مل سکا۔ لیکن اس شہر کے قدرتی حسن کی جھلک جب انھوں نے احباب کے خطوط میں دیکھی تو بے اختیار انھیں سوادِ ایران کی نزاکتیں یاد آگئیں اور انھوں نے اپنے مکتوب، بنام سید سلیمان ندوی میں بھوپال سے متعلق لکھا کہ:-

"وہاں (بھوپال) کا نشاط انگیز موسم کا خاکہ جن الفاظ میں آپ نے کھینچا ہے، ہے مجھے بے ساختہ "سخندانِ فارس" کا وہ موقع یاد آگیا۔ جہاں آزادؔ نے سوادِ ایران کی قدرتی نزاکتیں دکھائی ہیں۔"

مہدی افادی بھوپال کو "بہشتِ ارضی" سے موسوم کرتے ہوئے ہوشؔ بلگرامی کو لکھتے ہیں:-

"خدا کرے آپ وہاں جم جائیں جس کی نگاہیں "فلک نما"[1] سے الجھی ہوئی ہوں، اس کا ٹھکانہ، بہشت ارضی (بھوپال) کے سوا کہیں ہو ہی نہیں سکتا۔"

تاریخ شاہد ہے کہ عہد عتیق سے ہی امن و آشتی کی علمبردار یہ سرزمین صوفی سنتوں اور مختلف علوم و فنون سے تعلق رکھنے والے فن کاروں کی توجہ کا مرکز رہی ہے۔ اس کی آغوشِ ماضی میں سیکڑوں کہانیاں اس انتظار میں محوِ خواب ہیں کہ کوئی صاحبِ نظر اپنی جولانیٔ فکر سے ان کو جگا کر، نئے تناظر میں اپنی نوکِ قلم سے نئی تاب زندگی عطا کر دے! چنانچہ بعض مشاہیر نے اس خوشگوار فرض کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کی کوششیں کی ہیں۔ اس کی شفق عبیر، شامِ رنگین سے متاثر ہو کر نیاز فتحپوری نے جہاں ایک خوب صورت نظم "بھوپال کی ایک شام" لکھی وہیں علامہ اقبال کو اس کی فطرت کی جمال و زیبائی نے ایسا مسحور کیا کہ وہ "نگاہ" اور "صبح" جیسی نظمیں تخلیق کرنے پر مجبور ہو گئے۔

سلام مچھلی شہری کی نگاہِ شاعرانہ کو اس شہر میں جہاں عرشِ گم گشتہ کے مہتاب اور خندۂ گل کے آداب کے ساتھ اس تالاب میں نیل امبر کی اپسرائیں نہاتی دکھائی دیں وہیں پروفیسر احتشام حسین کی متجسس نگاہوں نے جب اس کے وسیع تالاب کو دیکھا تو بچپن میں سنی کہانیوں کی روشنی میں ان کے دل میں طلسمی گلِ بکاؤلی کا رشتہ اس تالاب سے جوڑنے کی خواہش بیدار ہوئی اور انھوں نے اس کے متعلق لکھا کہ: "یہ تال بھوپال کے تصور پر حاوی ہے اس میں کوئی طلسم ہے جو بھوپال کی انفرادیت کو نمایاں کرتا ہے۔"[2]

بھوپال کی ادبی و تہذیبی خصوصیات سے متاثر ہو کر جگن ناتھ آزاد نے طویل نظم بعنوان "بھوپال" لکھ کر اسے "حیدر آباد صغیر" سے تعبیر کیا تو جدید شاعر محمد علوی کو یہ شہر "پانی پر لرزتا ہوا محسوس ہوا" اور انھوں نے اس کے ماضی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

اک شخص کہیں دور سے آیا ہوگا چلّا کے پہاڑوں نے بلایا ہوگا
بھوپال تجھے تب اس نے پانی پہ لرزتا ہوا پایا ہوگا

مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی اس کے حسن سے متاثر ہو کر جہاں یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ "بھوپال آئے بغیر اردو کا ادیب صیقل نہیں ہوتا۔" وہیں

---

[1] "فلک نما" شملہ ہلز پر بھوپال واقع ایک عمارت کا نام
[2] مطبوعہ ماہنامہ "نقاد" ۱۹۱۷ء ص مطبوعہ "نوائے سیفیہ"

مشہور عالمِ دین اور بزرگ ادیب مولانا عبدالماجد دریا بادی کے حقیقت نگار قلم نے بھوپال گذشتہ اور بھوپال موجودہ کو اس طرح سراہا:- بھوپال مرحوم کی خدماتِ اردو کا تو کہنا ہی کیا لیکن بھوپال موجودہ بھی پکار اٹھے کہ

"میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد"

تو کچھ ایسا بے جا نہ ہوگا۔"

ایسا ہی اعتراف رشید احمد صدیقی نے بھی، اپنے ایک خط میں کیا ہے۔

"بھوپال کا ہماری تہذیب اور شعر و ادب کی ترقی میں بڑا قیمتی حصّہ رہا ہے۔ اس میں جو شک کرے وہ آپ بے بہرہ ہے" [1]۔

اس سلسلہ میں ترقی پسند شاعر کیفی اعظمی کی یہ رائے بھی خصوصی اہمیت کی حامل ہے:-

"ہماری تہذیب اور زبان کے جتنے پرانے مرکز تھے وہ سب کے سب قریب قریب منجملہ آثارِ قدیمہ ہو چکے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن صرف بھوپال کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ ہمارا مرکز تھا اور ہے۔

یہاں اگر کچھ سورج ڈوبے ہیں تو کچھ طلوع بھی ہوئے ہیں، جن سے ہماری زبان آج بھی کسبِ نور کر رہی ہے۔" [2]

پاکستانی ادیب مشفق خواجہ، جب یہاں پہونچے تو بے اختیار کہہ اٹھے:-

"اگر اس شہر میں نہ آتا تو اپنی زندگی کے قیمتی تجربے سے محروم رہتا۔۔۔۔۔ اس خوب صورت شہر میں زندہ رہنا ہی نہیں مرنا بھی ایک خوشگوار تجربہ ہے۔"

اس سرزمین پر جب افسانہ نگار، رتن سنگھ نے ۱۷ر دسمبر ۱۹۶۲ء کی صبح پہلے پہل قدم رکھا تو اس کے نظر فریب حسن کے جلووں نے انھیں نہ صرف حیران بنا دیا بلکہ اس سے حاصل شدہ تاثر کو، انھوں نے اپنے اثرِ خامہ سے اس طرح جاودانی عطا کر دی:-

"مجھے پہلی نظر میں ہی بھوپال کی دھرتی اس لیے پسند آئی تھی کہ مجھے مزاجاً میدانی علاقوں کے سیدھے سپاٹ راستے پسند نہیں۔ وہ راستے ہی کیا ہوئے جو ٹیڑھے میڑھے بل نہ کھائیں اور اونچائیوں نیچائیوں سے نہ گزرتے ہوں اور بھوپال کی تو دھرتی ہی ایسی ہے

---

[1] مکتوب بنام پروفیسر عبدالقوی دسنوی، مطبوعہ "نوائے سیفیہ"!

[2] ۲۸ر نومبر ۱۹۶۷ء مطبوعہ نوائے سیفیہ بھوپال نمبر ۳

ہر موڑ پر نئے نشیب و فراز۔ ہر موڑ پر نئی دلکشی، نیا حسن۔ میں نے اپنی آنکھوں سے آسمان کے چاند کو اس دھرتی پر بیٹھے ہوئے دیکھا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ بھوپال کے تال میں صبح نہانے کے لیے آیا ہو .... میری آنکھوں نے چاند کے اس حسن کو دل کے شیشے میں اتار لیا ہو۔ اور اب جب بھی میرے دل میں کوئی خوب صورت خیال پیدا ہوتا ہے تو مجھے اس بات کا پورا احساس رہتا ہے کہ اس میں میری فکر یا کوشش کا کوئی دخل نہیں بلکہ یہ اس چاند کا حسن ہی ہے جو پگھل پگھل کر خیالات کا جامہ اختیار کر رہا ہے۔“ [۱]

جموں میں رہ کر ڈاکٹر گیان چند جین کو جب بھوپال یاد آتا ہے تو وہ لکھتے ہیں :-

بھوپال جو میرا وطن نہیں ہے، مجھے ہر وطن سے بڑھ کر ہے۔ مجھے وہ بھوپال یاد آتا ہے جہاں مالویہ نگر کے اوپر اریرا کی پہاڑی ہے۔ جہاں لال کوٹھی کے نیچے چھوٹے تالاب کی سطح کنول کے پھول کے پتوں سے لپٹی رہتی ہے۔ جہاں شملہ کی پہاڑی کے نیچے بڑے تالاب کا خاموش سمندر اپنی جبروت کے ساتھ نرم ہے۔ جہاں لال گھاٹی ہے۔“ [۲]

بھوپال کے بزرگ شاعر، شاہ رؤف احمد رافت نے مثنوی ”زلیخائے ہندی“ میں بھوپال کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے، اسے یوں دعا دی ہے ؎

الٰہی تو بھوپال کو رکھ مدام　　بحفظِ اماں، دشمنوں سے تمام

باسط بھوپالی اسے آئینہ فردوس سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

صادق ہے ہر اک ذرہ پہ ہیرے کی مثال
تالاب کا پانی ہے کہ چاندی سیال
آئینہ فردوس جسے کہتے ہیں
اے دوست حقیقت میں وہی ہے بھوپال !

اس شہر کا قدرتی حسن اور اس کی مخصوص ادبی فضا، شہاب اشرف کی طرح بے شمار شعرا کرام کے فکر و فن کا محور و منبع ثابت ہوئی ہے۔ شہاب اشرف کا یہ شعر اسی شہرِ غزل سے منسوب ہے ؎

۱　”یادِ بھوپال“ ”ارمغان سیفیہ“ ص ۲۲۲

۲　”جموں تا بھوپال“ ــ گردش خیال“ (مطبوعہ نوائے سیفیہ)

حسن کیا کیا تمھارے شہر میں ہے　　حسن کیا کیا نظر نہیں آتا

یہ تو تھا تصویر کا ایک رُخ، یعنی رخِ لطیف اور اب ملاحظہ کیجیے دوسرا رخ، رخِ کثیف! بقولِ غالبؔ دہلوی ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی　　چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

جس طرح، سیاہ کے بغیر سفید، رات کے بغیر دن اور بدصورتی کے بنا خوب صورتی کوئی معنی نہیں رکھتی، اسی طرح تنقید کے بغیر تعریف کی بھی کوئی اہمیت نہیں! صحت مند تنقید نہ صرف نئے گوشے وا کرتی ہے بلکہ اس میں اصلاح و تعمیر کا پہلو بھی مضمر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس سے افسردہ خاطر اس وجہ سے بھی نہیں ہونا چاہیے کہ خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ، کبھی بڑا مفید ثابت ہوتا ہے۔

مثلاً:- بھوپال کے حسن نے جہاں بیشتر مشاہیرِ ادب کے دامنِ دل و نگاہ کو اپنی جانب متوجہ کیا وہیں پروفیسر صفیہ اختر کو اس میں کوئی کشش نظر آنے کے بجائے وہ محض ساکت و جامد نظر آیا اور اس کے متعلق اپنی کتاب "اندازِ نظر" میں انھوں نے لکھا کہ:-

"........ بھوپال کا حسن ایک مجسّمے یا Statue کا حسن ہے، جس میں حسن کی لطافت، حرکت کا لوچ، جذبہ کی گرمی اور ذہن کی روشنی کی تلاش تشنہ رہ جاتی ہے۔

بھوپال کی سیاسی سماجی اور دماغی دنیا اپنے فطری ماحول سے ہم آہنگ ہے۔ یہاں زندگی کی چیخ، تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی اور نیچی نیچی پہاڑیوں کی ثابت قدمی سے متاثر ہوکر دب جایا کرتی ہے۔"

ہوسکتا ہے کہ ایسے ہی کسی تجربے یا احساس کے تحت، نوجوان شاعر ظفرؔ صہبائی، یہ کہنے پر مجبور ہوئے ہوں ؎

یہاں لوگ باون گزے ہیں بہت　　یہ بھوپال سا بھی جگہ خوب ہے

ظفرؔ صہبائی کے اس شعر پر یاد آرہا ہے کہ مرحوم مخلص بھوپالی "غفور میاں" کے کردار کی صورت میں یہاں دو سو سال سے پیدا ہونے والی "غفوریت" کی تفصیلات پوری شدو مد کے ساتھ بیان کرچکے ہیں۔ مخلص بھوپالی کے "غفور میاں" اور جوہر قریشی کے "چاہ حسین" جیسے زندہ کرداروں کے علاوہ بہت سے بے نام کردار بھی اس دھرتی پر، ہر عہد میں جنم لیتے رہے ہیں اور اپنی داستانِ الف لیلہ کے ذریعے مخاطبین اور سامعین کو حیرت و استعجاب میں مبتلا کرتے رہے ہیں۔

اس سرزمین پر شعر و ادب کی تخلیق کا عمل اگرچہ عرصۂ دراز سے جاری ہے لیکن یہ کہنا بہت دشوار ہے کہ اس خاکِ ادب کے کتنے ذرّوں کو، مطلعِ ادب پر آفتاب و مہتاب بننے کا موقع نصیب ہوسکا۔ اور کتنے ناسازگاری حالات کا شکار ہوکر

ہمیشہ کے لیے یا تو گہنا گئے یا قعرِ گمنامی میں کھو گئے۔ کیونکہ یہاں کے کئی اہم فن کاروں کے ساتھ یہ حادثہ بھی پیش آچکا ہے کہ ان کا کلام بلاغت نظام، اپنوں کی غفلت یا امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں ضائع ہو گیا۔

بھوپال کے زود گو اور قادر الکلام شاعر، سراج میر خاں سحر بھوپالی (ہمعصر امیر مینائی) کے کلام کے بیشتر منتشر اوراق جنھیں وہ ایک بڑے صندوق میں محفوظ کر دیا کرتے تھے، اپنوں کی بے توجہی کے سبب کاغذ کی لگدی بن کر، سامان رکھنے کی ٹوکری میں تبدیل ہو گئے، وہ تو بھلا ہو سرراس مسعود مرحوم کا کہ جنھوں نے اتفاقاً کسی قوّال کی زبانی ان کا کلام سنا اور اس قدر متاثر ہوئے کہ "کلام سحر" کی باقیات کو یکجا کرا کے "بیاضِ سحر" کی صورت میں آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا۔ ورنہ ان کا نام تاریخ ادب سے نہ صرف محو ہو جاتا اور ہم ایک باکمال شاعر کی تخلیقات سے محروم ہو جاتے بلکہ خود سراج میر خاں سحر بھوپالی کا یہ بھرم بھی خاک میں مل جاتا کہ ؎

اے سحر غم نہیں کچھ فرزند گر نہیں ہے   باقی جہاں میں تیرا دیوان ہی رہے گا

ایسی ہی مجبوریاں بھوپال کے مشہور شعرا ممتاز احمد سہا مجدّدی اور عرشی بھوپالی کو بھی پیش آئیں جن سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنے ہی ہاتھوں اپنے کلام کا بڑا حصّہ نذرِ آتش کر دیا اور باسط بھوپالی یہ کہنے پر مجبور ہوئے۔

دل مرا خاکِ وطن سے خوش بھی ہے ناخوش بھی ہے   جتنی مردم خیز ہے اتنی ہی مردم کش بھی ہے

ہماری سرد مہری، بے نیازی اور ستم ظریفی، کتنے حساس فن کاروں کے لیے سمِ قاتل ثابت ہوئی۔ اس کا احساس ہمیں ہو یا نہ ہو، ان فن کاروں کو ضرور تھا جو اس بے اعتنائی کا شکار ہو چکے ہیں۔ چناں چہ بعض شعرا کرام کے ہاں اس کا شدید ردِّ عمل ظاہر ہوا ہے۔

بھوپال کے ہر دلعزیز اور طرحدار شاعر، محمد علی تاج بھوپالی کی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ وہ اپنی ذات سے بے نیاز رہ کر بھی دوسروں کے دکھ درد میں برابر کا شریک رہتا تھا۔ جس نے کسی سے نفرت نہیں کی، جس کا دل ہر قسم کا بغض و عناد سے منافقت سے پاک تھا۔ معصومیت، ایثار اور وفا جس کے مزاج کا خاصہ تھا۔ جس کے احد ہوٹل کے دروازے ہر نو وارد فن کار کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ جسے فلم نگری بمبئی کی مصنوعی زندگی راس نہیں آئی۔ مواقع ملنے کے باوجود جو اپنے وطن اور اہل وطن کو خیر باد نہیں کہہ سکا۔ کیونکہ وہ زمانہ ساز نہیں تھا۔ لہٰذا اپنے مستقبل کی تعمیر کے بجائے اپنا سب کچھ دوسروں پر قربان کرتا رہا۔ اور جب اس پر بُرا وقت آیا تو دیکھا گیا کہ ماسوائے

چند' اپنوں نے ہی منہ موڑ لیا۔ ظاہر ہے کہ ایک حساس و خود دار فنکار پر جو کچھ گزرنا تھی گزر گئی۔ لیکن اس طرح کہ حرفِ شکایت زبان پر نہیں آیا۔ کیوں کہ وہ ہمیشہ کا چاک دامن نہیں تھا۔ اور اس کی زندگی نے آسودگی اور مسرت کے دن بھی دیکھے تھے لہٰذا وہ اپنی سنہری یادوں سے دل کو بہلاتا رہا۔ اپنے ماضی کو یاد کرتا رہا اور یاد دلاتا رہا تاکہ دوسرے عبرت اور تجربہ حاصل کریں۔ اور بھوپال کا کوئی اور فن کار اس کی طرح لمحہ لمحہ مرنے پر مجبور نہ ہو! تجربات کی بھٹی میں تپ کر نکلے اس کے ان اشعار کی گرمی کیا کبھی ماند پڑ سکتی ہے؟ ؎

ہم سے خراب حال دوانوں کا غم نہ کر
عبرت بھی بن گئے تو بڑا کام کر گئے

تم بھی ہلاکتوں کے سوا کچھ نہ پاؤ گے
یارو، ہمیں کو دیکھ لو اک تجربہ ہیں ہم

میں لمحہ لمحہ مرتا جا رہا ہوں
مرا گھر میرا مقتل تو نہیں ہے

میں اکثر راستوں میں سوچتا ہوں
یہ بستی کوئی جنگل تو نہیں ہے

کبھی لبوں پہ تھے ہم بھی محاوروں کی طرح
اب اپنے شہر میں پھرتے ہیں زائروں کی طرح

مجھے تقدیر نے سب کچھ دیا تھا
مگر سب کچھ برائے نام ٹھہرا

چاک دامن ہم عمر بھر کے نہ تھے
ہم بھی رہتے تھے رکھ رکھاؤ کے ساتھ

مرہم تو کچھ اور ہی شے ہے تیرے حرف تسلی کو
یوں تو خود ہم نے بھی نہ دیکھا زخموں کو گہرائی تک

تشنگی لاکھ ہو اتنی قاتل نہیں
اے مرے دوستو بے حسی جرم ہے

تمھاری بزم سے باہر بھی ایک دنیا ہے
مرے حضور! بڑا جرم ہے یہ بے خبری

کچھ اس طرح سے ہم سحر و شام کر گئے
تارِ کفن بھی لوگوں کو انعام کر گئے

یہ اور اسی نوع کے دوسرے اشعار 'تاج کی کہانی تاج کی زبانی' سناتے نظر آتے ہیں۔ جن کے ذریعہ وہ براہ راست کچھ نہ کہہ کر بھی سب کچھ کہہ گئے ہیں' اس کے باوجود'

" سمجھے' نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا!"

غم نصیبی اور بے چارگی کی یہ مدھم لَے تاج کے یہاں نہ تو چیخ بن کر ابھرتی ہے اور نہ شکایت یا طنز کا پہلو اختیار کرتی ہے۔ انھوں نے تو محض گذارش احوال واقعی کے بطور اپنے خیالات' تجربات اور مشاہدات کو شعر کے پیکر میں ڈھال دیا ہے لیکن بھوپال سے تعلق رکھنے والے دوسرے فن کاروں کا لہجہ

اس سلسلہ میں خاصا تلخ اور تیز ہو گیا ہے۔ مثلاً کیف بھوپالی اپنا ردِّ عمل اس طرح ظاہر کرتے ہیں ؎

چاہتا ہوں پھونک دوں اس شہر کو   شہر میں ان کا بھی گھر ہے کیا کروں
دوستو، اب تم نہ دیکھو گے کبھی   ختم ہیں ہم پر ستم آرائیاں

ہم کو دیوانہ جان کے کیا کیا ظلم نہ ڈھایا لوگوں نے
دین چھڑایا، دھرم چھڑایا، دیس چھڑایا لوگوں نے

یا احسن علی خاں احسنؔ کا یہ شعر ؎

وہ تو کہیے کہ ہے وطن، احسنؔ   ورنہ بھوپال کیا ہے، کیا کہیے؟

یا بختیار ضیار کا براہِ راست یہ انداز ؎

کیا کائنات تنگ تھی مجھ پر مرے خدا   کیوں قاتلوں کے شہر میں پیدا کیا مجھے

یا دلی میں رہ کر، مظفر حنفی کو اس طرح بھوپال کا یاد آجانا ؎

اے مظفر کس لیے بھوپال یاد آنے لگا   کیا سمجھتے تھے کہ دلی میں نہ ہوگا آسمان

بھوپال کی ادبی و تاریخی قدامت کے باوجود، یہ امر بھی حیرت و استعجاب کا باعث ہے کہ اردو ادب کی ہر تاریخ، ہر تذکرہ، اور ہر انتخاب (سوائے "روحِ غزل") شعرائے بھوپال کے ذکر سے خالی نظر آتا ہے؟

آخر کیا وجہ ہے کہ بھوپال کا حسن اور اہلِ بھوپال کی وضع داری اور مہمان نوازی تو مشاہیرِ قلم کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لیتی ہے لیکن شعرائے کرام کا کلام ان کی توجہ کا مرکز نہیں بن پاتا؟

کیا اس کا جواب، ہماری غفلت، تساہل پسندی اور معاصرانہ چشمک میں مضمر تو نہیں ہے؟

کیا احمد علی جاویدؔ کی نظم "میرا وطن" کا یہ شعر، تو اس سوال کا جواب نہیں ہو سکتا؟۔

مگر کیا غضب ہے جو میرا وطن ہے   وہ اپنوں کا مشقِ ستم گلبدن ہے

یہاں محض اپنے ہی مشقِ ستم کے شاکی نہیں رہے۔ بلکہ بعض مشاہیرِ قلم کو بھی معاندانہ تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ چنانچہ علامہ شبلیؔ نعمانی کے سلسلہ میں لکھا گیا۔ "کتابچہ" اور نیازؔ فتح پوری پر لکھا گیا سخت تنقیدی مضمون بعنوان "نیاز فتح پوری کا نفسیاتی مطالعہ اور ان کی شاعری پر طائرانہ نظر" (دوسروں پر تنقید ک

...مندیں پھینکنے والا' خود تنقید کے دام میں) مطبوعہ روزنامہ "ندیم" (بھوپال) ...ار اگست ۱۹۵۷ء' اور ان پر قایم کردہ مقدمہ (جس کی پیروی نیاز کی ...جانب سے رمزی ترمذی صاحب نے کی تھی) اور علامہ اقبال کی یادگار کے بطور اقبال میدان (بھوپال) ...میں قایم کردہ "مینار شاہین" کے خلاف مضامین کی اشاعت اور مقدمہ دائر کرنا۔ ...د محوی کا انقطاع وغیرہ ایسی مثالیں ہیں' جن کا جواب احمد علی جاوید کے مذکورہ بالا ...شعر میں کسی حد تک مل جاتا ہے۔!

بھوپال کے بتدریج ادبی ارتقاء پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ راجا بھوج ...نے علم و عرفان کی جو شمع اس علاقہ میں روشن کی تھی اس کی لو نے ہر عہد میں ...یہاں کے ظلمت کدوں کو روشن بنائے رکھا ہے۔ کبھی رانی سال منی کے 'سبھا منڈل' ...کے روپ میں تو کبھی نواب جہانگیر محمد خاں دولہ' نواب سکندر جہاں بیگم' نواب شاہجہاں ...بیگم تاجور' نواب صدیق حسن خاں توفیق' نواب سلطان جہاں بیگم' اور نواب حمید اللہ ...خاں کی قابل قدر ادبی خدمات کی شکل میں!

مدھیہ پردیش کی راجدھانی بن جانے کے بعد بھی یہاں ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ نہ صرف ...جاری رہا بلکہ اس کے دائرۂ کار میں مزید اضافہ بھی ہوا ہے۔ مختلف زبانوں کے علوم و ...فنون کے فروغ کی خاطر' ساہتیہ پریشد' کلا پریشد' ہندی گرنتھ اکادمی' اردو اکادمی ...سندھی اکادمی' سنسکرت اکادمی' علاؤالدین خاں سنگیت اکادمی' فلم ڈیولپمنٹ کارپوریشن ...علامہ اقبال ادبی مرکز کے علاوہ "بھارت بھون" کے قیام نے' بھوپال کو پورے ملک ...کی ثقافتی راجدھانی کا درجہ عطا کر کے' عالم گیر شہرت کا حامل بنا دیا ہے۔

بھوپال کی تاریخ و ادب کے اس مختصر سے جائزے کے بعد' میں اس مضمون کو جگن ناتھ آزاد ...کی نظم "بھوپال" کے ان اشعار پر ختم کرتا ہوں:-

حال پر ماضی ترا اب بھی تجلی بار ہے — آج بھی تیری زمیں پر بارش انوار ہے
آج بھی گرما رہا ہے دل کو افسانہ ترا — اہل علم و فن سے ہے معمور کاشانہ ترا
اے دیار رنگ و بو' اے مرکز تابندگی — شعر و نغمہ ہی نہیں تیری متاع زندگی
اور بھی پہلو ہیں تیری دل نشیں تصویر کے — ہر طرف جلوے برستے ہیں تری تنویر کے
ہند کی تاریخ تیرے سینے میں خوابیدہ ہے — تیرے دل میں اک جہان سادگی آرامیدہ ہے
ہاں وہی سادگی کہ ہے تاریخ کا زریں ورق — حال کو جو دے رہا ہے آج ماضی کا سبق

اپنے دل میں لے کے تیرہ سو برس کی داستاں
بیس صدیوں کا ہے اس کا ذرہ ذرہ ترجماں! ●●

(تبصرہ نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

اپنے دل کی حفاظت کیجیے

مصنف: کرنل چوپڑہ
مترجم: نذیر الدین مینائی
قیمت: ۲۵/- روپے
مبصر: ڈاکٹر حلیم کوثر چاندپوری
پبلشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی

کرنل چوپڑہ کا نام طبی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں وہ ایک نہایت معتبر مشہور اور بین الاقوامی شہرت کے مالک ماہر امراض قلب ہیں۔ انھوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود عام آدمی کی طرف توجہ دی ہے اور اس کی معلومات کے لیے زیر نظر کتاب "اپنے دل کی حفاظت کیجیے" لکھ کر ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ کتاب کا ترجمہ پروفیسر مینائی نے کیا ہے جو خود ایک مقبول اور ماہر استاد ہیں اور دل کے آپریشن کا ذاتی تجربہ کرنے کے بعد دل کی دھڑکنوں سے بہتر طریقہ پر آشنا ہیں اس کے ترجمہ کو زیادہ اثر انداز بنا سکے ہیں۔

کرنل چوپڑہ نے اس کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت مختصر لیکن جامع اور نہایت آسان اور عام فہم طریقہ سے دل کے افعال اور اس سے متعلق مختلف امراض مثلاً انجائنہ ANGINA اور دل کے دورے CORONARY THROMBOSIS کورونری تھرومبوسس MCI سے پیدا شدہ کیفیات، ان کے عوامل، ان کا سامنا کرنے، اور اس کے لیے بہتر سے بہتر طریقہ علاج کو حاصل کرنے کے وسائل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ دل کی کسی بھی بیماری کی صورت میں اس کی صحیح حالت جاننے اور مستقبل کے اندیشوں سے باخبر رہنے کے لیے ایکو کارڈیوگرافی، اسٹرس ٹسٹ، کورونری انجیوگرافی Echo Cardiography، Stress Test، Coronary Angiography کے طریقوں اور نتائج کو بہت اچھے ڈھنگ سے بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ مختلف طریقہ علاج بیلون انجیوپلاسٹی اور بائی پاس سرجری Balloon Angioplasty، Bypass Surgery کے بارے میں خدشات کو دور کرنے

ان کے بارے میں مفید معلومات فراہم کی ہیں جن کو پڑھ کر نہ صرف دل کے مریضوں بلکہ عام آدمی کا بھی حوصلہ بلند ہوگا۔

دل کے مریضوں کے لیے عام تجاویز، دورہ کے دوران یا آپریشن کے بعد آرام، مناسب ورزش، اور غذا وغیرہ کے بارے میں اسکیمینز کے ذریعہ معلومات نہایت موثر ہیں۔ دل کے امراض کو پیدا کرنے میں دوسرے امراض مثلاً بلڈ پریشر، ذیابیطس، ذہنی پریشانی اور بے سکونی اور تناو کا جو دور رہے ان کے بارے میں تفصیل سے ذکر ہے یہ تمام معلومات ہر آدمی کے لیے نہایت اہم اور بہترین گائیڈ ہیں۔

موجودہ ترجمہ میں صرف ایک کمی شاید اس لیے نظر آتی ہے کہ یہ کتاب عام آدمی کے لیے ہے اور اسی ڈھنگ سے اس کو دیکھا گیا ہے۔ رنگین پلیٹیں جو کتاب کے آخر میں ہیں اگر وہ اسی صفحہ کے ساتھ جہاں ان کا تذکرہ ہے یا ان کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے شائع کی جاتیں تو پڑھنے والوں کو سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوتی۔ اسی طرح پلیٹ نمبر ۱ ،، نارمل صحت مند دل ،، میں دل کی رگوں اور مختلف حصّوں کی نشان دہی نہ کرنا بھی کھٹکتا ہے۔

جو غلطیاں ہیں وہ اتنی کم ہیں کہ نظر انداز کی جا سکتی ہیں۔

مکتبہ جامعہ نے اس ترجمہ کو شائع کرکے عام آدمی کو اپنے دل میں جھانکنے کی اہمیت کا احساس دلایا ہے، قاری اس کتاب کی افادیت سے ہرگز انکار نہ کر سکے گا اور اپنے دل کی پکار کو بہتر طریقہ سے سمجھ سکے گا۔

کاغذ اور طباعت معیاری ہے۔ کتابت بھی اچھی ہے۔

حسرت سے فراق تک
(جلد سوم)

مولف :- ایم حبیب خاں
مبصر :- ڈاکٹر شہناز انجم
قیمت :- ۳۵ روپے
ملنے کا پتا :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

مذکورہ کتاب ،، حسرت سے فراق تک ،، اردو کے کلاسیکی شعرا پر تنقیدی مضامین کے سلسلے کی تیسری اور آخری کڑی ہے۔ اس سلسلے کی پہلی جلد ،، ولی سے آتش تک ،، اور دوسری جلد غالب سے اقبال تک ،، کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اردو شعرا سے متعلق تنقیدی مضامین کو یوں تاریخی تسلسل سے مجموعوں کی صورت میں پیش کرنا ایم حبیب خان کی ادب سے دلچسپی اور وابستگی کا پتا دیتا ہے۔ مضامین کے ان مجموعوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کی نظر ادب کے ساتھ ساتھ وقت کے تقاضوں پر بھی ہے۔ ان تقاضوں کی تکمیل کے لیے شعرا سے متعلق تنقیدی مضامین کی یہ سلسلے وار ترتیب ان کا ایک عمدہ کام ہے۔ مختلف مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے مضامین پر مشتمل یہ مجموعہ نہ صرف طلبہ کے لیے مفید ہے بلکہ ادب سے دلچسپی رکھنے والے

اجنبی شہر

مصنف :- عبدالقوی دسنوی
مبصر :- اقبال حسن آزاد
قیمت :- ۱۵/- روپے
ملنے کا پتا :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

"اجنبی شہر" اردو کے مشہور ادیب عبدالقوی دسنوی کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ عبدالقوی دسنوی کا نام محتاج تعارف نہیں۔ موصوف گذشتہ چالیس برسوں سے گیسوے ادب کی شانہ آرائی کا کام بڑی جانفشانی اور تندہی سے کرتے آرہے ہیں وہ ایک بلند پایہ محقق اور تنقید نگار ہیں۔ اقبال، غالب، ابوالکلام آزاد، پریم چند اور مرزا دبیر پر ان کے متعدد شہ پارے شائع ہو کر خراج تحسین کر چکے ہیں۔

"اجنبی شہر"، اپنے طرز کی منفرد تصنیف ہے۔ اسے شہر نامہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ بھوپال ہندستان کا ایک مشہور شہر ہے۔ عبدالقوی دسنوی، سیفیہ کالج بھوپال کا نکون اور ادب میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ سیفیہ کالج بھوپال کا ایک اہم تعلیمی ادارہ ہے اور عبدالقوی دسنوی ابتدائے ملازمت سے لے کر اپنی سبکدوشی تک شعبۂ اردو، سیفیہ کالج بھوپال سے منسلک رہے۔ اس شعبے سے ان کی وابستگی اتنی گہری ہے کہ انھیں کم از کم تین بار بڑی یونی ورسٹیوں سے ملازمت کی آفر آئی مگر وہ اس جگہ کو چھوڑنے کو تیار نہ ہوتے جس کی آبیاری انھوں نے اپنے خونِ جگر سے کی ہے۔ انھوں نے اپنی ان تھک کوششوں سے شعبۂ اردو کو ایک مثالی شعبہ بنا دیا ہے۔ یہاں کی لائبریری بھی اپنی مثال آپ ہے، جس کی شہرت تمام اردو دنیا میں ہے۔ اس شعبہ نے مظفر حنفی جیسا مشہور شاعر اور ادیب پیدا کیا ہے۔

"اجنبی شہر"، میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی بھوپال آمد کی روداد، سیفیہ کالج کے قیام کی تاریخ، وہاں آنے والے مشاہیر کے تاثرات، رخصت نامہ، پروفیسر مرتضیٰ علی شاد کی نظم، چند رفیقوں کے خطوط اور انگریزی اور اردو اخبارات کے تراشے شامل ہیں۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے سیفیہ کالج سے اپنی وابستگی کی تاریخ بیان کرتے ہوئے معمار اور پاسبان سیفیہ جناب فخرالدین، بانی سیفیہ ملا سجاد حسین مرحوم، تاج بھوپالی دیدہ ور، مولانا محمد عمران خان صاحب، باسط بھوپالی، شاہد اختر، پروفیسر حامد جعفری، پروفیسر مرتضیٰ علی شاد، پروفیسر بدیع الحسن، پروفیسر شریف احمد چغتائی، پروفیسر حسن مسعود، ڈاکٹر ارشاد شاد، پروفیسر آفاق احمد، ڈاکٹر حامد حسین، ڈاکٹر حنیف نقوی، ڈاکٹر یونس حسنی اور آصف شاہمیری کا تذکرہ بڑی عقیدت اور محبت کے ساتھ کیا ہے۔
شعبہ اردو، سیفیہ کالج میں آنے والے مہمانوں میں جن لوگوں نے اپنے تاثرات قلم

ہر قاری کے لیے معلومات افزا ہے۔ اس کا ایک وصف تو یہ ہے کہ مؤلف نے جن شعراء کا انتخاب کیا ہے وہ غزل کی تاریخ میں اہم کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسرے ان شعراء کے بارے میں لکھنے والے لوگ خود ادب کی دنیا میں ممتاز حیثیتوں کے مالک ہیں۔ پھر رشید احمد صدیقی جیسے معتبر ناقد کا تعارفی بیان کتاب کی اہمیت میں ایک اضافہ ہے۔ "حرفِ آغاز" کی سرخی کے تحت مؤلف نے مختصر طور پر غزل کی تاریخ اور اہمیت کا ذکر کیا ہے۔ اور مستزاد وہ تعارفی بیانات ہیں جو مؤلف نے ہر ناقد کے مضمون سے پہلے پیش بندی کے طور پر قلم بند کیے ہیں۔

نو شعراء کی زندگی اور فن کی رنگا رنگ جھلکیوں سے مزین مناسب ضخامت اور واجبی قیمت کے ساتھ یہ کتاب عبدالحق اکیڈمی کی طرف سے بلاشبہ ایک تحفہ ہے۔

جرنل

(شمارہ ۷۵ تا ۷۷)

مرتب :- خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ
مبصر :- ڈاکٹر خالد محمود
قیمت :- ۷۵ روپے
ملنے کا پتا :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ہندستان میں آج بھی کچھ ایسے ادارے اور افراد موجود ہیں جو اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہونے دیتے۔ خدا بخش لائبریری اور اس کے سربراہ عابد رضا بیدار انھیں میں سے ایک ہیں۔ بیدار صاحب کی نگرانی میں اس لائبریری نے ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں جو علم و ادب اور تحقیق و تدوین کی دنیا میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

اس وقت میرے پیش نظر اسی خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے مشہور "جرنل" کا ۴۷۶ صفحات پر مشتمل ۷۵ تا ۷۷ واں شمارہ ۱۹۹۲ء ہے۔ ان ۴۷۶ صفحات میں انگریزی کے وہ ۲۲ صفحے شامل نہیں ہیں جو محمد علی جناح، سید احمد شہید اور مخطوطات شناسی جیسے اہم موضوعات کو محیط ہیں۔ جرنل کے حسن ظاہری سے قطع نظر کر کے موضوعات کی فہرست پر نگاہ ڈالی جائے تو وہاں بھی ایک جہان تحقیق کے نشانات ملتے ہیں۔ ذرا یہ عنوانات ملاحظہ کیجیے۔ سکوں پر اشعار، امیر خسرو کے غیر مطبوعہ مقطعات، آزاد بلگرامی فن تعمیر اور کتبہ شناسی داستان امیر حمزہ کا ایک قدیم نسخہ، کشمیری پنڈتوں کی ذاتیں بابری مسجد اور رام جنم بھومی دستاویزات، علم کیمیا کی تاریخ میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام خدا بخش نامہ بنام سر سید اور سفر نامۂ حجاز۔ اس فہرست میں صرف ظاہری تنوع اور رنگا رنگی ہی نہیں تلاش و تحقیق کی عرق ریزی اور دیدہ ور محققین کی دقیقہ سنجی کے بھی جا بجا ثبوت ملتے ہیں۔ اردو سے محبت کرنے والوں کے لیے یہ امر باعث اطمینان ہے کہ یہ ادارہ اپنے وسائل کا بہتر سے بہتر استعمال کر رہا ہے اور اس میدان میں اپنی ساری صلاحیتیں وقف کیے ہوئے ہے۔ دوسری ان گنت مطبوعات کی طرح یہ جرنل بھی اس کی سعی و کاوش کا زندہ ثبوت ہے۔

بند کیے ہیں ان میں راجندر سنگھ بیدی، اختر الایمان، عبدالماجد دریابادی، کیفی اعظمی، خواجہ احمد عباس، جاں نثار اختر، آنند نرائن ملا، نورالحسن ہاشمی، قمر رئیس، گیان چند جین، محمد مجیب، رفیعہ سلطانہ، مسیح الزماں، وحید اختر، ظہیر احمد صدیقی، قاضی عبدالستار، خلیق انجم، مالک رام، سجاد ظہیر، نثار احمد فاروقی، سردار جعفری، محمد حسن، گوپی چند نارنگ، عبدالحق، عابد رضا بیدار، حسن نعیم، احسن علی خاں، مختارالدین احمد، مجروح سلطانپوری اور مشفق خواجہ شامل ہیں۔

ملازمت سے سبک دوشی کے موقع پر عبدالقوی دسنوی نے ایک نئی روایت قائم کی یعنی کارڈ چھپوائے، لوگوں کو مدعو کیا اور خود ہی اپنا FAREWELL منایا۔ اس موقع پر موصوف نے جو تقریر فرمائی وہ "رخصت نامہ" کے عنوان سے اس کتاب میں شامل ہے۔ ان کا یہ کہنا بجا ہے کہ "ادھر گذشتہ کئی برسوں سے ہمارے ملک کی دانش گاہوں کا تعلیمی معیار گرتا جا رہا ہے۔" وہ اس سلسلے میں فکر مند ہیں اور تعلیمی معیار کو بہتر دیکھنے کے خواہاں۔

کتاب میں شامل چند جملے خاص طور سے متوجہ کرتے ہیں مثلاً راجندر سنگھ بیدی کا یہ کہنا "یہ کسی نے صحیح طور پر کہا ہے کہ بھوپال آئے بغیر اردو کا ادیب صیقل نہیں ہوتا" اور وحید اختر کہتے ہیں، "میں شہروں کو عمارات و مقامات سے نہیں جانتا افراد کی نسبت سے جانتا اور جاننا چاہتا ہوں۔" یا پھر پروفیسر نثار احمد فاروقی کا یہ کہنا "یہ بھی ہمارے ملک کی بدنصیبی اور پسماندگی ہے، اساتذہ کو ریٹائر کیا جاتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جب کسی درخت کے پھل پک جائیں تو اسے کاٹ دیا جائے۔"

کتابت و طباعت اعلا درجے کی ہے۔ قیمت مناسب ہے۔ اردو ادب کے باذوق قارئین کے لیے یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

فیضِ رحمت و خُلقِ عظیم

مؤلف :۔ حاجی مرزا النعیم اللہ بیگ رسوا قادری وارثی
مبصر :۔ راجیندر بہادر موج
قیمت :۔ ۳۰/ روپئے
ملنے کا پتا :۔ مرزا النعیم اللہ بیگ رسوا قادری وارثی ۵/ہاتھی خانہ فتح گڑھ

الحاج مرزا النعیم اللہ بیگ نے حمد۔ نعت۔ سلام۔ منقبت اور غزل، ان سبھی اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے ان کے دو شعری مجموعے "آوازِ دل" اور "رموزِ زندگی" شائع ہو چکے ہیں۔

"فیضِ رحمت و خُلقِ عظیم" میں مرزا صاحب نے قدیم اسلامی تواریخ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے مشہور غزوات کا تذکرہ کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام بزورِ شمشیر ہی نہیں پھیلا ہے بلکہ اس کی تبلیغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات رحمۃ للعالمین اور خلقِ عظیم کی مرہون منت ہے۔

کتاب میں ۲۳ ابواب ہیں اور کل ۱۴۲ صفحات ہیں جن میں صفحات الفاتیہ ۱۱۶ ابتدائی پر صفحات ۷ الغایتہ ۱۰۶ میں پیغمبرِ اسلام کی ولادت سے لے کر غزوہ حنین و طائف کے

واقعات تحریر کیے گئے ہیں۔ صفحات ۱۰۷ سے ۱۱۲ میں مولف لمحۂ فکریہ تحریر کر کے عوام کو دعوتِ فکر و نظر دی ہے۔

قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں رحمۃ للعالمین در خلق عظیم وَاِنَّکَ لَعَلیٰ خُلُقٍ عَظِیم فرمایا ہے انھیں دو آیتوں کی کتاب ہذا میں تشریح اور توضیح کی گئی ہے اور یہ نشاندہی کی گئی ہے کہ پیغمبر اسلام نے تمام مذاہب کو اپنی رحمت سے نوازا ہے۔ پیغمبر اسلام کے اوائل عمری سے ہی اعلا اخلاق کی وجہ سے ساکنان مکہ آپ کو صادق اور امین کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ کعبہ شریف کی مرمت کے وقت جس خوبی سے حجر اسود نصب کر کے ایک بڑے فساد کا انسداد کیا وہ تاریخ میں بے نظیر کارنامہ تھا۔ آپ نے ایذائیں بھی برداشت کیں مگر انتقام نہیں لیا۔ مکہ کی ایک مشرکہ جو آپ کے سر مبارک پر کوڑا پھینکا کرتی تھی اس کی عیادت کو تشریف لے گئے یہ فیضِ رحمت اور خلقِ عظیم کا بیش قیمتی نمونہ تھا جس سے متاثر ہو کر اس نے اسلام قبول کر لیا۔

غزوہ حنین اور طائف فتح کرنے کے بعد ۲۴ ہزار اونٹ، ۴۰ ہزار بکریاں اور جملہ مالِ غنیمت واپس کر دیا جس کے نتیجے میں ہزاروں لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔

مکہ کے باشندوں نے جب پیغمبر اسلام اور اُن کے جاں نثاروں پر مظالم ڈھائے تو حضور نے مدینہ منورہ کی ہجرت کا حکم دیا۔ مشرکین نے کسی مسلمان کو سامان تک نہیں لے جانے دیا اور حضورؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ پر بھی برچھی سے وار کیا مگر سب مصائب برداشت کر کے بھی جہاد فی السیف کا حکم نہیں دیا۔

جنگ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فوج میں کل ۳۱۳ اشخاص نے مشرکین کی فوج جس کی تعداد ایک ہزار تھی، پر فتح حاصل کی مگر گرفتار شدہ مشرکین کی مشکیں کھلوا دیں اور کسی سے کوئی انتقام نہیں لیا گیا۔

یہ تھی رحمتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال۔

کتاب ہذا گو بہت مختصر ہے لیکن بہت جامع اور مفید ہے اور غلط فہمیوں کو دور کرتی ہے۔ لمحۂ فکریہ میں کچھ مورخین کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔

"فیضِ رحمت و خلقِ عظیم" کی تالیف کر کے مرزا صاحب نے کارِ ثواب بھی کیا ہے اور ایک ضروری و کارآمد فریضہ ادا کیا ہے۔ چھپائی عمدہ و دیدہ زیب ہے۔ یہ کتاب قابلِ مطالعہ ہے۔

"کتاب نما" کا ستمبر ۹۳ء کا شمارہ موصول ہوا۔ پروفیسر محمد حسنین صاحب کے مراسلے پر آپ کا نوٹ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ حسنین صاحب نے اپنے جلیل القدر ہم عمر کے ساتھ واقعی انصاف نہیں کیا۔ "خود نوشت" مصنف کی اپنی دنیا ہوتی ہے جس میں اظہار بیان کی مکمل آزادی ہوتی ہے۔ پروفیسر سرور نے بڑے تہذیبی رچاؤ کے ساتھ اسے سپرد قلم کیا ہے۔ ہم عصروں جیسے پروفیسر مسعود حسین خاں کے بیانات اور جناب رشید حسن خاں کے اعتراضات کا معروضی انداز سے جائزہ لیا۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری پروفیسر سرور کے محتاط اور بے نیاز قلم سے واقف ہی نہیں۔ صرف ٹوپی اچھالنے ہی سے چوٹ نہیں پہنچائی جاتی۔ نظر انداز کرنا یا کسی کو اس کا قد دکھانا بھی تیکھا انداز ہے۔ خلیق انجم صاحب نے پروفیسر سرور کی انکساری کی واشگاف انداز میں قدر کی ہے جو قابلِ تعریف ہے۔

پروفیسر گیان چند نے "خواب باقی ہیں" پر تفصیل سے لکھا تھا اور ان کے اندازہی کی تکرار بعض تبصروں میں دکھائی دیتی ہے۔ پروفیسر گیان چند نے ایک واقعہ جو بہت اہم ہے اسے مکمل طور پر پیش نہیں کیا۔ انھوں نے ۱۹۴۵ء میں جے پور کے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے جس میں پنڈت نہرو نے ایک نوجوان کو دھکے دے کر نکال دیا تھا۔ اس سے اہم بات یہ تھی کہ پروفیسر سرور نے نہرو کے مہارانہ پرتاپ کی تعریف و بیان کرنے پر ان سے پوچھا تھا کہ اکبر اور مہارانہ میں سے کون بڑا ہے۔ نہرو نے سوچ و فکر کے جواب دیا تھا۔ "اکبر"۔ اب یہ سوال پروفیسر گ صاحب سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ نہرو کی ا رائے کو وہ کہاں تک ٹھیک سمجھتے ہیں؟

پروفیسر سرور نے انارکلی پر تبصرہ کرتے لکھا تھا کہ مکالموں کی دلکشی اس کی خوبی خرابی ہے۔ "خواب باقی ہیں" ایک دانشو خود نوشت ہے جس میں بہت زیادہ روشنی چمک دمک نہیں۔ پہاڑوں اور سنگلاخ چ سے اتر کر یہ شاہ دریا میدانوں سے ٹھہر ٹھ کر گزرتا ہے۔ یہ تھکن نہیں سبک روی سنجیدہ نثر، دھیما دھیما اسلوب اور جگہ جگہ مص کے اشعار سے ایک ایسی فضا تعمیر ہوتی ہے کا اپنا حسن ہے۔ کہیں برنارڈ شا نے اس تعمیری فضا کو تعمیر سے زیادہ اہمیت دی تھ

ایک زمانے میں پروفیسر سرور ہماری ز کے مدیر تھے تو اداریوں سے ان کی سوچ و فکر اردو دنیا منور رہتی تھی۔ اور یہ سلسلہ اب ایک خلا کا احساس ہوتا ہے۔ ا انھوں نے اظہار کے لیے غزل پر خصوصی کی ہے۔ ان کے "سیاست، حیدرآباد شائع غزل کے اشعار تعلی نہیں سے

میں نے جو راہیں نکالیں، شاہراہیں بن گئیں
فکر کی کرنیں دو عالم کی نگاہیں بن گئیں
میں نے بانٹی دولت جذب و جنوں اس شان سے
دھجیاں میری بھی کتنوں کی کلاہیں بن گئیں

پروفیسر سرور اردو کے ایلیٹ ہیں کے بہت سے مضامین مستقل تصانیف کا در

ہیں۔ سفارت کاری گورنری راجیہ سبھا کی ممبری اہم ہیں اس سے کون انکار کرسکتا ہے؟ لیکن ایک ادیب، ایک شاعر، ایک نقاد اور ایک دانشور کی قدر دانی کے پیمانہ کے طور پر یہ صرف پاسنگ کا درجہ رکھتے ہیں۔

اخلاق اثر، صادق منزل، چوکی امام باڑہ، بھوپال۔

● اکتوبر کا "کتاب نما" سامنے ہے۔ کھلے خطوط کے تحت رباعی کے اوزان کے معاملے میں جناب افسر آغا لکھنوی اور جناب فراز بندہ نواز نے مجھے بھی گھسیٹ لیا ہے۔

رباعی کے ۲۴ اوزان نیز شجرۂ اخرب کے سلسلے سے کچھ اور اوزان کے اضافے کا جائزہ بھی لیا تھا میں نے مگر اس کی اشاعت کے بعد پتا چلا کہ یہ کام ڈاکٹر فرمان فتحپوری مدیر "نگار پاکستان" مجھ سے چند سال پہلے ہی کر چکے تھے۔

خوش فہمی اور بات ہے مگر بھارت میں اردو کا مستقبل تابناک نہیں۔ یہ ایک زندہ حقیقت ہے، سیاست ایسے اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتی ہے۔ بھارت کا مسلمان بھی اسے اپنی زبان سمجھتا ہے (جبکہ وہ اسے عرب اور ایران سے لے کر نہیں آیا۔ بار میں اگر یہ یہ کہوں کہ اردو میری زبان ہے میں اہل زبان ہوں۔ میں نے اسے فارسی سے اخذ کیا وہ فارسی جسے غالب نے کئی جگہ کا کابستھوں والی فارسی کہہ کر یاد کیا ہے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔) اقلیت کی اس ضد نے بھی اردو کو نقصان پہنچایا ہے اور پھر جہاں اردو کے اخبارات میں سیکڑوں املے کی اغلاط ہوتی ہوں، مشاعروں میں اردو کا شاعر ہندی رسم الخط میں غزل لکھ کر کے جاتا ہو۔ صحت زبان کا یہ عالم ہو کہ "یقین" کو "یکین" اور "زندگی" کو "جندگی" پڑھا اور بولا جا رہا ہو۔ رات کے قوافی میں "بساط" "آواز" کے قوافی میں "فیاض"۔ "آس" کے قافیے میں "خاص" اور "بھگونا" کے قافیے میں کھلونا استعمال کیا جاتا ہو۔ جذبات کی عکاسی اور ترجمانی کے لیے۔ آزاد نظموں کو فروغ حاصل ہو رہا ہو۔ فن شاعری سے شاعر نابلد ہو۔ وہاں وزن، بحر، رباعی اور عروض میں سر کھپانے سے حاصل بھی کیا؟

قابل تحسین و آفریں ہیں جناب بندہ نواز کہ صرف بائیس سال کی عمر میں (جیسا کہ انھوں نے اپنی عمر کا گراف تحریر فرمایا ہے) عروض جیسے دشوار گزار فن پر اتنی دسترس حاصل کرلی کہ رباعی کے چوبیس اوزان میں بیس اوزان کا مزید اضافہ کر دکھایا۔ اب میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ...

> غزل اپا کی بیٹے نے سنائی کون سن لے گا
> اڑا سکتے ہو لیکن یہ ہوائی کون سن لے گا

خیر۔۔۔۔:

انھیں کالموں میں حضرت ابو محمد سحر نے جناب رفعت سروش کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ میں متفق ہوں سحر صاحب کی بات سے کہ درد کو جمع کی حیثیت میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ رفعت سروش صاحب کو شاید یہ نہیں معلوم کہ الفاظ کی نشست و برخاست ہی زیادہ تر لفظ کے جمع یا واحد ہونے کا فیصلہ کرتی ہے۔ معترض کو اس کا خیال بھی رکھنا چاہیے کہ اعتراض برائے معلومات ہو برائے مضحکہ نہیں۔

"درد" ضروری نہیں کہ درد دل ہی ہو کچھ الفاظ کسی ایک مخصوص حصے میں "دم"

میں وہی الفاظ دوسرے خطے میں "زم" نہیں۔
میری طرف " وجود " کو عضو تناسل کے معنوں میں
بولا جاتا ہے مگر میں دیکھتا ہوں کہ سیکڑوں
وہ شاعر جو میرے خطے سے تعلق نہیں رکھتے
دھڑا دھڑ اپنی غزلوں میں لفظ " وجود " کا
استعمال کر رہے ہیں ۔ اب کوئی شاعر میرے
ضلع کے کسی مشاعرے میں لفظ " وجود " والا
شعر پڑھتا ہے تو سامعین جن میں اردو جاننے
والے سنجیدہ آدمیوں کی تعداد صرف ۱ فیصد ہوگی
اس شاعر کو فقروں پر اٹھا لیں گے ۔ جیسا
کہ رفعت سروش صاحب نے درج ذیل مطلع
کے سلسلے میں کہا ہے ۔

؎ درد حد سے گزر گئے یارو
سب جتن بے اثر ہو گئے یارو

ڈاکٹر صاحب کا دوسرا شعر

؎ بستیاں جل رہی ہیں نفرت میں
پیار کے وہ نگر گئے یارو

دوسرے شعر پر جناب رفعت سروش کا اعتراض
برائے اعتراض بھی نہیں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے
جیسے کھسیانی بلی کھمبا نوچ رہی ہو جبکہ مصرع
اولیٰ نے صاف کر دیا ہے کہ لفظ " وہ " نگر
کے لیے استعمال ہوا ہے کسی فرد کے لیے نہیں۔
رفعت سروش صاحب کے ان بچکانا
اعتراضات پر مجھے تعجب ہے ۔
اس کے بعد میں عرض کروں کہ ڈاکٹر
ابو محمد سحر صاحب کی تازہ غزل جو آپ نے پورے
صفحہ نمبر ۳۱ پر شائع کی ہے ۔ معیاری نہیں
ہے ۔ شاید اس شمارے کے لیے
آپ کو کسی اچھے شاعر کی غزل نہیں ملی ۔
فرماتے ہیں کہ ؎

؎ کالی غزل سنو نہ شہابی غزل سنو
موسم یہ کہہ رہا ہے کہ دھانی غزل سنو

موصوف نے غزل کو بھی کالے گورے
دھانی رنگ عطا فرما دیے ہیں ۔ یہ کالی اور شہابی
غزل سے کیا مراد ہے شعر سے مذکور نہیں
اگر موسم بسنت کا ہے تو دھانی غزل کی حد تک
تو گنجائش ہے یعنی دوسرا مصرع صحیح کہا جا سکتا
ہے مگر یہاں موسم کے بسنتی ہونے کا ان
کے دائرے میں شائبہ تک نہیں ہوتا کالی
اور شہابی غزل سے ڈاکٹر موصوف قبلہ کیا بتا
کے موڈ میں ہیں واللہ عالم بالثواب . . . .
دوسرا شعر ؎

جاگا وہ درد دل میں کہ آنسو نکل پڑے
برسا ہے آج ٹوٹ کے پانی غزل سنو

لفظ پانی کے بعد شعر کا مفہوم پورا ہو جاتا ہے
اور ردیف " غزل سنو " قرار یعنی حشو و زوائد
کی نذر ہو گئی ہے اگلا شعر ؎

افسانۂ جنوں نہیں پابند ماہ و سال
یاد آ رہا ہے دورِ جوانی غزل سنو

یہاں بھی ردیف "غزل سنو" حشو قبیح ہے۔
اگلا شعر ؎

اپنی تمام عقل پرستی کے باوجود
یہ زندگی ہے اب بھی دوانی غزل سنو

یہاں ردیف تو فرار ہو گئی تھی ڈاکٹر صاحب
نے ایک متروک لفظ " دوانہ " یعنی پاگل کو
بھی استعمال کر ڈالا ۔

اگلا شعر ؎ یوں تو سخن کے اور بھی پیرایے ہیں مگر
کہنی ہے ہم کو دل کی کہانی غزل سنو

یہ تو اور بھی الجھ گیا کہانی سنائی ہے ٹھیک
کہنی ہے غیر مناسب ۔ پھر سنانی ہے کہانی اور
سنانے چلے ہیں غزل میں نے آج تک کسی غزل میں

کہانی نہیں دیکھی غزل فسانۂ عجائب یا نثری دیا
شنکر نسیم تو نہیں ۔ اگر سحر صاحب کا مقصد
یہ نہیں ہے تو ردیف یہاں بھی بیکار گئی۔
چھٹا شعر ۔ ہوں زخم عشق پاکر زمانے کے درد و داغ
ہر غم یہاں ہے دشمنِ جاں غزل سنو
اولیٰ میں لفظ کہ حشو ہے اور دشمن میں اضافت
کا کوئی فنی جواز نہیں ردیف یہاں بھی نہیں
نباہی گئی۔
ساتواں شعر ۔
خونِ جگر میں فکر کی گہرائیاں بھی ہیں
گر ہے مزاجِ فلسفہ دانی غزل سنو
(الف) مزاج فلسفہ دان " ہونا چاہیے
مزاج میں اضافت کے بعد داں میں یائے
اضافی غلط ہے کیوں کہ دانی اصل نہیں
اصل داں ہے مزاج " ترقی " تو ٹھیک ہے
کہ لفظ ترقی اصل / سالم ہے مزاجِ فلسفہ داں
سے بخوبی کام چل رہا ہے ۔
(ب) فکر کی گہرائیاں خونِ جگر میں ہیں (حالانکہ
یہ ممکن نہیں فکر کی گہرائیوں میں خونِ جگر کا
شامل ہونا ممکن ہے ۔
(س) لفظ گر متروک ہے موصوف نے
متروکات کے معاملے میں اُن تمام شعرائے کرام
کی محنتوں پر پانی پھیر دیا ہے جنھوں نے زبانِ
اردو سہل و سلیس اور خوبصورت بنانے میں اپنا
خون پسینہ ایک کیا تھا ان میں مولانا حسرت
موہانی بھی ایک ہیں جن کی قبر پر سحر صاحب
نے خطبۂ نافرمانی پڑھ دیا ہے ۔ ڈاکٹر صاحب
کبھو ۔ تئیں ۔ کسو ۔ وسے بھی استعمال
کیوں نہیں کرتے ۔
اور ملاحظہ فرمائیں ۔

سر پہ ہوائے سنگِ ملامت چلی بہت
لیکن غزل نے ہار نہ مانی غزل سنو
یہ شعر صاحب بھی ہے اور اچھا بھی مگر مقطع ہے
زیبِ شفق ہے نوعِ بشر کا لہو سحر
ہر شے ہے اس جہان کی فانی غزل سنو
ردیف تو بیکار چلی ہی گئی ہے اُس پر مصرع
اولیٰ میں کیا گیا دعوا بھی بے دلیل ہے جہان
کا اعلانِ نون یہاں جائز تو ہے مگر کھل رہا
ہے ۔
گوندر شنک ۔ میٹھا کنواں ۔ رامپور ۔ یو۔ پی۔

● جناب شیخ سلیم احمد نے اپنے اشاریہ میں
لکھا ہے کہ " موجودہ تبدیلیوں کے پیش ماضی
پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے " یہ درست ہے ۔
لیکن اُن کا گرباچوف کے بارے میں نظریہ
ہمارے گلے سے کسی طرح نہیں اُترتا ۔ انھوں
نے گرباچوف کی تعریف کے پُل باندھے ہیں ۔
اور اُس کی تقریروں کے حوالے بھی دیے
ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں " گرباچوف اشتراکی نظام
اور نئی ترقی پسندی کا مسیحا ہے اس نے اشتراکی
سماج کو گھٹن سے نکالا ۔ اور اسے نئی زندگی
دی ۔ اس کی اصلاحات ادب کے لیے
نعمت ثابت ہوں گی اس نے اشتراکیت کی
روح کو زندہ کیا " لیکن اصلیت اس کے بالکل
برعکس ہے ۔ ان بیانات سے بعد کے حالات
نے یہ ثابت کر دیا ہے ۔ کہ گرباچوف کے یہ
بیانات مکاری ۔ بد دیانتی ۔ ریاکاری اور
جھوٹ پر مبنی تھے ۔
گرباچوف ایک نہایت چالاک ۔ مکار
Calculative ایجنٹ ہے سرمایہ
داری کا ۔ جو دنیا کے سب سے پہلے اور عظیم
سوشلسٹ ملک سوویٹ یونین کی تباہی بربادی

کا ذمے دار ہے۔ جناب سلیم احمد نے گرباچوف
کے ۱۹۸۹ء یا اُس سے پہلے کے بیانات
misquote کیے ہیں لیکن ۱۹۸۹ء اور ۹۲-
۱۹۹۲ء کے گرباچوف میں فرق اُبھر کر سامنے
آگیا ہے۔ اکتوبر انقلاب کی سترھویں سالگرہ
پر پارٹی پالیسی بیان کرتے ہوئے انھوں نے
بلند بانگ لہجے میں مارکسزم اور لیننزم پر مکمل
اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ اور عوام کو یقین
دلایا تھا کہ سوشلزم تو سوویٹ یونین کا
مقدر ہے۔ ۱۹۸۹ء تک وہ اسی موقف پر
ڈٹے رہے۔ اس پورے عرصے میں انھوں
نے مارشل سٹالن کے خلاف بھی کوئی رائے
ظاہر نہیں کی۔ البتہ ۱۹۸۹ء میں پہلی بار کھل
کر تھوڑی بہت تنقید ضرور کی۔ مگر اس
پر عوام کے فوری ردِ عمل کے بعد محتاط ہوگئے۔
دوسری طرف درپردہ انہی سالوں میں مغربی
ممالک کے حکمرانوں۔ وہاں کے مالیاتی اداروں
اور خفیہ تنظیموں سے ان کے روابط بڑھتے
گئے۔ اور انھوں نے سوویٹ یونین میں
رائج نظام کو منہدم کرنے کی جو اسکیم وضع کی
تھی۔ گورباچوف اور اُن کے معاونین اس کے
لیے زمین صاف کرتے رہے۔ اور ۱۹۹۱ء
میں اُن کے ہاتھوں ڈرامے کا ڈراپ سین
ہوگیا۔ اس کے بعد وہ امریکہ چلے گئے جہاں
انھوں نے ذرائع ابلاغ کے ذریعے سوشلزم
اور سٹالن کے خلاف اسی نفرت کا اظہار کیا
جو ۱۹۸۵ء سے اُن کے دماغ میں سُلگ رہی
تھی۔ انھوں نے مغرب کے اپنے رفقا کو یہ
یقین دلایا کہ وہ سوشلزم کے خلاف ۱۹۸۵ء
سے ہی سرگرم عمل تھے۔ "مگر جو نام نہاد" عوام کی
اکثریت۔ دانشور۔ حکام بالا" پارٹی کا سخت
گیر دھڑا۔ فوج اور کے جی بی والے مارکسزم
لیننزم کا اس طرح دم بھرتے تھے کہ منظرِ عام
پر کوئی کہنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔
اس لیے میں محتاط رہا اور معقول موقع کی تلاش
میں رہا۔ اور اب وہ اپنے مشن کے دوسرے مرحلے
پر کام کر رہے ہیں۔ یعنی مغربی ذرائع ابلاغ کے
ذریعے ساری دُنیا کے دانشوروں کو جدید سرمایہ
دارانہ جمہوری و اقتصادی نظام کی خوبیوں کے
بارے میں اُپدیش دے رہے ہیں۔ انھوں
نے مارکس پر تنقید کا بھی ایک منصوبہ شروع
کیا ہے۔ وہ مارکسزم کی بقول اُن کے "ناکامی"
کا ذمے دار بھی مارکس کو ہی ٹھہراتے ہیں۔

سوویٹ یونین کی تباہی میں نہ عوام شریک
تھے اور نہ اساتذہ و دانشوروں کی اکثریت
یہ تو ایک بہت بڑی اور طویل عالمی سازش تھی
جس کی ابتدائی خروشچیف کے ہاتھوں ہوئی اور
اختتام کا فرض گرباچوف نے ادا کیا۔ سوویٹ
یونین کے اندر مصنوعی ذرائع کی مدد سے ایک
بڑے منصوبے کے تحت اقتصادی بحران پیدا
کیا گیا۔ تاکہ عوام کو سرمایہ دارانہ سسٹم اور
مارکیٹ اکنامی کی خوبیوں کا سبز باغ دکھایا جا
سکے۔ اجتماعی ملکیت کے اداروں کو تباہ کر کے
یہ پروپیگنڈہ شروع کیا گیا کہ نجات انفرادی
ملکیت کے نظام میں ہے۔ خرید و فروخت کی
اس سودے بازی میں اساتذہ۔ دانشوروں
اور نظریہ سازوں کے حکومت نواز گروہ نے
عوام کو یہ بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ
یہی وہ سوشلسٹ اقتصادیات تھی جس نے
ترقی اور سماجی اصلاح کے ابتدائی دور میں ہی
وہ جنگ عظیم جیت لی تھی جس کے خوف سے مغرب
کی نیند حرام ہو چکی تھی۔ سوویٹ عوام نے انسانیت

مکمل ہلاکت سے بچانے کے لیے اپنی جانوں
قربانی اتنی بڑی تعداد میں پیش کی جس کی
مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔ اس
وقت سرمایہ دارانہ نظام اپنی عظیم طاقت اور
...وں کے باوجود ریت کی دیوار بن کر رہ گیا
تھا۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ سٹالن کی
قیادت میں سوویٹ نظامِ تعلیم۔ نظامِ صحت
اور اجتماعی آبادکاری کے منصوبے ساری دُنیا
کو حیرت زدہ کر گئے۔ جنگِ عظیم کی بے پناہ
تباہی و بربادی کے باوجود سوویٹ یونین
ایک بچھڑے ہوئے پس ماندہ غریب ملک
سے دنیا کی ایک زبردست طاقت بن گیا۔
اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی کئی ایجادات میں
امریکہ کو بھی بہت پیچھے چھوڑ گیا۔ یہ کیسے
ممکن ہوا؟

ہوسکتا ہے سٹالن کے عہد میں
کچھ غلطیاں بھی ہوئی ہوں۔ انسان خطا کا
پتلا ہے اور تجربہ سے سیکھتا بھی ہے۔ رموزِ
مملکت اور ریاستی انتظامات کے ضمن میں بنی نوع
انسان کی یہ فطری۔ جائز اور قدیم خواہش رہی
ہے کہ کارکردگی بالکل بے داغ ہو اور
اگر کسی چکی میں جو پستا ہو تو صرف جو ہی پسیں
ساتھ میں گھن کی پسائی نہ ہو جائے۔ مگر انقلاباتِ
عالم کی ساری تاریخ کھنگال ڈالنے کے
باوجود ابھی تک کسی ایسی چکی کا پتا نہیں چل
سکا ہے جس میں جو کے ساتھ گھن نہ پس
گیا ہو۔ عظیم سوویٹ یونین کی ترقی اور تعمیر
میں کہیں کہیں جو کے ساتھ گھن بھی ضرور
پس گیا ہوگا۔ لیکن دونوں نظاموں یعنی سرمایہ
داری اور اشتراکیت کے درمیان مقابلے کی اصلی
کسوٹی یہ ہونا چاہیے۔ کہ معروضی طور پر موجودہ
حالات میں زیادہ سے زیادہ انسانوں کی زیادہ
سے زیادہ ضروریاتِ زندگی کی اضافی لحاظ سے
مناسب تکمیل ہو نیز انفرادی اور اجتماعی سطح پر انسانی
اقداری لحاظ سے استحصالی پہلوؤں کا کم سے کم
دخل رہے۔ اس کے علاوہ کوئی کسوٹی
سراسر زیادتی، مکمل بدمعاشی اور بڑی منافقت
ہے۔

ترقی پسندی کی نظرِ ثانی کے سلسلے میں
گرباچوف کو مسیحا ماننے کے بجائے اسی پرانے
مادہ فارمولے کی طرف لوٹنا پڑے گا۔ جس
کے بارے میں ہاورڈ فاسٹ نے آج سے پچاس
سال پہلے اپنے مضمون LITERATURE
& REALITY میں لکھا تھا۔
(اچھا ادیب بننے کے لیے کمیونسٹ ہونا
ضروری نہیں۔ لیکن بنی نوع انسان سے پیار
کرنا ضروری ہے)

To be a good writer it is not necessary to be communist but it is necessary to love mankind

بس یہی ایک ایسڈ ٹیسٹ (Acid Test) ہے۔
ترقی پسند ادب وہی ہے۔ جو بنی نوع انسان کی
بہبودی اور ترقی میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔
اور پچھڑے کچلے ہوئے طبقے کو بیدار کرنے
اور اوپر اٹھانے میں مدد کرتا ہے۔

رام پرکاش کپور۔ پدم ناتھ پور۔ درگ، ایم پی۔

● ماہنامہ "کتاب نما" کی سب سے بڑی خوبی
یہ ہے کہ اس میں ہر مکتبِ فکر کے لوگوں کو اپنی
بات کہنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ لیکن اس
آزادی کا کبھی کبھار ناجائز فائدہ بھی اٹھایا
جانے لگا ہے۔ لکھنے والے کے لیے یہ ضروری
ہے کہ وہ لکھتے وقت احتیاط برتے۔ مضمون

کے عنوان کا خیال رکھے - اب دیکھیے نا! ڈاکٹر توقیر احمد ایک مضمون لکھ بیٹھے - مضمون کے معیار کے تعلق سے کچھ عرض نہیں کروں گا - یہ مضمون شمس الرحمٰن صاحب فاروقی ڈاکٹر نارنگ، ڈاکٹر محمد حسن کے لیے لاکھ مفید نہ سہی لیکن عام قارئین و طلبہ و طالبات کے لیے غیر مفید بھی نہیں - ہاں! ڈاکٹر صاحب نے کچھ "وہ" بھی تحریر فرما دیا جس کا اظہات نہ فرماتے تو بھی مضمون کی افادیت میں فرق نہ پڑتا - اگست ۹۲ء کا شمارہ صفحہ نمبر ۱۵ پر مرحوم خلیل الرحمٰن اعظمی کی بُت شکنی، بے باکی اور نہ جانے کن کن باتوں کا اعتراف کرنے کے بعد لکھتے ہیں ....

آخری ایام میں سیدھے سچے مسلمان کی زندگی گزاری - اس دور میں اپنی تنقید و تخلیق میں اسلامی اقدار حیات کی ترویج و تبلیغ کرنے لگے تھے" اگر مضمون نگار کی نظر میں مرحوم اعظمی صاحب کی یہ تخلیقات کا تعلق اردو ادب سے نہیں ہے تو مضمون میں اس کا تذکرہ کس لیے ضروری سمجھا گیا؟ عام تاثر تو یہی قائم کیا جا سکتا ہے کہ ان کا ادبی وقار گھٹ گیا -

اسی طرح ظ - انصاری کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ "آخری ایام میں ان کے اس اعلان نے ساری دنیا کو چونکا دیا کہ انھوں نے جو کچھ اشتراکیت و اشتمالیت کے زیر اثر لکھا ہے اسے کالعدم قرار دیا جائے - اور چند دنوں بعد ایک مذہبی شخص کی حیثیت سے انتقال کیا" دوسرے الفاظ میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ مرحوم ظ - انصاری کی ادبی حیثیت ختم ہو گئی - کیا ایسا کہنا ظ - انصاری کے ساتھ ظلم کے مترادف نہ ہوگا؟

آخر میں آپ سے درخواست ہے کہ "کتاب نما" میں شائع ہونے والے چند مضامین کے عنوان کے نیچے قوس میں اس قسم کا اشارہ لکھ دیا جائے - مثلاً (صرف طلبہ و طالبات کے لیے) - تو ڈاکٹر توقیر احمد خاں کے مضمون کے لیے یہ اشارہ مناسب ہے - شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے مضامین کے لیے آپ کچھ اس طرح لکھ سکتے ہیں - (ڈاکٹر نارنگ، ڈاکٹر محمد حسن - ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کے لیے)

اسی طرح ڈاکٹر نارنگ کے مضمون کے ساتھ اسی قسم کی فہرست مناسب ہوگی - جس مضمون کے ساتھ آپ کا جملہ تحریر نہ ہوگا وہ ہم عام قارئین کے لیے سمجھا جائے گا نہ کسی کو شکایت ہوگی نہ بات آگے بڑھے گی -

آپ کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے - آج اس کا اظہار یہاں غیر ضروری ہوگا - خدا کرے آپ خیریت سے ہوں -

محمد یعقوب الرحمٰن - ایوت محل -

صبا اکبر آبادی کی یاد میں مذاکرہ

اردو کے مشہور و معروف پاکستانی شاعر صبا اکبر آبادی کی دوسری برسی پر ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو پاکستان کی مختلف ادبی انجمنوں کے اشتراک سے ایک نہایت کامیاب محفلِ مذاکرہ منعقد ہوئی۔ مذاکرے کی صدارت جامعۂ کراچی کے سابق وائس چانسلر جناب ڈاکٹر منظور احمد نے فرمائی۔ پروفیسر حسن عسکری فاطمی نے کہا کہ صبا صاحب کے ادبی کارنامے اتنے کثیر الجہات ہیں کہ ان پر پاکستان کی مختلف یونی ورسٹیوں میں تحقیقی کام ہونا چاہیے۔ پروفیسر شاہدہ حسن نے "صبا اکبر آبادی اور جدید مرثیہ" کے عنوان سے مقالہ پڑھا جس میں کہا گیا کہ صبا صاحب نے ۷۵ سے زیادہ طویل مرثیے کہے ہیں جو جدید شعری رجحانات کے عکاس ہونے کے ساتھ یہ احساس بھی دلاتے ہیں کہ صبا صاحب کے مرثیوں سے غزل کی زبان کے امکانات روشن تر ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر فہیم اعظمی مدیر "صریر" نے صبا صاحب کے تراجم اور غزل گوئی کا ساختیاتی تجزیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ صبا اکبر آبادی اُن شاعروں میں سے ہیں جو مختلف اصنافِ سخن کو کامیابی سے برتنے کا فن جانتے ہیں۔ افسر ماہ پوری کے مقالے کا عنوان تھا۔ "غزل میں تاج محل کے معمار۔ صبا" افسر ماہ پوری نے کہا کہ صبا صاحب نے اپنی غزلوں میں حیات و کائنات حسن و عشق، جذبات و روایات، مشاہدات و تجربات کا کوئی ایسا گوشہ نہیں چھوڑا جو مکمل تغزل، تفکر اور تنوع کے ساتھ جلوہ گر نہ ہوا ہو۔ جناب افتخار احمد عدنی نے کہا صبا صاحب کا فن قیدِ زمانی سے ماورا ہے وہ کل کے بھی شاعر ہیں آج کے بھی اور مستقبل کے بھی انھوں نے مکمل دیوان غالب کی تضمین کی اور غالب، خیام اور خسرو کی فارسی رباعیات کو اردو رباعی میں منتقل کرکے ترجمے کو تخلیق کا درجہ عطا کر دیا ہے"۔ آخر میں صدرِ محفل ڈاکٹر منظور الدین احمد نے اپنا مقالہ عطا فرمایا جس میں کہا گیا کہ صبا صاحب کی شاعری کا ایک بڑا کمال یہ ہے کہ روایت کی پاسداری اور عصرِ حاضر کے احساس نے مل کر ایک نئے ذائقے اور نئی کیفیت کو جنم دیا ہے۔ ان کی غزل کا دامن بہت وسیع ہے۔ شاعری کیوں کہ تہذیبوں کی تہذیب ہوتی ہے اس لیے صبا صاحب کی شاعری میں خواہ وہ غزل ہو، مرثیہ ہو، رباعی ہو، نظم ہو یا ترجمہ تہذیب کی صورت گری مکمل انداز میں نظر آتی ہے۔ مذکورہ مقالات کے علاوہ پروفیسر افتخار اجمل شاہین، جناب مسلم شمیم جناب اختر لکھنوی اور پروفیسر نصیر الدین نے صبا اکبر آبادی کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔

(سید جاوید رضا۔ کراچی)

اس گھر کو آگ لگ گئی کی تقریب رونمائی

نئی دہلی ۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیرِ اہتمام جناب سلیم قریشی اور جناب سیّد عاشور کاظمی کی ایک اہم کتاب ”اس گھر کو آگ لگ گئی“ کی تقریب رونمائی اردو گھر کے مولوی عبدالحق آڈیٹوریم میں ۲۹ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو زیر صدارت پروفیسر جگن ناتھ آزاد منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے تعارفی کلمات میں کہا کہ

آج ہمارے لیے مسرت کا مقام ہے کہ ایک ایسی اہم اور تاریخی کتاب کی رسم اجرا ہو رہی ہے جو پہلی باقاعدہ جنگِ آزادی یعنی ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے سلسلے میں اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں انگریز افسروں کے نام ملک دشمن ہندستانی جاسوسوں اور غداروں کے خطوط اور کتابوں کے اقتباسات ہیں۔ جنھوں نے دولت اور جاہ و منصب کی

اسٹیج کا ایک منظر

تصویر میں (بائیں سے دائیں) پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، جناب سیّد مظفر حسین برنی، جناب عاشور کاظمی، جناب ایم حبیب خاں اور محترمہ شبانہ انجم (مائک پر) کو دیکھا جا سکتا ہے۔

لالچ میں وطن کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا اور جو اب تک ہماری نظروں سے اوجھل تھے۔

محترمہ شبانہ انجم نے اپنے مقالے میں کہا کہ اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں عاشور بھائی کے ساتھ میں نے بھی کام کیا ہے اس لیے میں کتاب کی تمام باریکیوں سے باخبر ہوں۔ محترمہ نے کتاب کی اشاعت کے تمام مراحل یعنی مخطوطات کی فراہمی، تحقیق و تراجم وغیرہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ عاشور بھائی کی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی

حوالے کو اس وقت تک نان و نفقہ کا ذریعہ نہیں بناتے جب تک وہ خود نہیں دیکھ لیں ۔ شبانہ انجم نے کہا کہ اس کتاب میں ،، گھر کے چراغ سے ،، کے عنوان سے عاشور بھائی نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کی غیر معمولی محنت اور صلاحیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ شبانہ انجم صاحبہ کے مقالے کے بعد سابق گورنر ہریانہ جناب سید مظفر حسین برنی نے ،، اس گھر کو آگ لگ گئی ،، کی رسم رونمائی انجام دی ۔

پروفیسر قمر رئیس نے عاشور کاظمی صاحب سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ عاشور کاظمی صاحب کا یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کے پیچھے ان کی غیر معمولی محنت اور دلچسپی کار فرما رہی ہے ۔ عاشور صاحب کی یہ خصوصیت ہے کہ جس موضوع سے ان کی وابستگی ہو جاتی ہے ، جنون کی حد تک اس سے لگاؤ رکھتے ہیں ۔ قمر رئیس صاحب نے کہا کہ عاشور صاحب بنیادی طور پر شاعر ہیں اور کچھ دن پہلے تک ایک شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے لیکن ان کے اندر ایک اچھا افسانہ نگار ، انشا پرداز اور محقق بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے ، اس کا ثبوت ان کی یہ کتاب ہے جس میں تحقیق بھی ہے ، نثر نگاری اور انشا پردازی بھی ہے ۔ عاشور صاحب کی ایک دوسری کتاب ،، افسانہ کہیں جسے ،، کا ذکر کرتے ہوئے قمر رئیس صاحب نے کہا کہ ۸۰ صفحات کے مقدمے میں انھوں نے فکشن اور افسانہ کی تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے ۔ پروفیسر قمر رئیس نے مزید کہا کہ عاشور صاحب بہت وسیع النظر اور کھلے ذہن کے حامل شخص ہیں اور یہی ان کا ایسا روشن پہلو ہے جس سے یہ جانے اور پہچانے جاتے ہیں ۔

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ میں جب سید عاشور کاظمی صاحب کی کتابوں اور تحریروں پر غور کرتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مغرب میں مقیم لوگوں میں اب خود اعتمادی آگئی ہے ۔ اس کا اظہار ان کی وہ خدمات ہیں جو اردو میں حاصل ہو رہی ہیں ۔ قدوائی صاحب نے کہا کہ اس کتاب کو بہت احتیاط سے پڑھنے کی ضرورت ہے تاکہ اس کے پورے مواد کو دوسرے ڈیکومینٹس سے تقابلی مطالعہ کر کے صحیح نتیجہ اخذ کیا جا سکے ۔ قدوائی صاحب نے مزید کہا کہ عاشور صاحب کا یہ بہت اہم کارنامہ ہے کہ انھوں نے ایک خاص موضوع پر مواد جمع کر کے کام کیا ہے ۔ یہ ہمارے قومی شعور کی بیداری کی علامت ہے اور ایک مبارک قدم ہے ۔

پروفیسر عبدالمغنی نے کہا کہ دیارِ مغرب میں جن مشاہیر نے اردو زبان و ادب کی غیر معمولی خدمت کی ہے اور جن کا ڈنکا دیارِ مشرق میں بھی ہوتا رہا ہے انہی میں ایک عظیم شخصیت سید عاشور کاظمی کا نام نامی بھی ہے ۔ عبدالمغنی صاحب نے کہا ، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو غدر کا

نام دیا گیا اور سرسید نے اسے بغاوت کہا۔ اور تمام ہندستانیوں کی طرف سے بغاوت ہند کے اسباب لکھ گئے اور اس بغاوت کا ذمہ دار انگریزوں کو بتایا لیکن اس بغاوت کے راز اور اس کی ایک گمشدہ کڑی فراہم کرکے عاشور صاحب نے اس کام کو آگے بڑھایا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ایک ایسی دستاویز ہے جس سے بہت سے حقائق سامنے آتے ہیں مؤرخین اس کتاب کا اعتراف ضرور کریں گے۔

جناب خلیل الرحمٰن (قطر) نے کہا کہ سید عاشور کاظمی صاحب نے جس موضوع پر یہ کتاب لکھی ہے۔ یہ ایک بہت حساس اور سنجیدہ موضوع ہے جس کا مطالعہ ہر پڑھے لکھے شخص کے لیے ضروری ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ سید عاشور کاظمی صاحب مختلف الجہات شخصیت کے مالک ہیں۔ یہ کارنامہ جو انھوں نے انجام دیا ہے ہندستان اور پاکستان میں نہیں ہو سکتا بلکہ لندن میں ہی ہو سکتا ہے جہاں تمام ڈیکومینٹس حاصل ہو سکتے ہیں۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ جناب سلیم قریشی اور جناب سید عاشور کاظمی نے مل کر بعض ایسے دستاویزی حقائق پیش کیے ہیں جو ابھی تک ہماری نظروں سے پوشیدہ تھے۔ نارنگ صاحب نے کہا کہ اس کتاب میں بہت سے دستاویزات جمع ہو گئے ہیں جن پر آئندہ تاریخ کا مؤرخ کام کرے گا۔ اس میں ادبی مؤرخ کے لیے بھی بہت کچھ مواد مل جائے گا۔ جناب سید عاشور کاظمی نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں امام حسین علیہ السلام کی ذات گرامی سے بہت متاثر ہوں وہ میرے آج بھی آئیڈیل ہیں۔ اس لیے کہ ظلم کے خلاف انھوں نے سر نہیں جھکایا۔ عاشور صاحب نے خطوط کی فراہمی، تحقیق، تراجم، تلاش اور ترتیب و تدوین کے سلسلے میں کچھ وضاحتیں کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اور سلیم قریشی بھائی نے مل کر یہ کام انجام کیا ہے جو ایک ابتدا ہے۔ اس کتاب میں بہت سے ایسے سوالات اٹھائے گئے ہیں جن پر کام کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ عاشور صاحب نے مزید کہا کہ آپ لوگوں نے جس حوصلہ افزائی کا اظہار کیا میں اس کا بہت شکرگزار ہوں۔

اس تقریب کے مہمانِ خصوصی جناب سید مظفر حسین برنی نے کہا کہ تاریخ آزادی پر بہت کچھ کام ہوا ہے لیکن یہ مواد بھی بہت کارآمد ہے۔ عاشور صاحب جو بھی کام کرتے ہیں بہت تندہی اور جانفشانی سے کرتے ہیں۔

پروفیسر آفاق احمد اردو اکیڈمی کے سکریٹری

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے سکریٹری کے عہدے پر ممتاز افسانہ نگار اور ناقد پروفیسر آفاق احمد (بھوپال) کا تقرر عمل میں آیا ہے۔ آپ کل ہند علامہ اقبال ادبی مرکز کے سکریٹری کی حیثیت سے بھی کام کریں گے۔ مدھیہ پردیش سرکار نے اردو اکادمی کی نئی باڈی بھی تشکیل دی ہے۔ اس میں جناب وکیل بھوپالی، جناب اختر سعید خاں، پروفیسر فضل تابش، ڈاکٹر بشیر بدر، رشا جہاں غنی صاحبہ، پرنسپل (سب بھوپال کے) علاوہ پروفیسر اختر نظمی (گوالیار) پرنسپل برہم شرلواستو مظہر (جبلپور) جناب صفدر رضا (کھنڈوا) جناب مقبول احمد مقبول (رتنا) شامل ہیں۔

پروفیسر آفاق احمد نے جو کہ صوبائی انجمن
ترقی اردو اور صوبائی جن وادی لیکھک سنگھ
کے بھی صدر ہیں۔ اپنے عہدے کا چارج
لے لیا ہے۔

خالد اگاسکر کو مہاراشٹر اردو اکاڈمی کا ایوارڈ

جناب خالد اگاسکر کو ان کی کتاب
"کتھا" پر مہاراشٹر اردو اکادمی نے انعام دینے
کا اعلان کیا ہے۔ اس سے قبل اسی کتاب پر
ساہتیہ اکادمی دہلی نے دس ہزار روپے کا انعام
اور نیشنل سرٹیفکٹ سے نوازا تھا۔
"کتھا" مراٹھی کے نامور اور مقبول ادیبوں
کی کہانیوں اور افسانوں کا ترجمہ ہے جس میں
انھوں نے آٹھویں دہائی کی مراٹھی کہانیوں
کو اردو میں پیش کیا ہے۔ خالد اگاسکر کو
مہاراشٹر اردو اکادمی نے بھی انعام دیا ہے۔

نمائش جامعہ "ایک سفر منزل بہ منزل"

یوم تاسیس کے موقع پر اس سال
ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری میں ایک نمائش
جامعہ "ایک سفر منزل بہ منزل" مرتب کی گئی۔
نمائش کا افتتاح امیر جامعہ جناب سید مظفر
حسین برنی صاحب نے مورخہ ۲ نومبر ۹۲ء کو
جامعہ کے اراکین قدیم طلبہ اور حیاتی اراکین نیز
دوسرے مدعو مہمانوں کی موجودگی میں کیا۔
منتظمین کتب خانہ نے اس نمائش
کے ذریعے جامعہ کی تاریخ اور اس کی علمی
سماجی و سیاسی خدمات کا تعارف نقشوں
چارٹ اور پینٹنگ کی مدد سے کیا ہے تصاویر
کے حصے میں مختلف گروپ فوٹو کے ذریعے
جامعہ کی زندگی کے مختلف ادوار کو اس ترتیب
سے پیش کیا گیا ہے کہ جامعہ کی ترقی منزل بہ منزل
نظروں میں پھر جاتی ہے۔
جگہ جگہ ڈاکٹر انصاری ڈاکٹر ذاکر حسین اور
پروفیسر محمد مجیب کے اقوال سے نمائش کو مزید
پُر معنی بنایا گیا ہے۔ جامعہ نہ صرف ایک تعلیمی
ادارہ بلکہ ایک جاندار اور مثبت تحریک کی شکل
میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔
نمائش کے دوسرے حصے میں جامعہ کے
قدیم طلبہ، کارکن اور آج کے اساتذہ اور
دوسرے کارکنوں کی علمی تخلیقات کو سلیقے سے
ترتیب دیا گیا ہے تعجب ہوتا ہے کہ جامعہ
کا علمی کام تنوع اور گہرائی دونوں اعتبار
سے اتنا وقیع ہے۔ تقریباً پانچ سو کتابیں
علم کے جملہ شاخوں سے متعلق اردو ہندی انگریزی
عربی جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں نمائش میں
موجود ہیں۔ شعبہ فائن آرٹ اور ایجوکیشن کے
اساتذہ کی بنائی ہوئی پینٹنگ اور مجسموں نے نمائش
کو ایک اچھوتا حسن عطا کیا ہے۔

علی گڑھ پوسٹ آفس پر چھاپہ
برسوں پرانی ڈاک برآمد

علی گڑھ۔ ۵ر نومبر۔
مقامی ہیڈ پوسٹ آفس میں افسران کی ایک ٹیم نے
اچانک چھاپہ مارا۔ کارروائی کے دوران بے
شمار بدعنوانیاں اور برسوں پرانی ڈاک بر
آمد ہوئی
بتایا جاتا ہے کہ افسران سب سے پہلے منی آرڈر
کے کیبن میں گئے جہاں چھ ماہ پرانے منی آرڈر
برآمد ہوتے اور ڈھیروں ایسے منی آرڈر
برآمد کیے گئے جو کٹے پھٹے تھے اس سیکشن

میں زبردست گول مال کا امکان ہے افسران کو شک ہے کہ بڑے پیمانے پر غبن کیا گیا ہے معاملے کی جانچ جاری ہے۔

چھاپہ مار ٹیم نے ایسی ڈاک بھی برآمد کی جو برسوں پرانی تھی اور اس کو تقسیم نہیں کیا گیا تھا اس ڈاک کو دیکھ کر افسران سکتے میں پڑ گئے جانچ کرنے پر پتا چلا کہ بڑی تعداد میں ڈاک آنے سے ملازمین ان کو چھانٹ نہیں پاتے اور ایک طرف جمع کرتے رہتے ہیں۔ (قومی آواز۔ ۶ر نومبر ۹۳ء)

ہریانہ اردو اکادمی کی نئی اشاعت "بچوں کا گلدستہ"

آج کے تقاضوں کے پیشِ نظر اردو میں بچوں کے لیے ان کی دلچسپی کی کتابیں سامنے نہیں آ رہی ہیں چنانچہ یہ کتابچہ اسی کمی کو دیکھتے ہوتے شائع کیا گیا ہے۔ اس کے مصنف ڈاکٹر بیتاب علی پوری ہیں کتابچہ میں ابتدائی نظمیں دعائیہ سے متعلق ہیں دوسرے حصّے میں حب الوطنی تیسرے حصّے میں بچوں کی کردار سازی اور چوتھے حصّے میں پرندوں اور جانوروں کی منظوم کہانیاں ہیں۔ پورا ہی گلدستہ باتصویر ہے جس کی قیمت اکادمی صرف بارہ روپے رکھی ہے۔

ایلیٹس کالج عالمی اردو کانفرنس کراچی

[اس موقعے پر جناب ایم، حبیب خاں نے اپنی "جمیل الدین عالی فن اور شخصیت"، محترم حکیم محمد سعید صاحب گورنر سندھ کی خدمت میں پیش کی۔ دائیں طرف جسٹس نصرت بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔]

۵، ۶، اور ۷ر ستمبر ۱۹۹۳ء کو کراچی (پاکستان) میں پہلی بار ایلیٹس عالمی اردو کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں ہندستان سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر قمر رئیس اور جناب ایم، حبیب خاں نے شرکت کی۔ اس کا اہتمام ایلیٹس کا لج کے سرپرست اعلیٰ جناب شوکت زیدی اور ان کے رفقا نے کیا۔ اس کا افتتاح حکیم محمد سعید گورنر سندھ نے کیا۔

آج سے ۷۰ سال پہلے مکتبہ جامعہ ایک معمولی دکان کی حیثیت سے قائم کیا گیا تھا لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ آج یہ اردو کا ایک بڑا اشاعتی مرکز ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس ۷۰ سال کے طویل عرصے میں مکتبے نے دنیا کے سرد و گرم کا مقابلہ کیا اور ہر عہد اور ہر دور میں ادب کی شمع کو نہ صرف فروزاں رکھا بلکہ اس کو مشعلِ راہ بھی بنایا۔ اردو زبان کی خدمت اور ملک کو آنے والی ضرورتوں کے مطابق بنانے کے ساتھ ساتھ ایک صحت مند قومی احساس کی بیداری ہمارا نصب العین رہا ہے اور ہمیں اس منزل تک پہنچنے کے لیے دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑا ہے۔ ہم نے اب تک پانچ ہزار سے زیادہ کتابیں شائع کی ہیں جو ہر طبقے میں شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

آج جب کہ علمی اور ادبی کاموں کی راہ میں دشواریاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ مکتبے نے ایک نئی قوت اور تازہ عزم کے ساتھ کام شروع کیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ جس طرح پہلے بھی ہم نے مشکلات کا صرف سامنا ہی نہیں کیا بلکہ ان کے درمیان راہیں ڈھونڈ نکالیں۔ اسی طرح آج بھی ان چٹانوں پر تیشہ زنی کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں گے اور پہلے کی طرح ہمارا ہاتھ بٹائیں گے

جنوری ۱۹۹۳ء

یادداشت

* براہ کرم خط وکتابت کرتے وقت اپنا نام اور پتا صاف صاف تحریر فرمایئے۔
* ڈاک خانے اور مقام کا نام انگریزی میں لکھ سکیں تو اور بھی اچھا ہے۔
* اپنے آرڈر کے ساتھ کم از کم چوتھائی رقم پیشگی ضرور بھجوایئے۔ آرڈر کی تعمیل کرتے وقت یہ رقم بل میں سے کم کر دی جائے گی۔
* اس مختصر فہرست کتب میں اگر آپ کی مطلوبہ کتاب موجود نہ ہو تب بھی براہ کرم آپ ہمیں خط ضرور بھیجیے۔ ہم مطلوبہ کتاب فراہم کرنے کی حتی الامکان کوشش کریں گے۔
* مصارف ڈاک وریل وغیرہ حسب قاعدہ خریدار کو ادا کرنے ہوتے ہیں۔ اس لیے اپنی سہولت کے پیش نظر آرڈر میں اس کی وضاحت ضرور کر دیجیے کہ کتابیں ڈاک سے بھیجی جائیں یا ریل سے۔
* کتابیں بذریعہ سواری گاڑی منگوانے کی صورت میں قریبی ریلوے اسٹیشن کا نام ضرور لکھ دیجیے۔
* کاغذ کی گرانی کی وجہ سے تقریباً ہر ادارے نے اپنی کتابوں کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا ہے اس لیے آرڈر کی تعمیل کے وقت وہی قیمت چارج کی جائے گی جو اس وقت مقرر ہوگی

مکتبہ جامعہ لمٹیڈ کے دفاتر

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمٹیڈ جامعہ نگر، نئی دہلی 110025
ٹیلی فون 630191

شاخیں
مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، اردو بازار، دہلی 110006
ٹیلی فون 3260668

مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، پرنسس بلڈنگ بمبئی 400003
ٹیلی فون 3763857

مکتبہ جامعہ لمٹیڈ یونی ورسٹی مارکیٹ۔
علی گڑھ 202002

مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نزدیک ڈاک خانہ جامعہ نگر
نئی دلی 110025

مطبع

لبرٹی آرٹ پریس، ۱۵۲۸، پٹودی ہاؤس
دریا گنج نئی دہلی 110002
ٹیلی فون نمبر 3276018

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمٹیڈ) دریا گنج نئی دلی 110002 میں چھپوا کر شائع کیا

منفرد اور اردو کے تاروں کو چھیڑنے والا شعری مجموعہ
قیمت -/۳۰ روپے

اسرار خودی

(فراموش شدہ اڈیشن)

ترتیب - شائستہ خان

علامہ اقبال کی "اسرار خودی" کے پہلے اڈیشن میں چند اشعار بطریق انتساب درج تھے جو دوسرے اڈیشن میں حذف کر دیے گئے۔ دوسرے اڈیشن میں گیارہ اشعار پیشکش سے نکال کر تمہید میں منتقل کر دیے گئے۔ کون سے اشعار حذف کیے اور وہ کہاں گئے؟ اور وہ اشعار کون سے تھے؟ یہ آپ کو اس کتاب کے عکسی اڈیشن سے معلوم ہوگا۔

قیمت -/۵، روپے

مسلمانوں کا تعلیمی نظام

ضیاء الحسن فاروقی

اس کتاب میں "مسلمانوں کے تعلیمی نظام سے متعلق چار اہم مضامین ہیں جس میں قیام مدارس کی تحریک' بغداد کا مدرسہ نظامیہ اور "مسلمانوں کا نظام تعلیمی دعہد وسطیٰ کے ہندستان میں) خاصی معلومات فراہم کرتے ہیں۔

قیمت -/۵م روپے

جامِ جہاں نما

اردو صحافت کی ابتداء

گربچن چندن

ہندستان میں اردو صحافت کے آغاز کے بارے میں نئی دریافتوں کی حامل یہ کتاب پہلی بار ان حقائق کو پیش کرتی ہے جو اب تک نیشنل آرکائیوز آف انڈیا اور برٹش لائبریری کے شعبے مشرقی میں مستور تھے۔ مصنف نے اوریجنل ریکارڈ کے مشاہدے کے بعد مسلمہ نظریات کا بیباک جائزہ لیا ہے اور اردو کے اس اولین مطبوعہ اخبار کے حقیقی موقف' کردار اور مرتبے کی صراحت کی ہے۔ مزید اس حصے کی نشاندہی کی ہے جو ۱۹ ویں صدی میں ہندستانی اردو صحافت کی پیش رفت میں جام جہاں نما نے ڈالا۔

قیمت -/۵، روپے

عموری اور بابلی تہذیب و تمدن

مالک رام

دنیا کے علم و فن، آئین و قوانین، حکومت کے نظم و نسق، مذہب، معاشرت، غرض زندگی کے ہر شعبے کی تشکیل و ترقی اور ترویج میں بابل کا جو مقام رہا ہے اس کی تفصیل آپ کو اس کتاب میں ملے گی۔ اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی اہم ترین دستاویز۔

قیمت -/۵، روپے

اپنے دل کی حفاظت کیجیے

ڈاکٹر لیفٹیننٹ کرنل کے۔ ایل۔ چوپڑا
ایف۔ آر۔ سی۔ پی

ترجمہ: نذیر الدین مینائی

خدا نہ کرے کسی کو دل کا دورہ پڑے۔ اور کچھ نہیں احتیاطی تدابیر تو کر ہی سکتے ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر کے۔ ایل۔ چوپڑا نے دل کا فعل۔ دل کا دورہ۔ قلبی انجیوگرافی بائی پاس سرجری سبھی کچھ بیان کر دیا ہے۔ کتاب باتصویر ہے ضرور مطالعہ کیجیے۔

قیمت -/۲۵ روپے

اہ ولی اللہؒ اور ان کا خاندان

تالیف:- مولانا حکیم محمود احمد برکاتی

ں کتاب میں برکاتی صاحب نے حضرت شاہ
اللہ رح اور ان کے خاندان کے حالات تفصیل
، لکھے ہیں۔ نیز ان کی تصانیف، تلامذہ،
یدین شاہ ولی اللہ کا تعارف بھی ہے۔

قیمت -/۴۵ روپے

تذکرۂ ماہ و سال

مالک رام

ں مجموعے میں اردو کے بیشتر ادیب، شاعر،
قاد، کالم نگار، صحافی اور دوسرے اہم عمائد
جنھوں نے اردو ادب کی قابل قدر خدمت کی
ہے) کی تاریخِ ولادت اور جو ہماری بدقسمتی سے
نتقال کر چکے ہیں ان میں سے اکثر کی تاریخِ وفات
بھی درج ہے۔ کسی بھی اہم ادیب پر مضمون لکھتے
وقت اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

قیمت -/۱۲۵ روپے

افکارِ اقبال

محمد عبدالسلام خاں

اس اہم کتاب میں علامہ اقبال کے حالاتِ زندگی،
ان کے اردو اور فارسی کلام پر سیر حاصل بحث،
ان کے مذہبی اور سیاسی افکار، اور کچھ ایسے
اہم واقعات کی نشان دہی کی گئی ہے جو اب
تک اندھیرے میں تھے۔

قیمت -/۱۲۵ روپے

تحقیق نامہ

مشفق خواجہ

مشفق خواجہ اردو کے وہ واحد محقق ہیں جو ہمیشہ
ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جو اپنی
اہمیت کی بنا پر ہماری ادبی تاریخ کے کسی نہ کسی
خلا کو پُر کرتے ہوں۔ زیرِ نظر مجموعہ میں ایسے ہی
اہم ترین مضامین شامل ہیں۔

قیمت -/۱۲۵ روپے

مرضیات

حکیم نعیم الدین زبیری

بیماریوں کے اصولی اسباب اور ان کی وجہ سے
افعال میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے مطالعے
یعنی ماہیت الامراض (پیتھالوجی) پر جامع اور
آسان بحث۔ طلبہ کے علاوہ اطبا کے لیے بھی
بے حد مفید ہے۔

قیمت -/۵۱ روپیہ

تاثر نہ کہ تنقید

صدیق الرحمٰن قدوائی

تنقید، ادب کی ایک اہم شاخ ہے مگر اس کا ضرورت
سے زیادہ چرچا بھی اچھا نہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ
ادب سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص "نقاد" ہو جائے۔
ادب کو تنقید کے سوا بھی مختلف زاویوں سے دیکھا
جا سکتا ہے جن کا انحصار پڑھنے والوں کے انفرادی
مزاجوں پر ہے۔ یہ تصنیف ادب سے دلچسپی رکھنے
والوں کے لیے ایک نیا نقطۂ نظر پیش کرتی ہے۔

قیمت -/۵۱ روپے

یہ صورت گر کچھ خوابوں کے

(عہدِ حاضر کے ۱۹ اہم ادیبوں کے انٹرویو)

طاہر مسعود

قیمت -/۶۶ رو۔

گوشے میں قفس کے

(طنزیہ ومزاحیہ مضامین)

دلیپ سنگھ

دلیپ سنگھ کا نام اب طنزیہ مزاحیہ ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ "گوشے میں قفس کے" آپ کے طنزیہ مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ دلچسپ انسان کے نہایت دلچسپ مضامین کا مجموعہ

قیمت -/۴۵ روپے

ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی (ناول)

کشمیری لال ذاکر

کشمیری لال ذاکر کا بھوپال گیس ٹریجڈی کے موضوع پر نیا ناول۔ انسانی رشتوں کے بننے، استوار ہونے اور ٹوٹنے کی درد انگیز داستان، جو ہمارے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔

قیمت -/۴۰ روپے

سحر کے پہلے اور بعد

میرزا سعید الظفر چغتائی

یہ ایک قصبے کی سماجی اور سیاسی تناظر میں لکھی ہوئی کہانی ہے جس میں مصنف کے بچپن کی گلیاں سعدی کے گلستاں کی طرح حسین و نوجوان نظر آرہی ہیں۔ دلچسپ جگ بیتی۔

قیمت -/۵۱ روپے

تحریریں

اسلم پرویز

اردو کے جانے مانے ادیب اور نقاد ڈاکٹر اسلم پرویز کے اہم مضامین کا تازہ ترین مجموعہ۔

قیمت -/۵۱ روپے

سفر (ناول) رابعہ تبسم

رابعہ تبسم کا ایک اچھوتا رومانی ناول۔ روزانہ زندگی میں پیش آنے والی خوشیوں اور غموں کا سنگم۔ یہ انتہائی رنگین بھی ہے اور سنگین بھی۔

قیمت -/۲۷ روپے

خواب اور خلش (شعری مجموعہ)

آل احمد سرور

شاعری ذات سے کائنات تک کا سفر ہے یہ خوابوں کے ذریعے حقائق کی توسیع کا نام ہے۔ بڑی شاعری تجربے سے مدد لیتی ہے مگر وہ روایت اور تجربے میں ایک توازن رکھتی ہے۔ آل احمد سرور کی شاعری صرف الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں بلکہ اس میں معانی کا ایک سمندر ہے جس کی تہہ میں پہنچ کر ہی موتی نکالے جا سکتے ہیں۔

قیمت -/۶۶ روپے

اقبال کے اردو کلام کے مجموعے

بانگِ درا قیمت -/۹ روپے

بالِ جبریل قیمت -/۶ روپے

ضربِ کلیم مع ارمغان حجاز

(اردو نظمیں) قیمت -/۶ روپے

اردو کے طلبہ کے لیے سستی کتابوں کا نیا سلسلہ۔

غبارِ منزل (شعری مجموعہ) غلام ربانی تاباں

اردو کے ممتاز شاعر جناب غلام ربانی تاباں کی غزلوں نظموں اور قطعات کا تازہ مجموعہ جس میں "سازِ لرزاں" "ذوقِ سفر" اور "نوائے آوارہ" کا انتخاب بھی شامل ہے۔

قیمت -/۴۵ روپے

ں قواعدِ اُردو

ے مضمون کو سمجھنے ، سمجھانے اور
ے نہایت آسان زبان میں ترتیب
علا اساتذہ اور طلبہ کے لیے نہایت

۔ ۵ روپے   طلبہ اڈیشن ۲٫۵۰

یدؒ و فردِ فریدؒ

ڈاکٹر اسلم فرخی

ید الدین مسعودؒ اور شیخ نظام الدین
ہیؒ کے روحانی سفر کی رُوداد۔
قیمت ‎-/۲۷ روپے

یان اور پرکھ

پروفیسر آل احمد سرور

ں پروفیسر آل احمد سرور کے جو مضامین
ں کا تعلق زیادہ تر شاعروں اور شاعری
ں سے ہے میرؔ، غالبؔ، انیسؔ،
نی، جوشؔ، اور فراقؔ کی شخصیات
بھرپور مضامین کا اہم مجموعہ
قیمت ‎-/۵۱ روپے

ستان میں مسلمانوں کی تعلیم

ڈاکٹر سلامت اللہ

ں مسلمانوں کی تعلیم کے جن مسائل کی
کی گئی ہے وہ مصنف کے نزدیک
زیادہ اہم ہیں۔ اس لیے اس کے تاریخی
زاید موجود ہیں۔ ماہر تعلیم ڈاکٹر سلامت اللہ
، تصنیف۔

قیمت ‎-/۵۱ روپے

اقبال کا نظریۂ خودی

عبدالمغنی

اس کتاب میں نظریۂ خودی کو مرکزی نقطہ فرض کر کے اقبال کے پورے نظامِ فکر کی تلاش کی گئی ہے تاکہ ایک طرف دنیا کی سب سے بڑی شاعری کی حقیقی جہت واضح ہو اور دوسری طرف آج کی انسانیت کو اپنے ارتقا کی صحیح سمت دریافت کرنے میں سہولت ہو۔

قیمت ‎-/۱۵۰ روپے

پت جھڑ کی آواز

قرۃ العین حیدر

برصغیر کی ممتاز ترین افسانہ نگار قرۃ العین حیدر کی اہم کہانیوں کا مجموعہ۔ یہ کہانیاں دلچسپ بھی ہیں اور زندگی کی صحیح عکاسی بھی کرتی ہیں۔

نیا اڈیشن   قیمت ‎-/۷۵ روپے

جدید افسانہ اور اس کے مسائل

وارث علوی

اردو کے ممتاز نقاد وارث علوی کے تنقیدی مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جدید اردو افسانہ کے متعلق ایک اہم دستاویز۔

قیمت ‎-/۳۶ روپے

قلندر بخش جرأت (خطبہ)

جمیل جالبی

اردو کے نامور عالم اور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک نہایت اہم خطبہ جو موصوف نے ۸/نومبر ۱۹۸۹ء کو ڈاکٹر سید عابد حسین میموریل ٹرسٹ کے سمینار میں پیش کیا تھا۔

قیمت ‎-/۱۰ روپے

کتاب نما کے چند خصوصی شمارے

علی سردار جعفری

(شخصیت اور ادبی خدمات)

ترتیب ـــــــــ رفیعہ شبنم عابدی

سردار جعفری کی شخصیت میں بیک وقت کئی شخصیتیں سانس لے رہی ہیں۔ وہ کون سا میدان ہے جہاں سردار جعفری اپنے فکر و نظر کی جولانیاں دکھاتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ صحافت ہو یا ادب، فلم ہو یا ٹی وی ریڈیو ہو یا اسٹیج، خطابت ہو یا شاعری! ان کی مکمل شخصیت کا بھرپور جائزہ۔

قیمت -/۵۰ روپے

پروفیسر مسعود حسین خاں

(علمی، لسانی اور ادبی خدمات)

مرتبہ ـــــــــ ایم حبیب خاں

کتاب نما کے اس خصوصی شمارے میں اردو کے ممتاز ادیب، ماہر لسانیات اور محقق جناب مسعود حسین خاں کی خدمات کے اعتراف میں اردو کے ۱۲ ممتاز ادیبوں کی نگارشات کا مجموعہ۔

قیمت -/۵۰ روپے

خواجہ احمد فاروقی

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ـــــــــ ڈاکٹر خلیق انجم

اردو کے نامور ادیب، ممتاز نقاد، انتظامی امور کے ماہر، سابق صدر شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی (جن کے عہد میں شعبۂ اردو، اپنے کارہائے نمایاں کے لیے پورے ہندستان میں مشہور تھا) کی علمی، ادبی خدمات کا اعتراف نہ صرف ان کے شاگردوں نے بلکہ ممتاز ادیبوں نے بھی کیا ہے۔

قیمت -/۵۰ روپے

عابد علی خاں

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ـــــــــ مجتبیٰ حسین

عابد علی خاں مرحوم ایک انجمن کا نام ہی نہیں ایک تحریک کا نام بھی تھا۔ اس خصوصی شمارے میں ملک کے ممتاز ادیبوں نے مرحوم کی علمی، ادبی، سماجی اور صحافتی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔

قیمت -/۵۰ روپے

ڈاکٹر اجمل اجملی

(حیات اور ادبی خدمات)

مرتبین ـــــــــ ڈاکٹر علی احمد فاطمی/عذرا نقوی

اردو، ہندی کے ممتاز ادیبوں کی اہم نگارشات کا مجموعہ، جس میں ڈاکٹر اجمل اجملی کی ادبی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا گیا ہے۔

قیمت -/۵۰ روپے

پروفیسر آل احمد سرور

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتب ـــــــــ ڈاکٹر خلیق انجم

پروفیسر آل احمد سرور، اردو کے ایک مشفق اور مقتدر استاد بھی ہیں اور صاحب طرز انشا پرداز بھی۔ ادب کے اعلا نقاد بھی ہیں اور زبان کے نباض بھی۔

قیمت -/۵۰ روپے

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ــــــــــــ خلیق انجم

فرمان فتح پوری کا خاکہ جن رنگوں سے بنا ہے وہ طرح دار، دلکش، دلربا، تابناک اور پایدار ہیں۔ کتاب نما نے اس خصوصی شمارے میں انھیں رنگوں کی جھلک پیش کی ہے۔ اردو کے بلند پایہ ادیب، نقاد، مدیر کی خدمت میں اردو کے ممتاز ادیبوں کا خراج عقیدت۔

قیمت ۲۵/- روپے

اختر سعید خاں

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ــــــــــــ ڈاکٹر سید حامد حسین

اختر سعید خاں نے جہاں غزل کی روایت کا احترام سیکھا وہیں شعر کے تخلیقی منصب کی پاسداری بھی سیکھی۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے انھیں زندگی کا ایک واضح شعور بخشا۔ اردو کے ممتاز غزل گو شاعر کی شخصیت اور فن پر ایک اہم شمارہ۔

قیمت ۵۱/- روپے

مکتبہ پیام تعلیم کی نئی کتابیں

اپریل ۹۲ء تا ستمبر ۹۳ء

سفر کے قصے	آصف فرخی	۵/-
حضرت آدم علیہ السلام	منورہ نوری خلیق	۴/-
ہم بنے کمانڈو	منیر احمد راشد	۵/-
خواجہ غلام السیدین (سوانح)	ذکیہ ظہیر	۵/-
میر امن دلی والے	ڈاکٹر اسلم فرخی	۴/۵۰
میرزا ادیب (سوانح)	طاہر مسعود	۴/۵۰
تین بندوقچی (ناول)	مسعود احمد برکاتی	۱۰/-

مکتبہ پیام تعلیم کی کتابوں کے نئے اڈیشن

اپریل ۹۲ء تا ستمبر ۹۳ء

رسول پاک کے اخلاق	خلیل احمد جامعی	۴/-
جادو کی ہنڈیا	(ادارہ)	۶/-
چاند کی بیٹی	〃	۶/-
کوے کا خواب	〃	۷/۵۰
ابو علی کا جوتا	〃	۶/-
عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں	انور خاں	۷/۵۰
کھلونا نگر	(ادارہ)	۸/۵۰
سمندری طوفان اور تین لڑکے	〃	۶/

مطبوعات مکتبہ جامعہ کے نئے اڈیشن

اپریل ۹۲ء تا ستمبر ۹۳ء

تاریخ الامت دوم	مولانا اسلم جیراجپوری	۲۱/-
تاریخ الامت ششم	مولانا اسلم جیراجپوری	۲۷/-
ورک بک آسان اردو	شکیل اختر فاروقی	۲۷/-
ہمارا دین اوّل	سید شہاب الدین دسنوی	۸/۵۰
〃 دوم	〃	۸/۵۰
مقدمہ شعر و شاعری	مرتبہ۔ رشید حسن خاں	۲۷/-
بانگ درا	علامہ اقبال	۹/-
بال جبریل	علامہ اقبال	۶/-
ضرب کلیم مع ارمغان حجاز	〃	۶/-
شعور ادب	(ادارہ)	۲۱/-
واردات	پریم چند	۲۱/-
ایک چادر میلی سی	راجندر سنگھ بیدی	۱۸/-
تاریخ الامت اوّل	مولانا اسلم جیراجپوری	۱۸/-
دروازے کھول دو	کرشن چندر	۶/۵۰
دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	۲۷/-
انتخاب قلی قطب شاہ	محمد اکبر الدین صدیقی	۲۷/-
انتخاب اکبر الہ آبادی	صدیق الرحمن قدوائی	۱۲/-

جدید ترکی ادب کے ارکان ثلاثہ — پروفیسر ضیاالحسن فاروقی — ۴/-
نظر اور نظریے — آل احمد سرور — ۲۴/-
تنقید کیا ہے۔ — " — ۲۷/-
باتیں کچھ سُریلی سی — داؤد رہبر — ۳۶/-
اردو اسپیز — مرتبہ: سید ظہیر الدین مدنی — ۲۱/-
روحِ تہذیب — خواجہ غلام السیدین — ۴/۵۰
نئی شعری روایت — پروفیسر شمیم حنفی — (زیر طبع)
دراسات — ڈاکٹر نثار احمد فاروقی — ۱۵/-
دبستانِ آتش — شاہ عبدالسلام — ۱۶/-

تعلیم

مسلمانوں کا تعلیمی نظام — ضیاء الحسن فاروقی — ۴۵/-
ہندستانی مسلمانوں کی تعلیم — ڈاکٹر سلامت اللہ — ۵/-
مشقی تدریس کیوں اور کیسے — ڈاکٹر محمد اکرام خاں — ۴۵/-
معاشیات کے اصول — عزیز احمد قاسمی — ۲۱/-
آسان اردو ورک بک — شکیل اختر فاروقی — ۲۴/-
تعلیم و تربیت اور والدین — ڈاکٹر محمد اکرام خاں — ۵۱/-
تعلیم اور رہنمائی — ڈاکٹر محمد اکرام خاں — ۳۵/-
ہم اردو کیسے پڑھائیں — معین الدین — ۵۴/-
تعلیم اور اس کے وسائل۔ — ڈاکٹر محمد اکرام خاں — ۳۶/-
آسان اردو (ہندی کے ذریعے) — شکیل اختر فاروقی — ۱۲/-
تعلیم نظریہ اور عمل۔ — ڈاکٹر محمد اکرام خاں — ۳۶/-
تعلیم فلسفہ اور سماج۔ — ڈاکٹر سلامت اللہ — ۲۷/-
بنیادی استاد کے لیے۔ — ڈاکٹر سلامت اللہ — ۱۳/-
ہم کیسے پڑھائیں۔ — ڈاکٹر سلامت اللہ — ۳۳/-
تعلیمی خطبات۔ — ڈاکٹر ذاکر حسین — ۳۶/-
سرسید کی تعلیمی تحریک۔ — اختر الواسع — ۲۵/-
اردو کیسے لکھیں — رشید حسن خاں — ۱۰/۵۰
بچوں کا آرٹ — عبید الحق — ۲۴/-

تذکرہ، سوانح، شخصیتیں

اپنی ہواؤں کی خوشبو — کشمیری لال ذاکر — ۳۰/-
دلّی کی چند عجیب ہستیاں — اشرف صبوحی — ۵/-
چند تصویریں بتاں — مولانا عبدالسلام قدوائی — ۴۵/-
ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب — پروفیسر آل احمد سرور — ۸/-
صاحب جی، سلطان جی — ڈاکٹر اسلم فرخی — ۲۰/-
ہندستانی مسلمان آئینہ ایام میں — ڈاکٹر عابد حسین — ۷۵/-
شہید جستجو۔ — پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی — ۵/-
مولانا آزاد کی کہانی۔ — ڈاکٹر ظفر احمد نظامی — ۱۸/-
نظام رنگ (حضرت نظام الدین اولیاؒ) — ڈاکٹر اسلم فرخی — ۱۵/-
حیاتِ جامیؒ۔ — مولانا اسلم جیراجپوری — ۱۲/-
نقشِ ذاکر۔ — مرتبہ عبدالحق خاں — ۵۱/-
مالک رام ایک مطالعہ۔ — مرتبہ علی جواد زیدی — ۵۰/-
مشفق خواجہ ایک مطالعہ۔ — مرتبہ خلیق انجم — ۳۰/-
عبداللطیف اعظمی حیات و خدمات۔ — مرتبہ انور صدیقی — ۱۸/-
یادوں کا اجالا بھگوان سنگھ۔ — مترجم شمیم حنفی — ۴۰/-
مجیب صاحب احوال و افکار — پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی — ۹۰/-
حیاتِ عابد (خود نوشت ڈاکٹر عابد حسین) — ڈاکٹر صغریٰ مہدی — ۴۵/-
سلسلۂ روز و شب (خود نوشت) — صالحہ عابد حسین — ۶۵/-
وجد شاعر اور شخص۔ — مرتبہ یوسف ناظم — ۲۵/-
غبارِ کارواں — بیگم انیس قدوائی — ۲۷/-
فراق شخص و شاعر۔ — مرتبہ شمیم حنفی — (زیر طبع)
حیاتِ حافظ۔ — اسلم جیراجپوری — ۱۵/-
افکارِ رومی۔ — مولانا عبدالسلام خاں — ۴۰/-
بزمِ رفتگاں — صباح الدین عبدالرحمٰن — (زیر طبع)
امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری۔ — پروفیسر ممتاز حسین — (زیر طبع)

مکالماتِ افلاطون ۔ مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ ۳۶
غلام ربانی تاباں، حیات اور شاعری ۔ شفیق النساء بیگم ۱۰/-
اب جن کے دیکھنے کو ۔ بیگم انیس قدوائی ۱۲/۵۰
پریم چند ۔ ہنس راج رہبر (زیرِ طبع)
شاد عارفی شخصیت اور فن ۔ ڈاکٹر مظفر حنفی ۲۴/-
حیاتِ اسماعیل، حیات و خدمات ڈاکٹر سیفی پریمی ۱۸/-
مفتی صدر الدین آزردہ ۔ عبدالرحمن پرواز اصلاحی ۱۲/-
میر انیس سے تعارف ۔ صالحہ عابد حسین ۷/-
ہمارے ذاکر صاحب ۔ رشید احمد صدیقی ۲۵/-
اشخاص و افکار ۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۷/۵۰
میر انیس ۔ سفارش حسین رضوی ۴/-
ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت ۔ مرتبہ عبداللطیف اعظمی ۶/۵۰
حسرت کی شاعری ۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۷/۵۰
گنجہائے گرانمایہ ۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی ۴۲/-
کیا خوب آدمی تھا ۔ مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین ۱۲/-
قدسیہ زیدی ۔ کرنل بشیر حسین زیدی ۲۵/-
انشار ۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ۴/-
ذاکر صاحب اپنے لفظ و معنی میں ۔ مرتبہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۴۵/-
روسی ادب اوّل، دوم پروفیسر محمد مجیب ۶۰/-

طنزیات، مزاحیات

طنزیات و مضحکات، رشید احمد صدیقی ۶۰/-
گوشے میں قفس کے دلیپ سنگھ ۴۵/-
فی الحقیقت یوسف ناظم ۲۵/-
فی الفور ۔ یوسف ناظم ۳۰/-
گول مال ۔ شفیقہ فرحت ۱۸/-
فی الحال ۔ یوسف ناظم ۱۸/-
رانگ نمبر ۔ شفیقہ فرحت ۱۶/-
باالکلیات ۔ یوسف ناظم ۱۸/-
برکت ایک چھینک کی ۔ وجاہت علی سندیلوی ۱۵/-
ذکر خیر یوسف ناظم ۲۱/-
بے پرکی ۔ حضرت آوارہ ۱۰/-
خنداں ۔ رشید احمد صدیقی ۳۶/-
شگوفہ زار ۔ خواجہ عبدالغفور ۱۶/-
دیوارِ قہقہہ (مزاحیہ شاعری) محمد یوسف پاپا ۱۵/-
آشفتہ بیانی میری ۔ رشید احمد صدیقی ۱۵/-

طب ۔ ایلوپیتھی

مرضیات حکیم نعیم الدین زبیری ۵۱/-
اپنے دل کی حفاظت کیجیے ۔ ترجمہ ۔ نذیر الدین مینائی ۲۵/-
ذیابیطس ۔ ڈاکٹر محمد شعیب اختر ۱۰/-

سفرنامے، رپورتاژ

کولمبس کے دیس میں ۔ جگن ناتھ آزاد ۴۵/-
پشکن کے دیس میں ۔ جگن ناتھ آزاد ۲۵/-
سفر زندگی کے لیے سوز و ساز ۔ بیگم صالحہ عابد حسین ۱۸/-
باتیں لاہور کی ۔ سوم آنند ۱۶/-
رہ نوردِ شوق ۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ۱۴/۵۰
یادوں کے سائے عتیق صدیقی ۱۲/-

شعری مجموعے

اسرارِ خودی (فراموش شدہ اڈیشن) شائستہ خاں ۷۵/-
بانگِ درا اقبال ۹/-

- بالِ جبریل — اقبال — ۶/-
- ضربِ کلیم مع ارمغانِ حجاز — " — ۶/-
- خواب اور خلش — آلِ احمد سرور — ۴۴/-
- غبارِ منزل — غلام ربانی تاباں — ۲۵/-
- انیس — ۳۲ غیر مطبوعہ مرثیے — ۹۰/-
- پرانی بات ہے۔ — زبیر رضوی — ۳۰/-
- سازِ سخن۔ — ادا جعفری — ۴۵/-
- غزل نما (غزلیات کا انتخاب) مرتبہ ادا جعفری — ۷۵/-
- دائروں میں پھیلی لکیر۔ — کشور ناہید — ۳۰/-
- آنکھ میں سمندر۔ — زاہد ڈار — ۳۰/-
- آنکھ اور خواب کے درمیان۔ — ندا فاضلی — ۲۱/-
- رات کے مسافر۔ — مرتبہ انور سجاد — ۲۸/-
- گدازِ شب۔ — معین احسن جذبی — ۴۰/-
- ایک خواب اور۔ — علی سردار جعفری — ۴۰/-
- حرف حرف روشنی۔ — حمایت علی شاعر — ۲۵/-
- لفظوں کا آسمان (اڑیا نظمیں) مترجم کرامت علی کرامت — ۲۰/-
- دوہے۔ — جمیل الدین عالی — ۱۲/-
- کلیاتِ عرش ملسیانی — مرتبہ مالک رام — ۷۵/-
- راوار۔ — ساقی فاروقی — ۲۰/-
- پتھر کی زبان۔ — فہمیدہ ریاض — ۱۵/-
- شام کا پہلا تارا۔ — زہرا نگاہ — ۲۱/-
- مثنوی نہ سپہر۔ (امیر خسرو) مترجم محمد رفیق عابد زاہدی — ۲۸/-
- لہو پکارتا ہے۔ — علی سردار جعفری — (زیرِ طبع)
- شامِ شہرِ یاراں۔ — فیض احمد فیض جلد ۱ — ۶/-
- جستہ جستہ۔ — خورشید الاسلام — ۱۸/-
- گل افشانیٔ گفتار۔ — نشور واحدی — ۵/-
- کربِ آگہی۔ — آنند نرائن ملاّ — ۱۰/۵۰
- نوائے آوارہ۔ — غلام ربانی تاباں — ۸/۵۰
- اردو گیت۔ — ڈاکٹر قیصر جہاں — (زیرِ طبع)
- پچھلے پہر۔ — جاں نثار اختر — ۱۵/-
- انتخابِ حالی (نیا اڈیشن) مؤلفہ سفارش حسین رضوی — ۱۵/-
- شہرِ آشوب — مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد — ۸/۵۰
- ذوقِ سفر۔ — غلام ربانی تاباں — ۵/-
- کو بہ کو۔ — سلمان جاں نثار اختر — ۷/-
- آتشِ گل — جگر مرادآبادی — ۲۵/-
- دیوارِ قہقہہ۔ (مزاحیہ شاعری) محمد یوسف پاپا — ۱۵/-

تاریخ، اسلامیات، مذہب

- مسلمانوں کا تعلیمی نظام — ضیاء الحسن فاروقی — ۱۴/-
- شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان۔ محمود احمد برکاتی۔ — ۴۵/-
- فریدِ و فردِ فرید — اسلم فرخی — ۲۷/-
- اسلام میں راسخ الاعتقادی بیچ کی راہ — ضیاء الحسن فاروقی — ۸/-
- اسلام کی اصلاحی تحریکوں میں سر سید احمد کا مرتبہ — سید مقبول احمد — ۸/-
- فقہ اسلامی اور دورِ جدید کے مسائل۔ مولانا مجیب اللہ ندوی — ۱۴/-
- نقدِ ملفوظات — نثار احمد فاروقی — ۶۵/-
- خطباتِ عیدین — مولانا آلہی امینی — ۲۱/-
- تاریخِ اودھ — قاسم علی نیشاپوری — ۲۷/-
- مذہب اور ہندستانی مسلم سیاست — پروفیسر مشیر الحق — ۹/-
- ہمارے دینی علوم — مولانا اسلم جیراجپوری — ۱۸/-
- قدیم ہندستان کی سیکولر روایت۔ ڈاکٹر مجیب اشرف — ۱۲/-
- ترجمۂ قرآن۔ منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش — پروفیسر مشیر الحق — ۹/-
- مسلمانانِ ہند سے وقت کے مطالبات۔ پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی — ۸/-
- دنیا کے بڑے مذہب۔ — عماد الحسن آزاد فاروقی — ۸۵/-
- ہندستان میں اسلامی علوم و ادبیات۔ عماد الحسن آزاد فاروقی — ۴۰/-
- ہندستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک۔ شمس الرحمٰن محسنی — ۵۰/-
- رسولِ اکرمؐ اور یہودِ حجاز۔ سید برکات احمد — ۴۰/-
- مجوب الارث۔ — مولانا اسلم جیراجپوری — ۴/-
- ہند اسلامی تہذیب کا ارتقاء۔ عماد الحسن آزاد فاروقی — ۴۰/-
- اسلام دورِ حاضر میں۔ — مترجم پروفیسر مشیر الحق — ۳۶/-

اسلامیات ۔ مالک رام ۲۷/-
عمرو بن عاص ؓ ۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۹/-
حضرت جنید بغدادیؒ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۵/-
روح القرآن ۔ مولانا عبد السلام قدوائی ۳۰/-
عشق اور بھگتی ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۶/-

عورت اور اسلامی تعلیم ۔ مالک رام ۳۰/-
مسلمان اور وقت کے تقاضے ۔ عبد السلام قدوائی ۸/-
عربوں کی تاریخ نگاری کا آغاز وارتقا ۔ محمود الحسن ۱۵/-
سماجی تبدیلیاں ۔ مترجم قاضی عبید الرحمٰن ۲/-
مذہب اور جدید ذہن پروفیسر مشیر الحق (زیر طبع)
ہندستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں ۔ ڈاکٹر سالم قدوائی ۱۶/-
دینِ الٰہی اور اس کا پس منظر ۔ مولانا مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی ۴/-
کتاب و سنت کے جواہر پارے ۔ مولانا جمال الدین اعظمی ۴/۵۰
خواتینِ کربلا کلامِ انیس کے آئینے میں ۔ صالحہ عابد حسین ۱۴/-
مسلمان اور سیکولر ہندستان ۔ پروفیسر مشیر الحق ۷/-
اسلامی عقائد و مسائل مذہب ۔ مولانا جمال الدین اعظمی ۶/۵۰
اسلام کی اخلاقی تعلیمات (امام غزالی) مترجم ڈاکٹر رشید الوحیدی ۲۵/-
تاریخ الامت سیرت رسولؐ حصہ اوّل ۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۱۷
" خلافت راشدہ " دوم " ۲۱/-
" خلافت بنی امیہ " سوم " ۱۲/-
" عباسیہ " چہارم " ۱۵/-
" عباسیہ بغداد " پنجم " ۱۷/-
" عباسیہ مصر " ششم " ۲۰/-
" ہفتم تا ہشتم " (زیر طبع)
فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید ۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۳۰/-
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد سائز) ۔ قاری محمد اسماعیل ۲/-
" " کلاں سائز ۴/-
اسلام اور بدلتی دنیا ۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۲۱/-
بکھرے ورق سینتی کمار چیٹرجی ۴/-
تاریخِ انگلینڈ (۱۹۰۱/۱۴۸۵) سید محمد عزیز الدین حسین ۹/-

ناول

نوٹوں کی تلاش اباز سیوہاروی ۶۰/-
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی کشمیری لال ذاکر ۴۸/-
سفر رابعہ تبسم ۲۷/-
سمندری خزانہ ماریہ رحمٰن ۲۷/-
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو ڈاکٹر صغرا مہدی ۲۴/-
مٹی سے ہیرا سید مقبول احمد ۱۰/-
تذکرہ انتظار حسین ۵۴/-
ریت کی دیواریں رفعت سروش ۲۱/-
بنجر بادل ۔ کشمیری لال ذاکر ۴۴/-
فرار ۔ ظفر پیامی ۴۰/-
ڈوبتے سورج کی کتھا ۔ کشمیری لال ذاکر ۳۶/-
لمحوں میں بکھری زندگی ۔ کشمیری لال ذاکر ۱۸/-
مہکتی بہاریں ۔ کوثر چاند پوری ۱۸/-
راگ بھوپالی ۔ صغریٰ مہدی ۱۵/-
دھرتی سدا سہاگن ۔ کشمیری لال ذاکر ۷/۵۰
کھجوراہو کی ایک رات ۔ کشمیری لال ذاکر (زیر طبع)
میں واپس آؤں گا ہارورڈ فاسٹ مترجم محمد انس ۲۵/-
پُروائی صغریٰ مہدی ۹/۵۰
گوری سوئے سیج پر صالحہ عابد حسین (زیر طبع)
انگوٹھے کا نشان ۔ کشمیری لال ذاکر ۷/-
ایک ہم دو دل ۔ خالدہ رحمٰن ۱۰/-
اشک خوں ۔ حبیبہ بانو ۱۰/-
اپنی اپنی صلیب ۔ صالحہ عابد حسین ۶۰/-
پرائی دھرتی اپنے لوگ ۔ جتندر بلو ۱۲/-
ایک مٹھی ہندستان ۔ سید ضمیم اشرف ۔ ۹/-

ایک چادر میلی سی ۔ راجندر سنگھ بیدی ۔/۱۵
آئیپس کے گیت ۔ مترجم قرۃ العین حیدر ۔/۲
پیار کا موسم ۔ مہندر ناتھ ۴/۵۰
چنار کا پتا ۔ سلطان آصف فیضی ۔/۳
پا بہ جولاں ۔ صغریٰ مہدی (زیر طبع)
زندگی کی لہر (ساؤمنگ) مترجم محمد خلیق ۔/۴
کالا شہر گورے لوگ ۔ احسان الحق (زیر طبع)
بیوہ ۔ منشی پریم چند ۔/۱۲
گئودان (نیا اڈیشن) 〃 ۔/۷۵
میدانِ عمل (نیا اڈیشن) منشی پریم چند ۔/۷۵
یو دوکیہ ۔ ترجمہ قرۃ العین حیدر ۔/۲
شکستِ ناتمام ۔ زہرہ سیدین ۔/۲
ابھی ڈور ۔ صالحہ عابد حسین زیر طبع
پراسرار مقدمہ کافکا مترجم رحم علی الہاشمی ۔ ۱۲/۵۰
ماں کی کھیتی ترجمہ قرۃ العین حیدر ۲/۵۰

کھڑکی ۔ پرکاش پنڈت ۔/۱
ریت سمندر اور جھاگ ۔ ہرچرن چاولہ ۷۵
تیوری ۔ امر سنگھ ۷۵
قلمی نمبر ۲۹۹ ۔ وجاہت علی سندیلوی ۵
دانہ و دام ۔ راجندر سنگھ بیدی ۔/۱
اپنے پرائے ۔ اوم پرکاش بجاج ۔
نئی دھرتی نئے انسان خواجہ احمد عباس ۔
درد و درماں صالحہ عابد حسین زیر
ہاتھ ہمارے قلم ہوئے راجندر سنگھ بیدی ۔
واردات ۔ پریم چند ۔/
اردو افسانے مرتبہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی ۔/
دس افسانے ۔ ڈاکٹر صغریٰ مہدی ۵۰
راستے اور کھڑکیاں ۔ انور خاں ۔
جو میرے وہ راجا کے نہیں ۔ صغریٰ مہدی
اپنے دکھ مجھے دیدو ۔ راجندر سنگھ بیدی ۔

افسانے

پت جھڑ کی آواز قرۃ العین حیدر ۔/۷۵
آوازوں کا میوزیم ساگر سرحدی ۔/۴۵
سدا بہار چاندنی ۔ رام لعل ۔/۳۰
دل دریا ۔ شرون کمار ۔/۲۵
تین چہرے تین آوازیں ۔ صالحہ عابد حسین ۔/۱۸
دردِ دل ستارہ جعفری ۔/۱۸
مکتی بودھ راجندر سنگھ بیدی ۲۵/۵۰
نیلی ساری خواجہ احمد عباس ۔/۱۳
گرہن ۔ راجندر سنگھ بیدی ۔/۱۰
کوکھ جلی ۔ 〃 〃 ۔/۱۸

ڈرامے

الجہاد ۔ ابراہیم یوسف
زندگی کی طرف ۔ پروفیسر شمیم حنفی ۔
زوال کا عروج مترجم انور عظیم ۔
مجھے گھر یاد آتا ہے ۔ پروفیسر شمیم حنفی
انٹی گونی ۔ سوفوکلیز مترجم قیصر زیدی
خانہ جنگی پروفیسر محمد مجیب
حبہ خاتون ۔ پروفیسر محمد مجیب
تاریخ کے آنچل میں ۔ رفعت سروش
اداس موڑ ابراہیم یوسف
انٹنی اور کلوپیٹرا ولیم شیکسپیئر ۵۰

...ابلاوا۔	شمیم حنفی	۱۲/-
...کھیل۔	راجندر سنگھ بیدی	۱۶/۵۰
...کون۔	سید محمد مہدی	۸/۵۰
...کی دستک۔	ساگر سرحدی	۱۲/۷۵
...بجھ گیا۔	کرتار سنگھ دگل	۶/-
...پے آپ۔ (مزاحیہ ڈراما)	افتخار عالم	۲/۵۰
...ر کا خواب۔	قدسیہ زیدی	۸/۵۰
...مایش۔	پروفیسر محمد مجیب	۴/۵۰
...ام۔	پروفیسر محمد مجیب	۲/-
...بتی		۴/۵۰
...یروئن کی تلاش۔	"	۵/۵۰
...دۂ غفلت۔	ڈاکٹر سید عابد حسین	۹/-
...روازے کھول دو	کرشن چندر	۶/۵۰
...ئینۂ ایام۔ جے بریسٹلے	مترجم خلیق احمد	۴/۵۰
...قش آخر۔	اشتیاق حسین قریشی	۲/۲۵
...یڈیو ڈرامے کا فن	ڈاکٹر اخلاق اثر	۱۸/-
...یڈیو ڈرامے کی اصناف	"	۲۰/-
...نشریات اور آل انڈیا ریڈیو	"	۱۰/-
فاؤسٹ (گوئٹے)	مترجم: ڈاکٹر عابد حسین	۲۵/۵۰

اقبالیات

افکار اقبال۔	محمد عبدالسلام خاں	۱۲۵
اقبال کا نظریۂ خودی	عبدالمغنی	۱۵۰/-
اقبال جادوگر ہندی نژاد	عتیق صدیقی	۱۴/-
اقبالیات کی تلاش	عبدالقوی دسنوی	۳۵/-
فلسفۂ اقبال (خطبات کی روشنی میں)	سید وحید الدین	۳۰/-
اقبال اور دہلی۔	عبدالقوی دسنوی	۹/۵۰
نقد اقبال۔	میکش اکبرآبادی	۲۵/۵۰
نقش اقبال۔	اسلوب احمد انصاری	۲۶/-

غالبیات

ذکر غالب	مالک رام	(زیر طبع)
گفتار غالب	مالک رام	۴۸/-
غالب اور صفیر بلگرامی۔	مشفق خواجہ	۳۶/-
تلامذۂ غالب۔	مالک رام	۷۵/-
فسانۂ غالب۔	مالک رام	۱۶/۵۰
غالب اور شاہان تیموریہ۔	ڈاکٹر خلیق انجم	۹/۵۰

معیاری سیریز

موازنۂ انیس و دبیر۔	مرتبہ رشید حسن خاں	۲۴/-
نیرنگ خیال۔	مالک رام	۱۵/-
یادگار غالب اردو۔		۲۶/-
فارسی۔		۹/-
انتخاب مضامین سرسید	انور صدیقی	
حیات سعدی	مرتبہ رشید حسن خاں (زیر طبع)	۳۰/-
فسانۂ آزاد (تلخیص)	ڈاکٹر قمر رئیس	۷۵/-
فردوس بریں	عبدالحلیم شرر	۱۶/-
انتخاب مضامین شبلی	مرتبہ رشید حسن خاں	۷۵/-
انتخاب ناسخ	مرتبہ	(زیر طبع)
مثنوی بحر المحبت	مرتبہ عبدالماجد دریاآبادی	۵/۵۰
شریف زادہ۔	" ڈاکٹر قمر رئیس	۲۰/-
امراؤ جان ادا	مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن	۲۸/-
فسانۂ مبتلا۔	" صدیق الرحمٰن قدوائی	۱۰/-
توبۃ النصوح۔	" مالک رام	۳۶/-

باغ و بہار ۔ ″ رشید حسن خاں ۔ ۴۴/-
ابن الوقت ۔ ″ ڈاکٹر خلیق انجم ۴۲/-
مجالس النساء ۔ ″ صالحہ عابد حسین (زیر طبع)
گذشتہ لکھنؤ ″ رشید حسن خاں ۷۵/-
قصہ حاتم طائی ۔ ″ اطہر پرویز (زیر طبع)
انتخاب ولی مرتبہ سید ظہیر الدین مدنی ۱۲/-
انتخاب سراج اورنگ آبادی مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن ۱۰/-
″ مراثی انیس و دبیر ۔ رشید حسن خاں ۳۶/-
″ نظیر اکبرآبادی ۔ ″ ″ ۳۶/-
″ اکبر الہ آبادی ۔ صدیق الرحمٰن قدوائی ۱۸/-
″ کلام میر ۔ ڈاکٹر محمد حسن (زیر طبع)
دیوان درد رشید حسن خاں ۲۰/-
انتخاب سودا ″ (زیر طبع)
″ قلی قطب شاہ ۔ محمد اکبر الدین صدیقی (زیر طبع)
″ ذوق ۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی ۲۴/-
مثنوی سحر البیان ۔ رشید حسن خاں ۲۱/-
مثنوی گلزار نسیم ۔ ″ ۱۶/-
افادات سلیم ۔ ڈاکٹر خلیق انجم ۲۱/-
مقدمہ شعر و شاعری ۔ مرتبہ رشید حسن خاں ۲۰/-

جیبی کتابیں

ایک خواب اور ۔ علی سردار جعفری ۱۰/-
آتش گل ۔ جگر مرادآبادی ۱۰/-
پچھلے پہر ۔ جاں نثار اختر ۶/-
رومانی غزلیں ۔ ثمینہ حجاب ۶/-
انتخاب اکبر الہ آبادی ۔ صدیق الرحمٰن قدوائی ۱۰/-
ساتواں آنگن ۔ صالحہ عابد حسین ۸/-
دھوپ ۔ رابعہ تبسم ۵/-
گھر ۔ ماریہ رحمٰن ۸/-
واپسی کا سفر ۔ عبداللہ حسین ۵/-
راگ بھوپالی ۔ ڈاکٹر صغریٰ مہدی ۶/-
نغیب ۔ عبداللہ حسین ۵/-
موت کا بازار ۔ آفتاب ہلالی ۸/-

کتاب نما کے خصوصی شمارے

خواجہ احمد فاروقی مرتبہ: خلیق انجم ۴۵/-
عابد علی خاں ″ مجتبیٰ حسین ۴۵/-
پروفیسر مسعود حسین خاں ″ ایم حبیب خاں ۴۵/-
ڈاکٹر اجمل اجملی مرتبہ علی احمد فاطمی / عذرا حبیب ۴۵/-
فرماں فتح پوری نمبر مرتبہ خلیق انجم ۲۵/-
سردار جعفری نمبر مرتبہ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی ۵/-
صالحہ عابد حسین نمبر مرتبہ: عزیز قریشی ۴۵/-
نئی نظم کا سفر مرتبہ: خلیل الرحمٰن اعظمی ۲۵/-
مشرقی علوم و السنہ پر تحقیق ۔ حامد حسین ۳/-
پریم چند نمبر ۔ عبدالقوی دسنوی ۸/۵۰
ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر ۔ کرنل بشیر حسین زیدی ۱۲/-
مولانا مہر محمد خاں شہاب نمبر ۔ ادارہ ۱/۵۰
مرزا سلامت علی دبیر ۔ ۔ قوی دسنوی ۷/۵۰
جوش ملسیانی نمبر ساحر ہوشیارپوری ۵/۵۰
خواتین افسانہ نگار نمبر ڈاکٹر صغریٰ مہدی ۴/۵۰
عرش ملسیانی نمبر ۔ مالک رام ۱۲/۵۰
سکندر علی وجد نمبر یوسف ناظم ۲۵/-
قدسیہ زیدی نمبر ۔ کرنل بشیر حسین زیدی ۲۵/-
فراق نمبر ۔ شمیم حنفی زیر طبع
لغت نویسی کے مسائل نمبر پروفیسر گوپی چند نارنگ ۲۵/-
عبداللطیف اعظمی نمبر ۔ ادارہ ۱۸/-
مشفق خواجہ نمبر ۔ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم ۳۰/-
جائزے ۔ مرتبہ مظفر حنفی ۴۵/-

سائنسی موضوعات پر
مکتبہ پیام تعلیم کی فخریہ پیش کش
کمپیوٹر
کیا ہے
قیمت ۸/-
یہ کیسا بخار ہے؟
قیمت ۴/۵۰
سائنس کی دنیا
فرید الدین احمد
قیمت 8/-
گندا پانی
قیمت ۴/۵۰
کیوں
اور کیسے
محمد ابراہیم شاہ
قیمت 6/-
آپ
کا
جسم
علی ناصر زیدی
قیمت ۶/-
عجائب گھر
قاسم صدیقی
قیمت 10/-

بتاشے
نرسری کے بچوں کے لیے آسان
زبان میں دلچسپ نظمیں قیمت ۶/۵۰
ننھے منے بچوں
کے لیے
دلچسپ
اور
باتصویر کہانیاں
جاں نثار دوست
بچوں کے لیے باتصویر کہانی
قیمت ۵/- روپے
جادو کی ہنڈیا
5/=
بھیڑیے کا گانا
6/50
شیر اور بکری
7/50
کوے کا خواب
7/-
دم کٹی لومڑی
6/50
گدھے نے بجائی بانسری
قیمت 7/50
چالاک بلی
6/50
چاند کی بیٹی
5/-

مکتبہ پیام تعلیم کی کم قیمت پر
دیدہ زیب اور عمدہ کتابیں
بکرے کی تعریف میں
یوسف ناظم
6
پادری کی روح
قیمت 4/50
تھوڑی تارا ماتھے چاند
اشرف صبوحی
4/=
بڑھیا کی بھینس
قیمت 4/=
قصر صحرا ۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی
اول تا سوم
قیمت مکمل سیٹ 25/
غذائیں دوائیں
قیمت 8/

لسان الصدق — مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہوار رسالے کا مکمل فائل، اس کا مقدمہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے تحریر کیا ہے۔ اہم علمی خزانہ =/۴۵

نظام رنگ — ڈاکٹر اسلم فرخی

سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ کا ادبی خاکہ — یہ اس نامور بزرگ کا خاکہ ہے جس نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر انسانیت کو وقار بخشا۔ =/۱۵

شہید جستجو (سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین) پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی

ذاکر صاحب وہ درویش تھے جن کا انداز خسروانہ ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب اقبال کے مرد مومن تھے، ذاکر صاحب وہ شبنم تھے جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک پڑتی ہے وہ طوفان تھے جس سے دریاؤں کے دل دہل جاتے تھے۔ اس کتاب میں ذاکر صاحب کی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ =/۴۵

پرانی بات ہے (سلسلۂ ارتسامات) زبیر رضوی

زبیر رضوی نے ان نظموں میں واقعات و ... ان کی جن سچائیوں پر سے پردہ اٹھایا ہے وہ ... ہے اپنے عہد کی سچائیاں ہیں، ان سچائیوں

قدیم شعرا — محمد قلی قطب شاہ سے لے کر میاں داد خاں سیاح تک کے کلام کا جامع انتخاب اور تعارف جس کو ادا جعفری نے برسوں کی محنت اور گہرے مطالعے کے بعد ترتیب دیا۔ بلا شبہ اسے ادا جعفری کا کارنامہ قرار دیا جائے گا۔ صفحات ۴۸۰ =/۴۵

ساز سخن — ادا جعفری

جدید شاعری کی خاتون اول، محترمہ ادا جعفری کے کلام کا جامع انتخاب۔ ادا جعفری کے انداز بیان سے ایک ایسی قوت ارادی مترشح ہے جس کے بغیر ... ادب کے کسی معمار کا پیام موثر نہیں ہو سکتا۔ =/۲۵

ترجمۂ قرآن — پروفیسر شیر الحق

(منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش)

پہلا پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ جو ۱۳ر اکتوبر ۱۹۸۸ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک خصوصی تقریب میں پیش کیا گیا۔ [illegible]

نذر مختار — مالک رام

مجموعۂ مضامین جو ممتاز محقق اور دانشور پروفیسر مختار الدین احمد کو عالیجناب شنکر دیال شرما نائب صدر جمہوریۂ ہند کے دست مبارک سے پیش کیا گیا جس میں [illegible] کے ممتاز چھبیس ادیبوں کی نگارشات شامل ہیں۔ [illegible]

Regd. with R.N.I. at No 4967/60 Dce, 1993.
Regd. No. DL 16016/93
Licence No. U[SE]-22 to Post without pre-payment of postage

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR NEW DELHI - 110025